

بیس (۲۰) طرے مسلمان

عبدالرشید اشرف



مکتبہ اسلامیہ

۱۹۷۱ء

۱۹۷۱ء



پین (۲۰) ٹرے مسلمان

حاجی امداد اللہ مہاجر کٹیؒ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
 مولانا رشید احمد لنگوٹیؒ شیخ النعمان مولانا محمد حسنؒ
 مولانا اشرف علی ہت نانویؒ علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ
 مولانا عبد اللہ سندھیؒ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ
 مولانا شمس الدین احمد مدنیؒ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ
 مولانا محمد الیاس دہلویؒ مولانا شیخ عبدالقادر آپٹویؒ
 مولانا احمد علی لاہوریؒ مفتی محمد حسن امرتسریؒ
 مولانا ابوالکلام آزادؒ مولانا محمد علی جوہرؒ
 مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ
 مولانا حفص الرحمن سیوہارویؒ سردار احمد خان تپانیؒ

جمع و ترتیب: عبد الرشید ارشد



إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مَا تَتَيْنِ

اگر تم میں کے ہیں آدمی ثابت قدم رہنے والے ہونگے تو دوسو پر غالب آجائیں گے

(الانفال : ۲۶)

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ

فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ

ان ایمان والوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا،

اُسے سچ کر دکھایا۔ پھر ان میں کچھ وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے۔ اور کچھ وہ ہیں جو

(شہادت کے) مشتاق ہیں

(الاحزاب : ۲۴)





ترتیب
عبدالرشید ارشد

مکتبہ رشیدیہ لاہور - ۲۵ - نور مال لاہور

انتساب

- والدِ محترم حضرت حاجی تاج محمد صاحب مدظلہ^۱
- استاذی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ ساہیوال^۲
- برادرِ بزرگ حکیم حافظ محمد اسلم صاحب زاد اللہ محاسنہ

کے نام

جن کی پُر خلوص دُعاؤں، مُشفقانہ تربیت اور سلامتی فکر و عمل کا یہ فیضان ہے
کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی عزت و سعادت بخشی

محمد امجدی

۱۔ ۱۴ جمادی الاول ۱۴۰۶ھ ۲۸ جنوری ۱۹۸۶ء انتقال فرما گئے۔
۲۔ ۲۴ رمضان المبارک ۱۴۰۵ھ ۱۴ جون ۱۹۸۵ء انتقال فرما گئے۔



اجمالی فہرست

۱۴۵	عبد الرشید ارشد	امام بیانی (نومرتکۃ الرشید)	مولانا رشید احمد گنگوہی
۱۹۵	"	ہیئت و ارشاد	"
۲۰۲	"	تلقین و تربیت	"
۲۱۱	"	سنوی کلمات	"
"	"	تذکرہ و تصرفات	"
۲۲۱	"	حسی کرامات	"
<p>شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی</p>			
۲۲۸	عبد الرشید ارشد	شیخ الہند متخلص تذکرۃ شیخ الہند	"
۲۳۹	مولانا حسین احمد دہلوی	شیخ الہند کی سیاسی خدمات	"
۲۵۲	"	شیخ الہند کا سفر حجاز	"
۲۹۹	"	سوادِ تحریر شیخ الہند	"
<p>مولانا اشرف علی تھانوی</p>			
۳۰۲	سوادِ تحریر		

۵۱۳	عبدالرشید ارشد	حضرت مدنی و اہل سنت کے انجمنیں
۵۱۵	"	ملفوظات حضرت مدنیؒ
۵۲۰		تاریخ کنائے وفات

علامہ شبیر احمد عثمانی

۵۴۲ سوادِ تحریر
۵۴۳ پر نور الامین شہر کوٹی
۵۴۳ علامہ عثمانی "تفسیری نکات" پر نور انوار المسیح شہر کوٹی
۵۴۴ شاد باغ دشاوندی اسے سرزمینِ دیوبند
۵۴۸ تارِ سناسے وفات

مولانا محمد الیاس بلوچی

۵۸۰		دوبابہ حجاب اندر
۵۸۱	مولانا محمد حسین عفی	مولانا محمد الیاس دلوئی
۵۹۶	عبد الرشید رشید	مولانا محمد لوسف دلوئی

مولانا شاہ عبدالقادر راسخوری

۴۰۰ سواد تحریر
۴۰۱ مولانا شاہ عبدالغادر راسہ پور
مولانا محمد حسین نقوی
۴۰۲ مولانا سیار الحسن علی نقوی
۴۰۳ " " "
۴۰۴ " " "
۴۰۵ ہفتی کیفیات اور نمایاں منجات
آہ قلب الارشاد (نظم)
۴۰۶ ستیفیس رقم

مولانا احمد علی لاہوریؒ

۴۳۲	سوادِ تحریر
۴۳۳	شیخ التفسیر مولانا احمد علی
۴۸۶	ماترل دین
۴۹۵	مفوضات بشاٹ علاقہ و اولاد حضرت مولانا
	ڈاکٹر سید عبداللہ

مفتی محمد حسن امرتسری

سوادِ تحریرِ مفتی محمد حسن (نظم) مفتی محمد شفیع صاحب ۷۰۰

حکیم: است خود اپنی نظر میں ایک خط ۳۰۵

٢٠٩

امت' نور احمد اکیابی ۳۰۸

۳۲۹

تقدیر و اوقات اقتصادات کے انجمن ۳۳۳

کتاب منش و الحاح ۳۵۹

پاکستان کی جبر و ستم

مقام

مَنْ مَاتَ مِنْكُمْ فَاجْعَلْهُ

علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ

۳۴۰. محمد انوشاه عبدالرشید ارشد

۴۹۶

۷۰۰. نورشاه کشمیری (نظم) محمد ضیاء الرحمن ضیا

مولانا عجلید اللہ سندھی

وادی عمریه

۰۳ روزنوشته حالات زندگی

مولانا عبید اللہ سندھیؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ

مفتی کفایت اللہ دہلوی

بواد تحریک

ولما مضى كفايت المم

فقہ اعظم واقعات کے ایسے میں

فصل اول در بیان تفاوت میان علم و حکمت

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

سوادِ تحریر

میرزا حسن احمدی * عبدالرشید ارشد

شماره ۱۱۱۱ کے لئے اشعار

ماہنامہ

۸۳۳ علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ خالد بڑی ایم سے
مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

۸۴۲ سواد تحریر
۸۴۳ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ علامہ خالد محمود
۸۴۴ بے اسیری اعتبار افزا قید و بند کے اعداد شمار
۸۴۸ ایک دنیا کا خراج عقیدت
۸۶۰ پر لیں کا خراج عقیدت
۸۶۴ پہل گرفتاری اور دیگر غوغا
۸۸۸ خطبہ شہ پار سے
۸۹۰ شاہ جی کی عادتیں شورش کاشمیری
۸۹۲ ان کی باتوں میں گوں خوشبو
۸۹۸ اب کہاں دنیا میں ایسی بستیاں مولانا تاج محمود
۹۰۰ جامع الصفات انسان شورش کاشمیری
۹۰۵ شاہ صاحب کی اولاد
۹۰۶ مادہ لٹے تاریخ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

۹۰۸ عکس تحریر
۹۰۹ مجاہد ملت مولانا سیدیاں صاحب
۹۲۱ مولانا حفظ الرحمنؒ ۱۹۳۶ء میں
۹۳۶ شخصیت و کردار
۹۴۳ واقعات و اقتباسات
۹۵۱ مجاہد ملت کا تصنیفی درجہ مولانا شاہ حسین الدین ندوی
۹۵۴ پیغام باد ویاں
۹۵۶ وفات پر خراج عقیدت
۹۶۶ مادہ لٹے تاریخ وفات

سرور احمد خان پٹانیؒ
۹۶۸ مولانا سید نور الدین شاہ بخاریؒ

۷۰۱ مونی محمد شرف علیؒ
مولانا ابوالکلام آزادؒ

۷۱۲ سواد تحریر
۷۱۵ ابوالکلام آزادؒ نحو جس نظامی
۷۱۶ بچپن تعلیم اور صحافت شریف الحسن خان مکتوی
۷۲۶ دار و درن کی آزمائشیں
۷۳۸ سنہ سے شکست تک
۷۴۱ ایک عالم
۷۴۲ مولانا ابوالکلام آزادؒ مولانا غلام رسول قنبر
۷۵۵ ایک مہم مومنی سیاستدان خواجہ لال بہرو
۷۵۶ خطبہ احیائے ملت
۷۵۹ بولتی ہوئی تحریریں
۷۶۲ در حدیث و دیگران مولانا آزاد کا ایک خط
۷۶۵ ایک بے مثال شخصیت مولانا غلام رسول قنبر
۷۷۰ قول فیصل مولانا کا تاریخی بیان
۷۷۳ بیگم آزاد کا تار بنام مرثیہ گندھی
۷۷۴ تقریبی پیامات
۷۷۶ سفر آخرت شورش کاشمیری
۷۷۸ عوام اور حکومت کا رہنما پنڈت گوبند و مہ پنت
۷۸۰ مولانا آزاد کی زندگی مادہ سال میں
۷۸۲ نام کے مسنوی و مذاق و ذہانت

مولانا فتح علی جوہرؒ
۷۸۳ سواد تحریر
۷۸۵ مولانا محمد علی جوہرؒ ترتیب عبد الرشید راشد
۷۸۶ بیان مقدمہ کراچی

مولانا سید محمد سلیمان ندویؒ
۸۳۲ سواد تحریر

مولانا عبدالرشید ارشدؒ

حضرت اقدس مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے تلمیذ رشید، مکتبہ رشیدیہ لاہور کے بانی و روح رواں، ماہنامہ الرشید کے بانی، مدیر، مدیر مسئول، حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کے رفیق و ہم درس، فکر و نوآوری کے پاسان، مسلک دیوبند کے داعی و مناد، دسیوں کتابوں کے مصنف، دارالعلوم دیوبند اور ایتائے دیوبند کے ترجمان حضرت مولانا عبدالرشید ارشدؒ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۱/ جنوری ۲۰۰۶ء منگل اور بدھ کی درمیانی رات، آٹھ بجے رحلت فرمائے عالم آخرت ہوئے۔

انا لله وانا اليه راجعون۔ ان لله ما اخذ وله ما اعطى وکل شئى عنده باجل مسمى

حضرت مولانا حافظ عبدالرشید ارشد سے یوں تو پرانی عقیدت و محبت تھی، مگر ان کی تصنیف ”میں بڑے مسلمان“ دیکھ کر اور پڑھ کر ان کی عظمت کے نفوذ دل و دماغ میں مزید گہرے ہو گئے، اپنے دل میں سوچتا تھا کہ وہ مجھ ایسے مجہول مطلق کو شاید ہی خاطر میں لائیں؟ لیکن جب حضرت لدھیانوی شہیدؒ کے برکت سے ان کے ساتھ ملاقاتیں ہوئیں تو وہ ہم و گمان کے برعکس انہیں نہایت نبی شفیق و خلیق اور بے حد متواضع پایا تو انتہائی خوش ہوئی، بلکہ شہید ہونے لگا کہ کیا یہ وہی شخصیت ہے جس نے اتنا بڑے کارنامے نمایاں انجام دیے ہیں؟ پھر جوں جوں ملاقاتیں بڑھیں۔ ان کی عظمت بڑھتی چلی گئی اور ان سے محبت و عقیدت میں بدلتی گئی، بنیادیں کے کسی قول و فعل اور چال و حال سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ تنہا اتنا بڑا مسلکی اور تاریخی کارنامہ انجام دینے والا شخص ہے۔

حضرت مولانا حافظ عبدالرشید ارشد قدس سرہ نے یکم ستمبر ۱۹۳۲ء کو جالندھری کی تحصیل کدور کے ایک غیر معروف گاؤں ہری پور کے ایک باخدا انسان جناب الحاج تاج محمدؒ کے گھر میں آنکھ کھولی۔ آپ کے والد ماجد جناب حاج تاج محمدؒ کا تہذیب الامت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ ارشد حضرت مولانا صاحب محمدؒ ساکن رائے پور گجرات ضلع جالندھری سے عقیدت و ارادت کا تعلق تھا، یوں آپ کو شروع سے ہی اہل قلوب اور اکابر علمائے دیوبند کی سرپرستی اور محبت و عقیدت و رشہ میں ملی، یہ اسی کی برکت تھی کہ روز اول سے ہی آپ کی رگ و پے اور قلب و جگر میں اہل حق علمائے دیوبند اور مسلک حق کی خدمت جال گزریں ہو گئی، ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا، چنانچہ زندگی بھر کے لیے انہوں نے اس دشت بیابانی کو اپنا وظیفہ بنالیا، اور اس میدان کی ہر محنت و مشقت کو خندہ پیشانی، محبت و عقیدت اور جذب و جنون سے نبھایا۔

حضرت مولانا کا اللہ تعالیٰ نے گونا گوں صفات سے نوازا تھا، انہوں نے باقاعدہ کسی یونیورسٹی سے صحافت کا کورس نہیں کیا تھا مگر ان کی انشاء پر دہائی کی تحریکی خشکی و روانی سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے صحافت پر اپنی ایچ ڈی کر رکھا ہے، اللہ تعالیٰ

نے ان کو سیال قلم عطا فرمایا تھا، بلاشبہ ان کو اپنے اظہارِ مافی الضمیر پر غیر معمولی طور پر قدرت تھی، اسی طرح ان کو اپنے قلم پر بھی مکمل کنٹرول تھا، وہ لکھنے بیٹھتے تو لکھتے چلے جاتے، ان کی تحریر کا ایک خاص اسلوب، جو عام انشاء پردازوں اور مصنفین میں کم نظر آتا ہے، یہ تھا کہ وہ لکھتے وقت مضمون کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے اور اس سے متعلقہ تاریخی واقعات کو جملہ معترضہ کے طور پر اس طرح درج فرماتے کہ پڑھنے والا نہ تو آکڑاہٹ کا شکار ہوتا اور نہ ہی مضمون کا تسلسل ٹوٹتا، گویا ایک مضمون میں وہ کئی مضامین اور ایک تاریخ میں کئی تاریخیں، یا یوں کہیے کہ وہ کسی ایک کے سوانحی خاکہ میں کئی ایک سوانحی خاکے اس خوبصورتی سے مدون کرتے کہ قاری کی دلچسپی مزید بڑھ جاتی۔

راقم الحروف نے ایک دن ان کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ حضرت آپ کی تحریر میں احاطہ اشیات ہوتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ مناسب نہیں کہ ایک مضمون مکمل کر کے دوسرا پھر شروع کیا جائے؟ فرمایا: ہاں آپ صحیح کہتے ہیں مگر میں نے ایک بار حضرت اقدس سید نقیس شاہ صاحب مدظلہ سے اس کا تذکرہ کیا کہ حضرت مجھے لکھتے لکھتے کچھ یاد آجاتے تو اس کا کیا کروں؟ حضرت نے فرمایا جو جو یاد آتا جائے اسے لکھتے جاؤ، تاریخیں ایسے ہی مرتب ہوا کرتی ہیں، فرمایا اس دن سے میں نے یہ اعزاز اپنا لیا تھا کہ جو کچھ یاد آتا ہے، اس خیال سے کہیں بعد میں بھول نہ جائے لکھ دیتا ہوں۔

لیکن مولانا کا یہ کمال تھا کہ بائیں ہمدان کی تحریر میں کسی قسم کا کوئی بھول، بے ربطی اور بے لطفی کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ قاری ان کی تحریر کے اس تنوع سے لطف اندوز ہوتا اور اس میں کھوجا پاتا تھا۔

حضرت مولانا مرحوم نے جب بھی لکھا بے تکلف اور وارفتگی کے انداز میں لکھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں ”از دل خیزد، بردل ریزد“ کا صداق ہوتی تھیں، ہار با لیا ہوا کہ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے آنکھیں نم ہو جاتیں۔

موصوف نے اپنی مختصری زندگی میں بہت لکھا مگر بغیر کسی صلہ و ستائش محض اللہ کے لیے لکھا۔ موصوف کے قلم صداقتِ رقم سے درج ذیل کتب وجود میں آئیں:

تذکرہ مولانا محمد یوسف دہلوی، افادات مولانا محمد یوسف دہلوی، بیس بڑے مسلمان، بیس مردانِ حق اول دوم، ماہنامہ الرشید کا دارالعلوم دیوبند نمبر، الرشید کا ”مدنی اقبال“، نمبر، دعوت و تبلیغ نمبر، ماہنامہ الرشید کا نعت نمبر، وہ جلد، تبلیغی جماعت کی دینی جدوجہد، الرشید کا حکیم محمد سعید شہید نمبر، الرشید کا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید نمبر، الرشید مفتی جمیل شہید نمبر، واردات و مشاہدات اور الہلال کی تین جلدیں۔

اسی طرح آخری دنوں میں بھی دو کتابیں آپ کے زیر تصنیف تھیں: ایک حیاتِ مستعار اور دوسری بیس علمائے حق چنانچہ حیاتِ مستعار کے تقریباً پانچ صفحہ صفا ہو چکے تھے، اسی طرح بیس علمائے حق پر بھی انہوں نے کئی ایک مضامین جمع کر لیے تھے۔ ان میں سے حضرت اقدس مولانا محمد عبداللہ دہلوی پر ایک مضمون راقم الحروف کے ذمہ بھی لگا تھا جو محض مولانا موصوف کی

میں بڑے مسلمان

برکت سے ہی پایہ تکمیل کو پہنچا۔

کہنے کو تو مولانا مرحوم نے مکتبہ رشیدیہ کے نام سے لاہور کے ایک مشہور بازار شاہ عالم مارکیٹ (اب لوئر مال روڈ پر ہے) میں ایک کتب خانہ بھی قائم فرما رکھا تھا، لیکن وہ کتب خانہ کم اور دارالتصنیف زیادہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کتب خانہ نے کبھی معروف تجارتی انداز نہیں اپنایا، بلکہ وہ ہمیشہ نقصان میں ہی رہا، اور جو کچھ اس سے حاصل ہوتا دکان، مکان کے کرایہ اور گھریلو ضروری اخراجات کے علاوہ اس کی تمام آمدنی کتابوں کی ترتیب و اشاعت پر صرف ہو جاتی، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر بچوں کے سر چھپانے کا کوئی ذاتی جھونپڑا تک نہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان و دکان سے ہی سوئے آخرت روانہ ہو گئے۔ اللہم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعده۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ سے خبیث النفس حسی تکلیف دہ مرض کا شکار تھے، لیکن انہوں نے کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ مریض ہیں، چنانچہ کسی قسم کا کوئی مرض ان کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکا، ان کی عادات مبارکہ تھیں کہ وہ رات کو دیر تک جاگتے رہتے چنانچہ فجر کی نماز، ناشتہ اور معمولات سے فارغ ہونے کے بعد آرام کرتے اور پھر کام میں مشغول ہو جاتے۔ حضرت مولانا کی ذات و صفات اور ان کے کمالات کا تقاضا ہے کہ ان پر ماہنامہ الرشید کا ایک یادگاری نمبر آنا چاہئے اور ان کے جاری کردہ منصوبہ جات کی تکمیل ہونی چاہئے۔ خدا کرے ان کا جاری کردہ ماہنامہ الرشید اور مکتبہ رشیدیہ حسب سابق جاری رہے اور ان کی زیر ترتیب کتب بھی منصفہ شہود پر آ جائیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَحُذُوهُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَا نَبِيَّ بَعْدَهُ

گزارش احوال

أُولَئِكَ آبَائِي فَبِحَبْلِهِمْ إِذَا جَمَعْتُنَا يَا جَبْرِئِلُ الْمُجَامِعِ

کتاب ”میں بڑے مسلمان“ آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں جن اکابر کا ذکر کیا گیا ہے ان کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی اشاعت و تبلیغ اور ملک و ملت کی آزادی کے لیے وقف تھی۔ اور اس فریضہ کو ادا کرتے ہوئے انہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی میں علم و بصیرت، تقویٰ و ایثار، جہد و عمل اور خلوص و التمسیت کی ایسی تابندہ و درخشندہ روایات قائم کی ہیں جن کی بہت کم مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں غازی اور ملک زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے جذبہ اقامت دین اور علم سیاست، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے کتاب و سنت سے مستفادہ و مستعیر فکر و فلسفہ اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سوز و دروں، سلوک و تزکیہ نفس، دعوت و عزیمت اور جہاد فی سبیل اللہ کا بہترین اور حسین مرقع تھیں۔

اس کتاب کے لیے اکابر کے اسمائے گرامی کا انتخاب کرتے وقت مختلف نقشے ہمارے سامنے آئے، اور بالآخر یہ نقشہ ترتیب پایا جو آپ کے سامنے ہے۔ برصغیر میں..... ان اکابر کے علاوہ بھی بہت سی نامور ہستیاں یقیناً ایسی ہیں جن کے سیر و سوانح کو محفوظ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کتاب میں پیش کئے جانے والے حضرات کے تذکار کا..... خصوصاً حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، حضرت مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادیؒ، حضرت مولانا حسین علیؒ والی بھڑاں، حضرت مولانا ظہیر احسن محدث نیوٹی، حضرت مولانا خلیفہ غلام محمد دین پورٹی، حضرت محمد عبداللہ سلیم پورٹی (کنڈیاں والے)، حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور دوسرے متعدد حضرات کی پاکیزہ زندگیوں اس قافلہ میں کہ ان کا مستقل تذکرہ کیا جائے۔ ہم اس کتاب سے فارغ ہو کر انشاء اللہ اس طرف متوجہ ہوں گے، اور عزم یہ ہے کہ سیر و سوانح کے سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے ان تمام علماء و مشائخ کا تذکرہ محفوظ کر دیں، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس خطہ زمین میں ملک و ملت کی خدمات سر انجام دیں، اللہ تعالیٰ سے ہم اس کے اتمام کی دعا کرتے ہیں، (الحمد للہ) جکل بیس مردان حق کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔

جن اصحاب کا ہم نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے انہوں نے امت مسلمہ کے لیے جو عظیم الشان کارہائے نمایاں انجام دیے، ان پر وہ ملک و ملت سے کسی صلہ و ستائش یا یاد و تحسین کے طالب نہیں تھے، ان کی نظر ”ان اجری الی اللہ“ پر رہی، رضائے الہی کے بلند نصب العین کی خاطر انہوں نے خدا کے بندوں کو اس کے دین کی دعوت پہنچائی، اور اس کے لیے زمانے کے گرم و سرد کو اچھائی خندہ پیشانی اور مرد و ثبات سے برداشت کیا۔ یہ لوگ خود تو ملک بدر ہوئے، قید و بند سے گزرے، بھٹلوں میں کودے، آگ سے کھیلے، طوفانوں سے ٹکرائے اور سلطنتِ برطانیہ کے جاہ و جلال اور جبر و استبداد کا مقابلہ کیا لیکن اس کے بدلے میں ہمیں صحیح دین، خالص توحید و عشق رسالت، احترام اسلاف، علم و عمل کے بے پناہ جذبے اور آزادی کی نعمت عظمیٰ کی دولت سے مالا مال کر گئے..... ان کی بلندی کردہ، حسن عمل اور پاکیزگی سیرت کو تاریخ کے صفحات پر محفوظ کرنا اور ان کے افکار و خیالات سے افراد و ملت کو روشناس کرنا وقت کا اہم

تقاضا تھا، ہم نے اپنی کم مائیگی اور کوتاہ علمی کے باوجود یہ سعادت و شرف حاصل کرنے کی جھڑوسی کی ہے اس میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے، قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

آخر میں تمام مضمون نگار اصحاب اور اپنے ان تمام بزرگوں اور رفقاء کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے رشحاتِ قلم سے یہ کتاب مرتب و مزین ہوئی اور جن کی کرم فرمائیاں اور دعاؤں سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچی..... علامہ خالد محمود صاحب اور محترم سید انور حسین صاحب نفیس رقم کی مریدانہ و شفقتانہ سرپرستی اور برادر عزیز حافظ محمد اسلم سہیل کے تعاون و محنت پر ان کا ممنون ہوں، مولوی مرتضیٰ حسن نے مسودات و مضامین کے نقل کرنے میں جو کام کیا، اس پر ان کا شکریہ بھی واجب ہے۔ اور یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ان سب حضرات کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں

عبدالرشید ارشد

۲۸/رجب ۱۳۸۹ھ

۱۱/اکتوبر ۱۹۶۹ء

بارشتم ۱۱۰۰ مئی ۱۹۸۵ء

بارہفتم ۱۱۰۰ مئی ۱۹۹۰ء

بارہشتم ۱۱۰۰ فروری ۱۹۹۶ء

بارنہم ۱۱۰۰ مئی ۱۹۹۹ء

باردہم ۱۱۰۰ جون ۲۰۰۰ء

باراول ۱۱۰۰ ۱۱، اکتوبر ۱۹۶۹ء

باردوم ۱۱۰۰ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء

بارسوم ۱۱۰۰ جولائی ۱۹۷۵ء

بارچہارم ۱۱۰۰ اگست ۱۹۸۳ء

بارہجیم ۱۱۰۰ جولائی ۱۹۸۶ء

”میں بڑے مسلمان“

مسلمانوں کے بڑے اور ہیر دھیں اور تھیں کی قید سے ہمیشہ آزاد اور بالاتر رہے ہیں، اسلامی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہزاراں ہزار ہیر دوں اور بڑوں سے بھرا ہوا ہے، اور ان میں جو بھی نظر آتا ہے مع اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بڑا ہی نظر پڑتا ہے۔ محدثین ہوں یا مفسرین، فقہاء ہوں یا شیعہ، صوفیاء ہوں یا عارفین، حکماء ہوں یا اصولیین، اخباری ہوں یا مؤرخین، غرض آج ہوں یا مجاہدین، خلفاء ہوں یا سائنسین، افسر کے جس دور پر بھی شاہ ڈالی جائے وہ میں تھیں یا چالیس پچاس نہیں ہزاراں ہزار کی تعداد میں نظر پڑیں گے اور اپنے اپنے رنگ کا ہر ایک بڑا ہی نظر پڑے گا، جو ایک ہو کر بھی ایک لقمہ کے برابر ہوگا، جی کہ اس دور انحطاط اور روزِ زانہ خوارِ جال میں بھی ان بڑوں کی کوئی کمی محسوس نہ ہوگی کہ انہیں میں تھیں کی حدود میں محدود کیا جاسکے۔

پھر بھی ”میں بڑے مسلمان“ جیغہ میں یہ عشرینی، بڑوں کی کمی کی بنا پر نہیں بلکہ دہائی کی قلت کی بنا پر ہے، جیسا کہ خود مؤلف کتاب نے بھی اسے واضح کرتے ہوئے اس عشرینی کے سوا اور بھی مثالی شخصیتوں اور بڑوں کے نام گنائے ہیں جو اس کتاب میں نہیں آسکے۔ مقصد کتاب محض نام نہاد شخصیتوں یا ان بڑوں کی منفرد ستیوں کو سامنے لانا نہیں بلکہ ان عہدِ آفریں شخصیتوں کے سامنے لانے سے مسلمانوں اور اسلام کی ایک خاص تاریخ کو پیش کرنا ہے جو شخصِ تعارف نہیں بلکہ ایک مثالی تاریخ کا تعارف ہے۔

یہ ”میں بڑے مسلمان“ جنہیں اس کتاب میں تعارف کرایا گیا ہے کسی ایک دائرہ یا کسی ایک ہی لائن کے لوگ نہیں بلکہ متحدہ گوشہ ہائے زندگی کی مختلف لائنوں کی جسم اور مضبوط تاریخ ہیں جن کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر ایک راہِ نور..... راہ، نشان راہ اور منزل راہ متعین کر سکتا ہے کیونکہ ان شخصیتوں کا آجا کر ہونا، درحقیقت اسلام اور سچے مسلمانوں کے مختلف مقاماتِ زندگی اور ان مقامات کے علوم و معارف کا نمایاں ہو کر سامنے آ جانا ہے، جبکہ وہ ان راہوں پر چل چکے ہیں اور انشاء راہ کی ساری مشکلات کو میسر کر کے نشانِ راہ اور استقامتِ راہ کا پتہ دے گئے ہیں۔

اس لیے محترم مؤلف کتاب کا ہم سب مسلمانوں کو ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے صرف میں ۲۰ مثالی شخصیتوں ہی کو نہیں جھجکایا، بلکہ چلنے والوں اور عزمِ راہ رکھنے والوں کے لیے میں ۲۰ سے کہیں زیادہ اصولی راستوں کی نشان دہی کر دی ہے جن میں سے ہر ایک راستہ حقیقی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے کافی، دانی اور شافی ہے، یہ شخصیتیں روشنی کے پتار ہیں کہ ان میں سے جس کی روشنی میں بھی گامزن کی جائے گی منزلِ مقصود آ جائے گی۔ فجزاءہ اللہ عنا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء۔

حق تعالیٰ انی مبارک ستیوں کی قبروں کو نور سے بھرے اور راہِ نوروں کو ان کی راہ پر چلنے کی توفیق بخشے، آمین

محمد طیب مفتی محمد ہاشم دارالعلوم دیوبند

دار وحال لاہور۔ ۸ اکتوبر ۱۹۷۰ء

(وفات ۱۹۸۳ء مطابق ۱۳۰۳ھ)

مرتب کتاب

صحیح تاریخ اور سن تو یاد نہیں، بعض دوسرے خامدانی واقعات کی روشنی میں قیاس کر کے اپنی تاریخ پیدائش یکم ستمبر ۱۹۳۲ء مندرجہ بالا ہے۔
جائے پیدائش آبائی گاؤں ہری پور تحصیل کھور ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) ہے ہمارے گاؤں کی نصف آبادی راجی مسلمانوں اور
نصف سکھوں کی تھی، اگر ستمبر ۱۹۳۲ء میں ہمارے گاؤں کے مسلمان گاؤں سے نکلنے میں گھنٹہ بڑھ گھنٹہ کی تاخیر کر دیتے تو شاید ایک فرد بھی
زخمہ نہ چلتا۔

پرائمری اپنے گاؤں سے کر کے گورد ہائی سکول پانچویں جماعت میں داخل ہوا، پچھٹی جماعت کا آغاز کیا تھا کہ والد ماجد کے حکم
سے ہائی سکول چھوڑ کر مدرسہ عربیہ خلیفہ گورد میں حضرت قاری تاج محمد (حال عبدالکلیم ضلع ملتان) سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع
کیا، بڑے بھائی حافظ محمد اسلم صاحب بھی یہیں قرآن پاک حفظ کر کے دہرا رہے تھے، سوا بارہ حفظ کرنے کے بعد مشرقی پنجاب کی مشہور
دینی درس گاہ مدرسہ رشیدیہ رائے پور میں قرآن پاک حفظ کر کے درس نکالی کی کتب شروع کیں۔

ہمارے گاؤں میں میرے لایا یا باوجود محمد خیرداد کو اخبار ”مدینہ“ بکجور اور چچا چودھری رحمت اللہ کو ”زحرم“ لاہور آیا کرتے تھے،
پرائمری ہی سے ان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ دادا جان کے پاس قسے کہانیوں کی کتابیں حاتم طائی، الف لیلا، چہار درویش وغیرہ اور ان
کے چچا زاد بھائی کے ہاں ظلم ہوٹھر باکے ساتوں دفتر تھے، ان سب کو بار بار پڑھتا رہتا، خاندان کے اکثر افراد برطانیہ تھے، ان کی باتیں
۱۔ والد ماجد حامی تاج محمد صاحب میرے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح بغرض معاش پہلے افریقہ اور ان دنوں برطانیہ میں تھے، آغا و شباب ہی سے
رائے پور آمدورفت کی وجہ سے مشرق اور پابند صوم، مصلوۃ تھے، افریقہ اور برطانیہ میں بھی بقول علامہ صاحب
نہ چھوٹے بھائی لندن میں بھی آدابِ عمر بخیری

ایسے رہے جیسے خاندان امداد یہ قاعدہ بخون میں رہ رہے ہوں، خاندان کے بعض دوسرے افراد چودھری ولی محمد گوہر (رشتے میں چچا بھاجو بھد میں
ایم۔ ایل۔ اے منتخب ہوئے) تاج زاد بھائی محمد عیاز (حال ڈاکٹر کٹرہاڈا) جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی میگزین میں پڑھ رہے تھے کے تقاضا و اصرار کے باوجود کچھ
جدید تعلیم دلائی گئے، والد صاحب کا حکم غالب رہا، وہاں گئے تو مجھے برطانیہ نکال کر تعلیم دلا سکتے تھے اور ان دنوں یہ بہت سبب تھا لیکن ان کی یہ کیفیت تھی
خیر نہ کرنا کچھ ملوہ دانش فرنگ۔ خیر نہ ہے میری آنکھ کا خاکہ بندہ زنج

آج برطانیہ میں تبلیغی جماعت اور بعض دوسری تنظیموں کی بدولت ان محنت چروں پر سنون واڑھی دکھائی دیتی ہے لیکن ۱۹۵۸ء میں شاید وہ تمام استقامت پر عمل پیرا
تھے۔ ان کے جذبہ و دل اور آواز کے محرکات نتیجہ ہے کہ برطانیہ میں دینی اور تبلیغی امور کو فروغ ہوں۔ برطانیہ کے دوسرے بڑے شہر میں جمعہ المسلمین قائم ہوئی جس کے وہ
برہن امیر رہے، برہنہ میں ہی حیدر نے چار لاکھ پونڈ کے سرمے سے یورپ کی سب سے بڑی جامع مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جو بیکل ایک ڈسٹ کے ذریعہ اہتمام تکمیل
کے مراحل میں ہے، جنرل آئی تو تبلیغی جماعت کے ایک بزم میں والد صاحب سے ملے، مجھے خط لکھا کہ ”آپ کے والد مجھ معنوں میں مردِ مومن ہیں“ یہی کچھ تاثر کرل
اٹھی، مجلس صانعِ بانی پاکستان کے والد میاں محمد بخش، مولانا سید ابوالحسن علی مدنی اور قاضی عبدالقادر جمہوریہ پاکستان سے ملنے والے ہر شخص کا ہے جسے وہ مسیح جی کر کے
وطن تشریف لاکر میاں بچوں میں قیام پڑا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ ان کا سایہ سلامت بکراست دے (کے)

۲۔ حال حاضر رشیدیہ سماجیہ یال، یہ ہمارے گاؤں سے تین میل دور جانب جنوب دریا سے پنج کے کنارے واقع تھا

’سننا۔ تقریباً سات آٹھ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے دو میل دور چشم پور میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی ایک جلسہ میں تقریریں کرتے سنا جو یا نہیں کیا قصص البتہ عبدالرحیم عاجز مرحوم کی پنجابی نظم کا پہلا شہراب تک یاد ہے۔

راتیں سیتیاں پیاں میوں اک خواب آگیا
گئے بدیشی انتہوں اتھے انقلاب آگیا

تیرہ سال کی عمر میں اپنے گاؤں سے بارہ میل دور ملیاں جا کر حاجی محمد شفیع (حال لاہور) کے ہاں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تقریر سنی، اسی کے لگ بھگ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ زیارت کی (حضرت سے بیعت پاکستان میں کی) علامہ حافظ غلام رسول حال مہتمم جامعہ علوم شرعیہ ساعی وال ان دنوں رائے پور کنڑہ لائق وغیرہ پڑھتے تھے ان دنوں بھی ان پر رشک آتا تھا اور آج بھی۔ رائے پور میں تعلیم کے دوران وہیں کے ایک طالب علم ”رشید احمد“^۱ سے ملاقات ہوئی جو ان دنوں دیوبند پڑھتے تھے اور رائے پور کے مدرسہ میں ان کی بہت شہرت تھی۔ اُن کی باتیں سنیں، دیوبند کے حالات پڑھتا اور سنتا رہتا تھا، وہاں کے ایک طالب علم کو دیکھا، تایا زاد بھائی سے جو ٹیکڑھ پڑھتے تھے، اُن کے گھر آنے پر اکثر گفتگو اور بحث و مذاکرہ رہتا، چودھری ولی محمد گوہر اکثر ہمارے گاؤں آتے اور کئی کئی بیٹے قیام کرتے ان کے پاس دنیا بھر کے اخبارات و رسائل آتے، ان کو دیکھنے کا موقع ملتا، میں گاؤں میں پیدا ہوا گاؤں میں پلا بڑھا لیکن مندرجہ بالا واقعات و حالات نے طبع میں روشنی اور جولانی پیدا کی اور اُن تک پیدا ہوئی کہ گاؤں سے نکل کر کسی بڑے شہر کی درس گاہ میں تعلیم حاصل کروں لیکن وہ جگہ کون سی ہو دارالعلوم دیوبند میں بڑی کتب میں داخل مل سکتا تھا اور سر میں سودا یہ بھی سہایا تھا کہ ایسی درس گاہ ہو جہاں دینی اور دنیوی دونوں طرح کی تعلیم کا اہتمام ہو، جامعہ طیبہ پر نظر انتخاب پڑی، خط و کتابت کی، میری عمر زیادہ اور استعداد کم تھی، تین سال کا نصاب مٹا کر تیاری شروع کی کہ اس طرح چھلانگ لگا کر انھوں میں داخلہ لیا جائے

ملکی سیاست عروج پر تھی، انتخابات کی آمد آدھی، دو سال یونہی ضائع ہو گئے۔۔۔۔۔ قیام پاکستان پر قافلے کے ساتھ چل کر پاکستان آ کر ڈیڑھ دو ماہ اور پھر کمریاں جنوں ضلع ملتان میں مستقل اقامت اختیار کر لی، اور ایک سال مزید ضائع ہو گیا (۱۹۴۸ء میں مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان میں داخل ہو کر دوبارہ درس نظامی کی کتب شروع کیں لیکن یہ جان کر کہ تحصیل نصاب میں آٹھ سال لگیں گے، واپس میاں جنوں آ کر حضرت مولانا محمد امجد علی صاحب جگرانوی کے مدرسہ عربیہ میں حضرت موصوف سے اور حضرت محمد عبداللہ تبکوہر کوئی سے منتخب کتب پڑھ کر، جامعہ رشیدیہ ساعی وال مشکوٰۃ جلالین پڑھ کر اس سے اگلے سال دوبارہ مدرسہ عربیہ خیر المدارس میں

۱۔ ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، قیام پاکستان کے بعد جامعہ عباسیہ میں داخل ہوئے وہاں سے جامعہ ازہر (مصر) گئے، کئی سال وہاں پڑھ کر اور واپس آئے تصوف میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی (پاکستان میں مختلف اداروں میں بطور سربراہ کام کیا، آج کل ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ڈائریکٹر ہیں)

۲۔ حضرت مولانا ابراہیم صاحب صورت و سیرت کے لحاظ سے مثالی بزرگ تھے۔ حضرت مولانا گنگوٹی سے ابتدا ہیبت ہوئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت گنگوٹی اور حضرت شیخ الہندی زیارت کے بعد سوائے نبی اور صحابی کے کسی بزرگ کی زیارت کی حسرت نہیں اور نبی و صحابی کی زیارت بیداری میں ممکن نہیں سوائے ان لوگوں کے۔ جو حضرت سید علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر زندہ ہوں۔ صبح نہجہ کے لیے اٹھے، دھوپا، چارپائی پر پاؤں پر لٹا کر بیٹھے تھے کہ گر کر جان چاہن آفریں کے سہرہ کی، وفات سے اگلے سال بادشہ سے قبر محل گئی، قبر کو کئی گھنٹے باہر نکال کر دوبارہ قبر ٹھیک کر کے دفن کیے گئے یعنی شاہدوں کا طیف بیان ہے کہ جسم کے وزن اور ہلک میں کوئی کمی تھی، جتنی کہ سہرہ پر گرنے سے چوٹ کا نشانہ ایسے قیامیہ محل دینے کے وقت تھا، ایک صاحب نے پتھر کو ہلا مارا دیکھا تو اس میں پوری ہلک تھی) ۳۔ مولانا مرحوم حضرت مولانا ابراہیم صاحب کے پہلے شاگردوں میں سے تھے اپنے مرشد حضرت رائے پوری سے مشق تھا۔ بہت متواضع اور منکسر الخراج تھے۔ متبع معنی میں صوفی اور عالم فاعل تھے۔ (۱۹۶۳ء میں انتقال فرمایا)

داخل ہو کر سنہ ۱۹۵۵ء میں دورہ حدیث کے سرفراغت لی۔ مولانا محمد یوسف مدنی ”چنات“ کراچی دورہ کے ساتھی تھے، ان دنوں بھی ان کی علمی و عملی بلندی کو رشک بھری نظروں سے دیکھتا تھا اور آج بھی۔ اور اسی دورہ کے سال میں چند ماہ ضلع فیصل آباد کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم رباتہ میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد رفیع کشمیریؒ سے استفادہ کیا۔ ۱۹۵۳ء میں منشی فاضل کیا۔

نشر و اشاعت، امامت و خطابت: ملتان سے فراغت کے بعد حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب کے حکم پر ایک مسجد میں امامت و خطابت کا آغاز کیا اور ان کی سرپرستی میں ادارہ اشاعت دین فہم میاں چنوں کی بنا ڈالی جس کی جانب سے کئی سالانہ سیرت کانفرنسیں اور بیسیوں تبلیغی اجلاس منعقد کرائے۔ مکتبہ رشیدیہ کے نام سے سکول کی کتب کی دکان کی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پر مشاہیر فخر اہل کمی ہوئی نظموں کا رزمیہ انتخاب بنام ”نعمات جہاد“ شائع کیا جس کی ایک ہزار کاپی اہالیان میاں چنوں نے فوج کو بھیجی..... ایک چارٹ ”شجرہ روحانی و علماء ربانی“ کا برڈ پوینڈ کے سلاسل سلوک پر شائع کیا، جس کی حضرت قاری محمد طیب نے خصوصاً بہت تعریف فرمائی اور چند ایک چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرائے۔ ۱۹۶۸ء میں ریڈرز ڈائجسٹ کے حلقہ نوے وقت میں مضمون پڑھا کہ پندرہ سولہ معروف زبانوں میں کروڑوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے اس طرح کا رسالہ نکالنے کی دمن انہی دنوں سے سوار ہو گئی، وسائل نہ تھے، ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ماہ نامہ ”عمران“ کی درخواست دی جوی، آئی، ڈی کی نذر ہو گئی، ۱۹۶۳ء میں ایک سال مفت روزہ ”دعوت“ کی ادارت کی، میرا ذہن ابتداء ہی سے اس طرف چل رہا تھا کہ عمدہ اشاعتی ادارہ ہونا چاہیے، ۱۹۶۰ء میں ”چنات“ کے سالنامہ میں آغا شورش کاشمیری نے ”مدوۃ المستفین“ دہلی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا کہ..... کاش پاکستان کے مذہبی دیوانے بھی اس پر غور کریں اور ملک میں عمدہ جیسا کوئی معیاری اشاعتی ادارہ قائم کریں اس بات نے ہمیز کا کام کیا اور میں نے ۶۰، ۱۰، ۹ کروڑ ناچے میں لکھا کہ..... ”ان شاء اللہ کسی نہ کسی دن ایک معیاری اشاعتی ادارہ پبلک لیڈ کپنی کی شکل میں قائم کیا جائے گا“..... اور یہ دورے کر ادھر ادھر تک دیتا رہا کہ مل کر ایسا ادارہ قائم کیا جائے مولانا سید نیاز احمد شاہ گیلانی، علامہ خالد محمود ایم۔ اے، مولانا مقبول احمد سانی وال (حال گلگت) کے ساتھ ایک مجلس مشاورت میں ”ادارہ حفظ معارف اسلام لاہور“ کی بنیاد رکھی مگر اس ادارے کی زندگی دو تین کتب کی اشاعت تک محدود رہی، راقم اس کا بہتم تھا، اس کے بعد حضرت مولانا عبداللہ درخواسی کی صدارت میں ایک ایسی ہی مجلس میں ایک ادارہ بنام ”دارالکونین“ کے قیام کا فیصلہ ہوا، مولانا محمد علی جاندھری بہتم، مولانا سید حامد میاں ناظم اعلیٰ، راقم ناظم نشر و اشاعت اور حکیم محمود ظفر سیالکوٹی خازن مقرر ہوئے اس کی تین چار مجلسیں ہوئیں لیکن نشستہ و گفتہ ویر خاستہ کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا.....

میں بڑے مسلمان: انہی دنوں مجھے خیال ہوا کہ جن حضرات نے گزشتہ صدی میں ملک و ملت کی خاطر اپنی زندگیوں وقف کیے رکھیں اور اشاعت اسلام و تحریک آزادی کے لیے کام کیا، ان کے تذکار و سوانح پر ایک کتاب ترتیب دینا چاہیے چنانچہ ”میں بڑے مسلمان“ کے نام سے کتاب کا اعلان کر دیا پانچ چھ سال بعد اللہ کا نام لے کر ۱۹۶۶ء میں لاہور آکر مکتبہ رشیدیہ کے نام سے کام شروع کیا، پہلی کتاب تذکرہ مولانا محمد یوسف دہلوی کے نام سے شائع کی اس کے بعد اعلیٰ الٰہی ترجمان جس کے اب تک کی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، پیشلک سنتر سے اس کتاب کی ترمیم و تراش پر اؤل انعام ملا۔ ”میں بڑے مسلمان“ کتاب بھی شائع ہوئی جس کا یہ

گیا رحوال ایڈیشن قارئین کے ہاتھوں میں ہے الحمد للہ یہ کتاب دستاویزی اور حوالہ جات کی کتب میں شمار ہو رہی ہے۔

برطانیہ کی سیاحت: ستمبر ۱۹۷۱ء میں برطانیہ سیاحت کے دہرے پر جانا ہوا۔ برطانیہ میں میرے احباب و رشتہ دار اتنے ہیں جتنے شاید پاکستان میں نہ ہوں جاتے جاتے چھ دن کا کل میں ٹھہرنا ہوا، یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ جہاں کے لوگوں نے (انگریزوں کی خفیہ تحریک پر) امان اللہ خاں کو اس لیے ملک بدر کر دیا تھا کہ اس کی بیوی کا فوٹو چھاپا تھا اب وہاں نوجوان لڑکیاں ننگریں پہنے پھر رہی تھیں، چار ماہ برطانیہ رہ کر تقریباً ہر بڑے شہر میں گیا، ایڈنبرا، مانچسٹر، نیورسٹون کی لائبریریاں دیکھیں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی مہرانی سے برٹش میوزیم (لندن) دو دفعہ جانا ہوا۔ اردو عربی، فارسی کی کتب کا انتخاب اور انگریزوں سے کہہ کر جرمانی ہوئی اور یہ بات سمجھا آئی کہ علامہ اقبال نے یہ مصرع کیوں کہا تھا کہ کئی میں اپنے آپ کی

جو دیکھیں ان کو پرپ میں قندل ہوتا ہے سپہا

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور بانی جماعت اسلامی دہلیوں بڑے حلقے کی عمر میں برطانیہ وغیرہ گئے، کاش ہمارے طباع ملایہ نوجوانی میں برطانیہ جائیں اور وہاں سے عبرت حاصل کریں کہ ”کافر“ طبعی دنیا میں بھی ہم سے کس قدر آگے ہیں۔ برطانیہ گیا تو ملک سالم تھا وہاں آیا تو ایک بازوٹ چکا تھا وہاں بھی پرچہ کھٹے عمان انرپورٹ پر ٹھہرا ہوا، انرپورٹ کی شکستہ حالت اور خاندان پرانی دیکھ کر روتے روتے بھی بندھ گئی۔

پبلک لیڈنگ کتبھی: جس عزم کا اعہار جنوری ۱۹۶۶ء میں کیا تھا اس نے حقیقت اور واقعہ کی شکل دسمبر ۱۹۷۱ء میں اختیار کی کہ کتبہ رشیدیہ پبلک لیڈنگ کتبھی کی شکل میں معرض وجود میں آگیا اور قیام پاکستان کے بعد غالباً کتبہ رشیدیہ لیڈنگ پہلا اشتاعی ادارہ ہے جو بطور پبلک لیڈنگ کتبھی قائم ہوا، کتبہ کی جانب سے اب تک تیس ایک عمدہ کتب شائع ہو چکی ہیں جس میں کتابت سید احمد شہید (قاری مخلوط) تفسیر روح المعانی (عربی) (مشتمل بر سولہ جلد)..... میں بڑے مسلمان، تفسیر عثمانی، ترجمہ حضرت شیخ الہند، اصلاحی نصاب (مشتمل بر نو کتب حکیم الامت حضرت خانقاہی) تحریک شیخ الہند (الطائف لائبریری لندن سے حاصل کردہ) آئی ڈی ریپورٹوں کا اردو ترجمہ (مقدمات و بیانات اکابر، تفسیر مواہب الرحمن) (اردو) دس جلد آٹھ ہزار صفحات، تفسیر القام المحمود حضرت عید اللہ سندھی کے تفسیری مخلوط کی پہلی جلد (سورۃ بقرہ ختم) (جو ڈاکٹر منیر احمد کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے) اور روایتی ادراج دین و عمر ترجمہ خواص اناں آف بیڑاں بھی ضخیم کتب شامل ہیں۔

برطانیہ گیا تھا تو ایک ماہنامہ ”ارشید“ کا ڈائریکشن داخل کر گیا تھا، وہاں پر منظوری ہوئی جو بطور ”ترجمان جامعہ رشیدیہ سہ ماہی“ ۱۹۸۵ء تک شائع ہوتا رہا۔ فروری، مارچ ۱۹۷۶ء میں راقم الحروف نے ”ارشید“ کا دارالعلوم قنبر، تربیت دے کر شائع کیا۔ جس میں حضرت مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے اکابر کے مضمون شامل ہیں۔ اس کا افتتاح جامعہ اشرفیہ لاہور میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی صدارت میں ہوا، ملک بھر کے علماء دین دیوبند شریک تھے۔ مفتی محمود مہمان خصوصی اور لوہا بڑا

نور اللہ خان صاحب جیسے لوگ سامعین تھے، احقر نے سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے حضرت قاری صاحب کو دارالعلوم دیوبند نمبر ۱۰۷۸، ۱۹۷۸ء میں دوبارہ برطانیہ جانا ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا مشہور آفاق مفت روزہ ”الہلال“ (جولائی ۱۹۱۲ء تا نومبر ۱۹۱۳ء) دیکھنے کو لوگ ترستے تھے اور ایک ایک شمارہ کی قیمت ہزار بتلاتے تھے۔ مولانا سید الحق صاحب صاحبزادہ حضرت مولانا عبدالحی اکوڑہ خٹک نے ”دارالعلوم دیوبند نمبر“ کی تقریب پر فرمایا کہ اب ”الہلال“ کو ہاتھ والو۔ اس کی تلاش شروع ہوئی مکمل فائل جناب ڈاکٹر شیر بہادر عینی کی معرفت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے مل گئی اور مولانا محمد اسحاق صاحب مدنی مباحث برائے اسلامک مشن برائے متحدہ امارات، دعویٰ جیسے عالم فاضل دوست سرمایہ کے ساتھ اس کی اشاعت میں مدد و معاون ہوئے۔ الحمد للہ مکمل فائل کا عکسی ایڈیشن شائع ہوا، اس کی تقریب رونما ۲۸ مئی ۱۹۸۳ء کو فلپیئر میں زیر صدارت مولانا اسحاق صاحب منعقد ہوئی جس میں مہمان خصوصی پاکستان کے وزیر دفاع میر علی صاحب تالپور تھے یہ بھی ایک منتخب اجتماع تھا، میر صاحب موصوف نے مختصر مگر تاریخی خطاب فرمایا، حضرت مولانا عبید اللہ انور، مولانا عابد الحسنی، مولانا سعید الرحمن علوی نے مقالات پڑھے اور لاہور کے تمام اخبارات نے نمایاں طور پر تقریب کی کارروائی کو شائع کیا۔ ہر انسان کی ذمگی میں کچھ دن ایسے آتے ہیں جو یادگار اور تاریخی ہوتے ہیں احقر کی ذمگی میں پہلا تاریخی دن وہ تھا جب میں نے ۱۸۷۵ء کی یاد میں مئی ۱۹۷۵ء میں میاں چنوں جلسہ کیا جس میں آغا شورش مرحوم نے خطاب کیا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا تاریخی دن علی الترتیب ”میں بڑے مسلمان“ کی اشاعت، دارالعلوم دیوبند نمبر کی تقریب اور الہلال کی تقریب تھی اور ہاں آغا شورش مرحوم کے ساتھ ”موت سے واپسی“ کراچی سے لاہور تک تاریخی سفر میں ساتھ رہا۔ ہر اہم شخص پر آغا صاحب کا جیسا استقبال ہوا اس کی نظیر ہر مغربی تاریخ میں شاید دو تین اور ہوں۔ احقر نے پورے سفر کی روایت ادا کلمہ بند کی جو ”خدام الدین“ اور ”چٹان“ میں شائع ہوئی۔

ذمگی کا ایک واقعہ چند عرصوں میں صدی جبری میں داخل ہوتا ہے گزشتہ صدی کے آخری سال دارالعلوم دیوبند کا صد سالہ جشن منایا گیا جس میں حاضری کی سعادت ہوئی اور ۱۹۷۴ء کے بعد پہلی دفعہ اٹھایا جانا ہوا اور جس دارالعلوم کے بانیوں، سرپرستوں اور اکابر کی کتاب دست کی اشاعت اور عشق ختمی مرتبت رسالہ کتاب ^{عظیم} میں ڈوبی ہوئی ذمگیوں کو دیکھ کر اپنی ذمگی کی شمع روشن کی تھی، اس دارالعلوم کو جیتے جاگتے جا کر دیکھا، ان دو بابا کو سلام کیا کہ جہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہوئی کہ

اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے

لاہور سے ایک ٹرین دیوبند ایکسپریس چلی جو تین دن وہاں رہی، عالم اسلام یا کسی تعلیمی ادارے کا دنیا میں شاید ہی اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے چوداسی بچاسی سال کی عمر میں اس تاریخی اجتماع کا اہتمام کیا اور ایک نشست سے خطاب بھی فرمایا، سبحان اللہ اپنے بچپن میں حضرت قاری صاحب کی جوانی میں جو تقریریں تھی اس ضعف و بیری میں بھی وحی حسن تقریر، سلاست ربط تھا، محترم آواز کی شیرینی اور لب و لہجہ کا وہی انداز تھا، اسی سفر میں ارد گرد کے تاریخی مقامات کی زیارت کی۔ حکیم لائق حضرت تھانوی کی تربیت، تھانہ بھون کو دیکھا اور دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یہ وہ جگہ ہے کہ جہاں جینے کر اس عظیم انسان نے عظیم انسانوں کی تربیت کی،

چھوٹے چھوٹے حجرے، چھوٹی سی مسجد اور کام اتنا کہ اس پر کئی تحقیق کا ہیں کھل سکتی ہیں۔ اپنے شیخ و مربی قطب الارشاد حضرت شاہ عبد القادر گیلانی خانقاہ رائے پور کو دیکھا، گنگوہ اور پیرانہ کلیر بھی حاضری ہوئی اپنی مرتبہ کتاب ”میں بڑے مسلمان“ کے اکثر اکابر کی ابدی آرام گاہوں پر حاضری کا اتفاق ہوا۔ دہلی میں جو خزانے مدفون ہیں وہاں حاضری ہوئی اپنے دور کی سب سے بڑی اسلامی و اصلاحی و تبلیغی تحریک کا مرکز نظام الدین دیکھا اور ان تمام اہل علم و فضل اور یورپینیشنوں کو سلام کیا کہ جن کے تعلق کہا گیا ہے۔

زنجبوت و تاج میں نے لکھو سپاہ میں ہے

جوابات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

گویا ”دلی دیکھی اور دلی والے دیکھے“ اور یہ یقین پختہ ہوا کہ خدمتِ دین اور خدمتِ انسانیت کو دوام ہے۔ سلاطین کے حرار اور قہور بھی ہیں اور اہل دل اور فقیروں کی بھی آرام گاہیں ہیں۔ ایک جگہ جا کر شاید دماغ جھکا ہو لیکن دوسری جگہ دل دو ماغ دلوں بھرد احرام جھکتے ہیں اور پھر سر اللہ کے آگے جھکا ہے کہ اللہ ”یہ تیرے پر اسرار بندے“ کیا تھے کہ ان کی تعلیمات آج بھی زندہ ہیں جو جو بندہ انسانوں کو آج بھی راہ ہدایت اور توحید و رسالت کا پتہ دیتی ہیں، بحرِ حال یہ سفر زندگی کا اہم ترین سفر تھا۔

حضرت شیخ مدنی اور حضرت شیخ الحدیث کے تقویٰ و طہارت، عشقِ ختمی مرتبت ﷺ اور کمالِ اتباع کے ساتھ ساتھ مجرودا کسار، تواضع و فروتنی خصوصاً مہمان نوازی، فیاضی اور سیرِ چشمی کے بہت واقعات سنے تھے، وہ تو ہمیں تھے البتہ دیوبند حضرت مدنی کے صاحبزادگان حضرت مولانا سید اسعد مدنی، مولانا سید ارشد مدنی اور سہارنپور مظاہر العلوم میں شیخ الحدیث کے کوا سے حضرت سید شاہد کی مہمان نوازی دیکھ کر محسوس ہوا کہ جب صاحبزادگان کا یہ حال ہے تو شیخین کا کیا عالم ہوگا۔

میرے سن شعور میں سب سے پہلے جن دو بزرگوں کا انتقال ہوا وہ حضرت تھانویؒ اور مولانا عبید اللہ سندھی تھے پھر پاکستان کے قیام بلکہ کچھ عرصہ بعد تک اکابر مشائخ و علماء کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، لیکن اس کے بعد جیسے تسبیح ٹوٹ گئی، کیے بعد دیگرے تمام لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے کہ جن کی مسیحائے نفسی سے ہندوستان میں اسلام کی فتح ہوئی شیخ روشن ہوئی، دین و سیاست کا میدان ہو یا علم و ادب کا، خانقاہیں ہوں یا مدارس ہر جگہ ”کدو“ خالی نظر آتے ہیں، وہ شخصیات جو مجمع البحرین تھیں سب جا چکیں، آخری دو قدآور شخصیتیں کہ جن سے بزم کی رونق تھی وہ ایک سال کے عرصے میں دارالافتاء کو سدھار گئیں میری مراد حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا صاحب اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے ہے، ان دو بزرگوں نے بانیانِ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کی زیارت کی اور ان کے انصاف و انوارِ طائفہ و جانشینان سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ حضرت شیخ الحدیث نے اپنی تعلیم کی فراغت کے بعد سے مظاہر العلوم کی ایسی خدمت کی کہ اس کا نام، کام اور شہرت دارالعلوم دیوبند کے بعد دوسرے نمبر پر ہے اور بعض مغرورانہ خصوصیات کی بناء پر اؤل نمبر پر جن کو اہل نظر جانتے ہیں اور آپ کی فضائل کی کتاب ”تلیق نصاب“ تو اتنی مقبول ہوئی ہے کہ اس وقت عالم اسلام میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں الہامی کتب کے بعد سب سے زیادہ شائع اور پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے بھی اپنی تعلیم کی فراغت کے بعد اپنی ساری زندگی دارالعلوم کی خدمت میں بتا دی۔ آپ کی ساتھ ساتھ تدریس اور اجتماع میں دارالعلوم نے انتہائی ترقی کی، تقسیم کے بعد اغیار میں بلا تقسیم تمام مسلمانوں کے رہنما تھے کہ جن کی استعداد و صلاحیت اور اصابت رائے پر تمام مکتبہ ہائے

فکر کو اتفاق تھا، مختلف اوقات میں اربعین مسلمانوں کے پر لاء کے لیے جو انجمنیں ہیں آپ ہی تقریباً ہر دفعہ اس کے صدر الصدور قرار پائے، اب جولائی ۱۹۸۳ء کو دیوبند میں وفات پائی، دہلی کے بعد ہندوستان کا دینی مرکز دیوبند رہا لہذا دہلی کے بعد علماء مشائخ اور اولیائے کرام کی ابدی آرام گاہوں کا سب سے بڑا مرکز بھی دیوبند ہی ہے۔ دہلی کا تو کیا کہنا اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے گٹھ آخر میں سب سے زیادہ اولیائے کرام نے دہلی کو رشد و ہدایت کا مرکز بنایا تو مباہلہ نہ ہوگا۔ اگر ان صالحین اور اہل اللہ کی صرف فہرست بتائی جائے جو دہلی میں مدفون ہیں تو اس کے لیے اس صفحہ جیسے کئی صفحات درکار ہوں گے۔ میرے دہلی میں قیام کی مجملہ اور اہم وجوہ کی ایک اہم وجہ مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر پر زعا کرنا تھا، تمام احباب جب موقع ملا ہوا تے لیکن میں وقتی یکسوئی کی تلاش میں رہا اور جب وہ میسر آئی تو مولانا کی قبر کے احاطے کا دور درازہ بند تھا جو احاس اوقات میں کھلتا ہے۔ آپ کی قبر جامع مسجد دہلی کے سامنے ہے، بقول شورش مرحوم، مولانا آزاد اور علامہ اقبال دونوں اس دور کے مبرق تھے، ایک کوشاں مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی اور دوسرے کوشاں مسجد دہلی کے سامنے..... ایک خاص راستہ ڈھونڈ اور حزار پر فاقہ خوانی کی۔

میرے حالات مشاہدات کا بڑا پ دھارتے چلے جا رہے ہیں جو کسی ضخیم کتاب کے متقاضی ہیں، انشاء اللہ جلد ہی اس کی باری آئے گی۔ خیال ہے کہ جو کچھ پڑھا، سنا، دیکھا اور سوچا اس کو قلمبند کر دیا جائے، شاید اس میں کوئی کام کی بات ایسی آجائے جو اوروں کے لیے مفید ہو۔ میری وقتی ساخت پر راحت میں اساتذہ، شیوخ، بڑے بھائی کی وقفا و قاعدہ نصائح حضرت والد صاحب کے خطوط، دعاؤں بہرہ قسم کے مطالعے کے علاوہ دو شخصیتوں کا ہاتھ ہے، پہلے ماسٹر عبداللطیف صاحب لوہو کو جو میرے گاؤں میں میرے پر انگری پاس کرنے کے بعد قیامت ہوئے لیکن ان کی نیکی اور مذہبی و سیاسی مطالعہ میرے بہت کام آیا، میاں چنوں آکر مولانا غلام حیدر صاحب سے تا قیام میاں چنوں استفادہ کرتا رہا، افسوس کہ سولہ سترہ سال پہلے اوکاڑہ میں مولانا غلام حیدر صاحب یکم اگست کو فوت ہو گئے اللہم اغفر لھما وارحمھما، دوست احباب، بزرگ رشید دار اور اساتذہ و شیوخ سبھی الحمد للہ اپنی اپنی جگہ مہربان اور کرم فرما رہے لیکن اپنا حال یہ ہے کہ پچاس سے اوپر عمر ہو چکی ہے لیکن اب تک اپنے پاس محض ہے نہ علم، عمل ہے نہ کوئی خوبی، جذبات و احساسات ضرور ہیں لیکن ان کو بروئے کار لانے کے لیے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا فقدان ہے البتہ اپنے زمانے کے جن لوگوں کو اسلام کا شیدائی و فدائی دیکھا ان سے محبت ضرور ہے اور اسی محبت کے ثقلیں اگر اللہ تعالیٰ کوئی کام لے لیں تو وسال ذالک علی اللہ بعزیز۔ چنانچہ اب کئی سالوں کی سوچ اور فکر کے بعد اپنے خدا پر اعتماد کرتے ہوئے ایک کثیر القاصد منصوبہ بنام ادارہ قاسم المعارف کا آغاز کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں کامیابی عطا فرمائے کہ فرمائے قیامت میں عجاں رسول ﷺ سے شرم ساری نہ ہو۔

استغفر اللہ واتوب الیہ الھو فی امری الھو واللہ وھو المستعان و علیہ التکلان

عبدالرشید ارشد

۲۱ ذوقعدہ ۱۴۰۴ھ / ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء

مرتب کتاب نے اپنے اجمالی حالات ۳۱، اگست ۱۹۸۳ء تک لکھے تھے، اس کے بعد کچھ دیگر اہم واقعات و حالات پیش آئے۔ ان دنوں جیسا کہ گزرا ایک کثیر القاصد منصوبہ بنام ادارہ قاسم المعارف سوچا اور اس کے اغراض و مقاصد اور مختصر قواعد و ضوابط کی کاپی بھی شائع کرائی، لیکن بوجہ یہ کام آگے نہ بڑھ سکا، ارقم دودھ برطانیہ جا چکا تھا اور سوچنا رہا تھا کہ یہاں کی نئی نسل کے لیے جو اردو، عربی پڑھنے کے قابل نہیں ان کے لیے کوئی بنیادی دینی کام کیا جائے اور وہ یہ ذہن میں آیا کہ ارکان اسلام میں سب سے پہلی شرط یا رکن کلمہ کے بعد اہم فریضہ نماز ہے لہذا مکمل نماز مع کلمات، ادویہ نماز جنازہ و قنوت اور ایمان مفصل و مجمل عربی، اردو مع انگریزی ترجمہ و تلفظ رومن رسم الخط (جیسے الحمد (ALHAMDU) میں خوبصورت چارٹس شائع کئے جائیں اور برطانیہ میں پھیلا دئے جائیں تاکہ گھروں دکانوں کی زیبائش اور برکت بھی ہو، اور بچے، آنے جانے والے اور مگر دانے لٹختے بیٹھے ان کو دیکھ کر نماز یاد اور صحیح کریں، پاکستان سے کویت گئے ہوئے تین حضرات الطاف احمد کیانی اور ان کے دو دوستوں نے آٹھ ہزار پونڈ سرمایہ فراہم کیا اور دو افراد پاکستانی کرنسی میں ۲۵ ہزار روپیہ کرایہ مہیا کیا، میں اپنے ایک عزیز دوست محمد حیات خاں کو لے کر برطانیہ گیا اور وہاں چودھری نیاز محمد آف آئیڈیل پرنٹرز و جیٹر میں اسلاک ایڈیٹی مانیٹر اور سلیم ایڈ کھنی کی ٹیکنیکل اور اخلاقی اعانت سے میں ہزار کی تعداد میں آرٹ کارڈ پر چار رنگ میں تین پرت میں کیلنڈر کی شکل میں نماز شائع کر کر لیمینیشن کر کر برطانیہ میں پھیلا دیئے۔ تاجر اور کاروباری حضرات نے لے کر مفت تقسیم کیے، اس کا سارا ثواب سرمایہ فراہم کرنے والوں، تعاون کرنے والوں اور تقسیم کرنے والوں کو جاتا ہے اس کے لیے کئی بار جانا پڑا۔

مئی ۱۹۹۴ء میں گلاسگو کی خوبصورت، پر شکوہ کشادہ جامع مسجد کے افتتاح کے موقعہ پر حرم کعبہ فیصلہ الشیخ عبداللہ بن سبیل حفظہ اللہ، رابطہ عالم اسلامی، جنرل سیکریٹری جناب عبداللہ نصیف صاحب اور تین چار اسلامی ملکوں کے سفیر حضرات بھی شریک تھے۔ "انجمن اتحاد المسلمین" نے قرارداد کے ذریعہ اپنے جنرل سیکریٹری حفیظ اسماعیل چوہدری کو اختیار دیا کہ برصغیر پاک و ہند سے بھی کسی کو بلایا جائے۔ قرعہ قال میرے نام پڑا اور فقیر نے بھی اس باوقار تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔

مجھے یہ دعوت یوں بھی ملی کہ میں نے ۱۹۷۲ء میں آکسفورڈ سٹریٹ والی مکانی مختصر مسجد میں کئی جتنے اور عید الفطر کی نماز ایک ہال میں پڑھائی جس میں زوردار اعزاز میں گلاسگو کے خوشحال مسلمانوں کو حوجہ کیا کہ غیر مسلم لوگوں کے ہال میں کہ جہاں تاج گانے ہوتے ہوں عید پڑھی جاتی ہے کیوں نہیں اپنی وسیع جامع مسجد تعمیر کر لیتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انجمن اس منہج پر سوچ رہی تھی..... دو تین سال بعد گلاسگو میں مہاجرین کے ایک مشہور تاجر چوہدری محمد طفیل شاہین نے اپنی زیر ملکیت ایک وسیع عمارت جس کے اوپر نیچے تین بہت کشادہ ہال اور نیچے تقریباً تینوں کے برابر پیچھے تک بہت کشادہ خانہ قاصد مسجد کے لیے دے دی۔ نچلے ہال میں نماز اور جمعہ، درمیانہ میں دفتر، دار

الطالعہ، امام و خطیب کی رہائش اور ادوار والے میں سامان رکھنے کا سٹور بنایا گیا..... اسی اثنا میں جدہ کے میٹر جو گلاسگو کے میٹر کے کلاس فیلو تھے، گلاسگو آئے اور جہر پڑھنے کے لیے اس عمارت میں آئے نماز کے بعد کہا کہ مسجد بنادو اور گلاسگو کے میٹر سے زمین کی بات کی، انہوں نے اس کی حامی بھری اور کہا کہ اگر مسجد ہماری خشاء کے مطابق خوبصورت بنائی جائے تو میں زیر تعمیر یا مجوزہ ہائیگورٹ کے بالقابل مسجد کے لیے پلاٹ دیتا ہوں اور یوں مسجد کے لیے خاصی کشادہ جگہ مل گئی۔ ہمارے سب کے خند دم و محترم حضرت مولانا عبدالعزیز مسلمانوٹی (والد ماجد برادران محترم حافظ شفیق احمد و مولانا حافظ مقبول احمد جو ہاں علی الترتیب امام و خطیب تھے) نے اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور یوں یہ مسجد جو یورپ کی خوبصورت مساجد میں سے ایک ہے تقریباً تین ملین پونڈ میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد میں پہلی نماز عید الاضحیٰ پر خطبہ دینے کی سعادت بھی مجھے حاصل ہوئی..... اس طرح کی اسلامی طرز تعمیر کے مطابق چھوٹی بڑی تقریبات میں مساجد برطانیہ میں بن چکی ہیں (جو سماجدرگنوں، مکانات اور دکانوں میں بنائی گئی ہیں ان سب کی تعداد پورے برطانیہ میں تقریباً آٹھ صد ہوگی) کاش ان سے ”الدین الاسلام“ کا صحیح تبلیغی، اشاعتی کام لیا جاسکے..... اس سے ایک سال پہلے مولانا حافظ مقبول احمد، چوہدری محمد طفیل شاین اور حاجی غلام محمد صادق عظیم اللہ اسی مسجد کے زیر تعاون کے لیے مکہ معظمہ حاضر ہوئے، میں بھی عمرہ کے لیے ساتھ حاضر ہوا اور امام حرم کے دفتر کو دیکھا کہ جو کسی وفاقی سیکرٹری کے دفتر یا اس سے بھی زیادہ پر شکوہ تھا، امام صاحب کے گمراہ ایک پر تکلف دعوت بھی کھائی، ایک دفعہ مانچسٹر میں حضرت الامام کی تقریر کا وقت صحیح کرایا..... کہ بعض لوگوں نے موسم گرما میں ظہر کے بعد رکھ دیا تھا، جب کہ یہ دن کاروباری تھا۔ میں نے منتظرین سے کہہ کر بعد از مغرب کرایا، جامع مسجد کچا صحیح بھر گئی، امام صاحب نے نماز پڑھائی اور عشا تک بیان فرمایا، اس تقریب کے منتظم میاں چنوں والے چوہدری قمر الدین صدر انجمن تھے۔

۱۹۸۴ء ہی میں عزیمت شاہد انور اور حافظ عبدالرحمن، ریاض سے برطانیہ آئے، ان کے ساتھ طے تھا کہ امریکہ، کینیڈا چلیں گے، ان کو پہلے لندن، گلاسگو اور ایڈنبرا کے تاریخی مقامات دکھائے، اس کے بعد تینوں امریکہ، نیویارک سے اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر حبیب اللہ بھٹہ کے پاس لائزل (میری لینڈ) گئے، وہاں سے فلوریڈا کے شہر لمپورن سے کار کرایہ پر لے کر کیلی فورنیا تک گئے اور آئے، نیویارک، ہوسٹن دیکھنے کے بعد لندن آؤ تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کراچی سے فیصل آباد آ گئے۔ (انشاء اللہ تفصیل ”حیات مستعار“ میں آئے گی) دو دفعہ قاہرہ میں اہرام مسجد دیکھا، لیکن اب حسن میں جدہ کا کوئی مقابلہ نہیں اور جو عظمت و وقار اور شکوہ مسجد نبوی، مسجد حرام میں بقول مستاز مفتی ”کالے کوٹھے“ خانہ کعبہ کی ہے وہ ہر مسلمان کے نزدیک دنیا کی ہر عمارت سے تو زیادہ ہے ہی، لیکن کوئی غیر مسلم بھی دیکھے (گواس کا وہاں جانا منع ہے) تو اس کو بھی یہی نظر آئے، کیوں نہ ہو یہ گمراہ فرمان قرآن پاک ”جعل اللہ الکعبة البیت الحرام قیمتا للناس“ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو بزرگی والا گھر ہے ”ناس“ یعنی دنیا کے قیام کا باعث بنایا ہے۔ جس دن یہ نہ ہوگا دنیا ختم ہو جائے گی، بارشاد قرآن پاک ہی دنیا کا پہلا گھر بھی یہی ہے۔ ان اول بیت وضع للناس للذی ببکے“ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ ہے جو ”بکے“ کہ

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ مگر خدا کا

ہم اس کے پاسباں ہوں نہ ہوں وہ ساری دنیا کا پاسباں یعنی قیام کا باعث ہے۔

الحسنی اکرم ﷺ اپنے اللہ کی جانب سے تفویض کردہ کام پورے کر کے کم و بیش سوالا کہ جو ہم دایت (صحابہ کرام) چھوڑ کر اپنے اللہ سے جا ملے۔ داعیہ پیدا ہوا کہ میں ہر چند عرض دو تائی سے بالکل بے بہرہ ہوں لیکن اس واقعے پر چودہ صدیس گزرنے پر بھی اکرم ﷺ کی شان میں کبھی منکوم نعمتوں کا ایک جامع منفرد اور خوبصورت ترین انتخاب شائع کیا جائے، مجھ دعائیٰ ۱۳۸۰ صفحات پر دو جلدوں میں آرت بجبر پر چار رنگ میں عربی، فارسی، اردو اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کا جامع انتخاب تین سال کی شب و روز کی محنت سے بارگاہ رسالتاب ﷺ کی نذر کیا، اور اس کا انتساب اپنے وقت کے مجدد اعظم شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ اور ان کے دو شاگردوں حضرت مفتی فقیر اللہ رائے پوریؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم مگرانویؒ اور اپنے والد مرحوم کی طرف کیا اس لیے کہ حقیر کو اپنے والد مرحوم کی پدرانہ شفقت سے شیخ الہندؒ کے ان دو شاگردوں کی صحبت سے مشق و حسب محمد ﷺ کا ذرا نور نصیب ہوا اور یہ سعادت ان کو اپنے استاذ سے نخل ہوئی تھی۔ الحمد للہ بطور تحریف نعت عرض ہے کہ ایسا جامع وغیر صورت ”نعت فخر“ آج تک تو شائع نہیں ہوا، آئندہ کا علم اللہ کو ہے۔

میرزا ذبیح نے اپنے مفصل تبصرہ میں ”نواعت وقت“ میں لکھا:

انتخابات چھپ چکے ہیں وہ دریا ہیں اور یہ نمبر اپنی ضخامت، اپنی جامعیت اور اپنے صوری محاسن کے اعتبار سے

ایک ٹھاقمیں مارتا سمندر ہے“

برطانیہ گزشتہ سال بھی جانا ہوا۔ لندن انٹرنیٹ پر آفس دو تین دفعہ جانا ہوا، اور حضرت خواجہ کیہ دورانیہ تحریر مرثیہ "الاستطاعہ" کے مخطوط (جو تین جلدوں میں ہے) کی دو جلد کی (تیسری اس وقت موجود نہ تھی) انگریزوں کو ملی، یہ حضرت سید شمس الحسنی نے علی کی فرمائش تھی کہ حضرت خواجہ، سید صاحب کے چہاں ہوں۔ گزشتہ ایک سفر کا حاصل کیہ کراچی کی یونیورسٹی کا ایک جلسہ تھا جس کی تفصیل مستقل لکھوں گا۔

ان دنوں ”میں بڑے مسلمان“ میں کئے ہوئے وعدے کے ایفاء کے لیے ”میں مردان حق“ کی ترتیب میں مشغول ہوں اور ساتھ ہی ”حیات مستعار“ اپنے محسوسات، مسوعات اور واردات کو ترتیب دے رہا ہوں، جو تجویزیں شائع ہو چکی ہیں ان کو ”واردات و مشاہدات کے نام سے ان شاء اللہ جلد ہی لا رہا ہوں اور ابھی ”ادارہ قاسم الحارثی“ کا منصوبہ زوجین سے نہیں نکلا..... رمضان المبارک کی مبارک

ساعات میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کو مکمل کرنے کی توفیق دے اور ادارے کے آغاز کی توفیق رفیع عطا فرمائے اور ہمیشہ کی طرح آسانیاں بہا فرمائے۔ وما ذلک علی اللہ بھزیز۔

عبدالرشید ارشد

۱۸/رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ - ۸/فروری ۱۹۹۶ء

الحمد للہ "میں بڑے مسلمان" میں کیا ہوا عہد پورا ہوا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مزید میں خدام کتاب و سنت کا تذکرہ "میں مردان حق" کے نام سے دو جلد میں شائع کر قریب الاقترام ہے اور "الرشید" کے دو حریہ نمبر "تبلیغی جماعت کی دینی جدوجہد" اور "حکیم محمد سعید شہید" ایک نئی سال (۱۹۹۸ء) میں شائع ہوئے..... حریہ برآں خدام کتاب و سنت کا ایک مزید تذکرہ اور کئی دوسرے قابل عمل کام ذہن میں ہیں۔ قارئین سے دعا کی استدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بصحت و فراغت ان کو بروئے کار لانے کی توفیق عطا فرمائے۔

عبدالرشید ارشد

۱۹/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ - ۶/مئی ۱۹۹۹ء

دیوبند

شاد باں و شادی اے سر زمین دیوبند
بلبل بیضا کی بھرت کو لگائے چار چاند
اس تیرا ہاسٹے، ضرب تیری بے پناہ
تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے بنار
تو علم بردار حق ہے، حق نگہبان ہے ترا
ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
جان کر دیں گے جو ناموس جیبر پر فدا
کھر ناچا جن کے آگے بار ہا جگتی کا ناچ
اس میں قاسم ہوں کہ انور شہ کہ محمود الحسن

ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
حکیم بھٹا کی قیمت کو کیا تو نے دوچند
دیوبند استبداد کی گردن ہے اور تیری کند
قرن اول کی خبر لائی جری الٹی زندقہ
نخلی باطل سے بچنے نکلا نہیں تجھ کو گزرد
کر لیا اُن عالمیان دین قسم نے پسند
حق کے راستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند
جس طرح جلتے آگے پر قوس کرتا ہے پسند
سب کے دل تھے درد مند اور سب کی فطرت اربند

گرمی ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج

جن سے پرچم ہے روایات سلف کا سر بلند

علامہ خالد محمود

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، بریٹن

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

بآں گروہ کہ از ساغر وفا مستند

سلام ما برسانید ہر گجا ہستند

جس قوم کا تہذیبی ورثہ لٹ جائے اور حال ماضی سے کٹ جائے وہ قوم کو نام سے باقی رہے مگر حقیقت میں اس کی بقیہیں خاموش ہوتی ہیں، وہ کسی دوسری قوم کے قالب میں جلوہ گر ہو تو یہ زندگی کی علامت نہیں اپنی اصل کے لحاظ سے موت کی آغوش میں ہے۔

اسلام اگر ایک زندہ مذہب ہے تو تاریخ اسلام کے ہر دور میں اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ زندگی تسلسل کے بغیر زندگی نہیں اور اس کے تمام دور آپس میں زنجیری کی کڑیوں کی طرح مربوط و منظم ہونے چاہئیں۔ اسلام تاریخ کے مختلف دوروں میں خواہ کسی پیمانے میں رہا اور ناسازگار حالات میں سے اسے کیسے ہی کیوں نہ گزرنا پڑا، اسلام کی شاہراہ حیات ہر دور میں موجود رہی اور اس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا کہ اس کی اساسی حیثیت کھینچ لی گئی ہو اور آئندہ پھر نئے سرے سے طلوع اسلام ہو۔

دین کی قایت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی تعمیل ہے۔ وہی ذات واجب الوجود اس شاہراہ مسلسل کی آخری منزل ہے۔ سب پیغمبر اسی ایک کی طرف دعوت دیتے رہے اور اسی کی تلاش ہر دینی کاوش کا منہمک رہی۔ جس نے اسے پالیا اس نے سب کچھ پالیا، اسی کی طرف لوٹا نجات اور اس سے ٹوٹنا اشتقاق و اضطراب کی آگ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے من البصاری الی اللہ کہہ کر بتلایا کہ میں خدا کی طرف بلانے والا ہوں تو حضور خاتم النبیین ﷺ نے بھی اپنی منزل کی نشاندہی فرمائی اور اللہ کی طرف بلانا اپنا رستہ بتلایا: قُلْ هَذِهِ سَبِيلِيْ اَدْعُوْكُمْ اِلَى اللّٰهِ عَلَى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَّمِنَ التَّابِعِيْنَ

یہ شاہراہ مسلسل اسی ذات واحد سے چلتی اور اسی کی طرف لپکتی ہے، تمام پیغمبرانہ دعوت کا اجماعی نقطہ وہی ایک ذات ہے جہاں تمام دینی محنتیں منطقی اور سب مذہبی کاوشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہی منزل حقیقی ہے جو اسے پالنے، بھراس کا انتقال بھی وصال ہو جاتا ہے۔

پیغمبروں کے بعد پیغمبروں پر ایمان لانے والے اسی شاہراہ کے داعی رہے اور ان کی پیروی اس شاہراہ سے ملانے والی نیکی کی راہ تھی؛ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اَسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهِيْمَ وَآلِہٖٖمَ وَآلِہٖٖمَ عَلَیہِ السَّلَامُ (پ ۲۸: امتحان) بے شک تم لوگوں کے لیے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان کے ساتھیوں میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔

جو لوگ ایمان لا کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہوتے گئے، سب نے اپنے اپنے وقت میں لوگوں کو اسی ایک منزل کی دعوت دی تھی۔ جس راہ وہ چلے تھے، وہ آئندہ لوگوں کے لیے نشان راہ ہو گئی، فرعون کے سامنے ایک مومن نے یہی کہا تھا کہ اب میری پیروی میں

نبی کی راہ ہے: **وقال الذی امن یقوم اتبعون اهدکم سبیل الرشاد** (پ ۲۳ المؤمن ع ۵) اور کہا اس ایماندار نے کہا اے قوم: میری راہ پر چلو، میں تم کو پہنچا دوں گا نیکی کی راہ پر۔ آنحضرت ﷺ کے بعد اس شاہراہ کے داعی صحابہ کرام تھے، وہ اپنے اپنے دائرہ عمل رسول خدا کے بندوں کو اس شاہراہ کی دعوت دیتے رہے اور آئندہ آنے والے لوگ ان ہی سے اس شاہراہ کا نشان لیتے رہے۔ یہ نجوم ہدایت اس راہ میں چلنے والوں کی روشنی اور حضور رحمۃ اللعالمین ﷺ کے مشن کی عالمی رحمت تھے ان کا اختلاف بھی رحمت تھا، جس سے زندگی کے ہر خاکے میں رنگ آتا تھا زندگی کا ہر گوشہ عمل کی راہ پاتا اور زندگی ہر تعبیر میں حضور خاتم النبیین ﷺ کی تعلیم سے بہرہ ور ہوتی۔ جس طرح خدا کی طرف بلا تا تمام پیغمبروں کا اجتماعی نقطہ تھا، سب امت کو حضور ﷺ کے نقش قدم پر لانا تمام اصحاب رسول ﷺ کا اجتماعی نقطہ رہا اور اصحاب رسول ﷺ کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ آئندہ آنے والے لوگ ان کے نقش قدم پر چل کر اس شاہراہ سے مسلسل ہوں، جو انبیاء کی میزاث ہے۔ ان کی دعا رہی کہ اسلام کا ہر قافلہ اپنے بعد آنیوالوں (successors) کی پیروی سے اپنے پہلوں (pioneers) کے ساتھ مسلسل رہے قرآن کریم میں اللہ کے بندوں کی یہ دعا مذکور ہے۔

واجعلنا للمتقین اماما (پ ۱۹، الفرقان ع ۶) ترجمہ: اے اللہ ہم کو پیغمبر گاروں کا پیشوا بنادے یعنی ایسا بنادے کہ لوگ ہماری پیروی کر کے تقی بن جایا کریں۔ حضرت امام بخاری (۲۵۶ھ) اس دعا کا یہ معنی تحریر فرمایا ہے: **المتقین نقصدی بمن قبلنا ویقتدی بنا من بعدنا** (صحیح بخاری) جلد ۹، ص ۱۱۳، ترجمہ: ”اے اللہ ہمیں ایسے پیشوا بنانا کہ ہم تو اپنے پہلے ائمہ کرام کی پیروی کریں اور ہمارے بعد آنیوالے ہماری پیروی کریں اور ہمارے ساتھ مسلسل ہوں۔“

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ (۳۶ھ) کو خطاب کر کے بڑی بیخبرانی فرمائی، انکم ایہا الرہط الغنہ یقتدی بکم الناس (موطا امام مالک ص ۱۳۲ کتاب الحج) ترجمہ: (اے اصحاب رسول ﷺ) بیشک تم لوگوں کے امام ہو لوگ تمہاری پیروی کریں گے، پس تمہیں بڑا احتیاط رہنا چاہیے اور ہر اس بات سے بچنا چاہیے جو اپنے آقا ﷺ کے طریقے کی نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے اپنی اس نصیحت میں پیروی کر نیوالوں کے پیروی کرنے پر کوئی تنقید نہیں کی، جن کی پیروی ان کی راہ ہوگی، انہیں ہی اپنے باقی طریقے کے التزام کی تاکید کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، تمام صحابہؓ کو آسان ہدایت کے ستارے جانتے تھے کہ جو ان میں سے کسی کی پیروی کرے، ہدایت پا جائے وہ لوگوں کو اس شاہراہ پر لانا اور اسی پر چھوڑنا چاہتے تھے، جو اپنے باجد اور باقیل سے مسلسل ہو، اللہ کی رسی کا ہر جزو اپنے باقیل اور باجد سے تو متصل ہو، لیکن دائیں بائیں کسی طرف سے مربوط نہ ہو۔

حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ (۹۳ھ) کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ (آخری حج میں) جب مٹی سے واپس ہوئے، تو رستے میں وادی بطح میں ٹھہرے، زمین پر چادر بچھائی، اس پر بیٹھے اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا: **اللھم کبروت منی و ضعفت قوتی و انتشرت رعیتی فاقبضنی الیک غیر مضیع ولا مفروط** اے اللہ میں بڑھا ہوا چکا ہوں، قویٰ کمزور ہو گئے ہیں اور میری رعیت بہت دور تک پھیل چکی ہے اب تو مجھے اپنی طرف بلا لے کہ میں بغیر کسی زیادتی اور کسی کے تیرے ہاں حاضر ہو جاؤں، پھر آپؐ مدینہ تشریف لائے اور خلیفہ ارشاد فرمایا اور ایک ہاتھ دوسرے پر راتے ہوئے کہا: **ایہا الناس قد سنت لکم السنن و فرضت لکم الفرائض و توکم علی الواضحة الا ان تصلوا بالناس یعنیوا شمعالا** وضرب باحزی یدیدہ علی لاحذی و

موظا امام مالک، ص ۳۳۹ کتاب الحدود (۱) لوگوں کو تمہاری راہیں متعین ہو چکی ہیں اور تمہاری ذمہ داریاں طے ہیں، تم ایک شاہراہ پر چھوڑے گئے ہو، دیکھا دیکھیں یا میں طرف دیکھ کر (دوسری قوموں کے متوازی نظریات سے اثرات لے کر) گمراہ نہ ہو جانا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے آقا حضور خاتم النبیین ﷺ اور اپنے پیٹر و حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جو شاہراہ پائی تھی، جس پر آپ خود بھی چلتے رہے اور دوسروں کو بھی چلاتے رہے، اب آپ اسی شاہراہ میں سلامتی کی راہ بتلا رہے ہیں اور متحدہ فرما رہے ہیں کہ عصری تحریکات سے متاثر ہو کر اپنی شاہراہ کو چھوڑ دینا اس میں ترمیم کرنا گمراہی کی راہ ہے، سلامتی انہی کی ہے جو اس شاہراہ مسلسل میں چلیں اور زندگی کے خاکے میں اسلاف کی اتباع کا رنگ بھریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ۳۲ھ نے شاہراہ اسلام کے پہلے قافلے سے محفل رہنے کی یوں تلقین فرمائی۔ من كان مستعنا فليستن بمن قد مات فان الحي لا تؤمن عليه الفتنة اولئك اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا الفضل هذه الامة ابرها قلوباً واعمقها علماً و اقلها تكلفاً اختارهم الله نصبة لبيته و لاقامه دينه فاعرفو الهيم فضلهم و اتبعوهم على اثرهم و تمسكو بما استطعتم من اخلاقهم و سيرهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم (مشکوٰۃ شریف) ترجمہ: جس کو کسی لائن پر چلنا ہو اسے چاہئے کہ ان لوگوں کی لائن پر چلے جو اسے دینا سے جانچے کیونکہ زندگیوں پر ابھی آزمائش ختم نہیں ہوئیں، وہ جانے والے جن کی لائن پر چلنا ہوگا حضور اکرم ﷺ کے صحابہ کرامؓ ہیں یہ طبقہ امت اسلامی کا بہترین طبقہ تھا، ان کے دل بہت نیک تھے اور ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا، ان میں بناوٹ نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پیغمبر کی صحبت کے لیے اور دین کی اقامت کے لیے چنا ہوا تھا، ان کی فضیلت پہچانو، ان کی شاہراہ پر چلو، جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق اور ان کے طریقوں کی پیروی کرو، یہ شک و دوسیم کی راہ پر تھے (شیخ المصنف جلد ۱ ص ۲۳۷) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد تابعین کو نصیحت کرتے ہوئے تھا کہ وہ صحابہؓ کی پیروی کرتے ہوئے ہدایت کی راہ پر چلیں۔ فقہ لامت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد مصلح ایک اتفاقی نصیحت نہ تھی وہ امت کو آئندہ اٹھنے والے وقتوں میں حق کی راہ بتا رہے تھے۔

محول کر آئیں سرے آئینہ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

بزرگان دین کا نور بصیرت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو مذکورہ سرس پر درس دیتے تھے، امام ابوحنیفہؒ (۱۵۰ھ) اپنے وقت میں اسی سند علی کے وارث تھے۔ ان دنوں تین بنی اسلامی دنیا کے علمی مرکز تھے حجاز جہاں امام مالکؒ ۱۷۹ھ رونق افروز تھے، شام: جہاں امام اوزاعی (۱۵۷ھ) حدیث و فقہ کا مرجع تھے اور عراق: جہاں کی مسند علی امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے آباد تھی۔

علم الہی میں یہ بات موجود تھی کہ دین میں اٹھنے والے علمی فتنے زیادہ تر عراق سے اٹھیں گے۔ اعتزال اور انکار قدرت کی تحریکیں یہیں سے سر اٹھائیں گی۔ شیعیت کا مرکز بھی یہی زمین ہوگی، ظاہر ہے کہ ان تمام فتنوں میں سلامتی کی راہ صحابہ کرامؓ کے نقش قدم کی پیروی اور

انہیں معیارِ حق تسلیم کرنا تھا اور وہی حضور ﷺ کے بعد دنیائے اسلام کے نجومِ بدانت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کوفہ کی مسندِ رئیس کے پہلے معلمِ حضور ﷺ کے سفرِ حضر کے ساتھی اور خلفائے راشدین کے بعد افضل الاصحاب سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے دل میں ڈال دی اور آپ نے تابعین کو صحابہ کرامؓ کی پیروی کی راہ بتلائی اسے ہی سلاستی کی راہ سمجھا اور آپ نے مذکور القدر اصول بیان کر کے آئندہ اٹھنے والے تمام فتنوں کا اصولی سد باب کر دیا، بزرگانِ دین کی فراست کی عجیب شان ہے وہ اللہ کے نور سے دیکھتے ہیں۔

جایزایا شام کی علی درنگا ہوں کی ان اعتقادی اور علمی فتنوں سے براہِ راست گزرنے لگی، یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ صحابہؓ کی بات کو کج فتنہ قرار دینے میں وہ حدت نہیں کرتے، جو درنگا کوفہ کے امام ابوحنیفہؒ نے اختیار کی اور دیگر کسی درنگاہ میں عقائد اسلامی کا اصولی تجزیہ نہیں کیا گیا، جو امام ابوحنیفہؒ نے فقہ اکبر میں کیا ہے۔ حدیث و فقہ کے ساتھ کلامی مسائل میں یہ اہتمام اور ان میں اصول سنت کا پورا تحفظ حضرت امام کا وہ عظیم موقف ہے، جو رہتی دنیا تک ہر الحادی تحریک کے سامنے اسلام کا مضبوط قلعہ بنارہے گا حضرت امام مجھ چکے تھے کہ علی فتنوں کی ان تیز و تند اندیشوں میں سلاستی کی یہی اک راہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نقش قدم کی پوری پابندی کی جائے اور اسلام کی شاہراہ مسلسل کو لازم پکڑا جائے۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ہندوستان میں اٹھنے والے خطرناک دینی فتنوں سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ نے یہاں کے مسلمانوں میں امام ابوحنیفہؒ سے گہری دینی عقیدت پیدا کر دی تھی۔

اگرچہ اربعہ میں دوسرے امام خلیفہ ابن الحادی فتنوں سے واسطہ پڑا، حضرت امام احمد بن حنبلؒ (۲۴۱ھ) تھے، آپ فقہ میں زیادہ تر اہل حجاز کے ہم نوا تھے مگر آپ نے جب مسئلہ خلقِ قرآن میں مخزنہ کے فتنوں کو قریب سے دیکھا، تو آپ بھی صحابہؓ سے تمسک کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کے ہم نوا ہو گئے۔

حافظ ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) لکھتے ہیں: جعل للمصاحبة في ذلك مالم يجعل لغيرهم و اظنه مال الى ظاهر حديث اصحابي كالنجوم والله اعلم والي نحو هذا كان احمد بن حنبل يذهب (جامع بيان العلم جلد ۲ ص ۱۰۱) ترجمہ: امام ابوحنیفہؒ نے اجتماع حق میں صحابہؓ کا وہ درجہ ٹھہرایا ہے جو صحابہؓ کے علاوہ اور کسی طبقہ کے لیے نہیں، میرا خیال ہے کہ آپ حدیث اصحابی کا نجوم کے ظاہر پر مطمئن تھے اور یہی مذہب امام احمد بن حنبلؒ کا تھا، محمد بن عبدالرحمن العمریؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ جب صحابہ کرامؓ کسی مسئلے میں مختلف ہوں تو اس میں غور و فکر کرنا کہ حق پر کون ہے تاکہ اس کی پیروی کی جائے، کیا جائز ہے؟ امام احمدؒ نے فرمایا: ”نہیں“ یجوز النظر بين اصحاب رسول صلى الله عليه وسلم (جلد ۲ ص ۱۰۲) میں نے پوچھا: اس کی کیا وجہ؟ تو آپ نے فرمایا: تقلد ايهم احببت تاکہ ان میں سے جس کی چاہی پیروی کر سکو۔

حنبلی مسلک کے مقتدر امام حدیث ابوداؤد سجستانی (۲۷۵ھ) لکھتے ہیں کہ اگر کسی مسئلے میں حضور ﷺ سے دو مختلف روایتیں نقل ہوں تو صحابہ کرامؓ کا مکمل فیصلہ کر کے گا کہ ان روایات میں سنت باقیہ کیا ہے: النظر الى ما عمل به اصحابه سنن ابی داؤد۔

(ص ۱۱۶) باب المروء بين يدي المصلي.

یہ اسلام کی علمی میراث اور اس کا تہذیبی ورثہ ہے، جو حضور ﷺ سے صحابہؓ کو اور صحابہؓ سے تابعین اور ائمہ مجتہدین کو پہنچا۔ اسلام

کی شاہراہ مسلسل جو خمیر القرون قوی ثم اللہین یلوہم ثم اللہین یلوہم کی بشارت نبوی صحابہ و تابعین سے مسلسل چلی آ رہی تھی، امام ابوحنیفہؒ نے اس پر پھر دیا، امام احمد نے تاکید کی، اس سے حمک دین مسلسل سے وابستگی ہے اور یہی دین قیم اور ایک زندہ مذہب ہے..... اسلام کی چودہ صدیوں میں ہر صدی میں کچھ ایسے لوگ ابھرتے رہے، جنہوں نے اسلام کے اصول و عقائد اور اساس اعمال کو ہر قیمت پر زندہ رکھا اور اس کی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں آیا، جب قرآن کی تعبیر اور اسلام کی تعبیر قرآنِ حریف کی نذر ہو چکی ہوں، ورنہ اسلام ایک زندہ مذہب نہ رہتا، پھر یہ ایک مجموعہ ساتیر ہے زندگی کا تسلسل نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ایسے افراد پیدا کئے جن کی زندگی اظہار حق اور ابطال باطل کے لیے وقف رہی، نامساعد حالات اور الجاد کی لہریں انہیں ایک انج بھی شاہراہ عظیم سے نہ ہٹا سکیں۔ یہ پاک شخصیتیں گولی الاغراض مضمون نہیں، مگر ان کا مجموعی موقف ضرور معصوم رہا ہے۔ یہی اسباب کی وہ دنیا ہے جس کے ذریعے دین کی ابدی حفاظت ہوئی اور رب العزت کا یہ وعدہ پورا ہوا آیا۔ انا لھن نزلنا الذکر وانا لھ لحافظون (پ ۱۴، سورہ الحج) (بے شک ہم نے ہی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرتے والے ہیں) قرآن کریم عظیم و وحی کے مجموعہ کا نام ہے، جہاں الفاظ کا یہ نظم نہیں، وہ قرآن نہیں، یہی وجہ ہے کہ محض ترجمہ قرآن کو قرآن نہیں کہہ سکتے، کیونکہ وہاں الفاظ کی وہ نشست اور ترتیب نہیں رہی اسی طرح اگر معانی کی تعبیر غلط ہو تو بھی قرآن محفوظ نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ قرآن کی صحیح مرادات بتانے والا طبقہ ہر دور میں موجود رہا پس قرآن کی وہی تعبیر صحیح ہوگی، جس کا حال اس کے ماضی سے منقطع نہ ہو اور ہم صرف اسی تعبیر کو اختیار کر سکتے ہیں، جو اسلام کے اسنادی پہلو سے کہیں نہ ٹکرائے اسلام کے تسلسل حیات اور حفظ دین کی خصوصیت اس کا اسنادی پہلو ہے اور تاریخ کے ہر موڑ پر اسے تھامے رہنا اسلام کا ایک معجزہ ہے، اسباب کی دنیا میں اس کا باعث وہ علما نے ربانی رہے ہیں، جو آج سے لے کر نبی کریم ﷺ تک زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہیں..... یہ صحیح ہے کہ صحابہ کے بعد کوئی طبقہ بحیثیت طبقہ کے مقدس نہیں کہ پورے طبقے کو پاک باطن اور بلا استثناء عدل کہا جائے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس امت کا کوئی قرن مصلحوں، ہادیوں مجتہدوں اور مقتدین سے خالی نہیں رہا اور ائمہ علوم، ائمہ ہدایت اور ائمہ کمالات ظاہر و باطن کی کسی دور میں غمی نہیں ہوئی، ان واران نبوت میں کوئی طبقہ نسبت ایمان و احسان کا محافظ رہا، کوئی نسبت احسان و عرفان کا، کوئی الفاظ قرآن کا اور کوئی سنت صاحب قرآن کا اور یہ سب طبقے اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ تا قیامت باقی رہیں گے، یہی اسلام کی زندگی ہے اور یہی اسلام کا تسلسل ہے

قرآن کریم کی ابدی حفاظت کا دائرہ الفاظ کتاب اور مطالب کتاب ہر دو کو محیط ہے، جس طرح اس کے نقوش کتابیہ پر تحریف لفظی سے محفوظ ہیں، اس کے معانی و مطالب بھی پر تحریف معنوی سے معصوم ہیں، الفاظ اور معانی و مطالب دونوں کی حفاظت ہوتی چلی آئی ہے۔ قرآن کریم کی اس ابدی حفاظت کا خود رب العزت نے تکفل فرمایا اور اس کے لیے جو اسباب پیدا کئے، وہ امت کے اہل حق کے ذریعے اس کے طرق حفاظت ہیں۔ جب بھی اسلام کے خلاف کفر و الجاد کی آندھی چلی، رب العزت نے اس اہمت کے بہترین نفوس اس کے مقابلے میں کھڑے کر دیئے۔ ہر بزرگ نے اپنے مناسب حال کسی نہ کسی سوچے کو سنبھالا اور ایسے بڑے مسلمانوں کا ایک قافلہ ہر دور میں باطل سے نبرد آزما رہا ہے، ان افراد کا کسی جزئی مسئلے میں کوئی اختلاف ہو تو ہو، لیکن ان کی مجموعی کوششیں ہمیشہ معصوم رہی ہیں، یہ ضرور خاتم المرسلین ﷺ کا معجزہ ہے کہ آپ ﷺ کا دین تاریخ کے ہر دور میں زندہ ہے، دسویں صدی ہجری کے مشہور فاضل علامہ حسن شرنبلالی

(صاحب نور الایضاح) اپنے رسالہ ”الحمد للقدیر“ میں لکھتے ہیں: امرنا بحفظ النظم والمعنی جمیعاً فانہ دلالة علی النبوة (ص ۳۱) ہم لوگ قرآن پاک کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت پر مامور ہیں اور یہی نبوت کا معجزہ ہے۔
ابراہیم بن عبدالرحمن القدیری کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله یفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین و تاویل الجاهلین (کتاب المدخل) ترجمہ: اس علم کو ہر صحیح جانشین سے آگے ثقہ لوگ لیتے رہیں گے، وہ اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف، جھوٹوں کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویل کو ہمیشہ دور کرتے رہیں گے۔
حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

ان منکم من یقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیله (بے شک تم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے، جو قرآنی مرادات کے لیے بھی اسی طرح جہاد کریں گے، جیسے تمہیں قرآن پر میں جہاد کرتا رہا ہوں) (ادکامال، رواہ احمد و الطحاوی) اس روایت میں الفاظ قرآن کی طرح مرادات قرآن کے تحفظ کی بھی خبر دی گئی ہے کہ امت کے ذریعے قرآن پاک کی ہر لفظی اور معنوی تحریف سے پوری طرح حفاظت رہے گی، حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ، آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں
لن یسرح هذا الذین قاتلوا یقاتل علیہ عصا بہ من المسلمین حتی تقوم الساعة ”یہ دین برابر قائم رہے گا اور اس کے لیے مسلمانوں کا ایک طبقہ برابر لڑتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے“
حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے منبر پر غلبہ دیتے ہوئے یہ حدیث روایت کی:

سمعت رسول الله صلی لله علیہ وسلم یقول لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لا یضوئهم من غلہ لهم او یخالفهم حتی یاتی امر الله وهم ظاہرون علی الناس (صحیح مسلم ص ۱۴۳ ج ۲) میری امت کا ایک طبقہ امر الہی پر برابر قائم رہے گا، جو انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کریں گے یا ان کی مخالفت کریں گے، وہ انہیں کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے اور وہ طبقہ لوگوں پر ظاہر رہے گا)

فطرت سلیمہ کے خلاف چلنے اور حق سے ٹکرانے والے اگر قیامت تک رہیں گے تو ایسے مسلمانوں کا بھی ایک طبقہ ضرور رہے گا جو اپنے پاک کی وفاداری اور اطاعت میں اس کے جرم و کرم اور رضوان و عفران کا مظہر ہوں۔

ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربک ولذا لک خلقهم (پ ۱۲ سورۃ ہود) (اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اور اسی لیے ان کو پیدا کیا ہے)

ورحانہ عشق از کفر تا گزیر است دوزخ کرا بسوز کر یولہب نہ باشد

قرآن پاک نے اس مقام پر ایک ایسے ہی طبقے کی نشاندہی کی ہے جو رحم و کرم کا مظہر ہو کر قیامت تک دین فطرت کا ساتھ دے گا، آنحضرت ﷺ نے جب یہ بتلایا کہ آپ کی امت گمراہی کے کئی حصوں میں بٹ جائے گی تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ایک طبقہ جو ہمیشہ سنت اور میری جماعت کے مطابق ہوگا، وہ حق پر ہوگا اور وہی راہ نجات ہوگی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ حق پر قائم رہنے والا طبقہ بھی قیامت تک باقی رہے گا اور کوئی آنحضرتی حق کے درخت کو اپنی جڑ سے اکھاڑ سکتے گی۔

نورِ خدا ہے فکر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ائمہ ہدایت اور ائمہ ضلالت

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حق و باطل کی سرحد کو آسانی برابر جاری رہے تو جس طرح ہدایت مسلسل رہے گی، مگر ایسی بھی برابر چلے گی اب ان کا امتیاز کیسے ہو؟ جواباً گزارش ہے کہ خط مستقیم صرف ایک ہوتا ہے اور ٹیڑھے خط کئی، ہدایت کی راہ صرف ایک ہے، اور باطل کی راہیں کئی ہیں، قرآن کریم نے ظلمتوں کو جمع کی صورت میں اور نور کو واحد کی صورت میں ذکر فرمایا ہے، جعل الظلمات والنور (پ ۷، سورۃ الانعام) پس ہدایت کے باقی رہنے میں مسلسل رستے کی بات ہے اور مگر ایسی کے باقی رہنے میں ایک طریق کی بات ضروری نہیں، ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی گمراہی سر اٹھائے اور کبھی کوئی گمراہی دم مارے، مگر ایسی میں گودہ سب برابر ہوں، مگر ہر گمراہی کی راہ ایک دوسرے سے مختلف ہو گی ہے جیسے ٹیڑھے خط آپس میں سب مختلف ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ائمہ ضلالت اپنے طریق کو کبھی ایک دوسرے کی طرف اسناد نہیں کرتے، مردود، شہادہ، فرعون، ہامان سب اپنے اپنے وقت میں ائمہ الکفر تھے، مگر ایک دوسرے سے انتساب کے ہرگز مذمتی نہ تھے، بخلاف ان کے انبیائے کرام جو ائمہ ہدایت تھے، سب ایک دوسرے کے معتمد اور ایک ہی راستے کے داعی تھے۔

اولئک الذین ہدی اللہ لہد اہم القندہ (پ ۷، سورۃ الانعام)

حضور ﷺ کو بھی یہی حکم ہوا کہ ”یہ سارا طبقہ میرے رستے پر تھا، آپ بھی اسی راہ پر چلیں،“ نبوت کے چھوٹے مذہبی اور انکار حدیث کے متشیغین، سیلہ کذاب، اسود ضعی، مرزا غلام احمد، عبد اللہ چکرا لوی اور غلام احمد پرویز یہ سب گمراہی کے امام ہیں، مگر آپس میں کوئی انتساب نہیں رکھتے اور نہ ان میں سے کسی نے اپنے طریق کفر کو اپنے مقلد سے اسناد کیا ہے، یہ سب اپنے اپنے طریقے کے موجد ہوئے ہیں، بخلاف ان کے وہ تمام اہل حق جو ان ائمہ ضلالت کے مقابلے میں ائمہ ہدایت بنے، آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ جو سیلہ کذاب کے خلاف اٹھے، ان کی غلامی پر وہ سب اہل حق فخر کرتے ہیں، جنہوں نے مرزا غلام احمد کی تحریک کا مقابلہ کیا، بلکہ علما اور علماء وہ اسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہی پیروی سمجھتے ہیں، ثم نبوت کے عقیدے میں یہ امت کا اقبال ہے، مگر یہ مدعیان نبوت آپس میں متصل نہیں، مسٹر پرویز اپنی لگن کے خود موجد ہیں، لیکن ان کے خلاف اٹھنے والے اپنے مسلک کے موجد نہیں، وہ پہلے کے متواتر دین کے داعی ہیں اور اپنے حتم شدہ اہل حق کی پیروی کو ہی راہ نجات سمجھتے ہیں، حق ایک مسلسل راہ و ہدایت ہے جس کے کارکن آپس میں اسناد و اعتماد رکھتے ہیں اور باطل کی راہیں گورہر دور میں موجود ہیں، لیکن وہ آپس میں مسلسل اور مربوط نہیں، حق کا امتیاز اس کا اسنادی پہلو ہے، حق ایک راہ ہے، جو مسلسل چلی آ رہی ہے، یہی صراطِ مستقیم (سیدی راہ) ہے اور اس کے سوا باقی سب نیل (کئی راہیں) ہیں

وان ہذا صراطی مستقیماً فاتبعوہ ولا تتبعوہا للشیئل فتفرق بکم عن سبیلہ (پ ۸، سورۃ الانعام)

”یہ میری ایک سیدی راہ ہے، اسی پر چلو اور متحد رہو! ہوں پر نہ چلو، یہ تمہیں میری راہ سے جدا کر دیں گی“

سیدی راہ چلنے والے اہل حق جو انبیاء کرام کی پیروی میں اس راہ پر چلے وہ کو فرادہ مفہوم نہ تھے، مگر ان کا مجموعی موقف ضرور معصوم رہا اور اسی طریق سے ہدایت کی راہ آگے بھٹکتی رہی۔ اس میں اسلام کی بھائی اور اسی میں اسلام کی زندگی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ انفرادی معصوم نہ ہو سکتا جب سے ان میں بھی اختلافات اور نزاعات ہوئے، مگر ان کے اختلافات فروعات کے اختلاف تھے، اصول و عقائد کے نہیں، ہم ان کی توجیہ کرتے ہیں تو یہ نہیں اور فقہی اختلافات میں انھیں راجح اور مرجوح سے آگے نہیں جانے دیتے، یہی وجہ ہے کہ ان سب کے باوجود یہ ایک راہ ہے اور یہ راہ آنحضرت ﷺ کی سنت اور آپ کی جماعت کی راہ ہے، یہ سب اہل حق اپنے ہر عقیدے اور عمل کی سند اپنے پہلوں سے لیتے رہے اور اسی طریق سے یہ متواتر دین ہم تک پہنچا ہے۔

یہ سلسلہ صحابہ کرام سے چلا اور بارہویں صدی کے بعد یہ اسناد حضرت امام شاد ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان میں جمع ہو گئے پاک و ہند بلکہ بیشتر بلاد عرب کی دینی فضا اسی گہرائی سے قائم ہوئی اور اپنے بعد والوں کے لیے یہی خاندان روشنی کا بیڑا رہا، حضرت شاہ صاحب کے بیٹوں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی نے قرآن پاک کے پہلے اردو ترجمے لکھے، حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے حدیث و فقہ کی سند سنہالی، انگریزی، مملداری میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا اور حضرت شاہ صاحب کے پوتے، شاہ اسماعیل شہیدؒ عملی جہاد کے لیے اٹھے، بعد میں آنے والے سب اہل علم اسی گہرائی سے سند لیتے رہے اور یہی خاندان ان ممالک میں اہل حق کا سلسلہ اسناد اور مرکز اعتبار تھا۔

اسی عہد کے قریب قریب یورپ مدیوں کی نیند سے بیدار ہوا تھا، انگریز ہندوستان میں اپنے پاؤں مضبوط کر رہے تھے۔ مسلم حکمرانوں کی باہمی مخالفت کا انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور Divide and rule کی راہ سے وہ پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے، مسلم ممالک اور تہذیب اسلام کے تحفظ کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا، یورپ کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے مسلم ممالک کو تہذیب جدید کی راہیں دکھائیں "وقت کے تقاضوں پر پورا اترنا چاہیے" یہ ایک بڑا حسین عنوان تہجدت پسندی کے نام سے مغرب پسندی اپنا دامن پھیلا رہی تھی محدثین دہلی کے پیروؤں کے تقاضوں سے غافل نہ تھے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ Modernisation کی راہ سے Westernisation ہمارے گھروں میں گھس رہی ہے سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں جب اقتدار کے سائے میں پروان چڑھیں تو دینی اور روحانی قدروں کی زمین بھی ملی جاتی ہے

اس باب میں عثمانی ترکوں کی مثال ہمارے سامنے ہے ترک قوم مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنے ماضی سے کٹ گئی اور مغربی قدروں میں بہہ کر اپنے رسم الخط تک کو بدل ڈالا، آئندہ ترک خلیس ایک عظیم و ذخیرہ علم سے جو عربی فارسی اور ترکی زبانوں میں مشرقی رسم الخط میں پھیلا ہوا تھا محروم ہو گئیں، ترک کلچر غربیت میں فنا ہو گیا اور ایک عظیم اسلامی سلطنت اپنے ماضی سے کٹ کر رہ گئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں اور خاص کر محدثین دہلی کے علم و فکر کے وارثوں کے لیے یہ وقت بڑا نازک تھا۔ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ناکامی کے بعد اس باب میں کراب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے، مسلم مفکرین کی آراء مختلف تھیں۔

۱۔ مسلم مفکر (بعض) یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے دفتر و اد ملازمتوں میں بکھور عایت لے کر مغربی فکر نظر سے سمجھو نہ کر لیا جائے اور مسلمانوں کو دنیوی تعلیم میں اتار آگے لگانا چاہیے کہ غلام ہندوستان میں وہ کئی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہیں یہ راستہ ابتداء میں

اگلے بے ضرر تھا، لیکن مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ کرتے ہوئے انجام کار اپنے ماضی سے کتنا لازمی تھا چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد غار میں ڈھلنے لگے اور اعمال وسعت قلب Broadmindedness کی سمیٹ چڑھنے لگے، اسی دور کے قریب سرسید نے علی گڑھ ہول کی بنیاد رکھی (جو بعد میں کالج اور یونیورسٹی تک پہنچ گیا) اور جدید تعلیم یافتہ مسلمان اس نظریے کے گرد جمع ہو گئے، یہ ایک اچھی فکر نبی، مگر وقتی تدبیر تھی، جس کا متواتر اسلام سے کوئی انسدادی تعلق نہ تھا۔

۲:- محدثین دہلی کے پیر و اس بات کے حامی تھے کہ گوجک آزادی میں ہم ناکام ہو چکے ہیں، مگر مغربی فکر و نظر سے سمجھوتہ نہ ہونا چاہیے۔ انگریزی زبان بے شک سیکھی جائے، مگر انگریزی تہذیب و تمدن کو نہ اپنایا جائے اور درس و تدریس اور تہذیب و تعلیم کے ذریعے اسلام کی علمی اور فکری قوت کو محفوظ رکھا جائے، جس سے پھر کسی وقت راول کے چراغ روشن ہو سکیں۔ یہ حضرات اپنی فکر و نظر کے موجود نہ تھے علم نبوت کے ترجمان اور متواتر اسلام کے داعی تھے اور اسی راہ سے وہ ملت اسلامیہ کی راہنمائی کرنا چاہتے تھے، ان کا انسدادی پہلو صحابہ کرامؓ، بزرگان اسلام اور محدثین دہلی سے مربوط تھا۔ اسی دور کے قریب اہلسنت والجماعت کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند قائم ہوئی۔

۳:- مسلمانان ہند میں ایک خیال یہ بھی کام کر رہا تھا کہ نماز روزہ جیسے چند اعمال اسلام کو باقی رکھ کر انگریزی عملداری کو خلوص قلب سے اپنالیا جائے اور انگریزوں کو اپنے اولی الامر میں داخل سمجھا جائے، یہ لوگ دین اور دنیا کی تقسیم کے حامی تھے اور دنیوی مراعات حاصل کرنے کے سوا ان کا مطمح نظر نہ تھا، انگریزوں سے کامل وفاداری کے اظہار کے لیے یہ لوگ محدثین دہلی کے خلاف بھی کبھی کبھی دم مارتے تھے اور ان کی مرکزی دینی رجحانی انہیں بہت کھٹکتی تھی۔ اس دور کے قریب کئی دنیا دار مشائخ کو استحکامِ مِلّٰت اور ان کی گدیوں نے باقاعدہ شکل اختیار کی، مگر انگریزوں کو اولی الامر میں داخل کرنے کے لیے ان کی آواز پھر بھی کافی نہ تھی، کیونکہ ابھی تک علمی چراغ محدثین دہلی کے چراغ ہی سے روشن تھے اس کام کے لیے تہمت کی ہدایت درکار تھی انگریزوں نے ضرورت محسوس کی کہ قلام ہندوستان میں ایک نبوت بھی قائم کی جائے، جو انہیں اپنے اولی الامر میں داخل کرے، چنانچہ ۱۸۶۹ء میں انگریزوں نے ایک کمیشن لندن سے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ انگریز کے متعلق مسلمانوں کا مزاج معلوم کرے اور آئندہ کے لیے مسلمانوں کو رام کرنے کی تجاویز مرتب کرے، اس کمیشن نے ایک سال ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے حالات معلوم کئے۔

۱۸۷۰ء وائٹ ہاؤس لندن میں کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں کمیشن مذکور کے نمائندگان کے علاوہ ہندوستان میں مشین مشنری کے پادری بھی دعوت خاص پر شریک ہوئے، جن میں دووں نے علیحدہ علیحدہ رپورٹ پیش کی جو کہ ”دی ارا بیول آف برٹش ایمپائر ان انڈیا“ کے نام سے شائع کی گئی، جس کے دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

رپورٹ سربراہ کمیشن سرولیم ہنٹر

”مسلمانوں کا مذہب عقیدہ یہ ہے کہ وہ کسی غیر ملکی حکومت کے زیر سایہ نہیں رہ سکتے اور ان کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے، جہاد کے اس تصور سے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ ہے اور وہ جہاد کے لیے ہر لمحہ تیار ہیں ان کی کیفیت کسی وقت بھی

انھیں حکومت کے خلاف اُبھار سکتی ہے۔“

رپورٹ پادری صاحبان

”یہاں تکے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت ہیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غذا رکو دھوئے میں کا کامیاب ہو جائیں، جو ملکی نیت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اس کے حلقہ نیت میں ہزاروں لوگ جو جو رجحانات شامل ہو جائیں گے لیکن مسلمانوں میں سے اس قسم کے دعوے کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اس شخص کی نیت کو حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے، ہم اس سے پہلے بڑے صغیر کی تمام حکومتوں کو خدا تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں، وہ مرحلہ اور تھا، اس وقت فوجی نقطہ نظر سے خدا روں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جب کہ ہم بڑے صغیر کے چپے چپے پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے، جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔“ (اقتباس از مطبوعہ رپورٹ کانفرنس وائٹ ہاؤس لندن، ستمبر ۱۹۷۰ء، ”دی امریکنل آف برٹش ایمپائر ان انڈیا“، ناخوذ)

ان تینوں ذہنوں میں نمایاں فرق یہ تھا کہ پہلا ذہن دنیوی تقاضوں کے ضمن میں دین کو باقی رکھنا چاہتا تھا، دوسرا طبقہ دین کے ضمن میں دنیوی تقاضوں سے عہدہ براء ہونے کا حامی تھا اور تیسرا ذہن دین اور دنیا کی پوری تقسیم کا ہموار تھا ان تینوں طبقوں میں اسنادی اختیار صرف دوسرے طبقے کو حاصل تھا یہ حضرات درس و تدریس میں باقاعدہ اسناد اور تزکیہ و تعلیم میں باقاعدہ سلسلوں کے حامی تھے۔

دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند، محدثین دہلی کے نظریہ فکر کی نشاۃ ثانیہ تھی اس کے بانی اور پہلے سرپرست شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں باقاعدہ شریک تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے پہلے اور دوسرے ذہن کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے لیے صحت عقائد پر سرسید سے خط و کتابت کی جو انہی دونوں ”تصفیہ العقائد“ کے نام سے شائع ہو گئی، پھر ان حضرات کے ارشد مظاہرہ اور دیوبند کے پرنسپل شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن خاں نے گڑھ تشریف لائے، حضرت مرحوم اور ان کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ مشیر احمد عثمانی کی تقریروں سے نہ صرف دونوں ذہن ایک دوسرے کے قریب ہوئے بلکہ پہلے طبقے کی کافی حد تک دینی اصلاح بھی ہو گئی، علامہ شبلی اور عددۃ العلماء کے ذریعہ جو جدید نظریات اسلام کے نام سے سامنے آ رہے تھے، ان کی اصلاح کے لیے علماء دارالعلوم دیوبند نے خاموشی سے سمی فرمائی، جو تاریخ دیوبند کا بہترین سرمایہ ہے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی نہ صرف دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت ہوئے بلکہ ان کے ارشد خلفاء میں شمار ہوئے، جس کی وجہ مولانا عبدالباری ندوی اور عبدالماجد دیوبندی جیسے مغربی علوم کے شہسوار، اکابر دیوبند پر اپنی فکر نچھاور کرنے لگے اور اس کا اثر پھیلتا گیا، مولانا ابوالحسن علی ندوی جو عددۃ العلماء کے ناظم، جامعہ اسلامیہ مدینہ مدینہ یونیورسٹی کے رکن اور مجلس تائیس رابطہ اسلامی کے رکن رکن ہیں، اور آج کی دنیائے اسلام کے جانے پہچانے مفکر اور اپنی خاص صلاحیتوں کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، وہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر راجپوری اور قطب الاقطاب حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے خلیفہ مجاز ہوئے۔ علمائے دیوبند کی ان

کوششوں اور علوم بہت کی ان بے لوث وفاداریوں کے لیے گو مغربی طرز کا پروپیگنڈا اساتذہ تھا، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان حضرات نے علم تقویٰ کی اور تزکیہ و طہارت کی روشنی میں اسلامیان ہند کی ہر شبیہ میں کامیاب راہنمائی کی ہے۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا درد مند دل جب سوئی قوم کو جگا رہا تھا اور مرحوم کی آفتیں تو انہیں مسلمانان ہند کو چھوڑ دی تھیں تو علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ مبادا ڈاکٹر صاحب مرحوم کی فکر اسلام کی اسنادی علم سے ذرا مختلف نہ ہو جائے فلسفہ اسلام کی بعض گہرائیوں پر مرحوم سے گفتگو ہونی چاہیے، چنانچہ امام العصر، حجۃ الاسلام علامہ انور شاہ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی لاہور تشریف لائے، ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اہم ملی مسائل اور اسلام کی گہرائیوں پر کئی دن تبادلہ افکار رہا، انجمن حمایت اسلام میں ڈاکٹر صاحب نے قادیانیوں کے متعلق جو موقف اختیار کیا وہ زیادہ تر انہی مذاکرات کی صدائے بازگشت تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دائرہ اثر میں اس حقیقت کو خوب اجاگر کیا کہ نبوت کے اختلاف سے قوم بدل جاتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پر اسرائیل سے ایک نئی قوم نکلی اور نصاریٰ یہود سے علیحدہ ایک ملت بن گئے، حضور اکرم ﷺ کی نبوت آگے ایک اور ملت کا موجب ہوئی اور یہود و نصاریٰ کے بعد امت مسلمہ کا قیام عمل میں آیا، آنحضرت ﷺ کے بعد اگر کسی اور نبی کا پیدا ہونا نہ لیا جائے تو پھر ایک اور قوم عمل میں آئے گی جو ملت اسلام سے علیحدہ ایک الگ قوم قرار پائے گی اور جس طرح اہل اسلام کی عقیدت کے مرکز مکہ اور مدینہ ہیں، اس نئی قوم کی وفاداریاں اپنے جدید مرکز نبوت سے وابستہ ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ان پاکیزہ کوششوں میں علمائے دیوبند کا بہت دخل ہے اور ان ہی حضرات کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے افکار سلف سے کہیں نہیں گمراہے اور نازک سے نازک مسائل میں وہ اسلام کی شاہراہ عظیم سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوئے، ان ہی دنوں ڈاکٹر علامہ اقبال اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی جدا گانہ قومی نظریے پر متفق ہوئے، جس کی صدائے بازگشت ہندوستان کے سیاسی میدانوں میں برسوں بعد تک سنی جاتی رہی، البدر الساری کے مصنف لکھتے ہیں:

لم يستعن عن آرائه الدقيقة في الفلسفة مثل الفيلسوف الدكتور السمر محمد اقبال الهندي

وسعت سنة ۱۳۳۷ھ في ديوبند من المحترم عبد الله جفتانی من اخص اصحاب الدكتور المرحوم

ان الدكتور اقبال يتبنى كثيرا على دقة رأيه في غوامض الفلسفة، ص ۲۰ طبع مصر

علمائے دیوبند کا اعتدال

علمائے دیوبند دین کے سمجھنے سمجھانے میں نہ تو اس طریق کے قائل ہیں، جو ماضی سے یکسر کٹا ہو، کیونکہ وہ مسلسل رشتہ نہیں ایک نئی راہ ہے اور نہ وہ اس افراط کے قائل ہیں کہ رسم و رواج اور تقلید آباء کے تحت ہر بدعت کو اسلام میں داخل کر دیا جائے۔ جن اعمال میں تسلسل نہ ہو اور وہ تسلسل خیر القرون تک مسلسل نہ ہو وہ اعمال اسلام میں نہیں ہو سکتے۔ یہ حضرات اس تقلید کو پوری طرح قائل اور پابند ہیں، جو قرآن و حدیث کے سرچشمہ سے فقہ اسلام کے نام پر چلتی آئی ہے۔ قرآن کریم تقلید آباء کی صرف اسی بنا پر مذمت کرتا ہے کہ وہ آباء عقل و

ل ترجمہ شاہ صاحب کے دقیق تفسیرات نظریات سے ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے فلسفی بھی بے نیاز نہ تھے۔ اور میں نے دیوبند میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دوست ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سے ۱۳۳۷ھ میں سنا کہ ڈاکٹر اقبال فلسفی گہرائیوں میں حضرت شاہ صاحب کی دقت نظری کے بہت مداح تھے۔

ابتدا کے نور سے خالی ہوں۔

اولو کان آباء ہم لا یعقلون شیاً وَلَا یعتدون (پ ۲)

ترجمہ: بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ کو جانتے ہوں۔

اسے سلف اور فقہائے اسلام جو علم و ابتدا کے نور سے محروم تھے، ان کی پیروی نہ صرف یہ کہ مذموم نہیں بلکہ عین مطلوب ہے اور ہمیں تعلیم دی گئی ہے کہ صرف پیغمبروں ہی کی نہیں، صدیقین، شہداء اور صالحین کے رستے پر چلنے کی بھی ہر نماز میں رب العزت سے درخواست کریں، کیونکہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔

اهدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیہم (پ ۱)

ترجمہ: "اے اللہ! چلا ہمیں سیدھی راہ پر... راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا۔"

اس مسلک اعتدال کی وجہ سے علمائے دیوبند دینی بے قیدی اور خود رانی سے بھی محفوظ رہے اور شرک و بدعت کے اندھیرے بھی انہیں اپنے جال میں نہ کھینچ سکے، ان کے اعمال و انکار سے اسلام کا تسلسل بھی قائم رہا اور کوئی غیر مسلسل نظریہ عمل دین کے نام سے اسلام میں داخل بھی نہ ہونے پایا، یہ حضرات علم و عمل کے تسلسل سے اسلام کے چراغ روشن کرتے گئے اور تاریخ دیوبند پر نظر کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام واقعی ایک زندہ دین ہے، جو ان حضرات سے لے کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد سعادت عہد تک مسلسل ہے۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا علامہ قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

"اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا طبقہ علمائے دیوبند کی رو سے امت کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے اس امت کی باطنی حیات وابستہ ہے جو اصل حیات ہے، اس لیے علمائے دیوبند ان کی محبت و عظمت کو تحفظ ایمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، مگر فلو کے ساتھ اس محبت و عقیدت میں انہیں ربوبیت کا مقام نہیں دیتے، ان کی تعظیم شرعاً ضروری سمجھتے ہیں لیکن اس کے معنی عبادت کے نہیں لینے کہ انہیں یا ان کی قبروں کو سجدہ و درود کر یا طواف و نذر یا منت و قربانی کا محل بنالیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی حضرت سید احمد کبیر رفاعی، حضرت شیخ علی ہجویری، حضرت شیخ معین الدین چشتی، امیری، حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت الامام الحدیث شاہ ولی اللہ دہلوی کے صحیح جانشین اور ان کے فیوض سے زندگی کے خاگوں میں ابتداء سنت کا رنگ بھرنے والے یہی بزرگانی کرام ہیں ان حضرات کا فیض روحانی اعمالِ خیر سے نہیں اعمالِ سنت سے قائم ہے اور یہ حضرات باقاعدہ چشتی، سہروردی، نقشبندی اور قادری بتوں سے انتساب رکھتے ہیں، بلکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حکمت اور تزکیہ نفوس کا یہ رستہ اب صرف اسی مسلک کے لوگوں سے آباد ہے، یہ حضرات علم و عمل ہر دو ابواب میں اسنادی پہلو قائم رکھتے ہیں، بدعات کی روک تھام میں بھی یہ حضرات صوفیت اسی لیے پیش پیش رہے کہ ان کے اعمال کا اسنادی پہلو کہیں موجود نہ تھا اور یہ تردید بھی غبی نہیں، بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) بھی اسی رنگ میں بدعات کی تردید فرماتے رہے ہیں۔

”انتخاب از اسم و رسم بدعت تا از بدعت حسنہ و رنگ بدعت سیدہ اختر از عمائد بوئے از بس دولت بمشام جان
اور سدو ایں معنی امر و محسوس است کہ عالم در دریا نئے بدعت غرق گشتہ است نظامات بدعت آرام گرفتہ کرا جمال است کہ دم
از رفیع بدعت زندہ ہا حیاے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہند ہائے بدعت اند و کونکند ہا ی سنت و بدعت ہا بہن
شدہ را تعامل متفق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آں فتوے سے دہند و مرد رجبہ بدعت دلالت ی فرمایند“

(کتوب ۵۴، فتر دوم ص ۱۰۳)

ترجمہ: بدعت کے نام اور عمل سے بھی پرہیز لازم ہے، جب تک بدعت حسنہ سے بھی اسی طرح پرہیز نہ کرے جس طرح
بدعت سیدہ سے پرہیز کی جاتی ہے روحانیت کی بوطالب کے دماغ تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج بہت مشکل ہو گئی ہے ایک جہاں
بدعت کے دیو میں ڈوب رہا ہے اور لوگ بدعت کے اندھوروں میں آرام لے رہے ہیں کسی کی مجال ہے کہ بدعت کے خلاف دم مارے
اور اچھائیے سنت کے لیے زبان کھولے اس وقت اکثر مولوی بدعتوں کو رواج دے رہے ہیں اور سنتوں کو مٹا رہے ہیں، رواج یافتہ بدعتوں کو
مجبوری قرار دے کر ان کے جائز بلکہ بہتر ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں اور لوگوں کو بدعت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

حضرت مجتہد والف ثانیؒ نے جن علمائے ربانی کی تمنا کی تھی کہ اچھائیے سنت کے لیے زبان کھولنے والے اور بدعات کے
خلاف دم مارنے والے کہاں ہیں؟ ان کی یہ تمنا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان اور اسی تحریک کی نشاۃ ثانیہ حضرات اکابر دیوبند
سے پوری ہوئی، **لِّلّٰہِ الْمِنَّۃُ**

فقہ میں سنت کی راہیں

سرزمین پاک و ہند میں نوے ۹۰ فی صد مسلمان فقہ حنفی کے مقلد ہیں، فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد، ان کے تلامذہ کے
اختراجات اور پھر اصحاب ترجیح کے فیصلوں کے مجموعہ کا نام ہے ظاہر ہے کہ اتنی چھان بین اور کانٹ چھانٹ کے بعد فقہ کا کوئی مسئلہ اصول
شریعت کے خلاف باقی نہیں رہ سکتا، مگر اس طریق عمل میں ایک اور پہلو بھی تھا وہ یہ کہ عمل کرنے والے کی نظر فقہاء و ائمہ کی تحریجات تک
محدود رہتی اور گو وہ اعمال حضور ﷺ کی سنت اور مجاہدہ کے طریق سے تجاوز نہ ہوتے، مگر عمل کرنے والے کا شعور اتباع سنت کی لذت پوری
طرح محسوس نہ کر سکتا تھا، علمائے دیوبند نے اعمال و عبادات کو ان کے مصادر کی طرف لوٹایا، احادیث کے وفاتر کھلے تحقیقات پھیلے،
رجال کی نئے سرے سے پڑھنا، ہوتی، مطالب و معانی میں بحیثیت کی گئیں اور گوان حضرات کو فقہ کا کوئی مفتی نہ فیصلہ اصول شریعت سے ٹکراتا
ہوا نہ ملتا ہم اس راہ تحقیق نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ پہلے جن مسائل پر فقہ سمجھ کر عمل کیا جاتا تھا، اب وہی مسائل نور سنت کی روشنی دینے
لگے اور ان اعمال و عبادات میں اتباع سنت کی ولایت محسوس ہوتی لگی، جو اس فکری تبدیلی کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھی، علمائے دیوبند نے نہ
صرف پاک ۱۱ ہند کے احناف کو سنت کا شعور بخشا بلکہ ان کی حدیثی تحقیقات نے شام، مصر تک ان حضرات کے علوم پھیلادئے، یہ حضرات
نہ صرف علمائے حنفی ہیں بلکہ آج حنفیت کی مسند تدریس انہی کے دم قدم سے قائم ہے، یہاں نہ ظاہریت کی تفریط ہے اور نہ اہل بدعت کی سی
افراط بلکہ سلف صالحین کی سی کامل اتباع و دیوبند کا مسلک مختار ہے۔

تیرھویں صدی ہجری میں علما نے احناف کے پاس اصحاب تریج کے کچھ ستون رو گئے تھے، جن سے فقہ کی تدریس باقی تھی ان میں مرکزی کتاب ہدایہ تھی، جسے علامہ برہان الدین الرفعیانی (۵۹۳ھ) نے اس بیڑا پر میں لکھا تھا کہ دین کی اصل جڑ ائمہ مجتہدین نہ سمجھے جائیں بلکہ طالب کا مرکز توجہ کتاب الہی اور حضور ﷺ کی ذات مقدسہ ہو، علامہ ابن حام اسکندری (۸۶۱ھ) اور صاحب بحر علامہ ابن نجیم (۹۶۹ھ) کے بعد فقہ حنفی کا مدار و مختار، عالمگیری، طحاوی اور شامی پر رہ گیا تھا اس میں شک نہیں کہ ان کتابوں میں فقہ حنفی کے فائدہ کی نہایت فتح اور قابل اعتماد صورت میں ملے ہیں، لیکن فقہ کے طالب علم ان کتابوں میں فقہ کے مجتہدانہ ذوق کا ادراک نہ کر سکتے تھے، فقہ حنفی کی اساس حضرت امام محمد (۱۸۹ھ) کی کتابوں پر تھی اور ان کی ظاہر الروایات فقہ حنفی کا اصل خزانہ تھیں۔

امام محمد حضرت امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد مدینہ تشریف لائے اور حضرت امام مالک (۱۷۹ھ) کے حلقہ درس میں شامل ہوئے، آپ نے امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے ذوق اجتہاد کا قطعی مطالعہ کیا تو امام ابو حنیفہ کے اجتہاد کا اصول سنت کے زیادہ قریب پایا، آپ نے اپنے ان احساسات پر الجھنے علی اہل مدینہ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کا ایک نسخہ مدینہ منورہ بھجوا دیا، یہ کتاب مدینہ شریف کے مکتبہ محمودیہ میں موجود تھی، ایک نقل ترکی کے مکتبہ نور عثمانیہ میں تھی، علماء و فضلاء دور دراز سے اس کتاب کو دیکھنے آتے تھے۔

شیخ الہند کے نامور شاگرد محدث جلیل حضرت مولانا مفتی مہدی حسن (جو ۲۰۵۰ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہیں) نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا اور بیس سال میں اس کے سؤ وے کی تصحیح اور تعلیق مکمل کی۔ حیدرآباد دکن کے مطبع المعارف الشرعیہ نے ۱۳۸۵ھ میں اس کی دو جلدیں شائع کر دیں، دوسری جلد کتاب المبعوع پر ختم ہوتی ہے، پوری کتاب چار جلدوں میں ہے، علماء دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمت میں یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے، امام محمد کی کتاب مبسوط جو ظاہر الروایہ میں کتاب الاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے اس نام سے بھی موسوم کرتے ہیں، استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں چھ جلدوں میں موجود تھی، دیوبند کے محقق عالم مولانا ابو الوفا افغانی رئیس الجندہ المعارف العمادیہ نے اس کتاب پر تحقیقاتی کام کیا اور تعلیق لکھی، ۱۳۹۰ھ میں اس کتاب کی پہلی دو جلدیں بڑی آب و تاب سے شائع ہو گئیں اور وہ کتاب جسے دیکھنے کے لیے علماء ایک ہزار سال سے تجسس کر رہے تھے، دیوبند کے فیض کا صدقہ مصطفیٰ شہود پر آگئی، تیسری جلد کتاب اتھری سے شروع ہوتی ہے کتاب الاصل کی اشاعت سے فقہ کے طالب علم تحقیقات میں قرن اوّل کے ذوق فقہ سے حصہ پارہے

ہیں

امام محمد کی کتاب السیر الکبیر بھی امام سرخسی کی شرح کے ساتھ چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اسلامی ریاست کی تعمیر میں یہ کتاب اساسی حیثیت رکھتی ہے۔

فقہ میں سنت کی راہیں معلوم کرنے کے لیے آٹھویں صدی میں حافظ جمال الدین طبری (۶۲۷ھ) نے علم حدیث کا ایک بڑا ذریعہ ”نصب الرایہ“ کے نام سے جمع کیا تھا، یہ عظیم علمی سرمایہ سا لہا سال سے نایاب تھا، علما نے دیوبند نے نہ صرف اسے دوبارہ طبع کرانے کا اہتمام فرمایا بلکہ اس پر بیعتہ الالہی فی تخریج طبعی کے نام سے ایک جلیل القدر حاشیہ تحریر فرما کر علما نے حدیث پر ایک بڑا احسان فرمایا۔ یہ کتاب چار ضخیم جلدوں میں مصر سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ علما نے دیوبند کی یہ کوشش فقہ حنفی اور علم حدیث کی ایک بہت بڑی خدمت ہے، محدث کبیر ملا علی قاری کی کتاب شرح فقہ حدیث کا عظیم سرمایہ تھی مگر زبور طباعت سے آراستہ نہ تھی۔ دیوبند

کنہ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علیؒ نے ”محمود الروایہ“ کے نام سے اس پر ایک مستقل حاشیہ لکھ کر اسے بڑے اہتمام سے شائع فرمایا۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے شرح و تفسیر کے ساتھ درس نظامی میں مستقل جگہ دی جائے اب یہ کتاب طلب سے مکمل صورت میں شائع ہو رہی ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تمام فقہی ابواب کو احادیث و روایات کی روشنی میں مرتب کرنے کا اہتمام فرمایا اور خانقاہ تھانہ بھون میں اعلاء السنن کے نام سے ایک عظیم علمی ذخیرہ میں جلدوں میں مرتب ہوا، یہ عظیم علمی خدمت اس الحمد ثلین حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سرانجام دی۔ اس کا مقدمہ قواعد علوم الحدیث علماء شام نے بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔ یہ مقدمہ ایک مستقل کتاب کی شکل میں ہے، شیخ ابو نعیم نے اس کی بہت توصیف فرمائی ہے اور عرب کے نامور فضلاء نے اس کی غزالت علمی کا اعتراف کیا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے اعلاء السنن کی تیرہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں کتاب ایک متن اور ایک شرح پر مشتمل ہے، متن اور شرح کی زبان عربی ہے بعض جلدوں کے آخر میں صرف متن کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے جس سے اردو دان حضرات بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جہاں تک فقہ کی عام خدمت کا تعلق ہے یہ کہنا کافی ہوگا کہ علماء دیوبند نے کئی کتابوں پر مفید حاشیے لکھے، علامہ ابن ہمام (۸۶۱ھ) کی کتاب زاد الفقیر پر حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے المستر البصیر نام سے مفید عربی حاشیہ تحریر فرمایا۔ دیوبند کے شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علیؒ نے مختصر القدوری پر نور الایضاح پر اور کنز الاقلاق پر بہت اعلیٰ عربی حاشیے تحریر فرمائے آپ کا نور الایضاح کا حاشیہ بہت مقبول ہوا اور کئی دفعہ چھپا ہے، آپ نے آزاد قبائل اور افغانستان کے طلبہ کے لیے نور الایضاح کا ایک فارسی حاشیہ بھی تحریر فرمایا جسے مطبع قاسمیہ نے شائع کیا ہے۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاویٰ رشیدیہ تین حصوں میں، حضرت مولانا تھانویؒ کا فتاویٰ امدادیہ چھ ضخیم جلدوں میں، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب نقشبندیؒ کا عزیز الفتاویٰ، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، مفتی عبدالرحیم صاحب کا فتاویٰ رحیمیہ، جو انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور اہل یورپ اس سے اسلامی قانون استناد کرتے ہیں اور مفتی رشید احمد صاحب کا احسن الفتاویٰ وہ فقہی مواد ہے جو علماء دیوبند کی فقہ حنفی کی خدمات میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس دور میں ہزاروں تشکلات علوم دینی کو سیراب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان فضلاء کرام پر رحمتوں کے پھول برسائے جو انگریزوں کی پوری سازشوں اور ایجنوں کی پوری مخالفتوں کے بیچ ایسی سلامت روی اور خلوص کی راہ چلے کہ امت کو سلف کا ذوق متواتر دے گئے، اخبار کی سازش سے ان پر تکفیر کے گولے بھی برستے رہے مگر دیوبند سے انتساب رکھنے والا ہر فرد سلف کے روشن چراغوں سے امت کو شاہراہ مسلسل دعوت دیتا رہا۔

علم حدیث کی خدمات

اس مسلک کے اکابر نے علم حدیث کی وہ خدمات انجام دی ہیں جن کا تصور بھی اس قرن میں مشکل تھا۔ حدیث کی ہر اہم کتاب پر عربی شرحیں لکھیں حاشیے رقم فرمائے اور نئے تقاضوں کے مطابق حدیث کا گراف قدر ذخیرہ اردو میں بھی نئی ترتیب سے پیش فرمایا،

امام العصر حضرت غلامہ انور شاہ کاشمیری کے امالی ”فیض الباری علی صحیح البخاری“ مصر سے چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے صحیح بخاری پر اپنی تقریرات کو اپنے تفسیر قرآن کے مخصوص انداز میں ایک نہایت نفیس شرح کی صورت میں مرتب فرمایا یہ شرح ”فیض الباری علی صحیح البخاری“ کے نام سے چھپ گئی ہے۔ عصر حاضر کے اس شاہکار کا ساتھ ہی ساتھ انگریزی میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔ حکیم الاسلام مولانا قاری طیب صاحب نے اس کتاب کو دیکھ کر فرمایا کہ اس سے حضرت مولانا محمد قاسم کی وہ تہنہ پوری ہو گئی جس کے تحت وہ یورپ میں حضور ﷺ کی تعلیمات کا پھیلاؤ دیکھنا چاہتے تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا ذکریا صاحب کی عربی تفسیر لامع الدراری علی صحیح البخاری حضرت گنگوہی کی تقریر صحیح بخاری کے متن کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں مکمل چھپ چکی ہے اور صحیح بخاری پر تحقیقات کا نادر خزانہ ہے حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تراجم بخاری کی مکمل عربی شرح کی جلدوں کی تحریر فرمائی ہے خدا کرے کہ یہ علمی خدمت جلد طباعت پذیر ہو، شیخ الحدیث حضرت مولانا غفر الدین امروہی کی صحیح بخاری پر اردو تقریرات نہایت نفیس انداز میں چھپ رہی ہیں۔ صحیح مسلم کی بہترین عربی شرح جسے علامہ ازہر نے احاطہ و شواہج کی جملہ سابقہ شروح پر فائق تسلیم کیا ہے۔ شیخ المہم کے نام سے کی ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کی یہ عظیم خدمت حدیث دیوبند کا بابر مایہ ہے۔ راس الحدیث مولانا ظلیل احمد نے ابو داؤد کی شرح بذل المجہود پانچ ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر فرمائی اب یہ شرح حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد ذکریا کے مختصر حواشی کے ساتھ مصر میں دوبارہ بڑے آب و تاب سے چھپی ہے۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے امالی علی سنن ابی داؤد انوار المحمود کے نام سے دو جلدوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ الطیب القدی مولانا اشفاق الرحمن کا عرطلوی، الکوکب الدری شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا اور معارف السنن مولانا یوسف بخاری جامع ترمذی کی بہترین شرحیں ہیں، معارف السنن کی پہلی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ دوا ہے کہ باقی دو سرائی جلدیں بھی جلد طباعت پذیر ہوں مولانا محمد یوسف بخاری کی یہ عظیم شرح ۱۲ دور میں خدمت حدیث کا شاہکار ہے۔ عرب ممالک کے علماء حدیث اس شرح ترمذی پر انگشت بدعاں ہیں۔ امام محمدی کتاب الآثار کی شرح حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب نے تین ضخیم جلدوں میں عربی میں لکھی جو پوری تاریخ میں پہلی مثال ہے۔ جامع ترمذی کے امالی میں شیخ الہند اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی تقریرات بہت معروف ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کی العرف القدی سے حدیث کا کوئی مدرس مستغنی نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عجیب مقبولیت بخشی ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نامور شاگرد عبدالرزاق بن ہمام نغانی (۲۱۱ھ) کی حدیث کی ضخیم کتاب المصنف علم حدیث کا بڑا ذخیرہ تھی اس کے چند نسخے مختلف جگہ موجود تھے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اس کے سوڈات پر بڑی عرق ریزی فرمائی اور اس پر نہایت نفیس نقاش لکھنی۔ حدیث کی یہ عظیم کتاب گیارہ ضخیم جلدوں میں بیروت میں چھپی ہے اور اسے جو ہانسبرگ (افریقہ) کی مجلس علمی نے شائع کیا ہے۔ علماء دیوبند کی یہ حدیث کی یہ خدمت قرن حاضر کا بہت بڑا علمی کام ہے۔

ابو بکر بن ابی شیبہ (۲۳۷ھ) کی حدیث کی کتاب المصنف کا ذکر بھی صرف شروح حدیث میں ملتا تھا اور علماء کی آنکھیں اسے دیکھنے کو ترستی تھیں۔ جمعیت علماء حیدرآباد (ہند) کے نائب صدر مولانا عبدالخالق افغانی نے اس پر تحقیقاتی کام کیا اور علم حدیث کا یہ نادر خزانہ منصفہ شہر پرا گیا ۱۳۸۷ھ تک اس کی تین جلدیں شائع ہوئی تھیں

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم نے بھی ترمذی کی ایک نہایت جامع اور نفیس عربی شرح تحریر فرمائی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ سنن نسائی پر حضرت مولانا اشفاق الرحمن صاحب نے بہترین حاشیہ تحریر فرمایا، موطاء امام مالک کی مفصل عربی شرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ نے چھ ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع فرمائی اور طحاوی کی شرح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے ”امانی الاحباری شرح معانی الآاتار“ کے نام سے کئی ضخیم جلدوں میں تحریر فرمائی اس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں مشکوٰۃ کی شرح ”المعلیق الصبیح“ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے سات ضخیم جلدوں میں عربی میں تحریر کی، سنن ابن ماجہ پر حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے ایک نہایت عمدہ حاشیہ لکھا جو ابھی تک چھپ نہیں سکا، ایک اور حاشیہ جو مفصل شرح کا درجہ رکھتا ہے، مولانا اشفاق الرحمن صاحب کاندھلوی نے بھی تحریر فرمایا جو الحمد للہ کراچی سے شائع ہو گیا ہے۔

اُردو میں حدیث کی خدمت

سب سے پہلے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس طرف توجہ فرمائی اور اپنے مخصوص ادبی اعزاز میں صحیح بخاری پر تشریحی نوٹ لکھے۔ ان کے بعد علامہ محمد شین حضرت مولانا سید بدر عالم ہاجر مدنی نے ”ترجمان السنۃ“ کے نام سے ایک گرانقدر علمی ذخیرہ چار ضخیم جلدوں میں مرتب فرمایا جسے عدوۃ المؤمنین دہلی نے اپنے روایتی اعزاز میں شائع کیا اور اسی طرح صاحب موصوف نے ”جواہر الحکم“ کے نام سے تین چھوٹے چھوٹے مجموعے موجودہ دور کے خصوصی تقاضوں کو مد نظر رکھ کر لکھے۔ ”ترجمان السنۃ“ کے نام سے انہوں نے جو کام کیا وہ اگرچہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے کیونکہ ان کا ارادہ اس طرح کی آٹھ دس جلدیں لکھنے کا تھا مگر زندگی نے مہلت ہی اتنی دی کہ چار جلدیں پوری کر سکے، تاہم یہ ایک ایسا عمدہ علمی ذخیرہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے یہ اپنے دور کی حدیث کی سب سے بڑی خدمت ہے، حضرت مولانا مرحوم کا انداز تحریر ایسا ہے کہ متوسط درجے اور اونچے طبقے کے لوگ اس سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ نے نہایت عام فہم اور سلیس اعزاز میں ”معارف الحدیث“ کے نام سے علم حدیث کی خدمت کی اس کی ۷ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، ان گراں بہا تحریرات پر نظر کرنے سے یہ غلط پروپیگنڈا پارا ہوا جاتا ہے کہ کدراخ العلم علمائے کرام عصر حاضر کے تقاضوں سے غافل ہیں۔

قرآن کریم کی عصری خدمات

علمائے دیوبند نے عصر جدید کے پھیلنے ہوئے الحاد کے آگے ہر ممکن بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس باب میں سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ قرآن کریم کو کئی نسلوں کے سامنے اس اعزاز سے پیش کیا جائے کہ روایات کے کسی قسم کے الجھاؤ کے بغیر نفس مراد نہایت آسان پیرایہ میں ادا ہو جائے اور جہاں جہاں دشمنان اسلام موزے بنائے ہوئے ہوں وہاں ایسی تعبیر اختیار کی جائے کہ نفس اختلاف میں اترے بغیر تمام پیدا ہوئے والے یا پیدا کئے گئے شہادت از خود دور ہو جائیں۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر ایک نہایت کثافت، پر مغز اور دلکش تفسیری حاشیہ لکھ کر عصر حاضر کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا، آپ کے حواشی اگر ایک طرف سلف صالحین کے مسلک کے مطابق ہیں، تو دوسری طرف موجودہ ضروریات کے بھی عین مطابق ہیں پڑھتے جابجائے، معاندین اسلام کے پیدا کئے ہوئے شہادت کی جرا خود کٹتی چلی جائے گی، پھر کسی فریق کی دل آزاری نہیں کسی فرقے کا نام تک نہیں زبان اور طرزیان شک اور پرانتا نہیں

بلکہ نہایت سلیس اور دل نشیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس تفسیری حاشیے کو اتنی مقبولیت عطا فرمائی ہے کہ پاکستان، ہندوستان، چین، ہانگ کانگ اور افغانستان وغیرہ میں (فارسی میں ترجمہ ہو کر) چھپ چکا ہے اور پاک و ہند میں چھ سات اداروں نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، مکتبہ رشیدیہ نے اس کو ایک جلد میں شائع کیا ہے۔ تاج کھنٹی نے حسب روایت دو سائزوں میں چار قسم کے کاغذ پر شائع کیا ہے، جدید تعلیم یافتہ حضرات جو اسلام کو سلف کے آئینے میں مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس مختصر تفسیر میں نہایت اطمینان اور شرح صدر محسوس کرتے ہیں، یہ ترجمہ اور حاشیہ علمائے دیوبند کا جدید نسل پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا کام بیان القرآن کے نام سے کیا ہے۔ حکیم الامت کی یہ تفسیر اپنی معنوی خوبیوں کے اعتبار سے اتنی جامع اور مختصر ہے کہ بلا خوف تردد کہا جاسکتا ہے کہ اس تفسیر کو غور سے پڑھنے کے بعد کسی دوسری تفسیر کی مراجعت ہی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا بیاریہ بیان علمی ہے اور معمولی پڑھے لکھے لوگ اس سے کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ قرآن کریم کا مختصر..... عام فہم اور ربط آیات سے مطالعہ کرنے والے حضرات شیخ التفسیر مولانا محمد علی صاحب لاہوری کے ترجمہ اور حاشیہ سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو ادبی ترجمہ یہ بیان میں پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے حبان الہند مولانا سعید احمد دہلوی کا ترجمہ اور تفسیر بہت مفید ہے۔

مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب کی تفسیر معارف القرآن آٹھ ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ عام فہم اور سلیس انداز میں قرآنی مسائل اور معارف کا پیش بہتر انداز ہے اس میں عصری فتنوں پر پوری گرفت ہے۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوان اور پڑھے لکھے لوگ اس تفسیر میں زبان کی فصاحت عصر حاضر کی بلاغت اور سلف کی سی شائستہ محسوس کرتے ہیں۔ اس تفسیر میں مولانا تھانویؒ اور علامہ عثمانیؒ کی تفسیرات کی روایت ملتی ہے اور اس نے تفسیر کے تمام جدید ذخیروں کو اپنی سلاست، جامعیت اور اعتمادیت میں پیچھے کر دیا ہے، کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے۔

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے بھی معارف القرآن کے نام سے ایک نہایت جامع تفسیر لکھی ہے مولانا کا علمی انداز بیان حقائق و معارف کے موتی جن جن کرشیں کرتا ہے۔ یہ تفسیر سورہ احزاب تک مکمل ہو چکی تھی کہ مولانا رحمت الہی سے جالے خدا کے کہ یہ عظیم تفسیری خدمت جلد طباعت پڑ ہیو۔ (یہ تفسیر چھپ چکی ہے۔) (ادارہ)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آخر عمر میں قرآن کریم کی آیات احکام پر کام کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وقت نے مہلت نہ دی اور آپ نے یہ خدمت اپنے اصحاب و خدام میں تفویض فرمادی۔ کل کتاب سات جلدوں میں ہے۔ پانچ جلدیں چھپ چکی ہیں تیسری اور چوتھی جلد اب باقی ہے۔ یہ عربی تفسیر احکام القرآن تفسیر علم اصول حدیث اور فقہ کا بحر تائید انکار ہے علماء عرب اس زمانے میں اس عظیم خدمت پر خیر ان ہیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے سورہ نساء تک آٹھ سو صفحات میں اس کی دو جلدیں تحریر فرمائیں۔ پانچویں اور چھٹی جلدیں مفتی محمد شفیع صاحب نے چھ سو صفحوں میں مکمل کیں اور ساتویں جلد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے قلم بلاغت رقم سے پایہ تکمیل کو پہنچی ہے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی تفسیر مشکات القرآن عربی نادر علی تحقیقات کا عجیب خزانہ ہے آپ نے قرآن کریم کے مشکل مقامات پر بصیرت افروز کلام کیا ہے محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے..... اس کا ایک مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو مقدمہ تفسیر

القرآن پر ایک بڑی خدمت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد سالم استاذ دارالعلوم دیوبند ان دنوں تفسیر کے جدید عصر کے تقاضوں کے پیش نظر ایک مبسوط مقدمہ تفسیر قرآن عربی میں لکھ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ قرآن کریم کی یہ عظیم خدمت بھی جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو، اپنے ملک کے علمی حلقے اس کے شدت سے منتظر ہیں۔

اس وقت جو ترجمے برصغیر پاک و ہند میں سب سے زیادہ مقبول اور موثر ہیں ■ زیادہ تر علماء دیوبند کے ہی ہیں مولانا عبدالمجید ریا آبادی سے کہ بعض امور میں شدید اختلاف ہے تاہم ان کی خدمات قرآن کریم انگریزی حاشیہ قرآن اور اردو تفسیر قرآن زیادہ تر علماء دیوبند خصوصاً حضرت مولانا شرف علی تھانویؒ کا ہی فیضان ہیں۔ مولانا ریا آبادی جابجا مرشد تھانوی سے اپنی بات کی سند لاتے ہیں۔

جدید عصری تقاضوں پر دینی لٹریچر

عقیدت پسند ڈھن کو انسادی اسلام کے قریب کرنے کے لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی ”المصلح والھل“ ”خوارق عادات“ اور ”مسئلہ تقدیر“ جیسی تحریرات عصری تقاضوں کے پیش نظر نہایت مفید کتابیں ہیں حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب ”سائنس اور اسلام“ حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانیؒ کی ”اشاعت اسلام“ مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ کی ”اسلامی معاشیات“ مولانا حافظ الرحمن سید ہارویؒ کی ”اسلام کا اقتصادی نظام“ ”اخلاق اور فلسفہ اخلاق“ ”قصص القرآن“ (چار جلد) مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی ”علم الکلام“ حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کی ”آلات جدیدہ اور احکام اسلام“ مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی ”اسلام اور مسئلہ غلامی“ اور اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد منظور احمد نعمانیؒ کی مختلف کتابیں وہ صحیح دینی لٹریچر ہے جو اکابر دیوبند اور متبعین دیوبند کے ذریعہ جدید نسلوں کو ملے۔

ندوۃ المصنفین دہلی

عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو میں کتاب و سنت اور سیر و تاریخ اسلام کی وسیع تر اشاعت کے لیے فضلاء دارالعلوم دیوبند مولانا مفتی تقی الرحمن عثمانیؒ، مولانا حافظ الرحمن سید ہارویؒ، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر دہلیؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ (حال صدر شعبہ دینیات علیگزہ یونیورسٹی) نے ندوۃ المصنفین دہلی کی بنیاد ڈالی۔ یہ چاروں حضرات علامہ شاہ انور کشمیریؒ کے ہونہار خلفاء اور دارالعلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند ہیں۔ ان کی ساسی سے ندوۃ المصنفین دہلی نے اردو میں جو مفید دینی لٹریچر شائع کیا اس لٹریچر اور مذکورہ بالا لٹریچر کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اکابر دیوبند اور متبعین دیوبند نے عربی اور اردو میں کتاب و سنت اور فقہ کی اشاعت و تبلیغ میں جو گرفتار خدمات انجام دی ہیں اس کے مقابلہ میں کسی دوسری ایک جماعت یا سب جماعتوں کے دینی لٹریچر کو مل کر بھی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جن حضرات نے اس مفید دینی لٹریچر کا پورے غور سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام کو ناموسی سے وابستہ رکھتے ہوئے اور اسلاف پر تنقید سے بچتے ہوئے جدید نسلوں تک دین پہنچانے کی عزت انہی حضرات کو حاصل ہے یہ بزرگ پرانے متن میں نیا مطالعہ

کرنے کی بجز اللہ پوری استعداد رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس مفید دینی لٹریچر کے پیچھے کسی منظم پارٹی کا پرائیگنڈ نہیں اور نہ اسے کسی سیاسی مکرہ کی تائید حاصل ہے مگر یہ کوئی کمزوری نہیں دین کا تقدس ہے کہ اسے اس قسم کی آلائشوں سے پاک رکھا جائے۔

سرزمین پاک و ہند میں کئی افراد اور جماعتیں دین کا کام کر رہی ہیں۔ جماعت دیوبند کا امتیاز یہ ہے کہ یہ اپنے علم و فکر کو اسلاف سے جوڑ کر آگے چلتے ہیں۔ ان کا حال نامی سے مربوط اور ان کا دین عہد صحابہ تک مسلسل ہے دین کے نام پر جب یہ کہا جائے کہ پہلوں نے دین کو غلط سمجھا تھا، صرف ہم اس کے صحیح داعی ہیں یا اسلاف پر اس طور تنقید و جرح کی جائے کہ جس سے تقاضی عظمت دلوں میں راسخ اور اسلاف کی عزت و وقعت اور عظمت و رفعت کم ہوتی چلی جائے تو ظاہر ہے کہ ایسے داعی حق اس عظیم قافلے کے رکن نہیں ہو سکتے جو عہد رسالت کے بعد قیام حق کے لیے چلا تھا اور قیامت تک اس کے ارکان اس راہ پر کار بند رہیں گے۔ یہی حق کا تسلسل ہے اور یہی اسلام کی زندگی ہے، دین کی جو دعوت اسلاف سے مربوط نہیں وہ حق نہیں نفس کا فریب ہے، حضور ختم مرتبت ﷺ نے اسلام کے اس تسلسل کی یوں خبر دی ہے۔

لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر اللہ لا یضرهم من خذلهم او خلفهم حتی یاتی امر اللہ
(میری امت کا ایک طبقہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، اس کی مخالفت کرنے والے اسے کوئی ضرر نہ پہنچائیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے)

زیر نظر کتاب میں اکابر دیوبند کی جن خدمات کا ذکر ہے، یہ اہل حق عہد رسالت سے قائم بامر اللہ چلے آ رہے ہیں اور اس وقت بھی ان کے جانشین اور خلفاء اس عظیم قافلے کا نشان ہیں، علامہ اقبالؒ جب یہ کہتے ہیں کہ:

ع سوئے قطارے کشم ناقہ بے زمام

تو کیا وہ بھی اس مسلسل قطار کا ہی دم بھرتے ہیں اور اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کا اسناد قائم رہے۔ حضرت امام ابن

سیرین تو علم اسناد کو بھی دین ہی قرار دیتے ہیں کیونکہ اس پر دین کا مدار ہے امام مسلم ان سے نقل کرتے ہیں:-

ان هذا العلم دین فانظروا عمن نا خلدون دینکم

(بے شک یہ علم، علم اسناد، دین ہے پس دیکھو کہ تم کن لوگوں سے دین حاصل کرتے ہو)

ایک سوال اور اس کا جواب

اگر کہا جائے کہ جماعت دیوبند اپنی طور پر جماعت نہیں ان کی کسی ایک رکنش میں ممبر سازی نہیں، اس کے کارکنوں کے موضوع مختلف ہیں اگر مولانا سید حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ دہلوی استخلاص وطن کے لیے قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے رہے تو حکیم الامت حضرت تھانویؒ زیادہ تر حکمت اور تزکیہ نفوس میں مصروف رہے، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے فقہ و حدیث کی مسند نے زینت لی، حضرت مولانا محمد الیاس کاغذ حلوی امر بالمعروف کے لیے ہر ہستی و صحرائیں گھومے تو خیمہ انکسار کے لیے مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا عبد الشکور کھنوی، مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری اہل باطل کے سامنے تلوار بن کر جھکتے رہے اور ان

سب کے شیوخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر پٹی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے ترقی نفوس اور جہاد نفوس اور جہاد بالسیف، درس و تدریس اور مندر اور شاووقلائی میں ساری عمر گزار دی تو یہ افراد جو مختلف موضوعوں اور میدانوں میں کام کرتے رہے اور ہر ایک کا دائرہ علم ایک دوسرے سے مختلف رہا اب یہ مختلف حضرات اس عظیم قافلے کے رکن کیسے ہو سکتے ہیں جو عہد رسالت سے قائم بامر اللہ چلا آ رہا ہے، طائفہ دہی ہے جس کے ارکان ایک نظام میں منسلک ہوں۔ جواب عرض ہے کہ طائفہ کے لیے موضوع عمل ایک ہونا ضروری نہیں جو لوگ اصولاً متحد ہوں اور موضوعاً تقسیم کار میں جدا جدا کام کر رہے ہوں یہ ان کے ایک جماعت ہونے کے منافی نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ کبھی وہ ایک جگہ جمع ہوں اور ایک رجسٹر میں مندرج ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ اقطار عالم میں پھیلے ہوئے ہوں اور بعض ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ ہوں مگر سلف سے مربوط رہنے میں سب ایک دوسرے کے قوت و بازو ہوں، حدیث مذکورہ بالا کا محدثین نے یہی مطلب بیان کیا ہے، ساتویں صدی ہجری کے مشہور محدث امام حنی الدین نووی اس طائفہ کی شریعت میں لکھتے ہیں

قلت و یحتمل ان هذه الطائفة متفرقة بين انواع المؤمنين منهم شجعان مقاتلون ومنهم فقهاء ومنهم محدثون ومنهم زهاد و أمرون بالمعروف و الناهون عن المنکر ومنهم اهل النواع الاخرى من الخیر ولا یلزم ان یکونوا مجتمعين بل قد یکون متفرقين فی اقطار الارض وفي هذا الحديث معجزة ظاهرة فان هذا الوصف مازال بحمد الله تعالى من زمن النبی ﷺ الى الآن ولا یزول حتی یاتی امر الله المذکور فی الحديث و فيه دلیل لكون الا جماع حجة وهو اصح ما یستدل به من الحديث (میرے خیال میں طائفہ میں اس بات کی گنجائش ہے کہ وہ مسلمانوں کی متفرق اقسام پر مشتمل ہوں (۱) لڑنے والے بہادر بھی ہوں (۲) فقہاء بھی (۳) محدثین بھی (۴) زہاد و عابد بھی (۵) امر بالمعروف کا تبلیغ کام کرنے والا (۶) باطل کا مقابلہ کرنے والا اور (۷) کسی دوسرے نیک کام کرنے والے بھی، طائفہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ (ایک رجسٹر یا ایک جگہ) جمع ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اقطار ارض میں پھیلے ہوئے ہوں اس حدیث میں اسلام کا ایک ظاہر معجزہ مذکور ہے کیونکہ قیام بامر اللہ کا یہ وصف اس امت میں عہد رسالت سے اب تک مسلسل چلا آ رہا ہے اور یہ تسلسل اس وقت تک قائم رہے گا جب تک قیامت واقع نہ ہو جائے، اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امت کا اجماع حجت ہے اور اجماع کے تحت ہونے پر احادیث سے جو استدلال کئے گئے ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح استدلال ہے

اسناد و سلف کے اثرات

جن حضرات نے علم و عمل کے چراغ سلف کے اسناد سے روشن کیے ہوں ان کے ذمے سلف کا دفاع لازمی ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کے متکلف ہیں کہ اپنے اسلاف کے عمومی کردار کو ہر دور میں بے دارغ اور آئندہ نسلوں کے لیے بمنزلہ چراغ ثابت کرتے چلے آئیں، اس کے بغیر اسلام ایک مسلسل حقیقت نہیں رہتا، اور نہ اسے ایک زندہ مذہب کہا جاسکتا ہے۔

اسلام کے اس تسلسل کا آغاز صحابہ کرام سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ پاک و ہند کی علمی و عملی فضا میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے

۱۔ کیونکہ اجماع بھی ہو گا جب یہ طائفہ بھی ساتھ ہو اور اس طائفہ پر ہونا مقصود ہے نہیں اجماع کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا

خاندان تک پہنچتا ہے۔ ہمارے بعض دوست اس زنجیر کی پہلی کڑی کو کزور بتاتے ہیں اور جن چند نفوس کا اقرار کرتے ہیں انہیں بھی حکمت عملی (یا تقیہ) اور خاموشی کی چادر اوڑھ دیتے ہیں اور دوسرے بعض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے خاندان مثل شاہ اسماعیل شہیدؒ اور شاہ محمد اسحاق محدثین دہلی پر اعتراض کرتے ہیں اور گوان کے ایک بزرگ یہ بھی کہتے ہیں کہ علمائے محتاطین شاہ اسماعیل کو کافر نہ کہیں اسی میں سلامتی ہے مگر ان کی اس خاندان سے مخالفت پھر بھی دھکی چھپی نہیں، محدثین دہلی کے پیرو تحریک خلافت میں ترکوں کے ساتھ تھے لیکن یہ بزرگ اور ان کے ساتھی ترکوں کی مخالفت میں کام کرتے رہے ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ علمائے حق اسناد دین کے دفاع میں صحابہؓ پر تنقید اور مخالفت بھی روکیں اور محدثین دہلی کی بھی عمومی صفائی پیش کریں کیونکہ اسناد کی سبکی کڑیاں انہیں حضور ﷺ سے ملاتی تھیں اور اسلام کا تسلسل انہی حضرات سے قائم تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرو صحیح اسلام کے اسناد سے یوں بے نیاز ہو گئے کہ انہوں نے اس لڑی کے اعلیٰ ترین افراد صحابہ کرامؓ سے بھی ایک بڑا منصب (تہت) اپنے گھر میں جموڑ کر لیا اور مرزا نے اعلان کر دیا کہ وہ ہر حدیث جو میری وحی کے خلاف ہو قائل قبول نہیں، چودھری غلام احمد پرویز نے پرانے اسلام سے بغاوت کر کے نیا ”طلوع اسلام“ جاری کر لیا۔

دینی نظریات کی اس کش مکش میں علمائے دیوبند مکمل طور پر صحابہ کرامؓ سے لے کر محدثین دہلی تک اسناد اسلام کی ہر کڑی سے پورے وفادار رہے اور سلف صالحین کی اتباع کی یہاں تک پابندی کی کہ چھوٹی سے چھوٹی بدعت کو بھی دین نہ بنے دیا۔
دنیا نے اپنے آپ کو بدلا گھڑی گھڑی
اک اہل عشق ہیں کہ جہاں تھے وہیں رہے

تسلسل اسلام اور اسناد دین کو کزور کرنے والے ان مختلف طبقوں نے ان اکابر نے اگر کوئی اختلاف کیا تو یہ اس لیے نہیں کہ وہ اختلاف پسند تھے یا انہیں کسی طبقے سے کوئی ذاتی بغض تھا بلکہ محض اس لیے کہ اسلام جس مبارک سلسلے سے ہم تک پہنچا ہے اس سے پوری وفا کی جائے۔ ان کے الحادی یا بدعتی نظریات کی تخریب و تردید اس لیے ضروری تھی کہ اس کے بغیر اسلام کی تعمیر اور بقا کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن ان کی یہ تردید بھی اصولی رہی اور اس کا اعجاز جمل احسن رہا جس کی تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے
وجا دلہم بالشیء احسن (پ ۱۳) اور ان سے مجادلہ احسن (طور پر) کرو

ناموس صحابہؓ کا دفاع

ناموس صحابہؓ کے دفاع میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ہدایت الشیعہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ہدایت الشیعہ، حضرت مولانا غلیل احمد سہارنپوریؒ نے منقرتہ الکرۃ علیٰ مرآۃ الامتہ اور ہدایات الرشید الی افہام التعلید تحریر کیں اور محدثین دہلی کے علمی اور فکری موقف کی پوری نمائندگی کی جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ازالۃ الخفا عن خلافتہ اختلفا اور قرۃ العین فی تفصیل الشیخین اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب تھنہ اثنا عشریہ سے ظاہر ہے پھر امام اہل السنۃ حضرت مولانا عبدالکوکر لکھنویؒ دفاع صحابہؓ کی اس عظیم خدمت میں پوری عمر معروف رہے اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جیسی ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا یہ کئی جلدوں میں پھیلی ہوئی

کتاب تعارف صحابہ کا ایک انسائیکلو پیڈیا ہے اس کتاب کا ترجمہ مولانا عبدالکفور کا برصغیر پاک و ہند بڑا احسان ہے حضرت مولانا لکھنؤی نے ازلیہ الخلاء کا بھی تین جلدوں میں اردو ترجمہ کیا آیات امامت و خلافت اور مقام صحابہ سے دوسری آیات کی وہ بے نظیر تفسیر لکھی کہ اس کا تصور اس قرن میں مشکل تھا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے مقام صحابہؓ پر کامیاب مضامین لکھے اور جب وقت کی سیاسی آندھیوں نے قافلہ اسلام کی صف اول پر یلغار کی تو حضرت مدنی نے صحابہؓ کے معیار حق ہونے پر وہ مباحث تحریر فرمائے جو قرن حاضر کا سرمایہ فخر ہیں۔ پھر دفاع صحابہؓ کے لیے حضرت مولانا غلیل احمد محدث سہارنپوری کے شاگرد آگے بڑھے مولانا دلائی حسین ربکیں دپورہ نے صوبہ بہار میں اور سلطان المناظرین مولانا حافظ محمد شفیع سکھری نے پنجاب میں اس مورچے کو سنبھالا۔ مولانا دلائی حسین نے کشف التلبیس تین حصوں میں تحریر فرمائی اور حافظ صاحب مرحوم نے مناظرے کے پلیٹ فارم کو سنبھالا حضرت مولانا عبدالکفور کے شاگرد خصوصی مولانا بشیر احمد پرسوری، جو حدیث میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کے شاگرد اور سلوک میں شیخ انشیر حضرت مولانا حامد علی صاحب لاہوری کے خلیفہ مجاز تھے، نے پوری زندگی دفاع صحابہؓ کے محاذ پر لگا دی اور ان موضوعات پر پچیس کے قریب لاجواب رسائل تحریر فرمائے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا لکھنؤی کے ارشاد پر مخدوم القوم سردار احمد خاں پٹانی نے تنظیم اہل سنت کی بنیاد رکھی جو تقریباً نصف صدی سے دفاع صحابہؓ کی بیخ فروزاں ہاتھ میں لیے ہے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد مدنی کے شاگرد علامہ دوست محمد قریشی نقشبندی اور حضرت مولانا لطف اللہ جالندھری (جو حضرت مفتی نقیر اللہ صاحب رانپوری کے فرزند شریذ تھے) اس پلیٹ فارم پر فقہ رفیع والحاد کے خلاف بیخ براہ بن کر چمکے اور اسی محنت میں حضرت عثمانؓ کے یہ دونوں شاگرد اپنے خالق سے جا ملے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد اور خلیفہ مجاز مولانا قاضی مظہر حسین صاحب امیر انجمن خدام اہل السنۃ جو اپنے والد ماجد مولانا کریم دین دیر مصنف آفتاب ہدایت کی نسبت سے بھی دفاع صحابہؓ میں پورے مجاہد ہیں اسی میدان میں ربیع صدی سے خدمات جلیلہ سرانجام دے رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو خاصی شہرت رکھتی ہیں۔

حضرت مدنی کے شاگرد مولانا سید نور الحسن شاہ بخاری اور مولانا عبدالستار تونسوی اس وقت پوری قوم کو اسلام کی شاہراہ مسلسل کی دعوت دے رہے ہیں، اور اس شاہراہ کے پہلے قافلے کا پورا دفاع کر رہے ہیں، مولانا نور الحسن شاہ بخاری تنظیم اہل السنۃ کے قیام میں سردار احمد خاں پٹانی ربکیں اعظم جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں کے دائیں بازو تھے سالہا سال تک ہفت روزہ دعوت لاہور کے مدیر رہے اور دفاع صحابہؓ پر عظیم اور تاریخی خدمات سرانجام دیں، مولانا تونسوی دفاع صحابہؓ پر صف اول کے مناظر ہیں اور رب العزت نے انہیں ہر میدان میں عجیب فتح و نصرت سے نوازا ہے حضرت مدنی نے اپنے خلافت میں عظمت صحابہؓ اور دفاع صحابہؓ کی وہ روح پھونک رکھی ہے کہ جو بھی جہاں کہیں ہے شاہراہ اسلام کے اس ہر اول دستے کی مدح میں مصروف ہے اور قوم کو اسی کے نقش قدم پر آنے اور چلنے کی دعوت دے رہا ہے۔

عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ

اس عظیم شاہراہ اسلام پر ایک اور یلغار ہوئی۔ ایک بڑا فتنہ انکار ختم نبوت پیدا ہو گیا اور انگریز کی خانہ ساز نبوت کے داعی یورپ اور بلا و افریقہ میں تبلیغی مشن کے حسین عنوان سے مسلمانوں کو ارتداد کی دعوت دینے لگے۔ علماء حق نے مسلمانوں کو اس فتنے سے خبردار کیا سرخیل اکابر دیوبند حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر تکی نے اپنے خلفاء حضرت مولانا شرف علی تھانوی اور حضرت پیر بہار شاہ گولڑی کو اس طرف متوجہ فرمایا۔ پیر صاحب جہاز ہجرت کے ارادہ سے آئے تھے۔ حضرت حاجی صاحب مرحوم کی نظر بھاپ رہی تھی کہ حضرت گولڑی کو مرزا غلام احمد کے مقابلہ میں کام کرنا ہے آپ نے پیر صاحب کو واپس ہندوستان جانے کا امر فرمایا شیخ الہند کے شاگرد امام العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، مناظر اسلام مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا محمد عالم عاصی امرتسری اور مناظر اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری میدان میں نکلے اور ناقابل فراموش خدمات سر انجام دیں۔ شاہ صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں عربی اور فارسی میں کتابیں لکھ کر دوسرے ممالک کو بھی اس فتنے سے خبردار کیا اور پھر شاہ صاحب کے شاگرد حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد یوسف بنوری نے پوری قوت سے فتنہ انکار ختم نبوت کا مقابلہ کیا اور عقائد اسلام کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند اور دیگر مسلم ممالک کو وہ علمی اور تحقیقی مواد بھیہا کیا کہ منکرین ختم نبوت دم بخود رہ گئے مولانا مناظر احسن گیلانی کے شاگرد رشید پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ”قادیانی مذہب“ اب بھی قادیانی نظریات کا انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے۔

شیخ الہند کے شاگردوں میں مولانا ثناء اللہ امرتسری مسائل فقہیہ میں شیخ کے مسلک پر نہ تھے لیکن ختم نبوت کے لیے آپ کے ارشاد پر جان چڑھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا امرتسری کے ذریعہ اہل حدیث کے پورے حلقے میں مرزائیت کے خلاف بیداری پیدا کر دی اور مولانا امرتسری نے مولانا محمد امجد علی لکھنوی اور مولانا محمد داؤد غزنوی کو بھی اس پلیٹ فادام پر لاکھڑا کیا۔ فہمناہم اللہ

احسن الجزاء

میدان تبلیغ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شطرنجی سے نصف صدی کے قریب گرم رہا۔ شاہ صاحب آخر دم تک مرزائیت کے خلاف نبرد آزما رہے اور ان کے سروں پر تیغ براں بن کر نکلنے رہے۔ آپ کے بعد مولانا قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور مولانا محمد علی جالندھری نے اس مورچے کو سنبھالا اور اپنی زندگی اس محاذ پر لگا دی۔

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں صدر مولانا ابوالحسنات خلیف جامع مسجد وزیر خان لاہور تھے مگر موصوف میں یہ دلولہ پیدا کرنے والے اور انہیں اس صدارت کے لیے تیار کرنے والے خود مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تھے اور تحریک کی زمام کار حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ جب دو وقت قریب آیا کہ مرزائیت قانونی طوڑ پر بھی غیر مسلم اقلیت قرار پائے تو اللہ رب العزت نے مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر کے طور پر محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا انتخاب فرمایا۔ پھر ۱۹۷۲ء میں تمام مسلم جماعتوں نے حضرت مولانا بنوری کو مجلس اعلیٰ کا صدر منتخب کیا ملک میں ہمہ گیر تحریک چلی۔ پاکستانی قومی اسمبلی نے مرزائیوں کو قانونی طور پر مسلمانوں سے الگ ایک

غیر مسلم اقلیت قرار دیا۔۔۔ اور تحفظ ختم نبوت کا جو کام حاجی امداد اللہ اور علامہ انور شاہ کے الف سے شروع ہوا مولانا یوسف بنوری کی باپ باپ غیر مسلم اقلیت تک پہنچ گیا۔ اب خدام دیوبند خلف الممالک میں ختم نبوت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

علماء دیوبند نے اس محاذ پر نہ صرف عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کیا بلکہ اسلام کے جملہ وہ مسائل جن پر قادیانی الحاد کا اڑہ چل رہا تھا ان کا پورا دواغ کیا حرمات جہاد، مسیح ہندوستان میں، وفات مسیح اور مسیح خوارق عادت کے خلاف کام کیا مسلمانوں کو اسلام کی شاہراہ مسلسل سے جوڑا اور یہ ان کی قربانیوں اور محنتوں کا فیضان ہے کہ امت ان مسائل میں ابھی تک شاہراہ اسلام پر گامزن ہے۔

خدا رحمت کنہا میں عاشقان پاک طینت را۔

شیخ الغیر حضرت مولانا اجمل لاہوری اہل باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ شیخ بنیام رہے اور انہیں جہاں اور جب کہیں پتہ چلا کہ کوئی اسلام میں رخنہ اندازی کر رہا ہے اور ملت اسلامیہ کو سلف صالحین کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بجائے توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا کرنے والے پر غم خود میرا دل امت کی ایسی رہبری کر رہے ہیں کہ پوری تاریخ میں ملت کو ایسا عالی دماغ قائد و رہنما نہیں آیا تو حضرت مولانا اس کے سامنے بلا خوف و ولولہ لائے سینہ سپر ہو گئے، اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں جب انہوں نے محسوس کیا کہ فتنہ انکار حدیث پر ضرب کلہی کی ضرورت ہے تو انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں ایک جلسہ عام میں اعلان فرمایا کہ جو حدیث کا منکر ہے وہ قرآن کا منکر ہے اور قرآن کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی علما نے ربانی خاموش نہیں تھے، حضرت لاہوری کے اس نعرہ رستاخیز کے بعد ملک اور بیرون ملک کے ہر فرقہ و خیال کے علماء کے دستخطوں سے ایک ضخیم جلد شائع ہوئی جس میں حضرت مولانا کے اس خیال کی مکمل تائید کی گئی اور اس پر اجماع امت ہو گیا کہ حدیث کے منکر کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور اب اس سلسلے میں مولانا سرفراز احمد خاں صاحب صفحہ شیشہ الحمد حدیث مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں

رہ بدعت و شرک

اجماع سنت اور حدیث کا انکار کرنے والا گروہ ”مرکز ملت“ کے نام سے ایک نئی اصطلاح وضع کر کے قرآن کی تعبیر و تشریح کا اختیار اسے سونپ دیتا ہے کہ یہ نام نامی مرکز ملت زمانے کے تقاضوں اور امنگوں کے مطابق بغیر ع کے ارشادات، نبیائے فیصلوں اور اجماع امت کے مسائل سے قطع نظر کر کے جو چاہے فیصلہ کر دے۔ ایک دوسرا گروہ ایسا ہے جو ربانی کلامی محبت و عشق رسول کا بہت دعویدار ہے اور اپنے تمام احوال و طبقات امت کو قابل گردن زدنی اور دنیا کے ہر کافر و مشرک سے بدتر سمجھتا ہے لیکن عملاً اس کا حال یہ ہے کہ شریعت کے ہر نور چہرے کو کھج کر کے دین میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے اور جب ٹوکا جاتا ہے تو ”ثواب کا کام ہے، کیا حرج ہے“ ان جیسی باتیں کہہ کر اپنی وضع کردہ رسومات و بدعات کو اسلام میں داخل کرتا اور من گھڑت افکار کو شریعت قرار دیتا ہے اور پھر اس پر بس نہیں اپنے ان رسوم و رواج کو دین شریعت کا جزو بنانے کے لیے بے معنی دلائل کا انبار لگا دیتا ہے ایسے رسوم و رواج کو پیغمبر ﷺ نے بدعت قرار دیا ہے اور بدعت ایسی برائی ہے کہ جس کا چھوڑنا انتہائی مشکل ہے جتنا کسی کے لیے نیا دین اختیار کرنا، پیغمبر ﷺ اپنے ہر خطبہ میں بدعت کی برائی بیان فرمایا

کرتے تھے آپ ﷺ کے بعد صحابہؓ سے لے کر آج تک علمائے حقانی نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو سب سے زیادہ رد و بدعت پر مرکوز رکھا کیونکہ اسی سے شرک کی راہ نکلتی تھی۔ جانشینانِ محدثین دہلی نے اس سلسلے میں بھی بہت کام کیا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہید ربیوٹیؒ نے اس بارے میں بہت مضبوط موقف اختیار کیا، یہی وجہ ہے کہ مبتدعین کی نظر میں سب سے زیادہ یہی دو افراد ٹککتے ہیں، ان حضرات کے بعد اکابر دیوبند کی باری آئی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا ظلیل احمدؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے شرک و بدعت کے رد میں ناقابلِ فراہوش خدمات سر انجام دیں۔ ماضی قریب میں مولانا حسین علی (واں پھراں) اور مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری نے اس فریقہ کو بطریقِ احسن ادا کیا۔ مولانا محمد منظور نعمانی سالہا سال اس میدان میں کام کرتے رہے اور آج کل ان سب کی جانشینی کا حق تحریری طور پر مولانا سر فراز احمد خاں شیخ الحدیث مدظلہ مدرسہ عربیہ النور العلوم گوجرانوالہ سر انجام دے رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر انہوں نے قابلِ قدر ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس سے کتاب و سنت کی راہیں واضح اور کشادہ نظر آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اثر رکھے چنانچہ قزوین عرصہ میں ان کی اکثر کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ قافلہ اسلام کے ان کارکنوں کی نظر مخالفین کی مخالفت کی بجائے اصل اسلام کی اشاعت پر مرکوز رہتی ہے مخالفت نہ صرف رستے کی چھیڑ ہے جسے خدام دیوبند پسند نہیں کرتے، ہاں گلے پڑ جائے تو پھر اس سے گریز بھی نہیں کرتے پھر یہ حضرات ایسے کج رو انسانوں کو چھٹی کا دودھ یاد کرا دیتے ہیں اور صدق کی تلوار حق کا جلال بن کر چمکتی ہے اس کا متعجب بھی مخالف کی تذلیل نہیں متواتر اسلام کی وقافہ کیونکہ اسناد اسلام کی کڑیاں اپنی اپنی جگہ لائق تحفظ ہیں۔

رد بدعت میں داعیہ اہتمام

بدعت کا لفظ سنت کے مقابلے میں ہے جس طرح سنت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم تک مسلسل پہنچتی ہے بدعت اس سے پہچانی جاتی ہے کہ اس میں تسلسل نہیں ہوتا۔ اہل بدعت سے جب کسی عمل پر اس کے تسلسل کا حوالہ پوچھا جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑاتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اہل بدعت کا نظریہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی میں تسلسل ضروری نہیں اسلام میں نئے طریقے داخل کرنے کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔

مولانا احمد رضا خان نے فتاویٰ افریقہ ص ۱۱۲ میں تصریح کی ہے کہ راوی احداث کشادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بزرگ جو مسلسل اسلام پر رہنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی وہ مسلسل اسلام کی تعلیم دینے کے حامی ہیں وہ مولانا احمد رضا خان کا ساتھ نہ دے سکتے تھے انہیں سنت اسلام ہر مصلحت سے زیادہ پیاری تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ بتلاتی ہے کہ یہ حضرات اسلام کی سنت قائمہ کے حامی اور بدعت سے بہت دور تھے اور وہ اپنے کسی عمل کو جو شراہہ مسلسل سے نہ آئے وہ اسلام کا نام دینے کے لیے تیار نہ تھے پس رد بدعت میں ان حضرات کا موقف اسلام کی سنت قائمہ سے وفاداری تھی اہل السنۃ والجماعۃ وہ حضرات ہیں جو اسلام کی سنت قائمہ سے وابستہ اور جماعت صحابہؓ کے نقش پا سے دین کی راہیں تلاش کرنے والے ہوں اور احداث کشادہ (بدعت کا دروازہ کھلا ہے) کہہ کر بدعت کو فروغ نہ دیں، بدعت کا دروازہ کھلا رکھنے سے تفریقِ بین المسلمین لازمی ہوگی کیونکہ بدعات ہر ایک گروہ کی اپنی اپنی ہوں گی۔ یہ فقط سنت ہے جو تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو سکتی ہے اور ملت

واحدہ بنا کر رکھ سکتی ہے پس بدعت کے رد میں مذکور الصدور حضرات کا اہتمام کوئی منفی دہمیدہ نہ تھا بلکہ اسلام کی شاہراہ سے ٹھکانہ عقیدت تھی۔

عصری تقاضوں میں احساس ذمہ داری

علم و تحقیق اور تزکیہ و تدریس تک یہی نہیں، اکابر دیوبند نے نئے نئے پیش آمدہ حالات میں ملت کی ہر قدم پر راہنمائی کی ہے، جس طرح فروغی مسائل میں احمدیہ مجتہدین میں اختلاف ہوا اسی طرح خالفہ سیاسی مسائل میں ہر دور میں نظریاتی اختلاف پایا گیا ہے برصغیر میں بھی یہ نظریاتی اختلاف پیدا ہوا اکابر دیوبند کا ایک وقیع کردہ اگر کانگریس کے ساتھ اتحاد و اشتراک کو ملک و ملت کے لیے مفید خیال کرتا تھا تو دوسرا وقیع کردہ مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم اور کانگریس سے عدم اشتراک و اتحاد کا موہد تھا۔ پہلے کردہ کے قائد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور دوسرے کے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تھے اور دونوں گروہوں کا یہ اختلاف مبنی بر دیانت تھا اور ہر ایک کے پاس اپنے موقف کے لیے دلائل تھے یہ کہنا تاریخی حقائق کا منہ چڑانا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے تمام خدام یا متعلقین کانگریس کے موہد تھے، دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کی علی الاعلان حمایت کی اور مسلم لیگ کو مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر قرار دیا شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے پاکستان کی نہ صرف پرزور حمایت کی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ قائد اعظم کے بعد حضور پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرنے کا سب سے مؤثر عمل حضرت علامہ سی کا تھا تو بیجا نہ ہوگا، آپ نے قرار داد پاکستان میں بیان جاری فرمائے، جمعیتہ علمائے اسلام کی بنیاد رکھی، مضامین لکھے، پرزور تقاریر کیں، ہیرانہ سالی میں ہمت کو بخوان کر کے قائد اعظم کا پورا پورا ساتھ دیا، یہاں تک کہ ہندوستان کی فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی محرّافرس خطابت کا جواب مسلم لیگ کے پاس شیخ الاسلام کی وجد آفرین زبان تھی، اور، سابق صوبہ سرحد اور سلطنت (مشرقی پاکستان) کا ریفرنڈم تو شیخ الاسلام نے جیتا تھا، حضرت علامہ پاکستان کی حمایت میں نہ ٹکٹے تو آج یہ علاقے بھی ہندوستان کے پاس ہوتے، صوبہ سرحد اور سلطنت کی پاکستان میں شمولیت محدث دیوبند کا پاکستان پر احسان عظیم ہے، حلقہ دیوبند سے حضرت علامہ سی پاکستان کی حمایت میں نہیں ٹکے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی، مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، حکیم الامت قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی محمد حسن اور حکیم الامت کے دوسرے سب خلفاء پاکستان کے حامی تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے چار بڑے عہدیداروں، (سرپرست، صدر مہتمم، صدر مدرس، مہتمم) میں سے تین مسلم لیگ کے ہم خیال تھے، سرپرست حکیم الامت حضرت تھانوی تھے، صدر مہتمم شیخ الاسلام حضرت شبیر احمد عثمانی تھے اور مہتمم حکیم الاسلام قاری محمد طیب دامت برکاتہم تھے صدر مدرس شیخ الحدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کانگریس میں تھے۔

ہمیں ان دوستوں پر بہت افسوس ہے جو پاکستان کی مخالفت میں تو دیوبند کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں اکابر دیوبند کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا جاتا حالانکہ ان اکابر کی خدمات کے بغیر پاکستان کی تعمیر کس طرح ممکن نہ تھی۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا اختلاف بھی مسلمانوں کے سودے پر نہیں دینا ت پرستی تھا، ان کا خیال تھا کہ مسلمان وہ تو ایمان اور ہمت عمل رکھتے ہیں کہ

متحدہ ہندوستان میں کبھی مغلوب نہ رہیں گے ایک تہائی کے قریب اتنی بڑی اقلیت ہے کہ اگر یہ خدا کے ہو کر ہیں اور محمد بن قاسم، سلطان محمود غزنوی وغیرہم حضرات کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیں تو ہندو اکثریت ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی اور اگر ایمانی جذبہ مفقود رہا، بے عملی والحاد نے راہ پکڑ لی تو پھر ایک علیحدہ ملک لے کر بھی ان کا خواب شرمندہ تعمیر نہ ہو سکے گا۔ حضرت مولانا مہدی مسلمانوں کو اپنے آئینہ میں دیکھتے تھے، مگر حضرت تھانوی انہیں حالات کے آئینہ میں اور ان کی عملی کوتاہیوں کو دیکھ رہے تھے بہر حال اس سے انکار نہیں کہ حضرت مدنی کا اختلاف کسی غرض پر نہیں دیانت و خلوص پر مبنی تھا چنانچہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلم لیگ کے جلسوں میں فرمایا کہ مجھے مولانا حسین احمد مدنی سے پورا سیاسی اختلاف ہے مگر مجھے ان کی دیانت پر کبھی ایک لمبے کے لیے بھی شب نہیں ہوا، واقعی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں یہ حقیقت ہے کہ دیوبند کے ایک طبقے میں اگر کانگریس کی حمایت تھی تو دوسرا حلقہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیادت میں علی الاعلان مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔ اور حکیم الامت حضرت تھانوی کے تمام خلفاء بھی پاکستان کے حامی تھے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کی مخالفت میں حضرت مولانا مدنی کے اسم گرامی کو اچھالتے ہیں لیکن پاکستان کی حمایت میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، انہیں اصولاً اس وقت کے سیاسی اختلافات سے دلچسپی نہیں بلکہ علماء کے خلاف ایک اندرونی بغض ہے جس کو یہ لوگ وقتاً فوقتاً اُگتے رہتے ہیں، مسلمانوں کو ایسے بے رحم انداز گفتگو سے محتاط رہنا چاہیے، علمائے دین کے خلاف اس قسم کے خیالات دین سے بیزار کی ایک نیا عنوان ہے

قرارداد مقاصد

پاکستان بننے کے بعد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے مسلمانوں سے کئے گئے اس وعدے کو پورا کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن و سنت پر مبنی ہوگا اور پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے قرارداد مقاصد پاس کرائی جس میں اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ پاکستان ایک اسلامی سلطنت ہوگا اور اس کے قوانین شریعت اسلامیہ پر مبنی ہوں گے، شیخ الاسلام نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور بڑی محنت سے قرارداد مقاصد پاس کرائی مگر افسوس کہ مولانا کی وفات کے بعد کئی قیادت کے بددعوی نے اس قرارداد کو بھی ایک یادگار ماضی بنا کر رکھ دیا حالانکہ یہ قرارداد پاکستان کی روح تھی اور اس مقصد کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

تعلیمات اسلامی بورڈ اور شریعت کی قانونی دفعات

خان لیاقت علی خان مرحوم نے شیخ الاسلام کے ارشاد کے مطابق تعلیمات اسلامیہ کا ایک بورڈ قائم کیا جو شریعت کی روشنی میں پاکستان کی قانون سازی کرے اور پھر یہ سفارشات دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوں، بعض اعیان حکومت کا خیال تھا کہ علمائے اسلام وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلامی قانونی جزئیات مرتب نہ کر سکیں گے اور روایات کے اختلاف میں الجھ کر رہ جائیں گے مگر علمائے دیوبند نے وقت کے اس چیلنج کو بھی قبول کر لیا اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور حضرت علامہ سید محمد سلیمان ندویؒ غلیظہ خاص حضرت حکیم الامت تھانویؒ جو اس بورڈ کے ممبران میں سے تھے انہوں نے اس بیدار مغزی روشن خیالی اور وسعت نظر سے اسلام کی قانونی جزئیات مرتب کیں کہ حکمران طبقے کے لیے اعتراض کا کوئی موقع نہ رہا سوائے اس کے کہ وہ قانونی مسودات کو

سرخ فیتے سے بائندہ کر رکھیں اور دستور ساز اسمبلی تک پہنچنے ہی نہ دیں۔ ہمیں اس وقت اس کی علت و غایت سے بحث نہیں، ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ علمائے دیوبند نے وقت کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہر موقع پر مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر علمائے اسلام نے اپنے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی بھی پوری صلاحیت رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ اجتہاد آزاد نہ ہو۔ پچھلے مجتہدین کرام کے بیان کردہ اصولوں کے ماتحت ہو اور اس کا مقصد بھی نئے مسائل کا حل ہو، پہلے فیصلوں کی تردید و تنقیص نہ ہو۔ اس قسم کے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے، نئے اجتہاد کا مطلب پچھلے مجتہدین کی تغلیط نہیں پچھلے ذخیرہ اجتہاد پر ایک ضروری اضافہ ہے، علمائے دیوبند نے اس قسم کے اجتہاد کو کبھی مخ نہیں کیا، ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی اجازت انہی لوگوں کو ہو جو اس کے اہل ہوں اور پچھلے فقہاء و مجتہدین کے اصول و فروع پر پوری نظر رکھتے ہوں۔

اسلامی دستور مملکت کی مساعی

پاکستان ایک مسلم جمہوری مملکت ہے، یہاں ہر کتب فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ہر ایک کی فکر اور فقہ جدا ہے، شیعہ لوگوں میں اکثریت اثنا عشری فرقے کی ہے، اہل سنت کے بڑے بڑے گروہ دیوبندی اور بریلوی ہیں، اہل حدیث کے ہم خیال بھی کافی موجود ہیں مولانا مودودی کے ہم مسلک بھی کچھ نہ کچھ پائے جاتے ہیں، ان تمام مکاتب فکر میں کوئی ایسا کتب نہیں جس پر دوسرے سب مکاتب جمع ہو جائیں، ہر ایک کے اپنے اصول ہیں اور اپنے مسائل ہیں۔ ان میں سے جو جماعت بھی فسادِ شریعت کے لیے آگے بڑھے گی دوسری جماعتیں اسے اپنے مسلک کے لیے خطرہ سمجھیں گی، گو وہ جماعت دوسرے مکاتب فکر کو کتنا ہی یقین کیوں نہ دلائے کہ اسلامی قانون سازی کے وقت ہر کتب فکر کی فقہ کا پورا احترام کیا جائے گا، یہ یقین دہانی اسی قسم کی ہوگی جیسے کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے پر ہر طبقہ کو اس کے حقوق پورے ملیں گے، لیکن مسلم لیگ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اقتدار پر قبضہ ہونے کے بعد مسلمان انہی کے رحم و کرم پر ہوں گے، اسی طرح مسلمانوں کا ہر کتب فکر نظام اسلامی کے قیام کی باگ کسی ایک کتب فکر کے ہاتھ میں دینا اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے، مبادا وہ لوگ اقتدار پر آکر ان کی فکر و فقہ کو نظر انداز کر دیں، جماعت اسلامی اگرچہ اپنے آپ کو تمام فرقوں سے بالا سمجھتی ہے اور گروہی تعصبات سے دور رہنے کا اعلان کرتی ہے، لیکن علماء و مولانا مودودی کی مساعی سے ایک فرقہ بین چکی ہے جس کو ہر فرقے نے توڑنا بہت اختلاف ہے، جماعت کی اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کے ارکان اور محققین وغیرہ زیادہ تر مولانا مودودی کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس ایک مسلک فکر کے ساتھ وہ تمام مکاتب فکر کی نمائندگی کرنا چاہتے ہیں، اور جب یہ بات سامنے آتی ہے تو مولانا مودودی کی یقین دہانی پھر وہی رنگ اختیار کرتی ہے جو کانگریس کے لیڈر اختیار کرتے تھے، ان حالات میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ پاکستان میں اسلامی دستور مملکت اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے یہاں کے رہنے والے تمام مکاتب فکر مشترک کمان نہ لیں، جماعت اسلامی کے ارکان علیحدہ علیحدہ ہر کتب فکر کے افراد کو اپنے ساتھ سمجھتے ہیں، لیکن ان کے مکاتب فکر کو ان کی نمائندہ حیثیت میں کبھی انہوں نے دعوت نہیں دی اور نہ انہوں نے دوسرے تمام مکاتب فکر کی کبھی کوئی مشترک میٹنگ بلائی ہے، نظام

سنائی کے تقاضے کے لیے وہ کسی مشترکہ قیادت کے قائل نہیں! علمائے دیوبند اس اصولی ضرورت سے پوری طرح باخبر تھے، نظام اسلامی سے گریز پائی کرنے والے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو نظام اسلام کے تقاضا کا ایک بہانہ بنا رہے تھے، علماء دیوبند نے اس مغرب زدہ طبقے کا چیلنج بھی قبول کیا اور اگرچہ میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی ایک مشترکہ میٹنگ بلائی، جس میں دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتب فکر کے اکابر شامل ہوئے مولانا مودودی نے اپنے کتب فکر کی نمائندگی خود کی، اکتیس علماء کی یہ نمائندہ میٹنگ بلائے کا سہرا علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے سر بندھا، کافی بحث و تحقیق اور محنت و عرق ریزی کے بعد وہ مشترکہ دستوری خاکہ تیار ہوا، جس پر تمام مکاتب فکر متفق ہوئے، یہ اکتیس علماء کا تاریخی فیصلہ کہلاتا ہے اور بار بار پھسپ چکا ہے اور ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جو فرقہ وارانہ اختلاف کی آڑ میں اسلامی نظام زندگی سے بھاگنا چاہتے ہیں، علمائے دیوبند کا یہ تاریخی کارنامہ ہے جو برقی دنیا تک مثال رہے گا، ہمیں اس وقت اس کی تفصیلات سے بحث نہیں، ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرزمین پاک و ہند میں مسلک دیوبندی ایسا معتدل مسلک ہے جس کے علماء نے باہمی اختلاف کو کم کرنے اور مشترکہ ملی ضروریات کے موقعہ پر مختلف مکاتب فکر کو جوڑنے کی پوری غلصہ اندکوشش کی ہے۔

عالمی قوانین اور علمائے حق

عالمی اختلافات و مسائل پر حکومت پاکستان نے ایک عالمی کمیشن مقرر کیا جو یہ رپورٹ پیش کرے کہ عالمی قوانین کو کس طرح کتاب و سنت کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔ اس کمیشن میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی ایک رکن تھے لیکن اس کے باقی ارکان مغرب زدہ تھے، انہوں نے اپنی جو رپورٹ مرتب کی اس میں عورتوں کے حقوق کی گہما گہماشت کے عنوان سے ایسی تجاویز پیش کی گئیں جو سراسر اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں، مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس پر اختلاف کیا اور اپنا ایک مفصل اختلافی نوٹ لکھا جو کتاب و سنت کی صحیح حکایت کرتا تھا، خود اعیان حکومت میں اکثر ایسے افراد کی تھی جو اسلام کے نام سے غیر اسلامی قانون کو نافذ کرنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اس اختلاف کو اہمیت نہ دی، عالمی سفارشات جو منظور کی درجہ میں تھیں، لیکن ان کا تقاضا نہ ہوا تھا کہ مارشل لاء کا تقاضا ہو گیا، اور مارشل لاء کے سائے میں ان سفارشات کو ایک آرڈی ننس کے ذریعہ قانون کی شکل دے دی گئی اور اس کی دفعات قوم کے سامنے آئیں تو معلوم ہوا کہ بعض امور میں صریحاً قرآن و سنت کی مخالفت کی گئی ہے اور قرآن پاک میں تحریف کردی گئی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب "خلیفہ اکبر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی" کی تجویز و صدارت میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، تمام مکاتب فکر کا نمائندہ اجتماع جامعہ اشرفیہ فیلا گنبد میں ہوا، اور بالاقاق عالمی قوانین کو مدخلت فی الدین قرار دیا گیا، لیکن اس فیصلہ کی اشاعت کی اجازت نہ ملی، اسی طرح مولانا احمد علی کی صدارت میں اسی قسم کا فیصلہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں صدر محمد ایوب خاں مرحوم نے ملک کو

۱۔ امیر جماعت اس دور میں دینی اسلام کہلاتے ہیں، بلکہ انہوں نے خود بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ "دینی اسلام ہے چاروں ایک کرے" سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام کے تقاضے کے لیے مختلف مسلمانوں کو یکجا کرنے کے لیے تاریخ کیا تحریریں طوہر "سبق دیتے ہیں کہ شامت مسلک کو یکجا کرنے کے لیے کڑے اصولوں اور ایسی نعرے کی بدولت شروع شروع میں ہندوستان کے بعض بڑے علماء نے اس آواز پر لبیک کہی اور ان کا نعرہ بنے ان کی تحسین بھی کی جس کا ج بھی جماعت اسلامی اچھا نیتی ہے لیکن علماء بعض استبدادی مسائل اور بعض دوسرے امور میں پوری امت کے عہدوں پر تنقید کے اہل سنت و الجماعت کے تمام فرقوں نے ایک طوہر فرقہ بن کر نہ گئے ہیں اسلامی نظام جو اہل متعصبہاں کے لیے تو وہ مشترکہ قیادت کے قائل نہیں لیکن جمہوریت کے لیے ستر مضامین جناب کی بھی قیادت قبول کرتے ہیں اور تو بار بار اللہ تعالیٰ خاں کی بھی رعایت چاہی ہو گئی است (ارشاد)

نیا آئین دیا اور اس کے تحت انتخابات ہوئے، ہزارہ سے مولانا غلام غوث ہزاروی صوبائی اسمبلی کے اور ذریعہ اسماعیل خان سے مفتی محمود صاحب قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ صوبائی اسمبلی میں عالمی قوانین کے خلاف صدائے بازگشت سنی گئی، مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس سلسلے میں ایک معرکہ الہٰی رائے کی اور کہا کہ صوبائی اسمبلی ان قوانین کو مسترد کرنے کی سفارش کرے، ایک مرد مجاہد کی لگاکرات و بیباکی اور کتاب و سنت کی ترجمانی کا یہ اثر ہوا کہ سوائے چار پانچ مجاہدوں کے تمام ہاؤس نے مولانا کی تائید کی..... اور عظیم اکثریت سے مولانا کی تجویز پاس ہوئی، اور یہ قرارداد مرکزی اسمبلی کو بھیج دی گئی، لیکن قومی اسمبلی میں اس کا جو حشر ہوا وہ ایک طویل دل گداز داستان ہے، جس کو علامہ قابلؒ کے الفاظ میں مختصر یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

آجائوں تجھ کو مرزا یہ ان الملوک
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر

سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادوگری
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمران کی ساعری

ختم نبوت اور علمائے حق

اسلام اللہ کا آخری دین ہے۔ قرآن پاک خدا کی آخری کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں، لیکن مملکت پاکستان میں بوجہ اس عقیدہ کے خلاف کام ہوتا رہا، ضرورت محسوس ہوئی کہ تحفظ ختم نبوت کے بارے میں ایک موثر تحریک چلائی جائے اور حکومت تک اپنے مطالبات پہنچائے جائیں، چنانچہ مولانا محمد علی جالندھری نے تمام مکاتبات فکر کے تقریباً پانچ صد نمائندہ علمائے کرام کو دعوت دی اور برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ایک عظیم تاریخی اجتماع ہوا اور طے ہوا کہ اس سلسلے میں آئینی اور قانونی طور پر اپنے مطالبات حکومت تک پہنچائے جائیں، ایک مجلس عمل ترتیب دی گئی جس کے صدر مولانا ابوالحسنات قادری خلیفہ جامع مسجد وزیر خان مقرر ہوئے، تحریک پر اس طریقے سے چل رہی تھی کہ مجلس عمل کے تمام ارکان کو کراچی میں گرفتار کر لیا گیا، تحریک اتنی ہمہ گیر اور وسیع ہو چلی تھی کہ مغربی پاکستان کے نوے فیصد عوام اس کے ساتھ تھے، وزیر اعلیٰ پنجاب محمد متاورد دلہانہ نے بھی ہمنوائی کی، امید تھی کہ اس عوامی اور اسلامی تحریک کے دور رس نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجلس عمل کی گرفتاری سے ملک میں آگ لگ گئی، اور تحریک جذبات کی نذر ہو گئی، اس کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور لاہور میں مارشل لا لگانا پڑا اس کی تمام تر ذمہ داری حکومت کی غلط پالیسی اور مجلس عمل کے ارکان کی گرفتاری کا رد عمل تھی، عرض کرنا یہ مقصود ہے کہ علمائے حق نے یہاں بھی مذہب اسلامیہ کے ایک اہم بنیادی مسئلہ کی حفاظت کے لیے پوری اہمیت کو ایک سٹیج پر لا کھڑا کیا، جو لوگ کہتے ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے، وہ حقائق سے چشم پوشی کرتے اور اپنے مخصوص مفادات و نظریات کے پرچار کی خاطر ہمیشہ سے غلط پروپیگنڈا کرتے چلے آئے ہیں، یہ تحریک دینی طور پر درد منگتی تھی، لیکن اس کی بنیادیں خلوص اور لاتعداد قربانیوں کا خون تھا، شہیدوں کا خون ہمیشہ رنگ لاتا ہے، چنانچہ ۱۹۷۷ء میں یہ تحریک حضرت مولانا یوسف بنوری کی قیادت میں کامیابی سے ہمکنار ہو گئی اور مرزائی قانون کی نظر میں باقاعدہ غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔

اس مختصر تحریر میں ان خدمات کی تفصیل کا حقد پیش نہیں جاسکتی جو ان علمائے حق نے برصغیر پاک و ہند میں ملت اسلامیہ کی رہنمائی کرتے ہوئے سرانجام دیں، اس کام کی قدرے تفصیل ”میں بڑے مسلمان“ میں آپ کو ملے گی، یہ کتاب میں علمائے حق اور

موسلمین کی متاع حیات ہے، جس میں ذی علم اور فاضل حضرات کے قلم سے ان اکابر کے سیرتی خاکے پیش کئے گئے ہیں، یہ کتاب ان اہل حق کی پاکیزہ داستان ہے جو ایک صدی کے قریب اپنے اپنے دائرہ عمل میں حق کا نشان بنے رہے، اس پاکیزہ داستان کی تحریک تجویز اور ترتیب عزیز محترم حافظ عبدالرشید ارشد فاضل خیر المدارس نے کی ہے، جو اس پاکیزہ کوشش پر بدیہ تبریک کے مستحق ہیں، رب العزت عزیز موصوف کی اس کوشش کو اسی طرح حیات دوام بخشیں جس طرح انہوں نے اپنے اسلاف کی خدمات کو زندہ رکھنے کی یہ گراں بہا کوشش کی ہے۔

نام نیک رفیقاں ضائع مکن تاہم اند نام نیکت برقرار

راہم المحروف اپنی علمی بے بضاعتی اور ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ ان پاک باز و پاک نہاد اکابر کی سوانح پر کچھ بطور لکھے لیکن مولانا موصوف کے اصرار اور گزشتہ کئی سال کی مودت نے مجبور کر کے یہ چند سطور لکھوا دی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے ان بزرگوں کے تجربہ، تقدس اور ان کی قربانیوں کا حق ادا نہیں ہو سکا، لیکن اس اعتبار سے یہ کچھ امید ہو گئی ہے کہ رب العزت ان کی محبت کا صدقہ ان کے ساتھ خشر فرمائے۔

أَحِبِّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللَّهَ يَرْزُقَنِي صِلَاحًا

یہ سطور اپنے وطن سے ہزاروں میل دور انگلستان میں جہاں کوئی مطلوب کتاب پاس نہیں مسافرت کی حالت میں لکھی گئی ہیں کوئی کمزوری رہ گئی ہو یا کوئی ضروری بات نہا سکی ہو تو دوستوں سے معذرت اور چشم پوشی کا خواستگار ہوں۔
خالد محمود حال مقیم برمنگھم

اب پاکستان میں علمی، فکری، مجاہد پر حضرت مولانا سرفراز خاں صاحب صدر، حضرت علامہ خالد محمود صاحب اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی اور حضرت محمد یوسف لدھیانوی مدظلہم کی خدمات بہت نمایاں ہیں۔ (ابرشد)

از حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند

تیرھویں صدی ہجری آخری سانس لے رہی تھی۔ ہندوستان میں اسلامی شوکت کا چراغ گل ہو چکا تھا، صرف اٹھتا ہوا دھواں رہ گیا تھا جو چراغ بجھ جانے کا اعلان کر رہا تھا۔ دہلی کا تخت مغل اقتدار سے خالی ہو چکا تھا۔ صرف ڈھول کی منادی میں ملک بادشاہ کا "کہ گیا تھا۔ اسلامی شعائر رفتہ رفتہ زوال تھے۔ دینی علم اور تعلیم گاہیں پشت پناہی ختم ہو جانے کی وجہ سے ختم ہو رہی تھیں۔ علمی خانوادوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ دینی شعور رخصت ہو رہا تھا اور جہل و ضلال مسلط قلوب پر چھانا چلا جا رہا تھا۔ مسلمانوں میں پیغمبری مسئول کی بجائے جاہلانہ رسوم و رواج، شرک و بدعت اور ہر باہشتی وغیرہ نذر پرکھنے جا رہے تھے۔ مشرقی روشنی چھپتی جا رہی تھی اور مغربی تہذیب و تمدن کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ جس سے دہریت و احماد فطرت پرستی اور بے قید و نفس، آزادی فکر اور بے باکی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں جس سے نگاہیں خیرہ ہو چلی تھیں۔ اسلام کی حقیقی جاگتی تصویر بیاں آنکھوں میں دھندلی نظر آنے لگی تھی اور اتنی دھندلی کہ اسلامی ضد و خال کا سپہا نا بھی مشکل ہو چکا تھا، چمن اسلام میں خزاں کا دور دورہ تھا۔ خوش آواز اور شیریں آواز پرندوں کے زمرے دم ہوتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ زار و زلف کی کڑوا آوازوں نے لے لی تھی اور اسی قسم کے اور ہزار ہا حوادث اور المناک واقعات کے چند اجمالی عنوانات ہیں جن سے اس وقت کے ہندوستان کی مسموم فضا کا اندازہ لگانا چندان مشکل نہیں۔

انہ کے باوجود بگنہتیم و بدل ترسیدیم کہ دل آزرہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ان حالات سے یقین ہو چلا تھا کہ اسلام کا چمن اب اجڑا اور یہ کہ اب ہندوستان بھی، اسپین کی تاریخ دہرانے کے لئے کمر بستہ ہو چکا ہے کہ اچانک چند نفوس قدسیہ نے بالہام خداوندی اپنے دل میں ایک غلش اور کسک محسوس کی۔ یہ غلش علوم نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستے سے تم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں کہ اس وقت بقائے دین کی صورت ہجرت ہے۔ اس کے اور کچھ نہیں کہ دینی تعلیم کے ذریعہ مسلمانان ہند کی حفاظت کی جائے اور تعلیم و تربیت کے راستے سے ان کے دل و دماغ کی تعمیر کر کے ان کی بقا کا سامان کیا جائے اور اس کی واحد صورت یہ ہی ہے کہ ایک درس گاہ قائم کی جائے جس میں علوم نبویہ پڑھائے جائیں اور ان ہی کے مطابق مسلمانوں کی دینی، معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچوں میں ڈھالی جائے جس سے ایک طرف تو مسلمانوں

کی داخلی راہ نمائی ہو اور دوسری طرف خارجی مداخلت۔ نیز مسلمانوں میں صحیح اسلامی تعلیمات بھی پھیلیں اور ایمان و ارادہ سیاسی شعور بھی بیدار ہو۔ ان مقاصد کے لئے کربانہ کر اٹھنے والے یہ لوگ رسمی قسم کے راہنما اور لیڈر نہ تھے بلکہ خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاءِ وقت تھے اور ان کی یہ باجمعی گفت و شنید کوئی رسمی قسم کا مشورہ یا تبادلہ خیال نہ تھا بلکہ تبادلۃ الہامات تھا۔ جیسا کہ میں نے حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمہ اللہ مہتمم سائنس و دارالعلوم دیوبند سے جتنا کہ وقت کے ان تمام اولیاءِ اللہ کے قلوب پر بیک وقت یہ الہام ہوا کہ اب ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی واحد صورت قیامِ مدرسہ ہے چنانچہ اس مجلس مذاکرہ میں کسی نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ خطبہ دین و مسلمین کے لئے اب ایک مدرسہ قائم کیا جائے کسی نے کہا کہ مجھے کشف ہوا ہے کہ مدرسہ قائم ہو۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسہ کا قیام ضروری ہے۔ کسی نے بہت صریح لفظوں میں کہا کہ مجھے منجانب اللہ الہام کیا گیا ہے کہ ان حالات میں تعلیم دین کا ایک مدرسہ قائم ہونا ضروری ہے۔ ان اہل اللہ کا اس تبادلۃ واردات کے بعد قیامِ مدرسہ پر جم جانا درحقیقت عالمِ عجیب کا ایک مرکب اجماع تھا جو قیامِ مدرسہ کے بارہ میں منجانب اللہ واقع ہوا۔

اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں قیامِ مدرسہ کی یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی۔ وہیں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی۔ جو محض مقامی یا ہنگامی نہ تھی کیونکہ اسلامی شوکت ختم ہو جانے کا اثر بھی مقامی نہ تھا۔ جس کے تدارک کی فکر تھی وہ فکر تھی کہ پورے ملک پر پڑ رہا تھا اس لئے اس کے دفعیہ کی یہ ایمانی رنگ کی تحریک بھی مقامی انداز کی نہ تھی بلکہ اس میں عالمگیری پنہاں تھی۔ گو ابتداء میں اس کی شکل ایک چھوٹے سے حجم کی سی تھی، مگر اس وقت اس میں ایک تناور شجرہ طیبہ لپٹا ہوا تھا جس کی برطیں سچے قلوب کی زمین میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے ٹاٹیں کر رہی تھیں۔ اس سلسلہ میں ان نفوسِ قدسیہ کے سربراہ حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ تھے جنہوں نے اس غیبی اشارہ کو سمجھا اور اُسے ایک تجویز کی صورت دی۔

بنائے دارالعلوم

کچھ وقت گزرنے کے بعد یہ مبارک تجویز عملی صورت میں نمودار ہوئی اور ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ

مطابق ۲۰ مئی ۱۸۶۶ء کو دارالعلوم کی بنیاد رکھ دی گئی

بنیاد رکھنے کی تفصیلات سوانح قاسمی میں ملیں گی۔ اس بنیاد میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب
قدس سرہ، حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہ اور حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہ قابل ذکر ہیں جو
کا مکتبہ ابتدا ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی قدس سرہ کے دست و بازو رہے
ہیں اور بنیاد کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن رکن کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ بعد میں
اقدس مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس مجلس خیر کے رکن رکن ہوئے اور بالآخر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ
کے ارشاد و ایما پر دارالعلوم کے عمدہ اہتمام پر فائز ہوئے اور آپ کا عہد اہتمام خیر و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ دارالعلوم
کی معنوی بنیاد کے لئے تو حضرت نانوتوی قدس سرہ نے اٹھ اصول تحریر فرمائے۔ جو اس ادارہ میں تمام قوانین کے لئے اساس
بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھ اصول عملی تجویز فرمائے جو اس
ادارہ کے نظم و انتظام کی اساس و بنیاد ہیں۔ دونوں بزرگوں کے اصول و ہدایت گانہ درج ذیل ہیں جو اس دارالعلوم کی حکمت
عملی اور نظم و انتظام کی اساس ہیں۔

اساسی اصول و مشنگانہ

از حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ — بانی دارالعلوم دیوبند

۱۔ اصل اول یہ ہے کہ تمام درکارکنان مدرسہ کی ہمیشہ بخیر چہ پر نظر رہے، آپ کو شمش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیش مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے

۲۔ ابقار طعام طلباء، بلکہ افرائش طعام طلباء میں جس طرح جو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ سماعی رہیں۔

۳۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو۔ اپنی بات کی کچھ نہ کی جائے، خدا نخواستہ سبب اسکی نوبت آئی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت راستے اور اوروں کی راستے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔

۴۔ الفتہ تدول سے بروقت مشورہ اور اس کے پس پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متبادل نہ ہوں اور سامعین بریت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بدل و جان قبول کریں گے نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ ہمت امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کرے۔ خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی دار و صادر جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسہ خیر اندیش جو اور نیز اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آوے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار مختار سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ ہاں اگر ہمت بے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۵۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے تو ہیں نہ ہوں۔ خدا نخواستہ سبب اس کی نوبت آئے گی تو مدرسہ کی خیر نہیں۔

۶۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۷۔ اس مدرسہ میں حبیبک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جیتک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توبہ الی اللہ چلیگا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگی جسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی ایسی دیگر اقول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ خوف رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے یا تھکے سے جانا بڑیگا اور مال و غلبی ہو توقف ہو جائیگی اور اگر توں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا۔ الفتہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سرمایہ آمدنی ہے۔

۸۔ سرکار کی شرکت اور املا کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۹۔ تمام درکار ایسے لوگوں کا چہدہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چہدے سے اُمید ناموری نہ ہو بالجلہ حسن نیت اہل چہدہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

انتظامی اصول ہشتگانہ

از حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ — مہتمم دوم دارالعلوم دیوبند

۱۔ ہر کارخانہ کے امور جزئیہ کی بنا۔ ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہیے۔ اسی قاعدہ پر اس کارخانہ کے امور جزئیہ کے میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہوا مشورہ اور رائے کہ وہ اپنے موقع پر اظہار فرمادیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کرے۔
۲۔ امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا مشکور ہوگا مگر انجام امور موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہیے۔

۳۔ جس کسی صاحب کو، خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق، کوئی امر قابل اعتراض معلوم ہو تو مہتمم سے مزاحمت نہیں جلتے شوریٰ میں پیش کر کے اس کو ملے کر الیں اور جیسا قرار پائے اس کے انجام پر مہتمم کو غور نہ ہوگا۔
۴۔ مشورہ کے جلسے جب کبھی ہوں بے حاضری، مہتمم نہ ہوں گے اگرچہ اس کی بھی کسی بات پر غور نہ ہو اور یوں اہل شوریٰ اختیار اعتراض کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔

۵۔ مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام پر انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو ابلاغ دے گا اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہوگا۔

۶۔ آمدنی مدرسہ کی مہتمم کے ہاتھ نہیں رہے گی کیونکہ صرف ضروریہ کے لئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضروری حاجت ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کرے گا تو غواچی کے پاس جمع کر دیا جائے گا۔

۷۔ ہر روز وقت مقررہ مدرسہ پر مہتمم میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرسہ کو انجام دیا کرے گا۔
۸۔ مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے دستخط اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جاتے سند رہے۔

دستخط

العبد محمد عابد

دستخط

العبد ذوالفقار علی

دستخط

العبد محمد قاسم

(تحریر ۳ ذیقعدہ ۱۳۸۸ھ)

دارالعلوم کی تاسیس اور پیشین گوئیاں

دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جسے چھتہ کی مسجد کہتے ہیں ایک انار کا درخت ہے۔ اسی درخت کے نیچے سے آپ بیات کا یہ چشمہ بھڑٹا اور اسی چشمہ نے ایک طرف تو دین کے چمن کی آبپاری شروع کر دی اور دوسری طرف اس کی تیز دھڑکنے شرک، بدعت، فطرت پرستی، الحاد و دہریت اور آزادی فکر کے انخس و خاشاک کو بھی مہانا اور راستہ سے نشانہ شروع کر دیا جنہوں نے مسلمانوں کے قلوب میں جو بڑا پکڑ کر انہیں یہ روز بد دکھایا تھا۔ باقی دارالعلوم کا یہ خواب کہ میں ماں کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ماتحتوں اور پیروں کی دسوں انگلیوں سے نہریں جاری ہوں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں اور اپنا اور مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہمارا ہو گئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مہاجر مدنی قدس سرہ کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں مجھے دی گئی ہیں، خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت کے پاس میں جلوہ گر ہو گیا۔

اور اس مدرسہ کے ذریعہ ان چابیوں نے ان قلوب کے تالے کھول دیئے جو علم کا ظرف تھے یا ظرف بننے والے تھے جن سے علم کے سوتے ہر طرف سے پھوٹنے لگے اور چند نفوس قدسیہ کا علم ان کی آن میں ہزار بار علما کا علم ہو گیا حضرت سید احمد شہید اے بریلوی دیوبند سے گذرتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تھے جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے۔ پس وہ خوش ہو جس کو سید صاحب کی روحانی قوت شام نے سونگھا تھا ایک سدا بہار گلاب لے پھول، بلکہ گلاب آفریں درخت کی شکل میں آگئی جس سے ہزاروں پھول کھلے اور ہندوستان کا اُبڑا ہوا چمن تختہ گلاب بن گیا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ خوش بو بیج بنے گی، بیج سے کلی کھلے گی، شگفتہ کلی سے پھول بنے گی، پھول سے گلستان بنے گی اور اس گلستان کی خوشبو سے سارا عالم انسانی مہک اٹھے گا اور کسے پتہ تھا کہ ایشیا کی فضا میں مغربی استعماریت کے جو براہیم پھیلے ہوئے ہیں وہ اس کی براہیم کش مہک سے آپ ہی اپنی موت مرے شروع ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے برطانوی ہند میں نئی فاتح قوم انگریز کو کنگرہ کی کہ ہندوستان کے دل و دماغ کو یورپین سانچوں میں کس طرح ڈھالا جائے جس سے برطانویت اس ملک میں جو بڑا کڑے کے مظاہر ہے کہ دل و دماغ کے بدل دینے کا واحد ذریعہ تعلیم ہو سکتی تھی جس نے ہمیشہ ان سانچوں میں داخل اور داخل کو ڈھالا ہے جن کو لے کر تعلیم آگے آتی ہے اس لئے ہندوستان کو فرنگی رنگ میں ڈھالنے کے لئے لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کی اور وہ اسکوئی اور کالجی تعلیم کا نقشہ لے کر یورپ سے ہندوستان پہنچا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے دیوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی ہوں۔ یہی سنایا کہ آوازہ جب کہ ایک فاتح اور برسرِ اقتدار قوم کی طرف سے اٹھا اور تمنا بھی وہ تعلیم کا — جو بذاتِ خود ایک انقلاب آفریں حربہ ہے تو اس

نے ملک پر ذہنی انقلاب کا خاطر خواہ اثر ڈالا۔ اس تعلیم سے ایسی نسلیں ابھرنی شروع ہو گئیں جو اپنے گوشت پوست کے لحاظ سے یقیناً ہندوستانی تھیں لیکن اپنے طرز فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کے اعتبار سے انگریزی جامہ میں جاماں ہوئے لگیں۔ آخر ذہنی مگر خطرناک انقلاب کو دیکھ کر بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد تقی صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم قائم کر کے اپنے عمل سے یہ نعرہ بلند کیا کہ

”ہماری تعلیم وہاں کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے ایسے اسلامی ہوں۔“ جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات بیدار ہوں اور دین و سیاست کے لحاظ سے اُن میں اسلامی شعور زندہ ہو۔ اس کا ثمرہ یہ نکلا کہ مغربیت کے ہمہ گیر اثرات پر ہر ایک لگ گیا اور بات یک طرفہ نہ رہی بلکہ ایک طرف اگر مغربیت شعار اُٹھانے کے جنم لینا شروع کر دیا تو دوسری طرف مشرقیت کو از اور اسلامیت طراز جذبہ بھی برابر کے درجہ میں سنا آنا شروع ہو گیا۔ جس سے یہ خطرہ باقی نہ رہا کہ مغربی سیلاب سارے خشک و تر کو بہا لے جائے گا اگر اس کی روکار یا لہا نہ پڑے گی تو ایسے بند ہی باندھ دیئے گئے ہیں جو اُسے آزادی سے آگے نہ بڑھنے دیں گے۔ بہر حال وہ سماعت محمود اگئی کہ مدرسہ کا آغاز ہو اور اس کی یہ تعمیر و دفاع کی ملی جلی تعلیم عملاً ساحت وجود پر آگئی۔ تلاٹھ گھوڑیوں بند ہی نے (جو حضرت بانی دارالعلوم کے امر پر مدرسہ دیوبند کا تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کے لئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے) اپنے ایک شاگرد (کہ ان کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے دنیا میں مشہور ہوئے) بیٹھا کہ کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کچھ صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہور عالم درس گاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔ نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا روکار اور جذبہ، نہ نام و نہ کی ترپ تھی اور نہ پوسر و اشتہارات کی بھرمار۔ بس ایک شاگرد اور ایک استاد، شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود۔ دونوں یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آگئی۔ سادگی اور ندرت ایمان کا دور دورہ شروع ہو گیا جو سنت نبوی اور اتباع سلف کی روح ہے۔ مقصد نہ ترقی نہ تنعم، نہ تعیش نہ تزیین نہ تفاخر نہ تکاثر بلکہ صرف ”ما انا علیہ“ اصحابی ”کا مرقع بنانا اور ”عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي الْخَيْرُ“ و ”اتَّبِعُوا سَبِيلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ“ کی سیدھی راہ کی عملی تصویر کھینچ تھی اور اس تصویر کشی میں کمال احتیاط و اعتدال بھی پیش نظر تھا کہ صراطِ مستقیم کے یہ خطوط کہیں اُن بہتر بلے فرقوں کے خط سے نہ مل جائیں جنہیں شریعت کی اصطلاح میں مُسَلِّک مفرقہ کہا گیا ہے۔

ہفت تا دودھ و دو طریق تھے کے عدد سے ہیں اپنا ہے وہ طریق کہ باہرِ حد سے ہے

اس لئے جامعیت و اعتدال کو بین و دانش کے بلے جملے اندازوں کے ساتھ اس درس گاہ میں تعلیم و تربیت کا خطِ مستقیم کھینچا گیا۔

دارالعلوم کا سلسلہ سند و استناد

دارالعلوم دیوبند کا سلسلہ سند حضرت الامام شاہ ولی اللہ صاحب فاروقی قدس سرہ العزیز سے گزرتا ہو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک جا پہنچتا ہے۔ شاہ صاحب اس جماعت دیوبند کے مورث اعلیٰ ہیں جن کے مکتب فکر سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی۔ حضرت ممدوح نے اولا اس وقت کے ہندوستان کے فلسفیانہ مزاج کو اچھی طرح پرکھا۔ پھر علوم شریعت کو ایک مخصوص جامع عقل و نقل طرز میں پیش فرمایا۔ جس میں نقل کو عقل کے جامہ میں ملبوس کر کے نمایاں کرنے کا ایک خاص انداز بنایا تھا۔ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند نے ولی اللہی سلسلہ کے تلمذ سے اس فکر کو نہ صرف اپنایا جو انہیں دلی الہی خاندان سے ورثہ میں ملا تھا بلکہ مزید تنور کے ساتھ اس کے نقش و نگار میں اور رنگ بھرا، اور وہی منقولات جو حکمت دلی الہی میں معقولات کے لباس میں جلوہ گر تھے، حکمت قاسمیہ میں محسوسات کے لباس میں جلوہ گر ہو گئے۔ پھر آپ کے سہل متنبع انداز بیان نے دین کی انتہائی گہری تحقیقوں کو بلاشبہ علم لکھنی کے خزانہ سے ان پر بالہام غیب منکشف ہوئیں، استدلالی اور لمبائی رنگ میں آج کی نوگر محسوس یا حص پرست دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور ساتھ ہی اس خاص مکتب فکر کو جو ایک خاص طبقہ کا سرمایہ اور خاص حلقہ تک محدود تھا، دارالعلوم دیوبند جیسے ہم گیر ادارہ کے ذریعہ ساری اسلامی دنیا میں پھیلا دیا۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ دلی الہی مکتب فکر کے تحت دیوبندیت درحقیقت قاسمیت یا قاسمی طرز فکر کا نام ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے وصال کے بعد اس دارالعلوم کے سرپرست ثانی قلبی ارث و حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے قاسمی طرز فکر کے ساتھ دارالعلوم کی تعلیمات میں فقہی رنگ بھرا جس سے اصول پسندی کے ساتھ فروغ فقہیہ اور جزئیاتی تربیت کا قوام بھی پیدا ہوا اور اس طرح فقہ اور فقہاء کے سرمایہ کا بھی اس میراث میں اضافہ ہو گیا۔

ان دونوں بزرگوں کی وفات کے بعد دارالعلوم کے اولین صدر مدرس جامع العلوم اور شاہ عبدالعزیز ثانی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے جو حضرت بانی دارالعلوم سے سلسلہ تلمذ بھی رکھتے تھے دارالعلوم کی تعلیمات میں عاشقانہ، والہانہ اور مجذوبانہ جذبات کا رنگ بھرا جس سے یہ صہبائے دیانت سرآئندہ ہو گئے۔

آپ کے وصال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ثالث شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند جو حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ کے تلمیذ خاص بلکہ علم و عمل میں نمونہ خاص تھے ان نام الوان علوم کے محافظ ہوئے اور انہوں نے چالیس سال دارالعلوم کی صدارت تدریس کی لائن سے علوم و فنون کو تمام مظلقت نامے اسلامی میں پھیلا دیا اور ہزار ہا تاشہ نگان علوم ان کے دریائے علم سے سیراب ہو کر اطراف میں پھیل گئے۔ اس لحاظ سے دل بھنا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ جماعت دارالعلوم کے جد امجد ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ جدِ ربیب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اخ الجہد اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بمنزلہ پدر بزرگوار ہیں۔

دارالعلوم کا مسلک

علمی شخصیت سے یہ دلی الہی جماعت مسلک اہل سنت والجماعت ہے جس کی بنیاد کتاب و سنت اور اجماع

وقایس پر قائم ہے۔ اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل و روایت اور آثارِ سلف کو حاصل ہے جس پر لوہے دین کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے یہاں کتاب و سنت کی مرادات اقوال سلف اور ان کے متواتر مذاق کی حد و قیاس محدود رہ کر محض قوت مطالعہ سے نہیں بلکہ اساتذہ اور شیوخ کی صحبت و ملازمت اور تعلیم و تربیت ہی سے متعین ہو سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ عقل و روایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب و سنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے۔ وہ روایات کے مجموعہ سے حنفی فقہ کی روشنی میں شارح علیہ السلام کی غرض و غایت سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وائستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں۔ اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اصول ہے۔ جس کا منشا یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے متعین روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کر دینا نہیں چاہتا جب تک کہ وہ قابل احتجاج ہو۔ اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض اور اختلاف نہیں محسوس ہوتا۔ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے جس میں ہر رنگ کے علمی و عملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور راہوں اور نمائشی حال و قال سے بیزار اور بری ہے۔ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے۔ اس نے اپنے متنبیین کو علم کی رفعتوں سے بھی نرازا اور عبدیت و تواضع جیسے انسانی اخلاق سے بھی مزین کیا اور اس جماعت کے افراد ایک طرف علمی وقار، استغناء (علمی حیثیت سے) اور غفار نفس (اخلاقی حیثیت سے) کی بلندیوں پر فائز ہوتے، وہیں فروتنی، خاکساری اور ایثار و زہد کے مواضع ان جذبات سے بھی بھر پور ہوتے۔ نہ رعونت اور کبر و نخوت کا شکار ہوتے اور نہ ذلت نفس اور مسکنت میں گرفتار وہ جہاں علم و اخلاق کی بلندیوں پر پہنچ کر عوام سے اپنے دکھائی دینے لگے وہیں عجز و نیاز، تواضع و فروتنی اور لامتناہی کے جوہر دل سے مزین ہو کر عوام میں ملے جلے اور "کاخہ من الناس" بھی رہے۔ جہاں مجاہدہ و مراقبہ سے خلوت پسند ہوتے وہیں مجاہدانہ اور غازیانہ سپرٹ نیز قومی خدمت کے جذبات سے جلوہ آرا بھی ثابت ہوتے۔ غرض علم و اخلاق، خلوت و جلوت اور مجاہدہ و جہاد کے مخلوط جذبات و دواعی ہر دائرہ دین میں اعتدال اور میاند روی ان کے مسلک کی امتیازی شان بن گئی۔ جو علوم کی جامعیت اور اخلاق کے اعتدال کا قدرتی ثمرہ ہے۔ اسی لئے ان کے ہاں محترث ہونے کے معنی فقیہ سے لڑنے یا فقیہ ہونے کے معنی محدث سے بیزار ہو جانے یا نسبت احسانی (تصوف پسندی) کے معنی مشکل دشمنی یا علم کلام کی خدائت کے معنی تصوف، بیزارگی کے نہیں۔ بلکہ اس کے جامع مسلک کے تحت اس تعلیم گاہ کا فارغ درجہ بدرجہ بیک وقت محدث، فقیہ، مفسر، مفتی، متکلم، صوفی، محقق اور حکیم و مرتبی ثابت ہوتا جس میں زہد و قناعت کے ساتھ عدم نقشہ، حیا و انکسار کے ساتھ عدم مدابنت، رافت و رحمت کے ساتھ انرا بالمعروف و نہی عن المنکر، قلبی کیسوئی کے ساتھ قومی خدمت اور خلوت و راجح کے ملے جلے جذبات راسخ گئے۔ ادھر علم و فن اور تمام ارباب علوم و فنون کے بارے میں اعتدال پسندی اور حقوق شناسی نیز ادائیگی سہوق کے جذبات ان میں بطور جوہر نفس پیوست ہو گئے۔ بنا بریں دینی شعبوں کے تمام اسباب فضل و کمال اور راسخانی فی العلم عوام و محدثین ہوا یا فقہار، صوفیاء، ہوں یا عرفاء، متکلمین ہوں یا اصولین، امراء اسلام ہوں یا خلفاء اس کے نزدیک سب واجب الوجود

اور واجب العقیدت ہیں۔ اس لئے جذباتی رنگ سے کسی طبقہ کو برٹھانا اور کسی کو گونا یا مدح و ذم میں حدود شرعیہ سے بے پردا ہو جانا اس کا مسلک نہیں۔ اس جامع طریق سے دارالعلوم نے اپنی علمی خدمات سے (شمال میں) سائبریا سے لے کر (جنوب میں) سمٹرا اور جاوانک اور مشرق میں برما سے لے کر مغربی سمتوں میں عرب اور افریقہ تک علوم نبویہ کی روشنی پھیلا دی۔ جس سے پاکیزہ اخلاق کی شاہراہیں صاف نظر آنے لگیں۔ دوسری طرف سیاسی خدمات سے بھی اس کے فضلہ رائے کسی وقت پہلو تہی نہیں کی جاتی کہ ۱۸۵۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے رنگ میں بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ کسی وقت بھی ان بزرگوں کی سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ بالخصوص تیرہویں صدی کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعثوں میں خصوصیت سے حضرت شیخ المشائخ مولانا حاجی محمد ادا اللہ صاحب قدس سرہ کی سرپرستی میں ان کے ان دو مریدان خاص حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متنبین اور متوسلین کی مساعی انقلاب جہادی اقدامات اور حریت و استقلال کی کی فدا کارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قید و بند وغیرہ تاریخی حقائق ہیں جو رجحاناتی جاسکتی ہیں نہ بھلائی جاسکتی ہیں۔ جو لوگ ان حالات پر محض اس لئے پردہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ خود اس راہِ سر فروشی میں قبول نہیں کئے تو اس سے خود ان ہی کی نامقبولیت میں اضافہ ہوگا۔ اس بارہ میں ہندوستان کی تاریخ سے باخبر ارباب تحقیق کے نزدیک ایسی تحریریں نواہ وہ کسی دیوبندی نسبت کی ہوں یا غیر دیوبندی کی جن سے ان بزرگوں کی ان جہادی خدمات کی نفی ہوتی ہو لایعیاہ اور قطعاً ناقابل التفات ہیں۔ اگر حسن ظن سے کام لیا جائے تو ان تحریرات کی زیادہ سے زیادہ توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ ایسی تحریریں وقت کے محبوب کن عوامل کے نتیجہ میں محض ذاتی حد تک جزم و احتیاط کا مظاہرہ ہیں۔ ورنہ تاریخی اور واقعاتی شواہد کے پیش نظر ان کی کوئی اہمیت ہے نہ وہ قابل التفات ہیں۔ ان خدمات کا سلسلہ مسلسل آگے تک بھی چلا اور انہیں متواتر جذبات کے ساتھ ان بزرگوں کے اختلاف، رشید بھی سرفروشانہ انداز سے قومی اور ملی خدمات کے سلسلہ میں آگے آتے رہے (خواہ وہ تحریک خلافت ہو یا استقلال وطن) اور بروقت انقلابی اقدامات میں اپنے منصب کے عین مطابق حصہ لیا۔ مختصر یہ کہ علم و اخلاق کی جامعیت اس جماعت کی طرہ امتیاز رہا اور وسعت نظری، روشن ضمیری اور رواداری کے ساتھ دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت اس کا مخصوص شعار، لیکن ان تمام شعبہ ہائے زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس جماعت میں مسئلہ تعلیم کو حاصل رہی ہے۔ جب کہ یہ تمام شعبہ علم ہی کی روشنی میں صحیح طریق پر پروئے کار آسکتے تھے اور اسی پہلو کو اس نے نمایاں رکھا۔ اس لئے اس مسلک کی جامعیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جامع علم و معرفت، جامع عقل و عشق، جامع عمل و اخلاق، جامع مجاہدہ و جہاد، جامع دیانت و سیاست، جامع روایت و درایت، جامع خلوت و جلوت، جامع عبادت و مذہبیت، جامع حکم و حکمت، جامع ظاہر و باطن، جامع حال و قال ہے۔ اس مسلک کو جو سلف و خلف کی نسبتوں سے حاصل شدہ ہے۔ اگر اصطلاحی الفاظ میں لایا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارالعلوم دینا مسلم، فرقۃ اہل السنۃ والجماعت، مذہبنا حنفی، مشرکنا صوفی، کلامنا اشعری، سلوکنا چشتی بلکہ جامع سلاسل، فکر و ملی الہی، اصولاً قاسمی، فروغارشیدی اور نسبتاً دیوبندی ہے۔

اس سلسلہ میں چونکہ مسلک دارالعلوم کے نام سے ہم نے ایک مستقل رسالہ لکھ دیا ہے۔ اس لئے اس موقع پر اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کے بعض جامع جملے اس تحریر میں لے لئے گئے ہیں۔ تفصیلات کیلئے اس رسالہ کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کا مجموعی مذاق اور اس کی تربیت کا رخ

۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان سے پامال ہو چکی تھی اور حالات میں کیسے انقلاب اور تبدیلی آچکی تھی۔ دارالعلوم نے ان بدلتے ہوئے حالات میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین و مذہب اور بلحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی کہ وہ حالات کی زد میں نہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کیساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زباناں و تلوک لاند اخلاق پر تامل رکھا مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرون حدود و جائز توسعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس سے عام مسلمانوں میں اسلامی مذہبیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن و معاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی غیرت و محبت باقی رہ گئی۔ مروجہ بیت اور احساس کسری قلوب میں جسے نہیں پایا۔ غمگینہ کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا اور اتباع اغیار کے بجائے سنت نبوی کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے۔ جس سے عام تمدن و معاشرت میں پرہیز گاری اور تقویٰ و طہارت کے دواعی اُجاگر رہے بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ اس کا ثمرہ تھا کہ دارالعلوم اور اس کے پروردوں کے مسلک اور زندگی کے معاملات کو اساس و بنیاد فلسفہ اور عقل محض پر نہیں تھی بلکہ انبیاء علیہم السلام کے ڈالے ہوئے راستہ پر یعنی — محبت و عشق پر تھی جو ایمان کا بنیادی جوہر اور غالب عنصر ہے۔ فلسفہ اختراعات اور آزادی فکر کی راہ پرلے جاتا ہے اور عشق و محبت اتباع و ادب کی راہ پر چلاتا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد چونکہ عقلی اختراعات پر ہے اس لئے اگلا فلسفی پچھلے فلسفی کی تمیز اور تغلیط کو اپنا داجی حق سمجھتا ہے اور نبوت کی بنیاد چونکہ وحی اور عشق و محبت خداوندی پر ہے اس لئے ہر اگلا پیغمبر پچھلے پیغمبر کی تصدیق و محبت کو جزو ایمان بتاتا ہے۔ اندرونی جذبات کا یہی فرق فلاسفہ اور انبیاء کے متبعین میں بھی ہے۔ پیر دارالعلوم کے طرز تربیت اور تعلیم و تمدن کا اہم جزو چونکہ وحی الہی کے ساتھ ہمہ وقتی مشغول و اشتغال اور قال اللہ و قال الرسول ہی کا تمام تر مشغلہ تھا اس لئے طبعی طور پر اس کے حلقوں میں ادب و اتباع اور عشق و محبت کی بنیادیں استوار ہوئیں اور ان کا اثر اوپر کی تعمیر یعنی دیانت، معاشرت اور عادت و عبادت میں آنا ناگزیر تھا اس لئے اس نے بدلتے ہوئے حالات پر پچھلوں کے نقیش قدم کو برقرار رکھا اور زمانہ کی زد میں عوام کو کلیتہً بچنے نہیں دیا اور اس کی اس عزیمت کی عظمت کو دوست

درمخالفوں سب نے تسلیم کیا۔

لیکن جن بزرگوں نے اس دور میں اپنے حین نیت اور اخلاص سے ہندوستانی مسلمانوں کی عزت نفس اور زبان کے تقاضوں کے مطابق ان کی باوقار ترقی و سر بلندی کے لئے مساعی سر انجام دیں ان سے کبھی آویزش نہیں کی ان کے کسی اقدام سے اگر دین یا دینی ذوق اور دین کے کسی عقیدہ و عمل کو متاثر ہوتے دیکھا تو اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس طرح امکانی حد تک دین میں آزاد فکری اور آزاد روشی اور بے قیدی کی مداخلت کے راستے روک رکھے۔

دارالعلوم کی مجالس

دارالعلوم میں تین ذمہ دار مجالس ہیں۔

۳۔ مجلس علمیہ

۲۔ مجلس عاملہ

۱۔ مجلس شوریٰ

۱۔ مجلس شوریٰ | یہ مجلس دارالعلوم کی سب سے بڑی بااختیار مجلس ہے۔ دارالعلوم کا تمام نظم و نسق اس جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی جملہ تجاویز و بار بارہ انتظام و تعلیم قطعی اور جملہ کارکنان دارالعلوم کے لئے واجب التعمیل ہوتی ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد اسیٹھ ہے جس میں کم از کم گیارہ علماء کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ باقی ارکان مسلمانوں کے دیگر طبقات سے منتخب ہو سکتے ہیں مگر مستحق الامکان دو ممبر باشندگان دیوبند سے لئے جاتے ہیں۔ مہتمم اور صدر مدرس بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کے رکن رہتے ہیں۔ اس مجلس کے سال میں دو جلسے ہوتے ہیں۔ ایک محرم میں و در سراجب میں۔ اس مجلس کا کورم ساٹھ ہوتا ہے۔

۲۔ مجلس عاملہ | یہ مجلس، مجلس شوریٰ کے ماتحت ایک مستقل مجلس ہے جو مجلس شوریٰ کے فیصلوں اور منظور کردہ تجاویز کے عمل درآمد کے سلسلہ میں ذمہ داروں کے طریق عمل پر نظر رکتی ہے۔ نظم و تعلیم اور دفاتر کے حسابات کی اور کارکردگی کی نگرانی اس کے ذمہ ہے۔ اس مجلس کے ارکان کی تعداد نو تیس ہے۔ مہتمم اور صدر مدرس باعث بار عہدہ اس کے مستقل رکن ہوتے ہیں۔ نقیب سائت ممبر مجلس شوریٰ کے ارکان میں سے منتخب ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا انتخاب سالانہ ہوتا ہے۔ مجلس عاملہ کے سال بھر میں چار جلسے ہوتے ہیں۔ پہلا ربیع الاول میں، دوسرا جمادی الاول میں، تیسرا شعبان میں اور چوتھا ذی قعدہ میں۔ مجلس عاملہ کا کورم پانچ ہوتا ہے۔

۳۔ مجلس علمیہ | تمام درجات عربی، فارسی، اردو، دینیات اور تجوید وغیرہ کے تعلیمی کاموں میں صدر المدرسین کو مشورہ دینے کے لئے ایک مجلس ہے، جس کا نام مجلس علمیہ ہے۔ اس کے ممبران میں صدر المدرسین، مہتمم دارالعلوم اور اساتذہ طبقہ اعلیٰ شامل ہیں۔

دارالعلوم کی سندیں اور سرٹیفکیٹ

دارالعلوم میں درجات عربیہ سے فارغ ہونے والوں کو تین سندیں دی جاتی ہیں۔

۱۔ سند العالم

یہ سند اس کو دی جاتے گی جو دورہ حدیث کا امتحان پاس کر لے۔

۲۔ سند الفضل

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو دورہ حدیث کے علاوہ دورہ تفسیر بھی پڑھ چکا ہو۔

۳۔ سند الکامل

یہ سند اس شخص کو دی جائے گی جو درجہ تکمیل کے علوم و فنون پڑھ چکا ہو۔

مذکورہ بالا تینوں سندیں طالب علم کی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے تین درجے کی ہیں۔ اعلیٰ، اور ادنیٰ۔ جن میں برتقاوت الفاظ اور عنوان امتیاز رکھا گیا ہے۔ یہ سب سندیں عربی میں ہوتی ہیں۔ مذکورہ بالا تین سندوں کو علی گڑھ سکول یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ (مصر) اور مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (مجاز) منظور کر لیا ہے۔

درجات فارسی سے فارغ ہونے والے کو صرف ایک سند دی جاتی ہے۔

درجہ تجوید سے فارغ ہونے والے کو ایک سند دی جاتی ہے۔

درجہ ابتدائی دینیات سے فارغ ہونے والے کو طلب کرنے پر سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ اگر نصاب کی تکمیل سے پہلے کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے دارالعلوم کو چھوڑنا چاہے تو جس ملک کی کتابیں اس نے پڑھی ہیں اس کا سرٹیفکیٹ تصدیق نامہ دیا جاتا ہے۔
فراغت کے بعد اگر کوئی شخص سند کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی لینا چاہے تو اسے ایک مطبوعہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے جو اردو اور انگریزی میں ہے۔

دارالعلوم کا ملک کے دوسرے اداروں سے رابطہ

۱: ملک کے دوسرے علمی اور ثقافتی اداروں سے دارالعلوم کا بھی ربط قائم ہے۔ چنانچہ دارالعلوم کے کارکن ادارہ اہل ہند کے ممبر بنائے گئے ہیں۔

۲: دارالعلوم وقتاً فوقتاً ہندوستان میں منعقد ہونے والی تعلیمی اور ثقافتی نمائشوں میں بھی ان کی درخواست پر بلاشبہ شرکت کرتا ہے اور اس کی منظومات وائل بھیجی جاتی ہیں جس سے دارالعلوم کے کتب خانہ اور نوادر کے ذخیرے کی عظمت قائم ہوتی ہے۔

۳: طبیبی اداروں میں اس کے کتب خانہ کی نقلی اور نوادر کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔

۴: تصنیفی اداروں میں (مثلاً حیدرآباد دکن وغیرہ) یہاں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں اور منظومات بھیجی جاتی ہیں۔

۵: سرکاری کمیشنوں جیسے لسانی کمیشن یا اوقاف کمیشن وغیرہ میں بھی دارالعلوم کی مختلف اوقات میں شرکت ہو تو شاہد طلب کئے جانے پر بطور نمائندہ شاہدین کو بھیجا جاتا ہے۔

جلد دارالعلوم

دارالعلوم سے دور رسالے نکلتے ہیں۔

سالہ دارالعلوم | یہ رسالہ اردو میں نکلتا ہے اور اس میں علمی مضامین شائع کئے جاتے ہیں جو مختلف اصولی، فروعی و تاریخی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں نیز معلوماتی و ذخیرہ کافی حد تک پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک دینی اور علمی رسالہ ہے۔
سالہ دعوت الحق | یہ رسالہ عربی زبان میں شائع ہوتا ہے جس میں اکابر دارالعلوم کے علمی اور مسلکی مضامین عربی زبان میں شائع کئے جاتے ہیں تاکہ اکابر دارالعلوم کے علوم جو اردو میں ہونے کی وجہ سے عرب ممالک تک نہیں پہنچ سکے پہنچیں اور ان سے عرب ممالک بھی مستفید ہو سکیں اور ساتھ ہی دارالعلوم کی خدمات اور کارناموں سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

دارالعلوم کا وفاق عن الدین

دارالعلوم کی جماعت اپنے مسلک کی ہمدردی کی وجہ سے بر فتنہ کی مدافعت کے لئے سینہ سپر رہی۔ خواہ وہ فتنہ نقل وایت کی راہوں سے آیا یا عقلیت پسندی کی بنیادوں سے اٹھا۔ اس جماعت نے ہر دور میں اعلا رکلمۃ اللہ اور امار بالمعروف و نہی عنکر و اکیا اور اسی اسلوب اور اسی رنگ میں جس رنگ و ہنگ میں کسی دینی فتنہ نے سراٹھایا متصوفین بے تصرف کی جانب بدعات، محدثات اور شرک و کفر کا فتنہ روایتی انداز میں اُٹھرا تو اُس نے روایتی ہی طور پر مقابلہ کیا اور فتنہ کے بے شرباب و بے سند روایتوں کی تلقین کھول کر شریعت و طریقت کی مستند بقول سے اس کا استیصال کیا اور مقابلہ میں نقل و روایات ایک بڑا ذریعہ پیش کر دیا۔ مدعیان عقل و اجتہاد کی طرف سے آزادی فکر، عدم اتباع سلف اور نیچریت کا فتنہ عقل و کاسہ سالہ کے دین میں داخل ہونے لگا تو اُس نے عقلی دلائل پیش کر کے کامیاب مدافعت کی۔ اور جس کے لئے حضرت دارالعلوم قدس سرہ نے ایک متقل حکمت ہی مدون فرمادی جس کے سامنے فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اُس نے فلسفہ کے انداز و بیان کو اس کے راستے روک دیے۔ غرض بدعت پسندی، ہوا پرستی، دہریت، نوازی، بے قیدی، مطلق العنانی اور آزادی فکر کی بڑیوں دارالعلوم نے کھوکھلی کر کے عقل و نقل، روایت و روایت اور حکمت و دین کی جوڑ میں مضبوط کر دی۔

دارالعلوم نے ملک کو کیا نفع پہنچایا

دارالعلوم نے اس نوعیت کے افراد پیدا کئے جنہوں نے تعلیم، تزکیہ اخلاق، تصنیف، افتاء، مناظرہ، صحافت، خطابت و تبلیغ، حکمت اور طب وغیرہ میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ان افراد نے کسی مخصوص نقطہ میں نہیں بلکہ ہندوپاک کے

ہر بر صوبہ اور بیرونی ممالک میں قابل قدر کارنامے انجام دیتے۔ ۱۲۸۲ھ سے ۱۳۸۲ھ تک سو سال کی مدت میں اگر دارالعلوم ان خدمات کا جائزہ لیا جائے جو اُس نے ہندوپاک میں انجام دیں تو معلوم ہوگا کہ ان دونوں ملکوں کے ہر حصہ میں اُس نے اپنے ایسے فرزندان رشید پہنچائے جو اس خطہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اور مخلوق خدا کو ظلمت جہل سے نکال کر نورِ علم سے مالا مال کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے فضلاء نے دارالعلوم کی صوبہ دار فہرست ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ درج ذیل ہے۔

ہندوستان

نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام	نمبر شمار	نام صوبہ	تعداد فضلاء کرام
۱	لوہ پٹی	۱۸۹۶	۱۰	مدھیہ پردیش	۲۸
۲	مغربی بنگال	۱۵۱	۱۱	مشرقی پنجاب	۹۶
۳	آسام و منی پور	۲۶۵	۱۲	دہلی	۱۲
۴	بہار و اڑکیہ	۷۸۰	۱۳	مہاراشٹر	۳۹
۵	مدراکس	۳۰	۱۴	گجرات	۳۸
۶	ٹراونکور	۴	۱۵	راجستھان	۳۳
۷	کیرالہ	۴۲۰	۱۶	جموں و کشمیر	۱۰
۸	اندھرا	۵۲	۱۷	نیپال	۳
۹	میسور	۶		میزان ہندوستان	۳۹۵

پاکستان

مشرقی پاکستان	میزان پاکستان
۱۵۱۹	۳۱۹۱
	۳۷۹۵
	۴۹۸۶
	میزان ہندوستان و پاکستان

ان فضلاء نے دارالعلوم کے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے رنگ سے دین کے کسی نہ کسی شعبہ میں شخصی یا اجتماعی حیثیت سے کام کیا اور کر رہے ہیں۔

دارالعلوم کے فیوض بیرون ہند میں

پھر دارالعلوم نے اپنے علمی فیوض سے صرف ہندوپاک ہی کو نہیں بہرہ اندوز کیا بلکہ ایشیا اور افریقہ کے اسلامی ممالک بھی اس کی خدیا پاشیوں سے جگمگا اٹھے۔ چنانچہ غیر ملکی فضلا دارالعلوم کی فہرست از ۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ یہ ہے۔

۱	افغانستان	۱۰۹	۶	انڈونیشیا	۱	۱۱	جنوبی افریقہ	۱۳
۲	روس بشمول سائبیریا	۷۰	۷	عراق	۲	۱۲	سعودی عرب	۲
۳	چین	۴۴	۸	کویت	۲	۱۳	سیام	۱
۴	برما	۱۴۴	۹	ایران	۱۱	۱۴	یمن	۱
۵	ملائیشیا	۲۸	۱۰	سیلون	۲			

میزان بیرونی ممالک

۴۳۱

میزان ہندوپاک

۶۹۸۶

ہندوپاکستان اور بیرونی ممالک کے فضلا کی مجموعی میزان

۷۴۱۷

فضلا کرام کے علاوہ جن طلباء نے دارالعلوم سے استفادہ کیا ان کی تعداد

۵۸۲۱۰

ان فضلا کرام اور طلبہ کی مجموعی تعداد جنہوں نے دارالعلوم سے استفادہ کیا۔

۶۵۷۲۷

تفصیلات آئندہ صفحات میں آ رہی ہیں۔

دارالعلوم کا حصہ تصانیف میں

دارالعلوم کامسک اور مخصوص رنگ علماء دارالعلوم کی تصانیف میں صاف نمایاں رہا۔ ہمیشہ بروقت اور بر محل تصانیف اس احاطہ سے نکلتی رہیں۔ دارالعلوم نے تو سال کے عرصہ میں ۱۱۶۴ مصنفین پیدا کئے جن میں سے تقریباً ۶۷۱۰ علی کے مصنفین ہیں۔ علماء دارالعلوم میں سے چند شہرہ ور معروف مصنفین کی فہرست درج ذیل ہے۔

بہم مصنف

نمبر شمار

۱ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند

۲ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب

۳ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب علیطوسی

۴ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

۵ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی

۶ عارفانہ، صوفیانہ، فقہیانہ اور مفسرانہ۔ آپ کی تصانیف کی تعداد جو علم و فن میں ہیں ایک ہزار سے زائد ہے۔

محمد ثناء

نمبر شمار

نام و معنی

تصنیف کا نام

موضوعات

سیاسی، فقہیہ اور اجتماعی

سیاسی و فقہیہ

مورخانہ

فقہیہ اور مورخانہ

محشیہ، فقہیہ اور ادبیہ

فلسفیانہ و منطقانہ

مورخانہ و محققانہ

فلسفیانہ

محشیہ و منطقانہ

محشیہ

سیاسی و مورخانہ

مورخانہ

ادبیہ اور مورخانہ

محشیہ

محققانہ

حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسین صاحب

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری

حضرت مولانا مفتی اعجاز صاحب

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

حضرت مولانا سید ہفت حسین صاحب

حضرت مولانا احمد علی صاحب

حضرت مولانا شمس الدین صاحب عثمانی

حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب مدنی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

حضرت مولانا محمد رفیع صاحب کاندھلوی مدظلہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہ

حضرت مولانا محفوظ الرحمن صاحب

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مدظلہ

حضرت مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ

حضرت مولانا محمد رفیع صاحب بنوری مدظلہ

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سارم سید مدظلہ

اس کتاب میں ان تمام شمار کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ تاہم تحریر فی النعمت انکشافت بھی شکر نعمت ہے کہ اس کتاب کی تصانیف کا عمدہ بھی جو مختلف موضوعات پر ہیں تقریباً سو سو (۱۷۵) ہے جن کا رنگ ان کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔

مشاہیر دارالعلوم

علمائے دیوبند میں ایسے مشاہیر بھی ہوتے ہیں اپنے اپنے وقت کے اہم طاقت، علم و عمل کا نمود، بنو ہمن و عوام کی رشد و ہدایت کا مرکز، سیاست مدینہ، نگاہ فقیر، رفعت و ولایت میں راسخ اور ذاتی تمہا پرستی کے ساتھ مخفی کے لئے حق میں مرنے والے علمائے دین اور دوسرے قوم کی تعلیم و تہذیب میں مسدود طور پر قائم تسلیم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

۱: حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مانوٹومی باقی دارالعلوم دیوبند

آپ باقی دارالعلوم ہیں مگر ہمت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے نیز اس حیثیت سے کہ انہیں دینار دارالعلوم بھی

دارالعلوم کی ایک نسبت ہے اس موقع پر بھی آپ کا تذکرہ کر دیا گیا۔

دینی خدمات | متعدد مناظرے جیسا تیوں اور آریہ سماجیوں سے کئے۔ تصانیف اور تقریروں کے ذریعہ ولی اللہی مسک کی وضاحت اور اشاعت کی مشکلانہ اور عارفانہ انداز سے اصول اسلام اور اساسی عقائد دین کو عقلی دلائل سے مستحکم اور مضبوط کیا، اور دین اسلام کی سرحدات کو آنا مضبوط بنا دیا کہ اختیار کے جیسے ان پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔

سیاسی خدمات | ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں علی اور قانداہ حصہ لیا۔ جنگ شامی میں خود سپاہیانہ جنگ کی۔ سماجی اصلاحات | معاشرہ (سوسائٹی) میں غلط قسم کی رسوم سے جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اسے پہلے اپنے گھر سے ختم کیا۔ اس کے بعد دوسروں کو اس کے ترک پر آمادہ کر کے معاشرہ کو صاف کیا جس کی تفصیل کتاب "مسک دارالعلوم" میں بقدر ضرورت کر دی گئی ہے۔ مزید تفصیلات کے لئے کتاب "سوانح قاسمی" ملاحظہ ہو۔

۲۔ قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

آپ بھی دارالعلوم کے طالب علم نہیں بلکہ بانویں میں سے ہیں اور سربراہ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر چونکہ یہ بھی دارالعلوم ہی کی ایک نسبت ہے اس لئے اس موقع پر بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا۔

دینی خدمات | علم حدیث، فقہ اور تصوف سے بہت زیادہ شغف رہا۔ ہزار ہا انسانوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ نے علماء کی دینی تربیت فرمائی اور انہیں دین کے بارے میں اتنا سامع اور مستحکم بنادیا کہ ان افراد پر کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہ ہو سکا۔

سیاسی خدمات | ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں حضرت نانوتوی کے دوش بدوش قانداہ حصہ لیا اور نوماہک اسیر فرنگ رہے۔ جن لوگوں نے ان کی سیاسی اور جہادی خدمات پر پردہ ڈالنا چاہا ہے، خواہ اپنی لاعلمی اور معاملات سے بے خبری کی بنا پر یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے، ان کی مصلحت اندیشی لایعبار اور باخبر لوگوں کے نزدیک لغو ہے۔

۳۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی

دینی خدمات | آپ حضرت نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور حضرت کے بعد قاسمی علوم کا جو فیضان عالم میں آپ کی ذات سے ہوا اس کی نظیر دوسرے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ اپنے استاد میں فانی اور استاد کے علم میں غرق تھے۔ دین کے ہر دائرے میں آپ کی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ درس، تصنیف، ارشاد و تلقین اور جذبہ جہاد وغیرہ میں آپ کی خاموش خدمتیں زبان حال سے گویا ہیں۔ آپ اپنے استاد حضرت نانوتوی کے علوم کے امین اور خزانہ دار تھے۔ آپ نے ان علوم کی ایضاح و تفصیل و تبیین میں نمایاں حصہ لیا اور عظیم خدمت انجام دی۔ حضرت نانوتوی کی تصانیف کی اعلیٰ ترین طباعت پر تہمتیں حواشی و عنوانات آپ ہی نے شروع فرمائی اور حجة الاسلام پر آپ ہی نے سب سے پہلے عنوانات

تاکم کئے اور قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا۔ بخاری کے ابواب و تراجم پر ایک جامع اور دیر رساتہ تصنیف فرمایا متعدد مناظرے تصانیف بھی فرمائیں اور مناظرے بھی کئے۔ دارالعلوم دیوبند میں چالیس برس تک مسلسل درس حدیث دے کر آٹھ سو ساٹھ

اعلیٰ استادوں کے صاحب طرز عالم دین، فاضل علوم اور ماہرین فنون پیدا کئے۔ آپ کا درس حدیث اُس دور میں امتیازی شان رکھتا تھا اور مرجع علماء تھا۔ آپ کو علماء عصر نے محدث عصر تسلیم کیا۔ بیعت و ارشاد کے راستہ سے ہزار ہا تلمذ گان

معرفت کو عارف باللہ بنایا اور آپ کا سلسلہ طریقت ہندوستان سے گذر کر افغانستان اور عرب تک پہنچا۔ متعذرو علی تصانیف آپ نے ترکہ میں چھوڑیں۔

سیاسی خدمات | ہندوستان کو غیر ملکیوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک زبردست انقلابی تحریک چلائی جس کو "رواٹ کمیٹی" کی رپورٹ میں "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ تحریک بہت زیادہ موثر تھی مگر راز میں نہ رہ سکی اور ناکام ہو گئی۔ پھر بھی اس کی آگ جن کے دلوں میں لگی ہوئی تھی انہوں نے آئندہ کام کر کے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ آپ تقریباً پانچ برس ماث میں قید رہے۔

۴۔ حضرت مولانا عبد اللہ صاحب اجمیلوی

آپ حضرت بانی دارالعلوم دیوبند کے داماد تھے۔ حضرت کے تلامذہ میں سے بھی تھے۔ حضرت حاجی امدا اللہ صاحب قدس سرہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے پاس عرصہ تک قیام رہا۔ سرسید نے آپ کو علی گڑھ بلا کر مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات کے عہدہ پر فائز کیا۔ سرسید اس پر اظہارِ مسرت کیا کرتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی مولانا محمد قاسم صاحب کی نسبت سے خالی نہیں ہے۔ اختر نے بھی مولانا محمد عبد اللہ سے اجازت حدیث حاصل کی ہے۔

۵۔ حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امرہی

آپ حضرت نانوتوی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اور جلیل القدر محدث تھے۔ آپ مدرسہ جامع مسجد امرہہ میں جے حضرت نانوتوی نے قائم فرمایا تھا ایک طویل عرصہ تک بحیثیت صدر المدرسین فائز رہے اور آخر عمر تک درس حدیث میں منہج رہے۔ آپ علوم قاسمیہ کے امین تھے اور ان کی ترویج میں عمر بھر نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے آپ علوم قاسمیہ کی مجسم تصویر اور بالفاظ دیگر حضرت نانوتوی کے مثیل شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کا فیضان علمی دور دور تک پہنچا اور سینکڑوں طالب علم آپ کے درس سے عالم و فاضل بن کر نکلے۔ عالم بے مثل حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب خوجہ، مفسر مشہور حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب امرہی اور اس قسم کے دوسرے اور بھی ماہرین علم و فضل آپ کے تلامذہ ہیں جن سے علم و دین پھلا اور ایمان و عرفان کا رنگ دلوں میں جما۔

۶۔ حضرت مولانا حکیم جمیل الدین صاحب گلدیوی

آپ مشہور اطباء میں سے تھے۔ حکیم اجمل خان صاحب کے استاد تھے۔ طبعیہ کالج دہلی کے ممتحن رہے۔ آخر دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی ہوئے تھے۔ بااوقات بزرگی، معمولات کے شدت سے پابند، ذا کردش غل، ہجو گزار اور شب بیدار لوگوں میں سے تھے علم نہایت راسخ اور نکھرا ہوا تھا۔ ابتداءً غازی پور میں قیام رہا۔ آخر میں دہلی کو وطن بنالیا اور وہیں وفات ہوئی۔

۷۔ حضرت مولانا عبد العلی صاحب دہلوی

آپ حضرت مولانا نانوتوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دہلی کے محدث شمار ہوتے تھے۔ مدرسہ عبدالرب دہلی میں ایک طویل مدت تک بحیثیت صدر مدرس درس حدیث دیا۔ آپ نے سینکڑوں پیش گرو چھوڑے۔ تقویٰ، طہارت اور استقامت

میں آپ خود ہی اپنی مثال تھے۔ آخری سانس تک جماعت کی نماز اور صف اولیٰ ترک نہیں ہوتی تھی۔ آخری عمر میں فالج کا اثر نقل و حرکت سے معذور ہو گئے۔ اسی حالت میں حکم کے مطابق خدام آپ کو اٹھا کر صف اولیٰ میں رکھ دیتے تھے اور آپ بیٹھ کر امام کی اقتدار کرتے تھے۔ اپنے استاد میں فنائیت کا درجہ رکھتے تھے اور ہر دار و صادر سے فرماتے تھے کہ قاسمی بن جواد محرم نہیں رہو گے۔ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ جیسے اکابر آپ کے تلامذہ میں سے تھے۔

۸۔ حضرت مولانا نواب محی الدین خاں صاحبؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے مخصوص تلامذہ اور جلیل القدر علماء میں سے تھے۔ ریاست بھوپال میں آپ مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ کے علم اور پاکیزہ زندگی سے بھوپال اور اس کی ریاست نے برس مابرس فیوض و برکات حاصل کئے۔ آپ گھر کے نواب اور امرار میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد بادشاہ دہلی ظفر شاہ کے مصاحبین خاص میں سے تھے اور حضرت نانوتویؒ کے معتقد تھے۔ حضرت نانوتویؒ نے جہاد کے سلسلہ میں ان ہی کے ذریعہ بادشاہ تک اپنی سکیم پہنچائی تھی۔ شاہ ظفر جب انگریزوں کے خلاف اٹھے تو ایک جنگی مورچہ پر مدد بھی سرباہ تھے۔

۹۔ حضرت مولانا صدیق احمد صاحب امبیڈھویؒ

آپ بھی حضرت نانوتویؒ کے تلامذہ میں سے تھے اور دارالعلوم دیوبند میں عرصہ دراز تک رہ کر تعلیم حاصل کی اور پھر دارالعلوم ہی میں عرصہ تک درس بھی دیا۔ دارالعلوم سے مالِ کوٹہ تشریف لے گئے اور وہاں ریاست کی طرف سے عہدہ اقتدار پر فائز رہے۔ مشاہیر اہل اقتدار میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ عم کا آخری تمام حصہ مالِ کوٹہ میں عہدہ اقتدار پر ہی گزارا، اور وہیں آپ کی وفات ہوئی مسیح الملک حکیم اہل خاں صاحبؒ بھی آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ آپ صاحب بیعت و ارشاد و بزرگوار میں سے تھے۔ جن سے ایک بڑے حلقے نے تربیت باطنی حاصل کی۔ خواجہ فیروز الدین مرحوم اکاؤنٹنٹ جنرل ریاست کپورتھلہ آپ کے مخصوص متوسلین میں سے تھے جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے ہیں۔ اختر نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد کچھ دنوں آپ سے بھی تربیت باطنی حاصل کی ہے۔ علوم عقلیہ و عالیہ میں مہارت نامہ رکھتے تھے اور آپ کی تدریس میں ایک خاص برکت تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ دارالعلوم کے درجات ابتداء کے متحق تھے۔ صاحب اسرار و معارف تھے اور اکثر و بیشتر آپ کی تشریف آوری دیوبند کے موقع پر اساتذہ و طلبہ آپ کے حلقے میں بیٹھ کر مستقبل کے بارے میں باتیں پوچھتے تھے۔ اور آپ بطور پیشین گوئی کچھ نہ کچھ ارشاد فرما دیا کرتے تھے۔ آپ کا نقوی و طہارت مسلم اور نمایاں تھا، شب بیدار علماء میں سے تھے۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانیؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے باضابطہ مفتی بلکہ دارالعلوم میں دارالافتاء کا نقطہ آغاز ہیں۔ دارالعلوم میں دارالافتاء کی منضبط صورت آپ ہی کے وجود و باوجود سے معرض وجود میں آئی۔ آپ عارف باللہ، صاحب درس و تدریس، صاحب بیعت و ارشاد اور مربی اخلاق بزرگ تھے۔ آپ حضرت مولانا شاہ فیض الدین صاحب دیوبند ہی قدس سرہ کے خلیفہ مجاز تھے جو حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ سے دارالعلوم کے متعلقوں نے ظاہری و باطنی فیوض و برکات کافی حد تک حاصل کئے۔ افتاء کی خدمات کے ساتھ ساتھ حدیث، فقہ اور تفسیر

کے ادنیٰ اسباق بھی آپ پڑھاتے تھے۔ جلالین شریف میں احقر ناکارہ کو بھی حضرت مفتی اعظم ہی سے تلمذ حاصل ہے۔ آپ کا بیعت وارث و کاسلسلہ بھی کافی پھیلا۔ آپ ہی کے خلیفہ اعظم حضرت مولانا قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی تھے جن کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر ہیں جن سے عرب اور افریقہ میں نقشبندیہ طریق کا کافی شیعہ ہوا اور سینکڑوں کی اصلاح ہوئی۔ ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ کے لوگ جب حج کے لئے حاضر ہوتے ہیں تو اکثر و بیشتر مولانا بدر عالم صاحب مدظلہ کے حلقہ بیعت میں داخل ہو کر جاتے ہیں۔ ابتداء میں حضرت مفتی اعظم ہی حضرت بنتم صاحب کی نصیحت میں نیابت اہتمام کے فرائض سرانجام دیتے تھے بہر حال دارالعلوم آپ کے علم، سلوک، افتاء اور انتظام وغیرہ سے سالکے ہی شعبوں میں مستفید ہوا کرتے تھے۔

۱۱۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

آپ حکیم الامت، مشہور محدث، عارف باللہ، فقیہ اور بزرگ تھے۔ آپ دین کے ہر شعبہ کے کاموں کے لئے من اللہ موفق تھے۔ ۳۵ برس کان پور کے مدرسہ جامع العلوم میں درس قرآن و حدیث دیا جس سے آپ کے تلامذہ ملک کے ہر خطے میں پھیل گئے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا کہ سفر کر کے وعظ و تبلیغ نہ فرمایا ہو تصنیف کے میدان میں قدم رکھا تو ہر علم و فن میں ہزار سے اوپر تصانیف و رشیں چھوڑیں۔ آخر میں خانقاہ امدادیہ بھون میں مقیم ہوئے تو ہندو بیرون ہند کے ہزار انسانوں کی بیعت و ارشاد کے سلسلہ سے واصل فرمایا۔ بڑی تعداد میں آپ کے خلفاء ہیں جنہوں نے مختلف خطوں میں اصلاح و تربیت کام مختلف رنگوں سے انجام دیا۔ آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند سے زیادہ مستفید ہوئے۔ جو حدیث و تفسیر میں حضرت نانوتویؒ کے متفید ہیں نیز آپ حضرت نانوتویؒ سے براہ راست بھی بعض تفسیری درسوں میں متفید ہوئے۔ حکیم الامت کا لقب آپ کے لئے اہم باسٹی تھا۔ بہر حال آپ کی تقریر، تحریر، تصنیف اور تبلیغ سے لاکھوں مسلمانوں علمی و عملی فیض پہنچا اور ہزاروں مسلمانوں کی باطنی اصلاح ہوئی۔ آپ دارالعلوم میں اُس سال بغرض حصول تعلیم تشریف لائے تھے ۱۸ سال حضرت نانوتویؒ کا وصال ہوا۔ اس لئے حضرت نانوتویؒ سے مزید استفادہ نہیں فرما سکے مگر حضرت کے تلامذہ حضرت فی البدہہ حضرت مولانا عبد العلی صاحب اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سے استفادہ کمالات کیا۔

۱۲۔ حضرت مولانا حافظ عبد الرحمن صاحب امرہویؒ

آپ حضرت مولانا احمد حسن صاحب امرہوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے تفسیر کے بعض اسباق حضرت نانوتویؒ سے بھی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے فیض سے آپ کے اوپر حدیث، فقہ اور تفسیر وغیرہ کے اسباق میں مشکل و رنگ غالب تھا۔ جگہ جگہ انت نانوتویؒ کے علوم کا حوالہ بھی دیتے تھے اور انہیں وضاحت کے ساتھ بیان بھی فرماتے تھے۔ امرہہ میں ایک عرصہ درس دیا اور آخر میں کچھ عرصہ جب کہ ۱۳۶۱ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ گرفتار کر گئے تو دیوبند میں بھی بعدہ صدر مدرس درس حدیث دیا ہے۔

۱۳۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب

آپ حضرت بانی دارالعلوم کے صاحبزادہ تھے۔ علم و فضل کی لائن میں آپ کی تعلیم ضرب المثل تھی۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم خامس ہوئے مگر دورِ ابتہام میں بھی درس و تدریس کا مشغل نہیں چھوڑا۔ مشکوٰۃ، جلالین، صحیح مسلم اور منطق میں میرزا بہرہ وغیرہ آپ کے درس میں رہتی تھیں۔ مشکوٰۃ اور مسلم احقر نے بھی ان ہی سے پڑھی ہے۔ کھٹن سے کھٹن مسئلہ کو اپنے اندازِ تعلیم سے پانی کر دیتے تھے۔ آپ حضرت حاجی املا داد صاحب قدس سرہ کے متوسل اور خلیفہ تھے۔ بیعت وارث و کاسلسلہ بھی تھا مگر کم۔ زیادہ مصروفیت نظم دارالعلوم اور ابتہام میں رہتی تھی۔ آپ کا چالیس سالہ دورِ ابتہام تعمیری و تعلیمی ترقیات کا دوسرا سمیٹا جاتا ہے۔ یہ دینی ادارہ مدرسہ کی حیثیت سے ترقی کر کے آپ ہی کے دورِ ابتہام میں دارالعلوم بنا اور اس کا حلقہ اثر ہندوستان کے تمام خطوں میں زیادہ پھیلا۔ آپ مشامیر ہند میں سے تھے۔ زیادہ انہماک انتظام دارالعلوم اور درس و تدریس میں تھا۔ لیکن وقتی طور پر ملکی سیاست میں بھی کم و بیش آپ نے حصہ لیا۔ چنانچہ جمعیتہ العلماء و مدہل کھنڈ کے اجلاس عام مراد آباد کی آپ نے صدارت فرمائی اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ کو اپنا خطبہ صدارت پڑھا جو اس زمانہ میں کتابی صورت میں شائع بھی ہوا، جس میں انگریزوں سے ترکِ موالات پر زور دیا گیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے عہدہ ابتہام کی عظمت کے پیش نظر نظام و کن نے آپ کو حیدرآباد کے عہدہ مفتی عدالت عالیہ کے لئے نامزد کر کے بلائے کی استدعا کی جسے آپ نے بشورہ جماعت منظور فرمایا اور چار سال وہاں گذارے۔ واپسی پر پھر بدستور اپنے فرائض سنبھال لئے۔ آپ کا اخلاص اور ظاہر و باطن کی یکسانی جماعت میں مسلم تھی۔ آپ کی آبائی نسبت کی عظمت کی وجہ سے خصوصیت کے ساتھ آپ کے اسامہ بھی آپ کا احترام کرتے تھے۔

۱۴۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دیوبندی

آپ دارالعلوم دیوبند کے چھ مہتمم تھے۔ حق تعالیٰ نے آپ کو دین کا خاص فہم عطا فرمایا تھا۔ آپ کی دانش و تدبیر مشہور زمانہ تھی۔ ادبیات کے ماہر تھے۔ عربی نظم و نثر دونوں پر کمال قدرت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے نظم و نسق نے آپ کے تدبیر و دانش سے عظیم استفادہ کیا۔ آپ کی اس دانش و بینش اور عظیم علمی شخصیت کی بنا پر حکومت حیدرآباد کا عہدہ افتار مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے بعد آپ ہی کو تفویض کیا گیا تھا۔ آپ کا حکم، تواضع، مروت اور تحمل مشہور زمانہ تھا۔ آپ حضرت گنگوہی کے متوسل اور طریقت کے عمولات کے نہایت پابند تھے۔ وفات کے دن فجر سے حسرت کے ساتھ فرمایا کہ میرا بارہ ہزار اسم ذات انسوس کہ آج پورا نہیں ہو سکا۔ شب بیدار اور ہمہ وقت مشغول کار رہتے تھے۔ ان کی مجلس پر شکوہ اور مورث طمانیت ہوتی تھی۔ کئی عربی تصنیفیں اور کئی مفید ترین تصانیف آپ کا ترکہ ہے جو امت کو ملا۔ ان میں اشاعت اسلام، ایک معرکہ الکرامہ، تصنیف ہے جو مقبول خواص و عوام ہے۔

۱۵۔ مولانا حکیم عبدالوہاب صاحب یوسف پوری (ضلع غازی پور) المعروف حکیم نابینا

آپ دہلی کے مشہور طبیب، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے عاشق مرید اور علوم و دینیہ کے ماہر تھے۔ نابینائی کی حالت میں تحصیل علم کی اور مہارت تامل پیدا کی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے تلامذہ میں سے تھے۔ انہیں کی طالب علمی کے زمانہ میں یورپ کا ایک ستیاج دارالعلوم دیکھنے آیا تو اُس نے واپس ہو کر یورپ کے اخبارات میں دارالعلوم کے حالات کا ذکر کرتے

ہوئے لکھا کہ دارالعلوم میں پہنچ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ایک نابینا طالب علم اپنے ساتھیوں کو اقلیدس کا تکرار کر رہا تھا اور اقلیدس کی مشکل مشکل شکلیں سامنے کے طالب علم کی کرپرائنگلی سے پہنچ گئیں کہ اسے سمجھا رہا تھا یہ طالب علم یہی حکیم عبدالوہاب صاحب تھے۔ بعد تعلیم حضرت اقدس مولانا گنگوہی سے بیعت کی اور حضرت کی صحبت سے استفادہ ہو کر باطنی کمال پیدا کیا۔ خود مجھ سے ایک دفعہ ذکر فرمایا کہ میں نے طب پڑھنے کے بعد حضرت گنگوہی سے عرض کیا کہ ذریعہ معاش کے طور پر میں نے طب پڑھ لی ہے لیکن اطباء مریض کا چہرہ مہرہ دیکھ کر، قارورہ دیکھ کر اور دوسرے مشاہدات سے مرض کی تشخیص کرتے ہیں لیکن میں نابینا ان تمام مشاہدات سے محذور ہوں اور چاہتا ہوں کہ معاش اس فن (طب) سے پیدا کر دوں، اس لئے میرے ہمتی میں دھار فرمادیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نباضی کی مہارت عطا فرمائیں گے اور تم نبض دیکھ کر وہ تمام باتیں معلوم کر لو گے جو دوسرے اطباء مشاہدات سے معلوم کرتے ہیں۔ یہ قصہ سنا کر فرمایا کہ الحمد للہ میں اپنے شیخ کی اس کرامت کو روزانہ مشاہدہ کرتا رہوں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی مجھ پر مرض اور مریض کے احوال کی تمام کوششیں منکشف ہو جاتی ہیں چنانچہ ان کی نبض شناسی کی مہارت، اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ باپ یا بھائی کی نبض دیکھ کر بیٹے اور دوسرے بھائی کے احوال مرض بتا دیا کرتے تھے۔ باوجود علمی استحضار کے شغل آخر تک طب اور طب ہی کا غالب رہا اور اسی میں پوری عمر گزاری۔ لوگ شفا ر بدن کے ساتھ ان کے تقویٰ و طہارت اور معمولات کی پابندی اور سختگی سے شفا ر روح بھی حاصل کرتے تھے۔

۱۶۔ حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری

آپ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے اور حضرت تھانوی کے ہم عصروں میں سے تھے۔ ذکی، طبائع اور تیز فہم علماء میں سے تھے۔ آپ کی تقریر معروف اور مشہور تھی۔ زبردست مناظر تھے۔ مبتدعین اور قادیانیوں کو تائبہ دروازہ آپ ہی نے پہنچایا۔ عرصہ دراز تک درجہ نگہ اور مراد آباد میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیئے اور اس خدمت میں دارالعلوم کے عہدہ نظامت تعلیم اور پھر نظامت تبلیغ پر فائز ہوئے۔ دارالعلوم میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ آپ کی نمایاں اور غیر معمولی خطابت نے ملک کے گوشہ گوشہ کو مستفیض کیا۔ آپ کو رو بہ دعوت اور رد قادیانیت سے خاص شغف تھا اور اس سلسلہ میں آپ کی بہت سی قابل قدر تصانیف ہیں جو طبع ہو چکی ہیں۔

۱۷۔ حضرت مولانا حکیم الدین صاحب

سابق پرنسپل اور نٹیل کالج لاہور۔ آپ مشہور حلیم و سلیم عالم تھے۔ لاہور کے علمی حلقوں میں آپ کے علم کی خاص شہرت تھی۔

۱۸۔ حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری

سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔ آپ حضرت شیخ الہند کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے۔ علم کا چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ آپ تمام علوم منقولات و معقولات میں کامل دست نگاہ رکھتے تھے۔ قوت حافظہ میں یگانہ روزگار تھے۔ کئی مشہور محققانہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا درس حدیث اپنے دور کا مشہور درس تھا جو ایک خاص امتیازی طرز

لئے ہوئے تھے۔ آپ کے تبحر علمی نے درس حدیث کو جامع علوم و فنون بنا دیا تھا۔ آپ کے درس نے نقل و روایت کی راہ سے آنے والے فقہوں کے لئے آنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ آج بھی نمایاں علماء اور صاحب طرز فضلاں زیادہ تر آپ ہی کے تلامذہ ہیں جو ہندو پاک میں علمی مسندوں کو آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ کے یہاں یوں قادیانیت کا خاص اہتمام تھا اور اس فقہ کو اعظم الفتن شمار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں بہت سی معرکۃ الافراک آگیاں خود بھی تصنیف فرمائیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے تلامذہ سے بھی لکھوائیں۔ اس بارے میں بڑے شغف کے ساتھ کھنے والوں کو علمی مدد دیتے تھے اور کوئی بھی اپنا نوشتہ لا کر سنا تا تو غیر معمولی خوشی کا اظہار فرما کر دعائیں دیتے تھے۔ تقریباً ۱۲۷۷ھ سے آپ نے دارالعلوم میں درس کا آغاز فرمایا۔ ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک آپ دارالعلوم کے صدر مدرس رہے۔ اس دوران تقریباً ایک ہزار طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا جن میں سے آپ کے دور صدر مدرس میں ۸۰۹ طلبہ نے درس حدیث لیا اور اس فن پاک کو تقریباً و تحریراً اور درساً و تدریساً دورِ دور تک پہنچایا۔

۱۹۔ حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب لکھنوی

آپ مشہور صاحب سلسلہ بزرگ تھے۔ حضرت گنگوہی کے خلیفہ مجاز تھے۔ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ انگریزی دان طبقہ بالخصوص گورنمنٹ کے بڑے بڑے عہدے دار آپ سے زیادہ مستفید ہوئے۔ ابتداء عہد میں آپ سے بعض خوارق کا ظہور بھی ہوا ہے۔ ریاضت کافی کی اور آپ پر اس کے اثرات نمایاں تھے۔

۲۰۔ حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب

محدث مدرسہ امینیہ دہلی، مفتی اعظم ہندوستان۔ اپنے زمانہ کے مشہور و مسلم مفتی اور فقیہ تھے۔ حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ نکتہ رس علماء میں سے تھے۔ تدریس و افتاء کے علاوہ سیاسی لائن میں بھی نمایاں کام انجام دیا۔ آپ ہی جمعیتہ العلماء ہند کے سب سے پہلے صدر ہوئے اور عرصہ دراز تک صدر رہے۔ جمعیتہ العلماء اور کانگرس کی تحریکوں میں قائدانہ حصہ لیا۔ کئی مرتبہ جیل گئے۔ آپ کا علم و فہم علماء میں تسلیم شدہ تھا۔ حضرت تھانوی جیسی مردم شناس ہستی نے فرمایا کہ میں مفتی کفایت اللہ کے تدبیر اور مولوی حسین احمد کے جوش عمل کا متفقہ ہوں۔ مجموعی طور پر آپ فقیہ، محدث، مفتی، مجاہد، اور نکتہ سنچ علماء دیوبند میں سے تھے۔

۲۱۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے پانچویں صدر المدرسین تھے۔ حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ علم و فضل کے ساتھ غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہی کے خلفاء مجازین میں سے تھے۔ علم سے فراغت کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ ۱۳۱۶ھ میں مدینہ طیبہ پہنچے اور اٹھارہ سال مدینہ منورہ میں رہ کر مختلف علوم و فنون بالخصوص حدیث شریف کا درس دیا۔ زندگی کمال زہد و قناعت کی تھی جو کمال صبر و تحمل سے اس مدت میں بسر ہوئی۔ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران ۱۳۱۸ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ پھر ۱۳۱۹ھ میں واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۳۲۹ھ تک درس دیا۔ پھر اسی سال مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ ۱۳۳۱ھ میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے۔

اور اسی سال مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۵ھ میں حضرت شیخ الہند کے ہمراہ حجاز ہی میں اسیر کر کے مالٹا بھیج دیے گئے۔ ۱۳۲۸ھ میں مالٹا سے رہا ہو کر حضرت شیخ الہند کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے اور اسی سال اکابر کے حکم سے جامع اسلامیہ امرتسر میں صدارت تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں صدر مدرس رہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۳۰ھ میں ہی جامعہ اسلامیہ سلہٹ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے آپ کاقرر ہو گیا۔ سلہٹ میں آپ ۱۳۴۵ھ تک قیام پذیر رہے۔ حضرت علامہ سید محمد اور شاہ صاحب کشمیری کے ڈائجیل تشریف لے جانے پر آپ شوال ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس بنائے گئے۔ آپ بڑے درجہ کے محدث تھے۔ حدیث کے مشہور اسکالر تھے آپ کا درس حدیث بہت مقبول تھا کئی تصانیف فرمائیں جو سیاست اور تصوف پر ہیں۔ ۱۳۴۵ھ سے ۱۳۴۸ھ تک تیس برس دارالعلوم میں صدر مدرس اور ناظم تعلیمات رہے۔ اس دوران میں ۱۳۸۳ھ طبع نے آپ سے بخاری اور ترمذی پڑھ کر دو حدیث سے فراغت حاصل کی۔ آپ ان تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت مردانہ سے سیاسی کام بھی پوری تن دی سے انجام دیتے رہے۔ اسی دوران میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے بار بار صدر بنائے گئے۔ آپ جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے قائد میں سے تھے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور سر دھڑکی بازی لگا دی۔ کئی مرتبہ جیل گئے اور آخر کار ملک کو آزاد کرایا۔ بہر حال مجموعی حیثیت سے آپ عالم، فاضل، شیخ، وقت، مجاہد، جفاکش، جبری اور اولوالعزم فضلہ دار عالم دیوبند میں سے تھے۔

۲۲۔ حضرت مولانا عبد اللہ صاحب سندھی

سابق ناظم جمعیۃ الانصار دارالعلوم دیوبند۔ سکھ مت سے آپ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذکاوت، ذہانت اور حافظہ کے مالک۔ ذہن مختلف طور پر سیاسی تھا۔ سیاست میں گہری نظر تھی، ابتداء طبعی اور علمی انداز میں اور بعد میں مشاہداتی انداز میں۔ یورپ اور ایشیا کے بہت سے انقلابات آپ کے سامنے گذرے اس لئے سیاسی اسکیموں کی ساخت و پرداخت میں آپ کو فنی ملکہ حاصل تھا۔ آپ نے حضرت شیخ الہند کی تحریک ریشمی ردال میں سرگرم حصہ لیا۔ افغانستان کی آزادی کی اسکیم آپ ہی بہ مرتب فرمائی تھی۔ ۲۵ سال تک جلاوطن رہے۔ واپس تشریف لا کر فلسفہ ولی الہی سے ملک کو روشناس کرایا۔ سندھ سر اکاڈمی اور محمد قاسم ولی الہی سوسائٹی قائم کی۔ جس نے حضرت نانوتوی اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم کی کافی بک کی۔ افغانستان میں آپ نے اٹلین فینیل کانگریس کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر کے افغانستان کے حق میں ہندوستان کی جنگ حاصل کیں۔ آپ کانگریس میں شرکت کے حامی تھے مگر انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث القوم۔ دارالعلوم میں آپ جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے بڑے بڑے دو اجلاس مراوا آباد اور میرٹھ میں ہوئے۔ اور اس کے حلقہ اثر میں وسعت اور قوت پیدا ہوئی۔ آپ دارالعلوم کو ایک علمی انداز سے منظم کر کا ایک مرکز بنا چاہتے تھے۔ جس کا نقش اول جمعیۃ الانصار کا قیام تھا۔

۲۶۔ حضرت مولانا محمد نجفی صاحب مدظلہ العالی

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل تھے۔ مشہور عالم ذی استعداد و فاضل تھے۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے راستہ سے آپ کا علمی فیضان بنگال کے گرد و نواح میں کافی پھیلا۔ متواضع، ہنس اور خلیق علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

۲۷۔ حضرت مولانا عبدالرزاق صاحب پشادری

آپ افغانستان میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز رہے۔ حکومت افغانستان میں آپ کا خاص وقار تھا۔ آپ وہاں کی پریوی کونسل کے صدر بھی تھے اور شرعی احکام میں آپ کا فیصلہ آخری ہوتا تھا۔ جس پر بادشاہ اور حکومت سب سر جھکا دیتے تھے۔

۲۸۔ حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب

خطیب جامع مسجد جوہر النوالہ۔ آپ قابل قدر علم کے حامل تھے۔ ارشاد الباری: "آپ کی مشہور تالیف ہے آپ گہرا علم رکھتے تھے اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید تھے۔

۲۹۔ حضرت مولانا محمد سہول صاحب بھگل پوری

آپ دارالعلوم کے ممتاز ابناء قدیم میں سے تھے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف دینی مدارس میں آپ نے مدرسہ کی۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے۔ دارالعلوم دیوبند میں تقریباً آٹھ سال درس دیا۔ پھر تقریباً تین سال یہاں کے مفتی کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد ازاں مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس ہو کر تشریف لے گئے اور عمر کا آخری حصہ وہیں گزارا۔ آپ کا علمی فیض بہت عام ہوا۔ شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا محمد اعجاز علی صاحب جیسے لائق اور فاضل علماء آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ مدد و رحمت قلب کے ساتھ صاحب دل تھے اور اکابر اسلاف کے نقشبند قدیم کے انتہائی طور پر محافظ تھے۔ رحمہ اللہ رحمت واسعہ۔ آپ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر بھی رہے۔

۳۰۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری

آپ حضرت نانوتوی کے نواسے تھے۔ حضرت شیخ الہند کے خاص مستند تلمیذ رشید تھے۔ ابتداءً حضرت شیخ الہند کے علمی کاموں میں شریک رہے اور اخلاقی استفادہ کیا۔ پھر حضرت کے سیاسی منصوبوں میں شریک ہوئے۔ اور آخر کار حضرت کے امین اور راز دار و رفقا میں شمار ہوئے۔ ریشمی خط کو حجاز لے کر آپ ہی روانہ ہوئے تھے اور برطانوی حکام کی انتہائی کوشش کے باوجود ان کے قبضہ میں نہ آئے اور ممبئی سے پشاور تک مخفی سفر کیا۔ ہندوستان کی سرحد پار کر کے افغانستان میں داخل ہو گئے اور ریشمی خط اپنے موقع پر پہنچا دیا۔ کابل کا انقلاب آپ کے سامنے ہوا۔ بچہ سقہ کی چند روزہ حکومت میں آپ کو کابل سے بھی جلا وطن کر دیئے جانے کا آرڈر دیا گیا اور آپ کسی نہ کسی طرح کابل سے روپوشی کے ساتھ روس کی سرحدیں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں افغانستان میں انقلاب ہو گیا اور جنرل نادر شاہ حکمران ہو گئے۔ انہوں نے مولانا کو عقیدت کے ساتھ پھر بلایا اور روسی سفارت خانہ میں بحیثیت نائب سفیر آپ کو روس بھیجا گیا۔ وہاں سے واپسی پر قتل آپ کابل میں مقیم ہوئے۔ ۱۳۵۵ھ میں مجھے آپ نے بحیثیت مہتمم دارالعلوم دعوت دی اور مجلس شوریٰ نے اس دعوت کو کمال بخوشی

منظور کرتے ہوئے مجھے بطور نمائندہ دارالعلوم افغانستان بھیجا تاکہ میں امیرزادہ شاہ کی وفات پر تعزیت اور موجودہ بادشاہ افغانستان امیر ظہیر شاہ کی تخت نشینی پر تہنیت پیش کروں۔ افغانستان میں آپ کا علمی اور سیاسی وقار قوم اور حکومت کیساں طور پر برپا تھی۔ مولانا ابوالکلام مرحوم کا جذبہ اور فیصلہ یہ تھا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وہ مولانا منصور گوہر و لاہور کے لیکن آزاد ہی ہند کے چند ماہ پیشتر مدد کا وصال ہو گیا۔ رحمہ اللہ۔

۲۸۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی

آپ پوری علاقہ میں خاص شہرت رکھتے تھے مگر آخر میں ان پر عدم تقلید کا غلبہ ہو گیا اور جماعت دیوبند نے انتساب کا رشتہ کمزور ہو گیا۔

۲۹۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

آپ حضرت شیخ الہند کے مہتمم علیہ تلامذہ میں سے تھے۔ غیر معمولی ذہانت و کلمات کے حامل تھے۔ علم مستحضر تھا اور بڑا منقح علم تھا۔ درس مقبول تھا، علوم عقلیہ سے خاص ذوق تھا۔ منطق، فلسفہ اور علم کلام میں غیر معمولی دسترس تھی۔ حکمت، قاسمید کے بہترین شارح تھے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مسجد فتح پوری دہلی کے مدرسہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تدریس علوم میں مشغول ہوئے۔ پھر دارالعلوم میں بحیثیت مدرس بلائے گئے۔ اُنہی کے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار تھا۔ ڈاکٹر بھیل میں ایک عرصہ تک شیخ التفسیر کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے آخری دور میں چند سال دارالعلوم کے صدر مہتمم بھی رہے۔ صحیح مسلم کی بہترین شرح مشکوٰۃ انداز میں لکھی اور حکمت قاسمید کو اس میں نمایاں رکھا۔ حضرت شیخ الہند کے تفسیری فوائد حضرت نے ترجمہ کے ساتھ شروع فرمائے تھے آپ نے پائیکمیل کو پہنچاتے۔ بے مثال خطیب تھے اور خطبات میں قاسمید بکثرت بیان کرتے تھے۔ تحریر و تقریر میں انہی علوم کا غلبہ تھا۔ سیاسی شعور اُنہی کے درجہ کا تھا۔ ملکی معاملات میں آثار چرچہ کا پورا نقشہ ذہن کے سامنے رہتا تھا اور اس بارے میں عجیبی شکی رائے قائم کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کی تحریک لیشمی روٹ میں شریک رہے۔ جمعیتہ العلماء ہند کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ آخر میں مسلم لیگ کی تحریک میں شامل ہو گئے اور جمعیتہ اسلام کی بنیاد ڈالی۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستان پہنچ کر ترک وطن کر دیا۔ پاکستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے۔ پاکستان اسلام آباد قانون کے نفاذ کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ قرار داد متفاصد پاس کرانی۔ وہاں کی قوم نے آپ کو شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کیا۔ ایک سفر کے دوران میں بہاول پور میں وفات پائی اور کراچی میں دفن ہوئے۔ پورا ملک اور حکومت سزا ہوئی اور عرصہ دراز تک آپ کا غم منایا جاتا رہا۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

۳۰۔ حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب مدظلہ

سابق صدر المدرسین مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد، موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ آپ اُنہی کے درجہ کے ہیں۔ جمعیتہ العلماء ہند اور کانگریس کی تحریکوں میں برابر حصہ لیتے رہے اور کئی بار جیل گئے۔ حضرت مولانا سید حسین احمد کی وفات کے بعد آپ ہی کو جمعیتہ العلماء ہند کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک دارالعلوم میں آپ سے ۱۱۹۱ طلبہ نے بخاری شریف پڑھی۔

۳۱۔ حضرت مولانا فضل رتی صاحبؒ

آپ شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں ایک بوشیلے عالم تھے۔ آپ حکومت افغانستان کی ہیئت تیزیہ کے رکن کی حیثیت سے بہت ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔

۳۲۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے موجودہ صدر المدرسین ہیں اور حضرت شیخ الہندؒ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت معقولات میں خصوصاً اور جمیع علوم میں عموماً فرو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ موجودہ اساتذہ دارالعلوم و دیگر مدارس دینیہ اکثر بہت کے ساتھ آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ درس حدیث میں آپ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مختلف مدارس دینیہ، فتح پوری دہلی، مدرسہ امدادیہ دہلی، مدرسہ ہاٹ ہزاری پٹانگام وغیرہ میں صدارت تدریس کے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کے اساتذہ نے بالآخر آپ کو دارالعلوم کے لئے انتخاب فرمایا اور بہت اویسے طبقہ کے اساتذہ میں آپ کا شمار رہا۔ ۳۷ھ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ دارالعلوم کے صدر مدرس، ناظم تعلیمات اور مجلس شوریٰ کے ممبر بنائے گئے۔ آپ کے زمانہ صدر مدرس میں ۳۷ھ سے ۳۸ھ تک ۱۱۴۱ طلبہ دورہ حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

۳۳۔ حضرت مولانا ماجد علی صاحبؒ

آپ مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پرنسپل رہے اور اس نواح کے مشہور عالم و فضل میں سے تھے۔

۳۴۔ حضرت مولانا شمس الدین صاحب امرتسریؒ

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ حدیث اور قرآن پر اچھی اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ آریلوں اور قادیانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور متعدد مناظرے کئے۔ آپ کا لقب شیر پنجاب تھا۔ میلان عدم تقلید کی طرف تھا۔ آزادی ملک کی تحریک میں جمعیۃ العلماء ہند کے ساتھ رہے اور باوجود اختلاف مسلک کے اکابر و اسلاف دیوبند کے بہت زیادہ گرویدہ اور اخلاقی طور پر ان سے غیر معمولی انداز سے وابستہ رہے۔ اس حق سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ ہمیشہ ملاقات کے وقت مصافحہ اور معالفت ہی پر قناعت نہ کرتے تھے بلکہ پیشانی بھی چوستے تھے، اور بعض اوقات آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے۔

۳۵۔ حضرت مولانا مسطر احسن صاحب گیلانیؒ

آپ بھی مشہور فضلاء دیوبند میں سے تھے۔ صاحب طرز مصنف، نیز ذہن و ذکا اور طباعی میں منفرد تھے۔ تحصیل علوم سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے آرگن رسالہ "القاسم" کے ایڈیٹر اور رئیس التحریر منتخب کئے گئے اور عرصہ دراز تک علمی خدمات سے ہندوستان کے علمی حلقوں کو مستفید کرتے رہے۔ اس کے بعد حضرت حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سفارش پر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس دوران میں بہت سی مفید اور علمی تصانیف آپ کے قلم سے نکلیں۔ "کائنات روحانی"، "سوانح ابوذر غفاریؓ"، "اور مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" وغیرہ آپ کی منہ افسوس کہ حضرت مولانا وفات پا گئے۔

مخصوص اور مشہور تصانیف ہیں۔ تصانیف اور علمی مقالات کا عدد بہت کافی ہے جو مقبول خواص و عوام ہیں۔ آخر میں اشترکی فرمائش پر آپ نے "سوانح قاسمی" تین جلدوں میں مرتب کی جو آپ کی تصانیف میں ایک شاہ کار تصنیف ہے۔ اس کے بارے میں جب اشترک نے اُن سے فرمائش کی تو بہت خوشی اور انگ سے اُسے قبول کرتے ہوئے لکھا کہ میری علمی زندگی کی ابتداء "القاسم" ہی سے ہوئی تھی اور شاید انتہا بھی "القاسم" (یعنی حضرت نافو توئی) ہی پر ہوگی۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سوانح قاسمی کی چوتھی جلد آپ نے شروع کی۔ پانچ صفحے لکھنے پائے تھے کہ عمر فانی نے جواب دے دیا اور "القاسم" پر انتہا ہو گئی۔ تقریر و خطابت نہایت عالمانہ، ادبیانہ اور پر جوش ہوتی تھی۔ توقیف سنچ اور مکتہ رس علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ ہندوستان کے مشاہیر علماء میں آپ کی ممتاز حیثیت مانی جاتی تھی۔ ۱۳۵۷ھ میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

۳۶۔ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمپوریؒ

آپ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ حدیث سے خاص لگاؤ تھا۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں عمر تک صدر مدرس رہے اور علوم و فنون کا درس دیتے رہے۔ پاکستان بننے پر مدرسہ خیر المدارس ملتان میں اُسٹا د حدیث مقرر ہوئے۔ کئی سال سے ضعیف ہونے کی وجہ سے گھر پر تھے۔ گذشتہ سال انتقال ہو گیا۔

۳۷۔ حضرت مولانا سیف الرحمن صاحب کالپیؒ

آپ مشہور سیاسی لیڈر تھے جنہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک میں بہت نمایاں کام کئے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد صدر ملک دہلی میں قیام کیا۔ پھر اپنے وطن واپس جا کر وہیں مقیم ہو گئے۔ میں جب ۱۳۵۸ھ میں افغانستان حاضر ہوا تو بقید حیات تھے۔ اور میرے ساتھ غیر معمولی محبت اور ادب و احترام بلکہ نیاز مندی سے پیش آتے تھے حالانکہ میں اُن کا حق خود تھا۔ آپ زبردست مجاہد تھے اور جہاد کا جوش سینہ میں اُبٹا ہوا رکھتے تھے۔ بیٹھنے جب یورپ پر حملہ کیا تو میں اس وقت کابل ہی میں تھا اور اتفاق سے مولانا ہی کے مکان پر موجود تھا۔ حملہ کی خبر سننے ہی جوش مسرت سے دوڑ پڑے۔ سجدے میں گر گئے اور فرمایا کہ "خداوند! تیرا شکر ہے کہ بھٹیڑوں میں باہم جنگ شروع ہو گئی جس سے انسانوں کے بچ جانے کی توقع ہو گئی۔"

۳۸۔ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز علماء اور شیوخ میں سے تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اہل خلفاء میں سے تھے۔ آپ کا طرز اصلاح و تہذیب نفس ہو یہو حضرت تھانویؒ کی طرح تھا۔ پہلے ضلع اعظم گڑھ میں شہر گورکھ پور میں اور پھر اکباد شہر میں آپ نے اپنی خانقاہیں قائم فرمائیں۔ بڑے بڑے ذی علم اور صاحب جاہ و ثروت حضرت کی اصلاح آپ کے ذریعہ سے ہوئی۔ نبراردوں ننگانہ خدا کو روحانی فیض پہنچایا اور یہ خط آپ کے وجود باوجود سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔

۳۹۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مظلہؒ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مظلہؒ دیوبند میں سے ہیں اور ابتداء طالب علمی سے استہبابک محمد طیب بہتم دارالعلوم دیوبند کے رفقاء تعلیم میں سے ہیں۔ قوی الاستعداد ہیں اور استحضار علم کے ساتھ معروف و

ادب میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ فراغت تعلیم کے بعد دارالعلوم کے درجہ ابتدائی کے مدرس ہوئے اور تعلیمی ترقی کی منزل میں طے کر کے طبقہ دسویں اور پھر طبقہ اعلیٰ کے مدرسین میں شمار کئے گئے۔ فقہی مناسبت اور فہم سے خاص ذوق کی بنا پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی اعظم دارالعلوم کے حلقہ افتاء میں شامل ہوئے، اور ایک ممتاز مفتوی نہیں ثابت ہوئے۔ بالآخر حضرت ممدوح کی وفات کے بعد دارالعلوم کے سمدہ افتاء پر بحیثیت مفتی دارالعلوم آپ ہی کا انتخاب کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اسارتِ مالٹا سے رہا ہو کر آجائے کے بعد آپ حضرت شیخ الہند سے بیعت ہوئے۔ اور حضرت کے وصال کے بعد احرار کی معیت میں حضرت اقدس مولانا مفتوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیا اور حضرت مرشد مختار مفتوی سے خلافت حاصل کی، اور تعلیم ظاہر کے ساتھ تعلیم باطن کی طرف مشغول ہوئے۔ الحمد للہ مولانا کے متوسلین بکثرت ہیں اور مخلوق کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ تصنیف و تالیف کا ذوق ابتداء ہی سے تھا۔ فقہ و حدیث اور مناظرہ میں نہایت مفید تصانیف کا ایک ذخیرہ ہے جو آپ کے قلم سے نکلا اور خواص و عوام کے لئے مفید ثابت ہو رہا ہے۔ شعر و شاعری کا ذوق بھی زمانہ طالب علمی سے ہی تھا۔ عربی، فارسی اور اردو میں نہایت عمدہ قصائد، مرثیے اور واقعاتی نظمیں کہیں، جن کا مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار فرمائی اور آج وہاں کے ممتاز مفتویوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ گورنمنٹ پاکستان نے اسلامی قانون کی تدوین کے لئے علماء کی جو کمیٹی بنائی آپ اس کے رکن رکن رہے۔ آپ نے لاٹھی (دراچی) میں ایک بڑے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی، جو آج مرکزی حیثیت کی ایک ممتاز تعلیم گاہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ آپ فضلاء دارالعلوم دیوبند میں ایک ہم جہتی امتیاز رکھتے ہیں۔

۴۰۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ

از عزیز احمد قاسمی ناظم شعبہ تنظیم اہلناہ قدیم و ناظم شعبہ تبلیغ دارالعلوم دیوبند
آپ حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ کے پوتے اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب بہتم خاص دارالعلوم کے صاحبزادے ہیں۔ آپ حضرت علامہ سید محمد الہ شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے مخصوص تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ نے علامہ میں علوم و دینیات سے فراغت حاصل کی اور دارالعلوم میں حسبہ للہ درس و تدریس کا آغاز کیا اور درس نظامی کی مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ ۱۳۷۳ھ سے ۱۳۸۸ھ تک دارالعلوم کے نائب بہتم رہے اور ۱۳۸۸ھ سے اب تک کہ ۹۵ سالہ ہیں آپ ہی دارالعلوم کے بہتم ہیں۔ اس وقت پورے ہندوستان میں بہترین خطیب تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے ہر خطہ میں پہنچ کر تقریر و خطابت کے ذریعہ اسلامی مقاصد کی اشاعت اور مسک دارالعلوم کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا۔ تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک متقل ادارہ آپ کی تصانیف کو شائع کر رہا ہے جو ملک میں مقبول ہیں۔ شعر و سخن میں بھی اپنے بزرگوں کی طرح ثقہ انداز میں دخل رکھتے ہیں۔ آپ کی متعدد نظمیں، مثنویاں، اور قصائد میں جو رسالہ دارالعلوم اور القاسم میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بعض تبلیغی نظمیں کتابی صورت میں بھی مستقلاً شائع ہوتی ہیں۔ آپ ہندوستان کے متعدد علمی و تعلیمی اداروں کے ممبر اور سرپرست ہیں اور متعدد مدارس کے بانی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انگریز کالج، کونسل کے ممبر ہیں اور عرصہ دراز تک سٹی سنٹرل وقف بورڈ کے ممبر رہے۔ دارالعلوم کے ذمہ داروں میں سے آپ پہلے شخص

ہیں جنہوں نے بیرونی ممالک کے متعدد سفر کئے۔ افغانستان، برما، عدن، حجاز، مصر، اردن، لبنان، سائنہ، افریقہ، روڈیشیا، کینیا، ملائیشیا، تنزانیہ، بنگلہ دیش، بھارت، سری لنکا، پاکستان وغیرہ میں جا کر دارالعلوم کا تعارف کرایا۔ آپ کے زمانہ میں دارالعلوم نے غیر معمولی ترقی کی۔ تعلیمی اور تعمیری سلسلہ کافی بڑھا۔ کاموں اور شعبوں میں اضافہ ہوا۔ اساتذہ، طلبہ اور عملہ کا عدد بہت بڑھ گیا۔ آمدنی کی رفتار غیر معمولی طور پر ترقی پذیر ہوئی جس کی تفصیل آتے والے نقشوں سے معلوم ہوگی۔ شعبوں نے محکموں کی صورت اختیار کر لی جیسا کہ آگے متعلقہ نقشہ جات سے تفصیلات معلوم ہوں گی۔ محمود حضرت شیخ الہند سے بیعت اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا بیعت وارشاہ کا سلسلہ ہندویر، دہلی، ہند میں پھیلا ہوا ہے۔ اہتمام کے طویل الزمیل کاموں کے باوجود درس و تدریس کا مشغلہ آپ کا کبھی ترک نہیں ہوا۔ حدیث و تفسیر اور فن حقائق اسرار کی کتابیں جیسے حجتہ اللہ البالغہ وغیرہ اکثر زیرِ بحث رہتی ہیں۔ دیوبند میں آپ کی ایک متعلیٰ مجلس مذاکرہ قائم ہے جس میں طلبہ اور شہر کے لوگ جمع ہو کر علمی استفادہ کرتے ہیں۔

۴۱۔ حضرت مولانا محمد اعجاز علی صاحب

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے نہایت ممتاز فضلاء میں سے تھے۔ آپ نے ۱۳۲۱ھ دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد حضرت شیخ الہند نے آپ کو مدرسہ نعمانیہ پورنی ضلع بھاگل پور کے لیے منتخب فرمایا۔ چنانچہ آپ تقریباً سات سال اس علاقہ میں درس دیتے رہے۔ پھر آپ شاہجہان پور تشریف لاتے اور ایک مسجد میں فضل المدارس کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں سب سے ابتداً درس دیتے رہے۔ یہاں تقریباً تین سال نہایت کامیابی کے ساتھ درس دیا۔ ۱۳۳۲ھ میں آپ کو تقرر دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ہوا اور پہلے سال آپ کو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نور الایضاح و غیرہ پڑھانے کے لئے دی گئیں۔

دوران ملازمت میں جب حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند ریاست حیدرآباد کے مفتی اعظم کے عہدہ پر سرفراز فرمائے گئے تو اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے حضرت مولانا محمد اعجاز علی صاحب کو اپنی معیت میں لے گئے۔ وہاں ایک سال قیام رہا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے ساتھ ہی آپ دیوبند واپس تشریف لاتے۔ آپ کو مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب کے بعد صدر مفتی دارالعلوم دیوبند کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد انہیں عمر تک دارالعلوم دیوبند ہی میں آپ کا قیام رہا۔

فقہ و ادب آپ کا خاص فن تھا۔ جس کی مہارت مشہور زمانہ ہے۔ آپ جب ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں تشریف لاتے تو عربی کی ابتدائی کتابیں علم الصیغہ اور نور الایضاح آپ کو دی گئیں مگر آپ کے درس نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ شیخ الادب والفقہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور عم کے آخری دور میں کئی سال ترمذی جلد ثانی اور تفسیر کی بلند پارے کتابیں بھی پڑھانے لگے۔ علم حدیث، علم ادب، علم تفسیر وغیرہ ہر فن کی کتابیں آپ نے پڑھائیں۔ تعلیم کے ساتھ طلبہ کی تربیت اور نگرانی کا کام میں خاص ذوق تھا جس سے طلبہ کو بے انتہاء فائدہ پہنچا۔ آج تک آپ کے شاگرد آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ کی نظیر نہیں رہا۔ آپ کی پابندی اوقات ضرب المثل تھی۔ اوقات درس کی پابندی میں آپ خود ہی اپنی نظیر تھے حتیٰ کہ بعض اساتذہ دارالعلوم

نے درس میں اوقات کی پابندی کا سبق حضرت ممدوح ہی سے حاصل کیا۔

مدرسہ کے ابتدائی دور سے آخر عمر تک منٹوں اور سیکنڈوں تک کی پابندی فرماتے تھے۔ بے نفسی اور تواضع میں بدیہی رکھتے تھے۔ بڑی سے بڑی کتابوں کے درس کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی کتاب پڑھانے میں کبھی عارضہ ہوتا تھا۔ ترمذی و بخاری کا درس بھی دے رہے ہیں اور کچھ کو میزبان الصرف، علم الصیغہ اور نور الایضاح وغیرہ بھی پڑھا رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب طالب علم وہ ہوتا تھا جو کیسوی کے ساتھ پڑھنے لگنے میں لگا رہے اور سب سے زیادہ مبغوض وہ ہوتا تھا جو غیر تعلیمی مشاغل میں لگ کر پڑھنے میں تساہل کرے خواہ وہ خود ان کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

آپ کو جس طرح اور دو نظم و نشر پر قدرت تھی اسی طرح عربی نظم و نشر پر بھی کامل دستگاہ تھی۔ آپ نے ادب کی بعض درجہ کتابوں کے غیر اخلاقی مضامین دیکھ کر خود ہی ادب کی ایک کتاب نفیۃ العرب مرتب فرمائی جس میں نفیۃ النہین کے مصیار کو باقی رکھتے ہوئے اس کے غیر اخلاقی مضامین کو حذف کر کے ان کی جگہ اس کتاب کو مستند تاریخی حکایات و قصص اور اخلاقی مضامین سے مالا مال کر دیا۔ اور اس پر مفید حواشی کے اضافہ سے افادہ میں مزید اضافہ کر دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور مدارس میں داخل درس ہے۔ آپ نے نور الایضاح، دیوان حماسہ، کنز الدقائق، متنبی، شرح نقایہ وغیرہ کتابوں پر جو مفید حواشی تحریر فرمائے۔ ان سے آج تک بڑے بڑے استاد استفادہ کرتے ہیں۔

استظامی امور میں بھی آپ کی اہلیت مسلم تھی اور وقتاً فوقتاً ادارہ اہتمام میں بھی آپ کی استظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا تھا۔ عرض آپ ایک بے نظیر استاد اور متبحر عالم دین اور ایک جامع شخصیت تھے۔ دارالعلوم میں آپ کی علمی خدمات کا دور چوبیس کئی برس تک رہا جس کا اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

۴۲۔ حضرت مولانا عبد الغفور صاحب مہاجر مدنی مدظلہ

آپ دارالعلوم کے فیض یافتہ اور آخری دور طالب علمی میں خصوصیت کے ساتھ حضرت مفتی اعظم ہند مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے متفید ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ کے ممتاز مشائخ میں سے ہیں۔ اصل سے صوبہ سرحد کے باشندے ہیں لیکن نعرہ دراز سے مدینہ طیبہ میں مہاجر کی حیثیت سے مقیم ہیں اور حجازی قومیت اختیار فرمائی ہے۔ آپ پر قلب باطنی ارشاد و ہدایت کا ہے۔ سرحدی ذہانتی لوگ بکثرت آپ کے سلسلہ بیعت میں داخل ہیں۔ مدینہ منورہ میں آپ کا مقام سکونت ایک مستقل خاندان کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ہر وقت طالبوں اور متفیدین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ اس وقت حجاز میں آپ ممتاز مشائخ میں شمار جوتے ہیں۔

۴۳۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب گاندھلوی مدظلہ

آپ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء و علمائے میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد ارشد صاحب کشمیری قدس سرہ کے مخصوص اور معتبر علیہ تلامذہ میں سے ہیں۔ اختر کے خاص تعلیمی رفیق اور دورہ حدیث کے ساتھی ہیں۔ اوپر سے ہم نسب بھی ہیں۔ حدیث، فقہ اور تفسیر میں امتیازی مہارت کے حامل ہیں۔ قوت حافظہ امتیازی ہے۔ علوم اور کتب کا استحضار تام ہے۔ اوپر سے درجہ کے ارباب تدریس میں سے ہیں۔ علوم سے فراغت کے بعد بعض مدارس میں سلسلہ تدریس سے منسلک رہے۔ ان کے کتب خانوں میں کتب و تصانیف کا مجموعہ ہے۔ ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

رہ کر بالآخر دارالعلوم دیوبند میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے بلاتے گئے اور کتب تفسیر کے ساتھ دوروی کی کتب حدیث بالخصوص ابو داؤد و شریف الکثر و بیشتر آپ ہی کے درس میں رہتی تھی۔ اتباع سنت اور عظمت سلف کا بغاوت شغف نہ تھا۔ علوم شریعیہ اور دینی مذاہب باطلہ میں بہت سی کتب کے بہترین مصنف ہیں۔ معتقادِ امانت سے بحث کرتے ہیں جس میں علمی مواد کافی ہوتا ہے۔ علمی تصانیف کے سلسلہ میں مشکوٰۃ المصابیح کی شرح (التعلیق الصلیح) آپ کا تصنیفی شاہکار ہے جو پانچ جلدوں میں ہے۔ ممالک اسلامیہ کا سفر کئے ہوئے ہیں اور بیروت جاکر آپ نے خود ہی شرح مشکوٰۃ طبع کرائی۔ سیرۃ المصطفیٰ کے نام سے کئی جلدوں میں مختلف سیرت لکھی۔ جس میں آزاد خیال مصنفوں پر علمی انداز سے تنقید کی ہے اور ان کے بہت سے شکوک و شبہات کے مسکت جوابات دیئے ہیں۔ عربی ادب میں بخاص مہارت ہے۔ عربی اشعار جزئیگی سے کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آپ کی نگلیں ہیں تقسیم ملک کے بعد آپ نے پاکستانی قومیت اختیار کر لی اور جامعہ انٹرنیٹ لاہور کے شیخ الحدیث ہیں۔ تقریباً سترہ سو کو آپ کے دعوے کی مجلس ہوتی ہے جس میں ہزاروں کا اجتماع ہوتا ہے۔ سنی گوئی میں (حکیمانہ انداز کے ساتھ) یہ طوطی بکھتے ہیں اور سچی بات بلا خوف و ہمت لائے بر ملا کہتے ہیں۔ تقویٰ اور خشیت اللہ آپ پر نمایاں نظر آتا ہے۔ ممتاز و شاہیر علم و فضل میں سے ہیں۔

۴۴۔ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی مدظلہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ متعدد کتب میں اسحق کے ہم سبق رہے ہیں۔ علمی استعداد شروع سے مضبوط تھی۔ اصل وطن ضلع ہزارہ (پاکستان) ہے۔ صاف گو خطیب ہیں۔ آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو جمعیت علماء اسلام پاکستان کا ناظم منتخب کیا گیا ہے۔ موصوف کی علمی شہرت کی بنا پر مہر نے آپ کو بطور نمائندہ جمعیت علماء اسلام پاکستان دعوت دی اور آپ نے وہاں کی عالمی مقررین علماء عالم کو خطاب فرمایا آپ کا شمار وہاں کے مشاہیر میں ہے۔

۴۵۔ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی

آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں سے ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری صدر المدینہ دارالعلوم دیوبند کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ فراغت تحصیل کے بعد دارالعلوم دیوبند کے درجہ ابتدائی کے مدرس رہے۔ فن حدیث میں خاص دلچسپی اور لگاؤ ہے۔ فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد کئی بار حضرت شاہ صاحب کے ہاں ترمذی اور بخاری کی پابست فرمائی۔ آپ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے خاص ترجمان ہیں۔ فیض الباری شرح صحیح بخاری آپ کی تالیفات کا شاہکار ہے۔ حضرت مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز حضرت قاری محمد اسحاق صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز ہیں۔ آپ کا سلسلہ ارشاد و ہدایت الحمد للہ وسیع ہے تقسیم ملک کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کی اور انڈیا کے مدرسین ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کیا اور درس حدیث میں مشغول رہے۔ پھر پاکستان سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں مقیم رہے۔ آپ کا سلسلہ بیعت و ارشاد خصوصیت سے افریقہ میں بہت پھیلا۔ بکثرت افریقی آپ سے بیعت ہیں۔ زمانہ حج میں جو خانہ ایسٹ یا ساؤتھ افریقہ سے آتے، وہ اکثر و بیشتر آپ کے سلسلہ بیعت میں داخل ہو کر واپس ہوتے۔ آپ کی تصنیف و تالیف میں ترجمان السنۃ، علم حدیث میں ایک شاہکار تصنیف ہے جس میں اکابر دارالعلوم اور بالخصوص حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کے علوم کو جمع کر کے خود اپنے علم اور علمی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس

مبارک کتاب کی تین ضخیم جلدیں مدوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہو چکی ہیں۔ جو خواص و عوام میں مقبول ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں انتقال فرمایا۔

۴۶۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی مدظلہ

آپ حضرت مفتی اعظم الشیخ مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبند قدس سرہ کے فرزند رشید اور دارالعلوم دیوبند کے جنوہاں فاضل ہیں۔ حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ درسیات سے فراغت کے بعد دارالعلوم کے درس و تدریس کے سلسلے میں لائے گئے۔ پھر دارالافتار میں اپنے والد بزرگوار کی زیر تربیت افتاء نویسی کی مشق کی۔ اور دارالافتار میں بحیثیت نائب مفتی کام شروع کیا اور فتویٰ نویسی میں مہارت حاصل کی۔ ایک عرصہ تک حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ایک عرصہ دراز تک کلکتہ میں مقیم رہے اور وہاں کے لوگوں کو کلم اور دین سے متفہم کیا۔ اس کے بعد دہلی آکر ادارہ مدوۃ المصنفین قائم کیا۔ جو وقت کا ایک بہترین معیاری ادارہ ہے جس نے اسلامی علوم و فنون کی بہت سی قابل قدر تصانیف ملک کے سائنس پیش کشیں آپ اس وقت دہلی کے شاہرہ علم و فضل شمار کئے جاتے ہیں۔ بہت سے علمی اور دینی اداروں کے ممبر ہیں اور مرکزی حج کمیٹی کے صدر ہیں۔ گورنمنٹ بھی آپ کی بات کا اثر لیتی ہے۔ قومی کاموں میں آپ کا خاص حصہ ہے۔ تحریک آزادی ہند کے سپاہیوں میں سے ہیں۔ جمعیتہ علماء ہند کے کاموں میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کے دست راست رہے ہیں اور ان کے وصال کے بعد جمعیتہ علماء ہند کے صدر عامل کے عہدہ پر فائز ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے مؤثر ممبروں میں سے ہیں۔ جو برادریوں و مقرر ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی آپ کی آمد و رفت رہی ہے۔ حال ہی میں آپ نے روس کے بعض دینی اداروں کی دعوت پر روس کا سفر کیا تھا۔ مجموعی حیثیت سے دارالعلوم کے ممتاز فضلا میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

۴۷۔ حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی

آپ سید علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے۔ اعلیٰ ترین علمی استعداد کے مالک، خاتم درجہ کے ذکی اور طبائع فضلا میں سے تھے۔ ابتدائے دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے مختلف علوم و فنون کی کتابیں پڑھائیں۔ پھر دارالعلوم کی طرف سے مدراس بھیجے گئے اور وہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا پھر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مدرس رہے تصنیف و تالیف کی مخصوص صلاحیتیں رکھتے تھے۔ متعدد اعلیٰ ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ ہندوستان کے بڑے بلند پایہ مقرر اور خطیب تھے۔ بہترین سیاستدان تھے۔ مدوۃ المصنفین کے مخصوص کارپردازوں میں سے تھے۔ جمعیتہ علماء ہند اور کانگریس کے صنف اول کے لیڈروں میں سے تھے۔ کئی بار جیل گئے۔ طویل عرصہ تک جمعیتہ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے۔ ۱۹۶۵ء کے انقلابی ہنگاموں میں اپنی جان پر کھیل کر ہزاروں کی جا میں بچائیں۔ پارلیمنٹ کے لیے لوٹ اور نڈر ممبر بنے۔ فرقہ پرست بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔ گورنمنٹ بھی انہیں مانتی تھی اور ان کے اثرات قبول کرتی تھی۔ بغرض ان کی شخصیت ایک جامع اور مؤثر شخصیت تھی جس کا ہندوستان کے تمام علمی اور سیاسی طبقات پر اثر تھا۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور اس کے کاموں میں دخیل تھے۔

۴۸۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی مدظلہ

آپ دارالعلوم دیوبند کے چوتھار فاضل اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ علوم و درسیہ سے فراغت کے بعد مدرسہ شاہی فرد آباد میں مدرس اور مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ جمعیتہ علماء ہند کے فہرہ دار کارکن اور ان میں سے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کے حکم پر جمعیتہ علماء ہند کے ناظم بنے۔ حضرت مولانا سید محمد الرحمن صاحب کی وفات کے بعد ایک سال تک ناظم اعلیٰ جمعیتہ علماء ہند کے عہدہ پر فائز رہے۔ جمعیتہ اور کانگریس کے بڑے مفصل سپاہی اور صف اول کے لیڈروں میں سے ہیں۔ کئی بار جیل گئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ علماء ہند کا شاندار ماحیہ کئی جلدوں میں اور تاریخ اسلام آپ کی شاہکار تصانیف ہیں۔ بچوں کی اسلامی تعلیم سے بہت زیادہ شغف ہے۔ چنانچہ دینی تعلیم کے متعدد رسائل تصنیف فرمائے جو بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ تعلیم کے ہر شعبہ میں اور ہر مضمون میں اسلامی رنگ دیکھنے کی تربیت ہے اور اس تربیت کا مظاہرہ تصنیف کردہ کتابوں اور چارٹوں سے ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے کارگذار ممبر ہیں۔ مجموعی حیثیت سے علم و عمل میں دست نگاہ اور صلاح و تقویٰ حاصل ہے۔

۴۹۔ حضرت مولانا سید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ

آپ نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ایم اے کیا۔ دلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ پھر مدرسہ عالیہ گلگتہ کے پرنسپل رہے۔ آج کل علمی گدہ مسلم یونیورسٹی میں ٹی سی ڈی کیات کے شعبہ کے انچارج ہیں۔ رسالہ برہان کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی قابلیت اپنی جماعت میں مسلم ہے۔ کتا ڈا، انگلیڈ وغیرہ میں آپ کے کچھ بہت مقبول ہوئے۔ متعدد مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکاڈمی قرآن عظیم) کی مجلس شوریٰ کے رکن رکیں ہیں۔ آپ بھی حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اس وقت آپ کی شخصیت ایک بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ مصر، شام، حجاز، کویت، لبنان، کتا ڈا، انگلستان وغیرہ کے آپ نے قومی طور پر سفر کئے اور اپنی قابلیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں ممتاز رہے۔ مصر کی عالمی مقرر میں محترم کی محبت میں آپ کا خصوصی سفر ہوا اور عالمی مقرر میں آپ کے خطاب کو سنا گیا۔

۵۰۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مدظلہ

آپ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے نابہ ناز شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے علوم کے امین ہیں جن کی ذات سے حضرت کے علوم کی بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ علمی دنیا میں آپ کا ایک خاص درجہ اور مقام ہے۔ ادبیت اور عربی و فارسی کی ادبی قوت بے مثال ہے۔ عربی زبان میں بے تکلف اور بے تکلف ہوتے ہیں جس میں برجستگی اور روانی ہوتی ہے۔ عربی تحریر اور انشاء پر وازی میں ایک بے نظیر صاحب طرز ہیں۔ متعدد اعلیٰ کتب کے مصنف ہیں ترمذی شریف کی نہایت ہی جامع اور بیخ شرح کتب ہیں جس میں محتقانہ اور فقیہانہ انداز سے کلام کیا گیا ہے۔ اس کی عربیت اور طرز اور ادبی معیار ہی ہے اور ذخیرہ معلومات بہت کافی ہے۔ اس سے سحر اور فقط دونوں نمایاں ہیں۔ آپ نے مصر، بیروت، شام، حجاز، عراق اور افغانستان وغیرہ کے سفر کئے۔ مصر میں علماء دیوبند کا سب سے پہلے آپ نے تعارف کرایا اور وہاں کے اخبارات اور رسائل نے آپ کے بیخ مضامین نہایت ذوق و شوق سے شائع کئے۔ جس سے مصر و شام میں آپ کی علمیت کا چرچا بھی

نہیں ہوا بلکہ دھاک بلیٹ گئی اور معیاری علماء کی مجلسوں میں آپ کو نہایت توقیر اور احترام کے ساتھ طلب کیا جانے لگا۔ علامہ طنطاوی مصری صاحب تفسیر طنطاوی پر آپ نے مصنف کے زور پر نقد و تبصرہ کیا جس سے خود مصنف متاثر ہوئے اور بہت سی تنقیدات کو انصاف پسندی کے ساتھ انہوں نے قبول کیا اور نیا استاد کے الفاظ سے خطاب فرمایا۔ عربی میں برجستگی اور بدولتی حاصل ہے۔ موثر عالم اسلامی قادیانہ (مصر) میں رئیس پاکستان کی حیثیت سے آپ کو بلایا گیا اور وہاں آپ نے مسلک علماء دیوبند کے مطابق مسائل پر نقد و تبصرہ فرمایا۔ بعض مسائل کے متعلق آپ کے مقالہ کو اہمیت دی گئی اور کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ آپ نے کراچی میں ایک مثالی دارالعلوم قائم فرمایا اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر نیا ٹاؤن کی عظیم مسجد میں ابتداء زبید و قنات اور بے سرو سامانی کے ساتھ تعلیم دینی شروع کی۔ فقر و فاقہ تک برداشت کیا مگر کار تعلیم جاری رکھا۔ بالآخر سنت الہیہ کے مطابق، آخر میں لوگوں کا رجوع ہوا اور یہ دارالعلوم کئی لاکھ کی عمارت بنے جس میں پندرہ بیس کے قریب اساتذہ کار تعلیم و تدریس میں مشغول ہیں۔ حدیث و فقہ میں ممدوح کی استعداد و لیاقت ممتاز حیثیت رکھتی ہے جسے ان کے ہم عصر بھی بطور اعتراف تسلیم کرتے ہیں۔ آپ فضلاء دیوبند میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور ملک میں معروف ہیں۔ صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) آپ کا وطن ہے اور اس وقت بحیثیت ناظم اعلیٰ دارالعلوم نیا ٹاؤن کراچی میں قیام فرما ہیں۔

۵۱۔ حضرت مولانا حامد الانصاری غازی مدظلہ

آپ حضرت مولانا منصور انصاری رفیق سیاست حضرت شیخ الحدیث صاحبزادے ہیں اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری کے تلامذہ ہیں سے اور حضرت بانی دارالعلوم قدس سرہ کے نواسلی میں سے ہیں۔ علمی ذوق سے طبعی وابستہ رکھتے ہیں۔ اردو ادب کے صاحب طرز ادیب ہیں۔ مشہور اخبار ندیہ، مجبور کے برہا برس ایڈیٹر ہے۔ پھر ممبئی میں اپنا مستقل اخبار مجبوریت جاری کیا۔ آپ کے سیاسی مقالات کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ قادر الکلام شاعر بھی ہیں صوبہ ممبئی کی جمعیت علماء کے صدر ہیں۔ سیاست پر کافی نظر اور سیاسی نشیب و فراز میں مہارت و صداقت رکھتے ہیں۔ اسلام کا نظام حکومت آپ کی معرکہ الارار تصنیف ہے جو مقبول ہے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور ادارہ مجلس معارف القرآن (اکادمی قرآن عظیم) کے رکن ہیں۔

۵۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد محمود صاحب مدظلہ سابق ایم۔ پی (پاکستان)

آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں بہت زیادہ معروف ہے۔ پاکستان کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے ہیں۔ سنی گوئی میں بے باک ہیں۔ فقہی اور حدیثی استدلال کے ساتھ عصری معلومات پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں آپ کی تقریریں شرعی اور عصری معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ انتشار آپ کا خاص منصب ہے اور آپ کے فتاویٰ ملک میں اعتماد و وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وطن صوبہ سرحد (مغربی پاکستان) ہے۔ آپ اپنی گونا گوں علمی خصوصیات کی وجہ سے مصر کی عالمی موثر میں بھی طلب کنندہ آئے اور وہاں آپ کا مبلغ خطاب و وقعت کے ساتھ شہرت آگیا۔ آپ دارالعلوم کے ممتاز فضلاء اور پاکستان کے مشاہیر میں سے ہیں۔

۵۳۔ حضرت مولانا سید محمد منست اللہ صاحب رحمانی مدظلہ

آپ بھی دارالعلوم کے جوبہار ابن قدیم ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد خانقاہ رحمانیہ میں اپنے والد بزرگوار کے جانشین کی حیثیت سے گدی نشین ہوئے اور خلقِ خدا کی روحانی اصلاح میں مشغول ہو گئے۔ ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جامعہ رحمانی میں جاری رکھا۔ آپ کی وجہ سے جامعہ رحمانی کو کافی ترقی ملی تا آنکہ جامعہ کی سابقہ عمارت نامافی ہو جانے کی وجہ سے آپ نے جدید عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جو آج نہایت شان و درصورت میں دیدہ و زیبی کے ساتھ کھڑی ہوئی علومِ دینیہ کی اشاعت و ترویج کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ آپ نے ایک نہایت ہی شان دار لائبریری اور کتب خانہ بھی تیار کرایا ہے جس کی شان و امارت تمام ضروری علوم و فنون کی کتابوں سے بھرپور اور آراستہ ہے۔ عالمی مقرر اسلامی قاہرہ (مصر) کے لئے بحیثیت امیر شریعت بہار آپ کا نام منتخب کیا گیا۔ اختر کی معیت میں آپ نے مصر و حجاز کا سفر فرمایا۔ مقرر اور الرابطة الاسلامیہ مکہ مکرمہ میں آپ نے مقالات پیش فرمائے جن کو وقت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ آپ مشاہیر ملک میں سے ہیں اور فضل دیوبند میں ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی دینی و ملی خدمات اور ساتھ ہی آپ کے والد ماجد حضرت اقدس لانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ارشد حضرت اقدس مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی قدس سرہ کی روحانی نسبت اور صلۃ اثر کے زیر اثر اہل بہار و اڑیسہ نے آپ کو امارت شریعت بہار و اڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا۔ آپ کی امارت کے نامہ میں امارت شریعت نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس کی شاخیں صوبہ کے مختلف اضلاع میں قائم ہو گئیں۔ جو شرعی قانون کو عملی طور پر اس خطہ میں نافذ العمل کئے ہوئے ہیں۔ آپ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکنِ رکنین اور مقرر مجرب بھی ہیں۔

یہ مختصر فرست ان مشاہیر کی ہے جن کے فیوض سے ہندو پاک کا گوشہ گوشہ سیراب ہو رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیرون ہند میں بھی ان حضرات کے فیوض جاری ہیں۔ مشاہیر میں بہت سے ذہنی استعداد افراد ایسے ہیں جو پڑھنے پڑھانے میں تو زیادہ شہرہ نہیں ہوئے لیکن اپنی اہلیت اور قابلیت کی بنا پر دوسرے علمی کاموں میں آفتاب و اجتاب بن کر چکے مثلاً تصنیف، خطابت، طب اور صحافت وغیرہ میں بہت مشہور ہوئے۔ چند افراد کی فهرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مولانا احسان اللہ صاحب تاجور۔ نجیب آبادی

سابق پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور و ایڈیٹر ادبی دنیا لاہور۔ آپ بہت مشہور صحافی اور ممتاز شاعر تھے۔

۲۔ مولانا مظہر الدین صاحب بجنوری

سابق ایڈیٹر الامان دہلی۔ آپ مشہور مقرر اور صحافی تھے۔ مسلم لیگ کے ممتاز لیڈروں میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ مدرس بھی رہے۔

۳۔ مولانا شائق احمد صاحب عثمانی

سابق ایڈیٹر عصر جدید گلٹہ۔ آپ دیوبند کے ممتاز فاضل اور ذہین و ذکاور اور علمی استعداد میں اپنے دور میں فروغ پاتے تھے۔ مگر فراغت کے بعد علمی سلسلہ قائم نہیں رہا۔ بلکہ اخباری دنیا میں اگر اسی میں منہمک رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستانی قومیت اختیار کر لی۔

۴۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب بجنوری

سابق ایڈیٹر "منصور و نجات" بجنور۔

۵۔ مولانا حکیم جمیل الدین صاحب بجنوری

آپ مشہور طبیب تھے۔ میح الملک حکیم اجمل خان صاحب کے استاد تھے۔

دارالعلوم کے فضلاء کرام کی کارکردگی

دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت تعلیم گاہ ہونے کے سہجہتی تعلیم دی اور ہمہ نوع فضلاء پیدا کئے، جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کیا۔ ذیل میں فضلاء دارالعلوم کی کارکردگی کا مختصر تذکرہ بصورت اعداد و شمار پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انہائے قدیم دارالعلوم دیوبند نے کون کون سی خدمات انجام دیں۔ یہ اعداد و شمار کارکردگی کے لحاظ سے ہیں۔ یعنی اگر ایک ابن قدیم نے پانچ یا چھ کام کئے ہیں تو ہر کام میں اس ابن قدیم کا شمار کیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار سن آغاز دارالعلوم ۱۲۸۲ھ سے ۱۳۸۲ھ تک کے ہیں (یعنی گزشتہ سو سال کے)

۱۲۸۲ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ۱۰۰ سال کے عرصہ میں دارالعلوم دیوبند نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں درج ذیل ہمہ نوع فضلاء کرام پیدا کئے۔

مشائخ طریقت	۵۳۶	مناظر	۱۵۴۰
مدرسین	۵۸۸۸	صحافی	۶۸۴
مصنفین	۱۱۶۴	خطیب و مبلغ	۴۲۸۸
مفتی	۱۷۸۴	طبیب	۲۸۸

دارالعلوم کے ۴۸۷ فضلاء نے صنعت و حرفت اور تجارت کے ساتھ دینی خدمات بھی انجام دیں۔

انہائے قدیم دارالعلوم نے ۸۹۳۶ مدارس و مکاتب قائم کئے۔

تذکرہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجہ کا مقام حاصل کیا ان کی تعداد درج ذیل ہے۔

اعلیٰ درجہ کے معلمین و مدرسین	۴۴۸	اعلیٰ درجہ کے صحافی	۱۰۸
" " مصنفین	۲۷۶	" " خطیب و مبلغ	۲۸۸
" " مفتی	۱۶۴	" " طبیب	۱۶۴
" " مناظر	۱۱۲		

مُلک میں دارالعلوم کی شاخیں اور زیر اثر مدارس

دارالعلوم کے فیضان نے ایک طرف تو ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سے ایک ایک فرد ایک مستقل امت اور ایک جماعت کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف مدارس و مکتبہ کا سلسلہ قائم کر کے شخصیتیں اور کردار بنانے کی مشینیں نصب کر دی اور منسوب مدارس اور انجمنوں کے ذریعہ اپنے غیر معمولی فیضان کا سلسلہ ہمہ گیر انداز میں پھیلا دیا۔

دارالعلوم کی تاسیس کے بعد تقریباً ایک ہزار مدارس عربیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئے۔ ان میں سے بہت سے مدارس ایسے ہیں جن کے امتحانات اور کارگزاری کی نگرانی بھی دارالعلوم ہی کے ذمہ ہے مگر وہ خود اپنے اثر کے لحاظ سے مرکز حیثیت رکھتے ہیں، جیسے جامعہ ملیہ لڑکانہ کی۔ (تقسیم کے بعد اس کی نگرانی ختم ہو گئی) یا مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد، یا مدرسہ جامعہ امروہہ یا مدرسہ گلاوٹھی وغیرہ۔ اگر ان متعلقہ مدارس کے فضلا اور تعلیم یافتہ بھی دارالعلوم کے فیض یافتہ حضرات میں شامل کیے جائیں جیسا کہ بالواسطہ وہ یقیناً شامل ہیں تو ہندوستان کا کوئی سہلی حلقہ ایسا نظر نہ آئے گا جہاں دارالعلوم کی ظاہری اور ضمنی برکات نہ نہ کر رہی ہوں۔ پھر اگر ان تمام مدارس متعلقہ و مکاتب اور اجتماعی اداروں کے حلقہ سے اثر کو بھی دیکھا جائے تو بلا مبالغہ یہ کہہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان خواہ وہ کسی حصہ کا رہنے والا ہو، دارالعلوم کے رقبہ کو انتساب سے سبک باز نہیں ہو سکتا۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ اس عظیم سعادت کا شجرہ طیبہ کہاں کہاں تک پھیلا اور اس کے شیریں لے لکڑوں کو حیات لازوال بخشی۔

بیرون ہند ممالک غیر میں دارالعلوم کا اثر

پھر کوئی اسلامی منطقہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم کے علمی اثرات کسی نہ کسی صورت میں نہ پہنچے ہوں اور قائم نہ ہوں، جو مرکز اسلام و مہبط وحی کی خدمت کے لئے بھی دارالعلوم ہمہ وقت حاضر رہا۔ اسے یہ فرض حاصل ہے کہ اس کے متعدد فضلا نے اس مقدس میں بھی مستقل افادہ و درس کا سلسلہ جاری کیا اور ان حضرات کا درس اس قدر مقبول ہوا کہ اہل حجاز نے دور دور سے اس میں شرکت کی۔ اس طرح مرکز اسلام (حجاز مقدس) اور مرکز علوم دارالعلوم کے درمیان ایک مخصوص ربط قائم ہو گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب امرتسری مہاجر مدنی نے حرم مکہ میں حدیث، تفسیر اور مختلف فنون کے درس کا کامیاب سلسلہ جاری فرمایا۔ اس درس سے اہل مکہ و اہل مدینہ اور دوسرے حجازیوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا۔ دوسرے ممالک سے جو زائر تھے وہ بھی اس درس سے فیض یاب ہوتے تھے۔ اس کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ نے حرم مدنی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اٹھارہ سال تک علوم کتاب و سنت کے دریا بہائے جس سے ہزاروں حجازی، شامی، عراقی اور مختلف بلاد اسلامیہ کے لوگوں نے اپنی علمی پیاس بجھائی اور ان تک دارالعلوم کی سند پہنچی۔

پھر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب قدس سرہ کے برادر بزرگ حضرت مولانا سید احمد صاحب فیض کسی

قدس سرہ مہاجر مدنی فاضل دارالعلوم دیوبند نے مدینہ طیبہ میں مستقل طور پر ایک مدرسہ "المدرستہ الشریعہ" کے نام سے جاری کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مدرسہ کی روداد ہر سال چھپتی ہے۔ اس میں کئی سو طلبہ اور متعدد مدرسین کام کر رہے ہیں اس مدرسہ میں جملہ علوم و فنون پڑھائے جاتے ہیں اور بچوں کو دست کاری بھی سکھائی جاتی ہے۔ اسی مدرسہ میں دارالعلوم کے مشہور استاد حضرت مولانا سید الشکور صاحب دیوبند نے بھی مستقل مدینہ منورہ میں قیام فرما کر رہسہا برس تعلیم دی۔ اہل مدینہ نیز مضافات مدینہ کے لوگ اس سرپرستہ علم سے اب تک سیراب ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مدظلہ سابق استاد دارالعلوم دیوبند نے بھی جو اب نئے قدیم دارالعلوم میں سے ایک ہونہار فاضل عالم اور شیخ طریقت ہیں مدینہ منورہ میں مستقل قیام فرما کر بیعت و ارشاد، اصلاح اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری فرمایا ہے جو تا حال قائم ہے۔ گرامولانا محترم ابو جہر امراض و کبرئی ضعیف ہو گئے ہیں لیکن ہمت باطنی سے فیضان کے یہ سب سلسلے دستور قائم ہیں اور نہ صرف اہل حجاز بلکہ دوسرے ممالک مثلاً ساؤتھ افریقہ اور ایسٹ افریقہ وغیرہ کے ہزار ہا افراد آپ کے علوم و فیضان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے علاوہ افغانستان، پاکستان، برما، افریقہ وغیرہ میں تقریباً ہر صوبہ اور بعض ممالک میں شہر بہ شہر مدارس اور خانقاہیں قائم ہیں۔ جہاں فضلاء دارالعلوم ظاہری و باطنی افاضات میں مشغول ہیں۔ تاریخی اعداد و شمار کے علاوہ خود اس ناچیز کاٹ ہرہ بھی گواہ ہے۔

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف اور اس کی کفایت شعاری

دارالعلوم کے تعلیمی مصارف پیش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مصارف کی نوعیتیں بھی پیش کر دی جائیں تاکہ دوسرے اداروں سے مقابلہ کرنے میں آسانی ہو۔

دارالعلوم میں ابتداء ہی سے مفت تعلیم کا انتظام ہے مفت تعلیم کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ طلبہ سے کوئی سہولت نہیں لی جاتی بلکہ ہر امیر و غریب طالب علم کو حسب ذیل چیزیں بالکل مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

تعلیم، کتابیں، رہتے کے کمرے، بجلی کی روشنی، سردیوں میں گرم پانی، گرمیوں میں سرد پانی، طبی امداد۔ ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ جو طلبہ غیر مستطیع ہوتے ہیں انہیں مذکورہ سہولتوں کے علاوہ حسب ذیل امداد بھی مفت دی جاتی ہے۔
دو نوں دقت کا کھانا، سال میں چار سو پڑے کپڑے، سال میں دو سو پڑے جوتے، ٹیل اور صابون وغیرہ کے اخراجات کے لئے ۵ روپے ماہوار، سردیوں میں لحاف اور کپل۔ ایسے طلبہ کی تعداد تقریباً ۹۰ ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ حضرات مدرسین اور کارکنان کی تنخواہیں ہیں جن پر ہر ماہ تقریباً تین ہزار روپیہ صرف ہوتا ہے۔ اس مرکزی ادارے کی شان، اس کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتے پھر اس کے تعلیمی اخراجات پر نظر ڈالئے تو آپ کو اس کے کارکنوں کی دیانت داری، کفایت شعاری اور اخلاص مندی کا اندازہ ہو جائے گا۔

لے افسوس کہ مولانا استقلال فرما گئے۔

ذیل میں ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۲ھ تک ایک سو سال کی آمدنی و خرچ وغیرہ کے کچھ اعداد و شمار پیش کئے جاتے ہیں۔

سوبرس کی کل آمدنی	۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ	۱۰,۸۳,۵۴۴	سوبرس کا کل خرچ	۱۲۸۳ھ — ۱۳۸۲ھ	۱۰,۸۳,۵۴۴
سوبرس کا کل خرچہ تعمیرات	۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ	۱۱,۰۰,۸۹۵	سوبرس کی تعداد قاضی جو کتب خانہ میں موجود ہیں	۱۲۸۳ھ — ۱۳۸۲ھ	۸۲,۲۵۰
سوبرس کی تعداد قضاوی	۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ	۲,۴۹,۲۱۵			

فضلار و مستفیدین دارالعلوم کی عددی تفصیلات

سوبرس میں جن طلبہ نے دارالعلوم سے استفادہ کیا اور جن کے تعلیمی اخراجات دارالعلوم نے

برداشت کئے ان کی تعداد

سوبرس میں فضلار کرام کی تعداد جنہوں نے سند و ستار حاصل کی یعنی ۷۷۱۷ کو منہا کرنے

کے بعد ان طلبہ کی تعداد جنہوں نے دارالعلوم سے استفادہ کیا۔

کل خرچہ میں سے صرف تعمیرات منہا کرنے کے بعد سوبرس میں کل خرچ کی مقدار

۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ ۹,۷۴,۰۵۰ روپیہ اگر ۷۷۱۷ طلبہ تقسیم کیا جائے تو ایک طالب علم پر خرچ کی مقدار

۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ ۹,۷۴,۰۵۰ روپیہ اگر ۷۷۱۷ فضلار کرام تقسیم کیا جائے تو ایک کمال عالم تیار کرنے پر خرچ کی مقدار

۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ ۹,۷۴,۰۵۰ روپیہ اگر ۷۷۱۷ عالم کمال تیار ہونا جو قوم کی تمام ضروریات، مثلاً تزکیہ نفوس، تدریس، تصنیف، اقتدار، مساجد

اتنی مختصر رقم سے ایک ایسے عالم کمال تیار ہونا جو قوم کی تمام ضروریات، مثلاً تزکیہ نفوس، تدریس، تصنیف، اقتدار، مساجد

صحافت، خطابت و تبلیغ اور اصلاح عام کے فرائض وغیرہ کو بخوبی انجام دے سکے، یقیناً ایک معیاری اور مثالی کامیابی ہے

جس کی نظیر دنیا کے رسمی اداروں میں ملنی ناممکن ہے۔ دارالعلوم کا بطور پر اس پر فخر ناز کر سکتا ہے بالخصوص جب کہ یہ بھی پیش

رکھا جائے کہ اس ۷۷۱۷ کی تعداد میں کتنی ہیبتناں ایسی بھی ہیں کہ اگر لاکھوں روپیہ ان میں سے کسی ایک پر بھجوا کر دیئے جائیں

تو کم ہیں جن میں سے بعض کے نام ہم ادھر شمار کر چکے ہیں۔

بہر حال دارالعلوم کا فیض باران رحمت کی طرح عام رہا۔ علم کے پیار سے دور دور سے آئے اور اس نے ہر ایک کے ظرف

اور ہر ایک کی طلب کے موافق اس کی پیاس بجھائی۔ ہندو پاک کا کوئی شہر، کوئی قصبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا، جہاں اس

علم دین سے منکلی ہوئی کوئی نہر موجود نہ ہو جس سے سب لوگ سیراب ہوتے ہیں۔

ایک چراغ است، دریں خانہ کہ از بر تو آں

ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نوٹ : مذکورہ بالا بطور میں ۱۳۸۲ھ — ۱۲۸۳ھ ۹,۷۴,۰۵۰ روپیہ کا جو خرچ دکھایا گیا ہے وہ تعمیرات کے علاوہ باقی

شعبہ جات دارالعلوم کا خرچ ہے۔ اسی میں دارالافت کا خرچ بھی شامل ہے جس سے سو سال کے تجربہ میں

۲,۲۹,۲۱۵ قضاوی صادر کئے گئے اور کتب خانہ کے اخراجات بھی ہیں، جس میں سو سال کے اختتام پر

۸۲,۲۵۰ کتب موجود ہیں۔

دارالعلوم کے اسلاف

دارالعلوم دیوبند کے اسلاف میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ سے لے کر حضرت نانوتوی قدس سرہ تک کے سارے بزرگ شمار ہوتے ہیں کیونکہ مسلک کا اور روایت دارالعلوم دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کی جانب منسوب ہے اور سلوک میں حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کا سلسلہ اکابر دارالعلوم میں جاری و ساری ہوا۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کے اہل خلفاء میں سے تھے اور خود حاجی صاحب قدس سرہ دارالعلوم کے اسلاف میں سے ہیں۔

ان کے علاوہ دارالعلوم کے اسلاف وہ حضرات بھی ہیں جنہوں نے دارالعلوم کی رسمی یا معنوی سرپرستی فرمائی۔ مثلاً حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری قدس سرہ جن کا دخل تعمیر مدرسہ کے معاملات سے رہا اور ان کی مبارک رالیوں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے چنانچہ تعمیر مدرسہ اور عمارت کی سنگ بنیاد کے سلسلہ میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا ذوق تو یہ تھا کہ مدرسہ کی عمارت خام ہوں گھاس پھوس پر بیٹھ کر طلبہ تعلیم پاتیں تاکہ زبرد و قناعت، سادگی، ہذاذہ اور ضرورت کو رکھ کر ان میں نمایاں رہے لیکن دوسرے اہل رائے حضرات کی رائے یہ تھی کہ دارالعلوم کی عمارت پختہ اور محکم بنوائی جائے تاکہ مدرسہ اپنی صورت کے لحاظ سے بھی نمایاں رہے لیکن اس بارہ میں جب کہ حضرت نانوتوی قدس سرہ کی رائے متاثر نہ ہوئی تو آخر کار حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ سے حضرت نانوتوی قدس سرہ پر اثر ڈلوا لیا گیا اور آپ نے مولانا احمد علی صاحب کے ارشاد کے بعد اپنی رائے تبدیل فرمادی اور مدرسہ کی پختہ عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ اسی طرح حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ منگھوری جو صاحب سلسلہ اور نہایت پائے کے بزرگوں میں سے تھے۔ دارالعلوم کے قیام کے سلسلہ میں ان کے کماشات بھی تھے جن کا فہرہ قیام دارالعلوم کی صورت میں ہوا۔ اس لئے آپ بھی اسلاف دارالعلوم ہی میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دارالعلوم کے اعلیٰ عہدے دار

دارالعلوم میں اعلیٰ ذمہ دارانہ عہدے صرف چار ہی ہیں۔
 ۱۔ سرپرستی ۲۔ اہتمام ۳۔ صدارت تدبیر ۴۔ افتاء۔
 ان چاروں عہدوں کے لئے ہمیشہ ایسی ممت از شخصیتوں کا انتخاب عمل میں آتا رہا جو اہل اللہ، اہل دین و اہل تقویٰ اور جامع شریعت و طریقت تھے۔

دارالعلوم کے سرپرست

دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست بانی دارالعلوم حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز تھے۔ جن کا پُر امن و بابرکت عہد آج تک احاطہ دارالعلوم میں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ۱۲۸۳ھ مطابقت سے ۱۸۶۷ء مطابقت تک سرپرست رہے۔ حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دوسرے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے۔ آپ کے عہد کی برکات دارالعلوم پر نور آفتاب کی طرح چھائی جن سے ظلمات کو قرار بکڑنے کا موقعہ مل سکا۔ آپ ۱۲۹۸ھ مطابقت سے ۱۳۲۳ھ مطابقت تک سرپرست رہے۔ آپ کے بعد ۱۳۲۳ھ مطابقت سے ۱۳۴۹ھ میں باجماع اہل دارالعلوم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب نور اللہ مرقدہ سرپرست تسلیم کئے گئے جن کے نورانی آثار سے آج تک دارالعلوم کا احاطہ چمک رہا ہے۔ ۱۳۳۳ھ مطابقت سے ۱۹۱۴ء میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو حضرت اقدس مولانا عبد الرحیم صاحب راستے پوری قدس سرہ کو سرپرست تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۳۴۹ھ مطابقت سے ۱۹۱۵ء مطابقت تک سرپرست رہے۔ ۱۳۴۹ھ مطابقت سے ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بالٹا سے راجہ کو واپس تشریف لائے۔ تو پھر آپ ہی ۱۳۴۹ھ مطابقت سے ۱۹۲۰ء تک سرپرست رہے۔

آپ کے بعد ۱۳۴۹ھ مطابقت سے ۱۹۲۵ء میں محکم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ اللہ سرپرست ہوئے۔ آپ نے اپنی باطنی توجہات اور صرف ہمت کے ذریعہ دارالعلوم کے جہاز کو فتن و حوادث کے تھلنے سے محفوظ رکھا۔ ۱۳۵۵ھ مطابقت سے ۱۹۳۵ء میں اسی گزانا گول مشغولیات کی وجہ سے حضرت تھانوی قدس سرہ اللہ العزیز سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد سے آج تک سرپرست کے نام سے کسی شخصیت کا انتخاب عمل میں نہیں آیا۔

دارالعلوم کے مہتمم

اہتمام کے عہدہ پر بھی ہمیشہ اپنے وقت کے منتخب مخصوص افراد کا انتخاب ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مہتمم حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبندی تھے جو طریقہ بحث تہ صابریہ کے ایک معروف صاحب سلسلہ بزرگ نے اور زہد و ریاضت کا پیکر تھے۔ آپ کا حلقہ اثر دیوبند اور اطراف و جوانب میں بہت وسیع تھا۔ آپ اولاً محرم ۱۲۸۳ھ مطابقت سے جب ۱۲۸۵ھ مطابقت تک مہتمم رہے۔ ثانیاً ۱۲۸۹ھ مطابقت سے ۱۳۰۸ھ مطابقت تک ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک ربيع الاول ۱۳۰۴ھ مطابقت سے ۱۳۱۸ھ تا شعبان ۱۳۱۹ھ مطابقت سے ۱۸۹۳ء مہتمم رہے۔

آپ کے اہتمام اول کے بعد حضرت اقدس مولانا شاہ ربيع الدین صاحب دیوبندی عہدہ اہتمام پر فائز ہوئے۔ آپ طریقت و حقیقت کے ایک بلند پایہ شیخ اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دیوبند نور اللہ مرقدہ کے ارشد خلیفہ تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان پر فخر کیا کرتے تھے۔ موصوف بہت سے اکابر دارالعلوم مثل حضرت مفتی مولانا غزنی الرحمن صاحب

قدس سرہ اور حضرت مولانا سید رفیع الحسن صاحب ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند وغیرہ کے شیخ طریقت تھے۔ دارالعلوم کی معنوی ترقی میں حضرت ممدوح کی تربیت و صرف ہمت کا اسی طرح حصہ ہے جس طرح قطب عالم عارف باللہ حضرت مولانا نانوتوی اور قطب ارشاد و عارف باللہ حضرت مولانا گنگوہی کا تھا۔ آپ اولاً شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۸ء تا ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء اور ثانیاً ذی قعدہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۲ء تا ربیع الاول ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۴ء دارالعلوم کے ہتھم رہے۔ آپ کے بعد غیر ہتھم حاجی محمد فضل حق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مقرر ہوئے جو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اور ایک صالح و متقی بزرگ تھے۔ آپ شعبان ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۴ء سے ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۵ء تک ہتھم رہے۔

آپ کے بعد ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں حضرت مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے چوتھے ہتھم ہوئے۔ آپ حضرت نانوتوی قدس سرہ کے رشتہ کے بھائی اور جہاد شاعلی میں ردیف کی حیثیت رکھتے تھے۔ نہایت ہی باخدا بزرگ اور صاحب دیانت و تقویٰ لوگوں میں تھے۔ آپ کے زمانہ اہتمام کی انتہا جمادی الاول ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۵ء تک رہی۔

آپ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۱۳ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب ابن حضرت مولانا محمد کاسم صاحب نانوتوی دارالعلوم کے پانچویں ہتھم بنائے گئے۔ آپ کا عہد سابقہ تمام عہدوں سے طویل پر شوکت، اور پر بہنیت گذرا ہے۔ یہ دور چالیس برس تک متدرجاً اور اس چالیس سالہ مدت ہی میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی حضرت ممدوح کی ذاتی قربانی و جہاد نے بہت سے پیدا شدہ فتنوں کو دبا کر دارالعلوم کے حلقہ اثر کو وسیع تر بنایا، مالی امدادیں کثیر مقدار میں برہمیں، بڑی بڑی عمارتیں مثلاً دارالطلبہ قدیم، دارالطلبہ جدید کا کچھ حصہ، دارالحدیث تختہ فی، مسجد دارالعلوم، کتب خانہ، دارالمشورہ، قدیم مہمان خانہ اور مختلف احاطے ارض دارالعلوم پر نمایاں ہوئے۔ کارکنوں میں اضافہ ہوا۔ حاصل یہ کہ اس درس گاہ نے دوسرے دارالعلوم اور دارالعلوم سے ایک جامعہ کی صورت اسی زمانہ میں اختیار کی جس کے ماتحت آج بہت سے اصلاح اور صوبجات کے بہت سے ادارے چل رہے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۲۹ء میں حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی دارالعلوم کے چھٹے ہتھم ہوئے۔ آپ ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی نیابت میں رکھے گئے تھے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اپنی دانش و نبیض اور فہم و فراست میں نیکانہ جہاد تسلیم کئے جاتے تھے۔ ممدوح نے اپنے خدا داد تدبیر سے دارالعلوم کے انتظامات کو نہایت اعلیٰ پایہ پر لے کر تقسیم کار کے ذریعہ مخلوط امور کو شعبوں میں تقسیم کیا اور دارالعلوم کو حقیقی معنی میں مرکزی حیثیت دی۔ موصوف کا یہ قتل اہتمام کو تقریباً ڈیڑھ برس تا یکین حقیقت رہا کہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب کے دست راست اور ان کی چالیس سالہ خدمات کے مرجع رواں نیابت کی صورت میں آپ ہی رہے۔ آپ کا زمانہ اہتمام شعبان ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۳۲ء تک رہا۔

(از مولانا عزیز احمد صاحب قاسمی ناظم شعبہ اہتمام قدیم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کے

بعد ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ دارالعلوم دیوبند کے ساتویں مہتمم ہوئے، اور سکھاننداب تک آپ ہی کے دست مبارک میں تمام اہتمام ہے۔ آپ کا حلقہ اثر ہندوپاک سے گذر کر افغانستان، برما، بھوٹا، مقدس، ایران، مصر، ایسٹ افریقہ اور جنوبی افریقہ تک پھیل گیا۔ آپ کے زمانہ اہتمام میں انگلینڈ، امریکہ میں بھی دارالعلوم تعارف ہوا اور وہاں سے بھی امدادی رقوم وصول ہوئیں۔ آپ کے زمانہ میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی۔ دارالعلوم کا حلقہ اثر بھی وسیع ہوا۔ مالیات میں بھی بے حد اضافہ ہوا اور تعمیرات بھی بہت زیادہ ہوئیں جس کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جن میں دارالعلوم کی ترقیات اور اضافوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک حصہ آغاز دارالعلوم ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۵۸ھ تک پچھتیموں کا ۶۵ سالہ دور اہتمام ہے اور دوسرا حصہ ۱۳۵۸ھ سے ۱۳۸۶ھ تک کا ہے جو حضرت مولانا محمد طیب صاحب کا ۳۵ سالہ دور اہتمام ہے۔ اس میں ان دونوں ادوار کی آمد و صرف، مصارف تعمیر، تعداد کتب و کتب خانہ، تعداد فتاویٰ اور تعداد فضلا موازنہ کر کے دکھائی گئی ہے اور نتیجہ درج ذیل میں پر نسبت درجہ اضافوں اور ترقیات کے اعداد پیش کر دیتے گئے ہیں۔

نام مداخلت	۱۲۸۳ھ تا ۱۳۵۸ھ	۱۳۵۸ھ تا ۱۳۸۶ھ	اضافہ
۱: آمدنی	۱۴,۸۸,۸۲۳ - ۹ - ۱۱	۹۳,۵۲,۷۴۳ - ۳ - ۲	۷۸,۷۴,۹۱۹ - ۹ - ۴
۲: خرچ	۱۵,۰۰,۲۵۷ - ۷ - ۲	۹۳,۵۴,۹۸۹ - ۴ - ۰	۷۸,۷۴,۳۳۱ - ۱۲ - ۹
۳: ضرر تعمیرات	۳,۵۴,۷۸۵ - ۷ - ۱۱	۷,۵۵,۱۱۰ - ۹ - ۴	۴,۰۰,۳۲۵ - ۰ - ۰
۴: کتب خانہ میں تعداد کتب	۳۰,۴۹۱	۵۱۸۸۹	۲۱۸۳۸
۵: تعداد فتاویٰ جو دارالعلوم سے روانہ کئے گئے	۵۴۸۹۴	۲۴۵۳۲۱	۷۹,۵۲۷
۶: تعداد فضلا کرام	۱۸۸۴	۵۵۳۳	۳۴۵۹
۷: مجموعی تعداد طلباء دارالعلوم	۷۹۰	۱۵۶۹	۷۷۹
۸: تعداد امدادی طلباء	۳۴۵	۸۲۵	۴۷۹
۹: تعداد مدرسین	۲۴	۵۹	۳۵
۱۰: تعداد دیگر ملازمین	۳۲	۶۸۲	۱۵۰
۱۱: دارالاقامہ میں کدوں کی تعداد	۱۰۰	۲۲۸	۱۲۸
۱۲: دارالاقامہ میں طلباء کی تعداد	۵۰۰	۱۷۳	۵۷۳
۱۳: شعبہ حیات کی تعداد	۱۱	۳۰	۱۹

دارالعلوم کے صدر مدرس

۱: دارالعلوم دیوبند کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ، فائز ہوتے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ و باطنیہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۶ء سے ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ سے حدیث پڑھ کر ۷۷ طلباء فارغ التحصیل ہوئے۔

ب: ربیع الثانی ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ جو علوم منقولہ کے ساتھ ساتھ علوم مقولہ خصوصاً علم ہدیت و ریاضی میں امام وقت تسلیم کئے جاتے تھے۔ آپ ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۶ء تک صدارت تدریس پر فائز رہے اور آپ کے ذریعہ ۲۸ طلباء فارغ التحصیل ہوئے۔

ج: ۱۳۰۸ھ میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبند دارالعلوم کے تیسرے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آپ نے پچیس برس تک مسلسل حدیث اور تفسیر کلام ربانی کے علوم کے دریا بہاتے اور تشنگان علوم اس بحر ذخار سے سیراب ہو کر دوسروں کو سیراب کئے رہے۔ آپ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۱۳ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس عرصہ میں ۸۶۰ طلبہ آپ سے حدیث پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

د: ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں بحر العلوم محدث دوران علامہ عصر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری قائم مقام صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ پھر ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں موصوف تقل صدر مدرس ہوئے۔ آپ اپنے علم و عمل زہد و تقویٰ، سحر و تفقہ اور حفظ و روایت کے لحاظ سے یکاؤ روزگار تھے۔ آپ ۱۳۳۲ھ سے ۱۳۳۸ھ تک قائم مقام صدر مدرس اور ۱۳۳۸ھ سے اوائل ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء تک صدر مدرس رہے۔ اس بارہ سالہ مدت میں آپ سے حدیث پڑھ کر ۸۰۹ طلباء نے فراغت حاصل کی۔

۲: شوال ۱۳۴۵ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں استاد العرب والجمع حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مئی رئیسین صدارت تدریس ہوئے۔ جن کے علم و فضل اور اخلاق فاضلہ سے ہزاروں تشنگان علوم نے ظاہری و باطنی تکمیل کر کے اپنی علمی و روحانی پیاس بجائی۔ آپ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۸ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران میں آپ سے ۴۴۸۳ طلبہ نے بخاری و ترمذی پڑھ کر فراغت حاصل کی۔

۳: ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں جامع معقول و منقول حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی مدظلہ دارالعلوم کے صدر مدرس مقرر فرمائے گئے۔ آج آپ ہی بحوالہ اس عہدہ پر فائز ہیں۔ آپ معقولات کے امام ہیں حضرت شیخ الہند سے ظاہر و باطنی استفادہ ہیں اور طریقت میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر صاحب راستے پوری قدس سرہ سے سلسلہ بیعت رکھتے ہیں۔ عرصہ دراز سے آپ بحیثیت محدث دارالعلوم میں اس حدیث کی مختلف کتابوں کا درس دیتے رہے ہیں۔ خصوصیت سے صحیح مسلم

۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

آپ کے درس کا شاہکار رہی ہے جس کی مقبولیت طالبان علم و حدیث میں عام ہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۳۸۶ھ سے ۱۱۹۰ھ طبع فارغ التحصیل ہوئے اور کچھ اندیشہ بھی آپ کا فیض جاری ہے۔

دارالعلوم کے مفتی

۱۔ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کے علاوہ افتاء کا کام بھی ابتداء ہی سے ہوتا رہا جس سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی جو دارالعلوم کے صدر المدرسین تھے وہی اس اہم کام کو بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ آپ نے ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۰۱ھ تک اس خدمت کو بھی انجام دیا۔

ب : اس کے بعد کسی مخصوص شخصیت کے ذریعہ کام نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف اساتذہ کرام سے افتاء کا کام لیا جاتا رہا۔ چنانچہ ۱۳۰۲ھ سے ۱۳۱۹ھ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔

ج : استفتاء کی تعداد بڑھ کر غیر معمولی حد تک پہنچ جانے کی وجہ سے باقاعدہ ایک دارالافتاء کی بنیاد ڈالی گئی اور ۱۳۱۵ھ میں دارالافتاء قائم کر کے حضرت اقدس مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی قدس سرہ کو مفتی کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ آپ کے زمانہ میں دارالافتاء سے ۱۳۲۳ھ سے ۱۳۴۶ھ، ۱۶ برس کی مدت میں ۴۲۶۲۱ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔ ۱۳۳۳ھ سے پہلے کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ملتا۔ اس لئے ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۲۹ھ تک، ۱۴ سال کے فتاویٰ کی تعداد معلوم نہیں ہو سکتی۔

د : ۱۳۴۶ھ میں حضرت مولانا احمد نواز علی صاحب صدر مفتی اور حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب مفتی کی حیثیت سے دارالافتاء کے ذمہ دار بنائے گئے۔ یہ دور ۱۳۴۸ھ تک رہا اور اس دور میں ۴۴۴۸ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ه : ۱۳۴۹ھ میں تنہا حضرت مولانا مفتی ریاض الدین صاحب کی ذمہ داری میں دارالافتاء آگیا اور اس دور میں ۲۴۵۳ فتاویٰ روانہ کئے گئے۔

و : ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مظاہر حال مفتی پاکستان و ناظم اعلیٰ دارالعلوم کراچی مفتی دارالافتاء بنائے گئے۔ آپ اس عہدہ پر ۱۳۵۴ھ تک فائز رہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۸۳۹۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ز : ۱۳۵۵ھ میں حضرت مولانا محمد سہول صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ ۱۳۵۸ھ تک مفتی رہے۔ آپ کے دور میں ۱۵۱۸۵ فتاویٰ دارالافتاء سے روانہ کئے گئے۔

ح : ۱۳۵۸ھ میں حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب میرٹھی مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ صرف ایک سال تک رہے اور ایک سال میں ۵۸۴۰ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ط : ۱۳۵۹ھ میں دوبارہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مظاہر مفتی مقرر فرمائے گئے اور ۱۳۶۱ھ تک آپ مفتی رہے۔ اس دوران میں ۷۶۸۷ فتاویٰ دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ی: ۱۳۶۲ھ میں حضرت مولانا محمد فاروق صاحب المیدھوی ابن حضرت مولانا صدیقی احمد صاحب مفتی ہار کوٹک
العلوم کے مفتی مقرر کئے گئے۔ آپ ۱۳۶۳ھ تک رہے۔ آپ کے دور میں ۸۶۲ھ قنادی روانہ کئے گئے۔
ک: ۱۳۶۴ھ میں پھر مولانا اعجاز علی صاحب مفتی مقرر فرمائے گئے۔ آپ ۱۳۶۶ھ تک مفتی رہے اور آپ کے
زمانہ میں ۲۰۴۰ قنادی دارالعلوم سے روانہ کئے گئے۔

ل: ۱۳۶۶ھ میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہان پوری مدظلہ مفتی مقرر فرمائے گئے، اور اس
تک کہ ۱۳۸۴ھ پہلے آپ ہی مفتی دارالعلوم ہیں۔ قنادی میں آپ کی محنت و عرق ریزی اور شب و روز کا انہماک معروف
زبان زد عام ہے۔ آپ کے زمانہ میں ۱۳۸۲ھ تک ۱۳۳۷۵۲ قنادی دارالافتار سے روانہ کئے گئے۔

دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم

۱۲۸۳ھ تا ۱۳۸۲ھ

شمار	اسمار گرامی حضرات نائبین اجتام	از	تا	دیگر تفصیل
۱	مولوی عبد القدیر صاحب دیوبندی	۱۳۰۷ھ	ربیع الاول ۱۳۰۹ھ	
۲	مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی	ربیع الاول ۱۳۰۹ھ	صرف ایک سال	۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۶ھ
۳	" " " " " " "	۱۳۱۶ھ	۱۳۲۳ھ	کوئی نہیں رہا۔ ۱۳۲۴ھ
۴	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب دیوبندی	۱۳۲۵ھ	۱۳۴۳ھ	میں کوئی نہیں رہا۔ ۱۳۴۸ھ
۵	حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ میں کوئی نہیں رہا
۶	حضرت مولانا سید محمد مبارک علی صاحب ننگونی مدظلہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۱ھ میں کوئی نہیں رہا
۷	حضرت مولانا محمد طاهر صاحب قاسمی دیوبندی	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۱ھ میں کوئی نہیں رہا

دارالعلوم کے صدر مہتمم

نوٹ: دارالعلوم میں یہ کوئی مستقل عہدہ نہیں رہا۔ وقتی طور پر حسب ذیل دو حضرات اس منصب پر فائز رہے۔

شمار	اسمار گرامی حضرات صدر مہتمم	ابتدائی سن	آخری سن	دیگر تفصیل
۱	حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب	۱۳۴۴ھ	۱۳۴۷ھ	۱۳۴۸ھ تا ۱۳۵۱ھ
۲	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۲ھ	کوئی نہیں رہا

۱۳۶۲ھ تا ۱۳۶۲ھ میں کوئی نہیں رہا۔

یہ بیسویں حضرت تھائی صاحب نے ۱۳۵۴ھ کو لکھا تھا۔ انہوں نے ۹۵ بار بار مفتی صاحب موصوف ہی کام کر رہے ہیں۔ ان کے بعد جو قنادی جاری کئے گئے ان میں علم نہیں ہو سکا (ارشاد)

دارالعلوم دیوبند کے ممبران مجلس شوریٰ

ذیل میں ان حضرات کے اسماء گرامی درج کئے جاتے ہیں جو ۱۲۸۳ھ سے ۱۳۸۴ھ تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے یا ہیں۔

اسماء گرامی حضرات ممبران مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند

نمبر شمار	اسماء گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۱	حضرت حاجی عابد حسین صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۱۰ھ
۲	حجت الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ	۱۲۸۳ھ	۱۲۹۷ھ
۳	مولانا مہتاب علی صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۰۵ھ
۴	مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۲۱ھ
۵	مولانا فضل الرحمن صاحب دیوبندیؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۲۳ھ
۶	منشی فضل حق صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۱۱ھ
۷	شیخ نہال احمد صاحبؒ	۱۲۸۳ھ	۱۳۰۵ھ
۸	حکیم مشتاق احمد صاحبؒ	۱۲۹۸ھ	۱۳۰۹ھ
۹	حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوچیؒ	۱۲۹۸ھ	۱۳۲۲ھ
۱۰	حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوریؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۲۲ھ
۱۱	شیخ ظہور الدین صاحب دیوبندیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۲۲ھ
۱۲	مولانا احمد حسن صاحب امر دہوئیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۲۹ھ
۱۳	مولانا قاضی محمد علی الدین صاحب مراد آبادیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۴۷ھ
۱۴	مولانا محمد عبدالحق صاحب پور قاضیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۵۱ھ
۱۵	شاہ مظہر حسین صاحب گنگوچیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۳۸ھ
۱۶	حکیم محمد اسماعیل صاحب گنگوچیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۵۱ھ
۱۷	شاہ سعید احمد صاحب امبیطوچیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۳۹ھ
۱۸	حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانیؒ	۱۳۱۶ھ	۱۳۵۴ھ

اسماء گرامی

نمبر شمار	اسماء گرامی	ابتدائی سن	آخری سن
۴۵	خواجہ فیروز الدین صاحب جنرل اکاؤنٹنٹ ریاست کپورتھلہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۲ھ
۴۶	مولانا محمد فضل اللہ صاحب دانشداری مدراس	۱۳۵۰ھ	۱۳۵۲ھ
۴۷	مولانا عبدالرحیم ملن خاں صاحب خوبجہ	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۱ھ
۴۸	مولانا سعید احمد صاحب صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ ٹاٹ پٹاری ضلع چانگنام	۱۳۵۰ھ	۱۳۶۶ھ
۴۹	مولانا شاہ رحمت علی صاحب موضع ہیرانی ضلع جالندھر	۱۳۵۰ھ	۱۳۵۹ھ
۵۰	مولانا حافظ محمود صاحب رامپوری دارالمہام ریاست اندرگڑہ راجپوتانہ	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۹ھ
۵۱	مولانا محمد شفیع بھٹا صاحب دیوبندی صدر مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۲ھ
۵۲	حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی	۱۳۵۱ھ	۱۳۵۳ھ
۵۳	مولانا نواب حبیب الرحمن صاحب شیروانی صدر یار جنگ علی گڑھ	۱۳۵۲ھ	۱۳۶۲ھ
۵۴	مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گنگوہی	۱۳۵۲ھ	۱۳۶۶ھ
۵۵	حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بحیثیت مجددہ (صدر مدرس)	۱۳۵۲ھ	۱۳۶۶ھ
۵۶	نواب عبدالباسط خان صاحب حیدر آبادی	۱۳۵۳ھ	۱۳۶۶ھ
۵۷	خان بہادر شیخ فیاض الحق صاحب راجپوری ضلع سیہارن پور	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۳ھ
۵۸	حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بحیثیت مجددہ صدر مہتمم	۱۳۵۴ھ	۱۳۶۲ھ
۵۹	حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیتہ العلماء ہند مدنی	۱۳۵۵ھ	۱۳۶۳ھ
۶۰	مولانا محمد ابراہیم صاحب رانڈیری	۱۳۵۵ھ	۱۳۶۶ھ
۶۱	مولانا حکیم محمد الیسین صاحب گنگوہی	۱۳۶۰ھ	۱۳۶۸ھ
۶۲	حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رانڈیری قدس سرہ	۱۳۶۰ھ	۱۳۶۸ھ
۶۳	مولانا ظہیر الحسن صاحب کانڈلوی	۱۳۶۰ھ	۱۳۶۸ھ
۶۴	مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ	۱۳۶۲ھ	۱۳۶۶ھ
۶۵	مولانا حافظ الرحمن صاحب سیواری ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماء ہند دہلی	۱۳۶۲ھ	۱۳۸۲ھ
۶۶	مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۶ھ
۶۷	مولانا خیر محمد صاحب جالندھری مدظلہ	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۶ھ
۶۸	مولانا شبیر علی صاحب تھانوی حال مقیم پاکستان	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۶ھ
۶۹	مولانا شبیر احمد صاحب کھٹوری	۱۳۶۳ھ	۱۳۶۶ھ
۷۰	مولانا احمد سعید صاحب دہلوی	۱۳۶۴ھ	۱۳۶۶ھ

دوبارہ

دارالعلوم دیوبند

(مشاہیر عالم کی نظریں)

علامہ سید رشید رضا (مصر)

اگرچہ اس مدرسہ کو نہ دیکھا تو ہندوستان سے بہت نگینہ والیں ملتا ہیں۔ ”میں علم و مدرسہ دیوبند پر جسے ازبچہ کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک جدید علمی رجحان ترقی کرتے دیکھا۔ ہندوستان میں میری آنکھوں کو ایسی ٹھنڈک کہیں حاصل نہیں ہوئی تھی کہ مدرسہ دیوبند میں حاصل ہوتی اور نہ اتنی خوشی حاصل ہوتی جتنی وہاں۔ اس کی وجہ صرف غیرت اخلاص ہے۔ جو میں کبھی اس مدرسہ کے علمائے دیوبند دیکھا۔“

(بحوالہ رسالہ الزما - مصر)

مولانا ابوالکلام آزاد

”آپ کی یہ درگاہ وراہل ایک ایسا کارخانہ ہے جو مسلمان کی رگوں کو ڈھالتا ہے۔ یہ کارخانہ قائم ہے تو میں پریشان نہ ہونا چاہئے۔ اس درس گاہ کے اساتذہ علم کا جو رز پریشان کیا تھا اور جن معابد کو دیکھ کر یہ ”دس گاہ قائم کی تھی۔ اگر وہ روشنی آپ کی رہنمائی کر رہی ہے۔ تو میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ شاہد مستقبل اس کے لیے تیار ہے۔“

(تقریر)

ڈاکٹر راجندر پرشاد (سابق صدر جمہوریہ ہند)

آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک میں بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ہند کے طلباء بھی آپ کے یہاں آتے ہیں۔ اور یہاں سے تعلیم کا جو کچہ یہاں انھوں نے دیکھا ہے۔ اپنے ہاکیاں اس کی اشاعت کرتے ہیں۔ یہ بات اس کی کہ ہندوؤں کے لیے قابل فخر ہے۔

دارالعلوم دیر بند کے بزرگ علم کو علم کے لیے بڑھتے اور بڑھاتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے ہی جوتے ہیں مگر کم۔ ان لوگوں کی عزت بادشاہوں بھی زیادہ ہوتی تھی۔ آج دارالعلوم کے بزرگ اسی طرز پر چل رہے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عزت دارالعلوم یا مسلمانوں ہی کی خدمت نہیں بلکہ پورے ملک اور

نی خدمت ہے۔ کچھ دنیا میں ادریت کے فروغ سے بلے چینی پھیلی ہوئی ہے اور دلوں کا اطمینان اور چین مغفود ہے۔ اس کا صحیح علاج روحانیت ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ سکون و اطمینان کا وہ سامان یہاں کے بزرگ دنیا کے لیے میاں فرما رہے ہیں۔ اگر خدا کا اس دنیا کو رکنا منظور ہے۔ تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے۔ میں دارالعلوم اگر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جابا چوں۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان

میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ دارالعلوم افغانستان میں اقدار خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت مشہور و معروف ہے۔ افغانستان کے علماء دارالعلوم دیندہ کے باتیں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں اور علم و روحانیت کے یقین میں بے شکست اور تربیت انہیں حاصل ہے۔ اس کے ہمیشہ وہ قابل و ملاح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علماء اس دارالعلوم سے فیضیاب چرسے اور انہوں نے اپنے وطن عزیز چلپیں جا کر وہاں علم کی روشنی پھیلانی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔

مشرع عبداللطیف (وزیر عدل و صحت برما)

”یہ ایک ایسا ادارہ ہے۔ جس نے صرف اپنے ہم مذہبوں کے لیے نہیں بلکہ پورے ملک کے لیے لائق انسان پیدا کیے۔“

محمد عبدالفتاح محمودہ (مصر)

”میں نے دیرینہ اسلام اور سنی دایان کا ایک قلعہ دیکھا اور محسوس کیا کہ دین کی طرح لکھا اور اخوت کی جھلکیوں کا منہاں ہوا ہے اور کس طرح سلفہ صالحین کی تقلید کی حفاظت یہاں کے بزرگان دین کر رہے ہیں اور جس سے یہاں کے طلبہ فیضیاب چر رہے ہیں۔ ایک میٹھن بہار لارٹ شاکر کی جاتی ہے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس طرفہ کو مضبوطی سے پکڑیں اور مستقبل کی عمارتوں کے لیے اسے بنیاد بنائیں۔“

رشید احمد اسماعیل ٹکولیا (جوہانسبرگ جنوبی افریقہ)

”انگریزی زبان بولنے والی دنیا میں اس کو دارالعلوم دیندہ کو اٹھیں۔ اور کیمبرج کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ درجہ اس کی شان کے لیے کمتر ہے۔ دارالعلوم کا رتبہ دوسرے اداروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ کچھ تو یہ ہے کہ اس کا کئی مہر نہیں۔“

نیاز برکیز (ٹرکی)

”لازبری اور اس کے پیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی مومنیت کے اظہار کے لیے یہی طرح الفاظ نہیں پاتا۔ میں اس علم کا کام پڑھ رہا ہوں کا علم اور مدرسین انجام دے رہے ہیں۔ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“

ایس اے ایل اے (جنوبی افریقہ)

دارالعلوم کے جلیل شعور کو بطور ملاحظہ کرتے ہوئے میں اس مقبرہ پر بیٹھا ہوں کہ میں نے اپنی سیاحت و سفر میں کسی جگہ ایسی مغربی عظیم الشان درس گاہ نہیں دیکھی جہاں نوعیت میں ایک مرکزی درس گاہ کھلانے کے قابل ہو۔ موجودہ تاریخ اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔

ڈی جولیس جرمنیس (پروفیسر بوڈاپیسٹ یونیورسٹی ہنگری)

”میں نے خود اپنے ملک میں دیوبند کے مدرسہ کے بارے میں سنا۔ مجھے ہمیشہ سے شرق تھا کہ علوم اور اسلامی اسپرٹ (روح) کے اس بلب کو دیکھ کر اس کی اور پھر کے قدیم مدرسوں کے بعد مجددوں میں قائم کیے جاتے ہیں مجھے عربی اور تعلیمات اسلامی کی اس گہرائی اور عہد و جہد کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہو رہی جو اس مدرسے کے دو دیوبندوں کا دوسرا حصہ ہے۔“

جناب ابراہیم الجبالی (رئیس وفد جامعہ ازہر - مصر)

ہیں دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم نے مختلف درجات میں ہجرت کے مدرسین کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے جناب شیخ شہیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی۔ ہم نے ایسا نظارہ دیکھا جس نے ہمارے عقوبت کو مسرت سے پر کر دیا۔ اور ان کے چہرہ پر علم کا نور دکھا۔ ہم نے ایک ایسی جامعیت دیکھی جس نے علوم دین یعنی تفسیر قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً عربی، ادب، منطق، فلسفہ، اور انسانیات وغیرہ، ہم دعا کرتے ہیں کہ ان علوم سے امت اسلامیہ کو بڑھتی نفع پہنچائیں۔“

پروفیسر گرے ونٹ (آکسفورڈ یونیورسٹی - لندن)

”یہ میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کالج بھی یہاں پوری آب و تاب سے مشغل ہے۔ ایک مورخ کے لیے اس سے زیادہ روشن مواقع کائنات میں بھی نہیں کر سکتا۔“

عثمان کیدو (نائبہ جینی اسلامی نیشنل سائبرین فیلڈریشن)

”میرے لیے یہ بات باعث سعادت ہے کہ مجھے دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خالص مذہبی ادارہ ہے۔“

ازہر مشرق کا خطاب دیا جاسکتا ہے۔“

ایم - حسن (وائس چانسلر ڈھاکہ یونیورسٹی)

یہ دارالعلوم دیوبند (صحیح معنی میں ایک یونیورسٹی ہے۔ مجھے ہندوستان اور یورپ کی نہایت سی یونیورسٹیوں کے بارے میں ذاتی تجربہ ہے۔“

میں کہہ سکتا ہوں کہ مدیہ طرکی بہت ہی یونیورسٹیاں اس قدیم طرکی یونیورسٹی سے بہت کم ہو سکتی ہیں۔

جناب انوار الساموات (وزیر حکومت مصر و جنرل سیکرٹری مومل اسلامی)

اس عظیم تاریخی یونیورسٹی کی زیارت نے مجھے عجوبہ کیا کہیں غلو جس دل سے اپنے ان بھائیوں کو مبارک باد پیش کر دیں جو اس کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ فلاح پہنچے اور یہ علم و معرفت کا ایک منار ثابت ہو۔

پرنس روسی وفد (برائے ہندوستان)

میں نے یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند کو کچھ پیسے دیکھا۔ یہ غلام کے اس جتن میں یہ مذہب اسلام کا ایک مرکز ہے۔ میں اپنے میزبانوں کی درباری کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اس اور فیاضی کا جذبہ جو مذہب اسلام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ہندوستانی عوام اور سوڈان یونین کے عوام کے درمیان، ہمیشہ، ترقی پذیر ہے۔

امیر کی وفد برائے ہندوستان

مدد ہماری امیر کی حاجت کو ایک دن یہاں دارالعلوم دیوبند میں، قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے شہر علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں۔ درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ روح کو نور بخشا ہے اور یہ نور یہاں دارالعلوم دیوبند میں، منوشتا ہے۔

مختار حسن، عمر حسن، امیر رشید، سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد (میر)

جناب علی اصغر حکمت (سفیر ایران برائے ہندوستان)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اس عظیم الشان دارالعلوم دیوبند کی زیارت کی نیت سے نوازا۔ اور یہاں کے لائبریری اساتذہ کرام اور علمائے عظام کی مساجد کی ترقی عطا فرمائی۔ ان کے کلمات طلیات سے اس جو شخصیت کے دل و جان بہرہ ور ہوئے۔ ان کے باقی رہنے واسطہ آثار و تالیفات سے میں محظوظ ہوا کہ بقول "مداد العلماء افضل من دمار الشہداء" علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے افضل ہے، اپنے دامن میں ربانی برکات اور آسمانی فضیلتیں لئے ہوئے ہیں۔

دیوبند

شاد بابتش و شادری اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
ملتِ بیضا کی عزت کو لگاتے چار چاند
حکمتِ لطفا کی قیمت کو کیا تو نے دو چند
اسمِ تیرا بامستی، ضربِ تیری بے پناہ
دیوبند استبداد کی گردن ہے اور تیری کھنڈ
تیری رحمت پر ہزار اقام سو جاں سے نثار
قرنِ اول کی خبر لاتی تری الٹی زلفِ زہر
تو علم بردارِ حق ہے، حق نگہبان ہے ترا
خیلِ باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند
نازِ کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کر لیا اُن عالمانِ دینِ قیم نے پسند
جان کر دیں گے جو ناموسِ پیہر پر فدا
حق کے رشتے پر کٹا دیں گے جو اپنا بندہ
کفرِ ناجا جن کے آگے بارِ تابکنی کا ناچ
جس طرح جلتے توڑے پر رقص کرتا ہے پسند
اس میں قاسم ہوں کہ اندر شہ کہ محمود الحسن
سب کے دل تھے دروند اور سب کی فطرت ارجہ

گر مئی نہ گامِ تیری ہے حسین احمد سے آج

جن سے پرچم ہے روایاتِ سلف کا سر بلند

شیخ الاسلام حضرت حاجی امداد اللہ علیہ الرحمہ

۵۱۳۱۶
۶۱۸۹۹



۵۱۲۳۳
۶۱۸۱۶

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ کا خط جو انھوں نے

حضرت نانوتویؒ کی تعریف میں مولانا فیض الدین صاحب کو لکھا ہے

ارفعہ لہذا اللہ صبر بجزئیہ بکرت غرر دلم نور ربیع رہبر صبر و صبر
 ملک مستوفی و د عادیہ معلوم از فی خطہ ہما بعد از انتہا یعنی عینا اور
 معلوم مواہل و اتمہ بانگاہ کا خط طبعی اور ہموال اور ترشہ وغیرہ سے مفید ہوا تھا اس کے
 صفع بہ بہت کر دانا نا بند و نا ایہ راجعون رضا بماندہ ہی اس کی جو طائر کی
 ہم سب کو چاہئے جانانی دل اس کی رضا پر ہمیں ہماری نفع نقصان کوہ فوٹ
 اس پر سوینہ کر اپنے کام میں مقدرت میں جسے رضا نہ اس سے حاصل سو غریبی
 جو ہم میں بڑی سیرت مدرسہ کی تھی وہ سننے دو کہ کوسہ لاری اگر صید میں صاف موقوف
 و غم بہت حال مدرسہ کی سبب میں موقوف ہو کر فقر کی ملکوتی و اصل اثرات
 ترس حضور صابر مدرسہ کی شہم بد چند امور کا طبعانی ادنیٰ مدرسہ کی کام میں
 کیسے اور رعایت نکرانی چاہیے مانگتے دیانت رہنا چاہیے اگر کیتکی سات ہوجوہ
 رعایت روت آدمی کل کو جواب دینا ہوگا دوسرے مال بہت لالی ہوگی
 فرض دلم بایشکی تنخواہ مفت دیکھ کر تو نگو کہ میں تفرق نہیں ہیتی تیسے روز پو
 ساری مدرسہ لالی مدرسہ فقیر غریب اور ہمارے میں مگر عروج و مرجع بقویہ ہے بعد دسویہ

واسطے لکھوا کر وہ مدرسہ کی کتب خانہ میں رکھا گیا کہ اس کا دوزخ و عذاب کیا کہ وہ اس کی نادانی ہوگی کیونکہ وہ اپنی نوعی عقوت و مروجہ کی فحش گرد اور دیر میں اور دوستی کی تاب مدرسہ کی طرف توجہ رکھیں کہ عظیم الشان عالم کی بڑی عفو و بخشش یادگاری مدرسہ ہی اس کی عقلمندی کی پانچویں اور چھٹی اور ساتویں حالت اور درجہ خصوصاً تعلیم علم اور تربیت اور خیر میں خاطر رکھیں فقیر کا ہوتا تھا بارہ و چھ ماہ کے معیے فرزند عمر و عمر کو اپنے پاس رکھ کر اور بیان مدرسہ میں لکھ کر دھت اس کی خدمت میں تعلیم اور جب فقیر چلے آئے اس کے اپنے بکیتی بکیتی لکھی مگر اس کی دوا نہ شایہ صدارت کو ارادہ کر کے فقیر کو اس کی خاطر منظور ہی اس واسطے اس میں سستی کی سبب حال دعا و سرائف کا دیکھنا اور کو سب سے ایون ایڈر تکلیفوں کے محفوظ رکھیں اور علم نافع اور عمل صالح نصیب ہو جائیں سمجھتے تھے عزراں و دران سلام دعا قبول ہو جائے اور مضمون بالا کو اور تصور

عبدالرشید ارشد

شیخ المشائخ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

انیسویں صدی عیسوی میں ملک و ملت جن ممتاز ترین اور عظیم المرتبت شخصیتوں پر فخر کر سکتی ہے ان ہی میں سے ایک مایہ ناز اور عمدہ اور شخصیت شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نور اللہ مرقدہ کی ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی نہایت پر آشوب و دور تھا۔ چھ سو سال کی حکومت پر انگریز رفتہ رفتہ قابض ہوتے جا رہے تھے اس میں مہادوری و جان بازی کا دخل کم اور دین کاری و جعل سازی کا دخل زیادہ تھا۔

حضرت شیخ المشائخ نے ان حالات سے متاثر ہو کر روحانیت اور سیاست کے امتزاج سے ایک ایسی جماعت قائم کی جو ایک طرف بزم عرفان اور رشد و ہدایت کی روشن شمع تھی اور دوسری طرف جنگ و پیکار اور میدان سیاست کی شہسوار تھی۔ گزشتہ پوری ایک صدی میں اس جماعت نے اپنے علم و عمل اور اصلاح و ہدایت کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کے معرکہ جہاد شاملی سے لیکر ۱۹۴۷ء تک حصول آزادی کیلئے ملک و ملت کی جو زبردست خدمات انجام دیں اور سیاسی غلامی کی فضا میں ذہنی آزادی کو جس طرح برقرار رکھنے کی کامیاب جدوجہد کی ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد حسن دیوبندیؒ، مولانا جلیل اللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دیوبلی وغیرہم حضرات کے اسامہ گرامی اور ان کی خدمات جو سینکڑوں میں چند مثالیں ہیں اسی "سلسلۃ الذہب" کی نامور ترین کڑیاں ہیں۔

خاندان

حضرت شیخ المشائخ نسباً فاروقی تھے آپ کا سلسلۃ نسب پچیس واسطوں سے سلسلۃ تصوف کے مشہور بزرگ حضرت ابراہیم بن ادبم رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے اس سے اوپر اختلاف ہے بعض لوگوں نے حضرت ابراہیم بن ادبم کا نام زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے جو نابیان کیا ہے مگر یہی صحیح ہے کہ وہ فاروقی النسب تھے آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ محمد امین ہے مولانا

شیخ محمد محبت تھانویؒ آپ کے ہم جہت تھے جن کے اجداد اورنگ زیب سے لیکر انقلاب ۱۸۵۷ء تک تہماز بھولن وضع مظہر نگہ میں بسر اقتدار تھے، قاضی القضاۃ کا منصب بھی اسی خاندان میں تھا اس سلسلے کی آخری کڑی قاضی عنایت علی خاں تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں شمالی ملک کو مرکز میں انگریزی فوج سے مروانہ وار جنگ کی اور اسی کی پاداش میں اس خاندان کو نہ صرف دینی و جاہت سے محروم ہونا پڑا بلکہ تمام خاندان منتشر ہو کر تباہی کی آخری منزل پر پہنچ گیا۔

مولانا غلام رسول مہرا نے مضمون ”بزرگان دیوبند“ میں لکھتے ہیں۔

”بزرگان دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اولین درجہ کا احترام و اعزاز حاصل ہے۔ وہ حضرات حاجی امداد اللہ مہاجر کی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ان کے اسماء گرامی، اس سرزمین کے آسمان پر ان وراثت ساروں کی طرح روشن ہیں جتنا ایک کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سڑکوں میں ملاحوں کو راستہ بتاتے ہیں وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے شعل بردار تھے جب اس دنیا سے رحلت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ علمی نمونے چھوڑ گئے جو دلوں اور رُحوں میں برابر دین حقہ کے دلوں سے پیدا کرتے رہیں گے خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک باگدار و العلوم دیوبند ایسی ہے جو تقریباً ایک صدی سے اس وسیع سرزمین پر دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے اسکی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی ہے جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں کے دو تار میں قابلِ فخر ہیں۔“

تاریخ مشائخ چشت میں جناب خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ”حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ۱۲۳۳ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے۔ لسانی تعلیم و تربیت کے بعد حجاز چلے گئے انھوں نے صابریہ سلسلہ کو عروج کی انتہائی منزل پر پہنچا دیا۔ اور ان کے فیوض ہندوستان تک ہی نہ رہے بلکہ تمام اک اسلام میں بھی ان کے اثرات پہنچے۔ حضرت میاں جیو نواز محمد چغتائی نانوتوی (المتوفی ۱۲۵۹ھ) کے خلیفہ تھے۔“

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حجاز سے واپس آئے تو اشد و تلقین کی جنگ مآثرات سے ہندوستان کو منور کر دیا اللہ تعالیٰ نے انہیں نواہد و مہار کی بہت سی خوبوں سے نوازا تھا۔ وہ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی۔ جس نے بالآخر دیوبند کی شکل اختیار کی ان ہی کے خلفاء و مریدین کی پر خلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (المتوفی ۱۳۲۲ھ) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (المتوفی ۱۲۹۹ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ حاجی محمد عابد دیوبندیؒ حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفہ تھے۔

امام اللہ مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوشش سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔ باطنی اصلاح و تربیت کے لیے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں ناصر علیؒ پر قابلِ ذکر ہیں۔ انشا اللہ علی صاحب تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ تھے۔ نصف صدی سے زیادہ انھوں نے ایک پرانے قصبہ کی سائنس مسجد کے گوشے میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا لیکن مولانا تھانویؒ کی تحریک میں وہ وسعت اور انی پیمانہ ہو سکی جو مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دینی تحریک کو حاصل ہوئی۔

مولانا محمد الیاسؒ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور جذبہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عنایت فرمایا تھا۔ اس کی مثال اس عہد کے کسی کے گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس طرح جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا۔ بیسویں صدی کی تیسری اہم تحریک آزادی وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے منسلک۔

تعلیم

والدہ ماجدہ کو آپ سے بے انتہا محبت تھی اگرچہ آپ کے تین بھائی اور ایک بہن بھی مگر والد کو جو تعلق آپ سے تھا وہ دوسروں سے نہ تھا۔ اسی لاڈ پیار کی وجہ سے آپ ابتدائی تعلیم سے بھی محروم رہے۔ انجی عمر کی ساتویں منزل ہی میں قدم رکھا تھا کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے انتقال کے وقت خاص طور پر وصیت کی کہ کوئی میرے بعد اس بچے کو ہاتھ نہ لگائے۔ اس وصیت کی تعمیل میں یہاں تک مبالغہ کیا گیا کہ کسی کو آپ کی تعلیم کی جانب توجہ نہ ہوئی بالآخر آپ خود ہی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے شوق سے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، مگر پھر مرتبہ کچھ ایسے مواقع پیش آئے رہے کہ اس وقت حفظ کی تکمیل نہ ہو سکی اس زمانہ میں استاد الاسانہ مولانا مملوک علی نانوتوی جن سے آپ کا خیالی تعلق تھا۔ دہلی کے عربک کالج میں مدرس تھے۔ آپ انکے ہمراہ تحصیلِ علم کیلئے دہلی تشریف لے گئے۔ شاہ امدادیہ میں لکھا ہے:

سورسہا کے سن میں وطن شریف سے ہمارے ہی حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی زمانے میں چند محضرات فوری تحصیل فرمائے اور کچھ صرف و نحو اساتذہ عصر کی خدمت میں حاصل کی، اور مولانا رحمت علی تھانی سے تکمیل الایمان شیخ عبدالحی دہلوی کی قرات اخذ فرمائی۔

آگے چل کر لکھا ہے کہ:

”بالام فیہ و۔ بحمدہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ریچ قرآن حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پرگزرا نا۔ اور حسنِ حبیبین و فضلہ اکبر لاد الودیفیہ قرآن مولانا عبد الرحیم نانوتوی سے اخذ کیا۔ یہ ہر دو بزرگوار ارشد تلامذہ حضرت مفتی الی بخش کاندھلوی کے تھے اور مفتی صاحب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔“
شاہ امدادیہ ص۔ الثانیہ ص ۱۲

فتویٰ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ عبدالرزاق سے پڑھی جو مفتی الی بخش کاندھلوی کے ایک واسطے سے شاگرد تھے۔ فتویٰ مولانا روم سے آپ کو تمام شرائط شف ربا۔

دہلی اس زمانہ میں علماء و مشائخ کا مرکز تھی مولانا انصاری الدین دہلوی طریقہ نقشبندیہ مجددیہ کے مہند نشین تھے۔ دہلی کے زمانہ قیام میں آپ کو ان سے حقیقت چوٹی اور آپ ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر شمارہ سال کی تھی شاہ امدادیہ میں ہے کہ ”چند دن تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہ کر اجازت و خرقہ سے مشرف ہوئے اور اذکار طریقہ نقشبندیہ اخذ فرمائے۔“
پھر عہدِ نبیؐ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس آراستہ ہے شیخ المشائخ مجلس نبوی میں حاضر ہونا چاہتے تھے۔ غایتِ ادب کی وجہ سے قدم آگے نہیں بٹھاتا تھا۔ اچانک آپ کے جد امجد حافظ بلائی تشریف لائے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بارگاہِ نبوی میں پہنچا دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میں آپ کا ہاتھ لے کر حضرت میاں نور محمد بنجھانوی کے حوالے فرمادیا۔

حضرت میاں جی نور محمد بنجھانوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت اور شجرہ نسب
بنجھانہ حضرت میان جیہ کا مولد پاک ہے اور آپ شاہ العلین کی اولادِ اخفاء میں سے ہیں حضرت کا شجرہ نسب
زیر پشت میں شاہ عبدالرزاق صاحب (شاہ العلین) سے مل جاتا ہے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

شیخ الشارح فرماتے ہیں کہ میں جب بیدار ہوا تو پریشانی کا عجیب عالم تھا۔ میں اس وقت مجھجانے سے واقف نہ تھا۔ کئی سال اسی طرح گزر (بقیہ حاشیہ) ۱۲۰ھ میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت ہوئی۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ مشہور مجددین و مجاہد اسلام حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش اس دن اور سال بھی ہے اور اس اعتبار سے آسمان اسلام پر ایک ساتھ ان دو کو ایک مسعود و درخشاں کا طلوع نئے معنوں میں ایک قرآن السعیدین کلمات کا جواگے چل کر انتہا لڑا امت محمدی اور استحکام دین نبیین کے لیے ۱۸۳۶ء کے جہاد حریث میں بھی ایک دوسرے کے ہمدم و ہمتقدم رہے اور جن کی، ہم نفسی اور ہم آہنگی سے اسلام میں شریعت و طریقت کی الگ الگ راہوں اور جدا جدا اسکالہ کے نام پر فرقہ غلط پیدا ہو چکا تھا اسکا بر طریق احسن سد باب ہوا۔

سید جمال محمدی علیہ السلام حضرت میاں جیو کے والد ہیں حضرت اپنے خوش قسمت باپ کے دوسرے فرزند ارجمند تھے آپ کے برادر بزرگ کا اسم گرامی، غلام رضا تھا آپ کا نام مقدس اشادہ باطنی تہذیب کے تحت نور محمد قرار پایا۔

حضرت کے والد کا ایک متوسط درجے کے زمیندار تھے اور فضیلت و بزرگی میں اس وقت کے خاندان علوی کے افراد میں کل سرسید تھے اسی اعتبار سے آپ نجیب الطرفین ہیں اور عزت و عظمت شرافت و نجابت کے ساتھ فضیلت و بزرگی آپ کی خاندانی میراث ہے۔

ابتدائی تعلیم اور سفر دہلی
حفظ کلام پاک آپ نے مجھجانے ہی کے کسی مکتب میں کیا۔ ابتدائی فارسی تعلیم بھی یقیناً دستور زاد کے مطابق اپنے خاندان کے کسی بزرگ مارت میں گزارے اور کس سن میں پہلی بار حصول تعلیم کی غرض سے شاہجہاں آباد (دہلی) کا سفر اختیار کیا اس کی کوئی تفصیل روايت کسی کی نہ پائی نہیں معلوم ہو سکتی، لیکن سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۹۸۰ھ یعنی قریباً بیس برس کی عمر میں تحصیل علم و سلوک کی غرض سے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت اقدس میں حاضری دی تقریباً قریب یہی زمانہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کا حصول تعلیم کی غرض سے قیام دہلی کا ہے یا ہونا چاہیے چونکہ آپ کا اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا پیدائش ایک ہی جگہ لکھا جائے کہ اس زمانہ قیام دہلی میں حضرت میاں جیو پیدل والی مسجد میں رہتے تھے جو زینت المساجد نامی تاریخی مسجد سے متصل ہے۔ آپ بہت جلد علم سفینہ سے علم کی طرف راغب ہو گئے اور تکمیل درسیات و تحصیل علوم متداولہ ذکر کرتے ہوئے راہ سلوک کے ایک گرم رو مسافر بن گئے۔ جو ہر اندیشہ کی گرمی نے اپنے ان جملانیوں دکھائے کے لیے تصوف و طریقت کے حوالے سے پائیدار کار انتخاب کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ خود آپ کے استاد کامل کی حجت نے آپ کو یہ نکتہ بھیجا کہ جو علم حق و فوقی و جاہ سے حاصل ہوتا ہے محض کتابوں سے نہیں۔

ملازمت
دہلی سے سلسلہ تعلیم ترک کرنے کے بعد آپ مجھجانے والیں آگئے کچھ روزہ تک یہیں قیام رہا۔ اس کے بعد آپ نے قصبر لہاری جلال آباد میں پھر کو قرآن پاک اور فارسی کی تعلیم دینے کے لیے ملازمت کر لی اس وقت کے اقتدار سے آپ کی تنخواہ دور دورہ یا ہوا تھی اور آپ کے لیے کھانا منتر ل خاندان اقبال بیگ کے گھر سے آتا تھا۔ آپ کبھی کبھی حجرات کو لہاری سے مجھجانے چلے آتے تھے جہر کا دن دولت کدہ پر بسر ہوتا تھا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ و دیگر اقرباء کے ساتھ مجھجانے ہی رہتی تھیں ہفتہ کے روز آپ مجھجانے لہاری واپس تشریف لے جاتے اور یہاں سے وہاں تک کا سفر ایک گھنٹہ ہی پر کرتے۔ جو آپ کا ملکیت تھی۔ مجھجانے میں حضرت کا مکان محلہ پرنا ناگان متصل نیلا روہ مسجد چشتی کے قریب تھا۔ جس کا ایک کونٹا اور ایک سہ درہی ہنوز مجسمہ موجود ہے قصبر لہاری میں آپ کا ایک جوہر جو قیام رہتا تھا جواب بھی اسی حالت میں ہے۔

حلیہ مبارک
آپ کا حلیہ مبارک یہ تھا۔ پستقد، کچھ الجشہ، گدھی رنگ، اکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی اور وسط درجہ کی، لباس نیلا نہ بندہ گدا کرتہ، دوپٹا ٹوپی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے آخر کار مولانا محمد قاندر محدث جلال آبادی کی راجستانی سے گریہ مقصود تھا آیا اور حضرت میاں جیو کی خدمت میں مانجری کاموقی نصیب لائے چاہتا تھا (شہید)

سلسلہ سلوک میں آپ کے پیر و مرشد شاہ عبدالرحیم صاحب دلائی پتی پنجتاری میں انھوں نے ہی آپ کو سلسلہ بیعت سلوک و جہاد پر تہذیب میں خدمت خلافت سے نوازا۔

آپ نے ان آپ کے مرشد و مقلد نے حضرت سید احمد شہید کے ہاتھ پر تہذیب بیعت (جمادی) فرمائی وہ بھی اس سلسلہ میں بڑی اہم اور دور رس تھی۔

آپ کی شخصیت بڑی انقلاب آفرین شخصیت تھی آپ کی طبیعت پر سمیت دین و غیرت اسلامی کا غلبہ تھا اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت حاصل اور ان کی پیروی سے اسے عزم و عمل اور جوش جہاد میں بدل دیا تھا۔

پانچویں جب حضرت بید احمد نے اپنے وقتاً عزیز جناب مولانا محمد اسماعیل شہید اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب بڑھانوی کے ساتھ اپنی تحریک تبلیغ دین اور تائید جہاد کی ابتدا کی تو دور و نزدیک کے مسلمانوں نے پورے جوش و خروش اور ذوق و شوق کے ساتھ لیک لکھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت لوگوں کے دماغ اہل طلبہ کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ پورے پورے شہروں میں ہتھوڑے ہی آدمی ایسے ہوں گے جو توبہ و بیعت اور اس قافلہ دین کی برکات سے محروم رہے ہوں گے۔

پھر جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی تو عوام و خواص فقیر و امیر سب نے اسے گرم جوشی کے ساتھ قبول کیا۔ کاشتکار بل چھوڑ کر تاجر و دکانیں بند کر کے ملازم اپنے آقا کو سلام کر کے امراء اپنے محلوں سے نکل کر علماء اور مشائخ درس و ارشاد چھوڑ کر ان کے ساتھ ہونے لگے اور اسی نے ثابت کر کے اپنے گھروں کی طرف نہ دیکھا۔

اس تحریک جہاد اور تبلیغی جدوجہد کے سلسلہ میں جب سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا گرد و آب کے مشہور شہر سدانپور میں ہوا تو مسجد ابوبی میں آپ کی ملاقات شاہ عبدالرحیم دلائیؒ سے ہوئی۔ انش جیات میں اس تاریخی ملاقات کا ذکر حضرت مولانا ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان صدق ترجمان کے حوالے سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"محدث" پید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دورہ تبلیغ میں حضرت شاہ حاجی عبدالرحیم صاحب دلائی پتی پیر و مرشد حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ سے ملاقات کی ہوئے تو مولانا لوگوں کے نمونہ و نمونہ حضرت بید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت فرمائی۔ وہاں حالیکہ وہ خود صاحب ارشاد و مکمل تھے اور ہزاروں آدمی ان کی طرف انجم اور فراخ روانہ میں جھکے ہوئے تھے کہ ہاتھ پر بیعت کرنے کا حاجت نہیں، مگر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اسی میں دیکھتا ہوں (نظر کشی) اور اسی لیے بیعت پتا ہوں۔ پھر حضرت ہوئی اور وہ دونوں حضرات فوض روحانیت کا کتب کے لیے مجھ میں چلے گئے جب نکلے ہیں تو سید صاحب پر نسبت پڑا اور کہہ دیا کہ کیا خدا تعالیٰ اور حضرت حاجی شاہ عبدالرحیم دلائی پتی پر نسبت نسبت دیکھا؟

پھر حال حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب نے اپنے پیر و مرشد حاجی حکیم منیر الدین صاحب سدانپوری حضرت میاں جیو کو بھی جمعیہ مانجری سے روانہ کر کے سید صاحب سے حق پرست پر بیعت کرائی گئی جس وقت آپ کے پیر و مرشد کا پیغام ملے کہ ان آدمی جمعیہ مانجری پر چلے آئے تو حضرت دینی گھوڑی کا نہ بدتمیز میں نے کہتے تھے کہ ان آدمیوں پر پیغام ملے تھے کہ حضرت پر لڑکے کی نسبت ظاہر ہوئی اور گھوڑی بھی لوٹ پوٹ ہوئے گئی میں تک کہ اس کی بری حالت پر کئی آپ سدانپور پہنچے اور پیر و مرشد کی تاکید اور پیر و دی حکم کرتے ہوئے سید صاحب سے بیعت ہوئے۔

اس وقت تو لوگ کا یہ حال تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پنجاب بالاکوٹ پہنچا تو حضرت میاں جیو بھی اپنے پیر و مرشد راہبہ عاتقہ اپنے منصف پر

ہوا دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی صورت ہے جو خواب میں دکھائی گئی تھی حضرت میاں جیو نے مجھے دیکھ کر فرمایا کیا تمہیں اپنے خواب (بقیہ حاشیہ) حضرت شاہ عبدالرحیمؒ اور سید صاحب کے ساتھ تھے اور جماد میں شریک ہوئے، مگر بعد میں کسی کمال ایشی اور صحت کے پیش نظر خود آپ کے بہرہ ور شدہ دایہ دین کا حکم یاد آپ کو لوہاری تشریف لے آئے اور ان سرفروشنوں کی آخری جماعت نے بالاکوٹ کی تنگ اور سنگلاخ گھاٹی میں ان پتھروں اور چٹانوں کے درمیان جن میں مسافروں کا چلنا بھی آسان نہیں اپنے سے دس گنا حریف کے مقابلے میں جان دی۔

حیات باکرامات

تصویر لوہاری میں ایک مسلم کی حیثیت سے آپ کام کرتے رہے اور مستدرالاحوال رہے۔ آخر شیخ العرب والعم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب بخاری مہاجر کی مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب طریقہ سے آپ کے مرید ہونے اور آپ کے جلوہ عام کرنے کا باعث بنے۔ بابت حضرت حاجی صاحبؒ میاں جیو نے شہادت یہی پاکر مرید ہو گئے تو انھوں نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ حضرت ضامن صاحبؒ بیان کیا چنانچہ حافظ ضامن صاحب جیسے شوق طبع بھی حضرت کے تابدہ عاشق زار پر تار بن گئے اور حضرت سے ملاقات کرنے کا جوش اور ولولہ ان کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی جلتے قیام معلوم کی انھوں نے بتلایا کہ وہ لوہاری کی جامع مسجد میں پھل کو قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اصم وطن چھجاندے چنے چھجاندے کا پتہ یہ ہے محلہ پیر زادگان کانگن محلہ چشتی صاحبؒ مسجد کے پاس دھوبی رہتے ہیں ان سے معلوم کر لینا، آپ لوہاری تشریف لے معلوم ہوا کہ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ چھجاندے تشریف لے گئے ہیں۔ حافظ صاحب نے تجلجاء کارن کیا۔ جب دھوبیوں کے محلہ میں پہنچے تو حضرت مبارک مسجد چشتی کے سامنے ایک مزار کے قریب چوشتی صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ تہ ایں فرما تھے حافظ صاحب نے کہا اسے دھوبی میاں جیو کا مکان ہے آپ نے فرمایا کہ میں کپڑوں کا دھوئے والا نہیں دل کے دھوئے والا دھوبی ہوں حضرت حافظ صاحب سمجھ گئے کہ یہ ہی حضرت میاں جیو ہیں۔ قدم بوس چوئے اس کے بعد آپ کا معمول یہ لیا کہ اگر ہفتہ میں دو تین یوم قحاذ جمن میں قیام فرماتے تو تین چار روز حضرت کی خدمت میں آخر پورے سال کے تین سال کے بعد حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ آپ کو شرف مرید ہی بخشا۔

حضرت میاں جیو کی عظمت کا احساس ان واقعات سے جڑتا ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حوا میں پھر رہا تھا ایک جھلی میں کچھ آثار آدمی کے معلوم ہوئے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب پانی پتی ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے ہیں بھی بیٹھ گیا مجھ پر توجہ کی دنیا شروع کی جب مجھے آثار مجذوب معلوم ہوئے گئے میں نے حضرت پر دم شد کہ تصور کیا اس وقت میرے اور ان کے درمیان حضرت پر دم شد حال ہوئے مجذوب صاحب تبسم کرنے لگے میں نے عرض کیا مجھ کو آپ کی طرح دیا گئی پسند نہیں ہے۔

اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ حافظ محمود احمد قنویؒ داماد مولانا ملک علی صاحب نانوتوی ایک مرتبہ حضرت میاں جیو کی خدمت میں بعد بیعت کے حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ حضرت مجھے تصور شیخ کی اجازت دے دیجیے تاکہ تصور شیخ لیا کروں حضرت نے فرمایا کہ جب تک غلبہ کرتی ہے تب تصور شیخ کو نہ کرنا ہے۔ غلبہ محبت سے تصور شیخ خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ حضرت کے فرمانے سے ایں تصور شیخ ان پر غالب ہوا کہ ہر جگہ صورت شیخ کی نظر آتی تھی۔ چلتے پھرتے حیران ہو کر کھڑے ہو جاتے کہ صورت شیخ کی سامنے کھڑی ہے جہاں قدم رکھتے ہیں وہاں بھی صورت شیخ موجود۔ نماز میں سجدہ ہر ایک صورت شیخ دیکھ کر نماز کی نیت توڑ دیتے تھے۔ حضرت سے عرض کیا کہ اب تو نماز پڑھتی بھی شکل ہو گئی کہ کی نماز پڑھیں جس طرح حضرت کی ادنیٰ توجہ سے پیدا ہوتی تھی۔ اسی طرح جاتی رہی اور ایک نظر میں صحیح حالت ہو گئی۔

حضرت میاں جیو کی اس کیفیت باطنی کا حال مولانا شہباز احمد عثمانی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیفیت حضرت منہ پر صرف چند گھنٹہ بلکہ چند منٹ طاری رہی تھی اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور انہی کو دیا ہوئی کیفیت حضرت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پر کامل یقین ہے۔ یہ پہلی کرامت تھی جو مشاہیر میں کئی میسدا دل کمال استحکام حضرت میاں جیو کی جانب مائل ہو گیا۔ ایک مدت پیر و مرشد کی واقعہ حاشیہ صفحہ گزشتہ میں جو پر بارہ تیس سال تک مسلسل طاری رہی مگر اس قدر اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے کہ ان تک دی۔ یہ ہی آپ کا ظرف تھا کہ آپ اپنے آپ کے قلب الاقطاب تھے اور بقول مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے زمانہ میں ہندوستان کا دنیاوی و دینی تخت و سلیقہ اور روحانی بایں تخت و سلیقہ تھا۔ اب جس کو روحانی دنیا کی بادشاہت مل گئی اور جو قبلہ روحانیاں بن گئے اس کے ہاتھ میں کیا کچھ نہ ہو گا۔ مگر آپ نے اس کا انکار بہت کم ہونے دیا اور کہیں کہیں تو ایسا بغیر ارادہ کے ہوا جیسے کہا جاتا ہے کہ حضرت میاں جیو کی بات پر لوہاری کے خواہن (پٹھانوں) سے ناراض ہو کر جنجھنا نہ تشریف لے گئے۔

حضرت کے لوہاری سے تشریف لے جانے کے بعد لوہاری کے اکثر محلوں میں آگ لگ جاتی تھی جس سے وہاں کے خواہن کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ آگ کا لگنا حضرت میاں جیو کی خطی کا باعث ہے چنانچہ وہ لوگ جنجھنا نہ بھیجے۔ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور حضرت کی خوشامد کر کے لوہاری واپس لے آئے حضرت کا مراجعت کے بعد پھر کبھی آگ نہیں لگی خواہن نے حضرت کی خدمت میں پہنچ کر عرض کیا کہ حضرت جب آپ لوہاری والوں سے خفا ہو کر جنجھنا نہ تشریف لے گئے تھے تو یہاں مختلف محلوں میں آگ لگ جاتی تھی اس کا کیا سبب ہے حضرت نے جواب دیا مجھے اور کچھ تو معلوم نہیں صرف لوہاری سے محبت کے باعث مجھے اس کا ماحول اور محلے یاد آتے تھے۔

حضرت حکیم الامت مولانا غلام غفری کے یہاں ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میاں جیوؒ نور محمد علیؒ کی بعض بعض کرامتیں بھی عجیب و غریب ہیں فرمایا جی ہاں ایک مرتبہ کسی کے کھیت میں آگ لگ گئی کھیت والے نے آگ حضرت سے شکایت کی آپ نے اپنی ٹوپی اٹھا کر دے دی کہ جلدی سے جا کر آگ میں ڈال دو وہ لے جا کر آگ میں ڈال دی گئی اور آگ فوراً بجھ گئی۔

مولوی محمد میاں مرحوم سے جو حضرت میاں جیوؒ کے حقیقی بیٹے اور غلام حیدر صاحبؒ فرزند تھے روایت کرتے ہیں کہ حضرت میاں جیوؒ کے زمانہ میں ایک مرتبہ ہاشم کی سخت کینچ بونی چند حضرت میاں جیوؒ کی خدمت میں فرض دعا حاضر ہوئے حضرت اس وقت لگا چوس رہے تھے جب حضرت سے بارش ہونے کی شکایت اور دعا کی درخواست کی آئے والوں سے جو صاحب حضرت سے استہانہ لے تھے آپ نے ان سے فرمایا اگر تم میرے گئے کے چپکے چوس لو تو شاہ بارش ہو جائے گی ان صاحب کو پہلے ٹوگے کے چپکے چوسنے سے کچھ ذمہ سی ہوئی مگر آئے والوں کے اسرار پر ان صاحب نے حضرت کے چوسے ہوئے چنگلوں کو چوس لیا جس پر ابر رحمت اٹھا اور خوب زور سے بارش ہوئی۔

موصول دما دار استہد و ہمت کا ایک اور دلچسپ واقعہ سنئے۔ حضرت حاجی اماد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس وقت تھانہ جھون کی مسجد پیر محمد صاحب والی میں قیام فرمایا جواب خانقاہ امدادیہ اشرفیہ کے نام سے موسوم ہے اس وقت یہاں سے درسی تھی کچھ قریب تھیں کچھ ذمہ تھے اور اس جگہ ایک بزرگ بھٹا کرتے تھے جس کا نام حسن علی شاہ تھا صاحب سماع تھے مگر دنیا دار نہ تھے جب حضرت حاجی صاحب یہاں تشریف لائے تو انھوں نے اتنا اب کیا کہ خود آٹھ کر شاہ ولایت میں چلے گئے۔ لاکھ اس وقت حضرت حاجی صاحب جو ان تھے اور یہ یوڑے۔ ان کے جلنے کے بعد حاجی صاحب یہاں رہتے تھے۔ حضرت میاں جیوؒ بھی یہاں تشریف لیا کرتے تھے یہاں ایک خاندان تھانہ کی زمین ضبط ہو گئی تھی اور وہ کوشش کر رہے تھے۔ حضرت میاں جیو رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی وہ لوگ دعا کے واسطے حاضر ہوئے حضرت نے فرمایا کہ میرے حاجی کو بیٹھنے کی تکلیف ہے یہاں ان کے لیے ایک سے درسی بنوا دیں دعا کروں گا انھوں نے سے درسی بنوانے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے دعا کی وہ مقدمہ ال آباد جاکر موافق ہو گیا جس کی اطلاع ایک خاص خط سے ہوئی۔ حضرت میاں جیوؒ سے مذکورہ کیا گیا تو حضرت نے فرمایا وہ عہد بھی یاد ہے؛ انھوں نے لکھا کہ حضرت پوری سے درسی بنوانے کی طاقت تو نہیں رہی

خدمت میں حاضر رہ کر ریاضت و مجاہدہ کے بعد سلوک کی تکمیل فرمائی اور غرقِ خلافت سے مشرف ہوئے۔

(بقیہ حاشیہ) بنائیں گے حضرت نے فرمایا کہ بہت اچھا آدمی ہے سہی۔ پھر لاہور سے باضابطہ حکم آیا کہ آیاتِ توحفات تمہارے بعد پھر ضبط انھوں نے اگر حضرت میاں جیسے عرض کیا حضرت نے فرمایا تم نے ادعا ہی وعدہ پورا کیا ہے پھر میں کیا کروں

یہ کلمات ایک مجلس میں بھلائے ہیں، ایک دھندلا سا تو ہے اس جگہ طواغیت مارہ نذر کا جس کا ذکر حاجی امداد اللہ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے میں ایک بار حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مرقدِ اقدس پر تین روز تک مقیم حالتِ مراقبہ میں رہا میں نے دیکھا کہ حضرت قطب نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا دلی مقصد تم کو تمہارے مرشد سے ملے گا۔

ایک دن کمال کے ایک عالم نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے عرض کیا کہ حضرت بزرگوں کے قصے سنتے ہیں کہ لوگوں نے ان کے ہاتھ پاؤں سر و سرور کو الگ الگ پارہ پارہ دیکھا۔ آپ نے فرمایا میرے ماموں صاحب تذکرہ کر رہے تھے کہ میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں ایک دن دوپہر کے وقت گیا۔ چہرہ شریف بند تھا، مگر کراچی طرح لگے جوئے نہ تھے۔ کراچی کو لایا دیکھتا ہوں کہ حضرت میاں صاحب کا درمدا الگ الگ ہے مجھے دیکھتے ہی سب اعضاء باہم مل گئے اور حضرت میاں جیڑا اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے کہ سے نہ کہنا۔

ایک طرف تو اہل وطن کی دنیا میں آپ کے مراتب و مدارج نہ تھے۔ دوسری طرف اہل حاضر کی نگاہوں میں آپ کے نہد و سرع امداد باندہ شرع ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ تیس برس تک کبھی حضرت کی تکمیلِ اولیٰ تقاضا نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب صاحب کی فراتے ہیں کہ مولوی محمد صدیق صاحب بیان کرتے تھے کہ میری تیس سال سے حضرت میاں جیڑے ملاقات ہے۔ اس تیس سال میں کبھی آپ کی تکمیلِ اولیٰ تقاضا نہیں ہوتی معاملات و مسائل مذہبی میں بڑی اختیار برتتے تھے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی یا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نہایت ہی خوش گلو تھا اور نعت وغیرہ پڑھتا تھا کسی نے حضرت میاں جیڑے رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا یہ شخص خوش گلو ہے اور نعت پڑھتا ہے آپ بھی سن لیں آپ نے فرمایا لوگ کبھی کبھی مجھے اہم نام دیتے ہیں اور غنابلہ مزار میر میں بھی علما کا اختلاف احتیاط ہے۔ لہذا میں اس کے سننے سے معذور ہوں۔ اللہ اللہ کہ قدرتِ قادر ہے منصبِ امامت کا۔

ایک اور واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ ایک بڑا پنچا ہوا سادہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت کا ہمان رہا جب جانے لگا۔ تو بولامیاں جاری ہوئیں میں تھوڑی سی کسیر ہے۔ یہ لے لے تیرے پاس دھن کی کئی معلوم پڑتی ہے۔ اپنے کام میں لانا حضرت نے فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ اپنے پاس ہی رہنے دو اس نے پھر کہا۔ حضرت نے اس بار بھی انکار فرمایا جب اس نے تیسری بار یہی کہا تو حضرت نے ایک دھیللا اٹھا کر سامنے دیوار پر مار دیا اور فرمایا یہ دیکھو سادہ و سادہ نے اس طرف دیکھا تو ساری دیوار سونے کی ہو گئی تھی یہ دیکھ کر وہ بولا توب تمہاری ہی تھی اس کی کو ضرورت نہیں۔

اس سادہ وضعی اور نیکسراجی کے باوصف کو آپ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے سلف الصالحین کا بہترین نمونہ تھے۔ آپ کے چہرہ انور کے رعب و اب کا یہ عالم تھا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو آپ سے اس قدر قربت و نزوی کی کہ باوجود یہ جرات نہ ہو سکی کہ وہ آپ کی شان میں لکھی ہوئی اپنی ایک نظم آپ کے سامنے پڑھ سکیں لکھا جاتا ہے کہ جب کبھی حضرت میاں جی درمدا صاحب بازار کی طرف نکلتے تو سب دکاندار تعظیمی گھرے ہو جاتے اور سلام کرتے ایک دفعہ باہر کے ایک غیر مسلم غلام پراغراض کیا کہ تم لوگ کیوں گھرے ہو۔ ہرگز مت گھرے ہوا کرو ان کا نذر لوں گے لکھا اچھا آئندہ سے ہم ادب و تعظیم کے طور پر گھرے نہ جا کر بن گئے۔ ایک مرتبہ افغانا حضرت میاں جیڑے صاحب بازار کی طرف تشریف لے گئے وہ شخص بھی آیا ہوا تھا۔ سب سے پہلے حاضر شخص ہی حضرت کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب دکاندار

سفر حج ۱۲۶۰ھ میں آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو طلب فرما رہے ہیں۔ فرط شوق میں راہ راہ کا بندوبست بھی نہ کر سکے اور خالی ہاتھ روانہ ہو گئے۔ بھائیوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے پیچھے سے مصارف بھجواتے۔ ۵ ذی الحجہ کو آپ کا جہاز جدہ کی بندرگاہ کے نزدیک لنگر انداز ہوا۔ آپ جہاز سے اتر کر فی الفور عرفات کے لیے روانہ ہو گئے۔ ارکان حج کی ادائیگی کے بعد مکہ مکرّم میں آپ نے حضرت سید محمد اسحق محدث دہلوی کی خدمت میں کچھ عرصہ قیام فرما کر فیض و برکات حاصل کیے اور بعد ازاں مدینہ منورہ میں روضہ اقدس پر حاضر ہو کر سوز و دل کو تسکین بخشنا۔ پانی والہی میں پھر چند دن مکہ مکرمہ میں قیام رہا۔ ۱۲۶۲ھ میں وطن مراجعت فرمائی۔

بقیہ حاشیہ بھی حسب قاعدہ تحریر ہو گئے۔ حضرت کے گزر جانے کے بعد ان کا مزاروں کے پوچھا تم تو اعتراض کیا کرتے تھے اور حضرت کی آمد پر سب سے پہلے ہی تم کھڑے ہو گئے۔ وہ شخص کہنے لگا میں مجبور تھا کیونکہ جس وقت حضرت تشریف لاتے تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شخص میل کان پکڑ کر مجھ سے کہہ رہا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی دعا کیا ہو گی۔

انتقال ۵۸ برس اس دار فانی کی سیر کے سفر آخرت اختیار کیا۔ آپ کی وفات حسرت آیات کی تاریخ ۴ ربیع الثانی ۱۲۵۹ھ بروز جمعہ ہے۔

محبیر و تکفین حاجی املا واللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جہاں میرے حضرت پیر مرشد کا مزار شریف ہے۔ وہاں ایک احاطہ امام سید محمد شہید ہزاری کی اگر ممکن ہو تو مجھے اسی جگہ جہاں میں ان کا مزار ہے وہاں سے مجھے بڑے انس آتی ہے چنانچہ آپ وہیں دفن کیے گئے۔

حضرت نے مرنے سے پہلے فرمایا تھا فقیر مرانا نہیں صرف ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوتا ہے چنانچہ حضرت میں جبر علیہ السلام کی روح توجہ سے وہی فیضان و عرفان کا سرچشمہ جاری ہے۔ آپ کے ارشاد عالی کے مطابق آپ کے مزار مقدس سے دینی فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں جو آپ کی تابکرات سے ہوتے تھے

نصرت کے مرید و خلفاء حضرت حاجی املا واللہ صاحب فاروقی تھانوی مہاجر کی مدنی (خلیفہ) حضرت حافظ ضامن شہید فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت مولانا شیخ محمد صاحب محدث فاروقی تھانوی (خلیفہ) حضرت شیر محمد صاحب صاحب لوہاری (خلیفہ) شیخ الام الدین صاحب تھانوی (مرید) حضرت حافظ محمد صاحب تھانوی (مرید) حضرت حافظ نور محمد صاحب جھنجھانوی (مرید) (خلیفہ نور محمدی)

عزت میاں جی نور محمد جھنجھانوی۔

صفائی اور تعمیر پر لوگوں کی توجہ ہونی اور بہت جلد پانی کے چشمے با فراہم مکہ مکرمہ کے کلی کوچوں میں جاری ہونگے۔

شہداء و اہل بیت میں آپ کا حلیہ اور اخلاق و عادات کی نسبت لکھا ہے کہ:-
”سرمبارک کلان اور بزرگ ہے پشانی کشادہ، بلند اور نورانی ہے، ابرو وسیع اور خم دار آنکھیں بڑی اور

اخلاق و عادات

ہمیشہ فوق دہانی میں سرشار رہتی ہیں، رنگ گندم گل ہے، جسم نحیف اور قد مائل بطلالت ہے، کلام میں شیرینی ہے، کثیر المروت اور عظیم الاخلاق ہیں، ہر ایک سے کمال نشاۃ پیش آتے ہیں اور گفتگو میں ہر وقت جڑوٹوں پر متمسک کھینتا رہتا ہے، اخلاق و ذریعہ سے بالطبع نفرت ہے اور اتباع سنت تو گویا عادت بن گئی ہے۔ طریق سلوک آپ کا جذبہ و مجاہدہ ہی، ادنیٰ عرصہ کا آپ کی ولایت پر اجماع ہے اور علمائے زمانہ آپ کے علوم مرتبہ کے معترف ہیں۔ حق تعالیٰ نے علوم اسماء و صفات اور معارف خاص آپ کو مرحمت فرماتے ہیں، خلوت کو پسند فرماتے ہیں اور لوگوں سے کم ملتے ہیں۔ البتہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ لوجہ اللہ حاضر ہوتے ہیں ان سے کمال شفقت و اخلاق پیش آتے ہیں، باوجود کمالات باطنی اکثر اوقات اصحاب و مریدین سے فرماتے ہیں کہ میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ خدا کی ذات سے اسید ہے کہ کم لوگوں کے توسل سے میری بھی نجات ہو جائے گی“

حضرت شیخ المشائخ کے استغناء کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیراوی مہاجر کی جن سے سلطان المعظم کو بڑی عقیدت تھی جب قسطنطنیہ سے باکرام و احترام مکہ معظمہ تشریف لائے تو آپ سے سلطان المعظم کی تعریف اور مناقب بیان کر کے دعوت کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں سلطان المعظم کے حضور میں آپ کا تذکرہ کروں۔ آپ نے فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ سلطان المعظم مقتصد ہو جائیں گے پھر آپ نے دیکھ لیا کہ آپ کے معتقد ہونے کا نتیجہ کمال قرب سلطانی کی وجہ سے بیت اللہ کو مبارکباد البتہ آپ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے عادل بادشاہ ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ سلطان عادل کی دعا قبول ہوتی ہے سو آپ سے ہوسکے تو آپ ان سے میرے لیے دعا کرا دیجیے مگر بادشاہ وقت سے یہ کہنا کہ ایک درویش کے لیے دعا کرو۔ یہ آداب سلطنت کے خلاف ہے اس لیے میں آپ کو اس کا ایک طریقہ بتلانا ہوں وہ یہ کہ آپ ان کو میرا سلام پہنچا دیں وہ جواب میں وعلیکم السلام ضرور کہیں گے۔ پس میرے لیے اس طرح دعا ہو جائے گی۔
 (کمالات امدادیہ ص ۶)

قیام مکہ مکرمہ کے مشاغل

حضرت شیخ المشائخ نے ۱۲۶۴ھ ۱۸۵۹ء میں ۳۳ سال کی عمر میں ہجرت فرمائی ۳۴ سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہے یہ پوری مدت مریوں کی تربیت باطنی و فادہ میں گزری۔ آپ کے علاوہ ارادت میں ہجرت و عرب کے علاوہ مختلف ممالک کے بکثرت لوگ شامل تھے کہ مکرمہ میں ممالک اسلامیہ کے جس قدر مشائخ مختلف سلاسل کے مقیم تھے ان سب کا آپ کو نایاب اور امتیازی مقام حاصل تھا۔ اکثر مشائخ حاضر ہو کر فیوض باطنی سے لطف اندوز ہوئے۔

ترکیہ باطن کے ساتھ ساتھ اکثر ضیاء القلوب کا درس بھی جاری رہتا۔ ضیاء القلوب فن تصوف میں آپ کی بڑی معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ ثنوی شریف کے درس کا بھی التزام رہتا تھا۔ ثنوی شریف سے شغف کا یہ حال تھا کہ آخر عمر میں جب سیدھا بیٹھنا دشوار تھا۔ کوئی طالب دینی کر حاضر ہوتا تو فوراً پڑھانا شروع کر دیتے۔ ایک دو شعر کے بعد ہی بدن میں ایسی قوت آجاتی کہ نکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ جاتے اور سر و حقائق اور باوجود جوش مارنے لگتا۔

ایک مرتبہ قسطنطنیہ کے ایک بڑے شیخ اسعد آفندی جو مولانا ردالمکمل کے خاندان اور سلسلے کے شیخ کامل اور ثنوی شریف کے زبیر

عالم تھے آپ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اس وقت ثنوی شریف کا درس ہو رہا تھا۔ حضرت شیخ المشائخ بڑے جوش کے ساتھ حقائق و معانی بیان فرما رہے تھے۔ درس اردو میں ہو رہا تھا آپ کے ایک خادم مولوی نیاز احمد حیدر آبادی نے عرض کیا کہ اگر شیخ اسعد اردو سمجھتے تو بہت محفوظ ہوتے۔ شیخ المشائخ نے فرمایا کہ خط و لطف کے لیے زبان جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ فدا کر ثنوی شریف کے چند اشعار ایک خاص انداز سے پڑھے جن کو سن کر شیخ اسعد افندی پر حال طاری ہو گیا۔ جب اخفا جہا تو انھوں نے آپ سے اشغال کی اجازت لی اور اپنی قیاد پرش کر کے درخواست کی کہ آپ اس کو بہن کر تبرکاً مجھے عنایت فرما دیجئے۔

(کلمات امداد ص ۱۲۴)

حاجی صاحب کے علوم جیسا کہ تعلیم کے باب میں گذرا۔ حاجی صاحب نے باقاعدہ تعلیم و تدریس کم حاصل کی تھی، لیکن عشق و محبت الہی اور سوز و دود نے آپ کا سینہ کھل دیا تھا جس طرح انبیاء علیہم السلام کا سارا علم وہی ہوتا ہے کسی نہیں۔ اسی طرح امتداد میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جو بظاہر تو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں لیکن اتباع سنت اور اپنی اعلیٰ زندگی کی وجہ سے ایسا روحانی مقام حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء ان سے تربیت روحانی حاصل کرتے ہیں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے سینکڑوں افراد گذرے ہیں لیکن آفاقی شہرت کی حامل شخصیتیں دو ہوتی ہیں ایک مولانا جلال الدین دہلوی کے مرشد حضرت شمس تبریزی اور دوسرے ہمارے ممدوح شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی۔

شیخ المشائخ اور یہی اس خداداد دولت کی وجہ سے تھا کہ اپنے زمانہ کے بہترین علماء آپ کے گرد جمع ہو گئے اور ان سب نے آپ سے صفائی باطن اور تزکیۂ قلب حاصل کیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کیا آپ نے فرمایا تھا کہ معنی اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم کر فرمایا ہے۔

یہ کتاب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں۔

گواہی یہ علم شریعت میں علامہ دوران اور مشہور زمانہ مولوی ذمے مگر علم لدنی کے جامع عنبر شمار سے آراستہ اور نور عرفان والیقان کے زیورات سے مزینا پیرا ہے۔

(امداد المشتاق ص ۱۵)

العلاج ثلاثین حکیم الامت کا ایک قول یوں درج ہے:

حضرت حاجی صاحب نے صرف کافی تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافر لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے نیکر آپ کے سامنے علماء کی کوئی حقیقت نہ تھی ان اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے

(ص ۱۸۶)

شیخ المشائخ مرشدوں کے مرشد کا لقب حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ صحیح طور پر صداقت آتا ہے بھلا جس آستانہ سے لکھائے روزگار انسانوں نے (جو اپنی اپنی جگہ علم کے دریا اور فضل و کمال کے سرچشمے ہوں) کسب فیض کیا جو اور اس آستانہ کی غلامی پر انہیں فخر و ناز ہو اس کو شیخ المشائخ نہ لکھا جاتے تو اس کو کیا کہا جاتے گا۔ گزشتہ کسی صفحے میں چند امور ترین علماء و مشائخ کی ایک فہرست گزر چکی ہے جو حضرت صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر بات ہی عجیب ثابت رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا دوم رحمۃ اللہ علیہ جیسے انسان کو شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ کی زبان بنادیا اسی طرح حضرت لانا نذری رحمۃ اللہ علیہ کہ حضرت حاجی صاحب کی زبان بنادیا بقول حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ مولانا (یعنی مولانا اشرف علی تھانوی) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداد اللہ مہاجر) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا۔ جیسے مولانا دوم کو حضرت شمس تبریز نے سہرہ کی (زبان) بنایا تھا

(امداد المشتاق ص ۱۱)

سے بیعت ہوئے اور ان کو خلافت سے سرفراز کیا گیا ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ کو گہراں کھلانے کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ ان علماء کی فرست بیس گڑوں تک جا پہنچتی ہے جو حاجی صاحب کے حلقہ اراوت میں شامل تھے اور اگر یہ کہہ دیا جائے کہ پوری امت میں کسی شیخ سے علماء کی اس قدر کثرت نے بیعت نہیں کی تو بے جا ہوگا۔ صاحب تذکرۃ الرشید نے ان کی تعداد سات آٹھ سو بتائی ہے اور اس کی خوشخبری کہ علماء آپ کے ہمان ہوں گے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب میں آپ کو دی تھی۔

ایک کشف خواجہ پیر پیر مر علی شاہ صاحب گڑلوویؒ بھی مکہ معظمہ میں آپ کے تبرکاً بیعت ہوئے خواجہ صاحب ج پر گئے اور وہیں رہنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ حاجی صاحب نے آپ کو اس سے منع فرمایا اس کا تذکرہ خود پیر صاحب مرحوم نے کیا ہے تاریخ

مشائخ چشت میں ہے: ”مکہ معظمہ میں ایک دن وہ (خواجہ مر علی شاہ صاحب گڑلووی) حاجی امداد اللہ مہاجر کی ”کی خدمت میں حاضر تھے حاجی صاحب نے نہایت

اعزاز و تہنیت سے ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا در ہندوستان عنقریب ایک فتنہ ظہور کند شما ضرور در ملک خود واپس بروید و اگر بالفرض شما ہند خاموش نشستہ باشید ہم آن فتنہ ترقی نکند و در ملک آرام ظاہر شود (ملفوظات طیب ص ۱۲۶)

پیر صاحب حاجی صاحب کے اس کشف کو فتنہ قادیانی سے تعبیر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے خواب میں ان کی اس فتنہ کی مخالفت کا حکم دیا تھا چنانچہ خواجہ صاحب نے اپنی زبان اور اپنے قلم دونوں سے قادیانیوں کے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی ہے جیسا کہ گزرا حاجی صاحب باقاعدہ عالم تھے لیکن بمصداق ”من عمل بالعلم اللہ الم اعلم“ لے بعض علمی اشکالات اور مسائل کا اس خداداد علوم طرح حل کرتے تھے کہ اس کو دیکھ کر علماء حیران رہ جاتے تھے اس کی وہ چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

حسنات الابرار سیات المقربین مرتبہ یقین تین ہیں علم الیقین مرتبہ ادنیٰ، عین الیقین مرتبہ وسطیٰ، حق الیقین مرتبہ اعلیٰ۔ مرتبہ یقین تین ہیں علم الیقین میں جانا، حسنات الابرار سیات المقربین، حق الیقین مرتبہ غافل ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ علم حرارت آتش کا علم الیقین ہے اور جب اس پر آنکھ رکھی جائے عین الیقین جو اور جب پورے لوہے کو خوب گرم میں سرخ کیا جائے اور اس وقت لوہا انا النار (میں آگ ہوں) کہے بجائے یہ مرتبہ حق الیقین ہے۔ (امداد ص ۲۲)

دو حدیثوں کی مطابقت ”فرمایا ایک دن دو طالب علم آپس میں بحث کرتے تھے ایک کہتا تھا کہ نماز بدون حضور قلب درست نہیں ہے کیونکہ اصلۃً لا یجوز القلب (غافلوں کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ حضرت عمر فرماتے ہیں، انی اجبرہ بالحبش وانی فی الصلوۃ میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں (اس سے وہ کون امر منافی نماز ہو سکتا آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے حاکم حاکم آیا جاوا اور اشد دعا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے مقررہوں کہ بادشاہوں کی حضور ہی ہوتی ہے اور لا حقہ (پیشوا مدہ) عرض کرتے ہیں اور استمر نراج چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کہ کشش کرتے ہیں پس ان لہ تاریخ مشائخ چشت ص ۱۱۳، ۱۱۴ لے چار پٹھ پڑھنے پر کل کہنا ہے اللہ تعالیٰ اسے ایسے علوم سکھاتے ہیں جن کو وہ کسی سے نہیں پڑھتا۔

حضور ہے زمانہ حضوریؐ

(المدرس ۵۱: ۵۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب سے سوال کیا کہ خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا خدا کو دنیا میں دیکھنا ممکن ہے یا نہیں فرمایا

”ممکن ہے معنی آیۃ لا تدركہ الا بصار وہو یدرک الا بصار کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنیہ) حاصل ہو جاتی ہے۔ بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کی غلطی ہے دلیل اس بات کی کہ انہی نظر سے نہیں دیکھتا یہ ہے کہ آنکھ بند کرے رویت بدستور رہے دوسرے یہ کہ دید آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پر تو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے مولانا اشرف علی صاحبؒ نے کہ خطاب ابن قرائی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کیا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے کہ عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ دیدۂ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیونکہ ذات نے عباس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کیا؟

(المدرس ۵۱)

دعا کی چار قسمیں ہیں اول دعائے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے ہلاک کی دعا کرے پس اس پر یہ دعا کرنا فرض ہے دوم دعائے واجب جیسے قوت (دوروں میں) سوم دعائے سنت جیسے بعد تشہد التحیات پڑھنے کے بعد اور اوجیہ ماثورہ چہارم دعائے عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیونکہ دعائیں تذل ہے اور تذل ظاہری حق تعالیٰ کو محبوب ہے لهذا الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے

(المدرس ۵۰: ۵۱)

اکابر و بزرگہ سلسلۃ الدہب میں اصل چیز اتباع سنت ہے یہی وجہ ہے کہ اس مشرب کے تمام شاخ شریعت کے تحت پابند اور تابع سنت تھے اور اس سلسلہ کا ہر شیخ تقریباً ولی تھا جیسا کہ

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ کرامات کو برحق جانتے ہیں کہ ان کا صدور باہل کمال سے ہوتا ہے لیکن ولایت کا انحصار اس پر نہیں سمجھتے یہی وجہ ہے کہ اکثر حضرات صاحب کرامت ہونے کے باوجود اس قسم کی چیزوں کا بہت اخفا کرتے تھے کہ علوم اس طرح کے قصوں ہی کو بزرگی سمجھنے لگتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں تو کرامات کو ظاہر کرنا کم حوصلگی سمجھا جاتا ہے ایک دفعہ حاجی صاحب کے بہت سے مہمان آگئے کھانا کھا تھا حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ سب نے کھایا اور کھانا بچ رہا۔ حضرت حافظ صامن شہید کو خبر ہوئی حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہیے اب تو قحط کیوں پڑے گا؟ حضرت حاجی صاحب شرمندہ ہو گئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہو گئی تو کہہ کرنا ہوں پھر ایسا نہ ہو گا۔

(بحال المد)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کرامت دکھا کر شرمندہ ہوئے اور ایسا کرنے کو اچھا نہ سمجھا۔

آپ کی ایک کرامت تذکرۃ الرشید اور دوسری کئی کتب میں موجود ہے کہ شریک آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی ایک اور کرامت گفتاریاں جو رہی تھیں حضرت کے بھی وارنٹ جاری ہو چکے تھے کسی نے ضلع انبالا کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب راؤ عبداللہ رئیس پچھلاہ ضلع انبالا کے اصطبل میں مقیم ہیں کلکٹر بات خود اصطبل پر آ موجود ہوا اور رئیس صاحب سے

کئے لگا کر ہیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس عمدہ گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اصطلیل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ متعجبین سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا اور مصیعی بچھا ہوا تھا اور وضو کا لٹرا بھی موجود تھا اس کے پانی سے زمین زرخیزی یہ سب کچھ تھا گرجا حاجی صاحب غائب تھے، لیکن جب وہ چلا گیا تو حاجی صاحب کو مصیعی پر پایا گیا۔

”نفاذ مکیہ“ کے مترجم ”شائم امدادیہ“ میں لکھتے ہیں۔

قطب ارشاد اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علوم منزل کا اعتراف کرتے ہیں حضرت

حق سبحانہ نے علوم اسماء و صفات سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص و خصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات رحمت

(شائم ص ۶۷)

فرمائے ہیں۔

آگے چل کر یہی مترجم لکھتے ہیں:

قطبوں کا ایک گروہ ہمارے بکرت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار معارف و وقایق تصوف و نکات حروف و اسماء وغیرہ اسے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخالف معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں ایسے لوگ تعلیم و ارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگان خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الحق الی الحق رہتے ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب کے قطب ارشاد اور شرح المشائخ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید گنگوہی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا فیض الحسن بہار پوری، حضرت مولانا احمد حسن امروہوی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، جیسے کابر علماء اور یگانہ روزگار فضلاء جن کی غلامی پر فخر کرتے ہوں اس کی بزرگی اور ولایت میں کے شبہ ہو سکتا ہے۔

مرض وفات میں استغراق کے ساتھ ضعف اس قدر بڑھ گیا تھا کہ روٹ ٹھٹک بدلنا دشوار تھا، اشتہا بالکل جاتی رہی تھی

وفات

آخر ۱۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء کو چار شنبہ کے دن فجر کی اذان کے وقت چوراسی سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا جنت الحلیٰ میں مولانا رحمت اللہ علیہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مادۂ تاریخ وفات نکالا جیسی داخل الخلد ۱۳۱۷ھ

کرامات امدادیہ

کرامت :- حضرت حاجی صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ بھائی ہم نے ایک باب اور دو باب پگھلایا کا اور ایک باب بستان کا اور کچھ مفید نامہ اور کچھ دستور المستدی اور چند اوراق زینا کے پڑھے تھے اور صحن حسین حضرت مولوی قلندر صاحب سے پڑھی لکھی میں شوق درود و ملائت کا ہوا۔ اور دہلی میں اگر حضرت شاہ نصیر الدین صاحب سے بیعت کی بعد ان کے وصال کے پھر کسی کمال کی جستجو ہوئی۔ ایک روز خواب میں بشارت ہوئی۔ اور آپ کا ہاتھ حضرت میاں جی صاحب (حضرت نور محمد جھنجھانی) کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ اور اس سے اور بھی بے قراری ہوئی ایک روز مولوی قلندر صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ کو بیعت بیکراوی ہے تو لوہاری جا کر حضرت میاں جی صاحب قدس اللہ سرہ کی بیعت میں حاضر ہو کر اپنی تسکین کرو لیوچہ اب اشد مولوی صاحب کے آپ لوہاری پایادہ شریف لے گئے۔ حضرت مدوح المناقب نے دیکھتے ہی فرمایا کہ میاں خواجہ خیال کا کچھ اعتبار نہیں اس فرمانے سے دلی بیکراو کو کچھ قرار ہوا اور اسی وقت حضرت میاں جی صاحب نے آپ کو سلسلہ بیعت میں داخل کر لیا۔

کرامت :- ایک روز موسم سرما میں حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب لنگوٹا کے ہوئے اور کھل سر پر ڈالے ہوئے آگے خود اور پیچھے تاحی تجارت علی خان اور بہت سے ہمراہی پر محمد دلی مسجد کے در و درگزر سے اور شارع عام سے جانب شمال میں زمین پر بیٹھ گئے اس غرض سے کہ جناب حاجی صاحب مسجد سے باہر تشریف لائے اسی وقت حافظ صاحب نے تمام بدن اپنا کھیل ڈھانک لیا اور سر کو چھپا لیا۔ اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ شمالی دروازہ تشریف لے گئے۔

کرامت :- حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب موصوف کی ملاقات کے لیے جنگل میں تشریف لے جاتے اور پہلے سے بہت آدمی حافظ صاحب کی تلاش میں جمع ہو کر منتظر بیٹھتے بہتے اور آپ کسی سے نہ ملتے جس وقت حاجی صاحب وہاں پہنچتے فوراً کسی جھاڑی میں سے نکل آتے اور ملاقات کرتے اور بہت نرمی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے اور پھر رخصت کر دیتے۔

کرامت :- ایک روز نصف شب کے وقت ایک مفید باف آیا اور آپ کو سیرگاہ عرض کیا کہ حضرت میری لڑکی کو آسیب کی غلط سے بہت تکلیف ہے۔ آپ تشریف سے مجلس اور اس کا علاج فرما دیں اسی وقت آپ اس کے ہمراہ ہوئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ میاں اللہ بخش اس کے سر پر موجود ہیں انہوں نے آپ کو سلام کیا اور کہا کہ آج اس نے اپنی زبان سے ایسے ایسے کلمات ہماری نسبت کہے تھے۔ اس لیے ہم یہاں آگئے تھے۔ آپ تشریف لے آئے ہم جاتے ہیں اور پھر کبھی یہاں نہ آویں گے۔ آئندہ آپ کسی کی درخواست پر ایسے وقت تشریف نہ لویا کریں۔ مرت ایک تحریر لکھے ہاتھ بھیج دیا کریں موافقی اس کے تعمیل کیا کروں گا۔ مجھ سے آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ پھر جب کہیں ایسی شکایت ہوتی آپ ایک پرچے پر اپنا نام نامی لکھ کر دے دیتے وہ شکایت رفع ہو جاتی۔

کرامت :- بعض لوگ بلا اطلاع کہیں پہلے جاتے اور ان کے آثار پر پریشان ہوتے۔ حضرت کے رد ورجس وقت کسی لڑکے کے پہلے جانے کا ذکر آتا حضرت اسی وقت دستک دے دیتے وہ لڑکا اس وقت جس جگہ ہوتا تھا اُس سے آگے نہ بڑھتا وہاں ہی سے

واپس اپنے گھر چلا آتا آپ فرمایا کرتے کہ جس وقت فرار کا حال معلوم ہوا کہ اسے فوراً بیان کر دیا کریں جس قدر جلدی بیان کر دیا جائیگا اتنا ہی جلدی وہ لڑکا واپس آجائیگا اور جس قدر دیر کی جاوے گی اتنی ہی دیر سے واپس آوے گا۔

گواہت :- (برادریت حافظ قاری مولوی احمد علی) ۳۸۸ھ میں اسحق صاحب سقر ہند کے قصد سے آگبوت میں سوار ہوا اور بعد گزرنے عدن کے چھ روز گزرے آگبوت کا کوئلہ تمام ہو گیا جس کے باعث انجیر مع کپتان و معلم کے بہت حیران و پریشان ہوئے حتیٰ کہ اس وقت تک نہ جانے کی نوبت پہنچی۔ اسحق نے انجیر سے پوچھا بھلا رسیوں اور تختوں کا جلا نا کچھ مفید ہے۔ اور آگبوت موافق معمول کے چلتا یا کم اس نے کہا موافق معمول چلتا تو درکنار پانی کے زور سے کسی قدر پیچھے ہٹ جاتا ہے تب اسحق نے نہایت ملول ہو کر کہا پھر سوار کا جلا نا کیا مفید ہے یا کیا نقطہ انجن گرم رہنے کے لیے یہ گفتگو بعد النظر ہوئی اور وہ باقی روز نہایت شدت سے گزرا شب کے وقت ایک نیچے نیم خوابی کی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت اعلیٰ نظر العالی رؤس المشرکین اسحق کو نہایت دلجوئی سے فرما رہے ہیں کہ کوئی گھبراہٹ نہ ہے کل انشاء اللہ بندہ نبی ساتھ سلامتی کے پہنچے گا۔ اسی وقت سیدار ہوا اور اپنے ذلیل و درویش مشغول رہا۔ اور انجیر پھر پھرتے میرے پاس آن پہنچا اور کہا کہ اس وقت آگبوت ان ہی رسیوں اور کڑوں کے زور سے کچھ آگے بڑھ رہا ہے یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک آگبوت نظر آیا اور روشنی صبح کی ظاہر ہوئی اپنی اصطلاح خاص میں اس کو کچھ کہا کہ وہ آگبوت نزدیک آیا اور تھوڑے کوئلے سے بیٹے کوئلے لینے کی دیر تھی کہ آگبوت کی رفتار ایسی ہوئی کہ وہی انجیر کٹا تھا کہ جب سے میں اس آگبوت ہوں ایسی چال کبھی نہیں پھر میں نے پوچھا اب کب پہنچے گا۔ کہا کہ صبح کو۔ اسحق متحیر ہوا کہ حضرت نے فرمایا آج کے روز اور یہ کٹا ہے کہ کل۔ خیر اسی خیال پر ایک عرصہ گزر گیا با امداد اللہ تاملے اسی روز مع الخیر و السلام بندہ نبی پہنچے اور شہر میں اترے۔

گواہت :- اب بالفعل اسی ماہ میں مولوی محمد شفیع الدین صاحب واسطے نماز صبح کے جیل کے وقت جا رہے تھے راہ میں اتفاقاً گر گئے۔ اور پہلی میں کچھ تکلیف ہوئی حضرت اعلیٰ نے مکان پر صبح کے وقت چند بار فرمایا کہ مولوی شفیع الدین صاحب کو بہت تکلیف ہوئی اور ہنوز نہ کوئی آیا اور نہ کوئی گیا۔ جب مولوی صاحب تشریف لائے تب معلوم ہوا۔

(راوی حافظ قاری مولوی احمد علی) کرامات :-

گواہت :- ایک مرتبہ یہ ناچیز بقصد حرمین شریفین وطن سے پہلا بیٹھیں میں سوتا تھا خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت شریف لائے اور فرماتے ہیں کہ اس مرتبہ تو ہم ہی ہندوستان میں آگئے تھے تم کہ نہ جاؤ میں نے عرض کیا کہ حضور اب تو یہاں آگئے۔ اور جہاز کا کرایہ بھی کیا اور کل جہاز روانہ ہو جائیگا فرمایا نہیں، جہاں مناسب نہیں میں عرض کرتا رہا۔ ارشاد ہوا کہ نہیں اس سال نہ جاؤ انکھیں کھلیں فی الجملہ تردد رہا۔ مگر اس دن جہاز کی روانگی تھی اس میں عید سے واقف نہ تھا۔ سوار ہو لیا اور جہاز روانہ ہوا اسی دن ایسا طوفان آیا کہ جہاز میں نقصان آیا۔ (راوی مولانا شاہ محمد حسین صاحب آزادادی) کرامات امدادیہ

گواہت :- ایک دن فکر کے بعد میں اور مولوی منور علی صاحب اور لا محب الدین صاحب کو ضروری بات عرض کرنے کو حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت حسب معمول اوپر جا چکے تھے۔ کوئی آدمی تھا نہیں کہ اطلاع کرائی جاتی آواز دینا ادب کے خلاف تھا۔ آپس میں شورہ یہ کیا کہ حضرت کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جائیں یا بات کا جواب مل جائیگا یا حضرت خود تشریف لائیں گے۔ حضور ہی دیر نہ گزری تھی کہ حضرت اوپر سے نیچے تشریف لائے ہم لوگوں نے معذرت کی کہ اس وقت حضرت بیٹے ہوئے غرض

تکلیف فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں نے بیٹے بھی دیا۔ کیونکہ قیاساً ہم لوگ سخت نادوم ہوئے۔ (ایضاً)

گواہت :- ایک مولوی صاحب نے ایک دن امر پوچھا کہ اید الیہ الخیرین یا سلفی کی حدیث سے تو فقیر پر عینی ترجیح نکلتی ہے۔ فوراً ارشاد فرمایا کہ بد علیا اسی ہے افضل ٹھہرا کہ مال کو علیحدہ کر کے فقیر بننا چاہتا ہے۔ اور بد سلفی اسی لیے منفعول ہوا کہ مال نے کرنی بنتا ہے۔ (ایضاً)

گواہت :- ایک دن ایک فقیر صدا دیتا تھا کہ مافی قلبی غیور اللہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مانا فیہ نہیں مآ مولوی ہے۔ صافا فیہ ہوتا اور اس کو اس کی حالت ہوتی تو کبھی سوال نہ کرتا۔ (ایضاً)

گواہت :- ایک دن اللہ صانع بالسمع والبصر راجعاً للادب کی تفسیر مولویوں سے دریافت فرمائی اور ارشاد ہوا کہ وارث تو وہ ہے جو مرنے کے بعد باقی رہ جائے سمع و بصر کے وارث ہونے کے معنی کیا ہیں لوگوں کو تا مل ہوا تو خود ہی ارشاد فرمایا کہ یہ کنہ یہ ہے کہ سمع و بصر میرے سمع و بصر حق ہو جائیں اور بی بیہوشی کا مرتبہ ہو کہ ان اللہ خیر الودعین۔ عرض اس قسم کی ہنزدوں باتیں ہیں جو ہر دفعہ حضرت کی زبان اقدس سے ارشاد ہوتی ہیں کہ ضبط ان کا دشوار ہے۔ (ایضاً)

گواہت :- باد بود پیرانہ سالی کے مجاہدہ کا حال یہ تھا کہ ایک سال رمضان شریف میں مجھے حاضری خدمت اقدس کا اتفاق ہوا دیکھا کہ تمام رات نماز پڑھنے اور قرآن سننے میں بسر ہوتی ہے۔ حافظ عبد اللہ پنجابی ایک بزرگ تھے۔ تراویح میں ہر روز وہ حرم شریف میں محض حضرت کے سامنے کوسات آٹھ سپارے پڑھتے اس میں قریب نصف شب گزرتی۔ اس کے بعد حضور کبھی کبھی شیخ حسن عرب کا قرآن سننے جاتے۔ نصف شب سے حافظ عبد الحمید صاحب باب الرحمة پر تہجد میں پانچ پچھ سپارے پڑھتے۔ ان کا قرآن سننے فخر تک برابر سی کیفیت رہتی۔ ایک دن حضرت کی طبیعت صحیح نہ تھی۔ کھانا تناول نہیں فرمایا۔ حافظ جی نے کم پڑھا۔ آپ نے سلام کے بعد ارشاد فرمایا کہ حافظ جی طبیعت کیسی ہے۔ آج تم نے کم کیوں پڑھا۔ حافظ نے عرض کیا کہ آپ کے خیال سے آپ نے فرمایا کہ میں توجہ قرآن سننے لگا ہوں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ اور یہ جی چاہتا ہے۔ کہ بس یہ آواز برابر آتی ہی جائے اور اس وقت تک ذرا ضعف نہیں معلوم ہوتا۔ (از مولانا شاہ محمد حسین صاحب آبادی)

گواہت :- میرے والد صاحب قبل اس طرح فرمایا کرتے تھے کہ حضرت قبلہ عمومی حاجی محمد امداد اللہ صاحب نے علم عربی کم پڑھا ہے۔ ایک بار حضرت موصوف نے حجام کو گاندھلا اپنے ماموں کے پاس واسطے منگائے کسی بڑی کتاب حدیث کے جیسے اس کے جواب میں حضرت کے ماموں صاحب نے فرمایا کیا میان امداد اللہ اس کتاب کی زیارت کیا کریں گے۔ یا کسی سے پڑھا کر سنیں گے حجام نے واپسی میں عرض کیا حضرت انہوں نے ایسے فرمایا کہ میری مجال نہیں کہ عرض کروں۔ حضور نے باسرا وہ لفظ سنا فرمایا کہ اسی وقت واپس گاندھلا چلا جا اور میرا خط ماموں صاحب کے حضور میں پیش کر کے عرض کرو کہ جو حدیث مشکل ہو وہ آپ تشریف لا کر دریافت فرمائیں خدا کے نیک سے جواب دو لگا سنا گیا ہے۔ کہ وہ بزرگ تشریف لائے اور مشکل مشکل احادیث دریافت فرمائیں۔ حکم خدا سے جواب درست پایا۔ کہ الحمد للہ علم باطنی سینہ مبارک پر کھل گیا۔ ظاہری علم اس کے سامنے کیا ہے۔ (از حکیم مقبول احمد صاحب ٹھانوی)

گواہت :- میں نے ثقات سے سنا ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا کہ آپ کے سامنے سے گزرتا اور متاثر نہ ہوتا اور اس پر غصہ نہ ہوتا۔ پھر توجہ اور انتفات کی حالت کا کیا ذکر۔ (از مولوی عبدالغنی بہاری)

گواہنت :- فرمایا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں کے حالات کی چھان بین کرتے ہیں یہ امر مذموم اور ممنوع ہے قتال اللہ
لاندخلو ابیونا غیر بید نکم بزرگوں کے حضور میں اپنے دل کی نگہداشت کرنا چاہیے۔

پیش اصل دل نگہ دازید دل

ع

ایک دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور اپنی نسبت سے میرا تعیش حال کرنے لگے میں نے کہا کہ یہ امر بہت بُرا ہے
حال نسبت اگر اپنی پونجی چھپانا چاہیے تو پتہ بھی نہ لگنے دے یہ سن کر میرے زانو پکڑ لیے اور عذر کرنے لگے۔

گواہنت :- فرمایا کہ میرے بڑے بھائی شیخ ذوالفقار علی صاحب جب ملک پنجاب سے واپس آئے اور مجھ کو ادراد کا شائق پایا
فرمانے لگے کہ مجھ کو ایک تقرر فی الحال بتلایا ہے تم سیکھ لو میں نے اس کو ان سے لیا۔ ایک مرتبہ میرا دھلی جانا ہوا دہلی میں عبداللہ
مسند نشین درگاہ حضرت صاحبزادہ نے تقریب عرض میں مجھ کو بلوایا اور کسی اپنے سرید کا باغی سوار کو بھیجا جب میں ان کے مکان پر
پہنچا تو دیکھا کہ لوگ بڑی شان و شوکت سے جمع ہیں میں نے تقرر نہ حالت سے گیا مجھ کو دیکھتے ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور دست بوسی
کر کے مسند خاص پر بٹھایا۔ مجھ کو بڑا تعجب تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب رات کو وظیفہ پڑھنے لگا معلوم ہوا کہ سب اسی وظیفہ کا ترجمہ
نوا شیلے حضرت پیر و مرشد نے فرمایا کہ اس اعزاز سے کیا حاصل مجھے معلوم ہوا کہ آپ اس محل سے ناراض ہیں اسی وقت ترک کر دیا
پھر نہیں پڑھا۔

گواہنت :- فرمایا کہ حافظ غلام مرتضیٰ مجدد بمقام پانی پت ساکب مجذوب تھے حالت سلوک میں ان کو مجذب ہو گیا تھا۔ ہماری
بہن میں اکثر آیا کرتے تھے۔ ایک بار غل ہوا کہ غلام مرتضیٰ پتھر مار رہے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ مجھ کو دیکھ لائیں نے پتھر مارنا چھوڑ
دئے اور مجھے قریب بلا یا میرے ہاتھ میں کوئی کتاب عشق تھی اس کے اوراق کھلائے گئے جب یہ شعر نظر پڑا :-
عشق اول عشق آخر عشق کل
عشق شام و عشق نعل و عشق گل !

مجھ کو اشارہ کیا اور بشارت غلبہ توحید کی دی فرمایا کہ جو اسرار توحید میری زبان سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں یہ اسی بشارت کا ثمر ہے
گواہنت :- فرمایا کہ ایک دفعہ میں صحرا میں پھر رہا تھا ایک بھاڑی میں کچھ آٹا آدمی کے معلوم ہوئے غور کرنے سے معلوم ہوا کہ
مجدوب صاحب ہیں مجھ کو دیکھ کر بیٹھ گئے میں بھی بیٹھ گیا مجھ کی توجہ مجذب کر دینا شروع کی جب مجھے آثار مجذب معلوم ہونے لگے
میں نے حضرت پیر و مرشد کا تصور کیا اسی وقت حضرت میرے اور ان کے درمیان حامل ہو گئے مجذوب صاحب ہم کرتے گئے
نے عرض کیا کہ تمہاری طرح مجھ کو دیوانگی پسند نہیں ہے۔

گواہنت :- پنجلا سر میں ایک بار آپ مکان میں تشریف رکھتے تھے کہ ایک سکھ آپ کی خبر پا کر گرفتاری کے لیے آیا گھوڑے پر
اتر کر دروازے پر کھڑے ہو کر مکان کے اندر جھانکا اور آپ پر نظر پڑے تھے ہی بولنا شروع کیا اور تھوڑی دیر کے بعد سوار
واپس چلا گیا۔ از حضرت گنگوہی :-

تصنیفات

۱۔ مثنوی مولانا رومؒ

حضرت حاجی صاحب کو مثنوی مولانا روم سے والہانہ لگاؤ تھا۔ اور اکثر اس کا درس دیا کرتے تھے۔ حاجی صاحب پر درس کے دوران میں عجیب کیفیت وارد ہوتی اور سامعین و شریک درس بھی اس زبان سے لاعلمی کے درس سے پورا حظ اٹھاتے اور متاثر ہوتے۔ حاجی صاحب کا یہ درس کیسا اثر ہوتا۔ حاجی صاحب نے مثنوی پر فارسی زبان میں کاشیہ لکھا۔ اس مثنوی مثنوی کے دو دفتر تو حاجی صاحب کی زندگی میں چھپ گئے تھے بقیہ بعد میں چھپے۔

مثنوی مولانا روم پر مثنوی لکھنا۔ اور اس کی شرح کرنا معمولی کام نہیں۔ اس سے حاجی صاحب کے مجاہد کا سرسری اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ غذائے روح

اس کتاب میں سکابات و قصص سے تعلیم و تلقین کی گئی ہے۔ نفس کے مغالطوں، شیطان کے وسوسوں اور جہالت کے نتائج بیان کئے گئے ہیں۔ شروع میں حمد و ثناء اور ثقیب و خلفاء راشدین ہے پھر اپنے مرشد کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ روح کی غذا کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور اس بارے میں تمام متعلقہ موضوعات پر سیر حاصل مواد فراہم کیا ہے پوری کتاب اردو نظم میں ہے۔ چھپائی مضمون پر سولہ اشعار ہیں۔ حاجی صاحب خود ہی اس کے سن تحریر اور نام کا ذکر فرماتے ہیں۔

سال ہجری بھی ہوا جب ختم یار
یک ہزار دو صد و شصت و چہار (۱۲۶۴)

جب ہوئی یہ مثنوی یار و تمام
رکھ دیا اس کا غذائے روح نام

یہ بھی اردو نظم میں ہے اور کسی دوسرے شخص کی فارسی نظم کا ترجمہ ہے۔ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں۔

۳۔ جہاد اکبر

غرض جب ہوا یہ رسالہ تمام
”جہاد اکبر“ اس کا رکھا میں نے نام

یہ مضمون مٹھا فارسی میں لکھا
کسی مرد حق نے بعد پر ہوشیا

کیا میں نے ہندی ملا کر کچھ اور
کر تا خاص اور عام سمجھیں بغور

سن و سال ہجری غیر الا نام
تھے بارہ سو اڑسٹھ ہوا جب تمام

اس رسالہ میں نفس کی اصلاح وغیرہ پر مشتمل مضامین ہیں۔ اور ان کو تیشی اور حکایتی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ تیشی ۳۳ صفحات میں چھ سو اناسی اشعار ہیں۔

۴۔ مثنوی تحفۃ العشاق

اس میں عاشقانِ الہ کے لیے مضامین ہیں کہ کس طرح اللہ کی معرفت حاصل کی جاسکتی ہے اس کا سن تحریر ۱۲۸۱ء ہے۔ اس کا بھی حاجی صاحب نے شعر میں ذکر کیا ہے۔

بارہ سو تھے اور اسی سال ہجر
ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر

ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام
تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

اردو نظم کی یہ کتاب تیشی ۳۳ صفحات اور تیرو سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔

۵ درودنامہ غمناک

یہ آٹھ صفحوں پر ایک سو پچتر اشعار کی کتاب ہے۔ ضامن نے عشقِ حقیقی اور تہذیبِ بے خودی کی ترجمانی کی ہے۔ کتاب اتنی موثر اور درونگ ہے کہ پڑھ کر دل چوٹ کھاتا اور بے تاب ہو جاتا ہے۔ حضرت مخدوم کی روایت کے مطابق ایک شخص یہ درودنامہ غمناک پڑھ رہا تھا حاجی صاحب اس پر گندہ سے اور پوچھا کیا ٹیڈ رہے جو وہ بے سے پیش آیا۔ بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور سنائیتِ اعظم کی۔

۶ ارشادِ مرشد

اردو میں یہ سولہ صفحات کا مختصر رسالہ ہے جس میں نمازوں کے بعد وظائف اوراد۔ مراقبات۔ طریقِ اثباتِ مجرد۔ طریقِ اسمِ ذات۔ طریقِ ذکرِ پاسِ انفس و ذکرِ اسمِ ذاتِ ربانی اور وظائفِ سنہ کا ذکر۔ آخر میں پادریوں سہلوں کے شعرے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ آخر میں مثلثِ نظم میں چشتی شجرہ ہے۔ سب سے آخر میں انشائے ہیں۔ جمادی الاول ۱۲۹۳ھ میں یہ رسالہ مکمل ہوا۔

۷ ضیاء القلوب

یہ کتاب حاجی صاحب نے حضرت حافظ ضامن شہید کے صاحبزادہ حافظ محمد یوسف کی فرمائش پر لکھی۔ ۱۲۸۲ھ میں فارسی میں تحریر فرمائی۔ اور اس کا تاجیکی نام ”مرغوبِ دل“ ہے۔ اس کے متعلق حاجی صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

”از دفر التماس عزیزان چارہ ندیدہ و ملتی بجناب
قدس حق تباری گردیدم پس بدلم القاشدہ کنویں“
یہ کتاب سلوک و تصوف کا جوہر اور خلاصہ ہے۔ اس میں ہر قسم کے وظائف، اشغال اور اذکار عبادات کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے عنوان پر سنائیت عمدہ کتاب ہے۔ نماز اور تلاوتِ قرآن مجید کے متعلق بیش بہا معارف بیان کئے گئے ہیں۔

۸ حذو الوجہ

سات صفحات پر فارسی زبان کا طویل مکتوب ہے جس میں وصیۃ الوجود کے مسئلے پر سیر حاصل فرمائی گئی ہے۔

۹ فیصلہ ہفت مسئلہ

بارہ صفحات کے اس رسالے میں میلاد۔ فاتحہ۔ غرض و سماع۔ ندائے غیر اللہ۔ جماعۃ کائنات۔ امکانِ نظیر اور امکانِ کذب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رسالے کی ضرورت و اہمیت یوں ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے متوسلین میں ان مسائل پر نزاع ہو رہی تھی آپ نے اس نزاع کو روکنے اور اختلاف سے بچنے کے لیے یہ رسالہ تحریر فرمایا۔ مندرجات سے آگاہ ہونے کے لیے قارئین اس کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۰ گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے مرید باصفامیاں نیاز احمد نقشبند کر کے مرتب کیا ہے۔ حمد۔ نعت۔ عشقِ حقیقی کے متعلق غزلیات اور قیامِ مدینہ منورہ کے شوق پروردگار کے مضامین پر مشتمل ہے۔ ۳۱۹۔ اردو کے اور ۹۳۔ فارسی کے اشعار ہیں۔

۱۱ ”مرقوماتِ ملاویہ“ اور ”مکتوباتِ ملاویہ“
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب۔ مولانا مکیم ضیاء الدین اور مولانا محمد علی صاحب کے نام ہیں۔ ”مکتوباتِ امادیہ“ میں حکیم الامت کے نام پچاس خطوط ہیں جو تمام کے تمام اردو ہیں۔ حضرت مخدوم کی نام آخری ہے۔

۲۰ ربيع الاول ۱۳۱۸ھ کا تحریر کردہ ہے۔ اس کے دو ماہ بعد حضرت کا انتقال ہو گیا بارہ خطوط حضرت گنگوہی کے نام ہیں۔ ایک اور خط "وعدة الوجود" کے مسئلے پر حسین کا اوپر ذکر ہوا شامل کر کے کل خطوط ایک سو پچیس (۱۲۴) ہوتے ہیں۔ جو منظر عام پر آچکے ہیں۔ اب ہم آخر میں حضرت حاجی صاحب کی نظم اور نثر دو فو کا مقوڑا مقوڑا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جھے آگیا جو خیال ایک رات	لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کراؤس غفلت میں جاتی ہے عمر	سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر
جھے فکر گل کی ہوئی آج یوں	کہ کی دولت عمر برباد کیوں
نہ سوا شب اسی فکر میں ایک دم	رات بھر اس سے میں چشم نم

(جہاد اکبر)

کہا نفس کو آخرش میں نے رات	کہ کیا ہو گیا تجھ کو اسے بد صفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں	کہ آیا تھیاں کس لیے لے لیں !
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا	یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

(جہاد اکبر)

عاشق حق ہو کے دیکھے غیز کو	کعبہ میں چاہے بنا نا دیر کو
غیر کو نظروں سے تو اپنی نکال	چشم دل سے دیکھ بھر حق کا جمال
جو سوا حق کے ہے دے سب کو ہلا	ایک دلبر سے تو دل اپنا لگا

(غذا شے روح)

حضرت حافظ ضامن شہیدؒ کی شہادت پر ہدائی کا نقشہ :-

ہم بچاروں کو تڑپتا چھوڑ کر	سوئے حق راہی ہوئے نر مود کر
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور	پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
ماذو نعمت میں ہیں وہ مشغول وال	خاک و غول میں لوٹتے ہیں ہم میاں
حام کو ٹرسے ہوئے وہ لب بلب	چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
آپ تو راحت کے سماں لے گئے	یہ رنج و المیاں دے گئے

اور پھر اسی سلسلہ کے چند شعراور :-

گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے	کفش برذاری میں رہتے شاہ کے
شاہ کو زیبا ہے کب تیاروی	گو بہت خادم نہ ہوں مقوڑے ہی

اور کچھ اظہارِ حسرت کرتے ہیں -۱-

آہِ داوِیلا درِ یقا حسرتِ بنا
ساتھ والے پہل دے میں رہ گیا
ساتھ کا اپنے ہر اک حاصل ہوا
مرعادل کا اسے حاصل ہوا
پہنچا ہر اک منزل مقصود پر
رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر
(مثنوی تحفۃ العشاق)

تضمین

عاجی صاحب نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مشہور مناجات پر جوڑ لگا کر محسن بنا دیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے :
عقل و بحث و غلت و معلول ہیں زار و طیل
کے کسکے کیا کوئی وحدت میں تیری قبل و قال
اَنْتَ کَافِیُّ فِیْ مُعَاتٍ قَوْنِیْ رِزْقِیْ قَلِیل
خُذْ بِلُطْفِکَ یَا اِلٰہِیْ مَنْ لَّهٗ زَاوِی قَلِیل
مُقَفِّسٌ بِالْصِدْقِ یَا قِیِّ عِنْدَ بَابِکَ یَا طَیْلِیل
خود بخود ہو جائیں گے بیوقوفانِ دل سے دور
جتنے مقصد میں برہمیں گے الہی بالضرور
یہ تڑپ، یہ بے قراری، نکلے جابے قصور
اَنْتَ عِشْرَتِیْ اَنْتَ کَافِیُّ فِیْ مُہِمَّاتِ الْاُمُور
انت جسی انت ربی انت لی نعم الوکیل

پہلی رباعی کا تیسرا مصرع عربی عاجی صاحب کا ہے۔ اس سے عربی میں شعر کے ملکہ کا پتہ چلتا ہے۔

عالم و عارف شہ عبدالغنی
کہ دو چوں جملہ مرا تہ عطرے
این عذا آمد ز ہر سو غم فزا
ذا دجاں عبدالغنی با جلوہ ہے

تاریخی مادے

بست و ہشتم ذمی قعدہ کو
چلے جئے جنت کو یعقوب
رو کے کہا سب نے کہ جاں سے
ماو بدی ہوا آہ عزوب
عرش بریں پہ آپ ہیں نیریزیں ہوں میں
ملنا کہاں سے ہو کہ کہیں تم کہیں ہوں میں
گر تخت و حسن و ناز پہ ہیں آپ جلوہ گر
اقلیم عشق میں شہ مسند نشین ہوں میں
غزل کا نمونہ

رُخ سے کاکل اٹھا دیا کس نے
رات میں دن دکھا دیا کس نے
نغمہ سردی سنا کے ہیں
لست وہ بنو بنا دیا کس نے

تقابل اور تضاد خیالی

عشق کے صحرا میں اپنا آپ کہتے ہیں نگار
آپ ہی ہم صید ہیں اور آپ ہی میاں دہم
ہو گئے سب بخود ہر عشق پھر کس کا رہا
آپ ہی شیریں ہوئے اور آپ ہی فرما دہم

آپ ہی اچھے ہیں اور میں آپ ہی سے بُرے
 علم اپنا جہل ہے اور جہل اپنا علم ہے
 اپنے دشمن آپ ہیں اور آپ ہیں اپنے دوست
 آپ کو کرتے ہیں ویران تاکہ ہوں برباد ہم
 ہے ہمارا ہم کو غمزاں میں اور غمزاں اندر ہمارا
 غم ہے شادی میں ہیں اور غم میں ہیں بس شاد ہم

محمدیہ غزل

الہی یہ عالم ہے گلزار تیرا
 خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں
 الہی عطا ذرہ درد دل ہو
 کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ جانتا ہے
 نہیں دونوں عالم سے کچھ کچھ کو مطلوب
 تو مطلوب، میں ہوں طلبگار تیرا
 اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے
 تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خواہ تیرا

ایک غزل کے پانچ اشعار :-

نہ دیکھا داغ دل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 نہ دیکھا برش تیغ انگاو یار کو تم نے
 نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا
 اسے دیکھا اُسے دیکھا نہ یہ دیکھا نہ وہ دیکھا
 نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 اگر شمشیر کی اک دھار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 نہ دیکھا آپ میں دلدار کو، دیکھا تو کیا دیکھا
 نہ دیکھا ایک کو اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا
 ہمارے شعر امداد الہی سے ہیں شک دیکھو
 اگر پر دفتر اشعار کو دیکھا، تو کیا دیکھا

اگر پر ہے خود دستم و لے ہو بیاری گروم
 چو شد منظور قتل من تھا قتل حیات لے تکل
 بیا طعن شاہ کو نیم بظاہر خواہ می گروم
 کہ سر بہ کف، کفن بہ دوش، گرد دہمی گروم

فارسی اشعار

بمجد الشہ پر راحت یافت جان بقرار من
 باین نیکو نہ بردیدہ نہ آدم پائے قاصد را
 کہ آمد ناگهان نامہ ز کوئے شہر یار من
 کہ از نامہ منور کرد چشم انتظار من
 بہار اندر خزاں بود و خزاں اندر بہار من
 بہم درخندہ من گیلان

اردو شکر کا نمونہ

طریقہ مراقبے کا یہ ہے کہ دو روز نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ تعالیٰ کی حضور ہی میں حاضر رکھے۔ اول اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر تین بار اللہ حاضر فرمے۔ اللہ ناظر ہی۔

اللہ معنی یعنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقبہ ہو کہ ان کے معنوں کا دل سے ملا حظہ کرے اور تصور کرے یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ حاضر ناظر میرے پاس ہے اس بات سے میں اس قدر غرض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور غیر حق کا نہ رہے یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہوا مراقبہ منہوگا (ارشاد مرشد ص ۷)

بدان کہ تلاوت قرآن افضل عبادت

است و کلام طریق برائے تقرب

فارسی شکر کا نمونہ

الی اللہ سوائے قرآن افضل بہتر از تلاوت قرآن نیکیست پس

آداب و استعجاب و آنت کہ با خلاص تمام با طہارت کامل رو

بقیہ باترتیل و خشوع و تحزن بعد از اعوذ (باللہ) بسم اللہ

بملاحظہ آنکہ کلام باخلاص می کند و گویا اور امی بیند و اگر نتواند بلند

کر او مرا بیند و با و شروا ہی مرا حکم می فرماید و بر آیت بشارت

فرماں و بر آیت وعید ترساں و گریاں باشد و بحمد و الحان خوش

کہ موجب جمعیت خاطر و دفع غفلت است بخواند و ایں عام است

طریق خاص آنکہ

سمجھو کہ قرآن کریم کی تلاوت عبادت و

میں افضل ہے اور اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے

کے لیے فرائض کے سوائے قرآن کی تلاوت سے بہتر اور کوئی نہیں ہے

اس لیے اس کے آداب و مستحبات یہ ہیں کہ پورے اعلاص اور پورے

طہارت کے ساتھ قلب کی طرف منہ کر کے ٹھہر ٹھہر کر عاجزی کے ساتھ۔

اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد اس خیال سے پڑھے کہ خدا کے سامنے باتیں کر رہا

ہے گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا تصور نہ کر سکے تو یہ سمجھ کر کہ وہ

دیکھ رہا ہے اور اوراد و نوا ہی کا حکم دے رہا ہے اور خوش خبری کی آیت

خوش اور سزا کی آیت پر خوش زدہ اور درقنا ہوا ہوتا چاہیے اور جو غرض

سے غش سے دل کو المینان اور غفلت دور ہو پڑھے اور یہ عام طریقہ

لیکن خاص طریقہ یہ ہے کہ

.....

اس کے بعد حضرت نے اس خاص طریقہ کا مفصل ذکر فرمایا ہے۔ اس کے لیے "ضیاء القلوب" کی طرف مراجعت فرمائی جائے۔

ہم نے اختلاف کے ساتھ حضرت حاجی صاحب کے حالات پیش کر دیے ہیں مفصل مطالعہ کے لیے "شائم اداویہ" برکات اللہ علیہ
علماء ہند کا شاندار ماضی اور پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی کی تالیف "حیات امداد" کی طرف رجوع فرمائیں۔ ہم نے اس مضمون کی
ترتیب کے لیے سب سے زیادہ استفادہ "حیات امداد" اور نئی دنیا کے "عظیم ہدفی نمبر" سے کیا ہے۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

۵۱۲۹۷
۶۱۸۶۹



۵۱۲۳۸
۶۱۸۳۱

(عکس تحریر حضرت نانوتوی)

وہ اصول جن پر یہ مدرسہ اور نیز اور دیگر

چندہ بنی معلوم ہوتی ہیں

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تاسق دار کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ بیشتر حینہ بہ نظر رہی آپ لکھنؤ میں

اور دہلی کے اس خیر اندیش مدرسہ کو بہ بات ہمیشہ ملحوظ رہی

(۲) اتفاقاً طعام طلبہ ملکہ انفرائیس طعام طلبہ میں سطح ہوگی خیر اندیش مدرسہ ہمیشہ مسلمان

مدرسہ میں ان مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہی کہ مدرسہ کی خولی اور اسلولی مو۔ اینی بات

کی کج کمیائی حوالہ خورسنہ حسب اسل نوہ اسگی کہ اہل سوارہ کو اسچی خانقہ رای اور اوڈ کی رای

کی ملوث ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی سار میں تزلزل اچا سیکھا الحقہ تہ دل کی بروقت سوارہ

اور نیز اسکی دیس میں اسلولی مدرسہ ملحوظ رہی سختی پروری انوار اسکی ضروری کہ اہل سوارہ

اطہار رای میں کیوہہ سی تامل نون اور اس معین بہ نیتہ یک او کو سفین یعنی یہ حال رہی کہ اگر مدرسہ

بات سمجھ میں اچا نہ گی تو اگر چہ پاری مخالف ہی کو بیج بدل دجاں قبول کرن گی اور نیز اسکیوہہ سی

ضروری کہ منتہم امور سوارہ طلبہ اہل سوارہ سی ضرور سوارہ کیا لکری حوالہ وہ لوگ ہوں جو بہ

سیر مدرسہ متنی ہیں یا کوئی داروں و دعو علم عقل رہتا ہوا اور مدرسہ کا فرائد میں ہوا در نیز

اسکیوہہ سی ضروری کہ اگر اتفاقاً کیوہہ کسی اہل سوارہ سی سوارہ کی نوتہ نہ آئی اور بقدر ضرورہ

اہل سواد کی مقدار معتد بہی مژرہ کیا گیا ہو فوہرہ سمعی اور حبسی ناگوار ہو کہ نجیبیوں کیلئے جہان
الکریم تم کی کسکی یہ بوجھا تو پھر اہل سواد مقرر نہ ہو سکتا ہی

(۴) یہ بات بہت فردی ہی کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علما و زرکار

خود بین اور دوسرے کی دینی ٹوہین نہ ہوں خدا نخواستہ جب اسکی توبہ ایسی تو پھر اس مدرسے کی عزت

(۵) خواندگی مقررہ اور انداز سی جو ہر کسی کو پڑھ چکی ہی یا بعد میں کوئی اور انداز سواد سی تجربہ دہی

ہو جا یا کری ورنہ یہ موسم اول تو خوب آباد ہوگا اور اگر ہوگا تو بغایتہ ہوگا

(۶) اس مدرسے میں قریب اعلیٰ کوئی یسین یقینی نہیں جتیک یہ مدرسہ اس واسطے شرط

توصل الی اللہ سطح صبی کا اور اگر کوئی اتنی ایسی یقینی حاصل ہوگی جسی جاگیر یا کارخانہ

تجارت یا کسی امر علم القول کا وعدہ تو پھر ہوں نظر آنا ہی کہ یہ خون در جا، جو کرایہ

بجوع الی اللہ ہی اتنے کسی جتانہریکا اور امداد عینی موقوف ہو جا بیگا اور کارکنین میں

باہم نزاع پیدا ہو جا سکا انقصہ اتنی اور غیر وغیرہ میں امتیاع کی کمی بردستی ناخوشداری

(۷) سرکار کی سرگتہ اور لرا کی سرگتہ باہی زیادہ معلوم ہوتی ہو

(۸) تا معتد راہی لکھو کا حیزہ زیادہ موجب ہر گتہ معلوم ہوتا ہی جنگو ای حیزہ سی

امینیا سوری ہر بالمحمد حسن نہ اہل حیزہ زیادہ پائڈاری کا سامان معلوم ہوتا ہے

ادبیہ : عبدالرشید

تجۃ الاسلام حضرت مولانا محبت مسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ پر یہ مصنفہ - حضرت مولانا محمد عتیق نانوتویؒ کے تالیف
سوانح صریح مولانا محمد قاسمؒ اور مولانا محمد رفیع صاحب صفحہ گزشتہ کے کتابت - باب دہویہ
مکتبہ عزیز الرحمن کے تالیف تذکرہ مشائخ دہلیہ اولیم ملت قہر سے ماخوذ ہے - ہمارا کام صرف ترتیب ہے
(ارشاد)

ہام ولادت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی نام خورشید حسن ہے۔ آپ ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دورِ ولادت ۱۲۳۵ھ
محمد عزیزت مولف سوانح صری مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں۔ مولانا صاحب کی پیدائش کائنات کے تاریخی نام سے
معلوم تھا۔ ہمینا یا ذہن نہیں تھا۔ ربیع الثانی یا جمادی الثانی ذہن میں تھا۔ جن حضرات کے بارے میں خیال تھا کہ ان سے ہمینا اور تاریخ معلوم ہو جائیں
گی۔ وہ بھی ناواقف تھے۔ ایک صاحب نے چند صوفیوں سے کہا۔ مگر اعتبار نہ آیا۔ ایک نے ۱۹ رمضان المبارک اور ایک صاحب نے ۲۶
محرم تاریخ ولادت بتائی۔ یہ بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

مولانا کے والد ماجد شیخ اسد علی صاحب تھے۔ جو بامروت و صاحب اخلاق و کتب پرور، مہمان نواز، نمازی و
نسب نامہ خاندان پر عزیز گار تھے۔ مولانا ملک علی صاحب کے ساتھ دینی جاگرتا نہایت وغیرہ بھی پڑھی تھیں۔ ان کی عمر کا زیادہ حصہ کھیتی
بازی میں گزرا۔ مولانا محمد قاسم کے دادا شیخ غلام شاہ تھے۔ ان کی بھی تعلیم زیادہ نہ تھی۔ مگر طے و ذاکر و شامل بزرگ تھے۔ درویشوں کی خدمت کرتے
تھے۔ خواب کی تعبیر دینے میں مشہور تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب کا سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مختصر نسب نامہ یہ
ہے۔ محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد بخش بن علاؤ الدین بن فتح محمد بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن مولوی ہاشم نانوتوی ملے

ابتدائی تعلیم وغیرہ مولوی محمد ہاشم شاہ جہان بادشاہ کے دور میں مقرب شاہی تھے۔ چند دیہات اور مکان جاگیر میں تھے۔ لیکن تعلیمات
زمانہ نے خاندان والوں کے پاس کچھ نہ پھینکا۔ مولانا محمد قاسم بچپن ہی سے ذہین، طالع، بلند ہمت، تیز
و سیر حاصل، جفاکش، جری اور چپ تھے۔ کتب میں اپنے ساتھیوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ قرآن مجید بہت جلد بخیر کر لیا تھا۔ خط بھی سب
ساتھیوں میں اچھا تھا۔ شاعری کا بچپن ہی سے شوق تھا۔ اپنے کھیل اور لہجہ سے نظر کر لیا کرتے تھے۔ حضرت حاجی اداؤ اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا نہایت رشتہ
مولانا محمد قاسم کے خاندان سے ملتا تھا اور حضرت کی بہن نانوتہ میں بیانی ہوئی تھی۔ آپ اسی وجہ سے اکثر اپنی بہن سے ملنے نانوتہ تشریف لے جا کرتے
تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد عزیزت نانوتوی نے حضرت سے جلد سازی سیکھی تھی۔ اپنی اپنی کتابوں کی جلد خود ہاند لیا کرتے تھے۔ نانوتہ
میں آپ کے خاندان میں ایک ایسا قصبہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو نانوتہ سے وابستہ بھی لگایا گیا۔ شیخ کرامت حسین کے گھر شیخ خٹناں احمد
صاحب پڑھتے تھے۔ مولوی صاحب کو انھوں نے عربی پڑھائی۔ پھر ہارنپور اپنے تانا کے پاس آ گئے۔ وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارنپوری

کے کچھ پڑھا۔ فارسی عربی کی ابتدائی کتابیں حاصل کیں۔ اس کے بعد مولانا ملک علی صاحب کے ہمارے ۲۶ محرم ۱۲۶۶ء کو دہلی پہنچے۔ مولانا نے کافی مشورہ کی معقول کی شکل کتابیں میرزا، قاضی، صدر، شمس باغزہ ایسے پڑھا کرتے تھے۔ جیسے حافظ فرزند شمس باغزہ۔ حدیث آپ نے حضرت شاہ عبدالحی صاحب سے تحصیل کی۔ اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ مولوی ملک علی صاحب نے انجیل مدرسہ عربی یعنی دہلی کالج میں داخل کیا اور مدرسہ ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال پر معترض نہ ہونا۔ میں ان کو پڑھا دوں گا۔ اور مولانا نے فرمایا کہ ہم اقلیدس کو دیکھ لو اور حساب کے قواعد کی مشق کر لو۔ چند روز کے بعد مشورہ ہوا کہ مولانا محمد قاسم کے حساب پڑھا کر لیا جائے۔ اور مرقا لے بھی دیکھ لیے۔ چنانچہ مفتی ذکار اللہ صاحب کسی مدرسہ کے بنائے ہوئے چند سال لانے جو نہایت مشکل تھے۔ مولانا سے پوچھے تو آپ نے فرما مل کر دیتے۔ اس سے آپ کی حساب دانی کی بڑی شہرت ہوئی۔ دہلی کالج سے امتحان دیئے بغیر علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور مطبع احمدی میں کتب کی تصحیح فرماتے لگے تھے۔ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۶۶ء کو آپ کے استاد مکرم مولانا ملک علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تو آپ اپنے استاد زادہ مولانا محمد یعقوب ع کے پاس مقیم ہو گئے۔ مولانا ملک علی صاحب کا مکان کوچہ چیلان میں تھا۔

میں بخاری شریف
مولانا محمد یعقوب صاحب اپنے والد کے بعد ایک سال دہلی میں رہے۔ جب اجہ میں ملازمت مل گئی تو اجہ میر جیلے گئے۔ مولانا یعقوب صاحب کے اجہ جیلے کے کچھ کے بعد مولانا محمد قاسم نے مطبع احمدی میں کچھ نہایت اختیار کر لی۔ پھر دارالعلوم چند روز رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری نے عشرہ بخاری کا کام شروع کر رکھا تھا۔ پانچ چھ سپارے آخر کے ہو گئے تھے۔ وہ مولانا قاسم نانوتوی کے سپرد کر دیئے۔ مولانا نے ان کو لکھا اور قابل رشک لکھا۔ لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا اور مولانا احمد علی صاحب سے کہا۔ آپ نے یہ کیا کام کیا۔ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کر دیا۔ اس پر مولانا احمد علی صاحب نے فرمایا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بغیر سچے سمجھے ایسا کروں اور میری مولوی صاحب کا عشرہ انھیں دکھالیا۔ تب لوگوں نے مولانا محمد قاسم کی قابلیت کو سمجھا اور جاننا۔ یہ سپارے بخاری میں اور سپاروں سے مشکل ہیں۔ خاص طور پر مذہب حنفیہ کا جو التزام ہے۔ اس جگہ پر امام بخاری نے حنفیہ پر اعتراض کئے ہیں۔ ان کے جواب لکھنا معمول بات نہیں ہے۔ اس حاشیہ میں یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی بات بلا سند کے نہ لکھی جائے۔

بچپن کا ایک خواب
آپ نے ایم فطی میں یہ خواب دیکھا تھا کہ گویا میں اللہ جل شانہ کی گود میں بیٹھا ہوا ہوں۔ قرآن کے دادا نے دجہ تعبیر خواب میں شہر دئے، یہ تعبیر بتائی کہ تم کو اللہ تعالیٰ جل شانہ فرمائے گا اور بہت بڑے عالم ہو گے۔ حضرت مولانا جیسے بچے میں سب سے بڑھ کر رہتے تھے۔ ہر کھیل میں خواہ ذہانت کا ہونا عزم و محنت کا۔ سب سے اول اور غالب رہتے تھے۔ خواب یاد ہے کہ اس زمانہ میں ایک کھیل جوڑ کر تمام ہم کھیلتے تھے اور بہت پرانے مشاق لوگ اس کو عمدہ کھیلتے تھے اور ہم نئے کھیلنے والے مات کھا جاتے تھے۔ مولانا نے جب اس کا قاعدہ معلوم کر لیا۔ پھر اپنی ان کی سے مات کھائی ہو۔ بہت ہوا برابر رہے۔ بلکہ کھیل میں جو تیرہ کمال ہوا تھا۔ وہاں تک اس کو پہنچا کر کھڑے ہوئے۔

۱۔ تاریخ عربی مولانا محمد قاسم ص ۷۷ آج تک برصغیر پاک و ہند میں بخاری شریف یعنی دفعہ ہاں کہیں بھی ہے۔ اسی چاشنی کے ساتھ چھی ہے۔ دارالعلوم
۲۔ کے علاوہ یہ بھی مولانا کا عمدہ مبارک ہے۔
۳۔ سوانحی مولانا محمد قاسم از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۷۷ ایضاً ص ۵۔

کے پاؤں سے لٹک کر جاتی تھیں۔

اس خواب کو انہوں نے مولانا محمد تقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المرتب ۱۲۸۲ھ) پر بلا در شاہ محمد اسماعیل صاحب المرتبی (۱۲۶۲ھ) سے دان سے بیان فرمایا کہ حضرت ایک شخص نے اس قسم کا خواب دیکھا ہے تو انہوں نے یہ تہمید دی کہ اس شخص سے مذہبِ حنفی کو بہت تقویت اور وہ بہت پرکاش حنفی ہوگا اور اس کی خوب شہرت ہوگی۔ لیکن شہرت کے بعد اس کا جلد انتقال ہو جائے گا۔ اور اس خواب کی تعبیر پر دلیل لانے کی کوشش نہیں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، ان کے تلامذہ اور دارالعلوم دہلویہ نے فقہ حنفی کی جو خدمت کی ہے، اس کا انہیں کونسا کر سکتا۔ خود حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض کتابیں فائزہ غفلت اللام پر ترقی الکلام اور الدلیل المحکم اور میں رکعات تراویح پھیلانے کے لیے اور اسی طرح دیگر مسائل مختلف فیہا پر جو مضامین اور دلائل لکھے ہیں۔ وہ علمی دنیا میں ہمیشہ یاد میں رہے۔

مولانا محمد تقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وکی وکسر نفسی

بہت خوش مزاج اور عمدہ اخلاق تھے۔ مزاج تنہائی پسند تھا اور اول عمر سے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ناکت رہتے۔ اس لیے ہمیں ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ ان کے حال سے جھلکا ہوا بار بار کسی کو اطلاع ہوتی تھی نہ آپ کہتے۔ کہ اگر بیمار بھی جوتے۔ تب بھی شہرت کے وقت کسی نے جان لیا تو جان لیا۔ ورنہ خبر بھی نہ ہوتی۔ اور دوکانا تو کہاں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحب انبوری رحمۃ اللہ علیہ کے چچا پھانسی میں حبس کیا کرتے تھے۔ مدتوں یہ لطیفہ دیکھا کہ لوگ مولوی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں اور آپ بولتے نہیں کہ کیا پکارتا تو خوش ہوتے۔ تسلیم سے نہایت گھبراتے۔ بے کلفت ہر کسی سے رہتے۔ جو شاگرد باہر دیرتے ان سے دروس کی طرح رہتے۔ علماء کی تکرار سے بچتے نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا۔ ورنہ اپنی وطن کو ایسا خاک میں ملا دیکھو کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ میں کہتا ہوں۔ اس پر بھی کسی نے کیا جانا۔ جو کالات تھے وہ کس قدر تھے۔ کیا ان میں سے ظاہر ہوئے اور آخر بربک کھاک میں ملا دیا۔ اپنا کھانا کھلایا۔ مسئلہ کسی نہ کسی کے حوالے فرماتے۔ غرض پر نام لکھنا اور مر کر نا تو دور کہنا۔ اقل امامت سے بھی گھبراتے۔ آخر کہ اتنا ہر اکہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ دن و شب۔ خواب مولوی مظہر حسین صاحب مرحوم کا مدخلی وجہ اس آخری زمانہ میں قدام کے فرزند تھے، نے اول جو علی کہلایا اور خود بھی ملے کر سنا۔ اور بہت سے ملے۔

کی شکایت

مولانا محمد تاسیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد کی معاشی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کو رنج تھا کہ میرے بھائی پڑھ کر نوکر ہو گئے۔ کوئی سپاس کا کوئی نہ سکا۔ کوئی کم کوئی زیادہ سب خوش دردم ہیں۔ آپ نے حاجی امداد الشری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ کوئی میرے قریبی ایک بیٹا ہے اور مجھے اس سے کیا کچھ امیدیں تھیں۔ کہ کیا آؤ ہر ایک افلاس دور ہوتا۔ تم نے اس پر خدا جانے کیا فرمایا۔ اور نہ نوکر کی کہتا ہے۔ حضرت اس وقت تو ہمیں کر چپ ہو گئے۔ پھر کہلا کر سب کا تاسیر کو وہ مرتبے لگا کہ وہ سپاس دے سب اس کی بات کریں گے اور ایسی شہرت ہوگی کہ اس کا نام ہر طرف پکڑا جائے گا اور ہر تنگی معاش کی شکایت کرتے ہوئے خدا تعالیٰ بے زکری ہی اسے آملتا۔ ان لوگوں سے اچھا رہے گا۔ چنانچہ مولانا تاسیر کے والد کی حیات میں مالی حالت ایسی ہو گئی کہ شکایت نہ رہی۔

نکاح، سخاوت و مہمان نوازی کرتے ہیں۔ بالآخر آپ کے پیروند حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے ذکر کیا۔ صاحب نے خچر دیا تاہم بازار کراچ پر راضی ہو گئے۔ گھر طرہ لگائی کہ میرے ساتھ جیسی حالت میں ہنگامہ ہو رہی ہے گی۔ غرت ہو جائیگی۔ میرا۔ یہ شرط قبل کی۔ ایک چار خانہ میں پانچ روپے ماہوار پر تصحیح کا کام کرنے لگے۔ مزاج میں مہمان نوازی اور سخاوت۔ بچے کیا، جب گھر آئے مہمان بہت آئے۔ بالآخر میری کی اجازت سے اس کا زلیفر و صحت کر دیا۔ وہ بھی نہایت تابعدار تھیں۔ پہلے والدین کی بنے حد حرم کی۔ بعد شہر کی۔ آخر میں التشریل شانز لے کر شادی کی عنایت فرمائی تو کچھ ہوتا۔ میری کو لا کر دیتے۔ اور میری بھی ایسی کشادہ دست کہ حضرت مولانا کے حسب مہمان آیا۔ اسی وقت کھانا پکا کر کھلایا کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مہمان آیا اور فرما کھا نہ ملا۔ خود فرما کر تے کہ ہماری سخاوت احمد کی والدہ کی بدولت ہے جو میں قصداً کر رہا ہوں۔ وہ مہمان نوازی میں طبع عاقل ہے۔ آپ کے لڑکپن میں ایک خواب دیکھا تھا کہ میں مر گیا ہوں اور لوگ مجھے دفن کر آئے۔ تب میں حضرت جبرائیل تشریف لائے اور کچھ لکھن سامنے رکھے۔ اور کہا یہ تمہارے اعمال ہیں۔ ان میں ایک لکھن بہت خوشما اور کلاں ہے۔ اس کو فرما کر عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہے۔ اس خواب کی تعبیری سخاوت تھی تھے

انچیزوں کے ہندوستان میں قدم رکھنے کے بعد علماء کے طبقے یعنی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دیکھ کر کہ یہ دوسروں کے مذہبوں کو پامال کرنے اور عیسائی مذہب کو کھیلانے کے لیے شرمناک ہتھکنڈے کر رہے ہیں۔ ان کے اندام کی تدبیریں شروع کریں اور ایک انقلابی جماعت کی داغ بیل ڈال دی جیسا کہ اس جماعت کے تیسرے امام حضرت عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۳۴۶ھ میں امتیاز کے بعد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ جو تھے امام مقرر ہوئے۔ جنگ آزادی شہادت کی ابتدا ہوئی۔ بھی تیار تھے۔ حضرت حاجی صاحب کے شریک کار مولانا شیدائے گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبد الغنی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، شیخ محمد تھانوی نے جہادِ حریت کے سلسلے میں تبادلہ خیال کیا۔ مولانا شیدائے گنگوہی نے بے سرو سامانی کا ذکر فرما کر جہادِ حریت کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم فرمایا کہ ہم صاحبِ مدرسہ سے بھی بے سرو سامان زیادہ ہیں۔ حضرت امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سنی۔ فرمایا کہ الحمد للہ انشراح ہو گیا۔ اور جہاد کی تیاری شروع ہو گئی۔ مولانا اللہ نے امانت قبول کی اور مولانا نانوتوی سپر سالار مقرر ہوئے۔ اور مولانا شیدائے گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔ اسی طرح قصبہ تھانہ بھون دارا لاسلار میو کے بعد ولی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ آزادی چھ لگتی تھی۔ ان حضرات نے بھی مرجعہ لگالیا۔ قاضی عنایت اللہ ان کے چہرے عجایب عبدالعزیز ان کے ساتھ سہارن پور پہنچے اور سرائے میں ٹھہرے۔ ایک بیٹے نے تلکھی صاحب سے جو انتظام سہارن پور پر مامور تھا۔ چوری کرتا تھا کہ تیس بھی کپڑے سے ہٹی ہو گیا ہے۔ اس کا بھائی دہلی میں ملک بھیجنے کے لیے اپنی خریدنے لے آیا ہے اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ایک کار و صہبت سرائے روانہ کیا گیا اور عبدالعزیز اور ان کے ساتھیوں کو قید کر کے جلی خانا بھیج دیا اور ان لوگوں کو چھاپسی پر لٹا دیا۔ اگلے دن قاضی عبدالعزیز کو اپنے بھائی کی چھاپسی کی اطلاع ہوئی یہ اپنے رفقاء اور رعایا کو اپنے فرجی سوار کارندوں کے کئی حصوں پر کارندوں کی کئی ہتھکنڈاں لودا نے سہارن پور کی طرف جارہے تھے کہ قاضی صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی۔ اپنے رفقاء اور رعایا کو ساتھ لیکر شیر علی باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے اور قاضی وہ سارا سامنے سے گزرے۔ ان چوکر کے میگزین میں بھیج لیا۔ ایک سوار اس جنگ میں زخمی ہو کر صہبت بنگالہ بھاگا۔ مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گھڑے

مگر مرگیا۔ اس واقعہ کی خبر منظرِ بصری کو حاضرِ شمع کی طرف سے متناظر پر فوج کشی کا حکم ہو گیا جس پر حنایت علی خاں اور اس کے ساتھیوں نے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ ایک معرکہ میں حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور لائق احمد لنگہوی مولانا قاسم اور حافظ ضامن ہمراہ تھے۔ بندہ بچوں سے مقابلہ ہوا۔ یہ بندہ آڑا جھنڈہ بھاگ جانے والا ایٹھ جاتے والا نہ تھا۔ اس لیے پہاڑ کی طرح حکم کو تقابل پر ڈٹ گئے۔ اور دوسرا گروہ انھوں میں تلواریں لیے بندہ بچوں کے سامنے ایسے جا رہا تھا۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ چنانچہ ان حضرات پر قابو ہوئے اور حضرت ضامن رحمۃ اللہ علیہ نے زیرِ زلف گولی کھائی اور شہید ہوئے۔ حضرت مولانا قاسم کا ایک سر پر کڑھ گئے۔ جس نے دیکھا جانا کہ کپڑی پر گولی لگی ہے اور داغ پام کے لکے لکے تھے۔ تعجب یہ تھا کہ خون سے تمام پڑے تھے۔ معرکہ جنگ جاری ہے۔ اسی گھسان کے میدان میں حضرت حافظ ضامن شہید نے مولانا شایع لنگہوی رحمۃ اللہ علیہ کو پاس بلایا اور فرمایا کہ میں رشتہ دارم نکلے تو میرے پاس ضرور رہنا۔ پھر ڈیڑھ گزیر بھی کہ حافظ ضامن صاحب دم سے زمین پر گر پڑے۔ معلوم ہوا کہ گولی کاری لگی اور خون کا فوارہ بہنا شروع ہو گیا۔ حافظ صاحب زخمی ہو کر گئے کہ حضرت مولانا لنگہوی نے ایک کر نش کو لٹھ سے پراٹھا لیا اور قریب کی مسجد میں لائے اور حضرت کامر اپنے زانو پر کھڑک تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہو گئے۔ انھوں میں آئے تھے۔ یہاں تک کہ حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آپ کے زانو پر وصال ہو گیا۔ اہل کار کا تھیل اس جنگ میں کام آئے اور زانو پر عبادین نے قبضہ کر لیا۔ جب کچھ سکون ہوا تو تھکانہ بھون کا انگریزی فوج نے گھیر لیا اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع کی۔ دن نکلنے پر فوج تعصبین داخل ہو گئی اور قتل و غارتگری کا اناکارم ہو گیا رات کی تاریکی بچانے سے پہلے شہر بیاہ کے چاروں دروازے کھول دیئے گئے اور بھگت پڑی کا تیل ڈال کر آگ لگادی گئی۔ اس کس پیرسی کے عالم میں لوٹنا صوبہ ہوتی غرض یہ کہ رات کی تاریکی ختم ہونے سے پہلے تھانہ بھون مٹی کا ڈھیر بن گیا تھا۔

گرفتاری کے وارنٹ
ان ٹینٹل حضرات - حضرت حاجی صاحب مولانا محمد قاسم - مولانا رشید احمد لنگہوی رحمۃ اللہ علیہ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے کہ تھانہ بھون کے فساد میں شامی کی تحصیل چمک کر لے والے یہی لوگ تھے۔ تھانہ کی بستی کی دکانوں کے چھپا پڑے تھے تحصیل کے دروازے پر پھیر جمع کیے اور ان پر آگ لگادی۔ یہاں تک کہ جس وقت آدھے کو اوبل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی۔ ان میٹر رولیں نے جلتی آگ میں گھس کر فرائڈ لوٹ لیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قصبہ میں مولانا محمد قاسم - مولانا لنگہوی کو انوار کہا اور حجاز جانے کے روانہ ہو گئے۔ اہم قایم میں مولانا عقیلم مرحوم اصحاب کے املا پر تین دن تک روپوش رہے۔

اتباع سنت در روپوشی
تین دن پورے ہوتے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں چلتے پھرتے لگے۔ لوگوں نے پھر نسبت روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زائد روپوش رہنا سنت کے خلاف ہے۔ بیکر کہ جناب نبی کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین ہی دن تک روپوش رہے۔

(سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۴۲ ۱۴۳) مناظر احسن گیلانی

قیام دارالعلوم دیوبند کے اسباب
دنیا کا کوئی کام مذہبی سبب، داعیہ اور محرک کے معرض وجود اور منقہ نشو و نما پر نہیں آتا۔ ہم جب ٹھنڈے دل کے ساتھ ہندوستان کی تاریخ پر نگاہ ڈالے ہیں تو ہمیں سترہویں صدی کے پہلے ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی تاریخ کسی اور صورت میں نظر آتی ہے۔ سیاست کی باتیں تو سیاسی حضرات بہتر جانتے ہیں۔ مگر یہ کہ جس وقت ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کی حکومت اور دور

”میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے۔
اس لیے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کی رضا جوئی کرتے ہیں۔
(ان پی پی انڈیا ۱۹۹۹ء)

انڈیا کی سپریم کورٹ کے باوقار رکن سر جارجس ٹریلویں، جو حکومت کی طرف سے گورنری کے عہدہ پر فائز تھا، پورے دھوکے سے یہ کہتے ہوئے تھے کہ یہ برقیں ہیں۔ یہ امیدیں قائم کیے ہوئے تھے کہ

”جس طرح ہمارے بزرگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہو گئے تھے۔ اسی طرح یہاں
ہندوستان، میں بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔“

دعویٰ الہ مسلمانوں کا دشمن قتل ۱۴۳

اور برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ممبر مریڈیگل نے آغاز ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ کے والیوں میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ :-
”خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے
زیر نگیں ہے۔ تاکہ جیسے مسیح (علیہ السلام) کا جہنم ہندوستان کے ایک سرے
سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان
کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہیے اور اس میں
کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیے۔“ حکومت خود اختیاری ۱۸۵۷ء اور علانیہ
حق کے بے باک کرنا سے حصہ اول ۱۸۵۷ء

اور لارڈ ڈریش نے کہا کہ :-

”ان بدعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان
پر حکومت کریں گے۔“

دعویٰ ہند کی شاندار ماضی کا آخری حصہ، تصویر کا دوسرا رخ ص ۳ طبع اول،

غور فرمائیے کہ ساریہ بوم (ظالم برطانیہ) کے منحوس دور اقتدار میں ہندوستان کی سرزمین پر کس طرح زہلوں حالی کا گھپ اندھیرا اچھا گیا تھا اور جس میں
کے قیام کرنے والوں نے یہاں تک داسے قائم کی کہ :-

”اب اسلام صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔“

(موج کوڑوٹ ایچ مجید اکرم صاحب ام لے)

اس نازک دور اور نامساعد حالات میں علماء دیوبند کثر اللہ جہاں تم نے جس طرح تہمت و استقلال کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی شریک
نہیں رہ سکتا۔ آخر غالباً یہ کہاں اس وقت تمام گمراہ کن تحریکوں کا مقابلہ کس نے کیا؟ ظالم برطانیہ کے فلاحی پنجے کس نے ٹھکرائے؟ حجاب عزیز کو مقبلی پر رکھ کر
نے جہاد کیا؟ شہداء میں بڑھ چڑھ کر شہید کیا؟ آریوں اور پادریوں کا تعاقب کس نے کیا؟ ان کی تردید میں کتابیں اور رسالے کس نے لکھے؟ کس
نے تقریریں کیں؟ ذریعے اسلام کی حقانیت واضح کرتے ہوئے ان باطل فرقوں کے مکائد اور وسیعہ کا ریلوں سے مسلمانوں کو آگاہ کیا؟ اور اس

ہنگامے میں کس طبقہ کے علماء کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک روا رکھا گیا؟ اور نہایت بے دردی کے ساتھ دھڑوں پر کئی کر لیا گیا۔ اور ملک عزیز سے جلا وطنی کی دھمکانے کے ساتھ کئی طبقہ کی اکثیت کو دی گئیں اور سختہ دار پر لکھنے کے لیے زبان حال سے یہ کہتے ہوئے کس نے خوشیاں منائیں کہ ۔

فانی اللہ کی تہ میں بقا کا راہ نہیں ہے
جسے مرنائیں آتا، اُسے جینا نہیں آتا!

برطانیہ کا ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں ان کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکومت میں شروع غروب نہیں ہوتا۔ اگر ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے اور برطانیہ کے معزور وزیر اعظم سر گلیڈسٹون نے یہ کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے سروں پر گر اچا ہے تو ہم سنگتوں کوک پر اسے تمام کھٹے ہیں (معاذ اللہ) اس دور میں بھی علماء دیوبند نے اس ظالم برطانیہ کے خلاف جدوجہد کی تھی اور اس سے نبرد آزما رہے ہیں۔ چنانچہ یوپی کے گورنر سر جیمز اسٹینٹن نے اسیرہ والہ حضرت شیخ الحدید رانا محمد الحسن صاحب دیوبند ہی رحمۃ اللہ علیہ والہ العزت کی خدمت کے بارے میں ایک موقع پر کہا تھا کہ :-

اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اٹھے
گی جس میں کوئی انگریز نہ ہوگا۔

تیز یہ بھی ان کا ہی مقولہ ہے کہ :-

اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کے خلاف
عدالت ٹپکے گی۔ وحاشیہ سرائے قاضی جلد دوم، ص ۱۱۳
حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۶ھ)

غالباً ایسے ہی موقعہ کے لیے کہا گیا ہے کہ :-

وہی مومن ہے جس کو باطل دیکھ کر پکار اٹھے
کہ اس مرد خدا پر چل نہیں سکتا فصول مسیحا

عبداتی بنانے کے لیے طریق کار
آپ باحوالہ پہلے یہ پڑھ آتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان میں زمام حکومت میں لیتے ہی تمام ہندوستان میں کو ایک ساتھ عبداتی بنانے کا خواب دیکھا شروع کیا اور اس کے لیے ملازمین اور میسرینوں کو کرپوں اور پھر کرپوں کی پیش کش کے علاوہ اور بھی کئی حربے اختیار کیے گئے۔ ان میں ایک طریق یہ تھا کہ ہندوستان میں کو اتنا غریب اور ضلوع الحال کر دیا جائے کہ وہ عبداتیوں کی بھولی میں پڑنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔ چنانچہ عوام کی غمخیزیت میں حد تک عمر بچپاد دی گئی تھی کہ قبل مرید صاحب دیکھ آئے یومیہ یا دیکھ سیر لاج رہندوستان اپنی گردن کٹوانے پر جو شہنشاہی اختیار ہو جاتا تھا۔

(اسباب بنناوت ہندوستان ص ۲۴)

اور سب سے زیادہ خطا کا کہ در ملک طرہ قیہ حجاز انگریز نے تجویز اور اختیار کیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ قرآن پاک اور اس کی تعلیم اور علوم اسلامیہ بیکار دیا جائے تاکہ ایمان والے ایمان کی پوچھ گلی مسلمانوں کو حاصل ہے۔ بالکل ختم ہو جائے اور عبدایت کا راستہ ان کے لیے سہل اور ہموار ہے

اداس کے مقابل میں انگریزی تحلیف کو اس قدر عام اور رائج کر دیا جائے کہ کوئی شخص اپنے لیے اس کے سوا چارہ کار نہ پائے۔ چنانچہ قرآن کریم جیسی جامع و مکمل، بے نظیر اور انقلاب انگیز کتاب کی بے پناہ قوت اور طاقت سے مخالفت اور بدحراس جو کہ برطانیہ کے مشہور و متہ دار وزیر اعظم گلڈ اسٹون نے جو بے جمیع میں فتوان کریم کو اٹھاتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہا تھا کہ :-
 "جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے۔ دنیا مستحکم اور مضبوط نہیں ہو سکتی۔"
 دیکھو! یہ خطبہ صدارت ۱۸۵۷ء - اعلان پنچاہ سالہ
 آل انڈیا مسلم کونگریس علی گڑھ (حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ)

اور نہ ہی برٹش گلاس نے کہا کہ :-

وہ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو۔ اچھی رہا انہیں ہر گز نہ

بجائے حکومت خود اختیاری ۱۸۵۷ء

الغرض قرآن کریم کو مٹانے اور مسلمانوں کے اسلامی جذبات کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنے کے لیے ایسے ایسے حربے استعمال کیے گئے کہ شیطان بھی دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اور لارڈ ویلیکس نے تو صامت لغفلوں میں کہا کہ :-

ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دلی رواج

کے اعتبار سے انگلستانی۔" دیکھو! یہ مینڈیکور ۱۸۵۸ء (مئی ۱۸۵۷ء)

اور سچ پوچھئے تو اس میں ان کو کافی حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ جیسا کہ یہی صاحب علم پر مخفی نہیں ہے۔

یہ طلحہ تو وہ تھا جو براہ راست حکومت برطانیہ اور اس کے ذمہ دار اصحاب نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یادری صاحبان کی طرف سے دہن کی حفاظت و نگہانی اور مالی سرپرستی خود انگریز کر رہا تھا، عیسائیت کی جارحانہ تبلیغ ہندوستان میں جو شروع کی گئی۔ وہ اپنے مقام پر ایک ساتھ عظیم اور آفات ارضی میں سے ایک بہت بڑی آفت تھی۔ مسلمانوں پر تو حکومت کی طرف سے صد ہا آئینی پابندیاں عائد تھیں کہ وہ انگریز کے خلاف لب کشائی نہ کرے کہ مجاز نہیں مگر دالعیاذ باللہ، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یادریں پر کسی قسم کی پابندی نہ تھی۔

قبول کے :-

ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بے شک و گشاہ
 کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سنگ آزاد

تاریخ قیام دارالعلوم دیوبند

یہ تھے وہ مختصر سے دل گداز اسباب و علل جن کی وجہ سے حجة الاسلام حضرت نالوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء نے کارنے فراموش اپانی اور دیدہ بصیرت سے اندازہ کر لیا کہ اگر ان نازک حالات میں مذہبی اور دینی طور پر مسلمانوں کی حفاظت و تربیت کا کوئی معقول اور

علاوہ ازیں نظام نہ کیا گیا اور تہذیب و تمدن کے اعلیٰ کارناموں اور اقدار سے ان کو باخبر نہ رکھا گیا تو سخت غلطی ہوئی کہ دنیا و اللہ، مسلمان کہیں تہذیبیت اور یکجہتوں کے دام ہنگام نہیں ہی میں نہ الجھ جائیں جس جہاں کو بچانے میں شاہان افغان اور پٹانوں اور دیگر باطل پرستوں کے حوالہ و مسامحہ کوئی راہ نہ تھا نہ تھے۔ مسلمانوں کی اجتماعی تیز فہمندی کو پرانے مکر کے اور اہل کفر و بدعتی ماحول و فتنوں سے بے بہرہ رکھنے کی جو کوشش و کاوش اس ملک میں ہو رہی تھی۔ ان تمام ریڈیائیوں کو سرچنے اور سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے رفقاء کا کوئی تہذیب و رس و طبع اور پیاد کی طرح بے قرار دل و جہت فرمایا تھا اور تلافی ان جہت کے ایک ایک فرد کو زبان حال سے پکار پکار کر یہ کہہ رہے تھے۔

کھول کر آنکھیں برسے آئینہ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء بروز جمعرات راسی دن ہفتہ بھر کے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش ہوتے ہیں۔ تاریخ کا وہ مبارک دن ہے جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی امانت کا چشمہ علم سرزمین دیوبند سے پھوٹا اور رشد و ہدایت کا پودا شجرہ طوبیٰ بن کر پھلنا جس کے لذیذ پھل سے دنیا کے اسلام کی طلی بھوک ختم ہوئی اور جس کی سرسبز و شاداب شاخوں کے سائے کے نیچے جہالت اور غفلت کی بادِ کرم میں بھلنے والوں کیسبیں اور اطمینان نصیب ہوا اور اس صاف اور شفاف چشمہ سے نہریں اور ندیاں پھوٹ پھوٹ نکلیں۔ اور ایسا بھر کے مردہ دلوں کو زندہ اور اچھے پورے طلب کو لہلہا تاہرا چمن بنا دیا۔

اس مبارک تقریب میں بہت سے بھلا بزرگ جمع ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کی موجودہ عالیشان عمارت کے متصل جنرل کی طرف مسجد چھتہ میں امار کے رخصت کی ٹہنوں کے سایہ میں اس مدرسہ کا افتتاح ہوا۔ اور سب سے پہلے معلم حضرت علامہ محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور سب سے پہلے معلم حضرت مولانا محمد الحسن صاحب دیوبند ہی قرار پائے۔

اس مبارک مدرسہ کے آغاز کی خبر جب تباہے والوں نے مکر مکر میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو بتائی اور یہ کہا کہ حضرت ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے تو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا:-

”سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں۔ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ بیخبر نہیں کہ کتنی

پیشانیوں اوقات میں سرحد ہو کر گزرتی ہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقاء

اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی گھر گاہی دعاؤں کا ثمر ہے۔

بلاشبہ دارالعلوم دیوبند وستان میں تحفظ اور بقا کے اسلام کا ذریعہ ہے۔ اور اس کی وجہ سے ہزاروں پیادوں کو سیرابی نصیب ہوئی۔

بچ

مکرم سید اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں بہت بڑا جھگڑا لیا ہے۔ سر سید مرحوم و مفتوح مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی بیٹی نذیر احمد بنتی ذکار اللہ۔ مولانا محمد حسین آزاد۔ ماریا بیارے لال انشرب ذیلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ مولانا محمد قاسم نے دلیوبند میں اور سر سید نے علی گڑھ میں مدرسہ کالج قائم کیے۔ سر سید بیارے لال انشرب کی بیٹی نذیر احمد۔ مولانا محمد حسین آزاد نے پنجاب میں وہ تعلیمی کارنامے انجام دیئے ہیں جو حیاتِ جاوید کے مالک ہیں۔ سر سید مرحوم مولانا محمد قاسم کی بہت عزت کرتے تھے۔ بعض مذہبی مسائل کے علاوہ تعلیم و تہذیب کے مسائل میں دونوں متفق تھے۔ علومِ جدیدہ اور علومِ قدیمہ کے پڑھانے میں بھی دونوں ہم خیال تھے۔ چنانچہ تہذیبِ الاخلاق علی گڑھ مدرسہ کیم ڈی ایچ ۱۲۹۰ء میں مضمون بعنوان مدرسہ دلیوبند میں مولانا محمد قاسم کی تقریر اپنی علومِ قدیمہ اور جدیدہ کے پڑھانے کے بارے میں درج ہے اور اس پر جنوری اختلاف کے ساتھ سر سید مرحوم نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مضمون پور نظر کیا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی سالانہ مجلس میں جناب مولوی محمد قاسم صاحب نے ایک نہایت لمبی اور دل میں اثرنے والی اور صداقت سے بھری ہنسی گفتگو کی۔ اس کے پڑھنے سے ہم کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ جناب مولوی صاحب مرحوم بھی مسلمانوں کے حق میں علوم و فنونِ جدیدہ حاصل کرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

سر سید مرحوم کو بھی دینی درسگاہ سے اختلاف نہیں تھا۔ اور خاص طور پر مدرسہ دارالعلوم دلیوبند جس کے بانی مولانا محمد قاسم تھے۔ وہ اس کے حامی تھے اور اس کی کامیابی چاہتے تھے۔ چنانچہ جناب مدرسہ دلیوبند کے مہتمم صاحب نے سر سید کے پاس مدرسہ کی سالانہ رپورٹ بھیجی جس میں مدرسہ کی طرف سے مسلمانوں کی بلے ترقی اور تعلیم کا رونا روایا گیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سر سید کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور انھوں نے یکم مئی ۱۲۹۰ء کے تہذیبِ الاخلاق میں عربی مدرسہ دلیوبند اور مسلمانوں کا جھگڑا جو دینی دینا لری کے عنوان پر تین صفحہ کا ایک مقالہ تحریر کیا۔ اس میں مولانا محمد قاسم اور مولانا محمد یعقوب انور کی بارے میں کیسے حقائق مبررے محبت آمیز الفاظ استعمال کیئے ہیں۔ ان کے خلوص پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ اس مضمون کے اقباس میں پڑھیے۔

مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ عربی دلیوبند نے اس مدرسہ کی رپورٹ سالانہ ۱۲۹۴ء ہمارے پاس بھیجی ہے جس کے دیکھنے سے ہم کو نہایت ہی مسرت ہوتا ہے اور مسلمانوں اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس آتا ہے۔ اب ہم اس رپورٹ پر مشدود طرح پر نظر ڈالتے ہیں۔

”اولے لجانہ مسلمانوں کے خوش مذہبی کے ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کیا ہے جس میں علومِ انگریزی اور دیگر علوم و دنیاوی شمول علومِ دینی پڑھائیں گے۔ اس پر جو بچے مسلمان یا معتصب دیندار اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرسٹینی مدرسہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اسی سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ دلیوبند میں جس میں جو مسلمانوں کے اور کچھ نہیں ہے۔ جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کو مسلمان چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور روک دیا۔ مگر رپورٹ کے دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوئی۔ بڑے سے بڑا چندہ فہرست میں آنکھ روپیہ ہمارا ہی کا۔ اس کے بجائے روپے ہمارا کا۔ اس کے بعد چار روپے ہمارا ہی کا اور اس کے بجائے روپے ہمارا ہی کا اور یہ چاروں قسم کے چندے غیر مصرعی ہیں۔ بعض

پر دو دو برس اور بعض پر ایک ایک برس کا باقی ہے۔ اس کے بعد بہت مختصر سے چندے دو روپیہ اور ایک روپیہ باجاری کے ہیں اور اس کے بعد تو پھر روپیہ دو روپیہ تین روپے آٹھ آنے چار آنے سال پر نسبت پہنچ چکی ہے اور وہ بھی با آسائش وصل نہیں ہوتا۔ مجبور ہی رہتا ہوں کہ تجزیہ کی ہے کہ چندہ لانے کے لیے ایک آدمی نوکر رکھا جائے۔ پس یہ کارروائی ہمارے لیے قطعی شرت اس بات کا ہے کہ جو لوگ اپنے ٹیکس مقدس اور متقی اور پاک مسلمان ظاہر کر کے مدرسہ العلوم مسلمانان میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اپنی دینداری ظاہر کرتے ہیں صرف سخی ساختہ اور حیلہ آشورو عینہ ذہن عربی دلوں میں جس میں بجز مسلمان کے اور کچھ نہیں ہے۔ کیوں مدرسین کی۔ حقیقت میں مسلمانوں پر نہایت افسوس ہے کہ ایسے مدرسہ میں جیسا کہ دلوں کا مرقی مدرسہ ہے اور جس میں مولوی محمد قاسم سافرشہ سیرت شخص نیکان ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سائنس مدرس ہے۔ کچھ مدد نہ کریں۔

۱۔ بطاقت استغفار مدرسہ :- تمام رپورٹ پر عرض کر کے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ خود اپنے پیرایہ مسلمانوں کی بہرہ دہی پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ ایک شخص کی فائت پر اس کا دار ہے مولوی محمد قاسم در حقیقت نہایت بزرگ و نہایت اور زاد ولی ہیں تمام مبلغ سہا پور اور دیگر اہل علم و فضلہ دوسرا طالب علم مولوی محمد یعقوب صاحب کا ہے۔ جو مدرسہ اول اس مدرسہ کے ہیں۔ اور انھوں نے صرف ۳۵ روپیہ باجاری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت اور زہد سے اس قدر قلیل تنخواہ میں اوقات بسر کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو کیا کوئی دوسرا شخص اس قلیل مشاہدہ پر ان علوم کے پڑھنے کو ملے گا جو اس میں پڑھانے جاتے ہیں۔ پس یہ مدرسہ صرف ان دو بزرگوں کی دعا پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسہ میں ۱۲۵ طالب علم ہیں جن میں تراسی خاص دلوں کے رہنے والے ہیں۔ اور باقی پیر و نجات کے ہیں اور ان میں سات طالب علم تو ایسے ہیں جو اپنے پاس سے روٹی کھاتے ہیں اور سچیں وہ ہیں جو دلوں کے رہنے والوں سے یا مدرسہ سے روٹی کھاتے ہیں۔ کسی کو کچھ کپڑا اور رضائی بھی مل جاتی ہے۔

صورت تسمیر انعام لیں تجویز نہ ہوتی کہ طلباء مکتب قرآن میں جو اعلیٰ و وحافظہ اور ادنیٰ دو لڑکے۔ کل چار مستحق انعام ہوتے۔ ان کے لیے ڈیڑھ روپیہ تجویز ہوتا۔ اور طلبہ فارسی ادنیٰ جو سہ تھے۔ ان کے گیارہ انعامات کے لیے ایک روپیہ چھ آنے تجویز ہوتا کہ تختہ ہر انعام کے سوا ہی دو آنے ہوتے۔ اور فارسی کے طلبہ اعلیٰ جو چھ تھے۔ سات انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آنہ کل دو روپیہ تین آنے مقرر ہوتے اور عربی میں ادنیٰ درجہ کے چوبیس طالب علموں کو

ترتیبین انعام ملے۔ بحساب فی انعام پانچ آئہ۔ ان کا کل ۱۶ روپے ۹ آنے ہوئے اور
اوسط کے گیارہ طلباء کو اکیس انعام۔ ان کو فی انعام سات آنے تھیں کئے۔ کل فوراً روپے
تین آنے ہوئے اور طلباء اعلیٰ عربی کے ۱۹ قابل انعام ہوئے اور چھیاٹھ انعام انہوں نے
پاس کیے۔ فی کتاب چودہ آنے تھیں کیے تو کل روپیہ انکا ستاون روپے بارہ آنے ہوا۔ اول تو
ہم مسلمانوں کی اس حالت پر افسوس کرتے ہیں کہ اچھی قوم کا مسلمانی مدرسہ اور ایسی خراب اور
محتاج حالت میں ہے۔ کہاں ہیں بڑے بڑے دینداری کا دعویٰ کرنے والے اور کیوں مذہب
اسلام کے مدرسہ کو ایسی حالت میں ڈال رکھا ہے۔

دیکھ لو تہا رسے ہی ملک میں ایک تربیت یافتہ قوم یعنی پادریوں کے مذہبی مدرسے
میں۔ ان کی تائید بھی غریب آدمی اور بیوہ عورتیں زیادہ تر کرتی ہیں اور خود انصاف کرو کہ ان دونوں
میں کیا فرق ہے۔ اس کا سبب صرف یہی ہے کہ اس قوم میں تعلیم و تربیت عمدہ ہے۔ ان کے
سب کام اچھے ہیں۔

ہماری قوم میں تعلیم و تربیت نہایت خراب ہے۔ گو تعلیم تو برائے نام ہے اور تربیت کا
تو نام بھی نہیں ہے۔ اسی سبب سے ہمارے سب کام کیا دینی اور کیا دنیوی سب خراب اور
بر باد و ذلیل ہیں۔

ہماری غرض اس تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام
دین و دنیا سب خراب و ابتر ہیں۔ انکو چاہیے کہ اس مدرسہ کی ایسی بددعویٰ اور ایسی اعلیٰ
ترقی پرستی چھوڑیں۔ جو اسلام کی روئی و نشان کا نمونہ ہو۔

(واقف سید احمد)

ہم نے سر سید احمد خاں کا یہ طویل اقتباس اس لیے نقل کیا ہے تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ وہ مدرسہ جس کی ابتدائی حالت
وہ تھی۔ جس کا نقشہ مدرسہ بالا اقتباس میں دیکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا مدار سراسر اخلاص و طہیت اور نظریہ اشاعت
کتاب و سنت پر تھا۔ لہذا اس کو اتنی ترقی ہوئی کہ پورے عالم اسلام میں کوئی غیر سرکاری ادارہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا
اور اس مدرسہ اور اس قسم کے دوسرے مدارس میں تعلیم پانچواں صدی کے حضرات جو خدمت اسلام کی۔ اس کی
مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ سر سید کو حضرت نانو تو ہی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد یعقوب کے علم و ولایت اور
ان کے خلوص و تقویٰ پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ۱۲۹۱ھ میں علی گڑھ سکول کی ابتدا ہوئی تو اس کی
مشاورتی کمیٹی میں ہر دو حضرات کے نام کو شامل کیا گیا۔ مگر یہ دو حضرات کے انکار فرما دیا کہ ہمیں مفرد و تنہا۔ اس مفرد و تنہا کی وجہ سے

خطبہ پڑھتے ہوئے وہ خطبہ رمضان ۱۲۹۱ھ کے تہذیب الاخلاق میں سرسید نے شائع فرما دیا ہے۔ وہ یہ ہے۔

جناب مولوی محمد قاسم صاحب اور جناب مولوی محمد یعقوب صاحب نے جو خط متضمن عذرات شرکت مجلس مدیران تعلیم مذہب سنت والجماعت سے کیا ہے۔ بعینہ ذیل میں مندرج ہے۔

سجدت منبع عنایات بے غایات مجمع الطاف بے نہایت سلاست بہ
عبد السلام سمن معدوم ہے۔

پہنچہ تجرید اصلاح قلائد و رباب در سہ العلوم جو متعلق علوم دینیہ سے ہے۔ پہنچا اور مجوز ہونا حاجی علی بخش خاں صاحب کا مقصد اس امر کا واضح مراد ہے۔ اب اسید ہے کہ کوئی خلاف اُتی نہ رہے گا۔ اس قدر کا نام اور جناب مولانا محمد قاسم صاحب قبلہ کا نام اس قدرست میں نظر آکر کہ جن کو اہل شوریٰ تجرید فرمایا ہے۔ پہنچہ تا نید مذہب اہل تشیع اس مدرسہ میں ایک جدا گانہ پہنچے۔ مگر ہم لوگوں کے دل میں یہ امر متجان کرنا ہے کہ ایسے مجمع میں جس میں ایک شعبہ تا نید ایسے لوگوں کی ہے جن پر فرض ہمارے مذہبی بزرگوں کو برا کہنا ہے۔ ایسے مجمع کے سر تیدوں میں۔ شامل ہو کر خدا ریل کو گریں کر نہ دکھائیں گے۔ قال تعالیٰ ولا تشعروا الی الذین ظلموا انتم تسکمون الناس۔ آپ لوگوں کو بڑی بہت اور نہایت قوی حرکت ہے۔ ہمارے جو حصے یہاں لپٹ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنی پناہ میں محفوظ رکھے۔ پہنچہ تجرید مذکورہ بالا ہر اقص عقلوں کے نزدیک مسقط حصص ہے بات وہی کی وہی ہے۔ اور شامل ہونا جناب مولوی علی بخش خاں صاحب کا خلاف عقل تو نہیں کہہ سکتے مگر یہ ایک کسی مصلحت عقل پر مبنی ہے۔ مگر یہ عمل قابل التفات تھا۔ اللہ اس میں اتنا ہی تھا اُقتدا۔ مواضع التہم۔ کہتے ہیں مسلمان ہم لوگوں کی وضع اور عقائد اور اعمال اور رائے اور طرز کو ایک کیفیت خاص پر سمجھ رہے ہیں۔ اس صورت میں اگر متزلزل نہ ہو جائے۔ مستور جانے میں کچھ تردد نہ تھا۔ باجبلد اب ہم خاک نشینوں کو آگوشہ عنایت و توجہ سے ایسا پہنچے۔ و محو فوہوس کہ پھر کبھی بھولے سے بھی۔ یاد نہ آویں۔ جناب محمد قاسم صاحب نے فتنی عارف سے تربیت ملاقات جب انھوں نے اس تجرید کا ذکر کیا تھا۔ بعینہ یہی مضمون ارشاد فرمایا تھا۔ انھوں نے آپ کی خدمت میں ذکر کیا ہوتا۔ اب بروقت پہنچے۔ ان چیزوں کے جناب مولانا یہاں تشریف رکھتے تھے۔ اس قدر ارشاد فرمایا کہ تو یہی یہ جواب لکھ بھیج چنانچہ حسب ارشاد معرض ہوا۔

(محمد یعقوب)

پادریوں کی تبلیغ

ہندوستان میں مسلمان کے ہاتھوں سے سلطنت اور اقتدار جانے کی وجہ سے مختلف قسم کے مذہبی فتنے عذاب الہی کی صورت میں خود اہرے اور سادوں کے ہنگاموں کی طرح بازاروں اور گلیوں، گلیوں اور بنگلوں میں پادری صاحبان جوق و جوت

درجہ اعلیٰ و درجہ اولیٰ کر کے برتنے اور مسلمانوں کے ایمان پر بڑا کے ڈالتے ہوتے نظر آئے گئے اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی قابلِ شہرہ و خوش نصیب قصبہ ہوگا جس کو پادری صاحبان نے اس دروز میں اپنے مغرس پاؤں سے نہ روندنا ہو۔ اور اسلام کے خلاف خوب زہر کے مسلمانوں کی دل آزاری نہ کی ہو۔ اور حارثہ رنگ میں عیسائیت کی تبلیغ میں کوئی کی بھڑی ہو اور مسلمانوں کو چیلنج نہ دیا ہو۔ ایسے تمام واقعات استیغاب اور احاطہ نہ تو ہمارے بس کاروگ ہوتے اور نہ ان پر ہمارا دعویٰ موقوف ہے۔ اس لیے ہم ان کو رقم انداز کرتے ہیں۔ صرف دو تین واقعات بطور نمونہ عرض کیے دیتے ہیں۔ پہلے ان انسان ان سے بھری حقیقت کی تکرار پہنچ سکتا ہے اور انہماں کے لیے توفیق دے دے جسے جہل سے نہیں ہندوستان میں عیسائیت کی وسیع پیمانہ پر تبلیغ کو دیکھ کر ہندوؤں کو بھی یہ جرأت پیدا ہو گئی کہ وہ ایسے مذہب کا پکار کریں اور عیسائیت کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مذہبی امور میں الجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلہ کی

چاند پور کا مذہبی اجتماع

یہ گڑی برہمن کے مشہور شہر شام جہان پر سے پارچہ چیل کی مسافت پر ایک قصبہ تھا جس کا نام چاند پور تھا۔ وہاں کے ایک ہندو رئیس منشی سید علی علی نقی نے ۱۲۹۸ھ میں ایک مذہبی جلسہ بنام میلہ نداشتا سنی مقرر کیا جس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کا باہمی مباحثہ طے پایا اور دونوں فریق اس میں شریک ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے حالِ محشر یاری اور انتہائی چالاک سے ایک مختصر سی لیکن نہایت بے حسنی اور مہل لکھی ہوئی تقریر کیا شروع کی کہ کیاں کہیں نے نکل کے پھول ہیں۔ حرمِ لیا اور ان کے پیچھے میں جاگتے سوتے سانا چلتا رہتا تھا۔ دلچ، جس کو چھپتیاں اور پہلی کننا زیادہ مناسب لگا۔ اور اس طرح اپنی اور اپنے ہم مذہبوں کی جان چھڑائی اور اہل گفتگو مسلمانوں اور عیسائیوں میں رہی۔ عیسائیوں کی طرف سے ان سب کے پڑھائی گامی پادریوں کے علاوہ پادری ٹولس صاحب انگلستانی بھی تھے جو بڑے انسان، عمدہ مقرر اور چوٹی کے مناظر تھے۔ پادری ٹولس صاحب کا یہ جلسہ بنیاد دعویٰ تھا کہ یہی دین کے مقابل میں محمدی دین کی کچھ حقیقت نہیں (معاذ اللہ) اور اہل اسلام کی طرف سے جو حضرات اس موقع پر موجود تھے۔ ان میں شاہ ہیر میں سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شیخ الدین مولانا محمد الحسن صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید ابوالمنصور صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، امام فن مناظرہ اہل کتاب خصوصیت کے ساتھ قابلِ اہم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات علماء اور اہل دل اور دیندار مسلمانوں نے بھی اس میں حصہ لیا۔ پہلے دن اس مباحثہ میں متعدد حضرات نے حصہ لیا اور پادری ٹولس صاحب کے معرعم دلائل کے جواب دیتے رہے اور اپنے وعدائی کا اثبات کرتے رہے مگر دوسرے دن مناظرہ میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے حصہ لیا اور ایسے زبردست دلائل اسلام کی حقانیت پر پیش کیے کہ مجمعِ دانشمندان و بزرگانِ دین و دینی کے منہ پر اسے اور قابلِ اتباع ہونے پر ایسے ٹھوس براہین پیش کئے کہ پادری باہم کہتے تھے آج ہم مغلوب ہو گئے۔ گفتگو کے مذہبی

کتاب تاریخی میلہ نداشتا اسی جلد

اس مناظرہ کی مکمل روداد انگریزی کتاب میں ملاحظہ فرمائیے کہ پادریوں کا مغرور سر کیسے سرنگں ہوا اور اسلام کی حقانیت اور صداقت اس طرح آشکارا ہوئی۔ سچ ہے کہ یہ

نور خدا ہونے کی حرکت پر خندہ زن
پہنچوں سے چپ سدا بھجایا نہ جائے گا

اس مناظرہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۲۹۵ھ میں شاہجہان پور میں اہل اسلام اور مختلف باطل فرقوں کا مناظرہ ہوا۔

شاہجہان پور

مباحثہ طے ہوا جس میں نہایت دبا بندہ سرتی، فتنی انداز میں، پادری اسکاٹ مفتی کھیل اور پادری ٹولس صاحب وغیرہ نے جیت لیا اور اہل اسلام کی طرف سے متعدد علماء سنی اور شاہ میر اس وقت، اور اس مقام پر حاضر اور رہے تھے۔ مگر مناظرہ پادریوں اور مسلمانوں کا ہوا۔ اور لالے وقت کی نزاکت سے فائدہ اٹھا گئے۔ اس میں حضرت حجت الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ مناظرہ تھے۔ انھوں نے عقلی و نقلی رنگ میں ایسی صحیح اور قطعی دلیلیں پیش فرمائیں کہ پادری صاحبان سے انکا کوئی معقول جواب نہیں سکا اور اس موقع پر بھی اسلام اور اہل اسلام کا بول بالا ہوا۔ مسلمانوں کی کھلی فتح کا مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ متعصب ہندوؤں نے بھی اقرار کیا چنانچہ فتنی پیارے لال نے یہ کہا کہ کمر لوی قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کھال کیا بیان کیجئے؟ ان کے دل پر علم کی سستی، علم کی لپی، بول رہی تھی۔ (مباحثہ شاہجہان پور صفحہ ۹۶)

پورے بیان سے صفحات پر اس مناظرہ کی رونماوار باطالع چوچکی ہے۔ اہل علم اس سے استفادہ کریں۔

اس کے علاوہ حجت الاسلام نے پادری تارا چند سے بھی مناظرہ کیا۔ چنانچہ سوانح قاسمی ص ۱۵۱ اور مولانا محمد تقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں ہے،

”ایک پادری تارا چند نام تھا۔ اس سے گفتگو ہوئی۔ کہ غزوہ ہند ہوا اور گفتگو سے

بھاگا۔ سچ ہے شیروں کا مقابلہ لڑ پٹاں کیا کر سکیں۔“

پادری ڈاکٹر کامل فنڈر دو ایک جرمنی شہری تھا۔ جسے روسی سلطنت نے جوڑیا کے قلعے شوشا سے بدر کیا تھا جس نے فارسی میں میزان الحق نامی ایک کتاب شائع کی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ دماغ خطہ ہمالیہ سمندر

پادری فنڈر کا فتنہ

۳۱۲ مصنفہ اہل برہنہ جزیرہ، بی۔ اے، بی۔ ڈی لندن۔ مترجمہ جے عبدالسمان بی۔ اے، بی۔ ڈی۔ پنجاب ییچس بک سوسائٹی لاہور، نے ہندوستان میں پہنچ کر اور انگریز کی سرپرستی حاصل کر کے جس دریدہ دہنی سے عیسائیت کی تبلیغ شروع کی اور اہل اسلام کے خلاف جو زہر افلاک اور پتھر اسلام علیہ وسلم اور آپ کے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں جو جہر بہتان تراشی اور اتہام بازی اس نے اختیار کی اس سے مسلمان تہذیب و تمدن کو نقصان پہنچا۔ دوسرے سرسے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلے میں سگریٹ عمل تھا چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کے ایک برسرے سے ”دوسرے سرسے تک تبلیغ عیسائیت کے سلسلے میں سگریٹ عمل تھا چنانچہ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب عثمانی کے ایک برسرے سے“

۱۲ رمضان ۱۲۸۵ھ میں حضرت مخدوم جلال الدین کبیر لاہوری پانی پتی قدس سرہ العزیز کی اولاد میں تھے اور سلسلہ ولی اللہی میں غلٹک ہر دہلی میں تعلیمی اور تبلیغی خدمت انجام دے رہے تھے۔ ۱۰ در آپ کی ولادت جمادی الاولیٰ ۱۲۳۳ھ میں کیرا خیل ضلع مظفر نگر میں ہوئی تھی۔ نے پادری فنڈر کے ساتھ خط و کتابت کی اور مناظرہ کا چیلنج دیا۔ اور تمام ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد اکبر آباد اگرہ میں کئی دن کے لیے مناظرہ طے ہوا۔ ۱۱ اپریل ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۲ جب سنہ ۱۲۸۵ھ کو ہوا تھا جو اسلام اور عیسائیت کی صداقت اور حقیقت واضح کرنے کے لیے فیصلہ کن اور تاریخی ہندوستان میں اس موضوع کا سب سے پہلا اور عظیم الشان مناظرہ تھا جس میں طرفین سے معزز مسلمان، ہندو اور انگریز اس مناظرہ کے سچ اور نصف قرار دیتے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے آنے والی دین کا حامی و ناصر ہے۔ اس کے اسلام کی صداقت کا غلط پری سبب اس موقع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کو دنیا بھر میں لے اپنی خداداد قابلیت، عمدہ ذہانت اور تبحر علمی سے تین روز کے متواتر مناظرہ میں دلائل قاسمہ اور برہانین باطالع سے اس کو ثابت کر دیا کہ مجردہ کھیل جس پر آج پادری صاحبان کو فخر و ناز ہے، بالکل محرف ہے جس میں دوا

جبرئیل اور شبیر کی گنجائش نہیں ہے اور خود عیسائیوں کے مایہ ناز اور چوٹی کے مناظر پادری فنڈر صاحب کو عام جلسہ میں انجیل مقدس کی تحریریں تسلیم کیے بغیر اور کرنی چارہ کار نظر نہ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کی تاریکی ہی میں پادری فنڈر صاحب اپنے چیلوں سمیت بھاگ گئے۔ جب چوتھے دن حسب معمول مناظر کا وقت آیا تو سبک اور نصرت کو سبھی حاضر ہو گئے۔ مگر پادری فنڈر صاحب کا کہیں نام و نشان نہ ملا۔ نامیاد تمام جوہن اور مسعودوں کو جو طوفان سے حکم قرار دینے گئے تھے۔ عیسائیت کے خلاف فیصلہ کرنا پڑا اور پادری فنڈر صاحب نے ہندوستان کو چھوڑ کر دیگر ممالک اسلامیہ میں اپنے نام و بدل کا حال پھیلانے کی سعی کی۔ نیاپنچرہ پھرتا پھرتا ترکی بھی جا پہنچا اور وہاں کے علماء کو کھینچ کر تا پچھرا پھرتا وہ بیچارے اس کے پھٹکندوں سے واقف نہ تھے۔ اس لیے اس دریدہ دہن کے منہ نہ آتے تھے۔ بالآخر سلطان عبدالعزیز خاں ترکی کی خواہش اور صدر اعظم خیر الدین پاشا کوٹلی سے کی تحریک پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب نے عربی زبان میں ایک محقق اور مدلل کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام اظہار الحق رکھا جس کا ترکی فارسی اور یورپ کی مختلف اور متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ حسب سال ۱۸۹۱ء میں انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع ہوا۔ تو شہر اخبار ٹائمز آف لندن نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ لکھا کہ اگر لکھ اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی بند ہو جائے گی۔

(ملاحظہ ہو علامہ حق کے معراج پادہ کار نامے کے حصہ اول ص ۳)

واقعہ الحروف نے آج سے تقریباً سوڑستہ سال پہلے اظہار الحق کے عربی نسخہ کا مطالعہ کیا ہے۔ بلاشبہ رد عیسائیت کے لیے بہترین اور لاجواب کتاب ہے مگر صرف اہل علم حضرات کے لیے ہے۔

ان مسائل میں ہے کچھ ثروت نگاہی درکار
یہ محتاج ہیں تماشائے لب بام نہیں

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کے علاوہ اس وقت حضرت مولانا رحم علی صاحب دہلوی، مولانا سید محمد علی صاحب فرنگی پوری مولانا عسکرت رسول صاحب چڑیا کوٹی اور ڈاکٹر وزیر خاں صاحب آگدھی رہے تھے بھی عیسائیت کا خوب رد کیا۔ اور اسلام کے ناقابل شکست قلعہ کو محفوظ رکھنے کی سعی تبلیغ کی۔

آریہ کافتم

آپ اور ان گزشتہ میں یہ طبع چمکے ہیں کہ انگریزوں نے اقتدار اور حکومت کے بل بوتے پر اور پادری صاحبان نے حکومت برطانیہ ہی کے زیر سایہ رہ کر تبلیغ کے ذریعے کس طرح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالا اور کیا کیا کرشیں کیں۔ یہ مصائب مسلمانوں کے لیے کیا کم تھے؛ مگر جب مصائب و آفات کے گنگنہ و اڈل چھاتا ہے تو ان سے مصیبت کا ہوت ایک ہی طور پر نہیں دیکھنا۔ بلکہ ایسی سرمداد ہمارے بارش ہوتی ہے کہ مشکلات و بلیات کے سیلاب اٹھ اٹے ہیں۔ ایک طرف انگریز اور ان کے پائیل لائیکل قلمبر تھا اور دوسری طرف انگریزوں کے جیسے ہندوؤں اور آریوں کا گناہرا سوامی دیانند سرتی جو اپنے سطحیانہ اور فلسفیانہ آلات میں مشغول تھا۔ پورے ہندوستان میں لوگوں کو آریہ بنانے اور مسلمانوں کو مرنے کی معاذ اللہ، مہم چلا رہا تھا۔ بیسیوں اس کے پیچھے اور شاگرد تھے جواس کی دگر پر اسلام کے خلاف زہر لگاتے تھے۔ سرتی کی حماقت اور دریدہ دہنی کا اندازہ لگانا ہوتا اس کی کتاب ستیا رتھ پرکاش کا چورہاں اب ملاحظہ کیجئے جس میں اس نے بجا بال غرض قرآن کریم کی ہر آیت سے لے کر وائٹس تک کی تمام سورتوں پر اعتراضات کیے اور ان کی کی دھما بٹلاتی ہے (والہذا بالذکر) سرتی پر ہشام پر اسلام اور اسلامی عقائد پر خوب برستا تھا۔ اور اہل اسلام کو جواب کے لیے لاکھ لاکھ جہانچہ اپنا تبلیغی دورہ کرتا تھا۔ ۱۲۹۵ھ میں وہ رڑکی جا پہنچا اور کئی دن وہ رڑکی میں رہا۔ ۱۲۹۵ھ

وہاں اس وقت کوئی ایسا مستعد اور نافرمان نہ تھا۔ جو اس کے فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دے سکتا۔ اس لیے میدان کو خالی دیکھ کر اس کی بہت اور دو چنڈ بیگنی۔ سچی کبر باز اس نے اسلام کے خلاف نازیبا اور واسی تباہی بائیں کنہا شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان دونوں حضرت خجہ الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے ہی سے ضیق النفس کے مرنی مرض سے دوچار تھے۔ سبجار اور کھانسی کے شدید مرض میں مبتلا تھے۔ اور ان کی علالت کی خبریں ان کے احباب اور تلامذہ اور عقیدت مندوں کو پہنچتی رہتی تھیں۔ سرسوتی کے کانوں میں بھی خجہ الاسلام کی بیماری کی خبر پہنچ گئی تھی۔ جب روٹکی کے کچھ دیو دل رکھنے والے اور غیرت مند مسلمانوں نے سرسوتی کا حسب استطاعت جواب دینا ضروری سمجھا تو پندرہت صاحب یہ کہہ کر بات ٹال گئے (اور مدم ہٹا سکتے کہ پندرہتوں کو بات ٹالنے کا خاصا ملکہ اور ذرا لاٹھنگ معلوم ہے۔ جیسا کہ اس وقت پندرہت نہرواد کی بیٹی مسکیشیر کو سا لہا سال سے ٹال رہے ہیں مگر تاجیکے؟ کہ ہم تو باہلوں سے گفتگو کرنے کے لیے بالکل آمادہ ہی نہیں۔ اپنے کسی بڑے مذہبی حاکم کو بلاؤ۔ پھر گفتگو کریں گے۔ پندرہت جی کے حالات سے یہ بہ اسب لیا تھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب اس شدید علالت میں کیونکر اور کیسے آسکتے ہیں۔ لہذا کوئی ایسی شرط لگاؤ کہ گفتگو کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور نہ پندرہت جی کے مبلغ علم کا ہر دم کھلے اور نہ شرمندگی حاصل ہو۔ بقول شمسے :- توں تیل پر گانہ رادھا ناچے گی۔

جب گروں نے شدید اور کیا کہ پندرہت جی آپ مولانا نانوتوی رہی سے گفتگو کرنے پر کیں مہر لی۔ تو وہ تجھ شخص یہ بیان کی کہ "میں تمام پورب میں پیرا اور اب تمام پنجاب میں پھر آیا ہوں۔ ہر اہل کمال سے مولانا کی اعلیٰ سخی۔ ہر کوئی مولانا کو دیکھتا ہے روزگار کتنا ہے اور میں نے بھی مولانا کو شام چھ بجے اور بکر کے جلسہ میں دیکھا ہے۔ ان کی تقریر دلاؤ گری ہوئی ہے۔ اگر آدمی مباحثہ کرے تو اسے کابل دیکھتا ہے کہ سے جس سے کچھ فائدہ ہو۔ کچھ بچہ نکلتے۔" (بحوالہ مقدمہ انتشار الاسلام ص ۱۵) اور مولانا فخر الحسن صاحب

اہل روٹکی نے جب حضرت نانوتوی رہ سے پر زور استدعا کی تو حضرت کے لیے خود شدت علالت میں وہاں پہنچا تو نامکن تھا۔ آپ نے اپنی طوف سے چند نمائندے بھیجے جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا شیخ السید محمد وحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا فخر الحسن صاحب اور مولانا حافظ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ قابل ذکر ہیں۔ یہ حضرات پایادہ ہجرت کے دن مغرب سے پہلے روانہ ہوئے اور شام کی نماز دیوبند کے باغوں میں طے ہو گئی۔ علی الصبح روٹکی پہنچے جنی نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد مقامی باشندوں کے ہمراہ پندرہت جی کی کوٹھی پر پہنچے اور بحث مباحثہ کی دعوت دی۔ مگر پندرہت جی اسی پانی ضد پر پھر رہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب آئیں تو مباحثہ کر دوں گا۔ اور کسی سے مباحثہ پر گزرنہ کر دوں گا جب وہ کسی صورت مباحثہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو یہ حضرات واپس ہو گئے اور اہل روٹکی نے باوجود حضرت نانوتوی کی علالت کے محض اتنا مہمت کے لیے وہاں پہنچنے کی استدعا کی تو مولانا رہ باوجود علالت، ضعف اور کمزوری کے جس طرح بھی ہر کار روٹکی تشریف لے گئے۔

حضرت مولانا محمد اپنے تلامذہ اور اسباب کے شہر میں مقیم تھے اور سرسوتی صاحب روٹکی چھائی میں راجہاں تھے روٹکی میں اجتماع بحث و مباحثہ کے لیے ابتدائی مراحل طے کرنے کے لیے خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر سرسوتی صاحب اور ان کے معتقدین اس سے بھی گھبرائے اور یہاں تک کیا کہ :-

"ہمارے سارے کام بند ہو گئے۔ آج سے ہمارے پاس کوئی اور تفسیر

نہ آئے۔ ہم پر جواب نہیں گے۔"

(بحوالہ مقدمہ انتشار الاسلام ص ۱۵)

دوسرے روز حضرت مولانا محمد مولوی احسان اللہ صاحب بدینہ بھی اور اپنے چند رفقاء کے چھاؤنی چلے گئے اور کرنل صاحب کی کوٹھی پر انتظام کیا گیا۔ کپتان صاحب اور کرنل صاحب نے مولانا کی طبی و طبیعت کی اور ان سے مختلف مضامین پر تبادلہ خیال کیا اور داد و تحسین دیتے رہے۔ اور پندرہ سترہ کی کوہاں بلا کر کرنل صاحب نے کہا کہ تم مولوی صاحب سے کچھ گفتگو نہیں کر لیتے؟ مجمع عام میں تمہارا کیا نقصان ہے پنڈت جی نے کہا۔ مجمع عام میں فساد کا اندیشہ ہے۔ (حسب پنڈت جی سرکار اسلام کے خلاف اعتراضات کرتے تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ لیتے تھے۔ اس وقت تو کوئی خطہ اور اندیشہ نہ تھا۔ مگر اب اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔) اس پر کپتان صاحب نے کہا، اچھا، ہمارے ہی کوٹھی پر گفتگو ہو جائے۔ ہم فساد کا بندوبست کر لیں گے۔ پنڈت جی نے کہا کہ ہم تو اپنی ہی کوٹھی پر گفتگو کریں گے اور پھر بھی اگر مجمع عام نہ ہو جناب مولانا نے پنڈت جی سے کہا کہ لیجئے اب تو مجمع عام نہیں۔ دس بارہ ہی آدمی ہیں۔ اب یہی۔ آپ اعتراض کیجئے ہم جواب دیتے ہیں۔ پنڈت جی نے کہا۔ میں تو گفتگو کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔ (تو مولوی کا دم کو کا ہے کو لگاتار تھے تھے اور ان کے ساتھ گفتگو کرنے پر کچھ مصرعے تھے؟) مولانا کے فرمایا اب ارادہ کر لیجئے۔ ہم آپ کے مذہب پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے۔ یا آپ ہم پر اعتراض کیجئے اور ہم سے جواب لیجئے۔ پنڈت جی نے ایک زمانہ۔ شرائط کے باب میں گفتگو ہی۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجلس بجااست رہتی۔ جناب مولانا بھی اپنی فرو دگاہ پر تشریف لائے اور کئی روز تک شرائط میں رد و بدل ہی۔ آخر الامر مولانا نے یہ کہا ہوا کہ پنڈت جی کسی جگہ مباحثہ کر لیں۔ برابر بازار کر لیں۔ عوام میں کر لیں۔ خواص میں کر لیں۔ تنہائی میں کر لیں۔ مگر کر لیں۔ پنڈت جی اپنی رہائشی کوٹھی پر مباحثہ کرنے کو راضی ہوئے اور وہ بھی اس منہ پر طرح دوسرے سے زیادہ آدمی نہ ہوئی۔ مولانا مجرم پنڈت جی کی کوٹھی پر جانے کو تیار تھے۔ مگر سرکاری طرف سے ممانعت ہو گئی کہ چھاؤنی کی حد میں کوئی شخص گفتگو کرنے نہ جائے۔ شہر میں بنگلہ میں جہاں کہیں بھی جی چاہے گفتگو کرے۔ مولانا نے پنڈت جی کو لکھا کہ نہ کہ کنارے باغیچہ کے میدان میں یا دار اور کہیں مباحثہ کر لیجئے۔ مگر پنڈت جی کو یہاں نہ ہاتھ آیا۔ انھوں نے ایک دستخطی یہی کہا کہ میری کوٹھی پر چلے آؤ۔ چونکہ سرکاری طرف سے ممانعت ہو گئی تھی۔ بلکہ پنڈت جی اور ان کے حواریوں نے ممانعت کر دادی تھی۔ اس لیے جناب مولانا کو کوٹھی پر نہ جاسکے۔ اور پنڈت جی کو کوٹھی سے باہر نہ نکلے۔ (مقدمہ انتظار الاسلام ص ۷۸)

حضرت شیخ الہند، مولانا محمود حسن صاحب رح اور مولانا حافظ عبدالحل صاحب رح نے کئی روز مرزا زار پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دیتے اور پنڈت جی کے مذہب پر اعتراضات کیے اور پنڈت جی اور ان کے حواریوں کو غیرت والی کہ جواب دو۔ مگر پنڈت جی اور ان کے شاگردوں اور متقدموں کے کانوں پر جوں بھی نہ رنگی۔ اور ان کو کوئی ایسا سانس نہ لگا کہ وہ کہتے ہی سے رہے۔ آخر مولانا ناتوازی رح نے فرمایا کہ چھاپا پنڈت جی میرے اپنے شاگردوں اور متقدموں کے میرا غلطی سن لیں۔ مگر پنڈت جی غلطیوں کو کیا آتے۔ رٹا کی سبھی چل۔ یہ اور ایسے گئے کہ پتہ بھی نہ لگا کہ کبھر گئے۔ آخر میں مولانا نے بغیر نعلین برابر بازار میں روز ہک و عظ فرمایا۔ مسلمان ہندو عیسائی اور سب چھوٹے بڑے انگریز جوڑ کر لیں تھے۔ ان غظوں میں شامل تھے۔ قبرم کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ مولانا نے وہ وہ دلائل مذہب اسلام کے حق ہونے پر بیان فرمائے کہ سب حیران تھے۔ اہل جلسہ پر سکتے کا عالم تھا۔ شخص متاثر معلوم ہوتا تھا۔ پنڈت جی کے اعتراضات کے وہ وہ جواب دہان تھے دیکھ کر مخالف بھی مان گئے۔ (مقدمہ انتظار الاسلام ص ۷۹)

پنڈت مسرتی صاحب نے بزم خود اصولی طور پر اسلام پر گیارہ اعتراضات کئے ہیں جن میں سے دس کے جوابات حجتہ الاسلام حضرت مولانا ناتوازی نے انتظار الاسلام میں اور گیارہ میں اعتراضات کا مبل اور مندرجہ جواب قبلہ میں دیئے۔ دونوں کتابیں اہل عاصرات کے

لیے نفیست بارہ ہیں۔

جب پنڈت سرسوتی صاحب رٹکی سے جھاگ گئے تو پھر تلے پھرتے پھرتے میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی مذہب اسلام رٹکی کے بعد میرٹھ پر بے سرحیا اعتراضات شروع کر دیئے۔ حضرت حجۃ الاسلام مولانا نوری رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ بیمار اور وضعف میں مبتلا تھے۔ پھر بھی رضائے الہی حاصل کرنے اور مذہب اسلام سے دفاعت کرنے کے لیے آپ بائیں ضعف و بیماری میں میرٹھ پہنچے چنانچہ پنڈت جی وہاں سے کافر ہو گئے اور خود پنڈت جی تو وہاں سے چل بھی دیئے البتہ ان کے حواری لالہ اندلال نے مذہب اسلام کے خلاف ایک مضمون لکھ جس کا جواب حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب جواب ترکی بر ترکی میں دیا ہے۔ چنانچہ اسی کتاب "جواب ترکی بر ترکی" میں لکھا ہے کہ میرٹھ پنڈت دباندر کہیں پھر پڑا کر میرٹھ پہنچے اور وہاں بھی ان کے وہی حواری تھے۔ اور نیرازی میں تصریح میں ہے کہ چند مہینوں کے بقیتہ اور ضعف کے سبب قوت نہ تھی۔ مگر بہت کر کے (میرٹھ پہنچے) اور پھر لکھا ہے کہ لڑکی حواری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرٹھ سے جھکا کر کہیں لکھیں پھر پڑا (صفحہ ۳۹ اور وہ پنڈت جی) وہاں سے بہانہ کر کے کافر ہو گیا۔ اس سبب واقعہ کی تفصیل سوانح قاسمی (جلد دوم صفحہ ۵۱۲، ۵۱۳) مصنفہ گیلانی، میں مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کچھ ایسے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ ان کو نہ تو فراق کے بغیر اور نہ کوئی راہ نظر آتی تھی۔ اور نہ سر جھپانے۔

لیے کوئی اور سٹ ۷

شوریدگی کے ہاتھ سے سر پہے وہاں دوش

حوار میں لے حنرا کوئی دیوار بھی نہیں

ان حضرات کی یہ اسلامی خدات صرف ہندوستان ہی میں شہر ریش بلکہ مرکز ایمان مکہ مکرمہ وغیرہ میں بھی معروف ہیں چنانچہ مکہ کے ایک رسالہ میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ:-

"اور حقیقت یہ ہے کہ آریوں کے دیاندر سرسوتی کے مقابلہ کے لیے خاص مکتبر پر حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور تائید فیضی ہی کا نشان ہے اور یہ جس طرح عثمانہ حقہ کی اشاعت اور رد بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا اس کے آثار باقیاب بھی جاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔"

دلاحظہ ہوں ایک مجاہد معاصر ص ۱۲۸ کردہ مرکزی دفتر دارالعلوم حرم صولیہ مکرتم

اور مورخ اسلام حضرت مولانا سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ والمتوفی ۱۳۸۳ھ نے حیات نبوی کے دیباچہ میں ان اکابر کی علی اور اصلیہ خدات کا عمدہ تذکرہ کیا ہے۔

یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے کہ جابر برطانیہ بادریوں اور آریوں کے فتنے اسلام کے خلاف جو کچھ کر رہے تھے وہ تو انہوں نے کیا ہی۔ مگر صدافرسس ہے کہ پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لگائے ہوئے اور خلیا پسینہ سے سینچے ہوئے بانگ کو دیان کرنے کی کوشش میں صرف دشن ہی نہیں بلکہ محب نادوست بھی معروف تھے۔ مصیبت اور جہالت کی گنگوہر کشائیں انتہا اندر کہ ہندوستان پر محیط ہو گئی تھیں۔ پھر لے سبالے مسلمان بندہ قتل کی روش اور ان کے رم و رواج کے کچھ ایسے ظلام اور ظلم

میں چکے تھے کہ بھارتے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کے دل پر اس طرح چھاتی ہوئی تھی جس طرح مہم برسات میں سیاہ اور گھنے ابل آفتاب کو ڈھانپ لیتے اور دن کو رات بنا دیتے ہیں غرضیکہ دلوں کی گایا کچھ ایسے رنگ میں چلی ہوئی تھی کہ بربادی کا نام شادی، جہل کا نام علم، مشرک کا نام رسوم اور شر مچا تا ہوا چلا جاتا تھا۔ علم شریعت کی تعمیر اور سنت نبوی کی تذلیل و توہین چھتی جاتی تھی جو ہم علماء حق سے اپنے آپ کو مستثنیٰ اور سب سے زیادہ جگتے عزت اور بدعات کو جزو اسلام بنا لیا گیا تھا کہیں نہ جبریت سر ملاتی تھی۔ تو کہیں اہل بدعت بدعات میں چمک تھے۔ کہیں رفض و تشیع کا قلبہ تھا تو کہیں عدم تقلید جزم سے رہی تھی، کہیں ڈھل و سارنگی کھ کھاتی اور قوالیاں چرتی تھیں تو کہیں بازاری عورتوں کے گانے پر وجد و حال کی محفلیں گرم دکھاتی دیتی تھیں، کہیں گورہی اور تفریح پرستی کا عروج تھا تو کہیں حسب جاہ و جلال اور طمع نفسانی کی انگلیں پورے جوہر پر تھیں۔ اس وقت ایسے حالات کو دیکھ کر اہل دل حضرات پر کیا گزرتی ہوگی۔ پوچھنا ہی کیا؟ -

بیابانِ غم کا حال خود آنکھوں سے دیکھو

کیا لو پھٹے ہو دل پر جو گزری گزر گئی!

یہ وہ حالات تھے جن میں دارالعلوم قائم ہوا اور اس نے پھر حضرات سر انجام دیں۔ اس کا ایک خاکہ اس کتاب میں موجود ہے۔

عشقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم چند واقعات

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رفقاء کا واقعیت مند دل کو جس درجہ اور جس قدر و المانہ عشق و محبت اور اخلاص و حقیقت بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کا انکار بغیر کسی متعصب اور سراسے کسی متعنت کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ رومانی افسانوں میں مجنوں بنی عامر کے عشق و محبت کے بڑے بڑے افسانے زبان زدِ خلقت ہیں۔ لیکن اگر مجنوں سب کو پھر الیٰ پر فدا تھا تو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء کے کار مدینہ طیبہ کی مبارک گلیوں کے دروازے پر قربان و شمار تھے۔ اگر مجنوں الیٰ کے عشق میں مجبور و مقہور تھا تو یہ حضرات عشقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں سبے جہنم سے بے قرار تھے۔ اگر مجنوں الیٰ کی اداؤں پر مشغول تھا تو یہ حضرات اپنے آخر الزمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری مسنون کے شیدائی تھے۔ اگر مجنوں الیٰ کے افسانہ و الفت کے دام میں گرفتار تھا تو یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تسلی و علاقیہ پر شمار تھے اور آپ کے گلاؤں اور آپ کی لہجہ کو جان عزیز سے بھی زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ یہ جانتے تھے اور دل سے مانتے تھے کہ دینی اور دنیوی تمام لائق کا سرچرچہ ہی اس برگزیدہ سب سے کیا ساتھ مومنیت اور حقیقت ہے جن کے ارشاد و فہم و وہ ایک جملہ کے مقابل میں دنیا بھر کے لعل و گہر اور صنعت و اقلیم کی دولت اور خزانے قطعاً کوئی قیمت و قیمت نہیں رکھتے اور جن کے پیار سے اقبال و افعال اور اسرارِ حسنہ کے مقابل میں کوئی لذیذ سے لذیذ اور خوش آئند سے خوش آئند چیز بھی ایک لائق ہو کر وزن نہیں رکھتی جن کا اہم گرامی دنیا کی تمام بشریہ فیئیل اور شہرتیں سے میٹھا اور جن کی ایک ادنیٰ مسفت بھی جو اہل بیت سے مرصع تاجِ شہابی

سے بھی زیادہ مغرب و پسندیدہ ہے، کیا یہ خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حبیباً افضل المخلوقات نبی اور آپ کی شریعت جلیب شریعہ بہا شریعت بل گئی جس کے بعد کسی اور خوشی کی برے سے کوئی حاجت ہی باقی نہیں رہتی، کیا خوب کہا گیا ہے کہ

شراب خوش گوارم بہت دیار مہرباں ساقی

نار و عیسٰی داسے چنین یارے کہ من دارم

حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے عشق نبوی و ملی صاحبہ العن الف تحیۃ و سلام کے واقعات قلمی اور فعلی تو بہت کچھ جن کے بیان کرنے کے لیے دفتر کا رہیں۔ ہر صحت چند واقعات بطور تزیین پیش کر کے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ہندوستان میں بعض حضرات کی عزت و سب زنگ، کا جو تا بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ اور اب بھی پہنتے ہیں۔ لیکن حضرت نانوتویؒ نے ایسا جو نامدّت العمر بھی نہیں پہنا اور اگر کوئی تحفہ لا دیتا۔ تو اس کے پہننے سے احتساب و گریز کرتے اور آگے کسی کو پہن دے دیتے۔ اور سب زنگ کا جو تا پہننے سے محض اس لیے گریز کرتے کہ سرور کائنات آتائے وہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گنبد خضدار کا رنگ ہے، پھر حکماء ایسے رنگ کے جوتے پاؤں پر لکھتے اور کیکو استعمال کیے جاسکتے ہیں؟ چنانچہ شیخ العرب والجم حضرت اساذنا الحرم مولاسین احمد ذوالسنی ۱۳۴۰ھ ہجریہ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کرتے ہوئے انعام فرماتے ہیں کہ:-

”تمام عمر کفایت کا جو تا اس وجہ سے کہ قبر مبارک سب زنگ کا ہے۔ نہ پہنا اور کوئی دیر لے آیا تو کسی دوسرے کو دے دیا۔“

والشہاب الثاقب ص ۵۷

انارہہ کیے اس نظر بصیرت اور فطرت کا گنبد خضدار کے ظاہری رنگ کے ساتھ کس قدر حقیقت و الفت ہے جس کے اندر عظیم المرتبت کی آبرو و ابیں جن کی نظیر جن کی مثال اور جن کا ثانی خدا تعالیٰ کی ساری مخلوق میں نہ آج تک وجود میں آیا اور نہ تا قیامت آسکتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے شایہ کسی کی ترجمانی کی ہے کہ

دیش مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ

نہ جاری بیخ خیال میں نہ دوکان آئینہ سازین

(۲) حضرت نانوتوی جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو مدینہ طیبہ سے کئی میل دور ہی سے پابہنہ چلتے رہے۔ آپ کے دل و دماغ خیر نے یہ اجازت نہ دی کہ دیا حدیب میں جو تباہیں کچلیں حالانکہ وہاں سخت ٹوکیلو نگریوے اور چھینے والے پتھروں کی بھرمار ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح جناب مولانا حکیم محمد علی خان صاحب حیدر آبادی رح کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں جو اس سفر حج میں حجۃ الاسلام مرحوم سفر تھے کہ:-

”مولانا مرحوم مدینہ منورہ تک کئی میل آخر شب تارک میں اسی طرح چل کر

پابہنہ پہنچ گئے۔ (دولت قاسمی ج ۳ ص ۳۱)

اور نیز حکیم مصروف رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ ہی سے ارقام فرماتے ہیں کہ:-

”جب منزل بر منزل دہشت شریف کے قریب پہنچا تو افسانہ جہاں روضہ پاک صاحب لولاک نظر آتا تھا۔ فوراً جناب مولانا محمد قاسم صاحب، مرحوم نے اپنے تئیں اتار کر بغل میں ڈالیں اور بار بار یہ جملہ شروع کیا ”راغبنا اللہ“ (صلوات)

ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ سیر طیبہ اور گزشتہ سفر کے ساتھ کس قدر عقیدت اور کیسی فرشتگی تھی اور دیکھئے کہ تادب حسن کا ایسا ہی بہترین طریقہ اختیار فرما کر اپنی فطرت محبت کا اظہار فرمایا اور یہ ساری عقیدت و محبت جناب امام الانبیاء خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ احمد علیہ الصلوٰۃ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ ورنہ اس سنگلاخ رقبہ اور پتھری زمین کی فی نفسہ کیا قدر ہے؟ جو کچھ بھی ہے اور جتنی کچھ بھی ہے۔ وہ حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہے۔ اور آپ ہی کے واسطے سے ہے اور ایسے ہی موقع کے لیے کثرت شرفی کے یہ کہا ہے کہ:-

وما حب الیاد شغف حبی

ولکن حب من نزل الیہا

میرا اور میرے تمام اکابر کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کا وہ جھنڈ چاہے کہ جبرائیل سے لگتا ہے۔ عرش سے بھی زیادہ اتر اور وقیف رکھتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمادو نانوتوی ج ۱ ص ۱۹، میرت جلی ج ۲ ص ۲۲ اور روح المعانی ج ۱ ص ۲۱ اور اس کی وجہ بھی صرف اور صرف یہ ہے کہ:-

عرش پر گر عرش تجاری ہے تو ہے اس خاک سے
جس میں معجزات ہے کون دیکھاں کا تاحبار

(۱۳۷) انگریز کے خلاف جہاد شہداء میں دیگر اکابر کی طرح حضرت حمزہ الاسلام مولانا نانوتویؒ رح بھی بنفس نفیس خود شامی وغیرہ میں شامل تھے اور زخمی بھی ہوئے تھے اور تذکرۃ الشہداء کے حوالہ سے گزرجاتا ہے کہ جب ظالم انگریز کی طرف سے حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے اور گرفتار کنندہ کے لیے جلد تجویز پہنچا تھا۔ اس لیے لوگ لاٹھیاں ساٹی اور عداوت کی لگ ہو چکے تھے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو کمال شجاعت، استقلال اور بہت قلب عطا فرمائی تھی۔ اس لیے وہ ہتھیار کے تیرے سے بے نیاز ہو کر کھلے بندوں میں چلے گئے۔ مگر افسوس کہ ان کا قہر اور ہمدردوں کی طرف سے جب شدید اور بے رحم ہوا کہ حضرت وقت کی نزاکت کے پیش میں نظر ضرور روپوش ہو جائیں۔ تو ان کے اہل کی وجہ سے تین دن روپوش رہے اور لکھا ہے کہ ”تین دن پھلے ہوئے ہی ایک دم باہر نکل آئے اور کھلے بندوں میں پھرے چلے گئے۔ لوگوں نے پھر بہت روپوشی کے لیے عرض کیا تو فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا مسند سے ثابت نہیں کیونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غار ثور میں تین ہی دن روپوش رہے ہیں“ (مسند قاسمی ج ۲ ص ۱۵۳ از مولانا گیلانی ج ۲)

دار دیکھتے اس حذیرہ اتباعِ سنت کی کہ ظالم انگریز ان دنوں اہل ہند پر چڑھا اور ملازمین پر خصوصاً مسافرانہ اور قاتلانہ حربے استعمال
تھا اور نہایت بے دردی کے ساتھ مظالم کے ماحول میں سے ہر لی کھینچتا تھا۔ وہ کرنسی جیسا سزاوردی اکرنا ہو چکی تھی جو اس ظالم نے عبادِ دل
خلاف روانہ رکھی تھی اور وہ کرنسی غیر انسانی کارروائی تھی جو اس نے چھڑی تھی اس وقت انگریز کا ظلم جدا اور تقدسی و ستم اپنے نقطہ عود پر
لیکن حجۃ الاسلام مرحوم اپنی حیات سے لے کر تیار ہو کر اس موقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اضطراری کو ترک کرنے پر باوجود رش و اصرار کے
نہ ہرے اور تین دن کے بعد قزاقاں پر کل آئے اور کھلے بندوں پھرنے لگے۔ اور اس روایت کی حالت میں بھی آقا سے نامزد صلی اللہ علیہ وسلم سے
عشق و محبت کا تعلق اور رابطہ مستحکم ہی رکھا اور اس نازک حالت میں بھی سنت پر نگاہ جمی رہی ہے
تھا اسیری میں بھی کچھ ایسا تعلق روح کو
ہر نفس میں روزِ خواب آئینا دیکھا کیے!

(۴) حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے نظم اور شریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو مدح اور تلوین بیان کی ہے اور جس خلوص و
سے اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے اور دیکھنے والا ہر کسی متعجب کے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمام کتابوں کی عبارتیں جو نظم
میں آپ نے سرورِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت و تلوین میں بیان فرمائی ہیں، نقل اور پیش کرنا تو کاسے دار و صرف بطور تذکرہ ہم قصداً
کے پہلے حصہ سے جو ایک سو اکیادون اشعار پر مادی ہے، صرف چند اشعار بلا رعایت ترتیب پیش کرتے ہیں:۔

فلک پر عیسیٰ و ادیسین میں تو خسیر سی
فلک پر سب ہی پر ہے نہ ثانی ر ہجڑ
زمین چو سبلہ نما ہیں محمد صفت
زمین پر کچھ نہ ہو پرے محمدی سرکار

تو فرخ کن و مکان زبہ زمین و زماں
خلایق از خدا کا صیب اور مجرب
امیر لشکر پیغمبر ال شہ ابرار
خدا ہے آپ کا عاشق تر اس کے عاشق دار
قورقوش اگر اور انبیاء ہیں شش ہزار
تو بڑے گل ہے گلشن گل ہیں اور بنی

جہاں کے سارے کالات ایک تج میں ہیں
گرفت ہو تو ترے ایک بندہ ہونے میں
تیرے کال کسی میں نہیں مگر دو جہاں
جو ہو سکے تو حسن رانی کا ایک تری انکار
بجز خدائی نہیں چھڑا تجھ سے کوئی
بغیر سب کی کیا ہے لگے جو تجھ کو عار

کمان بلندی طور اور کہاں تری معراج
جہاں کو ترے کب پہنچے حسن یوسف کا
کہیں ہو سکے ہیں زمین آسمان بھی ہموار
دل رہا ہے دلیلا تو شاہد ستار

رہا جمال یہ تیرے حجابِ بشریت
سوا خدا کے جلا تجھ کو کوئی کیا جانے

نہا کون ہے کچھ بھی کسی نے جڑ ستار
تو جس نور ہے شہرِ نفاذِ اولا بصار

کفیلِ جرم اگر آپ کی شگافت ہو،
تو بے جرم رہ کر تپا ہے عوہ طاعت

تو قاسمی بھی مطلقیت پر صوفیوں میں شمار
گناہِ قاسمِ برگشتہ محبت پر اطار

گناہ کیا ہے اگر کچھ گناہ کیے میں نے
تمہارے حرفِ فضاہیت پر عجزِ طے شق

یہ سن کے آپ شفیق گناہ گاراں ہیں
کیے ہیں میں نے انکھے گناہ کے انبار

مذکر اسے کریم احمدی کو تیرے سوا
دیا ہے حق نے تجھے رب سے مرتبہ عالی

نہیں ہے قائم بکس لاکوئی حافی کار
کیا ہے سارے بڑھ چھوڑا تجھے شرار

جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کوئی پوچھے گا
بنے گا کون ہمارے بسا عزمِ خوار

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن ٹہری امید ہے
جیتوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیسے چہرے

کہ ہر گناہِ مدینہ میں میرا نام شہار
مزدوں کو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مرغِ دار

جو نہ نصیب نہ ہوا اور کہاں نصیب میٹھے
اٹا کے بادبیری مشتِ خاک کو پس مرگ

کہ میں ہوں اور سگانِ حرم کے تیسے قطار
کر کے حضور کے رومہ کے اس پاس شمار

و لے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قائم کا
کہ جائے کو چہ اطہر میں تیرے بن کے غبار

قصیدہ قاسمی

(از صفحہ ۳۳۹ ملاحظہ)

سید فرماتے کہ ایک ایک بشر میں کس طرح حضرت نانوتوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ہی کی بدولت مدینہ طیبہ سے

سوالنا حرمِ خود ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف میر جاتا ہے تو مکین مقصد ہوتا ہے اس طرف کو کتاب دنیا ر بجالا تا ہے تو آداب
دنیا کو پر شخص صاحبِ خانہ کے لیے سمجھتا ہے عرصہ قلدنا

اعلا حضرت کیا ہے اور کس طرح ایک ایک مصرع سے عشق نبوی ٹپک اور چمک رہا ہے اور کس شانِ مہر کا انظار ان اشعار ربانہ قصیدہ میں کیا ہے۔ ہر باخدا اور مصنف مزاج آدمی اس سے صحیح طور پر اندازہ لگا سکتا ہے کہ حضرت نانوتریؒ کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کس طرح انتہائی عقیدت اور بے حد محبت تھی اور کس طرح سوز و گداز کے ساتھ وہ اپنی بے جا رنگی اور جناب رس صلی اللہ علیہ وسلم کے علو مرتبت کا ترانہ گاتے ہیں۔ اور آپ کے عشق میں کس بے تابی بے چینی اور بے قراری کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور کس خوش عقیدگی کے ساتھ مدینہ طیبہ کی گلیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

(۵)۔ نثر میں حضرت نانوتریؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں جو کچھ فرمایا۔ اس پر ان کی تمام کتابیں شاہد ہیں ان کی تصنیف لطیف قبلہ کا ایک حوالہ عرض کیے دیتے ہیں۔ حضرت برصورت رحمۃ اللہ علیہ پنڈت دیانند سرتی کو اس اعتراض پر مسلمان بھی (معاذ اللہ) سب پرست ہیں کہ نیکو وہ بھی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جواب دیتے ہوئے چٹھا جواب یہ تحریر فرماتے ہیں۔

چٹھے۔ اہل اسلام کے نزدیک مستحبی عبادت وہ ہے جو بذاتِ خود موجود ہو اور سوا

اس کے سب اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں اور سب کے نفع و ضرر کا اس کو اختیار ہو اور اس کا نفع و ضرر کسی سے ممکن نہ ہو۔ اس کا کمال و جمال و جلال ذاتی ہو

اور سوا اس کے سب کا کمال و جمال اس کی عطا ہو۔ مگر حضرت بایں وصفت ان کے نزدیک بشہادت عقل و نقل سوا ایک ذاتِ خداوندی کے اور کوئی نہیں یہ بھی ٹپک

کہ ان کے نزدیک بعد خدا سب میں افضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، نہ کوئی آدمی ان کی برابر نہ کوئی فرشتہ نہ عرش نہ کسی ان کے ہمسر نہ کعبہ ان کا ہم پلہ مگر بایں ہمہ

ان کو بھی ہر طرح خدا تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں۔ ایک ذرہ کے بنانے کا ان کو اختیار نہیں ایک رقی یا بر کسی کے نقصان کی ان کو قدرت نہیں، خالق کائنات خواہ فاعل خواہ افعال

اہل اسلام کے نزدیک خدا ہے وہ نہیں۔ اسی لیے کلمہ شہادت میں ہمارا کار ایمان ہے یعنی اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدًا عبیدہ و رسولہ، -

خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عہدیت اور رسالت کا اقرار کرتے ہیں اس صرت میں اہل اسلام کی عبادت سوائے خدا اور کسی کے لیے مقصور نہیں۔ اگر ہوتی

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوتی۔ مگر جب ان کو بھی عہد ہی مانا معبود نہیں مانا۔ بلکہ ان کی خفیت کی وجہ ان کی کمال عبودیت اور عہدیت کو قرار دیا تو پھر ناز و کعبہ کو ان کا معبود اور

معبود قرار دینا بجز تمہمت یا کم نہی و جہالت اور کیا ہو سکتا ہے۔ الخ (قبلہ ص ۵)

اس سے پہلے حضرت نانوتریؒ نے پانچ جوابات اور بیان فرما چکے ہیں جن میں سے بعض کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ:-

۱۔ اہل اسلام کعبہ کی طرف منہ تو ضرور کرتے ہیں لیکن عبادت کعبہ کی نہیں کرتے اور نہ ہی اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ عبادت وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرتے ہیں۔ کعبہ تو صرف ایک

جہت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مصلحتوں کے علاوہ ایک اس مصلحت کے لیے بھی متین فرمایا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کا اس ایک جہتی کی وجہ سے اتفاق و اتحاد قائم رہے۔

(مصلحت پر ضحیٰ)

قبلہ نما کی اس عبارت سے جہاں اللہ تعالیٰ کی خاص توحید اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور منصب رسالت پر تپا ہے اس سے نہ "مدد کر لے کر ہم احمدی کو تیرے براہ، وغیرہ اشعار و عبارات کا مطلب بھی بالکل عیاں و آشکار ہو جاتا ہے حضرت نانوتویؒ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نافع اور ضار سمجھتے ہیں۔ اور نہ اس ارادہ سے آپ کو پکارتے اور مدد مانگتے ہیں۔ جیسا کہ ان کی بدعت نے سوز فہم سے یہ سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ محض عشق و محبت کے طور پر یہ نداء اور خطاب ہے۔ نہ یہ کہ عاجزانہ طریقہ سمجھ کر ان سے لڑائی لگائی گئی ہے وہ نہ اس نوعیت پر لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ دماغ پر فیوض قاسمی صحت)

حج

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے تین مرتبہ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو حج کرنے کی توفیق اور حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گنبدِ نبویؐ کی زیارت سے متبع ہونے کا شرف عطا فرمایا ہے۔ پہلا حج اسفند نے ۱۲۶۶ھ میں، دوسرا ۱۲۸۶ھ میں، تیسرا ۱۲۹۶ھ میں کیا ہے اور ان اسفار میں جو روحانی لذت اسفند نے محسوس کی وہ صرف انکا قلبِ مبارک ہی ادراک کر سکتا تھا۔ دوسرا حج اس کو سبھی ترکیبوں پر سمجھے اور بیان کرے تو کیسے بیان کرے۔

و اعظم ما یصون النون یوما

اذا دنت الخيام من الخیم

حفظ قرآن کریم

حضرت نانوتویؒ تصحیح کتب اور دینی بحث و مباحثہ اور سرگرمیوں میں ایسے مہمک رہتے تھے کہ ان اہم دینی کاموں سے فراغت کا وقت نہ آتا تھا اور دل میں قرآن کریم کے حفظ کا جو شوق تھا۔ وہ کب چین لینے دیتا تھا۔ بالآخر دو سال کے صرف دورِ رمضان میں قرآن لیا اور ایسی روانی کے ساتھ سناتے تھے کہ کوئی کہہ نہ سکتا تھا کہ حافظہ بھی شاید ایسا نہ بنا سکتا ہو۔ چنانچہ خود انکا اپنا بیان رسول اللہ ﷺ انمولاً محمد لعقبت صاحب ہیں، ہے۔

"فقط دو سال رمضان میں میں نے یاد کیا ہے اور حبیب یاد کیا پاؤ۔ سیدارہ کی قدر یا کچھ اس سے زیادہ یاد کر لیا اور حبیب سنایا۔ ایسا صاف سنایا۔ جیسے

اچھے پرانے حافظ

اور یہ کلام اللہ کی عظمت اور اس کی طوٹ پوری توجہ اور محبت کا نتیجہ تھا کہ اس کا ایک ایک حرف سینہ میں نقش ہو گیا۔

ترکی بھی شیریں تازی بھی شیریں
حرف محبت نہ ترکی نہ تازی،

مولانا محمد یعقوب نانوتوی تحریر فرماتے ہیں:-

وفاتِ حسرتِ آیات

چوتھی جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ میں بارہ سو ستانوے ہجری ہجرات کو بعد نماز ظہر دم آخر ہو گیا۔ انا لا
والہا الیہ راجعون اور یہ سائنس کی فتنوں کی جڑ کی گیت تھا، ایک قیامت ہو گئی۔ گھر میں وسعت نہ تھی مدرسہ میں لاکھ جواز رکھا اور بعد غسل کا
باہر ہر ایک قطعہ زمین کا حکیم شناق احمد صاحب نے خاص قبرستان کے لیے اسی وقت وقف کر دیا۔ وہاں اولیٰ مولانا صاحب کو دفن کیا اور
قبرستان میں شیخ الہند، حضرت مدنی وغیرہم کے مزار بنے۔ (تقد) باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی تینا بج ان بسینوں میں دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا
بعد مغرب دفن کیا اور اس خزانہ خوبی کو سپرد زمین کر دیا۔ اور ہاتھ جھاڑ کر چلے آئے۔ مولوی صاحب کے انتقال کا ساغرم و الم کبھی نہیں دیکھا
تھا۔ ایک ماہ تمام تھا۔ بہر حال شہر و عرفا اور سرسیدؒ اور دیگر بڑے بھڑانا نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر بہرکت صحبت مولانا جتنے لوگ تھے حدود شری سے باہر
ہوتے تھے۔ مگر الیاس عام ہر نے دیکھا نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ درجاتِ عالیٰ حبت میں نصیب فرمائے اور جہانِ فیض میں جگہ دے۔

اور اس طرح ہندوستان کا یہ درخشندہ ستارہ انگریز کے خلاف لڑنے والا بہادر و مجاہد، پادریوں کا تقاب کہ کرنا لانا ڈر نماظر
آریوں کے چھکے چھلنے والا بے باک ناقد۔ اسلام کے خلاف فتنوں کی سرکوبی کے لیے اپنی جان عزیز تک پیش کرنے والا جہاں نثار مسلمان
سفارت و اشیاء کا پتلا، قوم و ملت کا مہر و علوم و فیض کے احیاء کا علمبردار، حامی سنت اور ماحی بدعت۔ جگہ جگہ ہکا بکا سے تقاب
اسلام کو دل نشین کرنا والا فصیح بلیغ اور زار و لیل پر قناعت کرنا والا بے نفس صرفی اس دارالعل سے دارالآخر کو سدھار گیا۔

تاریخِ ہائے وفات

کیا چراغ گل ہوا _____ مولانا محمد یعقوب نانوتوی

_____ مصیبت پر مصیبت آئی

_____ مولوی فضل الرحمن دہلوی

_____ وفاتِ سربورہ عالم کا نمونہ ہے

_____ عبد الرحمن خاں مالک مبلغ نظامی کا منیر

رضی اللہ عنہما داتا

۱۲۹۷ء ہندوستان کے زبردست سفاروں ہزار حیف

(یہی تاریخ دن اور وقت شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا ہے)

تصانیف حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی متعدد تصانیف ہیں جو اپنے مرتبہ کی آپس ہی کی نظیر ہیں۔ حضرت نانوتویؒ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کر دیا جائے اور نام نہ بتایا جائے تو یہی کہا جائیگا کہ یہ کتابیں امام رازیؒ ام غزالی رحمۃ اللہ کی ہیں (قصص الاکابر) اور ان کتابوں کے متعلق بیجا طر پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جسے نماز ملکہ افتاب کرنا ہے۔ وہ چنگاری ان ہی دلوں میں پوشیدہ ہے۔ حضرت کی یہ تصانیف نہایت علمی ہیں۔ عام علماء کے بھی فہم سے بالاتر ہیں اور ان کتابوں کو لڑکچہ کو سمجھنا ہوتا ہے کہ علم کہتے ہیں۔ مشہور تصانیف یہ ہیں۔

- (۱) تقریر ولیدیر - اسلام کے اصول کلیہ پر جامع مانع تقریر۔
- (۲) تحفۃ الناس عن انکار اثر ابن عباسؓ - نظریں کے سات ہونے اور حضرت کے خاتم النبیین ہونے پر عجیب بحث جو اہات مخدورات عشرہ۔
- (۳) آب حیات - حضورؐ کی حیات برزخی کا بیان
- (۴) استقراء الاسلام - آریوں کے مقابل میں اسلامی اصول کی فلاسفی۔
- (۵) تصفیۃ العقائد - سر سید احمد خاں سے خط و کتابت۔
- (۶) حجۃ الاسلام - عیسائیوں کے مقابل میں اسلام کے اصول۔ اس کا مقدمہ شیخ السنہ نے لکھا ہے۔ "تم حجۃ الاسلام میں نہ لڑنا"۔
- (۷) قبلہ نما - نمازیں چھت کھجے سے شرک کا انہام اور اس کا شافی جواب
- (۸) صفحۃ لمحیہ - آریوں کے شبہات کا جواب
- (۹) مباحثہ شاہجہان پور - آریوں سے، مناظرہ کی مفصل رویت اور۔
- (۱۰) جمال قاسمی (مکتوبات) - الطائف قاسمی، فیضات قاسمی، الحق الصریح، مصباح الزواجر۔
- (۱۱) توشیح الامام - مسند فاتح خلف الامام پر بحث۔ الدلیل الحکم، فتویٰ متعلقہ اجرت تعلیم۔
- (۱۲) اجرتہ الرعین - تحفۃ الناس پر علمائے دلم پور کے اعتراضات کا جواب
- (۱۳) دیرۃ الشیخ - شیعہ قائد مفصل بحث۔ انبیاء المؤمنین، قصائد القاسمی،

آپ کی سب سے بڑی علمی یادگار اور زندہ جاوید یادگار دارالعلوم دیوبند ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ حضرت مولانا امجد علی صاحب دہلوی دارالعلوم دیوبند کے قلم سے شریک اشاعت ہے۔

جناب مستطاب ازام المدظلہ

۱۳۲

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ قتل مسلم بظن حربی باجارت قرآن است و قولہ بالخطأ
استثناء متصل است زیرا کہ در ماقبل عنوان عمد نیست کہ استثناء منقطع باشد بلکہ
عنوان و ما کان المؤمن ان یقتل مؤمنًا است کہ مراد از ان قتل بالاختیار است
و قتل مسلم بظن حربی ہم باختیار است نص قرآن آنرا خطا قرار دادہ۔ حقیقت خطا
در عرف فقہاء آن دیدیم کہ فاعل فعلی می گردید اختیار و سے فعلی درگردد مانند آنکہ زور
نشانہ را رسید بر آدمی۔ و قتل مسلم بظن حربی اینگونہ نیست بلکہ همان کار کردی می خواست
و لهذا خرسی میگوید کہ این قتل عمد بود لیکن شرع او را خطا نہاد لاجرم حنفیہ در اقسام
قتل از اول جنایات این قسم را قسم متقل نہادند و تصریح کردند کہ دیت درین قسم
بر عاقلہ است۔ مسئلہ قتل مسلم بظن حربی و قتل بصوت النقاء صغین در پیرایہ یک سالہ
است کہ دوبار مذکورہ و صاحب کنز بار دوم حذف کردہ چہ نکرار است۔

و آنچه صاحب احکام القرآن بر بودن این استثناء استثناء متصل اعتراض کردہ کہ این قتل
در زعم قاتل خطا نیست لاجرم استثناء منقطع باشد در جواب آن گفتہ اند کہ چون در ذہن قاتل
مخطوہ است کہ اگر این مقتول مسلم باشد شرع آنرا خطا قرار دہد پس برینا تقدیر نزد سے ہم خطا
تواند بود و استثناء متصل خواهد بود چرا کہ مستثنی منہ قتل بالاختیار است نہ بالعمد۔
پس نزول آیت در امثال قصہ قتلیمان موجب فراز این قسم گردید بخلاف قتل ابن و قتل مقضی علیہ لرجم
کہ بے اجازت شرع و بے ضرورت است آن اقسام را عمد کہ شبہہ قصاص ساقط شود و قرار دادند۔

قاتل مقضی علیہ بالرجم بجز رقبہ ہیچگونہ عامل المسلمین نیست بمر خود میکند۔ قاضی و جلاد خطا
معروف و رفقہ (کہ کار می خواست شد از ان کار می و گ) نکرادہ و نہ داخل نص تحمل از بیت المال تاعانہ
خطا قاضی و جلاد اگر چہ خطا معروف و رفقہ نیست تا ہم اگر خطائی القصد داشتہ آیر نیابت
از عامہ دارند بخلاف قاتل مسلم بظن حربی کہ ہیچگونہ نیابت ندارد۔ نیابت از کس
چیز ذر است و عود نفع بسوئے وے چیز دیگر و السلام محمد و نور عفا اللہ عنہ

عکس تحریر حضرت علامہ آوارشاد صاحب کتب کبیری۔ یہ اردو خط تحریر حکیم نقاشی کے نام ہے۔ میں علامہ کو اس نوری و مدظلہ سے ملا ہوا ہوں۔

خطا قاضی و جلاد اگر چہ خطا معروف و رفقہ نیست تا ہم اگر خطائی القصد داشتہ آیر نیابت از عامہ دارند بخلاف قاتل مسلم بظن حربی کہ ہیچگونہ نیابت ندارد۔ نیابت از کس چیز ذر است و عود نفع بسوئے وے چیز دیگر و السلام محمد و نور عفا اللہ عنہ

امام ربانی حضرت میرزا غلامرضا شید احمد گنگوہی

۵۱۳۲۲
۶۱۹۰۵



۵۱۳۲۲
۶۱۸۲۸

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ (مذکرۃ الرشید)
عبد الرشید ارشد

شاد باش اے خستہ ہجران بلا کر پیسے زرد و قورمال میرسد تازہ باش اے تشنہ وادی غم کنز برایت آب حیوان میر
درد دل افسردہ ہدے میدد مردہ تن را مژدہ جاں میرسد دُور شوئے ظلمتِ شامِ فراق کافان وصل تاباں میر
شوقِ کن لے لب لب کلزار عشق کاں گل نواز گلستاں میرسد بہرِ رشد خلق می آید و مشید قطب عالم بحرِ عرفاں میر
(از تذکرۃ الرشید ص ۳۳)

ولادت

امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۶ء بروز سوموار چاشت کے وقت اس ولادت گلی میں تشریف لائے۔ گویا سووار کی ولادت میں غیر اختیاری سنت نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل کیا۔ آپ کی پیدائش مشہور تاریخ میں مقام گنگوہی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے مزار مبارک سے مشرقی جانب تقریباً تیس قدم دُور اپنے جدی مکان میں ہوئی۔

سلسلہ نسب

آپ والد ماجد اور والدہ ماجدہ دولہ کی جانب سے شریف النسب اور نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ابوالحسن اور آپ کا نسبی سلسلہ جدہ کی جانب سے گیارہویں پشت پر قطب العالم شیخ المشائخ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ملتے۔ اور روحانی سلسلہ بھی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ حضرت شیخ موصوف سے ملتا ہے۔ گویا آپ نسبی اور روحانی دونوں طور پر گنگوہی ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ہوئے کہ آپ کی ذات گرامی قدر سے گنگوہ کا نام دوبارہ چار و انگ عالم میں پھیلا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ گنگوہ کی گذشتہ شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ صاحب تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی مذکرۃ الرشید میں رقم فرماتے ہیں :-

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۴۵ھ ہجری کو اس عالم جسمانی سے انقطاع فرمایا اور تیسری صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان الہی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نو بہاں نے اپنے وجود مسعود سے خاندان عالم محور اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خاندان اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال و دیوان پڑی ہوئی تھی۔ یعنی تیسری صدی کے پورے اعتقاد پر شیخ عبدالقدوس کے وصال کا سال اور مہینہ اور دن بھی ۲۳ جمادی الآخر ۱۲۴۵ھ کا روز جب آیا ہے تو ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ پورے سات ماہ اور سات دن کی عمر پانچکے تھے۔ (تذکرۃ الرشید ص ۵۵)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی داد و دیال در اصل قصبہ رام پور ضلع سمان پور میں تھی مگر حضرت کے دادا فاضل بیر بنحش صاحب مرحوم نے گنگوہ وطن بنالیا تھا۔ اس لیے آئندہ نسل کا انتساب گنگوہ کی جانب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح نسب نسبی، روحانی اور وطنی طور پر ان کا جانشین ہو۔

والدین

حضرت مولانا کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحب گنگوہ ہی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت ہوئی اور پھر یہیں انصاف میں مولانا محمد تقی صاحب کی تربیت سے شادی ہوئی۔ مولانا محمد تقی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی محمد شفیع صاحب

تحریک آزادی میں شہید ہوئے۔ مولانا محمد تقی صاحب حضرت مولانا گنگوہی کے خسر بھی ہیں اور ماموں بھی کیونکہ ان کی صاحبزادی حدیجہ حضرت مولانا کے عقد میں آئیں۔ حکیم مولانا مولوی مسعود احمد گنگوہی اور مولانا مولوی محمود احمد صاحب (صاحبزادگان حضرت گنگوہی) اسی عفت تک خاتون سے پیدا ہوئے۔

حضرت مولانا کے والد ماجد اپنے زمانہ میں مقدس عالم اور بڑے دینی مقتدا تھے۔ آپ نے تعلیم شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے علماء سے حاصل کی اور روحانی تربیت حضرت مولانا شاہ غلام علی محمد دہلوی سے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ کامل سے مولانا ہدایت احمد مرحوم سلوک و تقویٰ سے بھی خاصہ حصہ پائے ہوئے تھے۔ نہایت خوشنویس اور زود نویس تھے۔ تعلیمات اور تعویذ گزشتے بھی کیا کرتے تھے اور ہدایت مولانا صاحب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد سے مجاز بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بیست سال کی عمر میں ۱۳۵۷ھ میں اس جہاں سے اٹھایا۔ جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ اور حضرت مولانا صرف والدہ ماجدہ ہی کی تربیت میں رہ گئے اور سرپرستی جد امجد قاضی پرچش صاحب نے کی۔

والدہ ماجدہ حضرت کی والدہ ماجدہ نہایت پارسا اور عابدہ زاہدہ تھیں۔ باوجودیکہ عورت ذات تھیں۔ اور ان کے شدید تعویذ گزشتے بھی کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ ٹوٹے ٹوٹوں سے طبعاً مستفاد اور خائف تھیں۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی والدہ ماجدہ سے سنا ہوا ایک قصہ سنایا کرتے تھے۔ کہ میری والدہ ماجدہ بیان فرمایا کرتی تھیں کہ:-

رشید احمد جب توجہ تھا چھوٹا بچہ تھا چھوٹا بچہ جن نظر آتا تھا میں نے دیکھا کہ وہ تیری چارپائی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور مجھے سے کہا کہ تو فلاں مزار پر عطر کے چھوٹے چڑھاؤرنہ میں تیرے روکے کو مار دو لوں گا۔ والدہ فرماتی تھیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اچھا مار ڈال تیرے سامنے لیتا تو ہے۔ والدہ فرماتی تھیں کہ جب کبھی اللہ بخش نظر آتا اور یہ دھمکیاں دیتا اور ڈراوے دکھاتا تھا میں تو اس کو میری جواب دیتی تھی کہ میں تو ہرگز بھی نہ چڑھاؤنگی اگر تجھ سے مارا جائے تو مار ڈال اس کو رے اور صاف جواب پر بھی تیرا مال بیکار نہ کر سکا اور مارنا تو مانا تھتھے ڈرا بھی نہ سکا سکا

حضرت مولانا کا بچپن

جن لوگوں نے آگے چل کر بنا آدی بنا اور لوگوں کی اصلاح و فلاح میں اپنی زندگی بسر کرنا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ انہیں شروع ہی سے بیکار باتوں۔ لایعن حرکتوں اور فضول کھیل کود سے دور بلکہ مستفاد رکھتا ہے اور جن لوگوں نے تنبیہ و احیائے دین کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے وہ بچپن ہی سے اپنی فطرت میں بقیہ سنت و شریعت ہوتے ہیں یہ نہیں کہ بڑے ہو کر محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے یا ظن و تشنیع سے بچنے کے لیے شرعی شکل و صورت بنائی، تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں۔

لَمْ تَقْوِدُونَ مَالًا تَفْعَلُونَ (القرآن) کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں

یہ لوگ اگرچہ تعلیم و تدبیر حاصل کرتے ہیں لیکن وہی طور پر سلیم الفطرت ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تعلیم و تربیت نہ بھی ہوتی تو اپنی سلامتی طبع سے بہر حال مراعتِ تقیم پر چلتے چاہے شیخ و مرشد نہ ہوتے۔ حضرت مولانا گنگوہی بچپن ہی سے یہ بالائے سرکش نہ ہو شرمندی می تافت ستارہ بلند می

۱۳۳۳ھ وفات ۲۷ صفر ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۴ء - حادث کامل اور جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔
۱۳۳۳ھ تذکرۃ الرشید ص ۲۴۷ - مولانا شاہ غلام علی محمد دہلوی پیدائش ۱۳۵۷ھ مطابق

کامندان تھے چنانچہ اس سلسلے میں ان کے بچپن کی بیسیوں حکایات میں سے دو چار پیش کی جاتی ہیں

تھو میر سے نفرت آپ نے اپنے مکان میں کوئی تصویر نہیں رہنے دی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے ساڑھے چار برس چھوٹی آپ کی صوف باپ شامل علاقائی ہیں۔ بچپن میں گگڑیاں کھیتی تھیں حضرت قدس سرہ جس وقت باہر سے تشریف لاتے تو گگڑیوں کو توڑ مروڑ کر کھینک دیا کرتے تھے لہ

خدا اور رسول پر پختہ یقین ایک مرتبہ آٹائے و عظم میں منہ دیا :-

”میں اپنے آپ کو کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے طفولیت ہی میں مجھے وہ یقین عطا فرمایا تھا کہ لوگوں کے ساتھ کھیلنا اور جمعہ کا وقت آجائے تو کھیل چھوڑ کر چلا آتا اور لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ہم نے اپنے ماموں صاحب سے سنا ہے کہ تین جمعہ کا چھوڑنے والا (جہاں جمعہ ذمہ ہو) منافق لکھا جاتا ہے لوگوں کو کہتا ہوں آخر مسلمان ہیں خدا اور رسول پر تو یقین ہوگا ہی، پھر ایسے غافل کہوت ہیں شہ

اندازہ کیجیے کہ جس فرمان (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) پر لوگ بڑے ہو کر عمل نہیں کرتے حضرت مولانا بچپن میں اس کا کتنا خیال کرتے اور کتنے یقین رکھتے ہیں کہ وہ آدمی منافق ہو جائے گا جو مسلسل تین جمعے چھوڑ دے گا، اور بچوں کے ساتھ کھیلنے وغیرہ میں اکثر ایسا ہوتا کہ اکثر ان کے ساتھ شریک نہ ہونے بلکہ

ایک طرف پیٹھ جاتے اور یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ بھئی تم سب کھیلو۔ میں تمہارے پرشوں کی حفاظت کرونگا۔

بچپن ہی میں عبرت و نصیحت آموزی تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ آپ کی عمر چار یا پانچ سال کی تھی کہ والدہ ماجدہ آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی عنایت احمد کو دودھ بانٹ کر دیا، آپ بتقاضا

مصدقہ کرنے لگے کہ مجھے دودھ کم دیا ہے، بڑے بھائی نے دو ٹوک کر دودھ پی لیا، مولانا کو زیادہ تو کیا ملنا، اپنا حصہ بھی گیا، بس اسی عمر میں سبق حاصل کر لیا کہ بے جا صدقہ نہ دینا، اپنا نقصان اور حق کا ضائع کرنا ہے، چنانچہ اس کے بعد پھر کبھی صدقہ نہیں کی، فرمایا کرتے کہ ”مجھے دودھ کے قصہ سے یہ تجربہ حاصل ہو چکا ہے کہ صدقہ کرنے کا نتیجہ اپنے اصل حصہ سے محروم ہو جانا ہے“

ایک تمغائے ہوا نمردی ہے ناسخ ترک حرص عمر بھر میں ہے دم آب اکتفا تلوار کو

بچپن میں قناعت و استقلال جس عظیم ہمتی نے لوگوں کو قناعت و استقلال اور صبر و شکر کی تلقین کرنا تھی، اور لوگوں کے دلوں سے حرص و طمع اور غرض و مہاجہ اور دنیا کی محبت کو نکال کلاس میں خدا اور رسول

محبت پیدا کرنا تھی، جزوی تھا کہ وہ خود اس پر بچپن ہی سے عامل ہو، صبر و قناعت اور استقامت کا یہ جو ہر بچپن میں کس قدر تھا اس کی مث تذکرۃ الرشید سے پڑھیے :-

”ایام طفولیت میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بنار میں مبتلا ہوئے اور مرض کو اس قدر متاد ہوگا کہ کال چار سال تک بنار سے

بیچنا نہ چھوڑا۔ ابام مرض اور آٹھ ماہ میں طبیب نے صرف مونگ کو غذا بنا دیا اور تمام اشیاء سے پرہیز کر رکھا تھا۔ چنانچہ حضرت نے اس طویل مدت تک مونگ ہی پر اکتفا فرمایا۔ اور متواتر چار سال تک مونگ کی دال اور مونگ کی روٹی یا مونگ کی کچھری تناول فرمائی نہ کبھی آٹے نہ گھیرائے نہ شکایت کی نہ روئی صورت بنائی نہ دوسری چیز کی خواہش کی اور نہ اس ایک قسم کے کھانے سے بھی پرہیز لائے۔

ایک طعام پر گزراں ہوا اور پختہ عمر کے لوگوں کو چاہے وہ کتنا لذیذ ہی کیوں نہ ہو کس قدر شکل ہے اس کا اندازہ ہر ایک کر سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک بچے کے صبر اور حوصلہ کو دیکھیے کہ کس طرح چار سال ایک کھانے پر اکتفا کی ہے۔

راستبازی وغیرت مندی
آپ چھ یا سات سال کے تھے کہ آپ کے چچا زاد بھائی عبداللہ اور محمد حسن کھیلنے باتیں کرتے پانچ چھ میل دور آٹینڈ لے گئے۔ چچا زاد بھائیوں کی ہمراہی اور طفولیت نے یہ سرفراز معلوم نہ ہونے دیا۔ لیکن جب ان پہنچے تو خیال آ گیا کہ بھائی تو اپنی خالہ کے پاس جا بٹھریں گے۔ مگر اسے طفیل تو کہاں جاسے گا (حالانکہ ان کی خالہ ان کی بھی خالہ تھی مگر دور کی) اور کس نیت کے تقاضا سے کھانا کھائے گا۔ اور رات بٹھریں گے۔ اس خیال سے آپ اس قدر پریشان اور نام نہ ہونے کہ پسینہ میں نہا گئے۔ خیر رات گزری۔ اس طرح گزری۔ اگلے دن واپسی پر جب والدہ نے بغیر حاضری اور گشت کی کی وجہ پوچھی تو سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا کہ میں تو جانا نہ تھا بھائی عبداللہ عند کس کے لے گئے اور مجھے دوسرے گھر روٹی کھلائی۔ بلا تعلق مجھے اجنبی ہو گئی روٹی کھا تے جیسی شرم آئی ہے۔ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ میں نے روٹی کیا کھائی روٹی نے مجھے کھایا ہے

نماز کا شوق اور غلبی حفاظت
سارے چھ سال کی عمر تھی کہ آپ سے ایک ایسی کرامت حسید اور استقلال و توکل کا ظہور ہوا کہ جس سے آپ کے قبول بارگاہِ احادیث ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ آپ بچپن ہی میں نماز کے پابند تھے۔ جمیع کا قصہ تو گزر رہی چکا۔ عام نمازوں کے اوقات کا بھی خیال رکھتے۔ ایک دن شام کو بیٹھتے بیٹھتے قصبہ سے باہر نکل گئے وہاں غروبِ آفتاب کا وقت ہو گیا تو احساس ہوا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا۔ عباس کے پھولوں کی دو چھڑیاں ہاتھ میں لیے سرعت پلٹے پہلے گھر آئے اور والدہ کو چھڑیاں پکڑائیں کہ یہ رکھو میں نماز پڑھنے جاتا ہوں۔ چھپتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی تھی۔ وضو کے لیے لوگوں کی طرف سے توجہ نہ تھی۔ دیر میں دیر اور ہوئی۔ گھبرا کر پانی کھینچنے کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ ڈول وزنی تھا گھبراہٹ میں دسی پاؤں میں الجھ رہی تھی ہاتھ اٹاں جماعت کے فوت ہونے کے حشر سے چھوٹے ہوئے تھے۔ ذرا سا جھٹکا لگا اور دم سے کنوئیں میں گر گئے۔ نمازیوں کو نماز میں احساس ہوا کہ کوئی غائب ہو گیا۔ امام صاحب نے جلدی نماز پوری کرائی۔ اور تمام نمازی جلد کنوئیں کی طرف لپکے۔ اب پھر ایکسہ کنوئیں میں جھانکنے لگا۔ اندر سے آواز آئی ہے۔ گھبراؤ نہیں میں بہت آرام سے بیٹھا ہوں۔ قدرت حق تعالیٰ یہ ہوئی کہ ڈول اٹا پانی میں گرا آپ جب گرے تو حواس مجتمع کر کے فوراً اس پر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو باہر نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ پاؤں کی چھوٹی انگلی میں خیف سی خراش آئی ہے اور سب۔ اب اس نصرت سے استقامت و استقلال اور مصیبت سے نہ گھبرانا۔ اطمینان سے نماز کے ختم ہونے تک بیٹھے رہنا۔ کشائش و فرج من اللہ کا انتظار و درمیں اطمینان دلانا۔ خدا پر توکل و اعتماد اور مقدمات نماز میں تکالیف کا ایسا تحمل کہ کلمہ شکایت زبان پر نہ آئے یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ابتداء سے آپ اللہ کی حفاظت و رہنمائی میں فطرت کی راہوں پر چلتے ہوئے عمدہ خصائل و عادات کے حامل تھے۔ غرضیکہ بقول صاحب تذکرۃ الرشید۔

حق تعالیٰ شانہ نے علمائے زمانہ کے مقتدا بننے والے امام کو ابتدا ہی سے عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کے ساتھ سنوارا اور آراستہ فرمایا تھا۔ بچپن ہی میں ایک خدا ترس، رحمدل، عابد، خوش خلق، متین و بخیرہ و بخیرہ و با حیا، صابر و متقل مزاج، عظیم و بردبار، مہذب و با ادب اور نہایت درجہ سلیم الطبع ثابت ہو چکے تھے آپ کو خدا اور اصرار، ہٹ دھرمی و شرات چھوڑا دین اور بے تہذیب و غیر تربیت یافتہ بچوں کی عادتوں سے طبعاً نفرت تھی۔ آپ کا چھ سات سال تک ناز پروردگی اور لاڈ پیداکرنا اور آٹھویں سال یتیمی یعنی سرپرست و مربی کا سایہ سر سے اٹھ جانا جن عادات کو مقتضی ہے۔ ان برخصلتوں کا آپ میں نام بھی نہ تھا۔

تعلیم - ذہانت

آپ کے قرآن پاک ناظرہ پڑھنے کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں سے پڑھا غالباً گھر ہی میں والدہ ماجدہ سے یا والد ماجد سے پڑھ لیا ہوگا۔ آپ کے سوانح میں آپ کے پہلے استاد کا اسم گرامی میاں جی قنبر بخش صاحب مرحوم ہے۔ آپ نے ان سے چند دن بعد ہی اپنی ذہانت و ذکاوت کا اعتراف کر لیا۔ میاں جی مرحوم حضرت کے نخیال کی طرف سے رشہ دار بھی تھے لہذا غایت شغف کے ساتھ ساتھ استادانہ سختی و ذہانت ڈپٹ بھی رکھتے تھے۔ ان کے بعد فارسی آپ نے کراں میں اپنے منجملے ماموں مولوی محمد لقی مرحوم سے پڑھی جو فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ اسی طرح فارسی کا کچھ حصہ مولوی محمد نفوس مرحوم سے پڑھا۔ فارسی پڑھنے کے بعد عربی کا شوق ہوا اور آپ نے ابتدائی صرف و نحو کی کتابیں جناب مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں۔ رامپور حضرت کی داد حیا اور آپ کے دادا فاضل پیر بخش کا اصل مسکن تھا۔ لہذا آپ کی روحانی تربیت کا سلسلہ بھی ادھر منتقل ہوا۔ مولوی محمد بخش موصوف آپ کے نہایت شفیق استاد تھے آپ کو عرب البحر اور دلائل الخیرات کی اجازت اپنے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہی سے ملی۔ مولوی صاحب نے ابتدائی کتب پڑھانے کے بعد مشورہ کر آپ تکمیل تعلیم کے لیے دہلی چلے جائیں۔ وہاں بڑے بڑے کامل الفن اساتذہ موجود ہیں۔ یہ قصہ ۱۲۶۸ھ کا ہے جب کہ آپ ہدایت النور پڑھتے تھے۔ آپ نے استاد کے صاحب مشورہ پر دہلی کا سفر کیا۔

ان دنوں دہلی میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب، مولانا شاہ احمد سعید صاحب اور حضرت مولانا ملک علی صاحب کی شہرت تھی۔ اہل الذکر عربک سکول میں صدر مدرس تھے۔ اپنی علمی قابلیت اور فکری صلاحیتوں کی وجہ سے آفاقی شہرت کے

مالک مولانا ملک علی ناوٹہ کے رہنے والے تھے ۱۲۶۸ھ کو ایام تعطیل گزارنے گھر گئے تو واسطی پر حضرت مولانا محمد قاسم ناوٹوی کو تعلیم کے لیے اپنے سارے آئے۔ حضرت گنگوہی ۱۲۶۸ھ کو دہلی پہنچے۔ ادھر ادھر چھ پرچہ را کہ در سا کہوں کو جا پہنچے رہے لیکن کہیں تسلی نہ ہوئی ایک دن مولانا ملک علی کے ہاں پہنچے تو اتنے ہی دل لگ گیا اور فیصلہ کر لیا کہ یہیں پڑھوں گا۔ اللہ کو منفقو تھا کہ اپنے زمانہ کے شمس و قمر ایک جگہ تعلیم حاصل کر کے برصغیر میں شائع

۱۹۔ تذکرہ الرشید ص ۱۹۰۔ علی مولانا ملک علی آپ حضرت مولانا یعقوب ناوٹوی کے والد ماجد تھے۔ آپ نے درسیات کا اکثر حصہ بلکہ یوں کہیے کہ جملہ علوم و فنون جناب مولانا رشید الدین خاں سے پڑھے۔ جو حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد و ارشد تلامذہ ہیں مولانا کریم الدین اپنی کتاب "طبقات الشعراء ہند" میں لکھتے ہیں:-

"ہند کے زعم میں یہ ہے کہ کسی ایسا فائدہ لوگوں نے کسی فاضل سے نہ اٹھایا ہوگا۔ اگر ان کو ان علم اور غزن امر را کہا جائے تو بجا ہے۔ کوئی کتاب کسی کی تشکیل سے تشکیل ان کے پاس ہے حاجہ حفظ پڑھاں گے گویا ان کو حفظ ہے" الخ

حضرت ناوٹوی مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد یعقوب ناوٹوی اور سرسید احمد خاں مرحوم جیسے مشاہیر نے کثرت

کتابیں حضرت مولانا ملک علی ہی سے پڑھی ہیں ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔

آب و سنت کی ایسی تحریک چلائی کہ تاقیامت اس کا سلسلہ چلتا رہے چنانچہ محمد فاکم کو نافذ سے رشید احمد کو گلوہ سے لاکر ایک استاد کے دامن سے باغضیاء
بظہن شاگرد کو لانا استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح قابل استاد کو ذکی شاگرد کی۔ اپنے دور کے دوسرے ذہین لڑکے مولانا غلوک جیسے نادرہ
وزگار استاد کو مل گئے۔ اور انہوں نے ان کو ایسی تعلیم دی کہ ان کی وجہ سے پورا ہندوستان علم دین سے جگمگا اٹھا۔

ذہانت و ذکاوت

دونوں ساتھی مولانا محمد فاکم کو نافذ تو ہی اور مولانا رشید احمد گلگویی میرزاہ۔ قاضی۔ صدر اشس باغہ ایسے پڑھا کرتے
تھے جیسے حافظ منزل سنا ہے کبھی کہیں کوئی لفظ پوچھنا ہوتا تو پوچھ لیتے ورنہ ترجمہ تک نہ کرتے فر فر پڑھتے
جاتے۔ دوسرے شاگردوں کو خیال ہوتا کہ یونہی عبارت پڑھے جاتے ہیں، سمجھتے کچھ نہیں۔ کتابوں کے ستم کر لینے کا نام چاہتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ استاد
سے شکایت کی۔ استاد نے فرمایا کہ ————— میرے سامنے طالب علم بلے بجھے نہیں چل سکتا۔

استاذ کرام

مولانا غلوک علی کے علاوہ آپ نے بعض علوم عقلیہ مولانا مفتی عبداللہ علیؒ سے بھی پڑھے اور حدیث تدریۃ العلماء حضرت
مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مدنی سے پڑھی۔ نافذ تو ہی و گلوہ بھی دو شاگرد یہاں بھی (یعنی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مدنی کے پاس)
فی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے استاد کی خصوصی عنایات کے مستحق ٹھہرے۔

مولانا مفتی عبداللہ علیؒ آپ کی اصل کثیر ہے۔ پیدائش ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۹ء بمقام دہلی۔ تلمیذ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ، مولانا شاہ عبدالقادرؒ، مولانا شاہ
برہما حقؒ، انگریز کی جانب سے دہلی کے صدر الصدور اور مفتی تھے ۱۲۵۵ھ میں "فتویٰ جہاد کے الزام میں حاکم و ضبط ہو گئی۔ چند ماہ کی نظر بندی اور
نقیق کے بعد بائی ہوئی اور کچھ جہاد ادا پس مل گئی۔ اردو، فارسی، عربی کے اشعار لکھتے اور آئندہ تخلص کرتے تھے۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ
۱۸۶۸ء بروز جمعہ وفات پائی۔ "چرخ و دو جہاں بود سے تاریخ نکلتی ہے۔ فواب یوسف علی والیے رامپور۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور مرید خاں
بیرواں کے شاگردوں میں سے ہیں و قلموس المشاہیر ج ۲ ص ۳۷۲

شاہ عبدالغنی صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ علم ظاہری و باطنی میں شہرۃ آفاق۔ علماء صلحاء میں مذکور و خلاصہ دفعیہ اور معروف محدث تھے۔ ابن ماجہ
حاشیہ بنام "انجام الحاجۃ" آپ ہی کا ہے۔ اپنے وصال سے چند سال قبل ۱۲۵۵ھ کے قصہ میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے۔ اکثر حرم اطہر میں سترق و
راقب رہتے۔ ادب سے خائف و ترساں روضہ اطہر سے کچھ دور بیٹھے۔ اور زائرین کے شور و غل پر کانپ اٹھتے اور نہایت آہستہ آہستہ فرماتے —————
"صاحب شور نہ کرو و بکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے ہیں" ————— آپ وہاں حدیث کا درس بھی دیتے تھے۔ حجازی اور اطرا
الم کے علماء آپ کے علمی پایہ اور فن حدیث کے تجرد و علم و تربیت کے قابل و معترف تھے۔ ۹۰ برسوں میں تاریخ چھ عمر الحرام ۱۲۹۵ھ ہجری ۱۸۷۸ء سال انتقال
پایا۔ اور جنت البقیع میں قبر عثمانی کے متصل مدفون ہوئے رحمۃ اللہ علیہ۔ شاہ عبدالغنی کے دادا شاہ صفی القادر اپنے جد امجد کے مزار سرمد سے ہجرت
کر کر (سکون کے غلبہ میں) مع اہل و عیال مصطفیٰ آباد ریاست رامپور میں قیام کریں ہو گئے تھے۔ یہیں شاہ عبدالغنی ۲۵ شعبان ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے
مدنی روحانی استقامت کے لیے اکثر مدنی آئے۔ حضرت شہداء علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔ ان کے انتقال کے بعد علماء و فضلاء کے اہل پر حضرت
شاہ صاحب کی خانقاہ کو آباد کرنے کے لیے مدنی تشریف لے آئے۔

شاہ عبدالغنی صاحب اپنے جد بزرگوار حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ نقشبندیہ کے متمسک اور اپنے والد ماجد شاہ ابوسعید قدس سرہ سے
یار تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب و سلوک آنحضرت پر حضرت مجدد صاحب سے جا ملتا ہے۔
(مفضل مظالمہ کے لیے تذکرۃ الرشید ص ۲۹ دیکھئے)

میریدوں میں حضرت شاہ کی توجہ کا مرکز زیادہ تر حضرت مولانا رفیع الدین صاحب دیوبندی مہتمم مدرسہ عالیہ دہلی تھے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ احمد سعید صاحب قدس سرہ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ نے معطلات کی اکثر کتب اور تفسیر، اصول فقہ و معانی وغیرہ کی اکثر کتابیں مولانا مملوک علی سے۔ اور صحاح ستہ کی کل کتابیں عرفاً حضرت شاہ عبدالغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ تھوڑا بہت تلمذ جو دوسرا سادہ سے رہا ان میں مفتی صدر الدین صاحب۔ مولانا شاہ احمد سعید صاحب اور قاضی احمد بن صاحب پنجابی ہیں۔ رحمہم اللہ جامعین

تعلیمی مدت

آپ کی دہلی میں تعلیمی مدت تقریباً چار سال بنتی ہے اس مدت کو ملاحظہ کیجئے اور پھر آپ کے مبلغ علم اور استعداد کو دیکھ کر جس کا عاقلین بھی اعتراف کرتے ہیں۔ دونوں طرف کو دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا ہے کہ علم کا اتنا سمندر آپ نے اسی تھوڑی مدت میں کیسے پی لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت ذہین ذکی اور فطین تھے۔ شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں بشکل سونے کھانے اور ضروریات میں سانس اٹھ کھٹے صرف کرتے ہوں گے۔ باقی سارا وقت مطالعہ و کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ اور مطالعہ میں آپ اس قدر تہمک ہوتا کہ پاس پڑا ہوا کھانا کوئی درست اٹھا کر لے جاتا مگر آپ کو خبر نہ ہوتی۔ بار بار ایسا ہوا کہ مطالعہ کرتے کرتے سو گئے۔ صبح اٹھے تو معلوم ہوا کہ کھانا شام کا مگر طرح پڑا ہے رات کھا یا نہیں ہے۔ مدرسہ کو آتے جاتے ابھر دھڑکھی نہ دیکھتے۔

ایام طالب علمی

ایام طالب علمی میں آپ نے خود دونوں کا کسی پر بار نہ ڈالا تین روپے ماہوار آپ کے ماموں بھیجا کرتے تھے۔ اس میں سوکھی روٹی اور دال ترکاری جو وقت پر مل جاتی کھا لیتے۔ اور اپنی تین روپے میں صابن تیل۔ اصلاح خط وغیرہ ہوا۔ آپ کے علمی ذوق اور اہنگ کا خاصہ مشہرہ تھا۔ اسی بنا پر کئی بڑے لوگ آپ سے محبت سے ملتے۔ اور ان لوگوں میں ہر طرح کے ہوتے کئی ہندسے اور کیا گارے۔ انہوں نے فراست سے آپ کو پہچان کر بہت محبت آپ کو کیا کہ انہیں بتانا اور سکھانا چاہا۔ مگر آپ نے صاف انکار کر دیا۔ آپ کی اور فائزہ طبیعت نے ایسی چیزوں کی طرف مطلقاً توجہ نہ کی تھی دیر تھی کہ آپ ابھی جگہ پر پہنچے کہ جس کے متعلق شاعر کہتا ہے ع

آنکہ فکر راہ بنظر کیب گمشد

فرماتے تھے کہ ایک شخص نے کیا کیا بنا کر دکھا بھی دی اور ایک نے نسخہ دے دیا فرمایا کہ وہ میری ترمذی میں پڑا رہا۔ گنگوہی نے پر دیکھا کتاب سے نکل آیا لیکن میان بھی اسے آزمائے کاشوق نہیں چرایا۔ ایک شخص کا نام لے کر فرمایا کہ وہ پاس بیٹھے تھے انہوں نے نسخہ کی نقل مانگی ہم بخل کی کیا ضرورت تھی۔ نقل دے دی۔ اور اصل کو اسی وقت بھاڑ ڈالا۔ اس کے بعد غالباً فرمایا کہ اس شخص نے نسخہ آزمایا تو صحیح نکلا۔

زمانہ طالب علمی میں اساتذہ کی دونوں حضرات پر جو شفقتیں تھیں۔ ان کو اگر بیان کیا جائے تو ایک دفتر درکار ہے۔ آپ کے استاد مفتی صدر الدین صاحب مولود۔ قیام دہلی کو جائز کہتے تھے۔ اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے کسی رسوم و رواج اور بدعات سے سخت مجتنب تھے مفتی صاحب کو بھی پسند تھا لیکن اس کے باوجود شفقت فرماتے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک دفعہ دہلی آنا ہوا اور مفتی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ برہنہ محبت سے ملے سب حالات پوچھے اور کہا کہ میان قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا مطیع ہیں آٹھ دس روپے ماہ پر قصبہ کا کام کرتے ہیں۔ تو مفتی صاحب نہایت تعجب کے ساتھ بار بار پتہ دہاتے تھے کہ "قاسم ایسا ستا۔ قاسم ایسا ستا۔" پھر فرمایا کہ "فقیر ہو گئے فقیر ہو گئے" اس کے بعد نہایت محبت اور شفقت سے پوچھا "میان رشیدیہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اور تم دونوں کا ایک جگہ کھالیں حضرت نے مناسب طرز پر جواب دیا اور آخر مفتی صاحب کے اصرار سے کھانا وہیں تناول فرمایا۔ مفتی صاحب فرماتے گئے کہ "میان رشیدیہ تم ہی اس ہو کہ تارک دیا ہو گئے ہماری نوکری جائز نہیں تھی اور ہم خوب سمجھتے تھے کہ جائز نہیں مگر بدو علم اس کو جائز رکھتے تھے۔"

سلف حکمران رشیدیہ، مفتی صاحب دہلی میں انگریز حکومت کی طرف سے صدرالعدو رہتے اور کافی تنخواہ پاتے تھے۔

پہلے شاگرد دارالعلوم کے پہلے مدرس

زمانہ طالب علمی میں اپنی پڑوسی کتابوں کو پڑھانے کا بھی شوق رکھتے تھے نادر غوث
میں پڑھاتے تاکہ حرج نہ ہو۔ چنانچہ سب سے پہلی جماعت جو آپ سے پڑھنے لگی

وہ ہے جس میں علامہ غوث دہلوی بھی شریک تھے۔ جو دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے مدرس مقرر ہوئے اور جن کے پہلے شاگرد شیخ الہند مولانا
حمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے گویا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے شاگردوں میں سے ایک دارالعلوم دیوبند کے پہلے مدرس ہوئے۔

تعلیم

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چار حقیقی ماموں تھے۔ جن میں بڑے ماموں مولانا محمد تقی صاحب کی صاحبزادی سہماہ خدیجہ بنت انون
سے آپ کی منگنی ہو چکی تھی۔ مولوی محمد تقی صاحب سلسلہ قادریہ میں شاہ سیف اللہ تارووی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و عبادت تھے جو نہایت
پابند شریعت اور عاشق سنت شیخ تھے۔ مولانا محمد تقی کی یہ بات مشہور ہے کہ جس چیز کے متعلق علم ہو گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے رغبت تھی۔ مولانا
اس کو بلا تاخیر اپنے ہاں کھانے کا معمول بنالیتے چاہے مضر ہی کیوں نہ پڑے۔ مولانا مدوح ریاست جھجھر میں فوجی ملازم تھے۔ اور اپنے آقا کے ہاں شمار
خیر خواہ اور شاگرد کی جگہ آزادی میں لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔

حضرت جب اکیس برس کے ہوئے تو ماموں نے آپ کے دادا سے اتفاق کیا کہ نکاح کر دیا جائے۔ اس سلسلہ دہلی سے واپس آنے پر آپ کے
نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ آپ جب پڑے پہنکا گھر لائے گئے تو ایک اندھی مینسکین چند پانی نے دنیا کی رسم کے مطابق ایک سے تکامصرہ گونہ دلائی
ماں سہرا منہ سے نکالا۔ حضرت کا متبع سنت و شریعت تھے اس کے سننے کی کہاں تاب رکھتے بے اختیار حلال میں آکر ایک دھول رسید کی۔ اس کا تو
منہ بند ہو گیا مگر گھر کے چھوٹے بڑے اس میرا شین پر روپے پیسے بچاؤ کرنے لگے کہ خدا کے لیے دو لہا کو کو بیٹے مت جو ہر ناخوش سو ہوا بدشگونی کا کوئی
لفظ منہ سے نہ نکلے۔

مراڑہ جاتے نکاح میں تشریف لائے تو میرا پانچواں رسک چہرہ شاہی سنکر دو لہا بننے کی حالت ہی میں صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس
مقدار کا تحمل نہیں ہو سکوں گا۔ آپ کے خسر اتفاق سے موجود نہ تھے بالآخر بڑے بوڑھوں کے اصرار پر راضی ہوئے۔ لیکن نکاح کے منقل ہی آپ کی زوجہ
عزیزہ نے سارا قصہ سنکر ہر صاف انکار کر دیا۔ اس طرح حضرت کے صفائش قلب کو کئی راحت حاصل ہوئی۔ حضرت کی اہلیہ کی عمر پندرہ سال اور آپ
کی اکیس سال تھی۔

حفظ قرآن

جوانی میں شادی کے دن ایسے ہوتے ہیں کہ ادھر ادھر کے تمام مشاغل بالائے طاق دھک دیئے جاتے ہیں لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ
نے عین ان دنوں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔ اپنے جدی مکان میں ایک کوٹھڑی میں سارا دن قرآن پاک یاد کرتے رہتے
نماز کے اوقات میں کلام حمید پر رونال ڈال کر اٹھ کھڑے ہوتے اور مسجد میں نماز باجماعت ادا کر کے پھر ٹیسی جگہ آ بیٹھتے۔ آخر اس لازوال دولت سے
مالا مال ہوئے اور رمضان المبارک کی نزاد یوحی میں قرآن پاک سنایا۔

سلوک و تحصیل معرفت

خدا طلبی اور معرفت خداوندی کا شوق انزل سے آپ کے قلب مبارک میں دو بعیت تھا۔ چنانچہ تحصیل علم اور نکاح
کے بعد اب رشد کمال کی تلاش ہوئی جو آپ کو تھا نہ بھون صنم مظفر نگر لے آئی اور اس نعمت عالی سے سرفراز
ہوئے کہ جس کی طلب میں سلاطین دنیا کو تخت و تاج کا چھوڑنا آسان معلوم ہوتا ہے۔

بازار عشق و شوق محبت کے جان فروش
سیکھیں طریق وصل و لقاء خدا نے پاک
لیکن کہ چسپ چلاؤ ہے دنیائے دن کا
دل بیچ کر حسد ید لیں سودا حسنون کا

حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کے دربارِ دُر بار میں

دہلی میں تعلیم کے دوران میں حضرت نافو توی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت
حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ چار سال اس طرح یک جان و دو قالب

رہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی چلے آ رہے ہیں۔ حضرت نافو توی رحمۃ اللہ علیہ نانوتہ کے تھے اور حضرت حاجی امداد اللہ
مہاجر کی کمی نفعیالہ نافو تہ میں حضرت نافو توی کے خاندان میں تھی اس طرح آپس میں خاندانی ربط بھی تھا۔ اور حضرت حاجی صاحب کی ہر شے و بھی
نانوتہ بیاری ہوئی تھیں اس لیے حضرت حاجی صاحب اکثر نانوتہ نشر فرماتے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا محمد یعقوب دونوں حاضر
خدمت ہوئے۔ حاجی صاحب کا ان دونوں بہا لان چھٹن تھان علم کے ساتھ بچپن ہی سے غایت شفقت و محبت اور اخلاص کا معاملہ تھا۔ کتاب کی
جز بندی و دونوں بزرگوں نے حضرت حاجی صاحب سے سیکھی۔ حضرت نافو توی جب وطن سے دہلی اور دہلی سے وطن جاتے تو تھانہ بھون ضرور حاضر رہتے
یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ اور اعلیٰ حضرت حاجی صاحب جب دہلی جاتے تو مولانا ملک علی کے پاس قیام فرماتے۔ اس طرح شاگرد و رشید مولانا ملک علی
حضرت نافو توی کو حاجی صاحب کی زیارت ہوتی رہتی۔ حضرت نافو توی تمام ساتھیوں سے عموماً خصوصی رفیق و محب حضرت گنگوہی سے خصوصاً حاجی
صاحب کا تذکرہ کرتے رہتے۔

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی جو پہلی زیارت حضرت گنگوہی صاحب نے کی وہ یہیں دہلی میں مولانا ملک علی کے مکان کی۔ دونوں بزرگ دہلی میں
جب پڑھتے تھے تو مولانا ملک علی سے عرض کیا کہ تم چھادیجئے۔ انہوں نے فرصت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ آخر کار گروں کے اصرار
پر ہفتہ میں دو دن مقرر ہوئے۔ ایک دن سبق ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ تشریف لائے یہ کون تھے یہ قصہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے
بڑا لطف آئے گا

ہفتہ میں (سُکرمے) دو سبق ہونے لگے تو اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی۔ ایک روز می سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نی لنگی
کندھے پر ڈالے ہوئے آئے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب مدہ تمام مجمع کے کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا کہ لوجہائی حاجی صاحب
آگئے۔ حاجی صاحب آگئے اور (حضرت مولانا سے) مخاطب ہو کر فرمایا کہ تو مہائی رشید اب سبق چھو موگا۔ مجھے سبق کا مہبت
افسوس ہوا۔ اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ ”بھئی یہ اچھا حاجی کیا ہمارا سبق ہی رہ گیا۔ مولوی محمد قاسم نے کہا ہا ہا ہا
مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں ایسے ہیں۔“ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہیں موزد لیں گے۔ اول زیارت تھے اس وقت
ہوئی تھی اس کے بعد حضرت حاجی صاحب ہم دونوں کا حال دریافت فرمایا کرتے۔ اور یوں کہا کرتے تھے کہ سارے طالب علموں
میں وہ طالب علم (مولانا گنگوہی اور مولانا نافو توی رحمہما اللہ) ہوشیار معلوم ہوتے ہیں اور بس لے

حاجی صاحب کی کرامت

دوسری ملاقات تھانہ بھون میں ہوئی جبکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت نافو توی رحمۃ اللہ علیہ اور
دیگر کئی طالب علموں کے ساتھ تھانہ بھون گئے اور سب طلبہ نے مسجد میں قیام کیا۔ حضرت گنگوہی کا جو تہہ بالا
گیا اتنے میں حاجی صاحب آگئے اور فرمایا کہ جو تہہ (بدلا ہوا) دکھاؤ۔ اور چراغ کے سامنے دیکھ کر فرمایا کہ ”یہ تو حبیب حسن کا ہے۔“ (حالانکہ حاجی صاحب
حبیب حسن کو بھی نہ جانتے تھے جو تا نو کیا بیجا ہے) حضرت گنگوہی نے یہ ماہر اور کھاکو کشش سی پیدا ہوئی کہ حاجی صاحب صاحب کشف آدمی ہیں
(ان کی پہلی تعریف ان کے ذہن میں تھیں) — ویسے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ تھا کہ حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیت ہونگا

نیز یہ کہ آپ صحاح کی کتب پڑھنے کے دوران ان کے تقویٰ و زہد اور اخلاص عمل کا خوب مشاہدہ کر چکے تھے مگر دل کی بات زبان پر نہ لاکے اور بغیر کسی کے بیعت ہونے تکمیل علوم کر کے گنگوہہ آگئے تھے

ایک مرتبہ گنگوہہ مسجد میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے کہ ایک بزرگ تشریف لائے اور پاس آکر کھڑے ہو گئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے نظر اٹھا کر فرمایا تو ایک نورانی صورت نظر پڑی لیکن پہلی نظر میں پہچان نہ سکے اور پوچھا کون؟ جواب ملا: امداد اللہ۔ حضرت فوراً اٹھے اور تعظیم و تکریم سے پیش آئے اور اس سے زیادہ شفقت و محبت کا مظاہرہ حاجی صاحب کی جانب سے ہوا۔

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی گنگوہہ المقصد آتے یا کہیں آتے جاتے گنگوہہ انفاقہ قیام کرتا تو مولوی سراج الدین کے مکان پر قیام فرماتے تھے جو لازم ہونے کے باوجود نہایت پارسا اور متقی انسان تھے کبھی رخصت یا اس قسم کا کوئی پیہر کسی سے نہیں لیا۔ یہ حضرت گنگوہی کے رشتہ دار تھے۔ ایک ملاقات ان کے ہاں ہوئی اسی ملاقات یا کسی اور ایسی ہی ملاقات میں حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ ”میاں! رشید احمد اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی تمنا ہے یا نہیں؟“ مولانا نے جواب دیا کہ ”حضرت جی تو بہت چاہتا ہے۔“ حاجی صاحب نے پوچھا کہ ”کہاں اور کس طرف میلان ہے؟“ مولانا نے جواب دیا کہ ”اب ہم جتنا غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا یا آپ کا۔“ اعلیٰ حضرت مسکرائے اور فرید مار کر فرمایا کہ ”ہاں صاحب! شاہ عبدالغنی صاحب عالم بھی مشہور ہیں محدث ہیں علماء و قلعاء ہی کی طرف جھکتے ہیں مجھے کیوں شال کر سکتے ہیں۔ میں بے چارہ پڑھانہ لکھا۔“ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کھینچ لیا۔ اس گفتگو کے بعد آپ کا ارادہ حاجی صاحب کے متعلق پختہ ہو گیا۔

تھانہ جھون صاحبی اور بیعت تھانہ جھون میں ایک بڑے عالم۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے پیر بھائی مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے۔ ان کی ایک تحریر کسی نے حضرت گنگوہی سے کو

پہنچی جس میں لکھا تھا کہ ”روضہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں جو جگہ ایک قبر کے لیے چھوٹی ہوئی ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہونگے اور یہ اقطبی ہے اس کا منکر ایسا ہے اور ایسا ہے۔“ حضرت مولانا نے بجائے تصدیق و تصویب کرنے کے لکھ دیا کہ ”سارا ثبوت باحادیث و اخبار احاد ہے اس لئے علم ظنی حاصل ہونا کا قطعیت کا ثبوت دشوار ہے۔“ حضرت شیخ محمد صاحب کی نظر سے یہ تحریر گزری تو غضب میں آگئے کہ ایک طفل کتب نے میرا رد کیا چاہا اسی حالت میں ایک رسالہ اپنے موقف کی تائید میں لکھ کر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھیج دیا مولانا نے دیکھا تو سوائے ان احادیث و آثار کے کہ در اسناد کی تفصیل کے جن میں یہ مضمون وارد ہے اور کچھ بھی نہ تھا۔ اور اس کا اقرار مولانا نے اپنی پہلی تحریر میں ہی کر لیا تھا۔ مولانا نے اس رسالہ کے پشت پر لکھ دیا کہ

میں نے نہ احادیث کا انکار کیا نہ اس کا دعویٰ کر یہ مضمون ثابت نہیں ہاں میں نے یہ لکھا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس بحث کی جملہ اخبار واردہ احادیث ان سے مضمون کی قطعیت کیونکر ثابت ہو جائے گی جو میرا شبہ ہے اس کا رسالہ میں جواب نہیں اور جو احادیث مذکور ہیں ان کا میں منکر نہیں ہوں

گرتے ہیں شہ سواری میدان جنگ میں وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

حضرت مولانا شیخ محمد صاحب اگرچہ بہت نیک صالح اور فاضل شخص تھے علم کا غلبہ تھا اور علم کے لیے تفقہ لازم نہیں اس مسئلہ میں چونکہ گئے تھے۔ مگر اپنی غلط سمجھش کی لیکن چونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بات مدلل تھی لہذا جواب بھی پھر نہ دے سکے۔ البتہ دو چار جگہ کہا کہ کل کا بچہ مجھے طفل لکھتا ہے۔ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ نہیں میں نے تو آپ کی اس شعر میں تعریف کی ہے کہ شہ سواریوں کے باوجود گر گئے بچہ کیا کرے گا اور کہاں سے گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلتا ہے۔ بہر حال بات چل نکلی تھی حضرت مولانا کا علمی پوخش جسے حمیت دین کیسے آپ کو تحریک کرتا تھا کہ آپ بالمشافہ تھانہ بھون جاکر حضرت مولانا شیخ محمد سے بات کریں۔ ایک سفر مرات کا پیش آیا۔ اس سفر میں حضرت مولانا سے بات چیت اور حضرت حاجی صاحب سے درخواست بیعت کا ارادہ کر لیا۔ رسالہ ساتھ لے لیا اور بات کی واپسی پر تھانہ بھون چلے گئے جلدی واپس لے کر آیا تھا لہذا جو پڑے پہنے ہوئے تھے ان کے علاوہ کوئی اور جوڑا ساتھ نہ تھا۔ اور اس بات چیت کرنے کے لیے کئی دفعہ فیصلح نیت کی۔ استخارہ کیا اور غور و فکر کے بعد ارادہ کیا کہ حق کے اظہار کے لیے جارا ہوں۔

ظہر کی نماز کے بعد تھانہ بھون پہنچے حضرت حاجی صاحب سہ دہی میں تلاوت قرآن کر رہے تھے حضرت مولانا حاضر ہوئے سلام مستعمل کر کے بیٹھ گئے۔ حاجی صاحب نے تلاوت قرآن کے بعد پوچھا کہ کیسے آئے آپ نے فرمایا مناظرہ کے لیے آیا ہوں۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا: "ما ہا! ایسا ارادہ نہ کرنا میاں وہ ہمارے بزرگ ہیں۔" بس مباحثہ کا تو یہیں فیصلہ ہو گیا۔ مولانا نے عرض کیا کہ "حضرت اگر آپ کے بڑے ہیں تو میرے بھی بڑے ہیں" اس کے بعد گفتگو ہوتی رہی اور مناسب الفاظ میں بیعت ہونے کی درخواست کی حضرت حاجی صاحب نے تامل ہی نہیں کیا بلکہ طلب صادق دیکھنے کے لیے انکار فرمایا۔ مولانا نے بہت اصرار کیا مگر آپ انکار کرتے رہے۔ مولانا کے ہاں علمی غرور و نخوت نام کو بھی نہ تھی مراد باتوں کا خلاصہ نہ کر آئے تھے۔ حاجی صاحب استغفار ظاہر کرتے تھے اور یہ احتیاج و اختصار ظاہر کرتے رہے۔ دو تین دن گزر گئے کہ حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے آنے کا سبب اور حال دل پوچھا تو آپ نے بے اختیار فرمایا کہ "جہد دل کا میلان ہے وہ قبول نہیں کرتے دوسرے اپنی طرف کھینچتے ہیں" حافظ صاحب نے دلا سہ دیا کہ "ابھی جلدی کیا ہے چند روز ٹھہرو یہاں کے حالات دیکھو" آخر جب آپ کی بختی ہر طرح ظاہر ہو گئی تو حافظ صاحب نے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں سفارش کا اجر حاصل کیا اور دو تین روز بعد اعلیٰ حضرت نے آپ کو سلاسل اور بوس بیعت منبر لایا۔

سہ حافظ محمد ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب شیخ محمد شاوی اور حافظ محمد ضامن شہید ہم زمانہ اور باہم رفیق تھے۔ یہ تینوں حضرات عام طور پر اکٹھے رہتے۔ حافظ ضامن صاحب کی تاریخ پیدائش حاجی صاحب سے چند سال قبل ہو گی۔ صحیح معلوم نہیں ہوسکا۔ حافظ صاحب میان جی نور محمد جھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے اور سک و معرفت میں بہت اونچے مگر کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے اگر کوئی بیعت ہونے کے لیے آتا تو فرماتے

"میں ان کی بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ وہ خافہ میں اندر بیٹھے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہو تو مولانا شیخ محمد محدث کے پاس جا کر پوچھو اور اگر تہنہا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

آپ کا حلیہ رنگ گورا سفید چمپک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوش نما معلوم ہوتے تھے قد درمیان درجے کا تھا اور نہایت متناسب خوبصورت اور چہرے سے رعب نمایاں آنکھوں میں سرمئی چمکی تھی سینے پر سیاہ بال تھے۔ جھوٹی کٹاؤہ سرمئی رہتے۔ گردن بلند چہرہ جسم مرتابے تھک میرے مادے بزرگ اور ظرافت طبیعت کے مالک تھے۔ اور عادات و اخلاق یہ تھیں کہ ظاہر و باطن بالکل ایک تھا۔ نادان و منافق سے کچھ باک نہ تھا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ علماء میں سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے حضرت حاجی صاحب سے بیعت کی تھی اس کے بعد تو اس کثرت سے علماء بیعت ہوئے کہ اس کی مثال شاید دنیا میں ایک آدمی ہی مل سکے۔ سات آٹھ سو کے قریب علماء حاجی صاحب کے مرید تھے عوام کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اور اس چیز کی بشارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم حاجی صاحب کو ایک خواب کے ذریعے دے چکے تھے اور یہ اسی بشارت کا ثمرہ تھا اور بشارت حاجی صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے تھی

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے۔ یہ عجب قصہ تھا کہ حضرت نانوتوی کے تعریف کرنے سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان ہوا۔ لیکن حضرت نانوتوی کو حضرت گنگوہی نے سفارش کر کے بیعت کرایا۔

چالیس دن میں خلافت

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک دن کے ارادہ سے تھانہ جھون گئے تھے لیکن حضرت حاجی صاحب کے دربار میں پہنچ کر کچھ ایسے شیخ کی محبت میں گرفتار ہوئے کہ خود ہی ایک دفعہ فرمایا کہ "پھر تو مرنا" ظاہر ہے کہ جو محبوب محبوب حقیقی سے ملاوے اس سے زیادہ محبوب اور کون ہوگا۔ اور قبولی صاحب تذکرۃ الرشید حقیقت میں حضرت مولانا اس کے بعد مرے آپ نے اپنے نفس کو مار دیا ہوائے نفس کو ملیا میٹ کر دیا جس پاک نام کو دیکھنے کا قصد کیا تھا اس میں کھپ گئے۔ فنایت حاصل کی اور

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ * باوصف خان داری اور اہل و عیال سے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دنیا پاس بھی نہ آیا تھا دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک آپ کا خلوص و منفاد تھا۔ ہر وقت عشق الہی میں مست و مرشار رہتے تھے دل کی کیفیت چہرہ مبارک پر معلوم ہوا کہ فی حق محبت الہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا۔ میاں جی سے بیعت ہوئے تو آپ کے ارشاد پر کہ سوال اللہ آیت کریمہ پڑھو۔ پھر سے لے کر دوسری عشر تک در دہلا کر گیا اور تمام اشغال بہت جلد پور کر لیے۔ کئی سال تک آدمی پاؤں کے قریب روزانہ کھانا کھاتے رہے۔ فنا فی الشیخ ہو گئے تھے۔ ۱۵ شعبان سے آخر رمضان تک ہر رات مشغول رہتے۔ شب کو سونا لاینا موقوف کر دیتے تھے۔ چند ہی دن میں اہل کمال جذب کے ساتھ ملوک کی تمام منازل طے کر لیں۔ اور اس قدر کمال تو حیدر اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از دنیاں ہے اس وقت تمام درویش اہل حال فن تقویٰ میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے۔ مولانا شیخ محمد عورت تھانوی نے پہلے حافظ صامین شید رحمۃ اللہ علیہ سے کسب فیض کیا وہ آپ مولانا کے ناموں بھی تھے آپس میں ہم عمر تھے۔ بعد ازاں میاں جی سے بیعت ہوئے۔ حضرت حافظ اتباع شریعت اور زہد تقویٰ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ ادنیٰ بدعت کو بھی اکھاڑ پھینکتے تھے۔ مختلف فیہ مسائل میں احتیاط پر عمل کرتے۔ اہام و نواسی میں شان فادویٰ عروج پر ہوئی تھی کہ نسباً فادویٰ تھے۔ اخوائے حال کو پسند کرتے تھے۔ حاجی داد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت پر ان کو تنبیہ کی جیسا کہ حاجی صاحب کے ذکر میں گزر چکا۔

شہادت اور کشف شہادت

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شامی کے جہاد میں حصہ لیا آپ کو اپنی شہادت کا کشف ہو چکا ہے بچا پنچا آٹھ دس روز پہلے اپنے ایک مرید کو خط لکھا فادویٰ میں "کہ لازم کہ بغور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچا دیا

نہ ہو کہ توقف میں حسرت ملاقات کی دل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے باقی حال بروقت بیان کیا جائے گا۔"

شہادت کا دولہا

میدان شہادت میں جلد سے پہلے آپ نے خوب ذہن و زہدیت کی۔ خلل کر کے خیال باس زیب تن کیا جو کئی دن سے تیار کر رکھا تھا۔ نعلین اگرچہ بوسیدہ نہ تھیں۔ مگر وہ بھی نئی نہیں۔ خوشبو مل مرہ لگا یا دستار پیچھا رہا۔ سپا سنا نہ وضع شمشیر کے شریعت دیدار کی تئیں علم حجازی اٹھا کر روانہ اور شہادت پر برسرِ معرکہ جان بحق تسلیم فرمائی۔ شہادت کے سال اکثر زیا کرتے۔ "دیکھو عروس پرانے لیے ہوئے کافران کی منڈیوں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لیوے" حافظ صاحب نے حضرت گنگوہی کو وصیت فرمائی تھی کہ (باقی صفحہ آئندہ)

لے بر سرِ عکس شہید الدین تھے

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی ہی رات ذکر کیا تو صبح کو حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ
 ”تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔“
 اگرچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کے وقت کہا تھا کہ
 ”حضرت مجھ سے ذکر و شغل اور محنت و مجاہدہ کچھ نہیں ہو سکتا۔“

بقیہ، حاشیہ صفحہ گذشتہ * ان میں سے ایک یہ ہے :-

شہ بہشت بریں بود نیز از سپہ سال
 بقال طرفہ برآمدشہ بہشت بریں

حضرت ضامن شہید کے متعلق یہ تمام معلومات ”حیات امداد“ مولفہ پروفیسر انور الحسن شیر کوٹی سے لی گئی ہیں۔ اور آپ نے رسالہ ”مولانا محمد
 مولفہ حکیم منشاء الدین صاحب (یکے انور دلائل حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ) سے استفادہ کر کے اپنی کتاب میں جمع کی ہیں۔ جو دوسرے مولفہ کو مستطرب نہیں موجود۔
 حکیم صاحب موصوف حضرت ضامن شہید۔ حضرت حاجی امداد اللہ اور مولانا شیخ محمد عدت تھا نوی رحمہم اللہ جامعین اعمارہ ثلاثہ کی جدائی پر نثر میں جو
 لکھتے ہیں ملاحظہ ہو۔

داحسرا کہ ہر گیارہ اور کیا ہوا وہ مجمع خیر اور جماعت محبت آمیز اور وہ صحبت انگیز اور وہ مکان دل آویز یعنی مسکن حضرت اندس کہ
 اب ویران ہے با وضعت اس خستہ حال کے دیکھو وہاں کیا جلوسہ حق ہے اور اس اجڑے مکان میں کیا دل کشا دگی ہے خس و خاشاک
 سے بوسے گل اور نغمہ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اکثر اہل دل وہاں جاکر سرور ہوتے ہیں اور مغنیں اٹھاتے ہیں کسی نے سچ کہا ہے
 بزینتیک نشان کف پائے تو بود
 سا با سجدہ صاحب نظر ان خواہد بود

حافظ صاحب کی جدائی میں خود مرید صادق (حکیم صاحب موصوف) کا کیا حال ہوا وہ بھی انہی کی قربانی سینے :-

آتش مفارقت جی جلائے دیتی ہے دل مجبور گھبرا رہا ہے۔ سوزش درونی کو بیان کیا چاہتا ہے اور کوئی ذکر سوزش نہیں آتا اس جگہ
 میں جلال کبریائی کو جوش و غروش تھا اور مدہوشان شیون الہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق و شوق تھا چنانچہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ نور اللہ
 مرقۃ قدس سرہ نے بھی مسرور دینے دینا کچھ خیال نہ فرمایا کہ محبت چست باندھ کر امر حق پر جان و مال کو قربان کیا اور ذوق و شوق و دیدار الہی
 میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا ترو نہ ہوا اور تناسل شربت شہادت و جام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا سبحان اللہ! کیا
 ہمت مردان، مدد خدا کا تماشا دکھلا کر مارتا اور شستا قا و چوبیسویں محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو برسرِ مہر کہ جام شہادت نوش فرمایا وہ کیا ضربِ اہمیت
 لے گئے (دو پڑہ)

ساجن دکھیا کر گئے اور کٹھ کو لے گئے ساتھ
 بہنم بچھو اوسے کئے اور چہرہ بوجھی بات

دفنی و مرا خبر نکر دی
 بریکسیم نظر نکر دی

اسی رسالے میں حکیم صاحب لکھتے ہیں :-

آہ! جس وقت وہ صحبت یاد آتی ہے اور وہ صورت شریف رحمۃ اللہ علیہ نظر میں پھر جاتی ہے اس دل نامشاہد پر جو کچھ گزرتا ہے بیان نہیں ہو سکتا
 ہر چند توبہ توبہ کر ہی چاہتا ہے کہ مر جاؤں۔ اس ہر دم کی جانگزی سے چھٹ جاؤں مگر کچھ بس نہیں چلتا اور از خود مرا نہیں جاتا۔ انا چار کلجی کڑے اختیار
 اپنی زندگی پر دو دیتا ہوں جب کہیں صورت ملاؤ کہ نہ بدھی اور کچھ بس نہ چلا کر بزمِ عرفان حاجت کوئی چاہہ نہ دیکھا اب اکثر یہ دعا دو زبان اور (باقی بمقام آئندہ)

راہی حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا تھا کہ "اچھا کیا مضائقہ ہے" اور مولانا نے جواب دیا تھا کہ "پھر تو مرنا؟" لیکن حاجی صاحب جب آخر شب بیدار ہوئے تو مولانا کی آنکھ بھی کھل گئی، دوچار کروٹیں بدلیں کر لیا اور اٹھائے، مگر اعلیٰ حضرت کی توجہ کام کر چکی تھی، مضطرب و اڑاٹھے وضو کیا، سمجھ گئے ایک گوشے میں اعلیٰ حضرت نوافل تہجد کے بعد کدو شغل میں مصروف تھے اور دوسرے گوشے ہمارے ممدوح حضرت نگارہی اس کام میں مصروف تھے، کب جس کام کے نہ کرنے کی اجازت شیخ سے لی تھی، ایک ہی رات میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ بقول حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ "تم نے تو ایسا ذکر کیا جیسے کوئی بڑا مشاق کرنے والا ہو۔"

اور پہلی ہی شب محبوب کے ذکر سے ایسے لطف اندوز ہوئے کہ پھر ساری عمر کا وظیفہ بن گیا، خود فرماتے ہیں :-
"اس دن سے بڑے کچھ کے ساتھ مجھے محبت ہو گئی پھر کبھی چھوڑنے کو ہی نہیں چاہا اور نہ کوئی دوسری شے اس کی مخالفت کی معلوم ہوئی۔"

بقیہ، حاشیہ، صفحہ گزشتہ * مونس جاں ہے نہ
یہ غلام آپ کا اسے شاہ محمد صاف من
حضرت مولانا محمد قائم نالوتوی نے حضرت حافظ صامن شہید کے متعلق پینسٹھ اشعار کہے جن سے پتہ چلتا ہے :-

نہ پوچھو ہر دے میں کیوں خفت ہم جاں سے
کہیں سے مولے دے دل مجھے کچھ اور لے ہدم
چھپا آنکھوں سے وہ نور جسم خاک میں ج کر
شہید راہ حق حافظ محمد صامن چشتی
فرق یار میں عینا تعجب ہے دلے ہدم
نظر آئے گی بار ب پھر بھی وہ صورت کب ہم کو
کسی کا کیا گیا ہر رنج فرت کی مصیبت کو
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حب الہی کی
گناہوں کے سبب گم ہم نہیں تھے لائق محبت
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہ کاروں کا لے چلنا
اگر قاصد مجھے کوئی دواں تک کا ہم پہنچے
مبارک ہو تمہیں وصل خدا خلد یریں میں، پر
غم فرت میں یاں گزرتے ہے پر کچھ بن نہیں پرتی
بنے تھے یوں تو ہم بدزلزل سے غم اٹھانے کو
تمہارے چہرے جان جہاں کچھ بن نہیں آتا
دل مالوس کی کوئی نہیں صورت تسلی کی
تمہاری بزم پر انوار حبیب یاد آئے ہے ہم کو

ہمیں پالا پڑا ہے اب کے تمہارے دوراں سے
کہ اٹھے کا نہیں بار غم اس قلب پریشان سے
کہ جس کا خیال پا بہتر تھا اس مہر و نشان سے
بنایا تھا جے حق نے ملا کہ عشق و عرفان سے
اجل سے اٹھ کے شاید نہ ہم بارگشاہاں سے
نہیں گے پھر بھی وہ آواز ان لمبائے خنداں سے
کوئی جا کے مگر پوچھے فیضان الدین نالاں سے
کوئی پوچھے منب رحلت کا اس سالار خوباں سے
تو ہم کو بخشو لیا لینا تھا کہ کس کے رحاں سے
تو تمنا اس طرح جانا بھی نازیا ہے سلطان سے
تو کہلا کر کے جھوٹیوں میں اس سالار نیکان سے
ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا نہیں جانا نہ تنہا یوں سے
تمہیں فرصت نہیں دلا لذت و دیر بزدل سے
نہ تھی پرینہ خبر ہوں گے الگ بھی ترے دلاں سے
دل حسرت زدہ گھبراتے ہے بے رنگ تہاں سے
مگر ہاں سر نہ کاو تم مگر گنج شہیدان سے
تو اک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب زل سے

یہ تو پہلی شب کا صلہ تھا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے بعد آٹھویں دن ہی حضرت شیخ کی جانب سے دوسری خوشخبری یہ سنائی گئی کہ
 ”میاں مولوی رشید احمد جو نعمت حق تعالیٰ نے مجھے دی تھی وہ آپ کو دے دی آئندہ اس کو بڑھانا آپ کا کام ہے؟“
 کپڑوں کا جوڑا ایک ہی تھا۔ میلا ہونے پر خود ہی دھو لیتے۔ آخری دنوں میں بخار ہو گیا اور مولانا گنگوہی اس خیال سے کہ شیخ کو تیمارداری کی
 تکلیف دینا گستاخی ہے اور گھر سے تقاضے بھی شروع ہو گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بخوشی اجازت دے دی اور آپ کو شیخ نے مع متعلقین دور
 تک جہانیت کر کے الوداعی وقت ایک طرف کر کے کہا کہ
 ”اگر تم سے کوئی بیعت کی درخواست کرے تو اس کو بیعت کر لینا۔“

حضرت امام ربانی مولانا گنگوہی نے عرض کیا — مجھ سے کون درخواست کرے گا — اعلیٰ حضرت نے فرمایا — تمہیں کیا
 سوچتا ہوں کرنا؟ — یہ تفسیر انعام تھا جو اس پہلی حاضری کی آخری ملاقات کے وقت عطا ہوا۔ لوگ برسوں مشائخ کی خدمت میں رہ کر غلابادہ
 ریاضت کی زندگی بسر کرتے ہیں پھر بھی کچھ ملا ملا نہ ملا۔ لیکن مصداق

کوئی قابل ہو تو ہم شہنشاہ کی دیتے ہیں
 ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ دولت ایک چلہ میں مل گئی حضرت گنگوہی کو یا ایک صاف شفاف آئینہ تھے جو آفتاب کے مقابل رکھ دیا گیا۔
 صاحب تذکرۃ الرشید رقم فرماتے ہیں :-

کیا خدا کی دین ہے کہ جس دہلی میں بیعت ہوئے اسی دہلی میں صاحب نسبت بنے خلیفہ ہوئے اور چلتے چلتے اصرار و تقاضے کے
 ساتھ اعلیٰ حضرت کی زبان سے یہ مبارک ارشاد حکم سنا کہ دیکھو جو درخواست کرے اسکو ضرور بیعت کر لینا۔ یہی سفر سفر بیعت تھا
 اور یہی سفر سفر حصول خلافت، یہی قلیل زمانہ زمان سستی تھا اور یہی چند روز غفر و کامیابی، روانہ ہوئے تھے۔ مولانا شیخ احمد صاحب
 سے مبارکتہ کرنے اور تمنا و تمنا آجنان و ناواقف بن کر اللہ کا نام سیکھنے کے لیے، اور آئے پڑھے لکھے عالم طریقت عباد
 حقیقت شیخ مصیبر بن کر دوسروں کو اللہ کا نام سکھانے اور گنگوہ کو محیط انوار و مرجع خلافت بنانے سے
 خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔

گنگوہ واپسی

حضرت مولانا گنگوہ واپس تشریف لائے تو حالت بالکل بدل چکی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ پینے پہنچنے کا ہر وقت امتزاج و
 عویت اور نقصان کے عالم میں رہتے۔ اکثر تمام شب روتے گزرجاتی۔ والدہ ماجدہ نے بیلے رنگ کی رضائی تیار کی تھی کہ مسجد کو
 شب آتے جاتے تنگی سے محفوظ رکھے مولانا کی گریہ و زاری کے سبب آنسوؤں کی اس قدر کثرت تھی کہ رضائی سے پونچھتے پونچھتے اس کا کئی جگہ
 رنگ تبدیل ہو گیا۔ آپ آخر شب مسجد میں اس انداز اور جذب و کیفیت سے ذکر پہر کرتے
 ”ایسا معلوم ہوتا کہ ساری مسجد کا پ ہی سے خود پر جو حالت گزری ہوگی اس کی تو کسی کو کیا خبر ملے

لے تذکرۃ الرشید ص ۵۸

لے تذکرۃ الرشید ص ۵۸ یہ بیان مولانا ابوالمنکر کا ہے جو حضرت مولانا کے ماموں زاد بھائی اور طفولیت کے پرانے رفیق و ملگد تھے۔

شیخ کی گنگوہی

اسی اثنا میں حضرت حاجی صاحب گنگوہی تشریف لائے اور مرید کو اپنے مرشد کی میزبانی اور خدمت کرنے کا موقع ملا۔ اور اب تو ساری زندگی کا تعلق قائم ہو گیا تھا اور مجلس مرشد کا جو تعلق صحیح مرشد سے ہونا چاہیے اور اپنے شیخ کی جو عبادت قابل اور ذی استعداد مرید ہونا چاہیے اس کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ہفتہ گنگوہی میں گزرتا تو خوش زمانہ محبوں میں بغرض ہر دس پندرہ دن بعد کسی کئی دن کے لیے تھا نہ بھون جا کر شیخ کی خدمت میں حاضر دیتے۔

معاش

مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ طالب علمی کا دور گزار کر اب متاہل زندگی گزار رہے تھے۔ کوئی ایسا کام چاہتے تھے کہ جس میں دین کی خدمت بھی اور گھرانے کی صورت بھی۔ ایک جگہ سے ترچہ کران پاک پڑھانے کی بٹا ہر سات روپے ماہوار پیش کش ہوئی۔ مگر حاجی صاحب سے عازت نہ لی۔ اس کے بعد سہارنپور کے مشہور رئیس عظیم نواب شائستہ خاں نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے دس روپے ماہوار پک کو بلایا اور آپ اگرچہ ہلی بصیرت کے نزدیک بڑے بیش قیمت تھے، مگر آپ نے اپنی ہستی کو ختم کر دیا تھا۔ دس روپے گزارے کے لیے کافی سمجھ کر چلے گئے اور اس وضع و زمانہ خدا کا احسان سمجھ کر قبول فرمایا۔ یہ ملازمت یا تو کڑی چھ ماہ کے چھوڑ دی۔ اور وہ توکل اختیار کیا جس کی نظائر دنیا میں کہ ہی نظر آئیں گی سہارنپور سے واپسی پر آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جن لوگوں نے زمین کے ٹکڑے آپ کے دادا کے پاس رہیں رکھے ہوئے تھے وہ واپس کئے۔ رہن کی صورت یوں پیدا ہوئی تھی کہ آپ کے والد ماجد مولانا نادر علی اللہ

زمین زمینوں کی واپسی

جائے ملازمت گورکھپور سے اپنے والد قاضی پیر بخش کو پس انداز کی جہتی رقم بھیج دیتے اور لکھ دیتے کہ مکان یا دوکان جو چاہیں خرید لیں، مگر دادا اپنے متشرع نہ تھے انہوں نے لوگوں کو رقم دے کر ان کی زمینیں وغیرہ دینی شریعت کریں۔ حضرت مولانا صاحب پچیس سال کی عمر کو پہنچے اور بڑا بخلا اور وارث ہوئے تو آپ نے تمام کا فلاح و مصلیٰ آمدنی اور دین کے نکال کر حساب لگایا۔ اگر کسی کو دی ہوئی رقم کے برابر اس زمین سے آمدنی ہو گئی تھی تو کا فلاح چاک کر دیئے اور زمین واپس کر دی اور اگر آمدنی کم ہوئی تو زمین واپس کر دی اور رقم معاف کر دی اور اگر آمدنی زائد ہو گئی تو ان کو زائد رقم واپس کر دی کہ آپ نے جتنا فروخت لیا تھا آپ کی زمین کی آمدنی اس رقم سے زائد ہو گئی ہے ہم اپنی رقم تو آپ سے کیا لیں کہ آپ کی زمین سے ہمیں اس قرض کے برابر آمدنی ہو کر یہ زائد ہو گئی ہے یہ آپ کی امانت ہے جو آپ کو واپس کرتے ہیں اور ساتھ ہی آپ کی زمین آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ اس حساب و رہن چھوڑنے میں جو روپیہ دینا پڑا اس میں گھر والی کا سارا زائد فروخت کرنا پڑا۔ اس طرح تمام قرضدار بلا لگان و امید اپنی زمینوں کے دوبارہ مالک ہو گئے۔ اور حضرت نام رہانی رحمۃ اللہ علیہ کے دیانت و امانت کے طفیل قرضوں سے سبکدوش ہو کر از سر نو اپنی زمینوں کے مالک ہو گئے۔

اسے کسی ضرورت نہ کہ بغیر کسی لالچ یا مفاد کے غرض جہادی اور انسان دوستی کے خیال سے رقم قرض دینا ضرورت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ نواب کا باعث ہے اسے قرض نہ کہتے ہیں، لیکن اگر کسی ضرورت نہ کہ قرض دینے کے خیال ہو کہ اس سے کوئی چیز بطور ضمانت لے لی جائے مثلاً زمین مکان وغیرہ تو اس شکل قرض کہتے ہیں۔ قرضدار جب قرض واپس کرے تو اس کو اس کی ضمانت صحیح حالت میں واپس کر دیا جاتا ہے اور اس دوران میں رہن کر کہ چیز چاہیے اس کے قسم کا مفاد حاصل کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح سود۔ اس رہن کر کہ چیز سے ہونے والی آمدنی کا باقاعدہ حساب رکھا جائے اور جب قرضدار قرض کا روپیہ واپس کرے تو اس آمدنی کا حساب کر کے اتنی رقم چھوڑ دی جائے، لیکن ہمارے معاملے میں رہن کر کہ چیز سے ہر طرح کے مفاد حاصل کرنے کو شریعہ کی طرح جائز سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً زید اپنی دکان رہن کر کے بکرسے چھ ہزار قرض لیتا ہے تو کو سو روپیہ ماہوار کرائے پر اس دکان کو دے کر وہ کرایہ اپنی حیب میں ڈالتا رہتا ہے۔ پانچ سال کے بعد اگر زید قرض لی ہوئی رقم واپس نہیں کرتا تو کو کو زید کی دکان یہ بکھری واپس کر دینا چاہیے کہ یہ افترض تھا یہی دکان کے کرایہ سے پورا ہو گیا ہے لیکن ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ رہن کر کہ چیز کی آمدنی ہماری اور وہ روپیہ اسی طرح زید کے ذمہ رہتا ہے

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے زمینیں بغیر قرضہ لیے وہاں سے آمدنی قرضے کے برابر ہو گئی تھی۔ یا قرضہ سے زائد آمدنی کو مع زمین واپس کر کے جو مثال قائم کی تھی اس زمانہ میں الشاذ کا معدوم ہے اور اگر کہیں ہے تو وہ اپنی حضرات کے تربیت کردہ افراد میں ہے اور شاید ہی کہیں ملے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا جو حضرت کی بے حد پریشانی کا باعث تھا۔ وارث و خود مختار ہوتے ہی اس کا حاصل فرما کر رب العالمین کی عبادت کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ اور اس میں اس قدر محنت کی کہ اس سے آپ کی جسمانی حالت ایسے دہسے کو پہنچ گئی کہ دیکھنے والے خیال کرتے تھے کہ کسی اندرونی بیماری اور ملک مرض کا شکار ہیں۔ بے خبروں کو کیا علم کہ اس انسان نے ایسے شافی مطلق اور یکیم سے لو لگا رکھی ہے کہ جس سے لو لگانے کے بعد تمام روگ ختم ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خود ایسے مقام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کہ بے شمار روگی لوگ اس کی توجہ سے شفا پائیں گے۔

اب حضرت امام ربانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس مقام پر گئے تھے کہ بلا خوف و مہمت لائق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کریں۔ ان میں ہمت و دلیری۔ مروت و شجاعت اور صاف گوئی و حق گفتاری کا جذبہ ابھر آیا تھا۔ اگرچہ وہ بچپن ہی سے اس کے حامل تھے۔ لیکن اب محبت شیخ نے گویا سانپ پر چڑھ کر آب و تاب کو تیز کر دیا تھا۔

صحبت پروردگار سے مجھ پر ہوا یہ داز فاش لاکھ حکیم نہ بچیں ایک حکیم سرکھٹ

جب انسان حق کی تلوار بن کر لوگوں کے سامنے آتا ہے تو اس میں تہاری وغفاری اور قدوسی و جبروت کا عکس نظر آتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کے مفاد حکیم کا حیا و عکاس بن جاتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کی کوئی اپنی خواہش نہیں ہوتی جو کچھ کہتا ہے کتاب و سنت کی روشنی میں کہتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن گفتار میں، کردار میں اللہ کی بران

حالات کی ناسازگاری اور تکالیف و مصائب کے پہاڑ اس کے وقار و ملکوت کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ خطرناک سے خطرناک حالات اس کے عوارض کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ وہ تاریکیوں میں ایمان کی شمعیں جلاتا اور ظوفاؤں سے ٹکراتا ہے۔ اس کے ابتدائی مراحل زندگی میں لوگ اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ غریب و تنگ دست انسان کیا کر سکتا ہے یہ کیا اور اس کی بساط کیا، لیکن سچائی کا موقف، ایمان مکمل حاصل کی دولت اسے حیات جاوداں عطا کرتی ہے اور وہ بالاخر لوگوں کا محبوب بن جاتا ہے۔

فَالْمُضْمِرُ إِنَّهُ شَانٌ لِّغَفْرِ خَيْرٍ أَلَا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّأَوْا بِأَوْبَ الْحَقِّ وَتَوَّأَوْا بِأَوْبَ الصَّبْرِ (القرآن العظیم)

زمانے کی قسم! بے شک انسان یقیناً خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ (کامیاب ہیں) جو اللہ پر ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے اور حق کی وحیت کرتے رہے اور صبر کی وصیت کرتے رہے۔

جبکہ سابق میں گذرنا حضرت مولانا شیخ کی چند ذرہ محبت ہی سے کم ہونے لگے۔ آپ کو محبوب کے تصور و ذکر میں لذت آنے لگی اور اسی سرور و نشاط میں ہر وقت مگن رہتے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت

قدوسی جگر میں خلوت نشینی

میں جلوت سے گھبراہٹ اور خلوت سے پیار ہو جاتا ہے۔ یہی حال حضرت مولانا کا تھا بقول صاحب تذکرۃ المرشد

الغرض امام ربانی کی وہ عالی اور بلند ہمت جو خدائی خزانہ عامرہ سے فطرتاً آپ کو عطا ہوئی تھی مرتلاً یا تمام و کمال تحصیل قرب الہی میں صرف ہونے لگی اور آپ کی عمر عزیز کا لحظہ لحظہ جو حق تعالیٰ نے تجارت آخرت کے لیے جواہرات بنا کر دے اس اہمال قرار دیا ہے پائیدار منفعت کے سبب میں گزارنے لگا۔ رات کی مناسن گھڑیوں میں آپ اپنے نجات دہندہ کو پکارا کرتے۔ اندھیری شب کی سیا چادر

اور ہکرا اپنے پرورش کنندہ خالق کو سجدہ کرتے اس کے دیبا میں حاضر ہو کر ناک رگڑتے، گر گڑھاتے اور روتے روتے بیتاب ہو جایا کرتے تھے لوگوں کے پاس بیٹھتے ہوئے آکاتے گھبراتے اور ٹنگل ہوا کرتے تھے جنگل کے درختوں کی سنناٹا آپ کو پسند آتی اور دیران خالی گھروں کے گوشوں سے آپ کو اس حاصل ہوتا تھا۔ برادری کی کسی تقریب یا جلسہ میں آپ مدعو ہوتے تو آپ کی زبان حال یہ شعر پڑھتی ہے

در محفل خود راہ مدہ ہجو سننے را
افسردہ دل افسردہ کسدا بنجنے را
اور کوئی غیر آباد ڈھنڈر یا شکستہ و زمریت خوردہ کھنڈر نظر آتا تو بے اختیار آپ کی حالت پکا رہتی ہے
سب دلیوان کو دیران سے کیوں لطف نہ آئے
آخر تو ہر اک شخص کا انجام یہی ہے
سب دھنسنے ہیں دنیا کے جوڑے جانیگے اکدن
خلوت میں خلا ڈھونڈتے بس کام یہی ہے

آپ کا نسب شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سجدہ کی جانب سے جاملتا تھا۔ حاجی املا اللہ ہاجر کی سے بیعت بیکر خلافت پانے کے بعد آپ کا روحانی نسب بھی ان سے جاملتا تھا۔ آپ کے والد نے سابقہ سکونت کو ترک اور لنگوہ قیام کر کے سکنی نسبت بھی قائم کر دی تھی حضرت امام چوہدری قطب العالم شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین بننے والے تھے۔ لہذا ابھی ایک مرحلہ کی تکمیل باقی تھی کہ امام باقی اسی جہہ اور خلوت گاہ کو اپنی خلوت گاہ بنائیں جہاں قطب العالم اپنے محبوب حقیقی کی یاد میں سال ہا سال تک ریاضت و مجاہدہ کرتے رہے تھے قطب العالم کا یہ جہہ آپ کے روضہ مبارک کے متصل مسجد کی پشت پر واقع تھا لیکن گردش زمانہ کی وجہ سے اب گھروں گھوڑوں کا اصطبل بنا ہوا تھا۔ اور اگر اس کی حالت صحیح ہوتی تو متولیان خانقاہ اور دوسرے ظاہری جانشینوں کی شاید رلاں ٹسکتی اور اس پر ان کا قبضہ ہوتا چونکہ مذکورہ خانقاہ کا قطب العالم کا صحیح روحانی جانشین اس کو اپنی خلوت گاہ بنائے لہذا اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی کہ متولی اس سے صرف ٹھکر کرتے رہے۔ حضرت مولانا کی اب جو یہ حالت ہوئی تو خلوت گاہ کے لیے کسی ایسے مقام کی تلاش ہوئی۔ جہاں بیک سوئی اور توجہ قطب سے خالق بے نیاز کی یاد رکھیں۔ چنانچہ آپ نے اسی جہے کو منتخب فرمایا جس کو اب پرکڑ کہہ چکے ہیں۔ آپ نے جب اس جہے کا جائزہ لیا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رو دیئے۔ جہاں کسی زمانے میں اپنے وقت کا سب سے بڑا شیخ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ ناز میں اپنی جبین نیاز گزار کرنا چھٹا آج وہاں پھروں کھیلوں کی جھنڈاٹھ سناٹی دیتی تھی اور گدھوں کا سکن تھا اللہ تعالیٰ نے محل کو گدڑی میں چھپا رکھا تھا۔ اب اس جہے میں ہاں مل کا قدر دان جو نہی سن بلوغ کو پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ سے بہتی آنکھوں اور روندتے دل کے ساتھ یہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے اس جہے کو فلاحیت اور کوڑے کرکٹ سے صاف کیا، کھڑے سے زمین کھود کر ہر کی صاف ستھری مٹی لاکر اس کو لپا لپوتا۔ نئی مٹی ڈلوائی۔ سوراخ بند کئے۔ زمین پر بوریا کا فرش چھایا۔ گوشوں میں یوان کی دھونی دی۔ عطر چھڑکا۔ اس مقدس جہے کو از سر نو آباد کیا جو سواتین سو برس سے آپ کی آمد کا انتظار کرتے کرتے خستہ و تباہ ہو چکا تھا اور یہی خستگی و کبتگی اس کے آج تک محفوظ رہنے کا سبب ہوئی تین سو برس میں لنگوہ میں ہزاروں افراد آئے لیکن وہ اس جہے کے اہل نہ تھے اور اب جو اہل آیا تو امانت اس کے پروردگار

طب

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خاصہ عرصہ خلوت میں یاد الہی سے اپنے قلب کو آباد کرتے رہے اور جب حرارت عشق الہی میں پگھل کر زرخاں بن گئے تو اب از خود لوگوں سے انس پیدا ہونے لگا۔ قدرت جن خوش نصیب افراد کو امت کی اصلاح و تربیت کے لیے چنتی ہے کم و بیش ہر ایک کو یہ مرحلہ ضرور پیش آتا ہے کہ قدرت پہلے ان کو کچھ عرصہ کے لیے اپنا قرب حاصل کرنے میں کوتاہی و سرگرداں رکھتی ہے۔ جب ان کے ہر جن موصے اللہ ہو۔ اللہ ہو کی مدائیں نکلنے لگتی ہیں تب ان کے دل میں منجانب اللہ تھیراؤ پیدا کر کے ان کو تربیت خلق پر نامور کر دیا جاتا ہے۔ اور لوگ رفتہ رفتہ ان کی جانب کشش محسوس پیدا کرتے ہیں۔ ان کی باتوں میں تاثیر اور ان کی صحبت میں اللہ کی یاد آتی ہے۔ حضرت گنگوہی پر بھی یہ مرحلہ آیا اور اس مرحلہ میں دلجمعی اور سکون حاصل کر کے پھر رفتہ رفتہ لوگوں سے مانوس ہونے لگے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے لگے اور قدرت کی طرف سے وہ اسباب پیدا ہوئے کہ جنہوں نے امام ربانی کو طب جسمانی کی طرف متوجہ کیا۔ اور وہ لوگ جو آپ کو کبھی اپنی مرضی اور ہلک بیماری میں مبتلا سمجھتے تھے ابتداً آپ کی طرف جسمانی بیماریوں کے لیے رجوع کرنے لگے اور چند ہی روز میں آپ کی معالج ہونے کی شہرت قرب و دُور میں پھیل گئی۔ اور اس طرح حضرت مولانا کسی قسم کے مالی احسان سے بھی بچے۔ ملازمت آپ کے فریضہ کی راہ میں رکاوٹ تھی اس لیے چہرہ کے بعد ہی اس کو چھوڑ دیا۔ کیونکہ طبیباً اس سے دشت تھی اس کو چھوڑ کر متوکلانہ و زائدانہ زندگی گزارنا شروع کر دی تھی لیکن اسباب و وسائل کے درجہ میں اہل و عیال کے لیے مال و نفقہ درکار تھا۔ اس کی طرف سے پیشی سامان پیدا ہوا کہ آپ کی والدہ کی خالہ بیمار ہو گئیں اور بقول حضرت مولانا حکیم صاحبزادہ مسعود احمد گنگوہی (حضرت کے بیٹے)

ایک بار حضرت مولانا قدس سرہ کی والدہ کی خالہ بیمار ہوئیں اور سخت تکلیف کا سامنا ہوا۔ دست تھے کچھ نہ تھے اسفل معدہ میں درد تھا جس نے بے چین کر رکھا تھا۔ حکیم مولوی محمد تقی صاحب اپنی خالہ کے معالجے کے دوام میں پلاتے نہ دیر میں کرتے کئی روز گزر گئے۔ مگر فریضہ کو کوئی نفع محسوس نہ ہوا۔ حضرت مولانا کی عمر اس وقت کم و بیش ۲۲ سال کی تھی۔ نانی نے آپ سے شکایت کی کہ مجھے محمد تقی کی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا بیٹے تو بھی بڑا عالم فاضل ہے تو ہی کچھ کر اور کوئی دوا ایسی تاجس سے میری تکلیف رفع ہو۔ حضرت مولانا قدس سرہ نے اس وقت سکوت فرمایا اور کچھ جواب نہ دیا مگر نانی کی بے حد تکلیف پر دل میں خیال ضرور پیدا ہو گیا کہ اس طرف توجہ کروں چنانچہ آپ وہاں سے اٹھے اور میزان الطب میں معدہ کی بحث نکال کر مطالعہ شروع فرمایا۔ عرضیکہ حضرت مولانا نے نانی صاحبہ کا علاج فرمایا حکم خدا سے وہ صحت یاب ہو گئیں۔ اس سے متورات میں چرچا ہو گیا۔ اور پرانے پرانے مریض ٹوٹ پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دست مبارک میں شفا رکھی جو مریض آتا آپ "اکسیر عظم" اور میزان الطب کو غور سے دیکھ کر اس کی تشخیص و تجویز فرماتے۔ نتیجہً اس کو آدم آجاتا۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا حکیم مسعود احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خمدہ واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ ہمیں اس پورے قصے میں جو بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے چونکہ ایک بڑا کام لینا چاہتے تھے۔ لہذا آپ کی طرف لوگوں کو متوجہ اور راغب کر دیا۔ اور یہ کہ آپ کو اپنی متوکلانہ زندگی میں کسی کا احسان نہ اٹھانا پڑے۔ اور بغیر کسی قسم کا کوئی دنیاوی کاروبار کیے۔ آپ کی قوت لائیت کا مسلمان فراہم ہوتا رہے۔ چنانچہ آپ نے مطب کو بھی بطور پیشہ کے اختیار کیا کہ جاکہ خدمت خلق کا رجوع دیکھ کر انسان دوستی۔ خلائق سے اور شفقت کی نگاہ سے اس کو کرتے تھے۔ اور اس سے تنہا ہی شروع میں حاصل ہوتا

تھا کہ شکل گزرا ہوتا تھا۔ تذکرۃ الرشیدی میں آپ کے مشہور و معروف چند نسخوں اور ان کے اجراء کا بھی ذکر آیا ہے۔ دیکھی رکھنے والے اصحاب تذکرۃ الرشید کا مطالعہ فرمائیں۔ ہم نے یہاں اس کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اللہ وہی اس لیے کہ علم طب کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی ہے اور یہ خدمت خلق اور ننگاری و جہد و دی کا ایک بہت اچھا ذریعہ ہے بشرطیکہ اسی نیت سے کیا جائے۔

بہتر ہے وہی خلق میں جو خلق حق را کو
ایک علم رہ دین دوم علم بدن کا

تحریک آزادی اور حضرت گنگوہی

حضرت حاجی امداد اللہ ہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد فاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حافظ محمد صامن رحمۃ اللہ علیہ سمیت ان حضرات نے جو حصہ لیا اس کا اجمالاً تذکرہ آچکا ہے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ حضرت حاجی صاحب حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی تینوں حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے۔ حضرت نانوتوی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت فاروق پر عمل کرتے ہوئے تین دن روپوش رہے اور چونکہ فاروق میں روپوشی کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمن قابض نہ پاسکے تھے۔ اسی طرح اس ہندی فساد میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن کی روپوشی کے بعد (باوجودیکہ وارنٹ گرفتاری جاری اور پولیس تلاش کر رہی تھی) روپوشی سے خلافت نصرت ہونے کی وجہ سے جب مزید روپوشی سے انکار کر دیا تو مسد الکوین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کے صدقے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور رضیہ طریقے سے ساحل کی راہ لی

شیخ کی محبت

حضرت حاجی امداد اللہ ہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کے روانہ ہونے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو شیخ کی مفارقت کا بے پناہ صدمہ تھا۔ آپ کو اس صدمہ میں چند مہینے آتی تھی۔ یہی عارضہ تھی کہ کسی طرح ایک مرتبہ ملاقات ہوئی زیارت کی جائے قیام کا علم نہ تھا بعد وقت پتہ چلا کہ آپ بجلالہ میں ہیں۔ چنانچہ وہاں پہنچے۔ ملاقات ہوئی زیارت سے مشرف ہوئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بے حد اصرار کیا کہ مجھ کو بھی اپنے ہمراہ لے لیجئے۔ مگر حضرت حاجی صاحب رضی نہ ہوئے اور فرمایا "میاں رشید احمد تم سے توحفی تعالیٰ نے بہتر سے کام لینے میں گہراؤ مت۔ ہندوستان سے نکلنے وقت تم سے ضرور ملوں گا۔"

اور حاجی صاحب نے ملاقات کا یہ وعدہ پورا فرمایا

رشید احمد کو کوئی شخص پھانسی نہیں دے سکتا

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی گرفتاری کا قصہ آگے آ رہا ہے حاجی صاحب کو ذکر کیا ہے کہ وہ واقعات کا ذکر کہیں کر دینا مناسب ہے۔ حضرت مولانا کی گرفتاری اور جیل جانے پر ایک دفعہ یہ خبر پھیلی کہ ان کو پھانسی کا حکم ہو گیا ہے۔ حضرت حاجی صاحب کو بھی یہ خبر پہنچی۔ تذکرۃ الرشید میں ہے:-
بروایت مولوی دلائیٹ حسین۔ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب ایک دن فرلنے لگے کہ "میاں کچھ سنا کیا مولوی رشید احمد کو پھانسی کا حکم ہو گیا؟" خدام نے عرض کیا کہ حضرت کچھ پتہ نہیں ابھی تک تو کوئی خبر نہیں آئی فرمایا "ہاں حکم ہو گیا جلد" یہ فرمانا کہ رشید احمد کو پھانسی دے دیں۔ حکیم صاحب کا بیان تھا کہ برسات کا زمانہ تھا مغرب کے بعد اعلیٰ حضرت اور غالباً مولوی مظفر حسین صاحب کا ندھلوی عرض فرمایا "آئی پٹیلے، شہر سے نکل کر تھوڑی دور جا کر اعلیٰ حضرت زمین کی گھاس کے قد کی سبز چھٹی فرش پر بیٹھ گئے اور کچھ دیر سکومت

فرما کر گردن اوپر اٹھائی اور فرمایا: ”پھر مولوی رشید احمد کو کوئی شخص چھانسی نہیں دے سکتا خدا نے تعالیٰ کو ان سے ابھی بہت کچھ کام لینا ہے۔“ چنانچہ چند روز بعد اس کا بطور ہو گیا۔
 —————
 والحمد للہ علی ذاک۔

ایک اشکال اور اس کا حل

پچھلی سطروں میں گزرا ہے کہ حاجی صاحبؒ نے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی اس استدعا پر پیر کے میں بھی آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ فرمایا تھا کہ ”تم سے تو حق تعالیٰ نے ابھی بہتر سے کام لینے ہیں“ جب یہ بات منکشف ہو چکی تھی تو پھر چھانسی کی خبر کا کیوں یقین کیا۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کشف کا تعلق امور باطن سے ہے اور خبر احکام ظاہر سے تعلق رکھتی ہے کشف کے مقابل میں جب خبر آجائے تو اس کا یقین ایک ظہری امر ہے اور قرآن کریم میں بھی اس کی تعلیم ہے۔ اگرچہ خبر دینے والا فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر کسی مطلق خبر کی تردید پھر کشف سے ہو جائے تو اس سے پہلے کشف کو اتنی قوت منورہ مل جائے گی کہ وہ مطلق خبر کی تردید کر سکے۔ جس خبر کی تردید نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف خبر عدل ہے علامہ خالد محمود عقیدۃ الامت کے حواشیہ پر لکھتے ہیں:۔

و ثبوت پر جس غیب کا اظہار ہو۔ اس میں قطعیت ہوتی ہے اور اخبار غیبیہ یقینی طور پر معصوم ہوتی ہیں۔ جن میں شک و دوسے یا شیطان کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہو سکتا اور ثبوت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں جن میں کہ بعض اخبار غیبیہ کا اظہار ہوتا ہو ان میں وہ قطعیت نہیں ہوتی کہ ان پر احکام شرعیہ یا احکام عدالت کی بنا رکھی جاسکے (عقیدۃ الامت ص ۲۷)

اعلیٰ حضرت و عدہ خلاف نہ تھے

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے تو آپ سے حجاز روانہ ہونے سے پہلے ایک ملاقات کا وعدہ فرمایا تھا مگر آپ جیل میں رہے اور رہائی کے بعد وہاں نہ گئے۔ یہ وعدہ کب پورا ہوا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ہی ہلکی آواز میں فرمایا: ”اعلیٰ حضرت و عدہ خلاف نہ تھے“ چنانچہ دوسرے طرق سے معلوم ہوا کہ حضرت حاجی صاحبؒ باوجود سنگین پیر کے جیل میں حضرت مولانا سے جا کر ملے کئی گھنٹے باتیں کر کے شب ہی میں واپس ہوئے اور عرب کو روانہ ہوئے۔

گرفتاری اور زندان

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پھلا سے گنگوہہ تشریف لائے۔ یہاں ان کے اصحاب نے امر کیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔ آپ کی گرفتاری کا وارنٹ نکل چکا ہے۔ چنانچہ اپنی ادویات و تصدیق پورے گئے۔ اور حکیم ضیاء الدین کے مکان میں مقیم ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد گارڈن کریل فرانسسی غلام علی سکنہ قصبہ ٹی پور متعلق سہانہ پور خبر کے ہمراہ ستر سواروں کے ساتھ گنگوہہ پہنچا اور اتنے ہی مولانا کی تلاش کی۔ سوار اور دھڑ بھیل گئے مسجد اور خانقاہوں کے حجرہوں کو دیکھا۔ ان کے ملنے والوں کے مکان کی تلاش بھی کی حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ماموں زاد بھائی ابو النضر صاحب جو صورت و وضع میں حضرت سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ مسجد کے گوشہ میں گردن جھکا کر مراقبہ میں بیٹھے تھے کہ درگاہِ رسائی سے گردن پر زور کا ہاتھ مارا اور قبضہ میں لے کر پکارا چل کھڑا ہوا کہ گردن جھکاؤ بیٹھا ہے۔ مولانا ابو النضر نے گردن اٹھائی اور سبھراس نے کہا چل کھڑے ہوئے۔ حضرت مولانا کے دروازے پر ان کو لاکھڑا کیا اور کہا کہ گھر کی تلاش دلا اور دکھا کیا کیا ہتھیاریں عرصہ تک مولوی ابو النضر مار کھاتے ذلت سہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ میں مولوی رشید احمد نہیں ہوں۔ جب فوجیوں کو معلوم ہوا کہ یہ مولانا رشید احمد نہیں ہیں

اور ان کو حکیم امیر بخش نے بتلایا کہ حضرت مولانا رام پور ہیں، اس وقت مولوی ابوالنصر کی رہائی ہوئی۔

فوجی رام پور پہنچے اور مولانا گنگوہی کو حکیم ضیاء الدین صاحب کے مکان سے گرفتار کر لیا آپ کے چاروں طرف محافظ بہرہ دار تعینات کر دیئے گئے اور بندہ جلی میں آپ کو سوار کر کے سہارنپور روانہ کیا۔ بیل تیز رفتار تھے اور کچھ جی تھا کہ جلد سے جلد لے جاؤ۔ اس لیے کچھ پرشک بودہ خاک اڑتی تھی کہ وہ گریو اور آنکھیں اندھی ہو جاتی تھیں۔ مولوی ابوالنصر پریشان اور ان کے بور سے بپ مولوی عبدالغنی جنہوں نے مولانا کو پرورش کیا تھا، ننگے پاؤں پابادہ سڑکیں کی تیز رفتاری کا مقابلہ کرتے پہلی کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ عالم پریشانی میں ڈوبے ہوئے۔ عذاب سے آنکھیں بند ہو کر کانٹوں سے پاؤں زخمی بن چکا جائے کہاں جا رہے تھے۔ اور کس طرف قدم اٹھ رہا ہے۔ آخر ایک جگہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ حضرت مولانا سہارنپور پہنچے ہی جیل خانے بھیج دیئے گئے۔ اور بنگلہ پہرہ کی نگرانی لگا دی گئی۔

مولانا عبدالغنی کو جب ہوش آیا وہ پھر دوسرے راستے میں سہارنپور کے ایک صاحب نے بتایا کہ مولانا سہارنپور کے جیل خانہ میں ہیں مولانا عبدالغنی خود جھوکے پیائے تھے۔ مگر ان کو حضرت کی جھک کا زیادہ خیال تھا۔ چنانچہ انہوں نے تاوتر کے کسی کیل برادر کی معرفت حضرت کو کھانا پہنچایا۔ وہاں سے لکھریوں پر کوئلہ سے لکھا ہوا یہ فقرہ ان کے پاس پہنچا۔ کچھ مدت گھراؤ محمد اللہ آرام میں ہوں۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ عمر تبرج کے والد ماجد مولوی محمد تقی صاحب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہید ہو چکے تھے۔ انہوں نے جب حضرت کی گرفتاری کی خبر سنی تو خدا کا شکرا ادا کیا کہ حق کی راہ میں باپ شہید ہوا اور خانہ جیل میں ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی تین چار یوم کال کوٹھری میں بند رہے اور پندرہ روز جیل خانہ میں رہے۔ تحقیقات اور پیشی پر پیشی ہوتی رہی، آخر عدالت سے حکم ہوا کہ واقعہ تھا نہ سمجھوں گا بے اس لیے مقدمہ مظفر نگر منتقل کیا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا گنگوہی ننگی تلواروں کے پہرہ میں دیوبند کے راستے سے دوڑا اور کھلے پابادہ مظفر نگر لائے گئے اور مظفر نگر کے جیل خانہ کی کوالیات میں بند کر دیئے گئے۔ دیوبند کے قریب سے جب مولانا گنگوہی گزرے تو مولانا محمد قاسم صاحب مقدمہ راستے سے کچھ ہٹ کر بغیر ملاقات پہنچے سے آکھرے ہوئے تھے کہ غرضی ان کا دارن تھا اور درپوش زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں شہر نے اس وقت انہیں چھپنے نہیں یاد دہ سے سلام ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرائے۔

مظفر نگر کے جیل خانہ میں آپ کو تقریباً چھ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا اس زمانہ میں آپ کے استقلال، عزم، ہمت اور ارادوں میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ ابتداء سے کہ انتہا تک آپ کی نماز ایک وقت جی تقاضا نہیں ہوئی، محالہ

ثابت قدمی اور رہائی

کے دوسرے قیدی آپ کے معتمد ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت سے آپ کے مرید ہوئے باجماعت جیل خانہ کی کوٹھری میں نماز ادا کرتے تھے۔ ارشاد ظاہری و باطنی سے آپ کسی دن غافل نہیں ہوئے۔ وعظ و پند و نصیحت کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ لوگوں کو سناتے اور دہریت کا سبق دیا کرتے۔ سنی جب عدالت میں جاتے تو دریافت کیا جاتا ہے تلکھت اس کا جواب دیتے آپ نے کبھی کوئی ٹکڑا دیا کہ یا زبان موڑ کر نہیں کہا۔ کسی وقت جان بچانے کی کالی نہیں کی۔ جو بات کہی سچ کہی اور جس بات کا جواب دیا خدا کو حاضر ناظر جان کر واقعات اور حقیقت حال کے مطابق دیا۔ اور چاہا گیا کہ تم نے سرکار کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے۔ تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا۔ کبھی حاکم دھککا تم کو پوری سزا دیں گے۔ آپ فرماتے کیا مضائقہ ہے۔ بالآخر چھ مہینے جیل میں رہے کے بعد آپ کی رہائی ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دبا تو ہو گئے تھے لیکن ان پر سی آئی ڈی کا پہرہ مرنے دم تک

رہائی کے بعد خفیہ نگرانی

تھامریدوں کے روپ میں جہان کی شکل میں۔ مرید بننے کے بہانے سے آئے اور اپنا کام کر کے چلے جاتے

ایک مرتبہ ایک شخص تشریف لائے اور اس درجہ عقیدت کا اظہار کیا کہ کوئی ان پر شک نہیں کر سکتا تھا، یہ حضرت کے معتقد نہیں ہیں، جو وقت حضرت کے سامنے آئے اور درخواست بیعت کی۔ تو حضرت نے جھوٹ دیا۔ اور فرمایا جاؤ میرے یہاں تمہارا کام نہیں۔ میں ہرگز مرید نہیں کروں گا۔ یہ حضرت روئے اور حضرت کے متعلقین سے سفارش کرائی مگر جس نے بھی سفارش کی اس کو بھی یہی جواب ملا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ نہیں مرید کروں گا اس کو کہہ دو یہاں نہ بٹھہرے۔ اگر نہ جائے تو نکال دو۔ اور اسباب باہر پھینک دو۔ حضرت کی اس بے رحمی پر لوگوں کو بھی افسوس ہوا، مگر سوائے تمہیل حکم کے کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کا اسباب خالصاً سے باہر کر دیا۔ اس پر بھی حسن عقیدت کا اظہار نہ چھوڑا تھا۔ اور رو دو کہ کتنا کچھ ہی ہوں تو ضرور بیعت ہوں گا۔ حکیم محمد یوسف صاحب کو اس کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹیا۔ اس کو اپنی پیٹھک میں ٹھہرا کر وعدہ کیا کہ میں حضرت سے سفارش کروں گا کہ تمہیں مرید نہ لائیں۔ دوسرے دن حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں گئے۔ کہنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ حضرت نے خود فرمایا کہ آنے والا کہاں ہے۔ تم نے اسے کیوں ٹھہرا رکھا ہے۔ کرایہ کا انتظام کر دو۔ اور کہہ دو چلتا ہوں اب ان الفاظ کے بعد حکیم صاحب خاموش ہو کر چلے آئے۔ پیٹھک میں دم رکھا تو دیکھا کہ مسافر کتاب کھولے کچھ لکھ رہا ہے۔ حکیم صاحب کے آتے ہی جلدی سے کتاب بند کر کے جزدان میں لپیٹ حاصل بنا کر گئے۔ لیٹال۔ اب حکیم صاحب متنبہ ہو گئے۔ خیال پیدا ہوا کہ حامل کو دیکھا جائے۔ اس میں کیا ہے۔ حکیم صاحب نے ایک رات مسافر کو باتوں میں لگائے رکھا۔ کافی رات تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ نیند کے غلبہ سے عاجز آگیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ سونا جاہتا ہے۔ تو یہ کہہ کر چلے آئے اچھا اب سو جائیے۔ مسافر لیٹا اور لیٹے ہی گہری غفلت کی نیند سو گیا۔ اس وقت انہوں نے اس کی گردن میں سے حامل نکالی لیمپ کے سامنے لاکر کھولی تو کہیں انگریزی کہیں فارسی کہیں اودو اور کہیں عربی لکھی ہوئی ہے۔ غفلت کے ساتھ ورق گردانی کی تو ایک صفحہ پر کسی انگریز حاکم کے نام چھپی کی نقل پر نظر پڑی جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نے گورنمنٹ کی خبر غازی میں جان تو جان اپنے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کی۔ مگر افسوس میری قدر چھپی ہوئی چاہتے تھے دیسی نہ ہوئی اس عبارت کو دیکھ کر حکیم صاحب کا نپ اٹھے اور کتاب بند کر کے اسی طرح مسافر کے گلے میں حامل ڈال کر چلے گئے۔ علی الصبح کو راید کا ٹولیا اور اس کو رخصت کر دیا۔ حکیم صاحب حضرت کی خدمت میں آئے تو حضرت سگرائے اور آہستہ سے فرمایا ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ اس کو روانہ کر دو تم ہی نہیں مانتے۔

درس تدریس

گردانی سے رہائی کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود مہند آرائے تلقین و ارشاد ہونے کے درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گویا علوم باطنی کے ساتھ ظاہری علوم شرعیہ و فنون کی تعلیم میں بھی مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں آپ نے تیسرا چکیا اور اس کے بعد ایک سال میں صحاح ستہ کے دورہ کو ختم کرانے کا آپ نے التزام کیا اور اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا چنانچہ درس حدیث کا یہ سلسلہ ۱۲۶۵ھ سے لے کر ۱۳۴۱ھ انچاس سال تک چلتا رہا اور اس دوران میں یقیناً سو سے زائد حضرت نے آپ سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ آپ کے مرب سے پہلے شاگرد (گنگوہی) سید مومن علی تھے۔ جنہوں نے آپ سے شرح جامی پڑھنا شروع کیا اور آخری شاگرد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ جس سال حضرت مولانا کاندھلوی نے دورہ حدیث پڑھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی میان جاری تھی اور آنکھوں میں پانی اتروا تھا یہ آپ کا آخری سال تھا۔ اس سلسلے کی دوی ارشاد و تلقین کا مشغلہ تو جاری رہا لیکن تعلیم دینا ترک کر دیا۔ انچاس سالہ تعلیمی دور میں آپ سے پڑھنے والے۔ ہند۔ برما۔ کابل۔ افغانستان ہر جگہ سے آئے۔ بعض سالوں میں ستر آبی طلبہ کا بیع رہا۔

طریقہ تدریس

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے محدث تھے کہ جن میں اجتہاد و انتظام کی تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں حافظہ و ثقاہت، تقدیس و تبحر، فراست و مہمندی، خوبی و تعلیق و ارتباط، جود و ذہن اور آفتان و عدالت جتنے اوصاف

خوبیاں ایک اچھے محدث استاد میں پائی جاتی ضروری ہیں۔ ان تمام سے آپ متصف تھے۔ آپ کے درس حدیث میں ایک خاص خوبی تھی کہ معنوں کی حدیث اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یہ خاص اثر اس لیے تھا کہ اس دور میں آپ ہر فرد سے زیادہ متبع سنت تھے۔ آپ صحیح معنوں میں حب رسول اور سنت سنت تھے۔ آپ کی تدریس میں محبت کا ایسا عالم ہوتا تھا کہ ہر شریک درس کی یہ خواہش ہوتی کہ سلسلہ دس دراز ہو۔ اور جب سبق ختم ہوتا تو خیال ہوتا کہ ابچہ باقی ہے۔ کاش سبق شروع ہوتا، لیکن جب سبق اوراق و صفحات شمار کئے جاتے تو جبروت ہوتی کہ اس قدر سبق کیونکر ہو گیا۔ آپ کی تقریر کے بعد کتب سنت اور خواہش دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ رہتی تھی۔ اور یوں خیال ہوتا تھا کہ تمام شرحوں اور تفصیلات کا خلاصہ حضرت نے سلسلے کر دیا ہے۔

صحاح میں سب سے پہلے مولانا صاحب ترمذی شریف شروع کراتے۔ ہر حدیث کا ترجمہ اور معنی سلیس اور عام فہم الفاظ میں بیان فرماتے اور فقیر کو اس طرح کھول کر بیان کرتے کہ کوئی الجھن باقی نہ رہتی اس کے بعد اگر تلاوت کی گئی حدیث کا بظاہر کسی دوسری حدیث یا کسی آیت قرآن سے تعلق نہ تھا تو اس کو رفع فرماتے۔ بعد ضرورت اسما، الرجال ذکر کرتے۔ روایہ کی پوری تحقیق توثیق اور تضعیف بیان فرماتے۔ اگر سابق و سابق میں کوئی محض اختلاف تو اس کو کھولتے۔ طلبہ کے اعتراضات پر ذرا پس نہیں نہ ہوتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم قرأت کر رہا تھا "عطارد" کا لفظ آیا اس نے سمجھ لیا کہ یہ عطارد مشتق اور اس کا نفاذ معنی ہے۔ بلکہ تھان آگے پڑھتا چلا گیا۔ ایک پٹھان طالب علم کو سمجھ نہ آیا۔ اس نے قاری کے کہنی ماری اور کہا کہ ٹھہرو ہم نہیں سمجھا۔ معنی یہ؟ حضرت نے فرمایا "زبور عطر فروشدہ" قاری پڑھنے لگا اس نے پھر کہنی ماری اور کہا کہ حضرت عطارد معنی چہ ہم نہیں سمجھا۔ آپ نے "عطر فروش کی بیوی" قاری پھر پڑھنے لگا پٹھان نے تیسری دفعہ کہنی ماری اور نیر نظر سے دیکھا۔ اور کہا ٹھہرو ہم نہیں سمجھا عطارد کا معنی "اسر" امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے اونچی آواز سے فرمایا "عطر پھینچنے والے کا جو رو" اب پٹھان خوش ہوا اور کہا "ہاں سمجھا ہاں بھائی چلو" اس لطیف حکایت سے قاری میں بخوبی سمجھ گئے ہیں کہ حضرت کسی سوال پر مضامین نہیں ہوتے تھے۔

ترمذی شریف کے ختم ہونے پر صحاح کی دوسری کتابیں ہوئیں ان میں ترجمہ نہ ہوتا البتہ کوئی نئی حدیث آتی یا مروت کی عبارت ہوتی تو اس کا مطلب مثل سابق بیان فرماتے۔ حضرت تو ہر وقت ہی "الوضو صلاح المومن" و "مؤمن کا ہتھیار ہے۔ کے نظریے سے منسلک رہتے۔ کسی حدیث شریف کے درس میں تمام طلبہ کو با وضو ہونے کی مصلحت دہانت فرمایا کرتے۔ پڑھاتے وقت خوش رو رہتے تاکہ سائل کو سوال کرنے میں نہ ہو۔ اگر کبھی طلبہ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تو کوئی ایسی لطیف حکایت یا واقعہ بیان فرماتے کہ طلبہ کی تھکان دور ہو جاتی۔

حضرت مولانا مذہب حنفیہ کی اگرچہ دلائل مکمل ترجیح کرتے جاتے مگر کیا یہ خیال کہ کسی جگہ کسی دوسرے فقیہ یا امام کی ذرا سی تنقیص ہو جائے کہ جسے کچھ حنفی مسلک سے خاص محبت ہے اور اس کی حقانیت پر کئی اطمینان ہے۔ اگر کسی طالب علم نے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ جس سے مسلک مسکب کی توہین و تنقیص کا پہلو نکلا تو قرآن و حدیث اس کی اصلاح فرماتے۔ یہاں تک کہ نفس تغلید میں بھی تعصب کا حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا۔ بعد تشدد و عصبيت میں محدثین کے متعلق کوئی ذرا ناگوار نہ کہہ دیتے تو حضرت کے چہرہ پر کراہت کے آثار پیدا ہوتے اور فرار امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام کی ترجیح مذہب حنفیہ پر ظاہر کرتے اور فرماتے کہ ان حضرات نے ان وجوہ کی بنا پر اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔ جب طلبہ کی بڑی دور ہو جاتی تو میرے باوجود اس فضل و کمال کے آپ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے اور کبھی اپنے آپ کو کسی دوسرے پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت نے ایسی بیخ تقرر فرمائی کہ طلبہ جھجھ گئے اور بے اختیار درس ہی میں حضرت کے مسلک کی تعریف کرنے لگے آپ نے بے ساختہ قسم کھا کر فرمایا۔ "میں اپنے کو قوم میں سے کسی کے برابر بھی نہیں سمجھتا چہ جائیکہ زیادہ کچھوں۔ اگر

کسب نفسی اور تواضع

قسم کھانے کی مطلق عادت نہ تھی۔ لیکن اس موقع پر بلا اختیار قسمیہ الفاظ آپ سے صادر ہو گئے۔

طلبہ کے جوئے اٹھائے

ایک دفعہ درس حدیث میں بارش شروع ہو گئی۔ طلبہ نے جلدی جلدی کتابیں اور ترائیاں رکنا ہیں رکھنے والے چھوٹے چھوٹے میز اٹھائیں اور چل دیئے۔ اس کے بعد طلبہ نے دیکھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کندھے کی چادر میں طلبہ کی جوتیاں ڈالی ہوئی ہیں اور اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ طلبہ بہت نادم و حیرت زدہ ہوئے فرمایا کہ اس میں کوئی بری بات ہے۔ تمہاری خدمت کو نافرمانی کی نجات کا باعث ہے۔ طلبائے دین کے لیے تو حدیث شریف کے الفاظ میں پھیلیاں سمندر میں چھوٹیاں یلوں میں دغا کرتی ہیں اور فرشتے تمہارے قدموں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں اور تم تو مہمانانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ کہ حدیث پڑھتے آئے ہو۔

طلبہ پر ایسے معنی کے مہمان ہیں

حضرت طلبہ کی مدارات اور عزت و تکریم میں ہر وقت کوتاہی رہتے اگر کسی کو کوئی غم یا تکلیف لاحق ہوتا تو صبر و سہم کے کلمات سے تسکین بخشتے، جس طرح ان کے اپنے دل میں طلبہ دین کی عزت تھی چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ان کی اسی طرح عزت کریں، آپ کو یہ مرگ گواہ تھا کہ کوئی ان کو بظہر حقارت نہ دیکھے، ایک طالب علم کا کھانسی جگہ لگایا ہو تو غصا مانا نہ لانا، ہمارے گھر سے آیا کرے گا، ادھر اپنے رشتہ دار سے ناراضگی کے کلمات کہلا بھیجے، کہ اس وجہ سے ان کو اس طرح کھانا دیتے ہو کہ یہ سب ہی ہیں، ان کو دروازہ کا فقیر سمجھا گیا سو کیا مضائقہ ہے، ملک خدا تنگ نیست، تم اپنی روٹی اپنے پاس رکھو خدا ان کا اور جبکہ نظام کر دے گا، وہ سعادت نواب عورت جن کے گھر سے کھانا آتا تھا حاضر ہو کر معذرت خواہ ہوئیں اور خطا معاف کرائی، اور کہا آئندہ دسترخوان میں کھانا ملک کی تعظیم کے ساتھ پیش کیا کروں گی، آپ نے منظور فرمایا۔

طلبہ کے عقائد و اعمال کی نگرانی

آپ بیک وقت طلبہ کے استاد بھی تھے اور شیخ بھی، اگرچہ طلبہ آپ سے رسمی بیعت نہ کرتے ہوں تاہم آپ دونوں چیزوں کو ملحوظ رکھ کر طلبہ کی ہر طرح اصلاح و تربیت فرماتے تھے، آپ زندگی کا مشن ہی یہ تھا کہ لوگوں کے عقائد و اعمال درست کئے جائیں، شرک و بدعت کی رد کی جائے، تاہم سبق پڑھاتے وقت اس کا بہت زیادہ اہتمام نہ کیا، شرک و بدعت کا جبکہ قلع قمع فرماتے، توحید و اتہاد سنت کی ترویج دیتے، صرف زبانی نصیحت پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ ضرورت پڑنے پر تیزی اور قہر بھی فرماتے، اور اس کے ساتھ توحید قلبی اور روحانی فیضان سے تار و پود کو منور کرتے اور رنگ دور فرماتے، بعض اوقات طلبہ کا پورے گانا یا علامت جو حیرت ہونے کا جیسے آسمانی سکینت کے نازل کا احساس کر رہا، بچہ سلوک و معرفت کے حقائق دورانِ درس بیان فرماتے کہ طلبہ کو وجد آتا، مغرب تک طلبہ کی ہر طرح دیکھ بھال کرتے، ان کی نشست پر فراغت، پھال وصال، گفتار کو دہرا، وضع قطع ہر چیز کا خیال رکھتے، اگر کسی طالب علم دیکھتے کہ وہ اپنے پڑھے ہوئے پر عمل پیرا نہیں ہے تو حجب تک اس میں غوث گوار تبدیلی پیدا نہ ہو جاتی آپ بے چین رہتے۔

راست ایمانی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ "مومن کی فراغت سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے" حضرت مولانا طلبہ کی ہر وقت کڑی نگرانی رکھتے تھے، اگر کوئی طالب علم ایسا نظر آیا کہ اس کے متعلق یہ محسوس فرماتے کہ اس میں کچھ دیتے یا روکھائیں دکھاتے کہ وہ خود ہی چلا جائے، ہاں جس طالب علم کو سعید پاتے تو اس کی دلداری فرماتے، بیٹوں کی طرح عزیز رکھتے۔

ہدایہ کی تعلیم

آپ کتب حدیث کے علاوہ دوسرے فنون و علوم کی کتب بھی پڑھتے لیکن فلسفہ و منطق سے آپ کو نفرت تھی، لہذا دورانیہ تدریس ان کتابوں کو نہیں پڑھایا بلکہ ان علوم سے بے رغبتی دلانے کی کوشش کرتے۔ شروع میں آپ کی تدریس مومن علی آپ کے گنگوہ میں پہلے شاگرد تھے اور ان کو آپ نے شرح جامی پڑھانا شروع کی۔ مدرسہ مصباح العلوم مرہٹے کے ایک مدرس ذکر کرتے تھے کہ میں نے ہدایہ جلد ۱ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا۔ اور اس وقت حضرت نے فرمایا کہ یہ چودھویں مرتبہ ہے کہ تم کو پڑھا رہا ہوں۔ جس انسان نے فقط ذہنی اور دماغی صلاحیتوں سے بہرہ وافر پایا ہو اور پھر مولانا ملک علی ایسے یگانہ روزگار استاد سے تعلیم حاصل کی ہو، اور ان سے اپنی ذہانت و ذکاوت کی تحسین کرائی ہو۔ وہ انسان جب صحاح اور دیگر کتب کو بیسیوں مرتبہ پڑھ لے گا تو اس کے بصر علمی و فہمی کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔

سہ درمی کا قبضہ

گذشتہ اوراق میں معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت نے قدوسیہ حجرہ کو نشست کی جگہ بنالیا تھا۔ اسی میں مطب تھا اور اس میں اول اول پڑھانا شروع کیا جب طلبہ کی تعداد بڑھی، تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اب مزید کوئی کھنبرہ تعمیر ہو۔ آپ بھی خیال ہوا اور خدام نے بھی اصرار کیا چنانچہ مخلص احباب کے اصرار اور کچھ امداد آپ نے اپنی طرف سے باقی رقم ڈال کر حجرہ کے سامنے ایک سہ درمی بنوائی۔ اس دوران میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی شہرت و ناموری ہو چکی تھی، جب آپ نے حجرہ قدوسیہ صاف کر کے اس میں نشست رکھی تو خاندانہ نسبت کرنے والے پیڑا سے خاموش رہے، بلکہ خوش ہوئے کہ ایک غلیظ و گندی گھاٹ ہو گئی، مگر اب جب دیکھا کہ حضرت کی طرف خلق خدا کا رجحان ہو رہا ہے تو ان کو اپنی کا نڈاری ختم ہوتی نظر آئی، اور حسد و رقابت کی آگ میں جلنے لگے، حضرت کا رشک و بظلمت بھی ان کو حدودِ جبر ناکور تھا کہ بیشتر اس قسم کی برائیاں گھر کے بچے تھیں، لیکن انہیں کوئی بہانہ نہ آتا تھا کہ آپ کی مخالفت کریں، سال گزر گئے، لیکن اب جب حضرت نے بنوائی تو مشورے ہونے لگے کہ — "آج مولوی رشید احمد نے سہ درمی بنوائی ہے کل کو کچھ اور علامات بنا کر اپنی ملکیت کا دعویٰ کریں گے، کو اس مکان سے بے دخل کریں اور جو کچھ لاگت، اس تعمیر میں لگی ہے وہ ان کو دے کر قبضہ چھوڑ دیں۔" چنانچہ پیڑا نے اکٹھے ہو کر آپ کے پاس، عرف مطلب زبان پر لائے، حضرت کی خدا اور بدعت اور خدام و طلباء کی تعداد کی بنا پر ایک خاصہ معج بنا کر آئے تھے کہ اگر لڑائی کرنا پڑے، حضرت کو جب علم ہوا کہ یہ اس لئے آئے ہیں تو فرمایا

"بہت اچھا، اتنی سی بات کے لیے جمع کے آنے کی کیا ضرورت تھی اگر کسی ادنیٰ آدمی اور اپنے یہاں کے نائی دھوبی سے بھی یہ پیام کہلا بھیجتے تب بھی مجھ کو چھوڑ دینے میں تامل نہ ہوتا۔"

یہ فرما کر اتنی لاگت جو آپ کی جیب خاص سے خرچ آئی تھی لے کر اسی وقت طلبہ سے فرمایا کہ بستر کپڑے اور کتا بنیں وغیرہ سب نکال کر خالی کر دو۔ ————— اناذہ کیجئے کہ جب اس حجرہ میں گھوڑے اور گدھے باندھے جاتے تھے اور دھوبیوں نے اس پر قبضہ جمار کر لیا تو وقت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے کسی پیڑا سے کو خیال آیا نہ دل دکھا، مگر اب حبلہ میں قال اللہ اور قال الرسول کا نغمہ گونجا اور بائیس سے لہرائے والے دستروں کا بارغ جھانک گیا تو ان پر تازگان کو قبضہ کی سوچی۔

بہر حال حضرت نے فرما جگہ خالی کر دی اور ایک دفعی بھی مہلت نہ مانگی، کپڑے وغیرہ گھر پہنچا دیئے، کتا بنیں مسجد میں لا کر رکھ دیں اور عرصہا تو بیچ ہاتھ میں لے کر مسجد میں قلم رُخ آ بیٹھے، ذرا بھی خیال نہ آیا کہ برہمہا جس سے اس جگہ رہا ہوں۔ آپ کے رشتہ داروں، عزیزوں اور جان نثار شاگردوں پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اس کا اناذہ لگایا جا سکتا ہے۔ لے کسی کو زبان تک نہ لہانے دی اور ان کو فرمایا ————— کہ جس نے کوئی لفظ زبان سے نکالا وہ میرا دوست نہیں بلکہ دشمن ہے۔

ہولاج

آپ کے دن بڑی غربت اور تنگدستی سے گزر رہے تھے۔ لیکن حرمین شریفین کی حاضری کے لیے آپ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور تھی کہ مشکل اہل و عیال کی نگہداشت ہوتی تھی بلکہ یہاں تک کہ آپ کی خواہش یہ ہوتی کہ جس حال میں پڑا ہوں اسی گمانی و گوسفینی کی حالت میں پڑا رہوں کسی آنکھ یا کان کو اس کی خبر نہ ہو۔ ان حالات میں حرمین شریفین تک آنا جانا کیسے ہو؟ لیکن جب طلبہ بھی ہو تو اللہ قائلے اسباب پیدا فرما دیتے ہیں۔

ڈپٹی عبدالحی رامپوری کا قصد حج ہوا اور انہوں نے اپنے اہل و عیال اور متعلقین و وابستگان کا ایک جم غفیر ساتھ لے جانا چاہا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری جو حضرت حافظ بشیر سے خلیفہ جاز تھے۔ ڈپٹی صاحب کے احباب میں سے تھے۔ ڈپٹی صاحب نے حکیم صاحب کو بھی ساتھ لے کر صاحب حضرت گنگوہی عسکانی میں سے تھے کیونکہ انہیں علم تھا کہ میرے پیرو مشد نے حضرت گنگوہی کے زانو پر جام شہادت نوش فرمایا تھا حکیم صاحب نے حضرت گنگوہی کا ذکر کیا تو ڈپٹی صاحب بلا ادنیٰ تاہل مان گئے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کیا کہ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ مولانا گنگوہی جیسا بے رسول و متبع سنت ہمارے قافلے میں شریک ہو۔ مولوی ابوالنضر حضرت گنگوہی کے مساموں زاد بھائی جو حضرت کے بچپن کے ساتھی اور جان نثار تھے ان کو جب علم ہوا کہ مولانا سفر حج پر بارہ ماہ ہیں تو انہوں نے اپنا اثمانہ اونے پونے بیچ کر مدد اہلہ معیت اختیار کی۔ ان دنوں سفر حج انتہائی ہار تھا۔ اور فریضہ حج کی ادائیگی سب فریقین سے مشکل تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ دفعتاً کشتیاں تین تین چار چار ماہ مسند میں بچکوںے کھاتی رہتیں۔ آپ سفر میں سخت طوفان آیا تمام مسافر گھبرا گئے۔ مگر آپ نہایت پرسکون تھے تو کوئی گھبراہٹ پر انہیں یہ کہہ کر تسلی دی کہ "جس کوئی مر گیا تو میں نہیں ہوں تو کسی کے بلائے ہوئے جا رہے ہیں خود نہیں جا رہے" اور جہاز جب اصلی حالت پر آیا تو کپتان نے گھڑی دیکھ کر بتایا کہ کشتی بحال ہے اس طوفان کی وجہ سے نہیں آٹھ دن کی مسافت تین دن میں طے کر دی ہے۔

دیائے صالحہ

آپ کے شریعت و طریقت دونوں کے شیخ یعنی حضرت شاہ عبدالغنی مجددی اور حضرت حاجی صاحب علی الترتیب مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں قیام کئے ہوئے تھے حرمین شریفین کی حاضری اور شیخین کی زیارت کے تصور نے حضرت کو یہ گویا بخود بنار کھا تھا۔ مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کی زیارت ہوئی۔ حج کے دوران حضرت حاجی صاحب نے اپنے طالب صادق کو ہر وقت ہمراہ آپ نے مکہ معظمہ ہی میں خواب دیکھا:-

"ابداً جیسے اہل خدمت ادب کا ایک گروہ جا رہا ہے اور آپ ان کو دیکھ رہے ہیں آپ فرماتے تھے کہ میں نے خواب ہی میں دعا مانگی کہ یا اللہ مجھے بھی ان سے ملحق کر دے۔ یہ دعا مانگ کر میں ان کے پیچھے دوڑا اور ان کی جماعت میں مل گیا" ہوا علی حضرت کو خواب سنایا تو مسکرا کر فرمایا:- "پھر کیا چاہتے ہو لاحق تو ہو گئے" معظمہ میں ہیں دوسرا خواب دیکھا:-

"آپ کے آٹھ کی چاروں انگلیوں سے خون جاری ہے دوسرے کی شرت اور تیسری سے کم اور چوتھی سے اور کچھ کم"۔ سنے یہ خواب مولانا مظفر حسین کا ندھلوی سے بیان کیا انہوں نے تعبیر دی کہ تمہاری چاروں نسبتیں (چشتی سروردی نقشبندی قادری) میں ہوں گی دو کا جریان بہت ہوگا۔ حضرت مولانا گنگوہی سے ان چاروں نسبتوں کا جس طرح فیضان ہوا اس کی تشریح کی حاجت نہیں۔ لیکن آپ ان کی تسبیح فرمایا کرتے تھے کہ "اس وقت سے اب تک مظفر ہوں۔ مولوی مظفر علی بنو ہوتے تو کھتا۔ کہ آپ ہی نے تعبیر فرمائی تھی لیجئے کچھ کیجئے"

مدینہ منورہ میں حضرت شاہ عبدالغنی کی زیارت کی۔ ڈپٹی عبدالحق مرحوم مدینہ ہی میں فوت ہو کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ بیک وقت۔ اللہ تعالیٰ نے بہتر سلوک فرمایا۔

والہی میں آپ شدید بیمار ہو گئے جہاں ہی میں زندگی سے یابوسی ہو گئی اور یہ یابوسی بھی میں ایک ماہ برائے علاج اور ایک ماہ میں برائے علاج کے قیام میں مسلسل رہی۔ بالآخر اندوہ کے شاہی حکیم حکیم محمد عظیم کے علاج سے افادہ ہونا شروع ہوا۔ گنگوہی پینچ کرسات آٹھ کے بعد مکمل معنیابی ہوئی۔ اس پورے سفر اور طویل علالت میں مولوی ابوالنصر نے تیار داری کا سہی ادا کر دیا۔ تفصیلات جانتے کے بعد خیال ہے کہ اس طرح کے تیمار دار شاید انسانی تاریخ میں چند ہی گزرے ہوں حضرت گنگوہی فرمایا کرتے کہ ابوالنصر تو میری مال ہے، اور شاید حقیقی بھائی بھی آتھی خدمت نہ کرتا مثنیٰ انہوں نے کی۔

آپ سفر حج کو اوائل ۱۲۸۵ھ میں روانہ ہوئے اور محرم ۱۲۸۶ھ کو واپس گنگوہی پہنچے۔

آپ نے دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں کیا۔ اور اس سفر حج میں اللہ کے ایسے ایسے نیک بندوں نے شرکت کی کہ شاید ہندو میں اس سے پہلے اور اس کے بعد اس کی نظیر نہ مل سکے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رفیع الدین صاحب بہتم دار العلوم دہلی، شیخ الہند مولانا محمد حسن، حکیم شیخ الدین صاحب، مولانا محمد مظہر صاحب، بانی مظاہر العلوم کے علاوہ تقریباً سو بڑے بڑے عالم و فاضل اس قافلے میں شریک تھے۔ اس سفر کی پورے ملک میں شہرت ہو گئی۔ لہذا گھر سے لے کر سارے ہر گز فقید المثال استقبال ہوا۔ ایسے صلہ و علاء کے کھجور پر اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کی بوبارش ہوئی ہوگی اس کا کون اندازہ لگا حضرت حاجی صاحب کو اطلاع مل چکی تھی۔ لہذا علیحضرت باوجود ضعف و نقاہت اور پیرا سال کے مکہ معظمہ سے باہر استقبال کے لیے کتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ قافلے کے آنے پر ہر ایک سے معافی لیا۔ اور سب کو تقریباً اپنے پاس بٹھرایا۔ ۱۲۹۵ھ میں واپس

اسی سفر میں حضرت نانوتوی بیمار ہوئے اور اس بیماری نے آنا طول کھینچا کہ صرف اسی کا سبب بنی اور ۱۲۹۷ھ میں راجی ملک بھاؤ نے حضرت گنگوہی کو اس کا شہ

حضرت نانوتوی کی وفات

ہوا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے مولوی محمد قاسم کی مفارقت کا اتنا صدمہ ہوا کہ اگر ایک بات نہ ہوتی تو اسی وقت میری جان نکل جاتی، کسی خاص عرصہ کیا کہ حضرت وہ کیا بات تھی فرمایا، وہی جس کی وجہ سے تم مجھے بڑا سمجھ رہے ہو۔

۱۲۹۹ھ میں آپ نے تیسرے حج کا دفعہ ادا وہ کیا اور ایسے وقت میں کیا کہ بظاہر حج کے دنوں میں پہنچنا مشکل رہا۔ ذی قعدہ کو گنگوہی سے روانہ ہوئے۔ یہی سبب جہاں چلا ہے تو وہ روز میں باقی تھے۔ خدا کا فضل شامل

تیسرا حج

نویں دن جدہ پہنچ گئے۔ حالانکہ کراچ کے تیز رفتار وقت میں بھی چھ روز میں کراچی سے جدہ پہنچنا ہوتا ہے۔ اور یہی سبب کراچی کی نسبت جدہ دور ہے۔ کاسران میں فریٹین کے لیے جہاز کا ٹھہرنا اندر سردی تھا لیکن غبی کشش کی بنا پر جہاز کشتان چلتا رہا اور باوجود کاسرا رکنے کی ہدایات کے نہ رکا جس کی وجہ سے جہاز کو تین ہزار ہزار روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ حضرت جب مکہ معظمہ پہنچے ہیں تو اگلے دن شروع ہو گئے۔

علیہ حکیم محمد علی شاہ بہزاد روپیہ بجا دیا اور انہوں نے ان کی مشورہ تعینت کیا کہ عظیم ہے حضرت گنگوہی برائے علاج اس سے استفادہ کیا کرتے حضرت اگر عزت اور سفر ہی میں تھے تاہم حکیم صاحب نے ان کی جائے قیام پر کرمیہ کیا اور مہجون عبیری علاج تجویز کیا۔

ایک لنگوہ کے شخص اس سال حج کے لیے روانہ ہوئے مگر حضرت کی خواہش کے پاؤں پہلے چل دیئے اور واپسی میں بھی علیحدہ چلے گئے نتیجہ یہ کہ ایک ماہ قنطرین کے لیے راستہ میں بٹھرتا پڑا خیر بھی زیادہ ہوا اور وقت بھی زیادہ لگا۔ حضرت کا جہاز نہ آتے ہوئے لگا اور نہ جاتے ہوئے آپ کا تیسرا حج آخری حج تھا۔ اس کے بعد سرخج کا اتفاق نہیں ہوا بالاسنقلال تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے۔

حضرت گنگوہی کا وجود کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے وقت تھا۔ دارالعلوم دیوبند و دارالعلوم مظاہر العلوم سہارنپور کے تاحیات آپ سرپرست رہے۔ مظاہر العلوم سہارنپور کی بنیاد دارالعلوم دیوبند کے بنیاد کے چند ماہ بعد ۱۲۸۳ھ میں رکھی گئی۔ اس کے بانی حضرت مولانا سعاد علیؒ اور مولانا محمد مظہر نانوتویؒ تھے۔ حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سرپرست تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا احمد علیؒ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ سال ہندوستان میں مدارس میں تاریخ میں عام الحزن اور سال غم کہلاتا ہے۔ مظاہر العلوم اور دارالعلوم دونوں دیکھے تھے۔ چنانچہ حضرت گنگوہی کی توجہ جو اس سے پہلے مدارس کی طرف مستور تھی اب علانیہ ہو گئی اور آپ ان کے مستقل سرپرست و مقرر ہو گئے۔

۱۳۰۱ھ میں دارالعلوم دیوبند میں ہوتا تھا جلسہ دستار بندی ہوا۔ جو اس کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ حضرت گنگوہیؒ اس میں تشریف لائے اور حضرت مولانا اشرف علی

نویؒ حضرت مولانا محمد یحییٰ سمیت گیارہ حضرات کی دستار بندی ہوئی اس جلسہ پر دیوبند میں اتنا بڑا اجتماع ہوا کہ اس سے قبل شاید ہی ہوا ہو۔ حضرت گنگوہیؒ نے دستار بندی کی خوشادہ خوش نصیب حضرات کو جن کی دستار بندی حضرت گنگوہیؒ نے فرمائی۔ ہمارے اگلے دن جمعہ مولانا رفیع الدین صاحب و مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے عرض کیا کہ حضرت آپ کا وعظ سننے کو بہت دل چاہتا ہے تو آپ نے فرمایا کہ آپ کا چاہتا ہے تو جو کچھ مجھے آتا ہے کہہ دوں گا۔ اگلے دن صبح مسجد میں وعظ فرمایا اس وعظ کی کیفیت مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے کہیں پڑھے کہ جو روایتی قسم کے متعمد تھے۔ تکلف و تصنع سے بے نیاز۔ سادگی و خلوص کے بیکر۔ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددیؒ کے جانشین۔

جن میں آنا کہ انہوں نے رواد و تقریر میں ذرا بھی مبالغہ کیا ہو گا سالانہ رویداد مدرسہ میں تحریر فرماتے ہیں :-
وعظ کیا گیا سامعین کو جسے محبت الہی کے خم کے خم چلا دیئے درو دیوار تک مست تھے اور عجیب کیفیت ظاہر تھی کہ کہیں دیکھی نہ سنی اللہ اللہ! اس کے خاص بندوں کے سیدھے سیدھے الفاظ اور سادہ بیان اور ڈھیلی ڈھیلی زبان میں کیا کیا تاثیرات ہیں کہ بشر کا شجر و جرجر بھی ان جاتے ہیں مولانا نے کوئی دقیق مضامین علیہ بیان نہیں فرمائے یہی وضو اور نماز کے مسائل بیان کئے اور اغلاص کے بیان میں کسی تقریب سے ایک دفعہ باواز بلند اللہ کہا معلوم نہیں کہ کس دل اور کیسے سوز و گداز سے اللہ کا نام لیا کہ تمام مجلس وعظ لوٹ گئی اور آہ و زاری کی آواز سے مسجد گونج اٹھی ہر شخص اپنے حال میں مبتلا تھا اس وقت بعض اشخاص نے دلوئی صاحب کو دیکھا کہ کمال غدار سے منبر پر خاموش بیٹھے ہیں اور اہل مجلس کی طرف متوجہ ہیں یقیناً ہوتا ہے کہ اگر دلوئی صاحب ایسے متوجہ نہ ہوتے تو اہل کونہ و بزم تک افتاد نہ ہوتا مگر اللہ دے کوسلہ کہ خود دیکھے ہی متشکل رہے۔
سینہ میں تلازم کوئے قنطرہ کا قنطرہ ہی رہا

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

جامع الصفات

اسلام اور ایمان کے الفاظ اور ان کے معنوں پر علماء نے بالتفصیل کلام کیا ہے جس کا خلاصہ اور مفہوم یہ ہے کہ انسان اعضائے ظاہر اور قلب کو حق تعالیٰ شائع کی اطاعت و فرمانبرداری میں مشغول رکھے۔ اس کی زبان اور دل میں مطابقت پائی جائے۔ جو کام اس کے ہاتھ پاؤں ظاہر ہوں اور جو باتیں اس کی زبان سے نکلیں اس پر اس کا دل راضی ہو۔ طبیعت کو اس کا خوگ بنا کر شریعت جہاد و سنت نبویہ پر عمل کرنا مرغوب ہو جس طرح کہ تندرست اور صحت مند آدمی کو غذا کی رغبت ہوتی ہے مطلوب و محمود ہے۔ اس کے حصول کے لیے جو کوشش کی جائے اس کو سلوک و معرفت یا تصوف و احسان کہتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے پیارا اور شریعت حق کے احکام پر عمل کرنا بن جائے کسی تکلف کی حاجت نہ رہے۔ یہ تعبی ہو سکتا ہے جب ایسے لوگوں کی صحبت و رفاقت بیکر ہو کہ جن کی ہر حرکت اور سکون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے مطابق ہو۔ سنت نبویہ پر عمل کرنا ان کا طبعی شیوہ اور خلق و شعار بن چکا ہو۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل انسان تھے۔ آپ کی عبادت و سکناات جن کو عبادت کہا جاتا ہے مکمل اعتدال پر تھیں۔ آپ ہر انسان کے دل کو معتدل بنا سکتی ہے۔ اعضائے ظاہر کو دل کے ساتھ خاص تعلق ہے اگر مسلمان اپنے ظاہری اعمال کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کے مطابق اور اپنی عادات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع کر دیکھا۔ تو اس کے اعضاء اور عادات میں اعتدال پیدا ہوگا۔ دور ہو جائے گی۔ نیکی سے اسے محبت اور گناہ سے نفرت ہوتی چلی جائے گی۔ عبادات، بالطبع مرغوب و محبوب بن جاتی ہیں اور کسی اسے کی اگر نافرمانی ہو جائے تو اس سے دلی کوفت اور ناگوار سی پیدا ہوتی ہے۔ اور ہوتے ہوئے تعامل میں ان کے پیچ جاتا ہے کہ قلب کو اللہ و عدوں۔ اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں وہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی کسی لذت کی کوئی مستحقیت نہیں ہے۔ ذکر اور فکر سے ایک لمحہ غفلت ہفت تعلیم کی دولت چھن جاتی ہے زیادہ مفہوم بناتی ہے۔ جس کے وقت نوافل تہجد اور اللہ کے سالار سے جو امنیں دولت میسر آتی ہے۔ پوری کائنات کی مادی دولت اس کے مقابلہ میں بیچ نظر آتی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سحر کے علاوہ گور بنانا یا پاپا آپ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

ہوں چتر سجری ریح بنجتم سیاہ باد در دل اگر بود ہوس ملک سبخرم
زانکہ کایا فتم خبر از ملک نیم شب من ملک نیم روز بیک ہوئی شرم

لیکن یہ نہاد و دنیا سے بے رغبتی ان کو غاروں اور صحراؤں کے گوشے میں نہیں بھیجتی کہ دنیا سے قطع تعلق ہو جائیں وہ دنیا میں دوپہلے کے ساتھ رہ کر اپنی تمام مساعی کو لوگوں کو خدا سے ملانے میں صرف کرتے ہیں۔ لیکن دنیا میں رہ کر دنیا کے خواہش مند اور لوگوں سے طالب نہیں ہوتے۔ ان کی مثال کشتی اور دیبا کی ہوتی ہے کہ کشتی دریا میں بہنے کے باوجود دیبا کے اوپر تیرتی ہے پانی کو اپنے اندر نہ لے کر پانی اس کے اندر داخل ہو جائے تو غرق ہو جاتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اتباع نبی کریم صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم میں جو اہمک اور فائز تھی اس کی نظیر آپ کے زمانہ میں نہیں ملتی۔ بلکہ یوں کہیے کہ آپ اس بارے میں امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خوش قسمت افراد میں سے ہیں۔

جس پر پوری اُمت فر کر سکتی ہے۔ آپ نے ایک دیگر طریقت و شریعت کی ماہیت بیان فرمائی ہے جو بدیہ ناظرین ہے۔
 "علم المصنویۃ علم الدین ظاہر و باطن
 وقوة الیقین وهو العلم الاعلیٰ حالہم
 اصلاح الاخلاق ودوام الایقان فی
 اللہ تعالیٰ حقیقۃ التصوف النخل باخلاق
 اللہ تعالیٰ و سلب الارادة و کون العبد فی
 رضاء اللہ تعالیٰ - اخلاق المصنویۃ ما
 هو خلقہ علیہ السلام بقولہ انک
 لعلی خلق عظیم وما ورد بہ الحدیث
 و تفصیل اخلاقہم ہکذا - التواضع
 ضد العتبر - التداراة واحتمال
 الاذی عن الخلق المتعاملہ برفق و
 خلق حسن وترك غضب و غیظ - الواساة
 والایثار بفرط الشفقة علی الخلق و
 هو تقدم منفوق الخلق علی حظوظہ -
 الشخارۃ - التجاوز والتفوق للاقوة
 الوجه والبشرۃ - السہولۃ والین
 العیان - ترک التکلف والتکلف -
 انفاق بلا اقتصار وترك الاما دخار -
 التوکل - القناعة بيسير من الدنيا -
 التورع - ترک المراء والجلال والعتب
 الا بحق - ترک الغل والعتد والحسد -
 ترک الماہ والہماہ - وفاء الوعد - التکلم
 الاناعة - التزاد والتوافق مع الاخوان
 والعزلة عن الاغیاد - وشکر المنعم
 بذلہ الیاء للمسلمین - الصوفی یحبذ
 الظاہر والباطن فی الاخلاق - والتصوف

صوفیہ کا علم نام ہے ظاہر و باطن، علم دین اور قدرت
 یقین کا اور یہ علم اعلیٰ ہے۔ صوفیہ کی حالت اخلاق
 کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگانا ہے
 تصوف کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے مڑن
 ہونا اور اپنے ارادہ کا چین جانا اور بندے کا اللہ تعالیٰ
 کی رضا میں بالکل مصروف ہونا ہے۔ صوفیہ کے اخلاق
 وہی ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
 فرمان خداوند تعالیٰ کے بیشک نام برائے خلق پر (پہلے کئے گئے)
 ہو اور نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے (اس پر عمل اخلاقی ہو)
 میں داخل ہے) صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل اس طرح ہے
 اپنے آپ کو کمتر سمجھنا اور اس کی ضد ہے تجر مخلوق کے
 ساتھ تعلق کا ترک کرنا اور خلعت کی ایڑوں کو نہ
 کرنا۔ نرمی اور خوش خلقی کا معاملہ کرنا اور غیظ و غضب کا
 چھوڑ دینا۔ ہمدردی اور دوسروں کو ترجیح دینا خلق
 پر فرط شفقت کیساتھ جس کا مطلب ہے کہ مخلوق کے حقوق
 کو اپنے حظ نفسانی پر مقدم رکھا جائے۔ سخاوت کرنا۔ درگزر
 اور خطا کا معاف کرنا۔ خندہ روئی اور بشارت جسم۔
 سہولت اور نرم پہلو رکھنا۔ نصیحت اور تکلف کا چھوڑ دینا۔
 خرچ کرنا بلا تنگی اور بغیر اتنی فراخی کے کہ احتیاج لاحق
 ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھنا۔ تھوڑی سی دنیا پر قناعت کرنا۔
 پرہیزگاری۔ جنگ و جدل اور رقابت نہ کرنا مگر حق کیساتھ۔
 بغض و کینہ اور حسد نہ کرنا عزت و جاہ کا خواہشمند نہ ہونا۔
 وعدہ پورا کرنا۔ برو باری۔ دور اندیشی۔ بھائیوں کیساتھ
 موافقت و محبت رکھنا اور اغیار سے علیحدہ رہنا۔ حسن
 کی فکر نہ کرنا اور جاہ کا مسلمانوں کے لئے خرچ کرنا۔ صوفی
 اخلاق نامہ، اساطیر، اطہر، جہیز، التواضع، التواضع

ادبِ کلہ - ادبِ المحضرة الالہیة
الاعراض عما سواہ حیاء واجلہ لا
وہیبة - اسواء المعاصی حدیث
النفس وسبب الظلمة

سارا ادب ہی کا نام ہے۔ بارگاہِ احمدیت کا ادب
یہ ہے کہ ماسوائے اللہ سے منہ پھیر لیا جائے۔ شرم کے
بارے حق تعالیٰ کے اجلال و ہیبت کے سبب تحدیث
نفس (یعنی نفس سے تائیں کرنا) بدترین معصیت اور
ظلمت کا سبب ہے۔

(تذکرۃ الرشید ص ۷۷ دوسرا حصہ)

امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی اور اچھے انسان اور مسلمان کی جو تفصیل بالا جمال مندرجہ بالا عبارت میں فرمائی ہے۔ وہ
ان تمام کتب کا خلاصہ ہے جو چودہ سو سال میں اسلام کی تعبیر و تشریح میں لکھی گئی ہیں اور ہر وہ مرشد یا شیخ یا معلم جو صحیح معنوں
میں اس نام کا حامل ہوگا اس میں ان صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔ خود حضرت گنگوہیؒ میں یہ صفات پائی جاتی تھیں اور وہ
اپنے زمانے کے فردِ وحید تھے۔ جو صحیح معنوں میں شرک و بدعت کے مخالف اور احکام شرعیہ و مہن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے
مشیدائی تھے۔ حتیٰ کہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں رنگ لیا تھا۔ مدح و ذم ان کیلئے یکساں
تھی۔ نہ تعریف انہیں خوش کرتی تھی اور نہ ہی ان کی مذمت ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات چھوڑتی تھی۔

شیخ کا امتحان

پہلی بار جب آپ ایک چلہ تھا نہ بھون رہے کہ آئے۔ چند دن ٹھہرنے کے بعد خیال ہوا کہ حضرت حاجی
صاحب پر کھانے کا بوجھ ہے کوئی اور انتظام کرنا چاہیے لیکن ایسا انتظام دشوار تھا لہذا جانے کی
اجازت چاہی۔ حاجی صاحب نے فرمایا ابھی چند روز اور ٹھہرو۔ میں خاموش ہو گیا لیکن یہ فکر ہوا کہ کھانے کا کیا کروں گا۔ تھوڑی
دیر بعد حاجی صاحب تشریف لائے اور میرے دوسرے پر مطلع ہو کر کہا "میاں رشید احمد کھانے کی فکر مت کرنا ہمارے ساتھ کھاؤ
چنانچہ دوپہر کو گھر سے کھانا آیا ایک پیالہ میں لڈیہ کھاتے تھے اور دوسرے میں معمولی سالن تھا۔ حاجی صاحب نے معمولی سالن کا پیالہ
میری طرف کیا۔ انہوں نے حافظہ ضامن شہید آگے اور فرمانے لگے بھائی صاحب! رشید احمد کو اتنی دُور ہاتھ بڑھانا پڑتا ہے اس
پیالہ کو ادھر کیوں نہیں رکھ لیتے۔" اعلیٰ حضرت نے بے ساختہ جواب دیا کہ اتنا بھی غنیمت ہے کہ اپنے ساتھ بھلا رہا ہوں۔ جی تو
چاہتا ہے کہ چوڑ ہوں اور چماروں کی طرح ایک ہاتھ پر روٹی رکھ دیتا۔ یہ فقرہ کہنے کے بعد حاجی صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کی
طرف دیکھا۔ مولانا گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ "حضرت کا یہ دیکھنا اس لئے تھا کہ کچھ تغیر تو نہیں۔ مگر الحمد للہ میرے قلب پر بھی اس کا
کچھ اثر نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ حقیقت میں جو کچھ حضرت فرماتے ہیں بالکل سچ ہے۔ اس دربار سے روٹی ہی کا ملنا کیا تھوڑی
نعمت ہے جس طرح بھی بے بندہ نوازی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے پھر کبھی میرا امتحان نہیں لیا۔" اس کے بعد فرمایا۔ "اسی
لئے مجھ کو کچھ آیا نہیں رہا۔"

مجھے اس کی تمنا نہیں

ایک دفعہ آپ نانوتیار رام پور تشریف لے گئے۔ سردی کے موسم میں آپ کاٹنے کی سیلی دوسرے
ہوئے بیٹھے تھے۔ آپ کے دائیں بائیں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور حکیم ضیاء الدین صاحب
بیٹھے تھے۔ ایک صاحب آئے اور دائیں بائیں مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ آپ کو باوجود درمیان میں بیٹھے ہوئے عام آدمی خیال

کر کے چھوڑ دیا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب چونکہ آپ سے بے تکلف تھے۔ لہذا اسکو آتے۔ امام ربانی نے مطلب سمجھا اور فرمایا۔
”الحمد للہ مجھے اس کی تمنا نہیں کروں مصلحت کریں۔“

اتباع سنت اور ضلالت سے نفرت | شدید جذبات پر عمت و دگرہی کے خلاف تھا چنانچہ آپ کسی گمراہی یا خلاف شریعت کام نہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ کربلا سے لنگوہ ایک برات آئی جس میں رقاصہ بھی تھی۔ اس برات میں کچھ لوگ آپ سے ملنے والے تھے۔ آپ اُس دن صبح اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد میں منہ ڈھانپ کر لیٹ گئے۔ واقف کار لوگ سلام کرنے کے لئے آئے۔ دیر تک آپ کے پاس بیٹھے رہے مگر آپ نے منہ نہ کھولا۔ بالآخر ایک صاحب بولے۔ کہ حضرت ہم تو زیارت کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ آپ نے منہ ڈھانپنے غصہ میں جواب دیا کہ ”میری زیارت میں کیا دھڑا ہے“ چنانچہ ایک سفید ریش بزرگ نے معاملہ سمجھ کر عرض کیا کہ حضرت ہم تو رند کی کو سامتہ لاتے نہیں، بیٹی والوں کی حرکت ہے۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا کہ ”میاں بیٹی والے کسی کے خدا تو نہیں ہیں کہ اُن کا کہنا مانا ہی جائے۔“ اسی جملے سے بہت سے حاضرین کے دل بھر آئے۔ وہ لوگ جب چلے گئے تو آپ نے منہ کھولا اور اُٹھ بیٹھے۔

اس میں تیسرے تم تھے | آپ کے جد امجد شہ عبدالقدوس کا عرس ہوتا تھا۔ آپ اس کو بند کرنے پر قادر نہ تھے۔ اولیٰ اول آپ کو صبر کرنا دشوار تھا لہذا آپ ان دنوں رام پور چلے جاتے تھے۔ مگر جب آخر میں اس ایذا قلبی کی برداشت آپ کو دے دی گئی تو آپ یہ زمانہ خانقاہ ہی میں گزارتے۔ اگر کوئی آپ کا معتقد اُن دنوں آجاتا تو آپ کو تکلیف ہوتی۔ آپ اکثر ناراض ہوتے اور ترکِ تکلم فرما دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا حافظ محمد صالح صاحب حضرت گنگوہی کی زیارت سے بے تاب ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ اتفاق سے عرس کا زمانہ تھا۔ اگرچہ آنے والے کو اس کا دہم بھی نہ تھا مگر حضرت گنگوہی اپنے شدیدائے سنت کے باغخول مجبور تھے۔ آپ سے نہ ہوسکا کہ ان کی مزاح پُرسی کریں یا محبت و مدارات سے پیش آئیں۔ آپ نے بوجہ سلام

ملہ حضرت مولانا حافظ محمد صالح حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفاء میں سے تھے۔ آپ صاحب فضل و کمال بزرگ تھے اور سلفینا صاحبین کے زہد و تقویٰ کی قدویر۔ مشرقی پنجاب کے مشہور و معروف مدرسہ عربیہ مدرسہ رشیدیہ ”راستے پور ضلع جالندھر کے“ آپ بانی تھے۔ یہ مدرسہ آج کل جامعہ رشیدیہ کے نام سے سماجی وال میں مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس کے دورِ قدیم کے بعد مدرسہ مفتی فقیر اللہ (جو متحدہ پنجاب کے نامی گرامی مفتی تھے) کے فرزند ارجمند مولانا حبیب اللہ اس کے ناظم اور مفتی صاحب کے بڑے صاحب زادے مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب شیخ الحدیث ہیں۔ حضرت حافظ محمد صالح رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب مقیم چک عک (۱۱- ایل) نزد پیچید وطنی اور حضرت پیر جی عبداللطیف صاحب ہتم مدرسہ تجوید القرآن پیچید وطنی ہیں۔ دونوں بزرگ صاحب نسبت اور صاحب قال و حال بزرگ ہیں۔ اس مدرسہ رشیدیہ کے پہلے بہتم مولانا فضل احمد صاحب نے چک عک (۱۱- ایل) پیچید وطنی میں چند سال قبل تقریباً سو سال کی عمر میں وفات فرمائی۔

کے جواب دینے کے ان سے یہ بھی نہ پوچھا کہ روٹی کھائی یا نہیں اور کب آئے یا کیوں آئے۔ مولانا مہر صالح کو اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ حضرت کا رخ پھرا ہوا دیکھنا جس طرح شائق گذر رہا تھا۔ اس کو انہی کے دل سے پوچھنا چاہیے تھا۔ حاضر خدمت ہوتے اور خاموش بیٹھ کر تجزیہ و معرّون واپس ہو جاتے۔ آخر اس حالت کی تاب نہ لاکر حاضر خدمت ہوئے اور رو کر عرض کیا کہ حضرت مجھ سے کیا قصور ہوا جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔ میں تو اس کا متعلّق نہیں ہو سکتا، اللہ واسطے معاف فرما دیجئے۔ اس وقت حضرت نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور فرمایا کہ ————— ”میرا قصور نہیں کیا جس کو میں معاف کر دوں، خدا کی خطا کی ہے اس سے معافی چاہو۔“ اس وقت مولانا سمجھے کہ عرس کے دنوں میں آنا ناگوار گذر رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ ”خدا شاہد ہے مجھے تو عرس وغیرہ کے ساتھ اتنا ہی سے شوق نہیں اور نہ مجھے اس کا علم تھا۔“

حضرت امام ثنائی نے فرمایا۔ اگرچہ تمہاری نیت عرس میں شرکت کی نہ تھی مگر جس راستہ میں دو آدمی عرس کے لئے آ رہے تھے اسی میں تیسرے تم تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔
مَنْ كَثُرَ سَوَادُ قَوْمٍ فَمَوْ مَعَهُمْ۔
جو آدمی کسی قوم کی کثرت کا باعث ہوا وہ انہی میں سے ہے۔

عمل پر مداومت اور استقامت
اصل کرامت شریعت کے اعمال و احکام پر استقامت اور مداومت ہے یہ بڑا کمٹن اور مشکل کام ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں سنت رسول کا خیال رکھنا اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا سب سے بڑا مجاہدہ اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ حضرت گنگوہیؒ میں یہ بات کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اگر ایک آدمی آپ کو دس سال قبل مل کر گیا اور دس سال بعد پھر آیا تو آپ میں بلا کم و کاست اسی طرح اتباع شریعت کی محویت اور فانییت دیکھتا تھا اور اسی استحکام و استقامت کے ساتھ ادا کی پابندی اور نواہی سے اجتناب کو پاتا تھا آپ کے مخالفین نے آپ کے خلاف بہت زور لگایا اور بہت کچھ تحریریں شائع کیں مگر الحمد للہ مخالفین کو باوجود حد درجہ مخالفت کے آپ کی ذات پر کبھی کسی ایسے ظعن یا الزام کا موقعہ نہ بھر ملا جس کا عیب یا بڑائی ہونا عند الشرح مسلم ہو۔ آپ کے ہر ذل کو عیب بنایا گیا اور سنت و اصل شریعت سے فطرت محبت کی وجہ سے بدعات سے جو تنفر تھا اس کو معصیت بنا کر آپ کی تکفیر کی گئی۔ آج جب کہ آپ کو اس دنیا سے گزرے ہوئے پندرہ صدی سے اوپر کا عرصہ ہو رہا ہے اگر پوری مخلوق جمع ہو کر بھی کوئی ایسا واقعہ نکالنا نہ چاہے جس میں آپ کی نماز کا قضا ہونا یا جماعت سے کابل و دستہ یا کسی شرعی پسندیدہ امر سے ذرا برابر بے رغبتی غفلت ثابت ہوتی ہو تو نہیں نکال سکتی۔

۲۳ برس کے بعد تکبیر اولی فوت
دیوبند کا جلسہ دستار بندی جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس میں ایک دن غالباً عصر کی بائیس برس کے بعد تکبیر اولی فوت ہوئی۔ میں ایسا اتفاق پیش کیا کہ مولانا مہر یعقوب صاحب نماز پڑھانے کو مصلیٰ پر کھڑے ہوئے تو تکبیر اولیٰ بھی جا چکی اور امام نماز شروع کر چکا تھا۔ سلام پھیرنے کے بعد دیکھا گیا کہ جو دجو دے بڑے بڑے حوادث اور اعوار کی اموات، تنگ دستی و عزت میں کبھی پریشان ہوا تھا، اس کا چہرہ اداس اور پریشانی کا مظہر تھا اور آپ کے ساتھ یہ الفاظ فرما رہے تھے ”افسوس بائیس برس کے بعد آج تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی۔“
ہو! میں ارزا، سمندر میں اپنے پاؤں پر چلنا یا بھی طرح کی دوسری عوارق عادت باتیں کہ درجہ کی کرامات ہیں، اصل کرامت

یہ استقامت دو اہم ہے جو شاید کہ وژوں میں سے ایک کو حاصل ہوتا ہے۔

شب بیداری و تہجد گزاری "تذکرۃ الرشید" میں حضرت مفتی عزیز الرحمن کی زبانی حضرت گنگوہی کے انضباط و اوقات

درج ہوئے ہیں۔ ساری عمر تقریباً اس پر عمل کیا کبھی اس میں تبدیلی یا تغیر نہیں ہوا۔ مولانا منیر ناٹووی ایک سفر حج میں ساتھ تھے۔ ایک روز آدھی رات کے بعد ان سے کہا کہ ایک دو ڈول سمندر سے پانی کے کمال دو، غسل کروں گا۔ ناٹووی صاحب نے کہا کہ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔ صبح ہونے دیجئے اگر ایک رات تہجد قضا بھی ہوگی، تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر حضرت کو یہ منظور نہ ہوا اور اسی وقت غسل فرما کر نماز تہجد ادا فرمائی اور حسب معمول فجر تک تلاوت قرآن اور وظائف میں مشغول رہے۔

او مردود تو اللہ ہے ایک فقیہ صوفی آپ سے بہت پیار محبت رکھتا تھا۔ آپ بھی ان کو فقیر درویش سمجھ کر ان کا ادب

و احترام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس فقیر نے آپ سے کہا کہ جانتے ہو کہ یہ جو ذکر "اُدھر جو" کرتا ہوں کیا کہتا ہوں؟ یہ کہتا ہوں "اُدھر ہو"۔ یہ سن کر آپ نے فوراً طیش میں آکر فرمایا کہ "او مردود تو اللہ ہے"۔ سبابت دوستی یا مروت کا ذرہ بھر لحاظ نہیں کیا۔ اس کے بعد پھر اس فقیر کی کبھی صورت نہ دیکھی۔

گنگوہی دیکھتا چلوں داروغہ اسماعیلی صاحب انسپکٹر پولیس پشاور کو شیخ کی تلاش تھی۔ انہوں نے رخصت لے کر

ہندوستان کا کوئٹہ چھان مارا۔ بیسیوں درویش حضرات سے ملے۔ افغانستان تک گئے مگر کسی جگہ کسی کو سنت کے اتباع میں کامل نہ دیکھا۔ رخصت ختم ہونے کو تھی۔ واپسی میں مظفرنگر ریل میں گنگوہی اور حضرت گنگوہی کا تذکرہ سن کر گنگوہی چلے گئے کہ شاید یہیں مقصد حاصل ہو۔ دیکھو کیا انداز ہے۔ گنگوہی پہنچے ایک ہی دن میں ان کا غنچہ دل کھلا، اور یاس اُمید سے بدل گئی۔ آپ کو داروغہ صاحب نے دیکھا کہ ہر ہر بات میں سنت کا کمال اتباع کرتے ہیں۔ چنانچہ طبیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔

جانب اولیٰ کو بھی ترک نہ فرماتے مولانا علی رضا صاحب حضرت گنگوہی کے پاس برسوں رہے اور حضرت کی شاگردی کی

فعل کو دیکھتے کہ شیخ کی تلاش تھی اور شیخ کامل کو دیکھنا چاہتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ برسوں میں ایک دفعہ بھی حضرت کا کوئی فعل خلاف سنت نہیں پایا بلکہ حضرت حتی المقدور مستحبات اور جانب اولیٰ (بہتر) کو بھی ترک نہ فرماتے تھے لیکن مباح سے آگے قطعاً نہ بڑھتے تھے۔ مباح کاموں کو۔ یعنی جائز کاموں کو۔ کہ کہ آپ کو روحانی خوشی نہ ہوتی تھی مگر سنن و مستحبات اور اجابت و فرائض پر عمل کر کے آپ کی طبیعت میں ایسا انشراح اور مزاج میں ایسی لطافت و بشاشت پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والا محسوس کر لیتا تھا۔

بدعات کو دیکھ کر آنسو بھر لاتے دنیا میں ہدایت کا پھیلنا آپ کو اس درجہ محبوب و مرغوب تھا کہ اس سے زیادہ آپ

کو کسی چیز میں لذت نہ آتی تھی اور مخلوق کی مگرابی و جہالت سے اُسی قدر آپ کو صدمہ اور رنج ہوتا تھا۔ حق کی اشاعت اور باطل کی تردید میں بھی توڑ کر کوشش فرماتے تھے۔ اگرچہ آپ مناظرہ و مباحثہ سے بچتا

متنفر تھے لیکن بدعات و معصیت کو پھیلنے والی تحریر دیکھ کر آپ غصے کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو اتر آتے بلکہ غصہ اور رنج کے باعث غول اُتر آتا اور آپ کے ہاتھ پاؤں کاٹنے لگتے۔ چنانچہ آپ سنت کا دامن تنہا کر نہایت ضبط سے کام لے کر اس کی تردید میں جواب لکھتے۔ پھر اس کا طبع ہونا اور چھینا آپ کو پسند آتا۔ جو آدمی اس کی ذمہ داری اٹھاتا اس سے بہت خوش ہوتے اور دعا کرتے۔

مجھے تحقیق نہیں اگر آپ کو کسی مسئلہ کا علم نہ ہوتا یا اس کے بارے میں آپ کی تحقیق مکمل نہ ہوتی تو ادری "میں نہیں جانتا" کہنے میں آپ کو کوئی جھجک یا گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ بلا تامل یا بے تکلف فرمادیتے کہ میں اس مسئلہ کو نہیں جانتا یا مجھے یہ مسئلہ نہیں آتا۔ اس بات کا ذرہ بھر خیال نہیں کرتے تھے کہ لوگ کیا کہیں گے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک پیچہ ایک شخص کے پاس دیکھا جس پر چند سوالات اور حضرت کی طرف سے اُن کے جوابات تھے۔ اسی پرچہ میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ "بچوں کو نزع کی تکلیف زیادہ کیوں ہوتی ہے؟" اس کا جواب حضرت نے صرف یہ لکھا تھا کہ "مجھے تحقیق نہیں"۔

حوادث اور صدمات پر پھجور دنیاوی حوادث و صدمات میں آپ صبر کرنے میں کوہ استقلال تھے۔ ایک موقع پر مولوی شیعرباکر پچھوڑ کر، اور نواسی جیکے بعد دیگر فوت ہو گئے لیکن حضرت نے ایسا کمال صبر کا مظاہرہ کیا کہ لوگ انگشت بدندان تھے۔ ان کا بھی تذکرہ نہ کرتے۔ زمرگی میں "میں واقعات لے لے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جانے والوں کا ذکر فرمایا ہے ایک مرتبہ مولانا سیدی کا زہلولی۔ (آپ اُن پر غایت درجہ مشفق و مہربان تھے)۔ سے ایک موقع کی مناسبت سے فرمایا۔ "مولوی سیدی تمہاری عقل کو ہضم نہ نہیں ہو گیا" اُن کے جانے کے بعد مولانا دوسرے ساتھی سے فرماتے لگے کہ میں نے مولوی سیدی کو لے ہی کہہ دیا ورنہ ہمارے گردہ میں سبھی اُن کو عقل مند مانتے ہیں۔ انہوں نے اثنائاً جواب دیا تو فرمایا۔ "مزاغ دانی تو مسعود احمد کی مال ہی کو مٹتی۔ اس سے قارئین یہ خیال نہ فرمائیں کہ شایہ حضرت گنگوہیؒ کو ان حوادث کا صدمہ ہی نہیں ہوا۔ صدمہ تو ہر انسان کو ہوتا ہے مگر حضرت اظہار نہیں فرماتے تھے۔ بس اثنائاً ہی اظہار ہوتا جتنا سنت سے ثابت ہے۔ ورنہ صدمہ بہت ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ۔۔۔ محمود احمد (بیٹے کی وفات) نے میری کمزور دی۔ آپ کے ایک خادم مولوی رحمت اللہ پانی پتی اپنے خطوط میں ہمیشہ محمود احمد کو سلام لکھتے۔ آخر دو سال کے بعد امام ربانی نے ان کے کسی خط کے جواب میں یوں تحریر فرمایا۔ "آپ خط میں حافظ مسعود احمد کو سلام لکھا کریں۔ حافظ مسعود احمد مرحوم دو سال ہوئے کہ اس عالم سے رحلت فرما کر مجھ ناکارہ کو پریشان و حیران کر گئے ہیں۔ جب تم اس کو سلام لکھتے ہو مجھ کو بے قراری ہو جاتی ہے۔ آئندہ ان کا نام مت لکھنا۔"

جوابات میں جلدی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کچھ سوالات ایک آدمی کے ہاتھ لکھ کر بھیجے اور یہ بھی کہ بھیجا کہ جوابات جلدی عنایت فرمائیے۔ سوالات بہت سے اور خاصے و دقیق تھے اور آپ آشوبِ چشم کی تکلیف تھی۔ مگر آپ نے دین کے بارے میں سوالات کے جواب میں تاخیر مناسب خیال نہ کی اور جوابات تیار

کرا دیتے۔ البتہ جوابات مختصر ہونے کی وجہ بیان فرمائی کہ اسلوبِ چشم میں مبتلا رہوں چنانچہ چشم بند کردہ جواب لکھو رہا ہوں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ بیس پچیس خطوط ایک دن میں آجاتے اور اکثر میں سوالات ہوتے اور اپنے حالات لکھ کر اُن کی علاج پوچھا ہوتا تھا۔ آپ ان سب کا جواب دن ہی میں عنایت فرماتے۔ کبھی مہمانوں کی کثرت یا دوسری دینی خدمات کی مشغولیت کے سبب آپ کو فرصت کم ہوتی تو مختار کے بعد ان کے جوابات تحریر فرماتے۔

دل جوئی اور تسلی | آپ دوسروں کی دل جوئی و تسلی جیسی مناسب انداز میں فرماتے، اس کی بہت کم نظیر ملتی ہے۔ ایک شخص نے خواب دیکھا کہ گویا آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ اس خواب نے اس کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آپ نے بے ساختہ جواب دیا کہ ”بھائی تمہارے سامنے زندہ تو بیٹھا ہوں اور آخر کبھی تو مردوں ہی گا۔ مگر کیا ضروری ہے کہ خواب کے ساتھ ساتھ تعبیر بھی واقع ہو جائے؟“

حرمین اور اس کے متعلقات سے محبت | انسان کو جس کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے تمام متعلقات سے محبت ہو جاتی ہے۔ حضرت ربانیؐ کے دل میں حق تعالیٰ شانہ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت از حد راسخ تھی۔ اس لئے حرمین شریفین کے شخص و غاشاک تک کو آپ محبوب سمجھتے اور سسرانکھوں پر رکھتے تھے۔ مدینہ کی کھجوروں کی گٹھلیاں پسوا کر رکھتے اور ان کو کبھی کبھی پھانکا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ”لوگ زمرم کے طینوں اور گٹھلیوں کو یونہی پھینک دیتے ہیں یہ نہیں خیال کرتے کہ ان چیزوں کو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ہوا لگی ہے۔ ایک مرتبہ مدنی کھجور کی گٹھلی پسپی ہوئی حضرت نے مولانا عاشق الہیؒ کو دی اور فرمایا کہ اس کو پھانک لو۔ اور ایک دفعہ مدینہ الرسول کی مٹی عطا فرمائی کہ اس کو کھا لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مٹی کھانا تو حرام ہے۔ کہنے فرمایا ”میاں وہ مٹی اور ہوگی۔“ اگر کوئی مدینہ منورہ یا مکہ معظمہ سے آپ کے لئے کوئی تبرک یا تحفہ لاتا تو آپ اُس کو اس قدر خوشی سے قبول کرتے، کہ ہدیہ دینے والے کا جی خوش ہو جاتا اور آپ فوراً ہی تمام حاضرین میں اس کو تقسیم فرما دیتے اور اگر کوئی شخص کوئی چیز مانگ لیتا تو فوراً ہی اُسے عطا فرما دیتے اور خوش ہوتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے تسبیح مانگی۔ آپ کے پاس بیش قیمت خولصورت تسبیح تھی۔ ان کے حوالہ کی اور فرمایا ”پڑھتے رہنا ایسا نہ ہو کہ ویسے ہی رکھی ہوئی ہے۔“

حضرت امام ربانیؒ کا جی چاہتا تھا کہ ہر شخص حرمین شریفین سے اور ویاں سے آئی ہوئی چیزوں سے اسی طرح محبت و پیار رکھے جس طرح خود اُن کو تھا۔ ایک مرتبہ مولانا محمد اسماعیلؒ کو موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا عنایت فرما کر کہا کہ اس کو نکل جاؤ اور ایک بار غلافِ کعبہ کے لٹیم کا ایک تار ایشار کیا اور کہا اُس کو کھا لو۔

جنابِ آداب | شعار اسلام کی ترویج آپ کو حد درجہ مرغوب تھی۔ اگر کوئی خلافِ سنت سلام کرتا تو آپ غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب آئے۔ آپ بیت الخلاء گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے منظرِ عفا اٹھا، آپ کی چارپائی کے پاس رکھ کر بغیرِ جمع کو سلام کئے بیٹھ گئے اور جب حضرت آئے تو فوراً ہی سے انہوں نے پکارا۔ جنابِ آداب | حضرت نے فوراً بے ساختہ جواب دیا ”کون بے ادب ہیں جن کو شریعت کا ایک ادب بھی نہیں معلوم۔“ ایک مرتبہ ایک صاحب آئے اور بولے ”حضرت سلامت۔“ آپ کے چہرہ پر غصہ کا اثر ظاہر ہوا اور فرمایا ”مسلمانوں والا سلام“

چاہتے یہ کون ہے حضرت سلامت والا۔ اس شخص نے عرض کیا میں کچھری میں رہتا ہوں وہی عادت ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ ”یہاں تو کوئی کچھری نہیں ہے۔ بجائی میں تو فقیر آدمی ہوں۔“ وہ حضرات جو سنت کی محبت سے عاری اور محبت کے ثمرات سے ناواقف ہیں۔ وہ حضرت کے اس انداز کو بدعقلی پر محمول کریں گے۔ جس زمین قلب میں محبت رسول کا بیج ہی نہیں پڑا، ان کو کوئی گیونکر سمجھائے کہ یہ واقعات خلاصہ اصلاحات قلب ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سنت مصطفویہ کے ساتھ عشق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ آپ کو عربی میں چھوڑ کر انگریزی مہینوں کا بلا ضرورت استعمال کرنا سخت گراں گذرتا تھا۔ ایک صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ اُن سے کسی نے پوچھا گوالیار کب جہاد گئے؟ انہوں نے جواب دیا جولاہی کی فلاں تاریخ کو۔ تو حضرت نے تاسف کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ کہ اور ماہ و تاریخ نہیں ہیں، جو انگریزی مہینوں کا استعمال کیا جاوے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کی تحریرات میں کہیں انگریزی یا ہندی مہینوں کا نام نہیں۔

منطق و فلسفہ سے نفرت | اسی طرح منطق و فلسفہ کے ساتھ آپ کا تفرع عبادت کے درجہ پر پہنچا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ میرا جو مرید اور شاگرد منطق اور فلسفہ کے ساتھ اشتغال رکھے گا وہ میرا مرید اور شاگرد نہیں۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی تو امید ہے۔ اور یہ سب کچھ کتاب و سنت کے ساتھ والہا ز شغف و عشق کا ثمرہ تھا۔ آپ کے بال بال اور روئیں روئیں سے بطحا کی پیغمبر کی ہر ادراشیں ٹپکی ٹپکی تھیں اور آپ کا ہر لب و لہجہ زبان بنا ہوا تھا۔ جس سے بجز اتباع شریعت کی آواز کے دوسری صدا نہ نکلتی تھی۔ آپ نے اپنا سب کچھ حب رسول کے سپرد کر دیا تھا۔ آپ کی زبان، آنکھ، کان، بولنے، دیکھنے، اور سمجھنے سے پہلے دیکھتے تھے کہ آیا اس بات کی اجازت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہے یا نہیں؟

بیٹے کو گھر سے نکال دیا | آپ کے صاحبزادے مولانا محمود احمد بری صحبت کے اثر سے پہلوانی اور کسرت وغیرہ میں مبتلا ہو کر دینی تعلیم اور قید شرع سے کچھ باہر ہو چلے تھے۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر خدا اور رسول کی محبت کو بیٹے کی محبت پر ترجیح دی اور بیٹے کو گھر سے نکال دیا اور کہلا بھیجا کہ محمود مجھے شکل نہ دکھلائے۔ آپ اس کے لئے دعا کرتے رہے۔ آپ کی دعا مستجاب ہوئی اور حق تعالیٰ کے فضل و توفیق نے صاحبزادہ کے دل پر دستک دی، اور حالت اصلاح کے قریب ہوئی تو آپ نے اسے بلا بھیجا اور فرمایا ”محمود کیا ابھی تیرے سینے میں کادقت نہیں آیا۔ خدا کے بندے اس جہن کے ذریعہ کرنے میں کیا دھرا ہے۔ اس دقت کو یاد کر جب گور میں کیڑے کوڑوں کی غذا بن جائے گا۔ سمجھل اور اپنی بد عادتیں چھوڑ۔“

اس مختصر مگر جامع نصیحت کا بیٹے پر وہ اثر پڑا کہ گویا کا یا پلٹ گئی اور وہ ذاکر و ناشخل بن گئے۔ قرآن پاک حفظ کیا اور عالم ہوئے مگر عمر نہ وفاد کی۔ یا تو حضرت نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا تھا اور یہ حالت ہوئی کہ اس کی اصلاح کے بعد مفارقت موت سے آپ اس کی یاد میں تملاتے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ آج کہتا ہوں، بارہ برس ہو گئے جب سے محمود مرا ہے مجھے ہنسی نہیں آتی۔ اور یہ

محبت محمود کی صورت سے نہ تھی بلکہ اُس کی عمدہ سیرت سے تھی جو بعد تو بے کس اُس نے بنائی تھی۔ اگر وہ زندہ رہتے تو بہت بڑے بزرگ ہوتے۔ غرضیکہ حضرت مولانا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق کہ "مومن کامل نہ ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک مال و اولاد اور جان سے زیادہ عزیز و محبوب نہ بن جاؤں" صحیح اور کامل مومن تھے۔ آپ شریعت حقہ اور سنت نبویہ کی محبت میں ایسے فدا تھے کہ اپنے نفس کی باگ ڈور مکمل طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ آپ کے جملہ اعضاء شریعت کی سنگین قید میں مقید ہو کر آپ کے اختیار و ارادہ سے باہر نہیں ہوسکتے تھے۔

عاشقیِ چلیست بگو بندہ جاناں برون پاہستے دگرے، دست بدستے دگرے۔

اطباب اللہ شراہ وجعل الضر دوس مثواہ

حسن صورت، حلیہ مبارک | کمال حسن سیرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت میں بھی ممتاز مقام عطا فرمایا تھا۔ آپ کا سراپا نہایت خوش انداز اور خوب صورت تھا۔ آپ متناسب الاعضاء حسین جمیل اور اس درجہ وجیبہ تھے کہ بھرے مجمع میں چھپانے جاتے تھے۔ قد سیدھا میان، بدن دُبرا، سر درمیان، بال نرم اور جوانی کے زمانہ میں نہایت سیاہ تھے۔ پیشانی کشادہ اور صاف و شفاف، جس میں مصبوح کی عبادت کا نشان و نگاہ تھا۔ بھوین گنجان اور گمان کی طرح خمیدہ لیکن ایک دوسرے سے علیحدہ تھیں۔ آنکھیں بڑی، سرگیں جن کی سفیدی کے اندر صرخ ڈورے جھلکتے تھے، پتلی سیاہ اور بینائی کے زمانہ میں نظر دُور بین اور نہایت تیز تھی۔ حلقہ بدر کے بالہ کی طرح روشن اور چمکتے ہوئے۔ شرکان دراز اور پتلی، رخسار نرم و نازک اور پر گوشت۔ ناک ہموار اور دراز سی ناکل۔ لب کشادہ سرخی ناکل وہن مردانہ اور دانت نہایت سفید اور چمک دار گویا موتیوں کی لڑی، زرخیزان سیب جیسی۔ ریش مبارک گول گنجان۔ گردن چمک دار گویا چاندی کی صراحی، سینہ فراخ اور پیٹ کے برابر۔ ہاتھ سڈول بھرے ہوئے، ہتھیلی فراخ۔ انگلیاں سیدھی نرم۔ پُر گوشت پتلیاں۔ پاؤں چمکنے صاف شفاف اور بلند۔ آواز لطیف لیکن بلند کہ بات سمجھنے میں کسی کو تکلف نہ ہوتا تھا۔ خوش الحان مہم کنان، راست گواہ اور فصیح و بلیغ تھے۔ شجاعت و قوت میں مشہور، تواضع اور حسن معاشرت میں امام و مقتدی، ذکر و فکر میں ہر وقت مستغرق، عقل و تدبیر، صاحب الراء اور عادل، سخی و بہادر، عظیم و صابر، عفت و تاب و شکر جمیع اوصاف سے تصف اور تمام خصائل و ذیل سے طبعاً متفرد تھے۔

لطافت طبع اور ادراکِ حواس | آپ غلطی طور پر لطیف المزاج تھے لیکن کثرت ذکر نے اس لطافت کو دو چند کر دیا تھا۔ آپ کے محسوسات اتنے قوی ہو گئے تھے کہ مہموں کی سی چیز کا بھی ادراک فرمالیتے تھے۔ ایک دن استنجا کے لئے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ تمباکو کی بو آرہی ہے۔ خادم نے بعد میں دیکھا تو دماں پان کی بیگ پڑی تھی۔ اس کو کھینچ کر صاف کر دیا گیا تو داپسی پر فرمایا اب نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ضبط بھی کمال کا تھا۔ اگر اظہار سے کسی کو تکلیف پہنچے گا احتمال ہوتا تو لطیف اشارے سے کہتے اور نہ خاموش رہتے۔ ایک مرتبہ چند آدمی بیٹھے تھے جن کے کپڑوں سے بیٹھے اور عرق آلود چوڑے کی وجہ سے بو آرہی تھی۔ مولانا کھینچی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "میاں بھئی کبھی نہا بھی

لیا کرو۔ دیکھو جسم سے پسینہ کی بو آرہی ہے۔“

ایک دفعہ مولانا لکھنوی صاحب کے چھوٹے بھائی محمد الیاس (حضرت مولانا محمد الیاسؒ بانی تبلیغی جماعت) دس گیارہ برس کی عمر میں تھے۔ وہ بے پاؤں آئے اور چپکے سے حضرت کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ مٹا حضرت نے گردن اٹھائی اور فرمایا ”بچے کا سانس سہا ہے“ سنی نے عرض کیا محمد الیاس آتے ہیں۔ ایک بار مغرب کی نماز کے بعد واپسی پر ایک لڑکے کے پاس سے گزرتے تو فرمایا گئے ”نمبردار کی سی بو آتی ہے“ عرض کیا گیا کہ ”نمبردار کا لڑکا اکرام الحق کھڑا ہے۔“ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی روایت ہے کہ بھائی عبدالرحمن چائے پکایا کرتے تھے اور بڑے شوق سے عمدہ چائے پکاتے اور حضرت کو بھی پیش کرتے حضرت اکثر فرماتے کہ ”چائے میں کچھ پانی کا ذائقہ آتا ہے“ عبدالرحمن صاحب ایک دن دل میں کہنے لگے کہ آج پانی اتنا پکا کہ بھاپ بن کر اڑ جائے۔ بہر حال بہت دیر تک پانی پکا کر چائے پیش کی گئی تو فرمایا کہ کچھ پانی کا ذائقہ تو اس میں بھی انہوں نے عرض کیا کہ حضرت وہم ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ عبدالرحمن صاحب نے جو دودھ گھرتے منگوا کر ملا لیا تھا اس میں والوں نے کچھ پانی ملا دیا تھا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت کے لئے چائے پکاتے مگر یہی بات حضرت فرماتے۔ بڑا عجز کیا بات سمجھ میں نہ آئی۔ بالآخر حیرت چلا کر چائے کی پیالیاں ٹھنڈے پانی یا کچھ پا سے دھوئے کے بعد خشک نہیں کی جاتیں۔ چنانچہ اس کے بعد اس کا اہتمام کر کے چائے پیش کی گئی تو فرمایا ”آج کچھ کی بو نہیں ہے۔“

اس طرح کی شکایتیں بے شمار ہیں۔ سیرت کے باب میں ان کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت جہاں اور روح و دنوں کا لحاظ سے بڑے ذکی احس، نازک مزاج اور معمولی معمولی اشتیاء کا ارد رکھتے تھے۔ دنیاوی امور میں اظہار نہ کرتے تھے مگر دینی معاملات میں اظہار کر کے عیوب و مصیبات پر گرفت کرتے اور اصلاح احوال کی سعی فرماتے تھے۔

سواد تحریر | آپ کا خط نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا۔ ہمیشہ رواں دواں اور قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ کئی ایک لوگوں نے پاس اب تک ان کی تحریریں موجود ہیں۔ نمونہ کے طود پر اس کتاب میں بھی ایک تحریر کا عکس شامل کیا گیا ہے کہ تحریر سے بھی شخصیت کا عکس اور پرہیز نظر آتا ہے۔ آپ کی طویل تحریریں باریک نغم سے لکھی ہوتی موجود ہیں جس سے مضامین بھی چلنی ہیں۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کے عادی تھے اور لکھتے وقت حاضرین سے باتیں کرتے، ان کے سوالات سے جوابات دیتے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مجال ہے کہ کوئی لفظ غلط لکھ کر کاٹنا پڑا ہو۔ کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا۔ جو قلمو دے و خطوط پریشانی و فکر کی حالت میں لکھے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھو تو معلوم ہوتا ہے کہ نہایت غور و فکر کے بعد اطمینان سے لکھے گئے ہیں۔

تقریر تحریر کے مثل تھی | آپ کی تقریر بھی تحریر کے مثل صاف، جامع لیکن مختصر ہوتی تھی۔ جس میں جوامع الکلم کا ایک عکس نظر آتا ہے۔ آپ مسلسل تقریر فرماتے تو وہ گویا موتیوں کی لڑی ہوتی۔ ہر بات اپنے جے ترتیب سے بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ تقریر اور تحریر میں اس چیز کا ہونا عالی داعی اور کیسوئی ذہن پر دلالت کرتا ہے۔ دیتا ہے کہ اس انسان کا ذہن بالکل صاف ہے۔ اس میں کسی الجھن یا شک و ریب کا گز نہیں۔

خوش آوازی

آپ بہت خوش الحان تھے۔ جب ذکر یا لہجہ کرتے تو سُننے والے وجد میں آجاتے اور دیر تک اُن پر محویت کا عالم طاری رہتا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری فرمایا کرتے تھے کہ آپ کی قرأت قرآن اور خطبہ وغیرہ سُن کر لے سخت یار زبان سے نکلتا تھا "لقد اذیت مزماراً من مزامید آل داؤد" آپ کبھی شعر خوش الحانی یا ترنم سے نہیں پڑھتے تھے۔ اسی طرح خطبہ جمعہ اور نمازوں میں قرأت بھی رواں دواں پڑھتے تھے تاہم طبعی و خلقی خوش الحانی کی وجہ سے آپ کی تمام روح سمٹ کر گویا ایک جگہ آجاتی تھی۔ آواز میں آپ تصنیع اور بناوٹ سے سخت احتراز فرماتے تھے۔

فروتنی و تواضع

کوئی طالب علم کتنا ہی اچھا ہوا سوال کیوں نہ کرتا، آپ خوشی سے اس کا جواب مرحمت فرماتے۔ عام مسلمانوں سے اپنے لئے دعا کرتے اور فرمایا کرتے کہ "لوگوں کے حسن ظن کی وجہ سے نجات کی امید ہے" آپ کے بیسیوں خطوط میں آپ کے یہ الفاظ موجود ہیں۔ "من اثم کم من دانم" مجھے دعائیں ضرور شریک کرنا۔ خدا کرے کہ تمہارے ظن کے مطابق مجھ سے حق تعالیٰ کا معاملہ ہو"۔ ایک بار حکیم محمد حسن صاحب نے اپنے حال کے متعلق کہا کہ مجھے کچھ نفع نہیں محسوس ہوتا جی چاہتا ہے چھوڑ دوں۔ آپ نے تسلی دی کہ میان کام کے جادہمت نہیں ہارا کرتے رہتے کام کا چھوڑنا کس نے بتایا ہے، بہتیرا کچھ ہو رہا ہے۔ حکیم صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مجھے کیونکر اطمینان ہو جب کہ میں دیکھتا ہوں، کہ قلب میں کچھ اثر نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بھڑائی ہوئی آواز میں یوں کہا کہ۔ "خدا کے بندے نہیں اپنے بڑے کے کہے پر بھی اعتماد نہیں ہے مجھے نہیں دیکھتے کہ عام لوگوں کے حسن ظن پر جی رہا ہوں" ایک خط میں عبدالعزیز خاں کو تحریر فرماتے ہیں:-

"بھلا اپنے علم میں بحلف کہتا ہوں کہ تمہارے واسطے ہر روز تو دعا لیتا کرتا ہوں مگر پانچ وقت میں شاید کسی وقت ترک ہوتی ہو۔ لیکن آپ کے اس حسن ظن سے سخت پریشان ہوتا ہوں کہ تم کو میرے ساتھ اس قدر عقیدت ہے محل ہو گئی ہے۔ مجھ جیسے صدا اس عالم میں موجود اور بہتر بھی بہت ہیں۔ بندہ کا حال تو اسی سے واضح ہو جائے گا کہ اس دم شب و روز آپ کے باب میں دعا کرتا ہوں اور کچھ اجابت کے آثار نہیں۔ جس سے صاف روشن ہے کہ مثل دیگر عوام مومنین کے میں بھی ایک ہوں۔ کوئی شخص اپنی تفریف کو بُرا نہیں جانتا۔ میں بار بار اپنا عیب اور حقیقت جو ظاہر کرتا ہوں سو اس سبب سے کہ میرے سبب تم اپنے مقصود سے نہ رہ جاؤ۔ میری عقیدت تم کو مضرت ہو جاوے۔ ناقص کے ساتھ ہو کہ اپنا نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے قیامت کو جب اپنا حال ظاہر ہوگا، مجھ کو مذمت نہ ہو کہ خلاف توقع ظاہر ہووے گا"۔

روزانہ کے معمولات

نماز فجر سے فارغ ہو کر آٹھ نو بجے تک ذکر و فکر میں خلوت کے اندر مشغول رہتے تھے۔ بعد ازاں نوافل پڑھتے اور طلبہ کو سبق شروع کرا دیتے۔ جب ظاہری بیانی جاتی رہی تو نذرینس ترک کر دی اور اس کی جگہ ارشاد و تحقیق کا دروازہ کھل گیا۔ اثناء سبق میں اگر کوئی مریض دوا پوچھتا تو بتاتے (طلب جیسا ملے تذکرۃ الرشید حصہ دوم ص ۷۷ بحوالہ مکاتیب رشیدیہ

کہ گزرا باقاعدہ نہیں پڑھی تھی مگر ذہن اور حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے ایک دو کتب کے مطالعہ سے تمام امراض و آویزات مستحضر رہتی تھیں۔ اول باقاعدہ مطب فرمایا۔ بعد ازاں قارورہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ نسبت اور لطافت طبع اس کی متحمل نہ سکی۔ صرف نبض اور بیان حال پر تشخیص و تجویز کا مدار رہا۔ جب آپ کے صاحبزادہ مولینا حکیم مسعود احمد دہلی سے طب حاصل کر کے آئے تو مطب وہ کرنے لگے اور آپ نے یہ کام ترک کر دیا۔ تدریس سے فارغ ہو کر خطوط اور استفتاء کے جوابات دیتے۔ جب تک بینائی رہی خود ہی جوابات لکھتے رہے۔ بعد ازاں مولینا محمد عیسیٰ کو تحریر کرا دیتے۔ روز دوپہر کو دھوپ گھڑی سے گھڑی درست کرتے۔ اس کا بے حد اہتمام تھا۔ کھانا کھاتے اور تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ فرماتے (استراحت کرتے) نماز ظہر سے فارغ ہو کر قرآن پاک دیکھ کر تلاوت کرتے۔ بینائی جانے کے بعد زبانی تلاوت کرتے اور اس کے بعد پھر تدریس تعلیم ہوتی۔ عصر سے مغرب تک مجلس عام ہوتی تھی۔ حسب موقع کلمات نصائح اور قصص اکابر بیان فرما کر عوام و خواص کی تربیت فرماتے تھے۔ بعد مغرب نفل آذان پڑھ کر مکان پر تشریف لے جاتے اور بعد نماز عشاء آرام فرماتے علی البصر نہیں بیکے بیدار ہو کر تہجد پڑھتے۔ ابتداء میں آٹھ رکعت نفل پڑھتے تھے بعد میں دس کا معمول ہو گیا تھا۔ رکعات نفل بہت طویل ہوتیں۔ نوافل سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن پاک اور وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ اگر کچھ کسل ہوتا تو تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جاتے۔ ہمیشہ آپ کا یہ معمول رہا۔ اس میں کبھی تغیر و تبدل نہ ہوتا تھا۔ پوری زندگی اس پر درگام کے مطابق گزار دی۔ رمضان المبارک میں آپ کی عبادت میں مشغولی بڑھ جاتی تھی۔

اپنے معاملات میں تقویٰ اور احتیاط اس قدر تھی کہ مسائل مختلف فیہا میں قول راجح اور اقرب الی الاحتیاط اختیار فرماتے تھے چاہے اس میں وقت ہی کیوں نہ ہو، مگر عام لوگوں کے لئے سہولت کو مد نظر رکھتے تھے اور وہ پہلو اُن بتاتے تھے جس میں ان کو آسانی ہو۔ آپ کی احتیاط کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آپ اپنی امراض میں چاہے وہ کتنی شدید کیوں نہ ہوتیں ہمیشہ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ مرض الموت میں جب تک اتنی سکت رہی کہ دو تین آدمیوں کے سہارے سے کھڑے سکیں، نماز کھڑے ہو کر پڑھی اور انہی کے سہارے رکوع سجود کئے۔ خدام نے عرض کیا کہ بیٹے کرنا گزاریں مگر نہ کچھ جواب اور نہ ہی قبول فرمایا۔ ایک روز مولینا محمد عیسیٰ نے کہا کہ حضرت اگر اس وقت بھی بیٹھ کر نماز جائز نہیں تو پھر اور کس وقت ہو اور وہ کونسی صورت ہوگی۔ آپ نے فرمایا۔ کہ امام صاحب کے نزدیک قارورہ بقدرۃ الغیر (غیر کے سہارے قدر سے رکھنے والا) تو قارورہ ہوتا ہے اور جب میرے دوست ایسے ہیں کہ مجھ کو اٹھا کر نماز پڑھاتے ہیں تو میں کیونکر بیٹھ کر نماز پڑھ سکا ہوں اور جب ضعف اس قدر ہو گیا کہ دوسروں کے سہارے بھی کھڑے ہونے کی ہمت نہ رہی تو اس وقت چند نمازیں بیٹھ پڑھیں۔ گویا بتلادیا کہ اتباع شرع اس کو کہتے ہیں۔ تقویٰ اس کا نام ہے اور احتیاط راوی اس طرح ہوتا ہے۔

لباس، غذا وغیرہ | لباس آپ ہر طرح کا پہن لیتے تھے۔ گاڑھا کدر بھی پہنا اور اعلیٰ مثال بھی استعمال کی۔ آپ کے نزدیک دونوں برابر تھے لیکن مرغوب لباس سادہ تھا البتہ ستھرائی کا بہت خیال رکھتے چاہے ہلکا کپڑا چاہے بڑھیا ہر صاف ستھرا ہوتا۔ غسل کرنے کی عادت روز کی تھی اور کبھی کبھی گرمیوں میں عشاء کے بعد بھی غسل فرماتے تھے۔

سلفہ تذکرۃ الشہید مولانا خلیل احمد سہارنپوری (بادشاہی ترمیم)

کبھی میلہ لباس پہنا تو نماز کے وقت ضرور تبدیل کر لیا۔ میلے کپڑے سے نماز پڑھتے تھے اور فرمایا کرتے کہ خدا کی دی ہوئی نعمتیں اس کے دربار میں حاضر ہوتے وقت بدن پر ہونی چاہئیں۔

حلال و لذت چیزوں سے آپ کو نفرت نہ تھی۔ عمدہ، ادنیٰ کھانا بطیب خاطر کھاتے تھے اور ایک مجلسی خوشی و فرحت حاصل کرتے تھے۔ کبھی کسی خاص غذا کے پابند نہ ہوتے نہ کسی شے کا بذات خود کوئی اہتمام فرمایا۔ البتہ ٹھنڈا پانی آپ کو بہت مرغوب تھا اور اس کا خاناقاہ میں خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ ٹھنڈا پانی پی کر آپ بہت خوش ہوتے اور یوں فرماتے کہ یہ بڑی نعمت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا۔ اسی لئے آپ نے دعا فرمائی ہے۔

اللہم اجعل حبک وحب من یحبک احب الی من مالی و اہلی و من الماء البارد۔
 اے اللہ! اپنی محبت اور اپنی ذات سے محبت کرنے والے شخص کی محبت میرے مال، میرے اہل اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ مجھے محبوب کر دے۔

خمیری روٹی اور شوربے سے خاص رغبت تھی کہ یہ دونوں چیزیں سوزج البضم ہونے کی وجہ سے معدہ میں گرانی اور عبادت میں کسل پیدا نہیں کرتیں۔

خوشبو سے حد درجہ رغبت تھی۔ خصوصاً گلاب کا پھول اور عطر زیادہ پسند کرتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مولوی محمد قاسم کو گلاب سے بہت محبت تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ گلاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عرق سے بنا ہے۔ یہ حدیث ہے۔ اگرچہ معیض ہونے لگے ہے تو حدیث ہے۔ چائے کی عادت نہ تھی۔ میسرے ہوتی تو پی لیتے ورنہ نہ پیتے۔ کبھی ہفتوں مسلسل پی اور کبھی ہفتوں نہیں پی۔ جب تک دانت تھے اصرار پر پان کھا لیتے تھے۔ بیانی جالے پر لٹھکی کے سہارے مسجد کو آتے جاتے مگر یہ عادت تھی کہ کوئی لٹھکی تھامے یا راستہ نہ بنا پلے۔ آپ کو آدل تو اکل تھی۔ دوسرے دیوار ختام کر اور ٹوہ کر چلتے تھے۔ کھلکھلا کر پ ساری عمر کبھی نہیں بنے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کا ہر وقت غلبہ رہتا۔ بعض دفعہ ایسے قصے بیان فرماتے کہ سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے مگر آپ بے شکم کناں ہوتے۔

غوش طبعی اور ظرفیت

ایک مرتبہ مولوی ولایت حسین آئے اور مصافحہ کیا۔ پوچھا کون؟ عرض کیا ولایت حسین۔ فرمایا سیدھا دلی کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ایک دفعہ مولانا محمد یحییٰ کو ایک تعویذ بتایا اور فرماتے گئے، کہ ایک پیر زادے نے ایک شخص سے کہا ہمارے ساتھ رہا کرو، جو کچھ ملے گا آدھا آدھا۔ راستے میں ایک چٹا (یعنی پیسے کا دان) پڑا۔ پیر زادہ کہنے لگا کہ میں اٹھاؤ، چھیلو۔ آدھا ہمیں دو آدھا تم لو اور اس کے لہجہ کہنے لگا کہ دیکھو یاروں کے ساتھ رنگے تو رہتے ہیں۔ آپ کے مزاج میں بھی اس طرح صداقت ہوتی جس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں ہوتی تھی۔ آپ کے پیوستے عید احمد جانس کا رہے تھے۔ حضرت نے فرمایا۔ گھٹلی مت نگلیو۔ بچپن کے تقاضا و ناز کی وجہ سے پوشتے نے جواب دیا کیوں؟ تم تو گھٹلی بھی کھا جاتے گے۔ حضرت نے فرمایا۔ گھٹلی سے درخت ایسا دے ہے۔ "سید احمد ڈر گئے اور بخند کرنے لگے۔

ایک دفعہ درس حدیث میں فرمایا کہ جنت میں مرد سبزہ آغاز لے لیش ہوں گے۔ ایک طالب علم نے عرض کیا کہ مرد کے پیسے یا زینا بش تو لیش سے ہوتی ہے۔ بختیوں کے لئے یہ سن کیوں تجویز ہوا۔ بے ساختہ مسکرا کر جواب دیا کہ اس کا مرزہ ان سے لہجہ

جو داڑھی منڈاتے ہیں۔ مولوی محمد سہول ایک بار کسی مسئلہ پر بحث کرنے لگے اور اعتراض پر اعتراض کرتے رہے۔ فرمایا۔ تمہارا نام سہول کس نے رکھا۔ تم میں سہولت تو ذرہ بھر نہیں۔ تمہارا نام مسئلہ چاہیے کہ سوال بہت کرتے ہو۔

اشعار سے دلچسپی نہ تھی | آپ کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہ تھی، تاہم کسی خاص موقع پر بسے اختہ بچپن کا نظریہ سے گذرا ہوا شعر زبان پر آجاتا تھا۔ ایسے اشعار کی تعداد پوری عمر میں بیس پچیس سے زائد نہ ہوگی۔ مرض

الموت سے چند سال قبل آپ سخت مرض میں گرفتار ہوئے۔ اس شب بھر پر کہ کہیں کسی نے سحر نہ کر دیا ہو۔ حضرت مولانا غلیل احمد نے ایک شخص کو دیوبند سے روانہ کیا جو اس فن میں کمال رکھتا تھا۔ جب وہ گنگوہ پھنچا تو حضرت کو من جانب اللہ معلوم ہوا کہ یہ آئے والا سحر کرنے والے کا مرید اور شاگرد ہے۔ اُس کو واپس کر دیا۔ جب حضرت مولانا غلیل احمد حاضر ہوئے، تو مصافحہ کرتے وقت آپ نے یہ شعر پڑھا۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں
ظہر کے بعد جب خلوت خانہ میں تشریف لے جاتے، حجرے کے کوار بند ہو جاتے تو آپ پر بعض دفعہ ایسا کیف تھا کہ ہوتا کہ دینک وہیں رہتے کسی کا آنا اچھا معلوم نہ ہوتا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب اگر کوار کھولتے اور یا حضرت خود ہی کھول دیتے اور مولانا یحییٰ حضرت کے کچھ اس طرح مزاج شناس ہو گئے تھے کہ از خود ان کی طبیعت میں وہی بات آتی جو حضرت کی منتشر ہوتی۔ اس بنا پر حضرت اکثر فرمایا کرتے کہ ”مولوی یحییٰ تو میری آنکھیں ہیں“ یا ”یحییٰ تو میری لالچھی ہیں“۔ بارہ سال اسی شفقت تلے مولانا یحییٰ نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبت صادق کی خدمت کی۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حضرت کو نا درخلوت میں رہنا پسند آیا تو مولانا یحییٰ بھی اپنی جگہ سے نہ آئے۔ ایک بار ایسا ہی اتفاق پیش آیا۔ مولانا یحییٰ نے دیر کے بعد اگر کوار کھولا تو دیکھا کہ حضرت بیٹھے تسبیح پڑھ رہے ہیں۔ فرمایا اب تک کہاں تھے؟ انہوں نے کہا حضرت جی چاہا کہ ابھی حجرہ کھولوں۔ فرمایا پھر اب کیوں آئے۔ عرض کیا کہ اب دفعہ جی چاہا کہ کوار کھولوں۔ آپ مسکرائے اور بے شعر پڑھا وہ نہ آئیں تو تو ہی چل رینگیں
اس میں کیا تری شان جاتی ہے

ایک مرتبہ حضرت حمیری روٹی تو مرے کھا کر آئے۔ جیسا کہ گذرا یہ حضرت کی پسندیدہ غذا تھی۔ چہرہ پر نشاط تھا اور تلب میں انبساط۔ مولانا یحییٰ سے پوچھا کہ میاں تمہیں بھی کچھ بھادے ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت کچھ نہیں۔ ایک ارہر کی دال تو بھاتی نہیں۔ باقی جو کچھ مل گیا سب پسند ہے۔ آپ مسکرائے اور فوراً یہ شعر پڑھا
کیا کہوں جرات کہ کچھ بھانا نہیں
کچھ تو بھایا ہے کہ کچھ بھانا نہیں

ایک بار آپ نے فرمایا بھتی ہمیں تو حضرت کے دردناک میں ایک شعر بہت بھایا ہے
مرا ان کھیل خلقت نے بنایا
تماشہ کو بھی تو میرے نہ آیا

غلام طور پر بیمار ہونے پر رحمت علاج کی طرف نہ تھی۔ احبار و خدام ہی اس کا خیال فرماتے تھے۔ بتایا جانے پر متوسلین بہت کوشش کی کہ آنکھ ہوائی جائے مگر آپ راضی نہ ہوئے۔ کبھی تو یہ فرمایا کہ ”آدمی اپنے قویٰ کو دیکھے، آنکھ ہی درست

سیر کیا کرے گی۔ دیکھو قاری عبدالرحمان نے آنکھ بنوائی، چھ ماہ کے بعد انتقال ہو گیا۔ ”کبھی فرماتے: ”آنکھ بنوانے میں بڑی تکلیف دیتی ہے۔ نماز پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنی تکلیف کون اٹھائے؟“ کبھی یہ فرمایا کہ ”بھتی میں نہیں بنواتا۔ سنتا ہوں کہ آنکھ بننے پر طبیب چند روز حرکت کرنے کی ممانعت کر دیتا ہے اور مجھ سے بڑھاپے میں نماز نہیں چھوڑی جاتی۔“ لیکن جب بحال علی خاں سول سرجن نے جو اس فن میں مشہور ڈاکٹر اور ماہر دسند یافتہ طبیب تھے خود حاضر ہو کر دائق وعدہ کیا کہ شریعت کو فی نماز قصار نہ ہوگی۔ چند گھنٹے حرکت سے پرہیز ہوگا جو فجر اور ظہر کے درمیان ممکن ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو سکتی اور آنکھوں بغیر میرا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔ ”مولوی عبد اللہ نے از حد اصرار کیا تو آخر میں اصل بات فرمادی کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس کی آنکھ لے لے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کا بدلہ جنت ہے شاید یہی ایک ذریعہ حصول جنت ہو۔ مجھے تو اندھا رہنا ہی پسند ہے اور ایک مرتبہ خاص لوگوں سے یوں بھی فرمایا کہ میاں پہلے آنکھیں بند کر فی پڑتی تھیں۔ الحمد للہ اب خود بند ہو گئیں پھر ان کے کھلوانے کی تمنا کیسی؟

وام کے لئے سہولت اور پر گزرا کہ اپنی ذات کے لئے تو حضرت ہر حال میں احتیاط اور اولویت کو اختیار فرماتے تھے۔ مگر عوام کے لئے جہاں تک ہو سکتا سہولت ملاحظہ رکھتے۔ البتہ بدعات و معصبات

آپ کو تشدد پسند تھا اور سدالالباب مبادی و مقدمات پر بھی عدم جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔ مثلاً محرم کو شہادت چینی کا پاداشتہ بیان کرنے کو منع فرماتے تھے کہ اس میں روافض سے تشبیہ ہے۔ دوسرے موقع پر بیان کر دیکوں وہ ان دنوں اس واقعہ ہمارے صحابہ پر سبب و شتم بھی کرتے ہیں۔ لیکن عام مسائل میں جہاں تک سہولت نکلتی اس کو اختیار فرماتے اور بگڑم بلوئی بہت خیال فرماتے۔ ایک دفعہ تمباکو نوشی کا ذکر آیا تو فرمایا کہ ”مکروہ ہے کیونکہ منہ سے بدلو آتی ہے اور حق پر کیا منحصر ہے بدلو کی رچرچ میں مثلاً اہسن پیاز، موزی وغیرہ سب کچھ کھانا مکروہ ہیں۔“ ایک صاحب نے عرض کیا کہ بعض مولویوں نے تو حرام کہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ سب غلط ہے۔ تمباکو مثلاً اور مالکولات کے مباح ہے۔ اس پر کسی خادم نے عرض کیا کہ رمضان شریف میں بھی دم نکا کر لے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمباکو تشدد آور ہے۔ آپ نے فرمایا خالی معدہ میں کالی مرچ سنگھادی سے تو وہ بے ہوش کر دیتی ہے۔ میاں تمباکو تشدد نہیں کرتا بلکہ اس کی تیزی خاد معدہ کے وقت البتہ بے ہوش کر دیتی ہے۔

طرک تیزی ایک دفعہ حکیم ضیاء الدین کے ہاں رام پور تشریف لے گئے۔ ایک شخص صبح کو قارورہ لے کر آیا، اور حکیم صاحب کے سامنے پیش کیا۔ حضرت فاضلہ پر بیٹھے تھے۔ آپ نے دور ہی سے قارورہ پر نظر ڈالی اور جب شخص قارورہ پھینکنے لگا تو آپ نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ ”اس مریض کا علاج سنہل کر کرنا۔“ حکیم صاحب نے پوچھا حضرت یوں؟ آپ نے فرمایا کہ اس کا حال ابتر ہے۔ ”جب وہ شخص واپس آیا تو اس نے مریض کی چھکی وغیرہ کی وہ کیفیت بیان کی، جو لم نزع میں ہوتی ہے چنانچہ حکیم صاحب نے اُسے ٹال دیا۔

پر ترغیب و ترہیب کوئی شخص کیسا ہی قلب بگاڑ کر آپ کے پاس آتا، آپ اس کی اصلاح میں دریغ نہ کرتے بشرطیکہ اصلاح کی سچی طلب لے کر آیا ہو۔ خدام کی عیب پوشی میں آپ کو خاص ملکہ تھا خود بہت تھے۔ خدام متوسلین کو عالی حوصلہ بناتے، بہت متبول کو ابھارتے اور اکثر فرماتے کہ جو کچھ حق تعالیٰ تو فیق دے، کئے

جاتا۔ ہمت نہ ہارو۔ اگر قلب میں اثر نہ ہو نہ سہی آخر زبان سے ذکر ہوتا تو طوائف نفع ہے۔ جب زبان اللہ کے ذکر کے سبب دوزخ سے بچے گی تو دل بھی تو ساتھ ہی بچے گا۔ مریدین میں یاس و ناامیدی نہ پیدا ہونے دیتے۔ مگر ایک حالت پر قائم رہنا گوارا نہ تھا۔ تحریر، تقریر ہر انداز سے عرض جس طرح بن پڑتا ہر پہلو سے خدام کو توجہ الی اللہ کی ترغیب دلتے اور یوں فرماتے کہ جتنا بھی ہو سکے کرو اور حق تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اسی سے ترقی ہوگی۔

وَلَكِنْ شَكَرْتُمْ لَا يُزِيدُكُمْ وَلَكِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابَ ابْنِ السَّعْدِ
 (قرآن حکیم) اگر کفران (نعمت) کر گئے تو بیشک میرا عذاب شدید ہے۔
 اگر سچے گزشتہ سارا مضمون تذکرۃ الرشید سے ماخوذ ہے۔ اکثر جگہ اس کی عبارتیں خلاصہ کر کے پیش کر دی ہیں اور جگہ جگہ کے توں فقرے لے لئے ہیں۔ تاہم یہاں ایک طویل اقتباس تذکرۃ الرشید سے من و عن نقل کیا جاتا ہے۔ یہ ”آپ ذکر اللہ کی تحریض و ترغیب میں کیاتے زمانہ تھے۔ عالم ہو یا جاہل، غاص ہو یا عامی، شریف ہو یا وشیع، امیر ہو یا غریب، ہو کوئی بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا فوراً ابدی اور رغبت الی الآخرت کا حسب مقتدر کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے کر جاتا تھا۔ اس وقت خدا کی مخلوق کی کئی ہزار راست گفتار زبانیں اس مضمون پر متفق ہیں کہ آپ کی صورت دیکھ کر خدا یاد آتا اور آپ کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا سے نفرت پیدا ہوتی تھی۔ اتباع اور تسک بالسنۃ کی تعلیم کے لئے صرف آپ کی زبان نہ تھی بلکہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک جو افعال آپ سے صادر ہوتے وہ سب سبق پر چھاتے اور یاد کر لیا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ کا نام انسان کا بڑا رفیق ہے اور بطحا پیغمبر کا اتباع مسلمان کا اصل مقصد اور رضائے مخلوق کا مضبوط وسیلہ۔“

حق تعالیٰ نے آپ کو جس مشغلہ میں لگایا تھا، اس کے اندر آپ کو اس درجہ پختگی عطا کی گئی تھی کہ کبھی فرق نہیں کیا۔ آفتاب عالم صبح کو طلوع ہوتا اور شام کو افق مغرب میں غروب ہو جاتا تھا، ماہِ تاب کبھی ہلال بن کر نکلتا اور کبھی بدر بنتا، کبھی دکھائی دیتا اور کبھی عالم کی نظروں سے چھپ جاتا تھا، کبھی روز روشن ہوتا تھا اور کبھی شب تاریک، کسی وقت سردی جلوہ گر ہوتی اور کسی وقت گرمی، غرض عالم حادث ہر روز مختلف ہوتا اور دنیا اپنے انقلاب عظیم کو ہر لمحہ ملتتی اور بدلتی رہتی تھی مگر حضرت امام ربانی قدس سرہ کا ایک دم تھا کہ مضمون واحد یعنی خدا نے کیا وحدہ لا شریک معبود کی عبادت میں یکساں مصروف تھا۔ آپ اپنے نفس نفیس کی حیثیت سے اس خاصیت میں فروتنی کہ متغیر عالم کے تغیرات کا اثر آپ کے مستحسن مشغلہ پر نہ

لے میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے ہیں کہ ”تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔ میں نے ساک صاحب (عبد المجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے احباب کو یہ کتاب پڑھائی۔ اس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنجوی کی عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے آدمی تھے۔“
 لے تذکرۃ الرشید حضرت امام ربانی کی وفات کے دو سال بعد لکھا گیا تھا۔

پڑا۔ آپ کے حالات زمانہ کے ماتحت بن کر بیشک مختلف تھے مگر سنت کے اتباع کا اور مشترک سب کو شامل اور ہر حالت میں موجود تھا۔ آپ کا دل اندر سے یوں چاہتا تھا کہ دنیا میں ایک مقفّس بھی ایسا نہ ہو جس سے حق تعالیٰ کی محصیت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ظاہر ہو۔ آپ شفقت کے درجہ میں اپنے نفس ہی کے خیر طلب نہ تھے بلکہ تمام عالم کے ساتھ آپ کو یہ ہمدردی تھی کہ کاش دوزخ میں جانے والا ایک بشر بھی نہ رہے۔ آپ اس درجہ رفیق القلب تھے کہ کسی کی حالت تکلیف یا تنگی دیدہ حالی سنتے تو بے چین ہو جاتے تھے۔ واقف ہو یا ناواقف، یگانہ ہو یا بالے گانہ، کسی شخص کی بد حالی و محسرت آپ کو گوارا نہ تھی۔ جس طرح دنیا کی محسرت و بد حالی آپ کو صدمہ پہنچاتی، اس سے زیادہ آخرت کے افلاس پر آپ تنگ دل و بے چین ہوتے تھے۔ کسی شخص کی مصیبت اور بد دینی سن کر آپ کو جس درجہ حزن ہوتا اور اس کے لئے آپ کا دل روبا اور دکھایا کرتا تھا شاید اپنے فقر و افلاس پر بھی کسی کو رنج نہ ہوتا ہو گا۔ دشمن سے دشمن کے لئے بھی آپ نے کبھی بد دعا نہیں کی بلکہ،

مولوی احمد رضا خاں کے متعلق فتاویٰ کو جمع کیا جاتے جو حضرت امام ربانیؒ کے متعلق لکھے ہیں تو ایک رسالہ بن سکتا ہے اور ان کی تمام کوششوں کو شمار کیا جاتے جو انہوں نے حضرت امام ربانیؒ کی تکفیر کے متعلق رد رکھیں تو دل خون کے

نور و تاب سے کہ کاش وہ اس مشق کے بجائے بطحانی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو زندہ کرنے پر صرف کرتے۔ ان صاحب سے حضرت گنگوہیؒ کو اتنی ایذا نہیں پہنچیں کہ شاید انہوں نے کسی دوسرے کو نہ پہنچائی ہوں۔ مگر جو ہستی خلق پیغمبر کا نمونہ بن کر آئی ہو اور دنیا کو اسوہ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چلنے کی ترغیب و مشق پر جس نے ساری عمر اپنے آپ کو لگا رکھا ہو اس کی زبان سے بھلا کیوں اپنے مخالف کے لئے کوئی بُرا لفظ نکلتا۔ اس بارے میں حلف اٹھایا جاسکتا ہے کہ حضرت سے تا سحر کوئی ایسا لفظ نہیں سنا گیا کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ ان کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ جس زمانہ میں مولوی احمد رضا صاحب کو مرض بلام ہوا اور خون میں فساد پیدا ہوا۔ بعض لوگوں کو مسرت ہوئی کہ سب و شتم کا ثمرہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ مگر جس وقت کسی شخص نے حضرت سے عرض کیا کہ ”بریلی مولوی کو ڈھکی ہو گئے“ تو حضرت گھبرا اٹھے اور یہ الفاظ فرمائے کہ ”میاں کسی کی مصیبت پر خوش نہ ہونا چاہیے خدا جانے اپنی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔“ ایک دن ڈاک میں خط آیا جس میں اطلاع تھی کہ آپ کے ایک بڑے مخالف مولوی ہدایت رسول کو ایک منکوحہ عورت سے نکاح کرنے کے جرم میں عدالت سے سزائے قید کا حکم سُنا گیا۔ بعض سامعین کو مسرت ہوئی مگر آپ کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ اِنْ شَاءَ اللہ وَ اَنَا اَیْمٌ رَاجِحُونَ۔

زیادہ سے زیادہ رنج زیادہ سے زیادہ رنج کا اثر جو کسی بدگو مبتدع کی طرف سے آپ کو پیش آتا یہ ہوتا تھا کہ آپ اس کے لئے دعا کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ مگر یہ بھی اس لئے کہ یہ ایذا رسانی حضرت سے تجاوز کر کے آپ کے مخلصین تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار کسی شخص نے آپ کو دعا کے لئے لکھا۔ آپ نے فرمایا۔ کر یہ وہی تو

میں جنہیں مولوی خلیل احمد صاحب سے عداوت ہے۔ میرے دوستوں سے دشمنی رکھیں اور مجھ سے دعا کرانی چاہیں۔ یہ مجھ پر نہیں ہو سکتا اگرچہ کسی کے لئے بددعا بھی نہیں کرتا۔

اور اس میں بھی حضرت کے پیش نظر آقائے نامدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسودہ حسد تھا۔ طائف کی دوا آپ کو کتنی تکلیف پہنچائی گئی مگر بددعا کے لئے فرشتوں کی ایس کے باوجود آپ نے ان کے ہدایت کی دعا فرمائی۔ لیکن احمد میں جب آپ کے نکاح ساتھیوں کو شدید زخم لگائے گئے تو آپ کے ہاتھ بے اختیار بددعا کے لئے اٹھ گئے، اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی منع فرمادیا کہ آپ تو سراپا رحمت ہیں۔ اور آپ کو یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ پر سب دیکھ رہے ہیں۔

عکس تحریر حضرت گنگوہی

یہ خط مفتی فاروق احمد کے والد ماجد اور (تبلیغی جماعت دہلی) کے دادا مولانا صدیق نام ہے۔ غافلہ پر نگاہ کی ضرورت ۱۰ اکتوبر ۱۸۸۸ء بالبرکات کی ۱۳ اکتوبر ۱۸۸۸ء کو ہے۔ غافلہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے بھی دست بھی تبرکات شامل کر دیتے ہیں (دارشد)

سراور مولانا صاحب رحمہ اللہ علیہ وسلم در خدمت و در کائنات
آپ کا خطاب حضرت خلیفۃ المسیح اعلیٰ اور صاحبِ خود سے عافیہ ہوئی ابھی ہے نوح
میر کے عزیز صلیح کو علم نصیب ہو جاوے اور خود دعا کو نامہ ہو کر لے کر
نوح۔ آج صفا بادشاہت ہو جانتی ہو کہ کد کا حکم
تایید کا خواہر و ملین عوام کے لئے اختیار نہیں رہا
کہ طاعت سر۔ راجہ صدمہ وقت حضور خلیفۃ المسیح
با عابد بنہ بابو اور حسین طبع کو جو صاحبِ خود سے غیر شعل
بہتر ہو کر سر شہر انجیل اختیار میں ہو جاوے جس کے
مطلب آباد ہو وہ میر کے نہ او کو قید کو زبانی کر کو کر
کہ کے تصور خلیفۃ المسیح غفرلہ سے سر او ایس معادہ السلام
حکومت دعا میں باد کر لیا کہ وہاں حسن طرح اپنا فرض نباہا
عمر محمود کو ستم دعا دعا میں کامر سنگاہ میں وہ ہر اپنی مانتہ
وہ کہہ اسی میر کے جو کلمہ پاک کو ادنیٰ و ادنیٰ کا دل خوش ہو جاوے
وہ کہہ کہو تو کہ نہ فسق اور رضا میرے خواہر صلیح کو کلمہ

دعا
میر کے جو کلمہ پاک کو ادنیٰ و ادنیٰ کا دل خوش ہو جاوے
وہ کہہ کہو تو کہ نہ فسق اور رضا میرے خواہر صلیح کو کلمہ



بیعت و ارشاد

گر ہوائے اس سفر داری دلا
دامن را بھر بگیر و پس برا
در ارادت باش صادق لے فرید
تا بیابے گنج عسقلان را کلید
بے رقیبے ہر کس شد در راہ عشق
عمر بگذشت و نشد اگر عاشق

بیعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان کسی اچھے پرہیزگار، متقی، عالم یا مکمل اور باصلاحیت شخص کے ہاتھ پر توبہ کرے کہ میں آئندہ سے نیک کام کروں گا اور گناہوں سے اجتناب کروں گا۔ اور یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر اس طرح کا عزم وہ اکیلا کرے تو اس میں وہ استقلال و استقامت پیدا نہیں ہوتی جو ماضی کی عادات کو چھوڑنے اور استقبال میں اچھی عادات پیدا کرنے میں کام دے سکے۔ خلیفہ احمد نظامی نے "تاریخ مشائخ چشت" میں مقصد بیعت کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں ایک جگہ چند سطروں میں بیعت کا فلسفہ بیان فرماتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بیعت میں ایک نفسیاتی مصلحت پوشیدہ ہے جب انسان اپنے ماضی کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیتا ہے تو بہت سی باتیں اس کو اخلاق و مذہب کے خلاف نظر آتی ہیں۔ اس کا ضمیر بلاست کرنے لگتا ہے وہ دل ہی دل میں اپنی مصیبتوں سے توبہ کرتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا۔ اس سے قلب میں ایک بے چینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی کا تصور اس کے لئے سودا بن روح بن جاتا ہے۔ اس کی توبہ اس تصور پر غالب نہیں آتی۔ اب وہ ایک پاک باطن، نیک نفس انسان کے ہاتھ پر ترک ماضی اور توفیقی کا عہد کرتا ہے۔ شیخ یقین دلاتا ہے کہ "تا تب با متقی برابر است"۔ اُس کے دل کے رنجوں پر ایک پھار سا لگ جاتا ہے وہ اپنے مستقبل کو نئی امیدوں، محکم یقین اور بنیاد احساس کے ساتھ سنوارنے کی کوشش کرتا ہے۔

بیعت کا لفظی معنی "دست بردار یک دیگر نہاد و عہد بستن" کسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عہد کرنا۔ (سبع سوال و ۳۵) قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر صحابہ بیعت کیا کرتے تھے جس کا ذکر یوں آتا ہے۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون
اللہ ید اللہ فوق ایدہم فمن
نکث فانما ینکث علی نفسه ط ومن

جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں (اسے اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے سو جو عہد شکنی کرتا ہے تو اپنی ذات کی مضرت پر عہد ٹوڑتا

لے حدیث نبوی ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ۔ توبہ کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے کبھی گناہ نہیں ہوا۔ (ابن ماجہ باب ذکر التوبہ) تاریخ مشائخ چشت ص ۲۴۰۔

اَوْفِي مَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللّٰهُ فَيَسُوْغُوْا لِهٖ اَجْرًا
(سورۃ فتح پارہ ۷۶) کو عنقریب اجر عظیم ملے گا۔
ہے اور جس نے وہ عہد پورا کیا جو اللہ سے کیا تھا اُن

تصوف کے سلاسل اربعہ | چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، سہروردیہ۔ چاروں سلسلوں میں بیعت کا طرز
یہی تھا کہ ایک کامل شیخ کے ہاتھوں پر اپنے گناہوں کی کوئی توبہ کرے اور شیخ کے سامنے
آئندہ کے لئے نیک کام کرنے کا عہد کرے لیکن مرشد اور شیخ کا عامل شریعت اور متبع سنت ہونا ضروری ہے۔ یونہی بھی
کسی شہرت یافتہ پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا تاکہ ہم بھی اس کے مریدوں میں شامل ہو جائیں، بیعت کے مقصد کو
منہیں کرتا۔ بیعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان شیخ سے اپنے باطن کی اصلاح کرائے۔ جس طرح جسمانی امراض کے علاج
لئے کسی ماہر معالج مستند طبیب اور کو الیقا ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح روحانی امراض کے لئے بھی ماہر معالج
ضرورت ہے۔ لاکھوں میں شاید کوئی ایسا آدمی ہو جو طب کی کتابیں پڑھ کر اپنا آپ علاج کر سکے۔ لیکن جو ایسا کر سکتا۔
وہ بھی ایسا نہیں کرتا بلکہ اچھے سے اچھے معالج کی تلاش کر کے علاج کراتا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بخار کے بیشتر اقسام میں
وہ تمیز نہ کر سکے کہ مجھے کونسا بخار ہے۔ اسی طرح روحانی امراض میں وہ بعض امراض کو صفات سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہے
ساری عمر اس کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ تکبر اور غرور کو خودی اور خود داری سمجھ لے۔ علی ہذا القیاس دوسری بیماریاں
کو خوبیاں سمجھتا رہے۔

یہ ایک مستقل موضوع ہے جس پر سلف و خلف نے بیشمار کتابیں لکھی ہیں۔ اگر آج کل بعض لوگ تصوف یا پیری مریدی
اپنے دنیاوی مفاد کے لئے استعمال کرتے اور اس سے اپنی وجاہت بڑھاتے ہیں۔ اگر آج کل بے عمل صوفی یا بدکردار جاہل
اور گمراہ سجادہ نشین اس پاکیزہ راستے کو خراب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس کی اصلاح کرنا چاہیے نہ کہ سرے سے سلوک و
طریقت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے جس طرح آج کل کے لوگوں کے اسلام کو محض چند رسوم اور عہد
فاسدہ و باطلہ کا مجموعہ دیکھ کر اسلام ہی کو ختم کرنے کی مذموم کوشش شروع کر دی جاتے۔

حضرت مولانا گنگوہی کی ایک عربی عبارت سے اسی مضمون میں واضح ہو چکا ہے کہ صوفی کسے کہتے ہیں اور سلوک و
کیا ہے۔ تصوف دین و تربیت کی روح و معنی یا کیف و کمال کا نام ہے جس کا کام انسان کے باطل کو تمام رذائل اور بُرے اخلاق
سے پاک صاف کرنا ہے اور ان باطنی امراض یعنی رذائل اور اخلاق ذمیرہ کو دور کرنے اور اپنی روحانی صحت کی اصلاح کے لئے
ایک ایسے شخص سے رجوع کرنے کو کہ جو رذائل اور اخلاق ذمیرہ سے پاک ہو، بیعت کہلاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد
”تذکرہ“ میں تحریر فرماتے ہیں:-

”الغرض توفیق الہی کی سیکڑیں نہیں ہیں، ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں نہیں ہیں سب سے زیادہ انسان پر اپنی
راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت حاصل ہو جائے“ (تذکرہ ص ۲۹۹) ”نظام غیبی کی طرح نظام انسانی کے بھی مرکز و محور ہیں گویا
ان کا حال نہیں معلوم، تنگوارجم ماویا کی طرح معلوم کرنے میں جب ہزاروں برس لگ گئے تو نہیں معلوم عالم انسانیت کے نظام و مرکز کے کشف کیسے کتنان
دور کا ہو گا تاہم اتنا معلوم رہے کہ ہر دور میں خدا کے چند بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا وجود ستاروں کے مرکز غیبی کی طرح تمام انسانوں کا مرکز و محور ہے
گویا انجذاب ہوتا ہے اور جس طرح نظام غیبی کا مرکز حرکت ستارہ صرف اس لئے ہے کہ کعبہ شمس کا طواف کرے اس طرح انسانوں کے گروہ اور آبادیوں کے
ہجوم بھی صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ اس مرکز انسانیت اور کعبہ ہدایت کا طواف کریں انہیں والوں پر ہی موقوف نہیں انسانوں میں بھی صرف ہدایت

کے کارناموں کی پیکار ہوتی ہے" (تذکرہ ص ۶۶)۔

شیخ یا میر منتخب کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانچ اور پرکھ لیا جائے کہ آیا وہ کتاب وسنت کا پابند اور معاملات معاشرت میں ٹھیک ہے۔ ایسے شیخ کا انتخاب کرنے کے بعد پھر شیخ پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح کہ طبیب حاذق پر کیا جاتا ہے۔ اپنے باطنی امراض کا ذکر کر کے انکا علاج پوچھا جائے اور شیخ جو حکم دے اس کو پورے طور پر نبھایا جائے۔

حضرت گنگوہی۔ ایک مرشد کامل

حضرت گنگوہی جن خصوصیات وصفات کا ہونا ضروری ہے وہ حضرت گنگوہیؒ میں بجا اتم پائی جاتی تھیں۔ کتاب وسنت کی تعلیمات اور احکامات کو پڑھتے جاتے اور حضرت گنگوہیؒ کی زندگی کو دیکھتے جاتے علم ہو گا کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی حضرت کی زندگی کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہے۔ طبیب کامل کے لئے ضروری نہیں وہ خود بھی حفظان صحت کے اصولوں پر عمل کرے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ خود پورا صحت مند ہی ہو تو علاج کرے لیکن روحانی معالج کے لئے ضروری ہے کہ وہ جن امراض کا علاج کرتا ہے یا جن روحانی بیماریوں سے نجات پانے کے لئے لوگ اس کے پاس حاضر ہوں وہ خود ان امراض سے پاک ہو اور روحانی طور پر مکمل صحت یاب ہو۔ ایسا شیخ، شیخ کامل نہیں ہے جو خود زامراض باطنی میں مبتلا ہو مگر دوسرے کی اصلاح و تزکیہ کا پٹرا اٹھائے۔ اس سلسلے میں یہ مثال بڑی بلیغ ہے کہ ایک بزرگ شخصیت کے پاس ایک عورت اپنے بچے کو لئے حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ اس کو نصیحت کریں کہ گڑبگڑ کھایا کرے اور دعا بھی کریں تو انہوں نے فرمایا کہ کل آتا۔ عورت دوسرے روز حاضر ہوئی تو آپ نے بچے کو نصیحت بھی فرمائی اور دعا بھی کی۔ آپ نے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ نصیحت کل کیوں نہ فرمائی۔ تو جواب دیا کہ کل میں نے بھی گڑبگڑ کھایا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ اگر آج میں اسے صحت کرتا ہوں تو اس کا اثر نہ ہوگا۔ لہذا میں نے کہا کہ کل آتا۔ اندازہ فرمائیے کہ اگر ایک جائز امر میں نصیحت کے لئے اس سے خود احتیاط کی ضرورت شیخ کامل کے نزدیک ضروری ہے تو توڑ کٹن، منکرات و فواحش اور باطنی امراض میں داغ و صغیر یا شیخ کے لئے کتنا ضروری ہو گا کہ وہ ان کا مرتکب و فاعل نہ ہو۔ قرآن پاک اس کو اللہ کی ناراضگی کا موجب بتاتا ہے، کہ انسان خود تو عمل کرے لیکن دوسروں کو نصیحت کرے۔

اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے۔

بڑی بیزاری کی بات ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز

جو نہ کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا

تَفْعَلُونَ ۚ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا

مَا لَا تَفْعَلُونَ ۚ (الص: ۳)

جس طرح ہرے لہذا اس کے امراض واضح اور علاج و تدبیر بھی ظاہر ہے لیکن روح باطن کی چیز ہے لہذا اس کی بیماریاں مخفی ہیں۔ ان کو دیکھنے اور علاج کرنے کے لئے بصیرت اور فقاہت کی ضرورت ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح ان ٹیڑھ پائل اور انطی بڑے بڑے انقاب کے ساتھ اپنے پیچھے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اسی طرح روحانی دنیا میں گمراہ، بے عقیدہ اور بے عمل لوگ مسند طریقت پر براجمان ہیں۔ ایک حکیم یا طبیب غلط تجویز و تشخیص سے بیماری کو طول دینے یا مریض کی جان لینے کا سبب بنتا ہے اور گمراہ پر یہ مرشد ایمان کی خرابی اور گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ بعض بڑے نامور اور مستند طبیب علاج کرتے

بھی ہیں اور علاج کرنا سکھاتے بھی ہیں۔ اسی طرح شیخ کامل عوامی تربیت بھی کرتا ہے اور اس سے زیادہ ایسے لوگوں کی اصلاح کر کے ان کو امراض روحانی کا معالج بناتا ہے جو صحیح طور پر وسیع پیمانے پر لوگوں کا علاج کر سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتے تو حضرت گنگوہی کا دربار اپنے وقت کا سب سے بڑا مطلب بھی تھا کہ جہاں آنے والوں کی مرض دیکھ کر ان کی دوا تشخیص کی جاتی تھی اور ایسی تربیت گاہ بھی تھا کہ جہاں علاج کرنا سکھایا جاتا تھا۔

صدق و طلب کا امتحان

کئی لوگ رسمی طور پر دیکھا دیکھی کسی بڑے پیر کا مرید ہونے کے لئے آجاتے ہیں یا کسی دنیوی عزم و مفاد کے لئے کسی بڑے شیخ سے بیعت ہوتے ہیں یا بعض امتحان آجاتے ہیں کہ وہیں شیخ کیسا ہے اصلاح مقصود نہیں ہوتی۔ حضرت گنگوہی اس بارے میں اپنی خدا داد صداقت و قناعت اور بصیرت و فراست ایمانی کو کام میں لاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ آیا آنے والا طلب صادق سے واقف اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہے؟ اور اس کی طلب کماں تک ہے۔ چنانچہ اس طرح کی مثالیں کثرت سے ہیں کہ ایک آدمی بیعت کے لئے حاضر ہوا لیکن حضرت نے انکار فرمایا۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ حضرت کا انکار ٹھیک تھا۔ لوگ آج کل بطور فیشن بیعت ہوتے ہیں مطلق خدا کے لئے سچی بھوک کی ضرورت ہے، اس کے بغیر خدا کتنی ہی لذت یا مرض کیوں نہ ہو، کوئی فائدہ نہیں دیتی، بالکل نقصان کرتی ہے۔ اسی طرح طلب صادق کے بغیر اذکار و اشغال وغیرہ کچھ فائدہ نہیں دیتے۔

مولوی ولایت حسین صاحب کہتے ہیں کہ فراغت علم کے بعد میں نے خیال کیا کہ بیعت کرنا چاہیے۔ حضرت گنگوہی حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی دو بزرگ ذہن میں تھے۔ زیادہ عقیدت مولانا فضل الرحمن سے تھی۔ لیکن حضرت گنگوہی سے بذریعہ تحریر درخواست بیعت کی۔ تو فرمایا کہ اس وقت نہ بیعت جائزہ اور نہ نافع۔ ایک روزہ کہ جب آپ کے وقت رخصت کے لئے حاضر ہوا تو فرمایا کہ یہ سب شیطانی دھوکے ہیں کہ شعلہ علم سے باز رکھ کر ادرا و وظائف کی طرف مشغول کرتا ہے۔ تم نے حدیث میں پڑھا ہے کہ شیطان پر ہزار عابد سے ایک عالم بھاری ہے۔ جاؤ اور کتب دیر پڑھاؤ۔ اس کے بعد حضرت گنگوہی سے بیعت ہونے کا ارادہ پختہ ہو گیا اور کیسوی جو گنتی تو درخواست منور کر لی گئی اور بیعت کر لیا۔

ایک نوجوان جو شکل و صورت سے بڑے صالح نظر آتے تھے، بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا میں تمہیں قطعاً بیعت نہیں کروں گا۔ مولانا محمد یحییٰ کی سفارش بھی کام نہ آئی۔ ایک دن ڈاک میں خط آیا جو گاٹیوں سے شروع ہوا۔ ایک دفتر سے مولانا محمد یحییٰ نے پڑھے پھر ٹوک گئے۔ حضرت نے پوچھا کہ تمہیں علم بھی ہے یہ کس کا خط ہے۔ اور پھر فرمایا یہ انہی صاحب کا ہے جن کی بیعت کی سفارش تم نے کی تھی۔ سہارن پور پہنچ کر عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ایک بزرگ آئے۔ دیکھا کہ آدھ جھگٹ ہے نہ تعظیم و تکریم۔ اس لئے بہت رنجیدہ ہوئے۔ بادل غماستہ و غموات بیعت کی۔ آپ نے انکار فرمایا اور کہا۔ یہاں کیا دھڑا ہے میں مرید نہیں کروں گا۔ یہ صاحب جب تک رہے نہ کہ بات کی اور نہ کھلے۔ آخر چلے آئے اور پھر جس کسی سے ملے تو یوں کہا۔ "میاں کیا دھڑا ہے بس دوسرے ڈھول ہیں ان کا نام شوق ہے اس کا پتہ بھی نہیں۔ ہم تو امتحان لینے گئے تھے۔ جب یہ رنگ دیکھا تو چلے آئے۔ مرید ہو کر لیتے کیا؟"

ایک دن خانقاہ میں دو شخص آئے۔ حضرت سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ آپ نے دریافت فرمایا کون؟ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم آپ کے مرید ہیں۔ آپ نے بے ساختہ فرمایا۔ نہیں تم میرے مرید نہیں۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ حضرت آپ کو یاد نہیں رہا۔ مگر حضرت نے پھر وہی ارشاد فرمایا۔ انہوں نے پھر کہا۔ حضرت نے پھر کہا کہ نہیں تم میرے مرید نہیں۔ آخر دونوں صاحب حجرہ سے باہر آئے اور مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں کہنے لگے کہ مولوی صاحب یہاں کھانا بھی لے گا یا نہیں؟ مفتی صاحب اس سوال پر چونکے اور کہا کہ میںاں فکر تو یہاں ہے نہیں کہ جس کا جی چاہے آئے۔ حضرت کے جو مہمان آتے ہیں وہ کھانا بھی کھا لیتے ہیں باقی خیر صلا ہے مہمان صاف گوشتے یہ جواب سن کر کہنے لگے کہ ہم نے تو کھانے کے واسطے یہ ڈھنگ نکالا تھا مگر مولوی صاحب پہچان گئے۔

ایک قصہ اسی قسم کا پہلے گزر چکا ہے کہ ایک صاحب آئے اور بیعت کی درخواست کی۔ تو حضرت نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ڈانٹا اور کہا کہ چلے جاؤ اور اگر نہ جائیں تو اسباب اٹھا کر پھینک دو۔ حکیم محمد یوسف کو ترس آیا۔ گھر لے جا کر تشفی دی۔ اگلے دن حکیم صاحب نے قصہ کیا کہ اس کے بارے میں کچھ کہیں۔ لیکن حضرت نے ان کے کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اُسے کیوں ٹھیرا کھا ہے؟ ٹھوکر ادا اور کہہ دو کہ چلتا ہو۔ اب حکیم صاحب کیا کہتے؟ عصر کے بعد تقریب پیدا کرنا چاہی تو حضرت نے کہنے سے پہلے ہی فرمایا کہ اس کو ابھی چلتا نہیں کیا؟ حکیم صاحب نے عرض کیا حضرت آتے مہمان کو کس طرح نکالا جائے۔ آپ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا کیسی مروت؟ آخر پھر چپکے چلے آئے اور رات کو معلوم ہوا کہ وہ حکومت کا جاسوس ہے۔ اگلے دن صبح صبح ردا کیا اور حضرت کی خدمت میں آئے۔ تو حضرت مسکرائے اور آہستہ سے فرمایا۔ ”ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس کو چلتا کر دو، تم ہی نے نہ مانا۔“

ایک بار ایک طالب علم بیعت کے لئے آئے آپ نے فرمایا تحصیل علم کر دو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ طالب علم عموماً حجت کے عادی ہوتے ہیں کہنے لگے کہ حضرت فراغت کے بعد پیدا جانے کیا ہو کون مرے کون جسے؟ آپ نے فرمایا کہ میں کا کام بند نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو توفیق ہوئی تو میرے بعد دوسرے نہیں بیعت کر لیں گے۔ طالب علم نے پھر کہا ممکن ہے کہ میں ہی مرجاؤں۔ آپ نے فرمایا ”طلب میں مرجاؤ گے تو اچھا ہے۔“ جب اس پر بھی طالب علم کی تقریر ختم نہ ہوئی اور بار بار سوال ہوا کہ میرا جی چاہتا ہے مجھے تو مرید کر ہی لیجئے تو آپ کو غصہ آگیا۔ لیٹے سے اٹھ بیٹھے اور فرمایا۔ تم طالب علم ہو، اچھا بتاؤ مرید کے کیا معنی؟ طالب علم نے جواب دیا کہ کسی کام کا ارادہ کرنے والا۔ آپ نے فرمایا جی تو کہتا ہوں تمہیں ابھی مرید کے معنی بھی معلوم نہیں اور مرید ہونے آگئے۔ یہ باب افعال ہے، ہمزہ سلب کا ہے۔ مرید کے معنی ہیں مسلوب الارادہ کہ جو پیر کے وہی مان لے۔ اپنی طرف سے ارادہ ہی نہ کرے۔ اس پر طالب علم خاموش بیوٹے اور پھر نہیں کہا کہ مجھے مرید کر دو۔ آپ طالب علموں کو مرید نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت تھانوی جیسے ذکی، سلیم الفطرت اور ذہین طالب علم کو بیعت نہیں کیا۔ اکثر طلبہ کی حادث ہوتی ہے کہ سہمی اور خیال کیا کہ چلو اب بیعت سے بھی خارج ہو لیں۔ حضرت انکار فرماتے تھے۔ اس طرح کے سبب نکلوں واقعات پیش آتے۔ چند ایک مثلاً پیش کر دیئے ہیں۔

اگر کوئی مرید ہونے آتا تو اس کو استخارہ کرنے کا کہتے اور اکثر کو کئی کئی دفعہ استخارہ کرنے کا حکم دیا۔ ذی شہرہ یا پٹنہ

کچھ جس وقت آپ سے بیعت ہونا چاہتے تو آپ ادلی ان کو مالتے اور یہ فرما کر کہ مجھے کیا آتا ہے اور یہاں کیا رکھا ہے، اُن کی طلب کا پہلا امتحان لیا کرتے تھے۔ اور اگر اس پر بھی ان کی خواہش رستی تو پھر اُن کو بیعت کی غایت بتاتے کہ بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ آدمی کچھ کرے اور وہ مہینے یہاں آکر رہے۔ اگر یہ نہ کر سکے تو مرید ہونے سے کیا نفع؟ اس کے بعد بھی اگر مسائل کہتا کہ حضرت حصول برکت سلسلہ بھی بڑا نفع ہے تو آپ اس کو داخل سلسلہ فرماتے۔ لیکن اس کے برعکس اگر اُن پڑھنا دینا ہی بیعت کے لئے آتے تو فوراً بیعت کر لیتے۔ عورتوں کو بھی عموماً جلد بیعت کر لیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ عورتوں کو اگر کچھ پڑھنے کو بتایا جائے تو اس کو فوراً معمول بنا لیتی ہیں۔

بیعت کا طریقہ — بیعت ہمیشہ با وضو کرتے اور چونکہ آپ ہمیشہ با وضو رہتے تھے اس لئے بیعت بھی عموماً ہر وقت ہی کر لیتے تھے۔ کوئی خاص وقت متعین نہ تھا۔ جس وقت بھی آپ کا منشاء ہوتا، طالب کو وضو کرنے کا حکم ہوتا تو آپ نے توبہ کرادی مگر پھر بھی صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد خصوصاً عصر یا جمعہ کے بعد آپ بیعت فرمایا کرتے تھے جس وقت آپ کسی کو بیعت فرماتے تو گردن نیچے جھکا لیتے اور طالب کو مخاطب بنا کر یوں فرمایا کرتے تھے۔

”کہو ایمان لایا میں خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے نبیوں پر، اور تقدیر پر، کہ بھلا بڑا سبب خدا ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر، توبہ کی میں نے کفر سے، شرک سے، بدعت سے اور ساری معصیت سے۔ عہد کیا میں نے جھوٹ نہیں بولوں گا، پوری نہیں کروں گا، زنا نہیں کروں گا، کسی پر جھوٹا بہتان نہیں باندھوں گا، پانچ وقت کی نماز پڑھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، اگر مال ہو گا تو حج کروں گا، زکوٰۃ واجب ہوگی تو زکوٰۃ دوں گا، اگر کوئی قصور ہو جائے گا تو فوراً توبہ کروں گا۔“

بیعت کی میں نے رشید احمد کے ہاتھ پر خاندانِ حشر تیر، قادریہ، سہروردیہ میں۔“

اس کے بعد آپ ہاتھ چھوڑ دیتے اور مختصر مگر جامع نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ بیعت نام عہد کا ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے اس کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ٹوٹنے نہ پائے۔ اصل بیعت یہی ہے کہ آدمی اپنے وعدے کا پکا کرے اور حق تعالیٰ کی رضا کا طاعت رہے۔ سنت کا اتباع ہر وقت ملحوظ رکھے، اس سے قوم نہ بٹلائے۔ اس کے بعد بزرگوں نے جو طریق ذکر شغل کا تجویز کیا ہے وہ اسی کی مضبوطی کے لئے ہے۔ جس کو ہمت ہو وہ کرے اور نہ ہو سکے تو اپنی نماز، روزہ کو درست رکھے یہی سب کچھ ہے۔ آپ اپنے متوسلین سے تعارف حاصل فرماتے اور کیسا ہی اجنبی کیوں نہ ہوتا، کم سے کم اس کا نام ضرور دریافت فرما لیا کرتے تھے۔ حدیث کے اور احکام کو لے کر بعد فرماتے کہ اپنی گنجائش دیکھ لینا جتنا ہو سکے اتنا کرنا چاہیے۔ تھوڑا ہو مگر سچ ہو، نباہ بڑی چیز ہے۔ یہ بات ٹھیک نہیں کہ آج کیا اور کل چھوڑا۔ کوئی کام بھٹانے بغیر نہیں سنوڑنا، خاص کر دین کا کام اس میں تو بڑی ہنگامی کی حاجت ہے۔ پیر کی مٹھی میں کچھ نہیں دھرا ہوتا کہ مریدوں کو کھڑا دے۔ پیر کا کام تو بتا دینا ہے، کن اپنا کام ہے۔ زندہ سے جو کچھ ہو سکے کرے اور کوتاہی کی توبہ کرے کہ بشر ہر وقت خطا کار ہے۔

دیہاتی لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان سے بہت ہی ایشاشت سے گفتگو کرتے تھے اور چونکہ آپ کے ہاں کوئی رکھ رکھاؤ یا تکلف نہیں تھا لہذا دیہاتی بھی بے تکلف باتیں کرتے اور ہر طرح کے مسائل پوچھتے۔ آپ ان سے دیہا

زبان میں گفتگو فرماتے یہ نظارہ بڑا فرحت بخش ہوتا کہ مخلص اور بے ریا دیہاتی کسی بے تکلفی سے گفتگو کرتے تھے۔ کسی لوگ شاید اسے گستاخی یا معیوب سمجھتے ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اصل تمدن یہی ہے، اور یہی حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔

قبول ہدیہ — متنبین اور نیاز مندوں سے ہدیہ قبول کرنے میں آپ کا معمول مختلف تھا۔ بعض سے قبول کر لیتے اور بعض سے نہیں۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ لوگوں نے خاصی رقم پیش کیں مگر حضرت گنگوہی نے ان کے اصرار کے باوجود قبول نہیں فرمایا۔ اگر حاجت مند خدام کچھ پیش کرتے تو آپ انکار کر دیتے کہ مجھے حاجت نہیں اور تم حاجت مند ہو، اپنے صرف میں لاؤ۔ مگر جب دیکھتے کہ خادم کا دل ٹوٹتا اور روئے دیتا ہے تو قبول کر لیتے۔ بعض دفعہ کسی مخلص سے بہت تھوڑا ہدیہ بڑی بشارت و انبساط سے قبول فرمایا۔

ایک دفعہ ایک مخلص خادم مولانا محمد اسماعیل نے نذر پیش کی اور بے حد اصرار کیا اور چونکہ بہت بے تکلف تھے اس لئے کہا کہ یہ تو آپ کو لینا ہی ہوگی۔ مگر آپ نے مانا اور ہر بار یہی کہا کہ میاں مجھے ضرورت نہیں ہے۔ ایک دوسرے مخلص نے نذر گزرائی تو ان کو بھی انکار کر دیا اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا ہے کہ مجھ سے اور میرے مہانوں سے کھایا بھی نہیں جاتا میں نے کر کیا کر دل گا۔ ایک سے کہا کہ کیا نفع کہ دوسرے ردپوں میں ہلا کر رکھ لوں گا، تمہارے تو اس سے بیسیوں کام نکلیں گے۔ آخر جب ایسا اصرار بہت بڑھا تو آپ نے ردپوں پر ماتھ رکھ دیا اور فرمایا۔ لوئیں میں نے لے لئے، اب ان کو میری طرف سے اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔

متوتسلین و ممتاز خلفاء — حضرت گنگوہی کے متوتسلین میں ایسے منتخب حضرات شامل ہیں کہ ان میں سے ایک ایک فرد پر جماعت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً بعض علماء تو ایسے ہیں کہ جن کو حدیث رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم — فضل العالہ علی العابد کفضلی علی ادناکم — اور — فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد — کا مصداق ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ مثلاً حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہانپوری، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب انبلیٹی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد کبیری صاحب کاندھلوی، رحمہم اللہ اجمعین تو ایسے بالکل حضرات ہیں کہ جن کو عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں بڑے بڑے جید علماء آپ کے حلقہ آراوت میں شریک ہوئے اور پچاس ہزار کے لگ بھگ دوسرے متوتسلین ہیں جن میں امرار، روسار، سوام، غرضیکہ ہر طبقہ و جماعت کے افراد شریک ہیں۔

نواب سلطان جہاںگیر فرارواتے ریاست بھوپال حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی سے بیعت ہوا چاہتی تھیں مگر حضرت حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت گنگوہی کی طرف راجع ہوئیں اور مراسلت شروع ہوئی۔ اول تو حضرت نے ملیح طرز سے امتحان طلب دیا۔ لیکن جب بیگم صاحبہ کی طرف سے اصرار و اخلاص کا مظاہرہ ہوا، تو آپ نے تحریر فرمایا :-

”بیعت دو وجہ سے کی جاتی ہے۔ ایک تو بغرض تحصیل نسبت و حصول برکات طاعت۔ اس کے لئے ایک مدت و راز مرشد کے پاس رہنا ضروری ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زمین و دل آسکتا ہوں نہ یکم صاحب کی یہاں تشریف آوری مناسب ہے اور بدول اس کے یہ بیعت بیکار ہے۔ دوسری بیعت بغرض شرکت و تعلق بزرگان جہیں محض و فعل سلسلہ تواتر ہے اس کو اول تو بندہ کچھ مفید نہیں جانتا۔ دوسرے اس وجہ سے کہ دامت اقبالہا کو جو میرے حال پر نظر عنایت و توجہ اور التفات ہوگی، اس سے مجھے سخت ندامت ہوگی۔ نیز اس کی شہرت سے اہل حاجات بھی بندہ کو روز روز تنگ کریں گے جن میں سے کسی کی سعی و سفارش مناسب ہوگی کسی کی غیر مناسب پھر یہ کہ بیعت رخصت دامت اقبالہا کو میرے ساتھ محبت و اخلاص ہے تو یہ تعلق و اتحاد حاصل ہے بایں ہمہ اگر اصرار ہو تو دو شرط سے مجھے منظور ہے ایک یہ کہ میرے ساتھ قریبی برتاؤ میں کوئی تفاوت نہ آوے اور میرے ساتھ کسی قسم کی مروت و احسان نہ ہو۔ دوسرے اس امر کا اظہار نہ ہو۔ اگر یہ دونوں امر منظور ہوں تو میں ان کی بیعت اس امر پر قبول کرتا ہوں کہ اتباع سنت اور اجتنباب بدعت کو اپنا شعار رکھیں اور حق پرستی و عدل گستری و انصاف سے رعایا پروری میں مصروف ہوں۔ والسلام“

چنانچہ رخصت عالیہ مذکورہ نے حضرت گنگوہی کا یہ والا نامہ پڑھ کر مولوی محمد علی الدین احمد صاحب قاضی ریاست کو خط دے کر بھیجا اور آپ نے ملکہ کو بیعت کر لیا۔ اس بیعت کے آٹھ ہفتہ بعد حضرت گنگوہی کا انتقال ہو گیا اگر اس بیعت میں بھی تاخیر ہو جاتی تو ممدوح کا وہ افسوس و دلچند ہو جاتا جو ۱۲ جیلوی ۱۳۱۶ھ ہجری کو حضرت حاجی صاحب وفات پر ہوا تھا۔

تلقین و تربیت

ہیں کہ اسرائیل وقت اند اولیاء مرده را از ایشان حیات است و نما
گر تو سنگ خارہ و مرمی شوی چون بصاحب دل رسی گوہر شوی
کار پا کاں روشنی و گرمی است کار دوان خیلہ و بے شرمی است
از حدیث شیخ جمعیت رسد تفریق آرد دل اہل حسد
شیخ تورانی زہر آگہ کند با سخن ہم نور را ہمہ کند (مشرودی)

حضرت گنگوہی کو حق تعالیٰ نے جس طرح علم ظاہری میں مجتہدانہ استعداد عطا فرمائی تھی، اسی طرح تربیت باطنی میں بھی آپ کا انداز مجتہدانہ تھا یعنی آپ کی خدا داد فہم و فراست اور ذکا و مذاقت کے آثار و ثمرات شریعت و طریقت و دو علم میں بدرجہ مساوات ظاہر ہوتے تھے۔

لغت عرب میں نسبت و درجہوں کے ارتباط کا نام ہے۔ مخلوق کو خالق کے ساتھ ایک ایسا رابطہ ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے اسرار صفات ہیں اسی قدر حق تعالیٰ اور اس کے بندوں میں نسبتیں ہیں۔ مخلوق و مخلوق میں نسبت خلق اور رحیم و مرحوم میں نسبت رحمت ہے۔ علیٰ ہذا نسبت سے کوئی بھی خالی نہیں۔ اس نسبت کا سرسری علم جس کو نفس علم کہہ سکیں ہر ذی العقول کو حاصل ہے۔ ورنہ ایمان ہی نہ رہے حتیٰ کہ اس رابطہ کا علم کسی درجہ میں کفار کو بھی حاصل ہے کہ اصل فطرت ہے اگرچہ اتنی نسبت و واقفیت عند اللہ معتبر نہیں سمجھی گئی۔

صوفیہ کے نزدیک لفظ نسبت کا مفہوم یہ ہے کہ یہی نسبت قلب میں راسخ اور پیوست ہو کر موثر بن جائے اور وہ علم جو سرسری تھا یقین بن کر حضور کے درجہ میں پہنچ جائے اور جب کوئی سالک یقین کے اس درجہ میں پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو صاحب نسبت کہتے ہیں۔ اس کا حصول محض دہی ہے اگرچہ طرق و وسائل کسی اور اختیاری ہیں۔

انسانوں کی طبائع اللہ تعالیٰ نے مختلف بنائی ہیں اور طبیعت چونکہ فطری امر ہے لہذا اس کی تبدیلی تو انسان کے اختیار میں نہیں۔ نسبت معتبر پیدا ہونے پر بھی وہی رہتی ہے جو اس سے قبل تھی۔ مگر اس کے آثار و مقصدات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی تشدد پسند ہے تو صاحب نسبت بن کر بھی تشدد کا مضمون قائم رہے گا۔ البتہ اول اہل حق کے ساتھ تشدد اور سختی کا بڑا ذخہ، نسبت پیدا ہونے پر نا فرمانوں اور اہل باطل پر تشدد ظاہر ہو گا۔ مثلاً طبیعت میں لاپرواہی تھی۔ پہلے یہ لاپرواہی طاعات و فکر آخرت سے تھی، نسبت حاصل ہونے پر ایک خدا کی فکر ہو کر دنیا اور ساری مخلوق سے استغناء ہو گا مثلاً اگر کوئی کثادہ دست اور مال کو زیادہ خرچ کرنے کا عادی ہے۔ پہلے اس کی کثادہ دستی فضول خرچی اور لہو لعب پر ہو گی نسبت ملنے پر یہ خرچ آخرت کی فکر اور اللہ کی رضا میں ہو گا۔ علیٰ ہذا القیاس تمام امور طبعیہ کو قیاس فرمائیں۔ اسی مضمون کو جناب رسوا اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ:-

اشدھم فی الجاہلیۃ اشدھم فی الاسلام جو لوگ جاہلیت میں سخت ہیں اسلام میں بھی سخت ہوں گے خلاصہ یہ ہے کہ عادات دوسری رہتی ہیں مگر ان کا مصروف مکمل بدل جاتا ہے۔ عادات انسانی چونکہ متنوع ہیں اس لئے اس تنوع اور اختلاف کی وجہ سے رنگارنگ نسبتیں پیدا ہوتی ہیں اور جب کسی سالک کو اس کا رہنما شیخ مجاز طریقت بنانا ہے تو گویا مرشد اس کو اجازت دیتا ہے کہ نسبت سلسلہ یعنی اذعان و یقین جو تم کو حاصل ہے اس کے طلب کار مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو جائے گا جو طریق مناسب سمجھو، اس کو عمل میں لاؤ۔ اس اجازت کے بعد مکمل حالت شروع ہوتی ہے تو یہ مجاز طریقت اپنی طبعی عداقت و دافعتی کو کام میں لاتا ہے اور ہر مرشد و عارف اپنے فہم و استعداد و افاضہ کے موافق مریدین کی تربیت کرتا اور مخلوق کو تحصیل نسبت و توجہ الی اللہ میں مستفیض و فائز بناتا ہے۔

حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو یہ نسبت معتبرہ و جالیس بتالیس دن میں حاصل ہو گئی تھی اور یہ اُن کی اعلیٰ استعداد کی وجہ سے تھا کہ بہت جلد اس چیز کو حاصل کر لیا جس کے لئے برسوں محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اُن کو پیدا ہی اس لئے فرمایا تھا کہ وہ بندگانِ خدا کو صحیح راستہ بتائیں۔ آپ کی نسبت کا رنگ اس درجہ لطیف تھا کہ اس کا ادراک لوگوں کو دشوار تھا۔ نیابت نبوت اور منصب ارشاد و ہدایت نے آپ کو سراپا احمد اور بندہ معبود بنا دیا تھا۔ اس لئے آپ سچے طالب کو بیعت کر کے میں تامل نہ فرماتے تھے۔ مگر آپ کی طبعی غیرت اور نسبت کی لطافت چاہتی تھی کہ مرید جب تک سراپا طلب نہ بن جائے گا اور مقصود کو قابلِ قدر محبوب سمجھ کر اس کی طلب اور ٹوہ میں بے چین نہیں ہوگا اس وقت تک کامیاب و ابرار نہ بنیں ہوگا۔ آپ کی سوانح اور زندگی میں شاید ایک واقعہ بھی ایسا نہ ملے گا کہ آپ نے بغیر کسی کی درخواست اور طلب کے ذکر و شغل بتایا ہو۔ اس مضمون میں آپ کی غیرت یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ تعلیم و تلقین میں کسی درسیاتی شخص کا توسط آپ کو ناگوار گذرتا اور رسمی و سفارش کو کمرہ جانتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ کے ساتھ اُن کے داماد آئے۔ انہوں نے حضرت سہارن پوریؒ سے عرض کیا کہ مجھے بیعت کرا دیجئے چنانچہ مولانا خلیل احمدؒ نے موقع پا کر حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا کہ محمدیامین داخل سلسلہ بننا چاہتا ہے۔ حضرت قدس سرہ نے خفیف اعتراض کے ساتھ ارشاد فرمایا: خود مہیکار لائے ہو گئے؟ اس پر مولانا سہارن پوریؒ نے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس امر میں ایسی غیرت ہے کہ کبھی اشارۃً بھی کسی سے یوں کہنا گوارا نہیں کہ حضرت کی طرف رجوع کرو۔ میں تو اپنے شیخ کو آفتاب سمجھ جوتے ہوں۔ لاکھ دفعہ کسی کا بھی چاہے استاد پر حاضر ہو ورنہ جہاں چاہے مارا پھرے کسی کو مبتلا ہے پھسلانے اور اپنے شیخ سے بیعت کی طرف توجہ دلائے میں مجھے تو طبیعت عارِ آتی ہے۔ حضرت سہارن پوریؒ فرماتے تھے کہ جس وقت میں یہ عرض کر رہا تھا تو دیکھتا تھا کہ حضرت کے چہرے پر انباشت کے آثار ہیں۔ حضرت امام ربانیؒ کا اس امر پر مسرور ہونا صرف اس وجہ سے تھا کہ آپ کی نسبت لطیفہ اور طبع عبور کا مضافہ پورا ہو گیا باکہ اس وجہ سے بھی کہ آپ اپنے روحانی بیٹے کی طبیعت کو اپنی طبع کے موافق پال رہے اور نسبت سلسلہ و معتبرہ میں اپنا انداز بعد وصال بھی باقی رہنے والا کانوں سے سن رہے تھے

لے اور الحمد للہ اس نسبت کا اثر اب تک آتی ہے۔ ڈیڑھ دو سال کی بات ہے۔ میں اپنے ایک عزیز (بقیہ بر صغیر) آئندہ

و ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء۔

آپ کے اس طبعی انداز اور رنگ نسبت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ متوسلین کی تعداد بہت ہی کم ہوتی اور پھر منتفع اور نفع المومنین تو بہت ہی تحلیل تھکتے۔ مگر یہ حق کا فضل اور آپ کی کرامت ظاہر ہوتی کہ متوسلین کا شمار ہزاروں بلکہ لاکھوں تک پہنچ گیا۔ آپ کے خلفاء و درخلفاء کے متوسلین جو دراصل آپ ہی کے متوسلین ہیں، کا شمار کیا جائے تو ان کا شمار برصغیر پاک و ہند میں ایک کروڑ سے بھی زائد ہو گا۔

آپ عموماً متوسلین کو فجر و مغرب کی نماز کے بعد سبحان الله والحمد لله ولا الہ الا الله والہ اکبر تسبیحاً اور ایک تسبیح استغفار کی جس وقت فرصت ہو، اور اگر سونے کے وقت ہو تو بہتر ہے، کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ استغفار کوئی مخصوص نہ تھا۔ جو الفاظ بھی ہوں پڑھے جائیں۔ بعض کو آپ نے یہ بھی کہا کہ سونے وقت کم از کم و سونے مرتبہ پڑھا کر اور اس کے بعد یہ بھی فرمایا کہ یا اللہ میری توبہ ہے۔ اس طرح گناہ بھی کافی ہے۔ عرض جس طرح اور جن الفاظ سے توبہ استغفار کرے بہتر ہے۔ تاہم سید الاستغفار کے ساتھ آپ کو زیادہ انس تھا کہ وہ حدیث میں منقول ہے۔ استغفر الله الذی لا الہ الا هو الھی القیوم والوب الیہ۔

نیز عموماً متوسلین کو درود شریف پڑھنے کی تلقین فرماتے کہ کم از کم ستر سو مرتبہ روزانہ پڑھا جائے اور اتنا نہ ہو سکے تو ایک سو بیس میں تو کسی نہ ہونا چاہیے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان ہے۔ پھر آپ پر درود بھیجنے میں نکل ہو تو پھر پڑھی بے مروتی اور خسران کی بات ہے۔ درود شریف آپ کو ابراہیمی زیادہ پسند تھا جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد وہ الفاظ صلوة و سلام جو احادیث میں منقول ہیں۔ دوسروں کے مولفہ درود تاج و گنجی وغیرہ کو آپ عموماً پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ کو دوسرے معنی کا موہم ہونے کی وجہ سے خلاف شرع فرمادیتے تھے۔ یہ اوراد و وظائف آپ نے قریب قریب تمام متوسلین کو تعلیم فرمائے اور چونکہ متوسلین کی فراغت و مشغولیت کے حالات مختلف تھے۔ اس لئے مقدار کی بیشی و کمی ان کے حسب حال فرما دیا کرتے تھے۔ البتہ دو امر آپ تو ہر زیادہ دیتے تھے۔ ایک یہ کہ گو تھوڑا کام لیا جائے مگر نباہ کر بالا التزام کیا جائے۔ دوم یہ کہ جو وقت کسی درد کا تجویز کیا جائے، اس کی پابندی کی جائے اور یہ وقت بالیقین عموماً متوسل پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔

اوقات مختلف میں آپ اویس بن حنفہ کے بے حد پابند تھے یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دعائیں اور کلمات مختلف اوقات و کاموں کی وقت منقول ہیں ان کو آپ خود بھی نہایت پابندی سے کرتے اور اپنے متوسلین کا بھی ان کو پابندی سے کرنا پسند تھا۔ اذکار و اشغال میں آپ کسی خاص طریقہ کے پابند نہ تھے۔ طالب کی طبیعت کا رنگ و دیکھ کر اس کی تربیت فرماتے اور جو صورت اس کے لئے النفع و السب معلوم ہوتی وہ عمل میں لایا کرتے تھے۔ کسی کو پشتیہ خاندان کی اور کسی کو نقش بندیر کی اور کبھی

بقیہ صفحہ گذشتہ کو اس کی طلب پر حضرت مولانا عبد العزیز گنگوہی ثم سرگودھی جانشین حضرت اقدس ریلے پوری کی خدمت میں لے کر گیا اور عرض کیا کہ یہ توبہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ نے سختی سے پوچھا کہ کہیں تم توبہ کا کر نہیں لائے۔ (ارشاد)

کسی کے لئے دو دو خاندانوں کی مجموعی تعلیم ترکیب کی صورت سے عمل میں لاتے اور مرکب شغل کا پابند بنایا کرتے۔ آپ کا مجتہدانہ انداز کسی خاص طرز میں محدود نہ تھا۔ آپ کی حذاقت و رسائی ذہن اور فراست و خدا داد استعداد اس درجہ بڑھی ہوئی تھی، کہ طبیعت کی تشخیص میں غلطی نہ ہونے پاتی تھی۔ بہترین قصے ایسے پیش آتے کہ کسی شخص کو آپ نے پیشقدم تعلیم کے مناسب پاکر اس خاندان کی تعلیم شروع فرمائی۔ اثنائے تعلیم میں طالب کو کسی دوسرے اہل اللہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوتا تو انہوں نے یا تو اڈل ہی تصدیق فرمائی اور یا دوسری تعلیم شروع کرانے پر جوب اثر خلاف طبع دیکھا تو پہلی تعلیم پر لڑاکر یہ الفاظ فرماتے کہ تمہیں وہی تعلیم نفع دے گی جو حضرت مولانا گنگوہی نے فرمائی ہے

ایک مقصد پر دیکھ حاصل کرنے کے متعدد دان گنت طریقوں میں آپ کا طریق تربیت اس درجہ اسلم تھا کہ راہبانی و قطع اندیشہ کمزور پڑ گیا تھا۔ شوق محنتیں، چمک کشیاں، ریاضات و مجاہدات اور کثرت نوافل و عبادات کا اہتمام آپ کا تعلیم میں نظر نہیں آتا۔ آپ کی عالی نظر سالک کو ذات حق تعالیٰ شہ نہ کی طرف توجہ دلانے کی جانب زیادہ متوجہ تھی۔ جو کے طرق مختلفہ میں یہ طریق آپ نے زیادہ پسند فرمایا تھا کہ ذکر اللہ سے تمام تعلقات ماسوی اللہ مغلوب ہو جائیں اور ایسے درجہ میں کہ کوئی کسی سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے۔ آپ سالک کو دوازہ بسیج تعلیم فرماتے اور اتنا اہتمام کیا کرتے تھے کہ شب کو نہ ہو سکے تو دن کو اور اگر آج نہ پوری ہو سکیں تو کل کو قضا کی جائیں، بالآخر نہ ہو سکیں تو آہستہ آہستہ ہوں کر نہ ہو سکیں تو لیٹ کر، وضو قائم نہ رہ سکے تو بے وضو پڑھ لی جائیں۔ غرض جہاں تک ممکن ہو اور جس طرح بھی ہو سکے نہ کی جائیں۔ اس کے بعد جب سالک کو ذکر اللہ کی طرف رغبت پیدا ہو جاتی تو اسم ذات اللہ اللہ یا فنی اثبات لا الہ الا اللہ کی تعداد بڑھاتے اور ایک ہزار سے بارہ ہزار تک بلکہ چوبیس ہزار تک ذکر بالجمہر کی تعلیم فرمایا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پاس انفس ملقین فرماتے اور سانس کی محافظت بکرا اللہ کا طریق سمجھاتے تھے۔

کسی طالب کو پاس انفس کی جگہ ذکر قلبی تعلیم فرماتے اور چونکہ ذکر لطیف قلب محدود نہیں۔ اس لئے بلا تعین عدد ہر وقت اس خاص دھیان میں لگا دیتے تھے۔ اس تعلیم کی چند روزہ تعمیل پر جو کیفیت کا لبد خاکی کے اندرونی اور بیرونی اثرات ہر وقت اور نیز قلب کو حاصل ہوتی تھی وہ بیان کی حد سے باہر ہے اور نہ اس کے بیان کی کسی میں قدرت ہے اور نہ اس کے اظہار کی ضرورت۔ یہ ابتداء تھی اس جہاں جہاں آرا سے تعلق محبت کی جس کے تقا کی تمنا میں سبکدوشوں ہنگام خدا کو سختی تاج پر خاک ڈالنی سہل معلوم ہوتی اور مقدمہ تھا اس شہ ہنشاہی اطاعت کی لذت کا جس کے پیچھے پڑ کر آباد جسم کی دانی کو ہزار مائلوں نے منتہائے مرادات سمجھا کہ ان العلوک اذا دخلوا قریۃ انفسدوها وجعلوا اعزۃ اهلها اذلة

لے بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو تباہ کر ڈالتے ہیں اور وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل بناتے ہیں۔ حضرت مولانا کے جہاں اس کیت کے چپاں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہنشاہ حقیقی و مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ اس دل کی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو صاحب دل کو پھر خدا سے زیادہ محبوب اور کوئی نہیں ہوتا۔ دل کی اس آبادی کے مقیمین انسانیت کی ہر چیز حقیر و بیچ نظر آتی ہے اور لا موجود الا اللہ کا سماں نظر آتا ہے۔ (ارشاد)

پاس انفاس یا ذکر قلبی کا اثر جب آپ متوکل مساکین پر محسوس فرماتے تو مراقبہ حضور ہی و معیت تعلیم فرماتے یا جو شغل اس کے نافع خیال فرماتے وہ اس کو بتلاتے تھے۔ اس مختصر و چند روزہ تعلیم سے آثار و ثمرات جو کچھ پیدا ہوتے وہ ان کے دلوں سے پوچھتے جن پر یہ قصے گزرتے۔ مگر ان کی زبانوں پر بھی فعل لگے ہوتے ہیں اُن کو حاجت کیا کہ بیان کریں۔ ہاں اتنا ظاہر ہے کہ طاعات کے ساتھ اُنس بڑھتا اور مصیبت سے متفرق و استکار زیادہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ شرم و حیا کا مضمون پیدا ہو کر حق تعالیٰ شانہ کی نافرمانی میں چھپے اور کھلے شامل ہونے لگتا اور کوئی روکنے والا دربان بن کر قلب پر کھڑا ہو جاتا تھا کہ ماسویہ اللہ کو آنے سے روکنا تھا۔ ذکر کا لطائف میں سر بیان ہوتا اور دل و دماغ بھی کو نہیں بلکہ روئیں و زمین اور بال بال کو ایک ایسا حظ ہونے لگتا تھا جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ اخلاقِ رفیقا آہستہ آہستہ خود بخود کمزور ہو کر معدوم ہوتے جاتے اور اخلاقِ حمیدہ بیج بیج قوت پا کر راسخ اور مستحکم الاصل ہوتے جاتے تھے۔ دل کو ایک بلے کی محسوس ہوتی تھی گویا کسی شے کا متلاشی اور طلب گار ہے۔ قلب میں ایک ٹوہ اور تمنا محسوس ہوتی تاکہ خارج از فہم و ادراک ذات و راہ الودار کے بندہ بننے کی سچی آرزو ہے۔ یہاں تک کہ وہ فوراً حاصل ہو جاتا جس کو نسبت سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ حضور قائم ہو جاتا جس کو یادداشت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ نے مخلوق کے انداز و خواص جدا جدا رکھے ہیں۔ کسی درخت کا نشو و نما کھلے آفتاب کی شعاعوں کا محتاج ہے اس لئے عالم آشکارا ہونے سے اس کو مضرت نہیں اور کسی سایہ پر در درخت کی شادابی و سرسبزی اخفار و کتمان کی حاجت مند ہے کہ کھلی ہوئی دھوپ سے کھلتا اور مرجھاتا ہے۔ چونکہ قلبی داروات کتمان پسند اور ———— و اخفار و دست ہونے کے سبب اسی درجہ میں ہیں کہ اُن کو زبان سے نکال کر عالم آشکارا نہ بنایا جائے اس لئے کسی صاحب حال کی حالت بیان نہیں کر سکتا۔ مولف ناکارہ کا منصب سوانح میں اپنے احباب سے سُنی سُنی باتوں کے بیان کر دینے کا ہے مگر اس بحث میں خود کچھ آپا نہیں اور دوسروں نے کچھ سُنا یا نہیں اور اگر ادھر ادھر کچھ معلوم ہوا تو اس کے اظہار کی اجازت نہیں ملی۔ اس لئے واقعاتِ غریبہ و لطائفِ عجیبہ و ثمراتِ نادرہ و وارداتِ عجیبہ کے اظہار سے یہ عجزانِ خالی رہا۔ نگارہ عنوان کے لئے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت قدس سرہ کے دامانِ عاطفت میں پرورش پانے والے متوسلین کے قلوب پر عجیب و عجیب واردات ہوتے تھے۔ مبشراتِ نامیہ و روایاتِ صالحہ سے ان کی تسلی مُجاہ کی جاتی، اکابر سلاسل و راہنمایانِ خاندان کے فیوضات و برکات کے آثار مجاہد محسوس ہوتے۔ کہیں جوش و ولولہ اپنا رنگ دکھاتا اور کہیں تجرید و سکون اپنا کیفیت دکھانا تھا اور کسی پر گریہ و بکا کی حالت طاری ہوتی تھی ———— ایک شخص جن پر گریہ کا غلبہ تھا کہ مہبوت و متحیر مجنونانہ وار پختے اور چلتے رہتے تھے۔ عاشقانہ اشعار پڑھتے اور زار قطار بلبلا کر روتے تھے۔ گویا کسی غایتِ حد سے معصوم اور کمالِ کلفت میں مبتلا ہیں کہ ضبط ناممکن اور صبرِ محال و متمنع ہے۔ ———— ہر وقت یہ شعر پڑھتے رہتے تھے کہ:۔

کتابِ حزن تو رونے سے قضا میخواند در گوشم
شدم از خوشیش بیگانہ ز غلغم ماندے ہوشم
کوئی اس طلب میں پڑنا ہی حصولِ مراد سمجھتا اور اس تمنا میں مرجھاتا ہی زندگی اور عینِ حیات یقین کے ہوتے

برویش تانظر کردم دلی از کونین برکندم
زبستان وصال او اگر خنچه ختم خطے
دل کی چمکتی شمعوں اور شب کی سنان گھڑیوں میں اگر زبان سے کچھ نکلتا تو یہ نکلتا تھا کہ
اگر فریاد را حاصل نشد پیونہر با شیریں
بعض ایسے بھی تھے کہ حسرت و افسوس میں غمگیناں اور اشتیاق لقاء محبوب میں فنا ہونے جاتے تھے۔ با مراد
ہوتے اور اپنے کو نامراد سمجھ کر ترپیتے اور زبان حال کہتے تھے

آخو اپنے نیت بخ تر و تازہ نو تا بر چند
خار حسرت خورم و جانب خرم با بینم
کوئی کسی بھی حالت و کیفیت میں تھا لیکن مطلوبت امر محبوب اور تمنائے حصول مطلوب بصورت امر مشت
سب کے حالات میں قائم اور جملہ کیفیات میں موجود تھا۔ ہر سالک مختلف کسی حال میں مبتلا۔ اور کسی کیفیت
میں مبتلا۔ اور کسی کیفیت میں مغلوب کیوں نہ ہو، زبان حال سے اپنے آقا کے لاشریک کو مخاطب بنا کر یوں عرض
کرتا تھا کہ

تو بادشاہے من گدا ہر چہ کنی باشد روا
من بندۂ فرمان تو ہاں تا چہ فرمائی کبہم
امام ربانیؒ قدس سرہ کی مقدس و بابرکت جماعت میں ایسے نفوس بھی تھے جو آپ کی طبع کے مناسب طبع لے کر دنیا میں آئے اور
نسبت عبدیت کے رنگ سے انوس ہونے والے انداز پر ابتدائے انتہا تک قائم رہے۔ نہ ان حضرات پر کبھی کسی حال کا غلبہ ہوا
کبھی کیفیت عارضہ کا طربان۔ ایک سادہ اور عالمانہ طرز طاعت میں مشغولیت اور درس و تدریس یا تعلیم و تعلم شریعت
مصرفیت اور حضور و یادداشت قائم ہو کر نسبت حاصل ہو گئی۔ ان کی کیفیت قلبی کا ثمرہ بجز اس کے نہ تھا کہ حق تعالیٰ ان
کے احکامات و قضا و قدر کے سامنے سر تسلیم خم ہو گیا اور اپنی رضا و خواہش رضائے محبوب کے تابع ہو گئی تھے
اگر مراد تو اسے دوست نامرادی ما است
مراد خویش ازین پیش من نخواہم خواست
مطابعت و امتثال او امر میں لذت آنے لگی اور بندہ نواز آقا کی بندگی سے رغبت ہو کر دل کا تقاضا یوں ہوا کہ
از من گمان مبر کہ دل از دوست برکنم
اول کسے کہ جاں دہد از بہر تو منم
کمز بشنوی کہ قافلے مرد در غمت

آپ کے بعض متوسلین ایسے بھی تھے جن پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوتی اور مسجد کے فرش پر گھٹنوں لٹا کر تے
مستانہ و ارجحیں مارا کرتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ اپنے بھائیوں کی رقت و بے تابی کا عالم دیکھ کر حیران ہوتے اور سنا
کرتے تھے کہ یہ حالت کس طرح پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض اپنا اپنا حال کا انداز تھا۔ ایک حضرت امام ربانیؒ تھے کہ ان مختلف
الاحوال سب ذکرین و شاعریں کی حالت دیکھتے اور ان کی نگہانی کرتے تھے اور ہر ایک کے حسب حال معاملہ کرتے تھے کہ ان
دلی تمنا ہوئی کہ اگر کسی پر کوئی کیفیت وارد ہو تو اس کا اخصا کیا جائے اور شکر گداری کی جائے۔ ایک مرتبہ ایک شخص
قلب پر ایک کیفیت طاری ہوئی اور انہوں نے ایک گونہ قفاخر کے ساتھ اس کا اظہار و غیر دل پر شروع کر دیا۔ لوگوں

اس کا چرچا ہونا تھا کہ وہ کیفیت نازل ہو گئی۔ نعمت کا زوال ایسا نہیں کہ سالک کا قلب اس کا ادراک نہ کرے اور نہ تسلیم نہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت کی خدمت میں اپنا حال لکھ بھیجا۔ آپ نے جواب تحریر فرمایا:-

”لطیفہ غیبی مہانیت نازک مزاج کہ باطنی بے التفاتی رو میگرداند“

آپ اپنے متوسلین کو حالات و کیفیات کی طرف متوجہ نہ ہونے دیتے کہ یہ امر مقصود نہیں اصل مقصود حق تعالیٰ شانہ کی اطاعت اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا تھا کہ آپ کے متوسلین کیفیت حاصل پر بس نہیں کرتے تھے۔ جوں جوں وارذات پیش آتے ان کو خیر مقصود سمجھ کر اپنے کام میں لگے رہتے اور آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہی سادگی کا انداز یعنی افغان و یقین کے ساتھ بطور و خجست اتباع شریعت کا مضمون حاصل ہو جاتا تھا۔ آپ کے بعض متوسلین پر ابتدائی حالت میں وہ عجیب کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں کہ دور تک جگہ بہت قریح سمجھ کر مشہور ہوتیں مگر آپ کے یہاں کوئی کمال کا درجہ نہیں سمجھا گیا۔ اور آپ نے جب فرمایا یہی فرمایا، کہ توجہ دکر دو۔

سالک کو آپ جو کچھ تعلیم ارشاد فرمایا کرتے تھے اس کا خلاصہ صرف اس قدر تھا کہ حق تعالیٰ کی سچی محبت مسودا قلب میں راسخ ہو جائے۔ جس کا ثمرہ ہر حال میں اتباع شرع اور قدم قدم پر محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع و اقتدار ہے۔ پس اگر لوگ کہا جائے کہ آپ کی تعلیم نائب رسول ہونے کی وجہ سے تیار ہے اسی امر کی تبلیغ و ترویج تھی جس کو آیت مقدسہ میں بیان کیا گیا ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِيْ أَعْبُدْهُ ثُمَّ يَعْبُدْكُمْ اللَّهُ. (آیت ۵۰)

ایک دفعہ آپ کے کسی متوسل نے شکایت کی کہ ذکر شغل کرتے مدت گزر گئی مگر کچھ اثر بھی معلوم نہیں ہوتا۔ آپ نے یہ شعر پڑھا:-

کارکن کار بگزار از گفتار

کاندریں راہ کار باید کار

آپ کے متوسلین میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ آپ ہر ایک کو اس کی طبیعت کے موافق ذکر و شغل بتاتے تھے، لیکن ہر تہا تہا تجرد اور تہائی کی زندگی کو پسند کرنے لگتے تو ان کو اس سے روکتے۔ بعض متوکلانہ زندگی گزارنے کی طرف راغب ہوتے تو فرماتے کہ دیکھ لو اس کا تحمل بھی ہے یا نہیں۔ غرضیکہ ہر پہلو میں سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملحوظ رکھتے اور اسی کے مطابق تعلیم دیتے۔ اگر کسی متوسل کے متعلق یہ چلتا کہ عبادہ شریعت یا سنت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر بدعت کی طرف مائل ہے تو سختی فرماتے۔ خلاصہ یہ کہ آپ کی تعلیم و تربیت کا منشا صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنے آقا و مولا وحدۃ لاشریکہ کا ایسا بندہ بیچارہ بن جائے کہ اس کی رضا ہر مرغوب سے مرغوب شے پر فائق و غالب ہو اور اس کی اطاعت ہر محبوب سے محبوب کے انتہائے سے بڑھ کر ہو۔ بندہ طفل نوزائیدہ ہو اور دست قدرت اس کی دایہ، یا اس طرح کر جیسے مردہ کا بدن نہلانے والے کے ماتحت ہو۔ میں کہ جس طرح مرضی ہوتا مجلاتا اور سر کا تا ہے مسلمان بالکل اسی طرح دست قدرت میں اپنے آپ کو دیدے پٹھانی پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کی لاتی ہوئی شریعت سرتاپا اعضاء و جوارح کے حرکات و سکنات ہوں اور وقت و ولادت سے لحد کی آغوش میں پہنچنے تک جو زمانہ حیات کہلاتا ہے نقشہ و مجسم تصویر بن جاتے۔ اس عالیشان شاہی محل و مکان کا جس کی تعمیر فخر عالم رس اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس سالہ زمانہ نبوت میں فرمائی ہے نہ اپنے ارادہ سے سکون ہو نہ اپنے قصد سے حرکت۔ اگر سو مسخوڑ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کی تعمیل میں سوئے، اگر جاگے تو امتثال ارشادِ پیغمبر میں جاگے۔ اسی کا نام محبت ہے اور اسی کا نام عشق اور یہی سلوک کہلاتا ہے اور یہی طریقت ہے

عاشقی چھست بگو بندۂ جانان بوند
پا بدستے دگرے، دست بدستے دگرے
اگر مسلمان کو دعویٰ ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب رکھتا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو معبود مانتا ہے تو پھر اس زندگی کی ہر برکت و سکون سے اس دعوے کی دلیل لانا چاہیے۔
زندگانی نتوان گفت حیات کہ مرا
زندہ آنست کہ بادوست و حبالے وارو

تزکیہ و تصرفات

انسانی فطرت ہے کہ وہ نرم نشیں سے متاثر ہوتی یا ہرمن نشیں کو متاثر کرتی ہے اور دنیا میں بعض لوگ مشقیں اور مجاہدات کے لوگوں پر اثر ڈالتے ہیں اور اس کا انکار مشکل ہے۔ مسمریزم وغیرہ قسم کی چیزیں اسی قبیل سے ہیں اور جب کوئی مسلمان تقوا باخلاق اللہ کے امر کے تحت اپنے باطن کو صاف و پاکیزہ بناتا ہے تو اس کی روحانی قوت اس قدر مؤثر ہو جاتی ہے کہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی چیز کو بیان کیا ہے ج
دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
مسمریزم وغیرہ کرنے والے تو وقتی طور پر افراد کو متاثر کرتے ہیں مگر صاف باطن لوگوں کی نگاہ جب اٹھتی ہے تو اس سے زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اکابر صوفیائے کرام مثلاً حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور مخدوم علی ہجویریؒ جیسے بزرگوں نے اپنی اسی باطنی قوت اور اخلاص کی وجہ سے لاکھوں لوگوں کی کایا پلٹ دی کہ ع
نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اس سچو دھویں صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ بھی ایسے ہی پاک و صاف باطن لوگوں میں سے تھے کہ جن کی نظر کہیں اڑھتی۔ آپ کی صحبت کی تاثیر تھی کہ تاریک و زنگ آلود قلوب لئے سبب لوگ آپ کی مجلس میں پہنچتے تھے تو امام ربانیؒ کے منور قلب کی شاعیں ان کو صیقل کر دیتی تھیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے ایک فرضِ یسئلوا علیہم ایتہ کے بعد ”یٰٰکَیْہِمْ“ بھی ہے۔ امام ربانیؒ کو چونکہ حق تعالیٰ نے اس پر آشوبان میں تعلیم احکاماتِ شریعیہ اور تزکیہ طریقیہ قلوب کے لئے نائب رسول بنا کر بھیجا تھا۔ اس لئے آپ کی قوتِ قدسیہ کا کچھنا کہ کس حد پر تھی۔ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تیرو سو برس بعد پیدا ہونے والی امت جس کو زمانہ کی رسومات نے غلام فرائض کی جگہ اپنا پابند اور غلام بنا لیا ہو، وہ جس درجہ بھی ادراک سے بلے بہرہ ہو ظاہر ہے خصوصاً جبکہ خواہشات میں

بدعات کو عبادات بنا کر دلوں میں پلا دیا اور دنیا دار مولوں نے مقدس اہل اللہ کے مجمع کو دہائی کے خطاب سے مشہور کر کے اپنی صورت دیکھنے سے مخلوق کو بیزار اور ان کے پاس بیٹھنے سے متفرک کر دیا ہو، ایسی حالت میں ان کے نفرت کھائے دلوں کا کھینچ اور ان سے بدعات چھڑا کر سنتوں کا والد و شہید بنا دینا بڑے قوی القلب شیخ کا کام ہے۔

سیحکم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ آپؐ کی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی پریشانی یا وسوسہ شریت کیوں نہ ہو، جو نہی آپؐ کی صحبت میں بیٹھے اور قلب میں ایک خاص قسم کا سکینہ اور جمعیت حاصل ہوتی جس سے سب ریاضات، رفق ہو گئیں۔ اور قریب قریب آپؐ کے کل مریدوں میں جو عقائد کی دستی، دین کی کجنگی خصوصاً حب فی اللہ و بغض اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ ساری برکت آپؐ کی صحبت کی ہے اور ان کمالات کی شہادت میں بے شمار واقعات موجود ہیں۔ اس سے آگے خود حضرت تھانویؒ نے اپنے متعلق دو شہادتیں فراہم کی ہیں کہ کس طرح حضرت گنگوہیؒ نے علی (حضرت تھانویؒ کی) دو باتوں میں اصلاح کی۔ ایک علم ظاہر میں اور دوسری باطن میں۔ اور ہجران کی تفصیل بیان ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے تذکرۃ الرشید میں مندرج وہ مراسلت مطالعہ کی جائے جو ان دونوں بزرگوں کے درمیان ہوئی۔ طرح دوسرے واقعات کے لئے بھی تذکرۃ الرشید کی طرف مراجعت کی جائے۔

معنوی کمالات

ظاہر پرستوں کے نزدیک کمالات کسی کے ولی ہونے کی علامات ہیں۔ حالانکہ سب سے بڑی کرامت اتباع سنت اور تمامت علی الدین ہے۔ کرامت تو مقصود ہی نہیں ہے، اصل مقصود تو اتباع سنت ہے۔ جو اس بارے میں جتنا زیادہ مستقیم ہوگا وہ اتنا بڑا صاحب کمال اور مقرب الہی ہوگا۔ انسان افراط و تفریط کے درمیان احتیاط سے چلنے والا ہو تو وہ صاحب کمال کہلائے گا۔ حضرت گنگوہیؒ ایسے ہی معتدل المزاج، میاں رو بزرگ تھے اور اس پر ان کی اس قدر استقامت و تقال تھا کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔

حضرت تھانویؒ حج کے لئے تیار ہوئے اور خدمت میں حاضر ہو کر رخصت و اجازت چاہی۔ اس کے بعد بھی روٹا گئی کے دن بذریعہ تحریر پھر حضرت کو اطلاع دی کہ بندہ آج روانہ ہو رہا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے جو تحریر بھیجی، میں درج تھا کہ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر مجھے بھی یاد رکھنا۔ اس کے بعد یہ شعر مشہور تھا

چو با حبیب نشینی و بادہ پیانی بسید آر محبان بادہ پیارا

یہ اتباع ہے اس مضمون کا کہ جب سیدنا عمرؓ نے بارگاہ رسالت سے عمر کی اجازت چاہی تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ بھائی وہاں حاضر ہو تو دعا کے اندر ہمیں مت بھول جانا۔

مولوی حکیم اسماعیل گنگوہیؒ نے آپؐ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ بے تکلف ہونے کی وجہ سے حضرت کے متفرق ہونے کا یہ جزا ہے۔ ظاہر کرنے کے باوجود باصرار نہ کیا۔ جب ختم کر چکے تو آپؐ نے ٹھکے اور زبان سے خاک اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میرے کپڑے خواب ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ منہ پر مدح کر کے والوں کی یہی جزا ہے۔ میں کیا کروں۔ جناب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

دوسرے کے پاس نہیں ہے

امام ربانی کے پاس مقام ابراہیم کا ایک ٹکڑا تھا۔ خدام کی خواہش پر چند فوجی سے لکھاتے میں ڈال کر نکال لیتے اور ربانی کو جمع میں تقسیم کر دیتے۔ اس انمول تبرک سے آپ کو اس درجہ بھگی کہ کبھی کسی معتبر سے معتبر خدام کے بھی حوالہ نہیں فرمایا۔ جس وقت جمع کو زیارت کرتا، مسرت سے باغ باغ ہو جاتے بمقام دَامًا بِمُحَمَّدٍ وَبِآلِهِ فَحَدَّثَ آپ یہ الفاظ بار بار فرماتے کہ مجھے حق تعالیٰ نے وہ شے عطا فرمائی ہے کہ دوسرے کے پاس نہیں ہے۔ آپ کے پاس بیت اللہ زاد اللہ شرفیہ کی مقدس پوکھٹ کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس کی محبت و قدر دانی بھی اس کی سختی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

اتنے واسطوں سے میرا رشتہ دار ہے | آپ نے اپنے کنبہ و اقارب کے بہت سے رائے بیوہ عورتوں اور یتیموں کو اپنے ذمہ لے رکھی تھی اور اس سلسلے میں آپ کو اتنا شغف تھا، کہ دُور رشتہ داروں کا آپ پر تڑکتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ فلاں ابن فلاں اتنے واسطوں سے میرا رشتہ دار ہے اور پھر ان رشتہ داروں کے غریب و مساکین افراد کا خیال رکھتے اور جتنی گنجائش ہوتی امداد کرتے۔

دُنیا بھری پڑی ہے | انگسار اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی تقریر سے اپنی خوبی کا کچھ بھی اڑا ظاہر ہوتا تو فوراً اس کے خرقہ کا تذکرہ فرما رہے تھے کہ یہ سچا بر سرِ حضرت کے بدن پر رہا ہے۔ اسی ضمن میں فرمایا۔ اس حجرہ میں حضرت شیخ جلال تھا میری رہا کرتے تھے، شیخ میں دیوارِ حائل تھی۔ سو کہاں نہ فقر کا یہ حال تھا اور اب اس حجرہ میں دُنیا بھری پڑی ہے۔ جن ایام میں غالباً سرحد پر جنگ واقع ہوئی۔ ایک دن عشاء کی نماز کے بعد حضرت علیؑ نے

تمہارا منہ بھی نظر نہیں آتا | ادرھے استراحت فرما رہے تھے۔ چند خدام پاؤں دبا رہے تھے۔ ایک طالب علم نے بے بسی سے سوال کیا کہ حضرت اس لڑائی کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ حضرت نے ترشی سے جواب دیا۔ میں کیا جانوں۔ مجھے تو اس لڑائی میں سے تمہارا منہ بھی نظر نہیں آتا۔

جمع کر کے کیا کرول گا | ایک دفعہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان نے اپنے سفیر تجارت متعینہ رشاد کے ہاتھ

کے ساتھ ملے کر کے پہنچے تو حضرت امام ربانیؑ نے نمد قبول نہیں فرمائی اور نہ سفیر سلطنت کو خانقاہ میں ٹھہرنے کی اجازت دی ہاں فرمان پڑھوا کر سُنا۔ اس میں لکھا تھا کہ بیچ ہزار روپیہ ہندوگان حالی میں پیش کرتا ہوں۔ آئندہ ہر سال اتنی رقم پیش ہوتی رہے گی۔ اس کو قبول فرمائیں اور معاوضہ اس کا صرف دے جائے۔ سفیر نے جب الگے الگے دن واپسی کا ذکر کیا اور جتنی سلام کو حاضر ہوئے تو درخواست کی کہ اب کبھی یقین نہ کریں گے کہ میں لنگوہ پہنچاؤں اور حضرت نے نذر واپس فرمایا۔ کو ضرور خیال ہو گا کہ گھر بیٹھے بات بنادی۔ اس سلسلے میں میرے حاضر ہونے کی سبب عطا فرامیں کہ باگہ سلطانی میں پیش کردہ نوکری کے ساتھ میری جان بھی جاتی رہے گی۔ چنانچہ آپ نے زبانِ فارسی جواب تحریر کر کر اس کے حوالہ کیا۔ اس

ت یہ تھی کہ —۔ بحیثیت اسلام مجھے آپ سے تعلق ہے اور میرا دل ہمیشہ آپ کو دعا دیتا ہے خصوصاً منوجہ حالت میں اسلام اور قدر منزلت کی خبر جس سُن کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ حق تعالیٰ برکت عطا فرماوے گا۔ آپ کی مذمت بھی مگر چونکہ بڑھا ہو گیا ہوں اور حق تعالیٰ نے مجھے بہتیرا کچھ دے رکھا ہے، جمع کر کے کیا کروں گا۔ اس لئے واپس کرتا ہوں کسی دوسرے بیخیر میں خرچ کر دیا جائے اور مجھے بہر حال دعا گو سمجھتے۔“

ایک مرتبہ مولانا عبداللہ بن حنفیہ حاضر خدمت تھے۔ ان کے دل میں دوسرے گدرا کر بزرگوں کے حالات سے اور دھوڑے کے میں تنگ دتی اور زہد و فقر دیکھا ہے مگر حضرت کے جسم پر جو لباس ہے، گو مباح ہے مگر بیشک تباہ ہے۔ حضرت اس وقت کسی اور سے باتیں کر رہے تھے۔ دفعتاً منوجہ ہو کر فرمایا کہ — ”موصوفہ ہوا مجھے کپڑے بنانے لگائی نہیں ہوتا۔ لوگ خود بنانا کھینچ دیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ تو ہی پہننا۔ ان کی خاطر سے پہنتا ہوں۔ پچنانچہ وقت بدن پر جتنے کپڑے ہیں، سب دوسروں کے ہیں اور متعار ہیں۔ چند روز بعد اپنے اپنے کپڑے آکر لے جائیں گے۔ جب خود بنانا تھا تو گاڑے اور دھوڑے ہی کے بنانا تھا۔“ یہ فرما کر پھر نیلے شخص کی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ حاضرین تقریباً محل اور جملہ حاضرین معلوم ہوئی۔ مگر وہ مولانا جن کے خطہٴ نفس کا جواب تھا۔ ان کی پیشانی پر ہدایت سے پسینہ

پڑ بھی پیر کو ترا لیتا ہے بحیثیت تبلیغ جو خدمت عالیہ آپ کے سپرد تھی یعنی ہدایت و راہبری، اس کو آپ انجام دیتے بیعت کرتے۔ ذکر و شغل بتلاتے۔ نفس کے قبائح و مفاسد بیان کرتے اور معالجہ فرماتے تھے۔ ہمہ اپنے آپ کو متواضع، منکسر المزاج اور کمتر رکھتے تھے۔ شاید آپ پر کبھی دوسرے بھی نہ گذرا ہو کہ میں پیر ہوں یہ مرید، عالم ہوں اور یہ جاہل۔ کبھی کسی نے نہ شائبہ ہو گا کہ آپ نے اپنے خدام کو خادم، متوسل یا منتسب کے نام سے یاد کیا ہو۔ ہمیشہ نے لوگوں سے تعبیر کرتے، اور دعائیں یاد رکھنے کی ضرورت اپنے لئے طالبین سے بھی زیادہ ظاہر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں جس بیعت ہوئے کے لئے حاضر آستانہ ہوئے۔ آپ نے ان کو بیعت فرمایا اور یوں ارشاد فرمایا کہ ”تم میرے لئے دعا کرو تمہارے لئے دعا کروں۔ بعضا مرید بھی پیر کو ترا لیتا ہے۔“ یہ عمل ہے اس حدیث پر جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رساری امت کو عام حکم فرمایا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی سے دعا کرانی چاہیے کہ اپنے نفس کی بر نسبت دوسرے کی دعا و قبول ہوتی ہے۔“ آپ حقیقت میں اپنے آپ کو خدام بلکہ عام مسلمانوں کی دعا کا جتنا محتاج سمجھتے تھے شاید عام خدام اپنے آپ کی دعا کا اتنا محتاج نہ سمجھتے ہوں۔

انسانیت کے فروغی نزاع اور عصبیت و جہالت کے اختلاف سے آپ کو غایت و جہل نفرت رہی۔ جہالت کے مناظرے اور مباحثے میں آپ بنفس نفیس تو کیا دلچسپی لیتے، دوسروں کو اس میں مضمون میں مشغول پاتے تو تعجب فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ”منواد“ اور ”دواد“ کا جھگڑا آپ کے سامنے پیش ہوا تو اس طرح آپ تحریر فرمایا کہ ط۔ ص س ث۔ ز و وغیرہ حروف کو ایک دوسرے کی جگہ رکھتے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں کرتا۔ حق اختلاف ہوا کہ کس طرح ادا کیا جائے۔ عجیب بات ہے۔ یہ حرف نہ مشابہ وال ہے نہ غلط ہے۔ اس کو ایسا پڑھے کہ سب

سے الگ رہے۔ یہ جھگڑا انسانیّت کا ہے۔ ایسی باتوں کے پیچھے پڑنا دین کی بات نہیں۔ یہ سلسلہ علماء سے پوچھنے کا نہیں ہے۔ اگر تحقیق منظور ہو تو قاریوں سے دریافت کرو۔

بدعات سے اس درجہ احتراز تھا کہ آپ نے وہ امور مباحہ بھی ترک فرما دیئے تھے جن سے دین اسلام پر اکٹفا کرتا ہوں | والوں کو بدعت کی جانب میلان کا واہمہ پیدا ہوا یا صورتہ استناد و استدلال ہو سکے۔ ایک

خود ہی ارشاد فرمایا کہ حضرت شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے مدار پر اول بار حاضر ہوا اور بیٹھا ہوں۔ مگر مبتدی علم کے سہ سے اس کو ترک کر دیا۔ اب ماضی کے لئے بہت طبیعت پہلے قرار ہوتی ہے مگر اس خیال سے نہیں جانتا کہ یہ نرادر کے اب پھر ادھر کو جھٹکتے آئے اور بدعات کی طرف مائل ہو گئے۔ اس اندیشہ کے سبب یہیں سے اسلام پر اکٹفا کرتا ہوں اور اوروں کا قصد بھی نہیں کرتا۔

جن دنوں حضرت جناب مولانا کریم بخش صاحب پنجابی کی خدمت میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک صرف ناک کاٹنی تھی | طالب علم دہلی آیا جس کو دعویٰ تھا کہ مجھے یہاں کوئی عالم پڑھا نہیں سکتا۔ یہ شخص بکافی پڑھتا

مولانا کریم بخش صاحب کو طالب علم کا یہ دعویٰ پسند نہ آیا۔ سبق ہو رہا تھا۔ حضرت لکھنؤی شریک جماعت تھے۔ سبق کے بعد نے آپ سے کہا کہ یہ لو کافی ہے اس پٹھان کو سبق پڑھا آؤ۔ یاد رکھنا اگر نیچا دیکھ کر آئے تو سر گناہ کر دوں گا۔ غولیا لکھنؤ بغل میں لے کر سیر سے اس طالب علم کے پاس پہنچے۔ باتوں باتوں میں کتاب کھولی اور بحث شروع کر دی۔ یہاں تک کہ پٹھان رہ گیا اور آخر کار یہ لفظ کہے کہ ہمیں پوری کتاب دہراؤ۔ اس وقت حضرت نے کتاب بند فرمادی اور کہا پٹھانا منظور رہے صرف ناک کاٹنی تھی کہ دہلی میں جن علماء کے متعلق یہ خیال ہو کہ پڑھا نہ سکیں گے۔ ان کے ادنیٰ شاگرد نے نسخہ کر دیا۔ یہ کہہ کر استاد کے پاس چلے آئے اور عرض کیا کہ حضرت پڑھا آیا اور مات دے آئے۔

آپ کی دکاوت اور خدا داد استعداد بجا سے خود معنوی کمال تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ باس طرہ | سخیل میں اپنے آپ کو آپ اپنے آپ کو ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم کے برابر بھی نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ تدریس کے

جب کہ آپ کی حسن تقریر پر بعض طلبہ نے آپ کی کچھ تعریف کی تو بے ساختہ خلاف عادت آپ کی زبان سے قسم نکلی اور یوں ارشاد فرمایا کہ بخدا میں اپنے آپ کو تم میں سے ادنیٰ طالب علم کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ یہ ہے وہ کمال جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

ایک دفعہ صحن مسجد میں طلبہ کو درس دے رہے تھے کہ بادش ہوئے لگی۔ طلبہ کتابیں | میں نے سعادت حاصل کی ہے۔ تپائیاں لے کر اندر بھاگے۔ حضرت مولانا نے اپنی چادر بچھائی اور تمام طالب علموں کے

جو تے اٹھا کر اس میں ڈال کر ان کے پیچھے پیچھے چل دیتے۔ طلبہ نے جب یہ صورت دیکھی تو وہ پریشان ہوئے اور بعض حضرت یہ کیا۔ فرمایا کہ "حدیث میں آتا ہے کہ طلبہ کے لئے سچو بیٹیاں اپنے بلوں میں اور چھیلیاں پانی میں دھاکتی ہیں اور ان کے پاؤں کے نیچے چڑھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خدمت کر کے میں نے سعادت حاصل کی ہے۔ آپ مجھے اس سعادت کیوں محروم کرتے ہیں؟"

احضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم کا سردار تمہارے پاس آئے تو اس کا اکرام کیا کرو | اگر امیر قوم

کے امتثال امر میں حضرت گنگوہی کی خدمت میں اگر مخالف جماعت کا کوئی بڑا شخص آتا تو آپ اس کے اکرام میں مطلق پہلو تہی نہ راتے تھے۔ مگر اس کے باوجود متنازع فیہ امر میں براہِ سنت یا زنی ممکن نہ تھی کہ ذرہ برابر بھی ظاہر ہو۔ اور بات بھی یہی ہے کہ اسی کا اکرام جب امتثال امر پر غیر میں کیا جاتا ہے تو اکرام پر غیر پر شمشیر کی طرح ہو سکتی ہے۔ ایک بار مولوی عبد السمیع صاحب (حضرت کے کٹر مخالف اور غالی بدعتی) کسی تقریب میں گنگوہی آئے اور حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تو آپ ہایتِ خلق سے ملے اور فرمایا کہ آج کسی وقت کا کھانا میرے یہاں کھائیے حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولوی صاحب "انوارِ سامعہ" حضرت کے خلاف لکھ چکے تھے اور ادھر سے تصدیق حضرت اس کا جواب شائع ہو چکا تھا۔ قند کے دانے اور بدعات کی دھوپ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس امر کا مسلمان کو مامور بنایا ہے وہ آپ پورا فرما چکے تھے اور اب درجہ بنا کر ام ایف اور اکرام امر قوم کا تھا۔ سو اس کو آپ نے پورا فرمایا۔ مولوی صاحب نے دعوت قبول کی اور حضرت کے مہمان بن کر کھانا کھایا۔ حضرت نے ایک مکتوب میں اس دعوت کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ میرا خیال تھا کہ بدعات کا زبانی تذکرہ ہوگا۔ مگر مہمان نے اشارہ بھی کوئی لفظ نہیں کیا۔ سو میزبان کو کیا لازم تھا کہ یہ ذکر نکال کر مناظرہ کرے۔

جیسا کہ گذر حضرت امام ربانیؒ سنت کے فروغ اور بدعت کی رد میں بہت کوشاں رہتے تھے۔ یہی وجہ کہ مبتدعین کی نگاہ میں آج تک حضرت موردِ عتاب ہیں۔ لیکن حضرت کو اپنے زمانے میں ان چیزوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و محبت صحیحہ کے خلاف آپ کوئی بات نہ دیکھ سکتے تھے اور دشمن سکتے تھے اور آپ اس معاملہ میں اتنے سخت تھے کہ بعض مباح چیزوں کو ترک کر دیا تھا کہ مریدین اور طالبین اسی سے آگے راہ کو وسیع کر لیتے اور بدعات کا باب کھول لیتے ہیں۔ اکثر بدعات کا رواج اسی طرح ہوا ہے۔ آپ کے نزدیک اہل اتباع و اطاعت و اعتقاد اور اس کے رسول کی بھٹی۔ اس کے بعد اگر دنیا میں کسی کا ادب، فرمانبرداری یا اطاعت ہے تو وہ اسی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ مثلاً بڑے بھائی، والدین، استاد، شیخ سب اپنے بڑے اور مطاع ہیں مگر ان سب کے مراتب علیحدہ علیحدہ ہیں مخلوق کے مراتب مختلف ہیں ماتحت کی وہ فرمانبرداری زبیا نہیں جس سے مافوق کی نافرمانی پیدا ہو۔ مثلاً بڑے بھائی کا وہ کہتا نہیں مانا جاتا جس میں والدین کی نافرمانی ہو۔ اسی طرح والدین یا استاد کے اس حکم کی تعمیل نہیں ہے جس میں روحانی باپ یا شیخ طریقت کی نافرمانی لازم آئے۔ یہاں تک کہ پر کے بھی اس حکم کی تعمیل جائز نہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ماتحت سے چھڑا دے۔ اسی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات و خصوصیات کا حامل سمجھنا جو فرشتہ خدا سے تعالیٰ کی ذات سے مخصوص ہیں، غلط ہے اور شرک ہے۔ یہی کمال جس کو حفظ مراتب کہا جاتا ہے، تمام معنی کے اس بات کی اصل ہے کہ کمال کا تو کیا ذکر ان کے نزدیک تو اس کمال کا نام کفر ہے، بہت سے خواص بھی اس کا پورا سختی ادا نہیں کرتے۔ جو آدمی جتنا بڑا ہے اس کا اس باب میں اتنا ہی بڑا امتحان ہوتا ہے کہ اگر شیخ کے کسی قول و فعل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے کچھ فرق نظر آتا ہو تو شیخ طریقت کے عمل اور سنت نبویہ کے اتباع میں ایک کی دوسرے پر ترجیح اور بصیرت و محافظتِ ادب کے ساتھ حفظِ مراتب میں کمی نہ آئے پاتے۔ یہ چیز صرف کالمیں میں پائی جاتی ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے حضرت گنگوہیؒ کا بعض فردعی مسائل میں کچھ اختلاف ہوا۔ حضرت حاجی صاحب

میلاد قیام وغیرہ میں کچھ توسع رکھتے تھے اور حضرت گنگوہیؒ اس میں سخت تھے۔ لوگوں نے اس پر یہ افواہ اڑا دی کہ حاجی صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کی بیعت شیخ کر دی ہے۔ اصل چیز یہ تھی کہ حضرت حاجی صاحب کو وہ تشدد پسند نہ تھا جس کو امام ربانیؒ نے اصلاح خلق و احیاء سنت کی خاطر و انتوں سے مضبوط پکڑ رکھا تھا۔

اس تصور سے شیخ و مرید یا صفا کے اختلاف کو معاندین نے بہت ہوا دی اور یہاں تک خیر مشہور کر دی، کہ حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہیؒ کی بیعت شیخ کر دی۔ حالانکہ جابین کا حال یہ تھا کہ اور تحقیق و ادب میں علی حضرت حاجی صاحب کی جانب سے ذرہ برابر تفاوت پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر یہاں سے خط جانے میں توقف ہوتا اور خیریت معلوم ہونے میں روز کی دیر ہو جاتی تو حضرت حاجی صاحب بے تاب و بے قرار ہو جاتے اور خیریت طلب کرنے کے لئے باہر بار خط لکھتے تھے اگر علی حضرت کا دلا نامہ بغیر انتظار کے آجاتا تو حضرت امام ربانیؒ خوشی کے مارے پھولے نہ سہاتے تھے اور احباب کو بار بار مژدہ سنایا کرتے تھے کہ ہمارے حضرت کی عافیت مزاج بے موسم معلوم ہو گئی۔ اور بدگوئیاں جب حد سے گذر گئیں اور متوجہ افواہیں چار طرف پھیلیں تو حضرت امام ربانیؒ نے عرض لکھا اور دریافت کیا کہ ان باتوں کی اصل کیا ہے؟ علی حضرت کی طرف سے طویل والا نامہ آیا تھا اس کو مختصراً ہدیہ نظر میں کیا جاتا ہے۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ از فقیر امداد اللہ علیہ بحمدت فیض رحمت جامع شریعت و طریقت مولانا مولوی رشید احمد صاحب محدث گنگوہی متبع اللہ بطول حیاتہ و دتر عداۃہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“ مکتوب برکت اسلوب مورخہ چہار دہم رمضان شریف بدست مولوی ممتاز علی صاحب و دو سرور دلایا۔ ممنون و مسرور ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بایں عنایت و محبت کرمات و ارین سے محفوظ رکھ کر کوئین میں درجبات عالیات قرب و رضا عطا فرمائے۔ مولانا آپ کی تحریر باعث الشرح قلب و موجب جمعیت خاطر فقیر ہے اس لئے آرزو ہے کہ ہمیشہ اپنی خیر و عافیت و حالات ظاہر و باطن سے مسرور و مسہت فرماتے رہو۔

آپ کے اس خط کے ہر لفظ اور ہر فقرہ سے محب کیفیت و شگفتگی پیدا ہوتی ہے اے وقت تو خوش کرو وقت یا خوش کر دی۔ مولانا! اھیار القلوب میں جو کچھ آپ کی نسبت تحریر ہے وہ آپ سے نہیں لکھا گیا جیسا القار ہو لے لیا یہی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ پس برہنات کو نہ ماننا اور اپنے ذریعہ نجات و وسیلہ فلاح دارین سے علیحدگی کرنا سخت جہالت و محرومی و ادبار ہے، خارج کرنا نیز معنی؟ فقیر تو تم علماء صغار کی جماعت میں اپنا داخل ہو جانا محض فقر دارین و ذریعہ نجات و وسیلہ فلاح کو یقین لائق کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے بھی یہی دعا ہے کہ تم صاحبین کی محبت میں جلاوے یا مارے۔ وہ شخص مذکور ہے جو تم مقدس و مقتدائے زبان سے کچھ دل میں کینہ یا سورن ظن یا بر عقیدگی یا عداوت و رنج رکھے۔ فقیر تو آپ کی سب حرکات و سکنات و اقوال و افعال کو منجہ حسنات و برکات و موافق شریعت و طریقت سمجھتا ہے اور کل امور میں مخلص و صادق یقین کرتا ہے۔“ (الی آخرہ)

اور ادھر حضرت امام ربانیؒ کو اپنے شیخ کے ساتھ محبت کی جو حالت تھی، اس کو کیونکر ظاہر کیا جائے جب کہ ضبط و احتیاط لے کر کہ ان میں غیر محبت و حقیت و امداد مولوی رشید احمد صاحب سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری و باطنی اللہ و محبت و امتثال راغبت و اندک کہ اس چنان کس ویرن نماں نیاب اللہ (مختصراً از ضیاء القلوب)

کایہ عالم تھا کہ محبت رسولؐ جس میں آپؐ کو استغراق تھا اس کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھتے تھے۔ البتہ فرمان ہائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کو ثمرہ محبت سمجھ کر اپنی زندگی کو شریعت مصطفویہ کی خدمت میں ایسا گزارا کہ جس کی مثال آپ کے عصر میں ممکن نہیں۔ تاہم جس وقت اعلیٰ حضرت کے وصال کی خبر وحشت اثر مندستان میں پہنچی اور حضرت امام ربانی کے کالوں میں پڑی، اس وقت صدر سے جو حال آپ کا ہوا وہ پاس رہنے والوں نے دیکھا۔ اپنے مشہور عالم مستقل دست تقاضا اور مبر و نبات کے باوجود کئی وقت آپ کھانا نہ کھا سکے کسی سے بات کرنا یا مجمع میں بیٹھنا آپ کو گوارا نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے بے نقاباً نسو جاری ہوتے اور ہر چند آپ ضبط فرماتے مگر بے تاب ہو ہو جاتے تھے۔

سالہا سال کے بعد آج یہ مضمون عام طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ امام ربانی کو اعلیٰ حضرت کے وصال کا جو صدر ہوا شاید اُس صدر کے بعد جو صاحبِ طہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ہوا، آج تک کسی اور کو نہ ہوا ہو۔ مہینوں آپ کی یہ حالت ہی رہ چارپائی پر لیٹتے ہی خدام کو رخصت فرما دیتے اور خلوت میں بے تکلف ہو کر گھنٹوں رو یا کرتے تھے بعض مخلصین اُفقہ یہی حالت میں جاسچے میں انہوں نے ایسی آواز سُنی ہے جیسے دُکھی کو آگ پر رکھ دیا جاتا ہے اور وہ جوش مارتی ہے۔ یہ آپ کا ضبط خاکہ آنے والے کی آہٹ پاتے ہی آپ کلم کو پی جاتے تھے اور اسی حالت پر آ جاتے تھے جو مہملت اور صاحبِ راحت و سکون کی ہونی چاہیے۔

رُجح و کرم کے متعلق آپ کی یہ حالت حالانکہ مہینوں رہی مگر جب اعلیٰ حضرت کا تذکرہ فرماتے تو یہی فرمایا کرتے تھے کہ ”مجھے حضرت کے ساتھ محبت نہیں ہے جو دوسروں کو ہے۔“ اس کا یہ مطلب تھا کہ آپ اس محبت کو بھی کافی اور قابلِ اعتبار سمجھتے تھے۔ ان حالتِ محسودہ میں بھی آپ اپنے آپ کو دوسروں سے کم اور دوسروں کو اپنے سے زیادہ سمجھتے ہوئے تھے۔ اندر سے آپ کا حسی ہوتا تھا کہ کشش اس سے بھی زیادہ تعلق و محبت قلب کو عطا ہو۔

اعلیٰ حضرت کے دنیاوی مفارقت کے حادثہ پر مخفی طور پر باہمی بے آب کی طرح مڑنا، آہ کنا، رونا اور بے تاب ہو ہو جانا جو پچھلی عادت میں ہوتا تھا، اس کا تو خاص ہی لوگوں کو علم تھا۔ مگر عام لوگوں نے اتنا مضمون ظاہر بھی دیکھا ہے کہ جب مجلس اعلیٰ حضرت کا تذکرہ ہوتا یا کوئی نو وارد مہمان تعزیت کے کلمات کہتا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور بے چینی ہو جاتے تھے۔ آپ کا حسی ہوتا تھا کہ چھین ماریں مگر ضبط کو کام میں لاتے تھے۔ اس کشاکشی سے آپ کی حرکات پر وہ تغیر نمودار ہوتا تھا جس کا رفع ہونا مضمون میں مشکل پڑ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر واقفین و حاضرین نے اس تذکرہ سے احتیاط رلی۔ اور جو نو وارد یا اجنبی شخص آتا اس کو پہلے ہی منع کر دیا جاتا کہ اعلیٰ حضرت کے وصال پر ملال کا ذکر نہ فرمائیں۔

اس نے اس تذکرہ کو خواصا طویل کر دیا لیکن پھر بھی دل پر چاہتا ہے کہ اور کہیں تاکہ قارئین کو معلوم ہو کہ انسان کو اپنے مرنے و محسن شیخ سے کتنی محبت کا علاقہ ہونا چاہیے اور اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان حضرات کو جو لوگ کہتے ہیں کہ یہیت نہیں کہتے دیار اللہ کو نہیں مانتے وہ کتنا غلط پرانہ پیکرہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اولیائے اللہ کو اولیائے اللہ ہی مانتے ہیں، الہ نہیں مانتے۔ اور پھر جو لوگ اولیاء اللہ اپنے ان نادلوں سے اس لئے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ انہوں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استہ کیا یا وابستگی کو مستحکم کیا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر سے انہیں کس قدر محبت ہوگی کہ جسکی ایک ایک

سنت کو زندہ و تابندہ کرنے کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انہیں اپنے خالق و معبود کا پہنچے پہلا۔

فقر و استغناء

آپ زہد و قناعت، مجاہدہ و ریاضت میں، ہجوم مصائب پر صبر اور نعمتائے ربانی پر شکر ادا کرنے میں تقویٰ و طہارت اور اخلاص و اطہارِ عبادت میں، صدق و صفا اور حکم و وفائیں، رافت علی الخلق و شفقت علی الناس میں، اصلاح و شانِ تربیت میں، ایشار و سخاوت اور حیار و عفت میں، قصائے خالق پر رضا اور رزاقِ عالم پر کرم میں، خوف و خشیت اور رجاء و رحمت میں، حسب فی اللہ اور بعض فی اللہ، غرض ہر صفت محمودہ اور کمال معنوی میں وہ متر پائے ہوئے تھے جو ہر دارانِ مذہب یعنی علماء کے امام و پیشوا کو حاصل ہونا چاہیے۔ نبوی توکل کے آفتابِ عالمیت سے آپ اپنے زمانہ میں خصوصیت سے مستفید ہوئے تھے۔ آپ کے ارشاد و تربیت کا ابتدائی زمانہ چند ماہ کے لئے ستر تعلیمِ اطفال میں گزرا۔ فی النجاء تحصیلِ معاش کا ذریعہ بھی تھا مگر اس میں بھی اتباعِ سنت تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی ابتدائی عمر میں بکریوں کی پاسبانی کا اکتفا ہو جاتے اور آنے والے زمانہ میں اصلاح و تعلیم خلقِ اللہ اور بندگانِ خدا کی پاسبانی و نگہداشت کی عادت پڑ جاتے۔ اس کے بعد جب آپ مسندِ ارشاد و تربیت پر بیٹھے اور ریاستِ نبوت کا عہدہ آپ کے سر پر رکھ دیا گیا تو اسبابِ معاش سے آپ نے ایک کیسوٹی اختیار فرمائی۔ آپ کو یقین تھا کہ جو بندہ اپنے خدا کا ہو کر رہے گا، حق تعالیٰ اس کی ضروریات و حاجات کے خود ممکن ہو جائیں گے۔ اس لئے آپ نے چاہا کہ آقا کے دین کی خدمت کو چھوڑ کر رزقِ موعود کی تلاش میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ فرمائیں۔ آپ کا تو اس بارے میں بڑا کڑا امتحان ہوا۔ فاقوں پر فاقے گزرے لیکن آپ کی عالی ظرفی اور بلند ہمتی نے اپنی اعلیٰ و متنگ حالی کا اپنے جیسے محتاج انسان پر ظاہر کرنا بھی بے عزتی اور محبوب کی شکایت سمجھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ آپ کے دولتِ کدہ آگ نہیں لگی۔ مگر آپ نے کسی سے قرض نہیں لیا۔ آپ یوں سمجھتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ نے اسی حالت پر رکھا تو فرض کیونکر ادا ہوگی اس لئے قرض لینے سے فائدہ کرنا بہتر ہے۔

ذریعہ معاش

اور جب فتوحات کا دروازہ کھلا تو حق تعالیٰ نے مخفی و قلبی نعمتوں کے ساتھ ظاہری تمویل و نوکمری سے مالِ مال کر دیا۔ آپ دنیا سے بھاگتے تھے مگر دنیا اور دنیا کا مال و متاع آپ کے قدم پکڑتا اور جوتوں پر پھیل جوتا تھا۔ آپ خدام کی فرائض لیتے ہوئے گھبراتے اور انکار فرماتے تھے مگر وہ زور و کراہ کو لینے پر مجبور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مخالفین کی شکایات پر حکام نے ایک شخص کو اس پر مامور کیا کہ وہ آپ کا حال دریافت کرے۔ آپ درسِ حدیث کے بعد اس طرف متوجہ ہوئے۔ اس نے آپ کا ذریعہ معاش دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا توکل۔ وہ نہ سمجھا کہ توکل کیا شے ہے اور معاش کا ذریعہ کس طرح ہے۔ اس نے معیشت کے اسباب گنوائے مشدوع کہنے کہ زراعت کرتے ہو؟ تجارت کرتے ہو؟ چھیندار کسی کے نوکر ہو؟ کسی سے تنخواہ بندھی ہوئی ہے؟ کوئی حرفہ جانتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ آپ کا جواب نفی میں تھا۔ اُس نے پوچھا آخر کہاں سے کھاتے ہو اور کیا کرتے ہو۔ تو آپ نے فرمایا۔ تیرا نہ مغیب سے ملتا ہے۔ تو کل کرتا ہوں۔ مثلاً یہ۔ اُس نے گردن جھکا لی اور دیر تک کسی فکر و سوچ میں غرق رہا۔ خدا جانے کیا سمجھا کہ حبيب سے میں نے روپے نکال کر آپ سے نہ لیا اور واپس ہوا۔ آپ نے بلا تامل سے لے لیا اور فرمایا۔ یہ ہے توکل جو میرا ذریعہ معاش ہے اور جس کا مجھ سے سون

کیا جاتا ہے۔

حاضری دربار

یسے علم کا ثمرہ خدا تعالیٰ اور خشیت الہی ہے۔ مگر آپ کے ضبط کی وجہ سے اظہار مشکل تھا جس وقت اس وقت حضور نے فرمایا کہ اپنے نامک کے سامنے کھڑے ہوتے اور دست بستہ عرض و عرض شروع فرماتے تو آپ پر وہ حالت نمایاں ہوتی تھی جو شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہونے وقت غلام پر ہونی چاہیے۔ بسا اوقات آپ پر گریہ طاری ہو جاتا۔ آواز بھرا جاتی، پتلی بندھ جاتی اور سارے بدن پر ایک رعشہ طاری ہو جاتا۔ قرآن پڑھتے اور لغیر حال کی بنا پر گر کر جاتے پھر شروع کرتے پھر ٹھہر جاتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک آیت شریفہ پر آپ نے صبح کر دی نہ اسی کو بار بار دہراتے اور اعادہ فرماتے رہے۔

تلاوت قرآن میں محویت

ایک مرتبہ بظہر کے بعد حجرہ شریفہ میں آپ تلاوت قرآن کے اندر مشغول تھے کہ بندہ نادان و نادار مولوی محمد عینی صاحب کے پاس اس طرح دیے پاؤں جا بیٹھا کہ حضرت نے کہتے ہی نہ سنی۔ مولوی محمد عینی صاحب کسی ضرورت سے باہر تشریف لے گئے اور میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ چند منٹ کے بعد حضرت کے اہر میں تغیر آنا شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ آپ کا سارا جسم کانپنے لگا۔ بے اختیار آپ اٹھ اٹھ السورہ لے گئے۔ آواز دھک گئی۔ ہر چند آپ پڑھنا چاہتے مگر گریہ کا قلبہ جلنے کو کچھ بڑھتا تھا۔ خدا شاہد ہے کہ کافی بد شہیداء جو حالت اس وقت حضرت پر طاری تھی شاید تند مزاج خوشخوار شیر کے سامنے بڑ کر کسی کمزور و ناتواں ضعیف القلب شخص کی بھی یہ حالت نہ ہوتی ہوگی اور خشیت جو اس وقت آپ پر ہو رہی تھی غالباً کسی جبار و قہار با قدرت شہنشاہ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی خطاوار سے خطاوار مجرم غلام پر بھی ظاہر نہ ہوا ہوگا۔ آپ کی یہ حالت اتفاقاً اور عمر بھر میں پہلی بار میری نظر پڑی تھی۔ میں اب تک بھی نہیں جانتا کہ کس بات سے آپ ڈرتے تھے اور کیوں کانپ رہے تھے۔ یہی قرآن مجید ہے جس کو اول سے آخر تک مسلمان پڑھتے ہیں۔ خدا جانے وہ مضمون کو لیا اور کہاں ہے جس پر خوف یا خشیت پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے دفعتاً یہ تغیر حال دیکھ کر میں تھرا اٹھا اور اس وجہ پریشان ہوا کہ اب تصور آتا ہے تب بھی گھبرا جاتا ہوں۔ دل میں خوفزدہ ہو کر کہنے لگا کہ یا اللہ آج کس مصیبت میں آچھنسا۔ نہ جائے رفیق نہ پاسے نامن۔ اگر بیٹھا ہوں لیکن ہے کہ حضرت کو میرے پیشے کا کشت یا اور کسی طرح آہو جاتے تب متوجہ ہوا اور اٹھوں تو پاؤں کی آہٹ سے اطلاع ہونا ضرور ہے اور اس موبوم سے یہ غالب خیال زیادہ خطرناک۔ اس لئے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی۔ نہ میں آسمان پر تھا نہ زمین پر۔ ساکت و صامت بیت بنا بیٹھا رہا۔ اور وحشت زدہ دل بچائے اس کے کہ اس حالت سے مستفید ہوتا، کمال الحاح اور انخلاص کے ساتھ یوں دعا انگارہ مارا کہ یا اللہ! مولوی محمد عینی جلد آجائیں۔ وہاں حقیقت میں دل سے نکلی اور عین اضطراب و توحش میں واقع ہوئی تھی۔ اس لئے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ جو ہر وقت آسنے جانے کے مجاز تھے آگئے۔ اُن کا مجھ کو پہچاننے پر قدم رکھنا تھا اور حضرت کا اس حالت کو ضبط کر کے سیدھا ہوں بیٹھنا۔ خدا جانے یہ حالت مجھ پر کتنی دفعہ پیدا کر دیکر ہوئی اور اس طرح ایک سخت ضبط کس طرح ہو گئی۔ بجز اس کے کہ بالا جمال آنا سمجھا کہ یہ ہو کر ہی حالت کے سوز ہے جو خاص سنت نبویہ میں اولیا اللہ پر طاری ہوتی ہے۔ جو جہان کو لوٹھا اور قوی کو کمزور بنا دیتی ہے۔ روکھ نہ سوزت۔ سمجھا نہ اب سمجھ سکتا ہوں۔

مکتبہ تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الہی میرٹھی کی جن کی اس مفصل سوانح سے ہم نے یہ خلاصہ کیا ہے۔

ایک شب آپ نے تراویح شروع کیں۔ میں بھی جماعت میں شریک تھا۔ قرآن مجید پڑھتے پڑھتے آپ اس رکوع پر پہنچے جس میں خوف و خشیت والا لکھا تھا۔ جماعت میں حالانکہ نصف سے کم عربی جانتے والے تھے تاہم سب پر خوف کا اثر پڑا تھا۔ ہر کوئی بغیر درگھر تھرکانپ رہا تھا۔ دوسرے رکوع میں رحمت خداوندی کا ذکر تھا۔ اس کے شروع کرنے پر دفعہ سب پر سرور طاری ہو گیا۔

اچھے نمودار خروارے ایک مثال۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھانے کے لئے مصلے پر

ہم عصر علماء و احباب کا احترام | کھڑے ہوئے کہ بیچے سے کسی صاحب کا یہ کان میں پڑا کہ "مولوی صاحب آگئے، مولوی صاحب آگئے" آپ نے منہ پھیر کر دیکھا تو مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تشریف لارہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مصلے سے ہٹ گئے اور پوچھا کہ مولوی صاحب وضو ہے، مولانا نے اثبات میں جواب دیا اور اسی سادگی سے مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ حضرت نے دیکھا کہ سفر کی وجہ سے پنڈلیوں پر غبار ہے۔ اپنے کپڑے کے دامن سے جھٹکا شروع کر دیا۔ مولانا نانوتوی پر بھی کوئی حالت تھی آرام سے پاؤں صاف کر رہے۔ امام ربانی نے خوب اچھی طرح غبار صاف کیا اور بعد میں مسرت کے ساتھ فرمایا کہ مولوی صاحب کے پاؤں صاف کر کے میرا جی بہت خوش ہوا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ انہوں نے تکلف نہیں کیا۔

جرات و صاف گوئی | نواب محمود علی خاں آف چغتایہ کے ساتھ آپ کے گہرے مراسم اور خاصی محبت تھی۔ میں زمانے میں نواب صاحب یتیم ہونے کی ریاست کا انتظام کرنے کے لئے عرب سے ہندوستان واپس آئے تو زمانے کے رسم و رواج کے مطابق اسی ریاست کی آمدنی میں سے حکام کی دعوئوں وغیرہ کے متعلق وہ اخراجات بھی ہوتے تھے جس کے نواب صاحب شرعاً مستحق نہ تھے۔ حضرت کے نیاز مندوں نے یہ صورت حال بھی اور اپنی ملازمت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ:

"یتیم کے مال میں غیر مشروع تصرف کا کسی کو حق حاصل نہیں، نہ اس کی معاونت جائز، اس لئے ایسی جگہ کی ملازمت کو بھی میں تمہارے لئے پسند نہیں کرتا۔ خدا رازق ہے وہاں سے پھوڑ دو گے دوسری جگہ سے ملے گا۔"

حضرت کے اس فرمان پر حاجی دوست محمد خاں وغیرہ ملازمت سے ہٹ گئے۔ اسی انتظام ریاست کے زمانے میں نواب صاحب مرحوم نے حضرت کی خدمت میں حاضری کی اطلاع دی تو آپ نے لکھوا بھیجا کہ:

"ایسے آنے سے کیا فائدہ کہ آپ مجھ سے مل کر خوش ہوں اور وہ میں آپ سے مل کر خوش ہوں۔ میں نے منا ہے کہ یتیم کے مال میں آپ بے احتیاجی بہت کرتے ہیں مجھے اس کا افسوس ہے کہ آپ کو آخرت میں اس کا جواب دینا پڑے گا۔ یتیم کی ریاست کا جب تک محض انتظام اور مشروع تحفظ ہو جائے، دوسری دوسرے ملاقات کافی ہے۔"

نہ: رشید احمد

یہ تو معاملہ کا ایک پہلو تھا کہ جب دیکھا کہ نواب محمود علی خاں نے خلاف شریعت کام کیا ہے تو ان کو صاف لکھ دیا گیا۔ مگر معاملے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک دفعہ نواب صاحب نے چیکے سے حضرت کو تنویر و پیریزدہ پیش کیا۔ آپ نے باہر تشریف لاکر علی الاعلان ارشاد فرمایا کہ نواب صاحب نے مجھے اتنی رقم عطا فرمائی ہے۔ نواب صاحب نے گردن جھکا کر آپ نے فرمایا کہ مباحی کوئی کسی پر احسان کرے تو کیا اسے ظاہر بھی کرے؟

حسی کرامات

عوام کے نزدیک ایسی کرامات جو قانونِ عادت سے خارج اور صورتِ عجب ہوں بڑا کمال ہیں۔ مثلاً کسی کے مافی الضمیر پر مطلع ہو جانا، پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ لیکن خواص کے نزدیک بڑا کمال کرامتِ معنوی ہے۔ جیسے شریعتِ مستقیم رہنا۔ مکامِ اخلاق کا جوگر ہو جانا، نیک کاموں کا بے تکلف صادر ہونا، عاداتِ ذمہ سے قلب کا ظاہر ہو جانا اور کوئی سائنس غفلت میں نہ گزرنا۔ یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا احتمال نہیں اور وہ یکتائی ہے جس کا کوئی سا بھی نہیں۔ اگر پہلی قسم کی چیزوں میں سے کوئی چیز یابی جائے اور دوسری صفات سے انسان خالی ہو تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ البتہ اگر دوسری قسم کی صفات کے ساتھ پہلی چیزوں میں سے کوئی امر پایا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ تاہم یہ یاد رہے کہ ضروری نہیں کہ جو شخص کمالِ معنوی کا حامل ہو، اس میں کراماتِ حسی ضرور پائی جائیں۔ ولایت اور عبدیت کے لئے دوسری صفات پس کرتی ہیں۔ الحمد للہ ہمارے بزرگانِ دیوبند دونوں کے حامل ہیں بلکہ یوں کہتے کہ وہ نہ لحاظ سے جامع اور کامل ہیں عشق کی مستری اور عبادتِ شوق بھی پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کتاب و سنت کے ساتھ تمسک عملی کی وہ شان ہے جو صرف خاصانِ خدا اور مقررانِ بارگاہ ہی کا حصہ ہے۔

ہم سمنڈر ہنس دہم ماہی کہ در آئیم ہم عشق
روئے در سبیل و فقر دیا پیش است

کمالِ معنوی کے بعد کمالِ حسی کا ذکر کرنا غیر ضروری سا ہے تاہم بعض لوگوں کے نزدیک بزرگوں کی سوانح کا یہ بھی ایک حصہ ہے۔ انہی کے ذوق کی خاطر چند ایسے واقعات کا ذکر کیا جا رہے (اسی قبیل کے چند واقعات "نرشدِ کامل" کے عنوان کے تحت ذکر ہو چکے ہیں)

ایک دفعہ ایک نابینا شخص پایادہ میرٹھ سے گنگوہ پہنچا اور کہا کہ اللہ کا نام سیکھنے آیا ہوں۔ اہل خانقاہ ہاتھ جھٹک دیتے اس کے عاشقانہ شوق سے بہت متاثر ہوئے اور خوب خاطر مدارات کی۔ حضرت مسیح مہدی اشریف لائے۔ اس نے مصافحہ کرنا چاہا تو آپ نے ہاتھ جھٹک دیتے اور بڑی لاپرواہی کے ساتھ اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ ہر چند اس نے اپنی طلب کا سچا ہونا اور مدتِ دراز سے زیارت کا متمنی۔ وارز و مند ہونا ظاہر کیا۔ مگر حضرت نے مطلق التفات نہ کیا۔ اہل خانقاہ کو تعجب ہوا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ مگر کسی کو پوچھنے یا کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بعض مخلصین نے بالآخر سفارش کر ہی دی تو آپ کو یہ بات ناگوار گزری اور غصے سے فرمایا۔ "جب کہیں داخل نہیں تو اس کام میں بولا کیوں کرتے ہو۔ اس کے قلب کو تو دیکھو دنیا بھری پڑی ہے۔" خیر وہ نابینا چلا گیا۔ دس بارہ روز کے بعد عرس تھا۔ کسی نے دیکھا کہ توالی میں خوب خوب حال لائے تھے۔ جس نے خانقاہ میں اس کا ذوق شوق حضرت کے متعلق دیکھا تھا پوچھا کہ "میاں حضرت کے ساتھ شوق و ولولہ کہاں گیا۔" وہ نابینا صاحب تھے راست گو۔ کہنے لگے۔ "بھیا یہ تو یاروں کے وعدے ہیں۔ خیال تھا تمہارے میاں صاحب پر سکرم جم جائے گا تو آؤ جھگت ہوگی، عرس تک دن نکال لوں گا۔ پھر عرس میں حال قائل میں بھرم لے سمنڈر۔" ایسے جانور کا نام ہے جو آگ میں پیدا ہوتا اور آگ میں زندہ رہتا ہے۔

بندھے گا۔ باقی تکیا شوق اور کسی تمنائے زیارت، ہم تو سیاح آدمی ہیں یوں ہی گزارتے پھرتے ہیں۔
نے خادم شیخ کس نہ مخدوم کسے گوشتاد بزی کہ خوش جہانے دارو

ابھی چائے موجود تھی | مولوی شریف حسین مدرسی جو حضرت کے شاگرد تھے، حضرت کے دیوبند تشریف لانے پر ایک
سمادار میں بڑی عمدہ چائے بنا کر بڑے شوق سے لاتے۔ دیکھا تو بلیٹک اشخاص سے بھری ہوئی
بھتی۔ سوچتے رہے کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔ آخر یہ سوچ کر کہ خاص خاص حضرات کو بلا دیتا ہوں، دہلیز پر بیٹھ گئے۔
حضرت نے ارشاد فرمایا۔ مولوی شریف حسین ایک طرف سے پلانا شروع کر دو وہ پریشان تو ہوئے لیکن تحصیل ارشاد میں
واسطے ہاتھ سے تقسیم کرنا شروع کر دی۔ تقریباً پچیس آدمی مجمع میں موجود تھے۔ سب نے چائے پی لی تو سمادار کھول کر دیکھا
تو اس میں ابھی چائے موجود تھی اور یہ برتن صرف چھ پالی کا تھا۔

آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا | حضرت کا معمول تھا کہ ہر روز ۱۲ بجے دوپہر کو حجرہ کی گھر پان دھوپ گھڑی سے ملاتے
تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ متواتر کئی دن ابر محیط رہا اور دھوپ نہ نکلی۔ ایک دن دھوپ
نکلی تو اس طرح کہ کبھی دھوپ کبھی بادل۔ حضرت بارہ بجے سے کچھ قبل گھر سے تشریف لاتے اور مولوی علی رضا سے کہا کہ جب بارہ
بجیں، مجھے خبر کرنا اور نمود قریب ہی ایک جگہ لیٹ گئے۔ جب آئے تو دھوپ بھئی لیکن جس وقت سایہ خط کے قریب (۱۲) کے
خط کے قریب) پہنچے لگا تو دفعۃً ایک بہت بڑا بادل سورج پر چھا گیا۔ گھبرا کر عرض کیا گیا کہ حضرت دھوپ چھپ گئی۔ آپ
اٹھ کر دھوپ گھڑی کے پاس آگئے۔ آپ کا آنا تھا کہ بادل درمیان سے چھٹ گیا۔ آپ نے گھڑی ملائی اور حجرہ میں تشریف لے گئے
یا تو ایسا تھا کہ ابھی دس بارہ منٹ آفتاب نہ نکلے گا یا آپ کے آتے ہی آفتاب کے منہ پر سے ابر کھل گیا اور ایسا ہو گیا جیسے کوا
برقع سے منہ کو نکال دے یا جھوکے سے جھانکنے لگے۔

مولوی عبدالسیحان صاحب انسپکٹر پولیس گوالیار کے ایک تحصیلدار دوست برخاست کر دیئے گئے تھے
جا جا پھاڑ پر چڑھ جا | کوٹش کی دوبارہ تقرری ہو مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر دوما کے لئے گنگوہی پہنچے۔ حضرت نے فرمایا "تمہارا
کے قریب جو میدان ہے وہاں ایک مجذوب فقیر رہتے ہیں ان سے ہمارا سلام کہہ دینا" تحصیلدار صاحب مجھے کٹال دیا۔ دل برد
ہو کر واپس ہو گئے اور فقیر کے پاس بھی نہ گئے۔ کچھ دنوں بعد اتفاقاً ادھر سے گذر ہوا، تو فقیر مجذوب بیٹھا ہوا تھا۔ دُور ہی سے ا
کو دیکھ کر فقیر نے کہنا شروع کیا۔ بابا مولوی صاحب نے بھیجا ہے جا جا پھاڑ پر چڑھ جا "میں نے کرا انہوں نے حضرت کا سلام تو پ
دیا مگر رنجیدہ و غموم رہ سوچتے ہوئے مکان کو واپس ہوئے کہ مولانا نے بول ٹالا اور انہوں نے اس طرح ٹالا۔ کام کچھ بھی نہ ہوا۔
بیچ و تاب میں تحصیلدار صاحب مکان پر پہنچے تو حکم آیا ہوا تھا کہ تم بحال آئے گئے اور انہیں تال کا تبا دل نہ ہوا۔

مولوی عبدالسیحان صاحب کے ایک دوست مولوی قاسم صاحب کشر بندوبست ریاست گوالیار سے
تم گنگوہی جاؤ | ریاست کی جانب سے تین لاکھ روپیہ کا مطالبہ ہوا۔ ان کے بھائی مولانا فضل الرحمن صاحب کی خدمت
میں گنج مراد آباد پہنچے۔ انہوں نے وطن دریافت کیا۔ عرض کیا گیا دیوبند۔ مولانا نے تعجب کے ساتھ فرمایا۔ گنگوہی حضرت مدر
کی خدمت میں کیوں نہ گئے، اتنا لمبا سفر کیوں اختیار کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت یہاں مجھے عقیدت لاتی ہے۔ مولانا نے

تم گنگوہی جاؤ۔ تمہاری شکستگی حضرت گنگوہی کی دعا پر موقوف ہے۔ تمام بڑے زمین کے اویار بھی اگر دعا کریں گے تو نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ واپس ہونے اور بوسیدہ حضرت حکیم ضیاء الدین صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حکیم صاحب نے سفارش کی تو حضرت امام ربانی نے ارشاد فرمایا کہ میرا کوئی قصور نہیں کیا، یہ صاحب مدرسہ عربی دیوبند کے مخالف ہیں جو ائمہ کا ہے۔ سو قصور وار بھی اللہ پاک کے ہوتے۔ حق تعالیٰ سے توبہ کریں۔ بندہ دعا کرے گا۔ چنانچہ ادھر انہوں نے توبہ کی، ادھر مطالبہ سے کشر صاحب کی برارت ہو گئی۔

دورِ رکعت پڑھو ایک مرتبہ دو اجنبی شخص آئے۔ سلام و مصافحہ کے بعد بیعت کی تمنا ظاہر کی۔ آپ نے فرمایا: "دورِ رکعت پڑھو" حضرت کے اس ارشاد پر تھوڑی دیر تو دونوں صاحب گردن جھکائے بیٹھے رہے پھر چپکے سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جب دروازہ سے باہر ہوئے۔ تو حضرت نے فرمایا دونوں شیعہ تھے۔ میرا امتحان لینے آئے تھے۔ حاضرین میں سے بعض آدمی اس کی تحقیق کو ان کے پیچھے گئے اور معلوم کیا تو واقعی راضی تھے۔

ورنہ گمراہی کا احتمال ہے مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین گمراہ تھے اور ان کا اخبارات میں پھر چاہو رہا تھا، اس وقت تک ان کو حضرت امام ربانی سے عقیدت تھی۔ اس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہی کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے" اس کے بعد ہی مجددیت، مہمدویت و عیسویت کے خیالات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

اچھا جلدی کیا ہے انصارِ اطاہارِ حکیم احمد سعید امروہوی بیعت ہونا چاہتے تھے مگر کسی جگہ نظر نہ ملکی۔ اسی خیال سے گنگوہی حاضر ہوئے۔ حضرت کے کمال اتباع سنت کو دیکھ کر عقیدت پیدا ہوئی۔ مگر پھر یہ خیال ہوا کہ جب ایک ادھر ہی سے قلب کو نہ کھینچا جائے گا بیعت نہ کر دیں گے۔ کئی دن کے قیام میں معمولات پسندیدہ اور اخلاقی حمیدہ دیکھ کر ارادہ کہہ لیا۔ بعض خدام کے واسطے سے درخواست کی۔ حضرت نے صاف انکار فرمادیا کہ نہیں بیعت نہیں کر دیں گے۔ بڑے لوگوں کو مرید بنا کر جان کو آفت میں ڈالنا ہے۔ کوئی سفارش کراتا ہے، کوئی الزام لگاتا ہے۔ بغرض ٹھیک نہیں۔ حکیم صاحب بڑے افسردہ ہوئے کہ مجھ میں یہ قابلیت نہیں کہ مرجع خلافت اور کامل راہبر کی دست بوسی نصیب ہو۔ اب اسی افسوس میں کئی دن گذر گئے۔ آخر ایک دن حضرت کو مجھ میں تنہا دیکھ کر اندر چلے گئے اور عرض کیا کہ حضرت مجھے مرحومی کی امید نہ تھی۔ گو میں ناقابل ہوں مگر حضرت تو سب قابل ہیں۔ حضرت نے ان کو فرمایا: "اچھا جلدی کیا ہے، ابھی اپنے قلب کا اطمینان تو کر لو۔" حکیم صاحب اپنے دوسو سو پر بہت نادم ہوئے اور معذرت کی۔ آپ نے فرمایا: "نہیں نہیں بیعت سے متعلق انسان کو ہر طرح قلب مطمئن کر ہی لینا چاہیے۔"

لے بسا لہ لیس آدم روئے ہست پس بہر دستے بناید داد دست

بالفعل تم واپس جاؤ اور اپنا کام شروع کرو۔ حق تعالیٰ برکت عنایت فرمائے گا۔ اس کے بعد حکیم صاحب کے قلب پر سکون طاری ہونا شروع ہو گیا۔ بے چینی دور ہو گئی اور وہ تعلق قائم ہو گیا جو مرید کو اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ وطن سے

حیدر آباد گئے تو دنیاوی برکات بھی حاصل ہوئیں۔ افسر الاطباء کا خطاب ملا، اور بڑے بڑے ڈاکٹروں کے مقابلہ کا باوجود اعزاز دن بدن بڑھتا رہا۔

حضرت منشی رحمت علی صاحب جالندھری خلیفہ ارشد حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی کے حکم سے بیعت ہوئے۔ ان کو جب شیخ کی تلاش ہوئی تو حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی کی خواب میں زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ گنگوہی جاؤ اور مولانا رشید احمد سے بیعت کرو۔ چنانچہ حضرت منشی صاحب حضرت کے بیعت ہوئے۔

اسی طرح حضرت حافظ محمد صالح صاحب (گنگوہی جالندھری) کو جب مرشد کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں اس بزرگ سے بیعت لوں گا جس

مجھے خواب میں زیارت ہو۔ چنانچہ حضرت گنگوہی کی زیارت ہوئی۔ پھرتے پھرتے گنگوہی پہنچے اور جاتے ہی پہچان غالباً ادھر بھی اطلاع ہو چکی تھی۔ درخواست بیعت پر فوراً بیعت کر لیا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں۔ اول تو تسلیں بھی حضرت کی صحبت کی کیا اثر ہے اس کو معمولی بات سمجھتے تھے کسی کو یاد رکھنے کی طرف توجہ ہوئی، نہ محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا، پھر بھی تذکرہ ارشد میں حضرت مولانا عاشق نے تقریباً اس سائز کے تین صفحات میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے اس باب کی تکمیل کے لئے چند واقعات لے لئے درج نہ

اس شرح بے نہایت کد حسن یا رگشتہ حد نیست کو ہزاراں کا نذر عبادت آمد

وصال

۱۲ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کو آپ تہجد کی نماز میں مشغول تھے کہ آپ کے پاؤں کی دو انگلیوں کے درمیان کسی نے کاٹا۔ آپ کو جو حیرت نماز کے سبب احساس بھی نہ ہوا۔ جب فجر کی نماز کے لئے باہر آئے تو کپڑوں پر خون کی سرخی جلدی کپڑے تبدیل کر کے جماعت کرائی اور جب چار پائی پر جا کر لیٹے تو معلوم ہوا کہ انگلیوں پر خون جما ہوا ہے۔ خون نکل چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ضعف و نقاہت اور کمزوری وغیرہ کی طاری رہنے لگی۔

۲۷ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ مطابق ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء کو آپ کو تب لرزہ ہوا۔ پاؤں کے زخم کو معمولی سمجھ کر علاج نہ کیا تھا۔ اب اس جگہ نیگیوں چھالے پڑ گئے۔ یہ بھی خیال ہوا کہ کسی نے سحر نہ کیا ہو۔ ہر طرح کا علاج معالج کیا مگر جو وقت مقدر تھا وہ کب ٹل سکتا تھا۔ اسی زخم کی وجہ سے دم ہو گیا جو بڑھتے بڑھتے اوپر کو چڑھتا گیا۔

حضرت امام ربانیؒ کو چھ روز سے جھکنا انتظار تھا۔ پیغم شنبہ دریافت فرمایا کہ آج کیا جمعہ کا دن ہے۔ عرض کیا کہ حضرت آج تو شنبہ ہے۔ اس کے بعد درمیان میں کئی بار یوم جمعہ کو دریافت کیا۔ حتیٰ کہ جمعہ کا دن روز وصال ہوا۔ صبح کے وقت پھر دریافت فرمایا کہ کیا دن ہے؟ اور جب معلوم ہوا کہ جمعہ ہے تو فرمایا۔ اقلک

مولانا رشید احمد گنگوہی

اِنَّا بِالْمِيْنَةِ رَاجِعُوْنَ — باختلاف روایت ۸ یا ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء کو بیرونِ حجہ بعد ازاں یعنی ساڑھے بارہ بجے آپ نے دنیا کو الوداع کہا اور اگلے سال سات ماہ تین یوم کی عمر میں رفیقِ اعلیٰ کی جانب پہنچے اور مسکراتے ہوئے سدھارے۔

تاریخ ملتے وفات

شیخ الہند مولانا محمود حسن
حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری
حکیم الامت حضرت تھانوی
حضرت مفتی عزیز الرحمن
مولانا محمد شفیع گنگوہی
" " " "

اَللّٰہُ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ -
کُنْتُ حَمِیدًا کَمُنْتُ شَہِیدًا -
مَوْلَا نَاعَاشٍ حَمِیدًا مَاتَ شَہِیدًا -
حَتّٰی دَخَلَ الْخُلَدَ -
اے داتے نہاں شد آفتابِ عرفان
گفتند کہ دے شدہ خراماں بچان

تصنیفات و تالیفات

- ۱- تصفیۃ القلوب : حضرت حاجی صاحب کی تصنیف ، قیاد القلوب کا اردو ترجمہ۔
- ۲- امداد السلوک : تصوف کے رسالہ کیلئے کا ترجمہ جو اہل شباب میں کیا۔
- ۳- ہدایۃ الشیعہ : ہادی علی شیعہ لکھنوی کے اعترافات کے جوابات۔
- ۴- زبدۃ الناسک : حج کے متعلق تمام مسائل ضروریہ۔
- ۵- لطائف رشیدیہ : چند آیات قرآنی کے نکات اور پرہیز و رجسٹری کا حدیث سے ثبوت۔
- ۶- فتاویٰ میلاد و عرس وغیرہ مع تصدیقات دیگر علما۔
- ۷- رسالہ تراویح : میں رکعت تراویح کا احادیث سے ثبوت۔ الہامی الیقین فی اثبات التراویح
- ۸- نفوس داہجہ : مملکت مسجد میں جماعت ثانیہ کی کرامت کا فقرہ سے ثبوت۔
- ۹- مجمع فی القرئی : اہم حدیث کے اس فقرے کا جواب ہے جس میں انہوں نے گاؤں میں جمعہ جائز ہونے کا ثبوت دیا ہے موثق الحرفی
- ۱۰- رد الطغیان : کلام مجید کے اوقات کو بدعت ثابت کر کے دالوں کا جواب۔
- ۱۱- احتیاط النظر : اس کا ثبوت کہ جہاں جمعہ ہوتا ہے وہاں احتیاط ظہر کی ضرورت نہیں۔
- ۱۲- ہدایۃ المعتدی : قرآنہ نامہ خلف الامام کے جوابات۔
- ۱۳- سبیل الرشاد : رد عدم تقلید
- ۱۴- براہین قاطعہ : الزام اساطیر کا جواب نیز رد بدعات و تحقیق سنت میں لائق کتاب جو حضرت کے حکم سے لکھی گئی اور آپ نے اول تا آخر بغیر ملاحظہ کے تصدیق فرمائی۔

۱۴- رسالہ فتاویٰ از نامہ مولانا محمد شفیع گنگوہی

خانقاہ اور شہر کے درمیان ایک بڑا تالاب حاصل ہے جس کی وجہ سے شہر بالکل مجدا ہو گیا ہے جب شہر کے علمائے دین کو خبر ملی تو وہ مسرت سے پکے ہوئے آئے دیکھا تو حضرت کے ہاتھ میں تسبیح ہے منہ میں بیٹھے ہیں اور ذکر اللہ کر رہے ہیں۔ طلبہ اور دیگر بیٹھے ہیں یہ نووارد بھی مسلمان بن چکے تھے اور عرض کیا کہ

اے ہمارے سرتاج دینی بادشاہ سر اسٹے والور نے آپ کی قدر نہ پہچانی اب آپ ہم ناکارہ لوگوں کی عزت افزائی فرمائیں اور شہر چلے جائیں۔ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اہل مکہ نے مکہ سے باہر کیا تو حق تعالیٰ نے اہل مدینہ کو یہ عزت دی کہ انہوں نے آپ کو سر نہ کھنکھوں پر بٹھایا اور انصار کہلائے۔ سچے نائب رسول کے لیے یہ واقعہ اسی کا نمونہ اور نیابت کا جرحو ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے اگر ہماری درخواست منظور اور تمنا پوری ہو۔

امام ربانی نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہمدردی کے لیے دعا دی لیکن فرمایا کہ
 ”میں یہاں بہت راحت سے ہوں خدا کا بندہ خدا کے گھر میں پڑا رہے گا نہ کوئی نکالنے والا ہو گا نہ اٹھانے والا“
 اور ان کو رخصت فرما دیا۔

سر اسٹے کے پیادے حضرت کے محل اور بے تامل چلے جانے پر دلوں میں لوہا مان گئے۔ منجانب اللہ ان کو تنبیہ ہوئی اور اپنی کمزور حرکت پر نادم و متغیر ہوئے اب ایک دوسرے پر الزام دینے لگے کہ تم نے یہ گستاخ حرکت ہم سے کرائی۔ ہائے افسوس خدا کے آداب اور معصوم کوٹھ پڑی کو دیوان کر دیا۔ چنانچہ سب مل کر اپنی گستاخی کا عذر کرنے آئے خطا کی معافی چاہی اور جھوٹا کھڑا کرنے کی درخواست کی۔ حضرت کو مسجد میں قیام کئے ہوئے تین چار دن گزر گئے تھے آپ نے مسجد چھوڑ کر حجروں میں جا لے کر انکار کیا۔ منجانب ان لوگوں سے اصرار کیا اور اس میں ضعیف العمر لوڑھوں سفید ریش معمر بزرگوں نے بھی موافقت کی تو آپ نے گردن نیچے جھکا لی، اور بدستور سابق حجروں میں فرزند ہوئے۔ حضرت کا ایک کمال اس وقت ظاہر ہوا کہ جب بغیر کسی ادنیٰ تامل اور رکاوٹ کے حضرت مولانا حجروں سے حجر دان کے کہنے پر نکلے۔ اور دوسرا اس وقت ظاہر ہوا کہ جب آپ نے ان کی خطا معاف کر دی اور دوبارہ اسی حجرے میں آگئے اور پھر تاحیات اسی حجرے میں قیام فرمایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ علیہ کے موافق اگر علماء یا متعلمین میں سے کسی کو خطا ہو جائے تو آپ بلا دریغ عطا فرمادیتے۔ ایک شخص نے

حدیث جنتی کی اجازت

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے حدیث الجنتی کی اجازت چاہی آپ نے ان کو بے تامل اور ان میں کو جو خواہش رکھتے تھے یہاں رکھیں اجازت دے دی ہم اس حدیث کی سند قادیانی کے لیے یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ جو کوئی چاہے اس سند کو اجازت سمجھ لے۔
 حدیثی شیخی الشاہ احمد سعید الحمیدی قال حدیثی ابی الشاہ السعید الحمیدی قال حدیثی شیخ الشیخ الشاہ عبدالعزیز دہلوی قال عی الشاہ اہل اللہ الدہلوی عن القاضی الحنفی المعز قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی فی غیر زینۃ قد کلم اللہ وآنحضرت منقول مشہور است شیعہ باشندہ دیگر مسلمات اچھے منقول و مطبوع شدہ اندازان یا دیگر مذہبہ اجازت اسناد بالاجمال است بہریت کہ ازیر اخذ نموده بودم
 نقض والسلام۔

خانقاہ کا پورا علاقہ سر اسٹے کے نام سے مشہور تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے دورانِ قزاقان چھوٹا سا سب ماردا ایک ایسی آپ کو کیر کر رکھا ہے۔ دہلی کے کبار کلمین دوزد روانہ سے درگاہ دیکھا تو کچھ عبادت کا در تھا۔ ایک کلمین شہ صاحب پرانے پچھلے کا دعویٰ کیا چھوٹا سا سب سب کا پوچھا۔ یہی چھوٹا

شیخ النبی حضرت مولانا محمود حسن دہلوی مدظلہ العالی

۱۳۳۹ھ
۶۱۹۲۰



۱۳۴۸ھ
۶۱۸۵۱

ترتیب

عبدالرشید یار شاہ

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سھدہ کے پہلے تک ملک میں کام کرنے والوں کا ایک ہی طبقہ تھا وہ علماء اور مذہبی مسلمانوں کا طبقہ تھا۔ سھدہ میں علی گڑھ سکول قائم ہوا تھا جسے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا)۔ اس وقت سے جدید و قدیم فرق ہونے لگا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس حقیقت کو پہلے دن سے سمجھ لیا تھا کہ ہندی مسلمانوں کی تیر نہیں۔ اور اب ذہنی و دماغی۔ مذہبی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے رجحانات میں ایسا فرق ہو جائے گا کہ اگر علی گڑھ سکول کے قیام کی تحریک میں اصلاحات نہ کی گئیں تو آئندہ چل کر دیوبند اور علی گڑھ کی وہ چپقلش پیدا ہوگی جو کبھی بھی ختم نہ کی اور اس خلیج کو اپنا مشکل ہوگا۔ مولانا نانوتوی کی فراست ایمانی اور نگاہ مرد مومن کے سامنے ہندوستان کی پچاس سال اور پچاس سال بعد کی میاست تھی۔ اس لئے آپ نے سرسید مرحوم سے خط و کتابت شروع کی اور چاہا کہ جدید قدیم تعلیم فرق کو ترقی سے نکال کر صحیح اسلامی فکر کو اصولی تعلیم کے میدان کو حجت لیا جائے کیونکہ دین کی بنیاد صحیح علم و عمل پر ہے اور سب سے خود دشمنی اور دشمنی کا بعض امور پر اتفاق کے باوجود کچھ حالات ایسے پیش آگئے کہ جن کی وجہ سے ان دونوں کے اشتراک جابجائے نہ ہو سکا اور دونوں کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ایسی کہانی تھے کہ جو علوم و فنون، افکار و خیالات میں استاد کے انتہائی بانشین اور چھوڑے ہوئے کاموں کے پورا کرنے والے تھے۔ یہ شیخ الہند تھے کون؟ ایک عالم ربانی و عارف نیز دینی جو اپنے کام و ذہن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا نہ اٹھ مین شیخ قاسم۔ اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پر بھی تھی اور نہ روس اور مائٹسکو کے انقلاب، انگریزوں پر کا مطالعہ کیا تھا وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعہ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن اسپر کے افکار و نظریات سے۔ اس نے کسی دل نشی کا نظم اٹھایا تھا اور نہ عشرت کدہ فرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی ان سب چیزوں کے برعکس شہزادہ حیات ذوال اللہ و قال الرسول اور اس کی زندگی کا ذخیرہ اتباع سنت بنویر تھا اس کے فکر و نظر کا تاثر و پودا احکام الہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہان تاب کی شعاعوں سے گونہا گیا تھا۔ سینہ میں جبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا لہذا وہ اپنے گوشہ غزلت میں سب سے الگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بین میں زمانہ کی تمام کردیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سے مل کر جمع ہو گئی تھیں۔ نیشیل کانگریس حکومت سے حقوق طبکی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ لیکن شیخ الہند یہاں اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے۔ (مدینہ بنجور)

ہم کو تسلیم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدہ ہند کے خن و خاشاک میں الگ

بھی تھی لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت کا قدم بھی حقوق کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا مگر علمائِ حق آنے والی جنگ آزادی کے لئے خاموشی سے بہادر سپاہی تیار کرنے کی مہم شروع تھی۔ ان کا نصب العین نہ تو دین و دنیا بہم آمیز تھا اور نہ ان کا منہج نظر درمیع الدہر کہف دار تھا بلکہ ان کا طرہٴ زمانہ بالونہ ساز و تو بازمانہ ستیز پر تھا۔ ان کے نزدیک دین کا مفہوم ایک مکمل نظام زندگی تھا جس کی بنیادی اور دو گوشہ زمین و آسمان ہے۔

ان، خاندان، تولد اور ابتدائی حالات
 دیوبند کے چند مبارک اور ذی علم خاندانوں میں سے ایک خاندان شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ہے۔ حضرت کے جدِ اجداد شیخ فتح علی صاحب عالم تھے۔ باوجود کرم، اخلاق کے صورت سے سیادت اور رعب عیاں تھا حتیٰ تعالیٰ نے احوال و اولاد صحت و نجات بہرہ دانی عطا فرمایا تھا۔ اور مولانا اپنے شہر میں نہایت خوش قسمت اور بلند اقبال شمار ہوتے تھے۔ پچاسی سال کی عمر ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی۔ اس وقت ساٹھ افراد اولاد و کور وراثت چھوڑے۔ دہلی کے مشہور عربی کالج میں آپ نے علمی و الشائخ مولانا محمد ملوک علی صاحب سے تعلیم پائی تھی۔ آپ کی تمام عمر علمی خدمات میں بسر ہوئی۔ علوم ادبیہ و فرائض سے مناسبت تھی اور آپ کی نظم و شعر عربی و فارسی کی یاد دلاتی تھی۔ دیوان حسانہ اور دیوان مثنوی کی مفید شرح "تسبیح اللہ مستاد البیان" آپ کی بہترین علمی یادگار ہیں اور قصیدہ بروہ اور قصیدہ بابت سعادت کی شرح میں عطر الودہ اور الارشاد جس ذوق سے تحریر فرمایا ہے وہ حب نبویؐ کی علامت اور بہترین ذخیرہ آخرت اور کمال ایمان کی دلیل ہے۔ اسی طرز پر عرب کے مشہور تعلقات کی شرح التعلیقات علی السبع المعلقات تحریر فرما کر طالبانِ ادب پر احسان فرمایا ہے۔ اور فنِ معانی و بیان کو نہایت سے اردو زبان میں لکھ کر تذکرۃ البلاغت نام لکھا ہے اور قواعد و ضوابط معانی کی مثالیں اساتذہ اہل کلام سے دکھ کر کمال دیکھا۔ زبان اردو میں سب سے پہلے مدوح نے اس فن کو بھاری کر کے دکھلایا ہے ایسے بالکل حضرات اب کہاں پیدا ہوں۔

جناب موصوف کے دو صاحبزادیاں اور چار صاحبزادے تھے۔



فخر آباد احمد اور حضرت مولانا محمود حسنؒ۔

مولوی حامد حسن جن کی ملازمت کا اکثر حصہ ضلع بجنور میں گذرا۔

مولانا حافظ حکیم محمد حسن صاحب مدرس و طبیب دارالعلوم دیوبند۔ آپ نے حدیث شریف حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اور دیگر علوم دارالعلوم دیوبند میں اور اپنے بھائی حضرت شیخ الہند سے اور طب و دینی حکیم عبد المجید صاحب مرحوم و مغفور سے حاصل فرمائی۔

مولوی حافظ محمد حسن صاحب۔ اکثر مشغول ملازمت رہا۔ اپنے بڑے بھائی شیخ الہندؒ سے والدانہ محبت و الفت تھی۔ ان کے ایامِ اسیری، شاہیں یاد کر کے زار و قطار رو ما کرتے تھے۔

حضرت مولانا ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں بمقام بریلی (جب کہ آپ کے والد ماجد بوجہ ملازمت مع اہل و عیال وہاں مقیم عالم پور میں تشریف لائے۔ والد ماجد نے بطور شاکستہ اظہار مسرت کیا اور محمود حسن نام رکھا اور بعض ظریف حضرات نے ذوالفقار علی بتلایا۔ پھر سال کی عمر میں پڑھنے بٹھائے گئے۔ قرآن مجید کا اکثر حصہ میاں جی منگلوری سے پڑھا۔ بقیہ قرآن پاک اور ان کی ابتدائی کتابیں میاں جی مولوی عبداللطیف صاحب سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب اپنے معزز چچا اور مشہور استاد مولانا مہتاب علی سے پڑھیں۔ مولانا بچپن میں کھیل کود سے متجنب و متنفر تھے۔ البتہ سیر و سفر سے ایک مناسبت اور ویلی شوق تھا۔

مولانا شیخ الہندی کی عمر پندرہ سال کی تھی اور آپ قدوری تہذیب وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ کہ خدا تعالیٰ کے مقبول اور سر اخلاص بندوں کی تجویز سے ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ ہجری کو دیوبند میں ایک عربی مدرسہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اور حضرت مولانا محقق قاسم کی تجویز سے پہلے مدرس مولانا محمود صاحب بشاہزہ پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئے اور دیوبند کی مشہور مسجد چشتیہ میں تقسیم عربی شروع ہوئی۔

سبحان اللہ! کیا مبارک ساعت اور کیسے مخلص اور سعید حضرات تھے کہ ان کی معولی آواز پر پہلے ہی سال بنارس و پنج اور کابل تک کے طلباء جمع ہو گئے۔ اکیس طالب علموں کی جمیعت پر مدرسہ کا اجرا ہوا تھا۔ اور اخیر سال اور وقت امتحان تک طلباء کا اجتماع ہو گیا۔ اور اب وہی مدرسہ عربی دارالعلوم دیوبند کی شکل میں دنیا سے اسلام کا سب سے بڑا سرکاری دارالعلوم جہاں سے کتاب و سنت اور علوم اسلامیہ کے پیشے جاری و ساری ہیں۔ طلبہ کی کثرت ہوئی تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب دیوبند تشریف لے آئے۔ آپ اجیرین تنویر و پیر شاہزہ پر لازم رہ چکے تھے۔ پھر بریلی میں انسپکٹر مدراس ہو گئے تھے حضرت مولانا محقق قاسم کے ارشاد پر اس خدمت کو ایک اسلامی خدمت سمجھ کر اواخر ۱۲۸۳ھ میں میرٹھ ماہوار کے قلیل مشاہیرہ پر کام کرنے لگ گئے۔

پہلا استاد و شاگرد مولانا شیخ الہند دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم تھے۔ گویا پہلا استاد بھی "محمود" اور پہلا شاگرد بھی "محمود" ۱۲۸۴ھ میں آپ نے کنیز میبذی مختصر معانی کا امتحان دیا۔ آئندہ سال مشکوٰۃ ہادیہ امتحان پڑھیں۔ ۱۲۸۶ھ میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب حضرت مولانا محقق قاسم نانوتوی سے پڑھیں حضرت مولانا محقق قاسم نے اس دوران میں میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے مطبع میں تصحیح کا کام بھی کیا اور اسی طرح کبھی دہلی میں۔ اور دیوبند بھی تشریف لاکر دارالعلوم دیوبند بجالا کرتے۔ مولانا شیخ الہند نے ان سب مقامات میں حضرت نانوتوی کے ساتھ رہ کر سفر حضر میں سلسلہ درس جاری رکھا۔ مولانا نانوتوی کی خدمت میں سبق پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عبارت میں غلطی کرنا یا ترجمہ سمجھنے کے خیال سے ٹھہر کر کلمہ کبیرہ تھا۔ اس قسم کے امور اور بے موقع سوال سے مولانا کلمہ بوجایا کرتے تھے۔ اور سبق کا لطف ہی جاتا رہتا۔ جو شخص درس مستعد ہوتا اور سبق کو مطالع میں خوب ذہن نشین کر کے جاتا وہ مولانا کے مضامین سمجھنے کی امید کر سکتا تھا۔ اچھے اچھے ذی استعداد مولوی اس شرط پر شریک کئے جاتے تھے کہ صرف سنتے رہیں عبارت پڑھنے یا کچھ دریافت کرنے کا حق نہ ہوگا۔ لوگ خوشی سے بول کر کرتے اور حاضر ہوتے۔ بہت عالی دماغ اور ذکی لوگ ہی پڑھتے اور سوال کرنے کی جرأت کرتے تھے۔

مولانا کا طرز ہی جدا تھا حدیث ہو یا منطق۔ کلام ہو یا معانی، ہر فن کے متعلق عجیب و غریب تحقیقات بیان فرماتے جس سے ہر شخص کی انتہائی تحقیق اور اختلافات کی تطبیق بدیہی اور مشاہدہ طور پر ہو جاتی تھی اور اس قسم کے عالی مضامین بیان فرماتے کہ کسی کو خیال میں آئے تھے نہ سننے میں۔ مولانا کی جو دو جہا تصنیفات ہیں وہ بھی اسی شان کی ہیں۔

مولانا شیخ الہند کا مدت سے ان کے ساتھ رہ کر ان سے استفادہ کرنا اس بات کی دلیل تھی کہ وہ ان کے استعداد و صلاحیت کی معترف تھے لہذا ان کی خواہش تھی کہ یہ وہیں طالب علم مجھ سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے کر لے۔ مولانا شیخ الہند قدرتی طور پر عظیم ذہن رسا اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ یہ سب وجوہ مزید شغف کا باعث تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا کو قوی اپنی برکت اور نور فراست سے سمجھ رہے تھے کہ یہ شخص اپنے زمانہ کا عجیب و گہرا پیکر اور ملت اسلامیہ کا مایہ ناز فرزند ہوگا لہذا اس کی جتنی بہتر سے بہتر تربیت ہو سکے گی جیسے۔

درس دارالعلوم مولانا شیخ الہند ۱۲۸۹ھ میں صحاح ستہ اور دیگر علوم و فنون کی اعلیٰ کتابیں مولانا کی خدمت میں بختم فرما کر بطور معین مدرس دارالعلوم میں پڑھانے لگے۔ ۱۹۰۹ء ذی قعدہ ۱۳۲۹ھ میں مدرسہ کے ہمسدہ دستار بندی اور اہل اسلام جمیع عام میں اس وقت کے اکابر شیوخ و علماء کی موجودگی میں مولانا شیخ الہند کی دستار بندی ہوئی۔ اگرچہ مولانا اپنی تعلیم کے آخری دن ہی میں بطور معین مدرس کام کرنے لگ گئے تھے اور فراغ تحصیل تعلیم کے بعد باقاعدہ مدرسین کی فہرست میں شمار ہونے لگے تاہم ۱۲۹۲ھ میں طلبہ کی کثرت کی وجہ سے ایک مدرس چہارم چوتھا دارالعلوم کی ضرورت محسوس فرمائی۔ دوسرے کو ایک ذہین فطین العلوم کے فارغ حضرات بھی موجود تھے اور اپنی تعلیم کے زمانہ میں وہ بعض عہدیتوں سے مولانا سے ناواقف نظر آتے تھے۔ لیکن اس زمانہ کے قدس اور سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور شیخ حضرت مولانا رفیع الدین صاحب نے فراست صادقہ سے نظر انتخاب مولانا شیخ الہند پر پڑی۔ اور ان کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب سے ذکر کیا۔ آپ کے والد ماجد کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اموال عطا فرمائی تھی اور یوں بھی بیت خیر و شرف تھے۔ اس لئے ان کو گوارا نہ ہوا کہ ان کا لڑکا مدرسہ سے معاوضہ لے کر کام کرے۔ لیکن دوسرے بزرگان مدرسہ اپنے بہت سے مصالح پیش نظر تھے۔ لہذا ان سب بزرگوں کے ادب کو ملحوظ رکھ کر خاموش رہے اور مولانا شیخ الہند ۱۲۹۲ھ میں ماہرہ پندرہ روپے ماہوار مدرس چہارم مقرر ہوئے۔

مولانا اگرچہ درجہ چہارم کے مدرس تھے اور خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ "ابتدا میں قطبی اور قندری پڑھالیئے کوبھی میں غنیمت سمجھتا ہوں لیکن طلبہ پہلے ہی سے آپ سے بڑی کتابیں پڑھ رہے تھے اور اب رفتہ رفتہ آپ کی علمی استعداد اور خداوندانیت ظاہر ہونے لگی اور یہ کتابیں بھی حسب موقع آپ کے زیر درس آئے گئیں۔ ۱۲۹۳ھ ہی میں آپ صحاح ستہ کی نہایت مشکل اور اہم کتاب ترمذی شریف، مکارم شریف اور ہادیہ وغیرہ جیسی نو کتابوں کے اسباق روزانہ تیر تکلف پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں تو صحاح ستہ کی دوسری کتاب کے علاوہ سب سے بڑی اور افضل کتاب اور اصح الکتب بعد کتاب اللہ بخاری شریف بھی آپ نے پڑھائی۔

حیثیت اللہ ۱۲۹۴ھ میں بزرگان ہندوستان نے بیت اللہ کا قصد کیا اور اس قافلہ میں حضرت مولانا محمد قاسمؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا رفیع الدین بہتم دارالعلوم حضرت مولانا محمد یعقوبؒ اور دیگر بہت سے منتخب روزگار علماء و علمائے شام تھے۔ مولانا شیخ الہندؒ بھی زیارت حرمین شریفین نیز ان اکابر علماء کی معیت میں بڑی سعادت سمجھتے ہوئے ساتھ شامل

ہو گئے۔ ہندوستان سے ایسے نیک اور بلند پایہ علماء کا قافلہ حج کے لئے روانہ ہوا جو اس کی نظیر نہ سابق میں ملتی ہے اور نہ آئندہ امید ہے جس طرح شہنشاہِ بنگالی رکتی شوق زیارت میں سینکڑوں بندگانِ خدا مصافحہ اور دست بوسی کے لئے موجود ہوئے۔

جبمبئی میں بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ پھر سب قافلہ جہاز میں سوار ہو کر تیرہ دن میں بندہ اور وہاں سے اڈنٹول پر مکہ معظمہ پہنچ گیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہؒ ان دنوں مکہ معظمہ میں تھے۔ طواف و زیارت کے بعد سارا قافلہ ان کی زیارت کو حاضر ہوا اور پھر فراغت حج مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور بیس دن وہاں قیام فرمایا۔

شاہ عبدالغنی دہلوی سے اجازت حدیث | استاذ الاساتذہ شاہ عبدالغنی دہلوی مہاجر مدنی مدینہ منورہ تھے سب حضرت ان کی خدمت میں حاضر ہوئے جناب ممدوح بھی کمال شققت اور گونا گوار عنایات فرماتے اور باوجود انتہائی کم گوئی کے باخلاق و عنایات ہر ایک شخص

درجات و مراتب گفت گو فرماتے۔ ہر عالم کی درخواست ہوتی ہے کہ اگر کسی مشہور محدث یا استاد حدیث سے ملاقات ہو تو اس سے اجازت لیجا کے اور پھر جن بزرگوں سے واسطے کم آتے ہوں ان سے اجازت لینے کو ہر کوئی سعادت سمجھتا ہے کہ مولانا شیخ الہندؒ کا استاد کمال اور ملاحظہ کیجئے کہ مولانا نالوتویؒ کی موجودگی میں شاہ صاحب سے اجازت و سند حدیث لینا خلاف نیاز و مندی سمجھا۔ لیکن واپسی کے قریب جبہ حضرت استاذ ذہبیؒ نے تحریک فرمائی تو حضرت شاہ صاحب نے کمال بشارت مولانا شیخ الہندؒ کو سند حدیث عطا فرمائی۔

مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ واپس آکر ایک ماہ قیام ہوا تو حضرت نالوتویؒ کی استدعا پر خفیہ پریشخ العوب والجم حاجی امداد اللہؒ سے نہ صرف مولانا شیخ الہندؒ کو شرف بیعت عطا فرمایا بلکہ مضاف و اجازت بیعت سے بھی امتزاج کیا اور بعد میں تحریری اجازت نامہ ہندستان روانہ | بعض رفقاء کو مصارف کی دشواری ہونے لگی تو حضرت حاجی صاحب کے اشارہ پر مجبوراً یہ مقدس قافلہ مدینہ منورہ سے فراتے ہندوستان ہوا۔ بندہ پہنچ کر کلفت انتظار سے بچنے کے لئے جلد ایک ایسے جہاز میں سوار ہو گئے جس میں

مسافر کشیدہ اور جگہ تنگ تھی۔ باوجود باہمی مروت و ایثار کے سب کو نہایت وقت اور تکلیف پیش آئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم کو تقاضا مقدسہ اور اپنے بزرگوں کی جدائی کی کلفت اور غم کعبہ کے ادب و احترام کی وجہ سے دوڑ تک پایادہ چلنے کی تکلیف سے خاصی آگاہ تھی۔ بندہ اور مکہ معظمہ کے درمیان بڑھ (حدہ) پہنچ کر سجا ہو گیا۔ جہاز کی تنگی اور کشمکش سے اس پر مزید اضافہ ہوا۔ سوار ہونے کے تیس دن بعد صفراء کے دورہ سے بخار تیز ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مرض آسا بڑھ گیا کہ ساتھی یابوس ہو گئے۔ جہاز میں دبا بھی تھی۔ دو تین آدمی روزانہ فوت ہو جاتے تھے۔ اس لئے اور زیادہ خطرہ تھا۔ نہ دوا تھی نہ علاج نہ ہمارے راحت نہ سکون۔ مولانا شیخ الہندؒ نے خود سنگار میں دن رات ایک کر دیا اور استاد کا خوب خوب تہی خدمت ادا کیا۔ تمام تمام رات بیدار رہے۔ عدل پہنچے تو جھاگ دوڑ کر کہیں سے کوئین۔ گلاب اور لیموں وغیرہ تلاش کر کے لائے اور حضرت مولانا کو قدر سے آفاقمہ ہونے پر قافلہ کی جان میں جان آئی۔ چودھویں روز جہاز بمبئی پہنچا۔ دو ایک روز وہاں قیام کر کے مولانا شیخ الہندؒ اپنے استاد اور مربی و مرشد کو ان کے قصبہ نالوتہ میں پہنچا کر ذیج الاول میں دیوبند واپس آئے۔

شیخ الہندؒ کی غیر حاضری میں تقریباً چھ ماہ مولانا عبدالحی علیؒ کی جگہ کام کرتے رہے۔ واپسی پر آپ برستور سابق درس و تدریس میں صرف ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت نالوتویؒ نے بھی دیوبند قیام فرمایا اس لئے استفادہ کمالات استاد کے لئے شیخ الہندؒ کے شاگرد

میں پچھری اور زیادہ ہو گئی۔ نو دس دس اسباق روزانہ پڑھاتے۔ اپنی مشہور کتاب "ایضاح الاول" تحریر فرماتے اور حضرت استاد
ساکر کو شہودی حاصل کرتے اور شب کا بہت سادہ علاوہ کتب بینی کے عبادت درود و وظائف میں گزارتے۔ انہی دنوں حکم الامت
الاشرف علی تھانوی تحصیل علم کے لئے دیوبند تشریف لائے۔ اور منجملہ اور اسباق کے ملاحسن اور مختصر المعانی حضرت شیخ سے متعین۔
حضرت شیخ الہند اپنے ان مشاغل حسنہ میں جن کو وہ ذخیرہ آخرت سمجھتے تھے نہایت محویت کے ساتھ مشغول تھے کہ آگاہۂ شاہدین
قدہ انکار و مدحہ جعفر حضرت نانوتوی کی وفات کا پیش آیا۔ حضرت واپسی سفر حج میں مریض ہو کر صحت یاب ہو گئے تھے لیکن کھانسی کی
کایت رہ گئی تھی۔ اور کبھی کبھی نفس کا دورہ ہو جاتا تھا۔ ۱۲۹۶ھ میں مرض میں زیادتی ہو گئی اور بہت ضعیف ہو گئے پنجشنبہ (۴ جمادی الاول
۱۲۹۶ھ) کو انتقال فرما گئے۔ اس کے تیسرے دن بعد سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری نے بھی وفات پائی
اور صرف ایک دن کے فاصلہ سے دنیا اپنے وقت کے دو بہترین محدثوں سے خالی ہو گئی اور طبقہ صلحا و ادبا بل علم چرخہ پر غم اور صدمہ پر
اور مڑا۔ اِنَّ لِلّٰہِ دَانَ الیہِ رَاجِعُونَ۔

ملت استاد کا اثر

مخدوم استاد کی وفات کے حادثہ نے حضرت شیخ الہند کو بالکل پشمرہ کر دیا۔ تھیں وہ معلم سے دل سرد ہو گیا۔ رنج
و غم تو تھا ہی اس کے ساتھ یہ خیال بھی دل نشیں ہو گیا تھا جس کو کبھی خود ہی اظہار فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے شاغل
ی اور درس تدریس صرف اس لئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے۔ اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھ سکیں۔ انہی
حضرت ہی شخصت ہو گئے اس قبل وقال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ۔ فکر معاش نے ایسا سنگ کیا تو گھاسا۔ کھوکھو کسیر کس گے
انچ آپ نے مدرسہ آنا بھی چھوڑ دیا اور اپنے مکان میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حضرت اس عزم پر مضبوطی سے قائم تھے مگر حق تعالیٰ نے آپ کے
بیر سے احادیث نبویہ کی نشر و اشاعت اور علوم دینیہ کی خدمت اور فیوض قاسمیہ کی افادت مقدہ فرمائی تھی حضرت مولانا رفیع الدین
صاحب بہتم مدرسہ (قدس سرہ) کو خود بھی حضرت نانوتوی کی وفات کا صدمہ کچھ کم نہ تھا کیونکہ آپ سے زیادہ مولانا کا قدر شناس کون
سکتا ہے۔ لیکن حوادث و فوژل کے وقت اہل عزم و ثبات خود بھی سنبھلتے ہیں اور دوسروں کو سنبھالتے ہیں اور حق تعالیٰ کے علم میں جو امر
قدر ہوتا ہے باوجود ظاہری ناسعادات کے اس کے لئے ایسے ہی اسباب پیدا کر دیتا ہے۔

بہتم صاحب نے ایک دو مرتبہ سمجھایا اور تیسری مرتبہ اپنے ساتھ مدرسہ لے آئے۔ زادیہ نشینی اور علوم اسلامیہ کی خدمت میں کو کچھ فرق ہے
حضرت بھی خوب سمجھے جوئے تھے مگر دوسری حالت کا غلبہ تفرید و تجرد کو ترجیح دیتا تھا۔ مولانا رفیع الدین صاحب قدس سرہ کے ارشاد سنے
جام تہائی اور لطیفہ غنوں کا کام دیا۔ بزرگوں کی عظمت اور ان کے اوامر کی وقعت حضرت کے قلب میں ہمیشہ بدرجہ کمال رہی۔ مولانا ممدوح
کے ارشاد کے فیصل کی اور شرم گریں درس جاری فرمادیا۔

حضرت نانوتوی کے مخصوص تلامذہ میں سید دوسرے شاگرد مولانا احمد حسن امروہوی رحمہ بھی ترک تدریس میں حضرت مولانا کے ہم
خیال اور شریک حال تھے۔ ایک ماہ تک مغموم و محزون اور شغل تعلیم سے کنارہ کش رہے لیکن اہل دیوبند کے اصرار خصوصاً حضرت مولانا
عقوب صاحب کے ارشاد سے مجبور ہو کر بدستور سابق مراد آباد کی مسجد شاہی کے مدرسہ کی مدرسہ میں مشغول ہو گئے۔

ربیع الاول ۱۳۰۷ھ دارالعلوم کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مدرسہ اول کی وفات کا سخت صدمہ پیش آیا۔ مولانا ممدوح
نانوتوی ایک نور سلف جامع العلوم جامع شریعت و طریقت بزرگ تھے۔ اور حضرت نانوتوی کے ہم عصر اور بھائی تھے۔ نہ۔

مدرسہ کے سرپرست اگرچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قرار پائے تھے مگر چونکہ آپ کا قیام اپنے وطن گنگوہ میں تھا اس لئے ہر وقت پر معاملہ میں شریک حال نہ ہو سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کی ذات بابرکات سے کئی وجہ قریب قسم کے امور میں نہایت قوی اعانت پہنچتی تھی اور ہر قسم کے فیوض و برکات سے مستفیع ہوتا رہتا تھا۔ اور یہ کہ تمام علماء عصر مولانا کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحب کے خوش شاہن اور شاگرد تھے۔ ایسے قوی الاثر جامع الصفات عالم کے سایہ سے محروم ہو جانے والا دارالعلوم کے لئے کوئی معمولی حد نہ تھا۔ لیکن سوائے صبر و تسلیم بچارہ کار کچھ نہ تھا۔

اس حادثہ کے بعد مولانا سید احمد صاحب دہلوی جو فنون ریاضیہ میں خصوصیت کے ساتھ نام کہلانے کے مستحق تھے بمشاہرہ پچالیس روپے مدرسہ اولیٰ مقرر ہوئے۔ مولانا محمود صاحب دیوبندی پچیس روپے مدرسہ دوم اور حضرت مولانا تین روپے بمشاہرہ مدرسہ سوم اور مولانا محمد اعلیٰ صاحب مدرسہ چہارم۔

اس تقریر سے تقریباً دو ہی سال کے بعد دارالعلوم کے سب سے قدیم اور بافیض عالم علامہ محمود صاحب کی وفات ہو گئی۔ اور حضرت مولانا انہی کے مشاہیر پر مدرس دوم ہو گئے۔ ترقی مدارج اور اضافہ مشاہیر سے حضرت مولانا کے کارِ تعلیم پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ حضرت سجاد صاحب و لکھنیت تمام علوم کی کتابیں پڑھا رہے تھے اور طلبہ نہایت شوق اور گردیدگی کے ساتھ دن رات میں جب بھی موقع ملتا تھا حضرت کے فیوض حاصل کرتے رہتے تھے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس

بھوپال شریف لے گئے تعلیم کو حضرت پہلے ہی سے بڑی چاہتوں کو دے رہے تھے اور جیسا کہ سابق پر
گزارہ اب سے بارہ سال پہلے ۱۲۹۲ھ و ۱۲۹۵ھ سے کتاب صحاح کچھاری شریف و دیگر علوم کی انتہائی درسیات پڑھا رہے تھے
اب آپ مولانا سید احمد صاحب کے مشاہیر پر باتفاق آوارا کا بر و احصاء مدرس اول نامزد ہوئے اس وقت سے آخر عمر یعنی ۱۳۳۹ھ تک
تینتیس سال حضرت مولانا عبد ربدرس رہے اور آپ کی وفات بابرکات سے مدرسہ کو ترقی ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مولانا کو کبھی ترتیب
درجات اور مقدار مشاہرات پر نظر نہیں ہوئی اور جیسا کہ ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے وہ ہمیشہ دارالعلوم کی خدمت کو خدائے تعالیٰ کا کام اور دینی فرائض
سمجھ کر بجالاتے رہے۔ مشاہیر قبول فرماتے تھے مگر بضرورت و کراہت اگر آپ منافع دنیا کی طلب فرماتے تو بہت مواقع ایسے تھے کہ لوگ حضرت
کو سزا کھوں پر بٹھاتے اور صالح روپیہ مشاہروں اور نذرانوں کی صورت میں پیش کرتے لیکن آپ نے باوجود ذاتی ضرورتوں کے ہمیشہ اپنے اُستاد
(قدس سرہ) کے لگائے ہوئے باغ دارالعلوم دیوبند کی سرسبز می و شادابی کو مطلع نظر نہائے رکھا اور اسی دینی خدمت میں عمر تمام کر دی۔ دار
العلوم کے مخالفوں نے بستی سے موقع بموقع دل میں بخش ڈال کر علیحدگی پر آمادہ کرنا چاہا مگر ناکام رہے۔ پیر جی عبدالرزاق صاحب گنگوہی
مدارس اسلامیہ ملی نے محبت اور حسن نیت سے کوئی تحریک کا موثر نہ چھوڑا مگر دل میں حسرت ہی لئے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ حضرت ملی نے
فرما کر فیوض صحاری فرمائیں۔ اور سچا طور پر الامام الحدیث شاہ ولی اللہ دیوبند کے خاندان کی نیابت کا حق دہلی میں رہ کر ادا فرمائیں۔

استقامت، استقلال اور محنت و رخصیت

۱۳۱۰ھ میں جب بلوچ گزنی دیگر مدرسین کے مشاہدوں میں اضافہ ہوا تو بحکم حضرت گزنی قدس سرہ آپ کا مشاہدہ پچاس روپے ہو گیا۔ آپ نے خاموشی سے قبول فرمایا۔ استاد شفیق حضرت نانوتوی رح کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں: ”محمود حسن کہہ تے ہیں کہ مدرسہ سے مشاہدہ لیتے رہو گے۔“

ترتیب پورا غم مشاہیر چھوڑ دینے کا فرمایا لیکن حضرت لنگوئی کے ادب سے مجبور تھے۔ اجازت نہ دی بلکہ پرس کر فرمایا کہ — ”نہیں ان کو کہنے دو، ہرگز نہ چھوڑو“ — مگر جب حضرت مولانا محمود کی وفات ہو گئی اور ماتحت مدرسین کے اضافہ کے ساتھ آپ کے پچھتر روپے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ بالکل قبول ہی نہ فرمایا اور کچھ عرصہ کے بعد مشاہیر بالکل بند کر دیا پھر بھی اسی پابندی اور دیسوری سے درس دیتے رہے۔

حضرات مفتظین کی جان فشانی اور تہذیب حسنة اور مافعت اعلیٰ کو بھول جانا کفران نعمت ہے۔ اور مناسب مواقع پر اسکا مفصل طہار واجب و لازم مگر اس میں بھی شک نہیں کہ حضرت مولانا کی معنوی برکت کے ساتھ ظاہری مستعدی و تہذیبی اور دل سوزی نے بھی مدرسہ کے لئے باران رحمت کا کام کیا اور مدرسہ دیوبند کو ایک عظیم الشان دارالعلوم کی حیثیت تک پہنچا دیا صبح کی نماز و افرا کو درس کے لئے اکھاتے۔ کبھی پیشاب یا وضو کے لئے درمیان میں اٹھتے تو مضائقہ نہیں ورنہ متصل اور مسلسل درس دیتے ہوئے گیارہ بارہ بج جاتے تھے۔ اور ظہر کے بعد پھر بھی شغلہ موجود تھا۔ — عشرہ کے بعد بیت دیر تک کتب یثقی کرنا اور کچھ کچھ دیر آرام کر کے اپنے ولی کی عبادت اور بطرز مسنونہ ادا کرتے تہجد میں مشغول ہونا اور بعد تہجد کے طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھانا اور نماز فجر کے بعد عصر تک تعلیم ان مصروف رہنا آپ کا ہمیشہ معمول رہا۔

حضرت نے ۱۲۸۹ھ سے تحقیق معین المدرسین دارالعلوم میں کار تعلیم شروع فرمایا تھا۔ اور ۱۲۹۲ھ میں آپ باقاعدہ پرس ہو گئے تھے۔ اس لحاظ سے ہر ایس سال کامل خدمت تعلیم میں بسر فرماتے اور ۱۲۹۵ھ سے ۱۳۲۲ھ تک تو اتریس سال کامل علی الاطلاق خدمت نے علم کی اشاعت فرمائی۔ اس درمیان میں حضرت نے سوائے معمولی چند روزہ سفروں کے نہ کوئی طویل سفر فرمایا نہ اور کوئی ایسا غل پیش آیا نہ کوئی مرض لاحق ہوا جس سے کار تعلیم میں دوچار ماہ کا طویل حرج واقع ہوتا۔ یہ نصف صدی (تقریباً) کا زمانہ کچھ نہیں ہے۔ ہندوستان کی ان اکثری قوتوں میں دنیا میں ایسے بہت کم علمائے شمار ہو سکتے ہیں جنہوں نے اس قدر طویل زمانہ افادہ تلامذہ اور علوم اسلامیہ کی خدمات کی گذار ہو۔

حضرت سے چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ علمی کام لینا تھا۔ اس لئے ظاہری مختصر و قناعت اور ضعیف بدن کے ساتھ اندرونی قوی نہایت مضبوط بنائے تھے۔ باوجود خدمت تعلیم میں اس قدر محنت کرنے کے اور باوصف شب بیداری اور کثرت ذکر اللہ کے نہ ضعف دماغ کی شکایت مرتب تھی نہ ضعف بصیر کا کھل نہ دواؤں کے محتاج تھے نہ تقویات کے خواہاں معمولی سادہ غذا استعمال فرماتے تھے اور وہ بھی بہت قلیل۔ اس عرصہ میں تمام ہندوستان میں آپ کے علوم و کمال خصوصاً حقانیت کے تجر اور مہارت کی دنیا میں شہرت ہو گئی تھی۔ اور جابجا آپ کے فیوض جمیل گئے تھے۔ ہر نواح میں آپ کے شاگرد و شاگردوں سے فیض یافتہ عالم باعث اشاعت علوم و موجب ہدایت خلق اللہ بن گئے۔ دارالعلوم میں دو قدیم بزرگوں کے سوا تمام مدرس آپ کے شاگرد اور فیض یافتہ ہیں۔ اور ہندوستان کی کوئی قابل اعتماد علمی درس گاہ یہی نظر نہیں آتی جہاں آپ کے بلا واسطہ یا بالواسطہ شاگرد و مسند درس پر ممکن نہ ہوں۔

کابل۔ قندھار۔ بلخ بخارا، مکر مغلطہ، مدینہ منورہ اور یمن تک کے لوگ آپ کے علوم و فیوض سے مالا مال ہو کر گئے۔ مولانا محمد رحمان مرسری ایک باخدا عالم نمونہ اتقیا ہے سلف نے مدینہ منورہ جا کر درس جاری فرمایا۔ ان کی وفات کو زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ مولانا عبدالحق احمد صاحب اسی مقدس دارالہجرت میں مخصوص طور سے اپنے مکان اور مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں اشاعت علم کرنے

لگے اور ان کے پھوٹے بھائی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا حلقہ درس خاص مسجد نبوی میں سید العرب والعجم کے درضہ منورہ و مطہرہ کے سامنے اسی عظمت و برکت سے جاری ہوا کہ بڑے بڑے کامل الفہم اساتذہ کے حلقے منقرضہ گئے اور شرفائے مدینۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اولاد مولانا موصوف کی خدمت میں زانو سے ادب تر کرنے لگے۔ ذلک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔ حضرت نے تمام عمر عبادتی پر بیٹھ کر درس دیا۔ اخیر میں مرض ہوا سیر کا عارضہ ہوا تو بعض مخلصین نے کمانی دار لگدہ بنوا کر لکھ دیا تھا۔ اس پر پرفورٹ بیٹھتے تھے مگر کسی قدر گرانی و کراہت محسوس کر کے۔

شجر علمی اور طریقِ درس | حضرت موصوف تفسیر احمدیث۔ اصول فقہ، منطق، معانی کی کتب محنت اور شوق سے بے لگاف پڑھتے تھے اور ابتدا میں تو بہت ہی زیادہ شغولیت و شغف برداشت فرماتے تھے مگر آخر میں بھی ۱۳۲۰ھ تک پانچ چھ گھنٹہ روزانہ درس دیتے تھے اس زمانہ کے بعد کچھ ضعف و امراض کے اور نیز اس لئے کہ حضرت کے ممتاز تلامذہ علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور علامہ رشید احمد عثمانیؒ مدرسہ میں موجود تھے آپ حسب ضرورت روزانہ دو یا تین گھنٹے درس دیتے تھے اور ترمذی شریف و بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو گھنٹے میں بطمانیت تمام کرا دیتے تھے۔

حضرت کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شان تھا۔ دوسرے مدارس کے فارغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب علم نہایت خوب طریق سے حاضر خدمت رہتے اور حضرت کمال عظمت و وقار سے درس دیتے۔ راد پراد پر کی فضول باتوں کا ذکر تک نہ تھا۔ دوسروں کی تحقیر اسی تعریف کا نام و نشان نہ تھا۔ منہی مذاق اور تفریع طبع کے جیسے یا ذاتی حالات کا بیان بالکل مفقود و خطاب بالکل عام ہوتا تھا۔ کسی کی خصوصیت نہ تھی۔ کم سواد طالب علم قرات کرنے سے خود ڈرتے تھے اور بے موقع سوال کرتے ہوئے چکچکاتے تھے۔ مستعد طالب علم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک و شبہات پیش کرتے تھے۔ اس طرح کہ حلقہ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی۔ کبھی حضرت کے الزامی جواب طالب علم کو ساکت کر دیتے تھے اور کبھی جامع مانع تقریر شفاً لمانی الصدور کا کام دیتی تھی۔ الزامی جواب میں ملکہ نام تھا دو چار دفعہ اسی طرح مانتے رہتے۔ بہت رد و بدل کے بعد تحقیق شروع فرماتے اور اس خوبی اور قوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرج حد ہو جاتا۔

بہت سے ذہنی استعداد ذہین و فطین طالب علم جو مختلف اساتذہ کی استعداد سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اپنے شادک و شبہات کے کافی شافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی و مضامین عالیہ سن کر سر نیاز خم کر کے معترف ہوتے کہ یہ علم کسی نہیں ہے اور ابلیس متحقق عالم دنیا میں نہیں ہے۔

حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین و اکابر محدثین کے حلقہ محدث کا نقشہ نظروں میں چھرا جاتا تھا۔ ذرا آن وحدیث حضرت کو اذہر تھے اور ان کے اندر ازلہ کے مذہب زبان پر اور صحابہ و تابعین، فقہاء و مجتہدین کے اقوال محفوظ تقریریں نہ گردن کی گرس پوچھتی تھیں نہ منہ میں لکھنا تھا نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو اذہر اور مجتہدین نہاتے تھے نہایت سبک اور سہل الفاظ میں یا با محاورہ اردو میں اس روانی اور تسلسل سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا دیا امتدہا ہے۔ یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے اب بھی کئی دیکھنے والے موجود ہوں گے کہ وہی مضمون بسم اور مفسر المزاج ایک مشت آتھان ضعیفہ الجیشہ مرد خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اور بار بار مسجد کے فرش پر بلا کی بستر کے لیٹ ہوا نظر آتا تھا مسند درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیر خدا ہے جو قوت و شوکت کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے۔ آواز میں کڑنگی آئینہ بندی نہ تھی لیکن سننے والے جانتے ہیں کہ جب صدر درگاہ "فودہ" میں تقریر فرماتے تو (باوجود وجہ قرآن مجید و مکتب فارسی کے بچوں کی بلند آواز کے) مدرسہ کے دروازہ تک بے تکلف قابل فہم آواز آتی تھی۔

لجہیں تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی پہرہ بنا لینا یا آنسو بھرا لانا حضرت کا کام نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے تقریب میں اثر دیا تھا۔ بات و نشیں ہو جاتی تھی اور سننے والا یہی سمجھ کر اٹھتا تھا کہ جو فرار ہے میں حق ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ خود دوسری دور سے دشمنوں کے ذریعہ فرار کئے ہوئے عقائد فاسدہ سن کر بد عقیدہ ہو جاتے تھے۔ اپنی اولاد و عزیزوں کے دیوبند اگر تحصیل علم کرنے میں اس نے مانع نہیں ہوتے تھے کہ یہ بھی اسی رنگ میں رنگے جائیں گے۔

استاد رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق و وقایع نقل فرماتے اور اپنی تحقیقات عجیبہ اور مضامین عالیہ سناتے۔ مگر مفسرین و محدثین شرح و مصنفین کا ادب اس درجہ بخور رکھتے تھے کہ کہیں شائبہ متعین بھی نہ آئے۔

مسائل مختلف فیہا میں ائمہ کرام رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے لیکن جب امام ابوحنیفہ کا ممبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح پھر وہ پر شاشت، تقریریں روانی، لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل، شاہد پر شاہد، قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے تقریر کرتی ہی نہ تھی۔ اور اس خوبی سے مذہب امام عظیم کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصب المزاج لاٹ جاتے تھے۔ دوسرے دور کی مختلف المضامین احادیث جن کی طرف کبھی خیال بھی نہ جاتا تھا پیش کر کے اس طرح مدعا بیان ثابت فرماتے کہ بات میں اثر نہ جاتی تھی اور سامعین کا دل گواہی دیتا اور انکھوں سے نظر آ جاتا تھا کہ یہی جانب حق ہے۔

اسی جہاں مسالہ کا ادب و احترام اور ان کے کمالات کا اعتراف حضرت کی تعلیم کا ایک جزو لا ینفک ہو گیا تھا خود بھی ایسی ہی تقریر فرماتے اور راحت سے ذہن نشین کرانے کہ مذہب مجتہدین حق ہیں اور سب مستدل بالکتاب والسنۃ۔ ان کی تنقیص موجب برہنہ ہے اور سوء ادب باعث خسار۔ بے شک حضرت رحمۃ اللہ علیہ من عمل یا یعلم ان لا مللہ علیہ ما لہ لعلہ کے مصداق اور اس شعر کے عمل تھے۔

یٰنی اندر خود علوم انبیاء۔

لے کتاب و بے معید و اوستا

اس کے ساتھ ہی آپ نے نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اور بقول شخصے دو جزاں لکھ کر کتب مکتبیہ اور مطالعہ کا نہایت زیادہ اہتمام فرمایا تھا۔ خصوصاً شرح احادیث کمال غور و فکر مطالعہ فرمائی اور بعض کو کئی مرتبہ دیکھنے کی نوبت آئی۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ ذرا علیٰ اٹھا لاد۔ احقر نے عرض کیا کہ حضرت بخاری کی شرح بادل کی۔ فرمایا اس کو کئی مرتبہ دیکھ چکا۔ ہدایہ کی شرح لے آؤ۔

لیکن حضرت صرف شرح کی تعلیم کے احاطہ میں محصور نہ تھے بلکہ وہ مضامین عجیب انہیں مروج و دواشی کے مطالعہ سے آپ کے ذہن مصفیٰ میں آتے تھے جو دید تھے نہ شہید حضرت نے شرح احادیث کا عطر لگا لیا کہ وہ دیا ہے اور ہمارے فقہاء و شرع کے مجمل دلائل کو اس شرح رابطہ سے بیان کیا ہے کہ بابر و شاید محدثین میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور ائمہ مجتہدین میں سے حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا تہنہ نام نقل تھا۔ مزاج بخاری کے متعلق تحریرات کھنجر شرفی تھیں۔ بخاری کے متعلق کوئی شخص سوال کرتا تو خوش ہو جاتے اور بیان فرما شروع کر دیتے۔

امام مسلمؒ نے اپنی کتاب کے خطبہ میں امام بخاریؒ پر قولین کر کے جو کزوت کی ہے اس پر فرمایا کرتے تھے کہ جب ملاقات ہوئی تو بخاریؒ کے خادم و خدمت مند ہو گئے کاش اسی طرح امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ کی ملاقات ہو جاتی تو امام بخاریؒ اپنے تمام اعتراضات واپس لے لیتے۔

امام ابوحنیفہؒ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے لئے حق تعالیٰ نے حضرت کو شرح صدر کر دیا تھا اسی کا اثر ظاہر تھا یہ مقتضائے آجہ ازل خیزو در دل بریزو وہ دقیق فرق، وہ لطافت و دوزن سناتے کہ طالب علم بے ساختہ سبحان اللہ کہہ دیتے اگر امام صاحب کے مناقب بیان فرمانے لگے تو ایک

کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا بیان فرماتے چلے جاتے تھے۔ سلسلہ کلام ختم نہ ہو جاتا تھا۔ اٹا سے واپسی کے بعد ایک روز حسب عادت صبح کی نماز پڑھ کر بیٹھ بیٹھ مجمع تھا امام صاحب کا ذکر لگایا پھر کیا تھا۔ لطافت و قناتی، محلات و واقعات بیان ہونے لگے اور جب تک صوفیہ کی اذان نہ ہوگی سلسلہ ختم نہ ہوا۔ حضرت مولانا کا لڑکھٹیاں ادب جمع ہیں اقوال و الاسامیت دی تھا جو ہندوستان کے نامور علمی خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شائع العزیز قدس سرہ کا تھا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے اقوال کو نہایت اعتقاد و اعتماد کے ساتھ نقل فرماتے اور نہایت ادب سے نقل لیتے۔ آپ کی سند حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب ہی پر مشتمل ہوتا ہے آپ کے کمال کی جو برکتیں اور کارکردگیاں حضرت مولانا رشید احمد گلوڑی اور مولانا عبدالرحمن پانی پتی جی نے بقائے مودعین آپ کو اہم از حدیث عطا فرمائی تھی۔ لیکن درس و تدریس اور قرأت و تحدیث کے لحاظ سے آپ کی سند حدیث و دھڑن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تک دوران کے ساتھ کرام کے ذریعہ سے محدثین و متفہمین کتب احادیث اور جناب سید الاولین و الآخرین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔

اول : عن مولانا شیخ محمد قاسم۔ عن مولانا شیخ عبدالغنی عن مولانا الشاہ محمد علی عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم علیہ۔ ثانی : عن مولانا الشاہ احمد علی السہارنوی عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہم۔ حضرت مولانا کے علاوہ اسطوفاغ تحصیل و عالم شاگرد پانچویں سال میں کم و بڑا وسط پچیس سالہ نہ کھنے کے بعد ایک ہزار ہوتے ہیں۔ اور مولوی شاگردوں اور بعض کتب پڑھ کر چلے جانے والوں اور بالواسطہ شاگردوں کی کوچی انتہائی نہیں۔

دارالعلوم دہلیہ کے بانیوں اور سرپرست حضرات اور منطقین میں چونکہ غلوں اور تقدس بدو بکمال موجود تھا اس لئے دارالعلوم ابتدا ہی سے روز افزوں ترقی کے خلاف طے کر رہا تھا اور ان کی ظاہری و باطنی توجہ کے انکار و برکات اس میں جلوہ نما جو رہے تھے۔ اولیٰ کا تیسرا سونو بھی بھٹنا چاہئے کہ دیگر اکابر کے بعد حضرت مولانا اس کی مدد مدرسے کے لئے تجویز کئے گئے۔ پھر آپ کی علمیت و شہرت و عظمت اور شب و روز خدمت اللہ ایشیاء و غلوں اور باطنی ہمت کی وجہ سے جو شہرت و عظمت دارالعلوم کو حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں ہے اور گویا آپ ہی کے فیوض نے اس کو بجا طور پر دارالعلوم کا لقب دلویا ہے۔ اس کے منطقین نے جب بڑے بڑے نظرات کائنات میں سے اس کو سلامت بچا کر نکالا اور شدید طوفانوں میں سے اسے ساحل نجات پر لگایا تو مولانا ان کے پشت پناہ تھے اور جب اپنی حسن سعی سے اس کو مدارج ترقی پر پہنچا تو حضرت ان کے دست راست تھے۔

حضرت کو دارالعلوم سے اس قدر گہرا تعلق رہا ہے کہ شاید ہی کسی کو نصیب ہو۔ حضرت کے والد ماجد اس کے ابتدائی باپن اور اولین سرپرست محبوبوں میں تھے۔ حضرت کبھی اس کے سابقین بہترین طلبہ میں تھے۔ کبھی معین کہلاتے تھے کبھی مدرس سوم و چہارم نظر آتے تھے۔ کبھی مدرس دوم سے مدد مدرس کی مسند پر تیار دکھائی دیتے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ کبھی ممبر مشورہ اور کبھی اعلیٰ سرپرست تسلیم کے جاتے تھے۔ ہر عادت کی انتہا ہے اور ہر شے کو فنا۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد جب حضرت کے روحانی سرپرست ہونے کا بھاریا تو حضرت کا وقت بھی قریب آ پہنچا یعنی آپ دارالعلوم کی مسلسل پینتالیس سال تک خدمت کرتے ہوئے ملک و ملت کی آزادی کی خاطر حب و کرمیت باندھ کر میدان میں نکلے تو پھر دارالعلوم سے نصرت ہونے کا وقت آگیا جس کی تفصیل آئندہ آتی ہے۔

از حضرت مولانا حسین احمد مدنی

شیخ الہند کی سیاسی خدمات

آئندہ مضمون حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح نقش حیات ج ۲ سے ماخوذ ہے۔ ہم نے بعض جگہ مضمون کو مختصر کر دیا ہے (اثر شد)

تحریک انقلاب عرف ریشمی خطوط کی سازش | ہندوستان جب کہ صوبوں اور سترہویں صدی میں آسمان سیاست پر آفتاب درخشاں بن کر چمک رہا تھا اسی زمانہ میں سامان کسوف بنک منحوس یورپین قومن پہلے پریگیز پھران کی دیکھا دیکھی انگریز فریج۔ ڈچ جرمین وغیرہ ہندوستان آئیں۔ یہاں کے بادشاہوں اور حکام نے نہان نوازی کے دامن حسب عادت سلاطین ہند انجام دئے۔ ان کو نہ صرف داخلہ کی اجازت دی بلکہ کونست، تجارت اور حقوق شہریت وغیرہ بلا کاوش دئے گئے۔ انگریز بھی مثل دیگر اقوام اس خوان نعمت فیض باب ہوئے۔ اور محوڑے ہی عرصہ میں بہت سے انگریز تہوار اطراف و جوانب ہند میں پھیل گئے ان کو اپنے یورپین ہم وطن اقوام سے رقیبانہ شکستیں بھی پیش آئیں۔ بالآخر ستلہ میں ان کے تقریباً ایک سو تہاہروں کی منظم جماعت بنام الیٹ انڈیا کمیٹی بن گئی جس نے تجارتی کاروبار اجتماعی قوت سے جاری کیا اور غدارانہ طریقہ سے بہت زیادہ کمایا۔ جو جو چوں نہ لکھ نہ لگایا ان کی منتیں فاساد اورادے نہایت شہادت آمیز ہوتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے ستلہ میں نواب سراج الدولہ آف بنگال پر حملہ کر دیا اور اس کے اراکین دولت میں سے میر جعفر اور امی چند و دوزیوں کو توڑ پھینچ دیں کامیاب ہو کر ملک گیری اور حکومت شروع کر دی۔ یہ جیسے کان کو ایسا لگا کہ ہر وقت اور ہر آن یہی دھن لگی رہتی تھی۔ بالآخر ۱۸۵۳ء تک تقریباً اکثر ہندوستان میں ان کا مکمل اثر اور پورا اقتدار قائم ہو گیا اور اس قدر جرات ہو گئی کہ بادشاہ دہلی سے جبراً اپنی حکومت پر دستخط کر کر ملک میں اعلان کر دیا کہ ————— "اخلافت خدایا ملک بادشاہ کا حکومت پسندی بہادری" ————— ان حالات کو علماء اسلام دیکھتے تھے اور دلی ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے آخر کار حکام سلطنت کی غفلت، بے پرواہی، بے وفائی، بزدلی، ارباب اقتدار کے اس پاس کے نفاق کے مظاہر وں وغیرہ نے مجبور کیا کہ عام مسلمانوں کو متنبہ کیا جائے (اس سے قبل شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں کتابی صورت میں تجزیوں کے ذریعہ حکام و ارباب اقتدار کو ہر طرح سے انتباہ کر چکے تھے لیکن یہ لوگ کس سے سن نہ ہوتے) چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جانشین و فرزند حضرت شاہ عبدالعزیز نے آزادی کے متعلق فتویٰ دے دیا اور عام مسلمانوں کو ہندوستان کے آزاد کرانے کے فریضہ کو سکھایا۔ اس وقت سے مسلمانوں اور خصوصاً اہل علم میں یہ تحریک انقلاب شروع ہوئی اور تقریباً بیس برس کے عرصہ میں تمام ہندوستان میں شعلہ جوالہ بن کر یہ تحریک پھیل گئی اور ایک مکمل نظام اور مکمل قوت شروع ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء میں مغربی سرحد (سابقہ صوبہ سرحد) میں پہنچ کر اس کی عملی کاروائی جاری ہو گئی جس کی امداد و قیادت حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہا نے کی (اس کی تفصیل دیکھنے کے لئے مولانا غلام رسول کی تصنیف سیرت شہید اور مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تصنیف "سیرۃ سید احمد شہید"لاحظہ فرمائی جائے جن میں اس تحریک

کے متعلق سیر حاصل تفصیل پیش کی گئی ہیں) پھر برس تک کامیابیوں کے ساتھ یہ کاروائی جاری رہی مگر انگریزی ہوا بازوں اور آپس کے
 اتفاق اور غداروں اور غیرہ کی وجہ سے ۱۸۴۳ء میں شکست ہوئی اور تحریک تقریباً فیل ہو گئی۔ انگریزوں نے شہر کا مرکز پر عرصہ دراز
 انتہائی آزار اور انتقامی لکھنیت کے اعمال جاری رکھے اور ملک میں ہندوستانیوں کی عام ٹوٹ کھوٹ اور زیادہی میں وہ انسانیت سوز
 کیں جن کی وجہ سے انگریزوں سے ملک بھر میں عام نا اہلی پھیل گئی اور ۱۸۵۷ء کا مشترکہ واقعہ پیش آیا جس میں ہندو اور مسلمان آپس میں
 ہندوستان کی آزادی کے لئے سر یکٹ ہو گئے تھے۔ بد قسمتی اور زحمتوں کی بدلی کی وجہ سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان سر
 برباد کئے گئے مگر مسلمانوں پر براہی اور مظالم بہت زیادہ ڈھائے گئے اور ہر قسم کے انتہائی مصائب سے ان کو دوچار ہونا پڑا پینچا پینچا
 مظالم اور انگریزوں کی فوجی اور اسلحہ جدیدہ کی بے پناہ طاقت کی نمائش کی بنا پر ہندوستانیوں میں جنگ کے ذریعہ انقلاب برپا کرنے کی ہمت
 رہی خوف و ہراس کا دور دورہ ہو گیا اور مظالم شیعہ کا اندھیرا بہ نسبت سابق کی گنا زاد بھیل دیا گیا۔ بالآخر تنگ ہو کر انہی انقلاب کی تحریک
 ۱۸۵۷ء میں بصورت کاٹھریں چلائی گئیں۔ اس کی رفتار بہت دھیمی تھی اور بالقابل انگریز ہر قسم کے توڑ کی کاروائی کر رہا تھا۔ تاکہ بنگالہ
 تقسیم کی نوبت آگئی۔ لاڈ کو رزن نے بنگال میں چاروں طرف افتراق کا جال پھیلا دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑاکا حکومت برطانیہ نے
 مقصد خوب حاصل کیا مگر پھر مجبور ہو کر دربار کے موافق تقسیم کے منسوخ کر دیئے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۵۹ء میں یورپی میں نگاری کا داس
 کانپور میں مسجد کا اور کلکتہ میں توپیں بناب سردار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ناننگ کا قلعہ برپا کر دیا۔ اور شریک جو عرصہ دراز سے
 کا قبلہ کو تیرہ دہائیہ چلا آ رہا تھا اس کے ساتھ مظالم اور درواک نا انصافیوں خصوصاً جنگ برائیں اور بھقان اور تقسیم ممالک اسلامیہ کے
 واقعات لگا کر پیش آئے جنہوں نے تمام ملک میں عموماً اور مسلمانوں کے قلوب میں خصوصاً بھلی پیدا کر دی۔ حضرت شیخ الہند مولانا
 صاحب قدس اللہ سرہ العزیز جن کی گہری نظر واقعات عالم اور بالخصوص ہندوستان اور شریک پر زیادہ مرکوز رہتی تھی ان واقعات سے ان
 متاثر ہو گئے کہ ان کے لئے آرام و چین تقریباً حرام ہو گیا۔ تاریخ دانی اور گذشتہ واقعات ہندو ممالک اسلامیہ ایشیا و افریقہ اور یورپ
 پر غائرانہ نظر نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ مذکورہ بالا حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان عمل میں نہ صرف خود نکلیں بلکہ ہندوستان کے ذریعہ
 قائدین کے ساتھ مل کر ایک ایسی تحریک چلائیں جس سے انگریز قوم کے منحوس قدم ہندوستان سے نکل جائیں تاکہ ہندوستان کی آزادی
 ساتھ ممالک اسلامیہ و افریقہ وغیرہ سے بھی اس کا اقتدار ختم ہو جائے۔

حضرت شیخ الہند کی مختصر تاریخ میں ہم ذکر کر کے آئے ہیں کہ مولانا مرحوم کو تعلیم و تربیت کا شرف حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی و حضرت مولانا
 گنگوہی اور مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی املا اللہ رحمہم اللہ ہمیں سے حاصل تھا۔ سالہا سال ان کی خدمت عالیہ انتہائی اخلاص اور
 بلکہ عاشقانہ جذبات کے ساتھ رہتا ہوا تھا۔ اور ان حضرات کی وہ کامل و مکمل مستیائیں تھیں جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں علم آزادی ہند کے
 شاملی تھے انہیں مجبور وغیرہ پر سے انگریزی اقتدار کا غم کر دیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی مبارک آگ شعلہ کی
 اس لئے حضرت شیخ الہند کے دل میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر ہونا طبعی امر ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں چونکہ حضرت
 اللہ علیہ کو قدرت کی فیاضوں سے ایسا قالب عطا ہوا تھا جس میں انسانی غیرت، اخلاص اور لہجہ، وطن اور قومی حیثیت، اسلام
 وغیرہ کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی۔ و ماغ ایسا قوی اطا ق عطا کیا گیا جس میں نہ صرف تقلید و تقلید کے بے شمار مسائل محفوظ رہتے تھے بلکہ
 واقعات تاریخ اور اشعار ادبیہ اردو، فارسی، عربی کے بے شمار خزانے بھی جمع رہتے تھے۔ ذکاوت اور سمجھ ایسی اتلی درجہ کی عطا

بیشک سے مشکل مسائل اپنی توجہ سے حل فرماتے تھے۔ اس لئے بیرون ہند کے مذکورہ بالا واقعات خصوصاً بلقان اور طرابلس کے بدلے اور یونانک منظم اور اندرون ہند کی انگریزوں کی روز افزوں چوہ دستوں اور شرمناک وحشت و بربریت، لوٹ کھسوٹ کی فراوانی نے انتہائی درجہ میں مایوس اور مضطرب کر دیا اور گامہ کر دیا تھا کہ عواقب اور نتائج سے بے نیاز ہو کر میدان انقلاب میں سرکھٹ حق بردوش نکل پڑیں۔ زمانہ کی تاریکیوں، موسم کی کالی کالی گھٹائیں احوال کی نزاکتیں اپنی ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کردیاں کا وٹ بن کر سامنے آئیں اور کچھ عرصہ سیاسی غور و خوض میں گذرنا مگر چونکہ پانی سر سے گذر چکا تھا اس لئے خوب سمجھ سوچ کر صرف قادیان کا اعتماد اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دیا۔

شروع شروع میں قیاس سے بھی زیادہ مشکلات سامنے آئیں سخت اور تند اندھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادِ سموم کے چھلانگ سے اپنے عقیدوں نے طے پانچے مارے۔ احباب و اقارب مایوس ہو گئے۔ ہر شخص واضح اور خیر خواہ بنکر سداہ بنا اور کیوں نہ ہوتا۔ انگریز نے اس قد پیش بندی کر رکھی تھی کہ سیاسیات کی طرف آنکھ اٹھانا سن ستاروں کا سماں باندھنا تھا۔ آزادی اور انقلاب کا اگر کوئی خواب بھی دیکھ لیتا تھا تو پتہ نہ پانی ہو جاتا تھا۔ ہوم رول یا خود اختیاری حکومت کی خواہش بھی زبان پر لانا برقی جہاں سوز سے زیادہ تباہ کن شمار کی جاتی تھی۔ برطانیہ تشددات اور مظالم نے اس قدر قلب اور دماغوں کو متاثر کر رکھا تھا کہ بہت سے نفوس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اس قدر نہ آیا جاتا تھا جتنا کہ انگریز کا خوف مستولی تھا۔ خضیعہ پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی میں ایسے ایسے لوگ کام کر رہے تھے کہ جن میں شبہ کہ نہ بھی ہے دینی اور کفر سمجھا جاسکتا تھا۔ چاروں طرف خضیعہ پولیس کا جال بچھا ہوا تھا کہ ہر طرح امید کی جاسکتی تھی کہ کوئی شخص بھی جہن جال اور ہم زبان با ہم عمل ہو سکتا ہے۔ خود صاحب جب کہ ہر شخص آزادی کے ذکر کرنے سے بھی کان پر ہاتھ دھرتا ہوا ہر حال موہانے تمام خطرات سے قطع نظر ضروری سمجھا اور "ہر جہاد ادا با دامن دشمنی درآبِ انداختیم" کہتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اس پر دھار اور ہولناک طوفان میں کود کر گئے۔ بڑے اور لوگوں کو ہرجال اور رفیق سفر بنائے گئے۔ بڑے بڑے علماء اور شائخ سے چونکہ ناامید اور مایوس تھے (جیسا کہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ شہر مولویوں اور پیروں سے امید نہ رکھنی چاہئے اور فرماتے تھے کہ بعض اہل اللہ نے مجھ کو بیضیت کی تھی) وہ جو ظاہر ہے کہ ان کو اپنی بڑائی کی وجہ سے بہت زیادہ خطرات لاحق ہوتے ہیں اس لئے اپنے تلامذہ اور مخلص سمجھ دار مریدوں کو ہم خیال بناتے رہے جن میں سے مولانا عبد اللہ سندھی مرحوم بھی ہیں۔ مولانا عبد اللہ صاحب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور فاضل شاگرد تھے۔ سمجھ اور حافظہ اعلیٰ پیمانہ کا اور بہت استقلال بے نظیر قدرت نے عطا فرمایا تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مدرسہ نظارۃ المعارف القرآن میں تعلیمی کام کرتے تھے جس کا مقصد ریخاکہ انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد و خیالات پر بولے دینی اور اتحاد کا زہر لا اثر پڑتا ہے اس کو نائل کیا جائے اور قرآن کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ ان کے شکوک و شبہات دینی اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے سچے مسلمان بن جائیں۔ حضرت شیخ الہند دہلی تشریف لے گئے اور مولانا عبد اللہ صاحب سے ملاقات کی اور مذکورہ میں فرمایا کہ "جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت تک تم اپنی اس تعلیم اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الحیال مسلمان بناؤ گے اس مدت میں انگریز ہزاروں کو لٹاؤ اور زندیق بنا دیجئے" اور واقعہ بھی یہی تھا (دیکھو ہرگز کہتا ہی ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے

بزرگوں کے عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو چنانچہ مولانا عبید اللہ صاحب کی سچے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی سکیم آگئی اور وہ عالی ہستی اور تہذیبی کے ساتھ تمام ہولناکیاں خطرات کو پس پشت ڈالنے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رولٹ اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ — مولوی عبید اللہ نے (مولانا) محمود حسن کے خیالات پر اثر ڈالا حالانکہ مولوی عبید اللہ تعلیمی پھر دیوبند میں منہبک اور مشغول تھے میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔

الغرض حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور اپنا ہم عمل بنالیا چونکہ ان کے بہت سے اصحاب اور جان بچان والے سندھ، پنجاب اور سرحد وغیرہ میں تھے انہوں نے اپنے معتمد علیہ حضرت کو بار بار سفر کر کے استوار کیا اور اس تحریک کا مہینہ بایا نیز دیوبند رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، مولانا محمد علی جوہر مرحوم، مولانا شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ حضرت کے لئے بھی مولانا عبید اللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبید اللہ کو سرحد، افغانستان، سندھ وغیرہ میں بھیجا اور اردو کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس سکیم کو جاری کیا (یہ سکیم کبھی کسی اس کا مفصل تذکرہ مولانا عبید اللہ منشی کے سیرت خاکہ میں ملاحظہ کیے) اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ جو کچھ بغیر تشدد (وائٹس) ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرنا ممکن نہیں ہے اس کے لئے مرکز اور اس

سپاہی، مجاہدین وغیرہ ضروری ہیں۔ بنابرین مرکز افغانستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانناز سپاہیوں کا انتظام ہو جائے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قومی تھیل دیوانہ ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہی سے کامیابی کی امید قائم کی گئی۔ اس بنابر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں :-

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی و قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے۔

(ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

(ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی تڑپ پیدا کی جائے۔

(د) حضرت سید احمد شہیدؒ کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ ہستنا اور چتر قندیں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں فخر اور شکر بخیاں عرصہ سے چلی آتی ہیں ان کو دہر کرنا چاہئے) انہیں مقاصد کے لئے حاجی ترنگ زئی صاحب سے بھی بار بار استعاذگی کی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جاکر ان مقاصد کے لئے کوشش کریں۔ بالآخر حاجی صاحب موصوف جنگ عظیم چھڑنے پر آزاد قبائل میں گئے مجاہدین کا جھگڑنا شناسیے زیادہ ہو

۱۱۲۷ء تک تھیں ان سے کامیابی کی تمنا ہو رہی بلکہ عیش تھی کیوں کہ اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ برسوں کی جدوجہد ایک لمحہ میں ختم کر دیتا تھا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الحداد اور مولانا عبید اللہ سندھ کے معتمد علیہ سیاستیوں کا اجمالاً تذکرہ کر دیا جائے کہ ان کے (اعتقاد حاشیہ بر صغیر اکندہ)

تحریک آزادی میں غیر مسلموں کی شرکت

حضرت شیخ الہند نے ایک مستقل مکان اپنے مکان کے قریب کراہی پر لے رکھا تھا جس کو کوٹھی کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے اس میں رت کے غیر مسلم ہم خیال دوست اور رقت انقلاب بکھڑا کرتے تھے۔ ان کو رازداری کے ساتھ خدام خاص بکھڑا دیتے تھے۔ تنہائی کے اوقات میں یا رات کو ان سے حضرت الہند کی باتیں ہوتی تھیں۔ یہ لوگ سکھ یا بنگالی ہندو انقلابی (بنگال پارکیشن) سمجھتے تھے۔ چونکہ رازداری کا بہت زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا اس لئے ان کے نام اور پتے معلوم نہ ہو سکے اور نہ حضرت

یہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تذکرے کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہے گا۔

حاجی ترنگ زئیؒ (ترنگ زئی تحصیل چارسدہ - ضلع پشاور میں اتھان زئی (عثمان عبدالغفار خاں کا گاؤں) کے قریب ایک گاؤں کا نام ہے۔ حاجی صاحب ای گاؤں کے تھے۔ اور اسی نسبت سے مشہور ہوئے۔ ان کا نام فضل واحد تھا۔ نہایت متقی اور پرہیزگار لائق تھے۔ صاحب علم و عمل اور مشہور پیران طریقت و سلوک میں سے تھے۔ حضرت مولانا شاہ نجم الدین معروف بہ بڑے ملا کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ مولانا نجم الدین صاحب بڑے ملا حضرت مولانا شاہ عبدالغفور صواتی معروف بہ حضرت صوات صاحبہ کے جانشین تھے۔ مولانا عبدالغفور صاحب ریاست صوات (صوات) کے والی تھے۔ موجودہ والی صوات جہاں قریب۔ مولانا عبدالغفورؒ کے چڑھتے ہیں۔ حضرت مولانا شمس الحجی افغانی (مظاہر) شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ ہار پور حاجی ترنگ زئی مرحوم کے پیر بھائی مولانا غلام حیدر صاحب سے بیعت اور خلیفہ نمازیں) مولانا عبدالغفورؒ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ مل کر بہادر میں حصہ لیا تھا اور ان کی کافی معاونت کی تھی۔ حاجی ترنگ زئیؒ بھی اپنے پیران طریقت کے قدم بہ قدم پیل کر غزوہ سلوک و لوہے کے مرد میدان تھے۔ اس زمانہ میں ان سے زیادہ مقبول و معروف کوئی پیرا اس علاقہ میں نہ تھا۔ یاخستان اور آزاد قبائل میں ان کے ہزار نامیدے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا عبید اللہ سندھی شیخ الہندؒ کے ایما پر بار بار ان کے پاس گئے اور ان کو مجبور کیا کہ وہ آزاد علاقہ۔ ہجرت کر جائیں اور وہاں کمان سنبھالیں۔ کیوں کہ وہاں بے شمار مجاہدین تھے۔ اور اسلحہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جنگ عظیم کی وجہ سے انگریز کی مشاقق پٹنیں پڑ گئی ہوئی تھیں لہذا میہاں آزاد قبائل میں ان کو حاجی صاحب کی وجہ سے بار بار شکست فاش ہوئی۔ بالآخر انگریز نے ڈپو میس اختیار کیا اور امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کو درمیان ڈالا اور کھوکھار دیوہ سرداران قبائل میں تقسیم کر کے یہ شہر کیا کہ بغیر امیر کے جہاد جہاد نہیں لہذا امیر حبیب اللہ جو بادشاہ ہیں ان کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔ اس دو دھاری تلوار کا اثر یہ ہوا کہ حاجی صاحب کے ہاتھوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کی طاقت کمزور ہوئی اور شکست پر شکست کھانے لگے۔ آخر کار حاجی صاحب مرحوم کو ان کے ساتھی علاقہ ہند میں لے گئے۔ وہ وہاں محفوظ ہو کر اقامت پذیر ہو گئے اور وہیں وفات پائی (رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ ورضاءہ آمین)

مولانا سمیع الرحمنؒ اصل میں قندھار کے تھے۔ آباؤ اجداد نے پشاور کے پاس سکونت اختیار کی۔ حضرت مولانا شہید احمد گلوچیؒ سے علم حدیث حاصل کیا۔ عرصہ دلاز ریاست ٹونگ میں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اخیر میں مدرسہ فتح پوری دہلی میں مدرسہ اہل ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہم خیال بنایا اور یہ خستہ بھرت کرنے کا مشورہ دے کر روانہ کیا۔ لوگوں کو غلط فہمی کے ذریعہ جہاد پر تیار کرتے رہے۔ نہایت دین، صاحب علم اور اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے۔ چونکہ حضرت شیخ کے کہنے پر (بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

سے پوچھنے کی نوبت آئی۔ علاوہ مذکور بالا حضرات کے غیر مشہور حضرات اس تحریک کے ہم خیال اور مشن آزادی کے ممبر تھے۔ جن کی تفصیل تطویل چاہتی ہے۔ اور نہ ان کے ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے نہایت سرگرم لوگوں کی فہرست

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ملازمت چھوڑی تھی۔ لہذا حضرات ان کو ماہ ماہ خرچ بھیجتے رہتے تھے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی کے ساتھ میں شریک ہوئے۔ تنگست کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کے انجمنی عبد میں انگریزوں کے احتجاج پر مولانا کے ساتھ باغستان روانہ کر دئے گئے۔ مولانا کو جلال آباد میں برٹش افغانوں نے اپنی معیت میں لے کر ہندوستانی معاملات علیحدگی کا وعدہ لے لیا۔ اب وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ کی زندگی تک مستوفی الممالک کے ساتھ اور مستوفی کو جو کام انگریز دیتا اس میں اس کی امداد کرتے۔ سردار امان اللہ خاں کے عہد میں آزاد ہو کر کابل پہنچے اور بڑے عہدوں پر مولانا منصور صاحب انصاری [ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نواسے اور میر جی عبداللہ انصاری : ۳] دیلیات علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ انیسٹوٹ کے متوطن تھے۔ دارالعلوم معینہ اجمیر میں صدر مدرس رہے۔ شیخ الحداد کے ساتھ ترجمہ قرآن میں معاون رہے۔ مولانا عبد اللہ سندھی کے نائب بن کر جمعیتہ الانصار میں کام کرتے رہے۔ شیخ کے ساتھ جہاز گئے۔ مکرمل میں گورنر جہاز غالب پاشا نے شیخ کی ملاقات کے بعد دیلیات لے کر ہندوستان کو لے تاکہ یہاں کام کر حسب رپورٹ رولٹ غالب نامان کے پاس تھا۔ پاک ہندوستان اسٹڈی ڈیپارٹمنٹ انگریزوں کو مل چکا تھا۔ پکڑو حکمران تھی۔ لہذا جیسے بدل کر باغستان چلے گئے اور وہاں سے کابل۔ انگریز کے احتجاج پر مولانا سیف الرحمن کے ساتھ روانہ کر دیئے گئے۔ مگر کسی طرح جیسے بدل کر اور نام محمد منصور انصاری رکھ کر گرفتاری سے بچ گئے اور اسی۔ ڈی کی تمام گرفتاریاں ناکام رہیں۔ امیر امان اللہ کے زمانہ میں کابل پہلے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ امیر امان اللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد کابل سے جو سرکاری وفد استنبول گیا تھا اس کے ایک رکن تھے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت خانہ میں بطور مشیر شریک ہوئے۔ کسی ایک سیاسی اسلامی رسائل تصنیف کر کے شائع کئے۔ ان کے اہل و عیال کو ہندوستان میں ڈاکٹر انصاری تیس روپیہ ماہوار دے رہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری عرصہ دراز تک "مدینہ" مجنوری کی ایڈیٹری نہایت قابلیت کے ساتھ رہے۔ پھر ممبئی جا کر روزنامہ "جمہوریت" جاری کیا۔ مولانا منصور کا انتقال کابل میں ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاه ائیل مولانا عزیز گل [تقدیر زیارت کا صاحب منبع پشاور کے باشندہ۔ دیوبند کے فارغ اور حضرت شیخ الحداد کے خادم خاص۔ صدر اور باغستان میں بار بار حضرت شیخ کے سفیر کی حیثیت سے گئے۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور دیگر خوانین کو تحریک کے ساتھ میں مولانا سندھی کے ساتھ ہوتے تھے۔ حضرت شیخ کے ہمیشہ ساتھ رہے۔ اسارت یافتہ میں بھی ساتھ تھے۔ لوگوں نے سے ڈی۔ مشہور کیا کہ حضرت شیخ ان سے بظن ہوں لیکن نہ حضرت بظن ہوئے اور نہ ہی ان کا دل میلا ہوا۔ آخر تک ساتھ رہے۔ حضرت کے راز دار خزانچی اور محمد علیہ رہے۔ حضرت کی وفات کے بعد بھی کتنا غم حضرت کے مکان پر قیام پذیر رہے۔ آپ کی خلافت میں دیوبند خلافت کیٹیجی کے صدر رہے۔ پھر مدرسہ رحمانیہ دہلی میں صدر مدرس ہو گئے بعد وہاں ایک انگریز نے اس کی خواہش پر قلعہ ازرا کج کیا اور پشاور چلے گئے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

دی ہے اور یہ پانچ شاخیں تبادلی ہیں جو کہ علاوہ مرکز دیوبند کے ہمارے علم میں آسکیں۔ ۱۔ دین پور۔ ۲۔ امرتسر۔ ۳۔ جی محمد کھنڈہ۔ ۴۔ دہلی۔ ۵۔ پکوال۔ ہر جگہ کام کرنے والے حضرات اپنی تیز تر مساعی کی اور انتہائی اخلاص کی بنا پر صدر

یہ عاشیہ صغیر گذشتہ

مولانا احمد انصاری صاحب | پانی پت ضلع کرنال کے باشندے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء رحمہ اللہ کے اولاد میں سے تھے۔ فراغت دیوبند کے بعد مختلف جگہوں میں درس و تدریس کا کام کرتے رہے۔ پھر تدریس قرآن میں حضرت شیخ کے معین بن گئے۔ ان کی دیانت و امانت پر شیخ کو بہت اعتماد تھا۔ ایسا اوقات حضرت کی ڈاک انہی کی سپرد ہوتی تھی۔ حضرت حجاز جاتے ہوئے انہیں اپنا نائب بنا گئے۔ ان کے پاس مشن کے ممبروں اور چندوں کا جبرٹ تھا۔ یہ ان کو لے کر پانی پت چلے گئے۔ اور وہیں سے تمام کاروائیاں عمل میں لائے تھے۔ حضرات اچھے کاموں میں اپنا نائب حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کو بنا گئے۔ تھے دونوں حضرات ریل کر مشن کا کام کرتے تھے۔ گرفتاریوں کے وقت پولیس کے آگے سے چند گھنٹہ قبل تمام کاغذات چھپا چکے تھے۔ ان سے بہت پوچھ گچھ کی گئی مگر انہوں نے کسی امر کا اقرار نہ کیا۔ اس کے بعد ان پر ایک مسلمان سی۔ آئی۔ ڈی سسٹم کیا گیا۔ جو نہایت اخلاص کا اظہار کرتا تھا۔ احکام شریعت پر مستعدی سے عمل کرتا رہا اور دن رات ان کی خدمت کرتا رہا۔ ان کو اس پر اعتماد ہو گیا اس نے آہستہ آہستہ تمام باقیں پوچھ لیں اور مشن کا ممبر بن گیا۔ وہ تمام معلومات حاصل کر کے غائب ہو گیا۔ اس پر ان کو گرفتار کر لیا گیا مگر چونکہ الزامات کا کوئی تحریری ثبوت نہ تھا اور نہ ہی یہ اقرار کرتے تھے۔ لہذا ان کو سیخاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد مولانا احمد پکوال کی جو کراس سے قبل معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے کہا کہ تحریک ختم ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ کے پاس مستند و تحریری ثبوت ہیں آپ بھی معافی مانگ لیں۔ ایک مہدم و دھماکا مشورہ قبول کرنا پڑا۔ اس کے چند دن بعد ان کو آزاد کر دیا گیا۔ پانی پت واپس آکر تعلیمی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے مرض رضہ پانی پت میں انتقال ہو گیا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ)

مولانا ظہور محمد خاں | سہانپور کے باشندے اور حضرت شیخ الہند کے فدائی اور مخلص شاگرد تھے۔ نہایت زیادہ سادگت و صافیت اور عیسوس کام کرنے والے سرگرم ممبر تھے۔ مشن میں ابتدا سے داخل ہوئے اور ہمیشہ ممبرانہ اور چندہ فراہم کرنے کا کام کرتے رہے۔ حضرت کو ان پر بہت اعتماد تھا۔ مدرسہ رحمانیہ روڈ کی مجلس مدرسہ تھے کہ ان کو گرفتار کیا گیا۔ الہ آباد لے جائے گئے۔ بہت پوچھ گچھ کی گئی۔ مگر یہ گونگے بن گئے کوئی جواب نہ دیا۔ دو بار دیوبند سستی کے بعد چھوڑ دیئے گئے۔ حضرت شیخ کی واپسی کے بعد چند سال زندہ رہ کر انتقال کر گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)

شیخ عبدالرحیم مرحوم سندھی | حیدرآباد کے باشندہ اور مولانا سندھی کے مخلص و فادار و مسلم دوست تھے۔ مشن کے سرگرم ممبر اور نہایت دیندار تھے۔ مولانا سندھی نے ان کو جواریا کیا تھا۔ اور مولانا سندھی کو سرحد افغانستان تک پہنچانے میں انہوں نے بہت زیادہ مدد کی تھی۔ آپاریہ کر پانی کے بڑے بھائی تھے۔ جو عرصہ دلازمہ سندھ میں رہندوں کو تبلیغ اسلام کرتے رہے۔ بہت سے لوگ ان کی مساعی سے مسلمان ہو گئے جن میں ڈاکٹر شمس الدین بھی تھے۔ شیخ صاحب نے اپنی صاحبزادی کا نکاح ڈاکٹر صاحب (بقیہ عاشیہ صغیر گذشتہ)

کہلانے کے مستحق ہوتے تھے ورنہ باقاعدہ تقریر صدر اور سیکریٹری وغیرہ کا مقتضائے وقت اور ماحول کی بنا پر نہ ممکن وقوع میں آیا۔ ہم نے جس جگہ پر بھی صدر یا ناظم وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان میں علمی استحقاق مراد ہے رسمی کاروائی مراد نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جانے کے بعد مولانا سندھی کی خط و کتابت انہی سے ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ خطوط گوڈنٹ کے ہاتھ لگ گئے اور فاش ہو گیا مگر یہ رد و پوش ہو گئے۔ اور پھر ہاتھ نہیں آئے۔ کہا جاتا ہے کہ سرسبند میں بیمار رہ کر انتقال کر گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ رد و پوش ہونے کے بعد مشن کی بڑی کچھ حیدر آباد سندھ کا کام تقریباً ختم ہو گیا۔

۸: حضرت مولانا غلام محمد صاحب - دین پوری | مرحوم موضع دین پور تحصیل خان پور سا بقریاست بہاول پور کے باشندے مشہور شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق بھرپوری کی کے خلیفہ اول تھے۔ بہت لوگ ان سے بیعت تھے۔ چونکہ مولانا سندھ پیر بھائی اور ان کے پیر و مرشد کے خلیفہ تھے۔ لہذا ان کا اور مولانا سندھی کا آپس میں بڑا گہرا تعلق و ارتباط تھا۔ گویا دین پور تحریک کا ثانوی مرکز تھا۔ مولانا عبید اللہ کابل جاتے ہوئے اپنی صاحبزادی کا انہی کے پاس چھوڑ گئے جن سے بعد میں مولانا صاحب کا نکاح ہوا۔ ان سے ایک فرزند ارجمند پیدا ہوئے۔

رشی خط مولانا غلام محمد صاحب کے پاس بھی پہنچا تھا۔ انقلاب کی تیاری کے جلسہ سامان یہاں جمع کر لئے گئے تھے اور کوشش جاری تھی کہ فوج کی بڑی مقدار خان پور اسٹیشن پہنچی وہاں کے مخلصین نے فوراً مرکز کو خبر دی۔ راتوں رات تمام انقلابیہ وغیرہ منتشر کر دیئے گئے۔ صبح کو انگریز افسر مع فوج دین پور پہنچا تو نقش کش کی کوئی چیز نہ تھی۔ رشی خط ایک ڈبہ میں پھول کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ افسر نے اس ڈبہ کو اٹھایا مگر اوپر کے کھلونوں کو دیکھ کر دیکھ دیا۔ غرضیکہ غریبی کے مطابق کوئی چیز اطراف و جوانب سے ہزاروں مخلص جمع ہو چکے تھے۔ دین پور میں گرفتار کرنے کی افسر کو جرات نہ ہوئی۔ افسر نے اسے کہ ہمارا بڑا افسر خانپور ہے اس سے چل کر رہئے۔ وہاں جانے پر کہا کہ یہاں سے وہ بہاول پور چلے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارے تشریف لے چلئے۔ غرضیکہ آپ کو اس طرح ورغلا کر لے جایا گیا۔ اور ضلع جالندھر ایک قصبہ نور محل میں نظر بند کر دیا گیا۔

۹: فرام نہ ہونے پر چھوڑ دیئے گئے۔ مولانا کے کئی صاحبزادے فاضل دیوبند ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا عبد الہادی صاحب آج کل گدی نشین ہیں۔ نہایت صالح، متقی اور مریج خلائق ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری مولانا غلام محمد صاحب کے خلیفہ

دوسرے خلیفہ تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب کو ان سے بہت وابستگی تھی۔ انہوں نے ہی مولانا سندھی کا نکاح ماسٹر محمد یوسف ٹی کی لڑکی سے کرایا تھا اور مولانا سندھی نے امروٹ روہ کہ بہت کچھ تعلیم و تربیت حاصل کی۔ موصوف خدار سیدہ اور نہایت جوتیلے بزرگ تھے۔ لاکھوں مرید تھے ان کی کرامت کا ان اطراف میں بڑا پرجا ہے۔ مولانا سندھی نے ان کا تعارف شیخ الہند سے کرایا۔ متعدد مرتبہ دیوبند آئے۔ اور حضرت شیخ بھی ان سے ملنے امروٹ گئے۔ ان کا مقام سندھ کے اس علاقہ مرکز رہا۔ گرفتار ہوئے اور بعد چند دن بعد راکر دیتے گئے۔ ایام تحریک خلافت میں انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ ورضی وارضا مولانا محمد صادق صاحب کراچی | مولانا موصوف محمد کپڑہ کراچی کے باشندے تھے۔ کتب عالیہ درسید اور (بقیہ حاشیہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دودھ حدیث حضرت شیخ الہند سے پڑھا۔ ان میں اور مولانا سبھی میں گہرے تعلقات تھے۔ مرشد کے ممبر بنے اور سرگرمی سے کام کیا۔ جنگ عظیم میں جب انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تو انہوں نے لکھنؤ اور دیگر بلوچستانی علاقوں میں بغاوت کرا دی۔ کراچی سے ہر ہفتہ عراق کو جہاز میں فورس جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے مسٹر ٹاؤنشنڈ کا ٹائر عراق میں بڑھتا ہوا ہر پٹاؤ پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ فوجیں کے بعد دیگرے ایک ایک پٹاؤ کو سنبھالتی تھیں۔ اور پیچھے سے ملک پہنچتی رہتی تھی۔ اس طرح نظام پیش قدمی کا چلنا تھا۔ جب بلوچستان وغیرہ میں بغاوت ہو گئی تو وہ فورس اور فوج جو بصرہ کو جا رہی تھی اس داخلی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سندھ میں اتار دی گئی۔ کئی ہفتہ یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسٹر ٹاؤنشنڈ اپنی فوج مندی کے نشروں میں آگے بڑھتا چلنا گیا۔ پیچھے سے ملک نہ پہنچی تو کوکٹ النہار میں محصور ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جب بغاوت فرو کرنے کے بعد ہندوستان سے فوج پہنچی تو ترکی فوجوں نے جھار نہایت مضبوط کر لیا تھا۔ نہ اندر سے کسی کو نکلنے دیتے نہ باہر سے جانے دیتے کئی ماہ محصور رہ کر مجبوراً ٹاؤنشنڈ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ جب محصور ہوا تو اس کی فوج تیس ہزار تھی۔ جب آزاد کیا گیا تو کل تیرہ ہزار تھے۔ یہاں ہندوستان میں مجبوری پر مولانا محمد صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر خاطر خواہ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کاروائی (مہاراشٹر کا شہر) میں نظر بند کر دیئے گئے۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ہاکے گئے۔ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کبڈھ کراچی کے صدر مہتمم اور صدر مدرس رہے۔ خلافت کیٹیو سندھ اور جمعیت علماء ہند کا کام نہایت اولوالعزمی سے کرتے رہے۔ ۱۸ جون ۱۹۵۳ء کو وفات پانگے (درجہ اللہ تعالیٰ)

۱۱: مولانا فضل ربی صاحب [شیخ الہند کے شاگرد و رشید اور جوشیلے لیکن مستقل مزاج تھے۔ اپنے وطن جبل پشاور میں علی غل میں مصروف تھے کہ شیخ الہند کے حکم سے پاکستان میں پہلے گئے اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے رہے۔ حاجی ترنگ زئی کے ساتھ جہاد میں برابر کے شریک رہے۔ شکست کے بعد کابل پہلے گئے۔ اور اپنی علمی استعداد اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر علمی ڈیپارٹمنٹ، افغانستان میں ملازم ہو گئے۔ اور غالباً آج تک اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ متعلقین ان کے ساتھ نہیں۔

۱۱: خان عبدالغفار خاں | موضوع اتمان زئی کے رہنے والے اور مشہور لیڈر ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خاں مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں۔ تعداد کے محتاج نہیں۔ حضرت شیخ سے ان کا بھی رابطہ تھا۔ جب کبھی ملاقات کرتی ہوتی تو دیوبند لائسن کے کسی اسکے پچھلے شیٹن پر ملاقات کرتے اور شکست کسی دور تک کا ہوتا۔ اور پھر وہاں جا کر اتر جاتے۔ اور اس طرح بار بار ہوا اور سی۔ آئی۔ ڈی کو ملحق علم نہ جو سکا۔ آج کل افغانستان میں ہیں۔

۱۱: ڈاکٹر انصاری مرحوم | ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی تعداد کے محتاج نہیں ہیں۔ تین بھائی تھے۔ حکیم بابینا (حکیم عبدالوہاب صاحب) مرحوم سب سے بڑے تھے۔ میچلے حکیم عبدالرزاق تھے۔ اور ڈاکٹر صاحب چھوٹے تھے۔ تینوں بھائیوں کو حضرت شیخ الہند سے بہت تعلق تھا۔ حکیم بابینا صاحب نے دیوبند میں تعلیم پاکر حدیث حضرت گنگوہی سے سچی دہ اور بیعت بھی ہوئے اور مرنے سے قبل وصیت کی کہ میری قبر حضرت گنگوہی کے پاس بنائی جائے چنانچہ انتقال کے بعد ان کی لاش ایک کار میں لنگہ لے جا کر ان کو حضرت گنگوہی کے قریب دفن کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری بعض مصالح کی بنا پر ظاہری طور پر دیوبند آمد رفت نہیں رکھتے تھے مگر ہمیشہ حضرت شیخ کی تحریک کے مالی معاون و سرپرست رہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے اثر و رسوخ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حادثہ صفحہ گذشتہ) کی وجہ سے گورنمنٹ کے اعلیٰ کارکنوں کے ذریعہ سے بہت سی خبریں معلوم کر لیتے تھے اور حضرت شیخ کو اطلاع دیتے تھے۔ جنگ عظیم کے شروع پر انہوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ عنقریب شیخ الہند کی گرفتاری ہو جائے گی۔ لہذا وہ حجاز چلے جائیں ڈاکٹر صاحب ہی نے حضرت اور زقار کے مکٹوں کا انتظام کیا تھا۔ ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق بمبئی تک ساتھ گئے اور جیلدار کی دیکھ بھال کی۔ اور مصاریف حجاز نقد ادا کئے۔ اور اس خیال سے کہ حجاز میں گرانی شدید ہے اور وہ رقم ختم ہو گئی ہوگی اگلے سال شیخ الہند کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود کو ایک ہزار روپے دے کر اپنے خرچ پر بھیجا۔ اور چچے گھر پر بھی مکفل فرماتے رہے۔ مولانا صاحب نے جب دہلی میں مدرسہ تعلیم القرآن قائم کرنا چاہا تو حضرت شیخ الہند خود دہلی تشریف لائے اور مولانا صاحب کی ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرایا۔ اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے تعارف کا ذریعہ بنے۔ مولانا صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

”حضرت شیخ الہند نے جن طرح چار سال دیوبند رکھ کر اہل تعارف اپنی جماعت سے کرایا۔ اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے اس غرض کی تکمیل کے لئے دہلی تشریف لائے اور ڈاکٹر انصاری سے مرافعات کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مولانا ابوالکلام اور محمد علی تروم سے ملایا اس طرح تخمیناً دو سال مسلمان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔“

ایام جنگ بلقان میں ہلال احمر کے لئے جو دو وفد استنبول بھیجے گئے تھے اس کی ایک پارٹی کے صدر ڈاکٹر صاحب تھے۔ الغرض یہ حضرت شیخ الہند کے مشن آزادی کی جو تھی براہِ خرچہ دہلی میں ہی صدر تھے۔ اور نہایت رازداری اور سرگرمی کا کام کرتے تھے۔ البتہ مولانا عبید اللہ کے دہلی آجائے اور نظارۃ المعارف قائم کرنے کے بعد ان کی ظاہری جدوجہد کچھ وسیع ہوئی۔ ان کے قابلِ بھانے کے بعد پھر قوی ہو گئی۔ ایام وادوگیر میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب کو سی ڈی نے بلایا۔ اور بہت کچھ سوالات کئے گئے۔ سوائے مالی امداد کے اور کوئی گرفت کی چیز گورنمنٹ کے پاس نہ تھی۔ ڈاکٹر اور ان کے بھائی نے اقرار کیا کہ ہمارے مذہبی پیشوا اور مرشد ہیں۔ ہم پر ان کی ضروریات جنہا کرنا اور خدمات لانافرض تھا اور ہے۔ ہم اس کو بجالانے دے لائے ہیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے کیا گیا کہ مولانا گورنمنٹ کے باغی ہیں۔ ان کی امداد کرتے ہیں۔ تو جواب دیا کہ مولانا باغی نہیں ہیں ان کو بغاوت کے ثبوت میں سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں دکھائیں تو انہوں نے فرمایا کہ یہ جھوٹ ہے قابلِ یقین نہیں ہے۔ جب حکومت کی طرف سے ان رپورٹوں کی صداقت کا اصرار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے مذہبی پیشوا اور مرشدین ہونے کی بنا پر امداد کی ہے۔ اگر حکومت مولانا کو انیسائی ہے تو میں حاضر ہوں جو سرزمین کو دینا چاہتے ہو۔ رو۔ چونکہ سچائی کے ساتھ اقرار کر لیا تھا ادھر یورپ کے تعلیم یافتہ اور ان سے بخوبی واقف تھے اس لئے حکومت نے ان پر دست درازی کرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔ ان کو بھی اور ان کے ہمراہ چھوڑ دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب اخیر تک سیاسی جدوجہد میں نہایت رومی اور مستعدی کے ساتھ شریک رہے۔ تحریکِ خلافت اور کانگریس کے ممبر رہے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ جب تک زندہ رہے قومی لوگوں کا قیام ہی ان کی کوئی ہمت ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ہزاروں کے لحاظ سے مہوار ان کا قومی لیڈروں کی آؤ بھگت اور قیام و طعام پر علاقہ حاشیہ برصغیر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لگ جاتا تھا۔ بعض اوقات ایک ایک وقت پر سنگڑوں رہنماؤں کی کوٹھی پر ہوتے اور کھانا کھاتے۔ مشہور و معروف آدمی ہیں۔ مزید بیان کی حاجت نہیں۔ کئی دفعہ جیل گئے۔ حضرت شیخ انصاری آیام انہی کے اہل رہ کر علاج کراتے رہے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ۱۹۳۶ء میں دہرہ دہن سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں انتقال کیا۔ دہلی میں مدفون ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں جو چند بڑے مخلص لیڈر ہوئے ان میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا محمد احمد چکوالی اچکوال ضلع جہلم پنجاب کے باشندے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مولانا سندی کے مخلص دوست اور روشن کے سرگرم ہمیر تھے۔ مشن تحریک آزادی ملی یا پنجویں شاخ جو کہ پنجاب میں تھی، موصوف اس کے صدر تھے۔ نہایت استقلال اور بے جگری کے ساتھ شریک سفر رہے۔ ہزاروں کو ہم خیال اور مہم بنایا۔ دیوبند میں ان کی آمد و رفت بار بار ہوئی۔ ایام دار و گیر میں ان کو بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ ابتدا میں کوئی اسلام ثابت نہیں ہو سکا۔ اور نہ آپ نے اتر اکر کیا مگر جب کاغذات گورنمنٹ کے ماتحتوں میں آ گئے اور سی۔ آئی۔ ڈی۔ نے ان کو دکھلائے تو ان کی باتوں میں اگر اقرار کرنے اور آئندہ سیاسیات سے علیحدہ رہنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہو گئے چنانچہ ان کو رہا کر دیا گیا اور یہی مولانا محمد اللہ صاحب کے ذریعہ بنائے گئے۔ اس کے بعد انہوں نے سیاسیات میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لاہور میں ایک موٹر سے ٹکرا کر زخمی ہو کر انتقال فرما گئے۔ رحمت اللہ تعالیٰ علیہ۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر عبد القوی نقمان صاحب لاہور میں کام کر رہے ہیں اور ان کی صاحبزادی حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے عقد میں آئیں۔

حضرت شاہ عبدالکريم - رائے پوری، اقبہ رائے پور ضلع بہار پور کے باشندے اور حضرت مولانا رشید احمد لنگوہی قدس سرہ العزیز - کے خلیفہ اکبر تھے، نہایت بزرگ امتقی، باخدا انسان تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی

جلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الہند کے معتمد دوست تھے۔ ابتداء میں حضرت شیخ الہند نے ان کو شریک نہیں کیا اور سالہا سال تک اپنی سرگرمی عمل میں لاتے رہے اور انتہائی انخفا کو جیسا کہ مقتضائے وقت تھا کام میں لاتے۔ مگر اس قسم کی کاروائی مخلص دوست سے کیے جھپ سکتی تھی اور ان کو خبریں ماتی رہیں۔ ۱۳۳۰ھ میں میں (مولانا حسین احمد مدنی) ہندوستان آیا، تو رائے پور حاضری کے وقت حضرت نے فرمایا کہ شیخ الہند لوگوں سے بیعت جہاد لے رہے ہیں۔ یہ تو بہت خطرناک امر ہے۔ اگر نیکو اگر خبر ہوگی تو دارالعلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور مسلمان کا یہ مرکز علیٰ اُپ جاتے گا۔ چونکہ مجھ کو (حسین احمد مدنی) اس کی خبر نہ تھی لہذا لاٹلی کا اظہار کیا اور یہ عرض کیا کہ میں خود شیخ الہند سے پوچھوں گا۔ مولانا عزیز گل نے حضرت شیخ سے عرض کیا کہ حسین احمد کو بھی اس مشن میں شامل کرنا چاہئے تو آپ نے فرمایا کہ اس کو مشورہ نہیں کرنا چاہئے وہ چند دنوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ میں نے رائے پور سے واپسی پر مولانا عبدالکريم صاحب کا مقالہ ذکر کیا تو شیخ الہند نے فرمایا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دعا فرمائی تھی کہ پنجاس برس تک یہ دارالعلوم قائم رہے۔ سو محمد اللہ پنجاس برس گزر چکے ہیں اور دارالعلوم اپنی خدمات باحسن و جود انجام دے چکا ہے۔ یہ سن کر دم بخود ہو گیا اور سمجھ گیا کہ جو واقعات نقل کئے جا رہے ہیں وہ صحیح ہیں۔ اور حضرت کا اس امر میں پختہ خیال ہو چکا ہے اب اپنے ارادہ سے عمل نہیں سکتے۔ اور نہ کوئی ہٹا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

حضرت شیخ الہند کی ابتدائی کارگزاری | اس تحریک کی ابتدا میں ضروری سمجھا گیا کہ چونکہ بغیر تشدد (دھمکیوں) ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا اور وطن عزیز کا آزاد کرانا

ممکن نہیں ہے۔ اس لئے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں۔ بنا بریں مرکز یا خستہ (آزاد قبائل) قزاق دیالیا کہ وہاں اسلحہ اور جان باز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قومی بیگل اور جانبار ہوتے ہیں اس لئے ان کو متفق اور متحد کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا اور انہیں سے کامیابی کی امید کی گئی۔ اس بنا پر ضروری سمجھا گیا کہ مندرجہ ذیل امور عمل میں لائے جائیں:-

(الف) ان علاقوں کے باشندوں سے آپس کے نزاعات قدیمہ اور شخصی اور قبائلی دشمنیوں کو مٹایا جائے (ب) ان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کی جائے (ج) ان میں جوش جہاد اور آزادی کی ٹرپ پیدا کی جائے۔ (د) حضرت سید احمد رضا

بھتہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم صاحب اور شیخ الہند کی کہیں میں تہائی میں کھل کر بات چیت ہوئی تو حضرت شیخ الہند نے ان کو اپنا ہم خیال اور ہمنوا بنالیا۔ اور دو حضرات ایک جہان و دو قالب ہو گئے۔ اور اخیر تک اسی پر قائم رہے۔ اعلان جنگ کے بعد جب شیخ الہند حجاز جانے لگے۔ تو انہیں کو اپنا قائم مقام بنائے اور اپنے کارکنوں کو تاکید کر دی کہ مولانا شاہ عبدالرحیم کو میرا قائم مقام سمجھنا اور بہت باتان امور کو ان سے مشورہ لے کر اور پوچھ کر انجام دینا اور جزوی امور کو مولانا احمد الہند انجام دیتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی طرح عمل درآمد کیا۔ حضرت رائے پوری نہایت دل سوزی۔ استقلال اور عالی ہمتی سے انتہائی رازداری کے ساتھ امور مهم کو انجام دیتے رہے۔ اور ان کے خاص خدام بھی دل چسپی لیتے رہے مگر افسوس کہ ہمارے مائٹا میں اسیر ہونے کے کچھ بعد ہی مولانا رائے پوری مر گئے اور عرصہ تک بستر مرض پر ناچارگی اور ضعف میں مبتلا رہے۔ ایام دار و گیر میں سی۔ آئی۔ ڈی کا افسران کے پاس بھی تفتیش تحقیق کے لئے گیا۔ مولانا مرحوم نے تمام الزام کی تردید کر دی اور بعض میں لاعلمی کا اظہار کیا جس پر وہ ناکام واپس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مولانا جھوٹ بولتے ہیں۔

(حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالقادر ہوئے جن کا لاہور میں انتقال ہوا ان کا مفصل تذکرہ مستقل عنوان سے علیحدہ کر رہے ہیں۔)

حضرت شاہ عبدالرحیم کے انتقال کی خبر حضرت شیخ الہند کو بڑا مہم اسارت مانا پہنچی اور حضرت شیخ کو بہت حد تک ہوا اور عرصہ تک رہا۔ ان کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی لکھا جو آپ کے قصائد میں موجود ہے۔ رحمتہ اللہ تعالیٰ و رحمۃ دار شاہ

اس وقت نان و آٹا کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور کانگریس کی جو کچھ کوششیں اس وقت تک یعنی ۱۹۱۲ تک تھیں۔ ان سے کامیابی کی تمنا موزوم بلکہ عبث تھی کیوں کہ انگریز اپنی ڈپلومیسی سے ایسی رکاوٹیں پیدا کر دیتا تھا کہ یوسوں کی جدوجہد ایک لمحہ میں خاک میں مل جاتی تھی۔

کے لوگ (جماعت مجاہدین سرحد جو کہ محتاج اور چتر قندیں مقیم ہیں اور ان میں اور قبائل میں تنفر اور شکر رنجیاں جو عرصہ سے چلی آتی ہیں، ان کو دور کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس لئے مولانا سیدت الرحمان صاحب کو دہلی سے، مولانا فضل ربی اور مولانا فضل محمود صاحب کو لٹن اور سے بھیجا اور مولانا محمد اکبر صاحب وغیرہ کو امدادہ کیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس علاقہ میں بہت سے شاگرد اور مخلص موجود تھے۔ ان سبھوں نے گاؤں گاؤں اور قبیلہ قبیلہ میں پھر کر زمین ہمواری اور ایک عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ بڑے درجہ تک کامیابی نظر آنے لگی۔ انہی مفاد کے لئے بار بار حاجی تنگ زئی صاحب سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑیں اور انگریزی حدود سے باہر جا کر ان مفاد کیلئے کوشش کریں۔ ان کو مختلف مجبوریاں درپیش تھیں۔ ان کے حل کرنے کے خیال سے تاخیر فرما رہے تھے کہ جنگ عمومی چھڑ گئی اور کچھ عرصہ بعد ترک بھی مجبور کر دیئے گئے کہ جنگ کا اعلان کر دیں۔ ان کے دو جنگی جہاز جو انہوں نے انگلستان میں بنوائے تھے اور ان پر کروڑوں اشرفیاں خرچ ہوئی تھیں انگریزوں نے ضبط کر لئے اور اسی قسم کے دوسرے غیر منصفانہ معاملات ان سے پیش آئے جو کہ ان کو جنگ میں کھینٹنے والے تھے۔ یہ ان معاملات کے علاوہ تھے۔ جو کہ طرابلس غرب اور بلقان، کریٹ، یونان وغیرہ میں قومی زمانہ میں پیش آئے تھے۔ بہر حال ترکی حکومت سے مجبور ہو کر اعلان جنگ کر دیا تو اس پر تقریباً آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا۔ انگریزوں نے عراق (لبرہ) پر عدن پر سویر پچانی قلعہ پر اسی طرح روس نے متعدد تین چار محاذوں پر اس یورش کی دوسرے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے پھنی ہوتی تھی۔ چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہند نے حاجی تنگ زئی صاحب کو مطلع کیا کہ ضروری قرار دیا کہ وہ یاغستان پہلے جائیں اور وہ ضروری کاروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز یاغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا۔ چنانچہ جب حاجی مخوم پہنچے مجاہدین کا جنگی شمار سے زیادہ ہو گیا۔ مجاہدین چتر قند (حضرت سید احمد شہید) کی جماعت میں مل گئی۔ بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی اور بفضلہ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی اور انگریزوں کو جہانی اور مالی سجد نقصان اٹھانا پڑا اور اپنے استحکامات مذمہ میں پناہ لینا ناگزیر ہو گیا۔ اس پر انگریز نے بالمقابل متعدد مذکورہ ذیل کاروائیاں شروع کر دیں۔ (الف) فوجوں کو اطراف ہندوستان سے جمع کر کے بڑی مقدار میں سرحد پار بھیجا۔ (ب) عوام میں پروپیگنڈا کرنا اور جہاد نہیں ہے، جہاد بغیر بادشاہ کے نہیں ہوتا۔ بغیر بادشاہ کے جہاد حرام ہے۔ (ج) پانی کی طرح روپیہ خرچ کرنا اور اپنے لوگوں کو قبائل کے سرداروں کے پاس بھیجنا اور مال و زر بے شمار دے کر ان کو جماعت مجاہدین اور حاجی صاحب موصوف سے لٹا (د) عوام میں تبلیغ کرنا کہ مسلمان سرحد اور افغانوں کے بادشاہ میر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بیعت جہاد کرنا چاہئے۔ اور اس وقت تک انتظار ضروری ہے جب تک وہ جہاد کا حکم بلند نہ کریں (ہ) اس وقت مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ کاغذوں پر بیعت جہاد کر کے دستخط کریں۔ اور امیر کابل کے نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں کے دفتر میں یہ کاغذات بھیجیں (و) امیر حبیب اللہ خاں کو مختلف وعدوں کے سبب باغ دکھلا کر اور بے شمار اموال اور نقد روپیہ دے کر اپنی طرف مائل کرنا اور جہاد کے لئے کھڑے ہونے سے روکنا اور یہ وعدہ کرنا کہ اس جنگ سے فارغ ہو کر تمہارے لئے فلاں فلاں وعدے پورے کر دیئے جائیں گے۔ ان اور ان جیسی دیگر دھوکہ دہیوں کا اثر ہونا طبعی طور پر لازمی تھا۔ چنانچہ اثر ہوا اور بہت بڑا

ہوا۔ مگر اتنا نہ ہوا اگر مجاہدین کو رسد اور کار توں ملے گی نیز دیگر اسلحہ کی کمی کی مشکلات نہ پیش آجائیں۔ ادھر یہ کیا گیا کہ مسلمانان ہند کے چیجان اور اضطراب روکنے کے لئے ہندوستان میں اعلان کیا گیا۔ (الف) ترکوں کو جنگ کے لئے ہم نے مجبور نہیں کیا بلکہ ترک ان خود جنگ میں داخل ہوئے ہیں اور ہم تو ان کے اعلان کی وجہ سے جنگ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ حالانکہ ترکوں کو جنگ پر انگریزوں نے مجبور کیا تھا۔ جیسا کہ ہم ذکر کر آئے ہیں۔ (ب) یہ جنگ سیاسی ہے مذہبی نہیں ہے حالانکہ فتح بیت المقدس پر وزیر اعظم انگلستان لارڈ جارج نے اپنے بیان میں اس کو صلیبی جنگ قرار دیا تھا۔ (ج) ہم مسلمانوں کے مقدس مقامات جحدہ۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ۔ بغداد وغیرہ پر بمباری نہ کریں گے اور نہ کوئی اثر جنگ کا ان مقامات مقدسہ پر پڑنے دیں گے۔ مگر بالکل اس کے خلاف عمل کیا گیا۔ جس کا تذکرہ ہم مفصل طور سے بعد غنیہ کے باب میں کر چکے ہیں۔ (د) ترک مسلمانوں کے خلیفہ نہیں ہیں حالانکہ ۱۸۵۷ء میں سلطان عبدالحمید مرحوم فرمان مسلمانوں کے لئے انگریزوں سے نہ لڑنے اور ان کی اطاعت کرنے کا بحیثیت خلافت حاصل کیا اور ہندوستان میں پروپیگنڈا کیا کہ خلیفہ کے حکم پر جلد مذہبی حیثیت سے فرض ہے چنانچہ امیر عبدالرحمن خاں والی کاہل مرحوم اپنی تزک میں لکھتے ہیں کہ اسی فرمان خلیفہ کی بنا پر تیسری قبائلی ٹھنڈے پڑ گئے۔ بہر حال ترکوں کے خلیفہ اسلام نہ ہونے اور عدم استحقاق خلافت پر فتوے لکھوائے گئے اور بار بار حضرت شیخ الہند کے سامنے دستخط اور تصدیق کے لئے پیش کئے گئے، مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور بھرے مجمع میں پھینک کر لکھنے والوں کو بہت بڑے الفاظ کہے۔

حضرت شیخ الہند کا سفر حجاز | حضرت شیخ الہند کے پاس برابر کیفیات جہاد کی تخریب آتی رہتی تھیں ابتدائی کمزوریوں میں کارکنان مرکز کا پیغام آیا کہ رسد اور کار توں ملے گی ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں۔ جب تک ان دونوں کا انتظام نہ ہو جہاد حریت جاری نہیں رہ سکتا۔ بعد ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں ہے مگر رسد اور اسلحہ کے بغیر ہم بالکل بے دست دیا ہیں۔ ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے تمہیار ہو جاتا ہے۔ اگر کار توں اور رسد کافی مقدار میں ہو تو توپوں اور مشین گنوں، ٹینکوں وغیرہ کا ہم سبھی مقابلاً کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیے چنانچہ اس امر کی بنا پر حضرت شیخ الہند کا ارادہ بدلا اور مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو مستقبل پہنچنا ضروری قرار دیا مولانا عبید اللہ صاحب کے کابل جانے کی تفصیل ہم ان کی ذاتی دائری سے ناظرین کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور حضرت شیخ الہند کے حجاز جانے کی تاریخی تفصیل ہم سفر نامہ مالٹا میں لکھ چکے ہیں۔ ان کے ارادہ کی ضرورت نہیں۔ ہاں سیاسی کارناموں کو باقہ

لے سفر نامہ "مالٹا" کا وہ مضمون جس کے متعلق اوپر اشارہ ہوا وہ یہ ہے۔

مولانا مرحوم کا حجاز کو روانہ ہونا ۱۳۳۳ھ میں قصد فرمایا۔ چونکہ مولوی عزیز گل صاحب خاص خادم کو اپنے کی طرف جانا اور اپنے اکابر سے ملنا اور اجازت چاہنا ضروری تھا۔ اس لئے ان کی واپسی کا انتظار اربعہ ماہیں ہو گیا۔

وقت ہم نے اس میں چھپایا اور ذکر نہیں کیا۔ اور بعض امیر کا جان بوجھ کر انکار کیا تھا۔ کیوں کہ ماحول اس وقت میں اسی کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) فرمایا۔ اس مدت میں سامان سفر قدرے بھیا ہو گیا۔ عالی جناب حکیم عبدالرزاق صاحب غازی پوری برادر بزرگ جناب ڈاکٹر انصاری نے اس سفر میں نہایت زیادہ امداد دی جس کے حضرت مولانا مرحوم ہمیشہ ممنون منت راکے حکیم صاحب موصوف مولانا سے پہلے بمبئی پہنچ گئے اور ہر قسم کا ضروری سامان سفر نہایت فراخ دلی کے ساتھ مہیا کر دیا۔ بلکہ جائے قیام اور ٹکٹ وغیرہ کا بھی انتظام کافی طور پر کر دیا۔

مولانا کے رہنمائے سفر | مولانا کی روانگی ایک معمولی شخص کی روانگی نہ تھی۔ بہت سے ارباب عقیدت استغاضہ بخت کے لئے ساتھ ہو سکے جن میں سے خاص خاص حضرات حسب ذیل ہیں۔

مولانا رفعتی حسن صاحب پٹنہ پوری۔ مولانا محمد سہول صاحب بھگل پوری۔ مولوی محمد میاں صاحب انجٹوی۔ مولوی عزیز گل صاحب ساکن زیارت کالا صاحب۔ حاجی خان محمد صاحب مرحوم۔ مولوی مطلوب الرحمن صاحب دیوبند۔ حاجی محبوب خان صاحب سہارن پوری۔ حاجی عبدالکریم صاحب سرہنجی۔ مولوی وحید احمد صاحب۔ وغیرہ۔

مولانا کے سفر کی نسبت افواہ | عام لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ مولانا دیوبند سے ہجرت کر کے جا رہے ہیں۔ اور اب ہمیشہ حسین شریف میں عمر بھر فرمائیں گے اور چونکہ مولانا مرحوم نے ہجرت وفات اپنی جائیداد شرعی طریقہ پر ورثہ میں تقسیم کر دی تھی۔ اس لئے اور بھی لوگوں کو اس خیال سے تقویت ہوئی۔ مولانا نے ایک عرصہ تک کے لئے اپنے گھر کے مصارف کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ اس خاص افواہ کی وجہ سے پراسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا مجمع زیارت کے لئے موجود رہتا تھا۔ طلباء و مدرسہ نے اپنے اپنے اعزاء کو تاریخ روانگی سے تار کے ذریعہ مطلع کر دیا تھا۔ غرضیکہ پیش پر ہزاروں کا مجمع ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مصافحہ کرنا بھی سخت دشوار تھا۔ شایعت کرنے والے بھی بہت سے ساتھ ہو گئے تھے۔ وہی میں مولانا مرحوم نے گاڑی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر جا کر پیار بھی نوش فرمائی اور بہت تھوڑی دیر قیام فرما کر گاڑی کے وقت اسٹیشن پر آ گئے۔ ناگرہ ریلوے سے روانہ ہوئے۔ راستہ میں نظام۔ رانڈیر میں بھی قدرے قیام فرمایا۔ کیوں کہ ان مقامات پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خاص خاص لوگ تھے جنہوں نے سخت اصرار فرمایا تھا۔

رانڈیر سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچے اور انجن محافظ حجاج کے آفس میں جس کو حکیم عبدالرزاق صاحب نے پہلے سے آگاہ کر رکھا تھا۔ قیام فرمایا۔ وہاں بھی مولانا کے زائرین کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا۔ اگر انجن کے کارکن انتظام کافی نہ کرتے تو غالباً مولانا کو آرام کی صورت ممکن ہی نہ ہوتی۔

بمبئی سے مولانا کی روانگی | جو تاریخیں اگر جہاز کی روانگی کی تھیں، اس کے ٹکٹ مولانا مرحوم اور ان کے ساتھیوں کے لئے کے لئے تھے۔ مولانا اور ان کے بعض خاص خدام کے ٹکٹ سیکندھ کلاس کر کے ادربائی ماندہ چھتری یا متی کے تھے چنانچہ بروز شنبہ ۲۷ ذی القعدہ ۱۳۳۳ھ کو جہاز پر سوار ہو کر جدہ کو روانہ ہو گئے۔ چونکہ اکثر مراہیل (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

چاہتا تھا۔ اب چونکہ مواقع نازل ہو گئے ہیں اس لئے صرف اسی کو ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت

(یعنی حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی طبیعت درباری سفر سے مانوس نہ تھی۔ اس لئے گویا ان کو بد مزگی اور جگر وغیرہ کی شکایت پیش آئی جس کی وجہ سے مہربان اور عمدہ غذائیں اپنے موقع پر صرف نہ ہوئیں جن کی بڑی مقدار حکیم صاحب نے مولانا اور ان کے رفقاء کے لئے تیار کی تھی، بلکہ بہت سی چیزیں ضائع ہوئیں۔ بوجہ طور جنگ ان دنوں قریطینہ جزیرہ کامران سے اٹھایا گیا تھا۔ اور قریب جتدہ کے مقام سعد میں ہوتا تھا۔ چنانچہ وہاں جہاز نے لنگر ڈالا اور بحیرہ خونی مولانا اور ان کے رفقاء اترے۔ اور ایام قریطینہ نہایت عافیت سے انجام دے کر جتدہ پہنچے۔

خفیہ پولیس کی افواہ | بمبئی میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے مولانا کے رفقاء سے یہ کہا کہ تقریباً آٹھ دس آدمی ہمارے ساتھ خفیہ پولیس کے ہیں۔ ان سے احتیاط رکھنا (ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ بیان صحیح تھا یا غلط) چونکہ یہ بات اہل جہاز کو معلوم ہو چکی تھی کسی شخص نے جو کہ غالباً جتدہ یا مکہ معظمہ کا رہنے والا تھا۔ اس کو ٹرکی پولیس تک پہنچا دیا۔ اور جو لوگ مشتبہ تھے ان کے نام و نشان بتا دیئے اور کہہ دیا کہ یہ لوگ مولانا پر مسلط ہو کر آئے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کا خیال نہ مولانا کو تھا اور نہ ان کے رفقاء کو۔ ٹرکی پولیس نے فوراً ان لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اور مولانا مرحوم کی خدمت میں پولیس کا افسر تصدیق کرانے کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا خود آؤ آؤ میں نہ گئے مگر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب وغیرہ کو بھیج دیا۔ چونکہ واقعی طور پر کوئی یقینی بات تھی ہی نہیں۔ اس لئے مولوی صاحب موصوف نے یہی بیان دیا کہ ہم کو کوئی یقین ان لوگوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہونے یا مولانا پر مسلط کئے جانے کا نہیں ہے۔ ہم کوئی شہادت ایسی نہیں دے سکتے جس کا ہم کو علم نہیں۔ مگر پولیس ٹرکی نے اس جواب کو اس پر حمل کیا کہ چونکہ ان لوگوں کو پھر ہندوستان جانا ہے اس لئے صریح طور پر اپنی معلومات کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ الحاصل ٹرکی پولیس نے ان لوگوں کو زیر حراست رکھا اور اسی طرح ان کو جج کو کر کے کہا کہ اگر تم اپنے محافظ سپاہیوں کا خرچ دو تو تم کو مدینہ منورہ کی زیارت کی اجازت مل سکتی ہے ورنہ تم کو ہندوستان واپس ہونا پڑے گا چونکہ ان لوگوں نے پاس اپنا خرچ نہ تھا۔ اس لئے وہ بمبئی واپس کر دیئے گئے۔

دوسری افواہ | بعض خفیہ پولیس کے افسروں کا بیان ہے کہ جب مولانا مرحوم بمبئی پہنچے تو وہاں کے افسر پولیس کے پاس تیار کیا کہ مولانا کو بمبئی میں گرفتار کر لیا جائے۔ اور آگے جانے نہ دیا جائے۔ چونکہ مولانا کے پاس بہت بڑا مجمع رہتا تھا۔ اس لئے بمبئی کے مقامی حکام کو بوجہ کا خوف ہوا۔ اور اس وجہ سے انہوں نے عملدرآمد سے پہلو ہٹا دیا۔ پھر دوسرا حکم روانگی کے بعد جہاز کے کپتان کے پاس پہنچا کہ مولانا کو جتدہ میں اترنے نہ دیا جائے بلکہ جہاز پر ہی گرفتار کر لیا جائے۔ مگر یہ حکم اس کے پاس اس وقت پہنچا جب کہ مولانا جزیرہ سعد میں برائے قریطینہ اتر چکے تھے۔ اس لئے ہمیں معذوری رہی (ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دونوں بیان کہاں تک صحیح ہیں۔ مگر ہم کو معذور قرار سے معلوم ہوئے۔

مولانا مرحوم کی جتدہ سے روانگی اور مکہ معظمہ میں داخلہ | ۲۷ ذی قعدہ ۱۳۳۳ھ کو مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ (یعنی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حجاز جانے کا ارادہ کر لیا۔ پہلے سے کوئی تذکرہ نہ تھا۔ فوراً روانہ ہو گئے۔ اب حکومت کا شبہ اور قوی ہو گیا۔ پھر نہ ترک جنگ کر رہی ہے۔ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر ساز باز کر لیں گے۔ اس لیے ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا چاہیے۔ مگر وہ ملک کی اندرونی ہیجان اور فتنے سے اس زمانہ میں بہت بچتی تھی۔ اس لیے ان کی گرفتاری کے احکام جاری کئے گئے۔ مگر اس طرح کہ یہاں کی نسبت نہ آئے حضرت کے سفر کی خبر نہ تھی۔ ہر جگہ تار پیلے کئے تھے۔ چنگش پر آدمیوں کا جھگٹا ہر جگہ تھا۔ اس لیے راستہ میں کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ بمبئی پہنچے تو وہاں بھی لوگوں کا جھگٹا لگا رہتا تھا۔ گرفتاری کے لیے گورنر نے بمبئی کے نام گورنر یوپی کا تار پتھا تو جہاز روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر یوپی نے واسطہ دہلی کی حکومت کے گورنر کو تار دیا کہ مولانا محمود حسن صاحب کو جہاز سے تار لہ کر یہاں بھی لوگ ڈاکٹر انصاری صاحب کے گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے تار میں اس بات پر کہ وہی کہ جہاز ان سے روانہ ہو گیا۔ پھر تار جتہ میں جہاز کے کپتان کو دیا گیا کہ ان کو جہاز میں گرفتار کرو۔ اتنے دنوں۔ مگر اس وقت گورنر جہاز کو یہ تھا کہ جتہ سے پہلے حجاز کو جزیرہ بعد میں تار لہ کرکہ منظر پتھا پایا ہے۔ اس لیے وہ تار کپتان کو اس وقت بلا۔ جب کہ تمام حجاز جزیرہ میں اس وقت تھے۔ البتہ حضرت شیخ الہند کے ساتھ متحدہ دسی آئی ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے کر دیئے گئے تھے۔ تاکہ وہ تمام حرکات و کلمات کی اطلاع اور نوٹ کرتے رہیں۔ مگر جزیرہ بعد میں اترے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کر دی کہ فلاں فلاں شخص انگریزوں کے سی آئی ڈی ہیں۔ ترکی پولیس نے گرفتار کر لیا اور اپنی حفاظت میں چلا کر الہندوستان واپس کر دیا تاہم کچھ غمی لوگ باقی رہ گئے۔ بہر حال گرفتاری کی کوششیں بھی حضرت شیخ الہند اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگے آگے اس طرح محفوظ ہو کر مکہ منظر پہنچ گئے۔

مکہ منظر میں بہت سے ہندوستانی تاجر کام کرتے ہیں۔ مگر دہلی کے تاجر جان مرحوم کے خاندان کی وہاں خصوصی حیثیت ہے تجارت بھی ان کو پیار ہے اور دین داری اور علمی حیثیت بھی ان کی اونچی ہے اور حکام میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس خاندان کا سر

حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی سے

مولانا شیخ الہند کی ملاقات

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین مجاہدین ستیانہ خیر سے بھی قدیمی تعلق ہے۔ اس لیے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حافظ عبدالجبار صاحب سے جو کہ اس خاندان میں محمد اور جبار اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے بڑے اور ان سے۔

ملاقاتوں کا ذکر کر کے گورنر حجاز غالب پادشاہ سے ملاقات کرانے کی اطلاع انھوں نے اسی وقت ایک ہندوستانی معاملہ فہم نوجوان تاجر کو جو کہ اس تجارت کرتے تھے اور ترکی اور عربی زبان سے خوب واقف اور ان کی ترکی اسلحہ کے پڑھ پڑھتے تھے۔ بلایا۔ اور حضرت شیخ الہند کے ساتھ

گورنر حجاز غالب پادشاہ سے

ملاقات

وہ گئے اور غالب پادشاہ سے ملاقات کرادی اور وہاں حضرت شیخ الہند کے کس انکار تاجر کے غالب پاشا کو بھیجا۔ غالب پاشا نہایت سچے تمام باتوں کو سننے نہ بے مولی ملاقات کے بعد کہا کہ آپ کل اسی وقت تشریف لائیں۔ اس وقت میں جواب دوں گا۔ حضرت شیخ الہند واپس آگئے۔ غالب پادشاہ نے ہندوستان کے معزز تاجروں سے بالابالہ تحقیق کی کہ مولانا محمود حسن کی حیثیت ہندوستان میں کیا ہے حضرت کی علمی اور علمی حیثیت و شہرت اور قربیت کی بہت اونچی شان بتلائی۔ لہذا اگلے دن حضرت خب ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ زیادہ اعزاز کیا۔ اور نہایت تیاک سے ملے اور جو کچھ حضرت نے کہا۔ قبول کیا۔ دیکھ کر تحریک اور شن آوازوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں

نے فرمایا کہ میں انور پاشا سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا۔ ان سے ملنے کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ انور پاشا ہی کا کہنا ہے۔ مگر حضرت نے انور پاشا سے ملنے کا اصرار کیا تو انھوں نے ایک تحریر تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اپنی طرف سے شہادت گورنر جنرل لکھ کر دی اور ایک تحریر گورنر مدینہ بھری پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ متحدہ علیہ شخص ہیں۔ انکا احترام کرو اور ان کو استنبول انور پاشا کے پاس پہنچا دو اور ایک تحریر انور پاشا کے نام لکھ دی کہ یہ متحدہ علیہ شخص ہیں۔ ان کے مطالبات پورے کیجئے۔ پھر ایک آزادی کے متعلق حضرت شیخ کو ہدایات کیں۔ کہ اس تمام ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ پر آمادہ کریں۔ ہم ہر قسم کی امداد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا۔ ضرور کریں گے۔ حضرت جلیجی کی مجلس مشفقہ کی ترہم اور ہمارے حلفاء عربی اور آسٹریا وغیرہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے لیے پوری جدوجہد کریں گے۔ ایسا نہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان بے رحمت پڑھائیں اور انگریزوں کی باتوں میں اگر اس کے انتداب (مدیٹ) یا اس کی تابعداری پر راضی ہو جائیں۔ تمام ہندوستانیوں کو جباروں، عام مجبور، تقریروں، تحریروں میں اندرون ہند اور بیرون ہند ایک زبان اور ایک قلم جو ہر کسی کے مطالبہ کو لکھنا چاہئے اور حسب تک مقتدر حاصل نہ ہو جائے۔ اس کا پروپیگنڈا پوری طرح جاری کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو واپس جانا اور آپ میں اس اتفاق اتحاد کے ساتھ مطالبہ کرنا ازل سے ضروری ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت انگریز مجھ کو نہایت خطرناک نظر سے دیکھتے ہیں۔ میں اگر ہندوستان جباروں کے ہاتھ ہی میں گرفتار کیا جاؤں گا۔ مگر میں اپنے رفقاء کو اس کام کے لیے تیار کر کے ہندوستان بھیجا ہوں۔ اگرچہ وہاں کی عاقبتیں کا خیال وغیرہ اس پر ملدراہ کر رہی ہیں۔ مگر آپ کے حکم کے موافق کوشش زیادہ ہوگی اور پہلے سے زیادہ زور وادھر لیتے ہوئے مطالبہ جاری کیا جائے گا۔ میں بفضل ابلا ہا ہندوستان کی مغربی حدود میں جانا چاہتا ہوں۔ وہاں میرے دشمن کیے لوگ کام کر رہے ہیں۔ ان میں مل کر کام کروں گا۔ اس میں ملاقات کے بعد جب تک وہ مکہ مظہرین رہے۔ دو تین ملاقاتیں نہایت رازدارانہ ہوں گی۔ مگر مسئلہ کے ہندوستانی باشندوں یا انگریزی سی آئی ڈی کو خبر نہ ہو سکی جو غالب پاشا طائف کو اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ کو روانہ ہو گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ارادہ تھا کہ مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ دن قلم کے استنبول روانہ ہوں گے۔ اپنے تمام ساتھیوں مولانا فتح حسن صاحب، مولانا محمد میاں صاحب مولانا سہیل صاحب وغیرہ کو آخری خاندان میں مدینہ منورہ سے ہندوستان کو روانہ کر دیا۔ جبہ پہنچ کر ان کو کوئی جہاز ہندوستان جانے والا نہ ملا۔ اس لیے وہاں ٹھہرنا پڑ گیا۔ مدینہ منورہ میں وقت مولانا مفتی حسن صاحب کو دیر بند کے مرکز پر کام کرنے کی ہدایات فرمائیں۔ اور بہت سے خفیہ امور پر مطلع فرمایا اور مولوی محمد میاں صاحب کو جو کہ بعد میں ہندو منصور انصاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ خاص شخصوں کی نگرانی سپرد کی۔ غالب پاشا کی تحریر بھی ان ہی کو دی گئی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اگرچہ پہلے سے اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے۔ مگر مدینہ منورہ میں پہنچ کر بالکل متحد اور ہم فرا ہو گئے تھے۔

میرا بیسیا میں داخل ہونا

میں اس وقت تک نہ مشن آزادی ہند میں شریک ہوا تھا نہ حضرت شیخ الہند کی عالمی سرگرمیوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے ایک خصوصی مجلس میں مجھ کو اور مولانا جلیجی احمد صاحب کو طلب و فرما اپنے خیالات اور علمی کارروائیوں سے مطلع فرمایا۔ میں اس وقت تک علی جدوجہد میں مشغول تھا۔ اگرچہ مدینہ منورہ میں اس سے پہلے جب کہ محاذ منورہ کے لیے مطہرین والہ طوں کو بھیجا شروع کیا گیا تھا۔ ترغیب جہاد پر توجہ کرنے کی فوریست آئی تھی اور اس سے متاثر ہو کر کہ لوگ اس محاذ پر جہاد کے لیے مدینہ منورہ سے گئے تھے۔ مگر اس کے علاوہ علی جدوجہد کی فوریست نہیں آئی تھی۔ اب حضرت شیخ الہند کے واقعات اور خیالات سن کر میں بھی متاثر ہوا۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بھی۔ یہ وقت میری سیاسیات کی ابتداء اور سہ ماہی کا وقت تھا۔ یہی وقت حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی ابتدائی شرکت کا ہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وارضاء آمین۔ اس کے بعد مولانا خلیل احمد صاحب جب تک سحرا

میں رہے۔ بالکل متفق اور ہم فرار سے ہتھیاری اور پیش اگر رہتے ہیں کچھ لوگ حضرت مولانا خلیل احمد کے ساتھ جہاز میں لاہور کے باشندے رفیق رہے تھے۔ ان میں سے دونوں ان مدینہ منورہ میں وہ گئے۔ ہندوستان واپس نہیں ہوئے۔ جب تک عام حجاج مدینہ منورہ میں مقیم رہے کوئی تعینات ترک پولیس نے نہ کی۔ مگر قافلہ رواد ہوتے کے بعد محسوس شروع اور ہر باقی رہنے والے کی دلچسپی بھال شروع ہوتی۔ وہ دونوں لاہوری نوجوان پولیس انسپکٹر کی نظر میں مشتبہ ثابت ہوئے۔ پولیس نے ان کو گرفتار کر لیا۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سیدھے سادھے بزرگ تھے ان کو ان دونوں کے متعلق حسرت ظن تھا۔ مولانا نے ان کو گورنر مدینہ کے یہاں برأت کی۔ اس لیے پولیس محسوس نے مولانا کو بھی مشتبہ قرار دیا اور گورنر مدینہ منورہ لہری پاشا کو نہ صرف ان دونوں افراد کی طرف سے بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب کی طرف سے بھی بدظن کا شروع کیا۔ اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے جہد سے ہر ڈاک میں طویل طویل خطوط پانچ پچھ پچھ ورقوں پر بھیجے شروع کئے۔ وہاں ان کو کوئی کام نہ تھا حضرت شیخ کو بلا دھوکے مضامین لکھتے تھے اور ہر ایک بوجہ جنگ ڈاک خانہ میں کوئی خواہ مخواہ بی بات کی نہیں لیا جاتا تھا قرائفوں نے دیوین کے ذریعے بھیجنا شروع کیا۔ وہی ڈاک لائے والا بدوی بھی طریقہ پر لاتا تھا۔ پوسٹ آفس کی مہر اور گٹ ان پر نہیں تھے۔ یہ طریقہ حجاز میں جاری تھا۔ وہ ڈاک لائے والا بدوی کچھ اجرت لیکر مکتوب الیہ کو پرائیویٹ خط پہنچا دیتا تھا۔ کسی طریقہ سے وہ خطوط بدوی سے پولیس محسوس نے حاصل کر لیے۔ وہ خطوط سن سہ سہ تھے۔ تو پولیس محسوس کو ان کے ترجموں سے اور بغیر پوسٹ آفس آنے سے شبہ ہوا۔ اس نے گورنر مدینہ لہری پاشا کو بدظن کر دیا۔ جب کہ ہم سب مطمئن تھے۔ پولیس محسوس کی طرف سے گورنر مدینہ طلبہ کے پاس یہ شکائیتیں پہنچیں اور وہ ان سب حضرات سے بدظن ہو گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت شیخ الہند صاحب اس سے ملنے اور استنبال جانے کے لیے اتفاقاً نہ گئے۔ تو اس کا رنج بدلا ہوا پایا۔ اور دیکھا کہ وہ غیر اطمینان کثیر باقی کر رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کارروائی کی گئی کہ دونوں حضرات شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب کو آفس میں بلا کر پوچھ گچھ کی گئی کہ دونوں جہالت ظلم بند کے شام کو بھیجے گئے۔ اس لیے سب کو فکر ہوئی کہ کبیں کوئی فتنہ سامنے نہ آجائے۔ جنگ کا زمانہ ہے۔ ہر ایک حکومت اس وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتی ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ان احوال کو دیکھ کر اسی ترجمان دہلی تاجر کے واسطے سے غالب پاشا کو خط لکھا کہ یہاں گورنر مدینہ رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ پولیس محسوس نے گورنر مدینہ کو تشہید کر دیا ہے۔ کیونکہ اس کو ہمارے مخالفین نے بدظن کر دیا ہے۔ اس خط کے پاتے ہی غالب پاشا نے گورنر مدینہ کو نہایت تاکیدیں خط لکھا کہ مولانا محمود حسن صاحب بہت بڑے اور معتبر علیہ شخص ہیں۔ میں نے پوری تحقیق کر لی ہے۔ ان پر ہرگز شبہ نہ کرو۔ اور ان کے شناسکے مطابق ان کو انور پاشا کے پاس روانہ کرو۔ اس سے گورنر مدینہ منورہ کا رویہ اور خیال یک بارگی بدل گیا۔ اور اس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو بلا کر معذرت کی اور پولیس محسوس کو بلا کر تنبیہ کی اور حضرت شیخ الہند کو کہا کہ آپ تیاری کریں۔ جب آپ تیار ہو جائیں گے۔ بھیج دیا جائے گا۔ اس کے ایک دو دن بعد خبر آئی کہ انور پاشا اور جمال پاشا مدینہ منورہ آ رہے ہیں۔

اس وقت تک مدینہ حجاز طرے جاری تھی۔ ٹرین آتی جاتی تھی۔ تاری بھی جاری تھا۔ یکایک نا اکیہ دونوں وزیران جنگ دورہ کرتے ہوئے کل کے مدینہ منورہ پہنچ رہے ہیں۔ ہم نے بھی عرضی تیاری کی۔ حکومت مدینہ منورہ بھی استقبال کی تیاری میں مشغول ہو گئی اور اہل شہر بھی استقبال کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ چونکہ انور پاشا اس زمانہ میں حکومت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے اور جمال پاشا تھے فتن (ڈوٹرین) کے جو کہ محاذ جہنمی اور غری پرمینی میدان سیرینیا، حجاز، یمن تھا، لکنا تھے۔ اس لیے انرشاہ کا فریضہ تھا کہ مرکز کی خبر گیری رکھتے ہوئے ہر محاذ کی محافظت کریں اور جمال پاشا

برکت اپنے نماز کی خبر گیری ضروری تھی۔ اس لیے انور پاشا تمام محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے حسب محاذ و جزئی پر پہنچے اور سورہ دسیر بشام، اور سورہ
 نوح سے فارغ ہوئے تو ضروری معلوم ہوا کہ بادشاہ و وہاں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کا شرف بھی حاصل کر لیں۔ اس لیے مدینہ
 منورہ کی حاضری کا ارادہ کیا گیا۔ اور جب کہ مبارک دن اس کے لیے مقرر کیا گیا چنانچہ جو بھی حج کو تقرر کیا، ۹ یا ۱۰ بجے وہ اسپتال ٹرین جس میں یہ دونوں وزراء
 ان کے رفقاء تھے۔ حسب اعلان مدینہ منورہ پہنچی۔ وقت عین سے پہلے مشاقق قانون ملاقات اور وزرائین کی بلے شمار خدا نے تمام اسٹیشن اور اس کے
 بے کمر و باغداد۔ اہل شہر اور حکومت اور فوج کی طرف سے مجلس کا انتظام کیا گیا تھا۔ حسب دونوں حضرات ارے تو اسٹیشن کے بڑے ہال میں
 وہاں پر پہنچنے کی طرف سے انڈین پرنس کیا گیا۔ چار کا پہلے سے انتظام تھا۔ روس، شہر اور معززین کا تعارف کر لیا گیا۔ انڈین کا جواب دینے کے
 بعد عربی کی طرف روانہ ہوئی۔ چوتھے کے وقت قریب لگیا تھا۔ اس لیے یہی قصد کیا گیا کہ زیارت حضرت علیہ السلام سے فارغ ہو کر مسجد نبوی میں ٹھہرے
 نماز جمعہ سے فراغت کے بعد قیام گاہ پر جاویں۔ مجلس کی روانگی کے وقت منٹ سارانی کے لیے پیش کی گئی۔ تو انور پاشا نے انکار کر دیا۔ اور
 غلامانہ طریق سے بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ اس لیے یہ بدل چلیں گے۔ اہل شہر نے پہلے ہی سے مجلس کی سندرجہ ذیل ترتیب
 دی تھی۔ ارباب طریقت کا مجمع مع اپنے اپنے بزرگوں کے سب سے آگے آگے ذریں جھنڈے لیے ہوئے اور ذکر و تسبیح بالمجر کے ساتھ اشعار
 پڑھتے ہوئے چل رہا تھا۔ ان کی سات یا آٹھ چھتیاں تھیں۔ اس کے بعد مرحوم محرم نمبری کے خدام کی علیحدہ علیحدہ مختلف چھتیاں تھیں۔ سوزنوں کی
 ت جاروب کشوں کی جماعت، امران کی جماعت، خطیبوں کی جماعت علیحدہ علیحدہ تھیں۔ سب کے اخیر میں حمزہ شریف کے خصوصی خدام
 (ت خولہ رازوں) کی جماعت تھی۔ سب کے سب اپنی اپنی ریڈارم (دوریاں) پہنتے ہوئے حمد و صلوة دعا و ثناء پڑھتے ہوئے غرامان فرماں
 آتے تھے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقاء اور حکام شہر تھے۔ ان کے بعد اہل شہر تھے۔ تمام مجلس کے دائیں بائیں مسلح فوجیوں کی قطار تھی۔ میں درکاتب
 (۱) تاک میں تھا کہ موقع ملے تو انور شاہ کے پاس پہنچوں اور عرضی پیش کر دوں۔ چنانچہ نظار چکر انور پاشا کے پاس پہنچا اور اس عرضی کو جس میں
 شیخ نے تنہائی میں ملاقات کی استدعا کی تھی، پیش کر دی، انھوں نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو دے دی۔ مفتی ناموں بڑی کو جو کہ مدینہ منورہ
 پہنچی اور دینی طبقات کے رہی سردار تھے۔ اور نقیب الاشراف شامی حمزہ اللہ علیہ کہ جو کہ رفقاء انور پاشا میں سے تھے۔ میں نے پہلے سے
 اطلاع کی ان کا اعانت اور ہمدردی کی۔ جب سے مجھ کو کسی طرف سے روک ٹوک نہیں کی گئی۔ میں عرضی دے کر واپس آیا تو بعد میں معلوم ہوا کہ عرضی پر
 یا اور دونوں مذکورہ بالا معززین کی سعی سے مغرب کے بعد کا وقت تنہائی میں ملاقات کا دیا گیا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند اور مرزا غلام علی (۲) اور
 ملاقات پر پہنچے۔ ایک تنہا اور بندہ میں ملاقات ہوئی۔ حجاب پاشا سے بائیں ہوئیں۔ غالب پاشا کا خطاب ان کو دکھایا گیا۔ بہت خوش اخلاقی سے
 انے اور تمام باتیں خود اور اطمینان سے سنیں اور فرمایا کہ بڑا ایک مطالبہ آزادی اہل ہند کو متفقہ طور سے جاری رکھنا چاہیے۔ حسب مکہ۔ خود
 راجی کابل حاصل نہ ہو جائے۔ ساکت نہ ہوں۔ پھر حسب صلح کی مجلس بیٹھے گی۔ جمہالی ہند کی آزادی کے لیے پوری جدوجہد میں لائیں گے۔
 میں جو اور جو طرح ممکن ہوگا۔ ہم انھیں اہل ہند کی امداد و اعانت کریں گے۔ اس وعدہ اور عہد کے لیے انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے
 معززین میں سے ہم نے عرض کیا کہ انھیں صرف ترکی زبان میں نہ رہنی چاہیے۔ بلکہ عربی اور فارسی میں بھی پتہ چاہیے۔ تاکہ اہل ہند کو سیکھ سکیں۔ انھوں
 نے جواب دیا۔ مگر یہ کہ اگرچہ زبان کا قیام حسب پروگرام تہہ زائے۔ اور مقامی مشاغل بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم شام و دمشق، جاکہ تخریبیں ہو
 گئے۔ حضرت شیخ الہند نے اللہ علیہ کہ مطالبہ کیا کہ کچھ اور وعدہ و افتخار انسان تک بالا بالا بیچنا دیا جائے۔ ہندوستان کے راستے سے مجھ کو
 سارے ترک ایک یعنی افغانستان، اس وقت پر پورا غیر ممکن ہے۔ انھوں نے اس جیسے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ دوسرے نے اپنی فوج اراک

میں داخل کر کے افغانستان کا راستہ کاٹ دیا ہے اور سلطان آبا تک پہنچ گیا ہے۔ اس لیے یہ امر ہمارے قبضہ سے اس وقت باہر ہے۔ آپ جتہ ہی کے راستے سے اپنے وطن واپس جائیں۔ اور اگر آپ کو اپنی گرفتاری کا سخطہ ہے تو جواز یا ترکی عملداری میں کسی دوسری جگہ قیام لگے۔ یہ اٹلیان کش باتوں کے بعد ہم واپس آگئے۔

مفتی ماموں بری مرحوم صدر علماء دینہ کے پاس انور شاہ کا حکم اس میں پہنچا کہ میں علماء دینہ منورہ کی تقریریں سننے کا شائق ہوں۔ مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہر ایک عالم کے حلقہ درس میں علیحدہ علیحدہ جاکر تقریریں سنوں۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ صبح کو بعد از اشراق مسجد نبوی میں علماء دینہ

مسجد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں

جلسہ علماء اور حضرت شیخ الہند

ہر دو ماہ میں اپنی تقریروں سے ہم کو مستفیض فرماتے۔ مفتی صاحب برصغیر ہمارے استاد الاساتذہ حضرت شیخ عبدالحی صاحبہ مجدومی دہلوی کے شاگرد تھے۔ اس لیے کاتب الحروف اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نہایت درجہ بلکہ شفا تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے نقیب العلماء کو بھیجا کہ ان پر پاشا چاہتے ہیں کہ صبح کو اشراق کے بعد علماء کا اجتماع مسجد نبوی (درہ محترم) میں علماء تفریکہ کے حاضرین کو مستفیض کریں۔ اس لیے تجھ کو اس وقت حاضر ہونا چاہیے۔ اور میں خود ہی جھنڈا ہوں کہ ہر دو حضرات شاخ بھی آفرین لائیں۔ ہمارے لیے یہ زیر موقوف تھا۔ ہم نے قبول کیا۔ چنانچہ اجتماع ہوا اور مقام صدارت انور پاشا کے لیے تسلیم کیا گیا۔ مفتی صاحب ان کے ساتھ وسط میں بیٹھے اور اپنے بائیں حضرت شیخ الہند اور ان کے بائیں مولانا خلیل احمد صاحب اور ان کے بائیں کاتب الحروف کو بٹھایا گیا۔ مفتی صاحب نے اولاً انور پاشا اور جمال پاشا سے تمام علماء حاضرین کا تعارف اور صاحبہ کر لیا۔ بعض حضرات نے کچھ تحفہ اشعار ملنے کا وار سے پڑھے۔ اس کے بعد تقریر کا حکم ہوا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب رحمہم اللہم نے یہ عذر کیا کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ ہم کو عربی زبان میں تقریر کی عادت نہ ہمارت نہیں ہے۔ اس لیے ہم معافی چاہتے ہیں۔ پھر مجھ کو حکم کیا گیا۔ مجھ کو عربی زبان میں عادت تھی ہی۔ میں نے حسب مناسب وقت فلسفہ پر پیشو ط اور مفصل تقریر کی جس سے عقلی اور نقلی دلائل سے روشنی ڈالی کہ فروع انسان کی صلاح اور بہبودی کے لیے جہاں عقلی طور پر ضروری ہے۔ اسی میں انسانوں کی ترقی اور بہبودی اور کمال معزز ہے۔ اس کے علاوہ مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا گیا تھا۔ یہ تقریر تقریباً آدھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ جاری رہی۔ اس کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا اور نہایت توجہ اور غور سے سنتے رہے۔ بعد از تقریر میں خوشی اور مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد دوسرے علماء نے دوسرے موضوعوں پر تقریریں کیں۔ مگر افسوس کہ حاضرین مجلس نے ان کی تقریریں کو اس قدر استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تقریباً دو گھنٹہ کے بعد یہ جلسہ ختم ہو گیا۔ انور پاشا نے کچھ نقد حاضرین سے والے علماء کے لیے نقد مفتی صاحب موضوع بطور نذرانہ بھیجا کہ پانچ اشرفی فی کس تقسیم کیا گیا۔ حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب نے عذر کیا کہ ہمارے پاس کوئی خراج کافی مقدار میں موجود ہے۔ ہم کو حاجت نہیں ہے تو کہا گیا کہ یہ نقد صدقہ اور خیرات نہیں۔ یہ عطیہ شاہانہ ہے۔ اس کو قبول کرنا چاہیے۔ تو حضرات نے قبول فرما کر کچھ دے ہی دیا۔

اس جلسہ کے چند گھنٹہ بعد دونوں حضرات اور ان کے اس پیش ٹرین میں شام کو روانہ ہو گئے اور دو تین دن کے بعد تحریریں تینوں زبانوں میں مرتب شدہ دونوں وزیروں

انور پاشا اور جمال پاشا کا شام کو روانہ ہونا اور

تحریرات کا وہاں سے بھیجنا

وخط سے حضرت شیخ الہند کے پاس بذریعہ گورنر مدینہ منورہ شام سے آگئیں۔ معنون سب کا ایک ہی تھا۔ صرف زبان کا فرق تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے مطالبہ آزادی کے استحقاق اور ان سے اس مطالبہ میں ہمدردی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کی اس بار میں امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر اس شخص کو جو کہ ترکی رعیت یا ملازم ہر محکمہ تھا کہ مولانا محمد حسن صاحب شیخ الہند پر اعتماد کرے ان کی اعانت میں جتیلے۔

تحریرات اور وثائق کا ہندوستان پہنچانا،

چونکہ حضرت شیخ الہند کو من لگی جتنی بھی کجس طرح ممکن ہو۔ میں مرکز تحریک "پاکستان" جلد از جلد پہنچ جاؤں۔ اگرچہ اعلیٰ درجہ کے ترکی آفیسر اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور اہلکار کرتے تھے کہ آپ ترکی قلم میں قیام کر کے یہاں ہی سے اپنی تحریک چلاتے رہیں اس لیے تجویز فرمایا کہ ان تحریروں کے فوٹو متعدد دیے جائیں اور ہر مرکز اور راج پر پہنچا دیئے جائیں۔ مگر انگریزی عہدار میں جانے والوں کی چونکہ نہایت سخت تعقیب ہوتی تھی کسی چیز کا نکال کر لے جانا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ اس لیے تجویز فرمایا کہ لکڑی کا صندوق کپڑے کے رکھنے کا بنایا جائے اور اس کے تختوں کو اندر سے کھود کر اس میں کاغذات رکھ دیتے ہیں اور پھر تختوں کو اس طرح بٹا دیا۔ اس نے اسی طرح جاوی لکڑی کا صندوق بنادیا۔ اور کھدے ہوئے تختے میں کاغذ رکھ کر اس طرح بند کر دیا کہ باہر سے دیکھنے والا کتنا ہی مہر کیوں نہ ہو، شبہ بھی نہ کر سکے۔ صندوق میں کچھ زائد کپڑے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ادیکچے سے کپڑے اور نامی شان ریشی اور غیر ریشی شجر وغیرہ کے بچوں اور عورتوں کے لیے رکھ دیئے گئے اور چونکہ ہرمہین میں تجارتی جہاز مغل کبھی کاغذ اور سامان ایک ہوا آتا تھا اور واپسی پر بقیہ سہا ج کو لے جاتا تھا۔ تجویز ہر اک اس میں حضرت شیخ الہند کے بقیر رفقہ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء رکھ دیتے جاتیں۔ چونکہ زمانہ جنگ کا تھا۔ اس لیے جہازوں کی آمد و رفت عام دستور کے مطابق جاری نہ تھی۔ اس لیے کچھ انتظار کرنا پڑا۔ حضرت شیخ الہند کے رفقاء میں سے مولانا ہادی حسن صاحب رئیس خانبھان پور ضلع مظفرنگر اور حاجی شاہ بخش صاحب مدنی جو کہ اخیر آباؤ ہند کے باشندے اور مشن آزادی کے پہلے سے مرہم تھے، باقی رہ گئے تھے اور جانے کا قصد فرما رہے تھے۔ اور ان کو وہ صندوق دے دیا گیا اور سجاد کیا کہ اپنے مکان پر پہنچ کر ان کاغذات کو نکال لیں اور حاجی نور الحسن صاحب رئیس موضع رہٹ پٹی ضلع مظفرنگر کو دے دیں گے۔ وہ احمد رضا صاحب فوٹو گرافر دہلی سے ان تحریروں کے فوٹو لے کر چند کاپیاں لے لیں گے اور غلام فلاں جک پہنچا دیں گے۔

حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز اور آپ کے رفقاء مدینہ طیبہ کے معظمہ کو

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کا قافلہ ۱۲ جمادی الثانی کو مدینہ منورہ

لے گیا۔ مقصد سے دو مدینہ پہلے جہہ روانہ ہو چکے تھے۔ مگر نذر کار پر جہاز نہ ملنے کی وجہ سے وہ اور شاہ بخش صاحب موصوف مکہ معظمہ جاکر بانٹ جہاز بھر گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند مع دیگر رفقاء جب مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ پہنچے تو اس وقت تک یہ وہیں تھے اور جہاز کے منتظر تھے۔

سے روانہ ہو کر اخیر ماہ مذکورہ میں مکہ معظمہ پہنچا۔ حضرت شیخ السند قدس اللہ العزیز نے چند روز مکہ معظمہ میں قیام فرما کر طائف کا قصد اور ۲۰ رجب کو آپ طائف روانہ ہو گئے۔ مگر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور دیگر رفقاء مکہ معظمہ میں رہ گئے۔ حضرت شیخ الہند شریف کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہو گئے۔ جب دس شوال کو طائف سے واپس ہو کر مکہ معظمہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا خلیل احمد اور دوسرے رفقاء جہاز آسمان کی وجہ سے جہدہ روانہ ہو گئے ہیں۔ چونکہ کوئی خبر حضرت شیخ السند کے طائف سے واپس ہونے کی نہ تھی اس لیے ریسب حضرات بغیر انتظار اور بلا طاقابت روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ السند نے ضروری سمجھا کہ ان سے دعاوی ملاقات کی ہیں اس لیے حضرت شیخ الہند بھی جہدہ روانہ ہو گئے۔ جب جہاز سامان وغیرہ اٹا کر اور اپنی ضروریات پوری کر کے تیار ہو گیا۔ تو جانے والے ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ اور حاجی مقبول احمد صاحب اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھیوں میں سے مولانا ہادی حسن خانبھان پوری اور حاجی مشتاق بخش صاحب سندھی تھے۔ ان سب کو حضرت شیخ السند رحمۃ اللہ علیہ نے ساجل و لورٹ تک نصرت کیا اور جہاز روانہ ہو گیا،

بہی میں سی آئی ڈی کو اور حضرت شیخ الہند کے غمگین
کو خیال تھا کہ اسی جہاز میں حضرت شیخ الہند شریف
گئے۔ اس لیے انگریزی پولس سی آئی ڈی اور اہل شہر
بڑا مجمع جہاز پر پہنچ گیا تھا۔ اسی مجمع میں سے ایک صاحب
نے جو حضرت شیخ الہند کے غمگین نہیں تھے۔ مولانا ہادی حسن صاحب سے کہا کہ اگر کوئی چیز محفوظ رکھنی ہو تو مجھ کو فوراً دے دیجئے
اس کو نکال دو گا اور جہاز پہنچا ہوا اس کا ہتھ دے دیجئے۔ وہاں پہنچا دو گا۔ مولانا ہادی حسن صاحب اگرچہ پہلے سے ان سے واقف
تھے۔ مگر ان کے مخصوص انداز سے ان کے اخلاص و صداقت کا یقین ہو گیا اور صندوق ان کے حوالے کر دیا۔ یہ صاحب عام مسافر و
سامان کے ساتھ یہ صندوق بھی قیلوں سے اٹھا کر لے گئے اور فوراً اسٹیشن لے جا کر غریب پارسل چلنا کر دیا۔ پولیس اور سی آئی ڈی
شیخ السند رحمۃ اللہ علیہ کو ڈنڈہ مڑنے میں مشغول تھی۔ جب یہ یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند نہیں ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ کے کچھ لوگ ہیں۔ تو ریل
نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا ہادی حسن صاحب کو حراست میں لے لیا اور نہایت سخت تلاشی لی۔ حتیٰ کہ ہاتھ کی چھری
تور کر ٹوٹے ٹوٹے کر دی۔ مگر اللہ کوئی شے بچ نہیں سکتی۔ پھر ان سب کو پولیس کی حراست میں مٹی نال پہنچا دیا گیا۔ حضرت مولانا خلیل
احمد صاحب سے پوچھ گچھ ہوتی تو فرمایا کہ میں فلاں جہاز سے فلاں تاریخ کو گیا تھا۔ مولانا محمود حسن صاحب کا ساتھ نہ جاتے میں تھا۔ نہ
میں۔ البتہ عام حاجیوں کی طرح راج و زیارت میں میری شرکت بھی رہی۔ میں ان کی پارٹی میں نہیں ہوں۔ ایک ہفتہ یا عشرہ حضرت مولانا صاحب
کو رکھ کر چھوڑ دیا گیا۔ البتہ مولانا ہادی حسن صاحب کو روک لیا گیا۔ ان سے بہت زیادہ پوچھ گچھ ہوئی۔ ڈرایا دھمکا گیا۔ سختی بھی کی گئی اور اپنی

سے حاجی شاہ بخش صاحب سندھی کے پاس ان انقلابی اخباروں کے پرچے تھے۔ جن کو میری برادرس نے برلین سے جاری کیا تھا اور ہر اعلانات
سے ترغیب جہاد وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ان سب کو انھوں نے ذہیل میں حفاظت سے رکھ رکھا تھا۔ جب جہاز پولیس کی زیر نگرانی تھی تو
میر میں ذہیل ہاتھ میں لٹکائے ہوئے پھرتی ہے بلکہ گئے پانچ پانچ ہزار ہفت ہشت تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہوا۔ مگر جب وطن پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے اور کچھ دن خاندانہ رکھ

دیا گیا۔ گریہ نہایت مستقبل نہ ہے۔ کسی راز کی خبر نہیں دی۔ جب ہر قسم کی سختی اور طبع دینے پر بھی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی تو ایک ڈیڑھ دن بعد آپ کو بھی رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد بنی صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ صندوق کے تختوں میں کوئی راز کی صندوق خابجہاں پور میں چھپے ہوئے۔ جیسے ہی صندوق پہنچا۔ اس کے کپڑے نکال کر کلٹی کے دوسرے صندوق میں رکھ دیتے گئے اور اس صندوق کو توڑنا شروع کر دیا۔ ان کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی اور ایک تختہ کے اندر سے یہ تیلون کاغذات برآمد ہوئے۔ فزا ہی ان کو کال کر بخبردار کیا۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد ایک صاحب کے بیان سے سی آئی ڈی نے پتہ چلا لیا کہ وہ کاغذات ایک صندوق میں مولانا ہادی حسن صاحب کے یہاں ہیں۔ فوراً مولانا کے مکان پر پولیس کی دو پہنچی اور مکان کا محاصرہ کر لیا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ مولانا محمد بنی صاحب اس وقت ان تحریروں کو نکالے ہوئے نقل کر رہے تھے۔ سب پاہوں کی دوڑ دھچک کر جلدی میں ان کاغذات کو توڑ کر دیکر صدری کی چھب میں رکھ لیا اور صدری مراد مکان میں ایک کھڑی پر لٹا دی۔

تلاشی دس بجے سے شروع ہوئی اور نہایت سختی کے ساتھ چاہے تک جاری رہی۔ عمرتوں کو ایک کمرہ میں ایک بند کر دیا تھا ہر شخص کی تلاشی لے کر مراد مکان سے بھی نکال دیا گیا۔ موت ایک نذر وار صاحب پولیس کے ساتھ رہے تھے۔ ہر ایک چیز کی تلاشی لی گئی۔ کچل کھڑوں اور عددوں پرچوں کی ڈیس تک کھیل کھول کر دیکھا گیا۔ کپڑوں کے صندوق کی کم کٹی آئی۔ اس کا ایک ایک تختہ توڑ کر ریزہ ریزہ کیا گیا۔ گرج چیز کی تلاش بھی وہ دستیاب نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ صندوق وہ صندوق ہی نہ تھا۔ اور عجیب اتفاق یا حضرت شیخ الہند کی کرامت یہ تھی کہ اس صدری پر کسی کی نظر نہ گئی جو مراد مکان میں سب کے سامنے کھڑی پر لٹکی ہوئی تھی اور جس میں وہ خزانہ تھا جس کی جستجو میں پولیس سرگرداں تھی۔

چھ گھنٹہ کی سرگردانی اور تلاشی کے بعد پولیس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ موضع رہبر ٹری ضلع مظفرنگر میں ہے۔ یہاں جناب حاجی احمد فرید الرحمن صاحب رہتے تھے جن کے متعلق حضرت شیخ الہند قدس اللہ العزیز نے یہ خط فرمایا تھا کہ وہ ان تحریروں کے فوٹو لے کر اور اس کی کاپیاں کر کے قلات کر کے میں بھیجیں گے۔ پولیس حاجی صاحب کے یہاں بھی پہنچی۔ مگر ناکام واپس ہوئی۔

حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر دہلی کے یہاں تلاشی اور ناکامی سرائے دہاں نے پولیس کو صحیح بتایا تھا کہ حاجی احمد مرزا صاحب کے یہاں تحریروں کے فوٹو لیے جائیں گے۔ چنانچہ پولیس نے حاجی صاحب کی دوکان پر چھاپہ مارا۔ مگر اب تک وہ تحریروں حاجی صاحب کے یہاں نہیں پہنچی تھیں حاجی فرید الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی وقت ان کو لے کر لے رہے تھے۔ حاجی صاحب جب حاجی صاحب فوٹو گرافر صاحب کی دوکان کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ پولیس وہاں کا محاصرہ کرتے ہوئے ہے۔ حاجی صاحب

ان تحریروں کو حبيب میں ڈالے ہوئے اسلٹ پاؤں واپس ہو گئے۔

دوسرے وقت حاجی نور الحسن صاحب مرزا صاحب کی دوکان پر پہنچے۔ مرزا صاحب کی ثابت قدمی اور جنگی ملاحظہ کیے کر پولیس ایک دفعہ چھاپہ مار چکی ہے۔ خدر خدر اور خطرہ موجود ہے۔ مگر خطرہ سے بے نیاز ہر کس حاجی صاحب نے فوٹو لیے۔ عین اس وقت کہ فوٹو پانی میں ڈری ہوئی تھیں اور پانی کا طشت میز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ ساری دوکان چھان اڑی۔ ہر ایک البم ٹلا۔ مگر اس طشت پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اس کو حضرت شیخ کی کرامت کے برابر اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ بہر حال پولیس یہاں سے بھی ناکام واپس ہوئی۔

فوٹو کی کاپیاں تیار ہو گئیں۔ حاجی نور الحسن صاحب نے ان کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور جہاں جہاں پہنچا کیا حکم تھا۔ پہنچا دیا۔ یہ غلط ہے کہ ان تحریروں کو جلا دی گیا۔ جیسا کہ مولانا عبداللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ وہ تو اس زمانہ میں کابل میں تھے۔ ان کو غلط خبر پہنچائی گئی۔ یہ تمام فوٹو ذمہ داران و مراکز کے پاس پہنچا تو دیئے گئے تھے۔ مگر چونکہ ان کی طرف سے تشدد اور چھان بین بہت زیادہ ہو رہی تھی۔ تو ممکن ہے کہ بعض لوگوں نے ان کو جلا دیا ہو۔ تاکہ کوئی خدر خدر باقی نہ رہے،

یہ تحریرات اور ذاتی بہت زیادہ کار آمد ہوئے اور حکومت ترکیہ اور اس کے حلفاء پر دوسری طرح امداد کرتے رہے۔ مگر قدرت نے پانسویں لٹ دیا۔ جو جس اور ترکی کی فتنہ دہی کے بعد جب اریکھ انگیزیوں کا حلیف بن گیا اور برٹش و

ان تحریروں کا کار آمد نہ ہونا

کے پرفیوہ نکات سامنے آئے تو ہر ایک حالت بدل گئی۔ اور ان کی فتح آج کی شکست بن گئی۔ اریکھ کی بے شمار فوجیں اور لاقعد و ہتھیار چلے اتحادیوں و انگریزوں اور فرانس وغیرہ کی مدد پر آگئے اور ادھر شریف حسین نے خدر اور خیانت کر کے انگیزیوں کی حمایت میں ترکوں ان کی قوت کو ہر قسم کا نقصان پہنچایا۔ عربوں اور ترکوں میں انتہائی نفرت پھیلادی۔ تاکہ سربراہ فلسطین، عراق وغیرہ میں عرب کے عوام ترکوں کو قتل و غارت کرتے تھے اور عرب سپاہی ترکی فوج میں سے بھاگنے لگے۔ اور جدوجہد سے جان چرانے لگے تو طبی طریق پر پہنچ کر ناکامی پر ناکامی ہی سامنے لگئی اور جو کچھ نہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقع ہو گیا۔ تفصیلات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ خدا مالک ہے جس کو چاہتا ہے۔

اندر پاشا اور جمالی پاشا سے جب تحریریں دستہ حضرت شیخ الہند کا طائف روانہ ہونا اور محصور ہو جانا حاصل کر لیں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا قدر تھا کہ کسی طرح ایران کے راستے بالابلایاغستان یعنی اپنی نزدیک کے مرکز پہنچ جائیں۔ مگر روسی اور انگریزی فوجوں نے راستہ رک لیا تھا۔ جنگیں ان راستوں پر قائم ہو گئے تھے۔ اس لیے یہی قصد فرمایا کہ بحریر راستے سے سفر کیا جائے اور یہی نہ جایا جائے۔ بلکہ بحریرستان کے کسی بندر گاہ میں وغیرہ پر بھیجیں۔ بلکہ بادیانی جہاز سے پہنچیں اور بحریرستان کو وہاں سے روانہ ہو جائیں۔ مگر چونکہ مختلف مصالح تھے آخری ملاقات غالب پاشا سے ضروری سمجھتے تھے۔ چند ضروری باتیں ایسی ملاقات میں طے کرنی تھیں۔ اس لیے پہلے کہ خطا و بھرواں سے طائف کے لیے آئے ہو گئے۔ غالب پاشا ان دنوں طائف میں تھے۔ حضرت نے عالم لوگوں سے یہی ظاہر فرمایا کہ مخطوبین ان دنوں گرمی زیادہ ہے اور ضرور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی زیارت بھی کرنی ہے۔ اس لیے میں طائف جابا ہوں۔ نصف شعبان تک واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ ۲۰

مکہ منکر سے روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے اور دو تین دن کے بعد غالب پاشا سے ملاقات کی۔ کچھ باتیں طے نہیں اور مکہ کے لیے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہ وقت آنے نہ پایا تھا کہ شریف حسین نے بغاوت کر دی۔ ہم سب طائف میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اس کی تفصیل شہر میں سفر نامہ میں لکھ دی ہے۔ ایام حصار میں حضرت حمزہ الاعلیٰ ایک مرتبہ غالب پاشا سے ملے۔ پاشا مصروف تھے چند

سفر نامہ اسیرانہ جن کا حالہ دیا گیا ہے۔ اس کی حیات درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ الحدیث سید امین عاصم صاحب آمد و رفت کا اونٹ لکرایہ کر کے ۲۰ رجب ۱۲۴۲ھ کو روانہ ہو کر ۲۳ یا ۲۴ رجب کو طائف پہنچے۔ شہر نہاد کے باہر ایک باغ میں فروکش ہوئے جس کا انتظام سید صاحب نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ باغ کے بالائی حصہ میں سید امین عاصم صاحب موع اپنے تعلقین تھے۔ اور نیچے کے ایک حصہ میں مولانا حمزہ الاعلیٰ تھے۔ اس سفر میں مولانا کے ہمراہ فقہ مقلین ہوتے۔ مولوی عزیز گل صاحب، وحید احمد اور کاتب المصطفیٰ امجد،

طائف حقیقتہً ایک بچہ ٹاسا قصبہ ہے۔ اگر اس کا اطلاق بہت بڑے قصبے پر کیا جاتا ہے جس میں بہت سے قصبات اور دیہات شامل ہیں۔ قطع زمین کا بہت اونچائی پر واقع ہے۔ اونٹوں کے راستے سے تیری ایسی ہواں پہنچتی ہیں۔ کیرنیکہ زیادہ ہے اور چڑھائی با آسانی طے ہوتی ہے اور جبل کہہ کے راستے سے جس میں چرگدھڑ گھوڑے چلتے ہیں۔ ۲۴ گھنٹے لگلاس سے کہیں آؤنی پہنچ آجے۔ اگر راستہ دشا گزرا ضرور ہے۔ آدھے راستے سے ہوا ابل مٹین ہو جاتی ہے۔ جب کہ کوہِ حنظل کی سخت گرمی کی وجہ سے شب کو بھی آرام آتا۔ طائف میں بجلی رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں کا موسم گرمیوں میں نہایت عمدہ رہتا ہے۔ ہوا بجا باغات ہیں۔ بہار کے میوے پیدا ہوتے ہیں۔ انگور، انجیر، برشری، دانگ پھل، انار، آدو، آلوچی وغیرہ حملہ سرد گلوں کے میوے بکثرت اور عمدہ ہوتے ہیں۔ زراعت اور برشری بہتر ہے۔ بارش ہوتی ہے۔ کھیتی بکثرت ہیں۔ بارش بھی خوب ہوتی ہے۔ جواز کے لیے طائف، ہند کے لیے شکر کی مانند ہے۔ ترکی کے گورز اور گزین کے ناز میں طائف میں رہتے تھے اور بڑے درجہ کے حکام اور اہل رتبہ شریف وغیرہ بھی وہاں ہی چلے جاتے تھے۔

حبیب مکہ منکر میں پہنچے تو عجیب عجیب افواہیں شہر تعلقین۔ عام بدزوں اور اہل شرک کی زبانی سنا جاتا تھا کہ حضرت حبیب مد علی ہونے والی ہے۔ شریف حسین انگریزوں سے بلا ہوا ہے اور بغاوت کمزیرا لائے۔ مگر ترکی کے استدلال میں کوئی فرق تھا۔ ترکی فوج تمام حصار میں غالب چار پانچ ہزار تھی۔ کیرنیکہ اکثر فوج دوسرے مقامات پر کھینچ لی تھی۔ شریف نے باب عالی کو اطلاع دیا کہ دارالکاف کا گورنار وار میں ہوں۔ یہاں زیادہ قوت رکھنے کی ضرورت نہیں جاسکے ضرورت جنگ پر اپنی قوت لے جاؤ۔ یہ موجودہ فوج بھی عمدہ مگر طائف بہتر تھی۔ ہم کو یہ بھی اس وقت لگا گیا کہ عابد طائف جانا اور لوٹ آنا چاہیے۔ عباد ادا ہو جائے۔ مگر ہم کہہ دینے کا دل نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں بربر بھی شہر سے نکلتے تھے۔ گورنر شریف بدطالع کی طرف سے کوئی خلا شریف کے نام آیا ہے۔ یا کوئی ترکوں کو جواز سے نکال دو ورنہ ہم شریف سے لڑیں گی۔ کوہ پہلے شریف چھڑا تھا۔ اور شریف حسین کا بہنری ہے اور اس وقت مصر میں تھم۔ اس کا پھار کا شریف بنا کر بھیجیں گے۔ نہ معلوم بیچو کماں ایک صحیح تھی، عمدہ میں ہمیشہ لگی اگرت کہتے اور بندر گاہ میں تین چار ہزار اور کبھی کم زیادہ جمع ہوجاتے تھے اور کھڑے رہ کر چلے جاتے تھے۔ نہ کہ کچھ ترس کر لے جاتے تھے اور ترکی حکومت۔

ہم ان واقعات کو دکھانا نہیں چاہتے بلکہ اس فقرہ کے ناز میں ہوتے۔ اس مقام پر حضرت مولانا حمزہ الاعلیٰ کا سفر نامہ لکھنا ہے۔

اصولی بانی بنانے کے بعد مجبوراً ظاہر کیں اور کہا کہ آپ مکہ معظمہ جا کر مسندِ عثمان کو جلد از جلد چلے جائیں۔ اور ہندوستان کو
 حاضر کر آزادی کا بل کے مطالبہ پر ترقی کر لیں۔ مجلسِ صلح میں جو مختصر تبصرہ منعقد ہونے والی ہے۔ انگریزوں پر یہی کوشش کرے گا کہ ہندوستان کو
 یاکم از کم ہندوستان میں کوئیر سائیر برطانیہ اندرونی آزادی یعنی آدھی آزادی ملے۔ مگر ہندوستانی باشندوں کو چاہیے کہ بغیر مکمل آزادی کے
 سپریم ریاضی نہ ہوں۔
 تقریباً ڈیڑھ مہینہ محصور رہنے کے بعد اہل طائف کے ساتھ ہم کو باہر آجائے کی سہولت حاصل ہوئی اور پھر شوال کو ہم وہاں سے

(بقیہ بحاشہ صفحہ ۲۶۵ سے آگے) ہم کو طائف پہنچ کر کچھ طبیعت میں بہنے کا موقعہ ملا نہ آیا تھا۔ کہ مشہر بن آیا اور کہا کہ
 چلتے ہو تو شہر خارج ہے۔ ورنہ آٹھ دن بعد آؤں گا۔ مطوف صاحب اور ہم لوگوں کی رائے ہوئی کہ ایک مہینہ اور یہاں قیام کر لیا
 اس کے بعد مکہ معظمہ چلے جائیے۔ اتفاقِ وقت سے اس وقت طائف میں میرے بہت کم تھے۔ شہریت اور غریبوں وغیرہ کا استیلا
 تھا۔ اللہ شہر خوب آتا تھا۔ دو چار دن بعد مولانا مرحوم نے قاضی فدا کو مکہ معظمہ جانا چاہیے۔ مگر شہر بن چکا تھا۔ ایک دو دن بعد پھر قیام
 ہم نے جب دوسری سواریاں تلاش کیں تو معلوم ہوا کہ آئندہ آئندہ کے حالات نے خلافتِ عادت مولانا کو قاضی خانے سے فرج کر دیا ہے جن کو
 شہر مولانا نے معلوم کر لیا تھا۔ مگر پھر ضبط اور اختصار کا وہ بہت زیادہ تھا۔ اور مقامِ رضایہ قدم رائج تھا۔ اس لیے چند مرتبہ ظاہر ہو
 کر لے کے بعد چپ ہو رہے۔ اور پھر معلوم ہوا کہ طائف نہایت زیادہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اس لیے جو لوگ باہر باغوں میں
 ان کو شہر پناہ میں چلے جانا ضروری ہے۔ پناہ پر ہمارے مطوف سید امین عاصم صاحب مع اپنے اہل و عیال سیاحی معاشی کے
 چلے گئے اور ہمارے لیے بھی وہاں ایک کوٹھڑی لے دی۔ تمام شہر میں اس وقت عجیب بل چل رہی تھی۔ ۹ شعبان روز شنبہ کو ہم لوگ شہر چلے
 گئے تھے۔ ترکی افروں کو بھی یہ بات محسوس ہو گئی۔ انھوں نے شہر کے ارد گرد حسب قواعد مورچے بنائے اور جن جن باغوں اور
 کو مورچے کے لیے مناسب جانا ان کو خالی کر لیا۔ گیارہویں شعبان ۱۳۴۴ھ کی شب کو صبح صادق کے قریب چاروں طرف سے
 شریف کی فوجوں نے چڑھائی کی جو کہ زکریا زاری عبداللہ بیگ کام کر رہی تھی۔ صبح صادق کے وقت ہم سب بدیعتِ حضرت مرحوم
 صبح کی نماز کے لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مسجد میں جا رہے تھے کہ ناگاہ ایک بندوق کی آواز آئی۔ پھر چاروں طرف سے
 چلنے لگیں۔ تنگی فوج جس نے چاروں طرف حسب قواعد جنگ مورچے بنائے تھے۔ پورے طور سے جواب دیتی رہی۔ اگرچہ ترکی کی
 تعداد ایک ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ باقیانہ لوگ مسلح نہ تھے۔ مگر پھر متحملِ صحت تھی۔ اس نے بدوی فوج کو بہت زیادہ اور قریبی
 بدوؤں کی مقدار بہت زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس سے دو دن پہلے مکہ معظمہ، جدہ، مینع، مدینہ منورہ میں یہی واقعہ پیش آچکا تھا کہ
 شریف نے انتقام لیا تھا کہ ایک ہی دن میں سب جگہ پر کام ہو۔ اس جنگ کی وجہ سے جو لوگ طائف میں غلہ اور زرکاری میوہ لائے
 ان کا آنا بند ہو گیا۔ اور درجی حکام کو رسد کی فکر ہوئی۔ حسب قواعد جنگ انھوں نے تاجروں سے موجودہ غلہ کی نصف مقدار یعنی شروع
 نے خوشی سے دے دیا۔ اس کی مقدار میں سے نصف لے لیا اور نصف پھر ڈھیا اور لئے ہوئے نصف کی قیمت اس وقت کے حساب سے
 اس کو رسید دے دی۔ حکومتِ ترکی کے بعد از جنگ یہ مقدار کچھ ادا کرے گی۔ البتہ جن لوگوں نے چھاپا۔ ان پر شدت کی گئی اور تمام اہل تجارت
 خور و نوش اور ضروریاتِ فحش کی قسم کھالے لیا گیا۔ فقہاء بمقدار ان کے اہل و عیال کی ضرورت کے ان کو دے دیا گیا۔ اور شہر میں غلہ کی کمی

نکل کر مکہ منظر پہنچے۔ شریف عبداللہ بن شریف حسین باغی کمپ کا کارخانہ تھا۔ اس کے ایک شب ہماری مہمانداری کر کے صبح تک مکہ منظر تک ہماری سواروں کا انتظام کر دیا۔ ہم دس شال کو مکہ منظر پہنچ گئے۔ چونکہ زمانہ صبح کا قریب تھا۔ اس لیے حضرت شیخ الحداد کا ارادہ ہوا کہ چنانچہ یہاں قیام کیا جائے۔ آٹے والے حجاج سے اہل و عیال کی خیر و عافیت بھی معلوم ہو جائے گی اور مکہ سے کوئی متعارف بارشہ دار بھی آجائے۔ تو اس سے اس کا بھی پتہ چل جائے گا۔ انگریزی پالیسی حضرت شیخ الحداد کے متعلق اور دیگر سیالوں کے متعلق کیا ہے۔ اگر نرمی ہوئی تو تہمتی کے راستہ سے واپس ہوں۔ ورنہ کوئی دوسری ضرورت اختیار کرنی پڑے گی۔ اتفاقاً قاضی مسعود احمد صاحب آخری جہاز میں اوائل ذی الحجہ میں آگئے۔ ان سے احوال معلوم ہوئے۔

بقیہ صفحہ سے ہٹ کر آمد بالکل بند، غرض کہ اس وجہ سے شہر میں سخت گرانی ہو گئی۔ پھر شریف کے لوگوں نے 'نہر کو بھی اوپر سے بند کر دیا۔ اس وجہ سے پانی کی سخت تکلیف ہوئی۔ اگر قبیلہ (دفعی قیام کا) کا کٹناں نہ ہوتا تو تربت زیادہ اشکال کا سامنا کرنا پڑتا۔ اگرچہ شریف کی فوج کثیر التعداد بھی تھی۔ اور اس کے پاس نئی عمدہ انگریزی فلیس بھی تھیں اور انگریزی سامان جنگ نہایت کثرت سے تھا۔ مگر باوجود سنی سپاہیوں کا سامانی نہ ہوتی وجہ انھوں نے جبرم کیا۔ مکہ کی حالت۔ دن رات برابر گولیاں پلٹی رہتی تھیں۔ ترکی فوج ان کے محصور پر توپوں سے گولے برساتی تھی۔ نصف رمضان تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد وہ بصری فوجیں جو جہدہ میں اس کے لیے بیٹھے کے بعد آری گئی، تھیں۔ اور جہنوں نے مکہ منظر کے قلعہ اور شہر کو توپوں کے ذریعے فتح کیا تھا۔ طائف میں محد توپوں کے پیچھے اور طائف کے چاروں طرف سے توپیں سات یا آٹھ نصب کر کے قلعہ اور شہر پر گولہ باری کرنے لگیں۔ صبح صادق سے تقریباً ۱۲ بجے تک یہ عمل ہوتا رہا۔ اس کے بعد توپیں ٹھہر جاتی تھیں۔ ترک بھی انکا جواب دیتے تھے۔ یہی حال عید سواک تک رہا۔ انیسویں کے عید کے دن بھی شریف کے لوگوں نے جنگ کو موقوف کر دیا۔

مولانا کا رمضان طائف میں
چونکہ رمضان کا مہینہ طائف میں نہایت بدامنی کی حالت میں واقع ہوا تھا۔ اس لیے زندوں کو حسب خواہش لوگوں کو خوراک کا انتظام کرنا ممکن ہوا تھا۔ نہ صاحبہ وغیرہ میں زادیج کا انتظام حسب ضرورت ہوا تھا۔ مسجد ابن عباسؓ وہاں کی ٹری مسجد ہے۔ اس میں بھی زادیج اہم متکعبیت سے ہوتی تھیں اور اس میں بھی بہت کم آدمی آتے تھے۔ باقی لوگ محلہ کی مسجدوں اور اپنے گھرانوں پر پڑتے تھے۔ کیونکہ ہر وقت گولیاں اوپر سے گرتی تھیں۔ مولانا نے اولا مسجد ابن عباس میں حسب سابق عادت زادیج پڑھنا شروع کی۔ مگر چونکہ راستہ وہاں کا ایسا تھا۔ جہاں پر گولیاں بار بار آتی رہتی تھیں۔ اس لیے اس مسجد میں جاتے وقت خطہ مزدور رہتا تھا اور پھر ایک شب میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نماز صبح پڑھ کر نماز روزہ ہونے ہی تھے۔ ابھی تک نفل وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ اندھیرا چکا تھا کہ بد و دن نے هجوم کیا۔ مسجد ابن عباسؓ کی بھیت اور دیواروں پر بھی ایک بڑا دھڑکنے لگا تھا۔ اور مسجد کے قریب جو دروازہ تھا۔ وہاں پر سورج بھی تھا۔ غرض کہ طرفین میں خوب جنگ گولی اور گولوں کی بارش دیر تک، جوتی رہی خود سید میں بھی بارگولیاں برسی رہیں۔ ہر گول مسجد میں باقی تھے۔ وہ ایک کورسین مدھر گولوں کے آٹے کا گانہ تھا۔ بیٹھ گئے۔ اس روز زادیج بھی نہیں ہوتی۔ صرف چند آدمی بوقت نماز عشاء فرض عشاء ایک طوف پڑھ کر عجب سکون ہوا۔ چلے گئے۔ اس کے بعد احباب نے حضرت سیالین حاتم نے امر کیا کہ آپ مسجد ابن عباسؓ میں نماز کے لیے نہ آیا کریں۔ دروازہ مکان کے قریب جو مسجد ہے۔ اس میں ہمیشہ نماز عشاء پڑھا کریں۔ چنانچہ تمام رمضان اوقات خمسہ کی نماز وہاں پڑھا کرتے تھے۔ ان زادیج فقط اہم متکعبیت سے ہی پڑھی گئیں۔ اس کے بعد مولانا حضرت علیہ السلام میں سحر کے وقت تک مسجد میں بیٹھ کر

ڈاکٹر انصاری اور حکیم عبدالرزاق صاحب

رحمۃ اللہ کی غیر معمولی ہمدردی اور حضرت

شیخ الہند قدس اللہ الغریز کے ایک شیرازہ

ڈاکٹر انصاری صاحب اور ان کے بھائی حکیم عبدالرحمن صاحب رحمۃ اللہ کو خیال ہوا کہ حجاز شریف میں کوئی ایسا شخص شیخ الہند تہنہ نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کے سوا اور رفقا بھی ہیں۔ ویسے بھی حضرت موصوف کا حوصہ اور دسترخوان وسیع ہے۔ لہذا حضرت کے پاس جو آثار و ہنرمندی گویا ہوگا۔ اب کوئی اور رقم بھیجی جاتی ہے۔ لیکن ان دونوں رہنماؤں کی غیر معمولی ہمدردی کا فیصلہ ہوا کہ حضرت کے قریبی عزیز کی جہاں کی حالات سے بڑی طرح واقف اور خفاکی امور میں بے تکلف ہر بھیجا جائے۔ تاکہ رقم کے ساتھ حضرت کو اپنے متعلقین کے

(بقیہ صفحہ ۷ سے آگے) دہتے تھے۔ اور مولوی عزیز گل صاحب اور کاتب اطراف بھی اسی مسجد میں علیحدہ علیحدہ غلوں میں وقت گزار کر گریں کی رات تھی۔ جلد بڑھو رکاوٹ ہو جاتا تھا۔ پھر اگر کچھ چری پکاتے جو کہ بیٹھے چاول ہر تے تھے۔ گھر بچو ننگے وہاں وطن تھی۔ اس لیے شہر کو ننگے چاول اور چائے میں استعمال کرتے تھے اور اکثر ننگین چاول بغیر گشت پکایا جاتا تھا۔ اس وقت طائف میں چاول وغیرہ بھی دستیاب ہوتا تھا۔ ایک آدمی روٹی آٹھ آنہ کو ننگی لاتی تھی۔ گھر دہلی کے تاجروں میں سے حاجی ہارون مرحوم نے تھوڑے چاول ملانا مرحوم کے بیٹے کو طلب بھیج دیتے تھے جو کہ عمدہ قسم کے تھے۔ ہاتھوں نے بہت کام دیا۔ اس مدت میں جو کہ تقریباً دو ماہ تھی۔ ہم نے دس بارہ اشرفی طائف سے مفت کوئی کھا ڈالیں۔

عید کے بعد چھک تمام اہل شہر بھوک سے مرنے لگے تھے۔ حکام کے پاس جا کر شکایت کی۔ کہ اب ہمارے باغیچہ کے لیے کچھ نہیں رہ گیا۔ ہمارے پاس جتنے حیرانات دودھ سساری کے تھے۔ کھا ڈالے۔ سب غلہ ختم ہو گیا۔ ہمارے لیے کوئی صورت کہیں۔ ہر سب مرے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا صبح کے آٹھ بجے سے بارہ بجے تک باب ابن عباس سے دعا کی گئی۔ ہم تم کو اجازت دے گے۔ ہم اپنی حدیں تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ شریف کے آدمی تم کو نقصان پہنچائیں تم اس کے ذمہ دار نہیں۔

الحاصل لوگوں کو اس طرح ایک نامہ مع ان کے اہل و عیال کے نام دیا جاتا تھا اور ان سے عہد لیا جاتا تھا۔ کہ وہ کہیں ہمارے ترکہ سے جنگ نہ کریں گے۔ پھر ان کو مع ان کے مزدوری اسباب کے باہر نکلنے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح سے لوگ نکلنے لگے تو پھر بھی ہمارے کمزوری موسم ہوا کہ کل چیلین پنچا پڑا۔ ۷ شوال ۱۳۳۳ھ کو وقت صبح سبھی باب ابن عباس سے نکلے اور وہاں سے چل کر پھرے پڑے۔ (دعیم) میں پہنچے پڑے۔

مقام ہے۔ جہاں پر شریف کا مٹا عبداللہ بگ جو کہ نادر بدوں کا تھا۔ مقیم تھا اور تمام فوجی حرکات کا یہی مرکز تھا۔ یہیں مصری فوج کے خیمے تھے۔ چھوٹے پاس دس ساری تھی اور زندقہ وغیرہ اور راستہ دور تھا۔ ادھر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہایت ضعیف تھے۔ بین دکن پہاڑی راہ پر

قلعہ کو آنا نہ تھا۔ علاوہ انہیں اسباب بھی تھا۔ اس وجہ سے وہاں جانا مزدور تھا۔ عبداللہ بگ سے ملاقات ہوئی۔ اعزاز و اکرام سے پیش آیا۔ چھوٹے کو آکر لے لاکھ دیا۔ ایک دینار بک کر کے حوریت پیش کی۔ عرب میں عادت ہے کہ سفر زمیں کی دعوت میں دینار بک کر کاغذ پڑی ہے۔ اگر لایا جائے تو وہ کامل اکرام مکان کا شمار نہیں ہوتا۔ اور پھر انچہ وغیرہ میوہ جات بھیجے۔ اور ایک اشرفی ترز کی اور کما کتب کی یہاں قیام کرو علی الصبح تم کو روٹا دیا جائے گا۔ کوئی اطلاع نہ خالی پشت شرف کا انتظام کر دیا۔ گلابی خود دیا اور ڈاڑھ بھی۔ اس طرح وہاں سے روانہ ہو کر کوئی

۱۳۳۳ھ

مجموعی تفصیل سے معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت کے ایک خاص عزیز کو جن کا نام لیا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اس خدمت کے لیے جو ان کے ساتھ سرسرا سعادتی تھی، کیونکہ حضرت کی زیارت کے ساتھ حج بیت اللہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہو رہا تھا۔ نامزد کیا گیا۔ مندرجہ ان تار کے ذریعہ جہاز میں بیٹھ بھی تینوں کرائی۔ اور روانگی کے لیے ایذاقت مقرر کیا کہ پہلی پہنچ کر جہاز کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ بلکہ فوراً ہی جہاز پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ یہ عزیز دفعتاً دلہند سے روانہ ہوئے اور پہلی پہنچتے ہی بندر گاہ پر چلے گئے۔

اس محبت اور رازداری کا یہ فائدہ کہ ضرور ہوا کہ حکومت کو کہ لاٹ پیدا کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ عزیز صوف کی روانگی کا علم ہی حکومت کو اس وقت پہنچا۔ جب جہاز روانہ ہو چکا۔ لیکن اس طرح روانگی سے حکومت کو شبہ بھی ہو گیا۔ اس لیے حکومت ہند کی طرف سے عدنان تار دیا گیا کہ جہاز پر تلاشی لی جائے اور مشتبہ کا قذات وغیرہ بغض میں کر لیے جائیں۔ چنانچہ جب جہاز عدنان پہنچا تو پولیس کی جمعیت جہاز پر آئی۔ اور عزیز موصوف کی تلاشی لی۔ مگر کوئی چیز ایسی برآمد نہ ہو سکی جس پر شبہ کیا جاسکے۔ لہذا عزیز موصوف بحضرت مدبرہ اور پھر مکمل پہنچ گئے۔ حضرت کو اہل عدیان کی خبریت معلوم ہوئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ پھر عزیز موصوف اور ان کے رفقاء نے جن میں مولانا دلی حسن صاحب حسینی بھی تھے۔ بیان کیا کہ گورنمنٹ برطانیہ کی پالیسی حضرت کے بارے میں بہت سخت تھی۔ جب کوئی جہاز بلوچی پہنچتا ہے۔ تو سی آئی ڈی اور بارودی پولیس کا بلاڈہ جہاز پر پہنچتا ہے اور ٹھونڈتا ہے کہ مولانا محمود جن صاحب کہاں ہیں۔ جب تک اطمینان نہیں ہو جاتا۔ کسی مسافر کو اتارنے نہیں دیا جاتا۔ اس لیے کسی طرح مناسب نہیں کہ حضرت اس زمانہ میں بلوچی پہنچیں یا ہندوستان تشریف لے جائیں۔ عزیز موصوف نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا بھیجا ہوا ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔

مذکورہ بالا رقم کے علاوہ ایک ہزار روپیہ مولانا محمود ابراہیم صاحب اور زانیر کے احباب نے تاجروں کے ذریعے پیش بھیجے تھے۔ جو انھیں امام میں پہنچے تھے۔ ان دونوں قتل ہو گئے۔

مولانا محمود ابراہیم صاحب کا زانیر سے ایک ہزار روپیہ بھیجا

کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبدالمبارک دہلوی کے یہاں بطور امانت جمع کر دیا۔ چنانچہ ان میں ضرورت پڑنے پر رقم تنگدائی گئی اور کام آئی۔ فخر اجماع اللہ حسن الجبار

اس وقت تک مدینہ منورہ پر نرکوں کا قبضہ تھا اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود شریف حسین کی اور انگریزوں کی فوجیں کامیاب نہ ہو سکی تھیں۔ جنگ جاری تھی اور حجاج کی آمد و رفت کے راستے بند ہو رہے تھے۔ لہذا عزیز موصوف مدینہ طہیین جاسکے۔ اور حج سے فراغت کے بعد پہلے ہی جہاز سے آپ کو واپس بڑھا دیا۔ اس قدر محبت سے واپسی کا ایک اور سبب بھی تھا جس سے انگریزی حکومت کے شبہات میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب واپسی کے لیے عزیز موصوف جہاز پر سوار ہوئے تو بہا الدین حافظ حجاج اور سی آئی ڈی انکپٹر نے ڈبی سختی سے تلاشی لی اور ہر ایک پر چھاپا ماری۔ مگر کوئی مشتبہ چیز برآمد نہ ہوئی۔ جہاز پہلی پہنچا تو ہر ایک کی تلاشی لی گئی اور ان کو حراست میں لے کر لاہور پہنچا دیا گیا۔

یہ محترم عزیز حضرت شیخ المہندس سرہ الغریز سے جو رشتہ رکھتے تھے۔ اس کا تعلق تھا تھا کہ ان پر اعتقاد کیا جاتا ہے۔ بالخصوص افسار از ایسی صورت میں کہ نزدیک ہی کے کام سے پوری رازداری کے ساتھ ایک کارکن کی حیثیت سے اتنا طویل سفر کر کے آپ جہاز شریف پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ مولانا زانیر صاحب چونکہ مذکورہ بالا "تاریخی صندوق" لے کر آئے تھے جہاز سے اتنے

زفرار کر کے غنی نال میں نظر بند کر دیئے گئے تھے۔ اندائش اور بے چینی بھی کبھی مقصد کے لیے اتنی کوشش کی گئی۔ اتنی مصیبتیں جھیلی گئیں اور جس راز کو اس طرح مخفی کیا گیا۔ یہ سب کچھ بے نتیجہ رہے گا۔ بلکہ ممکن ہے کہ اس کے اثرات تباہ کن ثابت ہوں۔ اس بنا پر حضرت شیخ الحدیث نے عزیز موصوف کو صندوق کا راز بھی بتا دیا۔ اور یہی فرودیا کہ ان تحریروں کے فوٹو لیکر فلاں فلاں مقام پر فلاں فلاں صاحب کے پاس بھجوا گئے ہیں۔ دوسری طرف عجیب و غریب قصہ یہ تھا کہ عزیز موصوف کمزور دل کا تاجر بن کر اور ڈر گرفتار تھے۔ اور سی آئی ڈی کے وہ افسر جنہوں نے الگ بادیوں ان سے گفتگو کی۔ وہ پولیس کے کسٹم شٹل شاطر اپنے فن کے بہترین ماہر تھے۔ ان افسروں نے ڈرا دھاکا کر، پولیس کی جابازہ کار روایات عمل میں لا کر اور متعدد واقعات میں طرح طرح جرح کر کے وہ تمام باتیں معلوم کر لیں جو عزیز موصوف کے سافٹ ویئر میں تھیں۔ ان میں کچھ باتیں ایسی بھی تھیں کہ اگر ثابت ہو جائیں تو یہ معلوم کتنوں کو جہنم شامت نوش کرنا پڑتا اور کتنے معذور دریاے شہر اور جس دوام کی سزا پاتے۔ صندوق کا قصہ بھی انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا۔ گویا سی، آئی، ڈی کو دولت کا فریاد مل گیا۔ فوراً انظر نظر پولیس کو تاروا گیا اور انظر نظر سے دوش خاں جہانپور بھی اور مولانا ہادی حسن صاحب کے مکان کی تلاشی کی گئی۔ پھر جہاں نرائس صاحب اور حاجی احمد زافر گرفتار کی تلاشی بھی اسی انکشاف کا نتیجہ تھا۔ جس کا ذکر پہلے صفحات میں گزر چکا ہے۔

جج کے بعد حضرت شیخ الحدیث کا مکہ میں قیام اور گرفتاری

حضرت شیخ الحدیث نے اس سفر میں پہلا جج ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ میں کیا تھا۔ پھر دوسرا جج طائف سے والی پر ذی الحجہ ۱۴۳۳ھ میں کیا۔ قاضی مسعود احمد صاحب اور دوسرے واقف حضرات کے روانہ ہو جانے کے بعد حضرت کو فکر ہئی کہ جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو کر افغانستان پہنچنے کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ حضرت نے بار بار فرمایا کہ منظر میں ہمارا قیام مناسب نہیں۔ کیونکہ انگریزی حکومت ہم سے بظن ہی نہیں بلکہ ہرجم اور مخالفت ہے اور شریعت حسین انگریزی حکومت کے آلہ کار ہیں۔ لہذا کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ اس لیے جلد از جلد کوئی صورت ہونی چاہیے کہ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ لیکن اگر تباہ حضرت کی ثابت مبارک ہوئی تو معاملہ آسان تھا۔ مگر یہاں تو صورت یہ تھی کہ حضرت کے ساتھ جند رفقار تھے جو اپنا سب کچھ قرآن کے حضرت کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ حضرت کو کسی حال میں چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے اور حضرت کی جدائی پسند کرتے تھے چونکہ ترجمہ قرآن شریف کا سلسلہ جاری تھا۔ لہذا کہ انہوں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ رہتا تھا۔ سردی اور گرمی کے کپڑوں کے علاوہ ضعیف العمری اور امراض کی بنا پر روایات بھی ساتھ رہتی تھیں۔ اس قسم کی اور بھی ضروریات تھیں۔ ان سب کے حل و فصل کے لیے چند سرایاں درکار تھیں۔ اور خاموشی سے وقت گزارنا ہوتا تھا۔

۱۔ بیٹن، ۲۔ مشرین، ۳۔ تصدق حسین باپڑی، ۴۔ منظر علی خانسی۔ یہ تینوں افسر نیل میں کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الحدیث ان کے مشق آزادی کے مشق ان تینوں نے بہت سرگرمی سے کام کیا تھا۔ مشرین انگریز تھا۔ بیٹن سی آئی ڈی کا برطانوی تھا۔ مگر مذہب قاتل کا پابند تھا۔ اس میں کسی قدر انسانیت بھی تھی۔ لیکن تصدق حسین اور منظر علی نہایت جابر و ظالم تھے۔ ان کی انسانیت اور تہذیب نام کو نہ تھی۔ انھوں نے حضرت کے ساتھیوں پر نہایت وحشیانہ مظالم کئے۔ سید محمد الدین لودا افسر منتخب تھیں۔

خاتمہ: تاہم جب حضرت کاشف ید قفا حاضر ہوا۔ تو ایسا انتظام کیا گیا کہ خفیہ طور سے یہاں سے روانگی ہو جائے۔ چنانچہ ہم دو چار روز بعد روز بروز تھے۔ تدبیر کے راستہ میں تقدیر حال ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ

مجموعہ ۱۳۳۵ھ کی اختیاریوں میں شیخ الاسلام مکہ منظرہ عبداللہ سراج کی طرف سے نقیب علامہ مکرہ کے بعد آیا اور کہا کہ مجھ کو شیخ الاسلام ہے۔ اور حضرت شیخ السند سے اس محضر کی تصدیق طلب کی ہے۔ مولانا کے اس پر دستخط کرادو۔ اس کو دیکھا گیا تو عزمان یہ تھا "من عبد الله الحكمة المذہب بالجم الشریف المکت" رکھ کر کے علامہ کی جانب سے جو کہ کے عرم شریف میں درس دیتے ہیں۔ اور تمام ترکوں کی تحقیر اس بنا پر کہ گئی تھی۔ کہ انھوں نے سلطان عبدالعزیز علی مرہوم کو معزول کیا ہے۔ شریف حسین کی بغاوت کو بھی بجانب

ان قرار دیا گیا تھا اور ترکوں کی خلافت کا انکار تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ چونکہ یہ محض ان طرف سے ہے جو عرم کی میں پڑھاتے ہیں۔ اور میں ہندوستان کا باشندہ ہوں اور عرم کی میں درس بھی نہیں ہوں۔ اس لیے مجھ کو کسی طرح دستخط کرنا درست نہیں ہے۔ وہ واپس چلا گیا۔ حاضرین میں سے بعض احباب نے کہا کہ اس کا نتیجہ خطا کا ہے۔ حضرت نے جواب دیا کہ پھر ہاتے۔ دعوامان اجازت دیتا ہے اور نہ معذور۔ معذور میں جو باتیں ذکر کی گئی ہیں۔ وہ سراسر خلاف شریعت ہیں۔ اس کے بعد سراج کا اسلام عبداللہ سراج بہت برہم ہوئے۔ خط و تھاکہ وہ لوٹ کر آئے گا اور کچھ جواب دے گا۔ دو چار دن کے بعد شریف حسین مجددہ گیا اور ان کو بھیجا کہ دوڑا مولانا محمود حسن اور ان کے رفقاء اور سید انور اور دیگر محضر حضرت حسین کو گزار کر کے بھیجو۔ اس پر بہت تشویش ہوئی اور مختلف سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر کچھ نفع نہیں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل سفر نامہ میں جمع طور پر ذکر کر دی گئی ہے۔ اعادہ کی ضرورت

خلاصہ یہ ہے کہ ہم سب گرفتار کر کے جلا بھیجے گئے۔ ۱۲۴ صفر ۱۳۳۵ھ کو بوقت صبح زیر جلاست جلا بھیجے اور تقریباً ایک مہینہ زیر جلا

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے تصنیف "سفر نامہ اسیرانہ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ایام چ میں اورنگ آباد کے خان بہادر مبارک علی مکہ منظرہ شریف لائے۔ سرکاری آدمی تھے۔ ان ایمان خوب ہانکتے تھے۔ شریعت صاحب کے یہاں پہنچے۔ ترکوں کو کہہ کر عجم میں جلا کئے تھے۔ حکومت موجود کی وجہ سرائی میں زبان خشک ہو جاتی تھی۔ انھوں نے ظاہر کیا کہ میں گورنمنٹ ہند کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں تاکہ حجاز کے احوال کو دریافت کر کے واقعی باتیں اہل ہند کو بتاؤں۔ کیونکہ ہند میں اس وقت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور مولانا اہل ہند برطانیہ پر حسد اسے احتجاج بلڈ کر کے ہوتے اور شاہد حجاز کو برا بھلا کہتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ایک اعلان علامتہ مکہ کی طرف سے بھیج کر دیا جائے جس میں ترکوں اور ان کی حکومت اور خلافت کی برائیاں ہوں۔ ان کے استحقاق خلافت پر پر زور و صغیر سے رو کیا گیا ہو۔ اس وجہ سے انقلاب اور حکومت حاضرہ کی نمایاں ذکر کیا گئی ہو۔ چنانچہ ایک ایسا محضر تیار کیا گیا۔ اور وہاں کے ان علامتہ جن کو دوبارہ شریعت میں دخل تھا۔ اور صاحب عزت و شوکت شمار کیے جاتے تھے۔ اس پر دستخط اور مہر لایا گیا بہترین سنے خوشی سے اور بہترین سنے خوف سے دستخط اور مہر کر دیا۔ خان بہادر موصوف کے پاس حبیب یہ مختصر مہینہ تر

سے لے کر پھر ۱۰ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو خدیجی حجاز سے اسی طرح زیر حراست سوز بھیجے گئے۔ ۲۲ ربیع الاول کو سرحد پہنچے۔ وہاں گوروں کی حراست میں جو کہ پندرہ یا سولہ تھے۔ اور ہندو اور انگریزوں سے مسلح تھے۔ ہم کو قافیہ بدل میں بھیجا گیا اور اسی دن عصر کے بعد ہر کی سیاسی جیل منتقل، میں داخل کر دیا گیا اور اگلے دن سے بیانات لینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بیان لینے والا شخص انگریز تھا۔ اردو مناسبت سلیس اور صاف بولتا تھا۔ اس کے پاس بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور قابل تھے جن میں سی آئی ڈی کے بیان اور رپورٹیں درج تھیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۱)

۱۲۔ انہوں نے کہا کہ ان علماء کو کئی ہند میں نہیں جانا۔ کون تصدیق کرے گا۔ مناسب ہوگا کہ حضرت مولانا محمد صاحب جو کہ علماء ہند میں ایک مشہور اور مسلم شخص ہیں۔ ان کے اور بڑے علماء ہند کے دستخط اور مہرموں۔ روز معلم یہ اسی لیے وہاں بھیجے گئے تھے کہ اس ذریعہ سے مولانا مرحوم کو وہاں سے پکڑا جائے یا یہ قضیہ واقفیت تھا۔ الحاصل اس مضمون کو رہاں کے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج جو کہ زیادہ حکومت ترکیہ میں مفتی اخافت تھے اور اب القاب کے بعد عہدہ الاسلامی اور وکالت شرافت پر مامور ہو گئے تھے۔ بذریعہ نقیب العلماء مولانا کے پاس بھیجا اور آخر محرم الحرام ۱۳۳۵ھ میں عصر کے بعد وہ اس محفل مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں وہاں مکہ معظمہ سے جو لوگ مامور بن ہند اور علم دوست تھے۔ انہوں نے ظہر کے بعد مولانا مرحوم سے بخاری شریف کو شروع رکھا تھا۔ مکان اقامت پر ہی درس دیا کرتے تھے اور حسب وہ کاغذ آیا تو چونکہ اس کی سرخی تھی۔ من عہد حکمہ المدینہ من النبوت اللہ، یعنی یہ تحریر مکہ مکرمہ کے ان علماء کی طرف سے ہے۔ جو عہد شریف کی میں پڑھاتے ہیں۔ اس لیے ان سے کہا گیا کہ آؤں اس سرگرم سے کوئی استحقاق نہیں کہ حضرت مولانا اس پر کچھ لکھیں۔ کیونکہ وہ علماء مکہ میں سے نہیں اور نہ عہد کی یعنی سید الحرم میں مولانا نے کسی تدریس کی۔ مٹایا، اس میں قوم ترک کی مطلقاً بھیج کر گئی ہے اور دوبارہ اس کے جو کچھ احتیاط اور سخت احکام ہیں۔ آپ کو معلوم ہے۔ ثنائی اس میں وجہ تخریر سلطان عبدالحمید شاہ کا تخت سے انار دینا لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہی فقیر نے اس کو زہرات کفر میں سے قوائیں دیا۔ انجا، اس میں خلافت ملاطین آل عثمان کا انکار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ امر مخالفت اصول شرعیہ میں ہے۔

خائنہ اس میں اس القاب اور حرکت کو مستحسن دکھایا گیا ہے اور یہ بھی شرفا نہایت قبیح واقعہ ہے۔ چونکہ کاتب اطراف کی نقیب سے کچھ پہلے سے معرفت تھی۔ اس لیے ان سے تمام کیفیتیں ظاہر کر دینے کے بعد یہ کہا گیا کہ تم شیخ الاسلام سے یہ کہہ دینا کہ مولانا نے اس پر دستخط اور کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اس کا اعتقاد اہل مکہ اور مدینہ عہد کے ساتھ مخصوص ہے۔ میں آفاقی شخص ہوں۔ بریسی بریسی وجہ سے مجھ کو کہ اس پر دستخط کرنے کا نہیں اور یہ کہا گیا کہ ابھی دوسری جہوں کو ان پر نظر نہ کرنا۔ اگرچہ انہوں نے امر کیا۔ تب ان وجہ کو پیش کیا جائے گا۔ وہ واقعت واپس ہو گئے اور پھر کوئی جواب نہ لائے۔ اس صحر کا شہر میں پہلے سے چڑھا تھا جو لوگ حقانی تھے ان کو سخت لگا ہوا تھا کہ اگر ہمارے پاس کیا تو ہم کو کتب دیں گے۔ اور کسی طرح جان بچاؤں گے۔ مولانا مرحوم کے روکتے ہی پورے شہر میں مشہور ہو گیا کہ مولانا نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اب تو دوسروں کو بھی بہت چوٹی۔

ادھر شیخ الاسلام صاحب کتبہ ہندی۔ انہوں نے عبارت سابقہ بالکل بدل ڈالی اور اس طرح اس کو لکھا کہ اس میں سے بھی کچھ بالکل خارج ہو گیا۔ مگر دستخط کرنے کو پھر نہیں بھیجا۔ جو عبارت دوسری مرتبہ بنائی گئی تھی۔ اس پر پہلے علماء سے فقط دستخط لکیر اخبار "الفتا" میں جاری

ہمارا خیال تھا کہ ہماری گرفتاری فقط شریعت کے حصہ پر منحصر کرنے اور شریعت کی شکایت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مگر بعد میں بیانات لینے اور رسالت کرنے اور بار بار اس کے ان کتابوں کے دیکھنے اور والد دینے سے ظاہر ہوا کہ یہ گرفتاری تحریک آزادی کی ان حامی کاروائیوں کی بنا پر ہوتی ہے جبکہ افغانستان کال فریڈیا اور ورلڈ ویڈیو میں مقلد سے ہوتی ہیں اور جن کی مخبری اپنی اور پرائیو مقلدوں نے کی ہے۔ بہت سی ایسی باتیں بھی پڑھی گئیں ہیں کہ متعلق یقین تھا کہ کسی کو اطلاع نہیں ہے۔ حضرت شیخ الحدیث کے متعلق اس کے پاس بہت بڑا رجسٹر تھا۔ ہر حال ہر شخص نے ہر بات حسب اقتدار وقت اپنی سمجھ کے مطابق دیتے۔ اگرچہ ہم میں سے سب کے سب ایسے ہی تھے کہ جن کو ایسے امور کا سوا بعد اس سے پہلے نہیں پڑا تھا۔ اور ہر اس خیال کے کہ یہاں ہمارے ہندوستان کے واقعات اور وہاں کی کارروائیاں کا سب سے والا کوئی نہ ہوگا۔ ہم نے آپس میں کوئی قرار نداد بھی لے نہیں کی تھی۔ مگر اب بار اور بات سب کے تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ اگرچہ علیحدہ علیحدہ تھے۔ جینو کی چل رستل، تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد پاسپورٹ مرتب کیا گیا اور ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۶ فروری ۱۹۱۵ء میں ہم کو انارکالہ روانہ کیا گیا۔ مگر ریل کی پوری گارڈنگینوں سے مسلح جاہی حراست کرتی تھی۔ اسی روز شام کو کالہا جانے والے جاہ پر سوار کیے گئے۔ اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ میں مالٹا پہنچ گئے۔

۲۶ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ کو تقریباً بیس برس ۲۶ مہینہ مالٹا میں رہ کر ہم مالٹا سے روانہ ہوئے۔ روم کی گئی وقت نصرت کرنے کے لیے تمام ترک کی آغوش میں اس وقت تک رہا نہیں ہوتے تھے، صدر اعظم ترکی سے ملے کر نیچے کے محدود ملک سب کے سب خود بھی ہو گئے اور بہت زیادہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے رہے۔ شیخ الاسلام خیر الدین آفندی نے خاص طور سے ہمت اٹھا کر آواز سے دھماکائی شروع کی اور تمام آغوشوں نے ان کی موافقت کی۔ آمین آئین کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ پھر سب نے نہایت تپاک سے آبدیدہ کر نصرت کیا۔ پوری اور سماں نہایت عجیب و غریب تقدیر سے دنیاوی وجاہت اور دولت والے مالٹا سے اس سے پہلے روانہ ہوتے مگر اب پڑا بھی اور اتنے بڑے سبب والوں کا اجتماع اور اتنی محبت اور اخلاص کا مظاہرہ اور اس نہایت دھانیہ اور آئین کا اظہار کسی کے لیے نہیں ہوا تھا۔ انگریز افسریت سے وہاں موجود تھے۔ اس حالت کو دیکھ کر نہایت تعجب کہتے تھے۔ مگر عورت متانی تھی جس میں نہایت کامرانی شائبہ تھا۔ وہ شخص جس نے قتل و حمل کی کسی اپنی شافی کا مظاہرہ نہ کیا جس کو اہل دولت اور اصحاب مناصب کے اختلاط سے وحشت ہو جس کو کلف صوری اور طلب وجاہت دنیاوی سے نفرت ہو جس کی چال ڈھال مبینہ، اٹھنا، رنار و گھنار و غیرہ سب سے مسکنت اور نراش گشتی ہے۔ اس کی ہر عزت اور کثنت، نعمت خداوندی میں عام قبولیت اس کے انتہائی تعنی اور بلبلت اور بارگاہ خداوندی میں بلند پایگی کا اثر نہ تھا۔ تو کس پر کیا تھا۔

قبولیت اسے کہتے ہیں۔ مقبول ایسے ہوتے ہیں۔

ابن سادات بزر و باد و نیست

گر نہ بخشد خدا بخشند

(قبولیت حبیبہ صفحہ ۷۷) گیا اور اسی کرناں بہادر سہارن علی خاں لیکر روانہ ہو گئے۔ غیر خواہش نے سلطان مرحوم سے کہا کہ شرف آپ کر لیں انہیں دیکھنا ہے۔ سلطان مرحوم نے فرمایا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ نہ ہی حیثیت سے اس پر ہم وہ تضحکی طرح درست نہ تھا۔ آئندہ جو کہ تقدیر الٰہی میں ہوگا چلیں گے۔ (حاشیہ ختم)

بسم اللہ تعالیٰ و امانہ و امتنا باسناد فی السیاق و الاذیۃ آمین

۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء، آگبرٹ اسکندریہ پہنچا اور ۲۶ جمادی الثانی سیدی بشیرؒ کی طرف سے اسرار میں تھا۔ و انہل کر دیتے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کر کے بعد ۱۳ رجب ۱۳۳۸ھ کو مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء وہاں سے سوس کو روانہ کر دیتے گئے۔ سوس میں بھی ہم گینگٹوں کے پہرو میں اسیروں کے کیپ میں مثل سیدی بشیرؒ و انہل کر کے درمینہ کیپ میں رہنا پڑا۔ ۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبرٹ پر پہنچا گیا۔ ۱۲ رمضان ۱۳۳۸ھ جہاز عدن پہنچا۔ چونکہ عدن میں جہاز ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تارہندوستان کو دیتے۔ ایک حضرت یحییٰ محمدؒ کی طرف سے دیر بندیں و دوسرا ڈاکٹر انصاری کو دہلی میں۔ تیسرا حکیم اجیری کو بمبئی میں ہم نے دے دیا جس سے تمام احباب کو اطلاع ہو گئی۔ جس کے حسب ذیل تھے۔

۱۔ ہم ۸ جون تک بمبئی پہنچیں گے۔ مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچا کر ہم کو رکھا گیا۔

بمبئی پہنچنے اور خلافت کھٹی کے استقبال کرنے کی کیفیت

بمبئی پہنچنے پر سب سے پہلے سی آئی ڈی کا افسر انگریزوں افراد کے آیا اور حضرت شیخ السندس کے کہا کہ تہا میں۔ کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت اس کے ساتھ کمرے میں چلے گئے۔ مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آتے ہوئے ہیں۔ آپ ان پر گریبان سے نہ اتریں یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ہمیں جہاز پر ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب ہم بالکل آزاد ہیں۔ ہم نے مولوی رحیم بخش صاحب کا بہت احباب وہ پہنچے تو میں اور مولانا عزیز گل صاحب اسباب لیکر کنارہ پر چلے گئے۔ بعد کہ مولوی رحیم بخش صاحب آئے۔ حضرت شیخ السندس ملاقات کی اور کہا کہ آپ کے لیے اسپیشل ڈبہ ریل میں میں ریزرو کروا دوں گا۔ آپ ابھی اتریں اور ریل پر چلے چلیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے حسین احمد اور مولوی عزیز گل کنارے پر چلے گئے ہیں۔ ۱۵ آج میں تو روانگی ہو سکے گی۔ چونکہ ہمارے کنارہ پہنچنے پر زور کی بارش تھی میں طوفان آگیا۔ جہاز دریا میں کنارہ سے دور لنگر اڑانہ تھا۔ اس لیے اس درکار کوئی ٹھہری حضرت شیخ السندس جہاز سے لانے کے لیے ان کی ۲۱ رمضان کو حضرت اتر سکے۔ مولوی رحیم بخش صاحب گورنمنٹ کے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حضرت شیخ السندس کو ریل کے ریلوے اور بالا بالاریل پر سوار ہو کر دیر بند چلے جائیں۔ سب سیاست سے بالکل کنارہ کش ہو جائیں۔ اسی لیے وہ اگلے دن انارکے کے لیے پہنچے۔ گورنمنٹ لاچ کنارہ پر پہنچی تو مولانا شوکت علی مرحوم اور ہزاروں اشخاص ممبران خلافت کھٹی کے زوردار استقبال کیا۔ انہو کے کچھ فضا کو سج اٹھی۔ اور حضرت کو سواروں طرف سے گھیر لیا۔ اور کار میں سوار کر کے اپنی قیام گاہ پر جس کو پہلے سے تجدد کر رکھے تھے لے گئے۔ مولوی صاحب جرم کی شدت کی وجہ سے حضرت کے پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چونکہ خلافت کی تحریک اور اس کے جہاد کارکن، حضرت کے مددگار ہندوستان کے ہندوستان سے نکالنے کے ہم فراتھے۔ اس لیے بالبح ان سے مل گئے اور مولوی رحیم بخش صاحب جرم کا اثر قبول نہیں کیا۔

جسٹس ایم اور سپانسمہ مسلمانان ہندی کی طرف سے خلافت کمیٹی کے زیرِ اہتمام کسٹری مسجد میں جلسہ عام کیا گیا۔ اس جلسہ میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کی طرف سے حضرت کی خدمت میں انگریس "پیش کیا گیا۔

ان حضرات کی فہرست حقیر نے دور دراز سے بھی پہنچ کر پورٹ پر حضرت کا استقبال کیا۔ بہت طویل رہے۔ خاص خاص اسامہ گرامی یہ ہیں۔

حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم، جناب محمد محمد حسن صاحب مرحوم، دربارہ مولانا قاضی حسن پانڈر پوری مرحوم، جناب محمد محمد حسن صاحب مرحوم، دربارہ خود حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد حنیف صاحب مرحوم، رخا برزان و داماد

حضرت شیخ الحدیث محمد علی رزاق صاحب غازی پوری - برادر کلاں، ڈاکٹر انصاری مرحوم، نواب محمد الدین خان صاحب مراد آبادی قاضی بھوپال مرحوم - مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم، صدر مدرس مدرسہ اہلحدیث دہلی - ڈاکٹر مختار احمد صاحب عورت ڈاکٹر انصاری مرحوم، حاجی احمد مرزا صاحب مرحوم نور گزدار دہلی۔

بہی کے دوروزہ قیام میں حضرت مولانا عبد الباقی صاحب فرنگی علی مرحوم بھی قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اور تنہائی میں سیاسیات حاضرہ پر بہت دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں مولانا صاحب بھی تشریف لائے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے گفتگو کی۔

مولانا عبد الباقی صاحب مرحوم
فرنگی علی اور مسٹر گاندھی
علیہ سے گفتگو کی۔

بہی میں دوروزہ قیام فرما کر ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ رمضان المبارک کی درمیانی شب میں انگریس سے دہلی روانہ ہوئے۔ اور ۲۵ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو ۹ بجے دیوبند پہنچ گئے۔ خلیۃ الحدیث

حضرت شیخ الہند کی عام مقبولیت اور راستہ میں اسٹیشنوں پر استقبال ایک دو زمانہ تھا کہ نہ حضرت اسباب بلکہ تلامذہ، مریدین اور عزیز واقارب کو یقین تھا کہ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو پچاسویں دیہا سہنے گی۔ ورنہ کم از کم حبس وادام اور عبور دینے شریک سزا بٹیں گے۔ اس لیے مریدین اور شاگردوں تک نے صرف تعلق ارادت اور شکر گدی سے انکار کیا تھا۔

بلکہ تعارف سے بھی ملنے نہ دیتے تھے۔ خاص خاص لوگ نہ صرف مکان پر آتے ہوتے گھبراتے تھے۔ بلکہ اس عملہ اور کوہ میں بھی نہیں گزرتے تھے۔ جہاں حضرت کا دولت خانہ تھا۔ اور حضرت کے لیے تحقیر و ملامت کے الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن مدعیان اخلاص و توبان و عزت کے حلقہ سے انحراف کے سی آئی ڈی اور خبریں گئے تھے۔ اب یہ زمانہ بھی ان کے سامنے آ گیا کہ ہندوستان اور بیرون ہند جہاں بھی حضرت شیخ پہنچتے۔ لوگ سڑیں پڑھتے۔ ہر ایک اسٹیشن پر حقیقت مند مخلصین کا جہم پوراؤں کی طرح ٹوٹ پڑتا تھا۔ حضرت شیخ الہند تک پہنچا اور آپ سے مصافحہ کرنا۔ جو بہت غیر

لانے سے کم دشارت تھا۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چاؤنی، مظفرنگر، دہلی بند وغیرہ میں یہ حالت تھی کہ باہر لے جانے یا حرام کی نذر کرانے کے لیے لوگوں کو رسوں پر اٹھانا پڑا۔ لوگ اس مقبولیت کو دیکھتے تھے اور انگشت بدلتاں تھے کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

والله فضل الله يومئذ من يشاء ويعز من يشاء ويذل من يشاء ان الله على كل شئ شہيد

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ رولٹ کشنر کے الفاظ بھی ناظرین کے سامنے پیش کر دیں۔ تاکہ مگر رولٹ رپورٹ کے الفاظ بہانے کو وہ دشمن جواسی سطوت و طاقت کے نشہ میں بہت ہو کر نہ تھا کہ میں مسندوں کا ہوں۔ میری حدود مملکت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ مجھ پر اگر کسان لوٹ پٹے تو میں نگینوں پر اٹھاؤں گا۔ اس مغرور اور جارحانہ طاقت اس تحریک سے کیا اٹھایا۔ اس کی نظر میں اس تحریک کی کیا حقیقت تھی۔ اس کی بنیادیں کتنی مضبوط تھیں۔ اور کس طرح کامیابی کے کنارے پہنچ گئی تھی۔ اس کے نتائج کیا ہوئے۔ اور اس تحریک نے دیں کی کیا کیا خدمتیں سرانجام دیں اور اس کے لاکھوں نے کس طرح جان و تنہا کی قربانی کر کے کامیابی حاصل کی۔ یہ واقعہ ۱۹۱۶ء میں درج ہے۔ اگست ۱۹۱۶ء میں برٹش خطوط کے واقعات کا انشاء ہوا۔ اور حکومت کو اس سازش کا پتہ چلا یہ ایک مضمر تھا جو اس خیال سے ہندوستان میں پھیل گیا تھا کہ ایک طرف شمال مغربی سرحدات کو بڑھایا کرے اور دوسری طرف ہندوستان کی مسلمانوں کی شورش سے اسے تقویت دینا برطانوی راج کو ختم کر دیا جائے۔

اس مضمر کو مضبوط کرنے اور عمل میں لانے کے لیے مولوی عبد اللہ نامی ایک شخص نے اپنے تین ساتھیوں عبد اللہ، فتح محمد، محمد کے ساتھ اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحدات کو پار کیا۔ عبد اللہ پہلے سکے تھا۔ انہیں مسلمان ہوا۔ اور دہلی بند ضلع سہارن پور کے قریبی مدرسہ میں تعلیم حاصل کر کے مولوی بنا۔ وہاں اس نے اپنے باغیانہ اور برطانیہ کے خلاف خیالات کا زہر چند زمین اور طلبہ میں پھیلا دیا جن لوگوں اس کے اپنا اثر ڈالا۔ ان میں سب سے بڑی شخصیت مولانا محمد حسن صاحب کی تھی۔ جو مدتوں تک درگاہ دہلی بند کے صدر مدرس رہے۔ عبد اللہ جاتہ تھا کہ دہلی بند کے مشہور و معروف فارغ التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالمگیر اسلامی (پان اسلامک)

۱۔ اگر نقطہ مسلمانوں کے لیے مضمر بہتر تا تو راجہ ہند پر تاپ کو صدارت کیوں دی جاتی۔ اور حکومت موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی کیوں ترقی کی جاتی۔ جیسا کہ آئندہ آئیگا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ مضمر تھا تو پھر وہاں کی کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی احاطتیں کیا لوگیں تھیں۔ (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا جیسا کہ آئے گا اور وہ کرشنا وراما دوست اور اچھوتی قندلا کامیاب تھیں جن میں راجہ چندر جیسا مشہور و معروف بھی موجود تھا۔ تو اس میں فقط مسلمانوں کی شورش کیوں ذکر کی گئی۔ بلکہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تھی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ البتہ مسلم غالب تھا۔ جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارے میں دکھایا ہے اور یہی امر مولانا عبد اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔

۲۔ یہ بالکل جکس معاملہ ذکر کیا گیا ہے۔ مولانا عبد اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو متاثر نہیں کیا۔ بلکہ مولانا شیخ الہند انگریزوں کے مظالم شنیدہ اور مسلسل لیے راہوں واقعات ماننے اور حالات عالیہ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مولانا عبد اللہ صاحب کو اس طرح کہنا۔ جیسا کہ ہم نے حضرت شیخ الہند کے اس فتوہ کو پہلے ہی نقل کیا ہے اور مولانا عبد اللہ صاحب نے اپنی ڈائری میں بار بار اس کو ذکر کیا ہے۔

تحریک چلائے

مگر ہر صاحب اور ارباب شہرہ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس بخود کو درمیان میں ہی ختم کر دیا۔ مولانا محمود صاحب ہرنال میں دہلی میں ہی رہے اور عبد اللہ سے ان کی ملاقاتیں برقی تھیں۔ مولانا کے مکان پر چند عجائبات قائم تھیں اور کہا جاتا ہے کہ سرحد کے کچھ آدمی بھی ان میں شریک ہوا کرتے۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو مولانا محمود حسن نے میاں محمد امجد علی شخص اور دوسرے دوستوں کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵ سے جگہ) بات محض اصحاب غرض نے گورنمنٹ کو سر جہانی سخی کو مولانا عبد اللہ نے حضرت کو متاثر کیا ہے۔ یہ لوگ کہیں سخی تھے کہ تار سے سابقہ اور لاحقہ طامس اور بلقان کے معاملات اور ہندوستان کے نظام اس کے باعث جوتے ہیں۔ یہاں سے مولوی عبد اللہ کو ہفت ملامت بناتے رہے۔

۱۔ یہی پہلی غلط اور افترا ہے۔ ہندوؤں کو اس تحریک سے بھڑکانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے انگریزوں کی عادت رہی ہے۔ مولانا عبد اللہ صاحب اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جاتے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی ڈائری ص ۱۹ میں لکھتے ہیں۔ ”میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں برائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہمتی نہیں مانتا تھا۔ لیکن مطالعہ تحفہ ہرات مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔ ان علمی حجت لینے کے لیے مجھے اس زمانہ میں کوئی مرقعہ نہیں ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا۔ تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلائی و شرور کی اور میری مسرت کی اتنا نہ رہی۔ جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی (ذاتی ڈائری ص ۱۹) اور یہی مطالعہ غراو مشورہ حضرت شیخ الاسلام کا مولانا عبد اللہ صاحب کے لیے نشان راہ تھا۔ چنانچہ امیر حبیب اللہ خاں سے ملاقات کے باب میں ص ۱۹ پر لکھتے ہیں۔ ”مجھے یہاں مراحت اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر شیخ مغفور کا صحیح مشورہ نہ ملا تو میری بات اس قدر مؤثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو حقیقت ایک ہندوستانی مسلمان کے دبا میں پیش نہ کرتا۔ بلکہ ایک مسلم کی صورت میں متعارف ہوتا اور چند دنوں بعد مجھے مسلک ہندوستانیت بنانے کی یقیناً ضرورت پیش آتی“ (ذاتی ڈائری ص ۱۹) امیر حبیب اللہ خاں نے بھی یہ مشورہ مولانا عبد اللہ صاحب کو دیا تھا۔ چنانچہ ڈائری کے ص ۲۱ میں لکھتے ہیں۔ ”میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کر رہا۔ ۱۹۱۵ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے ملکہ کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں جو باقی۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مجرم اتحاد اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کر زیادہ پسند کرتے تھے ۱۹۲۲ء میں میرا ان الفاظ کے درمیان میں نے کانگریس کمیٹی بنائی جس کا امان ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیارہویں سال کے جلسہ کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس میں فخر محسوس کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریزیڈنٹ ہوں۔ (ذاتی ڈائری)

خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی تھی اور تحریک چلائے والا اس کو ہندوستانی تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے مقرر فرمادیتا ہے۔ یہی اس کا عقیدہ اس سے پہلے کا ہے۔ او۔ پان اسلامک اور اتحاد اسلامی تحریک کو ارباب الہندہ تحریک قرار دیتے ہیں اور اسی کو حضرت شیخ الاسلام قرار دیتا ہے۔ مگر رولٹ کمیٹی افتراق پھیلانے کے لیے اس کی پان اسلامک

مولوی عبید اللہ کی پیروی کی اور ہندوستان چھوڑ دیا۔ مگر یہ لوگ شمال کا رخ کرنے کے بجائے عرب کے خطہ حجاز میں پہنچ گئے۔ روایت
ہر نے سے بیشتر عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور دو کتابیں شائع کی تھیں۔ جس میں اس نے باخیزانہ تعصب کی تبلیغ کر کے
ہندوستانی مسلمانوں کو فتنہ بھارے سے متاثر کرنا چاہا تھا۔ اس شخص رسولنا عبید اللہ اور اس کے دوسرے دوستوں اور مولانا شیخ البند
کا ہم مقصد یہ تھا کہ یہ ایک وقت ہندوستان پر پاب سے بھی حملہ کر لیا جائے اور ہندوستانی مسلمانوں میں لبادت بھی پھیلائی جائے۔ ہم
اس خباثت و جہد کی تفصیل بتلاتے ہیں جو وہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے عمل میں لائے۔ عبید اللہ اور اس کے دوستوں نے پہلے
ہندوستانی تعصب بجا سخت (مجاہدین) سے ملاقات کی اور بعد میں کابل پہنچے۔ وہاں عبید اللہ کی ملاقات ترکی جزئی مشن سے ہوئی اور
ان کے ساتھ اس نے بھارتی چارہ قائم کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس کا دلیر بندی دوست میاں محمد بھی اس سے جاملے۔ یہ شخص مولانا محمود حسن صاحب
کے ساتھ عرب گیا تھا اور وہاں سے ۱۹۱۶ء میں جہاد کا ایک علوان حاصل کر کے واپس آیا تھا۔ جو مولانا نے حجاز کے ترکی سپہ سالار غالب پاشا
سے وصول کیا تھا۔ یہ دستاویز غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ محمد میاں نے اس کی کاپیاں دستہ میں ہندوستان اور سرحدی
قبائل دونوں جگہ تقسیم کیں۔ مولوی عبید اللہ اور اس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار
کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق مہندڑ پناپ نامی ایک شخص کو صدر مقرر کیا تھا۔ یہ شخص ایک محض خاندان کا جرنیل ہندو ہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے
آئی سو ایلز لینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جہاد گیا اور وہاں بڑا نام زمانہ ہر دیال سے ملا۔ ہر دیال نے اسے جس طرح
سے ملایا۔ وہاں سے یہ برلن آیا۔ لٹا ہراس لے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے ساتھ آئینہ تصویر سے متاثر کیا۔ اور اسے ایک خاص طرح
پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ مولانا برکت اللہ کرشنا درسا کا دوست اور ایک خیر غدا پارٹی کا ممبر تھا
اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان اور کیمبرج اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔ وہ لکھنؤ
ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا۔ جس کا نام اسلامک فرنٹیر
(اسلامی بارادری) تھا۔ حکومت جاپان نے اس کو بند کر کے اسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدا برائی
سے جاملے۔ ۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومت
موقتہ دیریشٹرل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خط لکھ بھیجا۔ جن میں اس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستانی

کہتی ہے۔ ہم پہلے بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا کو رنج بھاننے سے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو مسلمان پارسی سکھ وغیرہ ہندوستان
کے اتحاد سے آزادی کی کیسکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے۔ حضرت شیخ المند نے صرف اس کو قبول فرمایا تھا۔ بلکہ پہلے سے اس پر مانے
ان کے مشن میں کھارواقلانی ہندو شریک تھے۔ جن کی وجہ سے ایک شغل مکان ولینڈ میں کو لیا پر لے رکھا تھا۔ دولت کشیش کی یہ رپورٹ بھڑت اور اڑوا
ہے تو اور کیا ہے۔ ہم پہلے لکھتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی تحریک ۸۲۴ء اور جداد حضرت ۸۵۵ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا کام کر رہا تھا۔ حضرت
صفحہ) سے یہ غلط ہے کہ یہ تجویز آزادی ہند اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اسوجہ سے ختم ہوئی۔ یہ تجویز اس وقت تک ظاہر ہی نہیں ہو
تھی۔ بلکہ بعض مسائل وغیرہ مختلف فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سنجی سے دو بلڈیا معاصرین کو بٹلن کر کے تفصیل دیکھ کر آمادہ کیا گیا اور اسی انعام
کے لئے ان کے لئے ایک خط لکھا گیا۔ اس خط کا خلاصہ اس طرح ہے کہ مولانا سنجی نے مولانا سنجی

برطانوی حکومت کا غائب کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مندر بریتاب کے دستخط تھے اور یہ خطوط اعلیٰ برطانوی
 ہاتھ لگائے۔ زار کو خط لکھا گیا تھا۔ وہ سسر نے کی تھی بریتا۔ اور اس کی ایک تصویر میں درویش گھوڑی کے ارکان کو دکھائی گئی تھی۔ حکومت رقتہ
 یہ تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کئے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبداللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود
 منشیخ النہد کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جوہدہ رمضان ۱۲۹۹ھ (۱۹۱۶ء) کو محمد سیال انصاری نے لکھا
 ملاکر ایک لٹاؤ میں شیخ عبدالرحیم کے پاس حیدر آباد بھونڈھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبدالرحیم تب سے غائب ہے۔ لٹاؤ پر ایک تحریر بھی جس میں
 عبدالرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر
 فی دوسرا قابل اعتماد حاجی بذیل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سر انجام دیں۔ مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومت برطانیہ کے نام
 لے ہیں۔ ہم نے خود بھی لکھے ہیں۔ یہ خطوط درویش پر مشتمل پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں جس میں خط میں جرن اور ترک مشن کی سابقہ آمد جرمین
 راپسی اور ترکوں کے معطل قیام بھاگے ہوئے مہاجر طالب علموں کے واقعات۔ غالب نامہ کی اشاعت کا ذکر تھا اور حکومت
 افغانہ اور ایک حزب اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فرج کی بھرتی ہندوستان سے کر کے تجویز یہ تھی۔ اور اس کا کام اسلامی
 ستروں کے درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود حسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ سارے واقعات سلطنت عثمانیہ کو پہنچا دیں
 مولانا عبداللہ کے خط میں حزب اللہ کا مرتبہ وکل نقشہ تھا۔ اس فرج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ مولانا محمود حسن صاحب کو اس کا سارا بیان
 شافری مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ، طبران اور کابل میں قائم ہونے والے کابل کا سارا عبداللہ کو لٹا تھا۔ اس فرست
 تین سرپرستوں، بارہ جنرلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے نام درج ہیں۔ لاہور کے طلبہ میں سے ایک کو پھر جرنل بنانا تھا اور پھر کو

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸ سے معافی ہوگی۔ بہر حال اصلی سبب وہ امر ہے جس کی بنا پر مسلمان گورنری دینہ دار دارالعلوم میں گیا تھا
 درمتم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔

۱۱ فروری ۱۹۱۵ء تاریخ کے لیے جو سازش تیار ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ایک رجسٹر اور میگزین پر حملہ کرنا تھا۔ اس تاریخ کو ۱۲ آدمی
 ان میں سے کچھ مسلم تھے۔ دیل کے ذریعے فوڈز پر پہنچے۔ مگر فرج نے پیش بندیاں کی تھیں اور یہ سازش ناکام رہی۔ ان میں سے چند رہنما
 طالب علم سرحد کے ہندوستانی متعصبین (مجاہدین) سے مانگے گئے تھے۔ درویش گھوڑی، رپرٹ فعل پنجاب، پیر علی، ہم نے پنجاب
 سے متعلقہ فعل میں بتایا ہے کہ فروری ۱۹۱۵ء میں لاہور کے ۱۵ طالب علموں نے کالج چھوڑا اور مجاہدین سے جا ملے۔ اس کے بعد وہ کابل گئے
 بنان ان کو بیٹے رستمی سے نظر بند کر لیا گیا اور بعد میں دہلی کو لے گئے تھے۔ وہ ہندوستان واپس آئے۔ تین
 حکومت روس نے گرفتار کر کے برطانوی حکومت کے حوالہ کر دیا۔ انھوں نے اپنے بڑاؤ کے متعلق فراموش کا اظہار کیا اور انہیں شروط معافی کی گئی
 ان پندرہ طلبہ کو ان کے طلبہ نے مبارکباد کا لقب دیا تھا۔ ان میں سے جو دو واپس چلے آئے ان کے بیانات ہم نے پڑھے ہیں۔ ایک طالب علم تو ایک
 بطور ترکیٹ سے شہر ہوا تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ سلطان ترکی نے اعلان کیا ہے کہ پھر برطانوی حکومت کی طرف سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر
 مارنے کے اقدامات کی بے عزتی کا خطو ہے۔ اس لیے ہندوستان میں مسلمانوں کو ہجرت کر کے کبھی اسلامی ملک میں جانا چاہیے۔ دوسرے طالب علم کو بھی
 سلطان اعلان سے جوش آیا تھا اور انگریزی اخبار کی کاپی سے بھی اسے مدد پہنچا تھا۔ جو اس کے خیال میں نفرت کی لہر پیدا کرنے والی تھی

سینٹ کرنل ان اعلیٰ حیدر داروں کے لیے جی شخص کو تجویز کیا گیا تھا۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ اس تقریر کے بارے میں ملاقات تھی۔ مگر اس ساری اطلاع کی وجہ سے جو ریشمی خطوط میں دی گئی تھی، چند پیش بنیادیں مناسب سمجھی گئیں اور وہ عمل میں لائی گئیں۔ ۱۹۱۶ء میں محمود حسن اور اس کے چار ساتھی برطانوی حکومت کے قبضہ میں آ گئے۔ اور وہ اس وقت برطانوی نگرانی میں جلی قیدی ہیں۔ غالب نامہ پر دستِ غالب پاشا بھی جلی قیدی ہے۔ اس نے یہ اقرار کیا ہے کہ محمود حسن پارٹی نے میرے سامنے ایک خط رکھا تھا اور میں نے اس پر دستخط کیا۔ اس خط کے مشورہ صحت کا نتیجہ ہے۔

دو ایشیا۔ یرپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے کوڑے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آ گئے ہیں۔

اس لیے مسلمان اب جس عیسائی حکومت کے بندیں قم ٹپے ہوتے ہو۔ اس پر حملہ کر دو دشمن کو مار لے پھر برکات کے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جدوجہد عمل میں لانے کی جلدی کر دو۔ ان پر اپنی نفرت اور دشمنی کا اظہار کر دو۔ یہ بھی نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمد حسن آفندی سابق مدرسہ دیوبند ہندوستان سے تعلق رکھنے والے، ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا۔ ہم نے اس بارے میں اس سے اتفاق کیا۔ اور اسے ضروری چوٹیاں دیں۔ اگر وہ تمہارے پاس آئے تو تمہیں اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اور کاد میں اور دیوبند اور ہر اس چیز سے امداد کی جائے۔ جس کی ضرورت اسے پیش آ سکتی ہے۔

ذاتی ذخیرہ از ص ۲۵ تا ص ۶

رولٹ کیٹی کی رپورٹ،

رولٹ کیٹی کے ارکان کو اگرچہ واقعات کا صحیح اور مکمل علم نہیں ہو سکا۔ تاہم ان تحریروں سے حضرت شیخ الہندؒ کی جلالہ اور ان کے بلند ارادوں اور استقلالِ دعویٰ سمی اور بلند ریاضی کا کافی اندازہ ظاہر ہو کر گیا ہو گا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے در حضرت شیخ الہندؒ کو اس تحریک میں ایسے بلند مقام پر پہنچ گئے کہ ہمارے اذہان اور خیالات بھی وہاں تک نہ پہنچتے تھے۔

اور جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو تفریق کے لیے دیوبند ٹرینٹ لائے اور روکر گئے لگے کہ:-

”حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال نے ہماری فکر توڑ دی“

یہ زمین فوجیں ہر اس شخص کو جو اپنی قوم اور وطن کا فدائی اور خیر خواہ جو نہایت عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھتے ہیں احترام کرتی ہیں۔ اگرچہ سب سے وہ دشمن ہی ہو۔ مالٹا کی اسارت گاہ میں بڑے بڑے فوجی اور ملکی آفیسر لگے آتے تھے۔ تو حضرت شیخ الہندؒ سے دور سے دیکھ کر جیٹ (انگریزی ٹپل) ہمارا کس سلام کرتے تھے اور باادب کھڑے ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی نہیں ہرتے تھے۔ بلکہ لمبا اوقات اپنے تہجد مکان کے لکھنے میں مصروف رہتے۔ مگر یہ فوجی اور ملکی بڑے بڑے

کھڑے ہوتا ہے۔ آٹھ اور آپ کی مصروفیتوں کو نہایت ادب سے دیکھتے رہتے تھے۔ سالانہ معمولی گورامی بڑے بڑے گورنمنٹ پستروں، ہندوستانی نوابوں اور راجاؤں کی ادنیٰ درجہ کی تعظیم و تحویل عمل میں نہیں لایا تھا۔ پرنس جرنی و جرن کاشا بنادہ، جو کہ انڈیا میں سے گرفتار ہوا تھا اور مالٹا میں ایک حبس رکھا تھا۔ ہمیشہ حضرت کی خدمت میں بالخصوص فقیر عید کے موقع پر حاضر ہوتا تھا۔ اور سارک اسی پیش کرتا تھا۔ اور یہی حال بڑے بڑے فوجی اور سول افسروں جرنی، اسٹرن، بلکیرن اور دیگر کون کا تھا۔ مسٹر بن جو کہ گورنری کی کاسیکریٹری بن گیا تھا۔ مولانا عزیز گل صاحب سے لیجن اسٹادوں کے تذکرہ پر کہنے لگا کہ گورنری کا دفتر شکر چینی بن گئی دینی تھار سے وہ اس تذکرہ کی سہی کی وجہ سے نیچے ہی رہے اور تمام اداوغری اور ملکہ سہی کی وجہ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئے، یہ تو دنیاوی عزت اور وقعت کا معاملہ ہے مگر ہم کہہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس سے درجہ بالا نہ وقت کی امیدیں ہیں۔

ملک صاحب گفت روزے چند
پے مردم گرفت مردم شد
پیر نوح ۲ بابہاں بہ نشنت
خاندان بتوش گم، شد

اسی پر جب شریف حسین نے دنیاوی لالچ میں اگر انگریزوں کا ساتھ دیا اور اسلامی ترکی حکومت کو جو کہ اس کی اور اس نے آباد آباد اور اولاد و خاندان کی دلی نعمت بھی تھی۔ کفران نعمت کر کے برباد کر دیا تو حضرت شیخ المذرحہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

باباں یار شد شریف حسین خاندان شرافت گم شد

چنانچہ پھر بڑے ہی زمانہ کے بعد شرافت کا عہدہ اور امتیاز تمام مکہ معظمہ اور حجاز بلکہ عرب سے مٹا دیا گیا۔ شریف حسین کو اس کے آقاؤں نے بھی نظر نہ کر کے جزیرہ صیر میں دحبس میں پہنچا دیا۔ اور وہ اسی طرح وہاں بے جاگی کی حالت میں مر گیا۔ آخرت کی نبرد آزما بنے۔ اس کے لڑکوں شریف عبداللہ کو شرق اردن کی بے برگ و بے گناہ مملکت کا چھوٹا سا ٹکڑا اور شریف فیصل کو ماسو پٹامیا عراق کا برباد شدہ اور غیر آباد صوبہ دے دیا۔ اور پھر جو اس کے قتل وغیرہ کے واقعات پیش آئے۔ ان کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔ شریف کے ساتھ غد رکنیہ والے سرریہ اور فلسطین کے عرب باشندوں کا جو مشترک فرانس اور اسرائیل دیہودیوں کے ہاتھ سے کر لیا گیا۔ وہ تاریخ کے سیاہ اوراق اور عربوں کے رنجی اور گہری گھاؤ والے دلوں سے پوچھتے۔ جن پر یورپ کی تیر اندازی آج تک ختم نہیں آتی اور آئے دن قیامت پر قیامت ڈھنکی رہتی ہے۔

ان ربك لما المرصاد -

گندم از گندم بر وید جو ز جو! از مکافات عمل غافل شد

ترک تو اپنے مقامات پر مستقل اور قاضی و حکمران رہے۔ مگر عربوں کی پریشانی ختم ہونے میں نہیں آئیں۔ کہاں عربوں کی مستقل جہودیت اور تمام عربی بولنے والوں کا صہابی و فاتی اور شریف حسین کی سب پر جہودیت، جہودیت جس کا سب بارخ بلکہ نیش آئندہ خواب برطانوی دستہ واروں نے دکھایا تھا اور کہاں یہ تفرق اور یودیوں کا یہ تسلط اور ظلم و جبر اور عربوں کے لاکھوں نفوس کی ملامتیں یہ قدرت کے عجز بات میں سے نہیں ہے ترکیا ہے۔

قل اللهم ملائکة توفی الملائک من تشاء وتنزع الملائکة من تشاء وتلعن من تشاء وتذل من تشاء

تشد۔ مگر افسوس ہے کہ انسان اور مسلمان عبرت پکڑنے کے لیے آج بھی تیار نہیں ہے۔ اور نہ خدا نے قدوس مالک الملک کی طرف رجوع کرتا ہے۔

نَسُوا اللَّهَ فَنَسَاهُمْ وَالْعِيَادِنَا اللَّهُ -

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اس مدت مدید کی اسارت کی شقیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبہ حریت اور انگریزوں میں کرنی کمزوری یا کچی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی مارشل لارڈ لوٹ ایکٹ کے نفاذ، جلیاؤں والا باغ وغیرہ کے واقعات اور ترکی مملکت کی تشریف اور معاہدہ سیرے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ یہی میں اترے ہی مولانا شوکت علی مرحوم اور خلافت کمیٹی کے بانیوں وغیرہ سے ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی علی کلکتہ سے اور مرزا گاندھی احمد آباد سے حضرت شیخ الہند کے استقبال کے لیے تشریف لاتے۔ نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں باتیں ہوتیں تو آپ نے بھی عدم تشدد و دنانی کا پرگرام ہندوستان کے آزاد کرنے کیلئے ضروری قرار دیا۔ اور پھر سچی طریقہ پر تمام خلافت کمیٹی اور کانگریس کی بیکر وہ باقوں کی موافقت کی۔ دیوبند پینچ کچھ دنوں قیام فرما کر ضروری سمجھا کہ گڑا جہان آباد ضلع فتح پور جسرہ میں تشریف لے جائیں اور حکم نصرت حسین صاحب مرحوم والدہ اور اچھے محمد اور ان کے بچوں کی تحریک کریں۔

حضرت شیخ الہند کا سفر کرنا
حکیم نصرت حسین صاحب مرحوم، حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور مخلص خاص خادم تھے۔ اگرچہ مشن آزاد کی کمیٹر نہ تھے۔ مگر خط میں باس ارادہ ساتھ ہر گئے تھے کہ مدینہ منورہ ساتھ لے گئے۔ برطانیہ کی غلط کاری سے ان کو بھی رفقہ میں سے شمار کر دیا گیا اور گرفتار کر کے الٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ میں بیان لینے والے انگریز خود کہا کہ ان کاغذات (ڈائری اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں) میں آپ کا کہیں مذکرہ نہیں پاتا ہوں۔ تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ جن کو سی آئی ڈی نے ان کاغذات میں ذکر کیا ہے۔ مجھ کو گرفتار کرنا بالکل دہانڈی ہے۔ دھوکہ سفر نامہ میں ان جوابات کی تفصیل درج ہے۔ مگر اندھ بھگت چوہا راج میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ ہمارے ہی ساتھ ٹالٹا میں نہایت اطمینان اور اس سے رہے اور پھر جاری رہتے اور وہیں انکا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ الہند کو ان کے انتقال سے بہت صدمہ ہوا تھا۔ ان کی ضعیف العمر والدہ اور دیگر متعلقین سے حضرت کو بہت ہمدردی تھی۔ اس لیے یہ سفر ضروری خیال کیا گیا۔ اٹھ باڈو اٹھ کنوینسٹی تو انھوں نے وہاں اترنے کا اہرا کر دیا وہاں اچھا خاصا اجتماع قادی عبدالرحمن صاحب مرحوم کے مدرسہ میں ہو گیا۔ تو حضرت نے مولانا شبیر احمد کو تقریر کے لیے فرمایا۔ اس تقریر میں خلافت کمیٹی کی حمایت اور تائید پر زور طریقہ پر لگی تھی۔ پھر غازی پور فیض آباد کلکتہ کو تشریف لے جانا ہوا۔ کلکتہ میں فرنگی محل میں مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم نے حسب ارشاد حضرت شیخ الہند کلکتہ میں تقریر فرمائی۔ اس کے بعد مراد آباد سے ہوتے والیں ہو گئے۔

لے اور نہ ہندوستان سے ساتھ آئے تھے۔ بلکہ اگلے سال وہ اور سید باثم صاحب سوڈان اور مکہ ہوتے ہوئے آئے تھے جب حضرت شیخ الہند مدینہ منورہ سے واپس آئے تو مکہ خط میں ملاقات ہوئی۔

لے مولانا فاخر صاحب الہ آباد سے ملاقات کرنے کے لیے دائرہ میں آجمل صاحب میں تشریف لے گئے اور مبلغ لے گئے۔ انہیں راجی مولانا فاخر صاحب الہ آبادی، بکریش کئے۔ یہ حضرت شیخ کی کرامت تھی کہ اس روز جس نے نذر پیش کی۔ گیارہ روپے ہی پیش کیے۔ مولانا سید صاحب خلیف مولانا سید فاخر صاحب (شاہ)

شیخ الہند کا خطاب اربعہ قدم مبارک کی بکارت

ایسے اور نہ تھے کہ قلب کو سوز نہ گزیریں۔ چنانچہ عام مسلمانوں کے قلوب آپ کی طرف نہایت اخلاص کے ساتھ جھک گئے اور عمر فاروقؓ میں مافی الخبوت اور قرینیت جافز میں جرجی۔ چنانچہ خلافت کھٹی کے زمانے آپ کے لیے شیخ الہند کا لقب تجویز کیا۔ جو کہ بظہر اور ہر جماعت مقبول ہو گیا اور ہر نسل و جزا ہی میں گیا اور باوجودیکہ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ تقریر کے عادی نہیں تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں قبولیت نے وقت میں ایسی قبولیت پیدا کر دی کہ لوگ عمر ما آپ پر پروانہ وار فدا ہونے لگے۔ اور یہ تحریک بغلافت اور آزادی برقی طاقت کے یہ مسلمانوں کے دل اور دماغ پر چھا گئی۔

حضرت شیخ الہند اس سفرِ حجاز سے پہلے گفتگوں کے درد اور درجہ الفاسل میں مبتلا تھے

تھے۔ سردیوں میں یہ مرض ترقی کر رہا تھا۔ سر پھیروں پر چڑھا اتنا نہایت مشکل ہوتا تھا۔ علاوہ کے بواسیر کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایات رہتی تھیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اس سفر میں اس طرح شامل حال ہوا کہ تمام زمانہ اسارت بیکالیت بہت کم اور تقریباً معدوم ہو گئی تھیں۔ مالٹا نہایت سرد ہو گیا ہے۔ ہم کو انڈیا میں بھیجیں۔ سردی بھیجیں کے اہل تہذیبانی و جہل پڑتی ہی تھی۔ مگر اندر بھی اس قدر ترقی تھی کہ باوجودیکہ کلہوڑی کی چار پائیریں پر نیچے گدہ اور ادھر دو کھل ہوتے تھے۔ پھر بھی اچھی رات کے بعد سردی شدت سے نیند نہیں آتی تھی۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے۔ پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر شہدے پانی سے نہ کرتے اور نہ پیشاب کے بار بار آنے کی بیماری تھی۔ ایک شب میں کسی کئی مرتبہ ضرورت پڑتی تھی۔ تاہم بلا تکلف بار بار نہ کرتے تھے۔ اگرچہ وہیں ہر گرم پانی اور آگ کے میا کرنے کا انتظام بھی کر سکے۔ تاہم اس قسم کا انتظام عرصہ تک نہیں ہو سکا تھا۔ تب بھی بلا تکلف حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنے مال بجالاتے رہے اور اس قدر بیماریوں کی ٹکائیتیں تمام سفر میں نمودار برقیں۔ جو پہلے تھیں۔ الہ ہند و ہندوستان پہنچ جانے کے بعد پھر ٹھسے ہی عرصہ ان شکایات کوٹ آئیں اور بڑھنے لگیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہ جذبہ آزادی ہند اور انگریزوں کے یہاں سے نکلنے کا نہ صرف قائم رہا۔ بلکہ روزی اور ترقی پذیر ہو گیا۔ ان ہی مصائب مالٹا وغیرہ سے کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں پختہ ارادہ کیسے ہوتے ہوں اس بیماری سے اچھے جو تھے ہی تمام ہندوستان میں دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل ہدایت کے لیے آگہ کر دوں گا۔ اور یقیناً اگر عرضہ فاکر فی قوم و زوہ ایسا کرتے۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ گوناگوں امراض ترقی کرتے رہے۔ باوجودیکہ کوئی روکاری محالوں کی فزاد آتی تھی۔ اور ہر ایک نہایت فدائیت کا دم ہوتا تھا اور خلوص دل سے کوشاں تھا۔ مگر تقدیر کے سامنے تہ تسبیہ۔

چونکہ ۱۳۲۶ھ اور ۱۳۲۷ھ میں مدینہ منورہ سے ہندوستان تکم و الہ صاحب مرحوم بجز وفات الیہ اولیٰ راستے عقد ثانی آیا تھا۔ اور فرصت کو فضیلت جان کر دورہ حدیث شریف کی پرانی تناکر

محالوں کا تھا۔ چونکہ اور درشتہ دار کتبہ والوں نے نکاح کرنے سے خوف سفر حجاز الکار کر دیا تھا۔ اس لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور جناب حافظ زاہر حسن صاحب اردہ کی توجہ اور رعایت سے عقد ثانی قصبہ چکراؤن ضلع ملو آباد میں سید سلیم غلام احمد صاحب مرحوم کے یہاں ہو گیا تھا۔ اگرچہ سلیم صاحب نے بشرط واپسی ایک سال الیہ مرحوم کو مدینہ منورہ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ مگر مختلف ایسے موانع آئے کہ نہ کہ مجھ کو واپس نہیں تقریباً

تین سال سفر کر گیا۔ پہلے سال میں میں بخاری شریف اور ترمذی شریف دوبارہ پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دفعہ پڑھنے میں خصوصی مراعات فرماتے تھے جو کہ عام طلبہ کو حاصل نہیں ہوتی تھی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اس ۶ برس کے عرصہ قیام مدینہ منورہ میں یعنی ۱۳۲۰ھ تک کتب درسیہ غیر درسیہ عوام میں نے نہایت پڑھیں۔ تقریباً سو پینتارہ اسباق مختلف علوم درسیہ کے روزانہ پڑھتا تھا۔ طلبہ کو تھا۔ اکثر مضامین غامضہ پر جامی ہو چکا تھا۔ اس لیے مباحث علمیہ کی مشکلات زیر نظر گوشتیں تھیں اور ان کی گھسیٹوں کو سلجھانا۔ پھر حضرت شیخ کے کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی استحضار مسائل کیچہ کر نہایت کشادہ پیشانی سے بحث فرماتے تھے۔ اور مشکلات کو توجہ سے حل فرما کر بہت سے ایسے مضامین ذکر فرماتے تھے کہ عام مستفیدین کو ان کے سننے کی نوبت بھی نہیں آسکتی تھی۔ علاوہ حضرت رحمت اللہ علیہ کے تمام اساتذہ اور ارباب اہتمام انتہائی شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اگلے سال معقول تنخواہ پر خدمت مدرسین پر مقرر کر دیا۔ اور اس شہر سے ریجنر پاس کرادی کہ حسین احمد صاحب بھی متدبرستان میں آئے۔ بلا توجہ تقریر خدمات تدریس انجام دیا کرے اور کتب درسیہ اونچے درجے کی کتابیں حدیث وفقہ و فقہ وغیرہ کی پڑھانے کے لیے دی گئیں۔ اسی عرصہ میں جلسہ دستار بندی بھی منعقد ہوا۔ اور اس بھی حسب استطاعت انجام دینی پڑیں۔ پرنسپل میں اپنی خواہش سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے اور پھر حیدر سے ہوا سفر میں حضرت کی خدمات سر انجام دیں اور جتنی الویننگ نکالیں سفر کو کم کر دیں۔ اس لیے والہی پر قصد مصمم تھا کہ مہینہ پہنچ کر حجاز کو واپس آجی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کا بہت بلا کر وہاں جا بیٹھا۔ میرے خدمت میں حاضر ہونے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ اور مذکورہ مگر اس خیال کو حسب میں نے ایک روز سیر میں غار کربا تو فرمایا کہ میں تراجم الارباب بخاری کی تشریح لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ کام میں تنہا نہیں کر سکتا سمجھ گیا کہ چونکہ ایام اقامت دیر نہیں بھی ۱۳۲۶ء میں یہ کام شروع کیا گیا تھا اور حضرت نے میری اس وقت کی خدمات کو پسند فرمایا تھا۔ میں ۱۳۲۶ء کا یہ کہ جو وقت آپ اس کیلئے عطا فرمائیں۔ اس وقت میں چاہے کیسا ہی بلند رتبتی شخص آئے۔ اس کے لیے حوت نہ فرمائیں۔ فرمایا کہ قبول ہے۔ کار بھی ایک شرط ہے۔ میں نے عرض کیا وہ کیا ہے۔ تو فرمایا کہ کچھ کہیں گے۔ اس لیے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ دیر نہیں حضرت کی خدمت میں تا اختتام تراجم الارباب نہ ہوں گا۔ مگر حسب مہینہ پہنچا اور تجویب خلافت کا زور شور دیکھا اور دیکھا کہ حضرت کا طبعی رجحان تجویب آزادی کی جہد جہد کی طرف قوی تر ہو گئے اور وہی لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ توفیق ہر گیا کہ کبھی قریبی زمانہ میں تراجم الارباب کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے اس سے عرض کیا کہ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ چلا جاؤں۔ اور یہاں سے ہی انتظام سفر شروع کر دوں تو فرمایا کہ تیرا سارا کام کج اس زمانہ میں نہیں مناسب نہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ اپنے دوستوں و بھائیوں مولوی مسعود احمد مرحوم اور محمود احمد کبھی لکھنے کہ وہ یہاں ہی آجائیں پھر میں نے عرض کیا کہ اچھا تو اتنی اجازت عطا فرمائیں کہ میں اپنی بیوی ۳، ۴ دن ٹھہر کر آپ کے بعد دیر نہ پہنچوں۔ میرے چند احباب یہاں ہیں ان سے ملنے کی نوبت نہیں آتی ہے۔ تو اس کی بھی اجازت نہیں دی اور اسی پر اصرار فرمایا کہ ساتھ ہی چلنا ہو گا۔ چنانچہ ساتھ ساتھ ہی دیر نہ پہنچا۔ حافظ زاهدین صاحب امروہی میرے خصوصی محسن ہیں۔ ان سے ہمیشہ بہت گھرے تعلقات چلے آتے ہیں۔ وہ بھی اپنی تشریف لائے تھے۔ پھر مدرسہ امروہیہ جامع مسجد کے مہتمم تھے اور مدرسہ مدرسہ مذکورہ۔ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم کی کسی وجہ سے مدرسہ امروہیہ سے برادری خاطر ہرگز علیحدہ ہر اجباری کے مدرسہ میں چلے گئے تھے۔ اس لیے حافظ صاحب مرحوم نے مجھ پر زور دیا کہ وہاں کی ملازمت قبول کر لے بقدر ضروریات وقت میں نے اس کو قبول کر کے عرض کیا کہ آپ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت لے لیں۔ انھوں نے دیر نہ پہنچ کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اطلاع دیا کہ میں ملافا حافظ احمد صاحب کو اطلاع دیتی تو انھوں نے دیر نہ کے لیے فرمایا کہ اس کی مدد یہاں کی پہلے سے منظور شدہ ہے۔ بحث تمہیں کے بعد وہی راضی

ایسے بیجا نہیں ہو کر کے سفر کردہ جہاں ، آباد ، غازی پور ، فیض آباد ، لکھنؤ ، مراد آباد سے واپس ہو کر اور وہر چلا گیا۔ اور کتب
یہ متعلقہ مدرس اول کی تدریس میں مشغول ہو گیا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزارا کہ حضرت کا حکم مرم مجھ کو ملا کہ مجھ کو یہاں دیر نہیں میرے پاس رہنا چاہیے
زمانہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سپارڈن کی شکایت شروع ہو گئی تھی۔ مائٹن کا ہیبت ہجوم۔ سبقتاً اور تحریک آفاقی کے سلسلہ میں دورہ کی تیاری
ہو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت کے ارشاد و حکم سے میں امر وہر گیا ہوں اور وہ بھی آپ آج ہی کا مدرسہ ہے۔ اس کا قیام رکھنا ضروری ہے۔
ایک اور مجھ کو یہاں تیری ضرورت ہے۔ میں عرض کیا کہ یہاں تو خدمات انجام دینے والے بکثرت اور خصوصاً ظال ظال حضرات موجود رہتے ہیں۔ فرمایا کہ
اگر وہاں کی زندگی گنداشت بھی نہیں کر سکتے۔ میری نگہداشت کیا کریں گے۔ اس کو سن کر میں چپ ہو گیا اور عرض کیا کہ میں حسب ارشاد حفظ زاہدین حسب
حکما ہوں۔ چنانچہ حافظ صاحب موصوف کو اطلاع دی۔ وہ فوراً آئے اور عرض و عرض کے بعد اس پر راضی کر لیا کہ ایک عہدہ کے لیے حسین احمد کو اور وہ
اجازت دے دی جاتی ہے۔ تاکہ ہم اس مدت میں ہم دوسرے مدرس کا انتظام کریں۔ حضرت اس پر راضی ہوئے اور میں امر وہر جا کر تدریس
مشغول ہو گیا۔ میرے جانشین مرض ہیں زیادتی ہو گئی کچھ دن ہی گزرے ہرنگے۔ کہ حضرت کا آہنچا کر میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ تو مجھ سے
دوسریوں بل۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سفر علی گڑھ اور جامعہ ملیہ
تحریر خلافت کا زور تھا۔ انگریزوں کی غداری سے لوگوں میں خمت برپا تھی۔
ترک موالات کا جوش تھا۔ اس لیے چاہتے تھے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر طمانیت سے
مخفی کر لے مگر پانے سرکار پرست ٹرنٹیڈن یونیورسٹی کی اس کو گوارا کر سکتے تھے۔ انھوں نے سخت مخالفت کی۔ جس کے نتیجہ میں مولانا محمد علی مجرم اور
کے ہم خیال لوگوں کے ساتھ طلباء یونیورسٹی کی ایک بڑی اور متحدہ جماعت یونیورسٹی سے جدا ہو گئی۔ اور آزاد روگاہ قائم کرنے کے لیے جس میں
مخالفت حکومت برطانیہ کی نہ ہو۔ تیاری کر لے لی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اصلاح کانگرس ہوا تھا۔ اور اس میں نان کو اپریشن کی تحریک
ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور ان کے موافقین کی آواز نہایت کمزور ہو گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آگئی تھی۔ ملک کے تمام اہل ار
دار مسلمان برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مگر گاندھی کی راستے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ السند رحمۃ اللہ علیہ سے ترک موالات کے
نہ طلباء یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگرس کی موافقت کی تھی۔ اور تمام
لاال اور طلباء مسلم یونیورسٹی کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔ گورنمنٹ سے قطع تعلقی کریں اور تمام کالج اور اسکول گورنمنٹ ادا
کریں۔ اور اگر کالجوں اور اسکول کے نظاما اذیر چھڑیں تو طلبہ ایسے کالجوں اور اسکولوں سے نکل آئیں۔ نیز ملازمان حکومت انگریزی ان ملازمتوں
پر مقرر ہو جائیں۔ جن میں حکومت کی ادا خالص طور پر رہتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس ہی فتویٰ کی وجہ سے گورنمنٹ نے سر سرہ بخش کٹھن صوبی طور پر
میری مزید حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو سمجھا نے اور قضا واپس لینے کے لیے بھیجا تھا۔ مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسی فتویٰ ترک موالات پر اصرار کیا اور واپس
نہ لیا۔ یہاں کہ طلباء مسلم یونیورسٹی کے پاس ترک موالات کا مفصل فتویٰ بھیجا گیا تھا۔ اسی طوف خلافت کھینچ کے لاکر کنوں نے بھی فتویٰ حاصل کیا اور وہ
سہ راشن ہوا۔ فتویٰ مذکورہ کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ونحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم
قال اللہ تعالیٰ ولا تنازعوا فتقشلوا تذهب وجہکم واصبروا ان اللہ مع الصابین
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور آپ میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بڑوں پہ جادو اور تمہاری ہر ایک جگہ جاسے

تم کو نہایت صبر سے کام لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۛ
 وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط
 اور تم کو نیکی اور تقویٰ کی معاونت کرنی چاہیے اور گناہوں اور زیادتیوں کی معاونت مت کرو ۛ
 وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۚ وَمِنْ تَعَالَى الْغُلَامُوتِ ۚ
 کفار کی مولاات کی تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے۔ اور جس نے ان کی دوستی اور معاونت باقی رکھی۔
 وہ شخص بھی ان ہی میں سے شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا۔ -

گر پڑے ہے آگ میں پرواز سا گرم ضعیف

آدمی کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو بہر

اتابعد آج جب کہ مشرق و مغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ جب کہ
 اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز اسٹریٹے طرف ناز کی موجوں سے ٹکرا کر دھوا کر وہ پاش پاش
 ہو جائے۔ جب کہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے۔ بلکہ
 اگر عاقبت مبنی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور عصر حاضر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرات اور
 آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ علامہ ہند کی تعداد کثیر اور ہندو ماہرین سیاست کا بہت
 بڑا طبقہ اس بدو و بدہ میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو بال بال چھوٹے سے بچائیں۔ کامیابی تو
 ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ہر فرض شہری اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔ تقاس
 کے ادا کرنے میں ذرہ بھر تاخیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے۔ میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں
 ہوں۔ اور جیسا کہ میری طویل زندگی سے شاہد ہے۔ میرا مصلح نظر ہمیشہ مذہب رہا ہے۔ اور یہی وہ مصلح
 نظر ہے۔ جس نے مجھے ہندوستان سے مالتا اور مالتا سے پھر ہندوستان پہنچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لیے
 کسی ایسی تحریک سے اپنے کو علیحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کی فز و فلاح سے
 ہو۔ یاد شہناں اسلام کے حلوں کے جواب میں حفاظت خرد اختیاری کے طور پر استعمال کی
 گئی ہو۔ مالتا سے واپس آکر کچھ کو علم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بسط و کشادہ نے آخری طریقہ کار اپنے
 فرض کی ادائیگی اور اپنے جذبات و حقوق کے تحفظ کا قرار دیا ہے۔ وہ قرآن کریم کی صحیح اور ایک صحیح تفسیر
 اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوطی و تمام لیں۔ اور نقش و ضرر قومی کاموا نہ
 اور عواقب ملیہ کی پوری جانچ کر کے اس کو بے خوف و خطر انجام دے پھینچیں اور وہ اس کے سوا اور
 کچھ نہیں ہے کہ اعداء اسلام کے ساتھ تعاون و مولاات کو اعتقاد و عمل ترک کر دیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت
 ناقابل انکار ہے۔ اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی اقتضا ہونا چاہیے کہ وہ
 طاہر کاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کر دے۔

۱۔ ملک کی جدید کنسلڈن میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔

۲۔ صرف اپنی ملک کی مشیاء اور مصنفات کا استعمال کرے۔

۳۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کی جاتی ہیں۔ ان پر عمل کریں۔ بشرطیکہ ۔

۴۔ اتباع شریعت کیا جائے۔ اور عمل درآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔

۵۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد یا نقص امن کا اندیشہ ہو۔ ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں افلا و تفریط سے بچکر اعتدال مد نظر رہے۔

۶۔ ارشاد عثمان - اذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساءوا فاجتنب اساءتهم
 (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو۔ اور جبکہ برا کریں تو برائی سے بچتے رہو)
 کا لحاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ العلیٰ والہی

العبد محمد حسن عفی عنہ دیریندی ۳ ذی القعدہ
 ۱۳۳۸ھ

اس کے بعد یہی فتویٰ مجتہد علامہ ہند کے متفقہ فیصلہ کی ضرورت میں تقریباً ۵ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔ الغرض اسی تحریک اور اسی فتویٰ اور اسی تحریک کی بنا پر مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کی بنیاد ڈالی گئی۔ جبکہ بعد میں جامعہ ملیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ اگر دعاء مسلم یونیورسٹی پہلے سے آباد اور قوی لوگوں کی بات مان لیتے تو یہ افتراق نہ ہوتا۔ بہر حال گورنمنٹ پریسوں نے انگریزوں کی چیر و دستیاب اور اختاریاں دیکھتے ہوئے غلامی اور انگریز پرستی کو ہی سراہا۔ جیسی رو میں کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں۔ انھوں نے ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کیا۔ مگر جب اصلاح ممکن نہیں ہوتی۔ تو مجتہد آزاد و نیشنل یونیورسٹی کے لیے جلسہ کرنا چاہا اور اہل الرائے کو دعوت دی۔ اور حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کو صدر بنانا چاہا۔ حضرت اس وقت سخت بیمار تھے۔ چلنا چھڑنا ممکن نہ تھا۔ خدام نے اس سفر کو خطرناک اور بینائیت تکلیف دہ ظاہر کیا۔ دوسری طرف دعوت دینے والوں کا اصرار تھا کہ ہماری جدوجہد کی کامیابی کا دار اس پر ہے کہ حضرت صدارت فرمائیں۔ دیکھ کر فریقین کی گفتگو سننے کے بعد حضرت کا جواب حسب ذیل تھا ۔

” اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو معذور شریک ہوں گا “

۱۔ حضرت مولانا حافظ احمد صاحب صاحب زادہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب مرحوم اور مسٹر دارالعلوم دیوبند کو گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب مرحومین گورنری نے دیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو واپس کر دیا اور ایسی سوز و غمت دیر بیچ ضروری میں فرمائی کہ نہ صرف حافظ صاحب مرحوم بلکہ تمام صحیح متاثر ہر یک زبان و الہی کا متقاضی ہوا۔

چنانچہ ۱۹ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء اسلام کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ صدارت کا مشعر بن شبیر احمد صاحب کرتبا کر تحریر کیا حکم دیا اور جب مولانا شبیر احمد صاحب مسودہ لکھ کر لائے تو اس کو سن کر حسب فساد ترسیم فرما کر پھینکے کا حکم دیا۔ اس مدت میں مرض اور ترقی کرتا گیا۔ ہر قسم کا علاج جاری تھا۔ مگر بجائے فائدہ زیادتی تھی۔ بیمار لازمی صورت اختیار کیے ہوئے تھا ضعف اور نقاہت ترقی پذیر تھی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کا قاضی تھا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو دہلی لے جایا جائے۔ تاکہ میں پروردگار سے آنکھوں کے سامنے علاج کروں اور دوسرے اہل الرائے سے بھی مشورہ کر سکوں۔ مگر چونکہ علیگڑھ کی ناخین مقرر ہو چکی تھیں۔ اس لیے قرار کیا علیگڑھ کے جلسہ سے فارغ ہو کر براہ راست دہلی روانہ ہو جائیگی اور برائے معالجہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی پر قیام فرمائیگی۔

میرا علیگڑھ پہنچا اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے تار آیا کہ میں فلاں گاڑی سے علیگڑھ جا رہا ہوں

مجھ سے وہاں بل۔ حسب الحکم میں وہاں پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ جناب عبدالحمید صاحب کو کوٹھی پر قیام تھا۔ وہیں میں بھی قیام پذیر ہوا۔ اگلے روز جلسہ میں حضرت رحمۃ اللہ نے شرکت اور صدارت فرمائی۔ ضعف اور بیماری وجہ سے خود چل نہیں سکتے تھے۔ دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلتا ہوتا تھا۔ خطبہ جناب مولانا شبیر احمد صاحب نے پڑھا۔ مطبوع ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل فقرے قابل یاد گاریں۔

۱۔ میں نے اس پیادہ سال اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں۔ جن کے چہرہ دل پر نماز کا نور اور ذکر الہی کی روشنی جھلک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا را بجلد اٹھ اور اس امت مرحومہ کو کفار کے فرسے سے بچاؤ۔ تو ان کے دلوں پر غرور و ہنس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند پاپا کی ہستیاں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا۔

پھر چند طور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

۲۔ اے نو نما لان وطن حب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار و حزن میں میری ٹیڑیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔ تو میں نے اور چند مخلص اصحاب نے ایک قدم علیگڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریکی مٹا دی۔ دیوبند اور ملی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

۳۔ آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں۔ وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اپنی زبان سے کیسے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا۔ کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عوام کو دکھا گیا ہے کہ لوگ نفعانیت کے رنگ میں رنگے جائیں۔ یا طوطی گستاخوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں۔ یا سکھ

وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے
۴۰ ہماری قوم کے سرکار و رہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی شہری اجماع ضرورت
کا احساس کیلئے بلاشبہ مسلمانوں کی درسگاہوں میں جہاں علوم حدیث کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر طلبہ
اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض
فراوانش کر دیں اور ان میں قوم و ملک کی سمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو درسگاہ
مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آگ ہے۔ اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد نوکریسی
کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علیحدہ ہو اور جس کا تمام تر نظام
عملی اسلامی حفظان اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جوارث و حضرت شیخ الہند
نے فرمایا ہے۔ مصنف انگریز بھی یہی بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں پچانچہ ڈبلو ڈبلو ہنٹر صفحہ ۲۰۲
میں ۱۸۷۱ء میں لکھتا ہے

دو مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں۔ جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں
دنیا دار لوگ ہمیشہ قائم حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے انگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان
خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں لکھتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے الٹا کرنا نہ جانتا ہو۔ ایسا
کے پھیلنے پھرنے والے مذہب حب مغربی سائنس کے سچے پیسے صحافت کے مقابلے میں آتے ہیں۔
تو سیکھ کر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقہ کی
امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے فائدہ عقائد اور غلطی بہت جابجا دے مالک ہیں۔ اپنی
نمائندہ ادا کر کے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں۔ لیکن ضروری اور اہم مسائل پر پہنچنے
کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔

(صفحہ ۲۰۲ ہمارے ہندوستانی مسلمان مترجم ڈاکٹر صادق حسین الہی بی ایس)

۴۱ سے واپسی اجلاس مذکورہ سے فارغ ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ دہلی شریف لائے اور ڈاکٹر انصاری صاحب رحم
کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت ترجیح سے علاج فرمایا۔ چونکہ اس سے پہلے اتر میں ججیت
افتادہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی علی رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی جیلہ آؤ۔ مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا احمد عید صاحب اور دیگر
ہندو ہندو سے ہو چکا تھا۔ اور پہلا جلسہ بھی وہیں ہو چکا تھا۔ اس لیے اہل الرائے حضرات نے ضروری سمجھا کہ اب اس کا دوسرا اجلاس
بے جا نہ ہو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں منعقد کیا جائے۔ تاکہ احوال حاضر میں علانیہ اسلام کا زیادہ سے زیادہ اتفاق
ہو۔ حضرت کرام مقبولیت حاصل ہے۔ مسلمان سب سے زیادہ آپ کے گرویدہ اور آپ کے ساتھ ہیں اعتقاد رکھتے ہیں

اور آپ پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی اسناد عاکلی گئی تو آپ نے قبول فرمایا۔ اور ۸۰، ۹۰ ربیع الاول اجلاس کی تاریخ مقرر گئی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی کفایت اللہ صاحب کو تحریر خطبہ صدارت پر مامور فرمایا اور مضامین مندرجہ ذکور فرمادیے۔ مفتی صاحب مرحوم نے مسودہ تحریر کر کے پیش فرمایا اور حضرت کو سہنایا۔ بعد ضروری اصطلاحات اور ترجمہ کے حضرت نے تصحیح فرمادی۔ اور حضرت اس قدر سمجھا اور ضعیف تھے کہ جلسہ میں باوجودیکہ وہ دہلی میں تھے۔ نہیں جاسکتے تھے۔ جلسہ میں خطبہ مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کے پڑھا۔ مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیت العلماء اپنی کتاب علماء ہند ص ۲۱۵ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”در حضرت شیخ قدس اللہ سرہ العزیز الکریمات مقدسہ کے بالکل آخری دور میں تھے۔ مگر علمائیت کی آرزو یہی تھی کہ جمعیت علماء حضرت شیخ الہند کی صدارت کا تاریخی اختیار حاصل کرے اور آپ کے فیوض سے وطنی اور ملی سیاست کے متعلق ایسے بنیادی اصول معلوم کر لے جس پر پاکستان ہرگز اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کرتی رہے۔“

حضرت شیخ الہند کا خطبہ صدارت اگرچہ نہایت مختصر تھا۔ مگر طراوت اور ملی سیاست کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے مکمل اور کافی تھا۔

حضرت شیخ کے اس خطبہ صدارت نے علماء ملت کو ہندو مت کے ذیل اصل نظریات کی ہدایت فرمائی۔

۱۔ اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن غلو ہے جس سے ترک برائت منہ ہوتے ہیں۔
۲۔ تحفظ ملت اور تحفظ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ ہیں اگر برادران وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جواز اور مستحق ننگریں ہیں۔

۳۔ استخلاص وطن کے لیے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے۔ مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔

۴۔ اگر موجودہ زمانہ میں توپ، بندوق، ہوائی جہاز کا استعمال ممانعت اصدار کے لیے جائز نہ رہتا ہے۔ باوجودیکہ قرون اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں تو خطایہ دن اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں تامل نہ ہوگا کیونکہ موجودہ زمانہ میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں توپ، بندوق ہوائی جہاز نہیں ہیں یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔“

(خطبہ صدارت مطبوعہ مطبع قاسمی دہلی ہند)

حضرت شیخ کی اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس کے چند جملے بلغہ درج ذیل ہیں۔

”کوچہ پشیدیں کہ اختتامی تحریر جو آخری اجلاس میں پڑھی گئی اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کشیدہ قوم ہندو کو کسی نہ کسی طرح سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں موید بنادیا ہے اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ بخش سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو

محسوس کر کے جو کہ شش ماہ کے لیے فریقین کے عائد ہونے کی بنے اور کر رہے تھے۔ اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حالات اگر اس کے مخالفت ہوگی۔ تو وہ ہندوستان کی آزادی کو عیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ اور دوسری حکومت کا آئینی چہرہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرنا چاہے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلاؤ نافستہ باقی رہ گیا ہے۔ تو وہ بھی ہمارے باطل اعمال سے صرف غلطی کی طرح غفلت بہت سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو بلا کر تینوں عہدہ راجہ وراثتی سے رہیں گے۔ تو سمجھیں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم نہاد وہ کوئی ہی برہمن طاقت ور ہو۔ ان اقوام کے باہمی نصب العین کو محض اپنے ہر دو استبداد سے ڈسنے کے لیے ہی ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مخالفت اور آئینی کو اگر آپ بازار اور شوگر دیکھنا چاہتے ہیں اس کی حد و خوب اچھی طرح دیکھیں کر لیجئے۔ اور وہ حدود یہی ہیں۔ کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود ہیں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں۔ کہ مسلح وراثتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی کوئی امر کبھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دوسری معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا ہے کہ اب تک بہت جگہ مل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزریا کرتے ہیں۔ لیکن محکموں اور ارباب معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جہود سے خطاب نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو صلیبوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریڈیویشن کی تابندہ سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ عملی نوکریاں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے کبھی معاملات اور کاری محکموں میں تصادم و تقابض کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اگر فرض کرو، ہندوستان کے برتن سے پانی نہ پیتے، یا مسلمان ہندو کی اربھی کو کدھانہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے ملک نہیں۔ البتہ دونوں کی وہ عرفیہ جنگ آزما فی اور ایک دوسرے کو مزید پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں اتفاق کے حق میں ہم قائل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا عملی انداز کریں گے۔

(حضرت خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند علیہ السلام)

(ازملائے حق ۳۱۸)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بیماری اور وصال کی تفصیل تین باب مولانا صاحب
 حسین صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ "حیات شیخ الہند" میں بڑی تفصیل سے لکھی ہے جس کو نقل کرنے میں بہت تطویل ہے۔ بنابریں ہم اس کا اختصار ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو ایک بجے دن کو مالٹا سے
 بمبئی لورڈ پر تشریف فرما ہوئے۔ بمبئی میں دو دن قیام فرما کر ۲۳ رمضان شب جمعہ مطابق ۱۰ جون
 لجنڈا مغرب روانہ وطن ہوئے۔ ۲۴ رمضان المبارک مطابق ۱۲ جون ۱۹۲۰ء بوقت صبح دہلی پہنچے
 ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کے یہاں قیام فرمایا۔ ایک روز قیام فرما کر ۲۵ رمضان المبارک مطابق
 ۱۳ جون ۱۹۲۰ء بروز یکشنبہ بوقت صبح دہلی سے روانہ ہوئے۔ اور اسی روز ۹ بجے دیر بند پہنچے
 استقبال کرنے والوں کا ہر ایشیہ پر جس طرح نہایت زیادہ ہجوم تھا۔ یہاں پر بھی بہت زیادہ ہجوم تھا۔
 ایشیہ سے سیدھے دارالعلوم تشریف لے گئے۔ مہاتوں کی اطرائ و جوانب سے بہت زیادہ آمد
 تھی۔ بنابریں ۱۰ شوال ۱۳۳۸ھ کو دیر بند ہی میں قیام فرمایا پڑا۔ ورنہ پچھتر ارادہ تھا کہ جلد از جلد مولانا
 حکیم نیرت حسین صاحب مرحوم کے مکان پر کوڑھ جہاں آباد و ضلع فتح پور مرحوم کی قبریت کے لیے پہنچیں دہلی
 ان کی والدہ ماجدہ اور دیگر متعلقین موجود تھے۔ وطن سے الہ آباد، غازی پور، فیض آباد، لکھنؤ مراد آباد
 ہوتے ہوئے ۲۵ شوال کو دیر بند واپس ہوئے۔ چونکہ اہلیہ محترمہ سخت بیمار تھیں اس لیے درمیان فی
 مقامات پر نہ جاسکے مگر پچھتر عقیدت مندوں کے بہت تقاضے تھے۔ ۱۴ ذیقعد ۱۳۳۸ھ کو اہلیہ محترمہ مرحوم
 نے داغ مفارقت دیدیا جس کا اثر طبع مبارک پر بہت طبعی اثر تھا۔ ماہ ذی الحجہ میں دیر بند میں موسیٰ بنابر
 اور تپ ولرزہ کا بہت زیادہ شروع ہوا۔ چنانچہ پچھتر و محرم کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ بھی
 بقلاتپ ولرزہ ہو گئے۔ سہ پہلے ذکر کرتے تھے کہ وہ بوج مفاصل اور بواسیر کی تکلیف سابق ہندستان
 پہنچنے کے بعد عود کر آئی تھی۔ مگر تاہم اس کا تحمل فرماتے تھے اور نشست و برخاست آمد و رفت
 پر زیادہ اثر نمایاں نہیں ہوئے دیتے تھے۔ مگر اس تپ ولرزہ نے بیکارگی اتنا ضعیف کر دیا کہ
 نشست و برخاست آمد و رفت کی طاقت جاتی رہی۔ معالجہ ایرانی اور ڈاکٹری جاری تھا۔ بعد
 انتہائی کمزوری اور مرض کے اواخر محرم سے آفاقہ ندر کی طور پر شروع ہوا۔ مگر آفاقہ کی رفتار بہت
 سست تھی۔ ۲۰ صفر کو تقریب صحت احباب اور طلباء دارالعلوم کی دعوت کی گئی جس کا اہتمام
 غلمیں نے اٹھو دیا تھا۔ اس قدر کہ کوئی خوشی باقی رکھنی منظور نہ تھی۔ ۲۹ صفر کو کچھ بیمار آیا اور پیش
 بھی ہو گئی اور ضعف اور مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ تا آنکہ اطباء نے ورم جیٹیفین کیا۔ اسی زمانے میں سفر
 علی گڑھ کی شریک ہوئی۔ جس کو سہ پہلے ذکر کرتے ہیں چنانچہ ۱۶ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر
 ۱۹۲۰ء بروز جمعہ علی گڑھ میں جلسہ ہوا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ پڑھ کر صدارت فرمائی۔ کمزوری

استقرتہی کہ خود نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مولانا شبیر احمد مرحوم نے خطبہ پڑھا۔ اگلے روز علی گڑھ سے واپس ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر دہلی قسطنطین لے گئے۔ معاملہ نہایت توجہ سے ہوا جس سے تحقیق کے آثار نمایاں تھے۔ ۱۴ ربيع الاول تک اطمینانی حالت رہی۔ مگر ۱۵ ربيع الاول پریم شنبہ کو کچھ لرزہ بھارا اور حالت نہایت نازک ہو گئی۔ بیمار بہت تیز ہو گیا۔ حالت اگرچہ قسطنطین تک تھی مگر پیش و حمل سبج تھے۔ آدمی بچا پتے تھے۔ بہت ضعیف آواز سے بات بھی فرماتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مرحوم سناخ ص ۱۲۶ میں لکھتے ہیں (۱۵) کی شب کے متعلق رات بھر یہی حالت رہی۔ سید پرلغز تھا جس کو ضعف کی وجہ سے دفعہ نہیں کر سکتے تھے صبح کو شہد کا شربت دیا گیا تو غلاب اسد علی میں اثر کیا۔ ۶ بجے کچھ اجابت ہوئی۔ اور خود اپنے ہاتھ سے پانی سے استنجا کیا۔ نصف نعلیہ بظہر بچتا جاتا تھا۔ اور یوں پیش و حمل سبج ہو گئے کے ایک استغراقی حالت تھی مخصوص لوگ چار پائی کے گرد جمع تھے۔ دل دھڑک رہا ہے تھے۔ طبیعت ہر اس سال بیتی کہ دیکھتے کیا ہوتا ہے۔ سات بجے کے بعد ۱۵ ربيع الاول ۱۳۳۹ کو یوم سہ شنبہ ۳۰ نومبر کو بہت تیز ہو گیا۔ حضرت دنیا سے بالکل غافل ہو گئے۔ تنفس طویل اور غیر طبعی ہو گیا۔ اور انقطاع عن السیاق قوۃ الی الرفیق الاصلی کا گمان غالب آئے لگا۔ چار پائی کے گرد حاضرین خاموشی اور ہستکی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں حضرت نے اس غیفا فی اور واجب الوجود کی کو یاد کیا جس کے نام پر اپنے آپ کو محو کر دیا۔ تہا یعنی بلند آواز سے ۳ مرتبہ اللہ اللہ اللہ فرمایا۔

مولانا شبیر احمد مرحوم کا بیان ہے جس کو مولانا جلیل صاحب نے نقل فرمایا کہ حضرت نے تھڑی دیر آنکھ کھل کر چھت کی طرف دیکھا۔ چہ فرمایا کہ مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ میں بستر پر رہا ہوں۔ تمنا تو یہ تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اعلیٰ کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔ اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ اٹھ بیٹا آواز بلند ہو گئی۔ دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے سورۃ یسین شروع کی مگر وہ جوش گریہ اور ادب کی وجہ سے بلند آواز سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ اس لیے مولوی حافظ محمد الیاس صاحب نے پڑھنا شروع کیا۔ سورۃ قریب الختم ہوئی تو حضرت نے خود بخود حرکت کر کے اپنا بدن سیدھا اور درست کر لیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں کھل کر سیدھی کر لیں اور ۸ بجے جب کہ مولوی صاحب بالکل اخیر پہنچے تو حضرت نے ذرا آنکھ کھلی اور تصدیق طبعی کی تاہم کہ لیے زبان کو حرکت دی۔ ان خاص المیزاجوں کی آواز پر قلب رخ ہو کر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کر لی۔ کبر اور سہولت سے سانس قطع ہو گیا اور روح مقدس روح درجین رحبتہ نعیم

کی بنیاد دیکھنے کے لیے تمام اہل اسلام کو قیوم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔ **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** ۱۰ وفات سرور عالم ﷺ ہوئی۔

رواۃ شیخ الحدید رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸)

غزوہ اور پریشانی اعلیٰ جانہ زمین کے صدر سے اور قلعہ شہادت اری کا اندازہ آسان نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ حالت رہی کہ ایک کی خبر نہ تھی کسی کی آنکھ کی سرسبز پٹی ٹھیکہ لگیا۔ ایسے جانکلاہ حادثات پر آہ و نالہ اور سپیخ و پکار ایک معمولی بات ہے۔ مگر حضرت رضی اللہ عنہ فیض صحبت کام آرا اور رضا با تقصا کا مستحق غالب ہوا۔

انصاف کفایت کے بعد منزل اول (قبر) کا گذر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بھاتی صاحب رحمہم محرم صاحب خدام سے استفسار فرمایا کہ اگر وہی دفن کرنا آپ مناسب سمجھیں تو محدثین و حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور اسحاق کلام رحمہم اللہ تعالیٰ عز و جلال میں سامان کیا جائے اور اگر دیوبند کا خیال ہو تو وہاں کا انتظام عمل میں آئے۔ جواب کیا گیا کہ حضرت کی آرزو تھی کہ اپنے محرم اور جوار با کرامت میں جگہ ملے اور یہی آرزو اور شیش دوسری دنیا (مالیہ) سے کھینچ کر لائی تھی۔ نیز صاحبزادیاں بھی اب تک وہی نہ پہنچیں تھیں۔ لیکن یہی راستے ہوئی کہ دیوبند لے چلنا چاہیے۔

رواۃ شیخ الحدید (۱۲۸)

دیوبند کے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اس ضمن میں مفصل شمار روانہ کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہو گئی۔ جنازہ شام کو ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم اطلاع دینے اور کفن و تابوت اور ریل کے انتظامات میں مصروف ہوئے۔ اور خدام نے عمل کا انتظام کیا۔ صاحب نے مخصوص لشکر ووں کی اطلاع سے بطریق مسنون عمل دیا۔ اور کفن پتھر کا تابوت میں رکھا۔ جو کہ نہایت اہتمام سے بہت جلد تیار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی وجاہت سے بارہ بجے تک ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور ریل کے معلق تمام انتظامات درست ہو گئے۔ جن کی تکمیل میں دوسرے دن وقت اور تاخیر پیش آئی۔

ڈاکٹر صاحب ہی کا کارآمد وقت ہمیں میرے پاس وفات اور جنازہ کے دیوبند لے جانے کا اسی روز شام کو پہنچ گیا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنے لیے ان کو گرتی اطلاع نہیں دی تھی۔

مگر مولانا حلیل صاحب کا بیان یہ ہے کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی راستے یہ ہی تھی کہ حضرت کو مقبرہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میں دفن کیا جائے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میں دو مشکلات میں آ رہا ہوں ایک یہ کہ دیوبند لے جانے کا مذہب صحفی میں یہ غیر مستحسن ہے اور دوم یہ کہ یہاں کے مقابر میں دفن کریں تو چونکہ اس وقت حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تمام مسلمانوں کی انتہائی شغف اور محبت تھی کہ لوگ قبر پر بیٹھ کر دیں۔ اور ہم کتنا ہی صدائے احتجاج ملے کہ کچھ بھی نہ سنیں۔ پھر فرمایا کہ امیرن البقیہ میں ہے کہ جنازہ دیوبند ہی لایا جائے۔ وہاں قبر کے سچے کرنے کا احتمال ہے اور صاحبزادوں کی بھی اشک شرفی ہو جائے گی۔ اس لیے اسی کو اختیار کیا گیا۔

نے ان کو اطلاع دی ہوگی۔ دہلی میں آنا فنا و فساد کی خبر مشہور ہو گئی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی اپنی دکانیں فرما بند کر دیں۔ بہار اور
ملتان ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گئے اور جنازہ تیار کرتے ہی نماز جنازہ کے متعلق جو سب سے پہلے محمد حسن صاحب بارہنہ و حضرت رحمۃ اللہ علیہ
نے فرمایا کہ تم لوگ کی خواہش اور امر اسے تو تم جنازہ پڑھ لو میں شریک نہ ہوں گا۔ تاکہ مجھ کو نماز کے دہرائے کا اختیار نہ رہے۔ اور میں دیوبند میں پھر
از اونہ و قارب کے ساتھ پڑھ سکوں۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ایک مرتبہ بہت بڑے جمع کے ساتھ نماز ادا کی
۔ اس کے بعد جنازہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ لوگ بڑھتے جاتے تھے۔ اندازہ کیا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر
ان پر آرمیوں کی تعداد ہو گئی۔ وہاں پھر دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ڈھائی بجے کے بعد دہلی سے وہ گاڑی جس میں تالوت تھا۔ روانہ ہوئی
پشاور پہنچے اور پچاؤ فی ریڈ پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شب کو تالوت دیوبند اسٹیشن پہنچا۔ از دعاء نہایت عظیم الشان تھا۔
کل تمام جنازہ اسٹیشن سے نکلا اور بہت دیر میں مکان پر پہنچا جو کچھ قریب سے تیار تھی۔ اس لیے بہت سے لوگوں کی راستے چوٹی کہ ابھی رات
میں دفن کر دیا جائے۔ مگر پھر کچھ صاحبزادیاں اور ملاوٹ جو کہ مارنے کے بعد دیوبند سے دہلی کو روانہ ہو چکے تھے اور ابھی راستہ ہی میں تھے۔ کہ جنازہ
رہی آباد آگیا۔ اس لیے وہ غازی آباد آگئیں۔ مگر پھر کی زیادتی اور ٹرین کی جلدی سے روٹنگی اور ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ساتھ نہ ہو سکی تھیں۔ اس
پہرچ اس کو دی گئی کہ صبح تک جنازہ دفن نہ کیا جائے۔ پناہ وہ اگلی ٹرین سے رات میں آگئیں۔ بہت سے عمدت مند اور مخلصین کا

(حاشیہ گذشتہ صفحہ سے)

حضرت شیخ الہند کے قیام و احوال کے زمانہ میں مولانا
عبد اللہ مصری مولانا آزاد کا کلکتے سے ایک خط لکھا
آئے۔ جس میں لکھا گیا تھا کہ مدرسہ عالیہ کے طلباء نے تین ممالک کے
تحریک پر مدرسہ عالیہ سے علیحدگی اختیار کر لی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
کلکتہ سے ایک آزاد نیشنل مدرسہ عالیہ قائم کروایا جائے۔ لہذا آپ شیخ
ایک مدرسہ دینے جو علم حدیث کے تمام کتابیات اچھے طرح پڑھائے۔ حضرت
شیخ الہند نے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کا نام تجویز
کیا۔ نیک انھوں نے بعض مجاہدین کے بنا پر عرض کیا۔ بالآخر حضرت مدظلہ کا
نام تجویز کیا گیا۔ حضرت مدظلہ جاتے ہی تیار ہو گئے۔ آپ کلکتہ جا رہے تھے کہ راستہ
میں اس روہ والو نے آپ کو ایک ٹکٹ کے تصفیہ کے لیے (جو کہ سیٹروں اور شیروں کے
دھیان تھا) اتار دیا۔ ابھی اس روہ میں ہی تھے کہ وہلی سے ڈاکٹر صاحب کا
تار آگیا کہ حضرت شیخ الہند کا وصال ہو گیا۔

بے شمار اجتماع سہارن پور مظفر نگر وغیرہ اطراف و جوانب سے ہوا گیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ نماز جنازہ اور دفن صبح کی نماز کے بعد کیا جائے گا۔ یہ اجتماع اور بھی زیادہ ہوا گیا۔ جنازہ صبح کی نماز کے بعد دارالعلوم دیوبند میں پہنچا گیا۔ نورہ اور بابہ کا صحن آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمام صفت بندی ہوتی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ولی اقرب اور برادر عزیز مولانا حکیم محسن صاحب جنھوں نے اب تک نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ بالکل مضطرب چشم تر نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ تمام مجمع پر ایک پرفیکٹ سکوت طاری تھا اور ایک سہیبت و فورانیت مشاہد ہو رہی تھی۔ اس کو مذہبات حسرت سمجھنے یا واقعیت و حقیقت کہتے۔

دسراخ ۱۵۲

دیوبند میں اس وقت تک بڑے پڑھوں نے بھی کبھی کسی جنازہ کے ہمراہ اس قدر جمع نہیں دیکھا تھا۔ مدرسہ کے دروازہ سے تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ جنازہ بمقام میں پہنچا یعنی بنالیں برس کی ظاہری جدائی کے بعد دنیا کی کشاکش سے استراحت کے لیے یہ خواہناں اپنے مقدس و شریف و اسما کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ تہنیت راجی، جنازہ قریب لاکر رکھا گیا۔ مولانا حکیم محسن صاحب اور ان کے داماد اور بعض مخصوص خادم قرین اترے۔ چاشت کا وقت تھا۔ نوبت تھی کہ قدورہ الراصلین امام الحرمین والعارفین، قطب کمالات، بطل حریت، آزاد کفندہ، ہندوستان، حاتم دوراں، بخاری زمان، کوہ و قمار و علم، آفتاب معرفت و علم، گنجینہ حجاز، خزانہ امدادیت، سنن نبویہ و علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ کو بعد میں اتار دیا گیا۔ اور شریعت و طریقت کے آفتاب عالم تاب کو پیش کش کے لیے بچھا دیا گیا۔ ایک غزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ہے

مٹی میں کیا سمجھ کے بچھاتے ہو دوسترا
گنجینہ علم ہے۔ گنجینہ نذر نہیں،

اللہ وانا الیہ راجعون ورحمۃ اللہ عنہ وایضا آمین۔

میسائے زمان بچھا خاک پر چھڑ کر سب کو

چھاپا چاہ لحد میں دہائی قسمت ماہ کنعانی
جو تھا موصول الی اللہ ہو گیا واصل بحق ہو چکا،

پہرے ہیں ڈھونڈتے سرگت گان تیرہ جانی
زمانے نے دیا اسلام کو داغ اس کی نفرت کا،
کہ تھا داغ غلامی جن کا مختارے مسلمان،

نہیں ہے سینہ بھرج کر گنج شہیداں سے

تنہا جو تھیں دل میں ہوتی ہے بکی قربانی
فدا نہ ہاتے شیشیوں سے کوئی ایک دکھلا دے

کتے تھے حق تعالیٰ نے جو مولانا کو رزائی

قطا ایک آپ کے دم سے نظر آتے تھے سب زندہ

سجاری ، غزالی ، بصری کربلی و نغانی

جنہیں پھر ڈاکٹر پر حضرت امداد و قائم نے

کرے گا کون ان سب مکیوں کی باتے پانی

صفت در چشم زند صحبت بار اخوند

روئے گل سپر ندیم و بہار اخوند

میرا دیوبند پہنچا

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کلکتہ بھیجنے کے تیسرے دن امر دیوبند پہنچا اور اسی

نے دیوبند جانے کا ارادہ کر لیا۔ لوگوں نے منع بھی کیا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شام کی گاڑی نکل چکی تھی۔ اس لیے رات کی گاڑی ملی اور میں صبح کو قنوج پہنچا۔
۹ بجے دیوبند پہنچا۔ حضرت رحمۃ اللہ کے دولت کدہ پر جب پہنچا تو دیکھا کہ لوگ دن سے فارغ ہو کر واپس آ رہے ہیں۔ اپنی بد قسمتی اور بے چارگی پر انتہائی افسوس تھا کہ باوجود سالہا سال حاضر باشی کے شریعت آخری وقت میں زوفات کے وقت حاضر ہوا اور زوفن میں شرکت کر کے افسوس!

قسمت کی بغی کو صیاد کب کرے

سر گرہے پہاڑ تو فراد کیا کرے

کچھ بڑا کر دیا۔ دو چار روزہ کلکتہ کا عزم کیا۔ حضرت مولانا مفتاح محمد صاحب رحمہم مستم دارالعلوم دیوبند مانع ہوئے اور دیوبند ہی کے قیام کا حکم فرمایا۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا میں نے عرض کیا کہ حضرت نے اپنی شدید بیماری کے دوران میں جب کہ خود حضرت میری حاضری کی ضرورت محسوس فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اہم ضرورتیں درپیش تھیں۔ ان سب کو نظر انداز فرما کر کلکتہ روانگی کا حکم فرمایا۔ اور کلکتہ کے کام کو سب پر ترجیح دی۔ اب وفات کے بعد کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت کا حکم کس پشت ڈال دیا جائے اور تن آسانی اختیار کی جائے۔ خصوصاً جب کہ دارالعلوم میں بہت لوگ کئی حضرات موجود ہیں۔ میرا یہاں قیام کس طرح درست سمجھا جاسکتا ہے؟ الغرض میں نے کلکتہ کی روانگی پر اصرار کر کے حضرت مستم صاحب کو راضی کر لیا اور کلکتہ پہنچ کر اب باقی حدیث شریعت سمجھال لیے۔ مگر کچھ خلافت اور آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اطراف و جوارب کلکتہ میں بکثرت چلے ہوئے تھے۔ ان میں بار بار حاضر ہونا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں اندر رہن نگار بھی دور دراز شہروں میں بڑے بڑے جلسوں میں جانا پڑا۔ جن میں سے مولوی بازار کے مشہور جلسہ کانگرس و خلافت میں بھی جانا پڑا۔ ایک جلسہ کانگرس کے صدر مولوی اے۔ اے۔ آجمنانی تھے۔ اور جلسہ خلافت اور جمعیت کی صدارت مجھ کو انجام دینی پڑی تھی۔ اور دوسرا جلسہ ضلع رنگ پور میں بڑے پیمانے پر ہوا تھا۔ دونوں کے خطبات چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح دوسرے ہندوستان یونی میں بھی آنا پڑا۔ ایک جلسہ سیدارہ ضلع بجنور کا تھا۔ اور اس جلسہ میں جمعیت کی طرف حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نائب مستم دارالعلوم نے فرمائی تھی اور جلسہ خلافت کی صدارت کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی کانگرس کا اجلاس مشترک طور پر ہوا تھا۔ اس کے صدر رہو دون کے ایک پنڈت صاحب تھے۔ میرا خطبہ اس وقت بھی شائع ہوا۔ ان جلسوں کے مولوی اقتباسات حضرت مولانا محمد میاں صاحب نانظم جیو پلار مہند نے اپنے رسالہ میں نقل کر دیئے ہیں۔ اسی طرح سہارنپور کے مدرسہ مظاہر العلوم کے سالانہ جلسہ میں بھی کلکتہ سے حاضر ہونا پڑا تھا۔

لے ملاحظہ فرمائیے رسالہ حیات شیخ الاسلام

اس کے بعد کراچی کے مشہور جلسوں میں حاضر ہوا پڑا جس پر کراچی کا تاریخی مقدمہ چلا۔ اور دو سال قید باشت کی سزا سنائی اور مولانا محمد علی دوسلانا شرکت علی وغیرہ میرے ساتھیوں کو حاصل ہوتی اور کلکتہ کی ملازمت اس کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سرکاری بیان پر غور کریں۔ کیونکہ یہ احوال اکثر خبروں میں آگئے ہیں۔ بعد ازاں مولانا محمد میاں صاحب نے اپنے رٹسوں میں ذکر فرمادیتے ہیں اور لوگوں کو معلوم بھی ہیں۔ نیز خطبات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس لیے مزید تکرار پر غیر ضروری ہے۔

تذکرہ فرساقی بند کر دے ہیں۔

۱۔ ترجمہ قرآن مجید۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے درس و تدریس اور سیاسی مشاغل کے باوجود کئی ایک کتب تحریر فرمائی ہیں۔ ان سب میں سرفہرست قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ قرآن پاک مالٹا جیل میں سرانجام پایا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ شایعہ حضرت کو مالٹا جیل میں جو کس ہی اس لیے فرمایا تھا کہ وہ ترجمہ قرآن کی تکمیل کر لیں۔ سورۃ مائدہ تک حاشی تحریر فرمائے تھے کہ رہائی گئی۔ اور بقیہ فراموشی طالعہ مشہور احمد عثمانی نے پورے کر لیے۔

اس ترجمہ و تفسیر کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مقبولیت عطا فرمائی کہ شیعہ دہلی اور ترجمہ و تفسیر کو حاصل نہ ہوئی۔ جو یہی ترجمہ و تفسیر فارسی ترجمہ ہر حکومت افغانستان کے اہتمام سے کابل سے شائع ہوتی۔ تاج پبلی لاہور نے اس ترجمہ و تفسیر کو اتنی عمدگی اور لافاست شائع کیا ہے کہ جس کی نظیر میں ملتی۔

- ۲۔ تراجم ابواب بخاری، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحیح بخاری کے تراجم کی تشریحات ہیں جو نہایت مشکل کام ہے۔
- ۳۔ تفسیر ترمذی زبان عربی، یہ تفسیر ترمذی شریف کے حاشیہ پر چھپی ہے اور مقبول خاص و عام ہے۔
- ۴۔ حاشیہ ابوداؤد شریف، یہ بھی حدیث پاک کی خدمت ہے۔
- ۵۔ حاشیہ فقیر الباقی، عربی معانی کی مشہور کتاب پر حاشیہ
- ۶۔ ایضاح الا دلہ،
- ۷۔ شرح اثنی عشر فی تہمتی المحمدی القری، حضرت گنگوہی کی کتاب کی شرح، مضمون نام سے ظاہر ہے۔
- ۸۔ جہد القتل فی تنزیہ العز و الذل،
- ۹۔ ادلہ کاملہ، ۱۰۔ افادات محمود، ۱۱۔ کلیات شیخ الہند۔

۱۲۔ ملاحظہ فرمائیے علامہ حق جلد اول و دوم و حیات شیخ الاسلام

سوادِ تحریر حضرت شیخ الہند

شیخ الہند کا یہ خط حضرت مولانا محمد انوری مدظلہ کے والد ماجد مولانا شیخ الدین صاحب خیر وادگی ضلع لاہل پور کے نام ہے۔
حضرت مولانا محمد صاحب کے شکریے کے ساتھ ہم یہاں اس کا عکس دے رہے ہیں۔

مکرم سرا یا فضل و غایت زید و حیکم بندہ محمد مسیحی کی العبد
موسیٰ آپکا گرامی نامہ مولیٰ عبد اللہ صاحب کی دست سے پہنچا
مولوی صاحب نے چند بار جواب کا تقاضا اور یاد دہانی بھی کی مگر مفرد
مسفر کی مشاغل کی وجہ سے جواب کی توبہ نہ آئی
کچھ ہی وقت سخت مضر اور ہی آپکو لازم ہی کر عبت کی
ساتھ اپنی مشاغل و اذکار کی طرف رجوع کر رہا اور بہتر
ہو جو شب جمعہ میں غسل کر کے اور دو رکعت خشوع کی
ساتھ ادا کر کے اپنی اللہ سے توبہ کر رہا اور توفیق حسنت
اس الحاح کی ساتھ دعا مانگیں اور اپنا کام التزم کی ساتھ
شروع کر دیں اور عزم و محبت کی ساتھ اپنی کام میں مصروف
رہیں اور یہی کہ آپس نہ آئی دین بندہ حقیر ہی آپکا
لئے دعا کرتا ہی عشا کی بعد یا حی یا قیوم برحمتک
ترتیباً ایک سو ایک مرتبہ چہر کی ساتھ پڑھ لیا
اور یا حی کی ضرب قلب پر لگتی جا رہی

باقی از کار فرمودی صفتِ قدسِ حق اللہ علیہ سچ جاؤ —
 پریشان خواب و بخت نکر و سو نیکی وقت آیتہ الکرسی
 سورۃ فاتحہ معوذتین پڑھ کر دم کر لیا کر د اور کوئی خواب
 پریشان نہ آوی تو روزِ دلِ محل اور تعوذِ شکرِ قلب پر
 تہنکار دو اور کچھ پڑا نہ کرو —

در حق کی تعظیم کی کیسی پڑا نہ کرو اور اللہ پر توکل رکھو آپکو
 اللہ تعالیٰ شرفی عین سے محفوظ رکھی (بیشک یہ ضروری ہے کہ
 روٹوں کی ساتھ جلق اور زخمی اور صبر و تحمل سے معاملہ کرو
 کلمہ آجی ضرور کہو گو نہایت نرمی اور ولایت سے اللہ تعالیٰ
 اور نیکو ہدایت کری — اپنی اولیہ سے بے صلہ سنون کہہ بنا
 کہ بہت ہو تو جماع دن ارستہ میں ایک دفعہ یا مختلف اوقات
 میں اسم ذات یعنی نفذ اللہ کو چار بار اور مرتبہ پور کر د
 کرو — وہم اور دوسرے بری بلادہی ہرگز اسکا خیال
 نہ کرو اور دل میں نہ رکھو کہ جو چیز شریعت میں پاک
 ہی کی دوسرے سے وہ ناپاک نہیں ہو سکتی

بلکہ دوسرے شیخ فیضیال ہی صیب دوسرے آدمی تو
 لا عقل پڑ جو اور اد سکون فر د اد کی کو افق عملہ آند
 نکر و درند اور زیادہ دوسرے ترقی کر گیا اور دفع کر نی
 سے اٹا دلہہ رفتہ رفتہ جاتا رہ گیا — اپنی صاحبزادی
 سے بعد سلیم سنون فرما دیجی کہ تلو و تفران صیب صہبت اور
 صبح و شام درود — استغفار — سبحان اللہ — الحمد للہ
 لا الہ الا اللہ — اللہ اکبر ایک ایک تسبیح پڑھ لیا کرین
 تمام ضرر نکاح رکھی گا کر و جی جینر کی کوئی مقدار نہ کوئی
 وقت فردری جو سہولت میسر ہو اس پر یاد دہری وقت
 وہ دیدہ یا عادی ہر کی مقدار کو کم رکھتا بہتر ہی لیکن کوئی
 مصلحت درپیش ہو تو پانچ صد سے بڑا دینا مبالغہ نہیں

باقی عزیزت ہی واسطہ فرمائی

سکھ دوسرے محمودی

موقع وفات

موقع حیات

(رباعی)

محمود کہ بود مرکز سر و بود
آن نقطہ قضا ز لوح هستی نبرد

بہر کس کہ باد رسد بجائی
محمود رسید در مقام محمود

مولانا گرامی مرحوم

محمود کہ ز قلم بحرف باطل
بر بست ابرام کعبہ حضرت دل

مرد ایہ زندان با رفت وے
باطل را حق گفت حق را باطل

مولانا گرامی مرحوم

آہ شیخ الہند مولانا محمود حسن
رفت زین دار فنا اید و ست در دار بقا

بہر تارخ و مائش بر در ہائے شدم
ناگہاں آمد بگوش من عظامی این ندا

بے سرو پا گشتہ انداز دست بیدار ایل
علم و مجد و ریح و تقوی فقر و تسیم و رضا

۱۳۳۹ ہجری

عظامی مرحوم

حکیم الامت حضرت مولانا شرف علی تھانوی

۵۱۳۶۲
۶۱۹۲۳



۵۱۲۸۰
۶۱۸۶۳

حکیم الامت خود اپنی نظر میں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلقہ بیچوں میں متعین ایک لکھیں
افرنے بیعت کی درخواست کی تھی۔ جس کے جواب میں آپ نے ان باتوں کو کرتے ہوئے لکھا۔

”میں ایک خشک طالب علم ہوں۔ اس زمانہ میں جن چیزوں کو لازم درویشی سمجھا جاتا ہے جیسے میلاد شریف، گیارہویں عرس، نیار، فاتحہ، قوالی و تصرف و مثل ذالک میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اس خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔“

میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف۔ نہ صاحب تعریف ہوں اور نہ عامل۔ صرف اللہ اور رسول کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا۔ نہ اپنی حالت۔ نہ اپنی کوئی تعلیم۔ نہ امور دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں۔ نہ کسی کی سفارش۔ اس لیے بعض اہل الزام مجھ کو خشک کہتے ہیں میرا مذاق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں۔ خواہ حرفی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کا اذیت نہ پہنچائی جائے۔ خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو جیسے کسی کی تحقیر کسی کی غیبت۔ خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنجیدہ معاملہ کرنا اور اگر کوئی غلطی سے ایسی بات ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا استغناء ہوتا ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس سے نجات دے۔ یہ ہے کچا چٹھا ور نہ لوگوں نے تو یہ

منش کردہ امر رستم پہلوان :۔ دگر نہ بلے بود در سیستان

شمال

خلیج

نورانی صورت۔ گندمی رنگ۔ شاہانہ چہرہ۔ گول اور بھرا ہوا۔ سر بڑا مگر موزوں پشیمانی متوسط۔ آنکھیں نہایت شرمیلی نیچی اور اندر سرخ ڈور سے۔ ابرو گنجان مگر خمدار۔ دہن متوسط۔ دندان پیوستہ۔ لب ریلے۔ بینی موزوں۔ سینہ کشادہ۔ قد درمیانہ۔ ہاتھ قوی اور پُر گوشت۔ شانے اور بازو بھرے ہوئے۔ ہڈیوں کے بوڑے بوڑے بڑے اور بھرے ہوئے۔ گردن نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی نہ بہت اونچی۔ ہاتھوں کی انگلیاں نہ بہت موٹی پتلی پتھیلیاں نہایت نرم۔ پاؤں کی ایڑیاں بھاری۔ واڑی بھری ہوئی اور گنجان۔

بال

سر کے بال نہ بالکل سیدھے نہ بہت گھنگھریالے۔ ان کی وضع مختلف اوقات میں مختلف رہی۔ جوانی میں پیٹھے تھے۔ اس وقت مانگ اور گنگھی وغیرہ کی عادت تھی ان کو دھونے وغیرہ کی پابندی سے پیٹھے کٹوا دیئے۔ پھر صرف تپنی سے بال کٹوانے کی عادت پھر تک رہی۔ واڑھی کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید۔ سینہ پر بال زیادہ۔

چال

چال نہ بہت تیز نہ ہی بہت آہستہ۔ اور جب کوئی ہمراہی ہوتا۔ اس کی رعایت چال میں ضرور فرماتے۔ کیوں تمام افعال میں اپنے مقابل میں دوسرے کی آسائش کو ترجیح دیتے تھے۔ قدم نہ بڑے بڑے رکھتے تھے۔ نہ متغادر چھوٹے چھوٹے۔ بناوٹ سے نصرت کی طبیعت کو کسی نہ تھا۔ اور نہ رک لائینی اس دربر طبیعت میں داخل تھی۔ اگر غور سے دیکھا جاتا تو چال دو حال۔ جملہ حرکات و سکنات اور تمام اقوال و افعال میں کوئی جزو بھی ایسا نہ تھا۔ جو وہ اور غائر و بے غالی ہوا جس میں شرمی اور عقلی دونوں قسم کی حکمتیں جمع نہ ہوں یعنی حکم الامت کا لقب حضرت کے لیے بالکل اہم باطنی تقاسم

آواز

اسے قبائے رہنمائے دست بر بالائے تو علم و حکمت و اشرف از گومر والائے تو آواز اتنا تندی پست تھی اور نہ اتنی بلند کہ ناگواری پیدا ہو جائے۔ بلکہ نہایت شیریں اور مردانی تھی۔ خشوع اور جبر مجتہد آواز سے ہی پیدا تھا۔ چلا کر بات کرنے کی قطعاً عادت نہ تھی بقدر ضرورت بہر کے ساتھ کلام فرماتے اور وعظ میں تمام مجمع کو آواز پہنچتی تھی۔

مزاج

مزاج دومی مائل بحارث تھا۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے اعضا کی خوشحالی۔ جسم کا دھڑ بھڑانا۔ افعال کا اعتدال اس کے دلائل ہیں۔ مزاج میں حرارت کچھ تپسی زیادہ تھی۔ ہینا کر دومی مزاج کا منتق تھا۔ اور کچھ اس درجہ سے کہ عنفوان شباب میں کسی طبیعت نے سکھایا کا دھواں پلایا تھا۔

اس دہرے بردات کا استعمال مفید اور مرغوب تھا۔ پھر ذکر الہی اور بوشِ عبثت خداوندی نے حرارت میں اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ حرارت چونکہ حرارتِ غریبہ نہیں ہوتی۔ بلکہ حرارتِ غریزی کی بھی روح ہوتی ہے۔ اس واسطے بجائے بدمست بڑھانے کے لطافتِ مزاج و قوتِ صحت اور اک۔ سلامتِ فہم۔ نورانیتِ حواس اور اعتدالِ افعال کا باعث ہو گئی۔

قوت در جس قدر کام حضرت کے دماغ سے لیا گیا تھا۔ قومی سے قومی خلقت کا انسان بھی کرنا تو دماغ کیجی کا ختم ہو جاتا اور اختلالِ حواس بلکہ جنوں کی نوبت آ جاتی۔ ماہرین اس امر پر متفق تھے۔ کہ ایسے قومی الجڑ۔ صحیح الفہم اور سلیم الخواس آدمی کم ہوتے ہیں۔

گفتگو نہ تیز نہ ٹھہر ٹھہر کر بلکہ بہت صاف کرتے تھے جس میں تسلسل ہوتا تھا۔ گنگناک مطلق نہ ہوتی تھی۔ اگر خود ضرورت سمجھتے یا کوئی سوال کرتا تو پھر بات دہرا دیتے تھے۔ درہ گفتگو اتنی واضح اور صاف فرماتے تھے کہ دہرانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اس لئے دہرانے کی عادت نہ تھی۔ مجالس میں شاعری اور گویا رہتے تھے۔ پیچھے ریائے معارف و سخاقتی بوش و غروش سے ہر دم ہو۔ جس کی دہرے سے اتنے کثیر ملفوظات اور مواضع جمع ہو گئے۔ جن سے لاکھوں انسان فیض یاب ہوئے اور بورہے ہیں۔

تفکر عام مجالس میں کبھی متفکر نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ حسب حالات باطنی غفلت میں کبھی کبھی متفکر رہتے تھے دیے اکثر مسرور ہی دکھائی دیتے تھے۔

اشارہ اشارہ کرنے کے قطعی عادی نہ تھے۔ جو کچھ بھی کہنا ہوتا زبان سے صاف فرماتے۔

تبسم مجالس میں چہرہ پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ ہنسی کی بات پر ہنستے بھی تھے۔ ہنساتے بھی تھے۔ مگر مطابق سنت، تہنہ ہار کر کبھی نہ ہنستے تھے۔

مہلبیت اعضا کے تناسب چہرہ کی نورانیت اور آنکھوں کی سرفی نے جہانی خوبی کے علاوہ ایسا رعب پیدا کر دیا تھا کہ جلدی کسی کو بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ مگر تہذیبِ تواضع اور شرافت و بے تکلفی ہوتی تھی۔ کہ لوگ مہلبیت کے ماسے بات کرتے ڈرتے تھے وہ بھی بات کرنے کے بعد دل و جہاں سے تیار ہونے لگتے تھے۔ گویا منہ لپیٹ کر پائیدار اذکار اکا حید کے پورے مظہر تھے۔ مجموعی حالتِ جسم کی خوش قطع واقع ہوتی تھی۔ کہ جو لباس پہنتے وہی موزوں ہو جاتا۔ جس وضع و حالت میں ہوتے زیبانی یکساں جلد گرہوتی جس مجمع میں جاتے نظروں کے کیمرے فوراً حضرت کی طرف رخ کر لیتے۔ در سیمما ھتوفی و بوجہ ھیم من آتہ البتہ وجود کا نظارہ ہونے لگتا۔ اقوال اور معمولات سے ان صلاحاتی و نسکی و معجباتی و معانی اللہ رب العلمین کا ظہور ہونے لگتا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

نسب اور خاندان

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے قبل راجہ جیم نے ضلع مظفرنگر میں ایک قصبہ اپنے نام سے جو "تھانہ جیم" کہلایا۔ پھر مسلمانوں کی آمد و حکومت پر اس کا نام "محمد پور" ہوا جس کا ثبوت اس وقت کے کاغذات سے ملتا ہے مگر یہ نام مقبول و مشہور نہ ہوا اور وہی پرانا نام معروف رہا۔ البتہ "تھانہ جیم" سے "تھانہ جیون" ہو گیا، صوبہ جات پختاوردہ کا یہ قصبہ اپنی مردم شناسی میں مشہور ہوا رہا ہے اور یہاں کے مسلمان شرفاء اہل شوکت و قوت اور صاحب فضل و کمال رہے ہیں۔ مجدد الملت شاہ اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے اجداد نے آج سے صدیوں پہلے اسی قصبہ "تھانہ جیون" میں طائفتہ الہامیہ کے اجداد نسباً کاروقی تھے۔ ان میں ایک مولانا صاحب الدین جہاں تھے۔ جو تھانوی محمد نصر الدین خاں کے ہمعصر اور جن کا ذکر عبد الکریم کے کاغذات میں ملتا ہے، ان کے قریبی اجداد تھانوی ضلع کرناٹک سے نقل سکوت کر کے "تھانہ جیون" آئے تھے اور طرح فضیلتی اجداد نے (دعویٰ تھے) پہلے پہل جھانے میں سکونت اختیار کی تھی اور پھر یہاں آگئے تھے۔

مجدد الملت کے والد ماجد شیخ عبدالحق صاحب مرحوم ایک معتد رئیس، صاحب نقد و جامداد اور ایک کثادہ دست النان تھے۔ کی ایک بڑی ریاست کے مختار عام تھے۔ فارسی میں اعلیٰ استعداد کے مالک تھے اور حافظ قرآن تو نہ تھے لیکن ناظرہ بہت قوی تھا اور قیامت بہت صحت سے پڑھتے تھے۔ ذہنی اعتبار سے بڑے ہی صاحب فراست تھے جس کا ایک کلام ثبوت یہ ہے کہ اپنے صاحبزادوں کی صلاحیت کو پہچان ہی سے مٹا گئے تھے اور اسی بنا پر اپنے فرزند اکبر یعنی حضرت مجدد الملت (کو عربی و دنیا میں اور فرزند اصغر (اکبر) مرحوم) کو انگریزی اور علوم دنیوی میں لگا دیا تھا۔ اور اس پر مرحوم کو پورا پورا اعتماد تھا۔ ایک مرتبہ مرحوم کی بجاوج صاحبہ نے فرمایا: "جہاں نے چھوٹے کو تو انگریزی پڑھائی ہے وہ تو خیر کاکھانے گا۔" بڑا عربی پڑھ رہا ہے، وہ کہاں سے کھائے گا اور اس کا گزارہ کس طرح ہوگا کہ وہ تو دھار میں تقسیم ہو کر گذارے کے قابل نہ رہے گی؟ اس پر مرحوم کو جوش آیا اور فرمائیے گئے: "جہاں صاحبہ تم کہتی ہو کہ یہ عربی پڑھ لگا کہاں سے؟ خدا کی قسم جس کو تم کمانے والا سمجھتی ہو اس جیسے اس کی جوتیوں سے لگے گئے چھریں گے۔ اور یہ ان کی جانب رخ بھی نہ کرے کس بلا کی فراست ہے اور مزاج شناسی، یہی وجہ ہے کہ اکبر علی صاحب مرحوم سے کہیں زیادہ حضرت حکیم الامت پروردگار کرتے تھے۔ اور جب ایک مرتبہ بجاوج صاحبہ نے اس کی شکایت کی تو فرمایا: "جہاں مجھے اس (مجدد الملت) پر رحم آتا ہے۔ وہ بچہ سے لیتا ہے میری زندگی ہی تک ہے۔ میرے بعد یاد رکھو وہ میرے مال و متاع سے بالکل علیحدہ رہے گا۔" چنانچہ ان میں سے ایک ایک تیس حکیم الامت کی آئندہ زندگی میں پیکر حقیقت بن کر جلوہ نما ہوا۔ حضرت حکیم الامت کی والدہ ماجدہ بھی ایک صاحب نسبت بی بی تھیں۔

حضرت حکیم الامت کے ماموں پیر جی امداد علی صاحب ایک زبردست حال و قال بزرگ تھے۔ یہ اپنے وقت کے مجذوب
مل حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی کے مشورہ سے حیدر آباد دکن تشریف لائے۔ یہاں ملازم بھی ہوئے اور انکے بعد حضرت صاحب
کے ایمار سے مرزا سردار بیگ صاحب کی ارادت میں داخل ہو گئے۔ جنہوں نے نوابی دریاست کو ٹھکرا کر فقر و وریشی اختیار کر رکھی
تھی۔ مگر حضرت حکیم الامت کو مسائل و حقائق میں ان سے اختلاف تھا مگر ان کا جذبہ مشتق بہر حال قابل قدر تھا۔ حکیم الامت بعد ان کے
مارے آگ برستی تھی۔ چنانچہ ان کا یہ شعر حضرت اقدسؒ نے بارہا نقل فرمایا ہے

ساقی تراستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تو نے یہ سے ظالم شیشے میں بھری ہوگی

حضرت کے نانامیر نجابت علیؒ اعلیٰ درجہ کے فارسی دان، انشا پرداز اور حاضر جواب بزرگ تھے۔ مولانا شاہ ناز احمد بریلوی کے
غلیظہ خاص کے مرید اور حافظ غلام مرتضیٰ صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔

حضرت اقدس کے جد اعلیٰ سلطان شہاب الدین "فرخ شاہ" کابلی تھے۔ ان کی اولاد میں شیوخ تھانہ مہون کے علاوہ حضرت
مجدد الف ثانی، قدس سرہ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ فرید الدین گنج شکر حبیبی کالین ہوئے ہیں۔ خود حضرت فرخ شاہ پہلے تو
کابل رہے اور سلطنت غزنویہ کے زوال پر جذبہ جہاد کے تحت کئی بار ہندوستان پر حملہ کر کے کافروں کو زیر کیا۔ اور ہمارا دلوتے۔ جہاد و جہاد
فرغت پاکر جہاد اکبر میں مصروف ہو گئے۔ کابل کے کہار کو اپنا نشین بنایا۔ بزرگانِ پشت کے آگے ڈانٹنے ارادت تو کر کے تتر بتر کال
پئے۔ اور ایک عالم کو فیض باب کیا اور پھر بعد وفات وہیں دفن ہوئے۔ یہ موضوع آج تک "ودہ فرخ شاہ" نام سے مشہور اور زیارت گاہ
عام ہے۔

ناگوبر آدم نسیم باز نہ استند
ز ابائے خود ار بشمر اصحاب کرم را

خانداں اشرف کا بھل خاکہ نظروں میں آگیا۔ ایسے عالی خاندان میں جہاں ولایت و حشمت اور زہد و تقویٰ
بیکر گیر ہوتے تھے، حضرت مجدد الملت کی جامع شخصیت ظہور پذیر ہوئی۔ ولادت کا واقعہ بھی عجیب ہے

تہ اقدسؒ کے والد مرحوم کے اولاد نرینہ زندہ نہ رہی تھی۔ اس کی طاہری وجہ یہ تھی کہ موصوف جب ایک مرتبہ مرض خارش میں بری طرح
تھے تو مجبوراً کسی ڈاکٹر کے مشورہ سے ایسی دوا کھالی تھی جو قاطع نسل تھی۔ مگر جب اس کی خبر مرحوم کی خوشدامن صاحبہ کو پہنچی تو وہ سخت پریشان
اور حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب پانی پتی سے عرض کیا کہ "میری لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے ہیں۔" حافظ صاحب نے غمزدانہ
ساز فرمایا "مگر توئی کی کشاکش میں مر جاتی تھی۔ اب کی باری علیؒ کے سپرد کر دینا۔" اس مسئلہ کو کسی نے نہ سمجھا لیکن حکیم الامت کی والدہ ناگزیر
یہ حافظ صاحب کا یہ مطلب ہے کہ لڑکوں کی دھیال ہے فاروقی اور خضیال ہے علوی۔ اور اب تک جو نام بھی رکھے گئے وہ دھیالی
تھے۔ اب کی باریب لڑکا ہو تو خضیالی وزن پر نام رکھا جائے گا۔ جس کے آخر میں "علی" ہو۔ حافظ صاحب یہ سن کر ہنس پڑے اور فرمایا۔
"ہاں! ہاں! میرا نشانیشی تھا۔" پھر فرمایا "انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے۔ ایک کا نام اشرف علی رکھنا اور
دوسرے کا نام اکبر علی۔ ایک میرا ہوگا اور وہ مولوی ہوگا۔ دوسرا دنیا دار ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا
مجدد الملت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ء کو چہار شنبہ کے دن صبح صادق کے طلوع کے ساتھ جلوہ نما ہوئے۔

چنانکہ حضرت کی ولادت کے چودہ ہی مہینے بعد آپ کے چھوٹے مہائی اکبر علی مرحوم کی ولادت ہوئی اور ماں کا دودھ دو بچوں کے لیے

کی تکمیل مولانا منہج علی صاحب سے کی اور زبان فارسی میں پورا عبور حاصل کیا۔ ایک مرتبہ اسی زمانہ طالب علمی میں غار شاہ میں مبتلا ہونے کی وجہ سے چھٹی لے کر گھر تشریف لائے تھے تو بطور مشغلہ فارسی اشعار پر مشتمل ایک سنہری ”زیر دم“ لکھی۔ جس سے فارسی کی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی۔ آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور پانچ سال تک یہاں مشغول علم رہ کر شروع السالہ میں فراغت مکمل کی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۹-۲۰ برس کے لگ بھگ تھی۔

طالبِ نہ حیثیت

زمانہ طالب علمی میں حضرت میل جول سے الگ تنہا رہتے۔ اگر کتابوں سے کچھ فرصت ملتی تو اپنے استاد خاص حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہ و صدر مدرس مدرسہ دارالعلوم دیوبند کی خدمت فیضِ رحمت میں جا بیٹھتے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جو ہر فن میں ماہر ہونے کے ساتھ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مباحر کی قدس سرہ کے خلیفہ رشید بھی تھے۔ ان کی اسی جامع حیثیت کی وجہ سے ان کا حلقہ درس ”حلقہ ترقیہ“ بھی ہوتا تھا۔ اور ذہن و قلب کی تعلیم و تربیت ایک ساتھ ہوتی تھی۔ انہوں نے جو دینی درس گاہیں جامعیت فیض سے محروم ہیں۔ حضرت والا کی ابتداء اسی کو دیکھ کر اہل بصیرت انتہا کا پتہ چلا گئے تھے۔

چنانچہ جب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ طلباء کا امتحان لینے اور دستار بندی کے لیے تشریف لائے تو شیخ المذہب مولانا ابو جہن صاحب نے اپنے اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و ذکاوت کی بطور خاص مدح فرمائی۔ حضرت گنگوہی نے مشکل مشکل سوالات کیے اور ان کے جواب میں شیخ مکرر دہرائے۔

حضرت اقدس کو علوم عقلیہ سے خاص مناسبت تھی۔ فطرت نے حاضر جوابی، ملاقا، لسانی اور ذہانت و فطانت کے جوہر سے پوری طرح لیسہ کیا تھا۔ منطق میں مہارت کا اعتراف یوں فرماتے تھے کہ ”میں سچی بات کو سن نہ کوں۔ نہ میں متواضع ہوں نہ منکر اللہ مجھے منطق میں مہارت حاصل ہے۔ چنانچہ دیوبند میں جب کوئی مذہبی مناظرہ کس لیے آتا تو فوراً اشرافی تلواریں غلغلی سے باہر نکل آتی اور مخالفین کو لٹا کر جاتی تھیں۔ لیکن طبیعت کے اعتدال کا یہ عالم تھا کہ معقولات کو ہمیشہ وہیات کے لیے علوم اکیہ سمجھتے تھے۔ آپ کی ہر تقریر و تحریر میں یہ جوہر نمایاں نظر آتا ہے۔ اس المناظرین مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب (استاذ دارالعلوم دیوبند) حضرت کی اسی نوعمری کی تقریروں پر دم بدم کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ”حضرت کو فنی مناظرہ میں اس قدر کمال ہے کہ بڑے سے بڑا مناظرہ بھی نہیں ٹھیر سکتا“ اور خود حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ”جتنا شوق مجھے اس زمانہ طالب علمی میں مناظرہ کا تھا، اب اس کی مصروفیت کی وجہ سے اتنی ہی لغزش ہے۔“

علوم عقلیہ و نقلیہ میں اس قدر رسوم رکھنے کے باوجود تواضع کا حال قابلِ دید ہے۔ سنہ ۱۳۰۵ھ کا واقعہ ہے۔ خبر کہ دستار بندی کا تقسیم اسناد کا جلسہ بڑے شاندار پرانے پر ہونے والا ہے اور حضرت مولانا گنگوہی کے مقدس ہاتھوں پر رسم طے پانے والی ہے، اپنے ہم عقول و ہم کر کے اپنے استاد خاص حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کی کہ ”حضرت ہم نے سنا ہے کہ ہم لوگوں کی ستار بندی ہوگی اور سند فراخ دی جائے گی حالانکہ ہم ہرگز اس کے اہل نہیں۔ یہ تجویز منسوخ فرمائی جائے ورنہ اس میں مدرسہ کی بڑی بے نامی ہوگی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی ہے۔“ یہ سن کر صاحب بصیرت استاد کو جوش آیا، اور فرماتے گئے کہ ”تمہارا یہ خیال باطل غلط ہے۔ ہاں چونکہ تمہارے استاد موجود ہیں اس لیے ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہوگی۔ جہاں جاؤ گے بس تمہیں ہر جگہ اپنی سیار امید ان صاف ہے۔“ دینا نے میچا کر پیشین گوئی

حضرت بہرہ صرف صحیح نسکی۔

مولانا شرف علی تھانوی

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے فتویٰ نویسی کا کام بھی اسی زمانے سے آپ کے سپرد فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک طویل استفتا کا رد یا بھی مفصل اور مکمل جواب لکھ کر اپنے استاذ کی خدمت میں پیش کیا تو عارف کامل اٹاڈ نے اس پر دستخط کرتے ہوئے فرمایا: ”معلوم ہوتا ہے تم کو فرصت بہت ہے۔ ہم تو اس وقت دیکھیں گے جب خطوں کا ڈھیر تمہارے سامنے ہوگا اور پھر تم اتنے لمبے جواب لکھو گے؟“ آئندہ پتہ چلے گا بصیرت یعقوبی نے جو کچھ دیکھا کس قدر صحیح تھا۔

حق تعالیٰ نے مجدد الملت کو جہاں اور محاسن ظاہری سے نوازا تھا وہاں خوش الحانی سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ حضرت کی فن میں مہارت کے ساتھ حسنِ صوت سے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام دیا تھا۔ حضرت نے قرارت کی شوق مشہور عالم قاری محمد عبداللہ صاحب مہاجر کی سے بمقام مکہ معظمہ فرمائی تھی جو قرأت کے عرب کے نزدیک بھی ایک ماہر فن قاری تھے۔ حضرت کی قوت اخذ کا یہ عالم تھا کہ شاکر و استاد قرارت کی شوق کرتے کرتے ہوتے تو یہ پہچاننا مشکل ہوتا کہ استاد پڑھ رہے ہیں یا شاگرد و سنا رہے ہیں۔ کمال فن اور جمال نے مل کر عجیب و غریب پیدا کر دی تھی۔ بقول شخص ”تقرآن کیا پڑھتے تھے لوگوں کو ذبح کرتے تھے“ ایک مرتبہ نماز فجر میں مولانا عیسیٰ صاحب دجنہوں نے لکھتے ہیں قرارت کا ایک اعلیٰ مدرسہ قائم فرمایا تھا، شریک تھے حضرت کا قرآن سنا تو بعد نماز بہت اشتیاق کچھ اور سنانے کی خواہش ظاہر کی۔

حضرت کی اشد پر طبیعت کا نتیجہ یہ تھا کہ دارالعلوم ہیچ کر تکلف اور معمولی باتوں کی طرف ضرورت سے زیادہ التفات نہ دہن فرماتے۔ سادہ سادہ سی زندگی اور فقیرانہ رنگ اختیار فرمایا تھا۔ حضرت دلاطلباء کے بناؤ سنگار اور ان ادنیٰ چیزوں کی طرف سے غور نہ کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علم کا کچھ لگا نہیں۔

تعمیل تعلیم کے بعد آپ وقت آتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی عام فضا سے جو فیض حاصل کیا تھا اور اس کی تحقیقوں نے جس رنگ میں ڈلوایا تھا اسی فیض کو عام کریں اور اسی رنگ میں ایک ایک کو

درس و تدریس

سبزہ کا آغاز ہے۔ حسن ظاہری اور جمال باطنی سے آراستہ ہیں۔ کمال علمی اور جذبہ اشاعت دین سے معمور۔ حق تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ بلا کی کشش و مقابلیس ہے۔ جہاں بھی بیٹھ گئے لوگ پروانہ وار آئے۔ اور ساری فضا انہی کے رنگ پر لگی۔ شباب رنگین جمال رنگین دہر سے پانک تمام رنگیں تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں تمام رنگیں بسا رہیں مسلسل ہم ابریں تک اسی انداز سے درس و تدریس میں مشغول رہے اور ساتھ ہی مواظفہ تصنیفات اور افتاء کے کام۔ ایک

کو فیضیاب کیا۔ کانپور میں ایک مدرسہ تدریس چلا آ رہا تھا۔ جو مدرسہ ”فیض عالم“ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی صدر مدرس کے لیے کونانپور والوں نے طلب کیا تو اپنے استاد اور والد ماجد کی اجازت سے حضرت ۱۲۰۰ میں ۲۵ روپیہ ماہوار پر یہاں تشریف لے گئے۔ نوجوان تھے لیکن بہت جلد وہاں کے سارے مدرسین میں آپ کے علم و فضل کا شہرہ ہو گیا۔

ادھر درس و تدریس سے طلباء و علماء گماں لگے ہوئے۔ ادھر مواظفہ حسنہ نے سارے کانپور کو حضرت کا فرقتی بنا دیا۔ یہ سب چار مہینے میں ہوا۔ اراکین مدرسہ نے حضرت اقدس کی مقبولیت سے مالی فائدہ حاصل کرنا چاہا اور غفلوں میں مدرسہ کے فائدہ کرنے کی خواہش کی۔ حضرت والا چونکہ اس قسم کے چندوں کو شرعاً ناجائز اور ویسے بھی حیرت دینی کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس

یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس پر ان میں چرمیگوئیاں ہونے لگیں۔ حضرت نے اس کی اطلاع پاکر استغفے اپیش کر دیا۔ اور باوجود اصرار کے اس مدرسہ میں رہنا گوارہ نہ کیا بلکہ واپسی وطن کا ارادہ فرمایا مگر واپسی سے پہلے حضرت فضل الرحمن گنج مراد آبادی کی خدمت فیضِ درجت حاضر ہوئے کہ شاید پھر اس کا موقع ملے حضرت تشریف لے گئے اور ادھر کا پورے لوگوں میں اس نقصانِ عظیم سے ایک مہیجان بپا۔ جناب عبدالرحمن خاں صاحب اور کفایت اللہ صاحب مرحوم نے یہ سوچ کر کہ ایسی جامع شخصیت جو معقولات و دینیات پر حاوی و نایاب ہے اپنی طرف سے ۲۵ روپیہ تنخواہ کی سبیل کے مراد آباد سے واپسی پر حضرت اقدس کو روک لیا۔ اور اب حضرت اقدس جامع بدعہ پٹکاپور میں درس دینے لگے۔ اس طرح ایک نئے مدرسہ کی بنیاد پڑی۔ جس کا نام خود حضرت ہی نے مسجد کی مناسبت سے الجامع العلومؒ جو آج تک قائم ہے۔ غرض پورے ۴۴ سال قیام کے بعد خود اپنے مرشد شیخ العرب والعم حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکیؒ اقدس سرہ اردشاہ پر آخر صفر ۱۳۸۵ھ میں کانپور کا تعلق ترک کر کے مغانہ بھون کو روٹنی بخشی۔ اس مراجعت پر حضرت حاجی صاحبؒ ایک والا نامہ فرماتے ہیں :-

”بہتر ہو کہ آپ مغانہ بھون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ خلافتِ کشمیر کو آپ سے فائدہ فاسہری و باطنی ہوگا۔ اور آپ ہمارے مدرسہ بکواسر لوہا بکر کریں گے ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں (۱) مکتوب امداد یہ حضرت کو ابتداء سے لے کر آخر تک طلباء سے محبت رہی اور ان کا خاص لحاظ فرماتے رہے خود اپنے آپ کو ہمیشہ طالب علم کہتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ”مجھے یہ پیر جون والی پیش نہیں آتی۔ میں تو ایک طالب علم ہوں۔ مجھ سے تو قرآن و حدیث کی باتیں پوچھی جائیں۔ مجھے تو سادہ سیدھا قرآن و حدیث ہی آتا ہے۔ ماسی کو اصل درویشی سمجھنا ہوں“ اور فرماتے کہ ”صوفیاء سے زیادہ علماء کی ضرورت ہے کیونکہ انہی کی بدولت انتظامِ دین قائم ہے۔“ و نعمتِ علمی کا نتیجہ تھا کہ طلباء کے ساتھ ہر طرح کی رعایت فرماتے اور ان کی ہر طرح سے امداد کرتے تھے۔ ان کے دنار کا خاص لحاظ رکھتے و دوسروں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ اور خود طلباء کو ادنیٰ چیزوں کی طرف سے مرڈ کر ان کے مقامِ اعلیٰ اور منصبِ جلیل پر فائز کرنے پوری سعی فرماتے تھے۔

اب آئیے اس ہستی کے اصولِ تعلیم کو اجمالی طور پر سمجھیں جس کی چودہ سالہ تدریس میں سیکڑوں علماء کا دل بکھلا۔ حضرت والا اس بات کے قائل تھے کہ استاد جو بھی مضمون پڑھائے اس میں خود زیادہ مشقت اٹھائے اس کو سہل ترین پیرایہ میں شاکر دوں گے آگے پیش کرے گا اس میں استاد پر زیادہ بار پڑتا ہے لیکن جذبہٴ شفقت اس کو ہلکا کر دیتا ہے۔ پتہ یہ ہے کہ بغیر اس مذہب کے یہ کام انجام ہی نہیں پاسکتا۔ (۲) حضرت اقدس کا یہ بھی اصول تھا کہ مشکل اور پیچیدہ مقام پہلے سلیس تقریریں کیا جائے اور جب طلباء اکثر سمجھ جائیں تو اس مقام کا تفاوت کر لیا جائے۔ چنانچہ مدرسہ ”جامع العلوم“ کے شاگرد اول مولوی فضل حق جناب جلیلیں مدرسہٴ فتوح میں مدرس بنے، کو حدیث کا مشہور مقام ”مناثا بالکفر“ درپیش ہوا جو مہمت ہی شکل سمجھا جاتا ہے (۳) تو حضرت نے پہلے اس امکانِ تقریر فرمادی اور پھر جب وہ اچھی طرح سمجھ گئے تو فرمایا کہ ”یہ وہی تو مقام تھا جس کو ”مناثا بالکفر“ کہتے ہیں۔ اس پر وہ دمک رہ گئے۔ ہم فرماتے تھے لیکن یہ تو کچھ مشکل نہ نکلا۔ (۴) حضرت اقدس یہ بھی پسند فرماتے تھے کہ طلباء کے آگے زائد از ضرورت تقریر کی جائے جس سے مفعولِ محسنی اظہارِ نالایت ہو اور جس کی وجہ سے اصل مطلب غلط ہو جائے چنانچہ نہ صرف خود اس اصول پر کار بند تھے بلکہ اور مدین علی اسی نظر سے نگرانی فرماتے تھے (۵) ہفتہ داری تقریروں اور مناظروں سے بھی حضرت اقدس کو اختلاف تھا اور سب اختلاف فرماتے

مولانا تعلیم

کہ اس کی وجہ سے طلباء کی توجہ ہفتہ بھر ایک ہی موضوع تقریر و بحث کی طرف لگی رہتی ہے اور اصل درس میں ہرج واقع ہوتا ہے۔ حضرت افراتے تھے کہ سب کتابیں اچھی طرح پڑھیں تو پھر تقریر و مناظرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ حضرت اقدس کی طالب علمانہ کیسو زندگی اور بعد کی زندگی اس صحیح اصول کی کھلی آگاہ ہے (۵) فرماتے تھے کہ طلباء اگر تین باتوں کا التزام کریں تو استعداد علمی حاصل ہو جاتی ہے۔ اول آئندہ مناظرہ کر کے معلومات اور معلومات میں تیز پیدا کریں۔ (دب) پھر جب استاد سمجھائے تو بغیر سمجھے آگے نہ بڑھیں۔ (ج) جب سمجھ چکیں تو مرتبہ خود بھی اسی مطلب کی تقریر کریں۔ یہ تین باتیں تو واجب ہیں۔ ایک بات درجہ استجاب کی ہے۔ وہ یہ کہ کچا آزمودہ روزانہ پڑھ لیا کرے یا درہے نہ رہے استعداد انشاء اللہ پیدا ہو جائے گی۔ (۶) حضرت والا نے یہ اصول بھی بنایا تھا کہ اگر کوئی طالب علم عدم مناسبت یا عدم کی وجہ سے معقولہ نہ پڑھے لیکن دینیات کی درسی کتابیں تمام کر لے تو اس کو سندسے محروم نہ رکھا جائے بلکہ سند میں بجائے "درسیات درجہ معقولہ" کی جگہ کتب پر حاوی ہیں) "دینیات" لکھا جائے۔

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو حضرات اہل اللہ سے خاص عقیدت اور محبت تھی۔ فرماتے تھے۔

بزرگان عصر کی خدمت میں | ان بزرگوں کے ناموں سے بھی روح میں تازگی اور تلب میں تیز پیدا ہوتا ہے۔ بزرگوں کو اس درجہ رافع سمجھنے تھے کہ "نرمہ البسائین" کے نام سے ایک ہزار حکایات کا مجموعہ شائع کرایا اور بہت وثوق سے فرماتے تھے کہ یہ جو عشاق ہیں۔ "مکن سنہ" کہ ان کے حالات پڑھے جائیں اور قلب میں محبت الہی پیدا نہ ہو۔ خود اپنے متعلق بار بار فرمایا کہ "اے کبھی طالب میں نے محنت کی نہ اس طریق میں کبھی عبادات و ریاضات کیے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے سب اپنے حضرات اساتذہ و مشائخ توجہ اور میری طرف سے غایت درجہ ادب و عقیدت کا ثمرہ ہے۔" بالخصوص اس وقت جب حضرت اقدس اپنے شفیق اساتذہ کے ان کی علمی تحقیقات اور باطنی کیفیات کا ذکر فرماتے تو آپ پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی اور دینیک ہی حال قائم رہتا تھا۔ شعر پڑھتے۔

اولیٰ ابائی فحجۃ بشلہم
حضرت اقدس اپنے وقت کے سارے بزرگان دین سے ملے ہیں اور ہر ایک سے دعا و توجہ، لطف و عنایت کے ذریعہ کیا ہے۔ مع "تمت زہر گوشتہ یافتہ"

چنانچہ حضرت مولانا ربیع الدین صاحب مجددی (مستم مدرسہ دیوبند) کے حلقہ توجہ میں شریک رہے تھے فرماتے تھے کہ "اس مدرسہ محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہر ایک پاک صاف ہو گیا ہوں۔" مولانا قدس سرہ کے ساتھ حضرت نے سرمنہ پنچ کر شیخ مجدد الف ثانی قدس کی زیارت فرمائی۔ اور واپسی میں ریاست پٹنار میں ان مقامات کی بھی زیارت کا شرف ملا جہاں (دربارے کشف) بعض حضرات ان کے مزارات ہیں۔ مولانا قدس سرہ کو حضرت سے اس درجہ محبت تھی کہ مدفن آپ سے اپنی مسجد میں امامت کر دانی۔ اسی طرح آپ کے گچ مراد آبادی اور شاہ ابو حامد صاحب بھوپالی کو جو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے آفتاب تھے، کی زیارت سے بھی شرف ہوئے ہیں اور حضرت نے خاص بڑا ذمہ فرمایا ہے۔ اول الذکر بزرگ سے تو اس درجہ محبت بڑھی کہ انہوں نے آپ کو اپنے وہ احوال بھی سنائے جو اور سے نہ فرماتے تھے۔ مثلاً فرمایا کہ "کس نے کہا کہ تم نے کتبائیں کہ جب سجدہ میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔" یہ بھی فرمایا کہ "جہاں جنت کا مہرہ برحق، کوثر کا مہرہ برحق، لیکن غار کا مہرہ ہے وہ کسی چیز میں بھی نہیں۔" معانی ہم تو قبر میں آنا

زیں گے۔ دعا ہے کہ ہمیں تو اللہ میاں قریب یہ اجازت دیں کہ بس نماز پڑھے جاوے۔

مولانا صاحب لاجپوری ایک مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ غور ان بزرگ نے حضرت سے کئی بار ملاقات فرمائی۔ ایک مرتبہ حضرت لائڈز سے سورت جا رہے تھے اور مولانا صاحب سورت سے رانڈیر۔ راستہ میں ایک پل پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ مولانا صاحب لائڈز پر تھکے ہوئے ایک مسجد میں بیٹھے روتے رہے۔ اور کسی کے استفسار پر حضرت کا نام لے کر فرمایا کہ ”نہ جانے آنکھوں سے کیا کر گئے۔“ حضرت مولانا صاحب نے فرمایا کہ ”جی ہاں“ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کے پرہیزگاری تھے۔) بزرگین ہی میں جب حضرت کو دیکھا تھا تو فرمایا ”اے میرے بھائی! کاش کہ وہاں کا ہوگا“ چنانچہ دنیائے دیکھ لیا کہ یہی ہوا۔ مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے تو خود مدرسہ دیوبند کے مدرس اذلی حضرت حاجی صاحب کے خلیفہ رشید اور حضرت کے استاذ تھے، اپنے شاگرد کو خوب دیکھا تھا۔ آپ کے زمانہ طالب علمی ہی میں حضرت مدرسہ نے یہ فرمایا تھا۔ ”خدا کی قسم جہاں تم جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے“۔ ”سچ ہے“۔ ”تندرست ہو کر دیدہ گوید۔“ حضرت مولانا بشیر احمد گنگوہی مدرسہ سے دنیائے اسلام ادا رفت نہیں۔ اپنے وقت کے محقق عالم ادراہل دل کے نزدیک مسئلہ روبرو قطب ارشاد تھے۔ چونکہ اذلی حضرت نے آپ ہی سے بیعت کی درخواست کی تھی اس لیے آخر حیات آپ کے ساتھ شیخ ہی کا سلوک فرماتے رہے اور واقعی حضرت کو آپ سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔ فرماتے تھے ”میں نے ایسا جامع ظاہر و باطن بزرگ کوئی نہیں دیکھا اور لوگوں کے ساتھ تو میری عقیدت اشتدالی ہے اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے ساتھ غیر اشتدالی۔ دلائل سوچنا بھی غلاب ادب سا معلوم ہوتا ہے۔“ قیام خانہ بھون کے وقت حضرت مولانا صاحب کے مواظ و مشاغل کا حال سن کر بہت خوش ہونے اور فرمایا کرتے تھے ”یہ سب کچھ ہے مگر مجھے تو پوری خوشی اس وقت ہوگی جب کچھ اللہ اللہ کرنے والے بھی وہاں جمع ہوں گے“۔ حق تعالیٰ نے اپنے اس محبوب بندہ کی آرزو بھی پوری کر دکھائی۔ اور جب ہی پوری فرمائی۔ شیخ المسند مولانا محمد حسن صاحب سے آج کا برہمسلمان واقف ہے۔ حضرت رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ خاص اور بابی دلیو بند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد خاص تھے۔ ہمارے حضرت کے استاد تھے اور اپنے شاگرد کا اس درجہ احترام فرماتے تھے کہ ”میرا افضل رکال“ اور ”مصدق حسنات خیرات“ کے عنوانات سے مخاطب کرتے تھے۔ شیخ امداد حضرت میں جو سیاسی اختلاف رائے رہی ہے وہ عالم آشکار ہے۔ ہمیں بدخما ہوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر حضرت شیخ اللہ گوارچے سے برگشتہ کرنا چاہا تو آپ نے جواب دیا: ”افسوس تم ایسے شخص کی شکایتیں کرتے جس کو میں ایسا ایثار مجتہد الملک نے اذہاء تواضع وہ الفاظ نہیں بتائے، سمجھنا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں کیا مجھ پر کوئی وجہ آئی ہے۔ میری ایک رات ہے اور ان کی ایک رات ہے۔ اس میں اعتراض و شکایت کی کیا بات ہے۔“ اسی دور کے ایک اور بزرگ مولانا فیصل احمد سامانی پوری ہیں۔ جو حضرت گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اعظم اور علم و عمل میں اپنی نظر آپ تھے۔ حضرت مولانا کی متعلق فرماتے تھے۔ ”مجھ کو اشرف سے اس وقت سے محبت ہے جس وقت ان کو خیر محمد بنی“ آپ کے مواظ کے متعلق یہ راتے رکھتے تھے ”ان کے بیان میں (مراد مواظ اعظم) انگلی رکھنے تک کی گنجائش نہیں۔ ان کے ہونے ہونے کسی کا وعظ کتنا منہ چڑھا رہا ہے“

یہ تو ان چند بزرگوں کا باکسل اجمالی تذکرہ سوا جو مطلع شہرت کے درخشندہ ستارے ہیں۔ ان کے علاوہ اور اکابر وقت مثلاً مولانا عبدالحی صاحب فرنگی علی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی علی، مولانا فیصل پاشا صاحب مکی قدس سرہ اور دیگر بیسیوں بزرگان دین سے ملاقاتیں رہی ہیں اور حضرت نے ان کے لطف و کرم کو اپنی جانب مبذول کر لیا ہے۔ اور وہ حضرت کے علم و اخلاق سے متاثر ہوئے ہیں۔ اہل حق میں یہ قبولیت اللہ تعالیٰ کی دیں ہے۔ ذلالت فضل اللہ یورتر یہ ہوئے گشت گشت۔

شیخ ذوراں سے تعلق اور حج بیت اللہ

گذر چکا ہے کہ عبدالملت کی پیدائش ایک مجذوب حضرت مائلہ علیہ السلام صاحب کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ اور انہی بزرگ نے آپ کا نام اشرف رکھا تھا۔ اور آخر وقت تک اپنی محبت و توجہ سے سرفراز کرتے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ غیر شعوری طور پر حضرت میں عشق کی علوہ آرائیاں پائی جاتی تھیں۔

ایک بار قطب ارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی کمزورت سے دیوبند تشریف لائے تو حضرت ایک ہی نظر میں گھاس گھوٹے کے بیٹے سے مصافحہ کے لیے آگے بڑھے۔ شوق نے بے قابو کر دیا تھا۔ پاؤں بے اختیار پھیل پڑا۔ حضرت قدس سرہ گنگوہی نے ختم کیا۔ گو بیعت اور اس حقیقت سے نا آشنا تھے مگر کشش اس بلا کی ہوئی کہ بیعت کی درخواست کر دی۔ حضرت قدس سرہ نے دوران تعلیم میں اس کو مناسبت سمجھا اور انکار فرما دیا لیکن خاطر اشرف میں یہ خیال بصورت حسرت برابر پرورش پاتا رہا اور جب ۱۲۹۹ء میں حضرت مولانا گنگوہی عظیم عزم سے خود انہی کے ذریعہ شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں عریضہ گزارا کہ ”آپ مولانا سے فرمادیں کہ مجھ کو بیعت کر لیں“ نہ جانے دونوں عرفا میں کیا راز و نیاز رہا۔ یہ ظاہر یہی ہوا کہ حضرت حاجی صاحب نے جواب میں خود ہی بیعت فرما لیا۔ اس وقت عبدالملت کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔

حضرت عبدالملت تو ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے کہ شیخ العرب والعجم قدس سرہ نے مکہ معظمہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن جب احقر کی آنکھ کھل جاتی ہے تو زمان و مکان کے سارے حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ عارف باللہ حضرت حاجی صاحب نے وہیں سے متانہ جھون کے اور ششوار کا جلوہ دیکھ لیا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ حضرت قدس سرہ نے آپ کے والد ماجد کو کولہا بھیجا تھا کہ ”تم حج کو آؤ“ اور جب اپنے بڑے لڑکے کو لینے آؤ۔“

عرض شمال ۱۳۰۰ء میں جب کہ عبدالملت طالب علمی کی زندگی ختم فرما کر کانپور میں اشاعت علوم میں مصروف تھے، سفر حج کے لیے پیدا ہو گئے، تعصیل کے لیے دیکھو اشرف السوانح، حضرت والا اپنے والد ماجد کی معیت میں زیارت حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ کایہ عالم تھا کہ جب کسی ملاقاتی نے آپ کے والد ماجد سے سمندر کے تھلاؤں کا ذکر کیا تو فوراً اُٹھ اٹھے۔ یہ

چرخ و دیوار امت را کہ باشند چوں توپشتی بان
چہ باک از موج بحر و بان را کہ باشند موج کشتی بان

اسی جذبہ و اشتیاق سے مکہ معظمہ پہنچے حضرت حاجی صاحب سے نیاز حاصل کیا۔ شیخ قدس سرہ بہت خوش ہوئے اور دست بیعت کی نعت سے سرفراز کیا۔ بعد فرارح حج خود فرمایا کہ ”تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ“ لیکن حضرت والا کے والد ماجد نے مفارقت کو اور حضرت حاجی صاحب نے برائے احترام شریعت فرمایا کہ ”والد کی اطاعت مقدم ہے اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا“ چنانچہ ۲۰ مہینے پہلی بار فریضہ حج سے فارغ ہو کر ۱۳۰۰ء میں ہندوستان لوٹ آئے۔ دوران قیام مکہ معظمہ حضرت والا پر ارض پاک کا احترام و ادب اس درجہ غالب رہا کہ وہاں مقفوکے ہوئے بھی تامل ہوتا تھا۔ اور جس وقت بیت اللہ شریف پر پہلی بار نظر پڑی ہے، ایسی کیفیت شوقیہ و محبتی پیدا ہوئی کہ خود فرماتے تھے ”ایسی کیفیت مجھ پر عم بھر طاری نہیں ہوئی۔“

عشق کی چنگاری تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ حضرت حاجی صاحب کے تعلق نے اس کو خوب دھندلایا۔ اور ارض پاک کے قیام نے اس کو خوب بھڑکایا۔ لیکن والد ہی پر بھر بھی اس شعلہ میں شامانی کی صفت نہ آتی تھی۔ برابر مصروف درس و تدریس اور مشغول تقریر و تحریر رہے۔ سیکڑوں کو عالم بنایا اور ہزاروں کے دل میں دیوانہ

حج ثانی اور صحبت شیخ

والہی اور قیامِ وطن

میں خود ہی یوں فرما چکے تھے۔

عشق می سازد ز مالِ محالِ حُسد
عشق عاشق را کسند زار و زار
عشق سازد ز دردِ روئے عاشقان
عشق معشوقِ ستِ مرعشان را

عاشقان را نیست مطلبِ حُسد
عشق عاشق را کسند سوا و زار
ہم کسند ز ولیدہ موئے عاشقان
من اسوہ العشق ہم قالوا بطلے

(شعری زیرِ دوہم)

کانپور میں ۱۳۱۵ھ تک قیام

ہندوستان پہنچ کر پھر مدرسہ جامع العلوم کانپور میں معروف درس و تدریس ہوئے۔
ہی عرصہ گزر اٹھا کہ پھر کیفیت ”شوقیہ الیہ“ نہایت جوش و خروش سے وارد ہوئی۔
اب کی دفعہ اس میں کلفت کے عوض لذت اور ناکواری کے بدلے خوشگوار ہی تھی۔ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل کی کیفیت شوقیہ
”سیر فی اللہ“ کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت ”سیر فی اللہ“ کے باعث تھی۔ وہ حالت مشاہدہ سے قبل کی تھی اور یہ بعد کی۔ وہ اثرِ عشق تھا یا
بقول حضرت مجدد الملت، اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا کو ذکر و شغل اور ولی کامل بنا دوں۔ چنانچہ شروع
حلقہ توجہ بھی منعقد فرمائے گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا مدرسہ کانپور ذکر و شغل بن گیا تھا۔ اس کی اطلاع جب حضرت شیخ کو ہوئی تو جواب آیا
آپ اور آپ کے متعلقین کے فوق و شوق کی کیفیت من کر طبیعت نہایت ہی خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ بایں ذکر و شغل دائم مشغول رکھے۔ دن
در ترقی عطا فرمائے۔ مقصود اصلی تک پہنچائے۔ آمین ثم آمین۔ لیکن یہ کیفیت بھی عارضی تھی اور جب ”مقامات“ میں رسوخ بڑھ گیا تو اس
نے دوسرا ہی رنگ اختیار کیا یعنی متوقع مقامات کی طلب شدید ہوئی اور پھر ویسی ہی اضطرابی اور التنبائی کیفیت رونما ہوئی جیسی قبل قیام مکہ
لیکن دونوں کی اصل میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلی کیفیت ”طلب ابتدائی“ کا نتیجہ تھی اور موجودہ کیفیت ”طلب مزید“ کا۔ اور اسی وجہ سے
دفعہ حیرانی و پریشانی اور سخت لاحق ہوئی۔ یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیشین گوئی حضرت شیخ نے اپنی پہلی وصیت میں فرمائی تھی۔ سارے
دل اچاٹ ہو گیا۔ درس و تدریس سے دلچسپی ختم ہوئی۔ وعظ کہنا چھوڑ دیا اور کیسوی اختیار کر لی۔ اہل کانپور جو مجدد الملت کے وعظ کے پیالے
پہنچنے لگے۔ ایک دفعہ بڑا حلقہ تھا۔ بیرونی حضرات علماء بھی قشر لیف لائے تھے۔ اراکین مدرسہ ان علماء کو لے کر حضرت کی خدمت میں آئے
وعظ کے لیے اسرار کیا۔ اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار ہی پڑتا تھا۔ اپنی حالت کے مد نظر اقرار ممکن تھا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گر دن جھکا لیا اور
کی زبان اپنا حال سنائے گئے۔ یہ دیکھ کر مولانا غفور الاسلام فتح پوری کا دل گچھل گیا۔ اور بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا۔۔۔

عشق نے غالب کما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”بس بھائی بس اب انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ تنگ نہ کرو۔ ایک اور موقع پر جناب مولوی شاہ علیہ السلام
پہنوازی تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان سے بھی لوگوں نے اصرار کرنے کے لیے کہا تو انہوں نے عجیب جواب دیا۔ اگر ایسی حالت میں اس شخص سے
وعظ کھلوا تو بس نمبر پہ بیٹھتے ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا وہ انا لائق ہوگا۔ ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں۔“ اس کا
خود حضرت نے بھی فرمائی کہ ”اس زمانہ میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا۔ اس لیے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے مزے سے کی نکل لے اور

ام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے، مگر اس غلبہ حال میں بھی مصلحت عامہ کا یہ خیال نادرات سے ہے۔

عرض یہ کیفیت اضطراب بڑھتی چلی گئی۔ پیری امداد علی صاحب کا پونہ ہی میں تھے اور موصوف نے بہتیزی نندہ کی مگر

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

از حجب اضطراب والتمات حد سے گزرنے لگا تو ایک عرفینہ اپنے شیخ باکمال قدس سرہ کی خدمت میں بھجوا یا اور اس میں یہ بھی عرض کیا کہ
التم اضطراب میں پیری امداد علی صاحب سے بھی چارہ جوئی کی، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ جب یہ عرفینہ شیخ باکمال قدس سرہ کی خدمت میں پہنچا تو
ازت حاجی صاحب کبھی گھر کے اندر نظر لیتے جاتے، کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے کہ ”جوان آدمی پس غلبہ ہو گیا ہے، مشکل نہیں ہو سکا مگر
تو اتنی دیر ہوں کیا کروں“ اس پر جو صاحب عرفینہ لے گئے تھے انہوں نے عرض کیا کہ حضرت میں جلد ہی جانے والا ہوں، بس یس کہ حضرت
بہ عالم مسرور ہوئے۔ اس عرفینہ کا جواب ان کے حوالہ کیا اور فرمایا کہ ان سے کہنا ”حبیب ملک مہتما را یہ خادم زندہ ہے کیوں کسی دوسرے کی
بنا رجوع کرتے ہو“ جب یہ صاحب ہندوستان پہنچے اور حضرت مجدد الملت کو ان کے کانپور آنے کی اطلاع ملی تو شام نانہ عین دوپہر ہی کے وقت
ہا کے گھر پہنچے۔ انہوں نے دالان نامہ پہنچا یا اور زبانی پیام بھی۔ اس سے جواثر ہوا اس کا حال خود حضرت اقدس یوں بیان فرماتے ہیں: ”قبل ظہر
دن نے مجھے حضرت کا یہ پیغام سنایا تھا۔ بس سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دیکھتے ہوئے تیر پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی ہو اور جلتے ہوئے
پتھر پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا ہو۔ عرصہ تک نصرت سے بھی کم پریشانی رہ گئی۔ اور مرض تک تو لبس ملحق تھا“ اس طرح ”شوق“ کی کیفیت
”اس“ میں بدل گئی۔ اور یہ ”اس“ ”اس“ ”اس“ سے اوقع تھا پہلی مرتبہ کے غلبہ شوق کے بعد (حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری سے قبل)
مل ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ۔

ہر کہ از حق السن گریو از خلق وحشت گریو

رفتہ رفتہ مجدد الملت کو تعلقات سے وحشت شروع ہوئی اور دن بدن اس میں ترقی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ کانپور جیسے محبوب مقام اپنے
م کردہ مدرسہ اور درس و تدریس سے بھی برداشتہ خاطر ہو گئے۔ حضرت شیخ کی نصیحت یاد آئی کہ ”اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر نکل
بلاتما نہ بھولیں ہی جا کر بیٹھ جانا“ ۱۳۱۴ھ کے حتم پر عثمان لی کہ مخالفانہ انداز یہ متناہ بھولن کو جو ”دکان معرفت“ اسکا تھی دہار ہمسکن بنایا
لے لیکن کانپور کے فریقہ دیگر دیدہ کو کوں سے بے مروتی کو نہ برتی جاسکتی تھی۔ اپنی عناد و دفراسات سے کام لیا۔ اتفاقاً ان دنوں مدرسہ کی مالی
الت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ اس بہانے سے پہلے تنخواہ سے دست برداری حاصل کی۔ پھر اپنی جگہ مولوی اسماعیل صاحب بردوانی کو بدترس اول بنایا
بروز برائے نام سرپرستی قبول فرمائی۔ اس طرح پورے حن مندی سے مدرسہ کو ہر طرح کے نقصان و حرج سے بچاتے ہوئے اور اہل کانپور سے کچھ
ن آرام لینے کا انداز کے آخر صفر ۱۳۱۵ھ میں خوش خوش کانپور سے چل نکلے۔ تنخواہ بھون اگر حضرت شیخ کو مطلع کیا تو جواب آیا: ”بہتر ہو کہ آپ
ماہجون تشریف لے گئے۔ امید ہے کہ آپ سے خلافت کثیرہ کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ مسجد کو از سر نو آباد کریں گے
ناہ وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے“ (مکتوب ۱۲ ربیع ۱۳۱۵ھ)

ادھر مدرسہ کانپور کے حالات وقتاً فوقتاً دریافت فرماتے رہے اور ہدایات دیتے رہے تاکہ اہل کانپور کو ترک تعلیق کا گمان نہ
رہے۔ مگر جب دیکھا کہ مدرسہ کی دشین ٹھیک ٹھیک بیچ چل رہی رہے اور اب اطمینان عزم سے اس میں خلل کا اندیشہ نہیں
آتا کہ بیجا کہے۔

”از قبل و قال مدرسہ حالے لم گرفت یک چند نیز خدمت معشوق کی کہنم“

اہل کانپور کو جب یہ خبر ملی تو عرض کی کہ مدرسہ لاکوئی کام حضرت کے ذمہ نہ ہوگا لیکن قیام تو کانپور ہی میں رہے۔ حضرت والا نے بتا دیا کیا ہے حضرت حاجی صاحب کے حکم سے ہے۔ ان لوگوں نے پھر حضرت حاجی صاحب سے آپ کے قیام کانپور کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت سرہ نے ان کو اور عبدالملت کو یہ کہہ بھیجا کہ ”فیقر کے نزدیک قیام آپ کا تھانہ بیھون میں ضروری ہے باقی تعیل وغیرہ کسی فرصت میں یا جب طبیعت گھبرائے تو کانپور کا دورہ بھی کریں اور ان لوگوں کی خبر گیری کریں اور طالب کے لیے تو تھانہ بیھون، کانپور سے کچھ دور ہیں۔“

۱۳۱۵ھ سے مستقل قیام تھانہ بیھون

۱۳۱۵ھ سے مجدد الملت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تا آخر حیات یعنی مستقل قیام تھانہ بیھون، مجدد الملت اسی ”دکان معرفت“ میں جس کی رونق حاجی صاحب کی ہجرت اور حضرت حاجی ضامن صاحب و مولانا شیخ محمد کی شہادت و رحلت کے باعث ماند ہو چکی تھی پھر فروغ رونق ہوئے۔ کانپور کو ترک کیا، درس و تدریس سے چھٹی لے لی۔ والد ماجد کے ترک کو ششہ یا کفر یا کہا، اپنے شیخ عالی مرتبت کی نصیحت استاذ ذی معرفت (مولانا رشید احمد گنگوہی) کی تلمیذ سے بالکل متوکلاً علی اللہ بہ من مشغول ہوتے۔ پھر کچھ تھکا کھبی ”تجلی جمال“ سے سبکدستی پاتے ”تجلی جمال“ سے ”برق تپان“ بن جاتے۔ ”عبود اللہ“ کا رنگ چڑھتا رہا۔ جو آتے تھے ان کو بھی اسی رنگ میں ڈوبنے لگے۔ خانقاہ کی رونق لگ گئی۔ اس دور میں رنگ ہی اور تھانہ خود میرا پا سو ڈگر اڑتے اس لیے جو بھی آجاتا سوختہ و گداختہ بن جاتا۔ سلوک

بندوں کی رہبری میں سہولت ہو اور ان کو ملنے میں حیرانی نہ رہے۔ ایک مرتبہ پچھلی رات کو منہ کے لیے دھوئے ایک بیک بلا اختیار ایک خطرہ منکرہ کا ورود ہوا جس کا حاصل چند الفاظ تھے۔ جو دفعہ تنقید میں واقع ہو گئے۔ گو یہ کوئی نئی بات لیکن اس مرتبہ اس درجہ شدید و دیدار ہوا کہ حضرت والا اپنی زندگی ہی سے ہزار ہو گئے۔ یہاں تک کہ خود کشتی تک کے دوسرے کھٹے گئے فرماتے تھے۔ ”ایک بار ایک صاحب ملے آئے۔ ان کے پاس اس وقت بھری ہوئی بندوق تھی۔ بار بار میرے ہی میں آتا تھا کہ ان کے خدا کے لیے فائز کر کے میرے ناپاک کو جو دے دنیا کو پاک کر دو کیونکہ میں فرعون و پامان سے بھی بدتر ہوں۔ وہ جس بلا میں مبتلا ہیں ان ایمان لا کر ایک منٹ میں چھٹا کر اہو سکتا ہے اور میں جس بلا میں مبتلا ہوں اس سے سالہا سال میں بھی خلاصی ممکن نہیں۔“

حالات تو یہ تھی اور ساتھ ہی ساتھ دونی مشکل یہ کہ خود لیتوں حضرت اقدس اگر ذکر کرے بیٹھا دجو کہ قرب کی حالت تھی تو سارے وہ خطرہ منکرہ بھی عود کر آتا اور دھندلہ سے بچنے کی غرض سے ذکر کو منقطع کرنا چاہتا ہوں کہ بعد تھا، تو اس کو بھی دل کی طرح گوارا نہ کرتا گویا یہ حالت

من شمع جان گرازم توجہ دل کشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چوں رخ نمائی

نزدیک آن چنانچہ دور آں چنانچہ گفت
نئے تاب وصل دارم نے طاقت جدائی

غرض سخت کش مکش میں مبتلا تھا اور ایسی شدید حالت تھی کہ باوجود صحت بدنی کے موت کو حیات پر ہزار درجہ ترجیح دیتا تھا۔ ”حصر“ میں یہ خطرہ مجاہد کے وقت قیام گنگوہ میں واقع ہوا۔ فوراً قطب ارشاد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں پہنچ کر حالت عرض فرمایا: ”الغایت نہ کیا جاتے۔“ مجدد الملت تھانہ بیھون تشریف لے آئے، لیکن وہ خطرہ منکرہ برابر زور پکڑتا گیا۔ جس سے الغنائی کی حالت چلی گئی۔ یہاں تک کہ اختلاج قلب کے ایسے شدید دورے پڑنے لگے کہ چند دلوں میں نہایت خفیت و کمزور کر دیا۔

علم منوی محمد بن علی صاحب گلوگی اتفاقاً تھا نہ بھون آئے ہوئے تھے۔ ان سے بغیر من معالج رجوع کیا۔ حکیم صاحب نے فارودہ دیکھ کر کہا: ”مجھے یہ رت ہے کہ یہ شخص کیونکر زندہ ہے۔ فارودہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ حرارت عوزیرہ بالکل فنا ہو چکی ہے۔“ مبتدئ علاج کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور فائدہ ہوتا مخرج۔“ دروس ہی وہ تھاجس کا علاج بخیر ”خزانہ غیب“ کے اور کہیں نہ تھا۔ حکیم الامت نے خالقاہ چھوڑ سفر اختیار کیا۔ کبھی کبھی خالی ہیندوق کے کفرافرتے اور اسی سے فرصت پاتے۔ اس دوران میں حضرت گلوگی سے برابر ملتے رہے اور اپنی حالت پیش فرماتے رہے۔ حضرت گلوگی تو ”امام فن“ اور قطب ارشاد تھے۔ دعا و توجہ صرف فرمائی۔ لیکن جواب ہمیشہ وہی دیتے رہے کہ ”خطرات کی طرف التفات نہ کرو۔ ساتھ ہی ساتھ حکیم الامت نے پنے شیخ باکمال کو بھی ان احوال سے آگاہ فرمایا۔ جواب آیا: ”الحمد للہ آپ کے قلب کی حالت بہت اچھی ہے۔ یہ مقام ”خوف ورجا“ ہے۔ اسی کو ہیبت والہ“ کہتے ہیں۔ کبھی ہیبت“ کبھی ”انس“ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ دونوں کو ایک سمجھنا چاہیئے۔ نفیر دعا کرتا ہے کہ کچھ قلب پر وارد ہو مغبنا اللہ الہ کو۔ جو واردات مفسر ہوں گے اس مراتب سے سب رفع ہو جائیں گے۔ اس قسم کی گھٹائیں طالب کو آیا کرتی ہیں۔ انشاء اللہ سب سے پار ہو وگے۔“ مکتوبات ص ۴۴ نمبر ۴۲۔ رجب شعبان ۱۲۸۵ھ پھر مکتوب ص ۱۹۰ شمار نمبر ۱۲۱ میں تحریر فرماتے ہیں: ”آپ کی حالت اب بالحد بہت اچھی ہے۔ نفیر دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔“ عرض تقریباً ایک سال تک یہ ”غلبہ ہیبت طاری رہا اور حضرت شیخ کی حیات ہی میں یہ دشوار گزار مانی ملے ہو گئی۔ اس ایک سالہ دور میں حضرت مجدد الملت کو جو یہ حالت شدید پیش آئی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی مرید نے غلاباطی پر پٹائیوں کی تفصیل لکھ بھیجی تو جواباً تحریر فرماتے ہیں: ”جو جو مضائقہ و معائب و عقبات و بیلیات آپ نے لکھی ہیں یہ تو سوجھوں ہیں سے یہ حصہ بھی نہیں جو بعض کو پیش آتے ہیں۔ اس وقت مجھ کو بعض (درد اور خود حضرت مجدد الملت) کے احوال یاد آگئے اور سر سے پاؤں تک اس نے بکے جلادیا۔“ ۱۸۵۲ھ راجرم ۱۲۳۳ھ یعنی غلبہ ہیبت کے فوجہ من گئے پندرہ برس بعد بھی محض اس وقت کے تصور سے سر سے پاؤں تک جلادیا۔ اب مزادہ دگا و خود اس وقت کیا گزری ہوگی۔ اہل فن جانتے ہیں کہ اس ”قبض“ شدید کے بعد کس قدر اعمالی درجہ کا ”لیط“ اور ”ہیبت“ قویہ کے بعد کتنا لازوال اور ترقی پذیر ”انس“ حاصل ہوا ہوگا اور کیسا ”سروخ“ و ”نمکن“ میسر آیا ہوگا۔ کیونکہ یہ عادات جاریہ ہے۔ حاصل حضرت مجدد الملت کو وہ مرتبہ عطا ہوا جس کو ”عبدیت“ سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی لازمی صفت بندگی اور سرانگندگی ہے۔ ذیل میں ایک طعوظ درج ہے۔ اس سے حضرت اقدسؑ کے مقام عبودیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

”بہ قسم کتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کسی مسلمان سے حتیٰ کہ ان مسلمانوں سے بھی جن کو لوگ فساق و فجار سمجھتے ہیں فی الحال اور کفار سے بھی خائفانی احوال افضل نہیں سمجھتا اور آخرت میں درجات حاصل ہونے کا کبھی مجھے دوسوہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ درجات تو بڑے لوگوں کو حاصل ہوں گے۔ مجھے تو خبتیوں کی جوتیوں میں بھی جگہ مل جائے تو اللہ کی بڑی رحمت ہو۔ اس سے زیادہ کی ہوس ہی نہیں ہوتی اور اتنی ہوس بھی برکتا شتاق نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ دوزخ کے عذاب کا تحمل نہیں اور یہ جو میں بغیر دردت اصلاح و زجر و توبیح کیا کرتا ہوں تو اس وقت یہ مثال پیش نظر رہتی ہے کہ جیسے کسی شہزادے نے جرم کیا ہو اور جنگی جلاذ کو حکم شایہ ہوا ہو کہ اس شہزادے کو درے لگائے تو کیا جنگی جلاذ کے دل میں سے مارنے وقت کہیں یہ بھی دوسوہ ہو سکتا ہے کہ میں اس شہزادے سے افضل ہوں۔ عرض کوئی مومن کیسا ہی بد اعمال ہو میں اس کو خیر نہیں سمجھتا بلکہ نڈایہ مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حسین اپنے منہ پر کاکل لے لے تو اس کو جاننے والا کاکل کو کجا سمجھے گا لیکن اس حسین کو حسین سمجھے گا اور دل میں کہے گا کہ جب کبھی بھی صاحب سے منہ دھولے گا پھر اس کا وہی چاند سا منہ نکل آئے گا۔ عرض مجھ کو صرف منہ سے نفرت ہوتی ہے فاعل سے نہیں۔“

مجدد الملت مسند ارشاد پر

یوں توجہ ثانی کے بعد کانپور ہی سے رشد و اصلاح باطنی کا کام شروع ہو چکا تھا اور حضرت گنگوہی قدس سرہ بھی اپنے بعض بعض مریدین کو حضرت کی خدمت میں بھیجے گئے تھے اور پھر تھانوی بھونچ پہنچ کر ذرا اور مریدین کی تعداد فی بڑھ چکی تھی لیکن گذشتہ دہرہ نہایت "کے تقریباً سال بھر میں اصلاح خلقی کا سلسلہ رک گیا تھا اور خود آپ ہی اس کو یہ کہہ کر ملوث کر دیا تھا کہ اس کی حالت میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جب اس شدید اور آخری مرحلہ سے بھی اللہ تعالیٰ گزار دیا تو اب "مسند ارشاد" پر پھر جلوہ فرما ہوئے اور تربیت کے کام میں بہترین مصروف ہو گئے۔ مولانا محمد عیسیٰ کاکوروی مشہور لغت گو کے فرزند مولانا الزوار الحسن صاحب کاکوروی کا خواب درج ذیل ہے جس سے حکیم الامت کے منجانب اللہ اس مقام پر ناز نہ ہونے اور اپنے وقت سے "مجدد" ہونے کی بشارت ملتی ہے۔

خود تحریر فرماتے ہیں :-

میں نے سفر حج میں بمقام مدینہ طیبہ حضرت مولانا تھانوی مدظلہ کے متعلق ایک خواب دیکھا۔ حالانکہ اس زمانے میں مجھ کو حضرت سے کوئی خاص عقیدت بھی نہ تھی۔ البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا اور میرا خاندان بھی علمائے اہل حق کا کچھ زیادہ معتقد نہ تھا غرض حضرت مولانا کا کو مدینہ طیبہ میں کوئی بعید سے بعید بھی خیال نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پر فاضلہ اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیار واری فرما رہے ہیں۔ اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیے رہے ہیں جن کے متعلق خواب خواب میں معلوم ہوا کہ یہ طیب ہیں۔ آٹھ کھٹے پر زور میرے ذہن میں یہ تصویر آئی کہ حضور کو کیا سیار میں حضور کی امت ہے اور حضرت مولانا اس کی تیار واری یعنی اصلاح فرما رہے ہیں لیکن وہ بزرگ طیب جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے وہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون تھے۔ ہندوستان پر ہیں نے حضرت مولانا کی خدمت میں یہ خواب کھ کر بھیجا اور جتنی تصویر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی مکہ دی اور یہ بھی مکہ دیا کہ میری میں یہ نہیں آیا کہ وہ بزرگ طیب کون تھے جو دور بیٹھے نظر آ رہے تھے حضرت مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور ابھی زمانہ ابعد ہیں اس لیے خواب میں مکانا بعید دکھائی دیے۔

چنانچہ حضرت اقدس سے قصبہ تھانہ بھونچ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر، دولت و فروت اور دیریات کو ٹھکرا کر وہ بادشاہت کی جو کم کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب سے لوگ پروانہ وار آئے اور اس شمع ضیا پاش سے اپنی اپنی حیثیت مطابق روشنی کے سامان حاصل کر گئے۔ وہ بھی آئے جن کی پیاس چشموں سے نہ بجھتی تھی اور یہاں آگڑ سیاب پہنچے۔ لوگوں اور مریدوں کی یہ عالم تھا کہ قصبہ تھانہ بھونچ کے لیے ایک مستقل ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا۔ اور خانقاہ امدادیہ کی "وکان معرفت" پر خریداران علم و عرفان کا وہ ہوا جو حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ احمد مرہندی (مجدد العارف ثانی، رحمۃ اللہ علیہ کے بعد تاریخ ہند میں شاید اپنی نظیر نہ تھا۔ مریدین و متقین سیکڑوں نہیں ہزاروں تھے صرف "مجازین" ہی کی تعداد ۱۶۹۰ ہے۔ جس میں ۷۰ مجازین بیعت یعنی خلفاء ہیں (۵۹) مجازین بیعت ہیں جن کو بیعت کی تو اجازت نہیں لیکن تبلیغ کی اجازت حاصل ہے پھر مذکورہ ۷۰ خلفاء نہ صرف وہ ہیں جو کتابی علم دینی کم و دسترس رکھتے ہیں بلکہ وہ بھی ہیں جو اپنے وقت کے علامہ اور اپنے دور کے اساتذہ کامل ہیں جیسے مرشدی حضرت مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب دامت دینہ معظم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب دامت دینہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری مہتمم مدرسہ جامع اشرفیہ لاہور حضرت مولانا خیر محمد صاحب مدظلہ مہتمم خیر المدارس ملتان۔ حضرت مولانا علی صاحب لٹی مدظلہ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری سابق صدر مدرس مظاہر العلوم سہارن پور دیوبند صاحب کامل

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی سابق پروفیسر فلسفہ اسلام جامعہ عثمانیہ۔

حضرت اقدس کو یہ شرف ملا تھا کہ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی کے دور میں علماء و اقلیاء آپ کے خوان فیض کے زلمہ بردار تھے اسی طرح اس دور کے سارے علماء اسی نوکان معرفت کے خریدار تھے۔

اس سعادت بڑو یا زنیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ دینداری اور اُبابی بن مترادف دکھائی دینے لگے ہیں اور عوام تو عوام

لاکھ ایک پیسے مومن ہی کی زندگی نظم و ضبط کا بہترین نمونہ ہو سکتی ہے۔ حکیم الامت کی مجددانہ شان کا یہ وصف بھی بہت حمنا ہے۔ آپ نے خارجی زندگی اور داخلی زندگی کا ایسا اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اہل حق ایسے بھی ہوتے ہیں اور اہل منہ نے سمجھ لیا کہ مصلحانِ دین ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کم عقولوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو بالکل انگریزیت ہے کہ ملنے کے اوقات مقررہ گفتگو کے طور پر لیتی متعین۔ لیکن ان کے متعلق اس کے سوا کیا کیا جائے۔

ع بریں عقل و دانش باید گر لیست

یہ کچھ بغیر اس اصولی زندگی کے نہ خود کو راجت میسر آ سکتی ہے نہ غیر کو۔ نہ اپنی صلاحیتوں سے استفادہ و افادہ ممکن ہے نہ غیر کی تربیت و اصلاح اپنی صحت و توانائی برقرار رکھ سکتی ہے نہ اس کی افادیت۔ اسی لیے خانقاہ امدادیہ میں ان فزیر اصولوں کو جن کے ماعدہ بہ حالِ اسوہ و ارشادات مولیٰ کریم علی اللہ علیہ وسلم ہی تھے پانچاں نہیں کیا جاتا تھا۔

حضرت کے اوقات اس طرح بٹے ہوئے تھے یہ صبح سے ۱۲ بجے تک اور نمازِ عصر سے عشاء تک کے اوقات اپنے انفرادی

موجو رخصتی ملاقات کا طالب ہو۔ وہ سب کو کوئی فوری ضرورت لاحق ہو۔ ۱۲ بجے سے نمازِ ظہر تک بالکل تنہائی اور قیل و لہ کا وقت تھا اور اس

کوئی اشتغال تھا۔ نمازِ ظہر و قیل و لہ سے فراغت کے بعد نمازِ عصر تک عام مجلس ہوتی تھی جس میں ہر شخص شریک ہو سکتا تھا اور بات چیت

بکثرت تھا۔ پھر بعد نمازِ عشاء کسی سے نہ ملتے تھے لیکن یہ تو ان کے لیے ہوا جو بڑا اپنا مدعا ظاہر کر سکتے تھے۔ راز و تنہائی کے طالبوں کے لیے

ملی یہ تھا کہ سردی میں آویزاں لیٹر بکس کے اندر یا تو اپنا مدعا کھ کر ڈال دیں یا اس کے عزم کرنے کے لیے تعین وقت چاہیں۔ اور ہر دو

رہنوں میں اپنا پتہ ضرور کھ دیں یعنی خانقاہ کے کس کمرہ میں مقیم ہیں تاکہ جواب باسانی وہاں پہنچ جائے۔ نہ مسائل کو تکلیف پہنچا سکیں نہ مسائل کو

خانقاہ امدادیہ کا یہ بھی اصول تھا کہ کوئی شخص بلا اجازت صاحب خانقاہ کی خدمت نہ کرے نہ کوئی ان کے ہمراہ اور نہ راستے میں ان سے مصافحہ

ہے۔ خود اپنے کام میں مشغول رہے اور حضرت شریح کو اپنے امور و مشاغل میں آزاد رکھے۔

چونکہ پڑھے لکھے اور غیر تعلیم یافتہ، آداب سے واقف اور بے ادب سب ہی طرح کے لوگ آتے تھے اور ہر ایک کو بار بار تنبیہ میں کافی

تضائع ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے صبحِ تعارف حاصل کرنے کے لیے حضرت نے ایک جدول بنا رکھا تھا تاکہ اس کے مطابق خانہ پُکری

کے حضرت کو دوسے دیئے اس کے عنوانات یہ تھے :-

نام، وطن، اصلی، اس وقت کس مقام سے آنا ہوا۔ اور وہاں کی مدتِ قیام، شغل و ذریعہ معاش۔ کوئی موردِ فتنہ دین کے مالک تو

نہیں۔ علمی استعداد اور دوا عربی یا انگریزی کس قدر ہے۔ آنے کا مقصد اصلی کیا ہے۔ محض ملاقات یا کچھ کتنا بھی، کچھ کر دنیا یا زبانی، مجمع میں یا متناہ کسی شے سے بیعت میں یا نہیں، انگریزوں کو کس سے؟ اگر مجھ سے بیعت میں تو اس کو کتنا غرض ہوا۔ اور تعلیم کس سے متعلق ہے۔ میرٹ موعظ و رسا کیا دیکھتے ہیں؟ اگر مجھ سے کچھ خط و کتابت ہوئی ہے تو وہ پاس ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو دیکھا میں؟ کتنا قیام ہو گیا۔ کہاں قیام ہو گیا۔ خانقاہ میں پہلی ماہو اسے! پہلے بھی آئے ہیں۔ میان کے انتظام طعام کی خبر ہے یا نہیں۔ باہر والا بڑا علمی انداز دیکھ لیا یا نہیں؟ دیدہ ویدی اعلان ہے جس میں حد کے اوقات فراغت و مصروفیت کی تفصیل ہے)

اس کے علاوہ ہر ہر طبقہ کے افراد کے لیے اصول و ضوابط متعین تھے اور سب میں یہی روح کار فرما تھی کہ ہر شد و مرید دونوں کو راحت دے۔ تصبیغ اذنیان نہ ہوا اور بے جا احتیاط نہ رہے۔ اب کوئی بتائے، کیا بغیر اس نظم و ضبط کے مجدد الملت وہ کچھ کر سکتے تھے جو انہوں نے کر کے دیکھا؟ دونوں کتابوں اور رسالوں میں حقائق و معارف کے ذخائر جمع فرمائے۔ ہزاروں خطوط کے گراں بہا جوابات لکھے۔ سیکڑوں موعظ کے ذریعہ ہدایات کے دریا بہا کے ان گنت ملفوظات کے ذریعہ طرفیت کے عقدے کھولے۔ ہزاروں تشنگانِ حب الہی کو سیراب کر گئے۔ یہ سب اسی اصولی زندگی کا نتیجہ تھا۔

وعظ و پند، اصول و ضوابط صرف اغیار کے لیے نہ تھے۔ گھر کی نجی زندگی میں بھی ان پر نگاہ رکھی جاتی تھی۔ البتہ یہ نظام کے لحاظ سے اصول بھی حیات تھے اور ہونے بھی پاتیں۔

حضرت امی کو ازواج مطہرات تھیں۔ اس لیے جو بھی فقہ یا جنس کی صورت میں آتا مساوی مساوی کر کے اپنے ہاتھ سے تقسیم فرماتے تھے۔ کاہر عالم تھا کہ دونوں کے مہر ادا کر دیتے تھے اور باوجود فریقِ ثانی کی طرف سے واپس لینا گوارا نہ فرمایا۔ حضرت سخت گیر نہ تھے۔ کبھی گھر والوں پر غلہ و تحکم کا برتاؤ نہ کرتے، بلکہ ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتے اور بہت ہشاش بشاش رہتے تھے۔ اپنی ازواج کے مہمانوں کی پوری مدارات اور ان کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے تھے۔

اہل خانہ پر حتی الامکان کوئی بوجھ نہ ڈالتے تھے حتیٰ کہ کسی خاص کھانے کی فرمائش نہ کرتے۔ البتہ جب خود اصرار سے فرمائش کرنے کا راز ہوتا تو اس میں بھی ایسا اسلوب اختیار کرتے کہ ان کی دل چسپی نہ ہو، نہ ان پر بار پڑے۔ فرماتے ”تم ہی چند کھانوں کے نام لوجو بآسانی پسائی میں ان میں سے جو مرغوب ہو گا تیار دوں گا“

باوجود کثرت مشاغل کے گھر پابندی سے تشریف لے جاتے تھے تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔ ان کی بیاریوں پر پوری طرح فراخ دل رہے۔ روپیہ صرف فرماتے اور ضرورت ہوتی تو دور دراز مقامات کو خود لے جا کر علاج کرواتے تھے۔ اس طرح تعلق مع اللہ کے ہمارے حقوق تھے۔ انہوں نے دیتے تھے۔ یہ تو ان کا نذران کا شاعر ہے جو سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نا آشنا ہونے تھے جن کے نزدیک عبادت حق مع اللہ کا رشتہ انسانا ناک ہے کہ مسجد خانقاہ کے باہر قدم رکھتے ہی تار تار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اتباع سنت کے تحت ہر فعل جو مسجد و خانقاہ میں ہو، یا گھر اور بازار میں جو عین عبادت اور ترقی قرب کا موجب ہے اور یہی صفت ”جے ہر وہ باسمہ“ کمال کی دلیل ہے۔

حضرت نے تو دو وعظ کر کے عدل و انصاف کی حق نظیر نام کی کہ اب لوگوں کے لیے عقدِ ثانی کی حرات شکل ہو گئی۔ خود فرماتے تھے ”تو ایک کی باری میں دوسری کا خیال لانا بھی خلافِ عدل سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے اس کی طرف توجہ میں کمی ہوگی۔ اور یہ اس کی حق تعلی ہے۔ اب میں اپنے کپڑے خانقاہ ہی میں رکھتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ایک گھر میں کپڑے رکھتا تو دوسرے گھر والوں کو شکایت ہوتی کہ ہمارے ساتھ“

سوسیت نہیں جتنی دوسری کے ساتھ ہے۔

محبہ اللہ کے اس شہسار کو خور سے دیکھو اور جان لو کہ دیدار میں سمانشرت، معاملات و اخلاق اتنے ہی مستقیم بالشان ہیں جتنے عقائد و عبادات، تکمیل دین کے لیے ان پانچوں پہلوؤں پر یکساں نظر فرمادی ہے۔ حکیم الامت کو رنج ہوتا جب شوہروں کے ظلم و ستم کی روایتیں آپ سے پہنچتیں۔ آپ ہر ایک کو اپنی بیویوں پر مہر و کرم، عفو و درگزر اور پاس مروت کی تلقین فرماتے تھے۔

رشد و ہدایت کا وہ آفتاب جو ۱۲۸۰ھ میں مطلع تھا نہ بھوں سے منور ہوا اور ۱۳۱۵ھ سے ہندوستان کے طول و عرض میں شریعت و طریقت سے انوار چھیلنا رہا۔ بالآخر ۱۳۶۲ھ میں جہنم کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تاریخ وفات سے شاید پانچ برس پہلے ہی سے معذہ و جگر کی تکلیفوں نے عاجز کر رکھا تھا۔ کبھی قبض ہوتا تو بٹھنے کا نام نہ لیتا۔ اور جی اسہال ہونے لگتے تو رکھنے ہی نہ پاتے۔ مختلف اعضاء متورم ہو چکے تھے۔ علاج برابر ہوتا رہا۔ اور حق تعالیٰ کی اس امانت کی حفاظت ان کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ لیکن تدبیر ہی تو زندہ کے اختیار میں ہے۔

ع مرض بڑھنا لگی جوں جوں دوا کی

آخر جب تک بھی تقریباً بند ہو گئی۔ سچیت دنا تو اس اور صاحب فرماش ہو گئے۔ اکثر غنڈگی کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ مگر جب بھی ہوش آتا اور جتنی بھی دیر رہتا اپنے عارفانہ کلمات اور خطوط کے جواب اسی حکیمانہ انداز سے ادا فرماتے تھے۔ ماضی بالزل کو دیکھ کر عقدہ کھلا کہ یہ غنڈو لگی کے ارے نہ تھے بلکہ "رہو لگی" کی کیفیت تھی، ورنہ کسی کی عقل مان سکتی ہے کہ اس درجہ کے ضعف میں بار بار کسکے دوروں کے باوجود عقل و فکر کسی برج میں بھی متاثر نہ ہوں، مثلاً دیکھو کہ اسی چل چلاؤ کی حالت میں ۳۰۰ روپیہ کا ایک منی آرڈر آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ "میں نے ایک منت مالی کی کہ اگر کاروبار میں کامیابی ہوگی تو ۳۰۰ روپیہ حضرت والا کی خدمت میں بھیجوں گا چنانچہ حسبہ مرسل خدمت میں آپ مالک ہیں، جہاں چاہیں رقم فرمائیے" اس کا جواب اپنی ناواں انگلیوں سے بدقت تمام یہ تحریر فرمایا: "پہلے تو تم نے کھائے کہ آپ مالک ہیں۔ بعد کو اختیار پر کرنے کا وہاں ہے اور یہ میسر تو کیل ہے۔ چونکہ مالک بنانے اور وکیل بنانے میں شرعاً فرق ہے لہذا واپس کیا جاتا ہے۔"

حفظ شریعت کا ایسا خیال اور اس کا اتنا استہدام کسی غائب دماغ سے ممکن بھی ہے؟ اور یہ تو ایک مثال ہے ورنہ وہاں تو شب و روز یہی رامت جاری تھی۔ مرض الموت کے دن گزرتے گئے، دو شنبہ ۱۵ رجب ۱۳۶۲ھ کو صبح ہی سے مسلسل دست آنے لگے۔ کہ ورمی و لقا بہت، نے رنج حاجت کے قابل کب رکھا تھا۔ مجبوراً بار بار کپڑے بدلے جاتے رہے۔ خود صاحب مرض کو صفائی و طہارت، نماز اور ایسی شقوق کا ادا نہ تھا۔ آخر استہدام رہا۔ اسی دو شنبہ کو بعد نماز مغرب اپنی چھوٹی رفیقہ حیات سے پوچھا "میں دولوں کا مامور خیر دے چکا ہوں؟" "جی ہاں" فرمایا۔ "میں بہت کچھ ل چکا ہے۔ آپ دے چکے ہیں، ابے فکر میں" پھر فرمایا "آج تو ہم جا رہے ہیں" رفیقہ حیات نے عرض کی "کہاں؟" فرمایا۔

تم نہیں جانتیں۔ اس کے بعد پھر خوش غشی طاری ہوئی تو سوا گھنٹہ تک ہوش نہ آیا۔ سانس تیزی اور آواز سے جلتا رہا۔ جب سانس اوپر آتا تو کتنے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ کی درمیانی اور شہادت کی انگلی کے بیچ ہتھیلی کی پشت سے ایک ایسی تیز روشنی نکلتی تھی کہ جلتے ہوئے برقی قہقے مانند پڑ جلتے تھے۔ یہ روشنی سانس کے آنا اور چڑھنا کے ساتھ آتی جاتی رہی اور جب وہ ختم ہوا تو یہ غائب ہو گئی۔ کیا عجب کہ جس انگلیوں سے حقائق و معارف ایک عرصہ تک معرض تحریر میں آتے رہے، یہ نورا س کا ہو۔ مہر کیف عقل و دشمن کا وہ چراغ جو کئی برس کے مرض کے تند و تیز سنجھوٹوں سے سمجھ کچھ کر سنبھل سنبھل جاتا تھا۔ بالآخر ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ ۱۰۱۹ جولائی ۱۹۴۲ء

کی درمیانی رات ۸۶ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر پاکر بحالتِ عیاضہ کے لیے بھجوا گیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس سانحہِ غلیظ کی اطلاع ہوا کی طرح پھیلی۔ اور بن کر عشاق کے قلوب پر گری۔ صبح ہوتے ہوئے ہزاروں محبت کے مارے جو پہلے سے

دھڑلے کوئے جاناں میروم سرخوش و شادان و ذوالِ میروم

ادھیکم الامت دس جاں لب در حضورش بہرِ دس مایہ و دم

کے نفوس سے مست و سرشار چلے آتے تھے۔ آج فریادی اشکوں کے ساتھ آئے کہ

سیر و سنیلا بصیر امیری سخت بیہری کہ بے مایہ روی

اے تماشہ گاہِ عالم روئے تو تو کعبہ بہرِ تماشہ مایہ روی

وہی اور دوسرے شہروں سے پیشل ٹرینیں آئیں۔ اور ہزاروں شہداءِ حق کے ساتھ عہدِ الملت رحمۃ اللہ تعالیٰ کا جنازہ نکلا۔

صع عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم و دھما سے نکلے

عید گاہ میں غارِ جنازہ پڑھی گئی اور پھر آپ ہی کے وقت کہہ تکیہ میں جس کا تاریخی نام ”قبرستان عاشق بازاں“ تھا۔ جسمِ مبارک کو پڑا کیا گیا۔ لولہ اللہ مرشدہ۔ سنا ہے کہ بزرگِ جنازہ تھے ان کو پھر بھی چین و سکون آیا۔ لیکن جن کی قسمیں ”اولیٰ“ بنی تھیں ان کی آتشِ فراق ایک عرصہ میں جاکر فرو ہوئی۔ اس کا اندازہ وہی کر سکے گا جس نے کبھی عشقِ حقیقی کی چوٹ کھائی ہو۔ زبانِ قلم اس حسی کیفیت کے اظہار سے عاجز ہے۔ اے آتشِ فراق جاننا کیاب کہ وہ

سے سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فناء کیا پڑا کتنی ہے تجھ کو غلیظ فناء غائبانہ کیا

شہادتِ انام

گو فضلہ تعالیٰ حضرت والادرحمۃ اللہ علیہ کے کلماتِ علیہ وعلیہ وعلیہ اآفتاب نصف النہار کی طرح روشن ایسے مشہور زمانہ ہیں کہ ان کے لیے اب کسی شہادت کی حاجت نہیں۔ بالخصوص شہادتِ انام کی۔ لہذا اے صغ آفتاب آمد و دلیل آفتاب۔ لیکن مزید بخاری و مسلم حدیث استختم شہداء اللہ فی الارض ہے جو ایسے ہی موقع پر ارشاد کی گئی تھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اگر کسی کے مرنے کے بعد ہم طہر سے لوگ اس کی تہنیتی کریں تو اس کی توفیق ہے کہ وہ عند اللہ بھی اچھا تھا۔ کیونکہ حسب ارشاد نبوی استختم شہداء اللہ فی الارض عامۃ الناس بھی زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہی مضمون ایک روایت میں یوں آیا ہے۔ اللہ ملائکتہ تنطق علی السنۃ بنی آدم ما فی المرئ الخیر والشر (فتح الباری ج ۲ ص ۱۸۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے بعض فرشتے متعین فرما رکھے ہیں کہ وہ انسان کا خیر و شر لوگوں کی زبان پر جاری کر دینے اپنے محبوب کی ہر کس و ناکس سے تہنیتی کریں کہ جتنیں کو خوشی بھی ہوتی ہے جس کی ان کو اس علم میں ضرورت بھی ہے اس لیے سید گزشتہ وادیت اور تحریرات میں سے جو سننے یا دیکھنے میں آئیں صرف چند ہی بطور نمونہ پیش ہیں۔

مکہ کی حنفی مسلم جامعین ہیں جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کو حضرت سے کچھ سیاسی یا مشنری اختلاف بھی تھا۔ قریب قریب سب نے بالاتفاق اس خسارہ کو خسارہِ عظمیٰ محسوس کیا۔ جبکہ کچھ تفریق جیسے ہوئے۔ تقریریں ہوئیں اور تقریروں کے وقت بعض مقررین و سامعین کی زبان بند ہو گئیں۔ ریزولیشن پاس ہوئے۔ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی ہوئی۔ بعض بعض جگہ ملازمین بند ہوئے بلکہ وہاں بھی بند ہوئیں اور بعض جگہ خود سے کہیں ناجائز نہ ہو۔ اس ارادہ پر عمل کی ہمت نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ آزاد لوگ تھے۔ لیکن حضرت اقدس کی دینی شخصیت کا اتنا اثر شب و بام کا کہ خود بھی حضرت کے معاملہ میں احتیاط کے خلاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اکثر جگہ بہت بہت اوصافِ ثواب بیان کیے گئے۔ پانی پت سے اطلاع کی

۲۲ یا ۲۴ قرآن شریف ختم کیے گئے۔ وہاں حفاظ کی بہت کثرت ہے۔ متعدد دیگر تقسیم طعام کے ذریعہ بھی ایصالِ ثواب کیا گیا۔ غرض اپنے اپنے خیال اور مشرب کے مطابق سب ہی نے اظہارِ علم اور ایصالِ ثواب کیا۔ تمام کی خبرائیں جن میں غیر مسلم بھی تھے اس خبر کو خاص اہمیت کے ساتھ شائع کیا۔ بلکہ جہاں تک سنے میں آیا سب سے پہلے ایک غیر مسلم اخبار ہی نے اس خبر کو بہت اچھے عنوان کے ساتھ شائع کیا۔ حضرت اقدس کی علالت ہی کے زمانہ میں جس نے ساندل سے دعائی اور تمنا خواہر کی کراچی وہ تو بڑے شخص ہیں خدا کرے جلد اچھے ہو جائیں۔ میان بہت کوعیر مسلمانوں کے بھی یہی الفاظ ہوتے تھے۔ ایک بہت بوڑھے شخص نے جو مسلمان تھا اور جس نے کبھی حضرت اقدس کی زیارت بھی نہ کی تھی جب خبر ذاتِ سنی تو بے اختیار چھوٹ چھوٹ کر رونے لگا۔ اور کہنے لگا کراچی ان کی کیا بات تھی اگر کسی مسئلہ کی ضرورت ہوتی تو پہلے ڈھونڈتے پھرتے تھے اور کوئی مسئلہ بتانے والا نہ ملتا تھا۔ اور اب ہمارے گھر کی لڑکیاں بھی ہمیشتی زیور دیکھ کر بتا دیتی ہیں۔

بعض جوائے نے میان تک لکھا تھا کہ اگر مولانا اپنی تصانیف کی رجسٹری کر لیتے اور خود اشاعت کرتے تو آج کم از کم چالیس سو سو لاکھ روپے چھوڑ کر جاتے۔ بعض نے اپنے الفاظ میں لکھا کہ بے نظیر سستی تھی اور اب صدیوں ایسی سستی دینا نہیں بیدار کر سکتی۔ بعض نے لکھا کہ متعدد کتابیں تو ایسی تصنیف کی ہیں کہ جن کی نظیر سلف میں بھی نہیں پائی جاتی۔ بعض نے لکھا کہ مولانا نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی، ان کی اولاد ان کی تصانیف کیڑہ ہیں۔ ————— چنانچہ رسالہ ”البرہان“ دہلی ماہ اگست ۱۹۲۳ء میں اس حادثہ کا اظہار منہوں ذیل میں کیا گیا۔

اھ حکم الامت! انتھ میت کذات ہم میت شہوت یوں تو موت اس عالمِ آب و گل کی ہواں چیز کے لیے ہی منتظر رہے جو زندگی کا عاریتی لباس پہن کر بساطِ سستی پر بیٹھا رہا ہوتا ہے لیکن جس طرح زندگی زندگی میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ہر ایک کی موت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی ایسی اموات بھی واقع ہوتی ہیں جو صرف افراد و اشخاص کی اموات نہیں ہوتیں بلکہ ان ہزاروں لاکھوں انسانوں کی عمارتِ حیات بھی اس سے متزلزل ہو جاتی ہے جو مرنے والے کے دامانِ عقیدت و واردات سے وابستہ ہیں۔ پھر اس کی موت کا ماتم آنکھوں کے چند قطرہ ہائے اشک سے نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں دلوں کی پرسکون آبادیاں ایک مستقل غم کدہ امانی بن کر رہ جاتی ہیں۔ امیدوں اور دلوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ نشاط و کامرانی حیات کے آئینہ کسے سرد ہو جاتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس حادثہ کا تباہی سارے کائناتِ عالم کی ہر چیز کو اداس اور ملگن بنا دیا ہے اسی قسم کی ایک موت پر عربی شاعر نے کہا تھا ہے

وما کان قبیلہک ہلکۃ واحد

ولکنہ مہلبان قوم تہلکۃ

”قبیل کا مرننا صرف ایک شخص کا مرننا نہیں بلکہ ایک قوم کی بنیاد تھا جو تہلکۃ ہو گئی۔“ گزشتہ ماہ جولائی ۱۹۲۰ء کی درمیانِ شب کو تقریباً اس بے حکم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا جو سائے ارشاد پیش آیا وہ اسی قدر کا سا نہ تھا۔ حضرت مولانا جس طرح شریفیت کے عالمِ منہر تھے۔ طرفیت، اور سلوک میں بھی مقامِ رب کے۔ ایک تھے۔ ان کی ذاتِ علوم ظاہری و باطنی کا سخن تھی۔ علمِ سفینے سے زیادہ علمِ سینہ ان کا اصلی جوہر اور زیور تھا۔ تخریریں علم و فضل کا معدن ہوتی تھیں۔ اور تقریریں بلا کی اثر انگیز تھیں۔ وہ جس بات کو چاہتے تھے۔ بھتے اسے برعکس اور کہتے تھے۔ اور اس میں انہیں کسی کوسہ لاکھ کی پروا نہیں ہوتی تھی۔ خود ایک درویش گزشتہ شبیں تھے۔ لیکن ان کا آستانہ بڑے بڑے اربابِ ثروت و دولت اور اصحابِ علم و فضل کی عقیدت کا گاہ تھا۔ جو بات اور جمل تھا اخلاص اور بیانت کے ساتھ تھا۔ دیوی و جاہت و شہرت اور مالی حرص و آنکا شاید دل کے آس پاس بھی کہیں گزرنے ہوا تھا۔ اپنے اصول اور اپنے عقیدے و خیال پر اس مضبوطی و پختگی سے عمل پیرا ہوتے تھے کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کو اس سے منحرف نہیں کر سکتی۔ حضرت مرحوم کا آستانہ معرفت و روحانیت کا ایک ایسا چشمہ صافی تھا کہ ہزاروں شہداء کام آتے اور ہر باب

ہو کر بنائے تھے۔ وہ جن کی زندگیاں معصیت کو شہی اور عصیان آلودگی میں بسر ہوتی تھیں یہاں سے پاک و صاف ہو کر اور گوہر مقدس سے داماد آرزو ہو کر واپس لوٹتے تھے۔ ان کی زندگی اتباع سنت کا ایک زندہ درس اور ان کی گفتگو اسرار و موزون طریقت کا دفتر گراںمایہ تھی۔ بعض مسائل علم علمائے ہند کی ایک جماعت کو ان سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ لیکن تقویٰ و طہارت، و تقفہ فی الدین شرعی علوم میں مہارت و بصیرت، مہارت گفتاری اور مخلصانہ عمل کو شہی انابت الی اللہ، بے لوث خدمت دین، بے غرضانہ نافعین رشتہ دہایت، حضرت مرحوم کے یہ اوصاف عالیہ اور فضائل حمیدہ نے جو ہر موافق و مخالف کے نزدیک برابر مسلم رہے۔ بعض خواص و اسقام کی بنا پر گوشہ نشینی سے قبل اپنے مواظبہ حسنہ اور اپنی کثیر تصانیف کے ذریعہ حضرت مرحوم نے اصلاح عقائد و اعمال اور الباطل رسوم و بدعات کی جو عظیم الشان خدمت انجام دی ہے وہ غالباً تمام ہم عصروں میں ان کا وہ ظفر امتیاز ہے۔ تو میں نے ان کو حکیم الامت کے خطاب دیا تھا اور باہر کی دہ بجا دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ہزاروں انسانوں کے روحانی امراض کا ایسا کامیاب علاج کیا جو خوف ریزے محقق وہ گوہر آبدار بن گئے اور جو صرف پتیل تھے وہ زرخیز خالص ہو گئے۔

چھوٹے بڑے رسالے اور مستقل تصانیف جو مولانا کے قلم سے شائع ہوئیں ان سب کی مجموعی تعداد تازہ ترین شمار کے مطابق آٹھ سو سے اوپر بیان کی جاتی ہے جن میں سے کثیر تصنیفات ملک میں اتنی مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے درجنوں ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ کہا جاتا ہے اور دعا اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ مولانا کی تصنیفات جواب تک طبع ہو چکی ہیں ان کی مجموعی قیمت پچاس لاکھ روپیہ سے کم نہیں ہے۔ مولانا کی سیرت و فیاضی، خلوص اور تلقین کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تصنیفات کی اس غیر معمولی مقبولیت کے باوصف آپ نے کبھی کسی کتاب کا اشاعت و طبع اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا۔ ہر شخص کو ان کے چھاپنے اور طبع کرنے کا اذن عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مادی دنیا میں مولانا کا نام یہ ایک عمل ہی ایسا ہے جو آج کل کے بڑے بڑے نامور علماء کے لیے سرمایہ عبرت اور درس منعط ہے ہو سکتا ہے۔ پھر یہ تصانیف کسی خاص طبقہ کے مخصوص نہیں۔ علماء اور فضلاء اور باب شریعت اور اصحاب طریقت، مرد اور عورتیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی اردو خوان ہر ایک ان سے استفادہ کر سکتا ہے اور اپنے لیے اصلاح ظاہر و باطن کا سامان بنا سکتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں اسرار و نکات کے علاوہ ایسا عجیب و غریب منفعتی اور علم استدلال ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا حریف بھی تصدیق و تائید سے کوئی مفر نہیں دیکھتا۔ جس بات کو بیان کرتے ہیں نہایت وثوق اور یقین ساتھ بیان کرتے ہیں۔ حضرت مرحوم کی تحریروں اور ان کی گفتگو میں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کی آمیزہ دار ہوتی تھیں۔ بات سے بات پیدا کرنے ہر معاملہ کی اصل حقیقت کو پہچاننا ان کی ذہانت کا خاص جوہر تھا۔

خواص کے لیے تفسیر بیان القرآن اور شرح مشکوٰۃ مولانا مرام اور جوتوں کے لیے ہر شتی زیور آپ کی ایسی گراں مہا اور کثیر الشہرت تصنیفات ہیں کہ جو اپنی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے اردو کے مذہبی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں دھکتیں اور موخر الذکر کتاب تو اس قدر مقبول ہے کہ ہندوستان کا شاید ہی کوئی اردو خواندہ ہوگا جس نے کم از کم اس کا نام نہ سنا ہو۔

عسے یہ سیاسی اختلاف تھا کہ اول خلافت کیٹی اور پھر کانگریس میں علمائے ہند کی ایک جماعت شریک رہی اور حضرت مولانا مدظلہ کے خلاف رہے اور جس طرح حقیقی ہر کانفرنس سے امداد لینے کی اجازت نہیں اس سیاسی جنگ میں بھی ان کے نزدیک اجازت نہ تھی۔ ایکے شرارت پر اس وقت لوگوں کی نظر ہو سکتی تھی مگر خورسے بیکہ لیا کہ حق دہی تھا کہ جو کچھ کرے خدا پر ہر دہر کرے کرے۔ کاڈوں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے مدظلہ جہاں کا خار ہے اور یہی فکر حقیقت میں پاکستان کا شر ہے آیا ہے۔ ۱۲-۱۳

مولانا کی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے آپ کی عمر تقریباً ۸۲ سال ہوئی ہے۔ آپ کی مفصل سوانح عمری "ذکر السوارخ" کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں آپ کی حیات میں ہی شائع ہو گئی تھی۔ جس کی تصنیف کا اشرف اردو زبان کے مشہور شاعر اور ناضل عریض السان صاحب مجذوب اور مولوی عبدالحق صاحب کو حاصل ہے۔ اب اگرچہ حضرت مولانا کی وفات ہو چکی ہے لیکن وہ اپنی تصنیفات اور علمی کارناموں کے باعث آج بھی زندہ ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آپ کے بعد ان کے ہندو جاوید یادگاروں سے روشنی حاصل کریں اور ان جہانی میں اسلام کے سراط مستقیم پر چلیں۔

حق تعالیٰ اعلیٰ علیین میں مولانا کے مدارس و مراتب عیش از نبش بر حسانے کہ وہ عمر بھر لوگوں کو اسی لہلہ کی طرف بلا تے رہے اور قیامت ان کا حشر صدیقین وابرار کے ساتھ کرے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہمیشہ ایک مومن و فاضل و صدیق کی ہی طرح بسر کی۔

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

مجدد الملت کے آثار علمیہ

ذکر السوارخ اسلام
سلمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و دینی فیوض و برکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ ان سب کا احاطہ ایک مختصر سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ان کی جامعیت ہے جو ان کے اوصاف و محامد میں سب سے اول نظر آتی ہے۔ وہ قرآن پاک کے مترجم ہیں۔ دینی مفسر ہیں۔ اس کے علوم و حکم کے شارح ہیں۔ اس کے مشکوک و شبہات کے جواب دینے والے ہیں۔ وہ محدث ہیں۔ احادیث کے اسرار کے ظاہر کرنے والے ہیں۔ وہ فقید ہیں۔ ہزاروں فقہی مسائل کے جواب لکھے ہیں۔ نئے سوالوں کو حل کیا ہے۔ نئی چیزوں کے متعلق انتہائی باتوں کے ساتھ فتوے دیئے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ خطیب تھے۔ نصوتوں کے اسرار و خواص کو فاش کیا ہے۔ شریعت و طریقت کی ایک مدت ایک کا فائدہ کر کے دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے۔ ان کی مجلسوں میں علم و معرفت اور دین و حکمت کے موتی بکھرے جاتے تھے۔ یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں وہ محفوظات ہیں جن کی تعداد بیسیوں تک پہنچتی ہے۔ وہ ایک مرشد کامل تھے۔ ہزاروں مستزید و مستفیدین کے سامنے اپنے احوال و واردات پیش کرتے تھے۔ اور وہ ان کے تسکین بخش جوابات دیتے تھے۔ اور ہدایات بتاتے تھے جن کا مجرب و تربیۃ السالک ہے۔ انہوں نے بزرگوں کے احوال و کمالات کو یک جا کیا اور اس ذخیرہ سے سب کو آشنا کیا۔ ان کی متعدد کتب ہیں اس مضمون پر ہیں۔ انہوں نے نزات و حشمت کے احوال و اقوال میں سے بظاہر اعتراف کے قابل باتوں کی حقیقت ظاہر کی اور اس کی تاویلات کیں۔ ان کی کتابوں کے خلاصے،

علیہ میں لوگوں کی رسمی نظریں جو حینک تھی۔ ورد شریعت حضور علی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے اور طریقت پورے دین پر آسانی سے عمل کر کے کا طریقہ ہے۔

اب ہر نے یا اختلاف اور جنگ کا تو احتمال بھی نہیں ۱۲ ج

۲۰۰ بین بیسیر جلد ۱۲

۲۰۰ بین واقعی حقیقت کا بے غبار ہر ثابت کیا۔ ۱۲

اقتباسات اور تہہ بہ تہہ ان سے الگ ہیں، جن کی ترتیب ان کے مسترشدین نے کی ہے۔ وہ مصلحت انت تھے۔ امت کے سیکڑوں محدثین کی، رسوم و بدعات کی تردید، اصلاح رسوم اور انقلاب حال شد و کما ہیں تصانیف کی تھیں۔ وہ حکیم الامت تھے مسلمانوں کے علاج اور نشاۃ احیاء پر اور مباحثات السلیق وغیرہ رسائل تالیف فرمائے۔ عرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم ہی کوئی مذہبی ضرورت ہوگی جس کی مدد اس حکیم الامت زبان اور قلم سے نہیں فرمائی۔ اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعہ کے بعد ہی نظر میں آ سکتا ہے۔

ان کی تصنیفات ہندوستان کے پورے طول و عرض میں پھیلیں اور ہزاروں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کا باعث ہوئیں۔ اردو اور عربی مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ غیر زبانوں میں بھی کیا ہے۔ چنانچہ انہی کتابوں کے ترجمے انگریزی و بنگالی، گجراتی، سندھی اور پشتو میں شائع ہوئے۔

ان کی تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہے۔ ۱۲۵۵ھ میں خادم مولوی عبدالغنی صاحب نصح پوری نے ان کی تصانیف کی ایک فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے ۸۶۱ مضموں کو محیط ہے۔ بعد کے نو برسوں میں جو رسائل یا تصانیف ترتیب پائیں وہ ان کے علاوہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہر صدی کا مجدد ایسی صدی کے کمالات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو جو صدی مطبوعات و منشورات کے کمالات سے ملو ہے اور جس کا اہم کارنامہ خواہ حق کے اثبات و ظہار میں ہو یا باطل کی نشر و اشاعت میں۔ پریس اور مطبع ہی کے برکات ہیں۔ زبان قلم اس صدی کے مبلغ ہیں اور رسائل و منشورات دعوت کے پیغمبر ہیں، اس بنا پر مناسب صدی کے مجاہد کی کرامت بھی ان ہی کمالات میں جلوہ گر ہو۔

علائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جس کی تصانیف کے اور ان اگر ان کی زندگی کے ایام پر باث و دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد کے ایام پر فوقیت ملے جائے۔ امام ابن جریر طبری، حافظ خطیب بغدادی، امام فخر الدین رازی، حافظ ابن جوزی، حافظ جلال الدین سیوطی، نام اس سلسلے میں لیے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں اس سلسلہ کا اخیر نام حضرت مولانا فقہانوی علیہ الرحمۃ کا ہے۔

مولانا کے رسائل اور تصانیف کی تعداد تو آٹھ سو کے قریب ہے مگر ان میں چھوٹے و بڑے رسالے بھی جن کو نئی اصطلاح میں مضامین و مقالات کہتے ہیں داخل ہیں۔ ان میں سے

مولانا کی تصانیف کے انواع

مختصر ہیں کہ صرف تھے دو صفحے ہیں۔ یعنی ایسے ضخیم ہیں کہ کئی کئی جلدوں میں ہیں۔

بیشتر تصانیف نشر اور دو زبان میں ہیں۔ البتہ تیرہ چودہ رسائل و کتب عربی زبان میں ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں سبکی الثانیات، الزار الوجوہ، التبیان العظیم، حاشی تفسیر بیان القرآن، نقد المقطعات العشر، مائتہ، المنقب الماوردہ، وجوہ المثانی، بلع ثیابہ، زیادات، جامع الآثار، تائید الحق، خطبات الاحکام اور نین فارسی میں ہیں۔ مشنچی دیروم، تعلقات فارسی، عقائد بانی کمال۔

زبان

نظم میں مولانا کی تصنیف صرف یہی ایک شاعری زیر و بم ہے۔ اور یہ طالب علمی کے بعد ہی لکھی ہے۔ بظاہر اس میں ایک خوش عاشق اور چالاک معشوق کا نقشہ ہے۔ مگر درحقیقت یہ نفس انسانی کی بصیرت افروز کہانی ہے۔ ایک اور نظم دو اور اشعار کے آخر میں ہے۔ ایک تجوید کا منظوم رسالہ ہے۔

نظم و شعر

مولانا کو فارسی کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ حافظ اور مولانا رومی کے اشعار بیشتر نوک زبان تھے اور نظم کا ملکہ اور سلیقہ بھی تھا۔

کام نہیں کیا۔

تفصیلت کا بیشتر حصہ اصلاحی اور فنی ہے۔ اور کم تر کتب درس کے متعلق تاہم دو چار دوسری کتابوں پر بھی رسائل میں مذہبی تفانیات میں علوم القرآن اور الحدیث — کلام و کھاندہ — فقہ و فتاویٰ اور سلوک و تقویٰ اور وعظ و کثرت ہیں۔

قرآن پاک کی خدمت

اسلام میں علم کا سب سے پہلا سفید بنو خدا اسلام کا مجسم ہے یعنی قرآن پاک، مولانا نے اس کی خدمت کی سعادت جس جس نوع سے حاصل فرمائی۔ وہ جس نے خود ان کی ایک علمی کرامت ہے۔ کانپور کے زمانہ قیام میں اعلیٰ اسلامی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہاں سب سے پہلے مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ علیہم وسلمہ الکتاب کی دعا دی تھی۔ اور اشاعت سنائی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اس روایہ کے بعد سے میری مناسبت قرآنی بہت بڑھ گئی تھی اور دوا کی طرف اشارہ تھا۔ قرآن پاک کی یہ سعادت نہ صرف معنوی حیثیت سے حاصل فرمائی بلکہ لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے۔ وہ حافظ تھے اور پڑھے جدید نظر و وقار تھے اور فنون تجوید و قرات کے بڑے ماہر، اخیر زمانہ میں پانی پت کو قادی عبدالرحمن صاحب پانی پتی کی برکت سے قرات سے ایک خاص مناسبت مل رہی تھی۔ مولانا ایک دفعہ جب پانی پت گئے تو لوگوں نے ان کو بالخصوص جہری نمازیں امام بنادیا۔ مولانا نے بے تکلف کسی تصنع کے بغیر قرات فرمائی مگر یوں نے تفریق کی کہ صحت بخارج کے ساتھ تکلف کے بغیر اس قدر موثر قرات نہیں سنی۔ ایک اور مقام پر صبح کی نماز پڑھائی تو ایک صاحب نے کہا یہ سنی کی قاعدہ سے آپ کی قرات میں بھروسہ کی کیفیت تھی جو صبح کی ایک سہانی راگنی کا نام ہے۔

مولانا کی قرات کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں بخارج کی پوری صحت ہوتی تھی لیکن لہجہ میں عام قاریوں کی طرح بناوٹ نہ تھی اور نہ عجیب آواز کے تکلف، آواز چڑھاؤ نہ تھا، بلکہ فطری آواز بلا تکلف حسب موقع مختلف تھی۔ یعنی رستی رستی تھی اور تاشیر میں ڈوب کر نکلتی تھی۔ کہ ہر چہ آواز دل خیز و بدل دینے۔

علوم القرآن میں یہ پہلا فن ہے۔ مولانا نے اس پر حسب ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

تجوید و قرات و تعلقات قرآنی

۱۔ جمال القرآن :- یہ فن تجوید کا رسالہ ہے جس میں قرآن مجید کو ترتیل اور تجوید سے پڑھنے کے مسائل، قواعد اور صفات حروف، اظہار و اخفاء، ابدال و ادغام، تنجیم و ترتیب، وقف و وصل کے مسائل درج فرمائے ہیں۔

۲۔ تجوید القرآن :- اس مختصر مضمون رسالہ میں بچوں کی یاد کے لیے تجوید کے عام مسائل کیسے ہیں۔

۳۔ اختلاف فی حکم الاوقاف :- اوقات قرآنی کے بارے میں قادیوں میں جو اختلاف ہے اس رسالہ میں اس کی توجیہ و تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے۔

۴۔ وجہ المثالی :- اس میں قرآن شریف کی مشہور قراتوں کے اختلاف کو قرآن پاک کی سورتوں کی ترتیب سے سلیس عربی میں جمع فرمایا ہے۔ اور ان میں تجوید و قرات کے کچھ قواعد تحریر فرمائے ہیں۔

۵۔ تنبیض الطبع فی اجراء السبع :- قرات میں اور اس میں سے رۃ کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

۶۔ زیادات علی کتب الروایات :- اس میں قرات کی غیر مشہور روایتوں کی سندیں ہیں۔ یہ ”وجہ المثالی“ کے اخیر میں بطور نمبر ہے۔

۷۔ زیادات لمائی الروایات :- یہ اگے رسالہ کا نمبر ہے۔

۸۔ یادگار حق القرآن :- اس میں قرآن مجید کے آداب اور تجوید کے مسائل کا مختصر بیان ہے۔ یہ تجوید القرآن کا اختصار اور منہج ہے۔

۹۔ تشابہات القرآن لتاریخ و مضامین :- قرآن پاک کے حفاظ کو نزاد میں قرآن سنانے میں بعض مشہور مقامات پر جو تشابہات لکھے ہیں

ان سے بچنے کے لیے اس میں چند قواعد کلیہ لکھی گئی ہیں۔

۱۰۔ آداب القرآن، سنن ان پک کی تلاوت کے آداب اور تلاوت کرنے والوں کی کوتاہیوں کی اصلاح کے لیے ہدایات و تہنیتات ہیں۔

ترجمہ و تفسیر دیگر علوم قرآن

۱۱۔ ترجمہ قرآن پاک کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ جس میں زبان کی سلاست کے ساتھ بیان کی صحت کی احتیاط الیسی کی گئی ہے جس سے بڑے بڑے تراجم خالی ہیں۔ قرآن پاک کا سب سے صحیح اردو ترجمہ

حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ ہے۔ لیکن وہ بہت ہی لفظی ہے۔ اس لیے عام اردو خوانوں کے فہم سے باہر ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ترجمہ میں دونوں خوبیاں یک جا ہیں۔ یعنی ترجمہ صحیح اور زبان فصیح ہے۔ اس ترجمہ میں ایک خاص بات اور ملحوظ رکھی گئی ہے کہ اس میں کم فہمی یا ترجموں کی عدم احتیاط کی وجہ سے جو شکوک قرآن پاک کے لفظوں سے عدول نہ ہونے پائے۔ اسی لیے کہیں کہیں مزید تفسیر کی ضرورت ہے۔ قرآن میں ضروری تفسیری الفاظ بھی بڑھائے گئے ہیں۔ یہ مولانا کی عظیم الشان خدمت ہے (۲) تفسیر بیان القرآن۔ یہ بارہ جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر ہے۔ جس کو ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا ہے۔ اس تفسیر کی حسب ذیل خصوصیتیں ہیں۔ سلیس و بامحاورہ حتی الوسع صحت ترجمہ نیچے ”ف“ کے اشارہ فائدہ سے آیت کی تفسیر تفسیر میں روایات صحیحہ اور اقوال سلف صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحو کی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے۔ صوفیانہ اور ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں۔ کتب تفسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہل علم کے لیے عربی لغات اور نحو کی ترکیب کے شکوک اٹھائے گئے ہیں۔ مآخذوں میں غالباً سب سے زیادہ اگوستی بغدادیؒ کی تفسیر روح المعانی پر اعتماد فرمایا گیا ہے۔ یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتہً منفرد و تیرہویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے تمام قدما کی تصانیف کا خلاصہ ہے۔ اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا کی گئی ہیں۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اردو تفسیر صرف اردو خوانوں کے لیے علماء کہتے ہیں۔ یہی خیال مولانا کی تفسیر کے متعلق بھی علماء کو رہا۔ لیکن ایک دفعہ اتفاق سے مولانا کی یہ تفسیر مولانا انور شاہ صاحب نے اٹھا کر دیکھی تو فرمایا کہ ”میں سمجھتا تھا کہ یہ تفسیر عوام کے لیے ہوگی مگر یہ تو علماء کے دیکھنے کے قابل ہے“ قدیم کتب تفسیری میں راجح ترین قول مولانا کے پیش نظر رہا ہے۔ ساتھ ہی ربط آیات و سورت کا ذوق مولانا کو ہمیشہ رہا ہے اور اس کا لہجہ تفسیر میں بھی کیا گیا ہے۔ مگر چونکہ ربط آیات کے اصول سب کے سامنے یکساں نہیں اس لیے وجہ ربط میں تیاس اور ذوق سے چارہ نہیں۔ اس لیے ہر مسئلہ ذوق والے کے لیے اس میں اختلاف کی گنجائش ملے گی۔ اسی طرح مفسرین کے مختلف اقوال میں سے کسی قول کی ترجیح میں زمانہ کی خصوصیات اور ذوق و وجدان کا اختلاف بھی اثر طبعی ہے۔ اس لیے اگر کلام سلف کے اصول متفقہ سے دور نہ ہوتو تنگی نہ کی جائے۔

چونکہ مسلمانوں پر شفقت اور ان کی اصلاح کی فکر مولانا پر بہت غالب تھی اس لیے وہ ہمیشہ ان کو گمراہی سے بچانے میں بجاں و دل ساعی رہتے تھے۔ اردو میں حضرت شاہ عبدالقادر صاحب اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمے شائع ہوئے تھے وہ بالکل کافی تھے۔ مگر نئے زمانہ میں پہلے سرسیدؒ نے بعض تفسیر اور پھر شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے اپنے نئے اردو ترجمے شائع کئے۔ تو انہوں نے پہلی دفعہ یہ کوشش کی کہ اپنے جدید عقائد کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کریں۔ اذیل تو حسب زمانہ

علیہ ذکر انکار کی اور اختلاف بھی محنت اصول و اتباع اسلاف متبرک ہوگا دفعہ قرآن پاک کو کھیل بنانا ہوگا۔ ۱۲ ج۔

علیہ زمانہ اردو ذوق و وجدان سے تعلق نہیں روایات و اصول کی قوت و منفعت سے فرق ہوتا ہے۔ ورنہ ذوق کا اتباع و اتباع ہوا ہو سکتا ہے۔ ۱۲ ج۔

دلت رکھیں اور افضالِ سلطنت کی پرواہ نہ کریں۔ اس طرزِ عمل نے علماء کو مضطرب کر دیا اور ان کو مزدورت محسوس ہوئی کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ مولانا نے اپنا ترجمہ اسی مزدورت سے مجبور ہو کر کیا۔ مگر اسی پر کفایت نہیں کی بلکہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کے ترجمہ کو لغو پڑھا۔ اور اس کے اغلاط پر نشان دے کر یہ رسالہ اس ترجمہ کی اصلاح پر لکھا۔

مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت نے دہلی کے ایک ملنڈا باگٹ اخبار نویس مرزا حیرت کو حیرت میں ڈال دیا اور انہوں نے پہلے تو ڈپٹی نذیر احمد کے ترجمے پر اعتراضات شروع کئے اور پھر اپنا ترجمہ چھپا دیا۔ جس کی

اصلاح ترجمہ حیرت

سبب خام طور پر مشہور ہے کہ وہ کچھنوکے ایک عالم کا کیا سوا ہے لیکن نام سے وہ مرزا صاحب کے چچا ہے کیونکہ مرزا صاحب خود غریب سے ابلد تھے۔ اور حال مولانا نے اس ترجمہ کے اغلاط پر یہ رسالتا لایف فرمایا۔

بعض صاحبِ علم نے اردو میں قرآن شریف پر حواشی لکھے ہیں جن میں ربط آیات کا خاص طور سے اظہار کیا گیا ہے۔

التفسير في التفسير

اور آیات کو بتاویل و اعتبار سیاسی مسائل پر منطبق کیا ہے۔ اور اس ناول و اعتبار میں کہیں کہیں حد اعتدال سے قلم ابرسٹل کیا ہے۔ مولانا نے ان تاویلات بعدہ پر تنبیہات لکھیں جن کا نام "التفسير في التفسير" ہے۔

لاہور کے ایک بزرگ نے قرآنی مطالب کو کئی جلدوں میں تفصیل البیان فی منہد القرآن کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کے مولف کی درخواست پر اس میں جو ترمیمی

المادی للبحران فی وادی تفصیل البیان

نقص نظر آئے وہ مولانا نے اس رسالہ میں ظاہر فرمائے۔

مولانا کے خاندان کی بعض شکایوں نے مولانا سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا مٹھا اور اکثر آیات کی تفسیر و تقریر کو ضبطِ تحریر میں کر لیا تھا وہ ایک

تقریر بعض البیات فی تفسیر بعض الآیات

جو خود ہو گیا۔ مگر چھپا نہیں۔

اللّٰهُمَّ جَعَلْ لَكَ لَكَمُ الْأَوْحَافِ وَالْأَشْأَافِ وَالسَّامِعِ بِنَاغِ التَّسْمِیْرِ
جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان سے کیا کیا نازلے ہیں۔ یہ درحقیقت ایک سوال

رفع البنا فی نفع السامع

کے جواب میں ہے۔

اس میں سورہ بقرہ کی تین آیتوں پر نظر ثانی فرمائی ہے۔

أسس الآثاف فی النظر الثانی فی التفسیر المقامات الثلاث

قرآن مجید کی بعض آیات کے خواص جو بزرگوں کے تجربہ میں آئے، ان کو بیان کیا گیا ہے۔

أعمال مترانی

اس کا موضوع بھی یہی ہے۔ اس کا ایک حصہ ہے جس کا نام "آثار تبلیغیہ" ہے۔ ان رسائل سے مقصود عوام کو ناجائز، غیر شرعی، توہید، گنہگاروں اور عملیاتِ مغلی سے بچا کر قرآنی آیات کے خواص کی طرف

خواص مترانی

مفقت کرنا ہے اور اس قسم کے بعض خواص احادیث میں بھی مروی ہیں۔

یہ قرآن پاک کی آیات و سورتوں کے ربط و نظم پر عربی میں ۱۵۶ اصغیوں کی کتاب ہے۔ ۱۳۶۷ھ میں ڈھائی ہجینوں میں تصنیف فرمایا۔ اس میں مولانا نے سورۃ فاتحہ سے

سبق الغایات فی فسق الآیات

تائس تک تمام سورتوں اور ان کی آیات کے ربط پر کلام فرمایا ہے۔

مولانا کے چند مواضع سے ان کے ایک مستفاد و خادم نے ان افکار کو یک جا کر دیا ہے جن میں آیات قرآنی اور احادیث کے متبادلات

اشرف البیان لما فی علوم الحدیث والقرآن

کلمات و تحقیقات ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کام کو اگر زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ کیا جاتا تو کئی حصے اس کے مرتب ہو سکتے تھے۔

احکام القرآن

اور اسی بنا کے اعتبار سے اس کا نام "دلائل القرآن علی مسائل النعمان" تجویز فرما کر یہ خدمت حضرت نے اپنے مسترشد خاص سیدی وسندی مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی و امت فزیوہم کے سپرد فرمائی۔ یہ کام آسان نہ تھا۔ نہ مختصر حضرت مفتی صاحب نے اپنی خدمت کے شروع کر دیا۔ اسی عرصہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ اعلیٰ دارالسنن کی تصنیف کو مکمل کر کے فارغ ہو گئے تو حضرت دلائل نے یہ کام ادا فرمادیا۔ لیکن اتفاقاً حضور نے ہی عرصہ کے بعد مولانا موصوف بھی دھاک میں ملازم ہو کر تشریف لے گئے اور یہ کام تعین میں پڑ گیا۔ ۱۳۸۱ھ کو اس کام کی طرف زیادہ توجہ ہوئی۔ اور چاہا کہ کوئی عالم فارغ ہو کر اسی کام میں لگ جائے تاکہ جلد مکمل ہو سکے۔ مگر اس کی صورت نہ ہوئی، تو چونکہ پر تفسیر کر دینے کا فیصلہ فرمایا۔ اور دو منزلہ قرآن کریم کی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ کے اور دو منزلہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ کے اور ایک منزل استاذ ذی شیعہ التفسیر حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کا مدخلی کے حصے میں دے دی۔ چنانچہ حضرت کے ایمام کے سیدی وسندی حضرت مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ متحانہ بحیون میں ہی قیام کر کے اس کام میں معروف ہو گئے۔ مولانا دوزانہ کی مجلس میں اس کے متعلق جو جو نکات ان کو یاد آجاتے تھے بیان فرماتے۔ اور حضرت مولانا مفتی صاحب مدظلہ اس کو اپنے مقام پر آ کر قلم بند فرماتے۔ یہ گفت و شنود جاری تھی کہ مولانا کا مرض الموت شروع ہوا۔ اب بفضلہ تعالیٰ حضرت مولانا مفتی صاحب مدظلہ نے اپنے حصہ کے مسودہ کو مکمل فرمایا۔ معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا جلیل احمد صاحب مدظلہ کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اپنے حصے تقریباً مکمل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی لیے توفیق و تدوین اور اشاعت کا جلد کوئی انتظام فرمادیں۔ موجودہ وقت کے لیے نہایت اہم چیز ہوگی۔

تفسیر بیضاوی میں حروف مقطعات کا جو محل و خلق بیان ہے، اس رسالہ میں بزبان عربی اس کا بیان کر کے بیان کیا گیا ہے جس میں حروف مقطعات کی تاویل کا ایک طریق معلوم ہوتا ہے۔

التصویر المقطعات

لتبیین بعض العبارات

(۱۶، ۱۷) مولانا کے دور رسالے علم القرآن سے متعلق الوری ہیں۔ اور ان دونوں

کتاب کا کافی ذخیرہ ہے۔ خدمت ہے کہ اصحاب غیر حضرات اس کی طباعت کے لیے طرحت فرمادیں تو اسلام کی اہم خدمت اور حضرت مہر علی قاسم کی پروری کرنے کا اجر عظیم حاصل ہوگا۔

سے ہے جب کہ نام "مسائل السلوک من کلام ملک الملوک" اور دوسرے کا نام "تائید الحقیقۃ بالآیات العتیقۃ" ہے ان دونوں رسائل میں منوع قرآن پاک کی ان آیتوں کی تفسیر سے ہے جن سے سلوک کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ اس دوسرے رسالہ کی بنیاد ایک سابقہ مکتبہ کی ہے جس کا تعلق رسالہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ۱۲۶۷ھ میں مبارکپوری میں ملا تھا۔ اس پر مزید اضافہ کر کے یہ رسالہ مرتب ہوا ہے۔

وم الحدیث

مجتہد الملک نے علوم حدیث میں جو بہادت حاصل تھی اس کی شہادت ان کے مواعظ و رسائل و تالیفات کے ہزاروں صفحات سے رہے ہیں جن میں بے شمار احادیث کے حوالے، اشارے اور تعلیقات، ان کے مشکلات کی تشریح، ان کے معانی کے مطالب کے حل اور ان کے نکات و لطائف کا بیان ہے۔ خصوصیت کے ساتھ شیخ کے مواعظ میں جو زبانی تقریریں ہیں، بر محل حدیثوں کے اور اکثر احادیث کے بعد الفلاح ان کی تخریجات اور کتابوں کے حوالے کے اس کثرت سے ان میں ہیں کہ ان کو دیکھ کر کسی انصاف پرانے کے حافظ الحدیث ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد ان کی انی تصانیف کو لے کر جو کوفہ و قناوی اور احکام و مسائل یا اصلاح و رسوم اور سلوک میں ہیں، لیکن ان کی بنیاد احادیث پر ہے۔ احادیث کے حوالے، دلائل کے مضبوطی اور صحت بیان کی تائید و شہادت کے لیے آئے ہیں، جو مکتب کے علم و معرفت پر دلیل قاطع ہیں جس حدیث "ت" کو فن سلوک کی جو توفیق عنایت ہوئی تھی اس کا ایک مبارک اثر یہ ہے کہ حضرت نے احادیث کی کتابوں سے ان تمام حدیثوں کو یکجا فرمایا۔ اس فن مغرب کے مسائل متفرق تھے۔ اگرچہ بعض حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں بعض ابواب ذہد و رقائق کا تذکرہ کیا ہے۔ تاہم ان کی باتوں کی نہیں۔ قدامتیں سے صرف ایک بزرگ امام عبداللہ ابن مبارک المتوفی ۱۸۷ھ کا نام ہم کو معلوم ہے جنہوں نے "کتاب الذہد والرقائق" سے مستقل تصنیف فرمائی ہے۔

اہل سلوک نے جن روایات و احادیث سے کام لیا ہے۔ وہ عموماً ضعیف بلکہ موضوع نمک ہیں۔ اسی لیے علما کے سلوک کو اس فن میں کمزور ہے اور اسی بنیاد پر بعض اہل حدیث و روایت نے یہ جو غلط خیال قائم کر لیا ہے کہ فن سلوک اور اس کے مسائل احادیث نبوی سے ثابت نہیں ہیں سے ان کا یہ اعتراض قائم تھا۔ گو بعض محدثین نے ادھر تو جو فرمائی اور اس سلسلہ میں کچھ کام انجام دیا مثلاً امام ابن ابی جریر اندلسی المتوفی ۳۷۰ھ نے صحیح بخاری کی شرح ہجرت النفوس کے نام سے کبھی جس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہو چکی ہے اس میں اس کا التزام کیا ہے کہ احادیث کی اہل سلوک کے مسائل و نکات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔

حضرت مجتہد الملک نے اس کام کو مستقل طور سے انجام دیا اور "حقیقۃ الطریقۃ من السنۃ الامتیۃ" "التشریف بمعرفۃ احادیث التصوف" سے دو کتابیں تالیف فرمائیں۔

حقیقۃ الطریقۃ

۱۲۶۷ھ میں تالیف پائی ہے اور یہ حقیقت حضرت کی کتاب التکشف بمہمات التصوف کا آخری جزو ہے اور ساتھ ہی مستقل تصنیف بھی ہے۔ اس میں تین سو تیس احادیث سے جو عموماً مصاحح میں مذکور ایک و تصوف کے مسائل کو مستنبط کیا گیا ہے۔ اور ان کو اخلاق، احوال، اشغال، تعلیمات، علامات، فضائل، عبادات، رسوم، مسائل، اور بہات، اصلاح اور متفرقات کے دس ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اہل علم کے مطالعہ کی خاص چیز ہے۔

یہ کتاب چار حصوں میں ہے۔ ان میں ان احادیث کی تحقیق ہے جو تصوف کی کتابوں میں یا صوفیہ کے کلام میں آئی ہیں۔ اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اصول و فن حدیث کی دوسرے یہ حدیث کس درجہ کی ہے اور حدیث کی کس کتاب میں ہے۔ اور جو روایات

مرفوع

انہیں دراصل حدیث نہ نہیں بلکہ عوام نے غلط فہمی سے ان کو حدیث سمجھ رکھا ہے اگر وہ اقوال فقیر کے طور پر کسی دوسری حدیث یا آیت پاک سے ہیں تو ان احادیث و آیات اور ان سے ان اقوال کی صحت کے طریق و استنباط پر گفتگو فرمائی۔

حصہ اول النشوت میں امام عسکری کی احیاء علوم الدین کی احادیث کی تخریج ہے۔ اس حصہ کا ماخذ زیادہ تر امام غزالی کی تخریج احیاء علوم الدین ہے جس کا سہارا دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ احادیث کی دوسری کتابیں ہیں جن کا ماخذ ہر روایت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ ۱۳۲ حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ دوم میں دفتر اولیٰ ثنوی مولانا دوم اور اس کی شرح کلید ثنوی میں آئی ہوئی حدیث و روایات کی تخریج کی گئی ہے۔ ان احادیث کی تحقیقات زیادہ تر امام سخاوی کی المقاصد الحسنہ سے التفات کی گئی ہے۔

حصہ سلام چہارم ان دونوں حصوں میں حافظ سیوطی کی جامع صغیر سے جو احادیث کی ساری کتابوں کا یہ ترتیب حروف تہجی مجموعہ ہے۔ کہیں جاکر لیا گیا ہے جس سے مسائل سلوک مستنبط ہیں اور ان کو یہ ترتیب حروف تہجی ترتیب دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تحقیقات خاصہ کا جوابجا اضافہ کیا گیا ہے۔ مطالب کی تشریح و تطبیق اور بعض شکلات کا حل کیا گیا ہے۔ حصہ سوم صرف الف کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ۱۳۳ حصوں میں ترتیب پایا ہے۔ حصہ چہارم میں بقیہ حروف کی روایتیں ہیں اور وہ محرم ۱۳۵۴ھ میں تکمیل کو پہنچا ہے۔

حضرات اہل حدیث کے اس فرقہ کی طرف سے جو غالی ہے اکثر حضرات غلیظہ پر طعن کیا گیا ہے کہ خفی مسائل کی تائید میں احادیث میں ہیں اور چونکہ کتب حدیث زیادہ تر محدثین اور حضرات شوافع کی تالیفات ہیں اس لیے ان میں غلیظہ کی موید حدیثیں یک جا نہیں ہیں۔ گو امام محمد موطا اور ابن ماجہ ابویوسف کی کتب الآثار اور مسندی حلیہ مرتبہ بخاری اور امام طحاوی کی تفسیر حلیہ سے ان کا جواب دیا جاتا رہا ہے۔ مگر کتب حدیث و مصنفات سے جو راجع اور محدثین میں مقبول ہیں جن کو ان احادیث و روایات کو یکساں نہیں کیا گیا تھا جن سے مسائل غلیظہ کی تائید ہوتی ہے ضرورت تو ہمیشہ سے تھی مگر اس زمانہ میں اہل حدیث کے ظہور و شیوع سے اس ضرورت کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ چونکہ اس زمانہ

کا آغاز پورب (عظیم آباد) سے ہوا، اس لیے اس ضرورت کا احساس بھی پہلے یہیں کیا گیا۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل کے شاگرد رشید مولانا محمد علی ظہیر احسن شوق نبوی عظیم آبادی نے ”آثار السنن“ کے نام سے کتب حدیث سے التفات کر کے اس قسم کی حدیثیں جمع کیا۔ اس کے دو ہی حصے شائع ہوئے۔ اس کا دوسرا حصہ ۱۲۱ھ میں شائع ہوا۔ علماء احناف نے اس کتاب کا بڑی گرجوشتی سے استقبال کیا۔ لیکن مولانا انور شاہ کشمیری نے جو اس زمانہ میں مدرسہ آصفیہ دہلی میں مدرس تھے اس کی مدح میں عربی فقید کے لکھے۔ انصوں سے کہ مولانا کی وفات سے ان کا یہ کام ناتمام رہا۔

احیاء السنن

مجدد الملت نے بھی اس ضرورت کو محسوس فرمایا۔ اور احیاء السنن کے نام سے اس قسم کی احادیث کا مجموعہ مرتب فرمایا۔ اس کی ترتیب ابواب فقہیہ پر رکھی۔ لیکن انصوں کہ اس کا سودہ خالص ہو گیا۔

جامع الآثار

کچھ دلوں کے لیدر پھر اس موضوع کا خیال آیا اور دوبارہ ایک جدید اسلوب پر اس قسم کی حدیثوں کا مجموعہ ”جامع الآثار“ کے نام سے مرتب فرمایا۔ لیکن یہ سلسلہ دو ابواب الصلوٰۃ سے آگے نہیں بڑھا۔ تاہم جتنا مرتب کیا گیا

وہ چھپ کر شائع ہو گیا۔

یہ بھی اسی موضوع پر ہے اور اس کو ”جامع الآثار“ کا ضمیر بنا دیا گیا ہے۔

تالیفات

احیاء السنن کا احیاء

۱۳۲۱ء میں یہ خیال ہوا کہ یہ کام اتنا بڑا ہے کہ حضرت والا خود اس کام کو نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے یہ قرار پایا کہ اس کے لیے بعض مستند علماء کو رکھ کر کام لیا جائے۔ چنانچہ مولانا احمد حسن صاحب نے بھی اس کام کے لیے مقرر کیا گیا۔ انہوں نے کام شروع کیا۔ جو کام کرتے جاتے۔ مولانا کی نگاہ سے گزارتے جاتے تھے۔ اس طور کتاب الحج تک کام ہوا۔ اور اس کا نام دوبارہ "احیاء السنن" رکھا گیا تاکہ مروجہ احیاء السنن کی یادگار ہو۔ اس کے دو حصے شائع ہوئے تھے کہ بعض اسباب سے اس کتاب کے بعض مضامین سے مولانا کی تشفی نہیں ہوتی اور اس پر استدراک لکھوانے کا خیال ہوا اور آئندہ کام کے لیے مولانا نظر احمد صاحب، مفتی انوری مدظلہ کا انتخاب ہوا۔

الاستدراک الحسن

مولانا نظر احمد صاحب نے مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے زیر ہدایت اس کام کو بڑی مدیدہ ریزی اور مست نظر اور تحقیق و تنقید کے ساتھ انجام دینا شروع کیا۔ سب سے پہلے احیاء السنن کے شائع شدہ حصہ پر دوبارہ نظر کر کے اس کو "استدراک الحسن" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اعلام السنن

اس کے بعد احیاء السنن کے نام کو بدل کر "اعلام السنن" کے نام سے اس کام کو شروع کیا گیا۔ اور اس وقت تک اس کی بارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں مذہب غنی کی موبیہ معدنیوں کو بڑے استیعاب کے ساتھ جمع کیا گیا اور محدثین اور اہل فن کی تحقیقات کے شروع و حواشی میں یکجا کی گئی ہیں۔

الخطب الماثورہ من الآثار المشورہ

مجموعہ وعیدین کے خطبوں میں اس درجہ تکلف و تفتیح اور مضامین کے ابتداء سے کام لیا گیا ہے کہ یہ بازاری خطبہ زبان اور طرزِ اداء اور مضامین و مطالب کے لحاظ سے محدثین اور علما و دانشور کے اسلوب سے ہٹ کر بغیر اور خطباء کے اظہارِ قابلیت کا دھنگ بن کر رہ گئے ہیں۔ مجدد الملت کی اصلاحی نظر سے محراب و منبر کا گوشہ بھی مخفی نہیں رہا۔ چنانچہ "الخطب الماثورہ من الآثار المشورہ" کے نام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے خطبات کو احادیث صحیحہ سے انتخاب فرما کر ایک جگہ جمع کر دیا تاکہ خطبائے مساجد ان مسنون خطبوں کو پڑھ کر ان خطباتِ بارہ کے گناہ سے محفوظ رہیں۔

خطبات الاحکام

جمہور وعیدین کے پچاس خطبوں کا یہ مجموعہ تالیف فرمایا جس میں احادیث و آیات سے تزیین و ترمیم کے مضامین کے علاوہ عقائد و اعمال و اخلاق کے مضامین درج فرمائے۔

مناجات مقبول

احادیث میں وارد و آزاد و آزاد کا دستور کے لیے بعض حصین، و حزب اعظم لاء علی تارمی وغیرہ کتابیں، وراج پزیر ہیں۔ مگر وہ طویل ہونے کی وجہ سے سب کے کام کی نہیں۔ حضرت مجدد الملت نے عام مسلمانوں کے فائدہ کے لیے ان سب سے منتخب کر کے "مناجات مقبول" قریب ۱۰۰ حدیث و صلوات الرسول کے نام سے ایک مختصر مجموعہ تالیف فرمایا ہے جو اپنے اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے بے حد مقبول ہے۔

علوم الفقہ

مجدد الملت کو مسائل فقہیہ کی تلاش و تحقیق کا خاص ذوق تھا اور یہ ذوق ان کو اپنے شیوخ و اساتذہ کرام سے درشمن سلاحتاً چنانچہ اسی ذہ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ حضرت مولانا محمد رفیع صاحب نے ان سے فتویٰ لایس کی خدمت لینا شروع کر دی تھی۔ اگر حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ کی فقہی خدمات کا آغاز ۱۳۱۷ھ سے بھی لیا جائے تو ۱۳۷۷ھ تک بلا بائو کا جائز ہے پورے ساٹھ سال اس فنِ شریف کی خدمت میں بسر کیے۔ اس طویل عرصہ میں ہزاروں مشنوں کے جواب دیے۔ ہزاروں فتوے اور سیکڑوں

چھوٹے بڑے فقہی رسالے کے متعدد ضخیم جلدوں میں اہل الفقاویٰ اور ائمہ اہل الفقاویٰ کے نام سے حضرت محمد اللہ تعالیٰ کے فتاویٰ کے مجموعہ جمع کئے گئے ہیں جس کی نظیر ہندوستان میں کم از کم نہیں ملتی۔ ذیل فقہی اللہ تعالیٰ سے کثرت اور

کے نام سے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو اس زمانے کے نئے مسائل اور نئے مضامین سے متعلق ہیں جو اب تک کے جرائد و کتب فقہیہ سے باسانی حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ترجیح الراجح

یہ وہ مجموعہ ہے جس کی مثال سلف صالحین میں تو ملے گی، مگر متاخرین کے یہاں یہ سلسلہ بالکل مسدود ہے۔ اس مجموعہ حضرت مجدد الملت نے اپنے ان مسائل کو جمع فرمایا ہے جن میں از خود یا کسی دوسرے کے توجہ دہانے سے کوئی تسلسلہ آیا تو اس سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ یہ سلسلہ حضرت کی انصاف پسندی، تواضع اور عدم نفسانیت کا بہین ثبوت ہے۔ یہی حضرات مسما بہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرات تابعین و تبع تابعین عظام کا طریقہ تھا جس کو اس زمانہ میں حضرت مجدد الملت نے زندہ کیا اور اپنے کربا آخرت سے بچایا۔

حضرت کے فتاویٰ اس زمانہ کے فتاویٰ میں مستند اور علماء ہند کا مستند علیہ الزوریات و زہدین پر گہری نظر

مکمل اہل الفقاویٰ کی از سر نو تجویب ترتیب اجماع خدمت

حوادث، جدید معاملات اور آفت جدیدہ سے متعلقہ مباحث میں بنی نظریہ۔ اس وقت اس کی اشاعت کیا رہ حصول میں اس طرح جو کچھ مستقل جلدوں میں پانچ تھے۔ ایک ترجیح الراجح، ایک حوادث الفقاویٰ، اور آخری زمانہ کے فتاویٰ کچھ ماہوار رسالہ النور میں شائع ہوتے تھے۔ کچھ تلمیذ جس میں محفوظ تھے جو اب حوالہ جمع ہوا۔ سلسلہ فتاویٰ جاری رہنے کے سبب ان تمام حصوں کی تجویب و ترتیب کی گئی کہ جو کسی حق ایک مسئلہ کے متعلقہ مباحث تمام حصوں میں منتشر اور ایک دوسرے پر موقوف تھے جس سے استفادہ آسان نہ تھا اس وقت سیدی رضوی مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبند و دست فیہ منعم علیہ خاص حضرت مجدد نے قلم کتاب کے بار و حصول کو محنت شاقہ برداشت کر کے ابواب فقہیہ پر مرتب کیا جس کی چند خصوصیات یہ ہیں :- ۱) ایک مسئلہ کے متعلق مختلف فتاویٰ مختلف جلدوں میں تھے یا ترجیح الراجح اس کی بحث تھی اس کو یک جا کر دیا۔ ۲) ہر مسئلہ کے ساتھ طبع قدیم کی جلد اور صفحہ کا حوالہ لکھا۔ ۳) جن مسائل میں متعدد فتاویٰ نظر برداشت کر آئے اور ترجیح الراجح میں اس پر کلام نہیں، ان کی تطبیق یا ترجیح کے لیے حاشیہ میں توضیح کی گئی۔ ۴) جن مسائل میں کوئی اہتمام یا اعلانیہ ان پر حواشی لکھ کر جمع کیا گیا۔ ۵) ترتیب میں قدیم طرز کے ابواب فقہیہ کے ساتھ اہم مسائل کے لیے جدید عنوانات و فضول بھی قائم کر دیے۔ ۶) ہر جلد کے فتاویٰ پر ترتیبی نمبر ڈال دیے (۷) فہرست مضامین مناسبت سکھ اور واضح لکھی گئی وغیرہ وغیرہ اس کی دو جلدیں زیر طبع ہیں۔ کل جلدیں چھ ہوں گی۔

فتاویٰ اشرفیہ کے نام سے مسائل دینیہ کے تین حصے الگ شائع ہوئے جو مختصر رسائل ہیں۔

بہشتی زیور کی دس جلدیں جو کہ عورتوں کی مزدوریات کے لئے ہیں مگر ان میں اسلامی معلومات کا مکمل ذخیرہ ہے۔ اور ان میں پیداائش سے لے کر مرنے تک کے تمام حالات اور

مسائل جو ہر مسلمان کو پیش آتے ہیں مکمل طور پر درج ہیں حقیقت میں بہشتی زیور دینی و دنیاوی معلومات کا مکمل کر سہ ہے۔

شقی گوهر

بہشتی نذیر کے سلسلہ کا مردانہ حصہ ہے جس میں خاص طور سے ان مسائل کا بیان ہے جو مردوں سے خاص ہیں جیسے جمہ، جماعت، عیدین وغیرہ۔

بِالنَّاسِ وَالْحَيَاةِ الْعَالِيَةِ

۱۰۰۔ النازحہ للعلیہ العاجزہ | جس میں مظلوم و مصیبت زدہ عورتوں کی مشکلات کا شرعی حل - جن عورتوں کے شوہر مفقود یا مجنون ہو جائیں یا نامزد ہوں یا باوجود قدرت رکھنے کے نان و نفقہ نہ دیں اور طلاق و خلع نہ ہوں، ان کی خلاصی کے لیے شرعی صورتیں، نیز جن عورتوں میں عورتوں کو اپنا نکاح باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ملتا ہے۔ ان کے تفصیلی احکام اے کی صورت میں منبج نکاح ہونے نہ ہونے کی مکمل بحث فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ مسئلہ سچا ب، مسئلہ بربا، مسئلہ رشوت، مسئلہ بیگ، ام اور بیوہ وغیرہ کے مسائل پر فنی تحقیقات ہیں اور بعض موضوعوں پر بار بار کئی رسالے تالیف فرمائے۔

ام

علم کلام و عقائد کو تجدید پر مستعد و مسلح کرنے کے لئے جو شائع و ذائع ہیں، خاص نئے زمانے کے حالات کا خیال کر کے خود چند کتابیں تالیف فرمائیں اور دوسروں سے ترجمہ کرائیں۔ مثلاً "اسلام اور سائنس" کے نام سے "المصنوعون الحمد للہ" کا ترجمہ کر لیا۔ یہ عربی کی ایک جدید کلامی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف علامہ جبرئیل بن جحفل نے سلطان عبدالحمید خان کے حکم پر شام میں تصنیف فرمایا تھا اور جو نئے حلقوں میں بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس کی خاص صفت یہ ہے کہ اس میں تاویل فاسدہ کا دروازہ نہیں ہے۔

الحج العقلي للاحكام الفقهية

الحق العقليہ الاحکام الفقیہ

میں حصول میں ترتیب پایا ہے۔ جس میں اسلامی احکام و مسائل کے مصالح و مفاسد بیان کئے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں نماز و رکوع، دوسرے حصے میں روزہ، عیدین، عہدہ، غنیمت، قربانی، حج، غلامی وغیرہ کے مسائل کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں تیسرے حصے میں خرید و فروخت و معاملات، حدود و قصاص، فرائض، عذاب قبر، تغلق اسلامی تعلیمات کے مصالح ہیں۔

ابن النفیة عن الشیخات الحدیث

یہ بھی علم کلام کا باب ہے۔ اس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی خدمتوں اور وسوسوں کے تشفی بخش جوابات درج ہیں۔

الجواب

یہ بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو موعظ و مفلوظات سے جمع کیا گیا ہے۔ اس میں بہت سے نیا اور پرانے شبہات و خطرات کے جوابات فراہم کئے گئے ہیں۔

۱۱ و تصوف

۱۔ تصوف علم سلوک و تصوف درج شریعت کا نام ہے جس میں اخلاص دین اور اعمالِ نیک کے احکام اور ذاتِ حق سے بحث کی جاتی ہے۔ قدامتِ مہدی نے اس فن پر جو کتابیں لکھی ہیں مثلاً تفسیرِ امام شیرازی، فہرست القلوب، کتاب اللمع، البدر عبد اللہ بن علی سراج الطوسی، کتاب الصدق، البوسیدہ خزاہ، فتوح النیب، شیخ مسعودی، اور غنیۃ الطالبین، آثار جلیانی، اور متاخرین میں تصانیفِ امام شہرانی، ان کو پڑھنے سے اس فن کی جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو سب کے مصنفین نے اور بہتر سے تبلیس نے اس پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ وہ تو بدعات کا مجموعہ، بلکہ بطلان و ضلالت کا ذخیرہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر ہندوؤں کے جگ اور ویدانت کے اثر سے اس میں سمیت سے ایسے مسائل شامل ہو گئے جو اسلام کی روح کے تمام نرمائی و قدرت و جود و وحدتِ شہود و لطافت و دور اثر کے مباحث و اعمال بھی اصل فن سے قطعاً الگ ہیں۔ جو یا تو علمِ کلام و فلسفہ یا اہام و

خیالات و احوال سے وابستہ ہیں جن کا تعلق نفسیات سے ہے۔

اصل نئے جہد اخلاص فی الدین، طلب رضا، حصولِ قرب اور اعمال و اخلاق قلب و مقامات میں اور جن سے مقصود و داخل سے اور فضائل سے آراستگی ہے تمام متزلزل ہو گیا ہے۔ مدلول کے بعد حضرت مجدد الملت کے تجدیدی مساعی نے اس فن کو ہر سطح صاف و صاف میں پیش کیا اور ہر قسم کے اضافوں اور آمیزشوں سے پاک کر کے کتاب و سنت کے نور میں اس تاریک زمانہ کے اندر پھر ظاہر کیا۔
 قلم سے ان مسائل پر اتنا کچھ لکھا اور بیان فرمایا کہ اب طالب پر اسل طریق کا کوئی گوشہ انداز میرے میں نہیں رہا۔ واللہ الحمد۔

اس سلسلہ میں پہلی چیز ”فقد السبیل“ ہے جو پچاس ساٹھ صفحوں کا مختصر رسالہ ہے۔ لیکن اس کوڑہ میں دریا بند ہے۔ فن ساوک حقائق اور تعلیمات، جو سالہا سال میں معلوم ہوئے ہیں اور جن کے ز جاننے سے سالکین و عالمین غلط راستوں پر چکر منزل مقصود کو گم کر کے اس میں کھم دیئے گئے ہیں۔ اگر کوئی طالب صادق صرف اسی ایک رسالہ کی تعمیل و تکمیل میں صرف کر دے تو اس کے لیے انشاء اللہ کا اور جاہل بیروں اور دکاندار صوفیوں نے ایک مسئلہ یہ گھڑا ہے کہ شریعت اور طریقت دو چیزیں ہیں اور اس زد و شور سے اس کو عوام تو عوام خواص تک پر اس کا رنگ چھ گیا ہے حالانکہ یہ تمام تر لغو اور بے معنی ہے۔ مجدد الملت نے تمام عمر کوئی کبھی یقین دہانہ عین شریعت ہے۔ احکام الہی کی باخلاص تمام تعمیل و تکمیل ہی کا نام طریقت ہے، وگرنہ سچ اور یہی خواص امت کا مذہب ہے اور جس نے وہ دین کی حقیقت سے جاہل اور فن سلوک سے نا آشنا ہے۔

حضرت مجدد الملت نے اس فن کے مسائل کو سب سے پہلے کلام پاک سے منطبق فرمایا اور اس کے متعلق دو مسائل السلوک میں کاہل الملوک اور تائید الحقیقۃ بالآیات العقیقۃ کے نام دو رسالے تالیف فرمائے ہیں جن کا ذکر اور پورچھکا ہے۔ پھر ان مسائل سلوک کی تشریح کا ماخذ احادیث نبوی اور سنت صحیحہ ہے اور یہ ”العرف“ اور حقیقۃ الطریقہ میں التفتہ الانبیاء میں مدون ہیں۔

اہل تحقیق کے لیے اس فن شریعت پر ایک جامع کتاب ”التکشف بتمہاتہ التصوف“ تالیف فرمائی جو میں منقسم ہے۔ یہ حقیقت، طریقت، حق و طریقت، حقیق و کرامت اور دیگر مسائل تصوف پر مشتمل ہے۔

طریق اور سلوک کے امرا اور رموز اس قدر دقیق اور نازک ہیں کہ ذرا ان کے سمجھنے میں بے احتیاطی کی جائے تو ہدایت کی بجائے گمراہی کا ذریعہ بن جائیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا دوحیہ کی جو مثنوی معنوی کے نام سے سرور نواز حقیقت ہے کی خاص اہمیت ہے اور یہ اس سلسلہ کے خانقاہی درس میں رہی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اس سے خاص ذوق تھا اور وہ بھی خاص خاص لوگ اس دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت حاجی صاحب کے ایام سے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے بڑے اہتمام سے اس کا حاشیہ لکھا اور شریعت مرحوم کے مطبع سے اس کو چھاپا اور یہ کہا با سکتا ہے کہ مولانا کی بحر العلوم کے لکھنؤ کی حکیمانہ تشریح اس سے بہتر نہیں کہی گئی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے حضرت مجدد الملت نے اس مثنوی کی خدمت مخفی فن کی حیثیت سے سلوک کے مسائل، طریقت کی تعلیمات اور مثنوی کے بیانات کی قرآن و حدیث سے اس خوبی کے ساتھ لکھنؤ میں نظم و آرا کی فن کا مبتدی بھی چاہے تو اس کلید کے ذریعہ سے مثنوی کے خزانہ کو کھول سکتا ہے۔

دیوان حافظ کی پرچون و مرادگی شرب نے بھی بہت سے بے احتیاطی نے نشوں کو راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ بدگلائی کو اس شرب پر شریازہ کے باوجود انگریز کا شرب ہوا۔ اور بے احتیاطی غن گلائی نے اس سے اباحت کی کہ سے

بڑے تہجد و تکیہ کن گرت پریشان گوید کہ سناکتے خبر خود در راہ و رسم منبر لہا
حضرت مجدد الملت کی معرفت اس تہجد و تہجد منبراب کے متنازعہ واقعہ سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضرت نے ”عرفان حافظ“ کے نام سے اس کی
کچھ کچھ کاس پھول سے کاٹا اٹک ہو گیا۔ ع

ساقی پلاسے پھول تو کاسٹ نکال کے

طالعین و سائیکس کی تعلیم و تربیت کے لیے ”ترتیب السلاک و تہذیب الدعاک“ کا سلسلہ اٹک مرتب فرمایا جس میں سائیکس کی مشکلات راہ، ذاکرین
کے شبہات و خطرات راہ کے لیے ہدایات مندرج ہیں۔ یہ کتب بے جا نہیں کہ علوم مکاشفہ و معاملہ کے متعلق کلیات و جزئیات اور احوال شخصی
اور کتاب کی نظیر لغت کے سارے دفتر میں موجود ہیں ۱۲۷۲ صفحوں میں یہ کتاب تمام ہوئی ہے

ایک دوسرا اہم سلسلہ ”ملفوظات“ کا ہے۔ بزرگوں کے ملفوظات مرتب کرنے کی رسم قدیم زمانے سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ چشتیہ حضرت
نہ خارجہ میں الدین اجیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات بھی موجود
میں ہیں۔ اہل شوق اس کام کو بڑے استیجاب سے ذکر کے کیڑے ان اکابر کے ملفوظات قلمبند ہو سکے وہ چند سال بعد بلکہ چند ماہ
کے نہیں ہیں اور ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ کھنے والوں نے ان کو ان بزرگوں کی نظر کیمیا اثر سے گزارنا بھی تھا۔ اہم جو کچھ کھنے
واہل کمال و اہل احتیاط سے اس لیے ان کی صحت میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ اور وہ اس اختصار پر بھی ہمارے لیے بڑی ضرورت
ہیں۔

حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ جلدات اور رسائل میں مدون ہوا ہے اور ان میں سے ہر ایک ان کی
بے گزار کچھ پائی ہے اور جن میں سے اکثر ”حسن العزیز“ اور ”الاشافۃ الیومیہ“ وغیرہ نام سے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان ملفوظات
کے قلمی، مستعیدہ، لکھے، قرآن و حدیث کی تشریحات، مسائل فقہیہ کے بیانات، سلوک کے کھنے، اکابر کے حالات، طالعوں کی
تنبیہات، آداب و اخلاق کے نکات، اصلاح نفس و تزکیہ کے مجربات وغیرہ اس خوبی و دلچسپی سے درج ہیں کہ اہل شوق کے دل
و ذہن آپ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔

حضرت مجدد الملت رحمۃ اللہ علیہ کے سادہ کا یہ آخری باب ہے اور خاصا اہم باب ہے۔ مسلمانوں کی اصلاح
کی جو دقیق نظر ان کو بارگاہ الہی سے عنایت ہوئی تھی اس کا اندازہ ان کی اصلاحی کتابوں سے بخوبی ہو سکتا
ہے۔ ان کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بچوں، طالب علموں، عورتوں سے لے کر مردوں اور علماء و فضلا کے حلقہ تک پھیلا ہوا ہے اور سب کے لیے
مناظرہ کا ذریعہ یا درگاہ چھوڑا ہے۔

بیان

دوسری طرف ان اصلاحات کی وسعت یہ ہے کہ مجالس و مدارس اور خانقاہوں سے شروع ہو کر شاہی و علمی کے رسوم اور وزمو کی
مکہ و محیط ہیں۔ غرض ایک مسلم بدھ پرانی زندگی میں رخ کرے ان کے قلم نے شریعت کی ہدایت کا پروگرام تیار کر رکھا ہے۔
ان سلسلہ میں حضرت کی سب سے اہم چیز ”صواعظ“ ہیں۔ واعظ تو مجددانہ زمانہ بخیر کے بعد اسلام کی دس بارہ صدیوں میں بیشمار

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تعلیمات، واقعات اور اقتباسات کے آئینے میں

حکیم الامت حضرت تھانوی نے تعلیم و تربیت، سلوک و معرفت اور تلقین و ارشاد کے ذریعہ اس صدی میں بوندہ مت کی بنے اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی اس خدمت کی تفصیل کے لیے آپ کی سیرت و تعلیمات پر تحریر کی جانے والی کتب، حیات اشرف، جامع المجددین، تجدید تصوف و سلوک، تجدید معاشیات، تجدید تعلیم و تبلیغ، حکیم الامت اور سیرت اشرف کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ منشی عبدالرحمن صاحب کی تالیف سیرت اشرف سے ہم کچھ چیزیں شکریہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے، سوانح و سیرت کے باب میں یہ بہترین کتاب ہے۔

شرائط قبولیت ایک دنوٹھا کے مشہور معروف نواب سلیم اللہ نے جن کی دعوت کے واسطے اور گورنر مشرقی ہند تھے۔ اور بلا شرط منظور کرنے تھے۔ حضرت تھانوی کو بڑے اشتیاق سے مدعو کیا۔ تو آپ نے اس کی امارت و وجاہت کے پیش نظر قبولیت و دعوت کے لئے حرب دلی شرطیں لکھیں۔

۱۔ کسی قسم کا تقدیر یا غیر تقدیر نہ دیا جائے۔

۲۔ کسی خاص مضمون پر وعظ کہنے کی فرمائش نہ کی جائے

۳۔ قیام کا انتظام ایوان خاص سے جدا الگ جگہ ہو۔ جہاں عام مسلمان بے تکلف آجاسکیں۔

۴۔ خود اپنی ملاقات کیلئے کوئی خاص وقت متعین نہ کریں۔ جس میں کوئی اور شخص شریک نہ ہو تاکہ جانیبیں سے بے تکلف افادہ و استفادہ ہو سکے

نواب صاحب بھی بڑے سچے دار سلیم الفطرت اور اسم باہمی تھے شرائط کو پڑھ کر ان کی حکمت و ندرت، صحت و مصلحت پر عیش و عشر کر گئے اور غلبہ اشتیاق میں بلا چون و چرا سب شرطیں منظور کر لیں۔

شہادۂ تزک و احتشام حضرت تھانوی عادی یا مذہبی میٹروں کی طرح شاندار استقبال جلسہ جلوس اور زندہ باد کے نعروں کے قطعاً دلدار نہ تھے۔ اگر کوئی ازراہ محبت ایسا انتظام بھی کرتا تو حضرت منع فرمادیتے۔ نواب ڈھاکہ نے حضرت کا بھی اسی تزک و احتشام کے ساتھ استقبال کرنا چاہا جس طرح وہ وائسرائے کا استقبال کرنے کا عادی تھے۔ کہ پلیٹ فارم پر جمی فرش بچایا جائے

ہم راتوں کو رنگ بزم کی جھنڈیوں اور خوبصورت دروازوں سے سجایا جائے اور شام نہ جلوس کی صورت میں حضرت کو دیوان خاص تک لایا جائے واقعی حضرت ایسے ہی استقبال کے مستحق تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کے۔ کیوں کہ یہ اپنے زمانہ کے مجدد تھے۔ مگر یہ سب کچھ چونکہ خلاف شرع تھا۔ اس لئے حضرت نے نواب صاحب کو اس کی اجازت نہ دی اب انہوں نے دوسری درخواست بھیجی کہ ہمیں ایک جم غفیر کے ساتھ استقبال کی اجازت دی جائے۔ جو عمال ریاست اور وزراء پر مشتمل ہوگا۔ حضرت نے لکھا کہ یہ بھی خلاف طبیعت ہے جس سے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مگر ہم قدر پر حضرت کی مصلحت آمیز اور معنی امور ہدایات نواب صاحب کی گرویدگی میں نہ صرف اضافہ کر رہی تھیں۔ بلکہ ان کے دل میں حضرت کی عظمت بڑھا رہی تھیں چنانچہ نواب صاحب ہا کسی انتہام کے بن نفس نفیس اسٹیشن پر پہنچے۔ اپنی خاص موٹر میں حضرت کو سوار کیا۔ حضرت کی خواہش کے باوجود حضرت کے ساتھ نہ بیٹھ سکیوں کہ حضرت اپنے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہ ہوئی اور فرمایا کہ حضرت کے ساتھ بیٹھنا خلاف ادب تھا۔ گھر پہنچ کر بھی نواب صاحب خود خادم کی طرح حضرت کی خدمت میں کھڑے رہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت پر ایک ایک چیز خود اٹھا اٹھا کر حضرت کے سامنے رکھتے رہے۔

منظم کی نخوت اور اس کا علاج

علامہ اقبال نے اس دور کو اپنے ایک مکتوب میں خود بدترین قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور و فرعونیت کے زمانہ میں عام طور پر اہل دین اور علماء حق کو نفرت اور عقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جو حضرت تھانویؒ پر روا داشت نہیں کرتے تھے۔ کہ کوئی علامہ حق کی شان میں ایسی بات کرے۔ کیوں کہ آپ اسے اہل دین کی اور دین کی قرین سمجھتے تھے۔ اس لئے اگر کسی سے ایسی غلطی ہو بھی جاتی۔ تو ایسا سبق پڑھانے کو پھر وہ عمر بھر نہ جھوٹا۔

ڈھاکہ کے پہلے سفر کے بعد ایک کانفرنس کے سلسلہ میں نواب ڈھاکہ کے اشتیاق اور علماء دیوبند کے اہلار پر آپ کو دوبارہ ڈھاکہ جانا پڑا۔ مگر آپ نے بفراسٹ دیکھ لیا تھا کہ وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا۔ جس کی ناگوارگی کی وجہ سے آپ کے لئے ان حضرات کا آخر وقت تک ساتھ دینا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے آپ نے وہ سفر اپنے ذاتی خرچ پر فرمایا تاکہ جس وقت چاہیں آزادی سے واپس آ سکیں۔

ان حضرات نے کلکتہ سے ہو کر ڈھاکہ جانا تھا۔ اس لئے نواب صاحب کی طرف سے ان کے قیام و طعام کا کلکتہ میں نمایاں شان انتظام تھا۔ کے منظم ایک ٹیم ہو کر نواب صاحب کے دوست تھے۔ باتوں باتوں میں وہ دیکھیں حضرت سے کہنے لگے کہ:-

”آپ کے انکار کے بعد آپ کی تشریف آوری سے نواب صاحب کو بڑی مسرت ہوئی ہے۔ فرماتے تھے کہ آپ کی شرطیں بڑی سخت ہیں۔ جن کو قبول نہیں کر سکتے۔ جیسے ایک تو یہی کہ کوئی بدینہ پیش نہ کیا جائے“

حضرت نے فرمایا:-

”نہ دینے کی شرط کیا شکل ہے۔ دینا تو دشوار ہو سکتا ہے۔ نہ دینا کیا شکل ہے۔“

دیکھنے نے کہا:-

”صاحب جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کو تو بدیہ دینے کے لئے جی چاہتا ہی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے محبوب کی خدمت نہ کی جائے۔“

حضرت نے جواب دیا:-

”یہ کیا ضروری ہے کہ محبوب کو اپنے گھر ہی جا کر بدیہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو اس کے گھر جا کر باگھر بھیج کر بھی تو بدیہ دیا جاسکتا ہے۔“

میں ہونا اور بات ہے۔ سلیقہ سے گفتگو کرنا اور بات کرنے کی نہائی اور نخواست سے کہا کہ :-

”جانب سات فرمائیے پیار کنوئیں کے پاس آتا ہے کسوں پیار سے کے پاس نہیں“

حضرت تھانوی کو یہ کلمات سن کر بہت رنج ہوا مگر آپ نے ناگوار سی ظاہر کئے بغیر نہایت تہذیب سے اس رئیس کو مخاطب فرمایا کہ :-

”آپ کا خیال یہ ہے کہ آپ حضرات کسوں میں اور ہم پیار سے اور ہمارے دماغ میں یہ کیا ہوا ہے کہ ہم لوگ کسوں میں اور آپ

پیارے۔ اور اس کی ہمارے پاس دلیل بھی ہے کہ ضرورت کی وجہ میں دین اور دنیا میں سے ہماری حاجت کی ایک چیز تو آپ کے پاس بھی

یعنی دنیا، اخوہ اللہ تعالیٰ بقدر ضرورت ہمیں بھی دے رکھی ہے۔ یہی آپ کی حاجت کی چیز ہمارے پاس ہے یعنی دین، وہ آپ کے

پاس بقدر ضرورت بھی نہیں۔ اس لئے آپ ہمارے قلمج ہوئے یا ہم آپ کے؟ آپ پیارے اور ہم کسوں ہوئے۔ یا ہم پیارے اور آپ

کسوں ہوئے۔ پس اس نازیبا نہ محبت کے لگنے کی دیر تھی کہ وہ رئیس شرمندہ ہو کر نغیں جھانکنے لگے اس ناگوار سی کے بعد حضرت نے

مکرارادہ کر لیا کہ میں نے شیعہوں پر نواب صاحب کو بھی غرور کی۔ انہوں نے حضرت کو شیعہوں پر بلا خلاف ادب سمجھ کر ضروری ناریا و نفاذ سفر

ناریا کر لیا کہ آپ والہ کا ارادہ ترک کر دیں مگر آپ نے کسی کی خاطر اپنا اصول نہ چھوڑا اپنے کرایے پر تر گئے ہی تھے۔ بڑی آزمادی سے واپس

اور ارادہ پانچ کر نواب صاحب کو ناکار کا جواب دیا۔ اس واقعہ سے فرست کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ جس کے مقابلہ میں کشف بہت

ہے۔ اس لئے اس کی حدیث میں فضیلت آئی ہے (سیرت اشرف ص ۱۱۲ تا ۱۱۳)

حضرت تھانوی نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ اور مدعیان تہذیب جدید سے مشغول میں بد تہذیبی کا افکار کرا لینے

میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کی ناگوار سی، ناراضی، سختی اپنی ذات کے لئے نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ مناسب موقع پر

تہذیب کیلئے ہوتی تھی۔ اور آپ دعوئے سے فرمایا کرتے تھے کہ :-

”جس کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں اپنی جدید تہذیب کا دعوئے ہو کچھ دن میرے پاس رہ کر دیکھ لے۔ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ

پر کہتا ہوں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ خود اسی کے منہ سے کہلوادوں گا کہ واقعی ہم بد تہذیب ہیں اور تحقیق تہذیب وہی ہے جس کی

شرعیات مقدمہ نے تعلیم فرمائی ہے۔“

چنانچہ منظر نگار کے سفر میں بھی آپ کو ایک ایسے ہی رئیس سے سابقہ پڑا جو بڑے بے باک۔ زبان دراز یہاں تک کہ بڑے بڑے حکام

بھی نہ ڈر سنے والے اور ان کے سامنے نہ جھکنے والے تھے۔ چرنکو ان کی عادت ہو ایسی بن چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے کوناه انالیشتی سے

نرسے بھی بے ڈھنگی باتیں شروع کر دیں جس سے آپ کو از حد تکلیف ہوئی آپ نے انہیں مناسب الفاظ میں تفسیر بھی فرمائی مگر ریاست کے

میں دو کچھ نہ سمجھ سکے اور نوبت ناگوار تک پہنچ گئی۔ حضرت نے انہیں مجلس سے اٹھ جانے کے لئے فرمایا مگر وہ بیٹھے رہے اس پر حضرت یہ فرماتے

تھے ”خودی اچھے کھڑے ہوئے کہ :-“

”اگر آپ نہیں اٹھتے تو میں خود اٹھ جاتا ہوں میں ایسے شخص کے ساتھ ہم نشین بھی گوارا نہیں کرتا۔“

پس آپ کا اتنا زماں تھا کہ ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ دست بستہ کہنے لگے :- ”حضرت آپ بیٹھے رہیں میں خود بھی جاتا ہوں۔“

اور اٹھ کر چلے گئے۔ بعد ازاں انہوں نے حافظ صیغہ احمد سے کہا کہ :-

”میرا عمر عمر کیلئے علاج ہو گیا۔ میں علاء اور ملازموں کو بہت ذلیل بھی کرتا تھا۔ اب ہر ایک مولوی اور ملا کا ادب و لہجہ کرتا ہوں۔“

..... میں بڑے بڑے حکام سے بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ اس روز مولانا سے

اتنا مرعوب ہوا کہ ڈانٹ پڑنے کے بعد ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔

اس لئے حضرت مجذوب فرمایا کرتے تھے کہ اس

میں خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے۔

نواب رام پور کو سبق

ایک مرتبہ نواب رام پور نے قادیانیوں سے مناظرہ کا انتظام کیا۔ اور اس غرض کے لئے علماء دیوبند کو مدعو کیا۔ چنانچہ بہت سے اکابر علماء اشراف لائے۔ اور اپنے حضرات کے اہلار پر حضرت نے بھی بادل نخواستہ قادیانی مناظرہ سے فراغت پانے کے بعد جب سب حضرات واپس ہونے لگے۔ تو نواب صاحب نے حضرت کو کچھ زیادہ رقم دینی چاہی جو حضرت براہ راست پیام یہ کہہ کر واپس کر دی کہ:-

”ریاست کو بیت المال سے ناکد از ضرورت صرف کرنے کا شرعاً اختیار حاصل نہیں ہے۔“

اس سے نواب صاحب حضرت کے اصولی شریعہ کی پابندی سے بہت متاثر ہوئے خواہ ان سے اس پر بعد میں عمل نہ ہو سکا ہو۔ مگر نے انہیں ایک ایسا سبق دیا جو کوئی دوسرا نہ دے سکا۔ اور جس میں ان کی دینی اور اخروی فلاح و نجات مضمر تھی۔

امیر بہاول پور کو تعلیم دین

ایک سلسلہ میں نواب بہاول پور کی طرف سے حضرات علماء کرام کو مدعو کیا گیا۔ ان میں حضرت تھانوی بھی تھے۔ واپسی پر نواب صاحب کی طرف سے سب حضرات کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے بطور خلعت اور ہجرت روپے نام دعوت عطا کئے گئے اس وقت تو حضرت نے احرام نواب صاحب کے خیال سے سب کے ساتھ یہ رقم لے لی لیکن خلعت میں ہجرت سے مدد فرمایا کہ:-

”یہ رقم مجھ سے واپس لے لی جائے۔ کیوں کہ یہ بیت المال سے دی گئی ہے۔ جس کا میں معرف نہیں۔“

انہوں نے عرض کیا کہ:-

”چونکہ اس رقم کا غذات سرکار میں اندراج ہو چکا ہے اس لئے اب اس کی واپسی کی کوئی صورت نہیں۔“

حضرت نے فرمایا:-

”خیر! اگر خزانہ میں واپسی نہیں ہو سکتی تو اس رقم کو مقامی علماء اور طلباء میں صرف کر دیا جائے۔ کیوں کہ شرعاً بیت المال کے صرف

کے وہ قریب ہیں۔“

غرض جو کچھ حضرت کو ملا وہ آپ نے سب کا سب واپس کر دیا۔ لیکن نہایت سلیقہ سے اور طریقہ سے۔ جب یہ بات نواب صاحب کا علم ہوا انہوں نے اس عطائے تو بقیہ تھے تو یہ خیال کی بجائے مسترت کا اظہار فرمایا۔

خلعت کی واپسی

ایسا ہی واقعہ آپ کو ریاست خیر پور سندھ میں پیش آیا۔ وہاں بھی آپ نے خلعت کی واپسی کا یہی عذر فرمایا۔ وزیر تعلیم نے کہا کہ نواب صاحب کو واپسی خلعت ناگوار ہوگی تو حضرت نے فرمایا:-

”اگر اندیشہ ہے تو ان کو معلوم ہی کیوں کر کیا جائے۔ بلکہ جو نقد بعتوران خلعت ملا ہے اس کو مساکین میں تقسیم کر دیا جائے۔ کیوں کہ وہ لوگ اس کے صحیح معرف ہیں۔“

چونکہ حضرت کی نسبت نیک ہوتی تھی۔ اس لئے حق تعالیٰ آپ کو ایسے اتفاقی سوالات کا برمذوق ایسا جامع مانع جواب لیا فرماتے تھے۔ کہ دوسرے کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ :-

والحمد للہ اللہ جسے کسی جگہ خلاف شریعت یا خلاف طبیعت کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا ہے۔

ایک خاندانی، مقتدر، ذی وجاہت، رئیس اور نواب نے مبلغ دو سو روپیہ مدرسہ اعداد العلوم تھانوی بھوی کی امداد کے لئے بھیجے جو کسی پندرہویں کے توحید علی اللہ حضرت کی سرپرستی اور نگرانی میں خاص محتلفہ کے اندر قائم تھا۔ اس عطیہ کے ساتھ انہوں نے تشریف آوری کی درخواست بھی بھیج دی۔ حضرت نے یہ لکھ کر روپیہ واپس کر دیا کہ :-

”اگر اس روپیہ کے ساتھ بلائے کی درخواست نہ ہوتی تو مدرسہ کے لئے دو روپیہ لے لیا جاتا اب اس اقرار سے یہ اختلال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاید محرم کو تائر کرنے کے لئے یہ رقم بھیج گئی ہے۔ آپ کی یہ عرض نہ سہی لیکن میرے اوپر تو طبعی طور پر اس کا یہی اثر ہو گا کہ میں آزادہی کے ساتھ اپنے آئے نہ آنے کے متعلق رائے قائم نہ کر سکوں گا کیوں کہ انکار کرتے ہوئے شرم آئے گی۔“

نواب صاحب بڑے ہمیدہ اور جہاں دیدہ تھے۔ فوراً سمجھ گئے کہ عطیہ اور درخواست اکٹھی نہ بھیجی تھی۔ فوراً معذرت نامہ لکھا کہ :-

”آپ کے تئیں کرنے سے اب یہ معلوم ہوا کہ واقعی مجھ سے یہ سخت بدتمیزی ہوئی۔ میں اب اپنی درخواست تشریف آوری واپس لیتا ہوں اور دو سو روپیہ مکرار ارسال خدمت کرتا ہوں۔ براہ کرم مدرسہ کے لئے قبول فرمایا جاوے۔“

حضرت نے پھر بخوشی قبول فرماتے ہوئے نواب صاحب کو لکھا کہ :-

”ابھی تک تو آپ میری ملاقات کے مشتاق تھے۔ اور اب آپ کی تمہذیب اور شرافت نے خود مجھ کو آپ کی ملاقات کا مشتاق بنا دیا ہے۔“

کچھ مدت کے بعد نواب صاحب کے ہاں اس شرمناک تشریف لے گئے کہ تم کا بدیہ پیش نہ کیا جائے۔

محبت و مصلحت کا تضاد

جب آپ واپس آئے گئے تو نواب صاحب کی والدہ ماجدہ نے جو آپ کی پیر بہن تھیں تقریباً سو روپیہ خدمت میں پیش کرنا چاہا۔ اس پر آپ نے خلاف شرط ہونے کا عذر فرمایا نواب صاحب نے عرض کیا کہ

”شرط تو میرے ساتھ تھی۔ یہ والدہ صاحبہ کی طرف سے ہے۔ فرمایا :-

”والدہ اور والد میں کیا فرق ہے گھر تو ایک ہی ہے۔“

نواب صاحب نے مجبور ہو کر کہا :-

”حضرت اگر کسی کا جی خدمت کرنے کو چاہے تو آخر وہ کیا کرے۔“

فرمایا :-

”میں خاندان بددش تو نہیں ہوں کہ میرا کوئی ٹھکانہ نہ ہو۔ میرے ٹھکانے پر بھی تشریف لانا ممکن ہے۔“

چونکہ نواب صاحب باقاعدہ اللہ بڑے سلیم الفطرت واقع ہوئے تھے۔ اور ایک پراسنے ویندار خاندان کے اینداز زندگی تھے۔ اس لئے انہوں نے حضرت سے عام لوگوں کی طرح کچھ اصرار نہ فرمایا اور خاموش ہو رہے۔ پھر ایک معتد بہ مدت گزار جانے کے بعد تھانوی بھوی گئے اوز میں گشتاں :-

پیش کیں حضرت نے بڑی مسرت و احترام سے قبول فرمائی :-

نواب صاحب کی یہ دانش مندی قابلِ مَدَد تھی کہ انہوں نے حضرت کے ذہنی کو گذشتہ واقعہ کی طرف منتقل نہ کرنے کے لئے اور تلب پر بار نہ ڈالنے کی غرض سے پہلی رزم کی مقدار بدل دی۔ تاکہ محض وضعِ عداسی نہ سمجھی جائے۔ نواب کے مودب و مہذب ہونے کی وجہ سے اور ان کی اہلیت اور عقیدت کی بنا پر حضرت کے ان کے ساتھ خصوصی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ کیوں کہ حضرت کو با اصول انسان سے ملنے میں بڑی فرحت ہوتی تھی۔

سیرت اشرف

حضرت تھانوی کو بہت سب سے بڑے مختلف المزاج لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لئے ہر ایک کے حوصلہ کا علاج و معالجہ بھی مختلف ہوتا تھا۔ ایک دیندار رئیس نے دارالطلبہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور تیار کرایا۔ اور اس کے انتظامی جسد کی تاریخ مقرر کر کے ہتم صاحب کو لکھا کہ اپنے مدرسہ کے سرپرستوں اور دیگر اراکین کو اطلاع کر دیں کہ اس تاریخ پر مدرسہ میں آجائیں ہتم صاحب نے اس اطلاع کے ساتھ حضرت کو بھی شرکت کی دعوت دی تو آپ نے بدیں وچ شرکت فرمانے سے انکار کر دیا کہ:-

ایک رئیس کا علاج

”ان کو اس حال کا نہ بوجھ میں بلانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اس طرح حکمنامہ بھیج کر بلانا خلاف تہذیب ہے یہ بھی کوئی بلانے کا طریقہ ہے۔ میں نہیں آؤں گا۔ یہ وہ کسی رئیس کی ایسے طریقہ سے دعوت ہے۔ سکتی تیں؟“

ہتم صاحب نے مدرسہ کی مصالح کی بنا پر تیار کیا کہ یہ اُن رئیس کا فعل نہیں اس کے میرنشی کا ہے اس پر حضرت نے لکھا:-

”پھر بھی پیشکامیت ہے کہ اس معاملہ کو بالکل میرنشی ہی پر کیوں چھوڑ دیا۔ مسودہ خود دیکھ کر منظور ہی دیتیں جس طرح حکام کے دعوت ناموں میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان کے بلانے پر تو رام میں نہیں آؤں گا البتہ اگر آپ میں تو جرتیاں چٹھانا ہوا سر کے بن حاضر ہوں گا۔ مگر رئیس سے نہیں ملوں گا نہ اس سے کوئی گفتگو بلا واسطہ یا بالواسطہ کروں گا۔“

ہتم صاحب نے اس مشروط شرکت کو بھی غلیت سمجھا۔ اور حضرت کو تشریف دے دی کہ لکھا۔ چنانچہ حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ بڑا پر اثر و مظرف آیا جس سے رئیس بھی متاثر ہو گئے۔ مگر غصہ کرنے کے فوراً بعد حضرت کسی کو نہ بغیر میان تک کہ حضرت مولانا خلیل احمد کو بھی لے بغیر چلے آئے۔ تاکہ کسی کو کچھ کہنے سننے یا اصرار کرنے کا موقع نہ ملے۔ رئیس کو بھی اس واقعہ کا علم ہو گیا۔ اور انہوں نے پہلی دفعہ عسکس کیا کہ علمدار میں بھی خود دار لوگ ہوتے ہیں اس لئے انہوں نے مدرسہ میں جو دشمنی تقسیم کی تھی۔ اس میں سے اپنا حصہ حضرت کو اسٹیشن پر یہ کہلا کر بھیجا کہ یہ دشمنی عام تقسیم کی نہیں خود میرے حصہ کی ہے۔ اس لئے ضرور قبول فرمائیں اور واپس نہ فرمادیں چونکہ رئیس صاحب کو اپنے باطنی مرض کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے حضرت نے وہ قبول فرمائی۔ اور اس طرح نہایت خوش سادگی سے حضرت نے علمدار کو نظر حقارت دیکھنے والی اہلیت علاج فرمایا کہ پھر وہ علمدار کی بڑی عزت کرتی رہی۔

الانفادات الیوم کے ملفوظات میں حضرت کا ارشاد درج ہے۔ کہ مجھے اکثر اوقات انگریزوں کے ساتھ بھی سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر مجھ کوئی شر میں نہیں ملا۔ ایک مرتبہ ایک دوست کے اصرار پر کاکتے سے سیکنگ ٹکس میں سوار ہوا میں ریور سے کا ایک انگریز افسر بھی سوار ہوا جسے اوپر کے تختہ پر جگہ ملی کہنے لگا کہ ہم کو کچھ کے تختہ (سیٹ) پر تھوڑی سی جگہ کھڑکی کی طرف

انگریز کی دعوت

آپ دے دیں ہم کو بار بار ریور سے کے انتظام کے لئے باہر آنا نا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہمارا کوئی حرج نہیں۔ آپ بیٹھ جائیں دو بیٹھ گئی جب کھانے کا وقت آیا۔ میں نے ان دوست کے ذریعہ سے دریافت کیا کہ آپ کھانا کھائیں گے۔ کہا جھ کو کیا عذر ہے۔ ہم نے کھانا ہمارے سے خریدنا تھا جو پتوں پر ملا تھا۔ ہم نے اس کو بھی اس خیال کے برعکس کو کوں دھونا پھر سے لگا۔ انہی پتوں پر کچھ کھانا کھا کر کہہ دے دیا جو اس نے بڑی خوشی سے دیکر کھایا۔ ایک صاحب پوچھنے لگے کہ برتن میں کھانا کیوں نہ دیا؟ میں نے کہا چونکہ پڑوسی تھا۔ اس لئے حق جو ادا کیا۔ حق احترام ادا نہیں

کیا کہ اسلام سے محروم تھا۔ وہ بردوان کے اسٹیشن پر اترا اور شکرہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کو بہت تکلیف ہوا ہماری وجہ سے اور ہم کو آپ کی وجہ سے بہت آرام ملا۔“

ایک رفیق سفر کہنے لگے اگر آپ بڑوں میں کھانا دیتے تو زیادہ شکرہ ادا کرتا۔ میں نے کہا کہ یہ بھی ممکن تھا کہ ذکر کرتا۔ برتن میں کھانا دینے سے اپنے کو بڑا سمجھتا کہ ہمارا احترام کیا گیا ہے۔ پھر شکرہ کی ضرورت ہی کیا عروس ہوتی۔

تعظیم رسوم کا خاتمہ
برعلاقہ میں ملنے جلنے۔ کھانے پینے۔ اور تعظیم و تکریم کی مختلف رسومات رائج ہوتی ہیں۔ حضرت تھانوی اپنے سفر کے دوران میں جہاں جہاں ایسی رسومات کو دیکھتے ان کے اشد ادا و استیصال کی طرف فوری توجہ دیتے اور اس تہذیب تدبیر سے ان رسومات کے عادی لوگوں کو سمجھاتے کہ وہ فرار حضرت کے فرمان سے متاثر ہو کر انہیں ترک کر دیتے۔

اعظم گڑھ میں یہ دستور تھا کہ حضرت کے ساتھ ایک عذریہ کوٹ بھی لگتی تھی۔ حضرت تھانوی میزبان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنے کے عادی نہ تھے۔ اس لئے کبھی کسی کے کوئی فرمائش نہ کرتے نہ تکلف کھانوں کی۔ ہمارے سادہ معمول کھانوں سے خوش ہوتے۔ آپ نے وہاں کی اس رسم کے اشد ادا کی یہ ترکیب نکال۔
کوچ شخص بھی دعوت نہ کرتا چھوٹا ملا دیتے کہ میں تنہا کھاؤں گا۔ اور محض خشکا اور ربرک دال کھاؤں گا کیوں کہ وہاں میں کی روٹیوں کا رواج ہے جو ذرا سخت ہوتی ہیں اور مجھے موافق نہیں آتیں اس طرح آپ میزبان کو بہت بڑے بار سے بچا لیتے۔

بگال میں یہ رسم تھی کہ جو رسم ملے آسا۔ اگر پاؤں کو چھو تا۔ جیسے پنجاب میں بھی اکثر یہ رسم کے ہاں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے روکنے کی یہ ترکیب نکال۔
کہ اول آپ منع فرمائے۔ جس کے بعد بھی آپ کے پاؤں نہ چھو تا۔ اس کے لئے علاج بالمثل فرماتے یعنی آپ بھی اس کے فوراً پاؤں پر ٹھٹھٹھتے اور جب وہ شرمندہ ہو کر روکتا تو فرماتے۔

”اگر کوئی اچھی بات ہے تو مجھے اس سے کہوں روکتے ہو۔ اور اگر بری بات ہے تو تم ایسی حرکت کیوں کرتے ہو؟“

بس دو چار مرتبہ ایسا کرنے کی دیر تھی کہ اس کی شہرت عام ہو گئی اور لوگوں نے اس یہودہ رسم کو ترک کر دیا۔ ضلع اعظم گڑھ میں یہ دستور بھی تھا۔
کجب کسی بڑے آدمی کی سواری گزرتی تو چند لوگ آگے آگے بڑھ جاتے جوتے گزرتے کوئی آگے آتا ہوا دیکھتے اسے شہادت دیتے حضرت نے ان لوگوں سے فرمایا۔

”راستہ کسی کی بلک نہیں ہے سب کو چلنے کا برابر حق ہے۔ یہ حرکت خلاف شرع ہے۔ اس کو چھوڑنا چاہیے اور آئندہ ہرگز ایسا نہ کیا جائے۔“

بس لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور آئندہ کہنے یہ رسم موقوف ہو گئی۔

ایک جگہ یہ دستور تھا کہ لوگ پاکی کے۔ اتھ داییں داییں دوڑتے ہوئے چلتے۔ حضرت نے منع فرمایا کہ جو کس سے تکلیف ہوتی ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہم تو محبت سے ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ پھر مجھے دکھاتے کیوں ہو۔ داییں بائیں نہ چلو۔ پالکی کے پیچھے چلو۔ جہاں سے مجھ کو نظر نہ آئے چنانچہ تھانوی دیر بعد حضرت نے مرکز دیکھا۔ تو کوئی بھی نہ تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ رسم محض دکھلاوے کے لئے ہوتی ہے مگر وہ ہمارے کیا کرتے کسی مقتدا نے کبھی انہیں دکھا ہی نہ تھا۔ دہلی میں بھی دستور تھا کہ علماء ہندوؤں سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ اور اگر کوئی علماء کی تعظیم کے لئے ڈانٹتا تو اسے ڈانٹتے تھے۔ حضرت جب ایک انگریزی سکول کے پاس گزرے تو دستور کے مطابق سب ہندو طلباء اور مدرسین تعظیم کرتے ہوئے۔ ان کا یہ سلوک دیکھ کر حضرت سکول کے اندر تشریف لے گئے۔ اور نہایت سادگی اور ملاطفت کے ساتھ سب سے ملے اور کچھ دیر باتیں کرتے رہے جس سے

وہ لوگ بہت مسرور ہوئے اور تعجب کرنے لگے کہ ایسے مولوی بھی ہوتے ہیں

ایک جگہ دستور کے مطابق گاؤں کے چوہدری نے چندہ کر کے دو صد روپیہ حضرت کو نذرانہ دیا۔ لیکن یہ ظاہر نہ کیا کہ یہ گاؤں والوں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی مالی حالت سے حضرت کو شبہ ہوا کہ یہ از خود اتنا نہیں دے سکتا۔ اس لئے حضرت نے پوچھا یہ آپ کی طرف سے ہے یا اس میں اور بھی شریک ہیں جواب ملا اس میں دوسرے بھی شریک ہیں فرمایا۔

”بدیر محبت کے لئے بڑا ہے جب دینے والے کو میں نہیں جانتا تو مجھ کو ان سے محبت کیسے ہوگی۔ اس لئے ہر ایک کی رقم اُس کو واپس کر دوں پھر جس کو دنیا ہوگا۔ ہر ایک خود اگر اپنے ہاتھ سے دے گا جس سے مجھے پتہ چلے گا کہ یہ میرا عمن ہے اور مجھے اس سے محبت ہے“

چوہدری صاحب نے مذکر کیا کہ اب تو آپ جارہے ہیں فرمایا۔

”میں بہت تریب مقام پر جا رہا ہوں۔ جہاں پہنچنا سب کو آسان ہے۔ جس کو شوق ہو وہاں آکر بدیر دے“

مگر کوئی بھی بدیر دینے نہ آیا۔ کیوں کہ وہاں یہ رسم تھی۔ کہ اگر کوئی مولوی آئے اور اسے معقول نذرانہ نہ دیا جائے تو وہ برا مناتا تھا۔ مگر جب دینے والا ہی نہ لے تو پھر کسی کی پیچھے دوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔

اعظم گڑھ کے ان واقعات کے سلسلہ میں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ:-

”میں نے وہاں کی اور رسموں کو تو مشاہد کیا۔ لیکن ایک رسم کے مشانے میں کامیاب نہ ہو سکا وہ یہ کہ جب کوئی عالم آتا تو موضع کے اکثر لوگ یہاں تک کہ چھوٹے لڑکے بھی استقبال کے دور تک آتے اور ایسا ہی رخصت کے وقت کرتے۔ وہاں کے لوگوں میں بہت ہی صلاحیت اور دینداری ہے۔ وہاں کے انگریزی خواں خوش عقیدہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پچاسے صرف معاش کے لئے انگریزی پڑھتے ہیں“

ایک سفر کے دوران میں آریہ سماج کے ایک لیکچرار نے حضرت کی باتیں سن کر آپ سے یہ سوال کیا کہ وہ شخص ہیں۔ ان میں ایک آریہ کا اقرار کفر مسلم ہے اور دوسرا غیر مسلم۔ دونوں نے نیک نیتی سے کوئی نیک عمل کیا تو اس کا اجر دونوں کو یکساں ملے گا یا مختلف حضرت نے فرمایا کہ:-

”یہ سوال آپ کی دانش مندی اور تہذیب سے نہایت بعید ہے کیوں کہ آپ نے ایک ایسا سوال کیا ہے جن کا جواب آپ کے ذہن میں موجود ہے۔“

اس نے کہا:-

”نہ آپ کے کیسے معلوم ہے کہ اس کا جواب میرے ذہن میں موجود ہے۔“

آپ نے فرمایا:-

”جب اس جواب کے سبب مقدمات آپ کے ذہن میں موجود ہیں تو وہ جواب بھی موجود ہے۔ کیوں کہ جب ملزوم موجود ہے۔ تو

لازم کا وجود بھی ضروری ہے۔“

اُس نے پھر سوال کیا کہ:-

”یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ سب مقدمات میرے ذہن میں موجود ہیں۔“

مایا کہ :-

”بیچے! میں آپ ہی کے منہ سے ان مقدمات کے موجود فی الذہن ہونے کا اقرار کرانے لیتا ہوں۔ کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ مختلف مذہب و مکتب ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس کی بحث نہیں کہ حق مذہب کونسا ہے۔“

میں نے کہا :-

”جے شک حق تو ایک ہی مذہب ہو سکتا ہے۔“

حضرت نے فرمایا :-

”ایک مقدمہ تو یہ ہو چکا آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے۔ دوسری بات میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا مذہب حق والے کی مثال باطنی سلطنت کی سی اور باطل والے کی مثال باطنی سلطنت کی سی نہیں؟“

میں کا بھی اس آریہ نے اقرار کیا اس دوسرے مقدمہ کو تسلیم کرنے کے بعد حضرت نے پھر اسے فرمایا :-

”کیا باطنی کے سارے کمالات محض اس وجہ سے کہ وہ باغی ہے نظر انکار نہیں کر دیتے جاتے اور کیا باوجود صاحب کمالات ہونے کے اس کو عدالت سے سزا نہیں ملتی اور کیا وہ سزا عقل و انصاف کے خلاف ہوتی ہے؟“

جس نے ان سب باتوں کے صحیح ہونے کا اقرار کر لیا۔ تو اس پر حضرت نے فرمایا :-

”بس یہ تینوں مقدمات آپ کے ذہن میں پہلے سے موجود ہیں تو اس کا نتیجہ بھی ضرور آپ کے ذہن میں ہے۔ اور وہی آپ کے سوال کا جواب ہے تو ایسی حالت میں آپ کے سوال کا عاف یہ مطلب ہر اک میں اپنے منہ سے آپ کو انفرکوں ہر جاری

شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ بلا ضرورت ہم کسی کو انفر کہیں۔“

اس آریہ نے خوش ہو کر کہا :-

”واقعی مجھے اس کا شوق تھا۔ کہ میں اپنے بارے میں آپ کے منہ سے یہ لفظ سوں سے منہ سے اپنے بارے میں کافر کا لفظ سننے میں بھی مزہ آتا ہے۔“

حضرت نے جواب دیا :-

”خیر یہ آپ کے لئے تو خوب ہے۔ لیکن میرے لئے سخت بدنامی بات ہے۔“

اہم سبق

بلا ہو کہ اس سفر ایک ذاتی ضرورت کے ماتحت کیا جا رہا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنی روانگی کو پردہ اخفا میں رکھا اور شروع سے ایسے انتظام کر دیئے کہ سوائے متعلقین کے دوسروں کا اس سفر کا علم نہ ہو سکے۔ چنانچہ سہارنپور کے بعد آپ میڈرے اپنے متبعیہ حامد علی صاحب اور محمود علی کے ہمراہ جرائسٹن پر آئے ہوئے تھے۔ حامد علی صاحب کے مکان پر اتارے گئے۔ بلا اطلاع مدرسہ مظاہر العلوم میں تشریف لے گئے جس آپ کا وہاں پتہ نہ تھا۔ کہ کسی پریشید و مفتا فیکیشن سے آنا نا ناشاقان کا اتنا جرم ہو گا کہ مدرسہ قدیم کی عمارت ناکافی ہو گئی۔ اور حضرت کو چند قدم چلنا دشوار ہو گا ہر شخص زیارت و دعا فح کے لئے بیتاب تھا۔ حضرت کو کچھ بڑھانے ہر ایک کو مدافحو کی صورت ہم پہنچا رہے تھے۔ ہر جمہور بہ نحو بڑھتا جا رہا تھا۔ اور حضرت بھی اتنی دیر بات نہ بڑھائے رکھتے دیکھ کر مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ نے مدافحو کرنے والوں کو روکا۔ مگر حضرت نے خود ان کو روک دیا کہ انہیں کسی کو نہ روکا جائے۔

میرے محبت ان کرے آئی ہے میں یہاں ملے ملائے کو تو کیا ہوں، ناظم صاحب نے کہا کہ حضرت والا کو تکلیف ہوگی۔ فرمایا کبھی اجاب کے لئے تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں اور کام ہی کیا ہے۔ تھانہ جھون تو دوسرے مشاغل ہوتے ہیں اس لئے وہاں انضباط اذیتا ضروری ہے۔ درنہ بھی نہ ہو سکے یہ جراتنا کام ہو گیا ہے وہ انضباط اذیتا ہی کی بدولت ہے جب معاملہ عدسے تجا و زکر گیا۔ تب ناظم صاحب نے کچھ سختی کو تو حضرت نے پھر روک دیا اس پر ناظم صاحب نے کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے۔ اور لوگ ہیں کہ مانتے نہیں۔ اس لئے میں یہ کوئی انسانیت اور ہندوب ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ :-

دیکھئے جس کے سپرد انتظام ہو رہا ہے۔ اس کو سختی کرنا ہی پڑتی ہے۔ بغیر اس کے کام نہیں چلتا۔ جو لوگ مجھ کو سخت کہتے ہیں اب دیکھیں حقیقت میں میں سخت ہوں یا نرم حالانکہ حافظ صاحب بیچارے بہت نرم ہیں لیکن انتظام کے لئے ان کو سختی کرنا ہی پڑ رہی ہے۔ کوئی اجنبی آدمی اس کو دیکھے تو تعجب ہوگا۔ کہ جس کی نسبت یہ مشہور ہے کہ بہت سخت ہے وہ کتنا نرم ہے اور جو نرم ہیں وہ سختی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ جب تک تھانہ جھون میں ہوں وہاں کے انتظام اور کام کا تعقیب مجھ سے ہے۔ اگر میں سختی نہ کروں تو کچھ کام بھی نہ کر سکوں اور یہاں ملا ملانا بھی کام ہے اس لئے سختی کی ضرورت نہیں۔ نرم ہوں اور ناظم صاحب یہاں کے منتظر ہیں اس لئے وہ یہاں بہت سخت معلوم ہوتے ہیں :-

(ارمغان جاوداں ص ۱۷)

حضرت نے اپنے پروگرام کے مطابق سہارنپور سے دو بجے رخصت ہونا تھا۔ اجاب نے تقاضا کیا کہ دو بجے میں سخت گرمی ہوگی۔ لہذا بعد مغرب طوفان میل سے تشریف لے جائیں۔ حضرت نے فرمایا کہ مولوی شمس مشورہ کر لیا جائے۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ لاہور کے لوگ اس گاڑی سے انتظار کریں گے۔ اہل مدرسہ کی خواہش تھی کہ کوئی ایسی تجربہ کی زیادہ قیادہ نہ کرنا ہو تلے کے گھر میں آئی ہوئی نعمت ہو کہ رات کو جلد چھوڑنے کو کسی کا بھی نہ چاہیے۔ اس لئے کسی نے تجویز کی کہ لاہور تار دوسے دی جائے اس کے ساتھ ہی یہ تباحث نظر آئی کہ رات کو گاڑی میں جو ہم زیادہ برسنے کی وجہ سے تکلیف ہوگی۔ اوداہل لاہور کی پریشانی علاوہ اس لئے سخت خواہش کے مطابق دو بجے دن کی ہی گاڑی سے روانگی طے پائی۔ جب حضرت کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا :-

”بہتر آرام تسلیم و انقیاد ہی میں ہے۔“

چنانچہ سہارنپور سے وقت مقررہ پر روانہ ہوئے۔ یہاں سے حامد علی صاحب۔ مولوی ٹیپو الرحمن صاحب مولوی دلی محمد صاحب اور مولوی حافظ محمد سلیمان صاحب رنگونی بھی حضرت کی اجازت سے رفقہ سفر میں شامل ہو گئے۔ اگرچہ خاص مصالح کی بنا پر حضرت نے سے پہلے اہل تخریب عوام و خاص سب پر اس سفر کے غنی رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا تھا۔ اور حضرت کی آمد کا صرف ڈاکٹر عزیز احمد صاحب صاحب اور حضرت مولانا مفتی محمد رحیم صاحب اس سرسری کو علم تھا۔ اود انہیں تاکید بھی تھی کہ آمد کو غنی رکھنا ہے۔ مگر اس گاڑی میں دوا ایسے آدمی بھی تھے۔ جو لاہور جا رہے تھے اور ان کو حضرت کے ہم سفر ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ جب وہ حضرت سے ملنے آئے تو حضرت انہیں فرمایا کہ :-

”لاہور میں کسی کو نہ کہنا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ اگر تم نے کہا تو ہمیں گناہ ہوگا۔ اس لئے کہ تمہاری اطلاع پر لوگ میرے پاس آئے اور جو ہم سے مجھے تکلیف ہوگی۔ اور میرے ذہن کے آگے کو تکلیف ہوگی اور مسلمان کو تکلیف پہنچا نا گناہ ہے۔“

(ارمغان جاوداں ص ۱۷)

اس پر وہ لوگ بڑے حیران ہوئے کہ ہمارے مشائخ، علماء اور لیڈر تو جہاں جاتے ہیں روانہ ہونے سے پہلے اخبارات کے ذریعے اپنے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ شایان شان استقبال ہو۔ اور ان اپنے پروگرام کو شہرت دینے اور استقبال کرنے والوں کے منہ بونے ہیں اور یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے۔

زیارت مزارات قیام لاہور کے دوران میں آپ سے پہلے حضرت ذوالکفجہ بنی شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بقرض ناتواں تشریف لے گئے آپ وہاں صبح کو ایسے وقت پہنچے جب کہ زائرین کی کثرت تھی۔ آپ حسب معمول صاحب مزار کی بانیستی کی طرف تدریس جیسے بحث کرنا تھا پھر ٹرے کھڑے کھڑے ایصال ثواب میں مشغول ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب حضرت کے پیچھے کھڑے تھے کہ حضرت کو اس حالت میں کھڑے ایسا کر ایک قوی سیکل چاؤرنے زور دار ہیبت ناک آواز سے پکارا کہ ہاتھ آگے باندھو مگر حضرت کو آواز کی طرف مطلق التفات نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اُسے بھانسنے کی کوشش کی۔ مگر اُس پر اس کو کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور تند آواز میں یہی پکارنا مارا اور ہر مرتبہ اپنی آواز کو پیٹنے سے بلند کرتا رہا لیکن حضرت ستونادھر متوجہ رہے۔ فاتح سے فاتح ہونے کے بعد فرمایا کہ حضرت ذوالکفجہ بنی شریعت۔

”دہشت برنی شخصیت ہیں۔ عجیب و غریب ہنر و کثرت کے بعد بھی سلطنت کر رہے ہیں۔ دوسرے روز صبح کے ناشتہ کے بعد آپ جہانگیر کے مقبرہ پر تشریف لے گئے۔ فورجہاں کے مزار کو دیکھ کر فرمایا کہ اول یہیں چلیں عوام تو اس قبر پر کمر آئے۔ وہاں سے جو کہ جہانگیر کے مزار پر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں لاہور کے دیگر تاریخی مقامات شاہی مسجد، قلعہ، شمالا مار باغ، خانقاہ میاں میر، نوکو دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ان کی تاریخی حیثیت، تاریخی واقعات و حالات بتاتے گئے اور حضرت ہر چیز پر حقائق و تفروڈراتے گئے اور اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے۔

محصول کی ادائیگی آپ بلا ادائے محصول کوئی چیز نہ لے جاتے اگر دیکھی کسی چیز میں شبہ ہو تاکہ یہ مقررہ وزن سے زیادہ ہوگی تو آپ اُسے فوراً وزن کرتے اور اس کا محصول ادا کرتے۔ اس کا اتنا اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ سہا پور سے کاہنڈ جاتے ہوئے کچھ گئے ساتھ لے۔ جب ادائیگی محصول کے لئے تلوآنے لگے تو کوئی ترسے نہیں۔ پہلے تک کہ غیر مسلم ملازمین ریلوے بھی کہیں کہ حضرت آپ بو بھی لے جائیے۔ تلوآنے کی ضرورت نہیں ہو گا کہ کوہہ دیں گے۔ فرمایا یہ گارڈ کمان تک جائے گا۔ کہا گیا غازی آباد تک فرمایا غازی آباد سے آگے کیا ہوگا۔ کہا گیا۔ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ اور کاہنڈ تک پہنچا دے گا۔ جہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا فرمائے گئے نہیں۔ وہاں ختم نہ ہوگا۔ بلکہ آگے ایک اور سفر ختم بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہوگا۔ اس سبب انگشت بدندان رو گئے۔ جن میں تعلیم یافتہ ہندو بالو بھی تھے۔ کہنے لگے کہ اس زمانہ میں بھی خدا کے ایسے ایماندار بندے موجود ہیں جو خراج کے ٹکڑا احتیاط کرتے ہیں۔

کرایہ کی ادائیگی اس میں بھی آپ بڑے محتاط تھے۔ بلا ٹکٹ اور بلا ادائے کرایہ سفر کرنے کے قطعاً عادی نہ تھے۔ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دیتے۔ ایک دفعہ ایک طالب علم حضرت کی زیارت کے لئے تھانہ جہون آیا۔ آپ اُس وقت سفر پر جا رہے تھے۔ اس لئے دنگی وقت کی وجہ سے لاڈ کو کہہ کر بلا ٹکٹ حضرت کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اور دوسرے اسٹیشن نافو تیر گاؤں کو کرایہ دینے لگا۔ تو اُس نے کہا معمولی کرایہ ہے تم سب آدمی بڑا جڑ۔ اس نے کہ حضرت سے کہا کہ معاملہ یہ ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ گاؤں دیر سے پکینی کا ملازم ہے۔ ریل کا مالک نہیں ہے۔ اس نے یہاں سے کرایہ برابر رہا ہرے ذریعہ دعوں کا ٹکٹ لے کر اُسے چھوڑ دینا کہ پکینی کا حق ادا ہو جائے۔ اور تم حق العباد سے بری ہو جاؤ اس ڈبے میں ایک کلینر ہی خزانہ آریہ بیٹھ بھی بیٹھا تھا۔ اس نے یہ ساری گفتگو سن کر کہا۔ کہ میں تو خوش ہوا تھا۔ کہ اس نے غریب پر ترس کھایا ہے۔ مگر آپ کی تقریر سن کر حکمرانوں کو گریہ خوشی یہ ایسا فی کس تھی۔

استغناء

استغناء بھی آپ کی طبیعت کا ایک خاصہ خاص تھا۔ اور آپ اس ارشاد نبوی کے منظر تھے۔ لَا اَسْأَلُكُمْ مَالًا
 مِنْ اَجْلِ رِثَةٍ اَوْ اَخْرَیْ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ۔ کہ میں تم سے قطعاً کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر صرف اللہ پر
 ہی ہے۔ جو ہے کہ آپ کو امراء و وزراء اور مال و قدر تو کیا عوام سے بھی استغناء تھا۔

امراء سے استغناء کا یہ عالم تھا کہ جہاں حیدر آباد دکن جانے والے اکثر علماء و مشائخ والی دکن کی خدمت میں باریابی اور ذلیفہ و
 کی آؤ فوٹے کر جاتے تھے۔ وہاں حضرت کو ملنے سے بھی عار تھا۔ جس کی تفصیل خود حضرت کی زبانی لطف دے گی۔ فرماتے تھے کہ
 ”اہل علم کے لئے یہ بات بہت ہی نا پسندیدہ ہے۔ کہ وہ امراء سے خلط کریں۔ اس لیے کوئی باکو جو مصلح سے نفع ہوتا ہے۔
 امراء سے وہ بھی ملتا ہوتا ہے اصرح قلوب پر مصلح کا وہ اثر نہیں رہتا۔ کچھ کو حیدر آباد دکن میں ایک دوست نے مدعو کیا
 دیوبند کے بعض احباب خاص اہل علم نے مشورہ دیا کہ وہاں نواب صاحب سے ملاقات ضروری ہے میں نے
 کسی کو کوئی جواب نہ دیا۔ وہاں پہنچ کر سات ہی روز گزرے تھے۔ کہ فلاں نواز جنگ کا ایک پرچہ آیا۔ جن میں لکھا تھا
 کہ سرور ہے مجھ کو زیارت کا اشتیاق تھا۔ مگر بد قسمتی سے تھا نہ جھون کی حاضری نہ ہوئی۔ برائے زیارت حاضر ہونا چاہتا
 ہوں۔ فلاں فلاں وقت ایسے فرائض منصبی سے فرصت ملتی ہے۔“

یہ فلاں نواز جنگ صاحب اس وقت نواب کی ناک کے بال اور ارکان سلطنت میں سے تھے آپ نے انہیں لکھا۔
 ”بے حد مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں دین اور اہل دین کی نسبت و عظمت ہے۔ مگر نیچے کی معطر پٹھر کہ افسوس
 کی بھی کوئی حد نہ رہی۔ کہ اس میں ہم سے کام نہ لیا گیا۔ جس کے ملنے کو زیارت سے تعبیر کیا گیا اس کو تو اپنے اوقات
 فرصت بتلا کر پابند کیا گیا اور خود آزاد رہے یہ کون سی فہم و تہذیب کی بات ہے۔“
 اس پر نواز جنگ صاحب نے اپنی بد فہمی کی معافی مانگی اور لکھا کہ حضرت والا ہی اپنی ملاقات کے اوقات تحریر فرما دیں
 حضرت نے اس پر ایک اور سبق دے دیا کہ۔

”اب بھی پورے فہم سے کام نہیں لیا گیا۔ مردہ بدست زندہ کی طرح جہلن مینر بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے
 سفر میں اوقات کا ضبط ہونا غیر ضروری ہے۔ آپ ساتھ رہیں۔ جس وقت مجھ کو فارغ دیکھیں۔ ملاقات کر لیں۔“
 اس پر انہوں نے لکھا کہ بد فہمی پر بد فہمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں نہ اب اپنے اوقات کو ظاہر کرتا ہوں نہ حضرت سے
 معلوم کرتا ہوں۔ جس وقت فرصت ہوگی حاضر خدمت ہو کر زیارت سے مشرف ہو جاؤں گا اگر فرصت نہ ہوئی تو روضہ

آؤں گا حجب حضرت نے دیکھا کہ سابق کارگر ہوا ہے۔ تو پھر انہیں دلجوئی کے طور پر لکھا ہے۔
 ”اب پورے فہم سے کام لیا گیا ہے جس سے اس قدر مسرت ہوئی کہ پہلے آپ کا میری زیارت کو جی چاہ رہا تھا اب میرا
 آپ کی زیارت کو جی چاہنے لگا۔ اگر فرصت ہو تو آپ انشرف لے آئیں ورنہ مجھ کو اجازت فرمائیے میں خود حاضر ہو
 جاؤں گا۔“

اس افہام و تفہیم کی غرض آئیے مجلس میں یہ بیان فرمائی کہ۔
 ”میرا رُخ عمل اس لئے تھا کہ یہ دنیا کے جس قدر بڑے لوگ ہیں۔ اہل دین کو بے وقوف سمجھتے ہیں ان کو یہ دکھلانا
 تھا کہ اہل علم و دین کی یہ شان ہے کہ پہلے تو تہذیب و تمدن سے بچا مقصود تھا۔ مگر جب وہ اپنی کوتاہی تسلیم کر چکے تو اب
 کھینچا نکہ تھا اللہ کا شکر ہے کہ دونوں سے محفوظ رکھا۔“

شیک وہ صاحب خود آئے اہل مجلس میں بعضوں نے دوسرے دیکھ کر کہا فلاں صاحب آ رہے ہیں۔ حضرت ٹھاکر مکھڑے تھے برابر لکھتے رہے جس وقت انہوں نے پہنچ کر اسلام علیکم کہا تب حضرت مخاطب ہوئے فرماتے ہیں کہ۔ میں نے سلام کا جواب دیا اور کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ پیچھے سے بہت ہی ہندب تھے۔ دو زانو ہو کر سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے برابر جگہ دے کر کہا بھی کہ اس طرف آ جاؤ یہ اس پر کہا کہ مجھ کو یہیں آرام ملے گا کچھ دیر بعد میرے مال پر نواب صاحب کی میدار مغز می اور ان نظام سلطنت کے واقعات بیان کرتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اگر اب صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ تو بہت مناسب ہے۔

میں نے پوچھا کہ یہ خواہش آپ کی ہے۔ یا نواب صاحب کی۔ کچھ سکوت کے بعد کہا میری خواہش ہے۔ میں نے مال کیا کہ جس وقت آپ نے ملاقات کے مناسب و نامناسب ہونے پر غور فرمایا ہوگا۔ اس پر بھی ضرور غور فرمایا ہوگا۔ کہ ملاقات سے نفع کس کا ہے؟۔ کہا نواب صاحب کا۔ میں نے کہا کہ نفع نواب صاحب کا اور ملاقات کی ترتیب چھو کو دی جا رہی ہے۔ طالب کو مطلوب اور مطلوب کو طالب بنایا جا رہا ہے۔ اس پر کوئی جواب نہ دیا۔ اب میں خود اس کے متعلق عرض کرتا ہوں کہ اس صورت میں کہ میں خود ملاقات کو جاؤں حضرت ہی مضرت ہے۔ نفع کچھ نہیں۔ اگر ملاقات کو گیا تو وہ مطلوب اور میں طالب ہوں گا۔ تو اس صورت میں ان کو مجھ سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ ہاں ان سے بھر کو نفع ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جو چیز ان کے پاس ہے وہ مجھے ملیگی یعنی دنیا۔ وہ بقدر ضرورت محمد اللہ میرے پاس بھی ہے۔ اور جو میرے پاس ہے۔ وہ بقدر ضرورت بھی ان کے پاس نہیں یعنی دین اور اگر میں گیا بھی۔ اور جو ان کے پاس ہے (یعنی دنیا منصب وظیفہ وغیرہ) وہ مل بھی گئی تو اس صورت میں ایک خاص ضرر بھی ہے۔ اگر قبول کرتا ہوں تو اپنے مسلک کے خلاف اگر قبول نہیں کرتا تو آداب شناسی کے خلاف کیونکہ قبول نہ کرنے میں ان کی سبکی اور اہانت ہوگی اور چونکہ میں اس وقت ان کے حدود میں ہوں اس کی پابندی میں (خراج وغیرہ) جو چاہیں میرے لئے تجویز کر سکتے ہیں تو نواب صاحب کو کوئی نفع نہ ہوگا۔ اور میرا نقصان ہوگا۔

یہ امر بھی نشانِ مسلمین کے خلاف ہے۔ کہ وہ اپنی رعایا کے مدعو کئے ہوئے شخص سے ملاقات کریں اس میں کم از کم لوگ ان کو تنگدلی کی طرف منسوب کریں گے جس میں ان کی اہانت ہے۔ کہ کیا خود نہیں مدعو کر سکتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ خیر اس میں ہے کہ نہ میں ان کے پاس جاؤں اور نہ وہ میرے پاس آئیں اگر ان کا جی چاہے تو تھانہ سے مجھ کو بلالیں میں خاص شرائط لے کر کے آ جاؤں گا کچھ عذر نہ ہوگا۔

یہ سن کر نواز جنگ کی آنکھیں کھل گئیں اور کہا کہ۔

”ان چیزوں پر تو ہم لوگوں کی نظر بھی نہیں پہنچ سکتی۔“

اسی لئے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ۔

”امراء سے ملا کہ خط کرنا (ملنا جلتا) اس میں امر از کا کوئی (معتدبہ) نفع نہیں۔ بلکہ اہل علم اور غلبہ کے یہاں نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس کو تالیف نہ کرتا ہوں۔“

حدت کی علت

”میں نے قصاص کا دودھ پیسا ہے اسی لئے بھی میرے مزاج میں حدت ہے مگر الحمد للہ شدت نہیں میرا دل اس قدر نرم ہے کہ مجھ سے کسی کی ذرا سی بھی تکلیف دیجی نہیں جاتی۔ اگر کسی کو اپنی تکلیف میں بھی دیکھ لیتا ہوں تو دل پگھل جاتا ہے اور پانی پانی ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے طبعی تعلق اور اتباع سنت کی وجہ سے اس آقا کی اولاد کا پتہ لگانے کی بعد ازاں بڑی کوشش کی کہ اس کے ساتھ سلوک کیا جائے مگر اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

”اللہ تعالیٰ کے فضل سے بچپن ہی سے میں جہاں کہیں رہا اعتزہ و اقرار بادینہ اور بیگانے سب ہی کا محبوب رہا۔ چھپچھپ سالانہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا۔ مگر آج کل کے لڑکوں کی سی گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں۔ اس لئے سب کو بچاؤ ناگوار ہونے کے بجائے معلوم ہوتی تھیں۔ دیوالی کے زمانہ میں میرے چچاؤنی کے بازار میں رشک پر دو روپہ چراغ جلائے جاتے تھے، دو نور ہندو بھائی چلتا شروع کرتے اور دو مل کو حرکت دے کر سب کو ایک طرف سے بھٹائے چلے جاتے۔ مگر کوئی برا نہ مانتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا۔“

”بچپن ہی سے میرا دماغ اس کا عادی ہے کہ اگر کوئی معمولی سے معمولی بات ہو مگر ترکیب کے ساتھ بیان نہ کی جائے تو میری سمجھ ہی میں نہیں آتی نہ خود الجھی ہوئی تقریر کروں نہ دوسرے کی الجھی ہوئی تقریر سمجھوں۔ کیوں کہ بچپن ہی سے میرا دماغ ایک خاص ترتیب کا عادی ہو رہا ہے۔“

یہ اسی لطیف المزاجی کا اثر تھا کہ اگر کوئی شخص الجھا ہوا کلام یا بے اصول کام کرتا جس کا آپ سے تعلق ہوتا تو آپ کو اسی وقت بخیر ہو کر درد ہونے لگتا حالانکہ دماغ آشنا قومی تھا کہ بلا تکلان سارا دن اور سوتے وقت تک کام کرتے رہتے تھے اور بالکل نہ ٹھکتے تھے۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت تھانویؒ کے درمیان بھی ویسے ہی اختلافات تھے جیسے حضرت شیخ الحدادؒ کے درمیان۔ مگر مخالفین نے کاندھ میں غالباً ۳۳۹ھ میں

مولانا مدنی کا معاملہ

حسین احمد صاحب مدنی سے حضرت تھانویؒ کے مشتعل سوال کیا۔ تو مولانا بہت ناخوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ ”یہ کیا وہابیات سوال ہیں؟ ہم تو ان کو ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا کہ اپنے دوسرے بڑوں کو۔ بعد ازاں معاندین نے ان اختلافات کو انتہائی اہمیت دی کہ محمد الماجدؒ بھی جیسی شخصیت بھی اس پر دیکھ کر اسے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ ۱۔

”کانوں نے بیشک یہی سنا تھا۔ کہ ان کے اور ان کے درمیان بے لطفی ہے نا چاہتی ہے۔“

(حکیم الامت ص ۱۷۷)

(۲) ”دیوبند کے حالات سے اللہ جانتا ہے کہ بڑا ہی دل دکھتا ہے خصوصاً اپنے دونوں بزرگوں کے اختلاف دیکھ کر۔“

(حکیم الامت ص ۱۷۷)

لیکن جب عبدالمجاہد صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی معیت میں پہلی مرتبہ تھانویؒ حاضری ہوئے تو عبدالمجاہد صاحب کیا دیکھتے ہیں؟ اس کی تفصیل خود ان کی زبانی یہ ہے کہ ۲۔

”نماز ختم ہوئی۔ سلام پھیرا۔ دعا مانگا کہ جو خوشی حضرت تھانویؒ آئے۔ نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑ گئی۔ ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑے اور بڑے التفات سے ملے۔ لوگ تو کہتے تھے کہ بڑے خشک مزاج ہیں خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں؟ یہ نرم باشاش چہرہ۔ یہ ہنستا مسکراتا ہوا لشرہ کسی خشک مزاج کا ہو

سکتا ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے درمیان بے لطفی ہے۔ ناچاتی ہے۔ کانوں نے بے شک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں دو دوست لگے مل رہے ہیں تعظیم و تکریم مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے توخیر ہوتی بھی عادت طبعی ہونے کی بنا پر بھی اور سن میں چھوٹے ہونے کی بنا پر بھی لیکن مشاہدہ یہ ہو رہا تھا کہ ادھر سے بھی آداب و دوام تکریم میں کوئی کمی نہ تھی۔ (حکیم الامت ص ۱۴-۱۵)

حضرت تھانویؒ کے آداب و احترام کے بعد حضرت مدنیؒ کا اخلاص و اکرام بھی قابل قدر ہے۔ جب مولانا مدنی صاحب کے مرید باقاعدہ الماجد صاحب حضرت تھانویؒ کے ہاں چند دنوں کے لیے ٹھانہ بھون جا کر قیام فراتے ہیں تو انہیں تھانہ بھون میں حضرت مولانا مدنیؒ کا یہ خط موصول ہوا۔

محترم المقام زید محمدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

والا نامہ محرمہ ۱۴ اکتوبر (۱۹۲۹ء) باعث سرفرازی ہوا تھا۔ اب تو جناب خانقاہ میں پہنچ گئے ہونگے خداوند کریم ہاں کی حاضری باعث برکات لا متناہیہ کرے آمین۔

چوں با صبیح نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر محبان بادہ پیمایا

یہ کو قوی امید ہے کہ انجناب دہاں پر اپنے اوقات کو مشاغل حقیقیہ میں صرف فرمادینگے جن کے متعلق ہدایت کرنے کی ضرورت نہیں۔

البتہ ایک ضروری عرضی محض اخلاص کی بنا پر کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ کسی غیر محل پر عمل نہ فرمائیں گے میں نے اب الارشاد حضرت مولانا (تھانویؒ) و امت برکاتم اور آپ حضرات کے اصرار پر اس وقت آپ کو بیعت کر لیا تھا مگر یقیناً یہ سب کچھ اپنی بد حالی۔ رویا ہی۔ ناگامی پر نہایت درجہ گریہ کناں ہوں اور سخت شرمندہ۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا و امت برکاتم کے دربار میں پہنچا دیا ہے۔ اور مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے اس اور تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ واللہ الحمد اللهم زد فرد۔ اب مناسب اور ضروری ہے کہ آپ مولانا سے بھی بیعت کر لیں۔ مجھے لوی امید ہے کہ مولانا و امت برکاتم آپ کو نہ ٹالیں گے میں نے خود ان دنوں جب حاضر ہوا تھا عرض کیا تھا کہ آپ جب نہایت ائیں اور درخواست کریں تو جناب ان کو ضرور بیعت کر لیں قواعد طریقت کے اصول پر بیعت کر لیتا ہی زیادہ تر مفید اور کارآمد ہے اسی کی بنا پر فیض کی زیادہ تر امید ہے

بھر رویاہ کو بھی کبھی کبھی دعوات صالحہ سے یاد فرمایا کریں نیز مولانا و امت برکاتم سے بھی دعا کی التجا کر دیا کریں۔

(نگاہ اسلاف حسین احمد غفرلہ دیوبند ۲۰ جمادی الاول ۱۳۴۸ھ) (حکیم الامت ص ۹)

اس گرامی نامہ کا جواب عبدالمجاہد صاحب کی بجائے حضرت تھانویؒ نے یہ دیا۔

مخدومی و مکرمی مولانا حسین احمد صاحب و امت فیضم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عبدالمجاہد صاحب کے نام پر گرامی نامہ آیا۔ اس میں مشورہ تحویل بیعت کا پڑھا گوا اس وجہ سے کہ اس کا

مخاطب نہیں۔ مجھ کو جواب عرض کرنے کا استحقاق نہیں۔ لیکن چونکہ انہیں تعلق مجھ سے ہی ہے نیز اس میں مجھ کو مخاطب بنانے کی یاد دہانی بھی ہے۔ اس لیے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔
 بھلا تو دیی عذر ہے۔ جو زبانی عرض کیا تھا۔ اور قدر سے مفصلاً یہ عرض ہے۔ کہ اس میں مولوی صاحب کا ضرر۔ جسے اس لیے امید ہے کہ اس مشورہ سے دبیح فرمائیں گے۔ وہ ضرر یہ ہے کہ میری خشونت و سوء خلق تو مشہور ہے مگر مولوی صاحب کی یہ رعایت و دلجوئی جو صمیم قلب سے ہے وہ آپ ہی کے انتساب سے مسبب ہے کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ وہ اس رعایت سے محروم کر دیے جائیں۔ دوسرے گوان کو مجھ سے موانست کافی ہے لیکر ^۱نفع کا مدار انظم مناسبت ہے۔ اس کو نہیں پہلی ملاقات میں طے کر چکا تھا۔ اور اسی بنا پر آپ نے میری سفارش کو قبول فرمایا۔ جس کا میں شکر گزار ہوں اور اگر ان بناؤں کو آپ ضعیف خیال فرمائیں تو میں بھی ان کی تقویت پر زور نہیں دیتا۔ لیکن جب اول بار میں یہ قول خود ہی خاطر منظور تھی۔ سواب بھی میری خاطر نہائی جائے اور جس طرح کام چل رہا ہے چلنے دیا جائے کہ آپ ان کے محذوم رہیے اور مجھ کو خادم رہنے دیجئے۔ اس بعد تبدیل میں میری اور ان کی دونوں کی پریشانی مضمحل ہے جس کا گوارا کرنا اخلاقی سامی سے بعید اور بہت بعید اور جب اس کا مجھ پر مدار ہے اور میری طرف سے محض انکار ہے تو مولوی صاحب کو ایسی بات کا حکم فرما جو ان کی قدرت سے خارج ہے۔ تکلیف ملا لیا طاقی ہے۔ جو ہر پہلو سے منفی ہے۔ و اسلام

ناکارہ تنگ انام۔ اثرات برائے نام از مخدع بھون جہادی الاول ۱۳۸۸ھ (حکیم الامت ص ۹۲-۹۱)۔
 یہ خط و کتابت عین اختلافات کے زمانہ یعنی ۱۹۲۹ء کی ہے۔ اس لیے عبدالمجید صاحب لکھتے ہیں کہ:-
 ”سیاسی اختلافات مولانا حسین احمد سے اس وقت بھی تھے۔ اس پر بھی اس وقت تک ان کا پورا لحاظ و احترام قائم تھا“ (حکیم الامت ص ۳۳)

زمانہ گزرتا گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اختلافات کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ پورے اٹھ سال بعد بھی ان ہر دو حضرات کے درمیان عزت و عظمت کے وہی قابل رشک نظارے دیکھے گئے۔ عبدالمجید صاحب اس بات کی خود شہادت دیتے ہیں:-
 ”تھانہ بھون اور دیوبند کے سیاسی مسلک میں اختلاف کچھ آج سے نہیں۔ مدت دراز سے بالکل واضح و غیر مخفی تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں بزرگوں کے ذاتی تعلقات بڑے خوشگوار اور شگفتہ تھے نہ شفقت میں کوئی کمی حضرت تھانویؒ کی جانب سے تھی اور نہ احترام و بزرگداشت میں کوئی فرق مولانا حسین احمد کی طرف سے“ (حکیم الامت ص ۵۱)

یہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ جن اکابر کو دانستہ یا نادانستہ ایک دوسرے کا سخت ترین مخالف ظاہر کرنا نہیں کس درجہ التفات و ارتباط تھا اور ان کے اختلافات بھی کیسے اصول صحیحہ کے موافق اور محدود شرعیہ کے اندر کسی دوسرے مکتبہ فکر میں مثال مافی مشکل ہے۔ بقول عبدالمجید صاحب دیوبادی:-
 ”قوم عجیب افراط و تفریط کے مرض میں اندھا دھند مبتلا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے تو اسے پوجتے لگے۔ خفا ہوئے تو گالیاں دینے لگتے برسانے لگے۔ گویا ان کا

افراط و تفریط

یا امیر فرشتہ ہو۔ اگر فرشتہ نہیں ہے تو پھر شیطان کے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ توازن و اعتدال کا گویا قیط پڑ گیا ہے اور اشخاص و رجال کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا ہم لوگ بھول ہی گئے ہیں شیعینت اور خارجییت دونوں بے عزت کی پیدوار ہیں اور اہل سنت کا مذہب جو بین بین اور سارے پہلوؤں کے درمیان ایک حکیمانہ توازن کے ساتھ قائم ہوا تھا افسوس کہ وہ خود اس بدیختی کا شکار ہوا جا رہا ہے۔ (حکیم الامت ص ۹۱)

جماعت اسلامی

مکھنوں کے مشہور ماہنامہ ”الفرقان“ کے ایڈیٹر اور جماعت اسلامی کے سابق رکن مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے مودودی صاحب کی تحریک اسلامی میں شرکت اور اس کے موافقی شریعت ہونے کے متعلق گفتگو کرنے کے لیے حضرت کی خدمت میں بریلی سے آنا چاہا اور اجازت چاہی تو حضرت نے صاف لکھ دیا کہ :-

”اگرچہ کوئی اعتراض شرعی لحاظ سے بظاہر نہ وارد کیا جاسکے۔ لیکن مرادوں اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ہی زبانی بھی عرض کروں گا لہذا اس ضرورت کے لیے زحمت سفر نہ فرمائی جاوے۔“ (خاتمہ السوانح ص ۱۲۳)

اس صاحبِ قلم کو کیا علم تھا۔ کہ قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔ چنانچہ حضورؐ نے ہی عرصہ بعد مولانا موصوف اس تحریک میں شریک رہ کر اور اس میں قابل اعتراض امور کا خود مشاہدہ کر کے ذاتی تجربے کے بعد اس سے الگ ہو گئے اور بزبانِ حال اعتراف کر لیا کہ :-

انقصا و خراسۃ المومن فافہ ینظر بنور اللہ

ان کی علیحدگی کی خبر سن کر خود ہم نے بھی انہیں اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے خط لکھا کہ کیا آپ اس جماعت کے امیر ہیں روحانیت کی بجائے انانیت دیکھ کر تو علیحدہ نہیں ہوئے تو مولانا موصوف نے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ شوال المکرم ۱۳۷۳ھ میں لکھا کہ :-

”متمرمی سلام منون

”جماعت اسلامی کے نظام سے میری علیحدگی کے بارہ میں آپ کا فکر ایک حد تک صحیح ہے۔“

تخیل پاکستان

پاکستان کے لفظ سے دنیا پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۳۳ء میں پوہدری رحمت علی جو شیار پوری کی زبانی آشنا ہوئی۔ جبکہ چند وجوہاتوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے الگ کیا جائے۔

ہندوستان میں ۱۰ ملای سلطنت کے قیام کا خیال علامہ اقبالؒ نے مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۳ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران میں ظاہر کیا جس کا ۳۴ مارچ ۱۹۳۳ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں علی نقی صاحب الدین کے طور پر ایک تفسیر لکھی

۱۰ حضرت تھانویؒ کا انتقال ۱۹۳۳ء قادیان ۲۰ جولائی میں ہوا۔ ۱۱ سیرت اشرف ص ۵۴۷ تا ۵۴۸

کے ذریعہ باقاعدہ مطالبہ کیا گیا۔ مگر علامہ اقبالؒ کے خطبہ اور لاہور قرار داد میں لفظ پاکستان کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے ہندو اور برطانوی پریس نے تفسیر و استہزاء کے طور پر اچھالا۔ جو قائد اعظمؒ کی کوششوں سے ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو حقیقت بن کر منظر شہود پر آگیا۔

تاریخی مغالطہ

اسلامی سلطنت کے قیام کا جو خیال علامہ اقبالؒ نے مسلم لیگ کے تذکرہ بالا اجلاس میں پیش کیا تھا بالکل وہی خیال ان سے بہت پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی مجلس عام میں کئی بار ظاہر فرمایا تھے۔ بلکہ اس کا مکمل خاکہ اور حصول کا پروگرام بھی بنا چکے تھے۔ جون ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی جوہر مرحومؒ جو ابتداء کا گمراہ کے بہت بڑے حامی تھے ان کے معتقد خاص بلکہ دست راست اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مرید یا تمیز مولانا عبد الماجد صاحب نے اپنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ تھانہ بھون حاضر ہوئے اور اپنی اس اولین ملاقات کا حال اپنی کتاب نقوش و تاثرات میں ان الفاظ میں درج کیا :-

۱۹۲۸ء تھانہ۔ اور خطاب روزنامہ ”ہمدرد“ کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجہان ناگزیر رہا تھا۔ گفتگو آئی۔ حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں کا فور ہو کر ہیں۔ کون کتا بے کہ حضرت گوہر منشی آدمی ہیں۔ لا حول و لا قوۃ جس نے بھی ایسا کہا جان کر یا بے جا بنے۔ ہر حال جھوٹ ہی کہا۔ یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوش دینی اور غیرت ملی میں کسی ”خلافتی“ سے ہرگز کم نہیں۔ پاکستان کا تحیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں بیس کان میں ٹپیں بس صرف حضرت کو ہم لوگوں کے اس وقت کے طریق کار سے پورا اتفاق نہ تھا لیکن یہ اختلاف کچھ ایسا بڑا اختلاف نہیں۔ نفس مقصد یعنی حکومت کا فرمانہ سے گلو خلاصی اور دارالاسلام کے قیام میں تو حضرت ہم لوگوں سے کچھ پیچھے نہ تھے۔ عجب نہیں جو کچھ آگے ہی ہوں۔ حضرت کی گفتگو میں یہ جز بالکل صاف تھا۔ حضرت کو حکومت وقت سے جو مخالفت تھی۔ وہ اس کے ”کافرانہ“ ہونے کی بنا پر تھی۔ نہ کہ اس کے بدیسی یا غیر ملکی ہونے کی بنا پر۔ (نقوش و تاثرات ص ۳۸)

یہ اعتراف و انکشاف ہندوستان کے اس عظیم صحافی کا ہے۔ جو شروع شروع میں سیاسی لحاظ سے حضرت تھانویؒ کے ہم خیال نہ تھے۔ بلکہ کانگریس کی حامی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آج ارباب کانگریس کو بالخصوص اور عام دنیا کو بالعموم سچی بات سناتے ہیں ہندو پاکستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ممکن ہے آپ کے لیے ان کا یہ انکشاف موجب حیرت ہو۔ کہو کہ یہ بات علامہ اقبالؒ کے اظہار کے پورے پچیس سال بعد منظر عام پر لائی جا رہی ہے مگر کسی بات کا علم میں نہ آنا اس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اور نہ واقعات انسان کی طرح جھوٹ بول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو عقیدت کے پردہ میں مادیہ ویر تک چھپایا جا سکتا ہے۔

نظام پاکستان کا خاکہ

اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت تھانویؒ بھی ویسا ہی نظام پاکستان چاہتے تھے جس کا نقشہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ نے اپنے خطبات و اعلانات میں پیش کیا تھا جس کا قوم آج تک مطالبہ کر رہی ہے۔

اس سوال کا جواب عبدالمجید صاحب دریا بادی کی اس اولین ملاقات کی تفصیل سے ملتا ہے جو انہوں نے جون ۱۹۲۸ء میں حضرت تھانویؒ سے کی اور جس کے ضمن میں انہوں نے لکھا ہے کہ :-

پاکستان کا تخیل۔ خالص اسلامی حکومت کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں ہمیں کان میں پڑیں۔
حضرت کی گفتگو میں یہ جزو بالکل صاف تھا۔ (فقوش و ناثرات ص ۳۳)

”جیسے یہ غلط ہے کہ نماز روزہ کو کامیابی میں کیا دخیل ہے۔ اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں کہ خالی نماز روزہ کامیابی کے لیے کافی ہے۔ بلکہ دلائل اس کے شاہد ہیں کہ خالی نماز

روزہ سے کبھی کامیابی نہیں ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ بلکہ ایک دوسری چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ چیز قتال جلد ہے۔ کیا کو میں نماز روزہ نہ تھا۔ بھلا، صحابہؓ سے بڑھ کر نماز روزہ کس کا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دیکھ لیجئے کہ کس کے اندر مسلمان اتنے دنوں تک رہے۔ لیکن غلبہ نہ ہوا۔ جب ہجرت ہوئی۔ قتال ہوا اس وقت غلبہ حاصل ہوا۔ تمام تاریخ اسلامی اٹھا کر دیکھ لو۔ کہیں اس کی نظیر دے گی کہ خالی نماز روزہ سے مسلمانوں کو غلبہ ہوا ہو۔ البتہ ضروری نماز روزہ بھی ہے۔ غلبہ کی حیثیت سے نماز روزہ اور قتال میں فرق یہ ہے کہ نماز روزہ تو شرط ہے غلبہ کی۔ اگر نماز روزہ اور طاعت ہوگی۔ تو غلبہ ہوگا۔ اور جہاد علت ہے غلبہ کی۔ گو نماز روزہ فرض میں ہے۔ اور جہاد فرض نہ لکھا ہے۔ مگر غلبہ کی علت جہاد ہی ہے۔ بس ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے اور یہ میری رائے آج سے نہیں ہمیشہ سے ہے کہ جب تک طاعت کے ساتھ قتال نہ ہوگا۔ اس وقت تک مسلمانوں کو فلاح میں نہیں ہو سکتی۔ اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ لہذا محنت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی امیر المؤمنین ہو اور جس کو امیر المؤمنین بنایا جائے۔ اس کے اندر تین صفات ہوں۔ ایک تدبیر یعنی وہ دیندار ہو۔ دوسرے وہ سیاست سے واقف ہو اور تیسرے اس کے اندر ہمت ہو۔ اب یہ شکل یہ ہے کہ بعض کے اندر تدبیر تو ہے مگر سیاست سے واقفیت نہیں اور بعض کے اندر ہمت نہیں۔“ (آثار رحمتہ ص ۳۳)

چونکہ قائد اعظم کے اندر سیاست بھی تھی اور ہمت بھی۔ اس لیے آپ نے ان میں تدبیر پیدا کرنے کی طرف فوری توجہ مبذول فرمائی تاکہ وہ ان تمام ضروری صفات سے منفع ہو جائیں جو ایک امیر المؤمنین کے لیے ضروری ہیں۔

حضرت تھانویؒ کی یہ تمام جدوجہد ۱۹۴۷ء میں لاہور کے تاریخی اجلاس کے اندر قرار داد پاکستان پاس کرنے سے پہلے کی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت تھانویؒ نے نہ صرف سب سے پہلے پاکستان کا تخیل پیش کیا۔ بلکہ اس کے حصول کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں بھی آپ کا درجہ السابقون الاولون کا ہے۔

قائد اعظم کی دینی تربیت

حضرت تھانویؒ کے مرید خاص اور قائد اعظم کے یار غار نوامس جیش علی خاں صاحب جن کے پاس اکثر قائد اعظم اپنی ہمیشہ وس فاطمہ جناح کے ہمراہ موسم سرما میں، باغیت جاکر رہا کرتے تھے اور جو انہیں حضرت تھانویؒ کے مواظفہ ملفوظات سنایا کرتے تھے کہتے ہیں :-

”یہ بالکل حقیقت ہے کہ قائد اعظم کی تمام تردینی تربیت حضرت تھانویؒ کا فیضان تھا اور ان کا اسلامی شعور حضرت والا

کی بدولت تھا۔ مولوی شبیر علی صاحب تھانویؒ نے قائد اعظم کو حضرت والا کے قریب لانے میں بڑا کام لیا۔
قائد اعظم با محبت کے دوران قیام میں حضرت والا کا بہت غلوں اور ادب سے تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ
قائد اعظم کو بخانا بھون حاضر ہونے کا انتہائی شوق تھا۔ لیکن افسوس کہ چند وجوہات کی بناء پر ان کی یہ تمنا پوری
نہ ہو سکی

قائد اعظم پر آخر زمانہ میں جو مذہبی رنگ غالب ہوا۔ اور جس کو ہم سب نے دیکھا وہ حضرت رحمۃ اللہ کی ہی بی بیوں کا
صدقہ تھا۔
(تعمیر پاکستان اور علماء ربانی) ص ۹۲

داستان شکوہ لیگ

آخری سیکرٹری پنجاب پرافنشل مسلم لیگ، ارگن رائزنگ کمیٹی کی معرفت سر سکندر حیات
وزیر اعظم پنجاب نے حضرت تھانوی کو مسلم لیگ امیدوار شیخ صادق حسن کی حمایت

کرنے کے لیے خط لکھا اس کا جواب حضرت نے یہ دیا

(یہ تاریخی اور بصیرت افروز مکتوب سر سکندر حیات خاں کے خط کا صرف جواب ہی نہ تھا۔ بلکہ ارباب مسلم لیگ کے لیے
مکمل داستان بھی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ صادر ہوا۔ اتھرتو مسلم لیگ کا ہمیشہ حامی ہے اور وہ حمایت الحمد للہ کہ کسی غرض
سے نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی دنیوی اصلاح میں اس وقت مسلم لیگ ہی میں شامل ہونے میں سمجھ رہا ہوں۔ اور کانگریس میں داخل
میں دینی و دنیوی دونوں کا نقصان خیال کرتا ہوں۔ لیکن ہر مسلمان بھانتا ہے کہ دنیا سے دین مقدم ہے اور تاریخی واقعات
سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک مسلمان دین اور مذہب پر قائم رہے اور اس قدر جنگی سے قائم رہے۔ مگر لوگ ان کو محض سمجھنے کے
دین کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل کی دھن بھی اس وقت تک دنیوی اعتبار سے بھی مسلمان ہر طرح کامیاب رہے اور تمام
سے آنکھ لانے والا کوئی نہ تھا۔ اور جب سے اس میں کمی آئی۔ اسی وقت سے ذلیل ہوتے ہوئے اب ان کی ذلت کی انتہا ہو چکی۔
تمام مسجد حضرت اپنی تقریروں اور تحریروں میں فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنی ماضی کی طرف لوٹنا چاہیے۔ مگر معلوم اس کا مفہوم
لیا ہے۔ کہ اس کو فرماتے سب ہیں۔ جانتے سب ہیں۔ مگر دین کی باتوں سے گریز ہے۔ کہتے ہیں۔ مگر عمل نہیں کرتے۔ سو اگر حضرات
کی طرف توجہ فرماتے۔ تو آج لیگ کی ترقی سے تمام اقوام خائف ہوتیں۔ مگر معلوم کون سی چیز ماننے ہے کہ اس طرف نہیں آتے۔
آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسہ پٹنہ میں ایک پیام بھیجا تھا جو وہاں پڑھا بھی گیا تھا۔ اور سب حضرات کو تقسیم بھی کیا گیا تھا۔ اس میں
چیزوں کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی۔ اول نماز کی پابندی کو لیگ کے مقاصد میں شامل کیا جاوے۔ دوسرے وضع اسلام
برمبہر پر لائی قرار دیا جاوے نماز کا ارکان اسلام میں اہم ترین رکن ہونا ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ اور وضع خاص رکھنا تو ایسی چیز ہے
دنیا کے تمام سیاست دان اس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جرنی کا لباس الگ ہے جاپان کا الگ ہے۔ فرانسس کا الگ ہے۔
فوجی وردی تو لازمی طور پر الگ ہوتی ہے۔ اگر جرنی سپاہی مثلاً انگریزی وردی ہیں کہ جرمن فوج میں شامل ہو۔ اور ویسے
اور مستعد ہو۔ لیکن صرف وردی کی تبدیلی کی وجہ سے وہ مستوجب سزا کا ہوگا دعویٰ ہذا۔ تو کیا مسلمانوں کے لیے جو حق تھانے کے
کوئی خاص وضع اور امتیاز ضروری نہیں ہے؟ ہے اور ضروری ہے!

لیکن انفسوس کہ حضرات لیگ نے ان دونوں باتوں کی طرف توہیر نہ فرمائی۔ اگر ان باتوں کی طرف توہیر فرماتے۔ تو دین کی اور باتیں بھی بول تری دنیا میں بھی مؤثر نہیں۔ میں اور بتلاتا۔ مگر مجھے واقعی حضرات لیگ سے یہ شکایت ہے کہ مولویوں کو صرف ایک شی کے دقت کو پوچھا جاتا ہے اور ان کے فتوے پر کل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان کی بات کی طرف کوئی کان نہیں دھرتا۔ ہم اگر ذاتی منافع کے لیے کچھ بھی لکھیں تو بیشک نہ سننے نہ ماننے۔ لیکن اگر ان حضرات کو ہم پر اعتماد ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم فتویٰ صحیح دیتے ہیں۔ تو کیا دھبر ہے کہ وہ ایک شی ہی کے لیے صحیح ہوتا ہے۔ دوسرے وقت وہ قابل عمل نہیں ہوتا۔ میری عرض لیگ کی حمایت سے یہی تھی کہ اس میں مجدد سمجھدار۔ عالی دماغ مسلمان ہیں۔ تو ان حضرات سے جب دینداری کے لیے کہا جاوے گا۔ تو بہت جلد مان لیا جاوے گا۔ تو گویا لیگ کی حمایت دین کی حمایت یعنی اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اصل چیز یعنی دین ہی سے بے تعلقی اور بے توجہی ہے۔ تو بجز خاموشی کے اور کیا کروں۔ آپ ہی انصاف فرمادیں کہ اب میرا کیا جی چاہیے! یہاں تک تو وہ امور عرض کئے تھے۔ جن کی طرف حضرات لیگ کو متوجہ کر چکا ہوں اور پھر بھی انہوں نے عمل نہیں کیا۔

اب دوسری چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔ جن سے میں بہت پریشان ہوا ہوں ایک تو لیگ کا علامہ مشرقی سے تعاون اور دوسرا فمرداران لیگ کا علامہ کے وقار اور ملازم کے بے ادب کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ مشرقی کی کتاب میں نے دیکھی ہیں اور جہاں تک ہو سکا میں نے اس کے قوال کی تاویل بھی کی۔ مگر وہ انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور اس کے عقائد جن کی رفتار و فتنہ وہ خاموشی سے تبلیغ کر رہا ہے صریح کفر ہیں اور چونکہ لیگ اس وقت تک مسلمانوں میں مقبول جماعت ہے۔ مگر خاکساروں کی جماعت کی وجہ سے لوگ لیگ سے بھی بظن ہو رہے ہیں جس کا مجھے اس طرح علم ہے کہ انکاف ہندو سے ان لوگوں کے سوالات میرے پاس آرہے ہیں۔ جو اب تک مسلم لیگ کے سرگرم اور عامی ممبر تھے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ لیگ جب خاکساروں سے تعاون کرتی ہے۔ تو اب مسلم لیگ میں داخل رہنا جائز ہے یا نہیں؟ عرض ان خاکساروں سے ملنے کی وجہ سے بھی بدنام ہو رہی ہے۔ اور جو شخص اب لیگ کی جدید حمایت کرے گا۔ وہ بھی بدنام ہوگا۔ دوسری چیز لیگ والوں کا بلا کسی استثناء کے علماء کے وفادار کو تباہ کرنے کی ترغیب دینا ہے۔ اگر کانگریسی علماء سے بچایا جاتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اختلاف مسلک کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر بلا کسی استثناء کے علماء کے اثر کو مٹانے کی سعی کے بغیر تو مذہب کو مٹانے کی سعی کرنا ہے۔ اور جو جماعت دین کو مٹانے کی فکر میں ہو۔ آپ ہی انصاف فرمادیں کہ اس سے میں کیا تک تعاون کر سکتا ہوں۔

مجھے بھی انفسوس ہے کہ مجھے جناب سے نیاز حاصل نہیں ہے اور سرسکندر حیات خاں صاحب کے ارشاد کے بعد مجھے ایک ایسی خبر لکھنا پڑی جو بظاہر خلاف تہذیب ہے۔ مگر مسلمانوں کی اصل تہذیب جو نکر دیں ہے۔ اور دین کی خیر خواہی مجھے مجبور کرتی ہے۔ کہ ان حالات میں میں اس ارشاد کی تعمیل سے عذر کروں۔ اس لیے مجھے امید ہے۔ وہ معاف فرمادیں گے۔ اور اگر ذرا ٹھنڈے دل سے عذر فرمادیں گے۔ تو شاید وقت آجائے اور لیگ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دے۔ تو میں لیگ کا ہر وقت غلام ہوں، غیر میں ایک دم تنزل کر کے عرض کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں اور وزیر صاحب کی خدمت میں بھی جس سے مجھ کو ان کے غائبانہ اوصاف خصوصی اسلامی محبت سن کر مدت سے خاص محبت ہے وہ عرض ہے یہ ہے اگر پابندی شرعی وضع کو مقاصد لیگ کا جزو بنانا کسی دنیاوی مصلحت کے خلاف کہا جاوے۔ یا محبت سے بالاتر خیال کیا جاوے۔ تو کم از کم ان چیزوں کو تو ممنوع قرار دیا جاوے جن سے لیگ کی دنیوی قوت کو یا بالظہر دیگر اسلامی مفاد کو صدمہ یا مصلحت پہنچتا ہو۔ جن کی طرف میں نے اس خط میں اشارہ کیا ہے۔ اور اگر خدا نہ کرے یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو پھر میں کسی کی آزاد دی طرح غلامانہ خبر دیتا

گر یہ درخواست ضرور کروں گا کہ پھر میری آزادی میں بھی خلل نہ ڈالا جائے۔ اور مجھ کو اجازت دی جائے کہ اپنے لیے جو طریق عمل سمجھا جائے تجویز کروں۔

میں جانتا ہوں کہ اس خط میں بہت سے ایسے امور عرض کئے گئے جو اصل سوال سے زائد ہیں۔ مگر اس کا باعث صرف یہ ہوا کہ خط سے اسلامی ہمدردی کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ پھر جناب وزیر صاحب کی توہج بھی اس لیے توقع ہوئی کہ شاید یہ توہج کچھ ترقی میں مؤثر ہو جائے۔ لیکن اگر یہ بے محل سمجھا جاوے۔ تو آپ سے اور جناب وزیر صاحب سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر توہج صرف توہج کی تکلیف نہ فرمائی جاوے باقی دعا ہر حال میں اپنا فریضہ ہے۔

حافظ و ظیفر تو دعا گفتن است و بس در بند کن مباش کنشید یا شنید

(مشاہدات و اردات صفحہ ۲۰۵ تا ۲۰۷)

لطافت طبع

حضرت تھانویؒ کی زبان فیض ترجمان اور قلم حقیقت و رقم سے اکڑا بیٹے چھوٹے چھوٹے فقرے نکلا کرتے جن کے ذریعہ آپ کثرت کو لطافت میں بدل دیتے تھے۔ جیسا کہ مندرجہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

ایک طالب علم نے لکھا کہ میں نے اپنے قلب کو آپ کی تنبیہ کے بعد ایسا پایا جیسے اس کے اندر گڑھ درگڑھ ہو رہا ہو۔ آپ جواب بھیجا کہ :-

”مبارک ہو! یہ گڑھ خاکساری کی خاک سے مل کر کھاد کا کام دے گا۔ اور ایسی جناس پیدا ہوگی کہ روحانی غذا ہو جائیگی۔“
ایک طالب علم نے غلبہ خشیت میں لکھا کہ مجھے سخت خطرہ درپیش ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ خطرہ تو بحر معرفت کا نقص اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر دیا کر دے۔

اس سلسلہ میں ایک اور نے لکھا کہ سخت الجھن ہے۔ تحریر فرمایا کہ یہ الجھن تو مقدمہ ہے سلجھن کا ان مع الضمیر

ایک طالب علم نے لکھا کہ میں بالکل کورا ہو گیا ہوں۔ فرمایا کورا ہونا برا نہیں کورا ہونا برا ہے بلا سے کورا ہو کر نہ ہو۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ اس طریق میں خود رانی نہ کرے بلکہ خود کو راہی کرے یعنی اپنے کو تغیر و دلیل سمجھے پس دھن اور دھیان

اہتمام سفر آخرت

اثاث البیت کے متعلق وصیت

اثاث البیت کے متعلق وصیت اشرف السوانح جلد سوم ۱۷۷ تا ۱۷۸ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنی مملوک

اشیاء اور وقف ہماؤ کی فہرست وغیرہ اسی تفصیل سے دی ہے جیسی مملکت اسلامیہ جمہوریہ کا حکمہ تخصیص موت (امیٹ) پر اپنی ٹیکس ایکٹ ۱۹۵۰ء کی رو سے کسی لاکھ پتی کے مرنے پر طلب کرتا ہے۔ یعنی جس تفصیل سے متوفی کی فہرست پیش کرنے کا مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۰ء تقاضا کرتا ہے۔ وہی تفصیل قانون کے خوف سے نہیں۔ خدا کے خوف سے

پنے خود بخود اپنے وصیت نامہ میں درج کر دی تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ اگر طالع میں خوف خدا پیدا ہو جائے۔ تو قانون سازی کا نام بالکل برائے نام رہ جائے۔

الحقوق کو وصیت

حضرت تھانویؒ اپنے مذکورہ بالا وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ :-
 میرے بعض اخلاق میٹر کے سبب بعض بندگان خدا کو حاضرانہ و غائبانہ میری زبان اور ہاتھ سے کچھ گفتیں پہنچی ہیں۔ اور کچھ حقوق ضائع ہوئے ہیں۔ خواہ اہل حقوق کو اس کی اطلاع ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ میں نہایت عاجزی سے یہ پھوٹے جڑوں سے استدعا کرتا ہوں کہ اللہ دل سے معاف کر دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی تقصیرات سے درگزر فرمادیں گے۔ میں بھی کے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دین میں عفو و عافیت عطا فرمادیں۔ معذرت کرنے والے کی تقصیر سے درگزر کرنے جی ضرورت آتی ہے۔ اور اگر معاف کرنے کی ہمت نہ ہو تو حسب فتویٰ شرعی مجھ سے عفو لے لیں۔ خدا کے لیے قیامت پر مواخذہ لیکن کہ اس کا کسی طرح تحمل نہیں۔

اس قبیل کی کوتاہیاں جو دوسروں سے میرے حق میں ہو گئی ہوں۔ میں لطیف خاطر گذشتہ اور آئندہ کے لیے محض خدا تعالیٰ کے کرنے کو اور اپنی خطاؤں کی معافی کی توقع پر وہ سب معاف کرتا ہوں۔

توں کو وصیت

میں اپنے سب دوستوں سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے سب معاصی صغیرہ و کبیرہ عذر و خطا کے لیے استغفار فرمادیں۔ اور میرے اندر جو عادات و اخلاق ذمیر ہیں۔ انکے ازالہ کے لیے دعا کریں۔
 میں اپنے دوستوں کو خصوصاً اور سب مسلمانوں کو عمومیاً ہمت تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ علم دین کا خود سیکھنا اور لاگو تعلیم کرنا شخص بن میں ہے۔ خواہ بذریعہ کتاب ہو یا بذریعہ صحبت۔ بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ فتنہ دینیہ سے حفاظت ہو سکے جن کی آج کل کثرت ہے۔ اس میں ہرگز غفلت یا کوتاہی نہ کریں۔

بہن کو وصیت

میں اپنے متنبین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی عمر بھر یاد کر کے سورہ یسین شریف۔ تین بار قیل ہوا اللہ شریف پڑھ کر مجھ کو بخش دیا کرے۔ مگر اور کوئی امر خلاف سنت (بدعات عوام) نہیں نہ کریں۔

میرے ایصال ثواب کے لیے کبھی جمع نہ ہوں۔ نہ اہتمام سے نہ بلا اہتمام۔ اگر کسی دوسرے اتفاق سے بھی جمع ہو جائیں تو تلاوت کے وقت قصداً متفرق ہو جائیں اور ہر شخص منفرداً بطور خود جس کا دل چاہے دعا و صدقہ و عبادت نافذ کرے نفع پہنچا دے نیز مشعل چیزوں کے ساتھ متعارف طریق سے تبرکات سامعہ نہ کریں۔ البتہ اگر کوئی مجتہد سے شرعی طریق سے اس کا مالک بن بطور پر اپنے پاس رکھے تو مضائقہ نہیں۔ اس کا اعلان اور دوسروں کو دکھانے کا اہتمام نہ کیا جائے۔

حقی المسکان و نیاز داریا سے جی نہ لگادیں۔ اور کسی وقت فکر آخرت سے غافل نہ ہوں ہمیشہ ایسی حالت میں رہیں کہ اگر اسی وقت اجل آجائے۔ تو فکر اس نما کا مقتضی نہ ہو۔ **لَوْلَا بَعَثْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَلِّتُ وَأَكَلْتُ مِنَ الْخَالِطِينَ**۔ اور ہر وقت میں کہ

شاید میں نفس۔ نفس واپسین بود

فی اللہ وام کے گناہوں سے قبل رات کے رات کے گناہوں سے قبل دن کے استغفار کرتے رہیں اور حق الوعد

محقق العباد سے سکدوش رہیں۔

سوانح حیات کے متعلق وصیت

چونکہ محبت میں اکثر مذاخ غیر واقعہ مشہور کر دئے جاتے ہیں۔ اس سے میں اپنی سوانح کا لکھا جانا پسند نہیں کرتا۔ اگر کسی کو بہت ہی بیتابی کا ہو۔ اور دوسرے اہل تدین و تحقیق بھی اجازت دیں تو روایت میں احتیاط شدید کو واجب سمجھنا چاہئے۔ درنہ میں بری ہونا میں علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

آمادگی سفر آخرت

حضرت گو ضبط و صبر اور انتقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ اور نہ آئندہ کے خطروں کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو۔ مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی۔ گو ان کی زندگی اور طرز زندگی جس صفائی اور باقاعدگی کی عادی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ ذلتِ اخیر کے لیے کوئی کام اٹھانا نہیں رکھا تھا۔ کہ سالک ہر لمحہ کو لمحہ اخیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کی تیاری رکھتا ہے۔ یہی حال حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی تمام انتظامات اور حساب کتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی۔ عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا۔ گویا ہر وقت آمادہ سفر تھے۔

آخری عطیہ

آپ کی آخری تصنیف لطیف و بواور النوادر کے ۷۵۰ نسخے آپ کی وفات سے چند روز قبل ہی عبد الکریم صاحب ریٹائرڈ سشن جج نے اپنے مصروف طبع کر کے حضرت کی خدمت میں بھیجے۔ جو اسی وقت بعض خاص مقربین کی فرست تیار کرائی۔ جو غالباً ۱۱ تھے اور ہر ایک کو بواور النوادر کا ایک ایک نسخہ دینے کی ہدایت کی۔ اس فرست میں حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب ہالندھری کا نام نامی بھی شامل ہے۔ اس آخری تقسیم سے جو کتابیں پہنچ رہیں ان کے متعلق فرمایا :- کہ وہ سب بھیجئے والے سشن جج صاحب کو واپس کر دو۔ باوجود اسی طرح کیا گیا۔ (سیرت اشرف)

آخری عطیہ

۶ جولائی ۱۹۴۳ء سے حضرت پر غنودگی طاری رہنے لگی اور امتحان ملفوظات سے حاضرین محروم بنے گئے۔ وفات سے دو چار روز قبل خواجہ عزیز الرحمن صاحب سے مصروف قبل و قال رہے۔ بہت ہی عجیب و غریب مضامین بیان فرماتے رہے اور بالآخر فرمایا کہ :-

”خواجہ صاحب یہ باتیں ہیں کھنکھنے کی۔ خواجہ صاحب پھر یہ باتیں سننے میں نہ آئیں گی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں۔“
پھر مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کا یہ مصرع پڑھا :
بیدل کا یہ شعر پڑھا :

بیدل خستہ کو پاؤ گے کہاں کرو اس کھمبائی چند روز
وفات سے صرف ایک روز قبل عصر کے قریب انتہائی قناعت کے باوجود ملفوظات کا سلسلہ یکایک شروع فرما دیا۔
آواز بشکل نکلتی تھی۔ اور تقریر نہایت آہستہ آہستہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زبان فیض ترجمان سے صادر ہوتی تھی۔ اس میں

پ نے فرمایا کہ

”میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ میرے اعزہ مجھ سے لاکھ درجے بڑھ جائیں۔ مگر اسوس ہے کہ اب تک کوئی بڑھانہیں
 میں نے تو ہمیشہ اپنے کو موشیوں سے بھی بدتر اور کمتر سمجھا۔ لیکن حضرت حاجی صاحب کی بوتیوں کی برکت سے مجھے
 اول یوم ہی وہ بات نصیب ہو گئی۔ حضرت نے ایک ایسی بشارت دی۔ جس کو میں نے اس لیے کبھی ظاہر نہیں
 کیا کہ گالیاں پڑیں گی۔ بڑے بڑے اکابر کا نام لے کر فرمایا۔ جن کی بوتیوں کی خاک کے برابر بھی میں اپنے آپ کو
 منیں سمجھتا کہ یہ اب ان سے بھی بڑھ چکے ہیں۔ میں ہمیشہ اس کو آئندہ کے لیے بشارت سمجھا کیونکہ اب تک
 تو میری حالت اس قابل کبھی نہیں ہوئی“

جس طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری کلمات الصلوٰۃ واما ملک الیمانہم متے۔ اسی
 طرح حضرت تھانویؒ کو بھی آخری نکر نماز اور حقوق کی حق خواہر صاحب سے آخری ایام میں فرماتے تھے
 مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا۔ بالآخر جب سرکنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تو لیٹ لیٹے تیمم اور
 روں سے نماز ادا فرماتے گئے۔ اور اخیر وقت تک ایک نماز بھی قضا نہ کی۔ یہاں تک کہ آخری غشی اور استقلال سے تھوڑی دیر
 سے دریافت فرمایا کہ مغرب میں کیا دیر ہے۔ عرض کیا گیا کہ دس منٹ ہیں۔ فوراً مکرر استغفار فرمایا کہ وقت کے آنے میں یا وقت
 مانے میں۔ آخری وقت میں بھی اس شانِ تدقیق نے سب کو درط حیرت میں ڈال دیا۔ (سیرت اشرف)

خواہر عزیز الحسن صاحب جو حضرت کے خاصان خاص میں سے تھے۔
 لکھتے ہیں کہ:-

الارشاد کی وفات

ہ میں وتر کی نماز کے نشہ میں تھا کہ وقت مجھے اپنے قلب میں ایک تغیر عظیم محسوس ہوا۔ جس نے مجھے پریشان کر دیا۔
 ایسا معلوم ہونا تھا۔ جیسے بالکل کورا ہو گیا میں سوچنے لگا کہ یہ وہی بات تو نہیں ہے جو حضرت اقدس فرمایا کرتے تھے کہ جب
 قلب الارشاد کی وفات ہوتی ہے تو اس وقت اہل احساس کو اپنے قلب میں تغیر محسوس ہوتا ہے اور کیفیات میں کمی محسوس ہوتی ہے
 کیونکہ اس کا فیض عام ہوتا ہے۔ سب کو پہنچتا ہے۔ چاہے فیض پانے والے کو بھی یہ خبر نہ ہو کہ فیض خاص کو دھڑے آ رہا ہے۔ بلکہ خود
 قلب الارشاد کو بھی کسی کی طرف فیض منتقل ہونے کا علم ہونا ضروری نہیں جیسے آفتاب کی روشنی ملائے قصہ کے سب کہ پہنچتی ہے ارشاد
 یاد اگر گمان تو ضرور ہوا کہ اس تغیر کا سبب یہی ہے کہ حضرت اقدس عالم نزع میں ہی ہوں گے۔ پھر خیال ہوا کہ ابھی تو زندگیوں کو عالم نزع میں
 سی پیچھے سے آنکھوں شروع ہو گیا۔ اس اشکال کا جواب ذہن میں یہ آیا کہ اگر بھی رحلت نہیں فرمائی۔ لیکن نزع میں اس عالم سے چونکہ
 بے قیوسی ہوجاتی ہے ممکن ہے اشکال ارشاد کی وفات ہی کے ہوتا ہو۔ لیکن جب میں غارت سے فارغ ہو کر در دولت پر واپس گیا تو معلوم ہو کہ ابھی
 پانچ منٹ ہوئے رحلت فرما گئے ہیں اس وقت مجھے گمان غالب ہوا کہ وہ ہوا ایک تغیر خاص مجھے وتر کے نشہ کے تحت محسوس ہوا تھا۔ عجیب نہیں
 عین پروانہ درج مقدس ہی کے ہوا جو کہ نہ فانی ہو کر در دولت تک پہنچنے میں تقریباً اتنا ہی وقت صرف ہوا جو کہ وہ تغیر مجھے اس
 دور کا محسوس ہوا تھا کہ سلام پھرنے کے بعد میں محنت پریشان ہو کر بدواڑ کھنے لگا کہ یا اللہ اگر حضرت اقدس کے بعد میری سی سی حالت
 رہی تو میرا ایمان کیسے سلامت رہے گا۔
 (خاتمۃ السوانح ص ۷۷)

موشیہ حکیم الامت مشتمل بر ستارہ

۱۱

ندائے آہ در آفاق این چہ صبح و مید
کہ ہست شور قیامت ز وزہ وزہ پدید
ندائے از چہ شفق عرق شد بموجہ خون
ندائے از چہ سحر جامہ تار تار درید
چہ شد کہ چہ خبر افلاک حلقہ حلقہ گشت
چہ شد گز و ہمہ گہ سوارہ زمین لرزید
گد ام گل شدہ تاراج از جفائی خزاں
کہ غار غم برگ جان ماہزار غلیبہ
زمانہ آہ نور دید فرش عیش و طرب
فلک لباس خودش را بہ غم نیل کشید
فغان اہل زمین شد بلند تا کیواں
ز چشم ماہ و ستارہ چہ خون ناب پکید
چہ گوشت کہ چہ پیش آمدست عالم را
کہ است طاقت گفتن کہ است تاب شنید
ببارغ حضرت امداد تند باد اہل
چناں و زید عظامی کہ پیش دین نوزید
ز فوت حضرت اشرف کہ میت ثنائی او
چہ گوشت بخدائی بجان ما چہ رسید
ز دلگدازی این واقعہ میرس کہ این
بجا نگدازی معشر چہ خط نسخ کشید
بیاد سال و حالش شہنوزن کہ منم
عظامی تہذیب گرا

گسیخت صبر عیاں و شکیب
دل ز دیدہ غونبار قطرہ قطرہ چکید
کدام حضرت اشرف علی غیب
حکیم امت مرحوم از قریب
زمین بسر زہ خاکے بسو گواہی
فلک بماتم آن پیر بن مجسم
کلاہ زد بزین آفتاب زیر
زگرید دیدہ انجم سپید گشت
شکست کامل سنبل نخت
گرفتہ شد دل غنچہ زین غنہ
جنید وقت اگر گوشتش مبالغہ
ہم است راست اگر خواہش
چناں فقیہ و محدث چناں مجدد
ندیدہ است کہ و کہ غنہ
خلافت سنت خیر البشر لعب
بہ سوہم علی ز دنیا مد است
ز پایگاہ علومش چہ گوشت
مخمس ندیدہ و نہ پہنچ کس تو
ز پایگاہ عمارات شرک و بدعت
نیائی سنت عہد از و بہا
الف کشیدہ یگنم شہید گشتہ
۱۳۶۳ - ۱ - ۱۳۶۲

نیس المحدثین حضرت علیؑ محمدؑ انور شاہ کھنیریؒ

۵۱۳۵۲
۶۱۹۳۲



۵۱۲۹۲
۶۱۸۴۵

عبد الرشید احمد

حضرت علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیری علیہ رحمۃ اللہ

سوانح تحریر ۱۴۲۲ھ پر ملاحظہ کیجیے

ولادت، سلسلہ نسب و تعلیم

حضرت علامہ انور شاہ صاحب محدث کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت شیخ مسعود زوریؒ میں حکومت اختیار کی۔ آپ اپنے فخر و اپنا سلسلہ نسب اپنی تصانیف نیل الفریقین و کشف الستار کے آخر میں اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ محمد انور شاہ بن مولانا بن شاہ عبد البکر بن شاہ عبد الحامق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شیخ عبداللہ بن شیخ مسعود زوریؒ اور شیخ مسعود کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ ابن شاہ جنید بن اکل الدین ابن میمون شاہ بن ہرمان شاہ ہمز اس طرح حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب حضرت امام کا کے خاندان سے ملتی ہو جاتا ہے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا محمد عظم شاہ بڑے عالم ربانی، زاہد و عابد اور کشمیر کے نہایت مشہور خاندانی پیر و مرشد تھے۔ آپ ۱۲ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے فضیال بھقام موضع دودھواں و علاقہ کولاب کشمیر میں پیدا ہوئے ۱۲ سال عمر میں اپنے والد ماجد حضرت مولانا محمد عظم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن پاک شروع کیا اور پھر برس کی عمر تک قرآن کے علاوہ فارسی کے متعدد مسائل بھی سیکھ کر لیے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب دصونی پورہ سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اور ابھی آپ کی عمر ۱۳-۱۴ سال کی تھی ۱۳۰۵ھ میں علی گڑھ نئے کولاب کے مدرسہ ازل اور سبزہ زاروں پر غریب الوطن کی علمی زندگی کو ترجیح دی۔ حضرت علامہ ہرنہار بڑے کے چکنے چکنے پات کے مصداق بن گئے۔ میں بے حد دہن و ذکا و فطین تھے۔ سچ ہے کہ جس نے آگے چل کر وقت کا لازمی و نفع دانی بننا تھا۔ اس کی اعلیٰ علمی و علمی صلاحیتوں اور استعداد کا یہ سچا ہی میں ضروری تھا۔

آپ کے والد مولانا محمد عظم شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب انہوں نے مجھ سے مختصر القدری شروع کی تو مجھ سے بعض ایسے مسائل درپیش آئے تھے کہ میری کتابوں کا مطالعہ کے بغیر اس کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا میں انہیں ان پڑھ لوگوں سے مل کر ترجیح کیے کرتا تھا۔ انہیں اس وقت دہانہ سے پریشان ہو کر میں نے انہیں ایک دوسرے عالم کے سپرد کیا۔ مگر دوسرے استاد کو بھی یہی شکایت پیش آتی۔ آپ کے والد آپ کو اور آپ کے بڑے بھائی یسین شاہ مرحوم کو کشمیر کے پہاڑوں میں اعتکاف کرنے والے ایک عارف کے پاس حضرت اہل کے لیے لے گئے۔ عارف نے جب اس ہرنہار بڑے کو دیکھا تو والد سے پوچھا کہ یہ تمہارا بیٹا ہے؟ پھر کہا کہ یہ بڑا عظیم الشان عالم ہو گا اور مستقبل میں اس کی علمی و علمی ہونگی۔ ایک دفعہ منطق اور منطق کے چند مسائل کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اتفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے پاس آ گئے۔ ان عالم نے ان کی کمال کو

ایک باول پر خود حضرت مرحوم کے حراشی لکھے ہوئے تھے۔ بچپن کے زمانہ کی اس وکالت، تیزری طبع، جودت فہم اور طبیعت کی دوسری سی کا اندازہ کر کے اختیار انھوں نے کہا کہ یہ بچہ اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہو گا۔

علی مذاق اور ذکاوت و ذہانت کے ساتھ سلامتی طبع، حسن اخلاق اور اعمال صالحہ کی دولتیں بھی شروع سے آپ کو وافر مقدار میں ملی تھیں۔ آپ کے غیر معمولی احوال کو دیکھ کر کثیر کے عوام عام طور پر یہ شبہ کرتے تھے کہ کہیں آپ مہدی موعود نہ ہوں۔ آپ کے والد بزرگوار اور خاندان کے دوسرے لوگ کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید کرنا پڑتی تھی۔

آپ نے خود ایک دفعہ فرمایا کہ میں بارہ سال کی عمر میں فتاویٰ دینے لگا تھا اور نو سال کی عمر میں فقہ و نحو کی مطولات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ذالک

تین سال تک آپ ہزارہ دوسرے کے متقدم علماء و صلحا کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے پھر جب علوم و فنون کی وہاں بھی کجی نظر آئی تو ہندوستان کے مرکزِ علوم و تہذیب دارالعلوم کی شہرت سن کر آپؒ نے ۱۳۵۰ھ میں ہجر سولہ سترو سال ہزارہ سے ہٹا دی۔

دوبند میں آپؒ نے چار سال رہ کر وہاں کے مشاہیر وقت و یکتا کے روزگار علمائے فیوض علمیہ و باطنیہ کا بدرجہ اتم استفادہ کیا اور ۱۴۲۰ھ کی عمر میں نمایاں شہرت و عزت کے ساتھ سند فراغ ۱۴۱۲ھ میں حاصل کی۔ جن حکماء سے آپ کو شرف تلمذ رہا ہے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل حضرات بہت سے قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا محمد حسن، شیخ الہند، حضرت مولانا غلیل احمد سائیدی، حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب مدرسہ مہاجر مدنی، حضرت مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی۔

بندہ کے فارغ ہو کر قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں گنگوہ تشریف لے گئے اور وہاں سے سند حدیث کے علاوہ اسلامی سچے حاصل کیے۔ اس کے بعد آپ دہلی تشریف لے گئے اور تین چار سال تک مدرسہ اہلبیت کے مدرس اول رہے۔

دہلی میں کئی سال قیام کے بعد بعض ضرورتوں اور محجوریوں کے باعث آپ کثیر تشریف لے گئے اور ۱۳۲۳ھ میں آپ بعض شاہ پرکثیر کی رفاقت یارت مرین شریفین سے مشرف ہوئے۔ سفر حجاز میں طرابلس، بصرہ اور مصر و شام کے جلیل القدر علماء نے آپ کی بہت عزت کی اور سب نے اپنے داد و دیے نظیر لیاقت و استعداد دیکھ کر سندات حدیث عطا فرمائیں۔ جن میں آپ کا نام الفاضل الشیخ محمد الزہری مولانا محمد مظہم شاہ الکثیر سی ہائے

مفتی حجاز سے واپس آکر خواجگان قصبہ بارہ مولا (کشمیر کا ایک مشہور مقام) خصوصاً خواجہ عبدالصمد رگدو و رئیس غلام کے اصرار پر آپ نے اسی میں مدرسہ مفتین عام کی بنیاد ڈالی اور تقریباً تین سال تک آپ وہاں خلق اللہ کو مفتین باب فرماتے رہے۔ اسی اثناء میں آپ کو دارالعلوم دیوبند کے طلبہ و شاگردوں میں مگر کیا گیا اور آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ دارالعلوم میں آپ نے استفادہ علوم و فنون کیا تھا اور وہیں سے سند فرائع حاصل کی تھی۔ اسی دارالعلوم میں مدرسہ مقرب ہو گئے۔ سنن البراد و شریعت اور صحیح مسلم شریعت کا درس ساہا سال تک بغیر کسی تنخواہ کے دیتے رہے۔ چند کے بعد آپ کو اپنی والدہ ماجدہ کے انتقال کی وجہ سے پھر کشمیر جان پڑا۔ لیکن دارالعلوم کی طرف سے شدید تمنا تھا۔ ہوا۔ اس لیے آپ جلد ہی واپس منسلک آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا کالج

حضرت مولانا نور شاہ صاحب پریشان پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا کالج اور پڑھائی کا مقام عالم شہاب گڑا کر کا عالم گڑا کر ہے۔
ہر پچھلے تھے۔ مگر کالج نہیں فرمایا تھا۔ تجدد اور عزت کو اپنے لیے پسند فرماتے تھے اور بار بار ارض

ہجرت کا ارادہ فرماتے تھے۔ تاکہ ازدواجی تعلق اس راہ میں حائل نہ ہو۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اس وقت دارالعلوم دیوبند میں تھے۔ وہ اس ارادہ سے پریشان تھے کہ بااگر یہ آفتاب علم دیوبند سے ہجرت کر جائے تو فقط دیوبند ہی نہیں سارا ہندوستان غلٹ ہو جائے گا۔ اس لیے شاہ صاحب کے روکنے کے لیے انھوں نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہل یمن نے حضرت معمر کے روکنے کے لیے کی تھی۔ معمر کو روکنے والے تیغ تابعین میں سے ہیں۔ بڑے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث ہیں۔ نضیان ثوری، سفیان بن عیینہ، شعبہ اور عبدالعزیز مبارک جیسے اکابر کلمہ میں سے ہیں۔

لما دخل معمر الیہن کرموا ان یخرج من بینہم فقال
رجل قتیہ وہ فہو وجوہ (شرح اقام النہای علی النہای ص ۶۲)
معمر دیکھو کے رہنے والے تھے، جب میں یمن داخل ہوئے تو اہل
گولاڑ کیا کچھ کہاں سے چلے جائیں۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر ان کو روکنا
چاہو تو معمر کہاں قید کرو۔ یعنی انکا کالج گڑا کر۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے یہی کیا کہ جن تدبیر سے لنگرہ کے سادات میں شاہ صاحب
کرا دیا تاکہ ہر کی طرح شاہ صاحب دیوبند میں مقید ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب کو جراتے خیر دے کہ انھوں نے شاہ
کے وجہ پر سو کر اس طرح محفوظ فرمایا۔ کالج کے ایک دو سال بعد ایک بچی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے بچے پیدا ہوئے تو ذریعہ ہستی گیتی
کا ارادہ مست پڑا گیا جو بلاخر ترک کر دینا پڑا اور حضرت علامہ باطنیان خاطر دارالعلوم میں مستشین درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔
میں دارالعلوم سے انھیں معاوضہ لینے سے انکار رہا۔ حضرت مولانا محمد امجد رحمۃ اللہ علیہ والد ماجد حضرت مولانا خاری محمد صاحب مدظلہ نے باا
بات پر راضی کیا کہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھا لیں اور یہ صورت دس برس تک قائم رہی۔ اسی دوران میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو حضرت
نے دیوبند بلا لیا تھا۔ اور وہ بھی حضرت مولانا محمد امجدؒ کے مہمان کی حیثیت سے رہے۔ حضرت بہمن صاحب مولانا محمد امجدؒ حضرت علامہ کشمیری
مولانا حبیب الرحمن صاحب رحم، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ حضرت سندھی رحمہ تعالیٰ کی تمام حضرات بل کر کھانا کھاتے اور عجیب علمی اور تہنیتی باتیں
کالج اور اولاد کے بعد مشین مدرسہ کو موقع ملا کہ وہ حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم کی طرف سے کچھ شاہدہ بدوائیں۔ چنانچہ باہر ارحم حضرت
صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس پر راضی ہوئے۔

اسی دوران میں حضرت شیخ الہندؒ نے جہاز مقدس کا قصد فرمایا تو ان کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ تعالیٰ نے خانہ
درس کی حیثیت سے برہنہ شریف اور ترمذی شریف کا درس سنبھال لیا۔ اور طلباء علوم کو پچھوس تک نہا کہ وہ علم کے ایک بوجہ خوار حضرت
سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ حضرت شاہ صاحب کے درس میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات تھیں جو عام طور پر دوسرے حلقوں میں نہیں تھیں
حضرت علامہ رحمہ تعالیٰ کا انداز درس درحقیقت دنیا کے درس و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ہوا۔ درس کی یہ امتیازی خصوصیات اور انداز
اپنی جگہ پر ذکر ہو گا۔

۱۳۲۵ھ تک آپ دارالعلوم میں بحیثیت صدر مدرس و جانشین شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث دیتے رہے۔ اس کے بعد جب
سے بعض اصلاحات کے سلسلہ میں اختلاف ہوئے آپ نے ۱۳۲۵ھ میں دارالعلوم سے قطع تعلق فرمایا اور آپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن

یہ احمد شاہی حضرت مولانا سراج احمد شیدی رح، مولانا حفظ الرحمن صاحب سیول روی، مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی اور دیگر کئی علماء اور طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ ڈابھیل جامعہ اسلامیہ تشریف لے گئے اور ۱۲۵۱ھ تک آپ نے جامعہ میں درس حدیث دیا۔ ۱۲۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دیوبند میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ **وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا نَاجِعُوْنَ**۔ حضرت علامہ رح کے علمی و عملی کمالات میں سے جو چیز آپ کو اقران و احباب میں سب سے زیادہ ممتاز کرتی تھی۔ وہ آپ کی جامعیت و تجربہ علمی ہے۔ علوم عقلیہ و شرعیہ میں سے ایک بھی ایسا علم نہیں ہے جس میں آپ کو مہارت تامہ حاصل نہ ہو اور شاید یہ کہنا بھی سبب جانہ ہوگا کہ علامہ نقیہ انبیت سے ایسی جامع علوم عقلیہ و نقلیہ ہستیاں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔

آپ سیکڑوں علماء و فضلاء کے مجمع میں عید کر ہر ایک علم و فن کے مسائل پر اس طرح تقریر فرما کرتے تھے کہ گویا آپ کو تمام مسائل فن مستحض اور بالجوہر حق کی بعض دفعہ خیال ہوتا تھا کہ اپنے ارادہ سے کلام نہیں کر رہے ہیں بلکہ الہامات و واردات سے ارشاد فرما رہے ہیں۔ اور یہ تو بیشتر مرتبائی وقت سے جب بعض دقیق و لاجعلی یا مختلف فیہ مسائل کے متعلق پوچھا جاتا تھا تو وہ حضرت سے استفسار کرنے کو فرما کرتے تھے۔ اور اکثر علماء و محقق علمی مسائل کی وقت پیش آتی تھی تو وہ خود بھی حضرت علامہ رح سے مراد بحث فرماتے تھے۔ ذیل میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ مرتب لکھی کا پہلا اور آخری حصہ مندرج ہے جو انھوں نے حضرت علامہ مرحوم کو اسال فرمایا تھا۔ جس میں انھوں نے ان سے کئی مسئلہ پر بحث کیا ہے۔

فرد العزیز حضرت علامہ تھانویؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک طویل اور جامع تاریخ حیات ہے جسے مولیٰ زبان میں حضرت رح کے شاگرد مولانا محمد یوسف بنوری اور مجلس علمی نے ڈابھیل سے شائع کیا ہے۔ فقیر العزیز کا بیان ہے کہ حکیم الامت رح نے اکثر مسائل میں علامہ مرحوم سے استفادہ فرمایا ہے۔

آز نامہ آورہ اشرف علی حسرت، باریک جامع الفضائل العلمیہ العلیہ حضرت مولانا ابوالفضل صاحب دامت برکاتہم السلام علیکم رحمۃ اللہ، تحقیق سابق کے متعلق بعد زور تکرر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ محاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا۔ اس کے متعلق جدا گانہ تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ الخ وقال خاتمہ اس میں روایت و درایت سے یہ کچھ حکم فرمائی (حیات النور)

رحم اصرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری رح حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا کہ۔
 "میرے نزدیک حقانیت اسلام کی دلیلوں میں ایک دلیل حضرت مولانا انور شاہ صاحب کا اقتب مسلمین و جوہ ہے اگر دین اسلام میں کسی قسم کی کمی یا غرابی ہوتی تو آپ دین اسلام سے کنارہ کش ہو جلتے (حیات النور)
 بیت استاذی حضرت مولانا خیر محمد صاحب مظاہر مہتمم مدرسہ خیر المدارس سے بھی لکھی ہے کیونکہ اس وقت حضرت رح مروج بھی مولانا سبیت صاحب بخاری رح کے ساتھ تھے۔

خیر احمد شاہیؒ نے حضرت کی وفات پر جامعہ ڈابھیل کے ایک مجلس میں فرمایا۔

مجھ سے اگر بعد و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شیخ تقی الدین ابن وقیف العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عمر الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے۔ کیونکہ عرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے۔ ورنہ اگر حضرت علامہ انور شاہ بھی جیٹا یا سو تیس صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے مناقب و مقام بھی اوراق تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہوتے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر و شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا زمانہ

حضرت مولانا عبدالعادر رائے پوری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے۔

”واقعی حضرت شاہ صاحب : ”آیتہ من آیات اللہ تھے“

زعیم احرار مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بجناریؒ ایک دفعہ ڈائمیبل تشریف لے گئے تو جامعہ اسلامیہ کے طلبہ نے تقریر کی درخواست کی اور یہ بھی ہوا۔
علامہ کے حالات پر تبصرہ کریں۔ تو بجناری صاحب نے فرمایا کہ:

”میرے جیسا کہ علم ان کے حالات کیا بیان کر سکتا ہے۔ البتہ صرف اتنا کہتا ہوں کہ صاحبہ کا قافلہ بارہا تھایہ پیچھے رہ گئے تھے“

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے حضرت علامہ کے حلیہ تحریریت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے ہندوستان، حجاز، عراق، شام وغیرہ کے علماء سے ملاقات کی اور مساکین علیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن شہر علی، وسعت معلومات، جامعیت اور علم نقلیہ و عقلیہ کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کمال حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے حضرت علامہ کے انتقال پر ایک مضمون میں تحریر فرمایا کہ:-

”اگر قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولانا علامہ الفاضل الاول، اکمل العلامہ، افضل الفضلاء، النور القدام، البحر الطام، رملہ العصر، قرة الدھر، استاد الاساتذہ، رئیس الجہادہ، محدث وحید، مغیرہ فرید، فقیہ گجاندہ، ماہر علوم المنطقیہ و العقلیہ مولانا سید انور شاہؒ قدس سرہ کو آغوش رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لیے جلا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقت حاضر کے کمال ترین عالم ربانی کی وفات ہے۔ جن کا نظیر مستقبل میں متوقع نہیں۔ بلکہ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا شجر کمال فضل، درجہ تقویٰ و جامعیت، استغنا سلم تھا۔ نوافل و مخالفت ان کے سامنے تسلیم و القیاد سے سرخسٹا تھا۔“

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ ارتحال پر ”معارف میں کس قدر بیغ بات کہی تھی۔“

”مرحوم کی مثال اس سمندر جیسی ہے۔ جس کی ادب کی سطح ساکن ہر لیکن گہرائی میں تہوں سے بھر پور ہے“

ہم نے ایک بار و اخبار کو طوطا دیکھتے ہوئے۔ میں بڑے مسلمان، گناہ کے بڑے انسانوں کے تاثرات قلب بند کیے ہیں۔ ورنہ ان حضرات کے ہم پیر ہیں ہند کے تمام جید علماء۔ نے حضرت علامہ کے متعلق حسین عقیدت و اثر کا اظہار کیا ہے۔ اگر اس کو نقل کیا جائے تو اس کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ دنیا کے اسلام کے چہرہ نامور مفکران کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔ جن کی علمی قابلیت و استعداد پر ویرندی مکتب فکر کے علاوہ تمام مسلمان میں اتفاق ہے جس سے معلوم ہوگا کہ مندرجہ بالا تاثرات میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس میں مکتب فکر کی جانبداری نہیں ہے۔ دوسرا یہ بھی حال ہے۔

علامہ سید رشید رضا جوہرؒ کی ایک محروم شخصیت اور علمی حلقوں میں ایک نادور روزگار انسان سمجھے جاتے تھے۔ جب دیرینہ اہل حق ہیں۔ تراغول سے حضرت علامہ سید الزہراء رحمۃ اللہ کی ایک تقریر سنی جو عربی میں ان کی آمد پر ارتحال کی گئی تھی اور شخصیت کے بعض ایسے گوشے آگئے جن پر علماء تحقیق کی نظر تک نہ تھی تو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی دیکھو! نظام تعلیم و تربیت، سید رشید رضا بار بار اپنی کرسی سے اٹھتے فرماتے تھے۔

”واللہ زاریت مثل هذا الرجل فقط“ خدا کی قسم! میں نے ان جیسا آدمی گھر نہیں دیکھا

آپ کے استاد حضرت شیخ الہندؒ نے یہاں کو جو تاجازت عنایت فرمائی تھی۔ اس میں تحریر فرمایا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے مولانا الزہراء

علم علی، سیرت، صورت، و روح، زہد، راستے صائب اور ذوقِ شائقِ جمع کر دیا ہے اور شیخ الغدیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحب کو علامہ جیسے فیضِ لفظ سے یاد فرماتے اور مسائلِ علمیہ میں جب کوئی دقیقہ سامنے آتا تو حضرت شاہ صاحب سے دریافت فرماتے۔ کچھ علامہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول ہے۔ علامہ صاحب جواب دیتے اور حضرت شیخ الغدیر رحمۃ اللہ علیہ مسرت و اطمینان کا اظہار فرماتے۔ اسناد کا شاگرد کو علامہ سے یاد کرنا حضرت علامہ کے کمالِ علمی پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ علی بھری جہلی کا حافظہ حدیثِ مہر سے رات کے وہاں سے دہلی اور دہلی سے ولہند آئے اور حضرت شاہ صاحب کے درسِ بخاری شریف میں حاضر رہے۔ حضرت شاہ صاحب نے علامہ کی رعایت کرتے ہوئے بیخِ عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے سالات کئے۔ اور اسے جہالات دیتے گئے۔ درسِ ختم ہوا تو علامہ نے سیکڑوں طلبہ کے جہرم میں فرمایا۔

میں نے عربِ مالک کا سفر کیا اور علامہ و اکابر سے ملاقات کی ہے۔ خود بصرہ میں سالہا سال درسِ حدیث دے آکا جوں میں نے شام سے لیکر منہ تک اس شان کا کوئی محدث اور عالم نہیں پایا۔ میں نے ان کو رسالت کی نیک پیر طرح کوشش کی۔ لیکن ان کے استقصار، تيقظ، حفظ، واقفان، ذکاوت و ذہانت اور دقتِ نظر سے میں حیران رہ گیا اور آخر میں کہا۔ تو حضرت ائمہ اعلم باقی حنیفہ لہا حنثت یعنی اگر میں تم کھاؤں کہ یہ البوصیۃ کر سب زیادہ جانتے والے ہیں۔ تو میں اس دعوے میں بھڑانہ چل گا۔

ہندوستانی علامہ کو اعجازِ کلام قرار دینے والے علامہ علی بھری کا یہ اعتراف اور تاثر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شانِ علمی، جامعیت اور سبھر ایک مضبوط شہادت ہے۔ اور علامہ علی بھری کا یہ اقرار اس بات کو بھی تصدیق کرتا ہے کہ علم کسی کی میراث نہیں۔ علم اپنے محل کے اعتبار سے اعلیٰ و جہلی کی قید سے بے نیاز ہے۔

علامہ زاہد انگریزی کی میراث (الاعتزاز بخصیصہ) سے اہل علم سے کون ناواقف ہو گا۔ علامہ کی ایک زبردست علمی شخصیت اور اس قحطِ الرجال کے زمانہ میں سادہ حیثیت کے مالک تھے۔ تاہم وہیں جلاوطنی کے ایام گزار رہے تھے۔ وہیں حضرت شاہ صاحب مرحوم کی بعض تصانیف و تالیفات کا مطالعہ کیا تو سدا کا کہ۔ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث و عالم امت میں نہیں گزرا اور یہ کوئی نادر نہیں ہے۔

تو کہ ایک دوسرے عالم سابی شیخ الاسلام جو تاجروں میں جلاوطنی کے بدترین تھے اور مائتین و دہیرین کے دوسرے بہت کچھ لکھ چکے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ صاحب کے رسالہ "مرقات الظاہر" کا مطالعہ کیا تو فرمایا۔

"میر نہیں سمجھتا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے بکھنے والا۔ اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے۔"

علامہ اقبال مرحوم نے لاہور کے اس مغربی جلسے میں جو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

- اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی تخلیق پیش کرنے سے عاجز ہے۔

ابھی اوپر گزرا کہ علامہ گزشتہ نے شاہ صاحب کو ابن ہمام کا نظیر بنالیا۔ اور علامہ اقبال کا کہنا کہ اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی تخلیق پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور ابن ہمام پانچ صد سال قبل کے معقین سے ہیں۔ علامہ اقبال اور علامہ گزشتہ کے رائے کا یہ تواریخ یا تراویح کس قدر حیرت انگیز ہے۔ مولانا امجد احمد اکبر آبادی، اہم اسے میر نبروان نے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری کے مابین چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ جو ان کے

علم میں ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

علامہ کشمیری اور علامہ اقبال

علامہ اقبالؒ ایک نامور مفکر اور شہرہ شامیوں کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے۔ فلسفہ ایرانی، فلسفہ حاضر و مغرب پر ان کی خوب نظر تھی۔ اس کے علاوہ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شام

خطبات اور تصانیف سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے انگریزی زبان کے پچھلوں (CONSTRUCTION) کی تباہی میں حضرت علامہ کشمیریؒ سے کافی مدد لی ہے۔ حضرت علامہ کشمیریؒ

OF RELIGIOUS THOUGHT

صدر پیش عالم منظوم رسالہ اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن پڑھنے کو اس میں ایک وحدتِ علم پر سارے قدیم و جدید فلسفہ کا علم اور اس پر تنقید ہے۔ یہ رسالہ جب چھپا تو ایک نوجوان کشمیری نے ڈاکٹر اقبالؒ کے پاس تحفہ ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس فوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے۔ اس کے اعتبار سے ان کے لیے کوئی اس چند وقتی رسالہ سے نیاہ قیمتی نہیں ہو سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر سے پڑھا۔

مولانا مسیح احمد اکبر آبادی اس بڑی عبارت کے ناقل دروای ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ: میں ان دنوں سلسلہ طالب علمی لاہور میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر صاحب معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب کے ادبی درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہرنیسا شرف حاصل نہیں ہے۔ بلکہ اس بارگاہِ علم و عقل میں شخصی تقرب و اختصاص کا مرتبہ بھی ہے۔ اس بنا پر ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ میں تو مولانا ارشد شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ وقال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدیث عالم پر اس رسالہ میں انھوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر کارٹے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالے کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا میں نے ان پر نشان لگادیا ہے۔ آپ دیرینہ جانی قرینہ سہ ماہی لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کر لیں میں نے دیرینہ اگر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر سکے ڈاکٹر صاحب کا پیام پہنچا یا۔ لیکن حضرت الاساتذہ نے مجھ کو ان اشعار کا مطلب نہ کہہ سکے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اس میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرما دیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکم الاساتذہ ڈاکٹر اقبالؒ وہ ہیں جنھوں نے خود اپنے متعلق کہا تھا۔

ہم کسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راہیں
کبھی سوز و ساز دہی کبھی پیچ و تاب رازی

ان کے دل میں حضرت الاساتذہ کی کس قدر درجہ عظمت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دہلوی میں انتظامات کے وقت حضرت الاساتذہ نے اپنے چندہ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دے دی۔ اور پھر اخبارات میں بھی پیڑاں کے چندہ و تعبیں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ اس کے آپ کا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو۔ میں بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا کہ "آپ اس قدر دیرینہ کے نقصان کا کچھ لال نہیں ہے؟" فرمایا کہ میں نہیں، مگر دارالعلوم کو صدر الاساتذہ میں ادبی عمل باقیں گے اور یہ مجھ غالی نہ رہے گی۔ لیکن اسلام کے لیے اب ہمیں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انھوں نے اس اجمال کی تفصیل بریں بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت خدا کی جدید تعلیم ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑاں کاموں کو اسلامی مل پیش کیا گیا ہو جس کو دنیا کے موجودہ قری اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس

بیان فرمادیا کہ سننے والے ستمدار و حیران رہ گئے۔ ایک کتاب کے اگر پانچ یا چھ دس دس حواشی بھی تھے۔ تو وہ آپ کو یاد دہرتے تھے حوالہ دہاتے کتب صحیحہ و صحیفہ آپ کو ایک ہی دفعہ مطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تھے تو بے شمار کتابوں کے حوالہ بلا تکلف دیتے چلے جاتے۔ آپ کی قوت حافظہ ان معجزین حدیث کا گویا جواب تھا جو محدثین کے حافظہ پر اعتماد کر کے ہوتے ہوئے ذخیرہ حدیث کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ:-

”ذو جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا تب بھی پندرہ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں۔“

سرورِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ سندھ و موطوعہ مصر کے روزانہ و دوسو صفحات کا مطالعہ فرمایا اور وہ بھی اس شان سے کہ اس عظیم الشان ذخیرہ میں سے ان کی تائید میں جن قدر احادیث ہر کسی تھیں۔ وہ بھی منتخب اور محفوظ رکھیں اور پھر جب کسی درس میں سند احمد کی احادیث کا حوالہ دینا چاہتا تو بغیر مراجعت دے دیتے تھے اور رواۃ و طبقات پر بھی بے تکلف بحث فرماتے تھے۔ صرف اخیر عمر میں ایک مرتبہ حضرت عینی علیہ السلام کی حیات سے متعلق احادیث کو جمع کرنے کے لیے مطالعہ دوبارہ فرمایا تھا

شیخ ابن ہمامؒ کی فتح القدر متہ بحمدہ جلد کا مطالعہ میں روزیں کیا تھا۔ اس طرح کہ کتاب الحج تک اس کی تہنیں بھی فرمائی۔ اور ابن ہمام صاحب ہایہ پر اعتراضات کیے ہیں۔ اپنے غلام میں ان کے کل جوابات بھی تحریر فرمائے۔ اور پھر مدت العرفج القدر سے غلاب و مباحث نقل کر لیے ہیں۔ ان کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ایک دفعہ خود بھی درس میں بظہر تحدیث نعمت فرمایا کہ ۱۲ سال قبل فتح القدر دیکھی تھی۔ الحمد للہ اب تک مراجعت کی ضرورت نہیں ہو جن حضروں اس کو بیان کر دیا۔ اگر مراجعت کر کے تو لغات بہت کم پاؤ گے۔

سنن بیہقی قلمی کا مطالعہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کے یہاں کیا تھا۔ تیس سال بعد ڈبائیل میں ایک روز فرمایا کہ حافظان جو کچھ دلائل سے مکمل خلافت پہنچتی سے جمع کیے ہیں۔ میں نے بجز تہذیبی کا لنگہ میں دیکھا تھا۔ اس میں وہ چیزیں نہ تھیں پھر جب سنن بیہقی حیدر آباد سے چھپ کر آئی تو اس میں وہ چیزیں بھی تھیں لیکن اب میں اس نظر پر پہنچا ہوں کہ حضرت گنگوہیؒ والا بیہقی نسخہ زیادہ صحیح تھا اور اس کے شہادہ و دلائل میں اپنی یادداشت میں جمع کر رہا ہوں۔

حضرت شاہ صاحب کی قوت حافظہ کے سلسلے میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تحقیق بھی قابل ذکر ہے کہ مجموعی طور سے حضرت شاہ صاحبؒ کے مطالعہ پر پاس ہزار عربی کے ایسے اشعار یاد تھے کہ جس وقت چاہتے ان میں سے مناسبت تھے۔ فارسی اشعار بھی بجزرت یاد تھے۔ بلکہ اردو کے بھی آدھے شعر کا لہذا تھا ایک دفعہ غالب کے بہت سے اشعار سنائے۔

آپ کے وسعت مطالعہ پر اس واقعہ سے روشنی پڑتی ہے کہ شیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف پیدا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف ہوا۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحب بھی کثیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فاضل میر کے ”مخطوطہ کا دارالعلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ عبارت جبرگزر ہو وہیں۔ یہ لوگ تصحیف کر رہے ہیں یا تزلزل۔ اس پر حاضرین تحریر کرے اور سترتین مہر ہو کر رہ گئے۔

حضرت علامہ شبیر مہموتانیؒ فرماتے تھے کہ خواندہ التذلیل العزیز لکھتے وقت مجھے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق صحیح روایات حاصل نہ ہو سکیں۔ روز تک اس چپان میں میں لگا رہا کہ کوئی ایسی حدیث ہاتھ آئے جو انبیا کے شاہان شان چہر لیکن میری کوشش بیکار گئی۔ اس کے بعد میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ مبارکی کی وجہ سے صاحب فرماں تھے۔ میں نے اس پیش آئی ہوئی الجھن اور دشواری کا اظہار کیا۔ حضرت نے بلا تامل فرمایا کہ

نے مندرک کے اندر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک ان نقل کیا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کی تمام انجمن ختم ہو جائے گی۔ حضرت مولانا عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کے مطابق مطالعہ کیا تو میری تمام انجمنیں و دروس ہو گئیں۔ حضرت مولانا محمد رفیع صاحب بنوری کا بیان ہے کہ تیرہ دفعہ آپ نے صحیح بخاری شریف کے صرف متن کا مطالعہ فرمایا تھا جب کہ اس کے حاشیہ اور میں السطور پر بالکل نظر نہ تھی۔ یہ دفعہ ایسے علوم و دقائق کا انکشاف ہوتا کہ اس سے پہلے غلب میں گزرے ہی نہ تھے۔

حضرت شاہ صاحب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے بلے حد مراجع تھے ابن تیمیہ کو حافظ الدنیا اور جلال علم کے معزز القاب سے یاد کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر کے مقابل میں حافظ بدر الدین عینی شارح بخاری کے علوم اور ان کی تحقیقات کو زیادہ ذہین سمجھتے تھے درس میں ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے خراب میں حافظ بدر الدین عینی کو دیکھا اور اس سے بطور شکایت کہ کہا کہ ابن حجر کے مقابل میں جو طرز آپ نے اختیار کیا ہے۔ اس سے علماء کو بہت دقت ہوتی ہے حافظ عینی نے جواب دیا کہ حافظ ابن حجر سے دریافت کرو کہ انھوں نے یہ طرز کیوں اختیار کیا تھا؟ حافظ عینی کہنا چاہتے تھے کہ میں نے صرف بلاغت کی بجائے ابتداء ابن حجر سے ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں عینی کے اس جواب پر خاموش ہوا۔ ان مقامات پر عینی کے جوابات سے شاہ صاحب مطمئن نہ تھے۔ آپ تفسیر درایت شرح الفاظ اور فتاویٰ کبار میں زیادہ مکمل سمجھنے کے باوجود عظیم و مرتب میں پسند و کرتے تھے۔

کئی ایک بزرگوں سے سنا کہ حضرت شاہ صاحب بعض دفعہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک شخص کعبۃ اللہ کے پردوں کو کپڑ کر دیا کہ خداوند تعالیٰ مجھے ابن حجر کا حافظ عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔ حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب شیخ الحدیث جامعہ رشیدیہ فلگامری نے فرمایا کہ یہ شخص خود شاہ صاحب تھے۔ یہ بات بطور حدیث نعت ان کی زبان پر آجاتی تھی اگر اپنے نام کا انکار جاتے تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن مہتمم دارالعلوم دیر بندہ حضرت شاہ صاحب کو چلتا پھرتا کتب خانہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا امین اسفحی بن لہندی فرمایا کرتے تھے کہ۔

”مجھے جب مسئلہ فقہ میں کوئی دشواری پیش آتی ہے تو کتب خانہ دارالعلوم کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اگر کوئی چیز نیل گئی تو بظاہر درجہ حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرتا ہوں۔ شاہ صاحب جو جواب دیتے اسے آخری اور حتمی پاتا اور اگر حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ فرمایا کہ میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملے گا۔ اور محققین کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔“

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کے حافظ کا یہ عالم تھا کہ جب ایک مرتبہ دیکھ لیا اور جب ایک مرتبہ سنا لیا وہ ضائع ہونے سے محفوظ اور نکل ہو گیا اگر کہ اپنے زمانہ کے نہ ہی تھے۔ امام زہریؒ کی وجہ دیرینہ مژدہ کے بازار سے گزرتے تو کازن میں انگلیاں دے لینے کہیں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ فرمایا کہ میرے کازن میں جو داخل ہو جاتا ہے وہ نہ ٹھکنا نہیں۔ اس لیے بازار سے گزرتے وقت کازن میں انگلیاں دے لیتا ہوں۔ تاکہ بازار کی یہ غرافات میرے کازن میں داخل نہ ہو سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک دفعہ دیر بندہ کے قبرستان میں پھر رہے تھے۔ فرمایا کہ میں علم کی قبر کے پاس پھر رہا ہوں۔ یہ قبر حضرت شاہ صاحب کی تھی۔ مطالعہ کے سلسلے میں فنون و محضر و فلسفہ جدید و شہیت جدید حتیٰ کہ فن و دل اور جعفر کی کتابوں کو بھی بغیر مطالعہ کے دھچھڑا۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جسے اب دکھانا تو ممکن نہیں۔ البتہ بتانا ممکن ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔۔

حضرت شاہ صاحب کے درس کی خصوصیات

۱۔ درس حدیث میں سب سے اول اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیث نبوی کی نثر و ادب و قواعد و حدیث و بلاغت واضح ہر جائے حدیث

کی مراد کو علمی اصطلاحات کے تابع بنانے کو بھی پسند فرماتے تھے۔ کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبویؐ زمانہ و مرتبہ مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے۔

۱۔ خاص خاص مواضع میں حدیث نبوی کا اخذ قرآن کریم سے بیان فرماتے اور ایسی مناسبت سے بہت سی شکلات قرآنیکہ کا محل فرمادیتے تھے۔
۲۔ حسب ضرورت اسرار الہیال پر کلام فرماتے خصوصاً جن رواہ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تھا اس جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے کہ پہلے طرف سے ایک قول فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابلِ قبول ہے۔ اس کی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، قابلِ رد ہے، یا قابلِ اعتماد اور لاحق مسابحت؟ اور انخاص و مسابحت میں جو فرق ہے۔ وہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہو تو یہ بتلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذی نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

۱۔ فقہ الحنفیہ میں چوتھ کلام فرماتے تو اولاً اللہ اربعہ کے غایب نسل فرماتے اور پھر ان کے جود و لاکل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سے قوی ہوئے پھر ان کا جواب اور اہم اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔ حقیقت کے لیے استدلال و ترجیح میں کتاب و سنت کے تبادلاً سیاق و سباق کو بڑا ملحوظ رکھتے اور اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ شریعت کا منشا و مقصد اس بارے میں کیا ہے اور یہ حکم خاص شریعت کے احکام کلیہ کے قیام نہیں۔ شریعت کے مقاصد کلیہ کو مقدم رکھتے اور احکام جزئیہ میں اگر بے تکلف ترجیح ممکن ہوتی تو کسے ورنہ قواعد کلیہ کو ترجیح دیتے جو طریقہ فقہائے کرام کا ہے۔

۲۔ نقل مذاہب میں قدماء کی نقل پیش فرماتے اور ان کو متاخرین کی نقل پر مقدم رکھتے۔ اگرچہ ہاں کے اصل اقوال پہلے نقل فرماتے پھر متاخرین کے نقل کو نقل فرماتے تھے۔

۱۔ مسائل خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے۔ مگر یاد رکھو کہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لیے جو سبب طاعتیت طاعت

۲۔ درس بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے۔ اولاً بخاری کی عرض و مراد واضح فرماتے۔ بہت سے مواقع میں حل تراجم میں شایعین

خلاف مراد متفق فرماتے تھے۔ ثانیاً یہی بتلاتے کہ اس ترجمہ الباب میں امام بخاری رہے۔ ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار کیا ہے اور پوری بخاری بخاری

آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سراسر اہل مشورہ کے اکثر جگہ امام بخاری رہے۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کی موافقت کی ہے۔

۳۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جو بڑھاپہ امام شافعیؒ کے متعلق ہیں۔ اس لیے امام شافعیؒ کی روایت میں صحابہ امام طحاویؒ کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس

کی تفسیر یہی کرتے ہیں کہ امام طحاویؒ کا جراب مذہب پر ہے جسے جبریل نام طحاویؒ کا جراب دیکھتے بغیر حافظ عسقلانیؒ نے سمجھ لیا کہ جبریل کے جری شافعیت ادا نہیں کیا۔ اور یہ

میں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ کرشمہ جو حق کی کسانبل قضیہ میں حافظ کا جواب دینے بغیر گزرتی۔

۹ اسرار شریعت میں شیخ محمد بن عربی اور شیخ عبدالوہاب شترانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔
۱۰ درس کی تقریر مزبور و مخبر نہایت جلیب و پرتی تھی جس سے ذہنی علم مستفید ہو سکتے تھے، ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ کا وفاق
ہو گیا کہ حضرت عظیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی دہلوی نے تشریف لائے۔ بڑے ہنرمند صاحب یعنی حضرت مولانا محمد تاج محمد صاحب کے یہاں تھے۔ بڑے ہنرمند صاحب
نے فرمایا: مولانا آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ آپ ہمارے مدرسہ مدرس کا درس لائیں۔ فرمایا: بہت اچھا۔ درس میں تشریف لے گئے۔ فراغت کے بعد حضرت
حکیم الامت نے فرمایا کہ درس کا ہر شاگرد اس قدر مجاہد و محقق تھا کہ ہر خط کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ درس کو دیکھ کر محدثین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ جب سترین حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ سنہاری وسلم بول رہے ہیں اور جب فقہ الحدیث پر فرماتے تو محمد بن حسن الشیبانی معلوم ہوتے اور جب حدیث کی کتاب لکھتے تو تفتازانی اور جرجانی معلوم ہوتے اور جب شریعت کے اسرار بیان کرتے تو ابن عربی اور

شعرا کی معلوم ہوتے۔

روایت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں جو کہ علی گڑھ کالج کی روح رواں اور علامہ علی گڑھ کے جرنیل علی گڑھ اور یونیورسٹی کے درمیانی خلیج کی وسعت کم ہو رہی تھی تو صاحب زادہ مرحوم کبھی کبھی دیرینہ تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ صبح سلم کے دس میں اگر وہ بھی شریک ہوئے واپس ہو کر میں نے خود ان سے سنا کہ آج تو آصفیہ اور کیرج کے کچھ مال کا منظر میرے سامنے آگیا تھا۔ یورپ کی ان یونیورسٹیوں میں پروفیسروں کو جیسے بڑھاتے ہوئے میں نے دیکھا۔ آج ہندوستان میں میری آنکھوں نے اسی تماشے کو دیکھا۔

علامہ رشید رضا مرحوم مدظلہ العالی نے مفتی محمد عبدہ دہلوی صاحب کے متعلق مختصر تاریخچہ لکھا ہے۔ ان کی دیرینہ آمد۔ دارالعلوم کا معائنہ اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر کا مفصل واقعہ حضرت مولانا محمد صاحب الزوری خلیفہ حضرت راستہ فاضلہ قدس سرہ کی زبانی سینے سے نکال کر فرماتے ہیں۔ ۱۔

دست ۱۳۳۳ میں علامہ رشید رضا مصری مدظلہ العالی صاحب تفسیر مشہور تہذیب صدارت اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء ہندوستان تشریف لائے تو دارالعلوم دہلی کی دعوت پر یہاں بھی تشریف لائے۔ ان کے لیے غیر مذہم کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ اس وقت حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ موجود تھے۔ اتفاقاً علامہ رشید نے جلسہ سے قبل کسی استاد دارالعلوم سے دریافت کیا کہ یہاں درس حدیث کا طریقہ کیا ہے؟ تو بتلایا کہ پہلے قاری حدیث پڑھا جائے اور اسناد حدیث سے متعلق تمام مباحثہ علیہ اور حقائق و نکات بیان کرنا ہے۔ پھر اگر حدیث احکام سے متعلق ہوتی ہے تو اساتذہ عربین کے دلائل بھی بیان کرنا ہے اور احکام کا مذہب بظاہر حدیث کے مخالف ہوتا ہے تو اسناد و توفیق و تطبیق یا ترجیح راجع کے اصول پر تحریر کرنا ہے۔ یعنی اہم اہم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک جن دوسری احادیث سے مستند ہوتا ہے۔ ان احادیث کے بظاہر دلائل پیش کرنا ہے۔ اور حنفی مسلک کو سید و مدلل کرنا ہے۔ یہ بات علامہ کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ کہنے لگے کہ کیا ہر حدیث میں ایسا ہوتا ہے؟ کہا۔ ہاں! اس پر علامہ نے کہا۔ کیا حدیث حنفی ہے۔

یہ بات تو اسی طرح یہاں ختم ہو گئی۔ اور جلسہ کی شرکت کے لیے حضرت شاہ صاحب تشریف لائے تھے کہ راستہ ہی میں علامہ کی اس گفتگو کا حال سنا حضرت شاہ صاحب کا اداد علامہ کو خوش آمد کہنے اور دارالعلوم کی تاریخ و دیگر عام امور پر تقریر فرماتے کا تھا۔ مگر اس گفتگو کا حال سن کر ارادہ بدل گیا اور اتنے ہی قلیل وقفہ میں کہ جسے میں پہنچے اور کچھ پوچھیے۔ دارالعلوم کے اسی مذکورہ بالا طرز درس حدیث پر ضمنی ذہن میں مرتب فرمایا۔ اور پھر مشہور و معروف خالص محققان و محدثان تقریر نہایت صحیح و شیخ عربی میں فرمائی کہ اس کو سن کر علامہ اور تمام شرکاء اجلاس علماء و طلباء حیران رہ گئے۔

اس تقریر میں آپ نے نقباء حوثین کے اصولی استنباط تحقیق منطوق و نتیجہ منطوق و ترجیح منطوق و وضاحت و تشریح احادیث و احکام سے فرما کر حضرت شاہ علی الشارح سے لے کر اپنے اساتذہ دارالعلوم تک کے مذاقب اور طرز و طریق خدمت علم و دین پر روشنی ڈالی۔ علامہ آپ کی فصاحت تقریر اور رسالت بیان و قوت دلائل سے نہایت متاثر تھے۔ ایک دفعہ سوال کیا کہ اسے حضرت الاستاذ آپ حدیث تطبیق کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔ ایک بارکہا حضرت الاستاذ آپ سزاوارتہ خلعت الامام میں کیا فرماتے ہیں؟ اسی طرح بہت سے مسائل کو سبب تکلف سوال میں لائے اور حضرت شاہ صاحب بھی نہایت انبساط و شرح صدر کے ساتھ کافی و شافی جواب دیتے رہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کی روایت سے پیچھے گزر چکا ہے کہ علامہ بار بار کہی سے اٹھتے تھے اور کہتے تھے۔

واللہ شادایت مشمل هذا الرجل خط۔

خدا کی قسم! میں نے اس جلیلا آدمی ہرگز نہیں دیکھا۔

حضرت شاہ صاحب کی تقریر مذکور کے بعد علامہ معروف نے تقریر فرمائی اور اس میں حضرت شاہ صاحب کے غیر معمولی علم و فضل و تجر، وسعت مطالعہ، اور بے نظیر اعتماد و فاضلہ کی داد دی۔ نیز اعتراف کیا کہ بطریقہ آپ کے یہاں درس حدیث کا ہے۔ یہی سب سے اعلیٰ و افضل و انفع طریقہ ہے اور فرمایا کہ اگر میں ہندوستان کو اس جابہ علیہ کو نہ دیکھتا اور اس کے اساتذہ و علمائے اعلام سے مدعا تو یہاں سے نہیں ملتا۔ واپس جاتا۔ پھر ہر بار یہ سب حالات اپنے رسالہ العنا میں شائع کیے اور

اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ میں نے ازہر الہند دیوبند میں وہ نہضت دینیہ علیہ جدیدہ دیکھی ہے جس سے نفعِ عظیم کی توقع ہے۔ مدرسہ دیوبند دیکھ کر جس قدر میرے دل بہتر ہوئے ہیں، اسی قدر میرے دل پر بھی اچھا ہوا ہے۔

مجھ سے بہت سے لوگوں نے دارالعلوم دیوبند کے فضائل کا ذکر بیان کیے تھے اور کچھ لوگوں نے علماء دیوبند پر جو رد و تعصب کا بھی نقد کیا تھا۔ مگر میں نے اس شاندار نقد سے بہت بلند پایا اور میں نے حضرت شاہ صاحب جیسا جلیل القدر کو فی عالم نہیں دیکھا۔ واللہ

حضرت شاہ صاحب کی تقریر اور علامہ سید رشید رضا کی تقریر و بیانات دارالعلوم میں موجود ہیں۔ فاضل محترم حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری دارالعلوم کے کافی حصہ "نفع العبرین" پر ہی اشعار الاثر میں نقل فرمادیا ہے کہ یہاں اس سے زیادہ کی تجھنا آتی نہیں۔

حضرت مولانا محمد مظفر نعمانی کا بیان ہے کہ جس سال حج نے حضرت شاہ صاحب جیسا دارالعلوم دیوبند میں

حدیث پڑھا تھا یہ سال حضرت کا دارالعلوم میں آٹھویں سال تھا۔ ایک روز بزرگوار علیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نے اپنی زندگی کے پورے تیس سال اس مقدمہ کے لیے صرف کیے۔ کوئی حدیث حنفی کے خلاف نہ پڑھی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین اسلاف جو درجہ کی حدیث استناد کرتے ہیں، کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لیے اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔

فقہ حنفی اور حضرت شاہ صاحب

مولانا محمد مظفر نعمانی مظاہر دینی و فاضل دینی۔ کہ ایک موقع پر فرمایا۔ اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کسی کئی اقوال ہیں اور درجین و اصحاب فتاویٰ مختلفہ و وجہ و اسباب کی بنا پر ان میں سے کسی ایک قول کو اختیار کیا ہے۔

اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ و ذہنی اور قابل ترجیح سمجھتا ہوں جو اردو کے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے مجتہدین کا اتفاق زیادہ ہو یا جو فرمایا کہ میرا اپنا پسندیدہ اصول توبہ ہے لیکن دوسرے اہل فتاویٰ جو اپنے اصول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کی بھی تصدیق اس لحاظ سے کر دیتا ہوں کہ اگر دوسرے فقہ حنفی وہ جواب بھی صحیح ہیں۔

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص ذہن یہ تھا کہ اگر کسی مسئلہ میں فقہاء کی مختلف آرا ہوں تو اس پہلو یا مسئلہ کو ترجیح دی جائے جس میں اکثر کو اسانی اور سہولت ہو۔ اور اس ذہن کی تائید قرآن پاک اور احادیث نبوی سے ہوتی ہے۔ یہ بات مولانا محمد مظفر نعمانی نے ۱۹۶۷ء میں سفر حج کے موقع پر ممبئی میں اختر ایک مسئلہ کے پوچھنے کے دوران بتائی۔

بقول حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حضرت شاہ صاحب کے درس حدیث میں عموماً رنگ غالب ہوتا تھا اور حدیث کو فقہ حنفی کے موجدین حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے منشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ہر بات اس کے دلائل و شواہد سے اس دہلی کو مضبوط کیا جاتا تھا۔ متن حدیث کی اس کا ذکر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الہدایت بالحدیث کے اصول کسی حدیث کے مفہوم کے بارہوں میں آپ جو دعویٰ کرتے، اسے دوسری حدیث سے مزید اور مضبوط کرنے کے لیے درس ہی میں کتب پر کتب کھول کر دکھاتے جانتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متین ہو جاتا تھا تو تفسیر فقہ حنفی کا مسئلہ نکالتا تھا اور ان کو حدیث فقہ حنفی کو پیادہ کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ حدیث فقہ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ احادیث کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاوے یعنی گویا اصل تہذیب حنفی جو جیسے برویات کے طور پر روایات حدیث سے مضبوط بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہنسنے نہیں بلکہ یہ کہ اصل حدیث ہے۔ لیکن بھی اس کے مفہوم کو اس کے غمخیز اور سابق و سابق نیز دوسری، احادیث باب کی تائید و مدد سے اسے مستحکم کر دیا جائے تو اس میں سے فقہ حنفی

دس ہونے لگتا ہے۔ اس لیے طلبہ اسے حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لے کر اٹھتے تھے کہ ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں۔ حدیث کا ہر مفہم اور بیضہ کے سمجھنے میں وہی درحقیقت شاعر علیہ السلام کا فضا ہے جس کو روایت حدیث ادا کر رہی ہے۔ بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ اس روایت حدیث امام ابوحنیفہؒ اپنا کوئی مفہم پیش نہیں کرتے بلکہ صرف پیغمبر علیہ السلام کا مفہم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور قابل کی حیثیت رکھتے ہیں اس سلسلے میں ایک لطیفہ یا جاس اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار ایک منظر میں ہر حضرت ج اور ایک اہل حدیث کے مابین جڑا۔ اہل حدیث عالم نے پوچھا۔ کیا آپ ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں؟ فرمایا نہیں۔ میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں اُس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلے میں فقہ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں پھر مجتہد کیسے؟ فرمایا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد حکمۃ ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کے مطابق ہے۔ اس طرح اب سے سمجھا جائے یہ منظر دیکھا کہ ہم فقہ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لیے حدیث کو استعمال نہیں کرتے بلکہ حدیث میں سے فقہ حنفی کو نکالتا ہوا دیکھ کر اس کا راجح سمجھ دیتے ہیں۔ اور طریق استخراج پر مطلع کہہ دیتے ہیں۔ بہر حال اکابر دین بندہ کے مذاق کے مطابق حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقلد بھی تھے۔ مگر اس میں محقق بھی تھے۔ وہ مسائل میں بابت فقہ حنفی بھی تھے۔ مگر اس پابندی کو بعد از تحقیق سے اختیار کیے ہوئے تھے۔ جیسے مسئلہ تفسیر میں اہل سنت کا مذہب بندہ پر اختیار کیا جو کچھ کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے۔ مگر مجبوری الاعتقاد ہے۔ اسی طرح مسائل فقہ میں۔ حضرت شاہ صاحب کا ذہن یہ تھا کہ وہ مقلد ضرور ہیں۔ مگر فی النقص ہیں اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں۔ وہاں مسائل کو تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کے ساتھ بھی ذہن میں رکھتے ہیں۔ ایک امریکن مصنف نے اپنی معروف کتاب "ماڈرن ان انڈیا" میں زیر عنوان "دین بنیادوں کا اسلام" اہل دین کا یہی جامع استدلال نقل کیا ہے۔

"سیرت نامک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہل دین بندہ) اپنے کو مقلد کہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے معائنہ انداز سے سمجھتے ہیں اور مسائل کا تجربہ کرتے ہوئے ایسی نتیجہ تحقیق کرتے ہیں کہ اس دعا سے تعلید کے ساتھ وہ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔" (انتہی معنہ)

حاصل اس کا بھی یہی ہے کہ یہ حضرات مجتہد فی التعلید اور محقق فی الاتباع ہیں۔ کو رائے تعلید یا جہاد اتباع کے حال میں جھنجھتے ہوئے نہیں اور کم بخت و اعلیٰ ہا علیہ ان کے سچے صدقات ہیں۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب مظلہ فرماتے ہیں کہ:-

"حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ حضرت ممدوح کے علمی تجربہ اور علم کے جو ذخائر ہونے کی وجہ سے درس پر مشتمل علوم حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا۔ اس میں استدلال لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم و فن کی بحث آتی تھی۔ اگر معانی و بلاغت کی بحث آجاتی تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم معانی کا یہ لکڑیاں ہی حدیث کے لیے واضع سے وضع کیا تھا۔ معقولات کی بحثیں آجاتیں اور عقولیں کے کسی مسئلہ کا رد فرما لے تو اندازہ نہ کرنا کہ یہ شاگرد معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لیے طلب نبوی پر وارد ہوتی تھی۔

غرض اس نقلی اور روانہ فی حدیث، میں نقل و عقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے متعلقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور معائنہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحث

بہر حال حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ رہتا تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور کسی غیر تمام علوم جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا اور اس لیے جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لے کر اٹھتا تھا۔ اور اس میں یہ استعداد

پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ بعض کلام خدا اور رسول پر حق میں مقتانہ انداز سے کلام کر جاتے اور یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر رکھ رکھا
اکثر یہی سنے اعتبار فرمایا چنانچہ کبھی کبھی حدیث بالغتہ کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ یہاں اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابل میں جس قدر ہر کام ہم سنے سامان
ہے بالخصوص فقہ حنفی کے ماخذ و مناسبات کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں کافی سے زیادہ جمع فرمایا۔

تائید مذہب حنفی کے اس غیر معمولی انجام کی تعجب یہ کہتے ہر سنے گاہ بہ گاہ فرماتے کہ عمر میرا بوسیدہ کی نمک حرامی کی ہے۔ اب سرتے وقت ہی نہیں
اس پر قائم رہوں چنانچہ مکمل کر ترجیح مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نامور روزگار علوم و معارف اور نکات و لطائف ارشاد فرماتے جس سے لوگوں میں
مٹا کر من جانب اللہ آپ پر مذہب حنفی کی بنیادیں نکشف ہو گئیں تھیں۔ اور ان میں شرح صدر کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی جس کے اظہار پر گرا آپ مامور
تھے۔ ان علوم و معارف کے ذخیرہ کو حضرت محدث کے دور شیدائگار دونوں مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا سید محمد بدر عالم میر علی مہاجر مدنی کے اہل
ادراک میں جمع کر کے اہل علم پر ایک ناقابل کما فہ اجبان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزا خیر عطا فرمائے۔ اور حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ
روحانیت سے ان کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے

۱۔ علامہ مرحوم جو فارسی کے گرامر شہرہ گرامر نگار تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی نقبت کے
مطلق مندرجہ ذیل اشعار کہے ہیں۔

۲۔ غلام محمدید رہ با وج مہر و ماہ
در مدیخ شیخ انور مرد راہ

۳۔ آسمان معرفت را آفتاب
شیخ انور شاہ آں عالمیناب

۴۔ نور چشم شیخ محمود الحسن
واقف اسرار ہر نو و کهن

۵۔ یک جہاں از حلقہ در گوشان او
بجان پاکان بستہ دامن او

از تصر فمائی آں عالی گہ
شد عزیز الدین عظامی بانجہ
مولانا عظامی

حضرت محمود کا یہ حکم عمر بن ابی حفصہ رضی اللہ عنہ کی حکم جاری کی شاید اس طرف مشیر بنے کہ حضرت مخرج جہاں روایات حدیث میں تطبیق و توفیق روایات کا امتداد اختیار فرمائے ہوئے تھے۔ وہیں روایات فقہیہ ہیں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق و توفیق ہی کا تھا یعنی مذاہب فقہاء کے اختلاف کی صورت میں حلفہ کا وہ قول اختیار فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے اور دونوں فقہاء باجم برقرار ہیں۔ اگرچہ یہ قول غلطی پر بھی نہ ہو اور مسلک معروف کے مطابق بھی نہ ہو۔ مگر صرف اس پر اکتفا کرتے نہیں ہیں اختلاف متناہم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوڑ دیا جاتا اور صاحبین کا قول بڑا اختیار کیا تھا یعنی فقہ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہ جاتے تھے مگر ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بلا واسطہ قول سے کبھی باہر نہ نکل جاتے تھے۔ خواہ وہ بواسطہ صاحبین ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا قول ہو شاید اس کو حضرت نے ابوحنیفہ کی منکوحی کرنے سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسع سے رجوع کر کے کھلے طور پر مذہب کے معروف و مشہور جتنے بلکہ اقوال الی حدیثہ رحمۃ اللہ علیہ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آپ کی تھی اور بلاشبہ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام غلام مستیانا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصومات کے بارے میں جن تعالیٰ نے انھیں شرح صدر عطا فرمایا تھا اور وہ بالآخر اسی راہ پر چمک چکے تھے۔ جس پر ان کے شیوخ سرگرم و قادر ہو چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الحدیث ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ متفق ہو جاتے ہیں اور ائمہ اثنی عشرین سے کفر ان کی موافقت نہیں کرتا میں میں خود بالحدود پوری قوت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتا ہوں۔ اور کچھ مسائل میں کہ اس مسئلہ میں خود کفری ایسا واقعہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے وہ میری حق تعالیٰ اس واقعہ کو منکشف بھی فرما دیتا ہے۔ یہ مقلد امام ابوحنیفہ کے اس مسلک کے ذیل میں فرماؤ کہ فقہاء تابعی ظاہر و باطناً نافذ ہوتی ہے۔ فرمادے کہ اس مسئلہ میں بالحدود ابوحنیفہ ہی کی پیروی کروں گا۔ کیوں کہ اس میں صرف امام ہی متفق وہیں اور یہ تقریر اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بنیاد ان پر منکشف ہوتی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔

اس قسم کا مستحسن حضرت آئمہ قدس سرہ کے ہاں سے میں نے حاجی امیر شاہ خان صاحب سے سنا کہ حضرت مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی (داعیہ دین) کے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقلد ہوں۔ صاحب ہادیہ اور درمختار کا مقلد نہیں ہوں۔ اس لیے میرے مقابل میں بطور معارضہ صرف قول آپ میں کہیں وہ ابوحنیفہ کا ہرنا چاہیے۔ دوسروں کے اقوال کا میں جواب دہ نہیں ہوں گا۔ اس سے بھی سختی نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول ان طرقات کے نزدیک خود امام کا ہرنا تھا اور قوی و حقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔ پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ پر آخری عمر میں یہی سختی منکشف ہوا جو ان سے بیرون پر منکشف ہوا تھا اور اس کے خلاف ترجیح کو وہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی حکم جاری کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرما رہے ہیں۔

غالباً مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کا یہ ذکر حضرت مازنیؒ سے فخر خفہ امام پر ہوا تھا۔ حضرت مازنی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور حدیث سے جو فخر خفہ الامام کے مسئلہ کے لیے اہل حدیث حضرت پیش فرماتے ہیں۔ مولانا محمد حسین مرحوم کے پیش فرمائے پاسی حدیث کے بطور بحث اور بحث و معانی پر بحث فرماتے ہیں جسے فقیر کی کمزوری بٹالوی رنگ دے گئے اور یہ کہہ گئے کہ اگر مولانا صاحب ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ آپ حبیباً محقق، فقید اور صاحب علم و نظر انسان جو خود بخود بصیرت رکھتا ہے۔ وہ امام غلام کی تقلید کیوں کرتا ہے۔ اس پر حضرت مولانا مازنیؒ نے جواب دیا کہ اشکال نہ ہے۔ یہ کہ آپ کے فرمان کے مطابق جب میں باوجود اس علم و نظر کے امام غلام رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کر ضروری خیال کرتا ہوں تو آپ جیسے رنگ تقلید کریں نہیں کرتے۔ گزشتہ اوراق میں اگر ذکر علی مصری جلی صاحب دین حضرت شاہ صاحب کے متعلق یہ کہا کہ اگر میں تم کماؤں کلام اور شاہ امام غلام کے پیچھے چلے جاؤں تو مخالفت نہیں ہوگا۔ اسے اندازہ ہوتا ہے کہ جب ایسے عظیم انسان تقلید کر ضروری خیال کرتے ہیں۔ تو پیغمبروں کے لیے تو تقلید نہایت ضروری ہوگی اور اس سے حضرت امام غلام کی مخالفت قدر کا بھی پلاس اندازہ ہوتا ہے۔ (ارشد)

اس کے ساتھ درس حدیث کے سلسلہ میں غلابیہ مدرسہ کے خلاف بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورت حال بھی پیدا ہو جاتی تھی۔ ان مناظرانہ مباحث اور فرعاتی اختلافات سے کتاب و سنت کے ہزار ہا پوشیدہ علوم و اشکات برپا ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل ہونا ممکن نہ تھے اور پھر ان فرعات کا تراجم اور تراجم کے بعد قول فیصل حضرت محدث کے قلب و لسان سے ظاہر ہوتا تو قوف کی خصوصیات لگ جاتے تھے عجیب و غریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تراجم میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلے میں توفیق ہاتھ بیان نہیں۔ وہ خود مستقل علوم و معارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔ بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے تفردات کا ذکر آتا تو پہلے ان کے علم و فضل اور تفقہ تبرک و سرائے ان کی عظمت و شان بیان فرماتے اور پھر ان کے کلام پر بحث و نظر سے تنقید فرماتے جس میں عجیب رنگ و رنگ کیفیات جمع ہوتی تھیں۔ ایک طرف ادب و عظمت اور دوسری طرف رد و قرح یعنی بے ادبی اور بی احترامی کے اگلے سے اگلے شائبہ سے بھی بچتے اور راج اور صواب میں کٹان صواب سے بھی دور رہتے کبھی کبھی علی جوہر میں رنگ و مزاج بھی رد و قرح فرماتے تھے جو بجا تھے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ برتا تھا۔

(ماخوذ از نور الانوار قاری محمد طیب صاحب)

علی اشغال میں بغیر معمولی انماک اور شغف کے باوجود عمل بالکتاب والسنة اور اتباع سلف کے اہتمام میں زہد و تقویٰ اور تصرف و سلوک بھر کی اور کوتاہی نہیں ہوتی تھی طے والے بہت سی سنتوں کو حضرت شاہ صاحب کے عمل کو دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ سنت نبوی علیہ التحیۃ والسلام کے مطابق کھانا کڑوں بیچ کر کھاتے تھے اور کھانے میں ہمیشہ تین انگلیاں استعمال کرتے اور دونوں ہاتھ شغل رکھتے تھے۔ ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اُسے توڑ کر استعمال کرتے تھے۔ ہتھ بہت سے پھرتے پھرتے استعمال کرتے تھے۔ زہد و تقویٰ حضرت محدث کے روشن اور ہرے چہرے پر بے ساختہ ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر حضرت محدث کا سرخ و سفید رنگ کشا وہ پیشانی اور منہس کچھ چہرہ پر چوکی مجموعی جاہت و عظمت کر کہا تھا کہ اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ ہی ہے جو جمع کے لیے جاتے تو خاسعوا فی ذکر اللہ کا منظر سب کو نظر آتا۔ حَسْبُكَ اللَّهُ تھا۔ اُسے بیٹھنے اکثر دیشہ تحسینا اللہ فرماتے اور ایسے ہی مرقہ برقہ اللہ آجیٰ فرماتے رہتے تھے۔ درس میں بعض اوقات غایت بر خشیت سے آواز میں نئی آجاتی جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انشا و قصائد اور عظیمین خوف و خشیت کے اشارہ اکثر ترانہ گھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مضطرب المی نظر آتا اور سامعین کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں۔ ٹھیک طریقہ نبوی کے مطابق کن انھیں سے دیکھتے اور جو مرتبہ ہوتے پورے مرتبہ پڑھتے تھے۔ ادب علم کا یہ عالم تھا کہ غریبی فرما کر میں کتاب کو مطالعہ کے وقت اپنا تالیف کسی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ غور کتاب کے بالغ ہو کر مطالعہ کرتا ہوں۔ مطلب کسی کتاب پر حاشیہ لکھنا چاہیے تو جیسے اس کے کہ کتاب کو حاشیہ کے مطابق پیر لیں کتاب کو بغیر لائے آپ اس طرح گھم جاتے تھے۔ چنانچہ کبھی نہ لکھا گیا کہ لکھ کر مطالعہ کرتے ہوں۔ یا کتاب پر کبھی ٹیک کر مطالعہ میں شغل ہوں۔ بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مودب انداز سے بیٹھتے۔ گریبا کسی شیخ کے آگے بیٹھنے استفادہ کر رہے ہیں۔ گریبا مشہور مفتوح کے مطابق کہ عجب اپنا بعض بھی کسی کو نہیں دیتا۔ جب تک اپنا لکھ اس کے حوالہ نہ کرنا دیا جائے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں نے اس کے بعد سے اب تک وشیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بلکہ نہیں کیا۔ سبحان اللہ کہنے کو تو یہ بات چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور جہاد کے بس کی بات نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لیے مفتی و مدیر کر دیا ہے اور وہ گریبا بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس آداب کے عملی نمونے پیش کر اسے جائز رکھے۔

ہر کے را بہند کارے ساختند
میل اورا درویش انداختند

اب شیوخ و اکابر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ مار کر گفتگو نہ فرماتے۔ حضرت شاہ صاحب اپنے باطنی کالات کو ہمیشہ چھپائے رکھتے تھے اور یہ بھی بات ہے کہ علمی کالات حضرت کے ساتھ ایسے خیر و کئی تھے اور علم کا حضرت پر اپنا غلبہ تھا کہ مجبوراً علم معلوم ہوتے۔ لیکن بغیرائے قرآن پاک انسانی اللہ من عبادہ العلماء

آپ صیح معنوں میں خدائے انسان تھے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ علمی کالات کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اس کے لیے باطل دبلے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو سکون و تصرف سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس علمی کالات اور شغف علمی سے وابہ تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کو اس دولت سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور آپ یقیناً آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے ہمارے تھے۔ اس لائق کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ ایک دفعہ واقعہ سنایا اور اس سلسلے میں جو کچھ عرض کیا تو ایک آدھ بات کا پتہ چل گیا۔ فرمایا کہ:

ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لیے جہاز راستہ کی کافی مسافت گھڑے پر سوار ہو کر ملے کر پڑی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا سامنا ہو گیا۔ پنجاب کے شہر پر صاحب کے مرقبہ تھے۔ یہ مجھ سے اپنے پیر کے کالات و کرامات کا پڑاؤ کرتے تھے۔ ان کی خواہش اور غریب یہ تھی کہ میں بھی ان پر صاحب کی خدمت حاضر ہوں اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستہ میں بھی پڑتا تھا میں نے بھی ارادہ کر لیا جب ہم دونوں پر صاحب کی خانقاہ پہنچے تو ان صاحب نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ اندر حاضر ہونے کے لیے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے۔ ان بزرگ نے اطلاع پا کر نہ اپنے صاحبزادے کو مجھ کے لیے بھیجا۔ اور اکرام سے پیش آئے۔ خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے بانی سب مریدین و طالبین نیچے فرش پر بیٹھے۔ گر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ، پنجاب یا کچھ باتیں ہوئیں۔ اس کے بعد اپنے مریدین کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے طرفین پر ان پر توجہ دانی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو کر اور ترپٹنے لگے۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا: "میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی توجہ فرمائیں۔ انھوں نے توجہ دینا دیکھ کر اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا راز لیکر کہہ بیٹھا گیا۔ بے جا دل نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی۔ لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہوا کچھ دیر بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ پر اثر نہیں ہو سکتا۔

حضرت نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:

"کچھ نہیں ہے لوگوں کو سنا کر گرنے کے لیے ایک کرشمہ ہے اور جو شکل بھی نہیں۔ معمولی مشق سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں؟"

پھر اسی سلسلہ میں اور اسی جوش کی حالت میں فرمایا:

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو انشاء اللہ تین دن میں یہ کیفیت پہلے ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں اصل میں احسانی کیفیت اور شریعت و سنت پر استقامت ہے۔" ث

حضرت علامہ اپنی اس جلالت قدر اور رفیع منزلت کے باوجود اکابر و روہنڈ کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے۔ اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ فرمایا:

"ہم یہاں آئے دینی کشمیر سے ہندوستان، تو یہاں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا اس کے بعد حضرت استاد دینی شیخ المندر اور حضرت راجپوری دینی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہئے تو وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا۔"

پھر جلیل السلام کے اس ارشاد کی طرف سے جس میں آپ نے اس سوال کے جواب میں ملا احسان۔ احسان کیا ہے؟ فلاں! تہذیب کا کمہزار، خان نام لکھی تہذیب کا کمہزار، مذہبی، کر تہذیب کے لئے ہر بات کو کرنا تو اس کو بھی دے اور اگر یہ نہ ہو تو اسے یقین ہے کہ وہ خدا ہے دیکھ لے۔

اصلہ طبعیت کا مسلک ہے کہ اصل پر تائید و شریعت ہے (ارشاد)

انداز میں جس حضرات کی تعریف اور تعین انور شاہ جیسے محدث و فقیہ کی زبان سے ہوئی ہو۔ ان کا مقام کتنا بلند ہوگا۔ اس کا مجموعہ جیسے ذکر و تعریف
جہاں کی کہتے حضرت شیخ الحدیث، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر اسی کتاب میں اپنے اپنے مقام پر کر رہا ہے حضرت
رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ عبد القادر کے پروردگار تھے۔ ان کا ذکر شیخ عبد القادر کے حالات میں ملاحظہ فرمائیے گا۔

حضرت شیخ عبد القادر رائے پوری فرماتے تھے کہ کچھ دنوں میں نے ہی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا ہے۔ میں ایک دفعہ نہری مسجد
درہ اسماعیلیہ گیا تو دیکھا کہ حضرت شاہ صاحب ایک حجرے میں دروازہ بند کئے ذکر و مری جہر کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اللہ، اللہ، اللہ، درمیک
اہم ذات کرتے رہے۔ اس وقت عمر اکیس بائیس سال کی ہوگی۔ نیز فرمایا جب حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بازار نکلتے تو سر پر دھال ڈال کر انگھل کے
سامنے پردہ کر کے نکلتے۔ مبادا کسی عورت پر نظر پڑ جائے۔

عارف باللہ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ نے جب حضرت شاہ صاحب کا نام اور شہرت سنی۔ وہ عافیاں کر کے زندگی میں
شاہ صاحب کی زیارت ہر جاتے۔ ایک دفعہ لاہور حضرت کی تشریف آوری کی خبر سنی۔ کارہیج کر دعوت دی۔ حضرت نے پہلے تو انکار فرمایا لیکن مولانا صاحب
کے اصرار پر لاہور فرمایا۔ شرف پر پہنچے اور اپنے قدم سمیت نرم سے شرف پر کھڑے ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا: حضرت میاں صاحب بہت ہی مومن ہوتے۔ حضرت کے سامنے
دو دنوں کا ذکر کرتے اور کبہ کا گلاب تاب رسول ہیں۔ میرا ہی چاہتا ہے کہ حساب کے چہرے مبارک پر انار کو دیکھا جاویں۔ گفتگو فرماتے رہے اور حضرت شاہ صاحب
خاموش سنتے رہے کہیں کہیں کچھ ارشاد فرماتے رہے۔ میاں صاحب علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ مجھے نہایت کبر۔ شمار اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ حضرت جب واپس ہونے
لگے تو بہت پرانے سر تک ساتھ مشاییت کے لیے تشریف لاتے۔ جب بوڑھے لگی تو پچھلے پاؤں واپس ہوتے فرماتے لگے کہ
”یہ بند میں چاروں ہی جہد ہیں۔ ایک ان میں سے حضرت شاہ صاحب بھی ہیں۔“
یہ بند میں شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ شرف پر گئے تھے۔ میاں صاحب کر کیسے پایا۔
فرمایا :-

”میاں صاحب عارف ہیں اور صمیم معنی ہیں عارف ہیں۔“ (”حیات انور“ ہدایت مولانا محمد نورانی)

حضرت مولانا محمد انوری ہی نظر آ رہی کہ،

بہاول پور شہر میں جامع مسجد و محرمات پر قاریانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لیے عمار کر جیسے رہتے تھے۔ دو دفعہ اس کو بھی سبھا۔ ان ایام میں
اس قدر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے مبارک پر انار کی لاش جوتی جی تھی۔ شخص اس کو محسوس کرنا تھا۔ اس نے بار بار دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں
لیکن روشنی ایسی جیسے کئی کے فتنے روشن ہوں۔ حالانکہ اس وقت بجلی لگ جاتی تھی۔ بہاول پور جامع مسجد میں جو کہ نماز حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے
بعد نماز کو یہاں ہی چڑھتا تھا ہزاروں ہزار کا مجمع ہوتا تھا جسے چھین فرمایا کہ

حضرات! میں نے ڈاویل جانے کے لیے سارا بن سفر نافذ کیا تاکہ کیا کیا مولانا غلام محمد صاحب شیخ الحدیث کا
خط دہرندہ وصول ہو کر اشرار دینے کے لیے بہاول پور گئے۔ چنانچہ اس عاجز کے ڈاویل کا سفر طریقی کیا اور بہاول
کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ جہاں نامہ احوال تو سیاہ ہے ہی۔ شاید یہی بات میری محبت کا باعث بن جائے کہ کچھ بڑا
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانب دار ہو کر بہاول پور میں آیا تھا۔“

یہ روایات حضرت شاہ صاحب کے اخص اصحاب حضرت علامہ ابراہیم صاحب لاہوری، حضرت شاہ صاحب کے سرانجام حضرت خلیفۃ عرفۃ دین تھے۔ بہت اہم
حکامات کے شرف و کرم و جود و ہمدردی نے خلیفۃ عرفۃ کے لئے شامۃ ہے اسے دیکھ کر حقت مگر دیکھو۔

بروایت حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی :-

نور اللعین کا یہ عالم تھا کہ جو شخص بھی دیکھتا۔ وہ ازل نظر میں یقین کر لیتا کہ یہ خدا کا کوئی نیک بندہ ہے حتیٰ کہ یہ نور اللعین اعلیٰ برسیات میں ہے مگر حقیقت کی تتبع بہت دشوار ہے اور درجہ انصاف کی دشواری کو تو تو چھوڑی مٹ - وانہا لکبیرۃ الاعلیٰ الخاشعین الذین یظنون انہم ابہم و انتہم المیدۃ راجعون - شاہ صاحب اگر کسی مجلس میں شرکت فرما رہے اور باہر سے کوئی اجنبی مجلس میں داخل ہوتا تو یہ دیکھتے ہی سمجھ لیتا تھا کہ مجلس میں سب سے بڑا عالم اور سچی بی شخص ہے۔

مرد ستانی کی پیشانی کا نور !

کب چھپا رہا ہے پیشیں ذی شعور !

یہ نابھیر لانا محمد ادریس کاندھلوی، جب بھی حضرت شاہ صاحب کو دیکھتا تو یہ شعر زبان پر آتا۔

اَنْسَلُوْا بِحَبْرِ مَا بَقِیَتْ لَہُمْ وَلَکِنْ نَعْدُکَ خَیْرَ حَبِیْنٍ نَعْتَقُہٗ

عجب تک آپ زندہ ہیں۔ اس وقت تک مسلمان خیر و برکت میں ہیں اور تیرے گم ہونے کے بعد کوئی خیر نہیں۔ بلقاہ شافعیہ میں ہے کہ یہ شعر کسی بھاری کو دیکھ کر چھپتا تھا۔ شاہ صاحب چونکہ اس زمانے کے امام بھاری تھے۔ اس لیے یہ نابھیر ان کو دیکھ کر یہ شعر چھپتا تھا۔

شکل و صورت اور لطافت طبع

کہ جو کہنہ رستان، مصر و حجاز اور دوسرے ملک ہر گھر کے بڑے علماء اور شاہ کو دیکھتے کا موقع ملا ہے۔ لیکن جو عبادت، جو دھار و دشتانت جو کشتی اور میں سے حضرت الانشاؤں پائی۔ وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آتی۔ بڑا ہلکا نہیں بھی بیٹھے ٹوٹ سے الگ اور سب سے نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ اور گھومنے کے بعد وہیں پر جا کر نظری اور چہرہ جی تو اس طرح کہ وہاں سے بیٹھے کا نام دیتی۔ کشمیری النسل تھے۔ اس لیے خوب کھلا ہوا۔ سپید رنگ، کشیدہ دراز۔ چوڑا چوکھلہ سینہ، دوہرا اور گداڑ جسم بڑی بڑی گریلی اور شیشی نگاہیں۔ کشادہ و فراخ پیشانی طویل گردن، مٹی، بڑے بڑے کان پر گشت اور فرج چوڑا۔ حیر کی مانند نرم و سبک جلد۔ بیٹھے تھے تو معلوم ہوتے تھے کہ علم کا ایک کوہ گراں سب گامی کر رہا ہے۔ بیٹھے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب علم سے ولایت شادوں کو اپنے گرد لپیٹ لیا ہے۔ کبھی سفید اور کبھی سرسبز عالم اور قامت بالا پرست فرقا ! دیکھنے والے ڈر ڈر کے دیکھتے تھے کہ کیا خدا کے جانے کو فرمان نبوی ہے۔ العین حق - غرض کوئی ایک ادا ہوتا تو اس کا ذکر کیجئے۔ کوئی ایک خوبی ہوتا تو اس کو بیان کیا جائے۔ جہاں یہ عالم ہو کہ۔

نفرق القلم ہر کیا کہ می ننگ سرم ! کثرہ دامن دل کی کش کہ جہاں جا ست

وہاں ناموشی کو ہی ترجائی دل کا منصب قبولین کو دینے کے برا اور کیا چارہ ہے۔

اسی حسن و جمال ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور ابلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذائیں سادگی پر تھیں۔ نازہ بچوں اور پردے کے عاشق تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں سالہری زندگی میں ایسے گزرے ہیں کہ میں نے ہر نرندوں کے علاوہ اور دوسرے گشت و گجاہی میں خزانوں کے بہت شوقین تھے۔ اگر ٹیپے خزانوں سے میرے آجائیں تو اور کھانا بہت اکاماتے تھے۔

ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت تعریف تھے۔ ان کے علم کی عظمت و شان کو بہت وقیع اور حقیقت بھر سے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ یہ نبی جلال علم میں سے ہیں۔ ان کی رفعت شان اور عظمت قدر کیا عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو برا بھلا کہ دیکھنے لگوں تو کوئی بیچھے سے گریبا نیکی نہ کرے گا۔

استاد علی الشرحش میں اگر وہ یہاں آئے گا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہیں گئے دُعا گا۔

ایک دفعہ حضورِ مہربان کے درمیان بھاری شرعیات کا درس زور و شور سے ہوا تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرماتے لگے کہ جب عیالی شمس الدین ہی ہوتے ہر گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا۔ جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔ طلبہ حیران ہوئے کہ بھائی شمس الدین کون اور کب آئے اور کب نصحت ہو گئے؟ حیرانی دیکھ کر فرماتے لگے۔ جاہلین! دیکھتے نہیں، وہ بھائی شمس الدین جازسہ ہیں۔ اب کیا اندھیرے میں پتھر کے پے کیا وہ لطف کا سبق ہو گا؟

ایک باپ بچہ کی صفت میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا کہ بچہ کیل انداز سے۔ فرمایا کہ جاہل تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کسی طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اس اپنے پاس والے کو بھیج دیا کروں گا۔ وہ اپنے پاس والے کو بھیج دیا اسے گا اور وہ اپنے پاس والے کو بھیج دیا کہ کیا یہاں تک اس بچہ کا یہ فیاضی سلسلہ سنبھالے گا؟

ایک دفعہ مسائل فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرماتے لگے یہودی ہیں یہے مگر یسین بابا انھوں کے پیچھے ہر بھی جاتی ہے اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحب ہی سجدہ العلم میں امامت کرتے تھے، فرماتے لگے تم کسی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ جو چالیس برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؟ چالیس وہ ۴۰ برس کا نابالغ میں ہے۔ اس وقت تک حضرت کی شادی نہیں ہوئی تھی، اشارہ اسی طرف تھا۔

ایک دفعہ ملا علی الدین میرٹھی تعلقی کا بابت لیکر آئے حضرت بہتر صاحب مولانا محمد احمد مرحوم نے اس کو بلایا اور شاہ صاحب سیت دوسرے اکابر ملاتے لگے۔ کھاتے مکے دوران شاہ صاحب نے فرمایا کہ ملا صاحبی! اس برف میں کتنا کالیتے ہو؟ کہا کہ ساٹھ روپے۔ مسکرا کر فرماتے لگے کہ تو میرے تین دارالعلوم کی صدر مدرس کی ضرورت نہیں دان و دنوں حضرت کی تنخواہ ساٹھ روپے تھی،

بہر حال شاہ صاحب علی دہلی کا امامت رکھنے کے ساتھ ساتھ خوش طبع بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں مختلف جنرل اور لائین باتوں کا کوئی خود نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی نے کسی کی بُرائی یا فضول بات شروع کی تو مٹا کر فرماتے کہ بھائی ہیں اس کی فرصت نہیں ہے۔ کوئی مسئلہ پرچھنا اور تو پھر روزہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لیے فارغ نہیں۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت کرتے تھے۔

ادوات کا بڑا جتنہ طالب علم کتب میں کرتا تھا۔ ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی مندرجات کے علاوہ کوئی وقت کتب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ شیخ الباری کا درجہ جلدوں کی کتاب ہے، تیرہ صدیوں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور یہ بھی فرمایا کہ میں درس کے لیے کبھی مطالعہ نہیں دیکھتا بڑا ملازم کا مستقل سلسلہ ہے اور درس کا مستقل۔ اس لیے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی ہوتی ہیں۔

علم و فضل کی بلندی کے تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی سائل حضرت کے پاس آیا ہوا اور نام لگایا ہو۔ جیب میں جو کچھ ہوتا۔ اٹھتی یا روپیہ سائل کے حوالہ کر دیتے۔ ایسی بات کر کے اسے احترام کرتے جس سے کسی کی دلاوری ہو۔ ایک دفعہ تشریف لے گئے۔ وہاں کے ایک نامی گرامی پیر سرسبز بنائے عیدت حاضر ہوئے لیکن داڑھی منچھ صاف ہونے کی وجہ سے بھینچے بھینچے سے بیٹھے۔ شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ آپ نے جانب لیا اور فرمایا پیر شمس صاحب آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے۔ لیکن عرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے یعنی دنیا کا نام لینے پر کہ دوسری ہر دوسری داڑھی منچھ کو کوئی مجھے کھائے کہ نہ دے۔ اور اس طرح اگر آپ پیر شمس ہر دوسری داڑھی صاف دکانیں تو ہر کوئی کہے کہ ابلے ابن کو پیر شمس نے بنا دیا۔ یہ تو ملا ہے۔ تو پھر آپ کو بھی جیسا جیسا نام پر روٹی بیٹھے۔ جب ہم دونوں کی عرض ایک ہے، تو محض اختلاف فعل پر آپ شرمندہ کیوں؟

اخلاق

نموداری

عام اخلاق و فضائل کے ساتھ حضرت شاہ صاحب میں غور و ادراک بھی اُنسا دور کی تھی۔ بار کے قضیہ کے مسلمان نظام حیدر آباد دہلی آئے جس نے خود نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے۔ خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلایا۔ حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب و مشہد اُنک کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دست و دو آئین کی پابندی۔ روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب کے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر السلام علیکم کہا۔ نظام پر شہزادی کے لیے آگے بڑھے اور علیکم السلام کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر بٹیا کر بیٹھا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے متعلق تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور ان کے فنی لغوں کا ذکر کر کے فربا کر اگر آپ ان کو بھی حاصل کر کے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کریں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطے اسلام کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے ایک جنت روزہ اخبار ”مہاجر“ نکلتا تھا۔

کے ایڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام فہمن کے مطابق ”بارگاہِ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی“ یا اس مفہم کی کوئی اور عبارت بطور عزائم خبر لکھی۔ چھپنے سے پہلے اتفاق سے شاہ صاحب کو خبر ہو گئی تو دہرہ خفا ہوئے اور فرما کر کہ میں چرچہ ایک (دوسرے بار) بے لگتاعت ہوں بلکہ آئنا مگر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کروں کیسی بارگاہِ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؟ صاف لکھتے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات ایک مرتبہ حیدر آباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈریٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا۔ چرچہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کے حکمائے دیوبند کے ساتھ قیام بطور ادب و تلبی علاقہ تھا۔ دورانِ قیام میں بعض لوگوں نے جاہا حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات حضرت کو اس کی اطلاع ہوتی تو فرمایا مجھ کو شے میں عذر نہیں ہے۔ لیکن اس سفر میں نہیں بلوں گا۔ کیونکہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچی کی تقریب میں تھا اور بس۔ اور میں اس کو خالص ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ چرچہ لوگوں نے کوشش کی اور اور نظام کا بھی ایسا تھا مگر شاہ صاحب رضامند نہیں ہوئے اسی قیام حیدر آباد کے زمانہ میں ایک روز سر کر جیدری کا فون آیا بوجہ بعینِ آسمان کے گورز بنے، کہیں ہو لانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں و لاکہ انھیں کہہ دیں میں یہیں ہوں آج صبح۔ حیدری صاحب کو پیام پہنچا لیا گیا تو انھوں نے کہا۔ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں۔ مگر میرے آنے پر حاضرین کی کواٹھا دیا جائے۔ میں تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت کو پیام دیا گیا تو فوراً ارشاد فرمایا کہ ناممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لیے حاضرین مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا ان لوگوں کے میں کہوں کہ چلے جائیں۔

اسلامی غیرت و حمیت

حضرت علامہ کشمیری بطباعت حیدر آباد رہتے تھے۔ لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کسی طرح کے تسامح یا غفلت شعاری کو گوارا نہیں کرتے تھے۔

مقتدر بہادر میں مرزائی وکیل ایک دفعہ کچھ لگا لگا نکال بزرگ مرزا غلام احمد کو کافر نہیں کہتے۔ آپ نے فرمایا نہ کہتے ہوں گے۔ اس سے کیا فرق پڑا۔ اس نے اس بات کی محکوم کی۔ دراصل بات یہ تھی کہ اس بزرگ سے نواب بہادر پور کا روحانی تعلق تھا۔ مرزائی وکیل چاہتا تھا کہ شاہ صاحب کو قیامت میں جس سے مقتدر پر کر کے اثر پڑے۔ شاہ صاحب سمجھ گئے تھے۔ اس لیے زہی سے کہتے رہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب اس نے محکوم کی ترشہ دیکھی۔ جلال میں آگئے اور تن کفر فرمایا۔ ”اللہ کی جنم بہت وسیع ہے اس میں اس بزرگ کا نام لے کر“ وہی جہل کتا ہے۔ فہمت الہی کفر۔ مرزائی حیران دیکھا کہ ایک دفعہ ڈھیل سے دیوبند جا رہے تھے۔ دہلی سٹیشن پر گاڑی دہلی تھی۔ کافی دیر کرنا پڑا۔ دوران گفتگو حضرت کو معلوم ہوا کہ دہلی میں قادیانین کا تین ایک مجلس ہوتا رہا جس میں تہذیب کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علمائے اسلام میں سے کسی شخص نے جلسہ میں ہرج کر ان کو ملاحظہ کی عزت نہیں دی۔ حضرت علامہ غلام احمد کو ملا سید احمد اہم اے الکر آبادی سے فرمائے گئے۔ ”مولوی صاحب! کسی شریعت آدمی کی توہین گالی سننے ہی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے

بہزاکام کرے تو اس سے بھی اس کی تہمیں ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گالی وغیرہ ہے۔

اس پر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک تمول اور باغرت آدمی نے ایک تنص زبیر ثمان نامی کے خلاف شکایت کی کہ اس نے ایک عزم اس کی طبی شدہ بیچو کی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اس نے کہا: امیر المؤمنین میں نے تو اس کی مدح کی ہے نہ کہ ت۔ دیکھئے میں کہتا ہوں :-

ع د ع المكاوم لا ترسل بعقيتها
 افعد فانك انت الطاعم الساجي

سہجہ ۱۔ تو چھوڑ کر بیگمیں اور بڑی طاقتوں کو۔ مٹ سفر کو ان کی طلب میں۔ تو بیٹھا بھی رہ دینے لگا کر کے اندر۔ کیونکہ

ترکمانوں نے مالابھی نہیں اور پینے والا بھی۔ ہمارا اللہ خرب کھاتا پیتا آدمی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ شعر اتنا سراپا کیا کہ اس کا ترجمہ صحیح ہے۔ درحقیقت ایک شریف آدمی کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی کہ حضرت ابراہیم کو مغیروں کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔

ایک دفعہ دور وحدیت شریف کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "میں نے اپنے معری و فارسی ذوق کو محض غفلت کے لیے مٹا دیا اور دیرپا کھینچ کر لیا۔ اگر آپ کو علم حاصل ہو

اپنے اپنی مخلوق کو ثابت کی زبان پہنچیں جس نے عربی فارسی ہی کہی۔ لیکن اب مجھے اس پہنچی افسوس ہے۔ ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین کا دفاع کے لئے کئے گئے ضروری سہے کار اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور ابھر کر دنیائیں دین کا نامہ کر کے کیئے ضروری سہے کار انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں ہمارے میں اب کپ صاحبان کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔

بَابِ اَرْدُو وَاَنْگَرِيزِي كِي اِهْمِيَّت

اس صدی کے دو چار عظیم فنون میں سے ایک بڑا فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ ہے اور یہ فتنہ اس لحاظ سے اور بھی شدید تھا کہ اس کو اس وقت حکومت کر رہے تھے۔

حکم نبوت اور حضرت شاہ صاحب

جس کی سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ التو کی شان ہے کہ آج وہ پہر کے وقت بھی نظر نہیں آتا۔ کچھ انگریزی کی اب مرثیہ محرمت صرف اپنے ملک پر ہے اور وہاں خود ہی سال میں کبھی بھاری نظر آتا ہے۔ اور یہ بات صرف ہمارا قیاس ہی نہیں۔ خود متین قادیان سے کہہ سکتے کہ وہ انگریزوں کا خود پروردہ ہے۔ اور یہ بات اور بھی نمایاں ہے کہ اس وقت سامنے آگئی۔ جب سقوط بغداد پر مرزا یونس نے قادیان میں گئی کے چراغ جلائے۔

غلام احمد قادیانی کی بہت بڑی شہرت سے زیادہ سیاسی تحریک تھی۔ مگر اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا اور قادیانی اسلامی اصطلاحوں اور علی مخالفانہ دعوے سے مسلمانوں کی دولت ایمان کو کھٹکنے لگے۔ مسلمانان ہندوستان اس سے باخبر نہ تھے اور ہر مذہب و خیال کے سرآوردہ حضرت نے اس سلسلہ میں کام کیا اور یہی ہے کہ پیر محمد علی شاہ صاحب اور ابوالخیر مولانا انوار اللہ قرسری، مولانا ابوبکر سیّد سائیکو، رحمہ اللہ، جمیع نے رقبہ قرآنیت میں خوب کام کیا۔ جنگ عظیم میں مسعود بن عبدالقادر قادیانی میں گئی کہ چراغ جلنے اور اس جنگ میں مڑائیوں کے علی الاعلان انگریزوں کی حمایت نے اس جماعت کے نمائندوں کے جھلے بڑھا دیئے اور یہ لوگ کھل کر سامنے آئے لگے حضرت علامہ انور شاہ صاحب علیہ الرحمۃ جلیلا صاحب رسول عالم اور نور بصیرت و دانش سے موزن انسان سپر تاجدار حضرت شاہ صاحب نے اس سلسلے میں سب سے عاجز کام کیا۔ وہ ابن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ حضرت ابوبکر علیہ السلام کو یوں مندرج کیا ہے۔

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اٰمَنًا — ”بے شک ابراہیم تم سب سے پہلے یحییٰ اپنی ذات کے لحاظ سے تو ایک فرد تھے، لیکن کام کے لحاظ سے ایک

امت کے بارہ ائمہ نے کام کیا۔ یعنی اس طرح شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اس امت محمدیہ علیہ التحیۃ والصلوٰۃ والسلام کے ان جامعہ افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے بیک وقت مختلف محاذوں پر کام کیا اور جن کے نورِ معرفت نے ہر شعبہ زندگی میں برقی اور دوامی تفصیل کی پہلی گنجائش نہیں۔ ہم اجمالی طور پر مختصر بہت کے سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

مختصر بہت کے سلسلہ میں کام کرنے کے کئی تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ خالص علمی افلازیں روزمرہ زبانت کیلئے ایک جماعت ہر روز نہایت سنجیدگی اور سادگی سے اس کام کو سرانجام دے۔ ایک صورت یہ تھی کہ شعلہ ذرا مقروں کی ایک کھیمپ تیار کی جاتے۔ جو پڑھنے والی اور آتشِ مانی سے عوام کو اس طرح ایک غصہ بجا دے کہ آگاہ کرے اور حسب ضرورت قرآنی سے بھی گریز کرے۔ ایک پہلو کام کرنے کا یہ تھا کہ کسی ایک بڑی شخصیت کو روزمرہ زبانت کا مبلغ بنانا جاتے جس کا ایک ایک لفظ غرض قادیانیت کے لیے حاشیہ برق ثابت ہو۔ ایک انداز کام کرنے کا یہ تھا کہ اگر مرزا کی مشکلیں تھیں تو اس کے ذریعے تبلیغ کر تو ان کے مقابلہ کرنے والے تھیں یہیں ان کا جواب دیں۔ ایک شعبہ کام کرنے کا یہ تھا کہ مناظر میں انکو شکست دی جائے۔

بظہر غار دیکھا جاتے تو حضرت شاہ صاحب نے ان تمام محاذوں پر بطور خود سالار اعلیٰ کے فرائض انجام دے اور ہر موقعہ وجہ کے لیے کام کرنے والے افراد کی تربیت کی اور انکو آگے لائے۔

علی میدان میں شاہ صاحب نے علماء کے لیے عربی اور فارسی میں مختلف رسائل لکھے۔ جو روزمرہ زبانت میں اصولی افلاز پر صرف آخر میں اور اسی طرح علم کی تربیت کی کہ وہ اس محاذ پر علمی رنگ میں کام کریں۔ چنانچہ روزنامہ منتہیٰ محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا محمد ابراہیم کاندھلوی، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی، مہاجرہ فی حبیبہ یگانہ روزگار اہل قلم کو اس طرف متوجہ کیا۔ عربی سطح پر کام کرنے کے لیے مجلس احرار اسلام کو متوجہ کیا اور لاہور انجمن مہتمم الدین کے علم پر اور زبان کے سبب سے بڑے عوامی خطیب اور شعلہ نرا جادو بیان مترجم مولانا سید محمد علی شاہ صاحب بخاری کو اس بارے میں امیر شریعت کا خطاب سب سے پہلے خود ان کی بیعت کی اور اسی مجلس میں پانچ سو بیت علماء نے حضرت کی اقتدار میں بخاری علیہ الرحمۃ کے ہاتھ پر بیعت کی اور دنیا جاتی ہے کہ حضرت امیر شریعت کی قیادت میں مجلس احرار نے روزمرہ زبانت پر کام کیا۔ وہ سبھی حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسی طرح فلسفی شاہ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کو مرزائیت کے خدوخال سے آگاہ کیا اور انہوں نے جیسا کہ مولانا سید احمد امجدی نے ابرار کوادی کے حوالہ سے گزشتہ مطبوعہ میں گزرچکا ہے۔ روزنامہ پر کام کیا۔ وہ حضرت علامہ کشمیری کی توجہ کا اثر تھا۔ حضرت شاہ صاحب کا اس مسئلہ پر شخصی توجہ فرمانا علماء و خاص کے لیے کافی تھا۔ مزید یہ کہ علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر و شاہرہ کی توجہ شخصی اس طرف مبذول کر دینے سے سونے پر ہمارا کام کیا۔ آخری کام یہ تھا کہ اگر کہیں مرزائی مبلغ مناظر کا کھیل کھیلے۔ تو یہاں میں بھی ان کی سرکوبی کی جاتے۔

فیروزپور میں مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظر طے پایا اور عوام مسلمان نے جو فی مناظر سے ناواقف تھے۔ مرزائیوں کے ساتھ بعض ایسی شرائط طے کر لیا۔ جو مسلمان مناظرین کے لیے خاص پریشان کن ہو سکتی تھیں۔ والاعلوم دیوبند کے اس وقت کے صدر مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ صاحب کے مشورہ سے مناظر کے لیے حضرت مولانا سید رفیع الحسن چاندپوری، حضرت مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی، حضرت مولانا منتہیٰ محمد شفیع صاحب مولانا محمد ابراہیم کاندھلوی تجویز ہوئے۔ یہ حضرات جب فیروزپور پہنچے تو مرزائیوں کی شرائط کا علم نہ کر سکتے تھے۔ جب سے سن مانی شرائط سے مسلمان کو جرح لیا۔ اب دوسری صورتیں تھیں کہ اگر ان شرائط پر مناظر کیا جائے۔ یا چھوڑا کر دیا جائے۔ پہلی صورت مہتر تھی۔ دوسری صورت مسلمانان فیروزپور کے لیے کسی کا باعث ہو سکتی تھی کہ دیکھو تمہارے مناظر۔ بھال گئے۔ انجام کار اپنی شرائط پر مناظر کرنا منظرہ کر لیا گیا اور حضرت شاہ صاحب کو کار و بار دیا گیا۔ اور مقبرہ وقت پر مناظر شروع ہو گیا اور عین اسی وقت دیکھا گیا کہ حضرت شاہ صاحب نفیس نفیس حضرت علامہ شہباز احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تشریف لائے۔

ہیں۔ انھوں نے آئندہ ہی اعلان فرمایا کہ جیسے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرائط مسلمانوں سے منوالی ہیں۔ اتنی شرائط اور سن مانی لگوالو۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ مناظرہ کو اور اور عدالت کی حدت کا تاثر دیکھو۔ چنانچہ ایسی بات کا اعلان کر دیا گیا۔ اور مفتی صاحب، مولانا محمد ادریس کاڈلہری اور مولانا سید بدر عالم صاحب نے مناظرہ کیا۔ اس میں مرزاؤں کی جو حرکت تھی۔ اس کی کوہی بھی کچھ فیروز پور کے دود دیار دوسے سکتے ہیں۔ مناظرہ کے بعد بشر میں جلسہ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحب اور شیخ الاسلام مولانا سید احمد عثمانی نے تقریریں کیں۔ یہ تقریریں فیروز پور کی تاریخ میں یادگار خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے لوگ جو قادیانی دہل کا شکار ہو چکے تھے۔ اس مناظرہ اور جلسہ کے بعد اسلام پر واپس لوٹ آئے۔

۱۳۴۳ھ میں حضرت شاہ صاحب نے پنجاب کا ایک وسیع دورہ کیا۔ تاکہ مختلف مقامات پر قادیانیوں نے قادیانی منطق کا جو حال پیدا رکھا ہے۔ اس کا روبرو دیکھ اجائے۔ چنانچہ حضرت علامہ شہید احمد عثمانی، مولانا توفیق حسن صاحب، مولانا قاری محمد طیب صاحب، مولانا سید محمد بدر عالم صاحب، مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا مفتی محمد نعیم صاحب اور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی معیت میں حضرت شاہ صاحب پنجاب کے دورے پر نکلے۔ یہ علم دلی کے پہاڑ اور فضل و ولایت کے سنہرے درخت، انیسرا، لاجپور، گوجرانولہ، گجرات اور راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ، ہزارہ اور کوئٹہ وغیرہ میں جلسوں میں مرزاؤں کو لگاتار سے پھرے۔ مرزاؤں نے حال جو آئے دن اہل اسلام کو مناظرہوں کے چیلنج کر سکتے پھرتے تھے۔ ایسے چیلجے کو بھی ایک جگہ بھی چہرہ نہ دکھایا نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہان میں نہیں ہیں۔

بہاولپور کا معرکہ الاراتیاری مقدمہ
۱۳۴۳ھ میں احمد پور شرقیہ بہاولپور کی ایک مسلمان عزت نے ————— لہجہ بہاولپور کی ایک عدالت میں دعویٰ کیا کہ اس کا شوہر مرزا بیچ چکا ہے۔ لہذا اس کا نکاح فسخ کیا جائے۔ سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ عدالتوں میں پیش ہوتا رہا۔ بالاخر دربار عدلی میں پہنچا۔ ۱۳۴۳ھ میں دربار عدلی سے یہ دلی کی دہلی کے کراؤں طرف کے عمار کی شہادتیں کے استیع کے کوئی فیصلہ کیا جائے۔ پھر عدلی عدالت میں آیا۔ مدعیہ غریب عزت تھی۔ اس کے یہاں کی بات نہ تھی کہ اتنا لہجہ پڑا کام کرے۔ دران حالیہ ڈومہری طرف قادیان کا بیت الال اور جمال کا رب مجھ اس کھینے وقت ہو گیا۔ لیکن الحمد للہ بہاولپور کے غیر مسلمانوں کی انجمن موبد الاسلام نے اسکا بڑا اٹھایا اور شیخ الحداد بہاولپور کی زیر سرپرستی تمام شاہ میر عا کو شہادت کے لیے دعوت دی۔ حضرت شاہ صاحب ان دنوں ڈابھیل صدر مدرس تھے۔ مگر جبکہ عدالت دیوبند میں پیش تھے۔ لیکن جب اس مسئلہ کا علم ہوا تو اپنی صحت اور دیگر مصروفیتوں کی پردہ کئے بغیر دیگر شاہ میر کی معیت میں تاریخ بتدر سے کئی روز پیشتر بہاولپور میں تشریف لائے اور تقریباً ۲۵ روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت علامہ کشمیری کا تین دن مسلسل بیان ہوتا رہا۔ ناظرین و سامعین کو بیان ہنہ کو حضرت کے بیان کے وقت احوالہ عدالت میں سکتے طاری رہتا تھا۔ اور دلی معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک مندرجہ ہے جس کی گہرائی کا سولہ قدرت باری تعالیٰ کے کئی کرم نہیں۔ بیان ۹۰ صفحات پر قبیلہ ہوا۔ لیکن سارا اذاتل تا آخر نہیں۔ حوت تا پنجہ جو حضرت درج صاحب کے لکھواتے تھے۔ جو عبارات اثناء بیان میں تشریحات و تفسیرات کے ساتھ پیش کی جاتی تھیں وہ قلم بند نہیں ہونے۔ نیز حوالہ جات میں حرف اول اور آخر جملہ لے لیا گیا۔ حالانکہ حضرت پوری عبارت میں تشریح و تفسیر نہ لائے تھے۔ اگرچہ بیان مفصل شائع کیا جاتا تو تقریباً ایک سو اٹھ صفحات پر پھیل جاتا۔

بہر حال حضرت علامہ کشمیری ۷۰ اور دوسرے مفتی عمار کے بیانات ہوئے اور مقدمہ کا فیصلہ ۱۹۳۵ء میں روری کو سنایا گیا۔ جہاں ایک سربادوں، صفحات پر اردو زبان میں شائع ہوا اور ڈکٹر کشمیری نے مرزا کو قدرت اور دیتے ہوئے نکاح فسخ کر دیا۔ واللہ اعلم۔ عدالتی صلے پر اہل اسلام کی اتنی بڑی مستحجہ حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی قدر کی بدولت تھی۔ اس مقدمہ کی مفصل کارروائی مطبوعہ ملاحظہ کی جائے۔ یا پھر حیات الزما می کتاب میں حضرت

مولانا محمد انور صاحب کامضمون پڑھا جائے جس میں اس ردود کا اجمالی سا خاکہ لگایا ہے۔

”اللہ کے شیعہ دل کو آتی نہیں رُودِ باہی“ کے مصداق حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ اعلان فرماتے ہیں کہ ”یہ فی حق قادیان میں اعلانِ حق“ حقیر زمین برسرِ زمین کی خاطر کئی دفعہ قادیان تشریف لے گئے اور وہاں پہلک جلسہ کر کے اعلانِ کلمۃ الحق کا فریضہ سر کیا دیتے رہے۔ مزایاؤں نے حکام سے بل کر بہت کوشش کی کہ ان جلسوں پر پابندی لگا دی جائے۔ مگر یہ جلسے جس تائید اور سنجیدگی کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس کی بنا پر پابندی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ جب قادیانی جلسے بند کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر جلسہ سے قبل حضرت شاہ صاحب کو دھکی آمیز خط لکھا کرتے کہ اگر تم یہاں آئے تو قتل کر دیتے جاؤ گے اور واپس نہ جا سکو گے اور یہ صرف دھکی ہی نہ تھی بلکہ کئی ایک دفعہ علاؤ الدین کی گئی مگر یہ خود خدا ہے کھنڈر کی حرکت پر خندہ زن

مچھوڑوں سے یہ چپراخ بچھایا نہ جائے گا

تصانیف

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی تربیت سے ایسے متبحر اور عظیم عالم پیدا ہوئے۔ کہ جن کی نظیر کم از کم اس برصغیر میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت کے حافظہ، فہم و دکار اور جودتِ ذہن کے متعلق سابقین میں گزرجا ہے کہ حضرت اس بارے میں آئینہ میں آیات اللہ تھے۔ اگرچہ تہذیب کی نشست میں جس موضوع پر غور تھا اسے بیش قیمت کتاب ترتیب دے لیتے مگر اس کے باوجود حضرت کا قلم و طبع کچھ اس طرح کی واقع ہوتی تھی کہ انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف کم تر رجوع ہی اور کبھی بڑے عالم کی تصانیف نہ لکھنا یا کم نہ لکنا۔ اس کی عظمت و جلال میں کمی نہیں کرتا۔ امام عظیم رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ قدر و فضل و علم سے کون ناواقف ہے کہ آج دنیا کے اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کی پیروی کرتی ہے۔ اس کے باوجود حضرت امام کی تصانیف نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صاحب رضی اللہ عنہ کے ذہن کی طرف چلتے تو حضرت ابوہریرہؓ کی روایات سب صحابہؓ سے زیادہ نظر آتی ہیں مگر حضرت تصانیف کی روایات انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ کیا یہ کوئی کچھ بھٹکتا ہے کہ درجہ اور مرتبہ کے اعتبار سے صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کم سے کم نہ ان کی روایات کم ہیں۔ ان کی دوسری مصروفیات اور غفلتِ محل و تدبیر سے ان کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اس بارے میں بھی توجہ کر سکیں۔ حضرت مولانا سید محمد برادر عالم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح الیقوت فرمادیتے تو کچھ لوگوں کے لیے سرمایہ ہوتا۔ غصہ نہیں اگر فراموش لگے کہ زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پڑھا کر پیٹ پالا کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرے کے بعد بھی حدیث کی خدمت بکٹی رہے۔

ہر گئے را رنگ دہرے دیگدست

اس کے باوجود علمی اور دینی تقاضوں کی وجہ سے چند سبالی ایسے یا کاجھڑ گئے جن کی جتنی دنیا تک قدر ہوتی رہے گی۔ اور

نمانہ جسے سیکر آفتاب کرتا ہے

انہی کی رگ میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

کے مصداق علاؤ الدین شہل راہ کا کام دیں گے۔

حضرت کی بیحد پایہٴ ازل تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ تحفۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

۲۔ ختم النبیین (فارسی)

۳۔ فضل الخطاب فی مسئلہ الام الکتاب

۴۔ عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام

۵۔ التدریج باقرآن فی نزول الیس

۶۔ الکفا للحدیث فی ضروریات الدین

۱ خاتمہ الخطاب فی فاتحہ الکتاب (فدائے)

۲ بسط الیدین فیل الفرقین

۳ ضرب الخاتم علی حدیث العالم

۴ ازالۃ الہین فی الذب عن قرة العینین

۵ ان کتابوں کے علاوہ حضرت کی وہ تصانیف ہیں جو اس کے وقت ابلا کرتے تھے اور جن کو حضرت کے اہل خانہ نے تحریر کیا ہے۔ ان میں شہر

ترین تقریریں اب بھی کے نام سے جو مولانا سید بدر عالم میرٹھی نے تحریر کی ہے۔ چار جلدوں میں چھپ چکی ہے اور تمام علماء کے حلقوں سے خواہ مخواہ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ بخاری کی تقریر ہے۔ اسی طرح الفتح الشہدی دس جامع ترمذی کی دلا ہوئی — جس کو مولانا محمد پارس گورنمنٹ مدرسہ اور مولانا محمد فی شرح سنن ابی داؤد جس کو مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی حرم نے منبسط کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مسلم کی اطلاق شرح منضبط کرد مولانا مناظر حسن گیلانی اور مسند ابی یوسف نے منبسط کرد مولانا سید محمد ادریس صاحب مکر دو بوی غیر مطبوعہ ہیں۔ ادب اور دوزخ میں شرح بخاری بنام انوار الباری حضرت شاد دھاک کے افادات ۲۲ حصوں میں ساڑھے چھ ہزار صفحات پر شائع ہو چکے ہیں۔ ان سب شرحوں کو انجیا پائے اور شرحیں بے شمار نئی پرانی شرحوں سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد رفیع صاحب ہنوی جو حضرت کے شاگردان رشیدیہ میں سے ایک ہیں۔ نے حضرت کی حیات طیبہ پر ایک کتاب بنام فقہ الغبریزان عربی لکھی ہے۔ اس میں حضرت کی خصوصیات نیز ان کے علمی شہ پاروں کی مکمل تفصیل دینا پائی ہے شائقین اس طوف مرحبت فرمائیں۔ بی بیات ان کے نام سے ایک کتاب اردو میں شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت کے اہل خانہ نے حضرت کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مطالعہ کے قابل ہے۔

حجید ایس قصہ عوشی است در دفتر نے گنجد

دارالعلوم کے تحت بنیاد اسلام قیام میں کم از کم دو ہزار طلبہ حضرت شاہ صاحب سے بلا واسطہ استفادہ فرماتے۔ ان کی مکمل فہرست کیلئے اہل خانہ نے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو گزشتہ کئی عرصے میں خدمت دین میں مصروف ہیں اور اب بھی ہر جہلم کے آفتاب بہاب بن کر چمکے اور چمک رہے ہیں۔ مختصہ فہرست درج ذیل ہے۔

۱ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر راسکے پوری قدس سرہ

۲ حضرت مولانا تاجی محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دہلی

۳ حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

۴ حضرت مولانا حفص الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیر پوری

۵ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی پاکستان

۶ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی

۷ حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب ہاجرہ دینی

۸ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

۹ حضرت مولانا محمد میاں صاحب مصنف علماء شاد مار مانی وغیرہ

۱۰	حضرت مولانا عتیق الرحمن صاحب بانی دناظم ندوۃ المصنفین	۳۵	مولانا قاضی شمس الدین گوجر اللہ
۱۱	حضرت مولانا فخر الدین احمد شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند	۳۶	مولانا مفتی محمد حسن صاحب الترمذی
۱۲	حضرت مولانا محمد انوری صاحب قائل پور	۳۷	مولانا محمد وحی اللہ صاحب اعظمی روضۃ الدین
۱۳	حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب علی شیخ الحدیث	۳۸	مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب بی ایس سی ایم بی بی ایس
۱۴	حضرت مولانا محمد زبیری صاحب سکی بانی مجلس علمی	۳۹	مولانا فہیل احمد صاحب قادری بانی دارالتصنیف کراچی
۱۵	حضرت مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی	۴۰	مولانا عبداللطیف صاحب نائف
۱۶	مولانا سید احمد الیم لکھے اکبر آبادی	۴۱	مولانا شمس الحق صاحب افتخار فیض التفسیر علامہ اسلامیہ دہلی
۱۷	حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری	۴۲	مولانا حبیب الرحمن صاحب مکی خطیب چانگام
۱۸	حضرت مولانا محمد چراغ صاحب گوجر اللہ	۴۳	مولانا البرار قاسم صاحب شاہ جہانپوری
۱۹	مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈی	۴۴	مولانا غلام اللہ خان صاحب راولپنڈی
۲۰	حضرت مولانا احسان اللہ خان صاحب نجیب آبادی	۴۵	مولانا اسماعیل دیرف گاڑڈی ٹاٹھلی
۲۱	مولانا میرک شاہ صاحب	۴۶	مولانا سید جلیل الدین اسپیکر اہم کھڑا بہاؤ پور
۲۲	مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لکھنؤی	۴۷	مولانا اظہر علی صاحب سہلٹ
۲۳	مولانا حبیب الرحمن صاحب لکھنؤی	۴۸	مولانا خراجہ محمد علی صاحب سابق استاد جامعہ قلیہ
۲۴	مولانا مفتی محمود صاحب شیخ الحدیث	۴۹	مولانا محمد امین صاحب سہلٹ
۲۵	مولانا مفتی محمد یوسف صاحب میر داغ کاشمیری	۵۰	مولانا شہباز علی صاحب تھانوی
۲۶	مولانا عبد الزمان صاحب ہزاروی	۵۱	مولانا لطف اللہ صاحب پشاور
۲۷	مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی	۵۲	مولانا انوار الحسن شیکر ٹی
۲۸	مولانا عبدالرحمان صاحب کیمبلپوری	۵۳	مولانا مفتی ابراہیم صاحب سہیلوی
۲۹	مولانا حامد الانصاری غازی	۵۴	مولانا ڈی ای بیہار صاحب
۳۰	مولانا مصطفیٰ احسن علوی پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی	۵۵	مولانا محمد اسماعیل صاحب کاجھری
۳۱	مولانا فیوض الرحمن صاحب	۵۶	مولانا صالح محمد کیکڑا
۳۲	مولانا شہید اللہ صاحب بنوری	۵۷	مولانا محمد انیسوارہ صاحب ڈاھیلی
۳۳	مولانا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ صاحب سراجیہ کنڈیان	۵۸	مولانا موسیٰ بھام جی
۳۴	مولانا سلطان محمود صاحب سابق صدر مدرس	۵۹	مولانا نغمانی

شیخ الحدیث فتح پور دہلی

آخری سات حصوں کے اقرائے میں بہت زیادہ علمی دینی کام کیا ہے۔ مندرجہ بالا حضرات وہ گرامی قدر شخصیات ہیں جنکی علمی دینی تبلیغی خدمات سے

نبی علی دنیا متعارف کیے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک ادارہ - ایک انجمن ایک جماعت بنے۔ اور خود ان کے مستشرقین اور تلامذہ لاکھوں کی تعداد میں لیا کے کوثر کرمین پھیلے ہوئے ہیں۔ وَاللّٰهُ فَضْلُ اللّٰهِ يَبْلُغُهُ

علامہ کشمیری کی اولاد و اعزہ

حضرت مولانا محمد معظّم شاہ صاحب کے سات صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے مولانا یحییٰ شاہ صاحب تھے۔ وہ بڑے ذکی، فہیم، عالم و شاعر تھے۔ انکا انتقال عمر ۳۲ سال حضرت شاہ صاحب کے قیام مدرسہ اہل حق کے نابینا ہو گیا تھا جن کی وجہ سے آپ ۱۳۲۰ھ میں دہلی سے کشمیر واپس چر گئے تھے۔ دوسرے بھائیوں کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ مولانا عبدالرشاد صاحب، مولانا سلیمان شاہ صاحب، محمد نظام الدین شاہ صاحب، مولانا سیف الدین شاہ صاحب فاضل دہلی، محمد شاہ صاحب حضرت شاہ صاحب کی وفات سے کچھ عرصہ بعد حضرت والد ماجد کی وفات ایک سو کچھ سال کی عمر میں ہوئی۔ پندرہ سال بعد مولانا سلیمان شاہ صاحب کا وصال ہوا۔ اب الحمد للہ باقی بھائی اور ایک دو بہن بھی زندہ ہیں۔

حضرت علامہ حمزہ اللہ علیہ السلام نے تین صاحبزادیاں یا دو گار بھجڑیں۔ ان سب میں بڑی صاحبزادی عابدہ فائزہ تھیں۔ انکا اور منجھے صاحبزادے محمد اکبر اور کلمہ جانی انتقال ہوا۔

بڑے صاحبزادے حافظ محمد زہر شاہ صاحب قیصر عرصہ سے دارالعلوم دہلی کے ترجمان مآذنامہ دارالعلوم کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ کامیاب اور کہنے مشفق مافی ہیں۔ قلم میں خوب جولانی و روانی ہے۔ ان کے تین صاحبزادے محمد اظہار، محمد راحت، محمد فہیم، اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ سچے صاحبزادے مولانا محمد انظر شاہ صاحب دارالعلوم دہلی کے تین لائق استاد اور فاضل محقق و معتمد ہیں۔ ان کے ایک صاحبزادے احمد اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ

چھوٹی صاحبزادی راشدہ خاتون مولانا سید احمد رضا بجنوری مولف "الزوار الباری" کے عقید میں ہیں اور ان سے پانچ بچے اور دو بچیاں ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ

♦ ♦ ♦ ♦ ♦

اس معجزہ کے تہیہ و تدبیر
کھارے۔ لکھتے اس کے تمام منجھے
حضرت علامہ کے ارشد تلامذہ مولانا مناظر احسن گیلانی، علامہ
قاری محمد طیب صاحب مدظلہ - مولانا سید احمد بک باری - مولانا
محمد الہی، مولانا محمد منظور خان، مولانا محمد ادیب کاندھلوی
مولانا محمد یوسف بٹ، مولانا سید محمد ریاض صاحب مدظلہ کے
معاونین سے ملوث تھے۔ جمیع اللہ کے نام سے پوچھ چکے
ہوئے۔ انوالاداری سے مجھے استفادہ کیا
تیا ہے !

محمد ضیا الرحمن ضیا بھنگپوری

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری

۱ گلستانِ وادیِ لولاب کا تازہ گلاب ۱
چہرہ انور تھا شمعِ آئینہ نور و کتاب
۲ تھا جبینِ پاک پر سیمائے من اشوالعجود ۲
دیکھ کر حلقہٴ بگوشش دین ہوئے اہلِ جہود
۳ تکتک قرنِ اولیں کا گم شدہ در فریاد ۳
جہانِ محمود الحسن، نور دل احمد رشید
۴ دین کی حقانیت کا حجت و برہاں رہا ۴
تھا فرشتہ اور گمانِ حضرتِ انساں رہا
۵ چلتا پھرتا وہ کتبِ خاتمِ تھا شلِ زلیخا ۵
نکتہ دان فقہ دمیرِ افکیار و ترفی
۶ فلسفی و آشنائے رمزِ آن مبین ۶
شارحِ علمِ حدیثِ پاک و نکتہ آفرین
۷ بوعلی وقتِ فخر الدین رازی رح زماں ۷
نشہ دلی اللہ و دران و غزالِ زماں
۸ قالبِ روحِ بخاری، ہمسرِ ابنِ حجر ۸
جانِ شینِ بوحیفہ، رشکِ یعقوب و زفر
۹ تھا لبید و سعدی پُر گو نظیرِ بونواس ۹
خوش ادار و خوش مزاج و باجمال و خوش لباس
۱۰ قولِ مرزاں جانِ میاں د، کی جو تفسیر تھی ۱۰
فرقہٴ باطل کے آگے وہ زبانِ شمشیر تھی
۱۱ بے نیاز خانہٴ دجاہ و جلال و سیم و زر ۱۱
محو تھا درسِ دیباں و وعظ میں شام و سحر
۱۲ تھا دلی شیشہ میں انوارِ جمالِ کعبیا ۱۲
اشرف و ادرع سراپا دانشِ علم و حیا
۱۳ علم کے چرخِ چہارم پر ضیا افشاں رہا ۱۳
ہر ستارہ کا سب انوارِ بے پایاں رہا
۱۴ نفحۃ العنبر مکمل داستان ہے آپ کی ۱۴
فیضِ بادیِ بارگاہِ جاوداں ہے آپ کی
۱۵ آپ ہی کی ذات تو صد نازشِ کشمیر ہے ۱۵
فخر کے قابلِ انزل سے آپ کی تقدیر ہے
۱۶ لے خوشا دیو بند جلوہ زارِ حسنِ عالماں ۱۶
مکتہ ہندی، زیارت گاہِ اربابِ دلائل

بوت علم آسمانی تجھ سے آتی تھی کبھی
چلتے سجد میں ستانِ دلربائی تھی کبھی
۱۸ آج بھی دارِ العلوم پر شکوہ سبب نہ پہنچے
بارشِ الوار و در رحمت جس کے ہر زنبور پہنچے

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری
دارالافتاء دارالعلوم
۱۹ علامہ انور شاہ کشمیری
۲۰ علامہ انور شاہ کشمیری

امام انقلاب حضرت مولانا عبد اللہ سندھی

۵۱۳۶۳
۶۱۹۲۲



۵۱۲۸۹
۶۱۸۶۲

سوادِ مختیر مولانا عبید اللہ سندھی

کے انتقاد اور جیسی برادران کو اس درجہ متعلق کر دیا ہے۔ کہ نہ گنی شریف
 چاہی اور نہ کیرتھ پالی آج اسلام کی اس پیمائش سے جگہ کر نام دہی بھی گا۔
 اسپر اتر اور اس کے کیا نہ سکا ہے۔ کہ کیرتھ اور نیشنل ہمارا یکم ماننے والے مسلمان
 ساتھ لڑا، موزی نہیں مانگا۔ بلکہ بعض برادر سر قریبوں میں آتے ہیں۔ کہ اگر ایسے
 مذہب و ملت متعلق ہوتے تو ہم اس غرض کو قبول کر لیتے اور کاشکامان کے
 مسئلہ کو حل کرنے کے لیے یہ دھیر نہ ہوتا

مستور ہیں بڑے! میں آپ کا بہت بڑا وقت اپنی سرگزشت سنانے میں آیا
 میرا خیال ہے۔ کہ جب تک کوئی حکمران خاص طور پر پچانے کے کہ کشش کرے
 وہ ماری جو اہل حق و باطل میں ہرگز نہ ہوگا۔ ایک ہی دیکھا گیا ہے جس میں جو ہے کامیاب نہیں کیا گیا

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی علیہ السلام

خود نوشت حالات زندگی

۱۹۳۹ء میں مولانا عبید اللہ سندھی کو واپس وطن آسنے کی اجازت ملی۔ قدرتی بات تھی کہ اس موقع پر ہندوستان کے اخبارات مولانا مرحوم کے متعلق کچھ لکھتے، بعض اخبارات نے اس سلسلہ میں بڑی سبالہ آرائی کی۔ ایک مضمون میں یہاں تک لکھا گیا کہ جب مولانا مسکومین تھے۔ تو لندن کی بی بی ان کے دھوکے سے پانی خود گرم کرتی تھیں۔ ایک مضمون نگار نے مولانا مرحوم کا نسب ریاست جوں و کشیر کے شاہی خاندان سے سے جا پایا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں مولانا کے متعلق اور بھی بہت کچھ چھپا۔ جس میں مرحوم کی بہت زیادہ تعریف کی گئی۔

مولانا نے مکہ معظمہ میں یہ سب اخبارات دیکھے اور روانہ ہونے سے قبل خود اپنے حالات زندگی لکھ کر ان اخبارات کو تیار کرنے کے لیے بھیجے جو اسی زمانہ میں چھپ گئے تھے۔

لاہور کے اخبارات میں میرے متعلق محبت آمیز مقالات، شائع ہو رہے ہیں۔ مقالہ نگار عزیزوں کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن میری شخصیت اور ابتدائی تعلیم اور عام حالات میں اس قدر غرض غلطیاں موجود ہیں کہ میں بدون شرم محسوس کئے پڑھ نہیں سکتا۔ اس لیے تصحیح کے لیے چند واقعات مختصراً لکھنے پر مجبور ہوں۔ (معبود اللہ سندھی)

میرزا خاندان اور مولانا میں تبلیغ سیکلٹ کے ایک گاؤں چٹانوالی میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زندگی تھا لیکن عرصہ سے ایک جہت سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔ اور بعض افراد ساہوکار بھی کرتے رہے۔

میں عزت مسلمان خارجی کے اتباع میں اپنا نام عبید اللہ بن اسلام لکھنا کر انہوں نے مگر بعض غریب دوستوں کے امر سے جب اپنا نام والد کی طرف منسوب کر لکھنا تو عبید اللہ بن ابی عاصیہ لکھا۔ میری بڑی ہمت و کمال سے میری سہولت سے اس نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبید اللہ بن راعی بن راعی لکھ کر میرے باپ دادا کا پورا نام راعی بن راعی لکھ کر والدیت کے واسطے والد کا نام لکھ دیا۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا کو حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور بچپن میں بچپن سے قبل صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ء ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدائش ہوا۔ میرا باپ ۴ ماہ پہلے فوت ہو چکا تھا۔ دو سال بعد میرا دادا بھی فوت ہو گیا۔ والدہ مجھے ننھیال سے لے آئی۔ یہ ایک ناسر بہتے خانہ دار تھا۔ میرے نانا کی تعظیم پر ہی میرا دل بکھیر گیا تھا۔ میرے دو بھائی تھے۔ بزرگ کا نام پرورش تھا۔ چھوٹے کا نام پرورش تھا۔ میری تعلیم ۱۲۸۹ء سے ۱۳۰۰ء تک میرے والد کے ارادے سے سکول میں شروع ہوئی۔ ۱۲۸۹ء میں بڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ رہا۔ اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اپنے سکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

۱۲۸۹ء میں مجھے سکول کے ایک آریہ ساج ٹیچر کے ہاتھ سے تحفۃ اللہ بن علی میں اس کے سلسل مطالعہ میں مصروف رہا۔ اور بالذکر ان مطالعہ اسلام کی صداقت پر یقین پڑ گیا تھا۔ ہمارے قریب کے پرائمری سکول (کوئٹہ مغلان) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ اللہ کو دیدہ تھے۔ انہیں کے توسط سے مجھے مولانا اسماعیل شہید کی تقریر الا بیان ملی۔ اس کے مطالعہ پر اسلامی توحید اور پاک مشرک اچھی طرح سمجھ گیا۔ اس کے بعد مولانا گھمن کی کتاب احوال الاتحاف پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے غور کیا کہ اور اپنا نام تحفۃ اللہ کے مصنف کے نام پر عبید اللہ بن راعی لکھ دیا۔ احوال الاتحاف مطالعہ اور تحفۃ اللہ کا ترجمہ جس میں نو مسلموں کے حالات لکھے ہیں۔ یہی دو چیزیں ہیں جو علم ہی اظہار اسلام کا باعث بنیں۔ ورنہ اہل انادہ یہ تھا کہ سب کسی باپ کی کونکے سال تعلیم کے لیے جاؤ گا تو اس وقت اظہار اسلام کروں گا۔

۱۵ اگست ۱۸۸۹ء کو کوئٹہ علی اللہ شکر علی اللہ شکر میرے ساتھ کوئٹہ مغلان کا ایک دفعی عبید اللہ بن راعی نامی دوں مولوی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ اظہار اسلام کوئٹہ شہر شائع ہونے لگا۔ وہی انگریز ۱۳۰۰ء کو میری صفت تعلیم اڑا رہی تھی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے عزیز و اقارب کو ان کے تین سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عربی حضرت کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب دہجہ پڑی والدے کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جہاں اپنے وقت کے ہندو اور مسلمان تھے۔ چند آدمی ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعت ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لگوں کو کھٹا طلب فرمایا۔ دعا پڑھا مولانا الحسن امروٹی اس مجمع میں موجود تھے کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا نام باپ نانا لکھا۔ کہنے لگا کہ کیا تیرا خاص طور میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انہیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں۔ اور جس اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا یا بن گیا۔ جس کو جاری لائے ہوئے ہیں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ہر گاہ کہنے سے شکر انسان سے بہت کم عجب ہوتا ہوں۔

تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے نصرت جہاں مجھے بنا گیا تھے کہ حضرت نے مجھے اپنے خاص دعا فرمائی۔ خدا کرے کہ عبید اللہ کا کسی تاریخ عالم سے میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی اور مجھے اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل سے حضرت مولانا شیخ اللہ کی خدمت میں پہنچا دیا۔

”خبر چڑھی“ سے حضرت ہر کسی اس طالب علم کے ساتھ رست بنایا اور ہر کی دیہاتی صاحب میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھ کر اس نکل حرکت میں دین پڑ پڑا۔ جہاں سید العارفین کے خلیفہ اہل اول الاموالراج محمد صاحب رہتے تھے۔ یہاں بہتر کتابیں یہیں میں نے عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور دیا گیا۔

میں کچھ اللہ ثابت قدم رہا۔ دیر غلط نہ کر میری والدہ دیرینہ پختہ، شوال ۱۲۳۲ھ میں دین پڑھ کر خاں پور سے کوئٹہ کو روانہ ہوئے۔ والدہ کو مولوی خاں بخش صاحب سے کافیہ دیا۔ یہیں ایک نور اور طالب علم سے ہندوستانی مدارس جو کمال معلوم ہوا۔ اور میں سیکش نظر کر کے دیلی پر سوار ہو کر سید عالم دین پڑ پڑا۔

حضرت ۱۳۰۰ھ کو میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ چنانچہ پانچ مہینے میں قلمی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے علاقہ مطالعہ سیکھ لیا اور محنت سے ترقی کا راستہ مکمل کیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلد ہی ختم کر کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کاندھلوی کے مدرسہ میں چلا گیا اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں درکار مولوی فاضل الدین صاحب سے کتابیں پڑھیں۔ اس طرح حضرت ۱۳۰۳ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

دیوبند دین میں نے مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھا۔ اس کے شاگرد شیخ الحدیث کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۶ھ میں حضرت مولانا شیخ الہند ہمدانی، تلخیص، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا۔ اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید عالم صاحب نے مدرسہ اول سے میرے درجات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا: اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہو گا۔

چند دوستوں نے بشر خراب دیکھے ہیں۔ نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خراب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصول فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جہر و اہل علم کے اہل تحقیق کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل التباہات نامک المفسر نہیں بلکہ راغب فی العلم انھیں علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۶ھ سے تفسیر مزیادی اور دورہ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہند سے پڑھی اور سنن ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں لنگر پہنچا۔

بیار پور کو لنگو سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمودان کے علاج سے نازہ ہوا۔ حدیث کی اپنی کتابیں مولوی عبدالحکیم صاحب پٹنابی دیوبند سے جلدی جلدی سہم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں نے چند چاروں میں پڑھی تھیں اور سنن ابوداؤد کو گھنٹہ بھر کر لیں۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کے فیوض حق شکر کرتے۔ اُنہا سے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گیا۔ شیخ آری درجہ ترمذی میں دو سبھی ان سے تھے۔

۲۰ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ کو دہلی سے مدینہ حاضر چڑھی غیل کھر پہنچا۔ اس تمام سفر میں اباباد و فہلا پور نہیں آئے اور سید چرناپ نہیں گیا۔ میرے مشنیر سے آئے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ وجہ سفر میں حضرت شیخ الحدیث نے عبارت ترمذی کو پڑھ کر فرمایا اور مولوی کمال الدین صاحب نے فجر سے سنن ابی داؤد پڑھی۔

شوال ۱۳۰۶ھ میں سید العارفین کے مدرسے خلیفہ رفقا ابوالحسن تاج محمد صاحب کے پاس امرت ضلع کھر چلا گیا۔ انھیں نے اپنے مشنیر کا وعدہ پورا کر دیا۔ وہ میرے لیے مشنیر اب کے تھے۔ میرا نشان کھر کے اسلامیہ کول کے مدرسہ مولوی غلام نام بومست زنی کی لڑکی سے کر لیا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں

ان کے ظن عاطفت میں مشہدہ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔

کتاب خانہ پیر صاحب العلم

گوشت پھر ملاضلع حیدرآباد میں راشدی طائفہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم و فہرہ کا کتب خانہ تھا۔ میں دوران مطالعہ میں دہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لانا رہا۔ میرے تکیلی مطالعہ میں اس کتب خانے کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت

اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کئی دیکھیں۔ ذکر مسعود اصفیٰ میں نے انہیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔

حضرت مولانا ابراہیم صاحب العلم الرابع سے علمی محبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جدید عالم اور صاحب تصانیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی محمد صاحب کی علمی صحبت ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز

اللہ کی رحمت میں سے ایک نعت مظلٰی جن کا شکر میں ادا نہیں کر سکتا۔ یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق تطبیق میں اور ایسا ہی دوسرے غریب کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کر کے امام دیوبند کی ایک سلسلہ علماء میرا رہبر بناوا۔

میں نے اپنا نام بنالیا۔

مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس سے میری تمام کششیں ایک اصول پر ٹٹم چکیں اور میں اسلام کے فلاسفی سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

میں نے دہلی میں قبلہ ناکا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پرست ہو گئے۔ حدیث کی تحقیق میں حمزہ اللہ کا تعارف مولانا شیخ الہند نے کر لیا۔ انھیں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علامہ حمزہ اللہ الباقی رضاعی اور کافی صاحب علی شیخ الہند سے پڑھی۔

طریقہ داریہ

اس مرحلہ میں طائفہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشتغال و اذکار بھی حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے تلمیذ عظیم مولانا دین پوری سے سیکھتا رہا۔ اگر میری کئی دنیاوی ضرورت اوروں میں پوری نہ ہوتی تو دین پوری سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح اپنے مرشد کی حاجت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

میرا سیاسی میلان

دوران مطالعہ میں نے مولانا محمد اسماعیل شہید کی سوانح میری دلچسپی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتداء سے یہ تاریخی سبق مولانا مرحوم سے چکھتا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور کھلیات سے آشکارہ دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی کے سقوط کی تاریخ بھولن دلچسپی بتا دیتی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عزتوں کی صحبت میں انقلاب چناب کی تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سرچا تھا۔ اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے کلمات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنایا۔ وہ اسلامی جمہور اور انقلابی بھی۔ مگر نہ کہ باہر مسلمان کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا میں نے حمزہ اللہ پڑھنے والی حاحات کو اس میں شامل کر لیا اور اس طرح اپنے خیال کے لیے آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معا و دت دیوبند

۱۲۱۵ھ میں دیوبند چلا۔ اپنے مطالعہ کا نونہ دور ملے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے رسالے پسند فرمائے۔ اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف نہ کہ دوبارہ شغبنا اجازت حاصل کی۔

بعض مسائل جہاد کے مضمون میں ہماری اس حاجت کا بھی ذکر کیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اپنا

ایک کوئی بنایا اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

اروٹ واپس آنے کے بعد میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۱۹ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۰ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۱ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۲ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۳ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۴ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۵ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۶ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۷ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۸ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۲۹ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۳۰ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

۱۳۳۱ء میں میرے قلعی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الحدیث سے وابستہ رہے۔

میں اس کامیابی پر اقبال انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رہنما جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، سرٹسٹ بھی ہیں اور نیشنلسٹ سوس سوسٹ روس کا ہمیشہ دشمن اور سٹریٹنگ رولز کے گاہک۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے ملتی تو میں اس شخص اور امتیاز کو بھی حاصل نہ کر سکتا۔ خلیفہ احمد داؤد
۱۹۲۳ء میں انگریزوں نے میرے لئے سفیر بنایا۔ متین ماسکو اور وزارت خارجہ ماسکو کے بل کر کے گارانتہ متین کر دیا تھا اور برطانوی گارنڈے اس کے
جلد تکر کیا۔ یہ غلط ہے کہ اس ناز میں ہینیا جب بلانڈ اور فرانس اس پر قابض تھے، تحینا: تین سال تک میں دلوں میں سے تحریک اتحاد اسلام کا آغاز کیا
مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا اور کانگریس میں
کی ایک پارٹی کا بزرگام چھاپ دیا۔ جس سے میری مذہبی تحریک پر ایک مخالفت انقلاب سے مخزنہ رکھ سکتی تھی۔

پورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں اپنے استاد الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیرپندی کی ایک
ہمارا پروردگار علی ماہرینہا چاہتا ہوں۔

اس پرگرام کو ترکی پس سے شائع کرنے کے لیے انفہ گورنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارت خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کر کے حب
حرف نہیں طبع کیا۔ اجازت نہیں دی، بعض ہندو دوست اور وہ نہیں طبع کئے تھے۔ ان کی سہولت کے لیے میں نے انگریز میجر بھیجے شائع کر دیا۔ استدلال
جیت لے سے تبادلہ اخبار اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں نہیں۔ ہمارے بزرگ داسے مان سکے ہیں نہ اس کا اچھا بدلہ تباہ کئے ہیں۔ وہ کوشش کر
ہیں ہزار ہزار برس پہلے ناز میں لاکھ کر دیں۔ البتہ پڑت ہوا ہر لال ہر دے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے۔ وہ میرے لیے باعث مروت ہے۔

میں نے اپنے پرگرام میں عدم تشدد کو ضروری کر دیا ہے۔ اس میں ہمارا گاندھی کا نمونہ ہیں۔ میں عدم تشدد کو اخلاقی اصول ماننا تھا، لیکن اس شمار
کی تشکیل اور اس کی اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے عزت سب معروہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم دلا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام
دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہے۔ کلمۃ الحکمۃ حلالۃ اللہ بحیث وجدہا فہو احوی بہا۔

۱۳۲۴ھ میں جے پور کے سلطان میں ہندو خلافت منقہ ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آ رہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے
مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں متوجہ ہونے کے بعد صرف ۳۴۵ آٹھ میں پہنچا میں اپنی پڑائش صحیح طور پر پہنچنا تھا میں نے مجاز گورنٹ کو فتویٰ دلا دیا
کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کر دیا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ رہ گیا۔ اگر کسی کسی جزوی طور پر ہلاک کی درخواست میں نے کسی کی تحکومت نے اسے پورا کر دیا۔ میرے لئے
برہمن میں آ دیا۔ امور خارج نہیں ہوئی۔ اس لیے وہ میری طرف سے بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جہاں اللہ خیرا

مجھے اہل مکہ میں سے ہیں ہندوستانی اور ایک عرب خاندان کے خاص طور پر علمی امدادی۔ سب سے پہلے شیخ عبد
دہلوی (راج علی جان والے، دوسرے عبداللہ ابن عبدالوہاب (دہلی) مرحوم میرے ابراہیم جمدی۔ ان کے
علمائے مکہ سے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری ملاوٹ شیخ محمد بن عبدالرزاق بن محمد شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسعید عبدالغفار امام الحرم کا خاندان

میں تقریباً ۱۲-۱۳ سال سے آؤں علم اور حجتہ اللہ الباقیہ کا یہ عظیم مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے
میں انھیں امام دلی اللہ پڑی کے اصول پر بالاطمینان حل کر کے ہرگز میری طرح امام دلی اللہ دہلوی کو نہیں مان سکتے۔ ان کو یقین کرنے کی

میں نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس ناز میں قابل عمل تعلیم کا ایک علی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریزہ قدس مقام کی تاثیر ضرور ملنا چاہیے
میں نے امام دلی دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدوز بڑہ، خیر خیر، انہیات البیہ، سلطات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ
ان کی کتابوں کے لیے بطور رفقا میں نے رفیع الدین دہلوی کی تکیب الاذقان اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عقبات اور مولانا محمد قاسم صاحب

بزرگ عالم العلوم اور فقیہ دین و دنیا اور اکابر حیات کو استعمال کیا۔

مجھے لوگوں کے پڑھانے کا موقع بھی ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدرسہ قرآن مجید بھی جاری رہا۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ اللہ اشہد

اگر مجھے موقع دیاجائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو محنت کا مجتہد مستقل تسلیم کروں اور امام عبدالعزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس محنت کے منتسب اور مولانا اسد اللہ علیہ السلام اور مولانا محمد قاسم کو محنت دہی

تسلیم کر دوں تو میں اس محنت کا اسناد دہی کر سکتا ہوں۔ یہی میں دانت، دست، ان کا علم رب، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنت خلفائے شریفین (روح) تاریخ اسلام کی فوری عقلی تشریح ممکن ہے۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تخلیق و تطبیق، اس اصول پر آسان ہو جائے۔ واللہ و الفضل العظیم۔

۱۹۳۷ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری دہلی کے متعلق کوشش شروع کر دی اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے نومبر ۱۹۳۸ء کو

ہندوستانی وطن کی اطلاع ملی اور یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ چ کا موسم سر پر آ گیا۔ اس لیے اگلے سال کے بعد سے فراغت پر دہلی کا ارادہ کیا (انڈین نیشنل کانگریس)

ہندوستان میں پروگرام

(۱) انڈین نیشنل کانگریس کا عمومی ممبر بننا۔ (۲) ہندوستان کے متعلق میری ذمہ داری میرے قومی خازن کے اندر سلا ہے اور میں پریشان دوستوں کے مشورہ و کلمات سے محفوظ رہوں۔ لیکن کانگریس کی کسی پارٹی کے علمی جتنوں میں شرکت نہیں کروں گا۔

(۲) میرا مجرب شیخ فلسفہ امام ولی اللہ کی تعلیم و اشاعت ہو گا میں اعلیٰ طبقہ اہل علم کو اس طوط منبر پر گوارہوں گا۔ اس میں دینی عالم اور دانشمند دونوں مخاطب ہوں گے اور اگر کوئی غیر مسلم مذہبی آراء و افکار اس فلسفہ کا مطالعہ پسند کرے گا تو اس کی پوری مدد کروں گا۔

(۳) جب کبھی حالات مناسب ہوں تو میں نیشنل کانگریس میں فلسفہ ولی اللہ کی روشنی میں اقتصادی اصول پر اپنی مستقل پارٹی تشکیل کروں گا۔

واللہ المستعان و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عبد اللہ

جبال العودۃ
بلد اللہ الحرام

مولانا عبداللہ سندھی

مولانا عبداللہ سندھی کا نام بچپن سے سننا آیا تھا۔ ان کے علم و فضل اور مجاہدانہ کارناموں کا ذکر لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے تھے اور کوئٹہ میں جنرل اور ولولہ اٹھاتا تھا کہ اسے کاش مولانا اس زندگی میں کہیں مل جاتیں اور انھیں ان کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ آخر کار دل کی یہ مراد پوری کی اور قلمی میں اس کا ایک ایک ٹکڑا مولانا تین برس کی جلا وطنی کے بعد ہندوستان تشریف لارہے ہیں اور جہاز سے کراچی آ کر کوئٹہ پہنچے۔ اب ایک ایک گھڑی گنتی شروع کر دی اور مولانا کی آمد کا سخت بلے چینی سے انتظار ہونے لگا۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔ سب لوگ مولانا کے استقبال کے لئے کوئٹہ اسٹیشن پہنچے۔ عمار اور ملک کے زہار جس طرح رہتے تھے اس کے پیش نظر میں نے اس وقت ہوا کی نسبت جو تحلیل قائم کیا تھا وہ یہ تھا کہ عمامہ سر پر ہوگا جبکہ زیب تن ہوگا۔ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں گے۔ ایک خادم کم از کم ضرور ہوگا۔ دو تین بھاری بھاری سوٹ کیں، ایک بھاری بیڈنگ، دو تین تھامس کی بوتلیں، تین چار بھاری اور وزنی ناشتہ دان ہوں گے۔ چہرہ پر ٹمکنٹ اور وقار ہوگا۔ لیکن جب ٹرین پہنچی تو یہ تمام تحلیلات ادا نام باطلہ ثابت ہو کر رہ گئے۔ لوگ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے درجوں میں گھومتے پھر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا۔ ایک صاحب ننگے سر، صرف کھدڑا کا کرتہ اور پاؤں پہنے اور ایک سفید کی چادر گلے میں ڈالے ہوئے، ایک دم میں تھڑکلا سے چھٹک کر پلیٹ فارم پر آ گھڑے ہوئے۔ پچھاننے والوں نے پچھانا اور ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی مولانا عبداللہ سندھی ہیں۔ سر اور دالھی کے بال بالکل سپید تھے۔ عمر ۶۵ و ۷۰ سال کے درمیان ہوگی۔ مگر جسم مضبوط تھا۔ ٹھکانا ہوا۔ انکھوں میں غیر معمولی چمک، پیشانی پر مجاہدانہ عزم و ہمت کے کس بل، آواز میں لطافت اور چہرہ پر بزرگوار مصوئیت کے ساتھ ایک جلال کا گویا ایک سپاہی ایک میدان جنگ سے منتقل ہو کر ایک دوسرے میدان جنگ کی طرف آ گیا اور اس نے ایک دوسرا دنیا مورچہ سنبھال لیا۔ لوگوں کو تلاش ہوئی کہ مولانا کا سامان آٹاریں مگر وہاں سامان کہاں تھا۔ جو کچھ مولانا کے جسم پر تھا اس وہی ان کا سامان تھا اور باقی خالی نام۔ میں نے دنیا میں عمار بھی دیکھے ہیں اور درویش بھی نہ تارکین دنیا بھی دیکھے اور کسانوں اور مزدوروں کے گم میں مرنے والے بھی۔ لیکن دنیا اس کی چیزوں سے اس درجہ بے تعلقی ایسے نیازی اور مکمل قسم کا قلندر آج تک نہ کوئی دیکھا ہے اور نہ شاید دیکھوں گا۔

وہی پہنچنے کے بعد مولانا نے اتنا رز قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہان خانہ واقع قریب باغ میں کیا تھا۔ یہ جگہ میرے بڑوں میں تھی۔ اس کے منبر بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو ہوئی رہی جب میں نصیحت تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اُسے اور مرگ پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ لگتے میں دیکھا کہ ایک موٹر کار ہمارے پاس آ کر ٹکی کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سید محمد عبداللہ مارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے۔ آج میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا۔ مولانا نے پوچھا کہ سید صاحب نے کہا۔ میں ابھی سید صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا تو ایک ایسا کسان تھا کہ وہ بیٹے روانہ ہو گئے۔ نہ کہہ میں واپس گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کہہ وہاں روانہ ہو گیا۔ میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کہہ میں واپس جاتے تھے تو لیتے کیا۔ وہاں انکا سامان تھا یہی کیا؟ وہاں جو بستر تھا تو کیا کچھ برتن تھے تو وہ جامعہ کے مہان خانہ کے تھے مولانا کا کچھ

قول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمائے کے بعد مولانا جامعہ گراؤنگھل میں منتقل ہو گئے۔ اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اگر کوئی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ جامع مسجد کے مغرب جنوب میں حکیم نایب نامی مدرسہ کا مشہور مطلب تھا اور اس مطلب سے مل متصل ہمارے ایک دوست مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی کا ٹھکانا تھا جس کے ایک وسیع کوہ میں ادارہ شریفیہ کے نام سے مولانا موصوف نے ایک ایسی ادارہ قائم کر رکھا تھا۔ اس ادارہ شریفیہ میں جمعہ کی نماز کے بعد سے لے کر عصر تک احباب کا اچھا خاصہ اجتماع رہتا تھا۔ مولانا عبدالغنی سندھی بھی جمعہ نماز سے فارغ ہو کر سیدھے یہیں تشریف لاتے تھے اور عصر تک رہتے تھے چند روز کے بعد جو لوگوں کی درخواست پر مولانا نے اس مجلس میں حجۃ اللہ اقدس اس دینا شروع کر دیا۔ درس کی شکل پر ہوتی تھی کہ کتاب کی کوئی اہم بحث نکالی اور اس پر تقریر شروع کر دی۔ تقریر کے ختم ہونے کے بعد جو لوگ سوالات کرتے اور مولانا ان کے جوابات دیتے تھے۔ اس مجلس میں دیوبند کے فضلہ رجو دلی میں مقیم تھے وہ اور ان کے علاوہ جامعہ ملیہ کے کچھ اساتذہ اور چند ارباب شریک ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا، مولانا سندھی حسب معمول اوکھلے سے دلی آئے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارہ میں تشریف لاکر حسب معمول حجۃ اللہ الباقی کا درس دیا۔ اس وقت چہرہ پر دشمنان کا کوئی اثر تھا اور نہ آواز میں کسی قسم کا انضمام اور نہ ضعف کمال بشارت واثاتی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضرہ اس کی کیا تھہ حصہ لیا۔ لسنے میں عصر کی نماز کا وقت آیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے لیکن بخودری ویر کے بعد کسی ضرورت سے سختی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بارہ کی دکان پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا بھی بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن ایک آنہ کی روٹی۔ میں نے کہا حضرت ربے وقت کھانا کیسا۔ فرمایا: اوکھلے کھانا تیار دینا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا تھا اس لئے کھانا کھاتے بغیر ہی چلا آیا تھا۔

یہ تو غیر ہوا جی اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جس واقعہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یہ گریجویٹوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد رفت کابن کا کاریر ادا کرنے کیلئے پیسے نہ تھے اس لئے اس روز مولانا سخت پیش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے دلی کا پیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل کا پیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے نہ از خود ہم سے کچھ کہا اور چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ کا جامع ہو کر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے مولانا کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان سے جب مجھ کو معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت در مولانا نے اس کی تصدیق کی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اس مذکور مولانا کو پیدل آنا تھا اس لئے اوکھلے سے ان کو بہت پیڑروان ہونا تھا۔ چونکہ اس وقت تک کھانا تیار ہوا نہیں تھا اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ حسب میں صرفت میں آنے پیسے تھے جو بس کے کرار کیلئے کافی نہ ہو سکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

ایک مرتبہ میری موجودگی میں مولانا عتیق الرحمان صاحب عثمانی نے مولانا سے پوچھا: حضرت! اپنے اپنی زندگی میں کبھی نوکر بھی رکھا ہے؟ حسب مت بھر کر بولے: مفتی جی آپ یہ کیا پوچھتے ہیں۔ کیا کوئی انسان بھی کسی انسان کا نوکر ہو سکتا ہے۔ ہاں ایک انسان دوسرے انسان کی مدد کرے۔ میری مت بھی میرے دوست احباب کرتے تھے اور میں ان کی خدمت کرتا تھا۔ اسی نشست میں مفتی صاحب نے پوچھا: حضرت! تیس برس کی جلا وطنی کے میں آپ پر عیش و مسترت کے بھی کچھ دن آئے ہیں؟ فرمایا: مفتی صاحب! یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں چلین اور آرام سے سویا ہوں۔ ہندوستان پہنچنے پر تیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں۔

مولانا ہمیشہ شگے سر بہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا: مولانا! ہمیشہ شگے سر بہتے ہیں اسکی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: قلعہ کی طرف اشارہ کر کے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے لئے جملہ لہجہ کیسا تھا فرمایا: میری ٹوپی تو اس دن

سر سے اتر گئی جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اب جب تک مجھے کوہا پس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر کرے مولانا کافی حرم رسید کرتے۔ حکمرکار کا حقہ جلا وطنی کی تکالیف اور مصائب میں بسر کیا تھا اور بڑے زور و سرباز تھے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی روشنی میں انہوں نے اس سربسلسل نور و فکر کیا تھا کہ اسلام کو دنیا کے موجودہ اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات میں کس طرح ایک عالمگیر نظام بنایا جائے جس کا کہ وہ دینِ فطرت ہونے کے باعث، بجا طور پر متعق ہے اور جو اس کا طبعی حق ہے۔ اس سلسل میں مولانا نے اسلام کے ہتھیاری اقتصادی سماجی نظام کا بڑی دقت و نغرت سے مطالعہ کیا تھا اور دوسری جانب انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو دنیا میں مظہر صنعتی انقلاب ہوا، اور اس انقلاب کے جو اثرات انسانی فکر و خیال اور عام معاشرہ پر پڑے ہیں ان سب کا دیدہ دری اور حقیق بصیرت کیساتھ مطالعہ کیا تھا اور اس کے علاوہ انہوں نے ایک نتیجہ پر پہنچ کر اپنا ایک مستقل فکر قائم کیا تھا۔ مولانا کا یہ فکر بڑا مستحکم اور غیر متزلزل تھا اور اس پر ان کو کامل درجہ وثوق اور اعتماد تھا۔ جلا وطنی سے واپسی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے بڑا اہم اور مقدس مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کے اس فکر کو سمجھیں اور اس کی اپنی پر سوسائٹی کی از سر نو تشکیل و تعمیر کریں۔ رہنما بن جائیں انہوں نے وطن کے لیے خطبے سے دلی زور میں جو مقالات و مضامین لکھے اور جو رسالے الباقی ان کے حقوق اور ضمانت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی فکر کو عام کرنے اور اپنے ہم خیال پیدا کرنے کی کیسی دھن تھی لیکن افسوس کہ اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا جتنے بڑے مفکر اور شخص تھے، اتنے بڑے نہ تو مقرر تھے اور نہ بڑے انشائ پر داز۔ بات بہت گہری اور سچی کہتے تھے مگر انداز بیان کچھ ایسا گنگناک اور اشتباہ انگیز ہوتا تھا کہ بعض اچھے اہل علم اور مفکر ان سے بظن ہو جاتے تھے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فکر میں اس درجہ پختہ تھے کہ کسی مسئلہ پر بحث و گفتگو کے وقت ان کا لب و لہجہ اور خیر مصداق ہو جاتا تھا۔ مولانا خود بھی کبھی اس کا اعتراف کرتے اور اس پر افسوس کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بڑی تمنا اور آرزو تھی کہ کسی طرح ان سے سبقاً سبقاً حجۃ اللہ البالغہ پڑھ لوں اور پھر ان کے ارشادات کی روشنی میں حجۃ اللہ البالغہ کی شرح اپنے الفاظ میں لکھ دوں۔ ان کا کام کے لئے مجھ ایسے ہیچوان کا مولانا کی نظر میں انتخاب میری سب سے بڑی خوش قسمتی تھی۔ اس بنا پر میرے لئے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ میں فوراً اس لئے آمادہ ہو گیا اور قرارداد یہ ہوئی کہ مولانا روزانہ مغرب کے بعد اؤکھٹے سے دلی آئیں گے اور مسجد فتحپوری کے ایک حجرہ میں شب بھر قیام کر کے ادھر میں بحث و گفتگو کی نماز سے فارغ ہو کر اپنے مکان قرول باغ سے مسجد فتحپوری میں آجاول گا اور وہاں مولانا مجھ کو دو تین گھنٹے درس دیں گے۔ دوسرے دن میں مولانا کی تقریر درس کو اپنے الفاظ میں تقلید کر کے ان کو دکھاؤں گا۔ یہ قرارداد ہو چکی تھی اور ابھی اس پر عمل شروع نہیں ہوا تھا کہ ان کا پنجاب کا سفر پیش آگیا۔ فرمایا کہ ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، جلد واپس آجاول گا اور آتے ہی یہ پروگرام شروع ہو جائے گا لیکن اسے خیر بخئی کہ مولانا کا دلی سے یہ سفر آخری سفر تھا جس سے واپس آنا مقدر نہیں تھا۔ پنجاب اپنی صاحبزادی کے پاس گئے تھے جولاہہ برہنہ میں تھیں اور ان میں سے کچھ روز لہجہ بیاہر ہوئے اور اس قدر شدید کہ جانی نہیں ممکن نہ ہوئی اور واصل بکرت ہو گئے۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔

بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مشیتِ ایزدی میں کسی کو کیا مجال دم زدن ہے۔ کچھ مولانا دنیا میں نہیں ہیں لیکن اپنے پیچھے اپنی مثال کا گراں بہا ذخیرہ چھوڑ گئے ہیں۔ وہ اس لائق ہے کہ اسلامیات کا ہر طالب علم اس کا خود و فکر سے مطالعہ کرے۔ اس سے فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں اور تنازع البقا کے موجودہ دور میں ایک ایسی روشنی ملے گی جو ہمت اور عزم پیدا کرے گی۔

مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت الدین علیہ السلام دہلوی

۵۱۳۷۲
۶۱۹۵۳



۵۱۲۹۲
۶۱۸۷۵

سوال ابیضاوی شریف

(۱) والہدایۃ دلالت بلطف ولذلک تستعمل فی الخیر وقولہ تعالیٰ فاعلموا
الیصلوا الی محمد علی التہکم - ومنہ الہدایۃ وهوادی الوحش
لمقد ماتہا - والفعل منہ ہدا واصلہ ان یعدی باللام والی
فغول معہ معاملۃ اختار فی قولہ تعالیٰ ولختار موسیٰ قومیۃ
اس عبارت کا صاف مطلب اور ہدیہ اور سوادی کی وجہ تفریق
بیان کرو -

(۲) والعالم اسم لما یعلم بہ کالخاتمہ والقالب خلب فیما
یعلم بہ الصانع وهو کل ما سواہ من الجواهر والاعراض
فانہا لامکانہا وافتقارہا الی مؤثر واجب لذاتہ تدل علی
وجودہ - اس عبارت کا صاف مطلب تحریر کرو -

(۳) والایمان فی اللفظ عبارتہ عن التصدیق ماخوذ من الامن
کان المصدق امن المصدق من التکذیب والمخالفتہ
واما فی الشرع فالصدقین بما علم بالضرورة انہ من دین
محمد ﷺ کالتوحید والنبوۃ والبعث والجنائز -
اس عبارت کا صاف مطلب تحریر کرو -

۱۳۲۹ھ

محمد کفایت الرحمن

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کا سلسلہ نسب یہ ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ بن شیخ عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ۔

درث اعلیٰ آپ کا سلسلہ نسب شیخ جمال بخینی سے جا کر ملتا ہے۔ اس طرح آپ کے اباؤ اجداد کا اصلی وطن سرزمین عرب و لشکا وغیرہ کے ساحلی علاقوں میں فروخت کرتے تھے۔ قدیم زمانہ میں یمن سے اس قسم کے تاجروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی پر سوار کر بکری سفر پر روانہ ہوا۔ ابھی یہ بکری قافلہ برصغیر پاک و ہند کے ساحل پر پہنچے نہیں پایا تھا کہ ایک زبردست طوفان آیا جس نے اڑک تباہ و برباد کر دیا اور اس کے مسافر غرق ہو گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس بکری قافلہ کے سردار کا ایک نو عمر لڑکا جس کا نام جمال تھا، طوفان سے بچ نکلوا اور ایک تختہ پر مہلتا ہوا ساحل تک پہنچ گیا۔ ساحل پر اسے بھوپال کے ایک شخص نے دیکھا۔ اُس نے اس کی شادی ہو گئی۔ یہی شیخ جمال بخینی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے مورث اعلیٰ تھے۔ اندازہ ہے کہ کشتی کی تباہی کا تقریباً سو برس پہلے کا ہے۔

شیخ عنایت اللہ

شیخ جمال بخینی کے بعد آپ کے دیگر اجداد کے حالات دستیاب نہیں ہوتے۔ بھوپال سے یہ خاندان شاہجہان پور منتقل ہو گیا تھا۔ آپ کے والد محترم شیخ عنایت اللہ نہایت شریف اور پرہیزگار بزرگ عالم و آخروں نے اپنے زمانہ طالب علمی میں ان کی زیارت کی تھی کیونکہ وہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ کبھی کبھی مدرسہ امینیہ بھی لیتے لاتے تھے۔ انہوں نے بہت طویل عمر پائی اور شکل و صورت میں حضرت مفتی صاحب کے مشابہ تھے۔ شیخ عنایت اللہ صاحب کی اعیال اور غریب تھے۔ حضرت مفتی صاحب دو لڑکیوں کے بعد پیدا ہوئے تھے اور حضرت مفتی صاحب کے تین بھائی اور ان میں سے ایک بھائی کا اسم گرامی حافظ قاری نعمت اللہ تھا جو شاہ جہان پور ہی مقیم رہے۔ انہوں نے درس و تدریس کا انتخاب کیا اور رکھا تھا۔ نہایت عابد و زاہد تھے۔ دوسرے بھائی حافظ سلامت اللہ شاہ جہان پور کے تھے۔ تیسرے بھائی قدرت اللہ صاحب نے تصور (پاکستان) میں رہائش اختیار کی تھی۔ وہ ۱۹۴۲ء میں کانگریس کی تحریک آزادی میں

مقرر تارخ مدرسہ امینیہ دہلی از مولوی حفیظ الرحمن صاحب۔

شریک رہے اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔ وہ مقامی کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری بھی رہے۔ تین چار مرتبہ سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کے جرم میں جیل گئے۔ سیاسی تحریکوں میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کاروبار بھی کرتے تھے۔ آخر میں انہوں نے اُسے کامل کھیل رکھا تھا۔

تاریخ پیدائش حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب شاہ جہان پور (روہیل کھنڈ۔ یوپی) کے محلہ زئی میں ۱۲۹۲ھ آپ کا سن پیدائش ہے۔

ابتدائی تعلیم آپ نے پانچ سال کی عمر میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب شاہ جہان پور میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا۔ مکتب میں آپ نے نافذ قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم حافظ نسیم علی صاحب کے مکتب واقع محلہ درگ زئی میں حاصل کی۔ اس کے بعد آپ مولوی اعجاز حسن خاں صاحب کے مدرسہ اعزازیہ میں جو محلہ غیل میں واقع تھا داخل ہوئے۔ یہ مدرسہ اپنے قابل اساتذہ کی بدولت بہت مشہور تھا۔ اس لئے حضرت مفتی صاحب کی علمی ہمت اس مدرسہ نے مستحکم کیا۔ چنانچہ فارسی نصاب کی اعلیٰ ادبی کتاب "سکندر نامہ" اور عربی کی ابتدائی کتابیں حافظ بدھن خاں نے شروع کرائیں جو نہایت ہی ذہین اور قابل استاد تھے۔

آپ کے دوسرے استاد محترم اس مدرسہ میں مولانا عبدالحق خاں صاحب تھے جو افغانستان سے ہندوستان آئے تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے تھے اور مولانا مفتی لطف اللہ علی گڑھی جیسے شہرہ آفاق عالم کے شاگرد تھے۔ مولانا عبدالحق جو ہر شے اس نگاہ سے جملہ علوم کو لیا کہ ان کے نو عمر مرگہ یونہی شاگرد کو نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے اس لئے آپ کے والد محترم شیخ عنایت اللہ کو مجبور کیا کہ وہ اپنے لڑکے کو دارالعلوم دیوبند بھیجیں۔ آپ کے والدین اپنے غریبہ حالات ماتحت اپنے کم سن لڑکے کو اس قدر دیر بھیجے پر رضامند نہیں ہوئے کیونکہ اس وقت حضرت مفتی صاحب کی عمر صرف پندرہ برس تھی آخر کار مولانا موصوف نے انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے نو عمر صاحبزادے کو قریب کے مدرسہ شاہی مراد آباد کی طرف ایک اور طباطبائی کے ساتھ بھجوا دیں جن کا نام حافظ عبد المجید تھا۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب حافظ عبد المجید کے ساتھ مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہو گئے۔

مولانا عبدالحق خاں صاحب نے اپنے دونوں شاگردوں کو مدرسہ عربیہ شاہی مسجد مراد آباد کے مہتمم مرزا حافظ بنی بگ کے نام خط دے کر بھیجا تھا۔ مہتمم صاحب مولانا عبدالحق خاں صاحب کے پیر بھائی تھے۔ مگر جب یہ دونوں شاگرد مراد آباد پہنچے تو وہ بمبئی گئے تھے تاہم ان کے نائب مہتمم حاجی محمد اکبر خاں صاحب سوداگر نے بھی ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں مولوی عبدالحق

لے فرنگیوں کا حال از مولانا امداد صابری۔ مطبوعہ دہلی یکم جنوری ۱۹۴۹ء۔ ص ۲۸۹۔ ص ۲۹۰۔

مولانا عبدالحق خاں صاحب مولانا افضل اللہ خاں صاحب شاہ جہان پوری کے والد بزرگوار تھے جو بمبئی کے بعد کراچی میں بھی رہے۔ مولانا عبدالحق خاں صاحب، مولانا سیف الرحمن صاحب اور مولانا محمد سہیل صاحب بھانگلپوری کے معاصر تھے انہوں نے مولانا عبدالحق بنگلوچی سے بیعت کی تھی۔ ان کی وفات تیسری سال کی عمر میں ۱۳۱۲ھ میں شاد جہان پور میں ہوئی۔

احب کے پاس باقعی خانہ میں عارضی طور پر رہتے کا بندوبست کیا۔ مولوی عبدالخالق صاحب بھی مدرسہ اعظم ازیں میں مولوی بیادختی خاں صاحب کے پاس پڑھتے رہے تھے اور ایک سال قبل اس مدرسہ میں داخل ہوئے تھے۔

بعد میں حضرت مفتی صاحب اور حافظ عبد المجید مراد آباد کے مشہور وکیل حافظ محمد اسماعیل صاحب کے دیوان خانہ میں مقیم ہوئے۔ حافظ محمد اسماعیل صاحب مشہور سیاسی لیڈر سر محمد یعقوب ممبر اسمبلی کے والد بزرگوار تھے۔ وہ شاہ جہان پور میں وکالت کرتے تھے اس لئے وہیں رہتے تھے۔ البتہ اپنے وطن مراد آباد پر مہربانی سے وہیں دفعتاً آیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کا دیوان خانہ جو محلہ مغل پورہ رو آباد میں تھا، نہالی پڑا رہتا تھا اس لئے وہ ان دونوں طلبہ کے لئے موزوں مقام ثابت ہوا۔

حافظ محمد اسماعیل صاحب کے بار بار مراد آباد آنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے ہاتھ تینوں ہم وطن طلبہ کے والدین اپنے بچوں کے لئے ضروریات کی چیزیں بھیج دیا کرتے۔ مفتی صاحب جب مراد آباد کے مدرسہ شاہی میں تعلیم حاصل کرتے تھے تو اس زمانے میں اعلیٰ کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا تاہم تعلیم کے اخراجات اور دیگر ضروریات کے اخراجات حضرت مفتی صاحب خود ہی داشت کرتے تھے۔ آپ کے والد صاحب بہت غریب آدمی تھے اس لئے وہ تعلیم کے لئے اور اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں آپ نے اپنے قریبی بازو پر بھروسہ کیا۔ آپ دوسروں کے عطیات اور بخشش قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ رو آباد اور دیوبند کے قیام کے زمانے میں مانگے کی ٹوپیاں کو روٹھیا سے بناتے تھے۔ آپ بہت عمدہ مختلف رنگ کی کڑی بنائی، پوں میں بنایا کرتے۔ دو تین دن میں ایک ٹوپی تیار ہوتی اور دو روپے میں فروخت ہو جاتی۔ یہ ٹوپیاں آپ کی کاریگری اور ہنر کی کامیابی سے بنائی جاتیں۔ ٹوپیاں بننے سے پہلے آپ اپنے قلم کی ٹوپوں کے مختلف ڈیزائن اور نمونے بناتے تھے۔ چنانچہ پھیل کے نمونوں اور ڈیزائن کا یہ مجموعہ ان کے صاحبزادے صاحب کے پاس موجود ہے۔

مراد آباد کے تعلیمی دور کے کچھ واقعات مولانا سید فخر الحسن صاحب استاد دارالعلوم دیوبند نے اپنے والد مولانا سید فیض صاحب مرحوم کی زبانی بیان فرماتے ہیں۔ ان کے والد صاحب بیان کرتے ہیں :-

”مراد آباد میں حضرت مفتی صاحب اور میں نے ساتھ پڑھا ہے۔ غالباً مولانا احمد حسین امروری سے جو کچھ عرصہ تک شاہی مسجد مراد آباد میں مدرسہ رہے ہیں نیز حضرت مولانا محمد حسن صاحب مراد آبادی (مظہوری) سے ہم دونوں نے کچھ کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں شرح فقہ ایک کتاب مجھے یاد ہے جو ساتھ پڑھی ہے۔ مفتی صاحب سبق میں بالکل پلہ پڑا ہو کر کچھ بیٹھے رہا کرتے تھے اور کبھی کبھی سبق کے وقت بھی ٹوپی بننے رہتے تھے لیکن سچے اور حافظہ کارہ حال تھا کہ جب مجھے ضرورت ہوتی اور کتاب سمجھ میں نہ آتی تو مفتی صاحب کے پاس حاضر ہوتا۔ مفتی صاحب کتاب کی لعینہ دہی تقریر فرمادیتے جو حضرت استاد سے سُنی جاتی۔“

غالب علی کے زمانے میں (آپ کا) حضرت مولانا محمد حسن مراد آبادی ثم بھوپالی (آپ بعد میں ریاست بھوپال کے ناظم اوقاف ہو گئے تھے) کے یہاں قیام تھا اور کھانا مولانا ممدوح کے یہاں کھایا کرتے تھے۔ یہ صورت حضرت

مفتی صاحب نے اپنے محترم استاد موصوف کے اصرار پر قبول فرمائی تھی — اور کے خرچ کے لئے اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بٹن کر بازار میں فروخت فرماتے تھے، اور نہایت خودداری کے ساتھ طالب علماء زندگی بسر فرماتے تھے۔

مولانا عبدالعلی مراد آباد میں مدرسہ شاہی کے مدرس اڈل حضرت مولانا عبدالعلی میر علی تھے جو حضرت مولانا محمد قائم الدین کے شاگرد تھے۔ آپ بعد میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الحدیث ہو گئے تھے اور حضرت مفتی صاحب نے دیوبند میں بھی شیخ الہند کے زمانے میں ان سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت مولانا عبدالعلی صاحب دیوبند کے بعد دہلی کے مشہور مدرسہ عبدالرب میں بھی صدر مدرس تھے اور ان کے دور میں یہ مدرسہ بہت مشہور ہوا۔ آپ کو اس مدرسہ سے اس قدر والدہ شغف تھا کہ جب بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں کا وجہ سے تعلیمی خدمات سے سبکدوش ہو گئے تھے تو اس حالت میں آپ نے یہیں قیام رکھا اور لپ رشک مدرسہ کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں مجھ اسراحت رہتے تھے۔ راقم الحرف اپنے دور طالب علمی میں جب اپنے گھر سے مدرسہ امینیہ جاتا تھا، تو آتے جاتے اس فرشتہ صورت بزرگ کی زیارت کرتا تھا۔ مذکورہ بالا اساتذہ کے علاوہ آپ نے مولوی محمود حسن سہروردی سے بھی مدرسہ شاہی مراد آباد میں پڑھا تھا۔ مدرسہ شاہی مراد آباد میں آپ کی تعلیمی مدت دو سال ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۲ھ میں حضرت مفتی صاحب مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید کے ساتھ دیوبند پہنچے اور دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم کے مہتمم مولوی محمد نیر صاحب تھے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس تھے دیوبند میں حضرت مفتی صاحب نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

- ۱: مولانا منفعت علی صاحب - جو بعد میں مدرسہ فتح پوری میں صدر مدرس ہو گئے تھے۔
 - ۲: مولانا حکیم محمد حسن صاحب - (برادر خور و حضرت شیخ الہند)
 - ۳: مولانا غلام رسول صاحب -
 - ۴: حضرت مولانا غلیل احمد صاحب امینٹوی ثم سارن پوری۔
 - ۵: حضرت مولانا عبدالعلی صاحب -
 - ۶: حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب۔
- اسخبر الذکر دونوں حضرات سے آپ نے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔

خصوصی رفقا آپ کے دور طالب علمی میں وہ حضرات تعلیم حاصل کر رہے تھے جو آگے چل کر علم و فضل کے آفتاب بن کر چمکے ان میں سے کچھ حضرات مثلاً حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیریؒ آپ سے آگے تھے اور کچھ درجہ تعلیم چھپچھپے تھے۔ تاہم تعلیمی زمانہ ایک تھا۔ اس طرح یہ دور دیوبند کی تاریخ کا ایک زریں دور تھا۔ ان خصوصی رفقا میں سے آپ کے ہم وطن ساتھی مولوی عبدالخالق اور مولوی عبدالمجید کے علاوہ یہ حضرات بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

- ۱: حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ محدث کشمیریؒ۔
- ۲: شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔
- ۳: ان کے بھائی سید احمد فیض آبادی۔
- ۴: مولانا ضیاء الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ امینیہ۔

۵: مولانا محمد شفیع دیوبندی شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسہ عبدالرزاق دہلی۔

۶: مولانا محمد تقاسم دیوبندی مدرسہ امینیہ۔ ۷: مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ دہلی۔

دارالعلوم میں آپ کی تعلیمی مدت تیس سال رہی۔ آپ دارالافتاء (ہوسٹل) ہی میں مکہ ۱۳۷۱ھ احاطہ مولسری میں رہتے تھے۔ چونکہ آپ کا حافظہ بہت تیز تھا اور آپ بلا کے ذہین تھے اس لئے اسباق میں بہت کم محنت کرنے کے باوجود امتحانوں میں اپنے ہم سبقوں سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ کیونکہ آپ اساتذہ کے حلقہ درس میں جو پڑھتے تھے وہ اسی وقت سے یاد کر لیتے تھے اور باقی وقت اپنے تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے لئے ٹوپیوں کے بیچنے ہی میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ان کی اور اپنی طالب علمی کے دور کا ایک واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں ”ایک مرتبہ میں نے کوشش کی کہ اپنے ہم سبقوں میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کروں۔ امتحان کے موقع پر میرا ہر رسالہ کا پرہ تھا۔ ایک سوال کا جواب میں نے نہایت عمدگی کے ساتھ دو صفحے میں لکھا اور اسی سوال کا جواب مفتی صاحب نے اسی صفحے میں لکھا۔ حضرت شیخ الہند اس پرچہ کے متحن تھے۔ آپ نے دونوں کو برابر نمبر دیئے یعنی آدھے صفحے کا مضمون اپنے وزن کے لحاظ سے دو صفحے والے مضمون سے کم دیا تھا۔“

حضرت مفتی صاحب بالعموم رات کو زیادہ مطالعہ نہیں کرتے تھے اس کے باوجود وہ ہر امتحان میں اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوتے تھے۔ آپ بائیس سال کی عمر میں ۱۳۱۵ھ میں دارالعلوم دیوبند کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تھے۔

دارالعلوم کی تدریس سے فارغ ہو کر مفتی صاحب دہلی آئے اور اپنے رفیق خاص مولوی امین الدین صاحب کے پاس ٹھہرے۔ ان دنوں مولوی امین الدین صاحب ایک مذہبی مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اور مسجد چھتہ شاہ حسین چاؤڑی بازار دہلی میں قیام پذیر تھے۔

مدرسہ عین العلم آپ اپنے وطن شاہ جہان پور پہنچے تو اس زمانے میں آپ کے اولین مربی اور استاد مولانا حمید الرحمن تھے۔ مدرسہ عین العلم کے بنیاد ڈال چکے تھے۔ لہذا جب آپ شاہ جہان پور پہنچے تو انہوں نے آپ کو اپنے مدرسہ میں مدرس مقرر کر لیا۔ اور اس کے ساتھ مدرسہ کے دفتر کا سارا کام بھی آپ کے سپرد کر دیا۔ اس وقت آپ کی تنخواہ غالباً صرف پندرہ روپے ماہوار تھی۔

مدرسہ عین العلم کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور مفتی صاحب انجام دیتے تھے۔ آپ سب سے پہلے مدرسہ پہنچے اور سب کے بعد وہاں سے رخصت ہوتے تھے۔ آپ مدرسہ کا حساب بہت عمدہ اور باقاعدہ رکھتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی کام کے ساتھ ساتھ آپ نے فتویٰ نویسی کا کام بھی سنبھال لیا تھا۔ آپ نے سب سے پہلا فتویٰ اسی مدرسہ عین العلم میں تحریر کیا جو بہت مدلل اور مبسوط تھا۔ اس فتوے کو شاہ جہان پور کے تمام علماء اور بالخصوص مولانا عبدالحق خاں صاحب نے بہت پسند کیا تھا۔ آپ فتویٰ نویسی میں بہت محنت کرتے تھے اور اس میں بہت احتیاط اور جانفشانی سے کام لیتے تھے۔

رسالہ البرهان کا اجراء مدرسہ عین العلم کی مدرسے کے زمانے میں آپ نے ”فتنہ قادیانیت“ کی تردید میں ایک ماہوار رسالہ البرهان جاری کیا اس کے مدیر آپ خود تھے، اور منیر مولانا مفتی مہدی حسن صاحب کے بڑے بھائی مفتی سلطان حسن

تھے۔ پہلا نرسنگ ہانس ہسپتال تھا۔ اس زمانہ میں کلونیٹس کی تندرستی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان کے جسمانی اور ذہنی حالات بھی بدلتے رہتے تھے۔

- مولانا رفیع الرحمن صاحب مدظلہ العالی کے زیرِ اہتمام مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی کے زیرِ اہتمام مولانا محمد رفیع صاحب مدظلہ العالی کے زیرِ اہتمام

۱ : مندرجہ ذیل کے تحت حسب مقتضی وزارت اعظمیہ

میں نے اس کے لئے ایک نیا ہیرو بنایا۔

سورہ صافات ۱۰۰

یہاں یہ بھی ذکر کرنا چاہیے کہ اس کتاب کے علاوہ قاری کی کتاب بھی تحریر ہوئی تھی۔ یہ کتاب
پڑھنے پر کچھ کھردر کر کے لکھی گئی تھی۔ چنانچہ اس کتاب کے قاریوں کو اس کتاب پر
توجہ دینی چاہیے۔

میرا آپ سے تعلق یہ ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو میری زندگی میں (میں نے) سب سے پہلے
 سے اسلام اور ان کی اصلاحات کو اپنا مشرور کر لیا ہے۔ یہی میری سب سے پہلی اور سب سے زیادہ
 توان اور جرمہ ہے۔ ان کی اصلاحات کو اپنی زندگی میں کرنا میری سب سے پہلی اور سب سے زیادہ
 شریعت اور دین ہے۔ ان کی اصلاحات کو اپنی زندگی میں کرنا میری سب سے پہلی اور سب سے زیادہ
 محکمہ اور دین ہے۔ ان کی اصلاحات کو اپنی زندگی میں کرنا میری سب سے پہلی اور سب سے زیادہ
 محکمہ اور دین ہے۔ ان کی اصلاحات کو اپنی زندگی میں کرنا میری سب سے پہلی اور سب سے زیادہ

۱۰۰
 ۱۰۱
 ۱۰۲
 ۱۰۳
 ۱۰۴
 ۱۰۵
 ۱۰۶
 ۱۰۷
 ۱۰۸
 ۱۰۹
 ۱۱۰
 ۱۱۱
 ۱۱۲
 ۱۱۳
 ۱۱۴
 ۱۱۵
 ۱۱۶
 ۱۱۷
 ۱۱۸
 ۱۱۹
 ۱۲۰
 ۱۲۱
 ۱۲۲
 ۱۲۳
 ۱۲۴
 ۱۲۵
 ۱۲۶
 ۱۲۷
 ۱۲۸
 ۱۲۹
 ۱۳۰
 ۱۳۱
 ۱۳۲
 ۱۳۳
 ۱۳۴
 ۱۳۵
 ۱۳۶
 ۱۳۷
 ۱۳۸
 ۱۳۹
 ۱۴۰
 ۱۴۱
 ۱۴۲
 ۱۴۳
 ۱۴۴
 ۱۴۵
 ۱۴۶
 ۱۴۷
 ۱۴۸
 ۱۴۹
 ۱۵۰
 ۱۵۱
 ۱۵۲
 ۱۵۳
 ۱۵۴
 ۱۵۵
 ۱۵۶
 ۱۵۷
 ۱۵۸
 ۱۵۹
 ۱۶۰
 ۱۶۱
 ۱۶۲
 ۱۶۳
 ۱۶۴
 ۱۶۵
 ۱۶۶
 ۱۶۷
 ۱۶۸
 ۱۶۹
 ۱۷۰
 ۱۷۱
 ۱۷۲
 ۱۷۳
 ۱۷۴
 ۱۷۵
 ۱۷۶
 ۱۷۷
 ۱۷۸
 ۱۷۹
 ۱۸۰
 ۱۸۱
 ۱۸۲
 ۱۸۳
 ۱۸۴
 ۱۸۵
 ۱۸۶
 ۱۸۷
 ۱۸۸
 ۱۸۹
 ۱۹۰
 ۱۹۱
 ۱۹۲
 ۱۹۳
 ۱۹۴
 ۱۹۵
 ۱۹۶
 ۱۹۷
 ۱۹۸
 ۱۹۹
 ۲۰۰
 ۲۰۱
 ۲۰۲
 ۲۰۳
 ۲۰۴
 ۲۰۵
 ۲۰۶
 ۲۰۷
 ۲۰۸
 ۲۰۹
 ۲۱۰
 ۲۱۱
 ۲۱۲
 ۲۱۳
 ۲۱۴
 ۲۱۵
 ۲۱۶
 ۲۱۷
 ۲۱۸
 ۲۱۹
 ۲۲۰
 ۲۲۱
 ۲۲۲
 ۲۲۳
 ۲۲۴
 ۲۲۵
 ۲۲۶
 ۲۲۷
 ۲۲۸
 ۲۲۹
 ۲۳۰
 ۲۳۱
 ۲۳۲
 ۲۳۳
 ۲۳۴
 ۲۳۵
 ۲۳۶
 ۲۳۷
 ۲۳۸
 ۲۳۹
 ۲۴۰
 ۲۴۱
 ۲۴۲
 ۲۴۳
 ۲۴۴
 ۲۴۵
 ۲۴۶
 ۲۴۷
 ۲۴۸
 ۲۴۹
 ۲۵۰
 ۲۵۱
 ۲۵۲
 ۲۵۳
 ۲۵۴
 ۲۵۵
 ۲۵۶
 ۲۵۷
 ۲۵۸
 ۲۵۹
 ۲۶۰
 ۲۶۱
 ۲۶۲
 ۲۶۳
 ۲۶۴
 ۲۶۵
 ۲۶۶
 ۲۶۷
 ۲۶۸
 ۲۶۹
 ۲۷۰
 ۲۷۱
 ۲۷۲
 ۲۷۳
 ۲۷۴
 ۲۷۵
 ۲۷۶
 ۲۷۷
 ۲۷۸
 ۲۷۹
 ۲۸۰
 ۲۸۱
 ۲۸۲
 ۲۸۳
 ۲۸۴
 ۲۸۵
 ۲۸۶
 ۲۸۷
 ۲۸۸
 ۲۸۹
 ۲۹۰
 ۲۹۱
 ۲۹۲
 ۲۹۳
 ۲۹۴
 ۲۹۵
 ۲۹۶
 ۲۹۷
 ۲۹۸
 ۲۹۹
 ۳۰۰
 ۳۰۱
 ۳۰۲
 ۳۰۳
 ۳۰۴
 ۳۰۵
 ۳۰۶
 ۳۰۷
 ۳۰۸
 ۳۰۹
 ۳۱۰
 ۳۱۱
 ۳۱۲
 ۳۱۳
 ۳۱۴
 ۳۱۵
 ۳۱۶
 ۳۱۷
 ۳۱۸
 ۳۱۹
 ۳۲۰
 ۳۲۱
 ۳۲۲
 ۳۲۳
 ۳۲۴
 ۳۲۵
 ۳۲۶
 ۳۲۷
 ۳۲۸
 ۳۲۹
 ۳۳۰
 ۳۳۱
 ۳۳۲
 ۳۳۳
 ۳۳۴
 ۳۳۵
 ۳۳۶
 ۳۳۷
 ۳۳۸
 ۳۳۹
 ۳۴۰
 ۳۴۱
 ۳۴۲
 ۳۴۳
 ۳۴۴
 ۳۴۵
 ۳۴۶
 ۳۴۷
 ۳۴۸
 ۳۴۹
 ۳۵۰
 ۳۵۱
 ۳۵۲
 ۳۵۳
 ۳۵۴
 ۳۵۵
 ۳۵۶
 ۳۵۷
 ۳۵۸
 ۳۵۹
 ۳۶۰
 ۳۶۱
 ۳۶۲
 ۳۶۳
 ۳۶۴
 ۳۶۵
 ۳۶۶
 ۳۶۷
 ۳۶۸
 ۳۶۹
 ۳۷۰
 ۳۷۱
 ۳۷۲
 ۳۷۳
 ۳۷۴
 ۳۷۵
 ۳۷۶
 ۳۷۷
 ۳۷۸
 ۳۷۹
 ۳۸۰
 ۳۸۱
 ۳۸۲
 ۳۸۳
 ۳۸۴
 ۳۸۵
 ۳۸۶
 ۳۸۷
 ۳۸۸
 ۳۸۹
 ۳۹۰
 ۳۹۱
 ۳۹۲
 ۳۹۳
 ۳۹۴
 ۳۹۵
 ۳۹۶
 ۳۹۷
 ۳۹۸
 ۳۹۹
 ۴۰۰
 ۴۰۱
 ۴۰۲
 ۴۰۳
 ۴۰۴
 ۴۰۵
 ۴۰۶
 ۴۰۷
 ۴۰۸
 ۴۰۹
 ۴۱۰
 ۴۱۱
 ۴۱۲
 ۴۱۳
 ۴۱۴
 ۴۱۵
 ۴۱۶
 ۴۱۷
 ۴۱۸
 ۴۱۹
 ۴۲۰
 ۴۲۱
 ۴۲۲
 ۴۲۳
 ۴۲۴
 ۴۲۵
 ۴۲۶
 ۴۲۷
 ۴۲۸
 ۴۲۹
 ۴۳۰
 ۴۳۱
 ۴۳۲
 ۴۳۳
 ۴۳۴
 ۴۳۵
 ۴۳۶
 ۴۳۷
 ۴۳۸
 ۴۳۹
 ۴۴۰
 ۴۴۱
 ۴۴۲
 ۴۴۳
 ۴۴۴
 ۴۴۵
 ۴۴۶
 ۴۴۷
 ۴۴۸
 ۴۴۹
 ۴۵۰
 ۴۵۱
 ۴۵۲
 ۴۵۳
 ۴۵۴
 ۴۵۵
 ۴۵۶
 ۴۵۷
 ۴۵۸
 ۴۵۹
 ۴۶۰
 ۴۶۱
 ۴۶۲
 ۴۶۳
 ۴۶۴
 ۴۶۵
 ۴۶۶
 ۴۶۷
 ۴۶۸
 ۴۶۹
 ۴۷۰
 ۴۷۱

[illegible]

۱۔ ہمارے مشن کے تحت ہر سال ہر روز حضرت خلیفۃ المسیحؑ کو صاحبِ اور حضرت مولانا عبد الکریم صاحبِ فریقہ
کو ترازو حضرت میر تقی میرؒ کی شہت جو کہ بے قیاس ہے اور حضرت مولانا عبد الکریم صاحبِ فریقہ
کو شرفِ اعلیٰ ہے اور شریفین کے ہر روز حضرت خلیفۃ المسیحؑ کو صاحبِ اور مولانا عبد الکریم صاحبِ

ساتھ ہم نے ایک مسجد میں پانی کے ساتھ روزہ افطار کر لیا تھا۔ مگر اب بھوک زیادہ لگی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مجھے قرآن شریف تراویح میں پڑھنا ہے (اس لئے) میں چلا آیا۔ مگر یہ حضرات وہاں شب کے بارگاہ تک رہے۔

اسلام کی لالچ

یہ جگہ کس وقت ختم ہوا؟ مجھے معلوم نہ ہوا، لیکن صبح کو ہر کہہ دوسری زبان پر یہ تھا کہ ان دونوں مولویوں نے اسلام کی لالچ رکھی، خدا جانے یہ کہاں سے آگئے تھے (ان دونوں صاحبان سے شاہ جہاں پور کے لوگ ناواقف تھے) میں بہادر گنج کے بازار میں پہنچا تو مسلمانوں کی ٹولیاں اس کا تذکرہ کر رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا: ”مگر ان میں جو ایک دہلا پتلا سوکھا سا آدمی تھا۔ تم نے دیکھا وہ شیر کی طرح غرانا تھا اور اس کی ہر بات پر پادری صاحب کو پسینہ آ جاتا تھا۔“

قادیانیت کا رد اسی زمانے میں شاہ جہاں پور کے ایک تاجر جیو نہ حاجی — عبدالقدیر اور حافظ سید علی اور حافظ فخر احمد کے ذریعہ سے فقہ قادیانیت نے ہاتھ پر پھیلانا شروع کئے۔ مولوی اکرام اللہ خان مرحوم نے حضرت مفتی صاحب ہی کے زیر سرپرستی اخبارات میں مضامین لکھنے شروع کئے جن کی جلد شہرت ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کو ناکافی سمجھ کر خود ایک رسالہ البرقان مجاہدی کیا جس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ وہ زمانہ تحریر و تقریر کی آزادی کا نہ تھا۔ اس رسالہ کی مشکل اجازت ملی۔ غالباً یہ رسالہ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ آپ نے دہلی میں اقامت ملے نہ فرمائی۔ یہاں حضرت مفتی صاحب کے گریجویٹ شاگرد حافظ اکبر علی ایڈووکیٹ کے حوالے سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے بھی اس قسم کے ایک مناظرہ کا تذکرہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔

عین العلم میں مدرسہ سی مدت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ عین العلم کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ اسی وجہ سے ارکان مدرسہ اور مدرسین کافی مشکلات میں مبتلا رہے اور وہ اشارے کام لے کر کم تنخواہ پر کام کرتے رہے۔ ان مالی مشکلات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں مدرسین کی تنخواہ میں تخفیف کر دی گئی اور آپ کی تنخواہ بھی اٹھارہ روپے سے کم کر کے سولہ روپے کر دی گئی تاہم آپ مدرسہ عین العلم میں اپنے اسناد مولانا عبیدالحق خاں کی وفات تک تقریباً پانچ سال رہے۔

ازدواجی زندگی آپ کی پہلی شادی اس وقت ہوئی جب کہ آپ مدرسہ عین العلم میں مدرس تھے۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے مگر دونوں بچے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد پہلی زوجہ مرتدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ کا دوسرا عقد جناب شرف الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوا۔ ان سے سات بچے پیدا ہوئے۔ مگر بقید حیات دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

برہن کا دور حضرت مفتی صاحب کے رفیق خاص مولانا امین الدین صاحب نے اس عرصے میں سنہری مسجد چاندنی چوک مدرسہ امینیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کر لی تھی جس کے صدر مدرس حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری مقرر ہوئے تھے۔ حضرت علامہ کشمیری کچھ عرصہ تک وہاں درس دیتے رہے۔ اس کے بعد بعض خانگی وجوہات کی بنا پر استعفا دے دیے۔ مفتی اعظم کی یاد صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ ۱۱۳ھ مفتی اعظم کی یاد صفحہ ۱۲۷۔

دے کر اپنے وطن کشمیر واپس چلے گئے۔ اس وقت مولانا امین الدین صاحب نے مفتی صاحب کو خط لکھا کہ وہ ان کے مدرسہ میں آکر کام کریں۔

اس زمانے میں مدرسہ عین العلم کی مالی حالت کمزور ہو رہی تھی اور تنخواہ میں اضافے کی بجائے تخفیف ہو رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب کو مالی ترقی کی زیادہ خواہش نہ تھی تاہم وہ سمجھتے تھے کہ دہلی جیسے مرکزی مقام میں مذہبی اور دینی خدمت کے مواقع زیادہ میسر ہوں گے۔ اسلئے انہوں نے اپنے استاد مولانا عبید الحق صاحب سے دہلی جانے کی اجازت طلب کی۔ مولانا نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا۔

آپ اترتی پر جا رہے ہیں اللہ مبارک کرے لیکن اگر خدا نے مجھ سے آخرت میں یہ پوچھا۔ تم نے مولوی کفایت اللہ کو کیوں چھوڑ دیا تو کیا جواب دوں گا؟

استاد کی اس گفتگو پر مفتی صاحب نے دہلی جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ استاد مرحوم کے اصرار پر مفتی صاحب اسی مدرسہ میں کام کرتے رہے مگر جب ماہ رمضان ۱۳۲۶ھ میں مولانا صاحب الحق صاحب فوت ہو گئے تو مولانا امین الدین صاحب مفتی صاحب کو لینے کے لئے خود شاہ جہان پور تشریف لے آئے۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب شوال ۱۳۲۷ھ میں دہلی تشریف لے آئے اور مدرسہ امینیہ میں کام کرنے لگے۔

مولانا امین الدین صاحب نے ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ کو سنہری مسجد چاندنی چوک میں اسلامی علوم مدرسہ امینیہ کا قیام کیا۔ یہ درس گاہ مدرسہ امینیہ کے نام سے قائم کی۔ اس وقت علامہ انور شاہ کشمیری اس کے صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مدرس دوم مولانا عبد القادر بناروی تھے۔ مدرس سوم مولانا فاضل الحق دیوبندی تھے۔ مدرس چہارم مولوی محمد تاقم دیوبندی اور مدرس پنجم مولوی سید انظار حسین صاحب ہنس پوری تھے۔ فارسی کے مدرس اور نائب مہتمم مولوی بولانی

تھے مولانا فاضل الحق دیوبندی مفتی صاحب کے ہم جماعت تھے۔ آپ تاقم المعروف کے استاد بھی تھے۔ میں نے درس نظامی کے آخری دو سال کی بعض کتب انہی سے پڑھی تھیں۔ آپ آذونات، اظہان برس ملک مدرسہ امینیہ میں درس دیتے رہے۔ حضرت مفتی صاحب کی وفات پر آپ مدرسہ امینیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ آپ نے ۱۹۹۷ھ کے بغیر ان انقلاب میں مدرسہ امینیہ میں محصور رہ کر اس کی عمارت اور طلبہ کی جان بچا کر آپ کی وفات ۱۹۵۷ھ میں ہوئی۔ مولانا سید انظار حسین بھی میرے استاد تھے۔ میں نے قدوری، کنز الدقائق اور ابن رسالوں کی متعدد کتب انہیں سے پڑھیں۔ آپ میرے زمانے میں مدرسہ امینیہ کے سب سے بڑھے مدرس تھے۔ مگر بہت بڑھے اور کمزور ہونے کے باوجود نہایت زندہ دل اور خوش فہم تھے اس وجہ سے بہتری طلبہ اسی سے بہت جلد مانوس ہو جاتے تھے۔

مولانا عبد القادر عارف دیوبندی میرے زمانے میں بھی مدرسہ میں صرف فارسی کتب پڑھاتے تھے۔ مدرسین میں میری دہلی کے شاہ میرے زمانے میں وہ بہت بڑھے ہوئے تھے اور ان پر تصوف کا غلبہ تھا۔ فارسی کے نہایت خوش گو اور قادر الکلام شاعر بھی تھے ان کا کلام جارحانہ ہوتا تھا۔ میں نے ان سے یوسف زلیخا جامی تک سب فارسی گو مشہور کتبیں پڑھی تھیں۔ آپ کی وفات دہلی میں ہوئی۔

دہلی تھے۔ مدرس تفران حافظ عبد اللہ بلاسپوری اور حافظ رشید بخش فیض آبادی تھے۔ مولانا امین الدین صاحب مستم تھے۔ ان سب حضرات نے اعزازی طور پر بلا معاوضہ کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت ان میں کسی کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں تھی۔ جب علامہ انور شاہ شمیمی ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ کو اپنے والد محترم کے حکم کے مطابق اپنے وطن شہر تشریف لے گئے تو اس مدرسہ کی صدر مدرس کی جگہ خالی ہو گئی، اس وقت سے مولوی امین الدین صاحب مفتی کفایت اللہ صاحب کو دہلی بلائے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر کار حضرت مفتی صاحب مولانا عبیدالحق صاحب کے انتقال کے بعد دہلی منتقل ہو گئے۔

یکم شوال ۱۳۲۱ھ سے آپ کی تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ گو مولانا امین الدین صاحب مدرسہ کے ہنرمند تھے مگر عملی حیثیت سے درس حدیث اور افتاء کے علاوہ مدرسہ کے تمام انتظامی امور و معاملات مفتی صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ مدرسہ کے جلسوں کا انتظام، رسید و ادوں اور مضامین کی ترتیب، دعوویں اور دیگر انتظامات آپ ہی کے سپرد تھے۔

مقبولیت

دہلی اگر حضرت مفتی صاحب بہت جلد اہل دہلی میں مقبول ہو گئے۔ شہر کے معزز حضرات اور شرفاء اپنے سیاسی اور مذہبی معاملات میں آپ سے مشورہ کرنے لگے اور آپ کے صاحب اور درست مشوروں سے مستفید ہونے لگے۔ دیگر کے مرکزی شہر دہلی میں آپ کی اتنی جلد شہرت و مقبولیت منجانب اللہ تھی۔ آپ کی ذات سے دہلی کی عدالتوں کی بھی بہت فائدہ پہنچا کیونکہ آپ کی آراء پر بیشتر علمائے دہلی کے جو فتوے عدالتوں میں پیش ہوتے تھے وہ بہت الجھے ہوتے ہوتے تھے۔ یا تو عبارت سمجھ میں نہیں آتی تھی یا وہ فتوے غلط ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف علماء کے فتووں میں اختلاف ہوتا تھا۔ مگر جب حضرت مفتی صاحب نے دہلی میں اگر فتوے لکھنے شروع کئے تو دہلی کی عدالتوں کو بہت سہولت ہو گئی۔ کیونکہ آپ کے فتوے نہایت مختصر، صاف اور واضح عبارت میں ہوتے تھے اور ان کے سمجھنے میں کوئی الجھن اور پیچیدگی نہیں ہوتی تھی۔

تعلیمی اصلاحات

مدرسہ امینیہ میں آنے کے بعد آپ نے رفتہ رفتہ اس درس گاہ کے تعلیمی نظام میں مفید اصلاحات نافذ فرمائیں۔ آپ نے اپنی طالب علمی کا زمانہ نہایت خودداری میں گزارا تھا۔ آپ کے والدین انتہائی عزیز اور تنگ دست تھے مگر آپ نے اس تنگ دستی کے زمانے میں بھی کبھی کسی مال دار شخص کی خیرات کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ اپنے قریب بازو اور ہنر سے لویاں بٹن کر اپنا ذریعہ معاش پیدا کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ سے اپنے تمام اخراجات پورے کرتے تھے۔

مگر جب آپ دہلی آئے تو آپ نے مٹا دیہ کیا کہ مخیر حضرات مذہبی مدارس کے طلبہ کو گھر بلا کر شادی بیاہ اور موت و فی کی تقریبات میں انہیں کھانا کھلاتے ہیں۔ مخیر حضرات عزیز طلبہ کی امداد اور ہمدردی کے جذبے سے الیا کرتے تھے۔ ان کی طرف سے یہ جذبہ قابل قدر تھا۔ مگر اس طرح علم دین کی بے حرمتی ہوتی تھی۔ اس لئے آپ نے گھروں پر جا کر کھانے کے اس سلسلے کو بالکل ختم کر دیا۔

اصلاح مدارس کی تجاویز مدرسہ امینیہ کے اٹھویں سالانہ اجلاس میں مدارس عربیہ کی اصلاح کے لئے آپ نے ایک مقالہ میں چند تجاویز پیش کیں جن کا خلاصہ یہ ہے۔

۱: تمام مدارس اسلامیہ کا مقصد ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ اس لئے تمام اسلامی

اور عربی مدارس کو انتظامی حیثیت سے ایک ہی نظام میں منسلک ہونا چاہیے یعنی تعاون و اتحاد کے ساتھ کام کیا جائے۔ انہیں ایک مدرسہ کا مخالف نہیں ہونا چاہیے۔

۲: یہ اسلامی مدارس اس وجہ سے قوی نہیں کر رہے ہیں کہ ان کے کارکن یعنی اہل شوریٰ اور منتظمین، دین دار اور علماء ہیں بلکہ ان میں سے اکثر نئی وضع کے پابند اور جدید مغربی طرز کے شیعہ دانی ہیں۔ وہ دینی علوم سے بالکل بے بہرہ ہیں بعض کے اہل شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہوتے ہیں مگر ان کے ہمتیں بدنیت ہوتے ہیں۔ وہ تعلیمی معاملات کو خوب سمجھتے ہیں مالی معاملات میں دیانت دار نہیں ہوتے اور مدارس کے چندوں کو اپنا مال اور اپنی جائیداد سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ کے ارکان شوریٰ اہل علم اور دیانت دار ہوں اور تمام انتظامی اور تعلیمی معاملات کے مشوروں اور فیصلوں کے مطابق انجام پذیر ہوں۔ مدارس عربیہ کے ہمتیوں کے دلوں میں خدا کا خوف ہونا چاہیے۔ وہ فرائض کو ذمے داری کے ساتھ محسوس کریں اور مدارس عربیہ کے مال کا بے جا استعمال نہ کریں اور اگر ضرورت مند ہوں قومی امانت کو اپنی ذات پر بقدر ضرورت خرچ کریں۔

۳: جو شخص کسی اسلامی مدرسہ کا مہتمم بنے اسے چاہیے کہ وہ اپنی پوری توجہ اور تمام اوقات مدرسہ کے انتظام کریں۔ مدرسہ کے کاموں کے علاوہ اور کام اپنے ذمے نہ لے۔ بلکہ اپنی تمام زندگی اس کے کاموں کے لئے وقف کرے کیونکہ شخص پوری توجہ کے ساتھ دو کام نہیں کر سکتا۔

۴: مہتممین اور ماسکین کو چاہیے کہ وہ خدا کے ان مہانوں (طلبہ) کے ساتھ نہایت نرمی اور خیر خواہی کا سلوک کریں۔ مشکلات کو دور کریں اور ان کے اندر تعلیم کا ذوق و شوق پیدا کریں۔

۵: طلبہ کے داخلے کے وقت نہایت احتیاط سے کام لیا جاوے۔ صرف انہی طلبہ کو داخل کیا جاوے جو درجہ تعلیم کی تعلیم حاصل کرنے کا ذوق و شوق رکھتے ہوں۔ نیز انہیں داخل کرنے سے پیشتر سابقہ مدرسہ کی طرف سے ان کی نیک چلی کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا جائے۔

۶: طلبہ میں عزت نفس برقرار رکھنے کے لئے انہیں مدرسہ سے باہر کسی دعوت میں نہ بھیجا جاوے۔ اگر اہل غریبہ کی دعوت کرنا چاہیں تو ایک دن قبل مہتمم صاحب کو اطلاع دیں اور وقت مقررہ پر کھانا لاکر مدرسہ کے اندر ہی اپنے کھانے کے انتظام میں طلبہ کو کھلائیں۔

انجمن اصلاح الکلام اصلاح مدارس کی مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ ساتھ آپ نے طلبہ کی تعلیمی کمزوریوں اور اصلاح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ نے محسوس کیا کہ طلبہ اپنے خیالات کو عوام کے سامنے طرح طرح انہیں کر سکتے اور دخط و تقریر کی بھی عمدہ قابلیت نہیں رکھتے اور نہ بوقت ضرورت غیر مسلموں کے مقرروں کے ساتھ بحث و مناظرہ کر سکتے ہیں۔ لہذا ان کی ان خامیوں کو دور کرنے کے لئے آپ نے ۱۳۲۸ھ میں ایک مجلس تقریر و مناظرہ قائم کی جس کا نام کچھ عرصے کے بعد انجمن اصلاح الکلام تجویز کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو تقریر و مناظرہ سکھایا جائے۔ ہر شخص دن طلبہ تقریر اور مناظرہ کیا کرتے تھے اور آپ بذات خود ان کی راہنمائی فرماتے تھے۔

ابتدائی جماعت

اس انجمن اصلاح الکلام نے اپنے فارغ التحصیل طلبہ کی بدولت آگے چل کر بہت ترقی کی اور اس کے زیر نگرانی ایک جدید قسم کی ابتدائی جماعت قائم ہوئی۔ جس میں جدید طرز پر عربی کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، اور اردو املار، حساب، اور خوش خط کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اس ابتدائی جماعت کی شہرت سن کر قائم الحروف کے والد محترم نے مجھے یہاں داخل کرایا۔ اس ابتدائی جماعت کے استاد مولوی احمد دین تھے جو مدرسہ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے مجھے اس انجمن کے معزز کارکن مولوی عبدالہادی خان صاحب کی توفائیل کتاب مرقاۃ العربیہ حصہ اولیٰ مشہور دینے لائی۔ جس کے ذریعے میں نے اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کی مشقوں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور بہت جلد میں عربی کی ابتدائی گدافوں پر حاوی ہو گیا۔ سال بھر کی تعلیم کے بعد مفتی صاحب نے ہمارا امتحان لینے کے لئے دہلی کے مشہور مدرسہ فلسفہ کالج کے عربی اردو کے پروفیسر شمس العلماء مولوی عبدالرحمن صاحب کو بلا دیا اور انہوں نے ہمارا امتحان لیا۔ اس ابتدائی جماعت سے بھی اہل دہلی نے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ دہلی کے عربی مدارس میں اپنے بچوں کو بھیجتے تھے۔ بیرونی طلبہ صرف درس نظامی کی تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ان میں سے کئی ان میں شریک نہیں ہوئے اس لئے یہ جماعت بند کر دی گئی۔

نظامیہ مدارس

مدرسہ امینیہ دہلی میں آنے کے بعد آپ نے اس امر کی کوشش کی کہ تمام مدارس اسلامیہ کی تنظیم کی جائے اور اس کے انتظامی قواعد اور نصاب یکساں ہوں اور داخلے کے لئے بھی تمام مدارس میں مشترک قواعد کا قیام ہو اور اگر ممکن ہو تو تمام یا اکثر مدارس عربیہ کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ایک مرکزی مقام پر ہوا کرے۔ اس فکر کے لئے کار لانے کے لئے دہلی آنے کے دوسرے سال یعنی ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۹ء مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں آپ نے اتحاد اور تنظیم و اصلاح مدارس پر نہایت عمدہ تقریر کی۔ اس جلسے میں آپ نے وہ اصلاحی تجاویز پیش کیں جن کا ہم لوگوں پر لکچر ہے۔

آپ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے دارالعلوم دیوبند کے منتظمین نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ وہ دوسرے مدارس کے طلبہ کو اس وقت تک داخل نہیں کریں گے جب تک کہ وہ اپنے باپوں اور اس کی طرف سے نیک چلنی کی سند پیش کریں۔

مشترکہ دستار بندی

اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے منتظمین اس بات پر بھی رضامند ہو گئے کہ وہ مدرسہ امینیہ دہلی کے فارغ التحصیل طلبہ کی اپنے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں دستار بندی کریں گے چنانچہ ۱۳۲۸ھ مطابق ۱۹۱۰ء دارالعلوم دیوبند کے سالانہ اجتماع میں مدرسہ امینیہ دہلی کے دس فارغ التحصیل طلبہ کو بلا دیا گیا اور تمام مجمع کے سامنے ان کی دستار بندی کی گئی ان دس فارغ التحصیل طلبہ میں مولانا حافظ سید محمد حسین شاہ صاحب (فرزند ارجمند پیر جماعت، علی شاہ صاحب بزم) اور مولانا حافظ سید محمد حسن صاحب (موجود مفتی دارالعلوم دیوبند) بھی شامل تھے۔

جنگِ بلقان

دہلی کے ابتدائی زمانے میں مغربی طاقتوں کی ریشہ و دانیوں سے جنگِ بلقان کا آغاز ہوا۔ اس موقع پر مسلمانانِ ہند میں اسلامی اخوت اور غیرت ملی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ترکی کے مسلمانوں کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے

نے جنگ بلفان کے مظلوموں کے لئے سپردہ جمع کرنا شروع کیا۔ ایسے نازک موقع پر حضرت مفتی صاحب کی طرف سے دوا بہرہ شائع کئے جس میں ایک فتویٰ یہ تھا کہ ”ایسے موقع پر جب کہ ترکی کے مسلمانوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں مساجد کی بارگاہ میں اُن کے لئے دعائیں مانگی جائیں اور قنوت نازل پڑھی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے یہ مصیبت دور کرے اور فتویٰ حرم قربانی کے بارے میں ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا گیا۔“

علاوہ ازیں حضرت مفتی صاحب نے ترکوں کی حمایت میں ایک جلسہ منعقد کرایا جن میں آپ نے ترکوں کے انکسار کے بیان کئے اور طلبہ کو ان کی اعانت کرنے پر آمادہ کیا۔ آپ کی تقریر کا اس قدر اثر ہوا کہ ان غریب اور مجلس طلبہ کے پاس جو کچھ سب کچھ انہوں نے پیش کر دیا جن کے پاس کچھ نقد تھا انہوں نے اپنے کپڑے، کتابیں اور برتن دیدئے۔ اس کے بعد ان مدرسین اور طلبہ کو چندہ جمع کرنے کے لئے شہر بھیجا۔ اس طرح جو سامان جمع ہوا اس کو بذات خود حضرت مفتی صاحب نے بیڑے کھڑے ہو کر نیلام کیا۔ اس وقت لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر وہ سامان خریدتے تھے۔ اس طرح نقد اور نیلام میں سامان فروخت کر کے جو چندہ جمع ہوا وہ سب ترکی کی رفاہی انجمن ”بلبل احمر“ کو روانہ کیا اس کی کل میزان تین ہزار آٹھ سو چار نوے روپے آٹھ آنے نو پائی (۹-۸-۳۸۹۴) تھی۔

ابتدائی سیاسی سرگرمیاں | ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد کی تحریک زور پکڑ رہی تھی اور اس اتحاد کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے کیونکہ انگریزی حکومت نے متحدہ مطالبات پر زور دیا تھا۔

اصلاحات کا وعدہ کیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ تھی اور ہندوؤں کی بڑی اکثریت کانگریس تھی اور علمائے کرام باقاعدہ کسی جماعت میں حصہ لے کر یا علیحدہ سیاسی تنظیم کے طور پر کام نہیں کر رہے تھے بلکہ انفرادی طور پر کام کر رہے تھے۔ ایسے موقع پر کانگریس کے ممبئی میں ۱۹۱۵ء میں اجلاس ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ کے ساتھ سمجھوتہ کے تجویز منظور کی گئی تھی۔ اس کے متعلق ہندو اور مسلمان لیڈروں میں مشورے ہونے لگے اور آخر کار ایک متحدہ سمجھوتہ ہو گیا جس میں علمائے کرام کے اس اجلاس میں منظور کرایا گیا جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں کنھو میں قائدظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا اور اسی مناسبت سے یہ متحدہ سمجھوتہ مینا کنھو کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سمجھوتہ میں مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس وقت مسلمانوں کے سیاسی لیڈروں کو محسوس نہیں ہو سکیں۔ جمعیت علماء ہند اس وقت تک قائم نہیں ہوئی تھی مگر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر سیاسی بصیرت عطا کی تھی کہ آپ کی فکر دور میں نے اس کی خامیاں بھانپ لی تھیں۔ چنانچہ آپ نے اسی زمانے میں اس کی خامیاں اپنی ذاتی حیثیت سے واضح کیں۔ آپ کی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ اس قدر مسلم تھی کہ آپ کے استاد محترم حضرت شیخ الہند جب کبھی کسی سیاسی لیڈر سے گفتگو کرتے تھے تو سب سے پہلے حضرت مفتی صاحب کو بلا کر اُن سے مشورہ کرتے تھے۔ اس موقع پر آپ کے رفتار اور مخصوص تلامذہ آپ پر رشک کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ بہت اصرار کے بعد حضرت شیخ الہند نے اپنے رفتار کو مخاطب کر کے فرمایا۔

”بے شک تم لوگ سیاست دان ہو لیکن مولوی کفایت اللہ کا دماغ سیاست ساز ہے۔“

حضرت شیخ الہند سے تعقیدت سیاست میں حضرت مفتی صاحب شیخ الہند کے ہم نوا تھے۔ اپنے استاد سے آپ کا تلبی

تعلق عشق کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے مشہور قصیدہ "روض الیاحین" کے آخر میں حضرت شیخ الہند کی تعریف میں ایک متعل نظم لکھی ہے۔ اس قصیدہ میں علماء ہند کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ حواشی میں مفتی صاحب نے مذکورہ علماء کے مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے بارے میں اصل قصیدہ کے عربی اشعار میں آپ کے بارے میں جو تحریر کیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:-

"خلق خدا کے محمود، نیک فضائل، حسین جمیل اور صاحب اخلاق حمیدہ ہیں۔ میں آپ کی کس کس نسبت کی تعریف کروں۔ آپ کے جملہ اوصاف احاطہ شمار سے متجاوز ہیں۔ آپ کے علم کی وسعت اور صفائی قلب میرے اس دعوے کے بہترین گواہ ہیں"

اسی قصیدہ کے علاوہ رسالہ "روض الیاحین" کے آخر میں ایک قصیدہ نوید ہے۔ اس قصیدہ کے پانچ صفحات صرف حضرت شیخ الہند کی منظوم مدح پر مشتمل ہیں۔ اس میں رسمی تشبیہ کے بعد اپنے علمی پریشانی حال بیان کرنے کے بعد حضرت مفتی صاحب یوں رقم طراز ہیں:-

اچانک آسمان سے ایک آواز آئی کہ۔ جا اس مژدہ روحانی کی خدمت میں حاضر ہو تمام مخلوق میں بہت بڑے عالم اور ہدایت و تقویٰ کے کوہ گراں ہیں۔ وہ شرفار کے سردار ہیں اور وہ واضح اور روشن دلائل پیش کرتے ہیں" لہذا میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی دلیز پر حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے۔ روحانی اور علمی۔ شفا دی اور مجھے امن کی جگہ پر اتار دیا۔ آپ علم کے وسیع مستطلم سمندر ہیں، جس میں گوہر شہ نایاب کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس (سمندر) کی موجیں تمام زمینوں اور وادیوں تک پہنچ رہی ہیں۔ آپ کا سرچشمہ دیوبند ہے اور اس کا وسیع پانی بلاوگم اور ہندوستان کے شہروں کو سیراب کر رہا ہے"

روض الیاحین سے اقتباس رسالہ روض الیاحین کے اردو حواشی میں حضرت مفتی صاحب نے شیخ الہند کے بارے میں یوں تحریر فرمایا ہے:-

حضرت مولانا و متقدما و مرشدنا مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی، علم کے بحر ذخار، معرفت و حقیقت کی موسلا دھار بارش، تواضع و انکساری کی صحیح تصویر، مواساة اور مہمانی میں فروغ، مشیر رخ ہند کے شیخ اعلیٰ سلسلہ روایت کے مانتی، مدرسہ عالیہ دیوبند کے مدرس اعلیٰ، طلبہ کے لئے میدان طلب کے مقصود و انفعی کریم النفس، صافی السریہ، ذکی القلب (نہایت ذکی ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذ خاص اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے منظور نظر و مقرب باختصاص، علم حدیث کے امام، قدوة اعلام، بحر الکلام، سلالۂ خاندان اقیانیا عظام، آپ کا وجود طالبین علوم کے لئے رحمت ہے۔ خاکسار کو بھی حضرت اقدس سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کے وجود باجود تادیر سلامت رکھے اور تفسیرین ظاہر و باطن کو آپ کے انفس قدسیہ سے منتفع فرمائے۔ (آمین)

جب حضرت شیخ الہند کو گرفتار کر کے جزیرہ مانا میں قید کر دیا گیا تھا تو اس موقع پر بھی آپ نے اپنے اس نامور محبت میں ایک عربی قصیدہ کہا تھا :-

سیاسی تحریکیات میں شرکت

[illegible]

ہیں مندرجہ ذیل علماء شریک ہوئے۔

- ۱: حضرت علیؓ کا بیت شد
۲: مونسید عید باد کو فریاد مچا
۳: مولانا محمد بر علیہ السلام کو
۴: مولانا شمس الدین مرثیہ
۵: مولانا احمد سعید صاحب دیوبند
۶: مولانا کا آزاد سہانی
۷: مولانا عبدالحق دیوبند

جس کا نتیجہ اس وقت اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین کے قبضہ و اقتدار سے انکے مالک مکمل لئے گئے ہیں اور اسلام کی دنیاوی طاقت و اقتدار کو زائل کیا جا رہا ہے۔
آخر میں آپ نے فرمایا۔

"میں طبقہ علمائے ہوں اور شرعی نقطہ نظر سے کہتا ہوں کہ مسلمان کسی ایسی صلح میں شریک نہیں ہو سکتے اگر ہوں گے تو شرعاً گناہ گار ہوں گے۔"

یہ تجویز کی تاہم میں دیگر علماء کے علاوہ سیٹھ جھوٹانی اور مسٹر گاندھی نے بھی تقریر کی تھی۔

نجاتِ علماء کا احساس | دہلی میں خلافت جمعیتی کے قیام کے بعد حضرت مفتی صاحب نے یہ محسوس کیا کہ علماء کا ایک جداگانہ مرکز قائم ہونا چاہیے کیونکہ آپ نے یہ خطہ محسوس کیا تھا کہ اگر کسی سیاسی جماعت میں علماء انفرادی پر شریک ہوئے اور اس سیاسی جماعت نے کوئی غیر محتاط قدم اٹھایا تو اس موقع پر سب سے زیادہ آفت علماء پر پڑے گی۔ لہٰذا انہوں نے اس خطہ کو محسوس کرتے ہوئے اس خلافت کانفرنس کے زمانے میں ہی اپنے ہم خیال علماء سے اس مقصد لئے گفت و شنید کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر انصاری کا خطبہ صدارت | جمعیت علماء ہند کے قیام کا خیال آپ کے ذہن میں اسی وقت سے موجود تھا جب کہ مسلم لیگ کے گیارھویں اجلاس دسمبر ۱۹۱۵ء میں (جو کرشنا تحصیل لال کوٹوال دہلی) مولوی فضل الرحمن کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں بڑی تعداد میں علماء شریک ہوئے تھے جیسا کہ سابق میں گذرا۔ اس کے بعد استقبالیہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اس اجلاس میں جو خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا اس میں خلافت اور جزیرہ عرب کے بارے میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات کو نہایت عیباً کی کے ساتھ ظاہر کیا گیا۔ اس خطبہ استقبالیہ اس اہم حصہ کو حضرت مفتی صاحب نے تحریر کیا تھا کیونکہ اس میں خلافت اور جزیرہ عرب کے مسائل پر حضرت مفتی صاحب نے فقہی اور اسلامی نقطہ نظر سے بحث کی تھی۔

خطبہ استقبالیہ کی ضبطی | اس خطبہ استقبالیہ میں ایسی پرجوش دلائل بحث کی گئی تھی کہ صدر متحدہ (ایو۔ پی) کی حکومت کو اندیشہ ہوا کہ کہیں مسلمان گورنمنٹ برطانیہ کے جنگی مقاصد کے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔ اس لئے اس نے یہ خطبہ ضبط کر لیا تھا۔

تحاد کی کوششیں | اس کے بعد جب مفتی صاحب حضرت شیخ الہند کے حالات پر ایک کتابچہ بعنوان شیخ الہند لکھ رہے تھے (جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے) تو اس وقت بھی آپ کے ذہن میں یہ تجویز تھی کہ ام علماء ہند ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے شیخ الہند کی رہائی کے لئے کوشش کریں۔

مجموعہ اجتماع | مگر مختلف ان خیال مو مختلف العقائد علماء کو ایک مرکز پر جمع کرنا بہت مشکل کام تھا، اندیشہ تھا کہ جماعت علماء کے باہمی فرقہ وارانہ اختلاف سے فائدہ اٹھا کر علماء کو ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیں گی۔ اس لئے اس

اجتماع کو خفیہ رکھا گیا۔ ۱۹۱۹ء کے اس زمانے میں خلافت کمیٹی کا اجلاس سنگھم قیصر متصل ایڈورڈ پارک دہلی (حال جگہ) میں ہوا تھا۔ اس سلسلے فیصلہ ہوا کہ اجلاس ختم ہونے کے بعد صرف علماء کو اسی جگہ بلایا جائے۔ چنانچہ حضرت مفتی کی ہدایت کے مطابق مولانا احمد سعید صاحب اور مولانا آزاد سجانی نے تمام علماء کی قیام گاہوں پر خفیہ طور پر اس اجتماع شریک ہونے کی دعوت دی۔

جس روز یہ اجتماع ہونے والا تھا اسی روز صبح کو نماز فجر کے بعد بہت سے علماء درگاہ سید حسن کا معاہدہ (مگر آج کل نئی دہلی کے آباد اور پُروقت علاقہ میں شامل ہے) ان تمام علماء نے اس بزرگ کے مزار کے قریب حاضر ہو کر قرار کیا۔

”موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ہماری کارروائیاں صیغہ راز میں رہیں گی۔ حکومت کی جانب سے جو سختیاں ہم کی جائیں گی ان پر ہم ثابت قدم رہیں گے نیز آپس میں عقائد کے اختلاف کو نہیں آنے دیں گے۔“

حضرت مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم جو اس معاہدہ میں شریک تھے فرماتے ہیں: ”یاد نہیں کہ اس عہد و پیمان میں کون کون حضرات شریک تھے۔ حضرت مولانا عبد الباقی فرنگی محلی مولانا ابوالرحمان محمد سجاد، مولانا آزاد سجانی اور مولانا منیر الزماں کی موجودگی تو یاد ہے مگر ان کے علاوہ اور بھی حضرات تھے۔ مطبوعہ رپورٹ میں سرگزشت نہیں لکھی گئی کیونکہ اس وقت کے حالات کے پیش نظر ان باتوں کا شائع نہ کیا۔“

یہ تھا۔ میں نے درگاہ سید حسن رسول مناسے واپس آکر حضرت مفتی اعظم کو تمام کیفیت سنائی تھی اور حضرت نے اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔

جمعیت علماء ہند کا قیام اسی روز عشاء کی نماز کے بعد علماء کا جلسہ ہوا جس میں تقریباً پچیس ۲۵ علماء شریک ہوئے۔ وقت سب علماء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ تمام علماء ہند کی ایک جدا گانہ جماعت کی جائے اور اس کا نام ”جمعیت علماء ہند“ رکھا جائے۔ انہوں نے جمعیت علماء ہند کا عارضی صدر حضرت مفتی صاحب کو اور عارضی ناظم مولانا احمد سعید دہلوی کو مقرر کیا اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی دعوت پر یہ طے پایا کہ جمعیت ہند کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۱۹ء میں بمقام امرتسر بعدارت مولانا عبد الباقی منعقد ہوگا۔

یوں نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند کا سب سے پہلا دفتر مدرسہ امینیہ میں حضرت مفتی صاحب کے کمرے میں قائم ہوا۔ اس وقت کوئی محرر اور چیرپاسی نہیں تھا بلکہ آپ خود اور مولانا احمد سعید صاحب اپنے ہاتھوں سے تمام کام کیا کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں دہلی میں جمعیت علماء ہند کا بنیادی جلسہ ہوا تھا۔ اسی سال ۱۹۱۹ء کے آخر میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ اس زمانے میں جمعیت علماء ہند کا دوسرا اجلاس بھی امرتسر میں منعقد ہوا۔ اس میں شریک ہونے والے علماء کے مشہور علماء شریک ہوئے۔ یہ جلسہ بھی عام جلسہ نہ تھا تاہم اس جلسہ میں جمعیت علماء کا آئین اور آئندہ طریق کار

ہوا۔ اور مولانا عبدالباری فرنگی مہلی نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔

آئین اور دستور کی تشکیل اور آئندہ طریق کار میں علماء کا اختلاف تھا مگر اس موقع پر مفتی صاحب نے اپنے تدبیر اور بے مثل ذات کا ثبوت دیا۔ آپ نے ان اختلافات کو رفع کر کے چند گھنٹوں میں جمعیت علماء ہند کے لئے متفقہ آئین و دستور اور آئندہ کے لئے طریق کار پیش کر دیا جسے تمام علماء نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔

اس زمانے میں امرتسری میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس بھی کانگرس کے بیڑال میں منعقد ہوا۔ ان جلسوں میں علی برادران (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) بھی شریک ہوئے تھے جو نظر بندی سے رہا ہو کر سیڑیے امرت سر پہنچے تھے اور وہیں ان کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی تھی۔

حضرت مفتی صاحب اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی میں جمعیت علماء ہند کے عارضی صدر رہے وہ ماٹ میں نظر بند رہنے کی وجہ سے صدارت نہیں کر سکے اس لئے حضرت مفتی صاحب ان کی وفات تک عارضی صدر رہے اور ان کی زندگی میں مستقل صدر بننا قبول نہیں کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۱۹ برس تک صدر رہے، مگر اس عرصے میں کبھی آپ جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس کے صدر نہیں بنے بلکہ ہم عصر دستوں کی صدارت میں کام کرنا آپ کی طبیعت کا خاص وصف رہا۔

حضرت مفتی صاحب کی زیر قیادت جمعیت علماء ہند نے برصغیر پاک و ہند کی آزاد ملی کامل کا نصب العین اپنے پیش نظر رکھا اور اس مقصد کے لئے آپ نے علماء کو متحد کرنے اور ان میں صحیح قسم کا سیاسی شعور پیدا کرنے میں انتھک محنت کی۔ چنانچہ اس کے سالانہ اجلاس اسی مقصد کے لئے ہوتے تھے۔ جمعیت علماء ہند کے یہ اجلاس تقریباً ہر سال ہندوستان کے مختلف بڑے شہروں میں ہوتے تھے۔ اس کے بعض اجلاس بڑے شاندار اور تاریخی اہمیت کے تھے۔ ان میں سے کانپور کے اجلاس میں مسیح الملک میگو اہل خاں نے خطاب کیا تھا۔ نیز اس کے بعد اجلاس مراد آباد، جون پور، دہلی، گلیا اور امر و ہر میں ہوتے تھے۔ ان بھی اہم تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیت علماء ہند کے پشاور میں اجلاس ہونے وہ بہت معرکہ آرا تھے۔ ان اجلاس میں بڑی کڑے کا بائیکاٹ اور بازار قحطہ خزان میں حکومت کی فائرنگ کی سخت مذمت کی گئی۔ اس کے نتیجے میں اس فائرنگ کے خلاف جو غیر سرکاری تحقیقات کرنے والی ٹیل کمیٹی مقرر ہوئی تھی اس کے ایک رکن حضرت مفتی صاحب تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب سٹیج کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اس مقصد کے لئے حکمت مہلی کے ساتھ پورٹنڈہ کام کرتے رہے۔

تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شرودھانند نے شدمہ کی تحریک جاری کی، شدمہ کی تحریک اور ہزاروں ملکائوں کو جو مسلمان تھے مزدکر کے ہندو بنایا تو حضرت مفتی صاحب کانگرس اور ہندوؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے۔ آپ نے اس موقع پر سب سے پہلا تبلیغی وفد ان علاقوں میں روانہ کیا جہاں آریہ سماج کی شدمہ کی تحریک تبلیغی وفد

کا زور تھا۔ اس وفد کے صدر مولانا محمد عرفان مرحوم (مدیر اول اخبار الجمعیت) اور نائب صدر مولانا وحید حسن صاحب (مدرس مدرسہ اسمیلیہ) تھے۔ حضرت مفتی صاحب نے صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود بھی ایک وفد کے رکن بن کر جاپنچے اور وہاں کے مسلمانوں کو متاثر ہونے سے بچایا۔

تبلیغی خدمات حضرت مفتی صاحب کا انداز خطابت اور طرز خطاب اس تبلیغی دورہ میں دیہات والوں کی سطح ذہنیت کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ آپ کی دل نشیں اور سیدھی سادی گفتگو سے متاثر ہو کر دوبارہ

قبول کر لیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس قفقہ ارتداد کے زمانے میں حضرت مفتی صاحب کو یہ خبر ملی کہ فلاں گاؤں کا پورا موثر پیو گیا ہے لہذا حضرت مفتی صاحب نے مولانا احمد سعید کو حکم دیا کہ وہ فوراً گاؤں پہنچ کر صحت حال معلوم کریں۔ زمانے میں ملکاتہ قوم کے دیہاتوں میں آریہ سماج کی شجہ کا بہت زور تھا، اس لئے مسلمانوں کی تبلیغی جماعت کا وہاں خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا تاہم مولانا احمد سعید صاحب جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ آریہ سماج اُن سے یہ کہتے تھے۔ تمہارے باپ دادا سب ہندو تھے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو زبردستی مسلمان بنایا اور تمہاری پوجائیاں کاٹیں۔ یہ سن کر حضرت صاحب وہاں پہنچے اور جیسے کا اعلان کر اگر ان سب لوگوں کے سامنے آپ نے یوں تقریر ارشاد فرمائی۔

موثر تبلیغی تقریر آج اس گاؤں میں آگہ اور ایک بہادر قوم کے سپرد توں ہے مل کر میں بے اعتبار خوش ہوتا ہوں ملکاتہ قوم دنیا کی چند بہادر قوموں میں سے ایک ممتاز قوم ہے۔ یہ قوم ہندوستان کے لئے ریڑھ

کی ہڈی ہے۔ تمہارے باپ دادا نے ہمیشہ ہندوستان کی حفاظت کی ہے۔ دشمنوں سے کبھی ہار نہیں مانی لوگ تمہیں آکر بہکاتے ہیں کہ تمہارے باپ دادا کو مسلمانوں نے مار مار کر زبردستی مسلمان بنایا تھا اور گاؤں گوندیں پکڑ پکڑ چڑھائیں گاؤں ڈالی تھیں۔ کیا واقعی تمہارے باپ دادا ایسے ہی کمزور اور ڈرپوک تھے؟ بے یقین نہیں آتا دیکھو جی! یہ لوگ جھوٹ بولتے اور دھوکا دیتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے باپ داداوں سے کوئی گھبر بھی نہیں ملا سکتا تھا۔ وہ اسلام کو ایک اچھا اور سچا دین سمجھ کر اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے تھے۔ کیا تم اپنے سچے دین کو چھوڑ کر اپنے باپ داداوں کی ردحوں کو صدمہ نہیں پہنچا رہے ہو؟

آپ کی اس تقریر نے نفسیاتی طور پر ان کے دلوں پر اس قدر اثر کیا کہ اس گاؤں کے تمام اشخاص از سر نو مسلمان ہو گئے۔ شجہ اور سنگٹھن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے

مذہب کی حمایت میں کلمہ حق لہذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ستمبر ۱۹۲۵ء کو اکیس دن کا برت شروع کیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۵ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں مولانا

مولانا وحید حسن خاں صاحب بہت بڑے عالم اور عقولات، منطق اور علم کلام کے زبردست فاضل تھے اس لئے مصلحتاً ہی اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے بہت موزوں تھے۔ وہ مولانا محمود حسن خاں مولف معجم الغضنفین اور مولانا وحید حسن خاں محدث مودتہ کے بھائی تھے اور بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ راقم الحروف کے نہایت شیخ استاد تھے۔ آخر زمانے میں وہ کربلا کے ایک تبلیغی سلسلہ کی ایک جماعت تیار کر رہے تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔

ہر ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزا سے مرید اور تبلیغ کے احکام خارج کر دیں۔ اس موقع پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی۔ مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف اسی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پُر زور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین نصیحتوں سے بھی مروغوب نہیں ہوئے۔ چنانچہ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے فرمایا۔

اسلام کی بنیاد تبلیغ پر ہے۔ تبلیغ اس کے خمیر میں داخل ہے۔ بیشک اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ اسلام کا کھلا ہوا روشن اصول ہے۔ ہمیں اس کے اظہار میں کوئی تاثر نہیں ہے۔ مگر ہندوستان کے موجودہ فسادات اس عقیدہ کے نتائج نہیں ہیں کیونکہ اس سزا کو جاری رکھنے کا حق صرف سلطان اسلام کو ہے۔ پس موجودہ حالات میں اسلامی حدود کے جاری ہونے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔

نہ طرح آپ نے تمام مخالفتوں کے باوجود حکم حق کہہ کر علمائے حق اور اسلام کی لاج رکھ لی۔ بقول اقبالؒ

آئین جو انرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو بای

نومر حجاز | جب سلطان ابن سعود نے حجاز مقدس میں سے شریف مکہ کی حکومت ختم کر دی تو دنیا نے اسلام کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی اور اسی کے مطابق ایک نومر عالم اسلامی مورخہ ۲۶ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء کو شریف شرف عبداللہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس میں تمام اسلامی ممالک کے منتخب وفد و شرکاء نے تھے۔ جمعیت علماء ہند کی طرف سے خود نمونہ بھیجا گیا تھا اس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

۱: حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ (صدر وفد) ۲: مولانا عبدالحکیم صدیقی (پراسٹیوٹ سیکرٹری صدر وفد)

۳: مولانا محمد عرفان (سیکرٹری وفد) ۴: علامہ شبیر احمد عثمانی (رکن وفد)

۵: مولانا احمد سعید (رکن وفد) ۶: مولانا نثار احمد (رکن وفد)

حضرت مفتی صاحب نے سلطان ابن سعود سے مطالبہ کیا کہ نومر عالم اسلامی میں حجاز کے لئے حکومت کی تشکیل کا مسئلہ بھی زیر بحث آئے۔ چنانچہ یہ مسئلہ بھی ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ آخر کار ۱۴ مئی ۱۹۲۵ء کو جمعیت علماء کا وفد اور جمعیت خلافت کا وفد بدرجہ اکبر تہجارت بمبئی سے روانہ ہوا۔ خلافت کے وفد مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

۱: مولانا سید سلیمان ندوی (صدر وفد) ۲: مسٹر شعیب قریشی (سیکرٹری وفد)

۳: مولانا شوکت علی (رکن وفد) ۴: مولانا محمد علی (رکن وفد)

اس عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس میں ہند، مصر، جاوا، فلسطین، بیروت، شام، سوڈان، نجد، حجاز، روسی، ترکستان، افغانستان، ترکی اور دیگر اسلامی ممالک کے وفد شامل تھے۔

نومر عالم اسلامی کی سبجکٹ کمیٹی میں مندرجہ ذیل ارکان کو شامل کیا گیا۔

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيدنا محمد وآله الطيبين الطاهرين
الذين هم خير البرية وأفضلها

والسلام على من لا ينالها الجحود ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

الضعف ولا ينالها العجز ولا ينالها القصور ولا ينالها النقص ولا ينالها العيب ولا ينالها الخلل ولا ينالها

ایک لاکھ افراد شامل تھے۔ مجلس کی راہنمائی حضرت مفتی صاحب خود فرما رہے تھے۔ یہ مجلس مختلف سطحوں اور بازاروں سے ہوتا ہوا طاقن ہال کے پیچھے آزاد پارک پہنچ گیا۔ وہاں ایک جلسہ ترتیب دیا گیا جہاں کو تو ال شہر اور دیگر پولیس افسران پولیس کی بھاری جمیت کے ساتھ موجود تھے۔ مفتی صاحب سیٹج پر کھڑے ہو کر اپنا طوفانی بیان پڑھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے لیے تحاشہ لاکھی چارج شروع کر دیا اور بھتے عوام کو بڑی طرح زد و کوب کیا۔ لاکھی چارج سے سینکڑوں افراد سخت زخمی ہوئے مولانا عبدالحلیم صدیقی اور دیگر ممتاز علماء بھی شدید مجروح ہوئے۔

مندان جیل

جب پولیس کے ظالمانہ لاکھی چارج سے عوام منتشر ہو گئے تو کو تو ال شہر آپ کو گرفتار کر کے کو توالی لے گیا اور وہاں سے آپ کو جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ کے خلاف جیل میں عدالت قائم کی گئی اور آپ کو اٹھارہ ماہ قید با مشقت کی سزا دی گئی اور آپ کے لئے اسے کلاس منقر کی گئی۔ اس کے بعد آپ کو نیوسٹرل جیل مندان میں رکھا گیا۔ مندان جیل میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمن دہلوی، مولانا سید عطار اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، لالہ دیش بندھن جیلر چوہدری شیر جنگ، ڈاکٹر انصاری وغیرہ آپ کے ساتھ تھے۔

جیل کے مشاغل

حضرت مفتی صاحب گجرات اور مندان جیل میں بیکار نہیں رہے بلکہ اس حالت میں بھی گونا گوں مشغول رہے۔ وہ حضرات جو جیل میں آپ کے ساتھ تھے انہوں نے آپ کے جیل کے مشاغل کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

فتح الباری شرح بخاری کا آخری پارہ میں نے حضرت (مفتی کفایت اللہ) سے گجرات جیل میں پڑھا۔ اس وقت جیل میں مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر انصاری مرحوم، خان عبدالغفار خان مولانا نور الدین صاحب لائل پوری، مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ اور بہت سے ہندوستان کے چیدہ حضرات موجود تھے۔ وہاں بھی مختلف صحبتیں، مذہبی اور سیاسی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ خاص کر مولوی نور الدین لائل پوری تو ہر وقت ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ جیل خانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ اگر کلاس کے قیدیوں کو مشقتی دیتے جاتے تھے۔ میشتقی اخلاقی قیدیوں میں سے ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب قیدہ ان قیدیوں سے کام لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ — ”یہ لوگ بھی ہماری طرح کے قیدی ہیں۔ ان سے ہم خدمت کس طرح لے سکتے ہیں۔“ مفتی صاحب اپنا پرکام اپنے ہی ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔

جیل میں تعلیم

(مندان جیل میں) حضرت مفتی صاحب اپنی عادت کے موافق کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ کچھ وقت، لالہ دیش بندھن جیلر سے فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے (مولانا احمد سعید نے) مفتی صاحب سے سراجی اور دیوان حماسہ جیل میں پڑھا اور جب مندان جیل میں مشاعرہ کا دور شروع ہوا۔ تو مفتی صاحب قید اکثر غزلوں کی اصلاح کیا کرتے تھے۔

پچھلے ہوئے کپڑے سینا قیدیوں کے پچھلے ہوئے کپڑے عام طور پر مفتی صاحب ہی ریا کرتے تھے۔ جو قیدی آیا اس کا پچھٹا ہوا کرتا یا پاجامہ دیکھا تو اس سے فرمایا ”لاؤ تمہارا کرتہ درست کر دوں۔“

پر پھٹے ہوئے کپڑے سینا صرف سیاسی قیدیوں کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ اخلاقی قیدیوں کے کپڑے بھی (آپ) سیا کرتے تھے۔

اسی ملتان جیل میں آپ نے عربی زبان میں ایک فصیح و بلیغ نظم لکھی جس میں آپ نے جیل کے افسر میر فضل الدین کو تہنیت بھیجی اور اس میں آپ نے سچے جذبات کا وہ پورا نقشہ کھینچا ہے جو عید کے موقع پر ایک قیدی کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنی اسلامی حیثیت اور آزادی حاصل کرنے کے مصمم عزم کا اظہار بھی کیا ہے۔

مارچ ۱۹۳۲ء میں ملتان جیل سے مولانا احمد سعید صاحب حضرت مفتی اعظم سے پہلے رہا ہوئے تو حضرت مفتی صاحب نے اردو نظم میں اپنے جذبات کا اظہار فرمایا۔

اس زمانے میں مخالف حضرات یہ کہا کرتے تھے کہ مفتی صاحب اور جمعیتہ العلماء کے دیگر استغفار اور خود داری کو کا نگریس سے تنخواہ ملتی ہے اور ان کی تمام تحریکات کا نگریس کے فنڈ سے چلتی ہیں۔ ابو الغیاث شیخ کریم الدین میرٹھی جو جنوبی ہند میں پندرہ سولہ برس بطور سفیر جمعیتہ کا کام کرتے رہے ہیں، اس کی تردید ہوتے دیکھتے ہیں:-

مالی اہلاد سے انکار ۱۹۳۲ء کی سول نافرمانی کے موقع پر جمعیتہ علماء ہند پر ایسا تلک کا دور آیا کہ فنڈ میں بالکل نہ رہا۔ کئی ماہ کی تنخواہیں چوڑھ گئیں۔ اس وقت مفتی لعل بہرہ نے کا نگریس فنڈ سے مالی امداد کرنے کی پیشکش کرنا شروع کی۔ اس سلسلے میں جب آپ نے فرمایا:-

"جنگ آزادی کے میدان میں ہم کسی دوسرے کے سہارے پر نہیں کھڑے ہوئے ہیں۔ استقلال وطن کی

جدوجہد ہمارا مذہبی فریضہ ہے اگر ہم جماعت کو نہیں چلا سکیں گے تو دفتر کو بند کر دیں گے۔"

اور ویسے بھی حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور دیگر اکابر جمعیتہ کی زندگیوں کو دیکھا جائے تو ان کی زندگی اس الزام کا قطعی انکار کرتی نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کا تقویٰ، کردار، خلوص، لہیت اور ملی و قومی عقائد بے مثال تھے۔ اس کی ایک مثال وہ ہے کہ جب آزادی کے بعد حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو ہندوستان کا سب سے بڑا سول اعزاز پدم بھوشن دیا جانے لگا تو آپ نے انکار کر دیا حالانکہ آزادی کے بعد اپنے ملک کی حکومت سے اس طرح کا اعزاز ملک آپ کی خدمات کا اعتراف تھا اور آپ کا یہ حق بنتا تھا، لیکن جو لوگ ہمیشہ سنت پیغمبر پر عمل پیرا رہے ان کی نگاہ ہر وقت اِن اَجَبِیْ اِلَہِیْ (میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے) پر رہتی اور زخارف دنیا کی، ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ہفت ظلم کی دولت بھی پیش کرے تو ٹھکرا دیتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب اور حضرت مدنیؒ ایسے ہی خود دار اور اللہ والے لوگ تھے۔

حضرت مفتی صاحب کے لئے کانگریس سے مالی امداد لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ آپ خود جمعیتہ العلماء کی تحریکات اور اس کے دیگر کاموں کے لئے اس کے فنڈ سے کوئی پیسہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے بلکہ جمعیتہ العلماء کے کاموں، اس کی تحریکات اور سہولتوں کے لئے جو سفر کرتے تھے اس کے مصارف بھی آپ خود اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور اگر کبھی ہاتھ تنگ ہوتا تو سفر ملتوی کر دیتے تھے۔

لوہیت کی پیش کش | جب آپ نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا اور اس میں روز افزوں ترقی ہونے لگی تو آپ کے ساتھ آپ کے لاکھوں معتقدین اس تحریک میں شریک ہو گئے تھے۔ اس سلسلے حکومت برطانیہ آپ کو تحریک سے الگ رکھنے کے لئے ہر قسم کے دباؤ ڈالنے شروع کیے۔ آخر میں حکومت کی طرف سے دائرے کے کنسل کے ایک بیگمبیاں سر فضل حسین نے یہ پیام آپ تک پہنچایا۔

”حکومت برطانیہ یہ درخواست کرتی ہے کہ آپ سیاسی تحریکات سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس سے صلہ میں حکومت آپ کو بطور ہدیہ مدرسہ صدر جنگ کی شاہی عمارت اور اس کا ملحقہ میدان پیش کرے گی اور آپ کی ذاتِ خاص کے لئے ہبہ کرے گی۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کی حمایت یا پراپیگنڈہ کریں۔ نہیں بلکہ آپ صرف اتنا کریں کہ خاموش رہیں اور سیاسیات سے الگ رہیں۔“

حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمن صاحب آصف اپنے ایک مضمون میں مذکورہ بالا پیام کی یہ عبارت لے کر لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:-

یہ ایک رازدارانہ پیام تھا جو والد مرحوم نے بڑے رازدارانہ انداز میں مجھ سے بیان کیا تھا اور آج پہلی مرتبہ صفحہ قرطاس پر آ رہا ہے۔

میر فروشی سے انکار | میاں سر فضل حسین کے اس پیام کے جواب میں حضرت مفتی صاحب نے فرمایا:-
”میں آزادی وطن کی تحریک میں ذاتی منفعت کے لئے شریک نہیں ہوا ہوں۔ آپ کی پیش کش کا شکریہ۔ کوئی لالچ میرے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔“

حضرت مفتی صاحب اور دیگر ارکان جمعیتہ العلماء نے ہند کے بارے میں یہ غلط فہمی اب تک پائی جاتی ہے کہ وہ دیگر بعض کانگریسی مسلمانوں کی طرح کانگریس کے اندھا دھند

متعلقہ تھے اور انہی کی طرح ”پہلے ہندوستانی اور بعد میں مسلمان تھے“ مگر یہ الزام قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ آپ کے فرزند مولانا حفیظ الرحمن و اصف اپنی مرتبہ کتاب ”مفتی اعظم کی یاد“ میں پُر زور طریقہ سے اسکی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حضرت مفتی صاحب کی کسی تحریر یا تقریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برخلاف اُن کا نظریہ یہ تھا کہ — مسلک پہلیک کا اولین فرض ہے کہ وہ سیاسی ترقی کی رفتار میں، مذہبی آزادی کی حفاظت کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھے اور پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا عربی، ایرانی، چینی وغیرہ کے اصول کو لازم سمجھیں۔ (ملاحظہ ہو) مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت مطبوعہ دی پرنٹنگ ورکس دہلی ۱۹۱۷ء۔

اور اس خبر پر تک آپ اس پر قائم رہے۔

مصر کی موثر فلسطین | جب برطانیہ نے فلسطین کو تقسیم کیا اور ایک حصہ میں یہودیوں کی سلطنت قائم کر دی تو فلسطین کے عیسائی سخت بے چینی اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے برطانیہ کے خلاف سخت تحریکیں کی، جسے حکومت برطانیہ نے تشدد آمیز مظالم سے ختم کرنے کی کوشش کی۔ لہذا حضرت مفتی صاحب نے جمعیتہ علماء ہند کے زیرِ نگر ”مجلس تحفظ فلسطین“ قائم کی اور فلسطین کے مظلوموں کے لئے چندہ جمع کیا۔

علاوہ ازیں تمام ہندوستان میں تقسیم فلسطین کے خلاف ۲۶ اگست ۱۹۳۸ء کو ”یوم فلسطین“ منایا گیا۔ احتجاجی ہونے اور جلوس نکالے گئے۔ اس کے بعد قاہرہ میں عالم اسلام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ میں جناب علی علویہ پاشا کی صدارت میں یہ موثر فلسطین منعقد ہوئی۔ اس موثر میں مصر، عراق، ایران، ہندوستان، لبنان، حجاز، اردن، یوگوسلاویہ، پولینڈ، رومانیہ، ترکی وغیرہ کے تمام عالم اسلامی کے تقریباً ساڑھے تین ہزار نمائندے شریک ہوئے۔

جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے خود بخود بھیجا گیا تھا اس کے نمائندے مندرجہ ذیل علماء تھے۔

۱: حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب (صدر) ۲: مولانا عبدالحق ندوی (رکن) ۳: مولانا محمد یوسف بنوری (رکن)

حضرت مفتی صاحب اپنے ارکان وفد کے ساتھ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی سے روانہ ہوئے اور ۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو قاہرہ پہنچ گئے۔ قاہرہ میں حضرت مفتی صاحب کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا محمد یوسف بنوری نے کہا:

”ہم نے حضرت مفتی صاحب کے استقبال کا جو نظارہ قاہرہ میں دیکھا (ہمارے دل مسرت کی وجہ سے اچھل رہے تھے اور ہمارے سر فرخ کی وجہ سے بلند ہو رہے تھے) آنا عظیم الشان استقبال دنیا کے کسی نمائندے کا نہیں کیا گیا مفتی اکبر زمرہ باد، ہندی وفد زمرہ باد کے فلک بوس نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ ایک عظیم الشان جلوس کی موثر میں آپ کو قیام گاہ تک لے جایا گیا۔“

۷ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو شام کے ۵ بجے موثر شروع ہوئی۔ اتنے بڑے اجلاس میں یہ شرف آپ کے حصہ میں آیا کہ صدر کا جانب جو کرسی تھی وہ آپ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ سبکدوشی کے ارکان میں آپ کا نام سب سے پہلے رکھا گیا تھا۔ سٹ کمپٹی کے ۱۸ ممبر تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد عرفان اور ڈاکٹر عبدالرحمن مدنی

ارکان و خد خلافت کبھی۔

علامت

حضرت مفتی صاحب مصر مصر کے دوران جہاز میں علیل ہو گئے تھے اور مصر پہنچ کر بھی شدید بیمار میں مبتلا رہے۔ اس لئے آپ بیماری کی وجہ سے اس موٹر فسطین میں خود شریک نہیں ہو سکے۔ اس لئے حضرت سیدنا عبداللہ الحق مدنی نے موٹر میں آپ کا بیان پڑھا اور آپ کی نمائندگی کی۔

شیخ ازہر کی عیادت

حضرت مفتی صاحب کی علامت کے دوران شیخ ازہر علامہ مصطفیٰ المرعشی کسی مرتبہ آپ کی عیادت کے لئے آپ کی قیام گاہ میں تشریف لائے۔ مصر میں شیخ ازہر کی پوریش فیہی حیثیت سے شاہ مصر سے بڑھ کر ہے یعنی شیخ ازہر کی ملاقات کے لئے شاہ مصر خود ان کی خدمت میں جاتے ہیں اور شیخ ازہر کسی سے ملنے کے لئے کہیں تشریف نہیں لے جاتے ہیں مگر وہ حضرت مفتی صاحب کی علمی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ خود چل کر حضرت مفتی صاحب کی عیادت کے لئے آئے۔ یہ خاص امتیاز تھا جو انہوں نے حضرت مفتی صاحب کے لئے اختیار کیا۔

حضرت مفتی صاحب اپنی علامت کی وجہ سے موٹر کے جلسے میں شریک نہیں ہو سکے تاہم آپ کا جو بیان پڑھ کر سنا گیا وہ اور نمائندوں سے زیادہ جرات مندانہ اور حقیقت پسندی پر مبنی تھا۔

مصر سے واپسی

مصر سے واپسی سے ایک دو روز قبل آپ کا بخار اتر گیا تھا مگر نقاہت اور کمزوری بہت تھی۔ اس لئے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ جب تک مکمل طور پر صحت نہ ہو اس وقت تک آپ قاهرہ میں قیام کریں۔ مگر گہرے ہندوستان کے مشاغل اور دیگر مصروفیتوں کی وجہ سے حضرت مفتی صاحب باوجود بیماری اور نقاہت کے پروگرام کے مطابق واپس تشریف لے آئے۔

فوٹو سے انکار

واپسی کے وقت کافی تعداد میں علماء اور علمائین مصر آپ کو نصحت کرنے کے لئے آئے۔ اس وقت مصر کے علمائے مصر کا ایک طبقہ فوٹو کو جائز قرار دیتا ہے اس لئے ان حضرات نے بحث شروع کر دی۔ علماء مصر کا نقطہ نگاہ یہ تھا کہ شریعت میں اس تصویر کی ممانعت ہے جو انسان خود اپنے ہاتھ سے بناتا ہے جیسا کہ پہلے زمانے میں ادب ابھی مصوری کی جاتی ہے مگر فوٹو میں یہ بات نہیں ہے یہ تو صرف عکس ہوتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب کی ان حضرات سے جو گفتگو ہوئی حضرت مولانا عبداللہ الحق مدنی کے بیان کے مطابق اس کے الفاظ یہ تھے۔

علماء مصر

علماء مصر

ممانعت تو صرف اس تصویر کی ہے جو انسان کے عمل اور ہاتھوں کی کارگیری سے ہو فوٹو میں کچھ نہیں کرنا پڑتا یہ تو صورت کا عکس ہوتا ہے۔

التصویر الممنوع انھا ہذا الذی یکون بصنع الانسان ومعالجة الایدی وھذا الیس کذا لک انھا ہو عکس الصورة۔

حضرت مفتی صاحب

حضرت مفتی صاحب

یہ عکس کیمرہ لینس سے کاغذ پر کس طرح منتقل ہوتا ہے۔

کیف ینتقل ھذا العکس من الزجاجۃ الی الورق۔

علماء مصر

بعد عمل کثیر۔

علماء مصر

بہت کچھ کاریگری کرنا پڑتی ہے۔

حضرت مفتی صاحب

حضرت مفتی صاحب

اسی فوق بین معالجبۃ الایدی و صنع

انسان کے عمل، با مقبول کی کاریگری اور بہت کچھ کاریگری میں کیا فرق ہے ؟

انسان والعمل کثیر ؟

علماء مصر

علماء مصر

نعم ہوشی واحد۔

کوئی فرق نہیں صرف الفاظ کا اختلاف ہے مفہوم ایک ہے

حضرت مفتی صاحب

حضرت مفتی صاحب

اذا حکمها واحد۔

لہذا حکم بھی اس کا ایک ہے۔

علمائے مصر حضرت مفتی صاحب کی حاضر جوابی اور صحیح جواب سے بے حد متاثر ہوتے اور کچھ ایسے خاموش ہوتے

کوئی جواب نہ دے سکے۔

مدرسہ امینیہ دہلی

حضرت مفتی صاحب نے جمعیتہ العلماء میں رہ کر جو سیاسی اور قومی خدمات انجام دیں ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے مگر مدرسہ امینیہ میں رہ کر آپ نے جو درس و افتاء کی خدمات انجام دی ہیں وہ ان کا مختصر بیان کارنامہ ہے۔ اس لئے مختصر طور پر مدرسہ امینیہ کو ترقی دینے کے لئے جو کام آپ نے انجام دیئے ہیں ان کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

مدرسہ امینیہ کی ابتداء ماہ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ مولانا امین الدین صاحب اس کے بانی اور تھے اس لئے ان کے نام پر مدرسہ امینیہ نام رکھا گیا۔ حضرت مولانا علامہ الزرّہ کشمیریؒ اس کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے مگر ۱۹۰۲ء میں وہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے کشمیر تشریف لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد حضرت مفتی صاحب شوال ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں دہلی تشریف لائے اور اس مدرسہ امینیہ میں جو سہری مسجد چاندنی چوک میں قائم تھا شیخ الحدیث اور مفتی کاچوہہ سندھ سہری مسجد میں مدرسہ کے لئے جگہ تنگ تھی اس لئے یہ بندوبست کیا گیا کہ کشمیری دروازہ کی مسجد پانی پتیاں اور اس سے تعلقہ اراضی اس کے متولیوں سے حاصل کر کے وہاں مدرسہ امینیہ کی عمارت تعمیر کی جائے چنانچہ متولیوں نے یہ مسجد اور اس سے متعلقہ اراضی مدرسہ کے مہتمم صاحب کو منتقل کر دی اور اس اراضی پر ۱۹۱۵ء سے مدرسہ کی تعمیر شروع کر دی گئی اور ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں مدرسہ چاندنی چوک سے کشمیری دروازہ کی مسجد پانی پتیاں کی اپنی عمارت میں منتقل ہو گیا۔

ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں مہتمم مدرسہ امینیہ مولانا امین الدین صاحب فوت ہو گئے۔ انہی دنوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ماثلاً سے رہا جو کہ ہندوستان تشریف لے آئے تھے اس لئے انہوں نے اپنی موجودگی میں ۹ شوال ۱۳۳۵ھ میں ایک بڑے جلسے میں حضرت مفتی کفایت الدینؒ کو مدرسہ کا مہتمم بنایا۔

نعمیر مسجد

مسجد پانی پتیاں جہاں مدرسہ امینیہ واقع ہے، تاریخی حیثیت رکھتی ہے جسے نواب لطف اللہ خاں صادق پانی پتی نے ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۵ء کے شاہی زمانہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کی تعمیر کو تقریباً دو سو سال ہوئے تھے۔ اس لئے یہ بہت بوسیدہ ہو گئی تھی اور نشیب میں آ گئی تھی۔ لہذا جب عین پورے دو سو سال بعد حضرت مفتی صاحب کے زیر انتظام و اہتمام آئی تو آپ نے اس تاریخی مسجد کو از سر نو ۱۳۵۲ھ میں نہایت خوبصورت اور سنگین تعمیر کرایا۔

حضرت مفتی صاحب نے اس مدرسہ کے سرپرستوں کی وفات کے بعد ۱۹۴۲ء میں ایک مجلس منظم قائم کی جو مدرسہ اور مسجد دونوں کے انتظام کی ذمہ داریاں اور مجلس میں علماء اور مخیر تجار اور محرمین شہر کی نمائندگی تھی۔

تعلیمی خدمات

مدرسہ امینیہ کے ذریعے حضرت مفتی صاحب نے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کے سلسلے میں زبردست خدمات انجام دیں۔ یہیں سے آپ پاک و ہند کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے قنادی کا جواب تحریر فرماتے تھے اور ہیں آپ علم حدیث کا درس دیتے تھے۔ دور دراز ممالک کے طلبہ بھی آپ کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے تھے۔ بالخصوص اک و ہند کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آپ کے فارغ التحصیل علماء اسلامی خدمات سر انجام دیتے ہوئے نظر آئیں۔ ان ممتاز علماء میں مشہور ترین علماء حسب ذیل ہیں۔

۱: شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب استاد دارالعلوم دیوبند۔

۲: مولانا مفتی سید مدحتی حسن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند۔

۳: سبحان الہند حضرت مولانا حافظ احمد سعید صاحب دہلوی سابق ناظم جمعیت علماء ہند۔

۴: حضرت شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد عبدالغنی صاحب پٹیلوی مال شیخ الحدیث و مفتی مدرسہ امینیہ۔

۵: استاد محترم مولانا خدابخش صاحب سابق مدرس مدرسہ امینیہ و مال شیخ الحدیث دارالعلوم سرگودھا۔

۶: حافظ سید محمد حسین فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہ۔

۷: حضرت مولانا مفتی عبدالصمد صاحب کمرانی قاضی القضاۃ سابق ریاست قلات۔

۸: مولانا محمد تقی صاحب امینی مولف "اسلام کا زرعی نظام" وغیرہ

۹: مولانا محمد شفیع صاحب ملتان

۱۰: مولانا محمد اسماعیل رحمہ اللہ مفتی علاقہ گجرات (ہند) و سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات۔

حضرت مفتی صاحب نے مدرسہ امینیہ میں ایک مہمان خانہ بھی تعمیر کرایا تھا جہاں اکثر مشہور علماء ٹھہرا کرتے تھے۔ بالخصوص حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جب دہلی تشریف لایا کرتے تھے تو وہیں قیام فرماتے تھے۔ میں نے شاہ صاحب کی زیارت وہیں کی تھی اور کئی دفعہ حضرت شاہ صاحب کی نورانی شکل و صورت کے دیدار سے مشرف ہوا۔

آپ کے درس اور بالخصوص درس حدیث کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ طویل تقریر سے پرہیز کرتے تھے بلکہ اہم اور اختلافی احادیث کی تشریح نہایت سادہ اور آسان زبان میں مختص طریقے سے کیا کرتے تھے۔ آپ اپنے طریقہ تعلیم میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند کی طرح آپ کی تقریر مختصر ہوتی تھی۔ کسی حدیث کی تفسیر سے

توجہات میں سے آپ نہایت مختصر، جامع اور آخری توجہ بیان فرماتے تھے۔ جو آپ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول تھی۔ اس طرح احادیث کا خلاصہ طلبہ کو اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا تھا۔

مدرسہ امینیہ میں آپ نے تقریباً پچاس سال تک علم حدیث کا درس دیا اور اتنے ہی عرصہ تک آپ فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے۔ راقم الحروف نے اپنے زمانے میں صیغہ بخاری شریف اور ترمذی شریف کا درس آپ کی خدمت میں بیٹھ کر حاصل کیا۔ سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ آپ کا واضح اور دلکش طرز بیان تھا۔ میں اس زمانے میں نو عمر تھا اس لئے پیچیدہ بیان کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے حضرت مفتی صاحب کی سلیس اور دلکش تقریر مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔

تنخواہ آپ ابتداً جب مدرسہ امینیہ میں مدرس ہو کر آئے تو اس وقت آپ کی تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ اس میں ترقی پا کر آپ کی تنخواہ جمادی الاول ۱۳۷۱ھ میں دوسو پچاس روپے (-/۲۵۰) تھی۔ یکم جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ سے مجلس منتظمہ نے پچیس روپے کا اضافہ کر کے آپ کی تنخواہ دوسو پچھتر روپے (-/۲۵۴) کر دی۔ آپ نے فرمایا:۔ مدرسہ کی آمدنی کم ہو رہی ہے اس لئے میں اضافہ نہیں لوں گا چنانچہ آپ اپنی وفات تک پچیس روپے ماہوار مدرسہ کو واپس کرتے رہے۔

اس زمانے میں آپ کی شہرت بین الاقوامی ہو گئی تھی اور آپ کو بڑی سے بڑی ملازمت اور بڑے سے بڑا سکتا تھا مگر آپ نے مدرسہ امینیہ کے لئے زندگی وقف کر رکھی تھی اس لئے آپ نے کسی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ جس زمانے میں آپ کی تنخواہ چالیس روپے سے زیادہ نہ تھی اس وقت مدرسہ عالیہ کلکتہ سے آپ کو مبلغ پانچ سو روپے ماہوار پر تدریس کے لئے بلا لایا گیا۔ مگر آپ نے وہ پیش کش مسترد کر دی۔ آپ نے فرمایا:۔

”وہاں ضمیر کی آزادی میسر نہیں ہوگی اور یہ بات دین کی خدمت میں رکاوٹ بنے گی۔“
 مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی تحریک سے نظام دکن نے آپ کا کچھ منصب اور وظیفہ مقرر کیا تھا آپ نے اس کا اجراء نہیں کرایا۔ اس سے بھی آپ کے نزدیک یہی مصلحت تھی کہ یہ چیز آپ کے ضمیر اور حق گوئی اور بے باکی کا راز میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

دیکھیں اور قومی خدمات آپ اکثر قومی، علمی اور مذہبی مجالس میں مشورے کے لئے بلائے جاتے تھے اور ان کی دیکھیں اور قومی خدمات اداروں کے متحن بھی تھے۔ آپ دارالعلوم دلیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے اور اکثر دہشتہ مجالس شوریٰ کی صدارت آپ ہی کے لئے مخصوص رہتی تھی۔

آپ مسجد فقیر پوری کی مجلس منتظمہ کے رکن تحریک خلافت کے دور میں بنائے گئے تھے۔ آپ کی شرکت سے مسجد بہتر ہو گیا۔ آپ کے دور میں مسجد سے ملحقہ دکانوں کی تعمیر ہوئی نیز جیون بخش مال بنا اور فتح پوری مسلم ہائی سکول کی بنی کے دور میں قائم ہوا۔

مدرسہ فتحپوری مدرسہ عالیہ فتح پوری مفتی صاحب کے اہتمام سے قبل ایک معمولی حیثیت کا مدرسہ تھا۔ اس کے پانچ مدرسہ فتحپوری پانچ مدرسہ روپے سے زائد نہ تھے، مگر جب حضرت مفتی صاحب اس کے اہتمام بننے تو آپ نے اس کی

ان قدر بلند کیا کہ مولوی فاضل کے امتحان میں اسی مدرسہ عالیہ کے طلبہ ہر سال اوّل درجے پر کامیاب ہوتے تھے اور پنجاب یونیورسٹی سے وظیفہ اور تمغہ حاصل کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی علوم کی کلاس میں یعنی مولوی فاضل شی فاضل اور ادیب فاضل کی جماعتیں اس مدرسہ میں جاری ہوئیں۔ اس طرح یہ دہلی کا بہت بڑا اور ٹیل کالج بن گیا۔ ان محفل کی تعلیم و تدریس کے لئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی (حال صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولوی محبوب صاحب اور مولانا قاضی سجاد حسین صاحب جیسے اہل علم حضرات کا انتخاب کیا۔ اس طرح مدرسہ امینیہ کے دوش بدوش مدرسہ عالیہ فقہ پوری نے بھی زبردست تعلیمی خدمات سر انجام دیں اور اس کے تعلیمی معارف دو ہزار پہلے ماہ نامک ہو گئے۔

یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حضرت مفتی صاحب نے شاہ جہاں پور کے زمانے ہی سے فتویٰ نویسی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی جب آپ مدرسہ امینیہ میں آئے تو وہاں آتے ہی یہ کام شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کی فتویٰ نویسی کی وجہ سے یہ مدرسہ تمام دہلی میں بہت جلد مشہور ہو گیا۔ چنانچہ بقول مفتی صاحب مولانا ابو محمد عبدالحق اعظمی تفسیر حقانی نے اس مدرسہ کے سالانہ جلسے میں مجمع کثیر کے روبرو فرمایا:-

”میں حلفاً گھنٹا ہوں کہ یہ مدرسہ مدارس دہلی میں تعلیمی حالت اور طلبہ کی تہذیب و شناخت، مدرسین کی لیاقت اور مہتمم مدرسہ کی دیانت کے اعتبار سے اعلیٰ پیمانے پر ہے۔ دہلی میں فقط یہی ایک مدرسہ ہے جس میں فتویٰ نویسی کی اعلیٰ مہتمم بالشان اسلامی خدمت انجام دی جاتی ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پچاس سال کے عرصے میں آپ نے لاکھوں فتوؤں کے جوابات دیئے۔ اس طرح آپ کے فتوؤں کا مجموعہ ذخیرہ، ہجرتیات فقہ اسلامی کا لازوال خزانہ ہے جو اگر مرتب ہو جائے تو اسلامی فقہ و فتاویٰ میں پیش بہا اضافہ ہوگا۔ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کے فرزند ارجمند مولانا حفیظ الرحمن واصف دہلوی مختلف انبائے علم کی مدد سے اس کی ترتیب و تدوین کر رہے ہیں اور اس کی پہلی جلد شائع ہونے والی ہے تاہم یہ کام مجیر حضرات کی وسیع مالی اعانت یا کسی نئے ناشر کا طلب گار ہے اور مناسب سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اشاعت کی رفتار سست ہو رہی ہے۔

فتویٰ نویسی کے لئے آپ ہر وقت کام میں مصروف رہتے تھے۔ بالعموم فتویٰ نویسی کا وقت مدرسہ امینیہ میں تدریس کے بعد ہوتا تھا اور دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے آپ ضروری فتوؤں کے جوابات تحریر فرما دیا کرتے تھے۔ تاہم اگر کوئی شخص مقررہ وقت کے علاوہ آپ کے گھر فتویٰ کا جواب حاصل کرنے کے لئے پہنچتا تھا تو آپ فوراً اس کا کام پورا کر دیتے تھے۔ اس کام کے لئے آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی راستے میں بل جاتا تو وہیں قریب میں بیٹھ کر فتوے کا جواب تحریر کر دیا کرتے تھے۔ آپ کی فتویٰ نویسی پر آپ کے اساتذہ بھی اعتماد کرتے تھے۔ چنانچہ جب انگریزوں سے ترک موالات کے زمانے میں مولانا نے حضرت شیخ الہند سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے اس مسئلہ پر فتویٰ دینے کے لئے جن تین حضرات کے نام تجویز کئے تھے ان میں حضرت مفتی کفایت اللہ کا نام سر فہرست تھا۔

حضرت مفتی صاحب کے فتاویٰ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ نہایت مختصر مگر مدلل جواب سائل کی منشا کے مطابق دیتے

تھے۔ مطلب یہ کہ جو سوال پوچھا جاتا تھا اس کا جواب ”ٹودی پوائنٹ“ (TO THE POINT) ہوتا تھا۔ اس کی عبادت عام مفتیوں کی طرح زیادہ پیچیدہ اور طویل نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا فتویٰ نویسی کا انداز نہ صرف عوام میں مقبول سرکاری عدالتیں بھی اسے بہت پسند کرتی تھیں اور وہ مسلمانوں کے مذہبی اور نکاح طلاق کے معاملات میں حضرت مفتی صاحب فتوؤں کو ترجیح دیتی تھیں۔ ذیل میں آپ کے فتوؤں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک دفعہ بلیک مارکیٹ کے بارے میں یہ استفتاء آیا :-

بلیک مارکیٹ ”بلیک مارکیٹ کے متعلق شرح کیا کہتی ہے۔ یعنی بلیک کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اور یہ کسی حالت میں بھی جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً آج کل کپڑے اور آٹے پر راشن بنے تو اس کی بلیک کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مفصل تحریر فرمائیں۔“

آپ نے اس کا سلیس اور مختصر یہ جواب تحریر فرمایا :-

”بلیک مارکیٹ کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں مخلوق کے ساتھ نا انصافی اور بے رحمی ہے اور جھوٹ بولنے کا بھی قوی امکان ہے۔“

ایک بات یہ دریافت کی گئی :-

اللہ محمد کے سپرد ”بہت سے لوگ کسی چیز کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں ”اللہ محمد کے سپرد“ مثلاً کوئی خطہ کی جگہ جاتا ہے تو اس کے عزیز و اقارب کہتے ہیں ”اللہ محمد کے سپرد“ یہ کلمات کہنے درست ہیں؟ (ایسے موقع پر) کیا کہنا چاہیے؟

الجواب ”اللہ محمد کے سپرد“ یہ الفاظ نہ کہنے چاہئیں۔ صرف ”اللہ کے سپرد“ کہنا ٹھیک ہے۔

فوٹو کھینچنا ”فوٹو کھینچنے کے متعلق حضرت مفتی صاحب سے فتویٰ اس طرح دریافت کیا گیا :-

”کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے متعلق کہ فوٹو کھینچنا اور کھینچنا شرعی نقطہ نظر سے کیوں حرام ہے جب کہ زبردہ یہ کہتا ہے کہ متحرک کو ہم ساکن کر دیتے ہیں یعنی شیشے میں دیکھنے سے جو ہماری صورت نظر آتی ہے اُسے ہم مستقل کر دیتے ہیں تو وہ فوٹو کہلاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیوں حرام ہے؟ اس سے ایک یادگار بھی قائم رہتی ہے۔“

الجواب ”تصویر بنانا اور اس کو استعمال کرنا شریعت مقدسہ نے ناجائز قرار دیا ہے۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کا ایک

طریقہ ہے۔ پس وہ ناجائز ہے جب کہ اس سے جان دار کی تصویر بنائی جاتے۔ ہاں مکانات اور غیر ذی روح مناظر

کا فوٹو لینا جائز ہے جیسا کہ ان کی بات سے تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ شریعت مقدسہ نے جان داروں کی تصویر

بنانا اور فوٹو لینا ایک مصلحت سے حرام فرمایا ہے کہ غیر اللہ کی تعظیم اور توحید کا شائبہ بھی مسلمانوں میں نہ رہے۔“

ان دو میں مثالوں سے واضح ہوگا کہ مفتی صاحب فتویٰ دینے وقت کوئی ملبی سوطی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ

آسان سے آسان الفاظ میں شریعت کا حکم واضح فرما دیتے تھے اور یہی ان کا کمال تھا۔

تالیف

حضرت مفتی صاحب کو ابتداءً عمر ہی سے لکھنے پڑھنے کے کام سے دلچسپی رہی ہے۔ جب وہ دیوبند سے فارغ ہو کر شاہ جہان پور واپس آئے اور وہاں مدرسہ ہو گئے تو اس زمانے میں آپ نے قادیانیت کی پرہیزگاری میں ایک رسالہ "البرہان" لکھا تھا اس میں قادیانیت کی تردید میں جو مضامین آپ نے شائع کئے تھے وہ آپ کی تحریر تالیف کی گئی ہے۔ اگر اس کے پرانے قائل مل جائیں تو اس سے قادیانیت کی تردید میں آپ کے مضامین کے مجموعہ کو کتنی صورت شائع کیا جاسکتا ہے جو آپ کی پہلی علمی و مذہبی یادگار ثابت ہوں گے۔

الریاحین

آپ کا مشہور قصیدہ (عربی) روض الراحین آپ کی ابتدائی تصانیف کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے یہ قصیدہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں مطبع الفضل المطابع دہلی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔ اس سے ۱۳۲۶ھ میں یعنی ایک سال پہلے یہ عربی قصیدہ مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسے میں پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ اس عربی قصیدہ میں حضرت صاحب نے قدیم مذہبی مدارس اور علمائے کرام کا تذکرہ کرتے ہوئے مشابہہ اساتذہ دیوبند کے علمی اور مذہبی کارناموں کا خصوصی طور پر تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ قصیدہ اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے اس قدر پسند کیا گیا کہ حاضرین جلسہ مدرسہ امینیہ کے سرپرستوں نے یہ فرمائش کی کہ اسے اردو ترجمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ نیز ان حواشی میں ان مذہب دیوبند کے مختصر حالات بھی بیان کئے جائیں جن کے اسماء گرامی کا تذکرہ قصیدہ میں آیا ہے۔

لہذا حضرت مفتی صاحب نے خود ان اشعار کا سلیس اور با محاورہ اردو ترجمہ کیا اور حواشی بھی خود اپنے قلم سے تحریر فرمائے۔ بعض مشکل الفاظ کی وضاحت بھی حواشی میں بربان عربی کی ہے۔ آپ نے علماء دیوبند کے حالات اردو میں تحریر فرمائے ہیں مگر ہونے کے باوجود جامع ہیں۔

یہ رسالہ شائع ہونے ہی نایاب ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس کا علم تک بھی نہ تھا اور نہ بعد میں یہ میری سے گذرا۔ خوش قسمتی سے حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا حفیظ الرحمن صاحب و اصف نے اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں مدرسہ امینیہ کی گذشتہ پرانی رودادوں کے ساتھ اسے بھی ارسال فرمایا۔ جب میں نے اسے مطالعہ کیا تو اصل عربی قصیدہ کے علاوہ تفصیلات و بلاغت میں کوئی جواب نہ تھا اس کے حواشی بھی اردو کی نادر تحریر اور علمائے دیوبند کے بارے میں نادر معلومات پر مشتمل تھے۔ لہذا میں نے برائے افادہ خاص و عام ان اردو حواشی کو مربوط متن بنا کر انہیں ماہ نامہ "بینات" کراچی کے شمارہ ۱۳۲۶ھ و شمارہ ذوالحجہ مطابق مارچ و اپریل ۱۹۶۷ء میں دو قسطوں میں شائع کرایا۔ مزید توضیح اور افادہ کے لئے اس مضمون کے حواشی میں متعلقہ حضرات سے متعلق عربی اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ان حواشی کو ایک مربوط شکل دینے کے لئے ذیلی ابواب خود میں نے قائم کئے اور ارتباط قائم رکھنے اور مناسب وضاحت کے لئے قوسین میں کہیں کچھ الفاظ بھی میں نے بڑھائے تھے اصل عبارت خود مفتی صاحب کی تحریر کردہ ہے۔

سوئی اور المصطفیٰ کی اشاعت

حضرت مفتی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شرح المسویٰ کو جو موطا امام مالک کی شرح ہے شائع کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے عظیم نشان کار کا تذکرہ فارسی شرح المصطفیٰ کے حاشیہ پر صحت و اہتمام کیساتھ ۱۳۴۶ھ میں شائع کرایا۔ اس طرح قارئین یک نظر حضرت شاہ ولی اللہ

کی دونوں شریحوں عربی اور فارسی سے استفادہ کر سکتے تھے۔

تعلیم الاسلام

آپ کی سب سے مشہور تصنیف "تعلیم الاسلام" ہے جو آپ نے بچوں کے لئے نہایت سلیس اور آسان میں بطور سوال و جواب چار حصوں میں تحریر کی تھی۔ یہ نہایت ضروری اسلامی عقائد پر مشتمل ہے۔ یہ مقبول ہوئی اور برصغیر پاک و ہند میں اسلامی مدارس میں بچوں کے لئے داخل نصاب ہوئی۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ناشرین نے اسے ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا اور ابھی تک ہر کوئی ناشر اس کے نئے نئے ایڈیشن شائع کر رہا ہے۔ چونکہ اس کے حقوق قانونی طور پر اپنی ذات یا اپنی اولاد کے لئے محفوظ نہیں کئے تھے اس لئے بلا مبالغہ اس کے لاکھوں نسخے شائع ہوئے ہیں کہ اگر اس کی رائلٹی حضرت مفتی صاحب یا ان کی اولاد لیتی تو ایک کم از کم پچاس ساٹھ ہزار روپیہ حاصل ہوتا۔ اس کا بیشتر ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

دیگر متفرق رسائل

آپ نے ان کے علاوہ متفرق مذہبی رسائل بھی تحریر کئے تھے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ نایاب ہیں۔ آپ نے اپنے استاد حضرت شیخ الہند کے حالات پر ایک رسالہ جمعیتہ علماء ہند کے قریب ۱۹۱۵ء میں تحریر کیا تھا اور اسی طرح ایک رسالہ بعنوان مسلمانوں کے مذہبی اور قومی اغراض کی حفاظت لکھا جو اردو پرنٹنگ ورکس دہلی میں چھپا تھا اور اس رسالہ میں آپ نے اشکاف الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا کہ پہلے ہم مسلمان ہیں پھر ہندی یا ہندو۔ حضرت مفتی صاحب جیسا کہ قارئین کو معلوم ہو چکا ہے بہت بڑے مفتی، متبحر عالم اور قادر المکال مصنف ہوتے۔ تاہم اگر آپ کے فتاویٰ شائع کر دیئے جائیں تو ان کی پندرہ بیس بڑی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں جو ایسا ہی مواد ہو گا کہ اس کے سامنے ہزاروں کتابیں بیچ ہوں۔

خطبات و مکتوبات

آپ کے خطبات و مکتوبات کا بہت بڑا ذخیرہ منتشر ہے۔ اگر ان سب کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ بہت وسیع معلومات کا مجموعہ بن سکتا ہے۔

اشعار و قصائد

حضرت مفتی صاحب عربی زبان کے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کا قصیدہ "روض الیامین" جس کا ہم اردو ترجمہ کیا ہے آپ کی قادر الکلامی کی بہت بڑی دلیل ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک رسالہ انقاس ہوتا تھا۔ اس کے دورِ اول میں حضرت مفتی صاحب کافی عربی قصائد شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مدرسہ امینیہ دہلی کی گزشتہ دوروں میں آپ کے عربی قصائد شائع ہوتے ہیں۔ آپ نے ملتان جیل میں دماں کے ایک افسر میر فضل الدین صاحب کے نام سے ایک قصیدہ تحریر فرمایا تھا وہ بھی نہایت فصیح و بلیغ اور موثر قصیدہ ہے۔ نیز آپ نے اپنے رسالہ "شیخ الہند" مطبوعہ لاہور میں حضرت شیخ الہند کے ہاں میں قید ہونے پر جو عربی قصیدہ تحریر کیا تھا وہ بھی نہایت عمدہ اور موثر ہے۔ حکیم اہمل خاں دیوبند پر بھی آپ نے عربی قصیدہ تحریر کیا تھا۔ آپ کے عربی قصائد متفرق طور پر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے

بنی شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

ردو اشعار آپ نے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں مگر عالمانہ وقار کی وجہ سے خود پڑھ کر نہیں سُناتے تھے۔ چنانچہ حسبِ آپ ملتان جیل میں تھے تو وہاں کے سیاسی قیدیوں میں شعر کا اچھا خاصہ مجمع ہو گیا تھا اور جیل ہی میں ہفتہ وار شاعرانہ منعقد ہونے لگے تھے۔ ان میں آپ خود شریک نہیں ہوتے تھے تاہم ان مشاعروں کے لئے آپ کچھ اشعار لکھ لیتے تھے جنہیں مولانا احمد عبید اللہ کُسناتے تھے۔

وفات آخری زمانے میں آپ معاشرہ کی روز افزوں بڑھتی ہوئی بے راہ روی اور ہندو مسلم فسادات اور اس طرح کے دوسرے حالات سے بیزار ہو کر سیاسیات سے بالکل الگ ہو گئے تھے اور تقریباً دس سال تک آپ بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے اور کسی جلسے میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ملک کے تباہ کن حالات آپ کے جگر کا ناسور بن گئے تھے اور آپ کے لبوں پر خاموشی اور مرگ گئی تھی جو آخر کار جان لیوا ثابت ہوئی۔

جب مجھے کراچی میں آپ کی خطرناک بیماری کی اطلاع ملی تو میں نے اپنے ہم جماعت رفیق اور حضرت کے فرزند اکبر مولانا نیاز الرحمن دافع کو ایک خط لکھا جس میں حضرت مفتی صاحب کی خیریت دریافت کی گئی۔ اس خط کے جواب میں انہوں نے یہ خط بھیجا۔

محبت محترم! وعلیکم السلام۔ جواب گرامی نامہ ۲۴ نومبر ۱۹۵۲ء گزارش ہے کہ والد صاحب تین ماہ سے علیل ہیں درم جگر کی شکایت ہے باوجود بہتر سے بہتر علاج اور کافی توجہ اور غور و پرداخت کے مرض میں کوئی آفاقہ نہیں ہے۔ غذا بھی ہضم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے اور دیگر احباب متوسلین سے درخواست کیجئے۔ اُمید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام

آپ کا — حفیظ الرحمن ۱۲/۳/۵۲

خط کے خطوطے عرصہ کے بعد حضرت مفتی صاحب کی وفات کی خبر پاکستان پہنچی اور ہمیں معلوم ہوا کہ حضرت مفتی صاحب، وفات پانچ بجے ۲۱ دسمبر مطابق ۱۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ بوقت ۱۰ بجے شب عازم ملک بقار ہو گئے۔ دوسرے دن دہلی کے ناگد مسلمانوں نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ کا جنازہ مہراؤ لے جایا گیا۔ آپ کو حضرت خواجہ قطب الدین مختار مہراؤ کے واسطے قریب دفن کیا گیا۔

علاقہ حمیدہ آپ کے اخلاق حمیدہ کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ ایک سچے اور مخلص عالم کا نمونہ تھے۔ آپ نہایت باوقار اور سنجیدہ طبیعت کے انسان تھے مگر اس کے ساتھ احباب اور عوام کے لئے خوش اخلاق اور بکمال مہربان مہربان تھے۔ سنت رسول پر عامل تھے اور اپنا کام خود اپنے آپ کیا کرتے تھے۔ آپ حاجت مندوں کا کام سرانجام دینے کے لئے اور بچپن ہی سے خود کما کر اور ٹوپیوں کا ٹھکر اور انہیں سی کر اپنی روزی کما رہے۔ مراد آباد اور دیوبند کے تعلیمی زمانے میں آپ کا کام سے روزی کما کر اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتے تھے۔ اس کے بعد بھی جب آپ مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس اور مہتمم تھے، تو اس لئے نہایت ہی قلیل تنخواہ پر گزارہ کیا اور ضمیر فروشی کر کے کسی بڑے عہدہ کو قبول نہیں کیا۔ آپ کے اخلاق حمیدہ کے اعلیٰ نمونہ ان

حضرات نے نصف فصل طور پر بیان کئے ہیں جو سفر حج اور سفر مصر میں آپ کے ساتھ تھے یا جو حجرات جیل اور قلعان جیل میں آپ کے ساتھ تھے۔ جو لوگ سفر حج میں آپ کے ساتھ تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ سفر حج میں اپنے ہم سفر حاجیوں کی بے حد خدمت کرتے تھے۔ ان کے کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلاتے تھے اور خشک ہونے کے بعد انہیں تنہ کر کے اپنے ساتھیوں کو پہنچاتے تھے۔ حج کے موافق آپ پوشیدہ طور پر تہجد کی نماز پڑھتے تھے اور خاموشی کے ساتھ عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ آپ رات کو پوشیدہ طور پر اور مہینہ کی گلیوں میں روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ آپ نہایت سادہ طبیعت کے تھے۔ اپنے گھر کا سودا بلکہ پڑوسیوں کا سودا بھی بازار جا کر لایا کرتے تھے۔ آپ کی زمیں سلیمان سے بوجھل ہو جاتی تھی تاہم آپ اُسے اٹھا کر خود پڑوسیوں کے گھر سامان پہنچاتے تھے۔ اپنا کھانا خود پکا لیا کرتے تھے اور اپنے کپڑے خود سی لیتے تھے بلکہ جب آپ جیل میں تھے تو اپنے ساتھی قیدیوں کے کپڑے بھی سینے لیتے تھے۔

مفتی اعظم واقعات کے آئینہ میں

از مسٹر شعیب قریشی (اخبار الجمعۃ شمارہ ۳۸ جلد ۳۸ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۵۳ء)

پیغام تعزیت

ہندوستان میں مقیم پاکستانی مائی کشن مسٹر شعیب قریشی نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی وفات کو ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔

کا پورا بیان حسب ذیل ہے۔
حضرت مولانا الحاج مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی وفات حسرت آیات کی غم انگیز خبر سن کر مجھے انتہائی رنج و الم پہنچا۔ سالہا سال سے مفتی صاحب سے واقف رہا ہوں۔ مفتی صاحب کا غم نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں منایا جانے لگا، بلکہ عالم اسلامی دنیا میں ان کی وفات پر ماتم کیا جائے گا کیونکہ ان کی وفات سے ایک ایسا غلغلہ پیدا ہو گیا ہے جس کو فریب نہیں کیا جاسکتا۔ ایک زبردست عالم فاضل مفتی تھے۔ ان کے جاری کردہ فتوؤں کی جو علم و عقل کے امت بارے میں تردید ہوتی تھی۔ تھوڑی سی سیاق اور انہیں اُل سمجھا جاتا تھا۔ ایک مذہبی راہنما ہونے کے علاوہ مفتی صاحب نے ہندوستان کی قومی جدوجہد اور بین الاقوامی سیاست میں نمایاں کام کیا تھا۔ ہندوستان میں انہوں نے تحریک خلافت میں ایک اہم پارٹ انجام دیا اور عرصہ تک جو علماء ہند کے صدر رہے۔

ہندوستان سے باہر انہوں نے عالمی مسلم کانفرنس میں شرکت کی جو مکہ معظمہ میں شاہ ابن سعود نے بلائی تھی۔ بعد انہوں نے قاہرہ میں فلسطین کانفرنس کی صدارت کی۔

میں مفتی صاحب کے عزیزوں کے ساتھ رنج و غم میں دل سے شریک ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ انہیں وسیلہ عطا فرمائے اور مرحوم کی روح کو سکون پہنچے۔

مسٹر شعیب قریشی اور ان کے عملہ کے افسران نے مفتی صاحب کے جنازہ کی نماز میں شرکت کی۔ اسٹاف کے ممبران بھی تھے۔

یاد رہے کہ سر شعیب قریشی اپنے عہدہ پر مامور ہو کر کرب و بلی تشریف لائے تھے تو سب کاموں سے پہلے آپ مفتی صاحب کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

از حضرت مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی

(روزنامہ الجمعیت مورخہ ۵ جنوری ۱۹۵۲ء شمارہ ۵۷ جلد ۲۸)

فی مغفرت کے عجب آزاد مرد تھا

میں ان خوش قسمتوں میں سے ہوں جنہیں حضرت مفتی صاحب مرحوم کا قرب حاصل تھا۔ تحریک عدم تعاون کے زمانہ ۱۹۱۹ء ہی سے میں اُن کے قریب ہو گیا تھا اور جب ۱۹۲۶ء میں حضرت مفتی صاحب کے ہمراہ سفر حج کا موقع ملا اور اس کے بعد ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں اُن کے ساتھ ہجرات اور ملتان کی جیلوں میں رہنے کا اتفاق ہوا تو مجھے اُنہیں سمجھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ مفتی صاحب نہ کسی سے خدمت لیتے ہیں اور نہ کسی کو ڈالتے ہیں لیکن میں خوش نصیبوں سے ہوں جس کو مفتی صاحب ڈانٹ بھی لیتے تھے اور خدمت بھی لیتے تھے اور میں اس میں ایک خاص طرح کی لذت محسوس کرتا تھا۔ وہ دراصل مجھے اپنے بیٹے کی طرح جانتے تھے۔

جیل میں میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم کس قدر بلند کردار کے مالک ہیں۔ ہم لوگوں کو وہاں اخلاقی قیدی بطور نمونہ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب اُن کے پچھلے ہونے پر ٹپے بلیٹ کر سہا کرتے تھے اور اس کے علاوہ بھی اُن کے دوسرے کام کر دیا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جواب دیا کہ اُن سے کام لینا ظلم ہے۔ وہ میرا کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ ادا کرتا ہوں۔ حکومت کو ان سے کام لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۹۲۶ء کے دوران ج میں جب حضرت مفتی صاحب جمعیت علماء کا ایک وفد کے مقرر اسلامی میں شرکت کرنے کیلئے تشریف لے گئے تھے جو اس موقع پر سلطان ابن سعود نے طلب کی تھی۔ میں نے حضرت مفتی صاحب کی جو کیفیت دیکھی اُس کا اثر تمام عمر میرے دل پر رہے گا۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان اونٹوں کا سفر تھا۔ جب سب سامعین تھک کر سو جاتے تو حضرت مفتی صاحب سب کے لئے کھانا تیار کر دیا کرتے تھے۔ خرچ میں اگر گڑ بڑ ہوتی تو اپنے پاس سے ادا کر دیتے اور جمعیت کے فنڈ پر بار نہ ڈالتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جن سے ان کی بے لوث زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ ایک مجموعہ کمالات تھے اور مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ قلمبند کر سکوں۔ حق مغفرت کے عجب آزاد مرد تھا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان سے وابستگی رکھنے والوں کو سب جہیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

از مولانا محمد منظور نعمانی مدیر رسالہ الفرقان، کھنوا (بابہ دسمبر ۱۹۵۲ء و جنوری و فروری ۱۹۵۳ء)

مفتی اعظم کی خصوصیات

علیہ الرحمۃ والغفران کی خبر پڑھ چکے ہوں گے۔ اگرچہ کسی کی بھی موت اس حیثیت سے غیر معمولی حادثہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں آنے والے ہر انسان اور ہر جاندار کی آخری منزل موت ہے اور یہ ہر شخص کی جانی فوجی بات ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ جن بندوں کی زندگی غیر معمولی ہوتی ہے اُن کی موت بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے عام لوگوں کی موتوں کے مقابلے میں غیر معمولی ہی ہوتی ہے اور اور نزدیک والے اُس سے اس طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح کہ غیر معمولی واقعات و حوادثات سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ علم دین

میں حضرت مفتی صاحب کی بلند مقام اور خاص گرفتہ اور فتویٰ میں ان کی حریمیت اور سیاسیات میں ان کی خاص بصیرت اور فہم فہم کا سمجھنا کہ یہ تو دو چیزیں ہیں جن سے کسی دوسرے میں دو ٹوک بھی واقف ہوں گے جن کی واقفیت کا ذریعہ اخبارات یا دوسرے وسائل نظر ہوں گے لیکن ان کے علاوہ حضرت مفتی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے خیر معمولی کمالات سے بھی نوازا تھا جن سے صرف وہی لوگ واقف ہوں گے جنہیں نزدیک رہنے اور قریب سے دیکھنے اور بہتے کا نیا یہ موقع ملے ہو گا۔ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی علمی عظمت کا پوری طور پر ناواقف ہونے کے باوجود ان کے دوسرے کمالات سے زیادہ متاثر رہا۔ ان میں سے ان کے جس کمال کا نتیجہ میرے دل پر پڑا اور گہرا ہے وہ ان کی بے انتہا تواضع اور بے نفسی ہے۔ اس بارے میں اس عاجز کا جو آثار اور احساس ہے، واقعہ ہے کہ اس کا نتیجہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ اللہ نے ہی کو جتنی بلندیاں عطا فرمائی تھیں وہ ان ہی متواضع اور بے نفس تھے۔ ان سے ملنے والے ان کے کسی تیار منہ نہ ملے، کبھی محسوس نہ کیا ہو گا کہ وہ اپنے کو کچھ بھی سمجھتے ہیں میں اوقات اپنے بہت چھوٹوں کے ساتھ اس طرح پیش کش آتے اور ایسا معاملہ کرتے کہ انہیں شرم آتی۔ اس عاجز نے اس مقام کسی شخصیت میں بھی اس درجہ کا تواضع نہیں دیکھا۔

دوسری جن خصوصیت سے یہ عاجز بہت متاثر ہوا وہ یہ ہے کہ مفرد حضرت سیکنڈوں صحبتوں میں میں نے کبھی ان کی طرف نہ بولی گفتگو میں اور نہ کسی بحثوں میں اور گفتگو میں کسی بڑے سے بڑے اپنے مخالف کے متعلق بھی کوئی سخت لفظ کبھی نہیں آیا اسی طرح کبھی غیبت کا کوئی کلمہ یا نہیں۔

تیسری خاص بات جس سے یہ عاجز بہت متاثر ہے یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آیا ہے کہ **يُحِبُّ دُمُ الْفَسَادِ** (آپ خود ہی اپنے خاوم تھے، اپنے گھر اور اپنی ذات کے معمولی معمولی کام خود کر دیتے تھے، حضرت مفتی صاحب اس اسلوب کی خاص نمونہ تھے۔ اس بلند مقامی کے باوجود اپنے گھر کے اور بچوں کے ایسے معمولی اور حقیر کام خود کیا کرتے تھے جیسے کرنے میں ایک معمولی آدمی بھی اپنی تربیت سمجھ گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عاجز حضرت مفتی صاحب کی ان سیرتی خصوصیات سے متاثر رہا کہ اگر ان کے ہاتھ پر کھلی کراٹھیں دیکھتا تو غالباً اس سے زیادہ متاثر نہ ہوتا۔

حضرت مفتی صاحب ان اکابر دین میں سے تھے جن کی علمی عظمت و حقیقت اور ان کے علم پر اعتماد کی وجہ سے بہت سے لوگ غلطیوں اور لغتوں سے محفوظ رہتے ہیں اس لحاظ سے آپ کی وفات اس درد ناک میں ایک بڑا دینی سانحہ ہے۔

از مولانا عبدالماجد صاحب دیابادی — (صدرِ جدید ۲۴ جنوری ۱۹۵۶ء)

سچہ ہا میں

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہ جہان پوری ثم الدہلوی نور اللہ مرقدہ کی وفات کو کئی ہفتے ہو چکے اور ملک کا گورنر اب تک ان کے ماتم و شہ یون سے گرجا ہوا ہے۔ خود پاکستان تک سیاسی اختلاف کے باوجود تعزیت میں پیچھے نہیں۔ زندگی کا عرصہ کے مکرم و محترم رہے۔ سالہا سال جمعیت علماء کے صدر، ایک بڑی دینی درس گاہ کے راجہ دران اور مجلس خلافت کے اہم رکن و کاتب، لیکن آپ کو علم ہے کہ اتنے بڑے مفکر، جدید عالم اور شیخ وقت کیا تھے؟ حدیثہ خیر شیخ، رحمتی نہ حسینی، نہ صدیقی نہ فاضل، نہ علوی نہ عثمانی، باوجود اس کے آپ نے دیکھا کہ بڑے بڑے عالمی نسب شیخ اور سید ان کے علم و فضل، فتویٰ اور تہذیب کے لئے نچھلے رہے۔ بڑے سے بڑے علماء اور مشائخ ان کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ ان کے دینی فتوے سب پر چلتے رہے۔ مخالفوں اور

میں بھی کبھی کسی کو انگشت نمائی کرنے بلکہ ادھر اشارہ کرنے کی بھی جرأت نہ پڑی۔ یہ فیض اگر اسلام اور شارع اسلام کا نہ تھا تو اور کس کا تھا؟ اس بیسویں صدی کے گئے گزرے ہوئے اسلام کا بھی!

امتیازات نسب را پاک سوخت
آتش ادایں خس و خاشاک سوخت
بر نسب نازان شدن نادانی است
حکم او اندر تن و تن نادانی است

اور خود اقبال جہنوں نے یہ ترانہ گایا ہے وہی کوئے سید زادے یا شیخ زادے تھے؟ اور اسلام کی سارٹھ تیرہ سو سال کی تاریخ میں یہ مثالیں نئی اور انوکھی کب ہیں؟

بشکریہ — حکیم عبد القوی صاحب منیجر صمدیہ

(ماخوذ از اخبار نئی دنیا وغیرہ مورخہ ۲۷، ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء)

جنازہ کا منظر

یکم جنوری ۱۹۵۳ء۔ ستر کروڑ مسلمانوں کے مذہبی پیشوا حضرت مفتی اعظم کی وفات کی خبر رات کو جو نہی شہر میں پھیلی، ہر طرف ستا چھا گیا۔ شہر کے تمام مسلم علاقوں میں کاروبار بند ہو گئے اور ہر قسم کی دکانیں مفتی صاحب کے غم میں آج بند ہیں یہاں تک کہ کھانے پینے کی دکانیں بھی بند ہیں۔ شہر میں بعض جگہ نامی سیاہ بھنڈیاں بھی اٹھارے غم کے طور پر لگا دی گئی ہیں۔ ہر طرف ستا چھا ہے اور اُدا سی چھائی ہوئی ہے۔ آج مذبح بھی بند ہے۔

نماز فجر کے بعد ہی مفتی صاحب کے مکان کے باہر لوگوں کا ہجوم ہو گیا تھا اور بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک طرف بازار چلتی قبر تک، اور دوسری طرف دریا گنج تک سڑکیں بھر گئیں تھیں۔ مجمع کی طرف سے آخری دیدار کی خواہش کی جا رہی تھی۔ زنانہ مکان خواتین سے بھر گیا تھا اور اُس طرف کی گلی میں بھی خواتین کا ہجوم تھا۔ غرضیکہ ہر جگہ زیارت شروع ہوئی۔ چہرہ مبارک سے کفن ہٹا دیا گیا۔ مردانہ مکان کے چھوٹے سے صحن میں جنازہ رکھا تھا۔ لوگ ایک قطار کی صورت میں آ رہے تھے۔ یہ قطار بازار چلتی قبر سے مکان تک مسلسل رواں تھی۔ زیارت کے وقت منتظرین کی ہدایت تھی کہ کوئی صاحب ٹھہر کر زیارت نہ کریں۔ برابر چلتے رہیں۔ ٹھوڑی ٹھوڑی دیر کے بعد اس لائن کو روک دیا جاتا تھا اور خواتین کو اسی طریقے سے زیارت کا موقع دیا جاتا تھا۔ یہ دیکھا جا رہا تھا کہ لائن میں زیادہ آدمیوں کے آنسو رواں تھے۔ غرضیکہ ایک عجیب سکون و وقار اور میرا عقول نظم و ضبط کے ساتھ یہ لائن ۱۲ بجے تک چلتی رہی۔ اس کے بعد میت کو زمین پر سے اُٹا لیا گیا اور گلی میں لاکر مسہری پر رکھا گیا۔ تقریباً سوا بارہ بجے جنازہ اُٹھا اس وقت ایک عجیب رقت انگیز منظر تھا۔ کوئٹہ چیلان سے جامع مسجد تک سڑکیں اور گلیاں ہزاروں روتے ہوئے انسانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کچھ تو بڑے زور زور سے رو رہے تھے، اور بعض کے چہرے نہایت غمگین اور اُدا سی تھے۔ عورتیں مکانوں کی چھتوں پر رو رہی تھیں۔ مرحوم کے مکان سے جامع مسجد تک آدمی، ہی آدمی تھے۔ لوگ غم و یاس کے عالم میں اپنے مذہبی پیشوا کے آخری دیدار کے منظر کھڑے تھے۔

جنازے کو جن چار حضرات نے پہلے اُٹھایا اُن میں اگے مفتی اعظم کے خلیفہ اکرم مولوی حفیظ الرحمن واصف اور حکیم شرف الدین صاحب بقائی تھے۔ جب جنازہ چلا تو بارش شروع ہو گئی۔ تقریباً سوا بجے جنازہ پریڈ گراؤنڈ (میدان درمیان لال قلعہ و جامع بہا پہنچا۔ باوجود سخت سردی اور بارش کے لوگوں کا ہجوم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ جنازہ کی مسہری میں لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے تھے پھر بھی ہزاروں آدمی کندھا نہیں دے سکے۔ جنازے کے گم میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر فرقے کے لیڈر اور عوام شریک

تھے۔ یہ سب کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نماز جنازہ پڑھائیں گے مگر وہ وقت پر دہلی نہ پہنچ سکے۔ گذشتہ کو دہلی کی مشہور درگاہ صابریہ کے سجادہ نشین شیخ طریقت پیر جی کرار حسین صاحب کی بھی وفات ہو گئی تھی۔ ان کا جنازہ بھی یہیں پہنچ چکا تھا اور مفتی اعظم کے برابر ہی رکھا ہوا تھا۔ ایک سالک طریقت کا اور ایک عالم شریعت کا۔ دونوں جنازوں کی نماز ہوئی جو حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے پڑھائی۔ جنازہ کے بالکل قریب انکی صفت میں پاکستان کے بانی نیشنل اور کے فرسٹ سکریٹری مسٹر عبدالرحمن اور اسٹاف کے کچھ اور لوگ کھڑے تھے۔ نماز جنازہ ایک لاکھ آدمیوں نے پڑھی۔ اس کے بعد وقت جنازہ چلا تو دہلی دروازہ تک ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے۔

جنازہ کا فقید الاشمال منظر قابل دید تھا۔ ہر شخص اس ہستی کی عظیم الشان موت پر رشک کر رہا تھا۔ جس کی عقیدت میں مل جوق در جوق دہلی اور بیرون دہلی سے چلے آ رہے تھے۔ پرید گراؤ نہ تھی دہلی دروازہ تک کی وسیع سڑکیں انسانوں کا ایک مندرجہ ہوتی تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف ہندو، مسلمان، بلکہ عورتیں اور بچے کھڑے تھے اور جامع مسجد کی سڑکیوں اور شرعی دروازوں اور دو طرفہ دالانوں میں ہزاروں مسلم خواتین اپنے مرحوم پیشوا کے جنازے کے آخری دیدار کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ اتنے عظیم الشان ہجوم کا فخر و تکرار ہی کر رہی تھی، نہ فوج کی ضرورت پیش آئی اور نہ پرمیں کی۔

دہلی دروازہ کے باہر پہنچ کر جنازہ ایک بڑی سی ایمرنس کاریں رکھا گیا اور مہر دہلی کی طرف چلا۔ گورنمنٹ کی طرف سے فوجی بسوں کا کئی دستہ نہیں تھا۔ وگ اپنے پیسے خرچ کر کے بسوں، کاروں اور تاگوں میں مہر دہلی جا رہے تھے (دہلی دروازہ سے مہر دہلی کا فاصلہ گیارہ میل ہے) سائرس چارنگ کے جنازہ مہر دہلی پہنچی اور فخر محل کے پاس جا کر ٹپکا۔ بعد نماز عصر صحت کو ٹپکا اٹھا گیا۔ قبر میں آئے سے پہلے نماز عصر کے بعد حضرت شیخ الاسلام سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا قاری محمد طیب صاحب، حضرت مولانا اعجاز علی صاحب اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بنیادی جو دیوبند سے دہلی پہنچ چکے تھے، ان کی دیدار سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد سعید صاحب اور مولوی حفیظ الرحمن واقع نے قبر میں آ کر وصیت کی۔ میں رکھا۔ تقریباً مغرب کے وقت ہزاروں انسان اپنی اس جلیل القند اور گرانمایہ دولت کو سپردِ خاک کر کے واپس چوتے۔ تجبیز و تکفین اور مہر دہلی تک کے تمام انتظامات میں شریک تمام مصلوں کے سرکردہ حضرات نے اور عامیوں کو پرانی کے جائزہ اور حقیقت مندوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے شہر و قریہ مفتی اعظم کی خاتمانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔

اب مفتی اعظم سیر کے معانی میں شہر درج ہو رہے ہیں۔

از شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم۔

بشارات

وما کان قیس نھنکھ ہذاک واحد ولکنھ اوکان قوم قہدما

نہیں نام اگر سپر بقانون گریستے از چشم اختران ہر شب خون گریستے

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ آغا کے حضرت شیخ الہند مولانا محمد امجد الحسن صاحب مدظلہ

مرہ العزیز کے مخصوص تلامذہ سے تھے۔ اگرچہ ہزاروں علماء نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ العزیز سے علوم نقلیہ و عقلیہ کا استفادہ کیا، مگر قدرت کی فیاضیوں نے جو خاص جامعیت اور ساقیت مفتی صاحب مرحوم کو عطا فرمائی، وہ بہت ہی کم نصیب ہوتی ہے۔ مفتی صاحب مرحوم ابتداء ہی سے نہایت ذکی، سمجھ دار، مستقل مزاج، عالی حوصلہ، معاملہ دار واقع ہوئے تھے۔ آپ کو علوم نقلیہ اور عقلیہ سے طبعی مناسبت تھی۔ تقریر و تحریر کے میدانوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں بازی لے گئے۔ اخلاق فاضلہ میں خداوند عالم نے کمال عطا فرمایا تھا۔ دریا سے سیاست کے بہترین شاہد تھے۔ تدبیر و فکر کے انمول موتیوں سے آپ کا دامن بھرا رہتا تھا۔ ہر معاملہ کی گہرائی اور آخری تہ تک پہنچنا آپ کی اہل کا ہمیشہ شہکار رہا ہے۔

جس طرح آپ بلند پایہ مفتی، سرچشمہ النظر عالم، دور اندیش، زیرک، دقیقہ رس سیاست دان تھے، ایسے ہی آپ بہترین اس اور استاد بھی تھے۔ دقیق اور فاضل مضامین سمجھانے کا بہترین ملکہ خداوند عالم نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ علمی کمالات کے تحسن خطی کی دولت بھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ خطاطی گویا فطری جوہر تھا۔ چنانچہ نسخ اور تہذیبوں کے دونوں قسم کے دل پر آپ بے نظیر مہارت رکھتے تھے۔

تحریر آزاد و وطن اور خلافت کمیٹی کی تائید اور جمعیت علماء ہند کی راہنمائی میں آپ نے جس فراست اور استقلال سے لے کر وفات کے وقت تک دیا، ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ لوگوں کی زندگی اس کی مثال سے خالی ہے۔

شہرت طلبی اور نام و نمود کی خواہش کی ہوا بھی آپ کے پاس ہو کر نہ گزری تھی۔ فروتنی اور تواضع میں آپ بالکل اپنے حضرت شیخ الہند کے قدم بقدم اور آسمان تقویٰ کے چمکتے ہوئے ستارے تھے۔ باوجود اعلیٰ قابلیتوں کے جن کے جسے بڑی سے بڑی عزت، شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے آپ نے یکسوئی اور کم نامی کے گوشہ میں ساری زندگی دی۔ بہر حال حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کی وفات اور جدائی نے ہم خدام جمعیت کی کر توڑ دی۔ اللہ و ائمہ اربعہ راجعون۔

لَا يَدْرُكُ الْوَاصِفُ الْمُطَهَّرِ خَصَائِصَهُ
خَلْفَ الزَّمَانِ لِيَاثِيَتَيْنِ بِمِثْلِهِ
فَرَضَى اللَّهُ وَاذْوَاهُ فَخَلَفَ عَلَيْنَا وَخَيْرُ

ننگ اسلاف — حسین احمد غفرلہ

تقریر باجلاس کانگریس کمیٹی — منفقہ ۴۴ جنوری ۱۹۵۳ء بمقام اُردو پارک دہلی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد — وزیر تعلیم حکومت ہند

مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد اپنے سامنے رکھتے ہیں اور اپنی زندگی مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر ڈالتے ہیں۔ ان کی زندگی کا عظیم مقصد دین، علم اور ملک کی خدمت کرنا تھا۔ وہ ایک مستند تھے اس لئے قدرتی طور پر اُن کا یہ فرض تھا کہ وہ دینی خدمات کرتے رہیں۔ چنانچہ تمام زندگی انہوں نے اس مقصد کے لئے

گزار دی۔ مفتی صاحب شاہجہان پور کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت بھی شاہجہان پور میں ہی ہوئی۔ اس کے بعد دیوبند میں انہوں نے اپنی تعلیم کو مکمل تک پہنچایا۔ وہلی آئے اور اپنی تمام زندگی علم دین کی خدمت کرنے میں گزار دی۔ مدرسہ امینیہ میں وہ درس دیا کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان کی تنخواہ بیس چکیں روپے ماہوار تھی۔ اس وقت مدرسہ امینیہ سنہری مسجد میں تھا۔ بعد میں جب مدرسہ امینیہ کشمیری بازار منتقل ہو گیا تو وہاں درس دینے لگے۔ وہ ایک معمولی تنخواہ پر اپنا گذر کرتے رہے۔ (درحقیقت حضرت مفتی صاحب نے اُن علماء کو آنکھوں سے دیکھا تھا جو اپنی خوشی سے غریبی کی حالت میں اپنی زندگیاں بسر کیا کرتے تھے) وہ عالم دین تھے اور دین کا اشارہ تھا کہ وہ ملکی اور قومی کام بھی کریں۔ چنانچہ اس کام میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب میں جیل سے رہا ہوا تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اُس وقت سے برابراں کی زندگی کو رکھتا رہا۔ اُن کی ہمت، جرات اور استقامت کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ یہ وہ طوفانی دور تھا کہ بڑی بڑی شخصیتیں اس دور میں بہر گیس لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب کے عزم، ہمت اور استقلال میں ذرا فرق نہ آیا اور ان طوفانوں کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی۔ انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگریس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انہوں نے اس راستہ سے قدم نہیں ہٹایا۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی روح ہم سے قریب ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ہندوستان کی تاریخ میں اُن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اخلاق و عادات اور کچھ متفرق حکایات

آپ نہایت سادہ طبیعت، خاموشی پسند تھے۔ وقار اور مناسبت کا یہ عالم تھا کہ چھوٹے آپ کے رعب سے کانپتے، احباب و رفقا آپ کی ہمیت سے ڈرتے تھے۔ خوش اخلاق اور منجانب مرجع تھے۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے۔ ہنرمند ایسے تھے کہ کوئی کام آپ کے لئے مشکل نہ تھا۔ نہ خط نہایت عمدہ اور دلربا تھا۔ آپ کا کمال خوش نویسی بالکل وہی اور محض ربانی تھا۔ خوش نویسی کی مشق آپ نے کبھی نہیں کی۔ مفتی محمد دین خوش نویس کے صاحبزادے مسٹر ضیاء الدین نے اپنی کسی کتاب مفتی اعظم کے حالات لکھے ہیں۔ مناسب ہے کہ انہوں نے یہ لکھا ہے کہ مفتی اعظم خوش نویسی میں میرے والد کے شاگرد تھے۔ یہ بالکل غلط۔ حساب میں بڑی عمدہ مہارت تھی۔ سادہ لباس پہنتے تھے۔ شہرت و نمائش سے ہمیشہ متغیر رہے۔ عربی اور فارسی میں بہت شعر کہتے تھے۔ اردو میں بھی کچھ ٹھوڑی سی شاعری کی ہے۔ عربی ادب میں اور عربی مکالمے میں فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہے کہ عرب کے علماء نے آپ کی زبان وانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہندوستان کے علماء میں ہم نے آپ کو اہل زبان کی طرح شہ زبان بولتے سنا۔

شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ المراعی مرحوم نے آپ کے متعلق فرمایا: ینبلیج العلم والوقار فی جبینہ۔

عالم اسلام کے اکثر زعماء سے آپ کے تعلقات اور خط و کتابت تھی۔ مفتی اعظم فلسطین آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ رفیق شریف مرحوم (شامی لیڈر) جب ہندوستان آئے تھے تو اکثر آپ کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ہندوستان کے

آپ کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے حکیم محمد اہل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی وغیرہ کی دعوت کی۔ دسترخوان پر چنے کی دال کا بھرتہ بھی تھا۔ حکیم صاحب نے اس کو بہت پسند کیا، اور فرمایا کہ مفتی صاحب یہ دال ضرورت سے زیادہ لذیذ کیوں ہے۔ فرمایا کہ یہ میں نے اپنے ہاتھ سے پکانی چونکہ خلوص کے ساتھ پکانی ہے اس لئے لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ آہ! اب وہ خلوص والے نہ رہے، نہ خلوص کی قدر پہچانتے والے رہے حکیم صاحب مرحوم اپنی مجلس اور مطب میں کسی دینی سیات کے واسطے کھڑے نہ ہوتے تھے لیکن جب آپ تشریف لے جاتے تو سروسو کھڑے ہو جاتے اور دوڑ کر دروازے سے آپ کو اپنے ساتھ لاتے تھے۔

حضرت مولانا انور شاہ نور اللہ مرحومہ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کفایت اللہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت تھے مگر خود کسی کو بیعت نہیں کیا۔ جب کوئی عقیدت مند بیعت کی درخواست کرتا تھا تو حضرت مولانا تھانویؒ، یا مولانا عبد القادر رائے پوریؒ یا مولانا حسین احمد مدنیؒ یا مولانا محمد الیاس رحیم اللہ تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کی ہدایت کرتے۔

اہل حاجت اور مستفتی لوگوں کے ساتھ آپ کا طرز عمل یہ تھا کہ بسا اوقات رات کے بارہ بجے اور ایک بجے آپ سے فتوے لینے آتے تھے۔ آپ بستر استراحت سے خود اٹھ کر تشریف لاتے تھے اور پیشانی پر بل بھی نہ آتا تھا۔ آپ کے ایک شاگرد مولوی محمد فاروق کہتے ہیں کہ ایک روز مدرسہ امینیہ سے واپسی کے دوران کاٹھ کے پُل پر ایک صاحب ملے اور کہنے لگے کہ حضرت مجھے ایک فتنوی فتویٰ لینا تھا۔ حضرت مفتی صاحب نے اُن سے فتویٰ لیا اور کچنی باغ کے دروازے کے سامنے پڑول پیپ کے پاس ایک چارپائی پر پر اجازت لے کر بیٹھ گئے اور فتویٰ کا جواب لکھ کر اُسی وقت اُن کے حوالہ کیا۔

یہ چیز آپ کی فطرت میں داخل تھی کہ آپ کسی ملاقاتی کو انتظار کی زحمت نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کانہیں ہزاروں مرتبہ کا تجربہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران اگر کوئی آجاتا تھا تو آپ کھانا چھوڑ دیتے تھے اور جا کر ملاقات کرتے تھے۔ اور اگر کوئی فتویٰ لے کر آتا تھا تو فتویٰ بھی لکھ دیتے تھے۔ غرض کہ فتویٰ لکھنے کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا۔ چوبیس گھنٹے اور آرام و راحت، حتیٰ کہ پوری زندگی افتار اہل حاجت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

طبیعت بے انتہا غیور تھی۔ کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت یا اپنی کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔ ایک دفعہ ایک دکاندار سے کوئی چیز خریدی۔ جس کی قیمت حقیقت میں دس روپے تھی۔ اُس نے کہا کہ حضرت دیسے تو میں پندرہ روپے لیتا ہوں مگر آپ سے دس روپے لوں گا۔ آپ کے پاس اس وقت صرف دس روپے تھے۔ دکاندار کو کچھ نہیں دیا۔ گھر آکر اپنے شاگرد (مولوی ضیاء الحق دہلوی) کو پندرہ روپے دیئے اور فرمایا کہ اگر پندرہ روپے نہ ملے تو پھینک کر آجانا۔

مکان کے لئے زمین خریدی تھی مگر بنوانے کے لئے روپیہ نہ تھا۔ دہلی کے ایک رئیس نے آپ سے درخواست کی کہ میں روپیہ پیش کر دوں گا آپ تعمیر شروع کر دیجئے۔ آپ نے انکار فرما دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر انہوں نے اصرار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کچھ روپیہ قرض لے دو اور پردلوٹ لکھوا لو۔ انہوں نے ضابطہ کے مطابق پردلوٹ انگریزی میں، آپ کو لکھ کر پیش کر دیا۔ فرمایا کہ اس کا ترجمہ مجھے سناؤ۔ انہوں نے ترجمہ سنایا۔ آپ نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں شرح سود بھی لکھی جوتھی تھی۔ انہوں نے بہت کچھ سمجھانے اور

تسلّی دلانے کی کوشش کی کہ حضرت یہ تو صرف ضابطہ کی خانہ پری ہے ورنہ ہم نے عمر بھر میں نہ کسی سے سود لیا اور نہ کسی کو سود دیا فرما کر مجھے قرض لینے کی ضرورت نہیں، آپ مجھے معاف کیجئے۔ آخر انہوں نے دوسرا پروٹ ٹاپ کرایا جب آپ نے دستخط فرمائے قرض سے ہمیشہ بچتے تھے۔ وفات کے وقت آپ کسی کے مقروض نہ تھے۔

چند متفرق حکایات

ایک مرتبہ والدی پتہ والی نے حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں ایک تاج بھیجا جس میں دریافت کیا گیا کہ دہلی میں عید کا چاند ہو گیا یا نہیں۔ حضرت مفتی صاحب موجود نہ تھے۔ مدرسہ امینیہ میں چند پتہ والی طلبہ تھے۔ انہوں نے تار کا جواب دے دیا کہ چاند ہو گیا۔ اس کے مطابق صبح کو پتہ والی میں عید کر لی گئی۔ والدی پتہ والی نے حضرت کو خط لکھ میں آپ کا بہت ممتون ہوں کہ آپ نے ایک بہت بڑے اختلافی مسئلے کو حل فرما دیا یعنی یہ کہ اگر چاند کی اطلاع بذریعہ تار کے معتبر ہوئی تو آپ تار کا جواب نہ دیتے۔ حضرت مفتی صاحب نے خط کے جواب میں تحریر فرمایا کہ آپ کے تار اور اُس کے جواب کی گنجائش خبر نہیں۔ کب آپ نے تار دیا اور کب میں نے اس کا جواب دیا۔ یہی بات تار کی خبر کے غیر معتبر ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ سب سے چھوٹی صاحبزادی زبیدہ خاتون تھی جو اٹھارہ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔ اس سے آپ کو بہت محبت تھی۔ جب وہ چار پانچ سال کی تھی، ایک مرتبہ گھر میں شلیم منگاتے گئے۔ زبیدہ نے ان میں سے مٹی اور ریت پھڑا کر رکھ لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد والد نے وہ مٹی کوڑے پر پھینک دی۔ جب بچی کو اس کا علم ہوا تو چل گئی۔ پلک پلک کر رنے لگی۔ والدہ نے بہت بھلایا مٹنایا، پھسلائی۔ نے بھی بہت کچھ چپکا کرنے کی کوشش کی۔ گو وہیں سے کرباز سے مٹھائی دلائی گئی کسی طرح اُس کی ضد گئی۔ گملوں میں سے مٹی پھار کر اُس کو دی گئی مگر وہ کہتی تھی کہ میں تو شلیم کی مٹی لوں گی۔ آخر آپ اس کو گود میں لے کر سبزی فروشوں کی دکانوں پر گئے اور کئی دکانوں پر شلیم کی مٹی جمع کر کے لائے جب وہ بہت غرض ہوئی۔ گھر میں آکر فرمایا کہ ماں باپ ان پھولوں سے بچوں اور خاص کر بچیوں کی کرباز تار برداری کرتے ہیں۔ کس محنت اور محبت سے پالتے ہیں۔ جب یہ دو مسمے گھر جاتی ہیں تو وہ لوگ ان تمام محنتوں پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ لڑکی کے ماں باپ کے دلوں کو کس قدر صدمہ اور دکھ پہنچاتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک استفتار آیا۔ سوال یہ تھا کہ ایک مسجد تعمیر کی جا رہی تھی۔ ایک شخص کا مکان اس کے متصل تھا۔ وہ ان کی توسیع میں حائل ہوتا تھا۔ مالک مکان سے کہا گیا کہ اپنے مکان میں سے تھوڑا سا حصہ مسجد کو دے دو۔ اس نے مسجد کی شان نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ آیا وہ شخص کا فرمایا نہیں؟ مولوی محمد فاروق صاحب نے اس کا جواب لکھا کہ چونکہ مسجد شریف ہے اور شہر انہوں نے تو بن کر ہے لہذا وہ شخص کا فرمایا۔ جواب دیکھ کہ حضرت نے فرمایا کہ ابھی سے کافر سازی شروع کر دی تھی بن جاؤ گے تو کیا کر دو گے۔ کیا تم نے وہ حدیث نہیں پڑھی کہ جس شخص میں تنازعے باتیں کفر کی ہوں اور ایک بات ایسی ہو جس سے اس کے اندر ایمان ثابت کیا جاسکتا ہے تو اُس کو کافر نہ کہو۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ اس سوال میں تو ٹھکی ہوئی تو ہے پھر کفر کیوں نہیں ثابت ہو گا۔ فرمایا کہ پہلے اس بات کو ثابت کر دو کہ وہ مسجد حقیقت میں مسجد ہی ہے۔ فرض کر دو کہ وہ مسجد ہے پر بنائی گئی ہو اور اس شخص کو یہ بات معلوم ہو گئی ہو۔ اس لئے اُس نے نامناسب باتیں اور غیر الفاظ کہے ہوں۔ اس لئے آخری ایک مسلمان کے کفر کا حکم نہیں دینا چاہیے۔

ایک دفعہ راقم الحروف (واصف) ریل کے سفر میں حضرت والد ماجد کے ہم رکاب تھا۔ جس ڈبے میں ہم دونوں

میں دہلی کے سوداگروں میں سے دو معزز دولت مند حضرات بھی ہم سفر تھے اور ان کے قریب بھاری بھر کمزور قادیانی مولوی بھی بیٹھے تھے اور مرزا غلام احمد کی صداقت اور نبوت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک بڑا مولوی بڑے زور شور سے بول رہا تھا۔ بڑا لسان اور طرہ معلوم ہوتا تھا۔ حضرت والد ماجد کچھ فاصلے پر تھے اور ان لوگوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ قادیانیوں کے مخاطب کبھی کبھی جواب دیتے تھے مگر پھر لا جواب ہو جاتے تھے۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کی گفتگو میں شامل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہاں معاملہ دین کا ہے اس لئے خاموش نہیں رہ سکتا۔

میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے ابھی یہ جو فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور مرزا صاحب کی نبوت سے ختم نبوت میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا کیونکہ مرزا صاحب کی نبوت حضور ہی کی نبوت کا ایک جزو اور ضمیمہ ہے تو یہ فرماتے کہ علیہ السلام کے اس قول کا جتنی بعدی میں تو کسی قسم کی نبوت کی تخصیص نہیں ہے۔ مطلق نبوت کی نفی ہے۔ ضمنی غیر ضمنی ظنی، بروزی کی تخصیص کا نبوت کہیں نہیں ملتا۔ لائے یعنی جس نے نبوت کے تمام اقسام اصناف کی نفی کر دی ہے پھر بیچ میں نبوت ضمنی کیسی؟ قادیانی مولوی نے جواب دیا کہ جس طرح سچا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ اسی طرح ضمنی نبوت بھی ہوتی ہے اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دائرہ عمل قیامت تک ہے اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لئے آپ ہی کے دین کی تجدید کے لئے نبی آ سکتا ہے اور اس سے آپ کے ختم نبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

حضرت مفتی اعظم نے فرمایا کہ نبوت کا چالیسواں حصہ اگر کسی کو عطا فرمایا جائے تو وہ شخص نبی نہیں بن جائے گا۔ انسان کی ایک انگلی کو انسان کا لقب نہیں دیا جاسکتا۔

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ کے دعویٰ کے مطابق قیامت تک کے لئے نبی ہیں۔ پھر حضور کا یہ فرمانا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ بولتے جواب دیجئے۔ حضرت نے کئی مرتبہ فرمایا۔ بولے جواب دیجئے۔ مگر ادھر ایسا سننا تھا کہ صدائے برنخاست۔ قادیانی اک دم مبہوت ہو گئے بالکل جواب نہ دے سکے۔

پھر فرمایا کہ آپ لوگوں کا یہ کہنا کہ حضور قیامت تک کے لئے نبی ہیں، خود اس امر کا اقرار ہے کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے بعد نبوت کا عہدہ کبھی کسی کو عطا نہیں کیا جائے گا۔ دوران نبوت میں کسی اور نبی کی بعثت کے کیا معنی اور اس کی ضرورت کیوں بولتے جواب دیجئے مگر صدائے برنخاست۔ قادیانیوں پر اوس پرانگی اور شکست خوردگی کی وجہ سے چہرے زرد اور جوت خشک ہو گئے اور بالکل ساکت و سامت ہو گئے۔ تو حضرت والد ماجد نے تقریباً ایک گھنٹے تک قادیانیت کے رد میں مسلسل تقریر فرمائی اس کے بعد دہلی کے ہم سفر حضرات نے دریافت کیا کہ حضرت آپ تعارف تو فرمائیے۔ فرمایا کہ مجھے کفایت اللہ کہتے ہیں۔ مدرسہ امینیہ کا مدرس ہوں۔ اس وقت کا منظر بڑا عجیب تھا۔ ڈیلے کے تمام ہم سفر مسلمانوں نے یہ تقریر سنی تھی۔ بہت شکر ادا کیا اور ان دو متمند حضرات نے کہا کہ حضرت ہم تو مذہب تھے۔ آپ نے بروقت ہماری دستگیری کی اور اپنی اس کوتاہی پر بڑے ناام ہوئے۔ کہ وہی میں رہتے ہوئے ہم شرف ملاقات سے محروم تھے۔ اور ہر قادیانیوں کا حال یہ تھا کہ ادھر ادھر کی باتوں کا خیال بھی بھول گئے۔ حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب انگریزوں سے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا۔ تو نہایت انکسافاً

اور حدود شناسی کے ساتھ فرمایا کہ مجھے انگریزوں سے غیر معمولی بغض اور نفرت ہے۔ ان کے بارے میں فتویٰ دینے میں مجھے اپنے لئے پر اعتماد نہیں کہ وہ حدود کی رعایت رکھ سکے۔ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے اعداؤ اھواقرب للعدویٰ اور یہ فرما کر اپنے مخصوص تلامذہ میں سے فتویٰ لکھنے کے لئے سجن تین حضرات کا نام لیا ان میں اولیٰ نام حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ گویا حضرت اپنے نفس پر اس بارہ میں اعتماد نہ تھا جتنا ان پر تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے نفس پر بے اعتمادی یہ عین کمال بلکہ منتہائے کمال اور اعتقاد تقویٰ کی اعلیٰ ترین مثال ہے اور اس لئے فتویٰ صادر فرمانا و تحقیقت ایسے ہی اہل اللہ کا حق تھا۔ مگر اسی سے ظاہر ہے کہ ان کا برجن پر خود اعتماد فرمائیں اور اپنے مقابلے میں اعتماد کا اظہار کریں وہ کتنے محتاط اور متدین ہوں گے؟ کسی کے مقبول عند ہونے کی علامت یہی ہے کہ خواص اہل اللہ کے قلوب میں اس کی وقعت اور منزلت قائم ہو۔

پان کا لنگر حضرت مفتی صاحب کے لئے دہلی سے اعلیٰ درجے کے پانوں کے ڈگرے آیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب کی کی کوٹھڑی ایک لنگر خانہ تھی۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سبھی کہ بھنگی بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں پان کے سائل ہو کر آیا کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب نہایت خندہ پیشانی سے ہر ایک کو پان دے دیا کرتے تھے۔

عجیب واقعہ نیو سنٹرل جیل ملتان میں فجر کی نماز کے بعد میں جیل خانہ میں بالائی منزل پر ٹہل رہا تھا۔ احرار کے کشتہ ابھی پیشین کا ایک قیدی جو بی کلاس میں تھا، ڈاڑھی منڈایا کرتا تھا اور نماز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پان پر بیٹھا ہوا ہے اس کے سر میں درد تھا اور مفتی صاحب چار پائی سے نیچے کھڑے ہو کر اُس کا سر دبا رہے ہیں۔ امام اعظم مفتی اعظم ہندوستان کا یہ واقعہ میرے لئے حیران کن تھا اور آپ کے اخلاق عالیہ کا ایک بہترین نظارہ تھا۔

ایک تاریخی اور ادبی نکتہ از جناب حفیظ الرحمان صاحب داصف
اسوئی مغل بادشاہ سراج الدین ظفر کی تاریخ وفات

بجھا ہے چیدارخ دہلی

۱۲۷۹ھ

کہی گئی تھی۔

حکیم اجمل خاں مرحوم کی تاریخ وفات کسی نے کہی تھی۔

دلی کا چیدارخ گل ہوا ہے

۱۳۴۴ھ

حضرت مفتی اعظم کی تاریخ وفات مولوی مقبول الرحمن خیال سیواری نے نکالی۔

ہو گیا گل آہ دہلی کا چیدارخ

۱۳۷۲ھ

یہی مادہ تاریخ لوح مزار پر لکھوایا جا رہا ہے۔

شیخ العرب العجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

۵۱۳۷۷
۶۱۹۵



۵۱۲۹۹
۶۱۸۷۹

حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ رحمۃ اللہ

جامہ کبیر سید احمد بریلوی کی طرح حضرت مولانا مدنی کی شخصیت مسلمانوں میں مختلف فیہ ہے۔ اگر ایک جماعت کے نزدیک مولانا مہجور و محبوب ترین مخلوق و رہنما تھے تو دوسرے گروہ کے نزدیک مہجور ترین انسان۔ اور یہ بات ویسے کچھ فطری ہی دکھائی دیتی ہے۔ جسے جو انسان جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس کی مخالفت زیادہ ہوگی۔ حضرت سید احمد شہید مسلمانوں کی ایک جماعت کے نزدیک صحابہ کرامؓ کی نشانیں تھے ان کا اخلاق و کردار غلو و عمل اس پایہ کا تھا کہ صحابہؓ کے بعد اس کی مثال بہت مشکل سے ملتی ہے۔ اور دوسرے گروہ کے نزدیک وہ ہر کافر و مشرک اعلیٰ سے بڑے اعلیٰ تھے۔ یہی صورت حال مولانا سید حسین احمد مدنی کی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ میں سے جس نے بھی کتاب و سنت کی راہوں پر چلنے کی شش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاملہ پیش آیا ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی اپنے علم و عمل کے اعتبار سے اس صدی کے نابغہ و درکار انسانوں سے تھے۔ اور انہوں نے چین سے لیکن ذرا غفلت تک بھروسہ و عمل سے بھرپور زندگی گذاری ہے۔ ان کی بہت مردانہ اور استقلال و استقامت کا ہر کردار ثابت ہے۔ دشمن و دوست سبھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ مولانا غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اور عزم و ثبات کے اعتبار سے کوہ گرانے کی تحریک آزادی کے آخری دور میں مسلمانوں کی باہمی نظریاتی کشمکش اور سیاسی پیچیدگیاں کچھ اس طرح پیدا ہو گئیں کہ اس غار خوار وادی میں ان کا دامن ایسا نہیں رہا جو کمانوں سے ڈالچا ہوا اور کسی کے تلوار سے زخمی ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور پھر ہنگامی دور میں چونکہ جذبات کی فراوانی ہے فقہائیں ارتعاش ہوتا ہے۔ ہر کوئی تنگ و دو میں مصروف ہوتا ہے لہذا کسی کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ سکون کے ساتھ کسی فرصت حالات کا جائزہ لے کر کوئی صحیح فیصلہ کر سکے۔ مثلاً مشہور ہے کہ آٹھ دس دنوں کا ایک بکر بیٹھتے تھے۔ کراچیاں تک و آدمی ان کے سامنے آکر نہتے ایک نے پینٹول پلایا اور دوسرا گر پڑا اس کے بعد دو تین آدمی آئے اور اس مقتول کو اٹھا کر لے گئے اور یہ سب کچھ آنا نانا ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔ یہ تمام دانشور اس مقدمہ میں بطور گواہ پیش ہوئے تو ہر ایک کا بیان مختلف تھا۔ تقریباً یہی حال تحریک آزادی پاک و ہند کے آخری کا تھا جس میں چونکہ ہوا وہ سب کچھ ان حالات کا تقاضا تھا ورنہ یہ صورت ممکن ہی نہیں کہ ایک طرف کے سارے لوگ بے ایمان خود یا مشعور و دوسروں کے آکر کار ہوں اور دوسری طرف کے سارے لوگ غفلت۔ نیک اور ایماندار ہوں۔ ایک نظریاتی کشمکش تھی۔ اور نتیجہ اپنے اپنے دلائل کے ساتھ قوم کے سامنے آ رہی تھیں۔ ایک فیصلہ تھا جس کو تقیم کچھ پکا اور سیاہ سوکھ چکی ان حالات کا راسخ و کثرت بعد تک ایک دوسرے کو بڑا بھلا کتنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اخلاق و کردار، علم و عمل اور جہد و انثار کو سامنے لیا جائے۔ نظریات و خیالات میں ہمیشہ سے اختلاف چلا آیا ہے اور اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو زندگی ایک جمود کا کچھ نہیں۔ اس دنیا کی رونق اور آبادی اختلاف کی مرہون منت ہے۔

آئندہ طور پر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کے حالات آکر پہنچیں تو لوگوں نے حضرت مولانا کو دور سے دیکھا اور دور سے سنا وہ بھی سرسری۔ امید ہے کہ حضرت مولانا کے صحیح حالات جاننے کے بعد ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

خاندانی تفاوت تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اپنے ایک خط سے جو انھوں نے ایک سال کے جواب میں لکھا تھا

حضرت مولانا کا خاندان لکھتا تھا ملاحظہ فرمائیے۔

”محترم المقام زید رحمکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف۔ والا نذر باعث سرفرازی چھا۔ یاد داری کا شکر گزار ہوں۔ میرے تعلق نجی حیثیت سے سید پر نے کا اکابر جن عزات نے کیا ہے۔ وہ اس کے ذمہ دار ہیں میں تو اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا بھی نہیں ہوں جس کی وجہ یہ ہے کہ ملازمت نسب نہیں ہے۔ عمل ہے اگر کسی حیثیت سے کوئی اعلیٰ درجہ کا عالی نسب ہے۔ مگر اعمال قریب ہیں تو مثل سپر نور علیہ السلام وہ نادرہ درگاہ خداوندی ہے اور اگر ہمارے چمکی زاہد ہے۔ مگر وہ مسلمان تھے تھے تو اس کی فرد نخل مثل حضرت بلال و صہیب رضوان اللہ علیہما ہے۔ میرے عمل اس ادعا کی اجازت نہیں دیتے۔ مجھے شرم آتی ہے

عزیز! میں اللہ واپور قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد کا باشندہ ہوں۔ اللہ واپور قصبہ ٹانڈہ کے اہل مقبل ہے تقریباً چار سو برس یا اس سے زائد سے ہمارے خاندان کی جائے سکونت ہے۔ وہاں کے اطراف و جوار میں ضلع سلطان پور، اعظم گڑھ، اودھین آباد کے دیہات اور قصبات میں صرف سادات اور بڑے ذات کے ریشہ زادوں میں ہماری رشتہ داریاں صدیوں سے چلی آتی ہیں۔ چلا آتی پیشہ زمینداری اور پیری مودی ہے۔ شاہان چلی منلیہ خاندان کے ابتدائی بادشاہوں نے ہاں سے پہلے بادشاہوں نے ہمارے اعلیٰ مورثوں کو ۴۴ گاؤں دیئے تھے جن میں سے ۵۵ ایک ۳۵ باقی رہ گئے تھے ۵۵ میں ایک ہندو راجہ نے جس سے پہلے سے عداوت چلی آتی تھی۔ بڑوں کے انتقال اور چلی کی شامیت کی وجہ سے سب بقیہ کر لیا۔ اور اللہ واپور لٹ لیا۔ ہمارے قدیم کاغذات پر بھی قصبہ کر لیا۔ بے شمار خزانے، غلہ اور سامان اس کے لوہا جس کو وہ ایک ماہ تک گاؤں میں منتقل کرتا رہا۔ اس کے سوار کے زاد میں حرمیں اور بچے حسین دل کر شہ داروں کے یہاں شہر ٹانڈہ کے بعض محل میں مامون تھے۔ چناؤ کریں ہو گئے تھے اور دوسرے لوگ بھی لوگوں اور رعایا کو ہرگز مقرر ہو گئے تھے بہر حال اگر کسی تفتیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو تو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد دور نہیں ہے۔ وہاں جا کر تفتیش کرنے حال معلوم کر سکتا ہے ۵۵ کے بعد ان کے بعد صرف دو گاؤں ہمارے خاندان کے پاس رہ گئے تھے جن میں والد مرحوم کا ایک آٹھ آٹھ پانی تھا جس کو فروخت کر کے والد مرحوم نے نماز کا قصد کیا تھا۔

ہمارے مورث اعلیٰ جو کہ اللہ واپور میں آؤ لایے ہیں ان کا نام شاہ نور الحق قدس سرہ العزیز ہیں۔ ان سے دیگر عہد تک سترہ پشتیں گزریں ہیں جن کا سلسلہ حسب ذیل ہے۔

حسین احمد بن سید حبیب اللہ بن سید پیر علی بن سید جہانگیر بن شاہ نور اشرف بن شاہ مدن بن شاہ محمد شاہی بن شاہ خیر اللہ بن شاہ صفت اللہ بن شاہ حب اللہ بن شاہ محمد بن شاہ لدین بن شاہ ظہر بن شاہ موزر بن شاہ راجہ بن شاہ عبدالواحد بن شاہ محمد زاہد بن شاہ نور الحق قدس اللہ تعالیٰ

اسلام

یہاں تک پہنچا شجرہ نبیؐ موجود ہے۔ اس کے بعد کاشجرہ طہریت ہے۔ نبیؐ موجود نہیں ہے۔ شاہ نورالحق صاحب خلیفہ نبیؐ شاہ داؤد حشریؒ کے۔ وہ شاہ عتاب الدین چشتیؒ کے۔ وہ شاہ نجم الدین چشتیؒ کے۔ وہ شاہ روحی چشتیؒ کے۔ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے۔ وہ خواجہ معین الدین چشتیؒ اجیری رحمہ اللہ تعالیٰ و قدس سرہ السلام کے۔ اس کے بعد شجرہ میں وہی اسماء بزرگان طہریت درج ہیں جو حضرت خواجہ اجیری رحمۃ اللہ علیہ کے تمام شجرہ میں مذکور ہیں۔

بہر حال یہ احوال مختصر ہیں۔ اوصاف تہذیبیہ اللہ تعالیٰ اگر تربیت عنہ اللہ تعالیٰ پر ترجیح و صلاح ہے ورنہ سب پیچ ہے۔ انہاروں وغیرہ میں ایسے مضامین لانے کی ضرورت نہیں۔ آپؐ کو ضرورت ہے کہ اپنی قوم کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ترقی دیں۔ نبیؐ کی حیثیت سے غرور اور تکبر پر موقوف رہنا ہوتا ہے۔ وہ ترقی سے باطل ہوتا ہے۔ سادات پر تمام مسلمانوں کی خدمت گزار کی ضروری ہے نہ کہ سادات تمام مسلمانوں کو اپنا غلام سمجھیں اور ان سے خدمت کی خواہش کریں۔

تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ایک روز امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بغداد میں ایک بڑے مجمع کے سامنے فرمایا: لے کر مجاہد تو میں سے جس کو روز قیامت میں اللہ تعالیٰ بخش دے تو میری شفاعت کرنا۔ لوگوں نے تعجب کیا اور کہا کیا ہم آپؐ کی شفاعت کریں۔ حالانکہ آپؐ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ہیں تو فرمائیے لے کر یہی چیز میرے لیے باعث بے چینی ہے۔ امت کے تمام مسلمان میرے نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ہیں اور میں ان کے خاندان کا پیچہ ہوں۔ قاعدہ ہے کہ یہاںوں کی خدمت گزار کی خاندان کے پھر ٹوں پر ضروری ہوتی ہے اگر وہ کوتاہی کرتا ہے تو صاحب خاندان بہت بھارتیہ اور پھوٹوں کی سرزنش کرتا ہے۔ اگر قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے سوال کیا کہ جعفر! تم نے میرے خاندان کی کیا خدمت کی تو میں شرم کی وجہ سے منہ زائٹھا سکوں گا۔

یہ ارشاد حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا صحیح ہے اور سادات کے لیے نہایت عبرت کا فرمان ہے مگر ان سے کہ ہم انتہائی غفلت میں مبتلا ہیں۔ میں نے جب سے یہ ارشاد دیکھا ہے۔ بہت فکر مند رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

پس غرضی کا رقی صرف اسی وقت حاصل ہو گا جب کہ اللہ تعالیٰ کی حضرت اور ہمارے آقا و امتی نامہ جان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔ اس سے پہلے یہ مفارقت جہالت اور نادانی ہے۔

سادات کا فرض سب سے زیادہ اور اولین ہے کہ آقاؐ نے نامہ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت کو زچہ اپنے عمل سے کریں اور آپؐ کی سنتوں پر نہایت مضبوطی سے چلیں اور نہایت کج خواہ۔ خواہ وہ کیسا ہی غریب اور جاہل اور چھٹی ذات کا مسلمان ہو اور علم کریں اور اس کی خدمت گزار کریں۔ وہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا بلا یا ہوا انسان ہے۔

حضرت مدنی کا یطربل مکتوب ہم نے اس لیے نقل کیا ہے تاکہ تائین کو اس رجل رشید کی افتاد طبع کا اندازہ ہوا اور وہ معلوم کر سکیں کہ حسینؑ کیسے شفیق نام ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ولادت ۱۹ شوال ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دوشنبہ اور دوشنبہ کی درمیان میں بوقت اشجے بمقام انگوٹو منسل انڈوس بٹی جہاں آپ کے والد ماجد مولانا حبیب اللہ صاحب و خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمنؒ کے مدرس تھے۔ تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا۔ آپ نسباً حبشی تھے۔ آپ کے والد ماجد بڑے پادے کے بزرگ تھے۔ ذاکر، شاعر، بڑے پاکبار و باخدا انسان تھے۔ مستجاب اللہ ایسے کہ وہ حضرت شیخ مدنی نقش حیات میں لکھتے ہیں۔

ایسے بہت سے واقعات پیش آئے کہ جس نے انکو پایا اور اس کے واسطے انھوں نے بد دعا کی اور وہ کبھی غیپہ نہیں پایا۔ اور ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کشف ان کا بہت قوی اور زاہد تھا۔ متعدد بار مکاتفات ان کے صحیح ثابت ہوئے۔ ایک دفعہ انھوں نے مدینہ منورہ میں فرمایا کہ میں سے ایک شخص کو ہندوستان جانا ہو گا۔ میں نہیں مانتا مگر یہ فرقہ خال محمد دوسلے کے نام پکے گا۔

حضرت کی والدہ محترمہ راجہ وقت، پابند شریعت، بڑی صمدار تالغ خاتون، سارے اوقات ذکر و شغل سے معمور و مشغول۔ شیخ مدنی تین سال کے تھے کہ آپ کے والد محترم پیش لے کر اپنے وطن ٹانڈہ تشریف لے آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی۔ ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل تیرہ سال کے ہوئے کہ آپ کے دارالعلوم دہلویہ حضرت شیخ الہند مولانا محمد وحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ گویا ایک شفاف آئینہ کہ آفتاب اللہ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ ہندوستان کے چکنے چکنے بات۔ حضرت شیخ الہند نے ہندو شاگرد کو پہلی نظر میں پہچان لیا کہ میرا خال ہے۔ لہذا حضرت کے ابتدائی گناہیں بھی مولانا مدنی کو خود ہی چھپائیں جب کہ حضرت کے مشاغل طبی و جراحی کو بھی اوقات بدرمدہ کے علاوہ چھالنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اور زمین طالب علم کو مشورہ ہی سے لائق خالق استاد مل جائیں تو کیا کہنے۔ سولے برس ہاگ۔

حضرت مدنی کو اپنے وقت کے بہترین اور گیارہ روزگار اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ اساتذہ العلوم حضرت شیخ الہند، مولانا ذوالفقار علی صاحب حضرت مولانا عبدالحی صاحب محدث و طبیب، شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری، حضرت مفتی غفر الرحمن صاحب مولانا والد ماجد حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا عبدالحی صاحب محدث و طبیب، شیخ الحدیث حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہانپوری، حضرت مفتی غفر الرحمن صاحب مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، جہم الترمذی صاحب تعلیم کے دوران آپ ہمیشہ علمی زہر لے کر پاس ہوتے رہے۔ عربی مدارس میں انتہائی فہم پرکاش ہوتے ہیں۔ مگر آپ اکثر شیخ کتابوں میں ۵۱، ۵۲، ۵۳ نمبر لیتے رہتے۔ اور صدر راجد شیخ شکل اور ادنی کتاب میں ۵۵، ۵۶، ۵۷ نمبر حاصل کیے۔

۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد ماجد بقصد ہجرت بعد ایل و عیال عازم حجاز ہوئے۔ تو حضرت مولانا مدنی، کبھی اپنی محبت سے سرفرازی بخشی اور اس نے حجاز مقدس پر پہنچ کر رحمتہ اللعالمین کے حجاز رحمت کے واسطے قلعہ دارین رکھا اور وہیں پر امامت فرمائی۔ اسی طرح حضرت مدنی کو مشیت الہی نے اپنے اہل بیت نبوت اور عبدالحی صاحب جہد شرف کے وہ گراں قدر درویشان عطا فرماتے جو سب کو نہیں ملا کرتے۔ صرف ان ہی کو ملا کرتے ہیں جنھیں خداوند باری تعالیٰ اپنی رحمت کے لیے محض کر لیتے ہیں۔

اس وقت مدینہ منورہ میں دو کتب خانے غیر معمولی اہمیت رکھتے تھے۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام اور دوسرا محمودیہ۔ ان دونوں ہی کتب خانوں کے علاوہ مطبوعات کے مختلف علوم و فنون پر ایاب قلمی کتابیں بھی تھیں۔ جہاں سے حضرت کو استفادہ کا پورا موقع ملا۔ عسرت اور معیشت کی تنگی قیام میں نہیں آئی۔ ان کے لیے ہمیشہ ایسا بھی برآ کر آپ نے کتابیں نقل کر کے اپنی معیشت کے مسلمان مہیا کیے۔ مگر کوئی ایسا ذریعہ اختیار نہ فرمایا جس سے خود داری اور

نے لگے۔ دینہ منورہ میں آپ کا نانا لادو تیرا وافر شریک تھا مگر صرف بارہ چھٹایک سو کے پانی پر تیرا دم حضرت قناعت فرماتے تھے۔

ادبیات کی تکمیل آپ نے دینہ منورہ کے مراد ب مراد الشیخ آغدی علی اللیل براہ جزیرۃ الشعلیہ سے فرمائی جو علامہ جلیلی اپنی ادبیت کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ دینہ منورہ میں اس وقت میں آپ نے ترقی و ترقی کی ۶ کتابیں اپنے مشفق استاد کرام سے پڑھیں۔ حضرت شیخ الہند جزیرۃ الشعلیہ کی جو خصوصیت اور تعلقی تھا۔ اس کا لفظ مندرجہ ذیل کتب سے پرکھا تھا۔ یہی حضرت شیخ نے حضرت شیخ السند سے پڑھا۔

دستور البلبندی، زرادی، زنجانی، مدراج الادراج، قال اقول، مرقاۃ، شرح تہذیب، تہذیب، قطبی، تصدیقات و عوارض، مجملی، مفید الطالبین، نفیۃ الیمن، مطول، ہارہ افروز، ترمذی شریف، بخاری شریف، البدو اور شریف، تفسیر بیضاوی، تہذیب الفکر، شرح عقائد فلسفی، حاشیہ خیالی، موطا امام مالک، موطا امام محمد، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اگر استاد اور شاگرد قابل ہوں تو استاد ایک دو کتابوں میں ہی شکر ادا کر دے گا۔ ساتھ ساتھ تربیت کر دیتا ہے۔ اور یہاں تو ۱۲ کتابیں شیخ الاسلام بننے والے اور اپنے وقت کے سب سے بڑے استاد انسان سے پڑھیں اور ساتھ ساتھ چھ سال شرف تلمذ حاصل کیا۔

تعلیم علم کے ساتھ ساتھ ہی آپ نے دینہ منورہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمادیا۔ شمال ۱۳۱۵ھ تک آپ کا درس امتیازی حیثیت سے لیکن ابتدائی درجہ ۱۳۱۵ھ میں مندرجہ ذیل تشریف لائے اور باوجود مجرمین ۱۳۱۶ھ میں دینہ منورہ واپس ماضی ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا حلقہ درس بہت وسیع ہو گیا۔ اور طلباء کی جمعیت بڑھنے لگی۔ اہل علم میں حدود و رقابت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ خصوصاً مدینہ منورہ میں کوئی ہندی نژاد عالم کا حلقہ درس وسیع ہو جائے تو اس پر اہل عرب رقابت قدرتی طور پر زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ کی طرف آنکھیں اٹھنے لگیں۔ انکا خیال تھا کہ ایک عجمی عالم زیادہ دیر ترقی نہ کر سکے گا۔ مگر ایک زمین میں استاد جس نے شیخ الہند اور لاناخیل احمد صاحب سہارنپوری جیسے کامل الفہم اور وحیدان مصر سے استفادہ کیا ہو۔ وہ کسی کے کب مات کھا سکتا۔ حدود و رقابت اور تنقید و جرح کے باوجود حضرت کے حلقہ درس میں ترقیع ہوتی گئی اور اس قدر توسیع ہوئی کہ مشرق وسطیٰ، افریقہ، چین، جزائر، مشرق وسطیٰ کے تہذیبی عالم آپ کی طرف کھینچے کھینچے چلے آئے۔ لگے۔ اور آپ کے زیر درس درسیات ہند کے علاوہ دینہ منورہ، مصر، استنبول کی کتابیں مثلاً

اجروہ، دہلان، کفرادی، الفیہ، ابن عقیل، شرح الغیہ ابن ہشام، شرح عقود الجہان، استعارات رسالہ وضعیہ، الاضاحیہ عند، بلعیت ابن عجم، فی البحر، در، شرح مجمع الجوامع للسیکی، شرح تصنیف الاصول، ورفاۃ، شرح فہمۃ الاصول، مساموہ شرح مساموہ، شرح طالع الارار، جہرہ، الفیہ الاصول (یث) بیوتیہ و دیگر کتب اصول حدیث وغیرہ اہل علم کی کتابیں ہیں۔

قدرت نے آپ کو راسخ و زکات وہ اعلیٰ درجہ عارف فرمایا تھا کہ جس کی نظیر آپ ہی تھے۔ نیز آپ کو کئی سنی تفسیر مطالعہ کے درجہ ملے تھے۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹوں میں صرف ۴ گھنٹے آرام کرتے اور بقیہ درس و مطالعہ و ذکر و اوراد میں گزارتے۔ آپ دوران درس اپنے سامنے کتاب کبھی نہ رکھتے تھے۔ بلکہ طالب علم کی قراءت کے دوران میں کتب پر غور فرماتے۔ حالانکہ علامہ دینہ منورہ میں کتاب کو دوران درس سامنے رکھتے۔ بلکہ اس کی شرح بھی اہل علم میں لے کر پڑھاتے تھے اور تقریباً وقت عبارت قرآن الہامی کی سناتے تھے۔ مگر حضرت سب بنائی کرتے تھے۔

اس طرح آپ نے روزانہ چودہ بندہ ہر سب کا درس دیا جس میں کتب عالیہ حدیث و تفسیر، عقائد و اصول بھی شامل تھی۔ ان وجہ کی بنا پر آپ کی درسے مجاہدین و صالحین کی تھیں اور یہ صرف مطالعہ و محنت کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ ساتھ ساتھ مجاہدہ و ریاضت اور ذکر و شغل بھی جاری تھا اور بغیر اسے من عمل سماع علم علمہ اللہ سبحانہ لا یعلم۔ دہرے چلے چلے کر آپ نے الشعلی اپنے خزانہ غامض سے ایسے علوم و عقائد نکالے جو کسی سے پڑھنے میں نہیں آتے، آپ کو علم لدنی عطا ہوا تھا۔ غور فرماتے ہیں کہ بنزل الراقی کی شب میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت خراب میں نصیب ہوئی۔ یہ سب سے پہلی زیارت تھی۔

”چونکہ بدن میں حرکت پیدا ہوتی تھی۔ اس لیے لوگوں کے مطلع ہونے کا خیال اس امر کے باعث ہرگز نہ ہوا نہ شہر قریب مسجد اجابت بعض افتادہ مجرموں کی جھلکیوں کی تڑپائی میں جب تک بھی گئے ذکر کیا کروں۔ چنانچہ اس حالت پر ایک زمانہ گزرا۔ اس اثنا میں جو روایات سے صلح اور حالتیں پیش آتی تھیں۔ لنگرہ شریف حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں بذریعہ کامیاب پیش کر رہا تھا۔ الطاف بیکان کے ساتھ ہمیشہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ جوابات میں مفید اشارات کے ساتھ احاطت فرماتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ جواب میں دیکھا کہ گیارہ حضرات اولیاء الدین سے تشریف لائے ہیں اور فرمایا کہ تم مجھ کو اجازت دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ جواب میں دیکھا کہ حضرت خراجہ ابراہیم اپنے ارجم رحمۃ اللہ علیہ ایک کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ ایک تہائی گھر کا غایت فرمایا اور کہا کہ باقی دو ٹکٹ دوسرے مشائخ طریقت کے ذریعے سے بچ کر دینے چاہیں گے۔ اس قسم کے بہت سے جواب دیکھے بالآخر جو پچیس ۱۹۵۱ء کے رمضان یا شوال میں کرامت نامہ میں پچاس بچہ خدایک مہینہ کے لیے گھر آنا چاہیے۔ اس پر حضرت والد صاحب مرحوم نے ارادہ فرمایا کہ مرنے والے لنگرہ شریف بھیجیں۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم کو وہاں کی حاضری کا بہت زیادہ شوق تھا۔ وہ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ میں خفیہ طریقہ پر بقصد حاضری لنگرہ شریف روانہ ہو گئے۔ اگرچہ حضرت والد صاحب کا مقصد یہ تھا کہ بعد از حج جب کہ قوافل (قافلے) ورنہ مسافر سے جہد واپس ہوں گے۔ اس وقت مجھ کو بھیجیں گے۔ مگر بھائی عیاض جب کی تنہائی کی بنا پر حکم فرمایا کہ تراجمی چلا جائے۔ بھائی صاحب حج قریب ہونے اور جہاز نہ ملنے پر کمر غلہ چلے گئے۔ چنانچہ ہم دونوں نعمت حج اور عمرے سے فیضیاب ہونے کے بعد جہاد واپس ہونے مگر دخانی جہازوں کا کارڈ زیادہ تھا جس کے ہم قافلہ بند ہو سکے تھے۔ بالآخر اوائل محرم ۱۳۱۰ھ میں باد بانی جہاز دلفرادہ اسقط جاہلہ الاملاہ جس نے تقریباً ساہیو کے بعد سٹاپ ہنچا یا اسقط سے ہفتہ میں دخانی جہاز کراچی جاتا تھا تقریباً ایک مہینہ قیام کرنے کے بعد وہاں آگیا۔ دو دو روپیہ فی ٹکٹ پر کراچی پہنچا ہوا اور جہاز اوائل ربیع الاول میں لنگرہ شریف کی حاضری نصیب ہوئی۔ اس اثنا میں کام راہ میں میرے مشاغل سلوک بار بار جاری رہے اور بظہار تعالیٰ روایات سے صلح اور مختلف احوال مار دہرتے رہے۔ لنگرہ شریف پہنچنے پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بہت زیادہ عنایات فرمائیں۔ والد صاحب مرحوم کے خطوط سے چونکہ حضرت کرپوری کیفیت معلوم ہو چکی تھی۔ اس لیے یہاں انتظار تھا۔

بھائی صاحب مرحوم مہارنپور سے بالا بالا حاضر خدمت ہونے اور میں نے عرض کیا کہ میں پہلے دیرندہ جاؤں گا۔ اور وہاں سے خدمت اقدس میں حاضر ہوں گا۔ بھائی صاحب مرحوم سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم دونوں کے لیے ہم نے ایک ایک جہاز کا ٹکٹ تیار کر رکھا ہے۔ گو حسین احمد کے حاضر ہونے کے بعد دو ٹکٹ چنانچہ جب میں دیرندہ سے رانا پور پیدل حاضر ہوا۔ تو وہ بڑے جرحہ اجمعی جدید تھے۔ ہر ایک کو عطا کئے گئے پھر کہ اس میں کرنا یا ماہ ٹوپی ہی تھی۔ اس لیے بھائی صاحب مرحوم نے عرض کیا کہ حضرت ہم دونوں اپنے اپنے عمارت لائے ہیں اور پیش کر دیتے ہیں۔ حجاب الخوجی میں دے دیں۔ فرمایا کہ اس کو بچھڑا کر دیا جائے گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کمال شہادت آفرینی شکل سلوک تلقین فرمایا۔ میں نے اپنے رویاں کو بکر راستہ میں دیکھے تھے۔ تنہائی میں پیش کیا جس میں سے ایک ریتھی کہیں حضرت قطب العالم حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں اور اس سے پہلے ایک مقدار مجرموں کی حضرت کے یہاں بطور دیر پیش کر چکا ہوں۔ تر

حضرت نے فرمایا کہ خود اگر ان کچھ روں کو تسلیم کر دے۔ میں نے عرض کیا، حضرت یکجہریں تو میں آپ کے لیے لایا ہوں میرے یہاں تراس کی دوکان ہے۔ حاجی صاحب نے فرمایا، نہیں میں جانتا ہوں کہ کن مشقتوں سے کچھریں حاصل ہوتی ہیں۔ ملائنگلنگ ہی قدس الشریف العزیز نے اس خواب کو سن کر فرمایا۔ حاجی صاحب قدس الشریف العزیز کے یہاں سے کچھ لرا اجازت ہوگئی۔ میرے یہاں سے بھی غریب ہوجائے گی۔

چونکہ اجازت و خلافت میرے گلن میں بھی نہ تھی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تراس کا خواست گار نہیں ہوں۔ اس پر غالباً سکوت فرمایا۔ بارگاہِ رشیدی کی حاضری میں بفضلہ تعالیٰ معنوی نعمتیں بہت حاصل رہیں۔ ایک شب پندرہ دن کے بعد۔ بعد شام میں حضرت کی کمر دیا رہا تھا۔ بین النعم والیقظ کی حالت ہوئی اور سنا کہ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھے چالیس دن بعد اجازت ہوگی۔ اس کے ٹھیک ۴۰ دن بعد حضرت نے بعد عرفہ فرمایا کہ اپنے علم سے کہہ بجائی نے دو ماہے حاضر تھے، حضرت نے ہر دو کو اپنے پاس بیٹھا کر اپنے دست مبارک سے باز دے۔ اس کے بعد بجائی صاحب نے فرمایا، جانتے ہو یہ کیسی دستار تھی؟ بجائی صاحب نے فرمایا۔ یہ دستار فضیلت تھی۔ فرمایا، نہیں یہ دستار خلافت تھی۔ تم دونوں کو مجھ سے اجازت ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ خدمت میں رہنا چاہا مگر بہت جلد افراقِ حجابی کی قربت آگئی۔ افسوس کہ اپنی تن پروری اور نفس پرستی ہمیشہ بریلانِ علی میں سہ راہ ہوتی رہی۔ جس کی بنا پر ناقص رہا۔ ورنہ اعمار الہیہ کے کبھی نکل نہ فرمایا اور نہ حضرت مرشدی قدس سرہ العزیز کی تہجیات اور حضرت شیخ الہند کی برکات کے افامند سے کوتاہی کی

سود گشت از محبہ و ارتباط پیشانیم
از تحکیم مقصود شد فہم حدیثہ،
چند خیر و تہمت دینِ اسلامی ہنیم
چونکہ دلائل و بیکار ہما ندیم

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں اگرچہ زیادہ رہنا نصیب ہوا مگر باوجود ان کی تہجیات کے اپنی نالائقیوں نے گل کھلائے میں کمی نہ کی۔ غرضیکہ میں اپنے اسلاف اور اکابر کرام کے لیے ننگ و عار ہی رہا اور حضرت اہلِ حبشہ اور دیگر مشائخ اہلِ طریق کا صحیح معنوں میں بدنام کر دیا۔ تاہم مجھ کو افضالِ خداوندی سے امیدیں ہیں کہ مثلِ بگ اصحابِ کجمت مجھ کو اپنے اولیائے کرام کے فیض سے مستفید ہو کر نیا مقدمہ غایتِ فرائض لگے اور اپنے بھائیوں سے امیدوار ہوں کہ دعوتِ ماحمد اور تہجیات و ہم سے اس رویہ کی مستگیری فرمائیں گے۔

والسلام

ننگِ اسلافِ حسین احمد غفرلہ

(از ملاحظہ طیبہ)

۱۔ مشکِ انور چھڑ کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشکِ بن جانا ہے ہر کافہ آہر میں سب

اسارتِ مالٹا اور حضرت شیخ الہند کی معیت

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تقریباً سو سال مسیحی بنی دریں حدیث دیتے رہے۔ تشنگانِ علوم دین ہزاروں کی تعداد میں اس چہرہ صافی سے سب

ہوئے۔ حرمین، بکد و عمار اور دیگر عمارات پر اب بھی آپ کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ دوسرے علاقہ پر اپنے علاقوں میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر دس حدیث دیتے ہیں۔ مگر حضرت مدنیؒ کی حدیث شریف حاصل ہوا کہ وہ قال صاحبؒ والقرآن صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر حدیث پڑھا کر کے مستحکم ہیں حضرت شیخ الحدیث جہاد شریفؒ نے لکھے۔ اور انکی۔ حج کے بعد واپس بریت میں حاضری دی۔ اسی سال حلال پاشا، انور شاہ رحمہم بھی دربار رسالت میں حاضری دینے آئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد شریف حسین نے انگریزوں کی شالہانہ اور فریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے خدام اور نظام کی معیت میں اس موقع پر ترکوں کی حمایت میں سرحدی قبائل کو آکر آگے کیا۔ انور پاشا اور کمال پاشا کو تشدد کار کی تشکیل میں کافی مدد پہنچائی۔ حاجی رنگ زئی رحمہم مولانا طہ الرحمن، مولانا فضل ربی، مولانا فضل محمود، مولانا محمد میاں عرف محمد منصور، مولانا عبداللہ شمس اور دیگر شخص سے اس موقع پر بہت کچھ کام لیا جاتا۔ مگر شیفٹ انیز بھی کسی اور ہی نقشہ کی تشکیل کر رہی تھی۔ اور عرب کی سلاطین است الٹ جانا قصائے برم بن چکا تھا۔ اور احرار مرغان کار کے لیے ابتلا و آزمائش کی نہی راہیں باز ہو رہی تھی۔ انگریزی جالیں کا سیاب ہو گئیں۔ شریف حسین کی حکومت نے ترکوں کے خلاف ”رجبار“ شروع کیا کہ رعایا سے قدامی لیے اور جب کہ پرانے ہیں ہوتا ہے کہ رعایا سے اعتماد کی چوٹھک پر جس سانی کر کے ہر سے حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ان کی مرضی کے مطابق فتویٰ دے دیتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہوا۔ ورنہ عمار و خوجہ کے علماء نے بلکہ ہندوستان کے بیشتر علماء نے ترکوں کے خلاف جنگ کو جائز قرار دیا۔ انگریز بہت قریب پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو گرفتار لایا جاتا تھے۔ بلکہ حضرت شیخ الہند کے وارث گرفتار کی چند داستان ہیں ان کی موجودگی میں جاری ہو چکے تھے۔ مگر بوجہ اس پر علماء کا مذہب رکھا اور حضرت شیخ الہند رحمہم میں داخل ہو گئے۔ اب وہاں شریف حسین کی حکومت ہی گرفتار کر سکتی تھی اور شریف حسین ان دنوں انگریز کی انگلیں پرتا چ رہا تھا۔ لیکن سرکاری حامد شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی یہ فتویٰ حاصل کرنے کے لیے گئے۔ حضرت شیخ نے انکار فرما دیا۔ اس پر کچھ سر علماء کا ایک فتویٰ دکھا لیا تو حضرت شیخ نے فرمایا کہ ان بندگان طبع و ذر کے فترے کو میں پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں دیتا اور اپنے پاؤں کے جوڑے سے ٹکڑا کر ہل کر گرفتاری کے لیے ایک بہانہ مطلوب تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمہم کے ان حضرات کے دفاع حضرت مدنی، مولانا خزنگیل اور دیگر ساتھیوں کے گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں بھیج دیا گیا۔ یہ حضرات وہاں تقریباً ساڑھے چار سال مقید رہے۔ ان حضرات کے فتویٰ و ذہد اور صبر و استقامت کا دوسرے قیدیوں پر بہت اچھا اثر پڑا کئی قیدی جرم تھے۔ وہ تو بندہ بے دامن بن گئے تھے۔ حضرت مدنیؒ نے زمانہ اسارت و زان پاک خط لکھا اور حضرت شیخ کے ساتھ شب و روز گزار کر کہند بن گئے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوران میں قرآن پاک کا ترجمہ مکمل کر لیا اور سورۃ مائدہ تک لکھی تحریر فرمائے۔ اور یہ ترجمہ قرآن پاک اپنی افادی حیثیت سے اپنی شل آپ ہے۔ شاید قدرت کو بھی منظور تھا کہ ان حضرات کی سیاسی و دینی مشاغل سے دور رکھ لکھیں اور بھیج دیا جاتے۔ تاکہ ترجمہ قرآن پاک مکمل ہو سکے کچھ سے مسلمان عالم تاقیامت مستفید ہوتے رہیں

حضرت مدنیؒ نے زمانہ اسارت حضرت استاد کی وہ خدمت کی کہ جس کی نظیر مثال ممکن نہیں۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ معمر اور دین تھے۔ ٹھنڈا پانی استعمال کرنے سے تکلیف ہوتی تھی اور مالٹا میں لٹکی سردی پڑتی ہے۔ مگر گرم پانی کہاں سے آئے۔ حضرت استاد کو گرم پانی مہیا کرنے کے لیے مولانا مدنیؒ انور و نبات سے فارغ ہوئے کے بعد برتن میں پانی ڈال کر پیٹ سے لگا کر ساری رات بیٹھے رہتے اور تھک کے وقت کمال ادب و احترام استاد محترم کی خدمت میں سپیش کر دیتے۔ بہت عرصہ کے بعد تکلیفیں جیل نے گرم پانی کا اہتمام کیا تو مولانا مدنیؒ کو استاد کی اس خدمت سے محروم ہو کر ہوا پڑا۔

نے فرمایا اس قرآن صلی اللہ علیہ وسلم

اس سلسلے میں اسیر مالٹا مستفید از حسین احمد مدنیؒ کے علاوہ جن کے عبادت گزار و معتمد مولانا محمد میاں اور شیخ خطا کی سازش و خیر گناہیں پڑی مابقی۔ ان میں حالات کی تفصیل ہے۔ یہاں تک کہ شرف نہیں۔ بہت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے۔ حالات یہ کہ بڑا گڑباج ہے۔

مولوی ہدایت الدین ابی جعفر خلیع سلطان لاہوی ہیں کہ میں نے حضرت مہدی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک دفعہ پوچھا کہ حضرت آپ سارھے چار سال حضرت کی خدمت میں رہے کہ آپ کی اس صحبت میں کوئی دوسرا حال ہونے والا نہیں تھا۔ آپ نے اس دوران میں بہت کچھ حاصل کیا جو اگر تائبیدیکو کر دیتے تو مری صاحب این نگاہ کچھ حاصل نہیں کر سکا۔ میں نے جو بار بار عرض کیا تو فرمایا کہ ان اتنا ضرور ہر آدمی کے لئے نیکو قرار پایا۔ اب جب خیال سر جاتا ہوں۔ اور جب وقت اٹھنا چاہوں۔ بیدار ہو جاتا ہوں۔ پانچ دس منٹ کے لیے بھی سو سکتا ہوں۔ ارادہ کروں اور نیند آجاتی ہے اور اس قدر کہ بہت سی نیند آجاتی ہے۔ حضرت مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہیں کہ کبھی جگہ گئے وہاں پانچ دس منٹ فرصت ملی سرگئے اور خود بخود اٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر حال نہ صرف نیند پر قابو پا کر اپنا استاد کی خدمت کر کے سے حاصل ہوا بلکہ معرفت کے وہ دریا ہمیں نہ گئے ہوتے تھے جس کا ایک جہہ بھی بے خود کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اسات مائے ربانی

بلاشبہ ۲۲ جمادی الثانی ۱۹۱۹ء کو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ اپنے خدام کے مائے ربانے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

میں ترکیبِ ملافات اور استعمالِ وطن شروع ہو چکی تھی، حضرت مدنی اپنے شیخِ محترم کی ہر کابئی میں ہندوستان

حکومت ترکیبِ ملافات سے پہلے دہلی علی بن شاہری تھی۔ اس کائنات پر چڑھا تھا۔ اس کے مالک محمود سے پل جوا جی کر کے ہر ایک جتنہ جسم کو دیوہ پ کے حق فر

نہیں کر لیا تھا، حجاز، عراق، مشرق اردن کے علیمہ و علمیدہ ٹھٹھے بنا کر بطاری آلیت میں دے دیتے گئے تھے، حضرت مدنی کے ترکیبِ آزادی ہند ملت

کے نقطہ نظر سے مالکِ اسلامی کی آزادی کا لہجہ ذرا بھی۔ اس لیے آپ نے یہ طریقہ جانا مفید نہیں سمجھا اور میں معروف کاہر گئے۔ جیسا کہ آپ کے علمی

اس فقرے سے وجہ اقامت ہند شرح ہوتی (واللہ اعلم) حسب الاداء الالہیۃ سافوت الی اقطالی (المدیار الہندیہ) آپ

کلیۃ الحق ارض مقدسہ سے آزادی چنکا پرانے کے کردار ہندوستان ہوتے اور کارکنانِ قضاہ قدر کے فیصلہ ازی کے مطابق حضرت شیخ الہند کی ترکیب

مشن کی کامیابی کا سہرا جی حضرت کے سر نہ جاتا، ان میں سرفہرست نام شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمۃ ہے۔

مولانا آزاد کے دارالعلوم کلکتہ کی صدارت

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پراپنے شیخ اور مرشد کی اطاعت کا وہی غلبہ ہے جو سلف و اہل علم کا ان حجروں کے ساتھ اور علامہ ابن قیم کا علامہ ابن تیمیہ کے ساتھ اور علی ہاشمی کا اپنے شیخ و مرشد کے ساتھ تھا۔ علامہ رسوم کو بڑا دھوکا ہوا کہ انھوں نے ماشائے تقنی اور حاضر باشی کا نام از ادب و محبت رکھا۔ حالانکہ از ادب و محبت کا معیار اطاعت و شجاعت ہے۔ یہ رضاء جہتی اور فریضی محبوب کے سامنے تسلیم و رضا کے برادوسری اور کوئی چیز نہیں ہے۔ شیخ الہند نے اپنے بھائے حضرت مدنی کو دارالعلوم کلکتہ کی صدارت سے اور رخصت کر کے وقت شیخ الہند سے حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑواپنے سر پر رکھا۔ انھوں سے لگایا۔ سینے سے چٹایا اور تمام بدن پر اس کو بوسہ دیا۔ اس وقت کاظمی اور نوجوان اسٹیوٹن کے زور و طاقت کے نزدیک عطار فیضی روحانی کی خاص صورت تھی جس کے شاگرد سلف سے متواتر ہیں۔ بہت ماضی میں شیخ نے جہاد بنا دیا اور جہاد جہاد کے لیے سب کچھ قربان کر چکے تھے۔ زندگی کے آخری لمحات میں اس سے جدائی درد انگریزوں کے ساتھ تھا۔ اس وقت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے تھوڑی سی تعلیق تھی جو دیر ہوتے تھے۔ جب شیخ الہند نے مار فرمایا یا توبہ عز کر کے جان چھڑائی کہ اس حالت میں جدائی شیخ سخت دردناک ہے۔ حالانکہ اسارت مالٹا میں اس مفادقت کو ختم دیشانی سے رباشت کر چکے تھے۔ بلاشبہ تروہ تھے کہ جہنم کے ذلت آمیز عذاب و جہاد کے خلاف وفات جان بچائی تھی یہ واقعات و حضرت شیخ الہند کی جانشینی کی غمازی کر سکتے ہیں۔ بکائنات میں آپ کے سوا کسی اور پر یہ غضب نہ صادق آیا اور نہ ان کا بچا ہے۔ یہ سب کے سب کربا رہیں۔ اصل محبت اطاعت و وفا کی تھی جس سے بچنا پھر آپ کی عبادت و زندگی، خلوص، ابتداء، صداقت، حق پرستی، فرائض و سگی، ملیتی، زبان و ناکارسی اور آپ کا علم و عمل، زہد و تقویٰ وغیرہ ایسے اوصاف و کمال تھے کہ بزرگ شیخ الہند سے تسلیق رکھتے ہیں۔ انھوں نے حضرت مدنی کو حقیقی میں قرار دیا ہے۔ "یہ رتبہ بلند باجس کو مل گیا" عربی شاعر کہتا ہے۔

بِعَنْدِ لَا يَجِدُ كُلَّ مَنُجِدٍ ۖ وَمَا جَدَّ بِلَا مُنْجِدٍ يَنْجِي

ہر طرح کی بزرگی کو بیش سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ اس کے باپ دادا بزرگ تھے۔ اور نہ کوئی دادا بزرگی کے بغیر دادا بننے کے قابل ہے۔

صدارت دارالعلوم دیوبند شیخ الحدیث
دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت اور منصب شیخ الحدیث ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس کے سامنے دنیا کی تمام وجاہتیں اور اعزازات ختم ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جب رکھی گئی تو خدا جانے روئساعت کتنی سعادت تھی اور بانیان دارالعلوم کا کتنا خلوص تھا کہ دارالعلوم کی منصب صدارت پر اور منصب شیخ الحدیث پر جو حضرات فائز ہوئے نہ ہوئے۔ وہ علم و عمل اور دین و دنیا کے کردار کے لحاظ سے عالم اسلام کے ممتاز ترین اور منتخب روزگار انسان ثابت ہوئے۔ ان کی سیرت و کردار اور علمی و عملی شان کو دیکھ کر سبے اقتدار یافتہ صالحین کی یاد تازہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن اعلیٰ میں پہنچ گئے ہیں۔ پہلے صدر مدرس حضرت مولانا محمد عقیق نالوتوی تھے تو دوسرے شیخ الحدیث ان کے بعد علامہ انور شاہ محدث شریعی کی بارہی آئی تو ان کے بعد قعدہ خاں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی پڑھا۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے وقت کے جامع الصفات انسان تھے۔ ان کے علم و تحقیق کو دیکھ کر جہاں غزالی و رازسی یاد آتے ہیں۔ وہاں زہد و تقویٰ کو دیکھ کر احمد بن حنبلؒ کا زہد و تقویٰ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ سلوک و قہر میں حنیفہ و بنیہؒ نظر آتے ہیں۔ عہد و دینا میں سیاح شہید حضرت الشیخ علیؒ کی یاد آتے ہیں۔ غرضیکہ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کا سلسلہ ایسے یکا دو روزگار اور اہل دہا جو جامع الصفات تھے اور مختلف الانواع کمالات رکھتے تھے۔

۱۳۲۵ھ میں ایک اجلاس میں دارالعلوم کی ترقی پر غور و خوض ہوا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد قاری محوط صاحب) نے حضرت شیخ الانور رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ اگر مولوی انور شاہ صاحب کشری، مولوی مسرور بیگلمچری، مولوی سید حسین احمد مدنی، مولوی عبدالصکرات پوری وغیرہ حضرات یہاں اگر جمع ہو جائے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پایے پہنچتی۔ حضرت شیخ الحدیث نے یہ بات بہت پسند فرمائی۔ اگرچہ اس بارے میں حکومت فرمایا لیکن نہ جانے کیا باطنی تصرف کیا کہ یہ سب انھیں اجلاس کے لیے بلا کر جمع ہو گئے۔

پھر یکوہ بدر فیاض کو حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرے وقت غلیظ الشان کام لینا تھا۔ لہذا آپ مستقل طور پر اتہار میں دارالعلوم سے متعلق ذمہ سنبھالنے چاہتے تھے۔ جب حافظ محمد احمد و شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خواہش کے برابر کرنے کا وقت آیا تو خداوند قدوس نے ۱۹۲۵ء میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کو دارالعلوم دیوبند کی رفیع منصب پر مستقل طور پر جلوہ افروز فرمایا اور دارالعلوم دیوبند نے آپ کی سرپرستی و صدارت میں جو علمی ترقی کی ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ دارالعلوم کی منظر پر دوسرے اکابر علماء و محدثین عظام جلوہ افروز ہوئے اور اس دور میں بھی دارالعلوم کے دارالحدیث میں حدیث کی شمع روشن ہوئی اور اس پر جان نثار پڑائے آئے اور اہل علم نے اپنی شام حدیث پر شہر کی لیکن غور کیا کہ اس مدنی محدث نے جب شیعہ حدیث روشن کی تو اس پر اس قدر پروانوں کا جہیز ہوا۔ اور حدیث علم و فہم کے کتابک ستاروں سے اس قدر چمکا گیا کہ دارالحدیث کی تاریخ میں اس کی نظیر ملتی نہیں۔

دارالعلوم نے اپنی مدت ۹۴ سال میں جو فضلاء پیدا کئے ان کی تعداد (۶۹۳۰) ہے۔ اس میں سے (۲۰۵۶) صرف مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ باقی (۴۸۷۴) دیگر مشائخ و جہم الشہر کے برہنہ کاک و ہند کا شاہیدی کوئی ضلع ایسا ہوگا۔ جہاں پانچ سو جید علماء حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد و مروجہ ہیں۔

۱۳۴۶ء سے قبل آپ نے دارالعلوم دیوبند میں مختلف اوقات میں متعدد دروچی کتابوں کا درس دیا اور ہزاروں تالکان علوم کو مسرور کیا لیکن ۱۳۴۶ء سے آپ نے مستقل طور پر درس حدیث ہی دیا۔ ۳۲ سال کا یہ عہد دارالعلوم میں علوم شریعی کی عداوت میں گزارا آپ

نے صحاح ستہ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۵۶ھ) کی صحیح بخاری اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۷۹ھ) کی سنن ترمذی، دو کتابوں کو اپنے لئے منتخب فرمایا۔ صحیح بخاری کی وجہ انتخاب تو ظاہر ہے کہ وہ بالاتفاق اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ رہا سنن ترمذی کا انتخاب تو ان کی کتاب کی چند خصوصیات ہیں جو بقیہ کتب صحاح ستہ میں نہیں۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ روایت کو بیان کرنے کے بعد اس کے درجہ کو ذکر کرتے ہیں یعنی صحیح حسن غریب وغیرہ اور اس کے خصوصیات سنن ترمذی۔ سلسلہ میں جرح و تعدیل کرتے ہیں۔ اگر کسی راوی میں کوئی ضعف ہے تو اس کو ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث میں اگر کوئی نا دروغیب الاستعمال آتا ہے تو اس کے معانی کو ذکر فرماتے ہیں۔ تعارض روایات کو ذکر کرتے ہیں۔ اگر روایات میں الفاظ فقہیہ ہوں تو نا غیب اور لغو کو ذکر کرتے ہیں۔ پھر کتب ترجیح دیتے ہیں۔ اگر کوئی راوی کیفیت کے ساتھ حدیث ہے تو اس کا نام ذکر کرتے ہیں۔ اس کے قابل ذکر ذکر کرتے ہیں۔ وجہ استدلال کو ذکر کرتے ہیں اور کتب میں مکررات بہت کم ہیں۔ آخر میں کتاب الطل ہے جو بخیر ترمذی میں منافع بہت زیادہ ہیں اور اس کی ترتیب الباب فقہ پر ہے۔ اس کے نزاع شافعی مالک علمائے ہنوف ہیں۔ اس وجہ سے ان روایات پر جو بظاہر ہنوفی مذہب کے خلاف ہیں مکمل بحث کرنا پڑتی ہے اور حدیث کو فقہی انداز سے فہم کے لیے سنن ترمذی علاوہ اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے سنن ترمذی کو بغیر کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے شیخ رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے اسباب میں اکثر ترمذی کو شامل کرتے تھے۔ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی لیے سنن ترمذی کا نام دیا ہے جس میں دس مکتبے۔

سلسلہ سند حدیث استاد صاحب شگردوں کو رکھتا ہے تو اس سلسلہ میں اپنی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچاتا ہے۔ جو تفسیر پاک و معجزہ
اساتذہ کا سلسلہ سند اور امام الحدیث شامی علیہ الرحمہ جرحۃ اللہ علیہ پنجم پہنچاتا ہے۔ وہاں سے امام بخاری ج۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶،

عمر الانام احمد بن محمد حسن درویشی عن محمد قاسم نازکی و رشید احمد گلگڑی عن شیخ عبدالغنی دہلوی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالغنی دہلوی
عن الانام احمد بن محمد حسن درویشی عن محمد قاسم نازکی و رشید احمد گلگڑی عن شیخ عبدالغنی دہلوی عن شاہ محمد اسحاق دہلوی عن شاہ عبدالغنی دہلوی

۱۰ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن عن مولانا محمد قاسم نانوتوی و مولانا رشید احمد گنگوہی و دونوں عن شیخ علی بنی، دہلوی و شیخ احمد سعید اہل
دہرانا صاحبی سہانپوری و قاسم عن شاہ محمد اسحاق دہلوی، عن شاہ عبدالغنی دہلوی عن شاہ ولی اللہ قدس اللہ اسرارہم
۱۱ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ محمود حسن و دیوبندی عن علامہ محمد مظہر نانوتوی و مولانا قاری محمد عبدالرحمن انصاری و دونوں عن شاہ محمد اسحاق اہل اللہ
آفرنگ۔

ع ۵ مولانا حسین احمد مدنی عن شیخ مولانا عبد الغنی و مولانا خلیل احمد سمانپوری دودھو عن مولانا رشید احمد گنگوہی و مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ
ع ۶ قال الشيخ الاجل السیاحین احمد مدنی عن شیخ التقی حبيب الله الشافعی المکی و مولانا عبد الجلیل برادر و مولانا عبد السلام داغستانی فی مناقب
ملزمہ منورہ و مولانا سید احمد رنجی مفتی الشافعیہ مدینہ منورہ رحمہم اللہ اجمعین۔

ماس الحنبلیین حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نور اللہ مرقدی سے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ و امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ ارشد شاہزاد

۷ کتاب میں کسی دوسری جگہ نہایت کم ذکر نہیں ہوا۔ اکثر علماء و روایت کی سند بھی ہے۔

معروف ہیں۔ اور کتب مذکورہ میں طبع ہر کتابچہ اور اس سے الگ سلسلہ سند روایت میں مذکور ہوتا ہے۔ اس طرح حضرت مدنی پانچ طریقوں سے اپنا سلسلہ سند نبوی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہنچاتے تھے۔ اور ان سلسلہ سند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہوتا ہے۔

علوم کتاب و سنت کے عظیم الشان آکابر ہیں جن کی رعایت کرنا ہر معلم کو ضروری ہے چنانچہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ ان تمام آداب کی مکمل رعایت فرماتے۔ محقق طرز پر چنانچہ پیشین کی جاتی ہیں۔

رعایت آداب علوم نبویہ

آپ کا مقصد علوم نبویہ سے شہرت، عزت و جاہ و احترام نہ تھا۔ بلکہ آپ کا مقصد فقط جناب باری تعالیٰ کا اقتبال اور روزِ شہدائی تھا۔ نیز آپ چاہتے تھے کہ علوم نبویہ کی نشر و اشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہو تاکہ امت میں علماء زیادہ تعداد میں پیدا ہوں اور جہلاء کی تعداد کم ہو۔ اللہ کے بندوں کو راہِ راست پر لایا جائے اور دین الہی و سنت نبوی کی خدمت کی جائے۔

دوسری چیز معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلم دو طریقہ اپنے شاگردوں کے ساتھ اختیار کرے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپ اپنے شاگردوں کے ساتھ اس قدر شفقت و محبت سے پیش آتے تھے کہ کوئی غلطی یا مشکل ہو۔

تیسری چیز معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے متعلمین سے کبھی معاوضہ و اجر کا طالب نہ ہو۔ صحابہ اہل اللہ تعالیٰ۔ قتل لا استلکم علیہ احد۔ اسد خیمہ اکبر دیکھئے۔ میں تم سے کبھی معاوضہ و اجر کا طالب نہیں ہوں، چنانچہ آپ نے مدتِ العمر اپنے کسی شاگرد کے کسی قسم کا طمع اور اللچ نہ کیا۔ ان بعدی الہ علی اللہ۔ پرنال پر بار ہے۔

چوتھی چیز ضروری ہے کہ اپنے شاگردوں کو اخلاقِ حسنہ کی جانب رغبت دلائے اور برائیاں سے بچنے کی تاکید کرے۔ چنانچہ آپ درس میں ہمیشہ سنجی کے ساتھ ان دونوں باتوں کا ملحوظ رکھتے تھے۔ اگر کبھی ضرورت پڑتی تو قریشِ لہجہ میں اور انعمت و بقی عن الحکر فرماتے۔ ایک طرف تو شاگردوں پر شفقت کا یہ عالم کہ ان کے جوتے تک سیدھے کرتے۔ دوسری طرف اگر کوئی خلافِ شرع اور اس سے سرزد ہو جائے تو بھر عدل و انصاف کا ماسن اہل سے دھڑکتا۔

پانچویں چیز ضروری ہے کہ شاگردوں کو غلطہِ حسنہ کے ذریعہ سے نصیحت کرے چنانچہ آپ ہمیشہ غلطہِ الحسنہ ہی فرماتے تھے۔ نیز سبھی ضروری ہے کہ معلم متعلمین کی قوتِ اذہان کے موافق علوم بیان کرے جس قدر کہ وہ عقل کر سکیں چنانچہ آپ حکمِ آفاتے نامدار انا معشر الانسب یاہ اسرا ان ننزل الناس منازلہم ونسکلم الناس بقدر علومہم پر پوری طرح عمل فرماتے تھے۔

نیز سب سے زیادہ ضروری اور اشد ہے کہ معلم کے قول و فعل میں مطابقت ہو۔ دوسروں کو جس کی تعلیم دے تو پہلے خود اس پر عمل ہو۔ آپ کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی طرفان لم اتفعلون کیوں کہتے ہو چڑھ کر تے نہیں۔ اور آفاتے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گامی کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جس کے علم نے اسے نفع نہیں دیا۔ نیز قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت اس آدمی کو ہوگی کہ جس کے علم کے سبب دوسرے لوگ جنت میں داخل ہو جائیں اور یہ اس پر عمل نہ کر سکے کی بنا پر دوزخ میں ڈالا جائے۔ ہمیشہ یہ بات یاد رکھنا کہ آپ کے قول و فعل میں اعلیٰ درجہ کی مطابقت تھی۔ آپ کا کل تشریفِ شریف تھا جس کو دنیا سے دیکھا۔ آپ کی زندگی ایک کھلی کتاب کے مانند دنیا کے سامنے ہے۔ کسی قول و فعل میں مخالفت نہیں پایا۔

علوم نبویہ کی نشر و اشاعت کو نیز اس کے لیے یہ بھی بے حد ضروری ہے کہ وہ دوسرے اہل علم کا احترام کرے اور سلفِ صالحین سے عقیدت رکھے اور اہل فکر کی تکرار کرے چنانچہ آپ پوری زندگی اس پر عمل فرماتے رہے۔

درس کے وقت شمع، ہنرل نہ ہوتا بلکہ علم، وقار و رفعت اور عداوت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ درس میں ہمیشہ با وضو رہتے اور خنجر استعمال فرماتے تھے متعلمین سے دراز درس بلکہ محکماتہ خطاب فرماتے اور کبھی حدیث نبوی۔ انہما انہما کم مثل الوالد لولد ۶۔ میں تمہارے لیے شب

والد کے ہیں۔ انتہائی شفقت سے پیش آتے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ دارالحديث میں ایک شیعہ باپ اپنی اولاد سے مخاطب ہے۔ دورانِ درس لطیف بھی فرماتے۔ لیکن اس کے باوجود دارالحديث میں مکوت و سکون تھا۔ اہل طلبہ اس طرح ہمدردی سے متوجہ ہو کر بیٹھے گئے کہ سرور پروردگار سے بیٹھے ہیں۔ درس کی احادیث میں جب آپ تلاوت حدیث کرتے تو اس سے پہلے یہ خطبہ سن کر پڑھتے تھے۔

طریقہ درس

الحمد لله حمداً ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونستوكل عليه
ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله
فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله
وحدوه ونشهد ان سيدنا ومولانا محمداً عبده ورسوله اما
بعد فان اصدق الحديث كتاب الله واحسن الهدى هدى محمد
صلى الله عليه وسلم وشر الامور محدثاتها وکل محدثه بدعة
وکل بدعة ضلالة وکل ضلالة في النار۔

قرآن حدیث کے بعد اسناد حدیث کے متعلق تحقیق فرماتے۔ راویوں پر فن اسرار الرجال کی حیثیت سے بحث فرماتے اور جرح و تعدیل کرتے۔ مناسب موقع پر رواد کے حالات بیان فرماتے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں سے اگر کسی کا نام آتا تو ان کی خصوصیات ذکر فرماتے۔ اس کے بعد متن حدیث کا معنی اس طرح سمجھاتے کہ اچھی طرح سے ذہن نشین ہو جائے۔ حدیث میں جو شکل الفاظ آتے۔ ان کی لغوی تحقیق فرماتے۔ حدیث کے مراتب صحیح و غیرہ بیان فرماتے۔ پھر اگر کوئی اعتراض وارد ہوتا تو اس کی وضاحت فرما کر چند قوی اور مستند جواب دیتے۔ تعارض حدیث کو اس طرح دور فرماتے کہ یقین کرنا پڑتا کہ ان میں کبھی اختلاف نہ پایا گیا۔ ہر حدیث کا صحیح اور عمدہ محل بیان فرماتے۔ اگر کوئی حدیث کسی جگہ متفقہ آتی تو دور سری جگہ تفصیل آتی ہے۔ وہ بیان فرماتے۔ تراکیب و تخریج، تفسیر، مقامات، خطبات، کتب۔ فن حدیث کی اصطلاحات کی تشریح، علل احکام، امور شرعیہ کے عقلی و مشاہداتی دلائل، صحابی کی احادیث، مریہ کی تعبیر، وجہ تخریج، مذاہب اربعہ و دیگر علوم و فنون کی اصطلاحات کی تشریح، احادیث فسر و تخریج کی مکمل بحث، فرضیت احکام کی تخریج و نشان نزول، فرق حق و باطلہ کے آثار، کئی تشریح مع دلائل، تفسیر آیات، تشریح معجزات، مستند قصص انبیاء۔ ابحاث متعلقہ ایان، دہشتیہ سرگزشتی، عصمت انبیاء، احوال ائمہ حدیث و تخریج مع دلائل بہا و محشون۔ اثبات قدرۃ البیہ۔ احادیث کے عنوان سے تحت عنوان احادیث کی مطابقت شعب ایان و غیرہ کو مفصل بیان فرماتے۔ اگر کوئی حدیث متعلق آتی تو تفسیر حدیث کے بعد اختلافات ائمہ بیان فرماتے اور ہر امام کے جملہ دلائل بالتفصیل بیان فرماتے اور سب سے آخر میں مذہب حنفی کو قوی دلائل سے مزین فرماتے اور دلائل کو مدحوالہ جات بیان کرتے اور دیگر ائمہ کے دلائل کے چند قوی جوابات دے کر مذہب حنفی کو حدیث سے مطابق فرماتے تھے۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا کہ حنفی مذہب احادیث بنیہ کے بالکل مطابق ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو فقہ فی الدین میں دستگاہ کابل حاصل ہے۔

مراتب صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہ، حدیث، مذاہب محدثین، اسمی محدثین، روایت حدیث کے مساکن و ارطان، النساب محدثین، کتب صحابہ و تابعین و انسابہم، قبائل رواد، محدثین کی عمریں، ان کی ولادت و وفات، الغائب فی الانساب، زیادۃ الفاظ فقہیہ زیادہ راد، اولاد صحابہ، علل حدیث رواد، شاذ، الفاظ غریبہ کی تشریح، طبقات محدثین، ذکر تبعین، مغازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ جملہ لازم درس حدیث کا آپ دورانِ درس فرماتے تھے۔ نیز یہ کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا درس حدیث کتاب و سنت اور اس کے پورے متعلقہ علوم و فنون پر مبنی ہوتا تھا۔

شہد دران درس جب کسی نئی کا اسم لگائی کہ آنقر علیہ و علیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام فرماتے اور اگر کسی صحابی کا نام نہ تھا کہ آنقر رضی اللہ عنہ اور خصوصیات درس اگر نہ بدایت میں دوسرے اکابر کے ساتھ آنقر رضی اللہ عنہ، وغیرہ فرماتے اور اگر نہ مذہب علماء و اولیاء سلف کا نام آنقر نہ ہوتا تو ہم کہ وہ اہل سلف و الجماعت سے ہوں۔ اس پر پابندی سے خود بھی عمل فرماتے اور طلبہ کو بھی تاکید فرماتے تھے۔

دورانِ درس طلباء جس قدر بھی سوالات کرتے۔ آپ ان کے تعلقاً بخیر جوابات عنایت فرماتے۔ حالانکہ وہ زمانہ اوقاتِ درس کا ایک کئیتر حصہ ایسے صرف ہوتا تھا۔ ان سوالات میں درس سے غیر متعلق سوالات بھی ہوتے تھے۔ مگر آپ نہایت بخیر پیشانی کے ساتھ جواب دیتے اس سے یہ مفید ہوتا تھا کہ مستقبلین کو مسائل کا محاذ ذہن نشین رہ جائیں اور کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے۔ سوالات و جوابات کا یہ طویلانی سلسلہ آپ کے درس کے علاوہ اور کبھی درس میں نہیں ہوتا تھا۔

یہ کسی موقع پر اگر استہباب و کلام عرب کی ضرورت واقع ہوتی تو کتب متعدد اشعار اور بے شمار عبارتیں کتب لغت کی بلا تکلف بیان فرماتے۔ اس قصہ پر پرہیزگار ہوتا تھا کہ لغت و ادب کی کتابیں کبھی ہوتی ہیں اور بلا تکلف انکو پڑھتے جا رہے ہیں۔

یہ کلمہ بالکتاب بعد کتاب التبیح بخاری شریف کے ختم کے موقع پر جب آپ اپنے مخصوص لہجہ میں آخری حدیث حدیثنا احمد بن اشکاب قال حدیثنا محمد بن فضیل عن عمار بن القعقاع عن ابی زریعة عن ابی ہریرۃ (رضی اللہ عنہم) قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلنسان جیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی السیزان سبحان اللہ وجمعا سبحان اللہ العظیم کی تلاوت شروع فرماتے تو قلب پر رقت طاری ہونے لگتے تھے اور آپ حاضرین پر روحانی توجہ فرماتے تو تمام لوگ زار و قطار روئے لگتے تھے اور دل کانپ جاتے تھے اور لوگ توبہ و استغفار اس طرح سے کرتے تھے گویا کہ دربار خداوندی میں حاضر میں اور روزِ کر اپنے گناہوں سے معافی پانا رہے ہیں اور اس موقع پر جو دعا مانگی جاتی تھی۔

انہیں لشکر، دل مضطرب، زبان لعل خرازی ہوئی، روئے نگار و کائنات پر غرض چہرہ ہوا ہی ہے آپ کی طرح مرطبتاً تھا اور توبہ و استغفار اور دعا کرتا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ اس کا ہمان کس طرح سے کیا جاتے۔ اس کے اظہار کے لیے الفاظ کہاں سے لائے جاتیں۔

خدا گواہ ہے کہ دارالعلوم کے ہر دور میں بخاری ختم ہوئی۔ مگر اس انداز کا ختم بخاری کہاں۔ دارالعلوم کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا ممکن نہیں۔ روحانیت کا یہ علم الشان منظر شیخ الاسلام قدس الشرفہ کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آپ کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا۔

۵۔ دورانِ درسِ امیرِ المعروف، نبیِ علیہ السلام، اعتقادِ بالکتاب والسنۃ کی تلقین بہیشت فرماتے۔ متعلمین کے عقائد، اخلاق، اعمال کی اصلاح کے جوہرِ اخلاقیہ ان کے حضور ہی بہتے۔ سب کی تلقین فرماتے۔

شیخ الاسلام اور تحریک آزادی ہند

فنگی اقتدار سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کئی سوسال سے مسلمان بادشاہ اس ملک کے نظم و نسق پر بلا شرکت غیر سے قاضی چلے آ رہے تھے۔ انگریز کے اقتدار کے شروع ہی میں انگریزی حکومت کے خلاف علمی اور عملی جدوجہد مسلمانوں نے ہی شروع کی۔ یہ تاریخی حالات تفصیل طلب ہیں اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس جدوجہد آزادی میں سب سے نمایاں کردار علمائے حق نے ادا کیا اور گزشتہ دو صد سالہ تحریکات آزادی کا اگرچہ مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ ان تمام تحریکوں کی حیثیت اور قیادت علمائے حق نے ہی کی۔ اگرچہ بعض امار و دوسرا اور غلام بھی اس میں حصہ لیتے رہے۔ تاہم یہ اثرات بھی علمائے حق کی جدوجہد کا پتھر تھے۔ علمائے دینی سامراج کے خلاف کام کرنے کا دوسرا فرض عائد ہوا تھا۔ ایک کتاب، دست کے عالم ہونے کی حیثیت سے۔ دوسرا ہندوستانی اور

محب وطن ہونے کی حیثیت سے۔ اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بلکہ جہاں کہیں بھی مسلمان بستے ہیں مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی مشکلات کا علاج علم و حضرات نے کیا کہ علماء کسی خاص نسل یا خاص ملک کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے پیدا کئے گئے ہیں۔ حالین و کان اور مجاہدین نے و کان کی روشنی میں انسانیت کی فیطرتی تسمیر کو منسوخ کیا ہے اور تنگ خیالی کے طلسم کو توڑ کر فرض شناسی کے ایک وسیع عالم کی راہیں کھول دی ہیں۔ سچ سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ امام الوضیف رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ ثانی، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، احمدین، اپنے زمانے میں نہ صرف علم و فضل کے امام رہے۔ بلکہ دینی سیاست کے مقتدیات کے مطابق دنیا کی رہنمائی اور جہوں سے نکل کر سیدالانوں کی حادہ چمائی و نہر نکال انکا اہم کارنامہ ہے۔ قاضی البرہت رحمۃ اللہ علیہ کا دربار رشیدی میں ہونا اور امام نہری کا عبد اللہ کے زمانہ سے لے کر یزید بن عبد اللہ کے حکومت تک عبد اللہ کے دربار میں آنا شہر کی کاغذ پر دم کی طرف سفر کرنا علامہ ابن حرم کا پانچویں صدی میں وزارت کے باخیز کرنا داشت کرنا۔ یہ سب واقعات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ علامہ حق ہمیشہ سے عامۃ المسلمین کی سیاسی رہنمائی کرتے چلے آئے ہیں۔

مولانا حسین احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ابتدائے تعلیم ہی سے حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بن چکے تھے اور وہ انہیں اس پنج تربیت دے رہے تھے کہ وہ بڑے ہر کار مسلمان بن ہند کی قیادت کر سکیں۔ اس کے بعد مدینہ منورہ میں غربت و تنگ دستی تھے ان میں جفا کشی اور صبر و مہم پیدا کیا۔ مرشدوں کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کی خاص توجہ نے مزید صلاحیتیں۔ برہنہ برس مدینہ منورہ روئے اظہر کے پاس بیٹھ کر وصفت کے درس نے انکو مصفا کر دیا۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے خلعت و دستار خلافت بخش کر ان کو جہر قابل بنایا۔ اور آخر مرحوم شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں اسارت الہا نے بھی کسے لڑی کر دی۔ اب وہ صرف حضرت مولانا حسین احمد ندوی نہیں رہے تھے کہ کسی خاتما کے حجرے میں یا کسی مدرسہ مسجد کے گوشہ میں طوق تہائی میں اپنا وقت گزار دیں۔ وہ اپنے زمانہ کی تین مایہ ناز شخصیتوں کے پروردہ تھے کہ جن کے تعلق بلا خوف و ہرجا جاسکتا ہے کہ وہ تینوں اپنے زمانے کے سب سے بڑے مسلمان تھے۔ مولانا حسین احمد ندوی نے جبید وقت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کی نرم عرفان سے باور دینے سے سرشار ہوتے۔ قطب العالم مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی محفل ارشاد و ہدایت کے حدیث نشین قرار پائے اور شیخ الحدیث مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جیسے مجاہد اعظم کے قدوس میں بیٹھ کر جان بازی و سر فروشی کا سبق سیکھا۔ اب آپ بیک وقت بزم علم و عرفان کی شمع روشن۔ محفل ارشاد و ہدایت کے نشین، میدان خدمت و سیاست کے شہسوار، دائرہ تاریخ و اقتصاد کے مرکز، جامعہ شعر و ادب کے پیش رو و عرض علم و عمل کی سبل خزیروں سے آراستہ دست آپ کا وجود گرامی بن کر رہ گیا تھا۔ اس ابرکرم سے ہر طالب تحقیق بقدر استعداد فیض باب اور پر تشنگ کام معرفت بقدر ظرف و پیمانہ سیراب و شاداب پرتا تھا۔

جو ہر علم و صداقت کو ہر کھیت سے فن شب چراغ آگہی سوز و گداز انجمن

مشعل راہ طریقت شمع تہذیب کہن آبروئے بزم اسکان، عظمت خاک وطن

مرد میدان شجاعت پایاب عمل و ہوش

مشرقی خون شہیدان، سرفراز و سرفروش

پیکر زہد و تقدس جان نشین انبیا شان تقدیس اسام، ناموس دین مصطفیٰ

رہنمائے عالم اسلام، فخر ایشیاد یعنی مولانا حسین احمد اسیر مالٹا

جن کے اٹھتے ہی جبین حادثہ خوجھاگ گئی

ایک ساحل کے لیے بنیں دو عالم ترک گئی

اسارت والٹا سے رہائی کے بعد مسلمان ہندوستان کے سب سے مجرب قائد حضرت مولانا محمد حسن دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو کچھ پڑھی ، ہم نے سفقہ طور پر آپ شیخ السنہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد تمام خاندان تمام متعین ، تمام شاگردوں کا اس پر اتفاق تھا حضرت شیخ الہند کے خانشین مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں۔

اس زمانہ میں سیاسی تحریکات کا شباب تھا۔ لیڈروں کا شمار نہ تھا۔ مگر تمام سیاسی لیڈروں نے حضرت شیخ الحرم کو شیخ الہند کا خانشین تسلیم کیا اور ہر اخبار حضرت مولانا مدنی کا نام شائع کرتا تھا تو آپ کے نام کے ساتھ خانشین شیخ الہند در لکھا تھا۔

چنانچہ آپ نے صحیح صحیح خانشین ہو نیکار پر اور اجرت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح نبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کی بھی اوجہ تھی۔ علامہ کی رہنمائی کے فرائض سر انجام دیتے گئے اور عدم تشدد کے راستے پہلے کچھ مدت برطانیہ کے ایک ملک دو قمر کی سیاسی تحریکات میں جوش ملی کر دے پھر نکلے گئے۔

اگرچہ اچھی ماٹا سے تشریف لائے ہرے چند ماہ ہی گزرے تھے۔ مگر یہ سرفروش رہنا اور کتاب و سنت کا ترخان پھر ملک و ملت کے لیے عظیم قربانی دینے کے لیے تیار تھا۔

مقدمہ کراچی

چنانچہ ۸، ۹، ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی خلافت کانفرنس ہوئی جس میں حضرت شیخ نے ایک تجویز پیش کی جس کا حاصل یہ تھا کہ

”گرزنٹ برطانیہ کی فروغ کی خلافت کرنا کسی کو سمجھتی کرنا ، کسی کو سمجھتی ہرے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی اعانت مگرنا سب حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فرجی مسلمان تک پہنچا دے“

شراک کانفرنس نے تجویز پسند کی اور اس کی ردی۔ نتیجہ ایسا ہوا کہ آئی۔ کٹائی شکل میں شائع ہوئی۔ غرض پورے ملک میں شور مچ گیا۔ ہر شخص کو یوں پر گیا کہ حضرت شیخ اور شراک نے کانفرنس گرفتار کیلئے جاتے گئے۔ مگر فوری گرفتاری میں نہ آئی۔

۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں گرفتاری کی افواہ پھیلی اور دہلی کے تمام لوگ مضطرب و بے چین ہو گئے۔ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ہم حضرت کو گرفتار نہیں ہرے دیں گے۔ بعد وہ ایک انگریز افسر پبل پولیس کے لے کر دہلی پہنچا اور شام کو حاکم ریگنہ اور مقامی تھانہ دار کو لے کر سول پولیس کے ساتھ نکلا۔ عوام کو فورا پرہیز چل گیا تا اہل اندہ ہرے اور لوگ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے دولت کے درپہن گئے۔ لوگوں میں انگریز افسر کے خلاف اتنا اشتعال پھیل گیا کہ وہ اس کو قتل کرنے پر تیار ہو گئے اور گاڑی افسر پر وارنٹ لے کر آئے تھے۔ مکتوں اور تھپڑوں سے حکم دیا۔ استے میں حضرت شیخ اور دوسرے ذمہ دار حضرات آگے اور انھوں نے شکل ہم افسروں کو کچا کر تہہ نہا میں بند کر دیا۔ لگا دیا۔ پولیس باہر تھی۔ گوان کو حکم دینے والے بند تھے۔ مجمع مطالبہ کر رہا تھا کہ انکو ہارے حوالے کر دو حضرت مدنی سلطان برٹش عوام کو پسند فیضیت کے سر وجام پلا کر جھنڈا لیا اور ان کو اس شرانگہ پر راضی کیا کہ پولیس اب رات کو گرفتار نہیں کریگی۔ بلکہ سب کو ہم خود خوشی اپنے یورپ تازہ مجلس کی شکل میں پیش کش کر دیں میں تمھارے گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور انگریز افسر نے یہ شرط اٹھان لیں اور لوگ رات کے گیا ہرے بچے منتشر ہو گئے۔

لیکن انگریز افسر نے سہارا پر اطلاع بھیج دی کہ دن میں مولانا مدنی گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ فورا گرا یا اگر کھافوج بھیج دی جائے تاکہ رات ہی رات انکو گرفتار کے دہندہ سے لے جایا جائے۔ روز قریب میں اتنا ڈانگلا ہو گیا کہ جس کی دوسری مثال نہیں ملے گی۔ چنانچہ سہارا پر سے رات ہی ایک سپیشل نہ گاڑی میں گرفتار کر لیا اور فرج بھیج گئی۔ سب ہی لوگوں کو تلقین تھا کہ رات کو ٹرپی فرج آئے گی۔ کچھ لوگ پہرہ دے نہ سہے تھے۔ غرض تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ فرج نے شہر کے اہم مقامات اور شاہراہوں روک دی ہیں اور حضرت شیخ کے مکان کا پورا محاصرہ کر لیا۔ حضرت شیخ گھر سے باہر تشریف لائے اور اپنے

آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۱ء سے خالق دنیا مال کراچی میں حضرت شیخ اور دوسرے شکار کافر نس کے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی اور حضرت شیخ نے عدالت کے دروبرو وہ تاریخی بیان دیا جو ہندوستان کی سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ میں مولانا آزاد کے قول فیصل کی طرح ایک عظیم مقام رکھتا ہے۔ اس بیان میں حضرت شیخ نے مولانا محمد علی جوہر کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”ہندوستان ایک مذہب پرست ملک ہے۔ یہاں کے باشندے مذہبی تعصب میں دوسرے ملکوں سے بہت آگے ہیں۔ اسی لیے ہندوستان کی حکومت کے لیے مذہب کی رعایت کو ٹھکانیت ضروری سمجھا گیا ہے۔ برطانیہ اور ملکہ وکٹوریہ نے اس کو راز سمجھا اور یقین جان لیا کہ ہندوستان میں امن کا نام رکھنا مذہبی آزادی پر مبنی ہے۔ اس لیے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے وہ اعلان شائع کیا گیا جس کا حوالہ مسٹر محمد علی نے دیا ہے جس میں مذہبی آزادی پوری پوری تسلیم کی گئی ہے۔ اس میں کچھ قسم کی غلط کسی وقت بھی جائز نہیں رکھی گئی۔ اس میں صاف کہا گیا ہے کہ کسی مذہبی کام کو روک دینا یا نہیں جانے گا۔ اسی وجہ سے اب تک امن و آمان قائم رہا ہے۔ میں اس اعلان پر بوجہ دلالت کے بعد اچھی شخصیت کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔“

میں وحشیانہ رکھتا ہوں۔ میری ایک حیثیت یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ میں عالم دین ہوں مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں قرآن کریم کے تمام محظوظوں، صرفوں اور کمالات پر پورا ایمان رکھوں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ احکام پر یقین رکھوں چنانچہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی بھی دنیاوی طاقت قرآن کریم کے کسی حرف یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی حکم سے کسی کو روک دے تو وہ ہرگز ہرگز نہ رکے جب کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے۔ تو اس کو قرآن کریم کے تمام احکام پر یقین کرنا اور مل کر نافذ کرنا ہوگا۔“

سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے قرآن پاک اور سنت رسول اللہ سے دلائل و براہین پیش کرتے ہوئے کہ ہر مسلمان پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت لازمی اور ضروری ہے اور یہ کہ ہر ایسی حکومت کی اطاعت نہیں کرنا چاہیے جو خدا اور رسول کی مخالفت کرتی ہو فرمایا۔

”میری حیثیت عالم اور مذہب اسلام کے لحاظ ہونے کی ہے۔ اس لیے میرا فرض ہے کہ میں اپنا فرض پورا کروں۔ یہ فرض ہر عالم پر فرض ہے کہ قرآن کریم اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام پر ہر شخص تک پہنچائے چنانچہ قرآن کریم کی کئی آیتیں پڑھ کر ترجمہ کر کے بتایا کہ خدا کا حکم ہے اور کہا۔

”مخیرہوں نے بعد علماء کا یہی طریقہ ہے۔ علماء کی بات پر کوئی توجہ کرے یا نہ کرے۔ علماء کافر ہیں۔“

”کہن بات لوگوں تک پہنچائیں۔“

حضرت شیخ نے فرمایا۔

کہ ”اب میں اس ریزولوشن کی طرف توجہ دلاتا چاہتا ہوں۔ قرآن شریف میں مٹائوں کے قتل کرنے کی مناز

جس قدر سخت ذکر کی گئی ہے۔ کفر کے بعد کسی گناہ کی اس قدر سخت سزا ذکر نہیں گئی۔ حضرت نے اس بگڑے
دس بارہ قرآنی آیات اور اسی قدر احادیث اس کی دلیل پیش کیں۔

اس مقام پر مجسٹریٹ نے حضرت شیخ سے کہا کہ اب بھی کچھ باقی ہے۔ میں نے آپ کا وعدہ خوب سن لیا۔ بس اب ختم کیجئے۔
حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے ٹوٹ بکھلے ہیں۔ ان کے متعلق عرض کر رہا ہوں اور یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ ریزولوشن خالص مذہبی ہے۔
مجسٹریٹ نے کہا کہ اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ آپ پر اقراران شریف سنا دیں۔

حضرت نے فرمایا کہ میرا بیان تو سننا پڑے گا اور بیان شروع کر دیا۔

بخاری شریف اور دیگر کتب صحاح سے کئی احادیث پڑھیں اور مطلب بیان فرمایا۔

ہاں میں جب کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام سامعین حضرت کا منہ تنک رہے تھے اور ہر آدمی کی زبان پڑھتا تھا! جبرائیل اللہ! یہ تیرا ہی کمال ہے کہ تو تلواریں
نے سامنے میں جی جی کی صدا بلند کر رہا ہے۔

مجسٹریٹ — میں نے بہت غور سے آپ کی تقریر سنی۔ اب ختم کر دیجئے۔

حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ میں نے ابھی خلافت اور ترک مولات کا مسئلہ نہیں چھیڑا۔ صرف فتویٰ کا ذکر کر رہا ہوں۔ پھر فرمایا کہ اچھا میں اپنا بیان جلد ہی
تکمیل کروں اور بیان شروع فرمادیا بہت سی حدیثیں پڑھ کر ثابت کیا کہ

”والمحکم فی فوج میں بھرتی ہونا، بھرتی کرنا، انگریز کی فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینا، انگریز کی فوج
کی امداد کرنا، یعنی جنگی قرضہ دینا سب حرام ہے“

سامعین حضرت والا کی تقریریں کر رہے تھے۔ ان دنیا والوں کو تو یقین تھا کہ حضرت اپنے بچنے کی فکر فرمائیں گے۔ اپنی تجویز کی تائید کریں گے۔ بڑے بڑے
لوگ حضرت شیخ الاسلام کی صفاتی میں کشیں کریں گے۔ مگر مکتب اسلامیہ کا عظیم فرزند اپنی بات کا کیا تھا۔ وطن کی تحلیل القدر شخصیت کی زبان سے جو بات نکلی تھی اس پر
باز تھا حضرت مولانا نہ صرف اپنی تجویز کا اقرار کر رہے تھے اور اسے مضبوط حکم بنا رہے تھے۔ حج امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کی سنت
کو زور کر رہا تھا۔

حضرت شیخ نے فرمایا۔

”یہ ریزولوشن کی نئی بات نہیں ہے مجسٹریٹ صاحب! ہمیشہ سے مذہب اسلام کا یہی فیصلہ ہے اور
اٹل ہے۔ اسے کوئی شائبہ نہیں سکتا۔ یہ ہمارے خدا اور رسول کا حکم ہے۔ اس کی اشاعت کر رہا ہوں
مذہب میں کھلی مداخلت ہے۔“

مجسٹریٹ نے کہا۔ اس کی اشاعت کا کیا یہی وقت تھا؟

حضرت والا نے فرمایا۔

”مجسٹریٹ صاحب! اس کی اشاعت کی اس وقت سخت ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مسلمانوں کی
موجودہ حالت کا یہی تقاضہ ہے جس طرح برصغیر کی سخت حالت دیکھ کر طیب دوا اور پرہیز میں سختی کرتا
ہے۔ بالکل اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی حالت کو گونا گونا گونا بہت جلد اس کو سنبھالنے

” دوسری وجہ یہ ہے کہ فتح بیت المقدس کے وقت مسٹر لارڈ متھرج وزیر اعظم انگلستان نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کے نام سے موسوم کیا ہے اور مشرور چلنے لگی اس کو صلیبی جنگ کہا ہے۔
آپ میں ایسی حالت میں صاف عافیتا ہوں کہ جو مسلمان عیسائیت کا ساتھ دے گا۔ وہ جہنم گنہگار نہ ہوگا بلکہ کافر ہو جائے گا۔“

یہ آخری فقرے سن کر لوگ دباؤں مار مار کر روتے تھے۔ بلا خوف عدالت، پولیس اور فوج خین احمد مدنی زندہ باد کے خوشے لگا رہے تھے اور شخص غلام یاسمان، بے چین و بے قرار نظر آ رہا تھا۔ عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے حضرت شیخ نے فرمایا۔

” اگر گورنمنٹ کا منشاء مذہب آزادی سلب کرنا ہے تو صاف صاف اعلان کرے کہ کد سات کروڑ مسلمان اس بات پر بخیر کرکس کہ ان کو مسلمان رہنا منظور ہے۔ یا گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا۔ اسی طرح ۲۲ کروڑ ہندو بھی سوچ لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ کیونکہ جب مذہبی آزادی چھینی جائے گی تو سب کی چھینی جائے گی۔ اگر لارڈ ریڈنگ اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ قرآن کریم کو جلا دیں، احادیث کو سٹا دیں اور کتب فقہ کو برباد کریں تو سب سے پہلے اسلام پر اپنی جان قربان کرنے والا ہیں ہوں۔“

مولانا محمد علی جوہر بھی اس مقدمہ میں ماخوذ تھے۔ اور اس وقت کورہ عدالت میں موجود تھے۔ اس موقع پر جب حضرت شیخ مدنی نے اپنی بے مثال کا منظرہ کیا تو انھوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر جا کر حضرت مدنی کے پاؤں پر چوم لیے۔

پیراجا حسین احمد از حجتہ استخوائی : کہ نائب استنبی دوم زکال بنی است

مختصر یہ کہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۳ء کو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی معروہ دوسرے رفقاء کے پیش سپرد کر دیئے سیشن میں ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۳ء سے مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو حضرت شیخ نے مسٹر کینیڈی جو برٹشٹیل کسٹرن ہندو کی عدالت میں مسلمان حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا۔

” جہت دار دما میں نے پیش کی ہے وہ قرار داؤ نہیں۔ بلکہ تمام مسلمانوں کا فرائض ہے اور مذہبی فرض ہے۔ یعنی خدا کے رسول کا حکم ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا لارڈ ریڈنگ کا کام نہیں۔ بلکہ عطا کا کام ہے۔
آج انگریز گورنمنٹ کی فوجی بھرتی اس لیے حرام ہے کہ مسلمانوں کو مسلمان کے مارنے کے لیے بھرتی کیا جا رہا ہے۔ عیسائیت اور اسلام کا مقابلہ ہے۔ قرآن شریف میں مسلمانوں کو قتل کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ مسلمان کے لیے مسلمان کو قتل کرنا حرام ہے۔ اس لیے یہ ملازمت بھی حرام ہے۔“

حضرت نے فرمایا۔

” ہم اس تحریر کو خدا اور خدا کے رسول کا حکم جانتے ہیں۔ ہم کی طرح مجرم نہیں ہیں۔ بلکہ بھاری یہ کمزوری ہے کہ ہم اب تک فوج میں جا کر خدا کا حکم بیان نہیں کر سکے۔

کسٹرن کینیڈی نے کہا بعض ملا جلتے ہیں کہ فوج کی فکری جائز ہے۔

حضرت شیخ پر انتہائی حلال کی کیفیت طاری ہو گئی اور فرمایا۔

”اگر کوئی مسلمان عالم دین ہیں احکامِ قرآنی کی تعمیل سے روکنے کا تو ہم اس کی بات بھی بزرگزمندی میں لے کر لیں گے کیونکہ ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے لَّا طَاعَةَ لِلْمَخْلُوقِ فِي مَعْصِيَةِ الْخَلْقِ۔
 رخصتی کی نافرمانی کر کے کبھی مخلوق کی اطاعت درست نہیں،

اس پر سرکاری وکیل اور جج نے کہا کہ تم تو ریاستِ ہند کے پابندی میں بہت تان و حدیث کر رہے ہو جانتے۔
 حضرت نے فرمایا۔ میں قرآن و حدیث کا پابند ہوں اور تمام مسلمانوں کو پابند بنانا چاہیے۔ بزرگزمندی۔
 ”میں اس بات پر خوش ہوں گا کہ لاڈلہ بیک اور لاڈلہ براج آج اس بات کا اعلان کریں کہ مسلمانوں کو قرآن اور حدیث پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ بات ہمارے لیے خوش آئند ہو گی اور ہندوستان چارہا کے بجائے دوامین آزاد ہو جائے گا اور گورنمنٹ برطانیہ کا پول کھل جائے گا۔

یوں ہی ۱۹۲۱ء کو فیصلہ پایا گیا۔ اسپیران اور جیری کے ارکان نے فرج میں بغاوت پھیلانے کی کسی فوجی کمانڈر سے باز رکھنے کے حرم سے بری قرار دیا اور جج نے بھی اتفاق کیا۔ البتہ زیر دفعہ ۵۵ اور ۱۹۱۹ء تقریرات ہند دو سال قید با مشقت کا حکم سنایا گیا۔ اور چند دن بعد حضرت کو ساہتی جیل میں بھیج دیا گیا۔

دوسری قید با مشقت کا ٹھکانے کے بعد اب رہائی کا وقت آیا۔ دیوبند میں استقبال کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ہر گھر میں عید کی سی خوشی تھی۔ مگر حضرت شیخ بیکری اطلاع کے مات کی تیارچی میں تنہا تشریف لے آئے۔ لوگوں میں جوش تھا۔ جلسوں نکالنے پر آمادہ تھا۔ لیکن حضرت شیخ نے فرمایا۔
 ”جلسوں کیسے کیا کیا برطانیہ کو ہم نے شکست دے دی۔ مجھے اپنی رہائی کی کوئی خوشی نہیں۔ بلکہ اس بات کا رنج ہے کہ برطانیہ جیسا دہم ہمارے کبھی شکست خوردہ لوگ بھی مجلس نکالا کرتے ہیں۔ ہم کو دہم وغیرہ وغیرہ“
 ان الفاظ کو سن کر لوگ بے رحم ہوئے اور چپ ہو گئے۔

اسی طرح ہندوستان کے دوسرے مقامات پر حضرت کی آمد پر جلسوں کے پروگرام بنائے گئے۔ مگر حضرت نے تمام کام سختی سے منع کر دیا کہ شیخ نمود و نمائش کی خاطر کوئی کام نہ کرتے تھے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد مولانا مدنی نے دیکھا کہ ملک حالتِ ابتر پہنچ چکا ہے۔ فرقہ وارانہ سیاست پر جان بڑھ رہی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو چکا تھا۔ چند دن پہلے ملک کے تمام باشندے ایک پلیٹ فارم پر جمع تھے اور متحد تھے۔ مگر آج سب جدا جدا ہو چکے تھے۔ انگریز حکومت جو عوام کے اتحاد سے کلنک پریشان تھی۔ آج بے حد مضبوط اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بڑے بڑے علمبردار فرقہ واریت میں مبتلا ہو چکے تھے اور انگریز کی ذلیل پالیسی کو آواز دے کر دہکامیابی سے چل رہی تھی۔ ملک کے بہت سے مقامات پر ہندو مسلم بے ہوش ہو رہے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے ملک کا اندازہ پوری طرح فرمایا اور کہا کہ جس جانب مسجدیں تقریر فرمائی جس میں وطن کی محبت تھی۔ آزادی کی لگن تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات تبلی رنج کے اثرات تھے۔ اتحاد کا پیام تھا۔ مگر ہندوستانی عوام انگریز کے جال میں پھنس گئے تھے۔ چنانچہ حضرت شیخ نے فرمایا۔

”یہ تمام تھے انگریز کے اشارے پر ہر ہرے ہیں بہت جلد اس جال سے نکلوا اور ملک کی آزادی کی جدوجہد کرو۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان تحریکات سے تم کو دور اور حکومت طاقتور ہو رہی ہے۔ تمہاری نا اتفاقیوں تم کو کدو صائب میں مبتلا کر دیں گی۔ اگر تم نا اتفاقی کے جال میں پھنسے رہے تو تم ہمیشہ غلام رہو گے اور پوری دنیا

ترک و ذلیل سمجھے گی۔

اس تقریر کے بعد حضرت شیخ نے غازیانہ انداز میں پورے ملک کا دورہ کیا اور عوام کے جلسوں میں پیشانی تقریریں کیں۔ مگر پورے ملک پر تحریک خلافت ناکامی کا گہرا اثر تھا۔ ملک کا پریلیٹریا پوری سے تنگ ہے۔ سباز کی طرف منظر ایک سنگ۔ باقاعدہ حضرت شیخ بھی بعض حالات سے متاثر تھے۔ قید کی شفقت کا بھی اثر تھا کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد بھی چنچہ پڑے ہوئے تھے اور قید بند کے مصائب کا اثر زائل نہ ہوا تھا۔ مگر ملک کے حالات کا تقاضہ تھا کہ آپ کو کنگاڈا میں حبیہ علامہ اجلاس کی صدارت کریں۔ حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح واضح تھی کہ حکومت برطانیہ پہلے سے زیادہ مضبوط اور سخت پرچی ہے۔ مگر کنگاڈا کے اجلاس میں حضرت شیخ نے ثابت کر دیا کہ شیر خیزی ہونے کے بعد بہت نہیں ہارتا۔ بلکہ ہر فرب کے بعد پہلے سے زیادہ بہادر اور دلیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس اجلاس کا آخر صدارت انتہائی عظمت ہے اور جس جرم پر دو سال کی سزا دی گئی تھی۔ اسی کو پوری قوت سے دہرایا گیا ہے۔

حضرت شیخ نے اپنے خطبہ صدارت میں اعلان فرمایا:-

اجلاس کو کنگاڈا کی صدارت دو برٹش گورنمنٹ کی ناپاک پالیسی، ہندوستانی فوجوں سے اپنی اغراض کے لیے تان

قوموں اور ان کے مارو دیار، مال و منال اور عزت و اکبر پر تہمت اڑا رہا ہے۔ انکو قتل کر داتی ہے۔ انکو

ہر طرح پائل کر دیتی ہے۔ اگر کوئی فوجی اس امر کو حلال جان کر کرے گا تو حسب احکام شریعت کا فرسوجا بیگا۔

اگر عوام جاننا براہین و بائبلاوی طبع کی وجہ سے اس کا منتخب ہوا ہے تو سخت گنہگار اور ناسیق ہو گا۔ وہ استحقاق

اس کا رکھتا ہے کہ نہ اس کی توبہ قبول ہو اور نہ اس کو کبھی دوزخ سے نکالا جائے۔ چنانچہ متعدد آیات بے

شمار احادیث اور فقہائے کرام کے اقوال موجود ہیں۔ مگر کچھ محاجات معاشیہ نامار ہندوستانی مسلمانوں کو

مجبور کرتی ہیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ان گناہوں میں مبتلا ہوں۔ اس لیے ان کے اوپر دلیرانہ وغیرہ کے ایمان

اور دین کی سلامتی نقطہ اسی صورت میں برکھی ہے کہ ہندوستان آزاد ہو۔

حضرت شیخ الاسلام نے مزید فرمایا:-

مزدوری اور فرض ہے کہ مذکورہ پالیسی کی بنیاد پر اس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا جائے اور ہر ممکن طریقے سے

اس کی عزت و شرکت کو کم اور اس کی قوت کو کم کیا جائے اور یہی اعلیٰ درجہ کی جنگ اس گورنمنٹ

کے ساتھ ہوگی۔ ہندوستان کی مکمل آزادی۔ سولاج انگلستان کی موت کے مترادف ہے۔

حضرت شیخ نے سوال فرمایا:-

”لیکن کیا یہ انگریزوں سے مقابلہ صرف مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لیے کیا جائے۔ یا صرف ہندوستانی

مسلمانوں کے مفاد کے لیے؟“

جواب میں نے خود ہی فرمایا:-

”نہیں۔ پورے ہندوستان کے لیے۔ مغرب کے مقابلہ میں تمام مشرق کے لیے یہ جنگ

ہونا چاہیے۔“

نہ صرف ہندوستان کی مکمل آزادی بلکہ

پورے ایشیا کی آزادی کا مطالبہ

حضرت شیخ نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا یہ اعلان دسمبر ۱۹۴۲ء کو کرنا شروع کیا۔ جمعیۃ العلماء نے ہند کے ہر طبقہ کی حمایت کرتے ہوئے اس وقت فرمایا جب تک بڑے سے بڑا ایڈیٹر ہوم رول قبول کرنے کے لیے قریب قریب تیار ہو گیا ہو۔ مگر حزب نے ملک کے ایڈیٹروں سے الگ ہندوستان کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ سال بعد اپنے لئے ہاؤس کے اجلاس میں کیا۔ مگر حضرت مدنی جرحۃ اللہ علیہ نے کہا کہ عزت ہی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اس میں بڑی شد و مد سے یہ لکھا جاتا ہے کہ اگرچہ اس نے

۱۹۶۶ء میں ہندوستان میں سائنس کمیشن آگیا کہ ہندوستان کی دستور کی حکومت کے لیے سفارشات کرے۔ مگر حضرت شیخ نے جگہ جگہ تقریریں کیں اور بتایا کہ دستور بننے پر ہندوستان کی حکومت کا اور نائنسٹ انگریز۔ اپنے دستور کو کسی طرح بند نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا سائنس کمیشن کا اپنا ٹیکاٹ کیا جائے۔ سائنس کمیشن کے ایکٹ کا سب سے پہلا اور بڑا پیر حضرت مدنی نے کیا۔ بالآخر کانگریس اور دوسری تمام جماعتوں کا بھی یہ فیصلہ ہو کر سائنس کمیشن کا ایکٹ کیا جائے اور ایکٹ کیا گیا۔ اس کے بعد ملک ایک جماعت بنی اور اس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا دستور حکومت ہندوستان میں ہی کو بنایا جائے۔ چنانچہ کانگریس اور دوسری جماعتوں نے مل کر ایک کمیٹی بنائی۔ ایک کانگریسی لال نہرو کو چاہا اور دیر نہرو کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی نے جو دستور حکومت بنایا وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر اس رپورٹ میں بھی ہندوستان کی مکمل آزادی کا قصور نہ تھا۔ اس لیے حضرت شیخ نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ دستور ناقص اور ناقابل عمل ہے۔ ہم مکمل آزادی کے لیے دستور کو نہیں مانیں گے اور کسی طرح مکمل آزادی سے کم پر واقعی نہیں گئے

باردا ایکٹ اور اس کی مخالفت

لارڈ ایکٹ اور اس کی مخالفت

ابھی مذکورہ بالا سیاسی کشمکش چل رہی تھی کہ برطانیہ نے ایک قانون ساز دا ایکٹ کے نام سے پاس کیا جس میں بنگال کے لیے عزم کی تجدید کر دی گئی تھی کہ اس سے کم عمر میں بنگال نہیں بنائے گا۔ چونکہ میرزا اسحاق تعلیمات کے مٹانی تھا۔ لہذا اس کے بارے میں حضرت برنی کی سرپرستی میں علانے فیصلہ کیا اس کو نافذ نہ ہونے دیا جائے۔ اور پورے سامیں اس کی مخالفت کی جائے۔ جو تیار ہندوستان میں آئی اور مول افغانی کا زیر اثر بن گیا اور پورے ملک میں علانے اس قانون کو بے اثر بنانے کے لیے مخالفت کر کے ہرے بے شمار چھوٹے چھوٹے بھجوں کے بکاح ٹپا ہوا اسیے اور جل جاسے پر لایا ہو گئے۔ چنانچہ لارڈ ایکٹ تھوڑے دنوں میں بے بنا ہوا گیا۔ چاہے بنگال ہندوستان میں بے اثر ہوئے۔

۱۹۲۸ء ہندوستان میں سیاسی دور کا سن ہے۔ اس میں بے شمار سیاسی جماعتیں نہیں اور انھوں نے مختلف مطالبات کے لئے سرگرمیوں کا آغاز کیا ہے۔
 ان میں کوہنٹ ایک ہی وطن تھی کہ ہندوستان کو مکمل آزادی دے۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے اپنے اجلاس منعقد لاہور میں مکمل آزادی کی قرارداد
 لے لی۔ ان دنوں کانگریس نے چند سال بعد وہی کام کیا جس سے حضرت مفتی ۱۹۲۳ء میں خارج ہو چکے تھے۔

۱۰. کتاب حضرت مولانا مفتی فیض الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بیٹوں کے کسی میں صلاح پڑھائے اور یوں اپنے گھر میں اس قانون کی مخالفت کی۔

کانگریس کے ساتھ باضابطہ تعاون

برائے مکمل آزادی

حضرت شیخ نے اس دوران بائیس چوبیس نکال اور کام میں لبر کے لئے آپ جس زمانہ میں ملوث ہیں شیخ الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اسی میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم انقلاب آیا اور بزرگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ حضرت مولانا غلام اور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مفتی محمد رفیع الرحمن،

حضرت علامہ شبیر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات دارالعلوم سے علیحدہ ہو گئیں۔ ان حالات میں دارالعلوم میں جو اتنا بڑا غلا پیدا ہوا۔ اسے دیکھ کر کے لیے حضرت صاحب مولانا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحب الزین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم کی نظر حضرت شیخ پر پڑی۔ ان حضرات نے حضرت کو دارالعلوم سے ہٹا کر لیے صدارت کا کردار آپ دارالعلوم دیوبند میں تشریف لے آئیں۔ حضرت کا انکار تھا۔ مگر ان حضرات کے لیے مدد اور ہر مدد دہی کا منصب اس شرط پر تھا کہ ہٹا کر دے گئے کہ آپ سیاسی تحریکات میں بدعت نہ لیتے رہیں گے۔ دارالعلوم کی جانب سے اس پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ بہر حال آپ دیوبند تشریف لے آئے۔ پورے ہندوستان میں اسلامیان ہنسی کی سرسبزی و قیادت کو سنے رہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر فراموشی کے کوئل آزادی کے بغیر ہندوستان کا مصائب کا بل نامک نہیں ہے۔

چنانچہ کانگریس فیصلہ کر کے پھر بھرتی۔ اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی۔ ہر آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے کہ اگر جو جماعت انقلاب لاتی ہے۔ وہی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اور مسلمانوں کو اپنے لیے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا چنانچہ جمعیت علامہ بندہ سالار اہلسلام و تبلیغ مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا کام لیا کہ اپنا علیحدہ دفتر کھولتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں تعاون کیا جائے اور جمعیت علامہ بندہ نے ایک مستقل دائرہ ہیرہ قائم کیا۔

حضرت صاحب اکرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی حیثیت علیہ حبیب پر پڑتی تھی تو معلوم تھا کہ ان میں اکثر صحابہ شہادت ہی صفات کے حامل تھے جو بیک وقت صفات کی بنا پر ان میں ایک ایک کئی کئی کے برابر تھا یہی وجہ تھی کہ ان میں تخیل ہونے کے باوجود کسی شعبہ حیات میں کسی یکدیگر کے لیے بھی کام کے افراد کو کسی نہ تھی۔ انہیں حضرات کرام کے بارے میں علمات امت کا بیان۔ بالیل دھبائی و بانہار فرسائی - رات مصلے پر گزرتی اور دن گھر سے کی کچھ پر

اس امت دھرم میں انہوں میں بھی ایسے ایسے جامع لوگ پیدا ہوتے رہتے جو بیک وقت زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کر سکتے تھے اور اگر نہ تھے اس آخری دور میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید انہی لوگوں میں سے تھے جو بیک وقت مسند ارشاد و ہدایت کے نشانی بھی تھے اور معرکہ و جنگ میں جانثار سالار بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے بھی ایسی شخصیتیں پیدا کیں جن میں سرفہرست نام بابا انوار دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت علامہ شاہ احمد علی رحمۃ اللہ علیہ اور اس کے بعد شیخ الہند مولانا محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام علامہ شبیر عثمانی، حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی اور صاحبِ دہلی مولانا غلام الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ امت میں ایسے لوگ تو بے شمار پیدا ہوتے رہتے جنہوں نے کسی خاص شعبہ میں جہاد حاصل کی اور شہرت و عزت کے بلند و تمام پر فائز ہوئے۔ مگر جامع انسان قیامِ خال پیدا ہوتے۔

دوسرے بزرگوں کے حالات ایسی کتاب میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں۔ یہاں پر حضرت مدنی کے حالات انحصاراً ذکر کرنے کا مقصد ہے۔ جنہوں نے دارالعلوم و اسلامیات کے متعلق شروع میں ذکر کیا تھا چاہئے۔ انسانی زندگی کا ایک بہت بڑا شعبہ تہذیب اخلاق کا ہے۔ ہر مسلمان کو آدمی بہت اہم ہے۔

منکر ہو گا اس کی اپنی زندگی نور کی زندگی نہ ہو۔ اور دنیا کے اکثر پیشہ تر لکھ راور نام نہاد علماء اسی زبر سے ہیں آتے ہیں۔ انسان کو ذاتی طور پر اپنی تہذیب کر کے لیے تزئین کرنا پڑتا ہے۔ جسے آج کل کی اصطلاح میں منکر و تصوف کی راہ بھی کہا جاتا ہے۔ پھر کراچ کی یہی اصطلاح معروف ہے۔ لہذا ہم نے اسی کو عزراں کیا ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرآن میں چار ذہبہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔

ہو الذی یبحث فی الامین رسولاً منهم میتوا علیہم۔

اؤفتہ وینکبہم ویعلمہم الکتاب والحکمة

علامت قرآن، تزئین کتاب، تعلیم کلمہ سے تزئین کردل کی صفائی، اعمال کی پاکیزگی، اصلاح باطن، خلوص نیت اور تہذیب اخلاق بھی تیسرے تھے ہیں۔ بلکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

”بحث لا تتم مکارم الاخلاق۔“ میں اس لیے آیا ہوں تاکہ عمرہ اخلاق کا اتمام جستہم کروں۔

عالم الدین بننا اہل آسان ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اس ڈھنگ میں ڈھال لیا کہ سرسنت زہر علیہ التیہ والعلو سے انحراف نہ ہوا ڈھانگل ہے۔ بہت کم ہیں جو راہرو اپنی اصلاح کر لیں۔ اگر جہانی امراض کا علاج کوئی خود بخود طب کی کتاب میں پھر کہ نہیں کر سکتا تو باطنی امراض کا بھی خود علاج نہیں پرکھتا۔ بہت سی امراض ہیں کہ انسان جن کو مرض ہی نہیں سمجھتا۔ بخوار و غرور کا نام خود راہی اور عزت نفس لکھ دیتا ہے۔ اس کو خودی کا رنگ دے دیتا ہے۔ بعدہ جس طرح ایک پاگل اپنے آپ کو پاگل نہیں کہتا۔ بلکہ اپنے آپ کو عقل مند اور دوسروں کو پاگل قرار دیتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ کسی صاحب نظر سے تعلق پیدا کیا جائے۔ اسی تعلق کو کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کو سمجھا گیا۔ ورنہ صرف کتاب بھی تو بھیجی جاسکتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سلمہ یہاں کسی قدیم شیخ انداز میں اس کی تائید کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

”توفیق الہی کی سیکڑوں راہیں ہیں۔ ہدایت و تربیت غیبی کے ہزاروں پھیلے ہیں۔ مگر سب سے

پُرانا اور آسان راہ یہ ہے کہ رہنما بیان طریقی میں سے کسی صاحب ارشاد کی ہمت و صحبت

حاصل ہو جائے۔“

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک شرح میں یوں ادا کیا ہے۔ بھوان کا اپنا تجربہ و مشاہدہ سے اور امر واقعہ۔

سے مولوی پرگزشتہ درویش نے رزم ۛ تا غلام شمس تبسری نے رشد

اور یہ بھی غالباً اپنی کاغذ پر ہے۔

حکیم زمانہ مجھے با اولیٰ بہتر از صد صد طاعت بے ریا

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سابق میں گذرا کہ انھوں نے یہ راہ ابتدائی میں طے کر لی تھی اور اس سلسلہ میں انھیں اپنے وقت کے سبب سے سادہ و سادہ زندگی میں مشرک حاجی املا اللہ بھار کی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی معرفت و محبت و ہمت حاصل ہوئی۔ بلکہ یہ ان کی آرزو اور اہل کار و فوہیں۔ لیکن حضرت مولانا کی زندگی کا یہ پہلو عام لوگوں کی نگاہوں میں نمایاں نہ ہو سکا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں شیخ الحدیث اور دارالعلوم دیوبند کا مدرس سمجھا اور بہت سے لوگوں نے انھیں ایک سیاسی لیڈر خیال کیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی قیمری حیثیت شیخ و مربی ہونے کی ان دونوں میںوں سے بڑی تھی۔ مگر انھوں نے اس کو بہت کم ظاہر ہونے کے دیا اور اس روپ میں بہت کم ظاہر ہوئے اور اپنے آپ کو پیشہ انھیں رکھا۔

درویشی اور ولایت

درویشی اور ولایت کیا ہے؟ درویشی نیرت کا عکس چیل ہے۔ فضائل نیرت کا روشن منظر ہے۔ لیکن نیرت کیا ہے؟ شہ
 آپ یہ سوال کریں تو نیرت کی تعریف میں حضرت امام ربانی محمد رافت ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سامنے رکھیے کہ توبہ الی اللہ
 توبہ الی الخلق کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ اُسے اس طرح واضح کیا جاسکتا ہے کہ نبی وہ ذات ہے جسے ہر وقت خدا کی طرف متوجہ رہے اور خلیق خدا پر ہی
 حق کی طرف توجہ کرنے سے خلق خدا کی طرف سے اس کی توجہ کم نہ ہو اور نبی خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو نبی ہر اک حق سے بھی وابستہ رہتا ہے
 خلق میں بھی شامل رہتا ہے۔ اسی ایک نکتہ میں نیرت کے سارے کالات و فضائل جمع ہیں۔

اب دیکھئے ولایت کیا ہے؟ جو انسان اس صفت میں جتنا زیادہ نبی سے قریب رہتا ہے۔ وہ دہر ولایت کے اتنے ہی بلند مقام پر فائز رہتا ہے
 اسلام سے پہلے۔ اور ایک طبقہ آج بھی۔ یہ سمجھا ہے کہ خدا کے بندوں کو چھوڑ کر خدا کی لگن میں پہاڑوں اور دیوانوں میں مراۃ کرنا اور
 ہے۔ یا سکتی ہوئی انسانیت ظلم استبداد میں دبلے ہوئے سراج اور ریاست کی بے انصافیوں میں ٹپنے والے عوام سے بے تعلقی ہو کر بے نیاز ہو کر
 کرنا اور ان کے زیرِ تسلط کے لیے روحانی اور دنیائی ظلم کی تعلیم دینا۔ بے روزگاری اور جن بھوت ادارے کے نقشِ نقیہ کرنا۔ بس یہی ولایت ہے۔
 حالانکہ نبی جہاں توجہ الی الخلق کی وجہ سے عبادت اور ریاضت کرتا ہے۔ شب بیدار میں ہی خدا کی یاد کرتا ہے۔ ذکر الہی کے لیے مخلوق کا سارا
 تلاش کرتا ہے۔ وہاں وہ خلقِ خدا پر بھی کمال نظر رکھتا ہے۔ انسانوں کے دکھ درد میں ان کے کام آتا ہے۔

فوعنی امتداد بر باوقش کا استبدال۔ اس سے منظوم انسانیت کو نجات دلانے کے لیے شرم کی حد و جد کرتا ہے۔ سماجی بے انصافیوں کے خلاف
 آواز اٹھاتا ہے۔ لوگوں میں عادل بن کر بھی بیٹھتا ہے اور اچھا ظلم بھی۔ اچھا شہر بھی بننے کی سعی تعلیم دیتا ہے اور یہودی جیسے دشمن حق پر دسی کے ساتھ اچھا سرکار
 کی بھی تلقین کرتا ہے۔

جب نیرت میں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا مکمل احساس شامل رہتا ہے تو یہ ولایت کو بھی ہمیں اسی معیار پر پکھناٹے گا۔ کیونکہ اولیاءِ خدا
 تک اپنا سلسلہ پہنچاتے اور ان کے جانشین سمجھے جاتے ہیں۔

ہم دلی اور درویش اسے نہیں مان سکتے جو اجتماعی ذمہ داریوں سے جگانا ہو جو ملک پر قبضہ جاتے ہوئے ظلم استبداد کے خلاف کشمکش کرنے کے لئے ہو۔
 جو عوام کی خدمت کے کاموں کو دنیا داری کہتا ہے۔ تمدن و سیاست کے جنگاموں سے غبر آتا ہے۔ جب یہ بات صاف ہو گئی کہ ولایت کیا ہے کہ اللہ الہی ہو
 اور عوام کی خدمت بھی۔ اور خدا کی محبت بھی ہو اور جنگامان الہی کا درویشی۔ آخرت کا فکر بھی ہو اور ملک و قوم کا خیال بھی۔ تو اسے۔ اسی معیار پر مدنی درویش کہیں
 مؤثر نہ دے کہ اس درویش کا بل کی شان ہے کہ عبادت و ریاضت میں وہ جلیق و شعلی ہے علم و فضل میں بخاری و رازی ہے۔ اصلاح و تدوین
 وہ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی صف میں نظر آتا ہے۔ خدمتِ خلق میں وہ عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اور بہت کچھ ہوتے ہوئے وہ بے
 حد متواضع اور خفا کسا رہتے۔

مدنی درویش۔ سفروں میں جہاز سے کی لاتوں میں پیٹتے فارم کچی کو زین میں مضطرب پکڑے ہوئے تھوڑے میں مشغول ہے۔ خدام گزارش کرتے ہیں کہ نیرت
 وینک روم میں کیوں نہ کھڑے ہو گئے؟ تو جواب دیتا ہے کہ لوگوں کی غیظ و غراب ہوتی۔ مجھ جیسے شیخی خورے اور روسیاء انسان کو کیا حق ہے کہ وہ خدا کی بندوں
 کو پریشان کرے۔

۱۲ سبک رات کو بخاری شریف کا درس دے کر فارغ ہوتے ہیں سیر سے مہمان خانے میں تشریف لاساتے ہیں۔ مہمانوں کے بستراؤں کیچوں کی بجائے
 کرتے ہیں۔ ایک دیہاتی مہمان کو تکلیف میں پاتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص حقہ کا عادی ہے۔ خور و جاملے کرتا ہے ہیں اور اپنے ہاتھ سے اسے حقہ پیر

حق کی طرف توجہ کا یہ حال کہ ایک قوم شریعت و سنت کے خلاف نہیں اٹھتا۔ منہ پر اگر کوئی تعریف کرتا ہے تو کھڑے ہو کر اسے روک دیتے ہیں۔ مجال نہیں کہ شیخ پر کوئی شاعر شیخ کی مدح میں کوئی قصیدہ پڑھے جہاں کسی نے تعریف میں زبان کھلی اور مجال درویش کا جلال بڑھ کر اٹھا۔ بندگی کا اتنا گراں ہنگ کہ اگر کوئی تعریف کے جوش میں ہاتھ پیرنے کے لیے دیر چمکے تو ماتھ پھینچ لیں کسی کو پر دے جانے کی اجازت نہ دیں اور خدشات کو سر سے تیں اپنے ہاتھوں کو ہمیشہ دبتے رہیں۔ پھر توجہ الٰہی الملکی کا یہ عالم کہ نیکو گان الٰہی کو انگریزی سامراج کے ظلم کی بجائی پستاپا ہوا دیکھا تو پوری قوت سے آزادی وطن کے لیے میدان میں اتر آئے۔ ذکر الٰہی اور محبت رسول پر وعظ فرمایا تو دلوں کو ذرا ایمان سے روشن کر دیا۔ برطانوی سامراج کے مذہم افادوں اور انسانیت سوز مظالم پر تعزیر کی تو کرکڑوں میں حسرت و آزادی کی تڑپ پیدا کر دی۔

پھر آزادی کی جدوجہد، کسی اللچ میں نہیں، کبھی عہدے کے لیے نہیں۔ صرف بندگان الٰہی کو ظلم سے نجات دلانے کے لیے۔ وطن عزیز کی پیشانی سے غلامی کا ناخن مٹانے کے لیے اور صرف محب وطن کی سنت رسول کو زندہ کرنے کے لیے! کبھی معلوم تھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بت پرستی سے ناپاک وطن کو ظلم و جبر سے برسرِ دشمن۔ وطن عزیز کی کڑواہٹ اور مجرب فرمایا تھا۔ مکہ کو چھوڑتے ہوئے کہا تھا۔

ما اطلبک ببلد واحد کما! تو کس قدر پاک ہے اور مجھے مجرب ہے۔

یہ محبت وطن کا اعلان تھا، اسی سنت کو، اس مجاہدے زندہ کر کے دکھایا۔ اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی کمپنیں ہوتیں، مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو مخالفت وطن کے نام پر ہلاک کر دے تو ہم بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادی وطن کے لیے اس ستم کا فکرم نہ کر سکتا ہے جن لوگوں نے وطنیت اور قومیت کے نعرہ پر اس شیخ مجاہد کو مطمئن کیا تھا۔ انھوں نے پاکستان میں پاکستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم کہا۔ کیا تاریخ اس حقیقت کو فراموش کر سکتی ہے؟

یہ مدنی درویش کی جامع صفات شخصیت کے چند نمونے ہیں۔ جب کوئی اللہ کا بندہ اس ولی کامل مرد مجاہد، غازی اسلام کے حالات پر کچھ لکھنے بیٹھے گا تو وہ بتائے گا کہ۔۔

حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کون تھے اور کیا تھے؟

مسند اور ارشاد و ہدایت پر پورے شیخ مدنی نے جو کام کیا۔ وہ اتنا زاہد، سب سے کیریائی ہوتی ہے کہ ایک شیخ الحدیث، سیاسی لیڈر، اور مدبر و ملک اپنی ان بے پناہ مصروفیات سے اتنا وقت کیسے نکال لیتا تھا کہ تشریف لے کر بھی توجہ دے سکے اور اپنے لاکھوں مریدوں کے حالات کو آلف معلوم کر سکے ان کی تربیت کر سکے لیکن یہ جاری بھول ہے اللہ تبارک و تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کے وقت میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ صرف تبریع و پاکیزہ بندہ دوسرے اسلامی ممالک تک حضرت مدنی کے مرید پہلے برسے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ وہ حضرات تجلی حضرت سے آگے نہ بڑھ سکے ان کی اجازت ہے۔ جنھیں خلفائے مجاہد کہتے ہیں۔ جوف ان کی تعداد ایک سو ست اسی طرح پہنچتی ہے۔

حضرت مدنی کی زندگی کا یہ باب بہت وسیع ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کے فضائل و محاسن کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں حضرت مکرم اخلاق نے لمبی عمر پائی اور اتنے لمبے عرصہ میں کروڑوں انسانوں سے ملاقات ہوئی۔ ہر کہ و سراپ کے حق و اخلاق کا مدلل نثر آتا ہے اور ہر کی حضرت کی تواضع، انکساری اور حسن خلق کا نیا قصہ سناتا ہے اور اگر ان تمام واقعات کو جمع کیا جائے تو مختلف لوگ بیان کرتے ہیں۔ صرف انکو نظم و نثر کرنے کے لیے ایک دفتر بنائیے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبد اللہ ربادی کا اثر ملاحظہ فرمائیے۔

پیشخ العرب والجم حضرت مولانا حسین مدنیؒ ظلالہ العالی کے فضل و کمال مرتبہ و مقام پر گفتگو تو وہ کرے جو خود بھی کچھ بڑے مجھے ذاتی تجربہ اور علمی مشاہدہ تو مولانا کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے انفسی، سادگی، تواضع اور انکساری اور خدمتِ خلق کا عشق ہے۔ کتنا ہوں اور گویا خانہ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں بہترین رفیق سفر ہیں۔ جہاں ہوں تو آپ کی بیانی میں اپنے معاملات کو ترک کر دیں گے۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آئے تو خود خریدا رہ جائیں گے لیکن آپ کی حاجت ضرور کہیں سے پوری کر دیں گے۔ خدا نخواستہ بیمار پڑ جائے تو تیار داری میں دن رات ایک کر دیں گے۔ نوکری کی ضرورت پیش آئے۔ کوئی متدبر کھڑا ہو، کسی استخوان میں ٹھیکہ جائے تو سفارشات میں اور عملی دور و دور چپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے۔ نہ اپنی صحت کا اور نہ صحت کا جس طرح بھی ہوگا۔ آپ کا کام کمانے پر تن جائیں گے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ جو معاملہ بھی رکھتے ہوں۔ اپنے خردوں شاگردوں اور مدعوین کے ساتھ یہ درویش رکھتے ہیں کہ خادم کو خود ہم بنا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ حالی کے شعر کے معنی اب جا کر روشن ہر سنے ہیں۔

ہم نے ہر ادنیٰ کما علی کردیا۔ خاکساری اپنی کام آئی۔ بہت سنا ہے کہ یہ شان محمود الحسن؟
شیخ الہند دیوبندی کی تھی۔ اگر یہ صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے ملے کسی کو نہیں پہنچتا۔ فرصت میرا آتی
تو اس حق کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا اور پھر نوبت شرح پر جراثمی آتی۔ اور ایک مختصر العانی پر کسی کئی فصل اور مطلق تیار ہوتا ہے۔

سخن نہ چاہیے اس بھر بیکار کیسیلے

جو لوگ علم الاحسان اپنی تعریف و ملوک سے لپچی رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ انسانی شرف، دم و دار و کمال انسانیت کا مدار قرآنے مکرری و عملی کے اصول پر ہے۔ ان دونوں ملوک میں جن اصول اخلاق سے بحث کی جاتی ہے وہ چار ہیں۔

طہارت، عجز و نیاز، سماحت اور عدالت۔ آخر الذکر دو ملکہ ہے جب انسان افراط و تفریط سے بیکر نہ کر دے اور ان میں اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ تو عظیم خدائی بخش قسم سے نصیب ہوتا ہے۔ اس ملکہ کے پیلا ہر جالے کے بعد ایک انسان پھر اعتدال پر جاتا ہے۔ لیکن ہر جذبہ اور ہر فعل کا عمل الگ الگ ہے اور اس بنا پر اس میں مرزویت اور جن تناسب پیدا ہو جاتے ہیں حضرت امام احمد کی شخصیت کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کا وہی وصف جامعیت سے زیادہ نمایاں ہو کر نظر آتا ہے اور اسی بنا پر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ امام احمد اپنے زمانہ میں انسانی شرف و عہد کے ایک اعلیٰ بیکر نہیں اور ایسے لوگ روز نہیں پیدا ہو سکتے۔ بلکہ کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ اور بقول مولانا سعید احمد اے اگر اکیسی۔ حد و شعبہ و دنیا میں مسلم اور غیر مسلم کی علی گڑھ۔

کہیں ہندوستان کے باہر علماء اسلام کے بہتر سے علماء اور مشائخ سے اور ان کے حالات و سوانح سے باخبر ترین اور ان میں کتنے ہیں جن سے پھر کو ذاتی ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ اس کے باوجود مرزوزہ و زائیں جامعیت اور صاف فضائل کے اعتبار سے اگر کوئی شخصیت پروردگار نے بنا سکے کہ قابل ہے قرب و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ہی شخصیت ہے۔ لیکن اب ہر محو کر

آج تک نہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ بیعت حاصل ہوا ہے اور نہ شرفِ تلمذ۔ اس بنا پر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ محض انہی عقیدت کا نتیجہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اصل یہ ہے کہ امامِ احمدیہ است برکاتہم ان افراد میں سے ہیں جو اپنی جامعیت میں ایک پوری امت ہیں۔ اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے پیچھے ہیں لیکن مرتبہ کے لحاظ سے بہت آگے ہیں۔

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ والہ اعلم سے واقفیت پانے ہی اپنے والدین کے ساتھ مدینہ ہجرت کر جاتے ہیں۔ وہاں پہلے سے نہ کوئی جائداد ہے اور نہ وہاں اپنا کوئی کاروبار چل رہا ہے اور نہ کوئی ذریعہ معاش ہے۔ لوگ ہجرت کر کے جاتے ہیں تو حکومت سے دلیفہ پانے کے خواہش مند ہیں۔ دوسروں کی خیرات و صدقات پر گزارہ رکھتے ہیں۔ مگر مولانا اور مولانا کے والد محترم اسے پسند نہیں کرتے۔ مولانا ایک مدرسہ کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ ان کرتے ہیں اور مولانا کے والد محترم ایک چھوٹی سی دکان کھول لیتے ہیں۔ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کابیان ہے کہ ان کے والد ماجد ڈاکٹر زبیر علی خان جو دینیہ تعلیم کے کامیاب ڈاکٹر تھے۔ حد درجہ امرا کہنا کہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبداللہ صاحب کو بطور ٹیوشن تعلیم دیں۔ لیکن عین اس زمانہ میں جب یہ حالت تھی کہ گھر کے نزدیک ۳ یا ۴ سو روپے کے بانی پر قناعت کرتے تھے ٹیوشن گزارا نہ کی۔ البتہ اس کے لیے کما دیتے تھے۔ کو باقی معاوضہ حبیب اللہ صاحب اکرم اور طلبہ کو درس دیتے ہیں۔ مولانا عبداللہ صاحب کو بھی درس دیتے ہیں۔ طرفین سے یہ امر عجیب تھا۔ اور اس میں تعجب نہ ہو گا کہ۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب کو سہ ماہی گزارنا پڑا۔ اور وہ بڑی کسی معائنہ کے پڑے تھے۔ اتنی بے تکلفی اور کیا شکست کے باوجود ان حضرات کو یہ علم نہ ہو گا کہ اگر ان حالت میں ہوتے ہیں اور معلوم اس وقت ہوا۔ جب ہوشیاری میں دل بکلی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی شانِ بندگی اور عبادت تھی۔ اسی لیے مجددِ دوسرے کے متنازع خطاب سے آپ کو رازِ اہل عبادت گیا۔ جبکہ امام الشریب العزت اپنی شانِ ربوبیت اور مجردیت میں یکجا اور سبیلِ شل ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جدیت اور بندگی میں کابل اور بے مثال تھے۔ اسی کا ان عبودیت نے کہاں رسالت اور رسولوں کی سیادت کے اعلیٰ مقام پہنچایا۔ باوجودیکہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ساری ساری رات قیام و بچہ دین گزار دیتے۔ پاؤں پر درم آجاتا۔ سوال کرنے پر ارشاد فرماتا۔

املا اکتون عیبا شکورا — کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ ہوں

اسی سیریں صدی میں محبِ رسول اور متبعِ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مولانا حسین احمد مدنی کے ذوقِ عبادت کا وہ لوگ مجرب بنی اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے کمالِ کمال نہ دیکھا ہے۔ ان کی نماز حقیقی نماز نہیں تھی جس کو حدیثِ پاک میں مواجِ المؤمنین کے نام سے دیا گیا ہے اور جس کو احسان کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کر لیا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو کہ تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔" (بخاری شریف)

جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو صامت معلوم ہوتا تھا کہ یہ بندہ سارے عالم سے دستبردار ہو کر اپنے معبود کے ساتھ سرگرمی میں مشغول ہے اور بارگاہِ خداوندی سے وابستہ ہے۔ جو کثرت بھی نماز میں تلاوت ہوتی تھی۔ سننے والوں کو یہ محسوس ہوتا تھا۔ گویا وہی نازل ہو رہی ہے اور وہ کیفیت و وقت طاری ہوتی کہ جس کو بیان دشوار ہے۔ لیکن بالکل سچ لکھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ غرض نہیں تھی۔ یا سفر کی مشقت برداشت کر کے آتے ہیں۔ اور چہرہ سرخ کرتا ہے۔ مگر جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو انہیں ان کے ساتھ پڑھنے کہ گویا زہرا صاحب تھا۔ نہ آئندہ کوئی سوچ سکتا ہے۔

ہر وقت ذکرِ اللہ میں مشغول رہتے تھے اور "دل بیاہر و دست بکار" کے پورے مصداق تھے اور اس کا اندازہ اس وقت ہوتا تھا جب استہلاقی سوز و گداز

کے ساتھ۔ یا حیاتی یا قیوم برحمتک استخفیت بار بار پڑھتے تھے۔ وصال سے ایک روز قبل کوئی صاحب درم کردار بے تحاشے کہ حضرت نے از قاری سے بار بار یہی پڑھا۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ حضرت کیا کوئی تکلیف یا درد ہے؟ ارشاد فرمایا کہ یہی کیا تکلیف کم ہے کہ آپ حضرات مشغول ہیں اور میں بڑا ہوں۔ عرض کیا گیا کہ حضرت آپ نے تربیت کام کیا ہے۔ اتنا کام تو ایک جہالت بھی نہیں کر سکتی۔ ارشاد فرمایا۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

بیکون فاضل اذان مشاء نباشی : شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

رضوان کے مہینہ میں ان کے ایک نمونہ روزانہ پڑھاتے۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ آرام فرماتے اور پھر تہجد میں مشغول ہوجاتے اور سارا دن تلاوت قرآن کریم ایک کمرتب میں حضرت مئی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اتباع شریعت و سنت ”آپ ذکر اور اتباع شریعت و سنت پر مملویت کرتے رہتے انشاء اللہ تعالیٰ اصلاح رفتہ رفتہ ہوجائے گی“

حضرت مئی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اس دور میں شریعت مجہدی اور سنت نبوی کا بہترین نمونہ تھی۔ اس لیے ان کی ہر ادا سے انسانیت نمایاں تھی۔ انسانیت دنیا کے سب سے بڑے انسان کے نقش قدم پر چلنے میں ہے جو آدمی دنیا کے سب سے بڑے انسان کی حقیقی اتباع کرے گا۔ وہ اتنا انسانیت پر گاہ کہ حضرت مئی چونکہ متبع سنت تھے۔ لہذا دیکھنے والا پہلی نگاہ میں عجائب لیتا تھا کہ واقعی انسان ایسے ہر سہل نہیں ہے جو بے فکر و غیر مسلم آپ سے ملتا تھا۔ آپ کا گویا وہ ہر جہاں تھا۔

وہ ہزاروں لاکھوں اوقات منہ پر حضرت سے ذاتی طور پر واقفیت رکھتے ہیں۔ اس بات کی شہادت دینے میں قطعاً قائل نہیں کریں گے کہ جس مشہور عالم کے ہاں سے وہ وابستہ ہیں اس کے تعلقات کی خوشگوار یادیں کا وسیع ماحول ہی ایک تھا۔ یعنی اتباع سنت۔ اس قطب عالم کے یہاں رسومات فقیر کا تو سبک دینی رسومات میں بھی شرکت کے لیے یہ شرط ہوتی تھی کہ قبل کو سنت کا ماحول پیدا ہوجائے۔ مٹکا تفریبات کلاں میں شرکت کے لیے ضروری تھا کہ نادی کا پورا مال رکھا جائے۔ حضرت مرحوم سے ملا کر پھر انہیں تو لازمی تھا کہ ہر ”فاطمی“ ہر۔ علمائے اس میں بہت کچھ بحث کریں۔ مگر حضرت کے طرز عمل میں تبدیلی نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ بحث خوارا کہی۔ مگر اس جبریت سے مرحوم نے ہر جہاں فاطمی کی مسندیت کو ماحمل ہے۔

وایہ مسند نہ کہ لیے حضرت کا مطالعہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک بکری کی مقدار میں محدود رہے۔ اگر سنت کا شرعہ کیسے باپا نہ بچا تھے۔ مگر اس کی مقدار ایک مری۔ زیادہ نہ ہوا اور اس کے بموجب عزیز اور اقارب کو حضرت دیکھنے کیونکہ مسند مبارک کی تائید دینی کو ماحمل ہے۔ اس قسم کے معاملات میں فقہان اور معجزان لطافت یہ تھی کہ اور زبرد و ترجیح غصہ اور فحش کی کمرات تک محدود رہتی تھی۔ مباح پر پشیمانی ہوتی تھی اور جہاں نشاط اور انبساط کا تعلق تھا۔ وہ صرف مسنون ضرورت کے لیے محض تھا۔ قریب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ اگر ماسر میں احتیاط نہیں برتی جاسکتی تو حضرت شیخ کی خوشنودی میسر نہیں آسکتی۔ البتہ اگر تفریق میں مبارک کی پابندی کا عزم ہے تو دور دراز گاؤں کے باشندے کو بھی جہاں ماحمل تھا کہ وہ حضرت کو اپنے یہاں بلانے میں مدد کرے۔ حضرت بڑے لائق۔ اس کی حرمت ظفر فرماتے۔ اس کے یہاں پہنچنے کو پر ورام میں خاص اہمیت دیتے۔ پھر اس پرانے سال میں کچے راستوں اور بیل گاڑیوں کی رحمت برداشت فرماتے۔ اس کے یہاں پہنچنے۔ نہ بارش کی پرواہ ہوتی نہ گرمی یا سردی کی۔

داسنے ہاتھ سے کھانا۔ چوڑا لالہ لیتا۔ اس طرح کھانا کہ برابر کے آدمی کو تکلیف نہ ہو۔ ملیٹ میں اپنے آگے سے کھانا، منہ اس طرح چلا کہ آواز نہ آئے۔ سم اس سے شروع کرنا، دعا مسنونہ پڑھ کر کرنا۔ آت اور آخر فاتحہ و دعا، کلی وغیرہ کرنا، ہر سنت کا لحاظ تھا اور اگر کسی کو حکم نہ ہو کہ غلام کام یا غلام وقت میں کوئی شے کرے۔ تو وہ اس وقت حضرت مئی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز عمل دیکھ لے۔ بس وہی سنت ہر گاہ کھانا کھاتے وقت ساتھ ساتھ ذکر کرتا رہتا تھا۔ ہر قدر پر ہم الشک تھا۔ ہر

زیرِ عیش کا معمول تھا کہ کوئی اقدیمہ ذکر کے ملحق سے نیچے نہیں جاتا تھا۔ اگرچہ قرآن مجید نے اجازت دی ہے کہ اکیلے کھانا یا جگہ ملا کر آپ ہمیشہ اپنے ساتھ واسے کو اپنی پلٹ میں یک کر لیتے تھے۔ یہ معمول جیل میں بھی رہتا تھا۔ اگر وہاں کوئی ساتھی نہیں بنے تو اسے ادب کی کلاس والوں کو اپنی اقدیمہ قیدی خدمت کے لیے ملتا ہے۔ اس کو شریک کر لیتے تھے۔ شیخ الاسلام کی زندگی کے جس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ اتباع سنت، عیش و تنجی ملی الشعلیہ و علم الاستغراق فی ذکر اللہ کی وہ روشنی نظر آنے لگی جو انھوں کو تیرہ کر دیتی ہے۔ اس کی تہنائی سے قاصر اور قلم اس کی نگارش سے عاجز۔

زیرِ سر پر کھانا یقیناً سنت کے خلاف ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی وزارت کے ابتدائی دور میں چند حضرات کی دعوت کی اور زیرِ سر پر کھانا کھلایا۔ حضرت مدنیؒ کی طبیعت میں ہی بے نشاشت نام کو نہ بھی اور آخر میں اشارہ بھی کر دیا۔ اب مرلا آزاد کا لطیف اور پاکیزہ احساس ملاحظہ کیجئے چند دنوں بعد ان ہی حضرات کی بھر و عورت کی اور فرسٹ کھلایا۔ اس دن حضرت مدنیؒ کی طبیعت میں فوجت و بے نشاشت تھی۔

کوئی شخص ہراسے انبیاء علیہم السلام کے پیٹ سے زبان کر نہیں آتا۔ البتہ بلاشبہ کی قابلیت و صلاحیت ہر ایک میں موجود ہوتی ہے۔

م و استقلال پھر ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے اور عزم و استقلال اور بہت و حوصلہ سے کاربایاں انجام دیتا ہے۔ وہی بڑا انسان شمار ہوتا ہے بہت بلند دار کردار و عزت و منزلت۔ **بابت اقدیمہ بہت و اعتبار**

حضرت مدنیؒ کی زندگی پر جب غور فرمائی جاتی ہے تو عزم و استقلال اور بہت و حوصلہ کے کہ ہالیہ نظر آتے ہیں، جو کہ عام ہی انجام دیا۔ پورے عزم و استقلال اور انتہائی ت و حوصلہ کے ساتھ انجام دیا جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ پورے اور ضعیف پر جانے کے باوجود بہت و حوصلے میں جواز دیتے تھے جو عام جوازوں سے بہت بلند تھے۔ برطانیہ کا جس شان سے مقابلہ کیا۔ وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ حصول آزادی کے لیے جو عہدہ جہد کی۔ اس کا کوئی نر نہ پیش نہیں کر سکتا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت و وقعت بقرار رکھنے کے لیے جو کارنامے انجام دیئے وہ آپ ہی کا جتن تھا اور ابھی کچھ اور زندہ رہتے تو بہت کچھ کرتے۔ جو برطانیہ کی سنگینوں سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ وہ ہندوستانی حکومت سے کسی طرح عرصہ نہیں کر سکتا تھا۔ حصول آزادی کے بعد ایک ساتھی نے عرض کیا کہ آپ تو حکمت اپنی بن گئی۔ نہیں کہ فرمایا۔ ہمارے لیے تو پہلے ہی جیل خانہ تھا۔ اب بھی جیل خانہ ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حیثیت بھی حضرت مدنیؒ کے عزم و استقلال کا ایک ادنیٰ اثر ہے۔ دورِ مظلوم مسلمانوں کی تباہی، مسجدوں، خانقاہوں، مدرسوں کی بربادی، کسی حد تک پہنچی اور نقشہ کیا سے کیا رہتا۔ ۱۹۴۷ء کے خونریز جنگ میں جب ہر شخص کو اپنی اپنی پڑ پڑی تھی اور مسلمان کے لیے کوئی جاسے پناہ نہ تھی، حضرت مدنیؒ پورے حوصلہ کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کو جانے کی کوشش کر رہے تھے اور پورے فرق کے ساتھ مسلمانوں کو ہند میں رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک آہنی دیوار بن کر سہا پور کی مسجد پر چڑھ گئے اور اس تباہی کے آگے بڑھنے کی پوری روک تھام کی۔ آپ جہاں مسلمانوں کو بہت و استقلال کا سبق پڑھانا رہے تھے۔ وہاں حکومت کی کوتاہیوں پر بھی سخت تنبیہ اور باز پرس فرما رہے تھے۔

اسی دوران آپ نے پڑت پڑت وزیر اعلیٰ کو پوری سہ سخت غضب ناک لہجہ میں حکومت کے رویہ کے خلاف ڈانٹ دی تو پڑت پڑت نے کہا۔ "دارالعلوم کی مخالفت کے لیے فرج بھیج دی جائے تو حضرت مدنیؒ نے سخت غصہ میں فرمایا۔

"دارالعلوم کو خدا کا ہے۔ وہ خود اس کی مخالفت کرے گا۔ آپ سہا پور کی خبر لیجئے۔ اگر آپ مسلمانوں کا منتظر

اس معمول میں شدت اس لیے تھی کہ حبیب پندہ میں اور تہذیب و لاکھ پتار دونوں ہی اس بابے میں ہجرت و حیات کے قابل ہیں۔ وجہ چاہے برہمن کی اور ہر۔ اور اس کی اور گھر عطا دونوں ایک ہیں۔

کرنے کے بارے میں مذہب میں یا اس میں ناکامی کا اندیشہ ہے تو آپ مجھے اجازت دیں۔ میں مسلمانوں سے کہہ دوں گا کہ وہ اپنا تحفظ خود کر لیں۔

ان تہدیدی کلمات کے بعد جدید اشتغالات مکمل کئے گئے اور فسادات کی مہم کرتی ہوتی آگ آگے بڑھنے سے رکھی۔

انہماک مشاغل

جب انسان بڑے کا ناموں سے بڑا بنتا ہے۔ تو جس قدر بڑا انسان ہوگا۔ اسی قدر اس کے مشاغل کثیر ہونگے اور ان ہی کے بقدر انہماک اشتغال ہوگا جو واقعی انسان ہیں وہ ہر وقت انسانی کا ناموں میں مشغول رہتے ہیں۔ کھیل کر دیں سب کے کار وقت نہیں گزارتے اور نقلی امور صرف کھانے پینے والا حیران ناطق ہوتا ہے۔ ہر انسان چل دیتا ہے اور اس کے اعلیٰ مشاغل اور کارنامے اس کی یادگار رہ جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے مشعل راہ ہے

ہیں۔

حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ کے روزانہ معمولات اور مشاغل اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

روزانہ شب کو تین بجے تہجد کے لیے بیدار ہوتے اور نماز فرج تک تہجد اور اوروہ وظائف میں مشغول رہتے۔ نماز فجر کے بعد تیرہ ایک گھنٹہ تک تلاوت کریم اور مطالعہ کتب اس کے بعد چھانوں کی محبت میں چائے اور ناشتہ پھر تقریباً بارہ بجے تک دارالعلوم میں درس حدیث اور صدر مدرس کے فرائض کی انجام دہی کے بعد چھانوں کے ساتھ کھانا تناول فرما کر تھوڑی دیر قلیل فرماتے اور ان کی مختلف ضرورتوں اور گونا گویں مشکلات کو رفع فرماتے کسی کو سرلوہ کی تلقین ہر صبح اور کسی کو تھوہر دیا جا رہا ہے اور کسی کے سرائات کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ نماز صبح تک جاری رہتا اور اسی دوران سادی چائے کا دوز بھی چلتا تھا۔ عصر تک دارالعلوم میں درس حدیث ہوتا تھا۔ نماز مغرب کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ فرائض میں صرف تہجد میں سو پارہ لیر لیر تلاوت فرماتے۔ فرائض کے بعد چھانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے۔ اسی اثناء میں عشاء کا وقت ہو جاتا۔ نماز عشاء کے بعد دارالعلوم میں تقریباً تین گھنٹہ بیماری شریعت کا درس ہوتا۔ اس کے بعد چھانوں کا پتہ فرماتے ہیں یا جاتے ہیں۔ کسی کو تکلیف تو نہیں۔ اگر کوئی بلا ہوتا یا کمزور اور تھکا ماندہ ہوتا تو آہستہ سے اس کو روانہ ہوتے اور اس کے بعد بخیر دوستی کو گریزات کے تین سے لے کر رات کے بارہ۔ ایک تک الکیں باتیں کھٹے مشغولیت میں گزارتے تھے۔ صرف آدھ گھنٹہ، پون گھنٹہ دوپہر کو آرام ملتا تھا۔ سب سے زیادہ مشغولی کا وقت صبح عصر کے درمیان ہوتا تھا۔ ڈاک کا انبار سامنے ہوتا تھا اور چھانوں کا جھرم جھرم میں تلخ جویا لیں پچاس سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ہر ایک کی ضرورت کا معلوم کرنا۔ چرس کو رہنمائی شانت خندہ پیشانی سے جواب دینا یا پرکار کرنا۔ ہر ایک کے حق پر کھانی کو ادا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ ڈاک بھی اتنی کثرت سے ہوتی تھی کہ بعض دفعہ سبیلوں خلوت گاہ سامنے آجاتا تھا۔ اس لیے کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ بیک وقت شیخ طاعت بھی تھے اور عالم دین بھی۔ عامل کامل بھی تھے اور سیاسی پیشوا بھی اور ان ہی سبب رکن متعلق تجربی اور زبانی لوگوں کی فرائض اور استفسارات بھی ہوتے تھے جن کو حضرت پر لافرماتے تھے۔

یہ روزہ کے مشاغل تھے جن کو کئی حوازی دہی چند روز نہیں بھاسکتا۔ جو ایک پیر و ضعف و بیماری کی حالت میں سالہا سال بھالیا اور کئے دکھلا گیا۔ اسی کراہت ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت مدنی؟ اپنے ان تھکا دینے والے مشاغل سے دیکھی جھرا تے تھے اور نہ آتے تھے اور نہ کبھی اس کا احساس ہوتا تھے۔ دراصل انکا عقین تھا کہ انسان کام ہی کے لیے بنا ہے اور کام ہی سے انسان قیام اور سنو رہا ہے۔ کثرت اسفار کے باوجود ان مشاغل پر مدد و کرم نہیں تو اور کیا ہے۔ شاید ہی حضرت مدنی کے بارے میں کسی نے سفر کیا ہو۔ سال کا تقریباً نصف حصہ سفر میں گزارتا تھا اور سفر کے مشاغل اور مصروفیت حیرت سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

ہیں۔

وہ شخص بھی بھلا کیا ہے جس میں اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی کا احساس نہیں ہر شخص بھی جس قدر انسانیت کا رتہ ہوگا۔ اسی قدر اپنے فرض منصبی اور ذمہ داری کی ادائیگی میں حیرت و حلاکت ہوگا۔ حضرت مدنی ۲۸ برس دارالعلوم مدنی میں گذرے

احساس فرض منصبی

یہی کے منصب پر فائز رہے۔ اس دوران جس انہماک اور سرگرمی کے ساتھ آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ اس کی مثال ہمیں ملتی۔ آپ نے اس صر کے دوران اپنی دوسری بلے پناہ مصروفیتوں کے باوجود دارالعلوم کے انتظامی، تبلیغی اور تعلیمی کاموں میں اس قدر حسن و خوبی کے ساتھ دلچسپی لی۔ دارالعلوم کی ترقی اور بحال کو پہنچ گئی اور دنیا میں اس کے نام کو روشن کر دیا۔

اسی طرح اسارت الٹا سے روٹی کے بعد جیدہ علماء ہند کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور اخیر میں کوئی برس سے حجۃ کے مستقل صدر تھے۔ یہ صدارت ہی خلیہ صدارت چڑھ دینے والی صدارت نہیں تھی۔ بلکہ اس صدارت کی ذمہ داری کا آپ کو پورا پورا احساس تھا اور اسی احساس نے حجۃ علماء ہند کو ایسے دور میں بھی نبھانے کا موجب کیا۔ آپ نے ہی اس کے جوہر کو ختم کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس دوران حجۃ نے جو سیاسی کارنامے آپ کی سرپرستی میں سرانجام دیئے۔ ان ہی کی بدولت آج عالم اسلام میں مسلمان ہند کا سر بلند ہے۔ اگر حضرت مدنی کی ہستی سیاسی سرگرمیوں میں اس قدر سرگرم عمل نہ ہوتی تو کس کو معلوم ہوگا کہ اس تحریک آزادی میں مسلمانوں اور ہندو ہجرت کے جس کی بنیاد مسلمانوں نے ڈالی۔ اور اپنی جانبازوں اور سرفرشتہوں سے اس کو چھٹی ہانک پہنچایا۔ اور خاص طور پر چھب مسلمانوں کی۔ اکثریت نے پاکستان کا مطالبہ کر کے الگ ملک قائم کر لیا۔ اگر حضرت مدنی اور ان کے ساتھی نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ حالت سے اس قدر برتری کو جس کا قصہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

پھر دارالعلوم میں صدر مدرس کے علاوہ شیخ الحدیث ہونے کی وجہ سے درماب سے اہم سنی بخاری اور ذمہ شریف ہمیشہ آپ کے پاس رہتے تھے۔ روزانہ قیام میں سات آٹھ گھنٹے درس دینا آسان کام نہیں اور پھر دو ڈھائی سو طلبہ کے سامنے لائو لیسٹیک کے آواز پہنچانا معمولی بات نہیں۔ پھر درس بھی پورے استاد کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بربرہرہ کی تحقیق و توثیق ہوتی تھی اور ہر طالب علم کے سوال کا جواب تلی بخش دیا جاتا تھا جس میں کافی وقت صرف ہوتا تھا۔ قیام کے دوران کبھی بسوں کا ناغہ ہو کر لیا ہوا مسافر بھی بسوں کا خیال دیتا تھا اور اگر کشش بہتر تھی تو کبلا اور جلد واپس پہنچ کر بسوں کو چھوٹا جاتے۔ سینکڑوں میلوں کے سفر سے واپس ہوتی بسوں کا وقت ہوتا آتے ہی اعلان فرمایا جاتا کہ بسین ہوگا۔ اب ذکر کی نکلان ہوتی نہ انصہال یعنی کہ سفر ج سے ایک دفعہ واپس ہوتی جس کی نکلان ہفتوں نہیں آتی اور دکان سے بذریعہ لاری واپس نہیں ہوتا اور واپس بھی اسی طرح ہوتی کہ جس ٹرین کے ذریعے تشریف لاتے۔ وہ دیر بند نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے رات کو ۱۲ بجے منظر نگار اٹھا اور دواں سے بذریعہ لاری واپس نہیں ہوتا اور واپس بھی اسی طرح ہوتی کہ جس ٹرین کے ذریعے تشریف لاتے۔ وہ دیر بند نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے رات کو ۱۲ بجے منظر نگار اور مسلک تھی دیر درس جاری رہا اور اس شان سے بخاری شریف شروع کرائی گئی ہر آپ ہی کا حصہ تھی۔

سادگی و بے تکلفی سادگی اور بے تکلفی بھی اعلیٰ انسانی جہ ہے۔ حضرت مدنیؒ نہایت قدر سادگی اور بے تکلفی میں لکھتے اور بے تکلفی میں لکھتے تھے۔ شیخ طریقت عالم رانی ہونے کے علاوہ حضرت مدنیؒ کی ظاہری شخصیت ایک بڑے سیاسی رہنما کی تھی اور ہر سیاسی لیڈر پر ہمیشہ غور ملے ہوئے۔ یاغری ملی۔ آپ کے آس پاس ہر عارضی اور فوری اور باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ اس ظاہری عزت و وقار کے باوجود اپنی روزانہ شان اور برہنہ نشینی کو بڑا اور منت ہی کے موافقی سادگی کے ساتھ زندگی گزارنا، صرف آپ کا ہی حصہ تھا۔ یہاں جوں جوں کے قدم ڈھنگا جاتے ہیں اور اپنی راہ سے بہتک ملتے ہیں۔ حضرت مدنیؒ کا لباس، وضع قطع، رہائش، لہو و باشب سب لطیف اور سادہ تھا اور صفت بڑی کا پتھر نہیں نہرہ، آپ صفت کے موافقی چوڑے کاٹکیر، استعمال کرتے تھے اور چوڑے کا گول دسترخوان استعمال ہوتا تھا جس پر پوشیدہ ایک سالن ہوتا تھا اور دارے کی شکل میں کہ از کم دس بارہ آدمی دسترخوان کے گرد بیٹھا ایک ایک برتن من کھاتے تھے۔ ان میں سے ایک حضرت بھی ہوتے تھے۔ اور سب کھاتے تھے۔ جین کو ناشتہ کے ساتھ باسی روٹی اور مرچ کا پاجا ہوتا تھا۔ یہی حضرت کا ناشتہ تھا اور یہی تمام مہانوں کا۔ ایک دفعہ حضرت نے کھانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ہم آپ حضرات کے ٹٹا لیا کرتے ہیں۔ تو آپ مرغ اور جلو سے کھاتے ہیں اور یہاں باسی روٹی اور مرچ کھانا پڑتی ہے۔ اس پر لانا اشتہام الحسن کاغذ صلی جو ان تمام باتوں کے دلی اور محرم ہیں۔ نے فرمایا حضرت باسی ٹٹ

اور پچاس روز سے زیادہ مریلا رہے۔

انسان کی انسانیت اور برتری و سر بلندی کا اصلی طرز تواضع اور انکساری میں مضمر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تواضع اور انکساری ہے۔ ”جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور رفعت و سر بلندی عطا فرماتے ہیں۔“ تواضع اور انکساری اصل شانِ بندیت ہے۔ جو شخص بھی اپنی حقیقت کا شناسا ہو گا۔ وہ مجبوراً تواضع ہو گا اور کبر و غرور سے بالکل مبرا ہو گا۔ جو بندیت کے بالکل مستانی و مقصد ہے۔

حضرت مدنی کے متعلق گزشتہ سطور میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کی تحریر گزر چکی ہے کہ خادم کو مجبوراً بنا کر چھوڑ دیتے تھے۔ واقعہ حضرت مدنی تو انکساری کا ایک مجسمہ تھے۔ کبھی صدر مقام پر نہ بیٹھتے تھے اور چپہ نشست کے لیے مجلس کا گوشہ اختیار فرماتے تھے۔ ہر ایک چہرے پر ”کھڑے ہو“ آپ کے خطاب فرماتے تھے اور جیسے اس انداز سے گفتگو فرماتے تھے کہ ”گویا چہرہ اپنے بڑے سے گفتگو کر رہا ہے۔ اور ہر ایک کے ساتھ گفتگو کا یہی انداز تھا۔ گویا ان کے میں سب بزرگ تھے اور بیروز۔ ہر کام کے لیے غور و سبقت کرتے اور محنت و شفقت کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے۔

یت تواضع اور انکساری کی وجہ سے اپنے مخالفین و معاندین کا بھی ہمیشہ اچھے الفاظ میں ذکر کرتے اور کسی کو بڑے لفظ سے یاد نہیں کرتے تھے۔ گورنٹ برطانیہ کی عدالت و نفرت آپ کی فطرت بن چکی تھی۔ اس کو بھی ہمیشہ بنواری مہربان گورنٹ فرمایا کرتے تھے۔ اگرچہ اس لفظ ”مہربان گورنٹ“ طعنے پر تھا اور بعد کی تقریریں گورنٹ برطانیہ کی تمام مہربانیں کا زنا فاش ہوتا تھا۔ حضرت مدنی کی یہی انکساری اور انکساری تھی جس نے مخلوق خدا کو ان کے اور شیعائی بنا رکھا تھا اور آپ ہر ایک کے سرور اور رسل بنے ہوئے تھے۔

اس انتہائی انکساری کے باوجود حضرت مدنی وقار و کثرت کا کوہِ طور یا کوہِ نور تھے۔ ایک خاص نوع کا عجب و حلال چہرے پر عیاں تھا۔ باوجودیکہ ان کے منہ میں کراہتیں فرمایا کرتے تھے۔ مگر غلبہ کا دل اندر سے لڑتا رہتا تھا اور شکلِ بات کی جاسکتی تھی۔ مولانا احتشام الحسن کا زحلی فرماتے ہیں۔ ”بیرہ حال مولانا علی کی وجہ سے تمام بزرگوں سے بات کرنے کا عادی تھا۔ حتیٰ کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی بے دھڑک حرج میں آتا تھا کہ دیتا تھا اور حضرت بکری صاحب سے کبھی کسی گرائی یا ناگوار کسی کا کبھی اظہار نہیں ہوا۔

میں نے اکثر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عمر بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ سنا ہے ”حضرت مدنی سے ڈر لگتا ہے“۔ بار بار ایسا چاہا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کسی خاص مقصد اور بات کے لیے دیر نہ لگتے۔ وہاں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلف ملاقات ہوتی اور میں نہیں کراہتیں نہیں۔ مگر مقصد کی بنا پر پرتشائی اور دلچسپی کے بعد فرمایا۔ ”حضرت مدنی جو علیہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی“

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ لباس کے معاملہ میں سخت کاٹھا کھڑے پہنتے ہیں بہت تشدد سے تھے۔ اور پیشہ ساری تر کھڑے پہنتا۔ اور اس کے علاوہ اور استعمال ایسی استعمال کرتے تھے۔ اور ٹپے جلنے والوں سے بھی پھری پسند کرتے تھے کہ وہ ویلی کڑا پہنیں اور ویلی استعمال کریں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مالک سے وراثہ شریف سے نفرت مقصود تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت کا نشانہ ان کا ہاں سے معاش میں سادگی اور بے تکلفی آگیا ہے تاکہ زینت و لباس کے ہاں بے اندازہ اعتراضات اٹھ جائے ہیں۔ وہ کم ہوں اور اس ویلی لباس کے بارے میں اتنا اہتمام تھا کہ اگر کسی ہمت کو لٹھے وغیرہ کاٹھن دیا جاتا تو اس سے باز نہ آتے تھے۔ مگر چھوٹے نہیں تھے۔

بعض جلیل القدر شایخِ طریقت محض اس لیے کاٹھا پہننے کا اہتمام فرماتے تھے کہ شاید حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو جائے اور وہ اپنے سے ان کو گرائی اور ناگوار ہی ہو۔

ایشاد و قربانی بھی ایک اعلیٰ انسانی جہ ہے جس سے انسانیت پروان چڑھتی ہے۔ اسی لیے مسلمان پاک میں زمین تائین کا وصف بیان کیا گیا ہے۔

شار و قربانی

”وَيَسْخَرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَكِنَّ لَهُمْ فِيهِمْ خَصَاصَةٌ“
اور ایشاد کرتے ہیں وہ اپنے نفسوں پر گریہ خور ان کے لیے سنگی ہوتے۔

حضرت مدنی بھی ایشاد و قربانی کا مجسمہ تھے۔ ان طلباء کے اخراجات کی ضرورت فرماتے تھے۔ جن کا دارالعلوم سے وظیفہ نہیں پہنچتا تھا اور اپنے لئے کی ضرورتوں کو خفیہ طور پر پوری فرماتے تھے۔ بار بار یہ معلوم ہوا کہ اپنے رہتا سفر کے تمام اخراجات حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ خود برداشت فرماتے تھے۔ سفر میں اخراجات کے وقت سب سے پہلے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ تیب میں جاتا تھا اور بڑا نکال کر بڑی تلب اخراجات وہ اپنے پاس سے پورے فرماتے تھے۔ فی ضرورتوں کو اپنے پاس سے پورا فرماتے تھے اور اس معاملہ میں بہت سختی برتتے تھے اور بڑا دیا دوسروں کی طرف سے آتے تھے۔ بلے دریغ ان کو رہتا پورے کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے
فی مہمان نوازی، جو شخص اللہ اور ہم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرتے و مسلم و مشرک

پس معلوم ہوا کہ مہمان کا اعزاز و اکرام ایمان کا خاصہ ہے اور یہی انسانیت و شرافت کا اصلی تقاضہ ہے کہ اپنے پاس آنے والے کا ہر طرح اعزاز و اکرام کیا اور فیاضی و فراخی برتی جائے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اپنی آپ، ہی مثال تھی جس سے وہ رنگ بخوبی واقف ہیں۔ جس کی کمی نہ تھی کہ استاد پر حاضری کی سعادت نصیب ہوتی۔ روزانہ کم و بیش چالیس مہمان حضرت کے دسترخوان پر ہوتے تھے جو مختلف خیالات اور مختلف اطراف کے تھے۔ حضرت پر ایک کا پورا پورا اعزاز و اکرام فرماتے تھے اور نہایت فیاضی اور فراخی کی ساتھ خرچ کرتے تھے۔ کھانا اگرچہ ایک ہی ہوتا تھا مگر لذائذ و مزمار تھا۔ حضرت دنوں وقت کا کھانا مہانوں کے ساتھ کھاتے تھے اور خود بھی وہی کھاتے جو مہانوں کو کھاتے تھے۔ کھانے میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہوتی تھی۔ جو ہر تہا سب کے لیے یکساں ہوتا تھا اور اگر کوئی خاص چیز کپڑائی جاتی تھی تو سب کے لیے کپڑائی جاتی تھی۔

رضان المبارک میں چونکہ مہمانوں کی تعداد سینکڑوں ہوتی اور سب کے لیے دودھ کی کمی چڑھا کر انتظام نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے حضرت خود بھی دودھ استعمال فرماتے تھے اور تعلقین کے احار پر فرما دیتے۔ آنا کہاں سے ہے سب کے لیے دودھ کا بندوبست کیا جائے۔ اگر مہمان بے وقت بھی پہنچ جاتے تھے تو ہفت ان کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اور کبھی مہمانوں کی کثرت سے گھبراتے یا کھاتے نہیں تھے۔ بلکہ کبھی کوئی واقف دوسری جگہ ٹھہراتا تھا اور لانی ہوتی تھی۔ اگر کوئی ناواقف بلکہ مخالفت بھی دسترخوان پر بیٹھ جاتا تو اس کے ساتھ بھی پوری بشاشت کا اظہار ہوتا تھا۔

خود کم کھاتے تھے اور دوسروں کو زیادہ کھاتے تھے اور بعد میں بچے ہر سال کی لیلین کو خود اپنی انگلیوں سے چاٹتے تھے اور دسترخوان پر گرے ہوئے ہر شے اٹھا کر تناول فرماتے تھے۔ خود آہستہ آہستہ کھاتے تھے۔ تاکہ سب مہمان خوب پیٹ بھر کر کھالیں اور جب سب کھا چکے تو فرماتے کہ میں ابھی تک کھا ہوا ہوں اور تم پہلے ہی فارغ ہو گئے۔ یہ تو اچھا نہیں ہے۔ بار بار اور کھاتے تھے۔ غرضیکہ اس بارے میں آپ اپنی مثال آپ تھے۔

اس بارے میں ہندوستان کے شہر کیرٹھ لیڈر ڈاکٹر محمد اشرف کے مآثرات ملاحظہ ہوں۔

۱۹۲۶ء میں کیریٹ پارتی کو مسلمان سوال کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر متحرک کیا گیا کہ اس کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ میں اس عباد کی فرائض میں دلبرند بھی حاضر ہوا۔ محراب و ممبر کے جلسے تو میں نے اس سے پہلے بھی دیکھے تھے۔ خلعت کے مطالبہ کا مقدمہ ابلا۔

جنگ عظیم کے بعد ایشیا کی گرائی، مولانا کی قلیل آمدنی، بلیک مارکیٹ کا زور، مگلاس سے حضرت مولانا کی معائنہ فرائض میں کیا فرق آسکتا تھا اور جب مجھ جیسے اجماع اور بے دین کو مولانا نے باہر اسے مکان میں بٹیرا لیا تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیمت، ارشاد داری، دوستی اور درس و تدریس کے واسطے سے مہمانوں کا کیا جرم رہتا ہوگا جب میں مولانا کی رہائش گاہ پر سوچتا تو مہمانوں کا قافلہ پہلے سے موجود تھا چنانچہ میں نے بھی مہمانوں کے بڑے کمرے میں ایک چارپائی پر بستر لگا دیا۔

دینداروں کے معرلات سے میں لیں بھی گھبراتا ہوں۔ مگر پہلے دو دن میرے اوپر واقعی بڑے سخت گزرے۔ نماز پنجگانہ تک تو خیر میں صبر کر لیتا۔ مگر مولانا کے یہاں تمہیں تباہی کا قائل لیل تھے۔ کیفیت یہ کہ عشاء کی نماز کے بعد میں پیش کش تھے بھر سیرا ہوں گا کہ کسی کو نہ سے تنبیہ والی جہر ملے ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ میرے آس پاس کئی کرائی میں ٹھہک رہے تو کئی تیس دنوں میں تھوڑی دیر میں یہ حضرات تہجد کے لیے اٹھ بیٹھے پھر فجر سے پہلے اور بعد قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب دوسری رات بھی اسی کیفیت کی تھوڑی دیر میں تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضور کے ساتھ رہنے سے میری عاقبت درست ہو جائے مگر میری صحت کو خطرہ ضرور لاحق ہو جائے۔ حضرت نے قسم فرمایا اور میرے دن سے مجھے ایک صلحہ اور آرام وہ کوہل گیا یعنی اب میں آزادی سے اپنے کمرے میں رہتا تھا جو مجھے اپنے گھر میں حاصل تھی چنانچہ میں نے مراد کی فرائض کا وہ کام جس کے لیے میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں مجھے دیوبند کی مجاہدانہ تاریخ کے بہت سے نئے واقعات کا علم ہوا۔

دیوبند کے قیام کی غالباً چوتھی شام تھی کہ میں اپنے بستر پر دراز تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر سے پھر سنے کی وجہ سے کچھ تنگی زیادہ تھی چنانچہ لپٹ گل کیا اور سنے لگا۔ دروازہ کھلا رہتا تھا۔ مجھے کچھ غمزہ کی سی تھی کہ میں نے ایک ہفتہ اپنے گھر پر محسوس کیا اور پھر دو دن ہاتھوں سے کسی نے میرے پاؤں دہانہ شروع کر دیے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ دیکھتا ہوں کہ حضرت مولانا نفس نہیں اس گنہ گار کے پاؤں دہانے میں مصروف ہیں۔ میری بدحواسی اور شرمندگی کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میں نے پاؤں جلد جلد کھڑے اور بڑے ادب اور لطافت سے حضرت کو روکا۔ مولانا نے اس پر حضرت سے فرمایا۔ آپ مجھے اس ثواب سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ آپ جیسے مہمان کی خدمت کر سکوں۔ مجھ پر اس ارشاد کے بعد گزرنے والی میرے لیے اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ واقعہ یہ بھی بتاؤں کہ میں بارہ برس بعد آج پہلی بار اس واقعہ کا انکشاف کر رہا ہوں اور اگر حضرت زندہ ہوتے تو اس راز کو فاش کرنے کی ضرورت نہ

مولانا نے پچاس سال آقا کریمت جلد ستھین کے پاس پہنچ جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی زندگی میں کبھی اتنا مال بچ نہ ہوا کہ اس پر کڑوہ فرض ہو۔

مولانا کے زہد و تقویٰ کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ مولانا دارالعلوم کی مدتوں سے خدمت کرتے تھے ۳۴ سال کی طویل مدت دارالعلوم کی خدمت میں گزاری۔ مگر ان دنوں کے علاوہ جن میں پڑھاتے۔ بعید ایام کی تنخواہ نہ ملنے کے اگرچہ مدرسہ ہی کے سلسلہ میں کہیں آنا جانا ہوتا۔ پندرہ سو روپے ضرورت سے کہیں سفر کرنا ہوتا۔ مگر پھر بھی ایام مدرسہ کے علاوہ ان دنوں کی بھی تنخواہ نہ ملنے۔ مرض الوفا میں ایک مہینہ کی رخصت جاری وغیرہ اور اس کے کچھ چھٹیاں جو قاتلانہ سختی تھا اور نہیں لی تھیں۔ وہ بیماری میں شمار ہوتی۔ ان سب دنوں کی تنخواہ جو ایک ہزار روپے سے کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ مدرسہ نے بھی نہیں لے کر فرما کر واپس کر دی کہ جب میں نے پڑھایا نہیں تو تنخواہ کیسی۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مدرسہ صاحب قبلہ گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ حضرت کا زہد و تقویٰ اس بات کی اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر میں شرفا کوئی قسم نہیں ہٹے اگر آپ فرماویں تو وہ رقم میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں؟
خالد صاحب نے عرض کیا۔ جس پر کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے پسند نہیں فرمایا اس کو میں کس طرح پسند کر سکتی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ پس آپ کی ضرورت ہے۔

حضرت کی زندگی کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ اچھا لی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں جیسے بڑا واقعہ ہوتے تھے۔ یہ انکا ایک ایسا وصف تھا کہ علماء کی جماعت میں بڑے بڑے ارباب جو حضرت کے انکشافات نہیں کر سکتے۔ کیا مجال کہ دائمی مذاکرہ کی ان کے سامنے آتا ہے۔ کس کی عزت کہ سربراہ انگیزی طرز کے بال ہوں اور ننگے سر حضرت کے دربار جاتے اور ان چیزوں پر اس لیے زیادہ شدت تھی کہ لوگ سنت نبویہ کا مذاق اڑا لے لگتے ہیں۔ دائمی مذاکرہ، سربراہ انگیزی بال لکھنا اور پھر اس پر فرخ کرنا اور ننگے سر منع لوگوں کو بوجھ جانا گویا سنت نبویہ کی تحقیر و تہقیر ہی نہیں اپنے آپ کو کفر کی سرحدوں پر لاکھڑا کرنا ہے۔ بدین وجہ حضرت ایسے لوگوں پر سخت ناراض ہوتے تھے۔ اور ان باتوں پر ان کی گرفت سے نہ زور سناج سکتے تھے نہ محتاط طبقہ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان کی اس ادا کے نتیجے میں ہزار ہا چہروں پر داناں نظر آئے لگیں اور ہزار ہا سروں سے آنکھیں پڑتی جا بھر اتر گیا۔ معروف کی اشاعت اور نکالت سے اس شدت سے روکنے والا جماعت علماء میں اس سے کوئی پلایا ہوگا۔ باطل پرست جاحلین کا مقابلہ جس پامردی سے کرتے اور اس راہ میں ہر سبب شتم، طعنہ و تفرعن کو جس خندہ پیشانی سے قبول کرتے۔ یقیناً اس کے اجر و ثواب سے عالم افزائی میں انکا دوا میں مراد و جہاد ہے۔ لا عمل و ہمت کی ایک چٹان تھی جس کے کبھی ٹھکانا نہ مانا۔ عزم و بلند روحانیت کا ایک کوہِ گران تھا جس کو سوا دھ۔ روزگار اور انقلابات زمانہ اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے تھے۔

کون اس باغ سے اے باوصحابا آتے!

دنگ نصار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے!

حضرت مدنی دنیا کے علم کے آفتاب تھے جہاں آپ نے چستانِ روایت کو تازگی بخشی اور علم کے سبز زاروں کو سیرینجا۔ سیاسی دنیا کو بھی صبر و استقامت، متانت، فکر، احسانت رائے، یقین، حکم اور جہد مسلسل کا سبق دیا۔ سیاست کا ایک ملکہ کار اور پارکینگی دی۔ مذہب کو ایک نیا جوش اور نئی آمیگ دی۔ لیکن آپ متوجہ عالم، ممتاز سیاست دان، قومی رہنما اور روحانیک عظمت اور وقار عطا کیا۔ مولانا کی مقدس زندگی کے سبھی وہ پہلو ہیں جن پر دنیا کی نگاہ پڑتی ہے۔ لیکن آپ متوجہ عالم، ممتاز سیاست دان، قومی رہنما اور روحانیک

امام ہدے کے ساتھ ساتھ صاحب قلم بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے جو عملی مذہبی روحانی اور سیاسی خدمات انجام دی ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جو لوگ مولانا کے قریب رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ حضرت مولانا کے لیے پناہ سیاسی و مذہبی مشاغل اس بات کی اجازت ہی نہ دیتے تھے کہ وہ کوئی علمی کام کریں یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات چند سے زیادہ ہیں اور تصنیفات بھی اس لیے جو ہیں جنہیں آئیں کہ لوگ انھیں پڑھیں اور تحریک کریں۔ بلکہ قلم اس وقت ہاتھ میں لیا گیا جب اس کی شدید ضرورت محسوس کی گئی اور لوگوں نے مسلسل اصرار اور بار بار تقاضے کئے تصنیفات میں "اسیرِ مالٹا" متحدہ قریت "فتش حیات" "الشباب الثاقب" ہیں ان کے علاوہ کچھ رسائل اور خطابات ہیں۔ "الشباب الثاقب" آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

"اسیرِ مالٹا" غالباً تصنیف ہے۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب آپ کا قلم اور آپ جواں تھے۔ اس میں آپ کا قلم ایک طبع شیعہ آزادی کے پروانوں کو جہد و جدہ کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف اس کی توک سمارا حیثیت کے قلب میں پرست ہر ہی ہے "اسیرِ مالٹا" میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مدرس اور انقلابیوں کے امام شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مذکورہ زندگی کا ایک ایک گوشہ نمایاں کیا گیا ہے۔ "اسیرِ مالٹا" کے شروع کے چند اوراق میں بہت دل کش اور پسندیدہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں کا گلدستہ اس قابل ہے کہ بار بار پڑھا جائے۔ اس کے لفظ نقطے سے طعنے لگتا ہے۔ اس کے جملے جملے میں محبت و عقیدت کی بیج و تاب لکھا جی ہوئی لہریں، جذبات کا جہاز ابدل اور انقلابات کی گونج ہے۔ اس کے نقطے نقطے میں احساسات کی دہائی چنگاریاں اور اس کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی غور و فکر کی دعوت صبر و استقلال کا درس، یقین حکم و عمل پر چم کی تلقین تشکیل سیرت اور تہذیبیات کا ایسا ہی پہلی ہے مثلاً

"اس نے ہجرِ آزادی سے فیض حاصل کیے۔ لیکن دُکار نہ لی، اس نے قاسمی نہریں پی لیں۔ مگر منہ نہ کر گیا۔ اس نے رشتہ یی گھٹاؤں اور دھواں دار بادلوں کو چھوٹ لیا مگر لیے اختیار نہ ہوا۔ دعویٰ نہ کیا شیطانی دمنائیں، استقامت سے نہ ہٹا۔ شریعت کو بچھڑا، عشی میں گھل کر گھٹی ہر گیا۔ مگر دم نہ مارا۔

"ور کئے جام شریعت در کئے سندان عشق

ہر ہر ہمتا کے نڈا جام و سندان باطن

یہ الفاظ شروع کے چند اوراق میں اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مولانا کا قلم حالات و کوائف اور تجربات و مشاہدات کی اتھاہ گرائیوں میں بہت احتیاط کے ساتھ لکھا ہے اور مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رفاہی گھماڑ سے لے کر اسارت مالٹا اور ہندوستان کی واپسی تک تسلسل واقعات کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ہندوستان، عرب، مالک ترکی کی مظلومیت اور اتحادیوں کے رہا ہی کرشمے اور ظالمانہ رویے کھل کر سامنے آگئے ہیں۔

"فتش حیات" میں تو مولانا کی خود نوشت سوانح ہے۔ لیکن اس میں تجربات کے علاوہ سیاسی معلومات کا اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ اس میں آپ کا خاص اسلوب نگارش ہے جو بہت ہی سنجیدہ، بہت ہی جامع اور بہت ہی پاکیزہ ہے۔ آپ کا قلم اس دہائی تک چلتا ہے۔ جتنا اسے چلنا چاہیے۔ ذاتی تفصیلات و جزئیات میں ہی نہ کہ پڑھتے پڑھتے قاری کا جی کاٹتا ہے اور نہ اتنا اختصار کہ مطلب ہی معلوم نہ ہو جس بات کی تفصیل ضروری ہوتی ہے۔ اسے پھیلا کر لکھتے ہیں اور بہت اعتبار برتا جاتا ہے۔ وہاں مختصر کیجئے کہتے ہیں۔

تفصیل سے حیات "میں کثرت سے انگریزی اور اردو کی تاریخی کتابوں سے حوالہ جات پیش کرتے۔ لگتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو حدیث،

تفسیر، فقہ، معقولیات کے علاوہ فن تاریخ پر بھی پورا عبور ہے۔ جب کوئی بات لکھتے ہیں۔ بے دلیل نہیں لکھتے۔ مذہبی اور علمی مضامین ہوں تو ان میں جابجا کلام و ادب پیش کی جاتی ہیں۔ اور تاریخی حالات کا تجزیہ کرنا ہوتا ہے تو تاریخی کتابوں سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ہوتا ہے کہ دُعا کے ذہن میں لغتی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اور تجزیہ پر بھی کبھی قیام کا شک و تردید باقی نہ رہے۔ اس کے سامنے ایک متعین اور کشادہ راہ کھول دی جاتے۔

نقش حیات میں زیادہ تر انگریزوں کی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا۔ اس کی دولت لٹی اور بھرا ہے۔ بھی جتنا ہے اور ہر طرح اپنے عجیب و غریب چھپانے کی کوشش کی۔ مولانا نے ان کران ہی کی تحریروں سے بے نقاب کر دیا۔ اور ان کی تمام غلطی کھول دی ہے۔ بات ثابت کر دی کہ انگریز ظالم تھے۔ انھوں نے ہندوستان کا خون چوستے میں پورا ثبوت دیا۔

”نقش حیات“ کوئی ناول نہیں۔ افسانوں کا مجموعہ نہیں، شع و ادب کی کوئی کتاب نہیں۔ بلکہ ایک ایسے انسان کی خورد و نشو و سازش ہے جو دین و دنیا میں علم دینی مدرسہ کا صدر مدرس و شیخ الحدیث ہے۔ جب ہندوستان کی تحریک آزادی کا بہار سلا رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت کی تربیت کا محب صادق ہے۔ اسلام کے دشمن بزرگ ایک انگریز کا ہندوستان میں نہیں بلکہ لارڈ سیرس ہیں سب سے بڑا مخالف ہے۔ مصنف کی ان تمام صفات کو سامنے رکھ کر کتاب پڑھیں تو آپ کتاب کو ایک قیمتی دستاویز خیال کریں گے۔ ایک شیخ طریقت اور عالم اہل کس طرح اپنی سوانح لکھ سکتا۔ کتاب کی دونوں جلدیں گزشتہ ڈیڑھ صدی کے حالات، تحریکات آزادی اور انگریزوں کی ہندوستان اور دنیا میں وسیع کاریوں کی ایک ایسی سیچ جس کو پڑھنے کے بعد تاریخی بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ انداز زبان سادہ اور بے تکلف ہے۔ مثلاً

”بسا اوقات میں مسجد نبوی میں بیٹھا ہوا کتاب پڑھتا ہوا پڑھتا اور آدمی آنا کہ والد صاحب بلا رہے ہیں۔

طلبہ کو نصیحت کر کے حاضر ہوتا تو فرماتے کہ مٹی اٹھانے والا یا اینٹ اٹھانے والا مزدور نہیں آیا۔ تم

اس کام کو انجام دو۔ یہ مجھری تمام دن یہ کام کرنا پڑا اور تمام اسباب کو معطل کرنا پڑتا۔ بسا اوقات ایک

ایک دو دو ہفتہ اسباب کو معطل کر کے تمام اوقات اسی تعمیری خدمات میں صرف کرنے پڑتے۔

(حصہ ۱ ج ۱)

اسی ہی مختصر تحریر میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک نقشہ پیش کیا ہے کہ رکھ دیا ہے۔ لیکن اخلاص و انکسار کے ساتھ۔ زندگی کی یہی وہ ٹکٹیں منزل پہنچتی ہیں۔

عبد کریم صاحب و شمار ہوتا ہے۔ چند سطروں سے نہیں بتا دیا کہ انھیں کتابوں سے فطری تعلق اور دلی رابطہ تھا۔ لیکن والد صاحب کا حکم پہنچا۔ فوراً اس کی تیار

ایک طرف اطاعت والدین کی اور دوسری طرف سرکار و دعوای نبوی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی ادا کی۔

مولانا کی تحریروں میں پاکیزگی، سستہ کاری کے علاوہ یقین و عزم کی کیفیت پرچھوکتی ہے۔ کوئی مقام ایسا نظر نہیں آتا جہاں بزدلی و خوف اور ہراس کا احساس ہو۔ ہر لفظ میں شیرازہ ہے۔ ہر خط میں وقار ہے۔ ہر سطریں ایک مجرب اور شاہد ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ صاحب طرز ادیب یا شاہکار ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی تحریریں ایک انفرادیت و مزور جھلکتی ہیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کی بجائے انھوں نے اپنے مقصد اور موضوع پر محض اس قدر باتیں پیش کیں ہیں جن سے ان کا مقصد پورے کر پڑھنے والا فکرو عمل کا جذبہ لے کر اٹھے۔

مکتوبات شیخ الاسلام ”امیر دانا“ نقش حیات ”تمتہ قویت“ ”الشباب الثاقب“ اور دیگر سچے سچے حصے ہیں کے علاوہ آپ کے مکتوبات کو سچ لکھا گیا ہے اور یہ دعوت ملک کے نامور عالم مولانا نجم الدین اصلاحی نے مکتوبات شیخ الاسلام ”کے نام سے لکھی ہے

یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت والا مختلف خطوط لکھنے والوں کے جواب میں تحریر فرماتے رہے۔ مکتوبات فقہی، علمی، تربیتی اور سیاسی ہیں۔ یہ علم و معلومات کا ایک ذخیرہ ہیں۔ جن میں حضرت کی مقدس شخصیت اور شخصیت کا بلند اور پاکیزہ کردار کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ یہ مکتوبات رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

مکتوبات کا کونسا اسلوب پسندیدہ ہے یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی، سہلے لکھنی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا ہے تو کسی نے مولانا ابراہیم آزاد کے خطوط "غبار خاطر" کو یا راس و حیر سے لکھا کہ ان میں ادب کی چاشنی، الفاظ کی سجاوٹ اور جملوں کی خوب صورت ترتیب ہے۔ اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معلومات کا دریا موجزن ہے۔ لیکن مکتوبات شیخ الاسلام کو اس سہلے پسند کیا جاسکتا ہے کہ ان میں خاص علمی، اخلاقی اور روحانی باتیں ہیں۔ ایسے خطوں جن میں حوت زبان و بیان کی خوبی ہو۔ لیکن کوئی بنیادی فکری و عملی افادیت نہ ہو۔ ان کے مطالعہ سے قاری خطرات اٹھا سکتا ہے مگر اپنے فکر و عمل کے لیے کوئی سرمایہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مگر مولانا کے خطوط پڑھ کر ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ان خطوط کے متعلق حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدیر دارالعلوم دیوبند کی تحریر سے جو بڑے عمدہ مکتوبات کے شروع میں ہے۔ ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

حضرت قاری صاحب مدظلہ فرماتے ہیں۔

"ان مکاتیب اور ان کے مکثور علوم و احوال کی فہرست پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے ہی سے اس جامعیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا جو حضرت مدوح کی ذات میں ودیعت کی گئی ہے۔ اور ہر تمام ہی دینی طبقوں کے لیے یکساں شفا بخش ہے۔ حال و قال دلسہ حضرات ہوں۔ یا ہرین در مسئلہ لالہ طے ہوں۔ طالبان مسائل ہوں۔ یا عاشقان دلائل، سب ہی کے لیے اس مختصر گہرے جامع ذخیرہ میں سامان سیلابی موجود ہے۔ ان جامع دیات سے اگر ایک طرف طریقت و معرفت کے مسائل حل ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف شریعت کے حکمات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور جہاں شریعت و طریقت کے مقامات کھلتے ہیں وہیں سیاست و ادارات اور قومی معاملات کے دقائق بھی واضح گات ہوتے ہیں۔ غرضیکہ ایک وقت شریعت و طریقت اور سیاست کے دقیق اور حیات بخش کئے اس طرح زیب و قزاس ہو گئے ہیں۔ کہ ایک جہاں سے حقیقت و معرفت ایک متلاشی احوال طریقت اور طایفہ شریعت و سیاست کے لیے یکساں شفا اور سکون و روح کا سامان ہم پہنچا سکے ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ مکاتیب شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جس کی شخصیت معلوم کرنا ہو۔ اس کے خطوط دیکھ جائیں۔ خطوط کے آئینہ میں شخصیت کی تصویر اپنے علمی و خیالی میں صاف عکس نظر آتی ہے۔ مکتوبات شیخ الاسلام کے مطالعہ کے بعد ہر شخص حضرت مولانا کی شخصیت سے متعارف ہو جائے گا اور اسے مولانا کی عظمت، پاکیزگی اور علمی کا قافلہ ہزار پرے گا اور ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مولانا داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے بہت بہت معروف، نہایت مخلص اور بلند کردار کے حامل تھے۔ مکتوبات زبان کے اعتبار سے بوجہ ہر مزہ میں اور مزاجی چابو ہیں۔ کیوں کہ جن مکاتیب سے علم و ہدایت کا کام لیا جاسکے۔ علمی، فقہی، سیاسی اور باطنی مسائل کو سمجھا جاسکے۔ ان میں عربی کے مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کا پایا جانا ناگزیر ہے۔ مکتوبات کی دو ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت کے تمام مکتوبات ان دو جلدوں میں آ گئے ہیں۔ مرتب کو جو مکاتیب دیر آئے۔ انہی کا مجموعہ نے جمع کر دیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کی طرح "مکتوبات شیخ الاسلام" کی حیثیت بہت بلند ہے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ رشد و ہدایت

کے سلسلے میں ان دونوں حضرات نے کتب و کتابت کے ذریعہ جو کام سر انجام دیا ہے۔ تاریخ میں بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر میں تو تیسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایسی بے چوٹی مثال شاید پوری تاریخ میں نہ ملے۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ صحت اور حفظانِ صحت کے اصولوں کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ کیونکہ ایک تندرست جسم تندرستی اور مدنی دل و دماغ اور اعصاب بھی تندرست ہیں۔ اور تندرست انسان اپنے متعلقہ کاموں کو حسن و خوبی اور جلال کے ساتھ سر انجام دے گا اور پھر ایک مسلمان کو تو ہمیشہ جہاد اور مہم شہادت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ علمی اور ملی جہاد کے لیے جسمانی صحت کا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت مدنی نے دارالعلوم میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ تین شعبہ جات تعلیم سے نکلائے۔ اور ان کے لیے فخری محلین کا تعلق بنایا گیا۔ ایک علم و ہندی تعلیم کے لیے ایک علم عربی و اسلامی و قرآن و حدیث کے لیے تیسرا معدوم کر دیا گیا۔ جسمانی و ذہنی اور تندرستی کے اس نگران کو استادن کہا جاتا تھا۔ اس شعبہ کے استاد محمد طہیر مظہر تھانوی مقرر ہوئے۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ کھلے میدان اور آڑھ ہمارے ان کے اوقات صبح بعد نماز فجر اور شام کو بعد نماز عصر مقرر ہوتے تھے۔

ایک خط میں مولانا ایسی ہی چیزوں پر زور دے رہے ہیں۔ وہ ملاحظہ کیجئے :-

میرے عنایت فرماؤ گواہم کہ درمیں ہم میں اتفاق نہیں، ہم اختیار نہیں رکھتے۔ ہم مال نہیں رکھتے۔ ہمارا دشمن قوی ہے۔ اس کے پاس ہر شے کا سامان ہے۔ ہم کو اسے سیدھا کرنا اور اس سے بدلہ لینا ہے۔ مگر ہمیشہ مقابلہ بھی اور طاقت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے۔ یہی طریقہ قرآن، حدیث اور کتب صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ اس لیے ہم کو جب تک ہمارے مقصد حاصل نہ ہو جائیں یعنی خلافت کی آزادی، جزیرہ العرب، ہندوستان کی آزادی، پنجاب کی خلافت، اس وقت تک ہم کو نہ چین سے بیٹھنا ہے اور نہ بیٹھنے دینا ہے۔ آپ یہ سوال کریں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟

میں کہوں گا کہ آپ پرشہر غافض ہے کہ اگر ایک مری ہوئی چیز کی طرح آپ کاٹ کے ہیں تو ضرور کاٹ لیجئے۔ اس کے معنی یہ نہ سمجھئے کہ خلافت اس کوئی بات کریں غریزی کریں۔ نہیں۔ نہیں۔ صلح اور شہرہ کے ساتھ جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچائیں۔ دوسروں کو آگاہ کریں۔ دشمن کو گزند کریں۔ ان کی تجارت کو گھٹائیں۔ ان کی محبت ان کے خوف کو دلوں سے دور کریں۔ لوگوں میں جرات پیدا کریں۔ سچ کہنے سے زنجیریں۔ لوگوں کو زنجی اور حکمت سے سمجھائیں۔ شدت کو کام میں نہ لائیں۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملائیں۔ بے ہود کو نہ توڑیں۔ اسی دین میں رات دن لگے رہیں۔

لوگوں میں سپر گری پھیلائیں۔ ہانک، پیٹ، لکڑی، تلوار، گھڑے کی سواری وغیرہ جو ہمارے زنگوں کا طریقہ تھا جس کو تمام شریعت خانہ لڑوں کے لوگ لیکھنا۔ اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اس کی طرف لوگوں کو توجہ دیں۔ کم از کم روزانہ ایک آدھ گھنٹہ اگر یہ عمل جاری رہے تو ہم خود ہر کام کا کام دے جہاں صحت حاصل ہو۔ ایک فن ہاتھوں میں رہے۔ وقت بے وقت کام آئے۔ اور مال و اولاد کی حفاظت ہو۔

شیخ الاسلام کے پسندیدہ اشعار
 کسی شخصیت کا اندازہ ان اشعار سے بھی ہوتا ہے جن کو وہ عام طور پر استعمال کرتا ہے۔ یا بے
 اعتدالی میں اس کے منہ سے نکل جاتے ہوں۔ یہاں ہم چند اشعار نقل کرتے ہیں جو حضرت
 مدنی کی زبان پر تکرار و تکریر یا مجالس میں بے اعتدالی کرتے تھے۔

ناز پروردہ تنعم نہ روا دوست : عاشقی شہرہ زندان بلاکش باشد

عشق چوں خام است باشد بستہ ناموسنگ

عشق میں تیسے کو غم سر پر لیا جو سو ہو : عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا جو سو ہو

نوبہار است جنوں چاک گریباں مددے : آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

ہم نے تو اپنا آپ گریباں کیا ہے چاک : اس کو سیا سیا نہ بیا بھر کسی کو کب

باردوب از چوداے تو : منم : و کس نگہ کہ آشنائے تو منم

گر کشتہ شہی گو کہ من کشتہ شدم : شکلاں بد کہ خون بہتے تو منم

یقین ہے دان کہ آن شاعر نکو نام : بہت سر بریدہ ہے دہر حجام

تو گو مارا جاں شد باز نیست : پر گریباں کار با دشوار نیست

یام او مایا نہ یام جستوئے می کنم : بشند و دانشند من گفتگوئے می کنم

بجز ترش باوگر نزارم بجز دے تو دیکلام : ایک اشقی و شک از جو و ان سالت بجز سالی

فراق و وصل چہ خواہی رضا دوست طلب : کہ عیفت باشد از و غیر ازین تناسے

جزاؤ دوست ہر چہ کنی عرضائع است . جز سر عشق ہر چہ بخوانی لطافت است

سعدی بشوے لہجہ دل از نقش غیر حق علی کہ راه حق نہ نماید جہالت است

دنیا آخرت بگذرا حق طلب کن کیس ہر دو لیلیاں رامن خوب می شام

یک لمحہ غافل از ان مشاہد نباشی شاید کہ نگاہے کند و آگاہ نباشی

بڑے ہی درد سے پریشان کرتے تھے ۔۔

بابا رشتہ سب سے ، ٹوڑا ،

بابا رشتہ رب سے ، جوڑا

بابا رشتہ حق سے ، جوڑا

ہر اک کہ غافل از وسعہ یک زمان است . ہاں دم کا فر است اما نہاں ست

دگم نہ برگ سبزم نہ دخت سایہ دلم در حیرت کہ دہان بچہ کار کشت مارا

ذہب الدین یحاشی فی اکث فریم یقی الذین حبیبہم لا تنفع!

دو لوگ ترپٹے گئے جن کے سایہ میں زندگی گزارا جاتی تھی۔ دو لوگ رو گئے جن کی کچھ کار آمد نہیں،

موجودہ دور میں کسی شخصیت کی سراج باسیرت تب مکمل بھی جاتی ہے۔ جب اس کا فوٹو بھی لگا دیا جائے۔ شرعی نقطہ نظر سے فوٹو کا حرام نہیں۔ لوگ فوٹو سے اس کے خدوخال دیکھ کر اس کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم یہاں حضرت مدنی رحمہ اللہ

حلیۃ شیخ الاسلام

لیکھ کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ اس کے بارے میں مبصرین تشنہ نہ رہے۔

آپ کا رنگ گندمی تھا۔ قد درمیانہ، گٹھا ہوا، مضبوط جسم، آنکھیں بڑی بڑی سیاہ، کشادہ پیشانی، گھنی داڑھی، ناک نہ زیادہ اونچی ہوتی اور نہ زیادہ نیچی، متوسط اور درمیانی، سینہ نہایت چوڑا، دو ہار دین، انگلیاں پیر گوشت۔

ہمیشہ دینی اصلاح، اشاعتِ علم اور سیاست تہذیب کو اچھا کرنے اور پانچو طبع کو آگے بڑھانے میں حیرت و مستعد۔ آپ کی مجلس نہایت باوقار

وہی تھی۔ لغو اصبہ ہر وہ بات کوئی نہیں۔ سب خاموش اور متوجہ، وہی شخص بولتا تھا جس کو کچھ پوچھنا ہوتا تھا۔ یا اگر کسی خاص بات کہنا ہوتی تھی تو وہ اس کا باب تراغ، انکسار اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ حضرت کی طرف سے سناتا تھا۔
شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ نہ

ادب الوفا و عز سلطان التقی

فہم المہیب ولی ذی سلطان

یہاں سنجیدگی اور وفاداری کا ادب ہے اور تقویٰ کا اقتدار مسلط ہے۔ شان و شوکت کچھ بھی نہیں پھر بھی رحمت شاہانہ ہے۔
بعض لوگ سوسائٹی میں بڑے باعجب اور سیرت و فکر دار کے بالک ہوتے مگر ان کی گھر کی زندگی نہایت گھناؤنی اور ناقابل رشک ہوتی ہے۔

ایک شہنشاہ زندگی کے اس میدان میں گمراہ نظر آتا ہے۔ علم و فضل یہاں پہنچ کر علی و قار اور فضیلت کی شان سے متبرک نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے جرنیل، کارواں اس دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ اپنے امتیازات و مہربسات منجھتی آثار پھینکتے ہیں۔ سیاستیں و مدبریں یہاں عمومی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ دنیا اور زندگی کی اس کمزور ترین منزل میں جن کا باطن و ظاہر یکساں نظر آتا ہے۔ وہ عارفین و دامنین الی اللہ ہی ہوتے ہیں۔

علمائے ربانی اور مشائخِ سخا کی انداز اور باہر یکساں نظر آتا ہے۔ گھر کی زندگی دیکھ کر ہماری زندگی دیکھ کر گھر کی زندگی سے کوری زندگی کی زندگی کا جو خاکہ آپ کو لاکھوں انسانوں کے مجر تاج میں مقصدین و متوسلین کے بلے پناہ اور عقیدت مند نہ جہم میں، کانفرنسوں اور اجلاسوں کی مسند میں نظر آئے گا۔ بعینہ ہی نقشِ گھر کی چار دیواری میں۔ بچوں اور اہل خانہ میں رونق افزہ ہوتے ہوئے آپ ملاحظہ فرمائیں گے یہی بڑائی کا معیار اور عظمت و کرامت کا لہجہ ہے۔ حضرت شیخ مدنی کی پوری زندگی خلوت و جلوت میں یکساں رہی اور یوں سمجھ کر حضرت "صحن فی الخلوات" کما است فی الجلوات لکل صدق تھے۔ بحمد اللہ حضرت کی زندگی کا کوئی گوشہ راز یا پوشیدہ نہیں ہے۔

دیہات کی خواہشیں کبھی کبھی اہل خانہ کی غرضیں یکساں مطالعہ کا رنگ پہنچ جاتیں اور سامنے کھڑی ہوجاتیں۔ ایسی صورت میں حضرت بہت پریشان اور افسردہ ہوجاتے اور اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے تھے۔ اور ملازم لڑکے یا صاحبزادوں یا بیگم صاحبہ کو آواز دیتے تھے جو فوراً منشا سمجھ جاتی تھی اور یہ صورت گمراہی نہیں۔

گوہن بھی شریعت کی پابندی کا بلے حدِ خاطر تھے تھے اور سب ہی افرادِ خاندان کو تاکید بلکہ ضرورت کے وقت تنبیہ فرماتے رہتے۔ اس باب میں

ایک خاص الخاص عزیزِ حمید الرحمن صاحب فاروقی کو چار بابِ معلیہ دہلی گزیر منٹریل ڈیریسر ٹی کینیڈا سے ڈاکٹر کی ڈگری لیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے حضرت کے بڑے بھائی مولانا محمد صدیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان میں شادی کر کے داہمی منٹادی۔ رشتہ بڑا نازک تھا۔ لیکن حضرت ناراض نہ ہوئے اور اس وقت تک راضی نہ ہوئے جب تک انھوں نے داہمی رکھنے کا عہد نہ کر لیا۔ اور پھر دعا کرنے کا وعدہ کیا۔

اعزاء و اقارب میں جو لوگ غفلت و احوال چوتے۔ ان کی نہایت توجہ سے خبر گیری رکھتے، عید، بقرہ عید کے موقع پر حسب کبھی آبائی وطن ٹانڈہ جانا اور ان سے پہلے ان کے ہر گھر میں بنس نفیس تشریف لے جاتے اور ہر ہر فرد کو عیدی تقسیم کرتے۔ اس دور میں نفسا نفسی میں کی لوگ جھنجھکی پڑوں اور ہر شخص غفلت کا لہجہ نہیں پھرتے۔ لیکن حضرت اپنے بھائی کی اولاد اور ان کے پوتوں کی بھی اپنے بیٹوں کی طرح پرورش و نگرانی کرتے۔ گھر کے افراد سے

اپنے کام کے لیے کبھی نہ فرماتے۔ بدن دہلے، سر پریل لگوانے یا گرمیوں میں پچکا کرنے یا سخت سے سخت گرمیوں میں بجلی کا پچکا کھولنے کی کبھی فرمائش نہ کرتے اور جیسا باہر کے مردوں یا شاگردوں سے کوئی کام نہ لیتے۔ ایسا ہی گھر کے افراد سے کام نہ لیتے۔ بلکہ اپنا کام اور دوسروں کا خود کرتے۔ اگر کوئی پچکا لے کر کھڑا ہو گیا تو منع فرماتے ہوئے کہتے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی پچکا کر دانا ثابت ہے؟ اگر کوئی گھر کا فرد کوئی کام کرنے پر بہت زیادہ اصرار کرتا تو اجازت فرمادیتے۔

پرنسز مل متعلق سے بچوں کی شادی کے سلسلے میں حجلت کی تاکید فرماتے تھے۔ لیکن اپنے گھر کے بچوں کے سلسلے میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کپڑا لٹکے دن ہی سے دن گنتا شروع کر دیتے تھے۔ بچہ کوئی بچہ جو بلوغ کو پہنچا۔ پھر کوئی حجلت کام نہ دیتی تھی۔

صاحبزادہ اسعد علیاں آذربائی مولانا محمد صدیق صاحب کے پوتے سید فروغ الہدیٰ کی شادیوں کے لیے ۱۹۲۲ء کو فی حجل سے قاری اصغر علی صاحب معتمد خاص کو توفیر فرمایا کہ میری رہائی کا پرگز انتظار نہ کیا جائے اور ان کی شادی کر دی جائیں۔ چنانچہ صاحب زادہ اسعد علیاں کی شادی فرما تقبیل ارشاد کے لیے کر دی گئی۔ مولانا فروغ الہدیٰ لکھتے ہیں کہ میرے متعلق حجل ہی سے میرے بڑے ماموں سید توحید حسین صاحب کیل سہارنپور سے نسبت لے کر لی ہے۔ اور اب صرف نکاح باقی ہے۔ چنانچہ رہا ہوئے ہی کہا کہ اس نکاح کر دیا جائے۔ میں نے گھر میں کیا کو بھی زیر تعلیم ہوں۔ تو فرمایا اس کو اس بار سے میں بولنے کی جرأت کیسے ہوتی۔ اگر بچہ میں نے سن تو سر توڑ دوں گا۔ اور نکاح میں آتی مہلدی دراصل معاشقہ کی طرف توجہ ہوئی غرائی کی طرف دیکھ کر تھا کہ بالغ ہونے کے بعد جلد شادی کر دی جائے اور لڑکیوں کی جلد شادی کا تو سید محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

اعزاء و اولاد حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہجائی اور ایک بہن تھیں۔

۱۔ حضرت مولانا محمد صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ محمد احمد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں پہلی بری سے ایک بیٹی مولانا سید وحید احمد پیدا ہوئے جو اسارت مالک میں حضرت کے ساتھ قید رہے اور ان دنوں صغیر سن تھے۔ چنانچہ دونوں حضرت شیخ الہند اور شیخ الاسلام نے ان کی تربیت کی۔ ان کی شادی مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ماموں زاد بہن کی لڑکی سے ہوئی۔ آپ نے ۵ سال کی عمر میں وفات پائی اور تین صاحبزادے، دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا عافہ سید فروغ الہدیٰ سلمہ ہیں جو دارالعلوم دیوبند میں مبلغ اور ناظم شعبہ امر و ناصح ہیں۔ عربی کی تکمیل دارالعلوم سے کی اور انگریزی میں اعلیٰ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اچھے مقرر اور انشا پرداز ہیں۔ متعدد کتابوں کے اچھے مصنف ہیں۔

دوسرے لڑکے مولانا عافہ حاجی سید رشید الہدیٰ فاضل دیوبند ہیں۔ نیک صالح اور اچھے شاعر اور انشا پرداز ہیں۔ چھ لڑکے مولانا سید سعید الہدیٰ صاحب بھی فاضل دیوبند نہایت ذہین طبع اور تیز ہیں۔ بڑی صاحب نادہ کی شادی جناب ضیاء الحسن صاحب فاروقی سے ہوئی۔ دکنیڈا انشائیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اسلامیات پر کئے ہوئے ہیں۔ چھوٹی صاحبزادی کی شادی عنایت اللہ صاحب نظر اعلیٰ سے ہوئی۔ جو لیکچرر کے ایم۔ اے ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میں استاذ ہیں۔

۲۔ دوسرے ہجائی مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کی شادی بڑے ہجائی مولانا صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری بری جو مولانا نابین مدنی کی بہن تھیں۔ سے ہوئی۔ پہلی بری کا انتقال ہوا تو یہ دوسری شادی ہجائی کی بیوہ سے کی۔ ان پر دینہ مندرہ میں بہت سے مصائب ٹوٹ پڑے۔ جب غلام کو ناز تھا۔ مولانا سید حسین احمد مالک میں نظر بند تھے۔ حضرت کے والد سید حبیب اللہ شاہ اور ان کے دو لڑکے مولانا سید احمد اور مولانا سید محمود

کوئیکر کے ایڈیٹریل روائہ کر دیا گیا۔ ان پریشان کن حالات میں مولانا سید احمد کی بیوی مولانا سید محمود کی بیوی اور حضرت مدنی کی صاحبزادی مولانا عبدالحق مدنی کے سامنے ترکی جانے کے لیے روائہ چوہیں۔ اثنائے سفر میں مولانا سید احمد کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اور شام ہی میں مولانا سید احمد صاحب کی تیسری شادی ہوئی۔ ان سے ایک صاحبزادی عائشہ مرحومہ ہوئیں جن کی شادی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے صاحبزادے مولانا اسعد سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑکا ہوا تھا۔ جو مدینہ منورہ مدرسہ علوم شرعیہ میں زیر تعلیم ہے

مولانا سید حبیب اللہ شاہ کے تیسرے لڑکے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ کی پہلی شادی موضع قتال پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی تھی۔ اس نکاح سے دو لڑکیاں ہوئیں۔ ایک صغریٰ میں فوت ہو گئی۔ دوسری کا انتقال شام میں ہوا۔

حضرت کی دوسری شادی قصبہ بچہ رائیل ضلع مراد آباد میں حکیم قاری غلام احمد کی بیوی لڑکی سے ہوئی۔ دو لڑکے اخلاق احمد و اشفاق احمد ہوئے اولیٰ الذکر آٹھ سال کی عمر میں اور مقرر الذکر دس سال مدینہ منورہ میں فوت ہو گئے۔ ان بچوں کی والدہ کا انتقال بھی مدینہ منورہ میں ہوا۔ جب کہ حضرت مالٹا میں نظر بند تھے۔ اس کے بعد تیسری شادی دوسری البیہ کی چھٹی بہن سے ہوئی۔ جن سے دو بچے ہوئے۔ ایک صاحبزادہ مولانا اسعد اور دوسری لڑکی اجدہ خاتون جو بچپن میں سلطنت میں فوت ہو گئی۔ مولانا اسعد میاں کی شادی کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ صاحبزادہ کی دوسری شادی مولانا حمید الدین صاحب دس سال کی لڑکی کے صاحبزادی سے ہوئی۔ صاحبزادہ مولانا اسعد کی والدہ کا انتقال ۱۳۵۵ھ میں دیر بند ہوا اور ان کی قبر حضرت مدنی کی پائین ہے۔ یہی حضرت کی چوتھی شادی حضرت کے چچا زاد بھائی سید بشیر الدین کی منجلی لڑکی سے ہوئی۔ جن سے دو صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔ بچوں کا نام ارشد اور احمد ہے۔ اس طرح کے حضرت کے تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔

صاحبزادہ مولانا اسعد میاں فاضل دیوبند ہیں اور آج کل دارالعلوم میں مدرس ہیں۔ نہایت مصلح، متقی اور پرہیزگار ہیں۔ اچھے مقرر اور بہترین مدرس ہیں۔ مہمان نوازی، اشتیاق و لگاؤ، تواضع انکسار و فریاد جملہ اخلاق میں اپنے والد صاحب کے صحیح جانشین ہیں۔ حضرت مدنی کی وفات کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد گریا خان نے دوسرے خلفاء کی موجودگی میں بیعت کرنے کی اجازت دی۔

حضرت کے تیسرے اور مولانا سید حبیب اللہ شاہ صاحب کے چوتھے لڑکے مولانا سید محمود واحد مظاہر تعمیر حیات ہیں اور مدینہ منورہ میں مقیم ہیں۔ صدر مجلس اوقاف اور بہت با اثر اور ذی ثروت شخصیت ہیں۔ اس سے قبل گورنر مدینہ کی کینڈٹ کے ممبر اور مختلف سرکاری کینڈٹوں کے ممبر رہ چکے اور قاضی القضاہ رہ چکے ہیں۔ اس غرضی صحت اور دیگر مشاغل کی بنا پر تمام سرکاری کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

مولانا سید محمود صاحب کے ایک صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ صاحبزادہ سید حبیب نہایت دانشمند، جفاکش ہیں اور قابل ہیں عربی کے علاوہ ترکی اور اردو میں مہارت تامہ ہے۔ گورنر مدینہ کی کینڈٹ کے ممبر اور دیگر سرکاری کینڈٹوں کے ممبر ہیں۔ بعض اوقات گورنر مدینہ کی عدم موجودگی میں گورنری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

پانچوں بھائیوں میں سب سے چھوٹے سید جلیل احمد مرحوم تھے جنھوں نے بعد ۱۲ سال انتقال فرمایا۔ عمر کی اس قلیل مدت میں مرحوم نے ترکہ پر کمالی میں تسلیم پائی اور آخری امتحان میں سب سے اول آئے حکومت ترکی نے مخصوص وظیفہ دیا مگر نہ لے سکا۔

چھٹی بیٹی جن کی شادی سید فاروق احمد ساکن ہمسر ضلع فیض آباد سے ہوئی۔ مدینہ منورہ میں تھے۔ وہاں سے آئے تو بسوی اور دیکھیں کہ مرنے پر انتقال ہو گیا۔ ان فاروق احمد کے حقیقی ماموں مولانا عزیز احمد قاضی فاضل دیوبند بنی اسے۔ جامعہ ملیہ دارالعلوم دیوبند میں شعبہ تبلیغ کے ناظم ہیں۔

یہ حضرت مدنی کے اخلاف اور صلی اقداب کا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہندی نژاد مولانا سید حبیب اللہ شاہ کی اولاد میں کتنی رکت عطا کر ایک اڑکاشیخ العرب والجمہم حسین احمد مدنی ہر جہاد اپنے عہد کا غزالی و جنید ہوا اور جس کی یاد سے امام حنبلی اور امام مالک کی یاد تازہ ہوتی اور لوگوں میں سے مولانا سید محمود و نیا دہی جاہلیت کے لحاظ سے دینہ منورہ کی سب سے بااثر اور زوی و تثار شخصیت ہے۔

اِس سعادَت بزرور باز و نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اللَّهُمَّ مَا لَكَ الْمَلِكُ تَوَقَّى الْمَلِكُ مِنْ تَشَاءَ وَتَنْزَعُ الْمَلِكُ مِنْ تَشَاءَ وَتَعُزُّ مِنْ تَشَاءَ وَتَذِلُّ مِنْ تَشَاءَ
بِهِدَايَةِ الْخَيْرِ أَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

۱۹۵۷ء گری کا موسم تھا کہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ڈیرہ بھاد کے دورے پر مدین کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر جہو کے دن اگست سفر آخرت تاخیر کر کے صرف بیس دن بعد لوٹ آئے۔ دارالعلوم والوں اور اعزاء اقداب کو خوشی ہوئی کہ حضرت قبل از وقت تشریف لے آئے۔ ساتھ ہی حیرانی اور تعجب بھی تھا کہ حضرت اپنے پروگرام کسی بھی واقعہ یا ارضی سماجی حادثہ کے باعث ملتوی نہیں کرتے تھے۔ بعد میں مولانا اسعد میاں جو سفر تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضرت کو بہت زیادہ تکلیف ہو گئی تھی کہ آئندہ سفر جاری رکھنا خطرناک تھا۔ زیادہ چلنے یا تقریر سے سانس پھل جاتا تھا جس سے حضرت جبر پر کڑیٹھ جاتے تھے۔ دیر نہیں تشریف آوری کے بعد اس خطرناک بیماری میں بھی باجوہ منہ کرنے کے آٹھ نو دن سبیل ٹھہراتے رہے۔ بالآخر ہر کہ سہن بند کیا اور بڑے دکھ کے ساتھ باضابطہ دارالعلوم سے نصحت لے لی اور سہ ماہیہ پر جا کر انیس کے لایا اور سفر میں حضرت مولانا شاہ عبد العاد رابطہ کے سے راستے پر جا کر طاقات کی۔ انیس کے سے پتہ چلا کہ پیڑھے ٹھیک ہیں مگر گردے میں خرابی ہے۔ اس آفتاب خط خط کے جواب تصنیف مطالعہ وغیرہ بھی کرتے رہتے اور نماز کے لیے سجدے میں آتے رہے۔ بعد میں ڈاکٹروں کے شدید اصرار پر بندرہ روز کے لیے جلد مشاغل ترک فرما دیے۔ مگر نماز ایک دن بھی ٹھیکہ کر نہیں رہے اور سجدے میں آتے رہے۔ اس کی کوفت چہرے پر نمایاں ہوتی تھی۔ اس پندرہ روزہ آرام کے ناز میں بھی مطالعہ کرتے رہے۔ یعنی صحیح الامور و مؤلفہ مولانا عبد الماجد دریا بادی محمد علی کی ذاتی ڈائری حیات نبلی و سلیمان مدنی، اور بخاری ترمذی وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ اول الذکر تینوں کی مکمل مطالعہ فرمائیں۔ اگر کوئی اس دوران جاتا تو مطالعہ میں مصروف و منہمک ہوتے تو یہ بھی نہ کرتے۔ اگر کوئی زور سے سانس لیتا۔ تاکہ مریض ہو جاتا تو مطالعہ کرتے بھی متوجہ نہ ہوتے اور اگر انہوں کوئی خدمت پہنچا تو درپس ان حال کو تو فرماتے:۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ الحمد للہ بہت اچھا ہوں۔“ اور پھر مطالعہ کرتے لگ جاتے۔ وہیں کمرے سے اٹھ کر چارپائی سے اتر کر اپنے حجرے میں آتے۔ باجماعت نماز پڑھتے۔ فرائض تو ایک طرف۔ سنن اور نوافل بھی کھڑے ہو کر پڑھتے تھے۔ وہیں کمرے سے اٹھ کر چارپائی کی سطح پر بارہتے۔ لہذا اس پر پڑھنے کی چاہیے۔ البتہ ترمذی کی جگہ بخاری کریں اور حضرت وضو ہی کیا کرتے تھے۔ اللہ اللہ الحب لہی اس سے بڑی مثال کیا پر سکتی ہے۔

ایک دن کہا کہ قاری اصغر علی صاحب (مقام خاص و عمارت حضرت جو حضرت کا حساب کتاب رکھتے تھے) کے پاس جانا ہے۔ ہم نے قاری صاحب کو بلایا۔ ان سے پوچھا۔ حساب کر لیا، تقریباً ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار کا حساب معمولی بات تھی۔ ان کو معمولی رقم دی۔ انہوں نے کہا۔ اس سے کیا ہوگا۔ لے جاؤ تمہیں کیا۔ اس کے بعد شہر وانی سنگانی اور اس سے ۵۰۷۰ نکلے۔ وہ ان کو کھرا رہے۔

ایک دن مولانا رشید احمد نیرہ حضرت صاحبزادے کو ان کو بلا کر کہا کہ یہ چار مٹی کا گڑا کر آؤ۔ ان میں سے ایک کسی لڑکی کا نام تھا۔ ان کا خط آیا تھا کہ میرے پاس سکول کی اس ماہ کی فیس نہیں ہے۔ اگر جمع نہ کر اسکی تو نام خارج ہو جائے گا۔ آپ بہت سخی ہیں مٹی پر۔ حضرت نے فیس کی رقم سو کچھ زاد بھیجی تھی اور تسلی دیتی تھی۔ اور اسی طرح مستقل امداد چاہتے والوں کو اس سخت بیماری کی حالت میں نہیں بھٹاتے۔ ہماروں کے متعلق مسلسل صاحب زادہ کو ہدایت دیتے رہتے تھے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔

وصال سے تین دن قبل تنفس اور سینے کی تکلیف ختم ہو گئی۔ عام خیال تھا کہ صحت ہو گئی۔ اب کمزوری باقی ہے۔ مگر کبے معلوم تھا کہ اس تعالیٰ نے روح کے تزکیہ کے بعد حیات مقدس کی شرح کی دکر پھر لگا دیا ہے اور کچھ دیر بعد اس تاریک دور میں علم و عرفان کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جائے گا۔ تین چار دن قبل کھانے پینے سے رغبت ختم ہو گئی۔ ایک دوپچے کی چیز کے کھا لیتے۔ اسی ہی وزن ایک دن فرمایا۔ سردا نہیں ملتا۔ عرض کیا جاسے گا۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود کہیں سے ذہل نہ سکا۔ فرمائے گئے، زندگی میں پہلی بار کسی چیز کی خواہش کی تھی۔

اللہ العزیز نے بڑی بات فرمادی۔ دراصل حضرت کی زندگی اس قدر کی خواہشات سے بہت بلند و بالا تھی۔ بالآخر یہ خواہش پوری ہو گئی۔ کراچی اور لاہور سے مراد اگلیا کراچی سے مولانا سجاد حسین کی معرفت اور لاہور سے مولانا حامد میاں نے بھیج دیا۔

ایک دن حضرت کو معلوم ہوا کہ ارشد مکہ روزے رکھتے اور چاہے کچھ غلصین کے ساتھ دعائے صحت کہتے ہیں۔ اس پر مولانا اسعد کو بلا کر ڈانڈا کر دی صحت کے لیے یہ لوگ اپنی صحت کیوں غراب کرتے ہیں۔ ایک رات قبل ستر فرما آواز سے یہ شعر گنگنا تے رہے۔

ابلی میری زندگی ہے کمی نہ سونے کے ہے نہ دوتے کے ہے

آخری دن صحن میں چار پائی لائی گئی۔ اور یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارک کو فراموشی پوری کرانی کہ

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتقال سے چند گھنٹے قبل دو صحابوں کے ہمراہ مسجد نبوی مکہ تشریف لائے تھے اور جس وقت پیر صلی اللہ علیہ وسلم اس جہان سے تشریف لے گئے۔ تقریباً اسی وقت اس محبوب رسول ہندی خاں حسین احمد دہلوی کا تین بجے بعد ظہر انتقال ہوا۔ اس وقت وہ ۱۰۰ سالہ و انا

کیہ راجھون۔

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا انتقال بھی ۱۳ جمادی الاول بروز جمعرات بعد نماز ظہر ہوا۔ اور یہی وقت دایرہ و مہینہ حضرت

نور اللہ علیہ کے انتقال کا ہے۔

قرب دھار کے شہروں میں اسی وقت خون پر یہ وحشت ناک خبر پہنچ گئی۔ لوگ دیوانہ وار دوڑنے پھرنے لگے۔ دور دراز کے لوگوں کا خیال تھا کہ حرم کو بوجہ زمین بل میں آگئی۔ مگر صاحب زادہ مولانا محمد اسعد نے فرمایا کہ ایمان ساری برصغیر متعلقہ اصلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ اور حضرت کا شمار انہی کے درمیان میں ملکیت کی جائے۔ جس جلدی کرنا چاہیے۔ اگرچہ حضرت کی یہ وصیت نہیں ہے تاہم ان کی خوشی اسی میں ہے اور اس بہن سنت کی میت کے خزانہ کا نقصان ہے کہ آخری راحت لگا دیر بعد سے جلد پہنچا یا جائے۔ دیر لگا کر سفر کی منزل کمری کرنا مسافر کا احترام نہیں۔ بلکہ اس کی شان میں ایک قسم کی ساقی ہے۔

بہر حال صاحبزادہ محترم نے فرمایا کہ تاخیر سے حضرت کی روح کو اذیت دینا زقرین انصاف ہے نہ تعانسا سے احترام۔ محقر یہ کہ اگرچہ مرکز ملا برحقی دارالعلوم کی شان اور حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق اتباع سنت کا لحاظ کر لے کر جلدی کی گئی۔ مگر تب بھی اپنے ہر شرج و حواس سوجانے اور نفل و کفر کے نظام میں تقریباً گھٹنے لگ گئے۔

آنے والوں کا تائبانہ ہوا تھا۔ اکمل انڈیا ریڈیو سے وفات کے معجزی ویراج خبر شریگئی تھی۔ پورے ملک سے لوگ آ رہے تھے۔ قریب کے گئے دور کے آ رہے تھے۔ مگر اخیر سے بچنے کے لیے ۱۲ بجے شب حضرت قاری محمد طیب صاحب کے ایما پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مظلوم جنازہ پڑھائی۔ قبرستان اگرچہ ایک فلاںک کے فاصلہ پر تھا۔ تاہم جس مجلس ہزار انسانوں کے جم غفیر کو میت کے ساتھ دہاں پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے اور بالکل شیخ الاسلام کا جنازہ اپنے دو عظیم پیش روؤں حضرت مولانا محمد تقی ماسم نانوتوی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمود حسن دہلوی کی قبروں کے پاس پہنچ گیا۔ اور پھر اس وقت کہ درازائے شیخ الاسلام تہجد میں اپنے رب کے حضور پیش ہوئے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاضر ہو گئے۔ شاید کم ہی اس امت میں ایسے افراد ہوتے ہوں گے کہ خاص تہجد کے وقت جو خدا کا اپنے بندوں سے ملاقات کا خصوصی وقت ہے۔ دفن ہوئے ہوں گے۔ بہر حال ہماری شنید کے مطابق تو حضرت شیخ الاسلام ہی کو یہ اعزاز نصیب ہوا۔ کہ وہ خاص اس وقت میں روزانہ کی طرح اپنے آفاقی خدمت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حاضر ہو گئے۔

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

حضرت کے متعلق معاصرین کی آراء حکیم الامت، مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات مدنی کے متعلق ان کے بعض خلفاء کی زبانی:۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ کی روایت سے:۔

”دہلوی میں ان جیسی (مولانا مدنی جیسی) بہت مردانہ کہاں سے لادوں۔ میں مولانا حسین احمد صاحب کو ان کے سپاہی کاموں میں مخلص اور متین جانتا ہوں۔ البتہ مجھے ان سے محبت کے ساتھ اختلاف ہے۔ اگر وہ محبت رفع ہوجائے تو میں ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کو تیار ہوں۔“

بروایت حضرت مولانا اخیر محمد صاحب مدظلہ خیر المدارس ملتان حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمایا:۔

”ہمارے اکابر دہلوی کے بفضل تعالیٰ کچھ خصوصیات ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیخ مدنی کے دو خدا داد خصوصیات کمال ہیں جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایک تو عبادہ پر کسی دوسرے میں آنا نہیں ہوتے دوسرے تو اضع چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود آپ کو کچھ نہیں سمجھتے۔“

بروایت مولانا عبد الجبار بھٹو نوی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرمایا:۔

”مجھ کو اپنی موت پر بھی ٹکھتا کہ بعد باطنی دنیا کی خدمت کرنے والا کوں ہوگا۔ مگر مولانا حسین احمد مدنی کو دیکھ کر تسلی ہوتی کہ یہ دنیا ان سے زبردہ رہے گی۔“

حضرت مولانا حسین احمد مدنی بہت شرافت طبیعت کے ہیں۔ باوجود وہ سیاسی اختلاف رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حدود ان سے نہیں سنا گیا۔ (داشراف العلوم)

دائے گرامی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مظلوم:۔

میرے نزدیک ابوحنیفہ، غانہ، بخاری، اوزانہ، جنید و شبلی رحمۃ اللہ علیہ حضرت اقدس شیخ العرب والعجم حضرت

مولانا سید حسین احمد مدنی کی طرح میں کچھ کہنے والا "مدن خورشید ملیح خرواست" کا مصداق ہے۔ میرا خیال ہے کہ حضرت کے فضل و کمال تحریر فی العلم والحدیث سے شاید ہی کبھی کو اختلاف ہو۔ آپ نے سنا ہر گاہ کہ مولانا کی اسارت کی خبر سن کر حضرت مولانا خانوی قدس سرہ نے کس قدر رنج و حزن کے ساتھ فرمایا تھا۔

مجھے علم نہیں تھا کہ مولانا مدنی سے مجھے اتنی محبت ہے۔ اس پر حضا مجلس میں سے کسی نے عرض کیا کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ تو اپنی خوشی سے گرفتار ہو رہے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے اس جملہ سے تسلی دینا چاہتے ہیں۔ کیا حضرت حسین رحمی الشرفہ یزید کے مقابل میں اپنی خوشی سے نہیں گئے تھے۔ مگر کچھ تک کون ایسا شخص ہے جس کو اس حادثہ سے رنج نہ رہا ہو؟

برداشت حضرت قاری محمد طیب صاحب۔ ارشاد حضرت تھانوی رحمہ اللہ۔

"میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی محمد کفایت اللہ کے حسن تدبیر کا اور مولانا حسین احمد صاحب کے ہر شرف عمل کا معتقد ہوں۔"

برداشت حضرت موصوف۔ ایک صاحب کے حضرت تھانوی کی مجلس میں حضرت مدنی کے کبھی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ نے عمل نہیں کیا ہے۔

"جہاں میں ان جلیبی (مولانا مدنی جلیبی) ہمت مروان کہاں سے لائن۔"

حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ دہلوی کا ارشاد ہے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب فیض آبادی رحمہ اللہ نے آسمان علم و ہدایت کے آفتاب اور زہد و روح میں گیارہ زائر اور جہاد و تخلص وطن کے ایک ممتاز شہسوار ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ان کی ذات گرامی پر جس قدر بھی فخر کریں بجا ہے۔ وہ کل ہدایت اور سچی منصب قیادت ہیں۔ ان کی مذہبی اور وطنی خدمات سے تمام مسلمان ہندو اصف ہیں اور ان کے اخلاص و دیانت کے مخالف بھی محض نہیں۔ اذراں کی بے غرضت محبت کا لطف وہی حاصل کر سکتا ہے جو ان کی صحبت و معیت سے بہرہ ور رہا ہو۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی اور مشہور کرسٹ لیڈر ڈاکٹر محمد شرف کے تاثرات آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ مولانا عبدالرشید خان عزیز لاہور کا سچا تاثر

"امام بنی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کو لوگ ان کے علم و فضل اور تعمیری طہارت کی بنا پر جانتے ہیں اور عقیدت و احترام کا سہرا ان کے سامنے ختم کرتے ہیں۔ لیکن مولانا کی حقیقی عظمت ان کا محض علم و فضل و عبادت و اشتغال وغیرہ نہیں بلکہ ان کی پاکیزہ نفسی سیرت ہے۔ اس معاملہ میں ہندوستان تو درکنار غالباً عالم اسلام میں بھی ان کی مثال نہیں ملے گی۔ جس طرح مولانا مدنی غلامی کی طرف دل نہ کھینچتا ہے۔ اس طرح کسی اور کی طرف نہیں کھینچتا۔"

مولانا حفص الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سید ہاروی خواجہ ہیں۔

در شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس الشہرہ العزیز کی ذات مستردہ صفات نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے ایک بے بدل سعادت تھی۔ قدرت الہی کا بیشمار دستور رہا ہے کہ فساد و فتن سے مومراں دنیا میں انسانی سوسائٹی کی اصلاح و ارشاد، تنبیہ و رہنمائی کے لیے چہری و قرن میں مصلحین اور رفیاء بریل پڑھتے ہیں جن کی پوری زندگی اصلاح و خدمت کے لیے وقف ہوئی ہے اور جو اپنے عمل و کردار کے لحاظ سے عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند و برتر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کی شخصیت ان مصلحین و مرشدین کی صف میں بھی بہت بلند وقعت و امتیاز کی حامل تھی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو علم و عمل، اعلیٰ کردار و اخلاق، عزم و استقلال اور ہمدردی خلافت کے وہ تابناک جوہر عطا فرمائے تھے۔ جو صدیوں کے بعد بھی کسی انسان کو عطا ہوتے ہیں:

مولانا مفتی عتیق الرحمن، ناظم ربابی مدظلہ العالی، علی کا ارشاد دگرگامی۔

”حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کیلئے موجب افتخار تھی۔ ان کا شمار دنیا کے اسلام کے چند گنے چنے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آپ کی ہستی میں خلوص و شفقت، غلبت و وقار، علم و عزم، عزم و بہمت، عجز و فروتنی، صبر و استقلال، غریبیکہ و شریعت و طریقت کے تمام جوہر کچھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ ایک فرد میں ان خصوصیتوں اور کمالات کا اجتماع مشکل ہوتا ہے۔ آپ کو دیکھ کر جو کچھ اسلام دینی کی زندگی کی خصوصیات کا نقشہ سامنے آتا تھا۔“

سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلوی ”کے تاثرات۔“

”حضرت شیخ الاسلام آزادی وطن کے جانباز جرنیل تھے اور بین الاقوامی شخصیت اور علم و عمل اور زہد و تقویٰ اور ایثار و قربانی کے مجسم ہیں۔ اذعان و انسانیت کا سب سے بلند و بالا منظر اور سلف صالحین کی ایک زندہ یادگار تھے۔“

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس الشہرہ العزیز کا تاثر۔

”جہاں حضرت شیخ مدنی کا ذکر کیا اور پچھتے ہوئے پہلے قوم یوں ہی سمجھتے رہے مگر وقت کی نزاکتوں اور ہنگامہ کاروں میں جب ہم نے اس مرد مجاہد کو آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جہاں شیخ مدنی کے قدم تھے وہاں اپنا سر ڈال دیا۔ اسی حضرت اس وقت ملک و ملت کی خاطر باطل کے مقابل میں حق کا دامن تمام کھینچ کر صاف صورت میں استقامت اور استقلال کے ساتھ قربانیاں پیش کر رہے ہیں۔ یہ شانِ حسینیت کا مظاہرہ ہے۔“

بروایت جناب احسان قریشی فیملی گرینڈ کرائٹل انسٹیٹیوٹ سیالکوٹ۔

”۱۹۲۵ء میں میں امرتسر میں بطریق ارتعین تھا۔ حضرت منشی محمد رحیم، قائم الحروف، مرحوم شیخ صادق حسن اور اہم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے چند دوسرے پروفیسر مل کر ایک کو مستحکم خانے میں دن رات کوشاں تھے اور قیام پاکستان کے لیے جدوجہد کرتے تھے۔ ایک دن شنا کہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرح اپنے سفر لاہور کے دوران

اتر سر ریوے اسٹیشن سے گزرنے والے ہیں۔ اور مسلم لیگی طلباء کے پیچھے جاتی ہے کہ اتر سر ریوے اسٹیشن پر ان پر گندے انڈے پھینکے جائیں۔ جب اس کی خبر مفتی صاحب علیؓ کو پہنچی تو وہ بہت مڑوہ دہرے۔ مجھے فوراً بلایا اور کہا کہ تم پر لازم ہے کہ تم اس دن صبح کی گاڑی پر جالندھر یا پتھر اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ڈبے میں سوار ہو جاؤ تو جب گاڑی اتر کر پہنچے تو تم (معاذ اللہ) وہیں شاگردوں کے، حضرت مولانا کے لیے دھواں بن جاؤ جو کچھ پھینکا جائے تم اپنے بدن پر بہنا خود مارا، حضرت مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگرچہ انکا اور ہذا اختلاف قیام پاکستان کے متعلق بنے لیکن وہ ہمارے اکابر ہیں سے ہیں۔ سیاست میں انکا ملحق ہونا کچھ ہی برس کر بکشتش کرنا کوئی اینٹ، دوڑنا، پتھر مارنا گندا انڈا ان کو نہ چھوئے۔ چنانچہ میں اس دن اپنے تین چار چیلے اور قابل اعمال شاگردوں کے ساتھ جالندھر پہنچا۔ اور اسی وقت میں مولانا مدنی کے ساتھ اتر کر ٹرک اٹا۔ اتر کر اسٹیشن پر چند بدقماش طلباء نے گندے انڈے پھینکے۔ کار و گرام بنا ہوا تھا۔ وہ مجھے ڈبے میں دیکھ کر بہت ہی حیران ہوئے۔ اور کہا کہ ”تم مسلم لیگی ہو کر کیوں مولوی مدنی سے اختتام لینے کو منع کرتے ہو؟ میں نے کہا نہیں اپنے جیسے سخی مولانا مدنی کو کوئی دوڑنا، اینٹ مارنا اور کوئی چیز لگنے نہیں دوں گا۔ اس جواب پر آدھے ستر طلباء تو پلے گئے مگر باقی بدقماٹوں نے گندے انڈوں کی لہجھا دیکر دی۔ وہ تمام میں نے اپنے بازوؤں لباس، منہ پر لی۔ میرا دل عجیب بن چکا تھا۔ میرے کمرے میں لگی ہوئے کے اجڑے افواہوں نے مجھ پر بہت سے انڈے پھینکے تھے۔ مجھے گالیاں بھی دیتے تھے۔ لیکن المومنین کہ مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ البتہ میں مولوی صاحب رضوی ہوا۔ دوڑوے میرے گھٹنوں پر لگے تھے۔ جب میں اس حال میں حضرت مفتی صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے فرمایا:۔

”احسان! تم نے جنت میں اپنے لیے جگہ بنالی“

حضرت مولانا محمد الیاس کا بذریعہ رحمۃ اللہ علیہ الی تبلیغی جامعہ

”حضرت مدنی کی سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر آجاتی تو میں ان کے پیچھے دوڑتا دوڑتا چتا ہوا تاہم اللہ پاک کے نزدیک آپکا جو درجہ و مقام ہے۔ میں جانتا ہوں آپ سے سیاست میں اختلاف کر کے میں دوزخ کی آگ میں غریبا جا جاتا۔“

مولانا مدنی واقعات کے آئینے میں

بجائے کے سفر میں ایک بچہ لوگ حضرت کے ساتھ سخت گستاخی سے پیش آئے اور انہمازیات میں میں سب کو معاف کر چکا ہوں اس کا پرچار ہر توجہ دہی مقبول الرحمن خان سید امدادی نے ان کی جرم میں ایک ختم لکھی اور اس کے لیے کچھ بددعائیں بھی دیں۔ اس غم میں انہوں نے مجھ سے بھی مشورہ لیا۔ عرض اس کو صاف کر کے کہ میں نے تجھ سے مشورہ اختیار کیا۔ ”میرے“ کو برائے اشاعت بھیج دیا۔ جب وہ شائع نہ ہوئی تو میں نے مولوی مجیب حسن ہانک انشا کو لکھ کر شکایت خط لکھا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ جب وہ غم میں تھی تو حضرت یہاں دفتروں میں تشریف فرم تھے۔ ان کو علم ہو گیا اور انہوں نے سختی سے شائع کرنے سے روک دیا۔ اگلے ہی دن حضرت سید امداد تشریف لائے تو میں نے کہا۔ آپ نے جاری غم کو شائع ہونے سے کیوں روک دیا۔ فرمایا کہ۔

نے فرمایا: گریٹ کی ڈیوان اور ادھر سے اکٹھی کیں اور لٹا لیکر پانچاندین گئے اور اچھی طرح صاف کر دیا اور پندرہ دوست سے لے کر گے کہ جانیے پانچ تو بالکل صاف ہے۔ تو جوان نے کہا کہ مولانا میں نے دیکھا ہے۔ پانچاند بالکل بجا رہا ہے۔ قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا اور بالکل صاف تھا، بہت متاثر ہوا۔ اور پھر برعقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا۔ یہ صحنہ کی بندہ لازمی ہے تو کچھ سے باہر ہے۔
 انوارِ احرار کو یہ بات بھی پہنچی تھی کہ اسی واقعہ کو دیکھنے پر اس طرح کے کسی دوسرے موقع پر اسی طرز میں خواجہ نظام الدین رحمہ اللہ نے اس ڈرامے میں ایک ساتھی سے پوچھا کہ یہ کھد رویش کرن ہے جواب ملا کہ یہ حسین احمد مدنی ہیں تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہر کر مدنی کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔ حضرت نے جلد پاؤں چھڑائے اور پوچھا کیا بات ہے تو خواجہ صاحب نے کہا۔
 اختلافات کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فترتے دیئے اور بڑھلا لیا۔ اگر کج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا یہ جاہننم میں جاتا۔

حضرت نے فرمایا:۔ میرے بھائی میں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کیا ہے۔ اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک بھائی نے بستر پر پانچاند کر دیا تھا۔ صبح ملکہ ہی اٹھ کر چلا گیا۔ جب اپنی بھولی ہوئی تلمار لینے واپس آیا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر نفیس اپنے دست مبارک سے بستر کو دھر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادہ مولانا حبیب اللہ
 سے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں جو اب برسوں سے مسجد نبوی میں (دیں حدیث دیتے ہیں) (دورہ
 میں شریک تھے۔ کسی گستاخ نے ایک دفعہ بھیجا جس کا جواب حضرت نے دوسری نشست میں نہایت نرم و شائستگی سے دیا
 کہ اگلی دوست نے کچھ کر دیا دفعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔ تمام مجلس میں ہیمان پر رہا ہو گیا۔ اور بہت طالب علم غرض غیب
 لیا۔ آپ نے فرمایا: بخیر دار! کسی کو دفعہ کرنا کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کر دوں۔

فرمایا:۔ میں ضلع فیض آباد قصبہ ٹانڈہ محلہ اللہ پور کلا رہنے والا ہوں اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ
 خطابچ کر یا جا کر سمجھ لیا جائے۔ الغلۃ للذہ۔ برواری کی انتہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ پہلوان وہ نہیں ہے جو
 ہلکا ہار دے۔ بلکہ بہادر وہ ہے کہ دفعہ کے وقت اپنے اوپر ناپاؤ لے اور اپنے نفس کو مغلوب کر دے۔
 (ادو کما تال صلی اللہ علیہ وسلم)

رسد میں نے کیا غلطی کی ہے؟
 مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یو۔ پی
 لکھنؤ کی تقریر تھی۔ رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا۔ بین السیقطہ والنعم مجھ کو محسوس ہوا کہ کوئی میرے پاؤں
 میں سے لے لیا کہ اگر اس طرح دبا تے رہتے ہیں کوئی غلطی نہ لگا۔ مگر اس کے ساتھ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ عملی تو عجیب قسم کی ہے
 حضرت کے فہم و فصاحت ہوتی جا رہی ہے۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ حضرت شیخ مدنی ہیں۔ فرمایا چل کر چار پاؤں سے اتر پڑا اور نماز سے
 بلا حضرت کیا میں نے اپنے لیے جہنم بنائے کا خدا سالانہ پہلے سے کم کر رکھا ہے۔ کہ آپ بھی ہر کوئی خدا کے کہ جہنم میں سمجھتے ہیں
 اس لیے فرمایا کہ آپ نے دیکھ کر تقریر کی تھی۔ آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت تھی کہ ہر جگہ سعادت کی ضرورت ثابت

ہی نماز کا وقت قریب تھا میں نے خیال کیا۔ آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتائیے حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے سچ فرمایا گیا ہے

فروغی است دلیل رسیدگان کمال

کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیایہ شود

مولانا عبد اللہ فاروقی ۲۰ حضرت راستے پوری سے بیعت
عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتانہ اٹھاؤ گے لاہور دہلی سلم پٹن میں رہا ہا برس خطیب رہے۔ انکا بیان

میں بدینہ سزہ حاضر ہوا اور مولانا دنی کے ان قیام کیا۔ ایک روز جب مولانا کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے گیا۔ قوم نے مولانا
اٹھا لیا۔ مولانا اس وقت ترخاوش رہے۔ دوسرے وقت جب ہم نماز پڑھنے کے لیے گئے۔ تو مولانا نے میرا جوتا اٹھا کر سر پر رکھ لیا۔

پیسے بھاگا۔ مولانا نے یہ جلتا شروع کر دیا۔ میں نے کوشش کی کہ تیرا لے لوں۔ نہیں لینے دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے میرا جوتا نہ رکھنے۔
عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتانہ اٹھاؤ گے۔ میں نے عہد کر لیا۔ تب جوتا سر پر سے اٹا کر نیچے رکھا۔

حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ ملتان تشریف لائے۔ میں نفع دعوت کی۔ گھر والوں نے
جگہ جگہ صلیب نمائشان ہے اور درختی بچا دی۔ دو تہی چرخانی تھی مگر اس طرح کہ جمع کی شکل + اس کے خانہ

جاتی تھی۔ حضرت کی نظر پڑی۔ تو گھر سے پریشانی سے اٹا کر دیا۔ فرمایا اس میں جگہ جگہ صلیب نمائشان ہے۔ میں اس پر نہیں بیٹھتا۔
(مولانا خدا بخش ملتان)

مولانا خدا بخش پوری رہی ہیں کہ حضرت کی خدمت میں پیش کر کے
اس کا سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے میں نے کھڑے کر کہہ کر دیکھا خلع ملتان بہت عمدہ چھپوایا

پیش فرمائے کہ لیے دونوں ہاتھوں پر رکھا۔ دیکھا تو فرمایا۔ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا حضرت رومال پیش خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ قوم
سوت انگریزی مشین کا کتا ہوا ہے۔ میں ایسی چیزیں استعمال نہیں کرتا۔ میں ایسا کھڑا استعمال کرنا ہوں جس کے دونوں سوت

ہوئے ہوں۔ حضرت کی اس نصیحت کے بعد پوری کا منہ ہم متعین ہوا۔
میاں چتر دیل ملتان میں مولانا ولایت اللہ کا سالانہ تبلیغی جلسہ تھا۔ حضرت تشریف لائے۔ رات کو

وہ کھڑے نہیں تھا ایسے مشین پر آئیے اور بیٹھ گئے۔ بیٹھے بیٹھے کچھ نوکی لگائی۔ بان کی پیک ہاتھ پر لگائی۔ حضرت فرما چکے کہ
صاف کرنا چاہی۔ خدام نے مختلف رومال پیش کئے۔ مگر اتفاق سے جس کے پاس کچھ لٹا تھا۔ وہ کھڑ رہیں تھے۔ حضرت نے کہ میں

اور اس وقت اتفاق سے حضرت کے پاس اپنا رومال نہیں تھا۔ اپنی جیب سے کھڑ کی جراب نکالی اور اس کے کنارے سے
پیک صاف کی۔

یہ ہے صداقت اور قول دل میں مطابقت کہ کھڑ کے استعمال کا عہد ہے۔ تو یہ موقع پر کھڑ بھی کا استعمال کر
ملتان کانگریس کے جلسہ پر اس جلسہ میں تشریف لائے اور واپسی پر اپنا
اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا کھٹا خیرا اور ساتھ بیٹھ گیا تو اس

مفتین جیسے جو پیش نہرت کر کے لیے دی تھی۔ پیش کی ترجیح کہ فرمایا یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ مفتین نے یہ مصائب سفر میں۔ فرمایا کہ سری اجازت کے بغیر یہ کیوں؟ جب میں نے کافی معذرت کی اور اصرار کیا تو فرمایا میں ولید بند سے چلا ہوں۔ وہاں سے ایک کا تھوڑا کر ایہ آمد وقت سے۔ باقی واپس کر دو۔ اس کے بعد مجھے بیٹھا چار بج کر کہا کہ اب تم باؤ۔ میں نے عرض کیا کہ دوستوں اصرار کیا ہے کہ ساتھ باؤں۔ اس پر اور زیادہ جھگڑے اور فرمایا ٹکٹ واپس کر دو۔ حام ان کے ادا کر دو میرے ساتھ کسی کے جانے ضرورت نہیں۔ مجھے تعیل ارشاد کرنا پڑی۔ اور حضرت الشیخ حفاظت میں اس پر آشوب دور میں تنہا واپس ہوئے۔

(مولانا محمد بخش عثمان)

حضرت سیدہ ام کلثوم سے مراد آباد اترے۔ اسی وقت پہنچ کر لاٹھی سہانہ پر کا قصد تھا۔ ایک پیرس سے ڈپے محفوظ ہے کٹ کر پیرس کو لگ جاتے تھے۔ نماز عصر کا وقت آگیا۔ پلیٹ فارم پر جا حجت ہوئے گئے۔ ٹریک خادمہ جو ڈپے سے اٹھا حضرت نے اس کو بھی بلوایا۔ میں نے عرض کیا۔ سامان کی حفاظت کون کرے گا۔ فرمایا۔ اللہ محفوظ ہے۔

(مولانا انصار الحق شیخ القیصر جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

۳۲ میں جمعیت علیہند کی طرف سے آپ کو ٹیکٹ بنائے گئے۔ پھر پنے فوج کر کے لیے اپنا ہتھیار تھیں دوں ایک ڈکیر کو دہلی جا کر برل افغانی لڑا اور گرفتار ہوا تھا۔ آپ کی بات سنت علی حق۔ ٹانگوں میں زخم تھا۔ چلنا پھرنا دشوار تھا۔ مولانا انور شاہ محدث کشمیری رح کو مقصد روحانی کا علم ہوا۔ تو کہا کہ بیٹھا کہ اس بات میں سفر کریں۔ تاریخ بدل دیجئے۔ حضرت نے گوارا نہ فرمایا۔ اسی حالت میں روانہ ہو گئے۔ ڈکٹر کٹ مجسٹریٹ کی طرف سے وارنٹ جاری ہو چکا تھا۔ ولید بندیشٹین پر کثرت جرم کے باعث پولیس کو جرات نہ ہوئی۔ ولید بند سے آگے شیٹین پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے وہ پیش کیا۔ آپ کے فرمایا میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس نے کہا تلم دیجئے تاکہ اردو میں ترجمہ کر دوں۔ حضرت نے فرمایا کیا خوب؟ اپنے فوج کے لیے اپنا ہتھیار تھیں دے دوں۔ وہ خاموش ہو گیا اور گاڑی چل پڑی۔ مختصر جھڑپیشن پر ترجمہ کر کے لایا۔ اس میں لکھا تھا کہ حاکم سہانہ پر روت سے آپ کو ٹکٹ دیا جاتا ہے کہ آپ آگے نہ جائیں ورنہ آپ اپنے آپ کو گرفتار سمجھیں۔ فرمایا اب میں سہانہ پر کی حدود سے آگے نہیں ٹکٹ قابل تھیل نہیں۔ افسران چاراب سن کر حیران ہوئے۔ بعد میں مجسٹریٹ نے جو ساتھ تھا۔ کہا کہ آپ کو اپنے خصوصی امتیازات کی بنا پر اس دوگنا۔ چنانچہ اس نے اسی امتیاز پر دوسرا تحریری ٹکٹ پیش کیا۔ اور گرفتاری عمل میں آئی۔ حضرت کی یہ حالت تھی کہ گاڑی سے اتر کر دوں میں چلنا دشوار تھا۔ اسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے کسی بچہ کی گئی۔ اس پر حضرت بیٹھ گئے۔ اس تمام تکلیف کے باوجود فراموشیہ جہاد آزادی کو بھڑانا ملتوی کرنا گوارا نہیں فرمایا۔

(مولانا انصار الحق جامعہ قاسمیہ مراد آباد)

خداوند تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا
خشیتہ اللہ کی کیفیت تھی کہ بسا اوقات نماز میں جب آیات عذاب کی قراءۃ فرماتے تھے تو بے اختیار روئے لگتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل مولانا سید فضل الدین احمد دھال صدر مدرس دارالعلوم، کو بلایا اور فرمایا کہ چند روز سے نماز میں کچھ تیر سے پھر رہا ہوں۔ بڑی کواہی ہو رہی ہے۔ خداوند تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا۔ یہ فکر بلند آواز سے رونا شروع کر دیا اور اس قدر روئے کہ اس سے پیشتر کبھی آواز نہ سنے ہوئے نہیں

دیکھا گیا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ حافظ و نا صہ ہے۔
مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری چچن زمانہ میں سرسکندہ ریاض کی حکومت نے ایک مقدمہ چلا رکھا تھا جس میں بھانسی کی سزا کا اندیشہ تھا اور لوگ سخت پریشان تھے۔ اس وقت کچھ لوگ نہایت متفکرانہ انداز میں حضرت کی خدمت میں دعا کے لیے پیش ہوئے۔ حضرت سب کی سنتے رہے۔ آخر میں کچھ فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ راجہ جی میں قربان ہو نا تو بہت بڑی سعادت ہے۔ اس میں ٹھکر کی کوئی بات ہے۔ ”بہر حال اللہ تعالیٰ حافظ و نا صہ ہے۔ ان الفاظ سے بھرتی حضرت کے جذبات ظاہر ہو رہے تھے کہ راجہ جی میں یہ خوشحال مستراہی حضرت کے لیے ایک مرغوب شے ہے۔ بہر حال کچھ ہی دنوں بعد حضرت کی پر اجالی پیشین گوئی پوری ہوئی اور شاہ صاحب موصوف بری ہو گئے۔

آپ اطمینان سے ابھی طرح کھاتے تھے۔
چچ دشمن بریں خوان لینا چہ دوست کے مصداق آپ کا
خوان کرم اپنے پاس نہ ہر ایک کے لیے کٹا رہتا تھا۔ مہمانوں کا ہمیشہ جھگڑا رہتا تھا اور لطف یہ کہ چھوٹا بڑا، امیر غریب، حاکم حکوم، ملا امتیاز مند، و آقا سب ایک دسترخوان پر ملنے کی شکل میں بیٹھے ساتھ ساتھ کھاتے نظر آتے تھے۔ حضرت کی عجب شان ہوتی تھی۔ سنتے کے مطابق نماز کی ہی شکل میں بیٹھے بیٹھے کھانا تناول فرماتے رہتے تھے اور نگاہیں چاروں طرف گھومتی رہتی تھیں۔ جس مہمان کے سامنے روٹی ختم ہوتی تھی۔ فوراً اپنے پاس سے گرم روٹی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ مہمان نمازی کے سنت کے مطابق اور اس خیال سے کہ کوئی مہمان بھوکا نہ رہ جائے۔ کھانا آکر ختم کھاتے رہتے تھے۔ حالانکہ سب سے کم کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ کھانے کے موقع پر ایک صاحب جو بوسیدہ کپڑوں میں لباس بیٹھے تھے۔ دوسرے حضرات کے سفید پوش اور معززیت کی وجہ سے مرعوب ہو کر کھانے کے حلقے سے پیچھے بیٹھ گئے۔ حضرت نے دیکھا تو ساتھ کھانے کے لیے فرمایا۔ اتفاق سے وہ ایسے صاحب کے پاس آ بیٹھے جو بہت معزز اور سفید پوش تھے۔ اور ان کے ساتھ بیٹھے سے کچھ کبیرے معلوم ہوئے تھے۔ اول الذکر اس چیز کو محسوس کر کے کچھ پریشانی کے ساتھ مرعوب ہو کر کھاتے رہے۔ حضرت نے اس کو بجانب لیا اور ان سے فرمایا کہ آپ آ بیٹھیے۔ وہ نہ اٹھے۔ تو دوبارہ فرمایا اٹھیے آپ اٹھیے۔ اب وہ اٹھے۔ تو حضرت نے ان کو اپنے پہلو میں بٹھالیا اور فرمایا۔ آپ اطمینان سے ابھی طرح کھائیے۔ پھر فرمایا کہ کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان بوسیدہ حال لوگوں کا کتنا اونچا درجہ ہو گا۔ سفید پوشوں پر نگہوں پانی پڑ گیا۔ نہایت شرمندہ ہوئے اور بعد میں ان صاحب سے معافی مانگی۔

چچ پاس روپے ماہوار بھیجتے رہے۔
مہمان نمازی کی اس وسعت پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ بہت سے ضرورت مندوں، یتیموں، اور بیواؤں کی امداد کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا تھا۔ چنانچہ مولانا عبد اللہ سندھی جب تک حجاز میں رہے۔ حضرت ہمیشہ ان کو چچ پاس روپے ماہوار ارسال فرماتے رہے۔ جو وہ سنا یا پسلسلہ اس قدر پر مشہور رہتا تھا کہ بہت سے قریبی حضرات کبھی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

یہی کھانا کافی ہو جائے گا۔
حضرت مولانا عبد الباقی صاحب مدرس دارالحکوم نے مشکوٰۃ شریف کے درس کے دوران کئی کئی العجوات کے متن میں حضرت کا کچھ ایک واقعہ قلم کھاکر سنایا تھا۔ اس موقع پر سب سے زیادہ

طالب علم موجود تھے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ میں نے ایک روز حضرت کی دعوت کی۔ اتفاق سے اس وقت مہمان تھوڑے تھے۔ حضرت شیخ نے دعوت قبول فرمائی۔ جب کھانے کا وقت آیا تو مہمان زیادہ آگئے۔ حضرت شیخ تمام مہمانوں کو لے کر تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت دیکھ میں پریشان ہوا۔ حضرت نے عرس فرمایا۔ مجھے عیحدہ لے گئے۔ میں نے عرض کیا۔ تھوڑی دیر ٹھہریں۔ میں اور انتظام کر لوں۔ حضرت نے فرمایا یہی کھانا کافی ہو جائے گا اور آپ کے ارشاد کے مطابق تمام روٹی اور ترکاری آپ کے پاس لاکر رکھ دی گئی۔ روٹیاں پر کڑا ڈھسک دیا گیا۔ اب حضرت شیخ اپنے ساتھ سے کھانا نکال کر دیتے رہے۔

اموالا محمد السبع صاحب قسم کھا کر فرماتے تھے کہ وہی کھانا سب کو کافی ہو گیا۔ گھر والوں نے بھی کھالیا اور کچھ بیچ بھی رہا۔

روانا قادری حافظہ سید طاہر حسن صاحب مدرس مدرسہ اہل اسلام میرٹھ

تقسیم ہند کے بعد حضرت مدنیؒ سلسلہ کی بجائے نانڈہ میں مقیم تھے۔ یہی اور جن کا رمضان تھا۔ گرمی میں تنہا نہیں کھا سکتا۔ شباب پر بھی۔ نوجوان ہی تھی۔ اور طاہر مہمان رونانڈہ آئے تھے۔ اہل خانہ کے آپس کی پرانہ سالاری اور موسم کے تقاضے کے بموجب یہ بلا لیا کہ آپ صبح کے وقت کرنی میٹھی پینڈریش فرمادیا کریں۔ تاکہ شگلی کا غلبہ نہ ہو گا۔ پھر بیکتیت کے وجہ سے فرمایا کہ میرے مہمان صرف روٹی اور سالن کھائیں اور میٹھی چیزیں کھاؤں۔ اگر مہمانوں کے لیے انتظام ہو سکتا ہے تو میں بھی کھا سکتا ہوں۔ ورنہ میں تنہا نہیں کھا سکتا۔ باہر جو چوری گھر والوں نے سب کے لیے کبھی بیٹھے پاول، کبھی دن شہر اور کسی دن برٹوں کا انتظام کیا۔

اور سب سے جوت ناک بات یہ ہے کہ کھانا اور کسی مرض میں مبتلا ہونے پر حکم پر ڈاکٹر نے پریز بتلایا۔ بہیم امصار پر چند دنوں تو پریزی کھانا کھا لیتے۔ چند دن بعد اگر پریزی کھانا دوسرے مہمان پر آنا تو اس کو دوسرے کھانوں میں ملا دیتے اور وہی کھانا نوش فرماتے۔ یہ ایک ایسی پریزی ہے جو دنیا میں بالکل انوکھی ہے۔ اتباع سنت اگر ولایت ہے تو حضرت مدنیؒ اس دور کے سب سے بڑے دلی تھے۔

استاد العرب والجمہ کامول تھا کہ عشاء کے بعد سے باجے تک حدیث کی سب سے ساری رات عبادت کراؤ گھر گزاردی بڑی بہیم بالشان کتاب بخاری شریف کے کاویں دیتے تھے۔ مولانا فہیم اللہ، حضرت عجم الدین، کھانے پر ہمارے تھے۔ ان کا بیان ہے۔ ایک رات حضرت نصف شب کے سردی کے موسم میں مہمان خانہ میں تشریف لائے۔ دیکھا کہ ایک خدمتہ حال بوسیدہ کپڑے میں ملبس چارپائی پر بیٹھیں ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ ان سے پوچھ کر کہیں بیٹھیں۔ ان کو پھر خود ہی باکریچھا تو اس مہمان نے جواب دیا کہ کسی صاحب نے مجھے دسترخوان سے اٹھا دیا اور میرے پاس کھانا بھی نہیں ہے۔ حضرت پر ہلا اثر پڑا۔ بار بار ان کا نام پوچھا۔ مگر نہ بدلا۔ فرمایا اندر تشریف لے گئے اور کھانا لیکر خود باہر تشریف لائے اور جب تک اس مہمان نے کھانا نہیں کھایا۔ آپ باہر ہی بیٹھ رہے۔ سارے مہمان اور اہل خانہ سوچے تھے۔ حضرت اندر گئے اور اپنا تہ اٹھا لائے اور اس کو کھچا دیا اور خود ساری رات عبادت کرا کر دی مولانا فہیم اللہ حضرت کے شاگرد ہیں۔ گامیان بنے کہیں نے بہت اصرار کیا اور چاکر کہا اپنا تہ لے آؤں اور حضرت آرام فرمائیں۔ مگر اس بیکسر سنت نے گرا کر دیا۔

آپ ایک دفعہ بریلی تشریف لائے کہ جلسہ سے خطاب کریں۔ مرقی پارک میں ایڈ فرب مراد ما نصیحت بود و گوشتیم تقریر تھی۔ پٹال بھی کچھ تھا۔ جوف حضرت کی انتظار تھی۔ مولانا تشریف لائے۔ معززین شہر سارے تھے۔ پارک سے باہر معاندین کا زبردست جرم تھا۔ جو اپنے مخالفانہ فلک فلک کلمات غورے لگا رہا تھا۔ اور حضرت کو روکنا چاہا۔ مگر حضرت برابر بڑھتے

زہد اور جلیلہ گاہ میں بعد ثلاث و قرآن کریم و قال الذین کفرو لا تقسمون۔ اہل ہذا القعوت کی مخالفتیں کثرت اور تدارکوں کے خالی ڈھم پوری قوت سے سب کے لگے اور کیلوں کے ڈنٹھل پھینکے شروع کیے۔ تقریر بھی جاری رہی حضرت نے مجمع کو مٹی و فحاشی کا روانہ کرتے سے قطعاً روک دیا۔ بالآخر پتھر برسے لگے اور لوگ منتشر ہوئے۔ پتھروں کی کوئی نہ تھی کہ سڑک بن ہی تھی۔ ضلع کا افسر اعلیٰ مسلح لگی تھا۔ لہذا پولیس سبائے اس کے کہ ان کی سرکوبی کرتی۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ جانبازوں نے چاکا حضرت کے گرد بکر ساہر کر لیں۔ مگر واہ رسے حبز و استقامت کے پتے حسین احمد نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور انتہائی محبت و شفقت سے فرمایا کہ حسین احمد کا سر کپکے سپردوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ آخر کار مخالفین نے روشنی کے مقوق کو پتھروں کا نشانہ بنایا۔ اور فضا نارکب ہو گئی اور اچھے حیل میں جلسہ کرنا کام نہادیا۔ اس کے بعد جلسہ ریاضت کر دیا گیا۔ حضرت اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے اور قبل اس کے کہ اپنی سے واپس ہوں۔ آپ کی جانب سے ایک مینڈیل شائع ہو کر تقسیم ہوا۔ جو دعاؤں اور نصیحتوں سے پر تھا اور جس کا مستعمل اس شہر خرم ہوا تھا۔

سہ مراد ما نصیحت برد و گفستیم
حوالت با خدا کر دیم و رستیم

دس میں بعض دفعہ ذاتی نوعیت کے سوال پر پوچھتے تھے جیسا کہ
میں کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں سخت ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پوچھی آئی کہ حضرت آپ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتے ہیں۔ یہ تو اذرو سے حدیث حرام اور منوع ہے حضرت نے یہ پوچھی سنائی اور فورا کھڑے ہو گئے۔ اور پانچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: حضور کو ان کہتا ہے کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ پہنتا ہوں۔ دیکھیے یہ ایاہام کہاں ٹخنوں سے نیچے ہے۔ جو ہر کھاتا ہے کبھی غیر شعری طور پر اور غیر ارادی طور پر توڑ دے جس سے نیچے چلا جاتا ہو۔ پھر بھی کافی احتیاط اور خیال رکھتا ہوں۔ بھلا میں اس کی جرات کیسے کر سکتا ہوں جب کہ حدیث میں اس کی مزاحمت آئی ہے۔

حضرت جبر کے پروگرام کے سلسلہ میں رنگوں گئے۔ جہاں سے بذریعہ بری جہاز نکلتے
حضرت نے چار روپے دے دیئے آئے۔ بیڑیاں لے خادم کو بھی ساتھ کر دیا تاکہ آرام رہے۔ حضرت کا ٹکٹ اول درجہ کا اور خادم کا تیسرے درجہ کا خادم اول درجہ میں کبھی چلا جاتا۔ جب کہ وہ کوہ مالک خالی تھا تو جہاز کا ملازم ”سورہ“ صاحب کبھی دیکھتا تو اعراض کرتا دشاہ مولویانہ وضع قطع سے، چنانچہ حضرت نے یہ کیا کہ خادم کے ساتھ تیسرے درجہ میں اکثر وقت گزار لے لگے۔ سفر ختم ہونے پر وہ ملازم حضرت کی خدمت میں بخشش اور انعام لینے حاضر ہوا۔ حالانکہ اس نے راستہ میں ملکیت ہی ملکیت پہنچائی تھی۔ آرام میں نہیں پہنچایا تھا۔ خادم نے کہا کہ اس کو کچھ نہ دیجئے۔ حضرت نے فرمایا نہیں۔ اس کا حق اس کو دیا جائے گا۔ ان دنوں بڑے سے بڑا انگریزی ایک روپیہ سے زیادہ انعام نہیں دیتا تھا کہ وہ ایک روپیہ آج کل کے سات آٹھ کے برابر تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ نے چار روپے گن کر اس کو دینے کے لیے ہاتھ دھرایا حضرت نے اس کی پیشانی اور زراعت محسوس کرتے ہوئے فرمایا: لوہہ تمہارے ہی ہیں۔ چنانچہ اس نے لے لیے۔ خادم نے اس کے بعد کہا یہ کیا کیا۔ حضرت نے فرمایا: بھائی اصل بات یہ ہے کہ بے چارہ کچھ جانتا تھا کہ انعام و بخشش میں صاحب بہادروں اور انگریزوں سے ملتی ہے۔ ہماری سیسی ”مولویانہ“ صدر توں سے شاید اسے انعام کی توقع نہ تھی۔ اس لیے اس نے ہم سے یہ بنا دیا۔ کہہ لا سفر ختم ہو گیا۔ لیکن میں نے اسے یہ روپے اس لیے دیئے ہیں کہ اسے معلوم ہو جائے کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زیادہ دے

کئے ہیں۔ اب مجھے اتنی بات کہ ہماری ایسی صورت دلتے اللہ کے کسی بندہ کو انتشار آئندہ نہیں ستائے گا۔ بلکہ اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ اس واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاج ایمانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

(مولانا محمد منظور عثمانی)

ایک سلسلے میں فرمایا کہ سیاسی اختلافات کی وجہ سے ترک تعلق نہ
چالیس ہزار روپیہ نقد اور پانچ صد ماہوار
ہونا چاہیئے اور ایسی مجلس میں فرمایا کہ جب میں کراچی چلے سے ۲۲
میں رہا ہوں کہ آیا تھا تو بنگالہ کنسل کے ایک ممبر نے کہا کہ چالیس ہزار روپیہ نقد اور ڈھاکہ کنوینشن میں پانچ سو روپیہ مالانہ کی پرفیسری آپ کے
لیے ہے۔ اس کو منظور فرمایا۔ میں نے کہا کہ کام کیا کرنا ہو گا۔ ممبر صاحب نے فرمایا کہ نہیں۔ صرف تحریکات میں خاموش رہیں۔ میں نے
کہا۔ حضرت شیخ السید رحمۃ اللہ علیہ میں راستہ پر لگے ہیں۔ اس سے نہیں ہٹ سکتا۔ حضرت شیخ نے اس واقعہ کو بیان کر کے فرمایا۔
کہ آپ صاحبان اس کام میں لگے رہیں۔ تعلقات خراب نہ کریں۔ وہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ یہ ۲۳ کی بات ہے۔ اس وقت
حضرت کے لیے ملازمت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد سہلٹ تشریف لے جانے پر دشاہ روڈ پر صدر روپیہ تھا۔

(مولانا مقصود علی۔ مدرس مدرسہ تعلیم الدین آئندہ قلعہ کپڑا)

مولانا عبداللہ صاحب دیوبادی نے "تقدیر و تاثیرات" میں کیا خوب لکھا ہے۔

مخدوم خود خادم بنا ہوا تھا
"مخدوم خادم بنا ہوا تھا اور جس کا منصب آکر رہنے کو تھا۔ وہ مخدوم سترت اپنی ماموریت
میں محسوس کر رہا تھا۔ دیوبند مانیئے تو مولانا شیش پریشیوائی کے لیے موجود، چلنے لگے تو شیش بک مشالیت پر آمادہ۔ کھانا کھانے
کے لیے بیٹھے تو وہ لوٹا۔ نئے ہاتھ دھلانے کو کھڑے۔ پانی مانگئے تو گلاس لیے عاجز۔ سفر میں سادہ ہوتا ہوا کھانا کراہے اپنے پاس سے دے
دی۔ بل کا کھٹ وہ دوڑ کر لے آئیں۔ چٹل میں کھائیں تو بل وہ خود ادا کریں۔ آپ کا ہاتھ اپنی جیب میں پیسے بٹولتا ہی رہ جاتے۔ بستر بھی
وہ کھول کر بچھا دیں۔ غرض یہ کہ مالی اور بدنی چھٹی بڑی خدمت کی جتنی بھی صورتیں پر سکونی تھیں۔ ان سب میں آپ کو پیش پریش دیکھا۔ مولانا
محمد علی جبر کے مشورہ کیا تو تھا۔ اپنے شیخ مولانا عبدالباری صاحب فریجی علی کے حق میں۔ مگر صادق مولانا دیوبندی پر بھی لفظ بہ لفظ
اڑھاتا۔

ان کا کرم ہی ان کی کرامت ہے درنہ بیان
کرتا ہے کوئی پیر بھی خدمت مرید کی!

آپ کے کوٹھ میں پانی لے آئیں۔ آپ کا سامان اپنے ہاتھ سے اٹھائے لگیں۔ تین دن قیام دیوبند میں روایتیں مشاہدہ بن کر
رہیں۔ اور شہیدہ دیدہ میں تبدیل ہو گئیں۔ تنگناٹ اور خاطر میں، مہمان نوازیوں کھانے پر کھلے پائے پر چائے۔ دوسروں کو
شاید کام لینے میں وہ لطف نہ آتا ہو۔ جو مولانا کو دوسروں کا کام کرنے میں آتا تھا۔

آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں
ایک مرتبہ ایک بنگالی طالب علم صاحب کو ایک ضرورت سے
اقترا نے ٹانڈہ حضرت کے پاس بھیجا حضرت مجلس میں جا رہے تھے وہ
لاس میں ملا۔ فرمایا۔ آپ گھر ملیں۔ میں مجلس سے ہو کر آؤں گا۔ وہ طالب علم گھونہ پیچ گئے۔ کبھی مسجد میں سڑتے تھے۔ حضرت نے بہت تلاش کرنا
مجلس سے واپسی پر گھر نہ ملے۔ جب سچ کو ماہر خدمت ہوتے تو حضرت نے بہت افسوس ظاہر فرمایا اور معذرت کی۔ دوسرے دن طالب علم

دلچسپ ہوتے اور ساتھ ہی ڈاک سے حضرت کا گرامی نامہ پہنچا کہ ان بنگالی طالب علم کو تکلیف پہنچی۔ آپ میری طرف سے معافی چاہ لیں۔ (درواٹھس الدین صاحب نائب ناظم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور)

حضرت کے ساتھ بارہ کھانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت ہمیشہ کھانا بعد میں ختم فرماتے اور جب میں کھانے سے اٹھ کھینچ لیتا تو ارشاد دیتا۔ آپ مرغی کھانے کے مادی ہو گئے ہیں۔ غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ ایک دفعہ میں نے کہا کہ کچھ بھی ہو آج کھانا روں گا۔ یہاں تک کہ حضرت خندہ ہوں۔ بس میں نے شروع ہی سے بہت آہستہ آہستہ کھانا شروع کیا۔ سب لگ اٹھ گئے میں کھانا رہا۔ حضرت بھی کھانے نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ مجھے خیال ہوا کہ حضرت اب خفا ہو جائیں گے کہ مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ تب میں نے کھانا بند کیا تو حضرت نے اب بھی مسکرا کر یہی فرمایا۔ "غریب کا کھانا حلق سے نیچے نہیں اترتا۔ اور ہاتھ کھینچ لیا۔" (بحوالہ مذکور)

رمضان شریف کا مہینہ قیام اللیل کا مہینہ ہے۔ آپ ساری رات یاد الہی میں کھڑے ہو کر گزار دیتے رمضان المبارک جب کوئی آیت تہدید و وعید کی آتی تو راز راز جاتے اور دعا کی آیت کو بار بار لٹاتے۔ ایک ختم زاد مدرس میں فرماتے اور ایک تہجد میں۔ آپ کے ساتھ سلوک و طریقت کے منازل طے کرنے والوں کا ایک جرم مغیر رہتا۔ ذکر الہی سے وہ جگہ کو بخوبی ہوتی خاص رمضان المبارک میں تعداد ہزار دویسہ ہزار تک پہنچ جاتی جس میں پانچ چھ سو دواکین ہوتے تھے تقسیم سے قبل رمضان المبارک پہلے ہی میں عزم گزرتا تھا۔

جوں ہی عید کا چاند نظر آیا۔ خوشی کی لہر دوڑنے مبارک پر دوڑ گئی۔ لیکن وہ رات خاص اہتمام سے یاد الہی میں بسر کرتے اور صبح کو نام پھرنے بڑے ارشاد داروں میں عید ہی تقسیم کرتے اور انبساط سے عید کی مبارک بادی دیتے۔

عیدی

اجازتِ بیعت تقسیم سے ایک سال قبل صلہ میں بعد رمضان المبارک چھ ہزار اسناداٹے بیعت کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ لاؤ ڈھپک کا انتظام کیا گیا۔ یہ وہی حضرات تھے جو آپ کے دشمن اور نام سن کر بے گتے تھے۔ لیکن آج گرویدہ ہو کر ملحقہ حبشیہ میں داخل ہو رہے تھے۔

وظائف

آپ ہمیشہ صلہ رحمی اور رشتہ دار کی نگہداشت فرماتے۔ اصرار استہارہ کی نگہداشت۔ آپ کی خاص شان تھی رشتہ داروں میں سے جو کوئی آجاتا یا دارالعلوم میں طالب علم ہوتا تو اسے کبھی اجازت نہ تھی کہ اس گھر کے علاوہ کہیں اور قیام کرے اور کھانا کھائے کہ سبوں کو خاص طور سے تاکید تھی کہ گھر پر کھائیں۔ اور اگر کسی کی کمی ہو تو مجھ سے لے لیا کریں یہاں تک کہ ضروریات مختلفہ وقتاً فوقتاً پوری کر دے۔ تادار رشتہ داروں، بیگانوں اور پڑوسیوں کو توغیرنا دیکھ کر سر پریدہ باہر امداد فرماتے اور گھر میں ہر چھوٹے بڑے کے لیے حبیب خیر مالہ مقرر کر دیتا تھا۔ جسے وقت پر خود سے تقسیم فرماتے۔ اگر شریفیہ علماء کرام جن کی کنگی معلوم ہوتی۔ انھیں تنہائی میں لے جا کر ایک خلیہ رقم سے امداد فرماتے اور مٹی آؤر ڈر کر کے سرسپتی اور غم ساری فرماتے۔

وہ فروخت کرنے میں جھوٹ بولے گا چنانچہ مجاہدین حضرت کے دیکھا تو فرمایا: ناظر علی (مولانا حفص الرحمن) کا انتظام بہت اچھا ہے۔ سامن میں سے کسی نے جواب دیا۔ یہ ناظر علی کا انتظام نہیں۔ بلکہ آپ کے خادم محمد ہری عبدالرحمن کی عقیدت ہے وہ چٹانیاں فروخت کرتے ہیں۔ اس وقت نماز کے لیے بچا دی ہیں۔ حضرت نے ہر بی بی سے بنا۔ فوراً رنگ بدل گیا۔ اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور فرمایا نہیں۔ ان کو اٹھا دو۔ خادم نے عرض کیا کہ عبدالرحمن نے اپنی خوشی بچائی ہیں۔ فرمایا نہیں وہ انھیں غیر مستعمل (نبی بنا کر فروخت کرے گا۔ حالانکہ وہ استعمال میں آچکی ہیں گی۔ وہ فروخت کر کے میں جوڑ کر بولینگا۔ یہ کب درست ہے؟ اس کے بعد دفتر کی چٹائیوں پر نماز پڑھی۔ (رحمہ اللہ جان رفیق خاص دفتر جمعیتہ ملار چند)

یہ خرچ جماعت کے مال پر نہیں پڑتا ایک بگڑتی تھی کہ لیتے تھے اور سیدھے وہیں پہنچتے تھے۔ مراد آباد میں ہمیشہ سے مولانا محمد صدیق مرحوم کا گھر معین رہا۔ مختلف لوگوں نے بار بار کوشش کی۔ مگر آخر وقت تک وہیں جاتے رہے ۱۹۳۷ء میں مراد آباد میں مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں ہوا اور جگہ تھے۔ اور حضرت کا اپنی جگہ پر۔ اجلاس کے موقع پر نانگوں میں مقام اجلاس پر تشریف لائے تو ناظم جمعیت نے ان کے کے مصارف ادا کرنا چاہے تو فرمایا میرا وہاں قیام اپنی رائے سے ذاتی طور پر ہوتا ہے۔ اصلی طور پر مجھے دفتر میں رہنا چاہیے۔ اگر نہیں رہتا تو دفتر آنے کے مصارف میرے دفتر میں گئے۔ نہ کہ جماعت۔ یہ خرچ جماعت کی مال پر نہیں پڑ سکتا۔ نیز ناظم مولانا محمد میاں صاحب کو ہدایت فرمائی کہ جماعتی اور غیر جماعتی خرچ میں ہمیشہ امتیاز رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ سب کو یہ فرق سمجھنے لگے یہ کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ لیکن ناظم ایک عام چیز سمجھ رہا۔ بار بار درخواست کی گئی کہ حضرت جمعیت کا لیٹر فارم استعمال کریں۔ ہمیشہ سے آپ کوئی حاصل نہیں اور یہی بات موزوں بھی ہے۔ مگر بہت کئی اتفاق ہوا۔ ہر گاہ کہ جماعتی کام کے لیے بھی جمعیت کا لیٹر فارم استعمال کیا ہو۔ ورنہ اپنے پیڈلر جو جماعتی کام کے کاغذ پر لائے اپنے خرچ سے تیار کرتا تھا۔ استعمال ہوتا تھا۔ اپنے کام کے لیے بھی اور جمعیت کے کام کے لیے بھی۔ (مولانا محمد میاں ناظم جمعیتہ ملار چند)

لاش نہیں ملے گی

واقعہ کے راوی جالندھر کے ایک نوجوان مولوی محمد اکرم قریشی ہیں۔ جو جمعیت نظامی مرحوم (میرزا نے وقت کے گجی دوست مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں ان کے دست و بازو۔ اسلامیہ کالج کے فارغ التحصیل اور لیگ کے آغاز سے آج تک کامی چلے آئے ہیں۔ وہ مولانا مدنی اور ان کے مدرسہ فکر کے کبھی جو خیال نہیں رہے۔ بلکہ ان نوجوانوں میں سے تھے جنھیں مسلم لیگ کا بڑا دل دے کہا جاتا تھا اور جن کا کام لیگ سے اختلاف رکھنے والے عناصر کی برکھانہ سے مدافعت و مزاحمت تھا۔ بلکہ نوجوانوں کا یہ طائفہ احرار اور جمعیت کے طلبوں پر پلٹ کر کیا کرتا تھا۔ اس واقعہ کے راوی بھی محمد اکرم قریشی ہیں جنھیں لاہور کے احباب ڈاکٹر بھی کہتے ہیں اور آج کل بیڈن روڈ لاہور میں رہ رہے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق اس واقعہ کے کئی راوی اب بھی بقید حیات ہیں اور یہ واقعہ انھوں نے کافی ہاؤس میں بار بار بیان کیا ہے۔

کے سفر سے واپس جا رہے تھے۔ جانڈھر کے سٹیشن پر پہی نوجوان مسٹر شمس الحق کی ہراسی میں اپنے رہنماؤں کے استقبال کے لیے گئے ہوئے تھے۔ راتینا کسی وجہ سے پہنچ گئے۔ شمس الحق کی نظریں مولانا مدنیؒ پر پڑ گئیں وہ اپنے ساتھ کے نوجوانوں کو لیکر ان کے ڈبے پر چڑھا۔ نعرے لگائے۔ سب دو شہتم کیا۔ حتیٰ کہ ان کی دائیں کوٹہ پر کھینچا۔ ایک بیان کے مطابق نوجوان پر طمانچہ مارا۔ مولانا صبر کی تصویر تھے آہٹ نہ کی۔ اس کارنامے کے بعد شمس الحق بااں کے کسی ساتھی نے یہ واقعہ مولانا غلامیؒ (جانشین گرامی علامہ اقبال کے جگڑی دوست تھے) سے بیان کیا۔ جو جانڈھر مسلم لیگ کے نائب صدر اور سرگرم پاکستان کے مقامی طور پر معاون رہنا تھے۔ انھوں نے سننے ہی کانپ کر پوچھا:-

"کیا یہ صحیح ہے" جب تصدیق کی گئی تو ان پر ایک رشتہ ساطاری ہو گیا۔ اگر کام قریشی کہتے ہیں۔ وہ کانپ رہے تھے۔ انھوں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:-
"اگر یہ سچ ہے تو جس نے حضرت مدنیؒ کی دائیں پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس کی لاش ہمیں ملے گی۔ اس کو زمین ہمیں جگہ دے گی"

غلامی کانپ رہے تھے ان کا چہرہ اشکبار تھا۔ ان کے دیدے پرزور تھے۔ آپ جانتے ہیں یہ شمس الحق کون تھا۔ یہ وہی نوجوان ہے جو لائل پور میں قتل وطن کا شکار ہو گیا۔ جس کی نعش کا زہ پتہ چلا۔ اور اس واقعہ کو تقریباً گیارہ بارہ سال پہلے ہیں۔ کفن بلاز قبر۔ روایتیں پر روایتیں آتی رہیں۔ خود لیگ کے نوجوان مہربوب رے۔ کسی نے کہا جیل میں زندہ بلا دیا گیا۔ کسی نے کہا لاش کے ٹکڑے کر کے دریا برد کر دیئے گئے۔ کسی نے کہا قید کر کے جانوروں کو کھلا دیا گیا۔ ارشد جتنے منہ اتنی باتیں۔ پولیس نے انعام بھی رکھا۔ سب کچھ کیا۔ مگر شمس الحق کا سراغ نہ ملا۔

ایک حرف کا شے کہ بعد جانوشہ الم
(شرش کا شیر ہی ہفت روزہ "چٹان" ۳۱ مارچ ۱۹۶۳ء)

ملفوظاتِ حضرت مدنیؒ

(۱)

سابقہ کچھ واقعات پیش آئیں۔ ان کو ناچھوڑوں سے بگڑ نہ ظاہر کرنا چاہیے۔ اپنے شیخ سے ظاہر کرے۔ یا ایسے شخص سے جو طریقت کا ہزار اور سالک کا چند روپہ اور بس! یہ چیز سالک کے لیے مسرتِ رسال ہوتی ہے اور بسا اوقات فیضِ ربانی کے انقطاع بلکہ کبھی کبھی سلب کا باعث بن جاتی ہے جو راز و نیاز عاشق و معشوق کے درمیان ہو۔ اگر عاشق ان کو ظاہر کر دیتا ہے تو معشوق کے عتاب کا اس قدر ظہور ہوتا ہے کہ بعض اوقات انقطاع کامل کا باعث ہو جاتا ہے جب کہ یہ حال مجازی معشوق کا ہے تو محبوب حقیقی کا کیا حال ہو گا۔ اس لیے ایسے امور سے بچنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے توبہ کرنا چاہیے۔

(۲)

محبوب حقیقی ہر چیز کو مانا ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ ہر چیز کو سناتا ہے۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ وہ مشہدِ الذیبت ہے۔ اس کے سامنے ہر چیز خضر اور رازِ مائے مرببت کے اخلا اور اظہارِ عبودیت کا بلد اور اتباعِ سید الشان و علیہ السلام، کوئی چیز کارآمد نہیں ہے۔
(فن صکان یسجد لہ فام وہ فلیس عمل عملا صالحا ولا یشرع بعبادۃ ربہ اکلما)
جاہِ طلبی، مالِ طلبی، اس کی سخت مغنبت نامی کا باعث ہے۔
حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :- ما اشغلك عن الحق فهو طاعة نك وکان فوائد ہے :- ”فن صکان بالطاغوت دیومن باللہ والائیم“

(۳)

معاصی کی بنا پر بھی قہن ہوتا ہے اور کبھی طبعی طور پر بھی ہوتا ہے۔ بہر حال بندہ کلامِ عبودیت کا اظہار اور تضرع و ناری ہے۔

(۴)

ذکر کرتے وقت طبیعت پر زور ڈال کر کہ معنی اور ذکر کوئی غفلت اور محببت کا دھیان رکھا کریں، اسباب و اظہار و نیا ویدیں حتیٰ الوسع جیتے

لچھی نہ لیا کریں۔ ان امور کا خیال رکھیں۔ اس کا بھی التزام کریں کہ جب کوئی خطو آئے اس کو ٹھہرنے نہ دیں۔ اور لچھی پہلے ہونے نہ دیں۔ فوراً دفع کریں اگر آپ کو اپنی دعاؤں اور اذکار میں منقذات نظر آ رہے ہیں۔ ان کو کھل کر کے کی جڑو جہد رکھنی چاہیے۔ مگر واقعہ یہی ہے کہ ہم کتنی بھی کابل عبادت کریں۔ شانِ الہی کے سامنے وہ نہایت حقیر اور ناقص ہے۔ جب کہ سرورِ کائنات سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

”ما عبد ناک حق عبادتک ولا عرف ناک حق معرفتک“

تو ہم آپ کس قطار میں ہیں۔ اپنے آپ کو ہیشہ دلیل و حجاز سمجھنا اور اپنے اعمال و اخلاق کو ناقص سمجھنا واقعیت اور ضرورت ہے اور اس پر ناکرنا اور کامل سمجھنا غرورِ فک ہے۔ لن یجوز احدکم بعملہ الا ان یتغمد باللہ برحمتہ و اوکلنا فی اللہ السلام، تم میں سے کوئی بھی اپنے عمل کی بنا پر نجات نہیں پاسکتا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں چھپالے۔

۵

ذکر میں کوتاہی کرنا اور پاسِ انفس کو دن رات میں حرفِ دس پندرہ منٹ انجام دینا۔ انتہائی کسالت اور بے قرعہ ہے۔ الذین یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علی حیوٰں ہم کساں کس طرح پیدا کریں گے۔ کیا یا ایہا الذین آمنوا ذکر اللہ ذکر اکثین؟ سبحوہ بکوة و اصیلا۔ پراسی طرح عمل ہو سکتا ہے۔؟؟

۶

مراقب میں دھیان اور خیال ذاتِ مقدسہ خداوندیہ کی طرف لگائیے، وہی اسم ذات اللہ کی مستی ہے۔ وہی تمام عالموں کو پیدا کرنے والی وہ سب کو پالنے والی، ہر چیز کو جاننے والی اور تمام عالم میں تصرف کرنے والی ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ ہر قسم کے عیوڑ سے پاک ہے اور تمام کمالات سے موصوف ہے۔ نور اور نازیب اس کے پیدا کیے جوتے ہیں۔ تو ہمیشہ اس تصور اور دھیان کو جہانے رکھئے کہ وہ ذاتِ مقدسہ میرے قلب میں موجود اور جلوہ گر ہے۔ وہ مجھ کو دیکھتی اور جانتی ہے۔ کوئی حالت اور کوئی خطو یا خیال یا ادراک یا کام اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اسی تصور کو دل میں جمائیے۔ دوسری اور چہرزیں مخلوہ روشنی اور نور پر یا بزرگ بستیاں وغیرہ۔ ان کی طرف دھیان نہ کیجئے؛ فقط ذاتِ خداوندی جل و علا شانہ کی طرف دھیان رکھئے۔

ہیت رب الناس را با حبان ناس :

اتصالے بے تکلف بے قیاس :

۷

طریقہ نیت لینے کا یہ ہے۔

الحمد للہ نعمہ و نستعینہ و نستغفرہ و نؤمن بیدہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرورہ و الفسنا و من سیئات اعمالنا من یشہدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ

مولا هادي له ونشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له ونشهد ان سيدنا و
مولانا محمد ^{عليه} ورسوله صلى الله عليه وآله وصحبه وبارك وسلم.

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ . إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَهَ فَإِنَّمَا يَنكِّحُ عَلَى نَفْسِهِ وَمَنْ أُوْتِيَ مِمَّا عَاهَدَ اللَّهُ فَمَا يَنْتَهِ

دیکھئے! اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ وَ اَشْهَدُ اَنْ سَيِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٌ اَعْدُوْ و رَسُوْلُهُ۔

گواہی دیتا ہوں میں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی عبادت کیے جانے کے قابل نہیں، اکیلا ہے وہ، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ ہمارے سردار اور ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول نہیں۔ ایمان لایا میں اللہ پر جس کا کہ وہ اپنی ذات میں الٰہی صفات میں اور اپنے افعال میں اکیلا ہے اور کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں اور ایمان لایا میں اللہ تعالیٰ کے سب پیغمبروں پر اور اس کے سب قوتوں پر اور اس کی سب کتابوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر۔

و انزل مہر اقدس دین اسلام خیر سچے دل سے۔ بری اور بے زار ہوں میں سب دینیوں سے۔ سوائے دین اسلام کے۔ بیعت کی میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر بواسطہ ان کے خلفاء کے، اچھڑ کرنا ہوں نہ کر دینا۔ کہنے نہ کر دینا۔ چوری نہ کر دینا۔ زنا نہ کر دینا۔ کسی کو اپنی قتل نہ کر دینا۔ کسی پر پستان نہ باندھ دینا۔ جہاں تک ہر سچے گناہ اور اس کے رسول کی ہمیشہ ہمیشہ اطاعت اور فرمانبرداری کے ناموں کا۔ اپنی طاقت بھر ناموں سے سچا رہوں گا۔ اگر کسی کوئی گناہ گریا تو میری عفو نہ کر دینا۔

توبہ کرتا ہوں میں الی سب گناہوں سے جو اگلے ہل یا پھلے، چھوٹے ہوں یا بڑے، ظاہر ہوں یا پوشیدہ، جن کو میں جانتا ہوں اور جن کو میں نہیں جانتا۔ اسے اللہ توبہ کچھ نہ سنا ہے۔ توبہ کچھ دیکھتا ہے۔ توبہ کچھ جانتا ہے۔ توبہ کچھ چھپا ہوا نہیں۔ تو گناہوں کا بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ تو بار بار توبہ قبول کرنے والا اور کرم ہے۔ توبہ قبول فرما اور میرے گناہوں کو بخش دے۔ بیعت کی میں نے..... ہاتھوں پر۔ طریقہ ہشتہ، صابریہ، طریقہ چشتیہ نظامیہ اور طریقہ رافضیہ سہروردیہ میں۔ اسے اللہ میری بیعت قبول فرما اور مجھ کو ان سلسلوں کے بزرگوں کے طفیل میں اپنی سچی محبت اور کامل ایمان عطا فرما۔ میرا خاتمہ ایمان پر ہو اور آخرت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اور آپ کی کائنات اور جنت نصیب ہو۔

①

ہم عبیدین، ہمارا کام عبودیت اور امتثالِ حکم ہے۔ عاجزی اور نیاز مندی بنے خواہ بہت افزائی اور اجابت ہرمانہ ہر سہ

یایم اور ایاہ : یایم جب تھوڑے می کنم !

بشنود یا شنود من گفتگوئے می کنم!

۹

دورانِ ذکر میں آنکھوں کا کھلا رہنا شرط نہیں۔ جہاں تک ممکن ہو دل لگا رہنا چاہیے اور محض کا خیال رہنا چاہیے خواہ آنکھ کھلی ہو یا بند۔
کھلنے سے تشویش ہو تو بند رکھیں۔

۱۰

اشارہ ذکر چھپی میں ہر بندہ یا میں، یا پچیس مرتبہ کے بعد سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے
حقیقی ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ انکا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے لیے درود و شریف پڑھتا ہوں۔
پیش کرتا ہوں۔

۱۱

قلب اور بدن میں ذکر کی قوت و سیرت کرتی ہے اور اس کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کا اثر جسم وغیرہ پر زور دے پڑتا ہے اور اس قسم کی
رو نما ہوتی ہیں۔ دنیا سے نفرت بھی ذکر کا اثر ہے۔ اہل دنیا سے علیحدہ رہنے کو چاہتا۔ حقیقت اللہ العزیز کا منظر ہے۔

۱۲

واقعہ یہ ہے کہ حضراتِ چشتیہ رحمہم اللہ تعالیٰ (جن کا طریقہ ہمارے مشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت گلگویی، حضرت مدنی
حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہم کا طریقہ اور اصلی سلوک ہے) ان کی خاص نسبت گریہ و بکا، تڑپ و بے قراری، عشق و دلولہ ہے۔ جس سے
نسبت کا کسی برا اثر ہوتا ہے تو بے اختیار گریہ کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور جس قدر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہی مفید سمجھا جاتا ہے۔ حضرت گلگویی قدس سرہ
کبھی ان کے متوسل کو کہ تو دلِ محنت کے بعد ایسی حالت پیش آتی تھی تو فوادیتے تھے۔ کہ الحمد للہ ان شخص کو رو مانا کے لگا۔ خود حضرت گلگویی رحمہم
انویک بہت رو کیا کرتے تھے اور بالخصوص ابتدا میں تو اس قدر رو دیتے تھے کہ تمام کلمات پر مجھے پڑ جاتے تھے۔ مولانا محمد عیسیٰ صاحب مدظلہ
بیان کیا کہ ایک مرتبہ میں کچھ لکھتا ہوا رہ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے۔ وہ کبھی کہہ کر غالی ہے۔ قرآن شریف کا نام
فرمانے لگا۔ اور قرآن شریف کی تلاوت کے درمیان اس قدر بے قراری سے روئے کہ بچپان میں بھوکیں۔ میں یہ حالت دیکھ کر آہستہ آہستہ دعا
سے اٹھ آیا۔

۱۳

اگر سر برس کی محنت و رمانت کے بعد بھی تھوڑی سی توجہ محرابِ حقیقی اور بارگاہِ علمِ نبوی کی حاصل ہو جائے تو نعمتِ غیر متقربہ اور ان نعمتوں

منا ہی ہے۔

اگر بدنام کہ خواہی آمد بہت سن تو گاہے گاہے:
اِنْ اَجْتَرَفْتَ نَارَ عِشْقِكَ وَ مَنَعَكَ هَجْرًا فَلَا اَبَا بَا:

۱۴

معاشی ضروریات اگرچہ باعث تخریب توجہ الی اللہ اور موجب تنقص ہیں مگر ان کے بغیر اس دار فانی میں حیا رہ بھی نہیں ہے۔

اگر دنیا نہ باشد درو مندیم !

وگر باشد در ہر ش پائے بندیم !

بہتر یہی ہے کہ قبل بیاروقی بکار کا معاملہ رکھا جائے۔ جہاں تک ہم سے توجہ قلبی اور شغل لسانی ذکر کے ساتھ ہو اور ہاتھ پیر اور ناطہ ہر ان اشغال دنیاویہ کے ساتھ ہو۔

از دروں شواکشتہ از برون بیگانه و کش !

این چنین زیباروش کمتر بود اندر جہاں !

۱۵

عبادت اور ذکر پر ملاومت، اتباع سنت و شریعت پر قیام، یہی امر ہیں جن کے ہم سکھت ہیں۔ اور جن پر استقلال سے عمل پیرا ہونا اور درجائت احسان کا حاصل ہونا کمال ایمان ہے۔ خوف خداوندی اور رجاء دونوں ایمان کے کمال کی نشانیاں ہیں۔

۱۶

وساوس گزرتے رہیں۔ آپ اپنا کام باری کیلئے، سیلاب پلٹا۔ ہے اور اس پر جس دغا شک چھائے رہتے ہیں۔ کچھ پر دانہ کیجئے۔ ہاں نمازیں پر کوشش کیجئے کہ کچھ زبان سے پڑھا جا رہا ہے۔ وہ کیا ہے۔ اس کے معنی کا دھیان رکھتے ہوئے جناب باری عز و جل کو سامنے سننے والا دیکھئے والا تصور کیجئے۔

قرآن مجید میں ہے۔ وما تصفون فی نشان و ما شتدو امنہ من قرآن ولا تعلمون من عمل الا حسنا علیکم شہدا اذ نقبضون فیہ والایہ کے مطابق خیال نا بدعا کیا کیجئے۔ بغیرت ہر حالے پر بھی بار بار کوشش کیجئے۔ آہستہ آہستہ ستر سالہ درست ہوگی۔

۱۷

یہ رضائے الہی اگر ہزار برس عبادت کے بعد بھی حاصل ہو تب بھی عظیم الشان کامیابی ہے۔

۱۸

متصوفین کے لئے دل کرنا اور ان کو قیود شرعیہ اور کتاب و سنت کی حدود میں متحد کر دینا اڑیس ضروری ہے۔ درمیان عالم مسلمانوں میں سعادت نرس۔ اللہ کے پہلے جانے کا قری امکان ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہوش عشق خداوندی اور غلبہ سکینہ صرفیہ سے ایسے ایسے افعال و اقوال صادر ہو

جالتے ہیں جن کی شریعت کے احکامیں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو انتہائی فتنوں کا سامنا ہوگا۔ علماء کا فریضہ ہے کہ ظاہر شریعت کی مکمل حفاظت کریں۔

۱۹

خداوند باری عزاسمہ باری تعالیٰ وادراک سے نہایت ہی زیادہ بلند اور بالا ہے۔

تیس کے مثلہ شیئی =

اسے برزائیل و قیاس و گمان و وہم !

وزیر پر گفتم اند و شنیدم و خواہد اہم !

مگر تعجب و تعظیم کے لیے مندرجہ ذیل مثال پیش کرتا ہوں۔

ہر انسان میں ایک مرتبہ ذات کا ہے۔ اس وجہ سے وہ سب سے بلے پر ما اور غیر متعلق ہے۔ دوسرا درجہ صفات کا ہے جو کہ تمام تعلقات خارج سبب ہے۔ اس کا وصف کم اس کو داد و پیش پر کاہہ کرتا ہے۔ اسی پر وہ غیروں اور فقہاء ارباب حاجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور یہ وصف اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان کی حاجت مندوں پر بلے چہن ہو جائے اور اپنے مال و زر کو ان تک پہنچائے کہ اس کے لیے وہ صفات قتل و قتال قہر و غلبہ پر مجبور کرتا ہے۔ علیٰ فی الواقع تمام اوصاف بھی متعلقہ رکھتے ہیں۔ تیسرا درجہ جوارح کا ہے جن کے وسیلے سے وہ مقننات صفات کو خارج میں دیکھتا ہے۔ گریٹ شخص میں داد و پیش کی نسبت آتی اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ شجاعت میں قتل و قتال قہر و غلبہ کی عالم خارج میں صورت لیتی ہے۔ اگر یہ جوارح برہنہ تو مقننات صفات کے ظہور کی صورت دیتی۔ اسی طرح بلاتشبہ تمام ذات باری عزاسمہ تمام خلائی سے مستغنی اور غیر متعلق ہے۔ اس کی صفات کے جو کہ لایعین اور لایفہ ہیں۔ واسطہ بین العیون و الحادث ہیں۔ وہی تعلقات پیدا کرنے والی ہیں۔ اس کے بعد مرتبہ اسما کا ہے۔ یہ اسما عالیہ اپنے اسم اقتضا است کے موافق تمام عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کے جوارح اپنی قابلیت کے موافق تصرف کرتے ہیں۔ اسم رزاق خلق کو روزیا ہے۔ جیسے کہ انسان کا ہاتھ داد و پیش کا کام انجام دیتا ہے۔ اسم سلطان مابیات مطہرہ بالعلم الاذنی کو نصرت و حجب بخشنا ہے اور اسی طرح تمام اسما مقدسہ کے تصرفات ہیں۔ اسما باری عزاسمہ ہمارے اسما کی طرح تاثیر و قوت سے خالی نہیں۔ لایعین و لایفہ اذوات مقدسہ ہیں۔ ان میں وہ قدرت جو صفا و فائزہ میں سے ہے۔ ظہور پذیر ہے۔ جس سے ان کے تصرفات عالم میں جاری ہیں۔ جیسے کہ ہمارے جوارح جاری صفات کے مظاہر ہیں۔ اسما باری تعالیٰ کا تعلق ہر انسان کے ساتھ علیحدہ ہے۔ کئی شخص کامرانی اسم علم ہے۔ کئی کامرانی اسم قدیم ہے۔ کئی کامرانی اسم ہے۔ اہل اللہ کا ارشاد ہے۔ طہ الوصول الی اللہ مجد و النفس الخلاقہ اس کا لازمی یہی ہے جو اسم کی کا..... مرنے ہے۔ اس اسم کے ذکر اور تصور و ہم سے اس کو بلند تر کی پہنچتی ہے۔ مگر کیا تذکرہ نامہ میں کوئی مشکل ہے۔ اس لیے اسم جامع لفظ اللہ سالک کو تعلیم دیا جاتا ہے۔ سالک کی ترقی اس کے مرنے کا نام پر کھیتی ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۰

عزیز فرمائیے کہ آیا علم خداوندی کی وجہ سے انسان کا ارادہ اور اختیار چھین جاتا ہے اور وہ اپنے کار و بار میں روشہ والے اور اپنے نیچے گرنے

روح بے اختیار اور بے قدرت چرما جائے یا نہیں، بلکہ وہ اپنے اندر پورا اختیار رکھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ مجھ کو قدرت ہے، خواہ چراؤں یا نہ چراؤں۔ اس کو مجبور اور معذور کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ خداوند کریم کا علم صحیح ہے اور تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس کے خلاف ہو سکتی ہے۔ مگر یہ ایسا ہے کہ جیسے ایک اعلیٰ درجہ کا ماہر کیمیائی ہو، چاہے مال، یا اعلیٰ کشف والہ بادشاہ، یا الٰہی آئے ہوں، ان کو جانتا ہے اور جیسی پیش گوئی وہ کرنا ہے۔ ویسا ہی دنیا میں ہوتا ہے۔ تو کیا اس کی پیش گوئی کی وجہ سے، اس کے علم کی وجہ سے جو کچھ چوری ہو، یا ظلم وغیرہ کے متعلق ہوتی ہے۔ چور، یا ڈاکو، یا ظالم مجبور ہو جائے گا۔ اور اس کے قدرت و ارادہ میں ذرہ بھر بھی کمی ہوگی، ظالم سبیل میں گامزنوں کے وقت میں، ہم اس کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ظالم کا ٹری فلاں وقت اس نے منٹ پر علی گڑھ پہنچ جائے گی تو کیا اس کی وجہ سے بہن ڈائیر مجبور ہو جائے گا، اور اس قدرت و سکوت پر حواس کی، نہیں نہیں۔ اگرچہ اس مثال میں کمی ہے۔ مگر علم کی حقیقت سمجھنے میں مرید ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے علم کی وجہ سے لوگ مجبور نہیں آئے، ان کا اختیار اور ان کی قدرت پوری طرح باقی رہتی ہے۔ اسی کی بنا پر لوگوں سے مواخذہ ہوتا ہے۔ کہ تم کو ہم نے حکم دیا تھا، چوری مت کرو۔ تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے چوری کی، نیز خدا کے حکم کو نہ تو چور چوری سے پہلے علم تھا نہ کسی نافرمان کو، بلکہ اس کو چوری اور نافرمانی کے بعد یہ علم ہوگا۔ تو جب کہ علم کے گندہ اور چوری کا ارادہ اور عمل اپنے ارادہ و اختیار سے کیا ہے۔ اس پر مواخذہ کرنا بالکل صحیح ہوگا۔

میرے محترم عالم کی حقیقت ذہنی اور قلبی روشنی سے کسی چیز کو جان لینا ہے۔ جیسے کہ الجبر کی حقیقت ان آنکھوں کی روشنی سے کسی چیز کو دیکھنا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم نہایت قوی ہے۔ اس لیے وہ تمام اشیاء کو حقیقی طور پر جانتا ہے اور اس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ جیسے قوی عبارت والا چیزوں کو دیکھ لیتا ہے۔ اس میں غلطی نہیں ہوتی۔ علم کی حقیقت یہ نہیں کہ گریز والوں کے ارادہ اور اختیار کو چھین لے تو چور لے جس طرح چوری کی۔ اس طرح بھی علم اپنے قوی علم سے جان لیا کہ چور نے اپنے ارادہ و اختیار و قدرت سے چوری کی۔ اس لیے اس پر گرفت کرنا صحیح اور ضروری ہے۔

۲۱

الدعاء مع العبادة صاف طور سے بتا رہا ہے کہ دل لگا کر تعزیر و ذاری کرنا عبادت ہی ہے بلکہ افضل تر ہے۔ اس کو عمل میں لائیے۔

دعا میں دل لگانا ضروری ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "ان الله لا يقبل الدعاء بقلب لاه" "لہذا دعا میں دل لگانا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مظلوم کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ غلوں و دل سے نکلتی ہے۔ تاہم اگر دل لگے۔ تب بھی، گناہ سے غالی نہیں۔ لیکن کوشش کرنا ضروری ہے۔

۲۲

ایمان کو ہمیشہ بین الخوف والرجاء پر ناجائز ہے۔ ادعواہ خوف و طمعا "نص قرآنی ہے اور اس معنی میں مختلف آیت مرتب ہو رہی ہیں۔ مگر حالت زندگی میں غلبہ خوف کا ہونا چاہیے اور قرب ہمت میں غلبہ رجاء کا ہونا چاہیے۔ لقولہ علیہ السلام فی الحدیث "انما عند ظنی و قال سبحانه تعالیٰ افا من اهل القرآنی ان یاسیہم باسنا ضعی و ہم یلعبون افا من اهل اللہ فلا

یا من مصلی اللہ! لا القوم الغاسرون و قتال، لا تیسوا من روح اللہ والایہ

(۲۳)

جس طرح تمام اعضا و جوارح عطا فرمائی ہیں اسی طرح اولاد و مشیت بھی ہے جس بنا پر اس انسان کو صاحب الاعضاء کہا جاتا ہے۔ جس طرح اس کو بے زبان و بے عقل بلے ہاتھ بلے پیرو وغیرہ نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اس کو بے ارادہ اور بلا مشیت کہنا غلط ہے وہ شخص ہو گا جو کہ بلا ارادہ ہے اور وہی افعال جبری افعال کہے جاسکتے ہیں جن میں مداخل ارادہ کا نہیں ہوتا۔ جیسے ترش کی حرکت اور اس شخص جس کو پھینکنے والے نے پھینکا ہے اور جس طرح جسم انسانی جب بلا ارادہ فوق سے اسفل کو آتا ہے، یہ حرکت البتہ جبری اور بلا اختیار ہے۔ انسان اپنی حرکت و عرش اور حرکت جسمانی میں (دفع سے تحت کو) کسی قسم کا ارادہ نہیں محسوس کرتا خود کو مجبور محض پاتا ہے، بخلاف افعال اختیار کردہ ان میں اپنے ارادہ و اختیار کو صدر و افعال تک محسوس کرتا رہتا ہے اور یقین کرتا ہے کہ اگر میں چاہوں اس حرکت کو روک دوں۔ اس سے افعال اختیار میں مجبوری کا ادعا محسوس و مشاہد کے خلاف ہے۔ ثواب و عتاب ان ہی افعال اختیار میں ہے جن میں انسان کا اختیار ہے کہ میرے اختیار و ارادہ سے پاسے جارہے ہیں۔ افعال کو محسوس سے پہلے جب چاہوں روک دوں۔ یہ اختیار جبری، جس کو ہر فعل اختیار کا فضا اور صدر محسوس کیا جاتا ہے۔ کتب کو کہا جاتا ہے۔ جس کو ما تریدہ اور دیگر مکملین اثر قدرت حادثہ کہتے ہیں۔ بہر حال تحلیل ارادہ و اختیار ہر نے جو کہ خلاف مشاہدہ ہے۔

جناب کا ارشاد کہ مشیت تابع مشیت رب ہے۔ خود اس کا اقرار ہے کہ مشیت عبد موجود ہے۔ پھر اس کو منہدم مت بار دینا اور تعبیر کرنا کیونکہ غلط نہ ہو گا اور جب اختیار جبری موجود و مسلم ہے تو ثواب و عتاب یقیناً عدل ہو گا۔

(۲۴)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ غلطیاں جن کو آپ انسان بلکہ وقوع کے درجہ میں دکھلا رہے ہیں۔ اگر روایات تابعہ اور آحاد سے ہے تو وہ ان قطعاً قرآنہ کے سامنے کسی طرح کوئی حقیقت نہیں رکھتیں اور اگر ان کی کوئی حقیقت ہے تو وہ نیت ہائے فائدہ سے خارج ہوتی ہیں۔ یا نیت ہائے مصلحہ سے، کیونکہ بسا اوقات غلط فہمی اور خطا سے کوئی عمل صادر ہوتا ہے۔ مگر وہ (حقیقت میں) ان اعمال کو بہت گراہا اور خفیض شمار ہوتا ہے۔ جو کہ عمدتاً اور بنیعت فائدہ و وقوع میں آئے ہوں۔ قتل عمد اور قتل خطا کی جواز میں کس قدر تفاوت ہے۔ حالانکہ دونوں میں مقتول کی جان ہلاک ہوتی ہے۔

(۲۵)

انہ اہل صفت والجاہت مشاہیرت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو خطا اجتہاد ہی متبارک دیتے ہیں۔ اگر حضرت آدم علیہ السلام کے ارتکاب اکمل شجرہ کو ارشاد و فتنی و سلم نجد لدعنا، ذنب خفیف اور غیر موجب مواخذہ اور داخل فی العصۃ قرار دیتا ہے۔ تو ان تمام اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے مشاہیرت کو ان کے مناقب کی آیات اور آیات صحیحہ کیوں نہ لگی اور غیر قابل مواخذہ اور داخل فی العصۃ

ان کی اور کبریاں ان کے دامن کو خطائے اجتہاد ہی مسترد دے کر منشاء اور پاک سمجھا جائے گا۔

(۲۶)

لفظ میا راجی ایک لغوی لفظ ہے کسی فن کا اصطلاحی لفظ نہیں ہے۔ لغت عربی میں معیار ہر اس شے پر لیا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی پیمائی جائے بخوار، ناپ وکیل ہو۔ یارزن وغیرہ اس لیے بروہی شخص جس کے فعل قول و عقیدہ حال پر پورا اعتماد اس طرح ہو جائے کہ اس میں نقصان و نقصانیت کی گنجائش نہ ہو۔ معیار راجی ہر گاہ اور اس کے ذریعہ سے حق پہچانا جائے گا۔ خواہ اس پر وحی الہی آتی ہو یا نہیں۔

(۲۷)

اگر رسول یا نبی نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے کلام قطعی اور قدیم میں اس شخص کے متعلق خبر دیتا ہے کہ اس سے راضی ہیں۔ تو یقیناً بات ہے کہ یہ خدا کی گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ ورنہ اس کے علم قدیم میں جو کہ مذکور ہے عند مشائی فرقہ کا اعتقاد ہے غلط لازم آئے گا۔ یا یہ اپنے لاکر اللہ تعالیٰ خدا گناہ کرنے والے سے بھی راضی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ حق وہ ہی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں۔ قرآن مجید میں لایضی لعبادہ الصغیر اس لیے کسی ایسے شخص کے معیار راجی ہونے پر تامل کرنا بگڑنا نہ ہوگا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ یعنی راضی ہونے کی خبر دی ہو۔ جیسے سابقین اولین مہاجرین اور انصار اور تابعین بالاحسان کے لیے سرورِ قریب میں اور اصحابِ مدینہ کے لیے خیر میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

(۲۸)

تمام اہل سنت والجماعت مسلمان ہمیشہ سے اس امر پر یقین ہیں کہ جو شخص مکرم طہیر و اشہد ان لا الہ الا اللہ محمد المرسل صدق دل سے کہے۔ اس کا ایمان اجمالی تحقیق ہو جاتا ہے اور ہر شخص جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تہائی ہوئی تمام یقینی باتوں و دعائیت و احادیث، کتابِ ہائے خداوندیہ، قیامت، تقدیر، خیر و شر، وغیرہ قطعیات، کو دل سے مان لے اور امتِ دارِ کرب لے۔ اس کا تفسیل ایمان نہ رہتا ہے اور وہ مسلمان اور ملتِ اسلامیہ کا فرد بن جاتا ہے۔ اعمال کی کوتاہی سے یہ اسلام اور ایمان ضائع نہیں ہوتا۔ اعمالِ مذہبہ میں کوتاہی نہ ہوتی آئے، کفر نہیں آتا، ہاں اگر ان امورِ مایوسیہ کا انکار و جھوٹایا جائے۔ تب جہل تک استحقاقِ کفر نہ رہتا ہے۔ اعمالِ غلوہ کسی درجہ کے مالک نہ بن سکتے واد کا کفر نہیں ہوتا۔ البتہ گمراہ فرستے خوارق و معتزلہ وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ اعمالِ مذہبہ کے ترکہ کرنے سے یا کفر و کناہ کے ہونے سے انسان ایمان سے نکل جاتا ہے۔

(۲۹)

بدالسلام غریبیا و مدینہ کا تجربہ یہ کہ اگر اسلام غریبوں سے پہلے اور پھر غریبوں میں لوٹ گئے کہ لغت عربی کے لغت ہے۔ زبانِ ہمد میں غریب کا تجربہ سکین اور غیر سے کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص غریب ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو۔ مگر عربی میں یہ معنی نہیں ہیں

اور واقعہ یہی یہی ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے مردوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ جو کہ خطیوں بہت بڑے تاجروں مال داروں میں سے تھے۔

غریب عربی میں ادب کے شخص کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو کہ شہر اور معروف نہ ہو۔ لوگ عام طور پر اس کو جانتے اور پہچانتے نہ ہوں۔ مالدار ہوا سکین و نادر، اسی وجہ سے مسافر کو غریب کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بدیہی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی پہچان میں نہیں آتا، جو چیز نادر الوقوع ہے اس کو بھی غریب کہتے ہیں۔ کیونکہ قلیل الوقوع ہونے کی وجہ سے وہ معروف و شہور نہیں ہوتی اور اس میں غرابت اور ندرت آجاتی ہے۔ سب مالوں میں نہیں ہوتے۔

نیز اس حدیث میں اسلام کو ذوالحال مت رادیا گیا ہے۔ جو کہ مجموعہ احکام عقائد و افعال و اعمال سے عبارت ہے۔ یعنی دین اسلام تنہا ذوالحال مت رادیا گیا ہے۔ جیسا کہ اردو والے اور آپ کے یہاں کے لوگ کہتے ہیں تو جانب ذوالحال میں لفظ اہل کہا ہے۔ بدو المسلمین کہا جاتا اور جانب سال میں غنہ یا کہا جاتا۔

(۲۰)

صبر کا ثواب اور اس کا کمال صبر کے اوائل میں ہے۔ زمانہ و ماگز کرنے کے بعد تو طبعی طور پر صبر آجی جاتا ہے۔ لہذا وہ عظیم الشان خلق کی کی تاکید اور تعریف میں قرآن شریف میں تیس سے زیادہ آیات موجود ہیں۔ اس کو اور اس کے ثواب کو ہرگز نہ منانے ہونے دینا چاہیے۔ والہ عند الصدمة الہدیٰ۔

(۲۱)

سجدہ دوہر کہنے دا، سجدہ عبادت دا، سجدہ تحیۃ۔ سجدہ عبادت والا اتفاق تمام امتوں میں غیب اللہ کے لیے حرام اور منوع تھا کہ سجدہ اور سجدہ تحیۃ الہم سالتہ میں مباح، اور حاجز تھا۔ امت محمدیہ میں اس کو بھی منع کر دیا گیا۔

(۲۲)

عشاء کے بعد کسی وقت نماز پڑھنا مستحب ہے۔ کیونکہ اس میں رکوع نرم ہے اگر مطالعہ سے فراغت پانچے بعد قبل استراحت دور کہیں پڑھیں تو یہ بھی مستحب ہو جائے گی۔

(۲۳)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عبادت مدینہ کو پھر ڈیا۔ ہزاروں صلیب کرم اور کروڑوں اولیاء الہیہ عرب میں ہوئے اور وہیں مدینہ کی حالت کو سن کر ہنسی نہ تھا۔ کیا ان کو ایمان اور غیرت الیائی نہ تھی۔ وہ ان رہنماؤں میں نہیں، واجب نہیں۔ مقتدر و اصلی رضا کے الہی ہے۔ جہاں ان کا جہاں ہو جائے گا کہہ نہ۔

عشق اور کہاں آپس کے جھگڑے اور لڑائیاں۔ کہاں قلبی اضطراب اور کہاں شہوت پرستی اور آرام طلبی، نہ سرمہ کی فکر ہوگی نہ خوشبو اور تیل کا۔ وہاں، اس کو آبادی سے نفرت، جنگلی جانوروں اور جنگل سے الفت ہونی ضروری ہے۔ وھوہ علیکم صید البرما دمتم حرمہا سیر نکاحہ کار بیکاراں ہے۔ ایسے عاشق اور معطر نعوس کے لیے بے حد نفرت کی چیز ہوگی۔ و اذا احللتہم فاصطاہوا، اس کی تر و ناز کی سرگرمی، معشوق کی یاد، اس کے نام کو چہنا۔ اپنے تن بدن کو بھلا دینا۔ دوست، احباب، عزیز و اقارب، راحت و آرام کو تنگ کر دینا نہ نیند آنکھوں میں بھی محسوس ہوگی۔ نہ لذائذ اطعمہ، اور نہ خوشبودار ادویات و زلفہ اشیرہ والبسہ کا شوق ہوگا۔

یداری ہواہ مشم یکتم بسوہ و یغشیغ فی کل الامور یغشیغ
جوں جوں دہان محبوب اور ایام وصال کی قربت ہوتی جائے گی۔ اسی قدر ولولہ اور فریگی اور جوش جہن میں ترقی ہوتی رہے گی۔
وعدہ وصل چوں شمر نزدیک آتش شوق تیسز تر گردد،

ان دنوں جوش جہن ہے تیرے دیوانے کو
لوگ ہر سو سے چلے آئے ہیں بھالنے کو

نور بہار است جہن چاک گریبان مد دے
آتش افتاد بجان جلیش دلاں مد دے
قرب پہنچتے ہیں تو درمقات پر، اپنے رہے یہ کیلے کیڑوں کو بھینک دیتے ہیں۔ اس وادی عشق میں گریبان اور دامن سے کیا کام
ہر لے تو آپ اپنا گریبان کیا ہے چاک
اس کو بیا سنا نہ سیا پھر کسی کو کیا
اگر غم ہے تو مجرب کا۔ اگر ذکر ہے تو معشوق کا۔ اگر طلب ہے تو بیابان کا۔ اگر خیال ہے تو لبر کا۔
عشق میں تیرے کو وہم سر پہ لیا جبر سو ہوا!

عیش و نشاط زندگی چھوڑ دیا۔ جبر سو ہوا!

کوچہ مجرب میں پہنچتے ہیں تو اس کے در و دیوار کے ارد گرد برسی فریگی کے ساتھ چھلکاتے ہیں۔ سر جو کھٹ پر ہے تو لب دیواروں
پتھروں پر!
امو علی الدیار دیار لسنی
اقبل ذ الجدان و ذ العبد لہا
وما حب الیہ شغف قلبی
ولکن حب من سکن الیہا

کسی نے اگر جہنمی سی خبر دی کہ معشوق کا جلوہ فلاں جگہ نمودار ہونے والا ہے۔ تو بے سرو پیہر دوڑتے ہوئے وہاں پہنچتے ہیں۔ نہ کانا
کا خیال ہے نہ راستہ کے پتھروں کی فکر۔ نہ گڑھوں میں گرنے کا خوف ہے۔ نہ پہاڑوں کی تختیوں کا ڈر ہے۔ مجنوں بنی عالم کا سماں بندھا ہوا ہے۔ ہاتھ
اگرچہ طعیروں پڑی ہوئی ہیں تو کیا رچا ہوا ہے۔ اہل عقل اور اہل زمانہ اگر پھینکیاں اڑاتے ہیں تو کیا شرم آتی ہے۔
حب پیٹ بھی تب لاج کہاں سفار ہے تو کیا ڈر ہے!

دیکھ دو پڑے تو کب چننا! اور سکھ نہ رہے تو کیا ڈر ہے
 اگر ناصح نادان عشق سے رک کتا ہے۔ تو آتش عشق اور بھوک جاتی ہے۔ نادان ناصح کو پتہ چلتا ہے کہ اپنے آپ کو
 بڑبڑاتے ہیں ۛ
 اوصحا! مت کر نصیحت دل مرا گھبراتے ہے
 فومن احب الاعمیٹ صحنی الہادی قسمہ ابہ و مجسنہ و بہا نشہ
 اسے ملا مت گر! اپنے محبوب کی ذات اور اس کے حسن و جمال کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہوں کہ لہلہ محبت میں ضرور تیرے حکم کی خلاف
 رسی کروں گا،
 میرے محترم! یہ پتھر سا خاک کچ اور عورہ کا ہے۔

(۳۶)

ترمذی نے اس حدیث امام مدینۃ العلم و علی بابہا کی تحسین کی ہے جس میں حسن وغیرہ ہونے کا احتمال بھی ہے اور ممکن ہے کہ
 اس نے اس کی تصحیح بھی کی ہو۔۔۔۔۔ تاہم یہ حدیث ان روایات سے متبادل ہونے کی طاقت نہیں رکھتی۔ جو بالاتفاق صحیح ہیں۔ پس برکت تعارض ساقط
 ہی جائے گی۔ اگر اس کے مفہوم میں تعارض نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ احوال امتدادت را دی جا سکتی ہے۔ مگر جب ہم لفظ مدینہ اور لفظ اب میں غور کرتے ہیں۔ تو
 یقین آتا ہے کہ مدینہ اس جگہ کو کہتے ہیں۔ جہاں بہت سے مکانات مجتمع ہوں۔ ایک مکان بلکہ دس پندرہ مکانات والی آبادی کہ مدینہ نہیں کہا جاتا۔ خود لفظ
 مدینہ لغوی معنی بھی اجتماع پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اس علمی مدینہ میں بہت سے علمی گھر ہوں گے اور بہت زیادہ آبادی اس کے
 رہے گی۔ اور دروازہ دروازہ مکان کا ہر یا شہر کا بیشتر خارج ہو کر آتا ہے۔ شہر کا اندرونی حصہ یا مکان کا اندرونی حصہ شمار نہیں کیا جاتا۔ اور کم از کم اتنا ضرور
 کم از کم دھ خارج ہو۔ اور من وجہ داخل ہو، اس بنا پر اور صحابہ کرام و بالخصوص ان میں سے خواص رضی اللہ عنہم، اس مدینۃ العلم کے اندر والے ہونگے
 حضرت علی رضی اللہ عنہ بحیثیت باب اندر داخل نہیں ہوں گے۔ لہذا ان کی فضیلت دیگر صحابہ پر ثابت نہ ہوگی۔ ہاں باہر سے آنے والوں یعنی صحابہ
 یس کے کہ فضیلت ثابت کی جائے کہ ان کو اس مدینہ میں بغیر توسط حضرت علی رضی اللہ عنہ کا داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لیے اسکا ان کی وجہ باقی نہیں رہتی۔

(۳۷)

پہلے میں بہت سی قیود و جزئیہ طور پر ہوتی ہیں جن کو با اوقات ذکر نہیں کیا جاتا اور وہ بالاتفاق ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً حدیث میں قلبی یقین
 اور تصدیق کا ذکر نہیں ہے۔ فقط یہی کہا گیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ داخل الجنة تو کیا اگر یہ کلمہ استہزار اور مذاق کے طور پر
 یا کسی کلام کی نقل کے طور پر کہا تو وہ بھی اس کا مستحق ہو گا۔ یا کسی نے مسلم حبش کے سامنے جان بچانے کے لیے یہ کلمہ کہا اور طلب میں تصدیق نہیں ہے
 تو کیا وہ اس اجر کا مستحق ہو گا۔ یا اس کلمہ کے کہنے کے بعد اٹھا کر دیا۔ یا کلمہ شرک کا بول دیا تو یہ یقین معلوم ہے کہ وہ توحید خجاست کے لیے کافی نہیں ہے
 اور حسب تصریحات روایات و آیات قید تصدیق قلبی کی ضرورت لگانی ہو گی اور عدم انکار کی بھی قید ضرور ہو گی۔ اسی طرح اس روایت میں ایمان بالرسالت
 کی بھی قید لگانی ضروری ہو گی۔

سورہ ہجرت میں ہے: اٰمِنُو بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْا وِجْهًا وَّابًا لِّهٖمۡ وَالْفَسْهَمِ

فی سبیل اللہ اولئک ہم الصادقون ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے القدر اور اس کے رسول پر پورے نہ لائے اور جہاد کی لشکر راہ میں، اپنے مال اور اپنی جانوں سے۔ وہ لوگ ہیں وہ ہی کہے ہیں۔ فقط انما جو کہ مینہ صبر ہے۔ یہاں استعمال کیا گیا ہے۔ اسی لیے حدیث جبرائیل علیہ السلام میں اور حدیث وفد عبدالقیس میں ایمان کی تفصیل اور تشریف بیان کرتے ہوئے ایمان بالرسول والعلما جو الکتاب والقیمة والقدر کو ذکر فرمایا گیا ہے۔

توحید کا دعویٰ تو سب دوسری نصاریٰ، مشرکین عرب اور ہندو سب کرتے ہیں۔ مگر اسی توحید کے ساتھ یہود عزیر علیہ السلام ابن اللہ اور ید اللہ مغلوں اور ان اللہ فقیر و کج اختیار اور تبسم وغیرہ کے قائل ہیں۔ نصاریٰ اسی توحید کے ساتھ تلیث اور ابن اور روح القدس اور زچہ رئیس کے قائل ہیں۔ بہت پرستان ہند، زناکار، صرف خسل کے قائل ہوتے ہوئے اوتاروں اور عبادت غیر اللہ کے قائل ہیں، تجسیم اور حلول وغیرہ ان کے عقائد میں۔ کیا ایسی توحید قابل اعتبار ہوگی۔ اس لیے قائل من دتال لا الہ الا اللہ سے جو تفسیر توحید منقول ہے۔ وہی موجب نجات اور حب اس کی تعلیم کا اعتبار کیا گیا تو صدیق رسالت لازم آگئی ورنہ توحید حقیقی نہیں فعلی ہے جو کہ قابل اعتبار نہیں۔ واللہ اعلم اسی روایت میں من قال لا الہ الا اللہ (الحدیث) کے بلطریق اگر جمع کیے جائیں۔ تو معلوم ہوگا کہ روایت محضہ واقع ہوئی ہے۔ اس میں کچھ اور بھی زیادتی ہے۔ جو کہ راوی نے بوجہ ظہور باختصار سلف بیان یا عدم ضرورت بعض اوقات میں چھوڑی ہے۔ اور بعض اوقات میں ذکر کر دیا ہے۔ مثلاً مخلصا من قبلہ سماری تشریف وغیرہ میں اسی روایت میں موجود ہے۔ دوسری روایتوں میں دانی رسول اللہ موجود ہے۔ اسی لیے اکثر فن دانے ہیں کہ جب تک کسی روایت کو اس کے تمام طرق سے نہ دیکھا جائے۔ اس کے معنی متین کرنے میں دشواری ہے۔

(۳۸)

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب پوچھا گیا۔ کہ میں عبد العزیز افضل ہیں یا معاویہ رضی اللہ عنہ، تو منہ ہلکا کر امیر معاویہ کے اس گھر کے نقصان کی خاک میں پر سار ہو کر انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ عمر بن عبد العزیز سے افضل ہے۔

(۳۹)

رفقہ رفتہ اس درجہ طریقہ ایصال ثواب میں بہت سی غیر مفید اور ناجائز باتیں داخل کر لیں گئی ہیں جو کہ ایصال ثواب کے لیے ضروری مثلاً اس کو تبرک سمجھنا اور خود کھانا، احباب میں تقسیم کرنا، اختیار نہ کھلانا اور یہ اعتقاد کہ ناک کھانا اس بزرگ کا پس خوردہ ہے۔ جس کے نام پر ایصال ثواب کیا گیا ہے۔ قرآن اور فاتحہ کو ضروری سمجھنا اور اسی طرح دیگر امور مثلاً جگہ کا لینا جو شکر کا لگاؤ، پڑھنے والے امام یا مرنے یا مرنے والے کا ہاتھ اور پڑھنا عوام کے اعتقاد میں یہ امور اگر نہ ہوں تو ایصال ثواب ہی نہیں سمجھا جاتا اور عموماً یہ چیزیں نام و نمود اور شہرت کی غرض سے ریاکاروں کی جاتی ہیں۔ یا اگر ان کے لسن طین سے بچنے کی غرض سے ہوتی ہیں۔ اخلاص ہوتا ہی نہیں۔ علیٰ ہذا التیاس بسا اوقات مال ہی حلال نہیں ہوتا۔ یا بعض میت کے وصال کے بعد اس کے ترکہ میں سے جو کچھ کیا جاتا ہے۔ عموماً اور ثار سے اجازت نہیں لی جاتی۔ بالخصوص جب کہ وارث بعض یا کل یا بالغ ہیں۔ سکینوں اور غریبوں کو یہ مال دیا ہی نہیں جاتا۔ اور اگر دیا جاتا ہے تو نسبت ہی کم اور انی ترم عمدہ اور اکثر حصہ طعام اختیار اور انہیں ہی کھاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کھانے میں کسی ثواب کی امید نہیں ہے۔

اصحابِ حقوق کے مال کی مقدار میں خیرات کی جائے۔ یعنی اگر وہ فوت ہو چکے ہیں، یا کئی مانع ہے اور ان کے حق کی وصولی و ادائیگی کی نیت ہو۔ یعنی اس کا ثواب صاحبِ حق کو پہنچنے اور ان لوگوں کے لیے استغفار اور دعا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اپنے انعامات ان کو دیکھ کر راضی کر دے تاکہ وہ اپنے اپنے حقوق معاف کر دیں۔

ایسی نمازیں جو کہ شرعی نقطہ نظر سے صحیح ہوتی ہیں۔ انکا اعادہ واجب نہیں ہے۔ گوشش کرنی چاہیے کہ خیالات نہ آئیں اور حجب آئیں قرآن کو دفعت کر دینا چاہیے اور یہ تصور کرنا چاہیے کہ میں اس شہداء کے سامنے حاضر ہوں جو دلوں کو دیکھ رہا ہے۔ اور میرے قلب کی باتوں پر مطلع ہے۔ وہ میری باتوں کو سننا اور میری حرکات و سکنات کو دیکھتا ہے۔ اس دھیان کو بڑھانا چاہیے۔ آمین آمین انشاء اللہ فطرت ان خیالات کم ہو جائیں گے۔ نیز سورہ ناس کو شام یا صبح معنی کے خیال کے ساتھ ایک تسبیح روزانہ پڑھ لیا کریں۔

جو نمازیں قضا ہیں ان کو پڑھ لینا چاہیے۔ اور صحت نماز کی شرائط کو جہاں تک ممکن ہے محفوظ رکھتے ہوئے ادا کر لینا چاہیے۔ قابلیت قبول کی امید ہو کر نماز پڑھ کر نہ چاہیے۔

قرآن مجید میں مذکور ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "میری ماں کے بیٹے! میری دائرہ اور میرا سرست بڑھ لاتا خذ بلعینی ولا یسوا سی اگر حضرت ہارون علیہ السلام کی دائرہ قبضہ مشیت سے چھوٹی ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح کھڑے ہوتے۔

عن انس ابن مالک رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجش وھن وائسہ وتدرج لعینۃ۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سر میں تیل کی مالش اور گلگی سے ڈاڑھی کی آرائش بکثرت کرتے تھے۔ کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ شخصی ڈاڑھی میں نہ گلگی ہوتی ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کو سنوارا جائے اور یہی حال چھوٹی ڈاڑھی کا ہے۔

عن عائشہ رضی اللہ عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشر من الفطرۃ
لنفس الشارب و اخفاء اللحیۃ والسواک والاستنشاق بالماء وقص الاظفار وغسل المبراجم ونقث الابطح
حلق العانة وانتقاص السماء یعنی الاستنجاء

یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ مچھروں کا کرنا، ڈاڑھی کا بڑھانا اور مسواک کرنا الخ ابن ماجہ ص ۲۵ مسلم ص ۱۲۹ ابوداؤد ص ۱۱۰ اس حدیث میں جو کہ نہایت قوی روایت ہے۔ دس چیزیں ذکر ہیں سے ڈاڑھی کا بڑھانا اور مچھروں کا کرنا وغیرہ ہیں۔ فطرت بتلایا ہے اور فطرت و شرع میں ان امور کو کہا جاتا ہے جو کہ تمام نسب یار اور رسولوں کے معمول اور شرف علیہ ہیں اور ہم کو ان پر عمل کرنے کا حکم ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۶۹ھ
۶۱۹۲۹



۱۳۰۵ھ
۶۱۸۸۵

عس تسخیر علیہ عثمانی

کرم و خدمت خدایہ و اور مسلمانان

سید عالم بخوانم آئی از راه کم جو در آن تک فواری تیرے
 بدرجہ و درناحق و شریف و عیب پس بھی تیرے ہیں و ہتھیان کرل
 اگر دوران میں ایک کندہ برک گشتی ہے۔ راہ فارم جو تیرے
 الحکمہ کھنڈر تکلیف درد و غم کا نہیں جو تیرے فضل
 ۲۰۔ ۵۰۔ کندہ بن نکل چکی ہیں بیکر۔ یہ بے بڑ نہیں
 آج کی ریل و واغتم جو چکی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اے اے توبہ
 کہ آئندہ از تکلیف محفوظ فرما دے۔ لیکن احتیاطی میں چاہتا
 چنا کہ تھوڑی سی دوا رکھی ہے۔ اگر آئندہ اس کے نسخہ مال
 کو زین توبہ ہی پھرے۔ ورنہ کم از کم اسی قدر دوا مزید
 دوا نہ فرما دین منوں و نفا۔ آب کیسے دے کرنا چاہا اور دوا کا علاج
 اس کیسے کھو گیا

روز در سند
 ۶۶
 مہر محمد

محمد زکریا خان شیکری

پروفیسر اسلامیہ کالج - نائل پور

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی علیہ رحمۃ اللہ

یوں تو دارالعلوم دیوبند کا ہر فرد اپنے رنگ میں کچھ نہ کچھ نمایاں خصوصیت کا مالک ہے۔ اگر ایسا بھی ملنا دشوار نہیں، جنہوں نے اپنے سلیو ملے سے دوسروں کو فیض دینا یا ایک سماج کو نایہ منافع کر دیا ہے۔ ہر جگہ انکسار علمی سے درایت میں ملی ہے۔ لیکن اکثر مشیت گزار دارالعلوم دیوبند کا چشمہ فیض نہ صرف پاک و پندہیں ایک صدی سے سلسلہ میں ہے کہ دیگر مالک مثلاً افغانستان، ایران، عجم، ہما، ترکستان، جاما، ملا، وغیرہ وغیرہ ملک کام پر ہا ہے۔ دارالعلوم دیوبند نے دنیا کے اسلام کو علم دین، تقویٰ، اخلاق، انسانیت اور سیاست سے ہر پر منزل پر لانا اور ہر پر کام پر مسلمان عالم کی رہنمائی کی۔ اگرچہ ہم بعیرت سے دیکھا جائے اور دارالعلوم کی مجموعی ات اور حیثیت پر کسی پر غور والی جائے اور تہذیب کی علیک کو لہر کر اس کی ملی دلی عزت کا صحیح معنی میں جائزہ لیا جائے۔ تو آپ کو اس نتیجے پر پہنچنا آسان ہو گا کہ عزت مولانا امام صاحب دینی دارالعلوم دیوبند کا یہ لایا ہوا چین قدرت ربانی رحمت حقانی نے ازل میں مسلمان کی اطلاع و ہیود کے لیے چن لیا تھا۔

چشمات دارالعلوم دیوبند میں دین تو بڑھ کرے کہ رنگ بڑھ کر چلے۔ لیکن ان پیروں میں کتنے ہی پیر ہیں نہایت ہی باادب نظر، سلیو مدد فرازا اور سلیو انتہا سطر۔ ان میں شیخ العرب مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، یگانہ روزگار محدث مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری، منکر اسلام مولانا مہر علی، فقیر زمانہ مفتی کنایت اللہ صاحب دہلوی، سربراہ افتخار مولانا حسین احمد صاحب دہلی، ادیب یگانہ مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، شای تانی مفتی عزیز الرحمن انوار، ملازمہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سلیو ہا پیر ہیں۔

اپنے اس مقالہ میں میرا سلیو نظر مولانا علامہ عثمانی کی شخصیت اور ان کے علمی مقامات سے بحث کرنا ہے اور جن کی ذات میرے دماغ اور فکر کی زبردست تہلا تھی۔ اس لیے اس کے بعد میرے متعدد مضامین اس بات کا انبساط اور رسالوں میں ان کے متعلق شائع ہوئے اور ابھی تک کسی نے ان کی قدرت نے ان کی یاد تازہ کر کے کے لیے مجھے متغیر کر دیا ہے۔ میرے اکابر اور شیوخ علم میں یوں تو اہم معر حجت قرآنی سید انور شاہ صاحب کشمیری اور مولانا مہر علی کی جن کی معیت و محبت کے پیروں کے دل کچن میں سلیو ہا رہیں گے۔ اور جن کو فخر و شرف کی مثال کسی بھی مرتبہ میں کامیاب نہ کر سکے گی

گویا طالب علمی کے نام میں غالب علم بھی تھے اور مدرس بھی۔ اس زمانے ہی میں دارالعلوم کی چار دیواری میں ان کی شہرت پلک بپلک پھیلی۔ دیوبند میں صدیقی اور عثمانی خاندان کے علمی سرگرمیوں کے باعث درشتہور خاندان تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ علامہ عثمانی خاندان کے ذہنی وجاہت شہر چرخ ثابت ہے۔ اور اپنے ماحول سے انہیں پورا فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

یوں تو آپ کے مختلف اساتذہ تھے لیکن ان میں سب سے بڑے اساتذہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد حسن صاحب اسیر واثق تھے۔ اساتذہ اور شاگرد باہم ہر وقت استفادہ و تبادلہ لگاتار لگاتار رہتا ہے جس شاگرد کو ایسا جلیل القدر استاد مل جائے اور جس استاد کو ایسا ذہین و فہم شاگرد نصیب ہو وہ دونوں فخر علی ذر نہ ہوں تو اور کون ہو گا۔

یوں تو حضرت مولانا محمد حسن صاحب خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی علیہ السلام اور مولانا فیض یار تھے۔ مولانا صاحب دارالعلوم دیوبند کی ذمہ دارانہ صدد مدرس اور محنت و مطالعہ نے ان کو آسان علم کی بلندیوں تک پہنچایا تھا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب عثمانی زیادہ طالب علمی کے زمانے ہی سے متاثر ہوئے۔ علاوہ انہیں منطق و فلسفہ میں مولانا غلام رسول صاحب مرہدی سے انمول کے فیض حاصل کیا جو دارالعلوم دیوبند کے اعلیٰ مدرسین میں سے شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم محمد حسن صاحب، مولانا محمد حسین صاحب شیرانی بھی ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ علامہ عثمانی پر بھی طالب علم ہی سے اساتذہ بلکہ حدیث شریف خردان کے چہرے سے دکھات و ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔

واللہ اعلم بالصواب

چونکہ علامہ کی علمی شہرت طالب علمی کے نام میں ہی پہنچ چکی تھی اور ان کی لیاقت کا سب سے اس کی چار دیواری میں چل پڑا تھا۔ اس لیے فراغت کے بعد لکھنؤ کے چاند دارالعلوم میں آدھے درجے کی کتابیں لکھیں۔ بعد ازاں فتح پور کی سجد پٹی کے علمی مدرسے میں صدد مدرس کی حیثیت پر مشغول ہوئے۔ وہاں کے قیام میں دہلی میں آپ کی تشریف آوری ہوئی اور اہل دہلی میں آپ کی علمی اور باطنی شہرت نے زبردست اثرات حاصل کیا۔

قدرت کے جہاں ان کی ذات میں ذہانت اور فصاحت و دلالت کی تھی۔ وہاں وہ عقلی سے ہی تحریر اور تقریر کا ذوق و شوق رکھتے تھے۔ پہلیں کر دہلی میں رہا تھا۔ اکابر دیوبند کی نظر میں ان کی علمی لیاقت اور تقریر و تحریر کے اوصاف کھلے جا رہے تھے اور اس لیے بڑے ان کے فہم و ذہانت سے متاثر ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے متعلق سب کی خواہش یہی تھی کہ ان کو دارالعلوم دیوبند ہی میں واپس لایا جائے۔

علامہ کے دوران قیام دہلی میں حضرت مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے مولانا عبد اللہ صاحب ندوی جو حضرت مولانا محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور انہوں نے دہلی جہیز الاسلام کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کی انتظامیہ کی مجلس میں مولانا صاحب دیوبند مجاہد میں شرکت کے لیے تشریف لاتے جمعیۃ الاسلام کی مجلس منظر میں آپ کو بے غصہ دیکھ کر سب سے شام کیا گیا اور جہاں اس میں حضرت مولانا محمد حسن صاحب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی، حضرت مولانا محمد رشاد صاحب بیسے حضرات تھے۔ ان میں مولانا صاحب جمعیۃ انصار عالم و داخل کی شہریت اور انتخاب بہت ہی باحسب مشرف تھے۔ اس انجمن کا مقصد مسلمانان ہند میں مذہبی اور سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ جمعیۃ انصار کے پہلے جلسے میں جہاں ان کا بیٹا بھی شہرہ آفاق اور جس میں علامہ خود و دیوبند اور تمام ہندوستان سے اکابر علمائے شریعت کی۔ قیام زبردست تھا۔ پھر اس میں کون کون کا علم اور تہذیب و تمدن کے مسائل پر بحث ہوئی۔ اگلے سال مرہٹوں نے جمعیۃ انصار کا دارالعلوم لاہور اسطاس جہاں اس میں بھی علامہ نے زبردست اثر اور ذہانت کے نام سے اپنا نشان لگانا۔ ان مجلسوں میں تقریر و تحریر سے شرکت کرنے سے حضرت عثمانی کو ہندوستان کے اعظم مجالس کے مقارن کر دیا گیا۔

م الکلام

نشین قاسم

تفسیر حدیث اور فقہ کے علاوہ حضرت عثمانؓ کا نام ازانی، علم کلام تھا اور اس میں ان کا گرامر طالعہ تھا جسے تمام مہم جوں میں ان کو ایمانی شان بخشا۔ اپنے دور کے جس طرح مفسر ہوتے تھے اسی طرح اپنے پڑاؤ کو مفسریت کا اور کڑا سبیل اسل شاہجی کو عقلی اور دیندار مفسر بننے پر درکار تھے کہ ان کے دور کا کئی بھی عالم اس قدر قادر و قادر تھا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ کڑی نے ان کو زبردست شکم اور حق کیا ہے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اپنی دلاورم دیو بنائے اپنے کے اہم علم کلام تھے۔ انھوں نے قدیم علم کلام سے جٹ کر ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی اور اپنے جہد کے تقاضوں کو اپنی نگاہ بصیرت اور ذہن سے دیکھا۔ چنانچہ قدیم علم کلام کے سنگین اور عمدہ، یونان کے فلاسفہ، سقراط اور افلاطون کی ترمیم پرانی قوت علمی و استدلالی کو سر کرتے تھے۔ تو حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے لیے نیا علم کلام، میسٹریں، آیات، محمد و ان شائق با اور دیگر اپنے دور کے علم و ادب کے متعلق میں کیا کیا حضرت مرحوم کا بڑا ہی استدلال و اکثر پریشہ رہا ہوا تھا۔ قدرت تعالیٰ نے ان کو علم و عقل کا ایک دریا جس میں ہر وقت عروج و انحطاط اور دلدل و تھیں۔ ان کے علم و تربیت عین اور دقیق ہوتے تھے۔ چنانچہ علمی اور دینی درجہ کے اہل علم و توفیق کو اپنے دہے کے ان کی بعض شخصیات مثلاً شبہ حیات و اقرار و پند اور دیگر شیعہ سمجھنے سے کام لیں۔ فخر العزیز حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق صدر مدرس و صاحب مولانا محمد قاسم صاحب سرائے قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحب اس طرح کے مضامین بیان فرماتے تھے کہ کسی نے نہ سنے نہ دیکھے اور صاحب مذہب تحقیقات برقی میں بیان فرماتے ہیں کہ سے تطبیق اختلافات اور تحقیق برائے کی شبہ بنیاتی تھی۔

(سوانح قاسمی صفحہ ۲۱-۲۲)

اس سے آپ اذادہ لگاتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے علم و کس قدر عین اور دقیق ہوتے تھے۔ لیکن علامہ رشید بیہوشانی رحمۃ اللہ علیہ کو قاسمی علم و حکم کو اپنی طرح ان کے مضامین دس اور تیرہ دہائیوں میں بہا تے تھے۔

کہتے ہیں کہ مولانا جلال الدین رومیؒ کی تبریک زبان سے اور حضرت باقی اہل اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہاجر کی کے فواید اور آثار و رم کی طرح اللہ تعالیٰ نے قاسم صاحب کو سیری زبان بنایا ہے کہ قدرت بانی ان کی زبان اور فکر سے جو مضامین ظاہر فرمائی ہے وہ میرے دلی کی تعریف کرے کہ یہ۔

دہائیوں کہتا ہوں کہ مولانا رومی اور مولانا محمد قاسم صاحب کی طرح علامہ رشید بیہوشانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی زبان تھے اور اس لیے اگر ان کو جانشین قاسم کہہ سکتے تو بالکل سہا اور درست ہے۔

چنانچہ علامہ دلاورم دیو بنیدین علامہ عثمانی کو بڑا جانشین قاسم کہہ سکتا تھا۔ مولانا عبداللہ دیرا دہی نے آپ کی وفات پر تعزیتی بیان میں تحریر فرمایا۔

محکم الامت عثمانی کے بعد علامہ عثمانی کی ذات اب اپنے نگ میں مسدود رہ گئی تھی۔ لیکن انفس ہے کہ آج یہ بڑی نعمت بھی پاکستان و ہندوستان سے اٹھ گئی۔ آپ اپنے وقت کے زبردست محکم نہایت خوش تیز

دلاورم و محدث و مفسر سب کی کچھ تھے۔ (صدق و بربر ۱۳۴۹ھ)

ابرمید بری الم۔ اسے مرحوم ایڈیٹر اخبار احسان لاہور نے تحریر کیا ہے۔

مولانا عثمانی کی ذات گرامی ہی وہ دلاورم ذات تھی جس نے عقل و فہم کی روشنی میں اسلامی احکام کی مصطفیٰ کشاکش اور ہندوستان کے طول و عرض سے مستفید طور پر حکم اسلام کا لقب حاصل فرمایا۔

(احسان ۱۴، دسمبر ۱۹۴۹ء)

متعلق کہتے ہیں۔

”یہ تفسیر ایک ایسے مقبول عالم نے لکھی ہے جس کے متعلق مسلمان ہند کا صحیح علم ہے کہ نہی و کان، غور و فکر اور سلاست کلام، دلچسپی تحریر، دلپذیری تقریر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا یعنی شیخنا دامت تافا منہ اعظم قاسم ثانی حضرت علامہ شہید صاحب عثمانی شارح مسلم (دست خان کریم طبعہ مدیر پریس بکبزر)

مذکورہ بالا مقدمہ علامہ کے پاک و ہند کے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ عثمانی علوم و فنون یعنی تفسیر و حدیث، فقه، علم کلام اور دیگر معقولات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور تمام علمائیں ان کا علم و فضل لیے دانہ اتر سکتے تھے۔

جہاں مذکورہ بیانات میں ان کے علم و فضل پر پھر سے موجود ہیں۔ وہاں ان کی ادبیات و تحریر اور انشائے نثری اور شعلہ مقالی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تصنیفی خدمات یعنی کتابوں سے ان کے ادبی کمال اور انشائے نثری کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان اور شعلہ مقالہ عقرین میں سے تھے جہاں کے وقت سامعین کے دلوں پر مباد کرتے تھے۔ کبھی کی کیا مجال تھی کہ وہ ان تقریرات کو چلا جائے۔ نہیں ممکن کی تقریریں گورگراتی جلی جاتی تھیں اور اتنی موثر و پرتی تھیں کہ جہاں میں شنیدہ کے پر زور کومل کے لیے سحر کرنے کا پورا کرکٹ ہو پڑتی اور اہل مجلس کا شوق اور زیادہ ہو جاتا تھا۔ ان کی علامہ انسانی اور فصاحت لفظی اور بلاغت معانی پر دل و زبان ہرے کو چاہتا تھا۔

پاک و ہند کے وہ کون سے بنگال ہیں جن کی تقریریں سے نہیں گریز۔ والہ العلوم کی درگاہ آج تک اس جیسے شعلہ مقالہ مقرر کی گنج پر جوش و خروش ہوا کرتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جبر، ڈاکٹر انصاری، حکیم محل خاں، ڈاکٹر عثمانی، علامہ رفیع الدین، علامہ انور شاہ بخاری، ہندوستان پاکستان کے نامور علماء ان کی تقریر کا لہر مانتے تھے۔

۱۹۲۸ء میں جب مولانا عثمانی کی تقریر کی مسجد پر لگا دکن میں میرٹھان علی خاں نظام دکن نے سنی تقریر سے علامہ کے چہرے کو تکتے رہ گئے۔ ۱۹۲۳ء میں علامہ کے مقرر کیں شرکت فرمائی تو شاہ جہاں سورجیہ صاحبہ نے علامہ کو اس کے علم میں بہت وسعت اور ان کے خیالات میں بہت رفعت دے دی۔ یہی سلطان اور حکام ان کی اور انشا پر وازی میں بھی تھا۔ چنانچہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلی نے ان کی تقریر اور اور زبان کے متعلق فرمایا۔

”معارف قرآنیکہ کو اردو زبان میں اس خوبی، خوشنمائی، منگلی، مستان، سلاست، فصاحت و بلاغت کے ساتھ مصنفہ شہر پر لانا حضرت مولانا شہید احمد صاحب عثمانی کا ہی حصہ ہے (دوران کریم طبعہ بکبزر)

ہم علامہ کی تالیفی و درسی خدمات اور علوم و فنون میں خدمات و کمال پر بحث کر رہے تھے۔ علامہ جہاں بہترین عالم تھے۔ وہاں بہترین علامہ پر واز کرنے کے علامہ بہترین مدرس بھی تھے۔ میدان درس ایک جیسا میدان ہے جس میں ہر عالم کا سیلاب نہیں ہوتا۔ آپ کا درس سنا کر

سندھ سبابت، کامابل ہوتا تھا۔ سبق پڑھاتے وقت پورے ذوق و شوق کو مل میں لاتے تھے۔ طلبہ بے حد متاثر ہوتے تھے۔ اس طرح تقریر کرنے کا کتاب کا ایک لفظ دل میں اترتا، مشکل سے مشکل معنیوں کو اس طرح بیان فرماتے کہ مشکل پر مشکل مشکل پر مشکل آسان ہو کر آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ ان کی طرز بیان میں تخیل کا رنگ آتا تھا کہ تقدیر استقامتِ عرش اور شہادت کے دوسرے مشکل مسائل آسان ہو جاتے تھے۔ طلبہ کی اکثریت ایسے دشوار مسائل کے حل کے لیے علامہ کی طرف رجوع کرتی۔ وہ سبق کی زیادہ مقدار پڑھانے کے قابل نہ تھے بلکہ مقصد بنی کی کیا ہے سبق کی نوعیت اور معلومات کی فراوانی اور تحقیقات کی افزونی پر زور دیتے تھے۔ سبق معلومات اور تحقیقات کا انشا پر واز ہوتا تھا کہ دوسرے اساتذہ کے دس سبقوں کی برابر حقیقت لکھتا تھا اور طلبہ کے دل پر ایسا نقش ہو جاتا کہ گویا دل پر لکھا ہے

اور جن پر اس کے نقوش ہیں کہ نقوش کی طرح ہر جات تھے۔ ان کے سین میں لمبے پس اور روحانیت کی فراوانی کا عالم کچھ نہ پہنچے۔ و ان کو رب کی تفسیر پڑانے وقت دل معلوم ہوتا تھا کہ مطالب کا کشف ہر بار ہفتہ ۱۰ اسی طرح درس حدیث کے وقت قرن اول کے محدثین کا لگان ہوتا تھا کہ آسمان سے وحی نازل ہو رہی ہے۔ اسی طرح درس حدیث کے وقت دلوں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ مجلس میں تشریف فرما ہیں اور قتلاہ الرسول کا بازو لگ رہا ہے۔

۱۹۲۲ء تک ۱۰ سال کا عرصہ علامہ عثمانی کا درس حدیث و تفسیر فقہ حنفی و فلسفہ اور علم کلام میں گزرا۔ ان کا دسی تجربہ عمرانی

مذہب درس تجربہ تھا بلکہ ایک ایسا درس و تدریس کے مقام پر آپ تازہ تھے۔

آپ نے دالعلم دینہ میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۵ء تک تعلیم کی اور اس سے پہلے دو سال مدرسہ بریتین جی ویلی اور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک دینہ میں
 ملل کے سارڈ اہیل سرائے و تجارت کا شیاوہ اسکے جامعہ بریتین میں درس دیا۔

علامہ صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند یا وائس چانسلر کی حیثیت میں

آپ بعض جہہ کے سبب ۱۹۲۵ء میں دارالاسلام سے جدا ہو کر جامعہ ڈاکٹر ایل میں انعامتہ پڑھنے گئے اور وہاں دس دیتے رہے ۱۹۳۶ء میں پھر دارالعلوم فرید کے صدر مقرر ہوئے اور دونوں جگہ کام کرتے رہے۔ لیکن چند سال کے بعد ڈاکٹر ایل سے منتقل ہو کر دینہ پور تشریف لے گئے اور مدت اہتمام کے فرائض انجام دیے۔ معاوضہ انجام دیتے۔

اس مدرسہ میں آپ نے طلبہ قدیم کی تنظیم، چندے کی فراوانی، استقامت و درجہ میں بہت لپسی لی اور دارالعلوم کو بہت سے انتظامی معاملات میں علامہ کی شخصیت سے فائدہ پہنچا، لیکن یہ دارالعلوم کے طلبہ کی قبضہ بندی کی وجہ سے آپ سے علمی فرائض حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ البتہ آپ نے طلبہ کے سببے حواضر پر درس تفسیر قرآن کریم کا سلسلہ شروع فرمایا جس نے سببے مدبولیت حاصل کی اور زعفرات طلبہ بلکہ شہر میں سے بھی اور لکھنؤ کا بالائی حصار اور گیلان جرماتی تھیں۔

۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ بنگالیہ کے خانات ملک میں آزادی کی تحریک کا نیا دور اور جوش پیدا ہوا۔ طلبہ دارالعلوم نے بھی اس میں حصہ لیا۔ علامہ نے بعض طلبہ کو مدرسہ سے خارج کر دیا جس سے بعض شرش پسندوں نے فائدہ اٹھایا۔ دارالعلوم کی مجلسِ منتظمہ کے بعض افراد نے طلبہ کو ہمدردی کرنا پابجا۔ چنانچہ علامہ پر سناش کا دباؤ پڑا اور آپ نے اہل غمراہ سے طلبہ کو واپس لے کر دیا لیکن دل داں رہنے سے اپنا ٹپ بھگایا۔ اس لیے خود وہاں آٹھ ماہ بعد واپس دارالعلوم سے تعلیم کی انتہاء کر لی۔ اس کے بعد آپ کو پھر دہلی واپس لانے کا بلاوا کچھ عرصہ آپ نے دیا لیکن بحیثیت صدر جامعہ کام کیا اور انجمنی و ترقی کا سبق دیتے رہے لیکن جلد ہی گئے۔ آپ کے گھنٹوں میں دردِ ہوا اور سچے سچے مہر سے بھی عاجز ہو گئے۔ اس آٹھ ماہی اپنے دولت خانے میں دیر بندہ ۱۹۴۷ء تک انعامتہ پیر رہے۔

سیاسیات میں علامہ کی شرکت | علامہ نے جہاں ترقی نہایت میں اپنی فکر کو گزار دیا وہاں ان کی علمی سیاسی خدمات اور آزادی پسند سرگرمیاں کی رہنمائی اور اہمکداری سے مسلمانوں کو سیاسی راہ پر چلنے میں بڑی خدمات انجام دیں۔ آپ نے جب سے جہانگیر آباد میں سرگرمی سے جہت لینے کے لیے ۱۹۱۸ء کی جنگ بلقان و طرابلس سے سیاسیات میں خیریت لینا شروع کیا۔ اس دور میں آپ نے بلقان اور طرابلس کے مسلمانوں کی مالی اعانت کے لیے ہندوستان کے مختلف خطوں سے چندہ فراہم کیا۔

۱۹۱۲ء سے خلافت کی جنگِ ظہور میں خلافتِ ترکیہ جبرئیل کے ساتھ مل کر برطانیہ سے لڑ رہی تھی۔ جبرئیل اور کونکر کو شکست ہوئی۔ مسلمان ہند نے تحریکِ خلافت میں سرور مزی کی بازی لگادی۔ علامہ عثمانی نے بھی تحریکِ خلافت میں ڈاکو کام کیا۔ ہندوستان کے بڑے

بڑے شہر میں آپ کی زبردست تفریب، پتھریک خلافت میں جبر لے کر جلسوں میں تقریریں سے علامہ کی ملک میں اور حرم گنجی۔

جمعیتہ العلماء میں شرکت

تحریک خلافت جب شباب پر آئی تو جمعیتہ العلماء ہند کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں ڈالی گئی۔ ان میں ہندوستان کے ہر فرسے اور طبقے کے علماء شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی کی شخصیت کے پیش نظر ان کو جمعیتہ العلماء ہند کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس مغلہ کے سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ آپ جمعیتہ العلماء کے جلسوں میں شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے۔ ۱۹۲۰ء کے دہائی کے سالانہ جلسے میں علامہ عثمانی نے ترک ممالک پر اپنا زبردست اثر و اجلاس وقت چھپ چکا تھا۔ یہ جلسہ حضرت شیخ الہند مولانا محمد حسن صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا جو اسی زمانہ کی امارت سے آزاد ہر ہندوستان والوں پر ہوتے تھے۔ ملک میں خلافت کی تحریک زور پھیل رہی تھی اس لیے آپ نے اس میں حصہ لیا۔

شیخ الہند کے ہمراہ علامہ عثمانی اور دورہ ہند

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہندوستان کے تمام شہروں سے جلسوں میں شرکت کے لیے اہلارحمت دی جاتی تھی۔ ان تمام جلسوں میں حضرت مولانا علامہ عثمانی ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ دہلی، میرٹھ، ملو، امداد علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، غورنگ پور، جگت پور، علامہ کی شخصیت ناماندہ تقریریں فرماتے اور یہ شرف ان کے لیے اس قدر عزیز کی نایاب کاہر ہوا شرف تھا۔

ماسیہ کے افتتاح پر شیخ الہند ہند میں تھے۔ اسی عالم میں ملگرمیں شیخ۔ علامہ عثمانی نے ہی خط لکھا اور انھوں نے ہی خط لکھا۔

خلافت اور جمعیتہ العلماء کے جلسوں میں شرکت اور تقریریں نے علامہ کی شخصیت میں اور چار چاند لگا دیے۔ اس طرح مصروف جمعیتہ العلماء میں شریک رہنے والے مسلم لیگ کے نائب العین نے کانگریس سے علیحدہ اپنا زبردست مہم قائم کر لیا۔

علامہ عثمانی اور مسلم لیگ

حضرت مصروف کام رہا تھا۔ اسے ہی اس طرف تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کی نماندہ جماعت، اباد قاطن پر کانگریس سے علیحدہ اپنے حقوق کی لڑائی کرے اور ایسی جماعت مسلم لیگ ہی کہلاتی ہے۔ لہذا علامہ کانگریس میں اس وقت تک شرکت کرنے لگا نہیں فرماتے تھے جب تک کہ ان سے حقوق نہ ملتا۔ لیکن جمعیتہ العلماء پر کانگریس کے ساتھ متحد تھے۔ وہ آزادی ہند کی نظر مضبوط العین دیکھتی تھی کہ ہندوؤں کی دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو متحد کر کانگریسوں سے آزادی حاصل کر لینی چاہیے۔ دشمن کو گھر سے نکالنے کے بعد آپس میں حقوق کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جمعیۃ علماء کا یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان کو آزاد کرانے کے بعد اسلامی حکومتوں کو ہندوستان پر قبضہ دلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

لیگ اور کانگریس کا اختلاف

لیکن لیگ کے قائد شریعہ علی حیات نے کانگریس اور کانگریس کے حالات کے پیش نظر ۱۹۲۵ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو علیحدہ الیکشن لڑنے اور مسلمانوں کی نماندہ جماعت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ کی کوشش نے زور پکڑا اور اس طرح دونوں کا سخت مقابلہ شروع ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ نے نظریہ پاکستان پیش کر چکی تھی۔ علامہ عثمانی بھی لیگ میں شریک ہو گئے۔

حضرت عثمانی اور مسلم لیگ کو ترقی

ہندوستان میں علامہ کی دو جماعتیں بن گئیں جن میں سے بہت سے کانگریس میں شامل جمعیۃ علماء ہند دہلی قلعہ پر کانگریس کی موہی تھی۔ ان حالات میں جب کہ بڑے بڑے علماء کانگریس میں شامل تھے مسلم لیگ کو نہ ہی طور پر وقت کا سامنا ہوا لیکن ایسے نازک وقت میں کہی مشاوریہ رشتہ رعی کی نماندگی کی سخت ضرورت تھی حضرت مولانا اشرف علی صاحب ہمدانی سے ہی کانگریس کے مخالف تھے شیخ احمد صاحب ہی کانگریس سے نفی میں رہتے تھے۔ اس لیے آپ نے لیگ میں شرکت کا بد وقت اعلان فرمایا جس سے لیگ کو بہت تقویت پہنچی۔

جمعیتہ العلماء اسلام کی صدارت

۱۹۴۵ء میں جمعیتہ العلماء کے مقابلے میں کل جمعیتہ العلماء اسلام کی ہنس دڑی اور اس کا شاندار اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا۔ یہ اجلاس اپنی نوعیت کا نہایت شاندار اور تاریخی اجلاس تھا۔ شہزاد خرم خواں اس میں شامل ہوئے۔ علامہ عثمانی بیاری کی وجہ سے خود تشرفیت لے جاسکے۔ البتہ آپ نے اپنا ایک تجربی پاورچے میں چڑھا لیا۔ محض اس پیمانہ سے مسلمان پوزیشن ہوا۔ وہ بجلی کی طرح تمام مسلمان تپشیں پھیل گیا۔ اس بیان کو چھپا کر ہندوستان کے کطلی دھڑوں میں، ایلیس سے مسلمانوں میں کانگرس کے خلاف اور لیگ کے موافق پوزیشن پھیل گیا۔ علامہ کی شرکت نے مسلم لیگ کو بڑے حد تک تقویت پہنچائی اور کانگرس کو زبردست جمعیتہ سہماہندہ کی سخت نقصان پہنچا اور کانگرس مسلمانوں کی نظر میں اس کا دکھریلا سا نہ رہا۔

پڑھ کا نفرنس

پھر ریڈ میں لیگ کا نفرنس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت علامہ شہزاد صاحب نے کی۔ آپ نے اس میں ایک زبردست خطبہ صدارت پڑھا جس نے ملک کی کابینہ ہلک کر رکھی۔ اور آپ نے مسلم لیگ کو روٹ دے کر کامیاب بنانے کا فخری دیا جس کے ایک کو زبردست کامیابی ہوئی اور ریاست ملی ناں مرحوم بھی آپ کی کوششوں کے نتیجے میں الیکشن میں کامیاب ہوئے۔

بہ العلماء اسلام کا اجلاس لاہور میں

۱۹۴۷ء میں علامہ عثمانی کی صدارت میں جمعیتہ العلماء اسلام کا اجلاس لاہور اسلام آباد کے گراؤٹ میں ہوا۔ یہ اجلاس اس لیے زبردست اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں یونیٹوں کی وزارت قومی اور وزیر خرم خواہیت تھے علامہ عثمانی نے اس اجلاس میں ہمارا پاکستان کے نام سے ایک بسیط و طویل خطبہ صدارت پڑھا جسے مسلمان پنجاب کو صحیح راہ نظر آئی اور کانگرس مسلم لیگ کے حق میں ٹھٹھیں مارنے لگا۔

پاکستان کا دورہ

تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو تقویت پہنچانے کے لیے آپ نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور تقریریں کیں جس سے اب لیگ مسلمانوں کی واحد قائد جماعت مان لی گئی اور مسلمانوں کی اکثریت لیگ کے ساتھ ہر گئی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علامہ عثمانی لیگ میں شامل ہوئے تو مسلمانوں کو یہی حیثیت سے باور دلانا دشوار ہو جاتا کہ مسلم لیگ نہ صرف مسلمانوں کی جماعت ہے۔ بلکہ مذہبی حیثیت سے ان کی شرکت کا ضروری ہے۔

پھر حال علامہ عثمانی کی لیگ میں شرکت بہت ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

علامہ عثمانی نے قائد خرم سے تعاون کرنے کا براہ نام کیا۔ اس میں جو عمل کار فرمائے۔ ان میں سے سب سے بڑا یہ تھا کہ وہ لیگ میں اس نام پر شریک ہونے کو پاکستان بننے کے بعد وہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی

اس میں شرکت کی وجہ

ستور ساز اسمبلی میں مولانا عثمانی کی ممبری

مختار ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے لیے علامہ عثمانی بنگال سے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس لیے آپ کو دستور ساز اسمبلی کے دینے ممبر بھی تھے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پارلیمنٹ نے وہی ترمیمات طے ہو گئی کہ مسلم لیگ کی حمایت اور اتحاد کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے ان نمبروں میں یہاں ان کی جگہ ہندوستان کے انجمن خبروں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوستان میں شامل کر دیئے جائیں۔ اس فیصلے سے کانگرس اور لیگ

کی کلکتہ خیر ہوگی۔

علامہ عثمانی اور سرحد کا ریفرنڈم

ہیں بایک ان میں۔

اسی نظریے کے تحت کانگریس نے مطالبہ کیا کہ سرحد میں چونچو کانگریس کی وزارت ہے اور وہاں کے لوگ کانگریس کی شرکت کو پسند کرتے ہیں۔ لہذا ان سے اس معاملہ میں استعجاب کر لیا جائے کہ اگر وہ ہندوستان میں شامل ہوں

یہ سرحد پاکستان کے لیے بڑا زک تھا۔ اس مقصد کے لیے قائد اعظم کی نظر انتخاب علامہ عثمانی پر پڑی۔ آپ نے سرحد کا سخت گرمی میں دورہ کیا اور ان کے بڑے بڑے شہر میں تقریریں کر کے ان کو وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ پٹنہ پھر ریفرنڈم ہوا اور سرحد سرحد کی اکثریت نے پاکستان میں اپنی شمولیت کا اعلان دیا اور سرحد کی فتح کا یہ پہلا علامہ عثمانی کے سر نہ بھا۔

علامہ کی یوم آزادی پر کراچی میں آمد

۱۹۴۷ء ۱۲ اگست کو کراچی میں لارڈ مائونٹ بیٹن پنج زبہ تھے۔ تاکہ پاکستان کو آزاد کی حکم سن کر حکومت فدرالی مسلم لیگ کے سپر وڈر ہی بنائے۔ علامہ چونکہ دستر سزا آسلی کے ممبر تھے۔ اس لیے اس میں

سے آپ انٹیلی وائس نہ جاسکے اور جانا مناسب بھی نہ تھا۔ درہ شہید کر دیئے جاتے۔ جلال آپ نے پاکستان میں مستقل قیام کیا۔

مہاجروں کی آمد اور علامہ کی خدمت

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں ہندوستان سے مسلمانوں کا زبردست انخلاء شروع ہوا۔ اور اسی کے

طرح آپ حکومت اور قوم دونوں کے ہر دھڑ پر سر گئے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت چند نے کثیر ریفرنڈم کر لیا۔ پاکستان کے لیے پرنسپل نہایت ہی اداک صورت حال اختیار کر گیا۔ علامہ نے شرعی حیثیت سے مسئلہ شہیرا کثیر میں جہاد کا فتویٰ دیا۔ مہاجرین شہیر کے لیے امداد کی اپیل کی۔ اور ان کی طبی اور مالی اعانت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

قرار داد مقاصد

آپ مسلسل پاکستان اور ایل پاکستان کی رہنمائی فرماتے رہے۔ لیکن آپ کا سب سے بڑا فریضہ تھا۔ وہ پاکستان میں اسلامی قانون کو

ڈھاکہ میں جمعیت العلماء اسلام پاکستان کا جلسہ منعقد کر لیا اور اس جلسے میں ایک معنی خیز خطبہ صدارت دیا جس کے نتیجے میں سر شریعت علی نے قرار داد مقاصد کی پیش کی کہ پاکستان کا قانون اسلامی قانون ہوگا۔ علامہ نے اسلی میں اس ریزولوشن اور تجویز کی زبردست تائید کی۔ غرض یہ ہے کہ قرار داد مقاصد کا سہرا بھی علامہ عثمانی کے سر نہ بھا۔

وفات

دنیا میں کوئی راہ نہ رہ جاتے گا۔ علامہ عثمانی اس پیری میں کام کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس پر اسے دلی جاری کے سطل چنانچہ قدرت نے کہ جسے جو کام نہ تھا۔ اس کی تکمیل کے بعد آپ کو بیمار چ ۱۳ دسمبر ۱۹۴۸ء اپنے جوار رحمت میں بلایا۔ جب کہ آپ وزیر اعظم ہوادیر کی دعوت پر

کاسٹنگ سٹون پاد رکھنے کے لیے بہادر پور تشریف لے گئے تھے۔ اے اللہ! اے اللہ! واجب حق اللہ تعالیٰ حضرت علامہ عثمانی کی قربت اطہر پر ہزار ہزار رحمتوں کی بارش نازل فرمائے۔ امدان کو رحمت الغدوس میں صالحین و بارک کے ذریعے میں جگہ عنایت فرمائے کہ ایسے عالم لاکھوں میں کوئی کہ جیسے ہیں۔

علامہ عثمانی کے تفسیری نکات

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بڑی بات سے۔ نماز کا برائیوں سے روکنا دو معنی میں ہو سکتا ہے۔ ایک بطریق تسبیب یعنی نماز میں اللہ تعالیٰ نے خاصیت و تاثیر رکھی ہو کہ آدمی کو گناہوں اور برائیوں سے روک دے جیسے کسی دوا کا استعمال کرنا۔ بھار وغیرہ امراض کو روک دیتا ہے۔ اس صورت میں باد رکھنا یا بے گدوا کے لئے ضروری نہیں کہ اسی ایک ہی بیماری کو روکنے کے لئے کافی ہو جائے۔ بعض دوائیں خاص مقدار میں مدت التزام کے ساتھ کھائی جاتی ہیں۔ اس وقت ان کا فایدا یا اثر ظاہر ہوتا ہے بشرطیکہ مریض کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کرے جو اس کی خاصیت کے منافی ہو۔ پس نماز بھی بلاشبہ بڑی قوی التاثر دوا ہے جو روحانی بیماریوں کے روکنے میں اکسیر کا ککرکتی ہے ان ضرورت اس کی ہے کہ ٹھیک مقدار میں اس احتیاط اور بدرتہ کے ساتھ جو اطباء نے روحانی تہجد پر کیا جو خاصیت مدت تک مواظبت کی جائے۔ اس کے بعد مریض خود محسوس کرے گا کہ کس طرح اس کی پرانی بیماریاں اور برسوں تک کے روگ کو دور کرتی ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ نماز کا برائیوں سے روکنا بطور اقتضار کے جو یعنی نماز کی ہر ایک کیفیت اور اس کا ہر ایک ذکر مقتضی ہے کہ جو انسان ابھی درگاہ الہی میں اپنی بندگی فرمانبرداری خضوع و تذلل اور حق تعالیٰ کی ربوبیت الوہیت اور حکومت و شہنشاہی کا اظہار و اقرار کر کے آیا ہے۔ مسجد سے باہر آ کر بھی بدعہدی اور شرارت نہ کرے اور اس شہنشاہ مطلق کے احکام

سے منحرف نہ ہو۔ گویا نماز کی ہر ایک ادا مصیبت کو پانچ وقت تکمیل دیتی ہے کہ ادائیگی اور غلامی کا دعویٰ کرنے والے واقعی بندہ اور غلاموں کی طرح رہ اور بزبان حال مطالبہ کرتی ہے کہ بے حیائی اور مشرارت و سرکشی سے باز آ۔ اب کوئی یاد آئے یا نہ آئے نماز بلاشبہ اسے روکتی اور منع کرتی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ خود روکتا اور منع کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **إِنَّ اللَّهَ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِتِّقَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَنِيْهِ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ**۔ پس جو بد بخت اللہ تعالیٰ کے روکنے اور منع کرنے پر عمل سے نہیں کرتے، نماز کے روکنے پر بھی ان کا نہ رکنا محل تعجب نہیں۔ ہاں یہ واضح رہے کہ ہر نماز کار و کنا اور منع کرنا اسی درجہ ہو گا جہاں تک اس کے ادا کرنے میں خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ کیوں کہ از محض چند مرتبہ اٹھنے بیٹھنے کا نام نہیں۔ بڑی چیز اس میں خدا کی یاد ہے۔ نماز اگر کان صلوٰۃ ادا کرتے وقت قرات، قرآن یا دعا و تسبیح کی حالت میں جتنا حق تعالیٰ کی عطا جلال کو مستحضر اور زبان و دل کو موافق رکھے گا۔ اتنا ہی اس کا دل نماز کے منع کرنے کی آواز کو سنے گا۔ اور اسی قدر اس کی نماز پر کو چھڑانے میں موثر ثابت ہوگی۔ ورنہ جو نماز: "قلب لاجبی و غافل سے ادا ہو وہ نماز منافی کے مشابہ ٹھہرے گی جس کی نسبت میں فرمایا

(قرآن کریم، تفسیر عثمانی ص ۵۱۲ ف ۲)

تسبیح الرعد کی تفسیر

وَكَيْتُمُ الرِّعْدُ بِعَمْدٍ ۖ وَالْمَلِكَةُ مِثْقَلُ حَبِّ خَيْثُودَةٍ
اور گرجنے والا اس کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور سب فرشتے اس کے در سے (تسبیح تسبیح کرتے ہیں)۔
(تفسیر) یعنی گرجنے والا بادل یا فرشتہ زبان حال یا قال سے حق تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتا ہے۔۔۔ اور تمام فرشتے بیعت و خوف کے ساتھ اس کی حمد و ثناء اور تسبیح و تحمید میں مشغول رہتے ہیں (تسبیح) رعد و برق وغیرہ کے متعلق آواز کی کل تحقیق یہ ہے کہ بادلوں میں "قوت کبرانیہ موجبیہ" (برقی طاقت مثبتہ انگریزی (POSITIVE) پائی جاتی ہے اور زمین میں "کبرانیہ سالبیہ" (NEGATIVE) ہے جو بادل زمین سے زیادہ نزدیک ہو اس میں گاہ بگاہ زمین کی "سالبیہ کبرانیہ" سرایت کرتی جاتی ہے پھر بادل کے اوپر بسا اوقات وہ بادل گزرتے ہیں جہاں میں "کبرانیہ موجبیہ" موجود ہے اور یہ قاعدہ تجربہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف قسم کے کبرانیہ رکھنے والے دو جسم جب محاذی ہوں تو ہر ایک اپنے اندر دوسرے کی کبرانیہ کو جذب کرتا ہے تاکہ دونوں کی کبرانیہ متحد ہو جائے۔ اسی قاعدہ سے نیچے اوپر والے بادل جب ایک دوسرے کی قوت کبرانیہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تو دونوں کے ملنے سے شدید حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور اس حرارت شدیدہ سے دونوں بادلوں کے حجم کے مناسب ایک آتش شعلہ اٹھتا ہے جو صاعقہ کہلاتا ہے۔ اسی صاعقہ کی چمک اور روشنی برق کہلاتی ہے اور ہوا میں اس کے سرایت کرنے سے جو آواز نکلتی ہے وہ رعد ہے کبرانیہ کا یہی آتشیں شرارہ کبھی بادلوں اور ہواؤں کو چھڑک دیتا ہے جس کے نہایت عجیب افعال و آثار مشاہدہ کئے گئے ہیں۔ علاوہ اس کے کہ وہ مکانوں کو گرتا، پہاڑوں کو شق کرتا اور جانداروں کی موت کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ اس نے نہایت اہتیاط سے ایک آدمی کے بدن سے کپڑے اتار کر کسی دانت کی شاخ پر رکھ دئے ہیں مگر سینے والے کے جسم کو کچھ صدمہ نہ پہنچا (دائرۃ المعارف فہرست و جلدی) جسے دیکھ کر خال گزرتا ہے۔

جلی کے اس آتشیں شعلے میں کوئی ذی شعور اور ذی اختیار قوت بغیر مری طریقہ سے کام کر رہی ہے ہم کو ضرورت نہیں کہ اوپر بیان کئے ہوئے نظریہ کا انکار کریں لیکن یہ بیان کرنے والے خود اقرار کرتے ہیں کہ روح کی طرح کبریاۃ کی اصل حقیقت پر ابھی اس وقت تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ انبار کلام اور دوسرے ارباب کشف و شہود کا بیان یہ ہے کہ تمام نظام عالم میں ظاہری سبب کے علاوہ باطنی اسباب کا ایک عظیم الشان سلسلہ کار فرما ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھتے ہیں وہ صرف صورت ہے لیکن اس صورت میں جو بغیر مری حقیقت پوشیدہ ہے اس کے ادراک تک عام کی رسانی نہیں صرف باطنی آنکھ رکھنے والے اسے دیکھتے ہیں۔ آخر تم جو نظر ایت بیان کرتے ہو (مثلاً یہی قوت کبریاۃ کا موجب سالیہ ہوا وغیرہ) اس کا کل بھی چند شکلاطے طبعین کے سوا بلا واسطہ کس کو ہوتا ہے۔ کم از کم اتنا ہی و ثلوث انبیاء کے مشاہدات و تجربات پر کر لیا جائے تو بہت سے اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ احادیث سے یہ پتا ہے کہ دوسرے نوافیس طبعیہ کی طرح بادلوں اور بارشوں کے انتظامات پر بھی فرشتوں کی جماعتیں قیادت ہیں جو بادلوں کو مناسب مواقع پر پہنچاتے اور ان سے حسب ضرورت فصلت کام لینے کی تدبیر کرتی ہیں اگر کتاب سے بیان کے موافق بادل اور زمین وغیرہ کی کبریاۃ کا مدبر کوئی غیر مری فرشتہ ہو تو انکار کی کون سی وجہ ہے جس کو تم تیارہ کبریاۃ کہتے ہو۔ چونکہ وہ فرشتے کے خاص فرشتے سے پیدا ہوتا ہے۔ لہذا اسے وحی کی زبان میں "مخاریق من رب" (فرشتہ کا آتشیں کوڑا) کہہ دیا گیا تو کیا قیامت ہو گئی اس کی شدت اور سخت اشتعال سے جو گرج اور ٹرک پیدا ہوئی اگر حقیقت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے فرشتہ کی ڈانٹ سے تعبیر فرمایا تو یہ نہایت ہی موزوں تعبیر ہے۔ بہر حال "سائنس" نے جس چیز کی محض صورت کو سمجھا وحی نے اس کی روح اور حقیقت پر مطلع کر دیا کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ دونوں کو ایک دوسرے کا سرلیٹ یا مقابل قرار دے لیا جائے۔ علامہ محمود الوسی نے بقرہ کے شروع میں اس پر معقول بحث کی ہے۔

(بحوالہ مذکورہ پارہ ۷۷ - رکوع ۷۷)

عدل، احسان، ایثار، ذی القربی

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔

اور حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قربات والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے بے نیائی اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

(تفسیر) اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لئے تو ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ تاہم مقصود اس اندازہ یوں کیا رہا کہ اس کتاب سے کیا تم میں چیزوں کا مزہ لیا ہے (یعنی عدل، احسان اور ایثار ذی القربی (رشتہ داروں کے ساتھ سلوک) عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کے ترازو میں ٹکے ہوئے ہوں۔ افراد و افراد سے کوئی جھگڑنا یا جھگڑنے نہ پائے۔ سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن اٹھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو جو بات اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور لطافت و نرمی کی خواہش کرے۔ دشمن ادا کرنے کے بعد تلوار و ترس کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ اور ہر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا۔ اَلْإِحْسَانُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ

فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَدَاكَ — (صحیح بخاری) "هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ" —
 از حسن رکوع نکد) یہ دونوں خصالتیں یعنی عدل و احسان یا بالفاظ دیگر انصاف و مروت تو اپنے نفس اور ہر ایک ہر
 بیگانہ اور دوست دشمن سے متعلق تھیں۔ لیکن اقارب کا حق اہجاب سے کچھ زائد ہے۔ جو تعلقات قربت قدرت
 باہم رکھ دیتے ہیں۔ انہیں نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ اقارب کی ہمدردی اور ان کے ساتھ مروت و احسان اہجاب کے
 بڑھ چڑھ کر ہونا چاہئے۔ صلہ رحم ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب و ذوی الارحام کے لئے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہئے
 گویا احسان کے بعد ذوی القربی (رشتہ داروں) کا بالخصوص ذکر کر کے متنبہ فرمادیا کہ عدل و انصاف تو سب کے لئے
 ہے۔ لیکن مروت و احسان کے وقت بعض مواقع بعض سے زیادہ رعایت و اہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو نظر
 کرنا ایک طرح مروت کے قائم کئے ہوئے قوانین کو بھلا دینا ہے اب ان تینوں نقطوں کی ہمگیری کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھ و ارادہ سے
 کر سکتا ہے کہ وہ کون سی فطری خوبی، بھلائی اور نیکی دیا میں ایسی رہ گئی ہے جو ان تین فطری اصولوں کے اساطیر سے باہر ہو۔ اور
 بھی تین چیزوں سے فرمایا (یعنی) فحشاء، منکر اور بخی سے کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے
 برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں (وہ تین قوتیں) قوت بہیمہ شہوانیہ، قوت وہمیشہ شہوانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ ہیں۔
 "فحشاء" سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشأ شہوت و بہیمیت کی افراط ہو۔ "منکر" معروف کی ضد ہے یعنی
 کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ گویا قوت وہمیشہ شیطانیہ کے غلبہ سے قوت غضبیہ ملکیہ دب جائے۔
 "بخی" ہے یعنی سرکشی کی حد سے نکل جانا ظلم و تعدی پر کرب۔ ہو کر دزدوں کی طرح کھانے پھانٹنے کو دیکھنا اور دوسروں
 جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے ہر
 سے پیدا ہوتی ہیں۔ احصا اصل آیت میں تنبیہ فرمادی کہ انسان جب تک ان تینوں باتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت
 کو ان سب پر حاکم نہ بنائے مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا۔ (بحوالہ مذکورہ ص ۳۵۸۔ ص ۳۵۹ فٹ نوٹ)

مفسر اور تاریخ و جغرافیہ

الْكَهَّابُ غُلِبَتِ الرُّومُ ۚ إِنِّي أَخَذْتُ الْأَرْضَ وَ
 هُمْ مِّنْ بَعْدِهِمْ سَيَغْلِبُونَ
 مغلوب ہو گئے رومی جیتنے ہوئے ملک میں اور وہ اس
 مغلوب ہونے کے بعد عقرب غالب ہوں گے۔
 (تفسیر) "ادنی الارض" جیتنے ہوئے ملک یا پاس والے ملک سے مراد افریقا و مصر کے درمیان کا خطہ ہے جو
 سرحد پر حجاز سے ملتا ہوا ملک کے قریب واقع ہوا ہے یا فلسطین مراد یہ جو رومیوں کے ملک سے نزدیک تھا یہاں
 عمر بن العاص سے اقرب ہے۔ ابن حجر نے پہلے قول کی تصحیح کی ہے۔ (۷) یعنی فوسل کے اندر اندر رومی غالب نہ ہو جائے
 کیوں کہ لغت میں اور حدیث میں بعض کا اطلاق تین سے نو تک پر ہوا ہے۔ ان آیات میں قرآن نے ایک عجیب و غریب
 پیشین گوئی کی ہے جو اس کی صداقت کی عظیم الشان دلیل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی بڑی بھاری سلطنتیں فارس و ایران
 کی تھیں

کہتے ہیں اور روم مدت دراز سے آپس میں ٹکراتی چلی آتی تھیں۔ ۶۱۳ء سے لے کر ۶۱۴ء کے بعد تک ان کے حریفانہ نزو آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی تصریحات سے ظاہر ہے۔ ۶۱۵ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۵ء میں آپ کی بعثت ہوئی۔ مکہ والوں میں جنگ روم و فارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران میں نبی کریم صلعم کے دعوتِ نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کے لئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی۔ آخر ۶۱۳ء کے بعد جب کہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً پینتالیس سال اور بعثت کے پانچ سال گزر چکے خسرو پر دیز (کھسرو ثانی) کے عہد میں فارس نے روم کو ایک مہلک اور فیصلہ کن شکست دی۔ شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب ممالک رومیوں کے ماتحت سے نکل گئے۔ الخ (قرآن کریم تفسیر عثمانی ص ۵۲۳ ص ۶۰)۔

ضال کی حقیقت

وَدَّجَدَكَ ضَالًا فَهَدَىٰ ص وَدَّجَدَكَ
عَاثِلًا فَاعْتَلَىٰ ط
اور پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ بٹھائی اور پایا تجھ
کو مٹسی میں پھر بے پردا کر دیا۔

(تفسیر) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی آپ کے والد وفات پا چکے تھے۔ چھ سال کی عمر ہی کہ والدہ نے رحلت کی۔ پھر آٹھ سال کی عمر تک اپنے دادا عبدالطلب کی کفالت میں رہے۔ آخر اس دورِ یتیم اور نادارہ روزگار کی ظاہری تربیت و پرورش آپ کے بے حد شفیق چچا ابوطالب کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے زندگی بھر آپ کی نصرت و حمایت اور کریم و شہید میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا۔ ہجرت سے کچھ پہلے وہ بھی دنیا سے رخصت ہوئے چند روز بعد یہ امانت الہی، اللہ کے حکم سے انوارِ مدینہ کے گھر پہنچ گئی۔ اوس اور خزرج کی قیمت کا ستارہ چمک اٹھا اور انہوں نے اس کی حفاظت اس طرح کی جس کی نظیر چشمِ نلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ جب حضرت جوہان ہوئے تو قوم کے مشرکانہ اطوار اور بیہودہ رسمِ راہ سے سخت بیزار تھے۔ اور قلب میں خدائے واحد کی عبادت کا جذبہ بڑھنے لگا اور ان کے ساتھ موجزن تھا عشقِ الہی کی آگ سیہ نہ مبارک میں بڑی تیزی سے بھڑک رہی تھی۔ وصول الی اللہ (اللہ تک پہنچنے) اور ہدایتِ خلق کی اس اہم ترین استعداد کا چشمہ جو تمام عالم سے بڑھ کر نفسِ قدسی میں دو بعیت کیا گیا تھا۔ اندر ہی اندر جوش مارتا تھا۔ لیکن کوئی صاف کھلا جوا راستہ اور مفصل راستہ اور مفصل دستور العمل بظاہر دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے اس عرشِ دلکشی سے زیادہ وسیع قلب کو تسکین ہوتی۔ اس جوشِ طلب اور فرطِ محبت میں آپ بے قرار اور سرگرداں پھرتے اور غاروں اور پہاڑوں میں جا کر بالک کو یاد کرتے اور محبوبِ حقیقی کو پکارتے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے غارِ حرا میں فرشتہ کو وحی دے کر بھیجا۔ اور وصول الی اللہ اور اصلاحِ خلق کی تفصیلی راہیں آپ پر کھول دیں یعنی دینِ حق نازل فرمایا۔ وما آتت الذی ما الکتاب ولا

لے اور آپ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب اور ایمان کیا ہیں۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنادیا جس کے ذریعے اپنے بندوں میں سے ہم جس کو چاہیں ہدایت دیں۔

الایمان ولكن جعلناه نورا نهدي به من نشاء من عبادنا — (شوریٰ رکوع ۵۷)
 ضلک کے معنی کرتے وقت سورہ یوسف کی آیت قالولانالله انک لغی ضلک القییم کو پیش نظر رکھنا
 (تفسیر عثمانی، سورہ النجم)

علامہ کا صرف و نحو میں درک

وَلَا أَنْتُمْ عَبْدُونَ مَا أَعْبُدُ بِهِ
 اور نہ تم کو پوجنا ہے اس کا جس کو میں پوجوں۔

(تفسیر) یعنی آئندہ بھی میں تمہارے معبودوں کو کبھی پوجنے والا نہیں اور نہ تم میرے معبودہ احد کی بلا شرکت غیر سے پرستش کرو۔ مطلب یہ ہے کہ میں معبود ہو کر شرک نہیں کر سکتا۔ نہ اب آئندہ اور نہ تم مشرک رہ کر معبود نہیں قرار دیئے گئے۔ نہ اب اس تقریر کے موافق آیتوں میں تکرار نہیں رہا۔ (تنبیہ) بعض علماء نے یہاں تکرار کو تاکید پر عمل کیا ہے اور بعض نے پہلے میں حال اور استقبال کی نفی اور اخیر کے وجہوں میں ماضی کی نفی مراد لی ہے (کما صرح بہ المفسرین) اور بعض نے پہلے میں حال کا اور اخیر کے وجہوں میں استقبال کا ارادہ کیا ہے۔ کما یظهر من الترجمہ۔ لیکن بعض محققین نے پہلے دو جملوں میں ہوا صولہ اور دوسرے دونوں جملوں میں ما کو مصدر یہ لیکر یوں تقریر کی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان نہ معبود ہیں نہ ہے نہ طریق عبادت میں۔ تم تمہارے پوجتے ہو وہ میرے معبود نہیں۔ میں اس خدا کو پوجتا ہوں جس کی شان و صفت میں شک نہ ہو سکے۔ ایسا خدا تمہارا معبود نہیں۔ علی ہذا القیاس تم جس طرح عبادت کرتے ہو مثلاً گئے ہو کر کعبہ کے گرد ناچتے یا اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگے ہیں اس طرح عبادت کرنے والا نہیں اور میں جس شان سے اللہ کی عبادت بجا کرتا ہوں تم کو اس کی توفیق نہیں ہذا میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہے۔

اور احقر کے خیال میں یوں آتا ہے کہ پہلے جملے کو حال اور استقبال کی نفی کے لئے رکھا جائے یعنی میں اب یا آئندہ تمہارے معبودوں کی پرستش نہیں کر سکتا جیسا کہ تم مجھ سے چاہتے ہو۔ اور دلا انا عابد ما عبدتھم کا مطلب (بقول حافظ ابن تیمیہ) نے یہ لیا کہ (جب میں خدا کا رسول ہوں تو) میری شان یہ نہیں اور نہ کسی وقت ممکن ہے (بامکان شرعی مشرک کا ارتکاب کروں حتیٰ کہ گذشتہ زمانے میں نزول وحی سے پہلے بھی جب تم سب پتھروں اور درختوں کو پوچ رہے تھے کہ کسی غیر اللہ کی پرستش نہیں کی۔ پھر اب اللہ کی طرف سے نور وحی اور بیانات و ہدئی وغیرہ آنے کے بعد کہاں ممکن ہے کہ مشرکیت میں تمہارا ہم نوا ہو جاؤں۔ شاید اسی لئے یہاں دلا انا عابد میں جملہ اسمیہ اور ما عبدتھم میں صیغہ ماضی کا عنوان اختیار فرمایا۔ رہا کفار کا حال اس کا بیان دونوں مرتبہ ایک ہی عنوان سے فرمایا۔ دلا انتم عابدون ما عبد یعنی تم لوگ تو اپنی شوجر استعداد اور انتہائی بدبختی سے اس لائق نہیں کہ کسی وقت اور کسی حال میں خدائے واحد کی بلا شک و شبہ پرستش کرنے والے بنو۔ حتیٰ کہ عین گفتگو سے صلح کے وقت بھی مشرک کا دم چھٹا ساتھ لگائے رکھتے ہو۔ ایک لمحہ خدا کی قسم تو تو اپنی بڑائی غلطی میں مبتلا ہے۔

بلکہ ماعتبدون بصیغہ مضارع اور دوسری جگہ ماعتلم بصیغہ ماضی لانے میں شاید اس طرف اشارہ ہو کہ ان سے عبود ہر روز بدلتے رہتے ہیں جو چیز عجیب سی نظر آئی یا کوئی خوب صورت سا پتھر نظر پڑا اس کو اٹھا کر معبود بنا لیا اور پہلے کو زخمت کیا۔ پھر ہر موسم کا اور ہر کام کا جدا معبود ہے۔ ایک سفر کا ایک حضرت کا، کوئی ردی دینے والا کوئی اولاد دینے والا و قس علی ہذا۔

(قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۷۱۹ سورہ کافرون ص ۷۱۹)

طبی تحقیق شہد

فَسَيُجَنَّبُكَ الَّذِينَ لِلَّهِ (شہد) میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

(تفسیر) یعنی بہت سی بیماریوں میں صرف شہد خاص یا کسی دوسری دوا میں شامل کر کے دیا جاتا ہے جو باذن اللہ بعضوں کے لئے شفا یابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ ایک شخص کو دست آرہے تھے۔ اس کا بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شہد پلانے کی رائے دی۔ شہد پلانے کے بعد اسہال میں ترقی ہو گئی۔ اس نے پھر حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت زیادہ آگے لگے۔ فرمایا "صدق اللہ و کذب لطن ائیک" (اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے) پھر پلاؤ۔ دوبارہ پلانے سے بھی وہی کیفیت ہوئی۔ تو آپ نے پھر وہی فرمایا۔ آخر تیسری مرتبہ پلانے سے دست بند ہو گئے۔ طبیعت صاف ہو گئی۔ اطباء نے اپنے اصول کے موافق کہا ہے کہ بعض اوقات پیٹ میں کیوس فاسد ہوتا ہے جو پیٹ میں پہنچنے والی ہر ایک غذا اور دوا کو فاسد کر دیتا ہے اس لئے دست آگے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے مسہلات دی جائیں تا وہ "کیوس فاسد" خارج ہو۔ شہد کے سہل ہونے میں کسی کو کام نہیں گویا حضور کا مشورہ اس طبی اصول کے موافق تھا۔

ماموں رشید کے زمانہ میں ثمامہ عیسیٰ کو جب اس قسم کا مرض لاحق ہوا تو اس زمانے کے شاہی طبیب یزید بن یزید نے مسہل سے اس کا علاج کیا اور سری و جبر تلاء۔ آج کل کے اطباء شہد کے استعمال کو استطلاق لطن کے علاج میں بے حد عقیدہ تلاء تھے ہیں۔

(قرآن کریم بتفسیر عثمانی ص ۷۱۹ - فائدہ ص ۷۱۹)

بشارت احمد صلی اللہ علیہ وسلم

(تفسیر) یوں تو دوسرے انبیاء نے سابقین بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مژدہ برابر سناتے آئے ہیں لیکن جس صراحت سے وضاحت اور اہتمام کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام نے آپ کی آمد کی خوش خبری دی وہ کسی اور سے منقول نہیں۔ شاید قرب عہد کی بنا پر خصوصیت ان کے حصے میں آئی ہوگی۔ کیوں کہ ان کے بعد نبی آخر الزماں کے سوا کوئی دوسرا نبی آنے والا نہ تھا۔ یہ صحیح ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مجرمانہ غفلت اور مستعدانہ دستبرد نے آج دنیا کے انھوں میں اصل نورانات و انجیل کا کوئی صحیح نسخہ باقی نہیں چھوڑا جس سے ہم کو تھیک پتہ لگ سکتا کہ

انبیائے سابقین خصوصاً حضرت مسیح علیہ السلام نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبت کن الفاظ میں اور کس عنوان سے بشارت دی تھی اور اسی لئے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن کریم کے صاف اور صریح بیان کی اس تحلیل شدہ بابت میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے جھٹلانے لگے۔ تاہم یہ بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ سمجھنا چاہئے کہ حق تعالیٰ نے محرفین کو اس قدر قدرت نہیں دی کہ وہ اس کے آخری پیغمبر کے متعلق تمام پیشین گوئیوں کو بالکل محو کر دیں کہ ان کا کچھ نشان باقی نہ رہے۔ موجودہ بابتیں میں بھی بیسیوں مواضع میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قریب تصحیح کے موجود اور عقل و انصاف والوں کے لئے اس میں تاویل والٹاکار کی گنجائش قطعاً نہیں اور انجیل یوحنا میں تو فار قلیط یا پیر کلوطس اور بشارت اتنی صاف ہے کہ اس کا بے تکلف مطلب بجز احمد (یعنی محمود و ستودہ) کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ بعض علماء اہل کتاب کو بھی ناگزیر اس کا اعتراف یا نیم اقرار کرنا پڑا ہے کہ اس پیشین گوئی کا انطباق پوری طرح روح پر اور نہ بجز سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور پر ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی پارہ ۲۸، سورہ صفت، رکوع ۵۸)

مولانا کی وقت نظر ما کان یُنْزِلُ یُؤْتِیْہُ اللّٰہُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَ وَالنَّبُوۃَ ثُمَّ یَقُوْلُ لِلنَّاسِ کُونُوْا عِبَادًا لِیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔

نسی بتر کایہ کام نہیں کہ خدا اسے کتاب اور حکمت و نبوت بخشے وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بند بن جاؤ۔ (آل عمران پارہ ۳، رکوع ۱۶)

(تفسیر) وفدِ بخران کی موجودگی میں بعض یہود و نصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمد! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری اس طرح کرنے لگیں جیسے نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کو پوجتے ہیں۔ آپ نے فرمایا معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کی بندگی نہیں کیا اور رسول کو خود عزت و حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت عطا کرے اور پیغمبری کے منصب علیہ پناز کرے اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خواص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنائے لگے۔ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا ہے فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔

و دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدہ پر مامور کرتی ہے تو پہلے وہ باتیں سوچ لیتی ہے۔ (۱) یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی دیانت رکھتا ہے یا نہیں۔ (۲) گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ و فساداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جاسکتی ہے۔ بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت بنائے یا اس کی پالیسی اور احکام سے اخلاف کرنے کا شبہ ہو۔ بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری یا وفادار کا اندازہ صحیح طور پر نہ ہو لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں۔ (قرآن کریم تفسیر عثمانی ص ۵۸، فائدہ ۵۸) قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُکْمُ الْبَاقِیۃُ ثُمَّ فَلَیْشَءَ لَہُمْ اَجَیْبُ

(تفسیر) گذشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال و طیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرایا ہے اور اس میں خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس کی سند اور دلیل لاؤ۔ یہاں ان کی دلیل بیان کی گئی ہے جو وہ پیش کرنے والے تھے۔

اللہ چاہتا تو اس کی قدرت، مہمتی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس حرم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال و اقوال سے روک دیتا۔

بے زور دکا اور یونہی ہوتا چلا آیا تو ثابت ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری کاروائیاں پسندیدہ ہیں یا پسند ہوئیں تو ان کرنے میں ہم کو اب تک کہوں آزاد چھوڑتا۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام اور مدبر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے والے کو باوجود یقینی نفع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دے دیتی وہ اس کی حرکات کی نگہبانی رکھتی ہے کبھی یہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود بھل جائے کبھی نوح سے یالوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے اس کی انتہائی مجرمانہ عذاری قانونی حیثیت سے علیٰ ررس الا شہاد ثابت کی جاسکے۔ ان تمام صورتوں میں مجرم باگ ڈھیل چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا یہ ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کاروائی جرم و بغاوت میں ہے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا اول تو اس کے شائع کئے ہوئے قانون سے ظاہر ہے۔

دوسرے جب یہ مجرم مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ اور باضابطہ اثبات و اظہار جرم کے بعد پھانسی یا جس دوام کی سزا بھگتے گا۔ تب برائے العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں کیا بڑا جرم تھا۔ بہر حال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم و قدرت رکھنے کے کسی مصلحت سے فوری سزا دینے نہ کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ جرم کو جرم نہیں سمجھتی اس پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین استدائے فریض سے آج تک توسط اپنے صادق القول اور پاک باز نائبین کے ہر قسم کے قوانین و احکام سے بندوں کو مطلع فرماتا رہا ہے۔

فرقہ قادیانیت اور ختم نبوت

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْوَحْيِ لَكُمْ دِينًا فَانْتَظِرُوا يَوْمَ تَأْتِي السَّحَابُ مِنْ غُيُوبٍ وَأَمَّا الْوَحْيُ فَانْتَظِرُوا يَوْمَ تَأْتِي السَّحَابُ مِنْ غُيُوبٍ
(تفسیر) یعنی جب خدا کا دین اپنی مکمل صورت میں آپہنچا تو کوئی چھوڑنا یا مکمل دین قبول نہیں کیا جاسکتا۔
طالع آفتاب کے بعد مٹی کے چراغ جلانا یا گیس بجلی اور ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے۔
عقلمندیوں اور بدایتوں کا عہد گزر چکا ہے۔ اب سب سے بڑی آخری اور عالم گیر نبوت و ہدایت سے ہی روشنی حاصل کرنی چاہئے کہ یہ ہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیوں کا دم ہو چکا ہے۔ (ص ۱۷۱ غزنوی)

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَآمَةَ آيَةً وَأَوْنَمَّا إِلَىٰ
رَبِّكَ ذَاتَ ثَرَارٍ ذَمَّ حِينَئِذٍ -
(تفسیر) شاید یہ وہی ٹیلا یا اونچی زمین ہو جہاں وضعِ حل کے وقت حضرت مریم و آئشہ زین رکھتی تھیں..... دیکھو

اور بنایا ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک نشانی اور ان کو ٹیلا یا ایک ٹیلہ پر جہاں شہر نے کا موقع تھا اور پانی تھا۔

بلند تھی۔ نیچے چشمہ یا نہر جاری تھی اور کچھ کار درخت نزدیک تھا (ابن کثیر) لیکن عموماً مفسرین لکھتے ہیں کہ مسیح کے بچپن کا واقعہ ہے۔ ایک ظالم بادشاہ ہیردوس نامی نجومیوں سے سُن کر کہ عیسیٰ علیہ السلام کو سوار کر لگی، لہٰذا کچن ہی میں ان کا دشمن ہو گیا تھا اور قتل کے درپے تھا۔ حضرت مریمؑ الہام ربانی سے اُن کے مصلحتی گتیں اس ظالم کے مرنے کے بعد پھر شام واپس چلی آئیں۔ چنانچہ انجیل متی میں بھی یہ واقعہ موجود ہے۔ اور مصر کا اور بچا اعتبار روویل کے بے درنہ غرق ہو جاتا اور مامعین روویل ہے۔ بعض نے "ربوہ" اونچی جگہ سے مراد شام یا فلسطین لیا۔ اور کچھ بعید نہیں کہ جس ٹیلے پر ولادت کے وقت موجود تھیں۔ وہیں اس خطہ کے وقت بھی پناہ دی گئی ہو۔ بہر حال اسلام میں سے کسی نے ربوہ سے مراد کشمیر نہیں لیا۔ اور نہ حضرت مسیحؑ کی قبر کشمیر میں بتلائی۔ البتہ ہمارے زمانے کے بعض نے "ربوہ" سے مراد کشمیر لیا ہے اور وہیں عیسیٰؑ شہید اسلام کی قبر بتلائی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت تاریخی نہیں۔ "محلہ خاں" شہر منبری نگر میں جو قبر "یوزاسف" کے نام سے مشہور ہے اور جس کی بابت تاریخِ عظمیٰ کے مصنف نے محض عام افواہ نقل کی ہے کہ لوگ اس کو کسی نبی کی قبر بتاتے ہیں وہ کوئی شہزادہ تھا اور دوسرے ملک سے یہاں آیا ہے اس کو علیہ السلام کی قبر بتانا پیرے درجہ کی سبقت اور بے حیائی ہے۔

(قرآن حکیم۔ سورہ المؤمنون۔ رکوع ۷)

سینے ہجرت سے پیشتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ کفار کا مجمع تھا۔ انہوں نے آپ سے
 کی تشافی طلب کی آپ نے فرمایا کہ آسمان کی طرف دیکھو۔ ناگاہ چاند پھٹ کر دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا ان میں
 مہ مغربہ کی اور دوسرا مشرق کی طرف چلا گیا۔ بیچ میں پہاڑ چل رہا تھا۔ کفار کہنے لگے کہ محمدؐ نے چاند پر یا ہم پر جادو
 دیا ہے۔ اس معجزہ کو شقی القہر کہتے ہیں۔ اور یہ ایک نمونہ اور نشانی تھی قیامت کی کہ آگے سب کچھ یوں ہی پھٹے گا۔
 دوسری اور ارباب کثیر وغیرہ نے اس واقعہ کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے اور کسی دلیل عقلی سے آج تک اس طرح کے واقعات
 محال ہونا ثابت نہیں کیا جاسکا۔ اور محض استبعاد کی بنا پر ایسی قطعی الثبوت چیزوں کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ
 بعد از ان عجائز کے لئے لازم ہے۔ روزمرہ کے معمولی واقعات کو معجزہ کون کہے گا۔۔۔ باقی یہ کہنا کہ شق القمر اگر واقع ہوا
 تو تاریخوں میں اس کا وجود کیوں نہیں۔ تو یاد رہے کہ یہ قصہ رات کا ہے بعض ملکوں میں تو اختلاف مطالع
 پر سے اس وقت دن ہوگا اور بعض جگہ آدھی رات ہوگی۔ لوگ عموماً سوئے ہوں گے۔ اور جہاں بیدار ہوں گے اور کھلے
 مان کے نیچے بیٹھے ہوں گے تو عادیہ یہ ضروری نہیں کہ سب آسمان کی طرف تنگ رہے ہوں۔ زمین پر جو چاندنی پھیلی
 لی۔ بشرطیکہ مطلع صاف ہو۔ اس میں دو ٹکڑے ہو جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر کھڑی دیر کا قصہ تھا ہم دیکھتے
 کہ بار بار چاند گہن ہوتا ہے اور خاصہ مستند رہتا ہے لیکن لاکھوں انسانوں کو خبر بھی نہیں ہوتی اور اس زمانہ میں آج کل
 روح رصد وغیرہ کے اتنے وسیع و مکمل انتظامات اور تقاویم (جستہ یوں) کی اس قدر اشاعت بھی نہ تھی۔ بہر حال تاریخوں
 مذکورہ ہونے سے اس کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔ بایں ہمد "تاریخ فرشتہ" وغیرہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ہندوستان
 ہمارا راجہ نامی بار کے اسلام کا سبب اسی واقعہ کو لکھتے ہیں۔ (القمر پارہ ۳۱، ص ۷۷)

بیت پرستوں، عیسائیوں، شیعوں، برہمنوں، پیر پرستوں اور قبر پرستوں کی فہمائش
 وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ الْإِلَٰهَ وَهَهُ
 اور نہیں ایمان لانے بہت لوگ اللہ پر مگر سمجھتی
 مشرک بھی کرتے ہیں۔

تفسیر یعنی زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدا کی کا حد و دار بناتا ہے کوئی اس کے
 لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتا ہے، کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بناتا ہے۔ کسی نے احبار و رہبان کو خدا کی کے اختیارات دے دیے
 ہیں۔ بہت سے تعزیر پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو ملبہ کر رہے ہیں۔ بیا اور ہوا
 پرستی کتنے موجدین ہیں جو پاک ہوں گے۔ غرض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے بہت کم ہیں جو عقیدہ یا عمل کے درجہ میں شرک چل
 جاتی کا در تکاب نہیں کرتے۔ (قرآن کریم ص ۳۲، سورہ یوسف، تفسیر عثمانی، پارہ ۳، ص ۷۷)

سلیمان علیہ السلام اور منطق الطیر

ذَكَرْتُ سُلَيْمَانَ دَاوُدَ وَقَالَ يَا أَيُّهَا
 اور قائم مقام ہوا سلیمان داؤد آد بول

گو! ہم کو رکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی اور دیا
ہم کو ہر چیز میں سے بے شک یہی ہے فضیلت
حریج -

النَّاسُ عَلَيْهَا مَبْعُوثٌ لِّمَنْعَةٍ وَادْبَاسٍ
مِّنْ كُلِّ شَيْءٍ طَٰنٌ هٰذَا لَٰكُمُ الْفَضْلُ
الْكَبِيرُ -

(تفسیر) اس بات کا انکار کرنا بجاہت کا انکار ہو گا کہ پرندے جو بولیاں بولتے ہیں ان میں ایک خاص حد
افہام و تفہیم کی شان پائی جاتی ہے۔ ایک پرند جس وقت اپنے جڑ سے کوٹلاتا یا دانہ دینے کے لئے اپنے جڑ
آواز دیتا یا کسی چیز سے خوف کھا کر خبردار کرتا ہے۔ ان تمام حالات میں اس کی بولی اور لب و لہجہ یکساں نہیں
چنانچہ اس کے مخاطبین اس فرق کو بخوبی محسوس کرتے ہیں۔ اسی سے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے احوال اور ضرورت
کے وقت بھی انکے چہچہوں میں (گو ہمیں کتنے ہی متشابه و متقارب معلوم ہوں) ایسا لطیف و خفیف تفاوت
ہے وہ آپس میں سمجھ لیتے ہوں گے۔ تم کسی پوسٹ آفس میں چلے جاؤ اور تار کی متشابه کھٹ کھٹ گھنٹوں
رہو تمہارے نزدیک محض بے معنی حرکات و اصوات سے زیادہ وقعت نہ ہوگی۔ لیکن ٹیلیگراف ماسٹر فوراً
گا کہ فلاں جگہ سے فلاں آدمی یہ مضمون کہہ رہا ہے یا فلاں لیکچر کی تقریر انتہی تاروں کی کھٹ کھٹا ہٹ میں صبا
دے رہی ہے کیونکہ وہ ان فقرات تلفرازیہ کی دلالت و ضمیمہ سے پوری طرح واقف ہے۔ علیٰ ہذا القیاس کیا
کہ واضح حقیقی (اللہ) نے لغات طیور کو بھی مختلف معانی و مطالب کے اظہار کے لئے وضع کیا ہوا اور جس طر
کا بچہ اپنے ماں باپ کی زبان سے آہستہ آہستہ واقف ہوتا رہتا ہے۔ طیور کے بچے بھی اپنی فطری استعداد
اپنے بنی نوع کی بولیوں کو سمجھنے لگتے ہوں اور بطور ایک پیغمبرانہ اعجاز کے کسی نئی کو بھی ان کا علم عطا فرما
حیوانات کے لئے جنہی ادراکات کا حصول تو پہلے سے مسلم چلا آ رہا ہے۔ لیکن یورپ کی جدید تحقیقات اب وہاں
کی عافیت کو آدمیت کی سرحد کے قریب کرتی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ حیوانات کی بولیوں کی ایجاد تیار کی جا رہی ہے۔
یاد رہے کہ ہم اسرائیلی خرافات کی تائید نہیں کر رہے، ہاں جس حد تک اکابر سلف نے بلا اختلاف کلام اللہ
بیان کیا ہے اس کو ضرور تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ اسرائیلی روایات کے موافق پڑ جائیں یا مخالف۔ (تفسیر عثمانی رضی اللہ عنہ)

چوٹی اور سلیمان علیہ السلام

حَتَّىٰ إِذَا أَذَّ عَلَىٰ وَادٍ الْخَلِّ قَالَتْ قَمَلَهُ
سَمِعُوا السَّمْلَ إِذْ دَخَلُوا مَسْكَنَهُمْ
يُخَصِّمُهُمْ سَمْلُهُمْ وَبَنُوهُمْ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ
(تفسیر) یعنی سلیمان علیہ السلام کا اپنے لادشکر کے ساتھ ایسے میدان کی طرف گزر ہوا جہاں چوٹیوں
بھاری بستی تھی (تنبیہ) جہاں چوٹیوں کی طرف سے اپنا گھر بناتی ہیں اسے زبان عرب میں قر
ہیں۔ (چوٹیوں کی بستی)۔ مفسرین نے مختلف بلاد میں کئی ایسی بستیوں کا پتہ بتلایا ہے جہاں چوٹیوں کی بستی

بکثرت تحقیق۔ ان میں سے کسی ایک پر حسب اتفاق حضرت سلیمان علیہ السلام کاگز رہا۔

علمائے حیوانات نے سالہا سال جو تجربے کئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حقیر ترین جانور اپنی حیات اجتماعی اور نظام سیاسی میں بہت ہی عجیب اور شہنوں بشریہ سے بہت قریب واقع ہوا ہے۔ آدمیوں کی طرح چیز نیوں کے خاندان اور قبائل میں ان میں تعاون اجتماعی کا جذبہ تقسیم عمل کا اصول اور نظام حکومت کے ادارات نوع انسانی کے مشابہ پائے جاتے ہیں محققین یورپ نے صدوں ان اطراف میں قیام کر کے جہاں چیز نیوں کی بستیاں بکثرت ہیں بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

(قرآن کریم تفسیر عثمانی صفحہ ۴۹۰ فائدہ ۳۰۰)

شہد کی مکھی کا شعور

اور کم دیا تیرے رب نے شہد کی مکھی کو کہ نہایت پہاڑوں میں گھرا اور درختوں میں اور جہاں ٹھیاں باندھتے ہیں۔ پھر کھارہ طرح کے میوؤں سے، پھر چل رہا ہوں میں اپنے رب کی صاف پڑے ہیں۔ نکلتی ہے ان کے پیٹ میں سے بیٹے کی پیڑ جس کے مختلف رنگ ہیں۔ اس میں مرض اچھے ہونے ہیں لوگوں کے اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان کرتے ہیں۔

وَاُدْحِیْ دَبَّكَ اِلَى الْمَتَعْلِ اَنْ اَتَّخِذَیْ مِنْ الْجِبَالِ مِیْوَاتٍ وَمِنْ الشَّجَرِ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ لَا تَمْلِكُ مِنْ كُلِّ شَمَاتٍ فَاَسْکِیْ سُبُلَ رَبِّکَ ذُلًّا لَا یُخْرِجُ مِنْ کُفُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُ فِیْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ طَارَاتٍ فِیْ ذٰلِكَ لَا یَاْتِیَ لِقَدِیْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(تفسیر) شہد کی مکھی کو حکم دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی فطرت ایسی بنائی ہے جو باوجود ادنیٰ حیوان ہونے کے نہایت کاریگری اور باریک صنعت سے اپنا چھتہ پہاڑوں، درختوں اور کانوں میں تیار کرتی ہے۔ ساری کھیاں ایک طبی مکھی کے ماتحت رہ کر پوری فرمانبرداری کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ ان کے سر پر ایک عیسوب کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مکھیوں کا جلوس چلتا ہے۔ جب کسی جگہ مکان بنائی ہیں تو سب خانے مسدس، تبادلی الاضلاع کی شکل پر ہوتے ہیں۔ بدن مسطر اور پرکار کے اس قدر صحت اور انضباط کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ایک ہی شکل پر تمام خانوں کا لکھا آدمی کو حیرت زدہ بنا دیتا ہے۔ حکماء کہتے ہیں کہ مسدس کے علاوہ کوئی دوسری شکل اختیار کی جاتی تو لاعلم درمیان میں کچھ حاکم فضول بنائی رہتی۔ فطرت نے ایسی شکل کی طرف رہنمائی کی جس میں ذرا سا فریب (کشادگی) بھی بلے کار نہ رہے۔ کلی اور فاسکی سب ادھر کو نکلیے ہیں یعنی قوطی نے انکو ہدایت کی کہ اپنی خواہش واستعداد و فرائض کے مناسب ہر قسم کے پھلوں اور میوؤں میں سے اپنی غذا حاصل کرے۔ چنانچہ مکھیاں اپنے چھتے سے نکل کر رنگ رنگ کے پھول پھل چوستی ہیں جن سے شہد اور موم وغیرہ حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ان میں غذا حاصل کرنے اور کھا کر چھتے کی طرف واپس آنے کے راستے صاف کھلے پڑے ہیں کوئی روک ٹوک نہیں چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ مکھیاں غذا کی تلاش میں بعض اوقات بہت دور نکل جاتی ہیں اور پھر بے تکلف اپنے چھتے میں واپس آجاتی ہیں۔ ذرا اس قدر نہیں بھولتیں۔ بعض نے فاسکی سبل و دباخہ اخلا سے یہ مطلب لیا ہے کہ قدرت نے تیرے عمل و تصرف کے جو

فطری راستے مقرر کر دیئے ہیں ان پر مطیع و منقاد بن کر چلتی رہ رہ مثلاً پھول پھول چھوٹے فطری تواری و تصرفات سے شہد تیار کر۔ پھر شہد مختلف رنگ کا ہوتا ہے، سفید، سرخ، زرد۔ کہتے ہیں کہ رنگوں کا اختلاف موسم، غذا اور کھیتی کی طرح کے اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔
(پارہ ۱۴، رکوع ۱۵)

آب شور اور آب شیریں کا باہم ملنا اور جدا رہنا

وَهُوَ الَّذِي مَدَّجَ الْخَوْضَيْنِ هَذَا عَذْبٌ
قَوَاتٌ وَهَذَا أَمْلَحٌ أَحَابِرٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا
بُرْزَخًا وَحِجْرًا مَحْجُورًا۔
اور وہی ہے جس نے بے ہوشے چلائے دو دریا۔ یہ میٹھا ہے یہاں
بجائے والا اور یہ کھاری ہے کڑوا اور رکھا ان دونوں کے بیچ
پر دا اور آڑ رو کی ہوئی۔

(تفسیر) مجھ سے باریال (بنگال) کے بعض طلبہ نے بیان کیا کہ ضلع باریال میں دو ندیاں (بشر اور...) ایک ہی
سے نکلتی ہیں۔ ایک کاپانی کھاری بالکل کڑوا اور ایک کا نہایت شیریں اور لذیذ ہے۔ یہاں گجرات میں راقم الحروف (مفسر
تفسیر عثمانی) جس جگہ آج کل مقیم ہے (ڈابھیل مملکت، ضلع سورت) سمندر تقریباً دس بارہ میل کے فاصلہ پر ہے۔
اودھ کی ندیوں میں برابر مدو جزر (جوار بھٹا) ہوتا رہتا ہے۔ بکثرت ثقات نے بیان کیا کہ مد کے دت جب
کاپانی ندی میں آجاتا ہے تو میٹھے پانی کی سطح پر کھاری پانی بہت زور سے چڑھ جاتا ہے لیکن اس وقت بھی دونوں
مختلط نہیں ہوتے۔ اور پر کھاری رہتا ہے نیچے میٹھا۔ جزر کے وقت اوپر سے کھاری اتر جاتا ہے اور میٹھا جزر
توں رہتا ہے (واللہ اعلم) انی شواہد کو دیکھتے ہوئے آیت کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی خدا کی قدرت و حکمت
کھاری اور میٹھے دونوں دریاؤں کے پانی کہیں نہ کہیں مل جانے کے باوجود بھی کس طرح ایک دوسرے سے متاثر نہیں
ہوتے؟ (زفر قان ۱۴)

تحقیقات جدیدہ

وَالْقِي فِي الْخَوْضِ دَوَائِي أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ
(تفسیر) یعنی خدا تعالیٰ نے زمین پر بھاری پہاڑ رکھ دیئے تاکہ زمین اپنی اضطرابی حرکت سے تم کو لے کر بلا ٹھہر نہ
روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین ابتدائے آفرینش میں مضطربانہ طور پر چلتی اور کانپتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے
اس میں پہاڑ پیدا کیے جن سے اس کی کانپ بندی ہوئی۔ آج کل سائنس نے بھی اقرار کیا ہے کہ پہاڑوں کا وجود
مد تک زلزلوں کی کثرت سے مانع ہے۔ بہر حال زمین کی حرکت و سکون کا مسئلہ جو حکما میں مختلف فیہ رہا ہے اس کے
کافیاً یا اثباتاً کچھ تعلق نہیں کیونکہ پہاڑوں کے ذریعے سے جس حرکت کو بند کیا ہے وہ یہ دائمی حرکت نہیں جس میں اختلاف ہو رہا ہے۔
(تفسیر عثمانی صفحہ ۱۳۸ سورہ قمر
پارہ ۱۴)

لے زمین از تپ لرزہ آمد ستوہ
زد کوفت برداشش میخ کوہ

وَرَجَالٌ أَوَّاعٌ (ہم نے پہاڑوں کو زمین کی بیخ بنادیا)

(تفسیر) مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں، نہ کسی ایک کا علم کسی شخص کو بالذات بدو خطائے الہی کے ہو سکتا اور نہ مقایع غیب اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو دی ہیں۔ ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمایا یا غیب کی خبر دے دی۔ لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن نے کسی جگہ ایسے شخص پر عالم الغیب یا فلاں فیعلم الغیب کا اطلاق نہیں کیا۔ علمائے محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کئے جائیں۔ واضح رہے کہ علم الغیب سے ہماری مراد محض ظنون و تخمینات نہیں اور نہ وہ علم قرآن و دلائل سے حاصل کیا جائے۔ بلکہ جس کے لئے کوئی قرینہ اور دلیل نہ ہو وہ مراد ہے (الفصل۔ رکوع ۵) ولو کنت اعلم الغیب کے ماتحت لکھتے ہیں :-

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو نہ اپنے اندر اختیار مستقل رکھتا ہے نہ علم محیط۔ سیدنا ابو علوم اولیٰین و آخرین کے حامل اور خزانہ ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے۔ ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں وہ علم کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پرہیز ہے اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیوں اور کامیابیوں بھی حاصل کر لیتا جو علم غیب نہ ہونے سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں۔ نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی۔ مثلاً "افک" (بہتان عاشقہ) کے لکھنے دنوں تک حضور کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب و قلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرمایا اِسْتَقْبَلْتُ مِنْ اِیْهِ مَا اسْتَدْرَجْتُ مِنْکُمْ (اگر میں پہلے سے اس چیز کو جانتا تو بعد میں پیش آتی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا۔ اس قسم کے غیب میں جن کی روک تھام علم محیط رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر و اتدربہر کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ سبلا موقع ہے کہ میں نے جبریل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہنچایا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تب علم ہوا کہ جبریل تھے۔ یہ واقعہ تہر تہر محمد بن ابی عمر کا ہے۔ اس میں نیامت کے سوال پڑا لیسول عثما باعلہ من البسائل ارشاد فرمایا ہے گویا بتلایا گیا کہ علم محیط نوے برس کسی کو حاصل نہیں۔ اور "علم غیب" تو درکنار محسوسات و مبصرات کا علم ہی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات و مبصرات کا بھی اور اک نہیں کر سکتے۔ بہر حال اس آیت میں کھول کر بتلایا گیا کہ اختیار مستقل یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں۔ جیسا کہ بعض جہلاد سمجھتے تھے۔ ہاں شریعت کا علم جو انبیاء علیہ السلام کے منصب سے متعلق ہے۔ کامل ہونا چاہئے اور تو بنیاد کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اور میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے خالق ہیں آپ کو اتنے بیشمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔ (پارہ ۷، سورہ اعراف، رکوع ۱۱)

ان دونوں آیات کے علاوہ وعندہ مغایب الغیب لا یعلمہا الا اللہ کے ماتحت حضرت مفسر لکھتے ہیں کہ :-
مفتاح کوجن علمائے مفتوح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کے خزانے کیا ہے اور جن کے نزدیک مفتوح بکسر المیم کی جمع ہے وہ مفاتح الغیب کا ترجمہ مترجم رحمہ اللہ کے موافق کرتے ہیں۔ غیب کی کنجیاں۔ مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ ہی ان میں سے جس کو جس

اور چاہے کسی پر کھول سکتا ہے۔ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس عقل وغیرہ آلات اور اک کے ذریعہ سے علوم غیبیہ تک سائناتی پاسکے یا شے غیب اس پر منکشف کر دیئے گئے ہیں ان میں ان خود اضافہ کرنے کو علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے تھیں نہیں دی گئیں خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات اور واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا۔ ذرا تاہم غیب کی اصول و کلیات کا علم جن کو مفتاح غیب کہنا چاہئے حق تعالیٰ نے اپنے ہی لئے مخصوص رکھا ہے۔ (پارہ ۸، صفحہ ۱۲۱، رکوخ ۱۲۱)

منطقیانہ مگر حکیمانہ استدلال میں وحی کی ضرورت

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ رُّسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِقَوْلٍ شَاعِرٍ
یہ کہا ہے ایک پیغام لانے والے سردار کا اور نہیں ہے یہ کسی شاعر کا۔

(تفسیر) بلکہ یہ قرآن ہے اللہ کا کلام جس کو آسمان سے ایک بزرگ فرشتہ لے کر ایک بزرگ ترین پیغمبر پر اترا جو آسمان سے لایا وہ اور جس نے زمین والوں کو پہنچایا۔ دونوں رسول کریم ہیں۔ ایک کا کریم ہونا تم آنکھوں سے دیکھتے ہو اور دوسرے کی کرامت و بزرگی پہلے کریم کے بیان سے ثابت ہے (تنبیہ) عالم میں دو قسم کی چیزیں ہیں۔ ایک جن کو آدمی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ دوسری جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی عقل وغیرہ کے ذریعہ سے ان کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ مثلاً ہم کتنا ہی آنکھیں پھاڑ کر زمین کو دیکھیں وہ چلتی ہوئی نظر نہ آئے گی لیکن حکما کے دلائل و براہین سے عاجز ہو کر ہم اپنی آنکھوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ اور اپنی عقل کے یاد دوسرے عقلا کی عقل کے ذریعہ حواس کی ان غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کر لیتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم میں سے کسی کی عقل بھی غلطیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ نہیں۔ آخر اس کی غلطیوں کی اصلاح اور کوتاہیوں کی تلافی کس سے ہو۔ بس تمام عالم میں ایک وحی الہی کی قوت ہے جو خود غلطی سے محفوظ و معصوم رہتے ہوئے تمام عقلی قوتوں کی اصلاح و تکمیل کر سکتی ہے جس طرح حواس جہاں پہنچ کر عاجز ہوتے ہیں وہاں عقل کام دیتی ہے۔ ایسے ہی جس میدان میں عقل مجرور کام نہیں دیتی یا ٹھوکریں کھاتی ہے اس جگہ وحی الہی اس کی دست گیری کر کے ان بلند حقائق سے روشناس کراتی ہے۔ شاید اس لئے یہاں ماتصردون و مالانصردون کی قسم کھائی۔ یعنی جو حقائق جنت و دوزخ وغیرہ کی پہلی آیات میں بیان ہوئے ہیں اگر دائرہ محسوسات سے بلند تر ہونے کی وجہ سے تمہاری سمجھ میں نہ آئیں تو اشیاء مبصرات اور غیر مبصرات یا بالفاظ دیگر محسوسات و غیر محسوسات کی تقسیم سے سمجھ لو کہ یہ رسول کریم کا کلام ہے جو بذریعہ وحی الہی دائرہ حس چیزوں کو اپنی عقل یا دوسروں کی تقلید سے مان لیتے ہیں تو بعض بہت اچھی چیزوں کو رسول کریم کے کہنے سے ماننے میں کیا اشکال ہے۔ (سورہ الحاقہ۔ رکوخ ۱۲۱)

مستثنیات و تنبیہات

وَ اَمْرُهُمْ شُورٰی بَيْنَهُمْ
اور کام کرتے ہیں مشورہ سے آپس کے۔

(تفسیر) مشورہ سے کام کرنا اللہ کو پسند ہے۔ دین کا ہر یاد دہانہ۔ نبی کریم صلعم مہمات امور میں برابر صحابہ رض

سے مشورہ فرماتے تھے۔ اور صحابہ آپس میں مشورہ کرتے تھے۔ جروب وغیرہ کے متعلق بھی اور بعض مساکین اور انکام نسبت بھی بلکہ خلافت راشدہ کی بنیاد ہی شوری پر قائم تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت کامن میں ہے جو بہتر ہو اور جو قرآن و سنت میں منصوص نہ ہوں جو چیز منصوص ہو اس میں رائے اور مشورہ کے کوئی معنی نہیں اور ہرچیز بڑے کام میں اگر مشورہ ہوا کرے تو کوئی کام نہ ہو سکے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ ایسے شخص سے لیا جائے جو عاقل و عابد ہو ورنہ اس کی بے وقوفی یا بددیانتی سے کام خراب ہو جائے گا۔ انڈیشہ ریویگا۔ (سورہ شوریٰ رکوع ۱)

تفسیر نمبر ۲ (دو)

وَالْحَيْلُ وَالْبَغَالُ وَالْحَمِيرُ لَتَرْجُوْنَهَا وَ زِينَةَ طَوِیْحُنٍ مَّا لَا تَعْلَمُوْنَ
اور گھوڑے پیدا کئے اور چریں اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لئے پیدا کرنا ہے جو تم نہیں جانتے۔

(تفسیر) یعنی سواری کرتے ہو اور (سوار و کر ایک طرح کی) عزت و شان ظاہر ہوتی ہے (تنبیہ) عرب میں گدھے کی سواری معیوب نہیں۔ وہاں کے گدھے نہایت قیمتی خوبصورت، تیز رفتار اور قدم باز ہوتے ہیں۔ بعض گدھے کے سامنے گھوڑے کی کچھ حقیقت نہیں رہتی۔ ایک زندہ دل ہندی نے خوب کہا تھا کہ حجاز میں "گدھا نہیں جھوٹا ہے"۔ (سورۃ النحل - رکوع ۷)

ادب

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لِنَبِيٍّ سَكَرَتْهُمْ يَعْصُونَ
(تفسیر) ظاہر یہ ہے کہ یہ خطاب حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے نبی کریم صلعم کو ہے۔ یعنی تیری جان کی قسم لوٹ کی قوم غفلت اور مستی کے نشہ میں بالکل اندھی ہو رہی تھی وہ بڑی لاپرواہی سے حضرت کوٹ کی نصیحت بلکہ لجاجت کو ٹھکرا رہے تھے۔ ان کو اپنی قوت کا نشہ تھا۔ شہوت پرستی نے ان کے دل و دماغ مسح کر دیئے۔ وہ بڑے امن و اطمینان کے ساتھ پیغمبر خدا سے جھگڑ رہے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ صبح تک کیا ہوا ہو گا ہے۔ تباہی اور ہلاکت کی گھڑی ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ وہ لوٹ علیہ السلام کی باتوں پر نہایت تھے۔ موت ان کو دیکھ کر نہیں رہی تھی۔ (سورۃ النجر - رکوع ۷)

وَاَصْبَحَ قَوْمًا اٰیْمٌ مُّوسٰی فَرِیْعًا
اور صبح کو موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔

(تفسیر) موسیٰ علیہ السلام کی والدہ بچے کو دریا میں ڈال تو آئیں لیکن ماں کی ماتا کہاں چین سے رہنے دیتی رہ کہ موسیٰ کا خیال آنا تھا دل سے قرار جاتا رہا۔ موسیٰ کی یاد کے سوا کوئی چیز دل میں باقی نہ رہی۔ قرآن تھا کہ مبر و ضبط کا رشتہ انھ سے چھوٹ جائے اور سب کے سامنے ظاہر کر دیں کہ میں نے اپنا بچہ دریا میں ڈال دیا ہے۔ کسی کو خبر نہ ہو تو لاؤ۔ لیکن خدائی الہام کو یاد کر کے تسلی پاتی تھیں۔ یہ خدا ہی کا کام تھا کہ اُن کے دل کو

مضبوط باندھ دیا کہ خدائی راز قبل از وقت کھلنے نہ پائے اور بھٹوڑی دیر بعد خود موسیٰ علی والدہ کو عین الیقین اصل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ضرور پورا ہو کر رہتا ہے۔
(پارہ ۲۰ - رکوع ۷)

روحانیت و نورانیت

سَيَا هُمْ فِي دُجَاهِهِمْ مِمَّنْ أَتَى اللَّهُ جُحُودًا
وَالَّذِينَ هُمْ فِي التَّوْبَةِ جُحُودًا هُمْ فِي الْأَجَلِ
نشانِ ان کی ان کے منہ پر ہے سجدہ کے اثر سے۔
یہ شان ہے ان کی تو بات میں اور مثال ان کی انجیل میں۔

(سیر) نمازوں کی پابندی خصوصاً تہجد کی نماز سے ان کے چہروں پر خاص قسم کا نور اور روشنی ہے گویا خشیتِ مخصوصہ حسنِ نیت، اخلاص کی شعلیں باطن سے چھوٹ چھوٹ کر ظاہر کو روشن کر رہی ہیں حضرت کے اصحاب اپنے دلوں کے نور اور متقیانہ خیال و کھال سے لوگوں میں الگ سیچاٹے جاتے تھے۔ پہلی کتابوں میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی ایسی شان بیان کی گئی تھی۔ چنانچہ بہت سے غیر متعصب اہل کتاب ان کے چہرے اور طور و رنگ پر حیرت مائل تھے واللہ یہ تو مسیحؑ کے حواری معلوم ہوتے ہیں۔
(سورہ فتح - رکوع ۱۲)

ما حِصْلُ صَاحِبِهِمْ وَمَا غَوَىٰ ج
بہکانین تہذیب و رفیق اور مذہب راہ پلا۔
(سیر) انبیاء علیہم السلام آسمانِ نبوت کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور زقار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی ہے۔ اور ان طرح تمام ستاروں کے غائب ہونے کے بعد آفتاب و درخشاں طلوع ہوتا ہے ایسے تمام انبیاء کی تشریف بری بعد آفتاب محمدی مطلعِ عرب سے طلوع ہوا۔ پس اگر قدرت نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر حکم بنا دیا ہے اس میں کسی طرح کے زلزل اور اختلال کی گنجائش نہیں تو ظاہر ہے کہ ان باطنی ستاروں اور روحانی آفتابِ انتہا کا انتظام کس قدر مضبوط و محکم ہونا چاہیے جن سے ایک عالم کی ہدایت و سعادت وابستہ ہے۔

(الحج - رکوع ۷)

قیامت میں اعمال کا ریکارڈ اور وزن

حضرت عثمانی مرحوم سائنس کے زرد کے نسخے تقاضوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے قابل تھے۔ نیز ان کی باتوں کے ذریعہ باریک اسلامی مسائل کو سمجھانے میں یدِ بطون کی رکھتے تھے۔ مثلاً قیامت میں ہمارے اعمال تو لے جائیں گے۔ یہ قرآن کریم اور اسلام کا ایک اہم نظریہ ہے۔ اور ہمارے اعمال مثلاً جھوٹ، چوری، سؤد وغیرہ تو لے جائیں گے۔ لیکن ایک مخالف اسلام جو منکر قیامت بھی ہے یہ اعتراض کرتا ہے کہ جھوٹ بولنا غیبت کرنا جھگڑنا، تہمت باندھنا یہ ایسے اعمال ہیں جن کا جسم نہیں اور ظاہر ہے کہ جسمانی اشیاء اور مادی چیزوں کو کبھی تولیا جاتا ہے لیکن جو گناہ مادی نہیں، جسمانی نہیں رکھتے وہ کس طرح تو لے جاسکتے ہیں۔ علامہ عثمانی اپنے کلامی لائق کے کسی طرح اس کا جواب دیتے ہیں۔ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں جو حسب ذیل ہے۔

فَاَوْزَنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ مِمَّنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
اور اعمال کا وزن اس دن ٹھیک ہوگا۔ پس جس کے وزن

فَاُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ حَقَّتْ مِرَاسَتُهُ
فَاُولَٰئِكَ الَّذِينَ تَحْسَدُ عَلٰیْهِمْ ۖ فَمَا كَاٰلَا
بَايَتِنَا يَظْلَمُونَ -

بھاری ہوں گے، کامیاب ہوں گے اور جن کے وزن ہلکے
ہوں گے کہ جنہوں نے اپنا نفع کیا کیوں کہ وہ ہماری
آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

علامہ عثمانی مذکورہ آیت کی تفسیر کے بعد اعتراض بالا کا جواب دیتے ہیں :-

”کہ اب اسے کہ ہمارے اعمال تو غیر قار الذات اعراض (نہ تا تم رہنے والے غیر جسمانی) ہیں جن کا ہر جزو وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہوتا رہتا ہے پھر اس کا جمع ہونا اور ٹکنا کیا معنی رکھتا ہے۔
میں کہتا ہوں کہ اگر اگر کموفون میں آج کل جو لمبی چوڑی تقریریں بند کی جاتی ہیں کیا وہ تقریریں اعراض ہی
سے نہیں جس کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس کا پہلا حرف نکل کر فدا ہو گیا ہو
تو پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ کموفون میں کس طرح جمع ہو گیا۔ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا اگر کموفون کے موجد کا
موجد ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ تیار رکھے جس میں سے اگر
شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو۔ را اس کا وزن کیا جانا تو نصوص (آیات) سے اس قدر معلوم ہو چکا ہے کہ
ایسی میزان (تراز) کے ذریعہ سے ہوگا جس میں کفین (دو پڑے) اور سبان (رسیاں) وغیرہ موجود ہیں۔ لیکن
میزان اور اس کے دونوں پٹے کس نوعیت و کیفیت کے ہوں گے۔ اور اس سے وزن معلوم کرنے کا کیا طریقہ
گا۔ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقل و فہام کی رسائی سے باہر ہے۔ اس لئے ان کے جاننے میں ہمیں لنگھنا
دی گئی بلکہ ایک میزان کیا۔ اس عالم کی جتنی چیزیں ہیں ہر اس کے کہ اس کے نام ہم سن لیں اور ان کا
مفہوم ہو تو ان رشتہ سے بیان کر دیا ہو عقیدہ میں رکھیں۔ اس سے نامہ تفصیلات پر مطلع ہونا ہماری حجت
پر داز سے نہ ارج ہے کیوں کہ جن قوانین و قوانین کے تحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہوگا ان پر جس
عالم میں رہتے ہوئے کچھ دسترس نہیں پاسکتے۔ اسی دنیا کی میزائوں کو دیکھ لو کتنی قسم کی ہیں۔ ایک میزان ہے
جس سے سونا، چاندی یا سوئی ٹکتے ہیں۔ ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے۔ ایک میزان ہے
اسٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں۔ ان کے سوا ”مقیاس الہوا“ یا مقیاس اہر
وغیرہ بھی ایک طرح کی میزائیں ہیں جن سے ہوا اور حرارت وغیرہ کے درجات معلوم ہوتے ہیں۔ پھر بائیس
بدن کو اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے۔ قول کرتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنے اندری
حرارت پائی جاتی ہے جب دنیا میں بیسیوں قسم کی جسمانی میزائیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و
کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہو جاتا ہے تو اس قدر مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک جسی میزان کا
دے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورتاً و حسیاً ظاہر ہوتا ہو۔“

(تفسیر عثمانی پارہ ۷۔ الاعلان رکوع ۷۷)

حمد و نعت میں آئے والے باری تعالیٰ کے اسم اعظم "اللہ" پر علامہ عثمانی لکھتے ہیں:-

پھر یہ بات مشہور ہے کہ اسم جلیل یعنی اللہ واجب الوجود عالم الخالق تمام تعالیٰات کے مستحق کے لئے خاص بلکہ اللہ تعالیٰ کے اسم حسی میں انھی سے (پھر کیا لفظ اللہ عربی سے یا نہیں) صحیح ہے کہ وہ عربی سے جیسا کہ عام علماء کا خیال ہے نہ وہ عبرانی زبان کا لفظ ہے نہ سریانی کا جیسا کہ سریانی ہونے کا خیال ابو یزید بخاری صاحب پھر اس کے علاوہ کہ عربی سے آیا وہ نام ہے یا صفت ہے تو بعض نے کہا کہ صفت ہے لیکن جیسا کہ اکثر کا خیال ہے صحیح یہ ہے کہ وہ علم یعنی نام ہے۔ پھر علم ہونے کے علاوہ کیا وہ مشتق ہے یا غیر مشتق بعض نے کہا کہ مشتق ہے اس مادہ کے اختلاف کی بنا پر جس سے لفظ اللہ نکلا ہے اور اس شق پر اس کی علیت اس وقت بناوٹ یا غلبہ کی وجہ سے بعض نے کہا کہ اللہ غیر مشتق ہے بلکہ وہ بغیر کسی اصل کے کہ اس سے یہ لفظ نکلا جو واضح طور پر علم ہے اور اس خیال پر اکثر ہیں جن میں سے اسم ابو حنیفہ محمد بن حسن شافعی، ثعلبی، زجاج، ابن کثیر، ابن علی، امام الحرمین، غزالی اور خطابی، پھر بشام نے محمد بن حسن سے روایت کی ہے کہ انور نے کہا کہ میں نے ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ اللہ کا اسمی نام وہ اللہ ہی ہے یہی بات علماء نے اور بہت سے علماء اور اکثر صوفیائے کبار سے سنی ہے۔ یہاں پر اگر کسی صاحب مقام کے پاس صوفیائے میں سے اللہ کے ذکر سے جو کچھ کوئی ذکر نہیں ہے، اسی وجہ سے جو کہ کی تخصیص لفظ اللہ کے سرائے اور کسی دوسرے اسم کے ساتھ نہیں کی گئی۔

(فتح الملکم ج ۱ ص ۱۰۱ جلد ۱)

ثم من المعلوم ان الاسم الجليل اعني الله خاص بواجب الوجود الخالق للعالم المستحق لجميع الحمد بل هو اخص اسمائه الحسنی والصحيح انه عربي كما عليه عامة العلماء لا انه عبري او سرياني كما ذهب اليه ابو زيد البغلي ثم على انه عربي هل هو علم او صفة فقيل صفة والصحيح الذي عليه المعظم انه علم ثم على انه علم هل هو مشتق او غير مشتق فقيل مشتق على اختلاف بينهم في المادة التي اشتق منها وفي ان علمية حينئذ بطريق الوضع او الغلبة وقيل غير مشتق بل هو علم مرتجل من غير اعتبار اصل اخذ منه وعلى هذا الاكثرون منهم ابو حنيفة وه محمد بن الحسن والشافعي والخليل والزجاج وابن كيسان والعليني وامام الحرمين والغزالي والخطابي ثم روى هشام عن محمد ابن الحسن قال سمعت ابا حنيفة رحمه الله يقول اسم الله اعظم هو الله وبه قال الطحاوي وكثير من العلماء واكثر العارفين حتى انه لا ذكر عندهم لاصحاب مقام فوق الذكorie وقد علم من هذا وجه تفضيص الحمد به دون غيره من اسمائه تعالى۔

اور کی دو قسمیں ہیں واجب الوجود یعنی جس کا وجود ضروری اور قدیم اور درجہ شہ سے بلند ہو جیسے اللہ کی ہستی اور اس کا وجود۔ لہذا اللہ کو واجب الوجود کہتے ہیں اور اس کو ممکن الوجود کہلاتا ہے یہ وہ وجود ہوتا ہے جو پہلے نہ تھا بعد میں ہوا اور پھر فنا ہو گیا جیسا کہ خدا کے واسطے مخلوقات کا، اگر انسان، جانور، آسمان، زمین سب ممکن الوجود اور حادث ہیں۔ اس علم کے نام میں کسی شخص یا چیز یا جگہ کے نام کو کہتے ہیں لہذا خدا۔ اللہ کا علم یعنی نام ہے۔ مشتق اس لفظ کو کہتے ہیں جو کسی مصدر سے نکلا ہو جیسے کھڑے سے کھڑا، منقول سے منقول، وغیرہ۔

محمدؐ

یہ ہے علامہ عثمانی کی لفظ اللہ پر تحقیق، تو گویا ان کی شرح کی خصوصیات میں سے الفاظ کی تحقیقات بھی ہے وضاحت کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں، اب اللہ کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آتا ہے اس کی تحقیق میں کیا

اشھور اسمائہ الامام علامہ صلی اللہ علیہ وسلم واثباتہی بہ لکثرة فصالحہ الممودہ کذا قالہ ابن فادس وغیرہ من اهل اللغة قالوا ویقال لكل کثیر الفصل العنیلۃ محمد و محمود وقال فی شرح التحریر انما سمی بہ لانه محمود عند اللہ وعند اهل الارض جہلاً او عناداً وهو اکثر الناس حمداً الی غیر ذلک وقد منع اللہ تعالیٰ بحکمته ان یسمی بہ احد غیرہ الی ان شاء قبیل اظهارہ للوجود الخادجی ان نبیاً یبعث اسمہ محمد فسمی قلیل من العرب ابناءہم بہ رجاء من کل ان یکون ابنہ وذلک ثم منع اللہ تعالیٰ کلامہم ان یدعی النبوة او یدعیہا احد لہ او یظہر علیہ سبب یشکک احداً فی امرہ کذا فی شرح لتحریر۔

آنحضور کے مبارک ناموں سے محمد صلی نام ہے اور یہ نام آپ کے عمدہ عادات کثرت کے باعث رکھا گیا ہے جیسا کہ ابن فارس اور دیگر اہل لغت نے کہا ہے کہ ہر اچھی بکثرت سے خصلتوں والے انسان کو محمد اور محمود کہا جاتا ہے اور شرح تحریر میں کہا ہے کہ آنحضرت کا نام محمد اس لئے رکھا گیا ہے کہ آپ اللہ اور آسمان وزمین والوں کے نزدیک محمود ہیں اگرچہ بعض اہل زمین نے حیا کی حالت یا دشمنی کے باعث کفر کیا۔ لیکن آنحضور کی مخلوقات میں تعریف کرنے والوں کی اکثریت ہے برائیت تعریف نہ کرنے والوں کے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے کسی اور کو یہ (محمد کا نام) رکھنے جانے سے روک دیا تاکہ یہ نام ان حضور کے دنیا میں تشریف لانے سے پہلے مشہور ہو گیا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے کہ اس کا نام محمد ہو گا۔ اس لئے بعض عربوں نے (اس شہرت کے بعد) اپنے بیٹوں کا نام اس امید پر محمد رکھ لیا کہ شاید ان کا بیٹا جی رہے نبی ہو۔ پھر اللہ نے (اپنی قدرت سے) ہر ایک نبوت کا دعویٰ کرنے سے یا اس کے لئے کسی اور کو ایسا کرنے سے روک دیا، یا اس پر کسی ایسے سبب کو جو کسی کو اس کے معاملہ میں شک میں ڈال دے روک دیا۔ جیسا کہ شرح تحریر میں ہے۔

(فتح - الملم - ص ۷۷)

شاد باش و شادوری لے سرزمین دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کی ہمہ گیری اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ شبلی

کے جانشین سید سلیمان ندویؒ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست حکیم الامت تھانوی

سے جواز ہوئے۔ شیخ الہندؒ نے جامعہ ملیہ کا سنگ بنیاد رکھا۔ برصغیر پاک و ہند کے

سب سے بڑے اشاعتی علمی ادارے کی بنیاد مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ نے رکھی۔

ابجکل ندوۃ العلماء مکھنٹو کے ناظم سید ابوالحسن علی ندوی دارالعلوم کے ایک سرپرست

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مرید باصفا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے صدر شعبہ

دینیات، دیوبند کے ایک مسمومی فرزند مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہیں۔ حضرت مولانا سید

حسین احمد مدنیؒ نے تحریک آزادی میں اتنا اہم رول ادا کیا کہ جس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی

اس دارالعلوم سے وابستہ ایک فرد سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو زبان کے سب سے بڑے

خطیب ہوئے۔ اور اسی دارالعلوم دیوبند کے ایک نامور بزرگ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی بدولت

تحریک پاکستان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور پھر جب پاکستان بنا تو اس نئی مملکت اسلامیہ کی پرچم کشائی

کیلئے قائد اعظمؒ نے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو منتخب کیا۔ اور ڈھاکہ میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ منتخب ہوئے اور علامہ شبیر احمد

عثمانی پاکستان کے شیخ الاسلام قرار پائے۔ اور انکے بعد آج تک کسی کو یہ لقب قوم نے نہیں دیا۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
كُلُّ مَنْ عَلَيْهِمْ فَإِنَّ وَيَقِي وَجْهَ رَبِّكَ ذَوَالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ -

سنگ مزار

تاریخ الوصال

قدی اس شیخ الاسلام

۶۹ ۱۳

مفسر محدث اعظم

۶۹ ۱۳

۶۹ ۱۹

زاہد پاک فقیہ ملک جامع علوم مولانا شبیر احمد عثمانی

۶۹ ۱۹

امام العلماء المتقین رحمۃ اللہ علیہ

۶۹ ۱۳

۲۱ صفر ۱۳۴۹ مطابق ۱۳ دسمبر ۱۹۲۹ء - روزہ شعبہ بمقام بغداد الجدید - بہاول پور

مادۃ تاریخ وفات حضرت آیات حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی

از تہجیک نگر جناب لانا محمد ادریس صاحب مدرس مدرسہ عالیہ فتح پوری - دہلی

علم و عمل ، بذل و بحث ، حکمت ، کلام و اتقا
دستِ قضا نے آہ سب کو بلے سے پا کر دیا

۶۰ = کم

۳۰ = ل

۲۱ = لا

۴۰ = م

۵۰۰ = تن

۷۰۰ = ذ

۱۳۶۹ھ

۸ = ح

مبلغ اسلام حضرت میرزا محمد الیاس علیہ السلام

۵۱۳۶۳
۶۱۹۲۲



۵۱۳۰۳
۶۱۸۸۶

دربار بہ حجاب اندر

حلیہ | پست قد گندی رنگ۔ دبلا جسم۔ گھنی داڑھی۔ چہرہ پُر نور اور عالی ہمت۔ زبان میں قدرے لکنت اور طاقت ور۔ آخر عمر میں چند بال سفید ہو گئے تھے۔ انتقال سے قبل فرمایا: — لوگ آدمی چھوڑ جاتے ہیں۔ پورا ملک (میوات) چھوڑنے جاتا ہوں۔

پہاڑیوں پر چڑھتے، تیز دھوپ اور گرم کوہِ راشت کرتے، زمینی جون کی گرمی میں میوات کا وزہ کرتے۔ میں شہر ہن شہروں اور گاؤں گاؤں پھرتے اور فرماتے —

”عنّت کہ پہاڑ کے پیچھے خدا ہے جس کا جی چاہے ملے“ عنّت انسان کی قدرت ہے مگر موجودہ دور میں انسان دن کے لئے بے انتہا جودہد کرتا ہے جو ناپائیدار ہے اور دین کے لئے کچھ بھی نہیں کرتا جو پائیدار اور باقی ہے“ ایک سائنسی کو تبلیغی سفر میں بخار آ گیا فرمایا:۔

”ایسے زمانے میں کروٹیوں کے لئے جانیں جا رہی ہوں دین کی کوشش میں بخار آ جاتا کچھ بڑی بات نہیں مولانا ابوالحسن علی ندوی کو تبلیغی سفر میں بخار آنے پر لکھا:۔

”دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ صحت عاجلہ کاملہ سے مومن فرما دیں اور خود بیماری بھی جو مصلحا کے لئے ایک نعمت بلکہ یہ تقدیر ہے اس وقت تک بیماری سے رضا بقضاء اور بذریعہ تکلیفِ مہینات کے یقین کے متبع فرما دیں میرا ارادہ ہے کہ اس پر مبارکباد دوں کہ اس چودہویں صدی میں محض خلوص جہد فی سبیل اللہ والا سفرِ حق کا سبب ہوا“

هَلْ أَنْتَ إِلَّا رَاضٍ بِمِثِّهِ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا لَقَيْتَ

۱۳۱۵ھ میں گنگوہ حاضر ہوئے اور امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے مرشد سے بے انتہا محبت تھی بعض اوقات راتوں کو اٹھ کر صرف چہرہ دیکھنے کے لئے جاتے مرشد بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔

ابتداء سے دہلے پتلے اور کمزور تھے گنگوہ کے قیام میں آپ کی صحت اور زیادہ خراب ہو گئی آپ کو دورے آئے جو حکیم مسخدا احمد گنگوہیؒ نے علاج شروع کیا اور پانی بند کر دیا چنانچہ آپ نے سات سال تک پانی نہیں پیا

تاریخی نام ”اختر الیاس“ ۱۳۲۶ھ میں دہلی دہلی حاضر ہوئے اور شیخ الاسلامؒ سے بخاری شریف و ترمذی شریف کے ساتھ ساتھ سہارن پور کے بانی مولانا شاہ عبدالرحیمؒ سے بیعت ہوئے پوری اور حکیم امین

سہارن پور کے بانی مولانا شاہ عبدالرحیمؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل ہوئی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیمؒ نے پوری اور حکیم امین شریف علی نقویؒ سے بھی کسب فیض کیا حج ۱۳۳۳ھ، ۱۳۵۱ھ، ۱۳۵۶ھ اور ۱۳۵۷ھ میں نظام الدین دہلی سے بیعت

۱۳۳۰ھ پشیمانگان۔ مولانا محمد یوسفؒ و دہلی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ تلمذ سے بیابھی گئیں۔ ۱۳۴۰ھ علی الصبح خالق حقیقی سے جا ملے۔

مفصل مطالعہ کے لئے ”مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت“ مکتبہ مولانا محمد الیاسؒ ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ مرتبہ مولانا محمد الیاسؒ ندوی۔

مولانا محمد حسین للہی ایم۔ اے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد ابیاس دہلوی

رحمۃ اللہ علیہ

ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے:

لہ عزوجل بیعت لہذا الامة علی راس مائة سنة من یجد ولہا دینہا۔

اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر سو سال کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو نیا اور تازہ کرتے رہیں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ”حجۃ اللہ الباقیہ“ میں تحریر فرماتے ہیں:-

ہ صلی اللہ علیہ وسلم یبعث اللہ لہذا لہ علی سرائس کل مائة سنة من ولہا دینہا “ تفسیرہ فی حدیث یحمل هذا العلم من کل خلف عدولہ ینفقون عنہ تحریف الغالین وانتحال المطہلین

وتاویل المجاہلین

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ ”اللہ تعالیٰ اس اُمت کے لئے ہر صدی کے سرے پر ایسے بندے پیدا کرے گا جو اس کے لئے اس کے دین کو تازہ کرتے رہیں گے“ آپ کے اس ارشاد کی تشریح آپ کی دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ اس علم یعنی دین کو ہر زمانے کے اچھے اور نیک لوگ سنبھالیں گے۔ وہ بالذکر نے والوں کی تحریف سے، جھوٹوں کی جعل سازیوں سے اور جاہلوں کی غلط تاویلوں سے اس کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں اسلام کی ڈیڑھ ہزار سال تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس اُمت میں ہر زمانے میں اللہ کے ایسے پیچھے اور مخلص بندے پیدا ہوتے رہے۔ ان دین کو افراط و تفریط کی راہ سے بچا کر نہایت معتدل اور متوازن انداز میں اسے اپنی اصلی شکل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ان دین کے تجدید و احیاء کے لئے مختلف ادوار اور مختلف ماحول میں ضروریات زمانہ کے مطابق مختلف طریقوں سے کام کیا گیا اپنی اپنی استعداد کے مطابق بعض حضرات نے دین کے بڑی ہتھوں کی تجدید کی، اور بعض ایسی جامع اور مکمل شخصیتیں کا نام جو دین آئیں جنہوں نے یک وقت دین کے تقریباً تمام شعبوں کو نئے سرے سے زندہ کیا جیسا کہ حضرت شیخ احمد برہنہ

مہر الف ثانی، مکی ذات گرامی، جن کے عظیم الشان کام کی بدولت آپ کو پورے ہزاروں کا معجزہ مانا گیا۔ کبھی یوں بھی قرآن اور ایک زمانہ میں تجدید و احیائے دین کے لئے متعدد حضرات سے کام لیا گیا کیوں کہ حق تعالیٰ نے اپنے دین کا خود دترے لیا ہے اور فرمایا ہے اتاخن نزلنا الذکر وانا لہ لحاظون قرآن اول میں صحابہ رضوان ان جمیع نے اپنی بے پناہ قوت ایمانی کے باعث اپنی جانوں اور مالوں کی قربانی دے کر دین کے درخت کی آبپاری راستہ کے بعد جب خلافت کو ملکیت میں بدل دیا گیا تو عمر بن عبدالعزیزؓ نے اپنے عیش و آرام کی قربانی دے کر کوضا فتنہ علیٰ منہاج النبوۃ میں بدل دیا، جو عباس کے دور خلافت میں عجیب کا غلبہ ہوا اور قدیم یونانی فلاسفہ کے غری میں مشتعل ہوئے تو حق تعالیٰ نے ان کے توڑ کے لئے مسلمان فلاسفر غزالیؒ و فارابی وغیرہ پیدا کئے جنہوں نے بے پایلی کو عالم آنکارا کر کے علوم نبوت کی برتری ثابت کی۔ پھر اشراقیت اور مہدی ویدانت کا چرچا ہوا اور دینی عطا ہر بیسے صاحب دل صوفی اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ مشائخ پیدا کئے جنہوں نے اپنی روحانی قوت کے ذریعے جوگیوں اور سادھوؤں کے دجل و تبلیس کا پردہ چاک کیا اور کونہر لند کیا، پھر حبیب اسلامی تصوف میں بھی غلو کیا جانے لگا اور جاہل صوفی اسلام ہی کی تحریف کرنے لگے تو حق امام ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ کلیم اللہ دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ کے ذریعہ شریعت و طریقت کے تاج تجدید کرائی۔ پھر ان کے متبعین میں شاہ اسماعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ بیسے مجاہد پیدا فرمائے جنہوں نے دینی بے حسنی کے دور میں ایک بار پھر صحابہؓ کے دور کی یاد تازہ کر دی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

فریختہ جس زمانہ میں جس قسم کے کام کی ضرورت تھی حق تعالیٰ نے اس زمانہ میں اسی قسم کا کام اپنے خاص نبی لیا۔ مرثدہ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ نے ایک مرتبہ ایک مجلس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

”ہر زمانہ میں جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی لوگ اس طرف توجہ کرتے رہے ہیں۔ فرمایا ہمارے ایک استحقے انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کے زمانہ میں لوگ دلائل کو نہیں جانتے تھے بس لڑائیاں ہی جانتے تھے اس میں صحابہؓ نے اسلام پر دلائل نہیں بیان فرمائے صرف جنگ ہوتی تھی جنگوں میں لوگ مسلمان ہوتے تھے ان دلائل نہیں پیش کئے جاتے تھے۔ بعد میں فلسفیوں کا زمانہ آیا، یونان میں فلسفی پیدا ہوئے وہ دلائل سے بات کرتے تھے ایسے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے فارابی وغیرہ کو پیدا فرمایا انہوں نے یونان جا کر پہلے ان کے فلسفہ کو لیکھا پھر غری میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر لوگوں کو اس طرز سے دلائل کے ساتھ اسلام سکھایا۔“

ہمارے اس دور میں مغربی و مادی علوم و افکار اور سائنسی ایجادات، و انکشافات کا دنیا بھر میں چرچا ہوا، حق نے اپنے دین کی حفاظت کا یہ انتظام کیا کہ اپنے بعض مخلص بندوں کی اس طرف رہنمائی فرمائی کہ وہ بڑے پیمانے پر علمی اور دارالعلوم قائم کریں۔ یہاں پھر ترمسیر پاک و ہند میں دارالعلوم دیوبند و مظاہر العلوم سہارن پور، اور دہلی، رام پور، گورکھ پور، ممبئی، کانپور، بکنور وغیرہ میں مختلف دارالعلوم قائم ہوئے جن کے ذریعے دین کی حفاظت و اشاعت کا کام لیا گیا۔ اس کے بعض مخلص بندوں نے اپنی خدا داد صلاحیتوں، اپنے عبقری و ماعوں اور روحانی قوتوں سے کام لے کر انفرادی طور پر

جتنا بہت سے ادارے اور جامعیں اکٹھے مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانیؒ اور حضرت مولانا محمد ایاس دہلویؒ کے اخلاص اور سوز و دلوں نے اس دور میں عرصہ تک اسلام کے چراغ کو روشن کیا اور ان مردانِ خدا نے مغربیت و مادیت کی تند و تیز ہواؤں اور الحاد و ارتداد کے ہولناک طوفانوں کے غلات میں سپر لرسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو زندہ رکھا۔ اس مقالہ میں حضرت مولانا محمد ایاس دہلویؒ کے حالات اور ان کے سچے روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

مولانا کا وطن اور خاندان
مولانا محمد ایاس دہلویؒ کا دادھیالی اور ناہنالی شجرہ نسب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاتا ہے آپ کے والد ماجد مولانا محمد اسماعیل صاحب جھنجھنا نہ منفع مظفر گڑھ کے بے والے تھے۔ آخر میں جھنجھنا کی سکونت ترک کر کے دہلی میں آکر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا محمد ایاس کی والدہ مولانا نغمہ حسین صاحبہ کا ندھلوی کی نواسی تھیں، مولانا مظفر حسین صاحب مفتی الہی بخش صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے، حضرت شاہ فی صاحبؒ کے عزیز شاگرد اور حضرت شاہ محمد یوسفؒ کے مجاز تھے، ان کے نواسے اور نقوی کا یہ حال تھا کہ آپ کے منہ پر عمر بھر کوئی مثبت چیز قبول نہیں کی۔ حضرت مفتی الہی بخش صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے نماز شاگرد صاحب دہلی صاحب تصنیف، عالمِ حافظ، اے مشل ادیب اور ۶ بی۔ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب شجرہ نسب چھٹی پشت پر مفتی صاحب کے شجرہ نسب سے مل جاتا ہے۔ مولانا محمد ایاس صاحب کی ولادت ۱۳۰۶ھ میں لی۔ آپ کا تاریخی نام اختر ایاس ہے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب
مولانا محمد اسماعیل صاحب بہادر شاہ ظفرؒ کے سدھی مرزا الہی بخش کے بچوں کو پڑانے کے لئے دہلی تشریف لائے اور سستی نظام الدین کی ایک چھوٹی ٹیسی مسجد میں بے لگدالی مسجد کہتے تھے قیام پذیر ہوئے، چونکہ آپ ایک صوفی منش اور زاہد و عابد شخص تھے اس لئے تمام عمر عزت و گناہ میں اور عبادتِ الہی میں مصروف رہے۔ ذکر و عبارت سے جو وقت بچ جاتا اسے قرآن کی تعلیم و تدریس میں صرف کرتے۔ دس ارہ میواتی طالب علم ہمیشہ آپ کے پاس مقیم رہتے تھے جن کا کھانا مرزا الہی بخش صاحب کے ہاں سے آتا تھا، تواضع اور اظہارِ کایہ عالم تھا کہ گرمی کے موسم میں جو سرد لوگ پیاس کے مارے ہوئے ادھر آتے تھے آپ ان کا بوجھ اتار کر رکھ لیتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی میں اس قابل نہ تھا۔ آپ کے گھر میں شب بیداری کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا ہمیشہ رات بھر گھر میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہتا۔ آپ کی اس بے نفسی، اخلاص اور للہیت کا نتیجہ تھا کہ دہلی کے مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ آپ سے برابر محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اسی زمانہ میں میوات کے علاقہ کے لوگوں سے آپ کا تعلق قائم ہوا۔

لے مولانا محمد ایاس اور ان کی دینی دعوت مؤلف سید ابوالحسن علی ندوی۔

تہذکرۃ الخلیل مؤلف مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی۔

غریب میواتوں کی بڑی دل جوئی کرتے، ان کی جانی و مالی خدمت کے علاوہ ان کو دینی تعلیم بھی دیتے اس وجہ سے میرا کہے دل میں آپ کی بڑی عقیدت پیدا ہو گئی۔ حق تعالیٰ نے آپ کو احسانی اور عرفانی کیفیت اس درجہ کی عطا فرمائی کہ ایک مرتبہ جب آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں افکار و اشغال تصوف کے سیکنے کی درخواست فرمائی تو حضرت مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں جو اس طریق اور ان اذکار و اشغالی کا مقصود ہے وہ آپ کو عاجز ہے۔ "شوال ۱۳۵۵ھ مطابق فروری ۱۹۳۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے تین صاحبزادے تھے۔ پہلی بیوی تھے مولانا محمد صاحب جو صاحب نے آئے اور مولانا کے جانشین ہوئے، دوسری بیوی سے جو کہ مولانا مظفر حسین صاحب کی نواسی تھیں دو صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب تھے۔

مولانا محمد الیاس صاحب کے بیٹے حقیقی بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب ایک جامع بزرگ تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کو آپ کے ساتھ خصوصی تعلق اور بدرجہٴ قاطب محبت تھی۔ مولانا عاشق الہی صاحب میرے گھر آپ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"آہ مولوی محمد یحییٰ مرحوم میرے محسن اور مخلص دوست تھے جن کے کمالات مخفیہ اور حالات سنیہ بیان کرنے کو مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔ آخر کوئی چیز تھے کہ امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) کو اولاد سے زیادہ پیار سے ہوئے کہ حضرت ان کو پڑھائی کی لائشی اور نابینا کی آنکھیں فرمایا کرتے اور کسی ضرورت سے وہ چند منٹ کے لئے اُدھر اُدھر جاتے تو امام ربانیؒ بے چین اور بے کل ہو جایا کرتے۔ بارہ برس کامل اس لاڈ اور پیار میں گزرے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں بیان کر سکتا۔"

مولانا محمد یحییٰ صاحب اپنی عمر کے آخری سالوں میں مظاہر العلوم سہارن پور میں مدرس مقرر ہوئے اور ساڑھے پانچ سال تک بلا تنخواہ پڑھاتے رہے۔ آخر یقیناً ۱۳۵۷ھ کی شب میں بغار صہ ہیضہ انتقال فرمایا۔ آپ کے جانشین آپ کے صاحبزادہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ ہیں جن کی ساری عمر تدریس و تصنیف اور طالبین حق کی تعلیم و تربیت بسر ہوئی۔ ساری عمر مظاہر العلوم میں پڑھایا ہے مگر آج تک مدرسہ سے بطور تنخواہ کے ایک پائی تک نہیں لی۔ غالباً ان کے کچھ حقوڑا بہت ضرورتاً لیا تھا وہ بھی واپس کر دیا۔

یہ تھے مولانا کے والد اور بڑے بھائی۔ اب مولانا کی والدہ کا حال سنئے۔ مولانا ابوالحسنؒ کی نند

گھر کا ماحول لکھتے ہیں:

"آپ کی والدہ محترمہ صفیہ بڑی جید حافظہ تھیں۔ انہوں نے قرآن مجید شادی کے بعد مولانا یحییٰ صاحب کی شیر خوارگی کے زمانہ میں حفظ کیا تھا..... معمول تھا کہ رمضان میں روزانہ پورا قرآن مجید اور دس پارے

پڑھ لیا کرتی تھیں اس طرح ہر رمضان میں چالیس قرآن مجید ختم کر لیتیں۔

رحمضان کے علاوہ آپ کے روزمرہ کے جو معمولات تھے اور جن کی تفصیل مولانا عاشق الہی نے تذکرۃ الخلیل میں درج کی ہے، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کون کس طرح سے بڑا مجاہد اور متاض صوفی بھی بڑی شکل سے اتنے اور دودھ لٹھ کی پابندی کر سکتا ہے۔ اسی طرح آپ کی نانی بی امۃ الرحمن بھی ایک رابعد سیرت خاتون تھیں۔ غرضیکہ تمام بڑے صالحین و متعلمین امت کی طرح مولانا کو بھی ایسی آغوش تربیت نصیب ہوئی جس کے اثر سے آپ کو اپنے دور کے مشائخ اور علماء میں ایک امتیازی شان نصیب ہوئی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب آپ کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی ایاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آ جاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت | سب سے پہلے آپ نے خاندانی دستور کے مطابق قرآن مجید حفظ اور ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں شروع کی۔ بعدہ کبھی اپنے والد ماجد کے پاس دہلی اور کبھی کاندھلہ رہ کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ انہی دنوں آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ قیام پذیر ہو گئے۔ چنانچہ سلسلہ تعلیم میں وہ آپ کو اپنے ساتھ لنگوہ لے آئے اور خود پڑھانا شروع کیا۔ اس وقت مولانا محمد ایاس کی عمر مشکل دس گیارہ برس کی ہوگی۔ حضرت گنگوہیؒ کے دم سے اس وقت لنگوہ وقت کے بڑے بڑے علماء و علماء کامرکز بن گیا تھا اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی علوم کے فیوض سے بھی ایک دنیا فیضیاب ہو رہی تھی۔ مولانا محمد ایاسؒ نے اس مقدس ماحول میں اپنی زندگی کے دس گیارہ برس گزارے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب اس بات کا اہتمام کرتے کہ مولانا محمد ایاس کے اوقات سبق کے علاوہ حضرت گنگوہیؒ اور دوسرے صلحا کی صحبت میں بسر ہوں اور مولانا سے فرماتے کہ ان حضرات کی صحبت میں بیٹھو اور ان کی باتیں سنو۔

مولانا محمد ایاسؒ خلقی طور پر نحیف و ضعیف تو تھے ہی اور بچپن سے عبادت کا بھی بہت شوق تھا، پھر اس کے ساتھ قلبی انہماک، نتیجتاً آپ بیمار ہو گئے۔ حضرت گنگوہیؒ کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب آپ کے معالج تھے ان کی ہدایت کے مطابق ان کو پانی سے پرہیز کرنا ضروری تھا چنانچہ ثقہ بزرگوں کی روایت ہے کہ آپ نے اپنی بے مثال قوت ارادی اور عزیمت کی وجہ سے متواتر سات سال تک پانی نہیں پیا۔ اسی بیماری کی وجہ سے آپ کا سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا۔ لیکن آپ کو تعلیم کے مکمل نہ ہونے کا بڑا رنج تھا۔ ادھر اعزہ کا تقاضا تھا کہ آپ مسلسل آرام کریں۔ آخر ایک روز مولانا محمد یحییٰ صاحب نے کہا کہ ”آخر پڑھ کر ہی کیا کرو گے“ آپ نے جواباً فرمایا کہ ”جی کہ ہی کیا کروں گا۔“ چنانچہ جوں ہی آپ کی صحت قدرے بہتر ہوئی آپ نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ابتدائی کتابیں مولانا محمد یحییٰ سے پڑھ کر سلسلہ میں دوبارہ تشریف لے گئے اور شیخ الہند کے حلقہٴ درس میں شریک ہو کر ترمذی اور بخاری شریف کی سماعت کی۔ اس

لے، لے مولانا محمد ایاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

لے، لے مولانا محمد ایاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

حرم کئی سال بعد دوبارہ آپ نے مولانا محمد نجی صاحب نے حدیث کا دورہ کیا۔

تعلق بیعت

گنگوہ کے قیام کے دوران ہی آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے دست پرست پر بیعت کی۔ محبت و عشق کی چنگاری آپ کے خیر میں تھی، حضرت گنگوہی سے ایسا تعلق پیدا ہو گیا کہ زیارت کے بغیر آپ کو چین نہ آتا۔ کبھی کبھی رات کو اٹھ کر صرٹ چہرہ دیکھنے کے لئے جاتے اور آکر سو رہتے۔ حضرت کو بھی آپ کے حال پر بڑی شفقت تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جب میں ذکر کرتا تھا تو مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا، حضرت سے کہا تو حضرت تھرا گئے اور فرمایا کہ مولانا محمد قاسم نے یہی شکایت حضرت صاحب سے کی تو حاجی صاحب نے فرمایا کہ اللہ آپ سے کوئی کام لے گا ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہی کا انتقال ہو گیا، مولانا کے حساس دل پر اس حادثہ نے گہرا اثر چھوڑا، فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے تو ساری عمر کا رونا اسی روز رو لیا، روزِ حضرت دینا سے رخصت ہوئے، حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد آپ کا وقت زیادہ تر غلٹ اور مراقب میں بسر کرتے، اکثر اوقات حضرت شاہ عبدالقدوسؒ کے مزار کے قریب مراقب رہتے اور رات کا بیشتر حصہ نوافل میں گزارتے۔ عرصہ میں حضرت گنگوہی کے بڑے بڑے خلفاء سے برابر کا تعلق رہا۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ، حضرت شیخ النذیر مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ اور دوسرے بزرگوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہم سے بھی برابر استفادہ کرتے رہے اور ان حضرات کا بھی مولانا سے خصوصی تعلق قائم رہا۔ زمانہ میں آپ نے بلا مجاہدہ کیا۔ مرثدا حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت کو بعد میں جو بے پناہ مقبولیت اور مرجعیت حاصل ہوئی اور آپ سے تبلیغ و اشاعتِ دین کا جو کام لیا گیا وہ اس زمانہ کے مجاہد کا نتیجہ اور اس کا ثمرہ تھا۔

۱۳۲۶ھ میں مظاہر العلوم سہارن پور کے بعض اساتذہ کے جے پر چلے جانے پر خدمتِ تدریس اور قیامِ دہلی سے بہت سی آسائیاں خالی ہوئیں تو آپ کا تقرر بھی بطور مدرس کے عمل ہوا۔

متوسط کتابیں آپ کچھ عرصہ یہاں رہ کر یہاں پڑھاتے رہے، اس عرصہ میں مولانا محمد نجی صاحب کا انتقال ہو گیا اور ان کے انتقال کے دو سال بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب جو کہ دہلی میں مقیم تھے داعی اہل کو لبیک کہ گئے۔ مولانا صاحب کی وفات پر دہلی کے جمہور اور معتقدین نے مولانا سے دہلی ہی میں منتقل طور پر قیام پذیر ہونے کے لئے اصرار کیا اور اس پر مولانا کی کراہت والد صاحب اور بھائی صاحب کی مسند اور مدرسہ کو خالی نہ رہنے دیں بلکہ ان کے کام کو سنبھالیں۔ مولانا نے فرمایا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سے اجازت لے کر آجاؤں گا۔ چنانچہ حضرت سہارن پوری نے بخوشی اجازت فرمادی اور آپ دہلی آکر مقیم ہو گئے۔ بسنی نظام الدین کے ایک سرسے پر ایک مختصر سی مسجد تھی جس کے ساتھ ایک بنگلہ ایک حجرہ تھا، بس یہی مسجد اور یہی خانقاہ تھی، اس کے آس پاس جنگل ہی جنگل تھا کوئی آبادی نہ تھی۔ کچھ میواتی طلباء اس مدرسہ میں

پڑھتے تھے۔ مدرسہ کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی بس توکل علی اللہ سارا کام چلتا تھا۔ اکثر اوقات فاقوں کی نوبت باقی رہتی مگر مولانا کے توکل اور اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا تھا۔ اس تنگی اور سختی کے زمانہ میں مولانا اللہ کے فضل و کرم کے بڑے امیدوار تھے اور اس فارغ التحصیل اور کشائش سے جو اس امتحان کے بعد آنے والی تھی ہمیشہ خود بھی ڈرتے رہے اور ساتھیوں کو بھی ڈراتے رہے۔ یہ زمانہ بھی مولانا کے مجاہد اور ریاضت کا زمانہ تھا۔ اکثر اوقات خلوت میں گزارتے اور مشاہیر مشائخ کے مزارات پر جا کر پیروں مراقبہ رہتے۔ جو وقت بچ جاتا اس میں طلبہ کو درس دیتے۔ حدیث کا درس بڑے اہتمام سے دیتے اس میں ہمیشہ باوجود غور رہتے۔ کوئی کیسا ہی مغز آدمی کیوں نہ آجاتا اس وقت سبق چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے۔ آہستہ آہستہ طلبہ کا رجوع عام شروع ہوا اور طلبہ کی تعداد ستر آشتی تک پہنچ گئی۔

میوات سے تعلق آپ کے والد صاحب اور بھائی صاحب کے اکثر میواتی لوگ شاگرد اور مرید تھے اور ایک عرصہ سے میواتیوں کا اس خاندان سے تعلق تھا، مولانا کے دہلی قیام پذیر ہونے کے بعد بھی میواتیوں کی آمد و رفت برابر رہی اور پڑھانے معتمدین نے مولانا کو اپنے علاقہ میں تشریف لے چلنے کی دعوت دی، یہ علاقہ متدین نیا سے الگ تھلک ہونے کی وجہ سے اب تک تعلیم سے بالکل محروم چلا آ رہا تھا، اسلام بھی برائے نام تھا اور دینی درس و مکاتب کا تو یہاں کوئی نشان ہی نہیں تھا۔ مولانا نے میوات چلنے کے لئے یہ شرط پیش کی کہ آپ لوگ اپنے اپنے علاقہ میں دینی مدارس قائم کریں۔ پہلے تو ان لوگوں کو یہ بات بہت ہی دشوار معلوم ہوئی کیوں کہ اول تو متدین ہی کا مکنا مشکل پھر ان کی تنخواہوں کا انتظام ناممکن اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پڑھنے کے لئے لوگ اپنے بچوں کو کام کاج سے ہٹا کر مکتبوں میں بھیجنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بالآخر لوگوں کا جذبہ عقیدت غالب آیا اور چار و تاجارا انہوں نے مولانا کی اس شرط کو تسلیم کر لیا اور مولانا میوات تشریف لے گئے۔ اس علاقہ میں پہنچ کر مولانا نے دینی مدارس کے قیام کی پوری کوشش کی، لوگوں نے ہر طرح سے تعاون کیا۔ متدین کی تنخواہوں کے بندوبست کا خود مولانا نے ذمہ اٹھایا پھر پہلے سفر میں دس مکتب قائم ہو گئے بعد میں سفروں کا سلسلہ جاری رہا اور تھوڑی مدت کے بعد میوات کے علاقہ میں کئی سو مدرسے قائم ہو گئے یہ سب مولانا کے اخلاص اور سوز و درد کا نتیجہ تھا کہ ہمارے بالکل بے سروسامانی کے عالم میں دینی اعتبار سے ایک نیچر اور ویران زمین میں دینی علوم کے جگہ جگہ لگانے جن کا فیض اب تک جاری ہے۔

مکاتیبے دل برداشتگی مولانا کی بے قرار طبیعت مکاتیب کے اس کام سے مطمئن نہ ہو سکی اور آپ نے اپنی مومنہ خاتما ہوں کے ذریعہ جو دینی کام ہو رہا ہے یہ بہت نا کافی ہے اول تو اب دینی مدارس کی طرف مکت کا زرخیز طبقہ رجوع ہی نہیں کر رہا۔ جو لوگ آتے بھی ہیں ان میں اعلیٰ استعداد والے بہت کم ہوتے ہیں، پھر جو لوگ ان مدارس سے فارغ ہو کر جاتے ان میں سے اکثر معاش کی فکر میں پڑ کر دینی کام سے غافل ہو جاتے ہیں۔ تم بالائے تم یہ کہ قوم میں دین سے تعلق نہ ہو، کہ

سے دین اور اہل دین کی قدر ہی نہیں۔ اس لیے بہت سے لوگ بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں اور جو لوگ تھوڑا بہت کام کرتے ہیں ان کا حلقہ اثر طالبین علوم تک ہی محدود رہتا ہے۔ عوام اور زندگی کے کاروبار میں مصروف لوگوں کی اصلاح و تربیت کا کوئی کام یہ لوگ نہیں کر پاتے، ان حالات کے پیش نظر اور مسلسل غور و فکر کے بعد مولانا اس نتیجہ پہنچے کہ کوئی اس قسم کا کام ہونا چاہیے جس سے عوام الناس اور غافلوں اور بے طلبوں تک دین اور اس کا پیغام پہنچایا جاسکے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ سے فرمایا:-

”شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحب استدلال طلبہ کثرت سے آنے لگے، میں نے سوچا کہ ان کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ جو لوگ عالم مولوی بننے ہی کے لیے مدرسہ میں آئے ہیں، مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم مولوی ہی بن جائیں گے اور پھر ان کا مشاغل وہی ہوں گے جو آج کل عام طور سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر مدرسہ پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی۔ اللہ کا کرنا، آنے والوں پر اتنی جلدی کینیات اور احوال کا ورود و شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہ کچھ صاحب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لیے آئے، کوئی اولاد کے لیے تمویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت اور کاروبار میں ترقی کی دعا کرے اور زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعے بھی آگے کو چند طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے، یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ طے کیا کہ اللہ نے ظاہر و باطن کی ہر قوتیں بخشی ہیں ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو اس کام میں لگایا جائے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں، اور وہ کام ہے اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لیے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا“

کام کی ابتداء

شوال ۱۳۸۶ھ میں آپ دوسرے حج کے لیے مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی معیت میں تشریف لے گئے۔ حج کے بعد کچھ عرصہ مدینہ منورہ میں قیام رہا۔ مولانا فرماتے تھے کہ مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لیے امر ہوا اور ارشاد ہوا کہ تم سے کام لیں گے۔ کچھ دن میرے اس بیٹے میں گزر رہے ہیں تاوان کیا کر سکوں گا۔ ایک عارف سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کر دو گے

گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ بس کام لینے والے کام لیں گے! اس سے آپ کی تسکین ہوئی اور شہدہ میں جج سے والپسی کے بعد آپ نے تبلیغی گشت شروع کر دیا اور لوگوں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر اسلام کے اولین ارکان کا تذکرہ اور نماز و ہجرہ کی تبلیغ کریں۔ چونکہ کام نئی طرز کا تھا اس لئے شروع شروع میں تو لوگوں کو حجاب رہا۔ رفتہ رفتہ میواتی لوگ اس کام سے مافوس ہوئے اور میوات کے علاقہ ہی سے بہت سی جماعتیں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ عام لوگ گھروں اور کاروبار میں مصروف رہ کر نہ تو دینی علم بقدر ضرورت سمجھ سکتے ہیں نہ ان کی زندگی میں کوئی انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ اس کی بس ایک ہی تدبیر ہے کہ لوگ اپنے اپنے گھروں اور مصروفیتوں سے علیحدہ ہو کر کچھ عرصہ باہر رہیں، کچھ خود سیکھیں کچھ دوسروں کو سکھائیں۔ چنانچہ میوات کی ابتدائی جماعتیں علمی مراکز یعنی کاندھلہ، مارٹے پور، سہارن پور، تھانہ بھون و غیرہ کی طرف روانہ کی گئیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ میوات کے سادہ لوح اور جاہل لوگ، اہل دین کی خدمت میں بیٹھ کر اور ان سے اسلامی شعائر سمجھ کر جب وطن واپس ہوئے تو میوات کی فضا ہی بدل گئی۔ ایک عام علمی و دینی ذوق پیدا ہو گیا۔ جگہ جگہ مدرسے اور مسجدیں بننے لگیں۔ بدعات اور منہ و نادم رسوم سے لوگوں کو نفرت ہونے لگی اور ایک عام دینی فضا پیدا ہو گئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

”نقاری داؤد صاحب نے ایک بوڑھے میواتی سے اس کا عذریہ لینے کے لئے پوچھا کہ تمہارے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ بوڑھے میواتی نے کہا اور تو میں کچھ جانتا نہیں، اتنا جانتا ہوں کہ جن باتوں کے لئے پہلے بڑی کوششیں کی جاتی تھیں اور ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی وہ اب آپ ہی آپ ہو رہی ہیں اور جن باتوں کو بند کرنے کے لئے پہلے بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاتی تھیں اور بڑا زور لگایا جاتا تھا اور ایک بات بھی بند نہیں ہوتی تھی وہ اب بے کسے لئے خود بخود بند ہوتی جا رہی ہیں!“

مولانا کا خیال تھا کہ جس طرح دنیا میں معاش کے لئے کچھ کرنا ہر شخص اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، اس طرح دین کا ضروری علم سیکھنے اور اپنی اصلاح کے لئے ہر شخص کا گھر سے کچھ عرصہ کے لئے باہر نکلنا ضروری ہے۔ قرن اول میں بھی لوگوں نے دین اسی طرح حاصل کیا تھا کہ صحابہ کرام دینا کے ہر قسم کے کاروبار اور دنیا غل کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھتے تھے اور اہل دین اور اہل علم کے ساتھ ہر وقت کے اختلاط کی وجہ سے ان کی زندگی کے اعمال و اشغال اور ان کی روزمرہ کی حرکات و سکنات کو دیکھ کر اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ مشغولیت اور دین سے دوری کے اس دور میں بھی مولانا کے نزدیک دین کا شعور حاصل کرنے کی فقط یہی ایک صورت تھی کہ عام اور مشغول لوگوں کو اپنے اوقات میں سے کچھ وقت فارغ کرنے کی دعوت دی جائے اور ان کو اس ماحول سے نکلنے کو کہا جائے جس میں کافی عرصہ رہنے کے باوجود ان کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکی۔

دس دینی بصیرت کے حصول کے لئے مولانا دو باتوں پر بہت زور دیا کرتے تھے ایک علم دوسرے ذکر، علم سے مراد مولانا کے نزدیک محض کتابی علم نہ تھا بلکہ وہ علم جس کے حصول کے بعد زندگی میں انقلاب آجائے اور وہ ذکر جس سے غفلت دور ہو اور اخلاص و ولہیت پیدا ہو۔ اسی کی وضاحت کرتے ہوئے ایک دفعہ آپ نے فرمایا:-

وہ علم و ذکر کو منبہ و طبی سے تھا منے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ مگر علم و ذکر کی حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ ذکر کی حقیقت ہے عدم غفلت اور فرائض دینی کی ادائیگی میں لگا رہنا۔ یہ اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ اس لئے دین کی نصرت اور اُس کے فروغ کی جدوجہد میں مشغول رہنا ذکر کا ادنیٰ درجہ ہے بشرطیکہ اللہ کے اہل اور موانع کا خیال رکھتے ہوئے ہو..... اور علم سے مراد دینی مسائل اور دینی علوم کا صرف جاننا نہیں ہے۔ دیکھو یہود اپنی شریعت اور اپنے آسمانی علوم کے کیسے عالم تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نابوں تک کے چیلے اور نقشے حتیٰ کہ ان کے جسموں کے تل کے متعلق بھی اُن کو علم تھا۔ لیکن کیا ان باتوں کے صرف جاننے نے اُن کو کوئی فائدہ دیا..... فرمایا علم کے لئے جو وضع محمدی تھی (یعنی طلب اور عظمت و محبت کے ساتھ صحبت و اخلاط سے علم حاصل کرنا اور زندگی سے زندگی سیکھنا) اس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ذریعہ جتنا علم بڑھتا تھا اُسی قدر اپنے جہل اور اپنی علمی درماندگی کا احساس ترقی کرتا تھا۔ اور علم حاصل کرنے کا جو طریقہ اب رائج ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جتنا آتا ہے زعم اُس سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر زعم سے کبر پیدا ہوتا ہے اور کبر جنت میں نہیں جائے گا، علاوہ ازیں علم کے زعم کے بعد تحصیل علم کی تڑپ نہیں رہتی۔ جس کی وجہ سے علمی ترقی ختم ہو جاتی ہے۔

کام کا استحکام اور تائید ایزدی شروع شروع میں عوام اور اہل علم اس کام کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ بہت سے سطحین لوگوں کو اس اصلاحی تحریک کے نام یعنی دتبی جماعت سے بہت دھوکا ہوا۔ لیکن جیب لوگوں نے قریب تر ہو کر اس کو دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ کام علمی تبلیغی کام نہیں ہے بلکہ عمومی اصلاح کا ایک ٹھوس پروگرام ہے جماعت کے لئے جو لوگ وقت دیتے ہیں صرف دوسروں کو کلمہ اور نماز نبی نہیں سکھاتے بلکہ خود بہت کچھ سیکھتے ہیں اور ان کی زندگیوں میں فی الواقع ایک انقلاب آجاتا ہے۔ خود مولانا کا نقطہ نظر بہت بلند تھا۔ مولانا کے سامنے فقط اتنا ہی نہیں تھا کہ اُس عوام الناس کو ناز و روزہ سکھ جائیں اور کچھ فکر وادکار کے پابند ہو جائیں بلکہ مولانا پوری ملت اسلامیہ کو بیدار کر کے انفرادی زندگی کے اجتماعی زندگی تک کو اسلامی جانے کی فکر رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک صحبت میں فرمایا:-

”ہمارا ہی اس تحریک کا اصل مقصد ہے مسلمانوں کو مابا ویر الہی سکھانا یعنی اسلام کے پورے علمی و عملی

قلم سے احبت کو داب تہ کر دینا۔ یہ تو ہے ہمارا اصل مقصد، ہر سی فافون کی یہ چلت پھرت اور تبلیغی گشت، سو یہ اس مقصد کے لئے ابتدائی ذریعہ ہے اور کد و نماز کی تلقین و تعلیم گویا ہمارے پورے نصاب کی الف ب ت ث ہے۔

دینی مراکز میں جو لوگ جاتے ان کو یہ بھی ہدایت کی جاتی کہ بزرگوں کی مجلسوں میں تبلیغ وغیرہ کا کوئی ذکر نہ کریں بلکہ ان کی مجلسوں میں بیٹھ کر فیض یاب ہوں اور کچھ وقت مقرر کر کے اس پاس کے علاقوں میں تبلیغی گشت بھی کریں چنانچہ ان طریقے سے کام ہوتا رہا اور اہل بصیرت اور مشائخ وقت کا اس کام کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ یہ کام وقت کا اہم ضابطہ ہے اور اس کا طریق کار ہر لحاظ سے مناسب اور صحیح ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ، مولانا ابی احمد صاحب سہارن پوری، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، حضرت عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، اور دوسرے بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی توثیق و تصدیق بلکہ اس کی تائید و حمایت کی اور اپنے مریدین و احباب کو ہر طرح سے اس جماعت کے تعاون کی تلقین فرمائی۔ اسی وجہ سے واقعات ایسے بھی پیش آئے جن سے واضح ہوا کہ تائید ایزدی اس جماعت کے شامل حال ہے۔ ایک واقعہ یہ تھا کہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرتدہ نے رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ میں گھوڑا لنگی کی مجلس میں بیان فرمایا۔ یہ ہے۔

”فرمایا ایک دفعہ تبلیغی کی ایک جماعت حضرت کے بلانے پر جا رہی تھی۔ گاڑی سے اترے تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کس طرف کو چلیں۔ آخر ایک نے کہا ”جی ایک طرف کو منہ کر کے چل دو۔ چنانچہ چلتے رہے ایک جگہ سے آواز آئی، اٹھو، اٹھو، راستہ بھول گئے ہو۔ چنانچہ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد روانہ ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ تم دستہ چھوڑ کر جا رہے تھے، وادھر ہمارے پیچھے پیچھے آؤ یہ ان کے پیچھے ہوئے۔ ایک جگہ پہنچے تو دور سے روشنی نظر آرہی تھی، کہنے لگے کہ وہ جو روشنی نظر آرہی ہے ادھر ہی کو ہو جاؤ، ہم اب جاتے ہیں، ان لوگوں نے پوچھا کہ جناب اپنا نام تو بتاتے جاؤ، اس پر ایک نے کہا کہ میرا نام رحمت ہے۔ دوسرے نے کہا میرا نام ہمت ہے۔ چنانچہ یہ کہہ کر غائب ہو گئے، یہ لوگ ہنسنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ تم کہہ رہے تھے ہمت کہو، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے پہنچا دیں گے یہ ہمت اور رحمت ہی آگئے۔ ان کی بتائی ہوئی روشنی پر پہنچے تو دیاں حضرت کے لوگ کھانا کھا رہے تھے اور ان کی انتظار کر رہے تھے۔ فرمایا کیا یہ نصرت نہیں ہے؟“

ایک کی عالمگیری | اس تحریک کا ابتدائی کام میوات کے علاقہ سے شروع ہوا، جون جون اس کے نتائج سامنے آتے گئے اور اہل علم و صاحبان بصیرت اس کی طرف متوجہ ہوتے گئے تو انوں

اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ بیوات کے بعد وہلی میں کام کیا گیا اور لوگ جماعتوں کی شکل میں باہر نکلنے لگے۔ اس کے بعد یو۔ پی کے تمام علمی مراکز، دیوبند، سہارن پور، کانپور، کھننوا، تھانہ، جھون، انگلوہ میں جماعتیں لگیں، پھر تر یو۔ پی کا چپہ چپہ تبلیغی جماعتوں نے چھان مارا۔ رفتہ رفتہ یو۔ پی سے باہر پنجاب، سندھ، سرحد، صوبجات متحدہ، بہار، بنگال، اندراپس اور بمبئی تک جماعتیں جانے لگیں اور وہاں سے لوگ نکل نکل کر مشہور علمی مراکز اور تبلیغی مرکز نظام الدین وہلی کی طرف آئے اور یہاں سے دین سیکھ کر جاتے لگے۔ حتیٰ کہ چند ہی سالوں کے اندر اندر تیرہ صغیر ہندوپاک کے بڑے شہروں اور نصیبات اور لاتعداد دیہاتوں میں جماعتیں پہنچیں جنہوں نے وہاں کے لوگوں کو باہر نکلنے کی دعوت دی۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طرح سے اللہ کی کتنی مخلوق گھروں سے دین سیکھنے کے لئے نکلی اور کتنی تعداد کے لوگوں کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا۔ مولانا کی زندگی میں ہندوستان سے باہر حجاز، شام، بحرین وغیرہ میں بھی اس کام کی دعوت دی گئی اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ آخر ۱۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا اور آپ کے صاحبزادہ مولانا محمد یونس نے غلط فہمی کی جالشیٹی عمل میں آئی۔ کام جاری تھا۔ چلتا رہا اور تحریک کا سلسلہ پھیلتا گیا۔ اس وقت تک ہندو پاکستان سے جن جن غماک میں جماعتیں جا چکی ہیں ان کی فہرست بے تحریک کا عالمگیری کا اندازہ ہو سکے گا۔ راقم کے علم مختصر ہے۔ عبدالقادر صاحب ساکن جھڈواریاں (جن کا شمار جماعت کے اہم ارکان میں ہوتا ہے) نے ایک انٹرویو میں راقم کو بتایا کہ اس وقت تک جماعتیں ہندوپاکستان سے باہر جاپان، فلپائن، انڈونیشیا، جاوا، برما، سنگاپور، سری لنکا، ایران، ترکی، شام، عراق، اردن، لبنان، مصر، سوڈان، سعودی عرب، حجاز، بحرین، کویت، حضرموت، یمن، اسرائیل، چین، مشرقی افریقہ، نائیجیریا، انگینڈا، امریکہ، فرانس، لیبیا، ٹیونس، الجزائر اور مراکش میں جا چکی ہیں امریکہ کو پہلی جات ۱۹۵۲ء میں گئی تھی جس کے ساتھ قاضی صاحب موصوف بھی گئے تھے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ جماعتیں آئیں۔ ایک امریکہ جا چکی ہیں۔ اسی طرح قاضی صاحب نے بتلایا کہ جاپان، امریکہ، انگینڈا، شام، برما، حجاز اور سعودی عرب کے جماعتیں بن کر مرکز میں کئی دفعہ آچکی ہیں اور یہاں کے دینی مرکزوں میں رہ کر اور یہاں کے کام کو دیکھ کر علمی و عملی استفادہ و انتفاع کی دولت اپنے ساتھ واپس لے گئی ہیں۔ باقی ہدایت تو اللہ جل جلالہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

من يشاء الى صراط مستقيم۔

افسوس ہے کہ اس مختصر مقالہ میں مولانا کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی نہ ہو سکی۔ جاسکتی ہے چونکہ اس کی گنجائش نہیں ہے اس لئے مختصر طور پر یہاں مولانا محمد الیاس صاحب دہلوی کے چند خصوصی صفات کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا آخرت پر کمال یقین اور ہر وقت اس کا استحضار ہے۔ جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے ان کا زبانی اور تحریری بیان یہی ہے کہ مولانا کی تمام حرکات و سکنات سے واضح ہوتا تھا کہ جنت اور دوزخ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مولانا محمد منظور صاحب لہنائی لکھتے ہیں:-

”جسمانی لحاظ سے اگرچہ نہایت نحیف و ناتواں تھے مگر اس مقدس مقصد کے لئے ایسی آن نکلے اور اندر

بے پناہ جد و جہد کر کے دکھا گئے کہ میرا اندازہ ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے سامنے جنتِ اپنی ساری نعمتوں اور دہل فریبیوں کے ساتھ اور جہنم اپنی ساری ہولناکیوں سمیت منکشف کر دی جائے اور اس سے کہا جائے کہ اگر یہ کام کرو گے تو یہ جنت ملے گی اور انہیں کرو گے تو اس جہنم میں ڈالے گاؤ گے تو شاید اس کی سہی و جہد اس سے زیادہ نہ ہو سکے گی جو مولانا محمد ایساؒ کی بالخصوص آخری زمانہ میں تھی۔ یہ تو آپ کا حال تھا اب قال کی بات سنئے مولانا نعمانیؒ آپ کے ملفوظات میں لکھتے ہیں:-

”فرمایا جائے! اللہ کئے وعدوں پر یقین نہیں رہا۔ اللہ کے وعدوں پر یقین اور اعتماد پیدا کر داور پھر اس یقین و اعتماد ہی کی بناء پر کام کرنے کی مشق کرو۔ اور اللہ کے وعدوں کے معنی بھی خود نہ گھرو۔ تمہارا علم اور تجربہ بہت محدود ہے۔ اس کے وعدوں کا مطلب اس کی شان کے مطابق سمجھو اور اس سے یوں ہی مانگو کہ اپنی شان اور قدرت کے شایان ان وعدوں کو پورا فرما۔ آخر وہی نعمتوں کی معنویت اور اصل حقیقت کا تم اس دنیا میں کیا اندازہ کر سکتے ہو اور کیونکر وہ صحیح ہو سکتا ہے جب کہ حدیثِ قدسی میں ان نعمتوں کی صفت ہی یہ بیان کی گئی ہے۔ لا عین مرأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔“

مولانا کی دوسری اہم صفت مولانا کا سوز و دروں اور بلند بہتی ہے۔ مولانا کا دل اس زمانہ کی دینی و دنیوی گونجیہ دیکھ کر جلتا تھا اور مخلوقِ خدا کی عام گمراہی اور جہالت و بد عملی کی ہمہ گیری کا تصور کر کے آپ ماہجئے بے آب کی طرح تر پڑتے تھے۔ گویا کہ اس شعر کی مجسم تفسیر تھے۔

خضر جلے کسی پتڑ پڑتے ہیں ہم امیرؒ سارے جہاں کا درد ہمارے گلے میں ہے

مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ ”کبھی کبھی دین کے اس درد اور اس فکر میں بستر پر گر ٹپس بدلتے اور بیچینی برصتی تو اٹھ اٹھ کر بیٹھنے لگتے۔ ایک رات والدہ مولانا محمد یوسف صاحب نے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے کہ نیند نہیں آتی فرمایا کیا بتلاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جا گئے والا ایک نہ رہے دو ہو جائیں“ اسی سوز و دروں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے اپنی ساری زندگی کا اوڑھنا، پچھونا دین اور اشاعتِ دین ہی کو بنایا تھا اور آپ کی ساری زندگی کی پچھان اسی تبلیغی کام میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان کو اس راہ میں قربان کر دینا اپنے لئے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اس راہ کی تمام تکلیفوں اور مشقتوں کو نہایت عالی حوصلگی اور بلند بہتی سے برداشت کرتے تھے۔ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک سفرِ میوات کے موقع پر مولانا محمد نوکریا صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب کو تحریر فرمایا:-

”اس قدر ضعف ہے کہ خلاف طبع الجہی ہوئی بات سے اختلاج اور خفقان ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ موٹر کی دہلی تک کی سواری سے بخارا آتا ہے۔ اس پر الحمد للہ ایک ہینڈ کی مسافت کیلئے میوات کی سخت تحریک

ملہ ملفوظات مولانا محمد ایساؒ مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ

ملہ مولانا محمد ایساؒ اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

بادِ سوم اور جہاں کی باتوں کے الجھاؤ کا نشانہ بن کر موت کے لئے اپنی جان کو پیش کرنے کی تیت سے اس سفر کو کارزار کا میدان تصور کرتے ہوئے مصمم ارادہ سفر ہے۔ گویا یہ سفر جہاد ہے۔ مگر اپنے صنعت سے اور اپنی مجربہ کم ہمتی سے نہایت خوف ہے کسی جگہ یہ نفسِ شریہ کرب و شدائد کے مقابلے سے فرار کر کے نامردی سے واپس ہو گا دعا کر دو کہ جان کے جانے تک تحملِ ختمی نہ لائے شانہ شائد و کرب کا نصیب نہ کریں و ما ذا اللہ علی اللہ العزیز۔ اور یا کام کو پورا کر کے سلامتی کے ساتھ بغنیمت عود نصیب فرمادیں۔ اپنے اس سفر کو اہم فریضہ اور صحت کی رعایت کو سنگین ترین مصیبت سمجھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر سفر کر رہے ہیں۔

مولانا کی تیسری اہم خصوصیت مولانا کی وسیع القلبی ہے۔ جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے ہر مکتب خیال اور ہر دائرہ فکر کے لوگ آپ سے قریب ہو گئے اور اس تحریک کے ساتھ جڑا گئے۔ تمام اہل حق کی طرح آپ کو بھی حق تھاٹنے نے ایسی وسیع نظری اور عالی ظرفی عطا فرمائی تھی کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان تھا اس کی بھی آپ عزت کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہندو پاکستان کے تقریباً تمام مشہور دینی مدارس و مکتب کے لوگوں کے دوش بدوش انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے لوگوں کو اس جماعت میں کام کرتے ہوئے پایا گیا اسی طرح مختلف اذواق اور مختلف طرق کے مشائخ کے متبعین نے اس جماعت میں برابر کا حصہ لیا۔ کیوں کہ ہر ایک کے دل میں ہر ایک کی قدر اور عزت تھی۔ مدارس، یونیورسٹیوں، اداروں اور خانقاہوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے علاوہ ہر قسم کے کاروباری اور ملازمت پیشہ لوگ بھی آپ کی تحریک میں منسلک ہو گئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے نفع اٹھایا۔ اکرامِ مسلم مولانا کی دعوت کا اہم اصول تھا اور تمام تبلیغی کارکنوں کو اس کی تاکید کی جاتی تھی۔ اس زمانہ کی تمام دینی جماعتوں اور مذہبی اداروں کے ایک دوسرے سے بُعد و نفرت اور عام مسلمانوں کے افتراق و تششت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہر جماعت اور ہر شخص اپنے کو سب سے افضل اور تمام خوبیوں کا مجموعہ سمجھتا ہے اور دوسرے شخص اور دوسری جماعت کو تمام خوبیوں سے محروم اور تمام خرابیوں کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ مولانا نے فقہوں کی اس بنیاد پر اس طرح تیشہ چلایا کہ جماعت کے بنیادی اصولوں اور اکرامِ مسلم کو داخل کر دیا اور ہر اس شخص پر اس کی پابندی لازمی قرار دے دی گئی جو جماعت میں شامل ہو کر تبلیغ کام کرنا چاہتا ہو۔

ازمانہ کے اس دستور کے برعکس کہ لوگ اپنی ذات کو مجموعہ محاسن اور دوسروں کو مجموعہ معائب سمجھتے ہیں۔ مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ اپنے عیوب کا تو محاسبہ کیا جائے اور دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھی جائے۔ ایک

ان کو ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

”دکوئی شخص اور کوئی مسلم ہرگز ایسا نہیں کہ کچھ غویوں اور کچھ خراویوں سے خالی ہو۔ ہر شخص میں یقیناً کچھ خویاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اگر خراویوں کے ساتھ نظر اندازی اور ستر پر وہ پوشی کا اور غویوں کی پسندیدگی اور ان کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج ہو جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خرابیاں اپنے آپ دینا سے اٹھ جائیں اور ہزاروں غویوں کی اپنے آپ نبیاد پر جائے!“

مولانا کی یہی وہ اہم خصوصیات اور زہریں اصول ہیں جنہوں نے مولانا کو حقیقی سلسلہ کے جلیل القدر مشائخ کی میں لاکھڑا کیا ہے۔ پرنسپل خلیق احمد نظامی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:

”مولانا محمد الیاسؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے جو دینی بصیرت اور خیر اللہ نے انہیں عنایت فرمایا اس کی مثال اس عہد میں شکل سے ملے گی۔ گزشتہ صدی میں کسی بزرگ نے چشتیہ سلسلہ کے اصلاحی اصولوں کو اس جذب نہیں کیا جس طرح مولانا محمد الیاس نے کیا تھا۔“

”اس اہم کام (تبلیغ دین) کی انجام دہی کا جو نظم حضرت مولانا محمد الیاس صاحب نے قائم فرمایا ہے۔ اس کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مجھے پچھلے دنوں نصیب ہوا۔ اس کام کی سچی روح مجھے اس نظم میں کار فرما دکھائی دیتی ہے۔ ایمان اور یقین بخت اور دلیل سے پیدا نہیں ہوتے کسی کو یہ دولت نصیب ہو تو دوسروں تک بھی اسے منتقل کر دیتا ہے اپنے دل کی آگ سے دوسروں کے سینے بھی گرماتا ہے اور اپنے عمل کی بے چینی سے بے عملوں کی عروق مرودہ میں بھی خون زندگی دوڑا دیتا ہے۔“

(ڈاکٹر ذاکر حسین، سابق صدر جمہوریہ ہند)

مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت از مولانا ابوالحسن علی ندوی

تاریخ مشائخ چشت از پرنسپل خلیق احمد نظامی - سلسلہ تاثر ڈاکٹر صاحب کا اس وقت کا ہے جب حضرت مولانا بقیہ حیات تھے۔ بروایت حضرت مولانا عبد اللہ انور حضرت مولانا گشت کے لئے خصوصی دعوت دینے کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تو ڈاکٹر صاحب بالکل ساتھ جاتے تھے بالآخر ڈاکٹر صاحب نے مولانا اختتام الحسن کا مصلحتی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف مدظلہ العالی ابن حضرت مولانا محمد الیاس مدظلہ العالی

علم و فضل کی دنیا میں ایسا بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ والد اگر علم و عمل، زہد و تقویٰ، جہد و ہمت اور سلوک میں لیگانہ روزگار ہے تو بیٹا بھی انہی اوصاف میں فرو و جید ہو۔ ہندوستان میں اس کی نظیر خاندان مولانا میں ملتی ہے۔ کہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے گھر شاہ ولی اللہؒ پیدا ہوئے تو شاہ ولی اللہؒ کے ہاں شاہ عبدالعزیزؒ، عبدالقادر شاہؒ، رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالغنیؒ رحمہم اللہ اجمعین جیسے عارفین و کاملین پیدا ہوئے جن کی نظیر و مثل مجاہد ثانیؒ اور الامام المحدث شاہ ولی اللہؒ کے علاوہ پورے اسلامی ہندوستان میں نہیں ملتی۔ اور اپنے زمانے میں عالم اسلام میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ اور پھر ان صاحبزادگان والا تبار کی اولاد بھی علم و فضل کے اعتبار سے کچھ نہیں رکھتی۔ اسی فیصلہ کے ایک فرد شاہ اسماعیلؒ شہید اور اسی خاندان کے تربیت یافتہ حضرت سید احمد شہیدؒ تو صحابہ کرامؓ کے بعد اپنے جہد و عمل اور ایثار و خلوص کی بدولت پوری امت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ بلا کسی تشبیہ و تمثیل کے اندام السلام کے سفید گروہ میں جو افتیازی مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا ہے۔ یہی مقام امت محمدیہؐ النبیۃ والاسلام میں خاندانی لحاظ سے شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کا ہے۔ اور پھر اسی خاندان کی معنوی و روحی اور مشائخ و اکابر و دیوبندیوں کے اس جماعت کے علمائے اپنے علم و فضل سے کتاب و سنت کی خدمات جلیلہ و عظیمہ کی جو تالیفات قائم کی ہے۔ اس کی مثال بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ اس جماعت کے آخری دور کے علماء و مشائخ میں سے ایک نام شخصیت حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی ہے۔ جن کا مختصر تذکرہ گذشتہ اوراق میں گذر چکا ہے۔ ۱۳۲۷ھ میں جب اس کا ترتیب شروع کی گئی تو ان دنوں حضرت مولاناؒ کے صاحبزادہ محمد یوسف صاحب بقید حیات تھے اور ہم نے ان کے تذکار کا قصد کیا تھا وہ سب واصل بحق ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب ۱۹۶۵ء میں اپنے عالم جا ملے اگر کتاب کی ترتیب یہ ان کے وصال کے بعد ہوئی تو حضرت مولاناؒ کی مبارک زندگی اپنے علم و عمل کے ساتھ سے یقیناً اس قابل تھی کہ ان کا مستقل تذکرہ اس کتاب میں کیا جاتا۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اپنے تمام علم و فضل کے باوجود ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ مگر ان کے فرائض اپنے گرامی قدر والد کی چلائی ہوئی تحریک کی قیادت و ادارت کرتے ہوئے عالمگیر شہرت کے مالک ہوئے۔ پچھلے دور دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جہاں تبلیغی جماعت کے افراد کے مبارک قدم نہ پہنچے ہوں پچاس برس کی عمر میں مولاناؒ

لے اس اجمال کی کسی قدر تفصیل کے لئے کتاب میں بڑے مسلمان ترتیب دی گئی ہے۔ (دارشہد)

۱۔ تاہم الفضل المتقدّم من سنّہ حسنۃ فذلّہ اجرہ و اجر من عمل بہا (الحديث) کہہ بھداق مولانا محمد یوسفؒ اور ان کے صاحبزادے خدمتہ اور فضل و شرف بھی انہی کا حصہ ہے اور نیک بیٹے کے احوال کے اجراء کو بھی برابر سے دیکھیں

میں میں نے بھی ایکس برس مولانا نے تحریک کی سیادت کی۔ لیکن برقی رفتار کی کارہ عالم تھا کہ
 ہیں مرد مجاہد کے بھی انداز مرالے رفتار قیامت کی ہے پاؤں میں ہیں چھپاے
 حضرت مولانا گفتار و کردار میں اس زمانہ میں اللہ کی برہان تھے۔ دریا و صحرا ان کی ٹھوکر سے دہم تھے پورا عالم
 ما و دو کے سامنے سمٹ کر رہ گیا تھا۔ ان کا اپنا کوئی ارادہ نہیں تھا کوئی خواہش ان کی اپنی خواہش نہیں تھی۔ وہ
 مبارک و تعالیٰ کے مقاصد و احکام کے میار و عو کاں تھے۔ ان کی پوری زندگی کتاب و سنت کی تبلیغ کے لئے
 تھی۔ ان کا مقصد زندگی ایک ہی تھا کہ غیر مسلم مادی آسائش اور زندگی کی راحت و آرام کے لئے جیتا ہے۔
 مٹی بھی نفسانی محبت بھی نفسانی۔ لیکن مسلمان کی تخلیق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہوئی ہے۔ وہ اللہ کی
 لئے جیتا ہے اور اسی کی رضا کی خاطر جان دیتا ہے۔ مادی اغراض اس کا مطمح نظر نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ
 میں بھی مسکراتے رہے جمالت مغربی تہذیب کی چکا چوندا اور راہ کی تاریکیاں ان کا راستہ نہ روک سکیں حالات کسی
 ی کو وہ کبھی خاطر میں نہ لاتے۔ تکلیف و مصائب کے پہاڑ ان کے زقار و تمکنت میں فرق نہیں ڈال سکے۔ وہ تاریکیوں
 کی شمعیں جلاتے۔ مردہ دلوں میں حیات تازہ دوڑاتے دنیاوی امور میں غرق انسانوں کو فکر آخرت دلاتے اور
 اخلاقی اقدار کو زندہ کرنے پر تے ایک تبلیغی سفر میں اس جہان سے اور اپنی جان سے گذر کر زندہ جاوید ہو گئے۔

نوٹ: جبے دونے ہم نے اسے کتاب کے لیے مشاہیر کا
 انتخاب کیا تھا۔ حضرت جبے ان دونوں بفضل تعامل بقید
 حیات تھے۔ اسے لیے اسے کتاب کے میںے تو ان کے مضمون تذکر
 نہ آسکا۔ البتہ اسے کہہ کر پورا کرنے کے لیے ہم نے حضرت
 کے متعلق اکیسے جامع کتاب تذکرہ مولانا محمد یونس
 دہلوی کے نام سے علیحدہ طبع کروائے جس میں حضرت
 جبے کے مضمون حالات درج ہیں۔

(ارشد)

مولانا محمد یوسفؒ اپنی تحریرِ دل کے آئینے میں (مکتوبات سے اقتباسات)

اللہ جل شانہ کی ذاتِ عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہِ راست استفادہ ہو اس کے لئے حضرت علیہ وسلم، اللہ کی طرف سے طریقے لیکر آئے ہیں جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہ ہر نکتے میں کام دکھائیں گے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں اپنے یقین اور اپنے جذبے اور اپنے طریقے بدلنے کا مطالبہ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہؓ کی نماز کو سنانا خود اپنی نماز کو اچھا کرنے کی مشق کرنا۔ اہتمام سے وضو کرنا، اوجھ قیام میں، تعدہ میں، رکوع میں اور سجدے میں بھی دھیان کم از کم تین مرتبہ جمایا جائے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں نماز کے بعد کہ اللہ کی شان کے مطابق نماز نہ ہوئی اس پر رونا اور کہنا کہ اے اللہ ہماری نماز میں حقیقت پیدا فرما۔

علم سے مراد یہ ہے کہ ہم میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو جائے میرے اللہ مجھ سے اس حال میں کیا چاہتے ہیں اور پھر اللہ کے ساتھ اپنے آپ کو اس عمل میں لگا دینا یہ ذکر کرتے۔

ہر مسلمان کا حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہوئے کے اکرام بھی کرنا ہے۔ ہر امتی کے آگے بچھ جانا، حقوق کو ادا کرنا۔ جو آدمی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ جل شانہ اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے جب تک آدمی بھائی کے کام میں لگا رہتا ہے اللہ جل شانہ اس کے کام میں لگے رہتے ہیں۔

ہر عمل میں اللہ جل شانہ کی رضا کا جذبہ ہو کسی عمل سے دنیا کی طلب یا اپنی حیثیت جانا مقصود نہ ہو اللہ کی رضا کے لئے عمل بھی بہت انعامات و لوائے گا اور اس کے بغیر بہت بڑے بڑے عمل بھی گرفت کا سبب بنیں گے۔

صحابہ کرامؓ ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلے ہیں۔ نکاح کے وقت اور رخصتی کے وقت گھر میں ولادت کے موقع پر انامو تعویذ سر دی میں، گرمی میں، بھوک میں، فلتے میں، صحت میں، بیماری میں، قوت میں، صفت میں، جوانی میں اور بڑھاپے

لگے ہیں۔ دین کے دوسرے اعمال کی طرح ہمیں یہ محنت بھی کرنی نہیں آئی۔ خود اپنے آپ کو قربانی کی ٹکڑوں اور ہجرت و زہدیت کے اعمال پر دعوت کے بعد دوسرا کام تعلیم کا ہے جب تک تعلیم کیلئے نہیں نواہے بیٹھیں۔ دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہوئے علم کی عظمت سے

فواصل کا اندازہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم فرمائی ہوئی دعائیں یاد کی جائیں جو وقت و دعوت اور تعلیم کے خالی ہوا دور کوئی دوسرا ضروری کوئی نہ ہو اس میں نوافل پڑھے جائیں یا قرآن مجید کی تلاوت کی جائے یا ذکر و تسبیح میں مشغول ہو جائے یا اللہ کے کسی بندہ کی خدمت میں جائے

پورے تبلیغی سفر میں بطور اصل مقصد کے گئے جائیں گے اور اتنے کئے جائیں گے کہ یہ عادت و مزاج بن جائے (اللہ کے راستے میں) چار ضرورت کے طور پر کئے جائیں گے اور صرف بقدر ضرورت ہی کئے جائیں گے وہ چار یہ ہیں: (۱) کھانا پینا (۲) اقتضائے حاجت (۳) سونا (۴) چار

کرنے۔ یا ناگزیر ضرورتیں ہیں ان کو بس اتنا ہی وقت دیا جائے جتنا ضروری اور ناگزیر ہو سوئے کیلئے دن رات میں بس پھر گھٹنے کا فی چار باتیں وہ ہیں جن سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے۔ (۱) کسی سے سوال نہ کیا جائے بلکہ کسی کے سامنے اپنی کوئی بات

بھی نہ کی جائے یہ بھی ایک طرح کا سوال ہے (۲) اشرف سے بچا جائے کہ زبان سے تو سوال نہ ہو لیکن دل میں طبع ہو کہ کسی بندہ کو بھیجئے (۳) اشرف فضولی حرجی سے بچا جائے (۴) بغیر اجازت کسی ساتھی کی بھی کوئی چیز استعمال نہ کی جائے۔

لے تا یہ مکتوب جو عمرہ کرنے والی جماعت کے نام لکھا گیا (ماخوذ عن الفرقان) (۵) راہِ خدا میں نکلنے والے قافلوں کے لئے ہدایت موعظ مولانا محمد یوسفؒ

قطب الانشا حضرت میر الانشاہ عبدالقادر اپری

۵۱۳۸۲
۶۱۹۶۲



۵۱۲۹۵
۶۱۸۷۸

سواد تحریز حضرت رات پوری

بکرم و محترم حضرت شہید علیہ السلام
 و قد خمدہ اللہ و السلاح علیکم ورحمۃ اللہ اتی مساندہ حضرت و
 انفسہ ہموکر تحریریت تمام مکانہ ہوا پورا پورا پور بفرست
 ایسی بیکہ حضرت ہی راہ الخیر کا
 کل صوفی نورانی و فطانی معلوم ہوا حضرت دیوبندی و
 و اعمال ہوگی و انالہ و انالہ و احسن و احسن و احسن
 ہم فرام کی امید و کفا تہ کرنا پس اب زندگی کا کفر
 اور بیکہ و تہریر و عیساکت و محسن و احسن و احسن
 عبد اللہ در اردہ و دیکھی ضلالت پورا دیکھی و حکم خدا کی

نضرہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری علیہ السلام

مولانا عبدالرشید صاحب ارشد کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت مرشدی عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ کا یہ سیرتی خاکہ زیر ترتیب کتاب "پس بڑے مسلمان" کے لئے تلمیذ کیا گیا ہے۔ حضرت کی مفصل سوانحی برادر مکرّم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ترتیب دی ہے جو لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ (محمد حسین)

جی لوگوں کو دین و علم میں رسوم و مصلح ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ دین کا ایک اہم شعبہ احسان و اخلاص ہے جو کہ تملہ و کے تمام اعمال کی روح ہے، اور یہ بھی مسلم ہے کہ دین کے اس شعبہ کی عدم مت و حفاظت اس امت کے بقا ت میں سے صوفیاء کرام نے سب سے بڑھ کر کی ہے۔ خیر القرون کے بعد دین کی اس روح اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے سیدنا مبارک کی امانت یعنی "نور عرفان" کو محبت و صحبت کے ذریعہ حاصل کر کے "محبت و صحبت" ہی کے ہ دوسروں تک منتقل کرنے اور اس روح اسلام اور نور عرفان کو دنیا میں باقی رکھنے کی جو سماجی جملہ صوفیاء کرام نے مان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس طبقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح جانشینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ پھر سے اس دور میں مشائخ دیوبند کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ تمام مشہور سلاسل طریقت کے فیوض و برکات اور ان بتیں ان کو حاصل ہوئیں، شیخ العرب والعجم حضرت حاجی ادا اللہ صاحب کی کے واسطے سے مشائخ چشت کا جذبہ درد ان و قنایمت حاصل ہوئی، خاندان ولی اللہی کے ذریعے نسبت نقشبندیہ اور اتباع سنت کا ذوق نصیب ہوا اور کبر حضرت سید احمد شہید کے واسطے سے مجاہدانہ اور سرفروشانہ سپرٹ (SPIRIT) ملی، عشق و طریقت اور شریعت باہر ہاد کے اس سین امتزاج نے میخانہ شیرب کی شراب اخلاص و عرفان کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ کر کے حلقہ دیوبند کے متوالوں کو ایک امتیازی شان بخش دی ہے اور اب بجا طور پر ان کے متعلق کہا

انکا ہے سہ

برکے جام شریعت برکے سندان عشق
ہر ہوسنا کے ندانہ جام و سندان باخق

انہی مشائخ دیوبند کی آخری نشانی سیدنا و مرشدنا حضرت مولانا الشیخ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ -
انام مشائخ متقدمین و متاخرین کی نسبتوں کے جامع اور امین تھے، جن کے مقدس چہرہ کو دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ
عزت البکر شہلیؒ اور حضرت ابراہیم ادہم بلخیؒ کی نورانی صورتیں چشم تصور کے سامنے آجاتی تھیں۔ مجلس مبارک میں جب
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ و ملفوظات پڑھے جاتے تھے تو وہ بہو حضرت غوث الاعظمؒ کی مجالس

کا نقشہ کچھ جاتا اور جب موجودہ اسلامی و ملکی سیاسیات پر گفتگو ہو رہی ہوتی تو سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہ
ادریش، الہند مولانا محمود حسنؒ کی یاد تازہ ہو جاتی۔ علماء کرام کے مجمع میں جب علمی نکات بیان کئے جا رہے ہوتے
وقت خاندان ولی اللہی کے درس کی کیفیات کا نقشہ سامنے آ جاتا، اور جب اذکار و اشغال اور مراقبات کی تلقین
جا رہی ہوتی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فیوض و برکات کے آثار نمایاں ہوتے، جب کبھی کوئی نووارد حضرت
کے ہاں ہمان بن کر آتا تو اسی رات کے بعد اطراف و جوانب سے ذکر اللہ کی پیہم صدائیں سن کر اسے حضرت کی تیار
پیر شیخ کبیر شیخ فرید الدین گنج شکرؒ اور شاہ ابوالعالی قادری کی خانقاہوں کا گمان ہوتا۔ وسیع دسترخوان، کامل توکل و
اور عالمگیر اخلاقی و مروت کو دیکھ کر حضرت محبوب الہی خواجہ نظام الدین دہلویؒ کی خانقاہ کا سماں اہل بصیرت کی آنکھوں
کے سامنے آ جاتا غرضیکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس دور کی ایسی جامع الصفات شخصیت تھی جس نے ہندو پاکستان کے
المزاج اور مختلف الاستعداد مریدین و متشرعین کی رائے پور کی خانقاہ میں بیٹھ کر تربیت فرمائی اور نصف صدی تک
مشائخ سلاسل کی یاد کو تازہ رکھا اس مختصر تمیذ کے بعد حضرت کی زندگی کا ایک اجمالی نقشہ ذیل میں کھینچا جاتا ہے کہ
مضمون میں شرح و بسط کی گنجائش نہیں ہے :

ولادت و خاندان

حضرتؒ کے آباد و اجداد کا اصلی وطن موضع تھوہ محرم خان ضلع کیمیل پور درمنی پاک
ہے، حضرتؒ کے والد ماجد حضرت حافظ احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے تین بھائیوں کے
تھوہ محرم خان سے موضع ڈھڈیاں ضلع سرگودھا میں آکر آباد ہوئے، اس خاندان میں کئی پشتوں سے علم و تقویٰ کی
آرہا تھا۔ حضرتؒ کے تایا مولانا کلیم اللہؒ حضرت اخوند صاحب صوات والوں کے غلیفہ تھے اور عوام میں ٹوپی والے
نام سے مشہور تھے، حضرتؒ کے ایک دوسرے تایا مولانا محمد احسنؒ ہمت بڑے عالم تھے اور علم کے ایسے شہید تھے
دینی کتب کے حصول کے لئے اگر اپنے گھر کا سارا اثاثہ بھی قربان کرنا پڑتا تو اس سے دریغ نہ فرماتے۔ حضرتؒ کے
ماجد حضرت حافظ احمدؒ نے تمام عمر قرآن پاک کی خدمت کی، ہزاروں کو قرآن مجید کی تعلیم دی اور ساری عمر اپنے
کاشت کاری کر کے طیب و پاکیزہ روزی حاصل کی اور اس سے اپنی اور اپنے خاندان کی پرورش کی حضرتؒ کی
موضع ڈھڈیاں میں ۱۲۹۵ھ کے قریب ہوئی۔

تعلیم و تربیت

حضرتؒ کے تایا مولانا کلیم اللہؒ کھیوڑہ ضلع جہلم میں رائٹس رکھتے تھے، انہی کے پاس رہ کر
نے سب سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا اور فارسی کے چند رسالے انہی سے پڑھے، صرف
کتا میں مولانا محمد رفیق صاحب مجاڈریاں ضلع سرگودھا والوں سے پڑھیں، مولانا محمد رفیقؒ قطب الارشاد
رشتید احمد گنگوہیؒ کے تلمیذ تھے۔ بعدہ علمائے سلف کی طرح رحلت کا مرحلہ پیش آیا اور شوق علم نے اپنے
اور اعزہ و اقارب کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا چنانچہ بچپن ہی میں تحصیل علم کے لئے ہندوستان کا لمبا سفر کیا اور قلعہ
سے ہونے ہوئے رام پور پہنچے کچھ عرصہ وہاں رہ کر درس نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر پانی پت، سہارن
کے مقامات پر قیام کر کے درس نظامی کی تکمیل کی اور منطق و فلسفہ میں مہارت حاصل کی۔ حدیث کی کتابیں مدر

دہلی میں مولانا عبدالعلیؒ سے پڑھیں، مولانا عبدالعلیؒ مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے شاگرد تھے، دہلی کے قیام کے دوران ہی بخاری و فتوح حضرت مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں حاضر ہو کر ترمذی شریف کے چند اسباق کی سماعت کی۔ بچپن ہی سے حضرتؒ کی طبیعت بہت فانیہ واقع ہوئی تھی، جہاں کہیں بھی رہے جو کچھ میسر آ گیا اُسی پر زحمت کی، اساتذہ یا کسی اور دوست اکشنائے کبھی اپنی کسی تعلیف کا اظہار نہیں کیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں حضرتؒ نے بڑی بڑی مشقیں اور تکلیفیں اٹھائیں، خود فرمایا کرتے تھے ”جب میں رام پور سے دہلی گیا تھا صرف ایک انکھی میرے پاس تھی، تمام راستہ پیدل طے کیا تھا، گلے کے جننے لے کر چلائے تھے اور ٹکڑی والوں کو دوسے کر دیا عبور کیا تھا“ حضرتؒ کے متعلقیں سے یہ بھی سنا ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں کئی کئی وقت کا فاقہ برداشت کر لیتے تھے لیکن کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ منطق و فلسفہ اور فقہ و حدیث کی تکمیل کے بعد حضرتؒ نے طب یونانی کی باقاعدہ تحصیل کی اور ضلع بجنور کے ایک قصبہ افضل گڑھ میں مطب بھی کیا، کچھ عرصہ بریلی اور دوسرے مقامات پر رہ کر قرآن و حدیث کا درس بھی دیا لیکن حضرتؒ کی بے چین طبیعت کسی حال میں بھی مطمئن نہ ہوئی۔ فرماتے تھے میرے والد ماجد چاہتے تھے کہ میں ایک بڑا مولوی اور واعظ بنوں لیکن میری طبیعت اس طرف نہیں چلتی تھی اور طبیعت میں ایک خلش تھی جو کہیں چھین نہیں لینے دیتی تھی۔

تلاش حق علم کلام کی موٹگائیوں اور منطق و فلسفہ کے سمات (AXIOMS) سے جب کسی طرح طبیعت کی خلش دور نہ ہوئی تو ”جوہر الاسلام“ حضرت امام غزالیؒ کی کتاب ”المنقذ من الضلال“ کا مطالعہ کیا، اس سے متاثر ہو کر طبیعت نے یہ فیصلہ کیا کہ اندرونی غلش کا علاج اگر کہیں ہے تو صرف صوفیاء کرام کے پاس ہے اور صوفیہ کے بارے میں امام غزالیؒ ہی کی طرح حضرتؒ کے دل و دماغ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ:

انہیں (صوفیہ) کی سیرت خوب تر ہے، انہیں کا راستہ زیادہ سیدھا ہے اور انہیں کے اخلاق زیادہ پاکیزہ ہیں، بلکہ اگر تمام عقلا کی عقلیں، سب علماء کی دانیاں اور علماء شریعت اور واقفان دین کے علوم اکٹھے کئے جائیں تب بھی اس قابل نہ ہوں کہ ان کے اخلاق و سیرت کے مقابل میں کسی اخلاق و سیرت کو پیش کر سکیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تمام حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے روشن ہیں اور نور نبوت کے علاوہ دوسرے زمین پر اور کوئی نور ہے ہی نہیں جس سے روشنی حاصل ہو سکے۔

ان سیرتھم احسن السیر وطریقہتھم اصوب الطریق و اخلاقتھم اذکی الاخلاق بل لوجمع عقل العقلاء و حکم الحکماء و علم الواقفین علی اسرار الشرع من العلماء لیغیروا شیئاً من سیرھم و اخلاقتھم و یبدلوا بہما ہو خیر منہ لم یجدوا الیہ سبیلًا وان جمیع حرکاتھم و سکناتھم فی ظاہرھم و باطنھم مقتبسة من نور مشکوٰۃ النبوة و لیس وراء نور النبوة علی وجه الاضواء نورٌ یتضاء بہ۔

(المنقذ من الضلال ص ۳)

(امام غزالیؒ کے تغیر حال اور نظامیہ بغداد کی صدارت کو چھوڑ کر نقضوت کے دامن میں پناہ لینے کا مفصل واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ بڑے مزے سے اپنی مجالس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور اس طرح ”سیر دلبران“ کو ”حدیث دیگران“ کی صورت میں ظاہر فرماتے تھے)

آخر عنایت ربانی نے دستگیری فرمائی اور دوس و تدریس کے مشاغل کو چھوڑ کر تلاشِ حق میں دیوانہ وار نکل کھڑے ہوئے اور ایک عرصہ تک سرگرداں رہے حتیٰ کہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ کی خدمت میں پہنچے، بڑے حضرتؒ کو سلسلہ قادریہ نقشبندیہ میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارن پوری نے اجازت و غلافت حاصل معنی، اور سلسلہ چشتیہ مبارکیہ اور نقشبندیہ میں قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے، اور اس وقت کوہ شوالک کے دامنِ قصیدہ رائے پوری میں ہر کے کنارے ایک باغ میں متوکلاذ گزراں کر کے طالبینِ حق کی تربیت میں مصروف تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی حضرت عالیؒ کے اخلاق کو دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لئے انہیں کا ہجو رہنے کی تمنا کا اظہار کیا اور بیعت جوئے کی درخواست کی۔ اس وقت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بقید حیات تھے، بڑے حضرتؒ نے حضرتؒ کو گنگوہ حاضر ہونے کا مشورہ دیا لیکن حضرتؒ نے عرض کیا کہ مجھے جناب ہی سے پوری مناسبت ہے میں اور کہیں جانا نہیں چاہتا فرمایا اچھا! اتنی کیا جلدی ہے استخارہ وغیرہ کر کے اپنی طبیعت کا اطمینان کر لیں۔ چنانچہ ذکر وغیرہ بتلاک حضرتؒ کو رخصت فرمادیا۔ حضرت والا اپنے وطن تشریف لے آئے اور چند روز وطن میں قیام کر کے دوبارہ ہندوستان کا سفر کیا۔ اتفاق سے بھیرہ کے حکیم نور الدین سے کہیں ملاقات ہو گئی تھی چونکہ حضرتؒ کا ہم وطن تھا اس لئے حضرتؒ کو قادیان آنے کی دعوت دی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ میں ہندوستان جاتے ہوئے قادیان سے ہو کر گیا، وہاں حکیم نور الدین سے ملاقات ہوئی، اس وقت تک مرزا نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اور اس کی خوشناما تحریروں کی وجہ سے ملک میں اس کا عام چرچا تھا، لیکن اس کے مریدوں کو دیکھنے کے بعد میرے دل میں یہ آتا تھا کہ میں نے پہلے جس شخص (حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ) کو دیکھا ہے حق تو اسی کے ساتھ ہے اگر وہ شخص حق پر نہیں ہے تو پھر دنیا میں

سلسلہ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم قدس سرہ رائے پوری۔ اصل وطن موضع تگرہی متلع ایالہ ہے۔ بعد میں موضع رائے پور متلع سہارن پور کو منت اختیار کر لی تھی۔ اپنے زمانہ کے اولیاء کبار میں سے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور حضرت شیخ الحدیث کے مقصد حاصل تھے۔ شیخ الحدیث کے جج پر جاتے اور ذاتِ اربابا کے زمانہ میں ان کی چلائی ہوئی تحریک کی سرپرستی اور قیادت اپنی کے ذمہ تھی۔ پہلے شاہ عبدالرحیم سہارن پوریؒ سے بیعت ہوئے۔ اور سلسلہ قادریہ میں ان سے خلافت ملی اور ساری عمر یہی نسبت غالب رہی۔ بعد میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہوئے اور دوچار بڑے خلفاء میں شمار ہوئے۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند از مفتی عزیز الرحمن)

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہ نے بیعت ہونے کے لئے خط لکھا تو تحریر فرمایا ————— ”حدیث میں آتا ہے المتشارعون“ میں آپ کو لکھتا ہوں کہ میں کوئی چیز نہیں ہوں آپ میں تو طلب ہے مجھ میں یہ بھی نہیں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی طرف رجوع کریں۔ طالبِ صادق نے اس کے جواب میں مکرر لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو جو کچھ ملا حضرت گنگوہیؒ سے ملا۔ مگر میرا رحمان آپ کی طرف ہے

میری طرف سے اگر ہمدانہ کی لکھ رہے تو میرے حقوق حضرت کے ذمہ نہیں ہیں۔ میں اپنے طعام و قیام کا خود ذمہ دار ہوں۔

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ نے خط لکھ کر بہت خوش ہوئے لوگوں کو یہ خط دکھایا اور فرمایا — دیکھو یہ ہیں طالب۔ اخیر کے رمضان میں دونوں وقت کا کھانا چھوڑ دیا تھا۔ رات کا کھانا تو رمضان میں پہلے بھی شکلاتے تھے۔ ساری رات صبح تک قرآن مجید سنتے صبح سویرے کے وقت سادی چائے کا ایک گھونٹ اور بالکل ذرا سا ایک نوالہ چائے کا سنت کی خاطر اور ثواب کی خاطر کھا لیتے مولانا شاہ عبدالقادرؒ جو خدمت کرتے تھے تین چار روز تک عزم کرتے رہے کہ حضرت کچھ نہ کچھ تو تناول فرمایا کریں اس طرح صفت بہت بڑھ جائے گا۔ تیسرے چوتھے روز فرمایا — مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذائقہ نصیب فرمادیا ہے اس کھانے کی ضرورت نہیں۔ (سوانح حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور الحسن علی ندویؒ)

موت کا بہت شوق تھا بڑے ذوق سے فرمایا کرتے کہ اگر اللہ تعالیٰ وہ وقت نصیب فرمائے۔ سنت کے مطابق تجہیز و تکفین کرنا۔ ایک دن فرمایا کہ کوئی عمل تو ہے میں خبر نہیں موت کا شوق کیوں ہے۔

نکاح بیوگان کے سلسلہ میں بہت کوشش کرتے تھے۔ خود اپنا نکاح بیوہ سے کیا۔ صاحبزادہ عبدالرشید کا انتقال ہو گیا تو بہو کو سمجھایا کہ دوسرا نکاح ضرور کرنا چاہیے۔ پھر عبدالرشید کے خسر کے پاس گئے اور اس کو بھی سمجھایا۔ عبدالرشید کا نام آنے پر وہ رونے لگے تو فرمایا — حاجی عبدالعزیز! رونے کا مقام ہے یا ہنسنے کا؟ آج خدانے وہ دن نصیب فرمایا ہے کہ اس کے محبوب کی مردہ سنت ہم ناکا رہ گئے گا روں کے ماحقوں زندہ ہو یہ سنی کی کھجور کا وقت ہے کہ اتفاق سے میسر آگیا ہے، پس لوٹ لو جتنا لوٹنا ہے نہ ہوتا عبدالرشید پیدا کیا نکاح سے قبل ہی مر جاتا تو ہم کیا کرتے اور کیوں کر یہ نعمت پاتے۔ بہو کا دوسرا نکاح ہوا اور خود بھی اس میں شریک ہوئے حالانکہ اپنے بیٹے عبدالرشید کے نکاح میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے احباب کو بھیج دیا تھا۔ (تاریخ مشائخ دیوبند)۔

وفات سے قبل حضرت مولانا شاہ عبدالقادر قدس سرہ کو بلایا اور جو روپیہ ان کے پاس لنگر کے خرچ کا تھا سارا تقسیم کر دیا۔ تاکہ نہ کہے۔ (سوانح حضرت رائے پوریؒ)

حضرت مولانا محمد عبداللہ دھرم کوئی مدہ کی روایت ہے کہ اپنے جسم پر جو کپڑے تھے وہ بھی وفات سے قبل حضرت ہی کی ملک کر دئے اور فرمایا — کہ اب میں تم سے مستعار لیتا ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ اپنے اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ کسی چیز کی ملکیت کی نسبت میری طرف ہو۔

حضرت مولانا غلیل احمد محدث سہارن پوریؒ نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے اور دنیا میں اندیرا چھا گیا ہے۔ بدحواسی ہو کر رائے پور پہنچے تو دیکھا کہ آخری سائیں جاری ہیں۔ اپنے چھپے تین خلیفہ چھوڑے جو تینوں کے تینوں رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو وفات پائی اور رائے پوری مدفون ہوئے۔ حضرت مولانا اشرف بخش بہاول نگر ی۔ ۱۰ رجب ۱۳۵۵ھ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء حضرت منشی رحمت علی باندھری ۲۱ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ قدس سرہ۔

حضرت مولانا غلیل احمد محدث سہارن پوریؒ نے خواب دیکھا کہ آفتاب غروب ہو رہا ہے اور دنیا میں اندیرا چھا گیا ہے۔ بدحواسی ہو کر رائے پور پہنچے تو دیکھا کہ آخری سائیں جاری ہیں۔ اپنے چھپے تین خلیفہ چھوڑے جو تینوں کے تینوں رشد و ہدایت کے آفتاب تھے۔ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۹ جنوری ۱۹۱۹ء کو وفات پائی اور رائے پوری مدفون ہوئے۔ حضرت مولانا اشرف بخش بہاول نگر ی۔ ۱۰ رجب ۱۳۵۵ھ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء حضرت منشی رحمت علی باندھری ۲۱ جمادی الاول ۱۳۵۵ھ۔ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ قدس سرہ۔

حق کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں سے بھاگا اور سیدھا رائے پور پہنچا، حضرتؒ نے بیعت فرمایا اور ذکر اذکار کی تلقین فرمائی، فرماتے تھے، ایک روز میرے حضرتؒ نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارا بچے بھی کوئی ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں میرے والدین ہیں، بھائی بہن اور رشتہ دار موجود ہیں فرمایا ادھر! میں تو چاہتا تھا کہ زندگی کے دن اکٹھے ہی گزاریں گے! عرض کیا حضرت! میں ایسے ہی ہوں جیسے کسی کا کوئی نہ ہو۔ اگرچہ میرے سب رشتہ دار موجود ہیں لیکن میں نے سب سے یکسو ہو کر حضرت ہی کا ہو رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یسین کر حضرتؒ نے بہت خوشی کا اظہار فرمایا!

ریاضت و مجاہدہ رائے پور کی خانقاہ کے قیام کے دوران میں حضرتؒ نے بڑا مجاہدہ کیا، طالب علمی کے زمانے کے مصائب بھیلنے سے پہلے ہی بہت کچھ تزکیہ نفس ہو چکا تھا۔ اب شیخ طریقت کی رہبری میں سلوک کی باقاعدہ منزلیں طے کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ بڑے حضرتؒ بالکل متوجہ گزار کر تے تھے اور رائے پور کی خانقاہ کا وہ زمانہ نہایت عسرت کا زمانہ تھا، عام طور پر کئی، باجرے یا چنے کی خشک روٹی کھانے کو ملتی تھی حضرتؒ فرماتے تھے ”روٹی پکانے والے نہایت لاپرواہی سے روٹی پکاتے تھے اور کچی کچی مل جاتی ہم اسی پر گزارہ کر لیتے، ایک بار خیال آیا کہ حضرتؒ بے اس کی شکایت کریں لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں حضرتؒ یہ نہ فرما دیں کہ یہاں تو یہی کچھ ہے اگر اچھی روٹی کھائی ہے تو کہیں اور نشریت لے جائیے یہ سوچ کر خاموش ہو گئے“ متواتر کئی سالوں تک خشک روٹی کھانے اور اس کے ساتھ ساتھ پیروں ذکر بالجہر کرنے کی وجہ سے حضرتؒ کو مختلف اقسام کے امراض لاحق ہو گئے جن کا اثر آخری دم تک رہا لیکن ہمیشہ صبر و انتقامت کے ساتھ یا دِ حق اور خدمتِ شیخ میں مصروف رہے۔ ذکر اذکار کے ساتھ ساتھ بڑے حضرتؒ کی خدمت بھی حضرتؒ ہی کے دتے تھی اور رات دن میں آرام کرنا بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ فرماتے تھے ”پہلے پہل جب میں رائے پور گیا میرے پاس کوئی بستر نہیں تھا۔ سردیوں کا موسم آیا تو میں نے خانقاہ کے چیمبر کے ایک کونے کو صاف کر کے اپنے لئے مسونے کی جگہ بنائی اور ایک پھٹا پڑا نامل کیس سے دستیاب ہو گیا جس کو میں نے دھو کر صاف کر لیا، اُسی کو میں آدھا نیچے بچھا لیتا اور آدھا اوپر اوڑھ لیتا تھا“

ان تمام مرحلوں کو حضرتؒ نے بڑی خندہ پیشانی سے طے کیا اور کبھی کوئی سحرف شکایت دہلن پر نہیں لائے بڑے حضرتؒ کی توجہات بھی ہمیشہ حضرتؒ پر مرکوز رہیں اور آخری دم تک حضرتؒ سے راضی رہے۔ بوقتِ نماز حضرتؒ کو اپنا خلیفہ وجائیشین بنایا اور رائے پور قیام رکھنے کی تلقین فرمائی۔

مسند ارشاد پر جلوہ افروزی چھوہ پندرہ سال مسلسل حضرت عالی کی خدمت میں رہ کر اور سخی مجاہدات کر کے سلوک کی انتہائی منزلیں طے کیں اور چاروں سلسلوں کے فیوض و برکات حاصل کئے، پھر نکو بڑے حضرتؒ پر نسبت نقشبندیہ قادریہ کا غلبہ تھا اس لئے حضرتؒ بھی اس رنگ میں رنگے گئے آخر ۲۶ ریح الثانی ۱۳۳۶ھ کو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا حضرتؒ مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور پورے پینتالیس سال تک روٹی تلقین و ارشاد کا باعث بنے۔ بعد ازاں حضرتؒ کو بڑی مشکلات کا سامنا ہوا لیکن فضل خداوندی نے ہر حال میں دستگیری فرمائی اور کبھی پائے انتقامت

آئی۔ فرماتے تھے ”حضرت عالی کے وصال کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ قوتِ لامبوت حاصل کرنے کے لئے کر سہارن پور جا کر پیرج آگیا کروں گا اور اپنے کام میں مشغول رہوں گا لیکن الحمد للہ کہ ایسی نوبت کبھی نہیں آئی کہ فضل سے ہمیشہ غیب ہے روزی کے تمام سامان جیتا ہوتے رہے۔“

بیتائیس سال کے اس عرصہ میں دنیا میں سیکڑوں انقلابات رونما ہوئے، اسلامی ممالک کے حصّے بخرے ہوئے، شہنشاہیت کا نہ عزوب ہونے والا سورج آخر عزوب ہو گیا، برصغیر پاک و ہند نے برطانوی سامراج کی غلامی سے اپائی، بیسیوں مذہبی و سیاسی تحریکیں چلیں، بہی خواہان ملک نے ہزاروں رنگ بدلے، درویشانِ توہم نئے نئے اور طرح طرح کے لباسوں میں ظاہر ہوئے۔ نام نہاد مشائخ و سجادہ نشینان نے عوام کو خوب خوب بھونٹا اور دنیا کو لوٹا مگر وہاں سے پیکرِ صدق و اخلاص کبھی بھولے سے بھی شہرت و ناموری کی خواہش نہیں کی اور دنیا کے فائدات کو عمر بھر نظر اتفاقات سے نہیں دیکھا۔ دنیا کی کوئی چیز جتنی کہ استعمالی پارچات تک کبھی اپنی ملکیت میں نہیں رکھنے دینا بل دنیا سے بے عرض ہو کر اپنے مالک کے آستانہ پر جس توکل و تبطل کے ساتھ سر رکھا تھا، ہمیشہ اسی طرح رکھے اور بزبانِ حال یہ کہتے رہے۔

وہ تیری گلی کی قیامتیں کہ لمحہ سے مڑے نکل پڑے یہ میری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی عمل و اخلاص سے خلقِ محمدی کو دنیا میں عام کیا اور اشاعت و ترویج میں ہر ممکن کوشش کی، سینکڑوں علماء کو اپنی منازل طے کرائیں، لاکھوں مسلمانوں کو فقی و فخر اور بدعات سے توبہ کرائی۔ علاوہ ازیں ہر طبقہ کے لوگوں کو باریوں، ملازموں، ادیبوں، شاعروں، مقررین اور سیاستدانوں کو اپنے اخلاق و محبت سے اپنا گرویدہ بنائے اور ہر ایک کی استعداد کے مطابق سب کی اصلاح و تربیت فرماتے رہے، سیاسی لیڈروں کی اپنی خداداد سیاسی برکت سے رہ نائی فرمائی، جمعیتہ العلماء، کانگریس، احرار، مسلم لیگ اور دوسری مذہبی و سیاسی جماعتوں کے لیڈرین، نادک موافق پر نہایت مناسب ہدایات دیں جن پر عمل کرنے سے ملک و قوم کے حق میں نہایت مفید نتائج کا ظہور آگئی ایک دینی منتہی کی روک تھام کی اور اہل حق و صداقت کی ملائی ہوئی شمع کو آخر دم تک روشن رکھا۔

حضرت کے حکامِ اخلاق کی پوری تصویر تو حضرت کی مستقل سوانح حیات ہی میں مل سکتی ہے۔

یہاں حضرت کے چند نمایاں اوصاف کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

کامِ اخلاق

عالی ظرفی اور عالمگیر مروت

یوں تو حضرت کے سارے ہی اخلاق و عادات خلقِ محمدی کے پورے پورے آئینہ دار تھے لیکن سب سے نمایاں وصفت جسے ہر کردار و مسموس کرنا تھا حضرت کی عالی ظرفی اور عالمگیر اخلاق و مروت کا ہے جس کی بدولت حضرت کے اندر ایک ایسی مقناطیسی کشش معلوم ہوتی تھی جو انسانوں کو بے اختیار کر کے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی اور اپنا والدِ دشیدا بنائے رکھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کے متوسلین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ہندو پاکستان کا کوئی کونہ ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی ہواد

موجود حضرت کے واسطے ایسی کثرت کو حاصل دہوئی وجہ ہے کہ حضرت کے متوسلین میں ہر قسم اور ہر قاش کے لوگ مل جاتے ہیں حضرت کی مجلس مبارک میں ہر بار امتضا

نیالات رکھنے والوں اور مختلف المذاہب انخاص کو ایک جگہ جمع دیکھا ہے۔ ایک ہی مجلس میں ایک طرف کچے لیگی بیٹھے اور دوسری طرف کٹر کانگریسی، ایک طرف احراری رہنماؤں کا حلقہ ہے اور دوسری طرف جمیعت العلماء کے مشائخ جلوسہ ہیں۔ احرار رہنما سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور کانگریس اور احرار کے مشہور لیڈر مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ جو حضرت ہی کے دامن سے وابستہ تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے رہنما صوفی عبدالحمد صاحب (سابق وزیر زراعت پاکستان) کو حضرتؒ نے ہی کا خادم خاص ہونے پر ناز ہے۔ آزاد فتح پوری اور مولانا عبدالمنان دہلوی جیسے قادر الکلام شعرا اور مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے وسیع النظر ارباب کو حضرتؒ نے ہی کے استاذ مبارک پر سہرا دات ختم کیا کا فخر حاصل ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارن پوری، استاذ العلماء مولانا محمد ابراہیم صاحب میاں چنوں والے، مولانا عبدالعزیز صاحب رائے پوری، مولانا محمد صاحب الوری لائل پوری اور استاذی حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب دھرم کوٹیؒ جیسے مقدس ومتقی علماء آپ کو حضرتؒ نے ہی کی مجلس مبارک میں بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے ان کے ساتھ ساتھ بدنام کنندہ ٹکوتا مان راقم السطور جیسے تنگ اسلاف کو بھی آپ حضرتؒ کے دامن عقوب میں پناہ ہوئے پائیں گئے۔

بڑے بڑے مشائخ اور علماء و صلحاء اور علماء کی سیرتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے عالی ظرف و عالی استعداد جن کے ہاں ہر چیز کی سمائی ہو دنیا میں بہت ہی قلیل لوگ ہوئے ہیں۔ حضرتؒ کا معمول تھا کہ مجلس میں جس کوئی آدمی آجاتا حضرت والاؒ اس سے اس کے مزاج اور افتاد و طبیعت کے مطابق ہی گفتگو فرماتے۔ راقم السطور کا حال اجداد و چشتی تھے اس لئے جب کبھی حاضر خدمت ہوتا حضرت رحمۃ اللہ علیہ مشائخ چشت کا تذکرہ فرماتے۔ ایک دفعہ استاد فرمایا کہ ”مشائخ کی دو خصوصیات ایسی ہیں جو انہی کا حصہ ہیں ایک تو عشق و محبت ہے اور دوسری جذب و فطانت“ اس لئے میں احقر نے اپنی کتاب تذکرہ سلیمان تونسویؒ کا ایک نسخہ حضرتؒ کی خدمت میں رائے پور تشریف روانہ کیا ہے۔ حضرتؒ نے مجلس میں پڑھوا کر سنا، جب آخری دورے میں پاکستان تشریف لائے اور راقم السطور حاضر خدمت ہوا تو فرمایا ”میں نے آپ کی کتاب سنی ہے ماشاء اللہ خوب لکھی ہے، پھر فرمایا ”ہمارے تو سارے ہی بزرگ ہیں، خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ خواجہ شمس الدین سیالویؒ اور پیر مرعلی شاہ گولڑویؒ جیسے کو ہم ملتے ہیں اور یہ سب نہایت سچے لوگ تھے۔“

بعض اوقات صاحب استعداد مریدین کی حقیقی استعدادوں کو اجاگر کرنے کے لئے ان کے کسی صحیح وصف کی ان اوقات ان میں پایا جاتا تعریف فرماتے اور اس طرح ان کو اپنے ساتھ جوڑ کر نہایت حکیمانہ طور پر ان کی تربیت فرمانے۔ ہم مہر نفسیات ڈیل کارینکی نے اپنی مشہور عالم کتاب ”میٹھے بول میں جادو ہے“ میں لوگوں کو دوست بنانے کا ایک اصول بھی لکھا ہے کہ ہر شخص کی جائز تعریف کیجئے اور اسے دوست بنائیے۔ عجیب بات ہے کہ اس قسم کے تمام اصول جو اخلاق کے ماہرین بڑی کدو کاوش کے بعد محض علمی طور پر دینا کے سامنے پیش کرتے ہیں کم علمی طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے اسوۂ حسنہ میں مل جاتے ہیں لیکن افسوس کہ لوگ انہوں کو چھوڑ کر غیروں کے دروازوں پر ہاتھ مارنے لگتے جاتے ہیں جو خود اخلاق و عمل سے عاری اور اس معاملہ میں دوسروں کے محتاج ہیں اور جن کے پاس تھوڑا بہت جو

یہی ہے ہمارے ہی گھر (اسلام) سے مستعار لیا گیا ہے یا چرایا گیا ہے۔

سیاسی بصیرت، عالی دماغی اور سلامت فہم

حضرت کا دوسرا نمایاں وصف حضرت کی خدا داد

فہم و فراست، عالی دماغی اور سیاسی بصیرت کا ہے نصف صدی کی موجودہ اسلامی سیاست پر حضرت ہمت گیری نظیر رکھتے تھے، اس دور کی تمام تحریکوں، سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق ایسی چچی سچی رائے رکھتے تھے جس سے زیادہ مقبول و مناسب رائے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مدبر بھی قائم نہیں کر سکتا۔ زمانہ حال میں دنیا کے تمام اسلامی ممالک نے جن میں ابتدائی حالات کا سامنا کیا سب کی تاریخ حضرت کے حافظہ میں پوری طرح محفوظ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مسٹر محمد علی جناح، پنڈت نہرو اور گاندھی وغیرہ اس دور کے بڑے سیاست دان مانے جاتے ہیں ان لوگوں نے کچھ تو اپنی ذہانت اور کچھ سیاسی تجربات سے سیاسی بصیرت حاصل کی۔ یہ لوگ عملاً سیاست کے میدانوں میں اتر کر مٹھ کر سیں کھانے اور نشیب و فراز کا تجربہ کرنے کے بعد مدبر بنے لیکن حضرت نے دنیا سے الگ تھلک خانقاہ کے ایک گوشے میں زندگی گذاری، نہ کبھی کسی ماہر سیاست کی شاگردی اختیار کی اور نہ کوئی سیاسی جماعت بنا کر کوئی عملی تجربہ کیا اس کے باوجود حضرت کا ذہن سیاسی معاملات میں وہاں تک پہنچتا تھا جہاں تک بڑے بڑے سیاستدانوں کے افہام کی رسائی ناممکن ہے اور یہ نتیجہ ہے ریاضات و مجاہدات کے ساتھ ساتھ کامل اتباع سنت کا جسے اگر کوئی چاہے تو علم لدنی کا نام دے لے۔

حضرت نے اپنی مومنانہ فراست سے ہمیشہ سیاسی زعماء کی رہبری فرمائی، جمعیۃ العلماء، مجلس احرار اسلام اور کانگریس وغیرہ کے بعض لیڈروں کو برونق و ترقیت میں مشورے دئے گو خود عملاً سیاست کے میدان میں بھی نہیں اترتے تاہم سیاسی معاملات میں ہمیشہ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی ہمتی کی اور بارہا فرمایا کہ ہم تو حضرت مدنی کے ساتھ ہیں، حضرت مدنی کو بھی حضرت کے ساتھ ایسا اخلاص تھا کہ ہر اہم قدم اٹھاتے وقت حضرت سے مشورہ لیتے اور اکثر حالات میں اس پر عمل کرتے۔

اس سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ حضرت کی سلامتی فہم بھی اس درجہ کی تھی کہ کبھی فکری مبالغے سے کام نہیں لیا، جس چیز کا جو مقام و درجہ ہوتا اس کو اسی درجہ میں رکھتے، نہ کبھی سیاسیات کے معاملے میں افراط سے کام لیا اور نہ کبھی عبادات و معاملات کے معاملے میں تفریط سے، نہ کبھی عشق و محبت کے پہلو پر انہی توجہ دی کہ دین کے دوسرے پہلوؤں سے بالکل اغماض ہی ہو جائے اور نہ کبھی خشک فقہیت ہی کو اتنا درجہ دیا کہ اخلاص و احسان اور زوق و شوق کے جذبات بالکل مردہ ہو کر رہ جائیں۔ ایسی سلامتی فہم صرف انبیاء و کرام ہی کو نصیب ہوتی ہے جن کی پوری زندگی کا نئے پڑتلی ہوئی ہوتی ہے یا پھر ان لوگوں کو جن کے قلوب و ادراج کو انبیاء علیہم السلام کے قلوب و ادراج سے پوری پوری مناسبت ہوتی ہے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور ایسے جامع الصفات لوگ صدیوں کے بعد وجود میں آیا کرتے ہیں بقول اقبالؒ

ساہو در کعبہ و تاجانے نالہ حیات تازہ برم عشق یک دانائے راز آید بروں

الحمد للہ کہ ہمارے حضرت کا شمار ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں ہے۔

فتاویٰ

حضرت کا ایک تیسرا امتیازی وصف اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے کا ہے، جن لوگوں نے اپنی حضرت کے ساتھ بسر کی ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت کے کسی قول و فعل سے کبھی یہ ظاہر نہیں کہ حضرت اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں، تمام عمر میں کبھی مجھوٹے سے بھی اپنی کسی خوبی یا وصف کا ذکر نہیں فرمایا کہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بھی کبھی کوئی بات بیان نہیں فرمائی جیسا کہ بعض بزرگ بعض مصالح کے پیش نظر اپنے خصوصی حالات بیان فرمادیا کرتے ہیں۔ جانتے اور پرکھتے والے بخوبی جانتے ہیں کہ دل و دماغ کے ایک ایک گوشہ سے حب جاہ کو نکال حضرت نے صدیقین کے مقام میں رسوخ حاصل کر لیا تھا **إِنَّكَ فَضَّلُ اللَّهُ فَيُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ**۔

امتیازی کارنامے

مذکورہ بالا بے مثال اوصاف کے باوجود اور سینکڑوں طالبین حق کی اصلاح و تربیت اور ہزاروں گم گشت گمان بادِ ضلالت کی رہنمائی و دستگیری کرنے کے علاوہ حضرت کے چند ایسے امتیازی کارنامے بھی ہیں جن کا ذکر کرنا حضرت کے سوانح نگار کا فرض ہے۔ اول یہ کہ تقسیم ملک کے دنوں حصوں میں ایک عام افراتفری اور بے چینی پھیلی ہوئی تھی بالخصوص علماء دین پر ایک مایوسی و بددلی کی سی کیفیت طاری تھی، حضرت نے اپنی ایام میں ہندوستان میں مسلسل دورے کر کے علماء کو تسلی و تسخیر دی اور جگہ جگہ اور جس حال میں کوئی بیٹھا تھا اسی کو اسی جگہ اور اسی حال میں اشد پر توکل کر کے کام کرنے کی تلقین فرمائی، اس سے علماء کی ہمتیں بڑھیں اور جگہ جگہ نئے دینی مدارس قائم ہو گئے، دیکھا کبھی پرانے دینی مدارس کے بے جان و مرنہ میں بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس طرح اشاعتِ دین کا کام وسیع تر ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ تقسیم ملک کے بعد ہی پاکستان میں چند پامال مذہبی فرقوں نے سر اٹھایا مرزائیت، غیبتیت، عیسائیت اور بدعت کے علمبرداروں چاروں طرف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ حضرت نے ایک طرف تو احرار و مہذبوں کو مناسب ہدایات دے کر ایک دم پر لگایا اور اس طرح مرزائیت کے بڑھتے ہوئے فتنے کا سد باب ہوا ساتھ ساتھ دوسرے علماء سے غیبتیت، عیسائیت پر بدیزیت اور بہائیت وغیرہ کی تردید کروائی۔ دوسری طرف اہل قلم علماء سے باطل فرقوں کے زعم میں کتابیں لکھوائیں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے "تادیبیت" اسی سلسلے میں لکھوائی جس کا علمی اور سنجیدہ حلقوں میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ یہ ہیں حضرت کے وہ کارنامے جن کی وجہ سے حضرت نے اہل حق و صداقت کے دلوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے اور اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

اذا جتمعننی یا جریب المجمع
اولئك آباء فی جنئی بمثلهم

وفات و جانشین

آخری آفتابِ حکمت و ہدایت زندگی کی تقریباً نوے منزلیں طے کرنے کے بعد ہمیں کے لئے غروب ہو گیا، ۱۱ ربیع الاول ۱۱۰۰ھ کو لاہور کے مقام پر حضرت کا انتقال ہوا جنازہ لاہور سے ڈھڑھیاں لایا گیا، نماز جنازہ لاہور لائل پور، سرگودھا اور ڈھڑھیاں چار مقامات پر پڑھی گئیں پختونپور جمعہ کی درمیانی شب میں ڈھڑھیاں شریف کی مسجد کے پہلو میں سحری کے وقت دفن کئے گئے **وَأَنَّا لِلَّهِ**

جَوَی۔

رائے پور شریف میں حضرت نے اپنی زندگی میں ہی مولانا عبدالعزیز صاحب گم تھلوی مدظلہ العالی کو اپنا جانشین کر دیا تھا، ادھر دھڑھکیاں میں حضرت کے برادر خور و مولانا محمد خلیل صاحب مدظلہ اور ان کے صاحبزادے مولانا خلیل صاحب اور حضرت کے بھائی مولانا عاقل عبد الوحید صاحب جو کہ حضرت ہی کے تربیت یافتہ ہیں موجود در حضرت ہی کے نقش قدم پر چل کر لوگوں کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت کے بہت سے خلفاء پاک و ہند میں موجود ہیں جن کے ذریعے حضرت کے فیوض و برکات دنیا میں عام ہو رہے ہیں۔

الحقیر محمد حسین علی

مقام چکوال۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۶۲ء

اے پور کے شب و روز

شیخ المشائخ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر راجہ رحمۃ اللہ علیہ

انسانیت کی صحت گاہیں

جنہوں کے ہندوستان میں فقر و تصرفت کی تاریخ پیچی ہے۔ یا کبھی اس مقصد و ذوق کے ساتھ اس کا رویہ کیا ہے۔ جو جانتے ہیں کہ جس طرح شیہ سوری نے اپنی تاریخی شاہ راہ پر دور ویر تھوڑے تھوڑے کارواں سرائچ تعمیر کی تھیں جہاں مسافر قیام کرتے، محرک، حفاظت اور آرام کی جگہ پاتے اور راہ کی خشکی و مانگی دور کر کے تازہ دم ہو کر سفر کرتے۔ اسی طرح فیاض دل اور فیاض روح درویشوں اور انسانیت کے چارہ سازوں کے زندگی کے خشکے ہارے مسافروں اور روایت کے نقاشوں کے لیے مال کے ہرے انسانوں کے لیے جن کو اپنے دل کی زندگی دم توڑتی اور روح کا شعلہ بجھتا نظر آتا تھا۔ ایسی پناہ گاہیں اور کارواں سرائچ جہاں کچھ دن ٹھہر کر دل کے چاروغ کی کو نیا روغن اور روشنی پاتی۔ افسردہ قویٰ میں تازگی اور مرجس میں چلا پلید ہو جاتی۔ غفلت اور ماہیت کے مرکز اسلام کے پل کو اڑا پڑا حلیہ طر شبات کے ساتھ چلنے کا عزم اور قوت پیدا ہوتی۔ قوی الارادہ اور صاحب عزیمت لوگوں کو بہت محسوس ہوتی اور پابند بننے، غافل، فاکر، نمازدن میں صستی کرنے والے شب بیدار بن جاتے۔ اسباب کے پرستار اور ماہیت کے گرفتار ہو جانے کے خوف اور غفلت سے ہمیشہ لڑناں و زناں رہتے اور بہرہ و مسائل کو روزانہ حقیقی سمجھتے وہ ایک درویش خلافت کے کوئل و قنبل کا منظر اور اللہ تعالیٰ کی سبب شہابی دیکھ کر کوئل کے منہم سے کشنا اور یقین کی دولت سے بہرہ و یاب ہوتے۔

ڈہلی، قراج دہلی اور دہلی میں متحدہ الہی خانقاہیں اور روحانی تربیت کے مرکز بننے جو پوری بھارتی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے۔ ان کی خانقاہوں کے دربار انقلاب کے بعد خارجی و درویشی کے نگرہ اور تھانہ بھولوں کے روحانی و تربیتی مرکز مرجع خاص و عام بننے چکے تھے۔ پھر جیسے جیسے انقلاب آیا اور سنت اللہ کے مطابق رشد و ہدایت کی یہ شعیں بھی اپنے مشائخ کی وفات کے بعد خاموش ہو گئیں تو اسی سلسلہ روحانی کی ایک کارخانہ نہ صرف اس قراج بلکہ صوبہ بہت متحدہ سے لے کر پنجاب تک کارخانہ روحانی و تربیتی مرکز بن گئی۔ ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے۔ بڑے بڑے لوٹن ان آئے اور آنحضرت جلیں، ملک تقسیم ہوا لیکن ان تیر و تند ہواؤں میں بھی یہ چرخ جلتا رہا۔ دسارے ہو گئے، ذکر اللہ کی سرگرمی میں کوئی فرق آیا۔ انہیں اور مضرع میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔

نئے پور کی خانقاہ

راستے پور کی سٹی اور خانقاہ کے درمیان نہر جاہل بنے لیٹی سے جانب غرب نہر کے کنارے کچھ فاصلہ پر رکاوٹی ہے جس میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب راستے پور کی قدس الشریف العزیز کا قیام تھا۔ اس سے جانب غرب مسجد اور مدرسہ کی بڑی عمارت ہے۔ شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات تک یہی خانقاہ اور ایسی کے گرد پیش طالبین خدا کا قیام تھا۔ جب حضرت مولانا عبدالقادر صاحب کے لیے اس کے گرد پیش صاحب نے اپنے باغ میں جو مسجد سے مغربی جانب واقع ہے، نئی قیام گاہ تعمیر کرا دی تو نئی خانقاہ وہیں منتقل ہو گئی۔ اس کے سامنے چند چھتر ڈال کر ان کی کثرت کی وجہ سے چار پائتوں کا خاص انتظام کیا گیا۔ حضرت کی ہمیشہ آغیدہ ہاگرتی تھی کہ رات کو لوگ چار پائتوں پر ہی آرام کیا کریں اور نوافل بھی حتی الامکان بھی پڑھیں۔ جانب شمال میں ایک ایک لمبا سائبان تھا اور ایک بڑا دالان اور کمرہ اس طرح کثیر تعداد کے لیے رائج اور بعد ضرورت آسائش کا سامان تھا۔ گریں کی میں رات بڑی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی پہاڑ کے واسطے اور جہانگاہ کے کمرے پر ہونے کی وجہ سے بڑی ٹھنڈی ہوا آتی جس سے مٹا شالی پڑا بڑی ٹھیک اور لطیف ہوتی۔ بستروں اور کافوں کا خاصا ذخیرہ تھا جو ایسے مسافروں اور طالبین کے کام آتا جو اپنا پتہ نہ لے سکتے۔

موسم تک گئے پور کے پل سے راستے پور کی خانقاہ تک کسی سواری کا انتظام نہیں تھا۔ طالبین و زائرین علم طرہ پر نہر کی پٹی پر پہلے سہیل کی مسافت پیادہ پا کر پہلے انجمن خدایہ میں بیٹھتے تھے جو سہارنپور سے ۱۶ میل اور راستے پور سے ۶ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور ایک مرکزی مقام ہے۔ رکشے مل جاتے اور نام سے کابھی آجاتی، ایک زمانہ میں سہارنپور سے ہرٹ تک بھی آتے تھے تاکہ کے علاوہ کوئی سواری نہ تھی۔ بعض سہارنپور سے بکھڑت لایاں چلتے۔ پٹ یا گنڈ پور کے پل پر آتے دیتیں۔ سواریوں کی دشواری و نمایاں اور ساریوں کی کثرت و ہجرت کے ہر دور میں طالبین صادق دور دور کی مسافت طے کر کے رونق سے آتے اور ایک ایک وقت میں ذکر و تربیت کی نیت سے طویل قیام کرنے والوں اور متین خانقاہ کے علاوہ، جوانوں کی بڑی تعداد ہوتی۔

نئے پور کا نظام الاوقات

نظام الاوقات یہ تھا کہ رات کے پچھلے حصے میں بالعموم سب ہی جاگ جاتے اور طہارت و وضو سے فارغ ہو کر باہر جاتے بعض لوگ مسجد میں چلے جاتے اکثر بڑی چٹائیں اور چار پائتوں پر نوافل ادا کرتے۔ پھر کچھ جہاں بارہا قیام میں شغل ہوتا تھا۔ اس وقت رات کے سامنے اندر چل کر اس خاص مشق فرائض خانقاہ الشریف کے نام کی صدقوں اور ذکر کی آوازوں سے گرج جاتی اور حسب استعداد و توفیق لوگ اس فضا میں ہر دور سرود سنی کی ایک حاکم نسبت ہوتی۔ اس وقت ہر ایک آزاد اور اپنے حال میں مشغول ہوتا کہ کبھی نہ تعرض نہ کرتا۔

میں صادق کے طرہ سے ساتویں سہارنپور میں اذان ہوجاتی، اذان و جامعہ کے مابین جو اچھا خاصا وقت ہوتا۔ چائے آجاتی۔ خانقاہ کے انہم طبع حاجی مخلصین اور جن کا پیش مکان یا چھتر خانقاہ ہی میں جانب جنوب واقع ہے، ایسے سرور سے وقت میں محض اپنے مختصر کرنے کی مدد سے چائے کا انتظام اور جب گورنار کے دیتے حضرت بھی جب تک چائے نوش فرماتے تھے۔ اسی وقت چائے سے فارغ ہوتا۔ پھر چائے کی بجائے جو دوا کا معمول اسی وقت

راستے پور سہارنپور سے سہاگن شمال ۱۲ میل پر واقع ہے۔ سہارنپور سے چھوڑ کر جو پختہ شکل جاتی ہے۔ اس کے ۱۰-۱۱ میل پر پگنڈ پور کے پل سے مل کر پہلے پور کے پل کی لکھی آتی ہے۔ یہ راجپوت مسلمانوں اور سلطان شرفاء کی لکھی ہے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس الشریف انہیں کے فاسے تھے۔ اور اپنے فرائض سے آپ باہر منتقل ہو گئے تھے اور ایسی کو اچھے روحانی فیض کا مرکز اور دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

وقت سے فوراً زبیر ایک سال پیشتر ہر ایک کا قیام حضرت کی سابقہ کوشی میں ہو گیا۔ ہر متین خانقاہ کی بڑی تعداد اس کے آس پاس تقیم ہو گئی۔ حضرت دس روپہ ماہار کے حساب لگا کر دھکرہ لانا لگے تھے۔

بچنے کے لیے جاتے اور اگر صحیح صبح وقت جلاتے

مغرب کے بعد اپنی خانقاہ فراہم کر کے مشغول ہوجاتے۔ مغرب کے بعد کا یہ وقت زیادہ تر ان عالمین و سالکین کے لیے مخصوص تھا جن کو ایسے ذکر و سلوک کے طریقے کچھ دریافت کرنا یا اپنی کسی خاص کیفیت و حالت کو عرض کرنا پڑتا۔ بالعموم ایسے حضرات پہلے سے لڑائی کر کے وقت مقرر کر دیتے اس وقت کسی دوسرے کی آمد نہیں فرماتے تھے۔ نہایت شفقت و کرم کے ساتھ حال دریافت فرماتے۔ قہر سے بات نہ فرماتے اور بڑے اہتمام سے اس کا جواب دیتے۔ اور رہنمائی فرماتے۔ ایسا ہم ہوتا تھا کہ یہاں کے قیام و اہتمام کا خاص موضوع اور حضرت کی سادگ زندگی کا خاص مقصد ہے۔ اسی وقت میں اکثر لوگ بیعت و توبہ سے بھی مشغول ہوتے۔ عشا کی اذان اکل وقت ہوجاتی۔ معذوری اور ضعف کے باوجود اس کا اہتمام اور بھی کر لیا جاتا تھا۔ رات کا وقت ہر قسم کی آفسیر و ناز میں حضرت مغرب کے بعد بھی کھاتے، صبح صبحین خانقاہ اور مہمان بخشہ کی خدمت کھاتے۔ کھانے کے بعد بلا ٹھکانے کا کام اہتمام اور کوشش ہوتی۔ تاکہ رات کو بچیں آسانی ہو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا نظام الاوقات بیان کرتے ہوئے حضرت کے ایک خاص مہتمل لکھتے ہیں۔

رات کو تقریباً دو بجے اٹھتے۔ تجوید، ذکر، دفنی اشبات، مراقبہ وغیرہ میں غریب مشغول رہتے تھے۔ فجر کی سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھ کر مسجد میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں فرض فجر پڑھ کر میر کے لیے ذمیل ڈیڑھ گیل بنا ڈیڑھ گیل داپی، نہر جن غریب کے کنارے کنارے تشریف لے جاتے تھے۔ داپی پر وٹو کر کے پھر ذکر و مراقبہ وغیرہ میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ گزیر پھر ۱۰ بجے باہر تشریف لاتے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کچھ طعام سے فراغت ہوتی تقریباً ۱۲ بجے حضرت آرام فرماتے اور ڈیڑھ دو بجے کے قریب بعد دوپہر حضرت پھر ٹھٹھٹھے، استسجا، طہارت، دھوئے سے فارغ ہو کر ٹھہر کر سنتیں خانقاہ شریف میں پڑھتے اور عرض غلطی میں ادا کر کے واپس تشریف لاتے اور پھر ذکر و مراقبہ میں مصروف ہوجاتے۔ بعض خدام نے حضرت کے کمرے کے ابھران لگا کر سنا تو حضرت کو کافی اشبات کا ذکر آہستہ آہستہ آواز سے کرتے ہوئے سنا۔ اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ ذکر لسانی صحت ایک ذریعہ ہے۔ مفسد نہیں ہے۔ مفسد جو میں یاد ہے۔ اگر باو نصیب ہوجاتے تو ذکر لسانی پھر لڑا جاتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ بھی فرمایا تھا کہ بھلا کے بعد بھی اتنی عبادات سے ہی ہے۔ یعنی قرآن پاک کا پڑھنا، ذکر الہی، گناہ اس سے ہی ترقی ہے۔ خاموش بیٹھنے اور محض توبہ سے نہیں۔ غرضیکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ عصر کے وقت تک اسی طرح مصروف رہتے۔ عصر کی نماز کے بعد عام مجلس ہوتی حضرت عمر باخوش رہتے۔ لیکن جب کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب مفصل اور کچھ لمبا سے نہایت فرماتے جس سے سامعین کی اور کمال کی کمال ہوتی جاتی تھی۔ مجھے ایک بھی واقعہ ایسا یاد نہیں۔ جس میں کسی سوال نے سوال کیا ہوا اور حضرت کے جواب سے اس کی یاد گار سامعین کی تسلی نہ ہوئی۔ مغرب کی نماز کے بعد ہر شاہک کا وقت ان سالکین کے لیے مخصوص تھا جو بیگانگی میں کچھ عرض کرنا چاہیں جو شہار کے بعد کھانا تناول فرما کر حضرت آرام فرماتے تھے اور تقریباً ۴، ۵ گھنٹے آرام کے بعد اٹھ بیٹھتے تھے۔

زہد و توکل، اعتدال، بات بات سے عیان علی، کوئی چاہے کتنا ہی امیر ہو۔ حضرت کے دربار میں بھی ہوتی چار باتوں کے

نہانے کی طوط نہیں بیٹھ سکتا۔ اور بات چیت کی طوط ہی بیٹھتے تھے اور علماء کرام کے لیے سرانے کی طرف مخصوص تھی تھ

راتے پورے خانقاہ کی ایک بڑی خصوصیت جو باہر کے ہاتھ والے کو محسوس ہوتی اور جو حضرت کے ایک خاص ذوق اور ثقافت کے طلبی کا نتیجہ تھا۔ مجلس عام میں ان مفید و منتخب دینی کتابوں اور مواضع پر طے کا سلسلہ تھا۔ جو

کتابوں کی خواہش کا سلسلہ

جو زندگی کے آخری برسوں میں حضرت کے یہاں کا ایک حضور ہی معمول اور ایک فیضہ اور خانقاہ کی زندگی کا انصاب سا بن گیا تھا۔ اس پابندی تسلسل اور اتہام کے ساتھ کسی خانقاہ یا دینی مرکز میں کتابوں کے سننے اور پڑھنے جانے کا رواج نہیں دکھایا۔

کئی برس سے یہ معمول ابھریا تھا کہ عصر کی مجلس میں جو خانقاہ اور حضرت کے یہاں کی سب سے بڑی عمومی اور وسیع مجلس ہوتی تھی۔ کوئی ایک قابل اعتماد و معتدب دینی کتاب پڑھ کر سنائی جاتی۔ سربگائی، تندرستی، بیماری کی معزز و متنازعہاں یا کسی جلیل القدر عالم کی آواز کے موقع پر بھی اس میں خلط نہ پڑتا۔ جو کتابیں اس مجلس میں زیادہ تر پڑھ گئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی تصنیفات عام طور پر بصرہ صیت کے ساتھ فضائل نبوی اور کتاب ہائے فضائل بار بار اور مکرر سب کر پڑھی گئیں حضرت نے کئی بار فرمایا کہ لکھتے کتابوں میں بڑی ندرت ہے۔

وادی کی فتوح الشام کا ترجمہ، تاریخ دعوت و نصرت کا پہلا حصہ بار بار اور دوسرا حصہ ایک بار اور ذکر مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی بار بار پڑھا گیا۔ سیرت سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (مجموعہ تفسیر، لاہور، دلائل پر کے قیام میں پڑھی گئی۔ حاجی محمد سلیمان صاحب منصور پوری کی مقبول کتاب سیرۃ رحمۃ اللہ علیہ کے تینوں حصے بڑے ذوق اور توجہ سے سننے اور پڑھنے کی کا اظہار فرمایا۔

شیخ کی کتابوں کے علاوہ سب سے زیادہ جو کتابیں پڑھی گئیں۔ وہ دو تھیں۔ مکتوبات حضرت خواجہ محمد حسن مخلص درجہ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی رحمتی مکتبہ الفرقان کھٹنوں، اور حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے سرائے خواجہ مولانا عاشق الہی صاحب میرٹھی، اول الذکر کتاب بار بار دہرائے گئیں مولانا عبدالکمال صاحب نے سنائی اور احمد انڈیا کے بہترین دسے پورا اور لاہور کے آخری قیام اور مرض وفات میں آواز صاحب سکر پڑھی اور حضرت کے بار بار بڑے جوش کے ساتھ اس پر اپنے کا اظہار فرمایا۔ اس کی تصدیق فرمائی اور لوگوں کو ترغیب کیا اور آپ پر وقت طاری ہوئی۔

ان کتابوں کے علاوہ جن کے مستحق کہنا مشکل ہے، کہ کتنی بار پڑھی گئیں۔ دارالصفین، غرر کرم اور مدۃ المستفین دہلی کی تاریخ و سیر کی کتابیں، سیر کے مختلف جہزے، مولانا محمد منور نعمانی کی کتابیں جو درجہ اول، بیعت اور ملک و بربندی کے دفاع میں ہیں۔ بڑے شوق اور دلچسپی سے سنی گئیں اور رلا گوارا اس سلسلہ کے جان رکھنے کی ہدایت بھی فرمائی۔

عصر کی نماز کے بعد سے مغرب کی اذان تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بعض اوقات اذان سے چند منٹ قبل بند پڑتا۔ بعض مرتبہ بند ہونے پر دریافت فرماتے کہ گیارہ خاموش رہ گئے۔ قاری پڑھنا شروع کر دیا کہ کتاب شروع ہو چکے ہیں البتہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت عالم استغراق میں چلے گئے ہیں کبھی کبھی متوجہ ہو کر فرماتے کہ کیا فرمایا؟ یا پھر۔ درجہ انعم آپ پر سکوت و استغراق طاری رہتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوگوں کے نفع اور ان کو تشریح رکھنے کے لیے اور ان کی مشغولیت کی حالت میں مشغول ہونے کے لیے یہ سلسلہ جاری فرماتے تھے۔

کسی زمانے میں اس معمول میں اتنی ترقی اور انماک ہو جانا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کتاب سننے بیچین نہیں آتا بہت ہاؤس سامان پر رکھے قیام میں آ کر دیکھا گیا کہ نماز کے بعد باجماعت فرماتے کہ اس عمل تھا۔ اس سے بیدار ہو کر فوراً آواز صاحب کی طلبی ہوتی۔ فتوح الشام یا صحابہ کرام کے حالات کی کوئی کتاب پڑھنے

۱۰ حضرت کے خادم خاص دواۓ فنا ڈاک کے مہتمم اور سفروں کے وقتی خاص تقریباً ۱۹ سال حضرت کی خدمت میں رہے اور اسی خدمت میں رہے اور اس خدمت کے لیے ہندوستان غیر شہرت اختیار کی۔ رجسٹر انظار پنجاب کے رہنے والے اور دوسرے مشاہیر العلماء کے فارمان ہیں۔

۱۱ سید محمد علی نام حکیم سید محمد علی صاحب فتح پور کے فرد خاتیر زمانہ ہیں و جب سے حضرت کو سید شریعت کے جاننے سے معذور ہی ہوئی، خانقاہ اور حضرت کے امام السوانہ

کئی مریج ساحل سے اگر کواجاتی اور نسبت چشتیہ اپنا رنگ دکھائی کبھی کبھی آپ خود مولوی عبداللہ خان دیوبند کو دجن کر اللہ نے درد و سوز و خوش الحانی بھی سننے اور انکو سربوئی فارسی اردو کے بحرِ شریعت و بحرِ دین، یا آزاد صاحب کو بحرِ سخن شناسا بھی ہیں اور سخن سنج بھی اور ان کی آواز دو دین و دینی ہوتی ہے۔ طلب اور خواجہ حافظ امیر خسرو حضرت خواجہ نصیر الدین چرلج دہلی کی کئی عاشقانہ یا عارفانہ غزل طبع کر سکتے اور عجیب کیف و سرور پیدا ہو جاتا۔ مولوی عبداللہ خان صاحب اکثر حضرت خواجہ نصیر الدین چرلج دہلی کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے :-

بے کار و یا کام چو درجہ حساب اندر گویا تم و نامو تم بہوں خطا کی تاب اندر

اور قصیدہ، بابت سعاد و غیر عربی، فارسی، اردو کے اشعار سکتے۔ نیز خواجہ حافظ اور امیر خسرو کی متعدد غزلیں طبع کی ہیں۔

کبھی کبھی طبع صحیح سے پہلے کسی ذکر کر کے واسلے نے ذوق و شوق میں اگر خواجہ حافظ کی یہ غزل طبعی شروع کر دینی تو مناسب حال ہونے کی وجہ سے اس حضرت اور ان کی پیدا ہو گئی۔

من کہ با شرم کہ در آن خاطر عاقل گزرم * لطفہای کبھی اسے خاک در دست تاج سرم
اسے نہ سحر ہی بند گئی ما برساں * کہ فراموش کن وقت دھائے سحر
بہم بدقت۔ راہ کن اسے طائر قدس * کہ دراز است وہ مقصد دین تو سفر

لیکن بہت جلد چرلج اور اس کی مضبوط تحمل اور یکپخت کی فضا طاری ہو جاتی اور سب اپنے اپنے کام میں لگ جاتے اور معلوم ہوتا کہ تمام شریعت پرستان عشق کی عارضی کار فرما تھی۔ پھر دوبارہ چلنے لگا۔

در کئے جام شریعت در کئے سندان عشق

ہر ہر سنا کے غلام جام و سندان باطن

ایک حاضر خاتواہ اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں۔

ایک دفعہ خیال آیا کہ لوگ کہتے ہیں کہ بزرگوں کی مجلس میں حال ہو جاتا ہے۔ گویا نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ یہ میرے قیام کا اخیر دن تھا۔ دوسرے روز وہی مجلس کے بعد جب فکر میں بیٹھا تو بیٹھتے ہی عجیب حالت شروع ہو گئی۔ گویہ اور محبت اور توجہ الی اللہ الی الی اللہ تعالیٰ سانسے نہیے اور حضرت میرے جانب ہیں اور کئی فریہ ہیں۔ تمام فکریں پر عجیب حالت طاری تھی۔ اس حالت میں میں نے فکر کبھی رقت سے پور کیا اور اس پر مجبور ہو کر حاضر خدمت ہوا۔ راجہ علاؤ الدین خان نے عرض کیا کہ حضرت آج تو عجیب حالت تھی۔ آزاد صاحب نے تو قرانی ہی شروع کر رکھی تھی۔ آپ نے فرمایا۔ ادھر لاجو ولا فتوة الا بیا اللہ بس تمام حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔

آزاد صاحب سے اکثر ان کے والد کی نظم فراموش کر کے سنتے۔ اور جب آزاد صاحب اپنے مخصوص انداز میں پڑھتے۔ تو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں سامنے پھر جاتا اور سنا اچھا جاتا۔ نظم کا مطلع یہ ہے۔

یہ سرسارے دہر مسافر! بچھا کسی کا مکان نہیں!

جو مقیم اس میں سے کل، یہاں کہیں کج احکام نشان نہیں

اسے پور کا رمضان

مندان المبارک میں خاص بہادر ہوتی۔ لوگ بہت پہلے سے اس کے منتظر رہتے اور تیاریاں کرتے۔ ملازمین چٹیاں لے کر آتے۔ مدراس دینیہ کے اساتذہ اس موقع کو غنیمت جانی کر انہماک سے آتے علماء و حفاظ کی خاصی تعداد جمع ہوجاتی۔ تقسیم سے پہلے مشرقی پنجاب کے ہر جاتیں۔ باتوں کے لیے کوئی خاص وقت نہ تھا۔ ڈاک بھی بند نہ تھی تخیلہ دھار کے اوقات کے علاوہ تقریباً ۲۴ گھنٹے تک ایسے شخص کے آنے سے گرا بی جاتی۔ جس کے لیے وقت صرف کرنا پڑتا۔ افطار عیالات سے پریشتر جمع کے ساتھ ہوتا۔ جس میں کچھ روز روزم کا خاص بہ تمام ہوتا اور یہی پورا افطار تھا۔ مغرب کے متعہل کھانا، عیالات سے پہلے جمع کے ساتھ، اس کے بعد چائے، عشاء کی اذان تک یہی وقت ۲۴ گھنٹے میں مجلس کا تھا۔ اذان کے بعد نماز کی تیاری، اس سلسلے میں حضرات علماء جن کا جمع انکی صفت میں رہتا۔ بعض اہم اہم سوالات کرتے اور حضرت اکیلا جواب دیتے۔ عشاء کے بعد تقریباً ۲۴ گھنٹہ کبھی نشست اور کبھی لیٹ جاتے۔ عداہم بہن و بھائے و بھائی دیتے۔ مسجد و خانقاہ میں تلاویح ہوتی۔ مسجد میں بھی قرآن مجید ہوتا اور خانقاہ میں بھی۔

یوں تو حفاظ کی کثرت ہوتی۔ مگر حضرت اپنے پڑھنے والے بہتر سا خط کو پسند کرتے،

حضرت نے ایک سال ۱۲۵۲ھ میں، مسعودی پر رمضان مبارک کیا۔ ۵۰، ۶۰ عداہم ساتھ تھے۔ مولوی عبداللہ انسان صاحب نے قرآن مجید پڑھایا۔ تراویح کے بعد حضرت کے تشریف رکھنے اور مجلس کا معمول تھا۔ طبیعت میں ٹھیک ٹھکانگی اور اہل باطن تھا۔ متعدد حضرات رات بھر بیدار اور شغل رہتے۔ غرض دن اور رات ایک کیف محسوس ہوتا تھا۔ مضطرب و کم ہمت بھی سمجھتے تھے کہ۔

مخاند کا محروم بھی محروم نہیں بنے

ایک حاضر خدمت نے جس کو آخری عیش و گزرا نے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور جو اپنی محبت کی کمزوری اور ہمت کی پستی کی وجہ سے مجاہد سے قاصر رہا۔ اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا کہ

دکان سے خوش پر سالک پڑا رہا
اچھا گزر گیا رمضان بادہ غلہ کا!

باطنی کیفیات اور نمایاں صفات

اے مرغِ سحر عشقِ زہرِ دانہِ باموزؐ
کال سوختہ راجہاں شد و آذرِ نیا مدؐ

ایں مدعیانِ در طلبش بے خبر اندؐ
آزما کہ خبر شد خبرش باز نیا مدؐ

محبتِ شوق

کمالِ الاحوال بزرگوں کی باطنی کیفیات کا اندازہ عامی کیا جاسکتے ہیں۔ ان حضرات کا اصول و مسلک یہ ہے کہ

عشقِ عسلیاں امتِ گمستور نیست

لیکن پھر بھی یہاں جب لہر نہ ہوتا ہے تو درچار قطرے ٹپک پڑتے ہیں۔ ڈبڈبانی چوٹی آنکھیں ضبطِ گریہ اور اضافے حال کی کوشش اس حقیقتِ غمازی کرتی ہے جس سے سینہ معمور اور دل محمور ہے۔ کسی حقیقت شناس نے عرصہ ہوا کہا تھا :-

خوشتر آں باشد کہ سترِ دلبران

گفتہ آید در حدیثِ دیگران

اصحابِ احوال جب کسی شعر کا انتخاب کرتے ہیں یا اس سے ان کو خاص کیفیت اور ذوق حاصل ہوتا ہے۔ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ان کے حقیقتِ حال کی آئینہ اور ان کے دل کی ترجمانی اور تعبیر ہے۔ ایک مرتبہ راقمِ مسطور نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ اثر یہ شعر پڑھا کرتے رہے۔

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بولاجی ہے

اک ڈھیر ہے یاں لکھ کا اور آگ دہلی ہے

حضرت کو اس شعر پر بڑا ذوق آیا۔ اور کہنی با فرمائش کر کے مجھ سے سنایا میں سمجھ گیا کہ اس پسندیدگی اور کیفیت کی وجہ یہ ہے کہ شعر مطابق حال ہے۔ حضرت کے خیمہ میں شروع سے محبت و عشق کی چمکا رہی تھی۔ اور یہ ان کا فطری ذوق اور حال تھا۔ اس لیے مشائخ اور بزرگوں میں بھی جن کے یہ یہ عنصر نمایاں اور غالب نظر آتا تھا۔ ان سے خصوصی مناسبت اور عقیدت تھی، اسی بنا پر محبوب الہی سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے مشورہ

تین تھا۔ اور ان کے حالات سے خاص شغف اور شیفتگی تھی۔ اور کسی طرح ان کے حالات سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ دور آخر میں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کے حالات اور تذکرہ میں یہ جنس بہت ملتی ہے اور اہل عشق کو ان کے واقعات، ان کی کیفیات اور ان کے منتخب و پسندیدہ اشعار سے بڑی چاشنی حاصل ہوتی ہے۔ لاہور کے دوران قیام ۱۹۵۹ء میں حاجی متین احمد صاحب کی کوٹھی پر کسی دوست کی تحریک و تذکرہ پر تذکرہ مولانا فضل رحمان جگر کے بعد کی مجلس میں پڑھا جانے لگا۔ اس وقت تک کتاب چھپی بھی نہیں تھی اور میرے پاس اس کا ناقص مبیضہ تھا۔ کتاب شروع ہوئی اور مولانا کے سادہ لیکن دل کو تڑپا دینے والے حالات اور واقعات پڑھے جانے لگے تو ساری مجلس پر ایک کیف سا طاری ہو گیا۔ جو حقیقت حضرت کی کیفیت باطنی کا عکس تھا۔ زبان حال گویا کہہ رہی تھی:-

پھر پرش جرات دل کو چلا ہے عشق
ساہان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

بعض اہل احساس نے بیان کیا کہ ایسا کیف مجلس میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار فرمایا کہ بڑی پیاری باتیں ہیں۔ ”پھر فرمایا۔“ پیاروں کی باتیں پیاری ہی ہوتی ہیں“ اسی بار حضرت مولانا ہی کے ایک معاصر اور صاحب محبت شیخ سائیں کوکل شاہ صاحب انبالوی کا تذکرہ بھی بڑے ذوق و کثرت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ یہاں بھی کشش کی یہی وجہ تھی۔ حضرت کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب دونوں حضرات کی خدمت میں مہاجر ہوئے تھے اور دونوں نے خصوصی توجہ فرمائی تھی۔ حضرت خواجہ سلیمان تونسوی اور دوسرے مشائخ چشتیہ سے مناسبت اور خصوصی تعلق کی وجہ بھی یہی تھی۔

اہل درد و محبت کے یہاں ہمیشہ سے عشق و محبت کے اشعار سے تکیں و قوت حاصل کرنے کا دستور رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف دل کی آواز کا (جو بعض اوقات ناقابل برداشت ہو جاتی ہے) نکالنا یا اس پر آنسوؤں کے چھینٹے دینا ہوتا ہے۔ اپنے زمانہ کے مشہور نقشبندی شیخ حضرت مرزا مظہر جان جانا نے اسی ضرورت و حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے:-

آہی درد و غم کی مرزین کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے فیض نہ برماتی

اس کے لیے اہل دل رسوم و ضوابط کے پابند کبھی نہیں رہتے، کبھی سادگی کے ساتھ، کبھی ذرا ترنم سے کوئی غارناغہ عاشقانہ شعر سن لیا اور تکیں خائل کر لی۔ اس لیے کہ:-

فریاد کی کوئی نے نہیں ہے
تلا پابند نے نہیں ہے

حضرت بھی بعض اوقات اضطراب کسی صاحب دل اور صاحب نسبت کا کلام سن لیتے، بعض اوقات اپنی اس باطنی کیفیت ضرورت کا بنا پر فاش کرتے۔ اور سادگی و بے تکلفی کے ساتھ عربی و فارسی، اردو اور زیادہ تر فارسی یا پنجابی کا عاشقانہ کلام پڑھا جاتا۔ ۱۹۵۴ء یا ۱۹۵۵ء میں جب سہارنپور سے پاکستان تشریف لے جا رہے تھے۔ تو یہ خادم سہارنپور سے لڑھکیا تک اسی کام میں تھا جس پر حضرت تشریف رکھتے تھے مہاراجہ نے حضرت کے بار بار آئے اور تاکید سے رقم تے تاریخ دولت و عزت کا تیسرا حصہ حضرت خواجہ کے حالات پر شکل ہے مرتب کیا، حضرت نے اتنے بار اس کا قلم اٹھایا تھا کہ بغیر اس ارمان کے حاضر ہونے سے شرم لے لگی تھی۔ بلاخر اللہ نے اس کی توفیق دی اور حضرت نے اس کو حیرت منا جب تک، وہ ختم نہیں ہوا کہ دوسری چیز شروع نہیں ہو سکی۔

سے جب کارروائ ہوئی اور سواد شہر سے نکلی تو حضرت کی بے گلی و بے تابی کی عجیب کیفیت دیکھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کلمی چلن نہیں آتا پیچھے کی سیٹ پر خود بدولت اور مولانا عبدالحلیم صاحب اور مولانا عبدالمنان صاحب تھے۔ آگے کی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ یہ خادم بیٹھا تھا۔ مجھ سے ارشاد ہوا کہ کچھ سناؤ۔ یہ خادم اگرچہ مختلف وقتوں میں عارفانہ و عاشقانہ اشعار پڑھا کرتا تھا۔ لیکن اس وقت کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ سوائے دو اشعار کے کچھ یاد نہ آیا حضرت کی طبیعت مبارک اسی وقت اس کی متقاضی تھی کہ ترنم سے پڑھا جائے۔ وہ بھی اس وقت نہ ہو سکا۔ اس سے تسکین نہ ہوئی تو فرمایا کہ بزرگوں کے واقعات سناؤ۔ اتفاق سے وہ بھی کچھ یاد نہ آئے۔ اس اضطراب کو دیکھ کر بار بار اس کا خیال آیا کہ کاش اس موقع پر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی ہوتے اور حضرت کو خوش کرتے۔

پاکستان یکے یکے قیام میں بعض زمانوں میں یہ ذوق زیادہ غالب آجاتا۔ اور جب مانوس و فیم لوگ ہوتے تو پنجابی کے اشعار سنتے۔ ایک زمانہ میں سونے سے پہلے بہت دن تک یہی معمول رہا۔

ان بزرگوں کے اس تعلق و محبت کا اندازہ جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کو حاصل ہے۔ ان کو قریب سے دیکھ کر کچھ دن محبت میں رہے نہیں ہو سکتا۔ دور سے دیکھنے والے تو ان کو "زاہد رشک" اور معاذ اللہ بے ادب اور محبت سے نا آشنا سمجھتے ہیں۔ مگر ان کا حال وہ جوتا ہے جو کسی غازی پوری نے پوری احتیاط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

محبت رسول

صبا یہ حاکم کہ پیورے سلام کے بعد
کو تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس محبت اور جذبہ کی تسکین بھی نعتیہ اشعار سے ہوتی تھی۔ حضرت خاص طور پر صحابہ کرام کے نعتیہ اشعار زیادہ شوق اور فرمائش سے سنتے تھے۔ ان کے ساتھ قصیدہ بانس سدا حضرت کا بڑا محبوب قصیدہ تھا۔ اور اکثر مولوی عبدالمنان صاحب دہلوی سے اس کے سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ کے اشعار

اذا انشئت معروف من الفجر ساطع
بہ موقوفات ان مافاتال واقع
اذا استقلت بالمشرکین المضاجع

فینا رسول الله يتلوا كتابه
اذا انا الهدى بعد العمى فقلوبنا
مبيت يحيا في جنبه عن فرائضه
حضرت کو خوب یاد تھا اور خود پڑھ کر سنا تے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب قصیدہ جس کا مطلع ہے

صبا سونے مدینہ روکن آئین دعا گو سلام برخواں
بگرد شاہ مدینہ گرد و بعد تعزیر سلام برخواں

اکثر پڑھا کرتے سنا، اسی طرح

ولم زندہ شد از وصال محمد
جہاں روشن است از جمال محمد

اسی طرح پنجابی اور ملتان کے نعتیہ اشعار محمد شفیع صاحب اور کٹر صاحب سے اکثر سنا کرتے تھے۔ اور اس وقت اکثر تکبیس پر ہم ہوتے۔ ایک مرتبہ حضرت مجدد بنوری میں تشریف رکھتے تھے۔ اس خادم نے عرض کیا کہ حضرت اس مسجد میں بعد کے لوگوں نے بھی زیب و زینت پیدا کر دی۔ یہی قائلین بچھائے۔ کاش یہ مسجد اپنی پہلی سادگی پر ہوتی۔ معلوم نہیں اس وقت حضرت کس حال میں تھے۔ خوش آگیا، فرمایا "حضرت اور زیب و زینت ہو میں جہاں کہیں جمال اور زیب و زینت ہے انھیں کے صدقہ میں تو ہے؟ مجھے شرمندگی ہوئی اور احساس ہوا کہ یہ حضرات کس قدر محبت سے بھرے تھے ہیں۔

مرض وفات میں دیر نہ طویلہ کا ذکر سن کر بے اختیار رنٹ طاری ہو جاتی۔ اور بعض اوقات بلند آواز سے رونے لگتے۔ مولانا محمد صاحب انوری کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ حضرت سے رخصت ہونے کے لیے آئے۔ مدینہ طیبہ کا ذکر ہوا تو حضرت وحاشاں مار کر رونے لگے۔ مولانا محمد صاحب نے کہا میں نے کبھی حضرت اقدس کو اس سے پہلے بلند آواز سے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ "بالعبد العزیز صاحب آئے تو ان سے فرمایا دیکھو دیر جا رہے ہیں۔ یہ کہہ کر حضرت کی چھین نکل گئیں۔

بابہ کرام سے تعلق و محبت
حضرت پر ابتدائے شعور سے صحابہ کرام کی محبت و عظمت کا بڑا غلبہ تھا اور حضرت کو ان کے حالات اور تذکرہ سے بڑی مہارت اور شغف تھا۔ اکثر انھیں کا تذکرہ کرنا اور سننا پسند فرماتے تھے۔ ان کی فتوحات غازی کی کتابوں سے سیری نہیں ہوتی تھی، فوج الشام و اقدی سے خاص شغف تھا۔ خلفائے راشدین اور ام المومنین عائشہ صدیقہ کے مناقب پر بھی اور لطف سے سنتے تھے۔ اور اس داستان کو زیادہ سے زیادہ طول دینا پسند کرتے تھے۔

بھرے تو ان گفتگوں سے جہانے را

من اذ شوق حضور می طول و دام و استلئے را

پاکستان میں ان مخصوص زوہاں کے حالات کی بنا پر یہ ذکر و تذکرہ جنت بڑھ جاتا تھا۔ ایک روز ایک مجلس میں فرمایا:-

اگر شیخ کے اصول کو دیکھا جائے۔ تو پھر اسلام میں تو کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی کمال ہی نہیں معلوم ہوتا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ کی صحبت سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور صحبت کی برکت سے بچے دیندار بن جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے کوئی بھی پاکستان نہیں بناتا۔

میرزا ان حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے جو مساجد کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں اور تبلیغ کی طرف مائل ہیں فرمایا:-

جہاں میں تو سبیدوں سے مرعز کرتا ہوں۔ کہ مجھے تو آپ حضرات پر اعتبار نہیں رہا۔ ہم تو اچھے خاصے مندروں میں پوجا پاٹ میں لگے رہتے تھے۔ آپ کے بڑوں نے ہمارے بڑوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ہم لیکہ کہتے ہوئے ان کے پیچھے ہو لیے۔ اب آپ ہمیں یہیں چھوڑ کر کوئی شیعہ ہو رہا ہے، کوئی مرزائی اور کوئی عیسائی اور کوئی منکر حدیث، پس جہاں ہمیں یہ اسلام کا پی ہے۔ یہ ہمارے بس کا نہیں کہ تم جہاں جاؤ ہم تمہارے پیچھے پیچھے جھاگے پھریں۔ اگر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں تو ہمیں تو اور کوئی مسلمان نظر نہیں آتا۔

کتب مولانا محمد صاحب انوری۔
جلسہ ۶۔ جمادی الثانیہ ۱۳۷۶ھ کو مکتبی مولانا عبد الحمید صاحب۔
تحریر مولانا غلام فرید ساکن جھاریاں۔

مولانا محمد صاحب انوری لکھتے ہیں :-

حضرت نور اللہ مرقدہ کو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات سننے کا بڑا ذوق و شوق رہتا تھا۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی کتاب حیاۃ الصحابہ کرام میں کوہت رفتہ تھے۔ اور پنجاب کے اسفار میں لاہور اور لاٹھال پور میں تو ہم نے دیکھا ہے کہ محمد شفیع کبیر والا صلح ملتان سے آجاتے تو ان سے مناقب صحابہ کے متعلق پنجابی نظائیں سنتے اور رقت طاری ہو جاتی۔ اکثر اوقات حضرت اقدس کی زبان مبارک پر پنجابی کا یہ شعر بہتا تھا۔

او دیوانے محمدؐ نے میں دیوانہ صحابہؓ دا

او پروانے محمدؐ نے میں پروانہ صحابہؓ دا

پھر محمد شفیع کے انتظار میں رہتے۔ جب آتے تو یہ شعر ضرور سنتے۔

اپنے شیخ اور اکابر سے تعلق

شریف الفطرت اور کریم النفس انسان جس سے کوئی نعمت پاتا ہے۔ ساری عمر اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ اور اس کے گن گاتا ہے۔ پھر جس شخص کو کسی شیخ کامل اور مقبول بارگاہ کی خدمت میں طویل محبت اور خصوصی قرب حاصل رہا ہو۔ اور اس نے شب و روز خلوت و خلوت میں نظر غائر اس کی زندگی کا مطالعہ کیا ہو اور اس کالات اس پر منکشف ہوتے ہوں، اس کا دل کس طرح اس کی محبت و عقیدت سے لبریز اور اس کی زبان کس طرح اس کے حامد و ثناء بیان کرنے میں مشغول نہ ہو۔

حضرت اپنے شیخ و مرید حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب قدس اللہ سرہ کی محبت و عقیدت سے لبریز تھے۔ اور یہ آپ کا اکلیل و اور ذوق بن گیا تھا۔ جس وقت آپ کا ذکر فرماتے تھے اس شعر میں ذرا مبالغہ اور شاعری نہیں معلوم ہوتی تھی۔

زبان پر بادِ حسد آیا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے لفظ نے بوسے مری زبان کے لیے

حضرت کے اخلاص و للہیت، حضرت کی بے نفسی و فدائیت، حضرت کے اجتہاد و بصیرت پر آپ کو پورا اعتقاد و اعتماد تھا۔ اگرچہ میں اپنے حضرت کی تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ اس میں بھی اپنی ہی تعریف ہے، ورنہ ہمارے حضرت نقیصہ کے امام تھے اور تو کچھ عرض نہیں کرتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ میں چودہ سال حضرت کی خدمت میں رہا۔ اس طویل مدت میں کبھی ایک بار بھی حضرت کی زبان مبارک سے نہیں سنا۔ جس میں اپنی تعریف کی بوجھی آتی ہو۔ جب شاہ ایک ایسی چیز ہے جو سب سے آگے میں اولیاء اللہ کے قلوب سے نکلتی ہے۔ جب سالک صدیقین کے مقام تک پہنچتا ہے تب اس سے پیچھا چھوٹتا ہے یہ بات میں نے اپنے حضرت میں خوب اچھی طرح سے دیکھی کہ جب شاہ کا وہاں سرگنا ہوا تھا تب

حیاۃ الصحابہؓ مولانا محمد یوسف صاحب کی جلیل القدر تصنیف ہے۔ کتاب عربی میں ہے۔ یہ صحابہ کرام کے حالات و واقعات اور بیانات کی رو سے اکابریت و فخریت کا مجموعہ ہے۔ دو ضخیم جلدیں دارال معارف حیدرآباد سے طبع ہو چکے ہیں۔ تیسرا حصہ زیر طبع ہے۔

مکتوب مولانا محمد صاحب انوری۔

نحیر مولانا عبدالوہید صاحب۔

حضرت کو اپنے شیخ اور شیخ سے نہایت رکھنے والی چیزوں سے اتنا انس اور محبت تھی کہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں تو رائے پور کا کتا بھی پیارا کوئی نہ حضرت کا دور سے دور کا رشتہ دار بھی ہوتا۔ تو اس سے اس طرح جھجک کر ملنے کہ گویا اپنے کسی معزز قریبی عزیز سے مل رہے ہیں اس سے درجہ اظہار تعلق فرماتے کہ نہ جاننے والے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ لوگ حضرت کے کوئی قریبی عزیز اور خصوصی تعلق والے ہیں یہی عزیزوں کو ان کے مقابلہ میں ہمیشہ پیچھے رکھا بلکہ

اس غایت تعلق کا نتیجہ یہ تھا کہ کامل مناسبت اور اتحاد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "میرے اور شیخ کے تعلق کا کیا پوچھتے ہو حضرت کے قلب میں آتی وہی بات میرے دل میں آجاتی تھی بلکہ"

حضرت سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ خادمانہ برتاؤ فرماتے تھے۔ اور ان کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس کو اپنے نہایت مفید و موجب ترقی سمجھتے تھے۔ ایک بار فرمایا کہ:-

رائے پور میں شاہ زہد حسن صاحب مرحوم کی بیماری کی خبر آئی۔ میں نے سوچا کہ یہ ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے خادم تھے۔ خالص و صبر اللہ بنیر لائے ان کی عیادت کو جانا چاہیے۔ اس لیے رائے پور سے پیدل ہبٹ گیا۔ اس جاتے میں عجیب کیفیت رہی۔ اور ایک ایسی خوشبو آتی رہی کہ پھر وہ نہیں آتی۔ یہ اس صحیح نیت کی برکت تھی۔

یہ تعلق مردور ایام اور طویل مدت سے مضمل اور کروز نہیں ہوا تھا بلکہ جوں جوں وقت گزرتا اور وقت آخر قریب آتا جاتا تھا۔ اس محبت تعلق اور ترقی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں حضرت لکھنؤ میں مولانا محمد منظور صاحب کے مکان پر تشریف رکھتے تھے۔ عمائد شہر بھی حاضر تھے۔ حضرت اپنے نانا شاہ عبدالرحیم صاحب کے مرض وفات اور انتقال کا حال بیان فرما رہے تھے۔ جب انتقال کا ذکر فرمایا تو آنکھوں میں آنسو تھے۔ دم بدم ہوا تھا کہ زخم تازہ اور حادثہ بالکل قریب کہے۔ لاہور کے زمانہ قیام میں مرض وفات میں حضرت کا ایک مکتوب بنام شاہ زہد حسن لکھا تھا۔ جب آخر میں حضرت کا حکم گرامی "احقر عبدالرحیم" آیا تو مضبوط ہر سقاقت طاری ہو گئی۔

حضرت اپنے شیخ جن سے براہ راست تعلق تھا اور جو ولی نعمت تھے بلکہ اپنے سلسلہ کے تمام شیوخ بالخصوص سلسلہ ولی اللہی اور شوق کے مشائخ اور اہل سلسلہ سے نہایت درجہ عقیدت و محبت اور عشق و محبت کا تعلق تھا۔ ان حضرات کے بارے میں کسی طرح کی تنائیں یا طبیعت متعل نہیں تھی۔ اور یہ ایک ایسی غیر اختیار کی کیفیت تھی جس کا اندازہ دہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو سچی محبت، کامل اعتماد و شرافت و نگرانی کا جذبہ فطرت میں ملا ہے۔ صوفی محمد حسن صاحب راوی ہیں:-

ایک دفعہ دھڑیان میں شام کا کھانا ہو رہا تھا۔ حضرت والا خود دسترخوان پر تشریف فرما تھے۔ ایک صاحب نگر دسنا سے تشریف لائے۔ جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ اسلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ حضرت نے ان کو کھانے میں شریک نہ ہونے

تو مولانا عبدالوہید صاحب۔

تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

اس بیماری کے بعد حضرت شاہ صاحب مرحوم تک زندہ رہے۔ حضرت شاہ صاحب کی پشت پر برطان ہو گیا تھا اور وہ چھابا ہو گیا۔ اس مرض تک شاہ صاحب کو حضرت سے کچھ زیادہ موانعت و عقیدت نہ تھی لیکن اس کے بعد ان کو حضرت سے عاشقانہ و نوازہ تعلق پیدا ہو گیا۔ جو آخر تک۔

تحریر مولانا عبدالجلیل صاحب۔

کو کہ اپنا پیٹ کھانے میں شریک ہو گئے۔ ان کو حضرت کے ساتھ ہی بیٹھ لی۔ انھوں ایک ہی لقمہ اٹھایا ہو گا کہ انہوں نے حضرت اقدس سے سوال کیا اسوال بھی بڑے اکھڑنے سے کیا، حضرت! شاہ اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید کی تحریک کیوں انکام ہو گئی تھی؟ ناکامی کی وجوہات کیا تھیں؟ حضرت اقدس نے بڑی ناگاری کے ساتھ بلا غصہ کے ساتھ فرمایا کہ تم کوئی بزرگوں کے عیب نکالنے کے لیے تھوڑے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی سنی بہر حال مشکور ہے۔ اس سے وہ صاحب خاموش ہو گئے۔

بے نفسی و فناءیت

حضرت نے اپنے مرشد و مربی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی فناءیت و بے ذات سے متعلق اپنے ذاتی مشاہدہ و تاثر جو کچھ بیان فرمایا حضرت کے یہاں رہنے والوں کا بعد میں یہی تاثر حضرت ذات سے متعلق لیتے۔ کہ کبھی ایک کلام بھی ایسا نہیں سنا، جس میں اپنی تعریف کی وجہ آتی ہو۔ جب حاجی کاہیاں سرکٹا ہوا تھا۔ اس خدام کو اس کے آخری سفر حج میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔ اور تقریباً تین مہینے شب و روز ساتھ رہنا ہوا۔ بعض خدام نے اپنے اور انک و الطاف الہی واقعات بھی سنائے۔ پورے سفر میں حضرت نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی جس سے حضرت کے علو مرتبہ یا کسی کشف و ادراک کا احساس حج کے علاوہ کبھی کبھی کوئی ایسی بات قصداً نہیں فرمائی۔ جس سے لوگوں کی عقیدت میں اضافہ یا آپ کی بزرگی کا احساس ہو۔ خدام نے جب بے نفی، اپنا انکار، اپنی بے حسی اور غبارِ ذات کا اظہار سنا، شیخت کی باتیں یا مصوفانہ نکات یا سلوک و معرفت کی تحقیقات بیان کرنے کا حضرت کے دستور ہی نہ تھا۔ مسئلہ علماء پر چھپے، تصوف کی کوئی بات پوچھنا تو اگر حضرت شیخ الحدیث یا کوئی دوسرا صاحب علم و صاحب نظر قریب اس کی طرف متوجہ فرما دیتے، اگر اصرار کیا جاتا اور بات ضروری ہوتی تو نہایت چمچے تلے لفظوں میں مغز کی بات فرما دیتے۔ ایسی بات سے کہ جس سے آپ کی ذرت نگاہی باریک بینی کا اندازہ ہو۔ لیکن اہل حقیقت سمجھ جاتے کہ خواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

کسی بھری مجلس میں خواہ اس میں کیسے ہی نشہ نہ ہو اور سر برآوردہ اشخاص کیوں نہ ہوں اپنی لاعلمی اور اپنے عامی ہونے کا اظہار کرنا کوئی نالہ نہ ہوتا۔ خواہ اس کا اصرار حاضری مجلس اور خاص طور اہل علم طبقہ پر کچھ پڑتا ہو۔ ورنہ ہڈی میں ایک مرتبہ قریشی صاحب کی کوٹھی پر محفل کے بعد بڑی وسیع مجلس تھی۔ بعض اعلیٰ عہدہ دار، ممتاز علماء اور علماء شہر جمع تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب جے پوری نے غالباً اس مجلس کے حضرت کچھ ارشاد فرمائیں، اور لوگ مستفید ہوں، سوال کیا کہ حضرت مبرک حقیقت کیا ہے؟ حضرت نے بڑی بے تکلفی سے راقم کی طرف اشارہ کیا کہ مجھے تو معلوم نہیں، اُن سے پوچھو۔ میں نے اپنے نزدیک بڑی کس نفی اور تواضع سے کام لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مجھے تو اس لغوی مسئلے پر کچھ معلوم نہیں، نہایت سادگی اور اطمینان سے فرمایا کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں! مجلس پر سناٹا چھا گیا، حضرت کو اس کا احساس نہیں معلوم تھا کہ مجلس کے خواص حضرت کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ جن کو علماء اور علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنا شیخ و مربی تسلیم کر رکھا تھا۔ ایک مرتبہ لائل پور کے دوران قیام میں اس بارے میں خدام و احباب کے درمیان بڑی کشاکش تھی۔ کہ حضرت رمضان کہاں کریں، اہل تعلق لائل پور کے لیے کوشاں تھے لاہور کے احباب لاہور کے لیے مصرتھے۔ اور قریشی صاحب وغیرہ واولینڈی کے لیے عرض کرتے تھے حضرت نے ایک روز سحر کے وقت تینوں گروہوں کے خاص خاص اشخاص کو بلایا اور فرمایا کہ بھائی! دیکھو میں ایک عزم کا شکار کا لڑکا ہوں میں حضرت ایسی غرت تمہیں کریں جب طالب علمی میں آیا کرتا تھا تو میری والدہ کو فک ہو جاتی تھی کہ گہر کیوں کی روٹی کا انتظام کس طرح کریں؟ مجھی بھی تو کچھ زیادہ بڑھا نہیں، پھر جو کچھ بڑھا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔ اب تم جو مجھے کھینچے کھینچے پھرتے ہو اور کوئی ادھر لے جانا چاہتا ہے کوئی ادھر

برکت سے کہ کچھ روز اللہ کا نام لیا، تم خود اخلاص کے ساتھ چند روز اللہ کا نام کیوں نہیں لیتے کہ خود مطلوب بن جاؤ، یہ تقریر کچھ ایسی ساگی اور اثر
کے ساتھ فرمائی کہ بعض حضرات کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

لکھنؤ سے بریلی جاتے ہوئے سفر میں مجھ سے فرمایا کہ آپ لوگ اہل علم میں آکر آپ نے مجھے کیوں آگے کر دیا اور کیوں مجھے شرمندہ
میں، ایک سرشار خادم کو جو اپنی حقیقت اور احتیاج سے کسی قدر واقف تھے، اس کا جواب دینا چاہئے تھا، وہ عرض کیا گیا۔
ایک مرتبہ آزاد صاحب نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو مخاطب کر کے ایک غزل کہی جس کا مطلع تھا۔

یہ کیا ستم ہے کہ آزاد تیرے ہوتے ہرے

ہے میکہ میں بھی اور شہر کام ہے ساقی

یہ شعر سن کر فرمایا کہ بھائی میرے پاس تو پانی بھی نہیں، یہ شعر تو شیخ الحدیث کو سنانا، یہ دراصل حضرت کا حال تھا، جس میں کسی تعین
تہی کا دخل نہیں تھا۔ بدلتے اور وجدانی طور پر اپنے کو ہر کمال سے عاری سمجھتے تھے، اور اہل نظر کے نزدیک یہ مقام ہزار کرامتوں اور ہزار
معارف سے ارفع ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس دورِ انحطاط و اودیت میں مشائخِ متقدمین اور گذشتہ مہد کے اصحابِ یقین
کے زہد و توکل کی یاد تازہ کر دی، آپ کو دیکھ کر اور آپ کی صحبت میں کچھ وہ کران کے ان واقعات کی

توکل اور بذل و سخا

ن ہو جاتی تھی، جو اس زمانہ کے نا آشنا اور ظاہر میں اشخاص کو بالذات آمیز اور مشکوک معلوم ہوتے ہیں، یہاں اگر مال و دولت اور روپیہ
کی حقیقت کھل جاتی تھی، اور صاف نظر آتا تھا کہ وہ اس مروءت کی نظر میں کنکر یوں اور سنگ یوں سے زیادہ مہین، یہاں نہ کسی ایسے کا اعزاز تھا
اس کی دولت و ثروت اور جاہ و شہرت کا تذکرہ، بعض مرتبہ وزراء کے حکومت آتے اور چلے جاتے کبھی مخصوص خدمات سے بھی جو بعد میں
ان کی آمد کا تذکرہ تک نہ فرماتے، ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اس طرح استقبال یا دواغ ہوتا جو بڑے بڑے وزراء، امارا و کونسلر
لیکن ایک جگہ کے استقبال یا دواغ کا دوسری جگہ ذکر بھی زبان پر نہ آتا، معلوم ہوتا کہ یہ سب تماشہ ہے یا یہ سب اعزاز کسی دوسرے کا جو رہے
یہ سب زمین کا روٹی کا ایک کارواں پیچھے ہوتا، لیکن معلوم ہوتا کہ اس سب اعزاز و احترام سے بے تعلق اور علیحدہ کسی اور حقیقت پر نگاہ، جی
ہے، سب سے مانوس اور سب سے مستغنی تھے، مگر چھوٹی چھوٹی مزدوروں کا تو ایسا کھل جوتا کہ عقلِ ظاہر میں انگشتِ بزدان رہتی۔

پس انگشتانِ تنگ سے آتیں، موسم کے پھل اور میوے اور خاص طور پر چرن کی حضرت کو غذا یا دوا میں ضرورت ہوتی، وہ سہارنپور و دہلی
پاکستان تک سے بڑے اہتمام سے آتے اور اتنے جمع ہو جاتے کہ ان کا ختم کرنا مشکل ہو جاتا، اکثر دیکھا گیا کہ ادھر حضرت کو معالجے نے کوئی
بنا دیا، ادھر کوئی خادم بڑی مقدار میں نذر لے آیا، ایک مرتبہ رائے پور سے پاکستان کے لیے روانہ ہوئی، سہارنپور میں فرمایا کہ غلطی ہوئی موسم نہیں
پاکستان میں وقت سے ملتا ہے، موسمِ روغن کی ضرورت ہوگی، کچھ ہی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک شخص بہت سا موسم لے پھلا آ رہا ہے اور
کر رہا ہے۔

ادھر غریب سے ضرورت کی امید کی کہ آتی تھی، ادھر ان کا فوری عزم، روپیہ کدات کو رکھنا اور اس پر دات کا گزرا، طبیعت پر بڑا بار تھا،
مگر کچھ پیش فرماتے تھے، فوراً دوسرے مقامِ یقین خائفانہ اہل حاجت اور آنے والوں کو پیش کر دیتے، حاجی فاضل الرحمن خاں کہتے ہیں، کہ

روایت مولانا آزاد صاحب۔

صرف میرے ہاتھوں سے کبھی لاکھ روپے حضرت نے دوسروں کو دلائے ہیں۔ بعض اہل علم کو کرایہ کے نام سے سو سو دو سو سو فرمائے کا عام دستور تھا۔ کبھی ان کی آمد پر بڑی شفقت سے فرماتے کہ میں تو بہت دن سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ اور تمہارے لیے رقم ہوتے تھا۔ پھر فوراً کچھ عنایت فرماتے۔ ایک خادم جو سفر حج میں ساتھ تھے۔ حجاز سے مصر و شام چلے گئے تھے۔ ان کے ایک رفیق سزا کی رقم عنایت فرمائی۔ اور فرمایا کہ ان کو بھیج دو اور لکھ دو کہ تمہاری صحت بحری سفر کی متحمل نہیں۔ تم سوائی جہاز سے سفر کرنا۔ میں دیکھتا ہوں کہ بعض اوقات مٹی آ کر ڈر سے کوئی معتد رقم آئی۔ وصول کرتے ہی کسی کے حوالہ کر دی جو لوگ اس عادت سے واقف تھے۔ موقع پر موجود رہنے سے احتیاط کرتے تھے۔

صلی اللہ علیہ وسلم صاحب لکھتے ہیں:-

"مولانا عبداللہ صاحب دھرم کوئی نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ لاہور میں صوفی عبدالحمید صاحب کی کوشی پر حضرت والا قیام پذیر تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور سب لوگ سو رہے تھے۔ میں ساتھ کے کمرہ میں تھا۔ حضرت چارپائی پر آرام فرما رہے تھے۔ لیکن بیدار تھے۔ اور سب خادم سو رہے تھے۔ ایک نوادہ آئے۔ حضرت سے ملے اور کچھ نذرانہ پیش کر کے رخصت ہو گئے۔ حضرت نے ان کے جانے کے بعد فرمایا۔ اے بھائی کوئی ہے۔ چونکہ سب خادم سوئے ہوئے تھے۔ صرف ایک صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے (جن کا نام مولانا نے مصلحتاً نہیں بتایا) انہوں نے حضرت کی بات کا جواب دیا۔ فرمایا یہاں آؤ دیکھو یہ کیا ہے؟ انہوں نے دیکھ کر بتلایا کہ حضرت مبلغ سات سو پچیس روپے ہیں۔ فرمایا اچھا ان کی جیب میں ڈال لو۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے ضرورت نہیں ہے۔ مجھ پر اللہ کی مہربانی ہے۔ اور میں اس کے حضرت کی خدمت میں حاضر بھی نہیں ہوا۔ فرمایا۔ "اچھی بس ڈال بھی لو، کہیں کام آجائیں گے۔"

ڈاکٹر محمد اختر صاحب (نومسلم) بیان کرتے ہیں کہ:-

"ایک دفعہ جمع لگا ہوا تھا۔ بہت سے حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی شخص نے مصافحہ کرتے وقت بے تکلف عرض کیا کہ حضرت دس روپیہ کی ضرورت تھی۔ حضرت نے فرمایا اللہ سے دعا کرو۔ پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا۔ روپیہ کا نوٹ حضرت کے ہاتھ پر رکھا۔ حضرت نے آواز دے کر فرمایا۔ "اے بھائی وہ شخص کہاں گیا جو دس روپیہ مانگ تھا۔" وہ بولا، جی حضرت بیٹھا ہوں۔ فرمایا "تے یہ دس روپیہ" اس نے عرض کیا حضرت یہ تو سو روپیہ ہیں۔ فرمایا "اے بھائی مودج ہو گئی۔"

رقم کی مقدار اور تعداد میں ان حضرات کے نزدیک کوئی فرق اور اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ حقیر سی رقم قبول اور بعض مرتبہ رقم واپس فرمادیتے مولانا منظور صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے سامنے دو مٹی آ کر ڈر آئے۔ ایک پانچ روپے کا تھا ایک تو پانچ کا قبول فرمایا۔ نوے والے کو یہ کہہ کر واپس فرمایا کہ میں انہیں پہچانتا نہیں ہوں۔ رائے پور کا دسترخوان بہت وسیع تھا بالعموم ۵۰۔۶۰ اور بعض دنوں میں کئی کئی سو آدمی بھجان ہوتے دسترخوان بے بسا

۱۔ روایت مولانا منظور صاحب نعمانی۔

۲۔ روایت مولانا آزاد صاحب۔

حضرت اس سادگی اور اہل خانقاہ اور اہل ذکر کے لیے جھانسی اور سادہ غذا کو پسند فرماتے اور تکلفات و تنعم کو ان لوگوں کے لیے سمجھتے جو اپنی اصلاح و تربیت کے لیے آئے ہوتے ہیں، پھر بھی اس میں تنوع اور تکلف ہوتا رہتا۔ خصوصاً خصوصی مہمانوں کی آمد و رفت پر تو بروقت ایسا تنوع ہو جاتا کہ بڑے بڑے امرا اس کے یہاں دیکھنے میں نہ آتے۔
منظور صاحب نمائی لکھتے ہیں :-

اب سے چار پانچ سال پہلے کی ایک دن کی بات ہے ہم دونوں (یعنی عاجز اور رفیق محترم مولانا میر ابو الحسن علی ندوی) بھی حاضر تھے۔ لگ بھگ سو مہمان ہوں گے۔ دسترخوان پر خود میر نے گنا چار قسم کی توکیر تھی، تین قسم کی مچھلیاں تھیں، گوشت بھی کئی قسم کا تھا، یہ سب قرب و جوار کے دیہات کے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مجاہد و غلصین حضرت کے مہمانوں ہی کی نیت سے خود اپنے گھروں سے پکوا کر لے آئے تھے۔ اور دائیں پور کے خوش نصیب بھائی نور دہلوی ہی اپنے گھروں سے ناشتہ والوں میں بھر بھر کے کئی کئی قسم کے کھانے لاتے تھے۔ "إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا" کا یہ ظہور ادھر چند برسوں سے مسلسل ہو رہا تھا۔ حق یہ ہے۔ حَلَّ يَوْمَهُوْ فِي مَشَائِنَ۔ لیکن یہ سب کچھ اس دور میں ہوا جب حضرت اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے خود اس میں سے کچھ بھی نہیں کھا سکتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث کی آمد پر جتنا تکلف و اہتمام ہو حضرت کو بجا اور بر محل معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سامان بھی اللہ تعالیٰ بروقت اور غیب میں آتا اور اس کے لیے کبھی کبھی تردد کی ضرورت نہ ہوتی، غرض انہیں اہل توکل و یقین کو دیکھ کر آیت قرآنی وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَسَبِّحْهُ اور مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کی تفسیر ہوتی۔

بیتِ محبوبیت

دین سے استغنا اور معاشی بحران و دنیا پرستی کے اس دور میں آپ کی ذات کی طرف ایسا رجوع ہوا، اور محبت و معتقدین کا ایسا ہجوم ہو جس سے مسلمانوں کے عہد و عروج اور دینداری و خدا طلبی کے دور ترقی کی ہی جھلک نظر آگئی، آپ کہیں ہون گاؤں میں یا شہر میں، ہندوستان میں یا پاکستان میں، اہل طلب و اہل ارادت، آپ کی ذات سے ملتے تھے اور بغیر کسی اعلان و اشتہار کے پروانہ وار جمع ہو جاتا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۵۸ء میں آپ پاکستان جانے کے لیے لاہور آئے کہ لاہور کا گھول والی کوٹھی پر پہنچتے ہیں مقیم تھے۔ یہ جگہ آبادی سے باہر نہر کے کنارے الگ تھا کہ ہے۔ راقم کھنوسے رخصت کرنے کے لیے حاضر ہوا تو دیکھا ایک میل سال کا گاہر ہے، ناواقف آدمی دیکھتا تو سمجھتا کہ واقعی کوئی میلہ ہے، رواں لگی کے وقت مصافحہ و سلام کر نیوالوں جرم ہوا کہ بڑی مشکل سے آپ کی راحت اور باطنیان رواں لگی کا انتظام کیا جا سکا، مولانا اکرام الحسن صاحب کا نڈھلوی نے اس منظر کو دیکھ

حسن کی جنس حریدار لیے پھرتی ہے

ایک بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

یہی پاکستان میں حال ہوتا، کہیں تشریف رکھتے کئی کئی سو کا جمع حاضر رہتا۔ وسیع کوٹھیوں کا چپہ چپہ ذکر کرنے والوں اور دور دور سے آگاہ و معذور ہوتا، آپ کی ذات نے ثابت کر دیا کہ زمانہ کے انقلاب کا بہانہ ہے، اخلاص و کمال کہیں غنی و مستور نہیں رہ سکتے۔
ایک ہریانہ بلبل اور جہاں شمع ہو وہاں پروانے ضروری ہیں۔

محبت و شفقت

حضرت ر

حضرت کی زندگی اور اپنے خدام اور اہل تعلق کے ساتھ تعلق میں جو اداسب سے زیادہ نمایاں اور روشن
حضرت کی غیر معمولی محبت و شفقت تھی جس کو بعض خدام (جن کو اس محبت کا تجربہ ہوا تھا) شفقت
سے تعبیر کرتے تھے۔ اور اس کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور تشبیہ نہیں ملتی۔ اس شفقت کو دیکھ کر زمانہ سابق کے شیوخ کا ملین
نظام الدین اولیا وغیرہ کی شفقت کے واقعات یاد آتے تھے۔ اور اس کی تصدیق ہوتی تھی کہ ان کے خدام اگر جگہ نہ ہونے کی وجہ
میں کھڑے ہوتے تھے تو فرماتے تھے سایہ میں آجاؤ۔ دھوپ میں تم کھڑے ہو اور جلا میں جا رہا ہوں۔ ان کے دسترخوان پر لوگ کھا
فرماتے کہ کچھ کھاتے ہو اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کھانا میرے حلق میں جا رہا ہے۔ اور اندازہ ہوتا تھا کہ جب ان حضرات کی شفقت
ہے تو انبیاء علیہم السلام اور سید الانبیاء علیہ السلام (عَزَّوَجَلَّ عَلَيْنَا مَاعْنِیَ تُمْ حَرِیصٌ عَلَیْکُمْ بِاللَّهِ
رَبُّوْکُمْ وَرَحِیْمٌ) کی رافت و شفقت کا کیا عالم ہوگا؟

حضرت کی یہ ادا اور مزاج اتنا نمایاں اور ان کی زندگی اور اخلاق و معاملات پر اتنا غالب اور حاوی تھا کہ کوئی خادم بھی
کو کچھ تعلق جو اس کی لذت و حلاوت سے نا آشنا نہیں رہ سکتا تھا۔ اور وہ بلا تصنع کہتا تھا کہ حضرت کی شفقت نے ماں باپ
یاد دلادیا اور بہت سے لوگ تو اس پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ حضرت کے ایک مہتر شاہ اس شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
"حضرت ایسے شفیق تھے کہ ماؤں کی شفقتیں ان پر مہتران میں نے اپنی باؤں ساہ عمر ۶۰ سالہ تعلق میں دیکھی کی ماں اور بیٹی
استاد، نہ کوئی دوست، نہ کوئی بزرگ ایسا مہرمان دیکھا۔ مہرمانوں میں سے اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو حضرت کو تمام باتیں
آتی تھیں۔ اس ڈور کی وجہ سے خدام کسی مہرمان کے بہت زبچہ بیمار ہونے کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔

حضرت کے ملنے والے تمام حضرات فرداً فرداً یہ سمجھتے تھے کہ حضرت کو جتنی مجھ سے محبت ہے اور وہ سے نہیں
سے زیادہ محبت مجھی سے ہے۔ آپ کے اندر کوئی ایسی کجی کی سی محبت تھی کہ جتنا بھی کوئی مصیبت زدہ اور مکر مند ہو
کو دیکھ کر تمام تکلیفیں دور ہو جاتیں۔ بہت سے جو لوگ پیدل چل کر جاتے یا چھادریاں سے جو ڈھڈیاں یا پا پادہ جلا
میں بوڑھے اور امیر لوگ ہوتے جو پیار سے بالکل تھک جاتے، اس حضرت کو دیکھتے ہی تمام تھکان دور ہو جاتا، اور
میرا بار کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔

ایک دوسرے صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

میں نے اپنی تمام عمر میں ایسا شفیق شخص نہیں دیکھا، کوئی شخص اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں کر سکتا۔ جتنی حضرت بزرگوں
کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کھانے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کچھ بھی نہ کھایا، حضرت نے
کمال شفقت سے فرمایا کہ تم کھاتے ہو تو میں ہی کھانا ہوں۔"

مولوی عبداللہ صاحب دہلوی لکھنؤ کے زمانہ قیام مرکز میں درگاہ میں مبتلا ہوئے۔ حضرت کو ان کی وجہ سے سخت بے آرام
مہتاب آپ خاموشی سے اٹھ کر ان کی جانب قیام پزیر نہیں لے جاتے اور ان کا حال دیکھتے، ہر طرح کے علاج و تدبیر کا اہتمام فرمایا
مکتوب مولانا سعید احمد صاحب (ڈوگڑہ بنگر) ضلع بہاول نگر۔
مکتوب ہاشم منظور محمد صاحب ایم۔ اے۔

مولانا محمد صاحب انوری تحریر فرماتے ہیں کہ:-

”جب میں حضرت اقدس کے حکم سے (تحریک ختم نبوت کے سلسلہ میں) جیل گیا تو حضرت مرگودھاسے میرے گھر (لاٹل پور) تشریف لائے اور کچن کو تسلی نشینی دیتے رہے۔ فرمایا میں فقط تم سے ملنے کے لیے آیا ہوں، ملک و امیندیش صاحب نے کہا کہ جیسوٹے چھوٹے بیٹے ہیں، وہ تو حضرت کے حکم کی دیکھتی، حکم ہوا فوراً جیل چلے گئے۔ اس پر حضرت اقدس پر بہت رقت ٹائی ہو گئی، فرمایا وہ پہلے بھی میرے ہی کہنے پر ڈھاکہ تبلیغ پر چلے گئے تھے۔ وہاں بھی ہم نے ہی بھجوا تھا۔“

مولوی محمد یحییٰ صاحب بہاول نگر ہی اپنی پہلی حاضری اور حضرت کی شفقت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”حضرت نورانہ تشریف لائے ہوئے تھے، احقر بھی والد ماجد کے ساتھ چلا گیا، والد صاحب نے پہلے مصافحہ کیا، حضرت نے فوراً احقر کا نام لے کر دریافت فرمایا کہ برخوردار نہیں آئے؟ والد صاحب نے عرض کیا آیا تو ہے وضو کر رہا ہے۔ اتنے میں احقر بھی حاضر ہو گیا۔ مجلس بھری ہوئی تھی، حضرت نے بڑی شفقت سے مصافحہ فرمایا، اور بڑی ہی محبت فرمائی، حتیٰ کہ فرمایا برخوردار تم کو میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ، میں تعیل ارشاد میں بیٹھ گیا، حضرت والد صاحب اور نانا صاحب کی طرف منسوب ہو کر فرماتے گئے کہ برخوردار کا میرے پاس خط آیا تھا کہ میرے فلاں فلاں بہن ہیں میرے لیے دعا کریں اور میری اصلاح کرنی آپ پر واجب ہے۔ دین قیامت کے دن دامن گیر ہوں گا، تو میں نے بڑا غور کیا کہ بھئی کے نام کا کون لڑکا ہے؟ آخر خیال آیا اوہو یہ تو حضرت بہاول نگر ہی رحمۃ اللہ علیہ کا پوتا ہے تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ الحمد للہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد دین کی طرف توجہ رکھتی، پھر تقریر ہوئی رہی جو تقریر فرماتے اس کا خطاب مجھ کو فرماتے، اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی مجلس سے الگ ہوتا تو فوراً بلا لیا جاتا، نماز کے وقت پر حاضری میں دیر ہو جاتی تو فوراً یاد فرماتے، اور اپنے برابر ایک ہی چار پائی پر بیٹھتے، احقر کے ساتھ ایسا بڑا دکھایا، جیسے کہ اپنے بڑے عمن سے کیا جا سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جس پر کوئی اتنا خوش ہوتا ہے تو وہ انعام بھی دیا کرتا ہے مجھے اتنی خوشی ہے کہ برخوردار کو انعام دیا جائے، اس کے بعد آپ نے اپنی جیب سے پچاس روپیہ نکالی کر عنایت فرمائے، والد صاحب سے فرمایا دیکھو یہ رقم برخوردار کی ہے اسی پر خرچ کرنی ہوگی، کھانے پینے کی جو چیز آتی، اسی وقت مجھے اپنے ساتھ ملا کر کھلاتے اور فرماتے بھائی یہ تو برخوردار کے لیے ہے اور مجھ سے فرماتے برخوردار خوب کھاؤ۔“

حضرت کے ایک خادم صوفی محمد حسین صاحب لکھتے ہیں:-

”۱۹۵۳ء میں جب کہ احقر دفتر پٹنہ کٹر جیل میں ملازم تھا، حضرت اقدس لاہور سے راولپنڈی تشریف لے جا رہے تھے جب جیل سے گزرے تو کار کے ڈرائیور سے فرمایا کہ کار کو شہر کی طرف لے چلو جب شہر پہنچے تو فرمایا کچہری کا راستہ پر دیکھ کر کچہری کو چلو، چنانچہ کچہری پہنچے اور گروڈنڈین کار کھڑی کر کے کار سے باہر اترے۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے، نو بجے دوپہر کھلتے تھے، کوئی آدمی کچہری میں موجود نہ تھا، آخر ایک چڑیا سیلا اس سے رات کے مکان کا پتہ دریافت کیا، اس نے اٹلی کا اظہار کیا، اور بتایا کہ نو بجے دفتر کھلے گا، چنانچہ کچھ دیر کچہری کے میدان میں حضرت والا بیٹھتے رہے اور تقریباً آدھ گھنٹہ تک

۱۰ تحریر مولانا محمد صاحب انوری،

۱۰ تحریر مولوی محمد یحییٰ صاحب بہاول نگر ہی،

انتظار کر کے راولپنڈی تشریف لے گئے۔

نوبتے جب احقر شہر سے دفتر کو آ رہا تھا۔ وہی چیز اسی ملا اور کہتے لگا۔ کچہری میں ایک کار میں چند سفید ریش بڑھے آئے تھے اور تیکھے پوچھتے تھے۔ احقر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ بڑھے کون لوگ ہوں گے؟ آخر بار بار جلیہ پوچھنے پر یقین ہو گیا کہ حضرت اقدس نے کم فرمایا ہوگا۔ اپنی بے یقینی پر اگرچہ انہوں نے ہوا لیکن فوری طور پر دفتر سے رخصت لے کر اسی دم احقر راولپنڈی حضرت کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جب حضرت اقدس کی خدمت میں پہنچا تو حضرت بار بار ہنس کر فرماتے۔ "آج تو ہم نے تمہاری برکت سے کچہری بھی دیکھ لی۔ احقر شرمندہ ہو کر عرض کرتا کہ سب حضرت کی عنایت ہے، یہ فردہ بے مقدار ان نواذات کے قابل کہاں ہے۔"

اگر اس طرح کے ذاتی واقعات جن سے حضرت کی پوری واداری شفقت اور عنایت خصوصی کا اظہار ہوتا ہے اور مختلف خدام ان کو بیان کرتے ہیں نقل کیے جائیں تو ایک ضخیم دفتر تیار ہو جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخلاق و شفقت نبوی کی یہ روایت مشائخ کبار کو ملتی ہے یہ سمجھتا اور یقین کرتا ہے کہ انہ اکرم علیہ من صاحبہ (میں دوسرے سے زیادہ معزز و محبوب ہوں)

یہ شفقت اتنی خود نواز اور دقیقہ رس تھی کہ جن لوگوں سے خصوصی شفقت تھی، ان کی مرغوبات کا بھی اہتمام اور اس کی تاکید یلین فرماں پورب کے ایک خادم جو چاول (خشک) کے عادی اور شائق ہیں، بیان کرتے ہیں کہ میرے لیے ہمیشہ خواہ ہندوستان ہو خواہ پاکستان احقر اہتمام کی تاکید فرمائی جاتی، اور میزبان سے دریافت فرماتے کہ ان کے لیے خشک بھی تیار کیا ہے، ایک روز رمضان مبارک کے آخری عشرہ کے بعد کی مجلس تھی، کتابہ تم ہو چکی تھی، مولانا حبیب الرحمن کو (جو اس زمانہ میں لنگر کے ماتم تھے) یاد فرمایا عرض کیا گیا کہ مولانا صاحب گھر پر بلاؤ، ان کے آنے میں کچھ دیر لگی، دریافت فرمایا کہ آئے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ آدمی ملائے گیا ہوا ہے، یہ اہتمام دیکھ کر ایک صاحب پھر گویا منتظر تھے کہ حضرت اس اہم وقت میں کون سی اہم بات مولانا سے فرمانے والے ہیں، اور کس لیے اس اہتمام کے ساتھ ان کی طلبی اور یادگاری، تشریف لائے تو ان صاحب کا نام لے کر فرمایا کہ آپ نے ان کے لیے خشک بھی تیار کیا ہے؟ پھر بڑی شفقت سے ہدایت دیتے رہے کہ رہے کہ خشک مزدور تیار کیا جائے، اور روٹی بھی ہونی چاہیے، اس لیے کہ یہ دونوں چیزوں کے عادی ہیں،

۱۹۵۰ء میں سفر حج میں راقم سطور کو معظمہ میں دوستوں اور وہاں کے علماء سے ملنے چلا جاتا یا کسی اجتماع میں شرکت ہوتی، طلبہ احقر جب حرم شریف سے خلوت میں حاضر خدمت ہوتا تو دیکھتا حضرت کے پاس کھانا رکھا ہوا ہے اور حضرت منتظر ہیں، بڑی شفقت کے ساتھ کہ تمہیں نوکھانے کا بھی ہوش نہیں، دیکھو تمہارے لیے یہ روٹیاں رکھی ہیں یہ کھانا تمہاری صحت کے مطابق ہے،

ان جزئیات اور واقعات لکھنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس شفقت بے پایاں کا کچھ اندازہ ہو سکے، جو خدام و اہل تعلق کے احقر تھی ان خصوصی اہل تعلق کے آنے سے بڑے مسرور ہوتے، کبھی فرماتے کہ تم نے حکم کر دی، بڑا انتظار کروایا، کبھی کسی سے رخصت ہونے فرماتے۔ "دیکھئے اب کب نصیب ہوتے ہیں" ایک خادم کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ روادا سے رخصت ہونے لگا، مولوی عبدالمنان صاحب سے فرمایا کہ الٹیشن جا کر گاڑی پر سوار کرنا اور بیٹھ کر کلاس کا منکٹ خرید کر دینا، خود دولت میر کو تشریف لے گئے کچھ دیر کے بعد تشریف لائے چلتے وقت دیکھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبا رہے ہیں، تجل و منبط کہتا ہے کہ ٹپکنے نہ پائیں اور عبت کہتی ہے کہ کیا حرج ہے؟

والد مع بینہما عصی طبع

نومسلموں سے خصوصی تعلق اور شفقت

ان سید روحوں سے جو اپنی طلب صادق اور ذاتی جذبہ سے دین حق کو قبول کرتے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ اور ان پر اولاد کی سی شفقت فرماتے تھے۔ ان قابل حضرات کی اتنی قدر اور ان سے محبت کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب رائے پوری اور اختر صاحب کے ساتھ، کاغذ نامہ نہایت شفیق باپ اور بڑے چاہنے والے مرلی کا تھا۔ ان کی دلی جوئی ان کے آرام و صحت کا خیال تھا۔ ان کی ضروریات کا تکفل، ان کی اولاد شفقت اور ان کی تعلیم و تربیت و معاش کی فکر، ان کی شاہدوں کا اہتمام، غرض محبت کرنے والا باپ اور سرپرست خاندان جو برتاؤ اپنی محب اولاد اور افراد خاندان کے ساتھ کرتا ہے اور ان کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے، وہی برتاؤ حضرت کان عزیزوں کے ساتھ جنہوں نے آغوش اسلام میں پناہ لی تھی، اگر کوئی ناواقف شخص حضرت کا مولانا حبیب الرحمن صاحب کے ساتھ برتاؤ اور رائے پور میں رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ان کو جو خصوصیت، اعتماد اور تقرب حاصل تھا دیکھنا تو یہی سمجھتا کہ یہ تو حضرت کے فرزند ہیں یا حقیقی بھتیجے، بھائی کے ایمار اور تعلق خصوصی کی بنا پر مولانا اشفاق احمد صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ کے منتولی مقرر ہوئے۔ مدرسہ مولانا بلکہ ان کے صاحب حکیم حب الرحمن پر بھی خصوصی شفقت تھی، مولانا کے اگر غیر مسلم بھتیجے کبھی ملاقات و زیارت کو حاضر ہوتے تو حضرت بڑی شفقت فرما کر حضرت کی طبیعت میں حقیقت پسندی، علمیت اور زانگہ تفرغ کی رعایت بہت تھی۔ آپ کی طبیعت میں وہ افراط و تفریط اور تجمل

حقیقت پسندی اور حالات نامانے باخبری

نہیں تھی جو اکثر فطرت و ذہانت یا شدت عبادہ یا رجائیت (ضرورت سے زیادہ پرمیدار و نیک گمان ہونا) پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کا ذہن بڑا امن اور عملی تھا۔ حقائق و واقعات پر خواہ وہ کیسے ہی تلخ اور تشویش انگیز ہوں آپ کی نظر بہت تھی، معاملہ کا کردار اور تاریک پہلوئیں دیکھتے تھے کی نئی تبدیلیوں اور تقاضوں پر آپ کی نظر تھی، اور آپ ان کو پوری اہمیت دیتے تھے، اور ان کی طرف متوجہ اور متنبہ فرماتے رہتے تھے باوجود ایک مخصوص و محدود ماحول میں نشوونما پانے اور زندگی گزارنے اور ایک خاص دینی طبقہ سے تعلق و وابستگی رکھنے کے آپ کا ذہن فراتر از مصلح، نمودار اور نقاد تھا کہ قدیم دینی طبقہ میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

حضرت اسلامی ممالک کے لیے مادی ترقی، نئے علوم کا اکتساب، جدید صنعتیں، سائنس میں ترقی، مالی استحکام اور بخیر و کفالتی ضروری سمجھتے تھے، اور عام طور پر (خصوصاً پاکستان کے زمانہ قیام میں) اپنی مجلسوں میں خاص طور پر جب جدید تعلیم یافتہ حضرات

۱۔ آئین و دین و احکام اور تقاضوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہے۔

۲۔ مولانا ایک معزز مذہب زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پرانا نام بلوئندرس گند تھا۔ جنال و حجاب صنایع سنگورو ریاست پٹنالیں ہے۔ اے والے تھے، فرید کوٹ میں تعلیم پائی۔ وہیں ۱۹-۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی صاحب ظہر شریع ریاست جے پور اکیلفین سے ملا

۱۹۲۴ء میں حضرت سے بیعت ہوئے۔ اور ان کا جانا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں ماہ رمضان میں راجپور مستقل قیام اختیار کیا، ۳۶-۱۹۳۸

حزب انصاف قائم کی جس کی سرپرستی حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے قبول فرمائی اور سرپرست کی حیثیت سے نام کے اعلان کی اجازت

”فصلہ نشریت رکھتے ہوں۔“ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ عالم اسلام کے اس سلسلہ میں تباہی و بخلت کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

”مسلمان اپنے غرضان میں مبتلا ہو کر کچھ ایسے سوئے ہیں کہ جاگنے کا نام نہیں لیتے، جس وقت یورپ جاگ رہا تھا، مسلمان ترک ٹیمپری لینڈ سو رہے تھے۔ اس نے ہر قسم کا سامان جنگ بنایا۔ لیکن مسلمان غفلت میں پڑے رہے۔ جب تک مسلمان پاس نہ ہو رہا، کس طرح لڑی جاسکتی ہے۔ مسلمانوں کی ساری سلطنتیں اسلامی بھی بن جائیں تو جنگ کے لیے ایک دن کا خرچ دینے کی بھی طاقت نہیں، انگریز جن کے پاس اتنی بڑی سلطنت ہے کہ اس کے ملک میں سورج غروب نہیں ہوتا، برہمی جنگ کا خرچ برداشت نہیں کر سکا۔ چنانچہ اپنے ملک کے بیشتر حصے قرض میں دیدیئے۔ لڑائیاں لڑنا آسان نہیں ہے۔“

ایک مرتبہ ایک مسلمان ملک کے ایک بڑی سلطنت سے امداد لینے کا تذکرہ تھا اور بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، فرمایا:-

”کیا کریں؟ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں، ان میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ اپنی جملہ ضروریات کی اشیاء خود مہیا کر سکیں، بہر حال اپنی ضروریات کے لیے ان کو ان سے تعلقات رکھنے ضروری ہیں، عرب سلطنتوں میں سب سے زیادہ طاقت ورمصر شمار ہوتا ہے۔ وہ بھی ان کا محتاج ہے۔ عرب شریف ہے تو وہ محتاج ہے۔ امریکہ سب کو اپنے قبضہ میں لے رہا ہے۔ اگر پاکستان ملے سو سال تک سامان تیار کرنے میں لگے رہیں اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے لڑیں تو ممکن ہے کہ اتنی طاقت حاصل کر سکیں کہ ان سے مستغنی ہو سکیں اور ان کا مقابلہ کر سکیں۔“

ایک مرتبہ فرمایا:-

”نیک نیتی سے ملک کی طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے۔ سب دین ہی ہے۔ دَاعِدُوا اِلَیْہِمْ مَا اِنْشَطَعُمْ مِّنْ قُوَّةٍ اگر یادداشت قاسم سے نماز بھی پڑھی جائے تو وہ عبادت ہے۔ اسی طرح نیت صلح سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے سارے کام سارا دین ہی دین ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تاریاں ازخراق آوردہ شود مارگزیدہ مردہ شود؛ افراد کے اخلاق کی اصلاح بھی ضروری ہے لیکن ملک کی حفاظت بھی ضروری ہے۔“

ایک مرتبہ فرمایا:-

”اسلامی نظام خالی باتوں سے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم و فنون سیکھنے ہوں گے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین و مذہب کو خیراد کہہ دیتے ہیں جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو۔ اس زمانہ میں دین و دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

حضرت اکثر اسلامی ممالک بالخصوص حجاز کے متعلق بڑے افسوس اور قلق کے ساتھ اظہار خیال فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے ابھی بھی صنعت و حرفت اور اپنی ضروریات کو اپنے ملک ہی میں پیدا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور ان کی دولت زیادہ تر باہر سے ضروریات زندگی کے لئے

۱۔ جلس ۲۳ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۷ مئی ۱۹۵۴ء گھوڑا گلی رکوہ مری) بیاض مولوی احمد علی صاحب مرحوم۔

۲۔ ۲۳۔ ۲۴ رمضان المبارک ۱۳۷۳ھ (۲۷ مئی ۱۹۵۴ء گھوڑا گلی رکوہ مری) بیاض مولوی احمد علی صاحب مرحوم۔

۳۔ مسودہ صوفی محمد حسین صاحب مجلس برسکان مولوی عبداللہ صاحب گجراتی۔

کرنے پر صحت ہوتی ہے۔ شعبان ۱۲۸۱ھ جنوری ۱۹۶۲ء میں واقعہ نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ کویت و قطر وغیرہ کا سفر کیا۔ تب لمبازت اور رخصت کے لیے اسے پورہ حاضر ہوا۔ تو بڑی عنایت و محبت سے رخصت فرمایا۔ چلتے وقت خصوصیت کے ساتھ فرمایا: "ان جملہ مانوس سے کہنا کہ اپنی دولت کا صحیح استعمال کریں۔ کارخانے بنائیں اور صنعتوں کو رواج دیں۔ کویت میں مغربی تہذیب کا تسلط اور مادیت کا غولان دیکھ کر دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان عرب ریاستوں کے حالات کے گہرے مطالعہ سے اندازہ ہوا۔ کہ یہاں کی زندگی کی ڈوری ان ملکوں کے قاضیوں کے ہاتھوں میں نہیں۔ بلکہ یورپ کے سربراہوں کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہاں کی ساری روشنی اور جگہ گاہٹ کا بٹن (سوئچ) یورپ میں ہے۔ یہاں کی زندگی اور رجحان مغربی زندگی اور رجحان کا عکس ہے۔ میں نے حضرت کی خدمت میں وہاں سے مفصل غرضیں لکھیں۔ جن میں وہاں کے حالات کا تذکرہ اور اپنے تاثرات بھی تھے۔ ایک طرف میں یہ جملہ بھی آیا کہ یہاں کے حالات دیکھ کر بڑی یالرسی ہوتی ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک خود یورپ میں کوئی انقلاب نہ ہو، یہاں انقلاب نہ ہوگا۔ حضرت کے حقیقت پسند اور نفاذ دہن کو غالباً یہ جملہ پسند آیا اور اس میں حقیقت حال کی صحیح ترجمانی محسوس ہوئی۔ میں واپسی پر رمضان المبارک کے اخیر عشرہ میں حاضر ہوا۔ میری آمد کی اطلاع ہوتے ہی یاد فرمایا گیا اور مصافحہ کے ساتھ ہی فرمایا کہ آپ نے اپنے خط میں وہ کیا جملہ لکھا تھا کہ جب تک یورپ میں انقلاب نہ ہو، میں نے اس کی تقریر کی کہ واجب و اس کے کہ رمضان مبارک حضرت کے ہاں دین گفتگو کرنے کا معمول نہیں تھا۔ لیکن بہت دیر تک بہت تفصیل کے ساتھ کویت کے حالات دریافت فرماتے رہے۔ اور بڑی غور و توجہ اور دلچسپی کے ساتھ سنتے رہے۔ اس ایک مجلس سے میری نہیں ہوئی۔ متعدد بار مختلف وقتوں میں بلا بلا کر پوچھتے رہے۔ اسی سال جب واقعہ میں حجاز جانا ہوا اور رخصت کے لیے رائے پورہ حاضر ہوا۔ تو پھر اسی قسم کی بیانات دیں اور ملک کے ذمہ داروں اور سربراہوں کو اپنے ملک کی اصلاح و ترقی کی طرہ متوجہ کرنے کی تلقین فرمائی اور واپسی پر بازو در نہایت تقاضا اور صنعت کے وہاں کے حالات دریافت فرمائے۔ اور یہ معلوم کرنا چاہا کہ پیغام کہاں تک پہنچانے کا موقع ملا؟ پاکستان کے اہل ثروت کو بھی کارخانے قائم کرنے اور صنعتوں پر اپنا سرمایہ لگانے کی تلقین فرماتے رہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان سے تیسرے زمینداری کے بعد صنعتوں کو اختیار کرنے اور اپنی اولاد کو کوئی ہنر یا صنعت سکھانے کی بڑی تاکید کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اب ہندوستان میں بغیر اس کے شریفانہ زندگی گزارنا مشکل ہے۔ جن مسلمانوں کو ایسے پیشے اور صنعتیں اختیار کرنے سے (جس پر نامہ اقوام اور اہل حرفہ کا شمار بھی جاتی تھیں) غار اور تنگ محسوس ہوتا تھا۔ اس کی ہمیشہ اصلاح اور ترقیہ فرماتے تھے اور اس احساس کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ راہبر کے حضرات اور دہمے سے زمیندار طبقہ کے افراد کو ہمیشہ مشورہ دیتے تھے کہ اپنے سرمایہ کو کسی تجارت یا صنعت پر لگا کر کمپنیاں بنالیں بعض لوگوں کے لیے جو حضرت کو صرف ایک شیخ طریقت اور روحانی مرشد سمجھتے تھے اور آپ سے صرف اسی سلسلہ کی ہدایات اور رہنمائی کے متوقع رہتے تھے اس طرح کا مصنون منشا (جو ان کے نزدیک شیخ و ارشاد کے خلاف تھا) ایک نیا تجربہ اور غیر متوقع سی بات تھی۔ لیکن حضرت اس کی بالکل برداشتیں کرتے تھے اور نہایت زور اور جوش کے ساتھ کبھی کبھی اس پر تقریر فرماتے تھے۔

حضرت ان لوگوں کے لیے جو فریضہ، حج سے فارغ ہو گئے ہیں بار بار حج نفل کرنے کی (سوائے خاص حالات کے) ہمت افزائی نہیں فرماتے تھے۔ اس کے بجائے ایسے کاموں میں روپ صرف کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ جن میں دین کی ترقی اسلام و مسلمانوں کا استحکام ہے۔ حضرت کو (ایک عجیب طائفہ اور مہر کی حیثیت سے) اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ کہ اس میں نفس کا حصہ نہیں ہے۔

"ایک صاحب حج نفل کے لیے تیار تھے حضرت نے بلایا اور ہنس کر فرمایا کہ اگر لوگوں سے کہا جائے کہ نماز خوش و دشمن سے پڑھو

تو بار ہو گا اور نہیں ہو سکے گا لیکن حج کے لیے کہا جائے تو فوراً تیار ہو جائیں گے۔

حالات زمانہ اور بیرونی دنیا میں اور ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس سے واقف رہنے کا بڑا اہتمام تھا۔ اخبارات کی اہم خبریں اور اہم مسائل و جدید معلومات کے سننے کا ساری عمر اہتمام رہا۔ رائے پور میں یہ خدمت راؤ فضل الرحمن خاں صاحب کے اور پاکستان میں رفیق احمد خاں کے پر تھی۔ بہت سے نووارد اس معمول اور اہتمام کو دیکھ کر متعجب ہوتے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان آثار سے بالاتر اور مستغنی تھے۔ بھرت کی پر "نوائے وقت" میں رفیق احمد خاں صاحب نے حضرت کے اس شعبہ زندگی سے متعلق اپنے کچھ تاثرات شائع کرائے تھے، جن میں انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ حضرت کے اس ذوق و اہتمام پر روشنی ڈالی تھی۔ یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔

" بعض لوگوں کے لیے یہ بات حیران کن ہوگی کہ حضرت اقدس جیسے بلند مرتبہ بزرگ اور نظامہ دنیاوی علائقی سے لاتعلق انسان کو زمانہ کی خبروں اور سیاسی امور اور ملکی و غیر ملکی حالات و واقعات اور سائنسی تحقیق اور ایٹمی ایجادات و انکشافات سے کیا غرض و دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مگر شریک محفل رہنے والے احباب پر یہ بخوبی واضح ہے کہ حضرت اقدس یہ حالات کس درجہ توجہ و اہتمام سے سنا کرتے تھے۔ ملنے والوں سے اکثر تازہ خبریں سننے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی کسی خبر پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نہایت پُر لطف انداز میں تبصرہ فرماتے جس سے ان کی دور بینی، نکتہ شناسی اور گہری فہم و فراست کا ثبوت ملتا۔ اس وقت حضرت کے ارشادات گرامی کو سننے کے لیے محلِ مہرِ مہرِ گوش ہوجاتی، مگر حضرت کی آواز بوجہ درجہ نفاہت و درجہ نہ پہنچتی۔ اس لیے قریب بیٹھنے والے احباب بھی مشکل ہی سمجھ پاتے، تاہم حضرت کے چہرے سے فکر و اشتیاق یا خوشی و مسرت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ حضرت کو پاک بھارت کے باہمی تعلقات کی خبروں سے گہری دلچسپی تھی، دونوں ملکوں کے تعلقات کی بہتری و اصلاح کی کوئی خبر سننے تو بہت خوش ہوتے اور فرقہ وارانہ فسادات کی خبروں سے پریشان و فکر مند ہوتے۔ دونوں ملکوں کے چوٹی کے لیڈروں کی فرقہ وارانہ مذمت کی کوئی خبر سننے تو بڑی تسلی کا اظہار فرماتے حضرت اقدس بھارت اور پاکستانی کے باہمی بہتر تعلقات کو دونوں ملکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ضروری خیال فرماتے۔

سائنس کی کھوج اور تحقیق اور معلوماتی خبروں سے خاص شغف تھا، مصنوعی سیاروں کی زمین کے مدار پر گردش اور چاند تک پہنچنے کی کوششوں کے متعلق ہر خبر کو وہ غور سے سنتے۔ ایٹمی آلات، میزائل، راکٹ اور ایٹمی سائنسی ایجادات وغیرہ کے بارے میں معلوماتی خبروں کی طرف پورا دھیان فرماتے۔ مختلف ایجادات اور ایٹمی سرگرمیوں کو عالمی جھلانی کے کام میں لانے کی کسی خبر سے وہ مسرور و مطمئن ہوتے، چاند کے متعلق سائنس دانوں نے جو انکشافات کیے ہیں، اور کھوج اور تحقیق کی جو سعی جاری ہے۔ اس کے تازہ کوائف کے بارے میں اکثر دریافت فرماتے رہتے۔ چاند کے علاوہ اجرام فلکی سے متعلق سائنسدانوں کی تحقیق اور کوشش کی دوسری خبروں سے بھی دلچسپی کا اظہار فرماتے۔ اور اس قسم کی معلوماتی خبروں کو بڑے غور سے سنتے، چاند تک انسان کی رسائی کے بارے میں سائنسدانوں کی شک و دود اور حیرت انگیز کارکردگی رننے نئے راکٹوں کی تیاری اور اس ضمن میں آئندہ کی کوششوں کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار نہ فرماتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا یہ مگر یوگ و اورو ازمی اور ہمت کے لحاظ سے جن ہیں، جو دن رات نئے نئے تجربات سے کھوج اور تحقیق میں لگے رہتے ہیں، اور عجیب و غریب کارہائے نمایاں سر انجام

دینے کے لیے شکل اور جان جو کھوں کی جہات سے ذرا نہیں مگر رہتے۔ سائنس کی بوجہ تحقیق وترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے، وہ انسان کو چاند تک رسائی کو بعید از قیاس تصور نہیں فرماتے تھے بلکہ ایک روز دینے ایک عاقل سے جس کو فریاد نہ گئے۔

”جب لوگ بالائے زمین چاند پر نہیں گئے تب ہم کہیں زیر زمین پہنچ چکے ہوں گے۔ اہرام علی کی گردشیں فاضلہ ان کے نظام اور اس باب سے میں سائنسدانوں کے حیرت انگیز انکشافات کی خبروں سے اکتاتے نہیں تھے بلکہ حضرت کی دُپٹی کے منظر اترنے اس سلسلہ میں کئی بار مضمحل بہت کچھ عرض کیا۔ اس ضمن میں کبھی وہ خود بھی کوئی بہت پرک بات پوچھ لیا کرتے تھے۔

ایک روز حضرت کو بتایا گیا کہ مسجد اقصیٰ کے گنبد کی تعمیر کے لیے عرب ممالک میں چندہ کی تحریک جو رہی ہے اور سعودی حکومت نے اپنا جانتے سے اتنے ریاں دینے کا اعلان کیا ہے۔

حضرت کو اس خبر سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ بلکہ انھوں کا اظہار فرمایا اور کہا یہ سب بے کار ہے۔ گنبد کی مرمت سے کہیں ضروری یہ ہے کہ اس رقم سے سعودی حکومت ملک میں کوئی مدرسہ تعلیمی مرکز یا صنعتی ادارہ قائم کرتی، حضرت کو مسلم ممالک کی تعلیمی پس ماندگی اور صنعتی کم ہنگامی اور دیگر فنی شعبوں میں ترقی نہ کر سکے کا بہت قلق رہتا۔ اگر ان ممالک سے صنعتی یا تعلیمی ترقی کی کوئی خبر موصول ہوتی تو حضرت سن کر بہت مسرور ہوتے۔ پچھلے دنوں مصر سے راکٹ اور جٹ ہوائی جہازوں کے تیار ہونے کی خبریں آئیں تو حضرت نے خاص شوق سے انھیں سنا۔ اگر کبھی عالم اسلامی کے باہمی انتشار و آویزش کی کوئی خبر سننے کو کچھ منوم نہ ہو جاتے۔ اگر ہمارے کی تحریک آزادی کی خبروں کو پوری توجہ سے سنا کرتے اور حصول آزادی کے بعد ان کی آپس کی جھڑپوں کی خبروں سے افسردہ خاطر ہوتے۔

حضرت مختلف اور فنی امور میں مسلمانوں کی تعلیم وترقی کو زمانہ کی ضرورت و تقاضا کے مطابق لازمی خیال فرماتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس میدان میں مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اگر کوئی حضرت کی خدمت میں جا کر یہ عرض کرتا کہ بچوں کو سائنس کی تعلیم کے لیے کسی فنی ادارہ میں داخل کرنا ہے یا مزید تعلیم کے لیے کہیں باہر بھیجے کا خیال ہے تو بہت مسرور ہوتے اور اس کی حوصلہ افزائی فرماتے، حضرت کچھ شعبوں میں عورتوں کی اعلیٰ فنی تعلیم کو بھی ایک ضابطہ کے اندر ضروری خیال فرماتے تھے جن میں پھر ڈاکٹری کے پیشہ کے لیے عورتوں کے علاج کی خاطر اس تعلیم کو عورتوں کے لیے مفید خیال فرماتے تھے۔

حضرت کبھی کبھی خبریں سننے کو اپنا وسیعہ کہا کرتے تھے۔ ایک روز جب میں حاضر ہوا تو دیکھا مولانا ربیعہ علامہ شاہ صاحب بھمدی مرحوم حضرت کی چارپائی کے ساتھ گئے حضرت سے باتیں کر رہے ہیں، مجھے کسی نے دور سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مطلب تھا کہ شاہ صاحب کی حضرت سے مخاطبت میں کوئی غلط نہ ڈالا جائے۔ میں نے سکوت کیا اور حضرت کے سرانے کی جانب چارپائی کے قرب دیک کر بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت نے دوسری جانب منہ پھیر کر فرمایا ”یہاں کون کون بیٹھا ہے“ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی میرا نام بھی لیا گیا، حضرت نے فوراً کہا ”اسے تم کہاں چھپ کر بیٹھ گئے۔“ اور ”اؤ“ پھر شاہ صاحب کی طرف منہ کر دیکھا اور فرمایا حضرت اب ہم اپنا وسیعہ کرنے لگے ہیں اور پھر ارشاد ہوا ”اچھا کوئی خبر سناؤ“

اسلام کی فکر مندی اور مسلمانوں کے لیے دل سوزی

اسلام کی فکر مندی اور مسلمانوں کے حالات سے درد مندی طبیعت شائستہ اور پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی۔ اس کے لیے زندگی کا کوئی شعبہ

مخصوص تھا، نہ عمر کا کوئی وقت، یہ درد جسم اور قوائے فکر میں اس طرح جذب ہو گیا تھا۔

سناخ گل میں جس طرح بادِ سخن کا ہی کاغذ

جس گروہ سے آپ کا تعلق تھا اس کا ذکر و شغل، اس کا اقطاع الی اللہ، اس کی یکسوئی دے بیٹے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا اور بے فکر نہیں بنائی بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے درد میں مضطرب دے بیٹے قرار بناتی ہے اور اس گروہ کا ہر فرد زبان حال سے کہتا ہے:-

مرا درویش اندر دل چو می گویم زبان سوزد

اگر وہ در کشم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

یہی درد کبھی زبان پر آکر آہ و فغان میں تبدیل ہو جاتا۔ کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں، اور نا سمجھیوں پر درد و قلق کا اظہار اور ملامت و تنبیہ پر آمادہ کر کے کبھی تنہائی میں آنسوؤں میں تبدیل و شکیل ہو جاتا۔ لیکن وہ دم کے ساتھ تھا۔ اور اس سے کسی وقت قرار نہ تھا۔ ۱۹۴۶ء کے ہنگام تقسیم اور زمانہ فسادات میں جب بہت سے مسلمان بے ہمتی کے ساتھ اسلام کے خون اور پسینہ سے سینچے ہوئے اس باغ کو چھوڑ کر اپنے لیے پناہ کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور اس ملک میں بظاہر اسلام کا زوال نظر آ رہا تھا۔ اس درد نے طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ اس زمانہ کی بے قراری کی تفصیل ایک گزارش باب میں گزرنے لگی ہے۔

ایک مرتبہ ایک ایسے اہم اور نادر موقع پر جس میں دعا کی سخت ضرورت تھی۔ یہ خدام شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب کی ہرگز میں راسے پورہ حاضر ہوا۔ اور اس موقع کی نزاکت و اہمیت کی طرف متوجہ کر کے خصوصی دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے اپنے تعلق خاطر اور فکر کا اظہار فرمایا۔ اور تنہائی میں مجھ سے فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ تخلیہ میں معلوم نہیں کن عبادات میں مصروف ہوتا ہوں، بعض مرتبہ پورا وقت کمالی کی فکر اور رنج و قلق میں گزر جاتا ہے۔

لے محقق و متبحر صوفیہ کا وہ گروہ جس کی نسبت حضرت مجددات ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید، حضرت شاہ سلیمان کی طرف سے اور جس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت شیخ اہلبند جیسی شخصیات پیدا ہوئیں۔

انعام تحقیق واجتہاد

حضرتؒ کے طریقہ سلوک و تربیت، تصوف، طریقت، ذکر و صحبت، معرفت و محبت کے بارے میں بجائے اس کے کہ خود کوئی چیز پیش کی جائے اور اس پر عملی اور فنی طریقہ پر روشنی ڈالی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ سب چیزوں کے بارے میں حضرتؒ کے خود اپنے خیالات و تحقیقات پیش کی جائیں، جن کا وقت آفاقاً اصلاح و تربیت کے لیے کسی مجلس ان اظہار فرمایا اور جن کا مہمت خود بخود اس حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، انہیں منتشر، متفرق، ملغوظات پر نظر ڈالنے سے حضرتؒ کے اصلی خیالات کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور اس کا بھی کسی حد تک اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ حضرتؒ کو اس فن میں کیسی عمدہانہ بصیرت حاصل تھی اور آپ کی نظر سوم و ثواب، جزئیات و تفصیلات کے بجائے اہل مقاصد اور لب لباب پر کس قدر تھی، ان مقاصد کے لیے آپ طبائع، اخلاق، احوال اور زمانہ کی تبدیلیوں کی کس قدر رعایت فرماتے تھے، اور آپ کی نظر کس قدر دقیق، دقیقہ رس اور حقیقت میں تھی۔

مقصود کار فرماتے تھے کہ۔

” اصل کیفیت یقین کا پیدا ہو جانا ہے، جب کوئی سالک اپنی کیفیات کا ذکر کرتا تو یہی فرماتے کہ اصل کیفیت یقین ہے۔ ایک دفعہ فرمایا، کرے میں اندھیرے میں تیرے، نظر نہیں آتا، ایک آدمی وہاں ہے، وہ بے فکری میں وہاں بیٹھا ہے اچانک روشنی ہوئی، شیر اس کو نظر آگیا، اس پر غور طاری ہو جائے گا، اسی طرح یقین نصیب ہونے کے بعد غور خدا آجاتا ہے اور یہ غور خدا بنیاد ہے تمام اعمال حسنہ کے کرنے کی اور تمام اعمال بد سے بچنے کی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ اجرائے لطائف سلطان الاذکار، انوارِ حق کی خفایت کی کیفیت کو بھی کچھ اتنا بڑا امر تہ نہیں دیتے تھے، حضرت کے نزدیک استدلالی یقین کا وجہ الٰہی اور ذاتی یقین میں تبدیل ہو جانا اصل چیز تھی، اس کا نتیجہ پھر یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا بھی خدا کی ہستی کا انکار کرے تو یہ وجہ الٰہی یقین والا شخص کبھی بھی انکار نہیں کرتا۔“

” حضرت راستہ کی کیفیات مثلاً وجد، انوار، اجرائے لطائف، سلطان الاذکار، حتیٰ کہ خفایت کی اہمیت کو بھی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے، حضرت کے یہاں کیفیت قابل حصول صرف ایک تھی، یقین، کامل یقین اور اس کا نتیجہ میں حاصل ہونے والی کیفیات مثلاً خوف، خشیت، محبت الٰہی، تعلق مع اللہ کا دوام، کامل اخلاص، اتباع شریعت، امتیاز غایب، مشاہدہ حقائق رضا و تسلیم، سب و شکر وغیرہ، لوگ بڑے بڑے اُونچے حالاتِ محبت کو سناتے تھے، لیکن حضرت یہی فرماتے تھے کہ اصل مقصود یقین کا پیدا ہو جانا ہے، حضرت کے ہاں مقصود صرف یہ تھا کہ استدلالی یقین، وجہ الٰہی، ذاتی اور کشفی یقین میں پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہو، تعلق مع اللہ کا دوام و استقلال حاصل ہو۔“

” کسی نے کسی لطیفہ کے جاری نہ ہونے کی شکایت کی، آپ نے اس سے یقین کے بارے میں پوچھا، اس نے کہا کہ وہ تو ہے فرمایا کہ پھر لطیفہ کے پیچھے نہ پڑو، مقصود حاصل ہے۔“

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

آہ قطب الشاد گزشتہ

تکرار

سلطان العرفاء سید طاہرہ خضرہ اقدس مولانا و مرشدنا شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہ

از

کے بہترین مقلدین و پیروں نے غفرلہ

دل ہے پرخوں، آنکھیں پریم	یاد میں گے تیرے جلوے	روشن روشن، تدم تدم
عشق سدا پا، سخن مجسم	آہ کہ تجھ سے گرم مٹی تھیں	آہ کہ اب بے دردم برہم
قبلہ تھا و قبلہ عالم	اُجڑا اُجڑا، ویراں ویراں	ہائے وہ رائے پور کا عالم
رنگ تیرے سید و شبلی و آدم	ساحلِ حبس پر کیا گزری	آہ وہ طوقاں جسمِ حبس
ختم ہے اُن پر اُن کا عالم	تم ہی کو کچھ جسم کی کمائی	اے لپٹا دی اے لپٹا بل
نائبِ حضرتِ خضر و عالم	آہ خفیں زار کی حالت	بیکل بیکل، بیٹیم بیٹیم
شکری تیرے جبرِ حاتم	اللہ اللہ دیکھ لیا ہے	خسرے پہلے حشر کا عالم
جاری ساری باہم باہم	رشتہ نہ پریاں، دیدہ گریاں	آہ کہ اب کس حال میں ہیں
دھونڈنے پائے عالم عالم	ذکر کی دُنیا سونی سونی	فلک کا عالم دردم برہم
اُتر، دکھن، پورٹ، پتھر	دُنیا دُنیا تجھے تجھے	عالمِ حشر میں آگ
تیرا عالم تیرا عالم	دل کہ شیشہ ناز ہے تیرا	زندہ ہے اب بھی سیکلِ کم
غم کا مداوا، زخم کا مرہم	آہ کہ تجھ پرین عین نہیں ہے	یاد ہے تیری پیس پیس
عجب تجھ سے، نہیں نہیں	انشاء اللہ، انشاء اللہ	اچھے سے یہ وعدہ سک
دردِ محبت تیرے پیس نہیں	وہ جو عزیز جاں ہے تمہارا	وہ ہے ہمارا دل کے ہیں ہم
سب کاموں، سب کا پتھر	آہ کہ زاد حشر نہیں ہے	آہ دامت سے ہے سرم
خاک برابر لاکھوں دھرم	اے مجھے عشق اے مجھے	تم جو مجھے پھر مجھے کیا غم
اگل لگا دی پورٹ پتھر	ہاتھ میں تیرے ہاتھ دیا ہے	راج بھی تیرے ہاتھ ہے ہم
عشق میں شہد، سخن میں شہ	شریں ہم کو بھول نہ جانا	یاد کے لائق کر پس نہیں ہم

حشر ملکِ تربت پتیری
نور کی بارشیں سے جگم جگم

دعا مبارک :- ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۱ھ کو درجہ شریف
ملاقات ۱۶ اگست ۱۳۸۰ء، بوقتِ شہادت
درجہ لعلِ اجور لکھی

شیخ التفسیر حضرت میرزا محمد علی لاہوری

۵۱۳۸۱
۶۱۹۹۲



۵۶۳۰۴
۶۱۸۸۷



۳۱۳
صفحہ ۳

محمدی و محمدی العلماء و الفضلاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دہلی

از احقر الامام احمد علی نقی غفرہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کو معلوم ہے کہ اتحاد اور زندہ کاٹھن پاکستان میں بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا باب فقط مضبوط اور علماء کرام کی متحدہ جمعیۃ علماء اسلام ہی ہو سکتا ہے اور حکومت بھی ایسی ہی جمعیۃ علماء اسلام کو قابل اعتبار سمجھیں گی۔ اور عام مسلمانوں میں بھی یہی جمعیۃ مقبول ہو سکتی ہے۔ اس لئے مجھے آپ کی معاملہ فہمی اور اخلاق حمیدہ سے امید و توقع ہے۔ کہ ہمارے پنجاب کے وفد کو جو حضرت مولانا محمد شفیع اور حضرت مفتی مولانا محمد شفیع پر مشتمل ہے۔ کامیاب و سرفراز فرما کر واپس فرمائیں۔

فقط

عائشہ رحمت لاہوری

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا احمد علیؒ پر یہ مضمون اسٹرالین صاحب کی بسوگ کتاب الفرو دلایت کی مخلص ہے تزیین و قیوم اب کی ہے۔ ہم نے اس کا اشتعا کرنا ہے۔

جلال نامی قصبہ ضلع گوجرانوالہ میں ۲ رمضان المبارک ۱۲۰۴ھ کو جمعۃ الاولیٰ کے دن ایک مقدس گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس کا اسم گرامی احمد علی رکھا گیا۔ یہ قصبہ دیوے اسٹیشن لکھنؤ سے چار میل مشرق میں واقع ہے۔ مشیت الہیہ نے اسے کس صاحب کمالات اور منبع سعادات کی ولادت سے نوازا۔ اس وقت کی ایک زبان بھی ایسی نہ تھی، جو اس حقیقت کا رکھے، اور اس وقت کی ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی، جو اس مہر ولایت کے طلوع پر خلق خدا کو آگاہی بخشنے لیکن فرشتگان نضا و نبتی کے ہر کوچہ و بازار میں چپکا چپکا کر کہہ رہے تھے۔ ع

آمد آں یارے کہ مامے خواستیم

کس کو خبر تھی کہ یہ بچہ جو آج ایک گنم قصبے کے ایک غریب گھرانے میں جنم لے رہا ہے کسی دن آسمان ولایت پر آفتاب اب بن کر چمکے گا۔ اس کے فیوض و برکات کی سوتیں زمزم و کوثر کی آئینہ دار نہیں گی، اور یہ مشرق سے طلوع کرنے والا نیر ت مغرب کی وادیوں میں بھی ضیا پاشیاں کرے گا۔ جیسا کہ علامہ علاؤ الدین صدیقی صدر شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کی شہادت میں نے مغربی ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران میں اس حقیقت کو ہزار تعجب سے بلکہ ہلکے دیکھا ہے کہ سید العارفین، عالم فیض و شہداء حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے ارجمند شاگردوں، عقیدت مندوں یا خوش چینوں میں سے کسی نہ کسی فرد نے قرآن پاک کے درس و تدریس اور نشر و اشاعت کو اپنا لائحہ عمل بنا رکھا ہے، اور اسی طرح ہمارے محترم بالو منظور سعید اب جنھوں نے حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے آپ کے سوانح حیات سن کر نقل فرمائے ہیں۔ اپنی بیاض کی بادامیں رقم طراز ہیں:

”پنانچہ میرا اپنا واقف ہے کہ اپریل ۱۹۴۷ء میں جب میں دہلی دیوے اسٹیشن سے علی گنج صفدر جنگ کی طرف پیدل جا رہا تھا تو ایک آدمی راستے میں بلا تاؤں باتوں میں ہماری ایک دوسرے سے شناسائی ہو گئی۔ جب اس شخص کو معلوم ہوا کہ میں لاہور سے آیا ہوں تو اس نے مجھ کو بتایا کہ ہم ایران میں حضرت مولانا احمد علی صاحب کو مفسر قرآن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟ میں نے ان کو حضرت والا شان کے متعلق کافی واقفیت دلائی لیکن میں خود چیران تھا کہ ہمارے حضرت کی علمی شہرت بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔“

حضرت اقدس کے والدین ماجدین: حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت باسعادت میں اسباب و علل کے چہرے پر کوئی

نقاب نہ تھا اور ماحول میں ایسے آثار نہیں پائے جاتے تھے جس سے آپ کا بعد میں سید الاولیاء ہونا خارجی مہجرت واستعجاب سے دیکھا جاتا بلکہ یہاں تو مخالف ارض و سماء نے حسن اتفاقات کو اکٹھا کر دیا تھا۔ آپ کے والدین زندہ جاوید تصور پر تھے۔ شریعت ظاہرہ کے احکام کی پابندی ان کی سرشت میں سمائی ہوئی تھی۔ خصوصاً صوم و عیز اشک ان کے بغیر ہیں داخل تھا۔ اللہ! اللہ! پاک باز اور نیک فطرت والدین جب کسی بچے کو اپنی عارفانہ نگاہوں کی دعاؤں میں پرورش دیتے ہیں تو اس بچے کی زندگی اپنے ماحول میں ایک روحانی انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ بزرگوار سے انفرادی کی نجات کا مسئلہ وابستہ ہوتا ہے۔

تائید ایروڈی کاظمی: حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد محترم کا نام نامی شیخ حبیب اللہ تھا، اور آپ سادہ تھے۔ ہمارے حضرت مرحوم اپنے والدین کی امیدوں کا ثمر اولین تھے۔ اس مقام پر تائید نہاد ہندی نے ایک نیا نام کے والدین نے دین حق کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اپنے غیر اولین کی ولادت سے پیشتر حضرت مریم والدین کی طرح آپ کو کتاب و سنت کی خدمات کے لئے وقف (عزت) کر دیا تھا۔ قدامت و عید عالم کو یہ نذرانہ اس نذر کرنے والوں نے اس قدر صدق و اخلاص سے پیش کیا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ غفلت میں گزارا ہو۔ احقر تو حلیہ کہہ کرتا تھا کہ حضرت والا جاہ کے عمل کرنا ہماری سہل انگ زندگی سے کوسوں دور ہے۔

خیر! آپ کے خوش نصیب والدین نے حضرت مریم علیہا السلام کے والدین کی طرح حسرت سے نہیں بلکہ تہنیت سے آپ کی پیدائش پر اپنی تمناؤں کو پورا ہونے دیکھا اور افرط اسان مندی سے جھوٹے ہوئے آپ کا نام احمد فرمایا۔ والدین کے پاکیزہ ارادے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس وقت شدہ (محرم) نومو کوئی پرورش کے ایام سر رخصتے الہی کے حصول کو پیش نظر رکھا ہوگا۔ والد محترم کو ذوق عبادت کے ساتھ ساتھ اپنی روزی کے پاکیزہ ہونے کی فکر رہتی ہوگی، اور ادھر والدہ محترمہ کو اس نذرانہ الہی کی حسن تربیت کے لئے شبانہ روز تسبیح و تہلیل کا استغراق لازماً ہوگا۔ ملاں کی برکت اور جذبہ عبادت کا کیت نور ایمان بن کر ہونا بچے کی رگ رگ میں سما جائے۔

علم و حکمت زاہد از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

حضرت! کے حقیقی بھائی: حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے تین حقیقی بھائی ہیں: حافظ محمد علی صاحب بستان پور تھے اور کئی سال تک وہیں رہے اور اب قضاۃ الہی سے فوت ہو چکے ہیں۔ ان کا والد تاج الدین راجون۔ مولانا عزیز کراچی میں رہتے ہیں۔ ان سب حضرات سے چھوٹے حکیم رشید احمد صاحب ہیں۔ جو زبدۃ الحکماء کی اعزازی کمیٹی میں ہیں۔ اور طبیہ کالج لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے ذریعہ تمام چل رہا ہے میں بطور پروفیسر کام کرتے رہے ہیں۔ مسند میں اور حضرت اعلیٰ کی زندگی میں درس قرآن مجید میں تشریف لایا کرتے تھے۔ طبیعت کا اتفاق ہے کہ ان کے بھائی بھی عرض کر دوں کہ درس قرآن مجید کے بعد عقیدت مند لوگ حضرت سے مصافحہ کرتے اور چلے جاتے حکیم صاحب خوش

وقت پاکر حضرت اقدس کے ہاتھوں پر بوسہ دینے اور بعض اوقات آنسو بھی بہائے۔ یہ منظر دیکھ کر احقر کی آنکھوں سے جواہر ابل پڑتے۔ اور خیال آتا کہ الہی دنیا میں اب تک انھوں نے اسلامی کایہ نقشہ موجود ہے کہ ایک بھائی اپنے بڑے بھائی پر بوسہ دے رہا ہے۔ جب کہ اس زمانے میں یہ منظر لاکھوں میں بھی نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ حرص و آز، شکوکہ و شبہات، طعنے، عداوت، بغض، حسد، کبر و نخوت اور جاہلانہ ہٹ دھرمی رشتہ داروں میں اس قدر گھر گرائی ہے کہ شاہد ہی کوئی اب برادری ہوگی جس کے افراد ایک دوسرے کے وفادار کا خیال رکھتے ہوں یا ایک دوسرے سے حسرت و حسرت سے ہوں۔

علیم: ہم حضرت لاہوریؒ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق عرض کرنے بیٹھے ہیں۔ آپ نے جب اپنی والدہ ماجدہ کی آغوش شفقت و مہربانی میں پیدا ہوئے تھے، اس وقت آپ کی عمر تقریباً ایک سال تھی۔ والدہ ماجدہ کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تکیا۔ وہ بچے جن کی پرورش و پرورش کا نام کے لطف خاص نے گھر کے ماحول کو اسلامی بنا رکھا ہو، ان کی قسمت کی بلندیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ جو بچے جن کے دونوں میں فردوسی نعمتوں کی طرح دل و دماغ میں نور انشائیاں کرتی ہے۔ کیونکہ والدہ سے بڑھ کر تربیت و تہذیب اور کریم نہیں ہوتا۔

حضرت لاہوریؒ ابھی اپنی والدہ ماجدہ سے پڑھ ہی رہے تھے کہ آپ کو ایک مدرسہ میں داخل کرایا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ایک سال تھی۔ یہ مدرسہ قصبہ جلال سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھا، اور وہ جگہ کوٹ سعد اللہ کے نام سے مشہور تھی۔ حضرت اقدس سرگاہی صاحب قصبہ کے ہمراہ کوٹ سعد اللہ میں پڑھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ آپ نے تیسری جماعت تک اس جگہ تعلیم حاصل کی۔ اس کی تبدیلی: حضرت اعلیٰ کے پدر بزرگوار شیخ حبیب اللہ مرحوم تجارتی کاروبار کرتے تھے۔ آپ کا کاروبار بابونامی پک نامی گاؤں میں تھا۔ یہ گاؤں قصبہ جلال سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے۔ لہذا آپ نے اپنے کاروبار کی سہولت کے پیش نظر اہل دیہات کی بجائے پک بابو میں رہائش اختیار کر لی، اور اپنے اہل و عیال کو وہاں ہی لے گئے۔ اس جگہ آپ کو دوبارہ سکول مل گیا۔ آپ کا موجودہ سکول قصبہ ٹونڈی کھجور والی ضلع گوجرانوالہ میں تھا۔ آپ نے پانچویں جماعت تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اسے مسجد کی راہ: وہ عموماً اختر نونال جس کی پیدائش سے اس کے والدین نے دین متین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اس کو سکول میں بھیجنے کا مقصد صرف اُردو میں نوشت و خواندہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لہذا اب وقت آگیا کہ اللہ عز و جل ہر ایک کو شہادہ اپنی پوری نیاز مندوں کے ساتھ الیا کیا جائے۔ اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے والدین نے آپ کو شہر والہ میں ایک درویش صفت بزرگ صورت مولانا عبدالحقؒ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا موصوفؒ آپ کے والد محترم کے مخلص و احباب میں سے تھے۔ حضرت لاہوریؒ اپنے استادِ اوّل سے انتہا درجے کی محبت کرتے تھے۔ یہ آپ کی خداداد حُسنِ خرد اور آپ کے خداداد انقیاد کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا عبدالحقؒ مرحوم آپ کو اپنے صاحبزادوں کی طرح شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے۔

حضرت لاہوریؒ کا یہ ارشاد کہ میرے استاد و مشفق مجھ کو اپنے بچوں کی طرح اپنے گھر پر رکھا کرتے تھے۔ اس زندگی کی ایک اور شہرہ و برزور پیش کرتا ہے۔ ہر جگہ ایسا ہی ہوا ہے۔ اگر ہم خود اپنی اولاد میں بھی مزا برداری کے آثار نہ پائیں۔ تو ان سے

نفرت کرنے لگتے ہیں اور اگر شاگردوں میں سے کسی میں خدمت کا مادہ دیکھیں۔ تو اس سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ حضرت والاکلی خدائی قوتوں نے عین کمسنی میں بھی آپ کی دستگیری فرمائی اور آپ کے لئے والد روحانی کا ہمیشہ کھلا رکھا۔ حضرت مولانا عبدالحقؒ اپنے ہونہار روحانی فرزند کو اپنا تیسرا بیٹا خیال فرماتے تھے۔ اور یہ سعید گھڑیاں گئیں۔ آپ اٹھویں دن اپنے والدین کو ملنے کے لئے گھر واپس آیا کرتے تھے۔

انام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کے حضور میں: ہمارے آئلے روحانی آئے کو جواوالہ میں ہی گزارے تھے کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی وہاں نشر لیتے لائے۔ آپ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ حضرت مولانا رشتہ ملے تھے۔ لہذا آپ کے والد ماجد نے آپ کو حضرت سندھی کے سپرد کر دیا اور یہ الفاظ فرمائے کہ ”ہم نے یہ لوگ خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اب آپ کو حضرت سندھی نے اپنی شاگردی میں قبول فرمایا۔

توقفت: دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے منکر علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے فرنگی تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کا یوں ذکر کیا ہے:۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا کہاں سے آئے صد آلا الہ الا اللہ
سہجہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن وہ بچہ جس کا جنم کسی مسلمان گھرانے میں ہو اس کے کان میں تعلیم کے شہادت کی آواز آتی ہے چند سالوں کے بعد اسلام کی بعض ابتدائی چیزیں اور بھی اخذ کر لیتا ہے۔ مگر جب وہ اور وہاں سے کالج کی راہ لیتا ہے۔ تو بے دینی کے اثرات آہستہ آہستہ اس کی روح کو مکدر کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ دین اب سے وہ کلیتہً بیگانہ ہو جاتا ہے۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے کہ دیتے ہیں سبق شاہیں بچوں کو خاکِ بابی کا ان اشعار میں اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ تربیت سے حدود و صلاحیتوں پر غیر شعوری طور پر اثر پڑتا ہے اور پذیرگی کا مادہ نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے ماحول میں اکثر اوقات اچھا ہو جاتا ہے۔ ہم کو اس مسئلہ کے لئے لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی زندگی پر غور کرنا ہے۔

حضرت سندھیؒ جو اپنے وقت کے امام انقلاب تھے اور انہوں نے اسلام سے باقی اوصاف کے علاوہ انگریز دینی کا اتم حاصل کیا ہوا تھا۔ ان کے حلقہ اثر میں رہ کر ایک ہونہار بچہ کی کچھ نہیں بن جاتا۔ باپ کی سپاسیانہ زندگی اگر کسی بچہ پر مدد دیتی ہے۔ تو اس طرح حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی انگریز دشمنی نے ہمارے مرنے و محسن کو ایامِ تربیت کے لئے انگریزوں سے اس قدر نفور کر دیا تھا۔ اور انگریزی تہذیب سے اس دورِ حیر دور کر دیا تھا۔ کہ جس کی مثال ڈھونڈتے ہیں۔ امام انقلاب کے مکتب کا درس حریت حضرت لاہوریؒ کی زندگی کا ایک ہمہ گیر جذبہ بن گیا، اور ہم نے اس کا دار و ہدایت پر بیٹھے بیٹھے عین پیرائے سالانی میں بھی جب انگریزی تہذیب کے خلاف زبان کھولتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ وقت یا فاروقِ دوراں ہے۔ جو تمام دنیا کی ایلیسی طاقتوں کو چیلنج دے رہا ہے۔ وہ لوگ جن کو آپ کے ساتھ صاحبِ حاصل ہوا۔ ان سے آپ کی حریت، نواد فطرت۔ خطرِ بد طبیعت۔ بے باک جذبہ صداقت اور شبانہ روز غلبہ لکھتے

اور آپ کا ذکر خیر سن کر ہی نہایت حسرت سے آبدیدہ ہو کر پکار اٹھیں گے۔

مردِ مختار حکمِ زورِ دلا تخت
مردِ مختار چوں اشتراں بارے بُرد
ما بیدار سنجید اور سبکدشت
مردِ مختار بارے بُرد و خارے بُرد
ما کینا دوست۔ ماسجد فروش
اور دستِ مصطفیٰ پیمانہ نوش

(اقبال مرحوم)

ہم انشاء اللہ کسی اور موقع پر اس موضوع پر چند واقعات حوالہ قلم کریں گے۔ اب مندرجہ بالا اشعار کا ترجمہ لکھتے ہیں۔
(۱) مجذوبِ تربیت سے سرشار انسان غیر اللہ سے خائف نہیں ہوتا۔ ہم مصائب میں گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن وہ ہر وقت سرفروشی کے لئے تیار رہتا ہے۔

(۲) جیسے نق ووق صحرا میں اونٹ بوجھ اٹھا کر بے آب و گیاہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح آزاد انسان ملکِ دین کی خدمت کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کو مستعد رہتا ہے۔

(۳) ہم غیروں کی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ اور اپنی تہذیب سے نفور ہیں۔ لیکن اس کی خوش نصیبی کا کیا کتنا۔ وہ اپنی زندگی کو اسوۂ نبویؐ کے تابع کر چکا ہے۔ لہذا کامرانی ہر موقع پر اس کے قدم چومتی ہے۔

حضرت لاہوریؒ حضرت اعلیٰ مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے حضور میں؛ ہم حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہؒ کی زندگی کی روحانی تربیت کے ابتدائی مدارج پر غور کرتے ہیں۔ تو بے ساختہ یہ آیت زبان پر آتی ہے کہ اِنَّ اللہَ یُکَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ یَغْنِیْهِ حَسَابٌ۔ (اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بلا حساب رزق عطا فرماتا ہے) ہم تو خدا تعالیٰ کی عنایاتِ عظیمہ پر جب نگاہ کرتے ہیں تو احسانِ مندی کے نشے میں جھومنے لگتے ہیں۔ حضرت اقدس کا لو کہیں میں ہی ایک عارف باللہ کی صحبت میں جانا نا شاید غیبی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہمارے مربی حضرت شیخ النفس میر حضرت اعلیٰ پیر کامل ہادی دوداں پیکرِ حسنِ عمل سیدنا غلام محمد دین پوری کے مکتبِ معرفت میں کیا گئے۔ انہوں نے تو دواں ہدایت و معرفت کا ایک دائمی سرچشمہ پایا۔ گویا آج غُربِ بکُربتِ حضرتِ با کے ساتھ ولایت کا پہلا سبق بھی پڑھا۔

دمِ عارف نسیمِ صمد ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر
اسی سے ریشہ مضیٰ میں نم ہے
شبابی سے کلیسی دو قدم ہے

(اقبال مرحوم)

دراصل عالمِ اسباب کے مالک نے اس نظام کو اس طرح چلایا۔ کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ان دنوں مرکزِ ہدایت امروٹ شریف ضلع سکھر میں قیام پذیر تھے۔ وہ حضرت لاہوریؒ کو اپنی معیت میں لے کر سندھ روانہ ہو گئے۔ راستے میں بہاولپور گذرنا ضروری تھا۔ ریلوے اسٹیشن خان پور سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر دین پور شریف ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ اس بستی میں حضرت سندھی کے مختصر طریقیت حضرت مولانا غلام محمد رحمۃ اللہ علیہ رہائش پذیر تھے۔ یہ بستی دراصل حضرت ممدوح کی مسجد کی وجہ سے ہی مشہور تھی۔ کیوں کہ حضرت اعلیٰؒ کی قیام گاہ کے سوا وہاں کوئی چیز بھی قابلِ ذکر نہیں تھی۔ حضرت سندھی اپنے بیچ رحمۃ اللہ علیہ کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے لئے دین پور شریف حاضر ہوئے۔ اور وہاں دو دن ٹھہرے۔ حضرت

لاہوری رحمۃ اللہ علیہ جو طفل مکتب کی صورت میں ہمراہ تھے۔ آج زندگی کے ایک نئے میدان میں قدم رکھ رہے تھے۔ آپ کی کاسٹہ بندی پر تھا۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو حضرت اعلیٰ کے حضور میں بیعت کے لئے پیش کیا۔ تو جنید دوراں آپ کو اپنے حلقہ رشد و ہدایت میں داخل فرمایا۔ اس ساعت کی برکات کا کیا کہنا؟ زمانے بھر کی بے بدل ہستی ایک پنے کو نگاہوں سے جاچک رہی ہے اور اپنی آغوش ولایت میں جگہ دے رہی ہے۔ ع
تیری غلامی کے صدقے ہزار آزادی

بعد ازاں حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو امر وٹ شریف لے گئے۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے اہل و بھی وہاں تھے۔ کیوں کہ اس جگہ کوئی دینی درس گاہ نہیں تھی۔ لہذا حضرت سندھی نے خود ہی حضرت لاہوری کو فارسی و نحو کی تعلیم دینا شروع کر دیا۔
امروٹ شریف میں حضرت سندھی کے قیام کے وجوہات: امر وٹ شریف ضلع سکھر صوبہ سندھ میں ان دنوں اجل عارف اکمل امجاہد کبیر مختاب الدعوات حضرت تاج محمود رحمۃ اللہ علیہ جلوہ افروز تھے۔ آپ ہر وقت جذبہ جہاد سرشار رہتے تھے۔ آپ سرخیل اویسے کرام بھی تھے۔ اور غازی جانا بڑا بھی تھے۔ آپ کا تعارف علامہ اقبال مرحوم کے ان سے قدرے کروایا جاسکتا ہے۔

آن کہ بخشد بے یقیناں را یقین

آن کہ زیر تیغ گوید کلا الہما

ترجمہ: (جس کی صحبت ناقصوں کو دولت یقین عطا کرتی ہے۔ جس کے مخلصانہ سجدے زمین میں لپکی پیدا ہو جاتی ہے وہ تیغ ستم کے نیچے بھی کلہ تو حید پیش کرتا ہے۔ اور یہ وہ مجاہد ہے جس کے خون کے ٹپکنے سے بھی لالہ الا اللہ کی کھیتی سرسبز ہوا جاتی ہے)۔ یا یوں سمجھئے کہ سید تاج محمود امر وٹی مرحوم کے متعلق ہزار عقیدت سے یہ کہا جاسکتا ہے۔

خاک و از نوریان پاکیزہ تر

بندہ حق و ارث پیغمبران

از مقام فقر و شاہی باخبر

او نگہ در جهان دیگران

آپ جب تک مجاہد فی سبیل اللہ بن کر رہے۔ آپ کے شیخ طریقت حضرت حافظ محمد صدیق تھے۔ جو بھرپور نڈا سے متعلق تھے۔ بھرپور نڈی شریف کراچی ریلوے اسٹیشن خیر پور ڈھیر کی سے قریب دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت مرانا عبید اللہ سندھی نے بچپن میں حضرت حافظ محمد صدیق مرحوم کے دست اقدس پر بیعت کی تھی۔ اور انہی کے ہاتھوں پر اسلامی قبول کیا تھا۔ اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ آخر جب آپ (حضرت سندھی) مدرسہ دیوبند سے سند فراغت لے کر واپس پہنچے۔ تو بھرپور نڈی میں حاضر ہوئے۔ دس گیارہ دن پہلے بایزید دوراں حضرت حافظ محمد صدیق داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب حضرت مولانا تاج محمود نور اللہ مرقدہ نے حضرت سندھی کی علمی قابلیت و رتبہ اور مخلصانہ جذبہ خدمت دین کو اور علاوہ انہیں ان کو اپنے شیخ کامل (حضرت حافظ محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلقین میں سے خیال فرما کر دعوت دی۔ کردہ

شریعت کو اپنا مستقل قیام گاہ بنائیں۔ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امروٹی کے اس ارشاد کو بسر و چشم قبول کیا، اور امروٹ شریف میں رہائش پذیر ہو گئے۔

حضرت مولانا عبد اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی شادی خانہ آبادی : مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی استعداد اور عملی کمالات نے حضرت امروٹی مرحوم کی عارفانہ نگاہوں سے اس قدر فیوض و برکات حاصل کئے کہ خود ان کی نظروں میں محبوب بن گئے۔ چنانچہ حضرت امروٹیؒ نے اپنی پدرانہ شفقت سے حضرت سندھیؒ کو دامادی کا شرف عطا فرمایا۔ اور آپ کی زندگی کے تمام مصارف کی ذمہ داری بھی خود لے لی۔

نوٹ : حضرت سندھیؒ کے ان حالات کا تذکرہ (مذکورہ بالا تذکرہ) حضرت مولانا لاہوریؒ کو اپنے ہمراہ سندھ لے جانے سے پہلے کا ہے۔

حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی عمر تقریباً دس سال تھی جب آپ حضرت سندھیؒ کی معیت میں امروٹ شریف پہنچے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ بطور طالب علم پانچ سال تک امروٹ شریف میں رہے۔ حضرت سندھیؒ کی وساطت نے حضرت امروٹیؒ کی عارفانہ نگاہوں کو حضرت لاہوریؒ کی تربیت کی طرف منعطف کر دیا۔ اگرچہ آپ کے خور و نوش کا انتظام حضرت سندھیؒ کے گھر میں تھا مگر پھر بھی حضرت امروٹیؒ مرحوم نے نگر کے مشنظر اور حرم سرا کی خادمہ کو تاکیدا فرمادیا تھا کہ ہمارے عزیز احمد علی کو جس چیز کی ضرورت ہو مطالبہ پر فوراً پیش کی جائے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جو ہر قابل ہی نہیں
کوئی قابل ہو، تو ہم شان کئی دیتے ہیں
جس سے تعبیر ہو، آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ کہ ہر روز منزل ہی نہیں

حضرت لاہوریؒ مرحوم اپنے والد روحانی کے سائر عافیت میں ایام طفولیت بسر کرتے تھے۔ نواسی حمروں میں فرشتگان نفاذ قدرت آپ کے لئے قطبیت کا خلعت مرحوم نیا کر رہے تھے۔ دنیا والو! یقین کیجئے کہ اللہ والوں کے سرسری التفات سے بھی دلوں کی سونے بستیاں پھر سے آباد ہو جاتی ہیں۔

پرورش دل کی اگر تد نظر ہے تجھ کو
مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

حضرت شیخ التفسیرؒ بار بار اپنی محفلوں میں فرمایا کرتے تھے کہ میری بیعت کے بعد میرے روحانی مربی پچیس سال تک زندہ رہے۔ اور جب میں حضرت امروٹیؒ کی بارگاہ ولایت میں حاضر ہوتا تو آپ بے حد مسرور ہوتے، اور بار بار خیر و عافیت پوچھا کرتے تھے اور نہایت درجے کی شفقت فرمایا کرتے تھے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے دوسرے تھے۔ میں جس کے پاس جاتا تھا وہ ہر بار میرے کا سہ گدائی میں کچھ دیکھ ڈال دیتا تھا، اور وہ لوگ جو اس کو پیر کے راہ نور دو ہیں۔ ان کا تو یہ بھی کہنا ہے۔
دل میں سا گئی ہیں قیمت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

حضرت عین پیرانہ سالی میں بھی جب اپنے خزانہ طریقت کا ذکر فرماتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے کسی خوش نصیب کو جنت فردوس کے داخلے کی بشارت مل رہی ہے۔

حضرت سندھیؒ کی امروٹ شریف سے روانگی : حضرت لاہوریؒ امروٹ شریف کے قیام میں حضرت سندھیؒ سے فارسی، عربی،

صرف دعواد منطق کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت امروٹی کے زیر تربیت الشہداء نے والوں کی جماعت تھی۔ ان کی زندگی اور اصحابِ حقہ کی زندگی میں بڑی تمک مشابہت پائی جاتی تھی۔ فکرمیں جو کچھ اللہ تعالیٰ بھیج دیتا تھا۔ وہی ان لوگوں کی شبانہ روز خوراک ہوتی تھی۔ بعض اوقات دونوں وقت فائز ہوتا تھا۔ اور بعض اوقات سوکھی روٹیاں چبائی جاتی تھیں۔ اس نے حضرت لاہوری کی زبان مبارک سے خود بخود بعض دفعہ ستوروں کی قسم کی خوراک ہوتی تھی۔ جس سے ستارے بھی نظر آتے تھے اور اس کا نام تارا پلاڈ ہوتا تھا۔ بارک اللہ۔ متوکلین کی جماعت ایک قطب الاقطاب کی سرپرستی میں تمام کائنات سے مزہ موز کر تسلیم و رضا کے ابواب یاد کر رہی تھی۔ یہ حیف کے شمسِ ادا ہیں۔ جو کہ ہر زمانے میں کائنات کے کسی نہ کسی گوشے میں اسی طرح پرورش پاتے ہیں۔

بر در میکدہ آں مرد و قلد در باشند کہ تانند و ہند تاج شہنشاہی را

حضرت امروٹی علیہ الرحمۃ کی سرپرستی میں جو جماعت پرورش پا رہی تھی اس کو مدارس عربیہ کے طلباء سے کیا تعلیم سکتا تھا۔ لیکن حضرت علامہ عبید اللہ سندھیؒ ایک ایسا مدرسہ چلانا چاہتے تھے جس میں تمام علوم متداولہ کی تحصیل کا اہتمام جائے۔ چون کہ امروٹ شریف کا ماحول اس مدرسے کے لئے سازگار نہ تھا۔ لہذا آپ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدر آباد تشریف لے گئے۔

مدرسہ دارالارشاد: حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے گوٹھ پیر جھنڈا میں قدم رکھتے ہی دینی درس گاہ کی تعمیر و اساس کے وہاں کے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ زہے قسمت۔ زہے نصیب! اس وقت گوٹھ پیر جھنڈا میں حضرت مولانا رشید اللہ ایک تبحر عالم دین موجود تھے۔ انہوں نے علم حدیث کے چند اسباق حضرت سندھی سے پڑھے تھے۔ لہذا حضرت سندھی کے اسے کی تکمیل میں مولانا موصوف کا جو دے حد سود مند ثابت ہوا۔ چنانچہ ۱۳۱۹ھ میں گوٹھ پیر جھنڈا کے مقام پر مولانا رشید اللہ علیہ السلام نے اپنے مریدوں سے چندہ لے کر مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں طلبہ کی ضروریات، اساتذہ کرام کی تنخواہ اور باقی مصارف کی فراہمی میں بھی مولانا مذکور حضرت سندھی کے ہر طرح مدد و معاون رہے۔ ابتدا میں حضرت سندھی کا پیر جھنڈا میں تشریف لے گئے تھے۔ بعد ازاں حضرت لاہوری کو بھی وہاں ہی چلا بھیجا۔ وہاں پہنچ کر حضرت والا نشان نے اپنی ذہنی استعداد، شغفِ علم و فضل اور اساتذہ کرام کی خصوصی التفات سے توفیق ایزدی چھ سال کے عرصے میں تمام علوم عربیہ متداولہ میں پوری پوری دسترس حاصل کر لی۔

فارغ ہونے والی پہلی جماعت: مدرسہ دارالارشاد سے فارغ ہونے والی پہلی جماعت میں صرف پانچ علماء شامل تھے۔ ان میں ایک کھدر پوش مجاہد کبیر، جلال و جمال کا جامع بلکہ بقول سید السادات حضرت امیر شریعت سیدنا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ علیہ السلام کرام کے قافلے میں سے ایک پیچھے رہ جانے والا اسوۂ نبویؐ کا علمبردار بھی موجود تھا۔ جس کو مستقبل قریب میں شیخ القیام کے علاوہ قطبیت کے فرائض بھی انجام دینے تھے۔

یہ کون تھا؟ : ہاں ہمارا آقا، ہمارا مولا، ہمارا بادی۔ ویسٹنا فی الدارین۔ جو لاہور کے ام القری میں بیٹھ کر نصف صدک دینِ حقہ کی خدمت کرتا رہا، اور اپنے آپ کو سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کا غلام بتاتا رہا۔ اللہ! اللہ! اللہ!

سے بے نیاز، خالق کا محتاج، احقر و بردباری کا پیکر، صدق و صفا کا مجسمہ، پیغمبرِ انور کا کائنات، داعیِ تہذیب اور اپنی قوم کو بیکار کپڑا کر کے دینے والا قہر۔ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْنَا مَا لَا - اِنْ اَجْرِي اِلَّا عَلَىٰ اَشْهَاءِ - (اے میری قوم! شہداء ہدایت کے پرچار کے صلے میں میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ہوں۔ میری مزدوری کا تعلق دروازہ الہی سے ہے)۔

اک شرحِ مسلمانی۔ اک جذبِ مسلمانی ہے جذبِ مسلمانی۔ تر فلک الافلاک

اے زہر و فرزندِ بے جذبِ مسلمانی نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقین نمناک

دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ: اور دوسرے حضرت مولانا ضیاء الدین تھے۔ جو کہ اپنے والدِ محترم کے بعد گوٹھ پیر جھنڈا میں مسندِ رشد پر جلوہ فرما ہوئے۔ ان کے علاوہ تین اور خوش نصیب علماء کرام تھے۔ جن کے تذکرے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے حالات پر ہم کو چنداں آگاہی ہوئی۔

چوں کہ حضرت پیرِ رشد اندامِ اس وقت گوٹھ پیر جھنڈا میں گدی نشین تھے۔ اور ان کے صاحبزادے مولانا ضیاء الدین اس فارغ ہونے والی جماعت میں شامل تھے۔ لہذا پیرِ مرحوم نے ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا۔ مقصد یہ تھا کہ اصحابِ خیر و یقین کی شمولیت اور باقی سعید روحوں کے ورود و اجتماع سے دستار بندی کی تقریب کو ہر لحاظ سے بابرکت بنا یا جائے۔

صدارت کے فرائض: الحمد للہ! کہ اس جلسے کی صدارت کے لئے حضرت سید المشائخ حسین ابن محسن انصاری یمنی ریاست بھوپال سے تشریف لائے۔ یہ وحید العصر بزرگ نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال کے استادِ مکرم تھے اور نواب موصوف کی استعا پر ہی یمن سے ہجرت کر کے مع اہل و عیال بھوپال میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوئے تھے۔ چوں کہ آپ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور تھے۔ اس لئے آپ کو پانکی میں بٹھلا کر گوٹھ پیر جھنڈا میں لایا گیا۔ اور جلسے میں پانچ مذکورہ بالا فارغ التحصیل علماء کو مسندِ فراغت دی گئی۔ جہاں تک حضرت لاہوری کو اپنی مبارک یادداشت کا تعلق ہے۔ دستار بندی کی یہ مبارک تقریب ۱۳۳۷ھ کے آخر میں یا اسی سن کے شروع میں وقوع پذیر ہوئی۔

معلمی کا منصب جلیلہ: حضرت لاہوریؒ کی زندگی کے منازل اور مراحل اگرچہ طالبِ علمانہ مصائب اور غریب الوطنی کے تفکرات سے خالی نہیں تھے۔ لیکن آپ کی زندگی کے عام واقعات پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ندرت کا دستِ کرم ہر موقع پر آپ کے فرضِ اقدس پر رہا۔ اور ربِّ الطین کی شان پروردگار ہی نے ہر آن آپ کی دستگیری فرمائی۔ اب حضرت قدس اللہ روحہ! ایک فارغ التحصیل عالمِ دین کی حیثیت سے حضرت سندھیؒ کے ارشاد کے مطابق مدرسہ دارالارشاد میں معلمی کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ آپ نے جس انسٹاک اور قلبی طمانیت سے طالبِ علمی کے دن بسر فرمائے تھے۔ اسی استغراق اور کامیابی سے معلمی کے اوقات گزارنے شروع کئے۔ اس وقت آپ کو اسباق کی تیاری استادانہ اور صلحانہ روش کی حفاظت، بزرگوارِ سنجیدگی، سنتِ ظاہرہ کی پابندی، گویا خلیق و شفیق معلم کے فرائض کی ادائیگی کا خیال بڑی حد تک دامگیر رہتا تھا۔ تاکہ ذہیز طالبِ علموں کی شوخ و شنگ طبیعتوں کی اصلاح کا سامان مہیا ہوتا رہے، اور مدرسہ کے ماحول میں روحانی افوار کی جھلک عام نظر آئے۔

انفصاف نے مسلسل تین سال تک حضرت سندھیؒ کی سرپرستی میں مدرسہ مذکور میں معلمی کے فرائض سرانجام دیئے۔

اللہ اللہ! ہمارے آقا کی زندگی! ستہ

خلائق ابدی پر اس سس ہے اس کی یہ زندگی ہے۔ نہیں ہے۔ طلسم افلاطون
عناصر اس کے ہیں۔ روح القدس کا ذوقی جمال عجم کا سخن طبیعت۔ عرب کا سوز و دروں
دراصل وہ اوصاف حریت جو آپ نے امام انقلاب کی صحبت میں حاصل کئے تھے اب ان کو خلق خدا میں تقسیم
کرنے کے دن تھے۔

حضرت لاہوری کی شادی: حضرت مولانا سندھی جب آپ کو سندھ لے گئے تو انہوں نے اپنی صاحبزادی کو آپ سے منسوب کر لے کا
ارادہ کر لیا۔ لہذا جب آپ سندھ دارالارشاد میں معلق کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تو مولانا موصوف نے اپنی منسوب صاحبزادی
کی شادی آپ سے کر دی۔

آپ کے برادران حقیقی کا حال: فارغ التحصیل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے آپ کے والد محترم شیخ حبیب اللہ صاحب
نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُس وقت آپ کے والد مرحوم چک بابو ضلع گوجرانوالہ میں تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں
اپنے صاحبزادے حافظ محمد علی کو بھی گوٹھ پیر جھنڈا میں علوم دینی کی تحصیل کے لئے بھیج دیا تھا۔ حافظ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر
اس وقت تقریباً چھ سال تھی۔ حضرت سندھی کی شفقت کا اندازہ کیجئے کہ آپ نے اپنی چھوٹی صاحبزادی کی نسبت مولانا محمد علی
سے کر دی۔ حالانکہ حضرت لاہوری کے والدین کی طرف سے اس ضمن میں کوئی تحریک نہیں کی گئی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم کو
پہلے حضرت سندھی تھے قرآن حکیم حفظ کروا دیا۔ اور بعد ازاں دینی تعلیم دینا شروع کی۔ جب حضرت لاہوری کے والد بزرگوار
کا انتقال ہوا تو چک بابو میں حضرت لاہوری کے دو چھوٹے بھائی عزیز احمد اور رشید احمد اور آپ کی والدہ مکرمہ رہ گئیں۔
لہذا حضرت ان سب کو اپنے ہمراہ گوٹھ پیر جھنڈا میں لے آئے تھے۔ محترم عزیز احمد کی عمر اس وقت چار سال تھی اور رشید احمد
صاحب کی عمر دو اڑھائی سال تھی۔ آپ کی شادی کا ذکر جو پہلے گذر چکا ہے۔ وہ دراصل اس موقع پر ہوئی۔ جبکہ آپ کے والد محترم
کی فوتگی کے بعد باقی افراد خانہ گوٹھ پیر جھنڈا میں مقیم تھے۔

آپ کی اہلیہ محترمہ اور کسین بچے کی وفات: حضرت والا مرتبہ ابھی اپنے والد محترم کی ابدی مفارقت پر کبیدہ خاطر ہی
تھے۔ جب کہ غم دایمہ نے ایک اور روح فرسا صورت اختیار کر لی۔ آپ کی شادی کے تقریباً ایک سال بعد آپ کے ہاں ایک
بچہ پیدا ہوا۔ جن کا نام حسن رکھا گیا۔ چنانچہ اس مبارک نومولود کے نام کی وجہ سے حضرت والا کی کنیت ابو الحسن ہے۔ مگر
اندھنالی کی مشیت یہی تھی کہ نووارد اپنے والدین کی آنکھوں کے سامنے صرف سات دن تک آغوش مادر میں جئے، اور
بعد ازاں اپنی ناشفتگی کے دامن میں زندگی کی تمام بہاروں کو لپیٹے ہوئے راہی ملک عدم ہوا اور اگلے دن تھے حسن کی مغوم دم
والدہ اپنے تخت بگر کی تلاش میں دادی فردوس میں جا پہنچیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

اہلیہ کی موجودگی دینی وجاہت اور قلبی تسکین کا باعث ہوتی ہے، اور پھر وہ بیوی جس کی پرورش حضرت سندھی جیسے جا
کبیر کی پدرانہ نگاہوں کی مرہون ہو۔ اس کی رفاقت یقیناً سربایہ افتخار تھی۔ لہذا حضرت لاہوری کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی فوتگی پر عجیب
غم کے غوم دہوم سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت سندھی کی دامادی کا شرف ختم ہوا اور ساتھ ہی بچے کی وفات نے عین شباب میں

باپ نے دل کو مجروح کر دیا۔ اب زندگی کا بنانا کھیل بگڑا اور مستقبل کی ایک نامعلوم تنہائی کا بھیاں تک تصور خوف و ہراس پیدا کرنے لگا۔ مگر حضرت اقدس کو باوجود ان حالات کے پروردگار عالم نے قلب ابراہیمی کے انوار دے رکھے تھے تاکہ بیوی اور بچے کی جدائی میں بھی دینِ حق کی خدمت میں کوئی فرق نہ آئے۔ لہذا اب آپ اپنے یتیم کمن بھائیوں اور والدہ ماجدہ کے تمام اخراجات کے قبیل بن کر زندگی بسر کرنے لگے۔

جمعیتۃ الانصار کا قیام: حضرت مولانا عبداللہ سندھیؒ کو گھر پر چھنڈا ضلع حیدر آباد سندھ سے دوبارہ دیوبند لٹریچر لے گئے وہاں پہنچ کر آپ نے جمعیتۃ الانصار کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک عالمگیر تحریک تھی جس کی وسعت سرزمین ہند سے لے کر کشمیر، افغانستان، ایران، ترکستان، بخارا، عرب اور قسطنطنیہ کی حدود تک پہنچی ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل علماء کی ایک ہمہ گیر تنظیم کی جائے، اور ان سب میں "مجاہد اناموس اور وحدت فکری" پیدا کی جائے۔ وہ جہاں جہاں رہیں مرکز کی آواز کے مطابق اپنی زندگی کا رخ بدلتے رہیں، علماء، خبر کا یہ سواد اعظم کتاب و سنت کی افہامیت کے ساتھ ساتھ مغربی سامراج کی بیخ کنی میں ہمہ وقت کوشاں رہے۔ تمام اسلامی ممالک کو ایک مرکز پر اکٹھا ہونے کی دعوت دی جائے۔ یہ وہ عظیم انسان سلیم تھی جس کی تکمیل کے لئے حضرت سندھیؒ ہر وقت بے قرار رہتے تھے۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھتے ہی اس تجویز کو پورا کرنے کی مساعی جمیلہ شروع کر دیں۔ مگر مدد نہ بد کور کے بعض زہد دار حضرات کو آپ کی تجویز کے بعض پہلوؤں سے اختلاف تھا اور یہی وہ لوگ تھے جو تہذیب و ثقافت دارالعلوم کے مروجہ روایات تھے۔ لہذا آپ کو آخر کار دیوبند کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس موقع پر فارمین کرام کو یاد رہے کہ حضرت اعلیٰ شیخ النور رحمۃ اللہ علیہ انوار جامعیت کے مظہر اتم مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے ہر طرح ہمنوا اور موید تھے۔

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی

چند شور است این کہ در آب دگل افتاد ذبک دل عشق را صد مشکل افتاد
قراریک نفس بر من حرام است بمن رحمے کہ کارم با دل افتاد

ترجمہ (انسانی غمیر میں سوز و دروں اور عملِ ہیتم کا ایک بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ اللہ! اللہ! دل کے تو تھڑے کو عشق سے لگا ہوئے۔ جس کے سبب سے انسانی زندگی میں ہزاروں مشکلات پیدا ہو چکی ہیں، عشق کے سبب لمحہ بھر بھی چین نصیب نہیں ہے۔ خدائے کریم مجھ پر نظر رحم فرمائے۔ کیونکہ میرا آفت پسند دل سے واسطہ پڑا ہے۔)

حضرت سندھیؒ کی بنیاد زندگی کا یہ فطری اقتضا تھا۔ کہ وہ حضرت عمرؓ کی طرح عین نماز میں بھی فوجیں تیار کرتے رہتے تھے۔ ہجرت ان کا مشغلہ بن چکا تھا۔ وہ ارض اللہ کی برکات فراہم کرنے کے لئے اس کے ہر گوشے کو اپنا وطن مآلوت سمجھ کر چلتے جاتے تھے۔ جب دیوبند شریف میں چند حضرات کی اختلاف رائے نے آپ کے عقائد کو پورا ہونے نہ دیا۔ تو آپ اسی جذبہ سے سرشار ہو کر سرزمین دہلی میں چلے گئے اور مسجد فتح پوری کے شمالی کمروں میں سے ایک مکان کو اپنا پرانا۔ اور وہاں نظارۃ المعارف القرآنیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ نے اس جگہ علماء کرام اور گورکھ پور کے حضرات کی ایک مخلوط جماعت تیار کی جن کو حالاتِ حاضرہ کے تقاضوں کے مطابق تبلیغی مشن چلانے کی تربیت دی جانے لگی، ابتداء میں اس جماعت میں پانچ علماء اور پانچ گورکھ پور کے مشائخ شامل۔

جب یہ جماعت مجاہدانہ زندگی کی تعمیر نو کے اصول و آئین سیکھ رہی تھی تو حضرت سندھیؒ نے حضرت لاہوریؒ کو دہلی میں اپنے پاس بلالیا۔ اور آپ کو بھی اس نادردہ روزگار جماعت میں شامل فرمایا۔

حضرت مولانا کا نواب شاہ میں قیام : یہ سطور آپ کی حیات طیبہ کے واقعات میں ربط و تہ ربطہ کرنے کے لئے حوالہ قلم کی جاتی ہیں۔ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں شمولیت کرنے سے پہلے حضرت لاہوریؒ مدرسہ دارالارشاد میں معتمد و معاونین خدمت دین کا کام کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت سندھیؒ اور پیر راشد اللہ مرحوم میں اختلاف رہائے ہو گیا۔ نواقل الذکر نے حضرت لاہوریؒ کو مدرسہ مذکور سے واپس بلالیا۔ چونکہ نواب شاہ میں بھی ایک مدرسہ عربیہ موجود تھا۔ جس کی بنیاد بھی حضرت سندھیؒ نے ڈالی تھی لہذا حضرت لاہوریؒ کو نواب شاہ کا نگران اعلیٰ مقرر فرمایا۔ اور آپ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ دہلی روانہ ہونے سے پہلے وہاں ہی دین حقہ کی خدمات سر انجام دیتے رہے۔

حضرت اقدس کی دوسری شادی : جب حضرت لاہوریؒ کی پہلی اہلیہ محترمہ فوت ہو چکی تھیں تو آپ حضرت سندھی رحمتہ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق نواب شاہ میں تشریف لے گئے تھے، اور حضرت سندھیؒ جمعیت الانصار کی نگرانی میں مدرسہ دیوبند میں مقیم تھے حضرت سندھیؒ کو اپنے ارجمند داماد کی مجرور زندگی کو متاہلانہ حیات سے بدلنے کا خیال ہر وقت دامگیر رہتا تھا۔ اگرچہ رشتہ بہت مل جلکا تھا۔ مگر آپ طبعی اور رُوحانی مناسبت کا بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔ آخر کار پروردگار عالم کی مشیت نے اپنی رحمت و اسع کا کارنامہ کر دیا۔ گمراہ طبعی اور رُوحانی مناسبت کا بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔ آخر کار پروردگار عالم کی مشیت نے اپنی رحمت و اسع کا کارنامہ کر دیا۔ اس طرح فرمایا کہ حضرت مولانا ابو محمد احمد فاضل دیوبند نے حضرت سندھیؒ کو تحریر فرمایا کہ ”اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں اپنی بیوی کا عقد آپ کے عزیز مولانا احمد علی صاحب سے کر دوں۔“ یہ وہ پیغام تھا جس کی منظوری بارگاہ ایزد متعال میں ہو چکی تھی۔ لہذا حضرت سندھیؒ نے یہ ہزار مسرت اس دعوت کو قبول فرمایا۔

حضرت مولانا ابو محمد احمد مرحوم چکوال ضلع جہلم کے باشندے تھے لیکن کافی عرصے سے لاہور میں مستقل طور پر قیام پذیر تھے۔ اور ان کے فضل و شرف کا ایک انتیازی نشان یہ بھی تھا کہ آپ کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت شیخ الہند مرحومؒ کے تلمذ حاصل تھا۔ اور زمانہ طالب علمی میں آپ نے حضرت سندھیؒ کے ساتھ بڑی محبت کے دن گزارے ہوئے تھے۔ علاوہ ان حضرت مولانا ابو محمد احمد حضرت سندھیؒ کی جمعیت الانصار کے سرگرم و کمن تھے۔ لہذا آپ ان دنوں دیوبند میں تشریف فرما تھے۔ چنانچہ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ میں حضرت لاہوریؒ کی شادی کا معاملہ طے پایا۔ محرم الحرام ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہند نے حضرت لاہوریؒ کا خطبہ نکاح پڑھا۔ یہ تاریخی سعادت تھی جس کو فضل ایزد تعالیٰ سے ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ نکاح کے بعد حضرت مولانا مرحوم ایک دفعہ نواب شاہ تشریف لے گئے، اور حضرت مولانا ابو محمد احمد مرحوم دوبارہ لاہور واپس آ گئے۔ یہ ایک ضمنی واقعہ تھا جس کا اس موقع پر نقل کرنا ضروری تھا۔

علیگڑھ کا قیام : حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں علماء کرام کے علاوہ گریجویٹ بھی شریک تھے جیسا کہ پیشتر آئیں بھی لکھا جا چکا ہے۔ ان میں ایک انیس احمدی۔ اے بھی تھے۔ وہ اپنے عام جماعتی اسباق کے علاوہ حضرت مولانا لاہوریؒ سے صرف و نحو بھی پڑھا کرتے تھے۔ مولوی انیس احمدی۔ اے کو اپنے علمی مشاغل کے علاوہ ایک عالم دین کی ضرورت تھی جن کو وہ اپنی رفاقت میں علیگڑھ لے جانا چاہتے تھے۔ مولوی مذکور کے والد محترم مولانا رشید احمد

حرم علیگڑھ کالج میں ایک ممتاز عمدہ پرفائز تھے۔ اب مولوی انیس احمد نے حضرت سندھی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حضرت لاہوری کو اس کے ساتھ علیگڑھ بھیج دیں۔ لہذا حضرت سندھی نے آپ کو علیگڑھ بھیج دیا چونکہ آپ مح اہل وعیال نہ شریف لے گئے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنا قیام نوشہرہ میں ہی رکھا۔ اور دن کے وقت مولوی انیس احمد کے ساتھ کالج تشریف لے جاتے۔ سن ایک ماہ کے قیام کے بعد آپ مح اہل وعیال دہلی واپس آگئے۔ دہلی میں بھی حضرت لاہوری حرم مدرسہ میں رہنے کی بجائے ایک علیحدہ مکان میں رہا کرتے تھے۔

محمد بیٹ نصرت الہی، حضرت شیخ التفسیر محمد عبداللہ علیہ کو خالق ارض وسمانے دل و دماغ کی ایسی قوتوں سے نوازا تھا جن کی برکت سے آپ ہر موقع پر اپنے باقی شرکاء کار سے ممتاز نظر آتے تھے۔ جب آپ نظارتہ المعارف القرآنیہ میں تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے۔ تو خصوصی امتیازات نے آپ کو باقی ہم سبقوں سے نمایاں حیثیت دے رکھی تھی۔ آپ نے ابتداء میں ہی حضرت سندھی کی خدمت اقدس میں عرض کیا تھا کہ وہ آپ کو درس کے وقت اپنی تقریر ضبط تحریر میں لانے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ انہوں نے ازراہ شفقت اجازت دے دی۔ اس لئے آپ کا معمول تھا کہ آپ ایک دستہ کاغذ اور چار پینسل لے کر درس میں بیٹھ جاتے، اور اس سرعت اور بیدار مغزی سے حضرت سندھی کی تقریر کے الفاظ احاطہ تحریر میں لاتے کہ حضرت سندھی خود فرمایا کرتے تھے کہ آپ میرے الفاظ کو ۹۸ فی صد نقل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خداوند عالم کی یہ خصوصی عنایات کا فائدہ اٹھاتے۔ کہ ایک نشست میں حضرت سندھی جیسے متبحر عالم دین کی تقریر کے تیس تیس اور بعض اوقات چالیس چالیس صفحات نقل کرتے جاتے تھے۔ لیکن نہ ہاتھوں کو تھکاؤٹ پریشان کرتی تھی۔ اور نہ ہی دماغی توجہ میں فرق آتا تھا۔ ہم نے عین پیرانہ سالی میں آپ کو اپنے حجرے میں بعض مضامین تحریر کرتے دیکھا ہے تو جس جود و سرعت سے آپ اپنے کام کو مختصر وقت میں ختم کرتے تھے اس کی مثال ہماری زندگیوں میں کہیں نہیں ملتی کیوں نہ ہو۔ بیظاہری دیباغی کمالات اولیائے کرام کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ تھے، اور خصوصیت سے امام انقلاب حضرت سندھی کی تربیت بننے آپ کی تمام قوتوں کو وہ جلا بخشی تھی کہ جس کے فیوض و برکات صدیوں تک باقی رہیں گے۔

دل میں سا گئی ہیں قیامت کی شوعیاں

(مرزا غالب)

دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

حضرت کی تحریر کی اہمیت، جب حضرت سندھی ہندوستان سے ہجرت کر کے (جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا) افغانستان ہانے گئے تو آپ نے اپنے عزیز القدر شاگرد حضرت لاہوری سے فرمایا کہ آپ اپنی تحریر شدہ کتابیاں مجھے دے دیں۔ تو حضرت لاہوری نے نہایت متواضعانہ انداز میں عرض کیا کہ حضور! تعمیل ارشاد میں ذرا بھی تاثر نہیں ہے۔ مگر اتنی سی التماس ضرور ہے کہ یہ کتابیاں آپ کے دل و دماغ کا حاصل ہیں۔ آپ جب چاہیں گے ان سے بدرجہا بہتر تیار کر دیا سکتے ہیں۔ مگر کترین کی بے لباغی کا تو یہ عالم ہے کہ کترین کے پاس ان کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ لہذا آپ ازراہ تطہق ان اوراق کو میرے پاس ہی رہنے دیں تو میرا نہ عنایت ہوگی۔ حضرت سندھی نے نہایت شفقت سے اس کو حین قبول عطا فرمایا۔ یہ کتابیاں جن میں حضرت سندھی کے بیان کردہ نکات و رموز موجود تھے۔ تعداد میں سولہ تھیں۔ اور قرآن مجید کے فقط تیرہ پاروں کا مجموعہ تھیں۔ کیوں کہ ابھی یہاں تک

ہی نوبت پہنچی تھی۔ جب کہ حضرت سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو نظارۃ المعارف القرآنیہ کو چھوڑ کر افغانستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی
ضمنی طور پر اس جگہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ چند اشارات باقی ہیں جن کا بیان کرنا ضروری ہے۔

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ خواجہ باقی باللہ مرحوم والے قبرستان میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کئی ایک
مساجد موجود تھیں۔ آپ کسی مسجد کے منبر پر کھڑے ہو جاتے اور تصور میں حاضرین کو سامنے بیٹھا کر درس قرآن مجید شروع
اور ہر روز اسی طرح آپ حضرت سندھی کے دھس کی تقاریر اندر فرمایا کرتے، اور اپنے جسم کی تمام قوتوں کو قرآن مجید
سمجھنے میں وقف کر چکے تھے۔

پندرہ کی اہلیہ کا بیان ہے کہ حضرت باباجی اور اماں جی کسی صورت میں بھی نماز تہجد قضا نہیں کرتے تھے۔ کہوں کہ وہ
نیک سن شعور کے بعد حضرت مرحوم کے گھر میں رہی ہیں۔ دراصل اِنْ تَأْتِيَنَّكَ الْيَلِيلُ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ
(تحقیق رات کا جاگنا نفس کو کچلنے والا ہے اور پختہ بات ہے) کے مطابق حیاتِ عارفانہ کو زہد و ریاضت کی کٹھالی میں
جا رہا تھا۔ یہ امر ہر لحاظ سے قابلِ تسلیم ہے۔ کہ نبوت و رسالت کا عطیہ وہی طور پر ملتا ہے اس میں کسبِیات بشر کا
نہیں ہوتا۔ مگر ولایتِ علمی کے حصول کے لئے زہد و ریاضت نو شرطِ اول کا حکم رکھتے ہیں۔ کثرتِ نوافل پر جو توجہ
ہیں۔ ان کی تائید احادیثِ قدسی سے ہو چکی ہے۔ لہذا مولانا مرحوم کی طالبِ علمانہ زندگی میں استغراق و انہماک کا یہ
غیر خفا کیونکہ ان کے کا سہ گدائی کو ولایت کی نعمتوں سے چڑکیا جانا مقدر ہو چکا تھا۔ ع
قسمتِ بادہ باندازہ جام اے ساقی

امتحان اور نتیجہ: حضرت مولانا سندھی مرحوم نے افغانستان تشریف لے جانے سے پہلے نظارۃ المعارف القرآنیہ میں
کا امتحان لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ قاضی ضیاء الدین ایم۔ اے کو اپنی معادنت کے لئے اس کام میں شامل کر لیا۔ قاضی کو
درس قرآن مجید میں روزانہ تشریف لاتے تھے اور اس جماعت کو انگریزی پڑھانا بھی آپ کی ذیولٹی (DUTY) تھی
انہوں نے تمام طلباء کا امتحان لیا۔ جس میں بفضلِ ایزد تعالیٰ حضرت لاہوریؒ اپنے ہم سبقوں میں اول آئے۔

الْحَمْدُ لِلّٰہِ تَعَالٰی عَلٰی ذٰلِكَ

اگرہ کا تبلیغی دورہ: اب بعض احباب کے مشورے پر حضرت سندھیؒ نے علماء کی اس جماعت کو دیہاتوں میں تبلیغی
کرنے کا پروگرام مرتب کیا۔ ضلع اگرہ میں دورہ کرنے کے لئے تین علماء کرام کا انتخاب ہوا۔ حضرت مولانا علی اسد اللہ
فضل الرحمن اور حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا رخیہ پر مامور کیا گیا۔ یہ تینوں حضرات امام انقلاب حضرت
میں اگرہ پہنچے۔ آپ نے ان حضرات کے علاقوں کا علیحدہ علیحدہ تعین فرمادیا اور خود دہلی واپس آ گئے۔ اب یہ تینوں مذکورہ بالا
اپنے مجوزہ دورے کی تکمیل کے بعد دہلی واپس پہنچ گئے۔

حضرت سندھیؒ کا کابل تشریف لے جانا: ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ ابھی تیرہ پارے ہی مدرسۃ
القرآن دہلی میں ختم ہوئے تھے جب کہ مدرسہ کوحالات کا سازگاری سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۷ء کا تھا جب کہ
کے بننے والے پہلی جنگِ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں آرہے تھے۔ اس جنگ میں ٹرک بھی شامل تھے۔ ٹرک کی ایک انجی

اور برطانیہ اُنکے خلاف برسرِ کار تھا حضرت مولانا سندھیؒ پر ان واقعات نے دن کا چین اور رات کی نیند تمام کر رکھی تھی۔ وہ انگریزوں کے خلاف نرگوز کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ بایں سمجھنے کے اسلام کے ساتھ جو ان کا تعلق تھا اس کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے ایک اور جہ نیشن لیکن عہدِ حاضر کے ایک مجاہدِ کبیر حضرت مولانا محمود حسن مرحوم سے مشورہ کیا۔ جتنوں نے حضرت سندھیؒ کو حکماً فرمایا کہ "آپ کا بل میں حجت کر کے چلے جائیں"۔ اچھی طرح جھکا معاملہ صیغہ راز میں رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ آپ ہمیں بدل کر صوبہ سندھ سے ہوتے ہوئے کوٹھ پینچے۔ اگرچہ مولانا سندھیؒ نے تمام سفر ریل سے طے کیا۔ اور حکومت کی سی۔ آئی ڈی سائبر کی طرح آپ کے تعاقب میں تھی۔ لیکن اہل اللہ کی عقل دنیا داروں کی عقل سے تیز ہوتی ہے۔ گورنمنٹ کے اہل کاروں نے ہزار تلاش کی مگر مولانا سندھیؒ رحمۃ اللہ علیہ بفضلِ ایزد متعال کو ٹرے سے کابل پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

عشقِ کامل ہو تو ناکامی نہ ہو اے دل تجھے ڈھونڈھ لے ساحلِ تجھے آواز دے منزلِ تجھے
حضرت شیخ التفسیر اور تباہیت کے فرائض: حضرت سندھیؒ جب مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے تمام انتظامات کی ذمہ داری حضرت لاہوریؒ مرحوم کے کندھوں پر ڈال دی اور تحریریں طوریٰ حضرت لاہوریؒ رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کو مدرسہ مذکورہ کا نگران اعلیٰ بنا دیا۔ حضرت سندھیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ ہجرت غالباً ۱۹۱۵ء کے شروع میں ہوئی۔ اور ان کے کابل تشریف لے جانے کے بعد ہمارے حضرت نے دوسال تک درس و تدریس کا کام پوری دلچسپی اور مجاہدانہ مسند سے سرانجام دیا۔

بیگم صاحبہ والی بھوپال کا وظیفہ: مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے ابتدائی ایام میں حضرت سندھیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی ملاقات بیگم صاحبہ والی بھوپال سے ہوئی۔ عمر مرہ موصوفہ حضرت سندھیؒ رحمۃ اللہ علیہ کے تلمیذِ علی اور مدرسے کے اغراض و مقاصد کی تفصیل سن کر اس قدر متاثر ہوئیں کہ انہوں نے حضرت سندھیؒ کے لئے دوسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا اور یہ وظیفہ حضرت سندھیؒ کے ذاتی اخراجات کے لئے مخصوص تھا۔

وظیفہ کا حضرت لاہوریؒ کے نام منتقل ہونا: حضرت سندھیؒ کی ہجرت کے متعلق جب بیگم صاحبہ کو خبر پہنچی تو ساتھ ہی یہ بھی اطلاع دی گئی کہ مولانا کابل جاتے ہوئے ایک عالمِ دین کو اپنا قائم مقام بنا گئے ہیں۔ اس وقت اللہ والوں کی شانِ استغناء ملاحظہ ہو۔ کہ ہجرت کی اطلاع نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کی طرف سے نہیں کی گئی بلکہ بیگم صاحبہ کو یہ خبر کسی اور ذریعے سے ہوئی۔ لہذا عمر مرہ موصوفہ نے اس خبر کا تصدیق کے لئے حضرت مولانا مفتی انوار الحق اور مفتی الزبیر حضرت مولانا عبداللہ ٹوکی کو دہلی روانہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ حضرت سندھیؒ کے قائم مقام کی علی حیثیت اور علی وقت کا پورا پورا جائزہ لیں۔ مقصد یہ تھا کہ کیا مدرسے کے انتظامات مولانا کی شیرِ حاضری میں بطریق احسن سرانجام دیئے جا رہے تھے یا نہیں؟ اس وقت حضرت لاہوریؒ کے درس میں مشن کالج دہلی کے طلبہ کی ایک جماعت قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ رہی تھی۔ حضرت مفتی صاحب نہایت خاموشی سے درس میں آکر بیٹھ گئے۔ اور کافی دیر تک قرآن مجید کے ترجمے کی سماعت فرمانے کے بعد تشریف لے گئے۔ اب بیگم صاحبہ نے جناب مفتی صاحب کی رائے کے مطابق دو صد ماہانہ وظیفہ حضرت مولانا لاہوریؒ رحمۃ اللہ علیہ کے نام منتقل کر دیا۔

اہلی سے حضرت مولانا کی گرفتاری: امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے کابل میں بیٹھ کر چند ضروری شخصیتوں کو یہ پیام

ارسال فرمائے۔ یہ خطوط حضرت لاہوریؒ کے پاس دہلی پہنچائے گئے۔ آپ نے حضرت سندھیؒ کی ہدایت کے مطابق مکتوب الیہم کے کاغذ پر انتظام فرمایا۔ مگر سرزمین ہند کی تیرہ جہتی کا کیا کیئے۔

طائروں پر سحر ہے ہتیا دے اقبال کا اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا یہ خطوط جن میں انقلاب کا پیغام تھا۔ غلام آدمیان پر کماحقہ اثر ڈالنے سے قاصر رہے۔ اگر حضرت سندھیؒ کے ارشاد پر وگرام مرتب کیا جاتا۔ تو یقیناً انگریزوں کے لئے ہندوستان کے قیام میں حد سزا اُلجھنیں پیدا ہوتیں۔

اب ان خطوط کے تقسیم ہونے کے چھ ماہ بعد امام تجدید و انقلاب حضرت سندھیؒ نے ایک آدمی کے ذریعے پھر اس کے خطوط اپنا سال فرمائے۔ سوہ اتفاق سے وہ خطوط پکڑے گئے اور اس لانے والے آدمی کی وساطت سے سالفہ خطوط افشا ہو گیا۔

اور کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان نئے فرستادہ خطوط میں مولانا سندھیؒ کے متعلقین خاص کا ذکر تھا۔ یہ لوگ ہند اور بہاول پور میں پھیلے ہوئے تھے چنانچہ خطوط کے پکڑے جانے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک سی دن میں اس وقت پر مولانا موصوف کے تمام متعلقین کو گرفتار کر لیا۔

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شہبازِ نسیم

ایک دن حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ حسب معمول نماز صبح کے بعد مدرسہ نظارۃ المعارف القرآن میں درس فرماتے دے رہے تھے اور تعلیم یافتہ نوجوان آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس اور دو آئری پٹر درگاہ میں آدھکے سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا وہ آگے بڑھا اور اس نے وارنٹ گرفتاری حضرت مولانا کے ہاتھ میں رکھا کہ کو مدرسے سے باہر نکال دیا اور کمرے کو مقفل کر کے حضرت والا شان کو حراست میں لے لیا۔

ابیں سعادت ہمرو شہباز و شاہیں کردہ اند
اب آپ کو ساتھ لے کر آپ کے مکان پر پہنچے جو فتح پوری مسجد سے قاضی غوص جانے والی سڑک پر کڑھ پڑا ہوا تھا وہاں جاکر حضرت کے اہل و عیال کو مکان کی چھت پر چڑھا دیا اور خانہ تلاشی شروع کی گئی۔ ایک میرے اشیاء کے چند تنکوں کے لئے برقی کی زد میں گلستان کا گلستاں رکھ دیا حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وہ قلبی تحریرات جو قرآن مجید سے متعلق تھیں، اور وہ کتب جن کو اس علے نے پیش کیا ایک ٹرنک میں بھر لیا۔

۱۔ مولانا سندھیؒ نے کابل کا سفر شیخ الہندؒ کے حکم سے ایک مشن کے لئے کیا تھا۔ اس کی تفصیل مولانا سندھیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ مضمون میں لے گی۔

لی سے شملہ کو روانگی: چند دنوں کے بعد آپ کو ہتھکڑی لگا کر رات کے وقت دہلی ریلوے اسٹیشن پر لایا گیا، اور وہاں سے لے گئے۔ شملہ پہنچ کر آپ کو ہتھکڑی کی حالت میں ایک جھڑپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ ملزم کو شملہ کی حوالات میں لایا جائے۔

سب کے دل میں یہ شک تیری جو نورانی ہوا مجھ پر گویا کہ زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جب آپ کو شملہ کی حوالات میں نظر بند کیا گیا۔ تو ان دنوں حوالات کا نگران انسپکٹر آف پولیس نہایت شریف، طبع، علم و دست در فطرتانیک ہو تھا۔ اس کے ضمیر نے حضرت قدس اللہ سرہ کے متعلق حکم دیا کہ آکر جی متھاؤ (اس کو عزت آرہے رکھیے) لہذا اس نے حضرت والا انبار کو خاص مراعات دے رکھی تھیں۔ جو حوالتوں کو قانونی طور پر نہیں مل سکتی تھیں۔ اس نے اپنے تحت علی کے حکم دے رکھا تھا کہ جب حضرت مولانا کو وضو کی ضرورت ہو۔ تو آپ کو ہتھکڑی کے بغیر جانے دیا جائے۔ لہذا آپ بغیر ہتھکڑی اپنی حوالت سے فارغ ہوتے۔ اور جب وضو فرمانے کے بعد واپس تشریف لاتے تو آپ کو پھر حوالات میں بند کیا جاتا۔ دوسرا رعایت یہ تھی کہ انسپکٹر آف پولیس آپ کو بازار سے مٹھائیاں منگو کر پیش کیا کرتا۔ اور یہ رقم اپنی حیب سے ادا کرتا تھا۔ اور اس کی طرف سے میری برکت بفضل ایزد متعال یہ ہوئی کہ جو کبیل حوالتوں کو ملنے تھے۔ حضرت اعلیٰ کو ان کبیلوں کی بجائے انسپکٹر مذکور نے اپنے گھر سے صاف ستھرے کبیل منگو کر بھیجے تھے۔ اور اسی عقیدت مندی سے ایک دن آپ کو اپنے گھر بھی لے گیا اور نہایت تواضع سے پیش آیا۔ آپ کو قالین پر بٹھا کر گادھیکہ پیش کر کے آپ نہایت ادب سے سامنے بیٹھ گیا اور آپ کی بڑی پر تکلف ضیافت کی اور کہا کہ اگر اس وقت ہمارا افسر آئے اور آپ کو حوالات میں نہ پا کر مجھ سے پوچھے تو میرے پاس اس کا تسلی بخش جواب ہے۔ اس موقع پر یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ وہ انسپکٹر آف پولیس بحیثیت نگران مقرر تھا۔ تفتیش کے لئے مسلط نہیں تھا۔ کہ جس کے متعلق یہ گمان ہو سکے کہ وہ حضرت عالی مقام کے ساتھ ایسی خاطر و مدارات سے اس لئے پیش آتا تھا کہ وہ آپ کا دل بہلا کر اصل معاملے کی تحقیق نہ کرنا چاہتا تھا۔ دراصل یہ کاروائی خداوند عالم کی رحمت و واسعہ کا ظہور تھا۔ اور اس میں وَالْقَبِیْتُ عَلَیْكَ حَیْثُ قَبِیْتُ وَلَیْسَ مَصْنَعٌ عَلَیْ عَیْنِیْ کی شان پائی جاتی تھی۔ اور اسی کو اقتبال مرحوم نے ایک موقع پر اپنے خاص انداز میں یوں بیان کیا۔ ع

پاساں مل گئے کبے کو صنم خانے سے

شملہ سے لاہور کو روانگی: کچھ عرصے تک حضرت عالی دقار کو شملہ جیل میں رکھا گیا۔ بعد ازاں آپ کو ہتھکڑی لگا کر لاہور لے آئے حضرت اُن دنوں عربی لباس پہنا کرتے تھے۔ ریلوے اسٹیشن لاہور سے آپ کو پیدل امرت دھارا روڈ پر میراں عبدالعزیز پولیس افسر کے مکان پر لائے۔ اب حکم ہوا کہ آپ کو ریلوے اسٹیشن لاہور کی حوالات نوکھا میں محصور کیا جائے۔ لہذا آپ کو کوئی دن وہاں رکھا گیا۔

لاہور سے جالندھر کو روانگی: سیدالاولیاء حضرت شیخ التفسیر مرحوم رحمۃ اللہ علیہ کو اب ہتھکڑی لگا کر لاہور سے جالندھر لے گئے۔ اور وہاں جالندھر شہر کے ریلوے اسٹیشن کی جیل میں بند کر دیا۔ اس جگہ بعض پولیس افسر گاہے گاہے آتے جانے تقریباً پچیس

دن کے بعد آپ کو جانہ ہر شہر کی جیل میں منتقل کیا گیا، اور دوپہر کے وقت جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ نماز جب آپ کو ٹھہڑی سے باہر لائے تو آپ نے دیکھا کہ کافی فاصلے پر داروغہ جیل کے پاس آپ کے مرنے و مہمن حضرت محمد دین پوری نور اللہ مرتدہ بھی قشر لیت فرما ہیں۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ پر یہ راز اس وقت منکشف ہوا کہ دین پوری رحمۃ اللہ علیہ اس مقدمے میں موقوف ہیں۔ فرزندِ مرنوہانی نے اپنے والد محترم کو دُور سے بہ ہزار حسرت دیکھا حاضر خدمت ہو کر قدم بوسی کی اجازت کب مل سکتی تھی۔ ۷

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دُور اور شکستہ پر

پروانہ ہوں پیراغ سے دُور اور شکستہ پر

(ذوقِ) حضرت اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے خود ثنا ہے کہ ہم تو اپنے بچوں کو ہدایت کیا کرتے ہیں حاصل کرنے وقت پچاس فی صد تعلیم اور پچاس فی صد اساتذہ کرام کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھا کرو۔ لیکن راہِ طریقت میں سو فی صد کی تعلیم کا خیال رکھا جائے۔ ہم نے حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ہم عصر علماء کرام کے ساتھ اس قدر حسن سلوک سے ملاقات ہے کہ جس کی مثال اگر نایاب نہیں تو کیا ب ضرور ہے اور صوفیائے وقت کے ساتھ تو آپ کا تعلق نہایت صادقانہ اور حامل تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔ میں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاتا ہوں۔ مگر سوائے علیک سلیک کے اور کسی گفتگو نہیں کرتا ہوں۔ اگر تین گھنٹے تک بھی بیٹھتا ہوں تو دو زانو ہو کر بیٹھتا ہوں۔ پھر فرمایا کرتے تھے کہ اللہ والوں کو اللہ دکھانا ہوتا ہے۔ اور ان کا حال دیکھنا ہوتا ہے۔ اور بس انی الواقع ایسے موقعوں پر غ خاموشی معنی دار دیکھ کر گفتگو نہ آید

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ فطری طالبِ صداق کی قلبی کیفیت کا حال کوئی صاحبِ دل ہی بیان کر سکتا ہے۔ ”دلی راوی نے شناسد“ کے مطابق حضرت کے خیالات کی ترجمانی وہی کر سکتا ہے جس کو اپنے روحانی مرنے کے ساتھ اپنی روحِ جنتی آپ کو اپنے آقا نے روحانی تھی!

حضرت شیخ المشائخ مولانا غلام محمد دین پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے بعد آپ جب وضو کرنے کے لئے نکلے کے پاس آئے تو مولانا عبدالحق لاہوری رحمۃ اللہ علیہ رفاه عام سیٹھ پر بس کہے مالک کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی راتِ مقدم میں گرفتار ہو کر آئے ہیں۔

راہتوں ضلع جانہ ہر میں آپ کی نظر بندی : جانہ ہر شہر کی جیل سے اب ہمارے خضر طریقت کو راہتوں ضلع جانہ ہر کی جیل میں لے گئے وہاں آپ نے ابھی چوبیس گھنٹے ہی بسر کئے تھے کہ ڈپٹی کمشنر ضلع جانہ ہر دُور سے پراگئے۔ اب آپ کو جیل بحال ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ گورنمنٹ آپ کو اس مقدمے کے جرم میں راہتوں ضلع جانہ ہر میں نظر بند کرے۔ آپ اس قصبے کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔ اور نہ ہی کوئی بیرونی آدمی آپ کو یہاں آکر مل سکتا ہے۔ اگر آپ نے کوئی لکھنؤ ہو تو خط لکھ کر سب انپکٹر پولیس کے حوالے کیجئے۔ سرکاری افسر معائنہ کے بعد مکتوب الیہ کو بھیج دیا کریں گے۔ علاوہ ازیں آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے پندرہ روپے وظیفہ ملا کرے گا۔ چنانچہ یہ حکم سن کر آپ کو حوالات سے رہا کر دیا گیا۔

گفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

میں مولانا کا معمول : راتوں کے پولیس اسٹیشن کے پاس خاندان منلیہ کے وقت کی ایک شاہی مسجد تھی۔ مسجد اور گلی کے درمیان اڑھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ تاہم مطلق کی نوازشات کا اس جگہ بھی عجیب ظہور ہوا۔ وہ طبیعت جس کو خالق دو جہان نے اپنی عبادت مخصوص کیا ہوا تھا۔ اُس کے لئے خلوت کدوں کا انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ خلوت کے انوار نے آپ کے دل و دماغ کو عطا فرمایا جس کی اہمیت جی چلا سے آپ کا دل ہمیشہ عبادت الہی کے جذبہ سے سرشار و بیدار رہتا تھا، اور یہ حقیقت ہے۔

دل بیدار فاروقی دل بیدار کتراری
میں آدم کے حق میں کیا ہے دل کی بیداری

آپ تمام دن اس مسجد میں پورے ساکنہ انہماک سے اشغال و اوراد میں مشغول رہتے۔ قرآن حکیم میں تدبر و تفکر اور نئے علاوہ فعلی عبادات میں استغراق کا ایک سنہری موقع مل گیا۔ ایک دنیا پرست انسان کے لئے یہ وقت ہزار حسرت و یاس تھا۔ مگر اس عارف باللہ کے لئے یہ تنہائیاں راہ معرفت میں تیز گامی کا سبب بنی ہوئی تھیں۔

ع

چلے شاد جادہ صد سالہ باہرے گاہے

رات کے وقت آپ تھانے میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں کا سب انسپکٹر پولیس ایک سکھ تھا اس نے مسلمان سپاہیوں سے رکھا تھا کہ وہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام اپنے کھانے کے ساتھ ہی کریں۔ لہذا وہ کچا راشن بازار سے لاتے اور اپنے ساتھ ہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام بھی کرتے۔ مقصد یہ تھا کہ عیسائی کے اختتام پر آپ کے وظیفے کی قیمت ادا کی جائے گی۔

علی اللہ : راتوں میں آپ نے نومبر اور دسمبر کے مہینے گزارے۔ بچہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دہلی میں جب آپ کو گرفتار کیا گیا تھا مے آپ کا کوٹ اپنی تحویل میں رکھا تھا۔ ان کو شہر تھا کہ شائد ان کی میونوں میں سازشی کاغذات ہوں۔ اب یہاں وہ آپ کو واپس لوٹوا گیا۔ یہ گرم کوٹ ہمیں تھا اور اس کے واپس ملنے سے پہلے آپ کے مبارک بدن پر مکمل کا ایک کڑتر اور اس کے باطنی عبادتھی۔ علاوہ ازیں آپ کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا اور سردی دن بدن شدت پکڑ رہی تھی۔ جو لوگ مسجد میں نماز کی غرض سے تھے ان میں سے ایک شخص آپ سے متعدد دفعہ سوال کر چکا تھا۔ کہ میں آپ کے لئے ایک بستر بلاؤں مگر حضرت اقدس لہ علیہ ہر بار انکار ہی فرماتے رہے۔ حقیقت یہ تھی کہ آپ باوجود سخت ضرورت کے بستر لینے سے اس لئے انکار فرماتے تھے کہ آپ اس کے پوچھنے پر ”ہاں“ فرما دیں تو یہ بھی ایک طرح کا سوال بن جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں پر اپنی احتیاج دینے کے مترادف تھا۔ لہذا آپ کو یقین تھا کہ اگر میں اس شخص کے پوچھنے پر یہ کہوں کہ آپ بستر لا دیں تو یہ عمل بھی تعلق باللہ اور پیدا کر سکتا تھا۔ اس لئے آپ اس چیز سے اجتناب فرماتے رہے۔

ع

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کھدے یہ بندہ دو عالم سے تھا میرے لئے تھا

بندہ لواز می : آخر کار پروردگار عالم کو اپنے متوکل و صابر بندے پر رحم آیا اور اپنے ایک مخلص ترین بندے کے دل میں اور اجاہ کی اس ضرورت کا احساس پیدا کیا۔ لہذا ایک معترف متقی، مجتہد شخص ایک دن نماز عشاء کے بعد مسجد میں آیا اس وقت شرح التفسیر رحمۃ اللہ علیہ بالکل تنہما تشریف فرما تھے۔ اس شخص نے ایک نیا محاف اور ایک نئی ٹوشک نہایت لواضع

سے پیش کر کے عرض کیا کہ حضور! آپ اس ناچیز شخص کو قبول فرمائیں۔ یہ بسترہ فسطاپ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس عطیہ الہی کو نصرت غیبی سمجھ کر قبول فرمایا۔

راہوں میں حضرتؐ کے کھانے کا انتظام

کارِ مرداں روشنی و گرمی است کارِ دوناں جیلہ و بے شرمی است
پیشتر ازیں بیان ہو چکا ہے کہ راہوں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کھانے کا انتظام مسلمان سپاہیوں کے ذریعے کیا
وہ بازار سے کچا راشن لاتے اور خود پکاتے تھے۔ آپ نے تقریباً چار دن کھانا تناول فرمایا ہوگا جبکہ آپ کو معلوم ہوا کہ کھانا پکا
جو ایندھن استعمال ہوتا ہے وہ رشوت کا ہونا ہے۔ لہذا آپ نے کھانا تناول فرمانا بند کر دیا۔

اے طاثر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
چوں کہ چوکیدار لوگ جو دیہاتوں سے اموات و پیدائش کے اعداد و شمار لے کر ہفتہ وار کھانے میں آتے تھے۔ سپاہی
اُن سے اُوپلے یا باقی قسم کا ایندھن منگوالیتے تھے۔ جب آپ کو اس نقص کا پتہ چلا تو آپ نے سب اسپیکٹر پولیس کو کہا
کہ آپ ان کا پکا ہوا کھانا نہیں کھائیں گے۔

قوموں کی تقدیر وہ مرد و رویش جس نے نہ دیکھی سلطان کی درگاہ
اب آپ کے کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا مگر آپ نے بزرگانِ سلف کے صبر و تحمل کی داستانیں پڑھی ہوئی تھیں۔ یہ یقین
یقین تھا کہ اسلام کی روح رواں اپنی خواہشات پر قابو پانے کو یہی کہتے ہیں۔ مجاہدانہ زندگی و نبوی لذات سے بیگانہ ہوتی ہے
خودی کے نگہبیاں کو ہے زہر ناب وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

آپ نے کھانا بند کر دیا تھا۔ اور پروردگارِ عالم کے بھروسے پر فاقہ کشی کے لئے ہمت تن تیار تھے۔ اور یہ منزل
جو بندے کو محبوبِ خدا بنانے میں بڑی مدد دیتی ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے بل بوتے پر بندہ موت سے نہیں ڈرتا کیوں کہ
رگ و پے میں رُوحِ مصطفیٰ جاری و ساری ہو جاتی ہے۔
اقبال علیہ الرحمۃ نے ایک خاص موقع پر اس حقیقت کو اُجھا کر کیا ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا رُوحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
جب آپ کے کھانے کا نظاہر کوئی انتظام نہ رہا۔ تو ایک اجنبی عورت مسجد سے باہر کھڑے ہو کر آپ کو کئی کے جھٹے ہوئے
دے جاتی۔ اور اس کے ساتھ کچھ گڑ بھی ہوتا تھا۔ یہ عورت حضرت قطب الاقطاب رحمۃ اللہ علیہ سے نا آشنا اور حضرت
علیہ بھی اس سے بالکل ناواقف تھے۔ آپ یہ دانے چبا لیتے۔ اور پانی پی لیتے۔ لہذا راہوں کے قیام میں اسی روز پر کربہ
اذقات ہوتی رہی۔

مردِ مچوں اشتراں بارے بُرد مردِ حرّ بارے بُردِ خارے خور
تائیدِ الہی : راہوں میں ایک دن ایک بزرگ تشریف لائے۔ وہ اس قصبے کے باشندے نہیں تھے۔ حضرت مولاناؒ وقت

ہئے۔ اور یاد خدا میں مستغرق تھے۔ اس بزرگ نے بلاغ قریب آپ کو ایک وظیفہ بنایا اور کہا کہ اگر آپ یہ وظیفہ پڑھیں گے تو اللہ نے آپ کو نظر بندی کی رحمت سے نجات دے گا۔ لہذا حضرت نے یہ وظیفہ سات دن پڑھا۔ تو علم غیبی نے رات کو خواب میں آپ کو دکا مشرودہ سنایا۔

لٹاف سیاست اور علماء حق: جب ۱۸۵۷ء میں برطانوی ریشہ دو انیاں کامیاب ہو رہی تھیں حضرت سراج الدولہ مرحوم انگریزوں کے سامنے نازیبا اقدام نہ فرمایا۔ مگر اس مجاہد کا خون حریت پلاسی کے میدان جنگ میں گر کر ہیبت کے لئے شگ ہو اس کے لئے مجاہد کبیر حضرت سلطان شہید نے سگان برطانیہ سے ارض ہند کو پاک کرنے کا مکمل تہیہ کیا تو شہیدت ایزدی نے اس مجاہد کا نام تو بیٹھنا شہدائے بالاکوٹ کی قبرست میں سب سے نمایاں جگہ پر لکھ دیا۔ مگر اس کی عذرا دین فروش پست اور عیاش کے افراد کو برسوں کی محنت میں گرفتار کر دیا۔

بال بازاراں راسوئے سلطان بُرند بال زاخان را بگورستان بُرند

اس زوال و انحطاط کے دور میں علماء شیرازی تمام کوششیں دین الہی کے احیاء کے لئے صرف کرتے رہے۔ برطانوی حکومت نے جو استبداد اور اسلام دشمنی کے تمام منصوبوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنے کمزور بندوں کے ہاتھوں اپنے دین کی حفاظت کروائی۔ بلکہ روزِ اول سے یہی عادت اللہ اور سنت اللہ جاری و ساری رہی ہے کہ وہ ابامیلوں کی چوٹوں میں شکرینہ سے پلوا کر ہاتھوں کو تباہ کر داتا ہے۔ اسی طرح اور عین اسی طرح برطانوی ابرہہ کے مقابلے میں ہندوستان میں دین کے کچھ کی حفاظت کا کام لیا گیا۔ ان علماء شیر پر کوڑوں رحمتیں ہوں جنہوں نے سوکھے ٹڑے چاچا کر اور قید و بند کی سختیاں برداشت کر کے قرآن مجید کو اپنے سینوں سے لگائے رکھا۔ ورنہ اگر بڑھیا شاعر وقت نے اسلام کی تذلیل و تضحیک میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا۔ مدارالعلوم دیوبند اور سہارن پور کے فارغ التحصیل علماء کو پاچ روپے کی ملازمت بھی نہیں دی جاتی تھی۔ مگر سرکاری سکولوں کے پانچویں پاس نااہلوں کو ہر جگہ ملازم رکھا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی حضرت سید انور شاہ کا شہبیرؒ حضرت مولانا محمود الحسنؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی خدائی ہمتوں نے بفضل ایزد تعالیٰ کھڑے رہے۔

مِنْ وَجْهِ قَلِيلَةٍ عَلَيَتْ وَجْهٌ كَثِيرٌ لَا يَأْذِنُ اَللّٰہُ..... کا منظر پیش کیا۔ اور اسی قافلے کے ساتھ ساتھ سید السادات زعیم احرار اسلام حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور قطبِ دُورِاں مدوحِ جاہل حضرت شیخ التفسیر رحمہ اللہ علیہ بھی تھے جن کی شاہدِ روزِ کوششوں نے کفر و بدعت کے ہر وار کو اپنے ہاتھوں پر لیا۔ اور مچھل مچھل کا ہر موقع پر منہ چڑایا اور دینِ مصطفویؐ کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کر دی۔ دنیا کے حقیقت پسند مورخین جب اس دور کی تاریخ لکھیں گے تو ان کو ان پڑے گا کہ سید المجاہدین سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پروردگارِ عالم کی طرف سے مسئلہ ختم نبوت کے تحفظ و بقا کے لئے آسمان سے اور اسی راہ میں شہید ہوئے۔ لہذا آپ کو شہیدِ ختم نبوت کہنا ہر لحاظ سے بجا ہے اور حضرت مولانا سیدنا شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ خدمتِ قرآن کے لئے بھیجے گئے تھے۔ اور اسی پیغمبرِ خدمت میں جاں بحق ہوئے۔ اس لئے آپ کو شہیدِ قرآن کا لقب ہر دلیل سے زیادہ ہے۔

لاہور میں وروید مسعود: خداوندِ عالم نے تمام ظاہری اسباب کی موجودگی میں اپنی قدرتِ کاملہ کے معجز نامحسوسات مختلف

موتوں پر پیش فرمائے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ظاہر پرست انسان کو دعوت دی جائے کہ وہ دنیا میں اپنی فائز المرامی اور کامرانی کا دار و مدار اسباب و علل کے ظاہری سلسلے پر نہ رکھے۔ بلکہ تَحَوُّزُ مَبْنِیَّ تَشَاءُ وَ دَسَّیْلُ مَبْنِیَّ تَشَاءُ بِسَلَاکِ الْحَیْزِ پر یقین کامل کر کے اپنی زندگی کی تمام ترقیوں کو رمضان المبارک کے حصول کے لئے صرف کر دے۔ کیونکہ انسانی حیات کا یہی معراج کامل ہے کہ وہ فتح و شکست کے وقت خدائے دو جہاں کا دروازہ نہ چھوڑے۔

زمانہ کتنہ بیتاں راہزادہ بار آراست من از حرم نگزشتم کہ بختہ بنیاد است
حضرت شیخ التفسیر مرحوم رحمۃ اللہ علیہ برطانوی حکومت کے نزدیک باغی تھے، مجرم تھے۔ مگر آپ کا ہر قدم راہ راست پر پڑتا تھا، اور مشیت ایزدی کا تقاضا تھا کہ لاہور جیسے تہذیب فاسق کی بستی تھی۔ رشد و ہدایت کا سرچشمہ بن جائے اور اس زمزمہ قرآنی سے سر زمین ہند باقی بیرونی ممالک اور جزائر حتیٰ کہ عرب و عجم بھی اپنی تشنگی بجھائیں۔ علماء غیر کے گروہ درگروہ آئیں اور علوم و معارف سے اپنے دل و دماغ کو منور کر کے دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیل جائیں۔ سالکان راہ طریقت حاضر ہوں اور ریاضت کے لئے لائن سجان خاں کی جامع مسجد کے حجرؤں اور چٹائیوں پر شام و صبح عبادت گزاریں اور اصحاب صفہ کی سنت کے مطابق ذکر الہی اور فکر عاقبت میں مستغرق رہیں اور جب یہاں سے اپنے اپنے اوطان کو واپس جائیں تو دین مصطفویٰ کی خدمت کا ایک پاکیزہ جذبہ لے کر جائیں۔ جہاں رہیں اور جب تک دنیا میں رہیں۔ واللہ انداز میں کتاب و سنت کی نشر و اشاعت میں منہمک رہیں۔ علماء تو علماء تہذیب مغرب کے پرستار چند دلوں میں اسلامی معاشرے کے گرویدہ بن جائیں اور فرشتگان قضا و قدر قلوب و ارواح کے درد اذوں پر دستک دیتے پھریں۔

در فیض محمد و اہل آئے جس کا جی چاہے خدائے دو جہاں سے لو لگائے جس کا جی چاہے
حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ کو راہتوں سے لاہور لایا گیا اور سی، آئی، ٹی کے ایک انگریز افسر کے سامنے جس کے ساتھ ایک مسلمان افسر بھی تھا۔ پیش کیا گیا، آپ سے اس افسر نے کہا کہ "حکومت آپ کو صوبہ سندھ یا دہلی واپس بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ کیونکہ کہیں کا یقین ہے کہ صوبہ سندھ اور دہلی میں آپ کا واپس جانا کسی لحاظ سے ٹھیک نہیں۔ لہذا آپ کو لاہور میں ہی رہنا ہوگا" لیکن مشیت الہی نے اس فیصلے پر بھی تبسم فرمایا۔ اور اپنی اقلیت کا ظہور ایک عجیب انداز میں کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ع

عذو شرے براگیزد کہ خیر ما در اں باشد

البتہ آپ کو یہ شرط بھی پیش کی گئی کہ آپ اپنے دو ضامن پیش کریں، اور وہ ہزار ہزار روپے کی ضمانت دیں۔ تب گورنر نے آپ کو رہا کرنے کے لئے تیار ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ پنجاب میں میرا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ میں دہلی یا صوبہ سندھ سے ضامن پیش کر سکتا ہوں مگر افسر نے کہا کہ ہم وہاں سے ضامن لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ جب آپ نے غور کیا تو قاضی ضیاء الدین مرحوم ایم۔ اے فاضل دیوبند ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کا نام نامی یاد آیا۔ قاضی موصوف آپ کی اہلیہ محترمہ کے چچا زاد بھائی ہونے کے علاوہ

نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں علماء کی جماعت کے انگریزی پڑھانے کے استاد تھے۔ اب حضرت اعلیٰ قاضی مرحوم کے پاس گئے تو وہ اس کا رٹیر کے لئے فوراً تیار ہو گئے، اور دوسرے عناصر ملک لال خاں (پنجرانجمن اسلامیہ گوجرانوالہ) کو تجویز کیا گیا۔ چنانچہ ملک صاحب نے بھی اپنی آمادگی کا اظہار فرمایا۔ آخر اھما اللہ خیر الحجزاء فی الدین جب یہ دونوں حضرات ضمانت دینے کے لئے لاہور نشر لیت لائے تو سی۔ آئی۔ ٹی پولیس نے ضمانت میں تخفیف کر دی اور ہر ایک صاحب کو پانچ سو روپے ضمانت دینے کی اجازت ہو گئی۔ یہ ضمانت صرف ایک سال کے لئے تھی۔ اب حضرت والا جاہ لاہور میں قیام پذیر ہونے کے لئے پابند ہو گئے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دریائے راوی کی گہرائیوں سے لے کر شاہی مسجد کے بلند میناروں کی تمام فضاؤں نے ہزار سرت وعقیدت سے انہیں پکارا تھا۔ ع

آمد آں مردے کہ مائے خواستیم

روح لاہور استقبال کرتی ہے

مری بانوں کو سن کر اک ندامتھی فضاؤں سے
صدائے جزا اور حجاب گنجی ہواؤں سے
بیس ان کی راہ اپنے چمن پامال کرتی ہوں
بہت فراق بے ہیں بہت بیخواب بے ہیں
مری قیمت اگر برسوں سے یہاں لغت بستی ہے
مناعہ دین بھی قربان ہے فرنگی پیشواؤں پر
تماشا کھیل ان کے دین میں عین عبادت ہے
شب تار یک جاتی ہے میری قسمت چمکتی ہے
مثیل بایزید آئے امام الانقیاء آئے
کتاب اللہ کی آیات کا سننا مبارک ہو
ہزاروں اس جگہ شریعت عبادت آکے سکھیں گے
صدائی کے استقبال کرتی ہوں
مرے دامن میں لاکھوں نایاب بے ہیں
فحاشی کے مراکز ہیں، سینہاؤں کی بستی ہے
شیاطین کا تسلط ہے، یہاں کی درس گاہوں پر
کتاب اللہ پر قطعہ زنی کی یاں اجازت ہے
مگر فضل خداوندی سے اب صورت بدلتی ہے
بحمد اللہ مری بستی میں فخر اولیاء آئے
مجھے تمہیل کے نعمات کا سننا مبارک ہو
ہزاروں اس جگہ شریعت عبادت آکے سکھیں گے

حضرت کا لاہور میں مستقل قیام؛ آپ کو لاہور میں رہنے پر پابند کیا گیا تو آپ نے اپنے اہل وعیال اور اپنے جہانی رشید احمد صاحب کو اپنے پاس بلالیا۔ حکیم صاحب کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے طبیہ کالج لاہور میں داخل کیا گیا۔ آپ نے وہاں سے زبذۃ الحکماء کی اعزازی ڈگری حاصل کی۔ اور اسی کالج میں بیحدت پر فیسر کام کرنے لگے۔ لہذا آپ کئی سال تک وہاں کام کرتے رہے۔ آپ بڑی مستند سیاح تھے اور دیانتداری سے کام کرتے تھے۔ اس لئے آپ کی جماعتوں کے نتائج بہت اچھے نکلتے تھے۔

لاہور میں حضرت کے مشاغل: امام انقلاب حضرت مولانا سندھو نے حضرت مولانا سے دہلی کے قیام میں وعدہ لیا تھا کہ کردہ سازی زندگی قرآن حکیم کا درس دیتے رہیں گے۔ اس وعدہ کی پابندی کی وجہ سے حضرت مولانا مرحوم رہ اگرچہ لاہور میں ایک سال تک نظر بند ہی تھے مگر آپ نے دو آدمیوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا جن میں سے ایک مولانا عبدالعزیز جو کہ بازار سوہانوالہ میں دکاندار تھے۔ اور دوسرے میاں عبدالرحمن شاہ صاحب تھے جو سرہانوالہ بازار میں ایک مسجد کے امام

تھے۔ یہ دونوں حضرات آپ کے خسر حضرت ابو محمد احمدؑ کے مخلص احباب میں سے تھے۔ اس لئے ان پر اعتماد رکھتے ہوئے آپ نے ان کو ترجمہ پڑھانا شروع کر دیا۔ آپ کی اکثر کوشش ہوتی کہ درس میں کوئی مشتبیہ آدمی نہ آئے تاکہ آپ کے خلاف کوئی رپورٹ نہ ہو۔ اور نہ ہی آپ کے ضامنوں کو زحمتوں سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ بعد ازاں جب آپ کی صداقت، اخوت اسلامی اور کتاب و سنت پر استقامت کے راز لوگوں پر کھلنے لگے۔ تو مخلص احباب کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان دنوں آپ کا مکان "الندوتہ کا کٹڑہ" کی بالائی منزل پر تھا۔ اگرچہ آپ نماز پنجگانہ مسجد لائٹ سبجان خاں میں ادا فرماتے تھے۔ مگر یہاں درس نہیں دیتے تھے۔ درس کا انتظام ان دنوں مستری الہ دتہ کے کٹڑہ کے متصل ایک چھوٹی سی مسجد میں ہوتا تھا۔ یہ مسجد شیرالوالہ دروازہ سے فاروق گنج کو جاتے ہوئے جرنیلی سڑک کے نیچے انکرکروا میں ہاتھ پر واقع ہے۔ جب سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا اور مسجد میں گنجائش نہ رہی تو آپ نے مسجد کی ملحقہ دکانوں کی چھت پر درس دینا شروع کر دیا۔ یہ جگہ سڑک کے اوپر شیرالوالہ دروازہ سے بالکل سامنے تھی۔ لہذا جب شائقین حضرات نے وہاں درس ہوتے دیکھا تو مجمع اور بھی بڑھنے لگا۔ اب آپ کے دل میں سابقہ اندیشہ لاحق ہوا۔ کہ کوئی سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی آپ کے خلاف رپورٹ نہ کر دے اور آپ کے ضامنوں کی ضمانت ضبط نہ ہو جائے۔ لہذا آپ نے اس جگہ درس دینا بند کر دیا اور اب مولانا عبدالحقؒ کی بیٹھک میں درس دینا شروع کر دیا۔ جو ان دنوں اندرون شیرالوالہ دروازہ، نواس محلہ میں مقیم تھے۔ درس کا سلسلہ کافی عرصہ تک وہاں ہی جاری رہا۔

مسجد لائٹ سبجان خاں میں درس کی ابتداء، خیر اکافی عرصہ تک مولانا عبدالحق صاحب کی بیٹھک میں درس ہوتا رہا۔ بعد ازاں درس گاہ کا یہ کمرہ مولانا عبدالحق صاحب کو اپنی ذاتی ضرورت کے لئے استعمال کرنا پڑا۔ لہذا حضرت اقدس نے مولانا موصوف کے اشارے کے بغیر ہی مسجد لائٹ سبجان خاں میں درس دینا شروع کر دیا۔ دراصل یہ مسجد پولیس لائن کی مسجد تھی۔ اس وجہ سے اس مسجد کا نام لائٹ والی مسجد تھا۔ خدا جانے پولیس کے اٹھ جانے کے بعد اس مسجد کی آبادی کا کیا ذریعہ رہا۔ البتہ جب ہمارے حضرت نے اس جگہ درس کا سلسلہ شروع فرمایا تو اس وقت حاجی فضل دین نواس محلہ شیرالوالہ دروازہ حبشہ لائٹ اس مسجد کی ہر طرح خدمت سر انجام دیتے تھے۔ حاجی موصوف ایک صحیح العقیدہ شب بیدار اور متقی شخص تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑا زحیمی۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ان کے دل میں درس قرآن مجید کی عظمت اور حضرت مولانا کی محبت پیدا کر رکھی تھی۔

سلسلہ معاش: حضرت مولانا مرحوم کے خسر حضرت مولانا ابو محمد احمدؑ مدت مدید سے لاہور میں قیام پذیر تھے وہ کشمیر بازار صوفی مسجد مولاداد میں رہا کرتے تھے۔ ان کا ذریعہ معاش طبع ہونے والی کاپیوں کی تصحیح کرنا تھا۔ ان کی زندگی کے تقریباً آخری چالیس سال اسی کام میں گزرے۔ اسی بناء پر لاہور کے کتب فروشوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ چوں کہ وہ ابھی تک روڑ ضلع انبالہ میں نظر بند تھے۔ اور حضرت اقدس کو لاہور میں رہنے پر پابند کیا گیا تھا۔ لہذا آپ نے بھی کاپیوں کی تصحیح کا کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں جب آپ قرآن مجید کی نشر و اشاعت میں زیادہ مصروف ہو گئے۔ اور خدا و عالم نے فتوحات غیبیہ سے رزق پہنچانا شروع کیا تو آپ نے تصحیح کے کام کو ترک فرما دیا۔ اب حضرت والا تبار نے روزانہ متع

بلکہ درس دینا شروع کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ غیب سے رزق پہنچانے رہے۔ (والحمد للہ علیہ ذالک)
پہلے حج بیت اللہ کی نیاری: حوالات اور نظر بندی کے پیہم مصائب برداشت کرنے کے بعد ۱۹۱۶ء میں جب حضرت لاہور میں تشریف لائے تھے تو اسی سال کے آخر یا ۱۹۱۸ء کے ابتدا میں جب حج کا زمانہ آیا۔ تو حضرت اعلیٰ سفر حج کے لئے تیار ہوئے۔ یہ سفر صرف حج کی غرض سے ہی نہ تھا بلکہ آپ نے معتمم ارادہ کر لیا تھا کہ آپ اپنے اہل و عیال سمیت حجاز پاک میں ہجرت کر کے تشریف لے جائیں اور بقیہ زندگی مدینہ الرسول میں ہی گزاریں۔ لہذا آپ نے پاسپورٹ کی تحریر میں اپنے بال بچوں اور اپنے بھائی حکیم رشید احمد کا نام بھی لکھ دیا۔ درخواست کے وقت آپ کے مخلص دوست خواجہ محمد رشید صاحب دائیں مسجد آسٹریلیا بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ نے اس معزز رئیس زادہ کو فرمایا کہ وہ ان کی ہجرت کے ارادے کو کسی پر گاہ نہ کریں۔

تاہم غیبی کا ظہور: جب بدھ کے دن آپ نے حج کے لئے درخواست دی تو آپ کے گھر میں فقط دس روپے تھے مگر کھانے مسبب الاسباب نے اپنی رحمت واسعہ سے ہفتے تک آپ کے پاس انیس صد روپیہ بھیج دیا۔ اس عرصے میں آپ نے کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندے آتے۔ دروازہ کھٹکھٹانے اور کوئی دو سو کوئی چار سو روپے دے کر چلے جاتے۔ گویا بین چار دن کے اندر اندر حضرت کے اہل و عیال کے تمام مصارف حج کی رقم فراہم ہو گئی۔ کیونکہ ان دنوں ایک حاجی کے لئے تقریباً دو سو روپیہ کافی سمجھا جاتا تھا۔

استخارہ: سفر خرمین الشریفین کے بعد حضرت اقدس نے بارگاہ حق تعالیٰ میں بطور استخارہ کے استدعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ اگر اس اختر العباد کا ارض مقدس کو ہجرت کر کے جانا ہر لحاظ سے مفید ہے تو اپنے فضل عظیم سے اعانت فرما۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو اپنے حکم سے روک دے جس دن پاسپورٹ آیا اسی دن آپ تیار ہو گئے۔ ایک بستر باندھ لیا۔ برتن بوری میں ڈال لئے اور بقیہ سامان کچھ تو فروخت کر دیا، اور کچھ ادھر ادھر لوگوں کو دے دیا۔ لیکن مشیت ایزدی کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ حضرت مولانا کا ہجرت کا ارادہ باری تعالیٰ کو منظور نہ تھا۔ عین اسی دن آپ کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہو گئیں۔ اور سفر کے ہرگز قابل نہ رہیں۔ لہذا آپ کے مکرم المقام خسر حضرت محمد احمد مرحوم باقی انزواء و اعزاء کے ہمراہ تشریف لائے۔ اور اپنی صاحبزادی کی حالت کے پیش نظر ان کو ہمراہ نہ لے جانے کے متعلق گفتگو ہوئی۔ اس لئے آپ بال بچوں کو میسر و خدا کر کے تنہا حج پر تشریف لے گئے اور ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور حج کرنے کے بعد بخیر و خوبی واپس تشریف لائے۔

مکرم کی مخالفت: حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ جب سفر حجاز سے مراجعت فرما کر کراچی پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ انگریز مخالفان کا پورے زور سے آغاز ہو چکا تھا۔ امیر امان اللہ کے عرصہ محمول و طرزی انگریزوں کے ساتھ صلح کی گفتگو کرنے کے لئے ہندوستان آئے ہوئے تھے اور ادھر ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کے خلاف مشتعل ہو چکے تھے۔ کیوں کہ فرانسیسی اور انگریزوں نے افواج نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ درحقیقت المسلمین مع اہل و عیال گرفتار ہو چکے تھے۔ اس موقع پر امیر امان اللہ خاں نے مسلمانان ہند کو دعوت دی کہ وہ ہجرت کر کے افغانستان آجائیں۔ چونکہ مسلمان انگریزوں کے خلاف

پہلے ہی سے براہِ رفتہ ہو چکے تھے۔ لہذا انہوں نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا۔ اور ہزاروں کی تعداد میں کارواں درکارواں افغانستان کو روانہ ہونے لگے۔ اگر وہ ہجرت کامیاب ہو جاتی تو اس کے دور رس نتائج حکومت انگلشیہ کے حق میں ضررِ مہلک ثابت ہوتے۔ مگر قیاس چاہتا ہے کہ امیر امان اللہ خاں نے اپنی پیش کردہ شرائط کو منوانے کے لئے انگریزوں کو حفظِ دھمکی دی تھی۔ اور ہجرت کی دعوت کا حربہ استعمال کیا تھا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت: ہم نے جس قدر تحقیق و تفحص سے نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسلمہ حقیقت اپنی پوری تابی سے آجاکر ہو گئی ہے کہ ولایت اپنے ہر درجے میں نبوت سے مستنیر ہوتی ہے۔ حضرت کا جذبہ ہجرت اگر اس سے پیشتر پچھتھنوں کے پیش نظر پورا نہ ہو سکا تو آخر کار آپ کو ہجرت کی سعادت و برکات سے نوازا جانا بھی مقدّر ہو چکا تھا۔

ادھر بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت والا شانِ ہندوستان سے ہجرت کر کے مجاز مقدس کو جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر وہ پورا نہ ہو سکا۔ مگر ہجرت کی فضیلت کے لئے کہ اب آیام آچکے تھے۔ ہندوستان کے مختلف صوبجات سے ہماجرین ہوق درہوق کابل جانے شروع ہو گئے۔ لہذا آپ بھی اپنی تمنا کے مطابق ہمہ تن تیار ہو گئے۔ اس سے پہلے حضرت مولانا عبید اللہ سندھ مرحوم کی معیت میں آپ کے دو چھوٹے بھائی کابل پہنچ چکے تھے۔ حافظ محمد علی صاحب کو امام انقلاب حضرت سندھؒ ہمراہ لے گئے تھے۔ اور مولوی عزیز احمد صاحب کو مولانا سندھؒ نے پہلے ہی مولوی محمد علی قصوری کی معیت میں طیبہ کابل میں حصول تعلیم کے لئے داخل کرا دیا تھا۔

لاہور پنجاب کا اہم القریٰ ہے۔ لہذا مصافحات لاہور سے ہماجرین یہاں اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ اور انہوں حضرت مولانا مرحوم کو اپنا امیر قافلہ منتخب کر لیا۔ پنجاب کے بعض شہروں سے پانچ ہزار روپے کی ایک رقم فراہم کی گئی جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تحویل میں دی گئی۔ اور فیصلہ یہ طے پایا۔ کہ یہ رقم امیر امان اللہ خاں کی خدمت عالیہ میں پیش کی جائے اور یقین کیا جاتا تھا کہ یہ رقم خطہ پنجاب کی طرف سے پہلی قسط تھی جو پیش کی جانے والی تھی۔ جو وقت آنے پر سونے کی میں پیش کی گئی۔

کابل میں داخلہ: کابل میں آپ کے دو چھوٹے بھائی اور حضرت سندھؒ پہلے سے ہی موجود تھے۔ یہ حضرات رحمت خداوندی سے امیر افغانستان کی شاہی کوٹھی عین الامارۃ میں رہا کرتے تھے۔ یہ جگہ شہزادگی کے زمانے میں مکرم المقام جناب امیر صاحب کی قیام گاہ تھی۔ تخت نشینی کے بعد انہوں نے یہ شاہی قیام گاہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھؒ کی تحویل میں دے دی۔ چون کہ حضرت مرحوم کے قافلے کے بہت سے آدمی آپ سے پہلے کابل پہنچ گئے تھے۔ لہذا آپ کے بھائی کو آپ کی آمد کی اطلاع ہو چکی تھی۔ انہوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آپ کے لئے ایک کشادہ مکان کرایہ پر لے لیا۔ آپ نے کابل میں قدم ریزہ فرماتے ہی اس مکان میں رہنا شروع کر دیا۔ یہ مکان جڑا وسیع تھا۔ لہذا آپ نے شیخ میراں بخش صاحب اور میراں عبداللہ صاحب کو بھی اپنے ساتھ رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت الورا بالائی منزل میں مقیم تھے۔ اور دونوں حضرات اپنے اہل و عیال سمیت نچلے صے میں آباد تھے۔

حضرت قطب الاقطاب کا پشاور میں ورو مسعود پشاور سے دہلی میں کے فاصلے پر گورنمنٹ نے ایک فوجی افسر مقرر کیا ہوا تھا جو کہ واپس آئے والے مہاجرین کی سرسری دیکھ بھال کر کے ان کو پشاور بھیج دیتا تھا لہذا جب حضرت مولانا حدود ہند میں تشریف لائے تو آپ کے رفقاء سفر کو حکم ہوا کہ تمام مہاجرین اور عورتیں تانگوں میں بٹھریں پھریں پولیس نے تمام مردوں کے نام لپچھے شروع کئے جب حضرت اقدس سے نام پوچھا تو آپ پر سوال کیا گیا کہ کیا آپ مولانا عبد اللہ سندھی کے رشتہ دار ہیں جس کا آپ نے اثبات میں جواب دیا اس کے بعد آپ کو پشاور بھیج دیا گیا آپ دیگر مہاجرین کے ہمراہ ایک سرائے میں ٹھہرائے گئے اور اگلے دن صبح آپ کو ایک انگریز افسر کے سامنے پیش کیا گیا اس نے حضرت انور کو بغور دیکھا اور پوچھا کہ آپ مولانا عبد اللہ سندھی کے عزیز ہیں آپ نے فرمایا کہ ہاں میں حضرت مولانا سندھی کا عزیز ہوں بعد ازاں آپ کو سرائے میں بھیج دیا گیا سرائے میں دو تین دن کے قیام کے بعد آپ کو لاہور کا ملکٹ دیا گیا اور آپ تقریباً ۱۹۲۰ء کی ابتدا میں مع اہل وعیال لاہور میں رونق افروز ہوئے آتے ہی درس قرآن مجید شروع کر دیا اور انجمن خدام الدین کی بنیاد رکھی۔

انجمن خدام الدین کا قیام حضرت والا تیار نے بفضل ایز و امتثال درس قرآن مجید کا سلسلہ نہایت مخلص و اہمک سے شروع کر دیا تھا ایک دن درس کے بعد علم فیروز الدین صاحب حاضرین سے مخاطب ہو کر فرماتے تھے کہ آپ حضرت مولانا سے اشاعت قرآن کی اہمیت کے متعلق ہمیشہ سنتے ہی رہتے ہیں لہذا آپ لوگوں کی خدمت میں اتنا سہ ہے کہ ہم لوگ اس کا ریکر کے لئے کوئی منظم طریقہ پر اقدام کریں تاکہ اس کے اثرات دور رس ہوں اس وقت حاضرین نے ایک انجمن کی تشکیل کا فیصلہ کیا اور حضرت اقدس کی تجویز پر انجمن کا نام "انجمن خدام الدین" رکھا گیا اس تجویز کے بعد حضرت مولانا نے ایک دن چند احباب کرام کو انجمن نے انجمن کے لئے دینی خدمات پیش کرنے کا وعدہ فرمایا تھا دعوت دی لہذا حضرت مولانا ابو محمد احمد شاگرد رشید حضرت مولانا رشید احمد گلوٹی اور شیخ الہند محمد واجن حضرت مولانا نجم الدین جو کہ حضرت مولانا کے استاد و کرم تھے اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد عزیز تھے اور مولانا فضل الحق جو حضرت منیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے اس مجلس میں علاوہ باقی حضرات کے شامل ہوئے۔

انتخاب امیر جب ان سید و جوی پر مشتمل انجمن کا پہلا اجلاس شروع ہوا تو تجویز پیش ہوئی کہ انجمن کے کاروبار کی تعمیل کے لئے کوئی امیر انجمن ہونا چاہیے اور حضرت مولانا مرحوم نے اس موقع پر وضاحت فرمادی کہ صدر اور امیر میں ایک نمایاں فرق ہوگا صدر مجلس منتظمہ کی نواہر کو اپنی سرکشی میں علی جامہ پہنانے کا ذمہ دار ہوگا اور مجلس منتظمہ جو فیصلہ کرے صدر کے لئے اس کی پابندی لازمی ہوگی صدارت کی صورت میں ممکن ہے کہ انجمن کے اراکین میں پارٹی بازی کا غلط احساس پیدا ہوا اور کام میں رکاوٹ پیدا ہو اس کے برعکس امیر مجلس منتظمہ سے ضرور مشورہ لے گا لیکن مشورہ کے بعد اگر وہ انجمن کے مفاد کے پیش نظر منتظمہ کی رائے کو مسترد کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اس طرح دونوں اجواب خلافت کا روبرو کے نفوذ و اثر میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتے اور امیر اپنے کام کو مسلسل چلا سکتا ہے چنانچہ تمام اراکین انجمن نے حضرت مولانا کی اس رائے سے اتفاق کیا حضرت مولانا نے اس موقع پر اراکین کے منصب جلیلہ کے اوصاف بھی مختصر آئینہ قرآن سے اب تمام حضرات نے مل کر امیر کے انتخاب پر رجوع فرمایا اور تمام نے یک زبان حضرت مولانا مرحوم کے نام نامی اور اسم گرامی پر اتفاق کیا حضرت خدا کا برکات موجودگی میں اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں میں ایسے اصحاب موجود ہیں جن کو میرے استاد ہونے کی فضیلت حاصل ہے لہذا ان کا انتخاب ان پر ڈالنا چاہئے لیکن اس کے باوجود تمام حاضرین منحل حضرت مولانا مرحوم کے انتخاب پر مجبور ہوئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ اکابر میں سے بعض نے حضرت مولانا کے انکار پر اظہارِ الہامی فرمایا اس وقت حضرت اپنے بزرگوں کا حکم سمجھ کر تعمیل ارشاد پر راضی ہو گئے اس طرح اتفاق رائے سے آپ کو امیر انجمن مقرر کیا گیا حضرت مولانا

فضل الحق ناظم خواجہ محمد رشید صاحب دہلی اسٹریٹیا مسجد والے خزانچی مقرر ہوئے۔ اس بابر گت کاروائی کے بعد اجلاس برخاست ہوا۔

قرآن حکیم کے دو درس: حضرت اقدس نے جہاں تمام اوقات شبانہ روز شاعت کتاب و سنت کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ وہ دن میں دو دفعہ قرآن حمید کا درس دینا شروع فرمایا۔ ہر روز نماز فجر کے تقریباً پون گھنٹہ بعد ایک عام درس قرآن مجید ہونے لگا۔ جس کو آپ تمام والیسیں بھیجائے رکھا۔ دوسرا درس تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں گریجویٹ ملازمین دفاتر اور کالج کے طلباء شامل تھے۔ اعلیٰ اس درس کو پچیس سال تک بنفس نفیس چلاتے رہے۔ بعد ازاں دس سال تک آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ اس پر آپ کی بجائے نہایت محنت پڑوہی سے کام کرتے رہے اور حضرت مولانا صرف صبح کا درس ہی دیتے رہے اور حافظ حبیب اللہ کے بعد حضرت کی تک حضرت مولانا عبداللہ انور پڑھاتے رہے۔

مدرسہ قاسم العلوم کا اجراء: انجمن خدام الدین کی تشکیل و تعمیر کے بعد ایک عربی مدرسہ کے اہرام کی تجویز پیش ہوئی۔ اس پر ہر طرف اتفاق و نائید کی آوازیں بلند ہوئیں۔ المختصر بفضل ایبڑوی مدرسہ جاری ہو گیا اور اس کا نام قاسم العلوم رکھا گیا۔ متعلقین کی رہائش کے لئے پاس کوئی بچہ نہ تھی لہذا اندرون شیرالواہ دروازہ نواں محلہ کے باہر لب بازار ایک مکان کرایہ پر لیا گیا۔ طلبہ کی رہائش کے لئے اس جگہ کو مہیا کیا اور اسباق کا انتظام مسجد لائے سبحان خاں میں کیا گیا۔ عربی کے تمام طلبہ کے علاوہ فارغ التحصیل علماء کرام بھی قرآن حکیم کی تفسیر پڑھنے کے ہونے لگے۔ اب حضرت مولانا والا جاقہ بین ماہ میں مکمل قرآن عزیز کا ترجمہ مع ربط آیات، روکعات کا خلاصہ اور باقی ضروری موضوعات و عنوانات اور ان پر سیر حاصل روشنی ڈالنا شامل درس کر کے ختم فرماتے تھے اس لئے بفضل خدا تعالیٰ تمام ہندوستان کے متذاولہ مدارس بالخصوص دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ شاہی مراد آباد کے فارغ التحصیل علماء کی جماعتیں آنے لگیں۔ یہ لوگ یکسر ان ذلیفہ کے انجمن قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے تھے۔ ان کی خوراک اور رہائش کا انتظام انجمن خدام الدین کے ذمہ ہوتا تھا۔ علماء کرام کا یہ حق اعلیٰ نے زندگی کے آخری رمضان المبارک تک جاری رکھا۔ ۱۷ رمضان ۱۳۸۳ھ کو جب حضرت شیخ التفسیر عالم جاوادی کو سدھارے تو انھوں نے میں باہر سے آئے ہوئے علماء کی ایک معتبر جماعت شامل تھی را کیا یہ ہونے والے علماء کو مطبوعہ اسناد و مرحمت کی جاتی تھیں۔ ان کی سنانے پر مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا انور شاہ مرحوم اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے دستخط ثبت ہوتے تھے۔ تمام اطراف سے اور پھر ہندوستان کے علماء کرام سہ فرخت حاصل کر کے جا چکے ہیں۔ اور اب حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب جانشین حضرت شیخ التفسیر عالم جاوادی کے مبارک و مسو طریق پر عام درس کے علاوہ علماء کرام کے درس کا اہتمام بھی کر رہے ہیں۔

کے مبارک دستوں میں پرچہ اودھ کے صدر دار کا کلام اور اس کے لئے مکان کرایہ پر لیا جاتا تھا جس سے سخت مشکلات
در رسہ قاسم العلوم کی عمارت: علماء کرام کی جماعت کی رہائش کے لئے مکان کرایہ پر لیا جاتا تھا جس سے سخت مشکلات
پڑتا تھا۔ اس ضرورت کے پیش نظر انجن نے ایک اپنا مدرسہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ لائن سبحان خاں میں ایک قطعہ اراضی خرید کر
قاسم العلوم کی عمارت تعمیر کی گئی۔ تعمیر عمارت کے بعد حضرت رئیس المفسرین مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کو تشریف لانے کی دعوت دی۔ آ
تشریف لائے اور اپنے دست باعید سے مدرسے کا قفل کھولا۔ مدرسہ کی اوپنچے کی منزلوں میں قرآن حمید کے نسخے رکھ دیئے گئے۔
نے مل کر قرآن پاک کی تلاوت کی اور حضرت مولانا عثمانی مرحوم بھی بڑی دیر تک تلاوت فرماتے رہے۔ بعد ازاں علماء کرام کی جماعت
سوی مدرسہ میں گنا جاتا ہے۔ مطبع کا انتظام بھی اسی جگہ ہوتا ہے۔

قیام گاہ : تفصیلاً گزارش ہے کہ جب حضرت مولانا کا قافلہ کابل میں پہنچا۔ تو سب سے پہلے ایک عید گاہ میں ٹھہرے یہ عید گاہ مسقف تھی۔ ان کی آمد سے پیشتر بھی مہاجرین یہاں موجود تھے انہوں نے حضرت مولانا اور باقی اہل قافلہ کو یہ شش کن اطلاع دی کہ یہاں مہاجرین نہایت کس میسر کی حالت میں ہیں۔ حکومت افغانستان نہایت بے اعتنائی سے کام لے رہی ہے۔ مہاجر حضرات جو اپنے ہمراہ نان و نفقہ لائے تھے ختم کر چکے ہیں۔ اب ان کے پاس نہ کھانے کا سامان ہے اور نہ ہی واپس جانے کے لئے گریہ ہے۔ انانہ نے حضرت مولانا مرحوم کو ان حالات سے مطلع کرنے کے بعد واپس جانے کی اجازت طلب کی حضرت نے اس عجلت سے ان کو باز رکھنے کے لئے بڑا سمجھا یا بچھا یا۔ مگر وہ پھر بھی واپس جانے پر مصر ہی رہے۔

مہاجرین اور حکومت افغانستان کا فیصلہ : حکومت افغانستان نے فیصلہ کیا کہ مہاجرین کو افغانستان کے مختلف صوبوں میں آباد کیا جائے۔ کاشت کاری کے لئے زمین دی جائے تاکہ لوگ مستقبل میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائیں اور حکومت پر بھی بوجھ نہ بنیں۔ فیصلہ ہے کہ فیصلہ والشمادی اور مروت کے جذبات کا حامل تھا کیونکہ حکومت اپنے خزانہ عامرہ سے ہزار مہاجرین کی ضروریات زندگی کی کفالت میں کر سکتی تھی۔ لہذا حکومت نے مہاجرین کو ضلع کابل کے مختلف مقامات پر منتقل کر دیا۔

ادھر مہاجرین میں ایسے افراد موجود تھے جو زراعت کے تصور سے بھی نفرت تھے۔ لہذا وہ اس طرح کی زندگی کو اختیار کرنے کے لئے تیار تھے۔ جب ان کو مختلف مقامات پر گئے ہوئے چند دن گزرے اور ان کی خورد و نوش کا سامان ختم ہونے لگا تو ان کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا۔ ہندوستان کی شہری آبادی کے لوگ بھلا کاشت کاری جیسی کٹھن محنت پر وہی میں کب زندگی بسر کر سکتے تھے اور ادھر افغانستان کی برائی آب و ہوا ان کی جنتوں کی حرکت کو سرور کرنے کے لئے کافی تھی۔

مہاجرین کی بے بسی کا عالم : مہاجرین میں اکثر اپنے آبائی پیشے کے لحاظ سے کاشت کاری سے بالکل نا ابلد تھے ان شہری باشندوں کو بھلا کاشت کاری سے لگاؤ بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں سردی کی شدت کی وجہ سے مرنے لگے مرنے والوں کے لئے کفن تک مہیا کرنا ان کے مشکل تھا۔ خان آباد مہاجرین کی بستی سے تین دن کی مسافت پر تھا اور ادھر افسردہ کی بے اعتنائی بھی اس محبت میں جلتی پر تیل کا کاکا کر رہی تھی۔ لہذا بعض اوقات چھچھ دن تک لاشے بے گور و کفن پڑے رہتے تھے۔

ڈاک، مٹی، آؤر ز اور دیگر رسل و رسائل کا کام نہایت غیر یقینی تھا جس سے مشکلات میں اور بھی اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار لوگ افغان و غیر افغان قافلے کی صورت میں کابل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان دنوں حکومت افغانستان اور برطانیہ کے درمیان معاہدہ ہو گیا جس کی ضروری شرط یہ بھی تھی کہ مہاجرین کو دوبارہ ہندوستان بھیجا جائے مہاجرین نے اس مشرہ حیا بخش پر ہزار مسرت سے ہندوستان واپس جانا منظور کر لیا۔

حضرت کی کابل سے واپسی : اگرچہ حضرت مولانا مرحوم کے دو چھوٹے بھائی اور عم محترم حضرت مندھی افغانستان میں موجود تھے اور ان کی موجودگی میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا وہاں رہنا چندان دشوار نہیں تھا مگر حضرت مندھی نے حکومت کے رویہ کو بھانپ کر اور اپنے استغنا کے پیش نظر حضرت کو ہندوستان واپس جانے کے متعلق ارشاد فرما دیا۔ اس لئے حضرت اقدس یہ اشارہ پاتے ہی ہندوستان واپس تشریف لے آئے۔ ہم کو حضرت کی ہر نصیحت کے متعلق چندان حالات نہیں مل سکے۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ حضرت نے اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد علی صاحب کو یا غسان بھیج دیا اور اپنے برادر عزیز رشید احمد صاحب کو اپنے ہمراہ لاہور واپس لے آئے۔

سیدنا شیخ احمد تانی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ: شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کا ذکر جبر ہے۔ جن کی شخصیت پر حضرت لاہوریؒ کو بہت ناز تھا۔ لاہور کی فضائیں اور انسانی سمائیں اس حقیقت کی گواہ ہیں۔ کہ جب کبھی حضرت شیخ التفسیر کی زبان مبارک پر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی آتا تو آپ کا چہرہ فرط عقیدت سے تنمنا اٹھتا۔ آنکھوں میں ایک تہوار چمک ہوتی اور آپ کے ضعیف رگ و پے میں حریت فکر و عمل کی ایک بجلی دوڑنے لگتی۔ حضرت لاہوری نے حریت کا درس اقبالین حضرت سندھیؒ اور حضرت شیخ الہند سے پڑھا تھا۔ اور مکتب حریت میں آپ کے حضرت مدنیؒ کے ہم سہار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت کے وقت انڈین نیشنل کانگریس مسلم لیگ، احرار اور جمعیتہ علماء ہند سیار اور مذہبی جماعتیں تھیں۔ جو اپنے اپنے صوابدید کے مطابق آزادی ہند کا کام کر رہی تھیں۔ حضرت مدنیؒ کی صدارت سے لے کر آپ کی وفات تک کے حالات اگر دیکھتے مقصود ہوں تو علماء حق کتاب سمہ اول و دوم کے کم از کم ۳۸۰ صفحات کا مطالعہ کیے تاکہ آپ پر واضح ہو سکے کہ اس شیر پختہ حریت اور دور ماضی کے قائد انقلاب نے ہندوستان کی سر زمین میں مکمل پیکر اسلام بنی کن کن ابراہیمی اور اسماعیلی کا ناموں کو سر انجام دیا۔ اور حضرت لاہوریؒ اور آپ کے باقی رفقاء کار نے ان میں کیا کیا حصہ لیا۔ میں جبکہ دوسری عالمگیر جنگ میں ہندوستانوں کی شرکت کا سوال پیدا ہوا۔ اور حضرت مدنیؒ کی صدارت میں ۲۹-۳۰ ستمبر ۱۹۴۵ء اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا تھا۔ کہ انگریزوں کی مدد کے لئے کوئی وجہ جواز نظر نہیں تو اس وقت علماء کرام نے اپنے اپنے فیصلے کو نافذ کر کے ذریعہ اعلان کرنا شروع کیا۔ تو علماء کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ ان میں حضرت شیخ التفسیر کا نام خاص سر فہرست ہے اور الفاظ یہ ہیں "حضرت مولانا محمد علی صاحب امیر انجمن خدام الدین لاہور، جو تفسیر و ترجمہ قرآن کے دربار میں غیر فانی شہرت کے مالک ہیں۔ اور جن کے تلامذہ اور متبعین میں کثرت اور جو تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہزاروں علماء بھی متجاوز ہے۔" (کتاب علماء حق حصہ دوم صفحہ ۵۷)

تحریک خاکساراں، حق و صداقت کی تائید حریت و جہاد کی جان ہے۔ ہر شخص اس مجاہدانہ اقدام کی جرات نہیں رکھتا۔ لیکن ان صداقت کی تائید جو مخالفت پارٹی میں پائی جاوے یعنی پیغمبرانہ فعل کے مشابہ ہے۔ اپنوں کی مدحت سرائی لاہوں کا شیوہ ہے مگر لال میں شاید ایک آدھ زبان ہوگی جس سے مخالفت کی خوبی کی تحسین نکل سکتی ہو۔ بڑے بڑے جبہ پوش فرقہ پرستی کو اپنا امتیازی نشان لے بیٹھے ہیں۔ اخبار کے حسین کی تشریف اس مسلک میں حرام ہے۔ اور اپنے پیڑ کی قصیدہ خوانی ثواب ہے مگر اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی ہے خلق خدا میں ایسے انسان بھی فی امت تک موجود رہیں گے جو دشمن کی زبان سے نکلے ہوئے کلمہ تیر کو کلمہ تیر ہی کہیں گے اور دوسری برائی کو برائی سے ہی تعبیر کریں گے۔

خاکسار تحریک کا بانی علامہ غایت اللہ مشرقی دماغی قوتوں کے اعتبار سے ایک بے نظیر شخصیت کا حامل تھا لہذا اس کی حاملہ بھی کا زمانہ انتہا درجے کی ناموری اور جاہ و بیت رکھتا ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے مسٹر عثمان اللہ مشرقی کو علامہ بننے پر آمادہ کیا اور آخر کار صاحب کو مذہبی رہنما کی کا شوق پیدا ہوا۔ نیز مذکورہ ادا شدہ شاد و غیرہ تصانیف لکھیں۔ مولوی کا غلط مذہب بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ علامہ حق نے اس تعلی امیر روش پر نظر غار ڈالی تو دین حق کی توہین و تحقیر کی صورت سامنے آئی۔ اخبارات اور رسائل اور عام قلوب میں علامہ صاحب کی بیباکی کے تذکرے ہونے لگے۔ جہاں باقی علمائے ملت نے علامہ کی حق ترانیوں اور انما الموجد ولا غیر کے نعروں کا کاف کی وہاں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس قلیل قیادت کی چیرہ دستیوں سے عوام کو آگاہ کیا اور ایک چھوٹا سا رسالہ جس میں

میں چھپوایا۔

حضرت شیخ التفسیرؒ کی زندگی کا یہ واقعہ اور پھر اس دورِ تعصب و فتن میں اس بے لاگ تائید حق کی مثال شاید کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔ آپ علامہ مشرقی کی روش کی شکایت تو کرتے تھے۔ مگر ان کے بھولے بھالے رضا کاروں کی موت کو شہادت اور ان کی زندگی کو عبادتِ زندگی سے تعبیر کرتے تھے۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اس مبارک زندگی کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنائیں۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ ہر لحاظ سے قابلِ بیان ہے کہ حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی نے جن کی اسلامی سرگرمیوں میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی عجز و بانہ جھلکیں نظر آتی ہیں (سرحد میں ایک جگہ سنا) انتظام کر دیا۔ اس جلسے میں اس وقت کے مقتدر علماء و کرام نے شرکت کی۔ علامہ کی مجلس مشاورت میں یہ بات کا فی و بیک جاری ہوئی کہ علامہ مشرقی کے مخالفانہ رویہ کی تردید کسی ذمہ ڈالی جائے۔ آخر کار نام علماء نے متفقہ طور پر فیصلہ دیا کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب اس جرات مندانہ کام کی تکمیل کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ لہذا آپ نے اسٹیج پر تشریف لاکر ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں تذکرہ پیکر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ ان دونوں میں سے کسی کی پیروی کریں گے۔

حاضرین نے کہا کہ ہم قرآن مجید کی پیروی کریں گے۔ بعد ازاں آپ نے تذکرے کی چند عبارات پڑھ کر کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی تردید کی۔ حاضرین جلسہ آپ کی ایمان افروز تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سرحد کے اکثر لوگ علامہ صاحب کی جماعت سے نکل گئے۔

تحول بالہ واقعات کے باوجود احقر نے حضرت مولانا عبید اللہ انور صاحب سے سنا ہے کہ علامہ مشرقی کئی دفعہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجدِ شریفہ لاہور میں تشریف لائے اور میرے سامنے صاف اقرار فرماتے تھے کہ مولانا! میں آپ کا مخالفت نہیں ہوں بلکہ علامہ اسود کا مخالفت ہوں! اس رجوع و انابت کے پیش نظر ہم خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضلِ عظیم سے ہمارے محترم بھائی کی فروگزاشتوں سے درگزر کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ مرحمت فرمائے۔

جہاں کشمیر، قیام پاکستان کے فوراً بعد کشمیر میں بعض وجوہات پر جنگ چھڑ گئی۔ کشمیر کی اس صورتِ حال کو مکتب فکر (SCHOOL OF THOUGHTS) کے رہنماؤں نے جہاد کا نام دیا۔

لاہور کے اہم القریٰ سے جو آواز بلند ہوتی ہے وہ ملک کے گوشے گوشے میں زندگی بن کر پھیل جاتی ہے حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ اس جنگ کو جہادِ اسلام کے نام سے تعبیر فرمایا اور نہایت مجاہدانہ مستعدی سے اس میں حصہ لیا۔ کئی دفعہ روپے پکڑے اور باقی ضروریات کی چیزیں مجاہدین کشمیر کے لئے فراہم کی گئیں اور لاہور ہی میں کشمیری ہائندوں کے حوالے کی گئیں۔ روزانہ درس قرآن مجید جمعہ کا تدارک اور باقی مختلف مقامات پر ریزولیشنوں اور تقریروں کے ذریعہ حضرت مرحوم نے مسلمانانِ پاکستان کو اس اسلامی جہاد کی ترغیب دلائی۔ اندازاً دس ہزار کی ایک رقم خطیر لے کر خود لاہور پہنچ گئے اور یہ رقم کشمیر کے پہلے صدر سردار ابراہیم صاحب کے حوالے کی اس مبارک ستم میں آپ کے ہمراہ آپ کے صاحبزادے قاری عبید اللہ انور صاحب بھی موجود تھے۔

راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ کترین۔ جب اپنے اُنارے روحانی کولاہور میں مجاہدین کشمیر کی امداد کے لئے رات دن کام کرتے دیکھا تو بے گناہ غصہ و آلام میں جا کر اپنے اسباب سے مشورہ کیا تو انہوں نے نہایت سرگرمی سے جنگی چیک کی فراہمی شروع کر دی۔ پہلی دفعہ بیارہ سو تھوڑے کچھ

جب کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق خدام الدین کے دفتر میں مفتی سلطان احمد کے پاس جمع کرایا گیا۔ اور ان کی رسیدات اب تک کثرت کے پاس موجود ہیں۔ دوسری دفعہ جب کثرت نے اپنے گاؤں میں واپس گیا۔ تو انہی احباب کے مشورے سے کپڑوں کی فراہمی کا کام شروع کیا گیا۔ تمام کپڑوں کا وزن ساڑھے پانچ من تھا۔ ان کو تنکا داڑھیشن کے راستے لاہور پہنچایا اور حضرت کے ارشاد گرامی کے مطابق وہاں سے ہی کشمیر بھیجے گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام محترم حضرات کی کوششوں کو خوش فہم قبولیت عطا فرمائے۔

انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی:- سر زمین ہند میں اسلامی اقدار کو ملیا میٹ کیا جا رہا تھا۔ اور مغربی تعلیم و تہذیب کو اہل ہند نے اپنانے میں ایک دوسرے سے پیش قدمی کرنے کی مٹھان رکھی تھی۔ ہندو لوگ جن کی سرشت میں غلامی کی نحوہ گھر چکی تھی۔ تانہ ان منلیہ کے زوال کے بعد اپنے نئے دیوتاؤں (انگریز لوگ) کے جان و دل سے بھاری بن چکے تھے۔ اور ان کی نظروں میں اپنا وقار بڑھ رہا تھا۔ اور ادھر فرنگی لوگ اپنی سلطنت کا استحکام اور دوام اسی حکمت عملی میں دیکھ رہے تھے۔ کہ ہندوستانیوں کے تہذیب و تمدن بلکہ مذہب کو بھی ختم کیا جائے۔

چونکہ ہندو ازم فطرت کے اصولوں کے خلاف چند ایک من گھڑت تقورات کا نام ہے۔ لہذا ہندوؤں کے لئے مذہب فروشی کا سودا بڑا منفعیت بخش ثابت ہوا۔ مگر اس کے برعکس مسلمانوں کو اس قدم میں بڑا حصار نظر آیا۔ عجمان مذہب و ملت افراد قوم کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی حفاظت کی تاکید فرمائی۔ علامہ اقبال مرحوم جو اپنے دل میں مذہب اسلام کی بقا کے لئے ایک بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ مختلف طریقے سے باقی ناصحان ملت کے ساتھ مسلمانوں کی ناؤ کو گر داب بلائے کی کوشش کرتے رہے مذہب کے عنوان سے تین اشعار لکھے۔ اور مسلمانوں کو حفاظت مذہب کا پیغام دیا۔

مذہب

اپنی ملت پر قیاس اتوا م مخریہ ذکر خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تہری

دامن دیں ہاتھ سے چھڑا تو جمعیت کہاں اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

خیر! علماء و علماء عام مسلمان بھی انگریزی تہذیب سے اکثر نفوذ تھے مگر زمانے کا تقاضا تھا کہ اس غلامی کے دور میں مسلمان ہند بھی ہندوؤں کے روش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہوں۔ لہذا ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سر سید مرحوم نے یہ مسئلہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور ان کی شانہ و شوکت دشمنوں نے عام مسلمانوں کے رجحان کو بدل دیا۔ پتیا بنگال، پنجاب اور سرحد میں انگریز تعلیم کا عام چرچا ہو گیا۔ اس وقت پنجاب میں انجمن حمایت اسلام نے مسلمانوں کی بیداری اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق تعلیم و تربیت دینے کا بیڑا اٹھایا۔ اس موقع پر ہمارے آقا نے روحانی حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی انجمن حمایت اسلام کی بکارت قبول فرمائی حضرت اقدس کا روگھٹا روگھٹا انگریزی تہذیب و تمدن کے خلاف تھا۔ مگر حالات زمانہ کے اقتضا کے مطابق آپ ان کے لئے تھے کہ ہم چاہتے ہیں کہ جہاں ہندو اور سکھ ڈاکٹر موجود ہوں وہاں مسلمان نوجوان بھی ایم۔ بی۔ ایس (M.B.B.S) کی اعزازی ڈگری سے سرفراز ہوں اگر ہندو وکیل عدالتوں میں جج کے عہدے سنبھال لیں تو مسلمان بھی ان کے مقابلے میں دستاویز فیصلت بہن کرکھڑے ہوں۔

انفصاء آپ انجمن حمایت اسلام کے ہیڈ کوارٹرز پریذیڈنٹ (VICE PRESIDENT) رہے۔ دینی مشاغل کی کثرت پر آپ اس انجمن کی صدارت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور کئی دفینا نائب صدر کے عہدے سے استعفیٰ بھی پیش کیا مگر آپ انھیں لے کر آپ کے وجود مسعود کی برکات سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے۔ لہذا آپ لاہور کے تقریباً سارے قیام میں اس عہدے پر فرائض ادا کرتے رہے۔

اس جگہ پر یہ واقعہ بھی ضرور قابل ذکر ہے کہ آپ انجمن حمایت اسلام میں کسی مرزائی کی شمولیت کو شرعاً ناجائز سمجھتے تھے اور اس لیے مجلس شوریٰ میں بحث و تجویز بھی ہوئی۔ اور آخر کار حضرت گاجی صاحب علی اور بے باک صدارت غالب آئی۔ اور ایک عجیب نے اس بحث کو اپنے پراسرار انداز میں ختم کر دیا اور بعد ازاں مرزائیوں کو اس انجمن میں قدم رکھنے کا موقع نہ ملا۔ ایک دن جب انہوں کی کثرت کے متعلق بحث ہوئی تھی تو مرزا یعقوب محفل سے اٹھا اور بیٹھوں پر سے نیچے جا رہا تھا تو اس پر اچانک فوج کا حملہ ہوا اور بیٹھوں پر ہی گر گیا اور کچھ عرصہ بعد اس عارضہ سے وہابی ملک عدم ہوا۔

لیکن انجمن خیرنگ کالج: ۱۹۳۱ء کے شروع میں میکین انجینئرنگ کالج لاہور کے انگریز پرنسپل نے رسول انس و جان صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں زبان تشیع و دزدکی مسلمان طالب علموں نے اس انجمن الناس کی حرکت ناروا کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ مگر ان کی نفی سے بھری ہوئی آواز صدا بھرا ہو کر رہ گئی۔ آخر کار انہوں نے ہڑتال کر دی۔ اب شہر کی آبادی دو گروہوں میں تقسیم ہونے لگی۔ ہندو اسکول اور عیسائیوں نے پرنسپل کی حمایت شروع کر دی اور جب اس واقعہ کی خبر جابگیر حضرت شیخ الغفر رحمة اللہ علیہ ہوئی تو آپ فوراً میدان عمل میں کود پڑے اور طلبہ کی حمایت کا بانگ دہل اعلان کر دیا۔

علامہ اقبال مرحوم نے بھی طالب علموں کی پورے زور سے پشت پناہی فرمائی۔ اس وقت کے اقتضا کے مطابق ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور اس واقعہ نے تمام شہر میں ایک نمایاں تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ حضرت مولانا مرحوم اور آپ کے رفقاء کے کارناموں سے تمام مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس وقت اگرچہ حضرت رحمة اللہ علیہ کو گرفتار کیا گیا۔ مگر آپ کی گرفتاری عوام کی جذبات پر جلنے کا کام نہ کر گئی۔ آخر کار بفضل ایزد تعالیٰ ارباب حکومت کو اپنی خباثت سے تاب ہونا پڑا طلبہ کو نہایت عزت سے رہا کر دیا گیا اور حضرت رحمة اللہ علیہ اور باقی گرفتار شدگان کو رہا کیا گیا۔

کریک مرزا ایسٹ: تحریک مرزا ایسٹ پر قلم اٹھانے سے پیشتر فرنگی حکومت کی شاطرانہ روش کی طرف چند اشارات کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جنگ پلاسی اور بکسر میں مسلمان ہند کی شکست اور میسور کی چوتھی لڑائی میں سلطان شہید کی مجاہدانہ اور سرفروشاہ کو شہر کا ناک و خون کی نذر ہو کر رہ جانا دراصل غلامی کی ایک پوری تاریک صدی کا پیش خیمہ تھا۔ لارڈ ولزلی کے سفار کا نہ عزائم نے خونِ مسلم کی حرارت کو برسوں تک ٹھنڈا کرنے کے لئے سب سڈی ایمری سسٹم (SUBSIDIARY SYSTEM) جاری کیا جس کی رو سے مسلم اور ہندو حکمران طاقتوں کو یکے بعد دیگرے بے دست و پا کر دیا۔ ۱۸۵۷ء میں زیر دام ہندوں کی طرح اہل ہند نے آزادی وطن کی ایک ناتمام سی کوشش کی۔ مگر اس جنبش نے حال کے حلقوں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اور اب فرنگی شکاری ہند کے لئے چونکا ہوا کمر سوچنے لگا کہ آئندہ اس بران قفس کو غلامی کی ذلت کے احساس سے کسی نہ کسی طرح محروم کر دیا جائے

اس نے نفس کی تیلیاں طلائی اور فراقی تیار کیں۔ اور مستند پار سے چھیلوں کے گدے لاکھ بچروں کے ارد گرد ڈھیر لگا دیئے۔ دہ بزدلے جن کو کئی دنوں سے ایک حربہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ شکاری کے رحم و کرم پر اپنی اسیری کے دن بسر کرنے لگے۔ اس پرفتن سامری وقت نے جذبہ آزادی کو ختم کرنے کے لئے اہل قفس پر ایک خاص انداز میں داد و دہش کی بارش شروع کر دی۔ اس موقع پر نابض اقوام علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اہل ہند کو انگریزوں کی پُر فریب چال سے آسو بہا بہا کر آگاہ فرما گئے اور کہا کہ: سہ

آبتاؤں تجھ کو رمز آیتِ اٹا اٹلو کٹ
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
جا دوئے محمود کی تاثیر سے چشم آواز
دیو استبداد ہے نیلی قبا میں پائے کوب
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
اس سراب رنگ دیو کو گلستاں سمجھا ہے تو
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادو گری
پھر سلا دینی ہے اس کو حکمران کی ساحری
دیکھتی ہے حلقہ دگر دن میں ساز و لبری
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
آہ! اے ناداں قفس کو آشتیاں سمجھا ہے تو

انگریز محکوم ہندوستانیوں کو ظاہر مراعات دے رہے تھے لیکن درحقیقت ان کے دگ ویلے سے جذبہ حیثیت اور احساس برتہ نکال رہے تھے۔ ہندوؤں کو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ ملازمتوں کی چھکیوں سے شکار مسلمانوں کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں انتشار و فساد پیدا کرنے کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ جہاں باقی ہزاروں فریب کاریوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں بگاڑ پیدا کیا گیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے ذریعے نئی نبوت کا دروازہ بھی کھول دیا گیا ختم نبوت کا عقیدہ اسلامیہ عالم کی مرکزیت کا راز دار ہے۔ چودہ سو برس سے تمام کلمہ گو حضرات اس پر متفق ہیں۔ اب اجرائے نبوت کے اعلان سے ملت بیضا کے دامن کو پارہ پارہ کرنے کو کسی کی گئی۔ چونکہ اس نبوت کو برطانیہ کی حمایت حاصل تھی۔ لہذا مسلمانوں کی پوری مخالفت کے باوجود بھی اس جماعت کو ہمیشہ سے کاہی موقوف ملا۔ جہاں اپنے نبی، مجدد و مہیج موعود، کرشن اور اوتار ہونے کا دعوئے کیا۔ وہاں غیر احمدیوں کو شور و ادھر گٹوں سے بدتر بھی کہا۔ (ختم الہدیٰ ص ۱۸۰ مرزا صاحب)

اس نبوت نے حکومت برطانیہ کے استحکام و دوام کی دعائیں مانگیں، جہاد کو یکسر حرام قرار دیا حالانکہ مسلمانوں کا ابتداء ہی عقیدہ جہاد آتا ہے کہ جہاد اسلام اور اسلام جہاد ہے۔ (ترباتی القلوب ص ۵۸ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی)
تمام مسلمانوں نے عزم و اور مجلس احرار اسلام نے خصوصاً اس قادیانی نبوت کی روک تھام میں ہر قسم کی قربانی پیش کی۔ مولانا قطب الانظاہر رحمۃ اللہ علیہ نے ہر موقع پر احمدیت کی مخالفت میں جمہور علما کا ساتھ دیا۔ قید و بند سے بھی گریز نہ فرمایا۔ ان میں جب آپ تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں گرفتار ہوئے کسی باخبر انسان نے آپ کو لاہور کے اسٹیشن پر جھک کر دیکھا تو ایسے ساختہ پکار اٹھا کہ یہ پیرانہ سالی میں بھی ہونی کرا لے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ تو نہیں ہیں بلکہ عصر حاضر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مرزا صاحب کی طرح اپنے مخالفوں کو سب و قسم سے سمجھا دیا نہیں کیا تھا بلکہ نہایت احسن طریقے سے اپنے رائے کا اظہار فرما کر تھے آپ نے تحریری اور تقریری پر مشتمل مجاہدات سے کام لیا اور ہمیشہ دلائل و براہین سے حقانیت کی دعوت دیتے رہے۔

پرویز مریم: اسلام میں فتنوں کا آغاز کب سے ہوا ان کی تاریخی زندگی اور ان کے اسباب و علل یہ ہیں؛ اور ان سے کون لوگ اور کس حد تک متاثر ہوئے؛ یہ اور اس قسم کے باقی سوالات پر سرسری نظر ڈالنے کے لئے بھی ہزاروں صفحات کی وسعت درکار ہے نص قرآنی سے ثابت ہے کہ ابلیس دجیم لوگوں کو گمراہ کرنے پر ڈٹا ہوا ہے اور دوسرا قرآن عزیز نے بھی فتنہ بازوں کی نقلی کھول کر رکھ دی ہے۔ ارشاد خداوندی ملاحظہ ہو۔

هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَبِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ لَا كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَكْثَرُ الْأَنْبِيَاءِ - (سورہ آل عمران پارہ ۱۳ رکوع ۱)

ترجمہ: (وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس میں بعض آیات واضح المعانی ہیں۔ وہی آیات دراصل کتاب اللہ کے بنیادی پتھر ہیں اور دوسری آیات وہ ہیں جن کے معانی معلوم و معین نہیں۔ اب جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تشابہات کی پیروی کرتے ہیں ان کی غرض و غایت گمراہی اور فتنہ پھیلانا ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ تاویل کی تلاش کرتے ہیں حالانکہ ان آیات کی تاویل کو ہی منہیں کر سکتا ہوائے باری تعالیٰ کے۔ اور وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس کتاب متزل من اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس کا ہر جزو ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو حق تعالیٰ نے عقل سلیم عطا فرما رکھی ہو)

آیت مولا بالا سے یہ حقیقت ذوروشن کی طرح واضح ہے کہ تمام فتنہ جو علماء (علماء شیعہ) گمراہی پھیلانے کے لئے من گھڑت تاویلات کا سہارا لیتے ہیں حالانکہ احکام خداوندی کا انحصار آیات حکمات پر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ارشاد نبوی بھی ملاحظہ ہو مَعْنَى أَطَاعُوا عَنِّي فَنَعْنَى أَطَاعُوا اللَّهَ فَنَعْنَى أَطَاعُوا حَقَّي فَنَعْنَى حَقَّي اللَّهُ (مسلم) جس نے میری اطاعت کی اس نے حقیقتہً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے یقیناً خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی۔)

لہذا وہ لوگ جو دین حقہ کے متلاشی ہیں کتاب و سنت کے اتباع میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کرتے ہیں۔ وہ احادیث نبوی کو کتاب اللہ کی تشریح و توضیح یقین کرتے ہیں اور اسلاف کرام سے یہی مذہب چلا آتا ہے مگر سابقہ ہزاروں فتنہ پرور علماء کی طرح اب سے کچھ عرصہ پیشتر ہی اللہ جل جلالہ کے دل میں شیطان نے یہ دسوسو ڈالاکہ ۱۱ احادیث مقدسہ کا سلسلہ (نوعوڈ اللہ من ذالک) امرائے بنیاد ہے۔ دین کو اگر صحیح معنوں میں سمجھنا ہو تو صرف قرآن مجید کافی ہے۔ قرآن مجید کی محمل آیات کی تشریح مفصل آیات کریمتی ہیں۔ لہذا احادیث کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس منکر حدیث بد نصیب انسان کے جیلے چاٹوں نے اس معاملے کو یہاں تک طول دیا کہ غلام جیلانی برقی نے دفتر قرآن کے بعد دو اسلام ایک کتاب لکھی جس میں احادیث مقدسہ، سلسلہ روایت و درایت اور فقہ روادع پر وہ سو قیاد حملے کئے کہ خدا کی پناہ امام بخاریؒ (جن کی وفات پر کسی بزرگ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت تیزی سے کہیں جاتے دیکھا تو عرض کیا حضور آپ اتنی جلدی کہ دھر تشریف لے جائاد ہے ہیں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ امام زمان فوت ہو گیا ہے اس کے جنازے کے لئے جا رہا ہوں) جیسے عظیم المرتبت امام من کو لغو اور بازاری آدمی کا مقام دیا ہے۔ موضوعات کی تلاطم متواتر اور صحیح احادیث پر پوری شقاوت سے پھینکیاں گئی ہیں۔ اور آج کل غلام احمد پرویز (پرویز کے نام سے) ایک انکار حدیث ملکہ انکار رسالت کا واقعہ سامنے آجاتا ہے۔ اسی نابکار سلسلے کی تائید میں ایسے ادبیاد انداز میں انکار حدیث کے فتنے کو

اس قدر ہوا دے رکھی ہے کہ تمام مسلمانانِ پاکستان کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ علماء کرام نے اس فتنے کا ہر جگہ بڑی شد و مد سے مقابلہ کیا۔ ضمن میں دیال سنگھ کا کچ وافتہ نسبت روڈ لاہور میں حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے وصال سے تقریباً ۲۲ دن پہلے ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں لاہور اور مصافحات کے صاحبِ علم و فضل کو تقاریر کے لئے مدعو کیا گیا۔ ہر بزرگ نے اپنی علمی استعداد کے مطابق سنت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اور منکرینِ حدیث کی معاندانہ روش پر کتب و سنت سے دلائل پیش کئے۔ حسنِ اتفاق سے اس جلسے کی صدارت فراتھن سید العلماء امام الاقباد حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ سمر انجام دے رہے تھے۔ جلسے کے اختتام پر اپنی جگہ سے اٹھے اور نہایت سربلے ہوئی سے فرماتے گئے کہ منکر حدیث منکر قرآن ہے اور منکر قرآن خارج از اسلام ہے۔ یہ آواز اگرچہ سافقتِ تقاریر کا حاصل تھی۔ لیکن زبانِ قطب الاقطاب کی تھی۔ تمام مجمع کے قلوب میں اس غنغرغر جگ جگ صوت بادی نے فتنہ تاثیر پیدا کی کہ تمام مغربی پاکستان میں حضرت اقدس سے الفاظ زبانِ روح خاص و عام ہو گئے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفاتِ حسرتِ آثار کے چند دن بعد لاہور کے کئی کوچوں میں قدامتِ سنت نظر آئے کہ غلام احمد پرویز بفتوائے حضرت شیخ التفسیر خارج از اسلام ہے۔

اللہ! اللہ! باطل نے جہاں کہیں بھی سر اٹھایا حضرت رحمۃ اللہ نے وہاں ہی اس کو دبا کی پوری کوشش کی۔ آپ کا وجود و مصطفوی کا محافظ تھا اور آپ کی روح پاک ہر وقت قوم کے نوجوانوں کو پیغامِ دینی دیتی رہتی ہے۔ عزتِ ملتِ بیضا کی حفاظت کے لئے دوش پر لاکھ بھی سر ہوں تو کھلے جاؤ (ظفر علی مرحوم)

اگلے دن اخبارات میں پڑھا گیا اور پھر مقررہ ہفت روزہ حکامِ تدبیر میں اخبارات کے اقتباسات دیکھے گئے کہ چند سرسبز نے غلام احمد پرویز کو دیال سنگھ کا کچ میں کسی موضوع پر تقریر کے لئے مدعو کیا۔ اس سازش کی خبر جب باقی طلبہ یعنی پرست کو پائی تو انوں نے سخت احتجاج کیا کہ جس کا کچ کو حضرت شیخ التفسیر کے قدمِ میمنت لازم کی آمد سعید نے شرف و عہد عطا کیا ہو۔ وہاں پرویز جو حدیث قدم نہیں رکھ سکتا۔ لہذا تا ثبید از دی سے احتجاج کنندگان اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ الحمد للہ علی ذالک ایہ حضور صلی علیہ وسلم کے دروازے کے غلاموں کی فتح ہے جو قیامت تک مہرِ عالمات کی طرح ضوفاں کرتی رہے گی۔

ہفت روزہ خدام الدین : مبعج الائمۃ حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ انجن خدام الدین نے سنت و خدام الدین کو جاری کر کے اشاعتِ دین کے سلسلے میں نہایت احسن اقدام کیا ہے۔ اور اس انجن سے اللہ تعالیٰ نے اس رسالہ کو اجازت کر دیا کہ وہ متم بالشان کام لیا ہے جو اس سے پیشتر کبھی نہیں لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ جس کو پروردگار عالم نے آخری عمر میں پورا فرمایا اور اب کم از کم ایک لاکھ افراد کو ہر شعبہ اس جریۃ الشاد سے متبع ہونے کا موقع ملے گا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے تمام اوقات اس ہفت روزہ کی تیاری کے لئے وقف ہو کر رہ گئے تھے۔ خالق و جہاں آپ کے حلقہ بگوشوں کے لئے بھی یہ نعمتِ ہدایت و نجات کا باعث بنی ہوئی تھی۔

اگرچہ یہ مقررہ جریۃ اپنی صورتِ حیثیت سے پاکستان کے باقی جرائم و رسائل کا لگانہ کھاسکتا تھا مگر اس کی معنوی حیثیت تمام میں اپنی نظیر نہیں ملتی۔

وفاتِ حسرت آیات: کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيُتَبَقَّ وَجْهُ رَبِّكَ ۝ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (سورہ رحمن پارہ ۱۵)
حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک زندگی کی پچھتر بہاریں اپنی قدسی دلوں کی فضاؤں سے ہلکنار ہو کر ختم ہوئیں۔
اور یکم رمضان ۱۳۸۷ھ سے آخری بہارِ تہجد حیات بن کر آئی اور پوری صدی کے فیوض و برکات کی تمام وسعتوں کو اپنے
داس میں لپیٹ کر ۷ رمضان المبارک کو چلتی بنی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَيْہِ رَاجِعُونَ حضرت شیخ المشائخ کے اس سانچہ
ارتحال سے لاکھوں قلوب مجروح ہوئے۔ اور بڑے بڑے صبر و استغفار والے عظیموں کی طرح آنسو بہاتے اور آپہن بھرتے
ہوئے دیکھے گئے۔ وہ قیامت خیز لمحات بار بار دل کو آتشِ غم سے جلاتے ہیں۔ اس حق پرہیزگار کے ریلوے اسٹیشن سے آنسو بہانا
ہوا حضرت کی ولایتِ کدہ تک پہنچا، مگر جب آپ کے ملکِ شام کے چہرے پر نظر ڈالی تو کشتیوں پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آنسو خشک ہو چکے
تھے حیرت زدہ نگاہیں حضرت اقدس کے نورانی چہرے پر تھیں، اور دلِ عالم غم و حسرت سے کسی باہر کی دنیا میں معلوم ہوتا تھا مگر چند منٹوں کے
بعد قلب کا احساس واپس ہوا، آنسو اُٹ اُٹے اور دل کی بربادی کی ترجمانی کرنے لگے۔ اتنے میں فیصلہ ہوا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اٹھا کر
دروازے سے باہر اُزار میں لے جایا جائے غدا کے ذوالمنین کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مجھے اسحق الانام کو اس امامِ الاقبیاء کے فرقِ اقدس کے
نیچے اپنے گونگا راہتوں کا سہارا دینے کی سعادت نصیب ہوئی سمجھ کا مثیل شاید اس دور میں نہ ملے۔ صحن سے گئی تک تقریباً سات قدم
کا فاصلہ ہے جو لاکھوں مجروح احساسات سے ملے کیا گیا۔ اس دن میری مروج پر کسی عاشق صادق کے اس لطیف احساس کا راز افشا ہوا۔
جس کو اس نے مندرجہ ذیل شعر میں پیش کیا ہے۔

سارباں آہستہ مالہ کاں رام حیاں و در محل است اشتراں را بار بر لیت است مارا بردل است

خیر اسپد لائیں سبحانِ خاں کے دروازے سے لے کر حضرت اقدس کے دروازے تک دائرین کا ایک ہجوم تھا۔ اور نمازِ ظہر کے
بعد جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازے کے ساتھ ہر قدم اور ہر فرقے کے لوگ تھے۔ حفاظ، حکماء، وکلاء، عوام، محکام، فقراء، اولیائے کرام اپنے اپنے
بیگانے عرضیکہ مغربی پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے جس قدر عقیدت مند حاضر ہو سکتے تھے حاضر ہوئے۔ جن کی تعداد
لاہور کے باختر حلقوں نے لاکھوں تک بتائی ہے۔

احقر اس وقت حضرت والا جاہ کے جنازے کی تفصیل پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ لاکھوں انسانوں
نے اس مروّج آگاہ کے جنازے کو اپنی اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ! اللہ! انسانی نفوس کے اس تلاطم کی سوگاری میں مومکینِ ارض
و سما کی شرکت معلوم ہوتی تھی۔ مبانی صاحب کے مبارک قبرستان تک جنازے کی فضاؤں میں لَا یَدْرُونَ فِیہَا شَہِدًا وَلَا
نَحْبًا (لوگ وہاں نہ دھوپ دیکھتے ہیں اور نہ ہی سردی کی شدت محسوس کرتے ہیں) کا مقدس سماں نظر آتا تھا۔ چند دفعہ ہوائے سرد
آئیں ہمیں اور اسی طرح بادل نے عقیدت کے آنسو بہانے کے جنازے کے اہتمام میں قدرت کے یہ تمام ممد و معاون ثابت ہوئے۔ بازار
الانوں کے سروں سے سیل رواں بنے ہوئے تھے اور ہتھیوں اور منڈیروں پر بے شمار روزن اپنے ام القریٰ کے ہادی کے آخری دیدار کے لئے
جمع ہو گئے تھے یونورسٹی گراؤنڈ کی پہنائیاں اس وقت تنگ معلوم ہوتی تھیں جب اسلامیان پاکستان نے اپنے روحانی باپ کے وجودِ مسعود
کو وہاں جا کر رکھا، صغیر سیدھی ہوئیں آواز آئی کہ مغربی پاکستان کے اکثر علماء حاضر ہو چکے ہیں اور ان سب کا فیصلہ ہے کہ حضرت مولانا عبد اللہ
انور صاحب نمازِ جنازہ پڑھائیں۔ جنازہ پڑھایا گیا اور دنیا میں صاحبِ ملک لے جایا گیا۔ ان مختصر اسیدنا و محمد ونا کا جسدِ اطہر عروبِ آفتاب کے نوراً
بعد لاہور کے اس جنتِ نشان قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا اگرچہ ظاہری آنکھیں بنو قیس مگر شبیرِ قرآن حضرت شیخ التفسیر کا دل تجلیاتِ الہی سے سرشار تھا۔

قبر سے فردوسی خوشبو

تاریخ میں تین چار ایسے بزرگ ملتے ہیں کہ جن کی قبروں سے بعد از دفن ایسی خوشبو کا نشرو شروع ہوتا کہ لوگ اس کو محسوس کر کے حیران ہوتے کہ ایسی عمدہ خوشبو ہم نے دنیا میں کبھی

نہیں سونگھی۔ ان میں پہلا نام حضرت انام بخاریؒ کا اور دوسرا نام میاں شیدا صغریٰ دلیو بندہ کا ہے۔ تیسرا اور چوتھا واقعہ پنجاب میں پیش آیا۔ ساہی وال میں حضرت مولانا مفتی قیصر اللہ صاحب اور لاہور میں حضرت شیخ التفسیرؒ کی قبر سے یہ نتیجہ کمال انبیاء سنت کا۔ لاہور کے باشندوں نے ایک زبان ہو کر پکارنا شروع کر دیا کہ حضرت مولانا سیدالابرار والانبیاءؒ کی تربت پاک سے فردوسی خوشبو میں آنے لگی ہیں۔ نہایت معتد افراد نے جا کر پتہ لگایا۔ حضرت کی مرقد اقدس کی پاکیزہ مٹی کا ہر طرح کیمیکل EMICAL معائنہ کیا گیا لیکن یہ معلوم ہونا تھا نہ ہوا کہ اس شہیم جانغز کو کس چیز سے منسوب کیا جائے۔ لہذا یہ بات زبان زد خاص و عام ہو کر قدس حقیقت کی صورت اختیار کر گئی کہ حضرت شیخ التفسیرؒ مرحوم کی حد پاک رُوضۃ حق بنیاً حوض الجنتہ بن چکی ہے۔ جس طرح آپ کی زندگی آیۃ حق آیات اللہ تھی۔ اس طرح آپ کی موت بھی صداقت اسلام کا ایک نشان بن گئی ادواب کر کے کائنات میں پھیل سکتے ہیں کہ علماء اہل بنی اسرائیل کی تعبیر اور مشارکت معنوی یوں بھی ہو سکتی ہے کہ سیدنا مولانا کی روح پاک کہہ رہی ہوگی۔ وَجَعَلْنٰی مِیْثَاقًا کَاٰیٰتٍ مَّا کُنْتُ رَیْبَہٗ دَارَکَ اَعْلَامَ کَہج پر یہ مخصوص احسان و اتقان ہے کہ اس نے میرے وجود کو شیرازہ عالم میں بھی طالبان حق کے مشامِ جان کو معطر کرنے کے لئے سامانِ فرحت بنایا تھا ادواب بھی میانی صاحب کے مرکز میں سناٹا راہ ہدایت کے لئے یقین و اطمینان قلبی کی دولت بنایا ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ارشاد خداوندی سینے کے واسطے کہ اَللّٰہُ اَعْلٰی کَلِمَہٗ مَوٰلِدَتٍ وَّکَلِمَہٗ اِسْمٰوٰتٍ وَّکَلِمَہٗ اَبْعَثَ حَیًّا۔

اب ارشاد نبویؐ کی روشنی میں حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے علماء شیعہ کے کمالات و صفات اور حیاتِ مات کے حالات بنی اسرائیل کے انبیاء کرام کے لگ بھگ ہوں گے۔ تو اب ظاہر ہے کہ امتِ مرحومہ کے علمائے ربانی ہو کر ولایتِ گریہ منصف جلیلہ پر فیض المرام ہوتے ہیں من بجانب اللہ ان سعادتوں اور رحمتوں سے نوازے جاتے ہیں جو انبیاء سابقین پر رب نے بچھا دفرمائی تھیں۔

و دعا ہے کہ خدائے کون و مکان حضرت قدس اللہ سرہ کی روح پاک کو وَلَلْآخِرَہٗ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاَوَّلٰی کا مزدہ سنا۔ اور اس نعمتِ نبویؐ کا سہم و شریک بنائے۔

حضرتؒ کے معمولات: اس موقع پر حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کے معمولات کو نہایت اختصار سے پیش کیا جاتا ہے تاکہ قارئین کو اس ربانی شخصیت کی عملی زندگی سمجھنے میں آسانی ہو۔ آپؒ کے بھلے صاحبزادہ حضرت مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب آپ کی بڑی صاحبزادہ صاحبہ اور آپ کے نواسہ حافظ عبدالوہید صاحب نے اندرون خانہ معمولات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

حضرت کے جانشین مولانا قاری عبید اللہ انور صاحب کا بیان: ”ہم نے اپنی والدہ ماجدہ رحمۃ اللہ علیہا سے دفعہ سناٹا کہ جب ہم اچھے ہی تھے تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ با ازاد سے سودا سلف خرید کر لایا کرتے تھے۔ والدہ محترمہ کے بیمار ہونے کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے آگوندہ ہٹنے سالن تیار کرتے اور بیمار کے خاص کھانے کی تیاری بھی خود ہی فرماتے تھے۔ ساری زندگی گھر میں کوئی خاص

باخدا وہ رکھنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ والدہ محترمہ تندرستی کی حالت میں گھر کا تمام کام کاج خود ہی کر لیتی تھیں اور ہماری بہنیں آپ کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ جب ہم قدرے بڑے ہو گئے تو سودا سلع کی خرید و فروشی کے ذمہ داری پر چھوڑ دی گئی۔

ہمارے بچپن کے زمانے میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مکان کے پچھلے حصے سے تیسری منزل تک پانی خود لے جایا کرتے تھے۔ اور والدہ محترمہ کا بیان ہے کہ قیام سندھ کے ایام میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ دونوں وقت باہر کھڑے پانی اٹھا کر لاتے تھے اور کھانا گھر سے تقریباً دو چار فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ پہلے میں دو تین دفعہ نماز عصر کے بعد جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے جو جلانے کے کام آتی تھیں۔ اور اسی طرح طالب علمی کے دنوں میں جب آپ اردو ٹیچر تھے اور پھر جہانگیر آباد سندھ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہتے تھے تو حضرت سندھ کے گھر کے لئے پانی بھرنا جنگل سے لکڑیاں لانا حضرت سندھ میں اور اپنے چھوٹے بھائیوں (محمد علی صاحب، عزیز احمد صاحب اور رشید احمد صاحب) کے کپڑے دھونا آپ کا عام معمول تھا۔

احقر کی اہلیہ اور ان کی والدہ محترمہ نے کترین سے بیان فرمایا ہے کہ حضرت باہر کا دروازہ بند کر لیتے اور جمعہ کی صبح ہمیشہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے۔

گھر میں چھوٹے بچوں کے کپڑے آج جی مروسہ دھویا کرتی تھیں۔ اور جوں جوں بچے اپنی عمر کو پہنچتے گئے اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے رہے۔

حضرت مولانا عبداللہ انور صاحب کا ارشاد ہے کہ کبرئی میں جب آپ کو فالج اور وجع المفاصل جیسی موذی امراض نے پریشان کیا۔ اور کثرت مشاغل، نقاہت اور ملا تانہ کیوں کے انبوہ در انبوہ آنے لگے۔ تو آپ نے مجبوراً کپڑے دھونے کے معمول کو ترک فرما دیا۔ لیکن آپ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ دھوبی کپڑے صاف کر لیتے ہیں۔ مگر پاک نہیں کرتے ہیں۔

ایک نیک طبیعت دھوبی نے آپ کے کپڑے صاف کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا مگر بھی دھوبی کے مصلے ہوئے اور استری کئے ہوئے کپڑے گھر پر پانی میں تین دفعہ مزید پاک کئے جاتے تھے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائے عمر سے سفید کھدر کا لباس زیب تن فرمایا تو زندگی کے آخری دن تک وہی لباس رہا بلکہ اپنے کھن کی چادریں بھی سفید کھدر سے تیار کر دوائیں۔ حج اور عمرہ سے واپس تشریف لاتے تو احرام کی چادروں کا کفن کر رکھ لیتے اور ان پر اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا کرتے تھے۔ "یہ احمد علی کا کفن ہے"

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہم اذو حج و عمرہ کی سعادت حاصل کی اور زندگی کے آخری دنوں میں مع اہل و عیال سفر حجاز پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ آپ نے ساری زندگی حتی الامکان اس بات کی پوری احتیاط فرمائی ہے کہ بے نماز کے ہاتھوں کا پکا ہوا کھانا نہ کھایا جائے اس سلسلے میں بے شمار واقعات موجود ہیں۔ جن سے آپ کی اس عادت مبارک کی تائید ہوتی ہے مگر اس جگہ صرف ایک دو واقعات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۹۶۶ء میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ مع اہل و عیال بحری جہاز پر حج کے لئے تشریف لے گئے۔ جہاز میں کھانا پکانے والا علی بے نماز تھا۔ حضرت ہر روز پلوں گھنٹہ درس قرآن مجید دیا کرتے تھے۔ جہاز میں سندھ کی حاج کرام بھی تھے۔ ان کی استدعا پر آپ سندھ میں بھی تقریر فرمایا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر آپ کو فارسی زبان میں بھی مسائل، مسائل، کرنے ہوتے تھے۔ کیوں کہ افغانستان کے لوگ بھی آپ کے ہم سفر تھے۔

علاوہ ازیں آپ اپنے اوراد و وظائف میں مستغرق رہتے تھے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ حضرت نے جہاز میں آٹھ دن تک نہیں کھایا۔ کھانا پکانے والوں کو نماز پڑھنے کی ہدایت کرتے رہے اور وہ نماز پڑھتے کہ وعدہ کرتے رہے مگر آخری دن تک انہوں نماز نہیں پڑھی اور نہ ہی حضرت نے ان کا کچا کھانا کھایا۔ جب یہ جہاز جس کا نام ایس ایس انگلستان تھا جدہ شریف میں پہنچا بھوک سے بڑھال ہو رہے تھے ساحل پر اترتے ہی آپ نے ایک ٹھنی ہوئی مچھلی کھائی۔ جس کے نتیجے میں آپ کو پیش کا عارضہ لاحق ہوا۔ اور تقریباً ایک ماہ تک آپ اس تکلیف میں مبتلا رہے۔ لیکن حضرت اس بات پر خوش تھے کہ ہم اس سفر میں کچھ حاصل کرنے آئے ہیں۔ کھونے کے لئے نہیں آئے ہیں۔ الحمد للہ ابے نمازوں کا کچا کھانا نہ کھانے سے دل سیاہ ہونے سے بچ گیا۔ اور عبادہ میں خشوع و خضوع بھی محفوظ رہا۔

ایک اور واقعہ بدینہ قارئین کیا جانتے۔ جو کہ آپ کی مبارک زندگی کا معمول بن چکا تھا۔ جب کبھی آپ تبلیغی دورے پر تشریف لے تھے تو دعوت دینے والے سے مشروط وعدہ فرماتے تھے۔ بعد ازاں نے توفیق دی۔ کرایہ ہوا، نوادوں کا۔ وعدہ نہیں آؤں گا، قابل ذکر بات کہ دو مسروں سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ بعض خاندانوں سے آپ کے تعلقات برسوں سے چلے آتے تھے اور آپ ان کی دعوت پر ان کا متعدد دفعہ تشریف بھی لے جا چکے تھے مگر ان کے گھر کا پانی تنگ بھی نہیں پیتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ نواب محمد حیات خاں صاحب (ذکر تشریفی کے والد بزرگوار) حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس سے پہلے بھی آپ کے پاس آتے جاتے تھے۔ اس دفعہ انہوں عرض کیا کہ آپ پانچ چھ دن تک ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ کیونکہ ہمارا علاقہ دینی لحاظ سے بہت ہی پسماندہ ہے۔ حضرت نے فرمایا میں جانے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھ کو آمد و رفت کے کرایہ اور کھانا کھانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ نواب صاحب نے جواب دیا کہ حضور! آپ فکر نہ کریں۔ ہم گمنگناں آپ کے کھانے کا انتظام اپنے گھر پر نہیں کریں گے۔ بلکہ کسی باندہ صوم و صلوة آدمی کے سر کردار میں گئے۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ آپ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیں میں خود ہی بندوبست کر لوں گا۔ ان دنوں حضرت سرسین اپنے ہمراہ چڑے کا ایک مصلیٰ اور ایک بہادل پوری کو نہ رکھا کرتے تھے۔ باقی کوئی سامان آپ کے پاس نہیں ہوتا تھا۔ اس سفر پر آپ نے بچہ بھونائے اور مصلیٰ کے اندر باندھ لئے اور نواب محمد حیات کے ہاں تشریف لے گئے دن بھر درس و تدریس اور امتحان لکھانے کرانے میں گذرنا۔ رات کو آپ ان چوڑیوں میں سے کچھ پہنا لیتے اور پانی پی لیتے۔ لہذا آپ نے وہاں کے قیام میں چوڑیوں پر سی گزایا۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دنیا دار کی عزور کی گردن کو کاٹنے کے لئے میں نے استغنا سے تیز دھار آلہ نہیں دیکھا۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں دنیا داروں سے تحفے تحائف لیتا اور مرغ پلاؤں کھاتا تو شیطان ان کو سکھانا کہ حضرت صاحب خاطر مدارات بھی کروا کر میرے نام سے پیسے بھی لے گئے اور میں وعظ بھی سنگٹے۔ عوض معاوضہ لگتا رہا اس طرح سے میرے یہ سارے اوقات رات دن جاتے، نہ ان کی آخرت سنو رتی اور نہ میں ہی عند اللہ ماجور ہوتا۔

المختصر! حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ طریق تبلیغ ہر جگہ کامیاب رہا اور آپ کے ایک دفعہ تشریف لے جانے سے اصلاح کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے! لاہور لو! اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کو قرآن سناتے کے لئے مجھ کو دہلی سے تھکڑی لگو کھان بھجوا دیا ہے کوئی دہلی والا افغان نہیں بھیجا ہے۔ میں بیچا بی ہوں۔ آپ کی عظمت اور عادات و اطوار کو خوب جانتا ہوں۔ لہذا اللہ تعالیٰ مجھ سے اصلاح حال کا کام لے رہا ہے۔

اگرچہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عبادت شانہ روز کی تفصیل کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں تاہم معمولات میں ان کی عزت و شانہ کے دریا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ تمام زندگی نماز تہجد کی پابندی فرماتے رہے۔ اکثر اٹھ رکعت نماز پڑھی جاتی۔ اور اذان حفظ کردہ آیات قدرے بالجہر پڑھی جاتیں۔ باجماعت نماز پڑھنے کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور اکثر اقامت سے پہلے بات اول میں تشریف لے آتے تھے اور جلدی جلدی اپنی جگہ پہنچ جاتے تھے۔ منشی سلطان احمد صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جناب الانجمن سمروذیراعظم سندھ حضرت کی ملاقات کے لئے حاضر خدمت ہوئے۔ تو آپ نے رستے میں چلتے چلتے ان سے بات چیت کی۔ لیکن باجماعت کا وقت ہو رہا تھا۔ رانا شیر جنگ جیسے معزز خدام آئے۔ لیکن نماز کی پابندی میں ہرگز فرق نہ آنا تھا۔

نماز فجر کے بعد اپنے خاص حجرے میں تشریف لے جاتے تھے۔ تفسیر خازن یا اور ضروری عبارات پر نظر ڈالتے تھے۔ کچھ مخصوص خدام ہاتھ اندر چلے جاتے تھے۔ آخری عمر میں اگر اس وقت چند منٹ آرام فرماتے۔ تو خدام میں سے اپنی کھڑی کسی کے حوالے کر دیتے تھے۔ بارہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ آرام کیا جانا اور پھر نازہ و صوفرا کر سیدھے درس گاہ کی مسند پر تشریف لے جاتے تھے۔ قرآن مجید کا ایک رکوع تلاوت فرماتے۔ سلیس ترجمہ کرنے اور پھر نزول آیات کے ماحول کے پیش نظر سابقہ مفسرین کی تشریح و توضیح کی روشنی میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد مبارک میں ان آیات کا یہ طلب سمجھا گیا ہے۔ بعد ازاں ان اعتبار و التاویل کے طور پر ان آیات کی زماہ حاضرہ کے حالات پر تطبیق فرماتے تھے۔ پروردگار عالم نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو نصوص قرآنی سے معانی کے استخراج و مطالب و مفاہیم کے استنباط اور پھر عصر حاضر کے ساتھ ان کی تطبیق کا وہ عطا فرما رکھا تھا کہ جس کی مثال شاید وہاں ہی مل سکتی ہے۔ احقر تو ان دونوں کہا کرتا تھا کہ شہد کی کھچی کی طرح پروردگار و جہاں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی جبلت میں وہ اسناد رکھی ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ سے صحیح معانی نکالنے میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

درس قرآن مجید کے بعد تمام حاضرین حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مصافحہ کرتے۔ حضرت نہایت منانت و شفقت سے لوگوں کے جہروں پر نظر بس ڈال کر مصافحے کا جواب دیتے۔ چند ضروری امور کی تکمیل کے لئے تھوڑے وقت تک آپ مسند پر ہی تشریف فرما رہتے۔ بعد ازاں اٹھ کر حجرے میں تشریف لے جاتے اہل حاجت مرد و زن حضرات کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آپ سب لوگوں کو نہایت شفقت سے ملاقات کا موقع مرحمت فرماتے تھے۔

گھر کو تشریف لے جاتے تھے تو بعض خدام ساتھ ہو لیتے تھے۔ اگر کسی نے کچھ عرض کرنا ہوتا تو وہ قدرے قریب ہو جانا۔ رستے میں چھوٹے چھوٹے بچے آجی کہہ کر سلام کرتے اور آپ نہایت محبت سے ان کو جواب دیتے تھے۔

نماز عشا کے بعد گھر تشریف لاتے تھے۔ چند خوش نصیب خدام آپ کی معیت میں درو لایت تک آتے تھے۔ ان کو نصرت کرنے کے بعد دروازہ کھولا جاتا۔ تقریباً تمام افراد خانہ آپ کے استقبال کے لئے نیچے دروازے تک آتے تھے۔ حضرت چھوٹے بچوں کو اپنا ہاتھ بٹا دیتے تھے۔ اور بزرگوار کو انعام دیتے تھے۔ گھر میں اکثر ایک بلی ہوتی تھی وہ بھی افراد خانہ کے ساتھ دوڑ کر دروازے تک آتی تھی۔ کھڑکی میں بیٹھ کر بار بار تکبیر دہنتی تھی۔ حضرت اس سے پیار کیا کرتے تھے۔ اگر حافظ حمید اللہ صاحب یا فارسی عبید اللہ اللہ صاحب کے گھروں میں کچھ کو تکلیف ہوتی تو آپ ان کی پہلے عبادت فرماتے تھے۔ اور پھر اوپر کی منزل میں تشریف لے جاتے تھے۔ کھانا آجا تو اپنے دونوں

صاحبزادوں کے ساتھ بیٹھ کر عشاءِ نینا دل فرماتے تھے۔ اس موقع پر بعض ضروری باتیں بھی قبول ہوتی تھیں۔ اگر کوئی شخص دینی ہونا تو ان کو تین برابر حصوں میں تقسیم فرماتے تھے اور دوسرے اپنے صاحبزادوں کے گھروں میں بھیج دیتے تھے اور ایک حصہ گھر رکھتے تھے۔ روٹی کے بعد ہاتھ دھونے کا وقت آتا تھا تو گھر کا ہر فرد کوشش کرتا تھا کہ یہ سعادت مجھ کو نصیب ہو۔ بچوں اور کو بھی جھوکے دن پیسے دیا کرتے تھے اپنے صاحبزادوں اور اپنے گھر میں باہوار دپے محنت فرمایا کرتے تھے۔

جمعہ کے دن چند روپوں کی ریزگاری بازار سے لائی جاتی اور اماں جان کے حوالے کی جاتی تھی۔ تاکہ کوئی سائلہ نہ جائے۔

حضرت کے ملفوظات

حضرت شیخ النفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر میں بار بار دھرائے جانے والے حکیمانہ ملفوظات میں سے چند ایک ملفوظات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

- (۱) اللہ والوں کی جوتیوں میں وہ موتی ملتے ہیں جو بادشاہوں کے تاجوں میں نہیں ہوتے۔
- (۲) لاہور یوں میں انعامِ محبت کبریا ہوں۔ میں اپنے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بری الذمہ کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ قیامت کو یہ نہ کہیں کہ میں کوئی قدرے والا اور ستارے والا نہیں آیا تھا۔ **وَمِنْ ذٰلِكَ** !
- (۳) میں آپ کو بیدار کر رہا ہوں۔ پٹواری سے گورنر تک آپ کا کوئی بھی غیر خواہ نہیں ہے۔ اگر آپ کا کوئی غیر خواہ ہے تو وہ اللہ ہے۔ جو آپ سے کھائے کو نہ مانگے۔ دردِ اذہ محمدی کا غلام ہو۔ اس کے ہاتھ میں قرآن ہو۔ اور دوسرے ہاتھ میں مشعلِ حیاتِ نبویہ لاٹام ہو۔ اور وہ ان دونوں نوروں کی روشنی میں آپ کی پہنائی کرے۔
- (۴) اللہ والوں کی صحبت میں استغنا عن الخلق اور احتیاج الی اللہ کے صفات پیدا ہوتی ہیں۔
- (۵) جو نماز نہ پڑھے وہ بد معاش، جو روزے نہ رکھے وہ بد معاش۔ میں فتویٰ دیتا ہوں۔ جاؤ علماء سے جا کر کہہ دو کہ احمد عاقل اس طرح کہتا ہے۔ عربی میں دو لفظ ہیں۔ فاسق و فاجر۔ ہماری زبان میں ان کا ترجمہ ہے۔ بد معاش، وہ بد معاش ہے جس کی زندگی اسلامی قوانین کے خلاف ہو۔
- (۶) جب لالِ قلعے کے سامنے عصمتیں لٹنے لگیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو غیرت آئی وہ لاکھوں میل دور سے جو ہر طرے لایا اور ہر با مسلط کر دیئے۔
- (۷) اللہ تعالیٰ نہایت ہی نازک مزاج محبوب ہے اگر تم لینے نہیں آؤ گے تو وہ دینے نہیں جائے گا۔
- (۸) ہر کام میں حصولِ رضائے الہی مطلوب ہونا چاہیئے۔
- (۹) قرآنِ حکیم اور احادیثِ نبوی کی تشریح دو جہلوں میں کی جاسکتی ہے۔ خدائے تعالیٰ کو عبادت اور خلقِ خدا کو استیصال سے راضی رکھو۔
- (۱۰) رشتہ داروں اور دوستوں کو راضی رکھنے کا یہ طریقہ ہے کہ ان سے اپنا حق نہ مانگو اور ان کا حق بغیر مانگے ادا کرتے رہو۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد پر قرآن مجید سے بہتر کوئی کتاب نہیں بولتی ہے۔

تم کو مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر قرآن مجید سننے میں عار آتی ہے۔ تو غمناکی کو گھیبوں میں چل کر جانا ہمارے جوتے کی بھی تو ہین ہے۔

جو تم سے روٹی مانگے وہ تم کو حق بات نہیں کہہ سکتا۔ تم کہتے ہو ملائے ایمان! تم نے انگریزوں کے سامنے اپنی لڑکیاں پیش کیں۔ تمہارا منہ کالا، پچھلے تمہارے دم سے آباد سیناؤں میں تمہارا اتفاق، وہاں وہابی، سنی اور شیعہ تمام متفق، وہاں تم ہیویاں اور بیٹیاں لے کر جاتے ہو، یا مولوی جاتے ہیں، اگر مولوی سوکھے ٹکڑے کھا کر قرآن کو سینے سے نہ لگاتا تو ہندوستان میں اسلام ختم ہو جاتا، سرکاری سکول کا پرائمری پاس ملازم ہو جاتا تھا۔ مگر علمائے کرام دیوبند اور سہارن پور سے فارغ التحصیل ہو کر آتے تو ان کو دفاتر میں کوئی بوجھتا بھی نہیں تھا۔ تمام علوم متداولہ کے فارغ ملامونٹے اور کالج میں عربی کے چند لفظ پڑھ کر تم لوگ علامہ بن جاتے ہو۔

جو ہندیا میں ہوتا ہے وہی رکابی میں آتا ہے۔ پیٹ میں حرام ہو تو نیک عمل نہیں ہوتا۔

عالم دین ہو، حافظ قرآن ہو، حج بھی کر آیا ہو، زکوٰۃ کی پائی پائی ادا کرے اور مرجائے اور ضعیف والدین ہاتھ اٹھا کر بد دعا کریں۔ کہ الٹی ہم تو اس پر راضی نہیں ہیں۔ تو اس پر جنت کے آنکھوں دروازے بند اور اس کو جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔ جن لوگوں نے لاؤ کار تو اس کے عہد میں قرآن مجید کی بجائے رواج پر عمل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ میں فتویٰ دینا ہوں کہ وہ لوگ کافر ہیں۔ اور اگر وہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ تو ان کی قبریں جہنم کا گڑھا بنی ہوئی ہیں اگر دیکھنا چاہو تو نوٹس کلاس کا کرایہ خرچ کرو اور ہندوستان سے ایسے بزرگ لاؤ جو قبر پر کھڑے ہو کر تم کو بتا دیں کہ یہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ تم نے سمجھ رکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت اندھی ہے قرآن مجید کے پورے ڈیڑھ صفحے کا انکار ہے حالانکہ ایک لفظ کا انکار بھی کفر ہے۔

تم ایک دانہ نادر نہیں کھا کر مرو گے اور نہ ہی ایک دانہ چھوڑ کر مرو گے۔ رات دن روٹی روٹی کی پکارت ہے۔

میں نے اپنے تینوں بیٹوں کو تین وصیتیں کیں:

(۱) کیمیا گری میں مبتلا نہ ہونا۔

(ب) عملیات کے پیچھے نہ پڑنا، اور

(ج) کسی کی ضمانت نہ دینا۔

کیوں کہ خواہ مخواہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے اور اس طرح سے دین کی خدمت میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔

(۱۹) آج کل مسلمانوں کی اخلاقی گراؤ اور معاملات میں بددیانتی کی شکایت کرتے ہوئے اکثر فرمایا کرتے تھے کہ آج کا مسلمان وہ

ہے جو بے کمر نہ دے۔ اگر لے کر دے دے تو صورت و سیرت سے اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار لوگوں نے کم و بیش رقم

مستعلائی۔ اور لینے کے موقع پر کہتے رہے کہ جانتے ہی بددیانتی آؤ بیچ دیں گے۔ مگر آج تک شاید ہی کسی نے کچھ واپس کیا ہے

آپ خیال فرم سکتے ہیں کہ مجھ کو ملنے والے یہی علماء و طلباء ہی میری برادری ہے میرے پاس شبابی اور رکابی تو آنے سے رہے

جب ہیں ان کی جگہوں میں اتفاق سے جاتا ہوں۔ وہ لوگ مجھ کو ملتے بھی ہیں لیکن دیتے کچھ نہیں۔ اور میں بھی شرم کی وجہ سے نہیں مانگتا۔

(۲۰) میں ہمیشہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری کوئی نماز قضا نہ کرے اور صبح کا درس قرآن مجید کبھی نہ چھوٹے۔ اللہ تعالیٰ مجھ کو چلتا پھرتا بٹائے جائے۔ اپنے فضل سے سوء الکبر سے بچائے۔ مجھ کو چار پائی پر نہ لٹائے تاکہ میرے لئے اور میرے تیمارداروں کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنے۔ صبح کی نماز پڑھ کر درس قرآن مجید کے بعد اللہ تعالیٰ مجھ کو دنیا سے اٹھالے لوگ مجھ کو بیانیہ صاف میں پہنچا کر ظہر کی نماز واپس آکر باجماعت پڑھیں۔

(۲۱) آخری دنوں میں کبھی کبھی آواز سے فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں تجھ سے راضی ہوں تو جب چاہے مجھ کو بلا لے۔

حضرت مولانا محمد شعیب صاحب جو آپ کے ممتاز خلفاء میں سے ہیں۔ انہوں نے حضرت کے چند ملفوظات نقل کر دئے ہیں۔

(۱) میرا اپنا سلسلہ قادری ہے مگر میں سلاسل اربعہ کے بزرگوں کا ادب کرتا ہوں۔

(۲) حضرت مدنی مرحوم میرے شیخ نہیں ہیں لیکن میں اپنے مشائخ کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں۔

(۳) طالب تین تاروں کے ساتھ اپنے شیخ سے کنکشن پیدا کرے تو کامیاب ہوتا ہے۔ عقیدت، ادب اور اطاعت۔

(۴) لوگ کہتے ہیں۔ بیٹا سارے اندھا کوئی کوئی۔ میں کہتا ہوں۔ اندھے سارے بینا کوئی کوئی۔

(۵) مجھے جو موتی اپنے حضرات سے ملے ہیں وہ اتنے قیمتی ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ دنیا کے تمام خزانے میرے ہاتھ پر رکھ کر فرمائے کہ یہ تمام خزانے لے لو اور ایک موتی دے دو تو میں ہی عرض کروں گا کہ اے اللہ! مجھ کو دنیا کے خزانوں کی طلب نہیں ہے۔

ان کی طلب ہے یہ ان کو دے دے اور میرے پاس یہ موتی رہنے دے۔

(۶) نعم الامیر علی باب الفقراء۔ وبئس الفقیر علی باب الامراء۔

(۷) اطلبوا الاستقامة ولا تطلبوا الكرامة فان الاستقامة فوق الكرامة۔

(۸) اگر کوئی بڑا میں اڑنا آئے اور لاکھوں مریہ پیچھے لائے مگر سنت نبوی کا مخالفت ہو تو اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا نامناسب ہے۔

اس کی بیعت کرنا حرام اور اگر کوئی کر چکا ہو تو تو مافرض عین ہے۔

(۹) دل کتنا ہی سخت ہو ذکر الہی کی متواتر تضرعوں سے نرم ہو جاتا ہے۔ جس طرح سخت پتھر میں پانی کے چپکنے سے نشیب جاتا ہے۔

شیخ القیصر کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بلا خوف — ہر جگہ اور ہر ایک کے متعلق صاف اور واضح بات کہتے تھے۔ ان کے کسی عمل میں ابہام یا الجھجھک نہیں ہوتا تھا۔ دو اور دو چار کی طرح ان کی پالیسی واضح

متین رہی۔ اگر کسی کی حمایت کو انہوں نے ضروری سمجھا تو بغیر اس بات کا خیال کئے کہ اپنے کیا کہیں گے اور بیگانے کیا۔ حمایت کی اور اسی طرح ان کی خدا داد مہمت نے اگر سمجھا کہ خلاف کی مخالفت اور اس سے اختلاف شرعاً ضروری ہے تو اس سے بھی ورنہ نہیں کیا اور بے جھجک روک ٹوک بات کہی۔ علامہ مشرقی کے افکار و نظریات سے انہیں اختلاف تھا مگر بلا کیا لیکن جب سکندر کی وزارت نے خاکساروں پر ظلم کیا

جماعت اسلامی

قیمت تقریباً لاکھ تہر رکھی گئی ہے۔ حضرت مولانا کوئی رسالہ تحریر کرتے تو ہم عصر علماء و مشائخ کی اسپر تصدیق و تفسیر حاصل کرتے تاکہ عوام کو ان کے بارے میں پورا یقین ہو کہ وہ عین کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ ان میں اہم رسالے یہ ہیں:-
 ۱۔ تذکرۃ الرسوم الاسلامیہ ۲۔ شہادۃ النصار علی حرمتہ الزامیر ۳۔ اسلام میں نکاح بیوگان ۴۔ ضرورتہ القرآن ۵۔ اصلی شخصیت ۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمائے ہوئے وظیفے ۷۔ مال میراث میں حکم شریعت اور اختیار کی سزا ۸۔ توحید مقبول ۹۔ فوٹو کا شرعی فیصلہ گلدستہ مذاہب و نبوی۔ تفسیر سورہ قمری وغیرہ ہیں۔

حق یہ ہے کہ حضرت مولانا نے اپنے آسان و شگفتہ زبان میں کتاب و سنت کی تعلیم و تبلیغ کا بہترین انداز اختیار فرمایا ہے۔ اور لاکھوں خدا ان رسائل کی دہرے صراط مستقیم پر چلنے لگے ہیں۔

خلاصۃ المشکوٰۃ

اس عنوان و نام سے آپ نے ایک مختصر کتاب ترتیب دی جس میں ایسی احادیث کا انتخاب کیا کہ جن سے انسان اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو۔ کتاب الرقائی فضل الفقراء و عیش النبی صلی اللہ علیہ وسلم باب التوکل و البصر، باب الریاء و السمعة، باب الانذار و التنعیر، کتاب الغتین وغیرہ کے عنوانات احادیث درج کی گئی ہیں۔

تکبیر اولیٰ اور نماز باجماعت

آپ نماز باجماعت کا ہر چیز و کام سے زیادہ اہتمام کرتے اور ہمیشہ تکبیر اولیٰ شریک ہوتے۔ گرمی و سردی کی شدت آپ کو مسجد کی حاضری سے نہیں روکتی تھی۔ بیماری اور فالج کی حالت میں بھی آپ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے رہے اور جب بالکل ہی معذوری و لاچارگی تو البتہ گھر میں نماز پڑھی۔

ایک دفعہ جناب مولانا بخش صاحب سمر و مرکزی وزیر بحالیات آئے اذان ہو چکی تھی تو آپ نے چلتے چلتے ان سے بات چیت کی اس شخص کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے جو حضرت کے روحانی مقام رفیع کا بین ثبوت ہے۔ ایک دن دربار کے بعد ایک شخص علیحدگی میں ملا۔ اور کہنے لگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خواب میں حکم دیا ہے کہ اپنے مکانوں میں سے ایک مکان پر کو دیدل۔ اس کے بعد دو ماہ تک نہ آیا دوبارہ پھر آیا اور یہی کہا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے آپ چل کر مکان و کعبہ لے جائیں دن بعد پھر آیا اور عرض کرنے لگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر پر خطا ہوئے ہیں کہ مجھے سے تمہیں ارشاد میں سمجھتی ہو گئی ہے لہذا آپ کے مکان میں چنانچہ آپ ان کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ اور ایک مکان پسند کر لیا۔ لیکن وہ کچھ مسجد سے دور تھا۔ آپ کو مسجد کو روانہ ہونے میں معانجہ وغیرہ کرنے کبھی دیر لگ جاتی اور رکست رہ جاتی۔ آپ نے اس شخص کو بلایا اور کہا کہ اپنا مکان واپس لے لیں۔ اس نے کہا کہ میں نے آپ کو نبیہ کر دیا ہے آپ جو مرضی کریں پناہ آپ نے وہ مکان بیچ کر جو وہ مکان خضر میں مجھ میں بڑایا۔

اس سلسلے میں آپ کے پیشدر یہ حدیث نظر دھتی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ جو دن کو ہمیشہ روزے رکھتا ہے اور رات کو پیشہ عبادت کرتا ہے مگر جماعت پنجگانہ اور جمعہ کے لیے حاضر نہیں ہوتا کیا اس کو اللہ تعالیٰ پسند کرے؟ حضرت شیخ التفسیر جیدہ جماعت سے پہلے مسجد میں تشریف لائے صف اول میں کھڑے ہوئے۔

مسئل من ریل یعوم النصار و یقوم اللیل ولا یشہد الجماعت ولا الجمعة فقال ہذا من اہل النادر (ترمذی شریف)

کے فرمانبردار بیٹے نے آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کی نغش مبارک کو مہلا دھلا کر گفنانے کے بعد صبح کے وقت دیا اور نماز ظہر کے بعد آپ کا جنازہ اٹھایا گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ذکر دوسری عبادات کے لیے معین و مددگار ہے اس کی کثرت سے ہر عبادت محبوب بن جاتی اور لذت آنے لگتی ہے اور کسی بھی عبادت میں مشقت اور بار نہیں رہتا قرآن پاک میں اس کے

جلسہ ذکر

آیات و اقوال - مثلاً

پس تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا۔
اور البتہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔
خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے قلوب مطمئن ہوتے ہیں۔
اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پس نماز پڑھی۔
اے بندے اپنے دل میں گڑ گڑا کر اللہ کو یاد کیا کر اور غصہ
دشمنی و کینہ سے پاک و صاف دل لائے۔
وہی آواز سے شام و صبح اس کو یاد کیا کر۔ اور غافل لوگو
میں سے نہ ہوتا۔

اسی طرح بے شمار احادیث ذکر کی اہمیت اور فضائل میں بیان ہوئی ہیں جن کا احاطہ دشوار ہے۔ ایک حدیث میں
نہری آیا ہے کہ اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تم کو جنونی کہنے لگیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے
پیغمبر نے فرمایا کہ تم جنت کے باغوں پر گھنٹہ تو خوب سیر ہو کر کھاؤ کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ! جنت کے باغ کیا ہیں؟ فرمایا
ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جن سات آدمیوں کو عرش کا سایہ کر لے گا ان میں ایک وہ ہوگا جو تنہی یاد
کا ذکر کرتا اور روتا ہے۔

جن لوگوں نے ذکر کیا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہوئے انہوں نے ذکر کے فوائد کو اسے نہیں چنانچہ حافظ علیؒ نے
ایک رسالہ ”الاول العیب“ میں ذکر کے متعلق فرمایا کہ ذکر میں سو سے زیادہ فوائد ہیں اور پھر ان کا شمار کیا ہے۔ ان کو پڑھنا ہے تو
ہے کہ یہ فوائد دینی اور دنیاوی کس کسے ہیں بیش نقیب اس کتاب کا مطالعہ کریں یا پھر انوار ولایت حصہ دوم مطبوعہ ”مخام الدین“ میں
فرمائیں ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا ذکر دل کے لیے ایسا ہے جیسا کہ جھل کے لیے پانی۔

حضرت شیخ الغفر نے اپنی زندگی میں اتنا ذکر کیا کہ اگر اس کا ذکر کیا جائے تو سننے والا یقین نہ کرے کہ آیا ایک آدمی ان
ذکر کر سکتا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ حضرت شیخ الغفر نے ایک ایک دن میں کئی اذکار سوا لکھ مرتبہ کئے اور تواتر کیا اس کی
اور اتباع سنت کا اثر تھا کہ آپ کا دل اس قدر پاکیزہ اور معاف ہو چکا تھا کہ اس کی طرقت توجہ ہو کر کثرت حالات کر لیتے تھے
کے لیے آپ نے مجلس ذکر کا اہتمام کیا چنانچہ ہر جمعرات بعد از مغرب مجلس ذکر منعقد ہوتی جس میں حضرت مولانا حاضرین مجلس
اور بعد میں کسی ضروری عنوان پر کتاب و سنت کی روشنی میں خطاب فرماتے ”مخام الدین“ میں ہر ہفتہ آپ کی مجلس ذکر کی بیان
شائع ہوتا رہا اور اب کئی جلدوں میں علیحدہ کتابی صورت میں یہ تقریریں شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت شیخ الغفر کا ایک مہم

نہی کی باقاعدہ نیادی کرتے اور اس کے لیے نوٹس تیار کرتے۔ اور خدام الدین کے اجراء سے لیکر تا وفات آپ کا خطبہ اس طرح ہوتا رہا۔ حضرت کی وفات کے بعد آپ کے جانشین حضرت مولانا عبد اللہ النور دلو معمول باقاعدہ نبھا رہے ہیں اور آپ کو رکھنا اور خطبہ مجدد باقاعدگی سے ہفت روزہ خدام الدین میں شائع ہوتا ہے۔

مولوی حافظ نعیر الدین فرماتے ہیں کہ ایک صحبت میں میں نے ارادہ کیا کہ وقت بخیر مارا گیا ہے اب حضرت کچھ بیان فرمائیں تو اچھا ہے۔ میرے یہ عرض کرنے سے پیشتر ہی فرماتے گئے کہ اللہ والوں کے خاموشی سے بیٹھنا زیادہ بہتر ہے ان کو چشمِ بعیر سے دیکھنا اور اپنے آپ کو دکھانا ہوتا ہے فرمایا میں اپنے حضرت کے پاس گئی بیٹھا کرتا تھا لیکن نہ تو کبھی بات کی تھی اور نہ ہی زانو زین سے اٹھایا تھا اس کے بعد فرمایا حضرت اسے پوری میرے پر نہیں ہیں میں اپنے پیروں کی طرح ان کا ادب کرتا ہوں ان کے پاس جب تک بیٹھتا ہوں نہایت احترام۔ ادب اور خاموشی سے بیٹھتا ہوں جو کہ سلام کیا اور رخصت پر سلام و مصافحہ کیا۔ سح

تفکرات

اسے تقاضے تو جواب ہر سوال

آپ فرمایا کرتے تھے کہ تمام ریاضات کا مقصد یہ ہے کہ دل میں حلا پیدا ہو جائے اور دل کی سنگھیں اللہ پاک کے نام سے من ہو جائیں۔ ظاہر نکھوں کا کیا ہے یہ تو کتوں اور بیلوں کی بھی ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد قرآن پاک کی یہ آیات تلاوت فرماتے۔ ترجمہ کرتے۔

اور ہم نے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور انسان پیدا کئے ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں آتے ہیں لیکن دیکھتے نہیں اور کان ہیں ان سے سنتے نہیں وہ لوگ پیاروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے دی کوٹ داخل ہیں

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا الْجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لِمِ
قُلُوبٍ لَا يَفْقَهُونَ هُدًى مَّا هُمْ آتِينَ وَلَا يُبْصِرُونَ هُدًى مَّا هُمْ آتِينَ
لَا يَسْمَعُونَ هُدًى مَّا هُمْ آتِينَ وَلَا يَسْمَعُونَ هُدًى مَّا هُمْ آتِينَ

مولانا احمد دین مشہد میان علی کا بیان ہے کہ وہ ایک دفعہ سلطان مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سلام کے لیے حاضر ہوئے اور ان سے حضرت لاہوری کی خیر و مافیت پوچھی میں نے عرض کیا کہ باوجود فالج اور وجع المفاصل شبانہ روز مشاغل نہایت تندی سے جاری ہیں کہ شاہ جی مرحوم روئے اور والہانہ انداز میں فرماتے گئے۔

”وارے! سکھ دیا پتا۔ بخاری جیسے کھان سید تیرے قدیاں انوں وار دیواں“

حضرت لاہوریؒ اپنے ہم عصر علماء کا بہت احترام و اکرام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گاڑی میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندہری ساتھ تھے وہ لوٹا کھڑکی کی طرف جانے لگے تو حضرت اٹھ کر کھڑے ہو گئے وجہ انہوں نے دروازہ بند کر دیا تو اپنی جگہ پر بیٹھے جب دروازہ کھلے گا آواز آئی تو دوبارہ فوراً کھڑے ہو کر اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے بیٹھے پر اپنی جگہ پر بیٹھے۔

ایک دفعہ سلطان کسی جگہ فرود گئے تھے۔ اطلاع ملی کہ حضرت سید سلیمان ندویؒ ملنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ وہ نزدیک ہی کسی دوسرے کمرے میں تشریف فرما تھے۔ شیخ التفسیر بہ سن کر نہایت سرعت سے سید صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہو گئے آپ ان کو بار و نظر کا یہ تقاضہ تھا کہ سید صاحب میرے پاس آنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

سلطان بابا چک شہید تحصیل بڑا نوالہ ابتدا سے اپنے بیان کے مطابق چور۔ بد معاش اور بد کردار تھے اور عقیدہ بدعتی تھے۔ حضرت شیخ التفسیر روڈ والا روڈ اسٹیشن پر رہتے تھے۔ ان سے کسی نے کہا کہ ایک بڑے مولوی صاحب آکر ہے انہوں نے منایت بے پردائی کے کہا کہ ہمارے مولویوں سے کیا تعلق؟ اور اس وقت پوری کے کسی پر وگرام کے مطابق بارہ تھے میں گاڑی آگئی اور حضرت حمۃ اللہ علیہ گاڑی سے خود اتر ہوئے۔ سلطان بابا کی نظر حضرت پر پڑی اور وقت طاری ہو گیا کہ پر وگرام ترک کیا اور حضرت کی قیام گاہ پر جا کر بیعت ہو گئے۔ سابعہ گناہوں سے توبہ کی اور اب متشرع صورت نیک مسلمان بن گئے۔

انجمن تہذیب الدین کے مروجہ۔ عبداللہ بیگ برسوں تک سینا گھروں میں ملازمت کرتے رہے فحاشی اور بد معاشی کے پلٹ پڑے۔ ملتان قاسم العلوم کے جلسہ میں شیخ التفسیر کی تقریر بھی عنوان تھا "پاگل بن اور اس کا علاج"۔ آپ نے علامہ فرمایا (۱) تعلیم دیں (۲) رزق حلال (۳) صحبت صالحین۔ بیگ صاحب نے تقریر سن کر سبقت طریق زندگی سے توبہ کی۔ رزق دامن گیر ہوا۔ باوجود مفلسی اور ناداری کے خدا کے دین کی خاطر دو دن جیل گئے۔ قوانین کے نفاذ کے بعد مارشل لا کے دور رہے۔ قذافی نے سختی فافلت کرنے لگے پہلی پیشی میں پیشی ملٹری کورٹ میں کہا گیا کہ بیگ صاحب جانتے ہو کہ اس جرم کی سخت ہوگی تو مجاہدہ جرات سے جواب دیا کہ "میں اسی چیز کی تلاش میں اس جگہ پہنچا ہوں" اپنے اقرباء کو منع کر دیا کہ کوئی ضمانت کا انتظام نہ کرے کہ باہر آکر پھر دہی کام کر دے گا۔ حضرت نے سنا کہ بیگ صاحب جیل میں چلے گئے ہیں تو نہایت سے فرمایا کہ:-

"الحمد للہ بیگ صاحب نے تمام مسلمانوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا اور ساتھ ہی آپ نے اڑھائی سو روپے بیگ صاحب کے بچوں کی خاطر بھیجا؟

بیگ صاحب ریل ٹک ٹیکل تھے اور چودھری عبدالرحمن صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی۔ بیگ صاحب کی آمد پر چودھری صاحب بیارہ تھے حضرت ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو باتوں باتوں میں فرمایا کہ چودھری صاحب اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا کرنا تھا اور آپ کی جگہ کام کرنے کے لیے پہلے سے ہی ایک آدمی بھیج دیا۔ بظاہر حضرت کا یہ ارشاد حیران کن تھا مگر جب بیگ صاحب نے ان کے کام میں اپنی دیانت۔ محنت و انشعادی اور فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا تو حضرت کے ارشاد کا راز سب پر ظاہر ہو گیا۔ قاضی ارمان احمد صاحب مروجہ و مغفوت تحریک ختم نبوت میں شیخ التفسیر کے ساتھ ملتان جیل میں محبوس تھے۔ قاضی صاحب بازو قیام پاکستان سے قبل ٹوٹ گیا تھا جس کے نتیجے میں ان کا ہاتھ منہ تک نہیں جاتا تھا۔ قاضی صاحب کا بیان ہے کہ ملتان میں حضرت نے مجھے حکم دیا کہ تم جماعت کراہک و دایک دن جماعت میں حضرت کی ٹوپی کی نوک میرے پاؤں سے لگی میں نے یوں ہلکا کر دیا کہ میرے پاؤں پر گر پڑا ہے میں نے جماعت کرنا چھوڑ دیا دوسرے دوسرے دن حضرت نے فرمایا کہ قاضی صاحب آپ نماز کا صاحب ہیں نے معذرت کی کہ حضرت اور اچھے اچھے علماء موجود ہیں دوسرے یہ کہ میرا بازو ٹوٹا ہوا ہے اور میں تو منہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سن کر منایت پندارہ شفقت سے میرا بازو پکڑ کر اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرماتے گئے کہ اللہ تعالیٰ تاد رہے۔ وہ ہر مشکل کو اس کے حل سے شفا عطا ہی کی رحمت سے وابستہ ہے۔ قاضی صاحب کہتے ہیں کہ میں رات کو سویا صبح اٹھا تو دو بازو ٹھیک تھے اور میں بلا تکلف دونوں ہاتھوں سے وضو کیا۔

بیمگم سورہ ناری نے مولانا عبداللہ انور کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا واقعہ خود سنایا کہ ان کے پیٹ میں (کفر) پھوڑا تھا۔
 انھوں نے جنت اذیت اور تشویش تھی۔ ایک سرے لیا گیا اور اگلے دن ہسپتال میں دوائے کا انتظام کیا گیا اگلے دن داخلے کے وقت بچے خیال
 میں نظر ناک بیماری میں مبتلا ہوں اور پیش ہو گا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی قد مبسو کے بلند ہسپتال کا مہمان
 رہے۔ حضرت و عافریا میں گئے اللہ تعالیٰ جلد صحت دیں گے یہ خیال کر کے میں حضرت کے ولایت کدہ پر حاضر ہوئی حضرت نے
 شفقت اور مریاء التفات سے میری گزارش سن لی بعد میں میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہونا چاہئے
 ماری بھی اسی کے ہاتھ میں ہے شفا بھی اسی کی جانب ہے۔ بہر حال جب میں بادل خواستہ حضرت سے رخصت ہوئی تو مجھ کو یقین ہو چکا تھا کہ
 اللہ درست ہو چکی ہوں میں نے گھر کا اعلان کر دیا کہ علاج نہیں کرواؤ گی پھر پھر میں ہسپتال نہ گئی شام کو ڈاکٹر صاحب نے میں نے اس کو اپنے
 سے آگاہ کیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا اور کہا کہ علاج اندوں بہتر ہے ذرا مزید بڑھ جائے گا۔ فیصلہ ہوا کہ ایک سرے کرایا جائے۔ ایک سو کے لیا
 فیصلہ لگائی پھوڑے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اور میں پہلے ہی دلی سے تندرست ہو چکی تھی۔

ایک دفعہ ایام حج میں شرکت تہذیب سے نئی میں ہمت لوگ مر گئے مولانا حافظ حبیب اللہ شیخ التفسیر کے بڑے لڑکے کے متعلق
 والدہ کو تشویش ہوئی حضرت نے دیکھ کر انہماک کاربذریعہ تار پتہ کر نیکا فیصلہ ہوا حضرت نے اللہ کی رحمت سے کچھ شرم باطن دیکھا اور فرمایا کہ حافظ
 صاحب باکل صحیح سالم تھے گھر میں باکرہ بیگم کو تسلی دی۔ دونوں کے بعد تار کا جواب آگیا۔ تو حافظ صاحب بخیر و عافیت تھے۔

خواجہ نذیر احمد کا بیان ہے کہ ان کی ترکی ماکو میں تھی۔ اس کی خیریت کی اطلاع میں دیر ہو گئی ہم کو بڑی تشویش تھی حضرت کی خدمت
 میں میں حاضر ہو کر عرض کیا تو آپ نے فرمایا بغض نہ خانی بخیرت ہے خط بھی آجائے گا۔ بعد ازاں میری پریشانی دیکھ کر مزید فرمایا کہ لڑکی بالکل
 درست ہے چار پائی پر آرام کر رہی ہے اور دونوں اس کی ظلال صحت پر ہے۔ حضرت کے ارشاد کے مطابق وہ تین دن کے بعد خیریت نامہ
 آیا۔ اور دوسرا واقعہ بھی تحقیق کرنے پر حریف حضرت صحیح نکلا۔

مولوی احمد دین صاحب ڈوگر (مومن میاں علی) شیخ پورہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوانی حضرت کی خدمت میں آیا اور بیعت کی درخواست
 کی آپ نے فرمایا ابھی کچھ اور سوچ لو پھر دینی کے بعد آیا آپ پھر لڑا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا عزیز! تمرا دل تو مانتا
 نہیں کہ تم کچھ بھڑکی پر میری بیعت ہونا چاہتے ہو۔ یہ سن کر اس نوجوان نے کہا کہ جہاں میں شادی کرنا چاہتا ہوں وہ سب آپ کے مرید ہیں ان کی
 شرط ہے کہ میں آپ کے بیعت ہوں اور۔ تو شرط لیگا۔ پہلے وہ انھی مجھے آپ سے عہدیت نہ تھی مجبوراً آتا تھا مگر اب دل کا یا بدل گئی ہے بچے واسطے تیار
 ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے ہاتھ نہ دیا فرمایا واقعی اب ٹھیک ہے۔

اس طرح کے سینکڑوں واقعات کثرت و کرامت کے اور ہیں جو حضرت کے مکمل سوانح کی کتابوں اور احباب سے مل سکتے ہیں۔ یہ چیزیں
 کثرت و کرامت اور اتباع سنت کی دہرے خود بخود مکمل ہوجاتی ہیں کسی کو زیادہ کمی کو کم۔ لیکن جب کہ اس کتاب کے دوسرے صفحات پر کئی جگہ لکھا گیا۔
 کہ یہ چیزیں مطلوبہ محبوب نہیں ہیں۔ اور ہمارے سلسلہ کے بزرگوں میں ان چیزوں کو وقت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

کشاہدہ پیشانی پر سیما بی انوار کی جھلکیں (من اثر السجود) نازک بھویں۔ خوبصورت آنکھوں میں عارفانہ چمک مناجات
 یعنی مردانہ پردہ جہت و خیر۔ سپید گندی رنگت۔ لب مبارک موزوں۔ دندان مبارک آبدار۔ ریش مبارک فراز

سر ایا و حلیہ

اور سفید عام چہرہ انور کی کیفیت لعلہ انیم کا پتہ دیتی تھی گردن متوسط۔ شانے کشاہدہ۔ چھاتی مبارک پر بالوں کی گیسر بازو اور کلائیوں پر سبز
 مالی میں قدر سے کرد۔ جھیلیاں اور انگلیاں نہایت خرم و نازک۔ پاؤں مبارک قد و قامت کے عین مطابق سر مبارک موزوں۔

سردیوں اور گرمیوں میں کھدک کا پاجامہ۔ کھدک کا کرتہ۔ کھدک کی ٹوپی اور اس پر کھدک کی چار بیچ والی دستارِ فصیلت۔ سردیوں میں رنگ اور کبھی سیاہ رنگ کا چھتر۔ سنیلین جرابیں اور ہمیشہ سرخ چھتر سے کا پاپوش مبارک۔ وقت ضرورت ہاتھ میں عصا۔

اہلِ معیال

الہیہ محترمہ آپ کی عابدہ زادہ والدہ وقت تھیں۔ سرگرم فخری سنتوں اور فرغوں کے درمیان ہمیشہ گیارہ دفعہ نماز اور گیارہ سو مرتبہ یا مٹھنی۔ بعد نماز فجر پانچ یا سات پارے تلاوت قرآن مجید۔ ہر دن بارہ ہزار مرتبہ یا مٹھنی یا غیر یا مٹھنی علاوہ ازیں تمام نمازوں کے بعد تسبیحات۔ ذکر قلبی اور بہت سے معمولات تھے جن میں آپ مشغول رہتی تھیں۔ سرگرم کی بہت بڑی عالمہ تھیں۔ اس کی اجازت انہوں نے حضرت تھانویؒ سے حاصل کی تھی۔ اور آپ کا یہ عمل بڑا با اثر تھا۔ ان معمولات سے سرگرم قلب مطمئنہ رکھتی تھیں۔

مہرور کو فارسی زبان میں خاصی دسترس حاصل تھی۔ امام غزالیؒ کی کیمیا سعادت سے خاص شغف تھا۔ عوام سر میں پوری فہم کیا کرتے۔ مرتبہ روزِ ختم کرتی تھیں۔ شیخ سعدیؒ کا اکثر کلام حفظ تھا۔ مولانا حالیؒ کی کھدک از بر تھی۔ کبر الہ آبادی کے گرشا شعرا یاد تھے۔ آپ نے فارسی علم اخلاق پر ایک کتاب بھی تالیف فرمائی جس کی طباعت نہیں ہوئی۔ حضرت تھانویؒ کی تعانیف اصلاح الرسوم، تعلیم الدین۔ اور ہمیشہ زار بچوں کو پڑھایا۔ فقہی مسائل لوگ زبان تھے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ سے بہت عقیدہ۔ شیخ التفسیر کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ حبیب اللہ مدظلہ قیام پاک وقت سے مدینہ منورہ مقیم ہیں اور آپ نے ہجرت کی نیت کر رکھی ہے۔

مولانا حافظ حبیب اللہ مہاجر مدنی

نوبی میں باب صدیقؒ میں میٹر کر عمری زبان میں درس دیتے ہیں۔ ایامِ حج میں مسجد حرام میں پاک و مہند کے حجاج کو اردو میں درس فخر الہی بہت متواضع۔ منکر المزاج اور صمان نواز ہیں اتنی دیر سے وہاں رہنے کے باوجود کسی سے خاص روابط نہیں پیدا کئے۔

شیخ التفسیر کے ہاشمیں ہیں۔ خطبہ جمعہ مجلس ذکر کا التعمام و انتہام شیخ التفسیر کے معمول۔

مولانا عبید اللہ انور

جمعیت علماء اسلام کے نائب امیر ہیں عقیدت کی کشوں سے ملاقات اور اندرونِ شہر دیروں مہتر یا کتان کے مختلف مقامات پر کھدک کے لیے کٹر تہنیتی دوروں پر رہتے ہیں۔ بہت شہس مقال اور حیا کا محسوس ہیں۔ سرخیان مرجع قسم کے بزرگ ہیں۔ انتہا دور ہر کے عالم ہیں۔ اور آپ کے اس علم و بردباری کی وجہ سے کئی لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اطوار و کردار میں مربیانہ سروت۔ بشریہ و ذہنیہ کے اچھے ہیں پاکیزگیِ فطرت کی جھلک۔ اقرباء و اعزاء میں ہر دلعزیز۔ انبیاء میں محمود و موصوف۔

سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نوجوانی کے عالم میں بڑے عابد و زاهد تھے۔ متقی ہیں۔ نماز باجماعت کا بہت اہتمام رکھتے ہیں۔ والد ماجد کی طرح

مولانا حافظ حمید اللہ صاحب

اور ہاتھ میں بہت بڑا عصا رکھتے ہیں۔ حضرت کے عطا کردہ پروگرام کے مطابق آپ بچوں کو قرآن مجید کا ترجمہ پڑھاتے اور دینی لیتے رہتے ہیں۔ دو بچوں اور چھپوں کے باپ ہیں۔

حضرت شیخ التفسیرؒ کے مکمل حالات معلوم کرنے کے لیے سرگرم من مطبوعہ فیروز سنسٹرا ہور اور انوار ولایت حصہ اول خدام الدین لاہور مطالعہ کی جائیں۔

از ڈاکٹر سید عبداللہ

حضرت مولانا

میں ۱۹۲۰ء میں تعلیم کے لیے لاہور آیا۔ میرے چچا صاحب جن کے ساتھ عاقبت میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ہر روز صبح کے وقت مولانا احمد علی صاحب میرے کمرے میں شریک ہوتے تھے۔ مجھے بھی اپنے کمرے میں لے جاتے تھے۔

کھڑے لباس میں بلوس، لمبا کراٹا، اکھری شلوار، سرکھڑ کی ٹوپی، ایک کبھی کبھی عمامہ۔ لانا تھا۔ جوڑے شانے، ہجر گٹا ہوا۔ داڑھی جو لبہ میں بہت لمبی ہر گنتی اس زمانے میں مناسب مذہب بڑھی ہوئی، قد و قامت، عجب دار و رنگ سا ملا۔ مگر میرے پر بڑی نرالی کیفیت۔ یہ نہیں سکتا تھا کہ دیکھنے والا اس کا جب زہر۔ بات میں نرمی و شفقت، مگر جب بندے میں آتے تو آواز گونج دار ہر جاتی۔

یہ تھے حضرت مولانا احمد علی صاحب جن سے میں لکچر میں رشتہ اس تھا اور آخری دو تک عقیدت کم نہ ہو سکتی پائی۔

حضرت مولانا اعلیٰ کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہاتھ میں رشک آن و حدیث اور دل میں جذبہ جہاد — ان بزرگوں کی پریری کی آرزو رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ میں ہمیشہ ترین ہمت رہے۔ یہ سلاطین و شہداء ولی اللہ صلوٰی سے جا ملتا ہے جن کے خانوادے کے فیض تربیت سے جہاد کا ذوق پیدا کرنا چاہیے۔ ان کی سرمدار جاگیر ہے اور کبھی بنگال میں صحت آ کر رہتے کبھی بکھور کے سامنے یہ سیر پائی ہوئی دیا رہنے کبھی انگریزوں کے سوچوں میں پلپل چادی۔ غرض حضرت مولانا انہیں کیا ہیں صحت شکن کے وارث اور پریتھے۔

مولانا عبداللہ ندوی اس صدی کے بلند پایہ دینی مفکرین میں سے تھے۔ مولانا احمد علی ان کے شاگردان خاص میں سے تھے۔ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں خود ہندوستان سے باہر تھے۔ مگر مولانا احمد علی کی صورت میں ان کے انکار کی مانندگی یہاں برابر برتی رہی۔

مولانا عبداللہ ندوی نے دہلی میں جنگ غلامی سے قبل ایک امارہ نظارۃ العارفین قائم کیا تھا اس کے تین بڑے مراکز تھے۔

اقول : درس قرآن و حدیث

دم : شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیمات کی نشر و اشاعت

سوم : برطانوی استعمار کی مخالفت اور آزادی پسند گروہوں سے تعاون

مولانا احمد علی صاحب نے مرکز لاہور میں بیچے لڑکوں ہی میں اہم مقاصد کی پیش رفت میں مصروف کی۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے زیر اثر ہمیشہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کی تربیت پر نظر رکھتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے خیالات

پہنچیں۔ انہیں اس گروہ سے بلے حادثات بتائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے درس میں شرکت کرنے والی اکثریت۔ اسی جماعت سے متعلق تھی۔ یہ اور بات

اس جماعت کے سلسلے میں مولانا جو توقعات رکھتے تھے۔ وہ کبھی پوری نہ ہوئیں اور نہ ہو سکی تھیں۔ مگر یہ اس وقت اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔

تربیت حلافت ضروری تھی۔ انگریزوں کے خلاف شدید نفرت و حقارت کے جذبات شعلہ ہرچکے تھے اور معاملہ یہاں تک آگیا کہ فرسٹر

یوٹھن نے لڑکوں کی غلامی میں ایک دن بھی سرسزمین ہند میں لبر کریں۔ ہجرت کا فیصلہ ہوا اور ہجرت کرنے والوں میں حضرت مولانا بھی تھے۔ لاہور سے

قلاہیل میں رخصت ہوا۔ تو لاکھوں آدمی ٹیٹن پر ہجرت تھے اور جب اس قافلے نے سرحد پار کی تو لاکھوں آدمی ترک وطن کر چکے تھے۔

افغانستان اس قافلے کی منزل تھی۔۔۔۔۔ مگر کیا منزل تھی؟ اسلام کی حالت زکوٰۃ، دین کی صورت مرخ، دینی حالت ہوتی ہے

غریب جس کو اس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔

ادھر انگریزوں کے زور پر مسلمانوں نے دوسرا بیانیہ لکھا اور کہا کہ یہ لوگ ہندوؤں کے لیے سب کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ ہندوؤں کی چال ہے۔ انگریز

یہ جاسوس سران خان بہادر انگریزوں کے غلط فہم کرنے کی خاطر لکھتے تھے۔ لیکن آزادی کی صفوں میں ختم ہونے کے لیے ذرا فریاد بات کو کھرا وطنیان کہہ کر مسلمانوں کو جگانے اور

درست تھے۔ ہمارے ملک میں ایک سو سال سے یہ دوسرے بہت کامیاب رہے ہیں۔ ذرا مدد سے مسلمانوں کی واحد قدر نفع پرستی ہے۔ یہ انگریزی تعلیم و تعلیمی

متاع اور واحد پیشہ ہے۔ اور اب تو ساری قوم اس میں شریک ہے۔ اسلام کے عقیدے کو ابھی فلسفے کے گہوارے سے نکالنا گیا۔ متاع دنیا ہی حب

تو ہمارے سامنے ہے۔ یہ سب فروشی اور فرائض و سنت کے لیے جان گزاری کون کرے گا؟

بہر صورت ہجرت ناکام ہوئی اور حضرت مولانا بھی لحد ہجرت و مایوس اپنے گرد میں واپس آگئے۔ اور اسی دار الحرب میں رہ کر، کام کو جاری رکھنے کا فیہ

کیا گیا۔

قبلہ سے واپس آکر درس و تدریس کے ان قدیم مسلمانوں کو ہجرت نہ کیا۔ اس مرتبہ میں صحیح علم اور حجة اللہ اللہ کے درس میں شرکت کی۔ میں زیادہ شور و زخم نہ کیا

یہ بات میرے ذہن نشین رہ جاتی تھی کہ میری مثال ان کے سب اوقالی حکمت اور عقلیت سے مرکب ہیں اور دین کے سب احکام ہر ناز میں قابل عمل ہیں۔ بتائے ہر

میں اس کی ہدایت کے مطابق نہ ماننے کی توجہ دینا چاہیے۔

میں ۱۹۲۶ء کے بعد انگریزی تعلیم کے حارے میں داخل ہو گیا۔ فارسی کا ایم۔ اے کو چھاتا اور دینی تعلیم کی آرزو تھی۔ بڑا متصدد رہتا کہ اپنے لیے کتاب

معاش پیدا کر سکوں۔ پھر سچی خیال تھا کہ انگریزی تعلیم کے علم کے لیے جو کچھ ہے۔ اُسے بھی اندر سے دیکھ لوں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت مولانا نے کبھی حاصل

شک کی نہیں کی۔ پہلے تو اس پر غیب رہا۔ مگر ایک واقعہ کے بعد وہ غیب جاتا رہا۔

میں نے جامعہ طبع سے واپس آکر دارالعلوم اسلامی تھی۔ یہ سب سب سے عرصے تک رہا۔ آج کل کے لالوں کے اندر سفید بال دیر سے خیال میں قبل از وقت آگئے تھے

جوانی کے ان شہنوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے بھی ان کا نہ کالا کر کے کی کرش کی۔ مگر یہ دن بڑے سخت جان تھے۔ جھوٹ بسمایا کہ وہ کوہا پنا سفید ہو گا

دیتے تھے۔ کوئی اچھا بے بارا میں نے طحا کے کوکبی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اگرچہ رنگ پری ہے جوانی میری۔ بھ بھی جوانی کا محض خیال ہی بڑا ہی حیات بخش خیال ہے آخر ایک دن سیٹی بڑے سے کالے پٹے ابل سفید کر دیتے۔

واقعہ محنت تھا جنہر شمار سے لیے کہیں ملا کے ملحق سے متزل تھا۔ سب سے زیادہ اذیت یہ تھی کہ اپنے والد ماجد اور اپنے استاد کرم حضرت مرزا کو مدد کس کس کھاؤں گا چنانچہ دوا دراز کا پیچھے چھپانے کی کوشش کی۔ والد صاحب وطن میں تھے۔ اس لیے آسانی رہی۔ مگر حضرت مرزا کا وہ تو نہیں تھے۔ خیرین پھیلن بلکہ پچانی گئیں۔ میری طبی ہوتی۔ میں مال گیا۔ چھٹی ہوتی۔ پھر بہانہ تراش لیا۔ انھوں نے فراست سے اندازہ کر کے طول زیادہ میں سبھا سب کچھ فراموش ہو گیا اور مجھ پر اڑا کہ اب میری داد اور میرا حلیہ تک مجھ پر لگ گیا ہوگا۔

ایک دن ایک مجلس میں پڑا گیا حضرت مرزا اور بیٹے تھے۔ اٹھ کر میرے پاس آگئے ہیں نے کہا۔ تنگ آمد و محنت آؤ۔ مگر نہیں شفقت سے عبوری ہوئی اور آؤں میں لگتی۔

”و میاں عبداللہ شاہ! آپ اپنے مرکز سے کٹ گئے۔ کیا وجہ؟“

پھر خود ہی کہا۔

”دیکھئے سپاہی دو کم کے ہوتے ہیں۔ ایک باوردی۔ دوسرے بے دردی۔“

پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھر کر کہا۔

”ہم باوردی ہیں اور آپ بے دردی اور کج کے دور میں بے دردی سپاہی زیادہ مفید اور کارآمد ہیں۔ آپ اپنے مرکز کو: چھڑیں۔ پھر برہم ہو چڑھا۔“

۔۔۔ بہرنگے کو خواہی جامہ می پرکش

اور ان کی نرمی دل کی گھڑتیں میں اگر گئی اور نہ نہ تکی میں عجیب قسم کی رقت اور عجب قسم کا سکون محسوس ہوا۔ سچ کہا اقبال نے:۔۔

۔۔۔ معائنہ زندگی میں سیرتِ نوالہ چرچا

شبستانِ محبت میں حیر و پریاں ہو جا

حضرت مرزا ان کی باتوں میں عام علما سے مختلف تھے۔ انھوں نے بعض برساتِ زندگی، جدید لوگوں سے اپنائی تھیں۔ سائیکل کی سواری عمر زادہ وقار غالباً کے خلاف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حضرت مرزا اور وقت ضرورت سائیکل سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

وقت کی باقاعدگی میں بے مثال۔ ”مذاہلو و آداب میں بے نظیر، ان میں ڈھیل پان نام کو کبھی نہ تھا۔ سخت کوشی، بجا طلبی میں اپنے استاد کے نقش قدم پر تھے جہاں کے لیے جس قسم کی محنت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار رکھتے تھے۔

حضرت مرزا ایلن عثمان پور سے پہلے تھے۔ مگر مسلمانوں کے اتحاد کے مسئلوں میں، ان کے نظریوں میں بڑی جگہ تھی۔ حزب الامانات کے لوگ انھیں اچھی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر وہ خودی متوہن پر مرزا انید ویا علی شاہ سے بھی جوان درونِ احسان کے شریک تھے۔ مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب پنجاب میں ایک مسلمان وزیر اعظم نے خاکساروں کو ظلم کیا تو حضرت مرزا نے دھڑا بھاڑا احوال کے مسلک کے آدمی تھے، سخت احتجاج کیا اور اس کی پاداش میں غور کر دیتے گئے۔ لیکن حمایت اسلام کے مسئلوں میں جس اس لیے شرکت کر لے تھے کہ یہ بہرین فلاح کی غلامی انہیں ہے۔ اور انہیں کے بعض ارکان کی سولہ جہر سستی کو نظر انداز کر دیتے۔

حضرت مولانا نے سلسل چالیس برس تک قال اللہ و قال الرسول کی شرح روشن رکھی۔ مطالعہ قرآن کی تحریک کو تقویت دی، علم اسرارین روز سے علوم و فرائض کو آگاہ کیا۔ دینی ذوق کے ساتھ مسلمانان کی آرزو یا مسرت کو اپنے پرزور خطبات کے ذریعے مستحکم کیا اور یہ سب کچھ ایسے حالات کے گھر میں بے زری کا بیچارہ رہے مگر فکر و قناعت کو ہمت سے نہ جانے دیا۔ زمانے میں بڑے بڑے لوگ آتے رہیں گے مگر گھر علی کلم پیدا نہیں گئے۔ خدا تبارکی حضرت مولانا کی روح کو اسودہ رکھے اور ان کی برکات کے طفیل ہم پر بھی کرم کرے۔

حضرت شیخ التفسیر رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں خراج عقیدت

بحوالہ ذاکٹر مناظر حسین صاحب نظر

علامہ انور صاحب ری

یہاں نگاہ سے چلتا ہے کاروبارِ حیات زبانِ عشق ہے نادانِ کلام اسے دوست

یہاں سے سلسلہ سخن حضرت اقدس مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ قدس سرہ کی طرف مٹا۔ اور خاندانِ ولی اللہی کا ان الفاظ میں فرمایا :-

”ولی اللہی خاندان میں یہ ادا روزِ اول سے چلی آتی ہے کہ وہ دن کو گھوڑے کے سوار ہوتے ہیں اور رات کو مصلے کی پشت پر بارگاہ رب العزت میں مصروفِ راز و نیاز“

اور ایک سرگاہ کھینچ کر کہا :-

”مولانا کی وفات صدیوں کے دین و عمل کی تاریخ کی موت ہے“

حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ اس دور کے شاہ ولی اللہ مجاہدین میں سید احمد شہید اور تصوف میں امام ربانی مجددِ اہل ثنائی تھے۔

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کے مزار پر انوار کے متعلق کہا :-

اس چھوٹی سی قبر میں جسے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔ یہ اسلامی ثقہ، بصیرت فرآئینہ اور معرفت الہیہ کی پوری تاریخ و فن ہے۔

دلیل اسوۂ پیغمبری کو دیکھا تھا فریقِ تابع قدمِ زندگی کو دیکھا تھا
نہیں ہے کم یہ سعادت میری نظر کیلئے بہت قریب سے احمد علی کو دیکھا تھا

مخدوم الملک حضرت میرزا مفتی محمد حسن انیسوی

۱۳۸۰
۶۱۹۶۱



۱۲۹۵
۶۱۸۶۸

مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

مفتی محمد حسن — تاثرات

یہ محبوبہ فیض و فضل مولانا حسن دیکھا کہ امرتسر میں ہم نے آج اک تھانہ بھون دیکھا
 سنا وہ دس قرآن دل کی آنکھیں کھول دیں جسے معارف ہائے کرائی کا دریا موجزن دیکھا
 شریعت میں طریقت کو طریقت میں حقیقت کو کھلی آنکھوں سے ہر حاضر نے گویا ہم قریں دیکھا
 منادی حرم کا، پھر سنی آواز مستانہ پھر ان آنکھوں سے گویا وہ مدینہ کا چمن دیکھا
 ہزار اک اللہ کہ چشم باز کر دی یا دحق دادی مسلمان را بطرز نو تو دیرینہ سبق دادی
 الہی پھر مسلمانوں میں پیدا ذوق قرآن ہو
 اسی میں انکا بیٹا ہو اسی میں انکا مرنا ہو

عکس تحریر مفتی حسن صاحب

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے اس دارِ بقائی میں ۸۳ برس قیام فرما رہے رہا اور یکم جون ۱۹۶۱ء مطابِ بقیہ
ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ بروز جمعرات ساڑھے بارہ بجے دوپہر محبوب حقیقی کے بلاوے پر دارِ اہل خانہ کو انتقال فرما گئے۔ ہماری
یہاں تاریخ پیدائش کے بارے میں چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا البتہ جب کوئی بڑی عظیم شخصیت اس دنیا سے کوچ کرتی ہے
تو سوانح نگاری کے سلسلہ میں تاریخ پیدائش متنازع ہو سکتے ہیں حضرت سے رہ جاتی ہے کہ کاش تاریخ پیدائش کا پتہ چل جاتا سرسری
حساب سے ظاہر ہے کہ آپ ۱۸۷۴ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے اس سے ایک سال قبل ہندوستان میں ملک و گورنر کے
قبضہ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا گویا کہ انگریز کی سامراجی سیاست کا پکا جواہل ہند کی گردن پر اور بھی زیادہ مضبوطی سے کس کر باندھ
دیا گیا تھا۔ جب کہ انگریزی حکومت اور عیسائی تہذیب کی آمد آمد اور اس کے روز افزوں کے استیلا سے دین کا شیرازہ بکھرنے
کی کوششیں جاری تھیں۔ دینی مدارس کے لئے ایسے پرفتن دور میں علوم اسلامیہ اور قرآن و حدیث کی صحیح تعلیمات کو محفوظ رکھنا
کوئی آسان کام نہ رہا تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ ۱۸۹۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑ چکی تھی اور شاہ ولی الہی دعوت کا کام اس پر
آشوب دور میں جاری ہو چکا تھا۔ یہ ہے اس دور کی دھندلی سی تصویر،

حضرت مفتی صاحب غلام الہک کے فقیدِ واہ کے قریبی گاؤں موضع بل پور میں پیدا ہوئے مشہور تاریخی مقام حسن ابدال ہے
آپ کا گاؤں کوئی سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ جس وادی میں یہ گاؤں واقع ہے اس کو دریا سے ہرو کی وادی کے نام سے یاد کیا جاتا
ہے اس پر سد وادی نے کئی تہذیبیں دیکھی ہیں جن کا ریکارڈ پاس ہی کے آثارِ قدیمہ کے عجائب خانہ واقعہ ٹیکسلا میں محفوظ ہے۔
شمالی ہند میں بدھ تہذیب کا یہ وادی سب سے بڑا مرکز تھی۔ اور قبل مسیح میں روحانی نسیم کے لوگ اس پر فضا وادی میں اپنے چلنے
گانا کرتے تھے۔ سکندر اور پورس کا آمنا سامنا بھی اس وادی میں ہوا تھا گویا کہ یہ علاقہ ہزار ہا نسیم کی اہم روحانی روایات کا
مال ہے اور رب العزت کی بارگاہ میں یہی منظور ہوا کہ حضرت مفتی صاحب نے کو اسی وادی کی مٹی کے خمیر سے قالب عطا فرمایا
ہائے۔

آپ کے والد ماجد حضرت مولانا اللہ داد صاحب مرحوم بھی اپنے وقت کے ایک معروف محدث خادم دین اور اپنے
گرد و نواح میں ایک معزز ہستی اور جانی پہچانی شخصیت تھے۔ اور خاندان کے بیشتر اجداد و افراد بھی دین ہی سے خصوصی تنگ
رکھنے والے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقہ ہی میں پائی۔ قرآن پاک اور ابتدائی فارسی تعلیم موضع سنگ جانی ضلع
داؤلپور میں قاضی محمد نور صاحب سے پائی۔ عربی صرف نحو قاضی گوہر دین موضع کھوڑی ضلع الہک سے اور کھڈ شریف ضلع
الہک کے عربی مدرسہ سے اور علوم عقلیہ یعنی منطق اور فلسفہ کی تعلیم اپنے زمانہ کے ایک بے بدل عالم مولانا محمد معصوم سے
امینڈہ ضلع ہزارہ میں پائی۔ جب مولانا محمد معصوم اتر کر کے مدرسہ غزنیہ میں مدرس مقرر ہوئے تو حضرت مفتی صاحب کو
اپنے پاس ہی بلالیا۔ یہاں پر آپ نے بقیہ علوم مثل تفسیر و حدیث، فقہ و فلسفہ وغیرہ کی پوری تکمیل فرمائی۔ اور دورہ حدیث کیا

طبیعت ابتدا سے ہی مائل بہ تصوف تھی۔ اور اس روحانی ذکاوت کے علاوہ فہمی ذکاوت کا بہرہ دانی بھی عطا ہوا تھا۔ مفتی بھی حد درجہ کے تھے اسباق پر ایسے حاوی ہوتے تھے گویا کہ ان اسباق کے متعلم نہیں بلکہ معلم ہیں ہر بڑا ریفارمر اور مصلح ایک بڑا معلم بھی ہوتا ہے۔ یہی رنگ آپ پر بھی غالب تھا بات کو ذہن نشین کرانے میں اتنے جزئیات بیان فرما جانے کے غلبے سے غبی ہم سبق کو بھی اپنے سبق پر حاوی فرما دیتے۔ ساری عمر معلم رہے اور آپ کا یہ ملکہ آپ کے زندگی کے ہر شعبہ میں بیش بیش نہایت نمایاں طور پر ظاہر و باہر رہتا رہا مجلس میں بھی اور مکتب میں بھی، مجلس درس میں بھی اور مجلس وعظ میں بھی سمجھانے کے بعد پھر فرماتے کہ خوب سمجھ لو۔ کوئی غلط فہمی یا اشکال نہ رہ جائے۔

خوش قسمتی تھی امرتسر میں بھی آپ کو نہایت اعلیٰ درجہ کے ولی اور ولی گرا استاد نصیب ہوئے پہلے استاد حضرت مولانا عبدالحلیم غزنویؒ اپنے زمانہ کے بڑے علیل القدر روحانی بزرگ تھے اسی طرح مولانا نور احمد صاحب جن کے نام کی مناسبت سے امرتسر کی مسجد نور مشہور تھی۔ اور جو حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ سے نہایت قریب نسبت رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی ہی میں حضرت مفتی صاحب کو مسجد نور میں امام و خطیب مقرر فرما دیا تھا۔ اسی طرح تیسرے استاد حضرت مولانا مفتی پیر غلام مصطفیٰ صاحب فاسمیؒ جو ۱۹۳۳ء میں فوت ہوئے نہایت متبحر عالم اعلیٰ درجہ کے معلم اور منجھ ہوئے درویش بزرگ تھے۔ حضرت مولانا بہاؤ الحق صاحب فاسمیؒ انہی کے صاحبزادہ ہیں۔ حضرت مفتی صاحب وطن سے ایسے آئے کہ پھر گویا امرتسر ہی وطن بن گیا۔ لیکن وطن کے ساتھ تعلق کا رنج و طرح قائم رہا۔ چونکہ صلہ رحمی کی رعایت اس کے بدوں محال تھی اور حضرت صلہ رحمی کو جان سے عزیز جانتے تھے۔

سلسلہ میں آپ نے اپنی وصیت میں اپنی اولاد کو فرمایا کہ:-

دہمیرے دو بھائی اس وقت زندہ ہیں ان کا ادب باپ کی طرح کریں۔ اسی طرح آپ نے نکاح کے معاملہ میں بھی صلہ رحمی کی رعایت کرتے ہوئے بڑے بھائی کی بیوہ سے نکاح کرنا قبول کر لیا۔ شوہر کے فوت ہو جانے پر انہوں نے حضرت مفتی صاحب سے درخواست کی تھی کہ اگر آپ مجھے اپنے حرم میں لے لیں تو انشاء اللہ میری اولاد کی ترسہ اچھی ہو جائے گی۔ حضرت نے بھائی کے یتیم بچوں کا خیال فرما کر ان کی درخواست کو قبول فرمایا اور ایسا کرنے میں حرم اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ پر بھی عمل کی توفیق نصیب ہو گئی۔ جوانی میں پہلا نکاح اور بیوہ کے ساتھ۔ بیک تذکرہ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ حضرت نے بیک وقت دو نکاح والی مثال زندگی بھی بسر فرمائی کیونکہ بڑے بھائی صاحب کی بیوہ کو حرم میں لینے سے پہلے حضرت کی نسبت بھی ہو چکی تھی۔ نسبت والا نکاح بعد میں کیا اور وہ بیک کے حرم میں اب بھی بفضلِ تعالیٰ حیات ہیں۔ پہلا حرم عرصہ اٹھارہ سال کا ہوا اللہ کو پیارا ہو چکا گویا اوائل نکاح سے سال کی عمر تک حضرت مفتی صاحب کے دو ہی حرم سچے ہیں بھی سنت کا التزام ہے اور اپنے شیخ طریقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا قدم بقدم اتباع ہے۔ اس وجہ سے بھی حضرت مفتی صاحب کو کافی

کے خصوصی امتیاز کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ امرتسر کو وطن ثانی بنانے کے بعد حضرت کو محسوس ہوا کہ کسی مرد مفتی آگاہ سے اصلاح باطن کے لئے کوئی مخلص مفتی

بھی اور قلمی رابطہ بھی قائم کرنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ بغیر بیعت کے امر تشریف دے اساتذہ کرام کے مرتبہ توجہات کا مورد جتنے رہتے لیکن آپ کے دل کا دلولہ کسی اور ہی ہستی کا تقاضا کر رہا تھا اور بارگاہ ربی سے کسی اور ہی سلسلہ کی کڑی بنایا جانا مقدر تھا۔ اللہ رب العزت کی حکمت کا اقتضاء تھا کہ آپ کو جامع الشاخ اور جامع الاولیاء کے شرف سے نواز کر دنیا کے سامنے پھر حمید و بابرید اور عزالی و داذلی کی یاد تازہ کر دی جائے اس لئے بغیرائے اس درجہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارہ۔۔۔۔۔ آپ کے قلب مبارک میں داعی پیدا ہوا کہ حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ سے نسبت پیدا کی جائے۔ اس وقت آپ درس نظامی سے فراغت حاصل کر چکے تھے بعد ازاں نعاہ میں مدرس تھے اور دینی علوم کے اعلیٰ درجہ کے استاد لیکن علوم دینی کے ساتھ تربیت باطن بھی ضروری تھی۔ جس طرح علوم دینی میں اساتذہ کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنا ضروری ہے۔ بعینہ تربیت باطن کے اعتبار سے بھی کسی ایسے طریق طریقت میں منسلک ہونا ضروریات دین میں سے ہے۔ جس کا سلسلہ حمید اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تک پہنچتا ہو۔ حضرت مفتی صاحب اس اعتبار سے حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سید صاحبہ کلعت اپنی حاضری کا مقصد عرض کر دیا۔ اسی ملاقات میں حضرت حکیم الامتؒ نے تین شرطیں درمیان میں رکھ دیں کہ انہیں پورا کیا جائے تو تعلق قائم ہے۔ پہلی شرط یہ کہ کسی قاری سے فن قرآنہ حاصل کیا جائے دوسری یہ کہ کسی اشافہ الحدیث سے جو حنفی مسلک کا جو دورہ حدیث کیا جائے اور تیسری یہ کہ ہمارے دوست حکیم غلام مصطفیٰ صاحب بجنوریؒ کے اصلاح کا تعلق پیدا کر کے پورے پچیس مرتبہ خط و کتابت کر کے حکیم صاحب موصوف کی طرف سے وہ پورے پچیس خط بھیجے وگرنے ماہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اس ترسیریں مدرسہ غزنی میں دورہ حدیث تو کیا تھا مگر اہل حدیث مسلک کے اساتذہ کے سامنے بیٹھ کر۔ اور حضرت حکیم الامتؒ حضرت مفتی صاحب کا سلسلہ اسناد حنفی مسلک کے علماء کی وساطت سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچانے کے خواہاں تھے چنانچہ تینوں شرطیں حضرت نے دو سال میں پوری فرمادیں۔ دیوبندی حضرت علامہ سید انور شاہ صاحب سے دورہ حدیث کا فیضان حاصل کیا حضرت مولانا قاری کریم بخش صاحب سے فن قرآنہ کی سند حاصل کی اور پورے دو سال میں حکیم غلام مصطفیٰ صاحب سے پچیس خطوں بھی وصول فرمائے۔ بغواتے گہ ہوائے این سفر داری دلا دامن رہبر بحر دلس در ا

بے رفتے ہر کہ شد رادہ عشق مگر گذشت و نہ شد آگاہ عشق

حضرت حکیم الامتؒ کی رہبری اور رفاقت کا شرف عطا ہوا اور آپ کو ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ کو طریقت کے چاروں سلسلوں میں بیعت فرمایا گیا۔ اور آپ نے ایسی سرعت سے اپنے آپ کو بغض تنہا لئے فنا فی الشیخ کے مقام میں پایا کہ کل تین سال کی محنت و ریاضت و تزکیہ نفس پر آپ کو خلعت خلافت عطا فرمادی گئی اور حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے ارشاد ہوا۔

”میرے قلب میں بار بار اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ میں آپ کو تو کلاً علی اللہ تعالیٰ بیعت و تلقین کی اجازت دوں مگر کوئی طالب حق و خواست کرے انکار نہ کریں۔ اور اپنے خاص و دستوں کو اس کی اطلاع کریں

اور محمد کو اپنا پتہ جس سے ڈاک پہنچ سکے لکھ بھیجیں میں اپنی یادداشت میں درج کر لوں گا فقط۔

خلافت ملنے کے بعد آپ بھی خلفاء اور مصلحین امت میں شمار ہونے لگے اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ پھر اپنے شیخ سے وہ مناسبت پیدا ہوئی کہ آخر دم تک اس میں ہر آن برکت ہی ہوتی رہی۔

خلافت کا شرف حاصل ہونے کے بعد حضرت مفتی صاحب کو ۲۷ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۹۳۹ء کو حضرت حکیم الامتؒ نے نائب مسجد حوض والی تھانہ بھون میں دوبارہ بیعت کا شرف بخشا۔ یہ اس موقع کی بات ہے جب ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجر مبارک زیارت کے لئے تھانہ بھون میں لائی زیارت کے بعد حضرت مفتی صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، ماجہ زادہ عبید اللہ صاحب، حضرت مولانا خیر محمد صاحب، سب حضرات کو اس شرف خصوصی سے نوازا گیا۔ چونکہ حضرت مفتی صاحب کو جامع المجددین کے خلیفہ اعظم ہونے کا خصوصی شرف حاصل ہونا تھا آپ کو دورہ حدیث مکرر کا مکلف فرمایا گیا اور بیعت مکرر کے شرف کا امتیاز بخشا گیا۔

حق تقابل کے ان مقرب بندوں اور ہم ایسے خطاکاروں کی زندگی میں یہ فرق ہے کہ ہماری زندگیوں میں دینی امور کا التزام ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور دنیاوی امور میں ایسا انہماک ہوتا ہے کہ گویا کبھی مرے ہی نہیں اور ادھر اللہ والا کا یہ حال ہوتا ہے کہ دینی امور میں جان کو ہر وقت ایسے کپٹائے رکھتے ہیں گویا کہ وہ محض دین کے قیام کیلئے پیدا ہوئے تھے اور دنیا طلبی محض ایک ثانوی اور ادنیٰ حیثیت کی شے رہ جاتی ہے وہ دین کے لئے اور ہم دنیا کے لئے۔ حضرت مفتیؒ کی تمام عمر دین کی خدمت میں گذری دین آپ کا دن رات کا محبوب مشغولہ اور ڈھنچھونا بنا رہا۔ ان کے لئے دین کے لئے لکھ کی غفلت گویا کہ "حسب حقیقی سے بے نیاز ہو جانے کا حکم رکھتی تھی آپ کے سامنے اگر کبھی دین کے بارے میں توں کا اظہار کیا جاتا تو بڑے یقین سے حکم لگاتے کہ دین ملے والے خود مٹ جائیں گے دین بفضل تعالیٰ ہمیشہ قائم رہے گا اور معلوم ہوتا گیا کہ جَاءَ الْحَقُّ وَكَهَىٰ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ ذَهُوًّا" کی تفسیر بیان فرما رہے ہیں۔ فوراً ڈھارس بندھ کر ہم تو دین کے بارے میں قنوطی ہو رہے تھے۔ دین کی تقسیم میں بڑے انوکھے قسم کے مسلمانانہ انداز میں فرماتے کہ دین کی جائز و ناجائز پر ایمان ہے جس سے دنیا بے نیاز ہو رہی ہے اور شریعت کا فائدہ پہلے اپنے اوپر کر و اور بعد میں دوسرے پر، اور حضرت نے شریعت کو اپنی ذات پر نکل الوجہ صادق طور پر وار فرمایا ہوا تھا۔ جنتہ عرس اس دنیا میں قیام دین ہی کے لئے فرمایا۔ بچپن ہی سے دین سیکھنا شروع کر دیا اور پھر جوانی کا سلبانہ نہ بھی دین سیکھنے سکھانے میں گذر بڑھا یا بھی اس دھن میں گذرنا۔ دین سے عشق گویا کہ اندر ب العزت کی فات سے عشق تھا۔ شریعت کے قیام کا اہتمام تھا۔ خلافت ارضی سے مقصود بھی یہی ہے اصلاح طبائع اور انتظام شرائع کا اہتمام جاری رکھا جاتے۔ یہی شریعت کا اہتمام اور یہی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا راز ہے۔ احکام شریعت کا اتباع نصیب مجائے تو قلب میں ایک خاص قوت ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اسے تعلق کا سرخ بڑھتا ہے اور آہستہ آہستہ انسان کو اپنے آپ پر اور اپنے ماحول پر غلبہ دینا شروع ہو جاتا ہے۔

پیاد اللہ کوئی لمبے چوڑے پروگراموں کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کا کام صرف افراد سازی ہوتا ہے وہ مسلمان

مومن ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہوتا ہے صاحب سیرت اور صاحب کردار لوگ تیار کرنا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی سنت اور حضرات اولیائے کرام بھی اسی سنت سے تشک فرمائے رکھتے ہیں۔

انگریز کا زمانہ بڑا پر فتن دور تھا ان فتنوں کے مقابلہ میں دین کی شمع کو روشن رکھنا اولیاء اللہ ہی کے بس کا لوگ تھا اور یہ مسلمان نے اسلاف کی روایات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ہاتھ سے بیٹھتے دین کے تصورات کو عملاً اپنے اطلاق و کردار سے کرتے رہتا ہی خلافت کے قیام کا انتظام کرتے رہتا ہے ورنہ وہ دن دور نہیں تھا کہ مسلمان "گنگا دین" اور "تامادین" کی طرح "دین" اور "وکر دین" بنائے جاتے، شیعہ رسالت کے پروانے باری باری اس سلسلہ کی کڑیاں بنتے رہے اور دین کی دلیل بن رہی اور انشاء اللہ یہ سلسلہ علامات قیامت والی ٹھنڈی ہوا کے چلتے تک چلتا ہی رہے گا۔

دلی اور عالم دین بننے کے بعد اولیاء گری اور علماء سازی کا دور شروع ہوتا ہے۔ درس نظامی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ۱۹۴۷ء تک مدرسہ نعمانیہ میں مدرس رہنے کے ساتھ قرآن حکیم کا درس، ہر روز بعد از صلوٰۃ فجر شروع ہوتا ہے۔ امرتسر کے محضر ہیں کہ حضرت قرآن حکیم کا درس شروع فرمائیے لیکن آپ فرماتے ہیں حضرت حکیم الامتؒ سے اجازت حاصل کرنے بعد ہی یہ مبارک کام شروع ہو سکے گا۔ حضرت حکیم الامتؒ جواب دیتے ہیں کہ ضرور آپ ہی درس شروع کریں خطہ ہے دلی اور کرے گا تو تغیر بالرائے سے کام لے گا اور آپ اسے یہ امر ناممکن ہے یہ محال حضرت حکیم الامتؒ، پسندیدگی کا۔ پھر حضرت نے قرآن حکیم کا درس جو شروع فرمایا تو پورے دس سال میں قرآن حکیم کا پہلا ختم فرمایا۔ درس خاک غلامی درازئی و تازہ ہو رہی تھی۔ خشیت و خضوع کی بارش ہوتی رہتی۔ اور قدردان حضرات چنچیں اور دھڑاں مار مار کر روتے تھے وہ وہ اور اوصاف حل ہونے کے بڑے بڑے بڑا فلسفی حقائق کو اس دلنشیں انداز میں پیش کرنے سے عاجز تھا۔ درس پر آپ نے کبھی بات لینا گوارا نہ فرمایا اور نہ ہی کسی دوسرے رنگ میں کوئی دنیاوی اجر ہی قبول فرمایا۔ اس درس کے لئے حضرت میں کوئی نفیس بات نہیں ہوتی تھی کئی نکات اور اسرار کی باتیں ٹوٹ فرما کر ساتھ سے جلتے اور انہیں دوران میں بیان فرماتے جاتے، یہ سلسلہ مسجد نور میں جاری تھا اور تمام حضرات نور علی نور قسم کے رموز حکم سے اپنے فلوب کو منور کرتے رہتے خوش قسمت یا بزرگ حضرات جنہیں مخلوق خدا کا خالق حقیقی سے رابطہ اور تعلق کا بندھن مضبوط کر دینے کی سعادت نصیب ہوتی ہے وقت اختصار احکام شریعت کی سعادت سے بہرہ ور رہنا اور کسی بھی موقعہ پر دین کے کسی بھی حکم کا ذہن سے دھول نہ ہونے لگنا بڑا قابلِ صد رشک بلند درجہ ہے۔

قریباً اڑتالیس سال تک امرتسر میں اور دس سال تک جامعہ اشرفیہ لاہور میں درس قرآن پاک کا التزام صرف مئذیہ حکم دینے کی بات ہے عملاً اس کام کو ہاتھ میں لیا جاتے تو نفس کو پتہ چل جاتا ہے کہ کیسے بیت رہی ہے۔ بڑے بڑوں کے بارے میں ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی اس وقت تک دم نہیں لیا جس وقت کہ صحت جواب نہیں دے گئی کیا جانا کہ وقت یاد میں ناغہ ہو جاتے۔ وقت کی آپ بڑی قدر فرماتے تھے فرمایا کرتے تھے "کہ وقت کی قدر کرو"۔ مرتے وقت آدمی زمین مان کے خزانے بھی پیش کرے تو ایک منٹ بھی زندگی کا نہیں مل سکے گا۔ آپ اس زندگی کو سراپا رحمت سمجھتے تھے۔ اس میں عمل صالح کا موقعہ نصیب ہوتا ہے جس پر آخرت کی ابدی زندگی کی بنیاد قائم ہوگی

ماہ اور منظر میں نے بھی دیکھا جب کہ حضرت مفتی صاحب غیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ بہ بعد فجر درس قرآن دے رہے تھے۔ (ارد شد)

یہی حال درس و تدریس کا تھا وہ اس سے بھی زیادہ غرجا رہا۔ درس نظامی سے ندرغ ہونے سے بیکر وصال سے تین پہلے تک کوئی ساٹھ سال کا زمانہ ہے۔ درس و تدریس میں آپ خارج از بحث موضوعات کو قطعاً تجز و سبک نہ بننے دیتے تھے تمام تر توجہ متن پر مرکوز فرما کر مہوڑے ہی وقت میں طلباء کو مضمون سبق پر حادی فرمادیتے۔ یہ بات الشاذ کا محدود حکم ہے اور حضرت کے یہاں اس بات کا التزام تمام کر رہا۔ بات سمجھانے میں طالب علم کی جان بن جاتے تھے اتنا شاگرد کے تکلف و محول کا پیدا فرماتا کہ شاگرد کے قلب پر کوئی پر ہیئت اثرات مرتب نہ ہونے پائیں آپ کا ایک خاص کرشمہ تھا اور دورانِ سبق میں کسی وقت پُر مزاج قسم کی بات فرمادینا اکثر نظر آتا تھا جس سے شاگرد سبقت سے اکتانے نہ پاتے تھے آپ نے یوں تہہ بڑوں شاگرد فارغ التحصیل کرائے لیکن صاحب تذکرہ حسن نے کوئی ستر کے قریب ایسے جید علماء کی فہرست دی ہے جو اپنے زمانہ کے قیم وین کہلانے کے مستحق ہیں۔

حق تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب کو جہاں اور نعمتوں سے سرفراز فرمایا وہاں صالح اور دیندار اولاد سے بھی نواز آپ کے وصال کے وقت چھ صاحبزادے اور صاحبزادی عطا شدہ زندہ تھے اور بفضلِ تعالیٰ ایسے نیک اور سعادت مند کہ ایک بزرگ باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھے۔ ان میں سے ماشاء اللہ چار تو حج کے شرف سے بھی مستفیض ہو چکے اور پانچ فران حکیم کے حافظ اور بیشتر علوم و دینی کے مستند باہر، نیک اولاد کا چھوٹا بھی ایک بڑا صدف جاریہ ہے۔ اولاد کو اور حضرت کے حرم کو کیا، سب کو حضرت سے دالہا نہ محبت تھی اور سب کے سب حضرت پر جان دیتے تھے۔ حضرت معاملہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا پورے پورے مصداق تھے۔ خیرکم خیرکم لا ھلک و لا یموت خیرکم لا ھلک۔ بہت کم حضرت کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ جب دو حرم تھے تو دو نو ایک دوسرے پر بھی باہم حضرت پر بھی جان دیتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں فدا داند و واج کی سنت پر عمل کوئی کرتا ہے لیکن جو کرنا ہے۔ عدل و انصاف کی وہ تربیت حاصل کرتا ہے جو دوسروں کے نصیب ہونا محال ہوتی ہے۔ سنت پر عمل تو ہمیشہ ہی باعث برکت ہے جب بھی کوئی کرے اور جہاں بھی کرے البتہ قلب کا مومن ہونا ضروری ہے۔ یہ اولاد کی محبت ہی تو حقی جو آپ اواخرِ زندگانی میں کراچی لے گئے آپ کے صاحبزادگان حج کے سفر پر گئے ہوئے تھے اور آپ ان کے استقبال کے لئے کراچی میں ان کی آمد آمد میں دن گزار رہے تھے۔ ہر بات میں کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے۔ اللہ رب العزت کی یہی منظور تھا کہ اس کراچی کی سرزمین پاک کی گود میں سپرد کیا جائے اور آخری ایام میں کراچی کے بسنے والے فدائی حضرات بھی خدمتِ سعادت سے بہرہ ور ہوں۔

اللہ رب العزت کے ساتھ تعلق رکھنے والے حضرات کی ہر بات میں ایک شانِ محبوبی ہوتی ہے۔ حضرت اکثر ذیال کرتے تھے کہ زحمت زحمت نہیں ہوتی بلکہ رحمت ہوتی ہے اور پھر فرمایا کرتے کہ اللہ رب العزت جس وقت حبیب کوئی بظاہر ناگوار نصرف اپنے کسی بندہ پر فرمائیں اس میں بندہ کے لئے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں رحمتیں ہوتی ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کی حیاتِ طیبہ اس کی حقیقت جاگتی تصویر تھی۔ حضرت کو ۵۸ برس کی عمر میں دائیں پاؤں پر واد انقباض یاد دہانے الفاظ میں ٹیل پاؤں کی بیماری لاحق ہو گئی۔ آپ کے پاؤں میں ایک چھوٹا انگلیا جو بڑھتا بڑھتا اٹھا بڑھ گیا کہ بالآخر ستر سال کی

میں حضرت کو ساری دائیں ٹانگ کو ڈاؤن پڑی۔ یہ پھوڑا بھڑکے چھتہ کی طرح تمام پاؤں پر بڑھتا گیا۔ سخت قسم کا
 دھاک پھوڑا تھا۔ حضرت اس کی بدلہ کی وجہ سے اس کی مرمر پٹی بھی خود ہی فرمالیا کرتے اور نہیں پسند فرماتے تھے کہ
 ان کی وجہ سے کسی کو کھوٹنی بہت بھی اذیت پہنچے۔ بیماری کے لاحق ہونے کی عمر ملاحظہ ہو جب کہ جوانی کے تمام آثار ایک
 کر کے طبیعت سے رخصت ہونے لگتے ہیں۔ حرارت غریزہ رو بہ زوال ہونا شروع ہو جاتی ہے مزاج میں بروقت کا غلبہ
 نہ لگتا ہے اور جب انسان میں فطری طور پر پھوڑا بہت دوسروں سے خدمت حاصل کرنے کا ایک طبعی تقاضا پیدا ہونے
 ہے۔ حضرت ایسے وقت اس مرض کا مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ رب العزت سے تعلق خصوصی میں ڈھیل گوارا
 فرما لیں ضروریہ روزمرہ سرانجام دیتے رہے ہیں مدرسہ نعمانیہ میں تعلیم و تدریس کا فریضہ حسب سابق پورے اہتمام سے
 ہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسجد نور میں درس قرآن پاک بھی جاری ہے۔ فتویٰ نویسی کے فریضہ سے بھی عہدہ برآتی ہو رہی ہے
 طرح عین ۱۹۴۸ء تک ہجرت پاکستان تھے پہلے پورے بارہ سال یہ سلسلہ جاری رہا اور پاؤں کی دردناک کیفیت بڑھتی
 جا رہی ہے ۱۹۴۸ء میں لاہور تشریف لائے آتے ہیں۔ اور مولچند بلڈنگ واقعہ سائیکل مارکیٹ، نیلا گنبد کو مدرسہ
 انیس کے عوض میں الاٹ کر کے جامعہ اشرفیہ قائم فرما دیتے ہیں۔ دین کی دھن میں ایک لمحہ کی بھی غفلت کو ارا نہیں فرمائی۔
 یہ کاروس جہاں پر بھی جاری ہے اور جامعہ اشرفیہ میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری ہے اور پاؤں پٹی سمیت بظاہر
 معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پانچ سیر کا گوشت کا ٹکڑا ہو اور ساتھ ہی پنڈلی بھی لگتی جا رہی ہے۔ حضرت کے چہرہ مبارک
 ہی شہادت اور وہی صباحت ہے اور وہی شکر گزاری ہے صرف زبان کی نہیں بلکہ قلب کی انتہائی گہرائیوں سے ظاہر ہونے
 کی خوشی کی شکر گزاری ہے جو صبر الہوی کا نقشہ پیش کرتی ہوئی آپ کے منتسم لبوں پر آباد کرتی تھی۔ لاہور پہنچ کر بھی چھ
 علاج کا سلسلہ جاری رکھا گیا اور جب تمام ڈاکٹر حضرات جواب دے بیٹھے کہ حضرت اس روگ کا علاج اب ہمارے
 ہاں روگ نہیں رہا اور اب تو خطرہ ہے کہ اگر ران سے ساری ٹانگ مبارک نکال لی گئی تو سارے بدن میں اس کا زہر پھیل
 لے گا تو حضرت ٹانگ کو ران سے کٹا دینے پر رضامند ہو گئے ڈاکٹر حضرات بھی ایسے مخلص شفیق اور جانثار کہ کم
 و کسی مرلین کے نصیب ہوئے ہوں گے۔ ٹانگ کا کٹنا بھی تو امتحان تھا۔ اٹھارہ سال توداء الغیل کا عارضہ ایک
 تھان ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے تمام دینی امور کا اہتمام و انصرام جاری ہے اور عین اس طرح جیسے کہ ایک صحیفہ مند
 صاحب عزیمت بزرگ سے توقع ناممکن ہے۔ ڈاکٹر حضرات کا اصرار ہے کہ کوئی بے ہوش کرنے والی مخدر دوا سے
 حضرت کو بے حس اور بے ہوش بنا دیا جائے اور عمل جراحی شروع کیا جائے۔ ادھر حضرت مفتی صاحب اپنے آپ پر بے ہوشی
 کا طبع طاری کر کے اللہ رب العزت کے ذکر سے غافل رہنا ایک لمحہ بھر کے لئے بھی گوارا نہیں فرماتے اور یہ بھی گوارا نہیں
 لاتے بڑے اپریشن میں بے ہوشی کے عالم ہی میں روح پرواز کر جانا ہے۔ اور اگر اس نے پرواز کرنا ہی ہے تو خواہ مخواہ
 بڑی وقت کلمہ طیب سے محرومی کیوں اذخود مولیٰ جاتے۔ اس لئے جب ڈاکٹر حضرات نے بہت اصرار فرمایا تو ارشاد
 فرمایا کہ آپ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اپنے کام میں لگا ہوں گا۔ بالآخر ڈاکٹر حضرات نے کاٹی جانے والی جگہ کو ایک ٹیکہ
 معمولی سا بے حس کر کے ران مبارک کو اوپر سے کاٹنا شروع کیا پورے ایک گھنٹہ تک یہ عمل جراحی جاری رہا اور جب

ڈاکٹر حضرات فارغ ہو چکے تو حضرت مفتی صاحب نے الحمد للہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ بس میری تو آج عید ہے عید ہی کہ نہ جانے ران کی ہڈی کے کولے سے جہاد کر کے تمام نسوں، پٹھوں، عضلات، اور گوشت کو کاٹنے کے ایک ٹکڑے کے لیے عمل میں اللہ رب العزت نے اس صبر پر اپنی بارگاہ سے کتنے بڑے اور کیسے کیسے رضوانی خزانوں کو دولتوں سے مالا مال فرمایا ہو گا کہ ان کی خوشی میں زخم کی تکلیف ایک بیسج اور لاشے محض تکلیف بن کر رہ گئی ہو گی حضرت فرمایا کرتے تھے کہ بعض دفعہ کٹی ہوئی جگہ پر اتنا شدید زخم کا درد ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے بیک وقت ہزاروں چھریاں سے حملہ کر دیا ہو۔ صاحب تذکرہ حسن کے بیان کے مطابق ایسا صبر ماضی میں تاریخی طور پر صرف دو ہی شخصیتوں سے متوفی ہے۔

ایک تو ہیں حضرت غوث بن زبیر رضی اللہ عنہ، جب وہ خلیفہ عبدالملک کے پاس ملک شام تشریف لے گئے تو ان پر آپ کو کسی زہریلے جانور نے پاؤں پر ڈس دیا۔ زہر کے پھیلنے کا خدشہ لاحق ہوا اور اطباء نے پاؤں کوٹا دینے کا حکم لگا دیا اور ساتھ ہی مشورہ دیا کہ تھوڑی سی شراب پی لی جائے تاکہ جگر میں درد کا احساس کم ہونے پائے اس حادثہ سے عین کم زمانہ پہلے آپ کا جوان بیٹا فوت ہو چکا تھا۔ جس کے صدمہ کا بھی آپ پر بوجھ تھا آپ نے یہ فرماتے ہوئے کہ ”جس مرض میں مجھے صحت کی امید ہو اس کے علاج میں حرام شے سے مدد نہ لوں گا“ پاؤں کو باہوش ہونے کی حالت میں کوٹا دیا۔ اور دوسرا واقعہ ہے امیر عبدالرحمن مرحوم دانی کا بل کا، ڈاکٹر ان کو بے ہوش کر کے جراحی کا عمل کرنا چاہتے تھے جناب امیر نے پوچھا کہ آپریشن کتنے گھنٹے جاری رہے گا جواب ملا کوئی دو گھنٹہ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں دس منٹ امور سلطنت سے غافل رہا تو افغانستان میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ ٹانگ پھیلا دی اور کہا کہ اس کو جس طرح چاہیں چھڑ چھاڑ کر دو۔ مجھے بے ہوش نہ کرو اور پھر آف تک نہ کی۔ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں حضرت مفتی صاحب کے صبر کی داستان بالکل ہی زالی ہے ایک لفظ بھی تو شکایت نہ ٹھکنے پایا اور نہ احساس کرب و اضطراب کی کوئی سی ٹیک ہی ٹھکنے پائی۔ حضرت مگن تھے کہ ”ہر چہ از دوست رسید نکوست“ اور پھر سب سے تعجب کی بات یہ کہ آپریشن اور ایسا لرزہ انگیز آپریشن ستر سال کی عمر میں کرایا جا رہا ہے جبکہ حیوانی قوی قطعاً مضاعف ہو چکے ہوتے ہیں۔ خون صالح کی بجائے کے اھکانات کا کوئی احتمال نہیں اور یہ محض اس لئے کہ زندگی ایک نعمت عظمیٰ ہے ماہرین فن کی رائے کے مطابق اس قیام کا اہتمام فرض ہے۔ اور علاج نہ کرنا قنوط اور نعمت عظمیٰ کا کفران ہے جو نبی آپریشن کی تکلیف سے آفاقہ نصیب ہوا اپنے معمولات یعنی تعلیم و تدریس، درس قرآن پاک، اور فتویٰ نویسی پھر سے شروع فرما دیئے۔ صرف آخری تین سال دوران میں حضرت نے ان معمولات سے چھٹی فرمائی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور اس کے دوران میں حضرت کو دو دفعہ فاک کا حملہ بھی ہوا۔ خون کے دباؤ کی تکلیف بھی رہنے لگی اور آخری ایام میں مرض دیا بیطس بھی آفروزا ہوا۔ لیکن ان تمام عوارض کو فرائض کے مقابلہ میں کبھی کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت جو صلہ اور صبر کے ایک پہاڑ تھے آپریشن کے بعد مصنوعی ٹانگ لگوانے کے لئے جب حضرت سیالکوٹ تشریف لے گئے اور وہاں پر ٹانگ فٹ کرانے کے سلسلہ میں سشن جج میاں عبدالرحمان صاحب جالندھری کی کوٹھی پر مقیم رہے تو کچھ نہ پوچھے ہر طرف رو

دو تہی رہتی تھی۔ زائرین کا تانا لگانا تھا۔ ملک کے مختلف اور دور دراز گوشوں سے لوگ پروانہ دار آرہے تھے۔ اور پڑ و بارِ اشرفیہ کا وہی نمونہ جو جامعہ اشرفیہ لاہور کی بالائی منزل پر دیکھنے میں آتا، وہ سیالکوٹ میں آپ کی عارضی رہائش پر بھی نظر آرہا ہے۔ اور حضرت ہیں کہ باوجود اپنی تمام بدنی کمزوری کے دین کے اسرار و رموز پر کلام فرماتے رہے ہیں۔ بعض اوقات تو آپ کا کلام یہ صورت اختیار کر جاتا کہ گویا آپ تداخل فی البرزخ کے ماتحت کلام فرماتے چلے گئے ہیں۔ عجیب و غریب نکات ہوئے تھے کہ عقل رنگ رہ جاتی تھی۔ لیکن ایک بات جو حضرت میں تھی۔ اور نعت اس کا اظہار قصد نہ ہونے دیتے تھے وہ خرق عادت چیزوں کا حدود و ادوار آپ کا تداخل برزخ اور کشف اب تھے۔ لیکن بعض لوگ بعض باتوں میں خاص ذہن رسا بھی ذورکھتے ہیں۔ بعض زیرک طبع احباب اس بات کو بھابھ کر جاتے تھے ایک دفعہ سیالکوٹ کی مجالس کا ذکر جو آیا تو حضرت کی زبان مبارک سے بے ساختہ نکل گیا کہ وہاں بڑی ہی ہستیاں بیٹھیں۔ ایک مائی صاحبہ آئی تھیں اور میری پشت پیچھے بیٹھی تھیں۔ وہ اللہ رب العزت کے عشق میں بے جاں رہی تھیں۔ کہ جتنی مدت بیٹھی رہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرے پیچھے کوئی تپتا ہوا نور ہے جس کی حرارت اس رُخسے میں پشت اور قلب کو گرم کر رہی ہے۔ اس قسم کی حرارت کا احساس ہر ایک کو محفوظ رہی ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے دارکھ لئے تو حضرت ہی کی ذات تھی۔ اس مجلس میں کئی اور لوگ بھی تھے۔ مگر کسی کو کیا معلوم ہو سکتا تھا، یہ موقع نہیں ہے اس مختصر مضمون میں ایسے واقعات کو بیان کیا جاوے۔ صاحب تذکرہ حسن اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں آپ پر بھی کئی واقعات کا اضافہ فرما رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضرت سنت کے ساتھ شدت کا متک رہنے کے لہذا یہ گوارا نہیں فرماتے تھے خرق عادت امور بیچ میں آجائے ہوں۔ اور پھر دین میں انہی کے باعث کوئی بدعات کا لکھ چل نکلے۔ یہ اہتمام تھا مقتضیات شریعت کے قیام کا اور اپنی ذات کی فحش کرتے رہنے کا :

جامعہ اشرفیہ واقعہ مولچند بلڈ ٹنگ کی جگہ کفایت نہ کرتی تھی۔ اور حضرت کی خواہش تھی کہ کہیں باہر کھلی جگہیں سڑک کے لئے کوئی گناہ عمارت نہ بنایا ہو جائے۔ اللہ رب العزت جیسے اپنے خصوصی بندوں کی دعاؤں کو نہیں لوٹاتے۔ جیسے ہی ان کی تمناؤں کو محجب قبول فرماتے رہتے ہیں۔ تنہا کا پیدا ہونا تھا کہ اسباب کا حرکت میں آتا بھی ظاہر ہو گیا۔ حضرت نے سو کمال یعنی باڈہ ایکڑ زمین کے حصول کا قصد فرمایا سودا ہو گیا۔ سوا لاکھ روپیہ کی ادائیگی کا سوال پیدا ہوا۔ جگہ بہت لینس اور حسب پسند تھی۔ لیکن جامعہ اشرفیہ کے فنڈ میں چند ایک ہزار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور حضرت حاضر فرما رہے تھے۔ مالک زمین نے صرف ایک ماہ کی مہلت دی ہے۔ حضرت کے مخلص خادم الحاج محمد شفیع صاحب مرحوم آپہنچے۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد فرمانے لگے کہ اچھا مہینہ کی فلاں تاریخ تک جتنا روپیہ جمع ہو جائے۔ اس میں باقی ماندہ رقم کی کمی میں پوری کروں گا۔ ایک ہی مہنت کے اندر اللہ رب العزت نے نوے ہزار کا بندوبست کروادیا۔ باقی رقم حاجی صاحب مذکور نے ادا فرمادی۔ اور مدرسہ کے لئے زمین عطا فرمادی گئی۔ پھر سب سے پہلے دانغہ یہ ہوا کہ جامعہ اشرفیہ کی عمارت سے پہلے مسجد کی تعمیر کا کام ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے۔ مسجد کے لئے اتنے بڑے رقبے میں سے موزوں جگہ تلاش کرنا بھی ایک مرحلہ تھا۔ حضرت ہی کے ایک مخلص کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی اور حضور نے خواب میں مسجد کی جگہ بتادین

فرمادی۔ ایسا ہی واقعہ حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا تھا۔ جب اس امر کا تردد ہو رہا تھا کہ دیوبند میں دارالعلوم کے قیام کے لئے کوئی جگہ تجویز کی جائے۔ اور ایسے مبارک واقعات ہمیشہ اللہ رب العزت کی تائید و تائید ہی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ چنانچہ مورخہ ۱۳۸۴ھ کو بروز جمعہ بعد از نماز عصر حضرت کے خلوص کی برکت منگ بنیاد رکھ دیا گیا۔ وہ مبارک اجتماع جو اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔ اللہ رب العزت کی رحمت کا خاص نشان تھا پاک و ہند کے سبھی اکابر اس میں جمع تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب اپنے زمانہ کے اولیاء اللہ میں سے ایک سب سے بڑا برقی مقناطیس ہیں جو جس وقت چاہیں تمام اولیاء اللہ کو اپنے پاس جمع فرالیں۔ اس کی نظیر اپنے زمانہ میں آنکھوں سے اسی کہیں نہیں دیکھی گئی۔

جامعہ اشرفیہ کی نئی عمارت صرف بہانہ ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ کہیں صرف ہاتھ لگا دو دیکھو کہ ہم غیب سے حضور کیلئے متمثل ہوتی ہیں۔ آٹھ دس لاکھ روپیہ کی رقم کا خرچہ کوئی معمولی خرچہ نہیں تھا۔ تو کلاً علی اللہ کام شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے سلسلہ کہیں سے کہیں چلا گیا۔ حضرت کی بڑی خواہش ان جدید عمارت میں جامعہ اشرفیہ کا سالانہ اجلاس منعقد فرمایا کی تھی چنانچہ پھر حضرت نے اپنی حیات مبارکہ کے دوران ہی پانچ سالانہ اجلاس منعقد ہوتے ملاحظہ فرماتے۔

اگر تسرین رہے تو جامعہ نعمانیہ کا قیام فرمایا اور عمارت تعمیر فرمائی۔ پھر لاہور میں ورور فرمایا تو یہاں بھی جامعہ اشرفیہ کی عمارت کا وہ سلسلہ قائم فرمایا کہ تقسیم ہند کے بعد دارالعلوم دیوبند کے متنبہ میں چلے جانے کی کمی کو پورا فرما کر حضرت نانوتوی کی روح کو تسکین کا سامان پوری طرح پیش فرمایا۔ یہ سلسلہ عمارت دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان سے ظہور پتہ چلتا ہے کہ اللہ والوں کی زندگی کن بہتات امور میں کبھی رہتی ہے۔ اور مردانہ دنیا کے طلبکار اپنی خواہشات کے بارے سے اپنے آپ کو کتنا زبوں بناتے رکھتے ہیں

حضرت کے مقام کو بیان کرنا محض ایک صریح جرات ہو گا۔ ایک شخص پہاڑ میں کھڑے کھڑے دوسرے شخص کے بارے میں جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا مختلف النوع کیفیات سے لطف اندوز ہو رہا ہو دوسروں کو کیا تصور دلا سکتا ہے حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد دل حسرت کے آنسو رو کر کہتا ہے کہ وَمَا قَدَرْنَا لَدُنْكَ اس ملامت کا کام کیلئے تذکرہ نگار حضرت ہی موزوں رہیں گے۔

حضرت کی مجلس کا یہ حال تھا کہ وزیر بھی ہوتے تھے اور گورنر بھی کسٹرن بھی اور ڈپٹی کسٹرن بھی علماء بھی صوفیاء بھی مگر سب دم بخود ہو کر حضرت کے ارشادات سنتے رہتے تھے۔ اور سر جھومتے رہتے۔ بعض مرتبہ تو آپ کے پرانے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز بھی تھے مجلس میں حاضر ہوتے۔ حضرت ان پر نگاہ ڈالتے تو کہیں بہت حال کا غلبہ طاری فرماتے اور وہ تندرست مجلس میں استغراق کی حالت میں باریک سی آوازیں ”اوں۔ اوں کرتے تھے یہ کابلین کا حال تھا۔ ہم ایسوں کے لئے سعادت کہاں تھی۔

گفتگو میں اپنی ذات کی نفی کا یہ حال تھا۔ کہ جب بھی کوئی بات شروع فرماتے۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کفران منسوب کر کے فرمایا کرتے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ ہے..... اپنی ذات کا ایسا فقدان جیسے آپ کوئی چیز نہیں

ہیں۔ مخلصین نے عرض کیا کہ حضرت ہم آپ کے ارشادات کو قلم بند نہ کر لیا کریں۔ تو فرمایا کہ حضرت رحمت اللہ
یعنی حضرت اٹھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کی موجودگی میں میری کوئی بات غلط نہ ہو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔
اور پھر ادا خرمی میں یہ بھی معمول تھا۔ کہ کمزوری کے باعث جب حضرت کلام کرنے کی سکت سے عاجز رہتے
تو حضرت اٹھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات پڑھوانے شروع کر دیتے۔ حضرت ہی کے صاحبزادہ حضرت
مولانا عبید اللہ صاحب حضرت کے قریب ہو کر بیٹھ جاتے اور ملفوظات پڑھتے جاتے تھے۔ اور ساتھ
ساتھ بعض دقیق مقامات کی حضرت وضاحت فرماتے جاتے۔ بس جتنا عرصہ بھی حضرت اٹھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے
وصال کے بعد دنیا میں گزارا اسی حال میں گزارا۔ اور فنا فی الشیخ کے مقام کی کمالات کو نہایت مضبوطی کے ساتھ محفوظ
فرماتے رکھا۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ کی علیہ کی بزرگی کا احساس آپ کے نامزد و خلفاء کی ملاقات سے خوب ہوتا
ہے۔ صاحب تذکرہ حسن نے ایسے میں بزرگوں کی ایک فہرست دی ہے۔ جن کو حضرت نے اپنے آخری
سفر کراچی کی روانگی سے دو دن پہلے اپنے معتمد خاص حضرت پیر جی عبداللطیف کے سپرد فرمایا تھا۔ حضرت
نے سپرد بھی ایسے ہی انداز میں فرمایا۔ گویا پھر لاہور تشریف نہ لائیں گے۔ اور حضرت پیر جی کے دل میں یہ بات
اسی وقت ٹٹک گئی تھی۔ یہ بیسوں کے میں بزرگ اپنی اپنی جگہ روشنی کا مینار ہیں۔ اور اہل سنت مسلمہ کے لئے ہدایت
درمہنامی کا سرچشمہ ہیں ان میں سے کسی ایک کی کچھ عرصہ کی ملاقات اور صحبت یہ واضح کر دے گی کہ حضرت نے ان
بزرگوں کو تیار فرما کر امت مسلمہ پر کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔ ان میں سے ہر ایک محبت الہی کی آگ میں جل رہا
ہے۔ اور اپنے اثرات کو اپنے ماحول پر غالب کر رہا ہے۔ ”شفیدہ کہ بود مانند دیدہ“ والا معاملہ ہے۔

حضرت کے وصایا کا جائزہ لیا جائے تو ہم اہل بیتوں میں سے صرف ایک صاحب جو نفس دین سے متعلق نہیں رکھتی
لیکن صلہ رحمی کے اعتبار سے وہ جزو دین ہے۔ اور وہ وہی اپنے دونوں بھائیوں کے متعلق کہہ کر میری اولاد میرے
بعد ان کا ادب ایسا کریں جیسا باپ کا۔ تو گیا حضرت کا تعلق صرف دین ہی سے تھا۔ دنیا کے ساتھ دنیا کی خواہش
کے اعتبار سے مطلق نہ تھا۔ اور یہی حالت آپ کے بیسوں خلیفوں کی ہے۔ ان میں سے ایک صاحب جو جوفانی کے
ایام میں رحلت فرما گئے ہیں ان کا نام نامی تھا۔ مولانا حفیظ الرحمن صاحب جو وزیر آباد میں غلامنڈی کے آرائشی تھے
ان میں سے ہر کوئی دین کے لئے ایسے ہی سرگرداں تھے جیسا خود حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہو کر نہ تھے۔ اور یہی
زندگی کی سب سے بڑی فائز المرامی ہو کر رہے۔ کہ جو آگ اپنے کو لگی ہو وہ آگ اس دنیا سے رخصت ہونے
سے پیشتر میں اور کو لگا دی جاتے۔ تاکہ دین کا کام میں لگا اور چمکنا شروع ہو جائے۔

کراچی کا آخری سفر بھی یاد ہی رہے گا۔ حضرت جانا بھی چاہتے ہیں اور نہیں بھی۔ لیکن مشیت ربی پوری
وقت سے کارفرما ہو رہی ہے۔ دونوں صاحبزادگان کو جو حج کے لئے تشریف لے جا چکے تھے دل میں ان کے استقبال
کا شوق بھی ہے۔ اور نہیں بھی جانا چاہتے۔ جب ڈاکٹر حضرات فتویٰ لگا دیتے ہیں کہ حضرت ہوائی جہاز کا سفر

ختیار فرما سکتے ہیں۔ تو عجیب حسرت بھرے انداز میں فرماتے ہیں ”اچھا اب ہمیں کوئی یہاں پر رکھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اب کراچی جانا ہی پڑے گا“ جیسے مشیت الہی کے سامنے اپنی کوئی تدبیر نہ چل سکی اور مشیت الہی کے مقتضیات کا ادراک بھی ہو چکا ہو۔

اور پھر جب ایئر پورٹ والوں کی گاڑی کے اندر ہوائی جہاز میں سوار ہونے کے لئے تشریف لے چکے اور صاحبزادہ عبدالرحمن پھینچے پیچھے چلنے لگے تو حضرت نے صاحبزادہ صاحب کو قریب بلا کر چار پانچ مرتبہ تکرار کے ساتھ فرمایا کہ ”اچھا عبدالرحمن سب کچھ اللہ کے حوالے مدرسہ بھی اللہ کے حوالے الفاظ خود زبان حال پکار رہے تھے۔ کہ حضرت کے یہ الفاظ آخری سپرد داری تھی۔ جو اللہ رب العزت کے حضور میں عرض فرمایا کہ رنگ میں گزار رہے تھے۔ گویا بظاہر مخاطب طبعی تقاضا کے تحت صاحبزادہ صاحب سے ہر دم متعارف حضرت کوئی تین روز تو کراچی میں بہت خوش عرش رہے۔ چند احباب سے ملاقات بھی نصیب ہوئی۔ لیکن چونکہ روزِ اچانک ساڑھے دس بجے قلب کی حالت دگرگوں ہونے لگی۔ اور ساڑھے بارہ بجے حضرت نے اس عالم فانی سے کوچ کیا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

وفات: آپ کی وفات یکم جون ۱۹۶۱ء بروز جمعرات ساڑھے بارہ بجے محترم میاں جناب نور محمد صاحب برکات کے مکان پر واقع ہوئی۔ میاں نور محمد صاحب آپ کے ان بیس خلفاء میں سے ہیں جن کا ذکر اوپر آچینا ہے۔ حضرت اگرچہ تشریف لے جا چکے ہیں۔ لیکن آپ نے جس پاکیزہ مشن کے لئے اپنی حیات طیبہ وقف فرمائے رکھی وہ مشن بفضلہ تعالیٰ پوری رونی اور برکت سے جاری ہے اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ دین جاری رہے گا۔ البتہ اس سے غنا رکھنے والے مٹتے رہیں گے۔

وَكَلِمَةُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلَیَّۃُ

تاریخ وفات وَاَذْكُرُكَ کَثِیْرًا وَّسَبِّحْ

۱۹۶۱ء

لوح مرزا

تاریخ وفات و سبب

پول مفتی محمد حسن رخت بست
روان شد برائے جہانے دگر
بجائے گشتہ تیغِ تسلیم شد
کہ از غیب بیان ہر زمانے دگر
بگفتم یہ یک مصرع تاریخ و سبب
بدست آمدہ صنعت خوب تر

ز روئے بشنارت بگوا مصطفیٰ

تشیعش محمد، حسن راہبر

۶۸+۲ = ۱۳ - ۱۳۸۰ھ

امام الهند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۶۶ھ
۶۱۹۵۸



۱۳۰۵ھ
۶۱۸۸۸

عکس تحریر مولانا آزاد

دہلی ۱ - فروری ۱۹۴۷ء

عزیز میر

اسو۔ سنا خط ابھی ملا۔ اپنی صحت کا

کی نشاؤں گہے از دست و گاہے از دل و گاہے ز باہام

برعت پیردہ دے عمر! ہی ترسم کہ دامن

سہ صبح کر آخر جا رہے ہوں غائب ہوں۔ کو ملکیت دار ہوں اور

شیدائگی کے لیے رہا ہوں جو جاؤں اس لیے بقیم فارم ملکیت کر کے رہے

۵۔ یا ۶۔ کو دے دیں پیچھوٹا تو مل جائیگا۔ دینا چاہیے وغیرہ

۷۔ رہاؤں آؤں گے وہاں ایک بچے سے جاؤں گے۔ ہمارے جاز کے نوکروں کے

خصوصیت یہ ہے کہ ادھر بہ اچھا نام ملے گا کہ ہے۔ کان بکارت

اپنے انکھیں پیردہ کیوں کے ساتھ عام کرنا لگتی ہیں۔

میردہ صبح کال کا میرا ڈیڑھ رشتہ

لکھنؤ

ابوالکلام آزاد

دہرا دہن، گورادنگ، ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں، کنبائی چہرہ، سفید چھوٹی ڈاڑھی، آواز سریلی اور بلند، مزاج میں تکنت اور وقار طبیعت شوخی اور ظرافت، دہلی کے رہنے والے ہیں، ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں مگر پیری مریدی کے زیادہ دلدلادہ نہیں ہیں، قوم سید، پیشہ آزادی اور نیا دہی، حافظہ کی قوت بے مثال تصور کی حالت چوٹی کی ناک اور پیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی تقریر و تحریر کے خود بخود بادشاہ نازک مزاجی میں نانا مشاقت دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔

پیر دہنی ہند کے مسلمانوں میں اور امریکیوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور یورپین تاریخ سوچتے ہیں کہ ان کو یورپین کیوں کر ثابت کیا جائے، اگر چہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں تاہم ظاہر داری مندو کاہری سے بیزار ہیں مسلمانوں میں اگر کوئی گاندھی جی ہو سکے تو ابوالکلام ہوتے بلکہ سر اسٹیفن ہارڈن کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب لے ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش میں، جواہر لال لورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیونکہ جوں میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ نئے زمانے کی سیاست میں یہ گناہ کبیرہ ہے صرف مولانا ابوالکلام آزاد چالیس کروڑ باشندوں میں ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود بھی سمجھتے ہیں اور اس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور مسکا کر ایک نیکیا سیاسی نشتر حرلیں کے ماتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انگلش آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

قرآن مجید پر الیا عبور ہے اور اس کے مفاد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصروف شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش مند ہاتھ ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ مشعل نے میں مسز ناہرہ سردوی کے مکان پر انہوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ کچھ مختصراً بانٹیں منظر میں یہ راستہ شائستہ شریک مسلم لیگ گویا ہم ۴ سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آج کل ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوئی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعہ کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔ اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم پر مقبول ہو گئے سوائے ان کے جو انکی بادشاہی کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھیں۔ بہر حال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان کیلئے سیاسی سوچ ہیں اور سیاسی چاند ہیں ان کی سیاسی چراغ بھی کبھی کبھار مسکا تھا اگر دوسرے سیاسی چراغ بھی روشن کر سکتے تھے کیونکہ انکی مثال نظر نہیں آتی بلکہ ہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی میں مگر مزاج کی شوخی اور دلربائی کسی سے کم نہ کہ اب تک لو جہان اور زندہ دل جہان ہیں۔

شریف الحسن ناظم لکھنوی

بچپن، تعلیم اور صحافت

ولادت

حضرت مولانا ستمبر ۱۸۸۸ء میں ممبہ مظفر میں پیدا ہوئے۔ عجب اتفاق ہے کہ وہی سرزمین وادی گنگ و جمن کے کامن سکون ولادت بنی جس کی رفعت و عظمت کا ایک سزا دامن عصمت خلیل سے ملتا ہے اور دوسرا اس چوکہ ختم ہوتا ہے جس کی بندی کی حد انسان کے خیالی فہم کی رسائی سے باہر اور مقامِ دہلی فتیلا کے قریب ہے خاک مکہ سے ابوالکلام کو پیدا کرنا ان لوگوں کے لیے مشیت کا ایک تازیانہِ عبرت و درس تھا جو عہدِ حاضر میں اسلام کے خلاف ابھریں کی سنتوں کو تازہ کر رہے تھے۔ لیکن نگاہِ قدرت نے ابوالکلام کی ولادت کے لیے وہی سرزمین انتخاب کی جس پر کلامِ ناز نے نطقِ جہالت کو شکست دی تھی اور دوزخِ نشتِ منیر و نکر کو سیر و سیراب کیا تھا۔

تاریخی نام

امام الہند کا تاریخی نام فیروز بہت رکھا گیا اور مصرع ذیل سے جبری سال استخراج کیا گیا۔

جوان بخت ، جوان طالع ، جوان بار

ہندوستان کا سفر

سات آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آ گئے اور اسی زمانہ میں آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

بسم اللہ کی رسم شیخ عبداللہ مردار نے صبحِ حرم میں ادا کرائی اور قرآن شریف اپنی مثالہ سے پڑھا جو بڑی خوش آوازی سے کرتے تھے۔ اور اچھی طرح کھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مگر مظفر کی روانگی سے قبل قرآن پاک ختم کر لیا تھا، اور حرم کے سب سے بڑے قاری شیخ بن سے قرأت سیکھ رہے تھے کہ اتنے میں ہندوستان کا سفر پیش آ گیا۔

ابتدائی تعلیم

مشرقی علوم کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا خیر الدین سے حاصل کی، ابتدائی معاتوں میں دلی کے ایک فاضل مولوی محمد علی اور مولوی عبداللہ خیر آبادی کے ایک شاگرد مولوی نذیر الحسن مرحوم امیہ شوی کا نام بھی شامل ہے۔ لیکن تحصیلِ علم کا مقصد اور خود حضرت مولانا کے والد تھے۔ تھوڑے دنوں تک مولانا ہدایت اللہ جو پوری کے ایک ممتاز شاگرد مولوی محمد ابراہیم اور ایک باسکی پرانی دکنی شخص مولوی محمد عمر کے علاوہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مدرس دوم شمس العلماء مولانا سادات حسین مرحوم سے بھی حضرت مولانا کو کتب درسیہ پڑھنے کا اتفاق ہوا لیکن اس وقت کے بڑے بڑے علماء سے تحصیلِ علم نہ کر سکے کے بارہ میں مولانا طبعِ آبادی نے ”آزاد کی کہانی خود ان کی زبان میں جو حقائق حضرت مولانا کی زبان سے بیان کی ہیں ان میں سے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ حضرت مولانا کے والد کو علمائے وقت سے عام طور پر مذہبی سوچ و عقائد کی بے گمانی تھی اور یہ ڈرتھا کہ ان کی اولاد پر مذہب کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ دوسری شکل یہ تھی کہ علمی حیثیت سے بھی حضرت مولانا کے والد کی طبیعت ایسی بلندی و اتار تھی کہ کوئی بھی عالم و فاضل شخص ان کی نگاہ میں نہ جیتا تھا۔ خود طرح طرح کے مشاغل جاری کر رکھے تھے۔ اس لیے پورا وقت ان کا مشغول تھا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ ہر طرح کی مالی فراغت و بے نگہی کے باوجود حضرت مولانا بہترین علماء اور نامور درسگاہوں سے تحصیلِ علم نہ کر سکے۔

حضرت مولانا کے والد کی زندگی چونکہ زندگی و عظمت اور خواہم پر ان کے عزیز معمولی اثر سے مرکب تھی۔ لہذا قدرتی طور پر بچوں کی زندگی بھی اسی سانچہ میں ڈھل گئی اور طبیعتی طور پر کھیل کود کے جذبات اس قدر

بچپن میں شوق مطالعہ

انگئے تھے کہ ان کی جگہ قبل از وقت سنبیدگی نے لے لی، کتابیں کھلونا بن گئیں، اور مطالعہ کیمیل کو دے جذبات پر غالب آگیا، چنانچہ دس برس کی عمر میں حضرت مولانا کو کتابوں کا اتنا شوق ہو گیا تھا کہ ناستے کے جو پیلے ملتے تھے ان کو جمع کیا کرتے تھے اور ان سے کتابیں خرید لیتے تھے، لیکن حضرت مولانا کے والد، اردو کتابوں کا مطالعہ چونکہ سخت تعلیمی و بدینی تصور کرتے۔ لہذا اس جرم کا از کتاب کو ضرور دیکھا گیا لیکن مخفی طور پر، چنانچہ حضرت مولانا اپنے بڑے بچے کی طرح کتابیں دیکھتے اور موم بنی جلا کر مطالعہ کرتے۔ اکثر ایک ایک دو دو بجے رات تک مشغولیت رہتی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا کی محنت اور اسی وقت سے فوڑ آئے، لگا جب یہ راز کھلا کہ درسی کتابوں کے علاوہ حضرت مولانا اور کتابیں بھی دیکھا کرتے ہیں تو حضرت مولانا کے والد نے سختی سے مانع ہوئے اور ان کی نگرانی کرنے لگے۔

دووی تعلیم | اردو مکمل نظر ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن حروف تہجی کی مشق کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوا۔ مگر پینچ کر جب حضرت مولانا کے والد نے تعلیم کی طرف توجہ کی تو فارسی اور عربی شروع ہو گئی اور دو کا مطالعہ بالکل رہ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اردو پڑھنے شروع ہو گیا۔ کچھ قصبے حضرت مولانا کی بڑی بہن کے پاس تھے اور ایک مجبورہ پرانی شہر کی شہزادی کا تھاجس میں ابراہیم بن ادیم وغیرہ کے فوج تھے وہ پڑھتی تھیں اور حضرت مولانا سرفتے تھے۔ اس سے زیادہ شوق ہوا اور پھر وہ ان کے پاس زیادہ بیٹھنے لگے اور اردو پڑھنے لگے۔ اس کے بعد بطور خود پڑھنا شروع کیا اور دیکھنے بھی لگے۔ اس طرح آہستہ آہستہ استعداد حاصل ہوتی گئی۔

شاعری کا شوق | اسی زمانہ میں حضرت مولانا کو شاعری کا بھی شوق ہوا اور پہلے اردو شعر فارسی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں اب حیات، حیات سعدی، یادگار غالب اور شعراء کے کلیات و دوادیں کا مطالعہ کیا اور پہلی غزل جو حضرت مولانا نے لکھ کر دوسروں کو سنائی، کلکتہ کے مشہور مشاہیر اس طرح میں تھی۔

”پوچھی آسمان کی تو کی آسمان کی“

عبدالواحد خاں نے یہ غزل مشاعرہ میں بھی پڑھی جن کی تحریک پر حضرت مولانا کو شاعری کی طرف توجہ ہوئی تھی۔ اس وقت تک کوئی مخلص نہیں لکھا تھا۔ عبدالواحد خاں نے ”آزاد“ مخلص بن کر کیا، اور سب سے پہلی غزل ارغمان فرخ میں شائع ہوئی جو بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں گھنٹوں سے دو گھنٹے علاوہ ”پیام یار“ کے نکلنے تھے۔ ایک لڑکا صاحب غور شید مرحوم کا انتخاب دوسرا منشی زبیر رائے نظر کا مفرد لکھ کر انتخاب غور شید مرحوم کی ثقافت و شہرت کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول تھا۔ ان دونوں میں بالاتریم حضرت مولانا کی غزلیں ہر ماہ چھپتی تھیں اور ہر ماہ مشاعروں کی دینیوں میں ہوتی تھیں۔

اصلاح سخن کی مزدورت محسوس ہوئی تو پہلے دو غزلیں خوشی امیر احمد مرحوم کو بھیجیں اور انہوں نے اصلاح کر کے ڈراوا بھیج دیں۔ لیکن حضرت مولانا کی طبیعت کچھ زیادہ خوش اور مطمئن نہیں ہوئی اور پھر سب شاعری کے متعلق مولوی ظفر احسن شوق دینی کی کتابیں پڑھنے کا خیال ہوا تو حضرت مولانا نے ان سے خط و کتابت کی اور اصلاح لینا شروع کر دیا۔

زیرنگ عالم کا اجرا | اب شاعری کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ایک گلدستہ نکالنے کا خیال ہوا اور زیرنگ عالم کے نام سے ایک گلدستہ جاری کر دیا جہاں ہفت ماہ جاری رہا یہیں سے حضرت مولانا کی اخبار نویسی کا آغاز ہوا شاعری کے لئے شوق کی ہمیں کے لیے شروع کی گئی۔

وقتِ بیانیہ

بیان کی قوت اور گویائی کا جو شے کچھ فطرت نے عطا کیا تھا اور کچھ ورثہ میں ملا تھا، یہ دو آتش تھا، جس کے سرور نے مرید و متفقہ بلکہ حضرت مولانا کے اساتذہ کو بھی سہوت و متحیر کر دیا تھا، چنانچہ مولوی نذیر الحسن مرحوم نے جو حضرت کو درس دیتے تھے، التزام کر لیا تھا کہ کسی طالب علم کو اپنے ساتھ نہ لاتے تھے، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کا سچا و غیرت ان کے دوسرے طلباء ظاہر نہ ہو، البتہ یہ مرید تھا کہ غیر معمولی طور پر اپنی کم سن میں حضرت مولانا کا ان کتابوں کو پڑھنا، ان پر تقریر کرنا اور اپنے اعتراضات سے لاجواب کرنا کے دل پر شائق نہیں کرنا تھا بلکہ ایک خاص دلچسپی پیدا کر دیتا تھا۔

عمر میں شبہ

حضرت مولانا کی معلومات اور وقتِ بیانیہ جب اساتذہ کو متحیر کر دیتی تھی تو لوگ حضرت مولانا کی عمر کے بارہ میں شبہ ظاہر کرتے تھے، ”عمر کی مشکل“ کے زیر عنوان مولانا علیح آبادی نے ”آزادی کی کہانی خود ان کی زبان“ میں لکھا ہے کہ ”لوگوں میں ہوں جس زمانہ کا میں حال بیان کر رہا ہوں اس زمانے میں میرے اساتذہ نے میرے والد مرحوم تک سے جرات کر کے پوچھ لیا۔ انہو یہ بھی کہہ دیا کہ اس کا نام نیر و زنجبخت تاریخ ہے لیکن مولوی نذیر الحسن، مولوی محمد ابراہیم وغیرہ نے کبھی تسلیم نہیں کیا وہ ہمیشہ ہنسنے اور کہنے کو تیار کم سے کم اعشارہ انیس برس کی ہے لیکن بوسے ہو بڑے دکھائی نہیں دیتے“

اسی زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب (مرحوم) سے ملاقات ہو کر قی تھی اور وہ کہتے تھے کہ تمہاری عمر ۲۵ برس کی ہے، مولوی ظہیر الحسن جن سے میں نے شاعری میں اصلاح لینے شروع کی تھی عرصہ کی خط و کتابت اور معائنہ کلام کے بعد جب گلند آئے اور اشیش پر میں ان سے مکان تک راستہ بھر دے بائیکل گم سم ہے، اور بار بار اس طرح پوچھتے رہے گویا ان کو بھی اس میں شک ہے کہ جو کلام میں ان کو سمجھتا ہوں وہ سب کلام کسی اور کا لکھا ہوا ہے لیکن جب وہ دو چار دن رہے اور ہر طرح کی گفتگو اور مباحثہ میرے سنے اور اسی زمانہ میں ایک مختصر مشاعرہ بھی ترتیب پایا میں خود انہوں نے ذہن پر کے وقت مصرع طرح مجھے دیا اور مغرب تک میں نے اکتائیں شعر لکھ کر انہیں دیئے تب ان کی بدگمانی تو دور ہو گئی مگر یہ باقی رہا۔“

”مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۷ء میں سب سے پہلے ملے، میں ملا جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک ادھر ادھر باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا ”تواہ الکلام آپ کے والدین“ میں نے کہا میں میں خود ہوں“ ۱۹۰۷ء میں جب یہ وقت آئی تھی تو ۱۹۰۹ء سے کہ ۱۹۱۰ء تک اس بارہ میں میری پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے (آزادی کی کہانی خود ان کی زبان)“

اسی زمانہ میں حضرت مولانا نے جب محمد حسین آزاد، سر سید خاں، اور دوسرے جدید مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا تو روش خیالی میں اضافہ اور حضرت مولانا نے امام غزالی ابن رشد اور دوسرے فلسفیوں کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا اور علم و حکمت کی طلب و جستجو میں طبیعت ہر وقت سرگرم رہنے لگی۔ اگرچہ خود حضرت مولانا اپنی اس زمانہ کی حالت کو مذہبی بے اعتنائی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن شاید اسی بے اعتنائی کا دوسرا ناسبہ جستجو اور تنقید و تحقیق ہے۔

ترکی، فارسی اور عربی

تحریر و تقریر کے شوق اور مطالعہ کے ذوق کے ساتھ بالکمال شغفیتوں کا تعارف بھی حضرت مولانا کی شہرہ و نامور ذہنی و فکری انقلاب کی تکمیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتا رہا، چنانچہ آزادی کی کہانی خود ترکی، فارسی اور عربی کے بالکمال استاد و مرزا محمد حسین اور شیخ الرئیس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ آخر لکھ کر فارسی عربی اور قدیم معقولہ

یہ فکیر تھے، عربی میں نفیس و دلینے پر مجبور کرتے تھے اور حضرت علی کے خطبات پنج البلاغہ کی انہوں نے ایک بے نظیر شرح لکھی تھی شیخ ابوالکلام نے بھی بہت شوق تھا، نجوم، دہل، اجزاء، حروفیات اور کیمیائے قدیم میں کافی دخل رکھتے تھے۔ اسی ذوق کی وجہ سے انہیں علم معادن اور بے شمار کے بارہ میں نیز مختلف مشغل اور انقلاب عناصر کے تعلیمات میں بہت دخل بہم ہو گیا تھا۔ شیخ ابوالکلام سے حضرت مولانا نے ان علوم میں استفادہ کیا تھا۔

ان ہی ایام میں ایک اور مفید صحبت میر آبی جو حضرت مولانا کی تعلیمی زندگی میں بے اثر نہیں کہی جاسکتی، ایران کے فاضل اور نئے علوم سائنس نے آشنا اور نئے طریق تحقیق و فکر کا ذوق رکھنے والے مرزا فرحت شیرازی اسی زمانہ میں بمبئی آئے تھے۔ انہوں نے اگرچہ ایران کی نئی کتابوں میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ایک جرمنی مشن کے ساتھ آثار قدیمہ ایران کی تحقیقات کرنے کی وجہ سے انہوں نے جرمنی، فرانسیسی اور برٹش زبانوں کے علاوہ نئے علوم اور خیالات میں بھی باہمی واقفیت بہم پہنچانی تھی، حضرت مولانا نے ان سے استفادہ کیا، فارسی ادبیات میں دوسرے علوم میں بھی حضرت مولانا کو ان سے نہایت قیمتی فوائد حاصل ہوئے۔ چنانچہ مولانا طبع آبادی کی کتاب آزاد کی کافی خود ان کی زبان مرزا فرحت شیرازی کا تہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے مولانا کو نہایت قیمتی واقفیت بہم پہنچائی۔ اور دساتیر ان سے سبقتا چڑھی۔ قدیم ایرانی زبان و علوم باورسوم اور مصطلحات کے بارہ میں ان سے وہ نکات حاصل ہوئے جو لغت و ادب کے لیے نہایت قیمتی ہیں۔ فارسی اور سنسکرت کے کے نظریہ کے وہ بھی حامی تھے اور اس بارہ میں جوئے نظریات مقبول ہوئے ان کا بڑی شدت سے رد کرتے رہے اور اس بارہ میں ان نے بہت مواد جمع کیا تھا۔

مولانا فرماتے تھے ۱۔ ”میرے پاس ان کی دی ہوئی بہت قیمتی اور یادگار اشیاء ہیں مثلاً ان کے قلمی نقشے اور نقاد پر تخت جغدیہ کا نقشہ حاکم اصول مند۔ کے مطابق انہوں نے تیار کیا تھا۔ قدیم فارسی کتب کے متعلق ان سے مجھے نہایت قیمتی اطلاعات ملیں۔ ان کے طبعان جانے کے بعد بھی برابر خط و کتابت جاری رہی اور ان کے توسط سے مجھے وہاں کثرت کتابیں ملتی رہیں۔

تقریباً اسی زمانہ میں حضرت مولانا کو ترکی زبان سیکھنے کا بھی موقع ملا اگرچہ اس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ایک بہت قابل ترک طاهر کرب حریفانہ کے گلیے پڑے اور حضرت مولانا نے اپنے یہاں ان کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ سات آٹھ مہینے تک یہ وہیں رہے اور اس کے بعد قسطنطنیہ پہنچے گئے۔ ان کی صحبت سے بھی حضرت مولانا کو بہت سے تعلیمی فوائد حاصل ہوئے۔ ان کے خیالات بالکل فلسفیانہ تھے اور حضرت مولانا اس بات پر حیرت مندی ہوئی تھی کہ وہ تمام مذہبی مباحث میں بے بنیاد ہی خیالات رکھتے تھے اور ان کے اثبات کے لیے بعینہ وہی دلائل لاتے تھے جو خیال کے اصلاح پسند مہند و نشان میں ظاہر کر چکے تھے، یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ ایک ہی جیسے حالات میں ایک ہی طرح کے خیالات پیدا ہوا ایک قدر مشترک ہے جو تمام ملکوں اور قوموں میں یکساں طور پر ظہور میں آئی ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ حضرت مولانا خود بھی سرسید مرحوم کے فلسفہ میں دلچسپی رکھتے تھے اس لیے متوقع طور پر حضرت مولانا ان کی فکر کرنے لگے۔ ترکوں کے حالات، ترکی ادب، ترکی شاعری کے قدیم و جدید دور، شاہ میرادوبوں اور نئی سیاسی جماعتوں کے نظریات اور طریق کار کے متعلق بہت سی مفید باتیں حضرت مولانا کو طاهر کرب سے معلوم ہوئیں اور ان کے حل کر بہت کام آئیں۔

سرسید کی تصنیفات کے مطالعہ نے نہ صرف علوم جدیدہ سے آشنا کیا بلکہ نئے علوم کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ یہ شوق پیدا ہوا کہ اردو، فارسی اور عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں انہیں بھی کیا جائے اور شوق کتابوں کا شوق

اس قدر بڑھا کہ ہر شام اور لبنان سے بھی علوم مدیدہ کی کتابیں منگاتے گئے۔ کئی کتب خانے بھی ہاتھ لگے جتن میں ایک کتب خانہ سلیم عبدالرحیم دہلوی جن کے انشغال کے بعد ان کی بیوہ نے اسے فروخت کر دیا تھا۔ اور دوسرا کتب خانہ مولوی کبیر الدین مالک اردو گائیڈ پریس گلشن کا تھا جو مولانا نے غرضیکہ اس طرح کتابوں کا شوق بڑھا اور برابر مطالعہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں جب حضرت مولانا بی بی بی بی گئے اور کچھ عرصہ تک مستقل تو یہاں شرق کتب کے لئے زیادہ بہتر مواقع میسر آئے۔ یوں کہ یہاں کئی ایرانیوں کی کتابوں کی دکانیں تھیں اور مصری مطبعات کے بھی کتب خانے تھے جن کے سے مطالعہ اور انتساب کتب کا بہترین موقع ملا۔ اتفاق سے ایک صاحب ذوق شخص نے اسی زمانہ میں کتابوں کی تجارت شروع کی تھی اس کا نام عبد جنتیک تھا۔ عربی ادب کی خود بھی اچھی استعداد رکھتا تھا۔ اور عربی میں شعر کہتا تھا۔ انہوں نے شیخ امین نامی معروف قسطنطنیہ کے ایک تاجر کے ساتھ شراکت کی تجارت کے لئے شرکت بھی کر لی۔ ان کے یہاں علوم و فنون کی بے نظیر کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ نئی قسم کی تصانیف کا حضرت مولانا کے تعلیمی جہد کے اس دکان کا دوسرا حصہ بن گیا۔ یہاں حضرت مولانا گھنٹوں اس دکان میں رہتے اور ہر علم و فن کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے اور پھر اس حالت کے مطابق جتنی کتابیں خرید سکتے خرید لیتے۔ حضرت مولانا نے اعتراف کیا ہے ان کی تعلیمی زندگی پر عبداللہ کا یہ ایک احسان ہے۔

تخریر و تقریر اور ترجمہ جو حضرت مولانا نے ترجمہ کیا وہ علامہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں عبد کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

طرح ۱۹۰۱ء میں تقریر و تقریر کے ذوق کی ترویج و ترقی کے لیے مولوی رضا علی دشت نے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام انجمن الاسلام تھا۔ اس سے پہلے ایک باقاعدہ گچہ کی صورت میں حضرت مولانا کو دیں اتفاق ہوا۔ حضرت مولانا کا سب سے پہلا مضمون کب اور کس اخبار میں شائع اس بارہ میں کوئی قطعی بات اگرچہ نہیں کہی جاسکتی لیکن گمان غالب یہ ہے کہ حضرت مولانا کا پہلا مضمون جو شائع ہوا قدیم اقوام کی عیسیت رسوم سے متعلق تھا جو حضرت مولانا نے قسطنطنیہ کے فارسی رسالہ سے اخذ کیا تھا۔ اسی زمانہ میں مدوۃ العمار کے مبادیات شروع ہوئے اور ندوہ اور مخالفین ندوہ کے متنازعی کمپ قائم ہو گئے۔ ساتھ ہی رسائی و مضامین بھی شائع ہونے لگے۔ ندوہ کے سفر میں ایک شخص مولوی نظام الدین جھیری تھے۔ وہ مخالفین کے رسائی و مضامین حضرت مولانا کو دکھا کر ان کے جوابات لکھواتے تھے اور پھر ندوہ کی استقبال گئی تھی۔ چنانچہ کہ شائع کر دیتی تھی۔ اس قسم کے دو تین چھوٹے چھوٹے رسائل شائع ہوئے اور غالباً انہی رسائل کے بعد نئی قسم کی چیزوں میں یہ پہلا شائع تھا جس کی اشاعت نہایت کثرت آئی۔

عربی اخبارات کا مطالعہ عربی اخبارات کے مطالعہ نے عالم اسلامی کے مسائل سے پوری اور گہری دلچسپی پیدا کر لی؟

غالباً انی علاقہ کی وجہ سے پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی۔ یہ دلچسپی اس کے بعد بڑھ گئی۔ عالم اسلامی کے حالات و مباحث کا مطالعہ کرنے لگے کہ شاید ہی ہندوستان میں اور انھیں کو اس کثرت کے ساتھ مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔

یہی زمانہ ہے جب حضرت مولانا نے عالم اسلام کی سیر کی اور مصر میں کچھ عرصہ قیام کیا لیکن یہ روایت درست نہیں ہے کہ انہوں نے قاہرہ کی مشہور درسگاہ جامعہ الازہر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس مشہور روایت کے متعلق پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا تھا کہ آج کل ان کے بارے میں ایک غلطی کی تفسیر کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ یہ غلطی اس سرکاری ریزومیشن میں بھی ہے جو مولانا کی وفات کے

جامعہ الازہر میں تعلیم نہیں پائی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس مشہور روایت کے متعلق پارلیمنٹ میں یہ بیان دیا تھا کہ آج کل ان کے بارے میں ایک غلطی کی تفسیر کرنا چاہتا ہوں جو مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ یہ غلطی اس سرکاری ریزومیشن میں بھی ہے جو مولانا کی وفات کے

اری ہوا ہے۔

عام طور پر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ مولانا نے قاہرہ کی الازہر یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ گئے تھے لیکن انہوں نے وہاں تعلیم نہیں پائی لیکن وہ کئی برس تک عرب میں رہے وہ وہیں پیدا ہوئے اور دوسرے مغربی ایشیائے ممالک میں وہ مصر بھی گئے تھے۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مملکت و موانع کے باوجود علم کے شوق نے طفولیت ہی سے ساندہ دیا تھا اور ابتلائی سے علم کی رفتار کچھ ایسی تھی کہ بالائی خاص خیال و تشہیر کے حضرت مولانا تحصیل علم میں مصروف رہے اور یکے بعد دیگرے حصول علم کی نئی نئی باتیں اور مطالعہ مولانا کا طبع مشتعل بن گیا۔ تحصیل علم کی اس دھن میں بلاشبہ حضرت مولانا کی خاندانی حالت، نسلی توارث، آبائی روایات

نسلی ماحول کو بہت کچھ دخل ہے جس میں حضرت مولانا کے والد کا وہ غیر معمولی تشدد بھی شامل کر دینا چاہیے جو اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں کیا گیا اور جس نے انہیں کھلبلی کر رکھا ہے نہ وہی لیکن حضرت مولانا خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ طبیت ثانیہ جو خاندانی ریاست و پیشوائی کی اور انسانوں کی پرستش سے پیدا ہو گئی۔ اس کی غیر مسخر طاقت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اگر اللہ کا فضل و کرم دستگیری نہ کرتا اور خود نہ مولانا کو وہ ذہنی و فکری بحران نہ پیش آتا جو ایک زمانہ میں مرض اور دوسرے زمانہ میں شفا کا ذریعہ بنا تو یہ علم و حکمت کے اس سمندر میں حضرت کی ذہنی بر بادلوں کا نہ جانے کیا حال ہو تا جس میں ناخدا کی امداد کے بغیر ساحل مقصود پالے کے لیے شناوری کر رہے تھے۔

نیاز فتح پوری کہتے ہیں :-

بے نظیر صحافت

لاڈلہ چارج سے ایک بار کسی نے پوچھا ”صحافی بننے کے لیے ایک انسان کو کیا کیا جانا چاہیئے؟“ انہوں نے جواب دیا ”سب کچھ اور کچھ نہیں“ یعنی صحافی دراصل وہ ہے جو دنیا کی تمام باتوں کو جانے لیکن ماہر کسی کا نہ ہو۔ لیکن مولانا بے غریب خصوصیت تھے کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور جو کچھ جانتے تھے ماہرانہ حیثیت سے جانتے تھے یہ ایسی خصوصیت تھی جس کی نظر دینا نہ صرف مشکل بل سختی ہے۔

نیاز فتح پوری مولانا کی صحافت کو محمد یاسر کی اصطلاحی اور تکنیکی صحافت سے بہت مختلف قرار دیتے ہیں ”اتنی مختلف کہ اگر ہم اسے بدلتے تو کسی اور چیز سے تعبیر کریں تو خوبا بہر تقریب غلط نہ ہوگی۔ موصوف کی راتے میں مولانا کی صحافت خود ان کی صحافت تھی جسے خواندوں نے ایجاد اور جو انہیں کے ساتھ ختم ہوئی اور جس کی تشکیل متعدد عناصر سے ہوئی تھی جس میں ایک بڑا بڑا دست محمد علی قزوینی قوت حافظہ تھی۔“

صحافتی زندگی کی ابتداء ایک ہوئی ”تاریخ کا تعین اگرچہ دشوار ہے لیکن مولانا ملیح آبادی کی تالیف ”آزاد کی کہانی“ خود ان کی زبانی ”میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاعری کے ذوق میں حضرت مولانا نے

صحافت کی ابتداء

بڑے پہلا رسالہ ”ذہنی نگ عالم“ جاری کیا تھا جو پچاس روپے کے مختصر سرمایہ سے ان کی ادارت میں آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ ”العباس“ ”تحدید“ ”ندم نگ نظر“ ”احسن الاخبار“ ”رسالہ مخزن“ ”الذود“ ”اخبار وکیل“ اور ”گلستانہ“ ”حفۃ دارا“ ”اخبار دار السلطنت“ حضرت مولانا کی صحافتی زندگی کے ابتدائی عنوان تھے جن میں نہ صرف یہ کہ مولانا نے مضامین لکھے بلکہ ان میں سے الذود، اخبار وکیل اور ”ندم نگ نظر“ کے مدیر بنی اور ان کے علاوہ بھی انجام دیئے لیکن عنوانات کی اس فہرست میں سزا مہ کی جگہ ”الصدق“ کو ماحصل ہے جسے حضرت مولانا کی صحافتی زندگی کا ”غائب“ سہیل دینا چاہیے جسے حضرت مولانا نے خود جاری کیا۔ ”الصدق“ پہلا رسالہ تھا جس نے حضرت مولانا کی صحافتی و علمی عظمت کو شمار کے طبقہ میں منظر دار شہیلی اور حالی جیسے ادیبوں اور دانشوروں نے محسوس کیا کہ علم و ادب اور صحافت و سیاست کے امتزاج پر ایک نیا ستارہ جلوات ہو رہا

ہے جو خواص و عوام کی زندگی کے تاریک گوشوں میں اچلا پیلا گئے گا اور زندگی کی نئی سحر کا پیام دے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ لسان الصدق جس فضا اور ماحول میں رہ کر جاری کیا گیا تھا وہ حضرت مولانا کے لیے بہت تنگ تھی اور بہت سی باتیں تھیں جنہیں وہ زیادہ کھل کر کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکے تھے لیکن اس کے بندھنوں کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ ان باتوں کے کہنے کے لیے حضرت مولانا کھل کر کہنا چاہتے تھے۔ فضا نامساو گار اور ماحول تنگ تھا بلکہ اس کی دوسری وجہ عراق کا سفر بھی ہے جو ایسے حالات میں کیا جوناگزیر تھے۔

الندوہ کی ادارت

لسان الصدق کا سکھ اہل علم کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا، چنانچہ جب مولانا شبلی کی قدر شناس نگاہوں کی ادارت کے لیے حضرت مولانا کو منتخب کیا اور ان کے اصرار پر حضرت مولانا نے الندوہ کی ادارت ہاتھ میں لی تو فضا دوسری تھی، ماحول کچھ اور تھا لیکن یہ فضا اور ماحول بھی مولانا کو نہ صحابا کیونکہ ایک طرف بدعیمانِ فضل و کمال کی حاسدانہ راز متیں اور دوسری جانب اہل سیاست کی سازشیں جو ندوہ اور اہل ندوہ سے حضرت مولانا کی پیاری کاسبب بن گئیں، اور سات اٹھ ماہ کے بعد ہی واپس چلے گئے تاہم اس دورِ ناخوشگوار میں بھی انہوں نے الندوہ کو جس بلندی پر پہنچایا وہ ”الندوہ“ کا دورِ زین کلمات ہے اور نیا نفع پوری کے ”معاذ عوام کا نہیں بلکہ خواص کا تھا اور خواص کی بھی جماعت علما کا، لیکن مولانا نے انہیں بھی اپنی انفرادیت کا اعتراف کرنا نہیں چھوڑا۔“

اخبار وکیل

اسی زمانہ میں شیخ غلام محمد مرحوم امرتسر سے ایک اخبار نکالتے تھے جس کا نام وکیل تھا۔ حضرت مولانا بھی گاہ گاہ مضامین لکھتے تھے، مگر وہ شیخ غلام محمد مرحوم کا خط آیا کہ عائد علی صدیقی جو اس وقت ایڈیٹر تھے اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے گئے۔ کوئی ایڈیٹر نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ آجائے۔ اگر آپ آجائیں تو میں اخبار بالکل آپ کے سپرد کر دوں جس میں پوری آزادی اپنے خیالات ظاہر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شرکت کر کے حضرت مولانا امرتسر گئے اور محض عارضہ طور اخبار کی ترتیب شروع کر دی مگر اس کے بعد طبیعت کبھی شروع ہو گئی جس کی وجہ غالباً اس کے سوا کچھ نہیں کہ ”وکیل“ اس وقت کے امر اخبارات میں سب سے زیادہ متین و سنجیدہ اور قومی مسائل میں صاحبِ رائے و نظر اخبار تسلیم کیا جاتا تھا اور متعدد معاملات میں اس کے واقعہ درجہ بھی نمایاں کر دکھایا تھا۔

اخبار دار السلطنت

وکیل کی ادارت کے زمانہ میں حضرت مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابوالفرح انتقال ہو گئے مولانا غریب علی علیہ السلام نے اپنے دل برداشتہ ہو گئے اور والد کے اصرار پر کلکتہ واپس چلے گئے۔ یہاں کچھ عرصہ تک اخبار دار السلطنت کا شنفدر رہا، لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ اخبار کے مالک مرحوم عبداللطیف دوسرے لوگوں کے اغراض سے متاثر ہو کر اخبار کی پالیسی میں بدلتے ہیں تو حضرت مولانا نے اخبار سے علیحدگی اختیار کر لی اور پھر اخبار ہی بند ہو گیا۔

اخبار وکیل سے علیحدگی

آٹھ نو ماہ بعد پھر وکیل ہاتھ میں لیا، لیکن اتنے عرصے میں بہت سی باتوں میں تیزی پیدا ہو گئی تھی اور اخبارات کی تیز رفتاری کے سلسلہ پوری سرعت کے ساتھ جاری تھا اس مرتبہ حضرت مولانا کے سیاسی خیالات خاصہ مسائل ہند کے متعلق وہ تبدیلی ہوئی جس نے آگے چل کر حضرت مولانا کے ”عبداللہ“ کے مسلک کی طرف رہنمائی کی۔ شیخ غلام محمد مرحوم نے ان خیالات سے نہ تو اتفاق ہو سکتے تھے اور نہ سمجھ سکتے تھے لہذا نو دس ماہ کے بعد حضرت مولانا پھر دل برداشتہ ہو گئے اور امرتسر سے واپس چلے گئے۔

اس زمانہ میں حضرت مولانا نے یہ رائے قائم کی کہ جو مفاد صدا بپیش نظر ہیں وہ اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک ایک طاقتور
یعنی انتظام و انتہام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پگڑیاں نہ ہو۔

۱۹۲۱ء کے موسم گرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں حضرت مولانا کی چشم بیداری نے یہ خواب دیکھا
"اور کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی غمش اور ولوں کی شورش
یہ مضطرب رکھا اور یاس و فطوط کا ہجوم بار بار حوصلہ و عزم پر غالب آ گیا۔ یہاں تک کہ سلاسل میں اس خواب عزیز کی تعبیر ملی اور الملک عالم
ان آیا جس کی خصوصیات سے آج ہر شخص واقف ہے۔"

نیا درخ پوری لکھتے ہیں کہ "مولانا نے الملک بہت سوچ سمجھ کر جاری کیا تھا اور ملک کے حالات کے
منہایت عاشر مطالعہ کا نتیجہ تھا وہ یہ فیصلہ تو الملک کے اجراء سے قبل ہی کر چکے تھے کہ ملک کو آزاد ہونا چاہیے
لیکن اس کے ساتھ وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہ تھے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور یہ وہ راہ ہے
جو شرط اول قدم ان ست کو عبور یا باشتی۔ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ملک میں اجتماعی حیثیت سے ایک عام و مشترک جذبہ
نہ پیدا نہ ہو۔ مذہب و ملت کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے حصول مقصود ممکن نہیں۔ لیکن ملک کی آئندہ سیاست کا جو نقشہ ان کے سامنے
نکلتا تھا یہ تھا کہ تعبیر سے پہلے عمل تخریب سے کام لیا جائے کیونکہ مولانا کا نظریہ یہ تھا کہ جب کوئی ڈھانچہ اتنا بگڑ جائے کہ اس کی اصلاح و
تعمیر نہ ہو تو ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ کو توڑا جائے اور پھر از سر نو تعمیر کی جائے۔ وہ پرانے مٹے ہوئے نقوش اور کچھ خطوط
کے تائل نہ تھے بلکہ وہ ان کو شاکر نئی و داغ بیل پر عمارت قائم کرنے کے قابل تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب ذہن انسانی رسوم و روایات سے اس
کے افکار ہو جائے کہ اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو بہتر صورت یہی ہے کہ پہلے اس کے پرانے نقوش کو مٹایا جائے اور ذہن و دماغ کو سادہ
اس پر دوسرے نقوش قائم کئے جائیں۔

قاضی عبدالغفار مرحوم آثار ابوالکلام میں لکھتے ہیں "مولانا کی ذہنی جوانی کا سب سے زیادہ موثر مظاہرہ الملک تھا جس کی
اشاعت کے وقت تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا پس منظر کم و بیش وہی تھا جس کا نقشہ سرسید احمد نے
ملک کی جنگ آزادی کے بعد بنایا تھا اور یہی وہ زمانہ تھا جب تقسیم کرو اور حکومت کرو کا سرکاری مسلک اپنے ارتقار کی منزل میں طے کر رہا تھا۔
یہی زمانہ میں مسلم لیگ کی پیدائش ہوئی۔

امامی افکار میں انقلاب
الملک نے اپنی مختصر زندگی میں عوامی افکار کے ایسے نقشے بنا دیئے جو نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی
اہمیت رکھتے تھے اور اس نے تعلیم یافتہ گروہ سے زیادہ مسلم عوام کے لیے دلپذیر تھے، الملک
مملکت پر بعض اہم قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آتے رہے جنہوں نے ملت اسلامی کے ذہنی نقوش کو باہل بدل دیا ان مباحث میں
الاقوام مسفرین و مشکلیں کے طریق استدلال سے ہٹ کر اپنی اجتہادی قوت کو اس طرح واضح کرتے تھے کہ ہر قدم پر انہوں نے تنقید جادہ کی
تاریکیوں اور منافات صاف فرمایا کہ دنیا کی کوئی تہذیبی صداقت بھی ایسی نہیں ہے جس کے پیرو اس کا دروازہ آگے کی تعمیل بخشنے کے لیے بند نہ کریں
بلکہ ہر تہذیب کی کوئی قدر نہیں ہے جو تمام لوگ جو حقیقت و صداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی کوئی بات منوانی
اور اس کی کوئی بات گرانی چاہتے ہیں طریق "جہل" پر عامل ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اس ڈھونڈھ میں گئے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوانی

دس، مذہب عالم کے پرچوش حامیوں، مذہبی مجالس کے زبان دہانہ مناروں اور مذہبی بحث و نظر کے بنائے ہوئے نام نہاد علوم میں دسترس والوں کا غالب حصہ اسی طریقِ بدل کی پیداوار ہے۔۔۔ مذہب کی تعلیم اور پیروانِ مذہب کا فہم و عمل دو مختلف چیزیں ہو گئی ہیں چیزیں ہیں۔

پہنڈت نہرو کی رائے

بقول پنڈت نہرو (ڈسکوری آف انڈیا) مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الملال میں مسلمان نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ مخاطب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور سرسید، حسن الملک، منیر احمد اور حاکمی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کوئی نہ جھونکا ان تک پہنچا ہی تھا۔ الملال مسلمانوں کے کسی کتبِ خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو رہا تھا وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا سلسلہ ذہن وقت تک بیگانہ تھا۔

مولانا نے قدامت پرستی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا، لیکن یہ خطِ مستقیم نہیں بلکہ ایسے انکار کی اشاعت کر کے علی گڑھ کی بنیاد کو ہلا دیا۔

علی گڑھ کی تحریک

مولانا اس وقت علی گڑھ کے مسلک سے کس قدر دور تھے، اس کی ایک مثال احمدیہ میں قربانی کا ذکر ہے جس پر مولانا نے عام مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ ان کے دوست حکیم احمد علی جو اس وقت علی گڑھ کی تحریک کے حامی تھے۔ الملال کی رائے کے خلاف آواز اٹھانی پڑی۔ ملک کی صحافت میں اس بحث کا لہجہ بہت اور مولانا محمد علی سے بھی مولانا کے نظریات کا غالباً یہ پہلا تقادم تھا۔ (قاضی عبدالغفار)

مولانا محمد علی سے اختلاف

مولانا محمد علی اکثر مولانا کو ضدی مولوی کے نام سے یاد کرتے تھے لیکن غور کیجئے تو مولانا کی ضد ہی میں ان کی شخصیت کا اصل استحکام نظر آتا ہے مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں یہ بہت بڑا فرق تھا۔ مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر تھے مفہوم اور انداز کی عمومییت سے تقریباً بیگانہ رہے ان کی انفرادیت کے دائرہ میں سب سے نمایاں عنصر عوام کی مقبولیت نہ تھی، بلکہ خود بجائے خود تھی۔ مولانا با اذقات اپنے نقاد اور مخالف سے دست درگیاں ہو جانے کی جرأت رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت ان کی کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں پر اسے تنقید یا تخریق نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ ان کی احساس کمتری نہیں بلکہ ایک مزدوری اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدانِ جنگ میں اس لیے نہیں کھاتی کہ اسے برا بھلا کہیں نظر نہیں آتا۔ (ابوسعید بڑی)

الملال کی دعوت

اس طرح حقیقت حضرت مولانا نے الملال کے ذریعہ مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں غفلت کے بند دھڑلے کھولے اور ان کی آواز عوام کی زندگی میں گونجی۔ چنانچہ الملال کی تحریک، دعوت اور لہجہ کی نتائج کے متعلق خود فرماتے ہیں "الملال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کی۔ اپنے مباحثوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف انہیں اپنے مخالفین کے لیے پیروں کو کھلیں بلکہ انہیں ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرنے کی راہ دکھائی۔"

کنسٹنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انہیں اس قریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہوگی تو گورنمنٹ کا نام ہو جائے گی مگر اللہ نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دی اس سے وہ تیدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ کچھ متحدہ تحریک خلافت و سوامی ہے۔۔۔۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ اللہ تمام تر ملامت کی دعوت تھی۔“

ت وحدت کا پیغام ”میرے عقیدہ میں ضرورت اور وقت جب حق کے ساتھ جمع ہو جائیں تو پھر خدا کی بنائی ہوئی اس سبقت ینگوں کے نیچے کوئی شے ایسی نہیں جو اعلان حق کے لیے مجبوری ہو سکے اور اگر ہو تو وہ تمہارے تصور ہے اعلان حق کے وجہ کا بطلان نہیں۔“

”میں موجود حالات کو کسی بھی ایسی تعبیرات باطل سے مخفی نہیں کر سکتا جس سے اس کی اصلی حقیقت پر پردے پڑ جائیں۔ اگر تم کسی خونچکان ایک ریشمین لکھن ڈال دو گے تو کیا یہ ثابت کر سکو گے کہ وہ مردہ لاش نہیں ہے۔“

”اللہ اللہ ابتداء سے حق کی قوت کا واسطہ ہے اور اللہ عظیم ہے کہ مجھے سورج اور چاند کے چوکا آتیاں نہیں تھیں بقا کہ حق کی کامیابی اور باطل کے پر ایمان ہے یہ میرے محسوسات اور مرئیات ہیں اور ان میں کسی کو مجھ سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔“

”کوئی چھی بات اس لیے نہیں ترک کی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہ کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں اس کا ایک بھی دوست نہ۔“

”اسپانی کی ناتوازی حقیقت پر میرا اعتماد ہے اور اعلان حق اور امر بالمعروف کا فرض شرعی خوف، غفلتوں و جہل و غم و شہوات سے ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی و صندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ضعف ہے۔ ان کی خاطر چپراخ گلے کئے جاسکتے۔“

”جب تک میرے عقیدہ کی غلطی مجھ پر واضح نہ کر دی جائے میں اس کے مطابق کام کرنے پر مجبور رہوں اور کسی اعتراض اور کسی مخالفت کو نظر انداز نہیں ہو سکتا۔“

عبدالمجید کا اثر حق وحدت اور حریت پسندی کا یہ غیر متزلزل مسلک تھا جس پر اللہ اپنی زندگی کے آخری پرچہ تک مازن رہا۔ حضرت مولانا نے درحقیقت مصروف و عموام کی سر زمین پر قومی آزادی کے دلفریب چہرہ کی ایک جھلک دیکھ کر وہ یہ بھی دیکھ آئے تھے کہ بعض اسلامی اور مشرقی ملک میں کس طرح اندھیری رات کے لہجہ آزادی اور حریت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

میں اگر مصر کے جدید لٹریچر اور مصری صحافت کے نمایاں رجحانات نے نوجوان آزاد کے گرم خون کی گردش کو بھی پیٹلے سے زیادہ تیز کر دیا ہو۔ اور اپنے دل کے سوز کو ابھارنے وطن بالخصوص مسلمانوں کے دل میں منتقل کرنے کی تمنا رکھتے ہوں اس لیے جن ماہوں سے انہوں نے مسلمانوں

کو ہلکے پینچنے کی کوشش کی ان میں سب سے زیادہ روشن اور واضح ماہ مذہب کی تھی چنانچہ آپسے اللہ اللہ کے ناکمل اٹھا کر دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ وہ سیاست کی تعلیم کے سلسلہ میں ذہنی و اخلاقی اصلاح کا کوئی ایسا پلوند تھا جس کی تائید میں انہوں نے قرآنی دلائل پیش نہ کیے ہوں

اللہ کی ہدایت کے لیے احکام الہی کی حجت سے کام نہ لیا ہو۔ دوسری راہ جو مسلمانوں کے کچھ اور فطری ذوق کے لحاظ سے ان کے لیے قابل قبول ہو سکتی تھی ادب و انشا کی ماہ تھی۔ سو اس باب میں اللہ اللہ کی یہ خصوصیت کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ اس نے انبارِ ذخیرہ

شعروادب کا جمیع کردیا اگر آج تمام مشہور شعرا و ناری کا کلام دنیا سے محو ہو جائے تو بھی اس کا بڑا ستہر انتخاب آپ اللہ کی مدد سے خبر کر سکتے ہیں۔
(نیاز فتح پوری اگست ۱۹۵۷ء)

ملت اسلامیہ کی بیداری

ملت اسلامیہ کی روح افزاد کی غفلت میں سو رہی تھی، ذہن و دماغ کے تیز رفتاری میں غلاب کی جاتی جذبات کے ہوجان میں کروٹ بدل رہی تھی۔ اللہ کی تحریک و دعوت پر بالآخر وہ جدوں میدان میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ جدوجہد ایسا سفر تھی جس کی بندھی ہوئی منزلیں تھیں، پھیرائی ہوئی رسم و رواج تھی۔ حضرت مولانا نے اللہ کے ملت اسلامیہ کو اس سفر کی بندھی ہوئی منزلوں کی طرف رہنمائی کی، پھیرائی ہوئی رسم و رواج سے آگاہ کیا۔ بے شمار رکاوٹوں کی نشان دہی کی مشکلات کے مقابلہ کی سکت اور برداشت کی توانائی پیدا کی۔ اللہ درحقیقت مالہ جس تھا، لوگ آتے گئے اور کارواں بٹا گیا۔

تقسیم بنگالہ کی تفسیح

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی تفسیح نے مسلمانوں کی قدیم سیاست پر اگرچہ ایک سخت ضرب لگائی جس کی اساتذہ کی جنگ آزادی میں حریت پسندوں کی ناکامی کے بعد سرسید نے علی گڑھ میں رکھی لیکن مسلمانوں کی توجہ اب بھی برطانوی حکومت کے دامن سے لپٹی ہوئی تھی اور برطانوی سامراج کی چوکھٹ پر نیازمندانہ سجدہ کر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جب کی بے پناہ شخصیت پوری قوت کے ساتھ اللہ کے صفات پر نمایاں ہوئی اور بہت جلد پرانی سیاست کے پرانے نقشے بدلنے میں کامیاب گی۔ یہاں تک کہ جیٹن نذیر حسن مرحوم نے جو اس وقت مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور بالآخر ۱۹۱۱ء کے طے طے نام پر ”سرکار“ کی وفاداری کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے لیے موزوں حکومت خود اختیاری کا نام بھی زبان پر آیا اور مولانا نے وفاداری و حکومت خود اختیاری کے ساتھ موزوں کی شرط پر اعتراض کیا جس نے سرکار پرست لیگ کی قدیم قیادت کی طرف سے مسلمانوں کی لیدر غلام کو بدگمان و بدبین کر دیا۔

ضبطی ضمانت

انگریزوں کی حکومت مسلمانوں کی سرکار پرست قیادت کے اس اضمحلال کو توشیح کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ مولانا نے حالات کو بہتر دیکھ کر جدوجہد کو تیز کر دیا اور حکومت آپ کو توشیح دی۔
تنگاہوں سے دیکھنے لگی۔ نتیجتاً

اللہ اور مولانا کا جدوجہد حکومت کی آنکھوں میں کاسٹے کی طرح کھٹکے لگا۔ اور نام کا پور کے سلسلہ میں اللہ کے مضامین نے صورجبات متحدہ آگے داد دھکے گورنر کو بے چین کر دیا۔ انجام کار پہلے تو اللہ کی ضمانت تھی اور پھر ۱۹۱۵ء میں مولانا بھی بنگال سے خارج البلد کر دیئے گئے۔ اللہ کا یہ انجام مولانا کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

البلاغ کا اجرا

اللہ کے بعد حضرت مولانا نے البلاغ جاری کیا۔ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں، اس کا نصب العین بھی وہی تھا۔ بلاغ کا، لیکن طریق البلاغ کچھ مختلف تھا، تیور وہی تھے لیکن رخ و دوسرا تھا۔ انداز قدیم تھا مگر لباس بدل گیا تھا۔ لسانیات علمی کا درس تھا اور البلاغ لسانیات ذہنی کا۔ اللہ حرکت و عمل جوش و دلول کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانیت و بلاغ کا سلسلہ اشاعت منقطع ہوا تو ۱۹۲۱ء میں حضرت مولانا نے لکھتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں احباب کے اخبار پیغام کے مسلک کی نگرانی وہ خود کرتے تھے اور اکثر اس میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں احباب کے اخبار اللہ کو دوبارہ جاری کیا لیکن اس بار بھی اللہ کے خرمین حیات کو حکومت کی نگاہ گرم نے چھونک ڈالا۔

دافوسن کی آزمائش

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تفسیری عدالتیں اور قرون وسطیٰ ایدل ایجنز کی پراسرار انگوٹھ نیلٹھ“ وجود میں رکھتی ہیں یہ مانتے کے لیے تیار نہیں کروں عذبات، ان عدالتوں میں کام کرتے تھے اُن سے ہمارے راز کو خجاست لگتی۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں ہیں کے اندر وہ خوفناک سزا بند تھے لیکن ان دنوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور نا انصافی کے خوفناک رازوں کا دہیہ ہیں۔ اس جگہ عدالت میں، اکی عظیم الشان اور عقیق تاریخ پر حجب میں خود کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صوف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹھن میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے کاش خائن اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں چمکتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔“

گزشتہ نصف صدی میں دوسرا ایسے آئے تھے جہاں پر انقلابی قوتیں بیدار ہوئی تھیں۔ پہلا موڑ تو وہی حادثہ مسجد کا پنور کا تھا اور دوسرا جلیاؤں کا قتل عام۔ مسجد کا پنور کا انہدام گویا ایک شدید شوک سختی جس نے عالمی گٹھ بندیم سیاست کو مسمار کر دیا اور اسی نقطہ سے مولانا نے بھی اپنی قلمت کے لیے طلبِ حق کا ایک راستہ معین کیا۔ مسجد کا پنور کے انہدام کا ذکر دیکھ کر مولانا نے اپنے ایک ادارے میں لکھا تھا کہ :-

”تعب ہمیشہ اس واقعہ پر ہوتا ہے جو نادر و غریب ہو اور شکایت ہمیشہ اس سے ہوتی ہے جس سے توقع ہو۔ مجھ کو تو نہ اس واقعہ پر جب ہوا اور نہ شکایت پیدا ہوئی۔ میرے سامنے تاریخ ہے اور قوموں کی سرگزشتیں ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ طاقت نے ہمیشہ غرور کیا ہے اور کمزوروں نے ہمیشہ حق و حیات کے سانچوں کو ایسا ہی جواب دیا ہے۔ میں روزِ اوّل ہی سے جانتا تھا کہ یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے ہونے والا ہے اور وقت اور موسم کے تغیر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔“

جو آگ اس وقت لگی ہوئی تھی مولانا نے اسی کے انگاروں سے اپنی قوم کے دلوں کے آتش خالوں کو گرم رکھنے کی کوشش کی ؟

”وقت نازک ہے اور موسم مخالف ہے، غفلت کے جھونکے چلنے لگے ہیں اور گھنہ بڑھانے والے ہاتھ بے حرکت ہو گئے ہیں حلیت قوی و شاطر، مغالہ فریب خوردہ و سائیں و مطلق و لطیف اور ایمان کی آزمائش امتحان طلب ہے۔ سبھا بھی شروعاتی ہوا ہے اور تجربہ کی زاد راہ سے مسافر تھی و ست ہیں ایسا نہ ہو کہ قدرت کی کجی ہوئی ایک فرصت ہتھیاری ضائع کر دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جو برسوں کی جگہ میں میں محال ہوا تھا چھٹل و سرشاری پر قربان کر دیا جائے۔“

برائے قومی حادثہ کہ حضرت مولانا الملالت کی سیاسی دعوت کا پس منظر نیلے تھے اور حجب تک الملالت جاری رہا وہ اس کے صفت بریت فکر و نظر متحدہ قومیت اور حب الوطنی کا پیام دہراتے رہے۔

چند روز بعد جب ہندوستان میں ایک استبدادی حکومت کی وار و گیر شروع ہوئی تو مولانا نے اپنی "دعوت" کے نسخہ کو زیادہ زیادہ واضح کرنا شروع کر دیا۔ کلکتہ کی عدالت میں انہوں نے اپنا جو مشہور بیان تحریری پیش کیا اس میں السلطانی کی تحریک اور اس کے کا ذکر "قول فیصل" مولانا آزاد کا کلکتہ کی عدالت میں تحریری بیان کے ایک اقتباس کی صورت میں گذشتہ سطور میں چکا ہے۔

۱۔ علامہ میں مولانا بھی بنگال سے خارج البلد کر دیئے گئے۔ "السلطان" بھی بند ہو چکا تھا۔ یہاں سے مولانا کی زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

راپچی میں نظر بندی

۱۔ بنگال سے جلا وطن ہو کر مولانا راپچی گئے اور بعد میں وہیں نظر بند کر دیئے گئے۔ مولانا کی زندگی میں یہ ایک ایسی تنہائی اور خاموشی کا دور تھا جس میں بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کاموں کے لیے تیار ہوا کرتے ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے اپنے عزائم کے لئے میں رنگ بھرا اور وہ اس فیصلہ کن کشمکش کے لیے تیار ہوئے جس کا نتیجہ تیس سال کی تکلیف والی تھا

ہندوستان کی سیاست میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۰ء تک کا دور ایک غلام ملک کی زندگی کے نشیب میں اس فراز کا ایک انقلاب انگریز منظر ہے جس وقت مسلمہ میں مولانا نظر بندی سے آزاد ہو کر باہر آئے تو رولٹ کا

رولٹ ایکٹ

کا نفاذ ملک میں لگ لگچا تھا اور مسٹر گاندھی اپنے عدم تشدد اور عدم تعاون کے تمام ساز و سامان کے ساتھ میدان میں آچکے تھے جس وقت جلیاؤالاہ باغ کے دروازے پر جنرل ڈائریس اپنی فوج کی رائفلوں اور کلدار توپوں سے برطانوی اقتدار کے استحکام کی ایک آخری کوشش تو اس کے ساتھ ہی ملک میں ایسا طوفان آیا جس کے جوش و خروش کی کوئی مثال محضہ کے بعد نہیں دیکھی گئی۔ ۱۹۲۰ء کے تشدد کو اس مہمان گاندھی نے اپنے ہنس سے بدل دیا تھا اور یہ ایک ایسا اخلاقی حربہ انہوں نے ایک غلام قوم کے ہاتھ میں دیا تھا جس کی قوت کا کوئی اندازہ اٹھا سہرا اس سے پہلے دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوا تھا۔ اس وقت گاندھی جی نے اپنی قوم کے اندر خیالات ارادوں اور جذبات جو بے پناہ ہیجان پیدا کر دیا وہ ایک ایسی اخلاقی اور روحانی مہم تھی جس کے مقابلہ میں قدیم انگریز پرستی کے بہت سے زائد نئے مسماں ہو گئے۔ مولانا محمد علی جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں علی گڑھ کے سیاسی مسلک کے ہونو آتے۔ اب صاف صاف کہنے لگے کہ۔

"یہ کام جنرل ڈائریس کے لیے مخصوص رکھا گیا تھا کہ وہ اس دیوار کو گرا دے جو غاصبی مصالح کے تحت سرسید احمد خاں نے سال پہلے کھڑی کی تھی۔ اور اس کام کا سہرا جنرل ڈائریس ہی کے سر ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۷ء کی کانگریس میں ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک مشترکہ قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے شرکت کی ترغیب دی۔ اس کے سپاہیوں کی گولیوں نے ہندو اور مسلمان کا کوئی امتیاز قائم نہ کیا اور یقیناً قدرت نے یوں ہی مقدبر کیا تھا کہ ایک ایسی قوم بھی جو مسلمانوں سے بھی زیادہ انگریزوں کی وفادار تھی (ہمارے سکھ بھائی) اپنے مذہب کے مقدس شہر امرتسر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے خون سے بھی رنگین کریں اس واقعہ میں خدا کا ہاتھ تھا۔"

حالات کا جو رویہ چل رہا تھا اسی کے ساتھ ساتھ عجب برطانیہ نے ٹرکوں کو بھی دنیا سے مٹا دیئے کا ارادہ کر لیا اور گلیڈسٹن کے خواہش تبصرہ چل کر پی جاہی اور اسلامی اہلکے مقررہ کے لیے بھی ہر طرف سے خطرات پیدا کر دیئے گئے تو ہندوستان میں جلیاؤالاہ باغ کے غور و گنگ زیادہ گرا ہو گیا اور مسلح برادران تحریک خلافت کا علم بلند کر کے مہم تھا گاندھی جی کے پہلو بہ پہلو مشترکہ قوت ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کے داعی اور ترجمان بن کر میدان میں اتر گئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما جی سے ۱۸ جنوری ۱۹۳۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسندِ ترکی و خلافت کے متعلق والٹر رائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر انجمنِ ہندوستان کے صدر جی۔ پی۔ پٹیل اور دیگر رہنما بھی موجود تھے۔ اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قائم رہا۔

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ والٹر رائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بے ناز تھے۔ اور اس لیے اس مجلس میں انہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی دند کا دائرہ رائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے ہم خیال تھے جیکب اجمل خان مرحوم تھے۔

میرٹھ اور کلکتہ کی کانفرنسوں میں گاندھی جی کا پروگرام مکمل کیا گیا اور ناگپور میں بالآخر کانگریس نے اس پروگرام کی منظوری دیدی۔ اس کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر قومی تاریخ کے جو روح پرور نظارے دیکھے گئے۔ وہ ہماری قومی تاریخ کے لازوال نقوش ہیں۔ اسی تحریک کے دوران میں مولانا کے لیے گرفتاریوں اور سزاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تمام احمد نگر کا دروازہ کھلنے اور آزادی کی پہلی منزل طے ہونے تک جاری رہا۔

۱۹۳۱ء کا دور تحریکِ خلافت کا دور تھا جو ۱۹۳۰ء میں جلیاؤ والاہ باغ کے قتلِ عام اور امرتسر کے اجلاس کانگریس کے بعد شروع ہوا۔ مولانا کی زندگی کا یہ اس قدر معروف زمانہ تھا کہ اس سبب اب میں ان کے لیے صبح اور شام کا امتیاز باقی نہ رہا تھا شمال سے جنوب تک پیکڑوں جیسوں اور کانفرنسوں میں انہیں تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور ان کے اوقات کا ایک لمحہ نہ تھا جو اس تحریک سے بے تعلق ہو پھر فقہ پرادر ہر جلسہ میں زندگی اور استقامت کا ایک ہی پیام تھا جو وہ ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دے رہے تھے ان خطبات اور تقریروں کے اگر کم سے کم اقتباسات بھی نقل کیے جائیں تو وہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جاتے۔

اکتوبر ۱۹۳۱ء میں صوبائی خلافت کانفرنس اگرہ کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے اس تحریک کی ۱۸ ماہ کی سعت و ادراک نظر ڈالی اور مسلمانوں کو گاندھی جی کے اصول ترک موالات اختیار کرنے کی دعوت دی

تحریک ترک موالات

انہوں نے فرمایا:-

”تحریکِ خلافت کی بدولت ہندوستان کی آزادی کا سوہا ہوا مسند

اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اس کا غلغلہ دنیا میں بلند ہے۔“

لیکن اب اس جدوجہد کی تیسری اور فیصلہ کن منزل آگئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ترکِ موالات کے اصول کو اختیار کر کے وطن کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا جائے۔ انہوں نے فرمایا کہ:- ”یہ چیز جو ہمارے سامنے آ رہی ہے پہلے ہی تیرہ سو سال سے موجود ہے..... اصل میدان ہندوستان کا میدان ہے اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندوستان کے اندر ہونے والا ہے اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدانِ ترک موالات کے میدان بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کر لیں تو دنیا کی کون سی طاقت ہے جو آپ کو شکست دے سکے۔“

اگر آسمان کی تمام بجلیاں اُنہر آتیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی مٹھیں کھڑی کر لیں تو وہ ایک منٹ کے لئے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ سہ سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دلوں کے میدان کو فتح کر لیں، ایمان کے میدان کو، انتقامت کے میدان کو، قریبوں کے میدان کو اور ملک کے اتفاق کے میدان کو۔۔۔ تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔۔۔

مولانا نے اس زمانے کے تمام خطبات میں بار بار وقت کی اسی حقیقت پر زور دیا کہ خلافت کی تحریک ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے دوسری بات جس پر مولانا نے اُن علماء کو جو تحریک خلافت میں حصہ لے رہے تھے متوازن جس امر کو یہ توجہ دلائی وہ ایک نظام شرعی کے قیام کی تجویز تھی۔ مولانا اس وقت کے لحاظ سے ضروری سمجھتے تھے کہ ایک ایسی امارت شرعیہ قائم کی جائے جو مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو حقیقی مذہب کے سانچے میں ڈھلے۔

کراچی کا مقصد

۱۹۲۱ء میں علی برادران اور ان کے ساتھ بعض دوسرے لیڈروں پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا ان ملزموں پر یہ متنازعہ انہوں نے سرکاری فوج اور پولیس کو جاذبہ و فاداری سے منحرف کرنے کی کوشش کی ملزموں کو یہ الزام تسلیم تھا جو لیڈر گرفتار نہیں ہوتے تھے انہوں نے بھی اس جرم کا ارتکاب شروع کیا چنانچہ تمام لیڈروں نے اعلانات اور بیانات شائع کر کے پولیس اور فوج کو مخاطب کیا۔ بمبئی کے ایک اجتماع میں لیڈروں نے اس مسئلہ کے متعلق جو مشورہ اعلان شائع کیا وہ حکومت ایک کھلا چیلنج تھا۔ اس پر پہلے دستخط ملتا گا گاندھی کے تھے اور دوسرے حضرت مولانا کے۔ لیڈروں کے اس مقدمہ اقدام نے گرفتاریوں کا سلسلہ جاری کیا لیکن حکومت کے دست و پاڑہ کاری سے تھل تھل عرصی تھا۔ جس وقت برطانوی ولی عہد کے آمد کے سلسلہ میں بانی کاٹ کی تحریک شروع ہوئی اور تمام میں شمال سے حزب نمک اور مشرق سے مغرب تک ہر گوشہ احتجاج اور بیزاری کے نعروں سے گونجنے لگا تو پھر ایک دفعہ حکومت نے لیڈروں کو سزا شروع کیا۔ چنانچہ بنگالی میں مولانا اودھی۔ آہ۔ داس گرفتار کر لیے گئے۔ اس مقدمہ میں مولانا نے عدالت کے روبرو جو بیان تحریری پیش کیا۔ وہی کے سیاسی افکار کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے آئینہ میں ان کا سوانح نگار مولانا کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس دستاویز کو مولانا کے ادبی شاہکاروں میں بھی ایک مخصوص مقام حاصل ہے اس موقع پر مولانا کے اس بیان کے بعض اقتباسات صرف ان کے سیاسی افکار کی وضاحت کرنے کے لیے نقل کیے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے ان حالات کے پس منظر کا ایک گوشہ پیش کر دینا مناسب ہو گا جن حالات میں مولانا نے حکومت اپنے اوپر وار کرنے کی دعوت دی تھی۔

پانچ سلسلہ میں حضرت مولانا نے گاندھی جی کے ساتھ پنجاب کا قیام اور وہ کیا۔ اس وقت اضلاع لاہور اور امرتسر میں پبلک جلسوں اور تقریبات کی مخالفت تھی۔ باوجودیکہ مہاتما جی نے ان انتہائی احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اس لیے کہ خلافت ورزی کا پروگرام منہل کیا جا چکا تھا، لیکن مولانا نے اپنے متعلق یہ استدلال کیا کہ شخصی طور پر خلافت ورزی کرنے کا حق انہیں حاصل ہے اور افضلیت اسی میں ہے کہ وہ ایسا کریں۔ مہاتما جی نے بھی مولانا کے اس طرز عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ جمہور کے دن شاہی مسجد میں خطبہ کے بعد مولانا نے ایک دل دلا دینے والی تقریر کی۔ اس تقریر کے متعلق اس زمانہ میں پورے کے نیم سرکاری اخبار رسالہ ایڈیٹر ٹریڈ نے لکھا کہ اس تقریر میں مولانا نے اہل پنجاب کو علانیہ خلافت ورزی کا نواں کی دعوت دی ہے اور اگر حکومت نے کوئی کارروائی نہ کی تو پنجاب کے شورش پسندوں کی ہمتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ اس اور بار کا عنوان ”صحیح مسجد میں باغیانہ کیچر“ تھا۔ ایک سہ ماہی کے بعد مولانا نے ایک ایسی ہی تقریر امرتسر میں کی۔ پھر حبیب علی برادران گرفتار کر لیے گئے تو اس گرفتاری کے دو دن بعد کلکتہ کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ:۔

”جس بڑویشن کی بنیاد پر علی برادران گرفتار کیے گئے ہیں وہ اسلام کا ایک مانا ہوا اور مشہور و معروف مسلمان ہے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ بڑویشن واصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے وہ اسی کلکتہ کے ٹائٹن ہال میں منظور ہوا تھا۔ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اس وقت اس کے معنوں کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی آئی ٹی کے رپورٹر بیٹھے ہیں اور میں ان سے کہتا ہوں کہ حرف تلمیذ کر لیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہے گا۔“

حضرت مولانا کی گرفتاری

پھر دہلی میں جمعیتہ علماء اور خلافت کمیٹی کے جلسوں میں بھی مولانا نے اس اعلان کو دہرایا۔ اودھ موہتر پر بار بار دہراتے رہے، لیکن بمبئی میں برطانوی ولی عہد کی آمد کے موقع پر جوش و ہوا اس سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے چند روز کے لیے اپنی تحریک کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلہ نے اہل ملک کے حوصلوں کو بہت کر دیا پھر بھی چند روز بعد ایک دوسری سمت سے خود حکومت کی سخت گیری نے قومی تحریک کے لیے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ کلکتہ میں جس وقت رضا کاروں کی جماعتیں اور مجالس کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو اس حکم کی خلاف ورزی کے لیے فوراً ہی نئی نئی جماعتیں پیدا ہونے لگیں۔ حکومت نے بھی روزانہ سیکڑوں اور ہزاروں رضا کاروں سے اپنے جیل خانے بھرے شروع کر دیئے۔ ان حالات میں پھر ایک دفعہ مولانا کے لیے سرکاری دھان خانے کا دروازہ کھلا جب مولانا کو اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنا ایک مختصر بیان عام اشاعت کے لیے لکھ کر رکھ دیا جو ان کی گرفتاری کے بعد شائع ہوا۔ اس بیان میں انہوں نے لکھا تھا کہ:-

”گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دے دی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لیے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کر پیچھے رہ جسنے دلوں کے دلوں پر کیا کرتی ہے؟ محمد علی، شوکت علی، لالہ لاجپت رائے، چندر شیکھر، سب کا سفر لوہا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتح مند میدان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔ میں نے کلکتہ کے موجودہ میدان عمل کو ”آخری اور فتح مند میدان“ کہا۔ یہ میرا یقین ہے اور غریب تمام ملک دیکھ گئے گا کہ جو کام دو سال کے اندر تمام ملک میں انجام دیا سکا وہ ان چند دنوں کے اندر کلکتہ میں انجام دیا جائے گا۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو مہاتما گاندھی جی کو میرا یہ پیام پہنچا دیا جائے کہ میں آپ کو آپ کی کامیابی پر سب سے پہلے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس مبارکبادی کے لیے آپ مجھے جلد باز نہ سمجھیں۔ میں اس اہل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کی مبارکباد دینے میں کوئی دوسرا مجھ پر سبقت نہ لے جائے۔“

عوام کو مولانا نے اپنے پیام میں چار سچائیوں کی طرف دعوت دی تھی۔

”ہماری فتنہ مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر ہے اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو ان ہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔“

(۱) ہندو مسلمان کا کامل اتفاق۔

(۳) نظم

(۲) امن

(۴) قربانی اور اس پر استقامت۔

میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق نہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات ناراضی کی بھی ہو جائے تو اسے بخش دیں۔ اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کہہ جاؤ جس سے اس مبارک اتحاد کو کمزور پھینکے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا گاندھی پر پوری طرح اعتقاد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں جو اسلام کے خلاف ہو اس وقت تک پوری سچائی اور مصنفیت کے ساتھ ان کے مشوروں پر کاربند رہیں۔

”فتنہ و فساد کی ابتدا“

احمد مصطفیٰ صدیقی راجی

حضرت مولانا کی سیاسی زندگی میں متحدہ قومیت کا یہ باب بلاشبہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک شاندار اور روشن باب ہے لیکن حضرت مولانا کے شخصی اعتقادات کی یہ روشنی اور بھی زیادہ روشن اس تاریک زمانہ میں ہوتی ہے جب سلطہ کے لیدر اور انگریزی حکومت نے تفرقہ پر داری کا حربہ استعمال کیا اور فرقہ داری فتنہ و فساد کی تاریکی میں بڑے بڑے لیڈروں کے تصورات منتشر ہو گئے اور بڑے بڑے بھائی وطن کا لنگر ٹوٹ گیا۔ حضرت مولانا کی شخصی اور معنوی حزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا جتنی کہ وہ آزمائش تھی جس میں حضرت مولانا اس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دو گونہ رچکا وہ تعمیر ایک دفعہ پھر سمار ہو گئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری تصعبات کی آگ روشن کر دی اس آگ میں رہا تاجی، مولانا حکیم اہل خاں، ڈاکٹر انصاری، موتی لال نہرو اور ایسے بہت سے عوامی لیڈر جو تک دیئے گئے۔ حضرت مولانا کے عزم کی مندی کی کے امتحان کا یہی وقت تھا بہت سے ہندو آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے لیکن حضرت مولانا خود اپنی قوم کے ہاتھوں پر جبکہ وہ ظلمت ہو چکی تھی، وہ سب کچھ سنبھال گئے۔ برطانوی حکومت کا فوجداری بیچان کے وجود معنوی کو اس قدر جرح کبھی نہ کر سکا جتنے زخم کہ خود ان کی اپنی قوم نے ان کے دل و دماغ پر لگائے مگر انہوں نے ان تمام جراحات کو شکوہ شکایت کا ایک بھی لفظ زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا۔ یہی حضرت مولانا کی اصل بڑائی ہے جس وقت حضرت مولانا راجی سے واپس تشریف لائے تو یہ ارادہ کر کے آئے تھے کہ وہ خاص علمی زندگی بسر کریں گے اور سیاسی ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائیں گے لیکن حالات نے کچھ ایسا پیش کیا کہ حضرت مولانا کو پھر اس آگ میں کودنا پڑا۔ حضرت مولانا نے اپنے خاص انداز میں اس وقت کے حالات کے متعلق اپنے قلب کی کیشیات کو واضح فرمایا ہے۔

سیاست سے کنارہ کشی کا ارادہ

عین ۱۹۱۹ء کے آخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آزمندوں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حادث پورے زور شور کے ساتھ گزر چکا تھا تو میں راجی کے گوشہ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیا کے امید کی تعمیر کا سر و سامان دیکھ رہا تھا۔ گو دنیا نے دروازہ کے بند ہونے کی صدا میں ہنسی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔

تفاوت ست میاں شنیدن من و تو !

توبتین در و من فتح باب می شنوم

۱۹۱۹ء کے رمضان المبارک کا پہلا مہینہ اور اس کی بیلار و مہور راتیں تھیں۔ جب میں نے ان ہی باتوں سے امیدوں اور ارادوں کے نئے

تقشوں پر یہی کہیں جن سے تمام پچھلے نقشے پاک کر چکا تھا۔

بہت نگر کہ صد ورق دفتر امید

صد پارہ کردہ اہم دہ خوب شہ ایم !

جنوری سنہ ۱۱۰۰ میں جب میں نظر بندی کے گوشہ قید و بند سے نکلا تو دو سال پیش کا یہ نقشہ عمل میرے سامنے تھا اس لیے نہ تو مجھے واقعات کی رفتار کا انتظار تھا نہ مزید غور و فکر کا ایک صحت شغل و عمل شروع کر دینا تھا۔ میں نے آئندہ کے لیے جن امور کا ارادہ کیا تھا ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ راپنجی سے نکلتے ہی کسی گوشہ عزلت میں رفتار طالعین کی ایک جماعت لے کر بیٹھوں گا اور اپنی زبان و قلم کی خدمات میں مصروف ہو جاؤں گا۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ جو جماعتی اعمال پیش نظر تھے ان کے لیے بھی سیر و گردش اور نقل و حرکت کی ضرورت نہ تھی تاہم استقراری مطلوب تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر رہائی کے بعد سیدھا کائنات کا قصد کیا اور اگرچہ تمام ملک سے پیام ہائے طلب و دعوت آ رہے تھے اور ہر طرف نظر بندوں کی رہائی کا سہرا منہ تنہا دیکھ کر گرم تھا لیکن میں کہیں نہ جاسکا۔ اور سب سے عذر خواہ ہوا۔ میری طبیعت و جستجو نے مجھے مہلت نہ دی کہ اپنے وجود کو لوگوں کی طلب و جستجو کا سراغ بنا سکوں۔

اگر شیشہ دل و زیارت سنگ ست : کہ دامغ مئے ناب و شیشہ و چنگ ست

لیکن عزت ربی بفتح العزائم بلا آخر مجھے سیلاب میں مہلای پڑا ! مگر الحمد للہ کہ یہ حوادث و واقعات کے سیلاب کی مخالفانہ رونہ تھی جو عزائم کو ہٹائے جاتی اور قصد کو تاراج کر دیتی ہے، بلکہ خود عزیم و عمل ہی کی ایک روح تھی جس کے اندر سے مشیت الہی کی صدا اٹھتی ہے اور انسان کو اس کے فیصلہ کی جگہ اپنے فیصلہ کی طرف بلاتی ہے۔

وَمَا تَأْتِيكَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا

میں نے جنوری سنہ ۱۱۰۰ کے آخر تک پوری جدوجہد کی کہ موجودہ تحریک کی خدمات کو اس عزائم سے انجام دوں کہ یہ قرار داد اسلوب عمل بھی قائم رہے اور افلاس و گردش کے کاموں سے الگ رہوں لیکن حالات کی نزاکت و مقاصد کی ناگزیر احتیاجات اور اشخاص کے فقدان نے میری کوششوں کو کامیاب ہونے نہ دیا، کچھ عرصہ تک کشمکش جاری رہی اور بلا آخر مجھے فیصلہ کر لینا پڑا کہ اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت اور ضرورت نے کر دیا ہے اور اب تمام تہمتوں کے لیے وقف ہو جانا ہے۔ اس حالت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنوری سنہ ۱۱۰۰ سے اس وقت تک کا زمانہ جز ۱۸ ماہ سے زیادہ ہو چکا ہے تمام تر پے در پے دوروں اور عام تحریک کی نکلوں اور کاوشوں میں بسر ہو گیا اور تمام دوسرے شغف یک فلم ملتوی کر دینے پڑے۔ نہ تصنیف و تالیف کی تکمیل ہو سکی، نہ طباعت و اشاعت کی فکر کر سکا۔ نہ "البلاغ" جاری کی جاسکا۔ نہ اپنے پیش نظر مہات کار و علمی کے ساتھ انجام پائے کے اساری باتیں تمام دسکون پر موقوف تھیں اور وہ ان اٹھارہ مہینوں میں ایک شب و روز کے لیے بھی میسر نہ آ سکا زندگی وہی زندگی ہے جو سب کے لیے مقدّر ہوئی ہے، وقت وہی شب و روز کا وقت ہے جو ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے نہ سورج میرے لیے زیادہ دیر ٹھہر سکتا ہے نہ رات میری خاطر اپنا معمول بدل سکتی ہے۔ ایک زندگی ہے لیکن سیکڑوں زندگیوں کا حوصلہ دل میں پنہاں ہے کیونکہ دنیا کو بٹلے دلوں؟ اور کمال سے اس طاقت کو بلا لوں جو ایک دل و دماغ کے ساتھ سیکڑوں نسلوں ہاتھوں کو جوڑ دے۔

کند کوثر، بازوئے سست، بام بیلند

برمن حوالہ، و لامیدیم گند گیسرند

موجودہ حالت یہ ہے اور میں کہہ سکتا کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی
رو میں بے خشک مرکز کماں دیکھتے تھے
سنے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سورج پر اتحاد کو تیرے جیسے

۱۹۴۷ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گزر چکا اور آزمائش اور امتحان کا وہ دور شروع ہوا جو بلاشبہ
سلاطین میں ختم ہوا جب حضرت اور گاندھی جی کے رگ دپے میں ایک ناقابل بیان پیش کش اور
تھا۔ تقریباً ۲۵ سال تک ان دونوں اور ان کے ساتھ دوسرے لیڈروں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقل و فہم کی برابریوں کا سامنا کرنا
پڑا۔ ہر روز زلزلے آتے تھے اور متحدہ قومیت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کی دیواروں کو مسمار کر جاتے تھے تاہم امیدوں اور تناؤں اور مضبوط
ارادوں کی ایک ٹوٹی ہوئی عمارت کے نیچے ملک کے یہ بلاکیشن سپاہی بیٹھے رہے اور آزادی کی ایک نئی عمارت کے نقشے بناتے رہے۔
سنہ ۱۹۵۰ء میں جب بھی کسی موقع پر حضرت مولانا نے اپنے ہم وطنوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مخاطب کیا تو انہوں نے یاد دلایا
اس ملک کی آزادی اور زندگی کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد میں ہے۔

گاندھی جی کی نظر بندی

۱۹۴۷ء میں گاندھی جی پھر محسوس کر دیئے گئے اور ملک میں عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کے تصور اور
کو فروغ دینے کے مفاد سے بری طرح محسوس کر دیا۔ جی کہ خود گاندھی جی نے اپنے ہم مہم جوں سے یہ
طعنے سنے کہ تم نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دے کر ہندوؤں کے مفاد کا خون کیا ہے۔

کانگریس میں اختلافات

۱۹۴۷ء میں جب ایک دفعہ پھر اپنی زندگی کا کچھ زمانہ قید و نگاہ میں گزارنے کے بعد حضرت مولانا
آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خود کانگریس کے اندر لیکن اصولی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ گاندھی
نے قید میں جاتے وقت کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی رہی سہی طاقت تقریری پروگرام کے لیے وقف کر دے۔ ان کے جانے کے بعد
راجگربال اجپاری، سردار پٹیل، راجندر بھادراؤ ڈاکٹر انصاری اس امر پر زور دے رہے تھے کہ گاندھی جی کا تقریری پروگرام جاری رکھا جائے
اور کانگریس اپنی تمام قوت کو اس کام میں صرف کرے لیکن پنڈت مونی لال ہنر کی قیادت میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو ہندو مسلم
کی کوششوں میں ناکام رہ کر اب یہ پابندی تھی کہ کانگریس سے جگہ کرنے کا ایک محاذ دستوری مجلس کے اندر بھی قائم کیا جائے۔ عرف
میں یہ جماعتیں ”چینجر“ اور ”نوجینجر“ NO CHANGER کہلاتی ہیں اور ایک عرصہ تک ان کے اختلافات نے جماعت اور
جلسوں کے محاذ پر ایک ہنگامہ برپا رکھا۔ اس وقت جب حضرت مولانا نے جیل سے باہر آکر نظریات کے اختلافات کا یہ ہنگامہ برپا
تو انہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش تو یہی ایک طرف اب تو خود کانگریس کے اندر فی اختلافات کو مٹانے کی کوئی تدبیر ضرور
ہے۔ حضرت مولانا کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ علماء کی جماعت دستوری مجلس میں شرکت کے خلاف ایک انتہائی فتوے دے چکے تھے
ازد اب اس فتوے کے ہوتے ہوئے ”چینجرس“ کے پروگرام کی تائید کرنا بہت مشکل تھا۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا کے زیر صدارت اس
مسئلہ کے طے کرنے کے لیے کانگریس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جب حضرت مولانا پہلی دفعہ کانگریس کی صدارت کے لیے
ہوئے تو ان کی عمر ۸۰ سال سے بھی کم تھی اور اس طرح یہ خیال غلط نہیں کہ ان سے پہلے یا بعد کانگریس کے کسی صدر نے اتنی کم عمر میں یہ قومی اور
مامل نہیں کیا۔ پنڈت جاسر لال ہنر نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ”اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں۔ میرے

ام سالی کے قریب بچے جب اپنی پہلی دفعہ کانگریس کا صدر منتخب ہوا۔ گو کھیلے کی بھی تقریباً یہی عمر تھی مگر مولانا ابوالکلام آزاد مجھ سے عمر میں کم تھے۔ وہ صدر منتخب ہونے کے بعد اگر تقدیر کیجئے ان حالات کا اور زندگی کے اس مدوجزر کا جس سے گزشتہ ۲۵ سالوں میں حضرت مولانا گذرے تو ایک لکھنؤ کے دل و دماغ کی ان وارداتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے جن سے ان کی معنوی زندگی سمجھو ہے۔ اسی کیفیت کو پنڈت جواہر لال نہرو نے تلاش میں ”کی چڈسل روٹی میں کس قدر خوب بیان کیا ہے۔“

میرا زندگی ہے ہر وہ سب کچھ جو بی نفع نے حاصل کیا، وہ سب دکھ جو اس نے سہے ہیں، وہ سب خوشیاں جن سے اس نے لطف اٹھایا ہے اس کی فتح کے لئے اسے اور شکست کی تمغیاں۔ انسان کی وہ عظیم الشان ہم جراب سے قوتوں پہلے شروع ہوئی تھی، اور اب تک جاری ہے۔ یہ میراث ہے جو مجھ میں اور دنیا کے انسانوں میں مشترک ہے۔“

حضرت مولانا کی عمر کے چالیس سال بھی انسانیت کی اسی مشترک میراث کا ایک گراں قدر حصہ ہیں۔ زندگی کی اس شاہراہ پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی جو نشان راہ قائم کرتی ہے ان ہی میں ایک نشان راہ حضرت مولانا کی وہ زندگی اور بصیرت ہے جس کی راہ میں ان کا وطن موت و ذلیلت کی کش مکش اور فتح کے لئے اور شکست کی تلخین کا مزہ چکھنا پڑا۔

دہلی کے اس اجلاس خاص کے خطبہ صدارت میں حضرت مولانا نے کانگریس کے انتشار کو ایک آزمائشی دور سے تعبیر کیا اور ازمیزو کا گاندھی جی کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے پروگرام کی توضیح فرمائی اور اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ موجودہ لپٹائی کے بعد پھر ایک دفعہ جدوجہد کے میدان میں کانگریس آگے بڑھے گی۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ نعل صوف ایک وقفہ ہے۔

یعنی آگے بڑھیں گے دم کے کڑا

لیکن اس زمانے میں اندرونی اختلافات اور ہندو مسلم منافقت کی وجہ سے کانگریس کی ساکھ بہت گر چکی تھی اور یہ بگڑی ہوئی بات کچھ زیادہ ذہن سنبھالنے والی بات تھی۔ آخر کار ۱۹۲۲ء میں جب گاندھی جی جیل سے باہر آئے تو انہوں نے ان کا برکت رکھا اور اس کے زیر اثر ایک اتحاد کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی جس میں تقریباً ۵۰ ہندو مسلمان لیڈر شریک ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے اتحاد اور سمجھوتہ کی فضا پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ مولانا کے شرکار کرنے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کانفرنس کے مباحث میں مولانا کی خطابت اور اخلاقی قوت نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

قریبانی کا ڈھکاسہ

اس گفتگو کے دوران میں جب سب سے زیادہ جھجکا قربانی کا ڈھکے مسئلہ پر ہوا تھا تو مولانا نے فریقین کو مخاطب کر کے صلح اور مفاہمت کا ایک ایسا بنیادی اصول پیش کیا جو آج بھی وہی وزن اور دہری قیمت رکھتا ہے جو آج سے ۲۲ سال پہلے رکھا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ:-

”اس تمام قضیہ کا حل صرف اس بات میں ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق پر زور دینے کی بجائے اپنے فرائض کی تکمیل کے لیے تیار رہے۔“

اپنا برکت ختم کرتے وقت گاندھی جی نے حاضرین سے یہ عہد لیا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ اس دن جن لیڈروں نے یہ عہد کیا تھا ان میں سے حکیم اعلیٰ خاں، ڈاکٹر انصاری، ایلو ریڈ ایئرڈ اور سی آر داس آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن سب سے پہلے خود گاندھی جی نے اپنے اس عہد کو پورا کر دیا اور ہندوستان کی آئندہ نسلوں کے لیے وہ اپنا ایک ایسا نقش قدم چھوڑ گئے جو قزوں اور صدیوں تک نشان راہ رہے گا۔ لیڈروں کی اس جماعت میں

گاندھی سے عہد

سے جن سے اس دن کا ندھی جی نے عمل لیا تھا۔ اسی دور میں تنہا حضرت مولانا باقی رہ گئے تھے جنہوں نے گاندھی جی کی طرح ہندو مسلم کے عقیدے کو اپنے سیاسی، ایمان اور انسانی اخلاق کی ایک حکم بنایا تھا لیکن انہوں نے اس گھر سے ہوتے قافلہ کی یہ تنہا دگر بھی موت کی داویوں میں گم ہو چکی ہے۔

سامن کیشن

بہر حال سیاسی جہاد اور فرقہ داری کشت و خون کے اس زمانہ میں سامن کیشن کے ہندوستان آنے کا اعلان کیا گیا۔ یہ معلوم ہوا کہ غلامی کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے ایک نیا ہتھیار اس ملک پر عائد کیا جانے والا ہے۔ چنانچہ تمام ملک میں کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہو گئی اور اس نقطہ پر کانگریس کی تمام قوت از سر نو مرکوز ہونے لگی۔ اس محاذ پر کام کے دونوں فریق باہمی طرح متحد ہو گئے اور پھر ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ اس تحریک کے مظاہروں میں موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو ایڈروں نے پولیس سے ڈنڈے کھائے۔

برطانوی تدبیر بعد تھا کہ دستوری اصلاحات کا ایک نیا کھونٹا پیش کر کے ہندوستان کی آنکھوں میں دھول ڈالے۔ سامن کیشن کے بارے سے جو جنگ شروع ہوئی وہ ایک فیصلہ کن منزل تک اس وقت پہنچی جب سلاٹ میں ایک نئے دستور کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اس وقت نے "کامل آزادی" کے بنیادی نصب العین پر اپنا مورچہ قائم کر دیا یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ پرستی کا دہر تمام ملک میں سرایت کر چکا تھا اور کے زیر اثر ایسے بڑے بڑے مسلمان لیڈر بھی جیسے کہ علی برادران تھے کانگریس سے جدا ہو چکے تھے۔ گو کہ بظاہر نہرو رپورٹ ماعلیٰ برادران بعض دوسرے مسلمان قائدین کی کانگریس سے جدائی کا باعث بھی گئی لیکن اس انفران میں بعض شخصی عناصر کو بھی بہت دخل تھا۔ ان غیر ملکی حکومت نے نہایت چالاکي کے ساتھ تقویت پہنچائی تھی۔ بہر حال یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے آل انڈیا کانگریس نے کامل آزادی کی تیق پر ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔

آل پارٹیز کانفرنس

اس سے پہلے مسئلہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعہ سے ایک دفعہ پھر فرقہ داری اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ نتائج کے اعتبار سے شملہ کی سرزمین بھی خیر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر مونجے اور مولانا صاحبزادہ دونوں اپنے ڈنڈے سے ہوا میں گھمانے کے بعد مخالف سمتوں میں واپس ہو گئے۔ اس ناکام کوشش کے بعد فرقہ داری منافرت کے شعلے اور زیادہ بلند ہونے لگے اور ہر طرف خوریز ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس وقت کلکتہ میں بعض لوگوں نے یہ خواہش کی کہ حضرت مولانا ایک جلسہ عام میں شرکت کریں لیکن عالم یہ تھا کہ کسی قوم پرست انسان کے لیے جلسہ عام میں ہندو مسلم اتحاد کا نام لینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ دونوں فریق اس جلسہ میں اپنے غنڈے اور بدحاش لے کر آئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا پر حملہ کرنے اور جلسہ کو منتشر کرنے کی نہایت جنگجو یا نہایت گہری ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر حضرت مولانا کی بے خوف اور بے پرواہ "انفرادیت" نمایاں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا جلسے میں شرکت سے گئے اور محض ان پر بالکل صحیح کے روبرو دو گھنٹہ تک تقریر کرتے رہے۔ وہ تقریر مولانا کی خطابت کا ایک شاہکار اور معجزہ تھی جسے کے تماشا نیوں نے دیکھا کہ جو غنڈے مولانا اور ان کے شرکار پر حملہ کرنے لگے تھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں اور مولانا کے الفاظ اور فشر کی طرح ان پر برس رہے ہیں! حضرت مولانا کی زندگی میں ان کی بے پناہ انفرادیت کے امتحان کا یہ بہت بڑا اور یادگار تجربہ تھا۔ دوسرا موقع وہ تھا جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد دہلی کے خوریز ہنگامے میں حضرت مولانا دن اور رات خطرات کی پروا کئے آگ کے شعلوں میں گھستے تھے اور غلطیوں کی حفاظت و اعانت کا ممکنہ ہر سامان کرتے تھے۔

ستیزگاری

جدید اصلاحات کی اسکیم کے مقابلے میں کانگریس نے ستیزہ گردی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ستیزہ گردی یہ ستیزہ گردی کانگریس کی جدوجہد کا ایک اور نمایاں نشان راہ ہے۔ اسی نشان راہ سے کامیابی کی طرف پہلا موڑ آیا گوکہ گاندھی جی اور لارڈ ارون کے مجبورہ کے بعد بھی لندن کی گول میز کانفرنس کامیاب نہ ہو سکی۔

لیکن اس کانفرنس کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ دنیا کو ایک دفعہ پھر حقیقت یاد آگئی کہ سیاسی گفت و شنید میں برطانیہ کی نیت نہ کبھی پہلے غیر خفی اور نہ اب ہے۔

بادل خواستہ کانفرنس میں شریک ہونے اور حاکمی ہاتھ واپس آئے۔ ہندوستان کے انگریزی حلقوں اور انگریز مذہبی مہمانوں میں ان کے نمایاں آئے پر اظہارِ مسرت کیا گیا اور علانیہ جداگانہ حقوق کے حامیوں کی حمایت کے لیے اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھادی گئی کہ انگریز فرقہ پرستوں کو آزاد بنا کر آزادی کے مطالبے سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ انگریز کی حکمت عملی سے ہندو مسلم نزاعات ہوتے رہے جس کے نتیجے میں مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ایک علیحدہ حکم ریاست کا مطالبہ کریں۔

ملک ستیزہ گرد

گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہی گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو کانگریس نے تمام ملک میں ”یومِ آزادی“ کے مظاہرے کئے اور ماہ مارچ میں گاندھی جی نے ملک کی ستیزہ گردی کا اعلان کیا۔ اس طرح حکومت کے تشدد کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور ۵ مئی کو گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد لیڈروں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا لیکن سول نافرمانی کی اس تحریک نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔ حضرت مولانا کی شخصی قیادت نے پھر ایک دفعہ اپنے نفوذ اثر کا حیرت انگیز ثبوت دیا جس کی بدولت پنجاب اور صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

۱۰ ہزار افراد شخص گرفتار ہوئے اور سیکڑوں مارے گئے۔ گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد حضرت مولانا بھی گرفتار ہو گئے۔

مسلم قوم پرستوں کی جماعت

ستیزہ گردی ستیزہ گردی کے شروع ہونے سے پہلے کانگریس کے مسلمان قوم پرست لیڈروں اور کارکنوں نے ایک کوشش یہ بھی کی تھی کہ مسلمان عوام سے قریب تر رابطہ پیدا کریں۔ ڈاکٹر انصاری اس وقت زندہ تھے۔ ان کے اور حضرت مولانا کے مشورے سے ۱۹۳۱ء میں کانگریس کے اندر مسلم قوم پرستوں کی ایک جماعت منظم کی گئی۔ حضرت مولانا اس کے صدر تھے اور تصدق احمد خان شروانی سیکرٹری اور ڈاکٹر انصاری ٹرینر۔ جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام حریت پرست اور ترقی پسند جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

اس پارٹی کی راہ میں ایک مشکل یہ حال تھی کہ علی براہ دارن اب کانگریس کے میدان سے ہٹ رہے تھے۔ وہ سائنس کیشن اور نفوذ اصلاحات کے خلاف سول نافرمانی کے مخالف تھے اور ان کی وجہ سے بعض دوسرے مسلمان لیڈر بھی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اس وقت بھی مسلمان قوم پرستوں کے سب سے بڑے قائد مولانا ہی تھے جو کانگریس کی تحریک کی پوری پوری تائید کر رہے تھے۔ ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد اور قیام پاکستان کے بعد خصوصاً قوم پرست مسلمانوں کی قوم پرستی کے سب سے بڑے قلعہ دار صرف حضرت مولانا ہی رہ گئے تھے اور ان کی رہنمائی میں ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں نے جو متحدہ قومیت میں عقیدہ رکھتے ہیں اور ہندوستان کو اپنا حقیقی وطن تصور کرتے ہیں۔ ہندو اکثریت کے بعض طبقات کی شدید مخالفت کو انہیں کرتے ہوئے سیکورڈ نظام حکمرانی کی بنیاد کو مضبوط بنانے کے لیے جس بڑے ملکن ہونا اپنا کام جاری رکھا۔ اس وقت جب کہ ہندو اکثریت کی فرقہ پرستی اور مشترک کلیہ و متحدہ قومیت کے مخالف عناصر کی

تجزیہ کر گئیں پوری قوت سے جاری ہیں۔ بہر حال حضرت مولانا کی رہنمائی و قیادت پہلے سے بھی زیادہ ضروری تھی لیکن مشیت الہی اور کامقہ وقت انسان کی ضرورت و مصلحت کے مطابق نہ بدلا ہے نہ کبھی بدے گا۔

۴۰ سے ۴۶ تک

۴۰ء میں حضرت مولانا نے پھر ایک دفعہ کانگریس کی صدارت کی ذمہ داریاں قبول کر لیں تو گاندھی جی کی غیر مشروطہ پیشکش پر ایک جمعہ اور شروع ہوئی اور پھر حضرت مولانا ۱۸ ماہ کی سربراہی کھیل چکے گئے۔ ستیہ گرہ کی یہ ہم آہنگی میں بھی جاری رہی۔ مگر جب پرل ہاربر پر جاپانیوں کے کامیاب حملے نے جنگ کو تعزیناً عالمگیر بنا دیا اور پیر سیلاب مشرق بعید کی سمت براہ راست ہندوستان کی طرف بڑھنے لگا تو برطانیہ نے جس کی قوت جنگ کے پہلے ہی سال میں بہت مجروح ہو چکی تھی ہندوستان کی ہمدردانہ تائید کا حاصل کرنا اپنے لئے ناگزیر سمجھا۔ اور حضرت مولانا بھی دوسرے رہنماؤں کے ساتھ ہائیکورٹ وائسرائے نے تمام ملک سے اپیل کی کہ اس بڑھتے ہوئے خطرہ کے مقابلے میں ایک متحدہ مجاذق قائم کیا جائے۔ اس مجاذق کو مستحکم بنانے کے لئے کانگریس اور لیگ کا اتحاد بھی ضروری تھا۔ لیکن قائد اعظم نے ایک دفعہ پھر صاف صاف کر لیگ اور کانگریس کا اشتراک عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کانگریس پاکستان کے نظریہ کو قبول نہ کرے۔ چنانچہ بعد رنگون پر دشمن نے قبضہ کر لیا اور اب حالت اضطراب میں برطانیہ نے اسٹیٹ فورڈ کرس کو ہندوستان بھیجا۔ کرس نے اور لیگ کے لیڈروں کے سامنے آزادی کی یہ تجویز رکھی کہ ہر عہد کو یہ اختیار تیز می دے دیا جائے کہ وہ اپنے سیاسی مسئلہ کا فیصلہ کرے۔ اور ہندوستان کے دفاع کی نگرانی برطانیہ کے سپرد رہے۔ لیکن یہ پیش کش کانگریس کے مطالبہ سے بہت دور تھی چنانچہ حضرت مولانا نے اعلان کیا کہ وہ خود ملک کے دفاع کے لئے تلوار اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ ملک کی آزادی اور اعلان کر دیا جائے۔ لیکن نہ تو کانگریس اور نہ خود مولانا کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ تھے جس کے تحت صوبوں اور ریاستوں کی آزادی کے مطالبے کسی قسم کی تسلیم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ وہ ایسی ہر تجویز کو آزادی کی نفی قرار دیتے تھے۔

کریس مشن کی ناکامی

چنانچہ کریس مشن کے بارے میں امریکی دفاعی نگار نویس فشر کے بیان کے مطابق حضرت مولانا نے تاثرات تھے کہ اس اسٹیٹ فورڈ کرس نے حضرت مولانا اور کانگریس کے رہنماؤں سے جو دعائے تھے لندن سے ان کی اجازت نہیں ملی لہذا اب برطانوی حکومت سے مزید گفت و شنید دیکر بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے اقتدار سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے۔ تقسیم ملک کی تجویز کے متعلق حضرت مولانا نے نوٹیس فشر سے فرمایا تھا میں شادی سے پہلے ملاقات کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ اگر ہندو اور مسلمان ایک جازدگی بسر کرنے کی کوشش کریں اور ناکام رہیں تب بھی جدائی کا سوا اختیار ہے۔ لہذا حضرت مولانا نے کریس کی تجویز کا مطالعہ کرتے کرتے بعد کانگریس کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وہ نہ تو ان کی تجویز کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ اور نہ کسی ایسی مقامی حکومت کو تسلیم کر سکتے ہیں۔ جس کی سربراہی کریس مشن کر رہا ہے۔

اختیارات عوامی نمائندوں کے بجائے بدستور دائرے کو حاصل رہیں۔

ہندوستان چھوڑ دو لیونیشن

جولائی ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا جس میں ایک ریپریزنٹیشن کے ذریعہ انگریزوں سے کہا گیا کہ اب وہ ہندوستان سے فوراً ہی نکل جائیں۔ گاندھی جی نے بھی اس موقع پر صاف کہہ دیا کہ اگر آزادی کا تحفہ آسمان سے نہیں گرتا تو ہم روکر آزادی میں گئے مجلس عاملہ کے اس جلسہ کے فوراً بعد حضرت مولانا اور تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے یہ نظربندی ۹ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک جاری رہی۔ حضرت مولانا نے اس زمانے کے تاثرات کا بہت ہی دلچسپ خاکہ اخبار طائر کے ذریعے پیش کیا ہے۔ چند روز بعد جب لشکر کا دور ختم ہوا اور لاڈ پول دائرے بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے پھر از سر نو گفت و شنید کا آغاز کیا اور گاندھی جی پھر رہا کر دیئے گئے۔

اس کے بعد متعدد تجاویز پیش ہوتی رہیں لیکن گفتگو نے مفاہمت کی ہر راہ مطاہر پاکستان کی چٹان سے ٹکرا کر عرق ہوتی رہی خود گاندھی جی نے سرسبز جناح سے طویل ملاقاتیں کیں لیکن نتائج نہ اچھے نہ بد نہ موقوف میں اتنے مضبوط نئے کہ ایک پانچ نہ ہوئے۔ کرپس کی ابتدا ان تجویز میں یعنی یہ کہ ہر صوبہ کو اپنے لئے..... فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے میں مطالبہ پاکستان کی تائید کسی نہ کسی طرح موجود تھی۔ نہ تو راج گپال اچاری کا ناہر مولانا اس کا بدل ہو سکتا تھا اور نتیجہ ہمارا ہر دور کا ناہر مولانا۔ انصرض تہ اند اعظم کے تصورات کی وہ بنیاد کسی سے نہ ہٹ سکی جو ہندو مسلم فسادات نے قائم کر دی تھی۔

شتملہ کانفرنس

جون ۱۹۴۷ء میں لاہور ڈیول نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مرکزی عاملہ تشکیل دی جائے جس میں ہر منظم جماعت کو نمائندگی حاصل ہو لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ فروج اور دفاع کے محکمے اس عاملہ کے اختیارات سے باہر ہیں گے اور ان کی تمام داری صرف دائرے سے متعلق ہوگی مقصد یہ تھا کہ آل پارٹیز حکومت جاپان کے مداخلہ میں جنگ جاری رکھے اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کی حمایت حاصل کر سکے اس تجویز کے اعلان کے بعد وہ سب کانگریسی لیڈر جو بمبئی کی آخری قرارداد کے ساتھ ہی گرفتار کر لئے گئے تھے ۳ ماہ کی نظربندی کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ شتملہ میں ایک کانفرنس شروع ہوئی اور اس میں کانگریس نے حضرت مولانا کو پورے اختیارات کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت دی لیکن یہ کانفرنس بھی بالآخر ناکام رہی۔ حضرت مولانا مرکزی عاملہ کی روایت میں کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک نمائندے کو بھی نامزد کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کانگریس اپنے اس دعوے سے دستبردار ہوئے پر آمادہ نہ تھی کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ اور تمام فرقوں کی قومی جماعت ہے۔ کانگریس کا دعویٰ تہ اند اعظم کے موقوف کے خلاف تھا۔ اس لئے انہوں نے کانگریس کی جانب سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی نمائندگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں ایک وقت تو ایسا بھی آئی تھا کہ قائد اعظم حضرت مولانا کے ساتھ ایک ہی میز کے گرد بیٹھے پر بھی آمادہ نہ تھے۔

قائد اعظم کے رویہ سے مایوسی قائد اعظم سے مایوس ہو کر مولانا نے چاہا کہ اگر لیگ شریک ہونے پر آمادہ نہیں تو خود دوسری جماعتیں مرکزی حکومت کی تشکیل میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں۔ ان ہی کا شریک کر کے

مرکزی حکومت بنائی جائے۔ لیکن اس کے لئے دانشور تیار نہ تھے۔ دانشورائے کے اس انکار کا رد عمل کانگریس کے حلقوں میں ہوا اس سے قطع نظر کہ بھی عام طور پر سمجھا گیا کہ برطانوی تدبیر کو کوئی ایسی مرکزی حکومت قائم کرنا پسند نہیں کرتا۔ جس میں اختلاف تفریق کے امکانات باقی نہ رہیں!

پارلیمانی مشن۔ اسی زمانے میں برطانوی پارلیمنٹ کا مشن آیا۔

اینٹرپرائز گورنمنٹ جس وقت عارضی حکومت میں شرکت کا سوال زیر بحث تھا تو بلیک کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ تنہا مسلمانوں کا نمائندہ ہے اس لئے کانگریس کو حق حاصل نہیں کروہ کسی مسلمان کو کابینہ کی رکنیت کے لئے اپنی طرف متوجہ نہ کر دے۔ لیکن جب ان کا وقت آیا تو خود اس نے اس اصول سے قطع نظر کہ اقوام مندرجہ فہرست کے ایک غیر مسلم کو نامزد کیا۔ اور راجہ غنیشہ علی خاں نے صاف کہہ دیا کہ ہم اینٹرپرائز گورنمنٹ میں صرف پاکستان کے لئے جنگ کرنے جا رہے ہیں۔ اور بیاریات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اس لبا لبا کانگریس کی بازی ہر گئی۔

۱۵ اگست کو ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا اور اسی کے چند روز بعد بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ یہ اعلان ایک چنگاری تھی جو پنجاب کے بارود خانہ میں گری اور اس کے بعد دنیا نے انساںوں بہیمیت اور وحشت کے جو مناظر پنجاب اور دہلی میں دیکھے وہ انسانیت کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو صدیوں تک باقی رہے گا۔ ان دو جہیزوں کی تاریخ ان وحشیانہ افعال کے لحاظ سے جن کا ارتکاب کیا گیا انقلاب فرانس کے عہد تشدد کی تاریخ ہے بلکہ اس سے بے حد زیادہ ہندوستان کی تہذیب پر سب سے زیادہ شرمناک دھبہ مظلوموں جو خود توں اور بچوں پر کئے گئے اور اس فترت پرستی کے فتنہ کا آخری شعلہ وہ تھا جس نے خود گاندھی جی کے رخت حیات کو ایک آن واحد میں چھونک دیا، لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ان کے خون کے ایک ہی پھینٹنے نے ان انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو اس طرح ٹھنڈا کر دیا جس طرح کہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکتی تھی۔ یکم ستمبر کو کلکتہ میں اور پھر جنوری ۱۹۴۸ء میں دہلی میں انہوں نے آخری مرتبہ — ہندو مسلم اتحاد کے لئے برت رکھا اور ۳۰ جنوری کو بالآخر اپنے مقصد کی آخری اور انتہائی قیمت ادا کر کے وہ اپنی زندگی کے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

۱۶ اگست کے آخری اور ۱۷ اگست کے ابتدائی عہد میں حضرت مولانا جیسے حساس انسان کے لئے سخت ترین امتحان۔ زندگی کے..... سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ مرکزی حکومت کے رکن کی حیثیت سے

بھی ان کو اس آگ میں گزرنا پڑا۔ اہل دہلی جو بہت قریب سے حضرت مولانا کو دیکھ رہے تھے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اس دور میں مولانا کی انسانیت کس طرح اس امتحان میں پوری اتری وہ دن رات حالات کا مقابلہ کرنے میں معروف رہے اور امن و امان کے ان کی جدوجہد کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی شخصیت کے بہترین قویٰ برسر کار نہ کئے ہوں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دہلی کے دور میں..... اپنے سخت سے سخت مخالفین اور دشمنوں کی بھی پوری پوری مدد کر رہے تھے ان کا مکان ہر شخص کے لئے پناہ گاہ تھا۔ ان کے دنوں اور ان کی راتوں کا ہر لمحہ مصیبت زدوں اور مظلوموں کی خدمت اور امداد کے لئے وقف تھا۔ اس زمانہ میں وہ گاہی

کے دست راست تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ہنگام کی مایوس کن تاریکی میں وہ اور گاندھی جی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ گاندھی جی کا دفعتاً دنیا سے رخصت ہو جانا حضرت مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن ان کی باوقار شخصیت کو باہر سے بھنے والے لوگ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ سنجیدگی اور تمکین کی اس خاموش سطح کے نیچے ان کی زندگی میں یہ کتنا گہرا زخم تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک رستہ را۔

ایک عالم

عزمِ ہالیہ کی طرح استوار، دلِ آبِ زمزم کی طرح پاک و صاف، دماغِ آسمان کی طرح بلند، نظرِ آفتاب کی طرح روشن، فکرِ دیباؤں کی طرح رواں، علمِ سمندر کی طرح وسیع، عقلِ چراغوں کی طرح نور افروز، فضلِ اشجد کی طرح سایہ دار و مثرین، کلامِ شمد کی طرح لذیذ و شیریں، ان چھوٹوں کی طرح نازک اور شکنجہ۔

حکمت میں عقدہ کشا، سیاست میں صاحبِ تدبیر، حکومت میں فیضِ رساں، نرم میں صاحبِ مسلم و کمال، نرم میں مجاہد وطن۔ سرِ قیادت کا تاج، پیشانی پر شرافت کا عکس، آنکھوں میں ایمان کا نور، زبان پر لغو و حق اور پیامِ امن۔ سینہ پر محبت کی آئینہ بندی، لب میں انسانیت کا درد، گھر میں صبر کی تلوار، دوش پر شکر کی عبا، ہاتھ میں استقامت کی عصا، پاؤں میں عزم و ثبات کے سوزے۔ اور اتحاد کی راہ پر وہ سفر جس کی ہر منزل پر انسانیت کی فلاح کا پیغام اور جس کی آخری منزل پر یہ آواز کہ اب مجھے خدا پر چھوڑ دو۔ اس حالت میں خدا سے راضی ہے اور میں اپنے خدا سے راضی ہوں۔

کرد و ٹوں برس کی بوڑھی دینا نے اپنی زندگی میں ان گنت ابوالکلام دیکھے ہوں گے لیکن جس ابوالکلام کو دنیا ڈھونڈ رہی ہے اور ڈھونڈتی ہے گی وہ ایک ذات نہیں، انسانیت کے ایک دور کی تاریخ اور انسانی تمدن کے ایک زمانہ کی داستان تھی جسے ۲۲ دسمبر ۱۹۵۵ء تک دیکھا یا سنا گیا، وہ برباد گیا، لیکن اب پڑھا جائے گا کہ وہ خاک میں مل کر کیا بن گیا ہے، اب وہ عالم نہیں سراسر اپنا علم بن گیا ہے، جس کی تکمیل کے لیے اس کا میں نہیں گی، کتابیں تحریر ہوں گی، تحقیق کے باب کھلیں گے اور مستقبل کا انسان ابوالکلام کا علم صحیح عقول کو مانتے اور دلوں کو صاف کرنے والے علوم کی طرح حاصل کرے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ابوالکلام کو ایک عالم کی صورت میں کھو کر دنیا نے زیادہ کھوایا ہے یا ابوالکلام کو ایک علم کی صورت میں پاکر دنیا نے زیادہ پایا ہے۔

ابوالکلام اور اقبال دونوں کے اعتقادی مسکات میں عشق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ اقبال نے اپنے محبوب کو نے اہل طریقت سے حاصل کئے ہیں۔ مثلاً رومی، سنائی وغیرہ اور ابوالکلام کے نمونے اہل دین ہیں سے ہیں۔ مثلاً امام احمد بن منیل، امام ابن تیمیہ، حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ۔ اس سے یہ تو ظاہر ہو ہی جاتا ہے کہ ان کے درمیان بخود بخود وہ فاصلہ ضرور ہے جس سے وہ فاصلہ قائم رہنا چاہیے۔ ان میں سے ایک براہِ راست مسجد سے فیضیاب ہو رہا ہے اور دوسرا براہِ راست خانقاہ سے استفادہ کرتا ہے۔ اگر مذهب و جنس کی حد تک دو لڑن مذہبِ عشق کے مغز و متفقد ہیں۔

مولانا غلام رسول میر

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک مثال شخصیت کی چند جھلکیاں

چگونہ مے بہ میاں آورم دریں مجلس
کہ بادہ حوصلہ سوز است و جلد پر مستند

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے متعلق کچھ لکھنے کی فہم آتی ہے تو گہری سوچ میں پڑ جاتا ہوں، کہ بات حیات کا آغاز کہاں سے کیا جائے۔ اور کہاں اسے ختم کیا جائے۔ پھر یہ امر بھی خاص غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں علم و عمل کے جتنے بھی دائرے اور ان کے جتنے بھی گوشے ہیں، ان میں سے کس کس کا ذکر و درجہ حاضر کے خواجہ گان کلام کے لئے نوزوں و مفید ہو گا۔ مولانا نے کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جہاں اپنی عظمت و برتری ہی نہیں بلکہ بیگانگی کے گہرے ادکھی نہ بننے والے نقوش نہ چھوڑے ہوں۔ کوئی بھی میدان نہیں جس میں وہ کم از کم ہمارے عہد کے اندر سبقت و اولیت کے پھر سے اڑاتے ہوئے سب سے آگے نہ نکل گئے ہوں۔

عظمت و برتری | گذشتہ صدی یا اس کے پیشتر کے ادوار کو نظر انداز کر دیجئے۔ موجودہ صدی کا آغاز ہوا تھا تو بھاری قوم میں نہایت بلند پایہ اصحاب کی ایک عظیم القدر صف موجود تھی جن میں سے ہر ایک وقت کے ممتاز ترین فائدوں اور رہنماؤں میں محبوب ہوا۔ اور ان کے شخص نام ہی سے لئے جائیں تو ہر فرد کی گردن فرط احترام سے بے اختیار جھک جائے گی۔ مولانا ابوالکلام ۱۹۱۶ء تک ان میں بہ اعتبار عمر سے چھوٹے اور بہ لحاظ صلاحیت قیادت بالکل بے پایہ تھے یا کم از کم کچھ خود افراد کے سوا کسی کو علم نہ تھا کہ ان میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔ ۱۹۱۹ء کے وسط میں کلکتہ سے "الہلال" نکلا تو اس میں بھی وقت کے عوام و خواص کے لئے بظاہر کوئی خاص جاذبیت و کشش نہ تھی۔ عام لوگ نستعلیق کے عادی تھے۔ "الہلال" نے ٹائپ اختیار کیا۔ لوگ سادہ عبارتوں سے مستفید ہو سکتے تھے۔ لیکن "الہلال" ایک دعوت کے آرگن کی حیثیت میں ایسے اسلوب تحریر و نگارش کا پیکر تھا جس کا کوئی نمونہ اس سے پیشتر دیکھا نہیں گیا تھا۔ اور بعد میں بھی دنیا کوئی موقع بروز نہ کار نہ آسکا۔ تاہم دیکھئے کہ عوام اور مولانا کے درمیان ربط و تعلق پیدا ہونے میں مشکلات کی ایسی دیواریں حائل ہوئے کہ باوجود کیا صورت رہنما ہوئی۔ ابھی "الہلال" کے اجراء پر چند ہی صفحے گزرے تھے کہ مولانا قیادت کی آدھیں صف میں ایک ممتاز حیثیت پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کی عمر اس وقت صرف چوبیس سال کی تھی شاید ہی کوئی ایسی مثال پیش کی جاسکے کہ کسی فرد نے صرف چوبیس سال کی عمر میں کیا ایک قمر گنجی سے ابھر کر چند ہفتوں یا چند مہینوں میں وہ مقام بلند حاصل کر لیا ہو جو مولانا ابوالکلام آزاد کو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا۔ اور اعزاز احترام میں ایسی والہیت کے عناصر پر مشابہ کسی دوسری شخصیت کے تعلق میں جملہ افراد رہے ہوں۔ جیسے مولانا کے تعلق میں دیکھ گئے۔

یہاں پر ایک خاص معاملے کا ذکر بھی ضروری ہے جیل سے بہت کم اصحاب کی نظریں روشناس ہوئیں تھیں۔ ہمارے اکثر رفقاء ایسے تھے جنہیں ملک و ملت کا بے پناہ درد کھینچ کھینچ کر خدمت کے میدان میں لایا تھا۔ یہ خاص بڑی تعداد نے اپنا سب کچھ اس راستے میں بے دریغ لٹا دیا۔ اور ان کے اٹھا ہوا خلوص میں کسی بھی فرد کے لئے کلام یا گستاخ ہو سکتی ہے۔ تاہم جس حد تک مجھے علم ہے ان میں سے کسی نے بھی پہلے سے مختلف اہم مسائل و معاملات کے متعلق کوئی گفتہ تیار نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے، وہ اپنے قوائے فکر و عمل سے کام لے کر عوام کی رہنمائی کرتے رہے۔ میرے علم کی حد تک تنہا مولانا ابوالکلام کی شخصیت ایسی تھی جنہوں نے میدان عمل میں قدم رکھنے سے پیشتر تمام بنیادی مسائل کے حل میں سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ زندگی کے آخری سانس تک ان فیصلوں پر قائم و استوار رہے۔

مولانا محمد علی مرحوم و مغفور فرمایا کرتے تھے، فیڈر وہ نہیں جس کی گردن پھوٹوں کے ماروں سے لڑی رہے۔ لیڈر وہ ہے جو عوام کے بات و احساسات سے بالکل بے پردا ہو کر وہی کے جس میں قوم و ملت کی فلاح و بہبود ہو، اگرچہ اس سلسلے میں اسے جوتوں کے مار بے پڑیں، اگرچہ اس سلسلے میں اس کے سر پر ڈنڈے برسیں۔

مولانا آزاد کے افکار و مواضع سے آج بھی اختلاف کی گنجائش کھینچا کہ ان کی زندگی کے آخری دور میں ان سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا گیا ان کے آراء کی حکمت کے بڑے بڑے مدعی بھی زیادہ سے زیادہ ان کے لئے مصمت و اصابت رائے کا دعوے کر سکتے ہیں۔ مصمت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مصومت کا سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات باریکات پر ختم ہو گیا۔ مولانا کی برتری یہ ہے کہ انہوں نے اپنے معتقدات پر ثبات و استقامت میں ہر دسٹری کی مشاعرے گراں بہا بنے قائل و موافق بن کر ڈالی جو انہیں اس پہاڑ پر چاکر حاصل ہو سکتی تھی جس کی مثالیں ملنا مشکل ہے۔ لیکن وہ اس موقف کو اسلام، ملت اور ملک کے لئے صحیح سمجھتے تھے اس نے ایک لمحے کے لئے بھی ہٹنا انہیں گوارا نہ ہوا۔ حقیقت حال کیا تھی؟ اس کا فیصلہ ابھی باقی ہے۔ وہ آخری معاملہ اس وقت پر موقوف رہنا چاہیے جب بھی وہ قضا و قدر کی بارگاہ سے صادر و غیر مشتبہ طور پر سامنے آجائے گا۔

مولانا ابوالکلام کی صحیفہ نگاری کا دور حقیقتہً بہت مختصر ہے۔ کم و بیش سوا دو سال (الہلال ردور برائے میں شان امتیاز) اول، جاری رہا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۹ء سے ۲۴ مارچ ۱۹۱۹ء تک ساڑھے چار مہینے کا دور (الہلال) رہا۔ اسی طرح چند مہینے ان کے زیر نگرانی پیغام جاری رہا۔ غالباً ایک سال کی عمر (عربی) کی تھی۔ اور چھ مہینے (الہلال ردور) کے شامل کر لیجئے۔ دیکھئے اس مختصر سی مدت میں انہوں نے تحریر و نگارش، فکر و نظر، مقاصد و مطالب کے اعتبار سے صحافت کی دنیا کا رنگ و صنگ بدل ڈالا۔ ان سے پیشتر بھی اخباروں سے ضمانتیں طلب کی جاتی تھیں اور ضبط بھی ہوتی رہیں۔ لکھنؤ کے سلسلے میں جو انداز (الہلال) نے اختیار کیا، وہ بالکل نیا تھا اور مسرور نا دیدہ تھا۔ (الہلال) سے ضمانت طلب کی گئی تو لکھنؤ کے اول اس کا ذکر ہی ایسے انداز میں نہ کیا جس طرح عام اخبار نویس کرتے رہتے تھے۔ پھر نیاز مندوں نے اپنے درپے خط لکھے کہ حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے تو ایک مختصر سی تحریر (الہلال) میں چھاپی جس کا عنوان تھا "ابندائے عشق" اس میں لکھا کہ ضمانت کی رقم تو ہم نے اسی دن الگ رکھ لی تھی، جس دن اخبار جاری کیا تھا۔ اور اس رقم کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکٹا گئے

تھے۔ سوچتے تھے کہ یہ ابتدائی منزل طے ہونے میں اتنی دیر لگ گئی تو اگلی منزلوں کی نوبت کب آئے گی؟ غرض ہم نے دو ہفتے کی رقم اس تاریخ سے پیشتر ہی داخل کر دی جو اس کے ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

گویا سبق یہ دیا کہ ایسے حوادث پر پریشان ہونا بے معنی ہے۔ جو لوگ قوموں میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں، تو وہی جہاد آزادی میں کامیاب بنانے کی دعوت لے کر اٹھتے ہیں۔ انہیں پہلے یقین ہونا چاہیے کہ یہ منزل بڑی کمٹھن ہے۔ اس میں ہر نوع کے مصائب سے سابلقہ پڑ سکتا ہے۔ ہر لحظہ ان کے خرم پر کھڑک سکتی ہیں۔ جب تک ایسے حوادث کو صبر جمیل کے ساتھ جھیل لینے کا دل گردہ پیدا نہیں کیا جائے۔ اصل کام کیوں کر پورا ہوگا۔ ایسے حوادث بہر حال مصیبت فیز ہوتے ہیں اور حقیقتہً ختماتوں کی صبغی کسی کے لئے بھی خوش گوار نہیں ہو سکتی اور ہونی چاہیے۔ لیکن مجاہدین آزادی کا معاملہ تو میدان جنگ کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہاں تیغ و تفتنگ کے زخموں یا جان و مال کے نقص کا شکوہ کرنے کا کون سا موقع ہے؟ یہ حقیقت کسی سے بھی مخفی نہیں ہوتی لیکن اسے دعوت کارنگ دے کر ایسے انداز میں کرنا جس سے دار کا خوف و ہراس یکے تسلیم زائل ہو جائے اور ہر فرد بے تابانہ اصل نصب العین کی طرف پیش قدمی جاری کے سوا ہر شے کو تشویش کو پس پشت ڈال دے۔ یہ ہر فرد کا کام نہیں۔ صرف انہیں واعیان حق کا کام ہے جنہیں اللہ تعالیٰ قوموں اور مخلوقوں کی تقدیر بدلنے کے لئے میدان عمل میں کھڑا کر دیتا ہے۔

قریبانیوں کا سرا سر خاکہ | مولانا نے اپنی بیش بہا زندگی کے گرانمایہ اوقات قید و بند میں گزار دیئے۔ ان اوقات کا مجموعہ قریبانیوں کا سرا سر خاکہ | اس سال سے کم نہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے جو بے پایاں خزانے عطا کئے تھے ان کو وہ تصانیف کے انبار لگا سکتے تھے۔ چونکہ ان کی تحریریں موافقوں اور مخالفوں دونوں کے نزدیک مستحق مطالعہ تھیں۔ اس لئے اپنی زندگی حد درجہ خوشگوار انداز میں بسر کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جن مقاصد و عزائم کے لئے زندگی وقف کر چکے تھے ان کی خاطر قید و بند میں گزارنے پر تیار نہ تھے۔ لہذا جب کبھی ان مرحلوں سے سابلقہ پڑا انہوں نے اسے صابرانہ قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ آخری قید میں ان کے سخت بیمار ہو گئیں، حکومت خاص شرطوں پر انہیں رہا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن انہوں نے مشروط رہائی منظور نہ کی اور ان کا دل کلکتہ میں ہو گیا۔ مولانا اس وقت احمد نگر کے قلعے میں قید تھے۔ یہ داستان مسالینا یا سن لینا شاید ایک حد تک سہل ہو لیکن جب قید و بند عظیم پر یہ سانحہ جا بجا گرا کر، اس کے قلب کی حالت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے اور خود دیکھ کر کیفیت زندگی کے آخری پرستار میں کیا ہوگی؟

یہ نہ سمجھئے کہ مردان کار کے دل حساس گوشت کے دیسے ٹکڑے نہیں ہوتے جیسے عام انسانوں کے پہلوؤں میں ہوتے ہیں۔ مردان کار کے دل زیادہ نرم، زیادہ حساس اور زیادہ رقیق ہوتے ہیں۔ وہ ایک چیونٹی کی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے

آں دل کہ پریشان شود از نالہ لب لب

تاہم وہ زندگی کے اہم و بلند مقاصد اور ان کے اہم و بلند اصول کی عزیز داری اپنے ہر نازک جذبہ اور ہر فطری احساس پہننے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ اس وادی پر خار کو طے کرنا سہل نہیں۔ لیکن مردان کار کا رُخ مقاصد کی سرخوشی میں ایسی ہی

وادیوں سے بے خودانہ گزر جاتے ہیں اور پاؤں کے پھلنی ہو جانے کا انہیں خیال بھی نہیں آتا۔

مولانا کے لئے یہ مصیبت کم نہ تھی کہ قید و بند کے سلسلے میں پیش آنے والی تلاشیوں اور ہر قسم کے کاغذات کی ضبطی کے باعث ان کی گراں باعلی متاع جری طرح تلف ہوئی۔ ان میں مسودے بھی تھے، ادھوری چھپی کتابوں کے فرسے بھی، کتابت شدہ کتابیں بھی اور بے شمار یادداشتیں بھی جو زندگی بھر کے مطالع کا پتھر تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی چیز ت واپس نہ ملی جو کاغذات ساہما سال کے بعد آتھ آئے۔ وہ کسی بھی کام کے نہ تھے۔ مولانا نے خود اس افتاد کا ذکر کرتے ہوئے ہے:

سیاسی زندگی کی شور و شبیہ اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ پتہ و آتش میں آشتی محال ہے۔ میں نے چاہا، دونوں کو بہ یک وقت جمع کروں۔ میں نامراد ایک طرف متابع فکر کے انبار لٹکا رہا۔ دوسری دوسری طرف برق خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا۔ نتیجہ معلوم تھا اور مجھے حق نہیں کہ حرف شکایت نہیاں پر لاؤں۔

عربی نے میری زبانی کہہ دیا ہے :

زال شکستم کہ دنبال دل خویش مدام

و ز نشیب شکن زلف پریشاں رستم

مولانا کی تصانیف میں سے مندرجہ ذیل کتابوں کا نظم سب کو ہے :

۱۔ ترجمان القرآن جلد اول و دوم : تفسیر فاتحہ، جسے اب الگ بھی چھاپ دیا گیا ہے۔

وف تصانیف

۲۔ تذکرہ

۳۔ قول فیصل، جو سیاسی مقدموں کی سرگزشت میں بے مثال ہے۔

۴۔ مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب

۵۔ جامع الشواہد ۶۔ غبار خاطر

بعض رسالے یا خطوط کے مجموعے یا وہ مجموعے مضامین و مقالات جو مختلف لوگوں نے اہلال و البلاغ سے لے کر قاسم کی ترتیب کا لحاظ رکھے بغیر چھاپ دیئے۔ اس وجہ سے ان کی اشاعت کا مقصد بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا اور نہیں ہوا۔ مثلاً نمایاں طور پر ایک طرف خود ترجمان القرآن بھی غیر مناسب انداز میں چھاپ دینا غیر مناسب نہ سمجھا گیا۔

اب ان تصانیف کا سرسری حال بھی سن لیجئے، جن کا ذکر خود مولانا نے جا بجا کیا تاہم اب ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

بے سراغ ذخیرہ

۱۔ ایک رسالہ جن میں بتایا گیا تھا کہ اردوئے قرآن اقوام و مل کے مراتب ہدایت و ثقافت کیا ہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۱۲ء میں بغرض طباعت حوالہ مطبع ہو چکا تھا (اہلال ۱۶، اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۶، حاشیہ)

۲۔ سورۃ واقعہ کی تفسیر (اہلال ۲۲ جولائی ۱۹۱۳ء ص ۱۰۱، حاشیہ)

۳۔ تاریخ مقررہ (اہلال ۲۴ جون ۱۹۱۳ء ص ۴) شاید اسی کتاب کے بعض اجزاء البلاغ کے جو تھے پانچویں اور چھٹے

ساتویں نمبر میں یہ عنوان "تاریخ" وغیرہ چھپے تھے۔

۴ - سیرۃ شاہ ولی اللہ (اہل سال ۲۴ جون ۱۹۱۶ء ص ۴۰)

۵ - میرزا غالب کے اردو دیوان پر تبصرہ (ایضاً)

۶ - خصائص مسلم (ایضاً)

۷ - امثال القرآن (ایضاً)

۸ - دیوان شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ (ایضاً)

۹ - سیرۃ حضرت مجدد شیخ احمد سرہندی - اس کی ترتیب ۶ - یا ۷ - اگست ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی جب مولانا راجی (دھوبہ بہار) میں نظر بند تھے اور ۱۲ اگست کو پورے ایک ہفتے میں مکمل ہو گئی۔ اس کی ضخامت کا اندازہ کیا گیا تو متوسط قطیع کے ایک سو تہتر صفحے ثابت ہوئی (تذکرہ طبع اول ص ۲۴۱)

۱۰ - اتحاد الخلف بطریقہ السلف : اس میں سلف امت اور اصحاب تغویض کے مذہب حق و طریق حکمت اور عقائد صادقہ و فاضلہ کا اثبات کیا گیا تھا۔ اور اصحاب تاویل و رائے نیز مکملین و اتباع فلاسفہ کی بے حاشا و افح کی گئی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں بہ زمانہ قیام راجی مکمل ہو چکی تھی۔

۱۱ - النکم الطیب (تذکرہ طبع اول ص ۲۲۰)

۱۲ - (ایضاً) ان کتابوں کا موضوع بظاہر یہ تھا کہ علوم ہادیہ کے خلاف انسان کے شکوک و شبہات کے لئے ایسے اصول دریافت کئے جائیں جن سے تمام جزئیات کا انتقاء ہو جائے، نیز ان کے جواب۔

۱۳ - سیرۃ طیبہ، مآخذ قرآن حکیم (تذکرہ طبع اول ص ۱۸۸، ۱۸۶، ۱۸۲)

۱۴ - سیرۃ امام احمد بن حنبل، جن کے ساتھ ان کے وصیت نامے کی شرح بھی کر دی تھی۔ (تذکرہ طبع اول ص ۱۹۵ - ۱۹۶)

۱۵ - سیرۃ ابن تیمیہ و اصحابہ، جس کی تکمیل کے لئے مولانا نے سید سلیمان مرحوم سے الرضی الطیبی کا تفسیری نسخہ عاریتہ مانگا تھا۔ اس وقت تک یہ کتاب بھی نہیں تھی بعد میں چھپ گئی۔

۱۶ - شرح حدیث غربت (بَدَأَ الْفَتْوَى بِالْعَرَبِ وَبَدَأَ الْإِسْلَامُ بِالْمَدِينَةِ وَبَدَأَ الْوَسْوَاسُ بِالْمَدِينَةِ) مولانا فرماتے ہیں یہ حدیث بھی منجملہ جوامع الکلم نبویہ ہے۔ اس میں جس طرح اوائل کا حال دیا ہے اس ہی طرح اواخر کی بھی کوئی بات نہیں چھوڑی۔ حافظ ابن رجب نے چند صفحات میں اس کی شرح لکھی ہے۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔

اپنی شرح کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ ایک سو صفحہ سے زائد میں ختم ہوئی ہے۔ شرح ہائے غربت تاہمید و تفصیل اسباب غربت و بحث و تحقیق احادیث فقہ کے باب انشاء اللہ جوامع اوصاف ہوگی۔ انتہا عبت سے پہلے تقریباً ۱۰۰۰ مطالب پڑھا دیئے جائیں گے۔ جو کتاب میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے بالفعل سر انجام نہ پاسکے (تذکرہ طبع اول ص ۲۵۴)

اب تین بڑی کتابیں رہ گئیں جن پر الگ الگ بحث ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلے ترجمان القرآن جلد سوم آتی ہے۔

”ترجمان“ انہیں کم از کم دوسرے لکھا پڑا۔ کیونکہ پہلی مرتبہ کا مرتب کیا ہوا ترجمان جس کی طباعت بھی شروع ہو چکی تھی۔ ان کا غنڈا میں حکومت کے پاس چلا گیا تھا۔ جب مولانا کو صوبہ بنگال سے اخراج کا حکم ملنے کے بعد ان کے مکان اور چھاپے خانے کی تلاشی کی گئی تھی۔ اس تلاشی میں بے شمار قیمتی مسودے اور چھپے ہوئے فرسے نیز اہم یادداشتیں بھی پولیس ساتھ لے گئی۔

مولانا تین سال چند مہینے کی نظر بندی کے بعد باجوہ راجپوتی سے لکھنے پہنچے تو ۱۹۱۷ء میں حکومت نے جو کاغذات مولانا کو واپس کئے وہ مشفقہ کاغذات کا محض ایک جزو تھے۔ اور وہ بھی ارباب کی دیکھ بھال اور چارج پڑتال کے بعد اس طرح بل محل چکے تھے اور پھٹ گئے تھے کہ ان میں سے کام کی کوئی چیز نکال کر الگ کر لینا ممکن ہی نہ تھا۔

مولانا نے دوبارہ ”ترجمان“ کی ترتیب و تصویب شروع کی۔ اور جولائی ۱۹۱۷ء میں وہ آخری سورت کے ترجمہ و ترتیب سے فارغ ہو چکے تھے۔ ترجمان کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں چھپی۔ اور دوسری ۱۹۳۷ء میں چھپی۔ تیسری جلد کی طباعت نہ ہو سکی۔ شیخ غلام علی ایڈمنسٹر نے میری درخواست پر تینوں جلدوں کی ادب و اشاعت کا پروگرام بنایا تھا۔ اور ایک مفصل منصوبہ مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا تھا لیکن رائلٹی کی رقمیں اس وقت کے حالات میں دو گونہ کم ہو گئیں کا موجب بنتی تھیں۔ لہذا مولانا نے شرف الدین کتبی اینڈ سنٹر بمبئی سے مسئلہ کر لیا۔ اس نئے معاملہ کے مطابق کاروبار شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اور ترجمان کی تیسری جلد کا کوئی سراغ حال میں مل سکا۔ حالانکہ اس کی ترتیب کے شاہد باہم بچائے ہیں

میں نے ایک مرتبہ ترجمان کی محض دوسری جلد اس خیال سے دیکھی کہ اس میں کہاں کہاں تیسری جلد کے حوالے کا مقدمہ موجود ہیں۔ ان کی کیفیت ملاحظہ فرمائیجئے۔

۱۔ الحجر کے ایک تشریحی نوٹ میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے مختلف مقامات پر نوع انسانی کی پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ ان تمام مقامات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا ضروری ہے چونکہ سورہ ”ص“ میں بھی یہ بیان آیا ہے۔ اس لئے (سورہ الحجر میں) صرف ربط مطالب کی تشریح پر اکتفا کی جاتی ہے۔ باقی تمام تشریحات سورہ ”ص“ کے نوٹ میں ملیں گی (جلد دوم ص ۳۰۴)

۲۔ الحجر۔ آیت ۲۵ میں ”جان کی پیدائش کا ذکر فرماتے ہیں۔ جان اور جن کے لئے سورہ جن کا نوٹ دیکھنا چاہیئے۔ (جلد دوم ص ۳۰۴)

۳۔ سورہ کہف کے حواشی میں واقعہ کھف پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ رہبانیت کا ذکر آ گیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مسیحی رہبانیت اضطرابی حالات کا نتیجہ تھی۔ آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کر لی۔ اس کی مزید تشریح سورہ ”حدید“ کے حواشی میں ملے گی (جلد دوم ص ۳۹۷)

۴۔ سورہ انبیاء کی تشریحات کے ادوار میں لکھتے ہیں: باقی رہ حضرت ابراہیمؑ انی سقیم (میں بیمار ہوں) و ملاوٹ

تو اس کی تشریح سورہ صافات میں ملے گی (جلد دوم ص ۱۰۱)

۵۔ سورہ یونس کے تشریحی حواشی میں ایک مقام پر فرماتے ہیں کہ پہلی نشأت سے دوسری نشأت پر استدلال

تفصیل سورہ حج کی آیت ۱۵ اور سورہ قیامہ کی آخری آیات میں ملے گی (جلد دوم ص: ۱۴۸)

۶۔ سورہ مومنون کی تشریحات میں فرماتے ہیں کہ آیت ۷ کے معلوم ہوا، قرآن کے نزدیک اتحاد مناسلی کا جانا

صرف ایک ہے اور وہ ازواج کا طریقہ ہے۔ اس کے سوا جو طریقہ اختیار کیا جائے گا، وہ ناجائز ہوگا۔ دنیا کی

عرب میں بھی غلامی کی رسم جاری تھی۔ چونکہ وقت کی سوسائٹی میں آزاد اور غلام افراد کی دو قسمیں موجود تھیں اس

کا ذکر ناگزیر ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ خود قرآن نے رسم غلامی کے باب میں کیا حکم دیا۔ اور کس طرح اسے مٹا دیا

اس کا جواب سورہ محمد کی تشریحات میں ملے گا (جلد دوم ص: ۵۲۶)

۷۔ میں نے ایک مرتبہ سورہ فاتحہ کے بعض مطالب کے متعلق لکھا تھا کہ ان سے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے شاید

ضروری نہیں اور اسلام کا نظام عبادات بنگانی تھا۔ مولانا نے میرے شبہات کا مفصل جواب دیتے ہوئے فر

طرح اصل دین کی دعوت کامل ہو چکی اسی طرح شرع و منہاج کا معاملہ بھی کمال کو پہنچ گیا۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ

کا محل تفسیر سورہ فاتحہ یا سورہ بقرہ نہیں سورہ احزاب ہے۔ (ملاحظہ کیجئے تیسری کتاب نقش آزاد)

خود فرمائیے کہ آیا ارباب علم و فضل مباحث کے ان حوالوں اور نشانوں کو محض خیالی اور قیاس قرار دینا

کر سکتے ہیں؟

عجیب امر یہ ہے کہ تیسری جلد میں سے سورہ نور کتابت شدہ مل گئی ہے اور وہ اب ترجمان کی تیسری جلد

کے مطابق دوسری جلد کے ساتھ چھپ رہی ہے۔ گو یا حقیقتہً تیسری جلد کی کتابت شروع ہو چکی تھی۔ لیکن

معلوم ہوانے کی بنا پر معرض التوا میں پڑ گئی۔

دوسری اہم کتاب البیان تھی۔ جسے قرآن مجید کے بعض اہم مقامات کی مفصل تفسیر قرار دینا چاہیے۔

۱۔ کے صرف دو نمونے ترجمان میں ملتے ہیں۔ اول سورہ فاتحہ کی تفسیر دوم اس امر کی تحقیق کہ دو نمونے

کون تھا۔ مولانا کی تحریرات سے متحدہ شہادتیں ملتی ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ البیان نہایت اہم حقائق پر

چند شہادتیں ملاحظہ فرمائیے =

۱۔ سورہ توبہ کی تشریحات میں ایمان، کفر اور نفاق کی اجمالی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اس باب میں

امر تفصیل طلب ہیں اور مباحث تفسیر و حدیث کے متحدہ مقامات میں جن کی تحقیق ضروری ہے، لیکن مزید تحقیق یہ

نہیں۔ البیان کا انتظار کرنا چاہیئے۔ (جلد دوم ص ۱۴۳)

لہٰذا ہمیں ابتغیٰ ذوالاثراتک ہم العادون یعنی اپنی بیبیوں یا غلامی کی حالت میں پڑی ہوئی عورتوں سے جو ان کے نکاح میں

گئیں، علاوہ ان شرفی ٹھیکہ ہے۔ ان کے سوا کوئی دوسری صورت نکالنے والے حد سے باہر ہو گئے۔

۱۔ سورہ توہی کی تشریحات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ اہل کتاب اخلاص کھو چکے تھے۔ جب کبھی دیکھتے کہ شریعت کا کوئی حکم ان کی دنیا پرستیوں میں روک ہے تو کوئی نہ کوئی شرعی حیلہ نکال لیتے۔ سود کے لین دین سے بھی انہیں روکا گیا تھا علماء یہود نے جو حیلے نکالے ان کی تشریح البیان میں ملے گی۔ (جلد دوم ص ۱۲۷) ایسی تشریحات کے بعد ہی اس حدیث کی پوری حقیقت واضح ہو سکے گی۔ جس میں پیشگوئی فرمائی گئی تھی کہ تم پیشروؤں کے طریقے اختیار کر دو گے۔

۲۔ اختصار و اکتناز پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جو فرقہ جتنا زیادہ کلمائے گاتنا ہی زیادہ اتفاق پر مجبور ہو گا۔ یہ بات کہ قرآن کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کس طرح اجتماعیت پیدا ہو سکتی ہے، جس درجہ اہم ہے اتنی ہی زیادہ یقین بھی ہے۔ البیان میں یضمن تفسیر سورہ بقرہ اس کی مفصل بحث و تحقیق ملے گی۔ (جلد دوم ص ۱۳۲)

۳۔ رضی اللہ عنہم ورضو اعنہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں سابقون الاولون نے اللہ اور اس کے کلمے حق کی راہ میں جو کچھ پیش آیا، اسے جیسا ہی نہیں بلکہ کمال محبت ایمانی سے اس میں خوشحال و خوشنود رہے۔ یہی مقام ہے جو ان کے درجے کو تمام مدارج ایمان و عمل میں ممتاز کر دیتا ہے۔ تعجب ہے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مفسروں کی نظر اس صاف و واضح بات کی طرف نہ گئی۔ البیان میں مزید تفصیل ملے گی۔ (جلد دوم ص ۱۴۵)

۴۔ سورہ ہود کی تشریحات میں اس اعتراض کا ذکر آگیا ہے کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کے متعلق آثار مصر میں اب تک کوئی چیز نہیں ملی۔ اس بنا پر بیسیویں صدی کے علمائے تاریخ کا عام رجحان اس طرف ہے کہ ان دونوں واقعوں کی تاریخی حیثیت قابل تسلیم نہیں۔ لیکن کیا آثار مصر کا سکوت اس کے لئے کافی ہے کہ اسے تاریخ کی منفی شہادت تسلیم کر لیا جائے؟ نیز کیا فی الحقیقت آثار مصر میں ان واقعات کے لئے کوئی روشنی نہیں؟ یہ سوالات ضرور حل کرنے چاہئیں لیکن ان کا عمل البیان ہے۔ ترجمان القرآن نہیں۔ (جلد دوم ص: ۲۱۸)

۵۔ سورہ الحجہ کی تشریحات میں یہ ذکر آگیا ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سورہ فاتحہ کی پہلی آیت ہے یا نہیں۔ فرماتے ہیں اس پر مفصل بحث البیان میں ملے گی۔ (جلد دوم ص: ۱۳۰)

۶۔ سب سے آخر میں تیسری اہم کتاب یعنی مقدمہ قرآن کا معاملہ آتا ہے۔ جس کا نام ایک جگہ مولانا ابوالکلام نے البصائر لکھا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی اہمیت کا پورا احساس نہیں کیا گیا اس کے مباحث کی سرسری کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ”تذکرہ“ میں ایک مقام پر یہ بحث پیش نظر ہے کہ فلسفہ عقل پرستی کی راہ یقین و طمانیت تک نہیں پہنچا سکتی علم و بصیرت اور یقین و نور حقیقت صرف قرآن اور حال قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہے۔ فرماتے ہیں: یہ مقام منجملہ روح الروح معارف کتاب و سنت و حقیقۃ الخفائی قرآن و شریعت کے ہوتے مگر اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تفسیر البیان میں ایک سے زیادہ مواقع پر اسکی تشریح ملے گی۔ ادراس سے زیادہ مقدمہ تفسیر موسوم بہ البصائر میں بعنوان حقیقت ایمان و کفر با ایں ہمہ طبعیت اب تک اس طرف سے سیر نہیں ہوئی۔ روز بروز یہ مقام اپنی مزید وضاحت اور وسیع تر اطراف و مباحث کے

ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ شاید دامن بیان اس سے بھی کہیں زیادہ پھیلے جس قدر البیان میں سمیٹا جا چکا ہے

(تذکرہ طبع اول ص: ۱۴۳)

علوم سماویہ اور انسانی شکوک

تذکرہ میں ایک مقام پر اس مسئلے کے متعلق متفرق اشارات کے بعد فرماتے ہیں: "مطلب متعدد مقامات پر لکھا جا چکا ہے، سب سے زیادہ مقدمہ تفسیر میں۔ اس کے (یعنی مقدمہ کے) ایک باب کا موضوع ہے کہ علوم سماویہ کے خلاف انسان کے تمام شکوک و شبہات کے لئے اصول و معانی معلوم کئے جائیں جن سے تمام جزئیات کا استقصاء ہو جائے۔ اور کوئی قسم شبہ و اعتراض کی اس سے باہر نہ ہو۔ پھر ان شبہات و اعتراضات کو جمع کیا ہے جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے۔ نیز ان جوابات مندرجہ قرآن یہ دکھلایا ہے کہ جس وقت سے انسانی علوم اور علوم سماویہ کی آویزش کا حال معلوم ہے، اس وقت سے لے کر آج تک کوئی شبہ اور اعتراض ایسا نہیں کیا گیا، جس کا اصولاً جواب قرآن نہ دے دیا گیا ہو۔ (تذکرہ جلد دوم ص: ۲۱۹-۲۲۰)

تحریف شریعت کی حقیقت

تذکرہ میں ایک مقام پر یہ معاملہ زیر غور آ گیا تھا کہ تمام علوم و فنون میں جدل و خلافہ تاویل الجاہلین اور تحریف الغالبین کے برگ و بار ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں: "شرح حقیقت تحریف شریعت علی الخصوص فتنتین عظمتیں یونانیہ عجیبہ کے لئے مقدمہ تفسیر کا باب بست و حکم اور تفسیر فاتحہ الکتاب کو دیکھا چاہئے (تذکرہ طبع اول ص: ۱۹۳) ظاہر ہے کہ تذکرہ مولانا نے ۱۹۱۶ء میں لکھا تھا۔ مقدمہ تفسیر اس سے بہت پہلے شروع کر چکے تھے۔ اور یہ دیکھتے وقت مقدمہ کے کم از کم اکیس باب ضرور مکمل ہو چکے تھے۔ آخری دور میں مولانا سے میری جس قدر گفتگو ہوئی ان تفسیر کا ذکر ضرور آجاتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے مقدمہ عربی میں لکھا ہے، کیونکہ اس کی زیادہ ضرورت پوری کو ہے۔ جس میں عربی دان زیادہ ہیں بعد ازاں اسے اردو میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا: دیکھئے میں نے قرآن کے متعلق تمام اصولی مطالب کو مقدمہ کے چوبیس ابواب میں اس طرح سمیٹ دیا ہے کہ کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ تمام اصولی مطالب کو چوبیس عنوانوں کے ماتحت قلم کر دیا ہے۔ پھر ان پر ایسے انداز میں بحث کی ہے کہ کوئی چیز نہ نہ جائے جسے قرآن کو سمجھنے کے سلسلے میں جاننا ضروری ہو۔"

خطبات صدارت اور تقریریں

یہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و منور کے علم و فضل کی ہر سری سی سرگزشت تھی۔ ان کی خطبات صدارت اور تقریریں خاصا بڑا حصہ آزادی کی لگ و دو میں گزرا۔ ساڑھے دس سال کی مدت تو قریباً پورے دی۔ یہ ایں ہر فرصت کے چٹنے بھی اوقات بیستہ آئے ان میں تصنیف و تالیف کے انبار بھی لگائے۔ اعمال "السلطان" اور "وجاہت" کے مضامین و مقالات ان کے علاوہ ہیں۔ جن میں سے اکثر مقالات مستقل اور جامع رسائل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اصل موضوع کے کسی نہ کسی نہایت اہم گوشے پر بائیں نئی روشنی پڑتی ہے۔ پھر ان کے خطبات ہیں جو مختلف مجالس کے

بنیت میں دیئے گئے۔ مثلاً دہلی میں کانگریس کے اجلاس خاص (۱۹۲۳ء) کا خطبہ صدارت، کانگریس کے اجلاس رام گڑھ کا خطبہ صدارت، مختلف خلافت کانفرنسوں کے خطبے نائب صدارت۔ جمیعۃ العلماء کے اجلاس لاہور (نومبر ۱۹۲۱ء) کا خطبہ صدارت۔ ان بے شمار تقریروں کی فہرست مرتب کرنا مشکل ہے۔ پھر ان کی زبان پر کبھی اسیو، جینینہ آئی جس میں ذہنی و روحانی منفعت کا کوئی کوئی اہم پہلو موجود نہ تھا۔

جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں۔ پولیس نے ۱۹۱۶ء میں مولانا کے چھانڈے لانے اور مکان کی تلاشی لے کر جو کچھ اٹھایا تھا اس میں پچیس برسے فرسے، مسودے اور بادوستیں بھی تھیں۔ فرموں میں سے ایک کسی وجہ سے ادھر ادھر پڑا رہ گیا اور کرم خوردگی کے بعد اسے خاکر محفوظ کر لیا گیا۔ بی بی میں معلوم ہوا کہ یہ مقدمہ تفسیر کا کوئی باب تھا۔ اس کا آغاز ایسا ہوتا ہے =

"مقدمہ کے پانچویں باب میں قرآن حکیم کے طرز نزول اور ترتیب و انضباط کی بحث تم پڑھ چکے ہو....."

اب یہ فرمہ چھپ گیا ہے لیکن نامکمل ہے تاہم اس سے اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ مولانا نے "المبلاغ" کے اجراء کے ساتھ ہی ترجمان "میان" اور مقدمہ تفسیر (البصائر) کی طباعت شروع کر دی تھی۔ اور مقدمہ تفسیر کے کم از کم پانچ باب اس نامکمل فرسے سے پیشتر چھپ چکے تھے۔ جو یا مقدمہ مکمل موجود تھا تو درجہ اس کی طباعت ہو رہی تھی کہ حکومت کی طرف سے تلامذہ کی بلا اور کلکتہ سے مولانا کے اخراج نے تمام سلسلے درہم برہم کر ڈالے =

غور و فکر کے زاریے | اس سرگزشت پر غور و فکر کے اہم ناولے یہ ہیں :
۱۔ اصل سلسلے کی وسعت اور تنوع کا معاملہ۔

۲۔ اس کا یہ پہلو کہ بعض نہایت اہم مسائل کی عام حیثیت پیشتر کیا تھی اور مولانا نے ان میں غور و فکر کے کون سے نئے پہلو پیدا کر دیئے۔

۳۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولانا اصلاً داعی حق تھے۔ جب انہوں نے میدان دعوت میں عملی قدم رکھا تو کتاب و سنت کے سلسلے میں اعتقاد اور عمل کی کیفیت کیا تھی اور مولانا کی دعوت نے اعتقاد و عمل میں کیا بنیادی انقلاب پیدا کر دیا۔

ان میں سے ہر پہلو سیر حاصل بحثوں اور مثالوں کا محتاج ہے۔ اور مثالوں کے بغیر حقیقت بخوبی زمین نشین نہیں ہو سکتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک مقابلے کی تگنائے میں نہیں سما سکتا۔ اگرچہ اسے کتنی ہی وسعت دے دی جائے اس کا حق ادا کرنے کے لئے کتبوں کی ترتیب کا سروے ناگزیر ہے۔ یہاں صرف اشارہ و کنایہ پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

دعوت حق کے لئے سر و سامان | سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مولانا نے کتاب و سنت کی دعوت کے لئے بنیادی و استعداد کے سلسلے میں علوم کے کتنے دائروں اور شعبوں میں کمال حاصل کیا جس کے مولانا کے علم و معرفت میں زیادہ سے زیادہ جامعیت پیدا ہوئی ہے۔ انہوں نے خود ۱۹۰۳ء میں ترجمان القرآن کا دیباچہ مرتب فرماتے ہوئے لکھا تھا :

کامل ستائیں برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورت، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کئے ہیں۔ تفسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجوئے تسال کیا ہو۔۔۔۔۔

خاندان، تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا، میں نے اول روز ہی اس پر توجہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور تحقیق کی ہدشیں کسی بھی گوشے میں روک نہ ہو سکیں۔ اور تحقیق کی تشنگی نے کسی بھی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا۔۔۔۔۔

میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چھپ چکے ہوں۔ اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے دہرے گھونٹ بھی ہر جامے میں اور تریاق کے نشے بھی ہر دارا شفاء سے آزمائے ہیں۔

یہ الفاظ بار بار پڑھئے۔ پھر غصہ دے دل سے غور فرمائیے تو آپ پر آشکارا ہو جائے گا کہ دینی مباحث میں مولانا کے ایک لفظ کا باطن یقین و ایمان کی جس قدوسی روح سے سرشار محسوس ہوتا ہے، وہ ان مراحل سے گزرے بغیر نصیب نہیں ہو سکتی۔
سے مولانا گزرے۔

پھر کتاب و سنت سے حقیقۃً لذت اندوز ایمان ہونے کے لئے متعدد علوم میں خصوصی مہارتیں ضروری ہی نہیں سمجھا۔ مثلاً تاریخ، جغرافیہ، آثار و عہد، بائبل کے متعلق وہ وسیع ذخیرہ تحقیق و تفتیش جو یورپ نے پیدا کیا اور ہمارے ہاں کے ارباب علم کو شاید اس کی خبر تک نہ ہو۔ اسی غرض سے مولانا نے انگریزی اور فرانسیسی سیکھی کہ ان کے بغیر وہ ان تاریخ و ادب کے براہ راست پہنچ ہی نہیں سکتے تھے۔

پھر انہوں نے ادبیات (عربی، فارسی اور اردو) میں انگریزی اور فرانسیسی میں بھی اہل تمام دور و ادب کے شعبوں میں مہارت پیدا کی۔ اس کے بغیر بیان و اسلوب میں وہ حسن و جاذبیت اور کشش پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ جو کتاب و سنت کے حقائق و مظہر عام پر لانے کے لئے ضروری تھی۔ ان تمام مشقتوں اور ریاضتوں پر مستزاد ذہن و حواس حافطہ و اختصار کے وہ نادر اوصاف تھے جو انہیں قدرت نے عطا کئے تھے۔

یہ بھی واضح رہے کہ وہ حاضرین علم کی کتنی مسندیں آراستہ ہوئیں۔ جنہیں زینت دینے والوں نے تفسیر، حدیث، رجال و لغت کو قدیم اصول کے مطابق پڑھا اور ان پر غور و فکر کیا۔ پھر دور حاضر کے علوم کا پورا ذخیرہ کھنگال والا کہ شاید کوئی کام کی چل چلا میرے علم میں تو آپ تک کوئی ایسی مسند نہیں آئی ہے شاید وہاں نہ کہا جاسکتا ہے کہ اس جامعیت کے بعد جس فرد جلیل و عظیم نے

ماصر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر سب سے بڑھ کر دینی اثر ڈالا۔ اور ان کے دل میں اسلام کے لئے ایک خاص تڑپ پیدا کر دی، وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور آقبال کے بعد کون تھا؟ ہمارے زمانے کے اہیاء دین کی تاریخ اقبال کے کلام "اسلال کے اجراء ہی سے شروع ہوتی ہے ایک اہم معاملہ صاحبِ دعوت کے اوصاف و خصائل کا بھی ہے۔ مثلاً مسائل کے ہر گوشے راہِ حق و صداقت میں علمداری پر نگہری نظر، راہ و طریق کے ہر حجلہ ابتلا و آزمائش سے آگاہی۔ اثباتِ حق کے لئے ایسی استقامت جو کم از کم ہمارے زمانے میں یقیناً مثالی تھی۔ باطل کے رد و انکار میں انتہائی بے باکی اور اس کے نتائج سے کامل بے پروائی پر جوش و خروش تھا۔ انہماک و فکر کے بعد اٹھایا۔ اور جب اٹھایا تو دنیا بھر کی مخالفت سیل بے پناہ بن کر بھڑاسے نہ روک سکی اور نہ پیچھے ہٹا سکی۔ راہِ حق و صداقت میں یہ شانِ سلطانی و ملوکی۔ قرآن کے بنیادی حقائق پر اہل یقین و ایمان ہی کا کرشمہ تھی، قرآنِ ہدایت ہے کہ اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی۔ فتح و کامرانی اور شکست صرف حق کے لئے ہے۔ باطل آتی جاتی، بے بنیاد اور ناپائیدار ہے سوال یہ ہے کہ کتنے آدمی اس پر حقیقتہً یقین رکھتے ہیں۔ سورج کے ہر طلوع و غروب کا وقت مقرر ہے۔ ہر رات دن کے پیروں و گھڑوں کا شمار سب کو معلوم ہے۔ لاکھوں کروڑوں آدمی سوتے ہیں تو اگلے دن کا پروگرام پہلے سے بنائیے ہیں تاکہ صبح کو اٹھتے ہی اس میں مصروف ہو جائیں۔ مگر حق و باطل کے متعلق قرآن مجید کے اصول پر ویسا ہی اعتقاد کتنے دلوں میں موجود ہے؟ اگر سب اس فاقی ایسا اعتقاد موجود ہو تو ہزاروں لوگ بے بنیاد اور ناپائیدار اغراض کی خاطر باطل کی حمایت کے لئے اس طرح کیوں ججئے جس طرح کھٹیاں شہد پر جمع ہوجاتی ہیں؟

مولانا کا یقین محکم | مولانا کا قلب صافی ایسے ہی یقین و ایمان کے نور سے معمور تھا۔ اور ان کی پوری زندگی اس کی ایک سراپا روشن شہادت ہے۔ انہوں نے اسی طرح حق کو محکم و استوار اور باطل کو راکھ کی دیوار سمجھا اور دیسے ہی یقین کے ساتھ جس طرح صبح کو سورج کے طلوع اور شام کو سورج کے غروب کا یقین ہوتا ہے۔ بلکہ مولانا کا عقیدہ یہ تھا کہ، طلوع و غروب آگے پیچھے ہو سکتا ہے مگر حق کی کامیابی اور باطل کی شکست آگے پیچھے نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے قربانیاں کیں، ٹکٹیں بھینسیں، مشقتیں اٹھائیں۔ کیونکہ ان کی روح ایمان بھار رہی تھی کہ رات کی تاریکی ہمیشہ مسلط نہیں رہے گی۔ اس کا پردہ ضرور ہٹا کر ہوگا۔ صبح کی روشنی لازماً جبینِ مشرق پر رقصاں نظر آئے گی۔ عزمِ راسخ کے ساتھ جدوجہد جاری رکھی جائے تو محکومی کی زنجیروں کے لئے ٹوٹنے کے سوا چارہ نہ رہے گا۔ اور آزادی ضرور ملے گی، وہ ٹی۔ اے۔ جے۔ خاص اسباب کی بنا پر لاکھوں انسانوں کے لئے نام و سگواری بن کر آئی۔ محکومی ہر حال ختم ہو گئی۔ اور جس برطانوی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہ ہونے کا دعویٰ کر و فر سے کیا جاتا تھا۔ وہ آج اس چھوٹے سے جزیرے میں محدود نظر آتی ہے جہاں سے ابھر کر اس کے شجر ہستمار کی شاخیں دنیا کے ہر حصے میں پھیل گئی تھیں۔

پاک و ہند کی آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی بحری راستے کے ساتھ ساتھ جتنی اسلامی سرزمینیں مدت سے محکوم چلی آتی تھیں وہ بھی یکے بعد دیگرے آزاد ہو گئیں۔ کم از کم ایشیا اور افریقہ سے برطانوی استعماری منجوس سایہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ یہ دنیا ایک پردہ ہے جس پر سیمائی کشیں پے درپے نمودار ہوتی ہیں اور اپنے وظیفہ انجام دے کر ناپید ہو جاتی ہیں۔ سب کے وظیفہ یکساں نہیں ہوتے۔ بعض وجود اپنے دامن میں حسنِ عمل اور اتباعِ حق کے شہوار موتی بھر

جلا جاتے ہیں۔ بعض کے جتنے میں دیکھتے ہوئے انکار سے آتے ہیں۔ آخرت کے گھر کی راحت و طمانیت انہی کے لئے ہے جو دنیا میں توبہ اور صفا نہیں چاہتے۔ جن کی زندگی کا ہر لمحہ رخصتے باری تعالیٰ میں گزرتا ہے۔ اور انسانوں کی فلاح و اصلاح، خیر و بہبود اور امن سکون کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ خدا کے نیک، صالح اور حق گزار بندے بن جائیں۔ ان دشمنی کے بجائے دوستی، انفرت کی بجائے محبت، بغیر کسی بجائے قرب پیدا ہو، تاکہ مٹکی اور خیر خواہی کی روح دفتر رختہ سب سرایت کر جائے، ظلم و جور مٹ جائے، حق کشی اور حق سوزی نیست و نابود ہو جائے۔ اسلام کا نصب العین یہی تھا کہ ہر نوع بشر ایک گھر کے افراد کی حیثیت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی زندگی اسی نصب العین کے لئے وقف رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خواب گاہ ارضی کو ہمیشہ نور رحمت سے معمور رکھے و العاقبة للمتقين۔

یہ بھی کھلا راز ہے کہ ۱۹۵۰ء کے عام انتخابات سے پہلے جن لوگوں کے نام ہندوستان کی صدارت کے لئے زیر غور تھے ان میں مولانا آزاد کا نام نامی شامل تھا لیکن مولانا کا رجحان دوسرا تھا۔ وہ صدر سے اور منصب سے زیادہ کام کے قابل تھے اور اسی لئے صرف وہ مقرر قبول فرماتے تھے جس میں اپنے ذوق کے مطابق زیادہ سے زیادہ مفید خدمت انجام دے سکتے تھے چنانچہ اسی زمانہ میں اخباری نادر نگار نے ان سے سوال کیا کہ کیا تھے انتخابات کے بعد آپ ہندوستان کے صدر رہیں گے؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا: صدارت میں ایک وسیع باغ اور آرام دہ مکان کے سوا اور کیا رکھا ہے؟ اس مختصر سے جواب میں استننا دے بیٹھا کہ یہ دفتر کے سمٹ کر آگئے ہیں۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوبھیا نے اخباروں میں یہ جواب پڑھ کر اعتراض کیا تھا کہ مولانا نے صدارت کے منصب کی توہین کی ہے اور اس لئے انہیں ہندوستانی عوام سے معافی مانگنی چاہیے۔ لیکن مولانا کا مقام اس طرح کے عامیاد اعتراضات بہت بلند تھا۔ وہ اس طرف کیا توجہ فرماتے؟

رابعین الرحمن شروانی

”ایک دن ایسا ہوا کہ کوئی پانچ بجے گاندھی جی آپہنچے۔ میں نے استقبال کیا اور دوڑ کر مولانا کو خبر کی۔ انہوں نے سنا مگر صبر کیا نہیں۔ بس سے من نہ ہوئے۔ فرماتے تھے کہ ”دیکھتے اس وقت طے سے معذور ہوں۔ کل نو بجے تشریف لائیں“ عرض کیا ”خود فرمایا یہ کیا؟“ یہی پیغام پہنچا دوں!“ کسی قدر تھکے تیردوں سے فرمایا: ”اور کیا؟ گاندھی جی میں سرخاب کے پرتو لگے نہیں

عبد الزاق ملیح آبادی

پنڈت جواہر لال نہرو

ایک غیر معمولی سیاستدان

کسی آشنا ہستی کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا ایک مشکل کام ہے اور پھر یہ مشکل اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب وہ ہستی سیاسی رفیق ہو کہ قومی کاموں کی تمام قسم کی ذمہ داریوں اور تکالیف میں سامنے رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے حق قدم اٹھانا میرے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔

تقریباً پچیس سال ہوتے جب پہلے پہل میری ملاقات مولانا سے ہوئی لیکن مولانا کی حیثیت قومی کاموں میں عزم و ثبات اور عظیم کے دوران میں ان کی نظر بندی کے متعلق میں اس سے پیشتر ہی بہت کچھ سن چکا تھا اور ان سے ملنے کے لئے متیاب تھا۔ اس اعتبار سے ان کا بھی عالم شباب تھا لیکن ان کے چہرے پر پختہ کاری اور بالغ نظری کے گہرے نقوش تھے اور اس طرح کی جگہ بزرگان کا نگرس کے درمیان ناگزیر بنتی۔ چونکہ مجھے خود بھی اس وقت کا نگرس کے اندر دو فی معلقوں سے آشنا گہرا ربط و ضبط تھا اس لئے اس وقت انہیں صرف دور سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تاہم لیکن اس کے بعد کا نگرس دورنگ کیٹیج کی مینگوں میں ان کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور باخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے اندر ہندو اور برہمن ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانہ کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کا نگرس کے اندر مشاغل اور اس غیر نشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں ان کی مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے۔ کا نگرس کی تاریخ میں اور بابر ہندوستان تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کا نگرس کی تجدید اور عوام کی تلاش غراش اور وضع قطع میں ان کا بڑا بہت بڑا حصہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا دورنگ کیٹیج کے ایک عام ممبران کے آزاد مشورے کی طور پر دیتے سمجھے جاتے تھے کیونکہ ان راؤں اور مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبیر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پہنچ تھی۔

مولانا عام دنیا سے بالکل مختلف اور ان کے سیاست دان ہیں۔ آپ ایک کامیاب سیاست دان کے طبی مزاج سے معرا باغوس اور بے حس ہو کر چلنے کے اور چلنے سے تھکے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افتاد طبیعت منتراس کے خلاف ہے۔ وہ اکثر بے اور خلوت پسند ہیں اور مزید برآں ان کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل ہے۔ باوجود ایک متحرک اور باوقار انسان کے شور و شغب اور ہنگامہ جزیروں سے بہت گھبراتے ہیں۔ ان کو عوام میں تقریر کرنے کے لئے آمادہ کرنا کوئی آسان

کام نہیں جتنی یہ ہے کہ ان کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے انہیں حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا۔ مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسینی قلمی موسیٰ یاد آ جاتے ہیں جو انقلاب فرانس سے کچھ عرصہ پہلے وہاں موجود تھے۔ تاریخ ماضی میں ان کا دور کد و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا ذہن بدلے بغض و بغاوت اور سلجھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کا عام رویہ معقولیت پسند ہے۔ بایں ہر ان میں ایک ایسا انسان پس منظر میں تھا جو علم کے پہاڑوں کو نرم و دناز کر کے کبھی کبھی بلند مگر خشک خرافات پیش کرتا ہے۔

اگر اس قدر غلویت پسندی اور بشریت پر ان کی طبیعت کا غاصد نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بڑھ کر حصہ کیونکر ان کے قلم میں ایک بحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ یہ اعجاز پروردگار اب بیک میں نشا و نہاد رہا جیسا ہے اور بد قسمتی سے انہوں نے اپنے جاؤنگ نگار قلم سے بھی پہلے کی دل آویزیوں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی ہیں۔

مجھے ہمیشہ ان کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے کیونکہ جو زبان وہ لکھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ پر معنی سے مملو ہوتی ہے۔ وہ جو عنوان و شباب ہی میں انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا، عربی ممالک اور مصر سے خارج کر لیا تھا محض ان کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت ہے کہ اگر ان عربی لولتے والے ممالک میں کوئی سیاح ہندوستان جاتا ہے تو اس سے ابوالکلام آزاد کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے اپنا یہ جہاد قلمی جاری رکھا ہوتا تو اس قوم کو کھات اور سلجھے ہوئے طرز فکر اور بنا بریں صحیح راہ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ عرض حالات کا تقاضا ہے کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ انہوں نے یہ سب کچھ کس طرح بوجہ احسن ادا کیا۔ لیکن ہم کہ جنہیں ان کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا حاصل ہے تاریخ کے فیصلے کے واسطے زحمت کش انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لئے اور ملک و قوم کے لئے قوتوں کا پیٹھ پر ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ہم نے ان کی راتوں سے اختلاف کیا یا اتفاق۔ ہم ہمیشہ یہ محفوظ خاطر رکھتے رہے کہ ان کی رہنمائی زیادہ فزینہ ہوتی ہے اور ہم اسانی سے اس سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ دانتے ایک ایسے آزمودہ کار اور صاحبِ دماغ پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہوا اور دینہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا ہوتی ہیں۔

اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اندر جذب کے واسطے بہت کچھ ہے۔ وہ ایک ہی ذلت زبرست عالمی اتحاد ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ اور شارح ہیں اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً وقت محسوس نہیں کیا۔ اور اسے کم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اختلافات میں ایک یا بھی آویزش نظر آتی ہے لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند تھے۔ میں اور ان پابندیوں سے انہوں نے نہ صرف اس نوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یک جہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کیا ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف روٹوں کی نجات اسی یک جہتی اور اتحاد سے وابستہ ہے۔

خطبہ احیائے ملت

(اگست ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی میں مولانا آزاد کا ایک شاہکار)

میرزا ن گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی چیز میرے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہان کی اس یادگار مسجد یہ اجتماع نیا نہیں۔ میں نے اس زمانہ میں جس پرنسپل و مہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ تمہارے چہرہ پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد، اور آج تمہارے چہروں کا رعب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اخت یار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آ جاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے؟ تمہیں بیکار، تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ فوہیاست جو تمہیں آج داغ ملی دے گئی ہے، اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی راہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض ملکہ مفلکت و انکار کی ساری سنٹیلں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ہی ان خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ یقین سے دُور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دُور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے سچن لیا تھا وہاں میرے ہاں دہر کاٹ لئے گئے ہیں یا میرے اُشیانے بے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہتا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیلوں سے گھر ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سبھی تم نے کونسی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ خوف کی زندگی نہیں۔ آہ کیا دارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہش کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قسم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیالی کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بُری شے آ گئی۔ ہاں تمہاری بے قراری اسی لئے ہے کہ تم نے اپنے تسکین اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا اور بُری شے کو لچکا دلو اسے سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بنا کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا کہ جب کسی قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گری کا خطرہ بھی پیش آ گیا۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں، کہ مذہب کا راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعقلی ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغ

کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل بات ہے کہ جمنائے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سنبھلی ہوئی ہے۔ عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مسلمان کو نہ تو کوئی طمع بلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔

اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بنا دو جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک آدمی کی معرفت فرمایا تھا۔ ”جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر چم گئے تو پھر ان کے لئے نہ کوئی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم“۔ ہوائ آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر بھی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل کشی کے پیش نظر — بار بار یہ کہنا پڑا ہے کہ تمہاری طاقت گھمبیل کا پستارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سا پتہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سا ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلانا نہیں اور دماغوں کی چھین ختم نہیں ہوتی، تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی تو پھر اس طرح بدلو، جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ تم اس دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں مگر یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے در سے وفاداری کا متر ٹیکٹ حاصل کرو اور کا سہ لیس کی وہی زندگی بنالو کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے میں کہتا ہوں جو اپنے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر آج سے ہیں وہ تمہاری قافلہ لایا تھا انہیں بھلاؤ نہیں، انہیں چھوڑ دو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو اور تمہو کو کہ اگر تم بھانے کیلئے تیار نہ ہو پھر نہیں کوئی طاقت جھکا نہیں سکتی — آج زراٹوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود اک زراٹہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں کہ تمہارا وجود ایک آجالا تھا۔ یہ پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نہ جھیک جانا لے کے ڈرے پائے پوڑھالے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو زراٹوں میں اتر گئے پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا بکلیاں انہیں تو ان پر سکاڑیے، باطل کسے تو بہتوں سے جو اب دیا صرصر اٹھی تو اس کا رخ پھر ڈال دیا انہیں تو ان سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانگمی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھینچنے والے آج خود اپنے گریبانوں سے کھینچنے والے خدائے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس کبھی ایمان نہیں تھا۔ عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے وہی پرانا نسخہ ہے جو پہلے کا ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسان کا سب سے برا دشمن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان لا تعجلوا ولا تعجلوا انتم الاعجلون انتم موتین۔ آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کیساتھ کہہ چکا پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں۔ اپنے حواس پر قابو رکھو۔ رو پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ زندگی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لادوں۔ یہ تو دل ہی کی دکان سے اعمال صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہوتی ہے۔

بلو تھی ہوتی تحریریں

”قبل اس سے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں“

”میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۱ء میں جس جگہ سے انہیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے گذری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات صرف میرے سامنے سے گزرتے ہی نہ رہے، میں ان کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدہ کو نہ جھٹلاؤں نہ ہیرے لئے ممکن نہیں کہ میں اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا نہیں سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں کہ ہندوستان کے نوکر و مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۱ء میں انہیں دعوت دی۔“

”میں اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندوستانی ہوں اور ناقابل تقسیم اور متحدہ ہندوستانی قومیت میں شامل ہوں۔ گیارہ صدیاں گذر گئی ہیں اور ہندوستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح وابستہ ہے جس طرح ہندو دھرم۔ اگر اس ملک کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندوستانیوں کا مذہب بن چکا ہے۔ مذہبوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں ہماری شلوخی ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں میں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھیں لیکن ہم ایک ہی زبان بولتے تھے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دکھایا جاسکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی“

”سمندر میں جب طوفان خیز لہروں کا تلاطم رہا ہوتا ہے تو اس کے دریا انگریز نتائج کا حال ان لوگوں کو معلوم نہیں جو شام کے وقت ساحل کے کنارے اس لئے جمع ہو جاتے ہیں کہ سطح سمندر کے ہر جدید تغیر سے ایک نیا لطف اٹھائیں۔ ان کی حقیقت سے وہی نادران واقف ہو سکتے ہیں جن کے گھر کی دیواروں سے یہ سیلاب ٹکرا کر گذر گیا ہے۔ بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا ہم اور بہت کم دل ایسے نہ جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔“

”ہماری فتح مندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر مشتمل ہے۔ میں اس وقت بھی اس ملک کے ہر باشندہ کو صرف انہی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق، امن، نظم، قربانی اور اس کی استقامت“

”مغفور و درگزر، ہمتی و محبت، نرمی و عاجزی انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی ہے۔ لیکن کن کے سامنے؟ عاجز و اورادمانوں کے سامنے نہ کہ ظالموں اور مجرموں کے آگے۔ ایک مسکین و فلاکت زدہ پر رحم کیجئے تو سب سے بڑی نیکی ہے اور ایک

ظالم پر بھیجے تو سب سے بڑی بری ہے۔ گرے ہوؤں کو اٹھائیے تاکہ وہ چل سکیں۔ لیکن اگر سرکشوں کو مٹو کر دے لگائیے گا تو وہ گرے ہوؤں کو اور گرا دیں گے۔“

”دنیا کو نہیں بدلی مگر دنیا کی ہر چیز کا خلاف بدل گیا ہے۔“

”در اصل یہی ہمارا تجرم حقیقی ہے کہ قرآن نامی ایک کتاب ہے جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔“

”مسلمان کا یہی فطریہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے سمیٹے اس کا اعلان کرتا رہے۔ اور اداۓ فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص کہ جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعے سے اعلانِ حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کو چپ ہونا گوارا کر لیا جائے اور دو اور دو کو اس لئے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لئے خطرہ میں پڑ جائے اور حق کے انجھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ نہ رہے۔ حقیقت کا قانون دو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے، نہ اس لئے بدلا جاسکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لئے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا، آگ میں ٹھنڈک برف میں گرمی پیدا نہیں ہو سکتی۔“

”اس تمام قضیہ کا حل صرف اس بات میں ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق پر زور دینے کے بجائے اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے تیار رہے۔“

تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچھے کی بات نہ ہوئی۔ تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے سپتروں کے دل چھو گئے۔ میں کیا کر دوں اور کہاں جاؤں؟ اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ کر تمہاری غفلت میں رہ جائیں۔ یہ کیا ہو گیا کہ باگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور کیوں تمہاری عقلوں پر طاعون چھا گیا ہے کہ سب کہتے ہو اور سمجھتے ہو، پر نہ تو راست تباہی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ گراہوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔“

”تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سما یا ہوا ہے۔ تم وقت پر سامنے آنے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ کیوں درست نہیں کر لیتے۔ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا، روز سنتے نئے لوگ لگتے رہیں گے۔“

”میں کسی کے دل تو نہیں بدل سکتا اور نہ کسی کے سر میں نیا دماغ رکھ سکتا ہوں۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اُس کو ان کے سامنے رکھ دوں۔“

”تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسے لگ جاتے، تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہر سال میں پانی کی بوسونگہ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کا دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پھپھلا کر بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرتا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔“

”راہ مقصد کی خاک بہت غیور واقع ہوتی ہے۔ وہ برابر کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر

کی جو کھنٹ کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔

"اس بارگاہِ سود و زریاں کی کوئی معشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں لگا گیا جو دردِ کدورت اپنی تری میں نہ رکھتا ہو۔ بارہ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمائرِ ناکامی لگا رہا اور خندہ بہار کے نیچے یہ رخسارِ کاشیوں پر پار ہا۔"

"یہاں کامرانی سود و زریاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زریاں سے اسودہ حال رہنے میں ہے۔ یہاں پالنے کا وہ اُن ہی کو بل سکتا ہے جو کھونا چاہتے ہیں۔"

"زندگی کی حالتوں کو ہم راحت و الم سے تعبیر کرتے ہیں، ان کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ اضافت کے کشتوں صورت گرہی ہے۔ یہاں نہ مطلق راحت ہے نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سراسر اضافی ہیں۔ دودین، نقتن، ایستادن، شستن، نختن، و مردن، اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت و الم کی نوعیتیں بھی بدل جائیں گی۔ یہاں ایک ہی ترازو ہے کہ ہر بیت اور ہر حالت کا احساس ٹولا نہیں جاسکتا۔ راحت و الم کا احساس ہمیں باہر سے لا کر کوئی نہیں دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا احساس ہے جو کبھی رنج لگاتا ہے اور کبھی مرہم بن جاتا ہے۔"

"دعوت و اعلانِ حق کا کام کرنے والوں کو اپنے لئے نہیں مگر اپنے کام کی عزت کی خاطر بادشاہوں کی سی نظر اور نور ستاروں کا سا دماغ رکھنا چاہیے جو لوگ خدا کے دروازہ کے سائل ہیں دنیا میں کس کی ہستی ہے کہ وہ انہیں سامنے آئے دیکھ سکے۔ ان کی حبیب میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ ہو لیکن ان کے دل میں وہ خیرینہ چھنی ہے جس سے بڑے بڑے مفرور ہنستا ہوں کو خیر یاد جاسکتا ہے۔"

"اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ ان کی آنکھوں کا ضعف ہے جس کو دور کرنا چاہیے، اُن کی خاطر چراغ گل نہیں کئے جاسکتے۔"

"میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۷ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور میں سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے انہیں قید کر رکھا تھا۔"

"انسوس! اس دورِ جوش و خروش اور بیداری و ہشیاری میں بھی میں دیکھتا ہوں تو میرے دل کی نگہبانی اور اضطرابِ علاج کہیں نظر نہیں آتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا اگر بیداری کی کروٹیں بھی ہیں تو آنکھوں سے غفلت و دوش کا خمیر ابھی دور نہیں ہوا ہے۔ خوابِ غفلت کی سرشاری اور چشمِ نیم باز کی کروٹیں یہ تو دو پہلی حالتیں ہیں لیکن ان کے بعد ایک تیسرا کردہ بھی نظر آتا ہے جو بستر سے تو اٹھ چکا ہے مگر منزلِ مقصود کے نشان سے بے خبر ہے۔"

"تم میں کوئی نہیں جو میرا شتا سا ہو۔ میں سچ کہتا ہوں، تمہارے اس ملک میں، میں ایک بے یار و آشنا اور غریب الوطن ہوں۔"

"جب لوگ کام جوتیوں اور خوش و فقیوں کے پھول چرن رہے تھے، تو ہمارے حصہ میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انہوں نے پھول چرن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے اور ہم نے کانٹے چرن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔"

ایک مکتوب

..... در حدیث دیگر

مولانا غلام رسول پتہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھا کہ غالب کے متعلق بعض تذکروں میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ان کا ابتدائی نام میر تقی میر کے پاس کسی نے پیش کیا تھا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ اسے اگر کوئی کامل مہر پرل گیا تو صاحب کمال بن جائے گا نہ بلا تو مہر پرل کے میں اس واقعہ کو اب تک افسانہ سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں روشنی ڈالئے۔

اس سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے جو طویل مکتوب لکھا تھا اسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے۔

گلستہ ۱۲۳

”غزلی خط پہنچا۔ میر تقی میر والی حکایت کی مندرجہ بالا یادگار غالباً عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے، لیکن خاص حالات میں چندان مستبعد نہیں۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی جب قاعدہ القصد میرے مکان میں آکر قیام پورا فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دل و دماغ میں پیوست کر دیئے۔ عبدالصمد دو سال تک پتھر اٹھا، اگر تیرہ برس کی عمر میں آ ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہو گا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و وسعت کا یہ حال چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و خواص کا مضمحل ہو سکتا ہے جن پر سراج الدین خاں آزاد و شیخ الدین فقیر اور ٹیک چند جیسے دماغ ستونگان مدرس عمر جو درس و تدریس کے بعد بھی آشنائے ہوئے کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں کہنا شروع کر دیا اور ندرت و غزوات کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا۔ حتیٰ اگر میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک معلوم نہیں ہوتا ہے لیکن محض رفع غرابت کے لئے لکھتا ہوں۔ خود میں نے اس عمر میں شعرو شاعری شروع کر دی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا غالباً ۱۹۰۹ء کی بات ہے۔ بعض سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو بیچ بھلا نکالا کرتے تھے۔ ایک گلدستہ ارغمان فرخ کے نام نکالا اور گلستہ میں بعض شعرا اس کا مہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔“

پوچھی زمین کی تو کبھی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی، ہمیں شعر ان فرخزاد کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے ہیں:-

نشتیریل ہے کہ کسی سخت جان کی
تنگی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیاز گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کبھی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اس وقت انہیں لغویت نے لوگوں کو خیر کر دیا تھا۔ آج بھی جبکہ ۳۶ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہے جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی۔ جب ارغمان فرخ میں یہ غزل آپ لکرائی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادشاہ خاں شورش - رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے انہیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا جو غزلیں میں سناتا ہوں وہ میری ہی کبھی ہوئی ہیں۔

ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ اس نے مڈ بھڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دوکان جبر سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ چند شعرا اسی وقت کہہ دو۔

میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو"۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دیے کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہوئی چاہئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات میں تو بھولوں نہ بھی ان کو کبھی یاد نہ ہو کہنے لگے صورت سے دس بارہ برس کے صابزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔

اس وقت سوچتا ہوں یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ اس کے بعد یہ ضبط اور پڑا، اور خیال ہوا کہ ایک گلہ زبانی چاہئے۔ چنانچہ نیرنگ عالم کے نام سے ایک گلہ ستر جاری کیا۔ میری عمر اس وقت تیرہ برس سے کسی طرح بھی کم نہ تھی۔ پھر اس زمانہ میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ محزن نیا نیا نکلا تھا، میں نے چند تحریریں بھیجیں۔

لکھنؤ سے نوبت رائے نظر، فرنگ نظر نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجی کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل آدیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمہ لی۔

اس زمانہ میں مولوی احمد حسین صاحب فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور تحفہ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالائزام ضامین فوسلی ہوئے گئی تھی۔ پھر نیاں ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہئے۔ چنانچہ "السان الصدق" جاری کیا یہ نام معاملات ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر سولہ برس تھے کم نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دنیا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ کہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ سمجھ جائیں اس لئے والد مرحوم نے چند طلباء کی کفالت کے تدبیریں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خاں صاحب تھے ان کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی اس زمانہ میں تقریر کی طرف مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۲ء میں کی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ عظیم معمولی بات نہیں۔ اگر میں اس عمر میں تک نہ بنی کرتے گا تھا غالب جیسی شخصیت کے لئے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسام الدین حیدر، مرزا سلیمان شکوہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہو تو ان کا اگر سے تعلق واضح ہوتا ہے۔ مرزا سلیمان شکوہ کی حب قرچہ کے معاملے میں نور الدین حیدر سے ان بن ہو گئی تو وہ لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ کچھ دنوں جنرل گارڈن کے یہاں پھر اگرہ کا رخ کیا۔

ہو سکتا ہے کہ جناب الدین حیدر اور غالب کے ابتدائی تعلقات اس زمانہ میں شروع ہو گئے ہوں یہ محض قیاس ہے ورنہ ہم نہیں کہہ سکتے بعض کتابوں کے ملاحضہ سے تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔

دیکھتے بے خبری میں کتنے صفحے لکھ گیا، یا تو خطوں کے جواب میں دو سطر لکھا بھی دو سطر بڑا ہے یا یہ عالم ہے کہ دس بارہ سہ سیاہ ہو چکے ہیں اور ابھی تک کہانی ختم نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے رمضان کی آمد نے لگاتار کچھ بھی ہوئی طبیعت میں تازگی پیدا کر دی۔ عشاء کے بعد بیٹھنا ہوں تو صبح تک دماغ کے کیفیت و سکون میں کوئی خلل اندازی نہیں ہوتی۔ اس وقت تین بج چکے ہیں اور درجے کی سبز چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے جو ایک جاپانی دوست نے حال ہی میں بھیجا ہے۔

آپ کو بظاہر راہوں اور دل میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ایسی چائے کے فنجان میسر ہوں تو پھر اور کون سی نعمت باقی رہے جس کی انسان خواہش کرے۔ میرے لئے یہی چائے پھری کی صوبو بھی ہے۔ اور افکار کا جام خمار شکن بھی۔

آپ خواہ جس نظامی کے روزنامے غدر کا حال دیتے ہیں۔ میں نے اخبار دل میں ان کا نام دیکھا تھا۔ مگر کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ ان میں کوئی قابل اعتناء بات ہوگی۔ کیا واقعی غدر کے زمانے کی تحریریں اس میں استناد کے ساتھ جمع کی گئی ہوں اگر واقعی ایسا ہو تو لکھنے کو کون کون سے رسالے ہیں۔ بہادر شاہ مقدمے کی روئیداد پُرانی بھی بھیجی ہوئی موجود ہے اور پنجاب میں نئی بھی چھپ گئی ہے۔ مرزا حیرت نے "چراغِ دلی" میں اس کا خلاصہ اردو میں بھی چھاپ دیا ہے۔ اودھ کی بعض تحریریں اور ناچوں کا انگریزی ترجمہ سٹیٹ پریس کے سکشن میں شائع ہو چکا ہے۔ معین الدین کا نام روزنامہ "چراغ" اور نئے مرزا کی تحریریں چھپ چکی ہیں۔ کیا خواہ جس نظامی کے رسالوں میں ان کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے۔

(ابوالکلام)

والسلام

ایک بے مثال شخصیت

غلام رسول ہنر

(مولانا غلام رسول ہنر کے ایک طویل مضمون سے اقتباسات)

مولانا کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے۔ بہت کم بڑے آدمی جن کے متعلق ان کی زندگی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہوں جتنی مولانا کے متعلق شائع ہوئیں۔ جب تک روزِ دُشنبہ کا سلسلہ دور ویر جاری ہے بہت کچھ لکھا جائے گا۔ تاہم حقیقت حال پر نظر رکھنے تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔

تو، چنانکہ تو فی ہر کے کجا دانہ۔ بہ قدر طاقت خود سے کندہ اندر رک

ہر دائرے میں مستقل قدریں | "الہلال" سے پیشتر تمام جرائد و رسائل (الامام شاہ رحمہ اللہ) امر اور وسائے عانتی
 رقوم لے لینا غیر مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ قیمت کا اشتہار چھاپا جاتا تھا تو امر اور
 دوسرے کے لئے زیادہ رقم لکھی جاتی تھی۔ شاید اس لئے کہ ان کے درجہ امتیاز میں کوئی شغل نہ آئے۔ "الہلال" نکلا تو اس کا
 اہل بلائی نمبر دیکھ کر ایک مشہور صاحب ریاست نے خاص رقم کا چیک مولانا کے پاس بھیج دیا۔ ساتھ بھد دیا کہ
 ہر مہینے اتنی رقم باقاعدہ پہنچتی رہے گی، سال بھر کے لئے تو وعدہ سمجھئے۔ اس کے بعد بھی اخبار اپنے پادشہ پر کھڑا
 نہ ہو سکا تو یہ سلسلہ جاری رہنے لگا۔

مولانا نے شکر لے کے ساتھ چیک واپس کر دیا اور لکھا:۔
 میری شہسی اور خودداری | "ہم نے جس قدر کام اپنے ذمہ لے لئے ہیں، وہ روپے کے بل، سپلک کی قدر دانی
 اور دوسرے قوم کے جود سخا کے بھر دسے پر نہیں بلکہ صرف اس کے فضل اور توفیق کے اعتماد پر جو اپنے دروازے
 کے سانکوں کی فریادیں جب ایک مرتبہ سن لیتا ہے تو پھر دوسروں کی چوکھٹوں پر کبھی نہیں بھیجتا۔"

پھر فرمایا:۔
 "ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں۔ صلہ تحسین کے نہیں بلکہ
 نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ غلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔ دُنیا کے
 درویش کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ایسوں کی اعانت سے آپ کا جی
 ایا خوش ہوگا۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھے خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم
 ایک گراں قدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں ۱۰۰۰ ماں اگر اس سے
 میری رائے اور میرا ضمیر خریدنا مقصود ہو تو بہ ادب و واجب عرض ہے کہ ان خرف ریزہ ہائے طلانی کی تو کیا حقیقت
 ہے۔ کوہِ نور اور تختِ طاووس کی دولت بھی جمع کر لیجئے تو مع آپ کی پوری ریاست کے اس کی قیمت کے آگے بچ جائیں۔
 یقین کیجئے کہ اسے تو سوائے شہنشاہِ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا اور وہ ایک مرتبہ خرید چکا۔"

کم از کم اردو اخبار نویسی میں میرے علم کے مطابق عظمت و خودداری کی یہ پہلی صدائے حق تھی جس نے اس
 اخبار نویسی کے معیار کو آسمان پر پہنچایا۔
 "الہلال" کی ضمانت کا واقعہ | طلب ضمانت کا خیر مقدم "الہلال" سے پیشتر کبھی کسی اخبار نے نہ کیا تھا۔
 "الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر
 شائع کرنے میں تامل کیا۔ جب اطراف ملک سے پائے درپائے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر کی اشاعت
 میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا "ابتداء عیش"۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں:۔
 "انسان صرف کام کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس اس کو چاہئے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنیٰ
 درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکامِ وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کر دیا کہ حق و صداقت کے لئے کامیاب و منصور ہونا لازم ہے۔ باطل کے ساتھ طاقتوں کا کتنا ہی ساز و سامان ہو اور وقتی کامیابیاں اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دیں لیکن آخر وہ خامر و نامر اور بے اثر ہو کر اٹھیں گے۔ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے ۲۷ تک داخل کرنے کی مہلت تھی، لیکن ۲۳ ہی کو داخل کر دی گئی۔ "ضمانت کار و سپرہ تو اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن "الہلال" پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے۔ اور اب تو وقت آگیا تھا اگر کوئی مانگنے کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے۔۔۔ بڑی نگریرہ تھی کہ جب محرومی قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی کام کے لئے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟

شانِ استقامت عزیمت و استقامت مولانا کے آئینہ طبع کے درخشاں ترین جوہر تھے۔ انہوں نے جن امور و مقاصد کی دعوت کے لئے زندگی وقف فرمائی ان پر کاربندی اور عمل پیرائی میں ہمیشہ پختہ کی طرح جھبے رہے۔ اس سلسلہ میں ان کی صحت کو نقصان پہنچا، کاروبار تباہ ہوا۔ ان کی نہایت قیمتی تصانیف مسودے ضائع ہو گئے۔ انہوں نے علمی یادداشتوں کے جو مجموعے مرتب کئے تھے اور انہیں اپنی زندگی کا حاصل تھے، وہ سب تلاشیوں میں تلف ہو گئے لیکن ان کی شانِ عزیمت ان تمام نقصانات سے بالکل غیر متاثر رہی۔ ذاتی تعلقات کے سلسلے میں ایک نہایت دشوار و دل گزار علمہ امتحان اس وقت پیش آیا جب احمد نگر اسیری کے زمانے میں ان کی اہلیہ محترمہ سخت بیمار ہوئیں۔ اس موقع پر سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس پہنچا اور کہا اگر حکومت سے کچھ کہنا ہے تو میں اسے فوراً بمبئی پہنچا دوں گا۔ مطلب غالباً یہ تھا کہ اگر رفیقہ سہیات کی شدید کی وجہ پر مشروط رہائی کی درخواست کریں تو وہ حکومت کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دی جائے گی۔ لیکن مولانا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست نہیں کرنا چاہتا۔ سپرنٹنڈنٹ نے پندت جوامہار کی وساطت سے بھی مولانا کو راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ جو فیصلہ فرما چکے تھے اس پر قائم رہے۔ وہ خود فرماتے "جو نہی خطرناک صورت حال کی پہلی خبر ملی۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون مل گیا ہے اور اسے قابو رکھنے کے لئے جلد و جہد کرنی پڑے گی یہ جلد و جہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس بار میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔

میں نے تمام معمولات جاری رکھے لیکن۔۔۔ اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر و دریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھے جس سے دماغ کا معزورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا۔ اور اس لئے کھیلتا تھا کہ میں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی پریشان خاطر کی کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔"

اس کے باوجود مولانا نے حکومت سے کوئی درخواست نہ کی اور ان کی صاحبِ عزیمت و رفیقہ سہیات اس حال

ہیں دنیا سے رخصت ہوئیں۔ جب وہ سینکڑوں میل دور اپنے اہم اصول و مقاصد کی خاطر احمد نگر کے قلعے میں محبوس تھے۔ اصول و مقاصد کی قربان گاہ پر عزیز ترین رشتوں کو وہی ہستیاں اس طرح بھینٹ چڑھا سکتی ہیں جنہیں بخشندہ خیالات سے عزیمت و استقامت کی غیر معمولی صلاحیتیں ارزاں ہوئی ہوں۔

ستقا اور بے نیازی | تاہم مولانا کی ایک نا درخصوصیت کا ذکر کئے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتا یہ ان کی شاہانہ لیا آدمی صدیوں سے پیدا نہیں ہوا اور عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ ان سے وابستہ ہو گیا تھا۔ بارہا ان سے التجائیں کی گئیں کہ اپنا سوا رخ مرتب فرما دیجیے اور اپنے علوم و معارف کی مستقل حفاظت کا بندوبست کر دیجیے انہوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ نیا نہ مندوں کی التجاؤں کو شرف پذیر الٰہی بھی بخشا۔ پھر ہر سکیم، ہر منصوبہ اور ہر راہ وہ ان کی بے نیازی کی نذر ہو گیا۔ وہ چھوڑی دیر کے لئے بھی ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جاتے تو علوم و معارف کا ایک نامہ حلقہ قائم کر سکتے تھے اور یہ حلقہ ان کی نگرانی میں علمی کارناموں کے ایسے انبار لگا سکتا تھا جن کی کوئی مثال اس وقت سامنے نہیں آئی اور خود ان کے معارف بھی بہترین طریق پر اشاعت پا سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی ذات کو ہمیشہ سب سے آخر میں رکھا۔ یہ استغفار یہ بے نیازی تمام نیا نہ مندوں کے لئے ہمیشہ رنج و قلق کا سامان بنی ہر ہی معلوم نامہ، مدد ملے کئے بیٹھے تھے کہ اگر انہوں نے علم و عمل کی کوئی قابل ذکر متاع چھوڑی ہے تو زمانہ خود اسے محفوظ کر لے گا۔ پھر اسے محفوظ کر دینے کا وقت کتنی صدیوں کے بعد آئے۔ اگر ایسی کوئی متاع نہیں چھوڑی تو پھر اس کی حفاظت میں چند بے بھی صرف کرنا قدرت کی عطا کی ہوئی مہلت کا ضیاع ہو گا۔

ادوات و خصائل | مولانا کے عادات و خصائل کا باب بہت وسیع تھا۔ اور اپنے علمی و ادبی جوہروں کی طرح عادات و خصائل میں بھی وہ یگانہ حیثیت کے مالک تھے۔ مثلاً سحر خیز یا ابتدائی دور ہی سے ان طرقت ثانیہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ہمیشہ اول وقت اٹھتے تھے گویا نظیری کے اس شعر کی عملی تصویر تھے۔

عبادت سحری را ممکن نظیری کم کہ ہر چہ کرد و عمارتے صبح گاہی کرد

ایک مرتبہ سیاسی مصروفیتوں کے سلسلے میں لاہور آئے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے عرض کیا کہ "طافات کے لئے اول وقت تباہیے" صبح کے چار بجے سے آٹھ بجے تک بل سکتے ہو۔ وہ آٹھ دن یہاں مقیم رہے اور میں زیادہ سے زیادہ گاہے اُن کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ تین گھنٹے اطمینان سے باتیں کرنے کے لئے بل جاتے تھے۔ پچھلے دنوں میں دہلی گیا۔ تو اس وقت بھی وہ اپنے انتظامی کاموں میں بہت مصروف تھے۔ دس روز ان کے پاس ٹھہرا ہا، یہی صبح کا وقت انگوٹھ کے لئے مقرر تھا۔ سیاسی ہنگاموں میں عمر گزارنے کے باوجود انہیں خلوت و تنہائی بہت پسند تھی۔

تنہائی و خلوت طلبہ عشق نظیری | ایں خیل و خدم را بہر چہ بخش

وہ ایک زمانہ میں بہت خوش پوش تھے۔ غالباً ۱۹۲۰ء سے کھدر پہنا شروع کیا آخر تک اسی پر قائم رہے وہ ابتدا ہی سے ملکی غذا کھانے کے عادی تھے اور بہت کم کھاتے تھے۔ آخری عمر میں تو غذا کی تقبیل غیر معمولی صورت اختیار

کر چکی تھی۔ لطیف حدیثی چائے وقتاً فوقتاً ضرور پیتے تھے اور اس کے دلکش تذکرے ”غبارِ خاطر“ میں موجود ہیں۔

انہوں نے کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اپنے ان عقیدت مندوں سے بھی کوئی تحفہ یا سانی قبول نہیں کرتے تھے جنہیں انتہائی مشقت و لوازش سے انہوں نے عزیزوں کا درجہ دے دیا تھا۔ ایک مرتبہ انہیں عرق النساء کا ہوا شفا الملک حکیم فقیہ محمد شتی نظامی مرحوم بھی میری طرح مولانا کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مولانا کے عقیدت مندی کے مفصل حالات پوچھ کر مجھے بتاؤ، میں ایسا نسخہ تجویز کر دوں گا کہ بفضلِ خدا یہ عارضہ دوبارہ نہ ہوگا۔ میں نے حالات منگوائے، حکیم صاحب مرحوم نے غور و فکر کے بعد نسخہ تجویز کر دیا اور یہاں سے وراثتیں لکھتے بھججے ان سے نائدہ ہوا۔ حکیم صاحب کی رائے تھی کہ دو ایک کچھ دیر جاری رہتی چاہئیں۔

مولانا نے لکھا ”مجھے حکیم صاحب کی ودائیں استعمال کرنے میں ہرگز تامل نہیں اگر اب بھی ان کا فیصلہ یہی ہو کہ وغیرہ استعمال کرنا چاہئے تو ضرور کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ دوا خانہ کو حکم دے دیا کریں... تاکہ مجوزہ مرکبات وی کے ذریعہ پہنچتے رہیں اس صورت میں شکر گزار ہوں گا اور انشراحِ خاطر سے علاج کروں گا ورنہ طبیعت رک جاتی ہے کہ تحفہ یا ہونا چاہئے نہ کہ سلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہ کریں تو پھر میں نہ تو فراغِ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کر سکتا ہوں۔ امتداد و واجری حالت گوارا ہو سکے گی۔

ایک مشہور عالم دین نے مولانا کی تفسیرِ فاتحہ کے بعض حصوں پر ایرادات کئے اور اس سلسلے میں مناظرانہ رنگ پیدا کیا۔ ایرادات کے متعلق مجھے بعض باتیں مولانا سے پوچھنے کی ضرورت پڑی۔ ضمایم بھی لکھا کہ کتاب آپ نے نہیں دیکھی۔ دوں۔ فرمایا ”کتاب ہرگز نہ بھیجی بہتر ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں۔“

۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر اس شخص کو جو مناظرانہ طریقہ سے خلاف کچھ لکھے گا نہ تو جواب دوں گا نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو اودھ کر دوں گا یہ پنجاب کے ایک سیاست دان نے ایک بیان میں ایسی باتیں کہیں جو مولانا کے نزدیک کیسر بے اصل تھیں، انہوں نے مجھے لکھا کہ:-

”اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اس وقت تھا صاحب ”الہلال“ نکالتا تھا، تو یہ ایسا صریح کذب و سب سے معلوم کسی عام بیان میں میرے قلم سے سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے، لیکن اب میرا حال دوسرا ہے کہ کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں برا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقع پر نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو اپنے نفس کو کیوں برا نہ کہوں۔“

آخر میں فرماتے ہیں ”اگر ایک دعویٰ اسلام میں صدقِ مقال نہیں تو اسلام میں سے کوئی چیز بھی نہیں واپس دے دے گی۔ ایمان جتنے فردوں نے ایک مرتبہ دیر تک ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ میں نے ایک عرصے پر شعلہ افشا کی آہ بخت نہ دار کہ ہم بزمِ توہمیں۔ ماسر راہ تو داسے دنگا ہے

انہوں نے جواب میں تحریر فرمایا کہ اس شعر کا یہاں کیا موقع ہے۔
(جو ایک بالشتِ مرطبی میں ہے۔ یہ

ایک حدیث قدسی ہے مَنْ تَرَكَنَا فَبُذِلَ تَقَرُّبُ مَنَّةٍ ذَرَاعًا

ایک اٹھا اس کے قریب جانا ہوں (عمر بھر میری یہ کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تعلق سے محروم نہ رہوں۔ اسی پر عامل ہوں اور عامل رہوں گا۔ ع)

ہزار بار دہر دہر ہزار بار برب

مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ لیکن جو کچھ کہنا چاہتا تھا نہ کہہ سکا۔ وہی عرفی دلی بات بھولی گئی کہ

زبان زنگنه فروماند و راز من باقیست بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

آخر میں مولانا کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان کے طویل مکتوب سے ماخوذ ہے۔ کچھ علمی بحثیں فرما رہے تھے کہ خلافِ عادت ان کے قلم سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ فرماتے ہیں "افسوس ہے زمانہ میرے دماغ سے کام لے کر کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف اپنی شاعری کا رونما تھا۔" نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائیگی نار و ابودبہ بازار جہاں جنس دف رونق گشتم و از طالع دکان رفتم

بعض اوقات سوچتا ہوں تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہبِ علوم و فنون، ادب، انشاء، شاعری، کوئی دادی ایسی نہیں جس کی بے شمار نئی راہیں مبدئ فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں اور ہر آن وہ لحظہ بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو۔ کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پہنچتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سجیاں بچھی منزلوں کی جلوہ طرازیں ماند کر دیتی ہیں لیکن افسوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دونوں سے گرا بنا کیا۔ اس نے شاید سرد سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا کام ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا۔ مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔" یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے نہ سخن گستری ہے نہ تعلیٰ مراد حقیقت ہے۔ کاش مجھے اندازہ شناسی میں سنائی کا درجہ نصیب ہوتا تو اس کی زبان سے کہتا۔

وذر با باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود بایزید اندر خراسان یا اریس اندر قرن

میں اپنے علم کی بے باکی کو سامنے رکھتے ہوئے اس بلند مرتبہ شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کا اہل نہ تھا۔ چند محسوسات و مشاہدات نے جو بے اختیار زبانِ قلم پر آ گئے۔ یہ بے رنگ و بے خوشبو پھول ہیں جنہیں دامن میں سمیٹ کر مولانا کی بارگاہِ عظمت و جلالت میں حاضر ہوا ہوں۔ ایک بے نوافقیر سلطانِ علم و عمل کی قدم گاہ میں اور کیا نذر پیش کر سکتا ہے۔ خدا کرے یہ نذر حقیر شرف، دل سے محروم نہ رہے۔ اس ذکر کو غالب کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں جس کی روایت ضرورتاً بدل لی ہے۔

ہند را ز بند سخن پیشہ گنا سے بود اندر میں دیر کہن سے کدہ آتشا سے بود

مرزا غالب ہندوستان کے یگانہ تاجدار سخن تھے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے یگانہ تاجدار تھے۔ مرزا بھی گناہ نہ تھے اور مولانا کے بارے میں کوئی کو گناہی کا وسوسہ نہیں ہو سکتا لیکن مرزا نے اپنے مقام کی برتری اور اس کے شایانِ شان قدر شناسی سے محرومی کے باعث اپنے آپ کو گناہ مند کیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے بالکل یہی حالت مولانا کی سمجھنے۔ زمانہ جس طرح غیر معلوم ماضی سے گردش میں آ رہی اس طرح غیر معلوم مستقبل میں گردش کرتا رہیگا۔ عام لوگ بھی پیدا ہوتے رہیں گے اور بلند مرتبہ شخصیتوں کے ظہور کا دروازہ بھی بند نہ ہوگا لیکن یہ نہ وہ ذوقی کے عہد ہے جس میں اسے نظر رکھنے ہوئے کیا امید ہو سکتی ہے کہ مولانا کی یا کسی اور کی جتنی بھی شخصیت پھر پیدا ہوگی؟ اس کا تعلق کوئی بھی شے فنا کر دے گی۔ ہر چیز بقا جوت اللہ کے لئے ہے اور بس۔ (غلام رسول مٹر)

قول فیصل اس تاریخی بیان کے چند اقتباسات جو قتل کئے جاتے ہیں مولانا کے اُن احساسات کی پوری تصویر پیش نہیں کرتے جو بحیثیت مجرم پورے بیان کو پڑھ کر قلب و دماغ میں مرتب ہو سکتی ہے تاہم اس موقع پر مولانا کے ادکار کے چند گوشے اِن اقتباسات میں بھی واضح ہوتے ہیں۔

اپنے بیان میں عدالتوں کی قدیم تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ :-

”میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عداوتیں اور قرون وسطی (مثلاً ایجنز) کی پراسرارہ انکویزیٹیں“ وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے اُن سے ہمارے زمانہ کو نجات مل گئی۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جگہ اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے لیکن اُن دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور نا انصافی کے خوفناک رازوں کا دھینچہ ہیں..... اس جگہ عدالت میں اکی عظیم الشان اور عمیق تاریخی پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس شہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابل رشک ہوں۔ اُن کو اپنی خوب لگا، ہمیشہ میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعا میں مانگتے؟“

جو الزام اس مقدمہ کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اس کی نسبت فرماتے ہیں :-

”ہندوستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا کہ اقتدار ملکہ قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں..... یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کشتی ہی قابل ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش تو قابل ملامت نہیں۔“

ہندوستان میں بھی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق قرار دے جو انصاف کے نام سے اُس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا جرم ہوں بلکہ اُن لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں بے نیازی

کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمان بن ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے مسلمہ میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی۔ اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش نے ان کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پرنسپل فریب نے انہیں بتلا کر رکھا تھا..... میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف ان ہی دو موتوں پر بلکہ گزشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریریں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کتنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں اس فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ دفعہ ۴۴۱ (الف) کا جرم قرار دیا جائے گا میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کرتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کموں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے سامنے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں..... اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۴۴۱ (الف) کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرہویں بھلائی ہی کا ارتکاب کیوں متعجب کیا گیا ہے۔ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقع اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر ہجرت ۴۴۱ (الف) کی خلاف ورزی کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔“

انوں اور فرض اور سچائی کے فلسفہ پر مولانا نے اپنے نقطہ نظر کو اس طرح پیش کیا :-

”مسلمانوں کا یہی وظیفہ ہے (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اُسے علم یقین دیا گیا ہے ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ سے اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چُپ ہونا گوارہ کر لیا جائے اور دو اور دو کو اس لیے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لیے خطرہ میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے۔ نہ اس لئے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گذرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اُس وقت ہی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں بھولوں کی سیج ملے اور اس وقت ہی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں جھنڈک اور برت میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔“

ان بیان کے آخری جزو میں مولانا کے انکاراں غنیلوں سے نیچے کی طرف دیکھ رہے ہیں جہاں سے حکومت کا تمام ساز و سامان قانون اور عدالت بہت چھوٹا اور ادنیٰ نظر آیا کرتا ہے فرماتے ہیں کہ :-

”مجھ پر سٹیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اس ہمدردی کو کہنے یا بوجھل کر کہنا ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں

کہ اسی کا نام قابل احترام حب الوطنی بھی ہے، جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل ایک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویلر اور پازنل کے لیے برطانیہ عظمیٰ..... کو لٹا لٹب تجویز کرتی ہے؛

پازنل parmel نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ:-

”ہمارا کام ہمیشہ ابتدائیں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے“

میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ پس کرتا ہے جو میری کتاب و شریعت نے بتایا ہے جس طرح

ماہ اور اجسام میں انتخاب طبعی Natural selection اور بقا مصلح Survival

of the Fittest کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اُسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو مصلح

نظر مصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے، آخری فتح اُسی عمل کی ہوتی ہے

جو فتن اور سچ ہو اور اسی لیے باقی اور قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور نا انصافی میں مقابلہ

ہوگا تو آخر جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی..... پس آج جو کچھ مورخ رہے اس کا

فیصلہ کل ہوگا انصاف باقی رہے گا اور نا انصافی بنیادی علانیہ گی ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں البتہ

یہ قدرتی بات ہے کہ بدیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام

نشانیوں قبول کر لی ہیں، افسوس ان آنکھوں پر ہے جو نشانیوں سے انکار کریں۔ میں نے اپنی تقریروں میں

جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کما تھا کہ آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے

پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے..... مٹر مٹر ٹاٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا یہ

تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت ناک باب ہے جسکی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ

جبروں کا کٹھن آیا ہے تمہارے حصہ میں وہ مٹر مٹر کی کڑی میں ٹیکہ کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کبھی اتنی ہی ضروری

ہیز ہے جس قدر یہ کٹھن۔ آؤ اس یادگار افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے

اور مستقبل کب سے ہماری راہ نک رہا ہے جس جلد جلد یہاں آنے دو اور ہم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی

کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہیگا یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ عدالت کے قانون کی عدالت

ہے، وقت اس کا بیج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

آج جبکہ وہ بدلیاں جن کی طرف مولانا نے اشارہ کیا تھا برس گئی ہیں اور موسم کے بدلنے کی نو نشانیاں مولانا دیکھ رہے تھے وہ ٹھوس وریغی

حقیقتوں میں متقل ہو چکی ہیں خدا کے قانون کی عدالت نے اپنا آخری فیصلہ دیدیا ہے اور حاکم و مملوم نے اپنی جگہوں کا تبادلہ کر لیا ہے۔ اٹان کا

وہ عدالتی میان غیب کی ایک آواز معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جبر و استبداد اور حکومت کے اس گذرے ہوئے دور میں اس

قدر و درجہ اور کتدرہ صحیح دیکھ رہے تھے۔

سیگم صاحبہ مولینا کا تار بنام مہاتما گاندھی

ہم ذیل میں سیگم صاحبہ مولینا کا وہ تار دیکھ کر کہتے ہیں جو انہوں نے مولینا کی سزائیابی کے بعد مہاتما گاندھی کو احمد آباد اور برادولی کے پتوں پر دیا تھا، لیکن سنٹرل ٹیلیگراف آفس گلگت نے اسے روک لیا۔

میرے شوہر مولینا ابوالکلام آزاد کے مقدمہ کا فیصلہ آج سنایا گیا۔ انہیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت سب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سنے کے لئے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ ایم کر سکتے ہیں کہ اس معاملہ میں بھی ان کے ساتھ سخت نا انصافی برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی عزت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے، ان کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں، اور وہ تمام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے۔ میرے لئے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے ان میں خدا سے مدد کی پوری امید رکھتی ہوں، البتہ ان کی جگہ صرف بنگال میں ہی خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں، اور ان کے لئے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے۔

میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانہ میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں، اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ گزشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہو گئی ہے، دائمی محنت سے کل مجبور ہوں، اس لئے باوجود میری خواہش کے مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے میں حصہ لوں، لیکن میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی سزائیابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کر دیا جائے۔ میں آج سے بنگال پر انٹرنل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔

انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ان کے پُر محبت احترام سلام کے بعد یہ پیغام آپ کو پہنچا دوں کہ اس وقت دونوں فریقوں میں کسی فریق کی حالت بھی فیصلہ یا صلح کے لئے تیار نہیں ہے، نہ گورنمنٹ نہ ملک۔ اس لئے ہمارے آگے صرف اپنے تئیں تیار کرنے ہی کا کام درپیش ہے۔ بنگال جس طرح آج سب سے آگے ہے، آئندہ منزل میں بھی پیش پیش رہے گا۔ براہ عنایت برادولی تعلقہ پر بنگال پراؤنس کے نام کا بھی اضافہ کر دیجیے، اور اگر کوئی وقت فیصلہ کا آئے تو ہم لوگوں کی رہائی کو اپنی اہمیت دیجیے، جتنی آج کل دی گئی ہے۔ رہائی کو بالکل نظر انداز کر کے مقاصد کے لئے شرائط کا فیصلہ کرائیے۔

مولانا آزاد کی وفات پر عزتی پیغامات

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد | ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاست دان، ایک قوم پرست، ایک مایہ ناز محب وطن، جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک ایسے عظیم راہنما کی خدمات سے محروم ہے جس کا منظرہ مشکل اوقات میں قوم کے لئے ہمیشہ ہی مشعل راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی جبر انہیں بلے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔

گذشتہ چالیس پچاس برس کی زندگی کا تعلق مولانا کی زندگی کے ساتھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فرق کرنا جیسا بھی کوئی فرق نہیں کر سکتے۔ ایسے وقت میں جب ہم نے جانا نہیں تھا کہ ملک کی آزادی کے لئے کتنی مشکلیں برداشت کرنا پڑیں گی نے اپنی زبان اور اپنے قلم سے کروڑوں لوگوں کو جگایا، صرف جگایا ہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا کہ ملک کی آزادی کے لئے کس طرح قربانی پڑتی ہیں۔ یہ تو سب لوگوں پر ظاہر ہے کہ جب اس کے شروع میں مولانا نے اپنا کام شروع کیا تو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو سمجھ لیا تھا۔ ان کا یقین تھا کہ ملک کے اندر دونوں کو ہمیشہ رہنا ہے اور اگر رہنا ہے تو مل جل کر ہی رہنا ہے۔ تب ہی سب خیریت اور عافیت کی بات ہو سکتی ہے اور جب اس کام کو شروع کیا تو زندگی کے آخر تک تندرستی اور ہوشیاری کے ساتھ راستے میں مشکلیں آئیں لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اس پر قائم رہے۔ بہت سے لوگ آکر بے پھر الگ ہو گئے لیکن حضرت مولانا نے پھر بھی پرواہ نہ کی اور جو اصول طے کر لیا تھا آخر وقت تک اسی پر قائم رہے۔ ان کے اور زبان میں اتنی طاقت تھی کہ کروڑوں کو آزادی کے راستہ پر چلایا، کروڑوں کو قربانی کے لئے تیار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ پورا ملک گرویدہ تھا۔ عوام نے دکھلادیا کہ انہیں مولانا کے ساتھ کتنی محبت تھی۔

مولانا بیمار پڑنے سے پہلے کام کرتے رہے۔ انتقال سے قبل چند ہفتوں تک انہیں پہلے سے زیادہ کام کرنا پڑا مگر وہ اس کام سے شکستہ نہیں، کام کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اندر نئی طاقت اور نئی زندگی آگئی ہے۔ مگر آخر میں وہی نتیجہ ہوا جو سب جانتے ہیں اور وہ یہ کہ جو زبان کروڑوں کو جگاتی تھی، وہ قلم جو انسانوں میں نئی روح پھونکتا تھا، ہمیشہ کے لئے رُک گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم ان کی قربانی اور ان کی زندگی کے سبق سیکھیں۔ اسی میں ملک کی بہتری ہے اور اسی سے ہم اپنی آزادی محفوظ رکھ سکیں گے۔ ہمیں تہیہ کر لینا چاہیے کہ ہم مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے اور جس طرح انہوں نے اپنے ملک کی بھلائی کے لئے سب سے مقدم رکھا، اسی طرح ہم بھی اس بھلائی کو مقدم سمجھیں گے اور اس بات کو سمجھیں گے کہ آپس کے جھگڑے ملک کی نقصا ہیں۔ اگر ہم مولانا کی زندگی سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ملک میں اتحاد دیکھتے ہی کے لئے کام کریں۔

مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے۔ مفکر اور اسکالر تھے، بکے من سے اور پر جوش محب وطن۔ ان کی ہر بات تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ادھاکرشن

نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی ہیں لیکن پرواہ نہ کی۔ ایک سیاستمدان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے خطرات مول لیتا ہے۔ انہوں نے یہ خطرہ مول لیا اور سختی سے اپنے نظریات پر قائم رہے۔ اپنے ذاتی تعلقات میں مشفق رحم دل تھے۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اس نصب العین کو کیجیے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔

یہی نہیں کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات حضرت مولانا وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم، دریا کے سامنے پانی کا قطرہ دکھائی دیا ہے۔ ہندوستان کا روال ہے اور مولانا میر کا روال تھے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ماضی اور حال کے مابین پُل بن جائیں۔ یہ برگزیدہ شخصیت ہم سے جدا ہو گئی ہے۔ مگر اس کی زندگی کا پیغام جاودا ہے اور وہ ماضی کی طرح مستقبل میں بھی رہیں راستہ دکھاتا رہے گا۔ ممتاز افراد کے انتقال پر یہ کہنا بڑی رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے کہ اب ان کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح ہوتی ہے مگر جہاں تک مولانا آزاد کے انتقال کا تعلق ہے یہ بات سو فی صدی صحیح ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اب ہندوستان میں کوئی عظیم شخصیت پیدا نہ ہوگی۔ ہندوستان میں بڑے آدمی پیدا ہوتے رہتے ہیں اور آئندہ بھی پیدا ہوں گے۔ لیکن مولانا آزاد جیسی شخصیت کا دوبارہ پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مولانا مرحوم کی شخصیت قدیم و جدید قدروں کا سنگم تھی۔ ماضی و حال کی تمام خصوصیات ان میں پائی جاتی تھیں۔ خاص طور سے ان میں پرانے دنوں کا اخلاق، وضع داری، رواداری اور صبر و تحمل کوٹ کوٹ کر بچا تھا۔ یہ وہ قدس ہیں جو اس زمانے میں کہیں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ سائنسی اور ٹیکنیکل معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگ چاند پر پہنچنے کی فکر میں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر زندگی سے اخلاق اور رواداری کی قدریں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔

مولانا کی ذات اس شکر کلچر کی نہایت ہی مخصوص اور ممتاز نمائندہ تھی جو ہندوستان میں برسوں کی تبدیلیوں سے وجود میں آیا ہے۔ اس ہندوستانی کلچر پر مغربی ایشیا اور ایران کے کلچر کی گہری چھاپ پڑی ہے اور مولانا اس کے صحیح نمائندہ تھے۔ میں اب کسی ایسے شخص کا تصور نہیں کر پا رہا ہوں جو ان کی جگہ لے سکے۔ کیونکہ وہ جس عہد کی پیداوار تھے وہ عہد ختم ہو چکا ہے۔ ہم میں چند اس عہد کی یادگار، دھندلی سی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نئی نسل جذباتی طور پر اس بات کا اعتراف کر سکے گی یا کہ نہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ حضرت مولانا کی بصیرت اور دانش وری کا مقابلہ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے دانش وروں سے کیا جاسکتا ہے۔

شوش کا شہر

سفر آخرت

۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو پانچ بجے صبح معمول امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد چائے پی کر غسل خانہ میں گئے کہ یکایک جسم کے دائرے پر فالج نے حملہ کیا اور بس ہو گئے اور بالآخر ۲۱ اور ۲۲ فروری کی درمیانی شب میں دو بج کر دس منٹ پر موت نے اس عظیم انسان کے اپنا دامن داکر دیا جو اس دور میں سب سے بڑا ہندوستانی، سب سے بڑا انسان اور سب سے بڑا مسلمان تھا۔

تمام ہندوستان نے اشکبار چہروں کیساتھ اپنے بھنڈوں کو سرنگوں کر دیا۔ جہاں جھنڈے سر جھکا رہے تھے وہاں لوگوں نے اپنے کے پرچم جھکا دیئے کہ اس دور کا ابنِ تمیہ رحمت خداوندی کی گود میں چلا گیا ہے۔ دمِ تزلزل میں موت کی خبر ہندوستان کی وساطت سے دُنیا میں پھیل گئی۔ ہندوستان دیکھتے ہی دیکھتے تعزیت کہہ نظر آئے لگا کر دوبار بند ہو گئے حتیٰ کہ سڑکیوں میں بھی ہڑتال ہو گئی۔ ریلوے کا اعلان ہوتا ہے ہی تین چار لاکھ انسان کو کھڑی کے باہر جمع ہو گئے۔ گریہ و بکا کا طوفان بڑھتا رہا۔ لوگوں کے غول لگتا تھا کہ قطار اندر قطار کھڑی کے صحن میں اپنے عظیم نشانِ راہنما کی زیارت کے لئے آتے ہی گئے۔ ہر مذہب، ہر عقیدہ، ہر فرقہ کے انسانوں کو سوار بھاٹا دینے لگا۔ ہندو اور سکھ توڑتیں اور مرفوش کے پاس سے گزرتے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکا کر کہتے، ہر آنکھ میں آنسو تھے، ہر راجندر پر شاد صدر، راجندر، ڈاکٹر رادھا کرشنن، نائب صدر، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے عہدیدان ملک و قوم تصویرِ قائم بنے کھڑے جیسے وہ اس دن جینا نہیں چاہتے تھے دوسری طرف لوگ آنسوؤں کی لالائیں چڑھاتے گزرتے جاتے تھے کہی ہزار برقعہ پوش خواتین آزادی کے بعد پہلی مرتبہ ہستی دہلی میں اس طرح بکھیا اور اشکبار نظر آ رہی تھیں۔ حضرت مولانا تاریخِ انسانی کے تنہا مسلمان تھے۔ ماتم میں کعبہ و بیت خانہ اس شدت سے سینہ کوب تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو مسرا گریہ تھے۔ انہیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے۔ لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لئے دوڑے پھر رہے تھے تمام کھڑی کے وسیع باغات انسانوں سے اُٹ چکے تھے، لیکن لوگ اندر آنے کے لئے دروازہ پر هجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضا کار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے۔ اور جب جنازہ اٹھانے کیلئے ان کو بلایا تو انہی نظریں میں ہر کاب سیکورٹیز پر بزرگ گئیں۔ استفسار کیا۔ آپ کون؟ جواب ملا۔ سکیورٹی آفیسر۔ آپ کی حفاظت کے لئے۔ پنڈت نہرو نے کہا۔ کیسی حفاظت؟ موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔ یہ کہہ کر پنڈت نہرو ہلک ہلک کر رونے لگے۔

ہر لون بیکے میت اٹھانی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا جب کندھا شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی اور اردو کا ندھا دینے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، خانِ گلشنِ خان، مسٹر کرشنن، مینن، مسٹر پرل وڈھ چنڈ اور بخشی غلام محمد نے اساطیر سے باہر میت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو ورمہ کے مرثیوں ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویر یا سنے کھڑے تھے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آج ۳۸ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔ پنڈت پنڈت نے درد سے کانپتے ہوئے آواز میں کہا۔ مولانا ایسے لوگ پھر بھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

پنڈت نہرو کی پہلی بیوی گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اٹھے۔ تمام فضا میں نالہ بائے مسلمان

گئے۔ مولانا کی بڑی بہن آرزو بیگم نے کوٹلی کی چھت سے بھائی کی میت پر آخری نظر ڈالی اور کہا۔ اب کوئی آرزو باقی نہیں رہی۔
جنازہ کی گاڑی میں سرانے کی سمت دائیں رخ پر نڈت نہرو اور بانیوں طرف پیر صدر کا گلہاں دھیر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے
بیل شاہ نواز، دھیر بھائی کے ساتھ بخشی غلام محمد اور پروفیسر تالیوں کبیر موجود تھے۔

جسم رکھڑ کا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپیٹی ہوئی تھی جس پر شری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدر
یاد اور نائب صدر کار میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزراء اعظم، اکثر صوبائی گورنر اور غیر
عاری نمائندے پہلے آ رہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے۔ جب جنازہ کا جلوس انڈیا
اور مارڈنگ برج ہوتا ہوا، لاکھوں انسانوں کی تحدید و محبت کے لئے دریا گج کے علاقہ میں داخل ہوا، تو سڑک کے دونوں طرف
نی فٹ پاتھ اور دروازہ مکانوں کی چھتوں سے پھول ہی پھول برسے گئے۔ یہاں پھولوں اور پنکھڑیوں کی موسلا دھار بارش کے سوا
کچھ نہیں آتا تھا اور جب جنازہ جامع مسجد کے قریب دھوار میں پہنچا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ جامع مسجد کی بالائی چھت، بیڑیوں
سے لے کر محرابوں کی پیوست زنجیریں، حجرہوں کی ہم آغوش صفیں، مکالوں کی منڈیریں، اور دوکانوں کے چھجے انسانی سرورں سے
پڑے تھے۔ پریگراڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق کئی پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف عمار و حفاظ قرآن مجید پڑھ
تھے اور دوسری طرف اکابر و فضلا سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے بڑی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں، ہوائی فوج کے
ہرجانہ بازوں اور بحری فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے ٹھکری بالکین کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجڑ
س منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی۔ اور نماز جنازہ پڑھائی جا رہی تھی اور نہ نڈت نہرو قبر کے قریب فرش زمین پر بیٹھے ملک ملک دیکھ
تھے۔ امام نے السلام علیہ ورحمۃ اللہ علیہ کہا اور میت کے قریب لائی گئی تو ہزار ہا ہندو سکھ ماتھہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے
ایک بجائے۔ سڑکوں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے حمد میں اتارا۔ کوئی تالوت نیا نہ کیا
مار ایک یادگار جسم سفید کفن میں لپیٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بارو نے آنسوؤں کی سیل میں جھگو کر پھول نچا دے۔ نڈت نہرو
الاب چھڑکا تو لیے اختیار ہو گئے۔ لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی جیسے لگے تو بالک ملک کر دیے تھے ہر چہرہ رونا ہوا نظر آتا تھا۔

مسلمانوں کی عہد آفریں ہستیوں پر خود مسلمانوں کے ہاتھوں جو گزری اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ہمیشہ بڑوں کی عظمت پر انکی موت نے
امت دی ہے۔ آج جن لوگوں پر چارے علم کل اور فکر و نظر کی عمارتیں اٹھائیں، اپنی حیات میں ان پر نہی کیا گیا۔ قیدیوں کو الگ کیا۔ زنجیریں
ہاں لگئیں۔ بسا اوقات وہ عوام کے سب وقم اور خواص کے جو وقم کی تاب نہ لا کر موت کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں نے انہیں گڑ
س بھی محروم رکھا۔ غرض سداۓ اندر شہر کا نام گرد و غبار انکی ہستی پر ڈالا گیا۔ مگر جب وقت نے کوٹلی کی ذات سوچ کر طرح بھر
لے لگئی اور تاریخ کی پیشانی اُن کے آستانہ عظمت پر عیش کیلے جھک گئی۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ان جہاں راستوں
علیہ پڑا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں وقت کی کوئی گالی نہ تھی جو ایک زمانہ میں مسلمانوں نے اُسکے خلاف استعمال نہ کی ہو مگر وہ عمل کے اعتبار
سے اڑتے، انہوں نے ہمیشہ صبر کیا۔ انکی اور ابن تیمیہ کی زندگی میں حیرت انگیز مخالفت ہے اور یہ مخالفت موت کے بعد بھی نظر آتی ہے۔ حطرن
نیک کی حالت پر زندگی کا کوئی شعبہ قائم سے خالی نہ رہا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا کی وفات پر زندگی کا ہر شعبہ قائم گرا ہے۔ جب تک حیات
و وقت کی سیاسی فصلیں اُن کے گریبان پر پاتھ اٹھاتی تھیں آج اُٹھ گئے ہیں تو مزار، عوام و خواص کا مرجع ہے۔

مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا

نذرت گوند و لہجہ نیت (دو زیر و اسخندہ مند)

عوام اور حکومت کا رہنما

آنے والی نسلیں حضرت مولانا کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی۔

گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حشرناک موت سے۔ ۴۴ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔

مولانا مرحوم ہمارے دین کی مجسم ثقافت تھے جو ہمارا بیش بہا ورثہ ہے اور اس اعتبار سے وہ تمام لوگوں کو رواداری، غیر سگالی اور دوستی کے جذبات سے پیش آتے تھے۔ مرحوم ایک دانا مدبر، پرجوش محب وطن، جری ایک ایسے فاضل اہل تھے جن کے علم کی قدر نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی کی جاتی ہے۔ مرحوم نے ملک کی جدوجہد میں برسوں انڈین نیشنل کانگرس کی رہبری کی۔ مولانا مرحوم نے کرپشن، دیگر اداروں اور لاڈلوں کی ملک کی آزادی کے اہم مسئلہ پر گفت و شنید کی تھی۔

وہ ایسی ہستی تھی جس کے پاسے استقلال میں کبھی نفرت نہ آتی اور جس کے قدم سچائی اور راستی کی راہ میں کبھی اس ہستی نے اپنی زندگی دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس ہستی نے نبی نوع انسان کی آزادی کی اور ہندوستان کی آزادی اور اس ملک میں بننے والے تمام لوگوں کی یگانگت کے لئے محنت و مشقت کی۔

بڑی حد تک ہماری آزادی مرحوم جیسے لیڈروں کی مرہون منت ہے۔ مرحوم کی یاد محبت سے تازہ رہے گی اور ان مرحوم کی زندگی سے فیضان حاصل کرتے رہیں گے۔ مرحوم نے تمام لوگوں کے لئے ایک نقش قدم چھوڑا ہے اور آنے والی مرحوم کی شرافت نفس کو یاد رکھیں گی۔

مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم شخص تھے۔ یہیں ان جیسا آدمی پھر نزل سکے گا۔ قوم ایسی عظیم ہستیوں کو یاد رکھے گی۔ وہ ایک روشن بنیاد تھے۔ وہ آج ہم میں سے اٹھ گئے ہیں۔ نہ صرف لوگوں بلکہ حکومت کا بھی ایک ایسا رہنما تھا جو تمام حالات میں ایک کیلئے سید پرست تھا۔ مرحوم نے حکومت کے اندر رہ کر اور باہر بھی تنہا دل و دماغ اور خیریت انہماک سے کام کیا ہے۔ میں صدمہ ہوں کہ ملک اس صدمہ کو سہلے بلکہ وہ مفاد جن کے لئے وہ کھڑے ہوئے اور جو مفاد ہمیشہ ان کے پیش نگاہ رہے اور اس پر وہ کاربند رہے وہ ہماری رہبری کرتے ہیں۔

آفرینندہ عہد
 مولانا ابزرگ زیدہ ہمتیوں میں تھے ہوا اپنے عہد سے بڑی تھیں وہ آفرینندہ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب، اور ہمارے علوم کا اعتبار و افتخار تھے اس کا جس طرح ہر دہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے وقت میں ہوتا ہے،
 مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آ رہا ہے ہو کہیں نظر سے گذرا ہے یا سنتے میں آیا ہے کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ ”تم لوگ پانی اور پتھر کو دیکھ کر باتیں کا لیتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں“ دنیا کے کم لیڈروں کو یہ دربر نصیب ہوا ہے۔
 مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور انھیں بچانے کی خدمت سرانجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون و بیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی کس عظمت اور کس حیرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ و تنہا اس مسلمان کے حصے میں آتا جس سے زیادہ ملعون اور مضبوط نفیہ ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا۔ (رشید احمد صدیقی)

میں نے اپنی زندگی میں دو ہی انسانوں کی نمائیں دیکھی ہیں جن سے مجھے پتہ چلا کہ نماز کسے کہتے ہیں ایک ابوالکلام کی اور دوسری مولانا محمد الیاس رضوی۔
 (سید عطاء اللہ شاہ بخاری)

خدا کی طرف پکار

يَقُومُنَا اٰجِبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ - اے بلو ان ملت اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار کا جواب دو

انْفِرُوْا خِفَافًا وَثِقَالًا

آہ ابکاش مجھے وہ صور قیام قیامت ملتا، جس کو میں نے کہ پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جانا۔ اس کی ایک صدائے رعد اس کے عظمت شکن سے سرکش تھان خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ و پکار تاکہ ”اٹھو! کیونکہ بہت سوچئے اور بیدار ہو، کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے ابچہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو، پر اس کی نہیں سنتے، جو تمہیں موت کی جگہ حیات، زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔“ !!

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی صدا کا جواب دو جبکہ وہ تمہیں بلارہے تاکہ تم کو موت سے نکال کر زندگی بخشے یا کہو کہ اللہ عجب چاہتا ہے انسان اور اس کے دل کا انداز لے آ جاتا ہے اور پھر خواہ تم اُس سے کتنا ہی اسرار کو روک کر تم کو سر پرکے اسی کے آگے ایک دن بمانا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ
 وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ
 وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ
 وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۲۲:۸)

مولانا آزاد کی زندگی

- ۶۱۸۸۸ - ۱۱ - نومبر کو مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے ۔
- ۶۱۸۹۸ - مکہ معظمہ سے کلکتہ آئے ۔
- ۶۱۹۰۲ - رسالہ سان الصدق جاری کیا ۔
- ۱۹۰۴ - انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں خطبہ پڑھا ۔
- ۶۱۹۰۹ - آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوا ۔
- ۶۱۹۱۲ - اردو اخبار 'الہلال' جاری کیا ۔
- ۶۱۹۱۴ - حکومت نے 'الہلال' کی ضمانت ضبط کر لی، اور اخبار بند ہو گیا، 'البلّاغ' جاری کیا ۔
- ۶۱۹۱۵ - حکومت بنگال نے بنگال سے جلا وطن کر دیا۔
- ۶۱۹۱۶ - رانچی (بہار) میں نظر بند کر دیئے گئے ۔
- ۶۱۹۲۰ - رہا کر دیئے گئے، دہلی میں پہلی مرتبہ مستاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی ۔ ہاتھ کا گاندھی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون میں حصہ لیا۔ گرفتار ہوئے اور دو سال کے لئے قید کر دیئے گئے ۔
- ۶۱۹۲۳ - ستمبر میں انڈین نیشنل کانگریس کے خصوصی اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر ہوئے
- ۶۱۹۳۰ - کانگریس کے قائم مقام صدر ہوئے پھر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۹۳۲ء تک جیل میں رہے
- ۶۱۹۳۵ - کانگریس پارلیمنٹری سب کمیٹی کے ممبر ہوئے
- ۶۱۹۴۰ - پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۴۶ء تک اس عہدے پر رہے ۔
- ۶۱۹۴۲ - کانگریس کے خصوصی ترجمان کی حیثیت سے سرٹیفیڈ
- کرپس سے بات چیت کی اگست میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے اور تین سال تک نظر بند رہے ۔
- ۶۱۹۴۳ - بیگم آزاد کا انتقال ہوا
- ۶۱۹۴۵ - دوسرے کانگریسی لیڈروں کے ساتھ رہا ہوئے
- ۶۱۹۴۶ - وائسرائے کی طرف سے منعقدہ شکار ٹورس میں کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے شریک ہوئے ۔
- ۶۱۹۴۶ - کیپٹ مشن کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لیا۔
- ۶۱۹۴۷ - دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے عبوری حکومت میں تعلیم اور فنون لطیفہ کے ممبر ہوئے
- ملک آزادی کے بعد ۱۵ اگست سے حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہوئے ۔
- ۶۱۹۵۱ - پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے
- ۶۱۹۵۲ - پہلے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ تعلیم، قدرتی وسائل اور سائنسی تحقیقات کے وزیر مقرر ہوئے ۔
- ۶۱۹۵۵ - دوبارہ پارلیمنٹ میں کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر منتخب ہوئے ۔
- ۶۱۹۵۵ - دوبارہ کے لئے یورپ اور مغربی ایشیا کے غیر سنگامی دورے پر تشریف لے گئے ۔
- ۶۱۹۵۶ - یونیسکو کی فوین عالم کانفرنس منعقدہ دہلی کی صدارت کی
- ۶۱۹۵۷ - دوبارہ گورنر کارن کے حلقہ انتخاب سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ وزیر تعلیم، سائنسی تحقیقات کے عہدے پر برقرار رہے ۔
- ۶۱۹۵۸ - ۲۲ فروری کو دہلی میں رحلت فرمائے

حروف اسم مبارک کے صفاتی و معنوی اشارے

”احمد محی الدین ابوالکلام آزاد“

یہ مولانا کے اسم مبارک کے حروف اوصاف و محاسن کی بھی نشانیاں ہیں جن میں ولادت و وفات کے سہ ماہی مفسر تھے چنانچہ ”احمد محی الدین“ کے ان جن صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ان سے ولادت کا سہ ماہی نکلتا ہے اور ابوالکلام آزاد کے حروف جن محاسن کی نشانیاں ہیں ان سے نکلتا ہے۔ ابن الحسین مورخؒ کی یہ علمی ادبی کاوش ذیل میں درج کی جا رہی ہے

ابوالکلام آزاد

وفات ۱۹۵۸ء

۱۷	=	ا	ادیب
۲۰۳	=	ب	بلند و اعلیٰ
۶	=	و	
۶۶	=	و	دکیل
۲۱۱	=	ا	آزاد
۶	=	و	
۱۴۱	=	ل	لہذا
۶	=	و	
۱۰۰	=	ک	کلیم
۶	=	و	
۴۴	=	ل	لیب
۸۲	=	ا	الاسم
۴۷۰	=	م	مست
۶	=		
۱۶۲	=	ا	انسان
۲۳۷	=	ن	نیرک
۶	=		
۱۳	=	ا	آزاد
۱۷۶	=	د	دوسا زوین

احمد محی الدین

ولادت ۱۸۸۸ء

۱۱۹	=	ا	احسن
۶	=	و	
۱۱۹	=	ا	احسن
۳۸۰	=	م	مفسر
۶۴	=	د	دین
۶	=	و	
۱۸۰	=	م	معلم
۵۲	=	ح	حمد
۶	=	و	
۱۷۰	=	ی	یقین
۱۰۱	=	ی	یقین
۶	=	و	
۱۲۹	=	ل	لیفت
۱۹۳	=	و	وادی حق
۶	=	و	
۲۱۷	=	ی	یاد
۶	=	و	
۱۲۸	=	ن	نگبان

ادیب بلند و اعلیٰ دکیل لہذا کلیم لیب امامت انسان نیرک آزاد دوسا زوین

احمد محی الدین معلم یقین امین لیبیت داعی حق و یاور و نگهبان

لوح مزارِ تاریخی

ابرسلامتی بر خاکش ہمام باد
۱۹ - ۵۸

لُكَلْ نَفْسٍ ذَاتِ قُوَّةٍ الْمَوْتِ

۱۹ - ۵۸

أَعُوذُ بِاللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

۱۹ - ۵۸

رَضِيَ اللَّهُ الْمُهَيَّمِينَ عَنْهُ

۱۳ - ۷۷

۱۳ - ۷۷

صدر دریا اے امام الہند میر قافلہ

۱۹ - ۵۸

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم ہند

۱۳ - ۷۷

کائنات نیک طینت، رہبر ہندوستان

سمت ————— ۲۰۱۴ ————— بکری

اے امام الہند جرات، تاجدارِ حریت

سمت ————— ۲۰۱۴ ————— بکری

بے تکلف خاک میں جا کر ہوا ثوابِ نہاں

سمت ————— ۲۰۱۴ ————— بکری

اوج ایوان اے دبیرِ دیدہ صدرِ دریا

سمت ————— ۲۰۱۴ ————— بکری

ہدیہ محمد ادریس نسیم دہلوی تاریخ گو کا بن اللہ لہ

سمت ————— ۲۰۱۴ ————— بکری

ایک مطلب ہو گیا ہے دوزبانوں میں ادا

زندگی میں بھی رہے فیروزِ بخت ان کے قدموں پر نچھاور تاج و تخت

غیب سے ہاتھ لے دی صادقِ صدا آج بھی وہ ہو گئے فیروزِ بخت

۱۳۷۷ھ

صادقِ بستوی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۲۹ھ
۱۹۳۱ء



۱۲۹۹ھ
۱۸۷۸ء

۱۵

۱۵

عکس تحریر مولانا محمد علی جوہر

خبر ۱۶ - تمام عساکرت ہمارے اور ہمارے بہن
 صوفیہ دور کی گئی۔ فطحت کے قلب پر آپسی محبت
 ہر شہر کا بہت اثر تھا اور خود علی گڑھ
 آئر اور کاشمیرہ اوا کر گیا۔

میر کعبہ علیہ السلام آیتا مگر سکا رہا اور
 کہ آج نفٹ گھڑا جو جو پتھر پٹ دیا
 جارہا ہے اور کین شریک ہو۔ کل گارڈن بارگاہ
 صحت اسکی توقع پر بہت کام ہو رہا ہے خدا آپکا عمل
 کے لئے نذر آسیر خ آسیر

اپکا عزیز نازند
 مگر غدر

ابلی از رئیس احمد جعفری

بید الرشید ارشد

پس الامار مولانا محمد علی جوہر علیہ السلام

یک نفس جان تزار او پند اندر فرنگ
تا مژہ بر ہم ز نیم از ماہ و پر وین در گذشت
ای خوشامش غبار او کہ از جذب حرم
از گذار اندلس و از ساحل بر بگذشت
خاک قدس او را بہ آغوش تنہا در گرفت
سوئے گردون رفت ان رہے کہ بغیر گذشت
می نگنج جز آن خاکے کہ پاک از رنگ دلوست
ہندہ کو از تیز اسود و احمہ گذشت

جلوہ او تا ابد باقی بہ چشم آسیا است
گرچہ آن نور نگاہ خاور از خاور گذشت

”محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا۔ خدا جانے کتنی دفعہ عاکر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ کچھ مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے۔ صرف ایک صفت مسلمان کی سچی، بے غرض محبت ہے۔ باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں، میں نے کبھی دیکھا نہیں، اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصنات سمجھتا ہوں

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی

جس انسان کے متعلق حکیم الامت حضرت تھانوی اور شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے اپنے تاثرات کا مندرجہ بالا الفاظ میں اظہار فرمایا ہے۔ آئندہ طور پر اس کی تفصیلات دکر دار کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ پڑھے لکھے لوگوں میں چند افراد ہی ایسے ملیں گے جو محمد علی جوہر سے آشنا ہوں گے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی گذرا ہے جب اس کا روی سے لے کر ہالیوڈ کی چرنیوں تک اور آسام سے لے کر درہ خیبر تک ہندوستان کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا۔ مسلمانوں ہی کا سوال نہیں ہندو اور دوسرے غیر مسلم بھی اس میں شریک ہیں۔ جو محمد علی جوہر سے ناواقف ہو۔ اور پورے ہندوستان میں یہ رجز گرج رہا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی جان بی خلافت پر دے دو

مولانا محمد علی جوہر کے والد عبدالعلی خاں یوسف علی خاں ناظم فرماؤ واسے کے مقرب و مستند تھے۔ آپ کے وطن میں اختلاف ہے کہ وہ مراد آباد کے تھے یا نجیب آباد و موضع بجنور ان کا وطن تھا۔ لیکن مولانا مرحوم کے اپنے ایک مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی وطن نسبت نجیب آباد و بجنور سے ہے۔ آپ مشائخ کے آخر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے منجھ جان کا نام مولانا، شوکت علی اور بڑے کا زاد فقار علی گوہر تھا۔ اسے ذوالفقار علی گوہر نادیانی ہو گئے تھے۔ ان کا اکثر قیام نادیاں میں رہا۔

دو سال کی عمر کے تھے کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ ماجدہ باہمت و مستقل مزاج تھیں۔ تین بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ معمولی اردو و فارسی وغیرہ گھر پر ہوتی۔ اس کے بعد بریلی ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ مولانا جوہر کی ذکاوت و ذہانت اور فطانت اسی زمانہ میں ابجا کر تھی۔ میر محفوظ علی دار کے صاحب طرز ادیب، جو اس زمانے میں ان کے ساتھ پڑھتے تھے، لکھتے ہیں :-

”محمد علی بریلی میں بلا کے ذہین مگر کم محنت تھے۔ استاد سب غرض دہتے تھے۔ مزاج میں تیزی اور حاضر جوابی بہت تھی۔“

مولانا شوکت علی بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے لیکن بڑے ہونے کی وجہ سے تمام کام محمد علی سے کرایا کرتے تھے۔

بھائی کا احترام

محمد علی اگرچہ تیز تھے لیکن بھائی کا احترام پورا پورا کرتے تھے۔ میر محفوظ علی کے بیان کے مطابق :
”شوکت محترم گپ اور بار بار ہنسنے کے ساتھ کابل اور خوجہ کرائی ہوئے تھے۔ طالب علموں کے جمع میں بیٹھے محمد علی پانی لاؤ، کتاب اٹھاؤ، اپکین رکھ آؤ کما کرتے تھے۔ ایک دن خطیب جی نے دہلوی سخاوت حسین مرحوم اسٹنٹ الیکٹرک مدرس، محمد علی کو ”گپ باشش اور خوجہ دہاش“ کے معنی سمجھائے۔ میں نے کہا ایک دوسرا جملہ بھی ہے، خرباشش برادر بزرگ باشش، خطیب جی نے اس کے معنی سمجھا کر کہا تو محمد علی گپ ہونے اور شوکت خوجہ محمد علی نے فوراً جواب دیا جناب! میں تو گپ بنا پسند کروں گا مگر شوکت بھائی کا خرباش پسند نہ کروں گا۔ خطیب جی نے کہا شاباش!“

اس زمانے میں سرسید کے مدرسۃ العلوم کا جو لہجہ میں مسلم لیڈر رشی علی گڑھ بنا، پراثر و تھا۔ ہندو علی گڑھ میں داخلہ
میں جو لوگ اپنی اولاد کو انگریزی تعلیم دلانا چاہتے اور خوجہ برداشت کر سکتے تو ان کی یہ خواہش ہوتی
رہا کہوں کو علی گڑھ داخل کرائیں جس طرح دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہمتا ہے نظر دار العلوم دیوبند تھا۔ اسی طرح دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والوں کا ہمتا ہے نظر علی گڑھ تھا۔ اور جو طلباء ان گھوں میں پڑھتے وہ ہر جگہ مغربیہ انداز میں بیان کرتے کہ ہم علی گڑھ یا دیوبند پڑھ رہے ہیں۔

بقول رئیس احمد جعفری :-

”سینکڑوں ”مردانہ جویا“ علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ حیب وہاں سے نکلے تو تیز و طرار بن کر، بات بات میں شجری، خیال ڈھال میں رنگینی، کسی سادہ لوح کو دیکھا ایک فقرہ چیت کر دیا۔ ریل میں سوار ہوئے تو آفت میچا دی۔ ڈپٹی کلکٹری اور اسی قسم کے سرکاری عہدے تو اس زمانے میں گویا ایک ”غیاث“ کے لئے نہایت سہل الحصول ملازمت تھی۔ جب چاہتا وہ ان پر قبضہ کر سکتا تھا۔“

اور دار العلوم دیوبند کی فضا کے متعلق تو یہ مشہور تھا کہ کوئی وہاں یا نہ پڑھے یا نہ پڑھے اگر دو چار دن وہاں رہے تو باہر انگریز دشمنی کا جذبہ اور حسرت پسندی پیدا ہو جاتی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر اپنے بڑے بھائی شوکت علی کے ہمراہ علی گڑھ میں اسی زمانے میں داخل ہوئے۔ مولانا کا سارا سال کھیلوں اور تفریحات میں گزرتا۔ ڈیڑھ دو ماہ امتحان سے قبل ہر طرف سے کمیونیکو ہو کر کتابوں کے ہر کرہ جاتے اور امتیازی نمبروں کے کامیاب ہو جاتے۔ میر محفوظ علی فرماتے ہیں :-

”محمد علی قابلِ شکر اہلیت کے ساتھ کلاس میں لیکچر سنتے، فیلڈ میں کرکٹ کھیلتے اور یونین میں تقریریں کرتے تھے۔“
ان دنوں علی گڑھ میں خواجه غلام الثقلین، مولانا ظفر علی خاں، چودھری عویشی محمد ناکر، مولانا حمید الدین قرہاوی اور اردو کے مشہور ادیب حضرت سید سجاد حیدر ریلوے پر تھ رہے تھے۔ سید سجاد حیدر اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں، اور کرکٹ کا کپتان اس وقت کے علی گڑھ میں اپنی فکر و دہر و جنگ، کامیابی ہے۔
طلباء کے تابع فرمان، پروفیسر اس کے اقتدار کرمانے والے اور بڑھانے والے، کپتانی اور ان کے بھی کی اور کر رہے ہیں لیکن
شوکت علی کی کپتانی ایڈگار دماڈ ہے۔ اسی نے کپتان کے کمرے کو ایک دربار کی حیثیت دے دی تھی۔“
اگے چل کر تحریر کرتے ہیں:-

”جب میں علی گڑھ کالج کے اسکول کی فزکس جماعت میں داخل ہوا تو شوکت علی کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی محمد علی بھی رہتا تھا۔
یہ دو کلاس میں دہیں، کلاس کے باہر لڑکا اور ہر فن میں مولانا تھا۔ محمد علی اپنی بہت مختصر دنیا میں اپنے ہم عمر لڑکوں کی سرداری کرتا
تھا۔ مگر اس طفل نے کے ساتھ جو اس کے بڑے بھائی شوکت علی کو حاصل تھی اور پھر غضب یہ کہ اس چھوٹے سے سردار کی محمد
سرداری دھری رہ جاتی تھی۔ باہم نے دیکھا کہ بڑے بھائی نے محمد علی کو ڈانٹ کر اپنے حضور میں بلایا اور اس بزمِ احباب
اور دربار عام میں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دو ایک سوال جواب کے بعد رخا دوں پر غصہ پڑا کہ سرداری گئی۔“
سید سجاد حیدر کی کامیابی ہے:-

”اپنی انگریزی قابلیت کے لئے وہ اب بھی متاثر تھے کہ وہ دونوں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج کی کلاسوں میں آئے
یہاں پہنچ کر ان کے کردار کی وہ خصوصیات نمایاں ہوئی جس نے دنیا میں محمد علی کو آزادی رائے اور آزادی عمل دی وہ اکثر اپنے
پروفیسروں سے اختلاف کرتے تھے۔ یونین میں ایسے مباحث پر تقریر کرتے تھے جس جانب تقریر کرنا پروفیسروں کی پس جہیں
کا باعث ہوتا تھا۔ تقریریں ان کی زور دار، زبان شنہ اور اپنے من و مال کے لحاظ سے نہایت مؤثر ثابت ہوتی تھیں۔“
مولانا یحییٰ ہی سے شعر و شاعری سے دل چسپی رکھتے تھے۔ عبد الماجد دریا آبادی کے نام ایک خط میں تحریر
فرماتے ہیں:-

شاعری

”کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے تو ایک نظم
میں شاعرانہ کمال نے حاجی اسماعیل خاں صاحب کی دعوت کے شکریہ میں نثار کی تھی۔ ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک
سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسین صاحب آئیں۔ ”آدمودہ کار“ سیکرٹری مسلم لیگ کے برادر اصفہر خیرک سال
کالج میں خوب گزر گیا۔ اور وہ مشاعرہ جسے لیدر حضرت مولانا حسرت موہانی نے رونق بخشی ہم ہی لوگوں کا ایجاد کردہ تھا۔
چند ہفتے پہنچ کر ان کا تھا اور شمع پیش کی جاتی تھی۔ کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک چودھری کو بارش ہو گئی تو ۳-۴ دن
مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر یونین ہال میں کیا گیا۔ اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرہی غزل میں اس شعر کا بھی اسناد کر دیا:

پرست محمد علی زہرہ رئیس احمد جعفری ص ۲۲۷ لہ مرزہ ترجمانی جواد دھجیت کرکٹ کے جسٹس ہے کہ اصفہر حسین بلے ایل ایل بی، ملیگ، سیشن جج

فرش زرد میں ہیں وہ چاندنی نہیں لطف شاعہ تو گیا چاندنی کے ساتھ

(محمد علیؒ - ذاتی ڈائری کے چند ورق ص ۵۱)

اکسفورڈ

سجاد حیدر رکھتے ہیں۔

دو علی گڑھ کی طالب علمی اس چمک دمک کے ساتھ ختم کرنے کے بعد محمد علی گڑھ سے رخصت ہوئے مگر کس طرح؟ پرپیش خوش تھے کہ ایک جگہ اور طالب علم جا رہا ہے۔ عام طلبہ کو رنج تھا کہ ایسا خوش گیلیاں کرنے والا مگر ساتھ ہی موقع پڑنے پر لڑائی بھڑائی میں ان کی سرداری کرنے والا اور ان کے لئے پرفیسروں سے بے دھرم اور بے جھجک لڑنے والا جا رہا ہے علم دوست اور لائق طالب علم جہاں تھے کہ محمد علی ان سے کیوں دور رہتا تھا بلکہ وہ کیوں ان کی مہنسی اڑاتا تھا۔ انگریز روانہ ہونے سے قبل وہ علی گڑھ آئے اور احباب نے انہیں ایک رخصتی ڈر دیا۔

خود سید سجاد حیدر نے الوداعی نظم لکھی :-

اے عازم مصر ختم کنعان	اے خلعت سروری کے شایان
ایسی کر د جلے کوئی تدریس	سی ایس کی مھر کہ لوتنخیں
یہ باب ختم نہیں مبارک	یہ عزم سفر نہیں مبارک
نہیں بعد ہر اچھپ خواہی آں کن	ایں نقد یہ کبیرہ درمیاں کن

سجاد صاحب کہتے ہیں :

”اس وقت یہ دو عادل سے علی حق مگر شکریہ یہ دعا قبول نہ ہوئی، خدا کو ان سے زیادہ شاندار، زیادہ اہم اور زیادہ نتیجہ خیز کام لینے تھے۔“

بڑے بھائی کا ایشیا

آپ کے والد ماجد کی جائیداد کا یہی تھی لیکن ان کی زندگی ہی میں مقروض ہو چکی تھی اور علی گڑھ کی تعمیر و دوران میں اور زیادہ ہو گئی۔ اب اکسفورڈ جانے کے لئے اخراجات و مصارف کی ضرورت تھی مگر شوکت علی نے، جو محکمہ انہوں میں آفیسر لگ چکے تھے، دورے کے سفر خرچ سے اپنا گذر کیا اور تنخواہ چھوٹے بھائی جہاں کا محبوب بھی کے لئے وقف کر دی اور ایسا ایشیا تاریخ میں کم ہی ملے گا۔

داخلہ

مولانا محمد علی اکسفورڈ کے کالج میں داخل ہوئے تو آئی سی ایس میں کامیاب ہونے والے مضامین کی بجائے اے پتہ علمی مضامین سے دلچسپی لیتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آئی سی ایس میں ناکام رہے۔ مولانا شوکت علی نے خبر چھٹی تو بہت پریشان ہوئے مگر بی ایم اے والدہ ماجدہ نے صبر و تحمل کا ثبوت دیا، اور چہرے پر کسی قسم کا اثر ظاہر نہ ہوا اور مولانا شوکت علی سے کہا کہ محمد علی کو بلاؤ، منجیگر بیٹھی ہوئے بے شادی کر دو، بعد میں دیکھا جائے گا، چنانچہ مولانا واپس آئے اور شادی کر دی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ انگریز گئے اور وہاں بی۔ اے کی تیاری کی اور اکڑ کر گریجویٹ کی حیثیت سے کامیاب ہو کر واپس آئے۔

عفت و پاکیزگی

مولانا جب انگلستان گئے تو خوش پوش اور خوبصورت و جمیل نوجوان تھے اور انگلستان کا معاشرہ جیسا ہے سب کو معلوم ہے لیکن وہاں کی بنگلیاں، شوخیاں اور ہر ہر قدم پر دلہریب نظارے اس نوجوان کو بیکار کے ہر کوئی اس کا اعتراف کرتا ہے خود مولانا عبدالمجید دیریا آبادی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

”کالج چھوڑا تو دلالت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شانداران اصلی کی کمی نہیں تھی مگر ذوق نظارہ جمال لاکھ سی اور گرہ میں مال بھی سی، تاہم طبیعت کا میلان علات دستور عام ذہن و قورع کی طرف تھا“

علی گڑھ کے زمانہ طالب علمی میں ”علی گڑھ فٹیل“ میں ایک مضمون لکھا جس کو پڑھ کر کالج کے پرنسپل نے کہا کہ:

انگریزی میں قابلیت

”تم ایک ذہن میں انگریزی کے بے مثل ادیب ہو گئے“

میر معنوظ علی تحریر کرتے ہیں:-

”محمد علی کی ہر گز ذہانت نے انگریزی ادب اور انشا، مصطلحات و محاورات طرز ادا و طریقہ بیان پر اس درجہ عبور و تبحر حاصل کیا کہ ان کے قلم و زبان دونوں کو جابلوں سے لے کر امیروں اور معز و دیروں سے لے کر ذیروں تک کے الفاظ و عبارات ادا کرنے پر یکساں کامل قدرت و مہارت حاصل تھی۔ ملاحوں کے سردار انہیں یاد تھے۔ اناؤں کی لوریاں انہیں یاد تھیں۔ بلمرک LAIMRIC انہیں یاد تھیں۔ لندن کے مشرقی حصے EAST END کے آوارہ گرد چھوڑ کر ان کی پھبتیاں انہیں یاد تھیں۔ بل BALL انہیں یاد تھے۔ معے اور چیتان انہیں یاد تھے اس کے علاوہ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین کے بہترین علمی و ادبی جواہر بارے ان کی زبان پر بیان کی نظر میں تھے انجیل کی کتب متیق و جدید پر ان کی نگاہ تھی۔ سیکڑوں علمی لطیفے نوک زبان تھے۔ طبیعت پر چونکہ بذلتی، نظرائست اور شوخ نگار کی رنگ غالب تھا لہذا اس صفت میں ایسا بے ساختہ اور آناہتر لکھ سکتے تھے کہ لبا اوقات ان میں اور ’لندن پنچ‘ کی طرائف میں مشکل سے انفرادہ ہو سکتا تھا۔ یہ ایک جاہل اور میچھا منہدی کا خیال نہیں ہے بلکہ برے برے انگریز ادیبوں کی غیر جانبدار رائے ہے۔“

مسٹر میکڈاؤل جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے ۱۹۱۳ء میں لاڈلسنگٹن کے پبلک سروس کمیشن میں ایک ممبر تھے، یہ کمیشن جب لاڈلوگ مولانا جوہر شہادت دینے گئے۔ دوران گفتگو میں بقول مولانا جوہر ”مسٹر میکڈاؤل نے بالالتزام اپنے کامریڈ پڑھنے کا ذکر کیا، اور میری محمد علی اشوخی، تحریر کی بہت کچھ تعریف فرمائی۔“

ٹائمز آف انڈیا کا لندن ذائقہ نگار مولانا کی وفات پر لکھتا ہے:-

”مجھے اندس ہے کہ ان کی تحریر میں جو کچھ لکھا گیا اس میں ان کی یہ خوبی نظر انداز کر دی گئی ہے کہ وہ انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے، کوئی ہندوستانی اس میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور انگریزوں میں شاید بہت ہی کم ان سے بہتر لکھ سکتے تھے۔ مرحوم نے صحافت کی زندگی شروع کرنے سے پیشتر مجھ سے بہت طویل مشورے کئے تھے۔“

یہ لندن ذائقہ نگار ٹائمز آف انڈیا کا ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا اور انگریزی زبان کے زندہ جاوید ادیب و انشا پرداز

مصنف، افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار نے مولانا تاجر کے حضور جو حراج عقیدت پیش کیا ہے وہ اسی کی طرح زندہ جاوید ہے۔
”محمد علی کا دل سپر لین کا دل تھا، اس کا قلم میکے کا قلم تھا، اس کی زبان برک کی زبان تھی۔“

انگلستان سے واپسی پر ذاب رام پور نے آپ کو اپنی ریاست میں تعینات
سب سے بڑا افسر بنا دیا اور رام پور کی سکول کا پرنسپل بھی۔ مولانا بڑی خوش اس
سے یہ کام سر انجام دے رہے تھے کہ ریاستی قاعدے کے مطابق آپ کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ مولانا جب آکسفورڈ میں تھے
تھے تو ان کے ساتھ ذاب رام پور کے چھوٹے بھائی بھی پڑھتے تھے۔ یاد لوگوں نے اسی سے فساد بنا ڈالا کہ محمد علی اپنے دوست کو گور
لانے کے لئے پوئب صاحب کو اتارنا چاہتے ہیں۔ ذاب صاحب کے کان سچر گئے۔ مولانا نے حالات کو دیکھا تو تار دے کر بڑے بھائی
شوکت علی کو بلایا۔ ان سے ذاب صاحب کے اچھے تعلقات تھے۔ ان کے آنے سے ذاب صاحب تقریباً مطمئن ہو گئے، لیکن صاحب
اڑے آئے۔ مولانا شوکت علی کے مشورہ سے مولانا محمد علی مستعفی ہو گئے اور بڑے بھائی کے پاس رہ کر وکالت کی تیاری کی لیکن ایک
مضمون میں نیل ہو گئے۔

ریاست بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ کے تعلقات بھی مولانا سے دوران انگلستان
بہت گہرے ہو گئے تھے۔ کنور صاحب حوصوف کی تماشائی تھے کہ وہ مولانا کو اپنی ریاست میں بل
اور بالآخر انہوں نے اپنے والد کو مجبور کیا کہ وہ مولانا کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ مہاراجہ نے مولانا کو نہایت شفقت سے
محکمہ ایفون میں اعلیٰ منصب پر مقرر کر دیا۔ آپ نے تقریباً سات سال ملازمت کی۔ ساڑھے چار سال میں سترہ لاکھ روپے کا منافع ہوا
جو گذشتہ سالوں کے مقابلہ میں دوہرا پندرہ فیصد زیادہ تھا۔ یہ حسن تدبیر و انتظام دیکھ کر مہاراجہ نے آپ کو ضلع نزاری کا کمشنر بنا
دیا۔ آپ نے اپنے اس نئے منصب پر اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں اور ہر کہہ دہم کی نظروں میں مقبول و محبوب بنا دیا۔ ایک
کے مسئلے میں آپ کو ایک بہت بڑا ہدیہ یہ کہہ کر دیا جا رہا تھا کہ یہ ریاست کا قدیم دستور ہے۔ آپ نے نہ صرف بہت سختی سے اس
کو رد کیا بلکہ دوسرے افسروں کو بھی اس تقریر کے لگنے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد آپ کو ولی عہد کا پرنسپل اسسٹنٹ مقرر کر دیا گیا اور یہ تقرری اس لئے ہوئی تھی کہ
کنور فتح سنگھ بہت زیادہ شراب کا عادی تھا۔ آپ کو سیکرٹری مقرر کیا گیا کہ شاید اپنے دوشاد
تعلقات کی بنا پر اس کی عادت ترک کر دیں مگر یہ بری عادت کب چھوٹی ہے۔ بالآخر کنور کثرت شراب نوشی کی وجہ سے مر گیا۔
اپنی ملازمت کے دوران میں مولانا ”دقا“ تو قفا مختلف اخبارات کے لئے مضامین لکھتے رہتے تھے۔
ملازمت سے پیشتر ایک تقریبی انگریزی رسالہ ”گپ“ کے نام سے الہ آباد سے جاری کیا مگر اس کے صرف دو
پرچے نکل سکے۔

مولانا تاجر کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑے کام یعنی رہنمائی ملک و ملت کے لئے پیدا کیا تھا
اس لئے نہیں تھے کہ کسی ریاست میں کثیر یا سیکرٹری بن کر رہ جائیں۔ خود بخود کہیے
حالات پیدا ہو گئے جن کی بنا پر ان کا دل ملازمت سے بیزاد ہو گیا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۱۰ء کو میرٹھ محلہ علی کو خط لکھتے ہیں جہاں ملت
سے بیزاری کا اظہار کرتا۔

LOU PIDOU
SAINT MATHIEU
GRASSE A.-M.

17. 4. 32

My dear Sir

I met Mohammed Ali on several occasions I liked him very much personally. But I don't think I could produce anything very illuminating to tell about him. We differed & argued about all sorts of things but we sympathized mutually about the British "governing class".

بیج جی ویلار کے
خط کا عکس پر علی
کے متعلق۔

چارچ برنارڈ شا کے خط
کا عکس محمد علی کے
بارے میں۔



Yours sincerely,

B. P. Wells

یہ دونوں خط
مولانا عبد الماجد ریاری
کے نام ہیں!

TELEGRAMS, SOCIALIST, PARL.-LONDON.
TELEPHONE, WHITEHALL 3180.

4, WHITEHALL COURT, LONDON, S.W.1

6th May 1932.

Dear Sir,

My acquaintance with Mohammed Ali was limited to a conversation at my house at which we discussed the possibility of a Reformation in Islam somewhat like the Christian reformation led by Martin Luther. We agreed, I think, that a Back to Mahomet movement was needed to rescue Islam from the ruts which it has been digging for itself for some centuries past. I found M.A.'s company very congenial; and as your letter encourages me to believe that mine was not altogether disagreeable to him, I flatter myself we parted friends.

His personality left such an impression on me that when the news of his death came I felt that Islam had lost a very valuable living force.

That is all I can say about him from personal knowledge.

Mr Abdul Majid.
P.O. Daryabad
Bara Banki, India.

Faithfully

B. P. Wells

اجرا کامریڈ کا خیال

سن ۱۹۱۷ء کے اختتام تک یہ طے کر لیا کہ اب ملازمت نہیں کریں گے، بلکہ اخبار نکالیں گے، چنانچہ لکھنؤ میں فیصلہ ہوا کہ کلکتہ سے اخبار نکالا جائے۔ مولانا ایڈیٹر، میر محفوظ علی میجر ہوں۔ اس اثنا میں سر ایسکے ایڈوائزر کے توسط سے نواب صاحب جاوہر نے وزارت کی پیشکش کی۔

بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی ریاست میں چیف سیکرٹری کا منصب پیش کیا، لیکن آپ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہر دو جگہ انکار کر دیا، اور کامریڈ کے اجرا کا انتظام کرنے لگے۔ چنانچہ آپ نے بڑے دودھ سے دو سال کی رخصت لی اور اس کے بعد وہ مستعفی ہو گئے۔ ہمارا اصرار استعفیٰ منظور نہ کرتے تھے۔ آپ جب علیحدہ ہوئے تو افسر بالائے حسن خدمات کے صلیب میں سات ہزار روپے بطور انعام دینے کی تجویز کی، لیکن مولانا نے یہ رقم نہیں منگوائی۔ (بقیہ عبدالماجد دربار آبادی)۔

”کامریڈ کے ایڈیٹر کے لئے دیوبند ترقی کے بہتر سے بہتر مواقع تھے۔ ہندوستان کا ذکر نہیں۔ انگلستانی صحافت میں بلند سے بلند کرسی ادارت اس کے لئے خالی تھی۔ مناصب سرکاری میں بڑی سے بڑی رفعت اس کے لئے جہت براہ حق، عزت، ثروت، اقتدار، وجاہت کے اصرام کبیرہ نے قدم قدم پر اسے بھایا لیکن اس کشتہ عشق نے مساوی جانب نظر اٹھانا بھی گناہ سمجھا۔ اور سارے رشتے چھوڑ کر صرف ایک کامیور با“

کامریڈ سہتہ دار پر چڑھا۔ اس کی انگریزی ایسی عمدہ ہوتی تھی کہ انگریز تک خرید کر اسے پڑھتے یہاں تک کہ دائرہ رائے لاڈو بارڈنگ کی بیگم نے اپنے نام پر پرچہ علیحدہ جاری کر لیا۔ دائرہ رائے کے نام جو احرار اسی پرچہ جاتا تھا وہ جلدی فارغ نہ ہوتا تھا۔ ان دنوں جرمن کے ولی وعدہ انٹر رائے کے زمانہ تھے۔ انہوں نے اپنا پرچہ علیحدہ جاری کر لیا۔ اسی طرح دوسرے تمام قابل ذکر مناصب پر تمکن انگریز کامریڈ کو پڑھتے تھے۔

پرچہ خاصی کامیابی کے ساتھ چل رہا تھا کہ برس ایک کے ذریعہ بند ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں بیجا پور جیل سے رہائی کے بعد دوبارہ نکالا، مگر اب مولانا کی مصروفیات اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ پرچہ کو کسی معیار پر نہ لاسکے اور نہ ہی ہمیشہ وقت پر نکال سکے جس کی ایک وجہ قابل اور منتظم سب ایڈیٹر کی کمی تھی۔ بہت تلاش کی مگر کوئی قابل سب ایڈیٹر نہ مل سکا۔ اس کے باوجود مولانا نے سمیت نہاری اور اکیلے اس کام کو سر انجام دیتے رہے۔ لیکن جس آدمی نے دنیا جہان کے کام اپنے سر لے لئے ہوں وہ اسے کیسے پہلے معیار اور وقت پر نکالنا لیکن ان کی سمیت قابل وادھتی۔ بلگام کانگریس ۱۹۲۴ء کے موقع پر پورا مضمون بذریعہ تار بھجوا لیا لیکن تار بالہ کی انگریزیت اور دفتر کے آدمیوں کی تراسیم نے مضمون کی ایسی درگت بنائی کہ جب چھپا تو مولانا محمل نے جو کچھ لکھا اس کے سوا سب کچھ ختم۔

بی اماں کی وفات اور کامریڈ

بی اماں کو اپنے بیٹے سے اور بیٹے کو اپنی والدہ ماجدہ سے جتنا پیار تھا وہ ضرب الشمل بن چکا ہے۔ بی اماں کی وفات ہوئی تو کامریڈ کو وقت پر نکالنے کے لئے ایک کوسر میں بیٹھے رونے کے ساتھ ساتھ کامریڈ کے پردے کی تفصیل بھی کر رہے ہیں۔ بالآخر کوئی قابل ساتھی نہ ملنے کی بنا پر ۱۹۲۶ء کو اس امید پر بند کر دیا کہ جب کبھی ساتھی مل گیا سہارا نہ نکالیں گے لیکن نہ ساتھی ملانے کامریڈ نکلا۔

اسلم یونیورسٹی

سر سید نے جب علی گڑھ سکول قائم کیا ہے تو اس کے متعلق ان کے کیا عقائد تھے؟ ان کا اندازہ ان کے اس فقرے سے کیا جاسکتا ہے۔

”فلسفہ ہمارے دلائل ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر۔“

لیکن علماء دہاں ہوا کیا اس کے متعلق ہمارے دور کے مشہور مصنف ذوقا شیخ محمد اکرام ایم اے تحریر فرماتے ہیں:

”اگر علی گڑھ یونیورسٹی کی موجودہ صورت کو دیکھا جائے اور سر سید کے ان ارادوں اور منصوبوں سے اس کا مقابلہ کیا جائے جو ابتداء میں علی گڑھ کے متعلق ان کے دل میں تھے تو خیال ہوتا ہے کہ علی گڑھ علی حیثیت سے سر سید کے زیریں خواب کی ایک نہایت معمولی سی تعبیر ہے اور کئی ایسی ضروری باتیں تھیں جن کے سر سید دل سے خواہاں تھے، لیکن وہ علی گڑھ کو نصیب نہ ہوئیں۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں:

لیکن علی گڑھ میں ان صاحب کاموں کا سر نہ چلا۔ دہاں مادیت اور ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ انہوں نے یہ تو نہ کیا کہ دولت دنیا میں سے مختصر سے مختصر پر کفایت کریں اور اپنے علمی شوق کی تکمیل، تصنیف و تالیف اور نام نیک کو حاصل زندگی سمجھیں۔ ان کے نزدیک علم و فن کھانے کمانے کا ذریعہ تھا اس لئے بالعموم یہی خواہش ہوتی ہے کہ علمی زندگی پر مردنی چھا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن مادی زندگی کی بہار ضرور لوٹی جائے۔ جو لوگ اس قابل تھے کہ اگر وہ بلند فطری کو کام میں لاتے تو نہ صرف دوام اور قومی خدمات میں حائل اور آزاد۔ شبلی اور ندیر احمد کو کہیں پیچھے چھوڑ جاتے۔ ان کا مہلتائے زندگی یہ ہو گیا کہ کسی طرح ظاہری مٹھاٹھ اور خوش معاشی میں وہ ایک سیکڑ ڈگری ڈیڑی کلکڑ کا مقابلہ کر سکیں۔

علی گڑھ کے پروفیسروں میں علمی قابلیت و مذاق کی شستگی اور نیک ارادوں کی کمی نہیں لیکن جب خیالات کا رخ پھر گیا اور ہمیں لپٹ ہو گئیں تو یہ خوبیاں بیکار ثابت ہوئیں اور اساتذہ کا وقت مزید ڈرائنگ روم کی تزیین خوش معاشی، مصیافت بازی، کلب بازی، گپ بازی اور ہاں پارٹی بازی، کی نذر ہونے لگا۔ اس فضائیں علمی زندگی کا فروغ پانا محال تھا چنانچہ ان پروفیسروں کی ساری صلاحیتوں کے باوجود ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو ہمارے علمی محسوس کی صفت میں شبیل اور سر سید نہیں۔ سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحی کے قریب ہو جانے کا مستحق ہو۔

مادی نقطہ نظر کے فروغ سے نہ صرف یہ ہوا کہ اساتذہ اور طلبہ ایسے علمی کاموں کی تکمیل سے معذور ہو گئے جنہیں پورا نے خاطر اتار دے تو قربانی اور مستعدی کی ضرورت تھی بلکہ خیالات میں ایک عجیب طرح کی دھل پھیلی یعنی روحانی کمزوری اور ذہنی لاگت۔ سر سید کا خیال تھا کہ علی گڑھ دسے ان کے کام کو جاری رکھیں گے۔ وہ اسلامی ہندوستان کی شاندار روایت کے وارث

ہوں گے اور اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراض ہوتے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے لیکن یہاں یہ عالم تھا۔ ج
دریقل تیر و کمان کشتہ نچنچید شہدیم
کسی طرف سے اسلام یا مسلمانوں یا علی گڑھ کے خلاف کوئی آواز اٹھے اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڑھ
نہیں گئے ع

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

جہاں تک مسلمانوں، مسلمان بادشاہوں یا اسلام کے خلاف اعتراضات کا تعلق ہے ان کے جواب میں کوئی قابل ذکر کتاب
کا لچ کے باپوں کی نسل ختم ہو جانے کے بعد علی گڑھ سے آج تک شائع نہیں ہوئی بلکہ حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان بادشاہ
سلطان محمود غزنوی یا اورنگ زیب کے خلاف کچھ لکھے تو علی گڑھ کے خوش خود اور خوش اخلاقوں کا یہی جواب ہوتا ہے۔ ج
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو، عجب کہیے ا

بلکہ وہ تو کہیں گے کہ صرف محمود اور عالمگیر نقشب کے پتیلے تھے بلکہ اسلامی حکومت کا موسس علی سلطان محمد غوری
انٹری جرنیل اور بھونڈا سپاہی تھا اور یہ شہنشاہ ننگی قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ ایک سلطنت کی بنیاد ڈال گیا۔
مندرجہ بالا اقتباسات سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے خود ہی معلوم کیا
کہ اس ادارے پر انگریز ملازموں کی تہذیب و تمدن اور ان کے خیالات کا کس قدر اثر ہو گا اور یہی وہ چیز تھی جس نے مولانا محمد
احوال پر اکاڑ دیا۔ ان کی مادر علمی کی خستہ حالت ہر اور وہ دیکھا کریں۔ یہ محمد علی کی سرشت کے خلاف تھا۔ سیرت محمد علی کے
رہنمائی احمد جعفری لکھتے ہیں :

” سب سے زیادہ جس جماعت نے علی گڑھ کو محمد علی کے معیار سے نقصان پہنچانے میں حصہ لیا وہ انگریزوں کا انجمن
شافت تھا۔ انگلش شافت تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اس نسبت آفریں نام کی جمعیت خود اس کے ٹرسٹی صاحبان پر مشتمل
ہوئی تھی اور اس کے وجہ بھی تھے۔ اس جماعت کو نظم و انتظام کا دعویٰ تھا۔ یہ غرہ تھا کہ علی گڑھ کی سادی شہرستان
کے دم سے وابستہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ گھنٹہ تھا کہ اس کا تعلق حکمران قوم سے ہے اور حکمران قوم نے بھی اپنی زبان
سے ثابت کر دیا تھا کہ علی گڑھ کی سیاسیات میں اگر وہ دخل دے سکتی ہے تو اس معاملہ میں جب انگریز شافت کے ارادوں
شاکی ہوں ” ہر ایک کی لٹی پٹن “ کی توجہ اس وقت پورے ادا سے حکمرانی سے منقطع ہوتی تھی۔ جب ٹرسٹیوں اور انجمن
شافت کے درمیان کش مکش ہو رہی ہوئی۔ لے
آگے چل کر جعفری لکھتے ہیں :-

دوسری طرف اندرونی حالات نہایت نازک ہو رہے تھے۔ فرقہ بندیاں تھیں۔ فرقہ
پرچیتے تھے، تفرقے تھے، ہنگامے تھے۔ ایک جماعت چاہتی تھی کہ علی گڑھ میں اسلام

اندرونی حالات

ہے۔ دوسری جماعت کی خواہش یہ تھی کہ پہلی جماعت کو زک دے کہ خود برسر اقتدار ہو جائے۔ غرض مقصد حقیقی خدمت کسی کا بھی نہیں تھا۔ سب اپنا اقتدار اور اپنا تسلط چاہتے تھے لے

ان سب حالات کا مولانا محمد علی نے مقابلہ کیا۔ انہوں نے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن میں وہ کرکام کیا۔ پھر کورٹ کے ممبر بنے۔ ٹرسٹی قرار ہوئے اگرچہ دوسرے ٹرسٹیوں کی طرح وادعی نہیں بلکہ ان کی رائیہ دروایتوں سے صرف پانچ سال کے لئے تاہم اس عرصہ میں انہوں نے جو کام کیا وہ لائق صد تحسین و تبریک ہے۔ علی گڑھ کو کالج سے یونیورسٹی بنانے کے لئے انتخاب کام کیا۔ ان کاموں اور خدمات کی تفصیل جو مولانا نے اپنی مادر علمی کی خاطر انجام دیں۔ سیرت محمد علی وغیرہ میں مکمل موجود ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اگر قریب اور غرضات کے معیار پر نہیں آسکتی تو کم از کم آکسفورڈ اور کیمبرج کا معیار تو اسے حاصل ہو جائے اور اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

جامعہ ملیہ کا قیام
ترک موالات اور عدم تعاون کی تحریک میں مولانا جوہر کی نیک خواہش تھی کہ ملک گیر تحریک میں میرا کالج علی گڑھ بھی حصہ لے۔ جس کے متعلق مسلمان بڑے خوش کن تصورات لئے ہوئے ہیں کہ وہ وقت پرنے پر ملک کی خدمت سر انجام دے گا۔ علی گڑھ کالج کے طلبہ تو اس تحریک سے کچھ متاثر ہوئے لیکن حکام اور خداندان علی گڑھ ٹرسٹ سے مس لیا ہونے اٹھان کا قہر نازل ہوا کہ انگریزوں کی مخالفت کیوں؟ وہ عدم تعاون تو کیا کرتے ان کا دست تعاون گرفت کی جانب اور ہزار ہرگز۔ مولانا جوہر نے حکیم اہل خانہ ڈاکٹر انصاری کے ساتھ کورٹ میں تقریر کی لیکن چانسلر اور وائس چانسلر نے یہ دعوت رد کر دی، بلکہ کورٹ میں ان عظیم رہنماؤں کے خلاف قرار داد طاعت پاس کی کہ گویا یہ خداندان اسلام ہیں۔ اس کے بعد ان حضرات نے براہ راست طلبہ کو دعوت دی کہ وہ تحریک ترک موالات اور عدم تعاون میں حصہ لیں۔ اور یونین میں تقریر کی۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین (دائیں بریڈیٹ یونین) مخالفت کے لئے یونین میں آئے تھے مگر پورے طور پر ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب اور چند مخلصوں کو ساتھ لے کر یہ حضرات اولڈ بوائز لاج میں مقیم ہو گئے جو کالج کے قصبہ میں نہ تھا۔ اگرچہ اس کی زمین میں تھا اور شوکت علی محمد علی کی کوششوں نے۔ لیکن حکام کالج کی طرف سے ان کا مکمل مقاطعہ کیا گیا۔ پانی بند کر دیا۔ بھینگی جانے بند ہو گئے۔ روشنی کا رابطہ توڑ دیا۔ جب اس پر بھی یہ سخت جان ثابت ہوئے تو پولیس کی امداد سے ان لوگوں کو اولڈ بوائز لاج سے زبردستی لگا لایا۔

یہاں سے نکل کر خٹوڑی د در جا کر ان حضرات نے خیمے لگائے اور درخت کے نیچے تعلیم و تعلم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ علی گڑھ کالج سے طلبہ نکل نکل کر ادھر آئے لگے۔ خیمے کا کافی ثابت ہوئے تو پاس ہی چند کوٹیاں کرایہ پر لے لی گئیں۔ اس نئے کالج کے پرنسپل مولانا محمد علی تھے۔ خوش قسمت ہیں وہ افراد جوان دنوں ملت کے عظیم سلطنت سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد اس نئے کالج کا نام جامعہ ملیہ رکھ دیا گیا۔ شیخ الہند مولانا محمد حسن باجوہ اپنے صفت و لقاہت کے اس کے افتتاح کے لئے علی گڑھ تشریف لائے علامہ فاضل رحمہ نے ان کی جانب سے خط لکھا۔ غامدی دیر علی گڑھ میں جامعہ چلا دیا۔ مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیات بے پناہ تھیں۔ حکیم محمد اہل خانہ ہی اس کے سب کچھ تھے لیکن وہ دہلی میں تھے اور جامعہ علی گڑھ میں۔ آخر کار جامعہ ملیہ کو حکیم صاحب دہلی میں لے آئے۔ ڈاکٹر

ذاکر حسین تقسیم ملک کے بعد نیک اس کے شیخ الجامعہ رہے اور اس جامعہ نے ملک و ملت کی محبت خدمات سر انجام دیں۔ مولانا جوہر تاحیات اس سے متعلق رہے۔ سینئر جامعہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتے رہے۔ تا آنکہ آپ کی وفات ہو گئی۔

۱۹۱۳ء میں بلقان کی جنگ ہوئی تو ڈاکٹر انصاری کا خیال ہوا کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد وہاں

مقتولوں، مجروحوں وغیرہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی مدد کرے۔ مولانا محمد علی نے اس کے لئے بہت کام

کامریڈ میں اس کے لئے ایک زبردست مصنون لکھا جس کی وجہ سے نہراہار و پیرا اکٹھا ہوا اور اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے

نے کام کیا۔ غرضیکہ غلام ہندوستان کے بیدار مسلمانوں نے اپنی بجائیوں کی اس طرح مدد کی جو ہمیشہ کے لئے تاریخ کا ایک جڑ بن گئے

کامریڈ مولانا نے کلکتہ سے نکالا تھا کیونکہ ان دنوں دارالحکومت کلکتہ تھا لیکن جب دارالحکومت

دہلی قرار پایا اور حکومت کلکتہ سے دہلی آگئی تو مولانا نے بھی تعاقب کرتے ہوئے یہاں دہلی سے

اجراء کے انتظامات شروع کر دیئے۔ بیروت سے ٹاپ منگوا یا مگر وہ پورا نہ تھا۔ اس لئے ہمدرد نہ نکل سکا حکیم اعلیٰ خاں کے

وتوجہ دلانے پر خبروں کی ہم رسائی کی اشد ضرورت ہے۔ مولانا نے نقیب ہمدرد ایک ورق پر ۲۳ فروری ۱۹۱۵ء سے چھاپا شروع

ہمدرد کے شاف میں قابل تیری لوگوں کو شامل کیا گیا۔ میرٹھنوی علی۔ سید ماسخی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار، سید جالب، مولانا

شرر وغیرہ اس کے علم ادارت میں شریک تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب اس زمانے کے متعلق لکھتے ہیں :-

"میری زندگی میں وہ یادگار صبح تھی یعنی وہ پہلا دن جب بحیثیت استاد دشاگرد میرے اور محمد علی کے مستقل

تعلقات شروع ہوئے ہیں۔ اس زمانہ کو بھول نہیں سکتا کیا زمانہ تھا جب ہمدرد و کامریڈ کے دفتر میں صبح اور شام

تمام میران اسٹاف اخبار کے متعلق مشورے میں شریک ہوتے تھے۔ شوکت علی، محمد علی، سید مھنوی علی، راجہ غلام حسین

میں اور دوچار، ہم سب زیر بحث مسائل پر بحث کرتے تھے اور محمد علی صاحب ایک ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایت

دیتے تھے۔ ان کے دماغ کی ہم گیری کا یہ عالم تھا کہ جب چھوٹا سا نوٹ لکھنے کے لئے بحث کے خاص خاص پہلو بتانا شروع

کرتے تھے جو سب اگر حیطہ تحریر میں لانی جاتیں تو ہمدرد کے آٹھ دس کالم پُر ہو جاتے۔

مولانا جوہر نے اس اخبار کو اس سچ دھج کے ساتھ چلایا کہ اس کی نظیر بلا مشکل ہے۔ ہندوستان کا یہ پہلا روزنامہ تھا۔

براہ راست ایسوسی ایٹڈ پریس اور رائٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

اپنی گونا گوں صفات و افتادات کی وجہ سے ہمدرد بہت مقبول ہوا اور ان دنوں اس کی اشاعت اتنی ہوئی کہ آج بھی

تین اخبارات ہی اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

مولانا کی نظر بندی کے بعد صوبہ کے چیف کسٹرنے اردو پریس اور صحافت پر سب سے

کی لیکن ہمدرد کو نہ صرف اس سے مستثنیٰ قرار دیا بلکہ ہمدرد کے مقالات کی سبب

توصیف کی الفضل ما شہد بہ الامداد، فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں کی یہ کیسی اعلیٰ مثال ہے۔

طیف

جنگ کے بعد سہرورد پر ستر بٹھا دیا گیا۔ ایک دفعہ انہی دنوں چڑیا چڑے کی کمانی لکھی گئی تو سفر نے اسے کاٹ دیا۔ دریافت کیا گیا تو جواب ملا کہ سہرورد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ معلوم اس چڑیا چڑے کی کمانی میں کیا سہرورد یا گیا ہو، جواب دہی ہمارے سر پر آ پڑے۔

مولانا کی نظر بندی پر سہرورد کی اشاعت بھی ملتوی ہو گئی؛ اگرچہ اس کے علماء اور اہل تشیع نے بہت کوشش کی کہ شائع ہوتا رہے لیکن البتہ نہ ہو سکا۔

دوبارہ اجلاس

بیجا پور سے واپسی کے بعد دوبارہ سہرورد جاری کیا گیا۔ اگرچہ نقش نشان نقش اول سے بہتر ہونا چاہیے تھا لیکن وہی مولانا کی بے پناہ مہر و نیتیں کامیاب کی طرح یہاں بھی اڑے آئیں۔ پھر پہلے جیسا اخبار نہ نکلی سکا خود واری، اصول کی پابندی دہی۔ نہ غلط اشتادات لئے نہ دوسرے اخبارات کی طرح راجوں ہمارا جوں سے دھماکے یا ناکہ کے بھاری رقیب وصول کیے بلکہ اپنے پاؤں پر جو کچھ ہونے لگا، حالانکہ ان دنوں دلی کے دوسرے اخبارات راجوں، ہمارا جوں مختلف جیلوں ہماؤں سے پیش ہمارا قدم وصول کرتے تھے خصوصاً دہلی کے دو اخبار تو اس بار سے یہیں بیٹھ کر رکھتے تھے۔ ایک دو تو بعض اجاب نے اس بار سے یہیں سلسلہ جنابانی یا تحریک شروع کی تو ان کو ڈھونڈ کر ان سے حلفت اٹھوائے کہ وہ اس طرح کی کوئی بات یا حرکت نہیں کریں گے۔ مولانا کی صحت زیادہ خراب ہو گئی تو ہمارا راجہ الورد نے اپنے خزانے پر انہیں انگلستان برائے علاج بھیجا تاکہ کچھ عرصے سے اور کچھ آرام و سکون سے صحت بحال ہو۔

ان دنوں عبدالعزیز دیرا بادی نے اور نصر الملک صاحب نے سہرورد کو منبیا لادیا۔ مولانا واپس آئے تو رنجش چلے گئے رنگوں نظام کے دوران میں ہمارا راجہ الورد کی جہلی پر سہرورد، کاسپیشل ممبر لگانے کی تجویز بعض مخلصین کی طرف سے ہوئی کہ اس طرح سہرورد کی لاد ہو جائے گی۔ عبدالعزیز دیرا بادی نے بذریعہ نارا مولانا سے استعصاف کیا تو مولانا نے ہمارا راجہ الورد کی تمام کڑھ بایوں اور رعایا سے لاد جو وصات انکار کر دیا۔ اور لکھا کہ سہرورد کاسپیشل ممبر کج تک نہیں نکلا اس سے مزہ دہی ہے۔

انگلتھ کا پتہ

۱۹۱۳ء میں کابینہ میں مسجد کی جزوی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ قصہ یہ تھا کہ کابینہ کی میونسپلٹی ایک شرک تعمیر کر رہی تھی۔ ایک مسجد تک راہ بنی ہوئی تھی۔ متولیان نے رواداری سے کام لے کر غسل خانہ اور بیت الخلاء وغیرہ کے گرانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میونسپلٹی نے گرانے کا انتظام شروع کر دیا۔ ہندوستان کے تمام علماء و مفتوا، جمہور مسلمانوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی کہ متولی اس قسم کی اجازت نہیں دے سکتے مگر کیوں نے وہ بیکر گرا دی۔ مسلمانوں کے غلبہ زخمی ہوئے۔ پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ چنانچہ کابینہ کے مسلمان دوبارہ تعمیر کے لئے آئے۔ پولیس آئی نہ رکے، بالآخر فوج آئی۔ ہوائی فائر ہوئے۔ مسلمان ڈٹے رہے۔ بالآخر منصف اور عادل حکومت نے گولی چلائی اور مسلمان سینوں پر گولیاں کھا کھا کر شہید ہوئے رہے۔ بیسیوں شہید ہوئے۔ سینکڑوں زخمی ہوئے۔ پورے ملک میں آگ لگ گئی۔ اس پر مسلمانوں کے غم و غصہ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مولانا آداد کے اللہ میں ان دنوں ایسے انگلیں مقالات شائع ہوئے کہ آج بھی ان کو پڑھ کر خون کھول جاتا ہے۔ ایسی پیش ہوئے مگر بولی کی حکومت لٹ سے مس نہ ہوئی۔

۱ مولانا محمد علی نے گورنر صاحب سرحدیں ملٹی سے بھی طور پر خط و کتابت کی کہ شاید ذال تعلقات کی بنا پر وہ نرم ہوں مگر ان کا نشانہ نامتا

ستمبر ۱۹۱۳ء کو بمبئی جا کر میکڈونلڈ کو ایک تار دیا کہ وہ اس مسئلہ کو پارلیمنٹ میں پیش کریں۔ مگر انہوں نے بھی تار کا کوئی جواب نہ دیا۔ بالآخر مولانا نے مسٹر وزیر جس سیکرٹری کل انڈیا مسلم لیگ کو ساتھ لیا اور اکتوبر ۱۹۱۳ء کو نہایت خفیہ طریقہ سے انگلستان پہنچ گئے۔ اپنے جانے کے خفیہ اس لئے رکھا کہ کہیں گورنر صاحب کوئی رکاوٹ نہ ڈال دیں۔ پتہ اس وقت چلا جب آپ جہاز پر سوار ہو گئے۔ انگلستان جا کر تقریباً کیس۔ مضامین لکھے، میران پارلیمنٹ سے ملے، وزرا سے ملاقاتیں کیں۔ ہندوستان میں بھی کافی زور شور سے تحریک چل رہی تھی۔ مولانا نے وہاں کام کیا۔ سر جیمز لاٹھن، سابق گورنر یوپی، ارکن مجلس وزیر ہند مولانا کے دلائل سے کافی متاثر ہوئے اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کو ہدایت بھیجی اور انہوں نے پریسک اپنے ہاتھ میں لیا اور کانپور پہنچے۔ ہسپتال میں زخمیوں کا معائنہ کیا۔ قیدیوں سے ملنے جیل گئے انہیں کہا۔ سب کو رہا کیا اور مسیحی کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ اس نایاب کامیابی کے بعد مولانا دسمبر ۱۹۱۳ء میں واپس آئے۔ ان کا پرخلو شاندار استقبال کیا گیا۔

تظہر بندی

۱۹۱۳ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو لندن ٹائمز نے ایک اشتغال ایجنٹ مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ جنگ سے علیحدہ رہ کر دور سے تاشقند دیکھیں یہاں تک کہ یونان پر بھی ان کی پیش قدمی نہ ہو۔ ان دنوں بیگم محمد علی سخت بیمار تھیں۔ مولانا دن رات جاگتے گزارتے تھے لیکن یہ مضمون پڑھ کر جوش کو قابو میں نہ رکھ سکے، مسلسل چالیس گھنٹوں کی لگاتار محنت و جدوجہد سے ایک مضمون لکھا۔ اس دوران نہ کچھ کھانا نہ سوتے، نہ آرام کیا۔ خرد بکھتے بکھتے جاتے تو سیکرٹری کو کھکھراتے، پھر آپ بکھتے۔ اس دوران میں چند پالیسیاں قویہ پیا اور پس۔ اس مضمون پر کامریڈ اور سپرد کی صلیب ضبط کر لی گئی۔ آپ نے اپیل کی خود ہی پیریڈی کی اور جرح کر کے حکومت کے آرڈر کی دھجیاں اڑائیں۔ عدالت میں اور عدالت کے وکیلوں اور بیرسٹروں کا ہجوم تھا۔ ہر آدمی دم بخود تھا۔ جب آپ باہر نکلے تو بے ساختہ ہر ایک کی زبان سے نکلا۔ "کاش آپ بیرسٹر نہ ہوتے مولانا نے فوراً جواب دیا۔"

”اب بھی جو کچھ ہوں اس کی کونسی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی۔“

بالآخر ضمانت ضبط ہو گئی اور کامریڈ ایسا موت کی آغوش میں گھس گیا کہ پھر نہ ابھرا۔

مولانا نے دوبارہ دیا بیس کی شکایت محسب کی حکیم محمد اہل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے مشورہ دیا کہ ہر طرح کی مصروفیت ختم کر دو، چنانچہ آپ رام پور چلے گئے مگر وہاں پہنچتے ہی ڈاکٹر بیکر جنرل پولیس یوپی رامپور آئے اور نواب صاحب کی معرفت آپ کو کر کے قضیہ کانپور کے متعلق سوالات کئے اور اس دوران میں سخت تلخ کلامی ہوئی۔ ڈاکٹر بیکر کے جانے کے بعد آپ کو بتایا کہ نواب صاحب کی اجازت کے بغیر آپ کہیں نہیں جاسکتے۔ ڈاکٹر آپ اس طرح نظر بند رہے۔ اس کے بعد بمبئی تال شکار کھیلنے گئے۔ وہاں بہت مسرت ہمار ہو گیا۔ ڈاکٹر انصاری نے بمبئی تال میں آپ کے لئے موسم گرما گزارنے کے لئے مکان کا بندوبست کیا۔ مولانا شوکت علی دہلی سے رامپور گئے اور دونوں بھائیوں کا ارادہ خارج معین الدین الجبر کی عرس میں شرکت کے بعد بمبئی تال موسم گزارنے آئے۔ اجیر شریف گئے ہوئے آپ کو دو دن ہوتے تھے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے آپ کو اور مولانا شوکت علی کو پابند کر کے اپنے آپ کو نظر بند نہیں۔ اس حکم کی رو سے آپ پر وہ تمام پابندیاں عائد کر دی گئیں جو کسی جرائم پیشہ پر عائد کی جاتی ہیں۔ پھر دہلی میں نظر بند کر دیا گیا۔ مہرولی سے آپ باہر نہ جاسکتے تھے مگر لوگ مل سکتے تھے لیکن چند دن بعد لینڈ

ایک اور آزادی سلب کر لی گئی۔ قلم پر سنسکر لگا دیا گیا اور سپرد اخبار پر بھی سنسکر لگا دیا گیا۔ لیٹڈوں سے آپ کو دور دراز مقام 'چھنڈ وارہ' بھیج دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۱۷ء میں، نظر بندی کے ڈھائی سال بعد، آپ کو ال انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس پر آپ نے کہا:-

یہ صدر نشینی ہومبارک نہیں جو بہتر لیکن صلا در جزا اور ہر کچھ ہے

جب حکومت کی جانب سے جلسہ میں شرکت کی اجازت نہ ملی۔ تو لی امان مرحومہ اجلاس میں شریک ہوئیں اور کر سنی صدارت پر مولانا اب تک کی تصویر رکھ دی گئی۔ لی امان نے لیگ کے اجلاس میں اپنا پیغام علی پڑھا۔ جس کا ایک ایک لفظ تیز و نشتر کا کام دے رہا تھا اور جس نے اجلاس لیگ کو جیسے ناقص بنا دیا۔ اس سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور لیڈر مسٹر تلک نے قرارداد پیش کی، جس میں حکومت کی کو جو علی برادران کی فوری رہائی پر مبذول کر لی گئی۔

اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی کوششیں کی گئیں کہ علی برادران کو رہا کر دیا جائے مگر کامیاب نہ ہوئیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے رہائی کی یہ شرط تھی کہ وہ باہر آکر کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس سے جنگ اور جنگ کے تعلقات پر کوئی اثر پڑے۔ مولانا محمد علی نے جواب دیا کہ حکومت مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرے گی تو ہم سے بڑھ کر اس کا کوئی دشمن نہ ہو گا۔ یہ بات نیپے بھی کہی گئی جب ایک سرکاری ٹریبونل قرار کیا گیا اور وہ چھنڈ وارہ پہنچا۔ مولانا نے مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ یہ بھی کہا کہ حکومت اس نقصان کی نگرانی کرے جو اس جبری نظر بندی کے عرصہ میں ان کی تجارت اور اخبار کو ہوا ہے۔ کمیشن نے نظر بندی کو جائز قرار دیا۔ نقصانات کے معاوضہ کو غلط ٹھہرایا اور پھر سفارش کی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ بجلا ایسی سفارش کس کام کی!

چھنڈ وارہ میں علی برادران کی کوشش سے ایک جامع مسجد تعمیر ہوئی۔ ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد مولانا محمد علی نے ذہر دست تقریر کی۔ حاضرین پر اس کا خاص اثر ہوا۔ حکومت اس کو کیسے برداشت کرتی لہذا اس نے چھنڈ وارہ سے منتقل کر کے سیٹول جیل پہنچا دیا اور وہ خود ہی بہت آزادی تھی سلب کر لی گئی۔

لی امان اور مولانا محمد علی کے بچے و بیٹے چھنڈ وارہ میں تھے کہ ایک رات سحری کھانے کے بعد ڈپٹی کمشنر، ڈی آئی جی پولیس مع خاص زور کے ساتھ آئے اور ان دو حضرات کو بلا کر لاشی لی حالانکہ دونوں حضرات بنیان اور پاجا پہننے ہوئے تھے، لیکن پھر بھی خیرہ چشم انہوں نے اس لباس کو خوب ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں کوئی خفیہ اور نوا ایجاد ہتھیار الیسا نہ ہو جو ان ہٹکے کپڑوں میں چھپا ہوا ہو اور کہا کہ ہم آپ کیلئے آئے ہیں غسل و بیڑہ کرنے کی اجازت نہ دی اور پانچ منٹ کے اندر بنیاد ہونے کا حکم دیا۔ لی امان بھی برتنوں کی تیار ہو گئیں اور کہا کہ میں بھی ساتھ جیلوں کی نگرانی کو سمجھا گیا کہ روک دیا گیا علی برادران کا وفادار ملازم محمد حسین مولانا شوکت علی سے گلے ملنے وقت روئے لگا۔ مولانا نے ایک زور کا چناڑا رسید کیا اور فرمایا کہ خبردار اگر کافر کے سامنے آسنو نکلا۔ وہ بے چارہ سنبل گیا۔

۱۹۱۹ء ہندوستان کی تاریخ آزادی میں بڑا اہم سال ہے۔ اس سال گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف جیل سے امر تفسیر اپنی مشہور عالم تحریک ستیہ گره کا آغاز کیا اور ملک میں حکومت سے عدم تعاون کی تحریک عدم تشدد کے اصولوں کے ساتھ شروع ہوئی۔ اس پر حکومت بوکھلا اٹھی اور پورے ملک میں دار و گیر و تشدد و شرور کر دیا۔ تقریباً ہر بڑے شہر میں

لوگوں پر گویاں چلائی گئیں اور امرتسر جلیلا الزبائع میں تو اس تشدد کی انتہا ہو گئی جب کہ اس باغ میں ہندو مسلم اور سکھوں کے اجتماع اندھا دھند فائرنگ کر کے سینکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس واقعے پر دسے ملک میں آگ لگا دی اور حکومت کے خلاف اس قدر نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ باید و شاید حالات بے قابو ہونے جا رہے تھے کہ حکومت نے سنبھال لیا اور دفعۃً تمام سبائے قیدیوں کو بغیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام چار سال کی قید کے بعد رہا ہوئے اور علی برادران ساڑھے چار سال کی نظر بند قید سے آزاد ہوئے۔ جن دلوں گرفتار شدگان رہا ہوئے ہیں امرتسر میں کانگریس، مسلم لیگ اور خلافت کے اجلاس ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے علماء ہند کا سالانہ اجلاس بھی ہو رہا تھا اور یہ سب جلسے جلیلا الزبائع میں کہ جہاں انگریز حکومت نے اپنی دہرنگی و وحشت کا بدترین مظاہرہ کیا تھا، ہو رہے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کا یہ روح پرور نظارہ تھا جو شاید اس کے بعد کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔

علی برادران رہائی کے بعد سیدھے امرتسر پہنچے کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوں۔ ۲۹ دسمبر کو دونوں مجلسیں امرتسر پہنچے، راستہ میں جس جس شیش سے آپ کا گزرا، ہندو مسلمانوں نے پر جوش اور دلدادہانہ خیر مقدم کیا۔ امرتسر شیش پر ہزار ہا افراد کے منتظر تھے۔ وہیں سے جلوس بن کر کانگریس کے پیدل کی طرف روانہ ہوا۔ پیدل کے دروازے پر مسٹر گاندھی، پنڈت مدن موہن ماسکر اور دوسرے رہنماؤں نے آپ کا استقبال کیا۔ جب یہ حضرات جلد گاہ میں پہنچے تو پندرہ منٹ تقریر کی۔ رہے اور کارروائی کر کے پنڈت موتی لال نہرو صدر کانگریس نے ہر دو حضرات کا تعارف کراتے ہوئے قومی خدمات کا عظیم و توصیف کے ساتھ ذکر کیا۔ مولانا جوہر نے کانگریس کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

”میں کہتا ہوں اس آزادی کے لئے مسٹر ننگ کو بھر جیل چلا جانا چاہیے، مجھے دوبارہ اپنی عمر بھر کے لئے نظر بند ہونا چاہیے، مسٹر لینٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے۔ مگر اس عزم کے مخالف کامیاب کے لئے خاتمہ ہونا چاہیے حبس کا بیجا۔ میں ہنر کے۔“

کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے بعد علی برادران مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

امرتسر اور لیجن دوسری جگہ ہو کر علی برادران دہلی پہنچے۔ یہاں ان کے استقبال کی کیا شان تھی، اس کی کاپی حالات علی برادران اسے ملتی ہے۔

دہلی میں

”دہلی سورس کے بعد دلن جی ہوئی تھی۔ قریب قریب تمام چھوٹے بڑے بازاروں میں مجتبیوں کا جال پھیلا ہوا تھا، استقبال بھی ان کے عالیشان دروازوں کے علاوہ تمام چھوٹے بڑے بازاروں اور تمام گلی کوچوں کے سروں پر صد خوش مناد و داد سے نصیب تھے۔“

چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹ گھر کے نیچے، جہاں دائرے اور شہزادوں اور خود ہزار امیریل میٹھی میٹھی کو ایڈریس دیا گیا تھا ایک خوشنما انہی چادروں سے مٹھا ہوا اجاز بنایا گیا تھا اور جلی حرفوں پر آزادی کا جہاز، لکھا ہوا تھا جس پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس جہاز کی تعمیر صرن چوہیں گھنٹوں میں ہوئی اور پانچ سو روپے سے زائد اس کے پانچ سو روپے آج کے میں ہزار کے برابر تو فیقاً ہوں گے، اس پر عرض ہوئے تھے۔ اس پر ایک درجن آدمیوں کے بیٹھے کہہ رہے تھے اس کے نیچے کرسیاں بھی ہوئی تھیں جن کے لئے دو دروہ اور چار دروہ میٹھ تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے دونوں بھائی تشریف لائے۔

مجمع نے "اللہ اکبر" اور بندے ماترم کے نعروں سے خیر مقدم کیا اور پھولوں کی بادش شمع کر دی لے
 امرتسر اور دہلی میں خلافت کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ مسلم فائدہ مندوں کا ایک وفد بعض اہم ممالک
 میں جا کر مسلمانوں کے مذہبی فرائض کو نہایت خوش اسلوبی اور معقولیت سے گوش گزار
 لائے، حکومت نے وفد کو باہر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس وفد سے پیشتر ایک اور وفد ہندو مسلمانوں کا فائدہ مند بن کر وائسرائے ہند
 اور ڈیپٹی کمشنر ڈیو سے ملا تھا، جس کی قیادت مولانا جوہر نے کی۔ اس وفد نے حکومت کو وہ مواعید یاد دلائے جو اس نے اپنی مسلم رعایا سے
 رکے توڑے تھے۔

اس وفد میں خاصے سرکردہ حضرات شریک تھے۔ چند ممتاز نام یہ ہیں۔
 مسٹر گاندھی، سید محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شاد اللہ امرتسری، مفتی کفایت اللہ،
 مولانا حسرت موہانی، حکیم اجل خان، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی، سید سلیمان ندوی، راجہ محمود آباد۔ پٹنہ موتی لال ہندو،
 مسٹر محمد علی جناح۔ دونوں موقع الذکر بزرگ وقت پر دہلی نہ پہنچ سکے اور بذریعہ تار اپنے کامل اتفاق کا اظہار کیا۔ اس وفد کا
 پیریس مولانا جوہر نے تیار کیا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"ہم عرض کرنا چاہتے ہیں کہ چاہے کتنا ہی بڑا اور ذریعہ حصہ زمین ہو یا کیسا ہی زبردست سیاسی نفع ہو مگر وہ اس
 اخلاقی عزت کے نقصان کا معاوضہ نہیں ہو سکتا جو بڑھاپہ کو حرف بحرف وعدے پورے نہ کرنے پر ہوگا۔ اخلاقی رعب
 کا خاتمہ اس لئے اور گراں ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی نقلی کھل جانے کی جو حضور والا کے پیشتر وائسرائے نے ترکی کی
 لڑائی ہونے پر شائع کئے تھے۔"

بالآخر یورپ جانے کے لئے ایک وفد ترتیب دیا گیا اور اس کو جانے کی اجازت ملی
 اس وفد میں فائدہ مند مولانا جوہر کے علاوہ مسٹر حسن محمد جیات و سابقہ سیکرٹری کونسل
 بمبائل، سیکرٹری مسٹر سید حسن، مولانا سید سلیمان ندوی اور ابوالقاسم ارکان و وفد تھے۔ مسٹر شعیب قریشی اور عبدالرحمن صدیقی
 اور ان کے مسٹر ڈیپٹی کمشنر بھی زیر تعلیم تھے، ابھی اپنی تعلیم چھوڑ کر پورے دنوں ساتھ رہے۔

اس وفد نے وہاں جا کر اکثر علمائے دین اور ذمہ داروں سے ملاقاتیں کیں۔ وزیر اعظم لارڈ جارج سے ملاقات کی "حزب العمال" کے
 لارڈ مجلس میں مولانا جوہر نے معرکہ الآراء تقریر کی جس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ پانچ منٹ وقت ملا تھا مگر سامعین کے
 اراد پر میں منٹ تقریر جاری رہی اور اس دوران میں تین یا دو صد وجہ نے تقریر ختم کرنے کے لئے گھنٹی بجائی مگر سامعین
 کے شدت تاثر کا یہ عالم تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ تقریر جاری رہے، بالآخر چوتھی دفعہ گھنٹی بجاتے ہوئے حدود دنے کہا۔ "اب تقریر
 کی منٹ ہو چکی ہے۔ ابھی اور کام باقی ہیں، خود معزز مقرر کو ابھی اور سنا چاہتا ہوں مگر کیا کروں مجبور رہوں۔"
 اس کانفرنس کے سیکرٹری مسٹر بیڑے میکڈانلڈ تھے جو بعد میں برطانیہ کے وزیر اعظم بنے اور وہ مولانا کے ذاتی دوست بھی تھے

تاہم انہیں بڑا غصہ تھا کہ ارکان دست ممبران پارلیمنٹ اور دیگر عائدین سے پہلے کیوں نہ ملے، پہلے مجھے کیوں نہ ملے اور کی بنا پر انہوں نے مولانا کو کانفرنس میں تقریر کا وقت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مولانا جوہر فرماتے تھے ”جو شخص ایک برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، حیرانی تھی کہ وہ اس قدر تنگ دل اور کم ظرف تھا۔“ مہر حال سیکرٹری نے اجازت دوسرے بعض بزرگوں نے صدر کانفرنس سے کہہ کر پانچ منٹ لے کر دیئے جو میں منٹ کی جگہ لے گئے۔

ارکان وفد نے بھی ملاقاتوں، مختلف جگہوں میں تقریروں اور اخباری بیانات کے ذریعے وہ تمام وعدے حکومت برطانیہ والے جو اس نے کئے تھے۔ معقولیت اور دلائل سے مطالبات پیش کئے۔ ان تمام نتائج و عواقب سے آگاہ کیا جو وعدے پور کرنے پر پیشینہ آسکتے تھے۔ خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اسلامی نقطہ نظر سے پیش کی۔ پاپائے روم نے مولانا نے ملاقات کر کے المسدین کی حیثیت بیان کی۔ مگر معاط وہی ڈھاک کے تین پات کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس لئے کہ حکومت برطانیہ کو علم تھا کہ اس ملک اور حکومتیں کمزور ہیں اور برطانیہ کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا کہ وہ کمزوروں کو آنکھیں دکھاتا، طوطا چینی کرتا اور طاقت ور سیدھے کرتا ہے۔

یہ وفد جو ہندوستان سے گیا اس کا نام ”انڈین خلافت ڈیلگیشن“ تھا۔ اس وفد کے علاوہ ان دنوں مصری قومی وفد، جارجیائی وفد، جارجیائی وفد، آذربائیجانی وفد، اسلامی قازانی وفد بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ ہندوستانی وفد تقریباً آٹھ ماہ پورے اتنے عرصہ میں چھ ارکان کا خرچ تقریباً ۶۵ ہزار روپے ہوا اور تقریباً بیس کئی گیارہ ہزار روپیہ بڑا لیکن ایک وفد جو حکومت برطانیہ پر بیٹھ چھوٹائی کی قیادت میں گیا اس کے مصارف صرف ڈھائی ماہ میں بیس کئی دس ہزار ہوئے اور پھر مولانا جوہر والے وفد کے اخراجات بھی غاصے ہوئے جو سرکردہ اصحاب کو ڈنر پر بلانے، پولیس کانفرنسوں کرنے، اخبارات میں اشتہارات وغیرہ پر خرچ ہوئے۔

بالآخر آٹھ ماہ یورپ کا دورہ کر کے مولانا ہندوستان واپس تشریف لائے اور بمبئی وفد کی واپسی ارکان کا استقبال نہایت شاندار طریقے سے کیا گیا، مگر وفد کی ناکام مراجعت نے مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر دیا اور ان کے لئے یہی صورت باقی رہ گئی کہ وہ حکومت سے کسی معاملے میں تعاون نہ کریں اور ترک موالات کرنا چنانچہ شیخ الحداد نے ترک موالات کا مفصل مع دلائل فتویٰ دیا اور پورے ہندوستان میں سکول، کالج، پڑھانے میں شریک ہو کر سرکاری ملازمین دھڑا دھڑا مستعفی ہونے لگے اور مستعفی ہو کر الیاحسوس کرتے تھے گویا لغت عظمیٰ پانگئے اور بدو گدشتہ مسلمانوں ہی چکا ہے کہ ترک موالات کے سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر حکیم اعلیٰ حان اور دیگر انصاری علی گڑھ کالج میں اس نیت سے گئے کہ اور علی ادارہ بھی ساتھ دے لیکن جب وہاں کی منتظر نے جو انگریز شرف کے ذریعہ تھی ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت نے طلبہ سے اپیل کی اور اولڈ بوٹرز لاج میں منتقل ہو گئے اور جب ان حضرات کو بظاہر سختی اور ایک قسم کی بے عزتی سے دوستانہ فیما فیما انہوں نے ایک متوازی درس گاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی اور اس کا سنگ بنیاد حضرت مولانا شیخ الحداد محمد علی جوہر اور انہی کی صدارت میں مجسمہ ہوا۔ حضرت شیخ الحداد دنوں اپنی طویل قید کے بعد مائل سے رہا جو کہ آئے تھے۔ بہر حال لیکن ان حضرات کی استدعا پر کہ آپ ہماری سرپرستی کریں کہ ہم آپ کے بغیر کچھ نہیں ہیں چنانچہ حضرت نے فرمایا جیسا کہ اسے عام

گذرا ہے

”اگر میری صدارت سے انگریزوں کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں مزدور شہر ایک ہوں گا۔“
اور دو آدمیوں کے سہارے سے جلسہ گاہ میں تشریف لاکر صدارت کی۔

ر کانگریس

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جامعہ کاننگ میں داخلہ لیا گیا۔ انہی دنوں ترک موالات کا زور تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے قتل پر پانچ سو غلامانہ دستخط کئے اور یہ فتویٰ سارے ہندوستان میں قریہ قریہ بستی بستی پرا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ترک موالات کا پروگرام منظور کر لیا اور تمام کانڈھی جی کے سپرد کر دی گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترک موالات کا جو فتویٰ دیا تھا، قہیدی کلمات کے بعد اس پروگرام کی تین تین کوسلمان

- ۱۔ سرکاری اعرازوں اور خطابوں کو واپس کر دے۔
- ۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کر دے۔
- ۳۔ صرف اپنی ملکی اشیا اور مصنوعات کا استعمال کرے۔
- ۴۔ سرکاری سکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔

اس کے علاوہ جو تجاویز و فتاویٰ شائع کی جائیں ان پر عمل کریں بشرطیکہ :

- ۱۔ اتباع شریعت کیا جائے اور غلامی میں غلات حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آئے۔
- ۲۔ نیز اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں ضابطہ نفقہ امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے اور ہر کام میں اخراط و تفریط سے بچ کر اعتدال مد نظر رہے۔
- ۳۔ ارشاد عثمانیؒ اذا احسن الناس فاحسن معہم واذا اسا فانما یجانب اسماء تمہم حبیب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے اچھا کرنے میں شریک رہو اور جب کہ برا کریں، برائی سے بچتے رہیں، کالفاظ رکھنا ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے واللہ الموفق والمعین۔

والعید محمد حسن عفی عنہ ولینبذی ۳ ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ

ملالت کا نفرنس

جن دنوں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا انہی دنوں خلافت کا فاضل کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترک موالات کا ریزولوشن منظور کر کے مسلمانوں نے جس اپنی قیادت کے لئے بقول رئیس احمد جعفری موافقت میں تہ عمل :

جو جی کو منتخب کیا

مخلاف

”اس وقت تک کانگریس سے بال حضرت علیہ السلام نہیں ہوئے تھے اور وہ جس اس میں شریک ہوتے تھے دینی کانگریس کے اجلاس میں، انہیں چونکہ یہ غیر آئینی تھے، انہیں اپنی نہیں تھی اس لئے وہ بھی پوری مخالفت کے ساتھ کانگریس سے شریک ہوئے اور تجویز ترک موالات و ترک تعاون کو منظور کرنا چاہا۔“

”ہندوؤں میں پنڈت مالویہ اور مسلمانوں میں مسٹر جناح پیش پیش تھے۔ مسٹر سی آر داس بھی اس وقت تک پریکٹس کر رہے تھے اور مقابلہ اور ترک موالات کے وہ بھی شدید مخالفین میں تھے اس لئے بظاہر بڑی پریشانی تھی کہ دیکھئے اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔“

”مولانا، محمد علی نے اپنے آپ کو اس تجویز کے منظور کرانے کے لئے وقف کر دیا تھا، کبھی گاندھی جی سے گفتگو کر رہے ہیں، مالویہ جی سے مل رہے ہیں کبھی مسٹر جناح کو سمجھا رہے ہیں اور کبھی سی آر داس کو مجبور کر رہے ہیں، کبھی اور دوسرے لوگوں کو تباہ کر چکے ہیں۔“

”محمد علی کو سب سے بڑی عکاسی آر داس کی تھی۔ ان کی نگاہ دور رس نے بھارت کی جوہر قابل ہے اگر ہاتھ اٹھایا تو تحریک کو چار چاند لگ جائیں گے اس لئے ان کی

سی آر داس کی رضامندی
سی آر داس پر صرف ہوتا تھا۔ وہ انہیں دلائل سے، براہین سے، محبت سے پیار سے، خفگی سے غصہ سے، خوشامد سے، ہر طرح سے ہموار کر رہے تھے کہ وہ اپنی لاکھوں روپیہ سالانہ کی پریکٹس پر لات مار دیں۔ ایک رات کو وہ اسی فکریں غفلان بیچان گاندھی سے واپس آکر ہے تھے کہ داس نے محمد علی کا ہاتھ پکڑا اور الگ لے جا کر کہا، محمد علی! تمہاری رائے صحیح ہے۔ میں نے طے کر لیا کہ تحریک کی حمایت کروں اور اپنی پریکٹس چھوڑ دوں۔ محمد علی یہ سنتے ہی دفتر محبت سے واپس کے گئے لپٹ گئے اور پیشانی پر ہوی۔ محمد علی کو ہمیشہ اس خدمت پر فخر رہا کہ داس جیسی شخصیت کو میدان عمل میں لانے والے وہی تھے۔ انہیں نے یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کیا ہے تاکہ تاریخین کو اندازہ ہو سکے کہ مولانا محمد علی اپنے مقاصد و عزائم سے کس قدر متعلق تھے اور ملکی و قومی مفاد کی خاطر کس طرح بے تاباں، مضطربانہ غیر مسلم افراد تک کی خوشامد منت کرتے تھے۔“

اس ہندو مسلم اتحاد کی وجہ سے پورا ملک تحریک آزادی کی ٹرپ میں دوڑانہ ہو گیا اور مولانا محمد علی، مسٹر گاندھی، مولانا آزاد اور دوسرے مشاہیر نے پورے ملک میں جگہ جگہ جا کر بیداری کی لہر پیدا کر دی۔ ان مشاہیر کی مساعی سے لوگوں کے ایک کھیل بن گیا۔ لوگ گھروں میں بے قرار رہتے لیکن جلی میں جا کر سکون و راحت محسوس کرتے تھے۔

تحریک خلافت کے دنوں میں ہندوستان میں عید آزادی کی روح پیدا کرنے میں علی بڑا ہاتھ رہا۔ تحریک ختم نبوت کے دنوں میں راقم الحوادث شہر میں جنوں کے ایک دوست مولانا محمد علی کی قیادت کر رہے تھے، کی ایک بات مجھے بڑی پسند آئی جب انہوں نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا:

”ہندوستان نے تین محمد علی پیدا کئے محمد علی جوہر، محمد علی جناح، محمد علی جالندھر“ مولانا، پہلے نے آزادی ٹرپ پیدا کی، دوسرے نے ہمیں دینا کا سب سے بڑا اسلامی ملک پاکستان لے کر دیا اور تیسرے مولانا محمد علی جالندھر

لے سبیت محمد علی مولانا رئیس احمد جعفری

مولانا محمد علی جالندھر کی تحصیل نکودہ ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کی راجی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل مدرسہ عربیہ خیر المدارس میں مہتمم مدرسہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے دست راست اور مشیر علی تھے

موسس ختم نبوت کی خاطر تمام مسلمان فرقوں کو متحد کر دیا۔

اور عیب حسن اتفاق ہے کہ نینوں محمد علی جس نسبت سے مشہور ہیں اس کا پہلا لفظ "ج" سے شروع ہوتا ہے یعنی جوہر جناح، جالندھری۔ نینوں لفظ "جیم" سے مشہور شروع ہوتے ہیں۔

مولانا جوہر کی پوری ہی کہ انہوں نے اپنے آپ کو قوم و ملک کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ صبح کیسں شام کیسں۔ تمام ہندو مسلمان، اور ہر ایک کی زبان پر خلافت کا لغو ہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا یہ خوش کن زمانہ بقول رئیس احمد جعفری :-
"ہو اکی طرح کیا اور بادل کی طرح نکل گیا"

اجی دلوں جب کہ ملی برادران کی شہرت شباب پر پختی پورے ملک میں بڑے زور و شور کے ساتھ یہ افواہ مشہور کر دی گئی کہ "ملی برادران" نے حکومت سے معافی مانگ لی اور اس افواہ کے اڑانے میں سب سے زیادہ فتنے کے واسطے لارڈ ریڈنگ کا تھا اور بقول مولانا جوہر :-

"لارڈ ریڈنگ سے زیادہ کوئی چالاک واسطے اس صدی میں تو ہندوستان نہ آیا تھا"

بر حال اس معافی نامہ کے افسانے کا مسٹر گاندھی اور مولانا جوہر نے خوب خوب پردہ چاک کیا اور اصل میں یہ سب کچھ غلط فہمی مولانا کے بیان سے ہوئی تھی جو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ اور اس بیان کے شائع ہونے پر مولانا حسرت مولائی مرحوم نے مولانا

حاشیہ صفحہ ۸۰۴ سے ۸۰۵

ہام پاکستان کے پانچ چھ سال بعد تک یہی حیثیت رہی پھر ان کی مصروفیات کی بنا پر یہ حیثیت کم ہوئی چلی گئی اور پنجاب
فلس احرار اسلام کے صدر بھی بنیام پاکستان کے بعد مجلس احرار اسلام نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تو آپ نے اپنی
مادی خدمات اور سماجی تحفظ ختم نبوت پر مرکوز کر دیں۔ اگر سیاست میں حصہ لیتے رہتے تو آج ملک کے سرفہرست
یا سبستاقوں میں ہوتے۔ شاید یہ کہنا بجا ہو کہ آپ پنجابی کے سب سے بڑے خطیب ہیں۔ عوام کی بولی بھولی میں ختم نبوت
اور سیاسی و دینی مسائل سمجھانے میں یدِ طولی رکھتے ہیں۔ تقریر کے بادشاہ لیکن تحریر کے کوچہ سے تقریباً نا آشنا۔ اس دور
میں بہت غنیمت شہنشاہت ہیں۔ بڑے عالم فاضل، آجکل سلوک و نفوس کا مزاج پر غلبہ ہے۔ بہت سادہ۔ کبھی زمانہ تھا کہ
جب شیخ پرچھے تو معلوم ہوتا کہ کرنی سادہ و دیندار دیہاتی ہے لیکن جب تقریر کرتے تو یوں محسوس ہوتا گویا قرن اول کا
کامہ مسلمان جہاد پر تقریر کر رہا ہے۔ اب بیکہ علم و سیر کے قریب ہے، ماضی کی کبھی کبھی جھلک دکھا دیتے ہیں۔ تحریک ختم نبوت
کے متعلق "میزانِ انصاف" رپورٹ "ہیں آپ کے منطق کا کراس پڑھنے کے قابل ہیں۔ ۳۰
نور انصاف حسرت مولائی "مشہور دینی، سیاسی رہنما اور شاعر۔ بے حد مخلص اور بے باک و نڈر انسان تھے۔ سادگی میں کوئی
لہر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہر وقت جہل جانے کے لئے تیار۔ یہ مشہور شعر اپنی کا ہے :-
اک طرف تاثر ہے حسرت کی طبیعت بھی ہے شوق سخن جاری اور پیک کی مشقت بھی

۴
نہایت میں انصاف ان کے اور جس شخص کا نام انھیں نہ لیا تو انھیں نہ لگا دیتے کہ وہ بھی سادہ و دیندار
تھے نہ ان کی فکر ان کی طبیعت ان کے واسطے دیکھ گئے۔ ناگوار نہ ہو۔ طبع ان کے

"اگر ہاتھ جانی نے نہیں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے اطلاع دے دی تھی کہ دائرہ رائے نے اس شرط پر نہیں معاف کیا ہے تو تم سے بڑھ کر بزدل کوئی نہیں اور اگر انہوں نے اس کی اطلاع نہیں دی تھی تو ان سے بڑھ کر کوئی بے ایمان نہیں اور مولانا محمد علی جوہر نے اس پر یہ تبصرہ کیا:

"لیکن میرے ان جوشیلے بھائی کو یہ نہ سوچا کہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ لارڈ ڈریڈنگ نے ملاقات کا خلاصہ غلط دہرایا۔ بہر حال جب میں نے جیمس فورڈ کلب والی تقریر سنی تو سارا بدن پھینک گیا اور میں نے ہاتھ جانی سے اس قدر کہا کہ اجازت ہو تو اس کا جواب دے دوں۔ جلسہ خلافت کا تھا، میں صدر تھا، تقریر صدارت کچھ اور ہونے والی تھی مگر اس کے بعد میں نے حضرت لارڈ ڈریڈنگ کی تلبیس کا پردہ چاک کیا اور مشکل ہی سے میں نے ساری عمر اس سے زیادہ سخت کوئی اور تقریر کی ہوگی۔ ہر اس سربراہ اور وہ شخصیت کے ساتھ جس نے ملک و ملت کی رہنمائی کے لئے قدم اٹھایا ہے، یہ معاملہ جوتا چلا آتا ہے کہ اس سے کیا ہے۔ اگر محمد علی جوہر بڑے آدمی تھے اور یقیناً اپنے دور کے عظیم ترین قائد تھے تو ان کے ساتھ یہ معاملہ اور اس طرح کے معاملات پیش آنا لازمی تھے، مگر اس طرح کے معاملات پیش نہ آتے تو حیرانی ہوتی۔

۱۰۹۰ء جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں خلافت کا نفرنس منعقد ہوا۔

مقدمہ کراچی

مولانا سید حسین احمد مدنی، پیر غلام محمد دسندھی، ڈاکٹر سعید الدین بکچو، مولانا شوکت علی مرحوم، سوامی ششکر اپارہی وغیرہ شریک ہوئے۔ دیوبند اور دیگر مقامات کے پانچ سو علما کا فتویٰ پہلے شائع ہو چکا تھا جس میں حکومت اور تعاون کو حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ سکول، کالج، کیمپوں کی ملازمت اور وکالت کا پیشہ، خطابات و اعزازات کا قبول کرنا منع کیا گیا تھا۔ نیز تحریک خلافت میں حصہ نہ لینے والوں کو میدان جہاد میں بھاگ جانے والے کی حیثیت میں ثابت کیا گیا تھا۔ انہی حالات میں کراچی خلافت کا نفرنس منعقد ہوئی۔ کرسی صدارت کی اجازت سے مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس کا نفرنس پر قرار داد پڑھ کر سنائی جس کا حاصل یہ تھا:

"حکومت برطانیہ کی فوج کی ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرنا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین اور ہر قسم کی اعانت

از روئے شرع حرام ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر فوجی مسلمان تک پہنچا دے۔"

اور یہ صحت اس طرح ثابت کی گئی تھی کہ فوج میں شریک لوگوں کو اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر گولی چلانا پڑتی ہے

مولانا محمد علی جوہر ان دنوں پوری طرح مضر گاندھی کے مہمنا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکسانیت اس قدر تھی کہ

ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پُر خلوص اعتماد تھا، چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ تھی اس لئے مولانا اپنے لیڈر پر بھی

حاشیہ صفحہ ۸۰۵ سے آگے

اور یہ مشہور شعر بھی انہی کا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نشر نظم حسرت میں کچھ مزانہ نہ رہا

اور یہ ہندوستان کے واحد لیڈر ہیں جن کے متعلق نہ تو کسی نے معافی کا انداز رکھا، نہ چندہ سہم کرنے کا الزام

معقد و معترف رہے۔

کراچی جیل سے مولانا جوہر بیجا پور جیل منتقل کر دیئے گئے۔ راستے میں کسی سٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے منتقلی ان سے سوال کیا؟ اس سوال جواب کی روداد عبدالعاجد دریا بادی نے نقل کی ہے:

”عین اسی زمانہ میں محمد علی کراچی سے بیجا پور جیل منتقل کئے گئے تھے۔ کسی سٹیشن پر کسی انگریزی اخبار کے ایک منچہ وقائع نگار نے انہیں جالیا اور سوال تحریک ترک موالات کی موجودہ حالت کے متعلق کر دیا۔ محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں۔ میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ”میں اپنے لئے بعد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں۔“

لکھنؤ سے اجیر جاتے وقت ایک بڑے سٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں نے خریدی، اتفاق سے اس میں یہی مکارم درج تھا۔ مولانا عبدالبادی (مولانا جوہر کے مرشد) نے انہیں پڑھوا کر سنا۔ ان کے ایک رفیق سفر دھرم جو اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھے بول اٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا۔ یہ گاندھی جی کیا معنی؟ مولانا نے برحسہ جواب دیا ”مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں۔ وہ تو رسول ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اسی میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا۔“

اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ جب کسی کو تحریک کا قائد بنایا جائے تو پھر اس پر پورا نفاذ کرنا چاہیے، مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اس قسم کے نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے غلط نہیں ہے۔

مولانا محمد علی جوہر اور ان کے دوسرے رفقاء پر مقدمہ اور سزا سننے پر حلیں آگ پر تیل کا کام کیا۔ مرشد گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور نرک موالات اور عدم تعاون کے متعلق ہی قرارداد کر ہر جگہ پیش کرنا شروع کیا، جس کا نتیجہ ہوا کہ مذمت ہتھوڑے عرصے میں پچیس لاکھ روپے چندہ تحریک کے لئے جمع ہو گیا۔ علامہ مولانا جوہر کی گرفتاری تک دو تین لاکھ ہوا تھا۔ مولانا جوہر کی سبک دہی انہوں نے اس سلسلے میں اٹھک کام کیا۔ مولانا ابوالکلام کی گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر کلکتہ میں مقدمہ چلا۔ عدالت میں مولانا نے تاریخی بیان دیا جو ”قول فیصل“ کے نام سے شائع ہوا جو اسی کتاب میں مولانا کے حالات میں مختصراً نقل کر دیا گیا ہے۔

علی برادران کی گرفتاری کے بعد گاندھی جی رسول نافرمانی کے لئے تیار ہو گئے اور برادری سے اس کے آغاز کا پر دہ گرام بنایا گیا۔ لیکن اسی وقت ”چوری چوراہا“ کا واقعہ پیش آیا۔ جس کی وجہ سے گاندھی جی نے برادری جاکر تحریک کے اتوا کا اعلان کر دیا۔ اسے

لے ”محمد علی“ ذاتی دائرے کے چند اوراق حصہ اول ص ۱۷۱ مولانا عبدالعاجد دریا بادی

لے ”چوری چوراہا“ کو لکھ پور کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں کے لوگوں نے پولیس کے جبر و تشدد سے تنگ آ کر پولیس سٹیشن کو آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے کئی سپاہی جل کر راکھ ہو گئے۔

گاندھی جی کا خیال تھا کہ اب تحریک تشدد کی نذر ہو جائے گی، مگر کانگریس، خلافت کمیٹی کے ارکان نے مسٹر گاندھی پر زور دیا کہ تحریک جاری رکھی جائے۔ اس پر گاندھی جی نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی جو ملک کا دورہ کر کے یہ معلوم کرے کہ آیا ملک سول نافرمانی کے لئے ہے اور کیا اس تحریک میں دوبارہ تشدد تو نہیں ہوگا۔ ملک تو پہلے ہی سول نافرمانی کے لئے تیار تھا۔ اس انتظار نے لوگوں میں اضمحلال کر دیا اور لوگوں نے گاندھی جی کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار شروع کر دیا کہ یہ جہاد تہ جہانے پھر کس وقت اپنی مخصوص حکمت عملی بنا پر کوئی خاص حکم جاری کر دے۔ تاہم مسٹر گاندھی تحریک کو اکثر لیڈروں کے جیل جانے کے باوجود کسی دہائی طرح چلائے جا رہے تھے ایک دن گاندھی جی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور اب کوئی بڑا ایڈیٹر باہر نہ رہا اور تحریک تقریباً بالکل ہی ختم ہو گئی۔

انگریز بری شاطر قوم ہے۔ تحریک خلافت پر اس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو فائدہ دیکھا اس کو دیکھ کر انگریزوں کی تحریک گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح مقہور رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں لہذا حکومت نے سوامی شرودھ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ جنہوں نے باہر آ کر شدھی کی تحریک چلائی اور ملک کے راجپوتوں کو "شدھ" کرنا شروع کر دیا۔ یہ تمام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہذا شرودھانند کی شدھی تحریک کا ان پر جلد اثر ہوا اور وہ مذہب میں داخل ہو گئے اس کی کچھ تفصیل حضرت مفتی کفایت اللہ اور بعض دوسرے مقامات پر گزری چکی ہے اور اپنی دونوں مالا مال ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔

مولانا جوہر کو جیل میں مضمحل رہنے کی آمدنی بیگم کی شدید علالت کی اطلاع ملی۔ آپ نے وہیں سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جس کا ایک شعر یہ تھا ہے

کانگریس کی صدارت

تیزی صحت میں منظور ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو چھوڑ ہم کو بھی منظور نہیں۔
مولانا دو سال کے بعد جیل سے رہا ہوئے تو دہلی میں کانگریس کے سیشن اجلاس میں شرکت کے بعد سیدھے کوہ جہانی سینٹی ایم میں آئے۔

مولانا نے پریس کے فائدہ کو بیان دیتے ہوئے کہا:-
"میں ایک چھوٹے جیل سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آ گیا ہوں۔ مجھے برو دوا جیل کی کبھی کی تلاش ہے تاکہ میں گاندھی جی کو رہا کر سکوں اور اس کے حصول کا انصاف آزادی پر ہے۔"

اس سال مولانا جوہر کو آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ان نئے حالات میں مولانا جس غیر معمولی قابلیت، ذہانت اور حکمت عملی سے اجلاس کو کامیاب کیا وہ اپنی کا حصہ تھا۔

مولانا جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ انفرق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترک موالات اور عدم تعاون کا جو پرگرام دکھایا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت یعنی ہم مشروط کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علما شدھی کے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ علما کو موقف یہ تھا کہ سوامی شرودھانند کی تحریک

کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا دینی نقصان ہو گا۔ مولانا محمد علی جوہر کے مہینے سا مٹی بھی اسی تبلیغی ہم میں لگ گئے۔ موتی لال نہرو اور دوسرے دکلا پر کیٹش شروع کر کے اپنی اپنی دکالت و بے مٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنہیں بھی دھن تھی کہ اسی پر دگرگام و غضب العین کو اپنایا جائے جس کے لئے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس چالیس ہزار افراد نے ہنسی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ مولانا جوہر اگر چاہتے تو اسی رد میں بہرہ کراوی احساسات کا ساتھ دیتے مگر انہوں نے بغاوت و لوث لٹم ان حالات میں بھی لاگو نہیں سے پوری دفا واری کا ثبوت دیا اور کانگریس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بحال کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ مولانا جوہر پر ایک بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ بڑے جذباتی تھے اور عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے لیکن ایسا نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو مولانا ان دنوں کانگریس کا ساتھ نہ دیتے بلکہ عوامی جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے اسی پر دگرگام کر لے کر چل پڑتے جس کو دوسرے لوگ کر رہے تھے مولانا کے متعلق یہ تو کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے ان دنوں تبلیغی کام کی تمام کارکیوں نہ مستحال اور اس بارے میں اختلاف کرنے والے اختلاف کر سکتے ہیں مگر یہ کتنا قطعاً درست نہیں کہ وہ عوام کے جذبات سے کھیلتے تھے البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ جس کام کو وہ ملک و ملت کے لئے دیا تھا اسی سے مفید سمجھتے تھے اس کے لئے وہ انتہائی شدید جذبات رکھتے تھے اور اپنی غفلت بیانی، گرم گفتاری اور اپنی ادب و تحریر صلاحتوں کو اس کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ اس کے لئے مولانا جوہر ہی کی ایک تحریر ملاحظہ کیجئے جو اس سلسلے کی ایک بہت بڑی تحریر ہے۔

ہمارا گاندھی خاموش ہو گئے اور ہمارے بعض ساتھیوں نے تو سکوت ہی اختیار نہ فرمایا بلکہ ایک نقادہ لے کر اسی نقادہ خاندے کے نقاد چل دیے وہ بھی بن بیٹھے لیکن ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے نہ کوئی سکوت کیا، نہ کوئی نیا سرالا پس شروع کیا اور سامعین کی قلت اور بے پروائی کا مطلق پابن نہ کر کے ہم نے حافظہ ہی کے شعر پر اپنا عمل جاری رکھا

حافظ و ظیفہ تو دعا گفتق است و بس
در بند این مباش کہ نشنید یا شنید

ہم نے اور ہمارے چند ساتھیوں نے ذوق فزین کی محسوس کر کے جس قدر تبلیغ نوائی کی اور عمل کو گراں پا کر جس قدر حدی کو تیز کر کیا اسے یا ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا۔ لے

اس بارے میں ان کی مستقل مزاجی کے متعلق یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بلگرام خلافت کا فخر منس کے صدر ائیکے کراچی جلسہ کے ساتھی ڈاکٹر سیف الدین کچلے تھے جو متحدہ دوسرے سخت بیزار اور ایک الگ تنظیم کا علم جادے کر کھڑے ہوئے تھے انہوں نے خطبہ صدارت تند و تیز لہجے میں رقم کیا جس میں ہندوؤں پر سخت نکتہ چینی کی گئی تھی۔ مولانا جوہر کو خطبہ کے مندرجات کا اس وقت نہ چلا جب اگلی صبح اجلاس ہوئے والا تھا۔ مولانا نے ساری رات جاگ کر خطبہ سے ناروا اور تلخی آمیز حصوں کی قطع و برید کی اور اس میں سے وہ حصہ نکال دیا جس میں ہندوؤں پر جو کیا گیا تھا۔

۳۳۔ ہی میں بیگم میں کانگریس کا جلسہ ہوا۔ اس کے صدر رگاندھی جی تھے۔ اس جلسہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا کانگریس کی کمر کے لئے کھد ر کاتنے کی شرط رکھی جائے یا نہ رکھی جائے؛ اکثر لوگ اس کے خلاف تھے اور جوامی تھے وہ چرخہ کاتنے کو رواج دیے تو جوامی تھے مگر اس کے خلاف تھے کہ اس کو شرط کے طور پر رکھا جائے۔ مولانا جومر نے اس شرط کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے "چرخہ کو شرط طبعی ہونا چاہیے جو انتہائی مقدار کی کم از کم قربانی ہے۔ اگر کوئی جرمن پر دینر اپنے طویل نام کے ساتھ کہہ دے کہ چرخہ آزادی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے تو چرخہ کاتنے میں جوش پیدا ہو جائے اور اس وقت ہندوستان بلا پس و پیش چرخہ کو قبول کرے مگر چونکہ یہی بات ایک ہندوستانی نے کہی ہے اس لئے لوگ شک کرتے ہیں۔"

فسادات کوٹاٹ

کوٹاٹ میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ ہندوؤں کو شکایت تھی کہ مسلمانوں نے زیادتی کی اور مسلمانوں کو شکایت تھی کہ ہندوؤں نے زیادتی کی۔ کانگریس کا ایک وفد جگاندھی جی اور مولانا شوکت علی مشق تھا کوٹاٹ روانہ ہوا۔ حکومت نے وہاں جانے نہ دیا۔ چنانچہ راولپنڈی میں وفد نے شہادتیں لیبنی شروع کیں۔ مسلمان دوچار مگر ہندوؤں کی ایک جماعت نے گواہی دی۔ رپورٹ شائع ہوئی تو جگاندھی جی نے مسلمانوں کو قصور وار ثابت کیا اور مولانا شوکت نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیانات مادی طور پر نہیں ملے جاسکے لہذا اس رپورٹ بنابر مسلمان قصور وار ثابت نہیں کئے جاسکتے۔ بقول مولف سیرت محمد علی :-

در گاندھی جی نے اس اختلاف کو شرافت کے ساتھ برداشت کیا اور شوکت صاحب نے وفاداری کے ساتھ اختلاف کیا مگر ہندو پر میں اک آگ لگ گئی اور آفت برپا ہو گئی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر نے اس معاملے میں بھی بہتر کردار ادا کیا اور وہ بات کہی جو ہر اس سچے محب وطن کو کہنا چاہیے جس کے سامنے ملک کی آزادی کا سوال ہو۔ آپ نے پنجاب پر داخل خلافت کانفرنس میں مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”یہ وقت نہیں ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے سر الزام تھوپے بلکہ موزوں ہی ہے کہ ہر شخص اپنے ہم مذہبوں کو متنبہ کرے۔ اس لئے فسادات کو باٹ کی جتنی ذمہ داری مسلمانوں کے سر ہے میں انہیں ملامت کرتا ہوں۔“

مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابل تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پرپس مولانا کے اس رویے کو منظرِ استعجاب و حیرت اور مزاجِ عقیدت و اذکارِ مگر ہندو دعا اور پرپس سپہِ مصلحت و امیرِ سکونت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ کہتے رہے کہ مولانا جوہر پر گاندھی جی کا سحر ہے اور اہل اسی سرزمینِ شہرِ ملا کہ ہندو پرپس یہی ضرور کہہ دیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے۔ لیکن مولانا اپنے اور پرپس کا یہ سلوک دیکھتے اور سنتے کے باوجود ہمال کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرتے کہ میں بھی بخل نہیں کرنا چاہتا کہ گاندھی جی کا رویہ بھی مضفانہ رہا۔ انہوں نے بھی تحریکِ خلافت میں جو خواص اسلامی تحریک بنتی بھر پور حصہ دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا نقطہٴ معراج تھا

اور اپنے وقت پر پختگی کی ہو رہی تھی جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں غیر مقبول ہو رہے تھے

۱۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو قومی ہفتے کے سلسلے میں دھرم ساجی جیدی میں کانگریس کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا جوہر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

چهار کی طرح قائم ہیں حاضرین کی تعداد و جرت انجہ حنا تک کم تھی۔ مولانا جوہر نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”آج کے جلسہ میں بہت کم حاضری ہے مگر اس افسردگی کا اثر ان لوگوں پر کچھ نہیں پڑ سکتا جو اپنے عقیدہ اور رائے پر پابندی کی طرح قائم ہیں۔ اگر آج صرف بیلا دو آدمی ہوتے تب بھی جلسہ کیا جاتا اس وقت تک ہم لوگ برا برا اپنی کوششوں میں مصروف و مشغول رہیں گے جب تک ہم اپنی رائے اور عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ آج جو افسردگی اور اضمحلال آزادی کی تحریک میں پیدا ہو گیا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ ہمیشہ ہر ملک میں تحریک آزادی کو تشبیہ و فراز سے گزرنا اور بہت دیر بعد ہی سے دو چار ہونا پڑا ہے۔“

اور سیاسی میدان میں یہ جو درد اور افسردگی کیوں پیدا ہوئی اس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔

سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ”ریاست“ کا مولانا سے اکثر اختلاف رہتا اور کئی دفعہ اس

ریاست کا اعتراف

اختلاف میں خاصی تلخی اور کشیدگی پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس کے باوجود مفتون صاحب نے مولانا جوہر کی غویوں کا جو اعتراف کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے وہ لکھتے ہیں:-

”گو آج عدم تعاون کی تحریک ہو جانے کے باعث ہندوستان کے سیاسی آسمان پر مہاتما گاندھی اور ان کے رفیقوں کا علم بلند نہیں ہو رہا ہے اور ملک کے اندر شدھی و تبلیغ کی موجودہ افسوسناک گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں مگر ملک کے محترم لیڈر مولانا محمد علی کی قابلیت، خلوص اور قومی خدمات کی یاد لوگوں کے ذہن میں اس وقت تک محفوظ رہے گی جب تک کہ ہندوستان کے رہنے والوں کے دلوں میں حریت و آزادی کے خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔“

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب انہیں علامہ اقبال سے بھی سخت اختلاف ہوا۔ چنانچہ انہوں نے ہمدرد کے کاموں میں مسلسل لکھا ان صفحات میں اس کے خلاصے کی بھی گنجائش نہیں۔ اس کے لیے ہمدرد کے فائل اور ڈسیرت محمد علی کا مطالعہ کیا جائے بطور نمونہ صرف دو مختصر عبارتیں پیش کی جاتی ہیں:-

”اب اگر غلامی سے نکلنا ہے تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ ہم تم ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا بڑا ذکر کریں ایک دوسرے کی طرف سے جو اذیت زبان سے یا ہاتھ سے پہنچتی ہے اس پر صبر کریں مگر اس غلامی کو ہرگز برداشت نہ کریں جس میں تم بھی سو ڈیڑھ سو برس سے مبتلا ہو اور ہم بھی اور جو لقیہ بنو راج سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے اور مسلم رواج سے بھی۔“

نہ ڈاکٹر اقبال صاحب اسے ہمارے مریض کا علاج سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو صبر کی تلقین کریں اور ان سے کہیں کہ گویا یقین اس پر ہے کہ تمہیں خدا کی خاطر ساری

دشمن منتخب کر لو

خدا ہی سے لڑنا پڑے گا لیکن تم ایک ہی وقت میں ساری دنیا سے نہیں لڑ سکتے دشمنوں میں سے ایک کو چھانت لو جسے تم ”اڈا ٹیٹا نام“ سمجھتے ہو جو تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ قوی ہے اگر ہو سکے

سہ ہستی سب سے بڑا دشمن۔

تو اس کے خلاف اور دل کو اس طرح اپنا حلیف بنا لو، جس طرح رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے
یہ شرب کے یہودیوں تک کو مشرکین مکہ کے خلاف اپنا حلیف بنا لیا تھا، اگر کوئی جماعت بھی تمہارے یا
تمہارے رام ہو کر تمہاری حلیف بنیں سکے تب بھی ہر محاذ جنگ پر یکساں زور نہ لگاؤ اور محاذوں پر صرف
مددِ خلافت کرتے رہو اور جس محاذ پر جہاں جنگ کا فیصلہ ہونے والا ہے پورا زور صرف کردو اور جبکہ ضبط
سے کام لو، جب سب سے بڑے محاذ جنگ پر فتح حاصل ہو جائے گی اور اس وقت ایک ایک کر کے سر زمین
سے دل کھول کر انتقام لے لینا یہ نامرئی نہیں ہے بلکہ اس کو عزم کہتے ہیں۔

الدر انتقام کون ہے اگر چین و عرب بھی تمہارا ہے اور ہندوستان بھی تمہارا ہے اور تم سب
مسلمان ہو اور سارا جہان تمہارا وطن ہے تو اس دشمن کو الدار انتقام سمجھو
جو سارے جہان پر حامی ہونا چاہتا ہے یقیناً وہ دشمن ہندو نہیں ہے اس غریب کی تنگ و دو نو سمندر
کے کنارے تک ہے یہ گو کہ کامیاب ہو گا جس کی ساری دنیا اس گولہ میں محصور ہے ایمان سے کہو کیا تم
اس سے مخالفت ہو؟ ریل میں کسی ڈبر میں چھ رات ہندو ہوں اور ان میں تم بھی جا کر بیٹھ جاؤ تو کیا تمہیں
ان سے ڈر گئے گا بعض اوقات تو انہیں کو تم سے ڈر گئے ہے البتہ اگر اس ڈبر میں دو چار گورے ہوں تب
تو تم کو اور ان کو دونوں کو ڈر لگتا ہے کہ یہ ماریں گے یا سامان پھینک دیں گے یا گالی دیں گے یا پاؤں
دبو انہیں گے۔

اب اس پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ پڑھیے۔

”کانگریس کی حمایت میں، انگریزوں کی مخالفت میں، ہندو مسلم اتحاد کی موافقت میں اس سے بڑھ کر کچھ کیا
جا سکتا ہے؟ یا کسی بڑے سے بڑے مدبر نے ایسے نفسیاتی دلائل کبھی پیش کئے ہیں؟“

مولانا ندوی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد دم ہوتا گیا اور اختلافات
منج دیے جوتی چلی گئی اس کے لیے ایک ”یونٹی کانفرنس“ دہلی میں اور ایک شکل میں منعقد ہوئی۔
میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہوئے۔ کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے مولانا نے یہ کوشش کی کہ کسی طرح فیضان پیدا ہو
جو تحریک خلافت میں تھی لیکن اب نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں مبنی و کشیدگی بڑھتی رہی گا نہ صحیح
آدمی بھی یہ کہہ کر کہ ”اب میری بات کوئی نہیں سنتا“ اپنے آئرم میں پلے گئے۔

شریٹ حسین نے پہلی جنگ عظیم میں جس طرح ترکوں، اسلام اور قیاد اسلام سے غدار کی اس کا ہر ایک
مسئلہ حج و حجاز علم ہے۔ اس کی غداروں سے عالم عرب ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ ان حالات کو دیکھ کر عبدالعزیز ابن سعود
شریٹ حسین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ انگریز شریٹ حسین کے طرفدار تھے۔ انگریز کی خاطر انہ پانچوں۔ شریٹ حسین نے
حمایت کے باوجود ابن سعود کا مایاب جوئے اور حجاز کے باشندوں نے شریٹ حسین کے مقابلے سے تنگ آکر ابن سعود کو سیاح محمد

کران کا ساتھ دیا۔ حج کا موسم آ رہا تھا۔ انگریزی حکومت چاہتی تھی کہ اس سال ہندوستان سے حاجی حج کے لیے نہ جائیں کہ وہاں فسادات ہیں اور لڑائی ہو رہی ہے اور اس سلسلے میں ایک اعلان جاری کیا۔ مولانا محمد علی نے اس اعلان کی مخالفت کی اور کہا کہ حاجیوں کا جانا کسی صورت میں ملتوی نہیں کیا جاسکتا حجاج کرام بھی پہنچنے لگے بالآخر حکومت کو جھکنا پڑا اور اس نے حاجیوں کو جانے کی اجازت دی۔ شاہ ابن سعود مرحوم نے حجاج کرام کی جان و مال کے تحفظ کا وعدہ کیا اور حجاج بخیر و عافیت واپس آئے۔

آؤ پریش نجد و حجاز شاہ ابن سعود مرحوم اور شریف حسین کی لڑائی کا ہندوستان پر بھی اثر پڑا ہندوستان میں "بریلی" اور فرنگی محل "سے فتوے شائع ہونے لگے کہ شریف حسین سید زادہ اور نجیب اللطیفین ہے اور

شاہ ابن سعود بوہلانی "ہے اس کو ہٹا کر خود حجاز پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا محمد علی شاہ ابن سعود کے حامیوں میں سے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شریف حسین کو اس کی بدکرداریوں کی سزا ملنا چاہیے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کو اس حمایت کرنے پر "بریلی" اور "فرنگی محل" دونوں جگہ کی مخالفت کرنا پڑی۔ "بریلی" سے مخالفت تو خیر ان کو آسان تھی۔ لیکن فرنگی محل سے مخالفت کا رے دارد" تھی کیونکہ یہ ان کا پیر خانہ تھا۔ فرنگی محل کے علمائے تحریک خلافت میں جو حصہ لیا تھا اس کی بناء پر یہاں کے علماء و مشائخ کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن مولانا کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے حق کی خاطر بریلی سے لڑائی تو خیر اسی ہی فرنگی محل سے بھی لڑائی لڑی۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل۔ مولانا جو ہر کے مرشد تھے اور مرشد و شیخ سے اختلاف و مخالفت کرنا کتنا مشکل ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اور مخلص احباب سے اختلاف بھی مشکل ہوتا ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں اپنے مرشد سے بھی اختلاف کیا اور اپنے مخلص احباب مولانا عبداللہ عبداللہ بنی، مولانا انشاد احمد کانپوری اور اپنے محسن ویرینہ راجہ محمود آباد سے بھی مخالفت مولی۔ اور اپنے دعوے کو خوب صفائی اور مضبوطی سے پیش کیا اور ان کے موقف و مسلک کے دلائل کو پارہ پارہ کیا اور مذہبی اختلافات میں لوگ جہاں تک جاتے ہیں مولانا کے بارے میں لوگ وہاں تک گئے گالیاں دی گئیں۔ بٹوانے کا سامان کیا گیا۔ ہر طرح ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ قتل تک کے منصوبے بنے۔ لیکن مولانا جو ہر تھے کہ اپنے مسلک و موقف پر سوجان سے اڑے ہوئے تھے اور اس میں کسی قسم کی لچک لانے کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ ان کے اپنے اشتیاق ہیں اور ان کے مسلک و باطن ان کا عمل تھا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا مے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہوساری خدائی بھی مخالف کافی ہے اگر ایک خدا مے لیے ہے

پنجاب میں اترار کا گروہ بھی ان کا حمایتی اور احرار کو بھی ان سب مراحل سے گزرنا پڑا جس سے جو گزرے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا فاطمہ علی خان مولانا مسیح محمد داد و غفر غفری اور مولانا غلام رسول قمر نے اس سلسلے میں جو کام کیا وہ بھی اپنی نلیہ نہیں رکھتا۔ یہ سلسلہ بدستور چل رہا تھا اور افواہوں پر افواہیں اڑ رہی تھیں۔ یہاں تک افواہ گرم ہوئی کہ وہابی حکومت نے وہاں تمام خارجیہ ناظر گرانے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گنبد خضر بھی گرا دیا ہے۔ اس بات کے پھیلنے اور سننے پر مولانا جو ہر کو شاہ ابن تود سے اختلاف ہو گیا۔ شریف حسین کی مخالفت میں وہ شاہ ابن سعود کے ساتھ تھے۔ فقیہ اور مرآت گرانے پر شاہ ابن سعود کے نفالت ہو گئے۔ اس طرح اترار، مولانا آزاد اور مولانا جو ہر میں اختلاف ہو گیا۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی مدد سے دہلی میں کلاس

احزاب اسلام کے تمام زعماء شریک تھے، خلافت کمیٹی سے یہ تجویزیں منظور کر لیں کہ مکہ میں تمام عالم اسلام کی کانفرنس بلائی جائے اور اس میں یہ مسئلہ رکھا جائے اگر مؤتمراً متفقہ فیصلہ ہو کہ سبازوں کی مرمت کرائی جائے تو شاہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کا فیصلہ مانے نیز یہ کہ مجاز پر ملکیت نہ ہو۔ شاہ ابن سعود نے وعدہ کیا کہ وہ عالم اسلام کے نمائندوں کی بات مانیں گے۔ اور انہوں نے یہ بھی عذر کیا کہ مزارات کی شکست وغیرہ میرے حکم سے نہیں ہوئی بلکہ داخلہ فوج کے وقت اضطراراً ہو گئی۔

بہر حال اس قسم کی افواہوں کی بناء پر پورے عالم اسلام میں ایک کھرام برپا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں بھی یہی کیفیت تھی جوشیے، جذباتی مبتدعین کہتے تھے کہ یہ لوگ کشتی اور قابل گردن زدنی ہیں شریف حسین کی ناکامی اور شاہ ابن سعود کی کامیابی سے چونکہ حکومت برطانیہ کے ذخائر و غلبہ کو کافی دھکا لگا تھا۔ لہذا اس کی حکمت عملی کا اتفاق ضابطہ بھی یہی تھا کہ شاہ ابن سعود کی مخالفت زیادہ ہو اور عالم اسلام میں ایک ایسی تحریک اٹھے جس کا ابن سعود مقابلہ نہ کر سکے۔ اور اس کی فتح شکست میں تبدیل ہو جائے اور پھر اس کی جگہ اپنے خاص نعروں کو اٹھایا جائے۔ ابن سعود کے وعدہ پر مولانا محمد علی جوہر نے جو اس کی حمایت سے ہٹ کر مخالفت پر آگئے تھے، یہ لکھ کر رفع نزاع کی کوشش کی کہ ابن سعود کو موقع دو کہ وہ اپنے وعدہ کا ایفا کر سکے۔ اسے مؤتمراً اسلام بلانے دو۔ وہاں جا کر اس سے مطالبہ کریں گے۔

اس دوران میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں مخالفین سعود نے برابر کئی جلسے کر کے مسلمانوں کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ شاہ کی حمایت میں جلسہ کرنا مشکل تھا۔ ایک ایسے ہی جلسہ میں مولانا عبدالرزاق یحییٰ آبادی مولانا آزاد کے خاص نیاز مند، کو قتل کرنے کے دوران میں دھکے دے گئے ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اس کا سر قلم ہونے کا جی خوش ہوگا، ایک جلسہ دونوں گروہوں کا مشترکہ قرار پایا مولانا محمد علی اس میں تقریر نہ کر سکے۔ ایک جلسہ اور ہوا اور اس کو خراب کرنے کی بید کوشش کی گئی۔ لہذا رئیس احمد جعفری :-

اتنے میں سبازوں کی تعداد میں چاروں اور پارسیوں کا ایک لٹھ بند گروہ آیا۔ سینہ پر "خدام الحرمین" کے پتے لگے ہوئے تھے۔ وہ سب بد زبانیاں کرتے ہوئے آئے اور مل اور پارک کو گھیر کیا اور داخلہ کی کوشش کی جس کی مداخلت کی گئی اور وہ داخلہ ہو سکے۔

بالآخر یہ جلسہ بھی ملتوی ہو گیا۔ لیکن آخر مولانا نے قابو پا ہی لیا اور لکھنؤ کی اکثریت مولانا کی خواہ گئی۔

خلافت کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں اپنی پالیسی متعین کر دی کہ وہ یعنی خلافت کمیٹی حجاز پر ملکیت اور شخصیت نہیں چاہتی نیز منہدم شدہ مقابر کی از سر نو مرمت کرائی جائے۔ تاکہ یہ ہنگامہ نہ ہو اور شاہ سعود کو عالم اسلام کی تائید و حمایت سے شدید حسین کے اثرات ختم کرنے کا موقع مل سکے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد خبر آئی کہ سلطان ابن سعود نے حجاز کے باشندوں کے مجبور کرنے پر بادشاہت قبول کر لی ہے۔ مولانا نے ”جمہور“ میں اس خبر کو سیاہ حاشیہ لگا کر شائع کیا اور اس کے بعد وہ سلطان کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔ لیکن اس مرتبہ پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنجاب کی خلافت کمیٹی نے مولانا کو ہر سے اختلاف کیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہمارے پاس اخلاقی قوت تھی جس کے سہارے ہم اس کو بادشاہت سے روک سکتے تھے۔ اب جبکہ اس نے اس اخلاقی دباؤ کو قبول نہیں کیا اور اپنی سلطانی کا اعلان کر دیا تو سوائے اس کے کیا کیا جا سکتا ہے کہ اپنی کوششیں برابر جاری رکھی جائیں لیکن ایسا کوئی قدم نہ اٹھایا جائے جس کی وجہ سے شریف حسین جیسے لوگوں کو دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کا موقع مل سکے۔ یہ بجا نہ سلطان نے وعدہ خلافت کی لیکن وہ شریف حسین سے بدرجہا اچھا ہے۔

۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود نے عالم اسلام کی موتمر بلائے کا اعلان کیا اور تمام عالم اسلام کے نمائندے شاہ کی دعوت پر گئے شاہ نے موتمر کا افتتاح کیا مولانا محمد علی نے اس موتمر میں سلطان کو اس کے موعید یاد دلانے اور پر زور الفاظ میں یہ بیان کیا کہ اسلام میں شورا نیت ہے ملکیت و فیصرت نہیں۔ اور ہر وہ بات جو مولانا کے نزدیک حق و صواب تھی۔ اس کا برملا اظہار کیا اور اس میں سلطان کے جلال و جبروت سے رافتا نہیں ہوئے۔ اس موتمر میں خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت سید سیامان ندوی نے کی علی برادر اس کے ممبر اور شعیب قریشی میکرنی تھے۔ جمعیت علماء ہند کے وفد کی قیادت حضرت مولوی کفایت اللہ دہلوی نے کی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی بھی اس موتمر میں شریک ہوئے۔ ان ہر دو حضرات کی علمی و فقہی تقریروں نے پورے عالم اسلام کے نمائندوں کو متاثر کیا۔

اس پیشل خلافت کانفرنس میں چھ گز چکا ہے کہ شریعت کی تحریک اور اس مقابلہ میں مسلمانوں کی جانب سے جیلانی مہم کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے گڑبگڑ گئے تھے کہ گاندھی جی بھی اپنے آشرم میں ”منکف“ ہو گئے تھے۔ مہاسیہا کے لیڈر شریعتی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگریس کے ہندو زعماء ان حالات میں مضرب تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے مشن میں لگے ہوئے تھے اور برابر ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دے جا رہے تھے۔ یونہی کانفرنسیں کہیں۔ انہوں کی مخالفت مول۔ لی۔ ہندو لیڈروں سے اپنے درجہ سے گہرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اردو سرسے بڑوں کی میت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ ہر سکوت کو توڑ کر مہاسیہا کے لیڈروں کو سمجھانے کوشش کریں لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بناء پر یہ جرات نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرات کی کہ وہ ڈاکٹر مونجے۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ اور دوسرے ایسے لیڈروں کے اتفاق کا پردہ چاک کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پرپریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پرورد کوششوں پر سکوت اختیار کئے ہوئے تھا اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرتے لگے تھے مولانا کے خلافت زہر چکانے کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آگیا اور مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا پیشل اجلاس بلایا۔

جو حکیم اجل خاں کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اور اس میں مسلم زعمائے بالافتاق اتحاد و اتفاق کی دعوت دہی اور کہا گیا کہ آزاد دہی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دست تعاون بڑھا رہے ہیں اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دست کا ہاتھ بھیجیں جو مصافحہ کے لیے بڑھا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے۔ اس کافرنس کے بعد مولانا جوہر وفد حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ :-

”یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاؤں آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہندو کو مشتعل ہونے کا موقع دیں میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ چھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔“

آل پارٹیز کانفرنس

مولانا محمد علی جوہر عمر کے لحاظ سے اب اس دور میں ہیں۔ جب کہ انسان کے فوٹی مضمحل اور کمزور شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو ذہن متقل عام رہے تھے۔ خانگی پریشانیات بھی ان حالات کے باوجود وہ اپنے مشن میں برابر کوشاں تھے۔ لیکن ہندو مسلم فسادات اور اتحاد کو نقصان پہنچانے والے حوصلہ شکن واقعات و حالات نے مولانا کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ لیکن آپ نے اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ مولانا اور مولانا کے خیال ساتھیوں نے ایک وفد چھ کوشش کی کہ آل پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں ملک کی تمام قابل ذکر جماعتوں کے زعماء ہوں۔ یہ کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن نتیجہ دہی ڈھاک کے تین بات۔ ہر طرف سے حوصلہ شکنی ہوئی۔ مگر گاندھی ابھی تک اپنے ان آشرم میں متکف ہیں اور تقریباً بالوس ہو چکے ہیں۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد ہر مرحلے پر نئی انگلوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ پورے ہندوستان میں مولانا جوہر اور مولانا آزاد دو شخص ایسے ہیں جو روح فسادات کے باوجود نہ اس ہونے اور نہ کام کو ناچوڑا۔ اگرچہ دونوں بزرگوں کے کام کو نہیں تقویٰ بہت فرق رہا۔ لیکن مشن دونوں کا ایک رہا۔ شعلہ یونٹی کانفرنس کی طرح یہ کانفرنس بھی ملتوی ہوئی۔ اور اس کو ملتوی کرنے کے لیے بھانڈ بنانے والوں نے یہ بھانڈ بنایا کہ حالات ابھی سازگار نہیں ہیں۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آیا۔ اور اس کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نے گذشتہ اصلاحات سے کیا فائدہ اٹھایا اور آئندہ جدید اصلاحات کیا کی جائیں مطلب یہ کہ انگریز ہندوستان کو اصلاحات دینے کے پھر میں رکھنا چاہتے تھے بقول رئیس احمد جعفری :-

”ہندوستان کو پھر ”مجلس آئین و اصلاح و رعایت حقوق“ کا شیریں مگر ”خواب آور“ شربت پلا دیا جائے تاکہ ایک عرصہ دراز تک یہ سرخ زہرین بال اسیر دام رہے۔“

انگریزوں نے اس کمیشن کا مکمل طور پر بائیکاٹ کیا لبرل حضرات جو اب تک تذبذب میں تھے وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ اس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے حتیٰ کہ تعلقہ دار قسم کے لوگ مساراہر محمود آباد اور راہہ کالا کٹر بھی اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ حکومت نے بائیکاٹ

دیکھا کہ ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے اس کی مخالفت پر کمر باندھ دیا ہے۔ تو اسمبلی کو نسل آف سٹیٹ اور ہر ہر صوبہ کی طرف سے ایک دوسرا "سائنس کمیشن" بنا دیا جس کے صدر سر سکران مائر تجویز ہوئے۔ حکومت کو امید تھی کہ اب اس کمیشن سے کم از کم لبرل حضرات پھر مستدل ہو جائیں گے مگر اس کی بھی ہر جانب سے شدید مخالفت ہوئی۔

سر شفیق مرحوم کمیشن کے حامی تھے اور انہوں نے قناد کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ اسی زمانہ میں سر شفیق کم لیک کی صدارت کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔ لیگ کو نسل کے صدر قائد اعظم تھے۔ اور اجلاس کے صدر سر شفیق مقرر ہوئے۔ دونوں کے افکار میں سخت تضاد تھا قائد اعظم سائنس کمیشن کے مخالف تھے۔ مقام اجلاس کلکتہ مقرر ہوا تھا مگر سر شفیق لاہور کے لیے مصر تھے۔ دونوں صلح کرانے کی کوشش کی گئی مگر نتیجہ بے سود رہا۔ مسلم لیگ دو ٹکڑے ہو گئی۔ سر شفیق نے لاہور میں اجلاس بلایا اور اپنی جماعت کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا۔ یوں بعد میں شفیق لیگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ قائد اعظم نے کلکتہ میں اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت سر محمد یعقوب نے کی۔ قائد اعظم اس پٹوارہ سے سخت پریشان تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں اجلاس نا کام نہ ہو۔ مولانا محمد علی جوہر کو بھی خوف تھا کہ کہیں کلکتہ میں سر شفیق کے حامی غلبہ نہ پالیں۔ چنانچہ وہ مدلاس کا مگر اس کا اجلاس نامکمل چھوڑ کر کلکتہ پہنچے اگرچہ مولانا ان دنوں حکیم اعلیٰ خاں کی وفات کی خبر سے دیوانہ تھے تاہم "دیوانہ بکا رغزیش ہو شیوار" کے مصداق آپ کلکتہ پہنچ گئے۔ اور دوسرے نمبر سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی "مدد" کے لیے پہنچ گئے۔ اور تینوں حضرات نے مل کر مسلم لیگ کے اجلاس میں نہ صرف سائنس کمیشن کے بائیکاٹ کی تجویز منظور کرائی بلکہ (بشرائط) مخلوط انتخاب کی حمایت بھی منظور کرائی کہ جس سے بقول رئیس احمد جعفری:

"ابھی سر طہ جاج بھی مانوس نہیں ہوئے تھے"

قائد اعظم نے مولانا جوہر سے بہت کہا کہ مخلوط انتخاب کی تجویز نہ کرائیے کہ اس سے مزید انتشار ہوگا مگر مولانا جوہر کا موقف تھا کہ جو تجویز مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتی ہے اور جسے ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خاص طبقوں میں بمشکل منظور کر لیا ہے اب مسلم لیگ کے جلسہ عام میں کیوں نہ پیش کر کے منظور کرائیں۔ سائنس کمیشن کا پورے ہندوستان نے بائیکاٹ کیا مگر شفیق لیگ کی وجہ سے پنجاب میں اس کا بائیکاٹ نہ ہوا بلکہ استقبال کیا گیا۔ اخبارات ان حمایتیوں کی جھوسے بھرے پٹے تھے مگر یہ لوگ رمضان شریف میں سائنس کمیشن اور اس کے رفقہ کو ڈر دے رہے تھے۔ مولانا محمد علی یہ حالات دیکھ کر پنجاب آئے اور انہوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ پنجاب کے احرار ہر جگہ ان کے ساتھ رہے۔

اسی طرح ہمارا بھائی محمود آباد کی دعوت پر مولانا لکھنؤ گئے اور انہوں نے پینڈت بھوہر لال نہرو۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کی معیت میں جلت کیا اور کامیاب رہے۔

سفرِ یورپ برائے بحالی صحت

ملکی مسائل کی کثرت اور دن رات کے مسلسل کام نے مولانا کو بہت کمزور کر دیا ان کی صحت جواب دینے لگی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آپ آرام کریں لیکن آدمی قسمت میں کہاں۔ بالآخر احباب کے مجبور کرنے پر یورپ جانے کا ارادہ کیا مگر اس کے وسائل نہ تھے۔ ہمارا بھائی محمود آباد جو مولانا کے بھوک رہ گئے تھے انہوں نے مصارف کی ذمہ داری اٹھائی مولانا اس کے لیے تیار نہ تھے لیکن ڈاکٹر انصاری اور مولانا شوکت ٹانوی نے یہی سہارا دیا کہ اسی پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے کہ ایک محبِ خلیفہ کی جانب سے ہوئی ہے چنانچہ آپ آمادہ ہو گئے۔

روانگی سے بیشتر امیر شریف کے آستانہ پر حاضر می دی۔ پھر احمد آباد گاندھی جی سے اور آلو پٹا پر ہمارا بھائی اور سے کچھ ضروری

بائیں اور سر سے کر کے بمبئی سے روانہ ہو کر پیرس پہنچ کر ڈاکٹر دوس سے ضروری معلومات اور طریقہ علاج دریافت کیا چونکہ علاج ابھی شروع نہ ہوا تھا لہذا کھانسنے پینے کے معاملے میں خوب بندوبست کر دیا۔ اور پھر ایک ڈاکٹر سے علاج شروع کیا۔ ذیابیطس میں اگر چھوڑے پھنسیاں نکالنا شروع ہو جائیں تو ہلاکت کا سبب بنتی ہیں۔ کیونکہ شوگر کی کمی کی وجہ سے زخم بھرتے نہیں آپ کے دباؤ نکل آیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا اور آپ محتیا ب ہونا شروع ہو گئے۔ لیکن مولانا اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ اسی عمر، اسی مرض اور اسی حالت میں ان کے چچا زاد بھائی اور خسر کا انتقال ہوا تھا۔ اور اسی مایوسی کی بناء پر آپ نے بیگم اور مولانا شوکت علی کو بلا بیجا اگر وہ پہنچ جائیں تو آخری دیدار ہو جائے۔ وہاں رہنے والے اعزاء کو نماز جنازہ بھی سکھا دی کہ میری نماز جنازہ اس طرح پڑھانا۔ لیکن اللہ کو ابھی منظور نہ تھا۔ آپ کی اکثر شکایات رفق ہو گئیں۔ اگرچہ دن اور ٹھہر کر علاج کراتے تو کھل صحتیا ب ہو جائے۔ لیکن ہلکہ ملک میں منرو رپورٹ کے شائع ہونے پر جو سخت اختلاف ہوا اس نے آپ کو مجبور کر دیا کہ فوراً وطن واپس ہوں۔ آپ نے اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے زار و نزار حالت میں حاکم علاقہ کے راستے عازم وطن ہو گئے۔

منہر و رپورٹ

دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس کے التوا پر فیصلہ ہوا تھا کہ ممی کے آخر میں بمبئی میں ایک بار پھر اس اجلاس بلایا جائے۔ چنانچہ اجلاس بلایا گیا۔ لیکن اس میں ملک کی جماعتوں نے حصہ نہ لیا۔ اور صوبہ گاندھی جی۔ موتی لال منرو۔ ڈاکٹر انصاری۔ منراپنی پسند اور مولانا شوکت علی شریک ہوئے۔ گاندھی جی نے پھر تجویز التوا کر دی اور کہا کہ ایک کمیٹی بنا دی جائے جو لارڈ برکن ہیڈ کے چیئنگ کا جواب تیار کرے اور ایسا دستور اسامی وضع کرے۔ سارے طبقے متحدہ متفق ہو سکیں۔ مولانا شوکت علی اس کی زبردست تائید کی۔ چنانچہ ایک کمیٹی بنا دی گئی جس کے صدر منرو اور ارکان بن مٹھیب قریشی، منراپنی۔ مٹھجیکر۔ سمبھاش چندر بوس اور سردار منگل سنگھ شامل تھے۔ اس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی اس کے تیار ہونے پر آل پارٹیز کانفرنس "کھنٹو طلب کی گئی اور خلاف توقع اس میں اکثر جماعتوں کے نمائندے شامل ہوئے۔ ہندو مہاسبھا کے اتانیم تلاڈ لال لاجپت رائے، پنڈت مالوی اور ڈاکٹر موہنجی ان میں شامل تھے۔ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں شروع ہوا۔ پہلے اجلاس میں رپورٹ تیار کرنے والوں کی محنت و عرق دینے پر انہیں مبارکباد دی گئی۔ اور دوسرے اجلاس میں یہ رپورٹ جو منرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی منظور کی گئی اور پیش ہوئی۔ رپورٹ جب پڑھ کر سنائی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں مسلمانوں سے پورا انصاف نہیں کیا گیا۔ مولانا شوکت علی نے اس وجہ سے اختلاف کیا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر بیلورپ سے واپس آئے تو انہوں نے بھی خلاف کیا اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکہ کا زار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی۔ مگر مسلمانوں میں دو بڑی بن گئیں۔ اس آل پارٹیز کانفرنس میں منرو رپورٹ کی حمایت میں کانگریس بھی۔ برسر حضرات تھے۔ ہندو مہاسبھا فتنی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت فتنی گاندھی جی جو اب تک خاموش تھے اس مرحلے پر منرو رپورٹ کے منظور ہونے پر انہوں نے اس کے نامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی شوکت علی جنہوں نے ہر مرحلے پر کانگریس کا ساتھ دیا تھا اور اپنوں کی گالیاں سنی تھیں اس کے اختلاف کو کانگریس نے پرکھ کر کی حیثیت بھی عدی اور ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔

منرو رپورٹ کے مندرجات کیا تھے؟ اس کی تفصیل ہم یہاں پیش کرنے سے قاصر ہیں لیکن ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔

مسلمانوں کی مسلسل پیچ و پکار پر صدر کانگریس نے اعلان کیا کہ وہ اس زمانہ میں ایک نیشنل کنونشن کا اجلاس بلا کر تمام اختلافات رفع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کنونشن میں تمام جماعتوں کو نمائندے منتخب کر کے بھیجے کی اجازت دی گئی تھی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء ہند نے متفقہ طور پر مولانا جوہر کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ سب سے پہلے مباحثہ ڈومینین سٹیٹس کے اصول پر ہوا کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ سب سے گیتانے اس کی حمایت میں تقریر کی اور کہا کہ اسے درمیان منزل سمجھ کر قبول کر لیا جائے اور مکمل آزادی کی طرٹ قدم بڑھایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا جوہر نے تقریر کی اور اس نظریہ کی مخالفت کرتے ہوئے آزادی کامل کی حمایت کی اور کہا کہ کانگریس نے گزشتہ سال آزادی کامل کی جو تجویز پاس کی ہے اسے ہرگز فراموش نہ کیا جائے اور تقریر کی۔ وہیں یہ بھی منہ سے نکل گیا کہ جو لوگ آزادی کامل کے مخالفت اور دربر استعمرات کے حامی ہیں وہ ملک کے بہادر فرزند نہیں ہیں بلکہ بزدل ہیں۔ اس پر ایک شور اٹھا اور ہر طرف سے آوازیں اٹنے لگیں کہ ”محمد علی بیٹھ جاؤ“ ”ہم نہیں سننا چاہتے“ مگر مولانا نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس کے بعد اور تقریریں ہوئیں جن میں سے اکثر دربر استعمرات کی حمایت میں تھیں۔ مباحثہ ابھی جاری تھا کہ منبر کا وقت آ گیا مولانا نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ دربر استعمرات پاس ہو گیا۔ اور بحث ختم ہو گئی۔ مولانا نے اٹھ کھڑے اور اٹھ پڑھ کر واپس آئے۔ اس کے بعد ایڈیٹر پارک میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں مولانا نے زبردست تقریر کی۔ ہنز پورٹ کے حالات بیان کئے۔ ممالک اسلامیہ کے تنازعات پیش کئے۔ اس کے بعد سیاسیات وطنی ضرور پورٹ وغیرہ پر مفصل تبصرہ کیا اور کانگریس میں اپنی علیحدگی کے اسباب بتائے۔ اور فرمایا کہ اب ہم اس وقت تک کانگریس سے تعاون نہ کریں گے جب تک کہ وہ ... اتحاد و جدائی۔ منظور نہیں کر لیتی۔ قائد اعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس تک ہنز پورٹ کی مخالفت نہیں کی تھی مگر ابھی گلا لے ضرور پورٹ کی زبردست حمایت کی تھی (مٹھچا گار مسلم لیگ کے سرکردہ رکن تھے، مہاراجہ محمود آباد بھی بہت حامی تھے۔ اور وہ مولانا جوہر کے مقابلہ میں مسلم لیگ کی کرسی صدارت پر اس لیے کامیاب ہوئے کہ ہنز پورٹ کو مسلمانوں سے منوا سکیں۔ سر علی امام بھی ہنز پورٹ کے حمایتی تھے۔ اب ان سب حامیوں نے مل کر قائد اعظم کی سرکردگی میں نیشنل کنونشن کے آخری اجلاس میں شرکت کی کہ اتحاد و جدائی کنونشن کے سامنے منظور کیے لیے پیش کریں۔ قائد اعظم نے اپنے وقت پر زبردست تقریر کی اور محنت و اذیت کے نام پر اپیل کی کہ ان اتحاد و جدائی پر غور کر کے انہیں منظور کر کے اختلافات کا خاتمہ کر دیجئے کہ اس وقت قوم کی ضروریات کا تقاضہ یہی ہے۔ آپ کے بعد مٹھچا جیکر (مہاسبھاٹی لیڈر، نے تقریر کی جب وہ ڈینگ ہوئی تو قائد اعظم کو شکست اور جیکر کو فتح ہوئی۔ سر تیج بہادر پر دے کوشش کی کہ ایسا نہ ہو مگر ان کی ایک نہ چلی اور اتحاد و جدائی منظور نہ ہو سکیں۔

مسلم پارٹیز کانفرنس دہلی

کانگریس اور کنونشن وغیرہ سے جب مولانا جوہر مایوس ہو گئے تو انہوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی کہ آل مسلم پارٹیز کانفرنس بلائی جائے۔ جس میں تمام مسلم جماعتوں کے نمائندے مل کر ایک لائحہ عمل مرتب کریں اور اب اس کے سوا مولانا کے لیے اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کیونکہ کانگریس میں ان کی اس دربر مخالفت ہو گئی تھی کہ کلکتہ کانگریس کے اجلاس میں جب مجلس عاملہ کے ارکان کا انتخاب ہوا تھا تو مدراس کے ایک ممبر نے مولانا کا نام بھی پیش کر دیا۔ اس پر اجلاس میں ”ہمیں نہیں“ کے شور نے گرمی محفل کا سامان پیدا کر دیا۔ ان حالات کے بعد دہلی میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس سر آغا خاں کی صدارت میں شروع ہوئی۔ کونسلوں، اسمبلی اور کونسل آف میٹ

کے علاوہ علم لیگ - خلافت کمیٹی اور جمعیتہ علماء ہند کے سربراہان نے شرکت فرمائی۔ سر شفیق نے دعویٰ کیا کہ یہ کانہ پوری نمائندہ ہے اور بات بھی ٹھیک تھی جس کا نفرنس میں علی بردارہنی اور جمعیتہ علماء ہند کے ارکان شریک ہوں۔ سر شفیق بھی یہی موجود ہوں اور سر آغا خاں کی صدارت ہو وہ کا نفرنس یقیناً نمایندہ کا نفرنس ہوگی۔ رئیس احمد جعفری کے الفاظ میں

”کانفرنس میں سب سے بڑا مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کانفرنس کا نصب العین کیا ہو، سر شفیق اور ان کے ہمنوا حضرات کا جہاں تک تعلق تھا وہ تو اس پر بھی راضی ہو سکتے تھے کہ ”ڈومینین ایشیاس“ بھی نہ رکھا جائے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کم از کم دیر مستمرات کے طلبگار ضرور تھے ان کے ذوق کی رعایت بھی ضروری تھی اور ایسا ممکن بھی تھا لیکن سب سے زبردست مرحلہ یہ تھا کہ محمد علی کی آزادی کے علمبردار تھے اور یہ وہ چیز تھی جسے کانفرنس میں بطور نصب العین پیش ہی نہیں کیا جاسکتا تھا اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی تو سر آغا خاں دہلی میں نہ نظر آتے نہ سر شفیق کی یہ سرگرمیاں ظاہر ہوتی ہیں نہ مسلم لیگ کے سیاستدان بزرگ اس پلیٹ فارم پر نہ شریف رکھ سکتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ محمد علی اس درمیانی راستہ کو قبول کر سکتے یہ ایک ایسا مسئلہ ان پڑا تھا کہ محض دیر کے لیے اندیشہ نہ ہوتا تھا کہ کہیں کانفرنس ہی نہ ختم ہو جائے“

آخر میرے پایا کہ کانفرنس آزادی کے بارے میں کوئی نصب العین مقرر نہ کرے جو جماعتیں یہاں اکٹھی ہوتی ہیں وہ بارے میں اپنے اپنے نظریہ کے مطابق کام کریں اگر خلافت اور جمعیتہ علماء ہند مکمل آزادی کی علمبردار ہیں تو وہ اس کی کوشش کریں اگر دوسری جماعتیں کسی اور نصب العین کو اپنانا چاہیں تو وہ اس کو اختیار کریں۔ یہاں صرف مسلمانوں کے حق اور ان کے موجودہ سیاسی لائحہ عمل کے لیے کوئی مشترکہ پروگرام بنالیا جائے چنانچہ پھر اس نکتہ کو سامنے رکھ کر اجلاس کی کارواں شروع ہوئی۔ اور ایسی مشترکہ حدود ہند کے لیے مولانا جوہر تیار ہو گئے۔ اور ایک مشترکہ تجویز منظور ہوئی جس کی تفصیل یہ ہے

مولانا جوہر نے تائیدی تقریر کرتے ہوئے کہا :-

مولانا جوہر کی تائید

میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو میں اسے قبول کر لوں گا میں

(حاشیہ گذشتہ صفحہ) اتحاد دہلی تحریک پر تھیں اکثریت کو کسی عکراؤیت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں بلکہ ہے اس لیے ان میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں۔ ان کی اکثریت کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دوسرے۔ دوسرے صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان میں رعایتیں دی جائیں۔ جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے وہ ہندو اقلیت کو اسی طرح کی مراعات سے مستفید ہوں کریں۔ مرکزی اسمبلی ان کی سہ فیصد نمائندگی ہوگی۔ اس کے علاوہ صوبہ سرحد کو مساوی اصلاحات دی جائیں صوبہ سندھ کو مستقل اور جدا گانہ صوبہ بنایا جائے۔ بلوچستان کو

اس مسلمان کو بڑول سمجھتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ جب انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ مسلمانوں کی زندگی ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوگی، میں اس اندیشہ کو احمیت نہیں دیتا میرے نزدیک ایک سچا مسلمان دس آدمیوں پر بھاری ہوتا ہے کیا جنگ بدر اور جنگ احد میں مسلمانوں کی تعداد قلیل نہ تھی لیکن کامیابی و کامرانی کس کو حاصل ہوئی؟ مسلمانوں کو امیری خواہش یہ ہے کہ مصالحت ہو، امن ہو، اتحاد ہو، میری تحریروں اور تقریروں کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے، میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن و اتحاد کا چاہی ہوں۔ (سیرت محمدی ص ۵۴۳)

الاناکانگریزوں سے نکل چکے ہیں۔ کانگریس کے لیڈران سے بیزار ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا شریف دشمن کا کردار ادا کرتے ہیں۔ جس کام کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی جدوجہد کی تھی۔ ابھی تک اسی موقف پر قائم ہیں۔ اور پھر کس جذبہ ایمانی سے "مسلمان اور ہوتا ہے" کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ "پیش لفظ" کے مفہوم کے مطابق مولانا جوہر۔ مولانا سید حسین احمد مدنی "مہم مسلمان کو اپنے آپ کو دیکھتے تھے اور حضرت خٹاؤں۔ علامہ شبیر احمد عثمانی "مسلمانوں کو حالات کے آئینہ میں نیرون کی عملی کوتاہیوں کو دیکھتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آدمی میں اختلاف کا باعث ہوئی۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کی تائید

"میں جس ریزولوشن کی تائید کے لیے حاضر ہوا ہوں وہ ایک نہایت اہم ریزولوشن ہے اور یہ ریزولوشن ایک ایسے

جسے کی طرف سے ہے جو مسلم قومیت کے حقوق کی حفاظت کا ایک نمائندہ جلسہ اس میں ہر خیال اور ہر طبقہ کے مسلمان شریک ہیں۔ اب کسی کو یہ کہنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ مسلمانوں نے ہندو پورٹ کو تسلیم کیا ہے اگر کوئی شخص ایسا ہے تو اس کا کوئی غلط ہوگا اور یہ طرز عمل ایسا ہی ہوگا جس طرح کوئی شخص آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش دسی کرے۔ میں جمعیت علماء ہند کی طرف سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں" (سیرت محمدی ص ۵۴۳)

جنوبی افریقہ

مولانا جوہر نہ صرف ہندوستان کے محبوب راہنما تھے بلکہ بیرون ملک جہاں کہیں ہندو یہاں موجود تھے اور عالم اسلام میں ان کی قیادت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ جنوبی افریقہ کے ہندوستانی باشندوں کی عوامی اور قانونی کی صفوں میں وہ بڑے دو تین آئینوں کو آپ نشر و ترویج لائیں۔ آپ نے اس خیال سے کہ تبدیلی آج ہوگا محنت پر خوشگوار اثر پڑے گا اور دلوں کے لوگوں کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ جانے کا ارادہ کر لیا اور اپنے احباب کو اطلاع دے دی۔ پہلے مولانا شوکت علی کو روانہ کیا بعد میں بیگم کے ہمراہ خود جانے کی تیاری تھی بمبئی پہنچ کر ٹکٹ ملے لیا سامان بندھ گیا کہ جنوبی افریقہ کے گورنر نے شرط لگائی کہ داخلہ اسی وقت ممکن ہے جب چند پونڈ بطور ضمانت جمع کر لیں۔ مولانا یہ امانت آمیز شرط کیے قبول کر سکتے تھے آپ نے یہ شرط قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور گورنر کو بتا دیا کہ اس قسم کی جعلی شرط کے بغیر اجازت دی جائے اور ایک عجیب تار لائیں گورنر نے شرط بحال رکھی۔ اس کے بعد مولانا نے ایک تار دائیں سرٹے کو اور ایک تار سر فضل حسین ممبر حکومت کو دیا لیکن حکومت ہند نے کسی قسم کی مداخلت سے قطعاً انکار کر دیا۔ اس کے بعد مولانا نے جنوبی افریقہ کے گورنر کو آخری تار دینا جو پڑھنے کے قابل ہے۔

ہندوستان کی حکومت کو یہ سبق دینے پر کہ دوستانہ معروضات سے کس قدر توقع ہو سکتی ہے،

بہت بہت شکریہ ہم اب اس وقت آئیں گے جب آپ کو یہ سکھا دیا جائیگا کہ اسلام اور ہندوستان کا کس طرح احترام کیا جاتا ہے۔ ————— محمد علی صدر خلافت

اکتوبر ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ مکھنویں منعقد ہوا۔ جس میں آئندہ صدارت کے لیے پٹتہ ہوا ہر لالہ انتخاب ہوا تھا۔ اس جلسہ میں منسٹر راجہ جی نڈو نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفاد یہ تھا کہ علی برادران پر جنوبی افریقہ کے راجہ جوبانڈیاں عائد کی گئی ہیں انہیں واپس لیا جائے۔ مگر پٹیل اور دوسرے لیڈروں نے اس تجویز کی پر زور تائید کر کے اسے کرایا۔

ساروا ایکٹ

ایک ہندو مٹر پر بلاس نے اسمبلی میں ایک تجویز پیش کی کہ چونکہ علی العموم ہندوؤں میں یہ عادی پائی جاتی ہے کہ وہ نہایت کم سنی میں بچوں اور بچیوں کی شادی کر دیتے ہیں جس سے ان کی صحت نشوونما پر اثر پڑتا ہے لہذا ایسا قانون بنایا جائے جس سے اس طرح کی شادیاں نہ ہو سکیں۔ اس بل کی غرض وغایت ہندوؤں کی ایک غلط رسم کو ختم کرنا تھا مگر ایک مسلمان ممبر نے کہا کہ اس کو ہندوستان کی تمام قوموں پر بلا اشتہار نافذ کرنا یہ بل مجلس منتخبہ کے سپرد ہو کر سارے ہندوستان پر نافذ کر دیا گیا۔ جب یہ بل مجلس منتخبہ کے سپرد ہوا اسی وقت سے مولانا جوہر بعد لا میں مسلسل اس کے خلاف مکھنا شروع کر دیا تھا لیکن آپ اور جمعیتہ علماء ہند علماء کے احتجاج کی کوئی پروا نہ بنی بل نافذ ہو گیا۔ بل کے پاس ہونے پر پورے ملک کے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو گیا عام مسلمانوں اور علماء کو یہ لگتا ہرگز نہ تھی کہ مسلمان ممبروں کے ہونے ہوئے ایسا بل بھی پاس ہو سکتا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اعلیٰ سوسائٹی میں اس قدر فطری بن جاتی ہے جو لبرل و میجر سے آئی ہو۔

مولانا محمد علی جوہر نے قائم مقام وائسرائے کو (لاڈارون وائسرائے، دلاہیت چھٹی پرگئے ہوئے تھے) ایک طویل اہل مراسلہ لکھا جس میں از روئے شریعت اسلام یہ ثابت کیا کہ کوئی مسلمان از روئے شریعت مجبور نہیں ہے کہ ایک خاص عمر میں شادی کرے اور ایک خاص سن میں نہ کرے۔ آپ کے مراسلے کا مفہوم یہ ہے:-

”اسلام نے مسلمانوں کو اس باب میں بالکل آزاد رکھا ہے اور انسان کے مصالح اور ضروریات پر چھوڑ دیا ہے مثلاً ایک ضعیف العمر بابت مرگ پر پڑا دم توڑ رہا ہے اس کے صرف ۱۵ سال کی لڑکی ہے اور کچھ جا پیدا ہے وہ چاہتا ہے کہ اپنے مائے کوئی ایسی صورت پیدا کرے کہ وہ اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو جائے چنانچہ وہ اس لڑکی کا نکاح ایک لڑکے سے کر دیتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ اب ضروری انتظام مکمل ہو گئے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

اور پھر اس نکاح کے یہ معنی نہیں کہ لڑکی اور لڑکا مجبور ہیں کہ اسے ”بیان وفا“ سمجھیں بلکہ بلوغ کے بعد ان دونوں میں سے ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اگر اپنی اس ازدواجی زندگی کو پسند نہیں کرتا ہے تو نکاح متسوخ کر دے اور آزاد ہو جائے۔ مسلمانوں کو اس قانون کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ شرعاً آزاد ہیں جو یا بنڈیاں یا آسنیاں ضروری تھیں ان کا بھی شرع نے کافی لحاظ رکھا ہے آخر میں اس پر تعجب کا اظہار کی گئی تھا کہ میاں سر فضل حسین نے مسلمان ہونے کے باوجود اس قسم کے قانون کو کیسے منظور

لاڈارون سے ملاقات

کچھ عرصہ کے بعد لاڈارون واپس آئے تو مولانا نے ان سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ یہ ملاقات فی الدین ہے۔ وائسرائے نے جو جواب دیا وہ وہی ہے جس کو آجنگ منفی تہذیب و تمدن کے دلدادہ دہراتے چلے آ رہے ہیں گویا ”زبان میری ہے بات ان کی“ — وائسرائے نے کہا:۔

”کہ نہ ہب و معاشرت کی حدود جہاں متصادم ہوں وہاں ایک حذب اور متمدن حکومت کا فرض ہے:۔

کہ وہ معاشرت کا خیال رکھے“

مولانا محمد علی اس جواب سے برہم ہو گئے اور آپ نے فرمایا کہ ہم آپ کے قطعاً ہممنوا نہیں ہو سکتے ہماری آپ کی جنگ ہے میں جانتے ہی اس قانون کی غلات درزی کروڑ لگا اور لوگوں کو بھی اس پر آمادہ کروڑ لگا۔ اس تقریر اور بیانیہ سے مولانا کے سرکار سی زلفیاد کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ وائسرائے نے یہ کہا کہ جو کچھ کہیے اور کہئے قانون کے اندر رہ کر کہیے۔ لیکن مولانا نے جواب دیا کہ ۱۔

» مذہب کے معاملہ میں قانون اور آئین میرے سنگ راہ نہیں بن سکتے اگر ضرورت ہوگی تو میں مذہب کے لئے قانون شکن بن سکتا ہوں اس لیے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جا سکتا «

اس طرح وائسرائے نے گرامر مجتہد کے مولانا نے واپس آکر اپنی عملی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ اور پورے ہندوستان میں حتیٰ پسند علما نے اس بارے میں خافون شکنی شروع کر دی تھی۔ مسلمان اس جدوجہد میں کامیاب ہوئے اور جہل منسوخ کر دیا گیا۔ لیکن مولانا جوہر اس فتیخ سے قبل واصل جی ہو گئے۔

لاہور کا قومی ہفتہ

کنارے آزادی کامل کا پرچم لہرایا جانے والا تھا۔ مولانا جو ہترنے گاندھی جی سے ملاقات کرنا ضروری سمجھا تاکہ آخری بار ان سے مسلمانوں کے حقوق و مراعات کی بات چیت کی جاسکے چنانچہ یہ ملاقات ہوئی مولانا نے گاندھی جی سے کہا کہ اگر آپ ہمارے مطالبات منظور کر لیں تو پھر تمام مسلمان کانگریس کے شانہ بشانہ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوں گے۔ گاندھی جی نے کہا کہ غیر مشروط طور پر شامل ہو جاؤ آزادی ملنے کے بعد یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی۔ اور حقوق کی تقسیم ہوگی۔ لیکن ابھی یہ ممکن نہیں ہے۔ مولانا یہ سنکر یابوس ہو گئے۔ اور انہوں نے کوشش شروع کر دی کہ تمام مسلمان مل کر کوئی لائحہ عمل مرتب کریں۔ لاہور ان دنوں فوجی قبضہ میں تھا۔ اس ہفتے کے دوران بہت کوشش کی گئی کہ روٹھے ہوئے محمد علی کو متایا جائے لیکن مولانا کی جو شرط تھی وہ ان کے لیے ناقابل قبول تھی اور مولانا غیر مشروط پر اب ساتھ ملنے کے لیے تیار نہ تھے۔

گول میز کانفرنس

۱۹۴۷ء میں کانڈھی اور ون پیکٹ ہوا اور طے پایا کہ لندن میں گول میز کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ہندوستان کے بڑے ذعما شریک ہوں۔ مولانا محمد علی جوہر کا نام اس کانفرنس کے ممبروں میں سرفہرست آنا چاہیے تھا لیکن مختلف گروہوں اور دہلی کے ایک مشہور معاند کی پیہم کوششیں جاری رہیں کہ مولانا کو

یہ منتخب نہ ہوں۔ لیکن وہ گول میز کانفرنس کیا ہوتی جن میں مولانا سمبڑہ ہوتے۔ بالآخر مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کر لیے گئے اور آپ شروع اکتوبر بمبئی سے جہاز میں بیٹھ کر برطانیہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ مولانا ان دنوں حیدر علی اور نہایت کمزور تھے۔ برطانیہ کا سفر تو بہت طویل تھا۔ اندرون ملک کی چھوٹے سفر کے بھی تھکن نہ ہو سکتے تھے لیکن ملک قوم کی خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مولانا وہاں جا کر کس قدر مصروف رہے ہوں گے۔ مستندی اور کارگزاری کی انتہا کردی اخبارات کے ایڈیٹروں۔ وزراء۔ امراء اور سیاسی لیڈروں سے طویل طویل ملاقاتیں کیں۔ اور جب چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے تو پھر چار پائی پر لیٹے لیٹے ٹیلی فون کرتے رہے۔

مولانا کے صنعت و تقاضا بہت کا حال معلوم ہو چکا ہے اتنی قوت نہ تھی کہ کھڑے ہو کر تقریر کر سکیں لہذا گول میز کانفرنس میں بیٹھے بیٹھے ہو تقریر کی اس کے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

شیر کی آخری گرج

ڈوبلی ہسپتال کا جواب

”جب میں اس ملک میں پہنچا تو یہاں کے ایک اخبار ڈوبلی ہسپتال نے جس کے انتظام میں میں نے بھی حصہ لیا تھا میری تصویر شائع کی اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کر لیا ہے۔“

”میری رگوں میں وہی خون ہے جس سے لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں۔ جنہوں نے مجھے قید کیا تھا میں سامی نسل سے تعلق نہ رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے صہویت سے برگشتگی اختیار نہیں کی (تقدیر) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا وہیں اس وقت تک ہوں۔“

ضرورت ہے ایک انسان کی

دستور سیاسی تیار کرتے ہیں لیکن کاش! آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو ایسا آپ نے مشہور برطانوی مدبر لارڈ برک کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ۔ جمادیٰ کی ضرورت نہیں آدمیوں کی ضرورت ہے جو حقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ”اے خدا! ایسا انسان دے جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو وہ ان بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں ایک شور و غوغا سے لبریز سڑی میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے وہ خواہ امیر ہو، خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہونا چاہیے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے۔“ مجھے امید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم از کم اپنے تئیں اس حکمران آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت اپنے فیملی اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے۔“

آج جس ایک مقصد کے لیے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک

آزادی یا موت

کو اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا، میں ایک غیر ملک میں جت تک وہ آزاد ہے مرنے کو تو ترجیح دوں گا اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لیے بگڑ دینی پڑے

فات

رانا کی یہ تقریر خاصی طویل ہے۔ شائقین کو اس کے لیے "سیرت محمد علی" اور ان ایام کے اخبارات کے فائل مطالعہ کرنا چاہئیں۔
 مولانا نے گول میز کانفرنس میں عجیب و غریب معرکہ الّا رات تقریر کی اور اس کے بعد ان کی صحبت گرتی چلی گئی اور
 سنبھلے گا کوئی امکان نہ رہا تاہم وہ کام کرتے رہے وفات کی رات سے پہلے شب ساری رات کام کرتے رہے۔
 ہندو مسلم تعلقات کے متعلق ایک مفصل سیمینار میں ترتیب دیتے رہے وزیراعظم کو پیش کرنا بھی۔ مسودہ تیار ہو گیا تو آپ بے ہوش ہو
 گئے مولانا شوکت علی ایک دوست کو ملنے کے لیے اٹھ بیٹھ چلے گئے مگر بے ہوش میں آئے تو بڑھ چھٹے بھائی شوکت علی سر ہانے بیٹھے
 تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں منہ بند گئیں۔ یوں ملک کی آزادی اور ملت اسلامیہ کے لیے ساری دنیا سے لڑنے والا جہاد موت
 سے عاجز آ گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔
 تاریخ وفات۔ ۳۰ جنوری ۱۹۸۱ء

زال را ہے کہ پیغمبر گذشت

مولانا کی وفات کی خبر ہندوستان پہنچنے پر پورے ملک میں کراہ مچا ہو گیا۔ جس کی
 مثال لانا مشکل ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو۔ بعض احباب کا خیال
 تھا کہ لندن ہی میں دفن کر دے جائیں لیکن یکم ملک لانے پر مصطفیٰ خاں اور خود ملک میں مختلف شہروں۔ رام پور۔ مکتشو۔ اجمبر۔ کلکتہ۔ علی گڑھ
 درہلے سے علیحدہ علیحدہ دعوتیں آرہی تھیں کہ ہمارے شہر کو یہ استحقاق حاصل ہے۔ لیکن ہوا کیا اسے ہم "سیرت محمد علی" کے اپنے الفاظ
 پیش کرتے ہیں :-

"لیکن بیت المقدس کی سرزمین نے اپنے مقدس بازوؤں کو پھیلا لیا اور محمد علی سے کہا تیری ساری زندگی
 اور ساری جدوجہد تیری دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے تھی، دیکھو برگزیدہ انبیاء اور مرسلین کے
 جد پاک اور بے شمار اولیاء مقبولین کے اجماع مطہرہ میرے سینے میں محفوظ ہیں۔ انہیں مجھے ایک گوشہ
 عافیت اسی سرزمین میں و سلام کا دینی ہوں بولی منظور ہے؛ محمد علی کی روح مسکرائی اور آگے بڑھی، پیغمبر
 نے اپنا سینہ شوق کیا اور محمد علی اس میں سا گیا کیا قسمت تھی؟"

اس خاک کے ذرہ سے ہیں فہرہ تارے

آپ کا تابوت ایک جہاز کے ذریعے مصر لایا گیا۔ وزیراعظم اور شیخ پورٹ سعید پر استقبال کے لیے موجود تھے شہزادہ محمد
 خلف کعبہ کا ایک کھڑا تابوت پر رکھنے کے لیے مرحمت فرمایا۔ آپ کا کفن خالص کھدر کا تھا۔ تاہم سے آپ کا تابوت بیت المقدس
 لایا گیا اور بعد از جمعہ نماز جنازہ پڑھ کر آپ کو دفن کر دیا گیا۔

فائل رشک

مولانا کی وفات پر مشاہیر عالم، پریس اور ملک و ملت نے جو خراج عقدرت ادا کیا اس کا کچھ حصہ بھی
 خاصا طویل ہو سکتا ہے۔ شروع میں حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ۔ علامہ اقبالؒ کا تاثر قابل
 ملاحظہ ہے۔ آخر میں صرف سید سلیمان ندویؒ کا وقت انگیز تاثر ملاحظہ کیجیے۔

تو بہت کا عزا دار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزا دار ہو تو ادا مت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض
 ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیا سے اسلام کا نام کیا، نہادار ہے کہ دنیا سے
 اسلام تیرا نام کرے، ہندوستان کا نام دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے فہرہ، بلقان کیلئے
 اشکبار، شام پر گریبان، انجور پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوشلہ غم اور بیت المقدس کے لیے وقت الم،

ایسے ہمنہ کے ادارہ کرو مسافر! نیز احق سرزمین اسلام کہے چپے چپے پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبیلہ اسلام کا سینہ بھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

بیان — مقدمہ کراچی

”ایک حامی عدم تعاون کی حیثیت سے میں نے اس عدالت کی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے بجز اس مقدمہ کے کہ اس مقدمہ کے سمجھنے کی کوشش کروں جس کی حقیقت کے چہرے روز بروز پردہ اٹھ رہے ہیں نے اہل امر کو گوارا دیا کہ ہفتا نہ اپنے مطلب کے لیے جو شہادت چاہے پیش کرے۔ میں نے اس کے جواز یا عدم جواز کے متعلق کوئی لفظ نہ زبان سے نہیں نکالا۔ میں نے آپ کے اصولی شہادت کے مطابق کارروائی نہیں کی نہ کسی گواہ پر جرح کی اور اپنے دوست سرکاری وکیل کو اجازت دی کہ جب اسے کوئی جواب اپنی منشا کے مطابق نہ مل سکے تو وہ جرح کرے۔ ہاں میان عدم تعاون کی حیثیت سے ہم عدالت کی کارروائی میں جو حصہ لے سکتے ہیں وہ صرف اسی قدر ہے کہ ہم عدالت کے سامنے بیان پیش کریں جو واقعات پیش ہو اور یہ بھی اپنی بریت کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اس لیے کہ جو لوگ واقعات سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں وہ شش پنج میں نہ پڑیں۔“

جہاں تک کہ موجودہ مقدمہ کا تعلق ہے مجھے اس بیان کی بھی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی میرا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ میں ان غیر ضروری گواہیوں کی پھیلاہ باتوں کا قصہ ختم کر دوں جو لائے گئے تو اس غرض سے ہیں کہ تحقیقت کا انکشاف ہو لیکن ممکن ہے کہ تحقیقت کے چہرہ پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ میں اپنے بھائی اور دیگر اصحاب کے ساتھ کرچی میں آیا۔ میں بیشک کینا شالہ میں کوئی بیس اور آدمیوں کے ساتھ فروکش ہوا اور جب تک دھماں رہا ہزاروں لوگ وہاں دن اور کبھی کبھی رات کے وقت کینا شالہ میں آتے جاتے رہے۔ جس سے مجھے اور دوسرے بھائی کو بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن ایسی تکلیف الگ گوارا کرنی چاہیے جو نکرہ قید خانہ نہ تھا اس لیے مجھے اس امر کے تسلیم کرنے میں ذرا تاہل نہیں کہ میں کینا شالہ سے چلا گیا اور بعض اوقات اپنے بھائی کے ساتھ اور تنہا کینا شالہ میں واپس آتا رہا۔ میرے دوست ڈاکٹر جلیو شاد و نادری میرا ساتھ دیتے کیونکہ وہ پراڈنشل اور لوکل معاملات میں بہت منہمک رہتے تھے میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ بجے رات کے کبھی واپس نہیں آیا جیسا کہ ایک بچہ اسے گواہ نے اپنی شہادت میں بیان کیا ہے اور شاید اس لئے کہ اس کی ڈیوٹی رات کے بارہ بجے سے شروع ہوتی تھی اور اسے اپنی کچھ کاڈ گزارسی دکھانی مقصود تھی اس وقت کہ چاروں طرف خاموشی کا عالم چھایا ہوا تھا میں اپنے بھائی سے سازش کر رہا تھا یعنی میں نفلی معنوں میں اپنے بھائی سے اس وقت سازش کر رہا تھا جبکہ وہ خوب گھری ہو

میں سویا چڑھا تھا۔ لیکن خراٹے نہیں لے رہا تھا۔ میں بھی اسی حالت میں تھا۔ گویا اس عرض سے نہیں سویا تھا۔ کہ نیند کی بات میں میرے منہ سے دفعتاً یہ کاسافس نکلے۔ سازش کی جو کچھ میری ہم پکاتے ہیں وہ ہم بالعموم دن کی روشنی میں پکاتے ہیں۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں کراچی کی خلافت کا نفرنس کا صدر نہیں تھا۔ انکو راکورنٹس سے جنگ کے پھڑپھڑ جانے کے متعلق قرار داد کا مسودہ میں نے ہی مرتب کیا تھا جیسا کہ ضلع بلگرام میں گوڈل کا نفرنس کے موقع پر ایسا مسودہ مرتب کیا گیا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے یہ قرار داد کا نفرنس میں پڑھی اور میں نے اپنے محترم آقا مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی خدمت میں بفرس تجویز پیش کی دیہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے پیغمبر خدا کے روضہ مبارک کی طرف جس پر خدا کی رحمت اور برکت ہو بھرت کی، میں نے اس قرار داد کے متعلق کاروائی ختم کرنے سے پہلے اپنی تقریر کے خاتمہ پر ان لوگوں سے جو قرار داد کے متعلق تھے اور جو درحقیقت ہمارا ایک مقدس فرض تھا درخواست کی کہ وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنی اس تائید کی شہادت پیش کریں۔ لیکن جیسا کہ سرگروہ نے جھوٹ بولا ہے صرف یہی قرار داد نہیں تھی جو کھڑے ہو کر پاس کی کمرے سے کم وادار قرار دایں اسی طرح پاس کی گیسٹ اور اخبارات میں ان کی اطلاعیں بھی گئیں۔ سمجھیں نہیں آتا۔ کہ کیوں ان گروہوں نے یہ فائدہ جھوٹ بولا ہے۔

مسلمان کی حیثیت میں اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور صراطِ مستقیم سے میرا پاؤں لگ جائے تو مجھے میری غلطی کا یقین دلانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ میرے عملِ فعل کے خلاف قرآن مجید یا نبیؐ آخرا زمان صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مستند حدیث پیش کی جائے۔ یا زمانہ ماضی و حال کے مسلم علماء اسلام کے وہ ملہ ہی فتاویٰ دکھائے جائیں جو احکام اسلام کے انہی دونوں مآخذوں یعنی قرآن و حدیث پر مبنی ہوں۔

میں دعویٰ کرتا ہوں کہ آج میں غلطی پر نہیں ہوں۔ کیونکہ قرآن و حدیث موجودہ حالات میں مجھ سے ایسے عمل کے متفق ہیں جس کی پاداش میں آج وہ حکومت جو شیطانی حکومت نہ کہ لاپتہ نہیں کرتی مجھے گرفتار کئے بیٹھی ہے اگر میں اس عمل سے نفقت کروں تو گنہگار ہوا جانا ہوں اور اگر غفلت نہ کروں تو مجرم ٹھہرنا ہوں۔

ایسی حالت میں کیا میں وسمجھ سکتا ہوں کہ میں اس ملک میں محفوظ ہوں، اگر میں برطانوی وزیرِ اعظم کو لپٹا کروں یا وزیرِ ہند اور دیس رائے کو عزیز رکھوں تو مجھے یا تو گنہگار بننا پڑے گا یا مجرم بننا پڑے گا۔ لیکن میں اس عجز و درماندگی کے باوجود دلائل کی طرف ہوتا ہوا ہوں۔ اسلام صرف ایک شہنشاہی کو تسلیم کرتا ہے اور وہ شہنشاہی خدا کی ہے جو سب سے عالی و رفیع قطعی اور غیر مشروط حکمرانی ہے اور جس میں کسی قسم کے اختلاف یا مخالفت کا دخل نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے ساتھی قیدیوں سے جو

گفتگو کی وہ قرآن کے بارہویں پارہ میں اس طرح مذکور ہے۔

اے میرے ساتھی قیدیو! کیا متفرق مبعود اچھے ہیں یا ایک واحد القہار خدا اچھا ہے تم اس کے سوا دوسرے مبعودوں کی پرستش نہ کرو جسکے نام تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے مقرر کر رکھے ہیں۔ خدا کی حکومت کے سوا کوئی حکومت نہیں اس نے تمہیں حکم دیا ہے کہ صرف اس کی عبادت کرو۔ یہی دینِ قیم ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں سمجھتے۔“

میں دیکھتا ہوں کہ کھڑت یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد آج پہلے سے بھی زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ آج کل کی حالت تو یہ ہے کہ جب ایک موبیڈار میجر کے پاس قرآن کی ایک آیت اور رسول خدا کی حدیث پیش پڑھتی ہے۔ یہیں اسے فرض کی اطلاع دی جاتی ہے جو خدا کی طرف سے اس پر عائد ہوتا ہے تو وہ گھبرا ہوا اور بکھلا ہوا بھگا بھگا اپنے کمان افسر کے پاس جا چمکتا ہے۔ خدا کی اس شہنشاہی کا اعلان وقتاً فوقتاً مختلف قوموں میں بھیجا جاتا رہا۔ اور جب محمد لار رسول اللہ نبی آخر الزماں تمام نبی نوع انسان کو خدا کی رحمت کا آخری پیغام تک اس دنیا سے رحمت ہو گئے تو حضور کے بعد حضور کے خلفاء یعنی جانشین مقرر ہوئے رہے۔ چونکہ لقب ”امیر المؤمنین“ ہوتا تھا۔ ہمارے عقیدے کے مطابق موجودہ امیر المؤمنین اعظم حضرت سلطان المعظم ٹٹکی ہیں۔ اس لیے ہر مسلمان کو خواہ وہ مصافی ہو یا غیر مصافی کسی مسلم حکومت کے ماتحت رہتا ہو یا غیر مسلم کی رعایا ہو۔ قرآن مجید کا حکم یہی ہے کہ خدا و رسول کی فرمانبرداری کرے اور ادنیٰ ادا مرہ حکم یعنی مسلمان بادشاہوں کی اطاعت کرے۔ جن میں سب سے بڑا بادشاہ جانشین رسول اور امیر المؤمنین ہے لیکن خدا و رسول کی اطاعت تو قطعی و مطلق ہے۔ اور غلبہ کی اطاعت خدا و رسول کے بعد اور بشرط طور پر فرض ہے۔ قرآن مجید کی پوری سورت ”النسا“ میں خدا کے تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”اے ایمان والو! خدا اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس کی اطاعت کرو جو تم میں سے ادنیٰ الاسر ہو۔ لیکن جب تمہارے درمیان کسی معاملے پر تنازع ہو جائے تو خدا و رسول کی طرف رجوع کرو۔ تم خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھو کیونکہ یہی عمدہ اور احسن تاویل ہے۔“

اے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے۔ کہ اگر امیر المؤمنین جانشین رسول کریم بھی مسلمان کو ایسا حکم دین جس کی تعمیل پر وہ آمادہ نہ ہو۔ تو اسے نہ صرت یہ حق حاصل ہے۔ بلکہ اس پر واجب ہے کہ جو اختلاف اسے دنیا کے رب سے بڑے حاکم کے حکم کے متعلق ہو اس کی نسبت قرآن مجید اور رسول کریم کی مستند احادیث کو ثالث بالخیر بنائے۔ یہ اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ جو کلمہ طیبہ یعنی ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ میں مرموز ہے۔ یعنی خدا کے سوا کوئی مبعود نہیں۔ اور محمد اس کے رسول ہیں۔ یہ عقیدہ توحید کوئی ریاضی یا منطقی کا دعویٰ نہیں جو پیچیدہ اندیش فلسفیوں نے وضع کیا ہو۔ بلکہ ہر عام جاہل مسلمان کا عام اور معمولی عقیدہ ہے۔ اسی عقیدہ کی وضاحت دیا کیوں گے آزمائے کے لیے۔ ایک

دفتر خلیفہ المسلمین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسجد میں برسرِ منبر مسلمانوں سے استفسار کیا تھا کہ میں جو مخالف رسول میں سب سے بڑا قاتل تصور کیا جاتا ہوں اگر تم کو کوئی ایسا حکم دوں جو خدا کے اور رسولی خدا کی احادیث کے خلاف ہو تو تم کیا کر دگے ؟

لیکن یہ ایک اصول مسلمہ ہے اور اس میں کسی قسم کا تفسیر ممکن نہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے دنیاوی مفکرانوں کے صرف وہی احکام مان سکتے ہیں جن کی ذیل میں خدائے تعالیٰ کے احکام کی نافروانی کا کوئی پہلو نہ نکلتا ہو۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ قرآن مجید کی اصطلاح میں احکم الحاکمین اور شہنشاہوں کا شہنشاہ ہے۔ اطاعت کی یہ واضح اور قطعی حدود صرف غیر مسلم حکومت ہی پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا اطلاق ہر جگہ ہونا لازمی ہے۔ اور ان حدود و قیود میں کسی قسم کا ارتقا یا کسی قسم کی تخفیف نہیں ہو سکتی یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت تصور نظام و کن۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب رامپور۔ بلکہ خود جلال التکاب حضرت سلطان المعظم ترکی بھی اپنی مسلمان رعایا سے اپنے کسی ایسے حکم کی تعمیل کا مطالبہ نہیں کر سکتے جو اسلامی احکام کے خلاف ہو۔ اس اصول اسلامی کی توضیح و تشریح میں بولال کریم کی بہت سی مستند احادیث موجود ہیں جن میں سے ایک یہ ہے۔ ”مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ حکم سننے اور تعمیل کرے۔ خواہ وہ حکم اس کے نزدیک دلپسند ہو یا نہ ہو لیکن شرط یہ ہے کہ اس حکم کا کوئی منشا ایسا نہ ہو جس سے خدا تعالیٰ کی نافروانی ہوتی ہو۔ اگر مسلمان کو کوئی ایسا حکم دیا جائے جو خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کے خلاف ہو تو اس پر نہ اس حکم کا سننا فرض ہے۔ نہ اس کی تعمیل واجب ہے۔ تعمیل و اطاعت اسی حکم کا لازم ہے جو تقویٰ پر مبنی ہو۔“

یہی خیال انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث میں ظاہر کیا گیا ہے جس کی منطقی وجاہ ہے، فرمایا۔ ”کسی مخلوق کی اطاعت واجب نہیں۔ جبکہ اس اطاعت میں خالق کی معصیت کا ارتکاب ہونا ہو۔“

ہم پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے تھے اور سلطنت کی طرف سے بھی لیکن اگر کارِ برطانیہ کی حکومت شاہی کے مطالبات اور خدائے ہی و قیوم کی ربوبیت عامہ کے احکام میں تصادم ہونے لگا تو ہمارے ذمے صرف وہی فرائض رہ گئے۔ جو خدا کی طرف سے عائد ہوتے تھے ایسی حالت ہم صرف خدا ہی کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے چنانچہ اپنی حقیر طاقت اور وسیع کارہ امتداد کے مطابق اس تعمیل کی کوششوں میں سرگرم ہیں۔ مسلمان کی نفرت و محبت کا سرچشمہ خدا کی خوشی اور ناخوشی ہے۔ کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحب لله والبغض لله۔“

اگر ہندوستانی مسلمانوں کے پاس حکومت سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ایک طاقتور فوج موجود ہوتی۔ اور اگر وہ سچے اور مخلص مسلمان ہوتے تو آج اسلام کے قانون سے مجبور ہو کر حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرتے۔ اور ہمارے جھگڑا خالق دنیا مال میں نہیں بلکہ

کسی اور مقام پر فیصل ہوتا جب بدقسمتی سے ایسی طاقت اور ایسی فوج میسر نہ ہو تو احکام اسلامی کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جتنے بڑے کی استطاعت رکھیں وہ کسی محفوظ ملک میں چلے جائیں جہاں کوئی سرکاری استغنائے مذہب کی توہین و ہتک نہ کر سکیں۔ اس کے بعد جب تک کہ ملک اس قابل ہو جائے یا وہ اپنے ملک کو اس قابل بنالیں کہ وہاں خلائی عبادت بے خلل کی جاسکے۔ تو انہیں اختیار ہے کہ اپنے ملک کو مراجمت کرائیں۔

یہ وہ کفر ہے جس کے لیے حکومت مسلمانوں کو اب ایک دعوت دے رہی ہے اور جب ہم مسلمانوں کو اس نازک موقع پر ان کے پیغمبر صلی علیہ وسلم کی پاک نصیحتیں سناتے ہیں تو وہ حکومت جو پیغمبر اسلام کی آخری وصیت اسیود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دوں کے لیے ہم پر چاہتی ہے کہ ہم وصیت کی پرواہ نہ کریں۔ نہیں گرفتار کرتی ہے اور طرفہ نمائشیہ ہے کہ تمام برطانی حکمران ہمیشہ ہی اعلان کرتے ہیں۔ کہ وہ اپنے اعتقادات اپنے مذہب کے احکام کو ہم پر عاید کرنے کا نہ حق رکھتے ہیں اور نہ یہ ان کی تینا ہے۔

میں صرف ایک اور امر کی تذکرہ کروں گا جس سے شرح اسلام سب پر روشن ہو جائے گی ہندوستان کے غدار کا باعث جس کے بعد مغربیہ کا اعلان شاہی نافذ ہوا۔ یہ تھا کہ کار تو سوں پر چربی لگی ہوئی تھی۔ جس کے متعلق یہ یقین کیا جاتا ہے کہ گائے اور سور کی چربی تھی لیکن مقتدر اسلام کے خیالات کے مطابق جو میں پیش کر سکتا ہے۔

مسلمان کو اجازت ہے کہ اس کی زندگی معرض خطر میں ہو تو وہ سور کا گوشت کھالے۔ یہ بھی نہیں بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ اگر جان بچانے کی پرواہ نہ کر کے وہ ایسی حالت میں سور کے گوشت کھانے سے انکار کرے گا تو وہ گنہگار کی موت مرے گا لیکن اگر اس کی معرض زندگی خطر میں ہو اور وہ خطرہ اس طرح ٹل سکتا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو قتل کرے تو وہ مرجائے اور مسلمان کے قتل سے انکار کر دے ایسے حالات کی موجودگی میں وہ اسلام ترک کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ دل سے مومن ہو لیکن مسلمان کو ہرگز ہرگز قتل نہ کرے۔

بایںہم وہ حکومت جو اس درجہ نازک دماغ ہے کہ فوج کے بھرتی ہونے سے پہلے سپاہیوں سے پوچھ لیتی ہے کہ وہ جو چپ کا ٹیکہ لگوانے پر تومیں کریں گے مسلمان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ سور کا گوشت کھالے یا کافر ہونے سے بدتر فعل کر دکھائے۔ اگر مذہبی آزادی کی ڈینگ اور بادشاہوں کے اعلانات شاہی کی کچھ قدر قیمت ہے تو ہم نے حالات موجودہ میں مسلمان سپاہیوں کو فوج کی ملازمت ترک کرنے کی دعوت دے کر ایک مذہبی اور قانونی فرض پورا کیا۔ اس لیے ہم خدا کے گنہگار ہیں اور نہ حکومت کے مجرم۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ قضا میرے لیے ہے	پر غیب سے سامان بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو	خوش ہوں وہی پیغام بقا میرے لیے ہے
میں کھوکھری راہ میں سب دولت دنیا	سمجھا کہ کچھ اس سے بھی ہوا میرے لیے ہے
تو حیدر تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے	یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہوساری خلائی بھی خالص	کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
میں یوں تو قدرا ابر سیہ پر سیسی میکش	پر آج کی گھنگھور گھٹا میرے لیے ہے

تواریخ اسلام حضرت مولانا سید محمد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱۳۶۳ھ
۱۹۵۳ء



۱۳۰۲ھ
۱۸۸۴ء

عکس تحریر

سید سلیمان ندوی

اسم منجمل

کرم

آپ کا عتاب نامہ سورقمہ ۱۶ جوی کا جواب ۳۳ جولائی کو آیا
 ہر چند آئین اخلاق سے دور ہے، مگر چند سال سے یہ عہد تیار ہے نہ
 ڈھائی ہفتے گریوں سے کسی کو وہ دہ بین بہ کر دین جو ندین بدیدگی
 رعایتوں سے قالی ہو، چنانچہ میم جی سے ۱۵ جولائی تک دین بہ ہوا
 اسی رخی، بین عتاب نامہ آبا۔

مشرقی ملت سے تذکرہ پر تیوہ میں نے لکھا تھا جو زبیدار میں
 چھپا تھا اور سر میں لولا نا جاسی تھا چند سالوں کے ساتھ اس
 مضمون کو بھی چھاپا ہے، ان سے طلب فرماتے، میرے پاس بہت
 یہ کتاب سر ہی سے بھی آگے ہیں، اور کم از کم تذکرہ مفید
 ایسی جہالت کی بنیاد پر قائم ہے جس کا ڈھانا بہ سمجھار میں
 فرض ہے، باقی ساتوں کی عسکری تنظیم سے متعلق ہے بہت
 بہنیں اس طرح رہتی ساکن ہے کہ اس میں حرکت یہ کرنے پیدا کو
 نہ کوئی تنظیمی قوت ہو غیر استعدادی عسکری پر مبنی ہو یہ
 ضروری ہے

۱۹۳۱

۳۳ جولائی

سیپاہ

دہام

خالد بنی امیہ
(عربی۔ علوم اسلامیات۔ اردو)

علامہ سید محمد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نام و نسب
 حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کا اصلی نام امیں الحسن تھا اور یہ نام ان کی پیدائش پر ان کے دادا نے تجویز کیا تھا ان کی کنیت ابو حنیفہ تھی۔ بعد میں رنگوں کے ایک تاجر سلیمان کے نام سے متاثر ہو کر اہل خانہ انہیں سلیمان کہنے لگے۔ جب مولانا خود سن شعور کو پہنچے تو انہوں نے اپنا نام سید سلیمان بنانا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ان دنوں پانچ سلیمان نکلیا ہو گئے۔
 شاہ سلیمان بھلوی۔ (مشہور عالم، واعظ اور صوفی)
 قاضی سلیمان مشہور پوری۔ مصنف رحمتہ للعالمین "صلى الله عليه وسلم"
 مولانا سلیمان اشرف (سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
 سر شاہ سلیمان (سابق صدر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
 اور ہمارے زیر موضوع سید سلیمان۔

سید سلیمان کہتے ہیں بعض اوقات اوپر کے ناموں میں سے کسی ایک کے ساتھ التباس کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے پہلے مولانا مرحوم نے اپنے نام کے ساتھ اپنی علاقائی نسبت دہلوی کا اضافہ کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد یہ لفظ ان کے دل سے اڑ گیا۔ اور وہ ندوہ کی نسبت سے ندوی ہو گئے اب کا نام ہمیشہ کے لئے سید سلیمان ندوی ہو گیا۔

خاندان اور وطن
 سید سلیمان ندوی مرحوم نسب کے اعتبار سے دھیاں کی طرف تھے حسینی اور نناہال کی طرف زیدی "سادات سے تعلق رکھتے ہیں۔
 دھیاں سے زائد عرصہ گذرا کہ ان کے اجداد جزیرۃ العرب سے مکہ کی طرف ہجرت کر کے ساحل پر آئے اور یہاں سے اجمیر کے راستے یوپی سے گذر کر بہار کو اپنا مسکن بنایا۔ علامہ مرحوم کا وطن بہار کے غلپٹہ میں دیسہ کا علاقہ ہے۔

مولانا مناظر حسن گیلانی نے رسالہ "ریاض" کے مسلمان فیروز "سید الملک" کی لکھی زندگی کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے ان میں ان کے وطن کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں، ان سے ہماری بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:-

"علامہ سید سلیمان ندوی غفر اللہ عنہ بہار کے مشہور و معروف قریۃ السادات والوکر "دس" میں پیدا ہوئے جو سادات کرام کے دہلی و مسکن ہونے کے بعد اطراف و نواح کی ممتاز بیٹیوں میں شمار ہوتا رہا۔ مولانا اہل علم اور صاحب دل بزرگوں کو ہر زمانہ میں اسی جی میں ہم پاتے ہیں۔"

سید صاحب کے والد ماجد مولانا حکیم سید ابوالحسن (متوفی ۱۲۸۱ھ) ایک ممتاز دینی عالم دین تھے۔ وہ ریاست "اسلام پور" میں شاہی

محبیب تھے اور سلسلہ نقشبندیہ کے شیخ کامل تھے۔ اُن کا ظاہر باوقار اور اُن کا باطن تقویٰ کا آئینہ دار تھا۔ سید صاحب کی ماجدہ بھی ایک عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ اور بڑے بھائی مولانا سید ابو حبیب (متوفی ۱۳۴۶ھ) اُن سے عمر میں اٹھارہ سال بڑے تھے انہیں بھی سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت لینے کی اجازت تھی۔

۱۸۶۹

سید سلیمان ندوی (مرحوم) جمعۃ المبارک ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ (مطابق ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء) کو صبح کے وقت پیدا ہوئے۔ اُن کی پیدائش پر اُن کے جدِ امجد (عظیم محمدیؒ) کو خاص طور پر بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے فرط مسرت میں

پیدائش

ذیل قطعہ موزوں فرمایا:-

عید حسن ہست نہ ز ند من - شدہ نام ہو اُس نام نیکو خصال
خدایش عطا کرد نور بصیر - کہ یعنی پس شد یہ حسن و جمال
یہ شہر صفہ چون شدہ بدو سنہ - جو ان بخت آمد چو ماہ بلال
بروزِ ادریسہ بوقتِ سعید - بید مثال گلِ نرنبال
ز آزار و آشوب چشم بدش - معجزِ ارش اُن ایزدِ لایزال
بدولتِ قوی باد و عمرش دراز - کند شادمانی بہ ہر ماہ و سال
بہ اقبال و دولتِ کند سوری - سر دشمن نش شود پائال
نہادیم نامش "انیس الحسن" - ہو و حافظش حضرت ذوالجلال
چو مجتہم تاریخ اور از خود - یکایک سروشنے ز تاریخ و سال
بجفت کہ بے واد شد مصدر
شدہ ہر تہاں ز برچ کمال

۱۳۰۲ھ

سید سلیمان ندوی (مرحوم) سن شعور کو پہنچے تو انہیں ابتدائی تعلیم و تربیت کے لئے کچھ عرصہ تک گھر پر رہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ اُن کے اپنے گھر کا احوال علمی و دینی تھا۔ اُن کے برادر بزرگ مولانا سید محمدی تھے انہیں بعض ضروری کتب پڑھائیں اور کبھی کبھی پیر طریقت کی حیثیت سے انہیں اپنے حلقہ توجہ میں بھی لے جاتے تھے۔

عہدِ طفولیت

نے اپنے اُن بڑے بھائی کے بارے میں فرمایا ہے:-

"میں اپنے بھائی صاحب کے فیضِ صحبت سے اپنے قلب میں پاکی محسوس کرتا تھا۔"

یہ گویا ابتداء تھی جس کی تکمیل بعد میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاتھوں انجام پائی۔ سید صاحب بزرگ مولانا ابو حبیبؒ و عظیم و تلقین کے سلسلہ میں شاہ محمد اسماعیل شہید کی شہرہ آفاق کتاب تقویۃ الایمانؒ کو خاص طور پر پڑھا۔ علامہ مرحوم کو بھی یہ کتاب عہدِ طفولیت ہی میں دی رہی۔ وہ اس کتاب کی خاص توجید و سنت کے مطابق تعلیمات سے اس کی مستفید ہوئے۔

تھے کہ انہوں نے ایک بار ان الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا :-

”یہ زکوٰۃ الایمان پہلی کتاب تھی، جس سے مجھے دین حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ ثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آنحضریاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے مگر اس وقت جو باتیں طرہ پر طرہ کی تھیں ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ علم کلام کے مسائل، انباہرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازمی اور ابن رشد کے دلائل کیے بعد دیگرے نگاہوں سے گزر رہے مگر اصل شہید کی یقین بہ حال اپنی جگہ قائم رہی۔“

باتامادہ تعلیم | سید صاحب اپنے برادر بزرگ سے ابتدائی تعلیم اور بنیادی تربیت پاکر اپنے والد ماجد کے پاس اسلام پور پہنچے۔ کچھ کتابیں یہاں رہ کر ختم کیں۔ اس کے بعد پھلاری (پٹنہ) کی خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا امجد الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلاری) سے کچھ اور کتابوں کی تکمیل فرمائی۔

اس ماحول میں ان کی تجدید پسندی کے بعض قابل ذکر واقعات دیکھنے میں آئے کہ وہ اس دوران خانقاہ کی بعض غیر شرعی رسوم اور ہفتہ وار قایم رہنے پر کڑے کرتے رہے۔ یہاں کے بارے میں ایک بار انہوں نے یہ بات اپنے ایک ارادت مند کو بتائی:

”جو رنگ بھائی صاحب کی مجال میں چڑھ چکا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ طبیعت کو یہاں کے رسوم سے ذرا بھی مناسبت نہ ہو سکی۔“

پھلاری کے بعد سید صاحب کو مدرسہ امدادیہ (درہنگہ) بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ایک سال تک رہ کر درس نظامیہ کی بعض اذری کتابیں ختم فرمائیں۔

سید صاحب عبد طفولیت کے ایام میں بھی نہایت متین اور خاموش طبیعت تھے۔ مولینا مناظر حسن گیلانی مرحوم نے ان کے ایک ہم درس مولوی سید محمد حنیف کی یہ روایت نقل کی ہے کہ :-

”ایام طفلی ہی سے فقط سید صاحب کچھ خاموش رہنے کے عادی تھے بچوں کی عام شرارتوں سے ان کی طبیعت کو جلتا۔ کسی قسم کی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس لئے شرارت وغیرہ کے قصوں میں سید! البتہ تنبیہ کے بہت کم محتاج تھے۔“

ان کے بارے میں ان کے ایک اور ہم درس اور بے تکلف ساتھی مولوی جواد علی خان کہتے ہیں :-

”اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں دیتے اور خاموش ہو جاتے۔ کبھی کلام یا لب و لہجہ سخت نہ ہوتا۔ درسی کتابوں کی نگرانی لب و لہجہ البتہ زوردار ہوتا۔ اور بیان کی قوت و روانی سے شرکار کے دل پر شکم کا رعب بیٹھ جاتا۔ مناسبت برادرانہ پر غالب رہتی کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستے نہ تھے۔ بے تکلفی میں طرافت سے اذیت آتے۔ اس میں بھی مناسبت قائم نہ رہتی۔ کوئی ناگوار ہی جوتی تو اس کی غمازی چشم و ابرو ضرور کرتے مگر زبان پر تالور نہ ہوتا۔“

سید صاحب کے گھر کا حوالہ تربیت کے سلسلے میں کچھ ضروری پابندیوں کا حال تھا۔ ان کے اطوار و عادات کی بنیاد میں اس ماحول کا بھی کافی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو :-

ایک روز حبيب وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ دسترخوان پر کھانے میں مشغول تھے تو کمانا چاہتے ہوئے کبھی کسی آواز پیدا ہوئی۔ ان کے والد نے بے ساختہ ایک چپٹ رسید کردی اور کہا کہ اوی کے بچوں کو اوی کے بچوں کی طرح کھانا چاہئے۔ کھاتے ہوئے مزے آواز تو گنتے نکالتے ہیں :-

ندوة العلماء

سید صاحب سلسلہ ۱۹۰۱ء میں ذہن و فکر کی آخری ترین گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل کرائے گئے جہاں سے انہیں پانچ سال تک حکم تعلیم کے بعد ۱۹۰۶ء میں فرائض و تکمیل کی سند ملی۔

ماحول میں انہیں علامہ شبلی حسیہ مشہور زمانہ ادیب، مورخ، متکلم، فلسفی، محقق و مفکر کی تربیت و نگہداشت کا حامل میرا۔ اس دارالعلوم قباہم کے دوران میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس میں بعض دیگر اساتذہ کرام بھی حصہ ناقابل نظر انداز ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد فاروق چٹا، کوٹلی، مولانا حفیظ اللہ مرحوم، مفتی عبداللطیف اور مولانا عبدالغنی زرنگی علی کے اسمائے گرامی خصوصاً ذکر ہیں۔

طالب علمانہ دنیا

جس زمانے میں سید سلیمان ندوی مرحوم ندوۃ العلماء میں علم حاصل کر رہے تھے۔ اُن دنوں شاہ سلیمان بھلوری (مرحوم) مدرسے کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اگرچہ علامہ موصوف کے اساتذہ میں شامل نہ تھے لیکن وہ بھی اکثر ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔ علامہ موصوف نے خود شاہ مرحوم کے ذکر میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

"یاد ہے کہ اسی زمانے میں نواب محسن الملک (مرحوم) دارالعلوم ندوہ کے معاینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا فکھر احمد صاحب دہشتی شاہ جہان پوری کو امتحان تائیش فرمایا تھا میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے۔ نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں امتحان نہیں لوں گا۔ کہ امتحان سے پہلے ہی ایمان لا چکا۔ شاہ صاحب نے فرمایا: یہ میرے ہم نام بھی ہیں۔ نواب صاحب نے فرمایا: تو اور بھی یہ امتحان سننے والا تریں۔

میں نے اپنا قصیدہ پڑھا تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پرانی ادب دانی کا فائل نہیں عربی کا کوئی اخبار دیکھا ہے۔ اس کو یہ پوچھیں تو البتہ! اس زمانے میں اللوار اور التوید عربی کے مشہور اخبار تھے۔ وہ منکلائے گئے۔ میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا۔ تو بے حد خوش ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بے حد مخطوط ہوئے۔ اور اس زمانے کے دکیل۔ وطن اور کرن گڑ میں نواب صاحب کے اس معاینے کی جو کیفیت چھپوائی اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا ہے۔

یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا۔ ان کی اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر دور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا۔" (یاد رنگان صفحہ ۱۸۳)

یہ حیرت انگیز واقعہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی کتاب حیات شبلی میں ان سطور کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔

عطائے مہند

تو چشم پریشی فرمائیں؟

"دارالعلوم ندوہ کو کھلے ہوئے دوس برس گزر چکے تھے۔ مگر ابھی تک اس کے تارخ تفصیل طلبہ کی دستار بندی کا کوئی جلسہ، جس کا واقع ہندوستان کے عام مدرسوں میں ہے، نہیں ہوا تھا۔ اس غرض سے مارچ ۱۹۰۶ء مطابق محرم ۱۲۲۴ء میں رفاہ نامہ لکھنؤ کے وسیع آل میں طلبہ دستار بندی کے نام سے ندوہ کا عام سالانہ جلسہ ہوا جس کی صدارت مولانا غلام محمد فاضل ہرشاد پوری نے کی جو شروع سے ندوہ کے شریک و معاون رہے تھے۔ اس جلسے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماسرین اور اساتذہ کی

نہایت اچھی تعداد شریک تھی جو دلائل و اہل علم کے غلبہ و بائگ کے دعووں کا امتحان لینا چاہتے تھے۔

مولانا شبلی نے اس جلسے میں پیش کرتے کی عرض سے اپنے چند مختص طالب علموں کو بعض عنوانات پر تقریر کے لئے تیاری کرتے کی ہدایت فرمائی۔ اس ضمن میں مولوی ضیاء الحسن علوی راجہ راجہ پندرہ مدرس عربیہ الہ آباد نے قرآن مجید کے احکام و بلاغت اور قائم سے علوم جدیدہ و تدبیر کے موازنہ پر تقریر کی۔ اس تقریر کے دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے جلسے کو مٹا شاہ اور سامعین کو انہیہ حیرت بنا دیا۔ عین رات کی تقریر کے اثناء میں کسی ناگوار کہار اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو یہ شہرہ مندہ کی نقلی کلمات کا ہم یقین کر لیں۔ مولانا صاحب تادمہ جلسے سے باہر چلے گئے تھے مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ تم کہہ سکتے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور عربی میں تقریر شروع کی۔ جلسے پر ایک ماں چھا گیا، مولانا کو یہ خبر یہاں مطلع ہوئی تو فوراً اندر آئے اور میرے پاس کھڑے ہو کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اگر تم کو کسی وقت کوئی موضوع دیا جائے تو تم تقریر کر سکتے ہو؟ میں نے پھر اثبات میں جواب دیا تو مولانا نے مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ اس طالب علم نے جو تقریر کی اس کی نسبت بعض لوگ بدگمانی کر سکتے ہیں کہ یہ گھڑت تیار ہو کر آئے تھے۔ اس رعب بدگمانی کے لئے اگر کوئی صاحب چاہیں تو اس وقت کوئی موضوع دے سکتے ہیں۔ یہ اس پر تقریر کریں گے۔

چنانچہ موضوع کے تقرر کے لئے لوگوں نے تواجہ غلام الثقلین مرحوم کا نام پیش کیا۔ جو اس زمانے میں کنستور میں وکالت کرتے تھے اور جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے یہ موضوع مقرر کیا کہ

”ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کہ ہوئی؟“

میں نے اس موضوع پر عربی میں اپنے خیالات ظاہر کرتے شروع کئے۔ ہر طرف سے اشکنت اور آفریں کی صدائیں بار بار بلند ہو رہی تھیں۔ استاد مرحوم نے عرض مستر میں اپنے سرے تمامہ آثار کو میرے سر پر باندھ دیا جس خاکسار کے واسطے جہینہ کے لئے طرہ افتخار بن گیا۔

(حیات شبلی صفحہ ۲۵۶)

مذکورہ واقعے سے مولانا شبلی کا فطر مسترت و محبت ظاہر ہی ہے۔ مگر مولانا نے اپنے بایہ نادشاگردے کرشمہ علمی و دہائی کی اطلاع مولانا صاحب الرحمن خان مرحوم کو جن الفاظ میں فرمائی ہے۔ اس سے تاثر کی انتہا ظاہر ہوتی ہے۔ شبلی لکھتے ہیں۔

”..... سلیمان کی طرف سے درخواست کی گئی کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھ کو بتایا جائے میں اس وقت عربی زبان میں اس پر لکچر دوں گا۔ غلام الثقلین نے ایک مضمون دیا اور رفیعہ دہاسی اور کے سلیمان نے نہایت سلسل، فصیح اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی تمام طبعہ جو حیرت تھا۔ اور آخر لوگوں نے تفرہ ہائے آفرین کے ساتھ خود کو کہا کہ اب حد ہو گئی۔“ (حیات شبلی صفحہ ۲۵۸)

مندرجہ بالا واقعہ جہاں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی عظمت و فضیلت کا ایک قابل ترویج شہرت ثابت ہوا۔ وہاں اس کے بعد خود مولانا شبلی کے دلی میں شاکر و کی اہمیت و صلاحیت کے لئے بہت زیادہ اعتماد و احترام پیدا ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب زندگی کے آخری ایام میں مولانا شبلی مرحوم کو اس بزم رنگ و بو پہنچاؤ کا وقت نزدیک محسوس ہوا تو انہیں سب سے زیادہ اپنی عمر کو اردات تصنیف سیرت نبوی کی نامائی کا سچ اور اس کی تکمیل کی فکر تھی۔ انہوں نے ناب کے تمام دستورات کپڑے میں بندھوا کر ایک الماری میں مقفل کرادیئے اور تیار داری میں مہروف عزیزوں کو یہ وصیت فرمائی کہ:-

”یہ سروسہ حمید الدین اور سید سلیمان کے سپرد کئے جائیں۔ ان دو کے سوا کسی اور کو ہرگز نہ دینے چاہئیں۔“

مولانا حمید الدین ندوی مرحوم مولانا شبلی مرحوم کے اس نادر ہجائی تھے۔

میں اپنے خطبے میں بر ملا فرمایا :-

”مردہ نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، مرنے کا ایک سیلمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے۔“

اسی زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں جدید عربی اور علم کلام کے ایک اعلیٰ استاد کی ضرورت پیش آئی۔ مولانا شبلی نے یہ اہم منصب درس اپنے اسی جوان مریدین پختہ علم شاگرد کے سپرد کر دی اور وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب بلاشبہ لاجواب تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سید صاحب موصوف کی عمر صرف پچیس برس کے لگ بھگ تھی۔

تدریس و تعلیم کا یہ سلسلہ وقفوں کے ساتھ عرصے تک جاری رہا۔ اس دوران میں سید صاحب سے جن طلبہ نے علم حاصل کیا ان میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد اویس گرامی اور شاہ معین الدین ندوی (مدیر معارف) کے اساتذہ سے شاید کوئی بھی تعلیم یافتہ ناموافق نہ ہو۔

مندرجہ بالا بعض واقعات سے بہت پہلے ۱۹۱۲ء میں برصغیر کی سیاست میں اسلامی اتحاد کی تحریک پیدا ہوئی اُن دنوں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد لکھنؤ سے اپنا مشہور ”آفاق رسالہ ہفتہ وار الہلال“ نکال رہے تھے۔ انہوں نے ان حالات میں سید صاحب کی معاونت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے الہلال کے ادارہ تحریر میں شامل ہونے کے لئے زور دیا۔ مولانا آزاد کی اس خواہش و کوشش پر علامہ شبلی مرحوم نے خود سید صاحب کو ہی مشورہ دیا اور سید صاحب مولانا آزاد مرحوم کے ساتھ جلی تحریک کے میدان میں ملی، ادنیٰ اور سیاسی خدمات سرانجام دینے لگے۔

آج تک چار وائیک عالم میں ”الہلال“ کی علمی، ادبی اور سیاسی خدمات کا جو شمار ہے، بلاشبہ اس میں سید سیلمان ندوی مرحوم کی کوششوں کا بھی ایک حصہ ہے۔

کچھ عرصہ بعد سید صاحب ”الہلال“ کی معاونت چھوڑ کر پورے میں درس و تعلیم کی غرض سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ادارت کا کام اس قدر مختار ہوا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اِن الفاظ میں سید صاحب سے واپس چلے آنے کی درخواست کرتے پر مجبور ہو گئے۔

”آپ نے پورا میں پروفیسری قبول کر لی، حالانکہ خدا نے آپ کو درس و تعلیم سے زیادہ عظیم الشان کاموں کے لئے بنایا ہے۔ خدا کے لئے میری بیٹے۔ آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ کی محبت دل میں رکھتا ہوں۔ کیا حاصل اس سے کہ آپ نے چند خطبہ کو عربی نارسا سکھلا دی۔ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں۔“

آپ اگر ”الہلال“ بالکل ملے لیجئے۔ اور جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے۔ میں صرف اپنے مضامین دے دیا کرونگا اور کچھ تعلق نہ ہوگا۔ آپ متاواہل استفادے دیں اور لکھتے چلے آئیں۔“

یہ اس طویل خط کا ایک حصہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۹ جنوری ۱۹۱۴ء کو سید سیلمان ندوی مرحوم کو لکھا تھا۔ دیکھئے مولانا آزاد ایسے ”بائبر دررگزار“ و عبقری زمانہ کہ سید صاحب کی معاونت کی کتنی ضرورت محسوس ہوئی۔ بلاشبہ سید صاحب کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور نہ ابوالکلام آزاد کے مناظر میں لاتے تھے۔ الہلال کے ادارہ تحریر میں شامل ہونے کے زمانے میں سید صاحب نے جو مضامین سپرد قلم کئے۔ وہ مضامین سید سیلمان کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان مضامین میں سے اُن دنوں جو خاص طور پر مشہور ہوئے اور اہل طلب علم نے ان سے مستفاد استفادہ کیا۔ ان میں حسب ذیل موضوعات کے مضامین بھی شامل تھے۔

الحریث فی الاسلام، تذکرہ نزول قرآن، حیثیت کی تاریخ کا ایک وقتی، قلعہ بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ وغیرہ

علامہ شبلی کی جانشینی

سید سلیمان ندوی

نمبر ۱۹۱۷ء کی بات ہے کہ علامہ شبلی کا وقت آخر نزدیک سے نزدیک تر آگیا۔ انہوں نے سید صاحب کو تار دے کر پوچھا ہے کہ "فرمایا اور ہمیشہ کے لئے اپنے لب اور آنکھیں بند کرنے سے پہلے انہیں بنائے شجقت و محبت سے اپنی زیر تکمیل علمی مہمات با میرت النبیؐ کو مکمل کرنے کی دینیت فرمائی اور یہ عہد مستحکم کر کے ۱۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو اس جہم رنگ و بول کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس دینائے پائدار کی طرف رخصت فرمائے گئے۔"

اب علامہ شبلیؒ کی مسند عالی تھی۔ مگر کس کا حوصلہ تھا کہ اس شہ نشین کی طرف بڑھنے کی جرأت کرتا۔ اگرچہ سید صاحب موصوف ہر اعتبار سے اس شخص کے لئے اہل تھے لیکن انہی کو سب سے زیادہ استاذ کی عظمت و فضیلت اور اُن کی مسند کے احترام و وقار کا خیال تھا۔ آخر علامہ شبلیؒ مرحوم کے والد ارادت نے متفقہ طور پر استاذ مرحوم کی جانشینی کا تاج سید صاحب کے سر پر رکھا اور ان طرح گویا سید صاحب کی علمیت اور فضیلت کا پر ملاحظہ عزرائیل یہ جون ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت سید صاحب دکن کا بی پوٹا سے مستغنی ہو کر عظیم گڑھ پہنچ چکے تھے۔

دارالمصنفین کی بنیاد

جب سید سلیمان ندوی اعظم گڑھ تشریف لائے تو یہاں ابھی تک دارالمصنفین کا قیام عمل میں نہیں آئی۔ کوئی ایک سال پہلے ملازمتی مرحوم نے اس کاغذ کو سامہ در تیار فرمایا تھا لیکن یہ ایک تصور ہی تھا جس کا تک کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ صرت اور صرت سید صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک دفتر شبلی مرحوم کا خواب شرفہ تعبیر و تعمیر ہو گیا اور پھر اسے ترقی دینے کے لئے میں انہوں نے اپنے تلمب و دامار کی جملہ صلاحیتوں کو اس طرح مرکوز کر دیا کہ کچھ ہی عرصہ بعد علمی دنیا میں "دارالمصنفین" اور اس کی عملی خدمات دور دورہ نزدیک پھیل گیا۔

سیاسیات سے گریز

"دارالمصنفین" کے قیام کے بعد سید صاحب کے روز و شب پہلے سے بھی بڑھ کر علمی مشاغل میں صرف ہونے لگے۔ دوسری کچھ مہینوں پر بعض قومی رہنماؤں نے دُعا فرمائی کہ انہیں سیاسی سرگرمیوں کی طرف دعوت دی لیکن سید صاحب جی نے غارِ رازِ سیاست میں اُن سے اجتناب کرتے رہے۔ دورہ اگر وہ سیاست کے میدان میں کبھی پوری طرح داخل ہو جاتے تو شاید ملک و قوم کی سیاسی رہنمائی بھی وہ چرخی کا مقام حاصل کر لیتے۔ سیاسی سرگرمیوں سے بہت حد تک الگ تھلک رہنے کی خواہش و کوشش کے باوجود اُن کے اکثر عرصہ ان کی سیاسی بصیرت و فراست کے قائل و معترف تھے۔

ایک بار مہاتما گاندھی نے ان کے بارے میں کہا تھا۔

"یہ بڑا چارو بولی ہے۔"

کچھ مسلمان سیاست والوں نے بھی بعض موقعوں پر سید صاحب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ اپنا دامن پھڑپھڑاتے رہے۔ سید صاحب نے ایک موقع پر سیاست کے بارے میں خود کہا تھا۔

"میں نے کبھی بیخود سے آلودہ خود نہیں پہنایا کبھی محمدی (جوہر) نے پہنا دیا اور کبھی شکوت علی نے۔ اور جب کسی نے پہنایا بھی تو میں نے فوراً اُٹار پھینکا۔"

سیاسیات سے اس گریز کا سبب انہوں نے خود ایک بار ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا۔

"ڈیپومی (سیاست) کے معنی تو یہ ہیں کہ ہر ایک کو غیر دیانت دار سمجھ کر اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اور پھر اگر اس کی دیانت ثابت ہو جائے تو دیانت دار مانا جاتے۔ میرا مسلک یہ ہے کہ ہر ایک کو اچھا اور دیانت دار سمجھا جائے۔ پھر اگر اس کی بددیانتی ثابت

ہو جائے نراس سے قطع تعلق کیا جائے۔“

سید صاحب اسی بنا پر عملی سیاست سے کدہ کشی اختیار کرتے رہے اور اگر مجبور ہو کر اس میں حصہ لینا بھی پڑا تو وہ زیادہ سے زیادہ مشورہ رائے کے فیصلہ کن تعاون کرتے تھے۔ اپنے اس مسلک کے بارے میں انہوں نے اذراہ مزاج فرمایا تھا کہ۔

”بھئی! مجھے چیمبر پر کمیشن تو آتی ہے، پبلک پری کمیشن نہیں آتی۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سیاست کے اس مفہوم اور طریق کار سے گریز کرتے تھے جس میں فریب اور بددیانتی کا شائبہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بعض ایسے کارہائے نمایاں بھی انجام دیئے جنہیں ہم ان کی شاندار علمی و قلمی خدمات قرار دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاقات درج ذیل ہیں۔

• سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں مجلس علمائے بنگال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرمائی اور اس میں انگریزی حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود اجرائے آزادی و غلطیہ دیا۔ جس سے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں سے انگریزی مرعوبیت اٹھ گئی۔

• وہ ۱۹۲۶ء میں مولینا محمد علی جوہر اور مولینا عبدالباری خاں کی علی و غیرہ کے اصرار پر وفدِ خلافت کے ساتھ علمائے ہند کے واحد نمائندے کی حیثیت سے یورپ تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے نمائندگی کا حق ادا کر دیا۔

• ۱۹۲۶ء میں سید صاحب جمعیت علمائے ہند کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ اس اجلاس کے شرکار میں آغا محمد مولینا محمد اوزار شاہ کشمیری مرحوم ایسے حلیل القدر عالم دین بھی شریک تھے۔ اس اجلاس میں انہوں نے جو خطبہ صدارت دیا، وہ مسلمانوں کی امت میں قابلِ یادگار ہے۔

• ۱۹۲۶ء میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کی دعوت پر عہد رسالت میں اشاعت اسلام کے عنوان پر تقریر فرمائی۔ اس اجلاس میں علامہ فضلہ اسکے علاوہ علامہ اقبال مرحوم ایسے مشاہیر بھی شامل تھے جنہوں نے سید صاحب کی ملکیت و فقیہیت اور اہلیت و صلاحیت کا راز فرمایا۔

ہندوستان کی آزادی اور متحدہ حکومت کی صورت میں جو مسائل پیدا ہو سکتے تھے اور جو عدالت پیش آسکتے تھے، انہیں اپنی نادار دبیرت فراست سے بھانپ کر انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ

”سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیش نظر جو معاملات ہیں، ان میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ اُنہد حکومت میں مسلمانوں

کے خالص مذہبی اور شخصی قرائین کے تحفظ، ترقی، اصلاح اور استحکام کے لئے علیحدہ انتظام ہونا چاہیئے۔“

ان چند مثالوں سے اُن کی قومی و ملی خدمات کے دائرہ کار اور اُن کے مزاج و طبیعت کے مطابق اقدامات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سید صاحب مرحوم جن اخلاق میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی کوشش کرتے تھے، علم، غیرت، مروت، حیا، تواضع، انکسار وغیرہ سب نیک اوصاف ان کی سرشت میں شامل تھے۔ مولینا عبدالماجد آبادی نے ایک بار اپنی گفتگو میں اُن کے بارے میں گواہی دی تھی کہ:

”ردائے اخلاق بالطبع اُن میں موجود ہی نہ تھے۔“

پھر سید صاحب کی وفات پر مولینا وریا آبادی موصوف نے صدقِ جدید (۴ دسمبر ۱۹۵۲ء) میں جو پہلا تعزیتی مضمون پیر و قلم کیا۔ اس میں

نہیں سمجھی۔ لیکن ہے اس قسم کی کچھ اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ جن سے ایک بات ظاہر و باہر ہے کہ سید صاحب مرحوم کی ذات گرامی ملی کمالات کے سلسلے میں اپنوں اور بیگانوں سب کے لئے انانیت کا موجب تھی اور ہے۔

حبِ رسالت

سید صاحب اس اعتبار سے واقفانہایت خوش نصیب تھے کہ انہیں مولانا شبلی مرحوم کی شہرہ آفاق تصنیف "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کی تکمیل کا شرف حاصل ہوا۔ اگرچہ سعادت علامہ شبلی کو آخر عمر میں حاصل ہوئی وہ سید صاحب کو بہت پہلے مل گئی۔

"سیرۃ النبی" میں سوانح کی ترتیب کا کام تو بہت حد تک شبلی مرحوم کر گئے تھے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے ہر پہلو پر "قرآن کے مطابق" کرکھانا ایک وقت طلب کام تھا۔ سید صاحب نے سالہا سال تک روز و شب کی عرق ریزی کے بعد یہ نثر بھی حاصل کر لیا اور قرآن و حدیث کے مطابق تحقیق میں محو ہو کر اور اپنی مقررہ، عمدتاً ناز و نفیہانہ، مشکلائے اور غشیانہ عرض بدلہ انعام کی اہلیتوں اور صلاحیتوں کو بڑے کار لالہ الفاظ کی مدد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ بات ثابت کر دی کہ

كَانَ خَلْقَهُ الْقُرْآنُ

اوپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن قرآن (کے من مطابق) تھا۔

سید صاحب کے دل میں پیغمبر اسلام، سید الانبیاء، رحمۃ اللعین، و حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس قدر مہذب و تہی کردہ سلوک کی منزل طے کرنے سے پہلے بھی آپ اور آپ کے پیغام کے خلاف منہ و اب کا کوئی کلمہ سن کر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ سو وہ اتفاق سے اگر کوئی ایسا مرحلہ آجاتا قرآن کا قلم تیار بن جاتا تھا۔

اُن کی زندگی میں یورپ کے مستشرقین نے اس محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو عداوت قائم کیا تھا۔ اس عداوت کو شکست دینے کے سلسلے میں سید صاحب کی کوششوں کو تاریخ اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اُس زمانے میں سید صاحب نے "رسول وحدت" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا تھا۔ جس میں وحدتِ الہی، وحدتِ کتاب، وحدتِ انسانیت اور آخر میں دین و دنیا کی وحدت کو نہایت موثر اور مدلل انداز میں پیش کیا تھا۔ اس کتاب کی ایک ایک سطر میں صاحب قلم کا جذبہ دروں اور غلوں و عنیت کا رُخ ہاتھی۔ اس نے آئینہ نیچو و بر دل یزد کے مسدود حق جہاں اس سے اہل اسلام مستفید ہوئے وہاں بعض غیر مسلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

تلاشِ مُرشد

سید سلیمان ندوی مرحوم ایک جید عالم دین ہونے کے باوجود نہایت منکسر الحرات شخص تھے۔ اگرچہ وہ فخر و کبر و عظمت کے بلند مقام پر نازتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ انہیں کسی ایسے ذہن پر طیقت کی تلاش تھی جو ان کی آتشِ نسبت کو تیز کر دے۔ اس کے علاوہ اس مقصد کے لئے وہ تقریباً دس برس تک شیخ کی تلاش میں رہے۔ آخر عاقبت امداد اللہ بابر کی جسے ساتھ دل و دماغ کے باعث اُن کے غلیظ اثرات اور لٹا اثرات علی تھاوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جس میں اُن سے پہلے مولانا عبد الماجد دیوانا آبادی اور مولانا عبد الباقی ندوی وغیرہ بھی شریک ہو چکے تھے۔

مولانا اثرات علی تھاوی کے دوست مبارک پر ہیبت کے اس واقعے سے پہلے بھی سید صاحب کے دل میں اُن کے بارے میں نسبت و نفیّت کے جذبات موجود تھے۔ لیکن اس سلسلہ ارادت میں مشککہ جو جانے کے بعد ان میں جس قدر اضافہ ہو گیا، وہ قابلِ شک و تہقید ہے۔ اس کے بعد سید صاحب مولانا تھاوی علیہ الرحمہ سے زندگی کے ہر مرحلے اور ہر مسئلے میں ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے اندر وہ نہایت تھے سید صاحب نے

خود مولانا عبدالباری ندوی کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

”حضرت تھانویؒ میرے ہر معاملہ حتیٰ کہ ذاتی معاملات سے بھی باخبر رہیں۔ یہ میرا جوشِ محبت ہے کہ اپنے والدِ شریف کی طرح ان کو ہر معاملہ لکھے بغیر چھین ہی نہیں ملتا۔“

یہ الفاظ اپنے مرشد کے ساتھ سید صاحب کے ذہنی اور دلی لگاؤ کا اندازہ کرنے کے لئے بہت حد تک مدد دے سکتے ہیں۔

اعزازِ خلافت

سید سلیمان مرحوم نے اپنے شیخ کی زندگی ہی میں سلوک و معرفت کے جملہ مراحل طے کر لئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مرشد کی عنایت و نظر میں اس واسطے کے سبب نشیب و فراز سے پوری طرح باخبر ہو گئے۔ جب یہ مقام آگیا تو مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے دل میں ”دانشوں کی رہنمائی کے لئے سید صاحب کو ہر طرح لائقِ اعتبار دیکھ کر انہیں اپنا خلیفہ بنانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے استشارہ فرمایا۔ جب اس ذیل سے تائید و تقویت حاصل ہوئی تو سید صاحب کے نام ایک مکتوب تحریر کیا۔ جس میں یہ تحریر تھا کہ :

”میرا چاہتا ہے کہ آپ کو خلافتِ دہلی میں اس سلسلہ میں استشارہ بھی کر لیا جائے۔ اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟“

سید صاحب دو تین روز میں خود ہی اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے واسطے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس گرامی نامہ کا جواب نہیں لکھا۔ جب حاضر خدمت ہوئے تو بھی خاموش رہے۔ آخر ایک دن خود حکیم الامت مرحوم کی طرف سے ایک کاغذ پر مرقوم یہ الفاظ ملے کہ :

”آپ نے میرے استشارہ کا جواب نہیں دیا۔“

اس امر پر سید صاحب نے جہاں عاجز کیا کہ :

”حضرت والا کا مکتوب گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین چل گئی۔ کہاں ہیں اور کہاں یہ ذمہ داری!“

جب حضرت والا کو یہ جواب یا صواب پہنچا تو نہایت مسرور ہوئے اور حاضرین سے فرمایا کہ :

”الحمد للہ! وہی جواب آیا۔ جس کی توقع تھی۔“

اس کے بعد مرشد تھانویؒ نے مرید ندویؒ کو خلافتِ عطا فرمادی اور اُن کو مُسنَدِ ارشاد پر متمکن فرمایا :

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ علیہ الرحمۃ کے فیضِ محبت سے سید صاحب کی زندگی میں اس قدر واضح انقلاب رونما ہوا کہ وہ ایک طرح دنیائے علم سے دنیائے معرفت کی طرف آگئے۔ اس زمانے کی کیفیات کا اندازہ سید صاحب کے اپنے مکاتیب و فقرے سے بھی ہوتا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی کے نام وہ ایک خط میں رقمطراز ہیں :

”دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں آتی تھی۔ وہ عملاً سمجھ میں آگئی اور ادبِ ثلاثی انات میں مصروف ہوں۔“

اسی طرح مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک مکتوب میں لکھا ہے۔

”واہ واہ کاغذ بہت بڑا، چکا اور اب یہ رنگ آ رہا ہے۔ اب تو آہ آہ کا دور ہے۔ اور اپنی پچھلی تباہی پر قائم اور آئندہ کی فکر و تپش ہے۔“

(مکاتیبِ سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی۔ مکتوب ۱۱۹)

سید سلیمان ندوی کی زندگی میں یہ جو انقلاب آیا تھا۔ اُس کی شہادت دارالمتصفین کے دیگر زقار کے بیانات سے بھی ملتی ہے۔ اس سلسلہ درج ذیل دو اقتباسات للاحظہ کیجئے :

سید صباح الدین عبدالرحمن اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

"اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے میل و نہار ہی بدل گئے۔ اگرچہ اُن کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گزری تھی لیکن بادہ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں گونج و تقویٰ کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا۔ عبارت دریا صفت بڑھ گئی۔ ذکرِ خفی کے ساتھ ذکرِ جلی بھی کرنے لگے۔ تقریر و خطابت نے وعظ و پند کی شکل اختیار کر لی۔ زیادہ وقت علمی مذاکروں کے سیاتے رشتہ و ہدایت میں صرف ہونے لگا۔" (معارف، سلیمان تبر، صفحہ ۱۳۴)

اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مدظلہ معارف نے لکھا ہے۔

"وہ صیغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے۔ وَمَنْ أَحْسَنَ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً اور ان میں بڑا روحانی انقلاب پیدا ہو گیا تھا ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیر آگیا تھا۔ اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا۔"

اس زمانے میں سید صاحب نے جو منظوم کلام کہا، اُس میں بھی اس انقلاب کے مظاہر موجود ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نعمۃ اللہ سے طبعِ حزین موزوں ہوتی۔ - جو کبھی گاتی نہ تھی، وہ وجد میں گمانے لگی۔

فیض ہے یہ کس دلی دقت کا۔ - اب جو ہر شعر ہے، الہام ہے۔

سبھیں میرے کلام کو جو ہوش مند ہیں۔ - مستی میری یہ بادۂ انگور کی نہیں۔

جو شعر بھی سپرِ رستم کر رہا ہوں میں۔ - سب وارداتِ عشقِ رستم کر رہا ہوں۔

دیوانِ انگارِ عشقِ کرم کے حوالے عام۔ - آراستہ ہر مجلسِ جم کر رہا ہوں۔

مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے ایک اور خلیفہ تاجز مولانا الحاج حافظ محمد عثمان خان مرحوم راوی ہیں کہ :

"ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کے کمالات کا ذکر آگیا تو حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ جو کلامی سوکھی ہوتی ہے، دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اٹھتی ہے اور جریگی ہوتی ہے اس کو عمر بھر بھی پھونکتے رہتے تو سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اٹھتا۔۔۔ ان (سید سلیمان ندوی) میں کس بات کی کمی تھی؟"

مرشد کی زبانِ حقیقت بیان سے یہ الفاظ مرید کی عظمت کے لئے یقیناً سب سے بڑی سند ہیں۔

سید صاحب کی بعض تصنیفات اور علمی مقالات کا ذکر ہمتی طور پر ابتدائی سطور میں آچکا ہے۔ ان صفحات میں ان کی چند ایک شہرہ آفاق کتابوں کا ذکر نسبتاً تفصیل سے پیش خدمت ہے۔

تصنیفات و تالیفات

اس سلسلے میں جن کتابوں کا ذکر خاص طور پر مطلوب ہے، وہ حسب ذیل ہیں :

● سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

● خطباتِ مدراس۔

● سیرتِ مالشہ

● ارض القرآن

• عرب و ہند کے تعلقات۔

• خیام

• حیاتِ قبل از

• مضامین، مقالات و خطبات۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اصل میں علامہ شبلی کی شہرہ آفاق اور بے مثال تصنیف ہے علامہ مرحوم کتاب اس شرح و بسط سے لکھنے کے خواہش مند تھے کہ اس موضوع پر جلد ضروری معلومات ایک جگہ درج کر جائیں لیکن وہ اس کتاب کے پہلے دو حصے ہی لکھ سکے تھے کہ اللہ کو پیار سے ہو گئے لیکن انہیں اس کتاب کی تکمیل کا اس قدر خیال اور اشتیاق تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی آخری عمر میں اپنی زندگی کی آخری خواہش یعنی اس کتاب کی تکمیل سے آگاہ کیا اور اپنے بعد اس کام کو مکمل کرنے کی خواہش ظاہر کی سید صاحب نے اس تاوی کی خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا اور پھر سالہا سال کا وکاش کے بعد اس کے چار حصے اور لکھ کر اس کتاب کو مکمل کر دیا بلاشبہ شبلی مرحوم کے بعد اس کتاب کی تکمیل سید صاحب کا ایک عظیم کارنامہ جہاں تک محض سیرت و سوانح کا تعلق ہے، وہ پہلی دو جلدوں میں مکمل ہو گئے تھے لیکن اس کتاب کی تالیف اور تصنیف کا مقصد غیر کے حالاتِ حیات کے ساتھ ساتھ آپ کے پیش کردہ دین کو بھی اجاگر کرنا تھا۔ اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں جن سے ضروری مسئلہ دلائل و معجزات کا پہلو ہے تفسیری جلد خاص طور پر دلائل و معجزات ہی پر مبنی ہے۔

چوتھی جلد میں اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر ہے جن میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا اور جنت و دوزخ ایسے اہم مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

پانچویں جلد عبادات سے متعلق ہے۔ اس میں اسلامی عبادات کی خصوصیات اور اس کے اعتدال و توازن پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تفصیل و تشریح سے بحث کی گئی ہے پھر قلبی عبادات مثلاً تقویٰ، نکل، صبر، شکر وغیرہ کا ذکر ہے۔

چھٹی جلد اخلاقیات کے موضوع پر ہے جس کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے۔ اس میں اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو اسلام اور اخلاقِ حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی کی پہلی دو جلدوں کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم کی باقی چار جلدوں پر ایک نظر ڈالنے کے حقیقت کا احراز کرنا پڑتا ہے کہ مجموعی طور پر سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم جدید علمِ کلام کی نہایت معرکہ آرا کتاب ہے جس میں اسلامی ضروری عقائد و اعمال اجاگر کر دیئے گئے ہیں۔

خطباتِ مدراس

یہ خطبات دراصل سیرتِ نبویؐ ہی کے سلسلے کی ایک اور اہم تصنیف ہے یہ خطبات مدراس کے ویدار انوار ان کے فرائض پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں سیرت کے مختلف پہلوؤں پر دیئے گئے تھے جو بعد میں کتاب کی صورت میں بھیجے گئے۔ یہ کتاب زیادہ ضخیم نہیں بلکہ کل ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن اپنی معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادیت کے اعتبار سے اس کی کوئی کتابوں پر چار دیواری نہیں ہے۔ ان خطبات میں سیرتِ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر ایک نئے نقطہ نظر اور نئے اسلوب سے بحث کی گئی ہے۔ پہلے خطبے میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاءِ کرام کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے۔

- دوسرے خطبے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دائرہ اور مالگیریہ نمونہ عمل چہرے پر بحث کی گئی ہے۔
- تیسرے خطبے میں سیرت نبویؐ کے تاریخی پس پردہ نشانی ڈالی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اس قدر مواد دنیا کے کسی ٹکڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا۔ اس سلسلے میں سیرت کے تمام کاغذ قرآن، حدیث، معاذی، سیرت نامہ صحیح اور دلائل دشمنان نبویؐ کے پورے ذخیرے کا جائزہ لیا گیا ہے۔
- چوتھے اور پانچویں خطبے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت و کمالیت پر بحث کی گئی ہے۔ جامعیت کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ کی حیات طیبہ میں مختلف انسانی طبقات اور ان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق اسوہ عمل موجود ہے۔ اور کمالیت سے مراد یہ ہے کہ شریعت زندگی کے ہر انتقال تک آپؐ کی حیات طیبہ کا ہر واقعہ محفوظ ہے۔

- چھٹے خطبے میں سیرت نبویؐ کا عملی پس پردہ لکھا گیا ہے کہ آپؐ ہر اخلاقی تعلیمات پیش کرتے تھے۔ آپؐ کی سیرت اس کا عمل نمونہ ہے۔
- ساتویں خطبے میں دیگر مذاہب کے مقابلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی جامعیت، مالگیری، اس کی پیش کردہ اصلاحات اور دوسری انقلابی دیگر خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

- آٹھویں خطبے میں آپؐ کے پیغام کی بنیادی تعلیمات کا ذکر ہے۔ اس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام پر مشیر کسی بھی مذہب میں خالص توحید نہیں تھی اور جن مذاہب میں کسی حد تک تھی، وہ غلط تعبیرات و تاویلات کے باعث متحرک میں بدل گئی تھی۔
- "خطبات مدراس" کے اس اجمالی خاکے سے اس کتاب کی جامعیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب سیرت کے سلسلے کی تیسری کتاب ہے، اگرچہ یہ نگار حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے لیکن ایک حیثیت سے یہ بھی سیرت نبویؐ کا خیمہ ہے۔ حضرت عائشہؓ کی زندگی کے بیشتر حالات کا تعلق کسی نہ کسی طرح خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہیں۔ اس حیثیت سے ان کے سوانح ایک طرح سیرت نبویؐ کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ گویا سیرت عائشہؓ کو سیرت ہی کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے۔

سیرۃ عائشہؓ

اگرچہ نگار اس کتاب کا موضوع سیرت سے الگ ہے لیکن مصنف کے قول کے مطابق اس کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بیباچ سمجھنا چاہئے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد قرآن مجید کے بعض تاریخی اور جغرافیائی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کی قدیم تاریخ اور جغرافیہ پر تحقیق و تنقید ہے۔

ارض القرآن

قرآن پاک میں عبرت و بصیرت کی غرض سے عرب کی قدیم اقوام، ان کے انبیاء و رسول اور ان کے شہروں، آبادیوں، مسکنوں وغیرہ کا ذکر ہے، بعض مستشرقین نے ان کے بارے میں غلط مسلط تحقیقات پیش کیں جن پر بعض مسلمین کو غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے کا باعث بنیں۔ ایسے بیانات کی تفسیر میں عرب کی بہت سی زبانی روایات اور اسرائیلیات بھی شامل ہیں۔ ایسی باتوں سے مستشرقین کا اعتراضات کے اور بھی موقع ملے۔

"ارض القرآن" ایسے اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے۔ اور اس کا انداز بیان بھی سیرت نبویؐ کی طرح مناظرہ کے بجائے عقائد اور انداز ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

یہ کتاب سید سلیمان ندوی مرحوم کی مذکورہ دینی تصانیف سے ہٹ کر خالص علمی تصنیف ہے۔ لیکن اس میں مشکلائے متفرد موجود ہے۔ یہ کتاب اگرچہ خالص علمی و تاریخی ہے، لیکن اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کے سلسلے میں بعض

غلط نہیں کہ ان ائمہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت اور اس کی خوشگواہی دکھانے کے لیے اس سلسلہ میں مصنف کے پیش نظر خاص طور پر ان غلط فہمیوں کا انکشاف اور انکشاف بھی تھا اگر حکومت اپنی سیاسی مصلحتوں کی خاطر عام کر رہی تھی۔

خام

یہ کتاب علمی تصنیفات کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ خیام ایک نامور فلسفی اور جلیل القدر فاضل تھا لیکن اہل یورپ اسے ایک سادہ اور زبردست کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو ان کی ”تحقیقات“ کے مطابق بہترین شاہد و شراب میں مستغرق رہا۔ اور اس کی زندگی کا مقصد زندگی اور عیش پرستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ نیز وہ اسی مشرب کا مبلغ تھا۔

سید صاحب کو اہل یورپ کی اس تحقیق سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے زمانے کا غلط فلسفی، ہیئت، نجوم اور ریاضیات کا علامہ اور مشرب سمجھتے تھے۔ نیز وہ ان کے خیال میں ایک ویدوار مسلمان تھا اور مذہبی علوم میں مکمل دست کاہ کا حامل تھا۔

سید صاحب کی تحقیق کے مطابق جس طرح مولینا ندوی، شمس تیریزی اور ابوالسید ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شاہد و شراب کی رنگینیاں آتی ہیں اور خواجہ حافظ شیرازی کا کلام بھی ایک طرح پورا پیما ”ہے اسی طرح بقول غالب

ہر چند ہوش ہدایت کی گفت گو - بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کئے بنیبر

خیام بھی محض استعارات و کنایات کے طور پر ایسے الفاظ کے استعمال پر مجبور تھا۔ ہر حال اگر اس سلسلے میں خیام کی شخصیت کو ”نہ“ بھی مان لیا جائے تو نیز نظر کتاب کے گو تاگوں علمی مباحث، مختلف النوع تاریخی معلومات اور مصنف کی وسعت و وقت نظر اور تحقیق اندازہ کتاب کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔

حیات شبلی

یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم تصنیف ہے۔ جو ایک جلیل القدر اور شفیق استاد کی خدمت میں ایک شاگرد و رشید کا اندازہ عقیدت ہے۔ مصنف نے اس میں اپنا پورا ذوق و تلم اور تصنیفی کمال صرت کر دیا ہے۔

روایت ہے کہ علامہ شبلی کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو انہوں نے حوصلہ افزائی نہ کی اور اسی قسم کی ایک خواہش کے سلسلے میں انہوں نے اپنے شاگرد و رشید کو لکھنا تھا کہ:

”دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے۔ تم ہی جب کبھی دنیا کے دوسرے کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا۔“

ان الفاظ کا نتیجہ یہ تھا کہ علامہ شبلی کی زندگی کے حالات کی ترتیب و تالیف ہمیشہ سید صاحب کے پیش نظر رہی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ ان کی کتاب لکھنے کا موقع اس وقت مل سکا جب وہ دنیا کے اور کاموں سے بہت حد تک فرصت پا چکے تھے۔ ”حیات شبلی“ سید صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ جس کے ساتھ ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

دیگر مضامین، مقالات اور خطبات

مذکورہ اور دیگر تصانیف کے علاوہ سید صاحب نے زندگی کے مختلف موضوعات پر متفرق موضوعات پر چرمضامین، مقالات اور خطبات سپرد قلم کئے، وہ وقتاً بوقت مختلف جرائد و رسائل کے ذریعے سے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں سے کچھ کتابی صورتوں میں بھی اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ جن میں سے مکتوب فرنگ، سیر انفاستان، نقوش سلیمان، یاد و زنگان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولینا ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرح سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی شعر و شاعری سے ایک گہرا دلچسپی تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ ان کی طرح مولینا آزاد کے بارے میں یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے، سید صاحب کے بارے میں یہ بات عام کیوں نہیں ہو سکتی۔

خالد کشرم قہر کا بلند ذوق رکھنے کے علاوہ خود بھی اچھے شاعر تھے۔ اس زمانے کے شاعرانہ احوال اور سید صاحب کے ذوق شاعری کے سلسلے میں مولانا عبد الماجد آبادی نے اپنے آمازمیں بات کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

”... جب شرقی مطالعہ جو ان تھا اردو دن، مٹی جی جوانی کے تھے تو اردو کی غزلیات کیا معنی! غزلیات تک کا دفتر بے معنی و بامعنی ان کی انگلیوں کی ٹوک پر تھا۔ دیوان کے دیوان پڑھ ڈالے۔ کلیات پر کلیات ختم کر دیئے اور گلدستہ کا تو اب فقط یہی تشریح طلب ہو گیا ہے! اپنے وقت میں تازہ غزل کے ماہنامہ کو کہتے تھے ایک زمانے میں ان گلدستوں کی ببار تھی۔ لکھنؤ تو پھر لکھنؤ ہے، پٹنہ پٹنہ ہے، بلکہ قصور تک میں ان کے ذوق، ورتی، ورتی کی طرح کھلے ہوتے اور سید صاحب تھے کہ ان خوشبوؤں میں بسے ہوئے۔ پھر شاعر دکن کی باہمی ٹوک جھونک کے رسلے، اپنی برقمینوں میں مولوی صاحبان کے مناظر اور رسالوں سے ٹکراتے ہوئے۔ اس نے اس کی زبان پکڑ لی۔ اس نے اس سے محاورے کی سزا مانگی اس نے اس کے کلام میں ایلٹائے جلی نکالا۔ اس نے اس کے استادوں تک کو پٹن کے رکھ دیا۔ انہوں نے ان پر مرتزہ معنوں کا الزام رکھ کر ان کی موتی سی عزت آٹا لی۔ انہوں نے ان کے شعریں پہلے دم و فحش نکال کر ان کی گردن تاپ لی۔ پٹنہ سید صاحب کا وطن خود ہی اردو شعر و سخن کے عین میں گودا اور پیر سید صاحب کا لکھنؤ میں ساہا سال قیام، جو کہ کسرہ گچی غنی، پوری ہو گئی۔ سید صاحب اس چین کے ایک چبکتے ہوئے بیل خوشنوا خود بن گئے۔“

شاعر بھی تھے، تخلص، رمزی کرتے تھے۔ کبھی قطعہ، کبھی رباعی کہتے اور نغمہ نگار ہر بحر سخن میں شادری کر لیتے۔ غزل کبھی کبھی چوری چبے کہ لیتے۔ صرف دو چار شعر نمونہ کے حاضر ہیں۔

دلِ حریفہ نگہ یار کہاں سے لاؤں ۔ - جو نہ بخود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں۔
دوسرے چھوڑا، خرابات میں اگر ٹھہرا ۔ - دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں۔
تو بہ تو بہ، مری تو بہ بھی ہے کوئی تو بہ ۔ - لڑٹ جلتے جو نہ ہد بار کہاں سے لاؤں

تشنیر کا باعث نہ ہو امانِ تبا دیکھ ۔ - لائے نہ کہیں رنگ یہ خونِ شہد ا دیکھ۔
انکار تھا تجھ کو میری تاثیرِ دما سے ۔ - اب میری طرٹ دیکھ تو تاثیرِ دما دیکھ۔
آزاد ماکاں سے ہے اُسے قید ماکاں کیا ۔ - اگر آنکھ ہو، تھامے میں بھی نورِ خدا دیکھ۔

سید صاحب کی شاعری کی یہ چند مثالیں مولانا عبد الماجد دریا آبادی ہی کی فراہم کردہ تھیں۔ ان کی شاعری کے موضوع پر اگر تفصیل سے کچھ لکھنے کی خواہش پیش کی جائے تو اس سلسلے میں مزید بہت مواد مل سکتا ہے۔ ایک دوسرے صاحب پر ایسا بھی آیا، جب ان کی طبیعت صرف عارضہ کلام کی طرٹ آئی تھی۔ یہ کلام کی اکثر مثالیں ان کی کتابوں اور تذکرہوں میں موجود ہیں۔ ان مثالوں سے قصرت میں ان کا مقام سمجھنے میں بھی بہت مدد ملتی ہے۔ حسبِ دلی غزل سید صاحب نے ایک سفر کے دوران میں کہی۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ غزل کسی حد تک ان کے اس ذوق کے جذبات کا اظہار ہے۔

ابھی تو مشقِ نقاشی میں ہزار کرے ۔ - اثر کے واسطے کچھ مردِ انتظار کرے ۔

ہر قطرہ ندامت کا جو دیدہ ترمیں ہے - ہے دامن خالی کا وہ گہر شامانہ -
 وہ چشم محبت کو جو پائے محبت ہے - دیکھ تو ذرا کر کے کوئی اس سے یارانہ -
 مشفق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو - یعنی کہ جہان کا ہر وہ سب سے بیگانہ -
 حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی -
 آدل نہیں چھپ جا، اسے صورت جانانہ -

اعظم گزشتہ پہنچ کر طبیعت کئی روز تک عاجز رہی جس کے نتیجے میں ایک اور غزل ہو گئی، جو حسب ذیل ہے:-
 کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے - جو تری غفل میں بیٹھا، وہ سراپا ساز ہے -
 باغ میں صحرانظر آئے اور صحرائیں باغ - اب برسے جوش جنوں کا ادھی انداز ہے -
 پاؤں ترحہ اب سے عشق میں باہر نہ رکھ - وہ ہمہ غولی و محبوبی سراپا نماز ہے -
 نام ان کا برائے میں لب پیوں آیا کیا - تن سے جیسے روح بسمل مآلی پر دواز ہے -
 دیکھنے ملتی ہے کپ دولت سکون عشق کی - ہاؤد ہوئے جوش کو سراپا نماز ہے -
 گاہ دیکھا تھا بری چشم تصور نے انہیں - اب وہی تصویر میری جہم و دما ساز ہے -
 جو نہیں معلوم ہے اس کو کوئی جانے کیا -
 جب کہ جو معلوم ہے، وہ بھی سراپا راز ہے -

اور یہ غزل بھی ملاحظہ ہو، جو یہ صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی بیعت کرنے کے ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی اس زمانے میں ان پر جو کیفیات طاری تھیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی:-

پاکر تجھے اپنے کو یہ کیا بھول گیا ہوں - ہر سود و زیان دوسرا بھول گیا ہوں -
 جس دن سے مے دل میں تری یاد بسی ہے - ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں -
 آئے خدا بھی ترے صدمے میں مجھے یاد - گو یا کہ بظاہر میں حسد بھول گیا ہوں -
 عالم کے تماشے نہیں اب مجاہد دل میں - ہر لذت ہستی کا مزا بھول گیا ہوں -
 ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو - و دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں -
 اب مسئلہ کثرت و وحدت کو میں سمجھا - پاکر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں -
 سجدہ طوع کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے - اب قبلہ بھی اسے قبلہ بنا! بھول گیا ہوں -
 حل جیب سے ہوا فلسفہ حسن حقیقت - ہر مسئلہ اسے ذہن رسا! بھول گیا ہوں -
 ہے آہِ محرکہ میں وہ ذوق لب و دگر شہ - چنگ و سنہرے بربط کی صدا بھول گیا ہوں -
 منظور تری چشم رضا جیب سے ہوئی ہے - امید جزا، خوف سزا بھول گیا ہوں -

اے رہبر توفیق! مجھے راہ بتا دے۔ - نقش قدمِ راستہ بھول گیا ہوں۔
اے غفر! میرا تامل کس سمت گیا ہے۔ - تین صدائے درابھول گیا ہوں۔
اٹھائے ورق آج سے افسانہ نؤکا۔
افسانہ پارینہ دلا! بھول گیا ہوں۔

سید صاحب کے قلم سے ایک نعت بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس سے آپ کو ان کی حُسنِ نبوی کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا۔ یہ نعت محرم ۱۳۶۹
میں مدینہ منورہ میں کہی گئی تھی۔

آدم کے لئے خزیہ مالی تسبی ہے۔ - کئی، مدنی، ہاشمی و مطہبی ہے۔
پاکیزہ ترازو عرش و سما، جنت و فردوس۔ - آرام گر پاک رسولِ عربی ہے۔
آہستہ قدم، منجی نگاہ، پست صدا ہو۔ - خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے۔
اے دارِ نبیت نبوی! یاد رہے یہ۔ - بے تادمہ یاں پیشِ بے ادبی ہے۔
کیا شان ہے اللہ سے محبوبِ نبی کی۔ - محبوبِ خدا ہے وہ، جو محبوبِ نبی ہے۔
مجھ جاتے ترے چھینٹوں سے اے لبرِ کرم آج۔
جو آگ بزنے سیز میں مدت سے دہی ہے۔

قرآن حکیم کی سورۃ الشعراء کے آخر میں دو قسم کے شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک وہ جن کی پیروی گمراہ کرتے ہیں اور وہ ہرادی ہی سرگرداں رہتے ہیں۔ ایسے
شاعر جو کہ کہتے ہیں کہ تم نہیں۔ گویا ان کے قول اور عمل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی ناس کے برعکس دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جو ایسا نہاد ہیں اور یکساں اعمال
پر کاربند رہتے ہیں۔

سید صاحب نے اپنے شعروں میں جو کچھ کہنا چاہا کھلا وہ دوسری قسم کے شاعروں کی فہرست میں آتا ہے۔ ان کی شاعری اسلامی شاعری ہے۔ وہ جو ہر
اپنی فکر کے ذریعے سے اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور مخالفین سے اس کی ممانعت کرتے رہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی منظومات کے ذریعے سے بھی اسلام
کی اشاعت یا ممانعت کا کام لیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔
جن دن سید صاحب بھوپال میں مقیم تھے، اس دوران میں بھوپال کے شعراء نے بڑے وسیع پیمانے پر ایک منظم شعروں کا انعقاد کیا۔ اس میں جو کچھ
طرحِ آبادی کبھی مدعو کیا گیا۔ بھوپال کی عام نمائندگی تھی۔ اس معاملہ میں جو کچھ نے جو نظم پڑھی وہ اس کے ہفتوں میں شامل بھی جاتی ہے۔ جو کچھ کی مذکور
درجہ ذیل ہے۔

جب کہیے خواب کے ہنگام تھے گرمِ خودش
باپ کی حرمت ایک "ہوں" نے کر دیا سب کو غرض

”ہوں“ بزرگِ حنا مذاک کی آہنی دیوار ہے۔
 ہر شاد و غم کو ایک ”ہوں“ درکار ہے۔
 سستے میں انسان کا ہے پاپِ ربِ کائنات
 اس لئے اسے دوست! تجھ سے پوچھا ہوں میں یہ بات۔
 جب ہلاک نے بھائی تھیں لڑکی تھیں
 کوئی ”ہوں“ اس وقت کیا گرجی تھی زیرِ آسمان۔
 تحفہ آئے تھے جب مقبول انسان کے سر
 پھٹ پڑی تھی کیا کوئی ”ہوں“ غیمہ چنگیز پر۔
 شعلہ دئے علمِ نیر جب کہ تھے بھڑکے ہوئے۔
 ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی بامِ عرش سے۔
 لے اڑا تھا جب کہ رادھن ایک دیوتا کا گہر
 کوئی ”ہوں“ گرجی تھی اس وقت ادبِ چرخ پر۔
 جب بیہوش کر بلا کی خاک پر دریائے نوح
 دھیر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک ”ہوں“
 کر رہا تھا ہر جب سقراط کے دل پر اثر،
 عرش سے اتری تھی ”ہوں“ کوئی بساطِ فرش پر
 مسیحِ مریم کو جب کہیں چا گیا تھا دار پر،
 ہو گئی تھی کیا کسی ”ہوں“ سے زمیں زیرِ دُور
 اُنہم نے رکھ دیا تھا جہنم کو جب ایک شہر،
 قلعہ تیبہ میں آئی تھی کیا اس وقت لہر
 بہتیاں غلطیہ تھیں جب موت کے گرداب میں
 کوئی ”ہوں“ کوڑکی تھی کیا جنگل و پنجاب میں
 جب ہوئے تھے آخری اذکار گاندھی جی ہلاک،
 آئی تھی کوئی ندائے خشمگین و قہر ناک،

اتنی چپ سادے ہوئے ہے کس لیے عرش بریں
کیوں ہمارا آسانی باپؑ بھوں کرتا نہیں؟

آپ نے دیکھا ہو گا کہ مجموعی طور پر اس نظم میں اسلام کی تعلیمات اور خود خدا کے تصور کی کس طرح نفی کی گئی ہے۔ سید صاحب اس قسم کی خرافات کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے اس نظم کے بارے میں سنا تو فرمایا اس کے جواب میں یہ نظم لکھی جو جوش ایلیہ کم لہروں کے لیے سرمہ بھیرت ہو سکتی ہے۔ سید صاحب عرف عام میں شاعر نہیں تھے۔ بلاشبہ جوش کی نظم کا جواب کسی اسلام پر شاعر کو لکھنا چاہیے۔ بہر حال سید صاحب کی نظم ملاحظہ فرمائیے:

باپ کی بھوں سے منجیل جاتے ہیں فرزند سعید
ناخلف جو ہیں نہیں کھنتے ہیں تہدید و وعید

اس جہاں میں جو مصیبت پیش آئی ہے کہیں
وہ بجز تینہ رب العالمین کچھ بھی نہیں

تازیانہ غافلوں کو فتنہ چنگیز تھا !!
رہوارِ نظم ملت کے لیے ہمیں نہ تھا

نسل سے چنگیز کی سلطان ہیں پیدا ہوا،
خلعت تانار سے فریبیں پیدا ہوا۔

ظلم نیر دسے کلیں آنکھیں عوامِ روم کی،
ہل گئی بنیاد اُس کی عظمتِ مہرہم کی،

راون بدکش ظلم و جور کا فدا ہوا،
ہند کے دیوتا کا جو گوشت اڑا کر لے گیا،

اس سے جو ہر کھل گیا سیتا کے پاک اخلاق کا،
رام کی حرم بلند و شہرہ آفاق کا،

کر بلا کی خاک سے اُٹھا تھا جو سیلِ بلا،
ظلم پیشہ بادشاہوں کو بہا کر لے گیا

جو پیالہ زہر کا سقراط پلا کر مر گیا،
عقل کے وہ تاباں دھننے کا ساماں کر گیا،

جیسی طرح کی مظلومی کا یہ اعجاز دیکھ،
 روم کے ظالم ہونے یوں حق سے سرازاد دیکھ
 اُنٹم بم سے ہوا جو شہر کل دیران دیکھ،
 چین کی آہوں کا شرارہ اندروں جاپاں دیکھ
 غرمن پنجاب و بنگالہ پر جو جھبلی گری،
 اس سے جل کر خاک ہے سامانِ فرقہ پروری
 کشتہ بیدار گاندھی کے بدن کا سروغوں،
 ہے زبانِ فطرت خاموش کی خاموش "ہوں"
 جاگ اٹھی اس "ہوں" کے سیم شور سے خوابِ فروغ
 رو پڑی چشمِ ستم گر، ہنس پڑی غدیدہ روج
 بے بھر کو کیا خبر ہوتا رہا ہے بار بار
 "تیرگی" سے لڑ، "شر" سے خیر"۔ یہی انکار

اردو اور فارسی کے علاوہ عربی میں سید صاحب کا منظوم کلام اتنا زیادہ ہے کہ وہ دیوان کی صورت میں مرتب ہو کر مشرق وسطیٰ میں زیرِ اشاعت ہے۔

اعترافِ عظمت

بڑے صغیر پاک و ہند کی مردم خیز سرزمین کا ہلِ اسلام میں سے جو مشابہ پیدا کرنے کا فخر و شرف حاصل ہے، اُن کی تعداد اگرچہ کم نہیں، لیکن ان میں ایسے بلاشبہ کم ملیں گے، جنہیں اپنی زندگی ہی میں ہم عصر علماء و فضلاء کی اکثریت کی طرف سے اعترافِ عظمت کا انتقام حاصل ہو۔ بلاشبہ سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی چند عظیم القدر شخصیات میں شامل ہیں جنہیں یہ نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوئی۔ سید صاحب موصوف کی شخصیت اور اُن کی سیرت و اخلاق کے بارے میں خود اُن کی زندگی میں اور ان کی وفاتِ حسرت آیات پر مشابہ ملک نیز عالمِ اسلام کے مختلف حلقوں میں جس خلوص اور فراخ دل سے اُن کی علمیت، فضیلت اور عظمت کا اعتراف کیا گیا، وہ سید صاحب کی شخصیت کے لیے بہت بڑا خراجِ تحسین ہے۔

سید سلیمان ندوی مرحوم کی عظمت کا اعتراف کرنے والوں میں جہاں اور نامور شخصیات شامل ہیں، وہاں حکیم الامت، ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال مرحوم خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے میں حق شناسوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

ان سطور میں چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آپ انہی کو مٹتے، نمونہ از غرور اسے کے مصداق ایک نظر میں ملاحظہ کیجیے۔ اس سے سید صاحب موصوف کی بلند و عظیم شخصیت اور بالخصوص ان کی سیرت و عظمت کی ایک جھلک ضرور آپ کے سامنے آ سکے گی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے علامہ اقبال مرحوم ہی کی زبان و قلم سے اعترافِ عظمت کی مثالیں دیکھئے۔ علامہ اقبال سید صاحب کے گہرے رقائق میں شامل تھے اور انہیں سفرِ حضر میں سید صاحب کی سیرت و فضیلت کے مطالعہ و مشاہدہ کا موقع حاصل ہوا تھا۔

مکاتیبِ اقبال (جلد اول) میں علامہ اقبال کے شعر (خطابیہ میں) جو انہوں نے سید صاحب کے نام لکھے تھے۔ ان خطوں میں اقبال نے مسئلہ زمان و مکان، ختم نبوت، حقیقت وحی، قرآن میں مانع و مفرغ اور اسلام میں خلیفہ کے اختیارات وغیرہ ایسے فلسفیانہ اور سنگمانہ قرآنی اور فقہی مسائل میں استفادہ کیا ہے۔

علامہ اقبال کے مکاتیب میں سید صاحب کی علییت و فضیلت اور ان کی عظمت کا واضح اعتراف موجود ہے۔ ایک خط میں علامہ کے الفاظ یہ ہیں:

”مولانا شبلی کے بعد آپ استاذِ اکمل ہیں“

(مکاتیبِ اقبال جلد اول صفحہ ۸۰)

اور دوسرے خط میں اقبال مرحوم نے لکھا:

”علومِ اسلام کی جو شے شیر کا فرماؤ آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے“

(مکاتیبِ اقبال جلد اول صفحہ ۱۶۶)

علامہ اقبال نے ایک مکتوب میں سید صاحب کے مقامِ علییت و عظمت کو دار کا اعتراف ان الفاظ میں بھی کیا ہے:

آپ قلندر ہیں، مگر قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے:

قلندر ان کو براہِ تو سنت می کو شند

دشاه باج پساند و غرق می پوشند

بحکوت اند و کندے بہر و میر چھپند

بحکوت اند و زمان و مکان در انوشند

دریں جہاں کہ جمالی تو جلوہ دارو

ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشتند

بروزِ بزم سراپا چو پرنیاں و صبرید

بروزِ بزم خود آگاہ و تن و ابرو شمشد

(مکاتیبِ اقبال جلد اول صفحات ۱۳۹، ۱۴۰)

پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید صاحب سے متعلق اپنے ایک مضمون ”کج گز انبیاء“ میں تحریر کرتے ہیں:

حب و نسب، علم و فضل، اخلاق و عادات، خدمتِ ملک و ملت کے اعتبار سے سید صاحب کا درجہ بہت اونچا اور پورے طور پر مستقیم ہے۔ جہاں تک میری معلومات ہیں، سید صاحب کی تعلیم و تربیت پلانے طریقوں پر پرانے استادوں اور بزرگوں کے سایہ شفقت میں پرانی فضاؤں میں ہوئی تھی۔ جدید علوم و فنون سے براہِ راست انہوں نے کسی سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ لیکن نئے افکار اور نئے طور طریقوں سے انہوں نے آپ کو اس خوبی اور خاموشی سے آگاہ کیا تھا کہ وہ کہیں بخوبی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ چاہے وہ اہلِ علم کا حلقہ ہو، چاہے اربابِ سیاست کی مجلس، خواہ طالب علموں کی جماعت ہو، خواہ عام لوگوں کا

کا اجتماع جدید انکار اور رجحانات سے کوئی کتنا ہی آشنائی نہ ہوتا، سید صاحب سے تیار و خیال کرنے میں اسے کبھی ٹھوس نہ ہوتا کہ وہ ایک ایسے شخص سے گفتگو کر رہا ہے جس کی معلومات روایتی ہیں یا جس کا ذہن ہنسٹے ٹکے غلاظت میں اسیر ہے یا جس کے فکر و نظر کا دائرہ تنگ ہے۔

علی گڑھ میں جدید ترین افکار و اطوار سے مسلح اور مرتع لڑجوازل کو میں نے دیکھا کہ خالص اور ذہنی سطح پر مولانا کی سمہری نہ کر سکتے تھے اور ہمیشہ یہ ہوا کہ وہ سید صاحب سے کچھ سیکھ کر ہی واپس گئے۔

(معارف "سلیمان نمبر صفحات ۱۱، ۱۲، ۱۱۸)

مولانا سید احمد اکبر آبادی مدبر برہان "لکھنؤ اپنے مضمون" مولانا سید سلیمان ندوی — میری نظر میں "کے زیرِ عنوان ابتدائی سطور میں لکھتے ہیں :-

"مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرائے بیان ہے؛ جس سے مولانا کا اصل مقام اور مرتبہ متعین نہیں ہوتا اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان (برصغیر پاک و ہند) کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرزِ تقدیم کا ہو یا طرزِ جدید کا، نصف صدی کے اندر اندر مذاقِ تصنیف و تالیف، طریقِ فکر و استدلال اور تہذیبی احوال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا اور اس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم و جدید طبقہ کو کج سمجھائی بخشی ہے، اس کی نظیر انہیں پورے عالمِ اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے آخری دو برسوں کی صدی کے ادراک کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔"

(معارف "سلیمان نمبر صفحہ ۱۵)

مولانا شامس الدین احمد ندوی مدبر "معارف" نے اپنے مضمون "حضرت الامام رحمۃ اللہ علیہ کی دینی خدمات" کے آغاز میں لکھا ہے :-

"حضرت امتداد مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی جیسی جامع کمالاتِ شخصیتیں کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں وہ اپنے کمالات میں ائمہ سلف کی یادگار بنے، جملہ اسلامی علوم پر ان کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی اور بعض علوم میں امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ ان میں اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہیں گی۔ ان کا علمی و دینی درجہ اس قدر بلند اور ان علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گونا گوں اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔"

(معارف "سلیمان نمبر صفحہ ۱۷)

حضرت مولانا شامس الدین احمد ندوی نے اپنے مضمون میں اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

”مرحوم غفر اللہ لدنیات و اسلامیات کے عالم تھے لیکن اسی کے ساتھ عربی، فارسی، اردو و زبانوں کے ادب کا بھی صالح ذوق رکھتے تھے، اسی لیے ان کے عام علمی کارناموں کا تعلق اگرچہ اسلامیات و دینیات ہی سے ہے لیکن اس کے ساتھ ادبیات کے متعلق کبھی کبھی ان کو کچھ لکھنے کا سرفہ اگر مل گیا تو اس میں بھی انہوں نے ہمیشہ نئی راہیں پیدا کیں اور ایسے اچھے نتائج ان کی بدولت اس سلسلے میں بھی دنیا کے سامنے آتے کہ ہر طرف مرجعہ و آفرین کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔

قرآن و حدیث، فقہ، کلام و لغت اور سب سے زیادہ تاریخ اسلامی اور ان سب کے سماج جس موضوع پر سید صاحب نے نظم اٹھایا ہے اور اس سلسلے میں نئی معلومات یا نئے نقطہ نظر سے دنیا کو انہوں نے روشناس کیا ہے، بننے والے انسان کی فہمیت بنائیں گے تو میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں نہیں تو ہزاروں تک ضرور پہنچ جائے گی۔ یہ ان کے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اس مطالعہ فکر سے ان کی لقائیت اور شائے کردہ مقالات و مضامین کا جائزہ لے۔ دنیا کو حیرت ہوگی کہ کتنے تبدیل عرصے میں اس بندہ خدا نے جدید معلومات اور متعلقہ علوم کے سلسلے میں کتنے نئے پھولوں کا اضافہ فرمایا۔

بڑے بڑے مسلمانوں کی کتابوں میں پیشکش کی گئی چیزیں نئی چیزیں ہاتھ آتی ہیں لیکن سید صاحب کی کتابوں میں قدم قدم پر نئے انکشافات، اچھوتی معلومات سے پڑھنے والوں کا دامن تحقیق بھرتا چلا جاتا ہے ۵

(معارف سلیمان نمبر صفحات ۲۱۶، ۲۱۷)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی ان الفاظ میں غلیظت و فہمیت کا اعتراف کرتے ہیں :-

”سید صاحب کے فاضل اہل اور عالم بے بدل ہونے کا ایک زمانہ قائل ہے۔ دنیا کو مسلم ہے کہ وہ فن تاریخ میں امام وقت تھے اور سیرت نگاری میں اپنی نظیر آپ۔ لیکن آخر تک ہم ہی لوگوں نے ان کے ادبی، شعری اور تنقیدی مرتبہ کو جاننا اور کم تر ہی لوگوں نے انہیں ادیب، انشا پرداز اور سخن سنج کی حیثیت سے پہچانا۔

علم و ادب کی تاریخ میں ایسی نا شناسی اور کم شناسی کی مثالیں نہ معدوم ہیں نہ غیر معدوم۔“

(معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۳۰)

مولانا محمد ادریس ندوی داستان تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء (کھنڈ) سید صاحب مرحوم کے علمی کاموں کے بارے میں طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

”سید صاحب اس دنیا سے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے لیکن ہم چہرہ نہ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے۔ ان کی تصنیفات، مقالات، خطبات اور مکتب ایک گنج گمانا یہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ اور آئندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، علمی اور ذہنی راضائی کے لیے اس سے بڑا قیمتی سامان موجود ہے۔“

(معارف سلیمان نمبر صفحہ ۲۴۵)

اعزاز غلیظت کی مثالوں کے آخر میں جناب مالک رام کے جذبات بھی ملاحظہ کر لیجئے جو انہوں نے معارف کے سالانہ میلے اپنے معنوں پر بعنوان علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے اختتام پر الفاظ کی صورت میں سپرد قلم کیے ہیں۔

”جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ تو اب خالی ہی رہے گی۔ اس سے پہلے کس کی پڑ ہوئی ہے جو ان کی ہوگی لیکن ان کے ان

اتنا تو کر سکتے ہیں کہ جو شیخ انہوں نے جھٹائی تھی، اگر وہ اس کی روشنی میں اضافہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اس میں جان لٹا دیں۔ کہہ اس کی تابانی میں کمی نہ آنے پائے اور پیچ تو یہ ہے کہ ان کا اپنے آپ پر احسان ہو گا کہ اس مہمانے ان کا اپنا نام زندہ جاوید ہو جائے گا۔ ورنہ مرنے والے کے کارنامے تو ایسے ہیں کہ اگر کوئی انہیں جھٹلا بھی چاہے تو جھٹائے نہیں جاسکتے۔“

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

حیات مستعار کے آخری ایام میں سید صاحب کی صحت کافی گر گئی تھی، غوراک برائے نام رہ گئی تھی جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ قویٰ مضمحل ہوتے گئے، علالت کا آغاز استسقاء قلب کے عارضے سے ہوا، عرصہ بعد نفس کی شکایت پیدا ہو گئی، دو ہفتے میں ہمیشہ کے لیے رہ گئی اور آخر کار جان لے کر گئی۔

اتوار ۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۲ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء کی رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ اگلا دن شام تک مرض بد و جز میں گزرا اور آخر سی ساڑھے چھ بجے شام کے وقت سانس میں ایک جھٹکا محسوس ہوا، جیسے پھکی آئی ہو۔ یہ پھکی زندگی کی آخری ایاموت کی پھکی تھی جس کے ساتھ ہی یہ علامہ دروگاہ اس دنیائے دگم دلو کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے عالم باقی کی طرف رحلت کر گیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

مَوْتِ الْعَالَمِ مَوْتِ الْعَالَمِ کے مصداق ہندوستان کے علاوہ، علامہ سلیمان غفران شاہ مالک میں بھی سید صاحب کے انتقال پر پٹال پر دل رنج و اندوس کا اظہار کیا گیا اور شاہ میر وقت نے مختلف بیانات دیے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

”علامہ ندوی جیسے صاحبِ علم کی موت سے صرف پاکستان کو پرے عالم اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ وہ تاجروں کی عرب اکیڈمی کے ممبر بھی تھے۔ جہاں وہ عربی کے ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے“

عبدالوہاب غزام (دفتر سربراہ)

”ہم کو علامہ سید سلیمان ندوی کی موت سے دکھ ضرور ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اس کا دکھ سب سے کہ جو علوم و فنون ان کے سینے میں تھے، وہ بھی ان کے ساتھ دفن ہو گئے۔“

شیخ ابوالخیر (دفتر شام)

”مولانا سید سلیمان ندوی کے پایہ کا عالم صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام میں بھی کوئی نہ تھا۔“
گورنر جنرل پاکستان

”انہوں نے اسلامی تاریخ کی تدوین میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انہیں تا ابد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔“

سردار عبدالرب نشتر

”سید سلیمان کی وفات سے قوم ایسے جید اور فاضل عالم سے محروم ہو گئی ہے جس نے اپنی تمام زندگی اسلام کا پرچم بلند کرنے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔“

محترمہ فاطمہ جناح

سید صاحب کے انتقال پر پاکستان اور ہندوستان کے متعدد شعراء نے منظومات میں خراج پیش کیا اس قسم کی نظموں اور تاریخی قطعوں کی فہرست طویل ہے، ذیل میں صرف دو شاعروں کے قلم درج کیے جاتے ہیں:-

نذرانہ شعرا

رداں شد سورے عرض ربّ اعلیٰ

❖

سلیمان سرری علم و حکمت

علیہ رحمت اللہ تعالیٰ

❖

باب دیدہ سانش نوشتہ

(امجد حیدر آبادی)

۱۲۷۳ھ

ز خاکد ان فناخت زندگی بر لبست

❖

کشودہ پر برتنائے عالم باقی

بیس گز تخت سلیمان باوچ فودش است

❖

نشان صاحب عزناں بر زیر خاک مچو

(حفیظ ہوشیار پوری)

۱۹۵۳ء

امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری
 رحمۃ اللہ علیہ

۵۱۳۸۱
 ۶۱۹۶۱



۵۱۳۱۰
 ۶۱۸۹۱

سواد تحریر برامیر شریعت

(بشکریہ برادر ام بشیر احمد غاوری ایڈوکیٹ)

۱۱

۱۱/۱۱/۱۱

محبوب الی وند اعرف اور عرف

مستند قلم نبوی پر یہ سرگندہ لہریں

صدیق موعود کے دل فانی نورانی

تمام عبادت دھو دھو لے رہی ہیں برائی

ایک بہرور صفت انور کی وصف ہے

کہ اس اصول دین کی حفاظت ہماری

درد آگے رکھ کر موبائی کے درپے لگنا

جن میں عبادل کا مسجد ادا

گیا وہ دانا خان از آفر

۵۶
سرپرست
مسلمان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

تاریخ نے ہمارے سامنے کچھ ایسی شخصیتیں بھی پیش کیں ہیں جن کا اچھا کردار ان کے نام کا معنی لازم ہو کر رہ گیا۔ سنم کا نام آتے ہی باور کی نقش ابھرنے لگتا ہے اور قائم کے نام سے ہی سخاوت مفہوم ہوتی ہے سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تاریخ کے ان چند گنے گئے بزرگوں میں سے تھے جن کا نام آتے ہی برأت و ہمت ایمان اور بلاغت و خطابت کے نقوش نام کے معنی لازم بن کر آنکھوں کے سامنے نکھرتے ہیں اور تاریخ کے اس عظیم نام سے مردہ رگوں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔

جنتہ لوگ مر نہیں سکتے وہ صرف راستہ بدلتے ہیں

ان کے نقش قدم سے صدیوں تک منزلوں کے چراغ جلتے ہیں

آپ شہزادہ صلح و مصفا سیدنا امام حسنؑ کی اولاد میں سے تھے مگر طبیعت پر شہید ہو کر و جفا حضرت امام حسینؑ کا رنگ غالب تھا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ بھی آپ کے اجداد میں سے تھے آپ کے والد کا اسم گرامی ضیا والدین احمد تھا ان کی شادی حکیم سید احمد اندرابی کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ سے ہوئی اور انہیں سے ۸۹۱ھ میں عطاء اللہ شاہ بمقام پٹنہ پیدا ہوئے میں آپ کے تھیں۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ میں ہی حاصل کی اور میں شرو سن کا ذوق بیدار ہوا اور دگر گھر کی زبان تھی فارسی لوبایت کی تکمیل نے اس ذوق کو نکھارا اور عربی ادب نے مقصدیت کے خاکے میں علم و حکمت کے رنگ بھرے۔

سترہ برس کی عمر میں پنجاب آئے اور اسلامیات کا رخ کیا حافظ قرآن تھے ہی اتر سر کی دینی فضاؤں نے وراثت نبوت کی دعوت دلائی ان دنوں ادیب اریب اور فاضل لبیب مولانا محمد عالم اسی حضرت مولانا علامہ مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی اور عالم باعمل عارف اکمل حضرت مولانا نور احمد صاحب اتر سر کی علم و فضل کا بہت شہرہ تھا آپ نے ان کا بر سے ادب۔ فقہ اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی ان کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قلیفہ اعظم حضرت مولانا محمد قاسمی اور حضرت مولانا حبیب الرحمن چاٹگامی سے حدیث پر بھی اور امام العصر حضرت مولانا انور شاہؒ سے بھی حدیث کے اسباق تبرکاً سن کر قرآن کریم کا گرامر مطالعہ آپ کا امتیازی نشان تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر سیاست میں قدم رکھا برطانوی سامراج اور فرنگی سیاست پر گہری نظر تھی اللہ لا اور ستارہ صبح نے نکل کر انہیں اور اکابر دیوبند نے ذہن کو جلا بخشی انگریزوں سے اتنے متغیر تھے کہ دلائل و اسلحہ کی سرخی اور آئندے تک کو ناپسند کرتے فرماتے تھے کہ یہ انتخاب بھی جھپٹ کر لیا گیا۔ سرزائیت کی مخالفت بھی دراصل ان کی انگریز دشمنی کا ہی انعکاس تھا یہ صحیح ہے کہ ختم نبوت اسلام کا مرکزی مقصد ہے لیکن وہ سرزائیت کے مخالفت زیادہ تر اس لیے تھے کہ یہ انگریز کا ایک خود کاشتہ پودا ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے بڑ بڑھوت کو زنا اور انگریزی مملداری کو خدا کا سایہ رحمت قرار دینا تھا شاہ صاحب اس فرنگی سازش سے یہاں تک متاثر تھے کہ سرزائیت کی ترویج پوری زندگی کا موضوع بن گیا اور پھر پوری زندگی اس میں صرف کردی انگریز کے خلاف وہ مجلس احرار کے داعی تھے۔ تو ان کی دلی خواہش کے بعد وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کے صدر تھے۔

شجرات سے پیوستگی

صف علماء میں یہ عزت تھی کہ محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب مفتی اقلیم ہند مولانا کفایت دہلوی اور قطب وقت حضرت مولانا احمد علی لاہوری جیسے بزرگوں نے آپ کو امیر شریعت تسلیم کیا

ماحقہ پر بیعت کی پاک و ہند کا خطیب اعظم اپنی بحریا میں اور طوائف ساسی سے عوامی انفعیات کا بھی بلا شرکت غیرے مالک تھا تاہم آپ نے متنازعہ ہمتی کے انداز میں انظار شخصیت سے ہمیشہ پر سیر کی آپ کی سیاسی بصیرت کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان میں تفسیروں ہفتوں اور اختلافی مسائل کی ہی کمی نہیں دے ہوئے اختلافات کو اچھالنا اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈالنا پرانے فرقوں میں ایک نئے فرقے کا اضافہ تو ہے مسلمانوں کوئی خدمت نہیں ان پر ایک غلام ہے ہاں پچھلوں کے انتساب سے تفسیر وفقہ کا بیان فرقہ آرائی میں شجرات سے پیوستگی ہے۔

✓ تحریک آٹھویں کے پلیٹ فارم پر آپ کے ساتھ شیرازی، اہلحدیث، یعنی دیوبندی، بریلوی سب مکاتب فکر جمع تھے آپ کی ہمتی کہ پہلے مکاتب فکر سے اشتراک کیا جائے لیکن اس بات کی بھی پوری کوشش کی جائے کہ کوئی نیا مکتب فکر یا فرقہ پیدا ہونے نہ پائے خواہش تھی کہ قرآن و سنت کی تعبیر میں نئی اختلافی راہیں نہ نکالی جائیں اور جو اختلافات کتابوں میں سوئے ہوئے ہیں اور اس دور میں علماء نہیں انہیں کتابوں سے اچھال اچھال کر نئے سرے سے زندہ نہ کیا جائے۔

آپ کہا کرتے تھے کہ زمانہ حال کے مفکرین نے پرانے اختلافات ابھار دیے کہ جو نئے مکاتب فکر سامنے لاکھڑے کئے ہیں نئی گروہ بندی سے فرقوں میں۔ ایک نئے فرقے کے اضافے کے سوا مسلمانوں کو کچھ حاصل نہیں ہوا اگر یہ مفکرین اپنی سرگرمی تعمیر اور عملی خدمات تک محدود رکھتے مسائل و مسائل کی غار وادی میں نہ اترتے تو ان کا وجود مسلمانوں کے لیے ایک سعادت ہوتا خود اس امر کی پوری کوشش کی کہ نئے مفسر یا مفتی کے جلوں کبھی جلوہ گرہوں جب بھی مسائل کی نوبت آتی آپ اکابر علماء کی طرف سے مشورہ دیتے اور انہی علماء کی طرف متوجہ کرتے جو پہلے علماء اور سلف صالحین سے انتساب رکھتے ہوں آپ کی رائے تھی قلعة اسلام کے لیے علماء دین کے اعتماد کو قائم رکھنا اور ضروری ہے اس اعتماد کے رہتے ہوئے کوئی فرقہ اور اتحاد راہ نہیں پاسکتا۔ ایک بار میں آپ سے پوچھا گیا کہ مرزا غلام احمد کو اسلام سے خارج کیوں سمجھتے ہیں؟ آپ اس کے جواب میں ختم نبوت اور مرزا صاحب کے عقائد پر پیر بڑی مفضل بحثیں کر سکتے تھے لیکن آپ نے اس کی بجائے یہ جواب دیا

اکابر علماء جن پر امت کے تمام فرقوں کا اعتماد ہے مرزا غلام احمد کو اجماعاً دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں "میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوں اور وہ مرزا صاحب کو انکے عقائد کی وجہ سے مسلمان نہیں سمجھتے"

شجرات سے پیوستگی آپ کے ایمان کی دولت تھی اخلاص و انکسار نے انادلا غیری کی جاہلی آگ بالکل بجھا رکھی تھی اپنے جماعتی نظریات کے فیصلوں کی ترجمہ نمیل تھے حضرت واپوری قدس سرہ کے حلقہ ارادت نے آپ کے اخلاص و انکساری کو اور نکھار دیا تھا آپ کی جماعت کے کسی پرانے یا نئے کارکن نے کبھی امر اور ڈکٹیٹر ہونے کا الزام نہیں لگایا علم اور معصی و مروتی میں آپ نے جسے سمجھا اس کے تعمیل حکم سے آپ نے کبھی انحراف نہ کیا اپنے اکابر کی تعظیم و توقیر آپ کی روح کی لگاؤ اور آپ کے عمل کا منہاج تھی۔

تقیق ملک کے بعد زعمائے احرار میں بھی اختلافات ابھیرے بعض ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے اور بعض میں تقیق بھی ہوئی لیکن جس شخص کے خلاف کبھی کسی کی زبان نہ کھلی اور جس کا پر عظمت کردار اور ضمیر کی بلندی ہر کارکن کے دل و دماغ پر برہم رہی وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں احرار کے ہر فرد اور گروپ کا دل آپ کے اجمال و اکرام اور والہانہ عقیدت سے سرشار ہے

شاہ جی کے اس عظیم کردار کا پتہ چلتا ہے جس نے ایٹوں کو تو درکنار غریبوں کو بھی آپ کا متوالا بنا دیا تھا آپ پر یہ ارتداد و نفرت ہر وقت تھی نیز تھا کہ امت محمدیہ کا نشان بڑوں کی توہین اور چھوٹوں پر شفقت ہے۔

تھانہ بھون میں حاضری

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہاں حاضری اور ملاقات کے بہت آداب و ضوابط تھے عام آدمی آسانی سے حاضری کی جرأت نہ کر سکتا تھا پہلے بذریعہ خط اجازت لینا ہوتی تھی بھی دونوں شاہ صاحب پر وہ مقدمہ پل رہا تھا جس میں لدھارام سرکاری گواہ تھا ان دونوں آپ دعا کی درخواست کے لیے تھانہ بھون حاضر ہوئے آپ نے اساتذہ العلماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب متہم خیر المدارس مالدھرواں پرانہ کر لیا کہ وہ انہیں پیشگی اجازت دے بغیر تھانہ بھون لے جائیں ہر دو بزرگ جب وہاں پہنچے تو حضرت حکیم الامت خانقاہ میں تشریف دے گئے تھے گھر گئے ہوئے تھے حضرت مولانا خیر محمد صاحب شاہ جی کو وہیں بٹھا کر حضرت کے مکان پر حاضر ہوئے اور شاہ جی کے آنے کی اطلاع دی حضرت حکیم الامت اپنی روایتی سختی سے امتراز فرماتے ہوئے بڑی شفقت سے پیش آئے اور خانقاہ تشریف لا کر شاہ صاحب سے بڑی بے تکلفی سے ملے شاہ صاحب کے لیے مقدمے کی بریت کے لیے دعا بھی فرمائی اور واپسی پر شاہ صاحب کو تیس روپے بھی ہدیہ پیش کئے اور فرمایا :-

”ان تیس روپوں کو اپنے کاموں میں میری شرکت تصور کر لیجئے میں جس طریق سے دین کا کام کر رہا ہوں میرے لیے یہی مناسب ہے۔ آپ کے لیے میری ہمدردیاں پوری طرح موجود ہیں مجھے خط لکھنا ہو تو اس کی آپ کو پوری طرح اجازت ہے ہاں آپ اپنا ایک اور نام تجویز فرمائیں جو میرے اور آپ کے مابین ایک راز ہو اور مجھے اسی نام سے خط لکھا کریں اس طرح یہاں آپ کی خط و کتابت کی کو معلوم نہ ہو سکے گی“

جن حضرات کو تھانہ بھون کی حاضری کے آداب پوری طرح معلوم ہیں وہ اس واقعہ سے شاہ صاحب کی شخصیت کا با آسانی اندازہ کر سکتے ہیں اور یہ بھی اس سے واضح ہے کہ حضرت حکیم الامت کے ہاں محنت و قربانی کا دُر در رکھنے والے کارکنوں کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ آپ حضرت مولانا پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کے بھی بڑے معتقد تھے پیر صاحب کا ذکر آتے ہی بسا اوقات انہیں بڑباجا بتائیں فرمایا کرتے تھے کہ مرزا غلام احمد کی تردید میں حضرت پیر صاحب کی خدمات ہم سب کے لیے سراپا ہے خیر ہیں آپ حضرت پیر صاحب کے علوم اور ان کی باطل کشی بہت کے بھی پوری طرح قائل تھے۔

آپ کی سیرت کا یہ پسند بھی بہت دلکش ہے کہ آپ نے اپنے چھوٹوں کو خوب ابھارا ان کی اچھی طرح تربیت کی مکررات الاماء مجلسوں میں انہیں تقریر و جرأت کی داد دی کمزوروں کے کھلے بڑھائے گناہ کو شون کو روشنی بخشی اور اپنے رضا کاروں تک کو سلامی دی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ربع ہدی میں آپ کے گرد ایسے مقررین کا حلقہ بندھ گیا تھا جو اپنے اپنے انداز میں بلاغت و خطابت کے نہایت روشن ستارے تھے شاہ صاحب کی ایک ایک تقریر سے ان کی بیسیوں تقریریں بنتیں اور شاہ صاحب کے الفاظ اور آپ کی خطیبات ادا میں جملوں اور انداز میں اتیلیں اور یوں محسوس ہوتا کہ شاہ جی پر ان کے وسیع حلقوں میں محبوبیت کی تجلی پوری طرح جلوہ ریز ہے ملک کے ہر گوشے اور ہر علاقے میں اب تک آپ کے ایسے جانثار احباب موجود ہیں جن کے دل کی دھڑکنوں پر ابھی تک شاہ جی کا اعتراف ہے اور جن کی قربانیوں کی

صدائے بازگشت اب بھی کبھی کبھی ختم نبوت کے جلسوں میں سنی باقی ہے۔

یادش بخیر قاضی احسان احمد شجاع آبادی حضرت شاہ صاحب کی نہایت کامیاب تصنیف تھے۔ شاہ صاحب مخلصین جب کبھی آپ سے تصنیف کرنے کی درخواست کرتے تو آپ فرماتے کہ میں کتابوں کی بجائے شخصیتیں تصنیف کرتا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہی فکر سنت کے زیادہ قریب ہے۔ قاضی صاحب کی سحر آفرین خطابت شاہ صاحب کی زبان سے ”واہ قاضی“ اور ”حضرت یا انبی“ کی تحسین ہمارے مجمع کو بڑے محفلان بنا دیتی تھی قاضی صاحب نے شاہ صاحب کی یہی ہمت افزائی کا فیض بھی قاضی صاحب جب تقریر کرتے تو شاہ صاحب نے شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں اگر قید کی صورتیں بھی پتہ برداشت کیں سرزائیت کی تردید اور ختم نبوت کی نشر و اشاعت میں بھی ایک مرکزی کردار کی حیثیت میں تحریر آزادی ہند کا جاننا سپاہی ختم نبوت کا عظیم مجاہد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مشن کا یہ غرض رضا کار بھی کو اللہ کو پیار رہا ہو چکا ہے

سے اسیری الیکٹار

مذاہمت کنند ایں عاشکان پاک طینت را

قاضی صاحب شاہ صاحب کی وفات کے بعد مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان کے صدر رہے اور اپنے استاد کی پر آپ نے لیک کہا۔

شاہ صاحب استغنا کی دولت سے بھی مالا مال تھے دولت سے

آپ کی طبیعت ثانیہ تھی آپ کے ایک نہایت مخلص خادم کا بیان ہے

شاہ صاحب کی شان استغناء

میں نے شاہ صاحب سے بار بار سنا تھا کہ متعظیم جلسوں کے موقع پر جو مصارف سفر پیش کرتے تو آپ انہیں کبھی نہ لیتے تھے کہیں سفر خرچ نہ بھی ملا تو شاہ صاحب کو اس کی کوئی پروا نہ تھی عقیدت مند بدیر پیش کرتے تو اسے بھی اسی طرح قبول فرماتے۔ اس مخلص خادم کا بیان ہے کہ میں نے آپ کے اس شان کی تحقیق کے لیے ایک دفع جب کہ شاہ صاحب وضو کر رہے تھے آپ انہیں سے چالیس روپے نکال لیے بعد میں منتظر رہا کہ شاہ صاحب کبھی پوری کی شکایت کریں مگر معلوم ہوا کہ شاہ صاحب اس گشددگی کا پتہ نہیں چند ماہ گزرنے کے بعد میں نے وہ رقم پھر آپ کی جیب میں ڈال دی تو بھی آپ کو اس اضافے کا پتہ نہ لگا میں نے جب پوری بات بتائی تو آپ نے بڑے تعجب سے فرمایا :-

”بھائی پچیس سال سے جماعت کے ساتھ ہی ہوا ابھی تک تمہیں میرے ایمان کا پتہ نہیں چلا۔

دولت انسان کی خدمت کے لیے ہے مخدوم بننے کے لیے نہیں۔ مال جمع کرنے سے اور

گنتے میں لذت محسوس کرنا اہل جہنم کا نشان ہے جَنَّةٌ مَّالًا وَعَدَّةٌ اِچھے لوگوں

کے حق میں نہیں“

لکھنؤ کے تبرالچی ٹیڈیشن میں شاہ جی ناموس صحابہ کے لیے تڑپے آپ کی بس ایک کروٹ نے ملک میں یہ احسان سدا کر ناموس صحابہ کے لیے ایک مستقل پلیٹ فارم کی ضرورت ہے بنجاب محمود خاں لغاری اور سردار احمد خاں پٹانی کی

لیم کا قیام اس مرد قلندر کی اسی ایک کردٹ کا شمرہ تھا۔

شاہی صاحب کے ملفوظات بر حسب جوابات اور ان کی شخصیت کے متعلق علماء و وزراء کے بیانات آپ کے سامنے ہیں
برادر عزیز حافظ عبدالرشید ارشد نے ترتیب دیا ہے۔ ان میں ان بھڑات کی آزاد بھی شامل ہیں جن کی اپنی سوانح اور ملفوظات
میں ظاہر ہے کہ بہ اظہار عقیدت کسی ایک فرد ایک گروہ یا ایک مسلک کا نہیں پوری قوم اور پریس کی ایک مجموعی آواز ہے۔
۲۱ اگست ۱۹۴۱ء کو کاروان آزادی کا یہ سالار بھی اپنے پیشرووں سے با ملا اور نصف صدی کا یہ زریں باب بھی تاریخ
سے جزد ہو کر رہ گیا۔

سے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بند

گرفتاری = زیر دفعہ ۱۲۴۔ الف (تحریک بنادت) ۱۴ مارچ ۱۹۲۱ء مدت تین سال جیل میانوالی

ی گرفتاری = ۱۰۶ ضابطہ فوجداری و نقض امن و آئین شکنی، ۶ جولائی ۱۹۲۶ء مدت سزا ایک سال پورٹل جیل لاہور

(یہ سلسلہ سدا بابت قندہ شام رسول راجپال)

ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۰۸۔ الف ۳۰ اگست ۱۹۳۳ء مدت سزا چھ ماہ۔ علی پور جیل۔ ڈم۔ ڈم جیل

(یہ سلسلہ تحریک حقوق خود اختیاری و آئین آزادی)

ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۲۴۔ الف (غائب) ۱۹۳۱ء مدت سزا ایک سال دہلی جیل یہ سلسلہ تحریک کشمیر

ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۵۳۔ ۱۵ نومبر ۱۹۳۴ء مدت سزا چھ ماہ بعد از اپیل سیشن کورٹ سزا پندرہ منٹ تاہم درخواست عداوت ۶ دسمبر ۱۹۳۰

(یہ سلسلہ تحریک استقلال سزا نیت بر بناد تقریر انوار کافرنس قادیان)

ی گرفتاری = بوجہ خلاف ورزی دفعہ ۱۴۴۔ عامر شدہ برد اخلا قادیان۔ مدت سزا چھ ماہ۔ گورداسپور جیل و نیو سنٹرل جیل ملتان

(یہ سلسلہ ادارہ غازیہ مدرسین قادیان)

ی گرفتاری = زیر دفعہ ۱۱۶۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۵۳۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴۳۸۔ ۱۴۳۹۔ ۱۴۴۰۔ ۱۴۴۱۔ ۱۴۴۲۔ ۱۴۴۳۔ ۱۴۴۴۔ ۱۴۴۵۔ ۱۴۴۶۔ ۱۴۴۷۔ ۱۴۴۸۔ ۱۴۴۹۔ ۱۴۵۰۔ ۱۴۵۱۔ ۱۴۵۲۔ ۱۴۵۳۔ ۱۴۵۴۔ ۱۴۵۵۔ ۱۴۵۶۔ ۱۴۵۷۔ ۱۴۵۸۔ ۱۴۵۹۔ ۱۴۶۰۔ ۱۴۶۱۔ ۱۴۶۲۔ ۱۴۶۳۔ ۱۴۶۴۔ ۱۴۶۵۔ ۱۴۶۶۔ ۱۴۶۷۔

ایک نیا جسے خراج عقیدت پیش کرتی ہے

”ان کی باتیں عطا الہی ہوتی ہیں۔“

”قادیانیوں کے خلاف ان کی ایک تقریر ہماری پوری تصنیف سے بڑھ چکی۔“

”ان کا دل صرف اسلام کے لئے دھڑکتا ہے۔“

”وہ کسی ایک کے نہیں سب کے ہیں۔ وہ اسلام کی مشین ہیں۔“

”وہ دلی کامل اور اسلام کی برہنہ شہر ہیں۔ جب تک وہ نہ

کو کوئی خطرہ نہیں۔“

”ملک و ملت کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے۔“

”شاہ جی اسلام کی چھتی پھرتی تلواریں۔“

”مقرر نہیں سحر ہیں، تقریر نہیں جادو کرتے ہیں۔“

”جلیل چمک رہا ہے ریاض رسول میں۔“

”اسے کاش میں اس شخص کو مسلم لیگ میں لاسکتا۔ اگر میرے

توجہ ماہ کے اندر ملک میں انقلاب بن چکا کروں۔“

”وہ بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔“

”بخاری مرحوم جیسا اسلام کا شہیدانی دنیا میں پیدا ہوا ہو سکتا

”وہ باغ وچمن سے اٹھے اور وار ورس سے گزرے۔“

”وہ فن خطابت کے امام تھے ان کی موت نے اس ملک کے

گل جوئے ہیں۔ اب وہ ہمیشہ روشنی کو ترستے رہیں۔“

”ان کی زندگی کے روشن نقش نہ صرف تاریخ کے صفحہ ہر

کر دلوں انسانوں کے دماغوں پر مل سکتے ہیں؟

”وہ خطابت کے شاہسوار ہیں۔“

”انہیں دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمان یاد آتے ہیں۔“

۱ : حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

۲ : علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ

۳ : حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

۴ : شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

۵ : مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ

۶ : مولانا ابوالکلام آزادؒ

۷ : شاعر مشرق علامہ اقبالؒ

۸ : مولانا محمد علی جوہرؒ

۹ : مولانا ظفر علی خاںؒ

۱۰ : نواب بہادر جنگؒ

۱۱ : مولانا شوکت علیؒ

۱۲ : مولانا داؤد غزنویؒ

۱۳ : سردار عبدالرب نشتہرؒ

۱۴ : شیخ حسام الدینؒ

۱۵ : مولانا خضر الرحمن سیواریؒ

۱۶ : مولانا حسرت موہانیؒ

۱۷ : خواجہ حسن نظامی دہلویؒ

”وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔“

”قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادیؒ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب -
(دارالعلوم - دیوبند -)

مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی -

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کراچی -

مولانا محمد یوسف صاحب بنوری -

میدالوالاعلیٰ مودودی -

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (کنٹرولر بھارت)

مولانا محمد علی صاحب جاندھری -

علامہ خلد والدین صدیقی -

ماسٹر تاج الدین انصاری -

مظفر علی شمس -

شیخ عثمان آزاد کراچی -

حافظ حبیب اللہ خاں وائس چیرمین -

ملک اسحاقیات ایڈوکیٹ -

مولانا غلام رسول مہر -

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ -

آغا شورش کاشمیری -

احمد ندیم قاسمی -

حافظ علی بیادور (ایڈیٹر دور جدید یعنی بھارت)

مولانا عبدالرحمن صاحب میانوی -

مولانا تاج محمود صاحب لاکھپوری -

محمد ایوب خاں، سابق صدر پاکستان -

محمود علی قصوری -

”ان کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی پاکیزہ سیرت کی ترجمانی تھی۔“

”ان کی موت سارے عالم اسلام کے لئے نقصان عظیم تھی۔“

”ان کی موت سے علما کی صف میں پیدا ہونے والا نواں نسل پُر نہ ہوگا۔“

”ایک ایسی شخصیت جس نے ایسا کام کیا جو ایک صدی میں ایک

ادارے سے مشکل پرستائے۔“

”وہ اپنے دور کے سب سے بڑے خطیب تھے۔“

”وہ اسلام اور مسلمانوں کے وفادار تھے۔“

”وہ فقر و استغفار کا پہاڑ تھے۔“

”اسلام اور آزادی پر دل و جان سے قربان ہو جانے کی زندگی کا منتہا تھا۔“

”وہ علم و ادب، فکر و دانش، سیاست و تدبیر کی محفول کا چراغ تھے۔“

”وہ حقیقتاً فنا فی الرسول تھے۔“

”وہ برطانوی سامراج کے خلاف طویل جنگ کے عظیم رہنما تھے۔“

”ان کا برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں بہت بڑا حصہ ہے۔“

”ان کے محکوموں کی گونج تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ سنی جائیں گی۔“

”ان کے وجود کی باہمت اور محنویت کا ذرہ ذرہ اسلامیہ سے سرشار تھا۔“

”وہ واقعی عظیم اشخاص میں سے تھے۔ جن کی ہستی کی ترکیب و تعمیر میں

قدرت کے غیر معمولی قوانین نے کار فرمائی کی۔“

”قرن اولیٰ میں پیدا ہوتے تو یقیناً ایک جلیل القدر صحابی ہوتے۔“

”ان کے بے داغ اور بے لوث خلوص کی قسمیں صدیوں بعد لکائی جاتی رہیں گی۔“

”ایک فقیر جس کے دامن میں اللہ کے نور اور رسول کے عشق کی کچھ نہ تھا۔ جسکو ہمیشہ بخیر و صلاح دیکھا۔“

”جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک وہ سنبھم۔“

”ان کے کل محاسن خطابت کے لئے اور ان کی خطابت عشق رسول کیلئے تھی۔“

”وہ جنگ آزادی اور اسلام کے زبردست مجاہد تھے۔“

”ان کا چلن زندگی کے سفر میں چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔“

۴۱ : دلانا مظہر علی اظہر -

۴۲ : مولانا کوثر نیازی -

۴۳ : عبد الحمید عدم -

۴۴ : انور صابری (دیوبند - بھارت) -

۴۵ : علامہ لطیف انور -

۴۶ : شفیق فضل جعفری -

۴۷ : حبیب جالب -

۴۸ : عبداللہ ملک -

۴۹ : میاں محمد شفیع (مدیر ہفت روزہ "اقدام") -

۵۰ : امین گیلانی -

۵۱ : جہانبار مرزا -

۵۲ : لاکھ جھیم سین سپر -

۵۳ : دیوان سنگھ مفتون (بھارت) -

"ان کی سیاسی بصیرت کے علاوہ ان کی دینی، علمی اور ادبی بصیرت مثال دنیا کے کسی انسان میں نہیں مل سکتی۔"

"پاک و ہند کی تاریخ آزادی میں ان کی زندگی ایک روش کی حیثیت رکھتی ہے۔"

"انہوں کا پسیدہ گلن کاغیر۔"

"کرسے کی نازتجہ پر شہر تک تاریخ انسانی۔"

"تعلیم محمد کی ادھر نہیں سکتی"

"اس کا جنون دانش کا بدل"

"تجھ سے پہلے عام کہاں تھی دار و رس کی بات۔"

"وہ کس لئے حریت کی تلاش میں سیاست کی پر خارا واد"

"دلپا نہ دار مصروف رہا۔"

"میں ان کی سادگی اور ان کی خطابت کا قلب و جگر سے معذور"

"بھیسے خود شہید کوئی اس کے گریبان میں ہے۔"

"تیرے قدموں میں رہا سچ فرنگی کا وقار۔"

"وہ ان چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں جن کے لئے یہ"

"بے پناہ احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے۔"

"وہ تاریخ آزادی کے ایک بہادر نڈر بے باک اور بھی کو شخصیت"

پریس کا خراج عقیدت

تو نظیری زلفک آمدہ بودی چوں مسیح باز پس رفتی و کس قدر توشناخت و دروغ
جی چاہتا ہے آج جی بھر کر دونوں۔ بلاخر وہ بھی نصرت ہو گیا جو اس زمانے میں اللہ کی آیات میں سے ایک آیت تھا جس نے
میں تک فقر و استغفار کے پرچم کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جس کی زندگی بہت سی زندگیوں کا مجموعہ تھی جس کا وجود ایک تاریخ تھا ایک
تھا، ایک ادارہ تھا، ایک انجمن تھا، ایک تحریک تھا۔ غرض ایک ایسا محور تھا جس کے گرد افراد ہی نہیں محاسن بھی گھومتے تھے وہ
کاغذیپ تھا کہ اس کی آتش بیانی کا لوہا اس کے حریف بھی مانتے تھے۔ اردو زبان نے اس مرتبہ کا خطیب نہ کبھی پیدا کیا اور نہ
کر سکے گا۔ وہ ایک مجاہد عظیم تھے۔ انہوں نے علاقے کو تہمتی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ ۲۲ سال کی عمر متعارف میں انہوں نے

ہم نے اپنے اس وطن عزیز میں بہت سے جنازے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے علماء اور فضلا آغوشِ محمد میں اتارے گئے لیکن شاہجی کی میت کے گرد عشاقِ کاجوہر جم تھے اور لوگوں نے جس بے اختیار کی کے ساتھ ان کا تم کیا یہ بے اختیار۔ علماء کی پوری صف اس سے خالی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب دماغوں اور دلوں کے حکمران تھے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوصف انہیں اس اتلیم میں بخورق اور اقتدار حاصل تھا اس کا اقرار و اعتراف ہر جگہ موجود ہے۔ پاکستان میں وہ ایک ہی شخص تھے جو سیاسی اقتدار جماعتی رفاقت اور تنظیمی خطوط کے بغیر اپنی ذات میں ایسا باور رکھتے تھے کہ لوگ سروینے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے مذاہن کا قید ملک کے ہر گوشے میں موجود ہے۔ ان کے اٹھ جانے سے جو خلا رہ گیا وہ کبھی پُر نہ ہوا۔ خطاباتِ یہ ہو گئی۔ لوگ کبھی اس طرف سے گذریں گے جہاں شاہ جی گزرتے اور گزرتے رہے ہیں تو دلوں سے ہلک اٹھا کرے گی کہ یہاں کبھی وہ مردِ مجاہد صریح آغوشِ لائقوں میں اپنا چراغ بجایا کرتا تھا جس کی نوا پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کا کوئی غزوہ نقابِ اٹک کر سامنے آگیا ہے یا پھر لوگ غارِ چرا کے ارد گرد کھڑے ہیں۔ قرآنِ اتر آیا ہے اور قد و نبات کی طرح گھٹنا ہوا کانوں کے راستے سے دلوں کی انگوٹھی میں لکینہ کی طرح بیٹھتا ہے۔ لیکن اب وہ رعنائی خیال کہاں؟ (بہشتِ روزہ "پشمان")

سید عطا اللہ شاہ بخاری ۵۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اس پورے برصغیر کی ممتاز اور محترم شخصیت کی حیثیت سے لاکھوں انسانوں کی محبت اور عقیدت کا مرکز رہے۔ وہ ایک مجاہد و بیان مقرر اور برصغیر کی تاریخ کے سب سے زیادہ مؤثر خطیبوں میں شامل تھے۔ مولانا سید عطا اللہ بخاری کی ساری عمر قومی خدمت میں گذری۔ پندرہ سال تک وہ قیدِ افزنگ میں رہے اور سامراجی طاقت کے ساتھ لڑنے میں اپنا تن من و جان لٹاتے رہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ایک مخلص، دیانت دار، اصول پرست اور عوام دوست رہنما کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا جو یہ ہے کہ ایک عظیم شخصیت حقیقی جو ہم سے جدا ہو گئی۔ ایک مخلص رہنما سے یہ قوم محروم ہو گئی لیکن ان کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور انہوں نے قوم کو آزاد کرنے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لئے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی مجلسِ احرار نے آزادی سے پہلے جس خصوص اور جذبہ سے کام کیا وہ برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا اور اسے اس ملک کی تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی۔ ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اس قوم کے نوجوانوں میں وہ خلوص وہ جذبہ اور وہ کون پیدا کرے جس کا مظاہرہ اس مجاہد نے عمر بھر کیا۔ (روزنامہ "جنگ" - کراچی)

وہ شعلہ نور اٹھ گیا ہے جس نے ربعِ صدی تک سپاہِ آزادی کا دل گرمانے رکھا اور جو شعلہ بجھائے۔ دنیا کے خطابت کو اس پر ناز تھا اور یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لئے وقف رہی لیکن وہ صرف خطیب ہی نہیں تھا بلکہ وہ بھی تھا۔ وہی کچھ کہتا جس پر کاربند اور وہی کچھ کرنے کی تلقین کرتا۔ اگرچہ ان بزرگوں کی فہرست مرتب کریں جنہوں نے وہ غلامی میں برطانوی سامراج کے خلاف گفتار و کردار سے رائے عام کو بیدار کیا تھا تو امیرِ شریعت کا نام سب سے پہلے آئے گا۔

شاہ صاحب کی زندگی کا یہ پہلو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ وہ صرف سیاست کے ہو کر نہیں رہ گئے تھے، اسلام کی تبلیغ کافی سعید بھی ہمیشہ ان کی نظروں میں رہا تھا۔ دینِ فطرت کی سر بلندی ان کی سب سے بڑی تمنا تھی اور ناموس رسول کی پاسبانی اور ملت کا اسٹار ان کا مقصدِ حیات تھا۔ نہ وہ پاکیزہ آدمی اور مذہب کے گہرے مطالعہ اور علم کی بنا پر وہ امیرِ شریعت کے منصب پر فائز ہوئے تھے ان

(روزنامہ "امروز" - لاہور)

منصب پر اپنا حق ثابت کر دیتا تھا۔

ملک میں سید عطا اللہ بخاریؒ کی موت کی خبر انتہائی رنج و ملال سے سنا جائے گی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اگر ہم خاصی کی طرف دیکھیں تو ہماری آزادی کی شاہراہ ربع صدی قبل کے ان تنگ و تاریک اور ناہموار راستوں سے جاتی ہے جہاں چند اوالاعظم انسان و زمانہ مسافروں کو آواز میں سے رہے ہیں۔ کبھی ان کی شعلہ نواہی سے مرہ زندگانی کی رنگوں میں نوح و ڈوڑنے لگتا ہے اور اپنے حال سے پریشان اور مستقبل سے ناپوس ریکا ایک نئے حوصلہ اور ولولوں سے سرشار ہو کر ان کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں اور کبھی کڑی آزمائشوں کے دور میں ان کے پیچھے چلنے والے غافلوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے لیکن ان کو ہر پیر انسانوں کے عزم و ثبات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ آزادی کی تمنا کرنے کے جرم کی پاداش میں ان کے لئے قید خانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ان کی زبانوں پر سنگینوں کے پیرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہر مصیبت و ہر ناکامی اور ہر آزمائش ان کے سینے میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتی ہے۔

✓ سید عطا اللہ بخاریؒ کی زندگی کا مقصد کرڈوں انسانوں کو آزادی کی تڑپ عطا کرنا تھا۔ اگر ہم آزادی کے ایک ٹڈی بلنے کی حیثیت سے ان کے حالات پر غور کریں تو ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ہمیں ان کے طریق کار سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کوئی بھی ان کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب بصریغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے کچھ حصے ہوتے اوراق کٹھا کریں گی تو اس وقت سید عطا اللہ بخاریؒ کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔

(روزنامہ "کوہستان" لاہور)

✓ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ کی عظیم کی صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تقریر کا جادو استعارہ نہیں۔ مزاح کی ذات میں ایک حقیقت تھا۔ وہ اپنی سحر بانی سے لاکھوں کے مجمع کو گھنٹوں جو حریت رکھتے، مہناتے، رلاتے، تڑپاتے اور آمادہ عمل کرتے۔ آتش اشد لہو اور مجرہ بیان اب پیدا نہ ہوگا اور وہ اس لئے کہ بقول ایک معاصرہ روایت جس میں لفظ گرخی آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا اور وہ روایت جس نے خطاب کو ختم دیا۔ مگر وہ سوچتی ہے۔

(ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور)

✓ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے۔ انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت خطابت اور علم کلام کی تلوں کے واسطے انگریز شاہی قلعے پر مرکوز کئے تھے۔ انہیں اختلاف عقیدہ کے علاوہ احمدیوں سے غیر خالی کی کہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریز سلطنت کو ابر صحت قرار دے رکھا تھا (خدا تعالیٰ ابر صحت کی طرح ہمارے لئے انگریزی سلطنت کو دور سے لایا اور ہم پر اور ہماری ذریت پر یہ فرض ہو گیا کہ اس مبارک گورنمنٹ برطانیہ کے ہمیشہ شکر گزار رہیں) اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولی باری جاری رکھی اور دونوں کو خالص نقصان پہنچایا۔ (ہفت روزہ "آفتاب" لاہور)

✓ سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ مزاح کا ملاحات شخصیت تھے۔ ہر صغیر میں اس پائے کا خطیب پیدا نہیں ہوا۔ تنگ آزادی میں شاہ صاحب نے نمایاں طور پر حصہ لیا اور عزیز کا ایک حصہ تقریباً ۱۵ سال جیل میں بسر کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری زندگی بھی کیا تین

چوتھائی ریل میں گئی اور ایک چوتھائی میل میں۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۵ء میں ہوا۔ یہ زمانہ تحریک خلافت کے شباب کا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ صاحب مرحوم نے اپنی شعلہ بیانی تقریروں کے ذریعے عوام میں وہ مقبولیت اور مردِ اعزازی حاصل کی جو بہت کم لیڈروں کو نصیب ہوئی۔ ان کی تقریریں سراسر اعجاز تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ عشا کی نماز کے بعد تقریر شروع کرتے اور فجر کی نماز تک تقریر جاری رہتی۔ ان کی تقریر کے دوران کسی شخص کو بکس سے اٹھ کر جانے کا ہوش نہ رہتا تھا۔ مخالف سے مخالف کے مجمع کو شاہ صاحب اپنی سخن بانی سے مسحور کر لیتے تھے۔ ہزار ہا افراد کو بیک وقت رلا دیا اور ہنسنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ (ہفت روزہ "ایشیا" لاہور)

حضرت شاہ صاحب حق اور حق پرستوں کی گویا ایسی تلوار تھے کہ جس باطل پر پڑتی اس کو کسے ٹکڑے کر دیتی۔ وہ خدائی بجلی یا آسمانی صاعقہ تھی کہ کفر ضلالت کے جس غرمین پر گرے اس کو الٹ کر دیتی۔ وہ جن داؤدی کا اس دور میں نمونہ تھے کہ دوست و دشمن سب مسخر کر لیتے وہ صور اسرافیل تھے جس کی حیات بخش دعوت سے مردہ دلوں میں جان پڑ جاتی جس کی ایک آواز پر وہ ہزار رضا کار آزادی کشمیر کے لئے سر پر کھن باندھ کر چل پڑتے جن کے ایک اشارے پر متحدہ ہندوستان کے برطانوی جیل خانے بھر جاتے جن کا داخلہ قادیان ایوانِ مرزا نیت میں زلزلہ ڈال دیتا جو علم و عمل، شعر و ادب، اخلاق و مزاج، طرافت و لطافت، شریعت و طریقت اور رزم و بزم کے مجمع کمالات تھے۔ (ہفت روزہ "مخدّم الدین" لاہور)

امرت سر کے عظیم سیاسی اجتماع میں شاہ جی کی شرکت اور ان کی پہلی گرفتاری۔

سامعین میں ہمارے شاہ جی بھی لیڈران کی زیارت کے شوق میں محویت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں قائدین کی آمد کا غلفہ بٹھا ہوا اور رضا کاروں کی معیت میں یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے آرزوؤں کے منظر اپنی اپنی جگہوں پر برآجماں ہوئے۔ صدارت کی کرسی پر مسیح الملک حکیم جمل خاں مرحوم فروکش تھے اور ان کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں میں علی برادران، ڈاکٹر مختار انصاری، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ ڈاکٹر محمد قبال، میان فضل حسین، مسٹر سرجی، مینڈو، مینڈو موتی لال نہرو، مینڈو بزم برال نہرو، مولانا محمد داؤد غزنوی، ملک بر علی، پیر تاج الدین اور ڈاکٹر سعید الدین چکوتے۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد حضرت علامہ اقبالؒ نے علی برادران کو مخاطب کر کے وہ تقریر "ابو اسیری" کے نام سے مشہور ہو چکا ہے اس اجلاس میں جب حسیہ غور و اصلاحات کو رد کرنے کی قرار داد تحریکِ قناتید وغیرہ کی منازارہ کر سکی تو رئیسِ احرار حضرت مولانا حسرت موہانی نے رائے شماری سے پہلے ذیل کے شعر میں انگریزوں سے بیزاری کا اعلان کیا۔

تو جو جانے پہ جو راضی تو تیرے سر کی قسم
گر کے چنبدہ ابھی لے دوں تجھے لٹن کا کھٹ

اس پر مالِ نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھا جس میں ہمارے شاہ جی کی پر مسرت داد بھی کسی سے کم نہ تھی۔ واضح رہے کہ اس وقت شاہ صاحب صرف اصلاحِ رسوم پر ہی وعظ کہتے تھے یا دوستوں کی محفلوں میں بذراستی اور لطیف گوئی تک ہی اپنے اوقاف کو محدود کئے ہوئے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ اول تو شاہ جی مذہبی لٹریچر سے بہت زیادہ شغف رکھنے کی وجہ سے اخبار میں شرفِ بہت کم راغب تھے۔ دوسرے وعظ و خطیب کی حیثیت میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سوتے اتفاق یا سوچی سمجھی سلیم کے تحت

کا تعلق ایک تھانیدار سے اس قدر زیادہ ہو گیا اور باہمی اعتمادی کیفیت یہاں تک بڑھی کہ نو جوان شاہ جی اس کو اپنا مخلص دوست اور بھی خواہ سمجھتے ہوئے اس کی پسند و ناپسند کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ شاید ایک لمبے عرصے تک بخاری رہتا لیکن درمیان میں مولانا اودغزلی اور دوسرے سیاسی ذہن رکھنے والے دوستوں سے تبادلہ خیالات نے اپنا اثر چھوڑنا شروع کیا۔ جس کے نتیجہ میں شاہ جی کا ایک خلافت کمیٹی کے شیخ سے مسلمانوں کی پاداش بن کر سیاسی اور مذہبی افریقہ چکنا شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء میں مسیح خیر الدین کی ایک تقریر کی پاداش میں تین سال کے لئے میانوالی جیل میں بھیج دیئے گئے جس کے بعد جیل سے ریل اودھیل سے جیل کا وہ لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو مسلسل چالیس برس تک بخاری رہا۔ میرے خیال میں شاہ صاحب وہ منفرد و عظیم تھے جو امرار کو کوشیوں میں بہت کم اور غبار کی چھوٹی پٹیوں میں بہت زیادہ قیام میں راحت محسوس کرتے اور شدائد خاصہ صحت میں اپنا کوئی ہتھیار نہیں رکھتے تھے۔ ان سے زیادہ کسی قومی کارکن یا قائد نے سفر نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو یقیناً اس کے تجربے میں وہ تمام نئے اور پرانے طریقے کا شامل نہیں تھے۔ یہ سیدل سے لے کر اوٹ، گدھا، گھوڑا، موٹر کار، موٹر، بس، ریل، جیل گاڑی اور موٹر چھکڑے سب کے سب آپ کے مشن کی تکمیل میں استعمال کئے گئے۔ آپ، یہ سن کر حیران ہوں گے کہ شاہ صاحب نے عام طور پر پتھر ڈکلاں کے سفر کو پسند کیا۔ سیکنڈ ہینڈ کلاں میں کبھی سفر اختیار نہ کیا۔ نہ ہی آپ نے کبھی ہوائی جہاز کے ذریعے سفر کو ترجیح دی۔ بلکہ عام طور پر دوستوں کو یہ کہہ کر اس سفر سے روکتے رہے کہ "میاں یہ تو صریح ہلاکت ہے۔ بھلا اس کو بھی موت کہا جاسکتا ہے جہاں گور و دفن تو ایک طرف سرے سے لاش کا ہی پتہ نہ ہو" اس قسم کے بخاش، مخلص اور اپنی ذہن کے پچھلے خادم اب کہاں ملیں گے۔ بقول حضرت اقبال۔

آئے عشاق، گئے وعدہ فرواے کر اب انہیں دھونڈو پتھر جیڑ کر زیادے کر

شاہ جی کی تقریر "اے مسلمان لاہور آج جناب رسول صلعم کی آبرو و تمہارے شہر کے ہر ہر دروازے پر دستک دے رہی ہے اے امت رسول صلعم آج ناموس محمدی کی حفاظت کا سوال درپیش ہے اور یہ سانحہ سقوط بغداد سے بھی زیادہ غناک ہے۔ زوال بغداد سے ایک سلطنت پارہ پارہ ہو گئی تھی مگر توہین رسول کے سانحہ سے آسمانوں کی بادشاہت متزلزل ہو رہی ہے۔"

قادیان کانفرنس اس کانفرنس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تیسرے جفتے میں ہوا۔ اور اس کانفرنس کے لئے ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر کا نام ایشرنگ تھا۔ اس اراضی پر پنڈال بھی تیار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن مرزا میمن نے اس اراضی پر قبضہ کر لیا۔ اب احزابوں کیلئے اور کوئی راستہ نہیں تھا یا تو وہ اراضی کے لئے لڑتے یا شہر سے دور کانفرنس منعقد کرتے۔ احزاب نے جھگڑا کرنے سے گریز کیا کیونکہ اس وقت مرزا میمن کی مسلسل کوشش یہی تھی کہ فساد کو پایا جائے اور اس بنیاد پر کانفرنس کو امن عامہ کے خلاف ثابت کر کے بند کر دیا جائے۔ مجلس احزاب مرزا میمن کے اس ارادے کو بھانپتی تھی۔ چنانچہ اس اشتعال کے باوجود مجلس احزاب نے ایشرنگ کی اراضی پر کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے بعد قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ڈی۔ اے۔ وی۔ سکول کے پہلو میں پنڈال تیار کیا گیا۔

کانفرنس کے دو دن پہلے "رسول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار نے قادیان سے بیڑ بھیجی تھی کہ جس میں اس کانفرنس کے خد و خال اور اہمیت کا ملازہ ہوتا تھا۔ "مجلس اہل ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر کو ایک تبلیغی کانفرنس قادیان میں منعقد کر رہی ہے۔ اس کانفرنس کیلئے"

بڑے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مرزا بیوں کی طرف سے مسلسل یہ بھی چلائی جا رہی ہے کہ اس کانفرنس سے ان کا جان و مال خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ مرزا بیوں نے اپنی حفاظت کے لئے لاتعداد دیہاتیوں کو اور اپنے مریدوں کو قادیان میں جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ادھر اصرار کی اس کانفرنس میں ۲۰ سے لے کر ۵۰ ہزار کا ہجوم ہے۔ مزید بڑا کانفرنس کے متعینین کا مطالبہ ہے کہ ان کو کانفرنس کے صدر کا جلوس رکھانے کی اجازت ہوئی چاہئے اور یہ جلوس قادیان شہر میں سے گزرے۔

اس کانفرنس کے پیش نظر آج صبح پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس خود بنفس نفیس قادیان آئے۔ ان کے ہمراہ پولیس کی بھی ایک جہاز جمعیت تھی چنانچہ انسپکٹر جنرل پولیس نے کانفرنس وغیرہ کا موقع دیکھا اور احکام جاری کر دیئے کہ اگر اس کانفرنس کے دوران قادیانوں نے کوئی اجتماع منعقد کرنے کی کوشش کی تو یہ اجتماع خلاف قانون منظور ہوگا۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے اصراریوں اور ان کی کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کو بھی متنبہ کیا کہ وہ کانفرنس میں کسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ شرکت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ لڑکھٹیوں کو بھی ساتھ لانے کی ممانعت کر دی گئی۔ مزید برآں کانفرنس میں شرکت کے لئے آنے والے لوگوں کے لئے ایک خاص راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ نیز اگر کسی قسم کا جلوس نکالا جائے تو اسے شہر میں بٹھرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج تک قادیان میں امن و امان بحال رکھنے کے لئے چار سو پولیس کے سپاہی پہنچ جائیں گے۔ اصراری بہت میں کسی قسم کے جھگڑے سے اجتناب کریں گے۔ اس کانفرنس کا پنڈال ڈی۔ اے۔ وی۔ سکول میں بننا شروع ہو گیا ہے اور بارگروڈ کے تمام علاقے میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ اور لڑکھٹیاں ساتھ نہ لانے کی بھی منادی کر دی گئی ہے۔

اس اقباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں اس کانفرنس کے کس قدر بڑے اچھے اور کچھے گوشوں سے اس کانفرنس کی کامیابی اور ناکامی کی خبروں کا انتظار کیا

امیر شریعت کی کانفرنس میں آمد اور تقریر

جاری تھا اس فضا میں یہ کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کے صدر امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری تھے چنانچہ رات جب اپنا پورا سائے ال چکی لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اس کانفرنس کے صدر سید عطا اللہ شاہ بخاری تشریف لائے۔ ہزار ہا انسانوں کا ہجوم اور امیر شریعت کی پنڈال میں آمد۔ اور کون سید عطا اللہ شاہ بخاری عثمان کی سرزمین میں دفن ہونے والا سید عطا اللہ بخاری نہیں۔ وہ سید عطا اللہ شاہ بخاری نہیں جس کی زبان گنگ ہو گئی تھی جس کے چہرے کا جھروں نے اس طرح کر لیا تھا جس کے بالوں میں بڑھاپے کی سفیدی آگئی تھی یہ وہ سید عطا اللہ بخاری تھا جس کا شباب اور شعلہ بیاہی دونوں اپنے عروج پر تھے جو لاؤڈ سپیکر کے پیر لکھوں کے مجمع کو سحر سکتا تھا جس کا حسن اور بیان دونوں الگ الگ بجاؤں جگاتے تھے یہ کچاس ہزار کا مجمع رات کی خاموشی، قمقموں کی رشخ اور اسنے میں حسن و نور کے پیکر شعلہ بیان خطیب اور شریعت کے امیر کا آمد علی

”تم آگئے تو اس سر نور زندگی ہوئی“

بس پھر کیا تھا مجمع میں کہاں ایک خاموشی اور ہر جگہ عالم تھا اور اب وارفتگی اور دیدار یاری کے تانی نے سب کو ان گھیرا ہے اور اس تانی اور وارفتگی کا اظہار نعروں کی گونج میں ہوتا ہے۔ شاہ صاحب عین کہ مسکراتے ہوئے مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اسٹیج پر پہنچے، چاروں طرف نگاہ مست انداز سے دیکھا۔ پس پھر کیا تھا، نعروں کا ایک اور سیل ٹوٹ پڑا۔ اور امیر شریعت فاتحانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مجمع خاموش ہوا، تبادلات ہوئی، نظم ہوئی۔ اب سے پچیس برس پہلے کی تفصیلات کو دہرائیے اور

تقصیدوں کو جن پر شاہ صاحب کی تاریخی تقریر کی دبیز تہیں چڑھی ہوئی ہوں۔ شاہ صاحب نے بھی کوئی ساڑھے نو بیچے تقریر شروع کی ہوگی اور رات تھی کہ وہ بھی دم بخود گزرے بھاری تھی۔ لیکن شاہ صاحب کی شعلہ بیانی بڑھتی بھاری تھی اور اس شعلہ بیانی اور آتش نوا کی کو قدم قدم پر نفوس، قہقہوں اور انگوٹوں کے ذریعے خراج عقیدت پیش ہو رہا تھا۔ یہی وہ تقریر ہے جس میں شاہ صاحب نے اپنا مشہور جملہ کہا تھا۔

”وہ (مرزا محمود) نبی کا بیٹا ہے اور میں نبی کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے اور مجھ سے اردو، پنجابی، فارسی، عربی، ہریان میں بحث کرے۔ یہ بھگڑا آج ہی طے پا جاتا ہے۔ وہ پردے سے باہر نکلے، نقاب اٹھائے، کشتی لڑے، مولانا علی کے جوہر دیکھے، ہیر رنگ میں آئے۔ میں ننگے پاؤں آؤں اور وہ جبرید پر بناں ہیں کرائے۔ میں موٹا جھوٹا پسین کر آؤں وہ مرعوب کباب یا قوتیاں اور اپنے آبا کی سنت کے مطابق پلوں میں ٹانگ واہن پی کر آئے۔ میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں، ہمیں میدان میں لگو۔“

یہ تقریر جرات کی خاموشی میں شروع ہوئی تھی جو عشاء کی نماز کے بعد جب ابھی رات کا آغاز تھا لوگوں نے سننا شروع کی تھی۔ یہ تقریر پوری رات ہوتی رہی اور مجمع بھر کا کام لایا ایک بھی ذی نفس ایسا نہیں تھا جس نے تنہا کا اظہار کیا جو جس کے چہرے سے کتابت کی غازی ہوئی ہو۔ اتنے میں صبح کا نور عیدین شروع ہو گیا اور مودوں نے اذان دے دی تقریر بھی کر اس وقت بھی اپنے عروج پر تھی۔ لیکن مودوں نے اس سیل رواں کو روک دیا اور خطابت کے دریا کو بند کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ میں بہت کم خطیب اور مقرر ایسے گذرے ہیں جنہوں نے رات رات بھر تقریر کی جو جنہوں نے لوگوں کو اس قدر مسح کیا ہو۔ جیسا کہ امیر شریعت نے کیا ہے۔

کوئی ایسا نہ آئے گا لیکن کیا کریں گرنہ انتظار کریں

اور غالباً اسی موضوع کو حسرت موہانی نے کہا ہے:-

ہلاکشانِ غم انتظار ہم بھی ہیں خوابِ گردشِ لیل و نہار ہم بھی ہیں

انجینئرنگ کالج لاہور پر بیٹفار

رسالت یا رسول اللہ دہر کر باغبان پورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سے آگے آگے سرخ و سفید نورانی چہرے، انجی داٹھی اور لمبے بالوں والا چالیس برس کا ایک بزرگ قدم بڑھا رہا تھا، یہ قائد سید عطا اللہ شاہ بخاری تھے۔ اسی رات وہ اپنی شعلہ بیانی کا ادنیٰ گوشہ دکھا رہے تھے۔ وہ موچی دروازہ کے باغ سے پورے جلسے کو منظر پر انجینئرنگ کالج کی طرف لے نکلے تھے۔

اسی زمانے میں منغل پورہ انجینئرنگ کالج لاہور کے پرنسپل کے خلاف تحریک زوردار پر تھی۔ آج اس تحریک اور اس قسم کی دوسری تحریکوں پر کوئی قلم نہیں اٹھاتا اور ان تحریکوں کے پس پردہ ہتھوں کی نشان دہی کرنے والے اب بھی خاموش ہیں مگر نہ کسی برطانت و استانیس سننے میں آئیں اور نہ کسی دل چسپ محکات کا پتہ چل سکے۔ بہر حال یہ تحریک منغل پورہ انجینئرنگ کالج کے پرنسپل کے خلاف تھی۔ یہ پرنسپل اگر یہ تھا اور اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے حضور اکرم کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اس پر مسلمان طلبہ میں اشتعال پیدا ہو گیا جس پر کچھ کچھ شہر کے ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے تک یہ تحریک پھیل نکلی۔ شہر کے کئی ایک علماء نے آگے بڑھ کر اس تحریک کی قیادت سنبھالی

اور گرفتار کر لئے گئے۔ ان میں مولانا احمد علی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد مہرشد بھی تھے۔ ان گرفتاریوں کے بعد مروجہ دروازے کے باہر ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ عشاء کی نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا اور تقریباً دو بجے کے قریب شاہ صاحب مجلس گاہ میں تشریف لائے۔ ان کی آمد نے پورے جلسہ میں سچان بیکار کیا۔ ابھی لاؤڈ اسپیکر عام نہیں ہوا تھا اور مقرر کو اپنے گئے اور بھیچر دس کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ چنانچہ جلسہ گاہ میں بلا کی خاموشی تھی۔ سید عطا اللہ بخاری صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ یہ خاموشی، یہ جھجھک اور نموس رسول کا موضوع۔ پھر کیا تھا شاہ صاحب کی شعلہ نوائی انتہا پر تھی۔ ایک ایک لفظ سحر بٹاتا چلا گیا اور جب تین چار بجے گئے تو دس بارہ ہزار کا یہ جھوم سید عطا اللہ شاہ بخاری کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔ رات کے ایک بجے وہ مسجد جمع کو اپنے ساتھ لئے مغل پورہ انجینئرنگ کالج کی طرف بڑھنے لگا۔ تاکہ جب مودن فجر کی نماز کے لئے دعوت دے تو یہ جھوم مغل پورہ کالج کے سامنے ہی نماز ادا کرے اور وہیں ناموس رسول کی حفاظت کے لئے پکٹنگ شروع کر دے۔ اس جھوم میں ایک ذی نفس بھی ایسا نہ تھا جس نے شاہ صاحب کی آواز پر لبیک نہ کہی ہو یا اس کے قدم مغیورہ کالج کی طرف اٹھنے کی بجائے گھر کی طرف اٹھے ہوں۔

(عبد اللہ ملک)

مارشل لار کے قیدیوں سے ملاقات | لاہور سنٹرل جیل میں شاہ جی کی آمد کی اطلاع جب مارشل لار کے قیدیوں کو ملی تو انہوں نے حکام جیل کی اجازت سے شاہ جی سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ایک

دن صبح سویرے ہم اسیرانِ قفس ناشتہ کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے اگر شاہ جی سے درخواست کی کہ مارشل لار کے چند قیدی باہر کھڑے ہیں اور وہ آپ کی دیانت کے مشتاق ہیں۔ اگر اجازت ہو تو انہیں اندر لائیں۔ ابھی اس کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ شاہ جی شنگے سرزدنگے پاؤں ان قیدیوں کے استقبال کے لئے دیواندار کرے سے باہر نکل گئے۔ دیوانی احاطہ کے دروازے پر قیدی خراں خراں کر رہے تھے۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار اور شاہ جی کا استقبال ایک عجیب پرکیت نظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ شاہ جی نے سب کو گلے لگایا۔ ایک ایک کی بیڑی اور ہتھکڑی کو بوسہ دیا۔ پھر آپ نے اشبار آنکھوں اور ٹٹناںک لہجے میں فرمایا:۔ ”تم لوگ میرا سرمایہ نجات ہو۔ میں نے دنیا میں لوگوں کو روٹی اور پیٹ یا کبھی مادی مفاد کے لئے نہیں لپکایا۔ لوگ اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں۔ میں نے تو اپنے ناما حضرت خاتم النبیین کی عزت و اموس کے تحفظ کی دعوت دی ہے اور تم لوگ صرف اور صرف اسی مقدس فریضہ کے لئے قید و بند اور طوق و سلاسل کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہو۔ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ کسی شرت یا ذاتی وجہات جس کا مقصد ہو۔ تم یہاں جیل میں بھی غیر معروف ہو اور جب تم اس دیوانداروں سے پرے جہاد کے تو باہر تمہارا استقبال کرنے والا اور گلے میں بھوسوں کے ارڈن کر فرہنگانے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ نیت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لئے ہوئی ہے وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لئے اس سے بڑا سرمایہ افتخار اور کیا ہو سکتا ہے؟“

شاہ جی چند جملے فرما چکے تو کسی نے ایک قیدی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ لئے دعا فرمائیں۔ شاہ جی نے تحریک کا دورانِ منتہد دانہ کاروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:۔

”بھائی ہم بزرگ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر اتر آئیں۔ اور کوئی ناخوش گواہ صورت نمودار ہو جائے۔ میں نے

کراچی جیل میں جب لاہور ڈویژن کے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سنے اور معلوم ہوا کہ کسی بوڑھے یا بچوں کی لاطھیاں لڑ گئی ہیں۔ مافوں کے چرائی گئی ہو گئے ہیں اور کسی سہاگہ اچڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا اصرار نہ تھا۔ میں نے وہاں کہا تھا کہ کاش مجھے کوئی باہر لے جائے یا رباب اقتدار تک میری یہ آرزو پہنچا دی جائے کہ فقط ناموس رسول کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو کوئی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر دی جائے اور کاش اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹھیک پر باندھ کر میرے سینے میں پیوست کر دی جاتیں۔

(جبابہ محسنی)

دس بجے کے قریب کشن نعتان مسٹر بی۔ اے۔ قریشی تعزیت کے لئے شاہ جی کے مکان پر پہنچے۔ انہوں نے حکومت مغربی پاکستان کی طرف سے پیش کش کی کہ اس حلیل القدر

رہنما کو نعتان کے تاریخی قلعہ میں دفن کیا جائے لیکن مرحوم کے صاحبزادوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مرحوم نے زندگی بھر اپنے لئے کبھی کوئی رعایت حاصل نہیں کی۔ مرنے کے بعد بھی سرکاری رعایت حاصل کرنا ان کے مسلک کے خلاف ہے لیکن عقیدہ مندوں کی خواہش تھی کہ شاہ صاحب کو ان کی شان کے مطابق قلعہ میں دفنا جائے۔ انہیں مرحوم کے صاحبزادوں کے انکار سے مایوسی ہوئی اس موقع پر مولانا محمد علی جالبندہ صاحب نے مدرسہ قاسم العلوم میں اکٹھے عقیدت مندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم انسانی موت کا ذکر کرتے اور کہا کرتے تھے اب تو جل چلاؤ کا وقت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ ایسے مقام پر قریب نصیب کرے جو سربراہ ہوا اور آتے ہاتے لوگ فاتحہ پڑھ جائیں۔ (خواجہ صادق کاشمیری)

شاہ صاحب بہر حال انسان تھے فرشتہ نہ تھے، انکے ساتھ بھی زندگی کی وہ تمام ضرورتیں والی تھیں جتنی ہر انسان ضرور رہتا ہے۔ لیکن قیلے کی طلب میں کیوں وہ مزاروں سے الگ ہو گئے، اس لئے کہ انہوں نے

جو کچھ کیا وہ اسلامی زندگی کا اہم فرض تھا اور اہل حق کے نزدیک فرض اسی لئے ہوتا ہے کہ اسے بے چوں و بیڑاں ادا کیا جائے۔ اگر چہ اس راہ میں اتنی ہی تکلیفوں، مشقتوں اور قربانیوں سے سابقہ پڑے۔ یہاں تک کہ جہاں بھی دے دینے کی نوبت آجائے تو ایک لمحہ کیلئے اوائسے فرض سے روگردانی گوارا نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں انبیاء کرام علیہم السلام کا اسوہ حسنہ ہمیں کیا بتاتا ہے یہ کہ قوم کو دعوت دینے کے لئے اٹھتے تو فرمایا "ہم تم سے کچھ اجر نہیں مانگتے ہمارا اجر تو اللہ کے پاس ہے جس نے ہمیں پیدا کیا"۔ جن بزرگ ہستیوں نے اس اسوہ حسنہ کو اپنا شعار بنایا وہ بھی ہم قوموں یا ہم رفیقوں سے کبھی کسی اجر کے رد و ادا نہ ہوتے۔ انہوں نے جو کچھ کیا فرض سمجھ کر کیا ان کا مقصد ایک تھا اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔ اس رضا اور خوشنودی کے طلب گار اپنے کارناموں کی پاکیزہ دولت کو دینی حلوں کی متانے اکودہ کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لاسکتے۔ کاش ہم لوگ سمجھ سکیں اور اندازہ کر سکیں کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کی حقانیت اسی حقانیت کی گروہ سے ہے۔ یہی انسانی عظمت و برتری کی حقیقی اساس ہے۔ افسوس کہ اس مقدس گروہ کے افراد ہستہ ہستہ دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ لینے والے یہاں پیدا نہ ہوئے۔ شاہ صاحب اس وجہ سے بھی درد و رجس زہین ہیں کہ وہ اس گروہ سے متعلق ہیں اور اس وجہ سے بھی قابلِ صدا احترام ہیں کہ جماعتی اور قوت کے سلسلہ میں صحیح اسلامی معیار کے آخری نمائندوں میں سے ہیں۔

(مولانا غلام رسول مہر)

یہ کشش محض الفاظ کی نہ تھی اور محض الفاظ میں یہ جاذبیت جو بھی نہیں سکتی جب تک کہ الفاظ میں گہری معنویت نہ ہو اور معنویت بھی زنجیر کشش نہیں بن سکتی جب تک کہ اس معنویت میں معرفت نہ ہو اور محض معرفت بھی کشش کے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتی

جب تک کہ اس میں محبت نہ ہو اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری بے مثال خطیب ہونے کے ساتھ معنویت، صاحبِ برکت اور صاحبِ عشق و محبت تھے۔ رہا غلط دیگر وہ محض صاحبِ لسان نہ تھے بلکہ صاحبِ دل انسان تھے۔ محبتِ نبویؐ ان کے دل کی رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ اسی سے ان کے ہوش کا قلعن تھا اور اسی سے ہوش کا اور اسی سے ان کی خطابت کا چشمہ اُبھتا تھا جس میں دوسروں کی رگ و پے میں سما جانے کی خاصیت ہوتی تھی۔

اومی صاحبِ دل خود سے نہیں بنتا کسی صاحبِ دل سے بنتا ہے۔ اربابِ لسان کے بس کی بات نہیں کہ باتوں سے کسی کو صاحبِ بنا دیں، دل سے دل بنتا ہے دل جب کسی دل والے سے بنتا ہے جب ہی صاحبِ دلی بنتی ہے۔ عطا اللہ بھی ایک صاحبِ دل سے وابستہ ہو کر ہی صاحبِ دل بنے۔ اگر رائے پور کی خانقاہ میں ان کا گذر نہ ہوتا تو ان کا فنی کمال معنویت کی روح اختیار نہ کرتا وہ رائے پور کے مقدس درویش حضرت اقدس مولانا عبدالقادر شاہ صاحبِ رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں تک نہ پہنچتے تو ان کے دوسروں کے سروں پر نہ ہوتے انہیں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کا دستِ مبارک ملا تو دستِ بدست وہاں پہنچ گئے جہاں دست گیری کے بغیر نہیں پہنچا جاسکتا۔ یہ خدا کی دین ہے کہ پہنچتے تھے مرید بن کر اور لوٹے مراد بن کر۔

ہر مرید اپنے شیخ کا اور ہر شاگرد اپنے استاد کا عجب ہوتا ہے لیکن عطا اللہ کو مقامِ محبوبیت یہ ملا کہ خود شیخ ہی ان کے گرو گئے۔ سید عطا اللہ کی وفات کی خبر پہنچی تو شیخ بے اختیار رو پڑے اور رونے میں آواز میں تک نکل پڑیں۔ جس کا شیخ اپنے پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس کی محبوبیت کی کیا تنہا ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شیخ کی شفقتی، مرید کی اعلیٰ تربیت ہوتی ہے اور قابلیت بھی قلب کی نہ کہ محض لفظوں کی۔ اس لئے ماننا پڑے گا کہ سید عطا اللہ بے مثال صاحبِ برکت ہی نہ تھے بلکہ ایک بے نظیر صاحبِ دل عارف بھی تھے۔

(قاری محمد طیب صاحب)

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے پاک و دہند کا بچہ بچہ واقف ہے ان کی خطابت و قیادت و دونوں مسلم القوت کی انہوں نے لاہور میں ایک موقع پر شاہِ زمزمِ نزار کے دفتر میں سب کے سامنے شاہ صاحب کے متعلق فرمایا۔

”اس ظالم نے سے پہلے تقریر کی جا سکتی ہے، نہ بعد میں۔ اس کے بعد تقریر کرنے والے کا رنگ نہیں جھٹا۔ اور اس سے پہلے جو تقریر کرے اس کے اثر کو یہ اگر مٹا دیتا ہے۔“

(علامہ ملائوت)

بخاری نہ ہوتے تو زمانہ حال کے استثنائی صدیق ترین خطیبوں کو فنِ تقریر سے منہی کیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جن کی باتوں کا لفظ بخاری کے ہیں۔ اشعار بخاری کے انتخاب کردہ ہیں اور آیات و حدیث تک بخاری کی دی ہوئی ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اہلِ علم بخاری کی تقریریں ازبر ہیں۔ اور اپنے اپنے مقام پر وہ ایسے زمانے کی تقریر کر سکتے ہیں کہ اگر بخاری گونہ جانتے ہوں یا ان کا سریر سُنی ہو تو براہِ راست ان کی خطابت پر ایمان لے آئیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جنہیں آپ نقل برابر اصل کہتے ہیں۔ ادھر کچھ ایسے جنہیں بخاری کا پاکٹ ایڈیشن کہا جاسکتا ہے، ان کے علاوہ بہت سے ایسے بھی ہیں جن کی نقل راہِ عم نقل باید تک بھی رسائی ممکن نہیں۔ مگر بخاری کے شوق میں غلط شعری جھوم جھوم کر سنائے جا رہے ہیں، یہ لوگ اپنی جگہ پر اور سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن اگر بخاری نہ ہو تو وہ یانہ خطیب ہرگز نہ ہو سکتے اور یہ نہ سمجھتے کہ یہ بخاری کے حافظ (یعنی بخاری کی تقریروں کے حافظ) سب بخاری کے ہم نوا یا ہم سر ہیں ان سے اکثریت بخاری کی مخالف ہے۔ بخاری کے الفاظ، بخاری کے انداز اور بخاری کے منتخب اشعار، بخاری کے خلاف استعمال

ربا باعث فخر تھے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر بخاری بیہوتے تو ان لوگوں کا وجود بھی نہ ہوتا۔ عرض حسین طرح لوگ اقبال بننے کی کوشش لا حاصل کر رہے ہیں،
یہی طرح بخاری بننے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ اقبال اور بخاری کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔
قیمت اور شاہ صاحب | قیمت بخاری نے پنجاب کی تعریف کی ہے اور شاہ صاحب نے بھی۔ دونوں رنگ ملاحظہ ہوں۔

شاہ صاحب

ندیدم کشور سے مردود و مرتاب
بر شومی آئے کھڑا باد پنجاب
چہ ہلکے تنگ و عمار ہفت کشور
ز مشرق و مغرب بادش خاک بر سر
خچہ پیش مردم کشی
ز قتل مسلش باشد خوشی
چہ پیرانش مریدان فدنگی
لقب کا فور و ذات پاک رنگی
ز نواب و رئیسانش چہ پر سی
سگ و سگ زادگان کر سی بر کسی
چنان فرزند نامہ سوار زاید
کہ از خوقیتش برتر نیاید
چکہ از لاراش خون مسلمان
از دناناں جبار و مصر و ایران
جو انش غلامان فدنگی
پناہ شان بدامن فدنگی
چہ پنجاب آں فرنگی را معک
معکرا غلام احمد پیر
خلافت را پیر ہست پنجاب
فرنگی را معک ہست پنجاب
فضائش کفر ریز و کفر بیہ است
بر آئین الہی در ستیز است
زمین فتنہ زائے فتنہ خیزے
کہ شیطان پیش پانش سجدہ ریزے

قیمت

ندیدم کشور غارت گرتاب
بخاری آئے حسن آباد پنجاب
چہ پنجاب انتخاب ہفت کشور
قسم نووہ نچاکش آب کوثر
فضائے نشہ ہستی ہوایش
زمینے کا سمانہ خاک پائش
بنائے کعبہ و لہار خاکش
عروج نشہ معنی زناکش
غبارش آب و رنگ چہ گل
گیا ہش دلربائے زلف شبنم
مہر جا سبزہ از خاکش ویدہ
رُخ خوبان بے شتابش خط کشیدہ
زلالتش بادہ سازستی عشق
نیمش روح بخش ہستی عشق
گلش بر خاک ہر جا سایہ بداحت
زہیں از آتش یا قوت بداحت
نچاکش سایہ پر ہستے بلبل
جواب یک چمن خندیدن گل
شوق سراپہ چشم از دیدن گل
چمن سامان نگہ از چیدن گل
ز شوق آں کہ تا آمد بہ پنجاب
دل کشیدہ صدہ میشود آب
عشک ہر کس کہ در ہنگام سرا
دریں گلشن بود گرم تماشا

دونوں رخ کس قدر صحیح اور درست ہیں۔ غنیمت نے جزائیاتی اور بحرانی رخ کا جائزہ لیا ہے اور شاہ صاحب نے پنجاب کے اس زمانے کا سیاسی رخ دکھایا ہے۔ جب انگریز میان حاکم و قابض تھا۔ دونوں نظریں عنقریب تاریخ کا باب بننے والی ہیں اور مستقبل کا رخ بتلائے گا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ کس قدر صحیح نظر کرتی کی تھی۔

(علامہ طاہوت)

شاہ جی اور علامہ اقبالؒ آج اوہونداتے ایساں کرگساں نوں دسدہا کر بخاری غدار۔ اے کہ فدا کار۔ میں کہنوں کو ان میرے

شاہ جی اور علامہ اقبالؒ اتے ساتھی ای میرے کووں وچھڑ گئے تے یا پچھڑ گئے ہیں۔

علامہ اقبال کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ جی نے اک سرواہ بھری اور کہا۔

”اقبال زندہ ہوتا تو ان کرگساں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فدا کار، میں کہے کہوں کہ میرے ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ گئے، اور

پچھڑ گئے ہیں۔“

شاہ جی فرماتے تھے جب کبھی میں ان کے ہاں حاضر ہوتا تو وہ چار پائی پر گاد گیکہ کا سہارا لے کر بیٹھتے ہوتے، حقہ سلنے ہوتا، دو چار

کرسیاں بچھی ہوتیں۔ صدا دیتا، یا مرشد۔ فرماتے ”آج بھی میرا بہت دناں بعد آیا امیں“ (بہت دنوں بعد آئے ہو)

علی بخش سے کہتے تھے جاتے کلی کے لئے پانی لاؤ، کلی فرماتے، پھر شاد ہوتا، ایک رکوع سناؤ، میں پوچھتا کہ کوئی تازہ کلام فرماتے

ہوتا ہی رہتا ہے، عرض کرتا لائیے، کاپی منگواتے، پہلے رکوع سنتے، پھر وہ اشعار سنتے جو حضورؐ سے وابستہ ہوتے، قرآن پاک سنتے وقت کاٹتے

لگتے تھے۔ لیکن جو حضورؐ کا ذکر ہوتا یا ان سے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشک بار ہوتا۔

حضورؐ کا ذکر ہمیشہ با وضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی با وضو ہو کر بیٹھتے تھے حضورؐ کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک

مصور پتھر یا کافر روتا ہے۔

ایک دفعہ روایت شاہ جی، مجلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے۔ عاتقہ المسلمین میں بڑی جان ہے۔ اس قوم کا مزاج حرارت

سے بنا ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے پتہ انہیں کی گئی۔ ساری غربانی بیدار شب کی ہے۔ خواص تو خیر حضورؐ معطل ہیں، انہیں اپنے جسم کا عیش چاہئے

بیدار گم کردہ راہ ہیں لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لانے، عرض کیا، حضرت یہ بھی آپؐ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے۔ قوم خود بھی صحیح راہ پر نہیں آتی سچے

یکلئے عاتقہ المسلمین کس طرح تڑپتے ہیں لیکن آپؐ مجھ میں آتے ہی نہیں۔

”نہیں پیر جی، یہ بات نہیں۔“ میرا مجمع میری کتاب میں ہیں، میں ہجوم و انگار میں اس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ سب اذونات فرصت کے

اذونات ہی غنٹا ہو جاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کا اگر دیکھی نہیں جھلٹائی ہے۔“

”ادشاہ جی! انسان تلے دلاں تلے راناں دی مٹی جھاڑوے او۔“ (شاہ جی آپ، تودوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہیں)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرمایا اے کیا انسان تھے، حمید و دانش اور قدیم حکمت کا نقطہ عروج ہوئے

میاں سے محبت کرتے تھے اس لئے اللہ نے ان پر علم و دانش اور ذکر و نظر کے سبھی راستے کھول دیئے تھے۔ وہ میدان کا کھلاڑی نہیں

(سورش کاشمیری)

لیکن علم کا نہانہ ناخفا۔

شاہ جی اور میاں شمس پور جی غالب شاہ جی کا سیاسی زندگی کے آغاز کا زمانہ تھا کہ ایک دفعہ۔ شرفیہ حضرت شمس پور سے ملاقات

نے تشریف لے گئے ملاقات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا حضرت اپنے حجرے میں تشریف لے جا چکے تھے۔ خدام نے عرض کیا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ شاہ جی لاری کے اوٹے پر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت شیر محمد اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے اور زمانے لگے عطا اللہ شاہ نام کا کوئی آدمی ہے؟ خدام نے عرض کی چونکہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا اس لئے واپس تشریف لے گئے۔ انہوں نے یہ سنی کہ شاہ جی کو واپس بلوایا، بغل گیر ہوئے اور فرمایا تمہارا مرتبہ بہت بلند ہے، بہت اونچا ہے۔ افسوس ہوا کہ ہمارے ہاں ایسا اچھا اور بچا کرتے ہمارے۔ پیچھے ٹھونک کر رخصت کیا۔

مدحاتی فیض ان کو اپنے والد سے ورثے میں ملا۔ جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ جی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں بے حد وظائف کے لئے طبیعت میں بے حد جلال تھا۔ جب میں کسی راستے سے گذرنا تو مجھے درخت اور دیواریں پیچھے ہٹتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

(حافظ لدھیانوی)

شخصیتیں توفیقات ایزدی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا وجود قدرت کے معمولی قوانین کا کرشمہ نہیں ہوتا۔ وہ تو قدرت کے کسی غیر معمولی اور پراسرار عمل سے ظہور میں آتی ہیں۔ یوں قدرت (نیچر) کی اپنی کار فرمائی بھی لوگوں کی نگاہوں کی قوت سے احواس کے ماتھے کی ہم زدی کے عام تجربے بھی کچھ نہیں۔ صرف پھولوں کی کائنات پر ہی غور کریجئے۔ آپ فکر و گل کی دستوں کو دیکھ دیکھ کر جو حیرت تو لانا نہیں گے۔ مگر آپ بالیقین اس کی پہنائیوں، اس کی رنگ رنگیوں، اگر شہدائے فریبیوں اور دل فریبیوں کے انداز سے بے شمار کو دیکھ کر تھک۔ جہانیں گے اور بالاتر کہاں تھیں گے۔

مدح بلوہ در دیر و دیر جو مژگان اٹھائے طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائے۔

یہ تو ہوا سال نیچر کی عام تخلیقات کا۔ اور اس کے ادراک کی کوشش کچھ کامیاب بھی ہے مگر نیچر کی تخلیقات فائزہ کی کمالات کے عظیم انسان بھی اسی کا ایک حصہ ہیں۔ خدائے مصور الاجسام والارواح کا ایک بھید ہے، یعنی ایک جہاں راز جس کامر خود خدا کی ذات مجرور ہے جس کے انعکاسات عظیم فائق انسانوں کا روپ دھارتے رہتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق میر تقی میر نے سادہ سے الفاظ میں پتے کی بات یوں بتادی تھی۔

مت سہل ہمیں جانو چھڑنا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اور جب بھی سید عطا اللہ شاہ بخاری کا ذکر سنتا ہوں احوال کے کمالات فائزہ کا تصور کرتا ہوں تو میر تقی کا نذر جہاں بلا شاعر فوراً میر کی زبان پر وارد ہو جاتا ہے۔

اللهم اغفرہ وارحمہ ! (ڈاکٹر سید عبداللہ)

شاہ جی نے قائد ملت خاں یلداقت علی خاں صاحب مرحوم کے منہ کی تائید میں دفاع و استقامت کا وطن عزیز کے لئے جو طوفانی دور سے گئے۔ مہر موڑ پر دشمنان وطن کو ڈانٹا اور انہیں خبردار کیا کہ رسول عربی صلم کے نام پر حاصل کی گئی سرزمین کی طرف جو نگاہ بدلتی تھی اسے لنگال دیا جائے گا۔ اور جو ماتھا اٹھے گا اسے کاٹ دیا جائے گا۔ وہ ایک صاف دل اور صاف گوشت کا قائد تھے۔ انہیں مذہب اور وطن دونوں سے پیار تھا۔ وطن اگر ریزے پھیندا اور مذہب دشمنان رسالت سے محفوظ کرنا ان کا نصب العین تھا۔ ان کی زندگی میں دونوں کام ہوئے اور یہ ملت اسلامیہ کا بابر ناز سر دار طینت اور کامیابی کے ساتھ اس دار فانی سے سرزد اٹھا۔

اگرچہ اچھا کر سبے تو گولی کیوں نہیں سلطان ابن سعود پر عین احرام میں ایک حاجی نے پھر سے سے حملہ کر دیا۔

تو سلطان کے محافظ نے چھرا مارنے والے کو گولی سے اڑا دیا۔ لاہور کے ایک جلیے میں شاہ جی تقریر کر رہے تھے کسی نے دوران تقریر رسول کریم ﷺ کے شاہ صاحب! کیا حرم مقدس میں گولی چلانا سہاجر ہے، کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا مگر شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا۔ ارے میاں! جب چھرا مارا گیا نہ نہیں تو گولی چلانا کیوں سہاجر نہ ہوا۔ معترض شرمندہ ہو کر بیٹھ گیا۔ (منظر علی شمی)

اگرچہ کچھ عرصے میں شاہ جی نہیں مگر ان کا مشن ان کے معتمدین کے لئے مشعل راہ ہے۔ قائد اعظم کے بعد وہ اپنے محبوب رہنما ہیں جن پر سارا ملک رویا۔ اور ہر طبقے نے تعزیت کی اور ان کی موت کو زبردست

قائد اعظم کے بعد شاہ جی

قرار دیا۔ شاہ جی کی خدمات جلیلہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی زندگی کا وزن ایک تاریخ ہے۔ تحفظ ختم نبوت کے لئے ان کی قربانیاں یادگار عالم ہیں۔ شاہ صاحب نے مذہب و ملت کے لئے وہ کارنامے نمایاں سر انجام دیئے کہ جن سے شاہ جی کا قیامت زندہ رہیں گے۔ (منظر علی شمی)

کئی دفعہ ایسا ہوا کہ کسی جلسہ میں شرکت کے لئے میں اور امیر شریعت ایک ساتھ گئے ہیں۔ منتظمین مالی مفاد سے لا پرواہی

نے اپنی فراست سے سمجھ لیا کہ میں نے کوئی رائے دی ہے۔ ناراض ہو کر فرمایا محمد علی آخری عمر میں مجھے لے ایمان کر کے اڑنا چاہتے ہو۔ تم نے مقدار رقم کی رائے دی ہے حالانکہ میں نے تمام عمارت کا خیال بھی نہیں کیا۔ آمد و رفت کا ریکارڈ سے لے کر چلتا ہوں اور خیال بھی نہیں کرتا کہ کوئی ضرور دے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کے ذریعے دے بھی دیا تو میں نے دیکھا بھی نہیں کہ کیا دیا۔ (مولانا محمد علی)

ایک جلسہ میں بعض منتظمین کو شک ہوا کہ جس کے سپرد شاہ صاحب کا سفر خرچہ ادا کرنا تھا اس نے پورا نہیں دیا بلکہ خیانت کی ہے۔ اب انہوں نے تحقیق کی کہ

شاہ جی کے کردار کا ایک حسین پہلو

صورت نکالی۔ عرض کیا کہ جو سفر خرچہ پیش کیا گیا ہے اس میں ایک نوٹ کو تیل لگا ہوا ہے لایسے ہم اسے بدل دیں۔ مسئلہ ادا فرمایا اللہ تعالیٰ نے پردہ دری کی اجازت نہیں دی۔ سب خاموش ہو گئے۔ (مولانا محمد علی)

شاہ جی کے کردار کا ایک پہلو

میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ آپ میں حسد و عجب، کبر نام کو نہ تھا۔ البتہ خود داری کے پہاڑ تھے۔ کوئی شخص جس فن میں کمال رکھتا ہو، اس فن میں سوائے اپنی اولاد کے کسی اور کو برداشت نہیں کرتا لیکن حضرت شاہ صاحب فن تقریر میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے مگر جب دوسرے شخص کو تقریر کرتے سنتے تو خوشی سے جھوٹے اور چہرہ مبارک چاند کی طرح چمکتا، ماشاء اللہ فرماتے، اور فرماتے اب میری ضرورت نہیں چنانچہ وہ دفعہ ایسا ہوا، آپ کی تقریر کا اعلیٰ تھا جبکہ میں ہجوم کی وجہ سے تلی دھرنے کو مجھ نہ تھی، لوگ حشمت براہ تھے ادا ان سے پہلے میری تقریر تھی، میری تقریر کے بعد ان کو دیا کہ اس تقریر کے بعد میں تقریر کرنا مناسب نہیں سمجھتا، جلسہ برخاست کرتا ہوں۔ انہوں نے ایسا ایک دفعہ نسبت دیا لاہور اور دوسری بار کلکتہ باغ سرگودھا میں کیا۔ (مولانا محمد علی)

شاہ جی کی انکساری اور فراخ دلی

اپنے آپ کو بڑا بنانے سے گریز فرماتے۔ جب ایات اللہ علی خاں ملاقات چاہتے تھے۔ ان وقت مرکزی جماعت کے صدر اسٹوڈنٹ تاج الدین اور مولے کا صدر ہیں تھا، ہم نے ہمت کوشش کی کہ آپ ملاقات قبول فرمائیں لیکن آپ نے بار بار یہی جواب دیا کہ صدر کو ملاقات کرنی چاہیے۔ دونوں صدروں میں سے کوئی نے اللہ اللہ ایسے وقت جماعتوں میں ہرگز نہ یا ہمدردی کو بچھاڑنے کی کوشش کرتا ہے مگر آپ مضابطہ پیش فرما کر پیچھے ہٹ جاتے اور یا

کرتے ہیں ایسی جماعت میں وہ نہیں سکتا جہاں کہنی مبارک دوسرے کو پیچھے کرنے کی عادت ہو۔ (مولانا محمد علی جانان دہری)
حضرت امیر شریعت عالم باطل اور صوفی سر مشاس تھے، ہزاروں افراد نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور اپنے نفس، ان کی اصلاح کا اہتمام کیا، ان کی زندگی کے اس پہلو پر بہت کم حضرات کی نظر گئی ہے۔ اصلاح باطن میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ صاحب کو پیر عبد القادر صاحب المعروف حضرت رائے پوری سے فیض تھا۔ عبادت تصوف کے راہرو اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اس جہاں میں حضرت رائے پوری کی نسبت سے بلا مبالغہ انھوں نے طالبانِ صادق نے روحانی منازل طے کیں "راے پور" کی خانقاہ سے برسوں تصوف کا نورانی چشمہ رواں دواں رہا۔ یہ خانقاہ منازلِ سلوک میں اپنے وقت کی سب سے بڑی تربیت گاہ رہی ہے۔

ان کس سے اہل بشارت کے اشارت و انداز نکلتا ہست بسی، محرم اسرار کجا است
شاہ جی نے پیر کی اور سجادگی کی دکان کبھی نہ بجائی، پیری مریدی کو کاروبار کا درجہ نہ دیا۔ ان کی غیرت منہ طبیعت کبھی کسی مرید سے ایک پائی کی روادار نہ ہوئی۔ ان کی ارادت مندوں نے مجھ سے بھی ان کی پیشوائی و اولیائی کا ڈھنڈورا نہیں بٹایا، شاہ صاحب دینی اور دنیوی اور کلیم بود پر گہرا یمن تھے۔ انہوں نے بڑوں کا کفن نہیں بیچا اور آباؤ اجداد کی قبروں کی اینٹوں کو فروخت نہیں کیا کیونکہ وہ دھن دولت کے بندے نہ تھے، وہ تو بطلِ حریت تھے۔ انہوں نے وادی سیاست کے خارزار کی عمر بھر جاؤ۔ پیمائی کی، اپنے عقیدت مندوں کو بھی ساتھ لے کر چلے، انہوں نے مریدوں کے ہاتھ میں تسبیح کی بجائے گھاڑی پکڑائی، غلامی کی زنجیریں سے بردار رہے، وہ فاضلہ احرار کے شریک تھے۔ (اقبال، اسد)
سید عطا اللہ بخاری اس دنیا سے رحلت ہوئے تو اپنے ساتھ نیکیوں اور سعادوں کی ایک دُنیائے گئے گئے گونگاں گن وہ آدمی تھا مگر۔۔۔

اوصاف و خصائل اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کئے تھے وہ پہلے بھی ایک وجود میں جمع ہوتے رہے۔ اب تو زمانہ ان اوصاف و خصائل کی تربیت ہی سے یہ ظاہر محروم نظر آتا ہے۔ پھر کس بنا پر امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ کسی کوئی شخصیت ہمیں دوبارہ دکھائی نصیب ہوگی۔ جس دور سے میں گزر کر آیا ہوں اس میں بہر طوفان عظیم القدر شخصیتوں کی صفیں نظر آتی تھیں جن میں سے ایک ایک فرد علم و فضل، رحمت و شفقت، ایشیاء و نظریات اور عمل و سرگرمی کا ایک ایسا عجیب و غریب پیکر تھا کہ اسے دیکھتے ہی فطرت و ادب و احترام سے گردنیں جھکا جاتی تھیں۔ آج ویسے وجود کساں نظر آتے ہیں؟ اگر ہوں گے تو وہی جو آگ کا بابتی رہ گئے، جیسے طوفان گزر جاتا ہے تو اپنے پیچھے بادلوں کے چند ٹکڑے چھوڑ جاتا ہے۔ سید عطا اللہ بخاری مرحوم و مغفور کو بھی اس مجمعِ عظیم میں، ایک مخزنِ نظام حاصل تھا۔ میں آج ان کی مثال کہاں تلاش کروں؟ ایک وسیلہ ظلمت زار میں روشنی کی کرنیں کس امید پر ڈھونڈیں؟

گہری ہونی دنیا
حضرت امام بخاری سے ایک شعر منسوب ہے جس کا مفہوم اردو میں یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر زندگی طویل ہو گئی تو لازماً تمام احباب کی موت کے غم برداشت کئے بغیر تیرے لئے چارہ نہ رہے گا۔ اس وجہ سے تیری زندگی اندوہ و قلق کا ایک دریا گینزِ رقع بن جائے گی۔ اس اندوہ و قلق کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے احباب و رفقا کا فائدہ منازلِ حیات سے تیزی سے گزرا گیا اندوہ گرد و پیش کا ہزاروں کی حیثیت میں پیچھے رہ گئے۔ میں کیا عرض کروں کہ کون کون بزرگوں، محبتوں اور مہمدوں کی مفارقت کے داغوں سے سینہ و دل شعلہ زار بنے ہوئے ہیں۔ کان چن صدائوں سے عمر بھر آتا رہے۔ وہ اب کہیں سننے میں نہیں آتیں۔ لہذا میں جن مناظر کی اس درجہ شوگر ہو چکی تھیں کہ انہیں کو زندگی کے طبعی اور حقیقی مناظر سمجھتی تھیں، ان کی زیارت کے لئے اب دور دور تک جانی ہیں اور ناکام واپس آتی ہیں۔ کوئی گدبسی ہوئی دنیا کو کہاں سے لوٹائے اور کیوں کر لوٹا لائے؟

زندگی کا دھارا انتہائی تیزی سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اس میں بھت ممکن نہیں، اس کا پیچھے کی طرف لوٹنا خارج از بحث ہے، اور جو مویں اپنی نظری بے تابیوں کو دھارے کی سطح پر کبھی تھمتی ہوئی آگے جا چکی ہیں۔ وہ پلٹ کر نہیں آسکتیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہر مروج کے بعد دوسری ویسی ہی یا اس سے ملتی جلتی موج آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی اور منظر میں شکست یا انقطاع ہی نہیں بلکہ تغیر و تبدل کا بھی احساس کم ہوتا تھا۔ مگر اب؟ یہی کیا عرض کروں؟ اب دوسری دنیا ہی وجود میں آگئی ہے۔ وہ دنیا یقیناً باقی نہیں رہی جس میں ہم نے زندگی کے بیشتر اوقات گزارے۔

(مولانا غلام رسول مہر)

بے نفسی اور بلند ہمتی

پھر آپ نے دیکھا کہ جس عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے راہ حق کے لئے قربانیوں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی تردد نہیں کیا وہ اپنی ذات یا اہل و عیال کے لئے کبھی کسی اجری معاوضے کا طلب گار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ زندگی کے بالکل آخری اوقات میں بھی وہ چپ چاپ کرائے کے ایک کپڑے مکان میں مقیم ہو گیا اور کبھی کوئی کوشش نہ کی کہ اسے کوئی دریا بنے درجہ کا مکان ہی الاٹ ہو جائے حالانکہ اس کے گرد و پیش بارہ تیرہ سال تک الاٹ منٹوں کا ایک ہنگامہ بپا رہا۔ وہ غیر معروف فرد نہ ہزاروں آدمیوں کے دل فرط عقیدت سے اس کے لئے برابر تڑپتے رہے۔ ارباب محل و نقد میں بھی اس کے شناساؤں، بلکہ عقیدت مندوں کی کمی نہ تھی مگر اس نے اپنے لئے زندگی کا جو سامانہ تجزیہ کر لیا تھا اس میں ایسی باتوں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی، اہل حق اپنی ہمتا اہل علم کی تلاش و بہود کے لیے لٹاتے رہتے ہیں۔ مگر خود کبھی کوئی پیچھے ہٹنے کے روادار نہیں ہوتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بے عزت ترین متاع اس کی درویشی تھی۔ وہ اسی متاع پر اس طرح قانع اور مطمئن رہا کہ ارباب اقتدار کو اپنی بلند پایہ مندوں پر بیٹھ کر بھی کبھی وہ اطمینان شاید ہی نصیب ہوا ہو اسی مقام کے باب میں عرض کیا گیا ہے۔

گرد دولت این بود کہ بہ درویش مے دھند باید گریستن جم و کے را بہ تحت غولیش (مولانا غلام رسول مہر)

توحید کی پر جوش اشاعت اور سنت کی تردید میں جس والہانہ انداز سے انہوں نے تصدیق اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا عشق رسولؐ کی زنا کنوں اور توحید کے سرشار و رموز کو اس کامیابی سے بیان کرتے تھے جو صرف انہی کا حصہ تھا۔

اردو بولتے تھے تو معلوم ہوتا کہ:-

غالب، ذوق اور داغ نے شاعری کو کچھ بڑا خطاب اختیار کر لی ہے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ:-

چناب اور راوی نے اپنی روانیاں انہیں بخش دی ہیں!

آہ! اگرچہ ہم ایسی جامع صفات شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

شاہ جی بعض اوقات بڑے بڑے علمی و دینی مسائل کی گہریں کھولتے ہوئے شعرو شاعری سے ایسا کام لیا کرتے تھے کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی۔ مثلاً ایک مرتبہ حج کے بارے میں تفصیلات بیان کر رہے تھے کہ اچانک مزاج کا دھارا شعرو سخن کی طرف پھول کر کہنے لگے:-

کوئی تو بات ہے ساقی کہ سیکھ رہی ہوں

جو دور دور سے میخوار آگے بیٹے ہیں

یہ فیض میکہ دیکھو کہ چار ہی دن میں

ہم ایسے زند بھی بننا تبا کے بیٹے ہیں

شاد عظیم آبادی کے یہاں شاعر شاہ جی کے نفیس لب و لہجہ میں سن کر حاضریں بے ساختہ بھوم اٹھنے۔

میں نے شاہ جی کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں اور خطیبوں کے چراغ گل ہوتے دیکھے ہیں۔ ایک جلسے میں شاہ جی کے علاوہ

محمد علی اور دیگر زمانے بھی تقریریں کیں۔ لیکن شاہ جی کی تقریر کا رنگ و روغن ہی کچھ ایسا تھا کہ ان کے بعد اس فن کے بعض نامی گرامی لوگوں کی تقریریں بھی عوام کو متاثر نہ کر سکیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی اگلے شاہ جی سے کہا:-

”بخاری! تم اپنی تقریریں، لوگوں کو جب قورمہ اور پلاؤ فراہم کرتے ہو تو بعد میں انہیں یہ بھی کہہ دیا کرو کہ محمد علی کی کہنی سوکھی رہی تھی قبول کر لیا کریں۔“

اس پر شاہ جی فوراً بولے:-

”حضور! ایک جرنیل ایک سپاہی کے بارے میں یہ بات کہہ رہا ہے، سپاہی کی شہرت تو دراصل جرنیل کی عظمت کا آئینہ ہوتی ہے۔“

یہ الفاظ سن کر مولانا محمد علی نے غزید بحث و تحیص کی گنجائش دینا چاہی۔

بخاری جیسے خلیفہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا محمد علی جی پر میرے باوجود بیان مقرر نے اپنے اخبار ”ہمدرد“ میں شاہ جی کے بارے میں نہایت اعلیٰ طور پر لکھا تھا کہ:-

”یہ شخص مقرر نہیں، ساحر ہے۔“

(شیخ حسام الدین)

دہلی دروازے کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ تھا، شاہ صاحب ہی صدر اور وہی مقرر تھے۔ دس بجے شب کے بعد شریف لائے اور بیٹھ کر تقریر شروع کر دی، کہ آغاز میں ایک جوئے نرم زد کی سہی کیفیت رکھتی تھی۔ لیکن جوں جوں رات بھینگتی گئی۔ آوازیں بلند، کلام میں نرمی اور مخاطب میں روانی برابر بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر زمین و آسمان میں سناٹا تھا اور.....

اک شیر تھا جو گونج رہا تھا کچھ اریں :-

میں نے مولانا محمد علی جو بہر کو بھی سنا ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت سے بھی فیضیاب ہوا ہوں مولانا ظفر علی خاں کے سحر گفتار میں آج بھی امیر ہوں لیکن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے زور بیان اور شیرازی گفتار زمانہ کا ایک اپنا مقام بلند تھا کہ آج تک جس کی مثال نایاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی تربت کو خیر فرمائے، اور اپنے دایان رحمت میں جگہ دے۔ (صلاح الدین احمد)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد

۱۳۸۱ھ

انتقال پیر لال سید عطاء اللہ شاہ

۱۳۸۱ھ، محرم المقدس

خطیبانہ شبائے

وفاداری کے طالب ۱۹۴۸ء

میں نے جو کچھ کیا اللہ اور اس کے رسول کے لیے کیا۔ مجھے ایک لحظہ کے لیے بھی کسی حرکت پر زبردست نہیں۔ میرا دماغ غلطی کر سکتا ہے۔ لیکن میرے دل کے کسی غم نہیں کی۔ مجھ سے وفاداری کا ثبوت مانگنے والے پہلے اللہ اور اس کے رسول کو اپنی وفاداری کا ثبوت دیں۔ میں ان لوگوں میں نہیں، جو انصاف کی سوداگری کرتے ہیں۔ میں اس شخص کو دھوپ اور بھانڈوں کی اولاد سمجھتا ہوں۔ جو قوم کو بچتا پھرتا، ملک سے غداری کرتا، اور جس کا کھانا ہے اسی میں پھید ڈالتا ہے۔ میں نے صرف ایک اللہ کے سامنے جھکنا سیکھا ہے۔ میں ان لوگوں کا وارث نہیں جنہوں نے درباروں کی دلیز میں چائی ہیں۔ میں ان کا وارث ہوں جو شہادت کے راستہ میں رسول کو ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔

پاکستان کی حفاظت ۱۹۵۲ء

میں ان لوگوں میں سے نہیں، جو یہ عداوتیں پھیریں۔ کہیں تو شرع وفاداری لیے پھرتا میری انگلی پیکر کر اپنے ساتھ لے چلو، اور جس مقتول میں جاہو، مجھے ذبح کر دو۔ کبھی نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔ میری خوشی بیکراں ہے۔ کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی حصہ میں بھی سامراج کو دیکھ نہیں میں اس کو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔ تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو، میری رائے ہمارے ہمارے گئی۔ اور اس کو نہیں ختم کر دو اب پاکستان نے جب بھی لگارا، والدہ اللہ میں اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کروں گا۔ مجھے یہ انتہائی عزیز ہے جتنا کوئی اور دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو وہ پھوڑ دی جائے گی کسی نے اٹھا اٹھایا تو وہ کاٹ دیا جائیگا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابل میں اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا دل پیٹل بھی تمہارا تھا۔ اب بھی تمہارا ہے۔

ختم نبوت کا سپاہی ۱۹۵۰ء

ختم نبوت کی حفاظت میرا جزا ایمان ہے۔ جو شخص بھی اس رفاہ کو چوری کرے گا میں چوری کا سوا کس کا نہیں۔ نہ اپنا نہ پرایا۔ میں، انہیں کا ہوں وہی میرے ہیں۔ جس کے جس و جمال کو خود رب کہے نہیں کھا کر اگر راستہ کیا ہو۔ میں اُن کے جس جمال پر نہ مر مٹوں۔ تو لہنت ہے مجھ پر اور اُن پر اُن کا نام تو لیتے ہیں لیکن ساروں کی خیر و خوشی کا تماشا دیکھتے ہیں۔

لاہور کے تماشائی ۱۹۵۸ء

صدر محترم اور تماشائی بھائیو! لاہور آئے ہوئے مجھے بیس سال ہو گئے ہیں میں لاہور کا بڑھا ہو گیا ہوں۔ بال سفید ہو چکے ہیں۔ کچھ تنگ مجھے یہ بتہ نہیں چلا کہ آپ کیا کیا غوث ہیں، غلب ہیں، ابدال ہیں، دلی ہیں، کیا ہیں سمجھ میں نہیں آتا، کہ آپ کو کس خطاب سے مخاطب کروں۔ جو بیوی کے حق میں جیل جانا لکھا ہو اسے، اگر تم نہیں چاہتے، کہ ہم تمہارے سامنے آئیں، تو پھر تم ہمارے سامنے کیوں آئے ہو؟ کبھی کرتی ہے تو کبھی کر لو، یہ کیا کہ عطا اللہ نے کی تقریر، تم نے کہا، واہ شاہ جی واہ عطا اللہ ہو گیا قید، تم نے کہا، آہ شاہ جی آہ

تمہاری آہ اور واہ میں شاہ جی ہو گئے تباہ۔

قرآن مجید ۱۹۴۶ء

اللہ کی کتاب کی بلاغت کے صدقے جانیے، خود بولتی ہے کہ میں محمد پر اناری گئی ہوں۔ بالوگوگو اس کی قمیں نہ اٹھایا کرو، اس کو پڑھا کرو۔ سید اھرشید اور شاہ اسماعیل کی طرح زمسی اقبال کی طرح پڑھا کرو۔ دیکھا، اس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا، تو مغرب پر بد بول دیا، پھر اس نے قرآن کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ تمہارے بت کرے میں اللہ اکبر کی صدائیں۔

عقاب کی آنکھ ۱۹۳۹ء

تم میرے بارے میں جو جاپو، سوچ لو، مسلمانوں کا یہ شعار ہو گیا ہے، کہ وہ مرا سناں عقاب کی آنکھ سے پھٹتا اور جا کی رفتار سے پکڑتا ہے۔ کبھی کبھی میکیوں پر بھی نگاہ کر لیا کرو۔ تمہاری فطرتیں اس سے خوبصورت ہوتی چلی جائیں گی۔

راہچال کی گستاخی ۱۹۲۷ء

(اس جلسہ میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید جوہر تھے۔ یہ جلسہ راجپال کی کتاب (حاکم بدین) دیکھنا اور ام المؤمنین عائشہؓ اور ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰؓ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری آج مفتی کفایت اللہ، اور مولانا احمد سعید کے دروازے پر ام المؤمنین عائشہؓ اور ام المؤمنین خدیجہ الکبریٰؓ آئیں اور فرمایا ہم تمہاری باتیں ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں، کہ کافرول نے ہمیں گالیاں دی ہیں۔ (پھر اس زبردست کڑوت کے ساتھ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا، کہ جلسہ بدل گیا، اسے دیکھو تو۔۔۔ ام المؤمنین عائشہؓ صدیقہؓ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں (جلسہ میں کلمہ پڑ گیا لوگ ڈھائیں مار مار کر رونے لگے، دیکھو، دیکھو سبز گنبد میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تڑپ رہے ہیں۔ خدیجہ وعائشہ پریشان ہیں۔ اموات المؤمنین تم سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہیں۔ عائشہ پکارتی ہیں، وہ عائشہ، جنہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا سے حیرا رضی اللہ عنہ، کہا کرتے تھے جنہوں نے رسول اللہ (نداء امی وانی) کی رحلت کے وقت سواک چھا کر دی تھی۔ انکے ناموس پر قربان ہو جاؤ جیسے بیٹے ماں پر کٹ مرا کرتے ہیں۔ ۷ جولائی ۱۹۲۷ء

میں پہاڑوں سے مخاطب ہوتا ۱۹۲۵ء

چوالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا، پہاڑوں کو سنا، تو عجب نہ تھا کہ ان کی سیکینی کے دل چھوٹ جاتے، غاروں سے ہلکا سم ہوتا، توہم ان کی سیکنی کے لیے طوفان بلند ہو جاتے۔ درشتوں کو پکا زنا، تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا، تو وہ لبیک کہا اٹھتیں۔ مہر سے گویا ہوتا، تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سنا، تو اس کے سین میں بڑے بڑے شگات پڑ جاتے۔ جھگڑا لہانے لگتے۔ مہر سبز ہو جاتے۔ میں نے ان لوگوں کو خطاب کیا جن کی زمینیں بنجر چوکی ہیں۔ جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط ہے۔ جن کے ضمیر عاجز آچکے ہیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے ہیں۔ جن کی پستیاں انتہائی خطرناک ہیں۔ جن کا کھٹرنالہ ناک، اور جن سے گزر جانا طرب ناک ہے۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت ہے۔

مراجعت ۱۹۶۶ء

میں دہاں چلا جاؤں گا۔ جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آیا، پھر تم مجھے پکارو گے۔ مگر تمہاری پکار تمہارے کانوں سے ٹھکرا ٹھکرا کر تمہیں بلکان کر دے گی۔ اور

تم مجھے نہ پاؤ گے۔

شاہ جی کی عادتیں

شوش کاشمیری

شاہ جی خوبصورت عادتوں کے ایک دل فریب انسان تھے۔ قرون اولیٰ میں ہوتے، تو صحابہ کی صفت اول میں ہوتے۔ اور کربلا میں سید الشہداء کے ساتھ شہید ہوتے، ان کی درویشی اور فیر سی میں میں بوئے اسد ملی بھی تھی، اور غیرت شہیری بھی۔ وہ ابو ذر غفاری (رضی اللہ عنہ) کی طرح املاک پیدا کرنے کے ہر طریق کو ناجائز سمجھتے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمتوں جیسے بستے پناہ ارادت رکھتے تھے۔ عہد عقیق کے روم و یونان میں ہوتے، تو ڈیبا ستیہر باسرو موبت جنہوں نے خطابت کے اصول بدوں کئے۔ اور لوگوں کی عقلوں کا شکار کرتے رہے۔ گندہ یونان میں ہوتے، تو عجب نہ تھا کہ سقراط کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا۔ ویدوں کے ہندوستان میں ہوتے تو ہالیہ کے غاروں میں رشیوں کے ساتھ قند ملا کر پلٹے، اور گیتا کے ورق اچالتے پھرتے، یا پھر گوتم بدھ کے ساتھ ہوتے، جن کی یادیں ایلورا اور اجنتا کے تحیر العقول غاروں میں نہٹنے والی خطابت کا شاہکار محسوس ہوتی ہیں۔

شاہ جی ایک عجیب و غریب تصویریں مرتق تھے۔ ان کے پھرے مہرے پر فقراے اسلام کا طنطنہ اور دانشوران یونا کا ہمہہار مار کئے ہوئے تھا۔ آدمی ان کے نزدیک اگر اور نزدیک ہو جاتا تھا۔ ان کے مخالف وہی لوگ تھے جو ان سے دور رہتے تھے۔ یا پھر انگریزوں کے پٹھو، مسلمانوں کے دشمن اور قادیانیت کے مہنی، وہ لوگ کا تڑکا تھا کہ اندھیلکرات، اس کی گرفت اگر فقرا ہو جاتی ہے۔ یا پھر اس کا قطرہ تھے، کرفنچوں کا منہ دھلاتے اور پھول کھلاتے تھے۔ ان کی عادتیں جو ان کے الفاس کے ساتھ ساتھ چلتی تھیں، اتنی سادہ اور عجیب تھیں، کہ عظیم کتابی انسانوں کے سوا ان کا وجود فی زمانہ، شاذ ہی ملتا ہے۔ مثلاً۔

(۱) - وہ مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچتے تھے۔ ہر چیز کو اللہ کی رضا کے تابع سمجھتے، حال سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ اس جھنجھوڑتے، اُس پر کڑتے یا کبھی کبھار اس پر قہقہے لگاتے تھے، البتہ وہ ماضی کے انسان تھے۔ امور ماضی ہی سے محبت رکھتے۔ ان کا اور ہونا، بھوننا، چٹنا پھٹنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، سوچنا سمجھنا، بولنا ہنسا، سب ماضی کا مروجہ تھا۔ اور اسلام کے ماضی کے سوا کسی بھی ماضی کے قائل نہ تھے۔ وہ تہمند اس لئے باندھتے تھے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تہمند باندھا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی غذا کے عادی نہ تھے۔ ساگ ستو جولا، خدا کا کیا اور کھالیا۔ میں نے ہری مسروچوں کی رغبت کے سوا ان میں کسی شے کے لیے رغبت نہیں پائی! انہیں بشیر پکاے جھلے جلتے اور قہیے میں بھون کر بھی۔ ٹھنڈا پانی کثرت سے پیتے، بلکہ تقریر کرتے وقت تھراس ساتھ رکھتے تھے۔ برف ہی چباتے چلے جاتے، انکا گلاب برغاب سے اور کھلتا، بلکہ کرارا ہوتا تھا۔ اکثر فرش ہی پر ربت کھول کر سو جاتے یا پھر بان کی کھدھی چار پائی پر۔ دھوکے لیے لونا ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے۔ جب پان کھانے کی عادت پختہ ہو گئی، تو تیلیہ کی ایک غریبہ اچال نوکری میں پانوں کی ڈھولی، چونا، کھٹا اور سپاری کی گولیاں، کھد کے کٹروں میں پیسٹ لپٹ کر رکھتے تھے۔

(۱۲) - سرخیز تو تھے ہی، یعنی صبح کی نماز قضا نہ ہونے دیتے۔ نماز ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ مگر بات گئے دیر سے سوتے، اور

(۸) - انکے پاس ایک بہت پرانا بٹوہ تھا جو ملتان کے ایک مجذوب نے دے رکھا تھا، یا وہ بٹوہ انکا اپنا تھا۔ مگر اس میں اور پائیاں پڑی تھیں۔ جو اس مجذوب نے دی ہوئی تھیں۔ انہیں بٹوہ میں تبرک رکھ چھوڑا تھا، فرماتے ان کے برکت بٹوہ کبھی خالی نہیں رہا۔

(۹) - فرماتے جو لوگ روٹی کے لیے جدوجہد کرتے اور اسی کیلئے بیعتے ہیں۔ ان میں اور ایک کتے میں کوئی فرق نہیں وہ بھی کے لیے بھوکنا اور دم ہلا کر مالک کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ روٹی کوئی چیز نہیں اصلی چیز عقیدہ اور اس کے مطابق بسر کرنے کی دھن ہے۔

(۱۰) - مذہباً کچھے مسلمان اور بہ لحاظ مسلک حنفی العقیدہ تھے۔ دیوبند مدرسہ فکر کے پیرو لیکن طبیعت میں کسی کے لئے تنقید و عقاید کی اچھائیوں سے محبت کرتے، میرزائیوں کو تو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے۔ صوفیا اور اولیاء کا بے حد احترام کرتے مرنے میں اگر فرماتے بھی تو شیشی بھی ہوں، نقشبندی بھی، قادری بھی، صابری اور سرودی بھی۔

(۱۱) - اپنے دورانے باہر عام مجلسی دعوتوں میں شافعی شریک ہوتے تھے، میں نے انہیں اپنے بھائی یونس کاشمیری کے دعائے مغفرت مانگنے کو کہا، تو فرمایا اچی چھوڑو! اس بھئی کی سے کون حساب لے گا۔ خدا ہماری اور تمہاری طرح حضور قیامت کے روز پیگیر، ہلاکو، ہنر، موسیقی وغیرہ کا حساب ہی لمبا ہوگا۔ یہاں شماں سے کون پوچھتا ہے۔

(۱۲) - وعدہ ہر حال پورا کرتے، سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں تین سو تیس دن تقریریں فرماتے۔ لیکن وقت کی پابندی ان کو روگ نہ تھا، جلسہ میں دیر سے پہنچتے، اور جس کے اہل ہا کر لانا ہو دیاں وقت مقررہ کا دوپار گھنٹے اوپر ہو جانا تو معمولی بات تھی مولانا آزاد سے ملنے کا وقت طے کیا۔ وہ سیکنڈوں پر نگاہ رکھنے والے کوئی دو گھنٹے ٹیٹ پہنچے۔ وقت ہو رہا ہے نے متوہر کیا، مگر قبول کرنے لگے۔ مگر گاندھی سے بھی یہی کہا۔ مولانا حبیب الرحمن کہا کرتے تھے، اگر شاہ جی انگریزوں کا اتحاد کیا ہے۔ کہ کئی انسانوں کا مجموعہ بھی یہ نہیں کر سکتا، مگر وقت کے اصراف کا یہ حال ہے کہ آج اگر انگریزوں کا روز ٹھیک اتنے بجکر اتنے منٹ پر شاہ جی کو دالہ لال لاج بھوادو۔ تو ہم آزادی کا پروانہ دینگے، تو آزادی کبھی نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ

اور وقت کی پابندی دو متضاد چیزیں ہیں

(۱۳) - اپنی تعریف سے کبھی خوش نہ ہوتے، نہ پسند کرتے، نہ اجازت دیتے، اخباروں میں پھینے چھپانے کے سخت خلاف تھے۔ نے پریس کانفرنس کا دور دوری نہ دیکھا تھا۔ اخبارات کو عمر بھر کبھی کوئی بیان نہیں دیا نہ مضمون لکھا۔ آزاد میں ان کے نام سے دو مضمون چھپے، وہ بالکل غلط کے لکھے ہوئے، لیکن ان کی گفتگوؤں کا عکس تھے۔ اس معاملہ میں وہ عام لیڈوں کی کمزوری سے استغناء کرتے کہ ان کی ملکوتی صفات پر حیرت ہوتی تھی

(۱۴) - پان خود بناتے، چائے بھی خود ہی تیار کرتے، خود پیٹے اور دوسروں کو بلا تے تھے۔ اللہ سے مدد پر ڈرتے اور سحر سے علیحدہ رہتے

(۱۵) - ان کے پاس کوئی وسیع لائبریری نہ تھی بلکہ تھی ہی نہیں۔ فرماتے ایک قزاق کے سوا میں نے کوئی کتاب نہیں پڑھی

کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر مطالعہ کا یہ ذوق کچھ دنوں ساتھ رہا۔ آخر قرآن پاک ہی کو رفیق بنایا مولانا محمد طفیل منگھوری کی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" ایک زمانہ میں ساتھ رکھتے اور ساتھیوں کو اسکے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "اللال" ظفر علی خاں کا "ستارہ صبح" انہوں نے ڈوب کر پڑھے تھے۔ علامہ اقبال کے کلام کا بڑے انہماک سے مطالعہ کیا تھا۔ "بال جبریل" تو سفر و حضر میں ساتھ رکھتے۔

(۱۱۶) اپنی ذات کی ہر حال میں نفی کرتے اور جماعت کے دوستوں یا جماعت سے باہر کے اگر بزرگ دشمنوں کے قصیدے پڑھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔

(۱۱۷) خط و کتابت کے مطلق عادی نہ تھے۔ بہت کم خطوں کا جواب دیتے اور شاذ ہی کسی کو خط لکھتے تھے۔ البتہ بعض ہوا بست بیٹوں سے الاملا کر دیتے تھے۔ مضمون نگاری کا شوق مطلق نہ تھا۔ صرف بیامں رکھتے تھے۔

شوش کا شمیری

انکی باتوں میں گلوں کی خوشبو

شاہ جی تحریر کے سخت مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کوئی مضمون نہیں لکھا۔ وہ خط بھی شاذ ہی لکھتے تھے۔ وہ خود ایک بڑے آدمی تھے۔ لیکن اپنے عہد کے بڑے آدمیوں سے انکی مطلق خط و کتابت نہ تھی۔ فرماتے، انسانی سوسائٹی میں سب فتنے تحریر سے پیدا ہوتے ہیں۔ تلواروں نے انسانوں کے جسموں کو قتل کیا لیکن قلموں نے انسانوں کی روئیں فنا کر ڈالی ہیں۔ اس معاملہ میں ان سے زیادہ بے نیاز آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ جن دنوں میں ان کی سوا تخمیری لکھ رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ذرہ بھر تعاد ان نہیں کیا۔ بلکہ جب میں سوا تخمیری مکمل کر کے ان کے غامضانی حالات کا باب منانے کے لیے حاضر ہوا۔ تو فرمایا چھوڑو اس کو، کس راہ پر پڑ گئے ہو، صاف انکار کر دیا گو اسکے ادب بھی دیکھ تھے۔ جنہیں میں میرا قلم بند کرنا نہیں چاہتا تاہم انکی بے نیازی معراج کمال پر تھی وہ کسی کو اپنی فوٹو کھینچنے نہیں دیتے تھے۔ اور کھینچنے کے ناتوا سوال ہی خارج از بحث تھا۔ انکا ایک فوٹو جو کینڈر میں دیا جا رہا ہے ماسہمہ اور شاید کسی طرح ان کی اجازت سے کھینچ گیا ہے۔ تاہم اس پر سخت ناراض تھے۔ باقی تمام تصویریں ان کی منشاء مرضی اور ارادے کے خلاف ہیں۔ اور فوٹو گرافروں کی اپنی ہوشیاری کا نتیجہ۔ ان کی بعض تصویریں "پوٹان" کے فوٹو گرافروں کی محال کردہ ہیں۔ جو انہیں گفتگو میں مشغول رکھ کر بنا کی گئی ہیں۔ زانم لکھنوت کی تحریر کردہ سوا تخمیری میں انکی جو تصویر ہے۔ کتاب کا پسلا نسخہ ان کے ہاں پہنچا۔ تو کسی معتمد یا بزرگ نے اعتراض نہ سوال کیا۔ تصویر پھاڑ کر اسکے والے کر دی۔ اور کہا اس کو بھرتے مارو، ضرور مارو، سوچتے کیا ہو، یہ بے نفی اب کہاں؟ اور اس استنفا کے نمونے کوئی کہاں سے لاسکتا ہے؟۔

فی الحقیقت وہ ایک عہد، ایک ادارہ، ایک انجن اور ایک تاریخ تھے۔ گفتگو طراز سی میں انکا مثیل ملنا مشکل ہے۔ وہ خاص صحیفہ

میں بالکل ایک ادیب، ایک فقیر، ایک شاعر، ایک درویش، ایک متکلم، ایک صوفی، ایک نقاد، ایک عالم اور ایک دوست ہوتے تھے۔ ان میں سے جس تار کو بھی پھیر لو وہی نئے پھوٹنے لگتے۔ پھر گلف عارفی گفتار، بہار کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ ایک نقص یہ سزا دیتا تھا کہ اپنی گفتگو کھٹے نمٹیں دیتے تھے۔ درنہ انہوں نے تمام زندگی الفاظ و تراکیب کے اتنے انبار لگائے، اور لطافت و ظرافت کے اتنے موتی بکھیرے ہیں، کہ ایک شاہکار دماغ بھی سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ پھر مکتول اور بذلہ سخیوں میں تو وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد تھا، کہ — شاہ جی کی باتیں عطا اللہ تھی موتی ہیں

(۱۱) - شاہ جی کی سادہ زندگی سیاسیات کے چکر میں بسر ہوئی۔ گو عمر کا غالب حصہ دین ہی کی خدمت میں گزارا مگر کتنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سیاسیات سے دستبردار ہونے کی خواہش کے باوجود پندرہ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنے آپ کو سیاسیات سے الگ نہ کر سکے۔ لیکن مسجد شہید گنج کے انہدام کے بعد ان کا یہ عقیدہ پختہ ہو چکا تھا، کہ سیاست کا مطلب فتنہ خیزی، فتنہ پردازی، اور فتنہ انگیزی ہے۔ فراتے، سارے قرآن میں پالیٹکس کے مفہوم میں سیاست کا لفظ نہیں؛ اس کے معنی ہی مکر کے ہیں اور فرنگی مقاصد کی ایجاد ہے۔ جبکہ مطلب ہی فریب دہی ہے۔ سیاستین کے وعدے پورا ہونے کے لیے نہیں کئے جاتے بلکہ مٹانے کے لیے کئے جاتے ہیں۔

(۱۲) - حضرت امام حسین کی شہادت پر کبھی تقریر نہیں فرمائی۔ ان جیسا انسان جو خطابت کے سحر سے وقت کو گوش بساؤں کر لیتا تھا، سانحہ کربلا پر بولنے سے طرح دیتا رہا۔ کبھی دفعہ دوستوں نے اصرار کیا کہ عاشورہ کے دنوں میں سانحہ کربلا پر تقریر فرمائیے انکار ہی کرتے رہے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا تو کہا۔ کس طرح بیان کروں؟ کہانا کا کلمہ پڑھنے والوں کے ہاتھوں، نواہ پر کیا بنتی؟ مجھ میں کوسلہ نہیں کہ اس سانحہ کو بیان کر سکوں اپنے اندر طاقت نہیں پاتا۔ البتہ اپنے حال پر غور کر کے دل کو تسلی دے لیں ہوں کہ مسلمانوں کی پرانی سنت ہے۔

(۱۳) - جن دنوں بعض سیاستین کی بدولت مدرج صحابہ اور تبرجی ٹیشن کا زور بندھا ہوا تھا۔ شاہ جی نے دہلی دروازہ کے باہر ایک عظیم الشان جلسہ کو خطاب کیا اور فرمایا تدرج صحابہ کرنے والوں خدا کے خوف سے ڈرو۔ اتنے میں کسی نے دور کونے سے آواز دی :-

”شاہ جی خدا کا خوف کریں۔ سیدہ جو کہ خلافت کے غاصبوں (معاذ اللہ) کی مدرج کرتے ہو۔“

بس یہ ایک جملہ بخاری کو حلال پر لے گیا۔ فرمایا کیا کہتے ہو؟ میں علی کا بیٹا ہوں۔ اور صدیق، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کی مدرج کرتے ہوں۔ پہلے بھی کرتا رہا ہوں اور آئندہ بھی کرتا رہوں گا، تم کون ہو؟ — مائے وہ لوگ جنہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیروں سے مل چکی ہو۔ تم انہیں گالی دیتے ہو۔ ظالمو! حشر کے دن آقا کو کیا جواب دو گے؟ پھر اسکے بعد خلفائے راشدین کے فضائل مناقب پر وہ تقریر کی کہ جیسے شیر جبریل کی خطابت کا بار کئے ہوئے ہو۔

(۴)۔ کسی شیعہ دوست نے سوال کیا۔ علی (در عمر رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا بڑا فرق ہے۔ علی مرید تھے، عمر شرار اور حضورؐ نے خود انکی آرزو کی اور اللہ سے دعا مانگی تھی۔ فرمایا میں علیؑ کا بیٹا ہوں۔ نفس میرا بھی چاہتا ہے کہ سب کچھ انہیں کی جھولی میں ڈال دوں، مگر چھوڑتے نہیں وہ خود منواتے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ کو نکال دو اور سوچو تاریخ میں رہ کیا جاتا ہے؟

(۵)۔ اسی دوست نے پوچھا حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) میں کیا فرق ہے۔ فرمایا خدیجہؓ کا نکاح محمدؐ ہی عبد اللہ سے ہوا تھا۔ عائشہؓ کا عقد محمدؐ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجہ نہیں۔ یہ نبوت کی۔ یگوارا ایک ناقص سوال کا شلفہ جواب، لیکن ان لوگوں کے لیے مسکت جواب تھا۔ جو از دل مسکرات ہیں بھی بغارت کے ناشیہ باندھتے ہیں

(۶)۔ انہی صاحب نے لگے انھوں نے یہ سوال بھی کیا کہ حضرت فاطمہؓ ازہرہؓ اور ان کی دوسری صاحبزادیوں زینبہؓ، ام کلثومؓ اور حبیبہؓ میں کیا فرق ہے؟ فرمایا فاطمہؓ نبوت کے بعد کی بیٹی ہے۔ اور باقی نبوت سے پہلے کی بیٹیاں تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بیٹیاں سرے سے مسئلہ ہی نہیں ہیں۔ انہیں سوال کی صورت دینا بے سود تھا۔ تاہم غنیہ طرائفوں کو کس بانگ میں سے جواب دینے تھے۔

(۱۶)۔ صاحبزادہ فضل الحسن شاہ ایک زمانے میں جماعت احرار کے اکابر میں سے تھے۔ اب کل بریلوی عقائد کے مبلغ ہیں اور نوری و خاکی کے چکر میں محصور۔ کسی نے سوال کیا، شاہ جی، صاحبزادہ صاحب آپ کو کیوں چھوڑ گئے۔ فرمایا

”بھائی وہ نوری ہیں ہم خاکی ہیں ان نور لوں سے دفائی امید ہی کیا سب سے بڑے نوری درجہ صل علیہ السلام میرے انا کو شب معراج راستہ میں چھوڑ گئے تھے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ آگے چلو کہا اس سے آگے پر چل جائیگا۔ نتیجہ نوری رہ گیا، خاکی آگے نکل گیا“

ہائے نہ ہوا بخاری، میاں کا حکم مان لیتا، خواہ پر ہی بل جاتے، میاں کی طاعت اور آقا کی دلیزیر تو پختے اس سے بہتر کون سا موقع تھا۔
چوں رہی بگوئے دلبر پسار چان مضطر
کہ مبادا بار دیگر نہ رہی بدیں تمنہ

(۱۷)۔ درگاہ امام اسرہ اللہ صر کے جلسے میں کسی نے اس وقت کے اختلافی مسئلے زیارت قبور کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ مخالفوں نے شاہ جی کے بارے میں مشورہ کر رکھا تھا۔ کہ وہ بائی ہیں۔ سوال کیا گیا۔ کہ آپ کا زیارت قبور کے بارے میں کیا خیال ہے۔ فرمایا۔
”اپنے اپنے ظرف اور ذہن کی بات ہے۔ کچھ لوگ انگو دھنت خداوندی سمجھ کر کھاتے ہیں کچھ اس میں سے شراب نکالتے، اور عقل کی بازی ہارتے ہیں میں بھی اس سزا کی زیارت کر کے آیا ہوں اور تم بھی زیارت کرتے ہو۔ خدا کے فضل و کرم سے کچھ لے کر آیا ہوں اور تم ایمان میں سے کچھ دے کر لے رہے ہو۔
سبوا پنا اپنا ہے بام اپنا اپنا“

(۹۱) - سیرت کے ایک جلسہ میں فرمایا یہ بڑا نازک مضمون ہے۔ سیاسی تقریر ہو یا ایک آدھ جملہ نیچے ادھر یا اُدھر اُدھر ہو جائے تو ذر نہیں لگتا۔ زیادہ سے زیادہ قید ہوجاتی ہے۔ سال، دو سال، پانچ سال، لیکن سیرت یا حدیث کے مضمون پر بولتے ہوئے ایک آدھ جملہ بھی کم و بیش ہو جائے تو ایمان کا ضیاع ہے۔ اور دوزخ کی آگ، اس میدان میں بخاری بزدل ہے جس میں قید خانے کی تاب اس میں نہیں ہے۔

(۱۰) - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے منکرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔
 ”بھائی کوگو! آپ کے کبوتروں کی بھی نسل ہو اور پیروں کی بھی۔ لیکن ایک ہم سید ایسے ہیں کہ جن کی نسل نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تم بشر نہیں مانتے ہو، تو پھر تم کی اولاد ہوئے؟“

(۱۱) - فرمایا (خواجہ مولانا قاری محمد طیب مدظلہ) علامہ اسلام کی پولیس ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کریں۔ اہل حال بزرگوں کو کچھ کہنا ہے۔ اپنے تک محدود رکھیں اگر وہ کھلم کھلا قانون اسلام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے تو ہم انہیں پکڑ لیں۔ خواہ عدالت میں چھوٹ ہی جائیں۔

(۱۲) - کسی نے سوال کیا۔ شاہ جی یہ مروے سنتے ہیں کہ سنیں فرمایا۔ ”سنتے ہو گئے جن کی سنتے ہو گئے ہماری تو زندگی بھی سنتے ہیں۔“ حاضرین ہنس پڑے۔ مسئلہ ختم ہو گیا۔

(۱۳) - موری دروازے کے باہر کندن شاہ کا تکیہ ہے۔ جسے عام لوگ گدو شاہ کہتے ہیں اس سے پوچھتے کہی ایک بارغ تھا جہاں کانگریس کے جلسے ہوتے تھے۔ سائنس کمیشن کے زمانے میں شاہ جی نے یہاں ایک تقریر کی۔ سرکاری لوگوں نے اسے تکیے کے پرسیوں، بھنگیوں اور سلف بازوں کو رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے اکسایا۔ وہ سلف کا کش کھینچ کر باغی مدد کے لئے لگانے لگے۔ شاہ جی نے کڑوٹ بدلتے ہوئے کہا۔ اوپر سنبو! یہ غلامت پی کر میرے باپ علی (رضی اللہ عنہ) کا لہو نکل لگاتے ہو کیا تمہارے باپ دادا نہیں ہیں۔ (کیا بات کس گفتنی سے کہی ہے)

(۱۴) - ایک وکیل نے رمضان کے دنوں میں شاہ جی سے بدعہم تشریف فرما کرتے ہوئے کہا۔ حضرت علامہ تغیر و تادیل میں بیٹھ کر کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیے، کہ آدمی کھانا پیتا رہے اور روزہ بھی نہ ٹوٹے۔ فرمایا۔ سہل ہے قلم و کاغذ لیکر لکھو!۔
 ”ایسا مرد چاہیے تو اس وکیل صاحب کو صبح صادق سے مغرب تک بھوتے مارتا جائے۔ یہ بھوتے کھاتے بائیں اور نئے کو پیٹتے جائیں اس طرح کھاتے بائیں اور پیٹتے جائیں۔
 فرمایا۔ جاؤ اس طرح کھاتے پیتے رہو۔ روزہ کہی نہ ٹوٹے گا۔“

(۱۱۵) - اسلامیہ کالج کے طلبہ نے کہا شاہ جی کالج میں ڈاڑھی رکھ کر جانا مشکل ہے۔ فرمایا۔ ہاں بھائی اسلامیہ کالج میں مشکل ہے خالصہ کالج میں آسان ہے۔

(۱۱۶) - مسلم کانفرنس کے ٹوڈیوں کا زمانہ تھا، کسی تحریک میں لوگ جیل جاز ہے تھے۔ شاہ جی، مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں تقریر کر رہے تھے۔ "زمیندار" کی مضبوطی پر چھوٹی فراموشی کا ذکر آگیا۔ ایک شخص نے دور سے کہا۔ "چندہ کھا جاتے ہیں" فرمایا بھائی چندہ ہی کھاتے ہیں سو تو نہیں کھاتے اور مجمع زعفران زار ہو گیا۔ پھر فرمایا ان تنظیموں کو چندہ دو۔ یہ لوگ قربانی کے بکرے ہیں کھائیں گے تو جیل بائیکاٹ قربانی کے بکروں کو بھوکا مارنا چاہتے ہو؟ ۹

(۱۱۷) - کسی نے کہا شاہ جی۔ مجلس کے بعض لوگ اب لیگ میں چلے گئے ہیں۔ یعنی اس سے تعاون فرما رہے ہیں فرمایا ہاں بھائی کچھ زمین (رضی اللہ عنہ) کے پیر کو کاٹنے، کر بلا میں ذبح ہو گئے۔ کچھ حسن (رضی اللہ عنہ) کے پیر وہیں۔ انہوں نے صلح و آشتی کی راہ اختیار کی دونوں کے اسوہ حسنہ کی پیروی ہو گئی۔

(۱۱۸) - پاکستان بن جانے کے فوراً بعد راولپنڈی میں کسی دینی جماعت کا ایک جلسہ تھا شاہ جی بھی مدعو تھے راجہ غنصر علی خاں وزیر تھے اور جلسہ کے صدر۔ انہوں نے شاہ جی کو دعوت تقریر دینے ہوئے کہا۔ کہ شاہ جی جس لیگ کے خلاف تھے اسی لیگ نے انہیں پناہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طنز پر حملہ تھا، شاہ جی نے اسے اٹھتے ہی جواب دیا۔ ہاں بھائی یہ پناہ آج سے نہیں ملے گی اس کی بڑی لمبی تاریخ ہے میرے آبا کو بھی پشنے کے بعد تمہارے آبا کے گھر میں پناہ ملی تھی اور مجمع پریکٹک سنانا چھا گیا۔

(۱۱۹) - فرمایا ہمارے ہاں نوجوانوں کا عجیب مزاج ہو گیا ہے، بلکہ فطرت۔۔۔ جو لوگ امیٹک میں فیل ہوتا ہے ہٹا ٹوکہ منی میں سینئر میں ہو جاتا ہے۔ یاسی۔ آئی۔ ڈی کے ملاکر، مفلسین کا انعام میں کرنا پتا پھر جاتا ہے۔

(۱۲۰) - ختم نبوت کی تحریک کے دنوں میں سندھ کی جیل میں مجسوس تھے۔ ایک بہت بڑا سرکاری افسر ملنے کے لئے گیا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ شاہ جی، اب اسلامی حکومت ہے، پہلے جیل جاتے تھے تو لوگ قدر کرتے تھے۔ اب تو وہ دن نہیں رہے۔ لوگ بھول جائینگے۔ چھوڑ دینے اسے تفسیر کو باہر آکر کوئی اور کام کیجئے۔ فرمایا۔۔۔ ٹھیک ہے بھائی، لیکن میں کبھی لوگوں کے لیے جیل نہیں گیا۔ میں تو اسلام اور آزادی کے لیے جیل جاتا رہا ہوں۔ رہا اسلامی حکومت کا سوال تو مجھے تم سے ملنا تھا ہے۔ مگر یہ نہ بھولو کہ اسلامی حکومتوں میں کچھ لوگ جیل میں رہا کرتے ہیں اور کچھ لوگ تخت پر۔ کچھ گوالیار کے قلعہ میں، کچھ علی گڑھ میں

(۱۲۱) - کسی نے ایک بڑی گدی کے سالانہ عرس، سوال کیا۔ مزاروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔ فرمایا میں اس سوال کی بنیاد کو

سمجھتا ہوں۔ ہر سال ایک مزار اقدس میرے آقا۔ میرے دوستی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں بن چکا ہے۔ اب سزا مزار میرے نزدیک شریک فی النبوۃ ہے۔

مولانا تاج محمود

اب کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

ایک رٹیاڑ پوٹھ لیس افسر نے بتایا کہ ایک مرتبہ شاہ جی مسجد خیر دین اتر سر میں تقریر کر رہے تھے۔ میں ڈیوٹی پر تھا۔ دو بجے شب مجھے اعلیٰ حکام نے طلب کیا۔ اور میری جگہ ایک دوسرا رپورٹر بھیجا۔ میں نے جب اپنی ڈائری ختم کی تو اس میں یہ الفاظ لکھ کر دیئے۔

”شاہ جی رات کے ۱۱ بجے سے تقریر کر رہے ہیں اب رات کے دو بجے ہیں ان کی تقریر سے حاضرین جلسہ تو درکنار مسجد خیر دین کے درو دیوار اس کے گنبد و محراب اور عویس کے پانی تک مسحور ہو چکے ہیں“

خان غلام محمد خاں لوند نور نے سنایا کہ میں نے رتہ شاہ جی کو دیکھا ہوا تھا۔ اور نہ ان کا خاص متفقہ تھا۔ میرا سیاسی مسلک بھی ان سے جدا تھا۔ ایک دفعہ عشاء کے وقت دلی دروازہ کے باہر سے گزرا تو شاہ جی تقریر کر رہے تھے۔ میں بڑے منورہی کام میں تھا۔ اس خیال سے رک گیا کہ جس مقرر کی نامی شہرت ہے اسے پانچ منٹ سن لوں میری عادت یہ ہے کہ میں جلسہ میں ایک بلکہ نہیں بیٹھ سکتا۔ خود اپنے جلسہ میں بھی گھوم پھر کر دیکھتا اور سنتا ہوں۔ میں پانچ منٹ تک شاہ جی کی تقریر سنتا رہا۔ پھر سوچا تھوڑی دیر اور سن لوں ان کا سحر تھا کہ کھڑے کھڑے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو لیٹ گیا۔ اور لیٹے لیٹے ساری رات تقریر سنتا رہا۔ اور ایسے سو اس گم ہوئے کہ اپنا کام ہی بھول گیا۔ یہاں تک کہ صبح کی آذان بلند ہوئی۔ شاہ جی نے تقریر کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ تو مجھے خیال آیا کہ اوہو سارے رات ختم ہو گئی۔ یہ شخص تقریر نہیں کر رہا۔ ہادوگر رہا تھا۔

حاجہ فائز الدین لائپر میں کپڑے کے بہت بڑے تاجر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین و دنیا دونوں بڑی فیاضی سے عطا کی ہیں۔ شاہ جی کے مخلص و دوستوں میں سے تھے تقیم سے قبل اگر وہ میں تھے انہوں نے واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ شاہ جی اگر وہ میں مارکیٹ کی چھت پر بیٹھ رہے تو تقریر کر رہے تھے۔ مجازی نے میں قرآن مجید کی آیات پڑھیں۔ نو ایک نو جوان ٹرپ کر چھت کے کنارے کی دیوار سے چھت پر آن گرا۔ میرے نو بچ گیا۔ لیکن وہ دروازہ جب کی حالت میں مایہ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ لوگوں نے ٹھایا تو اس کے چہرہ ابرار ہوا اسے شاہ جی کے پاس لایا گیا۔ شاہ جی نے اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں ڈالا کچھ کچھ دھکا اور محبت سے پاس بٹھالایا۔ جب اسے ہوش آیا تو اسے انکشاف کیا کہ مجھے تو شاہ جی کے قتل کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن شاہ جی کا خطبہ اور قرآن مجید سن کر میں بے تاب اور بے ہوش ہو کر گرا پھر اس کے بعد کاجھے چہ ہوش نہیں۔

ایک دفعہ شاہ علی گڑھ کے کسی جلسہ میں تقریر کرنے تشریف لے گئے۔ کالج کے طلباء نے تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ ایسا کلام کیا کہ تقریر کرنا محال ہو گیا۔ شاہ جی نے دیکھا کہ بچے برا فروختہ ہیں کوئی اور نصیحت کار اگر نہیں ہوتی تو فرمایا اچھا بیٹا قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھ دینا ہوں اور جلسہ تمہارے احترام میں ختم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ طلبہ خاموش بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے انتہائی دل سوزی سے نیم خوردہ اذان میں قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ چشم گوش اور درو دیوار جھوم گئے۔ تلاوت ختم ہوئی تو فرمایا بیٹا کیا خیال ہے اس کا ترجمہ بھی کروں گا اداں حاضر و ترجمہ بھی کر دیجئے۔ اب ترجمہ شروع ہوا پھر ترجمے کے تغیر و تدریج کا سلسلہ دروازہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ شاہ جی نے تقریر ختم کی طلبہ نے شور مچایا۔ شاہ جی خدا کے لیے کچھ اور بیان کیے۔ فرمایا بیٹا کبھی پھر لوگ انو تقریر سنائو گا۔

گجرات کے مشہور مقدمہ میں جب لدھارام دوبرہڑی آئی ڈی نے حقیقت حال کا انکشاف عدالت عالیہ میں کیا اور شاہ جی کی رہائی ہو گئی لدھارام سے پوچھا گیا کہ آخر تو نے سرکاری ملازم ہوتے ہوئے یہ جھوٹی شہادت دینے سے گریز کیوں کیا اور سچی شہادت سے اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالا۔ تو اس نے بتایا کہ میں نے سرکاری ملازمت میں ہمیشہ سچی جھوٹی شہادتیں دی ہیں۔ اور اس دن بھی شاہ جی کے مات جھوٹی شہادت دینے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ ڈائری میں دو دو بدل اگر سچا اعلیٰ احکام کے حکم سے کیا تھا۔ لیکن اس میں مہر حال میری ہی رضامندی شامل تھی۔ ہوا یہ کہ میں جب گواہی دینے عدالت میں آیا تو شاہ جی کو دیکھا کہ ریشیوں اور دھنوں کی شکل و صورت کا ایک سچا نشان کھڑا ہے۔ مجھے کسی مخفی طاقت نے ٹوکا کہ یہ شخص اب میری جھوٹی شہادت پر پیمائی کی سزا پا رہیگا۔ میرا دل لرز گیا۔ میں نے دل بہنی دل تو بہی۔ اور عہد کر لیا کہ دنیا کی ہر مصیبت برداشت کروں گا۔ لیکن اس عظیم انسان کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کا پاپ نہیں کھاؤں۔ تب میں نے شاہ جی کے وکیل کو علیحدگی میں سارا ماجرا بیان کیا۔ ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی بتایا لدھارام نے اپنی کورٹ میں شہادت دی کہ میں ملازمت گئی۔ تین سال سخت کی سزا ہوئی۔ لیکن شاہ جی کی معجزانہ رہائی کا باعث بن گیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی ۹ ماہ کے قریب جیل میں رہے۔ جب رہا ہو کر آئے تو تقریباً دوں میں اکثر فرمایا کرتے کہ ایک طرف میں بے نوا تھا میرے عزیز ساتھی جیلوں میں مقید تھے۔ میری اولاد کم سن اور والد ضعیف العمر تھا۔ دوسری طرف فرنگی کی صولت و شتمت تھی۔ نوانے اس کے، پولیس اس کی، عدالتیں اس کی، جیل خانے اس کے، سب اختیار و اقتدار اسی کا تھا۔ پھر نرم سے پڑھتے رہے۔

روحِ نجات ملاقی ان کا چرخِ ہفت طبقاتی ان کا

حضرت یوسف علیہ السلام کے زندانی ہونے کا واقعہ دہراتے، زلیخا کی الزام تراشیوں کا تذکرہ کرتے۔ قرآن مجید کی آیت شریفہ — وشہد شامعدن اھلھا چڑھ کر دھارام کو انگریزوں کا گھڑیو گواہ قرار دیتے۔ اس مقدمہ سے رائی کو وہ اللہ کا عظیم احسان کہتے۔ آخر میں فرماتے۔ اے اللہ اس نعمت کے شکر اے میں میں تیری خدمت میں کیا پیش کروں۔ کیونکہ جو نعمت سچا نبیوں وہ ہمسایہ کے خزانوں میں مولود ہے۔ ایک دن تقریر کرتے کرتے جھولی پھیلا دی اور فرمایا میرے پاس ایک ایسی چیز ہے جو تیرے شکر نعمت کے لیے پیش کرنا ہوں، در وہ میرے گنہ ہیں میرے پاس ان کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ بیان کچھ اس عجز وانکسار اور رقت انگیز منظر میں ڈال دیا۔ کروگوں کی چھین نکل گئیں۔

حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سلسلہ میں انکا اخلاص کس درجے کا تھا اس کا اندازہ ان کی ۱۴ فروری ۱۹۵۳ء کی تقریر سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے لاہور دیروں دہلی دروازہ میں کی تھی۔ اس دن خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ شاہ جی نے تقریر کرتے اپنی ٹوپی اتار لی اور فرمایا کہ کوئی ہے جو میری یہ ٹوپی خواجہ ناظم الدین کے پاؤں پر رکھ دے اور ان میری طرف سے یقین دلا دے۔ کہ وہ مجھے اپنا سیاسی حریف نہ سمجھیں۔ اگر وہ محسن کائنات جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور عزت کا تحفظ کر دیں تو میں اپنی زندگی ان کا خدمت گزار رہوں گا۔ جتنی کہ ان کے گلے میں اگر سوز بھی ہوں گے تو انہیں بھی چراتا رہوں گا۔ اس سے مجمع میں ایک کہ لہجہ نکلا۔

وہ حدیث پائل اَلْمَدْرُوعُ مَنِ احْبَبَ كَوْصَاحِبِهِ رَضَوَانَ اللّٰہِ عَلَیْہِم اَجْمَعِیْنَ کے فضائل میں بیان کر کے سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شعر پڑھا کرتے تھے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے

رسید از دست محبوبے بدستم

بد و گفتم کہ مشکِ یا عجبیری

کہ از بوئے دلاویز تو مستم

گفتا من ناچیز بودم

و لیکن مدتے با گل نشستم

جمال ہم نشیں در من اثر کرد

و گر نہ من بہاں خاکم کہ ہستم

شاہ جی مختلف اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کا وہ صحابہ گیارہ گھنٹہ تک گواہ قرار دیا کرتے۔ پہلے جناب حضرت عمر بن خطاب اور دوسرے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کو۔ ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ شاہ جی اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما فرمایا۔ ان کی اس مقدمے میں سرکاری گواہ کی حیثیت تھی۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے ہی سے دوست تھے۔ لیکن یہ دونوں بہادر دشمن اور محنت دشمن تھے۔ لیکن نبوت کی صداقت یقین کر کے شرف ایمان حاصل کر گئے۔ وہ حدیث رسول کو نبوت کی مثل فرمایا کرتے تھے۔ اور کہتے کہ اب کچھ لوگ اس مثل پر غتر بود کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

شوخ کاشمیری

جامع الصفات انسان

(سید عطا اللہ شاہ بخاری بلاشبہ ایک جامع الصفات انسان تھے۔ قدرت نے انہیں دل و دماغ کی بے شمار خوبیوں سے نوازا)

تھا۔ انسان الفاظ کے استعمال میں عموماً فایض ہوتا ہے۔ مدح ہو تو قدح۔ تلم وزبان اکثر بے روک ہو کر چلتے ہیں۔ لیکن شاہ جی کا معاملہ یہ تھا۔ کہ کمالات و محاسن کے جتنے الفاظ بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔ انہیں ترازو کے ایک پلٹر سے مل کر رکھیں اور دوسرے پلٹر سے میں شاہ جی کے سن و خوبی کا سراپہ ہو تو یقیناً دوسرا پلٹر ہی بھجے گا۔ شاہ جی ایک خاص سا پتے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ یہ سانچہ اب ٹوٹ چکا ہے۔ اور اس عہد کے لوگ بھی دفتر دفتر اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

اس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ شخصیتیں ہی تہذیبی و معاشی حالات کے تقاضوں اور ضرورتوں کا منظر ہوتی ہیں ان کا وجود و محاسن کہیں بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ عوام کی پیروی کے لیے نہیں۔ عوام کی رہنمائی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور زادے ماورائی نہ ہو کر بھی اس سے مستثنیٰ ضرور ہوتے ہیں۔ شاہ جی فکر و نظر اور جہد و عمل کے ایک خاص عہد کی پیداوار تھے۔ اس عہد نے واقعہً ہماری فوجی معنوں میں بڑے بڑے آدمی پیدا کئے، شاہ جی گویا اس محفل کے آخری چراغ تھے۔ ایک دو نشانیاں اور ہو گئی لیکن وہ بھی محالِ نفس ایک دو نفس ہیں۔ چ

بہت آگے گئے باقی بوبیں تیار بیٹھے ہیں۔

یہ لوگ جس زمانے میں اپنے بلند آہنگ موصولوں کے ساتھ سامنے آئے تھے۔ جب تک ہمارے سامنے اس دور کی صحیح تصویر نہ ہو۔ اُس وقت تک ہم اس مٹی کے محاسن کا اندازہ ہی نہیں کر پائے جس مٹی سے ان لوگوں کے پیکر بنی ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ماضی اپنی خاص روایتیوں کے ساتھ گورنر سے اچکا تھا۔ اور اس کے روبرو ایک بنا دور اپنی تمام شدتوں کے ساتھ نشوونما پارہ تھا۔ جہاں تہاں برطانوی سامراج کے غلات خیالات بڑی تیزی سے گڑھیں رہے تھے۔ دماغوں میں ہمدردی و احتجاج کو جو د تھا پہلی جنگ عظیم کے نتائج نے اس احتجاج کا راستہ صاف کر دیا۔ پورے ملک کی خواہشیں آزاد دی رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ اور تحریک خلافت کے داخلی و خارجی اثرات کے تحت ایک مرکز پر آگئی۔ اس مرکز نے رہنمائی اور اس کے مظاہر کا ایک نیا فائدہ پیدا کیا۔ شاہ جی اس قافلے کے ممتاز حصے فوجیوں میں سر فہرست تھے۔ ادھر غور کرنے سے یہ عجیب و غریب بات کھلتی ہے۔ کہ جو لوگ اس فائدہ میں شریک تھے۔ وہ کسی تنہا خوبی ہی میں مغرور نہیں تھے۔ بلکہ ان کی شخصیت بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی۔ احوال کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ زندگی کا سرگوشہ تہذیبوں سے متاثر ہو رہا تھا نہ صرف دنیا نے ایک نیا سانچہ قبول کر لیا تھا۔ بلکہ فکر و نظر کے سبھی دائر ایک نیا روپ اختیار کر رہے تھے شاہ جی معنوں ان علما و صلحا کے وارث تھے جنہوں نے اسلام کی اساس پر انگریزوں کی بیخ کنی کا عہد کیا تھا اور دیوبند کا مدرسہ جن کے امتیازی مقصدات کی علامت تھا۔ اس ذہن کی تعمیر میں بہت سے عوامل کا ہاتھ کار فرما رہا۔ اب جو قومی احتیاج کی اجتماعی روح عدم تشدد کے طریق اور عدم تباہی کی تکنیک سے چمک کشا ہوئی۔ تو عثمانی خلافت کا سکوت اور عرب ملکوں کے جھجے جھجے اس ذہن کے لیے مہم بن گئے۔ اسلامیت اور وطنیت کے ملے جلے جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۱۹ء میں آزادی کا ایک ایسا دلولر پیدا کیا۔ کہ ذہنی طور پر انگریزوں کے سامنے ملک کے دماغوں اور دلوں سے مکمل گلیاں ہا تو ان لوگوں کے دلوں میں جو انگریزی بساط کے سروں کی حیثیت رکھتے اور اپنے گرد و پیش انسانوں کی اقلیتی کھیت کے دنا و داری بشرط استواری کے تحت سوداگر تھے۔

انگریزی حکومت کے دبدبے نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس برصغیر کو نہ صرف مفتوح کر لیا۔ بلکہ مغلوب لوگوں کے ساتھ

مرغوب و مایوس کا بازار بھی رونق پر تھا۔ مگر تحریک لاتعداد کے برگ و بار نے مسلمانوں کی عثمانی رہنمائی و دفعۃً ان لوگوں کے حواس جنہیں قدرت نے شکوہ شکنائی، ذہن ہندی اور لفظ اعرابی دے کر پیدا کیا تھا۔ اور جن میں اکثر ماضی مرحوم کے غفلت خانہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ سید عطا اللہ شاہ بخاری اسی ماضی کا حقیقی پیکر تھے۔ ان کا روبرو ایک بانکے چھبکت کی طرح جو کس کبھی نہ ٹھکنے والی روح کے کرائے تھے۔ آج چونکہ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ اور اس عہد کی اداس شناس پوجی و قرب قرب ہو چکی۔ یا ہو رہی ہے۔ پھر تنگ و زبان کے سینے نے رستم و اسفند بار پیدا ہو رہے ہیں لہذا یہ سمجھنا یا سمجھنا فرا مشکل ہے کہ ان لوگوں ملک و قوم کو کیا کچھ عطا کیا؟ صبح ضرور ہوتی ہے اور سورج بھی وقت پر نکلتا ہے۔ لیکن طلوع و مغرب کا فاصلہ یونہی طے نہیں شمارے ابھرتے۔ رات کٹتی۔ پھر لو پھٹتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننا اور پہچاننا اشد ضروری ہے۔ کہ قومی آزادی تاریخی اعتبار سے فرد واحد کی تنہا فراموشی اور تنہا ہمت کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ اس کا پلودا آنا فنا بار آور ہوتا ہے۔ یہ حکایت طویل عمل اور کامیاب عمل سے مرتب ہوتی ہے۔ یہ بھیج ہے کہ قومی خواہشوں اور ملکی دلولوں کا مظہر بسا اوقات ایک ہی وجود ہوتا ہے۔ اور عامۃً الناس اس کے قدموں کے ساتھ اٹھنے لگتے ہیں۔ لیکن اصلاحیہ حریت و استقلال کا یہ قصر بے شمار لوگوں کی جگر کاوی، سرفروشی اور فراموشی سے اٹھتا اور بنتا ہے۔

مثلاً بھوک ہے اس کے تقاضا پر انسان روٹی کھاتا ہے۔ لیکن بھوک پہلے فقر سے نہیں مٹتی۔ بلکہ یکے بعد دیگرے بہت کھانا پڑتے ہیں آخر میں ایک فقر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھوک نہیں رہتی۔ ظاہر ہے کہ یہ آخری فقر ہی بھوک کا مداوا نہیں ہے بلکہ ایک فقر ہے بلکہ آخری فقر تک جتنے لقمے بھی پیٹ میں جاتے ہیں ان کی اجتماعی طاقت سے پیٹ بھرتا ہے۔ یہی مثال آزادی کی ہے کہ یہ عمارت سنگ و خشت کی نہیں ہوتی۔ لیکن سنگ و خشت سے بنی ہوئی عمارتوں ہی کے اصول اس پر عائد ہوتے ہیں بنیادیں و دیواریں اٹھانے، اینٹیں لگانے، گاربانے اور رنگ و روغن کرنے کے بیسیوں مرحلے پیش آتے ہیں۔ تب ایک عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ شاہ جی بیالیس سال قبل جس ہراول دستے کے ساتھ نکلے تھے وہ لازماً قومی آزادی اور قومی استقلال کی جدوجہد کا مرکز تھا۔ ان کے سامنے صرف آخری مرحلہ ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ابتدائی مرحلے میں تھے اور اس مرحلے کو پیدا کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ ان کے بغیر زمینوں میں بل ہوتا۔ انہیں ہموار کیا پھر بیج بویا، کھیت سیچنا۔ موافق موسم کی نگہداشت کی۔ مخالف موسم کے تاؤ سے بچنا۔ اب کیا مزدوری تھا کہ بجائی کرانے والے ہی کٹائی کے وقت موجود ہوتے قافلہ چلتا اور بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ منزل سامنے آگئی اور آزاد گئے اب نصف صدی پہلے مگر دیکھیں تو ان بغیر زمینوں کو سیراب کرنے کی مشکلات کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

غرض پاکستان اور ہندوستان کا کوئی گوشہ ہوگا۔ جہاں شاہ جی کی آواز نہ گونجی ہو ان کی آواز کا علم نہ لہرایا ہو۔ یہ جگہ کے عظیم رہنما کا قول ہے کہ یہاں کا چیمپ شہ شاہ جی کے جہد آشتی قدموں کا شکر گزار ہے۔ مگر مغربی پاکستان چونکہ ان کا مسکن ان کے کاموں کا مرکز رہا۔ اس لیے مرحوم دلی سے لے کر مرحوم پنجاب کے دوران اقتادہ علاقوں ہی کو انہوں نے اپنی نوابیہ انہوں کے لیے کیا۔ اور یہیں اکثر و بیشتر انگریزی حکومت کے مختلف الاصل قلعوں کو مسمار کرتے رہے۔ پنجاب اور اس طرف کے علاقے ایک عسکری ضرورت کے تحت برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیر بن گئے۔ انگریزوں نے ان علاقوں میں مختلف مقاصد و نیت کر کے یہاں کبھی سیاسی شعور اور قومی آزادی کے دلولوں کو بڑھنے یا پسپانے نہ دیا۔ یہی وہ ہے کہ جب تک ہم اس علاقے کی

سیاسی معاشی اور معاشرتی صورت حال سے واقف نہ ہوں اس وقت تک ہم ان تحریکات کو جاننے سے قاصر رہیں گے۔ جہن کا منطقی نتیجہ بخاری قومی آزادی کا وجود ہے۔ یا جس معنوی طاقت کی اساس پر یہ مادی عمارت کھڑی ہے۔

حالت یہ تھی کہ انجمنی ہندوستان میں مروج پنجاب ہی ایک ایسا صوبہ تھا جہاں انگریزی مفادات کی بوتلمونیاں مضبوط بنائیں پر قائم تھیں اور انگریز کی حالت میں بھی یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ اس صوبے کے لوگوں میں حریت خواہی کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے پنجاب کے تین فرقوں یا قوموں (ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں) کو مفادات کے خالوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ہندوستان کا مسئلہ اگر۔۔۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مسئلہ تھا تو پنجاب میں یہ مسئلہ سکھوں کی موجودگی کے باعث سرخا تھا اور سکھوں کے معاشی و معاشرتی مفادات کچھ اس طرح بٹ گئے تھے۔ کہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوتا ہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔ پھر سو کہ ہندوستان کی حکومت انگریزوں نے مسلمانوں سے لی تھی اس لیے ان کا ذہن ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کے اثرات سے متاثر نہ ہو چکا تھا۔ علامہ کے خلاف ... جنگ امبیلہ (۱۸۴۳ء) کے بعد خان غزن خان کی خبر کی پر پور پانچ مقدمے اسے سازش ابلاغ (۱۸۴۳ء) پٹنہ (۱۸۴۵ء) راج محل (۱۸۶۰ء) نافوہ (۱۸۶۰ء) اور پٹنہ (۱۸۶۱ء) قائم کئے گئے۔ ان کے عینی مطالعہ سے انگریز نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے معاملہ میں خوفزدہ ہو چکے تھے۔ بلکہ وہ انہیں مختلف واسطوں سے زیر کرنے کی فکر میں تھے۔

اس ضمن میں تاریخ کا یہ افسوسناک پہلو ہے۔ کہ مروج پنجاب نہ صرف ان کا سب سے بڑا معادن ہو گیا۔ بلکہ بہت سے راستے ان کے حق میں ہموار ہوتے چلے گئے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال تھا۔ کہ ان کا سواد اعظم ان مٹھی بھر مسلمانوں کے قبضہ قدرت میں تھا جو برطانوی ایمپریزم کے شعوری یا غیر شعوری طور پر فرستادہ تھے۔ حتیٰ کہ برطانوی شاطروں نے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مذہب کی ان بنیادوں کو انحراف دانا چاہا اور اس میں بڑی مدد کا کامیاب بھی ہو گئے جن بنیادوں پر برطانوی ملکیت کے خلاف جدوجہد کا قلعہ ایسا نہ تھا ایک بڑا ہی دردناک سانحہ ہے کہ علامہ حق کے خلاف ہمیں سے فتوے جاری ہوئے۔ جہاد کی تفسیح کا اہم کام بھی ہمیں تفسیف کیا گیا۔ دنیا سے اسلام کے خلاف تعویذوں کا انبار بھی ہمیں تیار ہوتا رہا اور خلافت عثمانیہ کی شکست پر اس صوبے ہی کے خانہ زادوں نے چیراغاں کیا۔

اب خود کچھ بوجہ برطانوی ملکیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہو جہاں سے لوگ تین قومی دائروں میں مختلف و متضاد مفاد رکھتے ہوں اور وہ مفاد ان کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہو حتیٰ کہ قومی بیداری یا ملی استقلال کے راستے میں سب سے بڑی روک ٹوک خود مسلمانوں کی معاشی اور دینی گدگیوں کا وجود ہو اور بہت ہمتی کے پہلو پر پہلو دینی گدگیاں ان کے خون میں سرایت کر چکی ہوں اس فضا میں شاہ جی کا فخر جہاد بلاشبہ قدرت کے انعامات میں سے تھا۔ اور ان کا وجود آیت مفتی اللہ اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ محل نہیں لیکن اس تاریک دور میں مولانا ظفر علی خاں کا "زمیندار" و "ستارہ مع" اور دو چار برس کے فاصلے سے سید عطا اللہ شاہ بخاری کی خطابت اور ایک خاص موثر پیران کے ہمنواؤں کی جماعت ایسی بے مثال طاقت اور گراں بہا سرمایہ ہیں کہ تاریخ ان کا اعتراف کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

اور یہ بات بڑے زور سے کہی گئی ہے۔ کہ شاہ جی اردو کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کے بیان میں جہاد اور ان کی زبان میں تحریر تھا۔ ان کے حرفت عرب پر لوگ سردھتے اور موتی چیتے تھے۔ ان کے خدا۔ رسول اور اسلام سے عشق کی حکایتیں بھی زبان زد عام

پیس اور لوگ منہ سے لے کر بیان کرتے ہیں۔ مگر ان کی خطابت نے جن بتوں کو توڑا۔ اور ان کی فراست نے جن نوہوں کو پسپا کیا ان کا ذکر پس منظر میں چلا گیا ہے۔ حالانکہ دوسری اہم چیزیں پس منظر کی تھیں ان کا سب سے بڑا کمال یہی ہے تھا کہ انہوں نے ملک کے جمود کو توڑا۔ اور قوم کی سیاست میں مردانگی کا جو ہر پیدا کیا فی الجملہ ان کا جو مقصد تھا اس میں سے تھا۔ اس پورے ملک میں وہ اپنی ہمہ گیر خوبوں کے باعث ایک ادارہ تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ قیادت و سیادت اور خطابت و سیاست کی ایک انجمن تھے کہ مغربی پاکستان میں شاید ہی کوئی شخص ان خصالوں کے اعتبار سے ان کا ہمسر ہو۔ انہوں نے ۵۰ سال کا عرصہ صلہ و اجبر کی ہر تخی و کلی خواہش کے بغیر بسر کیا یہ شرف انھیں کو حاصل رہا۔ کہ:-

(۱) انھیں برصغیر میں ان کی آواز کا جادو تو کثیر تھا اور خلافت سامراج ذہن نے ان کے آتش کدے سے نشوونما کی حرارت پائی۔

(۲) مسلمان نوجوانوں میں برطانوی ملوکیت سے وابستہ رہنے کا جذبہ ایک عرصہ سے راہ پار ہوا تھا۔ انہوں نے اس جذبے کو بیخ بن سے الٹا دیا۔ جن نوجوانوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا وہ زیادہ تر دریائے جلیقہ کے لوگ تھے۔ جن سے عوامی تحریکوں میں لیڈر شپ پیدا ہوتی ہے۔

(۳) مغربیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کی جو امرائے امتحالات سے براہ فرختہ ہو کر نہ صرف طبقاتی شعور کی راہ پر آگئی۔ بلکہ بازار سیاست کے معرکہ ہائے خرید و فروخت سے بلند و بالا ہو کر کلام کرتی چلی گئی۔

(۴) عوام کے دلوں میں نہ صرف استحصالی گروہ کے خوف کو دور کیا بلکہ ان کے جوہر خودی کو یہاں تک پروان چڑھایا کہ قربانی و ایثار کا تاریک راستہ روشن ہو گیا۔

(۵) مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کیا۔ جن کا عام حالات میں قحط تھا۔ اس کیپ ہی سے اعلیٰ پایہ کے وہ مقرر پیدا ہوئے جنہوں نے انقلابی ذہن کی نقش آرائی میں قابل قدر حصہ لیا۔

(۶) مسلمانوں میں جن سیاسی و دینی بدعات کو بالائتزام راسخ کیا جا رہا تھا ان کا سانچہ توڑ ڈالا اور بعض معاشرتی خرابیوں کا سد باب کیا۔

(۷) خطابت میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ قیادت کے کاسرے ذہن کو شتم کیا۔ سیاست کو امرائے کی جیسی گھڑی یا تانچہ کی چھڑی بننے سے روک دیا اور اس کا ایک عوامی مزاج بنا ڈالا اگر تحقیق کی جائے تو یہ بات بھی ٹھکر کر سامنے آجائے گی کہ نشوونما کے اعتبار سے اردو کا دامن ان کا خود گفتا کا منت پلیر ہے (۸)

یہ حقائق اتنے واضح ہیں کہ نصف صدی کے سیاسی شب و روز کا ذائقہ نگار خود شاہ جی کے سوانح و افکار میں سے تاریخ کی بعض گہ گڑیاں تلاش کر سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس فرض سے کون عہدہ برآ ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کی اولاد

حضرت امیر شریعت کے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔

مولانا حافظ سید عطار انعم شاہ بخاریؒ آپ کے والدین کا رکھا ہوا نام ہے۔ لیکن عام طور پر سید ابو المعاویہ ابو ذر بخاریؒ تلمیذ نام استعمال کرتے ہیں۔ بہتر عالم۔ ادیب صحافی اور شاعر ہیں۔ اکثر عادات و فضائل میں اپنے والد بزرگوار کی تصویر ہیں۔ اگر تقسیم ملک کے قبل کے دور میں ہوتے تو بہت بڑے لیڈر ہوتے کیونکہ ان دنوں سیاست، سیاہ مت، نہیں تھی۔ ایک ایسے دوزخ میں اپنی زندگی کے دن گزار رہے ہیں کہ جس میں لفاق و فخر باڑی کا بازار تو گرم ہے لیکن غلو و ایثار کی کمی ہے اور اگر کوئی اس متاع کو لے کر بازار میں لگتا ہے تو اس کا احساس یہ ہوتا ہے کہ شاید میرے سکے کھوٹے ہیں جن کی کوئی قیمت نہیں۔

جلسوں میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے علمی اور دقیق مضامین پر بلا لگان تقریر کر دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کی طرح جس مجلس میں ہوں میرے جلس ہوتے ہیں۔ اور مجلس کو باغ و بہار بنائے رکھتے ہیں اگر اکابر علماء و مشائخ کی مجلس ہو تو ہمیشہ خاموش موب میٹھے رہتے ہیں۔ اعلیٰ علمی ذوق پایا ہے لیکن افسوس کہ زمانے کی سرد مہری اور ناہمواری کی بناء پر اس سے استفادے کی کوئی شکل نہیں۔ اب کچھ عرصے سے مکتبہ احرار اسلام عمان کی طرف سے مفید تاریخی اور علمی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اگر سی محنت اور مبالغہ فانی سے کام کرتے رہے تو محفوظ عرصے میں تحریک آزادی صومالیہ مجلس احرار اسلام اور شاہ جی کے متعلق بہت سا مواد موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے محفوظ کر دیں گے۔ مجلس احرار اسلام کی نظامت اب جکل انہی کے پاس ہے۔ حافظ سید عطار المؤمن شاہ بخاریؒ حافظ و عالم ہیں۔ ذہین و فطین اور بے باک و بھری نوجوان ہیں۔ ہر گز کی پسپائی رکھے بغیر نوجوان میں ہوتا ہے زبان پر لائے ہیں۔ سرود اور بالا و بلند نوجوان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی جوانی کو ملک و ملت کے لیے نفع بخش بنائے۔ اب جکل بخاریؒ اکادمی کے نام سے عمان میں کتابوں کا کام کر رہے ہیں۔

حافظ سید عطار المؤمن شاہ بخاریؒ انشا جی کے تیسرے فرزند ہیں۔ دوسرے بھائیوں کی طرح خوش شکل نوجوان ہیں بھارت و بے باکی اس گھر کی میراث ہے اس سے مالا مال ہیں اب جکل عمان کے ایک ہفت روزہ اخبار تحریک کی ادارت کر رہے ہیں جس میں علمی و دینی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

حافظ بخاریؒ سید عطار المؤمن شاہ بخاریؒ اسب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ اگرچہ سب سے چھوٹے ہیں۔ لیکن اس فرد کی کے باوجود سلوک و خصوصیات کی طرف مائل ہیں۔ تجوید و قرأت میں خاص مشق بہم پہنچاتی ہے۔ ان کے متعلق بھی یہ کہا جاسکے کہ جیسی ہی تو یہ تحصیل حاصل ہے۔

صاحبزادی صاحبہ کمال کاج سید وکیل احمد شاہ صاحب ایم۔ اے کے ساتھ ہوا میونسپل کالج اوکاڑہ میں لیکچرار ہیں یا بدصوم دسلوۃ اور مشہور و منور شخصیت ہیں

شاہ صاحب کی اہلیہ محترمہ بفضلہ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ عابدہ زاہدہ والیہ وقت میں حضرت شاہ صاحب نے اپنی اولاد کو تعلیم میں دینی تعلیم دلائی۔ سکول کا راستہ نہیں دکھایا۔ اور بیٹوں سے اکثر کہا کرتے کہ جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہو تب تکلف نہ پوچھا کرو میں تمہارا بھائی نہیں مجھ سے بھی بڑا اور محبوب بھی۔ اب بیٹے سے اور بیٹیا اب سے محبت کرے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

ہرم جہاں میں سب ہیں لیکن نہیں بخاری
عالم کو کر گیا ہے اندوہ گیس بخاری

پیدا نہ ہوگا کوئی ایسا خطیب دانش
ایوانِ خلد میں ہے محفل نشیں بخاری

۱۳ ۵۵ ۸۱

۱۱) علامہ عطاء اللہ شاہ بخاری

۱۳ ۵۵ ۸۱

۱۲) امیر شریعت والا زب

۱۳ ۵۵ ۸۱

اغوت کا پیکر، لنگن کا نصیر
نذیمِ محبت، نقیبِ بہار
چلن جس طرح لہجہ آتش
امادوں میں خیریت صبح و شام
ہمہ کیف و ہرکت، ہمہ کیف حال
علوم و درشمال کا بہتا چناب
لگا ہوں سے تنخیر کرتا ہوا
سے لگا کہاں ایسا مردِ خلق
سحر دم، وہ جاگا ہوا رات کا
امیر شریعت، قلندر، فقیر
خطابت کی انکسیر بار
سخن جس طرح آگے شکر کی حار
طبیعت میں موجِ مباحِ خرام
مشیت کی مشاطگی کا جمال
ہدایاتِ سادہ کا کوئی نصاب
تبسم سے تنخیر کرتا ہوا
حقیقی مرنی حقیقی رفیق
ادا کر کے قرض اپنی خدمات کا
ابد کے گھر کو روانہ ہوا
مکمل سفر کا فسانہ ہوا

کبھی رفعتوں سے الجھا تو نشیب کا رواں سے
عہ سبق ملا ہے مجھ کو تیری مرگ کہاں سے
تو جلا ہمیشہ ہٹ کر رہ ویرم کا رواں سے
تو غر ج لے رہا ہے ابھی خامہ زباں سے
تجھے نسبتِ خصوصی تھی نبی کے امتاں سے
یہی یاد رہ گیا ہے شمعِ کیم کی داستان سے
بنے خار بھی گلستان تیرے شوقِ بکراں سے
تیری داستان کو چھیریں مگر کہاں کہاں سے

کبھی پستیوں میں چرکا تو فرازاں سے
جو مٹے گا دین حق پر وہی رہ سکے گا زندہ
تھکے ہارے قافلے نے تجھے خضرِ وقت جانا
گلِ سرمدی کچیرے تیرے خامہ زباں نے
یہ خلوص یہ عقیدت یہ حضور سے محبت
تیری آہ صبح کا ہی، تیرا نالہ شبانہ
تیرا ذوقِ حق پسندی تجھے لے گیا رنک
تیری بے غرض قیادت تیرا علم اور خطابت

ایک چرت فقرہ کس کے بخاری نے کس دیا
سحرِ بیتِ نصیر کا ڈنکا بجا دیا
ارکانِ دین ہیں بستہ آزادی وطن
کدو یہ اس سے تم کو خودی کا ہو جس کو

کانوں میں گونجتے ہیں بخاری کے زمزمے
بہل چمک رہا ہے ریاضِ رسول میں

مولانا نظری علی خاں

محمد اکرم

مولا نظری علی خاں نے کلام اس کا یہ کہ
بہل چمک رہا ہے ریاضِ رسول میں

مُجَاهِدِ مَلَّتْ حَضْرَتِ مَوْلَانَا خَطَّ الْحَمَلِ سَيِّدِ اَوْمِي رَحْمَةُ اللهِ عَلَيْهِ

۵۱۳۸۲
۶۱۹۶۲



۵۱۳۱۸
۶۱۹۰۱

عکس تحریر

محافل حضرت مولانا حفص الرحمن صاحب کے ایک
مکتوب کا عکس ملاحظہ فرمائیے۔
یہ مکتوب حضرت مولانا نے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۴ء کو کجالت
ایبوری، لاہور پٹی جلی سے حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب
دمکودہ بنزل سکریٹری جمیہ علماء ہند کے نام ارسال فرمایا تھا۔
اس وقت کی قانونی پابندیوں اور حکومت کے تعاقب و سخت گیری
کے باعث اس مکتوب میں حضرت مولانا نے اپنا مقصد کچھ تشاؤں
میں ظاہر فرمایا ہے۔ ”الہ آباد کی کل ہند کمپنی“ سے مراد آل انڈیا کانگریس
کمپنی ہے جس کا صدر دفتر اس زمانہ میں الہ آباد میں تھا۔ ”ایجنٹ“
سے مراد ممبر اور ”ڈپٹی“ کا اشارہ گرفتاری کی طرف ہے۔
آل انڈیا کانگریس کمپنی نے ان دنوں کسی اعلان کے
ذریعہ اپنے تمام ممبران کی خواہ وہ اس وقت جیل میں ہوں یا
پہلے سزا یافتہ ہو چکے ہوں۔ فرسٹ اور حالات زندگی طلب
کئے تھے۔ حضرت مولانا بھی اسے آئی کسی سی کے ایک
نمبر گرام رکن تھے۔

السلام محمد فرامد۔ نریج گرامی

اسد کہ آرم تحفہ نمبر جوگے، اور سید بردا صاحب ہی تھے
اس وقت میں رضہ رہے تھے، مومن کہ اخبارات میں طرک عالمہ اور
”کل ہند کمپنی“ نے یہ اعلان کیا کہ جو ایجنٹ کمپنی کے اصرار
وقت سے ڈپٹی میر گے سن گون کا بھی نہرت اور جو اسے قبل ڈپٹی
حاکم کے من گون کی ہی نہرت مع حالت زندگی صد دفتر میں بھیج
جائے، میں جو سہ آرم صلح یہ کمپنی نہ ایجنٹ سنا کر امور
آپ براہ کرم بحیث انجام مراد ہمارے متعلق مدد و تدبیر
اخذ کر دے اگر یہ شخص تازہ اصحاب اسرا اعلان فرماتے
مگر صلح کے طور سے اس صلح کے رکنوں کی نہرت میں ضرر
نام شمار ہوا جائے۔

اسد کہ آرم تحفہ نمبر جوگے، اور سید بردا صاحب ہی تھے
اس وقت میں رضہ رہے تھے، مومن کہ اخبارات میں طرک عالمہ اور
”کل ہند کمپنی“ نے یہ اعلان کیا کہ جو ایجنٹ کمپنی کے اصرار
وقت سے ڈپٹی میر گے سن گون کا بھی نہرت اور جو اسے قبل ڈپٹی
حاکم کے من گون کی ہی نہرت مع حالت زندگی صد دفتر میں بھیج
جائے، میں جو سہ آرم صلح یہ کمپنی نہ ایجنٹ سنا کر امور
آپ براہ کرم بحیث انجام مراد ہمارے متعلق مدد و تدبیر
اخذ کر دے اگر یہ شخص تازہ اصحاب اسرا اعلان فرماتے
مگر صلح کے طور سے اس صلح کے رکنوں کی نہرت میں ضرر
نام شمار ہوا جائے۔

مگر انہیں صلح محمد فرامد مولانا سید محمد میاں صاحب سزا یافتہ
محمد محمد فرامد مولانا سید محمد میاں صاحب سزا یافتہ

مراد آباد شاہی مسجد (ریوی)

مولانا حفظ الرحمن سیوہاری

"تاریخ میں بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جن کی وفات بلا تیز مذہب و ملت ہر ایک کے لیے سوگاری اور صدمے کا باعث ہوئی ہو۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب کا شمار تاریخ کے ایسے ہی مؤرخوں میں ہے اور ایسا بھی اتفاق کم ہوا ہے کہ ایک انسان بیک وقت بے مثال خطیب — بے لوث و مخلص رہنما — بلند پایہ مصنف — غیر فلاحی و سکالر، نڈر مجاہد اور اونچے درجے کا منتظم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ خدا ترس، متقی اور پرہیزگار اتنا ہو کہ اس کے دامن پر کوئی بدنامی کا داغ نہ ہو۔ اپنی زندگی کا راحت و سکون، عیش و آرام و کم و کم پر توجہ دیا ہو۔ مندرجہ بالا صفات و خصوصیات کے انہوں کو اگر شمار کیا جائے تو ان کی پہلی صف میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن کا اسم گرامی ہوگا۔ مولانا مرحوم نے جس شدید بے چین روح کے ساتھ ملک و ملت کی خدمت کی اس کی مثال مشکل ہی سے کہیں مل سکتی ہے بے تکلف و سادہ وضع کے اس پیکر خاکی میں جس کا نام حفظ الرحمن تھا۔ مسلمانوں کو سر بلند کرنے اور دیکھنے کی اس قدر تڑپ تھی جس نے ان کو ہر وقت متحرک و فعال رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمانوں کا سہارا اور ان کا دماغ تھے بلکہ اگر یہ کہنا جائے کہ وہ بھارت میں مظلوم و بے کس ہر دھکی اور زخمی انسان کے لیے ہر وقت امداد کرنے کے لیے مستعد رہتے تھے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا ۱۹۴۷ء میں فسادات کے دوران جس بے جا جبری ہجرت بے باکی و جرات کے ساتھ کام کیا ہے۔ دلی کے کوچ و بازار اس کے شاہد ہیں۔ اس کے بعد پبلک سٹیج پر پارلیمنٹ کے ایوان میں، صوبوں کے وزراء، اعلیٰ کے سامنے پولیس کے اعلیٰ حکام کے روبرو انھوں نے جس بے خوفی کے ساتھ مسلمانوں کی نمائندگی کر کے بھارت کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا خوف و ہراس دور کیا یہ اور کیا ہے۔ اتنا بڑا کارنامہ ہے جو ان کو تاریخ اسلام کے بہادر اور اولو العزم قائدین کے ساتھ ملا دیتا ہے پاکستان کے بہت کم مسلمان مولانا حفظ الرحمن سے واقف ہیں اور جو واقف ہیں انہیں بھی ان کے کارناموں کا بہت کم علم ہے۔ ہم نے جب اکابر کے سوانح لکھنے کا قصد کیا اور سوچا کہ کن کن بزرگوں کے سوانح ہونے چاہئیں تو مولانا حفظ الرحمن کا نام نامی ہر فہرست میں میرے ذہن میں موجود رہا۔ (نوٹ) حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم عمومی جمعیتہ علماء ہند نے الجمعیت کے مجاہد ملت نمبر کے لیے مولانا پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا ہم نے اسی مضمون کی تلخیص کی ہے۔

آپ ۱۳۱۸ھ میں سیدوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے اور آپ کا نام مغل الدین علی رکھا گیا اور مستقبل نے ثابت کر دیا کہ آپ واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ سے دین حق کی بلندی و خدمت کا کام لیا۔ "حفظ الرحمن" آپ کا تاریخی نام ہے جبکہ اس کو حفظ الرحمن یعنی رحمان کے الفت کے ساتھ لکھا جائے۔ آپ کے والد بدولوی شمس الدین صدیقی اپنے قصبہ کے معزز و متدین اور عالم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسٹنٹ انجنیر

بہ عمدہ پر مامور رہے اور مشہور صاحب نسبت بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب کے دو بھائی، بہنوئی اور بیٹے سب علی گڑھ یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور یہ سعادت مولانا کے حصے میں آئی انھوں نے شروع سے لے کر تک تمام تعلیم عربی مدارس میں پائی لیکن اس کے باوجود وہ علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی اور دیگر اکثر جدید قدیم ہی اداروں کے رکن و سرپرست رہے اور ان کی علمی و فکری قابلیت و صلاحیت کے سامنے جدید درسگاہوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہمیشہ منگوں رہے آپ کی والدہ ماجدہ (جو بڑی عابدہ زاہدہ پابند صوم و صلوات خاتون تھیں) کی درخواست پر آپ کے والد ماجد نے آپ کو سیولہ رہ لے کر عربی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اس مدرسہ کا نام فیض عالم تھا آپ نے کچھ کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مراد آباد سے بھی پڑھیں، لیکن درس نظامی کی شرکت کی تکمیل سیدوہارہ کے فیض عالم مدرسہ ہی میں کی۔ سیدوہارہ میں آپ کے مخصوص اساتذہ حضرت مولانا سید عبدالغفور سیدوہاروی، سید رشید حضرت مولانا سید احمد حسن امروہویؒ اور الحاج حافظ مولانا احمد حسن صاحب چشتی نیر مولانا سید آفتاب علی صاحب شاگرد شیعہ حضرت مولانا مفتی نازفروزی یقیناً حضرات اخلاق فاضلہ سے متصف اور اعلیٰ قابلیت کے مالک تھے چنانچہ حضرت مولانا بچپن ہی میں اپنے خوش خصال اساتذہ کی وجہ سے ٹیکہ پسند بن گئے خداوند کریم نے آپ کو وافر ذہانت و ذکاوت سے نوازا تھا۔ لہذا آپ ہمیشہ اپنی جماعت میں ممتاز رہے اور اپنے دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں اپنی اس ذہانت و ذکاوت کی بدولت مشہور ہو گئے۔ آپ بچپن ہی سے مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ نیز ہفتہ وار مجالس میں طے شدہ عنوان پر مدلل تقریر کرتے۔

سیدوہارہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ الیشیا کی مشہور علمی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب اور میاں اصغر حسین صاحب جیسے نادر و بزرگ اساتذہ و شہید حق سے استفادہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اور دارالعلوم دیوبند کی اس تعلیم و تربیت نے آپ کی قابلیت میں چار چاند لگا دیے۔

آپ سیدوہارہ ہی میں تھے کہ سیدوہارہ سے پانچ میل دور درکانہ کے مقام پر ایک ایکسپریس گاڑی کو شدید حادثہ پیش آیا۔ بیسیوں آدمی قتل ہو گئے اور سینکڑوں افراد زخمی و مجروح ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمن کو اس حادثہ کی اطلاع پہنچی۔ بے تاوانہ و مضطرانہ جاتے حادثہ پر پہنچے۔ اور جلتی ہوئی لگ سے بیسیں آدمیوں کو نکالا۔ اگرچہ خود اس لگ میں جھلے گئے۔ لیکن ایک دن رات انہیں کچھ کھاتے پیے زخمیوں کی دیکھ بھال۔ تیمارداری اور تجزیہ و تکفین کا اہتمام و انتظام کرتے رہے۔ خدمت خلق کا جذبہ مولانا کی فطرت میں ودیعت ہوا تھا۔ سیدوہارہ ہی میں ایک جذباتی (کڑوسی) کی وفات ہو گئی سارے قصبہ میں اس کو کوئی غسل دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ مولانا نے اپنی کم عمری میں اس کو غسل دیا اور کفن و دفن کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کیا۔

۱۹۱۹ء کا سال ہندو متحین کی مذبح کا ہم سال ہے۔ اس سال کانگریس نے شدید سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اس سال جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا گیا اور اسی سال جیلدار باغ کا وہ خزیں حادثہ پیش آیا جس میں سینکڑوں بے خطا افراد کو فوجی استعمار نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔ تیسریں ان دنوں تحریک خلافت کا دور

انہا گزشتہ سال کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی صبح آزادی کہا جائے تو بجا ہوگا۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب اس دور میں اپنے قصبہ سے تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ ملکی حالات کا تقاضا دیکھا تو بلاتامل سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں آپ کی گرفتاری ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند کی کثرت اور وہاں کے اساتذہ و شیوخ کی کشش آپ کو دیر سے کھینچ رہی تھی۔ لیکن ملکی حالات نے آپ کو سیاست میں لا کھڑا کیا تاہم ۱۹۲۲ء میں خلافت کا بحرانی دور ختم ہوا۔ آپ کی بددوری ہوئی اور آپ علوم و فنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے اور وہاں پہنچتے ہی اپنا مقام پیدا کر لیا حضرت مولانا سید محمد ہاشم صاحب مدنی اور مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی (صاحب زادہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن مفتی اعظم دارالعلوم ان دونوں حضرات علامہ انور شاہ عثمانی شیریؒ کی مخصوص تلامذہ اور مقربین سے تھے۔ مولانا حفظ الرحمن بھی چند ہی دنوں میں حضرت علامہ کے مقرب۔ معتدا اور مضمون تلامذہ میں شمار کرنے لگے۔ اس کے علاوہ حضرت مفتی عزیز الرحمنؒ، حضرت مولانا میاں اصغر حسینؒ جیسے عارف باللہ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے فاضل اندکی جمعیتوں نے مولانا کی قابلیت و صلاحیت اور نیکی پسند طبیعت میں چار چاند لگا دیے۔ آپ میں قدرتی اور فطری صلاحیتوں کا اندازہ کر کے حضرت علامہ انور شاہ محدث شیریؒ کے مشورہ سے آپ دارالعلوم میں معین الدین کے طور پر کام کرنے لگے اور ساتھ ساتھ اعلیٰ فزوان گاہ میں اور دوبارہ بخاری کی سماعت کرتے رہے۔ دورہ حدیث تو آپ نے پہلے سال ہی کر لیا تھا، لیکن بخاری شریف کی سماعت دوبارہ بارہ کی مولانا سید احمد اکبر آبادیؒ (آپ کے خال زاد بھائی) حال صدر شعبہ و نیات علی گڑھ یونیورسٹی ان دنوں دارالعلوم میں دورہ جریت رہے تھے۔ آپ ان کے لیے بخاری شریف کی تقریر تحریر کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب حضرت مولانا سید محمد ہاشم صاحب مدنیؒ مولانا سید احمد اکبر آبادیؒ اور حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ کی مطالب علم و دوستی حاجات قائم رہی موت ہی نے اس کا علاقہ ختم کیا۔

صنف معلم اور مبلغ مدراس سے ایک فرمائش پر حضرت علامہ کشمیریؒ نے آپ کو وہاں بھیج دیا اور آپ پیرامیٹ میں کم و بیش سال بھر تدریس و تبلیغ میں معروف رہے اور یہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا چنانچہ آپ نے مختصر قیام میں دو مختصر رسالے ”حفظ الرحمن لمذہب النعمان“ اور ”الابارہ میں اسلام“ تحریر کیے۔ آپ نے وہاں نجات کر کے اتنی رقم اکٹھی کر لی کہ اس سے حج کر سکیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں آپ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے اور حج زیارت سے بہرہ ور ہوئے

دارالعلوم دیوبند میں ایک تحریک اصلاح اٹھی جس کی بنا پر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید محمد ہاشم مدظلہ العالی، مولانا سید جمیل (ملاقہ مہتمی) میں تشریف لے گئے اور وہاں جامعہ اسلامیہ میں سب حضرات کام کرنے لگے۔ مولانا حفظ الرحمن بھی اپنے سابقین اور مشفق و مربی اساتذہ کے ساتھ ڈابھیل میں آ رہے۔

الابارہ سیاست میں ڈابھیل کے قیام کے دوران آپ ہفتہ میں ایک دو دن گرو نواح کے قصابات میں وعظ و تقریر اور تبلیغ کی خاطر جاتے اور ہر جگہ اپنی مؤثر خطابت سے سامعین کو کتاب و سنت پر عمل کرنے کا غیب دیتے جس کا خاطر خواہ اثر چلتا آپ کی فکری، عملی اور فطری صلاحیتیں شباب پر پہنچ چکی تھی اور قدرت آپ کو اس مقام کی ان کے جادہ تھی۔ جواز دل سے آپ کے لیے مقدر کر دیا گیا تھا یعنی خاندان سیاست میں اور ملک و ملت میں آپ کی خدمت اور ایک آزادی کی سپہ سالاری۔

ان دنوں گاندھی نے ڈانڈی مارچ کی تحریک شروع کی اور ہمک پر حصول کے بائیکاٹ کا پروگرام پیش کیا۔ مفتی عتیق الرحمن صاحب کو

معلوم ہوا چنانچہ مولانا حفظ الرحمن کو لے کر دھارم پور پہنچے جہاں گاندھی کا قیام تھا۔ گاندھی سے مل کر اپنا تعاون پیش کیا اور گاندھی جی اس سے بہت متاثر ہوئے اور کانپن نے سنا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی ایسی ہدایت ہے کہ ملک پانی اور گھاس رفاہ عام کی چیزیں ہیں اس لیے اسلام میں بھی ان کو سرکاری محصول سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ مولانا مرحوم اور مفتی صاحب نے اس کی تصویب کی اور ساتھ ہی چند سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک معترجہ لکھ کر گاندھی کو دی جس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان ہی دنوں بارودلی میں سردار پٹیل نے کانگریس کے کارکنوں کا ایک بہت بڑا اجتماع کیا تھا جہاں یہ طے کیا گیا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی صورت میں سپک کی جو جائیداد حکومت نیلام کرے اس پر کوئی آدمی لڑی نہ دے اس پر مفتی عتیق الرحمن صاحب نے اسلامی نقطہ نظر سے اپنا مشہور فتویٰ صادر کیا جس میں ضبط شدہ جائیدادوں کو نیلام میں خریدنے کی شرعی ممانعت کا حکم تھا کیونکہ برٹش حکومت کی طرف سے جائیدادوں کی ضبطی ایک مرتع ظلم تھا۔ مفتی صاحب کا یہ فتویٰ سورت کے مشہور مسلم گزٹ پریس میں چھپا جس کی بنا پر پریس ضبط کر لیا گیا، حضرت مولانا حفظ الرحمن پہلے گرفتار ہو چکے تھے مفتی صاحب کے بھی وارنٹ جاری ہوئے مگر اس آئنا میں گاندھی اعد پیٹھ پہنچا تھا۔ بنا بریں مفتی صاحب گرفتار نہ ہوئے اور جگمگاتے ہوئے دو ہی دن کر دیئے۔ ان دنوں بزرگوں کی سیاسی سرگرمیوں سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے منتظمین پریشان تھے مفتی صاحب متعفی ہو کر وطن لگے۔ مولانا بھی جیل سے رہا ہو کر ڈابھیل واپس نہ گئے۔

۱۹۳۴ء میں انجمن تبلیغ الاسلام کی دعوت پر جس کے سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ آپ مکتبہ تشریف لے گئے۔ مفتی صاحب بھی دنوں وہیں تھے۔ یہاں روزانہ صبح کو دفتر تبلیغ سراچ بلڈنگ اور شام کے بعد مسجد جمال میں درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ مکتبہ کی وسیع و عریض میں ان دونوں بزرگوں نے بہت جلد اپنا سکھ منوالیا۔ اور دل نشین انداز میں قرآن کے مطالب و معارف کو لوگوں تک پہنچایا ان دنوں مولانا حفظ الرحمن کو مولانا آزاد کے بہت قریب رہنے کا موقع ملا اور ان کی اس رفاقت و صحبت نے مولانا حفظ الرحمن کے سیاسی ذوق و لگن کو آتش کر دیا۔ ان دنوں مکتبہ میں ایک بڑی سیاسی شخصیت سمجھاں چندرپوس تھے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمن اگرچہ اپنے وطن سے بہت دور تھے لیکن اسلام کی تائید

ندوة المصنفین کی بنیاد اگر پڑھا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ مبانی نے کتاب و سنت کی خاطر جیشہ اپنے گھر باج کر دور دراز کے سفر اختیار کیے اور تبلیغ میں مشغول رہے مولانا حفظ الرحمن کی صحت کچھ خراب ہو گئی چنانچہ آپ کچھ عرصہ امرہ میں مقیم رہ کر ان کے عربی مدارس کے اہتمام و نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مولانا حفظ الرحمن اور مفتی عتیق الرحمن صاحب ابتدائی سے ایک اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی ادارے کی بنیاد چاہتے تھے جس میں کتاب و سنت، فقہ و تاریخ اسلامی کی مستند اور معیاری کتب شائع کی جائیں گی۔ اسباب فیہ کی کمی کی بنا پر اس ادارہ کی تکمیل سے عاجز و قاصر تھے مکتبہ میں رہائش کے دوران مفتی صاحب کو خاصی رقم مل گئی جس کی وجہ پہلے کسی جگہ مسطور ہوئی۔ راقم الحروف نے ایک ثقہ شخصیت سے جو برسوں ندوة المصنفین میں کام کرتی رہی ہے سنا ہے مفتی صاحب سے ایک بہت بڑے صنعت کار یا سرمایہ دار نے مکتبہ میں ایک کام کے لیے تعیند مانگا مفتی صاحب نے تعیند لکھ کر دے دیا۔ خدا کا ناکار اس سرمایہ دار کا کام ہو گیا جس کے لیے اس نے تعیند لیا چنانچہ اس نے خوش ہو کر غالباً پندرہ ہزار روپیہ جمع کر دیا وہیں مفتی صاحب کی خدمت میں مفتی صاحب نے اس کے سامنے اپنے ارادہ کا بے تکلفی میں اظہار کیا کہ اس رقم سے یہ کام شروع کیا جائے گا اس کی عقیدت میں اور اضافہ چنانچہ اس نے کچھ رقم اپنی طرف سے اور ملائی کچھ اجاب سے لی اور تیس بیٹیس ہزار روپیہ جمع کر کے مفتی صاحب کے حوالے کر دیا

نقصان ہوا تھا۔ جنگ کے خاتمہ پر اس کے مقبوضہ علاقوں کے سب سے بڑے ملک ہندوستان میں یہ تحریکیں شروع ہوئی تھیں جس نے اس کے اور
 کو خطا کر دیا تھا، لیکن تحریک کے معطل ہوجانے پر اسے سکھ کسانوں نصیب ہوا اور اب حکومت کے آرٹھٹ اور پوری شہنشاہی بھی اس پالیسی پر چل رہی
 کہ اس کے بعد عام خصوصاً مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شریک نہ ہونے دیا جائے، کیونکہ ان کے مخصوص مذہبی نظریات و جذبات کسی تحریک کو
 دلوں میں کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ تحریک تقریباً ختم ہو گئی۔ حکومت مستعد ہو گئی اور وہ پوری قوت اور ڈپلومیسی سے لیں ہو گئی کہ اول
 کسی کو آزادی کا نام ہی لینے دیتی تھی اور اگر کوئی آزادی کا نام لے لے حکومت اس کی زبان گدی سے کھینچ لے۔ حکومت کے جملہ ذرائع علم کو تحریک
 سے برگشتہ کرنے میں مصروف ٹھہرا تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں پانچ طبقے پیدا ہو گئے۔

۱۔ انگریز۔

۲۔ انگریز کے ہستی خواہ

۳۔ وہ طبقہ جو تحریک خلافت کی ناکامی سے مایوس ہو کر جہد و جد آزادی کو بحث خیال کر لے لگا۔

۴۔ وہ طبقہ جو اگرچہ محب وطن اور جرأت پسند تھا، لیکن مشروط کام کرنے کے لیے تیار تھا غیر مشروط نہیں۔

۵۔ پانچواں طبقہ وہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ تحریک آزادی میں قائدانہ حصہ لیا جائے اور اپنے وطن کو دوسری جماعتوں کے شش بدو
 مل کر تحریک آزادی کو اتنا طاقتور بنایا جائے کہ انگریز کی یہاں سے جلتے ہی بنے۔ ان کا خیال تھا کہ اب انگریز کی شرائط چاہیں ایسا انداز اختیار
 گی کہ ہندو مسلم دن بدن دور ہوتے چلے جائیں اور تحریک آزادی قوت نہ پکڑے۔ اگرچہ مسلمان تحریک آزادی سے کچھ ملحدہ ہو گئے تھے، مگر
 ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ تحریک آزادی کو لے کر اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور گاندھی کی حیثیت اس میں رشیوں کی ہو گئی ہے اور وہ ہر جگہ مہاتما
 سے معروف ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کا ہر فرد اور ہستی اس بات سے متاثر ہو رہا ہے تو کیا مسلمان محض تباہی بن کر یہ سب کچھ دیکھ
 اور وہ اپنے مستقبل کی خاطر تحریک آزادی میں حصہ نہ لیں۔

یہ اور اس طرح کے کئی اور مسائل تھے جن کو حل کرنے کے لیے جمیعہ علمائے ہند نے ۱۹۲۹ء میں اپنا سالانہ اجلاس قصبہ
 ضلع مراد آباد میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا حفظ الرحمن جمیعہ علماء ہند کے رکن تھے۔ انھوں نے جمیعہ کے اس اجلاس میں تحریک آزادی
 میں شرکت اور کانگریس سے تعاون کرنے کی تجویز پیش کی اور اجلاس سے تقریباً دو ہفتہ قبل اخبارات میں اس کا متن شائع ہوا
 جبکہ اس پر تبصرے ہونے لگے اور لوگ اس جرات مندانہ تجویز پر حیران تھے کہ یہ عجیب ویلوانا ہے جو ان حالات میں اس طرح کی تجویز
 رہا ہے جبکہ مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی وغیرہ اس کے مخالف ہیں اور انھوں نے بھی ان دلوں ایک جمیعہ کے نام سے امر و نہی
 اجلاس بلا رکھا تھا۔

بہر حال یہ اجلاس ہوا جس کی سبکیٹ کمیٹی میں تقسیم کر کے ہوتے موزن اسلام مولانا سید محمد سلیمان نے فرما
 انقلاب کی تحریک جب شروع ہوتی ہے تو تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ وہ نتیجہ
 ختم نہیں ہوتی بے شک اس کو مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا
 ہے کہ وہ نیست و نابود معلوم ہونے لگتی ہے لیکن اس کی خاک میں پیچھی ہوئی چنگاریاں ہر جگہ
 ہیں اور شہد بن کر مختلف طاقتوں کو تدریجاً آتش کر دیتی ہیں۔ اب کیا مسلمان یہ پسند

کو اور اسی طرح یہ سلسلہ آگے چلتا رہا۔

مولانا حفصہ الرحمن ادارہ حربیہ کے افسر نچارج یکا نڈر تھے۔ مولانا اسی حیثیت سے مراد آباد پہنچے مگر حسب معمول سادے کپڑوں میں لباس کھد کر کی شیر وانی جو بوسیدہ تھی۔ احباب نے عرض کیا کہ آپ کو تو فوجی لباس میں جونا چاہیے۔ آپ کی خاموشی اس کا جواب تھا چند روز بعد ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ مقتدر چلا لیکن جرم ثابت نہ ہوا اور مارا کر دیے گئے۔ اور اس سلسلے میں ایک بات حکومت کی شاطرانہ پالیسیوں میں یاد رکھنے کی ہے کہ اس نے کانگریس کو خلاف قانون قرار دے رکھا تھا۔ لیکن جمعیتہ علماء ہند کو خلاف قانون قرار نہیں دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت اور اس کے کارندے عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ ہندو متحرک آزاد دی چلا رہے ہیں۔ مسلمان اس میں شریک نہیں ہیں اگر جمعیتہ علماء ہند کو خلاف قانون قرار دیا جاتا تو اس کے فریب اور پروپیگنڈہ کا پردہ چاک ہوتا تھا۔ لیکن علماء جمعیتہ کے ساتھ یہ ہوتا تھا کہ اس کے دفاتر پر چھاپے پڑتے تھے، نمایاں کارکنوں کو گرفتار کیا جاتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ

دہلی گھنٹہ گھر میں کانگریس کا خلاف قانون جلسہ

کانگریس خلاف قانون تھی، لیکن اس کے باوجود اس نے طے کیا کہ اس کا سالانہ جلسہ حسب معمول ہرگا صدار کا انتخاب ہوا۔ تاہم مقرر کی گئی دہلی بھی مقرر ہوا اور دل چسپ بات یہ کہ اس جلسہ کی جگہ دہلی کا گھنٹہ گھر تجویز ہوا جو چاندنی چوک میں واقع ہے۔ کانگریس اور حکومت دونوں کے لیے یہ جگہ وقار کا مسئلہ بن گیا، حکومت نے سی آئی ڈی کا جال بھیلادیا۔ بسوں میں گاڑیوں میں انتظار گاہوں میں ہر جگہ سی آئی ڈی دہلی کے چپہ چپہ پر سی آئی ڈی تھی جنڈوٹ سیل تک مجوزہ جگہ پر کرنی انتظام نہ تھا۔ حکومت کے کارندے خوش تھے کہ ہم کامیاب ہو گئے، لیکن عین وقت پر اس پاس کے لوگوں سے ایک جھگڑے میں اتنی تعداد اکٹھی ہو گئی کہ پولیس کی خاصی نفری اپنے کئے کا کافی سمجھنے لگی۔ جب ہنگامہ مریڈ پولیس آئی۔ کئے والوں نے کارروائی شروع کر دی۔ انقلاب زندہ باو، کانگریس زندہ باو وغیرہ نعرے لگے۔ صدر نے حلف نامہ آزادی پڑھا۔ آزادی کی تجویز پیش کی جو منظور ہوئی۔ جلسہ برعکاس ہوا اور سامعین و منتظین غائب۔ اس پر بے جلسے کی کارروائی پھر اس کے انتظام میں مولانا حفصہ الرحمن کا تدبیر اور حاضر حواسی شریک رہی اور کہا کہ علماء ہے کہ جلسہ کے کامیابی میں ان کا خاصہ دخل تھا۔ آپ آل انڈیا کانگریس ورلنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ سید ہارہ پولیس آپ کو وہیں سمجھتی رہی، مگر وہاں سے خفیہ نکل گئے۔ آپ ہمیشہ کھد کر کے کپڑوں میں لباس رہتے مگر اس دن رستے اور دہلی میں گرفتاری سے بچنے کے لیے لٹے کا ہوا جابجائی کپڑے کی شیر وانی جے پوری صاف جے پوری انداز میں باندھ کر سفر کیا دہلی شیش پرا تے ہیں تو گاہ میں بیش قیمت عمدہ چھڑی تھی اور ادا لائی شان سے دہلی میں داخل ہوئے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ یہ حفصہ الرحمن ہے۔ حالانکہ پولیس کو آپ کی آمد کی توقع تھی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسے کاموں میں سرگرم رہتے تھے۔

جمعیتہ علماء ہند اور مسلم لیگ کا اتحاد

۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ اگر ایکٹ کو اپنایا جائے، تو وزارتیں قائم ہوتی تھیں اور اس کے لیے انتخابات ہوتے تھے۔ متحرک آزادی میں شمولیت اور قائدانہ حصہ لینے پر جمعیتہ علماء ہند کا وقار اور اس کی شہرت یو پی، سی پی اور بہار وغیرہ میں بہت تھی۔ گوہر دور قوم پرست جماعتوں سے مل کر جماعت بنائی تو خاصی شیشیں لے جاتی، لیکن اس موقع پر قائد اعظم علی جناح نے جمعیتہ علماء کی طرف دست آداؤں

بڑھایا، اور جمعیت علماء ہند کے عام اجلاس منعقدہ دہلی میں تشریف لائے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ادھر سے پرتیب ک خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ قائد اعظم، مولانا شوکت علی مرحوم، نواب محمد اسماعیل نے اکابر جمعیت سے گفتگو کی اور جمعیت علماء ہند اور مسلم لیگ کا آپس میں اتحاد ہو گیا اور یہ عہدہ یہاں تک پہنچا کہ اگر کانگریس کسی حلقے سے مسلمان امیدوار کو رکھ کر لے گی۔ وہاں مسلم لیگ کا امیدوار رکھنا نہیں ہوگا۔ وغیرہ۔ اب پلیٹ فارم دورہ گئے تھے مسلم لیگ اور کانگریس، جب انتخابات ختم ہوئے تو قوم پرور مسلمانوں کا کوئی شیخ زربان جاعتوں کا اتحاد کیوں ختم ہوا یہ ایک طویل داستان ہے یہاں اس اتحاد کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کہ عام طور پر لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ حضرت مولانا ابجدین احمد مدنی نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کی مخالفت کی حالانکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دونوں جماعتیں جنگیہ ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں جمعیت کی سادھ بھی کمزور ہوئی لیکن اتحاد و اتفاق کے پیش نظر یہ قبول کیا گیا ان باتوں کی موجودگی اور ایسے واقعات کے تاریخ کا ایک حصہ ہونے کے باوجود بعض حلقے یہی رٹ لگاتے جاتے ہیں کہ یہ ہمیشہ قائد اعظم کے مخالف رہے۔

۱۹۴۲ء کو سٹانڈیا کی تجویز ۱۹۴۲ء میں دوسری جنگ عظیم شباب پر تھی، ہند کی فوجیں شالں گراؤ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں اور اس کے سنے حلیف جاپان نے سنگا پور کے قریب بطلانی بحری بیڑے کے سب سے بڑے جنگی جہاز (پرنس آف ولین) کو غرق کر دیا تھا اور اس کے پہلی جہاز کلکتہ بندر، ناخست و نادر ارج کرنے لگے تھے۔ برطانیہ کی حکومت پر ایسی پریشانی کا عالم تھا کہ شاید یہی کمی آیا ہو اور اسی پریشانی کے عالم میں کانگریس نے بمبئی میں سالانہ اجلاس کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ان حالات میں کانگریس سے یہ توقع نہ کر کہ وہ حکومت برطانیہ کا ہاتھ نہائے گی بلکہ یہ بات یقینی کہ وہ ان نازک حالات سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ پر ایک بھرپور وار کریگی، حکومت کی کوشش تھی کہ اجلاس کو ناکام بنایا جائے اور کانگریس کی کوشش تھی کہ اجلاس کامیاب ہو۔ ان جنگی حالات میں اس اجلاس کے متعلق کام کرنا ہر کسی کا کام نہ تھا، بلکہ ان حربوں اور اقدامات کو دیکھ کر جو حکومت بروئے کار لا رہی تھی اچھے اچھے آدمیوں کے پتے پانی ہو رہے تھے مسلم پالیں اور فوج مستعد مشین گنیں اور ٹینک تیار، خیال تھا کہ جلیاؤں کے باغ کے حادثہ کی تاریخ کو دہرایا جائے گا یا قاضی خاں بازار کی رواد تازہ کر دی جائے حضرت مولانا حفیظ الرحمن اکل انڈیا کانگریس کی ورلنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور ملک کے ہر باشندہ سے زیادہ مستعد و جفاکش، قوم کی طرف سے آپ کو مجاہد ملت کا خطاب ملنے والا تھا۔ لہذا آپ انہی حالات میں سیدہ راہ سے بمبئی پہنچے اور علی بیاد خاں کے پاس قیام فرمایا۔

حکومت کو علم تھا کہ کانگریس اس اجلاس میں ہندوستان خالی کر دے گی اور INDIA کی تجویز پاس کرنے والی ہے۔ اگر برطانیہ پر جنگ کا اتنی بڑی مصیبت نہ ہوتی تو شاید کانگریس کو قبل از وقت ہی خلاف قانون قرار دے دیا جاتا، مگر اب اس اجلاس کے بعد بھی شاید حکومت مجبور یوں کی بنا پر خلاف قانون قرار نہ دیتی، لیکن یہ قرار واد تقریباً بغاوت کے مترادف تھی اس کو پاس کرنے والے باغی، لیکن سوال یہ تھا کہ ان باغیوں کو گرفتار کون کرے صوبہ بمبئی کی حکومت یا اس میں شریک ہونے والے کے وطنی صورت، حکومت، حکومت، بمبئی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ بمبئی جیسے شہر میں سینکڑوں ممبروں اور لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں غیر محدود مدت تک ان کی ناز برداری کے فرائض انجام دیتی رہے۔ لہذا سرکاری پالیسی یہ تھی کہ پانی کو گرفتار کرنے کا تلخ فرض دوسرے صوبوں کی حکومتیں انجام دیں یعنی جو ممبر جس صوبے کا ہوا وہی صوبے کی حکومت اس کو گرفتار کرے۔

مولانا کی گرفتاری : مولانا حفیظ الرحمن صاحب چونکہ یو۔ پی کے تھے۔ لہذا ان کی گرفتاری یو۔ پی حکومت کے حکام سے ہو نا چھ، گرفتار نہ ہاں کر

تھی۔ ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس نے کوئٹہ انڈیا کی تجویز پاس کی اسی روز شب کو صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور دوسرے ورکنگ کمیٹی کے ممبر گرفتار کر لیے گئے مولانا حفظ الرحمن صاحب کو احساس ہوا تھا کہ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے حضرت مدنی چند ماہ پیش گرفتار ہو چکے تھے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نقاہت اور ضعف و ماع کے مریض تھے مولانا احمد سعید دہلوی بھی بیمار تھے ضابطہ کے لحاظ سے مولانا عبدالحکیم صدیقی ان دنوں ناظم تھے لیکن انہیں ایک بیدار مغز مشیر کی ضرورت تھی مولانا حفظ الرحمن سے بہتر مشیر اور کرن ہونا مولانا نے تمہید کیا کہ زیادہ سے زیادہ عرصہ اپنے آپ کو گرفتاری سے بچایا جائے۔ بھلیں بدل کر سیدوارہ پہنچے وہ اس طرح کہ کسی قریبی سٹیشن پر اتر کر خفیہ طریقے سے سیدوارہ گئے یہ موسم برسات کا تھا اور اس سال بارشیں کچھ زیادہ ہی تھیں بارش چشمِ قریب کے لیے گھونگٹ بنی رہا آپ دہشتی وضع بنا کر قریبی سٹیشن کا گٹھ سے دہلی کی طرف روانہ ہوئے جب تک یورپی گورنمنٹ سے وارنٹ گرفتاری آئے آپ محفوظ تھے ۲۶، ۲۸ اگست کو جمعیت کی مجلس علماء کا اجلاس ہوا اور اس میں کانگریس کی قرارداد کی حمایت کی گئی اور طے پایا کہ اس ملک کے گوشے گوشے پہنچایا جائے اس کا چھاپنا اور تقسیم کرنا خلاف قانون تھا تاہم جمعیت نے محفوظ طریقے سے یہ سب کام کیا۔

مولانا کا وارنٹ گرفتاری آیا اور آپ کو دہلی کے مضافی علاقوں کے دفتر قبول باغ سے گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں آپ روانہ اس کے منظر رکھ کر تھے آپ ضلع مراد آباد کی طرف سے کانگریس کے ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ لہذا آپ کو مراد آباد پہنچایا گیا حسن اتفاق کہ حضرت مدنی حافظ محمد باہر صاحب اور کئی دوسرے حضرات یہیں تھے چند روز بعد رمضان آگیا تو جیل کی بارک تو بلیو گاہ بن گئی حضرت مدنی قرآن پاک سنیا کرتے اور تہجد و شیخ الاسلام کے پیچھے قرآن پاک سنتے

مولانا محمد میاں کی گرفتاری پر عتاب
اکتوبر میں مولانا سید محمد میاں گرفتار ہو کر اسی جیل میں پہنچے تو مولانا حفظ الرحمن صاحب نے نہایت خشکی کے ساتھ استقبال کیا اور کہا تمہیں پہنچے بغیر چین نہ آیا کیا خرابی تھی اگر باہر پہنچتے یہ حرکتیں نہ کرتے اب باہر کا نام کام چوٹ ہو جائے گا۔ مولانا سید محمد میاں صاحب کے ذمے دہلی سے ہندوستان کے مشرقی گوشہ تک ڈارو اور پہنچانا تھا مولانا نے اگرچہ خاصا کام کر لیا تھا تاہم مولانا حفظ الرحمن کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام کرتے اور گرفتاری سے بچتے ہیں کام کی اس قدر دھن تھی کہ باوجودیکہ مولانا سید محمد میاں ان سے عمر میں بڑے اور جمعیت کے ذمہ دار و احمد پر تھے ان کو یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے۔

حضرت مدنی کی تبدیلی
حضرت مدنی کو مراد آباد جیل سے نیپنی تال منتقل کیا گیا تو سب ساتھی ان کی مفارقت کے صدمے میں دن رات رہتے رہتے کہ یہ کہ حضرت مدنی کی یہ اتنا فیر معیت ان سب کے لیے پارس کا حکم رکھتی تھی بارش طرح شب و روز اکٹھے رہنا مشکل تھا۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں مولانا حفظ الرحمن اور مولانا سید محمد میاں کو بریلی سنٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔

اس زمانے میں حکومت نے سیاسی قیدیوں کے لیے پیرول کی سہولت منظور کی تھی یعنی کچھ مدت کے پیرول پر رہائی سے انکار سے رہائی۔ مولانا حفظ الرحمن کی صحت بہت خراب تھی اور دوسرے کا دورہ ڈاکڑ تھا آپ کئی کئی بار ہسپتال پہنچتے رہتے۔ رمضان شریف میں کئی دفعہ دورہ ڈاکٹر کی رات اسی طرح گزری اس عارضہ کی بناء پر آپ پیرول کی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے اور دوسرا عذر یہ تھا کہ آپ کی طبیعت کی شدید علیل تھی جو بعد میں تپ دق میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں باہر کے دوستوں اور اندر کے ساتھیوں نے لے لے دھار کر کیا التجا تیں کیں لیکن آپ پیرول پر رہا نہ ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں مولانا حفظ الرحمن صاحب کو جمعیت کے ناظم اعلیٰ بنانے کی تجویز تھی، لیکن سیاسی حالات نے اپنی طرف متوجہ رکھا اور پھر گرفتاریاں ہو گئیں۔ ۱۹۴۳ء میں جرمنی کی جنگ دم توڑ رہی تھی، ہندو کی خودکشی اور ہٹلر پانے کے لیے ہندوستان کے معاملہ میں کچھ خاص فیصلہ کرنا چاہتا تھا لہذا گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ مئی ۱۹۴۴ء کو مولانا حفظ الرحمن — اور ۲۴ اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت مدنی رہا کر دیے گئے۔ ۲۴ تا ۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء مطابق ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ کو جمعیت علماء ہند کا اجلاس سمانپور میں منعقد ہوا۔ حضرت مدنی صدر اور مولانا حفظ الرحمن صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کیا گیا۔

مجلس استقبالیہ نے صاحب صدر کے جلوس کی تیاریاں کر رکھی تھیں، لیکن حضرت مدنی ان چیزوں کے سخت خلاف مجاہد ملت شہ سوار تھے اور خصوصاً اپنے لیے تو وہ اس قسم کی کوئی چیز برداشت نہ کرتے تھے۔ لہذا حضرت کو تیار نہ ہوئے۔ لہذا مولانا حفظ الرحمن نے دلداری کے لیے شرکت منظور کر لی۔ مجلس استقبالیہ نے ایک نہایت عمدہ شوق گھوڑا ناظم اعلیٰ کو سوار کر کے لیے پیش کیا۔ آپ اس سے قبل گھوڑے پر شاید ہی کبھی سوار ہوئے ہوں، لیکن جب سوار ہوئے تو معلوم ہوتا تھا پرانے شہ سوار ہیں۔ آپ نے اپنی غیر معمولی جرأت سے گھوڑے کو قابو میں رکھا حضرت مخدوم خواجہ جلال الدین کیرالاولیاء رحمۃ اللہ علیہ جانی کے زمانے میں شاہ شرف الدین بولعی قلندر پانی پتی کے سامنے سے گزرے تھے۔ تو انھوں نے یہ شعر پڑھا تھا

گلگول لباس کردو سوار سمنہ شد
باران خرد کنید کہ آتش بلند شد

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمان پاکستان کے حق میں ہیں یا خلاف؟ مولانا حفظ الرحمن جمعیت علماء ہند کے ناظم اعلیٰ تھے اور جمعیت علماء ہند کا موقف تھا کہ تیسرے نہیں ہونی چاہیے اور اب اس مسئلے میں ان کے ساتھ مقابلاً تھا۔ اکابر دیوبند بھی وہ خصوصاً میں مقیم ہوئے۔ ایک گروہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے زیر قیادت تحریک پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور دوسرا حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی قیادت میں مخالفت لیکن ان دونوں گروہوں میں اختلاف دیوبنداری کا اختلاف تھا، ہر گروہ دیوبنداری اور اجتہاد سے اپنے موقف کو صحیح سمجھتا تھا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بہت بلند ہے تاہم ایک تاریخی حقیقت کہ صحابہ کرام میں آپس میں بعض دفعہ ایسا سخت اختلاف ہوا جنگ جمل اور جنگ صفین جیسی لڑائیاں ہوئی لیکن پوری امت مسلمہ کا فیصلہ ہے کہ ان میں سے ہر گروہ دیوبندار تھا۔ کوئی بدینہ نہ تھا۔ ان صحابہ کے ساتھ اس اختلاف کا تشبیہ سخت بے ادبی ہے تاہم سمجھنا اور سمجھانے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ صحابہ کرام کے پیروکاروں میں بھی اختلاف ہوا قوم کے سامنے دونوں گروہوں نے اپنے اپنے دلائل اور ثبوت پر پیش کیے اور ملت اسلامیہ کی اکثریت پاکستان نے حق میں رائے دی اور اب پاکستان خدا کے فضل و کرم سے اپنی زندگی کے باقی سب سال میں ہے اور دنیا کے ہر طبقے کا مسلمان اس کی خوشحالی اور ترقی کے لیے دعا گو۔

ارباب علم کا اس بارے میں یہی فتویٰ ہو گا کہ جو صحابہ ان سچائی اور دیوبنداری کے ساتھ جس نظریے کے بھی حامی تھے ان میں سے کسی ایک کو خطا اجتہادی میں نہ تو بظاہر اور نہ دیا جاسکتا ہے۔ گناہ کسی کو نہیں لگا جاسکتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ مہند کے لیے دو ثواب ہیں یا ایک — دو ثواب اس کو جس نے اجتہاد کیا اور اس کا یہ اجتہاد صحیح نکلا — ایک ثواب اس کو کشتش کرنے کا اور

دوسرا صحیح اجتہاد کرنے کا ایک ثواب اس مجتہد کو کہ جس نے کوشش کی، لیکن اس کی یہ کوشش صحیح نہ تھی تو اس کو کوشش کرنے کا ثواب ضرور ملے گا۔ لیکن کس مجتہد کا اجتہاد درست ہے اور کس کا نادرست، اس کا فیصلہ وحی الہی کر سکتی ہے۔

اس انتخاب میں متحدہ ہندوستان کے موقف کی حمایت کرنے والی جماعتوں جمعیت علماء ہند، مجلس احرار اسلام، خلافتی خدمت گار وغیرہ پرتل ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا اور اس کی طرف سے امیدوار کھڑے کیے گئے۔ اس طرح پورے ملک میں اگرچہ یہ بورڈ لڑ گیا (یونی ہمار دنیو میں تیس سیٹیں حاصل ہوئیں) لیکن مجموعی طور پر جب ووٹوں کے اعداد و شمار حاصل کیے گئے تو قوم پر دو مسلمانوں کو ۳۵ فیصد ووٹ ملے اور ۶۵ فیصد ووٹ مسلم لیگ کو۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان کس حیثیت سے رہتے۔ جمعیت علماء ہند نے اس کے لیے ایک فارمولا تیار کیا تھا جس کے اہم اجزاء یہ تھے۔

۱۔ صوبے خود مختار ہوں

۲۔ مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کر دیں اور جن کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

۳۔ ان مشترکہ اختیارات کے علاوہ جن کی تصریح مرکز کے لیے کر دی گئی ہو، باقی تمام تصریح کردہ اور غیر مصرح اختیارات صوبوں کے حوالے ہوں۔

۴۔ مرکز کی تشکیل ایسے تناسب سے ہو کہ اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کر سکے۔ مثلاً پارلیمنٹ کے ممبروں کی تعداد کا تناسب یہ ہو۔

دوسری اقلیتیں ۱۰

مسلمان ۳۵

ہندو ۳۵

۵۔ جس مسئلے کے متعلق مسلم ممبران کی اکثریت فیصد کر دیجی کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے۔ وہ پارلیمنٹ میں پیش نہ ہو سکے گا۔ اس فارمولے کو جمعیت علماء ہند اور دوسری جماعتیں پیش کرتی تھیں، لیکن قوم نے اس کو مسترد کر دیا اور پاکستان کے حق میں ووٹ دیے۔

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ابھی تمام ہندوستان میں مکمل نہیں ہوئے تھے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۶ کو وزارتِ مشن و وزارتِ مشن کی آمد کرپس مشن کیا جاتا ہے کہ راجپوت پنجاب اس مشن میں تین ارکان تھے۔ لارڈ پٹیک لارنس وزیر ہند، سر اسٹیک فوڈل اور جنرل الیگزینڈر ایک ہفتہ مطالعہ آرام کے بعد اس وفد نے یکم اپریل کو ہندوستانی لیڈروں سے ملاقاتیں شروع کر دی۔

کلی ہند مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے صدر کی حیثیت سے حضرت مدنیؒ کو دعوت ملی آپ نے اپنے ساتھ شیخ حسام الدین (مجلس احرار اسلام) خواجہ عبدالحمید (صدر مسلم مجلس) شیخ تلمیذ الدین (صدر آل انڈیا مومن کانفرنس) کو دوسری جماعتوں کے نمائندہ کی حیثیت سے حافظ محمد علی (کرچ بھارت میں وزیر برقیات رہے) ترجمان کی حیثیت سے لیا۔ اس جماعت کو ایک شیر اور نمائندہ کی ضرورت تھی جو برلین نمائندگان وغیرہ کے ساتھ اس ضرورت کو مولانا حفظ الرحمن صاحب کو شریک کر کے پورا کیا گیا۔ اس وفد نے اپنا فارمولا (جس کا ذکر اوپر ہوا) پیش کیا۔ کس مشن نے اس فارمولا سے خاصی دل چسپی کا اظہار کیا اور مقررہ وقت سے ۴۵ منٹ زائد مذاقات جاری رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی ایک کتاب میں ایک فارمولے کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ بھی اس فارمولے کے ساتھ بنا جاتا ہے اس فارمولے کو وزارتِ مشن نے جو اپنی سفارشات

پیش کیوں وہ تقریباً اسی لائنوں اور خطوط پر چھپیں ان سفارشات کی بنا پر ۲۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا کینٹ کے ۱۴ بٹرس میں پانچ مسلمان تھے یعنی پم سے کچھ زیادہ۔ مالیات کا اہم حکمراناب زادہ لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن یہ عارضی حکومت بالکل بی عارضی ثابت ہوئی اور بات پاکستان کی منظوری پر آ کر ختم ہوئی اور ۳۱ اگست کو قیام پاکستان کا عمل بطور میں آیا۔

ہمارے ملک میں اب تک یہ تاثر شکار بحث چل رہی ہے کہ کون پاکستان کا مخالف تھا اور کون موافق؟ دیکھنا یہ چاہیے کہ جن لوگوں نے پاکستان کی مخالفت کی تھی قیام پاکستان کے بعد کیا وہ اب تک پاکستان کے مخالف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ایسے لوگ غدار اور قابل گردن زدنی ہیں لیکن اگر وہ محب وطن ہیں تو پھر ان کی مخالفت کیسی؟ مملکت پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد میسوں تک پہنچتی ہے جو تحریک پاکستان کے مخالف تھے مگر قیام پاکستان کے بعد وزارتوں میں شریک کیے گئے۔ ملک کی مقتدر چاروں کے صدر اور اعلیٰ عہدے دار رہے اور ایسے لوگوں کی تعداد سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے جو پاکستان کی تحریک کے ہر اول دستے میں تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مفاد اور خود غرضی کے وجہ سے پاکستان میں انتشار و افراق کا باعث ہوئے۔ ہمیں خاص کسی فرد کا نام لینے کی ضرورت نہیں، ملک کے تمام افراد ہر دو گروہوں کے ان افراد کو جانتے ہیں۔ اگر کل کوئی قیام پاکستان سے قبل تحریک سے دیانتداری سے اختلاف کرتا تھا، لیکن قیام پاکستان کے بعد نظریہ پاکستان کو یہاں علیٰ شکل میں دیکھنے کے لیے جدوجہد کرنا اور انتشار و قربانی سے کام لیتا رہا ہے تو وہ اس آدمی سے ہزار درجہ اچھا ہے جو کل پاکستان بنانے والوں میں تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ایسے افعال و کردار کا حامل رہا کہ جس سے ملکی ترقی اور نظریہ پاکستان کی عملی تشکیل میں رکاوٹ پیدا ہوئی رہی۔ آخر کوئی تو وجہ ہے کہ اکیس سال گزرنے کے باوجود ہم اپنے محبوب نظریاتی ملک کو اسلامی آئین سے ہمکنار نہ کر سکے۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب قیام پاکستان کے دیانتداری سے مخالفت تھے مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جگہ اقلیت نمائند انجام دیں وہ اب زر سے لکھنے کے قابل ہیں ان خدمات نے ان کو امت مسلمہ کے ان افراد کی صف میں لاکھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری امت مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمنؒ ۱۹۴۷ء میں

۳۱ اگست کو قیام پاکستان عمل میں آیا اور ۵ اگست کو ہندوستان آزاد ہوا۔ اسی شب کو بارہ منجے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں انتقال انبیاءات کا مندر پڑھا گیا اس کے بعد گورنمنٹ ہاؤس میں ایک پرسنگوہ تقریب منعقد ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمن نے خوشی خوشی تمام تقریبات میں شرکت کی۔ مولانا مرحوم نے آزادی وطن کے لیے جس طرح جان کی بازی لگائی اور جوانی کی تمام امنگیوں اس کے لیے قربان کر دی تھیں۔ ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ملک کی حضرات پر حریت و استقلال کی صبح مقصود نمودار ہو رہی تھی اس کی مسرتوں اور طرب و آفرینیوں کا پورا لطف بھی کچھ انہی کو حاصل ہوا ہوگا اور ان ہی جیسے لوگوں کا حق تھا۔

بہر حال ملک آزاد ہونا تھا ایک تاریخ آئی اور آزادی کی رسم پوری ہو گئی۔ آزاد ہندوستان کے جھنڈے لہانے لگے آزادی کے ترانوں سے فضا میں گونج اٹھیں یہ سب کچھ ہوا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے ————— اور اس کے بعد ————— ایک سناٹا —————

گھٹا ٹپ اندھیرا ایک ہیبت تک منظر اور جان لیوا دہشت — گویا بھارت کی دھرتی پر بلاؤں کا دیوتا اپنے پورے غیظ و غضب کے ساتھ برس ہی پڑا جو تاریخ کو شاید ایک ایسے وقت کا انتظار تھا جو ۱۵ اگست کی خوشیاں بھلا دے — مگر یہ سب بلائیں آفات اور مصیبتیں، شاید آؤں گئیں پورے بھارت کے لیے نہ تھیں یہ سب کچھ بھارت کی اقلیت اور صرف ایک اقلیت کے لیے تھا جس کا نام مسلمان تھا اور اس اقلیت کے لیے تھا جو سینکڑوں برس ہندوستان پر حکومت کرتی رہی، لیکن پھر اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے انگلیزوں کی غلام گئی اور پڑھ سو سال تک اسی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد اس کا ایک بڑا حصہ خوبی قسمت سے آزاد ہو گیا، لیکن دوسرا حصہ شومنی قسمت انگلیزوں کی غلامی سے آزاد ہو کر اپنے ہی ملک کی اکثریت کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گیا اور کئے کو تو وہ آزاد ہے، لیکن غلاموں سے بدتر — دلی اپنے اندر کئی انقلابات کو سموئے ہوئے ہے کبھی دہلی اشوک لکار اور بکر باجیت کا جھنڈا لہراتا تھا، لیکن ایک صبح دیکھا گیا کہ جمن کے کنارے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام وضو کر رہے ہیں انھوں نے توحید و رسالت سے بھرپور نغمے اذان کی صورت میں ہر چار طرف بکیر دیئے اور سات سو برس یہ توحید ہی نغمے دلی سے راس کمار سی اسام اور پٹاؤ تک گونجتے رہے اور دلی کے تخت پر قطب الدین ایک ہی محمد تعلق، باؤش اور ادو بگ زیب جیسے اولوالعزم انسان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بن کر پورے ہندوستان پر حکمرانی کرتے رہے پھر دیکھا گیا کہ مسلمانوں کو ہورہا ہے، لیکن اسی زوال کے دور میں شاہ ولی اللہ محدث جیسے ماورۂ درگاہ انسان نے یہاں جمن لیا انھوں نے نرمی گرمی سے حکمرانوں کو نصیحتیں کیں جو بے اثر رہیں تا آنکہ دلی کا آج بھی تاجدار صرف قلعہ میں تاجدار رہ گیا اور پھر اسی تاجدار کے سامنے اس کے عزیزوں کے سر تھاں میں دکھائے کیے گئے اور اس کو زندگن میں جلاوطن کر دیا گیا

کتنے ہی بد نصیب ظفر کو دفن کے لیے دو گز زمیں نہ ملی کونے یار میں اور دلی کے گوشے گوشے میں عمارت کے لیے پھانسیاں لٹکائی گئیں۔ اشراف کو ذلیل کر دیا گیا۔ دلی کے در و دیوار نے دیکھا کہ جن شہزادوں نے خرام ناز سے مروج آجاتی تھی وہ در بدر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں۔ ہندوستان کی دولت لٹتی رہی اور اس سے انگلستان کے کوچہ بازار میں دولت کے سامان جمع ہوتے رہے اور پھر آہستہ آہستہ دلی میں اس ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور ایک دن دیواروں پر اشتہار چسپاں گئے کہ ہندوستان خالی کر دو — ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو قانونی طور پر انگیز ہندوستان سے چلا گیا اور لال قلعہ پر ہندوستان کا پاپا جھنڈا لپورے شکوہ سے لہرانے لگا۔

۱۸۵۷ء کے پورے نوے سال اسی دن بعد دلی کے کوچہ بازار پھر خون سے رنگین ہونا شروع ہوئے لیکن اب کے قتل و خون کی کم بازار میں دلی کے صرف مسلمان کا خون بہتا تھا اور برائے والے اسی ملک کی اکثریت کے باشندے تھے۔ انتقال آبادی کے نتیجے میں مغرب و ہند سے غیر مسلم پناہ گزینوں کے قافلے دھڑا دھڑا دہلی میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ وحشت و بربریت کا بے قابو سیلاب دلی کی طرف بڑھ رہا تھا تین روز تک نہ صرف دہلی ایشین پر قتل عام ہونا رہا بلکہ شہر کے اندر بھی کشت و خون کی وہ گرم بازار ہی ہوئی کہ آغا نئی دہلی کی وسیع آبادی مہار گنج، قردلی باغ، سبزی منڈی شاہدہ اور قرب و جوار کے دیہات سے لاکھوں مسلمان اجڑ کر جامع مسجد امجدہ قہرہ جہاںوں میں پناہ گزین ہو گئے۔

اسلامی تاریخ میں جب ہم بغداد، کوفہ، شیراز، قرطبہ، قرناط، بخارا اور غزنی کا نام پڑھتے ہیں تو ایک خاص قسم کا شکوہ ان ناموں میں نظر آتا ہے۔ یعنی یہی تصور و شکوہ دلی میں تمام پایا جاتا ہے۔ مگر جس طرح انقلابات عالم کے لاکھوں مسلمانوں کی شامت اعمال کی وجہ سے اب

فرط، غمناطہ اور بیمار و خیرہ شہروں کی عظمت ماضی کو پدم سلطان بود کی طرح یاد کرتے ہیں یہی حال دلی کا ہو رہا ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس میں زندہ معنوی اثرات باقی ہیں، لیکن حالات کی رفتار سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ بھی نہیں رہیں گے اللہ تعالیٰ اس روز بد سے بے اور دلی کو بچائے

انہی دنوں جب ہندوستان آزاد ہوا۔ مولانا کی چہیتی بیٹی خالدہ حوا نہیں بیٹوں سے زیادہ عزیز تھی۔ ان کے فسادات اور مجاہد ملت مرض دق کی آخری منزل میں تھی تشویشناک علالت کی خبر پا کر مولانا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو سیدوارہ گئے۔ مولانا خالدہ کا انتقال ہو گیا اور مولانا غم میں ڈوبے ہوئے دل کے ساتھ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دلی واپس آئے اگرچہ خالدہ کی موت کا حادثہ ایسا تھا کہ میں اپنے گھر میں چندوں اور رہنا چاہیے تھا، لیکن گھر والوں کے اصرار کے باوجود مولانا دلی پہنچے تو ان کو شہر کا بھیا نک منظر دیکھنا پڑا، ستمبر سے گئے کا کہ فیوارہ نافذ کر دیا گیا پورے شہر میں موت کا سنا سنا چھایا ہوا تھا کوئی آواز آتی تھی تو گریلوں کی یا بے بس مظلوموں کی چیخ و پکار کی رات روتناک نعوں کے ساتھ پورے پورے محلوں پر مسلح چڑھائیاں، دور دور تک آگ کی لپٹیں اور دھوئیں کے غل ہر طرف چھ رہا زوں اور بے باک بدوں کی گویا حکومت قائم ہو گئی تھی ایک اندازہ کے مطابق چالیس ہزار کے قریب بے گناہ تین یا چار روز کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تیاست جن کے سروں سے گزری ان کا لٹو کر ہی کیا جو باقی تھے وہ بھی دم بخود پوری مایوسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس مایاںک اور جبلت ناک فضا میں جبکہ بڑے بڑے لیڈروں کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے یہ سوچنا بھی کہ اس سیلاب بلا روکنے، بے گناہوں کو موت کے چنگل سے نکالنے اور ان کے تحفظ کے لیے کوئی قدم اٹھانے کی کوئی گنجائش بھی باقی ہے کسی کے بس کی ات نہ تھی ایک مولانا حفظ الرحمن کا دم تھا جو سر سے کفن باندھ کر اٹھے اور بنام خدا ان کی عمت نے کچھ ساتھی بھی تلاش کر لیے۔ جمعیت کا دفتر بریت کیپ بن گیا۔ حالات انتہائی سنگین تھے مگر مولانا مرحوم کی ہمت اور جوش ان سے کچھ سوا تھا انھوں نے فوراً مقامی ایڈمنسٹریشن کو لکھا کہ جیتاؤں کا نگرانی کے باہمت کارکنوں کو جمع کیا اور اصلاح حال کی موثر کوشش اور تدبیر شروع کی۔ مجاہد ملت فرمایا کرتے تھے کہ:

”۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مسجد فتح پوری میں گولا بھینکا گیا وہ دلی میں قیامت خیز طوفان کا آغاز تھا اسی وقت اپنے اور اپنے خدا کے درمیان یہ عہد کر لیا تھا کہ مخالفت و مخالفت کے تمام قصے ختم ہو گئے اب ہر مظلوم، ہر پریشان حال، ہر مصیبت زدہ کی امداد فرض ہے خواہ اس کا سابق کردار کچھ رہا ہو“

اور اس عہد کو مجاہد ملت نے کس طرح پورا کیا اس کے متعلق دو تین واقعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔ ٹاؤن ہال امن کمیٹی کا سنٹر تھا امن کی کوشش کرنے والے ہندو مسلمان میل تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن جمع ہوتے تھے۔ ایک روز جب خوزری اور شباب تھا ٹاؤن ہال کے چاروں طرف مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ بلایاتوں کے بجم کے سامنے پولیس اور بجم بھی گویا ہتھیار ڈالے ہوئے تھے۔ ہندو دھندوں نے بڑے اصرار سے کہا:

مولانا آپ اور آپ کے ساتھی ہمیشہ قوم پرور رہے ہیں ہماری ندامت کی کوئی انتہا

نہیں رہے گی۔ اگر آپ صاحبان پر آنچ آئی۔ یہ وحشی ہجوم کسی کے بس کا نہیں ہے یہاں ہمارے تمام حفاظتی انتظامات ناکام ہو چکے ہیں اور کھلے میں ایک کیمپ بنایا گیا ہے وہاں یہ ہجوم ہمیں پہنچ سکتا وہاں فوجی دستے لگا دیے گئے آپ اور آپ کے ساتھی وہاں تشریف لے چلیں آپ حضرات کی بڑی مہربانی ہوگی۔

اس نازک وقت میں جب موت سامنے کھڑی تھی ہندو دہشتوں کی یہ لیل کس قدر موثر ہو سکتی تھی۔ آپ خود اپنے دل سے پوچھیے کیا آپ اس وقت اس ایبل پر لپک رہے تھے؟ اس وقت آپ کے ساتھ اور رفقاء بھی تھے، مگر سب سے پہلے جس نے تڑخ کر جواب دیا وہ مجاہدین عالمی حوصلہ تھا۔ آپ نے فرمایا:

ہمارے لیے اس سے زیادہ شرم اور بزدلی کی بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ خود اپنے وطن میں ہم پناہ گزین بن کر رہیں بے شک یہ سخت آزمائش ہے مگر اس میں ڈٹ کر اس بھراؤ سا ناکرنا ہے۔
یا تن در سہ بھاناں یا جھال زتن بر آید لہ

ایک دفعہ مولانا شہر کا گشت لگا رہے تھے۔ اچانک دیکھا کہ کچھ نیتے مسلمان کسی مومن کی نماز میں حفظ الرحمن کی زندگی تک ممکن نہیں کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ جنازہ سامنے رکھا ہوا ہے۔ مولانا تیزی سے اس مقام پر پہنچے تو بندوقیں چلی تھیں۔ مولانا کی نظر اچانک سامنے پڑی تو دیکھا کہ چند فوجی اسلحہ سے لیس چلے آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی صف باندھے دیکھ کر انہوں نے گولی چلانے کا ارادہ کر لیا اور ہندو قہیں سپہی کر لیں۔ اگرچہ لٹھے اسی طرح بیت جاتے تو ان میں سے کوئی بھی نہ بچتا۔ مولانا اس منظر پر کرموثر سے کوفتے اور آٹا فائنا ان دوندے فوجوں کے سامنے جا چکے اور گرج کر پوچھا۔ اُن نیتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا تمہیں کس نے اختیار دیا ہے؟..... مولانا کی پُر وقار آواز کانپ رہی تھی۔ قومی غیرت اور محبت کے جذبات نے ان کو فرشتہ بنا کر بھیجا تھا۔ فوجی دلائی اس بے باکی اور غیر معمولی شجاعت پر حیران رہ گئے ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ سب مسلمان مل کر ہم پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں مولانا نے فرمایا کہ:

کیا یہ نیتے مسلمان جن کے سامنے ایک بھائی کا جنازہ رکھا ہے تم پر حملہ کر سکتے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمانوں کے حق سے اس طرح ہولی کھیلو تو یہ حفظ الرحمن کی زندگی تک ممکن نہیں ہیں
جڑ نہ نہیں ہونے دوں گا۔

مولانا کے آپنی ارادے نے ان وحشیوں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ لہ
کنور مندر سنگھ آئی۔ ایس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سنگد لکھتے ہیں:
"۱۹۴۷ء کے فسادات کے فوراً ہی بعد جب میں وہاں میں بطور مجسٹریٹ تعینات تھا۔ ان دنوں میں اکیلا ہی جاؤں گا مجھے وقت بے وقت وہاں کے گلی کوچوں میں گشت کرنا پڑتی تھی کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے

تھے۔ جو شخص اپنے عقائد کا پکا جوہر اور بھی ہوا کرتا ہے اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کیے ہیں مولانا بھی اپنے دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ میں گھبراتے نہیں تھے میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹے دیکھا ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا میں پولیس کے گرفتار موقع پر پہنچا۔ دیکھا کہ مولانا پہلے ہی وہاں موجود ہیں میں نے گزارش کی کہ اب آپ تشریف لے جاتیے ہیں یہاں کی دیکھ بھال کروں گا میں نے ہر چند جاہر کہ پولیس ساتھ کروں تاکہ مولانا کو گلی قاسم جاں تک پہنچا آئے، لیکن مولانا نے انکار کر دیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی جاتوں گا میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لیے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جاں کی طرف چل پڑے بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے ان کے پیچھے ہوا تاکہ ہارانتے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آجائے۔ مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سرمایہ تھی جسے ہم کسی قسم کے حادثہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے اس واقعہ کا ذکر آج پہلی بار کر رہا ہوں مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔

مجاہد ملت کے تین خاص وصف
مجاہد ملت کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے تین جوہر ایسے عطا فرمائے تھے جنہوں نے مجاہد ملت کو ملک و ملت کا بہترین رہنما بنادیا اور جن کی وجہ سے نہ صرف ان کی شخصیت ابھری بلکہ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی ان صفات اور شخصیت سے حیات تازہ کا پیمانہ یاد و زہن ہندوستان میں ان کی حیثیت غلاما نہ ہو گئی تھی۔ مولانا کے یہ تین جوہر تدبر، جرأت اور خطاب تھے۔ تدبر سے تقاضہ وقت سمجھ کر جرأت سے علی اقدام اٹھاتے اور قوت بیان سے سمجھاتے تھے۔

مجاہد ملت کا حسن تدبر اور گاندھی جی
مجاہد ملت اور ان کے رفقاء کا اتفاق گاندھی جی سے پہلے سے تھا۔ جیسے ہی گاندھی جی لوکھالی اور کلکتہ سے واپس پھر دہلی پہنچے مجاہد ملت کا حسن تدبر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سر نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کو پختہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگریس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمن صاحب اور ان کے ساتھیوں پر گاندھی جی ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے ان کی اتنی مخالفت کی کہ انہیں اپنی پرلافتہ کالجوں میں ترمیم کرنا پڑی، مجاہد ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبوذاڑا تھے گاندھی جی کے دست راست بن گئے مجاہد ملت کو سبمان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔ بلکہ عجیب و غریب حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد سعید جو چند سال سے قلب کے مرض میں مبتلا تھے۔ نقل و حرکت سے معذور ہو کر تقریباً گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ مجاہد ملت نے ان کو کچھ عزت سے نکالا بلاشبہ سبمان الہند کا خود اپنا جذبہ اور ان کے قلب بیمار کی جی ٹیپ تھی کہ انہوں نے مجاہد ملت کی دعوت پر لبیک کہا اور ضعف و ناتوانی سے نکل آئے۔

جمیعت علماء ہند کے دفتر میں اس وقت تک کوئی گاڑی نہ تھی دلی کے مشہور تاجر حافظ محمد نسیم صاحب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی وہ صبح گاڑی لے کر دفتر پہنچ کر مجاہد ملت کو ساتھ لے کر مولانا احمد سعید کے پاس جاتے وہاں ایک مشہور صحافی سید محمد جعفری سابق ایڈیٹر "ہمدرد" وقت بھی وہاں موجود ہوتے یہاں سے پھر چاندوں حضرات گاندھی جی کے پاس جاتے اور ان کو شہر کے صحیح صحیح حالات بلا کم و کاست روزانہ سناتے۔ شروع شروع میں گاندھی جی نے اپنے طور پر دوسرے اسباب و ذرائع سے بھی حالات کا جائزہ لیا اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ چھڑا مجھے بالکل صحیح حالات سے روشناس کراتے ہیں تو پھر ان پر اتنا اعتماد کرنے لگے کہ وزیر داخلہ راز پٹیل باوجود پوری کرشموں کے انکے اس اعتماد کو ختم نہ کر سکے۔

کانگریس کے لیڈر فسادات کے بارے میں مختلف جذبات رکھتے تھے جن کی بند پر گاندھی جیسی مہاتما شخصیت کی کوشش بھی ناکام ہوئی۔ ایک دفعہ مجاہد ملت نے دہلی کے بڑے کثیر اکثریت مسٹر منہا کو ہنگاموں اور فسادات کے متعلق شکایات کیں اور گاندھی دھر دکانظر اور منشا سمجھانے کی کوشش کی تو مسٹر منہا کو فوراً تیوری بدل کر جواب دیا۔ ہمارا تعلق سردار پٹیل سے ہے اور وہ ہمارے کام سے مطمئن ہیں۔ تاہم گاندھی جی کا اثر و رسوخ بھی معمولی نہ تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام لچادریوں اور بے بسیوں کے باوجود جو جیتہ علما کے کا کار حامی تھے کہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے افسر طنزاً کہا کرتے تھے کہ دہلی میں حکومت جیتہ علما کی ہے۔

مجاہد ملت نے کارپردازان حکومت کے دروازوں پر دستک دے کر ان کو آرام گاہوں سے نکالنا جدوجہد کی مختلف صورتیں کو سمجھنا اور ان سب کی بے نیازی و بے اعتنائی ختم کر کے ان کو مسلمانوں کی امداد و اعانت پر بے شمار خاندان متفرق محلوں میں موت کے منہ میں چھینس گئے تھے ان کو انہی بے نیاز ممبروں کے ذریعہ تباہی سے بچایا۔ بارہا ایسا سوکار پولیس فراہم ہو سکی تو بنام خدا اس موت کے منہ میں مجاہد ملت خود کو دے اور زندگی سے پاپس انسانوں کو بایں دنا امید کی غلطی سے نکال کر گرفت پر پہنچایا۔ قدرت باری تعالیٰ حضرت مولانا کی محافظہ نگران تھی حضرت مولانا چونکہ مسلمانوں کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر چکے تھے اور وہ دہلی میں مسلمانوں کا ایک بہت بڑا سہارا تھے اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ مسلمانوں کا تحفظ کر رہے تھے۔ لہذا مولانا کو کوئی گزند نہ پہنچا حالانکہ شہر مسلمان شہید ہوئے۔ مجاہد ملت کی ہمت مرواز اور استقلال و استقامت دیکھ کر بے شمار کارکن بھی اسی راہ پر چل نکلے اور انہوں نے خطر مجاہد ملت کی طرح جان نذر کر مسلمانوں کی خدمت کی۔ یہ حضرت مولانا کی معنوی وحسی کرامت تھی۔

مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے لیے مجاہد ملت نے اپنے مذہبی مسلک اور عقیدہ کو معیار نہیں بنایا کسی جگہ سنت اور حد نہیں تھا، بلکہ سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کے شہری حقوق بحال کیے جائیں، ان میں تعزیر کے رمیں، عرس وغیرہ بھی آتے تھے۔ بلکہ بعض پر نہ صرف خود کے بلکہ گاندھی جی کو بھی ساتھ لے گئے۔ حکومت نے اہتمام کیا کہ حسب سابق تعزیر بنائے جائیں اور باضابطہ جلوس نکلیں تعزیروں اور عرسوں کے متعلق مسلک دیوبند ڈھکا چھپا نہیں ہے، لیکن مجاہد ملت ان دفتوں تمام مسلمانوں کے حقوق کے لئے تھے ہندوستان کی تمام درگاہوں اور خاندانوں کی حفاظت کا انتظام کر دیا۔ اجیر، سرہند، بسی، قطب شریف (یعنی درگاہ خواجہ قطب) اختیار گاہ کی تمام جگہوں کے متعلق مفصلاً کوششیں کیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شاہ افغانستان نے ہندو جواہر لال نہرو کو حضرت مجاہد کی خانقاہ کے متعلق نار دیا تھا اور یہی حقیقت ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے منصب اور شخصیت سے کام لے کر ان تمام امور میں مدد لے رہے تھے لیکن عوامی سطح پر جس نے سب سے زیادہ کوشش کی مولانا حفص الرحمن کی ذات گرامی قدر ہے۔ قطب صاحب کام میں پیچیدہ تھا کیونکہ مرولی جہاں یہ درگاہ ہے ایک لاکھ شرارتی مغربی پنجاب وغیرہ سے آکر یہاں آباد ہو گئے تھے خانقاہ کا کورڈز ان سے ہوا تھا۔ اس خانقاہ کو خالی لکھنا ایک لاکھ شرارتیوں سے ٹکرائی تھی اور ان سے ٹکرائی تمام ہندوؤں کو مشعل کرنا تھا تاہم اس کے باوجود کوشش کی گئی۔ سردار پٹیل کی ڈیوٹی پر بار بار گئے چیف کمنڈر اور ڈپٹی کمنڈر سے التماس کیں، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر گاندھی جی کو بھیج دیا گیا بلکہ ان کو پیشہ میرا نا لیا۔ مولانا احمد سعید صاحب دروازہ حضرت قطب صاحب کے حالات گاندھی جی کو ایسے انداز میں سناتے کہ وہ بالآخر بغیر نہ سکے اور انہوں نے دہلی شہر میں فسادات رونے اور مسلمانوں کی جان و مال محفوظ کر کے کی خاطر و جنوری ۱۹۴۸ء کو جب ان کا رکھا تو بہت کمونے کی آٹھ شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ قطب صاحب کی خانقاہ مکمل طور پر خالی کرانی جائے۔ جب گاندھی جی کو یہ

ہو گئی اور خانقاہ خالی ہو گئی تو عرس میں چند دن باقی رہ گئے تھے چنانچہ ان حضرات کی بلین کو کششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی نے عرس میں شرکت کی خواہش کی اور ان حضرات نے بھی اس کو حالات کے مناسب سمجھا اور گاندھی جی نے شرکت کی۔

پانی پت میں تقریباً تیس ہفتیں ہزار افراد کے متعلق (بھارگو حکومت) اخراج کا فیصلہ کر چکی تھی مگر وہ لوگ رہنا چاہتے تھے۔ مجاہد ملت یہاں گاندھی کو دو دھڑے کر گئے اور فضا ہوا کر کے کہ کشش کی، لیکن انہوں کو دہلی کے مسلمان استقلال کا ثبوت نہ دے سکے۔

دہلی اور اور پرت پور کی ریاستوں کی کھلی ہوئی یہ پالیسی تھی کہ وہ مسلمانوں کا نام و نشان ختم کر دیں اور اس پر عمل شروع میوات کا مسئلہ کر رکھا تھا۔ یہاں کے مسلمانوں میں زیادہ تعداد میواتیوں کی تھی ان ریاستوں کی حدود ضلع گورگاراؤں سے ملتی تھیں یہاں بھی کافی میواتی مسلمان موجود تھے تقسیم سے قبل مسلمان میواتیوں اور ہندو جاٹ یہاں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ لیکن پھر ان میں الٹی حیرت آگئی ضلع ہو گئی کہ کئے کے فسادات بھی ان کے اتحاد کو ختم نہ کر سکے، لیکن تقسیم کے بعد ان ریاستوں کے حکمرانوں نے میواتیوں اور مسلمانوں کے جبراً اخراج کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے قتل عام شروع کر دیا۔ اگرچہ میواتیوں کی ادھی تعداد ترکی وطن کر گئی تھی۔ مگر باقی ماندہ تقریباً تین لاکھ اپنی ثابت قدمی اور مضبوطی کے باوجود کسی پشت پناہ اور دستگیر کے نتائج تھے بالخصوص ایسی حالت میں کہ الورا اور پرت پور کی ریاستوں کے علاوہ مشرقی پنجاب کی بھارگو حکومت اور مرکز میں سردار پٹیل ہوم منسٹر کا منصوبہ یہ تھا کہ راجھانی دہلی سے ملے ہوئے علاقے کو شمعہ کر لیا جائے کہ اس محفوظ علاقے پر مسلمان کا سایہ بھی نہ پڑ سکے اس علاقہ میں خشک پہاڑیاں ہیں وہ اکثر مرقع پر میواتیوں کے لیے پناہ گاہ بن جاتی تھیں بلکہ اس موقع پر وہ بھی پناہ گاہ نہ بن سکے ان کو کرہ استقلال کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مجاہد ملت کی صورت میں یہ کہ استقلال خود ہوا آپ نے متعدد مرتباً اس علاقے کا دورہ کیا۔ رفیقوں کو بھیجا۔ گاندھی جی کے یہ بات ذہن نشین کرانی۔ کہ گاندھی جی نے ان میواتیوں کو اپنی جگہ آباد کرنا اپنا نصب العین بنالیا۔ اس سے زیادہ اور یہ کہ گاندھی جی نے کانفرنس میں کھلے اجلاس میں کہا کہ میواتی بھارت کی ریٹھ کی پڑی اور ہمارے ملک کا گڑھا خون ہیں ہیں کبھی ہوا داشت نہیں کر سکتا کہ وطن کا گڑھا خون اس کے بدن سے نکال دیا جائے ان کے متعلق کانفرنس ہوئی جس میں مولانا حفص الرحمن کے مشورہ پر کثیر تعداد میں میواتی شریک ہوئے۔ گھاسیہ مقام پاس کانفرنس میں پنجاب کے چیف منسٹر گوپی چند بھارگو بھی شریک ہوئے لیکن ان کی تقریر گاندھی کو مطمئن نہ کر سکی۔ گاندھی نے حکومت کے ذرائع سے علیحدہ ہو کر اپنے خاص و درکوں کو اس علاقہ میں لٹایا جو کئی سال تک یہاں کام کرتے رہے گاندھی کے مشورہ چیلے و فود بھادے نے گاندھی جی کے حکم سے بڑے علاقے کا دورہ کیا جو مسلمان جہنڈوں کی دہشت کی وجہ سے بند ہو گئے تھے ان کی چوٹیاں کوٹھڑیاں اور یہ سب کچھ نتیجہ تھا مولانا حفص الرحمن کی اس سعی بلین اور جدوجہد مشرور کا جس کا ادبہر ذکر ہوا۔

دہلی کے علاوہ بوپتی وغیرہ دوسرے صوبوں کے ہزاروں بلکہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان جہنڈ دہلی والوں سے زیادہ واقف تھے ان کو یہاں کی چور گلیوں اور کوچوں کی خبر تھی وہ اپنے آپ کو جب حادثات کے ان طوفانی حوادث میں گھرا ہوا پاتے تو اپنی موت سے زیادہ غریب الوطنی اور اپنے عزیزوں سے جدائی کا حدیران کے ہوش لگ کر دیتا تھا مجاہد ملت نے اصرار کر کے حکومت کی طرف سے اسپیشل ٹرینوں کا انتظام کرایا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے مقامات پر پہنچے تو ان کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ یاد آ گیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شکم میں ہی سے صحت سالم نکالا تھا۔

مجاہد ملت کا نمبرائے نظر صرف یہی نہیں تھا کہ مسلمانوں کی جانیں بچ جائیں اور ان کے مال محفوظ رہ جائیں۔
 شیرازہ بندی مسلم پراگندہ آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان اپنے وطن میں مہلوانہ حیثیت سے باعزت شہری بن کر رہیں۔ یعنی جس طرح
 وہ اپنے جان و مال، عزت و آبرو کی طرف مطمئن ہوں اس طرح ان کو اپنی تہذیب اپنے مذہب اور اپنے مذہبی مراسم کی طرف سے بھی اطمینان ہو کہ یہ سب
 محفوظ ہیں اور ان کو آزادی ہے کہ جس کام کو وہ مذہبی کام سمجھتے ہیں اس کو آزادی سے کرتے رہیں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے
 پاکستان کا ہر ایک حامی نہ صرف مصیبت زدہ اور مایوس تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا تھا۔ خدای کا ایک عام ازام پاکستانی شہزاد تھیں اور ہندو
 فرقہ پرستوں کی گرجنی ہوئی کہ سخت آوازوں کے ساتھ ان کے سر تھوپا جا رہا تھا۔ ان حالات میں تمام قوم پرور مسلم رہنماؤں کے سامنے خود اپنے مت
 ایک سوال تھا۔

وہ ہندوستان میں رہیں تو کس حیثیت سے خود ان کی پوزیشن کیا ہو اور عام مسلمانوں کی پوزیشن کیا
 ہو یا خصوصاً ان مسلمانوں کی پوزیشن کیا ہو جو پاکستان کے حامی تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد صاحب
 مولانا احمد سید صاحب دہلوی اور ان سے وابستہ حضرات سب ہی نے ان سوالات کا باعزوم و جہت اور بلند حوصلہ کے ساتھ سامنا کیا مگر جس شخصیت
 سب سے زیادہ اس میدان میں کام کیا اور اپنی زندگی اسی مقصد اور نصب العین کی طرح دی اور عوامی لیڈر کی حیثیت سے سب سے زیادہ جرأت اور
 کے ساتھ ان سوالات کو حل کیا بلکہ جس نے حل کے منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے جان کی بازی لگا کر شب و روز کے ہر ایک لمحہ کو اپنی جدوجہد سے
 جاودید بنا دیا وہ یہی مرد مجاہد تھا جس کو اس کی قوم نے بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

ہندوستان ہمارا وطن ہے یہ چاری روایات کا مخزن اور ہماری تہذیب و ثقافت کا گہوارہ ہے
 اسکی رو دیوار پر ہماری ہزار سالہ تاریخ کے نشانات کندہ ہیں اگر پنڈت جواہر لال نہرو کو یہاں رہنے
 کا حق حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں جیسا چلا سق بھی اس سرزمین پر نہ ہو۔ وطن عزیز پر ہمت
 حادثہ آئے ہیں ایک حادثہ وہ تھا کہ برطانوی سامراج یہاں مسلط تھا ایک حادثہ یہ کہ ہندو واریت کا
 دیو جلا کر ہو رہا ہے۔ اگر ہم نے تمام جمہوریوں اور لاجپالوں کے ساتھ برطانوی سامراج کے مظالم کا
 مقابلہ کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندو جو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں مرد ہمارے نہیں اور مرعوب ہو کر
 وطن عزیز کو خیر باد کہیں۔

ہمیں میں رہنا ہے اور باعزت طور پر ان تمام حقوق کے ساتھ رہنا ہے جو ایک باعزت شہری
 کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ بیشک ہم منکروم ہو سکتے ہیں مگر غلام نہیں بن سکتے اگر ہم نے برطانیہ کی غلامی
 برداشت نہیں کی تو ہر اکثریت کی غلامی بھی برداشت نہیں کر سکتے ہم آزاد شہری کی حیثیت سے
 یہاں رہیں گے اور نہ صرف حفظ الرحمن ابوالکلام نہ صرف قوم پرور مسلمان بلکہ کروڑوں مسلمان جو
 ہندوین ہیں میں سب باعزت شہری کی حیثیت سے رہیں گے۔ پاکستان بن چکا۔ اس کی حمایت اور
 مخالفت کا سوال بھی ختم ہو گیا۔ اب ہندوین کے تمام مسلمان ایک کشتی کے سوار ہیں ایک کی کھلیت

سب کی تکلیف ایک کی ذلت سب کی ذلت۔

یہ تھے وہ تصورات اور جذبات جن کو مجاہد ملت نے اپنایا اور جن کے لیے اپنی تمام کوششوں کو صرف فرادیا۔ وطن دوستی قوم پروری اور حقوق شہریت میں مساویانہ حیثیت حاصل کرنے کے جس بلند نظریہ کے ساتھ وہ ملی میں کام کیا گیا اور جس طرح مسلمانانِ دہلی کے ذہنوں کو احساسِ کتری سے محفوظ رکھا گیا ضرورت تھی کہ انہیں جذبات اور نظریات پر چند یونین کے مسلمانوں کو متحد کیا جائے اور قیامت خیز حکاموں نے جو خوف و ہراس عام مسلمانوں میں پیدا کر دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ احساسِ کتری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنے متعلق غلامی کا فیصلہ کر لیں۔ ضرورت تھی کہ اس پست احساس کی کٹائی ان کے ذہنوں سے صاف کی جائے ان مسلمانوں کے لیے ایسی روشنی کی ضرورت تھی جو گمراہی کے گمراہی کے ایک معین راستہ کی نشاندہی کر سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندو یونین کے تقریباً ساٹھ تین کروڑ مسلمانوں کی اس عمومی حالت کے احساس نے سب سے پہلے **کنفرس کانفرنس** مولانا ابوالکلام آزاد کو متحرک بنایا چنانچہ آپ نے پورے ہندوستان کے ممتاز مسلم رہنماؤں کی ایک خصوصی کانفرنس ۱۳ نومبر ۱۹۴۶ء کو دہلی میں طلب کی جبکہ ۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء کو کانگرس کا اجلاس دہلی میں ہونے والا تھا جس میں فرقہ واریت اور فرقہ وارانہ تنظیمات کے خلاف تجویز منظور ہونے والی تھی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں طلب کیا گیا اور ایک عام کانفرنس کنفیڈریشن میں طلب فرمایا آزاد کانفرنس کے نام سے اب تک مشہور و معروف ہے مگر جہاں تک عملی جدوجہد اور انتظامات کا تعلق ہے چونکہ مولانا حفیظ الرحمن نے دست راست بلکہ پیکرِ عمل بن کر کام کیا۔ اس لیے ان دنوں کانفرنس کی کامیابی کا سہرا بھی مولانا حفیظ الرحمن صاحب کی شخصیت ہی کو اُترتا کرتا ہے۔ نومبر ۱۹۴۶ء کو فسادات کا دورِ شباب تو نہیں کا جا سکتا مگر دہلی میں خونِ مسلم کی کٹی قحطیت اب تک بھی قائم نہیں ہوئی تھی، خاص انتظام کے بغیر گلیوں اور کوچوں میں کوئی شخص اپنی جان پر کھیل کر ہی گزر سکتا تھا۔

دہلی جکشن اب بھی خیر محفوظ تھا خود پلیٹ فارموں پر سخت سے سخت جانی اور مالی حادثے پیش آجاتے تھے دہلی کے پُر خطر دو دریا داخل ہونے سے پہلے آئے والے بحرین کا اس طرح استقبال کیا جانا کہ وہ حفاظت کے ساتھ اپنے تجویز کردہ قیام گاہ تک پہنچ سکیں یہ اقدام سے چل کر بحفاظت تمام کانفرنسوں میں شرکت کر سکیں پھر اس پریشانی کے دور میں فرائضِ عبادت انجام دینا بہت ہی خطرناک اور پریشانی کن خدمت تھی جس کو نہایت بلند آہنگی اور عرشِ سلوکی کے ساتھ مجاہد ملت نے اپنے مخلص فقہار کی مدد سے انجام دیا جمعیتِ علمائے ہند کے کچھ رضا کاروں کو اپیشیل پولیس کی حیثیت دیے دی گئی تھی۔ ان کو بند و قید بھی دے دی گئی تھیں۔ یہ مسلح دستے حضرت مجاہد ملت کے زیرِ امان ہر ایسے موقع پر فرائضِ حفاظت انجام دیتے تھے اتنا یہ قربان تک مسلمانوں کا پہنچنا مشکل تھا تھا تو یہی دستِ جہازہ کے ساتھ جاتا تھا۔ ہفتہ میں دو یا تین بار اس دست کو جناح پنپانے کی ڈیوٹی لایا حالانکہ انجام دینی پڑتی تھی۔ یہ رضا کار اور کچھ اور ساتھی غازی آباد بھیج دیے گئے تھے۔ آئے والے مہانوں کو غازی آباد آتا لیا جاتا تھا اور وہاں سے چپ کار یا موٹروں کے ذریعہ محفوظ راستوں سے نکال کر قیام گاہوں پر پہنچایا جاتا تھا

لکھنؤ میں یہ کانفرنس آزاد کانفرنس ۱۳ نومبر ۱۹۴۶ء کو ہونے والی تھی۔ دہلی کی اس وقت یہ حالت تھی کہ صرف ریلوے جکشن پر ہزاروں شرارتچی پورا پورا نا امانیت لیے ہوئے قیام پذیر تھے۔ نا امانیتِ البیت کے انباروں نے تمام پلیٹ فارموں کو گورام بلکہ خطرناک گھاٹیاں بنا رکھا تھا پلیٹ فارم پر گزرنے والے ایک کے لیے مشکل تھا مگر خاص طور پر مسلمانوں کے لیے حدودِ جد و جدویشیں تھا خیر زنی کے واقعات رات دن ہوتے رہتے تھے۔ لکھنؤ کانفرنس میں دہلی سے نمائندگان کی بڑی تعداد جاتے والی تھی تو اس وقت مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی جدوجہدِ نتیجہ خیز ثابت ہوئی کہ ان کے لیے اپیشیل ٹرین کا انتظام کیا گیا۔ پولیس کا ایک دستہ ٹرین کے ساتھ گیا۔ دہلی جکشن کے جس پلیٹ فارم سے یہ اپیشیل ٹرین روانہ ہوئے والی تھی وہاں

پولیس کا خاص انتظام کیا گیا۔ ان تمام انتظامات کو مولانا آزاد کے اشد رسوخ نے آسان کیا مگر ضرورتوں کا نقشہ تیار کرنے والے پھر اس میں عمل اور کردار کا رنگ بھرنے والے مجاہد ملت تھے۔ رحمہ اللہ دہلی کے علاوہ اور علاقوں میں یہ دشواریاں نہیں تھیں۔ چنانچہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تقریباً ایک لاکھ مدعوین اور ارکان و نمائندگان نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

حضرت مولانا آزاد کی تقریر صدارت یقیناً ایک تاریخی تقریر تھی مگر جس نے مسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس کے اعلیٰ نصب العین کی روشنی دکھائی اور ایک بلند ترین مقصد کا عزم ان کے ذہنوں میں برانگیختہ کیا وہ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر تھی اسی پر کامیابی کا کریدٹ آپ کو دیا گیا۔

بہر حال ۲۸، ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو یہ کانفرنس لکھنؤ میں کی گئی سمجھے ہوئے مسلمانوں نے اس کانفرنس کو پیغامِ مذمک کیا اور ملک کے تمام گوشوں سے سفر کر کے اس کانفرنس میں شریک ہوئے مسلمانوں کا اس سے بڑا اجتماع نہ اس کے

پہلے بھی دیکھا نہ اس کے بعد آج تک دیکھا گیا یہ کانفرنس اصولی اور بنیادی طور پر اس بات کی ضمانت تھی کہ مسلمانوں کا دامن فرقہ واریت سے پاک اور وہ ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر ترقی پذیر عصر کی حیثیت سے ملک کی خدمت کے لیے آمادہ ہیں۔ اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ کے خطرات سے ملک کو آگاہ کیا گیا، صوبائی حکومتوں سے فرقہ واریت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا کہ وہ فرقہ پرور عناصر سے اپنے نظام کو پاک کر کے فرقہ وارانہ جمہوریت کو کامیاب کرنے کی طرف تیزی اور مستعدی سے قدم بڑھائیں اس کانفرنس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے دامن ان تمام وحشوں کو دھوا گیا جو فرقہ پرستوں کی طرف سے لگائے جا رہے تھے۔ اس کے بعد خوف و ہراس اور احساسِ کمتری کے باقی رہنے کے معنی نہیں تھے۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمیٹہ علمائے ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر

اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ٹیڑھ گھنٹہ دلوں کو آگاہ اور تاریخی تقریر فرمائی۔ مسلمانانِ ہند کے ایک لاکھ نمائندوں نے جب یہ تقریریں سنیں اور کانفرنس کے دہ روز کی کارگزاری کا مشاہدہ کیا۔ اس تجزیہ پر غور و خوض کیا تو پھر وہی شخص خوف زدہ اور ہراساں رہ گیا جو ردل تھا۔ بایں کے وہیں کھوٹ تھی جمیٹہ علمائے ہند کے ارکان نے پورے ملک میں دورے کر کے کانفرنس کے حیات بخش فیصلوں کو بھرپور سننے والے کان تک پہنچایا اور کروڑوں مسلمانوں کو جو مستقبل سے یابوس ہو چکے تھے۔ اطمینان بخش روشنی سے آشنا کیا

مجاہد ملت معمارِ سیکولرزم اگر جمہوریت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر ایک باشندہ ملت بشری حقوق میں مساوی درجہ کا مالک ہو ہر ایک

کوزندہ رکھ سکے جہاں تک ممکن ہو ترقی دے سکے تو ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذہبوں کے ماننے والے مساویہ مذہبی حقوق کے ماننے والے ہیں مستحق ہیں، جمہوریت کا لازمی تقاضہ یہ بھی ہوگا کہ نظامِ حکومت سب مذہبیوں کو لایا نہی ہو۔ جبکہ ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہیں بہت سے فرقے اور بہت سے مکتبہ خیال موجود ہیں تو ”سب مذہبی نظامِ حکومت“ ناممکن العمل بھی ہو گا اور اتحاد و یک جہتی پیدا کر کے بھائے تقسیم و تقسیم اور انتشار و انتشار پیدا کر دے گا۔ وطن کی ملکی امور میں یک جہتی صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ مذہبیات سے الگ حکومت اور سیاست کا تعلق صرف ملکی امور سے ہو مذہبی معاملات میں حکومت قطعاً غیر جانبدار رہے، نہ کسی مذہب کی پشت پناہی

نکسی کی مخالفت۔ لادینی حکومت کا یہی مطلب ہے جس کو سیکولر حکومت کہا جاتا ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہنگامی حالات میں ہندو فرقہ واریت کے مقابلہ میں سینہ تان کر کھڑے ہو گئے پھر جیسے جیسے فسادات کے آتش فشاں شعلہ بار ہوئے۔ مجاہد ملت کی سرگرمیاں ان کے مقابلہ میں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ شعلے سرو پڑے اور وہ سیلاب پایاب ہوا۔ ظاہر ہے وہ ہندوین میں سیکولرزم ہی کے حامی ہو سکتے تھے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستان کا دستور اساسی منظور کیا جا رہا تھا فرقہ پرست طاقتوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ جب اسلامی حکومت کے نام پر پاکستان بنوا جائے تو لاچار ہندوین ہندو حکومت ہو۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب کانٹھی ٹیوٹ اسمبلی کے باقاعدہ ممبر تھے۔ ایک سب کیٹی کا ممبر آپ کو بنایا گیا تھا، مگر آپ کی تمام سرگرمیاں ان کو ملک پہنچانے میں صرف ہوتی رہیں جن کو باقی سیکولرزم کہا جاسکتا ہے یعنی مشرک گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم حکومت ہند۔

اس ماحول میں کہ فرقہ واریت شباب پرتھی اور ہر طرف فرقہ وارانہ جذبات کا دیورقص کر رہا تھا۔ سیکولرزم کو دستور اساسی کی بنیاد قرار دینا ایک ایسی عجیب بات تھی جس کے لیے مذہب کی زبان میں کرامت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یعنی ظاہر ہی اسباب کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو کامیاب ہو مگر جو نتیجہ ظہور پذیر ہوا وہ اس کے خلاف اور قطعاً غیر متوقع تھا۔ سیکولرزم کا تصور کامیاب ہو سکا یا نہیں یہ ایک مستقل مسئلہ ہے اگر پندرہ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ ناکام ہے تو اس کے اسباب پر بحث کی جاسکتی ہے مگر جہاں تک مجاہد ملت کی مساعی کا تعلق ہے ان کے دشمنان پیشانی و اعداء نہیں ہو سکتے بلکہ حالات کی نامساعدت اس کو اور زیادہ بدمدار بنا دیتی ہے۔ جب نظریات کا تصادم ہو تو اس کا اثر قومی کردار پر بھی پڑتا ہے چنانچہ ایک طرف سیکولرزم کے بانی اور معارض صاحبان کی کوششیں سیکولرزم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوتی رہیں تو دوسری جانب فرقہ پرست جماعتوں نے جہاں موقع ملا مسلمانوں کے عین سے ہولی کھیلی مسلمانوں کی مظاہرہ تباہی اور بربادی کا صدور مجاہد ملت سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے، مگر ہر موقع پر ایک اور صدور بھی آپ کے دل و دماغ کو متاثر کرتا رہا یعنی ہر ایک ہنگامہ اور فساد سیکولرزم کی تحریک کے خلاف ایک حملہ ہوتا تھا جس سے منزل دور ہو جاتی تھی۔ مجاہد ملت جیسے حساس مسافر کے لیے دوسری منزل کا صدور بھی کچھ کم نہیں تھا چند سال تقیاً ایسے کر کے کہ جذبات جو ۱۹۴۷ء میں مشتعل ہو چکے تھے وہی ان ہنگاموں کا سبب ہوتے تھے، لیکن ۱۹۵۲ء کے الیکشن میں جب ملک کے عوام نے ۱۹۵۱ء فی صدی ووٹ غیر فرقہ پرست سیاسی جماعتوں کو دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ملک کے عوام باشندے اپنا مذہب کچھ بھی رکھتے ہوں۔ وہ فرقہ پرستی کے حامی نہیں ہیں تو اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی دھم داری عوام پر نہیں ڈالی جاسکتی تھی بلکہ مقبولیت پسندی کا تقاضا یہی تھا کہ فرقہ وارانہ ہنگاموں کا زور دار ان مٹھی بھر غلط کار لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو قرار دیا جائے جو زیادہ طور پر سیکولرزم کے مخالف ہیں اور اپنی غلط حرکتوں سے عوام کو گمراہ کر کے ہنگاموں کی آگ بھڑکاتے ہیں، چنانچہ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت کے سربراہوں کو بار بار اس طرف توجہ دلائی۔ بعض سربراہوں سے اس سلسلہ میں تلخ کلامی تک کی نوبت آئی اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت یعنی ۱۹۵۳ء میں اگر صوبائی حکومتوں کے سربراہ مقبولیت پسندی سے کام لیتے اور اگر مجاہد ملت کے دروہل کا ایک کرشمہ بھی ان کو میسر ہوا ہوتا تو وہ تقریباً تقیاً سامنے آتا جو ۱۹۵۹ء میں قوم کا سرطان بن کر سامنے آیا۔

میں اندوس سے کہنا چاہتا ہوں کہ صوبائی حکومتوں کے بہت سے دھم داروں اور بعض مرتبہ مرکزی حکومت کے بھی بعض دھم داروں کی ذہنیت ایسی رنگ میں رنگی رہی جو فرقہ پرست جماعت اور اس کے پریس کا خاص شوق تھا۔ انتہا یہ کہ ان عین ہنگاموں کو بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں ہوتے

ہے۔ قوم پرستی ہی قرار دیا۔ بہت سے بہت لفظ جارحانہ کا اضافہ کر دیا یعنی فرقہ پرستوں کی جگہ گمراہیاں قوم پرستی کا تقاضا ہیں۔ فرقہ صرف یہ ہے کہ بیجا ہندو قوم پرستی ہے جبکہ مظلوم مسلمان کی آہ و زاری کو بھی فرقہ واریت اور ذمہ صرف فرقہ واریت بلکہ پاکستانی ذمہ نہایت کا نشانہ قرار دیا جاتا رہا۔ مجاہد ملت کا طرف دینے اور حصد عالی یقیناً اپنی مثال آپ تھا کہ باوجودیکہ سربراہوں کی یہ مسموم ذمہ نہایت مجاہد ملت کے لیے رات دن کی کڑھ تھی تب بھی سیکولرزم کی حمایت میں اٹھتا ہوا قدم تیز سے تیز تر ہو رہا تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی لغزش اس قدم میں آئے، لیکن چند سال بعد ہی ذمہ داران حکومت کی اس چشم پوشی کا نتیجہ سامنے آگیا جب ۵۹ء میں انہوں نے دکھا کہ عدوان کا ماحول ان کے خلاف ہو چکا ہے اور کاربر و ازاران حکومت کی اکثریت فرقہ واریت کی وبا میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۲ء کے وقتی جنگوں کے بعد جو فسادات گزشتہ پندرہ سال میں ہرے اکی نماز جنگ ہر فساد کے موقع پر جمعیت علماء ہند کی طرف سے فوج بھیجے جاتے تھے، اور تم رسیدہ مسلمانوں کی امداد کی جاتی تھی، مگر ان دفعہ میں خود مجاہد ملت شریک نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ اہم مواقع پر مولانا محمد میاں صاحب کو بھیج دیا کرتے تھے، ورنہ اور مساجد میں کامور فرادہ جیتے تھے، مگر ۵۹ء میں رمضان شریف کے ایام میں مبارک پور اور بھوپال میں جنگ لگے ہوئے ان کا جائزہ لینے کے لیے خود مجاہد ملت نے سفر فرمائے۔ روزہ میں مجاہد ملت کی لڑائی بکلیاں بڑھ جاتی تھیں، مگر ان سفروں کے لیے نہ روزہ خذ بن سکا نہ ریاضی تکلیف راستہ روک سکی۔

۵۹ء کے جنگوں میں مراد آباد وغیرہ میں بھی بعض موقعوں پر ثابت ہوا تھا کہ مقامی حکام اور پولیس نے مظلوموں کی بجائے ظالموں کا دست و بن کر کام کیا ہے، مگر واقعات کچھ اس قسم کے تھے کہ حکام کی اس غلط کاری کا عندنا قابل تسلیم ہو سکتا تھا، لیکن مبارک پور اور بھوپال کے جنگوں نے کھلے طور ظاہر کر دیا کہ فرقہ واریت کی دبا سرکاری حلقوں کو بھی یہاں تک متاثر کر چکی ہے کہ بد امنی کے زمانہ میں پولیس بھی وہ کرتی ہے جو فرقہ وارانہ جاعتوں سے والدیہ اور رضا کار کر سکتے تھے۔

مجاہد ملت کا گمراہی حلقوں میں بہت کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ کانگریس ان کو الگیشن کے موقع پر ٹکٹ دیا کرتی تھی، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ مقبولیت اور کانگریسی حلقوں میں محبوبیت امیدواروں کی عملی طاقت کو کمزور اور ان کی قوت گویائی کو سلب کر دیتی ہے، لیکن مجاہد ملت کی ہمت عالی اس کمزوری پاک تھی، آپ نے خاموشی کے بجائے بے پناہ خطابت سے کام لیا، مبارک پور اور بھوپال وغیرہ کے جنگوں پر وہ بیانات دیے، جنہوں نے ان ریاستوں کے چیف منسٹروں کے درمیان ایسا محاذ قائم کر دیا جس کو توڑنے کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کو دخل دینا پڑا۔ ورلنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک طرف مجاہد ملت تھے اور دوسری جانب مدھیہ پردیس اور یوپی کے چیف منسٹر اور ان کے حامی صداقت، انصاف اور حقیقت پسندی نے حضرت مجاہد ملت کی قوت خطابت میں استدلال کی بے پناہ طاقت پیدا کر دی تھی، جس نے صرف چیف منسٹر صاحبان کو لا جواب ہی نہیں کیا بلکہ لکھنؤ وری ورلنگ کمیٹی کو مجاہد ملت کی حمایت پر مجبور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ جمعیت علمائے ہند کی جماعت طاقت، اس کی مجلس عاملہ کی تجاویز وہ متعدد میمورنڈم جو مرکزی حکومت کے اہلکار اور کانگریس کے ہائی کمان کو بار بار پیش کیے گئے تھے۔ حضرت مجاہد ملت کی پشت پر تھے، مگر یہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں بالخصوص جمعیت علمائے ہند کی خوش نصیبی تھی کہ مجاہد ملت کی پر شوکت خطابت اور ناقص تسخیر قوت استدلال ان کو ہیرا فاش تھی۔ آج اس قوت طاقت کے فقدان پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہندوستان کے دستور میں اگرچہ ہندوستان کی حکومت کو سیکولرزم نہیں لکھا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کنونشن کی تجویز عام لوگوں میں تو کیا حکومت کے دائرہ کار میں بھی اس کا احترام نہ کیا گیا۔ لوکل باڈیز، اسمبلی پارلیمنٹ وغیرہ گزری اداروں میں فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں سے آئے دن مسلمان تباہ ہو رہے تھے اور پھر یہ فرقہ پرستی فسادات کی صورت میں ہی ظہور پذیر ہوتی

تھی، بلکہ لازماتوں، لوکل باؤنڈیز، صوبائی اسمبلیوں، پارلیمنٹ وغیرہ سرکاری اداروں میں نمائندگی، کاروباری سلسلہ میں لائسنس وغیرہ غرض سماجی سیاسی اور کاروباری زندگی کا ہر ایک شعبہ اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ چند ماہ تک جمعیت علماء ہند کے پیش نظر یہ رہا کہ مسلمانوں اور صاف دماغ سمجھی ہوئی ذہنیت رکھنے والے چند رہنماؤں کا کنونشن طلب کیا جائے جو مشترک نمائندگی کے ذریعہ حکومت کو اس خطہ ناک صورتحال سے آگاہ کر کے اس کے علاج کا مطالبہ کیا جائے، لیکن اس میں دشواری یہ پیش آ رہی تھی کہ جن ہندو رہنماؤں کو خیر متعصب اور صاف دماغ سمجھا جاتا، ان کے سامنے بھی صحیح صورت حال نہ تھی کیونکہ وہ انگریزی یا ہندی کے اخبارات پڑھتے تھے اور ان اخبارات میں ان فسادات وغیرہ کی تفصیل ہی نہ آتی تھی اور اگر آتی بھی تھی تو اس میں اکثر جگہ مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا، خود مسلمانوں کا اونچا طبقہ انگریزی اخبارات پڑھتا ہے، دوسرا ذریعہ معلومات ریڈیو ہے تو وہ اخبارات سے بھی زیادہ سنگ دل اور غلط ثابت ہو رہا تھا، ایسے غیر مسلم رہنماؤں کا کنونشن نہیں دعوت دینے سے پہلے ضروری تھا کہ پمفلٹوں کے ذریعہ مستقل پروپیگنڈا کر کے پہلے ان کو روشناس کر لیا جائے بے شک بعض غیر مسلم رہنما مثلاً دہلی کے جن سے جمعیت کارابلہ رہتا تھا وہ واقف بھی تھے، لیکن وہ پہلے ہی مسلم لازمی میں بنام ہو چکے تھے۔

یہ مسئلہ ابھی زیر بحث تھا کہ جاہلین میں جمعیت علماء ہند کے سالانہ اجلاس کا وقت آگیا اور مجاہد ملت نے اس اجلاس عام ہی سے کنونشن کا پروا نہ کیا، چنانچہ اکثر مسلم رہنماؤں کو دعوت دی گئی اور یہ مقصد ایک حد تک پورا ہوا۔ اجلاس میں کھل کر ان حالات پر بحث کی گئی جن پر مدھیہ پردیس کے پریس نے کہ کہاں یہ اجلاس ہو رہا تھا، بہت کچھ اچھالا، لیکن اس اجلاس کے چند روز بعد جیل پور کا حادثہ مسلمانوں کے حق میں چھوڑا گیا بن کر رونما ہوا۔ مجاہد ملت نے پہلے ایک وفد جیل پور بھیجا، پھر خود تشریف لے گئے۔ حالات کا معائنہ کیا اور واپس آئے کے بعد پارلیمنٹ میں ایسی زبردست تقریریں کیں کہ جن سے نہ صرف ہندوستان کے ایران سیاست میں پھیل چکی ٹیگٹی بلکہ پارلیمنٹ کی صدا پوری دنیا میں گونج گئی۔ ہندوستان کے مسلمان جو پہلے اخبارات کی زبان سے جیل پور سا گرہ وغیرہ کے ناممقام حالات سن رہے تھے جب انھوں نے مجاہد ملت کی پارلیمنٹ میں تقریریں پڑھیں تو ان کی شکستہ پانی تیز گامی میں تبدیل ہو گئی اور لاکھوں روپیہ سے ان جگہ کے مسلمانوں کی مالی امداد کی ان فسادات کے بعد کنونشن کی ضرورت افادیت پھر کھل کر سامنے آئی اور جمعیت علماء ہند نے طے کیا کہ غیر مسلم رہنماؤں کو بلانا مشکل ہے لہذا تمام ملک سے مسلم رہنماؤں کو بلا یا جائے مجلس عالم کی تجویز جیسے ہی پریس میں آئی، پورے غیر مسلم پریس نے مخالفت میں آسمان سر پہ اٹھایا اور جو لوگ پہلے کنونشن کے لیے مہر تھے ان کا رویہ بھی بدل گیا اور وہ بھی علماء آدم کے ساتھ ہو گئے چنانچہ دو ہفتوں نے چندتہ جواہر لال نہرو کے پاس ڈیپوٹیشن کے جا کر کنونشن کے نقصانات بند نہ ہو گئے، زمین نشین کرانے کی کوشش کی، سپورٹمانڈ جی چیف نمبر پورٹی اور اجیت پرشاد جین جیسے کانگریسی لیڈروں کی دلیل یہ تھی کہ اس کنونشن سے فرقہ پرستی کو شعلے کی دھجی اس کا جواب دیں گے، یعنی آج تک فرقہ پرست طاقتیں خاموش اور قطعاً غیر متحرک تھیں اور اب ان میں حرکت پیدا ہو گئی ایک ایسا لیڈر جراج تک مقبول واجب الاحترام اور ہر عنصر پر رہا جو اس پر جب ہر طرف سے اعتراضات کی بجھاؤ چوتھو بہت مشکل ہے کہ اس کا قدم لغزش سے محفوظ رہے مگر مجاہد ملت کی لیڈری مضمری نہیں تھی، بلکہ آپ کی لیڈری ان جذبات صادق اور نمائندہ کنونشن کا ثمرہ تھی جو وہ قوم و ملک کے لیے کرتے آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے اخلاص صداقت پسندی اور بے پناہ قوت عمل کے ساتھ وہ جرأت اور وہ استقامت آپ کو عطا فرمائی تھی کہ اگر وہ پیش کی زیادہ سے زیادہ مخالفت بھی آپ کو متاثر نہ کر سکتی تھی اس موقع پر آرمیل حافظ ابراہیم (وزیر برق و آب) نے بھی غیر معمولی جرأت و استقامت کا ثبوت دیا پہلے آپ زبانی حمایت تھے ان دنوں عملی ہمدرد بن گئے۔ آپ نے سرکاری حلقوں کی غلط فہمی کو دور کر کے ان کے اندر بھی حمایت کا جذبہ پیدا کیا، مجاہد ملت کی وفات سے تیسرے روز کارپوریشن کی طرف سے حملہ تعزیت کیا گیا تو ان

بہادر شاستری (جولہ بدین وزیر اعظم بنے) نے اپنی تقریر میں مجاہد ملت کی قوتِ خطابت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کنونشن کے متعلق ہماری رائے اپنی تھی چنانچہ مجاہد ملت سے ایک شب تفصیلی گفتگو کی گئی اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے، مگر مجاہد ملت کو جواب بھی نہیں دے سکے۔ بہر حال مجاہد ملت نے استقلال و استقامت سے ہی نہیں بلکہ حسن تدبیر سے ایک طرف پریس کو ہموار کیا۔ انگریزی زبان پر عبور نہ رکھنے کے باوجود انگریزی اخبارات کے نامہ نگاروں، بیرونی ممالک کے نمائندوں کو مطمئن کر دینا آسان بات نہ تھا، لیکن مجاہد ملت نے انکے اعتراضات کے بر محل اور معقول و شافی جواب دے کر نامہ نگاروں کے اطمینان کو گرویدگی کا رنگ دیا، اسی طرح صدر کانگریس شیواجی پٹی سے گفتگو کے کانچھیں اس درمیان اس کو دیا کہ مخالفت کر نیکی کے باوجود انھیں کناٹا کر مسلم کنونشن سے جوہیت اور قومی یک جہتی کے مقصد کو تقویت پہنچے گی۔ بہر حال کنونشن بڑھا اور جس شان سے ہوا اس کا علم صرف شرکا کنونشن کو نہیں بلکہ ہر اس صاحب بصیرت انسان کو ہے جو اخباری و دینی سے واسطہ رکھتا ہے۔ اس کنونشن نے ان سب کو جو سیکولر لازم کے حامی تھے ایک مرکز پر متحدہ کر کے ثابت کر دیا کہ خوفزدہ و مرعوب اور پست ہمت کرنے کی پندہ سالہ کوششوں کے باوجود اس تن مجروح میں قوتِ مقابلہ پاتی ہے اور بہترین قیادت کی یہ برکت ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ قوت ہمدماغ و داغ شدہ اپنے زخموں سے بے پروا میدانِ زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اپنے دوسرے اہم قومی دلی مسائل اور جنگامی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا حفظ الرحمن دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی صاحب کو عام تعلیمی سرگرمیوں سے بھی مسلسل شغف رہا، وہ خود دینی مدارس کے تعلیم یافتہ تھے فراغت کے بعد انھوں نے اپنی زندگی ایک استاد اور معلم ہی کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ ابتداءً دارالعلوم دیوبند میں بھی رہا پر بایستہ اور پھر اس کے بعد ڈابھیل، امر وہہ وغیرہ میں انھیں علمی خدمت کی کافی سعادت حاصل ہوئی، آزادی وطن کے بعد ان کے قیمتی اوقات کا حصہ جنگامی اور وقتی مسائل میں گزارا، لیکن اس دور میں بھی انھوں نے ملت کی جو سب سے اہم تعمیری خدمت انجام دی وہ جمعیتہ علماء ملیٹ فارم سے ملک گیر پیمانہ پر دینی تعلیم کی مہم پر پاکستان اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اتحادیے دینی سے بچا کر ان میں دینی حیثیت و شعور اور ایمانی کا تحفظ و بقا بھی تھا جس کے لیے انھوں نے پورے ملک کے دورے کر کے تحریر و تقریر کے ذریعہ برادرانِ ملت کے شعور کو بیدار کیا اور وقت کے تقاضوں سے روشناس کرایا۔

اس اہم بنیادی خدمت کے ساتھ ساتھ وہ موجودہ دینی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کی ہر ممکن مدد اور سرپرستی دہلی کی تعلیم گاہیں بھی برابریات سے تقسیم ہند کے بعد دہلی کے مشہور مدارس مدرستہ امینیہ، مدرستہ عالیہ فتح پوری، مدرستہ جیلانی مدرستہ مولانا عبدالرب مرحوم نیز فتح پوری مسلم ہائی سکول دہلی کالج اجیری گیٹ اور اس کا ایگلووہرک ہائی سیکنڈری اسکول، دہلی کی مسلم کالج کے ساتھ ساتھ ویران ہو کر رہ گئے تھے ان سب مدارس اور تعلیم گاہوں کو نئے سرے سے زندہ کرنے اور باقی رکھنے میں اور ان کی مشکلات کو حل کرانے میں بہت بڑا حصہ حضرت مجاہد ملت کی مسلسل کوششوں کا ہے وہ بذاتِ خود ان تمام اداروں کی مجالس کے رکن رہیں اور ہر دسپے اور اپنی انتہائی حدیم الفرضی کے باوجود ان کی میٹنگوں میں پورے فکرواہتمام کے ساتھ شریک ہوئے اور ان کے مسائل حل کرانے رہے۔

اجمیر کی بربادی کے بعد جہاں درگاہ معلیٰ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے تحفظ اور اس کے انتظامات کی اصلاح کیلئے مدرسہ معینیہ اجمیر مولانا مرحوم نے بھرپور کوششیں کیں وہاں مدرسہ معینیہ اجمیر کی نشاۃ ثانیہ بھی حضرت مرحوم کی مدد و حمایت کے

سہارے عمل میں آئی، اس مدرسہ کا افتتاح بھی خود حضرت مولانا نے ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو اپنے دست مبارک سے فرمایا اور پھر زندگی بھر اس کے معاملات و مسائل میں مدد فرماتے رہے۔

تقسیم بنگال کے ہاتھوں کلکتہ کا مشہور مدرسہ عالیہ جو مقامی اصطلاح میں کلکتہ مدرسہ کہا جاتا ہے ختم ہو گیا تھا۔ مجاہد ملت نے حضرت مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت ہند کو توجہ دلا کر حکومت مغربی بنگال پر زور دیا اور کافی جدوجہد کے بعد اس کا اجرا عمل میں آیا مدرسہ کا تمام اثاثہ لٹ چکا تھا۔ از سر نو اس کی زندگی کے تمام سر و سامان مہیا کیے گئے۔ ابتداً حضرت مولانا کے رفیق خاص "مولانا سعید احمد اکبر آبادی" اس کے پرنسپل رہے۔ بھلا اللہ آج مشرقی ہندوستان کا یہ بڑا مدرسہ علوم دینیہ و اسلامیہ کی خدمت گزاری میں مصروف ہے جامعہ قاسمیہ مراد آباد، قدرت ہائی سکول سید بارہ، مسلم انٹر کالج آمادہ اور دوسری کئی ہی درس گاہوں کو مسلسل حضرت مولانا کی عظیم شخصیت سے فیض پہنچا۔ وہ ایسے متعدد علمی اداروں کے رکن مجلس انتظامیہ رہے اور ہمیشہ ان کی مدد و رہنمائی فرماتے رہے۔

مدرسہ عالیہ رام پور، حمیدہ کالج جھوپال، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ اور بعض دوسری اہم درس گاہیں جو تقسیم ہند سے پہلے سرکاری طور پر مستند اور اسلامی درس گاہیں رہیں اور دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کے مضامین اور دینی علوم بھی ان کے نصاب میں شامل رہے لیکن تقسیم ہند کے بعد متعلقہ ریاستی حکومتوں کے ذمہ داران محکمہ تعلیم مسلسل دریائے رے کا نئے نصاب سے اسلامی دانش و مضامین خارج ہو جائیں بلکہ علما ان درس گاہوں کے سرکاری امتداد و یکوینیشن کو ختم کر دیا گیا اور مزید امداد و دل دی گئی حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں برسوں ریاستی حکومتوں سے مداخلت اور زبانی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رکھا اور بالآخر ان کی قدیم حیثیت کو بڑی حد تک بحال کر دیا گیا۔

دیسوں چھوٹے بڑے دینی مدارس جو نوک، بالوڑ، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، امروہہ، بریلی، شاہجہان پور، ہردوئی، مبارک پور، غازی پور وغیرہ میں چل رہے ہیں، اپنے معاملات و مشکلات میں حضرت مولانا مرحوم کی شفقتوں سے فیض باب ہوتے رہے ان مدارس کے سالانہ جلسوں میں بار بار مولانا مرحوم نے شرکت فرمائی ان کے لیے مالی امداد فراہم کرانے میں بھی کوشش اور سفارش کا بڑا وسیلہ حضرت مولانا ہی کی بااثر جامعہ ملیہ دہلی کے عاملین و سربراہ بھی ہم کے بعد نئے لکچے ہوئے حالات میں مجاہد ملت کی مدد و مدنیوں سے جامعہ کے معاملات اور مشکلات میں مدد حاصل کرتے رہے اور بالآخر ان کو جامعہ کی با اختیار مجلس جامعہ کا کارکن بھی بنالیا گیا ۵۹-۶۰ء میں جبکہ جامعہ ایک اندوئی کش کش اور انجمن سے گزر رہا تھا، حضرت مولانا ہی کی سعی و تدبیر نے اس کے لیے مسیحائی کا کام کیا اور ایک بڑے شلفشار سے جامعہ کو نجات حاصل ہوئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جو ہندوستان کی واحد مسلم یونیورسٹی ہے اور ہماری پہلی ایک صدی کی عظیم الشان علمی وراثت ہے، لیکن ملکی سیاست میں اس کا حامل اس کی روایات اور سیاسی رجحانات تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں بالکل بے ربط اور اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ تحریک آزادی کے بالکل آخری دنوں میں علی گڑھ اسٹیشن پر قوم پرست ملکی دشمنوں اور خاص طور پر حضرت مولانا آزاد اور حضرت مجاہد ملت کے ساتھ جو حوادث پیش آچکے تھے ان کی یاد دہانی میں تازہ تھی۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کی صبح اس عظیم درس گاہ کے لیے خطرات و آفات شش کا پیغام بن کر نمودار ہو رہی تھی، مگر یہی دونوں اولوالعزم رہنما تھے جو مسلم یونیورسٹی کے پشت پناہ بن کر سامنے آئے اور ان کی چاہ گری و دستگیری ملک کے نئے حالات میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے عزت و وقار کے باقی رکھنے کا وسیلہ ثابت ہوئی۔

مولانا آزاد نے محترم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کو بحیثیت وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا سربراہ بنا کر بھیجا اور شروع ۴۸ برس ہی سے حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے یونیورسٹی کے معاملات و مسائل سے دل چسپی لینی شروع کی اور ہر موقع پر اس کی مدد و ہمتی میں پیش قدمی رہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے بھی پورے احترام اور قدر شناسی کے ساتھ حضرت مولانا کے تعاون اور مشوروں کو اپنایا اور یونیورسٹی کی ایک کڑ اور کورٹ کے معزز رکن کی حیثیت سے مسلسل اپنی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک کے تنگ نظر حلقے ۴۷ برس سے مسلسل مصروف کار رہے ہیں کہ اس یونیورسٹی کا نام و نشان تبدیل کر کے اس کی مخصوص حیثیت کو ختم کر دیا جائے، حکومت یو پی جس کی حدود میں مسلم یونیورسٹی واقع ہے اس کا رویہ شروع ہی سے بہت ہمدردانہ اور دوستانہ نہیں رہا۔ مرکز میں بھی ایک خاص طبقہ آج تک معاندانہ نکتہ چیں رہا ہے، مسلم یونیورسٹی کا نام بدل دینے کی، بٹخیں تو بار بار چھیڑی جا چکی ہیں، لیکن ۴، ۵۹ء میں ہند پارلیمنٹ تک میں مسلم یونیورسٹی کے خلاف کچھ کوششیں صرف آرا جھگڑی تھیں، اس موقع پر تنہا جملہ ملت کی ذات تھی جو پارلیمنٹ میں مسلم یونیورسٹی کے دفاع اور مدافعت کے لیے سینہ سپر ہوئی، انھوں نے پارلیمنٹ میں ہی ان تمام الزامات سے صاف کرنے کے لیے پوری جدوجہد و فانی الغرض مسلم یونیورسٹی کے خلاف معاندانہ تنگ نظر حلقوں کی ان تمام کوششوں کے تارک اور روک تھام کے لیے جو سرگرمیاں پچھلے پندرہ برس میں مسلسل عمل آتی رہی ہیں اور جن کی بدولت مسلم یونیورسٹی کو تقسیم ہند کے بعد بقاء و استحکام نصیب ہوا حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سرگرمیوں کا محور امام ابراہیم مولانا آزاد اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب ہی رہے۔

دارالعلوم دیوبند جو ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی و دینی درس گاہ ہے مجاہد ملت نے اس کے واسطے دارالعلوم دیوبند سے پرورش پائی تھی۔ مادر علمی کا حق خدمت جمع کر کے احساس اور لگن کے ساتھ عمر بھر انھوں نے ادا کیا۔ بڑی سعادت و کرامت تھی جو ان کے حصہ میں آئی مجاہد ملت نے صرف یہ کہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے، بلکہ دارالعلوم کی فلاح و بہبود ان کے فکر و عمل کا نمایاں عنوان رہی ہے خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد کتنے ہی نئے اور پیچیدہ مسائل سامنے آئے جن کی عقدہ کشائی مولانا مرحوم کی بااثر شخصیت پیش رہی، پاکستان اور دوسرے ممالک سے آنے والے طلبہ کے پاسپورٹ اور ویزا کے مسئلے قوانین نے جب بھی کوئی پیچیدگی اختیار کی، مجاہد ملت ہی کا اثر و رسوخ اس کو حل کرا سکا۔ ابھی آخری دنوں جب دارالعلوم پر ناگہانی افتادہ نازل ہوئی اور ریاستی حکومت نے بھی اس موقع پر خیر ہمدردانہ موقف اختیار کیا، تو مولانا مرحوم ہی تھے جو سینہ سپر ہوئے اور پھیلائی ہوئی فضا میں وہی سے دارالعلوم کا دامن بے داغ رکھ سکے۔ دارالعلوم میں اسلامی ممالک کے سربراہ آئین یا صدر جمہوریہ ہند ان کے خیر مقدم میں دور حمایتین کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کا یہ نامور فرد عالمی مقام بھی پیش نظر آتا۔

شخصیت و کردار

نیکل و شبہیت ایک بید سے سادے انسان کا تصویر کیجیے، گندی رنگ، اوسط درجہ کا بدن، نمکتا ہوا قد، کتائی چہرہ جس پر سادگی بھی برستی ہو اور علم و فضل و وقار بھی، فکر و تدبیر سے معمور کردہ پیشانی، آنکھوں میں ایک حسین چمک، بھاری بھاری فلسفیانہ جھوکیا جنہیں دیکھ کر ایک دوست خارج برنارڈس کی بھٹوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے چہرہ پر گھنی داڑھی، آواز میں گرج اور گفتار میں بے ساختگی بس یہی حلیہ تھا۔ مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کا۔

وضع قطع وضع قطع میں سادگی بھی تھی اور استقامت بھی، لباس ہمیشہ سادہ سفید کھد کا کرتہ، اسی کا کسی قدر تنگ موری کا پاجامہ، کھد کی ہی ڈرائی سردیوں میں جو کسی عمدہ کھال کی اور گرمیوں میں سادہ سفید کھد کی اونچی باڑ کی ٹوپی جس کا تراش ان کا خود ایجاد و مخصوص تراش تھا، جتنا ہمیشہ عمدہ پہننے کے شوقین تھے۔ کبھی کھلا ہوا (نوٹ) ریسپ اور کبھی جے پوری

افتاد طبع خوراک بہت معمولی اور سادہ ہوتی تھی اور مقدار میں بھی بہت کم، سادہ تندوری روٹی ہوا اور معمولی دال، سبزی یا گوشت کی تزکاری یہی ان کی پسندیدہ غذا تھی، وقت پر جو کچھ بھی پیشہ آجاتے چند منٹ میں دس پانچ کھتے لیے اور بس فارغ ہو گئے کھائے پینے کے ذوق اور لذتوں کے انتہام سے وہ قدرتیاً نا آشنا ہی رہے احباب اور مخلصین بڑے اربابوں سے دعوت کرتے مگر ان کی دعوت کرنے والے ہمیشہ باپس ہی رہتے۔ دسترخوان پر کتنی ہی مرغین اور مکلف غذاؤں بیچاتے، مگر مولانا کا لہجہ جب اٹھتا تو کسی معمولی کھانے کی طرف اور اتنی جلدی فارغ ہو جاتے کہ ساتھ کھانے والوں کے لیے بھی بڑی دشواری ہوتی، اچار اور ترشی انہیں بہت مرغوب تھی اپنی تندرستی سے بے فکر اور اصول صحت سے بے نیاز کھانسی اور نزلہ کی حالت میں بھی اپنی مرغوب کھانسی اور ترشی کے استعمال سے باز نہیں رہتے تھے۔ سردیوں میں رس کی کھیر (دساول) کے بہت شوقین تھے، پھولوں میں ان کو خربوزہ کا بلے حد شوق تھا، صبح شام چائے کا باندھتے وہ بھی بہت پکی جس میں دو دھبہ بہت کم ہوتا اور میٹھا بھی برائے نام گرمیوں میں تیز برف کا پانی انہیں پسند تھا، پھولوں میں آم سے بھی کافی رغبت رکھتے تھے کئی برس سے احباب کے اصرار پر یہ معمول ہو گیا تھا کہ آموں کے موسم میں اپنے رفقاء سمیت کاغذ جلاتے تھے اور وہاں بڑی پُر رونق محفل ہوتی تھی۔ ادھر نئی دہلی میں ہر سال انڈیا کیٹ کے قریب آموں کی ایک محفل جاکرتی تھی جس میں جالین پچاس تے تکلف احباب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اس کے اہتمام پر مولانا فقیہ الدین، حاجی محمد صالح، سلطان بابراخان صاحب وکیل اور رفقاء دفتر شریک رہتے تھے۔

لباس اور خوراک نیز اپنے رہن سہن میں بھی بے حد سادگی پسند اور تکلفات سے بہت دور تھے۔ دفتر جمعیت میں ہمیشہ فرش پر بچھی ہوئی چاندنی یا چٹائی ہی ان کی مسجد کی دیارت میں ایک کھوڑا پلنگ اور ایک ٹیکہ، سونے میں تمنائی پسند تھے۔ غرضیکہ سادگی ان کے مزاج کا وہ عنصر تھی جو ان کے لباس خوراک، وضع قطع، رہن سہن اور زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر چھائی ہوئی تھی مزاج

کی دوسری خصوصیت تیز رفتار تھی یہ وصف بھی ان کے ہر کام میں نمایاں نظر آتا، بولتے بھی تیز کوئی اہم سے اہم سوال ہو یا کوئی سچیدہ مسئلہ انھیں نہ فیصلہ کرتے وہ لگتی نہ جواب دیتے مخاطب کے منشا کو سمجھنے اور اس کے رجحان کا اندازہ لگانے میں بھی مبتلا جاتے تھے رفتار کی تیزی ان کے ہر عمل میں نمایاں رہتی یہاں تک کہ غار ٹھننے اور قرآن حکیم کی تلاوت میں بھی لکھنے پڑھنے اور تقریر و خطابت میں بھی ان کی رفتار ہمیشہ تیز رہتی۔

کام کی لگن اور دھن مولانا مرحوم کو حد سے زیادہ تھی سکون اور فرصت سے زمان کی زندگی کبھی اُنٹا ہوتی نہ انہیں خدمات کا جذبہ اور کاموں کی دھن کبھی اس کی جستجو ہوئی، کاموں کے بجوم میں گھرا رہنا ہی انھیں راس آنا تھا اور خود بھی وہ کبھی چین سے بیٹھا پسند نہیں کرتے تھے جس وقت سے انہوں نے اپنے ہوش و حواس کی زندگی میں قدم رکھا تھا، آخر تک تقریباً پینتالیس برس وہ مسلسل تنگ و دور انہماک و عمل، بے شمار تحریکوں اور خدمت گزاروں میں اس طرح معوف رہے کہ آج بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے اپنی عمر کی تھوڑی سی مدت میں جو کام انجام دے لیے دوسرے انسانوں کے لیے وہ کئی عہدوں اور صدیوں کے کام تھے۔

خلوص و ایثار اس مجاہد زندگی کا اندازہ کیجئے اور پھر ساتھ ہی یہ دیکھیے کہ اس تمام جہاد و مسلسل خدمت و عمل، رات دن کی سرگرمیوں اور انتہک محنتوں سے مولانا نے خود اپنے لیے کیا حاصل کیا، ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطیب تھے، صاحب فکر و قلم بلند پایہ مصنف تھے، ملک گیر شہرت و مقبولیت کا اعلیٰ مقام حاصل تھا، حکومت و اقتدار کے دائروں میں اونچی سے اونچی شخصیتوں سے ان کے بارے کے تعلقات تھے اگر کسی درجہ میں بھی انھیں اپنا اور اپنی راحت و منفعت کا خیال ہوتا تو وہ اپنے لیے کیا کچھ حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اپنے لیے جو زندگی اختیار کی وہ غریب اور بے سروسامانی کی زندگی بھر کر ایسے مکان میں رہے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا مستقبل بنانے کے لیے بھی وہ اپنے وسائل کبھی کام میں نہ لاسکے نہ ان کے لیے اپنے بعد کی اپنا اثر چھوڑنے کی اپنی بھرپور صلاحیتوں اور زندگی بھر محنتوں اور کاوشوں کا پورا سرمایہ انہوں نے صرف کیا تو صرف ملک و وطن کی خدمت اور قوم و ملت کی خوشحالی اور سر بلندی کے لیے پارلیمنٹ کے ممبر ضرور رہے مگر سچ یہ ہے کہ ان کی کیفیت پارلیمنٹ بھی سراسر دوشل ہی کے کام آئی۔

قومی اور وطنی خدمت کی سعادتیں دوسروں کو بھی میسر آئی ہیں، مگر بے غرضی اور خلوص و ایثار کا یہ مقام صرف مولانا ہی کو نصیب ہوا کہ وہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور کوئی نہیں کہا جاسکتا جو عوام سے اتنا قریب رہا ہو لیکن اکثر اوقات دن کے جماعتی رفقاء کا ذکر بھی آج تک یہ معلوم نہیں کہ حفظ الرحمن صاحب کی اولاد بھی ہے۔ بھرا اللہ ان کا بیٹا بھی ہے اور بیٹیاں بھی، ان کے چہرے کی تعارف اور بے پناہ اثر و رسوخ کی فیض رسانیاں ہیں جس کا کوئی حصہ نہ تھا وہ صرف ان کی اپنی ذات تھی اور اپنی دلاویز پنے اسفار یا اپنی مجلسی اور جماعتی سرگرمیوں میں انہوں نے اپنے بیٹے ملک کا ساتھ دیا اور متعارف کرانا کبھی گوارا نہیں کیا۔

کئی بار وہ زمین میں یہ سوال اٹھ کر کہ ایسے بلند پایہ اور صاحب بصیرت عالم اور ایسے اکابر کے صحبت یافتہ ہوتے جسے یہ کیوں نہیں ہوا کہ مولانا کم از کم بڑھاپے کی اس زندگی میں تو رات دن کی جہاد و روزانہ مشاغل کے بجوم و ہنگامہ سے کنارہ کش ہو کر تبلیغ و مصطفیٰ سنبھال کر کسی گوشہ میں بیٹھ گئے ہوتے آخر اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا وہ بھی ایک راستہ ہے پھر زیادہ سوچا تو اس کی توجیہ خود بھی وہ زمین میں آنے لگی کہ مولانا خلوص و ایثار کا جن بلندیوں پر فائز تھے وہاں عزت نشینی کا ایسا تصور بھی عملاً و ثواب بھی رہا تھا کہ آخر فکر و خویش کا جو داعیہ اس کا محرک ہوتا ہے مولانا کے خلوص و لبریز بیانیہ اس کی آمیزش بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔

استغناء و بے غرضی طبیعت کے استغناء کا یہ حال تھا کہ زندگی کے اس دور میں تو بڑے بڑے دولت مند تاجر، نواب اور اصحاب اختیاران کے احترام میں دونوں درہتے تھے اپنے ہاں دعوتوں پر بلا تے، بڑے بڑے قیمتی ہدیے پیش کرنا چاہتے، مگر مولانا کی بے نیازی اور بے رخی نے کبھی کسی کو موقع ہی نہ دیا، جمعیت علماء کی انہوں نے عمر بھر خدمت ہی نہیں کی بلکہ چار چاند لگا دیے، اٹھارہ برس اس کے سربراہ رہے اور اپنی بھرپور صلاحیتیں اس کی آبپاری پر صرف کیں لیکن کبھی کسی قسم کا کوئی معاوضہ، کوئی الاؤنس، آنرزیم یا کسی طرح کی شہرت اس سے حاصل نہیں کی، اپنی کتابوں کی آمدنی ہی ان کا سبب مناس تھا۔

کانگریس کے حلقوں میں بھی ان کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے۔ کانگریس ٹکٹ پر انہوں نے تین بار پارلیمنٹ کے الیکشن لڑے (۱۹۲۰ء میں حلقہ بلاری اور ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۲ء میں حلقہ احمد وہر ضلع مراد آباد سے) مگر پیش کش اور اصرار کے باوجود انہوں نے کبھی کانگریس کے انتخابی فنڈ سے کوئی امداد قبول نہ کرنا راہ نہیں کیا

ہمدردی خلافت کی ہمدردی ان کے رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ بلا استثناء و بلا امتیاز ہر کس و ناکس، اپنے اور بیگانے، مسلم اور غیر مسلم کی خدمت ان کا عزیز ترین شغل تھا اور دن رات کا بیشتر حصہ اسی میں گزرتا تھا، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت کا ان کا خیال ہی نہیں تھا۔ کوئی وظیفہ اور امداد کے لیے سرگرداں، کسی کو کالج کے داخلہ میں دشواری پیش آرہی ہے تو کوئی امتحان میں دو چار نمبروں سے رہ گیا ہے۔ کوئی اپنے پرست کی میعاد میں تو بیع چاہتا ہے، کوئی اپنی مقدمہ بازی کے لیے وکیل سے فیس میں رعایت کے لیے کوٹناں ہے کسی کو مکان یا مکان کی ضرورت ہے تو کوئی بھلی یا پور کا کنکشن لینا چاہتا ہے کسی کی فصل اور کجی خراب ہو گئی ہے اور پورا مکان دینے کے قابل نہیں ہے۔ کوئی کی بیٹی جوان بیٹی ہوئی ہے اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آ رہا ہے غرضیکہ صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صد کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ درواسطہ سفارشیں کر رہے ہیں خاص طور پر قیصر ہند کے لجد تو سرکاری حلقوں میں ان کی عزت و منزلت ایک حوامی رہنما ہونے کے لحاظ سے پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے ان کے اثر و رسوخ پر لوگوں نے گویا جھولنا شروع کر دیا تھا، مولانا کی طبیعت شرافت اور ہمدردیوں کا دامن اس قدر وسیع تھا کہ جس نے بھی ان کے سایہ میں سر پہنچا یا چاہا انہیں نہ راستہ چلتے کسی ضرورت مند کی مدد سے گریز تھا نہ ادھی رات گئے کسی کے گئے پر کوئی ناگاری بعض اوقات تو بڑی بڑی اونچی شخصیتیں بھی اپنے کاموں کے لیے ان کی مدد اور سفارش ڈھونڈتی تھیں، آج کو ان کے کر سکتا ہے صبح سے شام تک انسانی زندگی کے صد کام تھے جن کے لیے لوگ بے تکلف مولانا ہی کی مدد مشورہ اور سفارش کا سہارا لیتے تھے اور مولانا مرحوم ہر ضرورت مند کے لیے وہ سب کچھ کرتے جو ان کے امکان میں ہوتا، کسی سرکاری افسر کو ٹیلی فون کر رہے ہیں کسی کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کا کام کر رہے ہیں اور کسی کے لیے واسطہ درواسطہ سفارشیں کر رہے ہیں۔

دنیا میں ان کے پایہ کے انسان ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں بھی شاید دو چار ہی مل سکیں، یوں تو ہر وقت ہی ان کے وسعت قلبی کے مشاہدات آنکھوں سے گزرتے رہتے تھے اور ہم خدام کار کے ساتھ تو ان کے سلوک و شفقت کا ذکر ہی کیا ان کے جیتے ہی افسر و ماتحت کا کوئی امتیاز کبھی درمیان میں حاصل نہ ہوا۔ اپنے عقیدہ اور مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے جہاں تک خدمتِ عمل کا تعلق ہے ان کی درود مندوں کے سایہ میں دارالعلوم دیوبند

اور مسلم نوپوریشی علی گڑھ کا ایک ہی درج تھا، جدید و قدیم، مقلد اور غیر مقلد، شیعہ اور سنی، خوبے اور یوہرے، مسلم لگی اور کانگریسی، مکمل اور غیر مکمل ہر انسان کی خدمت وہ اپنا حق سمجھتے تھے عقیدہ اور مسلک کا اختلاف ان کو کسی کی خدمت سے باز نہیں رکھتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان تمام حلقوں میں یکساں طور پر ان کو احترام اور اتفاق کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور کسی بھی گروہ نے ان کو اپنے لیے غیر اور ناجبجی محسوس نہیں کیا۔

ان کی شرافت نفس کا قدرتی نتیجہ یہ بھی تھا کہ دوسروں کے ساتھ بے انتہار رواداری، احترام اور اعتماد کا معاملہ کرتے تھے۔
رواداری اور اعتماد ہمیشہ ہر معاملہ میں دوسروں کا احترام ملحوظ رکھتے اور ہر موقع پر دوسروں کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے اپنے اپنے ساتھ اور کارکنوں کو حدود و رعاہت کے کسی سے شکایت کا موقع بھی ملتا تو وقتی ناگواری کا اظہار ضرور کرتے مگر دلی تعلق میں کسی ہال برابر فرق نہ آنے دیتے۔

مولانا مرحوم کے افکار و کردار کا سب سے اہم اور جوہری وصف ان کی جرأت حق اور استقامت و عزیمت تھا۔ ان کی پوری زندگی اس وصف کمال کا ایک مسلسل اور شاندار مظاہرہ رہی ہے اہم سے اہم اور نازک مقامات میں بھی جب وہ اپنی کئی رائے قائم کرتے تو کسی اندیشہ اور کسی لالچ کی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی تھیں ہر معاملہ میں کھلے دل سے اپنے اور اپنے خ کے درمیان سوچنا اور فیصلہ کرنا اور فیصلہ کرنے کے بعد اس پر پختگی کے ساتھ جم جانا، یہی ان کا صحیح موقف تھا ان کی زندگی میں بارہا ایسے موقع بھی آ جہاں ان کی جرأت و حوصلہ اور ثبات فکر و نظر کے لیے بڑی آزمائشیں درپیش تھیں، مگر ان کے کردار میں کوئی تزلزل راہ نہ پا سکا۔ چند برس پہلے ایک صاحب نے گاندھی جی کی پراختیا پر شرعی نقطہ نظر سے فریضہ چاہا۔ اگرچہ عام طور پر فتویٰ لکھنے سے مولانا ہمیشہ بچتے تھے، اور دوسرے علماء کو اس عمل کو دیتے تھے، لیکن جب یہ خاص سوال سامنے آیا تو مولانا نے پوری اہمیت کے ساتھ فوراً اس کا جواب خود لکھا اور بہت صاف لفظوں میں مسلمانوں کے لیے یہ پراختیا شرعاً ناجائز قرار دی یہ سوال حقیقتاً ایسا تھا کہ مولانا تو آخر کے کانگریسی اور گاندھی جی کو ایک ڈرمانے والوں میں سے تھے اگر کسی غیر کانگریسی عالم کے سامنے بھی رکھا جاتا تو ملک کے حالات اور گرد و پیش میں بہت مشکل چرنا کہ اس صفاتی اور جرأت کے ساتھ اس کیجیہ فیصلہ دے دیتا۔

اب آخری دلوں میں مسلم کنونشن کا معاملہ بھی مولانا کی جرأت فکر و عمل کی ایک مثال بن گیا کیونکہ وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو تک شروع میں اس کے خلاف تھے، لیکن مولانا کے لیے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، کسی نے لپچا کہ پنڈت جی کی قطعی مخالفت کے بعد بھی کیا آپ کنونشن ضرور ہاں گئے۔ مولانا نے پوری مضبوطی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ جب سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ پنڈت جی کی رائے بھی اس کے خلاف ہے تو ہر ہم ان کی مخالفت کے ڈر سے کنونشن کا خیال ترک کر دیں، یہ ممکن نہیں۔

جبل پور، ساگر وغیرہ کے ان حادثات سے مولانا مرحوم کو قلبی اور ذہنی اذیت پہنچی اور اصلاح زندگی کے آخری ایام میں مرض اور وفات کے لیے ان تنگ جہد و جد کا جو بے پناہ پوجہ پڑا اس نے مولانا مرحوم کی بڑھاپے کی حالت اور توانائیوں کو بے حد مضاعف کر دیا، رمضان کا مہینہ تھا اور اپنے معمول میں وہ سال کے گیارہ مہینے برابر جگمگاتے دوڑتے رہتے تھے، مگر رمضان میں دہلی سے باہر قدم رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس حال میں حالات کی تکلیفی نے ان کے اس معمول کو بھی قائم نہ رہنے دیا، ۸ فروری کو جب وہ دم کے طویل سفر سے واپس آئے بے حد تنگ ہوئے تھے، مزاج بھی خراب تھا آتے ہی انہیں جبل پور کی تشویشناک خبروں سے واسطہ پڑا اور پھر مسلموں میں لگا رہنا پڑا۔ رمضان ہی میں وہ جبل پور ساگر وغیرہ گئے پھر کنونشن کی تیاریوں کا غلبہ پوجہ بھی ہی پر پڑا۔ اس دوران میں بعض رفقہ کار نے بھی کئی غلط روش سے مولانا کی قلبی اذیتوں میں اضافہ کیا اور ایسے نازک وقت میں ان کا دل دکھایا شاید یہی وقت سے مولانا کے شعور پر مستقبل کی پرچائیاں پڑنی

شروع ہو گئی تھیں، چنانچہ مسلم کنونشن سے چند روز پہلے مقامی مسلم وکرز کی میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا کی زبان سے وفات سے ایک سال قبل یہ لکھات بے اختیار نکلے۔

”میں نے تو اپنے خدا سے معاملہ کر لیا ہے۔ میں نعرہ ہائے تحیین و فطوین سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ دنیا کی عمر ہی کتنی ہے، میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اللہ کے دربار جاؤں تو سرخرو ہو کر۔“

مولانا کے ان جملوں کو دہلی کے نوجوان شاعر کمال قریشی صاحب نے اشعار کے رنگ میں یوں ادا کیا ہے۔
 مانا کہ غم و رنج نے مارا ہے مجھے ہر تلخی و ترشی بھی گوارا ہے مجھے
 اللہ فرا وقت کے نباض سمجھ ملت کی تنہا ہی نے پکارا ہے مجھے

میں وقت کی تنقید سے مرعوب نہیں تنقید نے اے دوست منور ہے مجھے
 دنیا کے سداوں کا میں قائل ہی نہیں اللہ کی رحمت کا سہارا ہے مجھے

غرضیکہ یہ تمام اندرونی اور بیرونی عوامل آہستہ آہستہ ان کی صحت کی جڑیں کاٹ رہے تھے تھوڑے ہی دن بعد رانچی میں (ستمبر کے تیسرے ہفتہ میں) شدید فساد ہو گیا وہاں بھی مولانا فوراً ہی پہنچے اور ان کے پہنچ جانے سے حالات پر بہت ہی اچھا اثر پڑا اور حکومت ہمارے برداشت مفید تمام ٹھانے۔ رانچی سے مولانا دہلی پہنچے ہی تھے کہ اکتوبر شروع ہوتے ہی علی گڑھ، میرٹھ، پانڈرا اور چندوسی میں شریسنہدوں نے ایک طوفان بپا کر دیا، مولانا کی صحت رفتہ رفتہ اتنی بگڑ چکی تھی کہ مرض واضح حال ان کے چہرہ سے نمایاں ہونے لگا تھا، دیسے بھی بخار، زلہ اور کھانسی کی گرفت میں تھے۔ ایک قابل مقامی معالج ڈاکٹر عیلم نے مولانا کا معائنہ کیا تو بڑی تشویش محسوس کی اور تمام مشاغل چھوڑ کر کم از کم دس دن کے لیے مکمل آرام اور علاج آشورہ دیا، لیکن مولانا کی طبیعت ان بندشوں کو گوارا نہیں کر سکتی تھی انھوں نے ڈاکٹر عیلم سے صاف کہا کہ میرٹھ، علی گڑھ اور چندوسی میں لوگوں کو جان کے لالچے پڑ رہے ہیں اور میں اپنی صحت کی خاطر گھر میں لیٹا رہوں۔ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا اور پھر واقعہً اسی شام مولانا علی گڑھ اور میرٹھ وغیرہ پہنچ گئے۔ ان دنوں خاص طور پر محترم حافظ ابراہیم صاحب جمل شاہ فواز، چودھری چرن سنگھ وغیرہ جو بھی مولانا سے ملا چوکاں رکھ کر تشویش محسوس کی اور اصرار کیا کہ آپ اپنی صحت پر توجہ دیں، مگر مرض اپنی جڑیں پکڑتا رہا اور مولانا اپنے کاموں میں اسی تندہی کے ساتھ لگے رہے چندوسی بھی گئے دہلی میں پینڈت جاہر لال نہرو سے بھی ملتے رہے۔ ۱۶، ۱۵، ۱۴ نومبر کو زندگی میں آخری باج، جبل پور، ساگر، بھوپال، کاسر بھی اسی حال میں کیا، و سبھی زیادہ تر سفروں میں گزرا۔ جنوری میں میرٹھ، کان پور، امر وہر کے بعض جلسوں میں شریک ہو کر اپنے حلقہ انتخاب میں واپس آئے اور آٹھ دس روز سخت سردی کے عالم میں دیہات و قضاہات کا گشت کیا۔ یہاں تک کہ مرض پوری قوت کے ساتھ مولانا کی صحت پر چھا گیا، ۲۲ جنوری کو بمبئی جانے کے لیے دہلی واپس پہنچے اور ان کی حالت دیکھ کر ہم خدام نے زبردستی بمبئی کا سفر منسوخ کر لیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۴۳ء کی تاریخ تھی کہ مولانا زندگی بھر کی تنگیں اور مرض جانکاہ کو ساتھ لے کر لیٹر علالت پر ایسے گئے کہ آخر کار اللہ کی رحمتوں نے انھیں لیٹر علالت سے نہیں، دنیا ہی سے اٹھا لیا۔

علاج کے سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا نے اپنے پرانے معالج ڈاکٹر پانڈے سے رجوع کیا اور پہلے ہی دن انھوں نے پھیپھڑوں سے چھپائی نچلا، اس میں خون کی گہری آمیزش دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

مزید تحقیق کے لیے غرن ٹیسٹ کرایا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ڈاکٹر پاڈے نے فوراً ہی مولانا کو ہسپتال لے جانے کی ہدایت کی چنانچہ ۲۶ جنوری کو صبح ہی ہوائی جہاز سے مولانا کو ہسپتال لے جایا گیا۔ گورنر بھی شری پرکاش مولانا کے پرانے رفیق اور دوست تھے انہوں نے پورے اہتمام کے ساتھ ٹائٹا ہسپتال میں مولانا کو داخل کرایا۔ ایک ماہ دواؤں علاج جتنا دیا اور ۲۶ فروری کو مولانا دہلی واپس پہنچے، یہاں بہترین دوا ہر ڈاکٹروں اور معالجوں سے رجوع رہا، مگر مولانا صحیح معنی میں مریض عشق تھے ان کی حالت بھی یہ تھی کہ

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

علاج کی آخری کوششوں کے لیے پٹے ہوا کہ مولانا کو امریکہ لے جایا جائے چنانچہ ۱۶ اپریل ۶۲ کو شام کے آٹھ بجے مولانا مرحوم عالمی ایریڈروم "پالم" سے امریکہ روانہ ہوئے مولانا کے داماد مسٹر عزیز الرحمن رفیق سفر سے امریکہ کی ریاست "سکونس" کے شہر میڈیسن میں ڈھائی ماہ بغرض علاج مقیم رہ کر ۱۲ جولائی کو علی الصبح دہلی واپس پہنچے۔ حالت بہت گر چکی تھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں گئی پانچ انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور بجلی کے تعطل نے اور بھی غضب ڈھا رکھا تھا۔ گرمی کی تکلیف سے مولانا بہت بے چین تھے اور گلرگ (کشمیر جانا) ارادہ کر رہے تھے، تیاری بھی ہو گئی تھی، مگر قصائے الہی ان کے لیے گلرگ کی بجائے گلزار بہشت میں ابدی و سرمدی راحتوں کا اہتمام کر چکی۔ اکیس دن اور قید حیات کے گزار کر کہ

آخر اس بیمار دل نے اپنا کام تمام کیا

۶ اگست ۶۲ مطابق یکم ربیع الاول ۱۴۰۲ھ کو صبح ۱۳ بجے بارگاہ ربّی سے تقرب کی مخصوص ساعتوں میں وقت اور تاریخ کے طوفان سے کھیلنے والی پاکیزہ روح نے اس دیارِ فنا کو خیر باد کہا۔

کون ہوتا ہے عرب ہے مردانگ عشق ہے مکر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

حضرت مولانا کی علالت نے پورے ملک کو اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا اور ان کی صحت و شفا کے لیے پورے ملک میں دوا جو رہی تھیں مگر مشیت الہی کو ان سے جو کام لیا تھا وہ پورا ہو چکا تھا۔

کام تھے عشق میں بہت، پرستہ ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

صبح ہوتے ہوتے یہ اندھنہا کہ خبر ہندوستان و پاکستان کی دستوں میں پھیل گئی ان کے خدام نے اپنے مخدوم مجاہد ملت کو غصہ دیا کہادی کا کفن پہنایا، عطر کا فور میں بسا کہ سفر خلد بریں کے لیے دولا بنایا اور اجاب و مخلصین کے آخری دیدار کے لیے ۳ بجے مکرگ کھادی کے ایک کو بیت آرام سے لیا دیا جہاں روش صدیقی صاحب اور دوسرے حضرات قرآن حکیم تلاوت کرتے رہے اور مولانا کے تعلق خاطر رکھنے والی بے شمار مخلوق خدا قطار و قطار اپنے محبوب رہنما کی آخری باریادت کرتی رہی ان میں دہلی کے لاکھوں ہندو مسلم عوام و خواص بھی تھے اور باہر سے پہنچنے والے اجاب کے قافلے بھی، مولانا کے پرانے رفیق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کی لائے دوسرے وزراء اور پارلیمنٹ کے سینکڑوں عہدہ بھی مسلم ممالک کے سفراء اور عاملین بھی، صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ، ایک لوک سبھا آل انڈیا کانگریس کمیٹی، دہلی میونسپل کارپوریشن وغیرہ کی طرف سے ملک و وطن کے اس عظیم رہنما کے ہول پر خراج عقیدت و محبت کے نشان پھولوں کے حلقے، درخت، پتھر اور کیسے گئے ہر لمحہ بچے دولا لکھ انسانوں کے بے حال دانگے جو ہر لمحہ نے مجاہد ملت کا جنازہ اپنے گاندھوں پر اٹھایا۔ دہلی دروازہ کے بیرونی میدان میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب غفرلہ

متم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی اور مغرب کے وقت ملک و ملت کا یہ سرمایہ عزیز سپرد خاک کر دیا گیا۔
آسمان تیری لحد پر شبنم افشائی کرے

واقعات و اقتباسات

ایک مرتبہ ۱۹۴۸ء میں میں اور مولانا حفظ الرحمن صاحب دونوں ایک ساتھ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے، وہاں یوپی گورنمنٹ کی ایک تعلیمی سب کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہونا تھا۔ راستہ میں میں نے ان سے کہا کہ چاچا مردودھنی کی جنگ ختم کرنے کے لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح مغربی لباس اختیار کر لیا جائے؟ مولانا نے فوراً تڑا تو اس سے جواب دیا کہ اگر مسلمانوں نے ہندوؤں سے متوجہ ہو کر اسی طرح اپنی قومی تہذیب اور ملی عقن کو چھوڑ کر مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر کے اپنی عافیت و اطمینان کا سہارا ڈھونڈنا تو پھر کیا ہی کیا ہوئی؟ اور یہ تو کسی آزاد ملک کے ایک آزاد باشندہ کی زندگی نہ ہوئی۔ اسے میں ہرگز پسند نہیں کرتا۔

(مولانا احمد سعید لکھنؤ آبادی)

اسی طرح میرا ذاتی خیال تھا کہ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں کو گاؤں و کشتی کے افساد کا اعلان کر دینا چاہیے کیونکہ مذہباً ایسا کرنا جائز بھی ہے اور اس سے ہندو مسلم تعلقات کے خوشگوار ہونے کی امید بھی ہو سکتی ہے۔
ایک دن مولانا حفظ الرحمن صاحب سے میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو حسب عادت سنتے ہی بگڑ پڑے اور لگے تقریر کرنے انھوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے اگر ہم کتے تو اس کی قدر بھی ہوتی، لیکن اب کہا جائے گا کہ مسلمانوں نے ڈر کر ایسا کیا ہے تو پھر کرنے کا کیا فائدہ؟ اس لیے مسلمانوں سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ افساد و گاؤں و کشتی کا اعلان کر دیں، حکومت سیکور ہے، دستور جمہوری ہے۔ اگر ہندو اس سیکولرزم اور جمہوریت کو چیل کرنا چاہتے ہیں تو وہ بڑے شوق سے گاؤں و کشتی کا قانوناً بند کر دیں۔ اس وقت ہمارا موقف دوسرا ہوگا اور ہم اس مسئلہ پر پھر از سر نو غور کریں گے۔

مجھ کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ میں نے اس پر ”برلن“ میں لکھا، مگر ساتھ ساتھ مولانا حفظ الرحمن کو اپنی رائے پر اس قدر یکتائی تھی کہ انھوں نے میرے مضمون کا جواب ”برلن“ میں بھی دیا اور بڑے زور و شور کے ساتھ دیا۔ اس وقت تو بات میری سمجھ میں نہ آئی لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا اور رائے انہی کی درست تھی۔

(از مولانا احمد سعید لکھنؤ آبادی)

پوری عمر کے اشتغال ایک رات کے بدلے
حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مقصد نے ایک مجلس میں (جو سید لاہ میں مفتی جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند کے مکان پر) ہوئی مولانا۔
حفظ الرحمن کے متعلق ارشاد فرمایا کہ فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلہ میں مولانا حفظ الرحمن صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار و اشتغال تیار کرنے کو تیار ہوں۔

(روایت مفتی جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب و بے قرار ہیں اور ان کے اعزہ و احباب نیز متعارفین کی لاتعدادی تعداد ان کے لیے آج غم کا سہارا ہے ان متعارفین میں بادشاہ اور امراء اور وزراء بھی ہیں اور علماء فقراء بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطرب مظاہر کا وہ طبقہ ہے جن کے لیے حضرت مولانا پشت پناہ تھے۔ ان میں وہ بے بس و بے کس اور لاوارث باز یافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں۔

۱۹۴۰ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے جب تک بدن میں جان موجود ہے ساتھ مولانا ذیل میں تشریف لارہے تھے۔ مشرقی پنجاب کے ایک سٹیشن پر جب ٹرین پہنچی تو ایک مخالف مجمع نے انہیں کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری شروع کر دی، مولانا نے حضرت شیخ کو آڑ میں لے کر خود کو بلاناہل مجمع کے سامنے پیش کر دیا اور اب مولانا پر بلاناہل پتھر برسنے لگے حتیٰ کہ ایک پتھر ناک موقع پر آ کر لگا فرماتے تھے کہ یہ بہتہ کچھ کتنا کہ جب تک حفظ الرحمن کے بدن میں جان موجود ہے حضرت شیخ پر آج نہ آنے دوں گا۔

اس سنگ باری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جو مجھ سے حضرت رائے پوری نے بیان فرمایا کہ پاکستان برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنا کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ الاسلام پر سنگ باری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا اس بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ غیر گزشت ہو گیا لیکن لا یضلل ربی ولا یغی کھچہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکوں نے اس کے ساتھ یہ طریقہ برتنا کہ ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بیوی بیویوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں وہ کہتا ہے کہ اس وقت ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے جو حضرت مدنی کی امانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

(روایت مفتی جمیل الرحمن نائب مفتی دارالعلوم دیوبند)

ملت کی خدمت کے اس لاتعدادی سلسلہ کے علاوہ اسی سلسلہ کا ان کا ایک عظیم اور یادگار کارنامہ یہ بھی ہے کہ حکومتی پارٹی کانگریس نے عسکرِ قوم کیمٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر ہونے کے باوجود مسلمانوں کے خلاف ہونے والی بے انصافیوں اور خاص کر فسادات کے سلسلے انھوں نے پارلیمنٹ کے ایوان میں جس طرح کی تقریریں کیں (جہاں پارلیمنٹ کے ریکارڈ اور اخبارات کی فائلوں میں محفوظ ہیں) ان میں انھوں نے ان کی خصائص اور دروند مذہب و کالت اور سچی گئی و سبے بالی کا حق ادا کر دیا ہے۔

اور اس مجاہدِ گستاخ کے علاوہ فسادات کے سلسلے میں ان کا منتقل ٹھکانہ مذکور وارڈ ۱۶ کیمٹ کے جس حصے میں مسلمانوں پر کئی مصیبتیں انھوں نے دہلی جلدی سے جلدی پہنچنے کی کوشش کی اور جو کچھ کر سکتے تھے اس کے کرنے میں کئی دریغ نہیں کیا اور ان کاموں کے تقاضے کے سامنے اپنی صحت بلکہ اپنی زندگی تک کے مسئلہ کو بھی بھلا دیا۔

سنہ ۱۹۴۸ میں علی گڑھ وغیرہ میں فسادات ہونے لگے انھوں نے علی گڑھ کا وہاں اس حالت میں کیا کہ ان کے پیچھے پڑے میں کیسے ہو چکا تھا اور اس کے اثر سے پانی کی کافی مقدار پیدا ہو چکی تھی جس کی وجہ سے کھانسی کی سخت تکلیف تھی جسم گھلجا رہا تھا، لیکن انہیں اپنے اس حال کی کچھ خبر نہ تھی ان کی معائنہ کرانے کے لیے فرصت نہیں مل رہی تھی علی گڑھ سے انہیں سیدھا دیوبند آنا کھنا میاں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا اسی دن اجلاس ہوا

لوگ پہلے پہنچ چکے تھے، لیکن مولانا راستہ میں موڑ فیملی پر جانے کی وجہ سے چار پانچ گھنٹے لیٹ پہنچے ہر لوگوں نے ان کی کھانسی کی تکلیف اور ان کی صورت دیکھ کر ان سے کہا کہ خدا کے لیے آپ اپنے اوپر رحم کریں چند روز آرام کر لیں اور قاعدہ کا علاج کرالیں، بہر حال اسی دن دیوبندی میں یہ بات طے ہو گئی کہ اب وہ دہلی پہنچ کر سب سے پہلے ڈاکٹری معائنہ کرالیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیکن ملت کی بد فیسی کی ڈاکٹری معائنہ سے معلوم ہوا کہ ان کی کھانسی معمولی کھانسی نہیں ہے بلکہ ان کے پھیپھڑے میں پانی کی بہت مقدار ہے پانی نکالایا اور علاج شروع ہوا چند روز کے بعد طے ہوا کہ مولانا علاج کے لیے بمبئی جا ہیں وہاں کے ڈاکٹروں نے بتایا کہ مولانا تو کینسر میں مبتلا ہیں اور پھیپھڑے میں پانی اسی کا نتیجہ ہے بہر حال کنسیر بخاک وہ پھیپھڑے میں کینسر لیے ہوئے اور پانی بھرے ہوئے ملت ہی کے کاموں سے علی گڑھ اور دیوبند دوڑ رہے تھے۔

اتفاق یا لطیفہ عجبی یہ عجیب اتفاق ہے یا لطیفہ عجبی کہ بستر علالت پر مستقل لیٹ جانے سے پہلے ملت کے کاموں کے سلسلے میں مولانا کی زندگی کا آخری سفر علی گڑھ اور دیوبند کا ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ملت اسلامیہ ہند پر کا دیوبند مرکز۔ دارالعلوم دیوبند اس کا دیوبند مرکز۔
(محمد منظور نعمانی)

مدھیہ پردیش کی حکومت کو تنبیہ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

”آج مدھیہ پردیش کی سرکار فیاہور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک جو واقعات ہوئے انہیں دیکھ کر کہنا چاہیے کہ اس حکومت کے لئے کوئی حق حاصل نہیں ہے اس طریقہ سے تباہ اور برباد کر کے یہاں نہ کھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکورلائز لانا ہوگا۔“

جبل پور میں ساگر، دموہ اور کٹنی میں فسادات ہو جائیں اور جو فسادات وہ اسی طرح بیٹھے ہیں، کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان مال اور آبرو برباد ہونے دیکھتے رہیں یہ ان کے لیے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ چاہے اقلیتوں کا سوال ہو، چاہے اکثریت کا، ہمیں سب کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ یہ ایسا مذاری کے ساتھ کر سکتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص توجہ دی جائے۔

ہم کسی جماعت پارٹی یا حکومت کے وفادار نہیں ہیں ہم صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں۔ اگر کوئی جماعت پارٹی یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط راستوں پر جائے تو ہمارا کام ان کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا ہے۔ جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں ہم ان سے ملک کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو لوگ فرقہ پرستی، تنگ نظری یا تعصب پزیر کرتے ہیں۔ ملک کے عدا اور وطن کے دشمن ہیں ان کو کسی دوسرے سے وفاداری کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے وہ خود اپنی وفاداری کا امتحان دیں

جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان، خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں۔

دشست اور درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے شیر اور بھیڑ
جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاں نبھاتے
ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں بھارتے۔ یہ حضرت انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے
ہوتے نہیں شرماتے، عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جب خود معالج اور امر
کے ذمہ دار وحشت زدہ ہو جائیں۔ آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی
وحشت زدگی اور درندگی کا نتیجہ ہے

یہ کیا بزدلی ہے کہ تم درو دیوار سے وحشت زدہ ہو۔ تم خود اپنے سایہ سے ڈر رہے ہو اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج نہ
کیوں ہو گئے۔ اسلام اور بزدلی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمان سب کچھ
سکتا ہے، مگر بزدل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے۔ مسلمان نا انصافی برداشت نہیں کر سکتا،
ہراس اور بزدلی اور نامردی کو دل سے نکال دو۔ یہاں سے یہ عہد کے جاؤ کہ ہر ایک نا انصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک
ہم وفادار ہیں، مگر ہم اور وطن کے وفادار ہیں۔ وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی گمراہ یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فضل
کی قسم کی کتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چال پوسی وفاداری ہو اکتی تھی۔ حکومت، وزراء، حکومت اور افسران
کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار ہوں۔ اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے تو یقیناً مقابلہ
کے۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کر دو جو ہندو مسلمان
کے لیے مشترک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کانگریس میں شرکت کر دو۔ کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے۔
کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو۔ اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو
اس سے نہ جماعت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ تمہاری یہ شرکت ملک کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں
کہ فرودار نہ سیاسی لیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کر دو اور مشترک لیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لے کر
کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ، ہمت بلند رکھو۔ خدمت وطن کے سچے جذبے کے ساتھ آگے بڑھو تمہیں انصاف
اور حق و صداقت کا سر بلند کرنا ہے۔ اگر تم نیک مقاصد کے لیے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

حضرت مخدوم! مسلمان ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصہ مصیبت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور بے
اضطراب کی ترجمانی کے لیے یہاں منعقد ہو رہا ہے۔ بے جا نہ ہو گا کہ خود مسلمان ہند کی خدمت میں بھی گزارا کرنا
کہ وہ اپنی اس پُر آشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور
استقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کریں۔ اسوۂ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام
بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ وہ تکالیف و مصائب کے طوفان سے بے

بھی وہ احساس کمتری، پامالی اور بالواسطہ کا شکار نہ ہوں اور ان کے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث و مشکلات درپیش ہیں۔ بہر حال وقتی اور دیرپے مصائب اور ہمارا حقیقی اعتماد کار ساز حقیقی کی رحمت اور اس کی رضا جتنی پر ہی ہے، قرآن مجید کے ہیں بتایا ہے کہ لا یغیبن عن روح اللہ الا القوم الکافرین (خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہی بالواسطہ ہوتے ہیں جنہیں خدا پر ایمان اور بھروسہ نہیں ہے)

ان مع العسر یسرا۔ ہر مشکل و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے۔

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے، نبی رحمت کے نام لیا اقل اور اس رسول حق کے انبیاء کا (جس کی شان میں فرمایا گیا ہے انک لعلی خلق عظیم آپ کے محاسن و اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں، فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیوں پیدا کریں کہ دنیا ان کے وجود کو امن و رحمت کا سایہ محسوس کرے۔ ان کی وطن دوستی، غیر انہی اور اخلاق کی بڑا کوئی نہ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کرے آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس و شعور پیدا ہو اس پیارے دیس کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم باہر کے شریک و سپہم اور اس دعوت حق کے علمبردار رہے ہیں جو پورے عالم انسانیت کے لیے امن و رحمت کا پیغام اور پھر دوی و نیرنگالی کا سرچشمہ ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی و غمناکی کی زندگی نہیں ہو سکتی اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ چھاپا چلی اور وامن کا ساتھ ہے اس لیے ملی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لیے جائز نہیں ہو سکتی میرا توفیق یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے فرض و منصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ ان اللہ مع الذین القوا الذین ہم محسنون والذین کذبوا علیہم ان کے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکو کار ہوں)

(ماخوذ از خطبہ استقبالیہ ایڈٹن مسلم کنفرنس)

آج اگر جمیۃ العلماء ہند مسلمانوں کے معاملات کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ قومی حکومت میں مسلمانوں کا کیا مقام چنا چاہیے تو اس کو پورا حق ہے ملک کا بطورہ ایک پولیٹیکل بات تھی، بٹوارہ کے لیے ہندو جماعتوں کو کبھی اور مسلم ایک اور ہندو مہاسجا کو کبھی دوش دیا جاسکتا ہے لیکن اب جو لوگ ہندوستان میں بس رہے ہیں یہاں کے چالیس کروڑ باشندے ہیں جو ایک بڑے ہوتے سمندر کی طرح ہیں ان میں ہندو بھی ہیں، پارسی بھی ہیں، سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ یہاں امن اور عزت سے رہیں اور اگر مسلمان بھی یہ بات کہیں کہ وہ بھی اپنے اس ملک میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کہہ کر دیا جائے گا۔ جو تعلق اس ملک سے یہاں کی اکثریت کو ہے وہی اقلیت کو بھی ہے۔ جہاں تک ملکی آزادی کا تعلق ہے یہ فرقہ پرست کیا ہمارے مقابلے میں کسکے ہیں۔ جمیۃ کے خدام نے تو اس وقت انگریزوں کی گولیوں کا مقابلہ کیا۔ جب فرقہ پرست بہت بزدلی اور گھبراہٹ کے ساتھ گنڈیاں بند کیے بیٹھے تھے۔ آج ہماری قربانیوں سے ملک آزاد ہے۔ فرقہ پرست، ہمیں تلخ دین ان کی یہ ہیر قوفی ہے۔

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے، لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے دہاتے ہیں۔ خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے ہچکچتے ہیں۔ چائوں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو غرور میں ہوا کیا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لیے نہیں ہیں کہ کسی کی چال پالی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہو گا یا ہینڈل نہ ہو خوش ہوں گے۔ اگر جمعیت کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لیے بھی ایسا خیال گزرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے اسی طرح اقلیت کا بھی ہے جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح حفظ الرحمن کا بھی ہے یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ آئیے غور کریں کہ کس طرح اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے

ہے اور دوسری بات کا تعلق براہِ ران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی دوسرے کا جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو بھی رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک مثال دیکھ کر آتا ہوں، لیکن بات کو سمجھنے کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے اس لیے عرض کرتا ہوں کہ جسم ہے اس کے بہت سے حصے ہیں، پیر ہیں، ہاتھ ہیں، سر ہے، دل ہے، دماغ ہے، جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ ہر حصہ کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کو گردش کا نظام باقی ہے دماغ کو یہ حق ہے کہ وہ دماغی کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کا حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راک گاڑیں، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبیاں اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم ہیں پھر ہی نہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخامی ایک پھاس چھب جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے نول کہ چین ہے نہ دماغ کو سکون نہ ہاتھ کو راحت ہے نہ پیر کو آرام۔ ہر جسم پر اس درد سے بے چین رہتا ہے پس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخامی کے ہاتھ پیر دل و دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل و دماغ کر لیں، اس کے ہاتھ پیر بن جائیں ان پر یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذرا سی پھاس چھبے گی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے۔ یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں اپنی بڑائی بتائیں لیکن یہ ضرور بتا دینا چاہئے ہیں کہ ہم تو کیا ہم سے کم اقلیت کی کوئی تکلیف پہنچے گی تو اس کا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا۔ جب تک اس پھاس کو نکال نہ دیا جائے گا، کہ ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان چودہ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سامان درد اور بے چینوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہو گا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہو گا۔

یروش ہمارا دیش ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے۔ اس ذرہ ذرہ سے ہم کو محبت ہے اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے ایک حدیث میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما رہے تھے تو شہر مکہ منکد کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ! تجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے زندگاتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا ڈھنگ بدلنا ہے، ہمارا ملک آزاد ہے، آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے ہیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے کچھ طاقت بنانی ہے۔ وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے وہ ایٹم بم اور راکٹ یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی یاد رکھیں جس کے پاس دل کی طاقت ہے اسے کوئی طاقت دہا نہیں سکتی چوں طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کے لیے لڑائی لڑنی ہے اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اسے دور کریں گے ہر تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے۔ پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا تینک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی جوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلم اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہ کہ منہ بند کر دیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے، پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے اس طریقہ سے حقیقت کو دیا نہیں جاسکتا۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھانی چاہئیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیروہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے سوال یہ ہے کہ دیوالی ہی کا، دوسرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے یہ سب ہندوستان کے تیروہار ہیں۔ کسی کورس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں اکثریت کے تیروہار کا ذکر ہے، وہاں مسلمانوں کے تیروہار ہیں عید ہے، بقرعید ہے، شبِ برات کیا ہے، محرم کیا ہے، یا سکھوں کے تیروہار ہیں۔ عیسائیوں کے تیروہار ہیں۔ ان کا بھی اس میں ذکر ہونا چاہیے تھا اگر یہ کیا گیا جتنا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق جتنا، لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی جوتی ہیں کہ آؤ پتھر بھگوان کرشن کی پوجا کریں، آپ بتائیں کہ مسلمان کے بچے کیسے کریں گے۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں، لیکن مسلمان سکھ عیسائی کیسے کر سکتے ہیں، میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں عیسائی اپنے طریقے سے، اور ان کو پورا حق حاصل ہے، آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ

آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں، خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پڑھا کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں۔

جو تجویز جگت و دین جی نے پیش کی ہے اس کی توہین تائید کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں پھر سنئے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ سچ نہیں کہتے ہیں یہ کہ اگر پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق ہے کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کیا گیا ہے کہ ناپور ٹائٹس میں یہ لکھا ہے مگر کیا آپ نے ٹیٹھ میں جو چھاپا ہے اس کو پڑھا ہے ہندوستان ٹائٹس میں جو چھاپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ ٹائٹس آف انڈیا میں جو چھاپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اس کو کبھی پڑھتے جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک ساڈھی کو بر باد کیا گیا ہے جو کچھ جوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں الیکشن فائرنگ لگے جس طرح کہ وارداتیں ہوتی ہیں ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے اس طرح کے طریقوں کو بدلنا چوگا، اور صحیح معنوں میں سیکولر ازم کو لانا ہوگا۔ مسٹر گاندھی کے بتائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا، میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت میں سبھی لوگ بڑے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہتے ہیں، من مانی کریں خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں ان کو ہمیشہ ہی دبائے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک حربے کے طور پر استعمال کر کے اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ باوجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، ہمیں صاف جان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں میاں سیکولر ازم قائم ہو۔

(۱۲ فروری ۱۹۷۱ء ۵ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ)

جتنے بھی حضرات ہوم مسٹر ہیں اگر ان میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو سنبھال نہیں سکتے ہیں تو یہ ان کا فرض ہے ان کی ڈیوٹی ہے۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مستغنی ہو جائیں اور اگر وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں تو اس طرح کریں پڑھیے نہ رہیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی
(ایڈیٹر معارف)

مجاہد ملت کا تصنیفی مرتبہ

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی۔ ان کے کارنامے بڑے گونا گوں ہیں وہ نامور سیاسی لیڈر بھی تھے اور ممتاز عالم دین بھی، پرجوش خطیب بھی تھے اور غرض بیان واعظ بھی، ماہر تجربہ کار معلم و مدرس بھی تھے اور مشاق مصنف و صاحب قلم بھی انھوں نے مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دی۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے، مگر ان کی طوفانی سیاسی زندگی نے ان کے ان کمالات کو اتنا چھپایا تھا کہ مخصوص طبقہ کے علاوہ شاید عام لوگوں کو اس کا علم بھی نہ ہو گا۔ اس مضمون کا مقصد ان کی علمی و تصنیفی حیثیت کا مختصر تعارف اور اس پر تبصرہ ہے ان کا اور ان کے رفیق کار اور میرے محترم دوست مفتی عتیق الرحمن صاحب کا سب سے بڑا علمی کارنامہ مدۃ المصنفین دہلی کا قیام ہے۔ دارالمصنفین کے بعد یہ دوسرا ادارہ ہے جس نے مختلف علوم و فنون اسلامیات پر بڑا مفید اور دقیق ذخیرہ فراہم کر دیا ہے جس کے ذریعہ مولانا حفظ الرحمن مرحوم کا علمی فیض ہمیشہ جاری رہے گا وہ خود بھی ایک اچھے اور ممتاز مصنف اور اہل قلم تھے اگر وہ علمی زندگی اختیار کرنے کے تو چند دستان کے مشہور مصنفین میں ان کا شمار ہوتا اور یہ بھی ان کا کمال ہے کہ اپنی طوفانی سیاسی زندگی کے باوجود انھوں نے متعدد اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں ان میں سب سے اہم قصص القرآن ہے۔

کلام اللہ میں عبرت و بصیرت کے لیے بہت سے انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں مگر ان کا مقصد تازہ رخ اور سوانح نگاری نہیں بلکہ سبق آموزی اور عبرت پذیری ہے اس لیے ان میں تاریخی اور سوانحی ترتیب و تسلسل نہیں ہے اور نہ ان کی تفصیلات میں پڑھا گیا ہے، بلکہ صرف عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے اور موقع و محل کے لحاظ سے جہاں جہاں پیغمبروں اور ان کی امتوں کے جس قدر حالات کی ضرورت تھی ان کو بیان کر دیا گیا۔ اس لیے کلام مجید میں تاریخ و سوانح کی طرح ان کے مرتب اور مفصل حالات نہیں ملتے اور جس قدر ہیں وہ بھی کچھ نہیں ہیں بلکہ مختلف صورتوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان کے حالات کا دوسرا ماخذ احادیث نبوی، تفسیری روایات، حدیث عتیق کے صحیفے، قدیم تاریخی کتابیں، تاریخی آثار اور اسرائیلی روایات ہیں۔ جن کی مدد سے ان انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے حالات مرتب کیے جاسکتے ہیں مگر حدیث عتیق کے صحیفے محرف ہیں ان میں اور کلام مجید کے بیانات میں بعض اختلافات ہیں۔ اسرائیلیات میں خرافات کا حصہ بھی شامل ہے اس لیے ان سے اخذ و استفادہ میں بڑی احتیاط اور تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے اولیٰ میں تو اس نقطہ نظر سے قصص القرآن پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں قصص انبیاء وغیرہ جیسی غیر معتبر اور انسانی لکھائی کے علاوہ کوئی مستند کتاب نہیں تھی۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اس کی کوپوراً کرنے کے لیے قصص القرآن لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں کلام مجید میں مذکور انبیاء علیہم السلام کے حالات لکھے ہیں اور جانجا دوسرے ماخذوں سے بھی مدد لی ہے اور جہاں ان کے اور کلام مجید کے بیان میں اختلاف ہے وہاں دلائل سے کلام مجید کے بیانات کی صحت و صداقت ثابت کی ہے اور مستزیدین

کے اعتراضات کے تحقیقی جوابات بھی دیے ہیں اور کلام مجید کے اصل مقصد عبرت و بصیرت کے پہلوؤں کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے اس طرح یہ کتاب انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کی تاریخ بھی ہے اور عبرت و بصیرت کا صحیفہ بھی۔

دوسری اہم تصنیف 'بلاغ المبین' ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سے عالم انسانیت کے لیے سراج منیر اور رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے تھے اور آپ کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنا تھا اس لیے جزیرۃ العرب میں اسلام کے فروغ کے ساتھ ہی آپ نے عرب کے قرب و جوار کے حکمران اور امراء و حکام کو اسلام کی دعوت دی اور ان کے نام تبلیغی خطوط ارسال فرمائے اس وقت پر بعضوں نے اسلام قبول کر لیا۔ بعض نے انکار کیا اور بعض عناد اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے یہ تبلیغی مکاتیب اور ان کے نتائج احادیث و تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور عہد رسالت میں دعوت اسلام کی اہم کڑی ہیں اس لیے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر ہے، مگر کسی ایک کتاب میں ایک جگہ جمع نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف کتابوں اور مختلف جگہوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ان کو جمع کر کے 'بلاغ مبین' کے نام سے ان کا مجموعہ مرتب کر دیا ہے مگر بعض مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں اور بہت سی ضروری باتیں بھی آگئیں ہیں چنانچہ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے پہلے حصہ میں کلام مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں بڑی تفصیل سے تبلیغ اسلام کے اصول تحریر کیے گئے ہیں جن کی حیثیت دعوت و تبلیغ کے نصاب کی ہے۔ دوسرے حصہ میں مکاتیب مبارکہ ہیں ہر کتاب کے ضمن میں کتب 'بلاغ مبین' کے حالات اور اس کی دعوت کے سلسلہ میں جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل ہے تیسرے حصہ میں نتائج کے عنوان سے اس تبلیغ کے اثرات و نتائج کی تفصیل اور تبلیغ اسلام کے متعلق بعض اصولی باتیں تحریر کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جو شکوک و سوالات ہوتے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے دوسرے اور تیسرے حصہ میں تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات اور ان کے جواب کا خاص طور سے لحاظ کیا گیا ہے اور ان کی مدلل تردید کی گئی ہے اس لیے یہ کتاب تنہا مکاتیب کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ دعوت و تبلیغ کا خاص بھی ہے۔ عہد رسالت میں دوسری اقسام و مذاہب میں ان کی تاریخ بھی ہے اور تبلیغ اسلام پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کا متعلق بھی ان مسائل سے متعلق بعض اور ضروری مباحث بھی آگئے ہیں جن کا اٹھارہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

تیسری کتاب 'اسلام کا اقتصادی نظام' ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ اقتصادیات اور مختلف طبقوں میں دولت کی تقسیم کا ہے جس نے دنیا کو مختلف گروہوں اور مختلف نظاموں میں تقسیم کر دیا ہے اور سرمایہ و محنت میں ایک مستقل کشمکش برپا ہے۔ اسلام نے صدیوں پہلے اس مسئلہ کو حل کر دیا تھا اس کا اقتصادی نظام اس قدر متوازن ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو سرمایہ داری اور غربت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نہ کوئی اتنا سرمایہ دار بن سکتا ہے کہ قادر و ن بن جائے اور نہ کوئی غلبہ و محتاج باقی رہ سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مستقل کتاب لکھی اس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اسلام کے اقتصادی نظام کو پیش کیا ہے اور یہ کہ ہے کہ یہ نظام اتنا متوازن ہے اور اس میں تقسیم دولت کے اصول اتنے عادلانہ ہیں کہ اس سے سرمایہ داری اور غربت و افلاس کے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں نہ اس کے لیے کسی سوشلزم کی ضرورت رہتی ہے اور نہ کمیززم کی۔

رسول کریم: یہ کتاب جلیا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے سیرت نبویؐ پر اوسط استعداد کے طلباء کے لیے لکھی گئی ہے اس میں رسول نبوی کے ساتھ آپ کے خصائص و شمائل اخلاق اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مختصر مگر موثر انداز میں ذکر ہے ہر بحث کے خاتمہ پر احادیث کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات و دے دیے ہیں۔ طلباء کے لیے سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے یہ کتاب

امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا کی ایک اہم تصنیف اخلاق اور فلسفہ اخلاق ہے اور اپنے موضوع پر قدیم و جدید کتابوں میں نمایاں مقام کی حامل ہے بہت علمی و فلسفیانہ کتاب ہے اس موضوع پر دیرسریج کرنے والوں کے لیے اس سے بہتر کتاب پیش نہیں آسکتی۔

پردہ نشین خواتین کو سرکاری ملازمت میں بے پروگی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا

بہار کی بعض شکایات پر حضرت مجاہد ملت کانٹولس اور حکومت کا جواب

مارچ ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کو دیاست بہار کے بعض علاقوں بالخصوص ضلع چمپارن سے یہ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے پردہ نشین مسلمان اساتذہ اور ان پکڑ لیں وغیرہ کو سرکاری ملازم میں محکمہ کی جانب سے مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ پردہ چھوڑ دیں یا سروس چھوڑ دیں، ممکن ہے ملک کے کسی دوسرے حصہ میں بھی کہیں کوئی ایسی شکایت درپیش ہو، بہرحال مولانا محترم نے اپنے خصوصی مراسلے کے ذریعہ وزیر اعلیٰ بہار اور وزیر تعلیم بہار کی توجہ اس افسوس ناک شکایت پر مبذول کرائی اور لکھا:

"میں ان شکایات کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اگر واقعہ حکومت بہار کے کچھ ایسے احکام جاری کیے ہیں تو قانوناً وہ کہاں تک جائز اور قابل برداشت ہو سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستور ہند اور بنیادی حقوق کی دفعات ایسے احکام کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتیں ہیں چاہتا ہوں کہ ایسے غلط احکام کو اگر واقعہ (وہ جاری کیے گئے ہیں) دستور کی روشنی میں چیلنج کروں۔ براہ کرم آپ مجھے اپنے ذمہ دار اور اطمینان بخش جواب سے مطلع فرماتے ہیں منظر ہوں گا۔"

وزیر اعلیٰ بہار شری ایس، کے سناٹے مولانا محترم کو اس سلسلہ میں جو جواب بھیجا وہ بہت صاف تھا جو لیے امور پر سرکاری موقف کو برملا واضح کرتا تھا ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

پٹنہ۔ مارچ ۱۹۴۷ء ڈی۔ او نمبر ۳۸۸

مافی ڈیر مولانا صاحب، آپ کے شکایت نامے پر میں نے ایک مکمل انکوائری کرائی ہے اور میں مطمئن ہوں کہ جو شکایت آپ تک پہنچائی گئی وہ سرسری بنیاد اور غلط ہے اس لیے کہ میری حکومت کی ہمیشہ پر ایسی رہی ہے کہ سابق دستور اور ہدایت کو جہاں تک ممکن ہو سکے نباہا جائے اور ان میں کوئی مداخلت نہ کی جائے چنانچہ مسلم خواتین کو خواہ وہ استانیات ہوں یا طالبات ہوں یا گورنمنٹ کی کسی دوسری سروس میں ہوں، بے پروگی پر مجبور کرنے اور پردہ سے دست بردار ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہو سکتا۔

آپ کا مخلص

(دستخط ایس کے سنہ)

محمد احمد ایڈووکیٹ

۱۹۴۷ء ہندی مسلمانوں کی تازہ بخ کا ایک یادگار سال ہے۔ جو لوگ اس سال کی ہولناکیوں میں ڈوب کر ابھرے وہ کبھی اس سال کو بھول نہیں سکتے۔

۱۹۴۷ء کا یہ تھا، خاک و خون کی بھولی تھی، یا موت کا جھنڈا ناچ تھا، جہاں یہ سال ہمارے لیے ایک کڑی آزمائش تھی۔

وہاں یہ ہماری سخت چٹائی کا ایک عظیم الشان مظاہرہ بھی تھا۔ زمانہ نے تیر آزمائے ہم نے جگر آزمایا۔

خچر نے حلقوم ہی نہیں کاٹے حلقوم کے خچر کی باڈھ کو بھی موڑ دیا ہے۔

آزمائش اور مصیبت میں انسان کے جوہر ابھرتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے صبر آزما دور میں ملت کا بھی ایک جوہر ابھرا۔

جتنی زبردست اور کڑی آزمائش تھی اتنا ہی زبردست اور عظیم الشان جوہر ابھرا۔

وہ جوہر تھا ————— حفظ الرحمن

صدیقوں میں خاک کے پردہ سے ایسا انسان نکلتا ہے۔

چاروں طرف چٹوٹا رہی تھا، اور حفظ الرحمن سراسر حرکت تھا اور عل ہیوم۔

چاروں طرف بے حس تھی اور حفظ الرحمن احساس کامل تھا۔

ہر طرف موت چھائی تھی اور وہ صورا سرا فیل تھا۔

ہم گواہ ہیں اس کی بے مثال شجاعت کے!

لوگ پناہ کے لیے دوڑتے تھے اور وہ پناہ گاہوں سے نکل کر میدانوں کی طرف دوڑتا تھا۔

موت سے وہ نہیں ڈرا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ گرجا

جہاں دہشت تھی اور خطرہ تھا وہ وہیں پہنچا اس کے قدم کبھی نہ لٹکھڑائے راہ حق میں۔

وہ اُحد اور بدر کے مجاہدوں کے جذبہ سے سرشار تھا۔

ہم گواہ ہیں کہ اس میں منصور کی شہیدہ سری تھی۔ اس میں سرور کی سرفروشی تھی۔ اس میں دارورسن کا خوف نہ تھا۔ اس کی زبان قوت

سے کبھی مرعوب نہ ہوتی۔

مصلحت کو کٹھی اس کی جرأت تھی کہ کبھی مغلوب نہ کر سکی۔

وہ مظلوم کی زبان تھا۔ وہ بانگِ دہا تھا اس ملت کا۔ ہم گواہ ہیں کہ وہ عمر بھر جیتا رہا۔ شمع سوزاں کی طرح جلتا رہا اور اس کی روشنی

پہنچانے کے لیے۔

ہم گواہ ہیں کہ اس عظیم ملک کے جس گوشہ سے اس نے کسی زخمی کی کراہٹ کی آواز سنی وہ بے چین دوڑا گیا اس کی طرف۔

جس نے اسے پکارا اسے غافل اور سوتا چڑا نہیں پایا۔

وہ سرتاپا درد تھا اور اضطراب۔ وہ نا آشنا تھا سکون اور آرام سے۔ وہ برق تپاں تھا۔

ہم کہہ رہے ہیں اس کی بے داغ محبت۔

اس کا خلوص بے پایاں۔ اس نے دولت کے آگے کبھی سر نہ جھکایا۔

وہ جیتا تھا اور دلوں کے لیے اس نے اپنی زندگی کا ایک دن اپنے لیے نہیں گزارا۔

اس کا سارا ورثہ اس کا پیغام ہے۔

حفظ الرحمن فتح تھی ملت کی موت پر!

کیا موت نے اس پر فتح پائی؟ کیا ظلمت نے شمع سوزاں کو مغلوب کر لیا؟ کیا حرکت کو سکون آگیا؟

جس ملت کے لیے وہ جیتا تھا اور تڑپتا تھا سوچو کیا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا؟

کیا کینسر کے ایک زخم نے حفظ الرحمن کو ختم کر ڈالا؟ کیا ایک چنگاری نے آتش کو کو بیچونک دیا؟

ہم کہہ رہے ہیں اس کی پیادہ کی آخری دن بھی! اس دلی مضطرب نے اس سے کہا۔

تیری ساری زندگی پیغام تھی یہ پیادہ بھی ایک پیغام ہے۔ کینسر کی ٹیسیں۔ جانکلیاں۔ لیکن۔

ہجوم احباب ہیں اس کی محبت اور مروت بدستور تھی۔ وہ صبر و رضا کا مجسمہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتا تھا۔

مرض کی انتہائی سختیوں میں اس کی استقامت اور خندہ پیشانی قائم تھی۔

اس کی استقامت اور صبر میں جھلک تھی اس صبر و استقامت کی جریدہ کے زمین و آسمان نے چودہ سو برس پہلے دیکھی تھی۔

موت کے سلسلے گہرے ہوتے جاتے تھے۔

لیکن وہ مایوس نہ تھا۔۔۔ وہ ملت کے حال سے بھی غافل نہ تھا وہ عیادت کر کے والوں سے ملت کے حال کا پرسان تھا۔

ہم گواہ ہیں کہ ہم نے آخری دلوں تک اس کی ننگشتہ پیشانی پر مروت کا خوف نہیں دیکھا۔

سائنس بے قابو ہو رہا تھا لیکن بہت سیدھے سہجے۔

وہ مروت سے لڑتا رہا۔ وہ مجاہد تھا ملت کا۔

حفظ الرحمن کی زندگی ایک پیغام ہے۔ اس کی موت بھی ایک پیغام ہے۔ ایک پیغام جاوداں

وفات پر خراج عقیدت

ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریہ ہند

مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم کی وفات، پورے ہندوستان کے لیے ایک سخت سانحہ ہے۔ بعض مرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جگہ پر کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمن مرحوم کا شمار انہیں میں کرنا چاہیے انہیں نے اپنی مجاہد زندگی کی ساری صلاحیتیں ہندوستانی قومی تعمیر کے لیے وقف کر دی تھیں ان کی حساس اور فرض شناس شخصیت نے مذہب و ملت کا فرق واقف کیا کبھی روانہ نہ کیا وہ ہر اس تحریک کے ساتھ تھے جو مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت میں اٹھائی گئی ہو۔ جب کبھی اور جہاں کہیں انہیں مظلوم کی پیچ سنا دی تروہ بیتاب ہو گئے اور غم گساری کے لیے پہنچ گئے اور جو بھی بن پڑا کیا کبھی حکام کو متوجہ کیا کبھی مالی اور طبی امداد کے لیے سامان فراہم کیا اور کبھی جرأت اور بے باکی سے حق اور صداقت کو اپنے اہل وطن کے سامنے پیش کیا۔

مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی انہوں نے خلافت اور سراج کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت، حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی، ان کی زندگی مدح و ستائش سے ہمیشہ بے نیاز رہی جو کچھ کیا اسے فرض سمجھ کر کیا۔ قید و بند کے مصائب برداشت کیے تو فرض سمجھ کر۔ آزاد رہ کر جہتیں جھیلیں، وہ بھی فرض سمجھ کر۔ ان کی ذات ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان انصافی کر ٹی کے شکل تھی وہ قومی اتحاد اور یک جہتی کے زبردست علمبردار تھے انہیں پورا یقین تھا کہ جب تک اہل ملک میں جذباتی ہم آہنگی اور ہمدردی و ممانعت نہ پیدا ہو اس وقت تک آزادی کی پرکٹیں عام نہیں ہو سکتیں اور نہ حریت و اخوت کے اصول جو پکڑ سکتے ہیں، جن پر ہندوستانی دستور کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

افسوس، صد افسوس کہ وہ ہم سے نہ صحت ہو گئے، لیکن کیا وہ واقعی ہم میں نہیں ہیں؟

نہیں وہ ہزاروں ساتھیوں کے سینوں میں محبت اور عقیدت کے روپ میں ہزاروں بے یاروں بے مددگاروں بے شمار تھیں، ہزاروں کے دلوں میں ایک سہارے کی یاد کی شکل میں، لاکھوں ہم قروں کے ذہنوں میں، خوف کے وقت

جرات، بے مروتانی میں ہمت اور ہر حال میں خلوص اور صداقت کے ملک کی صورت میں زندہ رہیں گے۔ ایسے لوگ مرتے نہیں، موت ان کے لیے حیات جاوداں کا دروازہ ہوتی ہے۔ ان کی روح اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں پہنچ گئی ہے اس کی رحمتوں اور برکتوں کی بارش اس پر ہو۔

ڈاکٹر ڈاکر حسین خاں

السید جمال عبدالناصر، صدر متحدہ عرب جمہوریہ؛

مولانا حفظ الرحمن جنرل سیکرٹری جمعیت علماء ہند کی خبر وفات میں لے کر رے رنج و غم کے ساتھ پہنچی۔ بلاشبہ ہم ایک جید عالم دین سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے اسلام کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ خدا نے پاک سے میری دعا، کہ انہیں اپنی رحمتوں سے نوازے اور آپ کو جو رحمت نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی کرے۔

جمال عبدالناصر

ڈاکٹر راجندر پرشاد، سابق صدر جمہوریہ ہند؛

کیمپ جیڈ آباد

مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۶۲ء

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم جمعیت علماء ہند کے ایک بلند پایہ رکن، ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے ان عزیزوں دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ بارگاہ کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔ شل ہے کہ علوم کی یادداشت ہمت کمزور ہوتی ہے اور اسے اپنے سچے خادموں کو بھی بھولتے دیکھیں گے۔

راجندر پرشاد

مسٹر اندرا گاندھی

(خاص مکتوب کے ذریعہ)

مولانا کی وفات سے سب کو دلی صدمہ پہنچا۔ مولانا صاحب کی یاری کا مجھے علم تو تھا، لیکن یہ گمان نہ تھا کہ ان کا وقت اتنا قریب آگیا ہے۔ علاج کرائے کے بعد انہوں نے میرے دل (ہنڈت جواہر لال نہرو) سے کہا تھا کہ اب میں اچھا ہوں۔

مولانا صاحب نے اپنی تمام زندگی ملک اور قوم کی خدمت میں گزار دی وہ بڑے حوصلے والے روشن خیال اور

بلند اخلاق انسان تھے ان کی وفات سے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

شریک غم ناز کا گاندھی

شری جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہند:

مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔ مولانا کو میں کب سے جانتا ہوں، کچھ کہ نہیں سکتا میں بس سے جانتا ہوں، یا شاید بیس بیس چالیس برس سے جانتا ہوں، بالکل یاضمین ہم لوگ شروع میں دونوں یو پی کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے، اکثر ملا کرتے تھے چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے وہاں ان سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ سب مسئلوں پر بات چیت کیا کرتے تھے۔ جب انگریزی حکومت سے مقابلہ کرتے تھے تو جارا معمولی کام رک جاتا تھا، صرف مقابلہ ہوتا رہتا تھا جیل جانے اور آئے کا کام رہتا تھا۔ ہم پھر آگے گئے تھے تو اس سلسلے کو شروع کر دیتے تھے میں ان سے بہت ملتا تھا اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے، میرے دل میں ان کی بہت قدر تھی۔ بہت محبت تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے بہادر نیتا تھے جکتے تھے، اس میں وزن ہوتا تھا، ان کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے ان کی وفات سے مجھے کافی دکھ لگا ہے۔ آہستہ آہستہ سارے بزرگ گزرتے جا رہے ہیں۔ ان کے کاموں کا بوجھ لوگوں کے کندھوں پر آ پڑا ہے۔ دنیا کا اس طرح ہی دستور ہے دستور کیسا بھی ہو، رنج تو ہوتا ہے اور رنج ہونا بھی چاہیے۔

ابھی وہ امریکہ سے واپس آئے تھے تب میں مولانا حفظ الرحمن صاحب سے ملا تھا، مجھ سے بڑے اطمینان سے انھوں نے کہا تھا کہ ڈاکٹروں نے ان کو اچھا کر کے بھیجا ہے، ہاں کافی کمزور تھے میں نے انہیں مبارک باد دی تاکہ سہ کر اچھے ہو گئے۔ سوچا تھا کہ ہلکے ہلکے طاقت آجائے گی ابھی کمزور ہیں ایک روز میں نے سنا کہ وہ گزرنے لگے بڑا افسوس ہوا، اس بات کو برداشت کرنا ہی ہوتا ہے مناسب ہے کہ جمع ہوں رنج و غم کا اظہار کریں، لیکن کچھ غور کریں کہ کیا آدمی تھا۔ اس کا کیا طریقہ تھا کیا کریگا

ہیں چاہیے اس سے کچھ سیکھیں اس کے راستہ پر چلیں۔

جواہر لال نہرو

شری لال بہادر شاستری (جم فٹس)

ٹاؤن دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر:

مولانا حفظ الرحمن کا انتقال ہو گیا میرا ان کا ۳۷، ۳۸ سال کا ساتھ تھا۔ یو پی میں میرا ان کا ساتھ

رہا، پھر دلی آنے کے بعد میرا ان کا ساتھ رہا ہمارے ساتھی ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں۔ ابھی ٹنڈن جی اور سٹری سی رائے کا انتقال ہوا تھا، اب مولانا بھی چل دیے اسی طرح بہم بھی ایک دن چلے جائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ بچلا جاتا ہے اس کی جگہ لینے کے لیے کوئی دوسرا سامنے نہیں آتا۔

ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے، گاندھی جی اس ملک میں آئے انھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی، ان کے ساتھ مل کر، ان کے بنائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر ان پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے، چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ ان کا ڈھنگ اور طریقہ الیا ہی تھا۔

لیکن میں آپ سے ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا۔ بہت سا پڑھ لکھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وز پر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیرائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس ۳۲، ۳۳ سال کی مدت میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جلسہ ہو کوئی موقع ہو اور مولانا اس میں شامل ہوں اور انہوں نے سب کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچی ہو ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی، جہاں وہ بیٹھے ہوں، ٹھوٹی ہی وہ ہیں وہ سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں نے ان کو کانگریس کے جلسوں میں دیکھا، یو پی اسمبلی میں دیکھا۔ پھر یہاں پارلیمنٹ میں اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے دیکھا، وہ اپنی بات سے اپنی سچائی اور بردباری سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔

مولانا ہمارے لیے بڑا سہارا تھے۔ ملک کے لیے مشکل مشکل مسئلوں میں ان کی رائے کا ایک وزن تھا اس لیے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تک تو ان کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ ملک کو آزاد کرانے کا لیکن اس کے بعد سے ان کے سامنے ملک کی ترقی اور ملک کے اتحاد کا سوال سب سے زیادہ رہتا تھا

اس ملک میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں جن سے مولانا کو بہت دکھ پہنچتا تھا میں آپ کو بتاؤں وہ کیا باتیں تھیں جن سے مولانا بہت دکھی ہوتے تھے یہی باتیں کہ کبھی ہم یہاں اطمینان کبھی وہاں دنگا فساد کر دیا۔ جب الانچی اور بخر کا استعمال ہوتا ہے تو کون چندو ستانی ہے جس کے دل پر چڑھ نہ لگتی ہو۔

مولانا کو ایسی باتوں سے بہت دکھ ہوتا تھا وہ ناراض ہوتے تھے، غصہ بھی ہوتے تھے مگر سنجیدگی اور بردباری کے ساتھ ان باتوں کو سوچتے تھے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے ان کے اندر ایسے واقعات سے کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی تھی بے چین ہوتے تھے اور غلط باتوں کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھاتے تھے، مگر بردباری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے

جلد پر میں ایسا ہی دنگا فساد ہوا مولانا وہاں گئے اپنی آنکھوں سے دلوں کی باتیں دیکھ کر آئے۔ وہ بہت دکھی تھے انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے، ملک کے لیڈروں کے سامنے، وہ باتیں بڑے دکھ کے ساتھ

بیان کیں، جو وہ دیکھ آئے تھے میں آپ کو بتاؤں کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اس جلسہ میں اس صوبے کے چیف منسٹر صاحب بھی موجود تھے، لیکن مولانا نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہا جو غصہ لیے ہوئے، نفرت لیے ہوئے یا سخت ہو، ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی تکلیف میں اپنی زبان سے سخت لفظ نہ نکالتے تھے۔

بہت سی باتیں جو انھوں نے بیان کیں ان کے بارے میں جب ان کو ایسی باتیں بتائی گئیں جو ان کے علم میں نہیں تھیں تو انھوں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ انھوں نے فوراً کہا۔ یہ باتیں میں نوٹ کیے لیتا ہوں۔ میں ان کی تحقیق کروں گا، اور آپ کو بتاؤں گا کہ اصل بات کیا ہے لیکن یہ جو میں اپنی آنکھ سے دیکھ کر آیا ہوں اس کے بارے میں میں نہیں مان سکتا، یہ ان کی سچائی کی بات تھی اسی طرح وہ ہر معاملہ میں ہماری مدد کیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے لیے ایک بڑا سہارا تھے۔

باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن وقت نہیں ہے، اگر کبھی وقت ملا تو میں تفصیل سے آپ کو بتاؤں گا کہ مولانا میں کیا خوبیاں تھیں انکی خیریاں بہت زیادہ تھیں انکی باتیں کیسی ہوتی تھیں یہاں میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں۔

انھوں نے دہلی میں انڈین مسلم کنونشن بلایا۔ میرا خیال یہ تھا کہ ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس طرح کا ایک کنونشن بلا دیں، چنانچہ میری رائے ان کی رائے سے الگ تھی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہماری رائے ان کی رائے کے مطابق نہ ہوتی لیکن مولانا کی رائے میں ایک وزن ہوتا تھا یہیں انکی رائے مانی پڑتی تھی، وہ اپنی بات کو بہت صفائی سے، جرأت سے اور دلیلوں کے ساتھ پیش کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ ایک دن رات کو اسے مجھ سے ملنے آئے۔ ایک گھنٹہ تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے اور انھوں نے اپنے دلائل سے مجھے رائے بدلنے پر مجبور کر دیا میں ان کی بات سے متفق ہو گیا۔ چنانچہ میں صبح سویرے ہی اٹھ کر سب سے پہلے آپ کے ملک کے وزیر اعظم صاحب کے پاس گیا اور میں نے ان کو بتایا کہ رات ایک گھنٹہ تک مولانا سے میری بات چیت ہوئی ہے، میں نے پنڈت جی کو وہ باتیں سنائیں اور میں نے کہا کہ اس بات میں اس حق میں ہر ایک مسلم کنونشن ہونی چاہیے۔ چنانچہ پنڈت جی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور وہ کنونشن ہوا۔

مولانا ایک زبردست مقرر تھے میں یہاں کسی کی شان میں گستاخی کرنا نہیں چاہتا اور میری رائے اگر غلط ہے تو میں معافی چاہتا ہوں، لیکن میں کہوں گا کہ اس ملک میں ایک تو مولانا اور الہامیہ آزاد تھے جو بہت اچھی تقریر کرتے تھے ان کا نام ہی الہامیہ تھا، لیکن ان کے بعد میں نے گزشتہ ۳۰، ۴۰ برس میں مولانا حفص الرحمن سے زیادہ اچھی اور سلیجھی ہوتی تقریر کرنے والا نہیں دیکھا، ایک دفعہ مجھے ان کے ساتھ فرخ آباد کے ایک جلسہ میں شرکت کا موقع ملا کہ تقریباً ۳ لاکھ انسانوں کا مجمع تھا، مولانا تقریر کرنے کھڑے ہوئے ان کی آواز کے اوپر اٹھنے کے ساتھ مجھے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا مجمع نیچے گر رہا ہے مجھے تھوڑی دیر بعد یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ شخص اس ۳ لاکھ کے مجمع سے جو چاہے کر سکتا ہے اسی طرح جب وہ پارلیمنٹ میں بولتے تھے تو پورے ہاؤس میں سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر منی جاتی تھی اس کا خاص اثر ہوتا تھا۔ جنوبی ہند کے ممبران بھی جو ان کی زبان نہ سمجھ سکتے تھے۔ سکون اور خاموشی سے ان کی تقریر سننے اور ان کے لب و لہجہ اور آواز کے آثار چڑھا دے ہی متاثر ہوتے تھے۔

اس ملک میں بڑے بڑے لیڈر آج بھی موجود ہیں، لیکن جو بات مولانا میں تھی وہ میں کسی میں نہیں پاتا ایک طرف تو مولانا ملک کے بڑے بڑے مسائل میں اپنی رائے دیتے تھے اور انہی سے اچھی سطح پر کام کرتے تھے۔ دوسری طرف مولانا ایسی سادگی کے ساتھ زندگی گزارتے کہ غریب سے غریب اور کمزور سے کمزور آدمی مولانا کا سنا سن سے پہنچ سکتا تھا۔ سب کی بات سنتے تھے اور فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے تھے وہ روزانہ ہی مجھ کو یا تو کسی معاملے سے متعلق خط لکھتے تھے یا پارلیمنٹ میں مجھ سے اگر ملتے تھے وہ کسی ایک ہی فریق کے لوگوں کے کام کے کر میرے پاس نہ آتے تھے بلکہ جس فرقہ کا بھی آدمی ان کے پاس پہنچ جاتا تھا اور اپنی مصیبت کا حال ان کو سناتا تھا اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ تیار ہو جاتے تھے، وہ صحیح معنوں میں غریبوں کمزوروں، بیکسوں اور مظلوموں کا سہارا تھے، ان کے ہمدرد تھے، ان کے کام آتے تھے، یہ لوگ ان تک آسانی کے ساتھ پہنچ سکتے تھے۔

کسی کام کے کرنے کے سلسلے میں ہماری بھی اپنی دقتیں ہوتی ہیں۔ وہ جب کسی کام کے لیے کہتے تو ہیں ان کے سامنے اپنی دقتیں بیان کرتا، ان کو بھی وہ دعوے سنتے اور پھر جلد ہی ایک نتیجہ پہنچ جاتے وہ کہتے اچھا یہ تو آپ کے ایڈمنسٹریشن کی مجبوریاں ہیں، میں انہیں مانتا ہوں، لیکن فلاں بات کا کوئی تعلق آپ کے ایڈمنسٹریشن سے نہیں ہے اسے تو ٹھیک ہی ہو جانا چاہیے، اور ہمیں ان کی بات ماننی ہی پڑتی، ان کی بات میں اتنا دھڑکتا تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ ایسے لیڈر کہاں ہیں۔ آج ہمیں مولانا حفیظ الرحمن جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے۔ ایسے لیڈر کی ضرورت ہے جو ان کی طرح سوچ سکیں، ان کی طرح اپنی بات مندا سکیں، غریبوں، مظلوموں، بے کسوں کے بلا تفریق مذہب و ملت کام آ سکیں۔ برائیوں پر ان کے دل دھکی ہوں، لیکن ان کے اندر کبھی پیدا نہ ہو، میں نہیں جانتا کہ اب مولانا جیسی سنجیدگی ذہانت تدبیر اور بردباری رکھنے والے لوگ پیدا ہوں گے یا نہیں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ آج ہمیں ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے، میں فوجوائس سے کسوں کا کردہ مولانا کی طرح بننے کی کوشش کریں۔ وہ حقیقت مولانا کا انتقال نہیں ہوا ہے، بلکہ مظلوموں اور بیکسوں کا سہارا اٹھ گیا ہے۔

لال بہادر شاستری سابق وزیر اعظم ہند

مولانا داؤد غزنوی - لاہور پاکستان

مولانا حفیظ الرحمن سید ہارونی صاحب کے ساتھ اترکال کی خبر مجھے ایک سفر سے واپس آنے کے بعد ہوتی۔

اس خبر کا بے حد صدمہ ہوا۔ واللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ملک کے ممتاز ترین علماء میں سے تھے اسلامی غیرت و حمیت اور اس کے لیے جاں نثاری میں قابل رشک مقام رکھتے تھے۔ ان کی خدمات علماء کی تنظیم اور ان کے مقام کو بلند کرنے میں بے مثال تھیں۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد وہ اسلام کا بٹور بہادر سپاہی بھی تھے اور کمانڈر بھی تھے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تقسیم کے بعد وہ مسلمانوں کا سہارا تھے۔ انہوں نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر جس جرات اور بے باکی

مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز بلند کی آج اس کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔ وہ حسن اخلاق، مروت ہمدردی، ایثار نفسی اور تحمل و بردباری کے مجسم تھے۔

ان کے فراق پر آنکھیں اشکبار ہیں، دل حزین و گمراہ ہے، لیکن رضا بقضاء کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے رفیق قدیم کی جدائی پر اللہ وانا الیہ راجعون کہیں اور ان کے حق میں دعا کریں۔

اللهم اغفر له وارحمته دعائه واعف عنه واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واخله
بالسوء والشیخ ونقه من الخطایا کما نقيت الثوب الابيض من الدنس و بدلہ داراً خیرا من
داره اهلہ واولادہ وامن اهلہ وزیجہ خیرا من زوجہ وادخلہ الجنة واعذه من عذاب القبر ومن
عذاب النار۔
مولانا داؤد غزنوی لاہور

مولانا عبدالحمید بخاری۔ صدر جمعیۃ علماء پاکستان۔

سید بارہ ضلع بمبئی کی سرزمین قابلِ فخر ہے جس نے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب جیسا عالم پیدا کیا جانے والے اچھے طرح جانتے ہیں کہ مولانا حفظ الرحمن صاحب فراغت و تکمیل علوم عربیہ کے بعد ہی قومیات، مذہبیات کی تحریک میں پورے جوش کے ساتھ شریک ہو گئے۔ شریک خلافت، آزادی جزیرۃ العرب میں انہوں نے انتہائی سرگرمی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اس تحریک میں جو لوگ شریک ہوئے ان کے اندر مروت و محبت کے رجحانات و میلانات نمایاں طور پر پیدا ہو گئے۔ چنانچہ ہمیں یاد ہے کہ جب ہماری اور مولانا کی پہلی ملاقات سید بارہ خلافت کے ایک جلسہ خصوصی میں ہوئی اس دن سے تاقیام پاکستان وہ جب لے انتہائی اخلاص و محبت سے ملے۔ سیاسیات میں اگرچہ ان کی ہماری دو جدا گانہ راہیں اور منزلیں تھیں، مگر مولانا نے کسی وقت بھی تعلقات میں فرق نہ آنے دیا۔

مولانا حفظ الرحمن بہترین خطیب و مقرر تھے ان کی تقاریر میں جوش و ولولہ، خطابت علمی مواد ہوتا اور ہر ذوق کا سامان ہوتا، سیاسی تقاریر کے علاوہ میں نے چند تقاریر سیرت نبویہ پر بھی سنیں، بلاشبہ یہ تقاریر یادگار کی حیثیت رکھتی تھیں، کاش اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈ ہوتے تو یہ ریکارڈ کی جاتیں۔

مولانا اگرچہ شروع سے لے کر آخر تک کانگریسی رہے لیکن ان کے اندر مذہبی رُخپ ملت اسلامیہ کی ضرورتوں کا احساس، مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے تاثرات زیادہ سے زیادہ موجود تھے، وہ جہاں اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے معاملات پر آزادی کے ساتھ بولتے وہیں حکومت کی بیچوں میں بیٹھ کر لکھنؤ کی بلندیوں پر بولتے ہندوستان میں جہاں کہیں بھی مسلمانوں پر کوئی آفت آتی، مولانا حفظ الرحمن مضطربانہ انداز میں موقع و اوقات پر پہنچ کر مصیبت زدوں کی امداد و اعانت فرماتے مولانا کی یہ خدمات جلیلہ تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ اسلامیان ہند کی طرح پاکستان کے علماء بھی مولانا مرحوم کو فراموش نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم۔ مظاہر العلوم ہمدان پور
مکرم حضرت، رفیعہم، بعد سلام منوں

کلی کے تذکرے رسید تو مولانا محمد میاں صاحب کے کاڈ پر اسی وقت لکھ چکا تھا۔ اس حادثہ پر تعلق اور رنج و جفا
بھی ہوا، قرین قیاس ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ جرأت اور بیباکی سے حکام کے سامنے مسلمانوں پر مظالم کو پیش کرنا ہر ایک کے
بس کی بات نہیں، اللہ تعالیٰ ہی مولانا مرحوم کو ان سب مساعی جلیلہ کا، جو انھوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود بالخصوص مسلمانوں
کے حواشی میں کیں کہ یہ ناکارہ خود بھی اس وقت دہلی ہی میں موجود دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی ثنائی شان بہترین جزائے خیر
عطا فرمائے۔ غالباً آپ کے علم میں تو یہ بات ضرور ہو گی کہ اس ناکارہ کے یہاں تعزیری ریویویشن وغیرہ کرنی وقعت نہیں رکھتے۔
میرے نزدیک جانے والے کے لیے اور پسماندہ دوستوں کے لیے کام آنے والی چیز دعا، مغفرت اور ایصال ثواب ہے۔
_____ کل سے جب حادثہ کی اطلاع سنی، مدرسہ کے علاوہ خصوصی احباب سے بھی پی فرمائش کر رہا ہوں کہ ہر چہ
کہ ان کو قرآن پاک اور ناظرہ خواتین مرتبہ سورہ یسین اور جو ان پڑھ ہوں وہ کم سے کم تین مرتبہ قبل ہوا اللہ پڑھ کر ضرور بخشیں۔ بندہ کے
نزدیک مولانا کے احسانات علی السلیین کا اگر کوئی بدلہ ہے تو یہی ہے۔

محمد زکریا

مولانا حفظ الرحمن ہندوستان کی تازہ کاری کا ایک روشن باب تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا خراج عقیدت۔

(تعزیتی قرار داد)

حضرت مولانا حفظ الرحمن مرحوم کے انتقال پر ہلال پر اپنے رنج و غم کا اظہار کر کے کے لیے مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ کے طلباء، اساتذہ، ممبران کورسٹ اور جملہ کارکنان کا ایک جلسہ یونین ہال میں منعقد ہوا، اسی روز یونیورسٹی میں تعطیل کر دی گئی
تھی، جلسہ کی صدارت پر وچا سلسلہ نواب صاحب چھتری نے فرمائی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب چھتری جناب
عبد المجید خواجہ اور مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سیکرٹری بصیرت احمد صاحب نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش
کیا۔ بعد میں وائس چانسلر کرنل بشیر حسین صاحب زیدی نے مندرجہ ذیل قرار داد پیش کی جو متفقہ طور پر جلسے نے کھڑے ہو کر
پاس کی۔

”مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء، اساتذہ، ممبران کورسٹ اور جملہ کارکنوں کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمن
کی وفات پر انتہائی رنج و دالم اور ان کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، مولانا جنگ آزادی کے عظیم مجاہد روشن
خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے انہوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید و بند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت
ہی نہیں کیا بلکہ انہیں جہالت اور پامردی کے ساتھ و عسرت بھی دی وہ بھنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علوم
فصل میں ہمیشہ ممتاز رہے، خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں۔ اتر پردیش اور ہندوستان کی تاریخ
میں یادگار ہیں، وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے، ملک کی تقسیم کے بعد جس طرح انہوں نے ہندوستانی قومیت
اور جمہوریت کے تھور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جدوجہد کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

۱۸۸۷ء سے لے کر اپنے آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کے لیے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گراقت در ہیں، علمی اور ادب کی خدمت اور اساتذہ کی بہبودی کے لیے انھوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمنیں اور جماعتیں ذکر نہیں، وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے جس کا ایک بڑا روشن ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے دیوبند کے تصور کو علی گڑھ کے تصور پر اور علی گڑھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلط نہیں کیا، وہ جہاں پر اس نے علوم کا احترام کرتے تھے، وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور ان کے ماہرین کے سچے قدروان بھی تھے، ان کی رواداری اور وسیع الشربہ میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ امیر، غریب، عالم اور جاہل سب کے غمخوار تھے، البتہ وہ ہر قسم کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے سخت دشمن تھے اور ان کے خلاف جہاد کرنے میں اپنی جان و مال کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔

مولانا مسلم لیونیرٹری کے ساتھ کئی چھٹیوں سے وابستہ تھے وہ لیونیرٹری کرٹ کے ممبر اور ایک گیلیئر کونسل کے رکن تھے انھوں نے اس ادارہ کی ضرورت خدمات انجام دیں۔ مولانا کی وفات ہندوستان کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اور علمی، ادبی اور سیاسی جماعتوں کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ خدا نے عروج و جل سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے پیماہ گان اور اقرا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ہزار کیسینسی الشیخ یوسف الفوزان سفیر سعودی عرب

لا ریب بان وفاة المرحوم مولانا حفص الرحمن كانت فادحة كبرى بالنسبة للهند عامة، ولسلی الهند بصورة خاصة

اذ فقدہ مسلما للهند و هو اشد ما يكونون حاجة لقيادة حكيمة ذات مرزاة و معرفة
تصف صاحبها بالجموة والثبات على المبدأ
فلقد عرف النقيذ رحمة الله بحاسته الوطنية و غيرته الدينية و اتساع افق تفكيره
و نضوج آرائه

ولقد اتمر بالفرازة والتجرد من الاطماع والاعراض والمآرب الذاتية كما
ان صلابته و صراحته كانت مثالا من امثلة الرجل الحقة و برناته طويوت صفحة
بيضاء ناصعة في الجهاد الوطني والديني كان رحمة الله و غفرله اثنا مرضه مثال
المومن الصابر للحق شب اذ ابدا جلد و صبرا يتم عن عميق ايمانه بالرغم مناعاناه من الابداح
المبحة و آلام الداء العضال الذي ادى احيوا بحياته
اكرم الله مثواه و تعنده بركة (وانا لله وانا اليه راجعون)

يوسف الفوزان

مولانا سید محمد بدر عالم - مدینہ منورہ

میرے علم میں اس وقت تمام ہند میں مسلمانوں کے سب سے بڑے خیر خواہ اور مجدد، مجاہد عالم، رفیق مخرم مولانا حفظ الرحمن صاحب خضر اللہ و اعلیٰ درجات فی علیین تھے۔ اپنے علم کا کیا اظہار کروں۔ بستر ملائت پر چڑھا ہوا اس الم سے کروٹیں بدل رہا ہوں، موجودہ دور میں مولانا جیسی ہستی کا فقدان ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔

کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

مولانا سید محمد بدر عالم

ہنرہ ولی نس ملاطامہر سیف الدین - بیٹی۔

”مولانا حفظ الرحمن صاحب کی خیر وصال دلی رنج و غم کے ساتھ نبی ان کی عظیم الشان خدمات کے تذکرے تادیر باقی رہیں گے اور آئندہ نسلوں کے لئے لوث خدمت و عمل کا سبق دیں گے۔ ان کی فیمل تک ولی ہمدردیاں پہنچا کر مومن فرمائے۔“

”ملاطامہر سیف الدین“

شیخ الازہر الشیخ محمود شلتوت - جامعہ ازہر (مصر)

”مولانا حفظ الرحمن کی وفات پوری ازہر یونیورسٹی کے لیے باعث فلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خدمات کا اجر جزیل بخشے جو انہوں نے اسلام کی سر بلندی کے لیے انجام دیں اور ان کے قلم پس نامہ نگان، متوسلین و رفقا کار کو جو جزیل سے نوازے۔“

شیخ محمود شلتوت

شورش کشمیری - ایڈیٹر ”چٹان“ لاہور۔

”مولانا حفظ الرحمن صاحب کے وصال سے دل پر جو بجلی گری ہے، ناقابل بیان ہے۔ ان کی وفات ایک بے مثل عالم دین، عظیم رہنما، مجاہد حق اور مسلمان ہند کی آخری امید کی موت ہے۔“

شورش کشمیری

بانی تنظیم اہل سنت ہمدرد احمد خان پٹانی رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۰ء



بائے تحریک تنظیم سردار احمد خاں پٹانی

ضلع ڈیرہ غازی خاں (سابق پنجاب) کے طول و عرض میں بلوچ قوم کثرت سے آباد ہے۔ یہ ایک دیندار، خیرور، بہادر، مہمان نواز اور دوسرے بہت سے اخلاقی حمیدہ، صفات مندودہ سے منصف قوم ہے اس قوم کے متعدد مشہور قبیلے ہیں مثلاً لغاری، مزاری، ریشک، گورجانی، بزدار۔

انہی بلوچی قبائل میں سے ایک معزز و مشہور قبیلہ پٹانی ہے۔ راجن پور اور جام پور دو تحصیلوں میں پٹانی بلوچوں کے کئی خاندان آباد ہیں۔

جام پور سے ڈیرہ دو میل دور ساچل دریا پر ایک موضع ہے، لٹدی پٹانی! یہ پٹانی خاندان کی ملکیت ہے، جناب سردار صاحب مرحوم اسی خاندان کے ایک نہایت ہی معزز فرد تھے۔

جس زمانہ میں سردار صاحب کی سپدا آتش ہوئی اس زمانہ میں دین کا عمومی احترام زیادہ پایا جاتا تھا پھر ضلع ڈیرہ غازی خاں اپنے الگ شکل محل وقوع کے باعث فرنگی اقتدار و تہذیب کے اثرات اور لادینی رجحانات سے نسبتاً دور پھر دیندار خاندان اس منہاجل میں جناب سردار صاحب نے آنکھ کھولی۔

زیندار و ستور کے مطابق دین و دنیا کی واجبی تعلیم حاصل کی، انگریزی فارسی اور اردو تین زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی اور فارسی تو صرف پڑھا اور سمجھ سکتے تھے، لیکن اردو بے تکلف بول سکتے تھے اور لکھنے پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ دینی تعلیم کی عربی کتب و مدرسہ سے باضابطہ تو حاصل نہیں کی تھی، لیکن اپنے وسیع مطالعہ کی بنا پر دین کا نہایت صحیح علم رکھتے تھے۔ سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک زیندار گھرانے کے فرد تھے، لیکن آپ کا دل و دماغ زیندارانہ دل و دماغ نہ تھا، آپ نے دماغ و باطن تیار اور روشن و بیدار اور آپ کو دل ملا تھا تو زندہ و رومند۔

بیدار دماغ نے اغیار کی مذہبی بیداری و حرکت، تبلیغی تنظیم و مرکزیت اور ایشاد و فدائیت کا عمیق مطالعہ اور اضطراب انگیز احساس کیا اور وہ منہاجل اپنوں کے مذہبی جمہور و غفلت اور تبلیغی انتشار و لامرکزیت پر تڑپا جب مالی فراخی و فراغت کے ساتھ دل میں درد اور تڑپ ہو تو انسان قوم و ملت کی خدمت کے لیے آگے بڑھتا ہے، چنانچہ اس وقت جب ضلع کے دوسرے بڑے آدمی

فرنگی کی خوشامد و رآمد میں مست مگن تھے، سردار صاحب نے قوم و ملت کی خدمت پر کمر کس لی، جس کا آغاز آپ نے تعلیمی سلسلہ سے کیا۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب کہ قومی کاموں پر ایک پسیدہ خرچ کرنے کے تصور تک سے لوگ نا آشنا تھے آپ نے جام پور میں ایک اسلامی مڈل سکول اور تین چار پرائمری سکول قائم کر کے ان پر ہزاروں روپیہ صرف کیا۔ صرف مڈل سکول کی بچت عمارت پر بیس لاکھیں ہزار سے کیا کم خرچ ہوا ہوگا۔ یہ سکول امتحانات کے نتائج کے اعتبار سے پورے ضلع میں اپنی مثال آپ تھے، سینکڑوں طلبہ نے یہاں سے سرکاری وظائف پر تعلیم حاصل کی اور اپنا مستقبل روشن کیا۔

تبلیغی جذبہ تبلیغی سلسلہ میں جناب سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روپیہ بھی بے دریغ خرچ کیا اور اپنی زندگی کے بہتے اور شام کو گھر واپس تشریف لے آتے۔

پندرہ بیس سال کے بعد دور اندلوں میں آپ نے جب دیکھا کہ مرزائیت بلکہ آریہ سماجیت تک ہمارے ان سکولوں کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو کھانے جا رہی ہے اور زیادہ تر ملت کا تعلیم یافتہ وحساس طبقہ نہایت خاموشی سے انہماک کی رو میں بہا چلا جا رہا ہے، تو آپ کا درد مند دل مسلمانوں کی سیکسی و بے چارگی اور ان کے انتشار و لامرکزیت پر سیلاب وار بے قرار ہو گیا، اور آپ نے اپنے اندر ملی اصلاح کے طریق کار میں فوری تبدیلی کی ضرورت کا شدید احساس موجود پایا۔

اب آپ نے اسلام کے مستقل نظام تبلیغ کی ضرورت محسوس کی، کہ اس طریقہ سے اسلام کی اشاعت کا فرضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہل اسلام کو اختیار کی لورش و لیٹار سے سپایا جاسکتا تھا۔

ضلع بھر میں تبلیغی کام چنانچہ آپ نے اپنے ضلع کے طول و عرض میں تبلیغ دین کا کام شروع کر دیا اور اس کام کو محدود حلقے میں منظم بھی کیا۔ ضلع طبرہ غازی خان پر اس وقت جمالت و بدعت کی ظلمت و تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ ضلع کے اندر کوئی معیاری حق کو واعظ و داعی تھا نہ باہر سے کوئی اہل حق کبھی اگر حق کی دعوت دیتا تھا دالا مٹا۔ اللہ پورے ضلع میں (سابقہ) ریاست بہاولپور کے مولوی محمد یار کا طوطی بولتا تھا۔

مولوی محمد یار محمد یار عالم اور مولوی کہلاتا تھا۔ محمد یار واعظ تھا، شاعر تھا، صوفی تھا، پیروں مرشدوں کا بچاری تھا، اور خود بھی بیہوش مرشد بنا ہوا تھا۔

یہ وہی محمد یار تھا جس نے ملتان کے کھرے جلے میں مخدوم صدر دین شاہ صاحب کی موجودگی میں برلا کہا تھا۔ برلے چشم بینا از مدینہ بر سر ملتان
بہ تشکیل "صدر دین" خود رحمتہ للعالمین آمد
بشریحی اس محمد یار کا تشہیر کا بیان کیا جاتا ہے۔

چاچڑ شہر مدینہ و سدا، کوٹ مٹھن بیت اللہ ظاہر دے دچہ پیر فریدن باطن دے دچہ اللہ
محمد یار کی زبان میں بلا کا رس تھا، انتہائی سوز تھا، وہ اپنے لہجہ اور جادو بیانی سے حاضرین کو مسحور کر دیتا تھا۔ وہ منبر پر بیٹھ کر ملازم کی شنوئی اور خواجہ غلام فرید کا دیوان و ردناک انداز، رس بھری آواز اور دلفریب طرز و ترمیم میں گاتا تو آڑتے پرندے ٹھہر آتے اور چلتا دیرا تھم جاتا۔

مجھ پر اپنے طبع زاویا دوسرے شاعروں و نقادوں کے رومانی اور قبائل اشعار اور دوسرے ملتانی زبان میں منبر پر بڑھنا اپنے آپ کو کیف و سرور طاری کر لیتا تھا، وہ جھومتا اور وجد کرتا اور جھومتے جھومتے مست و بیخود ہو جاتا تھا جب وہ حاضرین سامعین کو اپنے اس رنگ میں رنگ کر مست و مدہوش اور مسحور و مسحور کر لیتا تو بڑی آسانی سے انھیں اپنی دعوت باطلہ کا شکار کر لیتا۔ اس مرد ضال و مضل نے خدا اور رسولؐ کے منبر و محراب سے برسوں شرک و بدعت کی دعوت اور پورے ضلع کے سادہ لوح و جاہل لوگوں کو الہاد و بے دینی، شرک و بدعت اور گمراہی و ضلالت کی آغوش شر سلادیا۔

ضلع بھر میں تین تین نواب، تمندار، سردار، جاگیردار اور اعلیٰ زمیندار تھے، مگر اس ایمان سوز منظر اور دردناک صورہ حالات سے کسی کے کان پر جوں تک بھی تو نہ رینگا اس الزلزلہ "حادثہ" سے اگر متاثر و مضطرب ہوا تو جواب سرور پٹانی رحمہ اللہ! ضلع میں عباد و رباؤ بھی تھے، مگر کسی کا دل مسلمانوں کی اس منظریت و ایمانی زبوں حالی پر نہ سیجا اگر سیجا تو سرور صاحب ہی کامل!۔

کابل اس سے فرقہ زہاد سے اٹھانہ کوئی کچھ جو کام آتے تو یہ زندان قدح خوار آتے سرور صاحب کا حس و در و مند دل تڑپا، آپ نے مقامی علماء کرام کو ساتھ لے کر ضلع میں تبلیغی مہم کا آغاز کر دیا، گویا ایسے فیح اللسان و سحر و فنکار کا بطل افسوں توڑنا ان حضرات کے بس کا روز تھا۔

سرور صاحب کی مفکر و مدبر شخصیت نے جلد تر اس حقیقت کو محسوس کر لیا کہ اگر محمدیہ کا قیام فرعون نے راموسی سکتا ہے تو حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعہ) سے موسوی سے!

چنانچہ آپ نے حضرت بخاری صاحب رحمہ اللہ سے رابطہ و تعلق پیدا کیا ان سے اپنا درد کہا اور بفضلہ تعالیٰ انہیں اپنا ہمدرد بنا لیا۔

سرور صاحب نے حضرت امیر شریعتؒ کو اپنے ضلع میں تبلیغ دین کے لیے تکلیف دی اور بارہا تکلیف دی، اور وہاں تک پہنچا کہ وہاں سے لے کر ڈیرہ غازی خان، چوٹی زیرین، جام پور، داجل، نوشہرہ غربی، حاجی پور، راجن پور اور دو جمان تک پورے ضلع کے ہر کونے تک تبلیغی دورے کراتے، سرور صاحب ہر جگہ حضرت امیر شریعتؒ کے ساتھ ہوتے تھے، رحمہما اللہ تعالیٰ، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنی قربت ایمانی، جادو بیانی اور اعجاز لسانی سے محمدیہ کے سحر سامی کو کچل کر رکھ دیا، خدا خدا کرے کہ باطل کا افسوں ٹوٹا، ضلع بھر میں ایمانی حرارت پیدا ہوئی اور حقیقت اسلامیان ڈیرہ غازی خان نے ایک نئی زندگی پائی۔

آز میں ضلع میں جو اسلامی روح، دینی جذبہ، اصلاحی ولولہ، ایمانی جوش و تبلیغی کام، خواہ وہ کسی جماعت قیادت میں نظر آتا ہے وہ انہی مردان حق آگاہ و غازیان سرفروش کے شبانہ روز عمل اور جہاد مسلسل کا ثمر ہے۔ رحمہما اللہ

مرزا نیت اور آریہ سماج کی مزاحمت ان تبلیغی دوروں میں دوسرے بہترین مبلغ بھی حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ کے ساتھ ہوا کرتے تھے، خصوصاً اس سلسلہ میں خطیب پاکستان حضرت مولانا قاضی احسان احمد صاحب شجاع آبادی اور حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر، کی خدمات جلیلہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت قاضی صاحب مدظلہ نے شرک و بدعت کے مضبوط و مستحکم قلعوں کو کتاب و سنت کی گولہ باری سے مسمار کر کے رکھ دیا، اور حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر نے ضلع کے اندر مرزا نیت اور آریہ سماج کی اٹھتی ہوئی نجر تک کا قلع قمع کر دیا۔ ان دنوں پنجاب میں آریہ سماج اور مرزا نیت پورے جوش و خروش سے مسلمانوں کے منابر ایمان پر شر و باری کو رہی تھی اہل ایمان و فرزند ان توحید کا دامن پکڑ پکڑ کر مناظروں کا چیلنج دیا جا رہا تھا۔ مولانا لال حسین صاحب کے حدود ضلع میں قدم رکھتے ہی مرزا نیت کو ٹوسنا پسوند لگا اور وہ دم بخود ہو کر رہ گئی۔ وہ بے حجاب دیکھ رہے تھے مری طرف میں نے نظر اٹھائی تو گھبرا کے رو گئے!

البتہ آریہ سماج اپنے غرور و پندار کے نشہ میں سرشار و بدست ہو کر میدان میں نکل آئی۔ جام پور میں سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اہتمام آریہ سماج سے مناظرہ ہوا ضلع بھر سے لوگ سینے کے لیے آئے۔ سماج کے چوٹی کے دو مناظر تھے اور مسلمانوں کی طرف سے ایک مولانا لال حسین صاحب اختر تھے، دو دن مناظرہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو فتح میں عطا فرمائی۔

ایک لطیفہ

اس مناظرہ کے سلسلہ میں ایک لطیفہ عمر بھر بھلائے بھی نہیں بھولے گا۔ پہلے دن آریوں کے جو مناظر پیش ہوئے، غالباً وہ کسی کالج کے پروفیسر تھے، اور اپنے مقام پر قابل آدمی تھے، مگر منظر اسلام کے آگے کسی کی بھلائی وال گل سکتی تھی؟ مولانا کے ہاتھوں ان کی وہ گت بنی کہ دوسرے دن آریوں کے جو مناظر پیش ہوئے اس نے اپنی تمہیدی تقریر میں شیخی بھارتے ہوئے کہا کہ

مولانا صاحب! میں وہ کل والا..... نہیں، میں..... ہوں، میرے ساتھ آپ بات کریں گے تو..... اس پر حاضرین ہنس پڑے، گویا ایک آریہ مناظر دوسرے آریہ مناظر کی شکست کا واضح اعلان کر رہا تھا۔ بلکہ غیر شعوری طور پر اسلام کے مقابلے میں آریہ سماج کی شکست و ہزیمت تسلیم کر رہا تھا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کچ ان "تمیں مار خاں" کی وہ گت بنی کہ کل والے پنڈت جی کی کیا بنی تھی، غرور کا سر نیچا، بڑا بول بولنے والے ایسے چاروں شانے چت گرے کہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو فتح عطا فرمائی، آریہ سماج نے شکست کھائی اور ایسی فاش شکست کہ خود ہندوؤں کو اپنی اس شکست کا اقرار و اعتراف تھا۔ اس فیصلہ کن مناظرہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ پورے ضلع میں آریہ سماج کا ناظر بند ہو گیا۔ نہ کسی کی آریہ کو بھی کبھی چیلنج دینے کی ہمت ہوئی نہ مناظرہ کرنے کی، حق و باطل کے ایک ہی معرکہ میں باطل کا سر ہمیشہ کے لیے کچلا گیا اور

زراعت کی طرح آریہ سماج بھی جب تک رہا۔ سرگندہ رہا اور سکوت مرگ سے زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔
انہماک و فغان سے ضلع ڈیرہ غازی خان کا محفوظ رہنا۔ جناب سرور صاحب مرحوم کی دینی خدمات کا ایک کرشمہ ہے جس کی جلا
بر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندے کو عطا فرمائی گئے۔

عیاری اور مرکزی کام کی تڑپ

جناب سرور صاحب کو اللہ تعالیٰ نے نہایت عالی حوصلہ، نہایت بلند نظر اور بدرجہ عایت و بیعت ظرف عطا فرمایا تھا۔ آپ کی
عالی حوصلگی، بلند نظری اور وسعت قلب و ظرف آپ کو حدود ضلع میں محدود و مقید رہنے کی اجازت نہ دیتی تھی، آپ نے اپنے اہل خانہ
سائل کی جانب سے اندرون ضلع، اہل باطل، آریوں اور مرزائیوں کی بھرپور مخالفت اور اہل حق
کی حفاظت کا بفضل و بعد نہ تعالیٰ خاطر خواہ انجام کیا، مگر آپ نے اسی پر قناعت نہ کی، بلکہ آپ کی دلی امنگ اور خواہش یہ
تھی کہ کسی طرح اہل حق کا تبلیغی مرکز قائم کر کے پورے ملک میں باطل کی مافقت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا معیاری کام کیا جائے۔

لاہور و دیوبند، دہلی کا سفر

تبلیغی تنظیم و مرکزیت کی ضرورت کے شدید جذبہ نے آپ کے دل کو بے قرار کر دیا، آپ کے دو مند و بے قرار دل
نے آپ کو چین سے گھر میں نہ بیٹھنے دیا، کوئی تیس پچیس سال پیشتر آپ اپنے خوجہ پر علماء کا ایک وفد لے کر جام پور سے چلے
لاہور میں حضرت مولانا احمد علی صاحب دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی اور حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب
وغیرہم اکابرین اور دہلی میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے ملے، رحمہم اللہ! ہر صاحب کو اپنا درد و دل سنایا اہل
سنت کی لامرکزیت و انتشار اور اس کے نتیجے میں ان کے ارتداد کا رونما دیا، ان کی تنظیم اور نظام تبلیغ کی ضرورت پیش کی، ہر بزرگ
نے جناب سرور صاحب کے درد و دل کی داد دی، آپ کے فکر و دور اندیش کو سراہا، تبلیغی مرکز کی ضرورت محسوس کی، مگر افسوس
کہ سرور صاحب کی تجویز و تحریک کے مطابق کوئی بزرگ اس اہم ضرورت کے لیے اپنے آپ کو فارغ نہ کر سکے اور آگے بڑھ کر
تمام کار ہاتھ میں لینے اور تحریک کی قیادت سنبھالنے کا فیصلہ نہ فرما سکے۔
سینکڑوں روپے خرچ کر کے جناب سرور صاحب دل کا درد و دل کا توں لیے واپس جام پور تشریف لے آئے۔

مولانا مودودی سے مراسلت

دل کا درد سکون سے کب بیٹھتے دیتا ہے۔ سرور صاحب رحمہم اللہ دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ آپ اکابر دیوبند سے خالی ہاتھ
واپس آئے تو حزمین و دالیوس ہو کر بیٹھ نہ گئے بلکہ اس سلسلہ میں بعض دوسرے حضرات سے بھی مراسلت کی، جن میں سے مولانا شبیر
الوہاء علی مودودی کا نام میرے ذہن میں اچھی طرح محفوظ ہے۔ مولانا مودودی نے بھی اس کام کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے باوجود
اسے اپنانے سے اپنا نے اپنی محدودی کا اظہار فرمایا۔

مولانا مودودی سے ملاقات

جناب سردار صاحب نے مجھے ساتھ لے کر بمقام لاہور مولانا سے ملاقات بھی کی اور نہایت تفصیل سے اس بارے میں گفتگو فرمائی، مگر مولانا اپنے موقف و مقام پر قائم رہے اور آپ نے تحریک سے اپنی قلبی ہمدردی کا برملا اظہار فرمانے کے باوجود اہل سنت کے تحفظ اور باطل فرقوں کی مزاحمت کے خاص پروگرام کو اپنانے سے معذرت ظاہر فرمائی۔

اکابر احرار سے درخواست

سردار صاحب کا رد و دل انہیں ہر اس شخص سے بات کرنے پر ہر وقت آمادہ اور تیار رکھتا تھا۔ جس سے انہیں تھوڑی سی بھی "ٹوے دفا" آتی تھی، پھر اکابر احرار سے تو سردار صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے، حضرت امیر شریعت رحمہ اللہ تو سردار صاحب رحمہ اللہ کو اپنا بھائی سمجھتے اور اپنا بھائی کہتے تھے۔ دوسرے اکابر بھی آپ کے اخلاص و ایثار کے پیش نظر آپ کا بڑا احترام کرتے تھے۔ سردار صاحب نے متعدد دلائل میں ان اکابر کو اپنا دکھایا تھا مگر مجلس احرار اپنے سیاسی افکار اور اپنی ہیئت ترکیبی کے باعث "نظیفی" مضموم کو اپنانے سے معذور تھی۔

اس وقت مجلس کی زمام قیادت مولوی منظر علی ظہر کے ہاتھ میں تھی، اگر حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری ان دنوں قائمہ احرار ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ مجلس احرار اس پروگرام کو اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور تحریک تنظیم کا وجود ہی معرضِ ظہور میں نہ آتا، مگر قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو کر رہا۔

اصابت فکر

جناب سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فکر اور پروگرام کی صحت و اصابت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے، کہ جناب مولانا مودودی صاحب جناب سردار صاحب کی منطق سے تو متاثر نہ ہو سکے اور کھل کر اجرائے نبوت کے فتنے کے خلاف لکھنے اور کہنے پر آمادہ نہ ہو سکے، مگر چند ہی سال بعد حالات کے اقتضا سے ترویجِ مزاہت کو اپنے لائحہ عمل میں جگہ دینے پر مجبور ہو گئے۔

اسی طرح مولوی منظر علی کی قیادت میں جب مجلس احرار رفیع کے جارحانہ حملوں سے اہل سنت کو بچانے کے نصب العین کو اپنا سکی۔ وہی مجلس احرار تھوڑی مدت کے بعد حضرت مولانا محمد علی صاحب کی قیادت میں بعنوان مجلس تحفظ ختم نبوت منسلک حلقہ اہل سنت کی حفاظت اور اعدائے صحابہ کی مزاحمت کے پروگرام کو بڑی خوبی سے اپنانے لگی اور ماشاء اللہ آج بطور احسن اس فرض کو انجام دے رہی ہے۔

اندرون ضلع تحریک کی دعوت

بہر حال بیرون ضلع سے جناب سردار صاحب رحمہ اللہ کو کوئی حوصلہ افزا جواب نہ ملا اور کام کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اب

بھی صورتیں تھیں، یا تو سردار صاحب یہ درد اور داغ قبر میں لے جاتے یا اپنے ناتوان اور کمزور بازوؤں پر اعتماد کرتے ہوئے
 کلا علی اللہ کام کا آغاز کر دیتے، سردار صاحب رحمہ اللہ نے دوسرے پہلو کو ترجیح دی اور یاس و فطرت کی آغوش میں مجاہدات
 جو جانے کی بجائے آپ نے اس و امید کا دامن پکڑا، اور اللہ کا نام لے کر اندرونِ ضلع کام شروع کر دیا۔
 میں ۱۳۳۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آگیا تھا۔ ۱۳۳۱ء سے ۱۳۳۲ء تک قریباً چار سال سردار صاحب رحمہ اللہ
 نے راقم بخاری مولانا مشتاق احمد صاحب مرحوم اور محترم صوفی کریم بخش صاحب کو ساتھ لے کر تونسہ، چوٹی زیریں کوٹلہ مغلان اور دوجان
 وغیرہ مقامات کا سفر کیا اور حضرت خواجہ نظام الدین صاحب نواب محمد جمال خاں لغاری مرحوم لغاری نواب زوگان مراری سردار
 صاحبان اور مرزا صاحبان سے ملاقاتیں کیں اور اپنا ورد و دل پیش کیا۔

علاوہ انہیں قریباً ہر سال جام پور میں ضلع کے علماء شرفاء کو جمع کر کے نظام تبلیغ اور مرکز تنظیم کے مسئلہ پر گہری سوچ بچار کی
 سردار صاحب کی اس مخلصانہ جدوجہد اور شبانہ روز سعی مسلسل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ضلع کے ادارے میں سے لغاری سردار
 صاحبان اور مرزا صاحبان کا دل اس طرف مائل کر دیا۔

آغاز تحریک

آخر ذی الحجہ ۱۳۳۲ء مطابق ۱۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو ضلع ڈیرہ غازی خاں کے اسلامی درد اور تبلیغی ذوق رکھنے والے علماء و ائمہ کا سردار
 صاحب کے دولت کدہ پر اجتماع ہوا، محترم سردار حاجی محمد علی خاں لغاری کی صدارت میں ایک مجلس منعقد ہوئی خطبہ صدارت جناب
 سردار صاحب نے ارشاد فرمایا:

”اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا کوئی تبلیغی جماعت کہیں موجود ہے؟ اگر نہیں اور افسوس ہے کہ نہیں، تو ہمیں وہ جماعت پیدا کرنی ہوگی
 قرآن و حدیث پر عامل اور اسلامی تعلیمات و روایات کی حامل صرف جماعت اہل سنت ہے ساری دنیا میں اس کی زبردست اکثریت
 ہے، مگر ہمارا کوئی مرکز نہیں ہماری کوئی تنظیم نہیں، نظام تبلیغ نہیں، کاش؟ یہ تحریک کسی اسلامی ملک سے آئتی، کاش شاہ فاروق یا سلطان
 ابن سعود اسے اٹھیں لیتا۔

تعلیمی محاذ پر یونیورسٹی کے مقابل یونیورسٹی اور کالج کے مقابل کالج قائم ہے، سیاسیات میں بھی مسلمانوں نے کانگریس کے مقابلہ میں
 مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی۔ جمیعت اور احرار بھی ہے۔ بہر حال اس پلیٹ فارم پر بھی کام ہو رہا ہے، مگر تبلیغ کا میدان اس وقت تک
 خالی ہے۔ آج ہندوستان بھر میں چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تو آپ کہیں اہل سنت کا تبلیغی مرکز نظر نہیں آئے گا، حالانکہ اسی مرکز میں
 پر عیسائیوں، آریوں، مرزائیوں اور شیعوں کے سینکڑوں ادارے اور مراکز برسرِ کار ہیں، شیعہ کی سرگرمیاں عموماً مدح اہل اہلبیت اور سنی
 شتم صحابہ تک محدود ہیں، عام طور پر شیعہ زندگی کا پروگرام قائم و سیدہ کبریٰ اور سب و شتم پر مشتمل ہے۔ مرزائیوں نے انسانی سعادت
 کے بلند ترین وہی مقام ”نبوت“ کو بازیچہ اطفال بنا کر وحدت امت کا شایزہ تار مار کر دیا ہے۔ ان فرق باطلہ سے امت حق
 کا اتفاق و اتحاد ناممکن ہے۔

اہل سنت کی حدود: باقی تمام مسلمان، اہل سنت والجماعت کے دائرہ میں داخل ہیں اور ہمارا حلقہ عمل یہی دائرہ ہوگا۔

مرکز تنظیم کا قیام

چند اور مختصر تقریروں کے بعد اسی مجلس میں مرکز تنظیم اہل سنت کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر بالاتفاق جناب نواب زادہ محمود خاں صاحب لغاری تجویز ہوئے ناظم جناب سرور احمد صاحب رحمہ اللہ اور مہتمم راقم بخاری قرار پائے۔

الی قربانی

تحریک چلانے کے لیے اسی مجلس سے فراہمی سرمایہ کی ابتدا کر دی گئی، محترم سرور احمد صاحب نے دو ہزار روپیہ سالانہ کی پیشکش کر دی، کئی سال تک برابر دو ہزار روپیہ سالانہ دیتے رہے، جس میں ایک ہزار سرور احمد صاحب کا ذاتی ہوتا تھا اور ایک ہزار سرور احمد علی رحمہ اللہ صاحب کی طرف سے! اس طرح سرور احمد صاحب کی دیرینہ تمنا برآئی اور خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا گیا۔

تحریک کا تعارف

چونکہ اس اہم تحریک کی خدمت اہتمام کا شرف راقم کو نصیب ہوا، لہذا میں نے تحریک کے اغراض و مقاصد شائع کر کے شروع فروری ۱۹۴۳ء سے وسط اپریل تک لاہور، امرتسر، سہارن پور، دیر بند، میرٹھ، دہلی اور لکھنؤ کا سفر کر کے اکابر ملت سے ملاقاتیں کیں اور ۱۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو ام ترس میں مرکزی دفتر کھول کر ”نہزم“ لاہور کے ذریعہ تحریک کو ملک میں متعارف کرنے اور مسلمانوں کو تحریک کا دعوت دینے کا کام شروع کر دیا۔ ”نہزم“ لاہور کے مدیر مجتہد مولانا محمد عثمان صاحب فارغیٹ نے اپنے طویل اختیاریہ بعنوان ”تبلیغ میں مرکز تنظیم اہل سنت“ کا تعارف کرتے ہوئے لکھا:

مرکز تنظیم اہل سنت

”سب سے آخر میں اور آخر زمانہ کے آخر دور میں مرکز تنظیم اہل سنت کے نام سے ایک آواز جامد پر ڈیرہ غازی خاں سے اٹھی ہے اس کے بانی جناب سرور احمد خاں صاحب پٹانی ایک حساس اور درمند مسلمان ہیں، آپ آج سے نہیں بیس سال سے اس میں غلام ہیں کہ مسلمانوں کی مرکزی تنظیم ہو، امت اسلامیہ کی اصلاح و تہذیب و سنت کی بنیادوں پر ہر فرقہ باطلہ کو راہ راست پر لانے کے لیے ملک بھر کی کوششیں کر رہا ہے۔ سرور احمد صاحب کی یہ تحریک بیس سال کے طویل تجربے کا نتیجہ ہے اور آپ نے مخلصین کی ایک ایسی امت زیر صدارت نواب زادہ محمود خاں صاحب پیدا کر لی ہے جو اس کام کا بیڑا اٹھائے گی اور اس آواز کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچائے گی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے ہر مسلم جماعت اور اکابر ملت سے تعاون کرے گی، تحریک کے اغراض و مقاصد شائع ہو چکے ہیں ”نہزم“ لاہور ۱۵۔

سرور احمد صاحب علیہ الرحمہ کے دل میں اہل سنت کی تنظیم اور ان کے تبلیغی مرکز کے قیام کا اس درجہ جوش اور شہوان تھا کہ آپ ہر اس آدمی سے اس کا ذکر و تذکرہ کرتے تھے جو ان سے ملتا تھا اور جس میں آپ اس

سلسلہ میں کسی قسم کی اہلیت و صلاحیت محسوس کرتے تھے چنانچہ لاہور کے مسلم انگریزی روزنامے کے ایڈیٹر نے تحریک کے منظر عام پر آنے کے بعد ایک مقالہ بعنوان ”ایک نئی تحریک“ شائع کیا اس میں لکھا،
 ”اس تحریک کے حامیوں میں سے ایک سردار احمد خاں صاحب پٹانی رئیس جام پور ہیں جن کے ساتھ ہماری ہمدردی ہے۔ ہم آپ سے دس سال ہونے ملے تھے اور آپ کے احیاء اسلام کے جذبات سے متاثر ہوئے تھے۔“ ایسٹرن ٹائمز، ۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء۔

”نیر اسلام“ لاہور ہفت روزہ ”نیر اسلام“ لاہور کے مدیر محترم نے لکھا، ”سردار احمد خاں صاحب پٹانی رئیس جام پور دین اسلام کے ایک نہایت مخلص کارکن ہیں ان کو ذاتی طور سے جانتا ہوں، مسلمانہ میں انہوں نے مجھ سے اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا چنانچہ آج ہم انہیں عملی میدان میں دیکھ رہے ہیں اور ہم مسلمانان ہند سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تحریک تنظیم میں شامل ہو کر سردار صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔“

اکابر کے ارشادات مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے تحریر فرمایا:

”نورم“ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۷ء میں پھر موجب مسرت ہوئی کہ تنظیم اہل سنت کی غرض سے ایک جماعت کا قیام عمل میں آگیا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی یا لاہور میں کھلنے والا ہے، میں سردار احمد خاں صاحب پٹانی بانی اور جناب نواب زادہ محمود خاں صاحب صدر کے فکر و دراندیش کی تحسین و تحریک کرتا ہوں، خدا تعالیٰ ان کو اس نیک مقصد میں کامیاب فرمائے اور اہل سنت والجماعت ایک مرکز پر جمع ہونے اور دنیا کے سامنے حکمت و موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسلامی پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ”نورم“ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء۔

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا:

یہ بالکل غیر سیاسی اور خالص دینی تبلیغی بیٹج ہے۔ تبلیغ دین ہم سب کا فرض ہے آج اسلام پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں سب کا جواب دو، مگر بیٹھے طریقے سے، مخالف کے اعتراضات کا منظم طریقہ سے جواب دو۔ منظرے کا جواب منظرے سے، اخباروں کا جواب اخباروں سے، تحریک کا جواب تحریر سے، تقریر کا جواب تقریر سے دو، مگر جواب بیٹھا اور شیریں چاہیے، یہ تحریک جن مقاصد کو لے کر اٹھی ہے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اپنے فضل و کرم سے مرکز تنظیم کو اپنے مقاصد عالیں کامیاب فرمائے آمین،

روزنامہ ”شہباز“ لاہور ۳۰ ستمبر ۱۹۳۷ء

بطور نمونہ صرف دو حضرات اکابر کے ارشادات گرامی پر کفایت کی جاتی ہے ورنہ اکثر مشاہیر علماء و مشائخ وقت نے تحریک کا نہایت پر جوش استقبال کئے کے بانی تحریک جناب سردار صاحب کے فکر و تدبیر کی تحسین و تصدیق فرمائی اس سلسلہ میں:

- ۱۔ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنؤی۔
- ۲۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔
- ۳۔ مورخ اسلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ اور
- ۴۔ حضرت مولانا محمد طیب صاحب متبع دارالعلوم دہلی ہند۔

معلوم ہونا چاہیے کہ آریہ مرزائی عیسائی تبلیغی اداروں کے بالمقابل آپ کا ہندوستان بھر میں کوئی مرکزی تبلیغی ادارہ نہیں ہے، ہم حیران ہیں کہ تبلیغی ادارہ کے بغیر اسلام آج تک اعدائے اسلام کے چراذ حملوں کے باوجود کس طرح باقی ہے، یقیناً یہ اسلام کی صداقت پر دین فطرت ہونے کا ثبوت ہے۔

ہندوستان اور بیرون ہند میں اسلام اور آنحضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آدمیوں اور عیساویوں کے اعتراضات اپنے تبلیغی ادارہ کے فقدان کی وجہ سے ہیں۔ مرزائیوں کا عروج و اقبال تو محض چارے تبلیغی مرکز کے نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ ان کی دست و رازمی سے افریقہ کے مسلمان محفوظ و مامون ہیں نہ جاوا سماٹرا کے، یہ جہاں بھی جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو انتشار و فتنہ میں مبتلا ہاتے ہیں کوئی ان کے سامنے پتھریں آنار کہیں بھی مسلمان ان کے سامنے آنے کے قابل نہیں یہ لوگ ہر جگہ میدان صاف پا کر دیگیں مارتے ہیں اس گراہ اور گراہ کن فرقتے نے آریہ، عیسائی، سکھ وغیرہ کسی جماعت کو مرزائی نہیں بنایا، ان کا نزلہ اگر گراہے تو عجز و ضعف پر، ان کی تمام آزمائشی تک و دو محض مسلمانوں جیسی بے نظم و سبے مرکز جماعت ہی تک محدود ہیں۔

”نعرم“ ۱۱/۴

اس سے پہلے ایک مکتوب میں مجھے لکھتے ہیں :

”جیسا کہ عرض ہوا دوسری جماعتوں کے پروگرام اور ادارے مسلمانوں کے سامنے لائے جاتے ہیں، انہی یہ حقیقت سمجھائی جائے کہ مرزائی جماعت کا تختہ مشق محض مسلمان ہیں، کہ صلیب تو محض بھارت ہے اگر صلیب کو کچھ توڑا ہے تو دہریت نے، پھر یورپ اور امریکہ کے مشن بھی مسلمانوں کو گراہ کر رہے ہیں۔“

غرائی کی بنیاد ایک ہے اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کا کوئی تبلیغی مرکز نہیں، یہی وجہ ہے کہ مرزائی فتوحات پر فتوحات دکھا رہے ہیں، الغرض اسلامی دنیا کا انتشار لامرکزیت، جمود، غفلت، انحطاط اور تنزل پیش کر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا جائے۔

آپ اہل الرائے سے مشورہ، اہل دولت سے روپیہ اور اہل علم سے آئریہ تبلیغی خدمات طلب کریں ”پیغامیوں“ نے آئریہ تبلیغ کا مطالبہ قائم کر رکھا ہے اور قادیان تو ہر مرزائی سے مطالبہ کرتا ہے کہ کم از کم ایک مرزائی بنا کر رہے اور یہ کوئی رسمی مطالبہ نہیں نہایت تاکید کی اور نہایت سنجیدہ مطالبہ ہے، یہ مطالبے براہ داران اسلام کو دکھائیں، پھر اس خستہ حالی میں مرکز تنظیم کی خدمات باہر بے سروسامانی ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ ان اہل باطل کی ناطقہ بندی مسلمانوں کے سامنے لائیں اور مسائل و ذرائع مہیا ہونے پر بیرون ہند اشاعت اسلام کا عالمگیر پروگرام ملت کے آگے رکھیں“

”نعرم“ ۱۱/۴

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں :

”الغرض اندرون و بیرون ملک تبلیغی و حفاظتی انتظام کرنے، ہر مقام کے مسلمانوں میں دینی بیداری اور دینی انقلاب پیدا کرنے کے لیے درحقیقت لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔“

الغرض ہمیں چاہیے کہ پچھلی غفلت سے توبہ کریں اور آئندہ کے لیے اسلام کی حفاظت، مدافعت کا کم از کم اس معیار

اور اس رتبہ پر اہتمام کریں جس پر اکابر، عیسائی اور عرانی نے کر رکھا ہے۔

آخر میں دست دعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے سینے کھول دے تاکہ وہ دینی ضروریات کو محسوس کریں اور پھر دینی ضروریات کو باقی جملہ ضروریات پر ترجیح دینے لگیں۔ آمین“

سردار صاحب رحمہ اللہ کی بطور نمونہ مشقے از خردارے ”ان تجربات سے جہاں آپ کے فکر و ذہن، آپ کے نصب العین اور پروگرام کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہاں آپ کے عزم و ارادے کی وسعت و بلندی بھی واضح ہو جائے گی، اور قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے دل میں پوری اسلامی دنیا کا درد تھا۔

عبارتیں جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ آپ عالم اسلام کو انتشار و لامرکزیت کے غم سے نجات سے نکال کر ایک مرکز تنظیم و تبلیغ پر جمع کر دینا چاہتے تھے۔ آپ دنیائے اسلام کے ایک ایک فرد کو اعدائے دین کے حملوں سے محفوظ و مامون رکھنا اور دیکھنا چاہتے تھے اور بیرون ہند اشیاء اسلام کا عالمگیر پروگرام دیکھتے تھے۔

وسعت صحرا.....
وسعت دل ہے بہت وسعت صحرا کم ہے
اس لیے ہم کو ترپنے کی تمنا کم ہے

سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں اعدائے اسلام کی ہرافت اور اسلام کی اشاعت کے لیے وسیع و بلند عزائم ترپ رہے تھے۔ لہذا آہ کہ آپ کے ان بلند عزائم کو تکمیل کی کوئی راہ نہ مل سکی،

مرکز تنظیم اہل سنت نے اپنی استطاعت اور اپنے امکانات کی حد تک ملک کے اندر بفضلہ تعالیٰ جو خدمت کی یا کر رہا ہے۔ وہ سارا سردار صاحب کی آرزوؤں، امنگوں کی تعبیرات اور آپ کے خوابوں کی تعبیر ہے، مگر سردار صاحب اس سے قطع نظر مطمئن نہ تھے، وہ کام کو جس بلند ترمیم اور وسیع ترین پیمانے پر دیکھنا چاہتے تھے، اس کی حسرت آپ اپنے ساتھ لے کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

عدم آباد کو جلتے ہیں بشر خالی ہاتھ
مجھ کو ہے ناز کہ لے جاؤں گا حسرت تیری

اخلاق و شہاقل

سردار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ پایا درد و اخلاص اور مجسمہ تبلیغ تھے، آپ کی پوری زندگی ملی سوز و گداز کا مرقعہ جیل تھی۔ درہمیت، جوش تبلیغ، جذبہ حمایت دین اور ولولہ حفاظت مسلمانوں سے قطع نظر بھی سردار صاحب کی زندگی ایک نمونہ کی زندگی تھی، آپ کی سیرت و اخلاق کے چند قابل ذکر پہلو درج ذیل ہیں۔

سادگی

آپ کی سیرت کا ممتاز وصف سادگی ہے۔ آپ کی زندگی بے حد سادہ تھی، خوراک سادہ، لباس و پوشاک سادہ،

ورد باش سادہ ، تکلف و ططراق اور ٹٹھاٹھاٹھاٹھا آپ کی پوری زندگی کے کسی ایک گوشہ کو بھی چھو کر نہیں گیا تھا۔ پیش و عشرت اور نشاط و تنعم کی پچھانیاں بھی تو آپ کے کسی زاویہ حیات پر نہیں پڑیں آپ کی زندگی ایک مرد مجاہد کی زندگی تھی ، سفر ہو یا حضر انہایت سادہ کھانا کھاتے تھے ، دال ، ساگ ، گوشت ، سبزی کی ایک پلیٹ اور دو خشک روٹیاں یہ تھی آپ کی خوراک ، روٹی تازہ اور گرم کھاتے تھے دسترخوان پر روٹیوں کو کپڑے میں لپیٹ کر رکھتے تھے اور حسب ضرورت نکال نکال کر تناول فرماتے جاتے کسی چیز سے خاص پرہیز نہ تھی اور کسی خاص چیز کے آپ عادی نہ تھے ، البتہ آدھ سپر ڈیڑھ پاؤ دو دو رات کو سونے سے پہلے ضرور پیتے تھے گھر پر تو لالہ کا دیا اپنا دودھ ہوتا تھا ، سفر میں بھی اس کا اہتمام و التزام فرماتے تھے۔

لباس کے معاملہ میں تو اور زیادہ سادہ تھے ، معمولی لٹھے کا تہ بند جسے عموماً رنگ لیتے تھے ، کھدر کا سفید کرتا ، کھدر کی لکیر دار بگڑی ، اوپر مقامی جلابوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی گاڑھے کی سفید چادر ، بس یہ تھی آپ کی پوشاک ، ملل کا کرتہ یا ملل کی بگڑی کبھی استعمال نہیں کی ، کلاہ کبھی سر پر نہیں رکھا ، گرم یا سرد کرٹ یا اچکن تو کیا ، واسکٹ سمک بھی کبھی زیب تن نہیں فرمائی ، شلوار بھی کمتر ، صرف خاص تقریبات اور اہم ملاقاتوں میں استعمال کرتے تھے۔

سردیوں میں سادہ موٹا اوننی کپل اوڑھتے تھے ، وفات سے کوئی دو سال پیشتر سوسا سو کا پشینہ ملتان میں خریدا تھا ابھی وہ میلا بھی نہ ہوا تھا کہ پیغام اجل آ پہنچا۔

گرمیوں میں پاؤں خالی رکھتے تھے البتہ سردیوں میں گرم جرابیں استعمال فرماتے تھے ، جتنا ساری عمر مقامی مچھوں کا سلاہوا استعمال کیا ، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے پندہ میں روچے کا فلر سلیپرنگ بازار سے خریدا استعمال فرمایا ہو ، بڑے آدمیوں و ذریعوں تک سے ملنے تو اسی سادہ اور پرانی وضع قطع میں ، البتہ اہم تقریبات میں تہ بند کی بجائے شلوار پہن لیتے تھے ، اور بس ، جس لباس میں ایک فقیر سے ملنے ، اسی لباس ہی میں امیر اور وزیر سے ملنے تھے ، جلاباس گھر پہ ہوتا تھا وہی سفر میں ہوتا تھا۔

ہاتھ میں بید کی ایک سادہ سی چوڑی ہمیشہ رکھتے تھے جن کی قیمت آٹھ دس آنے سے زیادہ کیا ہوگی ؟ پڑھتے لکھتے وقت بینک لگاتے تھے ، مگر اس کا فریم وہی پرانے ڈیزائن کا ، چار پانچ روپے والا دس بیس روپے کانٹے ڈیزائن کا فریم آپ نے آخر وقت تک استعمال نہ فرمایا البتہ قلم آپ پاؤں کا رکھتے تھے جو غالباً پچھتر روپے میں خریدا تھا ، اس کے ساتھ ایک بالکل معمولی روپے سوا روپے والا قلم بھی رکھتے تھے ، جب کوئی دوسرا آدمی لکھنے کی ضرورت سے طلب کرتا تو وہی دے دیتے مبادا اس شخص کو واپس دینا یا آپ کو لینا بھول جائے اور قیمتی چیز ضائع ہو جائے۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے ، کہ آپ کے مزاج میں احتیاط کس قدر تھی ؟ اب مکان کا حال دیکھیں ، آپ کی وجاہت و عظمت کے پیشین نظر بڑے بڑے لوگ ، علماء ، فضلاء ، متمدن ، نواب ، حکام اور اعلیٰ افسران آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے مکان پر آ جاتے تھے ، مگر آپ یہ سن کر حیران ہو کر کہ یہ سب لوگ ایک ایسی تنگ و تاریک کچی کوٹھڑی میں آپ کو موجود پاتے ، جس کے نہ دروازہ بھیج نہ چھت سلامت

اور جس میں مشکل سے دو یا تین چار پائیاں آسکتی تھیں، جب سرور عبدالرحیم خاں جوان ہوئے، تب سرور صاحب نے دوسرا مگر نچتہ، کھلے اور ہوا دار کمرے تعمیر کرائے اور خدا خدا کر کے اس کو ٹھنڈی سے ہم سب کو نکالت ملی۔

ہم نے اس کچی کو ٹھنڈی میں اس نچتہ مکان کے اندر کبھی پگنگ بچھا نہیں دیکھا۔ سادہ بان سے بنی ہوئی نہایت مضبوط چار چار پائیاں ہر کمرے میں پڑی رہتی تھیں، سرور صاحب خود بھی ان ہی میں سے ایک چار پائی پر چھٹا سا تکیہ لگا کر سارا سارا دن بیٹھ رہتے، لکھتے پڑھتے تو بھی اسی چار پائی پر میز کرسی لگا کر میں نے کبھی آپ کو لکھتے پڑھتے نہیں دیکھا۔

کفایت شعاری

سادگی کے بعد آپ کا دوسرا وصف کفایت شعاری تھا۔ جہاں آپ ملی کاموں پر نہایت فیاضی سے خرچ کرتے تھے تبلیغی اور تبلیغی سلسلہ میں ہزاروں روپے لگا دیتے تھے، وہاں اپنی ذات کے معاملے میں حد درجہ کفایت شعاری سے کام لیتے تھے، جہاں ایک پیسہ سے کام نکل سکتا وہاں کبھی دوپے خرچ نہ فرماتے تھے، سفر بشکل انٹر کلاس میں کرتے، سیکنڈ یا فیسٹ کلاس میں کبھی سفر نہیں کیا، البتہ حج کا مبارک سفر بحری جہاز کے سیکنڈ کلاس میں کیا، سفر میں کبھی کوئی خادم بھی ساتھ نہیں رکھتے تھے باوجود استطاعت کے کوئی گاڑی خریدی نہ تاکہ رکھا، ایک اچھی گھوڑی تھی شہر سے باہر اپنے کنوؤں پر جاتے یا دیہات کا سفر ہوتا تو اسی گھوڑی پر کرتے، آپ ایک اچھے سوار تھے۔

مہمان نوازی

آپ مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے تھے، خاص طور پر تبلیغی جلسوں کے موقعوں پر حضرات علماء کرام کی رہائش اور خوراک کی غورگرائی فرماتے تھے اپنی جماعت میں تقسیم کار کرنے وقت نہایت سمجھ دار، پختہ کار اور فرض شناس آدمیوں کو اس خدمت پر متعین فرماتے تھے۔ چنانچہ پہلے سرور مسٹر خاں کھوسہ اور بعد میں سرور عبدالرحیم خاں اس خدمت پر مامور ہوتے تھے۔ دسترخوان پر سالن یا چاول وغیرہ کبھی پلیٹوں میں ڈال کر نہ دیتے، ہمیشہ سالن وغیرہ ڈوگل میں آتا اور ہر مہمان کو اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق ڈسنگے سے نکال کر لینے کی تکلیف دی جاتی۔

مجلس مبلغین کے اجلاس کے موقع پر چونکہ اپنے بے تکلف مبلغ حضرات ہی دسترخوان پر ہوتے، اگر کبھی کوئی صاحب ضرورت سے زیادہ لے کر بچا چھوڑتے تو آپ فرماتے اگر اتنا کھانہ نہیں سکتے تھے تو ڈسنگے سے لیا کیوں؟ اب یہ آپ کو ختم کرنا ہوگا۔

نیز آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کھانا بہر حال بچا ہی پڑ جائے تو اس طرح کھایا اور بچایا جائے کہ بچا ہوا کھانا کھانے والا کراہت محسوس نہ کرے۔

صفائی صفائی ستمرائی کا خاص خیال رکھتے تھے، آپ کا لباس سادہ تو ہوتا تھا، مگر صاف ستھرا، مجھے یاد ہے کہ

اگر کبھی آپ کی چادر نماز کے وقت نیچے بچھانے کی ضرورت پیش آئی تو کوشش یہ فرماتے تھے کہ اس کے اوپر پاؤں نہ رکھے جائیں۔

بعض لوگ کھانے کے بعد دسترخوان ہی سے ہاتھ پونچھنے کے عادی ہوتے ہیں، آپ اسے بہت بڑی بدتمیزی اور نہایت مکروہ سمجھتے تھے، لوگوں کے سامنے تھوکنے یا ناک صاف کرنے کو بھی اچھا نہیں جانتے تھے، اگر کبھی چھینکے کی ضرورت پیش آئی تو چادر کا پلو منہ پر رکھ لیتے تھے۔

مناات و سنجیدگی

سردار صاحب بے حد متین و سنجیدہ تھے، آپ کی ہر ہر ادا میں سنجیدگی پائی جاتی تھی، کوئی فضول کام یا فضول بات نہ کرتے کہ بولتے تھے، ضرورت کی بات کرتے تھے، میں نے آپ کی زبان سے کبھی بیہودہ یا لغو اور دلائل و ارباب نہیں سنی اور آپ اپنے نجی ملازمین سے بھی بدگلامی تو بچائے خود درشتی سے بھی پیش آتے نہیں دیکھا، آپ کبھی کھلکھلا کر نہیں ہنستے تھے۔

شگفتہ مزاجی

لیکن اس کا یہ مطلب بھی دیا جائے کہ آپ ہمیشہ تیوری چڑھائے رہتے، بلکہ آپ کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ شگفتگی بھی حسین امتزاج تھا، آپ کی پیشانی پر ہیں کے نیچے بل نہیں پایا آپ کے مزاج میں لطیف مزاج کا جوہر بھی موجود تھا۔ بعض اپنے مخصوص احباب کی مجلس میں ایسے شگوفے چھوڑتے کہ اسے زعفران زار بنا دیتے آپ کو بہت زیادہ مثالیں یاد تھیں، ان کو ایسا بر محل استعمال فرماتے کہ لطف آجاتا تھا۔

میں نے اپنی عمر میں گنگو اور تقریر کے دوران میں بر محل اور سنجیدہ مثالیں پیش کرنے کے فن میں تین آدمیوں کو پایا ہے، ایک سردار صاحب مرحوم، دوسرے سردار گل محمد خاں بڑا در رئیس اعظم سکھانی دار ضلع ڈیرہ غازی خاں اور تیسرے حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری۔

وضع داری

وضع داری آپ کی فطرت میں داخل تھی، جن کے دوست تھے، ان سے نباہ کی اور ہر حال میں نباہ کی، مجھے یاد ہے کہ ایک تنظیم کے معرض وجود میں آنے سے پہلے کی بات ہے، ایک دفعہ ہم لاہور میں تھے کہ آپ کو سخت پیش کا عارضہ لاحق کیا اتفاق سے ان ہی دنوں میں پشاور یا پٹنڈی مجلس احمدیہ کی تبلیغی کانفرنس تھی، حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی تو آپ شدید تکلیف کے باوجود انکار نہ کر سکے اور تشریف لے گئے۔ اپنے ذاتی کام اور وقت کا حرج اور نقصان کر کے بھی لوگوں کے کام سرانجام دینے میں مصروف رہتے تھے ہر وقت آپ کو دو پیش ضرورت مند لوگوں کا اجتماع رہتا تھا اور آپ ہر آنے والے کی ہر ممکن مدد کرنے میں قلبی مسرت محسوس کرتے تھے۔

کئی دفعہ لوگوں نے آپ کو ان مشاغل سے روکا بھی، مگر آپ نہ رکے، اور حالت الناس کی خدمت میں برابر مصروف و منہمک رہے۔

اجتماعیت سے پیار اجتماعیت سے محبت آپ کی سیرت کا خاص جوہر ہے۔ جماعتی زندگی سے آپ کو محبت تھی بیک وقت عاشق تھا اور انفرادیت سے نفرت تھی، جماعتی زندگی سے دور اور انفرادیت میں مبتلا لوگوں کی آپ کے دل میں قدر کم ہوتی تھی، میرے ایک مخلص مہربان ہیں چوٹی کے مقرر اور خطیب ہیں سردار صاحب کے دل میں ان کے کمالات کی وجہ سے ان کی خاص قدر و منزلت تھی، جب وہ خاص حالات و وجوہ کی بنا پر اپنی جماعت سے کٹ کر علیحدہ طور پر تبلیغی کام کرنے لگے تو سردار صاحب کے دل میں ان کا وہ مقام نہ رہا اور آپ نے اس کا بارگاہ اظہار فرمایا۔

ذاتی حالات آپ اپنی زندگی کے معمولات میں ایک ضابطہ کے پابند تھے، رات کو بروقت سو جاتے تھے، آخر شب عموماً اٹھ جاتے تھے، آپ کے مطالعہ کا وقت بھی یہی تھا۔ اخبارات کا مطالعہ آپ بالالتزام کیا کرتے تھے، شام کو جمع کر کے درون خانہ ساتھ لے جاتے اور پچھلی رات ان کا مطالعہ فرماتے، آپ کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور مطالعہ بھی کی بنا پر آپ بہت زیادہ معلومات کے مالک تھے، آپ کا شخصی کیرئیر نہایت بلند تھا۔ دو شادیاں کیں، مگر اولاد و زمینہ سے محروم رہے، دوستوں نے بہت زور دیا کہ ایک اور شادی کر لیں شاید اس سے خدا اولاد دے دے، بعض شریف لوگوں نے رشتہ کی پیش کش بھی کی، مگر آپ نے اس شریک و تجویز پر عمل تو عمل کبھی بھیجیدگی سے غور نہ کیا کہ اس کی بھی تکلیف گوارا نہ فرمائی۔

اولاد ابھی عرض ہو چکا ہے کہ آپ کی اولاد و زمینہ نہ تھی، صرف ایک صاحبزادی ہیں، آپ کے بار و زادہ سردار عبدالرحیم خاں صاحب گویا آپ کے لڑکے بھی ہیں اور داماد بھی، سردار صاحب نے اپنی اولاد کی طرح ان کی تربیت فرمائی اور اپنی زندگی ہی میں انہیں اپنا قائم مقام بنا دیا تمام دینی امور کا رد و بار ہی فرائض ان کے سپرد فرما دیے اور اپنے لیے صرف خدمتِ خلق اور تبلیغی کام رہنے دیا۔ ماشاء اللہ آپ کی تربیت کا فیض ہے کہ سردار عبدالرحیم خاں نہ صرف دینی امور بلکہ دینی اور تبلیغی کاموں میں بھی سردار صاحب کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور سردار صاحب کی رحلت سے مقامی جماعتی کاموں میں کوئی فرق نہیں آیا، اگر آپا تو یہ کہ ماشاء اللہ انجمن کے اراکین، اس کی خدمات اور فنڈ میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

کوئی بڑی عادت آپ میں نہ تھی، حقہ اور سگریٹ تک کو آپ نے کبھی منہ نہ لگایا، بلکہ آپ کے سامنے کسی دوسرے صحت کو بھی حقہ یا سگریٹ پلینے کی جرأت نہ ہوتی تھی، جفاکش تھے، نہایت صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی گزار ہی، عیش و نشاط کے تصور تک سے دور، اس لیے آپ کی صحت ماشاء اللہ قابل رشک حد تک اچھی تھی، البتہ نزلہ اور زکام آخر عمر میں لگا رہا تھا۔
مرض وفات آپ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا جو قریباً سال بھر رہا، علاج معالجہ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی مقامی حکیموں سے بھی رجوع کیا گیا، سول اسپتال ڈیرہ غازی خاں میں بھی داخل رہے مگر کوئی خاص افادہ نہ ہوا، آخر اسی عارضہ سے قریب پینسٹھ ستر سال کی عمر میں ۲۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو بروز جمعہ المبارک اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ اہل اللہ و اہل اللہ راجعون۔

آپ کی وفات پر کون سی آنکھ تھی جو اشکبار نہ ہوئی جس نے آپ کے انتقال کی خبر سنی، دل پکڑ کر رہ گیا۔ اپنے بیٹے سب برابر کے غم زدہ و لگے رہے اور آپ کی صفات حسنہ، اخلاق عالیہ اور خدمات جلیلہ کے گن گار رہے تھے، کہتے ہیں کہ آپ کے جنازہ میں اتنی خلقِ خدا جمع ہوئی کہ اس سے قبل کسی کے جنازہ پر بھی جمع نہ ہوئی تھی، ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے اپنے محبوب سردار کے لیے مصرفت و رحمت کی دعا کی۔

آپ نے ترک میں ہزاروں ایکڑ رقبہ اور پون لاکھ سے زائد روپیہ نقد چھوڑا، جس دن میں اور عزیزم محترم مولانا ضیاء القاسمی متروکات صاحب آپ کی خدمت میں بغرض عیادت حاضر ہوئے، اسی دن آپ اپنی وصیت لکھوانے کا اہتمام فرما رہے تھے آپ نے سارا رقبہ اپنے خرب عزیزیوں، رشتہ داروں اور سارا نقد روپیہ تعلیمی اور تبلیغی اداروں میں تقسیم فرمانے کی وصیت فرمائی اور بعد وفات آپ کی وصیت کے مطابق عمل کیا گیا۔

آپ کی زندگی بھی قوم کے لیے تھی اور زندگی کے بعد زندگی بھر کا جمع کردہ سرمایہ بھی قوم و ملت ہی کے کام آیا رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ۔

ہو گئے رخصت جہاں سے باقی تنظیم بھی
چھا گئی حلقہ احباب پر غم کی گھٹا
اللہ اللہ کس قدر تھا ان میں ایشاکر و خلوص
صرف کی تبلیغ دین پر اس نے دولت بے بہا
(حافظ نور محمد انور)

اہل تصوف اور دینی جدوجہد

مولانا ابوالحسن نے ندوی نے کتاب کا مقدمہ لکھ کر دیا تھا، مگر اپنی بے پناہ مصروفیتوں، غیر ملکی سفارت و انصاف کی بنا پر خاص اس کتاب کے لئے مقدمہ نہ لکھ سکے، البتہ ان کا ایک پُرانا مضمون بطور تکملہ شامل کر رہے ہیں۔ کتاب میں جن اکابر کے حالات مندرج ہیں وہ تقسیماً سبھی لوگوں کے مقصد کے اہم تھے، لہذا ضروری معلوم ہوا کہ تصوف کے متعلق جو غلط تاثرات علوم بطور خاص میں پائے جاتے ہیں، ان کی غلطی واضح کرنے کے لئے اس قسم کی تحریر شامل کتاب کے دئی جائے۔

عبد الہشید اکاشد

دنیا میں بہت سی چیزیں خاص اسباب کی بنا پر بغیر عملی عقیدہ و تحقیق کے تسلیم کر لی جاتی ہیں اور ان کو ایسی شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اگرچہ ان کی کوئی عملی بنیاد نہیں ہوتی مگر خواہیں بھی ان کو زبان و قلم سے بے تکلف دہرانے لگتے ہیں۔ انہیں مشہور بات ہے اصل میں سے یہ بات بھی ہے کہ تصوف، تعطل دینے والی، حالات سے شکست خوردگی اور میدانِ جدوجہد سے فرار کا نام، لیکن عقلی و نفسیاتی طور پر بھی اور عملی و تاریخی حیثیت سے بھی اور اس دعوے کے خلاف مسلسل طریقہ پر دائمی و جاری شہادتیں ملتی ہیں۔ سیرت سید احمد شہید میں تو یکسر اصلاحِ باطن کے عنوان کے ماتحت خاکسارِ اہم نے حسبِ ذیل الفاظ لکھے تھے جس میں آج بھی تسبیح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اس حقیقت پر پہلے سے زیادہ یقین ہو گیا ہے۔

”یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سرِ مذہبی و جاں بازی، جہاد و قربانی اور تجدید و انقلاب و فتح و تخریب کیلئے جس روحانی و قلبی قوت، جس مجاہدت و شخصیت، جس اخلاص و ولایت، جس جذب و کشش اور جس حوصلے اور بہت کی ضرورت ہے وہ بااوقات روحانی ترقی، مصفاۃِ باطن، تہذیبِ نفس، ریاضت و عبادت کے بغیر نہیں پیدا ہوتی۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جنہوں نے اسلام میں مجددانہ یا مجاہدانہ کارنامے انجام دیئے ہیں ان میں سے اکثر افراد روحانی و قلبی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، ان آخری سلاسل پر نظر ڈالئے، امیر عبدالقادر، ابنِ عربی، مجاہدِ جزائری، محمد احمد سودانی (مہدی سودانی) سیدی احمد شریف لکھنوی (امامِ سنوی) کو آپ اس میدان کا روپائیں گے۔ حضرت سید احمد ایک مجاہد و قائد کے علاوہ — ایک عزیزِ القدر روحانی پیشرو اور بے مثل شیخِ اطریقت تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجاہدات و ریاضیات، تزکیہ نفس اور قربِ الہی سے عشقِ الہی اور جذبِ شوق کا جو مرتبہ حاصل ہوتا ہے اس میں ہر دھنگ سے یہی آواز آتی ہے۔

ہمارے پاس ہے کیا جو خدا کریں تجھ پر !

مگر یہ زندگی مستعار کھتے ہیں

اس لئے روحانی ترقی اور کمال باطنی کا آخری اور لازمی درجہ شوقِ شہادت ہے اور مجاہدے کی پہل جہاد ہے۔

سیرت احمد شہید، جلد ثانی ص۔

نفیاتی پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یقین اور محبت ہی وہ شہر ہیں جن سے جہاد و جدوجہد کا شہباز پرواز کرتا ہے، مرغوبات نفسانی، عادت و مالونات مادی مصاح و منافع اغراض و خواہشات کی پستیوں سے وہی شخص بلبند ہو سکتا ہے اور لکنہ اخلاص و اتباعِ ہوا کے دم ہمرنگ زمین سے وہی شخص بچ سکتا ہے جس میں کسی حقیقت کے یقین اور کسی مقصد کے عشق کے پارہ کی تقدیر سیالی اور تحقیقوں کی بیستابی پیدا کر دی ہو،

انسانی زندگی کا طویل ترین تجربہ ہے کہ محض معلومات و تحقیقات اور مجرد قوانین و ضوابط اور صرف نظم و ضبط، سرفروشی و جان بازی بلکہ سہل تر تیار و قربانی کی طاعت و آمانگی پیدا کرنے کے لیے بھی کافی نہیں ہے، اس کے لئے اس سے کہیں زیادہ گہرے اور طاقت و تعلق اور ایک ایسی روحانی لایح اور غیر فانی فائدہ کے یقین کی ضرورت ہے کہ اس کے مقابلے میں زندگی بار دوش معلوم ہونے لگے کسی ایسے ہی موقع اور حال میں کہنے والے نے ہاتھ۔

جان کی قیمت و بارِ عشق میں ہے کوئے دوست

اس نوبد جاں فزا سے سروبال و دوش ہے

اس لئے کم سے کم اسلام کی تاریخ میں ہر مجاہد یا تحریک کے سرے پر ایک ایسی شخصیت نظر آتی ہے جس نے اپنے حلقہ مجاہدین میں یقین و محبت کی یہی طرح پھونک دی تھی اور اپنے یقین و محبت کو سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں تک منتقل کر کے ان کے لئے نین آسانی اور راحت طلبی کی زندگی دشوار اور پامردی اور شہادت کی موت آسان و خوش گوار بنادی تھی اور ان کے لئے جینا اتنا ہی مشکل ہو گیا جتنا خدا و سرور کے لئے مرنا مشکل تھا یہی سر حلقہ وہ امام و دلت ہے جس کے متعلق اقبال مرحوم نے کہا ہے:

جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے،

ہے وہی سر کے زمانے کا امام و رست

زندگی اور بھی تیرے لئے کوشاں کرے

موت کے آئینہ میں تجھ کو دکھا کر رنج و رست

فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے،

مے کے احساں میں تیرا لہو گر مادی

معمولی و معتدل حالات میں قوموں کی قیادت کرنے والے مسیح و نصرت کی حالت میں لشکروں کو لڑانے والے ہر زمانہ میں ہوتے ہیں اگر کسی غیر معمولی یقین و شخصیت کی ضرورت نہیں، لیکن یابوں کن حالات اور قومی استقامت کی کیفیات میں صرف وہی مرمو میدان حالات سے کش مکش کی طاقت رکھتے ہیں، جو اپنے خصوصی قہر و اعتماد اور اللہ اور قربتِ ایمانی و روحانی کی وجہ سے خاص یقین و کیفیتِ عشق کے مالک ہوں، جتنا بچہ جہاد مسلمانوں کا ہمارے تاریخ میں ایسے تاریک و قحطی آئے کر دکھایا ہی علم و دھوس اور قوت مقابلہ نے جواب دے دیا، اور حالات، تہذیبی امور حال معلوم ہونے لگی تو کہ صاحبِ یقین و صاحبِ عشق میدان میں آیا جس نے اپنی جرأت و زندان اور کیفیتِ عاشقانہ سے زمانہ کا بہتا ہوا دھارا بدل دیا اور اللہ تعالیٰ یخرج الخلی من المسیت اور یجیہی اللادف بعد موتہا کا منظر دکھایا۔

تاتاریوں نے جب تمام عالم اسلام کو پال کر کے دکھ دیا، جلال الدین خوارزمشاہ کی واحد اسلامی سلطنت اور عباسی خلافت کا چراغ ہمیشہ کے لئے ہو گیا تو تمام عالم اسلام پر ایسے مرموئی چھا گئی، تاتاریوں کی شکست ناممکن الوقوع چیز بھی جانے لگی اور یہ شمال زبان و ادب کا جزو بن گئی کہ اذ اقیب لاک ان التتار لہن موانعاً لخصدق (اگر تم سے کوئی کچھ کہتا تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو کوئی یقین نہ کرنا) اس وقت کچھ صاحبِ یقین و صاحبِ قلوب مردانِ خدا تھے جو یابوں نہیں ہوتے اور اپنے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ تاتاری مسلمانوں کو مسلمان کے صنفِ خانہ سے کعدہ کیلئے پاب نہ بنایا

کرتے، ہندوستان میں اکبر کے دور حکومت میں ہندو سلطنت کا تاج اتحاد و لادینیت کی طرف ہو گیا، ہندوستان کا عظیم ترین بادشاہ ایک وسیع و طاقتور سلطنت کے پورے وسایل و ذخائر کے ساتھ اسلام کا امتیازی رنگ بٹھانا چاہتا تھا، اس کو اپنے وقت کے لائق ترین و ذکی ترین افراد اس مقصد کی تکمیل کے لئے حاصل تھے، سلطنت میں ضعف و پیراہن سالہ کے کوئی آثار ظاہر نہ تھے کسی فوجی انقلاب کی امید کی جا سکے، علم و ظاہر ہی قیاسات کسی خوش گوار تبدیلی کے امکان کی تائید نہیں کرتے تھے۔ اس وقت ایک درد پیش پے فوٹے تن تنہا اس انقلاب کا بیڑا اٹھایا اور اپنے یقین و ایمان عزم و توکل اور روحانیت و اہمیت سے سلطنت کے اندر ایک ایسا اندرونی انقلاب شروع کیا کہ سلطنت مغلیہ کا ہر جانشین اپنے جانشینوں سے بہتر ہونے لگا، یہاں تک کہ اکبر کے تخت و سلطنت پر بالآخر محمدی الدین اور ہمگ زیب نظر آیا۔ اس انقلاب کے بانی امام طریقت حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی تھے۔

انیسویں صدی میں جب عالم اسلام پر فرنگی "تاتاریوں" یا جاہلین صلیب کی یورش ہوئی تو ان کے مقابل میں عالم اسلام کے ہر گوشہ میں جو دہان سرے کھن باندھ کر میدان میں آئے، وہ اکثر و بیشتر شیوخ طریقت اور اصحاب سلسلہ کے بزرگ تھے جن کے تزکیہ نفس اور سلوک راہ نبوت نے ان میں دین کی حیرت، کفر کی نفرت، دنیا کی زندگی کی محارت اور شہادت کی موت کی قیمت دوسروں سے زیادہ پیدا کر دی تھی۔ اجماعاً (مغرب) میں امیر عبدالغفار نے فریسیوں کی مخالفت میں علم جہاد بلند کیا اور ۱۲۱۲ھ سے ۱۲۱۶ھ تک خود بخود بیٹھے دفریسیوں کو چین سے بیٹھنے دیا۔ مغربی مورخین نے ان کی شجاعت عدل و انصاف، نرمی و مہربانی اور علمی قابلیت کی تعریف کی ہے۔

یہ جامد، ذوقاً و عملاً مونی اور شیخ طریقت تھا، امیر شکیب اسلان نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

وكان المحرم الامير عبدالغفار يتصلعاً من العلم والادب سائى المعكروا سمع القمى القنوب لا يكتفى به نظراً حتى يحادسه عملاً ولا يجن الا شتاً حتى يبره ذوقاً وله فى التصوف كتاب حاشا (المواقف) فقهى هذا المشرق من الاخوان الا انذار بما لا يجد نظيره فى المناخير	امیر عبدالغفار در مرحوم پورے عالم و ادیب و عالمی دماغ اور بلند پایہ مونی تھے، صرف نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً اور ذوقاً و عملاً مونی تھے بقوت میں ان کی ایک کتاب (المواقف) ہے۔ وہ اس سلسلہ کے کیتائے روزگار لوگوں میں تھے اور ممکن ہے کہ متاخرین میں ان کی نظیر دستیاب نہ ہو سکے۔
--	---

دشمن کے زہر، نایم کے معمرات اور اوقات کا ذکر تے ہوئے لکھتے ہیں :-

وكان كل يوم يقوم الفجر ويصلى الصبح فى مسجد قريب من دافنى حلة العلاء لا يتخلف عن ذلك الا لمرض وكان يتعهد الليل ويمارس فى رمضان الرياضة على طريقة الصوفية وما زال مثلاً لا يدرى والفقوى والاخلاق الفاضلة، ان توفى رحمة الله - سنة ۱۸۸۳ م	روزانہ فجر کو اٹھتے، صبح کی نماز اپنے گھر کی قریب مسجد میں جو عملاً العمارہ میں واقع ہے پڑھتے، برائے بیماری کی حالت کے کبھی اس میں تاخر نہ ہوتا، تہجد کے عادی تھے اور رمضان میں حضرت مومنینہ کے طریقہ پر ریاضت کرتے، برابر سلوک و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ پر قائم رہتے ہوئے ۱۸۸۳ھ میں انتقال کیا۔
--	---

۱۸۱۲ء میں جب طاعستان پر روسیوں کا تسلط ہوا تو ان کا مقابلہ کرنے والے نقشبندی شیعہ تھے جنہوں نے علمِ جہاد بلند کیا اور اس کا مطالبہ اور جدوجہد کی کوشاںات و مقامات شریعت کے مطابق فیصل ہوں اور قوم کی جاہلی عادات کو ترک کر دیا جائے، امیر شکیب ارسلان بختہ ہیں:-

وقولی کہ الشوریہ علماء ہم و شیوخ الطریقہ
النقشبندیہ اللمششرۃ هناك وکما نهم
سبقوا سائر المسلمین الی معرفۃ کون ضررهم
ھو من امر اھلکم الذین اکثرهم یمعن حقوق
الامۃ بملقب ملک او امیر و قبو کو کسی و سریر
ورفع علم کاذب و الذہ فارغۃ باخطام اوسمۃ
و مراتب فنادوا منذ ذلک الوقت علی الاصرار
و علی الرد سۃ حامیتهم و طلبوا ان ینکروا العلم
وفقا لاصول الشریعۃ لا للعادة القدریۃ
الباقیۃ من جاہلیۃ اولیک الاقوام، وکان
زعیم تلك الحریکۃ غازی مجتہد الذی یلقبہ
الروس بقاضی ملاء وکان من العلماء المتبحرین
فی العلوم العربیۃ ولہ تابعین فی وجوب
نبذ تلك العادات القدریۃ المخالفۃ
المہ ہائے علی ارتداد عرفان
طاغستان

اس جہاد کے علمبردار طاعستان کے علماء اور طریقہ
نقشبندیہ کے (جو طاعستان میں پھیلا ہوا ہے) شیوخ
تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس تحقیق کو
عام مسلمانوں سے پہلے سمجھ لیا تھا کہ اصل نقصان ان
احکام سے پہنچا ہے جو خطا باٹ، عہدہ و اقتدار
بھوئی قیادت و سرداری، عیش و لذت اور نعموں اور
مرتبوں کی لالچ میں قوم فرشتی کا ارتکاب کرتے ہیں
یہ سمجھ کر انہوں نے ملی حکام اور ان کے حامی روسیوں
کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اس کا مطالبہ کیا کہ مسلمان
کا فیصلہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق ہو نہ کہ قوم کی قدیم
جاہلی عادات کے اس تحریک کے قائد غازی محمد تھے
جن کو روسی قاضی ملا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ علما
عربیت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان جاہلی عادات کے ترک
کرنے کے بارہ ہیں ان کی ایک تصنیف
اقامۃ البوہان علی ارتداد اہل فہام طاغستان
(طاغستان کے چودھویں اور برادری کے سرداروں کے
ارتداد کا ثبوت) ہے۔

۱۸۳۲ء میں غازی محمد شہید ہوئے ان کے جانشین حمزہ بے ہوئے، ان کے بعد شیخ شامل نے جہادین کی قیادت سنبھالی جو بقول امیر شکیب
امیر عبدالقادر اچراڑی کے طرز پر تھے اور شیخ سے امارت ہاتھ میں لی تھی۔
شیخ شامل نے ۲۵ برس تک روس سے مقابلہ جاری رکھا اور مختلف معرکوں میں ان پر زبردست فتح حاصل کی۔ روسی ان کی شوکت اور شہادت
سے مرعوب تھے اور چند مقامات کو چھوڑ کر سارے ملک سے بغیر ہو گئے تھے۔ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں شیخ نے ان کے سارے قلعے فتح کر لئے اور اڑھائی
سالان مالی غنیمت میں حاصل کیا۔ اس وقت حکومت روس نے اپنی پوری طاقت ان کی طرف مبذول کی طاغستان میں جنگ کرنے کے لئے باقاعدہ دعوت دی۔

علمہ طاغستان پر غرض کے مغربی ساحل پر اسلامی آزادی کا ایک ملک ہے۔ اگر شمالی تفتاکر اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے تو ۷۰-۳۰ لاکھ کے درمیان مسلمان
آبادی ہوگی۔ میں ہشام بن عبداللہ کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تھا روس سے پہلے یہ ملک ایران کے زیرِ نفاذ

شعرا نے نظیں بکھیں اور پے در پے فوجیں روانہ کی گئیں، شیخ شامل نے اس کے باوجود بھی مزید دس برس تک جنگ جاری رکھی بلکہ آخر ۱۸۵۹ء میں اس جہاد عظیم نے ہتھیار ڈالے۔

قصوف و جہاد کی جامعیت کی درخشاں مثال سیدی احمد اشرف السنوی کی ہے۔ اٹالویوں نے برطانویوں کی فتح کے لئے پندرہ دن کا اندازہ لگایا تھا تو اٹالویوں اور باریوں کی جنگ کا تجربہ رکھنے والے انگریز قائدین نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ یہ اٹالویوں کی نا تجربہ کاری ہے اس ہم میں ممکن ہے تین مہینے لگ جائیں، لیکن پندرہ دن تین مہینے۔ اس جنگ میں پورے تیرہ برس لگ گئے اور اٹالوی پھر بھی اس علاقہ کو مکمل طور پر سر نہ کر سکے۔ یہ سنوی فوجیوں اور ان کے شیخ طریقت سیدی احمد اشرف کی جہاد و جدوجہد تھی جس نے اٹالویہ کو پندرہ سال تک اس علاقہ میں قدم جانے نہیں دیا، امیر شکیب نے لکھا ہے کہ سنویوں کے کارنامے نہایت کر دیا کہ طریقت سنوی ایک پوری حکومت کا نام ہے بلکہ بہت سی حکومتیں بھی ان کی دوسال کی مالک نہیں ہیں جو سنوی کہتے ہیں۔ خود سیدی احمد اشرف کے متعلق ان کے الفاظ ہیں۔

وقد لحظت مسته صبرا قل ان یوجد فی
غیرہ من الدجال و عمر ما شدید التلح
سیمائۃ علم جحد فینا ہونی
تقواہ من الابدال اذا ہون
شجا حستہ من الابطال۔
مجھے سید سنوی میں یہ معمولی میراث ثابت قدمی دکھائی
وچمک لوگوں میں دی گئی، انوار العری ان کے تاحیہ اقبال ہے
ہو رہا ہے۔ ایک طرف اپنے تقویٰ و عبادت کے لحاظ سے
اگر وہ اپنے زمانہ کے ابدال میں شمار ہونے کے قابل ہیں
تو دوسری طرف شجاعت کے لحاظ دیگر ان زمانہ کی صف
میں شامل ہونے کے مستحق ہیں۔

امیر شکیب نے مصر، اعظم افریقہ کی سنوی خانقاہ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی دل آویز اور سلیس سمجھ رہے ہیں۔ یہ خانقاہ واسطہ الکفر میں واقع تھی اور سیدی احمد اشرف کی چچا اور شیخ اسید المہدی کے انتظام میں تھی اور افریقہ کا سب سے بڑا روحانی مرکز اور جہاد کا دارالفریبت تھی، امیر مرحوم لکھتے ہیں۔

”سید مہدی صحابہ و تابعین کے نقش قدم پر تھے، وہ عبادت کے ساتھ بڑے علمی آدمی تھے ان کو معلوم تھا کہ قرآنی احکام حکومت و اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتے اس لئے وہ اپنے برادران طریقت اور مریدین کی ہمیشہ شہسوری نشانہ بازی کی مشق کی تاکید کرتے رہتے۔ ان میں غریب اور مستعد کی روح چھوٹے، ان کو گھوڑوں اور ڈاکو سپاہی کا شوق دلاتے رہتے اور جہاد کی فضیلت و اہمیت کا نقش ان کے دل پر قائم کرتے، ان کی یہ کوششیں بار بار اور ہوئیں اور مختلف مواقع پر اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے خصوصاً جنگ طرابلس میں سنویوں نے نہایت کر دیا کہ ان کے پاس ایسی آدمی قوت تھے جو بڑی بڑی حکومتوں کی طاقت سے کھلے سختی تھے اور بڑی جبروت سلطنتوں کا مقابلہ کر سکتے تھے صرف جنگ طرابلس ہی میں سنویوں کا جوش و غضب ظاہر نہیں ہوا بلکہ علاقہ کا نام اور دادی سوان میں وہ ۱۳۱۹ء سے ۱۳۳۲ء تک فرانسسویں بوسر جنگ رہے ہیں۔

سید احمد اشرف نے مجھے بتایا کہ ان کے چچا مہدی کے پاس پچاس ذاتی بندوقین تھیں جن کو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے صاف کرتے اور پوچھتے تھے، اگرچہ ان کے سینکڑوں کی تعداد میں مریدین تھے مگر وہ اس کے روادار نہ تھے کہ یہ کام کوئی اور کرے، تاکہ لوگ ان کی اقتدار کی اس اور جہاد کی اہمیت کو کھینچیں

اور اس کے سامان و ذخائر کا انتہام کریں، جمعہ کا دن سچی مشقوں کے لئے مخصوص تھا، گھوڑوں کی ریس مٹی نشانہ کی مشق ہوتی وغیرہ، خود سید ایک بلند جگر پر تشریف فرما ہوتے، شہسوار درجہوں (پاریوں) میں تقسیم ہو جاتے اور دوڑ شروع ہوتی یہ سلسلہ دن چھپے تک جاری رہتا، کبھی کبھی نشانہ مقرر ہوتا اور نشانہ بازی شروع ہوتی، اس وقت علماء و مدرسین کا نمبر شہسوار کی نشانہ بازی میں بڑھایا ہوا ہوتا کیوں کہ ان کے شیخ کی ان کے لئے خاص تاکید تھی، جو لوگ گھوڑوں میں پلاجیت لیتے یا نشانہ بازی میں بازی لے جاتے ان کو قیمتی انعامات ملنے تاکہ جس کی کمالات کا شوق ہو۔

جمعہ صبح کا دن و تہکاری اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے لئے مقرر تھا۔ اس دن اسباق بند ہو جاتے، مختلف پیشوں اور صنعتوں میں لوگ مشغول ہوتے، کہیں تعمیر کا کام ہو یا ہوتا، کہیں تجارتی، کہیں لوہاری، کہیں پارچہ بانی کہیں دراتی کا مشغلہ نظر آتا، اس دن جو شخص نظر آتا وہ اپنے ہاتھ سے کام کرتا دکھائی دیتا، خود سید مہدی بھی پورے مشغول رہتے، تاکہ لوگوں میں عمل کا شوق ہو، سید مہدی اور ان سے پہلے ان کے والد ماجد کو دراعت اور درخت لگانے کا بڑا اہتمام تھا، اس کا ثبوت ان کی خانقاہیں اور ان کے خانہ باغ ہیں، کوئی سلسوی خانقاہ ایسی نہیں ملے گی جس کے ساتھ ایک یا چند باغات نہ ہوں، وہ نئے نئے قسم کے درخت و دروازہ مقامات سے اپنے شہروں میں منجوتے تھے، انہوں نے کفر اور جغوب میں ایسی زرعتیں اور درخت روشتاں کر لئے تھیں جو وہاں کوئی جانتا بھی نہیں تھا، بعض طلبہ سید محمد السنوسی (بابی سلسلہ السنوسی) سے کیا رکھانے کی درخواست کرتے تھے تو وہ فرماتے تھے کہ: ”کیا بآں کے نیچے ہے“ اور کبھی فرماتے ”کیا کیا ہے“ ہاتھ کی غٹ اور پیشانی کا پسینہ ”وہ طلبہ اور مریدین کو پیشوں اور صنعتوں کا شوق دلاتے اور ایسے جگے فرماتے جن سے ان کی ہمت افزائی ہوتی اور وہ اپنے پیشوں اور صنعتوں کو تیز نہ سمجھتے اور نہ ان میں علماء کے مقابلہ میں احساس کمتری پیدا ہوتا، چنانچہ فرماتے تھے ”بس تم کو حسن تہمت اور فرائض کی پابندی کا کافی ہے، دوسرے تم سے افضل نہیں، کبھی کبھی اپنے کو بھی پیشہ و درں میں شامل کر کے اور ان کے ساتھ کام میں شرکت کرتے ہوئے فرماتے ”کیا یہ کاغذوں والے علماء اور تہیوں والے (مؤلفین و ذاکرین) سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں برکت لے جائیں گے، نہیں خدا کی قسم وہ ہم سے کبھی برکت نہیں لے جاسکتے“ لے

عالم اسلامی پر سید جمال الدین افغانی مرحوم کی شخصیت و دعوت نے جو اثر ڈالا ہے۔ وہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ نئی دنیا کے اسلام کے معماروں میں ہیں۔ سید جمال الدین افغانی ستر پاد دعوت ملی اور ایک شعلہ جوا تھے جس نے افغانستان سے لے کر ترکی تک تمام عالم اسلام میں حیات اسلامی کی روح اور اتحاد اسلامی کا تصور پھونکا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کے سوز و دروں اور گرمی نفس ہیں اور ان کی بے چین طبیعت اور مسلسل جدوجہد میں ان کے ذکر علمی اور باطنی بیداری کو دخل بھی ہے جس کے بغیر اکثر آدمی مسلسل غٹ اور غافلوں اور رائیوں میں کس حالات کا ہمیشہ مقابلہ نہیں کر سکتا یہی حال ان کے شاگرد رشید اور دوست و رفیق شیخ محمد عیدہ کا ہے جو تصوف کے لذت آشنا اور اس کو سچے سے واقف تھے۔

ہندوستان میں تصوف، جہاد کا الہامیغیب، استزاج و اجراع ملتا ہے جس کی نظیر دوردور دہلیز مشکل ہے اس سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے کہ ان کی یہ جامعیت سلامت میں سے ہے اور حد تو اتنی پہنچ چکی ہے ان کے فقہاء جہاد اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے جوش جہاد، شوق شہادت، محبت دینی، بغضِ نانی اللہ کے واقعات قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جب کسی ان کے مفصل واقعات سامنے آئیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ قرنِ اول کا بچا ہوا ایک ایمانی جھڑکنا تھا تو تیرھویں صدی میں بچا تھا۔ اور جس نے دکھا دیا تھا کہ ایمان، توحید اور صحیح قلعق باللہ اور راہِ نبوت کی تربیت و سلوک میں کتنی قوت اور کبھی تاثیر ہے اور بغیر صحیح زمانیت اور اصلاح کے کچھ جوش و جذبہ اور تیار و قربانی اور جاں سپاری کی امید غلط ہے۔

سید صاحب کے جانشینوں میں مولانا سید نصیر الدین اور مولانا دلائت علی عظیم آبادی سید صاحب کے پوتے تھے ان کے جانشینوں میں مولانا بیگی علی اور مولانا احمد اللہ صادق پٹواری بھی دونوں جتیلوں کے جانشین تھے، ایک طرف ان کے جہاد و استقامت اور امتحان کے واقعات امام احمد بن حنبل کی یاد تازہ کرتے ہیں، اور دوسری طرف کی پیڑ پر بیٹہ کرنا لے کر ان کے پچاسی گھر، کبھی جزائرِ عثمان میں مجوس نظر آتے ہیں، دوسرے وقت وہ سلسلہ مجددیہ و سلسلہ مجددیہ (سید صاحب کے خصوصی سلسلہ) میں لوگوں کی تربیت و تعلیم میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔

دو کھلے جام شریعت در کھلے سندان عشق
ہر ہوسنا کے نمائندہ جنم و سندان باغلق
ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کی مجاہدانہ جدوجہد اور قربانیاں اگلیا یکب پڑے پورے دیکھی جائیں اور اہل صادق پور کی جدوجہد اور قربانیاں اگر دوسرے پڑے پورے پر تو شاید یہی پڑا جہاد ہی ہے۔

ان حضرات کے بعد بھی ہم کو اہل سلسلہ اور اصحاب ارشاد و دینی جدوجہد اور جہاد فی سبیل اللہ کے کام سے فارغ اور گوشہ نشین نظر نہیں آتے، مشامی کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت حافظ ضامن، مولانا محمد قاسم، مولانا شہید احمد گھنٹی، انگریزوں کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں۔ حضرت حافظ ضامن، دین شہید ہوتے ہیں حاجی صاحب کو ہندوستان سے ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ مولانا نواز قوی اور مولانا گھنٹی کو عرصہ تک گوشہ نشین اور مستور رہنا پڑا ہے۔ پھر مولانا محمد حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (جن کو ہندوستان کے مسلمانوں نے بجا طور پر شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا) انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاری کرتے ہیں اور ہندوستان کو ان کے وجود سے پاک کر کے ایک ایسی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کا اقتدار اعلیٰ اور ان کے ہاتھ میں ملک کی زمام کار ہو۔ ان کی بلند ہمتی ان کو ترکی سے تعلقات قائم کرنے اور ہندوستان و افغانستان و ترکی کو ایک سلسلہ جہاد میں منسلک کرنے پر آمادہ کرتی ہے، رستمی خطوں اور پاشا کی ملاقات مالٹا کی اسارت، انجی عالی ہمتی اور قوت عمل کا ثبوت ہے۔

من المومنین رجال صدقوا ما عاهدوا اللہ علیہ فقلوبہم من قضي الخبہ ومنہم من ینتظروا ما یذلوا تبیللا۔
ان سلسلہ تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ ایک صحیح ہوگا کہ تعطل و بے عملی حالات کے مقابلہ میں سپر انداز اور اسپرانی تصوف کے لوازم میں سے ہے۔ اگر اس دعوے کے ثبوت میں، چند مصنفین اور اصحاب طریقت کی مثالیں ہیں تو اس کے خلاف بڑی تعداد میں ان انکرنی اور شیوخ طریقت کی مثالیں ہیں جو اپنے مقام اور سرسوں فی الطریقہ میں آدل الکر اصحاب سے بڑے ہوئے ہیں۔

حافظ گوشتیہ عمر، جیسے قادیان میں مسکے شہرور فاضل و معتمد فاکر احمد ہیں بے نے (جن کو شیخ حریب و شعیفی واقفیت اور اسان میں شرکت کا شرف حاصل ہے) سید ابوالدین، شیخ حریب مدنی اس مناسبت اور اشتغال کا ذکر کیا۔

لہٰذا ان تفصیل واقعات کے لئے لافظ ہو میر سید احمد شہید معدوم و غیرہ جبرع

تصوف ابتدائی غور اور تجربہ

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و فکروں سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے میری نظر انتخاب اس نامہ کے ایک صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے اور منظر بھی مسویر اور شاداب ہے، بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے، ازراہ کم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھایا تھا، یاد آتا ہے کہ کوئی تیسرا شخص اس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سردی میں چند ڈاکر "لفی اثبات" کا اور بعض کن میں سے "اسم ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ، ملوک کے تجویز کے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب بھی لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اس وقت میرے لئے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابل برداشت تھا، چنانچہ مجھے بے درہنگا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا :-

"حضرات! ساری عمر دین کے بارہ میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو (رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے، اور جس کی تعلیم آپ نے صحابہ کرام کو دی اور پھر صحابہ کرام سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعہ جو اس ہم تک پہنچا۔ اور یہ حضرات ذاکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں، جہانک اپنا علم ہے نہ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم انے تابعین کو تعلیم فرمایا تھا، نہ صحابہ کرام انے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کیا، اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہ طریقہ بتلایا تھا، اس لئے ذکر کے اس طریقے کے بارہ میں مجھے خلیان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ ضعیفان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے۔"

ان بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں منہ مایا :-

"مولوی صاحب! یہ بچارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے، بس اسی کام کے ہوتے ہیں، اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں ان کو یہ بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریروں پر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس جگہ میں رہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا لیکن اُن بزرگ نے میری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا، اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اہل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے، مہلت دینے بغیر ہندو مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور ان کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرمایا جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا، اُن مائے رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اٹھانا میں نے مناسب نہ سمجھا اور عائشہ کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ فرما کر کہ میں نے اُسی دھن کے ساتھ اپنا ذکر شروع کر دیا، مجھ سے بچر نہ کر گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا، لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرمایا ہندوستانی مسلمانوں کی مائیں ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لبا سلسلہ شروع فرمایا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

اُن بزرگ کے اس رویہ سے اس کھٹھ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا جواب ان کے پاس نہیں، اس لئے یہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے، بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یا رہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت کچھ اور ہی تھی۔

خالفہ کہ جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نماز عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تقصوف کے اس قسم کے اعمال و اشتغال پر بطور خوبی خورد کرنے لگا۔ اس خورد و فکر میں خود ہی میں مسائل تھا اور خود ہی عجیب، یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی، میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے، اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو اس بارہ میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کر دوں، ان باتوں کے غلط باطل ہونے پر ایک سچے سچ پرست کی طرح ہمارا کر دوں۔

اسی خورد و فوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرح منتقل ہوا کہ تقصوف کے ان خامی اعمال و اشتغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو شائع کے تجویز کئے ہوئے ہیں اور اپنی قیود و اوضاع کے ساتھ سخت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت تیسرا احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو جہد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا، کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارہ میں قیام اور تباہی ہی برتا ہوا، بلکہ ان کی تعلیم سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طلبہ کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و تفتیل کر کے ان کا سلوک طے کر دیا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کے پڑھنے والے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص علم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن

لے مونیوں کو ان کے ایک بڑے استاد (حافظ شیرازی) کا مشورہ بھی نہیں ہے کہ۔

ہادی گوئیہ اسرارِ عشق، حق بخند، تائبہ، رنج خود پرستی

اور زیادہ قریب قیاس ہے یہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ و شاہ اسماعیل شہید جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو مقصود کیا جائے وہ بھی ایک فن سے متعلق مسکن ہیں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھرا اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔ دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے شخصی حالات اور اصلاحی جذبہ خدشات سے کچھ واقفیت کے وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عند اللہ مقبولیت کا یقین پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا، اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات (اپنے اپنے زمانہ میں اسرار دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قرب خداوند کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر ان میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزار بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے۔ بیشک مجدد دینی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا، لیکن وہ ہدایت کا داعی اور مروج بھی نہیں ہو سکتا، خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ اہمک ہوا اور اس کا داعی خاص ہو اور اسی کے ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو، اُس پس اگر وہ بدعت و غیر بدعت میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح زیادہ فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہو گا۔

بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی اطمینان کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی رہی ہے، اور اب مجھے اپنی غلطی ہی کو پکڑنے اور برائے کی کوشش کرنا چاہیے۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصبہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد پچھلے شہینے، اُس دن یہ عاجز بھی ساتھ ہوا۔ اور اس کے اپنے بحث و مباحثہ اور اس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا کہ :

”میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تعوت غیے اعمال و اشغال کے بارہ میں جواب تک سبھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو کچھ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گہ بھی کھل جائے اور جو غلطی باقی ہے وہ بھی کھل جائے“

موصوف میری یہ بات سن کر مشکرائے اور فرمایا :

”مولوی صاحب! آپ کو یہی توجہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟ میں نے عرض کیا :-

”بدعت کی تعریف تو علمائے کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ متفق اور متفق مسلم قصبہ وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی چیز کا اضافہ جس کے لیے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔“

منہ پایا :-

”ہاں ٹھیک ہے لیکن یہ بتائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو جس طریقے سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرام کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی،

بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس سے استعمال کو بھی آپ دین میں اضافہ اور بدعت کہیں گے؟ ————— (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا) مثلاً دین بیکھنا اور سکھانا ضروری ہے اور دین میں اس کا نہایت تاکید و حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں اس کے لئے صرف صحبت کا ہی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے، اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا، اور اب تک اسی سے قائم ہے ————— تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقے میں اس تبدیلی کو بھی دین میں اضافہ اور بدعت کہا جائے گا؟

میں نے عرض کیا :-

”نہیں!“ دین میں اضافہ ”محب ہوتا ہے“ جب کہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے لیکن اگر کسی دینی مقصد کے لئے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقہ ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا، جانور طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو دین میں اضافہ ”نہیں“ کہا جائے گا، اور نہ وہ بدعت ہو گا۔“

فرمایا :-

”بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے ان سب کی نوعیت بھی یہی ہے ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تخلیک کے لئے کیا کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصود اور مورد ہے۔ ————— مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اس کی رضا کا احسان، فکر کرنا، اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں دین کی تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایسا ہی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرامؓ کی محبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی، یہی بعد میں ماحول کے زیادہ بڑھ جانے اور استحدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کیلئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کیلئے صحبت کے ساتھ ذکر و فکر کی کثرت کا اضافہ کیا اور بڑے سے یہ تجویز بھی ثابت ہوئی ————— اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے احوال کا بڑے کر کے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو

مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لئے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور کھوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا گیا ہے، تو ان میں سے کسی چیز کو مقصود اور امور یہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے، اور اسی مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑادی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر طریق اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کرتا ہے، اور بعضے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جن میں اس طرح کا ذکر شغل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کیوں ہی نصیب فرمادیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کوایا جاتا ہے۔

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی غمان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ کچھ فرمایا ہے اس کو خود آزما کے دیکھ جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قطعی اطمینان اور حقیقتیں حاصل کیا جائے، لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کیے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں، اس لئے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا، کہ:-

”اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے، اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے، اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

فرمایا:-

”مولوی صاحب! تعارف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے، اور جان پڑتی ہے لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب اور توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ وہ ادھر ویدیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب نے بادام صاحب نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحب، حضرت شاہ صاحب اور حضرت سید صاحب نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ دکھایا (جن کا سودا ان ہزاروں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی بنجین اور جماعتیں نہیں کر سکتے) وہی ہیں، اُس میں اُن کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تقویٰ کے راستے سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی پیچھے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔“

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:-

”خدا معلوم لوگ تقوف کو کیا سمجھتے ہیں، تقوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو دراصل تقوف ضروری نہیں ہے بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستہ سے حاصل کرے اور ہم کو بھی بتا دے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے جن میں سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔“

میں نے عرض کیا، کہ:-

”جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اُسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو کیا وہ کسی مدت تک اُس کام کو چھوڑ کے اس کی تحصیل کرے، یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کو بھی کرتا رہے اور اس کے ساتھ اس کو حاصل کرنے کی بھی کوشش کرے؟“

فرمایا:-

”ہاں! ہو سکتا ہے، البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں کچھ مدت کے لئے یکسوئی کے ساتھ اسی طرح مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

میں نے عرض کیا:-

”کیا اس کے لئے بیعت ہونا بھی ضروری ہے؟“

فرمایا:-

”نہیں اور بالکل نہیں! ہاں طلب اور اعتماد کے ساتھ محبت اور محبت ضروری ہے، بیعت تو صرف تعلق اور اعتماد کے اظہار کے لئے ہے، ورنہ اصل مقصد میں بیعت کو کوئی خاص دخل نہیں ہے۔“

میں نے عرض کیا، کہ:-

”پھر کبھی کو بھی کچھ فرمادیں۔“

فرمایا:-

”مولوی صاحب! حدیث شریف میں ہے **اَلْمُسْتَقَامُ مَوْتَانِ** (جس سے مشورہ لیا جائے وہ ایسا ہے) اُس کو کپڑی دیانت داری سے مشورہ دینا چاہیئے! میں آپ کے لئے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لئے فلاں صاحب یا فلاں صاحب کی طرف رجوع کریں، ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے اور آپ بھی علم والوں کے لئے ہیں اُن ہی حضرات کو اہل سمجھتا ہوں۔“

میں نے عرض کیا:-

” ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے مجھے دل میں تھی اور اب حضرت کے اس ارشاد سے اور زیادہ ہو گئی
لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب نہیں پیدا ہوئی ہے اس لئے میں تو اس راستے میں حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا
اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں“

موصوف نے اپنی محنت و مشق کے پورے اظہار کے ساتھ ایک یا دو دفعہ پھر اپنی دونوں بزرگوں کا حوالہ دیا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ
اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمایا اور میری مصروفیتوں کا پورا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر و غیہ کا بہت مختصر سا پر دو گرام تجویز فرمادیا اور میں نے کرنا شروع کیا۔

اس کے بعد میں ٹھٹھار چار پانچ دن وہاں اور مقیم رہا، جب اجازت کے لئے رخصت ہونے لگا تو خاص اہتمام سے فرمایا، کہ :-
” حضرت دہلوی (یعنی مولانا محمد الیاس) کی خدمت میں ضرور جایا کریں، اور کچھ کیا کریں“

اس موقع پر مولانا موصوفؒ کے متعلق بہت بلند چند کلمات بھی ارشاد فرمائے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان بلند کلمات ہی نے مجھے اس مشورہ کی تعمیل پر
آمادہ کیا اور جیسا کہ مولانا مرحومؒ کے ملفوظات کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، اس کے بعد ہی میں نے مولانا موصوفؒ کی شخصیت کو کچھ جاننا اور کچھ عرصہ کے بعد میں یہ بھی
سمجھ سکا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا اتنے اہتمام سے مجھے کیوں مشورہ دیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ خانقاہییت اور خانقاہی مشاغل اور اہل خانقاہ سے جو مجھے بعد تھا اس میں اچھا خاصہ دخل میرے اس احساس کو بھی تھا کہ ان ملفوظات
میں دین کا فکر اور اس کی خدمت کا جوش میں کم پاتا تھا، حالانکہ میں اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص میراث سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اگر
بزرگ نے میرے اس احساس کو سمجھ کر اس کی اصلاح و تبدیل کرنے کے ہی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی خدمت میں حاضری اور قیام کی مجھے اتنے اہتمام سے
تاکید فرمائی، گو ایسے ایک عشق باز اور صاحب انعام بندے کے دین کے درد اور اس کی راہ میں اس کی تخریب اور بے کلی کا شہادہ کرنا تھا اور دکھانا تھا
کہ دین کی خدمت کرنے والے ایسے جو جتنے ہیں۔

لے مربع سحر عشق زہر دانہ سبب موز
کاں سوختہ جاں شد و آواز نیامد !

آٹھ، نو برس پہلے کا یہ واقعہ ہے، حافظ نے اب تک جتنا کچھ محفوظ رکھا لکھ دیا ہے اور اپنی اور ان بزرگ کی گفتگو کا جو حصہ نقل کیا گیا ہے،
ہے کہ اتنے عرصے کے بعد اصلی الفاظ میں نقل کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے اس سب کو روایت بالعمنی ہی لکھنا چاہئے بلکہ اس کا بھی قوی امکان ہے کہ اس سلسلہ
کی باتیں وہ گنتی ہوں، اور بعض ایسی باتیں یہاں لکھی گئی ہوں جو اس موقع پر بعد میں کسی اور صحبت میں ان بزرگ سے سنی گئی ہوں، بہر حال جو توضیحات
و تشریحات ان بزرگ کی طرف منسوب کر کے یہاں لکھی گئی ہیں اس کا اطمینان ہے کہ منسوب باتیں انہی کی ہیں۔

تصرف کے اعمال و اشغال کے متعلق جس ذاتی تجربہ کا ارادہ کیا تھا، انفس ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا ابالی کی وجہ سے، اور کچھ اپنے دانشور
کوشش کی وجہ سے اور خاص نوعیت کے سہل سے کماحقہ وہ تجربہ تو نہیں کیا جاسکا، تاہم جو کچھ پھر انوارِ ابدی کے نام سے متعلق اس سلسلہ سے اس
کے اشغال سے ان چند سالوں میں رہا اسکی وجہ سے اس راہ کے بعض اکابر سے جو قرب حاصل رہا، اور ان کے احوال اور ماحول کو قریب سے

اطالعہ کرنے کا جو موقع ملا اس سے چند یقین حاصل ہوئے، جن میں سے بعض تقوف کے مخالفین اور مخبرین کی خدمت میں عرض کرنے کے قابل ہیں اور بعض خود اہل تقوف کی خدمت میں پیش کرنے فرمادی ہیں۔ خدا انکی بات یہ ہے کہ عزیز "تقوف" اپنے منکود اور مخالفوں کا تو غلام ہے ہی، لیکن جو اس کے حامل اور علمبردار ہیں، کچھ ان کی بعض چیزیں بھی اس مظلومیٹ کا باعث بن رہی ہیں۔

آج آنے والی بربادوں اور ہلاکتوں سے نکلنے کے لئے تم بے قرار ہو، اور اس کے لئے طرح طرح کی تدبیروں کو سوچتے ہو اور ٹھونڈتے ہو لیکن یہ کیا برہنہ ہے کہ ایک لمحہ اور ایک دقیقہ کے لئے بھی تمہارے دل میں یرشیاں نہیں گذرنا کہ سب سے پہلے اس کو تو اپنے سے راضی کر لیں، جس کے دروازے سے بھاگ کر ساری دنیا میں ہم نے ذلتوں اور نامرادیوں کی ٹھوکریں کھائیں، حالانکہ وہ کہہ چکا ہے اور کہہ رہا ہے:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا
اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا يُ
يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَ
يَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ (۲۸: ۸)

اے مسلمانو! اگر تم اللہ سے ڈرو اور اس کے حکموں کے لگے جھک جاؤ تو پھر تمہیں کسی چیز کیلئے بھی کسی دوسری تدبیر کرنے کی احتیاج باقی نہیں رہے گی وہ دنیا میں تمہارے لئے عزت و اقبال کا ایک شرف و امتیاز پیدا کرے گا اور تمہاری تمام گرامیوں کو معاف کر دے گا وہ تو سب زیادہ بخشنے والا اور صاحب رحم و الطاف ہے۔

پھر اگر اٹھنا ہے تو اٹھ کھڑے ہو کیونکہ چلنے کا وقت یہی ہے اور اس کے بعد موت کے سوا کچھ نہیں۔ آج تم کو کوئی آنجنم، کوئی جمع شدہ دولت اور روپیہ کی مقدار، کوئی پولیٹیکل سرگرمی اور کوئی انسانوں اور ممبروں کے اجتماع محض کا ایک جھٹکا، آنے والے مصائب سے بچا نہیں سکتا، جب تک کہ خود تمہارے اندر کوئی انقلابی تبدیلی نہ ہو، اور جب تک کہ تم اپنے خدا سے اس کی راہ اور اس کی مرضات کی راہ میں اپنے تئیں دے ڈالنے کا عملی عہد نہ باندھ لو، اور اسی کے بتلائے ہوئے طریقہ، اور اسی کے حکم و ایمان کے ماتحت ہو کر اس کے نہ ہو جاؤ۔

ابوالکلام آزاد

تصوف اور اسکے اعمال و اشغال کے متعلق

چند یقینے

(۱) تصوف کا مقصد اور اس کی حقیقت

اور ملاکات کی تفصیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے جن کو کتاب و سنت ہی میں کمال ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے، چونکہ اس بارہ میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں۔ اس لئے ہر کچھ اس سلسلہ میں تفسیر کے لئے عقائد اور اعمال کی تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔ واللہ التوفیق، قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے مثلاً محبت کے بارے میں سورۃ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے:-

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ

(سورۃ بقرہ - ۲۰-۲۱)

اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت

اللہ سے ہوتی ہے۔

۴

اور حدیث صحیح میں ہے:-

(یعنی ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں، ان میں سے اول یہ کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو، اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اس کے لئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا)

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَرُحِّلَتْ ثِيَابُهُمْ وَقِيلَ لَهُمْ قُمْ وَادْعَ إِلَى سَبِيلِ اللَّهِ قَالُوا لَا تَنْفِرْ فِئْتَانٍ يَدْعَانِ إِلَى سَبِيلِ اللَّهِ وَالْأُخْرَى كَافَّةً أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَدْعُونَ إِلَى سَبِيلِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِمْ

سُورَةُ الْأَنْفَالِ: ۷۲-۷۴

پتہ ایمان والے ہیں وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو، اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے نور ایمان میں زیادتی ہو، اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔

اور سورۃ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:-

إِنَّ الْأَبْنَاءَ لَیْسَ لَهُمْ حَسِبَةٌ رَبِّهِمْ شَاقَّةٌ وَلَا أُنثَىٰ ۚ وَلِأُولَٰئِكَ أَجْرُ اللَّهِ الَّذِیْ لَا یُغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُمْ وَلَا أَزْوَاجُهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَتَزَاوَنَتْ أَعْيُنُهُمْ لِحُضُورِهِمْ رَبِّهِمْ وَأَطَاعُوا أَمْرًا تَحْتِیًّا ۚ أُولَٰئِكَ لَیْسَ لَهُمْ خَوْفٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کی عبادت سے خوف زدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کہتے ہیں، اور جن کا حال

وَالَّذِينَ يَبُذُّونَ مَا آتَوْا: وَتَلْبُسُهُمْ
وَجِلَّةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ سَبِيلِهِمْ رَاجِعُونَ
أُولَٰئِكَ يُكَايَرُ عَنْهُ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ
لَسَاءَ سَاقِيُونَ
الْمُؤْمِنُونَ ع-۴

کہ اللہ کی راہ میں اور نبی کے کاموں میں اپنا مال حسنہ بن کرتے
وقت اور اسی طرح دوسرے نیک اعمال کرتے وقت ان کے دل
خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جائے (منظوم)
ان کے یہ عمل وہاں قبول ہوں یا نہ ہوں ادھی لوگ بھلائی کی طرف
تیز گامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لئے دوزخ بڑھنے والے ہیں۔

اور سورہ نرم میں قرآن مجید کے بارہ میں ارشاد فرمایا گیا، کہ :-
تَقَشِّعُوا مِنْهُ جُلُودَ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ
رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلْبِثُنَّ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ
إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ د

اس سے ان لوگوں کے بدن کا پھینک دیتے ہیں اور روگٹے
کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کا ظاہر و باطن
نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف منجھک جاتا ہے۔

اور سورہ آل عمران میں ارشاد ہے :-
الَّذِينَ يَنبَغِ كُرْهُنَ اللَّهُ قِيَامًا وَفَعُولًا
وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
إِنْ عَمِلُوا:

وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو اہر وقت اور ہر حالت
میں یاد کرتے، اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے، بیٹھے اور بستر میں پڑے بیٹھے
ہوئے بھی۔

اور سورہ نزل میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے۔
وَأَذْكُرْهُمْ سَمِيعًا وَتَبْتَئِلُ رَأْسَهُ
تَبْتِئِلُهُ

اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے بھوکے ہو کر
اسی کی طرف متوجہ رہو۔

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہل ایمان کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں :-
(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

(۲) ان کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

(۳) ان کے سامنے جب آیات الہی کی تلاوت کی جائے تو ان کے فورا ایمان میں اضافہ ہو۔

(۴) اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا سہارا ہو۔

(۵) وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوف زدہ رہنے ہوں۔

(۶) اللہ کا خوف ان پر اتنا غالب ہو کہ کسی کرتے وقت بھی وہ ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت یا اس کی آیتیں سننے سے ان کے جسم کا نپ جاتے ہوں۔ اور ان کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی یاد

کی طرف منجھک جاتا ہو۔

(۸) ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں، اور کہہ سکیں میں ہی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم کے احوال اور کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَيْضًا لِلَّهِ
وَأَخْضَلَ لِلَّهِ وَمَنْعَ لِلَّهِ فَقَدْ
اسْتَكْمَلَ إِيمَانَهُ

مشکوٰۃ شریف

جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لئے محبت کرے (جس سے محبت رکھے اور اللہ کے لئے ہی بغض رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لئے دے (جس کو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی رضا کے لئے ہی ہاتھ روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے اور اس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔

اسی طرح مشہور حدیث تبرک میں ایمان اور اسلام کی پہلی کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے:

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ تَوَّابًا لِّمَا تَعْبُدُهُ
يُؤَاكِلُ (بخاری ومسلم) وَفِي تَوْبَتِهِ أَنْ تُخْشِيَ اللَّهَ
مَكَانَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ: (فتح الباری)

پہلی حدیث میں "اعمال" کا ذکر ہے، اور دوسری حدیث میں "احسان" کا، اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان پُر ہو جاتا ہے۔

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ سے کہیں فرماتے تھے: — اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں اس عاجز کے نزدیک خاصی طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْ مُحِبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي وَآهْلِي
وَمِنْ النَّسَاءِ الْبَارِدِ

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور دوسرے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کرے کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کہیں جائیں اور جب تو دنیا والوں کو ان کی چاہتی دنیا دے کے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کرے اور اپنی عبادت کے ذریعہ

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور دوسرے کے قابل ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کرے کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کہیں جائیں اور جب تو دنیا والوں کو ان کی چاہتی دنیا دے کے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کرے اور اپنی عبادت کے ذریعہ

اللَّهُمَّ اجْعَلْ مُحِبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي وَآهْلِي
وَمِنْ النَّسَاءِ الْبَارِدِ

میرے دل میں کون اور کون سا پیداکر۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي أَحْسَنَ كَرَامِي أَرَاكَ أَبَدًا
حَتَّى الْقَالِ: الخ

اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گیا
ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں، یہاں تک کہ اسی حال میں تجھ سے جا بول

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيْمَانًا يَبْشُرُ
قَلْبِي إِيْمَانًا صَادِقًا حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا
يُضَيِّبُنِي إِلَّا مَا كَتَبْتَ لِي وَرِضًا مِنْ لِقَائِكَ
بِمَا قَسَمْتَ لِي۔

اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں
چوست ہو جائے اور وہ ایمان ہو جس کے بعد میرے دل
کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ تجھ پر صرف یہی حالت
آسکھی ہے اور آجی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے
دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے
لئے مقرر اور مقرر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ التَّوْفِيقَ لِحَسَابِكَ مِنْ
الْعَمَلِ وَصِدْقَ التَّوَكُّلِ عَلَيْكَ وَحُسْنَ
ظَنِّكَ۔

اے اللہ! جو اعمال تجھے پسند ہیں میں ان کی توفیق تجھ سے
مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ
خُسن کی تجھ سے ہی استعا کرتا ہوں۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ
مُطْمَئِنَّةً قَوْمٍ بِإِقْلَافِكَ وَتَرْضَى
بِقَضَائِكَ وَتَنْتَعُ بِعِطَائِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسے تجھ ہی سے
ایمان اور اُس معاملہ میں جو مجھے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین
نصیب ہو جو تیری رضا و تیرے برائی اور تیرے دن پر قانع ہو

اللَّهُمَّ افْتَحْ لِي مَسَامِعَ قَلْبِي لِذِكْرِكَ

اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لئے کھول لے۔

اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ قُلُوبًا أَوْهَةً مَخْبِيَةً
مُيَبِّهَةً فِي سَبِيلِكَ

اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو نرم
اور دروشتا ہوں، ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے
والے ہوں۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْ وَسَائِرَ قَلْبِي خَشْيَتَكَ وَذِكْرَكَ

اے اللہ! میرے دل میں خضوع اور خیالات بھی بس تیرے

وَأَجْعَلْ هَمَّتِي وَهَوَايَ ذِمَّتًا حَبِيبًا وَ
خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہش ان
کی طرف ہو جائے محبوب ہوں اور جن سے تو رہائی ہو۔

اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا...
اے اللہ! میرے قلب میں نور ہووے اور مجھے نور عطا فرمائے
وَأَعْظِنِي نُورًا... اور مجھے سراپا نور بنادے۔

یہ سب دعائیں اور اس قسم کی اور بھی بیسیوں دعائیں (کتب حدیث شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اسے مروی ہیں آپ
ﷺ دیکھیں ان شاء اللہ تعالیٰ ہے۔ اچھے تھے اور اُمت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعائیں دیکھیں یہ چیزیں کہ مال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں مثلاً ہر چیز سے
اللہ تعالیٰ محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ کا خوف، اللہ سے شوق و ملاقات کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات کو فراموش کر لینا کہ
ہو جائیں، عبارت میں آنکھوں میں ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے
سنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضاء، توکل علی اللہ، بھروسہ نفس باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن ہونا اور مائوس ہونا، اور اُس کی عطا پر قانع ہونا، ذکر
تعالیٰ سے قلب پر اثر لینا، اُس کا درد سنا اور ڈرنا اور اوروں کا اُٹھنا ہونا۔ اللہ تعالیٰ سے قلب کا تعلق اُس درجہ ہو جانا کہ اللہ کی یاد اور اُس کا خوف
ماوس اور نظرات کی جگہ بھی لے لے، اور بندہ کاجی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں، نور سے قلب کا موعر ہو جانا۔
ظاہر ہیں، ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے، نہ اعمال کے باب سے، بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان
اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تقویٰ حاصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہیں اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور کثرت ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے
ہو اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں ایسی تدبیریں جن کا ترجمہ تصدیق کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والوں کے لئے ان کی
سیاقی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غائبانہ نظرین کے لئے مفید ہوگا کہ مذہب بالآیات و احادیث و دعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا
نی معلوم ہو چکا ہے ان میں سے چند مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور روزگداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر ان کے نتائج اور
اثر ہیں اس لئے تقویٰ کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہ راست صحت ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،
س کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ ہے وہ عقلی نظریہ جس پر تقویٰ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر اس کو دین کا مکمل شعبہ سمجھا جاتا ہے۔

لے عقلی توجیہ کے لئے مراد مستقیم (ترجمہ شاہ اسماعیل شہید) کے چند ابتدائی اوراق کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں کافی ہوگا۔

یہ عاجز بلا کسی انکار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لاپرواہی پان اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلے کے تجربے کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا، اس لئے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور پرانے نام تو حہ کی جاسکی اور اس رائے بعض اکابر کی خدمت میں کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلہ میں ملتی رہی، اسی سے کچھ لہر یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تقصوت اور اس کے اعمال و اشغال کی غرض و غایت اور ان کی حقیقت کے متعلق ان بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

(۱) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تقصوت کے ذریعے جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی صلاحات کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۲) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تقصوت ایمان و اسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی روح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر تقصوت اور طہیجیت کو مناسب ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت و عزیمت، ہمسرت و توکل اور ماسویٰ اللہ تعالیٰ سے بے خوفی جیسے اوصاف و رجحانات کا سر شہ پر تقصوت کے ذریعہ ان کو پیدا کیا جاسکتا ہے اور ابھارا جاسکتا ہے، اسی لئے تقصوت کو پانے کی سب سے زیادہ ضرورت اور اس سے فائدہ اٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقہ پر کسی بڑے اسلامی تہذیب یا طبعی مصروف جدوجہد ہوں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہوں۔

(۳) تقصوت سے دوری اور بے تجربی کے دور میں میری یہ رائے بھی درست تقصوت کا طالب ہم کو بدلتا دینا چاہیے، لیکن بعینہ جب تقصوت اور اس کے عاملین سے کچھ قریب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیلی کا عمل برابر جاری ہے، اور خود ہماری اس صدی میں حضرت مولانا رشید احمد گنجی اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی وغیرہ نے اپنے تجربے اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ ترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور مائتلف کر دیا ہے اور اب یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ ملک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہیے، لیکن اب اس کا پورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس نمند کے شاد ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے ایسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اس کے ساتھ ان کا گہرا علمی تعلق رہا ہے، تو اس کا بڑا امکان ہے کہ انہیں اس خدمت کے باوجود تقصوت میں ان کی اصلاح و ترمیم خدا نخواستہ اس قسم کی پوچھیں کسی روایتی بڑھیا نے شاہی بازی مرمت کی تھی۔

(۴) تقصوت اور اہل تقصوت سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین حاصل ہوا ان میں سے ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیا ہی ذہین فطین ہو، تقصوت سے صحیح واقفیت حاصل کرنے کیلئے اور اس کے مآل و مصلحت کو عملی انداز بصیرت جاننے کے لئے اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تقصوت کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزرے اور اس شعر کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ بزرگ کے کچھ دن صرف کرے اور اس کے بغیر تقصوت کو پوری طرح سمجھا اور جاننا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ صاحب ارشاد بزرگ کی مٹافقہ میں اپنی حاضری کا ذکر گذشتہ صفحات میں قائم سطر لکھا ہے، ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا، کہ: ”گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

الغرض مختصر سے ہے ہی تجربے سے اور اہل تقصوت و ملوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہو گئی، کہ من لم یدرک فیہ لہ یدرک، یعنی لذت میں نہ شناسی نہ تامل نہ پیشی، کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے ذہنی علم اور ذہین صاحب قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس میں

انہوں نے تصوف پر اعلیٰ درجہ خیال فرمایا تھا، کم از کم پیچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا زمین پر کبھی ایسے موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہے جس کے بارے میں بھی دقتیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اس کی ذہانت قابلِ داد ہے۔

(۶) تصوف اور اس کے بعض حلقوں کے اس چند درجہ قرب و تعلق سے بھی یہ اندازہ ہوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد دنیا فرامانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں مثلاً دیکھا جا رہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علمی ہذا دین کی دعوت و خدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں، بالکل یہی بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور اہتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوف) کا بھی ہے۔ اس وقت اُن خائفانوں سے بحث نہیں جو راصل دھوکہ فریب کی دکانیں ہیں اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کا کاہنہ پارتی ہے، اور نہ یہاں اُن نااہل مودنی سجادہ نشینوں اور پیشہ ویروں، صوفیوں کا ذکر ہے جو تصوف کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحب ارشاد دین اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر آتے ہیں، دیکھا جاتا ہے کہ ارشاد نادر شاہوں کو مستثنیٰ کر کے اول درجہ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً پستی ہی سطح کے ہوتے ہیں، اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن ظاہر باطل ہو کر وہ بیچارے خائفانہ سیٹ کی بدنامی اور تصوف و روحانیت میں زاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ اور افادیت تسلیم کرنے لوگوں کو مجبور کر دے۔

اصولی بات یہ ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بعد اور لطیف و نازک ہو اُس کے کرنے والے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں تصوف کی ناکامی اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ توجہ نہیں دیتے جو بیچارے توجہ کرتے ہیں عموماً اُن کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دنیا ان ہی کو بھل کر اہل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز ضرور متذکر کر کے غفلت عرض کرنا ضروری ہے۔

جس طرح دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہر فن انجینئر ہو وہ اچھا ایب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور کندہ پایہ محنت یا فقیہ ہو وہ تصوف میں بھی خاص متکلف رکھتا ہو، یا جو صاحب قلم صوفی اور عارف ہو وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور زہد حاضر کے اہم مسائل کے بارے میں دینی نقطہ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی چند رائے و بصیرت بھی رکھتا ہو۔ بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں پہلے بھی اکثر ایسا ہی ہوا ہے، اور ہمارے اس زمانہ میں تقریباً ۹۵، ۹۰ فی صد ایسا ہی ہے، کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے اس لئے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس اور محروم ہی رہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو اُن کے مختلف و منفرد معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکتل ہو۔

یاد آتا ہے راقم منظر نے اپنے ایک دوست سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفع عرض کیا تھا:-

آپ ماضی اور حال کے ایسے متعدد حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کے کوئی اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص و احسان اور اول و سلم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کا علم و فکر اور ان کی خدا زاد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابلِ استفادہ ہے اور

حسب سبب ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور ان لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اس لئے
 ان کی غلطی اور تہمتیں کر ششوں سے فائدہ نہیں اٹھاتے کہ وہ ان کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ
 اور معنی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کے کچھ بندوں کو الباپاتے ہیں کہ انہوں نے
 اپنی زندگی میں تقصوت اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اور کسی شیخ کمال کی رہنمائی اور نگاہی میں اپنے وقت اور اپنی
 قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لئے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا
 مقام حاصل ہو گیا، لیکن کسی دوسرے شعبے میں شفا علم وغیرہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی
 حاصل نہیں ہے، اور اس لئے دین کی بعض ضرورتوں کو ہم جہت اہم سمجھتے ہیں وہ اچھی طرح محسوس بھی
 نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا
 غور و تہم کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں، تو ان کاموں کو
 دیکھ کر ان کے اس کمال کی بھی نفی کرنا جو واقع میں ان کو حاصل ہے اور اپنی امتیاز کے باوجود اس شعبہ میں بھی
 ان سے ہمارا استفادہ کرنا ان ہی لوگوں جیسی عامیاد غلطی ہے جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کا
 مریض سمجھا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جی تو پتا بھی ہی چاہتا ہے، اور ہر اچھا بھلا آدمی ہی چاہے گا کہ جو شیخ خاتقاہ اور عارف حق اسکا ہودہ بلند یا یہ مفسرہ
 حقیقت اور بالغ النظر فقیر و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی تسک کی قیادت اور امامت گہری کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہو
 اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالم دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ امت کی قیادت اور حکمرانی کے فرائض
 کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید برآں اپنے قلب باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جلیقہ و بازیگر بھی ہو۔ لیکن یہ صرف ہر
 جی کی چاہش اور ایک خوش گوار آرزو ہوئی۔ اور یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تئوں کی دنیا نہیں ہے، بلکہ مطابق
 واقعات کی دنیا ہے اور علی آدمی کو اپنا طرز عمل و واقعات ہی کی اس دنیا کو سامنے رکھ کر معین کرنا چاہیئے۔
 جن صاحب خاتقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر درقمسطور نے گذشتہ صفحہ میں کیا ہے ان ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکایت
 ارشاد فرماتا ہے:-

”یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لئے جو سودا
 جس دکان پر چاہئے اس کیلئے آدمی کو اسی دکان پر جانا چاہیئے۔“

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اس میں رقم کا ذکر نہ تھے تقصوت کے مخلص تلقین اور معنوں کی طرف تھا، اب اپنے تجربے ہی کے چند نتیجے اور
 تاثرات تقصوت کے عالموں اور حامیوں سے بھی عرض کرتے ہیں۔

(۸) تقصوت کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ خود اپنے کو محمد اللہ اس میں شک نہیں رہا ہے کہ اصیبت اور
 لیکن بعض مشابیح حق اور ان کی خاتقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارہ
 صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، مثلاً تقصوت کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے جو کچھ نہیں ہے

بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں، خانقاہی حلقوں میں کبھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو ان اعمال و اشغال پر کوئی ناسل سلوک کچھ نہیں آتا، ان اعمال و اشغال اور ادکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ متحقق یہ فرماتے ہیں، کہ:-

”ان کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ ایک طرح کے ”ادھام و خیالات“ ہیں۔“

تقوٰف کے ہمارے حلقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی طلب میں لکھے ہوئے ملتے ہیں، اسی طرح ادب بھی بہت ہی قابل اور گنجین ہیں جن میں خانقاہی طالبین بجز متبتکاپین غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ بڑے اہم درجہ کی ضرورت ہے، اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک و طریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گزریوں نے جگہ پائی ہے وہ بعض ایسے بزرگوں کی اس قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے جو خود پہلے سے نزدیک ان گزریہوں میں مبتلا نہ تھے۔ تقوٰف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکتے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ کھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑے آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہیں، بہر حال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں ہونی چاہیے اور اداہان و خیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہئے۔

(۹) ائمہ تقوٰف امام ربانی اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی فصیح اور بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا چاہیے اور اس کوشش کے فرائض ہیں گردانہ ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اس کو اس طرف متوجہ کرے پس بعض مشائخ کے یہاں اس ذمہ داری کے احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی بہت سے بیچارے میدھے سادے ایسے بندے بھی ان کی خدمت میں بیعت کے لئے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں معلوم نہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئیں، اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو کبھی نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا، لیکن کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو کبھی مشائخ کے عام طریقے پر بخند یا ایمان اور توبہ کرا کے بس بیعت کر لیا گیا اور پھٹنے کے لئے کوئی تسبیح اُن کو بتادی گئی اور بقدر ضرورت دین کچھ کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا، حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی ان کے پاس آئیں، اُن کو دو چار دن کے لئے اُن کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تفصیل وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کر دی جائے، جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنے والوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی باقیات نہیں کہ ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مہذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شاہین شان نہیں بلکہ دماغ و کلکہ مستول کن رعیت ہے۔

(۱۰) تقوٰف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے اُن سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کسی کسی گرامیاں آمنت میں داخل ہوئی ہیں اور آج بھی اپنے تقوٰف و صوفیہ کی طرف منسوب کرنے والے حلقوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تقورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کے گرامیاں زیادہ بزرگوں کے ساتھ معتدیت اور غرض اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت و سنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخ حق کا خاص خاص الامس فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق و محبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط

نی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہیے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابیؓ کی زبان سے نکل گیا "ماشاء اللہ وشکنا" (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا:-

جعلنی للہ نذرا لعل ماشاء اللہ وحذرا۔

تو نے مجھے اللہ کے برابر بنا دیا، بلکہ یہ کہہ کر جو تمنا خدا چاہے۔

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہؓ کو تنبیہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:-

لَا يَتَّبِعُوهُ يَنْكُمُ الشَّيْطَانُ اَنَا مُحَمَّدٌ

لوگو! تمہیں شیطان گواہ نہ کرے اور تم اس کے بہکائے بہک نہ

بن عبد اللہ عبد اللہ ورسولہ صاحب

جاء، میں عبد اللہ کا بیٹا مسند ہوں۔ اللہ کا بندہ اور بس اس کا رسول

آن ترعونی فوق منزلتی السی انزلنی اللہ

ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے اوپر اٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے

رکھا ہے۔

اس بارہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر ثقی باریک میں تھی اور آپؐ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو صحاح میں مروی ہے، کہ جس روز آپؐ کے صاحبزادے "ابراہیم" علیہ السلام کی وفات ہوئی، اتفاق سے اُسی روز سورج کو گہن لگ گیا اور آپؐ کو شہ پہا کہ لوگ کہیں اس غلط خیالی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سورج کو یہ گہن میت نبویؐ کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپؐ نے اُسی وقت اعلان کر کے لوگوں کو مسجد میں جمع کرایا اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد اعلان فرمایا:-

آن الشمس والقمر ایقان من آیت اللہ

چاند اور سورج اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے دو نشان

لَا یَنکسفان لموت احد ولا لحیاتہ الخ

میں کسی کی موت و حیات سے ان کو گہن نہیں لگتا (بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے

حساب کے مطابق اور اس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے)

اور چونکہ امت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جس کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے لہذا چاہیے۔
نہ ان کے ان حضرات کا یہ خاص انخاص فریضہ ہے کہ اس بارہ میں اپنی ذمہ داری اور مسئولیت ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

تصوف اور اُسکے اعمال و اشغال کے متعلق

بعض شبہات

”یہاں تک جو لکھا گیا جب ’’افغان‘‘ کے صفحات میں یہ شائع ہوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات اس سلسلہ میں کئے گئے، اور الفرقان ہی میں اس عاجز نے اُن کے جوابات دیئے، مگر سب معلوم ہوتا ہے کہ اُن جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنادیا جائے۔“ (مؤلف)

۱۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

”تصوف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر واقعہً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال و اشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سچ نہیں آتی کہ کوئی شیخِ دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان و اسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُمت کو اُس کی تعلیم نہ دی ہو۔“

معلوم ہوتا ہے ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا، میں نے جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس کا حاصل ہی یہ ہے کہ آپ کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت و مشیت اور یقین و استحضار اور اخلاص و احسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا اور اس کی ترویج میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی تعلیم و ترویج بھی دی ہے، کتاب و سنت کے جو تفصیل اس سلسلہ میں پہلے لکھے جا چکے ہیں وہ اس کے ثبوت کے لئے کافی سے زائد ہیں، رہے اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً اذکار و مراقبات وغیرہ) تو میں ہر صراحت لکھ چکا ہوں، مگر یہ اُس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبوی طریقِ تعلیم اور اصولِ تشریح کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تفسیر اور تعین نہ کی جائے تاکہ ہر زمانے کے اُمت کے مطابق ہو جائے اور ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں انہیں اختیار کیا جاسکے اور اس میں تصوف کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔ غور فرمایا جائے دین کا میکنا نہ کھانا دین کے بنیادی فرائض میں ہے، لیکن کتاب و سنت میں اس کے طریقے طے ہیں۔

کی بھی کوئی تعین نہیں کی گئی۔ اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق بھی نہیں جس قدر کہ تم اس کے لئے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہدِ صدیقی میں پیامبر کی جنگ میں چار سو حافظ قرآن صحابہ شہید ہو گئے تب

سے پہلے حضرت عسکری (رضی اللہ عنہ) کو یہ خیال ہوا کہ مسلمانوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو معنیوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہیے۔ اور اس سلسلہ میں خالص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری شخص بھی تیار ہونا چاہیے، چنانچہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے سامنے پیش کی، حضرت صدیق (رضی اللہ عنہ) کو ابتداً اس کے ماننے میں تاہل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا، کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا، اس کا ہم کیوں لگا سکیں، لیکن حضرت عمرؓ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر انہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کی قلمی حاشیائی میں یہ کام انجام پایا۔ ————— پھر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے اس سلسلے میں ایک اور قدم اٹھایا، کہ اپنے خالص اہتمام سے اور اپنی عمرانی میں اس مصنف کی نقلیں کر کر تمام بلاد اسلامیہ میں روانہ کیں اور اس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت و تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلے میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔

پھر یہ بے خیال کہ جو چیزیں میں اہم ہوں، اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح اور یقین بھی کتاب و سنت میں ہونی چاہیے اور امت کی قیامت نامہ کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور یقین کے ساتھ کتاب و سنت میں ملنی چاہئیں، بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریق تعلیم اور اصول تشریح سے ناواقف کا نتیجہ ہے۔

۲۔ ایک صاحب نے دریافت کیا، کہ:-

اللہم کی محبت و خشیت اور اخلاص و احسان وغیرہ ایمانی کیفیت پیدا کرنے کے لئے تشریف میں جن اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور اذکار و مراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب و سنت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے، کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگر جو واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک محبت اور ذکر و فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب و سنت سے اشارہ ہی نہیں بلکہ صراحتہ بھی معلوم اور ثابت ہے۔ لیکن اگر بالفرض کتاب و سنت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہ ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب سلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے لاکھوں صحابہ بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمال صالحہ سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادت کو ہمیں مان لینا چاہیے۔

سلفہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت خطلہ مہملیؓ اور حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ عنہما) اپنا حال یہ پالتے تھے کہ جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور محاسن میں رہتے ہیں کہ یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمبے کے لئے غفلت نہ ہوتی اور غیب گویا شور مچاتا، لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے تو یہ کیفیت نہ ہوتی۔ ————— اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جڑا دیئے تھے کہ آپ ہمیں قلوب بدلے ہوئے نظر فرمائیں، یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نامہ سے عالم برزخ میں منتقل ہو جائے سے ہمارے قلوب کی حالت میں مومن بہرہ حق پڑا۔ ان دونوں روایتوں سے محبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر و فکر کے لئے قرآن مجید کی آیت ”وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ“ صریح شاہد ہے، جس مباحث میں یہ آیت وارد ہے اس پر غور فرمایا جائے، (اور مستحکم و مراقبہ بھی ذکر ہی کی ایک غصہ اور زیادہ گہری شکل ہے۔)

میرے جن دوست نے یہ سوال کیلئے وہ "صالح لٹریچر" کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں دیکھیں اس سے انکار نہیں ہے لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ ان کے "صالح لٹریچر" کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب و سنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ ان کے دل میں کبھی یہ سوال پیدا نہ ہو گا کیونکہ وہ اپنے ذاتی علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارہ میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی چیزوں اور اپنے تجربوں کے ساتھ تو ہمارا اہل عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادی، مری تقی، شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ بہاء الدین نیرودی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، مینا احمد شہید جیسے ہزاروں بندگان خدا کا اجماعی اور اتفاقی تجربہ بھی ہمارے لئے موجب اطمینان نہیں۔

۳۔ ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبی انقباض ظاہر کیا ہے، اور یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ۔

"اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر پیغمبر حضرت اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں"

جہری اور ضربی ذکر سے طبی انقباض تو ایک ذوق اور طبی چیز ہے، اس لئے اس کے بارہ میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور ان کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں جنہیں جہری اور ضربی ذکر ہی سے انس اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسی لئے شارح محققین طبیعتوں کے رخ اور ان کی منافستوں کو دیکھ کر جہری یا ضربی ذکر یا دوسرے اشغال ان کے لئے تجویز کرتے ہیں لیکن ذکر بالجہر کے بارہ میں ریاکاری کا جو ظہر ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچے سمجھے بات ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ بھول انہیں صاحب کے پیغمبر آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں اپنا اندازہ ہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرنا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے بلکہ بہت سے آدمی اس کو کم عقل یا مکار اور گویا گار بھتے ہیں پس ایسی حالت جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے، بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریاختی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور وہ خطرہ و وسوسہ میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہل تجربہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابل ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں، فنی طلب اور علم النفس کی روشنی میں انہی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھیں آجاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق ہی سمجھتا۔ کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے امدید پیدا کرنے کے لئے سب ایک طرح کی طبی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

۴۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ۔

"تم نے اپنے مقابلہ میں مقامات اور لطائف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی حالانکہ یہ تصوف کے وہ عناصر ہیں جنہیں مجھے سمجھائے بغیر تصوف کو نہیں سمجھا جاسکتا"

جواباً گزارش ہے کہ اس عاجز کے نزدیک لطائف و مقامات کو کوئی مفہم ہی اہمیت حاصل نہیں اور اس راہ کے جن بزرگوں کی روشنی میں حاضری اور ان کے ارشادات سننے کی سعادت رقم کو نصیب ہوئی تری ہے ان سب سے بھی ہمیشہ ہی اس کے یہ لطائف وغیرہ راستہ چلنے کے اپنے محسوسات اور ملاحظات ہیں۔ نہ یہ خود مقصود کے لئے ذریعہ، اور اس لئے اس کا اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے، بلکہ اصل مقصد ہے

مضر نہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ان چیزوں میں ہر راہ پر کا اور اک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے مناسک اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تقویٰ جو اصل مقصد ہے وہ ان کو فیصلہ تعالیٰ نصیب ہو جاتا ہے اور آخر تک انہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی اور اک اور احساس نہیں ہوتا۔

اگر عاقل کو اس دور کے جن اکابر سلوک سے شرفِ نیاز حاصل ہوا، ان سب کو اس بات پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانہ کے لئے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے اور محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرامؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

۵۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ :-

”ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہتے اور ذکر شغل کرنے کے باوجود ان میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لئے تقویٰ اور اخلاقیات کی ضرورت بتلائی جاتی ہے“

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی و اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دینے کا ایک دم ختم کر دینا صحیح طرز عمل ہو سکتا ہے صحیح طریق کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے، اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھانہ دیکھا جائے لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اس کو سرے سے ختم کر لینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور منہاں مارہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے ان میں دس پانچ فی صدی کا مینیابی بھی ہرگز ناکامی نہیں ہے۔

ایک صاحب نے فرمایا کہ :-

”مؤمنین کے طرزِ عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ تقویٰ دراصل رہبانیت اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اس کی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے“

میسرے نزدیک یہ بھی ان ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی بات کرتے ہیں دراصل خود ان کے دل میں تقویٰ کے غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی غلط فہمی کی بنا پر صوفی صرف ان ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند ہیں اور گوشہ گیر ہیں، اور پھر اپنے اسی تصور کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ تقویٰ رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی زاہب ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تقویٰ کے لئے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے تو اس دور میں بھی ایسے بہت سے بندگانِ خدا دیکھ سکتے تھے جو مجددِ ملت تھے صوفی بھی ہیں اور مردِ میدان بھی، گریات دہی نہ کر جو گوشہ گیر نہ ہو، پھر اے اپنی کم لگاہی سے اس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے۔ ان کا علاج تو خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔

مقالہ کے ابتدائی حصے میں جن بزرگ کی خدمت میں حاضری اور تصوف کے متعلق ان بزرگ سے اپنی گفتگو کا اس عاجز نے ذکر کیا ہے، بعض حضرات کا شدید اصرار ہے کہ ان کا ہم گرامی ظاہر کیا جائے، اس لئے عرض کرتا ہوں کہ میرے ذہن اور مخدوم بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب راہبوری مدظلہ ہیں۔

آخری بات:

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ مایہ ناز اس تصوف کا قابل اور حامی ہے جس کا ذکر اس مقالہ میں کیا گیا ہے، اور یہی اہل حق کا تصوف ہے، باقی اس نام سے کتنے گھوڑوں خلفاء ہوں میں شرک و بدعت کا جو کاروبار ہوتا ہے، اللہ نے اپنے جس بندے کو بھی ایسا بیصیرت کا کوئی ذرہ نصیب فرمایا ہو وہ یقیناً اُس سے بیزار ہوگا۔



”جو رب الارباب انسان کی غذا، جسمانی کا یہ سب کچھ سامان رکھتا ہے کیونکر ممکن ہے کہ اس کی روحانی غذا کا انتظام نہ کرے۔“

یہ روحانی غذا کیا ہے۔ یہ ہدایت و سعادت انسانی کی دعوت الہیہ ہے جس کے لئے فی الحقیقت روح انسانی بھوک پیاسی ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم حیوانی مدتوں کی بھوک اور پیاس کے بعد بے قرار و مضطرب ہو کر غذا کو پکارتا ہے اسی طرح حشرات کی شدت اور ہدایت کا فقدان بھی روح انسانی کو ایک محتوی جوع و عطش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنی زندگی کے لئے اپنی غذا کو دیوانہ وار پکارتے لگتی ہے۔ پس وقت آتا ہے کہ اس حکیم علی الاطلاق، اس فاطر الارض و السموات، اس مدبر الامر والاشیاء اور اس مسبب الاسباب حقیقی کی ربوبیت ظاہر ہوتی ہے جس نے انسان کی حیات جسمانی کے لئے تمام دنیا کو طرح طرح کے اعدیہ و ثمرات کی بخشش سے ایک نخلان کرم بنا دیا ہے۔ اس کا دست بخفی ہندائے روحانی کا بیج بوتا ہے۔ اور اپنی نشو و نما سے اسے بیکایک سرسبز و بالاقامت بنا دیتا ہے۔ پھر اس کی سعادت و ہدایت کی نعمتوں سے زمین کے بڑے بڑے شجر سے بھر جاتے ہیں۔ اور اس بخشش کی دعوت سے ارض الہی کو سچ اُٹھتی ہے۔ (الہلال، ۱۱۱، جنوری ۱۹۱۳ء)

باتیں اُن کی یاد رہیں گی

ایک دفعہ ان کے سامنے کسی نے خواجہ حافظ علی مغزل کے پیر چند اشعار پڑھے۔

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دل برمی داند نہ ہر کہ آئینہ ساز د سکندری داند
نہ ہر کہ طرف کلکچ تہاد تند نشست کلاہ داری و آئین سروری داند
ہزار نکتہ باریک تر ز موسیٰ این عیانت نہ ہر کہ سر بہ ترا شد قفسد ری داند
فرمایا کہ یہاں خواجہ حافظ زہ گئے اور عزیز بناری بہت آگے نکل گئے ہیں پھر عزیز کے حسب ذیل اشعار پڑھے۔
نہ ہر کہ طبل و علم ساخت سروری داند نہ ہر کہ تاخت بہ لشکر سکندری داند
خیال سایہ نشینان قدیار جداست و گر نہ ہر بحر سے سایہ گستری داند
عظمت و طبع رسا خدا داد است نہ ہر گیا ہے کہ روید صنوبری داند
زہر دمان و لب نکتہ و لب نشین نشود نہ ہر کہ خطبہ بخواند پیغمبری داند

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رانیوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ راقم کو بھی رفاقت کا شرف حاصل تھا۔ شیخ محمد اکرم ایم۔ اے کا ارمان پاک ”دیکھا۔ فرمایا ذرا شعرا کی فہرست پڑھو۔ راقم نے عزیز بناری کا نام پڑھا۔ تو کما اس کا منتخب کلام سنائیے! راقم نے عزیز کا سارا کلام جو ”ارمان پاک“ میں منتخب تھا سنایا۔ فرمایا اس شخص نے عزیز کے کلام کا انتخاب کرتے وقت حسب ذیل اشعار نظر انداز کر دیئے۔ اس نے چنداں انصاف نہیں کیا ہے۔ بہر حال اپنا اپنا ذوق ہے۔ پھر یہ اشعار فرمائیے۔

علامہ باوینی ہامادک سینہ پاک با
عزیز مشب گاہہ در بن میخانہ پروا دل

پھر عزیز کے لوہے مزار کے حسب ذیل اشعار سنائیے۔

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی داند
عزیز از پائے رہ پیابے سرگشتگی دیدم

یہ تو قلندر کی بات تھی۔ اب سالک کی سیئے یعنی نظام الدین ادویہ کی:
شرط امت کہ با ابر خدا دم نہ زنی کہیں نوع کشتی نہ تو سروری نہ زنی
گل را چہ مجال است کہ پز سد زلال از ہر چہ سازی و چو می شکنی

بیماریوں کے هجوم اور مصائب کی لینا میں اس کو انتقامت کے مقصدات میں ادنیٰ لغزش بھی رونما نہ ہوئی ہر مزاج پر سی کرنے والے کوئی پشانی سے الحمد للہ کہہ کر جواب دیتے فرماتے ہاں بھائی الحمد للہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ اس سے بڑھ کر حالت بھی تو ہو سکتی ہے۔ اور میں تو ادھر سے شرک کا تاقب ہی نہیں ہوں۔ کوئی اللہ تعالیٰ ہمارے دشمن یا شریک ہیں۔ جو ہمیں شر اور ایذا پہنچائیں اور تو غیر سی غیر ہے۔ وہ جو کچھ ہمارے لیے کئے ہیں بہتر ہوتا ہے اگرچہ وہ ہمارے فہم سے بالاتر کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد ایک مجذوب کا واقعہ ارشاد فرمایا کہ ان کی خدمت میں ایک رئیس حاضر ہوا اس نے عرض کیا۔ حضرت کچھ پریشانیوں ہیں۔ دعا کر و حضرت مجذوب نے فرمایا میں پریشانیوں کے خدا آپ کی بات نہیں مانتا یعنی جو کچھ آپ چاہتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتا تو آپ اس کی بات مان لیجئے۔ وہ اس کے زیادہ لائق ہے۔ پریشانیوں دور ہو جائیگی۔ مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ بھائی اس کے سوا چارہ نہیں الحمد للہ کہنے ہی میں غیر ہے۔ حضرت قلندر پانی پتی نے اس مسئلہ پر اعتراض کیا۔ تو حضرت نظام الدین ادا لیاہ نے کیا خوب جواب دیا۔

گمے راست کند اور صورت مردی و زنی گمے بشکند جامہ جاں را ز تنی
کس نیست کہ پر سدا ستادِ فغارا از بہر پہ سازی و چرا می شکنی

فرمایا۔ میری دوستی اور دشمنی ایک دفعہ ہوتی ہے۔ اگر ایک مرتبہ دوست سے گزند پہنچ جائے یا کوئی دوست بن کر مکاریوں اور فریب کاریوں کا ہدف بنائے تو عمر بھر اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا۔ چنانچہ رویم کہ دیگر بگرد مانی۔ یہ بلیغہ شرا بیہ کے شرکاء و دوسرا ہے ہے مکمل شعر یہ ہے۔

شدیم خاک رہت گر بہ درد مانی چنان رویم کہ دیگر بگرد مانی
کسی ایک اور محفل میں جب اپنے اس نظریہ کا اظہار فرمایا تو ارشاد ہوا۔

دل نیست کبوتر کہ پردیا ز نشیند از گوشہ بامی کہ پریدم پریدم
ما بخیر شاہ سلامت۔ بس اسے کراہ کئی سمجھے یا دشمنی۔ میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے آج تک نہ کسی کے متعلق برا سوچا ہے۔ اور نہ بڑا کیا ہے۔ اگر بڑا اور مرزائی کے سوا۔ جہاں تک بس چلا ان کے متعلق برا سوچا بھی اور کیا بھی "عمر بھر کبھی اعتماد نہیں کیا" اس فقرہ کو بڑے زوردار لہجے میں فرما رہے تھے۔ رافتم نے پیٹھ پر غرض سے کہا کہ کمال صند ہے فرمایا۔ ارے جاہل! ضد میں یہ ایمان ہے حدیث میں کیا پڑھا ہے؟

لا یلدغ المؤمن من جحرودا جدموتی۔ مومن ایک سوراخ سے دودھ ڈنگ نہیں کھاتا۔

فرمایا۔ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ میں کہاں سے کھاتا ہوں۔ ہائے اصرار کس وقت یاد آئے۔

میں رند باوہ کش بھی بے نیاز بام و راغ بھی
رگ بر تاک ساقی ہے کھنچ کر میری قسمت کی

میرا تو ہیشہ خدا کی ڈھیری پر ہاتھ رہا ہے۔ میرا رزق میرے پیچھے دوڑتا ہے۔ کبھی قبول کرتا ہوں کبھی روکتا ہوں۔ میں تو اپنے اللہ کا

ہوں۔ مجھے وہ صرف رزق دینا ہی نہیں بلکہ میری ٹھوڑی سے پکڑتا ہے۔ اور میرے منہ میں ڈالتا ہے۔
 مگس ہرگز نہ باشد عکبوت رزق را روزی رسال پر می دہد
 دنیا میں چاہتی چیزیں محبت کے قابل ہیں۔ مال۔ جان۔ آبرو۔ ایمان۔ لیکن جب جان پر کوئی مصیبت آئے تو مال قربان کرنا چاہیے۔
 اور آبرو پر کوئی آفت آئے تو مال و جان دونوں کو۔ اور اگر ایمان پر کوئی ابتلا آئے تو مال۔ جان آبرو سب کو قربان کرنا چاہیے اور اگر ان
 سب کے قربان کرنے سے ایمان محفوظ رہتا ہے۔ تو یہ سودا سستا ہے۔

فرمایا شریف کبھی بزدل نہیں ہوتا۔ کینہ کبھی بہادر نہیں ہوتا۔ کینہ چوب کوئی ابتلا آتی ہے۔ تو دشمن کے سامنے اڑیاں رگڑتا ہے۔ اور شریف
 جب دشمن اس کے قابو میں آتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہے۔ اور نہ ماضی کے کسی واقعہ پر ملعون کرتا ہے میاں (وہ اپنی زبان میں حضور
 صلی اللہ علیہ وسلم کو میاں کے نام سے پکارتے) کی شرافت اور بہادری دیکھئے۔ جب حضرت عمرؓ نے ایمان لانے کے بعد عرض کیا کہ حضرت
 کینہ میں کیوں نماز نہیں پڑھتے؟ تو فرمایا کہ تیری قوم میں پڑھنے دیتی۔ حالانکہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے رکاوٹ تو حضرت عمرؓ تھے۔ مگر یہ نہیں فرمایا
 کہ آپ میں پڑھنے دیتے تھے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کیا شرافت ہے۔

اس کے بعد چند کینہ سیاسی لیڈروں کا ذکر آیا اور چند کینہ صفت صحافیوں کا جو لوگوں کے ماضی کے بچنے ادا دھڑکتے ہیں۔ اور بڑے بڑے
 اسے سب الوطنی خیال کرنے ہیں چنانچہ اسی مناسبت سے مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔

خونے کا مشک گشت دلش می شود سیاه	زاں سفلیں خدر کہ دولت رسیدہ است	(عقی)
انا روانہ پختہ شود بکند اند بوست را	کینہ گر بزرگ شودیر بنجاند دوست را	(مناقب)
نہ ہر کہ صدر نشینند عزیز شد کہ غبار	گر بدیدہ قند طوطیہ نخواستد بود	(کی)
سنگہ خویش پوش را بر مسند خود جاہدہ	کفش گر زین بود بر سر سخی باید نہاد	

اس عالم کی بے ثباتی اور ناپائیداری حیات کے متعلق حضرت کے ملفوظات نہایت دلچسپ اور علمی ہوتے تھے۔ اس موضوع پر غالب
 الہ کا بڑا مامون ثابت ہوتا۔ راقم نے مختلف مجلسوں میں اس موضوع پر سب ذیل اشعار سنے۔

ہستی کے مت فریب میں آجا جو استد عالم تمام حلقہ دام خیال ہے
 مصرع ثانی کو کچھ اس رنگ سے پڑھئے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسیر دام خیال ہو جاتا ہے
 ہاں کھانو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
 دوسرے مصرع میں نفی و اثبات کا ذکر ہے۔ اس کے پڑھنے میں ایک عجیب سماں پیدا کرتے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور جز وہم نہیں ہستی! شاید دوسرے آگے
 یہ حیات نیروی الہ کے نزدیک مرگ کا درجہ رکھتی تھی۔ انہوں نے اپنے کلام میں بھی اس طرح ذکر کیا ہے۔ ”مردیم در انتظار مگریم“
 فرات کیوں حیات ہے لالہ و لا قوتہ۔ ہیں نواس حیات کے مٹلےں ابوطالب کا سیم کی تمیر پسند ہے۔

بدنائی حیات دو روز سے نبود بیش
 کلیم نے حیات نہیں کہا بلکہ تمت حیات سے تغیر کیا ہے۔
 آں ہم کلیم باتو پر گویم حیاں گزشت
 روز و گر بکندین دل ز این داک گزشت

اپنی نشست گاہ میں تشریف فرما تھے۔ ان دنوں دوس کے مصنوعی سیارے فضا میں پرواز کر رہے تھے اور اشتراکی مبلغ لوگوں کو یہ باور کرانے پھر رہے تھے۔ ان دنوں مذہب اسلام آسمان پر کوئی نہیں جاسکتا۔ حضرت مرام کے سامنے کسی نے اس کا ذکر کیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا ہم تو انسان کے اعلیٰ عظیم چمکنے پر ایمان لائے بیٹھے ہیں۔ یہ چاند اور ستارے تو راستے میں ہیں۔ لیکن مجھے اس کا یہاں (فضائی) تغیر پر کوئی مسرت ہے نہ غم۔ ہم تو بے مانیں گے جب یہ موت کا کوئی علاج کر دکھلائیں۔ اور کسی آدمی کے متعلق یہ فیصلہ کر دیں کہ اب وہ نہیں مرے گا۔ تو پھر میں انہی کو سجدہ کر لوں گا۔ مدت سے لیے پھرتا ہوں ایک بچہ تپے۔ ان سے کوئی پوچھے وہ خدا ہیں کہ سنیں ہیں

کبھی کبھی اپنے اعمال کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے۔۔۔
 شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی
 گوشت خاک ماہم برباد رفت باشد

شاہ صاحب کی قرآن کریم سے شیفتگی اور دلالت محبت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ اتشنائی صورتوں میں قرآن مجید کے علاوہ کسی دوسری کتاب کے پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ آپ کا عقیدہ تھا کہ میرے لیے جو کچھ ہے قرآن مجید میں موجود ہے۔ اگر آج دنیا قرآن کو چھوڑ کر دوسری کتابوں پر نگاہ کر سکتی ہے۔ تو میں دوسری کتابوں سے روگردانی کر کے صرف کتاب الہی پر توجہ کیوں نہ نہ کر دوں۔ میں تو قرآن کا مبلغ ہوں۔ میری باتوں میں اگر کوئی تاثر ہے تو وہ صرف قرآن کی برکت سے ہے۔
 خواجہ فرید علی الرحمن کے ایک بول لہجے میں یہ کافوا قدر ارشاد فرمایا کہ وہ ہر سال حضرت خواجہ کی خدمت میں ایک لنگی ہدیہ لایا کرتا تھا۔ ایک سال ناغہ کرنے کے بعد دوسرے سال دو لنگیاں ہدیہ لایا۔ حضرت نے گزشتہ سال غیر حاجی کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کیا کہ گزشتہ سال لنگی مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ تو فوراً حضرت نے لنگیوں کو آگ لگا دی اور فرمایا۔ بہتر ہی شے یاہ کون بھیڑے اور کون بھا لائے۔ یعنی جو چیز بار سے جدا کرے اسے آگ لگا دو

میں بھی یہی کرتا ہوں جو چیز مجھے قرآن سے جدا کرے اسے آگ لگا دو۔
 چوں غلام آفتابم ہمہ نہ آفتاب گویم
 نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

ما قصہ کند و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مرد وفا پیرس

شاہ صاحب کے ایک عقیدت مند عالم دین ج بیت اللہ کا فریضہ ادا کر کے ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ وہ اپنے اس پاکیزہ سفر کے تاثرات بیان کر رہے تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے ایک حدیث کا یہ مفہوم بیان کیا کہ جب تک ج بیت اللہ کا سلسلہ جاری ہے۔ اس وقت تک قیامت نہیں آئیگی۔ حج و طواف جب لوگ چھوڑ دیں گے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔ اس حدیث کے بعد حضرت شاہ صاحب نے رشید الدین و طواف کا حسب ذیل شعر پڑھا۔

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرایا دست
عالم نشود ویراں تا میکہ آباد است

اوصاف مجیدہ اور اخلاق عظیم کا مجسمہ تھے۔ اپنی شخصیت کو ابھارنے کا خیال تک نہ لاتے تھے۔ ہمیشہ دوسروں کے ماسن کا بڑی فریخ ولی سے اعتراف کرتے۔ خود میں اسے احتراز فرماتے۔ اکثر کہا کرتے ہیں تو گندگی کا ڈھیر ہوں۔ اللہ میاں نے سفید چادر ڈال راہ پر عطا اللہ لکھ دیا ہے۔ اسے بھائی ہم دوسروں کے عیب کیا دیکھیں نہیں تو اپنے عیبوں سے فرصت نہیں ملتی۔ ہم نے مجنوں پر لو کہیں میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یا د آیا۔ دوسروں کے عیب تلاش کرنا کوئی آدمی کا کام ہے۔ حضرت شیخ سعدی دو باتوں میں دین کا خلاصہ ذکر کر گئے ہیں۔

مرا پیر دانا سے مرشد شباب
دو انداز فرمود بر دے آب
یکے کل کہ بر غیر بد ہیں مباح
دگر آنکہ بر خویش خود ہیں مباح

ساحۃ طریق زندگی حضرت مرحوم کو بے حد پسند تھا۔ اسباب کی فراوانی۔ تکلفات کے بندھنوں کو تو خداوندی سے تعبیر کرنے اور فکری سوئے ایرانی قالین، امنیں لبو لانتے۔ حجاج کرام سے جب عربوں کے عیش و عشرت کے واقعات سنتے تو بے حد افسوس کا اظہار کرتے۔ اور اپنی گرجہ دار آواز میں فرماتے کہ رڈ لعنت ہو اس دم پر جہاں سے فرنگی کا لطف ڈھل کر آتا ہے۔ دیکھو عربوں کو کس کثرت سے اسباب عیش و تنوم فراہم کر رہا ہے۔ تاکہ شیکل پسند شتر بان کسی کام کے نہ رہیں۔

عیش کوئی۔ اردوؤں کا ہجوم۔ کثرت مباحات۔ خدا سے بند کے اسباب شمار فرماتے ہوئے ایک صوفی شاعر میر کا یہ شعر پڑھا۔

سراپا آردو ہونے نے بندہ کو دیا سم کو

وگر نہ ہم خدا تھے گر دل بے دعا ہوتے

یہ بڑھتے ہوئے فرمایا۔ حاجتیں جس قدر کم ہوتی جاتی ہیں۔ بندہ خدا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اگر کوئی حاجت نہ ہو تو خدا ہے۔

اپنے بارے میں ارشاد فرمایا۔ کہ اگر میر سے مانگھ میر سے بیوی بچوں کا جھنڈا نہ ہوتا تو میں کسی دریا کے کنارے تک دھن کی

کٹیا میں زندگی گزارنا۔ وقت ضرورت، عدائے دین و دشمنان اسلام پر حملہ آور ہوتا۔ اور پھر اپنی کٹیا میں آ پناہ لیتا۔ اس کے بعد جمائی
اس میں۔ احمد رضا کے چند اشارات نے جنہیں طوالت کے پیش نظر چھوڑ رہا ہوں۔ صرف جمائی کے اشارے عرض ہیں۔

ہنگے زیر ننگے بالا !
نہ خیم دُزد نے خیم کالا
گز کے بویا و پوست کے
دلکے در و مند و دو شکے

ایں قدر بس جمائی را !
عاشق زند ولا اُبی را

ایک عقیدہ قند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ کہیں ملازمت کا امیدوار تھا۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد عرض کیا۔ اور ایک انیس کے نام
سفارشی مکتوب کی خواہش کا اظہار کیا۔ جو اب شاہ صاحب نے فرمایا۔ جمائی میں نوکریاں چھڑانے والا پیر ہوں۔ اگر ملازمت کے لیے کسی کاغذ
کی ضرورت ہے۔ تو کسی مجاہدہ نہیں یا کسی مخدوم یا کسی بڑے لیڈر کے پاس جاؤ۔ ہماری آشنا نوابی کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر آپ کہیں ملازم ہوں
اور آپ کے اعلیٰ افسر کو معلوم ہو جائے یہ عطا اللہ شاہ کا غنے والا ہے۔ تو فوراً آپ پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ اور آپ ملازمت
سے سبکدوش ہو کر آرام سے گھر بیٹھ جائے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ میرا بھانجا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں اس کی والدہ کو ملنے
کے لیے گیا۔ جو میری پھوپھی زاد بہن تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے غم میں رو رہی تھی۔ میں نے اسے کہا دیکھو بہن ! اگر تیرا بیٹا ہفتے کے اندر
واپس آوے تو میرا کیا انعام؟ کچھ انعام ملے گا۔ میں نے اسی روز اس کو ایک خط لکھا۔ (وہ اس وقت بنگال کی کسی چھاؤنی میں تھا۔)
عزیزم ! آپ بڑی مناسب جگہ پہنچ گئے ہیں اپنے کام کی رفتار سے جھے مطلع کرتے رہنا۔ وغیرہ وغیرہ
نیچے میں نے دستخط کئے۔ - سید عطا اللہ شاہ بخاری -

خط سسر ہو کر اس یونٹ کے انگریز کرنل کو پہنچا۔ اس نے فوراً میرے بھائی کو بلایا اور پوچھا کون ہے عطا اللہ شاہ اس نے بتایا
تو کرنل نے اسے واپس جانے نہیں دیا۔ بلکہ اس کا سامان وغیرہ منگو کر فوراً ہی چھاؤنی سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔
اس کے بعد سفارشی مکتوب لینے والے کو فرمایا جمائی ! ہمارا نام تو اس کام کے لیے ہے۔ اگر کہیں ملازم ہو جاؤ تو پھر میری خدمات

حاضر ہیں۔ -

اے ہم نفساں ! آتش از من بگزینید
ہر کس کہ شود تہرہ را دشمن خویش



نعت شریف

نازاں ہے جس چُسن و چُسنِ رسولؐ ہے
یہ کہکشاں تو آپؐ کے قدموں کی ڈول ہے
اے راہروانِ شوق یہاں سہرے کے بل چلو
طیبہ کے راستے کا تو کانٹا بھی پھول ہے
ہر اک قدم پہ اس میں ضروری ہے احتیاط
عشقِ تباں نہیں ہے یہ عشقِ رسولؐ ہے
ایہیں مصطفیٰؐ کے سوا حلِ مشکلات
یہ عقل کا فریب ہے نگاہوں کی جھول ہے

پس مردانِ حق

مولانا خیر محمد جالندھری	مولانا رحمت اللہ کیرانوی
مولانا محمد علی جالندھری	مولانا سید محمد علی مونگیری
مولانا محمد شفیع دیوبندی	مولانا خلیل احمد بہارپوری
مولانا سید محمد یوسف بنوری	خلیفہ غلام محمد دین پوری
مولانا مفتی محمود	مولانا ابوالسعد احمد خان
مولانا غلام اللہ خان	مولانا محمد عبداللہ سلیم پوری
مولانا غلام غوث ہزاروی	مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی
مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی	مولانا محمد یوسف دہلوی
مولانا قاری محمد طیب قاسمی	مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی
مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک	مولانا عبدالرحمن کانملپوری

ترتیب
عبدالرشید ارشد

پہلی جلد صفحات ۱۰۲۸: دوسری ۱۰۵۲:

قیمت - ۷۵۰ روپے

بیس علمائے حق زیر ترتیب

مولانا احمد سعید دہلویؒ	مفتی عزیز الرحمن عثمانیؒ
مولانا عبدالغفور مہاجر مدنیؒ	مولانا محمد اعزاز علیؒ
مولانا محمد عبداللہ در خواستیؒ	مولانا رسول خاںؒ
مولانا محمد انعام الحسن دہلویؒ	مولانا سید مناظر حسن گیلانیؒ
مولانا غلام حبیب چکوالویؒ	مولانا ظفر احمد عثمانیؒ
مولانا مسیح اللہ خاںؒ	مفتی جمیل احمد تھانویؒ
مولانا محمد اشرف خاں سلیمانیؒ	مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ
مولانا سید عطاء المنعم بخاریؒ	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	مولانا شمس الحق افغانیؒ
مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ	مولانا سید محمد میاں مراد آبادیؒ

واردات و مشاہدات شخصیات و تاثرات

قیمت: -/300

صفحات 800

مرتبہ: عبدالرشید ارشد

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

مدیر ”الرشید“ عبدالرشید ارشد زید مجدد ہمارے دور کے ان علماء میں سے ہیں جن کے وقت اور قلم میں برکت ہے، ان کو اللہ تعالیٰ نے سیال قلم اور تحریر و تصنیف میں خاص ملکہ عنایت فرمایا ہے، اکابرین دیوبند کے تعارف و تذکرہ میں انہوں نے بے مثال خدمات انجام دی ہیں، ان کی ”میں بڑے مسلمان“ ہی میسوں کتابوں پر بھاری ہے، جبکہ ان کا جاری فرمودہ ماہنامہ ”الرشید“ اپنی لازوال خدمات کی ۲۹ منزلیں طے کر کے اپنا مقام پیدا کر چکا ہے، اور متعدد علمی و تاریخی نمبر شائع کر کے دنیائے علم اور میدان صحافت میں اپنا لوہا منوا چکا ہے، لکھنا پڑھنا اور تصنیف و تالیف مولانا موصوف کی روح اور غذا کا درجہ رکھتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ موصوف کو لکھنے میں کسی خاص عزم و ارادہ کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ وہ بے ساختہ لکھتے ہیں، اور لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بلا کی چاشنی ہے، وہ سادگی تحریر کے باوجود اپنے قارئین کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں، ان کی تحریروں میں جامعیت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے، وہ بلا کے ذہین اور غضب کے حافظہ کے مالک ہیں۔ بلاشبہ یہ کتاب اپنے متنوع مضامین اور جامعیت کے اعتبار سے ایک تاریخی دستاویز ہے، جو تاریخ و تذکرہ کے عنوان پر کام کرنے والے ہر باذوق کے لیے خاص اہمیت کی حامل ہے، ہمارے خیال میں کوئی کتب خانہ اس کتاب کے بغیر مکمل کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا، امید ہے باذوق قارئین اس دستاویز کی پذیرائی میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔ ماہنامہ ”پینات“ شمارہ ۱۱/ فروری ۲۰۰۲ء